تفسیر موضوعی

جلد اول

زیر نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

علامہ سید صفدر حسین نجفی رح

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔

فہرست

تفسیر موضوعی: پیامِ قران جلدنمبر1

عنوان	صفحہ نمبر
پیش لفظ	12
تفسیر کی قسمیں	12
تفسیر موضوعی کیا ہے؟	14
تفسیرِ موضوعی علمائے متقدمین کے کلام میں:	21
تفسیر موضوعی کی مشکلات	24
تفسیر موضوعی کی قسم اب تک پروان کیوں نہیں چڑھ سکی؟	25
سب کام خدا کے نام سے!	27
الفاظ کی تشریح	28
آیات کی تفسیر اوران کی جمع آوری	31
صرف خدا ہی کے نام سے کیوں شروع کریں؟	31
توضیحات	33
بسم اللہ کی زبردست اہمیت!	33
معرفت (شناخت) کا مسئلہ	42
قرآنی نقطہ نظر سے معرفت ضروری ہے	44
(علم کی اہمیت کے بارے میں چالیس قرآنی نکات)	44
۱۔حصولِ علم ضروری ہے	44
۲۔غور وفکر سے کام نہ لینے پر سرزنش کی گئی ہے	46
۳۔تعلیم وتعلّم کی تاکید	46
۴۔تخلیق کائنات کا مقصد ہی علم اور معرفت ہے	47
۵۔بعثت انبیاء کا مقصد تعلیم وتربیت ہے	48
۶۔قرآن کے نازل ہونے کا مقصد غور وفکر ہے	49
۷۔معراجِ پیغمبرؐ کا مقصد ہی معرفت تھا۔	50
۸۔دعوتِ اسلام کا آغاز علم کی دعوت سے ہوا	50
۹۔علم نور اور روشنائی ہے	51
۱۰۔کائنات کے اسرار کا ادراک صرف عالم ہی کر سکتے ہیں	51
۱۱۔سب سے پہلا معلّم خداوند عالم ہے	52
۱۲۔انسان دوسری مخلوقات پر علم ہی کے ذریعہ ممتاز ہوتا ہے	53
۱۳۔خدا کا قرب معرفت کے تناسب سے حاصل ہوتا ہے	53
۱۴۔انبیاء زیادہ سے زیادہ علم کے خواہاں ہوتے ہیں	54
۱۵۔انسان کی نجات کی کنجی معرفت ہے	55
۱۶۔علم ہر صوت میں قابل فخر ہے	57
۱۷۔قیادت کی اولین شرط معرفت ہے	58
۱۸۔علم ہی سے ایمان کے سوتے پھوٹتے ہیں	59
۱۹۔علم سے تقوٰی اور خوفِ خدا کے سوتے پھوٹتے ہیں	61
۲۰۔علم زہد کا منبع ہوتا ہے	62
۲۱۔علم مادی ترقی کا سرچشمہ ہوتا ہے	63

عنوان	صفحہ نمبر
۲۲۔علم، طاقت کا سرچشمہ ہوتا ہے	64
۲۳۔علم تزکیہ نفس کا سرچشمہ ہوتا ہے	65
۲۴۔علم صبر وشکیبائی کا سرچشمہ ہے	66
۲۵۔علم ومعرفت خیرِ کثیر ہیں	66
۲۶۔جہنمی لوگ جاہل ہیں	67
۲۷۔جہالت انسان کی پستی کا سبب ہے	69
۲۸۔جہالت نابینائی ہے	69
۲۹۔جہالت کی زندگی ارذل العمر ہے	70
۳۰۔جہالت کفر کا سرچشمہ ہے	71
۳۱۔جہالت ہی شکست کا اصل سبب بنتی ہے	72
۳۲۔جہالت کی بدولت اخلاقی برائیاں پھیلتی ہیں	73
۳۳۔جہالت تعصب اور ہٹ دھرمی کا موجب ہوتی ہے	75
۳۴۔جہالت بہانہ جوئی کا سبب ہوتی ہے	76
۳۵۔جہالت اندھی تقلید کا سبب ہوتی ہے	77
۳۶۔جہالت اختلاف وانتشار کا سبب ہوتی ہے	78
۳۷۔جہالت سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں	79
۳۸۔جہالت بے ادبی کا سبب ہے	80
۳۹۔جہالت اجتماعی مصائب اور پشیمانیوں کا سبب ہوتی ہے	81
۴۰۔جہالت اقدار کو بدل دیتی ہے	81
ا۔آیات کی جمع بندی اور نتیجہ	82
چند وضاحتیں	83
اور اب وضاحت:	86

عنوان	صفحہ نمبر
۲۔محدود انسانی علم	89
الفاظ کے معنی	90
تفسیر اور آیات کی جمع بندی	91
اس ساری بحث کا نتیجہ	94
۳۔ انسانی علم کے محدود ہونے پر فلاسفہ اور دانشوروں کی گواہی	95
چند ضروری باتیں	99
ا۔علمی غرور کا سدِ باب:	99
۲۔تیز تر علمی حرکت:	100
۲۔معرفت کے منابع اور ذرائع	101
(معرفت کے چھ راستے)	101
احساس اور تجربہ	102
الفاظ کی تشریح	105
تفسیر اور جمع بندی	105
نتیجہ	107
چند توضیحات	108
فلاسفہ اور حسّ کا منبع:	108
معرفت کا دوسرا منبع عقل وخرد ہے	112
الفاظ کے معانی	115
عقل کے افعال	117
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	119
عقل کا قرآنی معیار:	119
مزید وضاحتیں	123
ا۔فلسفی نقطہ نگاہ سے عقلی ادراکات	123

عنوان	صفحہ نمبر
۲۔اسلامی روایات میں عقل کا مقام	125
۳۔حاکمیت عقل کے مخالفین	128
معرفت کا تیسرا منبع تاریخ اور تاریخی آثار	130
۱۔مرتب صورت میں:	130
۲۔تکوینی صورت میں:	130
الفاظ کی شرح	132
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	134
توضیحات	137
۱۔تاریخ کا آئینہ جہان نما:	138
۲۔تاریخ کے پُرکشش نکات	140
۳۔تاریخ کے ناخالص پہلو	141
۴۔فلسفۂ تاریخ	143
۵۔نقلی اور علمی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ	144
ایک سوال کا اور اس کا جواب	146
۲۔نہج البلاغہ اور اسلامی روایات میں تاریخ کا بیان	146
معرفت عطا کرنے والی تاریخ کے بارے میں حرفِ آخر	152
معرفت کا چوتھا منبع فطرت، ضمیر اور باطنی شعور	153
الفاظ کی تشریح	156
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	157
نتیجہ گفتگو	161
تشریحات	161
۱۔فطرت و وجدان اور ضمیر کی قسمیں	161

عنوان	صفحہ نمبر
۲۔آیا شناخت فطری کا وجود ہے؟	162
ایک اور سوال	165
۳۔اسلامی روایات میں، فطرت اور وجدان	166
معرفت کا پانچواں منبع آسمانی وحی	168
الفاظ کے معانی اور تشریح	170
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	174
آفتابِ وحی	174
تفصیلات	177
۱۔قرآنِ مجید میں وحی کی قسمیں	177
۲۔وحی کی حقیقت کیا ہے؟	179
۳۔وحی کے بارے میں شرق و غرب کے فلاسفہ کیا کہتے ہیں؟	181
۴۔وحی کے غریزی ہونے کا مفروضہ	184
۵۔پیغمبر کو کیسے یقین ہوتا ہے کہ وحی خدا کی طرف سے ہے؟	187
۶۔اسلامی روایات میں قرآن مجید معرفت کا اہم ترین منبع ہے	188
۷۔غیر انبیاء کی وحی (یا وحی الہامی)	190
۸۔پیغمبرِ اسلامؐ پر وحی کیونکر نازل ہوتی تھی؟	193
۹۔غریزی الہامات	194
چھٹا منبع کشف شہود	199
الفاظ کی تشریح	202
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	204
غیب کا مشاہدہ	204

عنوان	صفحہ نمبر
نتیجہ	212
چند توضیحات	212
۱۔ روایت میں کشف وشہود کے چند دلچسپ نمونے	212
۲۔ پردے کیونکر اٹھتے ہیں؟	217
۳۔قرآن میں سات سچے خواب	221
۷۔سلطان مصر کا خواب	227
نتیجہ	229
۴۔ ''رحمانی'' اور ''شیطانی'' مکاشفے	230
معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں	236
کلی طور پر معرفت کے پردے	237
الفاظ کے معانی اور تشریح	239
آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی	241
معرفت کی آفات کا بالتدریج اثر ورسوخ (کجی، زنگ، بیماری، پردہ اور تالہ)	241
آخری نتیجہ	249
معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں (تفصیل کے ساتھ)	251
الف: وہ صفات جو معرفت سے مانع ہیں:	251
۱۔خواہش پرستی کا حجاب	251
الفاظ کے معانی اور تشریح	253
آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی	253
۱۔ھوی پرستی دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے	255
۲۔حب دنیا کا پردہ	256
آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی	256
۳۔تکبر، غرور اور قدرت کے نشے کا پردہ	258
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	259
مغرور اور متکبر حق کو نہیں سمجھتے	259
۴۔احادیث کی رو سے غرور کے پردے	260
۵۔ جہالت اور غفلت کے پردے	261
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	262
احادیث اور جہالت کے پردے	263
۶۔نفاق کے پردے	264
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	266
دل کے اندھے منافقین	266
۷۔تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے	269
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	271
چلتے پھرتے مردے	271
نتیجہ کلام	273
۸۔اندھی تقلید کے پردے	275
الفاظ کے معانی اور تشریح	277
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	278
دنیا کو تقلید نے برباد کر دیا	278
تشریح	279
۱۔تقلید کی مختلف قسمیں	279
۲۔صحیح تقلید کی شرائط	281
۳۔اندھی تقلید کے اسباب	283
۱۔فکری نابالغی:	283

عنوان	صفحہ نمبر
۲۔شخصیت پرستی:	283
۳۔آباؤاجداد سے شدید تعلق:	283
۴۔گروہ بندی یا قبائلی تعصّبات:	283
۹۔عیش پرستی کا پردہ	284
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	285
بچوں کی طرح ہمیں بھی جہاد سے معاف رکھا جائے	285
۱۰۔آرزوؤں کا حجاب	286
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	287
لمبی آرزوئیں	287
مزید تشریح	289
آرزوؤں کا حجاب روایات کی رو سے	289
دوسرا حصہ	291
وہ اعمال جو معرفت کے لیے حجاب بن جاتے ہیں	291
۱۱۔گناہوں کا حجاب	291
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	292
گناہ انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتے ہیں	292
تشریح	295
روایات کی رو سے گناہ کا حجاب ہونا	295
۱۲۔کفر اور روگردانی کا حجاب	299
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	300
گناہ کیونکر حجاب بن جاتا ہے؟	300
۱۳۔تجاوز اور سرکشی کا پردہ	304
آیت کی تفسیر اور اس کا نتیجہ	304
۱۴۔سطحی نگاہ اور تدبر سے کام نہ لینے کا پردہ	306
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	306
۱۵۔ارتداد کا پردہ	310
آیات کی تفسیر اور تشریح	310
۱۶۔جھوٹ اور افترا پردازی کا پردہ	311
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	312
جھوٹ کی فریب کاری	312
۱۷۔گمان کا ضخیم پردہ	315
آیت کی تفسیر اور جمع بندی	316
بیرونی حجاب	318
۱۸۔فاسد اور گمراہ رہنماؤں کا پردہ	318
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	319
اہل جہنم کا باہمی جھگڑا	319
تشریح	321
”مستضعفین“ اور ”مستکبرین“ قرآن کی نگاہ میں	321
قائدین کا مقام اسلامی روایات میں	323
۱۹۔گمراہ دوستوں کا حجاب	324
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	324
تشریح	326
ہمارے طرز فکر میں دوستوں کا کردار	326
پروپیگنڈے اور ماحول کا پردہ	328
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	329
زہریلا پروپیگنڈا	329
مزید تشریح	336

عنوان	صفحہ نمبر
حقائق کو چھپانے میں پروپیگنڈے کا اثر	336
۲۰۔شیطانی وسوسوں کا حجاب	338
الفاظ کے معانی اور تشریح	340
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	341
باطل کو کیسے زینت دیتے ہیں؟	341
مزید تشریح	346
شیطان کون ہے؟	346
۳۔ایک اور اہم نکتہ	348
۵۔معرفت کے ذرائع	348
ا۔تقوی اور معرفت کا رابطہ	350
الفاظ کے معانی اور تشریح	350
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	351
تقویٰ اختیار کرو تا کہ نور علم تمہارے دلوں میں روشن ہو	353
مزید تشریح	357
ا۔احادیث میں علم اور تقویٰ کا رابطہ	357
۲۔علم اور تقویٰ کا باہمی رابطہ	358
۳۔علم اور تقویٰ کی باہمی تاثیر	360
۴۔علم اور تقویٰ کے باہمی رابطہ سے ناجائز مفاد اٹھانا	360
۲۔ایمان اور معرفت	361
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	363
ایمان کی تاثیر	363
مزید تشریح	366
احادیث کی رو سے علم اور ایمان کا رابطہ	366
۳۔صبر و شکر اور معرفت کا رابطہ	367
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	369
"آفاق" اور "انفس" کی سیر اور صابر و شاکر ہم سفر	369
نتیجہ کلام	372
۴۔معرفت خود معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے	372
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	373
پہلے آشنا بنو پھر پتہ چلے	373
نتیجہ کلام	375

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اہداء

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زُلال سے زیادہ آبِ حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی

۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی

۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی

۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی

۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی

۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی

کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

پیش لفظ

۱۔تفسیر کی مختلف قسمیں۔

۲۔تفسیر موضوعی کیا ہے؟

۳۔تفسیر موضوعی کے ذریعہ کن مشکلات کو حل کیا جاسکتا ہے؟ (تفسر موضوعی کا دائرہ)

۴۔تفسیر موضوعی کا ماضی۔(کب سے اس تفسیر کی داغ بیل ڈالی گئی؟

۵۔تفسیر موضوعی کا صحیح طریقہ کار۔

۶۔تفسیر موضوعی کی مشکلات۔

۷۔تفسیر قرآن کی یہ قسم اب تک پروان کیوں نہیں چڑھ سکی؟

تفسیر کی قسمیں

جب بھی تفسیر قرآن کی بات ہوتی ہے تو ذہن فوری طور پر اسی عام تفسیر (ترتیبی تفسیر) کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس میں قرآنی آیات کو ترتیبی صورت میں زیرِ بحث لایا جاتا ہے اور قرآنی مطالب اور حقائق کی وضاحت کی جاتی ہے یعنی وہی طریقۂ کار جو اوائل اسلام سے اب تک ایک معمول اور مروج چلا آرہا ہے اور اسلام کے عظیم علماء اور دانشور لوگوں نے۔قرآن پاک کی تفسیر کے نام سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں تالیف کی ہیں۔

البتہ ایک اور قسم بھی کم وبیش معمول اور رائج چلی آرہی ہے جو ''مفرداتِ قران'' کی تفسیر کہلاتی ہے۔یعنی قرآنی الفاظ کو علٰیحدہ اور جداگانہ صورت میں الف' باء کی ترتیب کے ساتھ زیرِ بحث لاتی ہے اس کا ایک واضح نمونہ کتاب ''مفردات راغب'' وجہ القرآن'' اور تفسیر غرائب القرآن طریحی ہے۔

اور ابھی تازہ چند ایک اور کتابیں بھی منصۂ شہود پر آتی ہیں جن میں سے ایک تو ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' اور دوسری ''شرطربی' یا دائرہ المعارف قرآن مجید بھی ہیں۔

قرآن مجید کی کئی اور قسم کی تفسیریں بھی ہیں جن میں سے ایک تفسیر موضوعی ہے جس میں اسلام کے اصول وفروع، اجتماعی، اقتصادی، سیاسی اواخلاقی مسائل ایسے مختلف موضوعات سے متعلق آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور انہیں زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

تفسیر کی ایک اور قسم بھی ہے ہم نے جس کا نام ''تفسیر ارتباطی'' یا تفسیر مسلسل رکھا ہے اور وہ تفسیر کی وہ قسم ہے جس میں قرآن مجید کے مختلف موضوعات کو باہمی رابطے کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مثلاً جب ''ایمان'' تقوٰی'' اور عملِ صالح'' کے موضاعات کو تفسیرِ موضوعی میں علٰیحدہ علٰیحدہ صورتوں میں زیرِ بحث لاکر ان پر سیر

حاصل تبصرہ کرایا جاتا ہے اور مذکورہ تین مطالب کو قرآنی آیات کی روشنی میں اور ان کی طرف ہونے والے قرانی اشارات کے پرتو میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے تو ان کا باہمی رابطہ واضح ہو جاتا ہے ظاہری بات ہے کہ جب ان موضوعات کو آپس میں مربوط کریں گے تو کئی تازہ حقائق ہمارے سامنے آجائیں گے جو زبردست اہمیت کے حال رہنما اصول ثابت ہوں گے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کائنات اور موجوداتِ عالم کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم انہیں آپس کے باہمی رابطے کے تناظر میں دیکھیں۔ سورج ہو یا چاند، زمین ہو یا انسان اور انسانی معاشرے درحقیقت ایک دوسرے سے جدا اور علیٰحدہ موضوعات نہیں ہیں اور مجموعی طور پر ایک ایسی اکائی کو تشکیل دیتے ہیں جن کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور صحیح مطالعہ کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ہم ان سب کو ان کے باہمی رابطے کی صورت میں دیکھیں اور ان کی تحقیقات اور تجزیہ وتبصرہ کریں۔

کتاب ''تدوین'' یعنی قرآنِ مجید میں بیان شدہ مطالب بھی اسی قسم کے ہیں اور تمام قرآنی موضوعات کے درمیان نہایت ہی دقیق اور ظریف رابطہ میں موجود ہے لہٰذا ان کی باہمی رابطے کے تناظر میں تفسیر کی جانی چاہیے

تفسیر کی ایک اور قسم بھی ہے جس کا نام ''تفسیر کلّی'' یا ''قران کا آفاقی تصور'' ہے اور اس قسم کی تفسیر میں مفسر قرآن مجید کے تمام مطالب کی کائنات کے رابطہ کے تناظر میں تفسیر کرتا ہے یا واضح ترین الفاظ میں یوں کہیے کہ کتاب تدوین اور ''کتابِ تکوین'' کو آپس میں مربوط کرتا ہے اور دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور دونوں کو آپس میں مربوط کر کے تفسیر کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مجموعی طور پر قرآن مجید کی پانچ طرح کی تفسیریں متصوّر ہو سکتی ہیں:

۱۔ مفرداتِ قرآن کی تفسیر۔

۲۔ ترتیبی تفسیر۔

۳۔ موضوعی تفسیر۔

۴۔ ارتباطی تفسیر۔

۵۔ کلّی تفسیر یا قرآن کی آفاقی تفسیر۔

لیکن مذکورہ پنچگانہ تفسیروں میں سے صرف پہلی اور دوسری قسم کی تفسیریں ہمارے درمیان معروف ہیں جبکہ تیسری قسم کی تفسیر کسی حد تک یعنی موضوعی تفسیر ابھی اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے اور چونکہ ابھی تازہ اس تفسیر کی طرف علماء اسلام کی توجہ مبذول ہوئی ہے جس سے یہ امید بندھ گئی ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے گی اور یہ تفسیر اس طرح سے اپنے ارتقا کے تدریجی مراحل طے کر کے مستقبل میں اپنے شایانِ شان مقام تک جا پہنچے گی۔

رہیں قرآن مجید کی چوتھی اور پانچویں قسم کی تفسیریں تو ابھی تک ان کی طرف مفسرین کی توجہ نہیں ہوئی ہے اور یہ کام موجودہ اور آئندہ نسلوں کے ذمہ ہے کہ جب کافی حد تک تفسیر موضوعی ترقی اور کمال کی سرحدوں کو چھونے لگے تو وہ بھی ان کا تاحدِ امکان حق ادا کر دیں گے۔

تفسیر موضوعی کیا ہے؟

یہ سوال کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور سوال کو پیش کیا جائے اور وہ یہ کہ آخر کیا وجہ ہے کہ خود قرآن مجید کو موضوعی صورت میں کیوں جمع نہیں کیا گیا، اور عام کتابوں کی طرح اس کی تدوین کیوں نہیں کی گئی؟ یہی نہیں بلکہ یہ (قران) تمام دوسری عام کتابوں سے یکسر مختلف ہے!

جواب: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عام کتابوں کو تدوین وتالیف کے لئے ایک یا کئی مؤلفین مختلف موضوعات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں جو ایک قدرِ جامع میں شریک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر علمِ طب میں 'مختلف، امراض'' کو پیشِ نظر رکھتے ہیں جن کا ''انسانی سلامتی'' کے ساتھ تعلق ہوتا ہے پھر ان موضوعات سے متعلق مسائل کو مختلف ابواب اور فصلوں میں تفسیر کرتے ہیں (مثلاً امراضِ قلب، امراضِ اعصاب، امراضِ معدہ، امراضِ تنفس، امراضِ جلد وغیرہ)

پھر ہر باب اور فصل کو مقدمہ اور نتائج کے اعتبار سے زیر بحث لاتے ہیں اور اس پر تفضیل سے گفتگو کرتے ہیں تب کہیں جا کر ''طب' کے نام پر کوئی کتاب مرتب اور مدوّن ہوتی ہے لیکن قرآن کا معاملہ اس سے یکسر جدا ہے کیونکہ وہ ۲۳ سال کے عرصہ میں مختلف اجتماعی ضروریات گوناگوں حوادث اور مختلف مراحل میں بالترتیب نازل ہوتا رہا اور اسلامی معاشرہ کے قدم بقدم آگے بڑھتا رہا پھر کمال یہ کہ وہ کسی خاص زمانے اور کسی خاص مکان کے ساتھ مخصوص بھی نہیں۔

اگر ایک مرتبہ قرآن مجید کی بحث کا تمام تر دار و مدار بُت پرستی اور شرک سے محاذ آرائی اور توحید کی تمام اقسام سمیت تعلیم پر ہوتا اور اس دوران جو آیات اور سورتیں نازل ہوتیں ان کا محور مبدأ اور معاد کی بحث ہوتا (جیسے وہ سورتیں جو اوائل بعثت میں مکہ میں ۱۳ سال تک نازل ہوتی رہیں)

پھر دوسری مرتبہ جہاد اور اندرونی و بیرونی دشمنوں اور منافقین سے گرما گرم گفتگو پر مبنی بحث کا تذکرہ ہوتا۔

جب جنگ احزاب (خندق) پیش آئی تو سورۂ احزاب نازل ہوئی اور اس کی سترہ آیتیں اس جنگ کے سبق آموز حوادث تربیتی مسائل اور اس کے نتائج پر مشتمل ہیں۔

جب صلح حدیبیہ کا ماجرا پیش آیا اور سورۂ فتح' نازل ہوئی اور اس کے بعد فتح مکّہ کا ماجرا رونما ہوا اور غزوہ حنین پیش آ گیا تو سورہ "اذاجاء نصر الله" کی آیات اور کئی دوسری آیات نازل ہوئیں۔

الغرض اسلام کی پیش رفت اور اسلامی معاشرہ کے تحرک کے ساتھ ساتھ قرانِ مجید کی آیات نازل ہوتی اور احکام دیتی رہیں اور صحیح معنی میں اس انسانی پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی رہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفسیرِ موضوعی کا مقصد واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ تمام قرآنِ مجید میں مختلف آیات جو ایک موضوع پر مشتمل ہیں اور مختلف حوادث اور مواقع پر نازل ہوتی رہی ہیں انہیں یکجا کر کے مختلف زاویوں سے مجموعی طور پر قرآن مجید کا نقطۂ نظر

کیا جائے مثلاً معرفتِ خداوندی کے بارے میں ان دلائل پر مبنی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ملایا جائے جو برہانِ فطرت، برہانِ نظم، برہانِ وجوب وامکان اور دیگر براہین پر مشتمل ہیں اور چونکہ "القران یفسر بعضه بعضا" یعنی قرانی آیات ایک دوسرے کی خود تفسیر کرتی ہیں لہٰذا اس موضوع کی تمام جہات واضح ہوجاتی[1] ہیں۔

اسی طرح کچھ آیات ایسی ہیں جو جنت یا جہنم صراط اور نامۂ اعمال سے متعلق ہیں انہیں باہمی طور پر مربوط کر دیا جائے یا جو آیات اخلاقی مسائل مثلاً تقوٰی، اخلاقِ حسنہ اور شجاعت وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں انہیں آپس میں ملایا جائے اور احکام جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس اور انفال وغیرہ کو آپس میں مربوط کیا جائے یا کچھ آیات جو عدالتِ اجتماعی دشمن کے ساتھ جہاد اور نفس کے ساتھ جہاد جیسے مسائل سے متعلق ہیں، انہیں آپس میں اکٹھا کیا جائے وغیرہ۔

یہ تو مسلّم بات ہے کہ یہ آیات مختلف مناسبت کے موقعوں پر قرآن مجید پر نازل ہوتی رہیں۔ لہٰذا جب ان میں سے ہر ایک حصے کو بطور جداگانہ اکٹھا کر کے پھر انہیں آپس میں مربوط کر کے ان کی تفسیر کی جائے تو اس سے مزید نئے حقائق کا انکشاف ہوگا لہٰذا یہیں سے تفسیر موضوعی کی ضرورت واضع ہوجاتی ہے اس کی مزید تفصیل انشاءاللہ آئندہ بحث میں آئے گی۔

تفسیر موضوعی اور مشکلات کا حل: اب یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تفسیر موضوعی کے ذریعہ کن مشکلات کو حل کیا جا سکتا ہے؟ اگرچہ اس سوال کا جواب تو مندرجہ بالا سطور میں اچھی طرح واضح ہو چکا ہے البتہ مزید تشریح کے لئے مندرجہ امور قابل توجہ ہیں۔

قرانِ مجید کی کچھ آیات میں کسی ایک چند جہاتی موضوع کی طرف ایک جہت کو ذکر کیا گیا ہے مثلاً مسئلۂ شفاعت کے سلسلہ میں بعض آیات میں صرف امکان شفاعت کے اصولوں کو بتایا گیا ہے۔

بعض دوسری آیات میں "شفیع" (شفاعت کرنے والوں) کی شرائط کو بیان کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو سورہ سبا آیت ۲۳، سورہ مریم

---

[1] "القران یفسر بعضه بعضا" کا جملہ ابن عباس سے مروی ہے اور چونکہ ان کے پیغمبر اسلامؐ اور امیر المومنینؑ سے قرآنی مسائل کے بارے میں صمیمی تعلقات تھے لہٰذا بعید نہیں ہے کہ یہ جملہ دونوں بزرگواروں میں سے کسی ایک کا ہو۔ البتہ اس مفہوم کا ایک جملہ نہج البلاغہ میں موجود ہے کہ امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: "وذکر ان الکتاب یصدق بعضه بعضا" (خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ سے فرمایا ہے کہ قرآن کے مختلف حصے ایک دوسرے کی تصدیق کرتے اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ (ملاحظہ ہو نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۸)

بعض علماء نے اپنی کتابوں میں "القران یفسر بعضه بعضا" کے جملہ کو حدیث کی صورت میں بیان کیا ہے جیسا کہ مرحوم شہرستانی نے اپنی کتاب "تنزیه التنزیل" کے صفحہ ۱۰۶ پر اسے روایت کے عنوان سے ذکر کیا ہے، لیکن اس کا ماخذ اور حوالہ پیش نہیں کیا۔ اسی طرح نہج البلاغہ میں ایک اور مقام پر بھی اسی بات کی طرف اشارہ ملتا ہے جہاں پر قرآن مجید کے بارے میں امیر المومنین فرماتے ھیں "وینطق بعضه ببعض ویشهد بعضه علی بع ض" یعنی اس کی بعض آیات بعض دوسری آیات کے متعلق گفتگو کرتی ہیں اور بعض، بعض کی گواہی دیتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۳۳)

آیت ۸۷)

بعض آیات میں ان لوگوں کی شرائط کو بیان کیا گیا ہے جن کی شفاعت کی جائے۔ (ملاحظہ ہو سورہ انبیاء آیت ۲۸، سورہ مومن آیت ۱۸)

بعض آیات میں سوائے خدا کے دوسرے تمام لوگوں کی شفاعت کی نفی کی گئی ہے (ملاحظہ ہو سورہ زمر آیت ۴۴)

بعض دوسری آیات میں غیر خدا کے لیے بھی شفاعت کا ثبوت ملتا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۂ مدثر آیت ۴۸)

تو ایسی صورت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت سے متعلق مسائل میں بہت سے ابہام پائے جاتے ہیں حقیقتِ شفاعت سے لے کر اس کی شرائط اور دوسری خصوصیات سمیت ہر موضوع میں ابہام پایا جاتا ہے لیکن جب ہم شفاعت کی تمام آیات کو قرآن مجید سے یکجا کر کے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ مربوط کر کے ان کی آپس میں تفسیر کریں تو یہ ابہام برطرف ہو جائے گا اور یہ مشکل بڑی آسانی سے حل ہو جائے گی۔

بعنیہ یہی صورت حال جہاد اور دوسرے اسلامی احکام سے متعلق آیات کے ہے یا برزخ یا علم خدا یا علم غیب اور یہ کہ آیا علمِ غیب خدا کے علاوہ کسی اور کے لیے بھی ممکن ہے یا نہ؟ پس ان موضوعات سے متعلق آیات کو اگر ایک جا کر کے پھر ان کے بارے میں غور و فکر کیا جائے تو ممکن ہے کہ حق مطلب ادا ہو جائے اور تمام ممکنہ ابہام تفسیر موضوعی کے ذریعہ ہو جائیں۔

بلکہ اصولی طور پر ''محکم'' اور ''متشابہ'' آیات کے سلسلہ میں بھی یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس بارے میں حکم بھی یہی ہے کہ آیاتِ متشابہات کی محکم آیات کے ذریعہ تفسیر کی جائے جو بذات خود ایک موضوعی تفسیر ہے۔

بہرِ صورت جب کسی ایک موضوع سے متعلق اور مربوط آیات کی انہی کے ذریعہ تفسیر کی جائے تو ان کے درمیان سے کوئی نہ کوئی تازہ بات سامنے آجاتی ہے، ایسی نئی نئی باتیں جن سے قرآنی معارف کے سوتے پھوٹتے ہیں اور بہت سے عقیدتی اور اسلامی احکام کے مشکل مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔

اس لحاظ سے آیاتِ قرانی کو چند مختلف کلمات سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ جن کے مختلف اور جداگانہ معانی ہوتے ہیں لیکن جب انہیں ایک دوسرے کے دوش بدوش ملا کر پھر ان کے معانی کیے جائیں تو ان سے کئی نئے مفہوم اور مطالب حاصل ہوتے ہیں۔

یا انہیں ''آکسیجن'' اور ''ہائیڈروجن'' جیسے مواد سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ جب ان دونوں مواد کو آپس میں ملا دیا جائے تو ان سے ایک تیسرا مادہ حاصل ہوتا ہے جسے پانی کہتے ہیں۔ اگرچہ آکسیجن اور ہائیڈروجن بذاتِ خود زندگی کے لئے مفید اور معاون مواد ہوتے ہیں لیکن ان کے باہمی امتزاج سے زندگی کے لئے ایک تیسری اہم شئے پانی کا وجود عمل میں آجاتا ہے۔

الغرض قرانِ مجید کے بہت سے اسرار و رموز کی گھتیوں کو یہ طریقہ اختیار کیے بغیر نہیں سلجھایا جا سکتا اور نہ ہی یہ راستہ اختیار کیے بغیر ان کی گہرائیوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ تفسیرِ موضوعی کی اہمیت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ البتہ ذیل میں ہم تفسیرِ موضوعی کے فوائد کو خلاصہ کے طور پر یوں پیش کر سکتے۔

۱۔ بادی النظر میں قرآنی آیات میں جو ابہام نظر آتا ہے اسے دور کرتی ہے اور متشابہ آیات کے حل کا راستہ نکالتی ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں مذکور مختلف موضوعات اور مسائل کی خصوصیات، شرائط اسباب وعلل اور نتائج سے باخبر کرتی ہے۔

۳۔ توحید وخداشناسی، معاد، عبادات، جہاد، حکومتِ اسلامی اور اس قسم کے دوسرے اہم ترین موضوعات کی تفسیر بتاتی ہے۔

۴۔ ایک طرح کی آیات کو آپس میں ملانے سے قرآن مجید کے کئی اور جدید اسرار سے پردہ اٹھاتی اور اس کے تازہ پیغام سے مطلع کرتی ہے۔ تفسیر موضوعی کا ماضی: یعنی تفسیر موضوعی کب سے رائج ہوئی؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تفسیر موضوعی کا کب سے رواج ہوا اور وہ کس دور میں رائج ہوئی؟ تو عرض ہے کے ہمیں سب سے پہلے اس کا سراغ خود قرآنِ مجید ہی میں نظر آتا ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں متشابہ آیات کی محکم آیات، کے ذریعہ تفسیر کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو بذاتِ خود ایک قسم کی تفسیرِ موضوعی ہے۔

اس کے بعد آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے کلام میں بھی اس قسم کے بہت سے نمونے ملتے ہیں جن کے تحت ہمیں کسی موضوع کے متعلق آیات کو یکجا کر کے ان سے استفادہ کا طریقہ بتایا گیا ہے اور ذیل کے چند نمونے شاید اس دعویٰ کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

۱۔ ایک تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ مشہور معروف روایت ہے جو آپؐ نے عبداللہ بن مسعود کو بطورِ موعظہ فرمائی ہے اور جسے بحارالانوار کی جلد ص ۹۶..... پر درج کیا گیا ہے، یہ ایک طویل اور مطالب سے لبریز روایت ہے جس میں اس قسم کی تفسیر کے بہت سے نمونے ملتے ہیں جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ روایت کُلی طور پر تفسیرِ موضوعی کے محور کے گرد گھوم رہی ہے جس کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کی مذمت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اے ابنِ مسعود! احمق وہ شخص ہے جو اس جلد گزر جانے والی دنیا کا طلبگار ہو، چنانچہ آپؐ اس زرق برق دنیا کی بے ثباتی پر درج ذیل آیات سے استدلال فرماتے ہیں:

اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط ...“ [1]

یہ دنیا تو صرف ایک کھیل تماشہ ہے، زینت ایک دوسرے پر فخر کے اظہار کا ذریعہ اور مال واولاد کے سلسلے میں ایک دوسرے پر برتری طلبی کا وسیلہ ہے.....

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا

---

[1] سورہ حدید ۱۹

عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿٣٤﴾ [1]

اگر مادی نعمتوں سے کفار کی بہرہ مندی اس بات کا سبب نہ بنتی کہ تمام لوگ یکسر گمراہ ہو جاتے، تو ہم کافر ہونے والوں کے لیے ایسے گھر تیار کرتے جن کی چھت چاندی کی ہوتی اور سیڑھیاں بھی جن سے وہ اوپر چڑھتے اور ان کے گھروں کے لیے دروازے اور تخت (خوبصورت اور نقرئی) قرار دیتے جن پر تکیہ لگاتے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿١٨﴾ [2]

جو شخص اس جلد فنا ہونے والی مادی دنیا کو طلب کرتا ہے تو ہم جسے چاہیں اسے اس میں سے کچھ مقدار دے دیتے ہیں پھر اس کے لیے دوزخ مقرر کر دیں گے جس میں وہ مذموم اور راندہ درگاہ ہو کر ہمیشہ جلتا رہے گا۔

اسی طرح ''بغیر علم کے بات کہنے'' کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

اے ابن مسعود! جب تک تم کسی چیز کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل نہ کر لو اس وقت تک کوئی بات نہ کرو، اور جب تک کوئی بات کانوں سے نہ سنو اور آنکھوں سے نہ دیکھو اس وقت تک کوئی کلمہ منہ سے نہ نکالو۔

چنانچہ اس سلسلہ میں بہت سی قرآنی آیات کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿٣٦﴾ [3]

جو تم نہیں جانتے اس کی پیروی نہ کرو، کیونکہ کان، آنکھ اور دل سب سے پوچھا جائے گا۔

سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿١٩﴾ [4]

عنقریب ان کی گواہی لکھی جائے گی اور وہ جوابدہ ہوں گے۔

نیز ارشاد فرماتا ہے:

---

[1] سورہ زخرف ۳۳، ۳۴

[2] سورہ بنی اسرائیل ۱۸

[3] سورہ بنی اسرائیل ۳۶

[4] سورہ زخرف ۹۱

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾ [1]

انسان کوئی بات بھی منہ سے نہیں نکالتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگران فرشتہ تیار ہوتا ہے۔

نیز فرماتا ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾ [2]

ہم انسان ہے اس کی دل کی رگ (یا گردن کی رگ) سے بھی زیادہ فریب ہیں۔

اسی طرح ''ذکرِ خدا'' راہِ خدا میں خرچ کرنے اور مکارم اخلاق جیسے موضوعات پر بھی اسی حدیث شریف میں قرآنی آیات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ [3]

۲۔ دوسرا مقام وہ ہے جس میں امیر المومنین علی علیہ السلام نے ''قرآنِ مجید میں کفر'' کے معانی بیان فرماتے ہوئے متعلقہ آیات کو ایک جگہ جمع کرتے ہوئے فرمایا:

قران میں کفر کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں:

کفر کی پہلی قسم کا نام ''انکار'' ہے پھر اس کی اپنی دو قسمیں ہیں ایک تو خود خدا، بہشت، دوزخ اور قیامت کا انکار ہے، جیسا کہ قرآن نے ان کی اپنی زبانی نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ "وما یهلکنا الا الدهر" [4] (ہمیں تو صرف عالمِ طبیعیت ہی مارتا ہے)

کفر کی دوسری قسم یقین اور معرفت کے باوجود انکار ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "وجحدوا بها واستیقنتها انفسهم ظلما وعلوا" [5] (انہوں نے ظلم اور برتری طلبی کی بنا پر انکار کیا، جبکہ دل میں انہیں اچھی طرح یقین تھا۔)

کفر کی تیسری قسم کا نام ''معصیت اور ترک اطاعت ہے جیسا کہ خداوند عالم بنی اسرائیل کے ان لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتا ہے جو بعض احکام الٰہی پر تو عمل کرتے تھے اور بعض کو چھوڑ دیتے تھے، "افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض" [6] (آیا تم کتابِ خدا کے کچھ حصّے پر تو عمل کرتے ہو اور کچھ حصہ کے کافر ہوتے ہو؟)

کفر کی چوتھی قسم کا نام ''برائت اور بیزاری'' ہے جیسا کہ خداوندِ عالم نے بت پرستوں کے مقابلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

---

[1] سورہ ق ۱۸

[2] سورہ ق ۱۶

[3] بحار الانوار جلد ۷۴ ص ۹۲ تا ۱۱۰

[4] سورہ جاثیہ ۲۴

[5] سورہ نمل ۱۴

[6] سورہ بقرہ ۸۵

اس قول کو بیان فرمایا ہے کہ "کفرنابکم"[1] (ہم تم سے بیزار ہیں)

نیز یہ بھی فرمایا ہے، "یوم القیامة یکفر بعضکم ببعض"[2] بروزِ قیامت تم میں سے بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں سے (عقائدواعمال کی وجہ سے) بیزار ہوا ِگے)۔

رہی کفر کی پانچویں قسم تو وہ بمعنی "نعمت کا ناشکری" کے ہے جیسا کہ خداوندعالم کا ارشاد ہے "لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید"[3] (یعنی اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اپنی نعمتیں زیادہ دوں گا اور اگر کفر کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔)

پھر امام علیہ السلام نے شرک کی وہ قسمیں بیان کی ہیں جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور شرک پر مبنی تمام آیات کو ایک جگہ پر جمع کر کے اس کو شرکِ اعتقادی شرکِ عملی "شرکِ اطاعت اور شرکِ ریا کی قسموں میں تقسیم کیا ہے اور قرآنی آیات کی روشنی میں ان کی تشریح کی ہے۔[4]

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں امیرالمؤمنین علیہ السلام نے کفر وشرک پر مشتمل آیات کو یکجا کر کے ان پر کُلّی نگاہ ڈالی ہے اور ساتھ ہی واضح فرمایا ہے کہ ان دوکلمات کا ایک وسیع مفہوم ہے چنانچہ کفر کے عمومی معنی ہر قسم کے حق کو چھپانا ہے خواہ وہ اعتقادی اور عملی مسائل میں ہو یا خدا کی نعمتوں کے سلسلے میں۔ اور "شرک" خدا کیلئے ہر قسم کا شریک ٹھہرانا ہے خواہ وہ اعتقادی اور عملی مسائل کے سلسلے میں ہو یا قوانین کی اطاعت کے بارے میں۔

امامؑ کے کلام میں تفسیرِ موضوعی کا خوبصورت چہرہ ان دونمونوں سے بخوبی ظاہر ہوجاتا ہے اور یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تفسیر کس حدتک انسانی فہم ودانش اور قرآن کی عمیق آیات کو سمجھنے کے لیے مؤثر اور کارگر ہے؟

اس کا ایک اور قابلِ توجہ نمونہ حضرت امام موسیٰؑ کاظم علیہ السلام کی وہ مشہور ومعروف حدیث ہے جو آپؑ نے جناب ہشام بن حکم سے بیان فرمائی ہے اس حدیث میں آپؑ نے اولی الالباب سے متعلقہ آیات کو یکجا کر کے عقل وخرد کے مقام کو ثابت فرمایا ہے چنانچہ آپؑ ہشام سے فرماتے ہیں:

> دیکھو! خداوند عالم نے اولوالالباب صاحبانِ (عقل وخرد) کو کس بہترین انداز میں یاد فرمایا ہے اور ان کے قدوقامت پر کیسا بہترین لباس پہنایا ہے وغیرہ.....

پھر آپؑ نے قرآن مجید کی سات آیات کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اولواالالباب کے مقام کی اہمیت کو اجاگر فرمایا ہے اور وہ آیت یہ ہیں

---

[1] سورہ ممتحنہ ۴

[2] سورہ عنکبوت ۲۵

[3] سورہ ابراہیم ۷

[4] بحارالانوار، ج۶۹، ص۱۰۰ تا ۱۰۲ (کافی حدتک خلاصہ کے ساتھ)

سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۹ آل عمران کی آیت آل عمران آیت ۱۹۰ زمر کی آیت ۲۹ اور مومن کی آیت ۵۴۔ [1]

مندرجہ بالا آیات کی جمع آوری اور انہیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو قرار دے کر ان کے معانی اخذ کرنے سے اولوالالباب کے معنی سمجھنے میں انسان کو کس قدر عمیق معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اولوالالباب کے مقام ومنزلت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور یہ صرف تفسیرِ موضوعی ہی کا کام ہے۔

تفسیرِ موضوعی علمائے متقدمین کے کلام میں:

ہر چند کہ تفسیر موضوعی پراگندہ صورت میں اور خاص خاص موضوعات کے لحاظ سے علمائے متقدمین کے کلام میں بڑی حد تک موجود ہے لیکن پھر بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کم ازکم ہماری معلومات کی حد تک کسی نے بھی تفسیرِ موضوعی کو اس کے تمام موضوعات اور زاویوں کے مطابق پیش نہیں کیا۔

جو لوگ اس موضوع میں پیش قدم رہے ہیں ان میں سے ایک مرحوم علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بحارالانوار کی جس فصل کو بھی شروع کیا ہے پہلے اس موضوع سے متعلق آیات کو یکجا کیا ہے پھر ان پر ایک کلی نظر ڈالی ہے اور بعض مقامات پر مفسرین کے نظریے کو بھی پیش کیا ہے اور اس طرح سے انہوں نے آیات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

مثلاً ۶۷ ویں جلد میں جب انہوں نے قلب ''سمع'' اور بصر'' کے بارے میں گفتگو کی ہے اور قرآن مجید سے ان کے معانی بیان کیے ہیں تو اس سلسلے میں قران سے بیسیوں آیات کو جمع کر ڈالا اور کافی سے ایک روایت بیان کرنے کے بعد ان کے کلّی معنی کی تشریح کی اور تقریباً دس صفحوں میں اس پر تفصیلی گفتگو کی۔ [2]

اسی طرح جلد ۵۸ میں حقیقتِ خواب اور اس کی تعبیر کی فصل میں پہلے تو قرآن کریم کی دس آیات کو اس بارے میں قلمبند فرمایا ہے پھر کئی صفحوں میں ان کی تفسیر بیان کی ہے۔ [3]

بائیسویں جلد کے پہلے باب میں جہاں پر انہوں نے ہجرت کے بعد یہود، نصاریٰ اور مشرکین کی سرگزشت کو بیان کیا ہے وہاں پر قرآن مجید کے مختلف مقامات سے اس موضوع کی بیسیوں آیات کو یکجا کر کے ان کی تفسیر اور تفصیلی گفتگو کی ہے۔ [4]

اس عظیم الشان محقق نے کتاب کی دوسری فصول میں بھی یہی طریقہ کار اپنایا ہے۔

گزشتہ علماء کے کلام میں تفسیرِ موضوعی کے اور نمونوں میں سے وہ کتابیں ہیں جو آیات الاحکام کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔ ان

---

[1] اصول کافی جلد ا ص ۱۵ (کتاب العقل والجہل)

[2] بحارالانوار جلد ۶۷ ص ۷ ۳ تا ۴۳۔

[3] بحارالانوار جلد ۵۸ صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۸۔

[4] بحارالانوار جلد ۲۲ صفحہ ۱ تا ۶۲۔

کتابوں میں فقہی احکام مثلاً نماز اور اس کے اجزاء وشرائط روزہ حج نکاح اور طلاق کے اجزاء وشرائط حدود و دیات اور اسلامی قضا وغیرہ سے تعلق رکھنے والی آیات کو موضوعی صورت میں جمع کر کے ان پر تحقیقی کام کیا گیا ہے۔

اس بارے میں جو کتاب سب سے پہلے تصنیف کی گئی ہے وہ بظاہر محمد بن صائب کلبی کی کتاب ''احکام القرآن'' ہے جو حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے اصحاب سے تھے۔ان کی وفات ۱۴۶ھ میں ہوئی حتٰی کہ اہلسنت کے مشہور امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ..... سے پہلے یہ کتاب لکھی جانی شروع ہوئی۔

ان کے بعد بھی بزرگ فقہاء اور علما کے ایک گروہ نے آیات الاحکام کے سلسلہ میں کتابیں لکھیں (کبھی تو اسی نام سے اور کبھی دوسرے ناموں سے) محدّث تہرانی یعنی آقا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب "الذریعہ" میں ان کی تعداد تیس سے زیادہ ذکر کی ہے۔[1]

موجودہ فقہاء اور علما میں سے سب سے زیادہ مشہور کتاب مرحوم محقق اردبیلی کی آیات الاحکام ہے جس کا نام ''زبدۃ البیان'' ہے اور مرحوم فاضل مقداد کی آیات الاحکام المعروف کنز العرفان ہے۔

اس کتاب میں ہے کہ علماء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ قرانِ مجید میں فقہی احکام کے بارے میں پانچ سو آیات نازل ہوئی ہیں البتہ اس بارے میں یہ تعداد ممکر رہ آیات کو حساب کر کے بتائی گئی ہے اگر تکراری آیات کو شمار نہ کیا جائے تو پھر یہ تعداد کم بنتی ہے۔[2]

اسی طرح ''اعجاز قرآن از نظر علوم امروز'' جیسی کتابیں بھی موجود ہیں جن میں وہ آیات جمع کی گئی ہیں جو دورِ حاضر کے علمی انکشافات سے تعلق رکھتی ہیں جن انکشافات کو قرانِ مجید کے علمی معجزات کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور جامعہ و تاریخ یا حقوق در قرآن مجید ایسے عنوانات ہیں جو تفسیر موضوعی کے سلسلے میں مسلسل تلاش وکوشش کی نشاندہی کرتے ہیں۔

قصصِ قران کے سلسلے میں بھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں قرآنی آیات کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کی داستانوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

لیکن پھر بھی یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کتاب تفسیرِ موضوعی کی صرف ایک محدود اور معین حد کی نشاندہی کرتی ہے نہ کہ قرآنی موضوعات کے بارے میں ایک مکمل اور جامع تفسیر ہے۔البتہ ان آخری دنوں میں تفسیرِ موضوعی کے سلسلے میں قابل قدر اور وسیع پیمانے پر کوشیش عمل میں لائی جا چکی ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں۔

اس سلسلے میں جن کتابوں کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں سے ایک ''مفاہیم القرآن'' ہے جس کی اب تک عربی اور فارسی میں کئی جلدیں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔نہایت ہی قیمتی کتاب ہے۔

اس قدر تحسین وآفرین کے باوجود پھر بھی یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موضوعی صورت میں پھر بھی یہ تفسیر اپنے بچپن کے ادوار سے گزر

---

[1] الذریعہ الی تصانیف الشیعہ جلد ۱ ص ۴۰، ۴۴

[2] کنز العرفان جلد ۱ ص ۵۔

رہی ہے اور سالہا سال کی مدت درکار ہے تب کہیں جا کر تفسیرِ تربیتی کی مانند اپنا شایانِ شان مقام پیدا کرے گی اور اس صورت میں ممکن ہے کہ علماء ومفسرین جہدِ مسلسل اور علمائے متقدمین ومتاخرین کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اس سلسلے کو آگے بڑھائیں اور مطلوب کو کمال کو حد تک پہنچائیں۔

آپ اس کتاب میں جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے امید کی جاسکتی ہے کہ اسے دوسری کڑیوں سے ملا کر ایک شایانِ توجہ سلسلہ کو تشکیل دیا جاسکتا ہے لیکن اس بارے میں جو زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ صاحبانِ نظر تکراری کاموں سے پرہیز کریں اور ہر شخص ایک نئے موضوع پر خاصہ فرسائی کرے تا کہ نت نئے موضوعات سامنے آتے رہیں اور اس طرح سے یہ طولانی راہ طے ہوتی رہی۔

تفسیرِ توضوعی کا صحیح طریقہ کار۔

تفسیرِ موضوعی کے لیے دو قسم کے طریقۂ کار سامنے آتے ہیں۔

ایک طریقہ تو وہ ہے کہ جسے بعض مفسرین نے انتخاب کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے کلام میں اعتقادی موضوعات مثلاً (توحید ومعاد وغیرہ) یا اخلاقی موضوعات مثلاً (تقویٰ اور حسن خلق وغیرہ) کو پیش کیا پھر ان کی فلسفہ یا کلام کی روشنی میں تجزیہ اور تحلیل کی یا اخلاقی نقطۂ نظر سے ان تجزیہ کیا بعد میں شاہد کے طور پر قرآنی آیات کو ذکر کیا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے کسی ایک موضوع کے بارے میں سارے قرآن میں موجود تمام آیات کو جمع کیا جائے اور کسی قسم کے پیشگی فیصلہ کے بغیر تمام آیات کی ایک ایک کر کے تفسیر کی جائے پھر ان کے آپس میں رابطے کو پیشِ نظر رکھ کر ان سے نتیجہ اخذ کیا جائے۔

ایسی صورت میں مفسر اپنی طرف سے کسی رائے کا اظہار نہیں کر پاتا بلکہ سائے کی مانند وہ قرآنی آیات کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور سب کچھ قرآن سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تمام تر کوشش آیاتِ قرآنی کے مطالب کو کشف کرنے میں صرف ہوتی ہے اور اگر دوسروں کے کلام حتٰی کہ احادیث سے بھی کمک حاصل کرتا ہے تو وہ بھی دوسری اور ثانوی حیثیت سے ہوتی ہے۔

پیامِ قرآن میں ہم نے اسی دوسرے طریقہ کار کو اپنایا ہے اس کتاب میں ہر مقام پر تمام قرآنی آیات کو جو کسی ایک موضوع کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، سب سے پہلے لکھا گیا ہے اور ان آیات کے سایہ میں تمام مطالب کو بیان کیا گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ طریقِ کار ہمیں پہلے طریقہ کی نسبت بہتر انداز میں قرآنی حقائق تک پہنچا سکتا ہے اتفاق سے یہی دونوں طریقے عام تفسیروں میں بھی اپنائے گئے ہیں (یعنی ترتیبی تفسیروں میں جو آیات اور سورتوں کی ترتیب کے مطابق لکھی گئی ہیں) کچھ لوگ تو قرآنی آیات کو اپنی نشریات سے مطابقت دیتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے نظریات کو قرآنی آیات کے تابع بناتے ہے اور مسلم بات ہے کہ تفسیرِ قرآن کا صحیح راستہ ہے قرآنِ مجید نور اور کتابِ مبین ہے قرآنِ مجید کا تعلق ان حقائق سے ہے جو انسان کو سعادت عطا فرماتے ہیں ارشادِ رب العزت ہے "قد جاء کم من اللہ نور و کتاب

مبین،[1]، (خدا کی طرف سے تمہارے پاس نور اور واضح کتاب آچکی ہے)

تفسیر موضوعی کی مشکلات

تین اہم مشکلات ایسی ہیں جو تفسیرِ موضوعی کے مفسّر کو پیش آتی ہیں۔

۱۔ تفسیر موضوعی یہ نہیں ہے کہ انسان ''معجم القرآن[2]'' کو سامنے رکھ کر مثلاً تقویٰ اور جہاد کے موضوعات سے متعلق جمع شدہ آیات کی تفسیر لکھنا شروع کر دے کیونکہ بسا اوقات قرآنِ مجید کی کئی آیات ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان موضوعات پر گفتگو تو کرتی ہیں لیکن ان میں تقویٰ یا جہاد کا لفظ استعمال نہیں ہوا اور ایسی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ایک مثال سے وضاحت کی جائے اور وہ یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ خداوند عالم رحمان'' رحیم'' ارحم الرحمین'' ہے اور یہی معنی قران مجید کی اکثر آیات میں ملتے بھی ہیں لیکن ایسی آیات بھی ہیں جو اس حقیقت کو بیان تو کرتی ہیں لیکن ان میں ''رحم'' کا مادہ استعمال نہیں ہوا منجملہ ان آیات کے سورہ نحل کی ۶۱ ویں آیت ہے جس میں خداوند عالم فرماتا ہے:

"ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا من دآبۃ"

اگر خداوند عالم لوگوں کو ان کے ظلم کی سزا دینے لگ جائے تو روئے زمین پر کسی بھی چلنے والے کو باقی نہ رکھے[3]۔

اور یہی چیز سورہ فاطر کی ۴۵ ویں آیت میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان کی گئی ہے یعنی:

"ولو یواخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علی ظھرھا من دآبۃ"

چنانچہ یہ دونوں آیتیں بندوں کے بارے میں خداوند عالم کی انتہائی رحمت اور مہربانی کا پتہ دیتی ہیں لیکن ان میں رحم کے لفظ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔

۲۔ تفسیر موضوعی کی دوسری مشکل آیات کو یکجا کر کے ان سے نتیجہ حاصل کرنا ہے اور اس کام کے لیے نہایت دِقت طلب، ظریف ذوق اور آیاتِ قرآنی اور تفاسیر سے متعلق وسیع علم و آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ جب ایک موضوع سے متعلق کئی آیات ہوتی ہے اور ہر ایک آیت کا اپنا خصوصی انداز بھی ہوتا ہے تو اس وقت یہ صورتِ حال اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۱۵۔

[2] معجم قرآن ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن میں حروف تہجی کے لحاظ سے آیات کو جمع کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

[3] یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت میں ''لوگوں کے ظلم'' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعد کی آیت میں اس کی بجائے ''اکتساب'' آیا ہے۔ چنانچہ جب ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے ایسے کام، جو لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں، وہ کسی نہ کسی طرح کے ظلم سے خالی نہیں ہوتے۔

اور پھر جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں تفسیرِ موضوعی ایک نوخیز موضوع ہے جس پر نہ تو زیادہ کام کیا گیا ہے اور نہ ہی زیادہ کوشش کی گئی ہے اور یہی چیز ان لوگوں کے کام کو مشکل اور پیچیدہ بنا دیتی ہے جو اس پر کام کرنا چاہتے ہیں اور اس تفسیر کا معمول کی اُس تفسیر سے بڑا فرق ہے جس پر آغازِ نزول ہی سے کام ہونا شروع ہو گیا تھا۔

۳۔ایک اور بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ اس آسمانی کتاب یعنی قرآن مجید میں جو موضوعات بیان ہوئے ہیں ان کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ ہی حساب اعتقادی مسائل سے لے کر عملی مسائل تک اور اخلاقی مسائل سے لے کر سیاسی اجتماعی اقتصادی مسائل، آدابِ معاشرت، جنگ وصلح، تاریخ انبیاء اور اسرارِ تخلیق کائنات کے تمام مسائل تک، ہر ایک چیز کے متعلق کئی کئی موضوعات ہیں جن پر قرآن مجید نے بحث کی ہے اور ان سب پر تحقیقی کام کے لیے بہت وقت اور وسیع حوصلے کی ضرورت ہے۔

تفسیرِ موضوعی میں کبھی ایک آیت کئی مباحث میں قابلِ توجہ ہوا کرتی ہے اور اسے مختلف صورتوں اور خصوصی فصول میں کئی بار زیرِ بحث لایا جاتا ہے جبکہ تفسیرِ ترتیبی میں صرف ایک بار ہی تفسیر ہو جاتی ہے۔

تفسیرِ موضوعی کی قسم اب تک پروان کیوں نہیں چڑھ سکی؟

اس سوال کا جواب کسی حد تک گزشتہ مباحث سے واضح ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ تفسیرِ موضوعی کے راستے میں جو بے حد وحساب مشکلات چلی آ رہی ہیں ہمیشہ اس کی ترقی کے آڑے آتی رہی ہیں، خاص کہ جبکہ تفسیرِ موضوعی کے لیے ایسی دقیق اور جامع فہرست ہونی چاہیے جس کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ہر آیت کو نکالا جا سکے ماضی میں اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس وقت یہ موجود ہیں۔

لطف کی بات ہے کہ ہم قران مجید کی مشہور ومعروف معجم "المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الكريم" میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

''اگرچہ گزشتہ علماء نے قران مجید کے دیگر علوم کی تو بڑی اہمیت دی ہے لیکن قرآن کی ایسی فہرست مرتب کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جس سے قرآن کی آیات کو کسی سورت سے آسانی کے ساتھ تلاش کیا جا سکے اس کی وجہ یہ ہے کہ غالباً وہ لوگ حافظِ قرآن ہوتے تھے۔''

ہمیں نہیں معلوم کہ یہ فیصلہ کس حد تک قابلِ قبول ہے لیکن فرض کر لیا جائے کہ اگر انسان حافظِ قرآن بھی ہو پھر بھی معجم ہر صورت میں تفسیرِ موضوعی کا ایک ضروری ہتھیار ہوتی ہے (ہر چند کہ تنہا کافی نہیں ہے) اور یہ کام ماضی میں انجام نہیں دیا گے اور اگر انجام دیا بھی گیا ہے تو نامکمل حد تک یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید سے دلچسپی رکھنے والے مغربی اور غیر مسلم دانشوروں نے اس آسمانی کتاب کی معجم مرتبہ کرنے کے لے کافی محنت سے کام لیا ہے جن میں سے ایک توجہ طلب نمونہ جرمنی مستشرق فلوگل کی لکھی ہوئی کتاب نجوم الفرقان فی اطراف القرآن ہے اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں سے مفتاح کنوز القرآن اور فتح الرحمن کا نام لیا جا سکتا ہے۔

المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہی کتابوں نے مؤلف کی ہمت بندھائی جس سے وہ قرآن پاک کی جامع معجم تیار کر کے علماء اسلام کے ہاتھوں تک پہنچانے کے قابل ہوئے۔

اوراب آخری بات یہ ہے کہ تفسیرِ موضوعی میں تمام تر مشکلات کے باوجوداس کے آثاراور برکتیں اسی نسبت سے بہت زیادہ ہیں خصوصاً علماء اور محققین کے لیے اور جوحقائق اس کے پرتو میں منصۂ شہود پرآتیں گے ان کے ایمان قلبی مسرت اوراس بارے میں کام کو جاری وساری رکھنے کے شوق میں اضافہ کا سبب بنیں گے اوران کے دل میں آتشِ عشق کومزید شعلہ ورکردیں گے۔

کیونہ کسی ایک موضوع کے بارے مں جداگانہ طور پرقرآنی آیات ایک ایسے نقطہ کی مانند ہیں کہ جب ان سب کو یکجا کر کے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلوقرادیا جائے توان تمام نقاط کے مجموعے سے ایک نئی شکل وجود میں آجاتی ہے جو پہلے موجودنہیں تھی اور یہی چیز سب سے اہم قابل توجہ اورمسرت بخش ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں سرکارِرسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اورآئمہ اہل بیت علیہم السلام روز اول ہی سے تفسیر موضوعی کی طرف ہماری رہنمائی فرما چکے ہیں اوراپنے کلام میں اس کے ایسے مختلف نمونے بھی پیش فرمادیئے ہیں جونہایت ہی دل پذیراورزیبانمونے میں اوران یں سے بعض کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

اب جبکہ ہم اس مقدمہ کواختتام پر پہنچارہے ہیں اپنے آپ کوایک نہایت ہی اہم اورمشکل کام کے روبرو پاتے ہیں۔مسلّم ہے کہ اسے انجام تک پہنچانے کے لیے ہم اپنی توانائیوں پرقطعاً بھروسہ نہیں کرسکتے جب تک توفیقِ الٰہی لطفِ پروردگاراوراس کی عنایات ہمارے شامل حال نہ ہوں اس موقعہ پرہم اپنے تمام وجوداس کے حضورالتجا کرتے ہیں اورس کی بارگاہ اقدس میں ہاتھ اٹھا کرعرض کرتے ہیں:

خداوندا!اس راہ میں تُوخود ہی ہماری دستگیری فرما!اورہمیں صراطِ مستقیم یعنی ان لوگوں کے راستے کی ہدایت فرما جن پرتُو نے اپنی نعمتوں کی بارش کی ہے اس راہ میں قدم قدم پرلغزشیں ہیں ہمیں ان لغزشوں اورگمراہی کے دروں میں سقوط کرنے سےتُوخود ہی ہماری حفاظت فرما! اوراس کام کوبطوراحسن پایۂ تکمیل پہنچانے کی توفیق عنایب فرما۔آمین یارب العالمین۔

سب کام خدا کے نام سے!

اشارہ

قران مجید نے (سورہ برائت کے علاوہ) ہر سورت کے آغاز اور کئی دوسری آیات کے ضمن میں ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ہم تمام کاموں کا آغاز اللہ کے نام سے کریں اور اپنی روح وجان کی فضا کو اس کے نام سے معطر کریں۔

اس اللہ کے نام سے جو کمال کی تمام صفات کا جامع ہے۔

اس خدا کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے۔

اس کے نام سے جو ہر چیز پر قادر وتوانا ہے۔

اس کے نام سے جو ہر چیز اور ہر ایک سے باخبر اور آگاہ ہے۔

یہ مقدس نام قلب کو چمک، روح کو صدق وصفا اور جان کو نشاط ونازگی عطا فرماتا ہے۔

اس کی خاص اور عام رحمت کی یاد ایک امید بھری دنیا اپنے ہمراہ لاتی ہے اور اس کی قدرت وتوانائی کی یاد انسان کو مشکلات کے ہجوم کے مقابلے میں قدرت وطاقت عطا کرتی ہے۔

بالآخر اس کی ہر شخص اور ہر چیز سے علم وآگاہی کی یاد ہمیں اس بات کی خوشخبری دیتی ہے کہ ہم کبھی بھی تنہا نہیں ہیں۔

یقیناً جب ہم ہر کام کو اسی نقطہ نظر سے شروع کریں گے تو وہ ضرور اپنے انجام کو پہنچے گا اور جس سعی وکوشش اور تلاش کو اس نظریہ سے شروع کریں گے تو ضرور کامیاب ہوں گے۔

اسی لیے بہتر ہی ہے کہ اس کتاب کی سب سے پہلی بحث وگفتگو کا آغاز اسی موضوع (ہر کام کا آغاز خدا کے نام) سے کریں۔

سب سے پہلے اسی موضوع سے متعلق آیات پر تحقیقی نظر ڈالی جائے گی پھر ان کا ترجمہ کیا جائے گا اور اس کے بعد تفسیر اور جمع آوری پر توجہ دی جائے گی چوتھے اور آخری مرحلے میں ان مطالب کی تکمیلی بحث ہوگی جن کا عنوان توضیحات ہوگا اور انشاء اللہ العزیز ساری کتاب میں تمام موضوعات پر اسی طریقہ کار کو اپنایا جائے گا۔

آیات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(سورہ برائت کے علاوہ تمام سورتوں کی پہلی آیت)

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ (سورہ علق ۱)

وَقَالَ ارۡکَبُوۡا فِیۡهَا بِسۡمِ اللّٰہِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۴۱﴾

(سورہ ہود ۴۱)

قَالَتۡ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَؤُا اِنِّیۡۤ اُلۡقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیۡمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾

(سورہ نمل ۲۹، ۳۰، ۳۱)

ترجمہ

خدا کے نام کے ساتھ جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اس خدا کے نام کے ساتھ پڑھ جس نے پیدا کیا۔

(نوحؑ نے) کہا خدا کے نام کے ساتھ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ اور اس کے چلنے اور رُوکنے کے وقت اسی خدا کی یاد کرو کیونکہ میرا پروردگار بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔

(ملکہ سبا نے) کہا اے سردارو! ایک قیمتی خط میری طرف پھینکا گیا ہے یہ خط سلیمانؑ کی طرف سے ہے اور یوں (لکھا گیا) ہے کہ خدا کے نام کے ساتھ جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے میرا پیغام یہ ہے کہ مجھ پر برتری طلب نہ کرو اور (حق کے سامنے) سر جھکائے میرے پاس آؤ۔

الفاظ کی تشریح

اسم۔ بہت سے علمائے لُغت اس بات کے قائل ہیں کہ دراصل یہ لفظ سمو (بروزن عُلُو) یعنی رفعت اور بلندی سے لیا گیا ہے چونکہ

کسی چیز کا نام رکھنا اس کی معرفت پہچان اور مقام کی بلندی کا سبب ہوتا ہے لہٰذا لفظ اسم اس معنی میں استعمال ہوتا[1] ہے۔

~~رحمان اور رحیم دونوں~~ الفاظ رحمت کے کلمہ سے مشتق کیے گئے ہیں اور مشہور یہ ہے کہ رحمان ہو ہوتا ہے جس کی رحمت عام ہو اور ہر ایک کو شامل ہو جبکہ رحیم اسے کہتے ہیں کہ جس کی رحمت خاص ہو بنا بریں خدا کی رحمانیت اس بات کا موجب ہوتی ہے کہ اس کی نعمتیں دوست اور دشمن دونوں کو شامل ہوتی ہے خواہ وہ مومن ہوں یا کافر لیکن اس کی رحیمیت اس بات کا سبب ہوتی ہے کہ وہ صرف مومنین کے شامل حال ہو خواہ وہ دنیا کی خاص نعمتیں ہوں یا آخرت کی مخصوص نعمتیں اور خدا سے دور اور اس سے بے خبر لوگ ان نعمتوں سے محروم ہوتے ہیں چنانچہ اس فرق کے شاہد مندرجہ ذیل امور ہیں۔

۱۔ رحمان مبالغہ کا صیغہ ہے اور رحیم مشبہ ہے اور مبالغہ کے صیغہ میں زیادہ تاکید پائی جاتی ہے جو اس قسم کی رحمت کی وسعت پر صفتِ دلیل ہے بعض علماء ان دونوں کلمات کو صفت مشبہ سمجھتے ہیں یا دونوں ہی کو مبالغہ کا صیقہ جانتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ رحمان میں رحیم کی نسبت مبالغہ زیادہ پایا جاتا ہے۔[2]

۲۔ بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے چونکہ رحیم ''صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے لہٰذا مومنین کے لیے مخصوص ہے اور رحمان ''جو کہ مبالغہ کا صیغہ ہے، اس میں اس قسم کی دلالت نہیں ہے۔

۳۔ رحمان ''خدا کا مخصوص نام ہے جو کسی اور پر نہیں بولا جاتا جبکہ رحیم'' کا اطلاق خدا اور غیر خدا دونوں پر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رحمان'' کے مفہوم میں وسیع رحمت پائی جاتی ہے۔

۴۔ عربی ادبیات میں یہ قاعدہ معروف ہے کہ "زیادة المبانی تدل علی زیادة المعانی" کہ جس کلمے کے حروف زیادہ ہوتے ہیں اس کا مفہوم بھی زیادہ ہوتا ہے چونکہ رحمان' کے پانچ حروف ہیں اور رحیم'' کے چار حروف ہیں لہٰذا رحمان کے مفہوم میں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔[3]

---

[1] بعض علما اسے ''وسم'' (بمعنی علامت) سے مشتق سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ معنی صحیح معلوم نہیں ہوتے کیونکہ اس کی جمع ''اسماء'' اور تصغیر ''سمی'' یا ''سمیۃ'' آتی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ''واو'' جو کہ اس کے اول میں ہے، اس کا جزو نہیں ہے اور بعض لوگ اسے ''شیما'' کے لفظ سے مشتق سمجھتے ہیں جو آرامی اور عربی لغت ہے اور تعریب کی صورت میں ''اسم'' اور ''سما'' بن گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب التحقیق فی کلمات القرآن الکریم) لیکن یہ صورت بھی بعید از حقیقت نظر آتی ہے، کیونکہ اس پر کوئی شاہد موجود نہیں ہے۔ اس دعویٰ کی ایک اور دلیل کہ یہ مادہ ''وسم'' سے مشتق نہیں ہے، یہ ہے کہ لفظ ''اسم'' کا ہمزہ درمیان کلام میں ساقط ہو جاتا حالانکہ اگر وہ ''وسم'' کے مادہ سے مشتق ہوتا اور ہمزہ واو کی جگہ ہوتا تو وہ ساقط نہ ہوتا۔

[2] ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان ص ۲۰ تفسیر روح المعانی ص ۵۵ اور تفسیر المیزان جلد ۱ ص ۱۶

[3] تفسیر شبر ص ۳۸ و تفسیر روح المعانی جلد ۱ ص ۵۶

۵۔علماء نے اس فرق کو قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی استفادہ کیا ہے کیونکہ رحمان کا لفظ قرآنی آیات میں عام طور پر مطلق صورت میں استعمال ہوا ہے جبکہ رحیم کا لفظ بہت سے مقامات پر مقید طور پر استعمال ہوا ہے جیسے "ان اللہ بالناس لروءف رحیم" یعنی خداوند لوگوں پر مہربان اور رحیم ہے (بقرہ ۱۴۳) یا "وکان بالمؤمنین رحیما" یعنی خداوند تعالیٰ مومنین پر رحیم ہے۔(احزاب ۴۳) یا "ان اللہ کان بکم رحیما" یعنی پروردگار عالم تم پر رحیم ہے (نساء ۲۹) جبکہ "رحمان" ان قیود کے بغیر ذکر ہوا ہے جو اس کی رحمت کے عام ہونے کی دلیل ہے۔

۶۔بعض روایات بھی اس تفاوت پر شاہد ہیں چنانچہ ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

"الرحمن اسم خاص بصفة عامة، والرحیم اسم عام بصفة خاصة"

رحمان خاص اسم ہے (جو خدا سے ہی مخصوص ہے) لیکن عام صفت ہے (اس کی رحمت کا مفہوم دوست و دشمن دونوں کے لیے ہے) لیکن رحیم عام اسم ہے مگر خاص صفت ہے (یہ نام خدا اوغیر خدا دونوں پر بولا جاتا ہے لیکن اس کی رحمت کا مفہوم صرف مومنین کے لیے خاص ہے)۔[1]

لیکن ان تمام تر تصریحات کے باوجود اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کبھی یہ دونوں الفاظ ایک معنی کے لیے بھی بولے جاتے ہیں جیسا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی دعائے عرفہ میں منقول ہے کہ:

"یارحمن الدنیا والاخرة ورحیمهما"

"یعنی اے وہ خدا جو دنیا و آخرت کا رحمان اور دونوں کا رحیم ہے۔"

لیکن یہ بات بھی ممکن ہے کہ یہ ایک استثنائی صورت ہو۔بنابریں مذکورہ بالا تفاوت کے منافی نہیں ہوگا۔

"مجرھا" و "مرسھا" یہ دونوں الفاظ یا تو اسمِ زمان ہیں یا اسمِ مکان ہیں جن کا معنی ہے حرکت کی جگہ اور رُکنے کا مقام یا دونوں کا وقت۔[2]

پہلا کلمہ جریان سے اور دوسرا رسو (بروزن رسم) سے مشتق ہے جس کا معنف ثبات و برقراری ہے اسی لیے پہاڑوں کو رواسی" (راسیۃ کی جمع) کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ثبات اور مکمل برقراری کے حامل ہوتے ہیں۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۱ ص ۲۱۔

[2] بعض مفسرین نے انہیں صرف اسم زمان بتایا ہے (جیسے تفسیر مجمع البیان میں ہے)۔بعض نے فقط اسم مکان بتایا ہے (جیسے تفسیر المیز ان میں ہے) اور بعض نے اسم زمان اور اسم مکان بتایا ہے (جیسے تفسیر شبر میں ہے)۔

آیات کی تفسیر اوران کی جمع آوری

صرف خداہی کے نام سے کیوں شروع کریں؟

پہلی آیت (بسم اللہ الرحمن الرحیم) (میں جوسوائے سورہ برائت کے) تمام سورتوں کے آغاز میں آئی ہے ہم اس بات کا اعلان واظہار کرتے ہیں کہ اپنے کام کو رحمان اور رحیم خدا کے نام سے شروع کرر ہے ہیں اوراس کے انجام کے لیے بھی اسی سے مدد کے طالب ہیں۔[1]

ہمارے جوبھی کام اور منصوبے ہوں سب فانی اور ناپائیدار ہوتے ہیں، محدود اور چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن جب انہیں قائم ودائم پائیدار، جاوداں لامحدوداور بے حدوانتہاذات کے ساتھ ملادیتے ہیں تو وہ اسی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اوراسی کی عظمتِ جاودانی سے بہرہ مند ہو جاتے ہیں۔

ہماری توانائیاں جس قدر بھی ہوں، پھر بھی ہم کمزور ہیں، لیکن جب یہ ناچیز قطرے خداوند متعال کی باعظمت قدرت کے اوقیانوس سے مل جاتے ہیں تو اپنے اندر عظمت پیدا کر لیتے ہیں اور ہمیں ایک تازہ روح، جدید ادراک اور نئی آمادگی عطا کرتے ہیں یہ ہے ہر کام کے آغاز میں بسم اللہ کا فلسفہ!

دوسری آیت میں بعثتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آغاز میں جبرائیل امین علیہ السلام کے حضور سرکار رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کی بات ہورہی ہے جب انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آغوش میں لے کر دبایا اور کہا پڑھو! اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے کائنات کو خلق فرمایا۔

تو اس طرح سے جبرائیل امینؑ بھی بعثت کے موقع پر سب سے پہلا پروگرام آنحضرتؐ کے پاس کے کر آئے اس کا آغاز بھی خدا کے نام سے ہے۔

تیسری آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی داستان کا تذکرہ ہے۔ جب کافر اور سرکش قوم کی ہلاکت کے لیے طوفان اور عذابِ الٰہی کا

---

[1] بعض علماء کا نظریہ ہے کہ یہاں پر ایک جملہ "ابتداء" (میں ابتداء کرتا ہوں) محذوف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ "استعین" (میں مدد طلب کرتا ہوں) محذوف ہے۔ البتہ اگر ایسی صورت ہو کہ جہاں پر خداوند عالم اس جملہ (بسم اللہ الرحمن الرحیم) کو بیان کر رہا ہو (جیسے سورہ حمد کے علاوہ دوسری تمام سورتوں میں) تو وہاں پر "ابتداء" محذوف سمجھا جائے گا، لیکن خصوصی طور پر سورۂ حمد میں چونکہ بندوں کی زبانی یہ جملہ ادا ہو رہا ہے، لہٰذا پہلے معنی میں بھی ہوسکتا ہے اور دوسرے معنی میں بھی اور دونوں معانی میں بھی۔ بنابریں "بسم اللہ" میں موجود "با" یا تو "استعانت" کے معنی میں ہوگی یا پھر "مصاحبت" کے معنی میں۔ (غور کیجیے گا)۔

وقت قریب آیا اور حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی تیار کی اور اپنے مٹھی بھر ساتھیوں جن کی تعداد اسی (۸۰) سے زیادہ نہیں تھی سے کہا کہ کشتی پر سوار ہوں اور فرمایا ''خدا کے نام کے ساتھ اس پر سوار ہو جاؤ کہ تمہارا چلنا بھی خدا کے نام سے ہے اور ٹھہرنا بھی اسی کے نام سے ہے پھر وہ خدا کی مغفرت اور رحمت سے مدد حاصل کرتے ہوئے کہتے ہیں''ان ربی الغفور رحیم''۔

چوتھی آیت حضرت سلیمانؑ کے اس خط کے تذکرے پر مشتمل ہے جبکہ ہُدہُد نے قوم سبا اور اس کی بُت پرستی کی انہیں اطلاع دی تو آپؑ نے ملکہ سبا کے نام تحریر فرمایا۔

چنانچہ جب یہ خط ملکہ سبا کے ہاتھ پہنچ گیا تو اس نے اپنے ارکان حکومت اور درباریوں کو بلایا اور کہا یہ نہایت قیمتی خط ہے جو سلیمانؑ کی طرف سے مجھ تک پہنچا ہے اور اس کا مضمون یہ ہے کہ: خداوندِ رحمان ورحیم کے نام سے میرا پیغام یہ ہے کہ مجھ پر برتری طلب نہ کرو اور حق کے آگے سر جھکائے میرے پاس آؤ۔

مندرجہ بالا چاروں آیات سے مجموعی طور پر یہ بات اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ ہر کام کو خدا کے نام سے شروع کیا جانا چاہیئے خواہ یہ کام تعلیم اور ہدایتِ الٰہی ہو (جیسے قرآن کی تمام سورتوں میں) یا خدا حضور بندوں کی دعا ہو (جیسے سورہ حمد ہے) یا دعوتِ رسالت کا آغاز اور وحی کا پہلا پیغام ہو (جیسے سورہ علق کی ابتدا ہے) یا بحران اور طوفان سے نجات حاصل کرنے کے لیے حرکت کا آغاز اور کشتی سے اتر کر کسی نئے کام کے شروع کرنے کے لیے رکنے کا آغاز ہو (جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی داستان ہے) خواہ خط کا آغاز اور حق کے آگے سر جھکانے کی دعوت ہو (جیسے ملکہ سبا کے نام حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ہے)

الغرض کام کا آغاز خدا'' کی طرف سے ہو یا ''مخلوقِ خدا'' کی طرف سے جبرائیلؑ کی طرف سے ہو یا نوحؑ اور سلیمانؑ جیسے انبیاء کی جانب سے خاص انسانوں کی طرف سے ہو یا عام لوگوں کی طرف سے بغیر کسی استثناء کے ہر کام کو خدا کے نام سے شروع کیا جانا چاہیے اور خود کو اس کی پاک ومقدس ذات سے مربوط کر کے اس کی قدرت وعلم کے ناپیدا کنار سمندر سے آگاہی اور توانائی حاصل کرنی چاہیئے۔

اور یہ ہیں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور ومعروف حدیث کے معنی جو آپؐ نے فرمایا کہ:

''کل امر ذی بال لم یذکر فیه بسم الله فهو ابتر''

ہر اہم کام جس میں خدا کا نام نہ لیا جائے وہ نامکمل اور ادھورا رہ جاتا ہے۔[1]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مذکورہ آیات میں خدا کے نام کے بعد جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ٹھیک ان کاموں سے مناسبت رکھتے ہیں جنکے آغاز میں بسم اللہ واقع ہوئی ہے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کی داستان میں خدا کے ''غفور رحیم'' ہونے کا ذکر ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھیوں کے رحمتِ الٰہی میں شامل ہونے کی طرف اشارہ ہے اور سب سے پہلی وحی کے نزول کی داستان میں اس خدا کے نام کا تذکرہ ہے جو انسان کا خالق مُربّی اور پروردگار ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مسئلہ وحی بھی ایک قسم کی تربیت کا آغاز ہے بنابریں ''تربیتِ تشریعی'' اور تربیتِ

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۱، مادہ ''سما''۔

تکوینی ''ہم آہنگ ہوجاتی ہیں۔

بہرصورت ہر کام کی ابتدا میں خدا کو یاد کرتے وقت اس کے مناسب اوصاف سے استفادہ کرنا ہمارے اور دوسرے تمام انسانوں کے لیے ایک درس ہے۔

توضیحات

بسم اللہ کی زبردست اہمیت!

روایات میں قرآن مجید کی اس آیت کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے خدا نے اسم اعظم کے ہم پلہ قرار دیا ہے جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم اقرب الی اسم اللہ الاعظم من ناظر العین الی بیاضھا''

بسم اللہ الرحمن الرحیم خدا کے اسم اعظم سے آنکھ کی سفیدی کے اس کی پتلی سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام علی بن موسیٰؑ (رضا) علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اقرب من سواد العین الی بیاضھا''

آنکھ کی سیاہی اس کی سفیدی سے اتنا نزدیک نہیں جتنا بسم اللہ اسمِ اعظم کے نزدیک ہے۔[2]

''بسم اللہ...'' کے ساتھ شروع کرنے کی اہمیت اس حد تک ہے کہ بعض روایات کی رُو سے اسے چھوڑ دینے کی صورت میں ممکن ہے کہ انسان خدا کی طرف سے سزا کا مستحق ہوجائے جیسا کہ ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

عبداللہ بن یحییٰ حضرت امیر المومنین علی علیہ اسلام کی مجلس میں حاضر ہوا۔ آپؑ کے سامنے ایک چارپائی رکھی ہوئی تھی آپؑ نے فرمایا: اس پر بیٹھ جاؤ ناگاہ چارپائی اُلٹ پڑی وہ زمین پر گر پڑا سر پر چوٹ آگئی اور سر سے خون بہنے لگا۔

امیر المؤمنینؑ نے پانی منگوایا، اس کا سر دھویا پھر فرمایا میرے پاس آؤ اپنا دستِ مبارک اس کے سر پر رکھا اس نے پہلے تو شدید درد کا احساس کیا

---

[1] تفسیر برہان جلد ا ص ۴۱ حدیث ۲، ۹۔

[2] تفسیر برہان جلد ا ص ۴۱ حدیث ۲، ۹۔

پھر ٹھیک ہوگیا۔آپؑ نے فرمایا''اس خدا کا شکر ہے جو ہمارے شیعوں کے گناہ دنیا میں انہیں درپیش ناگوار حادثات کی وجہ سے دھوڈالتا ہے اور انہیں پاک و پاکیزہ بنادیتا ہے۔

عبداللہ نے عرض کی امیرالمؤمنین! آپ نے مجھے آگاہ تو کردیا لیکن یہ تو فرمایئے کہ میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے مجھے یہ ناگوار حادثہ پیش آیا تاکہ آئندہ اس کا ارتکاب نہ کروں۔

آپؑ نے فرمایا!تم نے چارپائی پر بیٹھتے وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں کہا،تمہیں معلوم نہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کی طرف سے مجھے بتایا کہ ہر اہم کام جس میں بسم اللہ نہ کہا جائے وہ ادھورا رہ جاتا ہے اور اپنے انجام کو نہیں پہنچ پاتا۔

یہ سُن کر عبداللہ نے کہا''میں آپؑ کے قربان جاؤں آئندہ کبھی اسے ترک نہیں کروں گا۔

امامؑ نے فرمایا''تو ایسی صورت میں تم فائدے میں رہوگے اور سعادت وخوش بختی تمہارے ہمراہ رہے گی۔[1]

لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اسم اعظم یا بسم اللہ جو اسمِ اعظم کے نزدیک تر ہے خالی الفاظ نہیں ہوا کرتے جنہیں زبان پر جاری کیا جائے اور صرف لفظوں ہی کے ذریعہ مشکلات حل ہوجائیں یا خیر وبرکت کے دروازے کھل جائیں یا بگڑی سنور جائے بلکہ ان پر قلبی اعتقاد اور دل کی گہرائیوں سے ان پر ایمان وعمل بھی ضروری ہے۔

یعنی بسم اللہ کا مفہوم اس قدر انسان کی روح وجان میں اُتر جائے کہ جب بھی اس جملہ کو زبان پر جاری کرے تو اپنے تمام وجود کو خدا کی پناہ وعافیت میں پائے اور اپنی تمام ہستی اور وجود کے ساتھ اس کی پاک ذات سے مدد طلب کرے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ صرف کہنے پر ہی نہیں بلکہ لکھنے پر بھی تاکید کی گئی ہے کہ ہر تحریر کو خدا کے نام کے ساتھ شروع کیا جائے جیسا کہ بلقیس کے نام حضرت سلیمانؑ کا خط ہے۔چنانچہ ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

"لاتدع البسملة ولو کتبت شعرا"

بسم اللہ کو ترک نہ کرو خواہ ایک شعر ہی کیوں نہ لکھو۔

پھر آپؑ نے ارشاد فرمایا:

''قبل از اسلام لوگ اپنے خطوط کا آغاز "بسمك اللهم" کے جملہ سے کیا کرتے تھے لیکن جب "انه من سليمان وانه بسم الله الرحمن الرحيم" کی آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے اپنے خطوط کو بسم اللہ الرحمن الرحیم کے سرنامہ سے لکھنا شروع کیا۔[2]

---

[1] بحارالانوار،جلد ۷۳،ص ۳۰۵(قدرے تلخیص کے ساتھ)۔

[2] سفینۃ البحار،مادہ''سما''۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام ہادی (علی نقی) علیہ السلام نے اپنے ایل ملازم کو بہت سے مسائل بتائے پھر اس سے فرمایا بتاؤ میں نے کیا کہا ہے؟ وہ نہ بتا سکا۔ امامؑ نے دوات کو آگے بڑھا کر یہ لکھا:

"بسم الله الرحمن الرحيم، انشاء اللہ یہ بات تمہارے ذہن نشین رہے کہ تمام کام خدا کے ہاتھ میں ہیں ..... ۔"

وہ کہتا ہے کہ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو مسکرانے لگا امامؑ نے فرمایا مسکراتے کیوں ہو؟ میں نے کہا کوئی ایسی بات نہیں امامؑ نے فرمایا نہیں! اپنے مسکرانے کی وضاحت کرو تو میں نے کہا آپؑ کے قربان جاؤں آپؑ کے اس طریقۂ کار نے مجھے وہ حدیث یاد دلا دی جسے آپؑ کے جدِ بزرگوار حضرت امام رضا علیہ السلام کے ایک صحابی نے ان ہی سے نقل کیا کہ، کہ وہ جب بھی کوئی حکم صادر فرمایا کرتے تھے تو لکھا کرتے تھے بسم اللہ الرحمن الرحیم یاد رکھو کہ انشاء اللہ..... (پھر ضروری باتیں تحریر فرمایا کرتے تھے) اسی لیے میں مسکرایا ہوں۔"

امام علی نقی علیہ السلام نے مجھے فرمایا:

"لو قلت ان تارك التسمية كتارك الصلوة لكنت صادقا"

"اگر میں کہوں کہ بسم اللہ کا تارک تارک الصلوٰۃ کے مانند ہے تو سچ ہوگا۔"

بسم اللہ کی اہمیت اس حد تک ہے کہ پیغمبرِ خداؐ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

"اذا قال المعلم للصبی بسم الله الرحمن الرحيم (وقال الصبی بسم الله الرحمن الرحيم) كتب الله برائة للصبی وبرائة لابويه برائة للمعلم من الجهنم"

"جب اُستاد بچے سے کہتا ہے کہ کہو بسم اللہ الرحمن الرحیم (اور وہ یہ کہے) تو خداوند عالم اس بچے کے لیے اس کے والدین کے لیے اور استاد کے لیے جہنم سے آزادی کا حکم صادر فرما دیتا ہے۔"[1]

ہم اپنی گفتگو اس کلام کے ذریعہ خاتمہ دیتے ہیں جو کئی مفسرین کے درمیان مشہور ہے اور وہ یہ کہ:

تمام آسمانی کتابوں کے معانی قرآن مجید میں جمع ہیں۔

تمام قرآن کے معانی سورہ حمد میں۔

تمام سورہ حمد کے معانی بسم اللہ میں۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۱، ص ۴۳، حدیث ۳۲۔

تمام بسم اللہ کے معانی بسم اللہ کی ''با'' میں جمع ہیں۔[1]

تمام قرآن اور تمام آسمانی کتابوں کے مفہوم کا بسم اللہ کی باء میں مجتمع ہونا شاید اس لیے ہو کہ عالمِ آفرینش میں تمام مخلوقات اور عالمِ تشریع میں تمام تعلیمات خداوندِ متعال کی ذات والا صفات سے استمداد ہی کی بدولت جامۂ عمل پہنتی ہیں کیونکہ سارے جہانوں میں وہی ذات پاک علۃ العلل (تمام علتوں کی علت اور تمام غایتوں کی غایت) ہے۔ اور معلوم ہے کہ بسم اللہ'' کی ''باء'' بھی خدا سے استعانت اور مدد حاصل کرنے کے لیے ہے۔

اور یہ بات غور طلب اور لائق توجہ ہے۔

آیا بسم اللہ.....تمام سورتوں کا جزو ہے؟ مفسرین اور قرآنی علوم کے ماہرین نے سورتوں کی آیات کو شمار کرتے وقت بسم اللہ'' کو سوائے سورہ حمد کے باقی سورتوں کی جزو شمار نہیں کیا، البتہ سورہ حمد کے بارے میں تقریباً تمام فقہاء کا اجماع اور اتفاق ہے کہ بسم اللہ اس کی جزو ہے اسی لیے وہ سورہ حمد کی سات آیات بتاتے ہیں جن میں سے ایک بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی ہے۔

نیز اس سورت کا ایک نام ''السبع المثانی'' بھی ہے (سبع اس لیے کہ اس کی سات آیتیں ہیں اور مثانی اس لیے کہ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر یہ سورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دو بار نازل ہوئی)

لیکن یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ قرآن مجید کی تمام قدیم اور جدید طباعتوں میں اسے ہر سورت کے آغاز میں لکھنا اس کے جزو ہونے کی قاطع دلیل ہے۔

عبداللہ بن عمر سے منقول ہے کہ جب وہ نماز کو شروع کرتے تھے تو تکبیر تحریمہ (تکبیرۃ الاحرام) کے بعد بسم اللہ الرحمن الرحیم ضرور پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر اسے نہ پڑھا جائے تو پھر اسے قرآن میں کیوں لکھا گیا ہے؟[2]

اہلِ سنت کے مشہور و معروف عالم سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور کی پہلی جلد میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے سورہ حمد کی جزو ہونے پر معتدد دلائل کا ذکر کیا ہے۔

اہلبیت اطہار اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام سے بھی بہت سی روایات بسم اللہ کے سورہ حمد اور دوسری سورتوں کے جزو ہونے پر وارد ہوئی ہیں۔ اسی لیے تمام علماء شیعہ کا اس کے تمام سورتوں کے جزو ہونے پر اتفاق و اتحاد ہے[3]۔

بطور نمونہ ہم یہاں اہلسنت کی روایات میں سے ایک روایت کو درج کرتے ہیں اور وہ یہ کہ:

---

[1] تفسیر روح المعانی، جلد ۱، ص ۳۷۔

[2] سنن بیہقی، جلد ۲، ص ۴۳، ۴۷۔

[3] شیخ طوسی کی کتاب ''خلاف''، جلد ۱، ص ۱۰۲، مسئلہ ۸۲، سنن بیہقی، جلد ۲ ص ۴۲، ۴۵، ۴۶۔ درمنثور، جلد ۱، ص ۷، ۸۔ البیان فی تفسیر القرآن، ص ۵۵۲۔

''جابر بن عبداللہ انصاری سے کہتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے پوچھا جب تم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو تو نماز کی کی قرأت کیونکر کرتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ الحمداللہ رب العالمین پڑھتا ہوں اور (بسم اللہ.....چھوڑ دیتا ہوں) تو آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا ''بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا کرو۔

ہر طرح کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے سرکارِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ سلم اصرار کے ساتھ بسم اللہ.....کو بہت سی نمازوں میں بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے چنانچہ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں:

"ان رسول اللہ کان یجھر ببسم اللہ الرحمن الرحیم"

یعنی رسول اللہؐ ہمیشہ بسم اللہ.....کو بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کے ایک صحابی کہتے ہیں کہ:

''میں آنحضرتؐ کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا اور وہ مغرب وعشا اور صبح اور جمعہ کی نمازوں میں بسم اللہ الرحمن الرحیم بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔''[2]

دلچسپ بات یہ ہے کہ بیہقی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ:

ایک مرتبہ حضرت معاویہ مدینہ میں لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے سورہ حمد کی اوّل میں تو انہوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا لیکن دوسری سورت میں نہ تو بسم اللہ کو پڑھا اور نہ ہی تکبیر کہی بلکہ سیدھے رکوع میں چلے گئے جب سلام کہہ کر نماز ختم کی تو جماعت کی صفوں سے مہاجرین نے ان پر ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور کہنے لگے "اسرقت الصلوۃ ام نسیت؟" یعنی کیا تم نے نماز کی چوری کی ہے یا بھول گئے ہو؟ چنانچہ اس کے بعد جب بھی وہ نماز پڑھتے حمد کے بعد سورت میں بسم اللہ کو ضرور پڑھا کرتے۔[3]

لیکن اس کے باوجود بھی اب تک بعض علمائے اہلسنت نماز میں حتّٰی کہ سورہ حمد میں یا تو بسم اللہ الرحمن الرحیم بالکل نہیں پڑھتے اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو آہستہ سے!!

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اس حقیت پر سولہ دلائل پیش کیے ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورہ حمد کی جزو ہے جن میں سے اکثر دلائل رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث پر مشتمل ہیں۔

ہر چند کہ مشہور مفسر آلوسی نے اپنی تفسیر روح البیان میں ان دلائل پر انگشت نمائی کی ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ صراحت ضرور

---

[1] تفسیر درمنثور، جلد ۱، ص ۸۔

[2] تفسیر درمنثور، جلد ۱، ص ۸۔

[3] اس روایت کو حاکم نے اپنی کتاب مستدرک جلد ۱، ص ۲۳۳ میں نقل کیا ہے اور اس کی سند کو بھی معتبر تسلیم کیا ہے اور یہی مضمون تھوڑے سے تفاوت کے ساتھ تفسیر درمنثور، جلد ۱، ص ۸ اور تفسیر روح المعانی، جلد ۱، ص ۹۳ میں بھی مذکور ہے۔

کرتے ہیں کہ بسم اللہ قرآن کی ایک مستقل آیت ضرور ہے لیکن سورہ حمد کی جزو نہیں ہے۔[1]

اس لحاظ سے انہوں نے درحقیقت اس بات کو تو تسلیم کرلیا ہے کہ بسم اللہ.....قران کی جزو ہے لیکن یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ کس بناء پر انہیں مستقل آیت اور سورتِ حمد کی جزو نہ ہونے پر اصرار ہے؟

بہرصورت اس سے بڑھ کر کوئی واضح دلیل نہیں ہوسکتی کہ تاریخِ اسلام کے طویل ترین دور میں چھپنے والے تمام قرآنوں میں ہر سورت کے آغاز میں (سوائے سورت برات کے) بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی جاتی آرہی ہے اور یہ یقیناً پیغمبرِ خداؐ کے حکم کے مطابق ہوا ہے کیونکہ یہ بات قطعاً ناقابلِ قبول ہے کہ پیغمبرؐ قرآن مجید میں ایسی چیزوں کے درج ہونے کا حکم دیں جو اس کا جزو نہیں ہیں پس اسی لیے ہم کسی بھی بہانے سے بسم اللہ الرحمن الرحیم! کو سورتوں کا جزو ہونے سے جدا نہیں کرسکتے کیونکہ یہ قران میں ایک طرح کی تحریف ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

سرقوا اکرم ایة فی کتاب اللہ بسم الرحمن الرحیم

''انہوں نے قرآن مجید سے نہایت ہی مکرم وقیمتی آیت یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم کو چُرالیا ہے۔''[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مالھم قاتلھم اللہ عمدوا الی اعظم ایة فی کتاب اللہ فزعموا انھا بدعة اذا اظھروھا وھی بسم اللہ الرحمن الرحیم"

''خدا انہیں غارت کرے انہیں کیا ہوگا ہے کہ وہ قرآن کی سب سے بڑی آیت کے خلاف کمر بستہ ہوگئے ہیں اور گمان کرلیا ہے کہ اگر اسے بلند آواز سے ظاہر کریں تو بدبخت ہے یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم۔''[3]

اسی لیے تو آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا اصرار رہا ہے کہ شب وروز کی تمام نمازوں میں بسم اللہ کو خاص طور پر بلند آواز سے پڑھا کریں تاکہ یہ ناپسندیدہ بدعت ختم ہو۔

قصہ مختصر، تمام قرآن میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کی اہمیت روزِ روشن کی طرح واضح اور عیان راچہ بیان کے مصداق کسی بحث کی محتاج نہیں، اسی لیے اسے بہت اہمیت دینی چاہیئے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض سلیقہ افراد اپنے خطوط اور تحریروں میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے لکھنے سے اجتناب کرتے ہیں یا اس کی جگہ چند نقطے لگا دیتے ہیں مبادا ان کی تحریر بے وضو لوگوں کے ہاتھ آجائے یا پاؤں تلے روندی جائے یا

---

[1] تفسیر روح المعانی، جلد ۱، ص ۳۷۔

[2] تفسیر برہان، جلد ۱، ص ۴۲، حدیث ۱۵۔

[3] تفسیر برہان، جلد ۱، ص ۴۲، حدیث ۶۲۔

کوچہ و بازار میں اس کی توہین اور بے حرمتی ہو لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اگر اسی بناء پر بسم اللہ کو نہ لکھا جاتے تو بسم اللہ حذف کرنا اور نامِ خدا کا سینسر CENSOR اس سے بڑھ کر قابلِ اعتراض جرم ہے۔

ہمارا فرض بنتا ہے کہ لکھیں اور اس کی حفاظت اور احترام کریں لیکن اگر دوسرے لوگ اس کا احترام نہ کریں تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں اور بہانے سے بسم اللہ کو لکھنا چھوڑ دیں کہ اس کا نقصان زیادہ ہے۔

کیونکہ تاریخوں میں مذکور ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے حکم سے عمومی اور مستقل صورت میں سکہ ڈھالا گیا جس کے ایک طرف "لا الہ الا اللہ" اور دوسری طرف "محمد رسول اللہ" لکھا گیا تھا اور ظاہر ہے سکہ یہ کسہ کافروں سمیت ہر شخص کے ہاتھ میں آتا تھا اور اس بات کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی تھی کہ مبادا ان مقدس ناموں کی ہتک ہو یا کوئی شخص بغیر وضو کے انہیں ہاتھ لگائے۔ لہٰذا ایسا سکہ نہیں ڈھالنا چاہیئے اسلامی شعار کی عبارت تحریر نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی ایسا ہونا چاہیے۔ [1]

سورہ برائت کے آغاز میں بسم اللہ کیوں نہیں؟

اس سوال کا واضح جواب حضرت امیر علیہ السلام کی ایک حدیث میں منقول ہے:

"لم تنزل بسم اللہ الرحمن الرحیم علی رأس سورۃ برائۃ لان بسم اللہ للامان والرحمۃ ونزلت برائۃ لرفع الامان والسیف فیہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم"

سورہ برائت (توبہ) کے اوّل میں بسم اللہ نازل نہیں ہوئی کیونکہ بسم اللہ امان اور رحمت کے لیے اور سورہ برائت (عہد توڑنے والے کفار کے لیے) رفع امان کے واسطے ہے اور اس میں تلوار چھپی ہوئی ہے۔ [2]

کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ سورت سورۂ انفال کا حصہ ہے کیونکہ سورۂ انفال میں عہد و پیمان کا تذکرہ ہے اور اس سورت میں عہد شکنی اور عہد شکنوں کا ذکر ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے درمیان "بسم اللہ" مذکور نہیں ہوئی۔

یہی چیز حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں بھی ہے کہ:

---

[1] کتاب تاریخ تمدن اسلامی از جرجی زیدان، جلد ۱، ص ۱۴۳، (عربی متن)۔

[2] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۲۔ اسی حدیث کو فخر الدین رازی نے ابن عباس سے، انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ "لان بسم اللہ الرحمن امان وھذہ السورۃ نزلت بالسیف ونبذ العھود ولیس فیھا امان" (جلد ۱۵ ص ۲۱۶)

"الانفال والبرائة واحدة"

سورہ انفال اور برائت ایک ہیں۔ [1]

یہ احتمال بھی ہے کہ خداوند عالم نے خاص طور پر اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ بسم اللہ تمام قرآنی سورتوں کا جزو ہے سورۂ برائت کے آغاز میں اسے نازل نہیں فرمایا۔

ان تینوں فلسفوں کا آپس میں جمع کرنا مکمل طور پر ممکن ہے۔

بسم اللہ کے بارے میں خاص طور پر حیوانات کے ذبح کرنے کے وقت قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں انشاءاللہ کسی اور مقام پر اس بارے میں گفتگو ہوگی۔

خدا کے نام کو غیر خدا کے ناموں کے ساتھ نہ ملاؤ۔

چونکہ قادر مطلق حقیقی رحمن اور واقعی رحیم صرف اور صرف اُسی خدا کی ذات پاک ہے اور یہ کائنات اسی کے احسان کا دسترخوان ہے اور جو شخص جو کچھ بھی اپنے پاس رکھتا ہے اسی کی مہربانی کی بدولت لہٰذا صرف اسی ہی سے مدد طلب کی جانی چاہیے اور اسی ہی کے نام سے ہر کام کا آغاز کرنا چاہیے بسم اللہ سے متعلق آیات اور اس بارے میں وارد ہونے والی تمام روایات بھی اسی بات پر زور دیتی ہیں۔

بنابریں جو لوگ غیرِ خدا کے ناموں کو اس کے نام کے ساتھ ساتھ ذکر کرتے ہیں درحقیقت وہ ایک قسم کے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں جیسے وہ طاغوت پرست افراد جو جبار اور آمر بادشاہوں کے نام کو اس کے نام کے ساتھ ملا کر خدا اور بادشاہوں کے نام سے پروگراموں کا آغاز کرتے ہیں یا وہ لوگ جو عوام کے نام نہاد ہمدرد بنتے ہیں اور خدا اور عوام کے نام سے اپنے پروگراموں کا اعلان کرتے ہیں بلکہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کو بھی اس بارے میں خدا کے نام کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا اور یہ نہیں کہا جا سکتا اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں۔

تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں ایک روایت ہے کہ:

ایک دن حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ یہ جملہ آپؐ کے کانوں تک پہنچ گیا، کوئی کہہ رہا تھا "ماشاء اللہ و شاء محمد" (جو خدا چاہے اور محمدؐ چاہیں) اور ایک دوسرا شخص یہ کہہ رہا تھا۔ "ما شاءاللہ وشاء علی" (جو خدا چاہیے اور علیؑ چاہیں) آنحضرت نے یہ سن کر فرمایا "لاتقرنوا محمدًا ولا علیا باللہ عزوجل" (محمدؐ اور علی کے ناموں کو خداوند عزوجل کے نان کے ساتھ نہ ملاؤ)

پھر فرمایا (ہاں اگر کہنا بھی چاہتے ہو تو) یوں کہا کرو "ماشاء اللہ ثم شاء محمد" یا "ماشاء اللہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۱۔

ثم شاء علی" (جوخدا چاہے پھر محمدؐ یا علیؑ چاہیں)۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کی مشیت اس قدر قاہر اور غالب ہے کہ کوئی چیز بھی اس کے برابر مشابہ اور ہم پلہ نہیں ہوسکتی خدا کے دین میں محمدؐ کی اس قدرت کے سامنے ایک ایسے طائر کی مانند ہیں جو اس وسیع وعریض کائنات میں پرواز کرتا ہے اسی طرح علیؑ ہیں۔ [1]

[1] اثبات الہداۃ، جلد ۷، ص ۴۸۲، حدیث نمبر ۷۹ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)۔

معرفت (شناخت) کا مسئلہ

اشارہ

تمام علمی مباحث میں سب سے پہلا مسئلہ جو انسان کو درپیش ہوتا ہے وہ یہی معرفت (شناخت) کا مسئلہ ہے اور دوسرے تمام سوالوں میں سے سب سے پہلا سوال جو انسان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ:

۱۔ آیا ہمارے اپنے وجود کے علاوہ کوئی اور جہان بھی ہے یا جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ خواب کی جیسی کوئی چیز ہے جو نیند کی حالت میں ہماری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو کر آ چکی ہے اور باہر کی یہ دنیا محض خواب وخیال ہے؟

۲۔ اگر واقعاً کسی جہان کا وجود ہے تو کیا اس تک رسائی ہمارے بس میں ہے اور اس کی شناخت و معرفت ہمارے امکان میں ہے؟

۳۔ اگر مذکورہ دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے یعنی خارج میں بھی جہان موجود ہے اور اس کی معرفت بھی ہمارے امکان میں ہے تو پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس معرفت کے کیا کیا راستے ہیں؟

الف۔ عقلی دلائل۔ ب۔ تجربہ اور سائنس۔ ج۔ وحی یا وکوئی اور راستہ؟ اور پھر یہ کہ ان میں سے کونسا راستہ زیادہ قابلِ اطمینان واعتماد ہے؟

۴۔ ان سب چیزوں سے ہٹ کر اس جہان کی معرفت کے کون سے ذرائع ہیں؟

۵۔ پھر یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ مندرجہ باتوں کو قبول کر لینے کے بعد کون سے ایسے امور ہیں جو انسان کے اندر معرفت اور شناخت کی راہیں مکمل طور پر ہموار کر کے روح اور جان کو معرفت کے لیے آمادہ کریں، اور معرفت کے راستے میں کون سی ایسی رکاوٹیں ہیں جو انسان کو عالمِ ہستی (کائنات) کے حقائق کی معرفت سے باز رکھتی اور گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں؟

آیا ہمارے ذہن سے باہر بھی کوئی جہان موجود ہے؟

اس بارے میں فلاسفہ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں ۱۔ واقع بین یا رِیلسٹ REALIST۔

۲۔ خیالی لوگ یا آئیڈیالسٹ IDEALISTS

دوسرا گروہ درحقیقت سفسطائیوں SOPHISTS کی ایک شاخ ہے جو تمام حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ سفسطائی وہی آئیڈیالسٹ ہی ہیں جو اپنے وجود اور ذہن کو تو تسلیم کرتے ہیں اور باقی چیزوں کو خواب وخیال سمجھتے ہیں۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی عقلمند انسان اپنے وجود سمیت تمام چیزوں کا انکار کرے مگر یہ کہ وہ ذہنی اور نفسیاتی مریض ہو۔ بہرحال اشیاء کے بیرونی اور خارجی وجود کے اثبات کے لیے بہترین راہ یہ ہے کہ اس امر کو ضمیر اور وجدان کے حوالہ کر دیں کیونکہ دنیا بھر کے تمام لوگوں، تمام عقلاء اور دانشوروں، بلکہ خود ان آئیڈیالسٹ حضرات (جو ہر شئے کے منکر ہیں) کا وجدان اور ضمیر بذاتِ خود اس مدعا کی بین دلیل اور شاہد ناطق ہے۔ کیونکہ تمام لوگ جب

پیاسے ہوتے ہیں تو پانی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں، یعنی عملی طور پر پیاس، پانی اور پیاس بجھانے میں پانی کی تاثیر کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں، حتی کہ چھوٹے چھوٹے بچے، بلکہ جانور تک اس چیز کو قبول کرتے ہیں اور عملی طور پر سفسطائی بھی دوسروں سے جدا نہیں ہیں۔

یا جب کوئی انسان پر ہجوم سڑک کو عبور کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے سڑک کے کنارے آ کھڑا ہوتا ہے، پھر دائیں بائیں دیکھتا ہے، ٹریفک ایک دوسرے کے پیچھے آ جا رہی ہوتی ہے۔ جب بھی سڑک پر تھوڑی سی خلوت ہوتی ہے اور وہ عبور کرنے کے قابل ہوتی ہے تو انسان بڑی احتیاط سے سڑک پر تھوڑی سی خلوت ہوتی ہے اور وہ عبور کرنے کے قابل ہوتی ہے تو انسان بڑی احتیاط سے سڑک کو پار کرنے کی کوشش کرتا ہے، مبادا کسی گاڑی سے تصادم ہو جائے اور وہ اسے مجروح کر دے یا موت کے گھاٹ اتار دے۔

اس طرزِ عمل میں واقع بین (ریلسٹ) اور خیالی لوگ (آئیڈیالسٹ) برابر کے شریک ہیں، یعنی مذکورہ دونوں قسم کے لوگ عملی طور پر سڑک اور گاڑیوں کے وجود کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور تصادم کے خطرات اور اس قسم کے دوسرے مسائل کو قبول کرتے ہیں۔ اسی لیے تو خوب دیکھ بھال اور بڑی احتیاط کے ساتھ سڑک پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یا جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے اور اپنے اندر بیماری کے مختلف آثار دیکھتا ہے تو حکیم یا ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال CHECK UP کرتا ہے، اس کے لیے دوا اور غذا تجویز کرتا ہے اور خوب سوچ سمجھ کر ہر ایک چیز کے بارے میں اسے ہدایات دیتا ہے اور مریض بھی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو ان ہدایات پر عمل کرنے کا پابند بناتا ہے۔

ان تمام امور میں واقع بین اور خیالی افراد برابر ہیں اور وہ بھی وجدانی طریق سے اپنی بیماری کے بارے میں ردعمل کا اظہار کرتے ہیں اور اس قسم کے بیسیوں عینی حقائق کو تسلیم کرتے ہیں، بیماری کے آثار سے لے کر طب اور ڈاکٹر، اس کی دیکھ بھال، دوا اور غذا کے وجود تک ہر ایک چیز کا اقرار کرتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ ''آئیڈیالسٹ، عمل میں ریالسٹ ہیں'' اور آئیڈیالسٹ جب میدانِ زندگی میں اترتے ہیں تو اپنی تمام باتوں کو فراموش کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو عینی حقائق کے سامنے پاتے ہیں اور ان کے مطابق اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

قرآن مجید بھی اپنی آیات میں صریحی طور پر اس بات پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے اور قرآن مجید کی تمام آیات عینی اور خارجی حقائق، آسمان و زمین، انسان اور فرشتے اس مادی دنیا اور اس کے بعد کا ایک اور جہان، یعنی دنیا اور آخرت کی خبر دیتی ہیں۔ قرآنی آیات کی رو سے یہ بات اس قدر واضح اور آشکار ہے کہ ہم اس سلسلے میں مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو یہیں پر ختم کرتے ہیں اور دوسرے مسئلہ یعنی معرفت (شناخت) کے امکان پر ایک تفصیلی اور تحقیقی نظر ڈالتے [1] ہیں۔

---

[1] یہاں پر ہم ایک بار پھر زور دے کر یہ بات دہراتے ہیں کہ اس کی تمام مباحث میں ہمارا مقصد فلسفی یا تاریخی یا اس قسم کی کسی اور بحث کو چھیڑنا نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا اصل مقصد تفسیر موضوعی ہے، یعنی قرآنی نقطہ نظر سے مختلف موضوعات کو زیر بحث لانا اور قرآنی آیات کی روشنی میں ان مباحث کو جانچنا اور اگر کسی مقام پر فلسفی یا اس قسم کی کسی اور بحث کی ضرورت محسوس ہوئی تو گفتگو کے آخر ''توضیحات'' کے عنوان کے تحت علیحدہ گفتگو کریں گے۔

قرآنی نقطہ نظر سے معرفت ضروری ہے

(علم کی اہمیت کے بارے میں چالیس قرآنی نکات)

اشارہ!

قرآنِ مجید جہانِ خارج یعنی بیرونی دنیا کی معرفت کو انسان کے لیے فقط ممکن ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے دوسرے تمام واجبات سے اہم بھی بتلاتا ہے۔

قرانِ مجید مختلف بیانات کے ذریعہ اپنے پیروکاروں کو حصولِ علم کے ذریعہ کائنات کے رازوں کی شناخت اور معرفت کی دعوت دیتا ہے صریحی اور واضح طور پر بھی اور اشاروں کتابوں میں بھی۔

اس بارے میں قرآنی تعبیرات پر تحقیق ہمارے سامنے ایک نئی افق کی راہیں کھول دیتی ہے اور شناخت و معرفت کے مسئلہ کو ایک قطعی فریضہ کی صورت میں نہایت ہی اعلیٰ سطح پر پیش کرتی ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ دعوت ایسے زمانے اور ایسے علاقے میں انجام پائی ہے جب جہالت اور لاعلمی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان تعبیرات کی گہرائی اور گیرائی سب سے پہلے مرحلہ پر قرآن کی عظمت اور صاحبِ قرآن (نبی اکرمؐ) کی حقانیت کی دلیل ہے۔

اب ہم اسی نکتہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سلسلے میں قرآنِ مجید کی مختلف تعبیرات کو بیان کرتے ہیں۔

یہ صورتِ حال پوری طرح جدید انداز میں بیان ہوگی کہ جس کے چالیس نمونے تو ہم نے قرآن پاک کی مختلف آیات سے جمع کیے ہیں جن میں سے ہر ایک نمونہ کو خصوصی زاویہ فکر سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی بتاتے چلیں کہ ان آیات کی مناسبت سے نہایت ہی انمول روایات کو ان کے حاشیہ میں تحریر کیا گیا ہے جو اس بارے میں کتاب وسنت کی مکمل ہم آہنگی پر روشن دلیل ہے۔

۱۔ حصولِ علم ضروری ہے

قرآن مجید کی ستائیس آیات میں.....(جان لو) کہ کلمہ سے کام لیتے ہوئے حصولِ علم کی دعوت دی گئی ہے جس کے چند ایک نمونے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ یعنی جان لو کہ خداوندِ عالم ناقابلِ شکست اور صاحبِ حکمت

ہے۔(سورہ بقرہ ۲۰۹)

۲۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ یعنی جان لو کہ یقیناً خداوندِ عالم ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

(بقرہ ۲۳۱)

۳۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ یعنی جن لو کہ یقیناً خداوندِ عالم ہر اس کام کو دیکھ رہا ہے جو تم انجام دیتے ہو۔(بقرہ ۲۳۳)

۴۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ یعنی جان لو کہ خداوندِ عالم زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔(حدید ۱۷)

۵۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ یعنی جان لو کہ یقیناً تم خدا کے پاس محشور ہو گے۔(بقرہ ۲۰۳)

۶۔ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ یعنی جان لو کہ ہمارے رسول پر تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہی ہے۔(سورۂ مائدہ ۹۲)

۷۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ ..... یعنی جان لو کہ جو نفع بھی تم حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ خدا اور اس کے رسول..... کے لیے ہے۔(سورہ انفال ۴۱)

۸۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ..... یعنی جن لو کہ یہ دنیا تو بس کھیل تماشا..... ہے۔(سورہ حدید ۲۰)

پہلی، دوسری اور تیسری آیات خداوندِ عالم کی ذات اور اس کی ذاتی اور فعلی صفات کی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔

چوتھی آیت تخلیقِ زندگی کی طرف توجہ دلا رہی ہے۔

پانچویں آیت میں قیامت اور حشر ونشر کی گفتگو ہے۔

چھٹی آیت میں نبوت اور پیغمبرِ اکرمؐ کے فریضہ کی بات ہو رہی ہے۔

ساتویں آیت میں اسلام کے عملی احکام کا تذکرہ ہے۔

اور آٹھویں آیت زندگی کے حقیقی چہرے اور اس کے بے وقعت ہونے کو مجسم کر رہی ہے جو زہد وتقویٰ دنیا پرستی اور اس کی وجہ سے حاصل ہونے والے گناہوں سے نجات کی دعوت کا ایک ذریعہ ہے۔

تو اس طرح سے عقائد اعمال اور معمولاتِ زندگی سے تمام امور کی جانب .....اعلموا کے ذریعہ توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور اس

بارے میں علم وآگاہی کی زیادہ سے زیادہ دعوت دی گئی ہے [1]۔

۲۔غور وفکر سے کام نہ لینے پر سرزنش کی گئی ہے

چنانچہ کبھی تو فرماتا ہے "افلا تتفکرون" آیا غور وفکر نہیں کرتے ہو؟ (سورہ انعام ۵۰)

اور کبھی تکوینی اور تشریعی آیات کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے "لعلکم یتفکرون" یہ صرف اس لیے ہے کہ شاید غور وفکر سے کام لیں۔ (سورہ بقرہ ۲۱۹)۔سورہ اعراف ۱۷۶ میں لعلھم ہے۔

اور کبھی فرماتا ہے "اولا یتفکروا" کیا انہوں نے اپنی فکر سے کام نہیں لیا؟ (سورہ روم ۸)

یہ سب باتیں علم وفکر کے لازم ہونے کی دعوت ہیں اور فکر وعلم کا لزوم معرفت کے ممکن ہونے کی دلیل ہے [2]۔

۳۔تعلیم وتعلّم کی تاکید

سورہ برائت (توبہ) میں ارشاد ہوتا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

ہر گروہ سے ایک ایک ٹولہ کوچ کیوں نہیں کرتا کہ دین کے بارے میں آگاہی حاصل کرے اور اپنی قوم کی طرف واپس آکر انہیں ڈرائے شاید کہ قوم کے لوگ فرمانِ الٰہی کی مخالفت سے بچ جائیں۔ (سورہ توبہ)

یہ آیت صرف دینِ الٰہی کی تعلیم حاصل کرنے ہی کو واجب قرار نہیں دیتی بلکہ حصولِ علم کے بعد اسے دوسروں کو تعلیم دینے کو بھی واجب جانتی ہے۔

نفر" کی تعبیر اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ کوچ کرنے سے مراد میدانِ جنگ کی طرف جانا ہے کیونکہ قرآن مجید کی مختلف آیات میں یہ

---

[1] روایات میں اس بارے میں زبردست تاکید کی گئی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور ومعروف حدیث "طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة" اس کی روشن مثال ہے (ملاحظہ ہو بحارالانوار، جلد ۱، ص ۱۱۷) اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام بھی فرماتے ہیں "طلب العلم فریضة علی کل حال" (ہر حالت میں علم کا طلب کرنا واجب ہے۔ ملاحظہ ہو بحارالانوار، جلد ۲ ص ۱۷۲)

[2] رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے "اغد عالما اومتعلما اومستعما اومحبا ولا الخامس" یعنی یا عالم بنو یا طالب علم، یا پھر علماء کی باتیں سنا کرو، یا علم دوست بنو، لیکن پانچویں شخص نہ بنو کہ ہلاک ہوجاؤ گے۔ (محجۃ البیضا، جلد ۱، ص ۲۲)

تعبیر اسی معنی کے لیے استعمال ہوئی ہے اسی لیے تو مسلمانوں پر یہ بات فرض تھی کہ غیر ضروری صورت میں سب کو میدانِ جنگ کی طرف جانے کی ضرورت نہیں بلکہ کچھ لوگ تو دشمن کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں جائیں اور کچھ لوگ جہالت کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے مدینہ ہی میں رہ جائیں اور احکامِ الٰہی کی تعلیم حاصل کریں اور دوسروں کر میدانِ جنگ سے واپسی کے بعد تعلیم دیں۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر یہ ہے کہ مسلمان دو حصوں میں بٹ جائیں ایک تو مدینہ ہی رہ جائے تا کہ شہر کی حفاظت کر سکیں اور جو گروہ میدان جہاد میں جائے وہاں پر خدا کی عظمت کے آثار اس کی غیبی امداد اور مسلمانوں کی معجزانہ کامیابیوں کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جب واپس آئے تو دوسروں کو تعلیم دے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک تیسرا احتمال بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ مدینہ کے گرد و نواح میں رہنے والے کچھ لوگوں پر ضروری تھا کہ وہ امن عامہ کے تحفظ کے لیے اپنے گھروں ہی میں رکے رہیں اور کچھ لوگ مدینہ میں آ کر آنحضرتؐ سے احکام الٰہی کی تعلیم حاصل کر کے واپس آ کر دوسروں کو یہ تعلیم دیں۔[1]

ان میں سے ہر ایک تفسیر کی اپنی خصوصیت ہے جو دوسری میں نہیں پائی جاتی[2]۔ لیکن ہم جس چیز کی تلاش میں ہیں اگر ان میں سے کسی کو بھی قبول کر لیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ جس طرح حصولِ علم واجب ہے اسی طرح دوسروں کو تعلیم دینا بھی واجب ہے اور ان دونوں واجبات پر تاکید مسئلہِ معرفت و شناخت کے لازمی اور ممکن ہونے کی روشن دلیل ہے۔[3]

۴۔ تخلیق کائنات کا مقصد ہی علم اور معرفت ہے

ارشاد باری ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۱۶، ص ۲۲۵، تفسیر مجمع البیان، جلد ۵ ص ۸۳۔

[2] پہلی تفسیر کی رو سے ضمیروں کا مرجع "لیتفقھوا" اور "لینذروا" میں محذوف اسم ہے جو تقدیری صورت میں یوں ہوگا "وتبقی طائفة"۔ لیکن یہ ظاہر کے خلاف ہے، جبکہ "نفر" جہاد کے معنی میں آیا ہے اور یہ اس کا ایک قوی نقطہ ہے۔ دوسری تفسیر میں بھی ضمیروں کا مرجع وہی مذکورہ کلمہ "طائفہ" ہے، لیکن اس تفسیر کی مشکل یہ ہے کہ میدانِ جہاد و احکام دین کی تعلیم حاصل کرنے کا مرکز نہیں ہوتا، مگر مذکورہ بالا توجیہہ کے ساتھ اور تیسری تفسیر میں بھی ایک مقدر محذوف ہے، لیکن بہت سی ان روایات سے ہم آہنگ ہے جن میں "نفر" کی "علم دین کے حصول کے لیے کوچ کرنا" سے تفسیر کی گئی ہے۔ (تفسیر نور الثقلین میں اس بارے میں نو روایات نقل کی گئی ہیں)۔

[3] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "لوددت ان اصحابی ضربت رؤسھم بالاسیاط حتی یتفقھوا" مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرے دوستوں کو تازیانے مار کر علم و دانش کے حصول کے لیے روانہ کیا جائے۔ (کافی، جلد ۱، ص ۸)

لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾

خداتو وہ ہے جس نے سات آسمانوں کو پیدا کیا اور زمینوں کی بھی اسی طرح اس کا حکم ہمیشہ ان کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے یہ سب کچھ صرف اسی لیے ہے تا کہ تم جان لو کہ خداوندِ عالم ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لے چکا ہے۔ (سورہ طلاق ۱۲)

سات آسمانوں اور سات زمینوں سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں ہم تفسیرِ نمونہ میں تفصیل سے بحث کر چکے ہ[1] یں۔ لیکن صورتف حال خواہ کچھ بھی ہو یہ آیت وضاحت کے ساتھ اس امر کی نشاندہی کتی ہے کہ تخلیقِ کائنات کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کو خداوندِ عالم کے علم وقدرت اور اس کی ذات وصفات سے آگاہ کیا جائے او یہ بات بڑی صرحت کے ساتھ وسیع پیمانے پر معرفت کے ممکن ہونے پر دلالت کرتی ہے۔[2]

۵۔ بعثت انبیاء کا مقصد تعلیم وتربیت ہے

قرآن مجید نے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بارہا اس بات کی یاد دہانی کرائی ہے۔ منجملہ ان کے سورہ بقرہ میں ہے:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

جیسا کہ ہم نے ایک رسول تمہارے لیے تم ہی سے بھیجا ہے تا کہ وہ تم پر ہماری آیات کی تلاوت کرے تمہارا تزکیہ کرے تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور جو تم نہیں جانتے وہ تمہیں سکھائے۔ (بقرہ ۱۵۱)

یہی چیز سورہ بقرہ/ ۱۲۹ سورہ آل عمران/ ۱۶۴ اور سورہ جمعہ/ ۲ میں بیان ہوئی ہے۔

اگر معرفت اور شناخت ناممکن ہوتی تو پھر یہ بات کیونکر ممکن تھی کہ اسے پیغمبر اسلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد کے طور پر

---

[1] سات آسمانوں کے متعلق تفسیر نمونہ جلد اول، طبع جدید میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ کے ذیل میں اور سات زمینوں کے بارے میں تفسیر نمونہ، جلد ۲۴، سورہ طلاق کی بارہویں آیت کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے، ادھر رجوع فرمائیں۔

[2] ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے دوستوں سے فرمایا "ایها الناس ان الله جل ذکره ما خلق العباد الالیعرفوه، فاذا عرفوه عبدوه، فاذا عبدوه استغنوا بعبادته عن عبادة ماسواه" یعنی اے لوگو! جان لو کہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کو پیدا نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اس کی معرفت حاصل کریں۔ جب اس کی معرفت حاصل کر لیں گے تو اس کی عبادت کریں گے۔ جب اس کی عبادت کریں گے تو اس کے غیر کی بندگی سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ (بحار، جلد ۵، ص ۳۱۲)

بیان کیا جات[1]؟

۶۔قرآن کے نازل ہونے کا مقصد غور وفکر ہے

ارشاد ہورہا ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴿۲۹﴾

یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر نازل کیا ہے تا کہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور صاحبانِ عقل یادآوری کریں۔(سورہ ص ۲۹)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴿۲۴﴾

کیا وہ لوگ قرآن میں فکروتدبر سے کام نہیں لیتے؟ یا اُن کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟(سورہ محمد ۲۴)

"یتدبروا" دراصل "دبر" (بروزن شتر) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہر چیز کی پشت ہے پھر یہ غور وفکر اور عاقبت اندیشی کے لیے استعمال ہونے لگا کیونکہ سوچ وبچار کے ساتھ کسی بات کا انجام نتیجہ اور پس وپیش سامنے آجاتا ہے۔

پہلی آیت نزولِ قرآن کا مقصد فکروتدبر بیان کررہی ہے تا کہ لوگ چند کلماتِ مقدسہ پر مشتمل آیاتِ قرآنی کی تلاوت ہی پر اکتفانہ کریں اور آخری مقصد کو فراموش نہ کردیں۔

اور دوسری آیت میں تفکروتدبر سے کام نہ لینے کا سبب دلوں پر تالے پڑجانے اور تشخیص کی حس کے ناکارہ ہونے کو بتایا گیا ہے تو گویا تمام صورتوں میں یہ آیات غور وفکر کرنے کے لیے دعوتِ عام ہیں ایسی دعوت جو معرفت کے امکان کو واضح طور پر ثابت کرتی ہے۔[2]

---

[1] امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں "کفی بالعلم شرفا ان یدعیه من لایحنه و یفرح اذا نسب الیه و کفی بالجهل ذما یبرأ منه من هو فیه" علم کے شرف کے لیے اتنا کافی ہے کہ جو لوگ اس سے آگاہ نہیں ہیں وہ بھی اس کا دعویٰ کرتے ہیں اور اگر انہیں اس کی طرف نسبت دی جائے تو خوش ہوتے ہیں اور جہالت کی مذمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ جہالت کے حامل افراد اس سے اظہار برائت کرتے ہیں۔ (بحارالانوار جلد ۱ ص ۱۸۵)

[2] حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہشام بن حکم سے فرماتے ہیں "ما بعث الله انبیائه الاعباده الا لیعقلوا عن الله فاحسنهم استجابة احسنهم معرفة" خداوند عالم نے انبیاء کو لوگوں کی طرف اس لیے بھیجا ہے کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کریں۔ ان کی دعوت کو ان لوگوں نے احسن طریقہ سے قبول کیا جن کی معرفت زیادہ تھی۔(اصول کافی جلد ۱ ص ۱۶)

۷۔ معراجِ پیغمبرؐ کا مقصد ہی معرفت تھا۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

پاک ومنزہ ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں رات سیر کرائی مسجدِ اقصیٰ تک کہ جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں بے شک کہ وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ (بنی اسرائیل ۱)

یہی چیز سورہ نجم میں بھی بالفاظ دیگر بیان ہوئی ہے:

وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی ⑱

اس نے اپنے پروردگار کی بہت بڑی نشانیوں کو ملاحظہ کیا۔ (سورہ نجم ۱۸)

یہ آیات معراجِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت بڑے مقاصد میں سے کم از کم ایک مقصد حق تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ بتاتی ہیں جو کہ معرفت کے اہم ذرائع میں سے ایک ہے۔[1]

۸۔ دعوتِ اسلام کا آغاز علم کی دعوت سے ہوا

ارشاد ہوتا ہے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ① خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ② اِقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ۙ③ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ④ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ؕ⑤

پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا پڑھو کہ تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی انسان کو وہ کچھ پڑھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ (سورہ علق ۱ تا ۵)

یہ آیات جو جبلِ نور کی غارِ حرا میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک ومطہر دل پر وحی کی پہلی جھلک تھیں معرفت کے مسئلہ سے شروع ہو کر معرفت ہی کے مسئلہ پر ختم ہوتی ہیں۔

ان کا آغاز "قرائت" سے ہوتا ہے جو کہ معرفت کا ایک ذریعہ ہے اور اختتام پر کائنات کے عظیم ترین معلم یعنی خداوند عالم کے

---

[1] اس بارے میں مزید تفصیلات کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۲ کے ابتدائی صفحات کا مطالعہ کریں۔

بارے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے انسان جس کے مکتب کا ایک چھوٹا سا شاگرد ہے۔

تو کیا یہ سب معرفت کے امکان اور اس کے لزوم کی روشن دلیل نہیں ہے؟

۹۔علم نور اور روشنائی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ ۙ اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ ۚ

کہہ دیجئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں؟ یا ظلمتیں اور نور برابر ہو سکتے ہیں؟ (سورہ رعد ۱۶)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَسۡتَوِي الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ ۙ﴿۱۹﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوۡرُ ۙ﴿۲۰﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الۡحَرُوۡرُ ۚ﴿۲۱﴾

نہ تو نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی تاریکیاں اور روشنائی اور نہ ہی سکون عطا کرنے والا سایہ اور گرم و جھلسا دینے والی ہوائیں۔ (سورہ فاطر ۱۹ تا ۲۱)

ان آیات میں ظلمت کو نابینائی اور نور کو بصیرت اور بینائی کے ہم پلہ قرار دیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم اور معرفت نور اور روشنی ہیں جبکہ جہالت اور بے علمی اندھے پن کے برابر ہیں۔ اور یہ شناخت و معرفت کی ترغیب کے لیے نہایت ہی حسین تعبیر ہے [1]۔

۱۰۔کائنات کے اسرار کا ادراک صرف عالم ہی کر سکتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡعٰلِمِيۡنَ ﴿۲۲﴾

اس کی نشانیوں میں ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف اس میں نشانیاں ہیں عالم لوگوں کے لیے۔ (سورہ روم ۲۲)

---

[1] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "العلم نور یقذفه الله فی قلب من یرید ان یهدیه" علم ایک نور ہے، جسے خداوند عالم ہدایت کرنا چاہے اس کی دل میں ڈال دیتا ہے۔ (وافی جلد ۱ ص ۷)

اورایک اورمقام پرارشاد ہوتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾

یہ وہ مثالیں ہیں جنہیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور علماء کے سوا ان کا کوئی اور ادراک نہیں کرسکتا۔ (سورہ عنکبوت ۴۳)

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ کتاب تکوین (عالم کون ومکان) کے اسرار کا علم صرف علماء سے ہی خاص ہے اور دوسری آیت میں کتابِ تدوین (قرآن مجید) کے ادراک کی انہی سے خصوصیت سے نشاندہی کی گئی ہے۔

اور یہ جہاں ایک طرف علم ومعرفت کے لیے ایک قسم کی ترغیب وتشویق ہے وہاں معرفت کے مسئلہ کی دلیل بھی ہے۔

۱۱۔سب سے پہلا معلّم خداوندعالم ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

خداوندعالم نے سارے کے سارے علم اسماء (اسرارِتخلیق) کی آدمؑ کی تعلیم دی۔ (سورہ بقرہ ۳۱)

دوسرے مقام پرارشاد ہوتا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾

خداوندرحمان نے قرآن کی تعلیم دی انسان کو پیدا کیا اور اسے بات کرنا سکھایا۔ (سورہ الرحمن ۱ تا ۴)

ایک اورجگہ فرماتا ہے:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿۵﴾

انسان جو کچھ نہیں جانتا تھا اسے سکھایا (تعلیم دی)۔ (علق ۵)

نیز فرماتا ہے:

الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾

جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ (علق ۴)

کائنات کا یہ عظیم معلم کبھی تو حضرت آدمؑ کو تمام علم اسماء کی تعلیم دیتا ہے اور کبھی بنی نوعِ انسان کو (تکوین اور تشریح کے ذریعہ) اس چیز کی تعلیم دیتا ہے جو وہ نہیں جانتے اور انہیں اس کی ضرورت ہے۔

کبھی انسان کے ہاتھ میں قلم پکڑا کر اسے لکھنا سکھاتا ہے اور کبھی ایک ایک دو دو حروف اس کی زبان پر لا کر اسے بولنا سکھاتا ہے اور بات کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ذات کی عظیم ترین صفات میں سے ایک اہم صفت بندوں کو تعلیم دینا بھی ہے تعلیم بھی ایسی جو ان کی شناخت اور معرفت کا ذریعہ ہوتی ہے۔

۱۲۔ انسان دوسری مخلوقات پر علم ہی کے ذریعہ ممتاز ہوتا ہے

ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

خدا نے فرمایا، اے آدمؑ! انہیں موجودات کے ناموں اور اسرار سے آگاہ کرو۔ جب آدم نے انہیں ان سے آگاہ کیا تو فرمایا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں اور اس چیز سے بھی باخبر ہوں جسے تم (فرشتے) ظاہر کرتے یا چھپاتے ہو۔ (بقرہ ۳۳)

یہ بات اس وقت کہی گئی جب خداوند عالم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جس وقت میں اپنے خلیفہ اور نمائندہ (آدم) کو خلق کرلوں تو تم سب اس کے سامنے سجدہ کرنا اور اپنی فروتنی کا اظہار کرنا۔ اسی طرح کی برتری کو ظاہر کرنا چنانچہ جب فرشتوں کو معلوم ہوگیا کہ علم و معروفت کے لیے آدم کی آمادگی اور استعداد اعلیٰ حدود پر ہے تو انہیں پتہ چلا کہ وہ کس لیے خدا کا خلیفہ اور کائنات کا گل سرسبد ہے اور اس سے پہلے وہ جو باتیں کر چکے تھے ان پر نادم اور پشیمان ہوئے [1]۔

۱۳۔ خدا کا قرب معرفت کے تناسب سے حاصل ہوتا ہے

ارشاد ہوتا ہے

.....يَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ۙ وَالَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ ؕ

(اگر تم احکامِ الٰہی پر عمل کرو تو) خداوند عالم تم میں سے ان لوگوں کو عظیم درجات کی بلندی پر لے جائے گا جو ایمان

---

[1] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "اکثر الناس قیمة اکثرهم علما و اقل الناس قیمة اقلهم علما"، لوگوں میں سے جس کا علم سب سے زیادہ ہے اس کی قدر و قیمت بھی سب سے زیادہ ہے اور جس کا علم سب سے کم ہے اس کی قیمت بھی سب سے کم ہے۔ (بحار الانوار جلد ۱ ص ۱۶۴)

لے آئے اور جولوگ علم کی نعمت سے مالا مال ہیں۔(سورہ مجادلہ ۱۱)

اس آیت کی ابتداء میں آدابِ مجلس کے سلسلہ میں چند اخلاقی احکام کی بات ہورہی ہے اوراس کے ساتھ ہی خدا کی بارگاہ میں نتیجہ اور پاداش کے طور پران علماء اور مومنین کے درجات کا تذکرہ ہے جوان احکام پرعمل کرتے ہیں۔

"درجات" "درجه" کی جمع ہے جس کا معنی سیڑھی کے وہ پائے ہیں جو اوپر کی طرف جاتے ہیں اس کے مقابلے میں درکات ہے جو "درکه" کی جمع ہے جس کا معنی سیڑھی کے وہ پائے جو نیچے کی طرف جاتے ہیں (جیسے تہہ خانے کی سیڑھیوں کے پائے ہوتے ہیں)۔

درجات کونکرہ کی صورت میں بیان کرنا ان کی عظمت کی طرف اشارہ ہے اورانہیں جمع کی صورت میں بیان کرنا شاید علماء کے درجات کے تفاوت کی طرف اشارہ ہے۔

صورت حال خواہ کچھ بھی ہو یہ بات ضرور مسلم ہے کہ درجات کی بلندی سے مراد ان کی مکان کے لحاظ سے بلندی مراد نہیں ہے بلکہ بارگاہ خداوندی میں قرب کی بلندی مراد ہے۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ اس آیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جاسکتی ے کہ مومنین کی دوقسمیں ہیں ایک مومنینِ عالم اور دوسرے مومنینِ غیر عالم جن میں سے مومنین عالم برتر ہیں پھر اس بارے میں سورہ زمر کی نویں آیت "قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون" سے استدلال کیا گیا ہے۔[1]

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ آیت میں ایمان اور علم کے رابطے کو بیان کیا گیا ہے انشاءاللہ بعد میں ہم اس بات کی طرف تفصیل سے اشارہ کریں گے۔[2]

۱۴۔انبیاءزیادہ سے زیادہ علم کے خواہاں ہوتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

کہہ دیجئے کہ اے پروردگار! میرے علم کو زیادہ کردے۔(طٰہٰ ۱۱۴)

یہ آیت جس کے مخاطب حضور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اس بات کی نشاندہی کررہی ہے کہ باوجود یکہ آنحضرتؐ علم کے

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۹، ص ۲۱۶

[2] حضرت امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہے کہ "ان الثواب بقدر العقل" ہر شخص کو اس کی عقل (ودانش) کے مطابق اجر ملتا ہے۔

(بحارالانوار، جلد ۱، ص ۸۴)

عظیم مقام ومرتبہ پر فائز تھے پھر بھی آپؐ کو زیادہ سے زیادہ علم طلب کرنے کا حکم تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا رہی ہے کہ انسان اپنی عمر کے کسی بھی مرحلے میں فارغ التحصیل نہیں ہوتا اور علم ودانش کا رشتہ کہیں پر ختم ہونے میں نہیں آتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾

حضرت موسیٰؑ نے اس عالم ربانی (حضرت خضرؑ) سے کہا کیا میں آپ کی پیروی کروں تا کہ جو کچھ آپ کو تعلیم دی جا چکی ہے اور رُشد وہدایت کا موجب ہے اس سے مجھے بھی سکھائیں؟ (سورکہف ٦٦)

معلوم ہوتا ہے باوجودیکہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام اولوالعزم نبی تھے "رب اشرح لی صدری" خدوندا! (میرا سینہ کشادہ کر دے) (طہ ۵) اور "ولما بلغ اشدہ و استوی اتیناہ حکما وعلما" (جب وہ طاقتور اور کامل بن گئے تو ہم نے انہیں حکمت ودانش عطا کی۔ قصص ر ۱۴) کے مصداق ایک بلند پایہ علمی مقام کے حامل تھے پھر بھی انہیں حکم ملا کہ وہ خضر علیہ السلام کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کریں اور ان سے علم حاصل کریں۔

بہرحال یہ آیات معرفت کے امکان اور اس کے ضروری ہونے نیز علم ومعرفت کے حصول کے لیے مسلسل تلاش اور کسی وقفہ کے بغیر سعی وکوشش کی روشن دلیل ہیں۔ [1]

۱۵۔ انسان کی نجات کی کُنجی معرفت ہے

ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ

کہ دیجئے میں تمہیں صرف ایک چیز کی نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ دو دو ہو کر یا ایک ایک ہو کر اجتماعی یا انفرادی صورت میں خدا کے لیے کھڑے ہو جاؤ پھر سوچ وبچار اور غور وفکر کرو۔ (سورہ سبا ۴۶)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ باتیں ہٹ دھرم اور ضدی مزاج دشمنوں سے کہیں جو کفر وشرک اور ہر قسم کی اخلاقی برائیوں کا شکار تھے لہٰذا خداوند عالم نے ان کی اس قسم کے خطرناک گردابوں سے نجات کی کنجی غور وفکر بتائی ہے جو کہ معرفت کا ایک راستہ ہے۔

یہی تو وجہ ہے کہ انسانی معاشروں میں ہر قسم کے انقلاب اور ہر قسم کی بنیادی تبدیلی کی اصل اور جڑ فکری اور ثقافتی انقلاب ہی میں

---

[1] حضرت امیرؑ فرماتے ہیں "العلم میراث الانبیاء والمال میراث الفراعنہ" علم انبیا کی میراث اور مال فرعونوں کی میراث ہے۔

(بحارالانوار جلد ا ص ۱۸۵)

ملتی ہے۔

اگر معرفت ممکن نہ ہوتی تو پھر غور وفکر کس لیے؟ خصوصاً جب اسے انما'' کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو'' حصر'' کے لیے ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات کی اصل کنجی صرف اور صرف یہی ہے۔

لیکن یہ بات ضروری ہے کہ یہ غور وفکر خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی صحیح معنوں میں ہو اور خدا کے لیے اٹھ کھڑا ہونے کے ساتھ ساتھ ہو اور پھر یہ بات سب سے اہم ہے کہ خدا کے لیے ہو اسی لیے تو فرماتا ہے کہ ''ان تقوموا للہ''یعنی ہر قسم کہ تعصب ہٹ دھرمی اور نفسانی خواہشات سے بالاتر ہو کہ جن کی تفصیل انشاء اللہ معرفت کی رکاوٹوں کے باب میں آئے گی۔

اللہ کے نبی جناب یوسفؑ نے بھی اسی چیز پر زور دیا ہے اور جب حکومتِ مصر کی مسندِ اقتدار پر متمکن ہوئے تو فرمایا:

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰۱

پروردگارا! تُو نے مجھے حکومت کا (بہت بڑا) حصہ دیا ہے مجھے تعبیرِ خواب کے علم سے آگاہ فرمایا ہے تو ہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے تو ہی دنیا وآخرت میں میرا سرپرست ہے مجھے مسلمان بنا کر موت دے اور مجھے صالحین سے ملحق فرمادے۔(سورہ یوسف ۱۰۱)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ علمِ تعبیرِ خواب کا شعار ان علوم میں ہوتا ہے جن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے لیکن اس کے باوصف قرآنِ مجید میں حضرت یوسفؑ کی داستان اس بات کی اچھی طرح نشاندہی کرتی ہے کہ اس عظیم الشان نبی کا یہی علم اس بات کا باعث ہوا کہ ایک تو وہ خود عزیز مصر کے قید خانے سے رہا ہو کر مسندِ حکومت پر متمکن ہوئے اور دوسرے اس وسیع وعریض مملکت کو خطرناک قحط سالی سے نجات دلائی کیونکہ جب جناب یوسفؑ قید میں تھے تو بادشاہ مصر نے ایک عجیب خواب دیکھا تھا کہ جس کی تعبیر بتانے سے سب معبر عاجز آ گئے تھے ایک قیدی جو حضرت یوسیٰ علیہ السلام کی تعبیرِ خواب کی وجہ سے قید خانے سے رہائی پا کر شاہی دربار تک رسائی پا چکا تھا نے کہا میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو اچھی طرح خوابوں کی تعبیر بتا سکتا ہے اور جب حضرت یوسفؑ نے اس خواب کی تعبیر بتائی جو مملکت کے آئندہ سات سالوں کے اقتصاد سے متعلق تھا تو خود بھی قید سے رہا ہو گئے اور ان کی حکومت کے مقدمات فراہم ہو گئے اور ساتھ ہی آنے والے سالوں کی منصوبہ بندی کی جو قحط سے دو چار ہونے والے تھے۔

مندرجہ بالا آیت جو حضرت یوسف علیہ السلام کے حکومت پر فائز ہو جانے کے بعد ان کی تعبیرِ خواب کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے ممکن ہے کہ ان دونوں کے باہمی رابطے کی طرف اشارہ ہو۔

لیکن صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو اس آیت سے بخوبی یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ نجات کی کنجی علم ومعرفت میں ہے حتیٰ کہ بسا اوقات سادہ

سے سادہ اور معمولی قسم کا علم بھی کسی مملکت کی نجات کا سبب بن سکتا ہے۔[1]

۱۶۔ علم ہر صوت میں قابل فخر ہے

ارشاد ہوتا ہے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۵ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝۱۶

ہم نے داؤد اور سلیمان کو وافر علم عطا فرمایا اور انہوں نے کہا حمد ہے اس خدا کی جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر برتری عطا کی اور سلیمان داؤد کے وارث ہوئے اور کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی گفتگو بھی سمجھائی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز سے عطا کیا گیا ہے یہ واضح فضیلت ہے۔ (سورہ نمل ۱۵، ۱۶)

باوجودیکہ جناب داؤد اور حضرت سلیمانؑ کی حکومت اور جاہ وحشمت کی مثال اور نظیر نہیں ملتی بلکہ جس طرح سورہ ص کی ۳۵ ویں آیت "ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی" سے احتمالی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مستقبل میں بھی دنیا میں اس طرح کی وسیع وعریض مملکت معرضِ وجود میں نہیں آئے گی خاص کر جبکہ داؤد سلیمان علیہما السلام کی انسانوں کے علاوہ جنات اور حیوانات بلکہ ہوا جیسے طبعی امور پر بھی حکمرانی تھی لیکن جب خداوند عالم نے ان دونوں باپ بیٹے پر اپنی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے تو سب سے پہلے علم ومعرفت جیسی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے بھی اسی بناء پر خدا کی حمد بجالائی ہے کہ خدا نے انہیں اپنے بہت سے بندوں پر فضیلت اور برتری عنایت فرمائی ہے۔ (شاید یہ اس لیے ہو کہ جو لوگ ان دونوں کے زمانے میں زیادہ علم کے مالک ہوں ان پر انہیں برتری حاصل ہو) نیز یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ اس قدر عظیم جاہ وحشمت کے باوجود سب سے پہلے ایک غیر اہم علم یعنی علم منطق الطیر پر فخر کرتے نظر آتے ہیں بعد میں اپنی عظیم سلطنت اور دوسری نعمتوں پر۔

اس قسم کی لطیف تعبیریں ہر جگہ پر علم کے مقام ومنزلت اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں اور بذاتِ خود علم ومعرفت کے امکان اور اس کے لازم ہونے کی واضح دلیلیں ہیں۔[2]

---

[1] حضرت علی علیہ السلام کمیل سے فرماتے ہیں: "یا کمیل ما من مرکة الا وانت محتاج فیها الی معرفته" اے کمیل! کوئی حرکت ایسی نہیں ہے جس میں تم معرفت کے محتاج نہ ہو۔ (تحف العقول ص ۱۱۹)

[2] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے "العلم کل حال سنی و منتهی کل منزلة رفیعة" علم ہر قیمتی حالت کا نام ہے اور ہر بلند رتبے کی انتہا ہے۔ (محجۃ البیضاء، جلد ۱، ص ۶۸)

۱۷۔ قیادت کی اولین شرط معرفت ہے

جب جناب یوسف علیہ السلام کو حکومت مصر کے اعلیٰ عہدے کی پیش کش ہوتی تو انہوں نے بادشاہ سے فرمایا:

اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

مجھے اس سرزمین کے تمام خزینوں کا سرپرست بنا دیجئے کیونکہ میں ایک صاحبِ علم محافظ ہوں۔ (یوسف ۵۵)

نیز بنی اسرائیل کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب جالوت نامی ظالم بادشاہ نے انہیں در بدر کر دیا تھا تو انہوں نے اپنے زمانے کے نبی کی سرکردگی میں اس ظالم بادشاہ سے مقابلے کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کیا اور خدا کے نبی سے درخواست کی کہ وہ ان کی قیادت کریں اور کمان سنبھالیں تا کہ وہ ان کے تابع فرمان ہو کر ظالم جالوت سے جنگ کریں تو خدا کے نبی نے ان سے یوں کہا:

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

خداوندِ عالم نے طالوت کو تمہاری حکمرانی کے لیے بھیجا ہے تو انہوں نے کہا وہ ہم پر کیسے حکومت کر سکتے ہیں ہم ان سے زیادہ اہلیت رکھتے ہیں اور ان کے پاس فروان دولت اور ثروت بھی نہیں ہے؟ پیغمبر نے کہا! خدا نے انہیں تمہارے لیے منتخب کر لیا ہے اوان کے علم اور جسمانی طاقت کو وسعت بخشی ہے اور خدا جسے چاہے (اور لائق سمجھے) اسے اپنا ملک عطا کرتا ہے خدا کے احسانات وسیع ہے (اور افراد کی لیاقت کو) اچھی طرح جانتا ہے۔ (سورہ بقرہ ۲۴۷)

قابلِ توجہ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ خدا نے جس طالوت کو ایک مقتدر اور جابر و ظالم بادشاہ سے لڑائی کے لیے منتخب کیا وہ ایک دیہاتی انسان تھا جو ایک دریا کے ساحل گاؤں میں پیدا ہوا اور گمنام زندگی بسر کرتا تھا اور اپنے والد کے چوپائے چرایا کرتا تھا کھیتی باڑی اس کا پیشہ تھا۔

لیکن اس کے سینے میں معرفت بھرا روشن دل تھا اور جسمانی لحاظ سے تنومند اور طاقتور انسان تھا عمیق اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مہارت رکھتا تھا معرفت اور شناخت اس کے دل میں جاگزین تھی اسی لیے جب اشموئیل نبی کی نگاہ اس پر پڑی تو بنی اسرائیل کی فرمانروائی کے لیے اسے منتخب کر لیا بنی اسرائیل کے سردار جو جو انتخاب اور انتصاب کا معیار فزونی مال و دولت اور ماں باپ یا قوم قبیلے کی شہرت جیسے موہوم امور سمجھتے تھے انہوں نے اللہ کے نبی اشموئیل پر اعتراضات شروع کر دیئے کہ بنی اسرائیل میں ہمارے جیسے ثروتمند اور مشہور معروف افراد کے

ہوتے ہوئے طالوت اس منصب کی اہلیت نہیں رکھتے لیکن خدا کے نبی نے ان کی ایک نہ سنی اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ ایک خدائی انتخاب ہے تمہیں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

یہ دونوں آیات اس امر کی بخوبی رضاحت کر رہی ہیں کہ علم ودانش اور معرفت وشناخت قیادت رہبری زمامداری اور سربراہی کے اہم ترین اور بنیادی عناصر ہیں اور معرفت کے بارے میں اب تک جو کچھ ہم بتا چکے ہیں اس کی تاکید ہیں۔[1]

۱۸۔ علم ہی سے ایمان کے سوتے پھوٹتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۶

جو لوگ علم رکھتے ہیں جو کچھ تمہارے پروردگار سے تم پر نازل ہوا ہے اسے وہ حق اور خداوندِ عزیز وحمید کی راہ کا ہادی سمجھتے ہیں۔ (سورہ سبا ۶)

اور فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝۱۰۷ۙ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝۱۰۸

جن لوگوں کو اس سے پہلے علم ودانش عطا ہوئی جب بھی ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ سجدے کے بل گر جاتے ہیں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب جو جس کے وعدے یقینا انجام پاتے ہیں۔ (سورہ بنی اسرائیل ۱۰۷ تا ۱۰۸)

نیز فرماتا ہے:

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝۷۰

(جب جادوگروں نے موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا اور جادو کی وجہ سے انہیں علم تھا انہوں نے سمجھ لیا کہ موسیٰؑ جادوگر نہیں ہیں) لہٰذا وہ سجدے میں گر گئے اور کہا ہم موسیٰؑ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے۔ (طہ ۷۰)

---

[1] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "الملوك حكام على الناس و العماء حكام على الملك" بادشاہ لوگوں پر حاکم ہوتے ہیں اور علماء بادشاہوں پر حکمران ہوتے ہیں۔ (بحار الانوار جلد ۱ ص ۱۸۳)

اورفرمایاہے:

لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ

تا کہ وہ لوگ اچھی طرح جان لیں جنہیں علم دیا گیا ہے کہ یہ قران تمہارے خدا کی طرف سے حق ہے اور اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے لیے جھک جائیں۔(سورہ حج ۵۴)

فرماتا ہے:

وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝

راسخون فی العلم کہتے ہیں ہم خدا کی تمام آیات پر ایمان لے آئے ہیں سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور صرف صاحبانِ عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔(آل عمران ۷)

یہ آیت علم وایمان کا باہمی رابطہ اور ان کا اٹوٹ رشتہ واضح کررہی ہے اور بتارہی ہے کہ جن کا علم جتنا زیادہ ہوتا ہے ان کا ایمان اور خضوع وخشوع بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔[1]

ان تمام آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ معرفت وآگاہی ایمان کے اہم سرچشموں سے ہیں اور ان] تجس کے ایمان کی بنیاد رکھی جائے گی وہ نہایت ہی عمیق اور مستحکم ہوگا جیسا کہ عصرِ فرعون کے جادوگروں کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب فرعون نے دیکھ لیا کہ جادوگروں نے اپنے فنِ جادوگری کی وجہ سے یہ بات بخوبی سمجھ لی کہ موسیٰؑ نے جو کام کیا ہے وہ جادو نہیں معجزہ ہے اور وہ ان پر ایمان لے آئے ہیں تو اس نے ان جادوگروں کر زبردست دھمکی دی اور کہا میری اجازت سے پہلے تم اس پر ایمان کیوں لائے ہو؟ (گویا طاغوت یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کا قلبی ایمان جو چ فکر اور فہم بھی سوچ ان ہی کی اجازت کے بغیر نہیں ہونے چاہئیں) لہٰذا اس نے کہا اب جب تم نے ایسا کرلیا ہے تو میں تمہارے ہاتھوں اور پاؤں کو الٹے سیدھے طریقے سے کاٹتا ہوں اور تمہیں کھجور کی شاخوں پر سولی لٹکاتا ہوں مگر وہ اس حد تک ثابت قدم رہے کہ اسے دوٹوک جواب دے دیا تم جو چاہو کرو اس خدا کی قسم جس نے ہمیں پیدا کیا ہے ہم ان روشن دلائل پر تمہیں کبھی مقدم نہیں کریں گے جو ہم دیکھ چکے ہیں۔(طہ ۷۲)

---

[1] جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے خواہ "والراسخون فی العلم" کا معطون لفظ "اللہ" کو جانیں، خواہ بعد کے جملہ کی مبتداء سمجھیں، کیونکہ "یقولون" میں موجود ضمیر "والراسخون فی العلم" کی طرف لوٹ رہی ہے اور علم اور عمل کے باہمی رابطے کو بیان کررہی ہے۔

آخر کار فرعون نے اپنی دھمکی کو سچ کر دکھایا اور انہیں ساحلِ شہادت سے ہمکنار کر دیا اور وہ بھی اس عاشقانہ راہ پر ثابت قدم رہے اور کشادہ قلبی کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا چنانچہ عظیم مفسر طبرسیؒ ان کے بارے میں کہتے ہیں:

"کانوا اول النھار کفارا سحرۃ واخر النھار شھدأ بررۃ"

وہ (جادوگر) دن کے اول حصہ میں کافر تھے اور آخری حصے میں نیک شہداء۔

تو اس طرح سے علم نہ صرف ایمان آفرین ہے بلکہ استقامت اور استقلال و جوانمردی بھی کسی کا ثمرہ ہے۔[1] و[2]

۱۹۔ علم سے تقوٰی اور خوفِ خدا کے سوتے پھوٹتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ

خدا کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ (فاطر ۲۸)

راغب کے بقول خشیت ایسا خوف اور ڈر ہوتا ہے جس میں تعظیم پائی جاتی ہے اور عام طور پر یہ علم ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

اور ارشاد ہوتا ہے:

وَ اتَّقُوۡنِ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ

اے صاحبانِ عقل وفکر پرہیزگاری اختیار کرو۔ (سورہ بقرہ ۱۹۷)

اگر علم اور تقوٰی کے رابطہ نہ ہوتا تو خداوند متعال اس حکم میں "اولوا الالباب" کو مخاطب نہ کرتا یہ خطاب ہی اس مبارک رابطہ کی بیّن دلیل ہے۔

اور فرماتا ہے:

---

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "علم" اور "ایمان" ایک چیز ہیں۔ یعنی اگر ہمارا یقین ہے کہ اس کائنات میں خدائے عالم وقادر موجود ہے تو ہمارا یہ علم اور یقین ہمارا ایمان ہوگا۔ لیکن محققین کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ممکن ہے کہ ایمان علم کا ثمرہ ہو (البتہ ہمیشہ کے لیے نہیں اور نہ ہی ہر جگہ) لیکن بہر حال عین علم نہیں ہوتا اور ایمان، دل سے قبول کرنے کا نام ہے، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کو جانتا تو ہے لیکن اسے دل سے قبول نہیں کرتا، جیسا کہ قرآن مجید کچھ لوگوں کے بارے میں کہتا ہے "وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم ظلما وعلوا" یعنی ان لوگوں (فرعونیوں) نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر انکار کر دیا حالانکہ دل سے انہیں یقین تھا۔ (سورہ نمل ۱۴)

[2] پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں "العلم حیاۃ الاسلام و عماد الایمان" علم اسلام کی حیات اور ایمان کا ستون ہے۔ (ملاحظہ ہو کنز العمال، جلد ۱۰، ص ۱۸۱)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اے صاحبانِ عقل پرہیزگاری اختیار کروتا کہ کامیاب ہوجاؤ۔(سورہ مائدہ ۱۰۰)

اورارشادفرماتاہے:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

خداوندِ عالم اپنی اس قسم کی آیات کولوگوں کے لیے بیان کرتاہے تاکہ وہ پرہیزگاربن جائیں۔(سورہ بقرہ ۱۸۷)

اس سے یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ آیات کا بیان کرنا مقدمہ ہوتاہے علم کااورعلم مقدمہ ہوتاہے تقویٰ کا۔

یقیناً جہاں پرعلم ہوتاہے ضروری نہیں کہ وہاں پرتقویٰ بھی ہو کیونکہ عالم بےعمل بھی مل جاتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ علم تقویٰ کا مقدمہ اورپیش خیمہ ضرور ہوتاہے اوراس کا اصل سرچشمہ شمارکیا جاتاہے علم عام طور پرتقویٰ کواپنے ہمراہ لاتاہے جوعلم ایمان کا سرچشمہ ہوتاہے وہ تقویٰ کا بھی سرچشمہ ہوتاہے جبکہ اس کے برعکس جہالت عام طور پر بےتقوائی کا عامل ہوتی ہے۔[1]

۲۰۔علم زہدکامنبع ہوتاہے

ارشادہوتاہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

جن لوگوں کوعلم عطا کیا گیا تھاانہوں نے کہاتم پرافسوس ہےخداوندعالم کا ثواب ان لوگوں کے لیے جوایمان لے آئےاورنیک اعمال انجام دیئے بہترہےلیکن صابرلوگوں کےعلاوہ کسی اورکونہیں ملے گا۔(سورہ قصص ۸۰)

یہ آیت سورہ قصص کے آخراورقارون کی داستان کے سلسلے میں آئی ہے جوعلمائے بنی اسرائیل کی لوگوں کونصیحت کےطور پر ہے ان لوگوں نے جب متکبرقارون کی دولت اورثروت کی نمائش کودیکھاتوآرزوکرنے لگےاے کاش کہ وہ قارون کی جگہ ہوتے!

جب بنی اسرائیل کےسلجھے ہوئے علماء نے لوگوں کی یہ صورت حال دیکھی کہ یہ لوگ تو دنیا پرستی کےسخت دلدادہ ہیں توعلماء نے انہیں سمجھنے کی کوشش کی اور باآواز بلند کہاافسوس ہےتم پراے دنیاپرستو!تم قارون کےزرق وبرق سے دھوکہ کھارہے ہو؟اگرتمہارے پاس ایمان اور عملِ صالح ہوتوخداوندعالم کی جزادونوں جہانوں میں ان سب چیزوں سے بہتراور برترہےلیکن اس جزاتک پہنچنے کے لیےصبروشکیبائی اورزور

---

[1] امیرالمومنین علیؑ فرماتے ہیں:"اعظم الناس علما اشدهم خوفا من الله" جن لوگوں کاعلم زیادہ ہوتاہےان کا خداسےخوف بھی سب سےزیادہ ہوتاہے۔(غررالحکم،حکمت ۳۲۶)

وزر کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرنا ضروری ہے!

"اوتوا العلم" کا جملہ اس بات کی بخوبی وضاحت کر رہا ہے کہ زہد اور علم کے درمیان ایک مضبوط رابطہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو لوگ دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کے ثبات اور خدا کی جزاء کی عظمت کے مقابلے میں مادی سرمائے کی حقارت سے آگاہ ہوتے ہیں اس مادی دنیا کے زرق و برق کے فریب میں نہیں آتے اور کبھی قارون کی دولت کی آرزو نہیں کرتے۔ [1]

۲۱۔ علم مادی ترقی کا سرچشمہ ہوتا ہے

قران میں ہے:

اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ

(قارون) نے کہا یہ ثروت مجھے اس علم کی بدولت ملی ہے جو میرے پاس ہے۔ (قصص ۷۸)

بنی اسرائیل کے مغرور متکبر دولت مند قارون نے یہ بات اس وقت کہی جب موسیٰؑ کی قوم کے علما نے اُسے نصیحت کی اپنی اس دولت وثروت کو معاشرے کی فلاح و بہبود پر خرچ کرو اور دنیا میں اپنے حصے کو فراموش نہ کرو خدا نے جس طرح تم پر احسان کیا ہے تم بھی لوگوں کے ساتھ اسی طرح بھلائی کرو اور اس دولت کو زمین میں فساد کا ذریعہ نہ بناؤ۔ (قصص ۷۷)

اس نے جواب دیا: میں نے یہ دولت اپنی علمی طاقت کی بدولت جمع کی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن مجید نے اس کے دعوے کی نفی نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ:

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ

کیا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ خداوند عالم نے اس سے پہلے ایسے لوگوں کو ہلاک کر دیا جو طاقت میں بھی اس سے زیادہ تھے اور مال و دولت میں بھی۔ (قصص ۷۸)

یہ ضمنی تائید اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قارون نے اپنے علم اور اپنی دانش کی دولت اس قدر عظیم دولت وثروت کو اکٹھا کیا تھا (یہ علم خواہ کیمیا کا علم تھا جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے خواہ تجارتی اصولوں اور کسب و کار کے فنون کا علم تھا)۔

لیکن یہ بات یقینی ہے کہ قارون کا یہ دعویٰ اس بات سے مانع نہیں تھا کہ وہ اپنی دولت لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا کیونکہ کوئی

---

[1] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: خداوند عالم نے جناب موسیٰ علیہ السلام سے جو باتیں کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی: "ان عبادی الصالحین نهدوا فیها بقدر علمهم بی" میرے نیک بندے اس دنیا میں اسی حد تک زاہد ہوتے ہیں جتنا ان کو میرے بارے میں علم ہوتا ہے۔ (بحار الانوار جلد ۱۸ ص ۲۳۹)

شخص خواہ کتنا ہی عالم ہو یا استعداد ہو پھر بھی وہ اکیلے اس قدر عظیم دولت اکٹھی نہیں کرسکتا بلکہ اسے دوسرے لوگوں کی طاقت سے استفادہ کرنا پڑتا ہے اسی لیے وہ معاشرے اور عوام الناس کے تعاون کا مرہون منت ہوتا ہے۔

بہرصورت اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادی علم اور مادی ترقی کے درمیان رابطہ ضرور ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے دورِ حاضر میں بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ بہت سی قومیں علم وصنعت کی بدولت مادی تمدن میں دوسری اقوام سے آگے جا چکی ہیں۔[1]

۲۲۔علم، طاقت کا سرچشمہ ہوتا ہے

ارشادِ قدرت ہے:

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۖ

جس کے پاس کتاب کا جو کچھ علم تھا اس نے کہا میں اس (ملکہ سبا بلقیس) کا تخت آپ (سلیمان) کے پلک جھپکنے سے پہلے آپ کے پاس لے آؤں گا اور جب اس نے اسے اپنے پاس موجود پایا تو کہا یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے۔(سورہ نمل ۴۰)

یہ آیت حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی داستان سے متعلق ہے جب جنابِ سلیمانؑ نے چاہا کہ ملکہ سبا کا تخت اپنے پاس منگوائیں تو سب سے پہلے جنوں کے ایک طاقتور سردار نے پیش کش کی کہ آپ کے دربار کے برخاست ہونے سے پہلے اسے حاضر کردوں گا لیکن (جناب سلیمانؑ کے وزیر آصف بن برخیا) نے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اور اسی کے بل بوتے پر وہ خارق العادہ کام کیا کرتے تھے کہا: میں وہ تخت آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے آپ کے پاس حاضر کردوں گا اور اس نے ایسا کر بھی دکھایا اور حضرت سلیمانؑ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کے اس طرح کے یار و مددگار بھی ہیں۔ اگرچہ یہ آیت خاص موقع کے لیے ہے لیکن علم اور قدرت کے باہمی رابطے کو بخوبی واضح کر رہی ہے اور زیادہ سے زیاد حصولِ علم کی ترغیب اور تشویق دلا رہی ہے۔[2]

---

[1] امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "لاغنی اخصب من العقل ولافقر احط من الحمق" عقل سے بڑھ کر کوئی تونگری نہیں اور حماقت سے بڑھ کر کوئی ناداری نہیں۔(اصول کافی، جلد ا، ص ۲۹)

[2] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "العالم بزمانه لا تهجم علیه اللوابس" جو شخص اپنے زمانہ سے باخبر ہوتا ہے اس پر پیچیدہ امور حملہ آور نہیں ہوتے۔(کافی، جلد ا، ص ۲۷)

۲۳۔علم تزکیہ نفس کا سرچشمہ ہوتا ہے

ارشادِقدرت ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

پروردگارا! ان (میرے خاندان) میں ان ہی سے ایک رسول بھیج تا کہ وہ ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلم دے اور ان کا تزکیہ اور تربیت کرے کیونکہ تو طاقتور اور صاحب حکمت ہے۔(بقرہ ۱۲۹)

خانۂ کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا ہے جو علم وحکمت اور تزکیہ وتربیت کے رابطہ کو آشکار کررہی ہے یہاں پر تزکیہ کو علم پر مقدم کیا گیا ہے۔

لیکن قران مجید کی دو اور آیات میں تزکیہ کو علم پر مقدم بیان کیا گیا ہے اور وہ آیات حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروگراموں سے متعلق ہیں ایک تو سورہ آل عمران میں ہے اور دوسری سورہ جمعہ میں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

خداوند عالم نے مومنین پر احسان کیا ہے (اور انہیں عظیم نعمت عطا کی ہے) جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا تا کہ وہ ان پر اس کی آیات پڑھے اور ان کا تزکیہ اور تربیت کرے اور کتاب وحکمت کی تعلم دے ہر چند کہ وہ اس سے پہلے واضح گمراہی میں تھے۔(آل عمران ۱۶۴)

اسی سے ملتی جلتی ایک آیت سورہ جمعہ میں بھی ہے۔(سورہ جمعہ ۲)

تعبیر کا یہ فرق کہ کبھی تو تعلیم کو تربیت پر مقدم بیان کیا گیا ہے اور کبھی تربیت کو تعلیم پر بظاہر اس لیے ہے کہ ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور وہ ایک دوسرے کے مقابلے کا اثر رکھتے ہیں علم تربیت اور اخلاقی نشوونما کا سرچشمہ ہے اور رشد وتربیت بعض مراحل میں حصولِ علم کا سرچشمہ ثابت ہوسکتے ہیں۔

اسی لیے وہ ایک مرحلہ پر پہنچ کر ایک دوسرے کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں اور یہی معنی ہے ان کے باہمی مقابلے کے اثر کا انشاءاللہ

اس موضوع پر شناخت کی تفصیل کے موقع پر مفصل روشنی ڈالی جائے گی۔ [1]

۲۴۔علم صبر وشکیبائی کا سرچشمہ ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾

جس چیز کے متعلق تم جانتے نہیں ہو اس پر تم کیسے صبر کرسکو گے؟ (سورہ کہف ۶۸)

یہ الفاظ ایک مردِ خدا (خضر علیہ السلام) کے ہیں جو انہوں نے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام سے کہے تھے جبکہ وہ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس پہنچے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ انہیں اپنے علوم سے بھی سکھائیں تو جناب خضرؑ نے فرمایا تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کرسکو گے کیونکہ تم میرے کاموں کے اسرار ورموز سے واقف نہیں ہو اور تمہاری یہ بے علمی تمہاری بے صبری کا ذریعہ بنے گی۔

اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ علم صبر کا سرچشمہ اور لاعلمی بے صبری کا سبب بنتی ہے۔

البتہ صبر وشکیبائی بھی اپنی حد تک علم وآگاہی کا سرچشمہ بنتی ہیں جتنا صبر زیادہ ہوگا اتنا ہی علم زیادہ ہوگا اس طرح اس ان دونوں کا آپس میں گہرا رشتہ ہے اور ان میں مقابلے کی تاثیر ہوتی ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ

اس میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کے لیے آیات اور نشانیاں ہیں۔ (سورہ ابراہیم ۵، سورہ لقمان ۳۱، سورہ سبا ۱۹، سورہ شوری ۳۳)

واضح سی بات ہے کہ علم ومعرفت کے راستے نہایت ہی پیچیدہ اور نشیب وفراز پر مشتمل ہوتے ہیں اور صبر واستقامت پامردی اور حوصلہ کے بغیر کوئی شخص وہاں تک نہیں پہنچ سکتا عظیم دانشور مشہور موجد اور دریافت کرنے والے معروف افراد صبر وشکیبائی کے زیر سایہ ہی اپنی منزل مقصود تک پہنچے ہیں۔

۲۵۔علم ومعرفت خیرِ کثیر ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

---

[1] علم کے بارے میں حضرت امیرؑ فرماتے ہیں: "ومن ثمراته التقوى واجتناب الهوى ومجانبة الذنوب" تقویٰ خواہشات نفسانی سے دوری اور گناہوں سے اجتناب، علم کے ثمرات میں سے ہے۔ (بحارالانوار جلد ۷۸ ص ۶)

خداوندِ عالم جسے چاہے (اور لائق سمجھے) علم وحکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت عطا کر دی گئی اسے فراوانی کے ساتھ خیر عطا ہوئی۔ (بقرہ ۲۶۹)

حکمت حکم (بروزن خشم) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں اصلاح کی غرض سے کسی کو روکنا اسی لیے اونٹ کی مہار کو..... حکمہ (بروزن شجرہ) کہتے ہیں اور چونکہ علم انسان کو غلط کاموں سے روکتا ہے لہٰذا اسے حکمت کہتے ہیں جیسا کہ عقل اصل میں رُکنے اور روکنے کو کہتے ہیں اسی لیے جو رسی اونٹ کے پاؤں میں باندھی جاتی ہے تا کہ وہ اسے چلنے سے روکے رکھے عقال کہلاتی ہے اور خرد کو اسی لیے عقل کہتے ہیں کہ وہ انسان کو غلط کاموں سے روکتی ہے۔

قرآنِ مجید نے علم وحکمت کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے زیادہ اور کئی تعبیر مناسب نہیں ہوسکتی کیونکہ خدا نے اسے خیرِ کثیر کہا ہے یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو خدا کی تمام نعمتوں کو شامل ہے خواہ وہ نعمتیں مادی ہوں یا معنوی۔

پچیس عنوانات کے تحت اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید مختلف عبارتوں اور لطیف بیانات کے ذریعہ انسان کو علم ومعرفت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے حصول کی تشویق وترغیب دلاتا ہے اور علم وآگاہی کو خداوندِ متعال کا بہت بڑا عطیہ بہت عظیم اعزاز اور اہم ترین نعمت شمار کرتا ہے۔ دلالت التزامی کی رو سے یہ تصریحات اور کنائے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ شناخت اور معرفت کی راہیں سب کے لیے کھلی ہوئی ہیں اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز مفید بھی نہیں ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔ [1]

اب ہم چند اور عنوانات کے بارے میں گفتگو کریں گے جن کا محور جہالت ہے تا کہ جہالت کے منفی اور مہلک آثار کو پیش نظر رکھ کر ہم اپنے لیے علم ومعرفت کے مثبت اور زندگی بخش آثار کی راہیں کھول سکیں۔

۲۶۔ جہنمی لوگ جاہل ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

ہم نے بہت سے جن وانس کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے ان کے دل (عقل) ہیں جن سے سوچتے نہیں سمجھتے نہیں آنکھیں ہیں دیکھتے نہیں اور کان ہیں سنتے نہیں وہ چوپایوں کی مانند بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں یہ وہی غافل

---

[1] حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "لا کنز نفع من العلم" علم سے بڑھ کر کوئی خزانہ سودمند نہیں۔ (بحارالانوار، جلد ۱، ص ۱۸۳)

لوگ ہی تو ہیں۔(سورہ اعراف ۱۷۹)

"ذرأ" "ذرأ" (برزن زرع) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے تخلیق ایجاد اور آفرینش لیکن جیسا کہ کتاب مقابیس اللغۃ سے ظاہر ہوتا ہے اس کا اصلی معنی بیج ڈالنا ہے شاید راغب نے مفردات میں اسی بنا پر اس کا معنی اظہار اور آشکار کرنا بتایا ہے اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم جیسی کتابوں میں اس کا معنی پھیلانا بتایا گیا ہے۔

زیر بحث آیت میں اگر تخلیق و آفرینش مراد ہے تو اس کے معنی یوں ہونگے کہ اس قسم کے لوگ جو دل آنکھ اور کان جیسے معرفت وشناخت کے خداداد اسباب ووسائل سے کام نہیں لیتے ان کا انجام سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں گویا وہ اسی کے لیے خلق کیے گئے ہیں اگر پھیلنے کے معنی ہے تو بھی یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کے لوگ وسیع صورت میں جہنم میں پھیل جائیں گے۔

معنی خواہ کچھ بھی ہوں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہالت کا انجام اور شناخت کے ذرائع ووسائل سے کام نہ لینے کا نتیجہ آتشِ جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۰﴾ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۱﴾

وہ کہیں گے کہ اگر ہمارے پاس سننے والے کان ہوتے یا ہم عقل سے کام لیتے تو جہنمیوں میں سے میں نہ ہوتے وہ اب اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے ہیں پس رحمتِ خدا سے دوری ہے جہنمیوں کے لیے۔(سورہ ملک ۱۰،۱۱)

جی ہاں! ان کا بہت بڑا گناہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنی عقل سے کام نہیں لیا اور حق بات پر کان نہیں دھرا اپنے اوپر علم ودانش کے دروازے بند کر دیئے اور جہنم کے دروازے کھول دیئے۔

اس دوسری آیت کا انداز اس بات کی دلیل ہے کہ جہنمیوں نے یہ راستہ اپنی مرضی اور اختیار سے اپنایا ہے کیونکہ آیت میں گناہوں کی نسبت جہنمیوں کی طرف دی گئی ہے اور وہ اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنی عقلوں سے کام لیا ہوتا تو ان کا ٹھکانہ جہنم نہ ہوتا۔ ان کا یہ اعتراف ندامت اور پشیمانی کی حکایت کر رہا ہے اور یہی چیز ان کے اختیار کی دلیل ہے لہٰذا اگر فخر الدین رازی جیسے بعض لوگوں نے پہلی آیت کو جبر کی دلیل سمجھا ہے تو یہ دوسری آیت اس کی تفسیر واقع ہو سکتی ہے کیونکہ "القرآن یفسر بعضه بعضا۔"

بہر حال قرآنی نقطہ نظر سے دوزخ اور جہالت کے درمیان رابطہ ایک مسلم چیز ہے اور آئندہ کی مباحث میں اس کو مزید واضح

کریں گے۔ [1]

۲۷۔ جہالت انسان کی پستی کا سبب ہے

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الۡبُکۡمُ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ﴿۲۲﴾

تمام چلنے والوں میں سے اللہ کے نزدیک بدترین وہ بہرے اور گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

(سورہ انفال ۲۲)

یہ آیت توصریحی طور پر اور اس سے پہلی آیت اشاروں کنایوں میں اس بات کو بیان کر رہی ہے کہ جب کوئی شخص قدرت کے عطا کردہ شناخت ومعرفت کے ذرائع اور اسباب سے استفادہ نہیں کرتا وہ پستی کی ایسی گھاٹی میں جا گرتا ہے کہ روئے زمین پر چلنے والے ہر ذی روح سے بھی بدتر ہو جاتا ہے آخر کیوں نہ ہو؟ جبکہ وہ اعزاز وافتخار کی بلند وبالا چوٹی اعلیٰ علیین اور قربِ حق کے پڑوس تک پرواز کر کے ایسے مقام تک پہنچ سکتا تھا جہاں خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ ان سب امکانات کو ٹھوکر مار کر ایسی جگہ جا گرتا ہے جسے اسفل السافلین کہا جاتا ہے اور جہاں سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔

اور پھر یہ بھی ہے کہ جب انسان خیر وہدایت کی راہوں پر چلنا چھوڑ دے تو خدا کی عظیم نعمتوں اور اس کی خداداد صلاحیتوں کو شر (اور برائی) کے راستوں میں استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے ہولناک جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے وحشت ناک اوزار واسباب ایجاد کرتا ہے کہ کوئی خطرناک درندہ بھی اس کی گرد پا کو نہیں پہنچ سکتا جیسا کہ دورِ حاضر میں ہم اس قسم کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ خدا اور خلقِ خدا سے بے خبر لوگ کیا کیا گُل کھلا رہے ہیں؟ [2]

۲۸۔ جہالت نابینائی ہے

---

[1] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ خداوند عالم نے میری طرف یوں وحی فرمائی ہے "انه من مسلك مسلكا يطلب فيه العلم سهلت له طريقا الى الجنة" جو شخص علم و دانش کے حصول کے لئے راستے پر قدم رکھے تو میں اس کے لیے بہشت کی راہیں آسان کر دیتا ہوں۔

(بحار الانوار جلد ۱ ص ۱۷۳)

[2] حضرت امیرؑ فرماتے ہیں: "الجهل مطية شموس من ركبها زل و من صحبها ضل" جہالت ایک ایسی سرکش سواری ہے کہ جو اس پر سوار ہوتا ہے وہ زمین پر آ گرتا ہے اور جو اس کے ساتھ چلتا ہے گمراہ ہو جاتا ہے۔ (غرر الحکم، جلد ۱، ص ۸۵)

ارشاد ہوتا ہے:

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ﴿۱۹﴾

آیا وہ شخص جو یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپؐ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے اس شخص کی مانند ہے جو نابینا ہے؟ یہ تو صرف صاحبانِ عقل ہی سمجھتے ہیں۔ (سورہ رعد ۱۹)

یہاں پر ایک طرف تو صاحبانِ علم وآگاہی کا ذکر ہے اور دوسری طرف اندھے اور نابیناؤں کا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہالت اور نابینائی میں کوئی فرق نہیں اور یہی چیز قرآنِ مجید کے ایک اور مقام پر دوسرے لفظوں میں ذکر ہوئی ہے:

وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ﴿۱۹﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۙ﴿۲۰﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ۚ﴿۲۱﴾ وَمَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ؕ

اندھا اور آنکھوں والا ہرگز برابر نہیں ہیں اور نہ تاریکی اور روشنی اور نہ ہی سکون عطا کرنے والا سایہ جھلسا دینے والی گرم ہوا کے برابر ہوتے ہیں اور (جیسا کہ) مُردے اور زندے برابر نہیں ہو سکتے۔ (سورہ فاطر ۱۹ تا ۲۲)[1]

۲۹۔ جہالت کی زندگی ارذل العمر ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ

اور بعض لوگ اس قدر زندہ رہتے ہیں کہ زندگی کے بدترین مرحلے اور بڑھاپے تک جا پہنچتے ہیں یہاں تک کہ انہیں اپنے علم سے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ (سورہ حج ۵)

یہی چیز تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ نحل کی آیت ۷۰ میں بھی مذکور ہے۔

"ارذل"، "رذل" کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ مقابیس اللغۃ صحاح اللغۃ اور مفردات وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے اس کے معنی پست چیز ہیں یا بالفاظِ دیگر ایسی چیز جو قابل اعتنا نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی کوئی قدر و قیمت ہوئی ہے۔ اور "ازلالعمر" سے مراد انسانی زندگی کے نہایت ہی بے قدر و قیمت ایام ہیں قرانِ مجید نے انتہائی بڑھاپے کے ایام کو ارذل العمر" میں شمار کیا ہے جن میں عام طور پر انسان فراموشی اور نسیان کا

---

[1] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "من لم یصبر علی ذل التعلم ساعة بقی فی ذل الجهل ابدا" جو شخص تحصیل علم کے لیے ایک گھنٹہ ذلت کو برداشت نہیں کر سکتا وہ جہالت کی ذلت میں ہمیشہ کے لیے باقی رہتا ہے۔ (بحارالانوار، جلد ۱، ص ۱۷۷)

مریض بن جاتا ہے اور اپنے سابقہ علوم کو فراموش کر دیتا ہے اس لحاظ سے انسانی زندگی کے بہترین ایام اور بہترین گھڑیاں اس کے علم و آگاہی اور شناخت و معرفت کے ایام اور گھڑیاں ہوتی ہیں۔[1]

۳۰۔ جہالت کفر کا سرچشمہ ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ہم نے بنی اسرائیل کو (صحیح سالم) دریا سے پار کر دیا اور وہ اپنے راستے میں ایسی قوم کے پاس پہنچے جو اپنے بتوں کے گرد اکٹھا ہو کر ان کی خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت کر رہی تھی ان (بنی اسرائیل) لوگوں نے موسیٰؑ سے کہا تو بھی ہمارے لیے ایسا معبود بنا جیسے ان کے معبود ہیں (موسیٰؑ نے) کہا تم جاہل لوگ ہو۔ (سورہ اعراف ۱۳۸)

تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ جو لوگ فرعونیوں کی غرقابی اور نیل کی موجوں سے اپنی نجات کے معجزات کو اپنی آنکھوں سے تازہ دیکھ چکے تھے اور عظمتِ الٰہی کو بچشم خود ملاحظہ کر چکے تھے وہی موسیٰؑ کو بُت سازی اور بُت پرستی کی پیش کش کر رہے ہیں۔

لیکن موسیٰؑ نے انہیں جواب دیا کہ یہ تمہاری جہالت اور نادانی ہی ہے جو تمہیں بت پرستی کی دعوت دے رہی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمیشہ اور ہر دور میں جہالت ہی بت پرستی کا منبع رہی ہے وگرنہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ہی مصنوعات کی پرستش کرے اور لکڑی یا دھات کے بے جان ٹکڑے جیسی چیزوں سے اپنی عظیم مشکلات حل کرنے کی درخواست کرے؟ بت پرستی کی تاریخ بھی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ برائی خرافات اور موہومات کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے اور جوں جوں اقوام و ملل کے علم و دانش نے ترقی کی ہے بت پرستی اور شرک نے اسی قدر عقب نشینی کی ہے اور انوارِ توحید کو وسعت ملتی رہی ہے۔

جب قوم عاد نے اللہ کے عظیم پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام سے بت پرستی کے اصرار پر مبنی عذابِ الٰہی کا تقاضا کیا تو انہوں نے بھی ان لوگوں سے یہی بات کہی:

اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ ۫ وَاُبَلِّغُکُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِہٖ وَلٰکِنِّیْٓ اَرٰىکُمْ قَوْمًا تَجْھَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

---

[1] حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "الجهل فی الانسان اضر من الاکة فی الابدان" کوڑھ انسان کے بدن کے لیے اتنا مضر ہے جتنی جہالت اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ (غرر الحکم)

علم تو بس خدا ہی کو ہے (وہی جانتا ہے کہ کب اور کن حالات میں مشرکوں اور گناہ گاروں کو عذاب کرتا ہے) میرا فریضہ تو یہی ہے کہ میں جس چیز کے ساتھ معبوث کیا گیا ہوں وہی تم تک پہنچاؤں لیکن میں تمہیں ایسے لوگ سمجھتا ہوں جو ہمیشہ جہالت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ (سورہ احقاف ۲۳)

"تجھلون" کا جملہ جو کہ فعل مضارع کی صورت میں ہے اور فعل مضارع عام طور پر استمرار پر دلالت کرتا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ مسلسل جہالت ہی شرک اور بت پرستی کا سرچشمہ چلی آرہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تین طرح کے جہالتیں مل کر ہی ان کو معرضِ وجود میں لاتی ہے۔ ۱۔ خدا کی ذات سے جہالت اور اس بات سے جہالت کہ اس کا کوئی شریک او مانند ہمتا نہیں ہوسکتا۔ ۲۔ انسان کی اپنی ذات اور مقام ومرتبہ سے جہالت وہ انسان جو اشرف المخلوقات اور گلستانِ تخلیق کا گل سرسبد ہے۔ ۳۔ عالمِ طبیعت کے بارے میں جہالت اور انسان جیسی مخلوق کے مقابلے میں جمادات کے بے قدر و قیمت ہونے سے لاعلمی۔ سچ مچ یہ بات کیونکر قرین عقل ہوسکتی ہے کہ انسان پہاڑ سے پتھر کا ایک ٹکڑا جدا کر کے اس کے ایک حصے تو گھر کی سیڑھیاں بنائے اور اسے ہمیشہ روندتا رہے اور دوسرے حصے کو تراش کر اس سے بُت تیار کرے پھر اس کے سامنے سجدہ ریزی کرے اور اپنی عظیم مشکلات کو اس سے حل کرنے کی درخواست کرے یہ جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ [1]

۳۱۔ جہالت ہی شکست کا اصل سبب بنتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

اے پیغمبر! مومنین کو کفار کے ساتھ جنگ کے لے آمادہ کریں اگر تم میں سے بیس با استقامت افراد ہوں تو وہ دوسو پر غالب آجائیں اور سو افراد ہوں تو ہزار ایسے لوگوں پر غالب آجائیں جو کافر ہو چکے ہیں کیونکہ وہ تو جاہل اور بے سمجھ لوگ ہیں۔ (انفال ۶۵)

یہ آیت جو بظاہر جنگ بدر کے موقع پر نازل ہوئی اور مشرکین مکہ کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد کے برابر نہ ہونے کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور اسلامی دستور کے مطابق حکم دے رہی ہے اگر دشمن کی تعداد کے مقابلے میں سپاہ اسلام کی تعداد دسواں حصہ بھی ہو تو وہ میدانِ

---

[1] حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: "الجاهل لا یرتدع و بالمواعظ لا ینتفع" جاہل جس راستے پر چلتا ہے اس سے وہ واپس نہیں پلٹ سکتا اور وعظ ونصیحت سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ (غرر الحکم جلد ا ص ۶۸) امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں "لیس بین الایمان و الکفر الا قلة العقل" ایمان اور کفر کے درمیان صرف جہالت اور کم عقلی کا فاصلہ ہوتا ہے۔ (اصول کافی جلد ا ص ۲۸)

جنگ کی میں پیچھے نہ ہٹےلیکن جو چیز اس ظاہری نابرابری کی تلافی کرتی ہے وہ.....اس آیت کی صراحت کے مطابق.....دو چیزیں ہیں: ایک تو خود مومنین کے اندر صبر واستقامت اور پامردی ہے اور دوسری دشمن میں جہالت، نادانی اور بے خبری کا وجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبر واستقامت کامیابی اور فتح کا سبب اور جہالت اور نادانی شکست کا موجب ہوتی ہے۔

اپنے وجود میں خداداد صلاحتیوں اور توانائیوں سے جہالت۔

پروردگار عالم کی قدرت وطاقت سے جہالت۔

جنگی اصول وفنون سے جہالت.....اور اس قسم کی کئی دوسری جہالتیں۔[1]

۳۲۔ جہالت کی بدولت اخلاقی برائیاں پھیلتی ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ۝۵۵

آیا تم شہوت کے لحاظ سے عورتوں کی بجائے مردوں کے پاس جاتے ہو؟ بلکہ تم تو ایسے لوگ ہو جو ہمیشہ جہالت کا اظہار کرتے رہتے ہو۔ (سورہ نمل ۵۵)

خداوند عالم مقصد تخلیق اور اس کے قوانین خلقت سے جہالت اس شرمناک گناہ ہم (جنس بازی) کے برے اثرات سے جہالت۔ یہ الفاظ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت لوطؑ کے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس منحرف اور گمراہ قوم کا ہم جنس بازی جیسے شرمناک فعل کی طرف رجحان ان کی جہالت اور بے خبری کی بدولت تھا۔

خدا کے ایک اور عظیم پیغمبر یعنی حضرت یوسف علیہ السلام بھی اسی چیز کو دوسرے لفظوں میں بیان فرماتے ہیں:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ۝۳۳

یوسف نے کہا: پروردگارا! میرے نزدیک قید خانہ اس سے کہیں زیادہ عزیز ہے جس کی طرف مجھے یہ عورتیں بلاتی ہیں اگر تو نے مجھ سے ان کے مکر وفریب کو نہ پلٹایا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا او جاہلوں میں میرا شمار

---

[1] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "من عمل علی غیر علم کان ما یفسد اکثر مما یصلح" جو شخص بغیر علم کے کوئی عمل کرے گا وہ بنانے سے زیادہ بگاڑ دے گا۔ (مشکوۃ الانوار، ص ۱۳۵)

ہوگا۔(سورہ یوسف ۳۳)

اس آیت میں جو تعبیر بیان ہوئی ہے یعنی عورتوں کو جمع کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صرف عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) ہی یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت نہیں دے رہی تھی بلکہ مصر کی عورتیں بھی انہیں عفت و پاکدامنی کے راستے سے ہٹانے کیکوشش کر رہی تھیں لیکن یوسف علیہ السلام نے کھلے دل سے قید خانے کو تو قبول کر لیا لیکن اپنی روح اور جان کو زنانِ مصر کی ہوس کے قید خانہ یں مقید کرنا گوارا نہ کیا۔

مندرجہ بالا آیت کا آخری جملہ بتا رہا ہے کہ گناہ آلود عشق اور جنسی گمراہی (کم از کم بہت سے مقامات پر) جہالت اور لاعلمی اور نادانی کی بدولت معرض وجد میں آتی ہے انسان کے وجودی اقدر سے جہالت عفت و پاکدامنی کے انمول آثار سے جہالت گناہوں کے انجام سے جہالت اور خدا کے اوامر اور نواہی سے جہالت۔

اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی اسی داستان میں ہم واضح طور پر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یوسفؑ کے بھائیوں کے جرائم کا اصل سبب یہی جہالت اور نادانی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ۝۸۹

(جب حضرت یوسفؑ کے بادشاہ بن کر سریر حکومت پر جلوہ افروز ہو چکے اور ان کے بھائی گندم خریدنے کے لیے کنعان سے مصر آئے تو یوسفؑ نے ان جان بن کر اپنے بھائیوں سے) کہا: آیا جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی (بن یامین) کے ساتھ کیا سلوک کیا جبکہ تم جاہل تھے؟ (سورہ یوسف ۸۹)

جی ہاں! تم ہی تھے جنہوں نے جہالت کی بنا پر پہلے اپنے بھائی پر تشدد کیا پھر اسے کنویں میں پھینک دیا! تم ہی تھے جنہوں نے اپنے بوڑھے باپ سے جھوٹ بولا۔ اس کے دل کو اپنے فرزند ارجمند کے فراق سے داغدار کیا اور انجام کار اپنے بھائی کو چند کھوٹے سکّوں کے بدلے بیچ ڈالا۔

اپنے دوسرے بھائی (بنیامین) کے ساتھ بھی تم نے بے وفائی کی، اسے چوری کے الزام سے متہم کیا، اسے اکیلا چھوڑ دیا اور اس کی حفاظت و نگہبانی کے سلسلے میں اپنے والد سے جو عہد و پیمان کیے تھے سب فراموش کر دیئے۔ تمہاری ان سب کارستانیوں کا سرچشمہ تمہاری جہالت اور نادانی تھا۔[1]

---

[1] پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں "فقیہ واحد اشد علی ابلیس من الف عابد" شیطان کے لیے ایک فقیہہ، ہزار عابد سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ (بحار الانوار جلد ا ص ۱۷۷)

۳۳۔ جہالت تعصب اور ہٹ دھرمی کا موجب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

اس وقت کو یاد کرو جب کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلیت کے تعصب اور غصے کو پرورش دی تو اس وقت خداوند عالم نے اپنی طرف سے پیغمبر اور مومنین پر آرام وسکون نازل فرمایا (تاکہ وہ ان کے مقابلے میں اپنے سکون ووقار کا مظاہرہ کریں)۔ (سورہ فتح ۲۶)

"حمیة" "حمی" (بروزن حمد) کے مادہ سے ہے جیسا کہ راغب مفردات میں لکھتے ہیں دراصل اس کا معنی وہ حرارت ہے جو آگ سورج اور جسم کی اندرونی توانائیوں جیسی چیزوں سے معرض وجود میں آتی ہے (اشیاء کے اندرون کی ذاتی حرارت) اسی لیے تو بخار کو حُمّٰی (بروزن کُبریٰ) کہتے ہیں اور چونکہ تعصب اور غصہ انسان کے اندر جلا دینے والی حرارت پیدا کر دیتے ہیں اسی لیے انہیں حمیّت کہتے ہیں۔

کتاب التحقیق فی کلمات القرآن الکیم میں بھی آیات ہے کہ حمیّت کا معنی حرارت کی شدت اپنے آپ سے دفاع کے لیے تعصب اور اپنی ذات تعلق اور کبر وغرور ہے (هی شدة الحرارة والعلاقة والتعصب فی الدفاع عن نفسه والتعنف والترفع "مادہ حمی)

یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہجرت کے چھٹے سال جب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کی غرض سے عازم بت اللہ ہوئے تو مشرکین مکہ کہ آنحضرتؐ اور دوسرے مسلمانوں کے مانع ہوئے تعصب اور جاہلیت نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ ان مسلم قوانین کا احترام کرتے جو سب لوگوں کے لیے خانہِ خدا کی آزادانہ زیارت کے بارے میں تھے۔ اس طرح کا اقدام کر کے انہوں نے خانہ خدا اور حرم امن کے احترام کو پس پشت ڈال دیا اور اپنے اصول وقوانین کو پامال کر کے اپنے اور حقائق کے درمیان ایک ضخیم پردہ حائل کر دیا۔

حمیت کی جاہلیت کی طرف اضافت سبب کی مسبب کی طرف اضافت ہے کیونکہ ہمیشہ تعصّبات ہٹ دھرمیاں اور آتشیں غضب جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے کہ جہالت انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کام کے انجام پر نظر کرے اور نہ ہی اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اس بات کو قبول کرے کہ شاید اس نے اپنی تشخیص میں غلطی کی ہو اور کوئی اور علم بھی اس کے علم سے بالاتر ہو اسی لیے ہمیشہ تعصب اور ہٹ دھرمی کی شدت جاہل اور بے علم اقوام میں دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب پیغمبرانِ خدا آسمانی کتابیں اور مشعلِ انوارِ ہدایت لے کر ایسی جاہل اور بے علم اقوام کے پاس آئے تو انہوں نے ان کی خوب ڈٹ کر مخالفت کی اور ان پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کیں اس کا نمونہ قرآن مجید کی سورہ "ص؟؟ میں موجو ہے:

انہوں نے عجب کیا کہ ڈرانے والا پیغمبران میں سے کیوں بھیجا گیااور کافروں نے کہا یہ جھوٹا جادوگر ہے اس نے ان تمام خداؤں کے بجائے ایک خدا قرار دیا ہے؟ سچ مچ یہ کتنی عجیب بات ہے ان کے سرداروں نے کہا جاؤ اور اپنے خداؤں کو محکم پکڑو کیونکہ یہ شخص چاہتا ہے کہ ہمیں بدبختی سے دوچار کردے ہم نے اس قسم کی کوئی بات اپنے باپ داداؤں سے نہیں سنی یہ تو ایک بہت ہی بڑا جھوٹ ہے۔(ص ۴ تا ۸)

اس تمام گفتگو میں ہٹ دھرمی کے آثار ملتے ہیں جو جہالت اور غرور سے پیدا ہوتی ہے۔[1]

۳۴۔ جہالت بہانہ جوئی کا سبب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

جاہل اور بے سمجھ لوگوں نے کہا: خدا ہمارے ساتھ بات کیوں نہیں کرتا؟ ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسی باتیں کہی تھیں۔ ان کے دل (اور افکار) ایک جیسے ہیں لیکن ہم نے (کافی حد تک) اپنی آیات اور نشانیوں کو اہل یقین کے لیے واضح طور پر بیان کردیا ہے۔(سورہ بقرہ ۱۱۸)

تاریخِ انبیاء میں ہمیں یہ نکتہ بار بار دکھائی دیتا ہے کہ جاہل اور بے سمجھ لوگ مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعہ ایمان لانے سے پہلوتہی کرتے رہے اور روشن دلائل آسمانی کتابوں اور صریح معجزات کے سامنے مختلف قسم کے بہانے تراشتے رہے کبھی تو وہ اپنے پیغمبر سے کہتے کہ تم انسان کیوں ہو تمہاری جگہ پر فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ کبھی کہتے خدا کی طرف سے ہمارے پاس کوئی خط کیوں نہیں آیا؟

کبھی کہتے جب تک تم خدا اور فرشتے ہمارے سامنے واضح طور پر نہ لے آؤ ہم ایمان نہیں لائیں گے!

اور کبھی کہتے جب تک تم بے آب و گیاہ سرزمین کو ایسے ایک باغ میں تبدیل نہ کردو جس میں پانی کی نہریں جاری ہوں اس میں انواع واقسام کے درخت پھول اور میوے ہوں تب تک ہم تم پر ایمان نہیں لاتیں گے (اس کا واضح نمونہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۹۰ تا ۹۳ میں

---

[1] امیر المومنین علی فرماتے ہیں: "العلم اصل کل خیر... والجهل اصل کل شر" علم ہر اچھائی کی بنیاد اور جہالت ہر برائی کی جڑ ہے۔

(غرر الحکم، ص ۲۰، ص ۱۲)

موجود ہے اس کے علاوہ اور بھی قرآنی آیات میں اس قسم کے معتدد نمونے ملتے ہیں)

درحقیقت صاحبانِ علم ومعرفت کسی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کسی ایک منطقی دلیل ہی کو کافی سمجھ لیتے ہیں اور اگر متعدد دلائل مل جائیں تو ان کا ایمان مزید راسخ ہوجاتا ہے لیکن چونکہ ہٹ دھرم متعصب اور جاہل افراد اس بات کے لیے حاضر نہیں ہوتے کہ خرافات پر مبنی اپنے عقائد سے دست بردار ہوجائیں لہٰذا حقیقت سے پہلوتہی کرنے اور اپنی جان چھڑانے کے لیے مختلف حیلوں بہانوں سے کام لیتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اگر ان کے بہانوں کو عملی شکل بھی دے دی جاتی پھر بھی اسے چھوڑ کر کسی اور اور بہانے کا آسرا لیتے کیونکہ ان کا مقصد حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ اس سے پہلوتہی کرنا ہوتا تھا۔ [1]

۳۵۔ جہالت اندھی تقلید کا سبب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے منہ بولے باپ (چچا آذر) اور قوم سے کہا: یہ بے روح مجسمے کیا ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم نے اپنے باپ داداؤں کو دیکھا ہے کہ وہ ان کی عبادت کیا کرتے تھے فرمایا: یقیناً تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں ہو۔ (سورہ انبیاء ۵۲ تا ۵۴)

تماثیل تمثال کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایسی چیز جس کی صورت ہو اور مجسمہ اور نقاشی یعنی پورٹیبل تصویر کو تمثال کہتے ہیں۔

"عاکفون"، "عکوف" کے مادہ سے ہے جس کے معنی میں ایسی مسلسل توجہ جس میں تعظیم بھی پائی جائے اور اعتکاف کا لفظ بھی اسی سے مشتق ہے جو مسجد میں مخصوص عبادت انجام دینے کے معنی میں ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ کے بت پرستوں کے پاس اپنے اس قبیح فعل کی کوئی منطقی دلیل نہیں تھی اور وہ غالباً اپنے بزرگان ماسلف کی اندھی تقلید پر ہی قناعت کرتے تھے اسی لیے جناب ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کھلم کھلا اور آشکار گمراہی اور ضلالت پر قائم رہنے والے کہا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بابل کے بت پرستوں سے تاریخی مناظرہ کرتے ہوتے وہ باتیں کہیں جنہیں قرآنی

---

[1] امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں، "الجاهل صغير وان كان شيخا والعالم كبير وان كان حدثا" جاہل، بچہ ہوتا ہے خواہ وہ بوڑھا ہو اور عالم بزرگ ہوتا ہے خواہ وہ کمسن ہو۔ (بخارالانوار، جلد ۱، ص ۱۸۳)

آیات نے یوں بیان کیا ہے: آیا تم خدا کے علاوہ ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ تو تمہیں ذرّہ برابر فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہی رتی بھر نقصان؟ پھر فرماتے ہیں:

أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦٧﴾

تم پر بھی افسوس اور خدا کے علاوہ ان چیزوں پر بھی جن کی تم عبادت کرتے ہو آیا تم عقل سے سوچتے نہیں؟ (انبیاء ٦٧)

یعنی اس قسم کی اندھی تقلید تمہارے عقل اور غور وفکر سے کام نہ لینے کی بدولت معرض وجود میں آتی ہے اور جہالت کی پیداوار ہوتی ہے اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ اہلِ علم افراد فکری استقلال کے حامل ہوتے ہیں اور فکری استقلال انہیں اندھی تقلید کی اجازت نہیں دیتا یہ تو جاہلوں کا کام ہوتا ہے جو کبھی اس کے پیچھے لگ گئے اور کبھی اسکے اور اندھا دھند ہر پروگرام کو اپنا لیا۔

۳۶۔ جہالت اختلاف وانتشار کا سبب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ ۚ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ ﴿١٤﴾

وہ تمہارے ساتھ کبھی اجتماعی صورت میں نہیں لڑیں گے مگر یا تو محکم قلعوں میں یا دیواروں کے پیچھے سے ان کے اپنے درمیان سخت لڑائی ٹھنی ہوئی ہے (لیکن تمہارے مقابلے میں وہ عاجز وناتواں ہیں) تم انہیں متحد سمجھتے ہو حالانکہ ان کے دل منتشر ہیں یہ اس لیے ہے وہ ایسے جاہل لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (سورہ حشر ۱۴)

"قری"، "قریة" کی جمع ہے جس کے معنی آبادی ہیں خواہ وہ شہر ہو یا دیہات اور کبھی اس انسانی گروہ کو بھی قریہ کہا جاتا ہے جو ایک جگہ اکٹھا ہوتا ہے اور "قری محصنه" ان آبادیوں کو کہا جاتا ہے کہ جو برجوں قلعوں یا خندقوں کے ذریعہ دشمن کے حملوں سے محفوظ ہوتی ہیں۔

یہ آیت طائفہ بنی نضیر (یہودِ مدینہ کے تین گروہوں میں سے ایک) کے حالات بیان کر رہی ہے اور ان کے اندرونی اختلافات اور خوف ووحشت سے پردہ اٹھا رہی ہے گویا کہہ رہی ہے کہ ان کے بظاہر اتحادی پراپیگنڈے کو مت دیکھو درحقیقت یہ اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے متفرق اور منتشر ہیں۔

ہمیشہ اختلافات جہالت اور اتفاق واتحاد علم کی بدولت معرضِ وجود میں آتے ہیں جاہل لوگ صرف اختلاف وانتشار کے عظیم خطرات ہی کو نہیں دیکھتے اور اتحاد واتفاق کی برکت ہی سے بے خبر نہیں ہوتے بلکہ جیو اور جینے دو کے سنہری اصول ایک دوسرے سے تعاون اور باہمی اور مشترکہ جدوجہد کے اصولوں سے بھی واقف نہیں ہوتے یہی چیز انہیں انتشار کا شکار بنا دیتی ہے۔

متعصب ہٹ دھرم مغرور متکبر خود پسند اور کینہ پرور لوگ اتفاق واتحاد کی نعمت سے کبھی بہرہ ور نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں سے ہر چیز وحدت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ جہالت کی پیداوار ہے۔[1]

۳۷۔ جہالت سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ

پھر اس غم واندوہ کے بعد اس نے تم پر اپنا سکون نازل فرمایا جو مختصر سی نیند کی صورت میں تھا تم میں سے کچھ لوگوں کو تو نیند آ گئی اور کچھ لوگ اپنی جان کی فکر میں تھے (انہیں نیند نہیں آئی) وہ خدا کے بارے میں زمانہ جاہلیت جیسے غلط گمان کرنے لگے۔ (آل عمران ۱۵۴)

یہ آیت جنگ اُحد کے بعد کی رات کے ماجرے کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو نہایت ہی دردناک اور پُر اضطراب رات تھی کیونکہ دشمن کے زبردست حملے کو سہنے کے بعد کچھ مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ خیالات جنم لینے لگے کہ قریش کا فاتح لشکر ایک بار پھر مدینہ کو لوٹ آئے اور مسلمانوں کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دے۔

اس دوران خداوند عالم نے اُن پر پُرسکون نیند طاری کر دی جس سے ان کا اضطراب کم پڑ گیا لیکن ضعیف ایمان لوگ ساری رات ڈھیروں غم واندوہ اور خوفناک تصورات کے درمیان کھوئے رہے کبھی تو بڑا بڑاتے اور کبھی سوچتے کہ آیا پیغمبرؐ نے جو وعدے وعید کیے تھے وہ سچے تھے؟ آیا خدا میں ہمارے ساتھ درپیش آنے والے دلخراش سانحے کے باوجود بھی انجام کار ہم کامیاب ہوں گے؟ آیا اس ہلاکت ناک ماجرے کے باوجود بھی زندہ بچ جائیں گے؟ یا یہ سب کچھ جھوٹ اور فریب ہے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے شیطانی وسوسے اور زمانہ جاہلیت کی سی بدگمانیاں!

لیکن آئندہ کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ زبردست غلط فہمی میں مبتلا تھے اور خدا کے سارے وعدے سچے تھے لیکن چونکہ ان کے تعلقات ابھی تک زمانۂ جاہلیت سے منقطع نہیں ہوئے تھے لہٰذا وہ خدا اور رسولؐ کے بارے میں بدگمانیاں کر رہے تھے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بدگمانی کا ایک اہم عامل جہالت بے علمی اور واقعات کے صحیح تجزیہ وتحلیل کی عدم توانائی ہے کیونکہ اگر انسان میں واقعات کے تجزیہ

---

[1] حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "لوسکت الجاهل ما اختلف الناس" اگر جاہل خاموشی اختیار کر لیں تو لوگوں کے درمیان اختلاف ہی نہ ہو۔

(بحار الانوار جلد ۷۸ ص ۸۱)

وتحلیل کی صحیح معنوں میں قدرت ہوتو اس قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔

۳۸۔ جہالت بے ادبی کا سبب ہے

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ۴

جولوگ حجروں کے پیچھے سے آپ کو بلاتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ دار نہیں ہیں۔، (سورہ حجرات ۴)

اعراب کے کچھ گروہ تھے جو وقت و بے وقت پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے پیچھے سے آ کر بلند آواز میں کہتے تھے: ''یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ؟ اخرج الینا'' اے محمدؐ! اے محمدؐ! (باہر آؤ تمہارے ساتھ ایک کام ہے) سرکار رسالتمآبؐ کو ان کی اس قسم کی بے ادبی اور بے جا مداخلت سے تخت کوفت ہوتی تھی لیکن ذاتی شرافت کی بنا پر خاموش ہو جاتے تھے یہ سلسلہ سورہ حجرات کے نزول تک جاری رہا جب یہ سورہ نازل ہوگئی تو اس پر آنحضرتؐ کے ساتھ گفتگو کے آداب اور آپؐ کو مخاطب کرنے کے طور طریقے بتا دیئے گئے۔

''اکثرھم لا یعقلون'' (ان میں سے اکثر سمجھ دار نہیں ہیں) کی تعبیر اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ بے ادب اور گستاخ افراد کی بے ادبی عام طور پر ان کی جہالت کی وجہ سے رونما ہوتی ہے خلاصہ کلام جہاں علم ہوگا وہاں اس کے ساتھ ادب بھی ہوگا اور جہاں پر جہالت ہوگی وہاں پر بے ادبی اور گستاخی بھی ہوگی۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖۤ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَۃً ؕ قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا ہُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ۶۷

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا خداوند تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم گائے کو ذبح کرو تو انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں؟ تو موسیٰؑ نے کہا میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ (سورہ بقرہ ۶۷)

اس آیت کا تعلق اس قتل سے جو بنی اسرائیل میں ہو گیا تھا اور چونکہ قاتل کا سراغ نہیں مل رہا تھا لہٰذا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ اس سے بنی اسرائیل کے مختلف قبائل کے درمیان خونریز جنگ چھڑ جائے اسی لیے خداوند تعالیٰ کی طرف سے حکم نازل ہوا کہ وہ ایک گائے کو ذبح کریں اور اس کے بدن کے ایک حصہ کو لے کر مقتول کو ماریں جس سے وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کی نشاندہی کرے گا۔

چونکہ یہ بات بہت ہی عجیب اور اعجاز آمیز تھی لہٰذا پہلے پہل بنی اسرائیل نے بڑے تعجب سے موسیٰؑ علیہ السلام کو کہا کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں؟

جناب موسیٰؑ نے جواب میں کہا میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں سے ہوجاؤں گویا مذاق کرنا جاہلوں کا نشان بے علمی کی علامت اور غرور وتکبر کی دلیل ہے اس قسم کے لوگ دوسروں کو حقیر کرنے کے لیے ان سے مذاق کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ تکبر اور غرور بھی جہالت سے ہی پیدا ہوتے ہے حتیٰ کہ بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے جاہل لوگ داناؤں اور خردمندوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔[1]

۳۹۔ جہالت اجتماعی مصائب اور پشیمانیوں کا سبب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝۶

اے ایمان والو؟ اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کرو مبادا جہالت کی وجہ سے کسی قوم کو مصیبت میں ڈال دو اور اپنے کیے پر پشیمان ہوجاؤ۔ (حجرات ۶)

یہ آیت ایک بنیادی اصول کے عنوان سے مسلمانوں کو حکم دے رہی ہے کہ خبروں کو ماننے کے لیے راوی کے ثقہ ہونے کو پیشِ نظر رکھو اور اگر کوئی خبر کسی فاسق اور ناقابلِ اعتماد شخص سے تمہیں ملے تو اس کے بارے میں خوب چھان بین کرو اور تحقیق کرنے سے پہلے کوئی قدم مت اٹھاؤ کیونہ ہوسکتا ہے کہ اس سے مصائب کا طوفان کھڑا ہوجائے اور تمہیں ندامت کا سامنا کرنا پڑے۔

ظاہری بات ہے کہ جاہل انسان مختلف حوادث کے بارے میں صحیح موقف نہیں اپنا سکتا اور اس کی یہ بے علمی کئی مصیبتوں اور نقصانات کا سرچشمہ بن سکتی ہے جس کا نتیجہ ندامت اور پشیمانی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

۴۰۔ جہالت اقدار کو بدل دیتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶

---

[1] امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: "العلماء غرباء لکثرۃ الجھال بینھم" جاہلوں کی کثرت کی وجہ سے علما ان کے درمیان پردیسی ہیں۔ (بحار الانوار جلد ۷۸ ص ۸۱)

راہ خدا میں جہاد تم پر فرض کیا گیا ہے جبکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو ہوسکتا ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرو جبکہ اس میں تمہاری بھلائی ہو اور کسی چیز کو پسند کرو جبکہ اس میں تمہارے لیے برائی ہو اور خدا سب کچھ جانتا ہے تم کچھ نہیں جانتے۔(بقرہ ۲۱۶)

ہمیشہ انسان کی حرکت ان اقدار کی جانب ہوتی ہے جو اس کے پیشِ نظر ہوتی ہیں اور اقدار کی تشخیص اس حرکت کی سمت کو متعین کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے اور اس سے لاعلمی اس بات کا باعث بن جاتی ہے کہ انسان اقدار کو خلافِ اقدار کے پہچاننے میں غلطی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے لہٰذا جو چیز اس کی ترقی و پیش رفت اور خیر و برکت کا موجب ہوتی ہے اسے شر یا خلاف اقدار سمجھ لیتا ہے اور اس کے برخلاف جو اس کی بدبختی اور تباہی کا موجب ہوتی ہے اور خوش بختی اور نجات سمجھ لیتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت بتا رہی ہے کہ راہِ خدا میں جہاد اقدارِ انسانی میں سے ایک ہے (عزت و آبرو اور افتخار و اعزاز کا موجب اور کامیابی کا سبب ہے) لیکن تم اپنی جہالت کی وجہ سے اسے ناپسند کرتے ہو کیونکہ اس کے آثار اور برکات سے بے خبر ہو اور اسکے برخلاف سکوت و خاموشی اور ترک جہاد کو اپنے لیے سعادت و سلامتی اور ایک اعلیٰ قدر تصور کرتے ہو حالانکہ یہ تمہاری بدبختی کا موجب ہے۔

اس طرح سے اقدار کی تشخیص میں غلطی کا سرچشمہ جہالت ہوتی ہے اور وہ بھی بجائے خود مختلف مسائل کے بارے میں غلط اور غیر صحیح مؤقف اور زندگی کے گوناگوں حوادث کے سلسلے میں نادرست مؤقف اور افراط و تفریط کا عامل ہوتی ہے۔[1]

۱۔آیات کی جمع بندی اور نتیجہ

علم و معرفت اور شناخت کے بارے میں چالیس عنوانات کے تحت قرآنی آیات کے مباحث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور قرآن نے اس بارے میں کس حد تک اہتمام کیا ہے۔(ہم اس بات کا ہرگز دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ بات انہی چالیس عنوانات میں منحصر ہے) معرفت خواہ خدا کی ذات ہو یا اس کی صفات کی عالم آفرینش کی شناخت ہو یا زمین و آسمان اور باقی کائنات کی زمین و آسمان میں موجود چیزوں کے اسرار سے آگاہی ہو یا طبعی اور ماوراطبیعت سے اپنی ذات کی پہچان ہو یا مختلف علوم کا احاطہ سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔

ان تمام آیات کی تحقیق سے مندرجہ ذیل امور بخوبی واضح ہوتے ہیں۔

۱۔معرفت کی راہیں سب لوگوں کے لیے کھلی ہوئی ہیں اور ہر شخص اپنی استعداد و لیاقت کے مطابق تلاش و کوشش کر کے ان راہوں کو طے کرسکتا ہے وگرنہ اس قدر تاکید و اہمیت کے ساتھ اس کی دعوت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

---

[1] امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "لاتری الجاهل الامفرطا اومفرطا" جاہل کو تو دو حال سے خالی نہیں پائے گا، یا وہ افراط میں ہوگا یا تفریط میں۔

(نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۷۰)

۲۔انسانی اقدار کا خدا کی معرفت کائنات کی شناخت اور اپنی پہچان سے مستقیم رابطہ ہے اور جتنا اس کی معرفت زیادہ ہوگی اتنا ہی ان اقدار کا رابطہ گہرا ہوگا۔

۳۔انسان کی جسمانی کمزوریوں کے باوجود اس کے لیے سب سے بڑا اعزاز اس کا زیادہ سے زیادہ معرفت کے لیے آمادہ ہونا ہے۔

۴۔فتح وکامرانی تک پہنچنے ہر طرح کی مشکلات پر قابو پانے اور تزکیہ نفس اور خودسازی کی راہیں علم ومعرفت کی راہیں ہیں۔

۵۔مختلف قسم کی تباہ کاریوں بدبختیوں اور ناکامیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے سب سے پہلے حصولِ معرفت ضروری ہے۔

ہم ایک بار پھر اس بات کو دہراتے ہیں کہ یہ قرآنی مباحث ایسے وقت اور ایسے ماحول میں نازل ہوئیں جب جہالت اور تاریکی کے بادل اس علاقہ پر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا پر چھائے ہوئے تھے علم ودانش کا سورج غروب ہو چکا تھا اور لوگ جہالت کی موجوں میں غوطہ ور تھے۔

اور یہ واقعاً عجیب بات ہے کہ اس قسم کے ماحول سے اس طرح کی تعلیمات کا آغاز ہو جو قرآن مجید کی حقانیت کی واضح اور زندہ دلیل ہے جو درس نہ پڑھے ہوئے انسان کے ذریعہ اس قسم کے مکتب کا پیام بر ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض محققین جنہوں نے علم ومعرفت اور اس کے منابع کے سلسلہ میں تحقیق کی ہے اس بارے میں سات سو سے زیادہ آیات کا پتہ لگایا ہے جبکہ وہ احکام پر قرآن پر مشتمل پانچ سو آیات کی نشاندہی کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے احکام دین کی نسبت علم ومعرفت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

چند وضاحتیں

۱۔آیا فلسفہ کی رو سے شناخت ممکن ہے؟ جیسا کہ ہم آغازِ بحث میں بتا چکے ہیں کہ ہمارے فکر وادراک کے دائرہ کار سے باہر کسی جہان کا وجود ایسا موضوع نہیں ہے جس پر بحث اور گفتگو کی جائے حتیٰ کہ سفسطائی یا آئیڈیالسٹ (خیالی لوگ) جو ظاہری اور بیرونی حقائق کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور پر اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان حقائق کی شناخت ومعرفت کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟ اگر جواب مثبت ہے تو پھر اس کے کیا ذرائع اور طریقے ہیں؟ اور اگر ذرائع اور طریقے ہیں تو پھر کن حالات کے تحت ان تک رسائی ممکن ہے؟

بالفاظ دیگر ہم خارج میں پائی جانے والی اور آنکھ سے دیکھی جانے والی واقعیات (واقعی چیزوں) کو حقیقت میں تبدیل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ خارجی واقعیت کو ذہن میں منعکس کر سکتے ہیں یا نہیں؟ شناخت وفروخت کی تمام تعریفوں اور اس مسئلہ پر تمام نزاع کی بازگشت بھی اسی موضوع کی طرف ہے۔[1]

اور اس کے ساتھ ہی تمام انسانی علوم ودانش کی اصل بنیاد اسی سوال کے جواب میں مضمر ہے۔

---

[1] بنابریں شناخت کی تعریف یوں ہوگی: خارجی واقعیات کو ذہنی حقیقتوں میں تبدیل کرنا اور انہیں جیسا کہ وہ ہیں۔آئینہ فکر میں منعکس کرنا۔

اگرچہ اکثر و بیشتر فلاسفہ، خواہ وہ خدا پرست ہوں یا مادہ پرست، عینی واقعیت کی شناخت کے طرفدار ہیں لیکن پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس بات کے منکر ہیں اور ان کے اس بارے میں مندرجہ ذیل چار اہم اور قابل ذکر دلائل ہیں:

۱۔ ہماری شناخت کے اہم ترین ذرائع ہمارے حواس ہیں اور ان تمام حواس میں حس بینائی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ کس قدر خطائیں ہیں جو آنکھ سے سرزد نہیں ہوتیں؟ مثلاً:

شعلہ اور شہابیہ، جو ہماری نگاہوں میں آگ کی ایک لمبی لکیر کی مانند آسمانوں میں منعکس ہوتا ہے، واقع میں ایک نورانی نقطہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

اگر ہم ایک لمبی اور مستقیم سڑک کے درمیان کھڑے ہو جائیں، جس کے دونوں اطراف درخت ہوں اور اس کے آخر تک نگاہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ درخت جتنا بھی ہم سے دور ہوں گے اتنا ہی ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے نظر آئیں گے۔ انتہائی دور نقطہ پر ہم ان دو متوازی خطوط کو ایک دوسرے سے بالکل متصل دیکھیں گے جن سے ہم تصور کریں گے کہ ان سے ایک زاویہ بن چکا ہے، حالانکہ واقعیت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے کیونکہ سڑک کے دونوں اطراف کا باہمی فاصلہ ہر جگہ بالکل یکساں ہوتا ہے۔

اگر ہمارا ایک ہاتھ گرم اور دوسرا ٹھنڈا ہو اور ہم دونوں کو ایک ہی آن میں نیم گرم پانی میں ڈالیں، تو جو ہاتھ گرم تھا اس سے ٹھنڈک کا اور جو ٹھنڈا تھا اس سے گرمی کا احساس کریں گے۔ گویا ایک ہی شے سے ایک ہی آن میں مکمل طور پر دو متضاد احساسات ہمارے ذہن میں ایجاد ہوں گے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جو حس بینائی اور دیگر حواس مثلاً حس لامسہ وغیرہ کے بارے میں ہیں۔ اس صورت میں حواس پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ اور شاید کہ یہ خارجی دنیا خواب و خیال کے سوا کچھ بھی نہ ہو، تو کیا جو چیز ہم خواب میں دیکھتے ہیں اور اسی لمحے اس کی حقیقت کے قائل بھی ہو جائیں تو کیا یہ واقعیت ہوگی؟

۲۔ دنیا کے متفکرین دانشوروں اور فلاسفہ میں سے دو شخص بھی ایسے نہیں ملیں گے جو تمام مسائل میں باہم متفق ہوں ان کے درمیان اس قدر تضاد اور اختلاف اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ حقائق کی شناخت کیلئے ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں اور جس چیز کو میں حقیقت و واقعیت سمجھتا ہوں ممکن ہے وہ کسی دوسرے کے نزدیک خواب و خیال سے زیادہ نہ ہو اور جس کو دوسرے لوگ واقعیت سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک ایک خواب و خیال ہو! حتیٰ کہ ممکن ہے کہ ایک انسان مختلف حالات کے مطابق مختلف نظریات و عقائد رکھتا ہو اور یہی چیز مسئلہ شناخت کی بنیادوں پر ایک کاری ضرب ہے۔

۳۔ ہم جانتے ہیں کہ کائنات کی ساری چیزیں حرکت کر رہی ہیں اور یہ عمومی حرکت ایسی ہے جس میں ہر شئے دگرگون ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ ہمارے افکار علوم معارف اور دانش بھی۔

تو پھر اس حالات میں کیونکر یہ بات قبول کی جا سکتی ہے کہ ہم کائنات کی موجودات اور ان کے باہمی روابط کے بارے میں صحیح

معلومات اور شناخت حاصل کر سکتے ہیں؟ جبکہ شناخت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک ثابت موضوع کو پیشِ نظر رکھیں۔

۴۔ہم جانتے ہیں کہ یہ عالم ہستی ایک باہم پیوستہ اکائی ہے اسی لیے جزو کی شناخت کل کی شناخت سے جدا نہیں ہوسکتی بنا بریں اگر ہم اس سلسلے کی ایک بھی کڑی کو شناخت نہ کر پائیں تو اس کی کسی بھی کڑی کی شناخت نہیں کر پائیں گے۔

ادھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سی ایسی واقعیات ہیں جن کا ادراک نوع بشر کے لیے ناممکن ہے اور انسانی معلومات کی تعداد ابھی تک اس کی کم از کم مجہولات کی تعداد سے بھی قابلِ موازنہ نہیں ہے۔

تو پھر ایسی صورت میں ہم کائنات کو کیونکر ممکن سمجھتے ہیں؟ اسی لیے ماننا پڑے گا جو کچھ بھی ہمارے تصورات میں آتا ہے وہ صرف علم کی حد تک محدود ہے نہ کہ واقعیت کی بناء پر!

جواب

ان دلائل کے تین طریقوں سے جواب دیئے جاسکتے ہیں۔

ا۔ جو لوگ بھی عدم شناخت کی بات کرتے ہیں اسی حالت میں بھی جبکہ وہ اپنے مخالفین کو دلائل دینے کے یا ان دلائل کو اپنی کتابوں میں درج کرنے کے لیے قلم بدست ہیں سینکڑوں خارجی واقعیات کی شناخت کر چکے ہیں اور اسی شناخت کے ساتھ اور ان ہی چیزوں کی شناخت کی بدولت ہی مسئلہ شناخت سے جنگ کرنے میدان میں نکل آئے ہیں قلم کاغذ خطوط کلمات جملات چھاپہ خانہ کتاب کی اشاعت لائبریری کتب خانہ فریق مخالف صوتی لہریں حروف کے مخرج نور اور روشنی دوسروں کے افکار پر اثر اندازی غرض ان سب عینی واقعیات کو قبول کرتے ہیں۔

ان سب چیزوں کی شناخت کے ساتھ ہی شناخت کے ساتھ جنگ کے لیے میدان میں اُترتے ہیں اور ان معارف کی امداد و تعاون ہی سے معرفت کی نفی کے درپے ہیں ہے نا یہ عجیب غلط فہمی؟ (غور کیجئے گا)

۲۔ان کی سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ انسانی علم و شناخت کے محدود ہونے کو شناخت کے اصل مسئلہ کے ساتھ ملا دیا ہے ان کے دلائل امکانِ شناخت کی ہرگز نفی نہیں کرتے بلکہ آخر میں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسانی معارف محدود یا بسا اوقات کچھ غلطیوں سے آلودہ ہوتے ہیں۔

وہ شہابیے'' کے وجود خارجی کا انکار تو نہیں کر سکتے بلکہ کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک نورانی (چمکدار) نقطہ ہے جو قوتِ باصرہ کی غلطی کی بدولت ہمیں آگ کی ایک لمبی یکسر دکھائی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہابیے کے اصل وجود میں غلطی نہیں بلکہ غلطی اس آگ کی لمبی لکیر میں ہے۔

اسی طرح سڑک اور اس کی دونوں جانب درختوں کے اصل وجود میں غلطی نہیں ہے بلکہ علطی اس بات میں ہے کہ وہ درخت ہم سے جس قدر دور ہوتے جاتے ہیں ہمیں آپس میں نزدیک ہوتے دکھائی دیتے ہیں اسی طرح نیم گرم پانی کے بارے میں ہے کہ پانی کے

اصل وجود اور ایک مقررہ حد تک درجہ حرارت کے اصل وجود کے بارے میں ہم غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ غلطی تو اس حرارت کی مقررہ حد کی تشخیص میں ہوئی ہے۔

لیکن جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہمیں یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ ہم اس جہان کے تمام حقائق کا ادراک رکھتے ہیں اور جن حقائق کا ادراک ہے ان میں غلطی واقع نہیں ہوتی بلکہ ہمارا مقصد جزئیہ کی صورت میں شناخت ومعرفت کے امکان کو ثابت کرنا ہے جبکہ ان کی تمام تر غلط فہمی اسی موقع پر ہے۔

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ عدم امکانِ شناخت کے طرفدار اپنے مدعا پر جو دلائل پیش کرتے ہیں اچھی طرح خود ان کے اپنے خلاف واقع ہوتے ہیں کیونکہ جب وہ حواس کی غلطی کے مسئلہ کو درمیان میں لے آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے واقعیت کو اپنے دوسرے حواس یا عقلی ذرائع سے دریافت کیا ہے جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہماری حسِ نے فلاح مقام پر غلطی کی ہے اس بات کا اعتراف ہی شناخت کی ٹھیک ایک قسم ہے۔

مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ آسمان میں شہابے کے بظاہر ہونے کے موقع پر جو آگ کی ایک لمبی لکیر دیکھتے ہیں یہ غلطی ہے تو ہم نے کئی اور رستوں سے اس واقعیت کو سمجھ لیا ہے کہ شہابیہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ زمینی فضاؤں میں داخل ہوتا ہے تو اپنی تندترین تیز رفتاری کی وجہ سے ہوؤں کے پردوں سے جا ٹکراتا ہے جس سے وہ گرم ہو کر شعلہ ور ہو جاتا ہے اور ایک چمکدار نقطہ دکھائی دینے لگتا ہے اور چونکہ یہ چمکدار نقطہ اس قدر تیز حرکت کرتا ہے کہ ہماری آنکھ غلطی میں پڑ جاتی ہے اور اسے خطِ مستقیم یا خطِ منحنی کی صورت میں دیکھتی ہے۔

اسی بناء پر ایک غلطی کے پہلو میں کئی معروف واقعیات موجود ہوتی ہیں کہ جن سے ہم آگاہ ہوتے ہیں اور ان ہی کے ذریعہ ہم اپنی خطاؤں کی اصلاح کرتے ہیں۔

اسی طرح آنکھ کی غلطی کا مسئلہ ہے جو دو متوازی خطوط کو ایک زاویہ کی صورت میں دیکھتی ہے ہم نے پہلے نزدیک سے سڑک کے دونوں کناروں اور ان کناروں پر موجود درختوں کو دو متوازی خطوط کی صورت میں دیکھا اور ان کا اندازہ لگایا لہٰذا جب دور سے اسے دو متقاطع خطوط کی صورت میں دیکھتے ہیں تو ان معلومات کی روشنی میں جو نزدیک سے دیکھ چکے ہیں ان کا آپس میں تقابل کیا تو اس غلطی کا احساس کیا۔

اس صورت میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کسی غلطی کے وجود کا حکم بہت سی واقعیات کی شناخت کی دلیل ہوتا ہے (دقت کیجئے گا)۔

۳۔ان لوگوں نے بدیہی ''و'' نظری ''اور ''امورِ مطلقہ'' و ''امورِ نسبیہ اور معرفت اجمالی ومعرفتِ تفصیلی کی تفصیل کو نہیں سمجھا اور ان تین موضوعات کو صحیح معنی میں نہ سمجھنے کی وجہ سے دوسری راہیں اختیار کی ہیں۔

اوراب وضاحت:

کچھ حقائق ایسے ہیں جن کے بارے میں سفسطائیوں کے سوا جو ہماری بحث سے خارج ہیں کسی کو انکار نہیں (جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں سفسطائی حضرات بھی اگرچہ زبان سے انکار کرتے ہیں لیکن دل سے انہیں ضرور مانتے ہیں) کچھ حقائق ایسے ہوتے ہیں جن میں غور وفکر کی

ضرورت نہیں ہوتی مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں پر شخص کو معلوم ہے کہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ پر رات بھی ہو اور دن بھی سردی بھی ہوتی ہے اور گرمی بھی یا ایک ہی شخص ایک ہی آن میں مکہ میں بھی ہو اور مدینہ میں بھی حتیٰ کہ جو لوگ اجتماعِ ضدین (دو ضدوں کے اجتماع کو ممکن سمجھتے ہیں وہ ان الفاظ کے مفہوم میں تصرف کرتے ہیں اور ان کی گفتگو زیادہ تر الفاظ بازی پر مبنی ہوتی ہے وگرنہ اصل مطلب کو وہ بھی جانتے ہیں مثلاً وہ اجتماع ضدین کے بارے میں کہتے ہیں کہ ایک لمحے میں بارش آجائے اور فوراً بعد ایک آن میں بادل چھٹ جائیں پس اجتماع ضدین ممکن ہو گیا لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ ایک مقررہ وقت اور مقررہ جگہ پر یہ دونوں چیزیں جمع ہو سکتی ہیں؟ تو کہتے ہیں کہ نہیں!

ان بدیہی معلومات کے مقابلے میں کچھ نظری معلومات ہوتی ہیں کہ جن میں غلطی اور شائبے میں پڑنے کا امکان ہوتا ہے اور شناخت کے ناممکن ہونے کے بارے میں یہ حضرات جو کچھ بھی کہتے ہیں ان سب کا تعلق انسان کی انہی نظری معلومات سے ہے۔

اسی طرح ہم کچھ ایسی واقعیات کو جانتے ہیں ؒ جو مطلق ہوتی ہیں اور ان میں کسی قسم کی نسبت اور تناسب کا رابطہ نہیں ہوتا جس طرح اوپر کی مثال جو ہم نے بیان کی ہے۔(اعداد کے درمیان ریاضی رابطہ دو ضدوں یا دو نقیضوں کا ایک جگہ جمع نہ ہونا)

لیکن اس بات سے بھی انکار قطعاً ناممکن ہے کہ کچھ مفہوم ہوتے ہیں جن کا تعلق نسبت یا تناسب سے ہوتا ہے جو شرائط کے مختلف ہونے سے مختلف ہو جاتے ہیں جیسے سردی اور گرمی ہے جو ایک معنی کے لحاظ سے نسبی چیز ہوتی ہے جس چیز کی حرارت انسان کی جسمانی حرارت سے زیادہ ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ گرم ہے اور جس چیز کی حرارت ہمارے جسم سے کم ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ سرد ہے بنابریں اگر ہمارے بدن کا درجہِ حرارت دگرگون ہو جائے تو ہمارے لیے سردی اور گرمی کا مفہوم بھی دگرگون ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب ایک کمرے میں دو آدمی بیٹھے ہوں تو ان میں سے ایک گرمی کا احساس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دروازے اور کھڑکیاں کھول دو جبکہ دوسرا سردی کا احساس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہیٹر لے آؤ۔

البتہ ان تمام صورتوں میں ایک واقعیت ضرور ہوتی ہے اور وہ ہے کمرے کا درجہ حرارت اور ایک دوسری واقعیت خود ہمارے جسم کا درجہ حرارت ہوتا ہے البتہ سردی اور گرمی کی برداشت دگرگون ہونے والی چیز ہے جو دونوں کے باہمی تقابل سے حاصل ہوتی ہے اور ان کے بارے میں فیصلہ مختلف ہوتا ہے:

اسی طرح اس دنیا میں کچھ واقعیات ثابت ہوتی ہیں اور کچھ واقعیات متغیر جو مثالیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں وہ اس قسم کی دوسری مثالیں ثابت واقعیات کا حصہ ہیں حتیٰ کہ مارکسٹ حضرات marxists جو کہ ہر چیز کو متغیر جانتے ہیں وہ بھی تغیر اور تبدل کو استثنائی طور پر ایک ثابت اصول کی صورت میں تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کائنات کی ساری چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں سوائے تغیر اور تبدل کے قانون کے جو ہمیشہ ثابت رہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی (البتہ اس اصول کے ساتھ ساتھ کچھ اور اصول بھی ہیں جنہیں وہ ثابت جانتے ہیں)

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے اور وہ یہ کہ معرفت کی دو قسمیں ہیں ایک معرفت اجمالی اور دوسری معرفتِ تفصیلی چنانچہ کچھ ایسی واقعیات ہیں جن کے بارے میں ہم صرف معرفت اجمالی رکھتے ہیں لیکن ان کی خصوصیات اور دنیا کی دوسری اشیاء کے ساتھ ان کے ارتباط سے

ہم بے خبر ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے چونکہ ہم تفصیلی معرفت سے بے خبر ہیں لہٰذا اجمالی معرفت سے بھی نابلد ہیں۔

ہماری آنکھ ہمارے بدن کا ایک حصہ ہے اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ جب تک ہم تمام بدن کو اچھی طرح نہ جان لیں آنکھ کی شناخت اور اس کے دوسرے اعضاء کے کے ساتھ روابط کی شناخت ناممکن ہے لیکن اس تفصیلی شناخت سے لاعلمی اس بات سے ہرگز مانع نہیں ہے کہ ہم اس بات کو سمجھتے ہوں کہ آنکھیں سر میں ہوتے ہیں پیشانی کے نیچے ہوتی ہیں ان کے سات طبقے ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک طبقہ کا مقررہ فریضہ ہے ان کا فائدہ یہ ہے کہ ہم ان میں سے مختلف مناظر اور واقعات کا نظارہ کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا توضیح کے بعد یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ شناخت و معرفت کے منکرین کے دلائل درحقیقت ان کے اس تقسیم کے بارے میں اچھی طرح غور وفکر نہ کرنے کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں مثلاً جب وہ کہتے ں کہ یہ کائنات ایک اکائی سے زیادہ کچھ نہیں اگر ہم نے اس کی کسی ایک کڑی کو نہ پہچانا تو کچھ بھی نہ پہچانا درحقیقت انہوں نے معرفتِ اجمالی اور معرفتِ تفصیلی کو آپس میں ملا دیا ہے کیونکہ اگر ہم اس عالم کے کسی ایک جزو کو اس کے دوسرے اجزاء کے ساتھ روابط سمیت مکمل طور پر پہچاننا چاہیں تو ہمیں مکمل جہان کی معرفت حاصل کرنا پڑے گی لیکن معرفتِ اجمالی کے لیے ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی یہی صورت زمین و آسمان افرادِ بشر اور اپنے اطراف میں موجود اشیاء کے بارے میں ہماری عرفت کی ہے۔[1]

اس سلسلے میں مزید وضاحت انشاءاللہ اگلی فصل میں آرہی ہے۔

---

[1] کبھی کہا جاتا ہے کہ معرفت کے منکرین اس کی مکمل طور پر نفی نہیں کرتے بنابریں معرفت کے طرفداروں کے ساتھ ان کا لفظی نزاع ہے، جو ''عنب''، ''انگور'' اور ''ازوم'' کی داستان کا مصداق ہے (انگور کو عربی میں عنب، فارسی میں انگور اور ترکی میں ازدم کہتے ہیں)۔

۲۔ محدود انسانی علم

۱۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ (سورہ بنی اسرائیل ۸۵)

۲۔ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾ (سورہ لقمان ۳۴)

۳۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ

(سورہ بنی اسرائیل ۴۴)

۴۔ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ (سورہ بقرہ ۲۱۶)

۵۔ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ (سورہ مومن ۵۷)

۶۔ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴿۱﴾ (سورہ طلاق ۱)

۷۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛؕ (سورہ اعراف ۱۸۸)

۸۔ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ (سورہ نسآ ۱۱)

۹۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾ (سورہ لقمان ۲۷)

ترجمہ

۱۔ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے

اور تمہیں علم سے تھوڑی سی چیز کے علاوہ کچھ نہیں دیا گیا۔

۲۔کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا؟ اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا؟

۳۔ہر موجود اس کی تسبیح اور حمد کرتا ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

۴۔ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو لیکن تمہاری خیر اسی میں ہو اور کسی چیز کو پسند کرو لیکن تمہارا شر اسی میں ہو اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

۵۔آسمانوں اور زمین کی آفرینش انسانوں کی آفرینش سے زیادہ اہم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۶۔تم نہیں جانتے کہ شاید اس کے بعد خداوندِ عالم (مطلقہ عورتوں کے بارے میں) کوئی تازہ صورت حال پیدا کردے۔

۷۔کہہ دو کہ میں اپنے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں مگر وہ جو خدا چاہے (اور غیب ومخفی اسرار سے بھی باخبر نہیں ہوں مگر جو خدا چاہے) اور اگر میں غیب سے باخبر ہوتا تو اپنے لیے بہت زیادہ منافع فراہم کرتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔

۸۔تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہارے لیے زیادہ مفید ہے؟

۹۔اگر تمام وہ درخت جو روئے زمین پر ہیں قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائیں اور سات سمندر ان میں اضافہ کردیئے جائیں پھر بھی یہ سب ختم ہوجائیں لیکن کلماتِ خدا ختم نہ ہوپائیں خداوند عالم عزیز اور حکیم ہے۔

الفاظ کے معنی

روح ''جیسا کہ کتاب مقاییس اللغۃ میں آیا ہے دراصل ریح کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہوا ہے اور سانس لینے اور پھونک مارنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے چونکہ سانس لینے اور انسانی بقا اور جان کے درمیان قریبی رابطہ ہے اسی لیے روح جان اور حیات کے معنی میں پھر اس مجرد حقیقت کے معنی میں بولا جانے لگا جس پر حیات کی بقاء کا انحصار ہے۔

روح (بروزن لوح) کے معنی ہیں نسیم خنک اسی طرح مہربانی اور رحمت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور رائحہ کا معنی بر اور مروحہ کا معنی پنکھا سب اسی اصل کی فرعیں ہیں۔

''**تفقھون**'' ''فقہ'' کے مادہ سے ہے جیسا کہ لسان العرب میں آیا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز سے آگاہی اور اسے سمجھنا ہے لیکن اگر خاص طور پر علم دین یا (علم احکام) پر اس کا اطلاق ہوتا ہے تو یہ اسکی عظمت اور اہمیت کی وجہ سے ہے راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ فقہ کا معنی ہے ظاہر اور آشکار امر کے ذریعہ مخفی چیزوں سے آگاہی بنابریں اس کا مفہوم علم کے مفہوم سے خاص ہے کیونکہ علم کا مفہوم عام ہوتا ہے۔

غیب جیسا کہ ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے کہ اس کا اصل معنی شک ہے اور جو چیز بھی انسان سے مخفی چیزوں کے بارے میں زیادہ شک کیا جاتا ہے اور راغب "یومنون بالغیب" کی تفسیر میں لکھتے ہیں غیب وہ چیز ہوتی ہے جو حسّ کے دائرہ سے باہر اور ابتدائی عقل کی دسترس سے بھی خارج ہو اور یہ انبیاء کے خبر دینے کی وجہ سے ہی پہچانی جاتی ہے۔

"نفدت"، "نفد" (بروزن حسد) اور نفاد کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ لسان العرب اور مفردات سے معلوم ہوتا ہے اس کے معنی فنا اور نابودی ہیں اور.....منافد.....اس شخص کو کہا جاتا ہے جو استدلال قائم کرنے میں زبردست مہارت رکھتا ہو اس طرح کہ مخالف کو مکمل طور پر ناکام کردے اور انفاد کنویں کا پانی خشک ہونا کے معنی میں بھی آیا ہے۔

تفسیر اور آیات کی جمع بندی

کچھ مشرکین یا اہلِ کتاب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بار بار روح کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے پہلی آیت کے مطابق آنحضرتؐ کو حکم ہوتا ہے کہ آپؐ انہیں کہہ دیں کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے پھر کہا گیا ہے کہ علم سے تمہیں بہت کم حصہ ملا ہے، لہٰذا تم حقیقتِ روح کے ادراک کی طاقت نہیں رکھتے۔ [1]

یہ چیز علمِ انسانی کی محدودیت پر واضح دلیل ہے کیونکہ روح انسان سے دوسری تمام چیزوں کی نسبت زیادہ قریب ہے (اگر مندرجہ بالا آیت میں روح سے مراد انسانی روح ہے) یعنی جب انسان اپنی روح کے جوہر ہی کو نہیں پہچان سکتا اور اس بارے میں اس کی معلومات سطحی اور اجمالی ہیں تو کائنات کی دوسری واقعیات اور حقائق کے بارے میں اس سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟

دوسری آیت جو سورۂ لقمان کی آخری آیت ہے ان علوم کی نشاندہی کررہی ہے جو خدا کی ذات سے ہی مخصوص ہیں اور اس میں پانچ علوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے قیامت کا قیام بارش کا نزول وہ بچے جو ماؤں کے شکم میں ہوتے ہیں انسانی اعمال سے متعلق آئندہ کے واقعات اور ہر شخص کی موت کی سرزمین جنہیں اسلامی روایات میں مفاتیح خمسہ غیب سے یاد کیا گیا ہے جنہیں خدا کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ [2]

ہوسکتا ہے کہ قرائن کے ان اعتبار سے کچھ لوگ ان امور کے بارے میں کچھ کلیات کو جان لیں لیکن ان پانچ امور کی جزئیات کو کوئی شخص بھی نہیں جان سکتا مثلاً کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ جو بچہ شکم مادر میں ہے وہ کن جسمانی استعداد کا مالک ہے؟ اس کی روح کی کیا کیفیت ہے؟ خوبصورت ہے یا بدصورت؟ صحیح وسالم ہوگا یا ناقص ومریض اگر بیمار ہوگا تو کس قسم کے مرض کا شکار ہوگا؟ حتٰی کہ کوئی شخص اس کی جنس (مذکر اور

---

[1] "وما اوتیتم من العلم" کے جملہ کی اکثر مفسرین نے "قلیلا من العلم" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ جبکہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد "قلیلا منکم" ہے۔ لیکن یہ تفسیر ظاہری آیت کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ اس میں مسئلہ روح کے بارے میں سوال کرنے والے ہی مخاطب ہیں۔ (دقت کیجئے گا)۔

[2] تفسیر مجمع البیان، جلد ۸، سورۂ لقمان کی ۳۴ ویں آیت کے ذیل میں۔

مؤنث ہونے) کی بھی بہت سے مراحل میں نہیں جانتا۔

قرآن کہتا ہے اے انسان! تو تو اپنے کل سے بھی بے خبر ہے اور اس سرزمین کو بھی نہیں جانتا جہاں تیری عمر کا خاتمہ ہونا ہے! تو پھر کائنات سے کیونکر آگاہ ہوسکتا ہے؟ اسی لیے تیرا علم محدود ہے۔

تیسری آیت میں موجودات عالم کی عمومی حمد اور تسبیح کا بیان ہے جو سب کی سب زبانِ حال اور اس عجیب وغریب نظم کے تحت جو ان پر حکم فرما ہے حقِ تعالیٰ کی حمد وثنا میں مصروف اور اس کے ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک ہونے کی گواہی میں رطب اللسان ہے اپنی زبانِ بے زبانی کے ساتھ کائنات کو اپنی تسبیح کے غلغلہ سے بھر رکھا ہے یا پھر یہ کہ زبانِ حال کے علاوہ ان کی زبانِ قال بھی ہے اور کسی استثناء کے بغیر اس موجوداتِ عالم کا ایک ایک ذرہ اپنی اپنی حد تک عقل وعرفان اور شعور کی نعمت سے مالا مال ہے اور مکمل آگاہی اور علم کے ساتھ خدا کی حمد وتسبیح میں مصروف ہے ان دونوں نظریات کی تشریح ہم تفسیر نمونہ بیان کر چکے ہیں۔[1]

لیکن بہرحال نہ تو ہم میں یہ قدرت ہے کہ ہم ان کی زبان حال کو سمجھیں کیونکہ نہ تو ہم موجودات عالم پر حکم فرما نظاموں اور کائنات کے اسرار سے باخبر ہیں اور نہ ہی ان کی زبان قال سے واقف ہیں کہ جس کا حال واضح ہے۔

اس طرح سے یہ کائنات شور ونوا اور غلغلہ سے بھرپور ہے لیکن ہم اس سے بے خبر ہیں اور یہ اور یہ بذاتِ خود ہمارے علم ودانش کے محدود ہونے کی ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔

چوتھی آیت میں جہاد کی بات ہو رہی ہے جو لوگ جہاد کو ناپسند کرتے تھے انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تم تو اپنے خیر وشر سے بھی بخوبی واقف نہیں ہو اور اس کا اچھی طرح ادراک نہیں رکھتے تو اس طرح سے کبھی تو تم اپنے منافع اور مفادات سے برسرِ پیکار ہوتے ہو اور کبھی اپنے نقصانات کی طرف بڑے شوق سے جاتے ہو جو تمہارے علم کے محدود ہونے کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ تم تو اپنے سود زیاں کو بھی نہیں سمجھ سکتے مگر خداوندِ بزرگ اس سے بخوبی آگاہ ہے اور وحی کے ذریعہ سے جو معرفت کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے تمہیں تمہارے تمام نفع ونقصان سے باخبر کر دیا ہے۔

پانچویں آیت میں آسمانوں میں اور زمینوں کی آفرینش کی عظمت کا بیان ہے اور اس واقعیت کا بھی کہ ان چیزوں کی تخلیق وآفرینش انسان کی تخلیق وآفرینش سے بڑھ کر باعظمت اور بااہمیت ہے اس کے ساتھ ہی اس بات سے اکثر لوگوں کی بے خبری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ اس دور یات کی بات ہے جب آسمانوں کی تخلیق کے بارے میں لوگوں کی معلومات عام طور پر اور جزیرۃ العرب کے باسیوں کی خاص طور پر محدود تھیں اور شاید وہ ستاروں کو آسمان کی چھت پر چاندی کی میخیں سمجھتے تھے اور آج جب کہ معلوماتِ انسانی کا دائرہ وسیع ہو چکا ہے پھر بھی اس بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔

چھٹی آیت میں طلاق اور عدت عدتِ رجعی میں مطلقہ عورتوں کے اپنے شہروں کے گھروں میں موجود رہنے کے مسئلہ کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے تم نہیں جانتے کہ شاید خداوندِ عالم اس کے بعد ان کے لیے کئی نئی صورت حال پیدا کر دے اور عدت کا دورانیہ خاص کر جب

---

[1] تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، ص ۱۳۳، سورۂ اسرأ (بنی اسرائیل) کی آیت ۴۴ کے ذیل میں رجوع ہو۔

سابق شوہروں کے ساتھ نظر ثانی اور صلح صفائی کا سبب بن جائے جس سے زناشوئی کی کوئی خاص صورت حال نکل آئے اور یہ دلیل ہے انسانی علم کے میں محدود ہونے پر کہ انسان تو اپنی کل کی زندگی سے متعلق مسائل تک سے بے خبر ہے اور ان کے بارے میں کسی قسم کی پیشگوئی نہیں کرسکتا۔

ساتویں آیت میں پیغمبرؐ سے کہا جارہا ہے کہ وہ لوگوں کو بتادیں: میں اپنے سود وزیاں کا خود مالک نہیں ہوں اور اس بات کا اعتراف کریں کہ میں (سوائے اس کے جو خدا نے مجھے بتایا ہے) غیب کو نہیں جانتا کیونکہ اگر میں غیب جانتا تو زندگی میں مجھے کوئی مشکل درپیش نہ آتی

آپؐ نے یہ بات اس وقت کی جب اہل مکہ نے کہا: اگر آپ کا خدا سے رابطہ ہے تو آئندہ کے بارے میں اجناس کی گرانی اور ارزانی سے باخبر کیوں نہیں ہیں یا مختلف علاقوں کی خشک سالی اور پُرآبی کو کیوں نہیں جانتے تا کہ اس طرح سے آپ کو بہت بڑا منافع حاصل ہوتا؟ تو آپؐ نے جواب میں فرمایا: عالم الغیب تو بس خدا ہی ہے کہ جس کا علم بے انتہا اور ذاتی ہے۔

جب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خداوند عالم جن کے علم کی عظمت کے بارے میں فرماتا ہے "**وعلمك مالم تكن تعلم**" (سورہ نساء ۱۱۳) اس بات کا اعتراف کریں اور کہیں کہ (خداوند عالم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے اس کے علاوہ) میں اور غیب نہیں جانتا (جو میرے دائرہ حس سے باہر ہے) تو دوسرے لوگوں کا حال صاف ظاہر ہے

آٹھویں آیت میں مختلف حالات وشرائط کے تحت اولاد اور والدین کی وراثت کے بارے میں احکام صادر کرنے کے بعد فرماتا ہے حتّٰی کہ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہارے لیے زیادہ مفید ہے اور تمہارے اموال کا کون زیادہ مستحق ہے تا کہ اس کے لیے زیادہ حصہ مقرر کردیا؟

جی ہاں تم تو یہ جانتے کہ تمہاری اپنی بہتری کس بات میں ہے؟ اسی لیے تو میراث وغیرہ میں تم اپنے لیے صحیح طور پر اور شائستہ صورت میں قانون سازی نہیں کرسکتے تمہارا قانون ساز خدا ہی کو ہونا چاہیئے جو تمہاری ہستی کے تمام اسرار سے آگاہ ہے جی ہاں! انسان کا علم تو اس حد تک محدود ہے کہ وہ اپنے لیے ایسے قوانین بھی صحیح معنوں میں نہیں بتا سکتا جو اس کے اپنے مفادات کی حفاظت کرسکیں اسی لیے تو انسانی قوانین بوجہ انسانی علم کے ناقص ہونے کے جو اس کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں جب اپنی سرنوشت کے بارے میں انسان کے علم کی یہ حالت ہے تو موجودات عالم کے بارے میں اس کی حالت صاف ظاہر ہے!

اور آخر میں نویں اور آخری آیت جو خدا کے بے انتہا اور غیر متناہی علم کی نشاندہی کررہی ہے اور اس علم کے بے انتہا ہونے کو کہ جس کا تصور بڑے بڑے دانشوروں کے لیے بھی مشکل ہے اس قدر نہایت شیریں اور زیبا صورت میں ہے کہ جسے کم علم ہی نہیں بے علم بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلیں یوں بیان کررہی ہے اگر روئے زمین کے تمام درخت یعنی تمام باغات اور جنگلات کے تمام درخت کہ جن کی تعداد کھربوں سے بھی بڑھ جاتی ہے قلم بن جائیں (جبکہ ہر درخت سے لاکھوں بلکہ کروڑوں قلم تیار کیے جاسکتے ہیں) اور تمام دریا اور سمندر لکھنے کے لیے سیاہی بن جائیں (جبکہ ایک چھوٹے سے حوض سے لاکھوں دواتیں بھری جاسکتی ہیں) اور پھر فرشتے اور جن وانس سمیت تمام کائنات لکھنے والے بن جائیں اور ان قلموں اور دواتوں سے خدا کے علوم وکلمات لکھنا شروع کردیں پھر بھی اس بات پر قادر نہیں ہوں گے یہ سب قلم فرسودہ ہوکر ختم ہوجائیں گے سیاہیاں ختم ہوجائیں گی لیکن ابھی ان کلمات کا آغاز نہیں کرپائیں گے۔

یہ تو رہا ایک طرف دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ کلماتِ خداوندی سے مراد عالم ہستی کی یہ کل موجودات ہیں تو اس لحاظ سے مندرجہ بالا آیت اس کائنات کی بے انتہا وسعت اور اس کے مقابلے میں انسانی علم ودانش کی محدودیت پر روشن دلیل ہے۔

اس ساری بحث کا نتیجہ

مندرجہ بالا تمام آیات سے یہ نتیجہ بخوبی نکالا جا سکتا ہے کہ انسان کی معرفت اور شناخت اس کی اپنی ذات کی حد تک کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور انسان کی دانش اور اس کا علم روز بروز کتنا ہی کیوں نہ بڑھتا رہے ساری دنیا مدارس جامعات اور تحقیقاتی مراکز سے بھر کیوں نہ جائے پھر بھی اس کی معلومات کا حجم اس کی مجہولات کی نسبت ایسے ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں قطرہ؟ جب انسان اپنے خیر وشر کو نہیں جانتا اپنے سود وزیاں سے بے خبر ہے اپنے روح کے جوہر کو نہیں پہچانتا جو اس کے سب سے زیادہ قریب ہے اپنے کل کے حوادث اور اپنی موت کے لمحہ سے بے خبر ہے تو اس سے یہ انتظار کیونکر کی جا سکتی ہے کہ وہ دور دراز کے رستوں کی کہکشاؤں اور اس وسیع اور بے انتہا کائنات میں گزرنے والے حالات وواقعات سے آگاہ ہوگا!

اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہے کہ انسان شناخت ومعرفت سے عاجز ہے بلکہ اس لیے ہے کہ عالم ہستی بہت وسیع ہے بعض لوگ جو شناخت ومعرفت کا انکار کرتے ہیں شاید اس لیے ہے کہ علمِ بشر محدود اور اس کے بعض علوم غلطیوں سے آلودہ ہیں جس کی وجہ سے وہ خود شناخت کے مسئلہ کے بارے میں اشتباہ میں مبتلا ہو کر غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔

بہر حال قرآنِ مجید نے جس طرح معرفت کی راہیں سب لوگوں کے لیے بنا رکھی ہیں اور بڑی تاکید کے ساتھ انہیں اس کی دعوت دی ہے، اسی طرح انسانی علم کو محدود بھی بتایا ہے ایسی محدودیت جو انہیں اس جہان اور اس کے خالق کی عظمت اور انبیاء اور صاحبانِ وحی کی ضرورت کے اقرار واعتراف پر آمادہ کرے۔

اب ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی دعائے عرفہ کے اس مطالب بھرے جملہ پر ختم کرتے ہیں جو آپ نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کرتے ہوئے فرمایا:

"الھی انا الفقیر فی غنای
فکیف لا اکون فقیرا فی فقیری
الھی انا الجاھل فی علمی
فکیف لاا کون جھولا فی جھلی"

خداوندا! جب میں بے نیاز ہوتا ہوں تو پھر بھی میں سرتا پا فقر واحتیاج ہوتا ہوں تو پھر میں فقر کی حالت میں فقیر کیوں نہیں ہوں گا؟ خدوندا! میں عین علم ودانش کے ہوتے ہوئے بھی لاعلم ہوں تو پھر لاعلمی کی حالت میں میں لاعلم کیوں نہیں ہوں گا؟

۳۔انسانی علم کے محدود ہونے پر فلاسفہ اور دانشوروں کی گواہی

انسانی علم کے محدود ہونے پر دلیل اس قدر واضح ہے کہ زیادہ بحث کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی لیکن نکات ذیل کی طرف توجہ کرنے سے یہ اور زیادہ روشن ہوجائے گی۔

ا۔انسانی حواس کی قدرت محدود ہے، آنکھ جو کہ امور محسوسہ کی معرفت کا اہم ترین ذریعہ ہے اس میں دیکھنے کی محدود طاقت ہوتی ہے بسا اوقات زیادہ تیز بھی ہو تو چند کلومیٹر سے زیادہ فاصلے کو نہیں دیکھ پاتی۔اسی طرح جن رنگوں کا انسان مشاہدہ کرتا ہے وہ بھی بہت محدود ہیں کیونکہ بنفشی رنگ سے اوپر اور سُرخ رنگ سے نیچے بھی بہت سے رنگ ہوتے ہیں لیکن انسانی آنکھ انہیں دیکھنے پر قادر نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی کان ہر آواز کو نہیں سن پاتا صرف چند لہریں waves ہیں جو اس کے لیے قابلِ درک ہیں لیکن وہ ارتعاش ofsoundvibration جس کی viberation کی مقدار حد سے زیادہ یا حد سے کم قطعاً قابل سماعت نہیں ہوتا اسی طرح دوسرے حواس کی صورتِ حال ہے۔

ہم کرہ زمین میں عام حالت میں اس آنکھ سے آسمان پر صرف چند ہزار ستارے دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ آسمان پر کئی رب ستارے موجود ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ علمی ذرائع نے انسانی حواس کی قدرت میں اضافہ کر دیا ہے لیکن ان ذرائع کی قدرتِ دید اور قدرتِ ادراک بھی محدود ہے۔

۲۔ہمارے فکر وادراک کی قدرت بھی محدود ہے اس کے ماوراء جو کچھ بھی ہے ہمارے وہم وگمان کی نگاہوں سے مطلقاً پوشیدہ ہے حتٰی کہ نہایت گہری سوچ رکھنے والے لوگ بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔،

۳۔ادھر عالم ہستی (یہ کائنات) اس قدر وسیع ہے کہ اس کی وسعتیں ہمارے فکر وخیال میں نہیں سما سکتیں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انسانی علم ودانش کا دامن جس قدر پھیلتا جائے گا اس کی نگاہوں میں کائنات کی عظمت بڑھتی جائے گی۔

اس عالم کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے (جہاں تک کہ ہمارے فکر کی رسائی ہے) اس قدر کافی ہے کہ یہ جان لیں کہ ہمارا نظامِ شمسی اور وہ تمام ستارے جو ہمیں آسمان میں دکھائی دیتے ہیں ایک کہکشاں کا جزوی حصہ ہیں (کہکشاں یا ستاروں کے شہر ستاروں کا ایک عظیم مجموعہ ہیں جو اپنے ایک علیٰحدہ عالم کو تشکیل دیتے ہوئے ہیں) دانشوروں کے مطابق اس کہکشاں میں ایک سو بلین (سو ارب) سے زیادہ ستارے موجود ہیں ہمارا یہ سورج اپنی تمام عظمتوں اور وسعتوں سمیت اس کہکشاں کا ایک متوسط ستارہ ہے!!

اور انہی دانشوروں کے بقول کہ اب تک وہ مختلف ٹیلی سکوپوں اور کمپیوٹروں کے ذریعہ اندازہ لگا کر جو نتیجہ اخذ کر سکے ہیں وہ یہ ہے کہ

اس عالم میں کم از کم ایک ارب کہکشاں موجود ہیں۔ [1]

جی ہاں! ان اعداد کو زبان سے کہہ دینا کس قدر آسان لیکن ان کا تصور کس قدر مشکل ہے؟ لیکن یہ بات بھی فراموش نہ کریں کہ یہ سب عظیم کہکشائیں اور یہ بے شمار ستارے جو ہماری معلومات میں آئے ہیں ان سب کا محور عموماً ہمارا یہ کرۂ زمین ہے اور پھر یہ کہ ہم ان سب کو بھی اچھی طرح نہیں پہچان سکے۔

۴۔ چوتھی چیز ہم جس عالم میں رہ رہے ہیں اس کا ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی لیکن اب تک کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے کتنے ارب سال گزر چکے ہیں اور نہ ہی اس کے مستقبل کے بارے میں کسی کو علم ہے کہ کتنے ارب سال اس پر اور گزریں گے؟ اس کی مثال ایک زنجیر جیسی ہے کہ جو ازل سے موجود چلی آ رہی ہے اور ابد تک چلی جائے گی اور ہماری معلومات صرف اس کی ایک کڑی تک محدود ہیں جس میں ہم خود رہ رہے ہیں اور اس کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں ایک موہوم سائے سے زیادہ ہماری معلومات نہیں ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان نے فطرت کی آواز اپنے اندرونی عوامل کی بنا پر جس دن سے خود کو پہنچانا ہے اپنی جہد مسلسل اور سعی پیم کے تحت اپنی اور اس جہان کی معرفت کی زیادہ سے زیادہ تلاش میں لگا ہوا ہے اور ہزاروں سال کی مسلسل کوششوں سے جو معلومات حاصل کی ہیں وہ اس وقت دنیا بھر کی چھوٹی بڑی لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان لائبریریوں میں سے کچھ اس قدر عظیم ہیں کہ ان کی الماریوں کی مجموعی لمبائی ایک سو کلومیٹر تک جا پہنچتی ہے جیسے برطانوی عجائب گھر کی لائبریری british museum library اور بعض لائبریریوں میں موجود کتابوں کی تعداد ساٹھ لاکھ ہے (جیسے پیرس کی نیشنل لائبریری) اور بعض کی تعداد اڑھائی کروڑ ہے (جیسے مشہور امریکن لائبریری) جبکہ بعض اس قدر وسیع ہیں کہ صرف ان کی کتابوں کی فہرست سے ایک بہت بڑی لائبریری بن چکی ہے اور بذاتِ خود لائبریری ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر چکی ہے جس کے مختلف شعبوں تک پہنچنے کے لیے ٹرانسپورٹ کی ضرورت پیش آتی ہے۔

پھر بھی کائنات اور اس کے تخلیقی اسرار و رموز کے بارے میں انسانی معرفت اور معلومات ایسی ہیں جیسے ایک قطرہ کو بحر اوقیانوس سے نسبت ہوتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر کچھ دانشوروں کی گواہی کو بطور نمونہ پیش کیا جائے تا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں بطور مشتے نمونہ از خروارے۔

ا۔ مشہور ڈاکٹر اور ماہرِ نفسیات کورسی موریسن ''اپنی کتاب راز آفرینشِ انسان میں لکھتے ہیں:

''جب ہم غیر متناہی فضا کے بارے میں سوچتے ہیں اور زمانے کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں جن کی نہ ابتداء

---

[1] ''آیا؟ چگونہ؟ چرا'' نامی کتاب میں ہے، ''عصر حاضر کے ستارہ شناسوں ASTROLOGERS کا کہنا ہے کہ ہماری کہکشاں کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی بڑی کہکشائیں موجود ہیں۔ طاقتور ٹیلیسکوپوں اور کمپیوٹروں کی مدد سے ایسے ستارے موجود دکھائی دیتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم میں تقریباً ایک ارب کہکشاں ہیں۔''

کا پتہ ہے اور نہ انتہا کا علم ہے یا ایٹم atom کے اندر نہفتہ طاقت energey کے بارے میں غور وفکر سے کام لیتے ہیں یا بے حد وحساب ثوابت وسیار سے مزین کہکشانوں کے متعلق غور وفکر سے کام لیتے ہیں یا سیارات شعاعوں کی قدرت پر ذہن سے کام لیتے ہیں یا زمین کی کشش کے بارے میں سوچتے ہیں یا نظامِ عالم سے وابستہ دوسرے قوانین کے متعلق غور وفکر کرتے ہیں تو اپنے وجود کی حقارت اور اپنے علم کی کوتاہی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔''[1]

۲۔ڈاکٹر الکسیس کارل اپنی کتاب انسان موجود ناشناختہ میں لکھے ہیں:

''یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ جن جن علوم نے بھی انسان کے بارے میں مطالعہ کیا ہے اب تک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے اور ابھی تک ہماری اپنی ذات کے بارے نیں معرفت بھی بہت سے نقائص کی حامل ہے۔''[2]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کا نام انسان موجود ناشناختہ بھی اسی لیے رکھا ہے جب انسان کی اپنی ذات کے بارے میں شناخت ومعرفت اس حد تک محدود ہو تو دوسری کائنات کے بارے میں اس کی معرفت کا حال ظاہر ہے!

۳۔معروف دانشور ولیم جیمز کہتے ہیں:

''ہمارعلم ایک قطرہ کی مانند ہے اور ہماری جہالت ایک عظیم سمندر کی مانند۔''

۴۔مشہور ماہرِ فلکیات فلے مارئین لکھتے ہیں:

''میں تم سے دس سال تک مجہولات کے بارے میں سوال کرتا رہوں لیکن تم میرے کسی ایک بھی سوال کا جواب نہ دے سکو۔''[3]

۵۔وہ ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

''ہم سوچتے اور غور وفکر کرتے ہیں یہ فکر کیا چیز ہے؟ ہم چلتے ہیں تو عضلات (پٹھوں) کا یہ عمل کیسا ہے اسے کوئی بھی نہیں جانتا میں اپنے ارادے کو ایک غیر مادی طاقت سمجھتا ہوں لیکن جب میں ارادہ کرتا ہوں تو اپنے ہاتھ کو اوپر اٹھاتا ہوں دیکھتا ہوں کہ میرا غیر مادی ارادہ میرے مادی ہاتھ کو حرکت دیتا ہے تو یہ صورتِ حال کیسے وجود میں آتی ہے؟ میری عقلی طاقتوں کے درمیان وہ کون واسطہ ہے جو مادی نتیجہ دیتا ہے؟ آج تک کوئی بھی ایسا نہیں

---

[1] راز آفرینش انسان ص ۸۷

[2] انسان موجود ناشناختہ، ص ۵

[3] کتاب ''علی اطلال المذہب المادی'' ص ۱۳۸

جواس سوال کا جواب دے سکے۔''[1]

جب روزمرہ کے مسائل کے بارے میں ہماری معلومات اس حدتک ہوں تو پیچیدہ یا زمان ومکان کے لحاظ سے دورترین مسائل کے بارے میں ان کا حال صاف ظاہر ہے۔

٦۔نسبت اور بعد چہارم کے نظریہ کے موجد مشہور ومعروف ریاضی دان آئن سٹائن اپنی کتاب میں کہتے ہیں:

''اب تک ہم نے جو کچھ کتابِ طبیعت میں پڑھا ہے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ہم زبان طبیعت کیا اصولوں سے آشنا ہوئے ہیں.....لیکن اس کے باوجود بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو کتابیں پڑھی اور سمجھی جا چکی ہیں ابھی تک اسرارِ طبیعت کے مکمل طور پر حل کرنے سے کافی دور ہیں۔''[2]

ان تمام شہادتوں پر ایک اور جملہ کا اضافہ کرنا چاہئیے اور وہ یہ کہ:

''عجیب بات تو یہ ہے کہ جس قدر تازہ انکشافات ہوتے جاتے ہیں انسانی مجہولات کے حجم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے بالفاظ دیگر مختلف موضوعات میں دانشوروں کے نت نئے انکشافات تازہ لائبریریوں یا روئے زمین کے مختلف نقاط میں گراں قیمت دقینوں کی دریافت کی مانند ہیں۔''

ظاہر سی بات ہے کہ اگر ہم نے کسی شہر میں کوئی لائبریری دریافت کر لی یا کسی جنگل میں کسی دفینہ کو دریافت کر لیا تو ایک مجہول کو تو دریافت کر لیا لیکن اس کے ہزاروں مجہولات اور اکٹھا ہو گئے مثلًا کتابوں کی تعداد ان کے مطالب ان کے قلمکار اور دیگر بہت سی تفصیلات اور یہی حال دفینے کا ہے۔

زیادہ دور نہ جائیں جب میکروسکوپ کے ذریعہ دیکھی جانے والی چیزوں (جراثیم بیکٹر یا اور وائرس) کے جہان کی دریافت نہیں ہوتی تھی تو یہ سب چیزیں انسان کے لیے مکمل طور پر مجہول تھیں لیکن جونہی لوئی پاسچر luis pasteur نے اس سلسلے میں آگے قدم بڑھایا تو ہزاروں مجہولات کا ایک عظیم عالم اس کے آگے آ کھڑا ہوا۔

منظومہ شمسی یورینس نپچون اور پلوٹون اور تازہ کہکشانوں کی دریافت سب اسی قسم سے ہیں اس مقام پر پہنچ کر ہمیں نہایت ہی عاجزی سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تمام انسانی علوم ودانش ایک شمع کی روشنی کی مانند ہیں اور اس کائنات کے حقائق نورِ آفتاب کی مثل بلکہ اس سے بھی عظیم!

یہیں پر ہمیں مجبورًا کہنا پڑتا ہے "سبحانك لاعلم لنا الا ما علمتنا"

اس گفتگو کو ہم کائنات کے ایک عظیم قادر الکلام یعنی امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کے خطبہ اشباح کے ان الفاظ کے ساتھ ختم

---

[1] کتاب ''علی اطلال المذہب المادی'' ص ۱۳۸

[2] خلاصہ فلسفہ نسبیت

کرتے ہیں۔

"واعلم ان الراسخين فی العلم هم الذين اغناهم عن اقتحام السدد المضروبة دون الغيوب، الاقرار بجملة ماجهلوا تفسيره من الغيب المحجوب، فمدح الله تعالى اعترافهم بالعجز عن تناول مالم يحيطوا به علما، وسمى تركهم التعمق فيما لم يكلفهم البحث عن كنهه رسوخا فاقتصر على ذالك ولا تقدر عظمة الله سبحانه على قدر عقلك فتكون من الهالكين"

آگاہ رہو! راسخون فی العلم وہ لوگ ہیں جنہیں خداوند عالم نے ان سے چیزیں پوشیدہ ہیں ان کے اجمالی اقرار کے ساتھ مخفی اسرار میں دخل دینے سے بے نیاز کر دیا ہے اور خدا نے ن کی اس بات پر تعریف کی ہے کہ جس چیز کی تفسیر سے بے خبر ہیں اس کے بارے میں اپنے عجز اور ناتوانی کا اعتراف کرتے ہیں اور جو چیز ان کے ذمہ نہیں لگائی اس کے بارے میں غور وفکر اور بحث مباحث میں نہ پڑنے کا نام رسوخ کی لاعلم رکھا ہے (اور انہیں راسخون فی العلم کہا ہے) تو بھی اسی چیز پر اکتفا کر اور عظمتِ خداوندِ تعالیٰ کو اپنی عقل کے پیمانے پر جانچنے کی کوشش نہ کرورنہ ہلاک ہوجائے گا۔[1]

چند ضروری باتیں

انسان کا اپنے علم کی محدودیت کی طرف متوجہ ہونا مندرجہ ذیل مثبت آثار اور تعمیری نتائج کا حامل ہوتا ہے:

ا۔ علمی غرور کا سدِ باب:

ہم سب کو معلوم ہے کہ بنی نوع انسان نے علمی غرور کی بدولت بڑے بڑے نقصانات اٹھائے ہیں جس کا ایک نمونہ اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ میں ظاہر ہوا، جب وہاں پر سائنسی علوم کی ایسی لہر دوڑی کہ جس سے بعض دانشور اس قدر علمی غرور کا شکار ہو گئے کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ کائنات کے تمام اسرار ورموز کو حل کر چکے ہیں اسی بناء پر انہوں نے اپنی معلومات کے علاوہ باقی تمام چیزوں کا انکار کر دیا بلکہ بعض واقات تو وہ ان کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے حتیٰ کہ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جب تک ہم روح کو آپریشن تھیٹر میں لا کر اس کا نشتر کے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۹۱

ذریعہ آپریشن نہ کرلیں اسے نہیں مانیں گے اور یہ بھی کہا چونکہ خدا ہمارے حواس کے ذریعہ قابلِ ادراک نہیں ہے لہٰذا اس کا وجود ہی نہیں ہے۔

اس علمی غرور سے بہت سی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں جن کے دور کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ انسان اپنی مجہولات کے مقابلے میں اپنی معلومات کو حقیر اور ناچیز سمجھے جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں۔

یہ اسی واقعیت کی جانب توجہ کا نتیجہ ہے کہ ایک عظیم دانشور اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا نظر آتا ہے کہ میرا علم اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ میں جان گیا ہوں کہ کچھ بھی نہیں جانتا وہ اپنی معلومات کو صفر Zero اور مجہولات کو لامتناہی سمجھتا ہے۔

۲۔ تیز تر علمی حرکت:

اس حقیقت کی توجہ انسان کو عالم ہستی کے راز کھولنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تلاش وکوشش اور مخلصانہ جدوجہد اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے اس کی تلاش وکوشش میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے جب وہ اپنے سامنے شناخت ومعرفت کی راہیں کھلی دیکھتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ معلومات کے حصول میں کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

ظاہر سی بات ہے کہ جب تک انسان اپنے نقص کا احساس نہ کرے کمال کی جانب قدم نہیں اٹھا سکتا؟ جب تک درد کا احساس نہ کرے دوا کی تلاش میں نہیں نکلتا اسی لیے تو کہتے ہیں کہ درد کا احساس خدا کی ایک عظیم نعمت ہے اور بدترین بیماری وہ ہے جس کے ساتھ درد نہ ہو کیونکہ انسان اس سے اس وقت باخبر ہوتا ہے جب وہ اس کا خاتمہ کرچکی ہوتی ہے۔

انسانی معلومات کے ناچیز ہونے کی طرف توجہ کا انسان کے لیے یہ مثبت ردِعمل ہوتا ہے کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ تحقیقات پر آمادہ کرتی ہے اور قرآن نے انسانی علم کے ناقص ہونے کی بار بار جو تاکید کی ہے شاید اس کا ایک مقصد بھی یہی ہے۔

۳۔ بالاترین مبداء کی طرف توجہ: علمی نقص اور انسانی معلومات کی محدودیت کا احساس ہر انسان میں ایک اور مثبت اثر پیدا کرتا ہے کہ وہ چارو ناچار خود کو بالاترین مبداء کا محتاج سمجھتا ہے ایسا مبداء تمام کائنات کے اسرار ورموز جس کے سامنے واضح اور روشن ہیں اور یہی چیز اسے انبیاء کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور فوقِ انسانی ذرائع کی طرف توجہ کی راہیں اس کے لیے کھولتی ہے۔

بہرحال علمِ انسانی کی محدودیت کی طرف توجہ اس بات سے قطع نظر کہ وہ ایک حقیقت اور واقعیت ہے مثبت تربیتی آثار کی حامل بھی ہے۔

۲۔ معرفت کے منابع اور ذرائع

(معرفت کے چھ راستے)

احساس اور تجربہ

عقل و منطقی تجزیہ و تحلیل

مرتب اور غیر مرتب تاریخ

فطرت اور ضمیر

وحی اور خدائی پیام

کشف اور شہود

اشارہ

اب جبکہ شناخت اور معرفت تک رسائی کے امکانات اجمالی طور پر ثابت ہو چکے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ اب شناخت کے طریقوں یا بالفاظ دیگر ان منابع کو تلاش کریں جو ہمیں اس کائنات کی واقعیت سے باخبر کریں اور واقعیت کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ان معلمین سے مکمل طور پر استفادہ کریں کیونکہ معرفت کے ان منابع اور ذرائع میں سے ہر ایک ایسے معلّم کی حیثیت رکھتا ہے جو کائنات کے رازوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھاتا ہے

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس بارے میں قرآنِ پاک کیا کہتا ہے؟ کیونکہ ہماری بحث کا اصل محور وہی تفسیر موضوعی اور قرآنی تعلیمات کے بارے میں تحقیق کرنا ہے۔

قرآنِ مجید کی مختلف آیات جو سب کی سب اس آسمانی کتاب کے اندر مختلف مقامات پر موجود ہیں کے بارے میں ہم مکمل تحقیق سے اس واقعیت پر پہنچتے ہیں کہ قرآنی نقطہ نظر سے معرفت کے منابع اور ذرائع چھ ہیں۔

۱۔ احساس اور تجربہ (یا طبیت)۔

۲۔ عقل اور منطقی تجزیہ اور تحلیل۔

۳۔ مرتّب اور غیر مرتّب تاریخ

۴۔ فطرت اور ضمیر۔

۵۔ وحی اور خدائی پیغام۔

۶۔ کشف اور شہود۔

احساس اور تجربہ

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو سنتے ہیں۔

۱۔ اَفَلَمۡ یَنۡظُرُوۡۤا اِلَی السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ کَیۡفَ بَنَیۡنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ ۝۶ (سورہ ق ۶)

۲۔ اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ

(سورہ اعراف ۱۸۵)

۳۔ اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ۝۱۷ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ۝۱۸

وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾

(سورہ غاشیہ ۱۷ تا ۲۰)

۴۔ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ

(سورہ روم ۵۰)

۵۔ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ﴿۶﴾ (سورہ طارق ۵،۶)

۶۔ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ (عبس ۲۴ تا ۲۸)

۷۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۷﴾

(سورہ شعراء ۷)

۸۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ (سورہ الم سجدہ)

۹۔ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

(حٰمٓ سجدہ ۵۳)

۱۰۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ۛ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىْءٍۭ بَصِيْرٌ ﴿۱۹﴾ (سورہ ملک ۱۹)

۱۱۔ وَفِى الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

(سورہ ذاریات ۲۰،۲۱)

۱۲۔ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ (سورہ نحل ۷۸)

البتہ اس بارے میں قرآن مجید کی آیات فراواں ہیں اور مذکورہ بالا آیات اس سلسلہ کے مختلف واضح نمونے ہیں۔ [1]

ترجمہ

۱۔کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان ک طرف نظر نہیں کی کہ ہم نے اسے کیونکر بنایا اور ستاروں کے ذریعہ اسے کیسی زینت دی؟ اور اس میں کہیں بھی شگاف اور ناموزونیت نہیں۔

۲۔کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت کے بارہ میں اور جو کچھ کہ خدا نے پیدا کیا (غور وعبرت) کی نظر ڈالی؟

۳۔آیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا؟ آسمان کی طرف نگاہ نہیں کرتے کہ کیسے بلند کیا گیا؟ اور پہاڑ کیسے گاڑے گئے؟ اور زمین کہ کیسے بچھائی گئی؟

۴۔رحمتِ خداوندی کے آثار کو دیکھو کہ زمین کو اس کے مرنے کے بعد کیونکر زندہ کرتا ہے؟

۵۔انسان کو چاہیے کہ یہ دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ ایک ٹپکنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔

۶۔انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی غذا کیطرف نگاہ کرے ہم نے بہت سا پانی آسمان سے نیچے ڈالا پھر زمین کو شگافتہ کیا اور اس میں بہت سے دانے اُگائے اور انگور اور بہت سی سبزی کو۔

۷۔کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا، ہم نے اس میں کس حد تک نباتات کی قسمیں اگائیں؟

۸۔کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم خشک زمینوں کی طرف پانی کو چلاتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے کھیتیاں اُگاتے ہیں جس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی خوراک حاصل کرتے ہیں آیا وہ نہیں دیکھتے؟

۹۔ہم بہت جلد اپنی نشانیاں انہیں کائنات کے اطراف میں بھی اور ان کی اپنی جانوں میں بھی دکھائیں گے تاکہ ان کے لیے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔

۱۰۔آیا انہوں نے ان پرندوں کو نہیں دیکھا جو ان کے سروں کے اور پر اپنے پر کھولے ہوئے ہیں اور کبھی سمیٹ لیتے ہیں خداوندِ رحمان کے سوا کوئی اور انہیں آسمان کی بلندیوں میں نہیں روکتا کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

۱۱۔اور زمین میں یقین کے طلبگاروں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اپنے اندر (بھی نشانیاں ہیں) کیا تم نہیں دیکھتے؟

---

[1] اس بارے میں مندرجہ آیات کی طرف رجوع فرمائیں: سورہ اعراف ۱۸۵، یوسف ۱۰۹، روم ۹، غافر ۶، نحل ۷۹، شعرائ ۷، احقاف ۳۳، ملک ۱۹، یسین ۷۷، انعام ۶، نحل ۷۸، مومنون ۷۸، ق ۷، ۳، احقاف ۲۶، ہود ۲۴، غافر ۲۱، محمد ۱۰۔

۱۲۔اور خداوندِ عالم نے تمہیں ماؤں کے شکم سے باہر نکالا ہے جبکہ تم کچھ نہیں جانتے تھے لیکن تمہارے لیے کان، آنکھ اور عقل بنائے ہیں تا کہ تم اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

الفاظ کی تشریح

ملکوت کے بارے میں ''راغب'' مفرادات میں کہتے ہیں کہ یہ ملک کا مصدر ہے جس کے ساتھ ''ت'' کا اضافہ کیا گیا ہے اور صرف خدا کی مالکیت کے بارے میں ہی استعمال کیا گیا ہے اور مجمع البحرین اور لسان العرب ملکوت کے معنی عزت اور سلطنت ہیں بعض ارباب لغت یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی اصل ''مُلک'' (بروزن حُکم) ہے جس کے معنی حکومت اور مالکیت ہیں اور ''واؤ'' اور ''تا'' کا اضافہ تاکید اور مبالغہ کے لیے ہے۔

''قضب'' (بروزن جذب) کے بارے میں لسان العرب کا کہنا ہے کہ یہ دراصل قطع کے معنی میں ہے اور جیسا کہ بہت سے مفرین کہتے ہیں اس کے معنی وہ سبزیاں ہیں جنہیں مختلف باریوں میں چُنا جاتا ہے۔[1]

''جرز'' (بروزن شُتُر) کے معنی بے آب وگیاہ زمین کے وہیں یا وہ زمین جہاں پر گھاس نہیں اُگتی اور ''جرز'' (بروزن مرض) کے معنی کاٹنا ہے اور لسان العرب میں بعض اربابِ لغت سے منقول ہے کہ.....زمین اس زمین کو کہتے ہیں جس سے گھاس کاٹ لی گئی ہو یا جہاں بارشوں کا سلسلہ منقطع ہوجائے۔

''افئدہ'' جمع ہے فواد۔۔کی اور راغب کے بقول اس کے معنی قلب ہیں البتہ فواد اور قلب میں یہ فرق ہے کہ فواد ایسے دل کو کہتے ہیں جس میں روشنی اور چمک کی حالت پائی جاتی ہو اور یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ خداوندِ عالم نے ایسے دل کو اپنی نعمت میں شمار کیا ہے جو خود بھی روشن ہو اور دوسرے دلوں کو بھی روشن کرے۔یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ لسان العرب نے اس کلمہ کو فاد، (بروزن (عد) سے لیا ہے جس سے معنی بھُن کر پختہ ہوجانا ہے اسی لیے فود.....ان عقول کی طرف اشارہ ہے جن کے افکار پختہ ہوتے ہیں۔

تفسیر اور جمع بندی

پہلی آیت میں لوگوں کی توجہ آسمان، اس کی زیبائشوں اور آسمانی کروں کی بناوٹ کی طرف دلائی گئی ہے خصوصاً ان چیزوں میں ناموزونیت کی طرف ان کو توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ زیبا ہیں محکم ہیں منظم ہیں اور ہر قسم کے نقص وعیب سے خالی ہیں۔

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۲۰، ص ۱۶ ۳۱ اور مجمع البیان جلد ۱۰، ص ۴۰ ۴۴ اور ابن عباس سے منقول ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں ''قضب'' سے مراد وہ تازہ کھجوریں ہیں جنہیں درخت سے چنا جاتا ہے۔لیکن چونکہ بعد کی آیت میں اس کا ذکر علیحدہ صورت میں کیا گیا ہے اس لئے یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ ''قضب'' سے مراد بیل بوٹوں اور پودوں پر لگنے والے پھل ہیں جیسے کھیرا، ککڑی، تربوز اور خربوزہ وغیرہ یا نباتاتی ریشے ہیں، جیسے گاجر اور گوبھی وغیرہ۔

دوسری آیت میں دلوں کو بیدار کرنے اور توحید وخداشناسی کی راہ پر چلنے کے لیے تمام انسانوں کو زمین وآسمان کے نظام اور مخلوق خدا کے مشاہدہ کی دعوت دی گئی ہے اور تیسری آیت میں آسمان سے زمین کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور انسانوں کو دو چیزوں کی طرف توجہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے ایک تو اونٹ اور اس کے بہت سے عجائبات کی طرف (خاص کر ان لوگوں کو جو نزولِ قرآن کے ماحول میں رہ رہے تھے) اور دوسرے کرۂ زمین کی سطح (ہموار) ہونے کی طرف کہ جو انسانی زندگی کے قابل ہے اور مشاہدہ کو تمام مراحل میں معرفت کے ایک مؤثر منبع کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔

چوتھی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں بارش کے نزول اور مردہ زمینوں کے زندہ ہونے کی طرف متوجہ کراتے ہوئے فرماتا ہے رحمتِ خداوندی کے آثار کو دیکھو کہ کس طرح مُردہ زمین کو زندہ کرتا ہے!

پانچویں آیت میں انسان کا ذکر ہے اوخصوصی طور پر اس کے مبداءِ آفرینش کی نشاندہی کراتے ہوئے فرماتا ہے ہر انسان کو چاہیئے کہ یہ دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ اس ٹپکنے والے ناچیز پانی سے! اور یہاں پر بھی حّس اور مشاہدہ کو معرفت کا ذریعہ بنایا ہے۔

چھٹی آیت میں انسان کو حکم دیا جارہا ہے کہ ذرا آنکھوں کو کھول اور اپنی خوراک پر نظر ڈال کہ اس کی کیونکر پرورش کی گئی؟ اس پرورش کے لیے بارش کو نازل کیا گیا اور زمین کو شگافتہ کیا گیا ہے نباتات اور غلہ کے پودوں نے وہاں سے سر اٹھایا میوے نکلے اور کھانے کی سبزی نمودار ہوئی اگر تو اس کے ہر پتے کو غور سے دیکھے تو تجھے اس میں معرفت پروردگار کی ایک بہت بڑی کتاب نظر آئے۔

مندرجہ بالا چھ آیات نظر کو دعوت دے رہی ہیں جبکہ ان کے بعد کی پانچ آیات رؤیت کو اگرچہ یہ دونوں الفاظ بہت مقامات پر ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن جیسا کہ لغت کی بعض معروف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے نظر کے معنی کسی چیز کے مشاہدہ کے لیے آنکھ کو گردش دینا اور اس کے بارے میں غور وفکر کرنا ہے۔

جبکہ خود مشاہدہ کو رؤیت کہا جاتا ہے۔[1] البتہ کبھی ان دونوں الفاظ میں سے ہر ایک کو حسّی مشاہد کے معنی میں استعمال کیا ہے اور کبھی ذہنی اور فکری مشاہدہ کے معنی میں لیکن اس بات کو ضرور پیشِ نظر رکھا جائے کہ اس کے اصل معنی وہی حسّی مشاہدہ ہے۔

بہرحال ساتویں آیت میں کفار کو نباتات کی مختلف انواع کے مشاہدہ کی دعوت دی جارہی ہے جو روئے زمین کے کونے کونے پر جوڑے جوڑے کی صورت میں اُگتی ہیں۔

آٹھویں آیت میں ان (کفار) کو بادل کے ذرّات میں دریاؤں کے پانی کی حرکت کی کیفیت اور اس کے خشک اور ویران زمین پر برسنے کی نوعیت کے مشاہدہ کی دعوت دی جارہی ہے کہ اس پانی سے کس طرح مردہ زمینیں زندہ ہوتی ہیں اور سبزہ ونباتات اُگتی ہیں جن سے انسان بھی استفادہ کرتے ہیں اور چوپائے بھی۔

نویں آیت میں آفاق اور انفس کی آیات یعنی خدا کی وہ نشانیاں جو عالم اکبر یعنی کائنات میں اور عالم اصغر یعنی خود انسان کے وجود میں

---

[1] ''مفردات راغب'' اور ''لسان العرب'' مادہ ''نظر'' کی طرف رجوع کیا جائے۔

پائی جاتی ہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ہم یہ آیات مستقل طور پر اور مسلسل صورت میں انسانوں کو دکھاتے رہتے ہیں تا کہ وہ خدا کے وجود کو تسلیم کرلیں اور حق ان پر آشکار ہوجائے۔

دسویں آیت میں پرندوں کے مشاہدہ کی بات ہورہی ہے کہ کس طرح وہ ہمارے روں پر پرواز کرتے رہتے ہیں کبھی تو وہ اپنے پروں کو کھول لیتے ہیں اور کبھی بند کردیتے ہیں اور آسمان کی بلندیوں میں ان اپنے پروں کو کھولنا اور بند کرنا ہی انہیں اڑاتا رہتا ہے اور کشش ثقل کے قانون کے برعکس وہ خود کو آسانی کے ساتھ زمین وآسمان کے درمیان محفوظ رکھے ہوئے ہیں کبھی تو پروں کو کھول کر تیزی کے ساتھ پرواز کرتے ہیں گویا کوئی مخفی طاقت انہیں آگے بڑھارہی ہے اور کبھی پروں کو بند کرکے تیز پروازی میں مصروف ہوتے ہیں اور پھر یہ ہر ایک کی اپنی راہ ورسم ہے بناوٹ اور مخصوص شکال وصورت ہے اور ہر ایک کے اپنے وسائل زندگی اور طور وطریقے ہیں۔

گیارہویں آیت میں ایک بار پھر زمین کی آفرینش اور پھر خود انسانی وجود کی تخلیق کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ خود انسان کا اپنا وجود کتنا چھوٹا ہے لیکن اپنے اندر ایک عظیم اور چہل پہل سے لبریز دنیا لیے ہوئے ہے "افلا تبصرون" کے جملہ سے ان لوگوں کو سرزنش کی جارہی ہے جو آنکھیں تو رکھتے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی بھی ہوتی ہیں لیکن وہ ان آنکھوں سے واقعیات کو نہیں دیکھتے۔

(توجہ رہے کہ بصیرت کا مادہ بصر ہے جس کے معنی ہیں آنکھ یا آنکھ کی نگاہ باوجودیکہ وہ نظر اور رؤیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس سے مختلف ہے کیونکہ اس کا زیادہ تر دارومدار بینائی کے عضو اور اس کی طاقت پر ہوتا ہے اور ان دونوں الفاظ (نظر اور رویت) کی مانند کبھی اندرونی مشاہدہ اور غور وفکر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

اور آخر کا اس سلسلے کی آخری آیت کان آنکھ اور دل کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ شناخت ومعرفت کے تین اصل عوامل ہیں اور یہ شناخت ومعرفت کے لیے ایک اصل منبع کی حیثیت سے حسّ اور مشاہدہ کی روشن دلیل ہیں۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات میں جو زیادہ تر توحید اور خداشناسی کے بارے میں گفتگو کررہی ہیں اس راہ کو طے کرنے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ان انسانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ وہ ٹھیک طریقوں سے اپنی آنکھیں کھولیں اور کائنات کی ایک ایک چیز کی پیشانی پر اللہ کا نام غور سے دیکھیں ان کے عجائبات کا مطالعہ کریں ان پر حکم فرما صحیح نظاموں کا غور سے مشاہدہ کریں اور برہانِ نظم کے بعد صرف ذاتِ خدا ہی نہیں بلکہ اس کی توحید تدبیر قدرت اور اس کے لامتناہی علم کا ادراک بھی کریں۔

چونکہ اسلام میں سب سے اہم مسئلہ توحید اور خداشناسی کا مسئلہ ہے اور قرآنِ مجید میں اس کی اہم ترین دلیل برہانِ نظم ہے کا اہم ترین ماخذ ومنبع یہ کائنات اور اس کی آفرینش ہے اسی لیے قرآنی نقطہ نظر سے حسّ مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

نہ صرف خداشناسی کے مسئلے بلکہ معاد کا مسئلہ بھی قرآنِ مجید کے حسی مشاہدات سے کافی حد تک استفادہ کرتا ہے جو خداشناسی کے بعد دوسرا اہم مسئلہ ہے اور معاد کے مناظر کو قرآنِ مجید کی بہت سی آیات میں اس جہانِ طبیعت میں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے مجسم کرکے پیش کرتا

ہے بطورِ نمونہ سورہ ق کی آیت میں ۹ تا ۱۱ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ﴿۹﴾ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾

ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا تو اس سے باغات اور اناج اور لمبی لمبی کھجوروں کو اگایا جن کا بُور باہم گتھا ہوا ہوتا ہے (یہ سب کچھ) بندوں کو روزی دینے کے لیے (پیدا کیا) اور پانی سے ہی مردہ زمینوں کو زندہ کیا بروزِ قیامت مُردوں کا زندہ ہونا بھی اسی طرح ہے۔

اسی طرح ظلم وستم اور بدکاروں کے انجام وعاقبت کو واضح کرنے کے لیے لوگوں کو ظالموں کے باقی ماندہ آثار اور تباہ شدہ شہروں کے کھنڈرات کے مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے۔

یہ سب کچھ قرآن مجید کی طرف سے شناخت اور معرفت کے لیے حسّ اومشاہدہ سے استفادہ کرنے کی بہت بڑی تاکید ہے۔ (غور کیجئے گا)

چند توضیحات

فلاسفہ اور حسّ کا منبع:

بیرونی دنیا سے ہمارا آگاہ ہونا کن مراحل کو طے کرتا ہے اور کن راستوں سے ہمارے اندر داخل ہوتا ہے اس بارے میں فلاسفہ کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن دنیا کے اکثر فلاسفہ حسّ اور حسّی تجربہ کو شناخت اور معرفت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ سمجھتے ہیں ہر چند کہ ان کے مقابلے میں فلاسفہ کے دو اور گروہ بھی ہیں جو کہ افراد اور تفریط کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں۔

۱۔ ایک گروہ جسے حسّیون کہتے ہیں صرف حسّ ہی کو شناخت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور عقل وخرد کے دوسرے منابع کا انکار کرتے ہیں۔

یہ لوگ سترھویں صدی عیسوی کے بعد منصۂ شہود پر آئے ہیں اور قیاسِ عقلی کے برہان کا مکمل طور پر انکار کرتے ہیں اور تجرباتی طریقۂ کار ہی کو صحیح اور قابل اعتماد طریقہ کار سمجھتے ہیں اس گروہ کے نظریہ کے مطابق جو نظری اور عقلی تجربہ علم (سائنس) سے جدا ہو اس کی نہ تو کوئی بنیاد ہوتی ہے اور نہ ہی اساس اور علم حواس ہی سے حاصل ہوتا ہے اور حواس کا تعلق صرف ظاہر اور عوارض سے ہوتا ہے لہٰذا فلسفہ کے ابتدائی مسائل جو صرف نظری اور عقلی ہوتے ہیں اور ان کا تعلق غیر محسوس امور سے ہوتا ہے بے اعتبار اور بے بنیاد ہوتے ہیں اور انسان کے لیے اس قسم کے مسائل

نفی اوراثبات کے لحاظ سے نا قابلِ ادراک ہوتے ہیں۔[1]

مادہ پرست materialists اور بڑی حد تک کارل مارکس کی منطق کے پیروکار dialaictics بھی اس نظریے کے پکے طرفدار ہیں وہ کہتے ہیں:

''اگر خارجی اشیاء کی تاثیر کے تمام راستے channels ہمارے حواس سے منقطع ہوجائیں یعنی ان میں سے کوئی بھی کام نہ کرے تو ہمیں کسی بھی قسم کی معلومات حاصل نہ ہوں اور مغز انسانی ہر طرح کی گرمی سے عاجز آجائے لہٰذا خارجی واقعیات کی شناخت ناممکن ہے اس بناء پر ہر چیز کے معاملے میں ہماری شناخت اور فیصلے کی بنیادِ احساس بنابریں یہ کہنا چاہیئے کہ احساس ہی شناخت کا سرچشمہ اور تنہا سرچشمہ ہے۔''[2]

۲۔ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے جو حسّ اور تجربہ کا مکمل انکار کرتا ہے اور معرفت کے بارے میں اسے ذرہ بھر بھی اہمیت نہیں دیتا۔

''ڈکارٹ کہتے ہیں کہ جو مفاہیم پنجگانہ حواس کے ذریعہ خارج سے ہمارے ذہن میں داخل ہوتے ہیں ان کے بارے میں ہمیں کوئی اطمینان نہیں ہے کہ خارج میں ان کا کوئی مصداق بھی ہے اور اگر ہو بھی تو یہ یقین نہیں کہ ذہن میں موجود صورت خارجی امر کے مطابق بھی ہے۔''[3]

سیر حکمت در اروپا کے مصنف یہاں پر اس بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ:

''ڈکارٹ کا یہ نظریہ تھا کہ انسانی محسوست واقع کے مطابق نہیں ہیں وہ تو صرف عالم جسمانی کے ساتھ بدن کے رابطے کا ذریعہ ہیں اور ہمارے لیے عالم کی ایک ایسی تصویر بناتے ہیں جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی.....اس کا نظریہ تھا کہ فقط نظری مفاہیم ہی علم واقعی کی بنیاد ہیں۔''[4]

خلاصہ کلام اس گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ صرف معقولات ہی یقینی اور معرفت کی قدر و قیمت کے حامل ہیں اور تنہا محسوسات کی نہ تو کوئی عملی حیثیت ہے اور نہ ہی یقینی۔[5]

پہلا گروہ عقلِ نظری کی غلطیوں اور مسائلِ عقلی کے بارے میں دانشوروں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کا سہارا لیتا ہے جبکہ دوسرا گروہ حواس کی غلطیوں کا اور اس بارے میں انہوں نے صرف حسّ باصرہ (حس بینائی) کی بے شمار غلطیاں گنوا ڈالی ہیں جو ایک اہم

---

[1] اصول فلسفہ وروش اٹالیسم، جلد ا، ص ۶ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[2] ماترہ یسیم ودیالتیک (از نیک آئین) (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[3] سیر حکمت در اروپا، جلد ا، ص ۱۷۲ (تھوی سی تلخیص کے ساتھ)

[4] سیر حکمت در اروپا، جلد ا، ص ۱۷۲ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[5] اصول فلسفہ، جلد چہارم (ارزش معلومات)

ترین اور وسیع ترین انسانی حسّ ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ دونوں فریق ہی غلط فہمی کا شکار ہیں اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے یوں کہا جا سکتا ہے۔

رہا حسیّون کے بارے میں تو ان کا اہم ترین اشکال (غلط فہمی) چند نکات ہیں:

ا۔ موجوداتِ خارجی کے بارے میں ہمیں چند مسلسل جزئی حوادث کا سامنا ہے جس نے استدلال کے لیے کسی بھی صورت میں استفادہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ استدلال کے لیے کلّی قضیہ کو لیا جاتا ہے نہ کہ کسی جزئی واقعہ کو۔

اب یہیں پر ہمیں مجبوراً عقل کی ضرورت ہوتی ہے جو کئی جزئیات کو ملا کر ایک کلّی قاعدہ بناتی ہے مثلاً ہم مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں کہ پتھر عام قسم کے شیشے کو توڑ ڈالتا ہے یہ اور اس قسم کے دوسرے جزئی حوادث جو حسّ کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں عقل میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وہیں پر ایک کلّی قاعدہ تیار ہوتا ہے۔

یا مثلاً مختلف حالات اور مختلف زمان اور مکان کے تحت حاصل ہونے والے مختلف تجربات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ روشنی خطِ مستقیم کے ساتھ منتشر ہوتی ہے ہماری عقل ان جزئی حوداث سے ایک ایسا کلیہ قاعدہ بناتی ہے جو خارج میں بالکل موجود نہیں ہوتا اور جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کے مصداق ہوتے ہیں۔

بنابریں ہماری حِسّی معلومات ایسے خام مواد کی مانند ہوتی ہیں جو عقل کی آزمائش گاہوں laboratories میں جا کر یا تو تجزیہ ہوتے ہیں اور یا مرکب بنتے ہیں اور ان کے تجزیہ اور ترکیب سے کچھ عقلی کلّی مفاہیم حاصل ہوتے ہیں جن سے منطق اور استدلال کے لیے استفادہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ اس میں شک نہیں کہ حسّ میں بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں جن کی اصلاح کے لیے عقل سے استفادہ کرنا چاہیئے مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سڑک کے دونوں طرف کے درختوں کو ہماری حسّ متقاطع صورت میں دیکھتی ہے جو کہ دور جا کر آپس میں ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو یہ ایک غلط فہمی اور خطا ہے اور اس خطا کو دور کرنے کا معیار عقل ہے یعنی جب اسے عقل کے معیار پر جانچیں گے تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس خطا کی تشخیص کے لیے ہم اپنی حس پر بھی بھروسہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے بارہا اس شرک کو طے کیا ہے اور ہر مقام پر نزدیک سے درختوں کے باہمی فاصلے کو ایک جیسا دیکھا ہے لیکن یہ استدلال اس وقت زیادہ جان پیدا کر لیتا ہے جب ہم اجتماعِ نقیضین کو محال سمجھیں اور کہیں کہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ یہ درخت باہم متوازی بھی ہوں اور غیر متوازی بھی اور اگر ہم ان درختوں کو نزدیک سے متوازی دیکھتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر انہیں دور سے متقاطع دیکھتے ہیں تو غلط فہمی اور خطا ہے۔

اصولی طور پر اجتماعِ نقیضین کے محال ہونے کا مسئلہ جو صرف عقل و خرد ہی کے ذریعہ قابلِ فہم و ادراک ہے تمام استدلالات کی بنیاد ہے اسی لیے کوئی حِسّی دلیل عقل کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہے۔

۳۔ ان سب سے ہٹ کر ہماری حِسّ صرف اشیاء کی سطح کا ادراک کر سکتی ہے اور ہم ایک جسم سے صرف اس کی سطحوں کو دیکھتے ہیں اسی لیے اگر عقلی ادراکات کا یہاں پر عمل دخل نہ ہو تو حقیقت جسم کے متعلق بھی کوئی نتیجہ نکالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے یہاں پر یہ بات کہی جائے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تنہا حواس ہی مفید نہیں ہوتے اور تجرباتی علوم (سائنس وغیرہ) میں عقل کے حتی ادراکات کے تعاون اور امداد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام عقلی ادراکات حِسّ ہی کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں اور مشہور برطانوی فیلسوف جان لاک کے بقول عقل میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اس سے پہلے حِسّ میں موجود نہ ہو۔

یہ اس کا ایک یادگار جملہ ہے جو ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن ابتداء میں ایک بے نقش اور سفید لوح کی مانند ہوتا ہے جو حواس کے ذریعہ نقوش کو قبول کرتا ہے اور عقل کا کام صرف ان چیزوں کی تجرید یا تعمیم یا تجزیہ و ترکیب کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جو اس کے ذریعہ اس تک جا پہنچتی ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ ایسا کہنا بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ ہمارے اپنے وجود کا علم (جو ایک علم حضوری ہے) حواس کے ذریعہ قطعاً حاصل نہیں ہوا۔ اس طرح حواس اور فطری مسائل کے بارے میں بھی ہمارا علم حِسّ کے ذریعہ حاصل نہیں ہوا جیسے اجتماع نقیضین کے محال ہونے کا مسئلہ ہے اگر ہم کوئی بھی حسّ نہ رکھتے پھر بھی ہم سمجھ سکتے تھے کہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ ہم موجود بھی ہیں اور موجود نہ بھی ہوں۔ اسی طرح بہت سے دوسرے مسائل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم حِسّ سے بے نیاز ہیں۔

اس بارے میں اور بھی بہت سی مباحث ہیں جن پڑ جانے سے ہم اس کتاب کے اصل مقصد سے دُور ہو جائیں گے اور ہمارا مقصد یہ تھا کہ حیتون اور عقلیون کا نظریہ واضح ہو جائے جو ادراک کے منبع کو صرف ایک ہی پہلو تک محدود رکھتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی نظریہ قابلِ قبول نہیں ہے بلکہ حسّ اور عقل جداگانہ طور پر ادراک کا ایک ایک منبع ہیں اور یہی چیز قرآنِ مجید میں بخوبی واضح ہے۔

معرفت کا دوسرا منبع
عقل وخرد ہے

اشارہ

اس منبع کے بارے میں قرآنِ مجید کی بہت سی تعبیرات ملتی ہیں اور فرقانِ حمید کی بہت سی آیات تمام انسانوں کو شناخت اور معرفت کے لیے غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں معرفت کے اس اہم منبع کے لیے قرآنِ مجید میں جو تعبیرات ذکر کی گئی ہیں بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔عقل۔ ۲۔لُبّ (جس کی جمع الباب ہے۔) ۳۔فواد۔ ۴۔قلب۔ ۵۔نُھیٰ (بروزن ہُما)۔ ۶۔صدر۔ ۷۔روح۔ ۸ نفس۔

اس کے علاوہ عقل سے متعلق کاموں کے بارے میں کچھ اور تعبیرات بھی قرآنِ مجید میں موجود ہیں مثلاً

۹۔ذکر۔ ۱۰۔فکر۔ ۱۱۔فقہ ۱۲۔شعور۔ ۱۳۔بصیرت۔ ۱۴۔درایت۔

اب ہم مندرجہ بالا عنوانات میں سے ہر ایک کو آیاتِ قرآنی کی روشنی میں زیرِ بحث لاتے ہیں۔[1]

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو سنیے:

۱۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ (سورہ بقرہ، ۲۴۲)

۲۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ (سورہ آل عمران، ۱۹۰)

۳۔ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ (سورہ نحل، ۷۸)

---

[1] اس کے علاوہ قرآن مجید میں ادراک کے مراتب کے لیے کئی اور الفاظ بھی بیان ہوئے ہیں، مثلاً ظن، زعم، حسبان، یقین، علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ علم وادراک کے معمولی مرحلہ سے شروع ہو کر یقین کے آخر مرحلہ تک کے مراتب کو بیان کیا گیا ہے کہ حق الیقین کے بعد کوئی اور مرحلہ نہیں ہے۔

۴۔ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾ (سورہ ق، ۳۶ تا ۳۷)

۵۔ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾ (سورہ طٰہٰ ۵۴)

۶۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ (سورہ عنکبوت، ۴۹)

۷۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○

(سورہ حجر ۲۹، ص ۷۲)

۸۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ﴿۷﴾ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿۸﴾ (سورہ شمس ۷ تا ۸)

۹۔ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ (سورہ بقرہ ۲۲۱)

۱۰۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾ (سورہ انعام ۵۰)

۱۱۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ (سورہ انعام ۶۵)

۱۲۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ (سورہ بقرہ ۱۵۴)

۱۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ (سورہ اعراف ۲۰۱)

۱۴۔ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ (سورہ لقمان ۳۴)

ترجمہ

۱۔ اسی طرح خداوندِ عالم اپنی آیات کو تمہارے لیے بیان کرتا ہے تا کہ تم اپنی عقلوں سے کام لو اور سوچ بچار کرو۔

۲۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات ودن کے آنے جانے میں (خداوند عالم کی عظمت کی بہت بڑی) نشانیاں ہیں، صاحبانِ عقل کے لیے۔

۳۔ خداوند عالم نے تمہیں ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا جبکہ تم کچھ نہیں جانتے تھے، اور تمہارے لیے کان، آنکھ، اور عقل بنائی (تاکہ تم علم وآگاہی حاصل کرسکو) ہوسکتا ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

۴۔ کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کردیا وہ ایسی قومیں تھیں جو ان سے طاقت میں زیادہ تھیں اور اور شہروں (اور مُلکوں) کو فتح کیا، آیا کوئی راہِ فرار تھی؟ اس میں اُس کے لیے یاددہانی ہے جس کی عقل ہے، یا وہ کان دیتا ہے اور موجود ہوتا ہے۔

۵۔ ان میوہ جات اور نباتات سے تم خود بھی کھاؤ جو خدا نے بارش نازل کرکے زمین سے پیدا کیے ہیں اور اپنے جانوروں کو بھی ان سے کھلاؤ، اس میں عقلمند لوگوں کے لیے (اس کی عظمت کی) نشانیاں ہیں۔

۶۔ (یہ قرآن انسانی سوچ کی پیداوار نہیں) بلکہ روشن آیات ہیں جو صاحبانِ علم کے سینوں میں (محفوظ) ہیں۔

۷۔ جب میں نے آدمؑ کی تخلیق کو موزوں بنالیا اور اپنی روح اس میں پھونک دی تو تم اس کے لیے سجدہ میں گرجاؤ۔

۸۔ انسان کی روح اور جان کی قسم، اور اس کی قسم جس نے اسے موزوں بنایا، اور پھر اسے اس کے گناہ اور تقویٰ (خیروشر) کی راہیں اسے سمجھادیں۔

۹۔ خداوندِ عالم اپنی آیات کو لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں (غوروفکر کریں اور سیدھی راہ پر آجائیں)

۱۰۔ کہہ دیجئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا (نادان اور دانا) یکساں ہیں؟ آیا تم سوچتے نہیں؟

۱۱۔ دیکھئے تو ہم اپنی آیات کو مختلف تعبیروں کے ساتھ ان کے لیے کیونکر بیان کرتے ہیں، شاید کہ وہ سمجھ جائیں۔

۱۲۔ اور جو لوگ راہ خدا میں مارے جاتے ہیں انہیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور تم نہیں سمجھتے۔

۱۳۔ متّقی لوگ جب شیطانی وسوسوں میں پھنس جاتے ہیں (تو خدا کی) یاد میں پڑ جاتے ہیں اور بینا ہو جاتے ہیں۔

۱۴۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا؟ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا؟ (صرف خداوندِ عالم، عالم اور آگاہ ہے)

الفاظ کے معانی

مفردات میں راغب کے بقول عقل دراصل عقال سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں وہ رسی جس سے اونٹ کے پاؤں کو باندھا جاتا ہے تاکہ وہ چل پھر نہ سکے چونکہ خِرد کی طاقت انسان کو ناروا اور ناپسندیدہ کاموں سے روکتی ہے اسی لیے اس پر عقل کا اطلاق ہوتا ہے صحاح اور دوسری لغوی کتابوں میں عقل کی حجر اور منع سے تفسیر کی گئی ہے اور قاموس جیسی دوسری کتابوں میں اس کا یوں معنی کیا گیا ہے کہ اشیاء کے حُسن وقبح اور کمال اور نقصان جیسی صفات کا علم عقل کہلاتا ہے اور مجمع البحرین میں عاقل کی یوں تفسیر کی گئی ہے عاقل وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے نفس کو کنٹرول کرے اور ہوا وہوس سے باز رکھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل بنیاد وہی روکنا اور باز رکھنا ہے لہٰذا جب کسی کی زبان بند ہو جاتی ے تو عرب کہتے ہیں "اعتقل لسانه" اور دیت کو بھی عقل کہتے ہیں کیونکہ وہ مزید خونریزی سے روکتی ہے اوعقیلہ اس عورت کو کہتے ہیں جو عفت حجاب اور پاکدامنی کی حامل ہو۔

کتاب العین میں خلیل بن احمد بقول عقل قلعہ کو بھی کہتے ہیں

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں منع اور باز رکھنے کا مفہوم ان تمام معانی میں پایا جاتا ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل بنیاد وہی منع کرنا ہی ہے۔

''لُب'' اور ''لباب'' کے بارے میں بہت سے اربابِ لُغت کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ہر چیز کا خالص اور برگزیدہ ہونا اسی لیے عقل وخرد کے بلندترین مرحلہ کو بھی لُب کہتے ہیں اسی لیے ہر لُب عقل ہے لیکن ہر عقل لُب نہیں ہے کیونکہ عقل کا لُب اس کے عالی ترین اوخالص ترین مرحلہ پر ہوتا ہے اسی لیے قرآنِ مجید میں کچھ مسائل کو اولوالالباب کی طرف نسبت دی گئی ہے جن کو عالی ترین مرحلہ کی عقول ہی درک کرسکتی ہیں اور بہت سے میوہ جات کے مغز کو بھی لُب کہتے ہیں کیونکہ وہ چھلکے سے خالص ہوتے ہیں۔[1]

"فؤاد" جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں "فأد" (بروزن وعد) کے مادہ سے ہے جو دراصل روٹی کو گرم راکھ یا ریت پر رکھنے کے معنی میں ہے تاکہ روٹی خوب پک جائے اسی طرح گوشت کے پکانے اور بھوننے کو بھی فأد کہتے ہیں۔[2]

اسی لیے جب عقل پختگی کے مراحل کو پہنچ جاتی ہے تو اسے فواد کہتے ہیں جس کی جمع "افئدة" ہے۔

''راغب'' مفردات میں کہتے ہیں کہ ''فواد'' بمعنی دل ہے اس اضافہ کے ساتھ کہ اس میں چمک اور دمک کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

"قلب" جیسا کہ ''قاموس'' مفردات ''العین'' اور ''لسان العرب'' میں آیا ہے دراصل کسی چیز کو دگرگوں کرنے کے معنی میں ہے اور عام طور پر دو معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے ایک تو اس عضو کو کہتے ہیں جو تمام بدن میں خون پہنچانے کا ذریعہ ہے اور دوسرے روح، عقل،

---

[1] لسان العرب، مفردات اور مجمع البحرین

[2] لسان العرب، تاج العروس اور مفردات راغب

علم، فہم، اور شعور پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ قلب خواہ جسمانی ہو یا روحانی ہمیشہ دگرگونی، تبدیلی اور حرکت کی حالت میں رہتا ہے جیسا کہ کسی صاحبِ لُغت نے کہا ہے:

ماسمی القلب الامن تقلبه

والرأی یصرف بالانسان اطوارا

قلب کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور انسان کی رائے اور عقیدہ کو مختلف اشکال میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

ضمنی طور پر ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہر چیز کے مرکز اور مغز کو بھی قلب کہتے ہیں مثلاً قلبِ لشکر، کیونکہ انسان کا قلب اس کے جسم و جان کا مرکز ہوتا ہے۔ اور کتاب ''قاموس'' میں بھی آیا ہے کہ ہر چیز کے خالص کو اس کا قلب کہا جاتا ہے۔

''نہی'' (بروزن ہما) بمعنی ''عقل'' کے ہے اور ''نہی'' (بروزن سعی) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز سے روکنا اور باز رکھنا اور بہت سے ارباب لُغت (جیسے مفرداتِ راغب، مجمع البحرین لسان العرب اور شرح قاموس) نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نُھیٰ کو اس سبب نُھیٰ کہتے ہیں کہ وہ انسان کی عقل کو بُری اور ناپسندیدہ چیزوں سے روکتی اور باز رکھتی ہے۔

''صدر'' دراصل سینہ کے معنی میں ہے پھر اس کا طلاق ہر چیز کے اگلے اور بالائی حصے پر ہونے لگا ہے جیسے صدر مجلس، مجلس کے بالائی حصے کو، صدرِ کلام، گفتگو کے آغاز کو، اور صدرِ نہار، دن کے اول حصّے کو کہتے ہیں ملاحظہ ہو قاموس، (مفردات اور لسان العرب)۔

لیکن بعض لغات سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اس کا اصل معنی وہی ہر چیز کا اگلا حصہ اور آغاز ہے۔

لیکن چونکہ انسانی عقل اس کے وجود کے اہم اور اعلیٰ حصے پر مشتمل ہے لہٰذا اسے صدر کہتے ہیں خاص کر جبکہ جسمانی بلب سینہ کے درمیان میں واقع ہوتا ہے اور ہم بعد میں بتائیں گے کہ بہت سی عقلی اور روحی تبدیلیوں کا تعلق اسی جسمانی قلب کے ساتھ ہوتا ہے۔

''روح'' کا اصل معنی تو تنفس یعنی سانس لینا ہے۔ لیکن چونکہ سانس لینے اور حیات کی بقا کے درمیان قریبی رابطہ ہوتا ہے لہٰذا اس (روح) کا اطلاق انسان کی جان اور اس کے عقل و فہم کے مرکز پر بھی ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے یہ تصریح کی ہے کہ ''روح'' اور ''ریح'' یعنی ہوا، دونوں ایک معنی سے مشتق ہیں اور اگر انسانی روح، جو کہ ایک مستقل اور مجرّد گوہر ہے کو ''روح'' کہا جاتا ہے تو اس لیے کہ وہ بھی ہوا کی مانند متحرک ہے زندگی کی موجد ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔

''نفس'' مفردات ''لسان العرب'' قاموس العین اور دوسری کتابوں کے بقول ''روح'' کے معنی میں ہے جو انسانی ادراکات کا مرکز ہوتی ہے۔ البتہ قرآن مجید میں نفس کے کئی مراحل ذکر کیے گئے ہیں مثلاً نفسِ امارہ یعنی وہ سرکش روح جو انسان کو برائیوں اور گناہوں کی ترغیب دلاتی ہے نفس لوامہ یعنی جو روح گناہوں سے آلودہ ہونے کے بعد پشیمان ہو جاتی ہے اور اپنی ملامت اور سرزنش پر اُتر آتی ہے، اور فارسی میں جسے ''وجدان'' (اور اردو میں ''ضمیر'') کہتے ہیں اور نفس مطمئنہ وہ روح ہوتی ہے جو مکمل طور پر اپنی خواہشات اور شہوات پر مسلط ہوتی ہے اور

سکون واطمینان کے مرحلہ پر پہنچ چکی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا تمام گفتگو سے مجموعی طور پر جو چیز بخوبی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں عقل وخرد کے بارے میں گوناگوں تغییرات موجود ہیں جو اس نفسانی گوہر کے اپنے اپنے مخصوص پہلوؤں اور طریقۂ کار کی نشاندہی کرتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان میں سے ہر ایک کلمہ انسان کی عقل وخرد کے کسی نہ کسی مخصوص پہلو سے مربوط ہے۔

کیونکہ خدا کی مخفی اور مرموز طاقت انسان کو برائیوں سے باز رکھتی ہے لہٰذا اسے ''عقل'' اور ''نُہیٰ'' کہتے ہیں۔

کیونکہ وہ ہمیشہ تبدیلی کی حالت میں رہتی ہے لہٰذا اسے ''قلب'' کہتے ہیں۔

کیونکہ وہ انسانی جسم کے بالائی حصہ میں ہوتی ہے لہٰذا اسے ''صدر'' کہتے ہیں۔

کیونکہ حیات وزندگی سے اس کا قریبی تعلق ہوتا ہے لہٰذا اسے ''روح'' اور ''نفس'' کہتے ہیں۔

اور جب وہ خلوص کے مرحلہ کو پہنچ جاتی ہے، اس وقت اسے ''لُبّ'' کہتے ہیں۔

انجام کار جب وہ پختہ ہوجاتی ہے تو اس پر فؤاد کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس بیان سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان مختلف اور گوناگوں الفاظ کے انداز اور طریقۂ کار کسی حساب کتاب کے بغیر نہیں ہوتے ہیں لہٰذا ہر اس مطلب کے ہم آہنگ ہوتے ہیں جو کسی آیت میں بیان کیا گیا ہے اور یہ قرآنِ مجید کے عجائبات میں سے ایک ہے جس سے انسان تفسیرِ موضوعی کی تحقیقات کے ضمن میں باخبر ہوتا ہے۔

عقل کے افعال

''**ذکر**'' جس کا نقطہ مقابل ''نسیان'' ہے اور ''مفردات'' میں ''راغب'' کے بقول ایسی حالت کا نام ہے جو انسان کو یہ امکان دیتی ہے کہ جن معارف کو اس نے دریافت کیا ہے انہیں محفوظ رکھے اور بوقت ضرورت انہیں ذہن میں حاضر کرے اور یہ معنی کبھی تو ''قلب'' کے ذریعہ اور کبھی ''زبان'' کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

''**فکر**'' کا معنی سوچنا اور عقل کا سرگرم رہنا ہے اور راغب کے بقول ایسی طاقت ہے جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے اور بعض فلاسفہ کے بقول غور وفکر دو حرکتوں سے مرکب ہے ایک حرکت تو ہر مطلب کے مقدمات کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری حرکت ان مقدمات سے نتائج کی طرف لے جاتی ہے اور یہ دونوں حرکتیں جو اشیاء کی شناخت اور معرفت کا سبب بنتی ہیں ''فکر'' کہلاتی ہیں۔

''**فقہ**'' یا تو اس کا معنی مطلقاً ''فہم'' ہے جیسا کہ ''لسان العرب'' میں آیا ہے لیکن ''مفردات'' کے بقول ''فقہ'' نام ہے حاضر اور موجود مطالب کی معاونت سے مخفی اور پنہاں مطالب سے آگاہی کا تو اس لحاظ سے فقہ وہ علم ہے جو دلائل کے ذریعہ حاصل ہو۔ (البتہ اصطلاحی معنی میں فقہ اسلامی احکام کے علم کا نام ہے)

شعور جیسا کہ صاحبِ ''قاموس'' ''لسان العرب'' اور مقابیس اللغۃ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی علم اور آگاہی ہیں لیکن راغب نے

''مفردات'' میں اس کے معنی ''احساس'' ذکر کیے ہیں لہٰذا اگر اس کے معنی اندرونی احساس ہیں تو اس کا دوسرے ارباب لغت سے چنداں تفاوت نہیں ہوگا۔ اور قرآنِ مجید کی بہت سی آیات میں بھی اس معنی (علم) میں استعمال ہوا ہے، ہر چند کہ بعض دوسری آیات میں بیرونی معنی بھی احساس کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بصیرت ''بصرہ'' سے لیا گیا ہے جو بقول راغب تین معانی کے لیے آتا ہے خود ''چشم'' ''چشم کی طاقت'' اور ادراک وعلم کی قوت۔ بعض دوسرے اربابِ لغت نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی علم ہیں خواہ مشاہدہ حسّی سے حاصل ہو خواہ علم وعقل کے ذرائع سے۔[1] بصیرت کا لفظ خصوصی طور پر قلبی ادراک اور علم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے لسان العرب میں آیا ہے کہ، بصیرت کے معنی قلبی عقیدہ، ہیں اور بعض نے ہوش اور ذکاوت کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

قرانی آیات میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے "**قل هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة**" یعنی کہہ دیجئے یہ میرا راستہ ہے کہ میں خدا کی طرف پوری آگاہی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں۔ (سورہ یوسف ۱۰۸)[2]

درایت، معنی مطلقاً علم وآگاہی ہے یا بمعنی مخفی اور پنہاں مسائل میں علمِ آگاہی ہے اور ہوشیاری کے معنی میں بھی آیا ہے مقابیس اللغۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی کسی چیز کی طرف توجہ ہیں بعد میں کسی چیز سے آگاہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے قرآنِ مجید میں بھی کئی مقامات پر علم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس بارے میں جو کچھ ہم بتا چکے ہیں اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو الفاظ عقل وخرد کے کام کے لیے استعمال ہوئے ہیں اور، علم وادراک کے معنی دیتے ہیں گونا گون اور کئی اقسام پر مشتمل ہیں جن میں سے ہر ایک علم کے کسی نہ کسی مخصوص پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ہر مناسب موقع پ استعمال ہوا ہے۔

جہاں پر علمی موشگافیوں کی بات مقصود ہوتی ے وہاں پر درایت جہاں پر تجزیہ وتحلیل کی بات پیشِ نظر ہوتی ہے وہاں پر فکر'' اور جہاں پر ایک محسوس امر کے ذریعہ کسی مخفی امر کی آگاہی منظور ہوتی ہے وہ پر فقہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور جہاں پر حفظ اور یادآوری کے ساتھ علم وآگاہی مقصود ہوتی ہے وہاں پر ذکر کا کلمہ استعمال ہوا ہے اسی طرح:

ہر سخ موقعی و ہر نقطہ مقامی دارد

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں عقل کے کام کے بارے میں جو تعبیرات بیان ہوئی ہیں ان کے بھی مراتب ہیں اور مرحلہ وار ذکر ہوئی ہیں جو شعور، یعنی عام سے ادراک کے معنی سے شروع ہو کر، فقہ پر جا ختم ہوتی ہیں جو آشکار مسائل کے ذریعہ مخفی مسائل کے ادارک کا نام

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم مادہ ''بصر''

[2] منجملہ اس کے اور آیات بھی ہیں جن میں یہ معنی مراد لیے گئے ہیں، مثلاً سورہ قیامت ۱۴، سورۂ انعام ۱۰۴، سورہ اعراف ۲۰۳، سورہ اسرأ ۱۰۲۔

ہے اس کے بعد فکر کا مرحلہ جو حقائق کے تجزیہ و تحلیل کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد، ذکر یعنی حفظ اور یادآوری کا مرحلہ ہے، اس سے بالاتر نہی، یعنی عمیق حقائق کے ادراک کا مرحلہ ہے اس سے بالاتر بصیرت یعنی عمیق دانش وبینش کا مرحلہ ہے اور اسے کہتے ہیں فصاحت اور بلاغت۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

عقل کا قرآنی معیار:

زیر بحث سے سے پہلی آیت یہ بتا رہی ہے کہ آیاتِ الٰہی کے نزول کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگ عقل وفکر سے کام لیں، اس قسم کے مقامات پر لعلّ کا ذکر جو ہدف کو بیان کرنے کے لیے ہے، اس حقیقت کا آشکار کر رہا ہے۔

کچھ دوسری قرآنی آیات اس مطلب کو کچھ اور آگے لے جاتی ہیں اور تہدید آمیز لہجہ میں ان لوگوں کا مواخذہ کر رہی ہیں جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے اور کہتی "افلا تعقلون"[1]

کچھ اور آیات میں اسی چیز کو جملہ شرطیہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "قد بینا لکم الایت ان کنتم تعقلون" (اور ہم نے تمہارے لیے آیات کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اگر تم عقل سے کام لو)۔ (آل عمران ۱۱۸)

یہ تین مختلف تعبیریں (لعلکم تعقلون۔ افلا تعقلون اور ان کنتم تعقلون) اس حقیقت کی بخوبی نشاندہی کر رہی ہیں کہ خداوندِ عالم نے عقل سے کام لینے کی طاقت کو انسان کے اختیار میں دے دیا ہے تا کہ وہ واقعیت کو درک کرنے کے لیے اس سے استفادہ کرے۔ اگر استفادہ نہیں کرے گا تو وہ ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیوں کا مستحق ہوگا۔

دوسری آیت میں زمین وآسمان کی تخلیق اور رات دن کے آنے جانے میں خدا کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ان آیات کا ادراک "اولو الالباب" کے لیے میسر ہے۔

جب کہ ہم الفاظ کی تشریح میں بتا چکے ہیں کہ "اولو الالباب" ایسے دانشور لوگ ہوتے ہیں جن کے افکار وعقول خلوص کے مرحلہ تک پہنچ چکے ہیں اور ہر قسم کے شائبوں اور اوہام سے پاک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی نظامِ آفرینش کی باریکیوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان کے ماوراء میں خدا کے جمالِ دل آرا کی زیارت کرتے ہیں اور یہ چیز بذاتِ خود حق کی معرفت کے ذرائع کے لیے عقل وخرد کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

تیسری آیت میں انسان کے شکم مادر سے باہر آنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد شناخت ومعرفت کے اوزار ووسائل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب انسان شکمِ مادر سے باہر آیا تھا تو اس وقت کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ سب سے پہلے، سمع (سننے کی طاقت) ہے جس

---

[1] آل عمران ۶۵، انعام ۳۲، اعراف ۱۶۹، یونس ۱۶، ہود ۵۱، یوسف ۱۰۹، انبیاء ۱۰، ۶۷، قصص ۶۰، صافات ۱۳۸

کے ذریعہ وہ علوم نقلی اور دوسروں کے تجربوں کو سنتا ہے۔ پھر بینائی کی طاقت ہے جس کے ذریعہ وہ حسّی امور اور مشاہدہ کے قابل اشیاء کو مادر گیتی میں دیکھتا ہے پرافندہ (دل اور عقل وخرد) ہے جس کے ذریعہ وہ ماوراحس حقائق وواقعات کا ادراک کرتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فواد پختہ عقل کو کہتے ہیں جو، عقل، کے مفہوم سے ایک درجہ بلند تر ہے۔

چوتھی آیت میں پہلے تو ان اقوام کی سرگزشت بیان کی گئی ہے جو ان لوگوں سے پہلے کرہِ ارض پر رہتی تھیں اور طغیان، سرکشی اور فتنہ وفساد کی وجہ سے نابود ہوگئیں اور ان کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پھر فرماتا ہے، ان کی سرگزشت اور انجام بیداری اور یادآوری کا سبب ہے، ان لوگوں کے لیے جو قلب (عقل) اور سننے والے کان رکھتے ہیں۔

پانچویں آیت میں بنجر اور مردہ زمینوں کے زندہ ہونے کا تذکرہ ہے اور نباتات کے اُگنے کا جو انسانوں اور چوپایوں کی غذا ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں میں ان لوگوں کے لیے خدا کی نشانیاں ہیں جو صاحبانِ نُھیٰ ہیں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں نہیٰ (بروزن شما) عقل کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو برائیوں اور غلط کاموں سے روکتی ہے۔

چھٹی آیت میں قران مجید کی باعظمت اور واضح آیات کے اشارہ کے بعد ارشاد فرماتا ہے یہ ان لوگوں کے سینہ میں ہیں جنہیں علم ودانش عطا کی گئی ہے.....جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں صدر، (سینہ) ہر چیز کے اگلے اور بالائی حصے کو کہتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عقل کا گوہر، شناخت ومعرفت کے اہم ترین منابع میں سے ہے اور انسانی وجود کے بالاترین حصے پر مشتمل ہے۔

ساتویں آیت میں حضرت آدمؑ کے مٹی سے پیدا کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے جب اس کی خلقت موزوں ہوگئی اور میں نے اس میں اپنی روح پھونک دی تو اے فرشتو! تم اس کی عظمت کے لیے سجدہ ریز ہوجاؤ۔

یہ الٰہی روح وہی گوہرِ عقل ہے جو اپنی اہمیت کے پیشِ نظر کی طرف منسوب ہے اور جسے اس کی طرف اضافت دی گئی ہے (اس اضافت کو اضافت تشریفی کہتے ہیں) وگرنہ نہ تو خدا کی روح ہے اور نہ ہی اس کا جسم ہے۔ اور یہ روحِ الٰہی ہی تھی جس کی خاطر تمام ملائکہ مقربین اور بارگاہِ حق کے باعظمت فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے حکم ملا، وگرنہ مٹی اور گارا اس اہمیت کا حامل نہیں تھا کہ اسے ایسے ایسے باعظمت فرشتے سجدہ کریں، اور یہ عقل وخرد کی اہمیت کے لیے ایک اہم تاکید ہے۔

آٹھویں آیت میں انسانی نفس (روح اور عقل) اور نفس کے خالق کی قسم اٹھائی گئی ہے اور پھر ارشاد ہوتا ہے، جب خداوندِ عالم نے اس روح کو پیدا کر دیا اور موزوں بنا دیا تو فجور اور تقویٰ کے (ٹیڑے اور سیدھے) راستے اسے (نفس کو) الہام کر دیئے، جو بذاتِ خود انسان کے فطری ادراکات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ روزِ اوّل ہی سے الٰہی تعلیمات کے طریقہ سے اس کی جان کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں۔

یہ تھا جوہرِ عقل وخرد کے بارے میں آٹھ مختلف عنوانات کا مجموعہ جسے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ اور شناخت کے اس منبع کی اہمیت کو اس کے مختلف پہلوؤں سے واضح کرتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اور قرآنی آیات کے چند نمونے ذکر ہوئے ہیں خود جوہرِ عقل کے بارے میں تھیں۔ لیکن اس کی فعالیت اور طریقۂ کار کے بارے میں بھی قرآن مجید میں متعدد تعبیرات بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک اس کے کسی نہ کسی پہلو اور زاویے کو روشن کرتی

ہیں اوران کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے۔

زیرِ بحث آیت میں سے نویں آیت میں "تذکر" کی گفتگو ہورہی ہے۔ارشاد ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم اپنی آیات کو لوگوں کے لیے اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ یادآوری کریں،تذکرہ کے معنی حفظ اور یادآوری ہیں جو عقل کے اہم ترین کاموں میں سے ایک ہے۔اگر یہ نہ ہوتا تو انسان اپنے علوم سے کچھ بھی حاصل نہ کرسکتا۔

یہاں پر ہم ایک بار پھر قرآن مجید میں مختلف تعبیرات دیکھتے ہیں۔کہیں پر تو ہر مطلب کو مذکورہ بالا آیت کی مانند لعلّ کے جملہ سے بیان کرتا ہے جو اس قسم کے مقامات پر مقصد کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کہیں پر سرزنش اور جھڑکی کی صورت میں ارشاد فرماتا ہے "افلا تتذکرون"[1]

اور کہیں پر ان لوگوں کو سرزنش کی جارہی ہے جو اپنی عقلوں کو کام میں نہیں لاتے اور حقائق کی یادآوری نہیں کرتے "قلیلا ماتذکرون"۔[2]

دسویں آیت میں تفکر کی بات ہورہی ہے۔پہلے ایک استفہام انکاری کے ساتھ پوچھتا ہے کہ آیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر جھڑکی بھرے لہجے میں فرماتا ہے آیا تم فکر نہیں کرتے؟ اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں مختلف مسائل کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے ان کے تجزیہ وتحلیل کو فکر کہتے ہیں اور یہ بہتر و بیشتر فہم کا ایک عمدہ راستہ ہے۔

اور یہاں پر بھی گوناگوں تعبیرات ہیں۔کہیں فرماتا ہے "لعلکم تتفکرون" یعنی شاید تم فکر سے کام لو (سورہ بقرہ/۲۱۹) "لقوم یتفکرون" یعنی ایسی قوم کے لیے جو فکر سے کام لیتی ہے (یونس/ ۲۴، رعد/ ۳۔نحل/۱۱) اور کہیں فرماتا ہے "اولم یتفکروا فی انفسھم" یعنی انہوں نے اپنے دل میں غور وفکر نہیں کیا؟ (روم/ ۸)

گیارھویں آیت میں فقہ،بمعنی فہم اور عمیق ادراک کی گفتگو ہورہی ہے ارشاد ہوتا ہے دیکھو تو! ہم اپنی آیات کو کس طرح مختلف بیانات کے ذریعہ ذکر کرتے ہیں شاید کہ وہ سمجھ جائیں اور درک کرلیں یہاں پر بھی (مندرجہ بالا آیت کی مانند) کبھی تو "لعلھم یفقھون" آیا ہے اور کہیں پر "لقوم یفقھون" یعنی ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں، (انعام/ ۹۸ آیا ہے) اور ایک مقام پر "لو کانوا یفقھون" یعنی اگر وہ سمجھتے (توبہ/ ۸۱) ہیں۔ایک دوسرے مقام پر "بل کانوا لا یفقھون الا قلیلا" (اگر وہ کم ہی سمجھتے ہیں) (فتح/ ۱۵) یہ آیت تفقہ اور عقلی ادراکات جیسے مسئلہ کی حد سے زیادہ اہمیت کو بیان کررہی ہیں۔

جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں فقہ کے معنی ہیں آشکار مسائل کے مشاہدہ کے ذریعہ مخفی مسائل کو سمجھنا جو بذاتِ خود عقلی ادراک کا ایک اہم پہلو ہے۔

---

[1] انعام ۸۰،نحل ۹۰،مومنون ۸۵،صافات ۱۵۵

[2] نمل ۶۲

بارھویں آیت میں، شعور کی بحث ہے۔ مومنین کو اس سے روکنے کے بعد کہ شہیدانِ راہِ خدا کو مردہ نہ کہو ارشاد فرماتا ہے وہ تو زندہ ہیں لیکن تم ان کی زندگی کو درک نہیں کر سکتے۔

البتہ شعور کبھی تو ظاہری احساس کے معنی میں آتا ہے اور کبھی اندرونی احساس کے معنی میں اور یہی عقلی ادرک ہے، اور قرآن مجید میں دونوں معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

جو لوگ اپنے شعور سے کام نہیں لیتے قرآنِ مجید نے بہت سی آیات میں ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے۔[1]

تیرھویں آیت میں بصیرت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تقویٰ کے آثار میں سے ایک اثر کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرماتا ہے متقی لوگ جب شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو اچانک خدا کی یاد میں لگ جاتے ہیں، بصیرت حاصل کرتے اور حقیقت کا ادراک کر لیتے ہیں اور شیطانی وسوسوں کے جال سے بچ جاتے ہیں۔

بصیرت اور ابصار کہ جن کے معنی بینائی ہیں کبھی تو ظاہری آنکھ پر بولے جاتے ہیں اور حسّی پہلو کے حامل ہوتے ہیں اور کبھی اندرونی آنکھ اور عقل وخرد کے لیے بولے جاتے ہیں جن کے معنی عقلی ادراکات ہوتے ہیں اور زیرِ بحث آیت ان آیات میں سے ہے جن میں یہ الفاظ دوسرے معنی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

قرآن مجید کبھی تو کہتا ہے کہ انسان اپنی نسبت اور اپنے بارے میں اچھی طرح بصیرت اور آگاہی رکھتا ہے "بل الانسان علی نفسه بصیرة" (قیامت/ ۱۴) اور کبھی خدا پیغمبرؐ سے فرماتا ہے کہ لوگوں کو کہیں کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اور میرے پیروکار سب لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے ہیں "وقل هذه سبیلی ادعوا الی الله علی بصیرة انا ومن اتبعنی" (سورہ یوسف/ ۱۰۸)

مسلم ہے کہ ان تمام مقامات پر بصیرت اس علم وآگاہی کے معنی میں ہے جو عقل وخرد کے ذریعہ انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

اور انجام کار چودھویں اور آخری آیت میں دلایت کی بات ہو رہی ہے جس کے معنی ہیں غیر محسوس اور مخفی مسائل سے ہوشیاری اور آگاہی، ارشاد ہوتا ہے کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا اور نہ ہی کوئی شخص یہ جانتا ہے کہ کونسی سرزمین مرے گا؟

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآنِ مجید درایت کا مادہ ہمیشہ منفی صوت میں استعمال ہوا ہے۔

یعنی جہاں ہر انسان کے عدم درایت کی بات ہوتی ہے وہاں پر یہ مادہ ہمیشہ استعمال ہوتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درایت درک وفہم کا ایسا عمیق (گہرا) مفہوم ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ بالا چودہ آیات سے درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ قرآنِ مجید انسان کی عقل وخرد، کو معرفت کے اصل منابع میں سے ایک اہم منبع کی حیثیت دیتا ہے اور اس کی زبردست اہمیت کا قائل ہے۔

---

[1] شعراء ۱۳۳، حجرات ۲، بقرہ ۹، آل عمران ۶۹، انعام ۲۶ و ۱۲۳، مومنون ۵۶۔

۲۔قرانِ مجید ہرایک کوتمام مسائل پرزیادہ سے زیادہ عقل وفکر سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے۔

۳۔قرآنِ مجید نے انسانی روح کے گوناگوں پہلوؤں کی طرف خاص توجہ فرمائی ہے اوران میں سے ہرایک پرخاص طور پر تاکید کی ہے۔

۴۔قرانِ مجید نے واقعیات کے ادراک کے لیے روح کی سرگرمیوں کومختلف تعبیرات کے ساتھ ذکرکیا ہےاور ہرایک پراپنے اپنے مقام کےلحاظ سے تاکید کی ہے۔

لیکن اس کے باوجودقرانِ مجید نےعقل کےصحیح ادراک کے متعددموانع کا بھی ذکرکیا ہے جوانشاءاللہ معرفت کے موانع کی بحث میں بیان ہوں گے۔

مزیدوضاحتیں

ا۔فلسفی نقطہ نگاہ سے عقلی ادراکات

اکثرفلاسفہ کےنقطۂ نظرسے عقلی ادراکات کومعرفت کےایک اہم منبع کی حیثیت سے پہچانا گیا ہے۔اورجیسا کہ ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں حسی فلاسفہ نے اس امرکی مخالفت پرکمرباندھ رکھی ہےاوروہ عقلی ادراکات کومکمل طور پردرجہ اعتبار سے ساقط سمجھتے ہیں اورواقعیت کی شناخت کوصرف حسّی تجربات میں منحصر سمجھتے ہیں۔

ان کااس بارے میں بہانہ چندچیزیں ہیں۔

ا۔عقلی مسائل کے بارے میں فلاسفہ کےدرمیان اختلاف ہےاور ہرایک نے اپنے اپنےنقطۂ نظرسے ظاہرامنطقی دلائل بھی ذکرکیے ہیں۔

۲۔بہت سے دانشوروں کےعقائد میں اس حدتک غلطیاں واقع ہویہ ہیں کہ بذاتِ خودانہوں نے کئی مقامات پراس کا برملااعتراف بھی کیاہوہےاوران کی اصلاح بھی کی ہے۔

۳۔مذکورہ بالا دونوں وجوہات پراس موضوع کااضافہ بھی کرنا چاہیئے کہ ان آخری چندصدیوں میں سائنس اورعلوم طبعی نے تیزی سے جوترقی کی ہےاورحسّی تجربات کے ذریعہ عالمِ طبیعت کے چہرہ سے جونقاب کشائی کی ہے،اس سے اس سوچ کومزیدتقویت ملتی ہے کہ صرف اور صرف حسّ کےمنبع پرہی بھروسہ کیاجائےاوراس کےعلاوہ دیگرتمام منابع پرخطِ تنسیخ کھینچاجائے۔

تاریخ فلسفہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ اس طرح کےموضوعات اس بات کا موجب بن گئے کہ قدیم یونان میں سفطائی افکار نے ہرقسم کےحسّی اورغیرحسّی واقعیات کا انکارکیا،کیونکہ ایک طرف توانہوں نے فلاسفہ کےاختلاف کودیکھا اوردوسری طرف بہت سے تنازعات اور جھگڑوں کودیکھا جوعدالتوں میں پیش کیے جاتے تھےاورزبردست اور ماہروکلاءاپنے مؤکلین کا بھرپوردفاع کرتے تھےاورعامۃ الناس ان وکلاء کے دلائل کوسنتے تھےکہ ہروکیل اپنے مؤکل کوسچا ثابت کرنے کے لیے یوں دلائل کی بوچھاڑکردیتا تھا کہ سننے والے ہردوفریق کوبرحق سمجھنے

لگتے تھے، حالانکہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مخالف ہوا کرتے تھے۔اس صورت حال سے اس فکر کو تقویت ملی کہ ممکن ہے کہ اس دنیا میں کوئی واقعیت سرے سے موجود ہی نہ ہو۔

لیکن ان تمام شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے عقلی ادراکات پر زیادہ سے زیادہ تحقیقات ہونی چاہئیے اور سب سے پہلے بدیہی ادراکات، کو نظری ادراکات سے جدا کرنا چاہئیے کیونکہ بدیہی ادراکات کے سلسلے میں کسی قسم کی غلطی واقع نہیں ہوسکتی، کیونکہ کوئی بھی شخص دو اور دو کے چار ہونے میں شک نہیں کرتا، اور نہ ہی اسے اس بات میں شک ہوتا ہے کہ ایک چیز ایک ہی آن اور ایک ہی مکان میں موجود بھی ہو اور معدوم بھی۔اور اگر کچھ لوگ اس قسم کے موقع پر شک وتردید کا اظہار کرتے ہیں، یا اس کے برخلاف نظریہ رکھتے ہیں، درحقیقت وہ الفاظ کے ساتھ کھیل رہے ہوتے ہیں، مثلاً وہ صندین (دوضدوں) اور نقیضین (دونقیضوں) کی اور طرح سے تفسیر وتشریح کرتے ہیں، وگرنہ اصل مطلب میں کسی کو اختلاف نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ استدلالی امور میں بھی اگر صحیح میزان وقواعد سے کام لیا جائے تو غلطی واقع نہیں ہوسکتی۔غلطی اس وقت سرزد ہوتی ہے جب میزان وقواعد سے صحیح معنوں میں کام نہیں لیا جاتا۔یا خود قواعد ومیزن دقیق نہیں ہوتے یہی وجہ ہے چونکہ ریاضی کے مسائل میں صحیح صحیح قواعد ومیران موجود ہیں لہٰذا ریاضی دان حضرات کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے اور ان کے نتائج قطعی اور یقینی ہوتے ہیں، کیونکہ صحیح اور باطل کی پہچان کے لیے روشن اور واضح معیار موجود ہوتا ہے۔لہٰذا ہر سوال کا نتیجہ صحیح حاصل ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کو جو ہم کہتے ہیں کہ عقلی ادراکات میں غلطی واقع ہوتی ہے یہ چیز بذاتِ خود عقلی ادراکات کے قبول کرنے پر خود ایک واضح دلیل ہے نہ کہ ان کی نفی پر، کیونکہ جب ہم غلطی کی بات کرتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ہم نے واقعیات کو قبول کرلیا ہے۔البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فلاں نظریہ غلط ہے۔مثلاً یہ جو ہم کہتے ہیں کہ فلاسفہ کے درمیان اختلاف ہے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ غلطی پر ہیں، تو یہ اس لیے ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں متضاد نظریات کا بیک صورت صحیح ہونا محال ہے یہ خود ایک بدیہی ادراکِ عقلی ہے۔اسی لیے اسی طرح کہ نکتہ کو ہم نے ان کے بارے میں کہا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ چونکہ حسّ خطا کرتی ہے لہٰذا درجہِ اعتبار سے ساقط ہے اور ہم بتا چکے ہیں کہ بینائی کی حسّ خطا اور غلطی کا شکار ہوتی ہے کیونکہ مثلاً ایک نورانی نقطہ اگر تیزی سے حرکت کرے تو آنکھ اسے ایک لمبی لکیر کی صورت میں دیکھتی ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے نورانی نقطہ اور اس کی حرکت کو واقعیت کے طور پر درک کرلیا ہے اور چونکہ نقطہ اور لکیر دو متضاد چیزیں ہیں لہٰذا جس چیز کو ہم ایک لمبی لکیر کی صورت میں دیکھتے ہیں یہ غلطی ہے۔گویا یہ سب کچھ واقعیات اور ادراک کے وجود کا ضمنی اعتراف ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو لوگ بھی عقلی ادراکات کی مخالفت پر کمربستہ ہو چکے ہیں درحقیقت وہ خود انہی عقلی ادراکات کی مدد سے ہی اپنے مدعا کو ثابت کرنا چاہتے ہیں گویا وہ عملی طور پر اپنے دعویٰ کی نفی کر رہے ہوتے ہیں اور عقلی ادراکات ہی کے ذریعہ عقلی ادراکات کے ساتھ نبرد آزما ہو رہے ہوتے ہیں۔

۲۔اسلامی روایات میں عقل کا مقام

اسلامی روایات میں عقل وخرد کے جوہر کو اس حد تک بلند و بالا درجہ عطا کیا گیا ہے جو انسانی تصور سے باہر ہے۔اسے دین کی اساس بزرگ ترین تونگری، سب سب سے بڑھ کر سرمایا، تیز ترین راہوار، بہترین دوست، غرض خدا کے تقرب اور جزا کے حصول کے لیے میزان ومعیار کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے۔

اس بارے میں وارد ہونے والی بیسیوں بلکہ سینکڑوں روایات جو پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہار علیہم السلام کی زبانی بیان ہوئی ہیں، میں صرف بارہ روایات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

۱۔پیغمبرِ اکرم صلی علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"قوام المرء عقله، ولادين لمن لاعقل له"

انسانی وجود کی بنیاد اس کی عقل ہے، جس کی عقل نہیں اس کا دین نہیں ہے۔[۱]

۲۔امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لاغنی کالعقل ولافقر کالجهل"

عقل سے بڑھ کر کوئی تونگری اور جہالت سے بھڑھ کر کوئی ناداری نہیں۔[۲]

۳۔امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان الله تبارك و تعالی یحاسب الناس علی قدر ما اتاهم من العقول فی دار الدنیا"

خداوند عالم لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق ہی ان کا محاسبہ کرے گا جو انہیں دنیا میں دی تھی۔[۳]

۴۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

"ان الثواب علی قدر العقل"

عمل کا ثاب اور پاداش عقل کے مطابق ہی ہوگا۔[۴]

---

[۱] بحارالانوار، جلد ۱، ص ۹۴، حدیث ۱۹

[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۵۴

[۳] بحار، جلد ۱، ص ۱۰۶، حدیث ۲

[۴] اصول کافی، جلد ۱، ص ۱۲ حدیث ۸ (کتاب العقل والجہل)

۵۔ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"ما قسم الله للعباد شيئا افضل من العقل وما ادى العبد فرائض الله حتى عقل عنه وما بلغ جميع العابدين فى فضل عبادتهم ما بلغ العاقل"

خداوندِ عالم نے اپنے بندوں کے درمیان عقل سے بڑھ کر کوئی اور نعمت تقسیم نہیں کی، اور بندے خدائی فریضوں کو اس وقت تک بجا نہیں لا سکتے جب تک کہ انہیں اپنی عقول سے دریافت نہ کر لیں، اور تمام عابدین اپنی عبادت کی فضیلت میں عاقل کے پایہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ [1]

۶۔ حضرت امام موسیٰؑ کاظم علیہ السلام نے ہشام بن حکم سے فرمایا:

"ياهشام ما بعث الله انبيائه ورسوله الى عباده الا ليعقلوا عن الله فاحسنهم استجابة احسنهم معرفة، واعلمهم بامر الله احسنهم عقلا، وا كملهم عقلا ارفعهم درجة"

خداوندِ عالم نے اپنے انبیاء اور رسولوں کو لوگوں کی طرف نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ وہ خدا کے بارے میں عقل سے زیادہ سے زیادہ کام لیں۔ اسی لیے خدا کے بہترین بندے جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا وہ لوگ ہیں جن کی معرفت بہتر تھی، اور جو لوگ امرِ الٰہی سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں وہی سب سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں اور جن کی عقلیں زیادہ کامل ہیں دنیا اور آخرت میں ان کا مقام و مرتبہ بھی بلند و بالاتر ہوتا ہے۔ [2]

۷۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث ہے:

"لكل شيئ الة وعدة والة المؤمن وعدته العقل، ولكل شيئ مطية ومطية المرء العقل، ولكل شيئ غاية وغاية العبادة العقل"

ہر چیز کے آلات و وسائل ہوتے ہیں اور مومن کے آلات و وسائل اس کی عقل ہے ہر چیز کی سواری ہوتی ہے اور انسان کی سواری عقل ہے اور ہر چیز کی کوئی نہ کوئی غرض و غایت ہوتی ہے اور عبادت کی غرض و غایت عقل ہے۔ [3]

---

[1] اصول کافی، جلد ۱، ص ۱۲، حدیث ۱۱

[2] کافی، جلد ۱، ص ۱۶

[3] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۹۵، حدیث ۳۴

۸۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"اذا اراد الله ان یزیل من عبد نعمة کان اول ما یغیر منه عقله"

جب خداوندِ عالم اپنے کسی بندے سے (ناشکری کی وجہ سے) اس سے نعمت سلب کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اس کی عقل کو زائل کر دیتا ہے۔[1]

۹۔امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

"العقل صاحب جیش الرحمن والهوی صاحب جیش الشیطان، والنفس متجاذبة بینهما، فایهما غلب کان فی حیزه"

عقل خداوندِ رحمن کے لشکر کی سربراہ ہے اور خواہشاتِ نفسانی شیطانی لشکر کی فرمانروا، جبکہ نفسِ انسانی ان دونوں کی کشمکش کا شکار ہے۔ان میں سے جو اس پر غالب آجائے انسان اس کی قلمرو میں داخل ہو جاتا ہے۔[2]

۱۰۔حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

"العقول ائمة الافکار، والا فکار ائمة القلوب، والقلوب ائمة الحواس، والحواس ائمة الاعضاء"

عقول افکار کی پیشوا، افکار قلوب کے راہنما، قلوب حواس کے رہبر اور حواس اعضاء کے پیشوا ہیں۔[3]

(اسی طرح انسانی اعضاء کا اس کے حواس پر جو اس کا قلوب پر، قلوب کا افکار پر اور افکار کا عقول پر تکیہ ہوتا ہے۔)

۱۱۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

"ان الرجل لیکون من اهل الجهاد، ومن اهل الصلوة والصیام، ومن یأمر بالمعروف و ینهی عن المنکر، ولایجزی یوم القیامة الا علی قدر عقله"

ممکن ہے کہ انسان اہل جہاد، اہلِ نماز، اہلِ روزہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا ہو، لیکن بروز

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۹۴، حدیث ۲۰

[2] عزز الحکم

[3] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۹۴، حدیث ۴۰

قیامت اسے صرف اس کی عقل کے مطابق ہی سزا اور جزا ملے گی۔ [1]

۱۲۔حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہوتا ہے:

"لامصیبة کعدم العقل"

بے عقلی جیسی کوئی مصیبت نہیں۔ [2]

۳۔حاکمیت عقل کے مخالفین

عقل کے بارے میں اس قدر تعریف وتوصیف اور آیات وروایات میں اس گراں قیمت جوہر کی عظمت ورفعت کے باوجود نہایت ہی تعجب سے کہنا پڑتا ہے کہ دنیا کے کونے کھدرے میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہیں جو عقل کی مذمت میں زبان کھولے ہوئے ہیں اور اپنے عقلمند ہونے سے نالاں ہیں۔اور اس سے بڑھ کر جو عجیب بات ہے وہ یہ کہ کہ اپنے اس دعوے کے لیے دلائل یا صحیح لفظوں میں بہانے بھی پیش کرتے ہیں۔

کبھی تو وہ کہتے ہیں کہ عقل انسان کی محدود کردیتی ہے اور نیک وبد،حلال وحرام اور غلط وصحیح کو انسان کے رستے میں ڈال دیتی ہے،اور انسانی آزادی کو بہت بڑی حد تک سلب کرلیتی ہے،کیا ہی اچھا تھا کہ یہ عقل نہ ہوتی اور ہم ہر لحاظ سے،آزاد ہی آزاد ہوتے.....

کبھی کہتے ہیں کہ عقل دردآفرین ہے،ہوشیار اور حسّاس انسان کے لیے سُکھ کا سانس لینا دشوار ہے،جبکہ کم عقل یا بے عقل آدمی خوش وخرم اور شاد وبے نیاز زندگی بسر کرتا ہے۔اسی بارے میں شاعر نے کہا:

دشمنِ جانِ من است، عقل من وہوش من
کاش گشادہ نبود چشم من وگوشِ من

یعنی میری عقل وہوش ہی میری جان کے دشمن ہیں۔اے کاش کہ میری آنکھ اور کان نہ کھلے ہوتے۔

یا ایک اور شاعر کا قول:

عاقل مباش تاغمِ دیوانگان خوری
دیو انباش تاغمِ تو عاقلاں خورند

یعنی عاقل مت بنو تا کہ تمہیں دیوانوں کا غم نہ کھانا پڑے،دیوانے بن جاؤ تا کہ عقل مندوں کو تمہارا غم کھانا پڑے۔

یا بقول شاعر:

---

[1] مجمع البیان،جلد ۱۰،ص ۳۲۴

[2] بحار الانوار،جلد ۷۸،ص ۱۶۵

خوش عالمی است عالم دیوانگی اگر
موی دماغِ شخصِ مانشود عاقلی

یعنی عالم دیوانگی کیسا بہترین عالم ہے بشرطیکہ کوئی عقلمند شخص اس بارے میں مانع نہ ہو۔

لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظریہ یا تو سفسطہ ہے، یا مزاح، یا کسی قسم کے اور مفہوم کی طرف اشارہ و کنایہ اور بہت بعید معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار کے کہنے والوں کا مقصد عقل کی مذمت ہو، بلکہ کنایہ کے طور پر وہ یہ حقیقت بتانا چاہتے ہیں کہ اپنے اطراف میں وہ ایسے دردناک مسائل دیکھتے ہیں کہ لوگ جن سے مکمل طور پر غافل ہیں۔

یا دیوانگی سے ان کی مراد ایک قسم کا عرفانی مفہوم ہے یعنی حق کا بے قرار عاشق ہونا اور دنیا کی ہر مادی چیز کو اس کے قدموں پر قربان کرنا۔

بہرحال یہ ٹھیک ہے کہ عقل انسان کو محدود کر دیتی ہے۔لیکن یہ محدودیت انسان کے لیے سرمایۂ افتخار اور موجب ارتقاء ہے۔اس کی مثال یوں سمجھیے کہ علمِ طلب سے آگاہی انسان کو غذا کی نوع اور زندگی کے دوسرے مسائل کے انتخاب میں بڑی حد تک محدود کر دیتی ہے، تو کیا یہ محدودیت عیب کی بات ہے یا نہ بلکہ انسان کی سلامتی اور بیماریوں اور مسمومیت سے نجات کا سبب؟

رہی یہ بات کہ عقل ہمیشہ انسان کے دل پر غم کا بوجھ ڈال دیتی ہے، تو یہ غم بھی انسان کے لیے موجب افتخار اور باعثِ کمال ہے۔کیا انسان کو مشہور مثل کے مطابق سقراطی ہونا چاہیئے کہ کمزور اور ناتواں ہو یا سوّر کی طرح ہونا چاہیئے کہ موٹا تازہ اور مسٹنڈا ہو؟

ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر ہم انسان کے مسئلۂ ارتقاء کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اصل کو چند روزہ مادی زندگی پر ترجیح دیں جیسا کہ لذت کو اصل مقصودِ زندگی سمجھنے والے کچھ مادی لوگ سمجھتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کی کوئی بات ٹھیک ہو، لیکن ایک موحّد انسان کی نگاہ میں یہ سب باتیں مذاق کے سوا اور کچھ نہیں جو انسان کے لیے حرکت، ادائے فرض، ہدف اور ارتقاء و تکامل کا قائل ہے۔

اور پھر دلچسپ بات ہے کہ لذت کو ہی سب کچھ سمجھنے والے مادی لوگ بھی مجبور ہیں کہ اپنی اسی لذت کو محفوظ رکھنے کے لیے اجتماعی قوانین کے ذریعہ بڑی حد تک محدودیت کو قبول کریں اور اس راستہ سے ہر قسم کے غم واندوہ کو اپنے لیے ہموار کریں۔یہیں سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر انسان وحی کے سرچشمہ اور انبیاءؑ کرام کی تعلیمات سے دور ہو جائے تو کس حد تک پستی کے گڑھوں میں جا گرتا ہے؟

شناخت کے دوسرے منبع یعنی عقل وخرد سے متعلق مسائل کو ہم یہاں ختم کرتے ہیں اور تیسرے منبع کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، اگرچہ اس مقام پر اور بھی کئی باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

معرفت کا تیسرا منبع

تاریخ اور تاریخی آثار

اشارہ

قرآنِ مجید میں تاریخی مسائل کو دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ مرتب صورت میں:

یعنی قرآن مجید مسلمانوں کے لیے گزشتہ اقوام کی تاریخ کے بہت سے حصے کو ظریف و دقیق الفاظ اور عبارات کے ساتھ بیان فرماتا ہے اور ان اقوام کی زندگی کے باریک اور روشن نقاط کو ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے انجام کی بھی بیان فرماتا ہے تاکہ مختلف مسائل کے بارے میں مسلمانوں کو آگاہی، بیداری اور معرفت حاصل ہو اور انسان اپنی زندگی کے حقائق کو گزشتہ اقوام کی تاریخ کے آئینہ میں دیکھ سکیں۔

۲۔ تکوینی صورت میں:

یعنی گزشتہ اقوام کے چھوڑے ہوئے تاریخی آثار ایسے آثار جو بظاہر تو خاموش ہیں۔ لیکن اپنے اندر شور غوغا کی ایک کائنات لیے ہوتے ہیں، ایسے آثار جو گزشتہ تاریخ کو واضح طور پر پیش کر رہے ہیں درحقیقت یہ ایسے آثار ہیں جو انسان کے سامنے آئینہ کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں وہ اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کے چہرہ کو بخوبی ملاحظہ کر سکتا ہے۔

سب سے پہلے ہم ان دونوں قسم کے نمونوں کو آیات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

آیات

۱۔ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ (سورہ یوسف ۱۱۱)

۲۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ (سورہ اعراف ۱۷۶)

۳۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾

(سورہ ہود ۱۰۰)

۴۔ نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ۖ وَاِنۡ كُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِيۡنَ ۝۳ (سورہ یوسف ۳)

۵۔ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الۡاٰخِرَةِ وَالۡاُوۡلٰى ۝۲۵ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ۝۲۶

(سورہ نازعات ۲۵،۲۶)

۶۔ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَتَكُوۡنَ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ يَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا ۚ (سورہ حج ۴۶)

۷۔ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ۙ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ اَمۡثَالُهَا ۝۱۰ (سورہ محمد ۱۰)

۸۔ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۱۳۷ (سورہ آل عمران ۱۳۷)

۹۔ قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنۡشِئُ النَّشۡاَةَ الۡاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝۲۰ (عنکبوت ۲۰)

۱۰۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِىۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِىۡ رَبِّهٖۤ اَنۡ اٰتٰٮهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ ۘ

(سورہ بقرہ ۲۵۸)

۱۱۔ اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝۶ اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۝۷ (سورہ فجر ۶۔۷)

۱۲۔ اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ؕ ۝۱ (سورہ فیل ۱)

ترجمہ

۱۔ان کی سرگزشت میں عقلمند لوگوں کے لیے عبرت ہے۔

۲۔ان قصّوں کو (ان کے لیے) بیان کرو شاید کہ وہ سوچیں (اور بیدار ہوں)

۳۔یہ شہروں اور بستیوں کی خبروں میں سے ہیں جو ہم آپ کو بیان کرتے ہیں کہ جن میں سے بعض تو ابھی تک اپنی

جگہ پر قائم ہیں اور بعض جا چکے ہیں۔

۴۔ہم اس قرآن کو وحی کرنے کے طریقے سے بہترین قصے تمہارے لیے بیان کرتے ہیں، ہر چند کہ تم اس سے پہلے غافل لوگوں میں سے تھے۔

۵۔خداوندِ عالم نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں مبتلا کیا اور اس میں ان لوگوں کے لیے عبرت ہے جو (خدا سے) ڈرتے ہیں۔

۶۔آیا وہ زمین میں نہیں چلے پھرے تا کہ ان کے لیے ایسے دل ہوں جن کے ذریعہ وہ حقیقت کو درک کریں یا ایسے سننے والے کان ہوں جن کے ذریعہ وہ حق کی آواز کو سنیں۔

۷۔آیا زمین میں نہیں چلے پھرے تا کہ وہ دیکھیں کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ خداوند عالم نے انہیں ہلاک کیا۔اور کفار کے لیے اس جیسی سزائیں ہیں۔

۸۔تم سے پہلے کچھ طریقہِ کار موجود تھے اور (ہر قوم اپنے اعمال وصفات کے مطابق کسی نہ کسی انجام کو ضرور پہنچی) لہٰذا تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ (آیاتِ خدا) کو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟

۹۔کہہ دو کہ تم زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ خدا نے تخلیق کا آغاز کیونکر کیا؟ (پھر اسی طریقہ پر) خداوندِ عالم، عالمِ آخرت کو ایجاد کرے گا، خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۱۰۔آیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں احتجاجی گفتگو کی۔

۱۱۔آیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے عاد، اس طاقتور شہر کے ساتھ کیا کیا؟

۱۲۔آیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے اصحابِ فیل (ابرہہ کے لشکر) کے ساتھ کیا کیا؟

الفاظ کی شرح

۱۔قصص، (بروزن قفس) کے معنی چیزوں کے آثار کے بارے میں جستجو کرنا ہے[1] اور قصہ کو اس لیے قصہ کہتے ہیں کیونکہ اس میں مختلف قسم کے حوادث اور خبروں کا تعاقب کیا جاتا ہے۔بنابریں قصہ کا معنی صرف داستان اور کہانی نہیں بلکہ لغوی معنی کی رو سے اشیاء کے آثار کی جستجو ہے۔

---

[1] یہ بات پیش نظر رہے کہ ''قصص'' کے ایک تو مصدری معنی ہیں اور دوسرے وہ قصہ کی جمع ہے۔سورہ یوسف کی ۳ اور ۱۱۱ ویں آیت میں جمع کے معنی میں ہے۔

ہر وہ چیز جو ایک دوسرے کے بعد قرار پائے۔ قصص کہلاتی ہے۔ اور قینچی کو اس لیے مقص کہتے ہیں کیونکہ وہ بالوں کو پے در پے کاٹتی ہے۔ اور قصہ (بروزن غُصہ) بالوں کے اُس مجموعہ کو کہتے ہیں جو سر کے اگلے حصہ میں ہوتا ہے۔[1]

۲۔ عبرت دراصل عبور اور عبر (بروزن ابر) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا ہے۔ اور عبور دراصل لغتِ عرب میں پانی سے گزرنے کے معنی میں ہے، خواہ تیر کر، یا کشتی کے ذریعہ یا پُل وغیرہ کے ذریعہ ہو۔ لیکن بعد میں وسیع تر معنی میں استعمال ہونے لگا، اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ بات کو اس لیے عبارت کہتے ہیں کہ وہ گزرنے والی ہوتی ہے اور بولنے والے کی زبان سے گزر کر سننے والے کے کانوں تک جا پہنچتی ہے۔

لیکن عبرت اس قابلِ مشاہدہ کیفیت کے معنی میں ہے جس کے ذریعہ انسان اس چیز تک جا پہنچتا ہے جو قابلِ مشاہدہ نہیں ہوتی۔[2]

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عبرت اس راہنمائی کو کہتے ہیں جو انسان کو منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے اور عبرت کے معنی تعجب بھی ہیں اور (یہ شاید اس لیے ہے کہ بہت سے تعجب خیز حوداث کو انسان اہم اور آشکار حوداث کے ذریعہ سے دریافت کرتا اور تعجب کرتا ہے)۔

سیر کا معنی زمین پر چلنا ہے۔ اور جب "سیر فی الارض" کہا جاتا ہے تو اس میں تاکیدی معنی پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ علماء نے "سیر فی الارض" کے دو معنی ذکر کیے ہیں، ایک تو روئے زمین پر جسمانی حرکت (اور مختلف آثار و موجودات کا مشاہدہ) اور دوسرے موجودات عالم کے بارے میں مطالعہ اور فکری حرکت۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ سیر کا معنی کسی ایک جہت میں لگاتار عبور ہے۔[3]

سیرت روش یا افراد کی تاریخِ زندگی کا معنی بھی اسی سے لیا گیا ہے۔

۴۔ رؤیت کے بارے میں لغت نے دو معنی بتائے ہیں۔ ایک تو آنکھ سے مشاہد دوسرے باطنی علم و آگاہی اور مشاہدہ۔[4] اور کلامِ مجید میں بہت سے مقامات پر دوسرے معنی یعنی علم و آگاہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور رائے بھی قلبی عقیدے اور نظریئے کے معنی میں ہے خواہ یہ عقیدہ قطعی اور یقینی ہو خواہ ظنی اور گمان کے لیے ہو۔ اور، رویہ اور تروی کا معنی ایک نظریہ کو حاصل کرنے کے لیے غور و فکر یا تلاش اور جستجو کرنا ہے۔

۵۔ نظر دراصل آنکھ کی گردش کرنے کے معنی میں ہے، یا کسی چیز کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے فکر کو جولانی دینے کے معنی میں ہے

---

[1] لسان العرب، مفردات راغب اور مجمع البحرین۔

[2] مفردات راغب

[3] مجمع البیان، جلد ۵، ص ۲۶۸

[4] پہلا ایک مفعول کی طرف متعدی ہے اور دوسرا دو مفعولوں کی طرف (لسان العرب اور مفردات)

اور کبھی تجسس اور جستجو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی ایسی معرفت کے معنی میں ہوتا ہے جو جستجو کے بعد حاصل ہوتی ہے۔[1]

مجمع البحرین میں نظر کے تین معنی ذکر کیے گئے ہیں: ۱: کسی چیز کا مشاہدہ کرنا۔ ۲۔ آنکھ کے ساتھ کسی چیز کو غور سے دیکھنا۔ ۳ علم یا گمان کو حاصل کرنے کے لیے غور وفکر سے کام لینا۔

لسان العرب نے پہلے تو، نظر کے معنی احساسِ چشم کیا ہے اور پھر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک آنکھ کیساتھ دیکھنا اور دوسرے قلب کے ساتھ دیکھنا اور لائقِ توجہ یہ ہے کہ یہ تفسیر بیان کرنے کے بعد اس نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ "النظر الی وجه علی عبادة" اور اس حدیث کی تفسیر میں ابن اثیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ جب لوگوں کی نگاہ علی علیہ السلام پر پڑتی تھی تو وہ کہہ اٹھتے تھے:

"لا اله الا الله ما اشرف هذا الفتی! لا اله الا الله ما اعلم هذا الفتی!"

"لا اله الا الله یہ جوان کس قدر شریف ہے!" "لا اله الا الله یہ جوان کس قدر عالم ہے؟

تو اس طرح سے ان کا علیؑ کی طرف دیکھنا عبادتِ الٰہی اور کلمہ توحید کی دعوت دیتا تھا۔[2]

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں گزشتہ اقوام میں سے کچھ قوموں کے دردناک انجام کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرماتا ہے: ان کے آثار کی تحقیقات اور ان اقوام میں سرگزشت اور ان کا انجام صاحبانِ عقل وفکر کے لیے موجبِ عبرت ہے اور وہ اس طریقہ سے بدبختی اور خوش بختی کے عوامل کو سمجھ سکتے ہیں اور نجات وہلاکت کی راہ کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتے ہیں۔

دوسری آیت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ان کی سوچ اور افکار کو زندہ کرنے اور انہیں غور وفکر پر آمادہ کرنے کے لیے ان کے سامنے گزشتہ اقوام کی سرگزشت اور داستانیں بیان کیجئے، کیونکہ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا صحیح بیان ان کے افکار کی بیداری کا موجب اور معرفت کا منبع ہے۔

تیسری آیت میں قومِ نوحؑ، قومِ شعیبؑ، قومِ فرعون اور قومِ لوطؑ عاد اور ثمود جیسی گزشتہ اقوام کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یہ ان شہروں اور آبادیوں کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں، جن سے کچھ تو اپنی جگہ پر قائم ہیں اور کچھ کو سرکوب کر دیا گیا ہے اور وہ نیست ونابود ہو چکے ہیں ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اور آخر میں اضافہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: اس بارے میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

---

[1] مفرداتِ راغب، مادہ نظر

[2] لسان العرب، جلد ۵، مادہ نظر

چوتھی آیت میں، جو کہ سورہ یوسف کے آغاز میں ہے، سامعین کو آمادہ کرنے کے لیے فرماتا ہے: ہم اس آسمانی وحی یعنی قرآن میں آپ کے لیے ایسی بہترین داستانیں اور سرگزشتوں کو بیان کرتے ہیں اور حقائق سے مطلع کرتے ہیں جن سے آپ پہلے آگاہ نہیں تھے۔ اس طرح آپ کی معرفت میں اضافہ ہورہا ہے۔ ان چار آیات میں قصہ یا قصص پر تکیہ کیا گیا ہے جو تحقیق، جستجو اور گزشتہ حوداث واخبار کی تحلیل کے معنی میں ہے اور معرفت کا ایک وسیلہ ہیں۔

پانچویں آیت میں فرعون کے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: خدا نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب سے معذب کیا اور اس ماجرے میں ان لوگوں کے لیے عبرت ہے جو خداترس ہیں۔

اس آیت میں عبرت پر تکیہ کیا گیا ہے جس کا معنی ایک قابلِ مشاہدہ حالت سے منتقل ہوکر اور عبور کر کے ایسے حقائق کے مشاہدہ تک پہنچنا ہے جو قابلِ مشاہدہ نہیں ہیں۔

چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں آیت میں "سیر فی الارض" پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ایک جگہ پر کہا گیا ہے کہ اگر وہ روئے زمین پر چلتے پھرتے اور گزشتہ لوگوں کے باقیماندہ آثار کو دیکھتے تو ان کے دل ودماغ بیدار ہوجاتے اور وہ حق کے ادراک کے لیے سننے والے کانوں کے مالک ہوتے۔

دوسری جگہ پر کفار کو سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ آخر وہ زمین پر چلتے پھرتے کیوں نہیں، تاکہ وہ ان اقوام کے انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے، اور انہیں معلوم ہوتا کہ اس قسم کے عذاب ان کے انتظار میں بھی ہیں۔

ایک اور مقام پر تمام لوگوں کو، یا تمام مسلمانوں کو، خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: تم سے پہلے کچھ طریقہ کار موجود تھے اور کچھ قومیں اپنے مختلف اعمال وکردار کی وجہ سے برسراقتدار آئیں۔ تمہیں چاہیے کہ تم کمر باندھ لو اور دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے آثار کو دیکھو تاکہ تمہیں اس بات کا علم ہوجائے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو جھٹلایا۔

ایک اور جگہ پر لوگوں کو "سیر فی الارض" کی دعوت بھی دی گئی ہے تاکہ اس طرح وہ آغازِ آفرینش کی جستجو کر کے معاد کے مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔

دسویں، گیارھویں اور بارھویں آیات میں مشاہدہ اور رؤیت کے مسئلہ پر زور دیا گیا ہے لیکن ظاہر آنکھ سے نہیں بلکہ باطنی اور دل کی آنکھ سے۔

مذکورہ تینوں آیات میں روئے سخن بظاہر تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی طرف ہے لیکن اس سے مراد تمام مؤمنین بلکہ تمام انسان ہیں، استفہام (سوالیہ انداز) کی صورت میں آنحضرتؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: آیا آپ نے اس شخص کی تاریخ کو نہیں دیکھا جس نے اپنی سلطنت کے غرور میں آکر ابراہیم علیہ السلام سے خدا کے بارے میں مناظرانہ گفتگو کی، اس کا انجام کیا ہوا؟ یعنی سرکش ومتکبر اور مغرور نمرود کا کبھی کہتا ہے کہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خداوند عالم نے قومِ عاد اور اس کے آباد وشاد شہروں کے ساتھ کیا کیا؟

آیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہاتھی والوں کا کیا انجام ہوا؟ وہی جو خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے سرزمین یمن سے ایک کثیر لشکر لے کر

آئے اور خدا نے اس قدر عظیم اور طاقتور لشکر کو ضعیف و ناتواں پرندوں کے ذریعہ کنکریاں برسا کر سرکوب کر دیا؟

یقینی بات ہے کہ نہ تو پیغمبر اکرمؐ نے ابراہیم علیہ السلام اور نمرود اور ان کی مناظرانہ گفتگو کو آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تھا اور نہ ہی مسلمانوں نے۔ یہی حال قومِ عاد اور ان کے شہروں کی کیفیت کا ہے۔ مشہور روایات کی بنّا پر پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی سال متولد ہوئے جس سال ہاتھی والوں کا ماجرا رونما ہوا۔ طبعی طور پر آنحضرتؐ نے اس ماجرہ کو نہیں دیکھا اور نہ ہی مسلمانوں کی اکثریت نے۔ اسی لیے یہاں پر رؤیت سے مراد ان کی تاریخ اور سرگزشت کے بارے میں غور و فکر کرنا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پہلی پانچ آیات میں مدوّن و مرتّب تاریخ پر زور دیا گیا ہے یعنی ان واقعات پر جو تاریخی کتب کے صفحات میں درج ہیں۔ اور بعد کی چار آیات میں زندہ تکوینی تاریخ پر زور دیا گیا ہے، یعنی گزشتہ اقوام کے وہ آثار جو دنیا کے مختلف نقاط میں موجود ہیں۔

تین آخری آیات میں شاید تاریخِ مدّون یا خارجی زندہ تاریخ یا دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ ان مجموعی آیات اور قرآن میں (ان جیسی دوسری آیات) سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید تاریخ کی دونوں قسموں کو معرفت و آگاہی کے منبع کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے۔

ایک اور مقام پر قرآنِ مجید لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ بداتِ خود جا کر فرعونی محلات، عاد و ثمود کے تباہ شدہ کھنڈرات، نمرودیوں کے بلند و بالا قصور اور قومِ لوطؑ کی تہ و بالا شدہ سرزمین کو دیکھیں اور معرفت حاصل کریں۔

قرآن مجید ایک اور مقام پر بذاتِ خود ان واقعات اور سرگزشتوں کی دقیق صورت میں موشگافی کرتے ہوئے تشریح کرتا ہے اور ان کے عبرت آموز نکات کو ایک ایک کر کے بیان فرماتا ہے اور ان تاریخی مباحث میں مکذبین کافرین ظالمین اور ہوس کاروں کے انجام کو واضح کرتا ہے۔

حقیقت میں کبھی تو لوگوں کو مصر لے جاتا ہے اور انہیں وہاں کے تاریخی آثار دکھاتا ہے اور منوں مٹی تلے سوئے ہوئے لوگوں کو ان کے سامنے مجسم کر دیتا ہے، ان کے تاراج شدہ بخت و تخت کو ان کی آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے۔ اور کبھی تخت سے گرے بختوں کا دیدار کراتا ہے۔

غرض گزشتہ تاریخ کو مستقبل کے سینوں میں محفوظ رکھ کر لوگوں کو ان کا دیدار کراتا ہے۔[1]

اور کبھی ان کا ہاتھ پکڑ کر قومِ لوطؑ کے رہائشی مرکز سدوم کی طرف لے جاتا ہے۔ وہاں سے شداد کی بہشت، پھر سرزمین بابل کی طرف جو کہ نمرود کی فرمانروائی کا مرکز تھا اور وہاں سے کئی دوسرے مقامات کی جانب۔

مدائن کے ایوان کو آئینۂ عبرت بنا کر پیش کرتا ہے اور ہر محل کے ایک ایک کنگرے سے نت نئی نصیحتیں پیش کرتا ہے۔

غرضِ قرآن مجید تعلیم و تربیت اور معرفت و آگاہی کے سلسلے میں تاریخ پر بھی انحصار کرتا ہے اور اوراقِ کتاب اور صفحۂ زمین میں موجود گزشتہ اقوام کی سرگزشت پر بھی۔ اور یہی چیز بذاتِ خود ایک غور و فکر کی صورت ہے۔

توضیحات

---

[1] مذکورہ بالا تعبیرات ''سرمد'' کے مشہور اشعار کی طرف اشارہ رہیں۔ سرمد کہتے ہیں:

بمصر رفتم و آثار باستان دیدم — بہ چشم آنچہ شنیدم زداستان دیدم
بے چنین و چناں خواندہ بودم از تاریخ — چنین فتادہ نصیبم کہ آنچنان دیدم
گزشتہ در دلِ آیندہ ہرچہ پنہاں داشت — بہ بصر از توچہ پنہان کہ برعیان دیدم
تو تخت دیدی و من بخت واژگون ازتخت — تو نقش ظاہر و من نقش ناتوان دیدم
تو تاج دیدی و من تخت رفتہ تاراج — تو عاج دیدی و من مشت استخوان دیدم
تو چشم دیدی و من دیدہ حریصان باز — ہنوز در طمع ملک جاوداں دیدم

یعنی میں مصر گیا اور وہاں پر آثار قدیمہ کے بارے میں جو کچھ میں نے قصے کہانیوں کے ذریعہ سن رکھا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

میں نے تاریخ میں تو بہت کچھ پڑھا ہوا تھا، لیکن نصیب کی بات کہ میں نے وہاں پر بعینہٖ وہی کچھ دیکھا۔

ماضی نے مستقبل کے بارے میں اپنے دل میں جو کچھ چھپا رکھا تھا اسے میں نے واضح طور پر دیکھا۔

تم نے تو صرف تخت کو دیکھا لیکن میں نے تخت کے اجڑے بخت کو دیکھا۔ تم نے ظاہری نقش و نقوش کو ملاحظہ کیا لیکن میں نے باریک و ناتوان نقوش کا مطالعہ کیا۔ تم نے تو صرف تاج کو دیکھا مگر میں نے تاراج ہونے والے تخت کو دیکھا، تم نے ہاتھی دانت دیکھے مگر میں نے ایک مشت استخوان کو دیکھا۔ تم نے صرف آنکھوں کو دیکھا، لیکن میں نے ملک جاوداں کے لالچ میں ابھی تک حریصوں کی کھلی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔

۱۔تاریخ کا آئینہ جہان نما:

انسانی عمر کا اہم ترین حاصل اور نتیجہ اس کے تجربات ہیں۔اور تجربات بھی ایسے کہ انسان جن سے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکے، زیادہ سے زیادہ جہاد کر سکے اور روز افزاوں ارتقاء کی جانب گامزن ہو سکے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک انسان اپنی مختصر سی زندگی میں کتنی مدت تجربات کرے گا؟ بیس سال؟ پچاس سال؟ اسی سال؟ اور وہ بھی اس صورت میں کہ شدید ترین بحرانوں سے دوچار ہو جو کہ تجربہ کا میدان ہیں، اور اس کی زندگی یکساں صورت میں نہ گزرے۔

اب ذرا سوچئے کہ اگر ہم ایک ہی دور میں رہنے والے تمام لوگوں کے تجربات کو اکٹھا کر سکیں بلکہ اس سے بڑھ کر گزشتہ تمام ادوار کے انسانوں کے تجربات کو یکجا کر سکیں، تو آپ ہی بتائیے کہ ان تجربات کا حجم کسی حد تک ہو جائے گا؟ اور یقینی بات ہے کہ یہی تجربات معرفت و آگاہی کا ایک عظیم مبدا ہوں گے۔

تاریخ گزشتہ تمام ادوار کے تمام لوگوں کے تجربات کا ایک مجموعہ ہے بشرطیکہ صحیح اور مکمل صورت میں اسے مرتب و منظم کیا جائے، حتٰی کہ اگر ناقص صورت میں بھی مرتب کی جائے پھر بھی اسی لحاظ سے گزشتہ ادوار کے تجارب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

تاریخ کی اہمیت اس لحاظ سے بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیں اس بات کا علم ہو جائے کہ موجودہ دور میں کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ایسا نہیں ہے جس کا ایک یا کئی نمونے ماضی میں واقع نہ ہو چکے ہوں اسی لیے تو کہا جاتا کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔اور یہ ہے بھی حقیقت البتہ ممکن ہے کہ چند استثنائی واقعات ایسے ہوں جن کی مثال نہ ملتی ہو لیکن واقعات کو قطعی اکثریت اسی زمرے میں آجاتی ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اپنے فرمانِ ذیشان میں اسی چیز کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہیں:

"عباد الله ان الدهر يجري بالباقين كجريه بالماضين"

خدا کے بندو! حالاتِ موجودہ لوگوں میں بھی اسی سرح چل رہے ہیں جس طرح گزشتہ لوگوں میں جاری و ساری تھے۔[1]

ایک مشہور معروف حدیث میں آیا کہ اس امت میں جو کچھ واقع ہو رہا ہے اس کا نمونہ بنی اسرائیل میں واقع ہو چکا ہے:

یہیں سے معرفت و آگاہی کے بارے میں تاریخ کا مقام و مرتبہ اس کی اہمیت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

تاریخِ بشریت کا بغور مطالعہ کرنے سے مندرجہ ذیل امور روز روشن کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔

شکست و ناکامی۔

فتح و کامیابی کے اسباب،

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۷

تمدن کی نشوونما کے اسباب،

حکومتوں کے سقوط وانقراض کے اسباب،

ظلم واستبداد کا انجام،

عدل وانصاف کا انجام

اتحاد تحرک اور تلاش وکوشش کے آثار،

علم وآگاہی کے نقوش،

اور جہالت سستی اور کاہلی کا انجام، غرض سب کچھ تاریخ کے آئینہِ جہاں نما میں منعکس ہوتا ہے۔

اگر کسی دانشور شاعر نے خدا سے دوبارہ زندگی کی درخواست کی ہے تو کہا ہے:

مرد خرد مندِ پسندیدہ را

عمر دوبالیت درِ این روزگار

تا بہ یکی تجربہ اندوختن

با گری تجربہ بستن بکار

یعنی ایک اچھے اور عقلمند انسان کے لیے دنیا میں دو عمریں ضروری ہیں

تا کہ ایک عمر کے ذریعہ وہ تجربہ حاصل کرے اور دوسری کے ذریعہ اس تجربہ پر عمل کرے۔

اسے کہنا چاہیئے کہ اگر تم تاریخ کا بغور مطالعہ کرو تو دوبارہ کی عمر تو آسان بات ہے سو بار بلکہ ہزار بار کی عمر بھی تمہیں مل سکتی ہے۔

کیا خوب فرمایا ہے امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اپنے فرزندِ گرامی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے:

"ای بنی! انی وان لم اکن عمرت عمر من کان قبلی، فقد نظرت فی اعمالهم، ونکرت فی اخبارهم، وسرت فی آثارهم، حتی عدت کا حدهم، بل کانی بما انتهی الی من امورهم قد عمرت مع اولهم الی آخرهم۔"

فرزند دلبند! اگر چہ مجھے گزشتہ افراد کی عمر نہیں ملی لیکن میں نے ان کے اعمال پر نظر ڈالی ہے اور ان کی خبروں کے بارے میں سوچ وفکر سے کام لیا ہے ان کے آثار کی سیر کی ہے اور وہ بھی اس حد تک گویا میں بھی ان میں سے کا

ایک شمار ہونے لگا ہوں: نہیں بلکہ جو کچھ مجھے ان کی تاریخِ زندگی سے حاصل ہوا ہے گویا ان کے اول سے لے کر آخری فرد کے ساتھ آغاز سے انجام تک زندہ رہا ہوں۔[1]

مذکورہ معروضات پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اس نکتہ سنج شاعر کا اظہارِ افسوس جو یہ کہتا ہے:

افسوس کہ سودای من سوختہ خام است
تا سوختہ شود خامیِ من عمر تمام است

(ہائے افسوس کہ میرا علم و عقل اور تجربہ ابھی تک خام اور نامکمل ہے اور جب میری یہ خامی دور ہوگی تو زندگی ختم ہو جائے گی)

یا ایک اور شاعر کا جو یہ کہتا ہے:

تا تو انستم ندانستم چہ سود
چونکہ دانستم توانستم بنود

(جب میں جان سکتا تھا تو نہیں جانا۔ اس کیا کیا فائدہ۔ جب جان لیا تو میری طاقت سے باہر تھا)

کوئی معقول معلوم نہیں ہوتا کیونکہ تاریخِ بشریت اس قسم کی بہت سی مشکلات کو حل کرسکتی ہے اور اس طرح کی کئی قسم کی کمی کو پورا کرسکتی ہے۔

البتہ ہم موجودہ تاریخ تو کمزوری اور ناتوانی کا انکار نہیں کرتے۔ لیکن تاریخ اپنے تمام اشکالات کے باوجود (جس کی طرف ہم عنقریب اشارہ کریں گے) آگاہی اور معرفت کا ایک مؤثر اور مفید منبع ہے۔

۲۔ تاریخ کے پُرکشش نکات

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ تاریخ سے سبق حاصل کیا جاسکتا ہے، اور کیونکر؟ تو اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں ہے، کیونکہ تاریخ کو ایک بہت بڑی تجربہ گاہ یا لیبارٹری سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس میں انسانی زندگی کے مختلف مسائل پر تحقیقات کی جاتی ہے۔

اسی لیے جس طرح تجرباتی علوم نے اپنی حدود کے اندر بہت سے مسائل کو حل کر دیا ہے اور تحقیقات کے ذریعہ بہت سی واقعیات کو ثابت کر دکھایا ہے، اسی طرح تاریخ بھی جو ایک عظیم تجربہ گاہ ہے مختلف مسائل کو آزمائش کے مراحل سے گزار کر خالص اور ناخالص کو جدا کر دیتی ہے اور تخیلات کی بجائے حقائق اور واقعیات کو پیش کرتی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ امام حسنؑ کو وصیت

اگر فزیکل اور کیمیکل لیبارٹریوں میں اجسام کے ظاہر یا ان کی ترکیب پر تحقیق ہوتی ہے تو تاریخ کی لیباٹری میں بھی اقوام کی فتح وشکست کے اسباب، تمدنوں کی پیش رفت اور سقوط کے عوامل، مختلف اقوام وافراد کے صفات واوصاف کے ردِعمل اور ان کے رفتار وکردار کے طریقہِ کار کو آزمائش کی کسوٹی پر رکھا جاتا ہے اور وہ بھی نہایت ہی شیریں اور پُرکشش انداز ہیں۔

اس طرح سے تاریخ انسان کی خوش قسمتی اور بدبختی کے عوامل واسباب کو پرکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید گزشتہ لوگوں کی تاریخ پر بہت زور دیتا ہے اور قرآن مجید کی سورتوں میں تاریخی مباحث کو بیان کیا گیا ہے، حتی کہ بعض سورتوں کی تقریباً تمام آیات مشتمل ہی گزرشتہ لوگوں کی تاریخ پر ہیں، تو اس کا سبب بھی یہی ہے۔

ممکن ہے کہ ہٹ دھرم اور ضدی مزاج کے لوگ بہت سے ہے نظری مسائل کا انکار کردیں لیکن تاریخ کی مسلم اور قطعی واقعیات کا تو انکار نہیں کرسکتے، خصوصاً جب قرآنِ مجید لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر گزشتہ اقوام کے باقیماندہ آثارِ قدیمہ کی طرف لے جاتا ہے اوان کی قبروں پر شہروں کے کھنڈرات پر کھڑے ہوکر بیان کرنے کی باتیں ان سے بیان کرتا ہے۔

درحقیقت تاریخ تجرباتی مسائل کی ایک شاخ ہے اور ایک لحاظ سے اسے معرفت کے ایک اور منبع یعنی حّس اور تجربہ سے ادغام کیا جا سکتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ حسّ اور تجربہ کا تعلق حال سے ہوتا ہے جبکہ تاریخ کا تعلق ماضی سے ممکن ہے کہ حس اور تجربہ کا صرف تعلق ہو جبکہ تاریخ کا تعلق تمام لوگوں سے ہوتا ہے۔

لیکن تاریخ جو کہ تجربہ کی ایک شاخ ہے، اپنی زبردست اہمیت کے پیشِ نظر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس پر معرفت کے مستقل منبع کی حیثیت سے غور وفکر کیا جائے۔

۳۔ تاریخ کے ناخالص پہلو

باوجود یکہ تاریخ بہت سی واقعیات کو بیان کرنے کے لیے ایک عمدہ اور عظیم آئینے کی حیثیت رکھتی ہے لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صاف وشفاف آئینے کے چہرے کو بگاڑنے کے لیے ہمیشہ کئی آلودہ ہاتھ سرگرم عمل رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے اندر کئی ناخالص مواد موجود ہیں بسا اوقات سچ کو جھوٹ سے اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

اس کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے، کیونکہ ایک طرف تو تمام مؤرخین ہمیشہ غیر جانبدار نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ اپنی ذاتی پسند یا گروہی مصلحتوں کے پیشِ نظر اپنی حسبِ منشا تاریخ نگاری کرتے تھے اور دوسری طرف ظالم وجابر طاقتیں ہر دور اور ہر مکان پر تاریخ نویسوں کو اپنے زیرِ اثر رکھ کر اپنی مرضی کے مطابق تاریخ لکھواتی رہیں اور وہ بھی ان کے حکم کے مطابق لکھتے رہے۔

اگرچہ ان جبار حکمرانوں میں سے ہر ایک کی حکومت کے خاتمہ اور آزاد ماحول میّسر آجانے کے بعد کوشش ہوا کرتی تھی کہ ان غلطیوں کا ازالہ کیا جائے اور خرابیوں کی ترمیم کی جائے لیکن پھر بھی اس میں یا تو مکمل طور پر کامیابی نہیں ہو پاتی تھی اور اگر ہو بھی جاتی تو اصلاح اور ترمیم ناکافی ہوا کرتی تھی۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ کئی خودسر حکومتوں کے عروج وزوال کے ساتھ تاریخی مسائل بھی مختلف صورتوں میں تبدیل کر دیئے جاتے جو ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہوتے تھے، مثال کے طور پر بنی امیہ نے تاریخِ اسلام میں اپنی مرضی کے مطابق تحریف کی تو بنی عباس نے دوسری شکل میں اسے بدل ڈالا لیکن جب بنی عباس کے جانشین آئے تو انہوں نے اسے ان دونوں سے مختلف شکل دے دی۔

سوویت یونین کا آمراء اسٹالن، کمیونسٹ انقلاب کی تاریخ کو اسی صورت میں تحریر کرنا ہے جیسا اس کا جی چاہتا ہے، حتٰی کہ پورے ملک کے مدارس میں اس تاریخ کو داخل نصاب کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس کے جانشین آتے ہیں تو اس کا ایک خون آشام جلاد کے عنوان سے تعارف کراتے ہیں اور اس کی تحریر کردہ تاریخی کتابوں کو سمیٹنے کا حکم دے کر تاریخِ انقلاب کو نئے انداز میں تحریر کیا۔ اسی طرح جوٹو لا بھی برسرِ اقتدار آتا رہا اپنے منشاو مذہب کے مطابق تاریخ میں ردو بدل کرتا رہا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ تاریخ سے اس قدر بدظن ہو گئے کہ اس معروف جملے کو مبالغہ کی حد تک اپنا لیا کہ تاریخ ایسے واقعات اور سرگزشتوں کا مجموعہ ہے جو معرضِ وجود میں نہیں آئے اور ایسی قوموں کے بارے میں ہے جن کا قطعاً وجود ہی نہیں تھا،

لیکن جہاں تک انصاف کا تعلق ہے۔ ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اپنے ان تمام نقائص کے باوجود تاریخ معرفت وشناخت کے منبع کی حیثیت سے قابلِ قبول ہے، کیونکہ تاریخ بھی دوسری تمام روایتوں کی مانند متواتر موثق ضعیف اور مجہول روایات کی حامل ہے۔

کچھ امور کے بارے میں تاریخی متواترات کا انکار نہیں کیا جا سکتا، جیسے منگولول کے لشکروں کے حملے، ہٹلر کی بربریت، اندلس کے دردناک حوادث اور اس قسم کے سینکڑوں دوسرے واقعات ہیں۔ البتہ جس چیز کی نفی یا اثبات، یا جس پر اعتراض اور اشکال کیا جا سکتا ہے، وہ تاریخی جزئیات ہیں کہ اگر موثق ذرائع سے ثابت ہو جائیں تو قابلِ قبول ہیں۔ البتہ ان کے ضعیف پہلو بھی کم نہیں ہیں۔

تاریخ کے بارے میں یہ ایک منصفانہ فیصلہ ہے لہٰذا نہ تو اس کی تمام چیزوں کو آنکھ اور کان بند کر کے تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تمام تاریخی کتابوں کو یکسر مسترد کیا جا سکتا ہے۔

اس سے قطع نظر تاریخ کے دو حصے ایسے ہیں جو ہر طرح کی دستبرد یا تحریف سے پوری طرح محفوظ ہیں۔ ایک تو وہ آثار جو خارجی اور تکوینی صورت میں اس دنیا میں باقی ہیں کہ آسانی کے ساتھ ان میں تحریف نہیں کی جا سکتی اور قرآنِ مجید نے بھی تاریخ کے اسی حصہ پر زیادہ زور دیا ہے اور سیر فی الارض کی آیات بھی گزشتہ لوگوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لیے اسی چیز کو بیان کرتی ہیں۔

اور اس سے بڑھ کر وہ تواریخ ہیں جو وحی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں، جیسے قرآن مجید میں موجود تاریخوں کے واقعات جو ہر لحاظ سے خالص اور اصل ہیں۔ اصولی طور پر جس طرح بہترین بہترین قانون ساز خداوندِ عالم ہے اسی طرح بہترین مؤرخ بھی وہ خود ہی ہے، کیونکہ اسے تمام حقائق کی جزئیات کا علم ہے اور شخصی یا گروہی پسند اور ناپسند کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی بنا پر وہ خود ہی دوسروں کی نسبت تاریخ کو بہتر طور پر بیان کر سکتا ہے۔

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کسی ایک تاریخی داستان کا اس حد تک تکرار کرتا ہے کہ بعض لوگ تعجب کرنے لگ جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت نوحؑ یا حضرت موسیٰؑ علیہ السلام اور فرعون کی داستانوں کو اور ان انبیاء کی متکبرین کے ساتھ محاذ آرائی کو اس حد تک کیوں بار بار دہرایا

گیا ہے؟ لیکن انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں سے ہر ایک آیت کا اپنا مخصوص تاریخی پہلو ہوتا ہے کیونکہ بسا اوقات ایک تاریخی واقعہ کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔

مثلاً بنی اسرائیل کی تاریخ کے سلسلے میں کبھی تو طاغوتِ وقت کے ساتھ محاذ آرائی اور مقابلہ کا پہلو اجاگر کیا جاتا ہے اور کبھی اس ہٹ دھرم قوم کی ہٹ دھرمی کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے، کبھی ان کے باہمی اختلافات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور کبھی نعمتوں کی ناشکری کے پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

الغرض بہت سے تاریخی حقائق ایسے آئینہ کی مانند ہیں جس کے کئی پہلو ہیں اور ہر ایک پہلو ایک علیٰحدہ حقیقت کو نمایاں کرتا ہے، انشاء اللہ (اس کی مزید تفصیل آپ تاریخِ قرآن کی فصل میں پڑھیں گے)

۴۔ فلسفۂ تاریخ

تاریخ میں جس چیز کو زبردست اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس بات کو دیکھا جائے کہ تاریخی واقعات کی بنیاد کیا ہے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر دنیا کے کسی خطے میں کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے تو سب سے پہلے ان مسائل کا منظر غائر جائزہ لیا جائے جس کی وجہ سے یہ انقلاب برپا ہوا ہے اور ساتھ ہی ان تمام گزشتہ حوادث و واقعات کا جائزہ لینا چاہیئے جن کے ساتھ ان انقلاب کا تعلق ہے۔

پھر اس انقلاب کے ثمرات اور نتائج کا جائزہ لیا جائے گا۔ اور جو چیز تاریخ کو ہدف عطا کرتی ہے اور اسے ایک قسم کی سرگرم رکھنے والی حکایات اور قصوں کہانیوں سے نکال کر شناخت و معرفت کے ایک اہم اور قابلِ غور منبع میں تبدیل کر دیتی ہے وہ یہی ہے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ نگاروں نے صرف تاریخی واقعات کے ذکر کرنے پر ہی اکتفا کی ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ رونما ہو چکے تھے۔ ان واقعات کے اسباب و نتائج کی طرف بہت کم توجہ دی ہے اور مسائل کے تجزیہ و تحلیل کرنے میں کوئی خاص توجہ نہیں کی۔

لیکن جو چیز قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ قرآن مجید نے تاریخی واقعات کو بھی بیان کیا ہے؟ ان کے اسباب اور بنیادوں کو بھی ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا نتیجہ بھی بیان کیا ہے۔ کہیں پر تو گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا کچھ حصہ بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے "فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین" دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ (سورہ آل عمران ر ۱۳۷)

کبھی کہتا ہے "وانظروا کیف کان عاقبة المفسدین" دیکھو فسادیوں اور تباہ کاروں کا انجام کیا ہوا؟ (اعراف ۸۶)

کبھی فرماتا ہے "فانظروا کیف کان عاقبة المجرمین" دیکھو تو سہی کہ مجرموں کیا انجام ہوا؟ (سورہ نمل ۶۹)

اور کبھی فرماتا ہے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم" خداوندِ عالم کسی قوم کی حالت اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ لوگ اپنی حالت خود تبدیل نہ کریں۔ (رعد ۱۱)

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ تاریخ کہ بہت سے شعبے ہیں جن میں زیادہ اہم شعبے یہ ہیں، انسان اور انسانی معاشروں کی تاریخ، مختلف

تمدنوں کی تاریخ اور انسانی علوم وفنون کی تاریخ یہ ایسی تاریخیں ہیں جن کا اصل محور انسان ہے اور انسان ہی اس گاڑی کو چلانے والا ہے۔

اور عجیب کم فہم ورسادہ لوح ہیں وہ لوگ جو تاریخ کو اپنے تمام لوازمات سمیت اقتصاد کے جبری مسائل کا نتیجہ سمجھتے ہیں بلکہ اسے صنعتی ہتھیار سمجھتے ہیں۔یعنی وہ انسانی تاریخ کو چند صنعتی مشینوں اور صنعتی ہتھیاروں کی مخلوق اور بے ارادہ غلام سمجھتے ہیں جنہیں خود انسان نے تیار کیا ہے۔

اس قسم کے لوگوں نے اپنے اس گمانِ باطل کی وجہ سے نہ تو انسان کو پہچانا ہے اور نہ ہی تاریخ کو۔

۵۔نقلی اور علمی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ

ایک معاصر دانشور نے تاریخ کو ایک لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ **نقلی تاریخ:** جو چند ایسے جزئی اور خصوصی حوادث اور واقعات کا مجموعہ ہے جو ماضی میں رونما ہو چکے ہیں، اور حقیقت میں ایسی فلم FILM کے مشابہ ہے جو کسی ایک واقعہ یا چند واقعات سے تیار کی جاتی ہے، اسی لیے یہ تاریخ ہمیشہ جزئی ہوتی ہے نہ کہ کلی، ماضی سے اس کا تعلق ہوتا ہے نہ کہ حال سے: اور نقلی ہوتی ہے نہ کہ عقلی۔

تاریخ کا یہ حصہ فیصلہ جات کے ذریعہ مفید اور سبق آموز ہوتا ہے مثلاً انسان کا اپنے ہم نشین پر اثر ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے لوگوں سے عبرت حاصل کرتا ہے جیسا کہ قرآنِ مجید نے مختلف لوگوں کے اُسوے بیان کیے ہیں تاکہ لوگوں کو ان سے نصیحت حاصل ہو۔

۲۔ **علمی تاریخ:** انسانی زندگی پر حاکم قوانین اور طریقوں کو بیان کرتی ہے۔ایسے قوانین اور طریقہِ کار جو گزشتہ حوادثات کے تجزیہ وتحلیل کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے اس حصے کے لیے نقلی تاریخ خام مال کا کام دیتی ہے۔

ان قواعد کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عام ہونے، علمی ہونے اور شناخت ومعرفت کا ایک منبع ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے، اور انسان کو مستقبل پر مسلط کرنے کی قابلیت بھی وتی ہے۔

اس کے باوجود پھر بھی تاریخ کی اس قسم میں یہ بتایا جاتا ہے کہ واقعات کیا ہیں اور یہ نہیں بتایا جاتا کہ کیسے ہوئے ہیں ہر چند کہ یہ قسم کّلی بھی ہے اور عقلی بھی۔

۳۔ **فلسفۂ تاریخ:** مختلف ادوار اور معاشروں میں رونما ہونے والے مرحلہ وار تغیر وتبدل کو بیان کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ بتاتا ہے کہ یہ واقعات کیونکر رونما ہوئے ہیں۔

اسی چیز کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں:

حیات شناسی EXISTENTIALISM زندہ موجودات کی زندگی پر حکم فرما کّلی قاعدوں اور قوانین کے بارے میں بحث کرتی ہے۔ جبکہ ارتقاء انواع کا نظریہ (اس نظریہ کے قائل ہونے کی صورت میں) زندہ موجودات کی ایک نوع سے دوسری نوع میں تبدیلی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔درحقیقت یہاں پر موضوعِ بحث تاریخ کی حرکت اور ارتقاء کی کیفیت ہوتی ہے اور تاریخ کی یہ قسم ایک کّلی حیثیت کی حامل ہے

اور عقلی ہے۔اور اس کے ساتھ ہی اس کی ماضی پر بھی نگاہ ہے اور مستقبل پر بھی۔

''تاریخ کی اس قسم کا فائدہ بھی کسی پر مخفی نہیں ہے۔''[1]

لیکن یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا تحقیق اور تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے سلسلے میں جو کچھ بیان ہوا ہے صحیح ہے لیکن علم اور فلسفہ کی جو اصطلاحیں بیان ہوئی ہیں وہ نئی ہیں جنہیں متکلم نے اپنا مقصود بیان کرنے کے لیے ادا کیا ہے وگرنہ عام حالات ان اصطلاحوں سے سازگار نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ دوسری اور تیسری قسم کو بھی ایک دوسرے میں ادغام کیا جا سکتا ہے، کیونکہ تاریخ پر حکم فرما کلّی قوانین جو تاریخِ نقلی سے حاصل ہوتے ہیں کبھی تو معاشروں کی موجودہ کیفیتوں کو بیان کرتے ہیں اور کبھی معاشروں میں پیدا ہونیوالی تبدیلیوں اور ارتقاء کو بیان کرتے ہیں۔

یہاں پر جو بات زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے صرف تاریخی واقعات کے ذکر پر ہی اکتفاء نہیں بلکہ معاشرے اور اجتماع پر حکم فرما کلّی قوانین کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے، ایسے کلی قوانین جو کیوں اور کیسے کی وضاحت کرتے ہیں اور تاریخ میں رونما ہونے والے تغیّر وتبدّل اور ترقی وپستی کے اسرار سے نقاب کشائی کرتے ہیں۔

مگر قرآن مجید نے ایک جگہ فرمایا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ۙ

اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم جب کسی قوم کو نعمت سے نوازے تو اس وقت تک اس نعمت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود کو تبدیل نہ کردے۔(انفال۔ ۵۳)

یادرہے کہ قرآن مجید نے اس کلی اصول کو قوم فرعون کی داستان اور گناہوں کی وجہ سے ہر عذاب نازل ہونے کے واقعہ کے بعد ارشاد فرمایا ہے۔

ایک اور جگہ پر ان طاقتور اور زور آور اقوام کی تاریخ کو بیان فرمایا ہے جو اپنے انبیاء کے جھٹلانے اور شرک وگناہ اور ظلم کے ارتکاب کی وجہ سے نیست ونابود ہوگئیں:

فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ قَدۡ خَلَتۡ فِىۡ عِبَادِهٖ ۚ

---

[1] استاد مرحوم شہید مطہری کی کتاب ''فلسفہ تاریخ'' کا خلاصہ

انہوں نے جب ہمارے شدید عذاب کو دیکھ لیا تو ایمان کا اظہار کر دیا لیکن انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا یہی وہ خدائی طریقہ کار ہے جو اس کے گزشتہ بندوں کے بارے میں جاری ہو چکا ہے۔ (مومن/ ۸۵)

جی ہاں! یہ ایک کلّیہ قاعدہ اور قانون کلّی ہے کہ حوداث کا علاج رونما ہونے سے پہلے کیا جانا چاہیئے اور جب انجام انسان کے دامنگیر ہو جائے تو پھر سب کچھ بیکار ہو جاتا ہے۔ چڑیوں کے کھیت چُگ جانے سے ہوت کا پچھتاوا بیکار ہو جاتا ہے اور تلافی ناممکن۔

ایک سوال کا اور اس کا جواب

ممکن ہے یہاں پر سوال کیا جائے کہ تاریخِ بشریت میں قواعدِ کلّیہ کے وجود کو قبول کر لینے سے جبرِ تاریخ کا مفہوم آنکھوں کے سامنے آ سکتا ہے جو انسان کی آزادی اور ارادہ سے سازگار نہیں ہے۔

لیکن اگر ایک نکتہ پر اچھی طرح غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کلّی قواعد اور طریقۂ کار سے مراد انسان اور انسانی معاشرے کے وہ اعمال ہیں جو ان سے تو آزادانہ طور پر سرزد ہوتے ہیں لیکن ان کا ردِ عمل یقینی ہوتا ہے، مثلاً باشعور، دلیر اور جفاکش قومیں کامیاب ہوتی ہیں اور منتشر، سست اور بے شعور قومیں شکست اور ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔

یہ ایک اٹل تاریخی فیصلہ ہے اور کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان مجبور اور تاریخی حوداث کے چنگل میں جکڑا ہوا ہے، یا انسان کے انجام میں اس کا ارادہ مؤثر اور اہم کردار ادا کرتا ہے؟

بعینہ اس کی مثال یوں دہ جا سکتی ہے کہ ہم کہتے ہیں مثلاً اگر کوئی شخص زہریلا کھانا کھالے تو وہ یا تو بیمار ہو جائے گا اور یا موت کے منہ میں چلا جائے گا اور یہ ایک کلّیہ قاعدہ ہے۔ لازمی طور پر اس کا ایک ضروری اثر بھی ہوتا ہے جو انسان کے ارادہ و اختیار کی اصل سے ہرگز کوئی منافات نہیں ہے۔

۲۔ نہج البلاغہ اور اسلامی روایات میں تاریخ کا بیان

چونکہ نہج البلاغہ ایک عظیم کتاب ہے جس کا تربیتی مواد نہایت ہی کثیر، قوی اور بے نیاز کرنے والا ہے، لیکن تربیت معرفت کے بغیر اور معرفت وسائل اور منابع کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی لیے نہج البلاغہ میں تاریخی مسائل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

نہج البلاغہ میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام کا کلامِ مبارک تاریخی حودث کی اس انداز میں تشریح فرماتا ہے گویا انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے دور دراز کے ادوار کی طرف لے جاتا ہے اور حالات و واقعات کو صاف صاف اس کے سامنے مجسم کر دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان فرعون کے لشکر کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے جو مستضعفینِ بنی اسرائیل کی گرفتاری کے لیے آگے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیل کی موجوں کی نذر ہو رہا ہے

قومِ عاد و ثمود اور قومِ لوطؑ کو سرکش آندھیوں کے جھکڑوں، بجلیوں، زلزلوں اور پتھروں کی بارشوں کے حملوں کا شکار ہوتا دیکھ رہا ہے۔

پلک جھپکتے ہی یہ سرکش، ظالم، ستمگار اور ہوس باز اور رب کی باغی قومیں اور ان کے قصور ومحلات، غرض کہ زندگی کا سب کچھ آن کی آن میں تباہ وبرباد ہورہا ہے اور سوائے خاموش کھنڈرات اور بے جان دھڑوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا اور اب وہاں پر موت کی خاموشی کا سکہ چل رہا ہے۔

پھر ہر مسافر کو معرفت وآگاہی کے توشہ کے ساتھ وہاں سے واپس لے آتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخی واقعات کی نشاندہی میں نہج البلاغہ کو جو عجیب قدرت حاصل ہے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے، اسی طرح فلسفہِ تاریخ کے بیان کرنے میں۔

ہم پہلے تفصیل کے ساتھ امیر المؤمنینؑ کا کلام انسان کی افرائشِ عمر کے بارے میں بتا چکے ہیں جو آپؑ نے اپنے فرزندِ گرامی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا اور بتایا تھا کہ تجربہ اور معرفت کے لحاظ سے تاریخ انسان کی عمر کو تمام دوسرے انسانوں کی عمر کے برابر بنا دیتی ہے۔

تاریخ کے کلّی قواعد کے بارے میں بھی آپؑ کے کلام میں نہایت ہی قابلِ توجہ تعبیرات ملتی ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

"عباد الله! ان الدهر يجري بالباقين كجريه بالماضين، لا يعود ما قد ولى منه، ولا يبقى سرمدا ما فيه، آخر فعاله كا وله، متشابهة اموره، متظاهرة اعلامه"

اے بندگانِ خدا! اس دنیا میں باقی رہنے والوں پر بھی وہی کچھ گزرے گا جو گزشتہ لوگوں پر گزر چکا ہے، جو گزر گیا اس نے لوٹ کر نہیں آنا، اور جو کچھ موجود ہے وہ ہمیشہ نہیں رہے گا، اس دنیا کے آخری کام اس کے ابتدائی کاموں جیسے ہیں، اور اس کے اعمال اور رفتار وروش سب ایک دوسرے جیسے ہیں اور اس کی علامتیں اور نشانات واضح اور آشکار ہیں۔ [1]

امیر المؤمنین علیہ السلام ایمان کی تفسیر میں چار ستونوں (صبر، یقین، عدل اور جہاد) کے قائل ہیں، اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

"والتقين منها على اربع شعب: على تبصرة الفطنة، وتاول الحكمة والموعظة العبرة وسنة الاولين"

اور یقین کے چار شعبے ہیں (چار ستونوں پر استوار ہے) روشن نگاہی، حقیقت رسی، عبرت اندوزی اور اگلے لوگوں کا طور طریقہ۔ [2]

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"واعلموا عباد الله انكم و ما انتم فيه من هذه الدنيا على سبيل من

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۷

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ نمبر ۳۱

قد مضى قبلكم، ممن كان لطول منكم اعمارا، واعمر ديارا، وابعد آثارا، اصبحت اصواتهم هامدة، ورياحهم راكدة، واجسارهم بالية، وديارهم خالية، وآثارهم عافية فاستبدلوا بار لقصو المشيدة، والنمارق الممهدة، الصخور والاحجار المسندة والقبور اللاطئة الملحدة، التي قد بنى على الخراب فنائها وشيد بالتراب بنائها"

اے خدا کے بندو! اس بات کو جانے رہو کہ تمہیں اور اس دنیا کی ان چیزوں کو کہ جن میں تم ہو انہی لوگوں کی راہ پر گزرنا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں جو تم سے زیادہ لمبی عمروں والے، تم سے زیادہ آباد گھروں والے اور تم سے زیادہ پائیدار نشانیوں والے تھے۔ ان کی آوازیں خاموش ہو گئیں، بندھی ہوائیں اُکھڑ گئیں، بدن گل سڑ گے، گھر سنسان ہو گئے اور نام ونشان تک مٹ گئے۔ انہوں نے مضبوط محلوں اور بچھی ہوئی مسندوں کو پتھروں اور چنی ہوئی سلوں اور پیوند زمین ہونے والی (لحد) احد والی قبروں سے بدل لیا کہ جن کے صحفوں کی بنیاد تباہی و ویرانی پر ہے اور مٹی ہی سے ان کی عمارتیں مضبوط کی گئی ہیں۔ [1]

ایک اور خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"فاعتبروا بما اصاب الامم المستكبرين من قبلكم، من باس الله و صولاته، ووقائعه ومثلاته، واتعظوا بمثاوى خدودهم ومصارع جنوبهم"

تمہیں لازم ہے کہ تم سے قبل سرکش امتوں پر جو قہر وعذاب اور عتاب وعقاب نازل ہوا ہے اس سے عبرت لو اور ان کے رخساروں کے بل لیٹنے اور پہلوؤں کے بل گرنے کے مقامات سے نصیحت حاصل کرو۔ [2]

اسی خطبے ہی میں فرماتے ہیں:

"فانظروا كيف كانوا، حيث كانت الا ملاء مجتمعة والا هواء موتلفة،

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۶

[2] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ نمبر ۱۹۲

والقلوب معتدلة، والا يدى مترادفة والسيوف متناصرة، والبصائر نافذة، والعزائم واحدة، الم يكونوا اربابا فى اقطار الارضين؟ وملوكا على رقاب العالمين؟ فانظروا الى ماصاروا اليه فى اخر امورهم، حين وقعت الفرقة، وتشتت الالفة، واختلفت الكلمة، والا فئدة، وتشعبوا مختلفين، وتفرقوا متحاربين، قد خلع الله غلهم لباس كرامته، وسلبهم غضارة نعمته، وبقى قصص اخبارهم فيكم عبر اللمعتبرين!"

غور کرو کہ جب ان کی جمعیتیں یکجا، خیالات یکسو اور دل یکساں تھے، اور ان کے ہاتھ ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور تلواریں ایک دوسرے کی معین و مددگار تھیں، اور ان کی بصیرتیں تیز اور ارادے متحد تھے، تو اس وقت ان کا عالم کیا تھا؟ کیا وہ اطراف زمین میں فرمانروا اور دنیا والوں کی گردنوں پر حکمران نہیں تھے؟ اور تصویر کا یہ رُخ بھی دیکھو کہ جب ان میں پھوٹ پڑ گئی یکجہتی درہم برہم ہوگئی، ان کی باتوں اور دلوں میں اختلافات کے شاخسانے پھوٹ نکلے، اور وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور الگ جتھے بن کر ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے لگے تو ان کی نوبت یہ ہوگئی کہ اللہ نے ان سے عزت و بزرگی کا پیراہن اتار لیا اور نعمتوں کی آسائشیں ان سے چھین لیں اور تمہارے درمیان ان کے واقعات کی حکایتیں عبرت بن کر رہ گئیں۔ [1]

ایک اور خطبہ میں فرماتے ہیں:

"وان لكم فى القرون السالفة لعبرة، اين العمالقة وابناء العمالقة، اين الفراعنة وابناء الفراعنة؟ اين اصحاب مدائن الرس الذين قتلوا النبيين، واطفعوا سنن المرسلين، واحيوا سنن الجبارين؟ الذين ساروا بالجيوش وهزموا بالابوف، وعسكرو العساكر، ومدنوا المدائن؟"

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ نمبر ۱۹۲

تمہارے لیے گزشتہ دوروں (کے ہر دور) میں عبرتیں (ہی عبرتیں) ہیں (ذرا سوچو تو) کہ کہاں ہیں عمالقہ [1] اور ان کے بیٹے، اور کہاں ہیں فوعون اور ان کی اولادیں؟ کہاں ہیں اصحاب الرس [2] کے شہروں کے باشندے جنہوں نے نبیوں کو قتل کیا، پیغمبروں کے روشن طریقے کو مٹایا اور ظالموں کے طور طریقے کو زندہ کیا اور کہاں ہیں وہ لوگ جو لشکروں کو لے کر بڑھے، ہزاروں کو شکست دی اور فوجوں کو فراہم کر کے شہروں کو آباد کیا۔ [3]

دیگر روایات میں بھی اسی چیز کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے اور تاریخ نے اسے معرفت کے ایک منبع کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے، خصوصاً اخلاقی مسائل، تہذیب نفس اور انسانی زندگی کے حقائق کی طرف توجہ کے لیے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ میدانِ صفین کی طرف جا رہے تھے تو شہر ساباط اور وہاں سے ''بھرسیر'' [4] نامی شہر کے پاس جا پہنچے۔ (مقتدر ساسانی بادشاہوں کی حکومت کے مرکزی علاقہ میں) تو آپؑ کے ایک ساتھی کی نگاہ اچانک کسریٰ (ساسانی بادشاہ) کے آثار پر جا پڑی تو اس نے عرب کے اس مشہور شعر کو تمثیل کے طور پر پڑھا:

جرت الریاح علی مکان دیارهم

فکانهم کانوا علی المیعاد

ہوائیں ان کے گھروں اور قصور و محلات پر چلیں۔ گویا ان سب کی ایک مقررہ مدت تھی جو (وہ پوری کر کے چلے گئے)

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تم نے ان آیات کی تلاوت کیوں نہیں کی؟

"کم ترکوا من جنات وعیون وزروع و مقام کریم ونعمة کانوا فیها

---

[1] ''عمالقہ'' قدیم اقوام سے تھے جو شمالی حجاز میں رہتے تھے، فراعنہ مصر کے زمانہ میں مصر کو فتح کیا اور وہیں پر حکومت چلاتے رہے (نہایت ہی طاقتور، قوی، جبار اور ستمگر قوم کے فرد تھے)۔

[2] بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ''اصحاب رس'' ایک قوم تھی جو جزیرہ نمائے عرب کے جنوب کی سرزمین یمامہ میں رہتی تھی۔ اس قوم کے نام ''حنظلہ'' نامی پیغمبر بھی بھیجے گئے، جبکہ کچھ اور لوگ انہیں حضرت شعیبؑ کی قوم سمجھتے تھے اور بعض لوگوں نے اس قوم کا محل سکونت شام اور حجاز کے درمیان کی آبادیوں کو لکھا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ، جلد ۱۵)

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۲

[4] بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ نام فارسی کلمہ ''بہ اردشیر'' یا ''دہ اردشیر'' سے لیا گیا ہے اور یہ ''مدائن'' کے سات شہروں میں سے ایک شہر تھا، جو دجلہ کے مغرب میں واقع تھا۔ معجم البلدان، جلد ۱، ص ۵۱۵

فاكهين كذالك واورثناها قوما اخرين۔ فمابكت عليهم السماء والارض وما كانوا منظرين"

وہ لوگ کس قدر باغات، چشمے اور کھیتیاں چھوڑ کر چلے گئے، اور دلکش قیمتی محلات اور دوسری بہت سی نعمتیں کہ جن سے وہ بہرہ مند ہوا کرتے تھے، تو یہ تھا ان کا ماجرا اور ہم نے ان چیزوں کو دوسری اقوام کی میراث قرار دے دیا۔ لیکن نہ تو ان پر آسمان رویا اور نہ ہی زمین! (اور جب ان موت کا فرمان ان کے پاس پہنچ گیا) تو انہیں کوئی مہلت نہ دی گئی۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا:

یہ لوگ ایک دن ایسا تھا کہ دوسروں کی املاک کے وارث تھے اور ایک دن انہوں نے اپنا سب کچھ دوسروں کے لیے وراثت کے طور پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے خدا کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا اور ان کی دنیا ان کے گناہوں کی وجہ سے برباد ہوگئی لہٰذا تم کفرانِ نعمت سے بچو تا کہ تم پر عذابِ الٰہی نازل نہ ہو۔ [1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک دن حضرت داؤد، علیہ السلام، زبور پڑھتے ہوے باہر آئے، چنانچہ آپؑ جب بھی زبور کی تلاوت کرتے تھے تمام پہاڑ چرندو پرندان کے ہم صدا ہوجاتے تھے۔

زبور پڑھتے ہوئے ایک پہاڑ پر جا پہنچے۔ اس کی چوٹی پر ایک عابد پیغمبر رہتے تھے، جن کا نام حزقیل تھا۔ جب حضرت حزقیل نے پہاڑوں، پرندوں اور درندوں کے زمزمہ کو سنا تو سمجھ گئے کہ حضرت داؤدؑ آ گئے ہیں حضرت داؤدؑ نے ان سے اوپر آنے کی اجازت طلب کی حضرت حزقیلؑ نے انہیں اجازت نہیں دی۔ داؤد علیہ السلام نے رونا شروع کر دیا۔ خداوند کریم نے حزقیل کی طرف وحی کی کہ آپ داؤد کو سرزنش نہ کریں اور مجھ سے عافیت طلب کریں۔

یہ سن کر حزقیل کھڑے ہو گئے اور حضرت داؤدؑ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ پر لے آئے اور ان دونوں کے درمیان یوں گفتگو کا تبادلہ ہوا:

داؤد: کیا آپ کو کبھی گناہ کی خواہش بھی ہوئی ہے!

حزقیل: نہیں۔

داؤد: عبادت کی وجہ سے بھی آپ کے دل میں غرور وتکبر پیدا ہوا ہے؟

حزقیل: نہیں۔

داؤد: آپ کے دل میں کبھی دنیا کا رجحان بھی پیدا ہوا ہے اور دنیاوی لذات اور خواہشات کے لیے جی چاہتا ہے؟

حزقیل: جی ہاں! کبھی ایسا ہوتا ہے۔

---

[1] بحارالانوار، جلد ۶۸، ص ۳۲۷

داؤد: تو پھر اس وقت کیا کرتے ہیں؟

خزقیل: یہ جو سامنے درّہ دیکھ رہے ہیں اس کے اندر چلا جاتا ہوں اور اس میں جو کچھ ہے اس سے عبرت حاصل کرتا ہوں۔

یہ سن کر حضرت داؤد اس درہ کے اندر چلے گئے وہاں پر لوہے کا ایک تخت دیکھا جس پر قدیم زمانے کی ایک بوسیدہ انسانی کھوپڑی اور منتشر ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی ایک تختی تھی جس پر کچھ تحریر تھا۔ حضرت داؤدؑ نے اس نوشتہ کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ ان تمام چیزوں کا تعلق ایک بادشاہ سے ہے جو نہایت ہی طاقتور تھا اور عرصہ دراز تک حکومت کرتا رہا، کافی تعداد میں شہروں کو زیرِ نگیں کیا، ایک عظیم حرم سرا کا مالک تھا، لیکن انجام کار اس کی اس صورت میں ہوا.....[1]

معرفت عطا کرنے والی تاریخ کے بارے میں حرفِ آخر

معرفت وآگاہی عطا کرنے والی تاریخ کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ:

۱۔ انسان کو چاہیئے کہ تاریخ کا مطالعہ صرف وقت گزارنے کے لیے نہ کرے۔

۲۔ تاریخ کے واقعی مسائل کا انسانی اعمال کے ساتھ کیا تعلق اور رابطہ ہے، اس پر اچھی طرح سے غور وفکر کرے اور، بخت واتفاق یا جبر اوقضاء وقدر جیسی موہوم اور باطل توجیہات سے تاریخ کے مسائل کا تجزیہ وتحلیل نہ کرے، (جیسا کہ بعض بے سمجھ لوگ اس بارے میں ایسا کرتے ہیں اور اسے انسانی قدرت کے سلب کا نام دیتے ہیں)

۳۔ تاریخ کے کلّی قوانین کو جزئی حادثات وواقعات سے استنباط کرے اور ان واقعات کے اصول ونتائج کا ہر ایک واقعہ میں تجزیہ وتحلیل کرے اور پھر خود کو ہی ایک مصداق کے عنوان سے ان قوانین میں شامل سمجھے اور ان سے نتیجہ حاصل کرے۔

۴۔ اسے اس بات کی امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ جس حادثہ اور واقعہ کو دوسرے لوگوں نے آزمایا ہے وہ خود بھی آزمائے تا کہ "من جرب المجرب حلت به الندامة" آزمائے کو آزمانا باعثِ ندامت ہے کے مصداق پشیمانی اس کے بھی دامنگیر ہو۔

۵۔ تاریخی مسائل کو تنقید کی نگاہ سے دیکھے اور تاریخی مسلمات کو مشکوک باتوں سے، حقائق کو افسانوں سے اور خالص کو ناخالص سے جدا کرے۔

قصہ مختصر تاریخ کا معرفت وشناخت کے الہام بخش منبع کی حیثیت سے اپنی زندگی میں مطالعہ کرے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے، نہ کہ اس کی انحرافی اور گمراہ کن حیثیت سے۔

---

[1] بحارالانوار، جلد ۱۴، ص ۲۲ (تھوڑی سی تخلیص کے ساتھ)

معرفت کا چوتھا منبع

فطرت، ضمیر اور باطنی شعور

اشارہ

انسان جب عقل وشعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو کسی استاد اور معلم کی رہنمائی کے بغیر کچھ حقائق کو جان لیتا ہے۔ بدیہی یعنی واضح ترین مسائل اس پر روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں مثلاً دو ضدیں یا دو نقیضین ایک جگہ اکٹھا نہیں ہوسکتیں اور ان کا اجتماع محال ہوتا ہے۔

بہت سی چیزوں کے حسن وقبح (اچھائی اور برائی) کا ادراک کر لیتا ہے، ظلم وستم کو بُرا اور عدل واحسان کو اچھا سمجھتا ہے۔

جب کوئی غلط کام اس سے سرزد ہو جاتا ہے تو اپنے باطن سے ایک آواز سنتا ہے جو اسے سرزنش اور تنبیہ کر رہی ہوتی ہے اور اس کے برعکس اگر کوئی نیک کام کرتا ہے تو اپنے اندر ایک قسم کا سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔

اچھی اور خوبصورت چیزوں سے پیار کرتا ہے اور علم وخرد کو دوست رکھتا ہے۔

اور اندرونی طور پر ایک مقدس مبداء کے ساتھ اپنے تعلق کا احساس کرتا ہے، ۔یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اپنے دل کی گہرایوں سے خدا کی طرف کھینچ کر چلا جاتا ہے۔

ان تمام چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ معرفت کا ایک اور عظیم منبع ان چیزوں کے علاوہ جو اب تک بتائی جا چکی ہیں انسان کے اندر بھی موجود ہے جس کو ہم فطرت یا ضمیر یا باطنی شعور کا نام دیتے ہیں۔

عقل اور فطرت وضمیر کی حدود کو ایک دوسرے سے جدا کرنے ۔کے لیے مندرجہ ذیل وضاحت پر غور فرمایئے۔

انسانی روح ایک عجیب مخلوق ہے جس کے کئی زاویئے ہیں، جن میں سے کچھ تو پہچانے جا چکے ہیں اور کچھ کی ابھی تک پہچان نہیں کی جا سکی۔ اور وہ زاویئے اور پہلو مختلف ہونے کی بنا پر ان کی سرگرمیاں بھی مختلف ہوتی ہیں۔

ان میں سے کچھ سرگرمیوں کا تعلق عقل وخرد سے ہے جن کا کام غور وفکر کرنا ہے، اس کا ایک اور حصہ بھی ہے جس کا نام، حافظہ ہے جو انسان کی تمام معلومات کو اکٹھا کرتا ہے، انہیں ترتیب دیتا اور انہیں ریکارڈ میں لاتا ہے اور بوقت ضرورت، صرف اور صرف ضروری چیز کو ہی لاکھوں، کروڑوں مطالب کے درمیان سے ڈھونڈھ نکالتا ہے، اور وہ بھی برق رفتاری اور معجزانہ انداز میں۔

اس کا ایک اور حصہ محبتوں، دوستی، اور دشمنی پر مشتمل تعلقات اور عشق ومحبت سے تعلق رکھتا ہے۔

ایک اور حصے کا تعلق انسان کے اندرونی اعمال سے ہے، مثلاً کسی چیز کا انتخاب کرنا، ارادہ کرنا اور فیصلہ کرنا وغیرہ۔

الغرض روح ایک ایسا سمندر ہے جس میں ہر قسم کے عجائبات پائے جاتے ہیں اور جو قوانین اس پر حکم فرما ہیں وہ نہایت ہی عجیب اور نہایت ہی پیچیدہ ہیں۔

البتہ ایک لحاظ سے روح کو دو اہم ترین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ایک حصہ کا تعلق غور وفکر اور نظری ادراکات یعنی جنہیں انسان استدلال کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، سے ہوتا ہے۔

۲۔ایک حصّہ کا تعلق بدیہی یعنی ظاہری ادراکات سے ہوتا ہے، یا پھر ضمیر و وجدان سے ہوتا ہے یعنی ایسے امور جو بغیر کسی قسم کی دلیل و برہان سے معلوم ہو جائیں۔

چنانچہ اس گفتگو میں ہم جہاں پر بھی فطرت اور ضمیر کی بات کریں گے تو اس سے مراد اسی دوسرے قسم کے انسانی ادراکات ہوں گے۔

فطرت یعنی اولین تخلیق، یعنی روح اور جان کی تخلیق جس میں ضروری معلومات کا کچھ حصہ ملا ہوا ہوتا ہے۔

ضمیر یعنی وہ چیز کہ جسے انسان اپنے اندر پاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

باطنی شعور یعنی وہ ادراک اور نظر جو انسان کی جان کی گہرائیوں میں موجود ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے انسان الہام لیتا ہے۔

بہرحال حقائق کی شناخت اور معرفت کا الہام عطاء کرنے والا ایک منبع یہ بھی ہے جسے کبھی کبھی دل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہ عقل سے بالکل جدا ہے جو کہ نظری افکار و ادراکات کا مرکز ہے، ہر چند کہ یہ سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور روحِ انسان کے شجرہ کا ثمر ہیں۔ (غور کیجئے گا)

البتہ یہ بات بھی یاد رہے کہ جو کچھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ضروری نہیں وہ تمام فلاسفہ کے لیے قابلِ قبول ہو، بلکہ یہاں یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا تھا اور انشاءاللہ ہم آگے چل کر مفصل اور مستدل طریقہ سے اس پر بحث کریں گے۔

اس اشارے کی طرف توجہ کرتے ہوئے اب ہم قرآن مجید کی چند آیات کو بیان کرتے ہیں تا کہ دیکھیں کہ معرفت کے اس منبع سے کیونکر پردہ اٹھایا گیا ہے۔

تو سب سے پہلے ہم مندرجہ ذیل آیات پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

آیات

۱۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ (شمس ۷۔۸)

۲۔ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (سورہ انبیاء ۶۴)

۳۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ

(سورہ لقمان ۲۵)

۴۔ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ (سورہ عنکبوت ۶۵)

۵۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۠ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

(سورہ البقرہ ۱۳۸)

۶۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ (سورہ الرحمن ۳۔۴)

۷۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿۵﴾ (سورہ علق ۵)

۸۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

(سورہ روم ۳۰)

ترجمہ

۱۔قسم ہے آدمی کی روح کی اور اس کی کہ جس نے روح کو موزوں بنایا، پھر فجور اور تقویٰ کی راہیں اسے الہام کیں۔

۲۔(بابل کے بُت پرست، جناب ابراہیمؑ کے دندان شکن دلائل کے بعد) اپنے آپ کی طرف لوٹ آئے اور خود کو کہنے لگے تم ہی تو ظالم اور ستمگار ہو۔

۳۔اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو وہ کہیں گے کہ خدا نے!

۴۔جب وہ کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں تو خدا کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں لیکن خدا انہیں خشکی پر پہنچا دیتا ہے اور نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ مشرک ہو جاتے ہیں۔

۵۔ہم تو خدائی رنگ قبول کریں گے (توحید اور اسلام کے رنگ کو) اور خدائی رنگ سے بڑھ کر اور کونسا رنگ بہتر ہو سکتا ہے اور ہم تو اس کی عبادت کرتے ہیں۔

۶۔خدا، جس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بات کرنا سکھایا۔

۷۔خدا نے انسان کو اس چیز کی تعلیم دی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

۸۔اپنے چہرے کو پروردگار کے خالص چہرے کی طرف متوجہ کرو، یہ وہ فطرۃ ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔اور خدائی تخلیق میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہے۔یہ ہے ایک محکم اور جاودانہ دین

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

الفاظ کی تشریح

"الھمھا"، "الہام" کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ بزرگ اہلِ لغت نے بتایا ہے اس کے معنی وہ چیز ہیں جو انسان کے دل پر نازل ہوتی ہے، لیکن راغب نے مفردات میں تحریر کیا ہے کہ یہ لفظ صرف اس چیز کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جو خدواند عالم اور عالمِ بالا سے انسان کے دل پر نازل ہوتی ہے۔[1]

پھر انہوں نے آیت "فالھمھا فجورھا وتقواھا" کو اس معنی پر شاہد کے طور پر پیش کیا ہے۔ لسان العرب میں مذکور ہے کہ اس لُغت کی اصل "لھم" (بروزن فہم) ہے جس کے معنی نگلنا ہیں۔ اور الہام کے معنی خدائی تلقین ہیں اور وہ وحی کی ایک قسم ہے) وحی اپنے کلمہ کے وسیع معنی کے لحاظ سے)۔

اس کلمہ کی اصل کی طرف دیکھتے ہوئے جو کہ ابھی بتایا گیا ہے، اس کے معنی کی مذکورہ تشریح کے ساتھ مناسبت واضح ہو جاتی ہے، گویا انسانی روح اپنا منہ کھولتی ہے اور خدائی تعلیمات کے ذریعہ حقیقت کو نگل جاتی ہے۔

فطرت فطر (بروزن سطر) کے مادہ سے ہے بعض لوگوں کے نظریہ کے مطابق اس کے اصل معنی، پھاڑنا ہیں جبکہ بعض دوسرے حضرات کے نزدیک اس کے معنی طول میں پھاڑنا ہیں۔[2] پھر اس کا استعمال مخلوق کی پیدائش کے معنی میں ہونے لگا ہے، گویا کہ عدم کا پردہ پھاڑ کر موجودات منصۂ شہود پر آجاتی ہیں روزہ توڑنے کو بھی افطار کہا جاتا ہے کیونکہ روزہ ایک متصل اور طویل امر ہوتا ہے جسے اس طرح پھاڑ دیا جاتا ہے۔

کھمبی جیسی نباتات جو زمین کو پھاڑ کر باہر آتی ہیں کو فُطر (بروزن قطر) کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کو بڑی تیزی سے پھاڑ کر باہر آتی ہیں۔ اسی لیے انگلیوں کے پوروں کے ساتھ جانوروں کے پستان کو دوہنے کو فطر (بروزن سطر) کہا جاتا ہے

یہ لفظ آٹا گوندھنے کے لیے بھی ستعمال ہوتا ہے یعنی جب آٹا گوندھیں اور فوراً اس سے روٹی پکائیں۔[3]

بہرحال ان آیات میں اس لفظ سے مراد خدائی تخلیق، اولین پیدائش اور ایک سلسلہِ حقائق کی طرف رہنمائی ہے جو آغاز ہی سے انسان کے اندرون میں امانت کے طور پر رکھے گئے ہیں اور اس کے وجود کے ضمیر میں شامل ہیں۔

---

[1] "فالالھام"، "القاء الشی فی الروع و یختص ذالك بما كان من جهة الله و جهة الملاء الاعلی" (روع بروزن نوح کے معنی دل ہیں اور روع بروزن شوق کے معنی خوف یا تعجب ہیں۔

[2] لسان العرب

[3] "کتاب العین"، "لسان العرب"، "مفرداتِ راغب"

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے نفس بمعنی انسانی، روح کے ہے اور کبھی کسی چیز کی ذات کو بھی نفس کہا جاتا ہے جیسا کہ ہم قرآنِ مجید میں پڑھتے ہیں "ویحذرکم اللہ نفسہ" (اور خدا تمہیں اپنی ذات (کی مخالفت) سے خبردار کرتا ہے) اور یہ لفظ، خون آنکھ اور شخص کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔[1]

اور کبھی بالخصوص نفس امارہ یعنی سرکش نفس کو بھی نفس کہتے ہیں۔

لیکن مذکورہ آیات میں، ضمیر اور وجدان کے معنی میں آیا ہے جو انسانی روح کا ایک حصّہ ہے۔

"صبغہ"، "صبغ" کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی، رنگ کرنا ہیں۔ اور نتیجہ کے طور پر اسے صبغہ کہا جاتا ہے اور صبغ (بروزن صدق) کے معنی سالن، اور وہ غذا ہے جو انسان روٹی کے ساتھ کھاتا ہے کیونکہ روٹی اس سے رنگین ہوجاتی ہے۔ اور بعض حضرات نے اسے روغنِ زیتون کے معنی میں بھی لیا ہے جس سے روٹی کو بھگو کر کھاتے ہیں۔

راغب کے بقول زیرِ بحث آیت میں صبغہ کا لفظ عقل کی طرف اشارہ ہے جسے خداوند عالم نے انسانی وجود کے اندر قرار دیا ہے اور فطرت کی مانند اس کے ذریعہ بھی انسان کو دوسرے جانوروں اور چوپایوں سے جدا کیا ہے۔[2]

جیسا کہ کئی اربابِ لغت نے بتایا ہے زیرِ بحث آیت میں یہ تعبیر شاید اس لیے ہے کہ جب نصاریٰ کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو وہ ساتویں دن کے بعد اسے ایسے پانی سے غسل دیتے تھے جس میں زرد رنگ کا مادہ ملا ہوتا تھا۔ (یعنی بتپسمہ مراد ہے) اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہ رنگ اسے پاک و پاکیزہ بنا دیتا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ رنگِ الٰہی یعنی اسلام اور توحید ہی ان سب سے بہتر اور بالاتر ہے۔

تو اس طرح سے مندرجہ بالا آیت میں صبغہ کی تعبیر فطرت اور اولین تخلیق کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے، خصوصاً جبکہ بہت سی روایات میں اسلام اور ولایت سے بھی تفسیر کی گئی ہے۔[3]

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں انسانی روح اور اس خدا کی قسم کھائی گئی ہے جس نے روح کو فراوانی کے ساتھ استعداد اور لیاقت عطا فرمائی ہے اور اسے نظام عطا فرمایا ہے۔ اس قسم کے بعد انسان کے اخلاقی وجدان، (ضمیر) اور آگاہی کے منبع یعنی فجور، اور تقویٰ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہتا ہے:

ان امور پر آگاہی الہام کی صورت میں اوائل میں انسان کے اندرونِ جان سے ہوئی ہے۔

---

[1] "مجمع البحرین" طریحی مادہ نفس اور مفردات راغب

[2] مفردات راغب، مادہ "صبغ"

[3] تفسیر برہان، جلد ۱ ص ۱۵۷، ۱۵۸

اس طرح کے مقصود کی طرف ایک اور آیت میں بھی انسان کی آفرینش کے بعد اشارہ کیا گیا ہے۔ "وھدیناہ النجدین" (اور ہم نے انسان کو اس کے خیر وشر کی ہدایت کر دی ہے)

توجہ رہے کہ بنجد لغت میں دراصل بلند مکان کو کہتے ہیں اور اس کے مقابل کا لفظ "تہامہ" (بروزن علاقہ) ہے جس کے معنی ہیں پست سرزمین اور یہاں پر قبل و بعد کی آیات کے قرینہ اور ان آیات کی تفسیر میں وارد ہونے والی روایات کے قرینہ کی رو سے یہ تعبیریں خیر وشر اور خوش قسمتی اور بدقسمتی کے عوامل سے کنایہ ہیں۔[1]

ممکن ہے سورہ ھل اتی کی تیسری آیت بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہو جس میں بتایا گیا ہے "انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا" (ہم نے انسان کو راہ دکھا دی ہے خواہ وہ شکر کرے یا کفران کرنے والا بنے) یا کم از کم اس آیت میں بیان ہونے والی ہدایت کے کلّی مفہوم میں ہدایت فطری تو آ ہی جائے گی۔

دوسری آیت میں توحید کے بطلِ جلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور بابل کے بُت پرستوں کی طرف سے آپؑ پر مقدمہ چلانے کے واقعات کو بیان کیا جا رہا ہے جب انہوں نے حضرات ابراہیمؑ کو بلایا اور پوچھا کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ ایسا کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا بلکہ ان کے بڑے نے ایسا کیا ہوگا، ان سے پوچھئے اگر وہ بولتے ہیں۔

اس مقام پر زیرِ بحث آیت کہتی ہے وہ اپنے آپ کی طرف (اپنے ضمیر کی طرف) لوٹ آئے اور اپنے آپ سے کہا یقیناً تم ہی ظالم ہو (ایک تو تم اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور دوسرے اس معاشرے پر ظلم کیا ہے جس میں تم رہ رہے ہو اور تیسرے اپنے خالق و مالک اور تمام نعمتیں عطا کرنے والے پروردگار پر)

اگرچہ بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ "فرجعوا الی انفسھم" کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت اور سرزنش کی لیکن یہ تفسیر آیت کے ظاہر کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اور پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

جی ہاں! یہی ضمیر ہی تو ہے جو خود غرض اور مغرور بت پرستوں تک کو اپنی ملامت کے تازیانے لگاتا ہے اور واضح طور پر ان کے خلاف فیصلہ دیتا ہے۔

سورہ قیامت کی دوسری آیت "ولا اقسم بالنفس اللوامہ" میں نفس لوامہ سے اسی عدالت کی طرف واضح اشارہ ہے، خاص کر جب "لا اقسم بیوم القیامۃ" (روزِ قیامت کی قسم) کے ساتھ ہی اسے ذکر کیا گیا ہے جس طرح قیامت، عدالت کا دن ہے، اسی طرح نفسِ لوامہ بھی اندرونی فطری اور ضمیر کی عدالت کا نام ہے

تیسری آیت میں مشرکین عرب کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب انہیں کہا جاتا تھا کہ آیاتِ الٰہی کی پیروی کرو تو وہ کہتے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کی پیروی کریں گے۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۱۵۵۷ و مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۹۴

پس خدا فرماتا ہے: اگر تم ان سے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے بارے میں سوال کرو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ان سب کا خالق خدا ہے۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اس عظیم اور بزرگ خالق کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس ایسے مجسموں اور تصویروں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا ہے اور یہ کس قدر نادانی اور لاعلمی کی دلیل ہے؟ بل اکثرھم لایعلمون۔

وہ خالقِ کائنات کے بارے میں سوال کا جو جواب دیتے ہیں ممکن ہے وہ ان کی فطرت کی آواز ہو، اور وہ اس حقیقت کو بیان کر رہی ہو کہ اس نورِ الٰہی کی تجلی تمام انسانوں کی سرشت میں داخل ہے اور وہ اس فطری حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے غلط راستوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں۔

چوتھی آیت میں بھی اسی معنی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے توحید فطری جو کہ مہایت ہی بحرانی حالات میں انسان کے اندرون جان میں متجلّی ہوتی ہے، کے معنی کو واضح کرنے کیلئے ایک واضح ترین مثال پیش فرماتا ہے اور ایسی حالت کو مجسم کرتا ہے کہ، لوگ کشتی میں سوار ہیں اور سمندر کی موجوں، گردابوں اور طوفانوں میں پھنس چکے ہیں اب کوئی طاقت انہیں ایسی نظر نہیں آتی جو انہیں ساحلِ نجات تک پہنچائے تو یہی موقعہ ہے کہ اندھی تقلید، خرافائی رسومات، غلط تعلیمات اور نادرست تجربے کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور خدا جوئی کی فطرت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے اور وہ بے ساختہ خدا کی یاد میں پڑ جاتے ہیں اور اسے مکمل خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں لیکن جونہی طوفان تھم جاتا ہے اور وہ ساحل نجات پر پہنچ جاتے ہیں تو شرک آلود افکار ان کے دلوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور ان کے اندرونِ قلب بتوں کو ٹھکانے مل جاتے ہیں کیونکہ وہی پردے پھر ان کی فطرت پر آپڑتے ہیں۔

پانچویں آیت میں پہلے تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰ علیہم السلام جیسے بزرگ انبیاء کا دین توحید ہے۔ پھر فرماتا ہے، آپ بُت پرستوں سے کہہ دیجئے کہ ہم خدائی رنگ کو قبول کرتے ہیں اور خدائی رنگ سے بڑھ کر اور کونسا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟ ہم تو اسے ہی پوجتے ہیں۔

مشرک مسیحی جو توحید کی بجائے تین خداؤں کی عبادت کیا کرتے تھے، وہ اپنے بچوں کی ولادت کے بعد بپتسمہ کرتے، یعنی ولادت کا غسل دیا کرتے تھے اور بسا اوقات اس میں ایک مخصوص قسم کے زرد رنگ کا اضافہ بھی کیا کرتے تھے اور اپنے نومولود کو باپ بیٹا اور روح القدس کے نام سے غسل دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ غسل نومولود کے گناہوں سے پاک ہونے کا باعث ہے کہ اسے آدمؑ سے وراثت میں ملا ہے۔[1]

---

[1] ''کتاب مقدس'' کی قاموس میں آیا ہے کہ ''بپتسمہ'' مقدس دینی قواعد میں سے ایک ہے جو حضرت مسیح کے ظہور سے بہت پہلے سے معروف ہے اور وہ کلیسا کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے کہ جب اقانیم ثلثہ کے لیے پانی کو استعمال کیا جاتا ہے تو یہ گناہ کی نجاست و ناپاکی کی علامت ہوتی ہے..... بہت سے عیسائیوں کا خیال ہے کہ مومنین کے بچوں کا بپتسمہ واجب ہے۔ (قاموس ص ۲۵۷، ص ۲۵۸)

قرآنِ مجید نے ایسے افکار پر خط بطلان کھینچ دیا اور فرمایا کہ اس خرافاتی رنگ کی بجائے توحید اور خدائی رنگ کو قبول کرو تا کہ وہ تمہاری روح اور تمہاری جان کو ہر قسم کے شرک بت پرستی اور گناہ سے پاک کردے۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں متعدد روایات میں یہ بات درج ہے کہ رنگِ الٰہی سے مراد وہی اسلام اور ولایت کا رنگ ہے [1] اور یہ انسان کی ذات میں فطری الہامات کے وجود کی ایک تاکید ہے۔

چھٹی اور ساتویں آیات میں انسانی تخلیق کے بعد پروردگار کے ذریعہ تعلیم بیان کی بات ہو رہی ہے، اور تعلیم بھی ایسی چیز کی جسے انسان نہیں جانتا لیکن اس کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔

اور ایک اور مقام پر لکھنے میں انسان کا معلّم خدا بتایا گیا ہے، کہ "الذی علم بالقلم" (علق ۴)

اس طرح سے وہ معلّمِ بیان بھی ہے اور معلمِ قلم بھی، اور ایسی چیزوں کا علّم بھی جن سے خود انسان آگاہ نہیں ہے۔ ان تعلیمات سے ممکن ہے کہ فطری تعلیمات کی طرف اشارہ ہو جو خلاصہ کے طور پر اور سربستہ راز کی صورت میں انسان کے اندرونِ موجود ہیں..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ اوزار، اسباب اور مقدمات ہوں جو خدا نے انسان کے اندر تخلیق فرمائے ہیں اور راس کائنات میں زبان وخط اور دوسری اور وقعیات کی ایجاد پر قادر بنایا ہے۔

اور پہلی صورت میں ہماری بحث کا شاہد ہے۔

اسی موضوع کی آٹھویں اور آخری آیت میں دینِ فطرت کی بات ہو رہی ہے۔ خداوندِ متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دے رہا ہے کہ پروردگار عالم کے خالص دین کی طرف توجہ کریں، وہی دین جو خالقِ کائنات نے تمام انسانوں کی فطرت میں داخل کر رکھا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی، بلکہ وہ پائیدار اور استوار ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن یہاں پر یہ نہیں کہتا کہ خدا شناسی فطری ہے، بلکہ فرماتا ہے کہ دین اور آئینِ الٰہی مکمل طور پر اور ہر لحاظ سے ایک فطری امر ہے۔

البتہ تشریعی اور تکوینی امور کی ہم آہنگی اور یک جہتی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسا ہونا چاہیئے یعنی جو چیز عالمِ تشریعی میں مفصل طور پر بیان ہوئی ہے وہ اجمالی طور پر انسان کی تکوین اور فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور فطرت کی آواز جو انبیاء اور شریعت کی آواز سے ہم آہنگ ہوتی ہے، وہ انسان کو راہِ حق میں رہنمائی کرتی ہے اور صحیح راستے پر قائم رکھتی ہے۔

انشاء اللہ العزیز، توحیدِ فطری کی بحث (بعد کی جلد) میں اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱، ص ۳۱۶ و تفسیر درمنثور، جلد ۱ ص ۱۴۱

نتیجہ گفتگو

اس طرح قرآن مجید نے فطرت اور وجدان کو معرفت کے ایک مکمل اور جامع منبع کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اور متعدد آیات میں تمام لوگوں کو اس منبع کی اہمیت کی طرف متوجہ کرایا ہے۔

تشریحات

۱۔ فطرت و وجدان اور ضمیر کی قسمیں

جو معرفت اور آگاہی فطرت اور وجدان سے عمل میں آتی ہے اس کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے زیادہ اہم مندرجہ ذیل چار قسمیں ہیں اور یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں سے ہر ایک آیت بھی انہی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ اخلاقی حسن و قبح اور اچھائی اور برائی کا ادراک: جسے بعض اوقات اخلاقی وجدان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی استاد اور معلم کی رہنمائی کے بغیر بہت سی صفات کو اچھا سمجھتا ہے، جیسے دوسروں کے ساتھ بھلائی، احسان، عدل و انصاف، شجاعت، ایثار، عفو و درگزر، سچائی اور امانت وغیرہ۔

اور ان کے مقابلے میں کچھ ایسی صفات بھی ہیں جنہیں انسان اچھا نہیں سمجھتا بلکہ بری صفات کے زمرے میں انہیں شمار کرتا ہے۔ جیسے ظلم و ستم، بخل، حسد، کینہ، جھوٹ اور خیانت وغیرہ۔ چنانچہ "فالهمها فجورها وتقواها" والی آیت اسی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ **عقلی بدیہیات کا ادراک:** اسی پر نظرِ استدلالات کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اس کے بغیر کسی موضوع کے لیے کوئی بھی دلیل قائم نہیں کی جاسکتی۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ علمِ ریاضی میں کچھ قضیے ایسے ہیں جو بدیہی کہلاتے ہیں اور ریاضی کے تمام استدلالات کا سلسلہ آخر میں انہی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق وجدان سے ہوتا ہے، مثلاً کل جزء سے بڑا ہوتا ہے دو برابر کی چیزیں ایک دوسرے کی مساوی ہوتی ہے یا دو برابر کی چیزوں سے مساوی مقدار میں کچھ کم کر دیا جائے پھر بھی وہ مساوی رہتی ہیں، یا مساوی مقدار میں ان میں اضافہ کر دیا جائے پھر بھی وہ مساوی رہتی ہیں وغیرہ۔

اسی طرح عقلی اور فلسفی استدلالات کی کیفیت ہے کہ اگر ان میں مسلم اور بدیہی اصولوں سے استفادہ نہ کیا جائے تو تمام استدلالات کی عمارت ہی منہدم ہو جائے، مثلاً دو ضدوں کا اجتماع یا دو نقیضوں کا یکجا ہونا محال ہے۔

قرآنِ مجید نے بھی بعض اوقات اہم مسائل کے اثبات کے لیے اس قسم کے بدیہی اصولوں کو بیان کیا ہے۔ مثلاً سورہ زمر/ ۹ میں ارشاد ہوتا ہے "هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون" (آیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو لوگ نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟)

یا ایک اور جگہ سورہ رعد/ ۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے "قل هل یستوی الا عمی والبصیر ام هل تستوی الظلمات والنور" (کہہ دیجئے یا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہیں؟ یا ظلمات اور نور یکساں ہیں؟)

۳۔ فطرت مذهبی: یعنی کچھ عقیدتی مسائل ہیں جنہیں انسان کسی استاد اور معلم کی تعلیم کے بغیر جانتا ہے، جن میں خدا شناسی اور معاد، اور اس طرح کے کئی دوسرے عقیدتی مسائل ہیں جن کی تفصیل انشاء اللہ اسی کتاب کی دوسری جلد میں آئے گی۔ اور "فاذا رکبوا فی الفلك دعوا الله مخلصین له الدین" کی آیت اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

یہی بات اس امر کی دلیل ہے کہ تاریخِ انسانی میں ایک مقدس مبداء پر ایمان موجود رہا ہے حتّٰی کے ایسے دلائل اور ثبوت موجو ہیں کہ زمانہ قبل از تاریخ کے ادوار میں بھی اسی مبداء پر ایمان واعتقاد انسان کے اندر پایا جاتا تھا، اور جیسا کہ بعد میں اس کی تفصیل بیان کریں گے اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ کسی چیز میں یہ فطری امر موجود نہ ہو اور وہ اس وسعت اور دوام کے ساتھ پائی جاتی ہو۔

۴۔ ضمیر یا وجدان کی عدالت: جو انسان کے اندرون موجود ہے اور ایک ایسی عجیب وغریب عدالت ہے کہ اسے قیامتِ صغریٰ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ ایسی عدالت ہے جو انسان پر اس کے اعمال کے سامنے ہی مقدمہ چلاتی ہے۔ اچھائیوں کے بدلے میں تشویق اور برائیوں کے بدلے میں سزا دیتی ہے۔ اس تشویق اور سزا کو ہم سب مختلف انداز میں اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے کبھی کہتے ہیں میرا وجدان اس کام پر راضی ہے، میرا ضمیر تخت بے قرار اور ناراحت ہے، اور ضمیر اور ضمیر وجدانکی یہ بیقراری اور بے چینی راتوں کا خواب حرام کر دیتی ہے اور سُکھ اور چین انسان سے مکمل طور پر چھین لیتی ہے، اور اگر حد سے بڑھ جائے تو دردناک انجام سے بھی دوچار کر دیتی ہے اور انسان خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے، یا دیوانگی اور دوسری نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آیت "فرجعوا الی انفسهم" اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ آیا شناخت فطری کا وجود ہے؟

باوجودیکہ ہر شخص اس منبع کو اجمالی طور پر اپنے اندر محسوس کرتا ہے یعنی کچھ اندرونی پیغامات اور باطنی الہامات، یا الفاظ دیگر کچھ ایسے ادراکات ہیں جنہیں روبکار لانے کے لیے انسان کو کسی استاد اور معلم کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر بھی کچھ فلاسفہ (خاص کر مادیین) ایسے ہیں جو شناخت کے اس منبع کے اصل وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس مقام پر تقریباً تین مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔

الف: ایسے لوگوں کا نظریہ ہے جو کہتے ہیں کہ انسان کسی استثناء کے بغیر تمام معلومات پہلے سے اپنے اندر رکھتا ہے اور اس دنیا میں جو

کچھ وہ یاد کرتا ہے درحقیقت اس کی بھولی بسری یادیں اور معلومات ہیں نہ کہ نئی تعلیم۔ اور یہ نظریہ افلاطون اور اس کے پیروکاروں کا ہے۔ [1]

ب: ایسے لوگوں کا نظریہ ہے جو کہتے ہیں کہ انسان کے اندر کسی قسم کی فطری شناخت اور معرفت نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اندر مختلف مسائل کے یاد کرنے کی استعداد اور لیاقت پائی جاتی ہے۔ اور یہ لوگ انسان کے فطری ادراکات کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہیں اس کے تجربات ضرورتوں اور اجتماعی تقاضوں کا۔

مشہور ماہر نفسیات، فرائیڈ کا اخلاقی وجدان کے بارے میں نظریہ یہ ہے کہ یہ وجدان کچھ اجتماعی رکاوٹوں اور نامکمل خواہشات کا مجموعہ ہے جو انسان کے مخفی ضمیر میں موجود ہوتی ہیں اس کا کہنا ہے کہ اخلاقی وجدان انسان کے عمیق روح اور ذاتی عمل کا نمائندہ نہیں ہے، بلکہ سادہ اجتماعی رکاوٹوں کی اندرونی کیفیت کا نام ہے۔ اچھائی اور برائی تصورات کا دنیا میں وجود ہی نہیں ہے، نہ کسی فرد کی تاریخ میں ان کا وجود ملتا ہے اور نہ کسی بشری تاریخ میں بلکہ یہ تصورات صرف اور صرف خارج اور اجتماعی ماحول کی پیداوار ہیں۔ [2]

میٹریالزم اور ڈائیلکٹیک مکتب کے طرفدار بھی اپنے مشہور اصل کہ ہر چیز اقتصادی صورتحال کا نتیجہ ہے کے مطابق فطری مسائل کی بھی اسی اصول کے مطابق تفسیر کرتے ہیں۔

ج: ان لوگوں کا نظریہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کچھ معلومات ایسی ہیں جن کا اصل تعلق فطرت سے ہے، جبکہ کچھ کا تعلق کسب واکتساب سے ہے اور ہمارے کسی ادراکات کا فطری ادراکات پر موقوف ہے اور منطق، عقلی اور آیات واحادیث پر مشتمل نقلی دلائل تھی اسی نظریہ کی تائید کرتے ہیں کیونکہ:

ا۔ اگر ہمارے پاس ریاضی کے چند مسلمہ اور بدیہی اصول نہ ہوں تو ریاضی کے کسی بھی قضیہ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح دوسرے استدلالی مسائل میں بھی یقیناً کچھ بدیہی امور کا ہونا ضروری ہے جو کہ فطرت کے ذریعہ درک کیے جاتے ہیں اور نظری استدلالات کا محور ہوتے ہیں۔

باالفاظ دیگر اگر فطری اصول کا مکمل طور پر انکار کر دیں تو کائنات کی کسی بھی چیز کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکیں گے، تمام

---

[1] ''افلاطون'' کہتے ہیں کہ انسانی روح بدن میں داخل ہونے اور مجازی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے عالم مجردات اور عالم معقولات میں تھی اور ''مثل'' یعنی حقائق کا ادراک کر چکی تھی اور جب اس کا ورود عالم کون وفساد میں ہوا تو اس نے تمام حقائق کو فراموش کر دیا۔ لیکن وہ مکمل طور پر محو اور نیست ونابود نہیں ہوئی تھی یہی وجہ ہے جب انسان کسی چیز کے پرتو اور سایہ کو دیکھتا ہے، یعنی ایسی چیزوں کو دیکھتا ہے جن کا ''مثل'' کے ساتھ تعلق ہے، تو تھوڑی سی توجہ کے ساتھ حقائق کا ادراک کر لیتا ہے۔ پس علم اور معرفت کا حصول درحقیقت ایک یاددہانی ہے۔ اگر انسان بالکل ہی نادان اور بے علم ہوتا، یعنی علم کا مایہ اس کے اندر نہ ہوتا، تو علم کا حصول اس کے لیے قطعاً ناممکن بن جاتا۔ (ملاحظہ ہو کتاب ''سیر حکمت در اروپا''، جلد ا ص ۲۳، نظریات افلاطون)۔

[2] کتاب ''اندیشہ ہائے فرویڈ'' ص ۶۴

عقلی مسائل مشکوک ہوکر رہ جائیں گے اور سفسطہ کے گہرے کھڈے میں جا گریں گے۔

مثال کے طور پر اگر ہم نے حس وتجربہ یا کسی ایک عقلی دلیل کے ساتھ کسی موضوع کے وجود کو ثابت کر دیا، لیکن ایک بدیہی ترین اور واضح ترین اصول اجتماع نقیضین محال کو اپنے ضمیر ووجدان کے ساتھ قبول نہ کریں تو یہ بات کہہ سکتے ہیں کیا حرج ہے کہ وہ موضوع موجود ہو بھی اور موجود نہ بھی ہو۔

اور اگر اس بدیہی اصول کو تجربہ اور استدلال کے ذریعہ بھی ثابت کرنا چاہیں تو دور اور تسلسل تک معاملہ جا پہنچے گا جو کسی سے مخفی نہیں ہے۔

۲۔اس کے علاوہ سفسطائیوں کے مقابلے میں جو کہ ہر شے کئ وجود کے منکر ہیں اور آئیڈیالسٹوں کے مقابلے میں جو کہ خارجی اشیاء کا انکار کرتے ہیں اور ذہنی اشیاء کے وجود کے قائل ہیں، ہم وجدان وضمیر پر تکیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا وجدان اس قسم کے نظریات کے باطل ہونے پر گواہ ہے کیونکہ ہم اچھی طرح اپنی ذات کا اور دوسری کائنات کا خارج میں ادراک کرتے ہیں یہی ضرورتِ وجدانی بھی اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ بہت سے ادراکات ہماری ذات کے اندر موجود ہیں۔

جیسا کہ ہم بہت سی جسمانی اور روحانی خواہشات کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں (جسمانی خواہشات وضروریات کی مثال غذا اور نیند ہے اور روحانی خواہشات کی مثال جیسے علم، اچھائی اور خوبصورتی، پرستش اور قدامت بعض عظیم نفسیات شناسوں کے بقول یہ چار ایسے عناصر ہیں جن سے انسانی روح تشکیل پاتی ہے)

یہی وجدان اور ضمیر ہمیں بتاتے ہیں کہ نیکی اور عدالت اچھی چیزیں ہیں اور ظلا وستم اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا بُری بات ہے اور اس قسم کے ادراک میں ہمیں کسی منبع کی ضرورت نہیں ہے، خواہ وہ اجتماعی یا اقتصادی ہو یا کوئی اور!

فرائیڈ اور مارکس جیسے افراد کا عذر بھی معلوم ہے۔انہوں نے پہلے ہی ایک اصل کے بارے میں فیصلہ کرلیا ہے اور اس کو وہ قبول بھی کر چکے ہیں، مثلاً وہ پہلے ہی سے اس بات کا فیصلہ کر چکے ہیں کہ فکر واجتماع کے بارے میں منصۂ شہود پر آنے والے تمام مسائل کا تعلق یا جنسی مسائل سے ہے یا اقتصادی مسائل سے۔پھر وہ اس بات پر مُصر ہیں کہ ساری دنیا کے مسائل کو اسی معیار پر رکھ کر ان کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

۳۔توحیدی نقطۂ نگاہ سے اس بات کی زیادہ وضاحت ہوتی ہے۔کیونکہ جب ہم اس اصول کو تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان ایک الٰہی طریقہ کے تحت، ارتقائی مراحل کو طے کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لہٰذا بغیر کسی شک وتردید کے اس راہ کو طے کرنے کے لیے اس کے اندر اسباب ووسائل بھی آمادہ ہونا چاہئیں، جو کچھ اور آسمانی کتابیں اپنے ساتھ لائی ہیں وہ اس کی تکوینی تخلیق سے ہم آہنگ ہے۔

اس طرح تکوین وخلقت کا عالم وحی اور تشریع کی کائنات سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے، یا بالفاظ دیگر ان تعلیمات کا خمیر، مایہ، نچوڑ اور خلاصہ خود انسان کی جان کے اندر موجود ہے اور آسمانی شریعتوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس خلاصے کی تفصیل ہے۔

پس اسی بنا پر فطری شناخت کے وجود میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔عقل اور توحیدی نقطۂ نظر سے بھی اس کی تائید وتصدیق ہوتی ہے۔

سوال

ہوسکتا ہے یہاں پر یہ سوال پیش کیا جائے کہ قرآنِ مجید صاف طور پر یہ کیوں کہہ رہا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ

خداوندِ عالم نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا ہے حالانکہ اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور عقل قرار دی ہیں۔ (نحل ۷۸)

کیا اس تعبیر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ فطری معلومات نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟

جواب

پہلی بات تو یہ ہے کہ جس لمحہ انسان شکمِ مادر سے باہر آتا ہے تو مسلّم سی بات ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا ہوتا، حتّٰی کہ فطری معلومات بھی فعلی صورت میں اس کے سامنے موجود نہیں ہوتیں لیکن جوں جوں وہ ہوش سنبھالتا ہے اس کے اندر عقل وتمیز پیدا ہوتے جاتے ہیں کسی استاد ومعلم اور حسّ وتجربہ کے بغیر فطری معلومات اس کے اندر پروان چڑھتی رہتی ہیں، وگرنہ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انسان تمام چیزوں، حتّٰی کہ اپنے وجود کا علم بھی آزمائش اور تجربے وغیرہ کے بعد حاصل کرتا ہے۔[1]

دوسری بات یہ ہے کہ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں؟ تو جو آیات یہ کہتی ہیں کہ خداوندِ عالم نے انسان کو پیدا کیا اور اسے اچھائی برائی بھی الہام کردی، یا دینِ الٰہی کو فطری صورت میں انسان کے اندرونِ جان میں قرار دے دیا، دوسری آیات مثلاً جو کہ اسی بحث کے آغاز میں بیان ہوئی ہیں کہ "واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم" کی تفسیر کر رہی ہے اور فطری معلومات کو اس سے مستثنٰی قرار دے رہی ہے۔

ایک اور سوال

یہاں پر ایک اور سال ہے جو دوسرے سوال کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ قرآنِ مجید نے بہت سے مقامات پر انسانی علوم کو تذکر، سے

---

[1] ''دیکارٹ'' سے ایک مشہور ومعروف جملہ منقول ہے کہ ''مجھے تو خود ہی اپنے وجود میں شک ہے، لیکن میں نے جب دیکھا کہ میں سوچ رہا ہوں تو میں نے سمجھ لیا کہ میں ہوں'' یہ غلط فہمی سے لبریز ایک جملہ ہے، کیونکہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ''میں سوچ رہا ہوں'' تو پہلے وہ اپنے ''میں'' کے وجود کا اعتراف کر چکا ہے، پھر اس نے اپنی سوچ کو پہچانا ہے، تب کہیں جا کر ''میں'' کو۔

موسوم کیا ہے، مثلاً "ان فی ذالك لایات لقوم یتذکرون" (اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو تذکر کام لیتے ہیں۔ (سورہ نحل ۱۳) اور فرماتا ہے "وما یذکر الا اولوا الالباب" (صاحبانِ عقل کے علاوہ اور کوئی تذکر نہیں کرتے۔ (سورہ آل عمران ۷) نیز فرماتا ہے "ویبین ایاته للناس لعلهم یتذکرون" خدا اپنی آیات کو لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تا کہ وہ متذکر ہوں۔ (سورہ بقرہ ۲۲۱)

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہاں پر تذکر کے معنی یادآوری نہیں ہیں؟ اور اس سے افلاطون کے نظریہ کو تقویت نہیں ملتی کہ علم خواہ کوئی بھی ہو، یادآوری ہی ہوتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تذکر ذکر کے مادہ سے ہے اور اربابِ لغت نے ذکر کا اصلی معنی حفظ لکھا ہے جیسا کہ راغب اپنی کتاب مفردات میں لکھتے ہیں کہ ذکر بھی تو نفسیاتی کیفیت اور حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے علوم و معارف کے حفظ پر قادر ہوتا ہے اور کبھی کسی چیز کے دل میں حاضر ہونے یا بیان کرنے کو کہتے ہیں۔

لسان العرب میں بھی اسی سے ملتا جلتا معنی ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ ذکر کا معنی کسی چیز کو حفظ کرنا ہے، نیز اس مطلب کو بھی ذکر کہتے ہیں جو زبان پر جاری ہوتا ہے۔

بنابرین ذکر اور تذکر، کا معنی صرف فراموشی کے بعد یادآوری یا کسی بھولے بسرے واقعہ کو از سرِ نو ذہن میں لانا نہیں ہے بلکہ تمام معلومات کو شامل ہے۔

۳۔ اسلامی روایات میں، فطرت اور وجدان

انسان کے اندر شناخت کے اس منبع کا وجود ان مسائل میں سے ہے جن کی طرف اسلامی روایات میں کافی حد تک اشارے پائے جاتے ہیں۔ بطور نمونہ مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجئے۔

۱۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مشہور حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

کل مولود یولد علی الفطرة حتی یکون ابواه یهودانه و ینصرانه

ہر مولود فطرت (توحید و اسلام) پر پیدا ہوتا ہے اور یہی فطرت اس کے اندر اسی طرح برقرار رہتی ہے یہاں تک کہ اس کے والدین اسے کسی اور دین، یعنی یہودیت یا نصرانیت کا پیروکار بنا دیتے ہیں۔ [1]

یہ حدیث بخوبی دلالت کر رہی ہے کہ صرف توحید ہی نہیں اسلام کے تمام بنیادی اصول بھی تمام انسانوں کے وجود میں موجود ہیں۔ [2]

۲۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ایک شخص نے آپؑ سے قرآنِ مجید کی آیت "فطرة الله التی فطر

---

[1] بحار الانوار، جلد ۳، ص ۲۸۱

[2] اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ دوسری جلد میں بیان کریں گے۔

الناس علیها" کے بارے میں استفسار کیا، تو آپؑ نے فرمایا:

امامؑ نے فرمایا: "التوحید" (فطرت وہی توحید ہی ہے)۔[1]

۳۔آپؑ سے منقول ہے کہ "ھی الاسلام" (فطرت وہی اسلام ہی ہے)۔[2]

۴۔ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فطرهم على المعرفة به"

(خداوندِ عالم نے لوگوں کو اپنی معرفت سے پیدا کیا ہے)۔[3]

۵۔"صبغة الله ومن احسن من الله صبغة" کی تفسیر میں بھی متعدد روایات موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "صبغة الله" (رنگ الٰہی) سے مراد ہی اسلام ہے۔[4]

۶۔حدیثِ قدسی میں خداوند فرماتا ہے "خلقت عبادی حنفآء" مجمع البحرین اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ پھر تحریر کیا ہے کہ "کل مولود یولد علی الفطرة" اس حدیث کے مساوی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں نیک کاموں کو معروف (پہچانے ہوئے) کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے لہٰذا امر بالمعروف کہا جاتا ہے اور بُرے اور ناشائستہ کاموں کو منکر (ان جانے) کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اخلاقی فضائل کے مفہوم ایسی چیز ہیں جو انسانی روح سے آشنا اور اس کے نزدیک پہچانے ہوئے ہیں جبکہ اس کے برعکس برائیاں اور قباحتیں قابلِ نفرت اور ناپسندیدہ ہیں، جو روح کے لیے انجانی اور غیر معروف ہوتی ہیں۔

---

[1] اصول کافی، جلد ۲ "باب فطرة الخلق على التوحيد" حدیث نمبر ۱، ۲، ۳۔"فطرت" کے بارے میں احادیث بکثرت موجود ہیں، بحارالانوار، جلد سوم، باب یازدہم (ابواب توحید) اور اصول کافی، جلد دوم، باب "فطرة الخلق على التوحيد" کی طرف رجوع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہوجائے گی۔

[2] اصول کافی، جلد ۲ "باب فطرة الخلق على التوحيد" حدیث نمبر ۱، ۲، ۳۔"فطرت" کے بارے میں احادیث بکثرت موجود ہیں، بحارالانوار، جلد سوم، باب یازدہم (ابواب توحید) اور اصول کافی، جلد دوم، باب "فطرة الخلق على التوحيد" کی طرف رجوع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہوجائے گی۔

[3] اصول کافی، جلد ۲ "باب فطرة الخلق على التوحيد" حدیث نمبر ۱، ۲، ۳۔"فطرت" کے بارے میں احادیث بکثرت موجود ہیں، بحارالانوار، جلد سوم، باب یازدہم (ابواب توحید) اور اصول کافی، جلد دوم، باب "فطرة الخلق على التوحيد" کی طرف رجوع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہوجائے گی۔

[4] بحارالانوار جلد ۳ ص ۲۸۰

معرفت کا پانچواں منبع
آسمانی وحی

اشارہ

قرآنِ مجید کی اس منبع کے بارے میں بہت سی آیات موجود ہیں نہ صرف قرآنِ مجید میں اس کا تذکرہ ہے بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ اصول کی بات تو یہ ہے کہ آسمانی ادیان کے پیروکار وحی کو ہی معرفت کے دوسرے تمام منابع سے اہم سمجھتے ہیں کیونکہ اس کا براہِ راست تعلق خداوندِ عالم سے کے بے انتہا علم سے ہے جبکہ باقی منابع کا انسان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جو کہ خدا کے مقابلے میں نہایت ہی محدود اور ناچیز ہے۔

توحیدِ الٰہی کے نظریہ کے حامل کہتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے ہمیشہ اپنے بندوں کی ہدایت (بمعنی راستہ دکھانے) کے لیے رجالِ وحی یعنی عظیم انبیاء کرام کو بھیجا ہے۔ ارتقاء اور سعادت کی راہیں طے کرنے کے لیے ہر قسم کی انسانی ضروریات کو انہی بزرگواروں کے ذریعہ پیدا فرمایا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری عقلیں زبردست طاقتور روشنی کی مانند ہیں اور فطرت و وجدان اور تجربہ وغیرہ دوسری طاقتور روشنیوں کی طرح تو وحی کا مرتبہ آفتابِ عالمتاب کی طرح ہوگا اور اس کی قلمرو نہایت ہی وسیع اور بے انتہا عریض ہوگی۔ اسی لیے خدا پرستوں کی نگاہ میں وحی ایک نہایت ہی اہم اور نہایت ہی مستغنی منبعِ معرفت کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لیے ہم اس پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں اور سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ دل سے سماعت کرتے ہیں۔

آیات

۱۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ (سورہ شوریٰ ۵۱)

۲۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾ (سورہ نجم ۳،۴)

۳۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (سورہ فصلت ۴)

۴۔ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ (سورہ بنی اسرائیل ۳۹)

۵۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

(سورہ بقرہ ۹۷)

۶۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورہ نحل ۸۹)

۷۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾ (سورہ شوریٰ ۵۲)

۸۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِىْٓ اِلَيْهِمْ (سورہ نحل ۴۳)

۹۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (سورہ حدید ۲۵)

۱۰۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ (سورہ حجر ۹)

۱۱۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ (سورہ آل عمران ۱۱۸)

۱۲۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ (سورہ نساء ۱۶۴)

ترجمہ

۱۔ کسی انسان کے لائق یہ بات نہیں ہے کہ خداوندِ عالم اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ سے، یا پشت پردہ سے، یا کوئی رسول بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم کے مطابق جو کچھ کہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے کیونکہ وہ بلند مقام کا مالک اور صاحب حکمت ہے۔

۲۔ وہ کبھی اپنی خواہش کے مطابق بات نہیں کرتا، وہ جو کچھ لایا ہے، وحی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۳۔ کہہ دو کہ میں تو صرف تمہارے جیسا ایک انسان ہوں کہ یہ حقیقت مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

۴۔ یہ احکام ان حکمت کی باتوں میں سے ہیں کہ تیرے پروردگار نے تجھ پر وحی کی ہے۔

۵۔ (وہ کہتے ہیں چونکہ جو فرشتہ آپؐ پر وحی لے آتا ہے وہ جبرائیل ہے اور ہم جبرائیل کے دشمن ہیں لہٰذا ہم آپؐ

پر ایمان نہیں لاتے) تو آپ کہہ دیجئے کہ جو شخص جبرائیل کا دشمن ہے (درحقیقت وہ خدا کا دشمن ہے) کیونکہ اس نے حکمِ خدا کے مطابق قرآن کو آپؐ کے دل پر نازل کیا ہے۔

۶۔اور ہم نے اس (آسمانی) کتاب کو آپؐ پر نازل کیا ہے جو ہر چیز کو بیان کرتی ہے۔

۷۔جیسا کہ ہم نے گزشتہ انبیاء پر وحی نازل کی ہے آپؐ کی طرف بھی ہم نے اپنے فرمان کے مطابق روح کو وحی کیا ہے۔اس سے پہلے تمہیں معلوم نہیں تھا کہ کتاب اور ایمان کیا ہے؟ (مضامینِ قرآن کو نہیں جانتے تھے)۔ لیکن ہم نے اسے نور قرار دیا ہے، کہ جس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں ہدایت کریں۔اور یقینا آپ لوگوں کو راہِ راست کی ہدایت کرتے ہیں۔

۸۔اور آپ سے پہلے ہم نے مردوں کو نہیں بھیجا مگر ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

۹۔ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتاب اور (باطل سے حق کی پہچان اور عادلانہ قوانین کا) میزان نازل کیا تا کہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔

۱۰۔ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی یقینا اس کی حفاظت کریں گے۔

۱۱۔ہم نے آیات (اور ان لوگوں کے شر کے بچاؤ کے راستے) کو تمہارے لیے بیان کر دیا ہے، اگر تم عقل سے کام لو۔

۱۲۔اور خداوندِ عالم نے موسیٰؑ سے باتیں کیں۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

وحی قران مجید، اسلامی روایات اور عربی ادب میں وحی کا لفظ بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن اس کے اصل معنی جیسا کہ راغب نے مفرادت میں لکھا ہے سریع اشارہ ہیں، اسی لیے سریع اور تیزی سے انجام پانے والے کاموں کو بھی وحی کہا جاتا ہے اسی طرح اشاروں اور کنایوں میں جلد از جلد انجام پانے والی گفتگو کو بھی وحی کہا جاتا ہے اور یہ یا تو اشاروں کے ساتھ یا تحریری طور پر حاصل ہوتا ہے لیکن اب ان معارفِ الٰہیہ کو وحی کہا جاتا ہے جو انبیاء یا اولیاء پر القاء ہوتے ہیں۔

وحی کی مختلف شکلیں ہیں کبھی تو فرشتہِ وحی کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر ہی یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جس طرح جناب جبرائیل علیہ السلام حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نازل ہوتے تھے۔کبھی صرف باتوں کو سنا جاتا ہے لیکن فرشتے کی شکل کو نہیں دیکھا جاتا، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کلامِ خدا کو سنتے تھے۔

کبھی صرف دل ہی میں کوئی مطلب ڈال دیا جاتا ہے۔

کبھی الہام کے ذریعہ سے ہوتی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی والدہ کی داستان میں بیان ہوا ہے۔

کبھی تسخیر کے ذریعہ سے ہوتی ہے جیسا کہ "واوحی ربك الی النحل" تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی)

اور کبھی خواب کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔(جیسے کہ رویائے صادقہ یعنی سچے خواب ہیں)[1]

لیکن خلیل بن احمد نے اپنی کتاب العین میں وحی کے اصل معنی کتابت یعنی لکھنا تحریر کیا ہے جبکہ ابن منظور نے کتاب لسان العرب میں وحی کے مندرجہ ذیل معانی تحریر کیے ہیں مثلاً اشارہ کتابت رسالت الہام مخفی گفتگو اور ہر وہ چیز جو دوسروں کو القاء ہوتی ہے۔

اس تمام گفتگو سے مجموعی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وحی کے اصل معنی تو سریع اشارہ اشاروں پر مبنی گفتگو اور اشاروں یا خطوط کے ذریعہ مخفی پیغامات ہیں۔اور چونکہ عظیم الشان انبیاء کو اشاروں کی زبان میں معارفِ الٰہیہ کی تعلیم دی جاتی ہے، لہٰذا یہ کلمہ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جن الفاظ سے ہم کام لیتے ہیں وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کے لیے وضع کیے گئے ہیں لہٰذا جب ہم ایسے مطالب اور مفاہیم کو بیان کرنا چاہیں گے جو ہماری روزمرہ زندگی سے ماوراء ہیں تو ان الفاظ کے مفاہیم کو وسعت دیں گے، یا پھر ان سے خالی کر کے استعمال کریں گے، پھر کسی مناسبت کو وہاں پر کام میں لائیں گے۔

مرحوم شیخ مفید رضوان اللہ علیہ شرح اعتقادات میں فرماتے ہیں:

وحی کے اصل معنی تو مخفی کلام ہے لیکن اس کا استعمال ایسے مطلب پر بھی ہونے لگا ہے جو مخاطب کو ایسے مخفی انداز میں سمجھایا جاتا ہے جس سے دوسرے لوگ بے خبر ہوتے ہیں۔[2]

۲۔"انزال" اور "تنزیل" دو ایسے الفاظ ہیں جو نزول کے مادہ سے لیے گئے ہیں جن کا اصل معنی اوپر سے نیچے آنا یعنی اترنا ہے اور نیز ان کے متعدد معانی بھی ہیں جن میں سے نیچے لانا اور بھیجنا بھی ہیں۔

کبھی تو نزول یعنی اوپر سے نیچے بھیجنے کے معنی میں حسّی پہلو موجود ہے جیسے "انزلنا من السماء ماء طهورا" یعنی ہم نے آسمان سے پاک و پاکیزہ اور پاک کرنے والا پانی بھیجا ہے

اور کبھی اس بخشش اور عطا کے معنی میں آتا ہے جو حکام بالا کی طرف سے اپنے ماتحتوں کو ہوتی ہے۔جیسے "وانزل لکم من الانعام ثمانیة ازواج" یعنی اس نے تمہارے لیے آٹھ جوڑے چوپایوں کے نازل کیے ہیں یعنی بخشے ہیں۔

اور کبھی خداوندِ عالم کی طرف سے الٰہی معارف اور مطالب کے القاء کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی یہ الفاظ کئی مقامات پر اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں

---

[1] مفردات راغب مادہ "وحی"

[2] سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۶۳۸

آیا "انزال" اور "تنزیل" ایک ہی معنی کے دو مختلف الفاظ ہیں یا نہیں؟ اربابِ لُغت میں اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان دو کے درمیان کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ تنزیل میں کثرت اور زیادتی کا معنی پایا جاتا ہے۔[1]

جبکہ بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان اساسی فرق ہے تنزیل کے معنی کسی چیز کو تدریجی طور پر نیچے بھیجنا ہیں۔ اور انزال کے معنی میں یکبارگی اور تدریج دونوں پائے جاتے ہیں راغب نے مفردات میں اس فرق کو مندرجہ ذیل آیت کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ

مؤمنین کہتے رہتے ہیں کہ کیوں نہیں (ایسی) سورت نازل ہوتی (جس میں جہاد کا حکم ہو) لیکن جب کوئی محکم سورت نازل ہوتی ہے جس میں جنگ کا ذکر ہوتا ہے تو بیمار دل (منافقین) کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی شخص موت کی دہلیز پر پہنچ چکا ہو۔ (سورہ محمد ۲۰)

اس آیت میں پہلے تو آیاتِ جہاد کے تدریجی نزول کی درخواست ہے لیکن بعد میں اس فرمان کے ایک قطعی اور جامع صورت میں نزول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ منافقین وحشت زدہ ہو گئے کیونکہ وہ جہاد کے اس حکم کے سامنے غفلت کا شکار ہو گئے۔

۳۔ "تبیین"، "بین" کے مادہ سے ہے جس کے معنی دو چیزوں کا درمیانی فاصلہ ہے۔ یہ ہوئے اور واضح اور آشکار کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے، کیونکہ دو چیزوں کے درمیان فاصلہ اپنے اندر ان دونوں نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ بعد میں یہ لفظ ان دونوں معانی کے لیے بطور جداگانہ استعمال ہونے لگا ہے، کبھی تو جدائی کے لیے اور کبھی واضح ہونے کے لیے۔

کتاب، صحاح اللغۃ میں ہے کہ بین دو متضاد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی کبھی بمعنی جدائی اور کبھی بمعنی اور وصل کے (لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی معنی وہی ہے جو لغت کی دوسری کتابوں میں درج ہے، یعنی جدائی اور فراق کے معنی) البتہ چونکہ کسی چیز سے جدائی بسا اوقات کسی دوسری چیز سے جا ملنے کا باعث بن جاتی ہے لہٰذا اس کے لازمہ پر اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

بہرحال یہ کلمہ یعنی تبین قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ظہور، انکشاف اور واضح ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا بینہ ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو روشن اور آشکارا دلیل ہوتی ہے خواہ وہ دلیل عقلی ہو یا محسوس۔ اسی وجہ سے قانونی امور میں جن دو عادل افراد کی گواہی ثبوت کا درجہ رکھتی ہے کو بینہ کہا جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو بھی بینہ کہا جاتا ہے اور بیان کے معنی کسی چیز سے پردہ ہٹانا ہوتے ہیں خواہ وہ

---

[1] "ابوالحسن" نے اس نظریے کو "لسان العرب" سے نقل کیا ہے۔

زبان کے ذریعہ ہو یا تحریر کے اور شاہد حال کے ذریعہ۔

۴۔ تکلیم اور تکلم، لفظ کلم، (بروزن زخم) کے مادہ سے ہے اور مفردات میں بقولِ راغب اس کے اصل معنی کسی چیز پر تاثیر کرنا ہے، ایسی تاثیر جو آنکھ یا کان سے محسوس ہو، جو چیز آنکھ سے محسوس ہوتی ہے وہ زخم یا جراحت ہے جو کسی کے بدن پر واقع ہوتی ہے۔ اور جو چیز کان سے محسوس ہوتی ہے وہ وہ باتیں ہیں جو ہم دوسروں سے سنتے ہیں۔

العین میں خلیل بن احمد اسے مجروح کرنے کے معنی میں جانتے ہیں اسی لیے اس لفظ کا اطلاق بات کرنے پر اس لیے ہوتا ہے کیونکہ سننے والے پر اس کا گہرا اور عمیق اثر ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات تلوار اور خنجر سے بھی بڑھ کر۔ چنانچہ عرب کا ایک مشہور شعر ہے:

جراحات السان لها التيام

ولا يلتام ماجرح اللسان

نیزے کے زخم تو مندمل ہو سکتے لیکن زبان کے زخم مندمل نہیں ہو سکتے۔

بعض تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلم اور تکلیم کے ایک ہی معنی ہیں اور دونوں کے معنی بات کرنا ہے، اسی لیے خدا کی صفات (ثبوتیہ) میں سے ایک صفت متکلم ہے۔ حالانکہ اگر ہم "وکلم الله موسى تكليما" کی اساس پر بات کریں تو کہیں گے کہ خدا متکلم ہے۔

اور یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے کہ تکلم کی لفظ ایسے مقامات پر استعمال ہوتا ہے جہاں ایک شخص دوسرے سے بات کرتا ہے لیکن تکلیم مکالمہ کی مانند ایسی بات کو کہتے ہیں جو دو افراد کے درمیان ردوبدل ہوتی ہے۔ کوہِ طور پر موسیٰؑ علیہ السلام سے خدا کی گفتگو کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

''علم عقائد'' کو اسی بنا پر ''علم کلام'' کہتے ہیں کہ اسلام میں عقائد کی اولین بحث کا آغاز، کلام اللہ یعنی قرآن مجید کے سلسلے میں ہوا کیونکہ کچھ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ کلامِ خدا قدیم اور ازلی ہے جبکہ بعض لوگ اسے حادث سمجھتے تھے اسلام کی قرون اولیہ میں اس بارے میں بڑی شدومد کے ساتھ بحث ومباحثہ اور جھگڑے اور نزاع کا سلسلہ جاری رہا ہے۔[1]

اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کا جھگڑا فضول اور بے بنیاد تھا، کیونکہ اگر قرآن سے مراد اس کے مفہوم اور مضامن ہیں تو مسلّم ہے کہ ازل سے وہ علمِ خدا میں تھے۔ اور اگر اس سے مراد الفاظ کتابت اور وحی کا نزول تھا تو بلاخوف وتردید اس کی صورت زمانہِ سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عمل میں آئی۔ بہرکیف علم عقائد کو علمِ کلام کہنے کی وجہ تسمیہ بیان کی جارہی تھی۔

---

[1] بیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا میں ''علم کلام'' کی وجہ تسمیہ کا موضوع سب سے پہلا عنوان کے طور پر ذکر ہوا ہے، (ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف، فرید وجدی، جلد ۸، مادہ کلم)۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

آفتابِ وحی

قرآنِ مجید میں مسئلہ وحی بڑی شدومد کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

قرآنِ پاک میں سینکڑوں آیات ایسی ہیں جن میں وحی کو شناخت ومعرفت کے عظیم منبع کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔کہیں پر خود وحی کے لفظ کے ساتھ کہیں پر تنزیل اور انزال کے عنوان سے، کسی جگہ پر خدائی آیات کی تبیین کے عنوان سے اور کہیں پر خدا کی انبیاء کے ساتھ گفتگو کے طور پر اور کہیں پر دوسرے عنوانوں کے ساتھ۔

اس بارے میں بہترین تعبیر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اگر حقائق کو بیان کرنے کے لیے قرآنی نقطۂ نظر سے عقل ایک طاقتور روشنی کی مانند ہے تو وحی آفتابِ عالمتاب کی طرح ہے۔

زیرِ بحث آیات میں سب سے پہلی آیت میں خدا کا انبیاء کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے تین ذرائع بیان کیے گئے ہیں ارشاد ہوتا ہے کوئی بھی شخص خدا کے روبرو نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ جسم وجسمانیات سے پاک ومنزہ ہے، مگر وحی کے طریقہ اور ان کے دل میں مخفی الہام کے ذریعہ سے، پھر فرماتا ہے یا پھر حجاب کی اوٹ سے پروردگار کا کلام سننے سے (جیسا کہ خدا نے کوہِ طور پر موسیٰؑ بن عمران سے باتیں کیں اور وہ اس طرح کہ فضا میں صوتی لہریں پیدا کردیتا تھا اور اس طرح سے اپنا پیغام حضرت موسیٰؑ تک پہنچادیتا تھا)

یا پھر اپنے قاصد کو بھیج کر اس کا پیغام اس کے رسول تک پہنچائے، جیسا کہ فرشتہ وحی حضرت جبرائیل امین پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا کرتے تھے۔

بنابریں قلبی الہام صوتی لہروں کی ایجاد اور فرشتۂ وحی کا نزول یہ تین ایسے مختلف ذرائع ہیں جن کے ساتھ انبیاء الٰہی عالم ماوراء طبیعت کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کرتے تھے۔

دوسری آیت میں اس بات کی قسم کھائی گئی ہے جب کہ ستارہ غروب کررہا ہوتا ہے، پھر فرماتا ہے، پیغمبرِ خدا ہرگز گمراہ نہیں ہوئے اور اپنے مقصد ومنزل مقصود کو گم نہیں کردیا۔وہ تو کبھی بھی اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق بات نہیں کرتا۔جو کچھ بھی کہتا ہے وہ آسمانی وحی ہوتی ہے۔

قسم ہے ستاروں کی جب وہ غروب کرتے ہیں ممکن ہے یہ عصرِ جاہلیت میں میدانِ افکار سے نور وایمان وہدایت کے غروب کی طرف اشارہ ہو۔ایسا غروب جو کسی اور طلوع کا پیشِ خیمہ بن رہا ہو یعنی زبانِ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ حقیقت ترجمان سے آفتابِ وحی کا طلوع۔

اس طرح سے یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام کلام کو ایک کلی اصول کے تحت وحی اور ایک غیبی کائنات کے ساتھ رابطہ اور وحی کی پیداوار سمجھتی ہے۔

لوگوں کے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عجیب وغریب تقاضوں کے پیشِ نظر تیسری آیت میں آنحضرتؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو واضح کریں اور لوگوں سے صاف صاف کہہ دیں: میں نہ تو اس بات کا دعویٰ کرتا ہوں کہ فرشتہ ہوں اور نہ ہی مافوق البشر کوئی مخلوق، نہ تو خدا کا بیٹا ہوں اور نہ ہی اس کا شریک! میں تو صرف تمہارے جیسا ایک انسان ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے اور ماوراءالطبیعۃ کائنات سے میرا رابطہ ہے۔

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے لوگوں سے اپنا طرہ امتیاز یہ بنایا ہے کہ وہ معرفت کے اس منبع تک دسترس رکھتے ہیں۔

چوتھی آیت میں اسلام کے چھ اہم احکام (قتلِ اولاد کی حرمت، زنا کی حرمت، قتلِ نفس کی حرمت، یتیموں کے مال کی لوٹ کھسوٹ سے پرہیز، ایفائے عہد کا وجوب اور کم فروشی کی حرمت) کو بیان کرنے کے بعد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: یہ احکام ان حکمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تیرے رب نے تیری طرف وحی کی ہے۔

اس آیت کے مطابق اصولِ عقائد نہیں بلکہ اسلام کے جزوی احکامات بھی وحی کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتے تھے۔

پانچویں آیت میں یہودیوں کے اس ٹولے کے اعتراض کا جواب ہے جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ پر نازل ہونے والا ملک وحی جناب حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، اور وہ ان لوگوں کے دشمن ہیں تو آنحضرتؐ کو حکم ہوا کہ، آپؐ کہہ دیجئے کہ جو جبرائیل کا دشمن ہے درحقیقت وہ خدا کا دشمن ہے کیونکہ انہوں نے تو حکم خدا کے مطابق قرآن پاک کی یہ آیات اور اسلامی تعلیمات وحکام آپ کے قلب پر نازل کی ہیں۔

اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام کبھی تو قرآنی آیات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر براہِ راست نازل کرتے، جبکہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی انسانی صورت میں مجسم ہو کر آنحضرتؐ کے سامنے آئے اور آپؐ تک خدا کا پیغام پہنچاتے۔[1]

چھٹی آیت اس حقیقت کو پوری وضاحت کیساتھ بیان کر رہی ہے کہ ہم نے اس قرآن کو آپؐ پر نازل کیا ہے جو تمام اشیاء کا بیان کرنے والا ہدایت، رحمت اور بشارت کا سرچشمہ ہے اسی لیے یہ تمام معارف وحی کے منبع سے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ ہر چیز سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کا انسانی سعادت سے تعلق ہے جی ہاں! ان تمام امر کے اصل خواہ وہ معنوی

---

[1] ''فخر رازی'' اس آیت کی تفسیر میں اس بات پر مصر ہیں کہ آیت کی توجیہہ کی جائے اور کہا جائے ''جبرائیل علیہ السلام آنحضرتؐ کے قلب پر نازل ہوتے تھے اور آیات الٰہی کو ان کے سامنے بیان کرتے تھے، نہ کہ آپؐ کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔ لیکن چونکہ ان آیات کے حفظ کا مرکز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلب مبارک تھا اسی لیے "فانه نزله علی قلبك" کے جملوں سے اسے بیان کیا گیا ہے۔'' (تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۳، ص ۱۹۶) لیکن چونکہ اس توجیہہ کو ہم خلاف ظاہر نہیں جانتے لہٰذا اس کی تردید نہیں کرتے کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ممکن ہے کہ کبھی جبرائیل علیہ السلام کا رابطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روحانی ہوتا اور کبھی جسمانی۔

مسائل سے متعلق ہوں، یا مساوی ہوں، یا دنیاوی اور مادی مسائل سے، قرآن مجید میں کلّی قوانین کی صورت میں بیان ہوئے ہیں۔

ساتویں آیت بڑی صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہے قرآن خدا کی جانب سے ایک روح ہے جو آپؐ پر نازل ہوئی ہے اور اس سے پہلے آپؐ نہ تو اس کتاب کے مضامین سے باخبر تھے اور نہ ہی اس کتاب کے مضامین پر ایمان سے۔ قرآنِ مجید کی روح اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دلوں کی حیات، جانوں کی زندگی اور انسانی معاشروں کی حیات و زندگانی ہے اور یہ وہ کلام ہے جسے بہت سے مفسرین نے قبول کیا ہے۔[1]

اور جو یہ قرآن نے کہا ہے کہ آپؐ اس سے پہلے آگاہ نہیں تھے، اس سے مراد آنحضرتؐ کی ان آیات کے مضامین سے عدم آگاہی بعثت سے پہلے ہے وگرنہ بہت سے تاریخی شواہد اور متعدد روایات بخوبی اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آغازِ عمر ہی سے معرفتِ الٰہی میں ثابت قدم تھے۔

بہرحال یہ آیت وحی کو معرفت کا ایک اہم منبع کی حیثیت سے تسلیم کر کے اس کی عظمت کو دوبالا کر رہی ہے، کیونکہ قرآن کو روح بھی کہا گیا ہے اور نور اور سرچشمہ ہدایت بھی۔

آٹھویں آیت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی معاملہ آگے بڑھ گیا ہے اور تمام انبیاء کی طرف ایک مختصر سے اشارے کے ساتھ فرماتا ہے وہ بھی ایسے مرد تھے جن کی طرف وحی بھیجی جاتی تھی اگر تم نہیں جانتے تو ان لوگوں سے جا کر پوچھتے جو اس سے باخبر ہیں، کیونکہ وہ سارے کے سارے معرفت کے اس منبع سے تعلق رکھتے تھے۔

نویں آیت انبیاء و مرسلین پر بینات اور آسمانی کتب اور قوانینِ حق و عدالت کے نزول کی بات کر رہی ہے کہ ان کے ایک ہاتھ میں معجزات اور دوسرے ہاتھ میں کتاب اور قوانین ہوتے تھے تاکہ لوگ عدالت پر قائم رہ سکیں اور ظلم و بیداد کی بیخ کنی کی جا سکے۔ جی ہاں! ان بزرگواروں نے یہ سب کچھ وحی کے منبع کے ذریعہ حاصل کیا۔

دسویں آیت ذکر کی تنزیل اور اسے بھیجنے کے بارے میں ہے یعنی جو آیات بیداری کا سبب بنتی ہیں ان کی بات ہو رہی ہے اور ساتھ ہی اس بات کا وعدہ بھی کر رہی ہے کہ خداوند عالم نے ان آیات کی ہر طرح سے تحریف کمی، بیشی اور محو و نابودی سے حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ پس لوگوں کی ہر قسم کی آگاہی اور بیداری کا ذریعہ وحی ہے اور چونکہ خداوند عالم خود ہی اس کا محافظ ہے۔ لہٰذا اس کی اصلیت اپنی جگہ پر ثابت اور برقرار ہے۔

گیارھویں آیت میں فرماتا ہے، ہم نے تمہارے لیے آیات کو بیان کر دیا ہے، اگر تم عقل سے کام لو اور یہ چیز بذاتِ خود دلیل ہے کہ اس بات پر کہ آیاتِ الٰہی عقل کو بیدار کرتی ہیں اور افکار کو متحرک رکھتی ہیں۔

اور آخر میں بارھویں آیت حضرت موسیٰؑ سے خدا کی گفتگو کے بارے میں ہے، ایسی گفتگو جو اس عظیم الشان پیغمبر کے معارف کا سرچشمہ تھی اور گفتگو بھی ایسی جو ایک قسم کی وحی تھی۔

---

[1] راغب، مفردات میں کہتے ہیں "سمس القرآن روحا ... لکون القرآن سببا للحیوۃ الاخرویۃ"۔

یہ چند ایک آیاتِ قرآنی بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جن میں بڑی وضاحت کے ساتھ اور بغیر کسی الہام کے وحی کو نہایت ہی عمدہ طریقہ سے شناخت و معرفت کا ایک منبع بتایا گیا ہے۔

اور یہ ایسی صورت میں ہے کہ مادی فلاسفہ مطلقاً اس کے مخالف ہیں اور وحی کے بارے میں وہ مختلف تفسیریں بیان کرتے ہیں جنہیں ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

اصل منبع کی وضاحت کے بعد اب ہم ایسے مسائل کو بیان کرتے ہیں جو وحی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

تفصیلات

۱۔ قرآنِ مجید میں وحی کی قسمیں

قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ وحی کے مختلف معانی ہیں، کچھ تو وحی تکوینی ہوتی ہے اور کچھ وحی تشریعی۔ چنانچہ ان دونوں معانی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سات قسمیں بنتی ہیں۔

۱۔ "وحی تشریعی": جو انبیاء پر نازل ہوتی ہے اور چند آیات بطور نمونہ اس بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ وحی بمعنی: ایسے الہامات جو غیر انبیاء پر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں آیا ہے کہ "واوحینا الی ام موسی ان ارضعیه" یعنی ہم نے موسیٰؑ کی ماں کی طرف وحی کی (الہام کیا) کہ اسے دودھ دے، اور جب اس کے بارے میں تجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے، اور نہ تو ڈر اور نہ غمگین ہو، کیونکہ ہم اسے تیری طرف لوٹا دیں گے، اور اسے رسولوں میں قرار دیں گے۔

اس سے ملتی جُلتی صورتِ حال بلکہ زیادہ مکمل طور پر، سورہ مریم میں حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں بیان ہوئی ہے کہ فرشتۂ وحی ان کے سامنے آیا اور انہیں عیسٰی کی ولادت کی خوشخبری دی۔ (سورہ مریم ۱۷ تا ۱۹)

۳۔ فرشتوں کی وحی: یعنی خود فرشتوں کو خدا کا پیغام، جیسا کہ سورہ انفال میں غزوہ بدر کی داستان میں مذکور ہے "اذیوحی ربك الی الملائکة انی معکم فثبتوا الذین امنوا" یعنی اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، بس جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں ثابت قدم رکھو۔

۴۔ وحی بمعنی: اشارہ کے ساتھ پیغام جیسا کہ زکریا علیہ السلام کی داستان میں ذکر ہوا ہے "فخرج علی قومه من المحراب فاوحی الیهم ان سبحوا بکرة وعشیا" یعنی وہ محراب عبادت سے نکل کر لوگوں کے پاس آئے اور انہیں اشارے کے ساتھ کہا کہ صبح و شام (خدا کی) تسبیح کیا کرو۔

۵۔ وحی بمعنی "خفیہ شیطانی القاء" جیسے "وکذالك جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی

بعضهم الی بعض زخرف القول غرورا" یعنی اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لیے انسانی اور جنی شیطانوں میں سے دشمن قرار دیئے ہیں جو (لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے مخفی طور پر فریب پر مبنی بے بنیاد باتیں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں)۔(سورہ انعام ۱۱۲)

۶۔ وحی بمعنی ''تکوینی کائنات میں قوانین الٰہی کا تعین'' جیسے "واوحی فی کل سماء امرها" یعنی خداوند عالم نے ہر ایک آسمان میں تقدیر اور تدبیر کو لازم قرار دے دیا ہے۔(فصلت ۱۲)

اور قیامت میں زمین کی شہادت کے بارے میں جو آیا ہے کہ "یومئذ تحدث اخبارها بان ربك اوحی لها" یعنی اس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہے۔(سورۃ اذا زلزلت) بھی ممکن ہے کہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہو۔

وحی بمعنی ،،عزیزوں کی تخلیق،، جیسے "واوحی ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر و مما یعرشون" یعنی تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کر طرف وحی کی (الہام عزیزی کیا) کہ پہاڑوں، درختوں اور ان چھجوں پر اپنا گھر بنا جو لوگ بناتے ہیں۔(نحل۔۶۸)

یہ سب کچھ تو رہا ایک طرف ادھر دوسری طرف انبیاء پر وحی کا نزول بھی مختلف صورتوں میں انجام پاتا رہا ہے کیونکہ قرآنِ مجید اور روایات میں کم از کم ان چار صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۔کبھی فرشتہ کے نزول اور اس کے مشاہدہ کی صورت میں۔

۲۔کبھی فرشتہ کی آواز سننے اور خود اسے نہ دیکھنے کی صورت میں۔

۳۔کبھی دل میں الہام کی صورت میں۔

۴۔کبھی خواب اور رویائے صادقہ کی صورت میں جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں ان کے فرزند کو ذبح کرنے کے بارے میں مذکور ہے۔(صافات/ ۱۰۲) یا جیسے خود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے کہ جب انہیں اس بات کی بشارت دی گئی تھی کہ وہ نہایت ہی امن وامان کے ساتھ خانہِ خدا کی زیارت کے لیے مکہ میں داخل ہونگے۔

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ کے ایک صحابی نے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ،، آپؐ پر وحی کیونکر نازل ہوتی ہے،، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا

"احیانا یاتینی مثل صلصلة الجرس، وهو اشده علی، فینصم عنی فقد وعیت ماقال، واحیانا یتمثل لی الملك رجلا فیکلمنی فاعی مایقول۔

یعنی کبھی تو مجھے گھنٹی کے بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور یہ صورت حال مجھ پر سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، حقائق کو مجھ پر روشن کر دیتی ہے اور وہ جو کچھ کہتی ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔اور کبھی فرشتۂ وحی مرد کی صورت میں میرے ساتھ سامنے آجاتا ہے ہے اور مجھ سے باتیں کرتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے میں اُسے یاد کر لیتا ہوں۔[1]

---

[1] بحارالانوار، جلد ۱۸، ص ۲۶۰

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

انبیاء اور رسولوں کے چار طبقے ہیں:

بعض وہ ہیں جن کے دل پر الہام ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ سے آگے نہیں بڑھتے۔ بعض وہ ہیں جو فرشتہ کو خواب میں بھی دیکھتے ہیں اور بیداری میں بھی اس کی آواز کو سنتے ہیں، لیکن کسی کو نہیں دیکھتے ہیں، اور وہ کسی کی طرف مبعوث بھی نہیں ہوتے۔

بعض وہ ہیں جو خواب میں اسے دیکھتے ہیں، بیداری میں بھی اس کی آواز سنتے ہیں اور اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں، اور ایک مخصوص گروہ کی طرف مبعوث ہوتے ہیں، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔

اور بعض وہ ہیں جو اسے خواب میں بھی دیکھتے ہیں، بیداری میں بھی اس کی صدا سنتے ہیں اور فرشتہ کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں اور وہ (دنیا بھر کے لوگوں کے) امام اور پیشوا ہوتے ہیں۔ [1]

۲۔ وحی کی حقیقت کیا ہے؟

وحی کی حقیقت کے بارے میں بہت کچھ کہا اور سنا جا چکا ہے، لیکن واضح سی بات ہے کہ جس عالم تک ہماری رسائی نہیں ہے اور ہم اس سے مکمل طور پر ناواقف ہیں، وہاں تک رسائی حاصل کرنا ہمارے بس سے بالکل باہر ہے حتیٰ کہ اگر خود پیغمبرِ گرامیؐ کی ذاتِ والا صفات بھی ہمارے لیے اس کی پوری پوری وضاحت کریں پھر بھی ہمارے لیے صرف ایک دھندلکے کی مانند ہوگا، کیونکہ وہ کائنات اور عالم ہی مرموز اور اسرار آمیز ہے۔

اس کی مثال ایسے ہے جیسے کئی آنکھوں والا شخص کسی ،، مادرزاد نابینا،، کے سامنے سورج کی دلکش شعاعوں، سمندر کی لہروں، مور کے رنگارنگ پروں اور پھولوں اور کلیوں کے دلفریب مناظر کو ایک خوش وخرم اور سرسبز وشاداب باغ میں بیان کرے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ مبہم سے کچھ تصورات اس کے ذہن میں پیدا کریں لیکن وہ ان مسائل کی حقیقت کو ہرگز درک نہیں کر پائے گا۔

لیکن ہم وحی کو اس کے آثار، اہداف اور نتائج کے ذریعہ وضاحت کر سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی وہی خدائی القاء ہے جو ثبوت کو حقیقت کا جامہ پہنانے اور بشارت اور ڈرانے کے لیے عمل میں آتا ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسا نور ہے جس کے ذریعہ خداوندِ عالم اپنے جن بندوں کو ہدایت کرنا چاہتا ہے۔ ہدایت کرتا ہے، یا اسی طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ عالم غیب کے ساتھ رابطے کا ایک ذریعہ اور اس عالم کے معارف کے ادراک کا ایک وسیلہ ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے صرف آثارِ وحی کی بات کی ہے حقیقتِ وحی کی نہیں۔

---

[1] اصول کافی، جلد ۱، باب طبقات الانبیاء

ہمیں اس معنی پر نہ تو استعجاب کرنا چاہیئے اور نہ اس کی حقیقت کو درک نہ کر سکنے کو اس کے وجود کی نفی کی دلیل سمجھنا چاہیئے اور نہ ہی اس کی مادی اور جسمانی توجیہات کرنی چاہیے۔ کیونکہ عالمِ نبوت تو ایک سہل سا امر ہے۔ اس مادی دنیا میں عالمِ حیوانات ہے جنہیں ہم اپنے سے پست مخلوق سمجھتے ہیں ان میں بھی کچھ ایسے احساسات اور ادراکات پائے جاتے ہیں جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کچھ جانور ایسے ہیں جو زلزلہ کے وقوع پذیر ہونے سے کچھ عرصہ قبل اپنی مرموز اور مخفی حس کے ذریعہ اس سے مطلع ہو جاتے ہیں جبکہ ہم مکمل طور پر اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات تو وہ مل کر شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور ایسی دلخراش آوازیں نکالنا شروع کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہونے والا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ رسیوں اور زنجیروں سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگ جاتے ہیں، جبکہ ہمارے نہایت ہی معیاری اور اعلیٰ ترین قسم کے زلزلہ پیما آلات اس طرح کا پتہ نہیں چلا سکتے۔

اسی طرح کچھ جانور ایسے ہیں جو موسمی حالات کا کئی ماہ پہلے پتہ چلا لیتے ہیں ں اور اپنے گھر یا گھونسلے اسی کے مطابق بناتے ہیں اور اس مدت تک کے لیے ضروری غذا اکٹھی کر لیتے ہیں مثلاً اگر آنے والا موسمِ سرما سخت اور زیادہ سرد درپیش ہو تو اس کے لئے ان کا درعمل کچھ اور ہوتا ہے اور اگر زیادہ سخت و سرد نہ ہو تو کچھ اور!! مہاجر پرندوں کی اجتماعی حرکت اور استوائی منطقہ سے قطبی منطقوں کی طرف یا قطبی منطقوں استوائی منطقہ کی طرف طولانی مسافت کا طے کرنا، حتیٰ کہ بعض اوقات رات کے وقت اور ابر آلود فضاؤں میں ایسا سفر کرنا ان ہی کا کام ہے جبکہ کوئی انسان نہایت یہی اہم اور پیچیدہ آلات کے بغیر اس کا ایک فیصد حصہ بھی طے نہیں کر سکتا۔

چمگادڑ کا رات کی مکمل تاریکی میں پرواز کرنا، نہایت ہی پیچیدہ رکاوٹوں سے گزر کر رات کی مطلق تاریکی میں اپنے شکار کو تلاش کر لینا، بلکہ بعض اوقات تو پانی کی موجوں کے نیچے سے شکار کو پکڑنا، اور اس قسم کے کئی دوسرے حقائق ایسے ہیں جو ہم انسانوں کے لیے نا قابلِ اعتبار ہیں، لیکن علم اور سائنس نے اس کی تصدیق کی ہے اور ثابت کیا ہے۔

ان واقعیات کا وجود کہ جس سے علم، تجربہ اور مشاہد نے پردہ اٹھایا ہے، اس بات کا غمّاز ہے کہ ان کے اندر مخفی درک اور شعور موجود ہے اور ہم اس سے بے بہرہ ہیں۔ البتہ حیوانات کے اسرار آمیز جہان تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ ایک ایسی حقیقت اور واقعیت ہے جس سے انکار ناممکن ہے۔ [1]

باوجود یکہ حیوانات کے حواس کا تعلق مادہ اور طبیعت سے ہے نہ کہ ماوراء الطبیعۃ سے لیکن ہم ان کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ تو پھر ہم وحی کی اسرار آمیز دنیا کو جس کا عالم وراء الطبیعۃ ہے درک نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کا کیونکر انکار کر سکتے ہیں؟

ہم نے جو کچھ ابھی بیان کیا ہے اس سے وحی کے مسئلہ کے اثبات پر استدلال مقصود نہیں تھا، بلکہ اس استبعاد کو دور کرنا مقصود تھا اور ان لوگوں کا جواب تھا جو اس کی حقیقت کے ادراک نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

---

[1] کتاب ''حواس اسرار آمیز حیوانات'' کی طرف رجوع فرمائیں

مسئلہ وحی کے اثبات کے لیے ہمارے لیے روشن راہیں موجود ہیں جن میں سے دو تین کو یہاں پر بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ ایک طرف تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے ساتھ کتابیں اور تعلیمات بھی لے آئے جو انسانی فکر وقدرت سے بالاتر ہیں۔ ایک انسان جس نے کسی سے درس نہ پڑھا ہو اور عصرِ جاہلیت میں نہایت ہی پسماندہ اور عقب افتادہ ماحول میں ظاہر ہوا ہو، اس اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے ساتھ قرآن مجید جیسی عظیم کتاب لائے جو آج تک پوری دنیا کو چیلنج کر رہی ہے۔

۲۔ دوسری طرف یہ ہے کہ انبیاء کی طرف سے وحی کا دعویٰ ہمیشہ معجزات اور خارق العادہ امور کے سات ہم آہنگ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک ماوراء الطبیعۃ جہان سے رابطہ ہے۔

۳۔ ادھر تیسری طرف یہ ہے کہ توحیدی نقطۂ نظر یہ بتاتا ہے کہ خداوندِ عالم نے ہمیں ارتقاء اور اپنی لامحدود اور بے حد وانتہا ذات کی طرف حرکت کرنے کے لیے تخلیق فرمایا ہے۔ اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ پیچ وخم، نشیب وفراز اور خطرات ومشکلات سے گھرا ہوا یہ راستہ صرف اور صرف انسانی عقل کے پاؤں سے طے کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے حقائق ہیں جن کے ادراک کے لیے انسانی عقل عاجز اور ناتواں ہے اور پھر ساتھ ہی صاحبانِ فکر ودانش کے درمیان سخت اختلافات پائے جاتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اپنی عقل اور ان قوانین کے ذریعہ چلانا چاہتے ہیں جنہیں انہوں نے خود وضع کیا ہے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ خداوندِ عالم بنی نوع انسان کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ عقل کی طاقت کے ساتھ ساتھ ان کی ایسے رہبروں کے ذریعہ راہنمائی بھی کرتا ہے جن کا عالمِ غیب سے رابطہ اور تعلق ہے اور وہ بحرِ علوم الٰہیہ سے سیراب ہوتے ہیں۔ وہ ان کے ذریعہ بنی نوع انسان کی امداد اور دستگیری کرتا اور انہیں منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

ہم ان تینوں قرائن سے عالمِ انسانیت اور عالمِ ماوراء الطبیعۃ کے درمیان رابطے کو بخوبی درک کر سکتے ہیں اور وحی سے حاصل ہونے والے امور پر ایمان لا سکتے ہیں، اگرچہ ہم اس کی ماہیت کو نہ بھی پہچانتے ہوں، بالفاظ دیگر بہت سے دوسرے مواقع کی مانند اس موقع پر بھی ہمارا علم اجمال ہے نہ کہ تفصیلی!

۳۔ وحی کے بارے میں شرق وغرب کے فلاسفہ کیا کہتے ہیں؟

بہت سے فلاسفہ کی یہی کوشش رہی ہے کہ وہ وحی کی اسرار آمیز دنیا تک رسائی حاصل کریں، خواہ وہ فلاسفہ قدیم ہوں یا جدید، مشرقی ہوں یا غربی! اور پھر وہ اس کوشش میں بھی تھے کہ وہ اپنے اپنے فلسفہ کی بنیاد پر اس کی تفسیر کریں۔ لیکن جب ان کی مباحث کے نتائج کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں اکثر لوگ بے راہروی کا شکار ہوتے ہیں اور اگر صحیح راستہ اختیار کیا بھی ہے تو صرف اس حد تک گویا اسرار آمیز دنیا کے صرف ایک معمولی سے سایہ تک رسائی حاصل کی ہے۔

کسی دانشور کا کہنا ہے کہ:

سولھویں صدی عیسوی تک دوسری اقوام کی مانند فلاسفہِ غرب بھی ،،وحی،، پر ایمان رکھتے تھے، کیونکہ ان کی

کتابیں انبیاء کرام کی خبروں سے لبریز تھیں لیکن جونہی جدید (سائنس اور طبیعی) علوم نے پر پُرزے نکالنے شروع کیے اور تمام مسائل مادی محور کے گرد گھومنے لگے تو فلاسفہِ غرب نے وحی کا مکمل طور پر انکار کر دیا، بلکہ بعض اوقات اسے ،،خرافات اور قصہ ہائے پارینہ،، کے نام سے یاد کرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی وہ خدا، روح اور ماوراءِ لطبیعۃ کی دنیا کا انکار بھی کرنے لگے۔ حتٰی کہ ان کی جسارت اور گستاخی اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ وحی کو خیالات کو مجموعہ یا اعصابی بیماریوں کا دوسرا نام دینے پر تُل گئے۔

یہ سلسلہ انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا یہاں تک کہ سائنسی اور تجربی علوم کے ذریعہ ان کے لیے عالمِ ارواح دریافت ہوا اور ان کے نزدیک عالمِ ماوراءِ لطبیعۃ کا مسئلہ تجربی مسائل کے زمرے میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ اس بارے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں اور مقالے لکھے گئے۔ [1]

اس موقعہ پر ''مسئلہ وحی'' کو ایک نئی صورت ملی، اگرچہ اب بھی وہ اس حد تک نہیں پہنچ پائے جس حد تک وحی کی حقیقت کو ادیانِ الٰہی کے پیروکار، بالخصوص قرآن کی روشنی میں مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ پھر بھی اس بارے میں ایک نہایت ہی اہم قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ [2]

جدید اور قدیم فلاسفہ کے درمیان وحی کے بارے میں مجموعی طور پر دو مختلف نظریے موجود ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اس نظریے کے مطابق نہیں ہے جو قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے۔

ا۔ کچھ قدیم فلاسفہ کہتے ہیں ،،وحی،، کا سرچشمہ وہی ،،عقل فعال،، ہی ہے اور پھر وہ عقلِ فعال کو ہمارے وجود سے الگ ایک اور مستقل اور روحانی وجود تسلیم کرتے ہیں، جو تمام علوم و دانش کا منبع اور خزانہ ہے ان کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام کا ،،عقلِ فعال،، کے ساتھ نہایت ہی قریبی رابطہ ہوتا ہے اور وہ اسی سے الہام لیتے ہیں اور وحی کی حقیقت بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، درحقیقت اس گروہ کے پاس اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ وحی ،،عقلِ فعال،، سے رابطے کا نام ہے اس سے قطع نظر، ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ،،عقلِ فعال،، علم و دانش کے عنوان سے ایک مستقل منبع کی حیثیت رکھتی ہو اس کے اثبات کے لیے آج تک کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکی، جیسا کہ فلسفی مباحث میں اس پر گفتگو کی جا چکی ہے۔

پس اس طرح سے مندرجہ بالا نظریہ ایک احتمالی نظریہ ہے اور دوسرے مفروضات پر مبنی ایک مفروضہ ہے۔ اور ان دونوں مفروضوں میں سے کوئی بھی مفروضہ پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچا۔ تو پھر ایسی کیا ضرورت ہے کہ اس قسم کی توجیہات کا سہارا لیں؟ بس اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ،،وحی عالم ماوراء الطبیعۃ اور ذاتِ کردگار کے ساتھ رابطے کا نام ہے لیکن کیسے؟ اور کس طرح سے؟ بات ہم پر واضح نہیں ہے، ہم صرف اس کے

---

[1] دائرۃ المعارف، قرن بیستم، جلد ۱۰، ص ۱۲۷

[2] دائرۃ المعارف، قرن بیستم، جلد ۱۰، ص ۱۲۷

آثار کو دیکھتے ہیں اور آثار دیکھ کر ہی ہم اس کے وجود کا پتہ لگاتے ہیں اور اس کی ماہیت کا پتہ لگائے بغیر اس سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس دنیا میں اس قسم کے بہت سے حقائق ہیں۔

۲۔ دورِ حاضر کے کئی فلاسفہ کا یہ نظریہ ہے کہ ،،وحی،، درحقیقت ،، ناآگاہ وشعور،، کی تجلی یا اس جہان کے حقائق کے ساتھ مخفی کے رابطے کا نام ہے کبھی تو ،، باطنی نبوغ،، کبھی ریاضت ،، اور اس قسم کی دوسری کششوں کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

جدید نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان دو طرح کی شخصیات کا حامل ہوتا ہے، ایک ظاہر اور آگاہ ،، شخصیت جو کہ ادراک، تفکر اور معلومات پر مشتمل ہوتی ہے اور ان عام اور معمولی حواس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور دوسری ،، غیر مرئی اور ناآگاہ ،، جسے کبھی ،، مخفی وجدان ،، یا ،، باطنی ضمیر ،، یا ناآگاہ شعور ،، کے نام سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور اسے بہت سے روحانی اور نفسیاتی مسائل کے حل کی کنجی سمجھتے ہیں۔

ان کے نظریہ کے مطابق انسان کی دوسری قسم کی شخصیت کے اثر ورسوخ کا دائرہ پہلی قسم کی شخصیت کے دائرہ سے کئی درجہ زیادہ وسیع ہے۔

ایک مشہور ومعروف ماہرِ نفسیات اس بارے میں یوں لکھتا ہے:

> ہم ،، آگاہ شعور ،، کو برف کے اس ٹکڑے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو پانی پر تیر رہا ہوتا ہے اور تقریباً اس کا 1/2 حصہ پانی سے باہر ہو، چنانچہ اس کا بیرونی حصہ وہی ہماری شخصیت کا ایک حصہ ہے، جس کے وجود سے ہم واقف اور باخبر ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں ناآگاہ وشعور جو ہماری دینی معالیت کا ایک اور حصہ ہے کہ جس کے وجود ہے ہم خود بھی آگاہ نہیں ہیں، اور نہ ہی اس کا اختیار ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے اور وہ انسانی شخصیت کے ایک عظیم حصے کو تشکیل دیتا ہے اور پانی تیرتے ہوئے برف کے بقیہ 9/8 حصے کی مانند ہے جو پانی کے اندر ہے اور جسے نہیں دیکھا جاسکتا۔ [1]

ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ انسان کی دوسری شخصیت کو کس نے دریافت کیا ہے؟ فرائیڈ نے یا کسی اور نے؟ آیا اس بارے میں متقدمین کا کوئی قول ملتا ہے جس میں اس چیز کی طرف اشارہ ہو یا نہیں ملتا ہمیں اس سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے لیے جو چیز سب سے زیادہ اور غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے ماہرین نفسیات نے ،، ناآگاہ شعور ،، کے دریافت کر لینے اور اس کے ذریعہ توجیہ کریں اور کہیں ،، وحی درحقیقت انبیاء کرام کے شعورِ ناآگاہ کا نتیجہ ہے جو فکری جولانیوں کی وجہ سے ان سے ظاہر ہوتا ہے۔

اور پھر انبیاء کے فکری نبوغ اور اس کے ساتھ ہی مسلسل ریاضتوں اور افکار سے کام لینے نے اس کے لیے سونے پر سہاگے کا کام دیا ہے۔

اور مفروضہ کے مطابق ،، وحی، عالمِ ماوراء الطبقیہ کے ساتھ خاص رابطے اور دیگر افرادِ انسانی کے فکری اور عقلی روابط کے منافی ہونے کا نام نہیں ہے، جو ہمارے وجود سے الگ ایک اور مستقل وجود بنام پیکِ وحی یا فرشتہ کے ذریعہ انجام پائے، خود انبیاء کرام کے مخفی ضمیر کی صدائے

---

[1] کتاب ''خودشناسی'' ترجمہ ڈاکٹر ساعدی، ص ۶ و ص ۷ (قدرے وضاحت کے ساتھ)۔

بازگشت یا ردِعمل کا دوسرا نام ہے۔

چنانچہ یہ،،نظریہ،، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں یہ،،مفروضہ،،بھی قدیم فلاسفہ کے مفروضہ کی مانند ہر قسم کی دلیل سے عاری ہے جو وحی کو ،،عقلِ فعال،، کے ساتھ متعلق سمجھتے تھے۔

جن لوگوں نے وحی کی ان الفاظ میں تفسیر کی ہے شاید ان کا یہ ارادہ نہ ہو کہ وہ اسے ایک ثابت شدہ حقیقت کے عنوان سے تسلیم کریں بس وہ اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ،وحی،،کے آثار جدید علوم سے سازگار ہیں اور انہیں انبیاء کے،،نا آگاہ شعور،،کی تجلّی سے تفسیر کیا جاسکتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں کہیں کہ:

بہت سے دانشوروں کا اس بات پر اصرار ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کی سائنسی اصولوں سے مطابقت دیں یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی کسی نئی چیز کا سامنا کرتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے انہی اصولوں پر رکھیں اور اگر انہیں اپنے مقصد کے اثبات کے لیے کوئی دلیل نہ ملے تو اپنے مفروضوں کے بیان پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔

لیکن ہمارا اشکال یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز کے ساتھ اس طرح سلوک کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس طرح سے تو یہ سمجھا جائے گا کہ ہم کائنات پر حکم فرما تمام بنیادی اصولوں کو پہچان چکے ہیں۔لہٰذا اب کوئی بھی موضوع ایسا نہیں ہے جو ہمارے پہچانے ہوئے اصولوں سے باہر ہو

لیکن یہ ایک عظیم دعویٰ ہے کہ نہ صرف اس کے ثبوت کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کی مخالفت پر ہمارے پاس کئی دلائل ہیں، کیونکہ ہم سب جانتے ہیں اور ہمارے مشاہدے میں یہ بات آچکی ہے کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے نظام کے لیے نت نئے اصول دریافت ہوتے رہتے ہیں اور موجود قرائن سے پتہ ہے کہ جو کچھ ہم اس دنیا کے بارے میں جانتے ہیں یعنی اس کائنات کے بارے میں ہماری علم اس سے لاعلمی کے مقابلے میں ؑ وہ حیثیت رکھتا ہے جو ایک قطرے کی سمندر کے سامنے ہوتی ہے۔

ہماری حالت تو یہ ہے کہ ہم حیوانات کے اسرار آمیز حواس کی کما حقہ معرفت سے عاجز ہیں اور اس سے بالاتر خود اپنی ذات کے اسرار کی معرفت سے ناتواں اور عاجز ہیں، البتہ ہم صرف اتنا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان اسرار میں سے صرف چند ایک ہی کو پہچان سکے ہیں۔

جب صورت حال یہ ہو تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس بات پر اصرار کریں کہ ہم کائنات کی ہر چیز کو اپنے معلوماتی اصولوں کے مطابق ہی تسلیم اور اس کی تفسیر کریں پس ہمیں یہی کہنا چاہیئے کہ وحی ایک واقعی حقیقت ہے جس کے آثار ہم دیکھتے ہیں لیکن اس کے اسرار سے بے خبر ہیں۔

۴۔وحی کے غریزی ہونے کا مفروضہ

بعض مسلم مفکّرین نے وحی کے بارے میں یورپی دانشوروں کے افکار سے مرعوب ہو کر ایک اور مفروضے کا اظہار کیا ہے جو اصولی طور پر بھی ان کے ساتھ یکساں ہے، ہر چند کہ ظاہری طور پر ان سے مختلف ہے۔

یہ مفروضہ مندرجہ ذیل اصولوں پر استوار ہے:

۱۔لغت میں ''وحی'' کا معنی ''آہستہ اور سرگوشی کہ صورت میں بات کرنا'' ہے اور قرآن مجید میں اس کا وسیع مہوم ہے جو مخفی ہدایتوں کی مختلف انواع کو بھی شامل ہے وحی کے ذریعہ جمادت' نباتات اور حیوانات کی ہدایت سے لے کر انسانوں کی ہدایت سب اس میں آجاتی ہیں۔

۲۔وحی، عزیزہ کی ایک قسم ہے اور ہدایتِ وحی، ہدایتِ عزیزی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۳۔اجتماعی نقطہِ نظر سے وحی، انسان کی ہدایت ہوتی ہے۔یعنی انسانی معاشرہ اس لہٰذا سے کہ وہ ایک اکائی ہے جس کی اپنی ایک راہ، کچھ قوانین اور حرکت وتحرک ہے، لہٰذا اسے ہدایت کی ضرورت ہے اور ''نبی'' اس وحی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے جو اپنے عزیزے کے طور پر وہ سب کچھ حاصل کرتا ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ضروری ہے۔

۴۔تمام جاندار چیزیں ابتدائی مراحل میں عزیزہ کے ذریعہ ہی ہدایت کی جاتی ہیں اور وہ ارتقاء کے درجات میں جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہیں اور ان کے حسّ تخیل اور افکار کی طاقت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر ان کی قدرتِ غریزہ میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حشرات میں نہایت ہی طاقتور غرائز پائے جاتے ہیں جبکہ انسانوں میں ان کی نسبت بہت ہی کم۔

۵۔اجتماعی نقطہِ نظر سے انسانی معاشرہ تسلسل کے ساتھ ایک ارتقائی راستے پر گامزن ہے جیسا کہ حیوانات ابتدائی مراحل میں غریزہ کے محتاج ہوتے ہیں اور جوں جوں حسّ' تخیل، حتیٰ کہ تفکّر کی طاقت ان میں ترقی کرتی جاتی ہے اسی قدر حسّی اور فکری ہدایت، غریزی ہدایت کی جانشین ہوتی جاتی ہے۔اسی طرح انسانی معاشرہ بھی ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے بالتدریج ایسی جگہ پر پہنچ چکا ہے کہ جہاں پر تعقّل کی طاقت ترقی کر چکی ہے۔اسی لیے وہ غریزہ (وحی) کی کمزوری کا سبب بن چکی ہے۔

۶۔انسانی کائنات کے دو بنیادی دورانیے ہیں۔۱۔ہدایتِ وحی کا دورانیہ۔۲۔طبیعتِ تاریخ میں تفکّر اور تدبّر کا دورانیہ۔

۷۔پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو خاتم النبیّین کا تعلق قدیم دنیا سے بھی ہے اور جدید دنیا سے بھی اپنے منبعِ الہام یعنی وحی کے لحاظ سے نہ کہ طبیعت اور تاریخ کے تجرباتی مطالعہ کی رو سے ان کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے، اور اپنی تعلیمات کی روح کے لحاظ سے کہ جس میں طبیعت اور تاریخ کے بارے میں تدبّر، تفکّر اور مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے، جب یہ امور پیدا ہوجاتے ہیں تو وحی کا سلسلہ رُک جاتا ہے، ان تمام باتوں کا تعلق نئی اور جدید دنیا سے ہے۔[1]

اس مفروضے کا نچوڑ یہ ہے کہ وحی ناخود آگاہانہ معرفت کی ایک قسم ہے جیسے غرائز ہیں جو کہ خود آگاہانہ معرفت سے کم درجہ پر ہے جو کہ حسّ، تجربہ، اور عقل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اور فکر وعقل کے ارتقاء کے ساتھ ہی وحی کا مجموعی ڈھانچہ کمزور ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ عقل

---

[1] شہید مطہری کی کتاب ''مقدمہ بر جہان بینی اسلامی''، (مرحوم شہید مطہری نے مندرجہ بالا سات امور کو جس میں وحی کے سلسلہ میں علامہ اقلاب لاہوری کے نظریات کو بیان کیا گیا ہے، ان کی کتاب ''اسلام میں فکر دینی کا احیاء'' سے خلاصہ کر کے پیش کیا ہے اور پھر اس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی ہے)۔

لے لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اکرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت کا خاتمہ ہو چکا ہے، اور ختمِ نبوت کا نظریہ یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ مفروضہ اگرچہ ایک اسلامی دانشور کی طرف سے ظاہر ہوا ہے لیکن کئی جہالت سے مغربی دانشوروں اور اہلِ قلم کے مفروضات سے کئی درجے پست اور کمزور ہے، جو وہ وحی کے بارے میں قائم کیے ہوئے ہیں ہر چند کہ دلیل کے فقدان کے لحاظ سے ان کے اب تک مفروضات سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا وحی کے بارے میں اب تک پیش ہونے والے نظریات میں سے بدترین نظریہ ہے۔ کیونکہ:

اوّلا: مغربی مفکرین وحی کو انسان کے حسّی اور عقلی ادراک سے مافوق سمجھتے ہیں جبکہ اس مفروضہ کے تحت وحی کا درجہ حسّ اور عقل سے کمتر ہے۔ اور یہ واقعاً عجیب سوچ ہے!!!

ثانیاً: ایک مسلمان جو قران سے آشنا ہے، اس کے لیے یہ بہت اچھی طرح واضح ہے کہ قرآنی نقطہِ نظر سے ''وحی'' خدا کے علم کے ساتھ ایک طرح کا رابطہ اور تعلق ہے۔ وہ عظیم ترین معارف جنہیں انسان عقل کے ذریعہ ہرگز حاصل نہیں کرسکتا وہ وحی کے بیکراں سمندر سے حاصل ہوتے ہے۔

قرآنی نقطہ نظر سے ''وحی'' مکمل طور پر خود آگاہ ہدایت کا نام ہے جو ''ہدایت عقلی'' سے کئی درجے بالاتر ہے اور جیسا کہ ہم اس سے پہلے تشبیہ کے طور پر بیان کر چکے ہیں کہ اگر ہم عقل کو ایک طاقتور چراغ سمجھیں تو وحی کا درجہ آفتاب عالمتاب کا ہوگا۔

قرآن مجید نے ایک طرف تو انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''وما اوتیتم من العلم الا قلیلا'' یعنی تمہارے پاس علم ودانش کا ایک تھوڑا سا حصہ ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

اور دوسری طرف علمِ الٰہی کی وسعت کو ن الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

''اگر تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلم، پھر بھی اس کے لامتناہی علم کو ہرگز نہیں لکھ پائیں گے۔ (لقمان ۲۷)

اور نبوت کی وحی کا اسی لامتناہی علم کے ساتھ ہی تعلق ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے کھلم کھلا لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کا معلّم خود خدا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ

یعنی خداوندِ عالم نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور جو چیز آپ نہیں جانتے تھے اس کی آپ کو تعلیم دی۔ (نساء ۱۱۳)

انسانی علم ودانش جس قدر بھی ترقی کر جائے پھر بھی اس کے بس سے باہر ہے کہ انسان کو وحی کی ہدایت کے بغیر سعادت وخوش بختی کے پُر پیچ راستوں سے باخبر کرے چنانچہ بہت سے فلاسفہ کا عجیب وغریب انحراف کا شکار ہوجانا ہمارے اس دعویٰ کی بیّن دلیل ہے۔

بہت سے لوگ اسلامی مفکّر کے عنوان سے مشہور ہو چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلامی مفکّر کی نسبت ''مغزی مفکّر'' زیادہ ہیں اوران کے نظریات میں ''مغربی مفکرین'' کا رنگ غالب ہے۔اسی وجہ سے وہ مافوق الطبیعۃ حقائق کے لیے طبیعی توجیہات کرتے ہیں۔

اگر یورپی مفکرین کا اسی معنی پر اصرار ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عالمِ ماوراءالطبیعۃ کے منکر ہیں۔لیکن کسی مسلمان کو اسلامی نظریہ کا حامل ہونے اور وسیع ترین ماوراءالطبیعۃ کائنات پر ایمان رکھنے کے باوجود ان لوگوں کا پیروکار نہیں ہونا چاہیے کہ اس قسم کے تمام مسائل کے لیے سائنسی اور طبیعی توجیہیں پیش کرتا رہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دورِ حاضر میں جو لوگ مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یورپ میں تعلیم حاصل کی ہے اوران کی اسلامی معلومات مغربی معلومات کی نسبت کمزور ہیں،ان کی تحریر میں مغربی مفکرین کی اتباع پائی جاتی ہے۔

۵۔پیغمبر کو کیسے یقین ہوتا ہے کہ وحی خدا کی طرف سے ہے؟

وحی کے بارے میں ہونے والے سوالات میں سے ایک یہی سوال ہے کہ جب پہلی مرتبہ کسی پیغمبر پر وحی نازل ہوتی ہے تو اسے کیونکر یقین آجاتا ہے کہ ''یہ خدا کی طرف سے وحی ہے نہ کہ شیطان القاء؟اس علم اور یقین کا منبع اور مرکز کہاں ہے؟

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے کیونکر اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کے مطالب اور موضوعات کے لحاظ سے رحمانی پیغامات اور شیطانی القائات کا زمین وآسمان جتنا فرق ہوتا ہے،اور ہر ایک کے مطالب سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اسے کہاں سے بھیجا جارہا ہے؟حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی پیغمبر عالم وراءالطبیعۃ یا وحی کے قاصد کے ساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے تو وہ اندرونی مشاہدہ کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح طور پر دریافت کرلیتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رابطہ قائم ہو چکا ہے۔ٹھیک اسی طرح جیسے ہم سورج کی ٹکیہ کو دیکھ رہے ہوں اگر اس موقعہ پر کوئی یہ کہے کہ تمہیں کیسے معلوم ہے کہ اس وقت عالمِ بیداری میں تم سورج کی ٹکیہ کو دیکھ رہے ہو؟شاید یہ سب کچھ خواب میں دیکھ رہے ہو؟تو صاف سی بات ہے کہ ہم اس کی اس قسم کی باتوں کو ہرگز لائقِ اعتناء نہیں سمجھیں گے،کیونکہ جو چیز ہم محسوس کررہے ہیں وہ قطعی اور ناقابلِ تردید ہے۔

آیہ ''فلما اتاها نودی یا موسی انی انا ربك''(سورہ طہ ۱۱،۱۲) کی تفسیر میں علامہ سیّد محمد حسین طباطبائی مرحوم کے بقول:

> ''جب خدا کا کو پیغمبر اور رسول پہلی بار وحی اور رسالت کا سامنا کرتا ہے تو اس کے لیے کسی قسم کے شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ وحی کے بھیجنے والا خداوندِ سبحان ہی ہے۔اور اسے اس بارے میں تحقیق،استدلال اور حجت قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر ضرورت محسوس ہو تو وہ غیبی اور بلاواسطہ وحی نہیں ہوگی بلکہ برہانِ عقلی سے استدلال اور استفادہ کی ایک قسم ہوگی''۔[1]

یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ بعض روایات جعلی ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ جب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے

---

[1] المیزان،جلد ۱۴ ص ۱۴۹

پہلی وحی نازل ہوئی اور آپؐ ''کوہِ حرا'' سے حضرت خدیجہؓ کے گھر تشریف لائے اور جو کچھ دیکھا تھا وہ حضرت خدیجہؓ سے بیان کر دیا، پھر فرمایا'' مجھے اپنا خوف ہے'' (یعنی میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ یہ خدا کی وحی نہ ہو!!) جنابِ خدیجہؓ نے انہیں تسلی دی اور اپنے چچازاد بھائی ''ورقہ بن نوفل'' کے پاس جا کر تمام ماجرا بیان کیا۔

ورقہ وہ شخص ہے جس نے زمانہ جاہلیت میں دینِ مسیحی اختیار کیا ہوا تھا، ایک پڑھا لکھا اور عربی وعبری (عبرانی) زبانوں سے واقف تھا۔ اس نے آنحضرتؐ سے تمام ماجرا بیان کرنے کی درخواست کی تو آپؐ نے سب کچھ اس کے سامنے بیان فرما دیا، یہ سن کر اس نے کہا: ''یہی تو وہ ناموس (فرشتہ وحی) ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوتا تھا۔

پھر کہا'' کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا جس وقت آپؐ کی قوم آپؐ کو اس شہر سے نکالے گی، اور میں آپؐ کی مدد کرتا۔[1]

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی روایات کا شمار جعلی روایات میں ہوتا ہے۔ کیونکہ جو پیغمبر واضح طور پر عالمِ غیب سے تعلق پیدا کر لیتا ہے اسے کیا ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ورقہ بن نوفل جیسے عیسائی کاہنوں کی پیش گوئیوں اور غیب کی خبروں کا محتاج ہو، اور اس طرح کی وحی پر کیونکر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

جب جنابِ موسیٰؑ علیہ السلام پر سب سے پہلی وحی وادیٔ طور پر نازل ہوئی تو انہوں نے اس بارے میں شک وشبہ کا اظہار کیوں نہ کیا جب کہ انہوں نے تو صرف آواز ہی سنی تھی اور فرشتہ کو نہیں دیکھا تھا؟ آیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دشمن کے مخفی ہاتھوں نے وحی اور نبوتِ اسلامی کی بنیادیں کمزور کرنے کے لیے اس قسم کی خرافات کو جعل کر کے اسلامی کتب میں درج کرا دیا ہے!!

۶۔ اسلامی روایات میں قرآن مجید معرفت کا اہم ترین منبع ہے

ہم اس بحث کو اس اشارے کے ساتھ مزید آگے بڑھاتے ہیں کہ وحی کے عظیم ترین مصداق یعنی قرآن مجید کی عظیم پیشواؤں کے کلام میں کس قدر اہمیت ہے اور وہ کس حد تک جامع اور مستغنی ہے تا کہ ایک تو اصل مسلۂ کی تاکید ہو جائے اور معرفت کے اس عظیم منبع کی اپنی ذاتی حیثیت کا بھی پتہ چل جائے۔ دوسرے ان'' کج اندیش دانشوروں'' کا جواب بھی ہو جائے جو وحی کو'' حیوانات کے غرائز'' میں شمار کرتے اور عقلی ادراکات سے کم درجے میں شکار کرتے ہیں اور اس بات کے معتقد ہیں کہ انسانی عقول کی پیش رفت سے نہ تو وحی کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی ان معارف کی وحی جن کا سرچشمہ ہے، تا معلوم ہو جائے ۔

صلاح کارو من خراب کجا
ببین تفاوت رہ ازکجاست تا بکجا؟

---

[1] اس موضوع کو اہلسنت کے بہت سے محدثین اور مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ منجملہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، تفسیر فی ظلال القرآن (سورہ علق کے آغاز میں) اور دائرۃ المعارف، قرن بیستم (مادہ وحی) جیسی کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۔ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اذا التبت علیکم الامور کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن۔۔۔۔ من جعله امامه قاده الی الجنة، ومن جعله خلفه ساقه الی النار، وهو اوضح دلیل الی خیر سبیل، من قال به صدق، ومن عمل به اجر، ومن حکم به عدل۔"

''جب تم پر رات کے تاریک ٹکڑوں کی مانند اور مشتبہ ہونے لگ جائیں تو تمہیں چاہیئے کہ قرآن کے دامن سے متمسک ہو جاؤ..... جو شخص قرآن کو اپنے آگے قرار دے قرآن اسے بہشت تک لیجائے گا، جو اسے پسِ پشت ڈال دے گا وہ اسے جہنم کی طرف پہنچا دے گا۔ قرآن بہترین راہوں کی طرف بہترین رہنما ہے، جو اس کے مطابق بات کرے گا وہ سچا ہوگا، جو اس پر عمل کرے گا اسے اجر ملے گا اور جو اس کے مطابق فیصلے کرے گا وہ عادل ہوگا۔''[1]

۲۔ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ نہی البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

"ثم انزل علیه الکتاب نورا لا تطفا مصابیحه، وسراجا لایخبو توقده، وبحرا لایدرك قعره، ومنهاجا لایضل نهجه، وشعاعا لایظلم ضوئه، وفرقانا لایخمد برهانه، وتبیانالاتهدم ارکانه، وشفاء الا تخشی اسقامه، وعزالاتهزم انصاره، وحقالا تخذل اعوانه"

"فهو معدن الایمان وبحبرحته، وینابیع العلم وبحوره، ورباض العدل وغدرانه، واثافی الاسلام وبنیانه"

یعنی پھر خداوندِ عالم نے آپؐ پر ایک کتاب نازل فرمائی وہ ایک ایسا نور ہے جو بجھنے میں نہیں آتا، ایسا چراغ ہے جس کے فروغ کو زوال نہیں، ایسا سمندر ہے جس کی گہرائیوں تک رسائی نہیں، ایسا راستہ ہے جس میں گمراہی

---

[1] اس حدیث کو مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں درج کیا ہے جسے ابوسعید خدری نے آنحضرتؐ کے ایک خطبہ کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ (جلد ۷۴، ص ۱۷۷)

نہیں، ایسی روشنی ہے جس میں تاریکی نہیں، حق اور باطل کو اس طرح جدا کرتا ہے کہ جس کی دلیل کی روشنی کبھی نہیں بجھتی، ایسی بنیاد ہے جس کے ستون مہندم نہیں ہوتے، ایسی شفا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بیماریوں سے خوف نہیں کھایا جا سکتا، ایسی قدرت ہے جس کے معاونین کو شکست نہیں ہوتی، ایسا حق ہے جس کے مددگاروں کو کبھی تنہائی نصیب نہیں ہوتی۔

قرآن ایمان کا مرکز و معدن ہے، علم کا چشمہ اور سمندر ہے، عدل و انصاف کا منبع اور سرچشمہ ہے، نیز اسلام کی بنیاد اور اساس ہے۔[1]

۳۔حضرت امام علی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے کسی نے پوچھا:

"ما بال القرآن لا یزداد علی النشر والدرس الا غضاضة"

یعنی کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید نشر و شاعت اور مطالعہ کی وسعت کے ساتھ طراوت ہی پیدا کرتا ہے؟

تو امام عالی مقامؑ نے ارشاد فرمایا:

"لان الله تبارك و تعالى لم يجعله لزمان دون زمان، ولالناس دون ناس، فهو في كل زمان جديد وعند كل قوم غض الى يوم القيامة"

کیونکہ خداوند عالم نے اسے کسی مقرر اور معیّن زمانے کے لیے قرار نہیں دیا اور نہ ہی کسی خاص قوم کے لیے قرار دیا ہے۔لہٰذا وہ ہر زمانے میں تر و تازہ اور تا روزِ قیامت ہر قوم کے لیے سرسبز و شاداب ہے۔[2]

اس سلسلے کی بہت سی روایات موجود ہیں، شیعہ منابع میں بھی اور سنی منابع میں بھی۔ہم نے صرف نمونے کے طور پر مندرجہ بالا تین حدیثیں پیش کی ہیں، ایک حدیثِ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، ایک حدیث حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے اور ایک حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے۔

۷۔غیر انبیاء کی وحی (یا وحی الہامی)

جیسا کہ ہم نے بحث کے آغاز میں کہا تھا "وحی" کے وسیع معنی ہیں جن میں سے ایک معنی کا تعلق، وحیِ نبوت و رسالت سے ہے جبکہ اس کی ایک اور قسم ہے جو غیر انبیاء کے دل پر اترتی ہے، یا وہ پیغام ہے جو بعض فرشتوں کے ذریعہ غیر انبیاء تک پہنچایا جاتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۹۸

[2] بحار الانوار، جلد ۸۹، ص ۱۵

اس کا پہلا نمونہ تو وہی ہے جو قرآن مجید نے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں کہا ہے:

"واوحینا الی ام موسی ان ارضعیه فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی"

یعنی ہم نے مادرِ موسیٰؑ کے دل میں الہام کیا کہ تو (اپنے نومولود کو) دودھ پلا اور جب تو اس کے بارے میں (دشمنوں سے) ڈرے تو اسے دریائے (نیل) میں ڈال دے اور نہ تو ڈر اور نہ ہی غمگین ہو۔ (قصص ۷)

اس قسم کی گفتگو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے بارے میں بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے:

وَاَوۡحَیۡتُ اِلَی الۡحَوَارِیّٖنَ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِیۡ وَبِرَسُوۡلِیۡ ۚ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَاشۡهَدۡ بِاَنَّنَا مُسۡلِمُوۡنَ﴿۱۱۱﴾

یعنی اس وقت کو یاد کرو جب میں نے حواریون کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ، تو انہوں نے کہا ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ (مائدہ ۱۱۱)

نیز حضرت یوسف علیہ السلام پر بھی مقامِ نبوت پر پہنچنے، سے قبل وحی ہوئی تھی۔ جب ان کے بھائیوں نے طے کرلیا کہ انہیں کنویں میں ڈالیں، تو اسی موقع کی مناسبت سے قرآن کہتا ہے:

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا وَهُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ﴿۱۵﴾

ہم نے اس وقت یوسف کی طرف وحی بھیجی کہ مستقبل میں (جب تم اقتدار حاصل کرلو گے) انہیں ان کی ان کارستانیوں سے باخبر کرو گے، جبکہ وہ تمہیں نہیں پہچانتے ہوں گے۔ (یوسف ۱۵)

اسی سورت کی بائیسویں آیت کے بموجب یہ وحی ''وحیِ نبوت'' نہیں تھی، بلکہ خدا کی طرف سے یوسفؑ کے دل میں ایک الہام تھا تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں بلکہ خدا ان کا محافظ ہے اور وہی نہیں اقتدار عطا فرمائے گا اور ان کے بھائی اپنی ان کارستانیوں پر پشیمان ہوں گے۔ اور یہی چیز ان دردناک لمحات میں وحی تھی جس نے یوسفؑ کے دل میں امید کی کرن کا کام کیا۔

فخر رازی نے سورہ طٰہٰ کی ۳۸ ویں آیت کے ذیل میں مادرِ موسیٰؑ پر وحی کے بارے میں گفتگو کے ضمن میں چھ احتمال پیش کیے ہیں جن میں سے بیشتر خلافِ ظاہر ہیں، کیونکہ اس کا ظاہری معنی تو ''قلب میں القا'' ہے یا ''فرشتے کی آواز کا سننا، ہے جو اس کے لغوی معنی سے بھی ہم آہنگ ہے۔ [1]

اور دوسری قسم وہ پیغام ہے جو خدا کے کسی فرشتے کے ذریعہ جناب مریمؑ تک ان کے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کی ولادت کے بارے میں

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر کبیر کی بائیسویں جلد کے صفحہ ۵۱ کا مطالعہ فرمائیں۔

بھیجا گیا، اور قرآن مجید نے سورہ مریم کے اوائل میں جناب مریمؑ کی اس فرشتے کے ساتھ تفصیلی گفتگو کا تذکرہ کیا ہے جو ایک خوبصورت انسان کی شکل میں ان کے سامنے مجسم ہو کر آ گیا تھا۔

اس قسم کی وحی کا روشن نمونہ وہ الہام ہے جو آئمہ معصومین علیہم السلام کے مقدس دلوں میں ہوتا ہے اور روایات میں اس سلسلے میں کئی مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔

جب امام جعفر صادق علیہ السلام سے آئمہ اطہار علیہم السلام کے منبعِ علم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"مبلغ علمنا ثلاثة وجوه، ماض، وغابر وحادث، فاما الماضی فمفسر، واما الغابر فمزبور واما الحارث فقذف فی القلوب، ونقر فی الاسماع، وهو افضل علمنا ولا نبی بعد نبینا"

یعنی ہماری علمی حدود (اور اس کا منبع) تین قسموں پر ہے، گزشتہ، آئندہ اور حادث۔

جو گزشتہ ہے وہ وہ ہے جس کی (ہمارے لیے گزشتہ آئمہ اور حضرت رسول اکرمؐ کی طرف سے) تفسیر کی گئی ہے جو آئندہ ہے وہ لکھا جا چکا ہے (اور وہ ایسی تعلیمات ہیں جو گزشتہ معصومینؑ کی طرف سے ہمارے لے یادگار کے طور پر موجود ہیں) اور جو حادث ہے وہ وہ ہے جو ہمارے دلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ (اور الہام ہوتا ہے) اور آہستہ سی آواز ہے جو ہمارے کانوں میں جا پہنچتی ہے۔ اور یہ قسم ہمارے علوم کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ البتہ ہمارے پیغمبر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کوئی اور پیغمبر کبھی نہیں آئے گا۔ [1]

ایک اور حدیث میں امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

"واما النکت فی القلوب فهو الالهام، واما النقر فی الاسماع فحدیث الملائکة، نسمع کلامهم ولا نری اشخاصهم"

جو دلوں میں اشارہ ہوتا ہے، وہ وہی الہام ہے۔ جو کانوں میں اشارہ ہوتا ہے وہ فرشتوں کا کلام ہے۔ ہم ان کی باتوں کو سنتے ہیں لیکن ان کے جسموں کو نہیں دیکھتے۔ [2]

تقریباً روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام معصوم علیہ السلام کے علوم چند ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں! وہ علوم جو انہیں پیغمبرِ اکرمؐ یا سابق امام سے انہیں وراثت میں ملتے ہیں، یا دستور العمل کی صورت میں لکھے ہوئے ان کے دے دیئے جاتے ہیں اور بعض اوقات روایات

---

[1] بحار الانوار، جلد ۲۶، ص ۵۶

[2] ارشاد مفید، جلد ۲، ص ۸۰، بحار الانوار، جلد ۲۶، ص ۱۸

میں اسے ''جامعہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اور اگر کوئی ایسا مسلۂ درپیش آجاتا ہے جو ان منابع میں نہیں ہوتا تو خداوند عالم کی طرف سے انہیں یا تو قلبی الہام ہوتا ہے یا پھر فرشتے کی آواز کے ذریعہ آگاہ ہوجاتے ہیں (جیسا کہ حضرت مریمؑ آگاہ ہوئی تھیں)۔

لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس وحی کا ''وحیِ نبوت'' سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی وحی کی قسم سے ہوتی ہے۔

اصولی طور پر آج کی اصطلاح میں عام طور پر وحی کا اطلاق ''وحی نبوت'' پر ہوتا ہے، اور ان جیسے حالات کو ''الہام'' کہتے ہیں اور علامہ طباطبائی مرحوم کے بقول کیا ہی بہتر ہے کہ ہم ایسی چیزوں کو 'الہام کہیں' کیونکہ یہ دینی ادب کے لحاظ سے نہایت ہی مناسب ہے۔[1]

اس بارے میں مزید وضاحت کے لیے بحارالانوار جلد ۲۶، ابواب علوم آئمہ اور اصول کافی' جلد اوّل' باب ''ان الائمۃ محدثون'' کی طرف رجوع کریں۔

۸۔ پیغمبرِ اسلامؐ پر وحی کیونکر نازل ہوتی تھی؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ہم وحی کی حقیقت سے بے خبر ہیں کیونکہ اس کا تعلق ایسے ادراک اور بصیرت سے ہے جو ہمارے احساس اور عقل کی دنیا سے باہر ہے۔ ہم تو صرف وحی کے آثار کو ہی دیکھتے ہیں اور اثر سے مؤثر کے وجود کا پتہ لگاتے ہیں۔ اسی لیے اس اسرار آمیز کائنات تک رسائی کی کوشش بیہودہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی معصوم امام علیہ السلام سے کیفیت وحی کے بارے میں سوال ہوتا تو وہ اس کا سربستہ جواب دیتے جو ''وحی'' کی حقیقت کا فقط ایک پرتو ہوتا۔

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ نے ''اعتقادات'' میں وحی کے بارے میں ایک تفصیلی گفتگو کی ہے جو تقریباً اخبار اور روایات ہی سے لی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''ہمارا عقیدہ ہے کہ اسرافیل کے سامنے ایک لوح ہے، جب خداوند عالم کوئی وحی بھیجنا چاہتا ہے تو وہ لوح اسرافیل کی پیشانی سے جا ملتی ہے اور وہ اس کو دیکھتے ہیں اور اس میں جو کچھ درج ہوتا ہے اسے پڑھ لیتے ہیں۔ پھر وہ سب کچھ میکائیل کو القاء کرتے ہیں۔ میکائیل جبرائیل کو اور جبرائیل انبیاء کو القاء کرتے ہیں۔ لیکن وہ بیہوشی کی حالت جو آنحضرتؐ کو عارض ہوجاتی بدن سنگین ہوجاتا اور پسینہ سے شرابور ہوجاتے تھے، وہ اس وقت ہوتی تھی جب خداوندِ عالم انہیں راہِ راست مخاطب فرماتا تھا لیکن جبرائیل علیہ السلام آنحضرتؐ کے پاس کبھی بھی بغیر

---

[1] المیزان، جلد ۱۲، ص ۳۱۲

اجازت کے نہیں آتے تھے اور آپؐ کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھتے تھے۔[1]

اس قسم کی حدیث کا روایات میں اجمالی ذکر موجود ہے۔

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ پر وحی نازل ہوئی تو آپؐ اپنے چہرے کے سامنے آہستہ سے زمزمہ کی آواز کو سماعت فرماتے تھے۔[2]

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب سرکارِ رسالتؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ کی پیشانی مبارک سے پسینہ جاری ہو جاتا تھا خواہ وہ دن سخت سرد ہی کیوں نہ ہوتا۔[3]

بہرصورت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی مختلف صورتوں میں نازل ہوتی تھی اور ہر ایک صورت کے اپنے آثار ہوتے تھے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ کبھی تو اپنی اس اصلی صورت میں نازل ہوتے جو خدا نے بنائی ہے اور ایسا تقریباً آنحضرتؐ کی ساری زندگی میں صرف دو بار ہوا ہے (جیسا کہ بعض تفاسیر کی بناء پر سورہ نجم میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔[4] اور کبھی فرشتۂ وحی ''توحید کلبی'' کی صورت میں نمایاں ہوتے۔[5] و[6]

۹۔ غریزی الہامات

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید اور اسی طرح لغت کی کتابوں میں ''وحی'' کا ایک نہایت ہی وسیع معنی ہے، جن میں سے ایک کا ایک مصداق خاص ''غریزی ادراک'' ہے جو حیوانات میں پایا جاتا ہے اور اس کی کوئی مساوی تفسیر نہیں کی جاسکتی، بلکہ ان کا وجود عالمِ ماورائے طبیعت

---

[1] اعتقادات، صدوق ص ۱۰۰

[2] بحارالانوار، جلد ۱۸، ص ۲۵۴، حدیث ۹ و ص ۲۵۶ حدیث ۶

[3] بحارالانوار، جلد ۱۸، ص ۲۶۱

[4] فی ضلال القرآن، جلد ۷، ص ۳۰۶

[5] بحارالانوار، جلد ۱۸، ص ۲۶۷

[6] ''وحیہ بن خلیفہ کلبی'' پیغمبر اکرمؐ کے رضاعی بھائی تھے اور اس دور کے خوبصورت ترین انسان تھے۔ جب جبرائیل امینؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے تو انہی کی صورت میں ظاہر ہوتے (مجمع البحرین، مادہ وحی) ان کا شمار آنحضرتؐ کے مشہور اصحاب میں ہوتا ہے اور خوبصورتی میں مشہور تھے۔ حضور اکرمؐ نے انہیں اپنا سفیر بنا کر روم کے بادشاہ ''ہرقل'' کی طرف بھی بھیجا تھا۔ ۶ھ یا ۷ھ میں معاویہ کی حکومت کے زمانے تک زندہ رہے۔ (لغت نامہ دہخدا)

میں علم وقدرت کے اس عظیم منبع کے وجود پر ایک دلیل ہے۔

قرآن مجید نے شہد کی مکھی کے بارے میں وحی کا لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ سورہ نحل کی آیات ۶۸، ۶۹ میں اس جانور کی حیران کن کیفیت کی طرف ایک پُرمعنی اشارہ ہے۔

دورِ حاضر میں دانشوروں نے شہد کی مکھیوں پر زبردست تحقیق کی ہے جس سے آج تک حاصل ہونے والے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعجب آور اور حیران کن اجتماعی زندگی اور تمدن ہے جو انسانی زندگی اور تمدن پر کئی لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے۔ ایسی خوبصورتی اور چابکدستی سے گھر تیار کرتی ہیں کہ انجینئرنگ کے تمام قواعد کو پوری طرح پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ شہد کی جمع آوری، اسے تیار کرنے، اکٹھا کرنے اور اسے ہر قسم کی آلودگی سے محفوظ رکھنے کے طور طریقے، اولاد کی تربیت کا انداز، دشمن کے مقابلے میں اپنا دفاع، بچوں کی پرورش، پھولوں کے وجود کا پتہ لگانے والی مکھیوں کا چھتے میں رہنے والی دوسری مکھیوں کو مطلع کرنے کا طریقہ کار، اور انہیں اس جگہ کے فاصلے، درجے اور زاویئے کے لحاظ سے صحیح صحیح نشاندہی کرنا تاکہ وہ وہاں تک اجتماعی صورت میں پہنچ سکیں، وغیرہ ایسے امور میں جن میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ ایسے امور ہیں جن کی انجام دہی ''غریزی الہام'' کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔

بعض ماہرین کے بقول اب تک جنگلی زنبور عسل کی ۴۵۰۰ قسمیں دریافت کی جا چکی ہیں، لیکن جو باعثِ تعجب ہے وہ یہ کہ ان سب کی ہجرت، چھتہ بنانے اور پھولوں وغیرہ سے رس حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔[1]

افسوس کہ ہماری بحث کی نوعیت ہی اس قسم کی ہے کہ اصل موضوع سے باہر نہ ہوں، وگرنہ زنبورِ عسل اور ان کی اسرار آمیز زندگی کے بارے میں گفتگو کے لیے بہت کچھ ہے، جن میں سے ان کا صرف ایک نمونہ اس کا چھ ضلعی گھر بنانا ہے جس میں انجنیئرنگ کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر ان کے زاویوں کی صحیح معنوں میں رعایت کی گئی ہے۔

ماہرینِ تعمیرات بڑی کاوشوں، تجربوں اور مطالعات کے بعد اس نچے پر پہنچے ہیں کہ اس کے کمروں میں رہنے والوں کے لیے کافی گنجائش ہوتی ہے لیکن ان پر مواد (میٹریل) بہت کم خرچ آتا ہے، کیونکہ ہندسی اشکال میں سے صرف تین شکلیں ایسی ہیں کہ جن سے گھر کی صورت بنتی ہے جبکہ ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو۔ (مثلث متساوی الاضلاع، چار ضلعی اور چھ ضلعی) لیکن انجنیئرنگ کے نقطہ نظر سے چھ ضلعی کمرے کے بنانے پر تعمیراتی سامان بھی کم خرچ آتا ہے اور اس میں پائیداری اور قوتِ مزاحمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زنبورِ عسل نے دوسری دو قسموں کو چھوڑ کر اسے اپنایا ہے۔۔

اس نے یہ غریزی الہامات کہاں سے حاصل کیے؟ کس یونیورسٹی میں یہ درس پڑھا؟

لیکن یہ غریزی الہامات شہد کی مکھیوں ہی میں منحصر نہیں بہت سے دوسرے حیوانات میں بھی اس قسم کے محیر العقول نمونے دیکھنے میں آتے ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوتا ہے، بطور نمونہ: ایک دانشور اپنی کتاب بنام ''دریا دیارِ عجائب'' میں رقمطراز ہے کہ:

---

[1] کتاب ''اولین دانشگاہ'' جلد ۵، ص ۵۵

''بعض مچھلیوں کا طریقہ کار اسرارِ فطرت میں شمار ہوتا ہے اور کوئی بھی شخص اس کی علت بیان نہیں کرسکتا۔

''قزل آلا' نامی مچھلی سمندر کو ترک کرکے دریاؤں کے ان میٹھے پانیوں کی طرف لوٹ جاتی ہے جہاں اس نے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اپنی پوری طاقت کے ساتھ دریا کی مخالف سمت میں تیرتی ہوئی وہاں پہنچتی ہے۔ اگر درمیان میں پتھر کی کوئی چٹان آ جائے تو وہ اس پر سے کود جاتی ہے، حتٰی کہ آبشاروں کے نیچے سے بھی کود کر اوپر آ جاتی ہے بعض اوقات ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہوجاتی ہے کہ تمام راستہ ان سے اٹ جاتا ہے، اور جب یہ مچھلیاں اس مقام پر پہنچ جاتی ہیں جس کی جستجو میں ہوتی ہیں تو وہیں پر انڈے دیتی ہیں اور پھر مرجاتی ہیں۔

یہ مچھلیاں کیونکر کسی مناسب نہر یا دریا کو حاصل کر لیتی ہیں' یہ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے بھی زیادہ عجیب کام ہے کیونکہ نہ تو ان کے پاس کوئی نقشہ ہوتا ہے اور نہ ہی پانی کے نیچے ان کی نگاہ زیادہ دور تک جاسکتی ہے اور نہ ہی کوئی ہوتا ہے جو ان کی راہنمائی کرے۔

پھر کہتا ہے کہ:

''اس سے زیادہ عجیب'' مارماہی'' کا طریقہ کار ہے برطانوی مارماہی جب آٹھ سال کی عمر کو پہنچتی ہیں تو اس جھیل یا دریا کو ترک کر دیتی ہیں جس میں وہ رہ رہی ہوتی ہیں اور سانپ کی مانند رات کے وقت گیلی گھاس میں جا چھپتی ہیں اور چھپتے چھپاتے سمندر کے کنارے پہنچ جاتی ہیں اور پھر تیر کر اوقیانوس اطلسی کو (چوڑائی میں) طے کرتی ہیں اور ''برمودا کے نزدیکی پانیوں مین جا پہنچتی ہیں۔ وہاں پر پانی کی تہہ میں جا کر انڈے دیتی ہیں اور پھر مرجاتی ہیں۔۔۔ مارماہی کے بچے پانی کی سطح پر آ کر اپنے مادری وطن کی جانب سفر کا آغاز کرتے ہیں (وطن پہنچتے پہنچتے) انہیں دو تین سال لگ جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا کہ مارماہی نے یہ راستہ اس پہلے سے نہیں دیکھا تھا پھر کہ کیونکر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے؟

اور یہ وہ سوال ہے جس کا جواب آپ بھی دوسرے عقلمندوں کی طرح دے سکتے ہیں (یعنی منفی جواب) کیونکہ اس کا سوال جواب کسی کو معلوم نہیں۔[1]

بعض مہاجر پرندے بہت طویل راستے طے کرتے ہیں حتٰی کہ بعض اوقات وہ یورپ سے جنوبی افریقہ تک کی دور دراز راہوں کو طے کرتے ہیں اور اپنے راستے میں کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتے ایک لمبے عرصے تک یہ موضوع زیر بحث رہا ہے کہ یہ پرندے اس قدر دشواری کے باوجود ایسے کٹھن راستوں کو کیونکر طے کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور کافی مدت تک یہ راز کسی کو معلوم نہیں تھا۔

---

[1] ''دریا در یارِ عجائب'' ص ۱۱۶، ص ۱۱۷

چنانچہ بعض دانشوروں نے مفصل اور پیچیدہ تجربات سے ثابت کے ہے کہ ان میسے کچھ پرندے ایسے ہیں جو اپنی رواہوں کو آسمانی ستاروں کے ذریعہ متعیّن کرتے ہیں۔

تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ غریزی طور پر ہی ستاروں کے مجموعوں کو پہنچانتے ہیں او جانتے ہیں کہ وہ آسمان میں کیونکر اپنی جگہ بدلتے ہیں اور سال کے بارہ مہینوں میں ان کی جگہ کہاں کہاں ہوتی ہے۔حتّٰی کہ جب موسم ابر آلود ہو اور کبھی کبھار ایک ستارہ چمکتا ہوا نظر آ جائے تو بھی اس کے ذریعہ وہ اس راہ کا پتہ چلا لیتے ہیں۔

تجربات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ان پرندوں کی آسمان' فلکی صورت حال' ستاروں کی حرکات وغیرہ کی شناخت انہیں وراثت میں ملی ہے یعنی اگر انہوں نے آسمان کو نہ بھی دیکھا ہو تو بھی وہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر ہی سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں۔

دانشوروں کو اب تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ آسمان اور دیگر ماحول کی اس قدر تفصیلی تصویر ان جانوروں کو کیونکر وراثت میں ملتی ہے، جبکہ صدیاں ڈگر رنے کے ساتھ ساتھ آسمان کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔(تو پھر) ابتدائی نسلیں یہ معلومات کہاں سے حاصل کر پائی ہیں؟[1]

اس موضوع کا ایک اور واضح نمونہ وہ عمل ہے جو''آکسیک لوپ'' نامی پرندہ انڈے دیتے وقت انجام دیتا ہے۔ایک فرانسیی دانشور مسٹر''وارڈ''اس پرندہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے اس پرندہ کے بارے میں کافی مطالعہ کیا ہے۔اس کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب اس کے انڈے دینے کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو اور مرجاتا ہے یعنی اس نے کبھی بھی اپنے نومولود چوزوں کی صورت نہیں دیکھی۔اسی طرح نومولود بچوں نے کبھی اپنی مہربان ماں کا چہرہ نہیں دیکھا جب وہ انڈوں سے باہر آتے ہیں تو بے پروبال کیڑوں کی مانند ہوتے ہیں اور اپنی خوراک حاصل کرنے پر قادر نہیں ہوتے حتّٰی کہ ان حوادث کا دفاع بھی نہیں کر سکتے جو ان کی زندگی سے جنگ کرتے ہیں۔لہٰذا انہیں ایسی حالت میں کسی محفوظ مقام پر ایک سال تک رہنا چاہیئے اور اس عرصے کی غذا بھی ان کے پہلو میں موجود ہونی چاہیئے یہی وجہ کہ جب مادہ پرندہ کو اس احساس ہوتا ہے کہ اس کے انڈے دینے کا وقت قریب آ گیا ہے تو وہ بڑی لکڑی کا ایک ٹکڑا تلاش کرتی ہے اور اس میں ایک بہت گہرا سوراخ کرتی ہے پھر وہ اپنی خوراک کی تلاش میں نکل جاتی ہے اور درخت کے نرم پتے اور شگوفے اکٹھے کرتی ہے جو نومولود کے لیے غذا کی صورت میں قابلِ استفادہ ہوتی ہے یہ ایک سال کی مدت تک کے لیے نوزاد کے لیے کافی ہوتی ہے اور اسے وہ سوراخ کے آخر میں جمع کر دیتی ہے پھر اس کے اوپر ایک انڈہ دیتی ہے اور لکڑی کے برادے کے خمیر کی ایک مضبوط سی چھت اس کے بنا دیتی ہے پھر غذا کی تلاش میں نکل

---

[1] کتاب''حواس اسرار آمیز حیوانات''از''ویٹس ڈروچز''ترجمہ لالہ زاری ص ۱۶۷ و ص ۱۷۱

جاتی ہے اور ایک سال کی غذا جمع کرنے کے بعد اس پر ایک اور انڈہ دیتی ہے اور اس کا اسی طرح منہ بند کر دیتی ہے۔ اسی طرح کی کئی منزل تیار کر کے انڈوں کا نصاب مکمل کر لینے کے بعد مر جاتی ہے۔ [1]

اس قسم کی وسیع معلومات پرندوں اور جانوروں کو کس نے بہم پہنچائی ہیں جنہوں نے ماں کی صورت تک کو نہیں دیکھا ہوتا' یا ماؤں نے بچوں کے چیزوں کو نہیں دیکھا ہوتا کسی کے پاس اس کا سوال کا جواب نہیں ہے سوائے اس کے کہ کہا جائے کہ ''خداوندِ بزرگ و برتر کی طرف سے غریزی الہامات ہی نے انہیں سب کچھ سمجھا دیا ہے۔

[1] کتاب ''فیسوف نما'' ص ۲۲۹

چھٹا منبع

کشف شہود

اشارہ

معرفت کا چھٹا اور آخری منبع ''قلبی مشاہدہ اور مکاشفہ'' ہے۔

سب سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس منبع کی تعریف کی جائے جس سے بہت لوگ ناواقف ہیں، تاکہ اس طرح سے ایک تو اس کا دوسرے منابع یعنی وحی والہام' فطرت' اور عقلی ادراکات سے فرق واضح ہو جائے اور دوسرے نادان اور بے سمجھ لوگ اسے وہم وخیال پر محمول نہ کریں۔

اور ساتھ ہی اس کے ذریعہ سے جو لوگ ناجائز مفاد اٹھاتے ہیں وہ رستے بھی بند ہو جائیں کیونکہ اس طرح سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں اس منبع کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اسے مسترد کر دیتے ہیں۔

اصولی طور پر اس کائنات کی تمام چیزیں دو قسموں پر ہیں۔

۱۔ وہ چیزیں جو حسّ کے ساتھ قابل ادراک ہیں اسے ''عالمِ حسّ'' کہتے ہیں۔

۲۔ وہ جیں جو ہماری حسّ سے مخفی اور غائب ہیں اسے ''عالمِ غیب'' کہتے ہیں۔

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک تازہ ادراک اور نظر پیدا کر لیتا ہے جس کے ذریعہ وہ غیب کی دنیا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور اپنی قدرت وتوانائی کے مطابق اس عالم کے کچھ حصے کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے، بالفاظ دیگر درمیان سے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں اور غیب کی دنیا کے بعض حقائق اس پر منکشف ہو جاتے ہیں، بلکہ اسی طرح جس طرح انسان اپنی آنکھوں کے ساتھ عالمِ محسوسات میں دوسری چیزوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی کئی درجے تسلی بخش اور واضح تر صورت میں۔ اور اس حالت کو ''مکاشفہ' یا شہود باطن'' کہتے ہیں اور وہ وہی چیز ہے جسے قرآن مجید نے سورہ تکاثر کی پانچویں اور چھٹی آیت میں یوں پیش کیا ہے:

''کلالو تعلمون علم الیقین الترون الجحیم'' ایسا ہرگز نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو اگر تمہارے پاس علم الیقین ہو تو تم دوزخ کو اپنی انہی آنکھوں سے دیکھ لو۔

مختلف اسلامی روایات میں ''مجرمین'' اور ''مومنین'' جب مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو ان پر شہود کی حالت ''طاری ہو جاتی ہے اور وہ فرشتوں کا یا خدا کے نیک بندوں کی ارواح کا مشاہدہ کرتے ہیں جبکہ ان کے بالکل ہی قریب کے لوگ اس قسم کے ادراک سے قطعاً

عاجز ہوتے ہیں۔

بعینہ اسی طرح جس طرح جنگِ خندق میں حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر طاری ہوئی تھی۔ جب آپؐ نے پتھر پر ہتھوڑا مارا تو اس سے ایک چنگاری اٹھی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ''مَیں نے کسریٰ یا قیصرِ روم یا یمن کے شاہی محلات کو دیکھا ہے (چنانچہ اس کی شرح آگے آئے گی)[1]

وہی کچھ جو اس مشہور و معروف حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مادرِ گرامی جنابِ آمنہؑ کے بارے میں آیا ہے کہ انہوں نے کہا جب سرکار رسالتِ مآبؐ میرے شکم مبارک میں تھے ''مَیں نے دیکھا کہ ایک نور مجھ سے باہر آیا ہے جس کی روشنی میں مَیں نے شام میں سر زمین ''بصریٰ'' کو دیکھ لیا'' اور اس قسم کے دوسرے بہت سے نمونے ہیں۔ انشاء اللہ العزیز بعد میں آیات و احادیث کے ذریعہ ان سب کی طرف اشارہ کیا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ یہ نہ تو وحی ہے اور نہ ہی قلبی الہام، بلکہ ایک قسم کا مشاہدہ اور درک و دید ہے جو حسّی مشاہدہ سے بالکل ہی مختلف ہے۔

یہ وہی چیز ہے جسے مشہور و معروف عارف اور سخن سنج نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

''اگر تمہاری آنکھ غیب کو دیکھ سکتی ہو تو اس دنیا کا ایک ایک ذرہ تمہارا ہمراز ہو سکتا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو جائے گی تو کائنات میں موجود تمام چیزوں کی تسبیح کے غلغلہ کو سن کر ہر قسم کی تاویلوں کے وسوسے تم سے دور ہو جائیں گے نامحرم لوگوں کے کان ایسے حقائق کو نہیں سن سکتے۔ لیکن جو لوگ محرمِ راز بن جاتے ہیں وہی ان آوازوں کے سننے اور رازوں کو پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔[2]

بنابریں ''کشف شہود'' کی ان مختصر الفاظ میں یوں تعریف کی جا سکتی ہے کہ:

کشف و شہود نام ہے حسّ سے ماوراء ایک اور عالم تک رسائی کا اور اندر کی آنکھوں کے ذریعہ اس عالم کے حقائق کے مشاہدہ کے ایسا مشاہدہ جو بالکل حسّی مشاہدہ کی مانند ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر طاقتور یا گوشِ جان سے ان زمزموں کے سننے کا۔

البتہ یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس جو بھی اس چیز کا دعویٰ کرے اسے قبول کر لیا جائے اور نہ ہی ہر مدعی کی باتوں پر کان دھرا جا سکتا ہے۔ لیکن ہماری گفتگو معرفت کے اس منبع کے اصل وجود کے بارے میں ہے اور بعد میں یہ بتایا جائے گا کہ وہاں تک کیسے رسائی حاصل کی جا سکتی ہے اور آخر میں اس منبع کے سچے اور جھوٹے دعویداروں کی شناخت کا طریقہ بتایا جائے گا۔

مندرجہ بالا تصریحات کو پیشِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا ثواب حاصل کرتے ہیں:

---

[1] تاریخ کامل، ابن اثیر جلد ۲، ص ۱۷۹

[2] مشہور اشعار کا خلاصہ

آیات

۱۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝۷۵ (سورہ انعام ۷۵)

۲۔ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۱۰۵ۚ (سورہ توبہ ۱۰۵)

۳۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى۝۱۱ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰي مَا يَرٰى۝۱۲ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى۝۱۳ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى۝۱۴ (سورہ نجم ۱۱ تا ۱۴)

۴۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ۝۵ۭ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ۝۶ۙ (سورہ تکاثر ۵ تا ۶)

۵۔ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰۗىِٕكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا۝۲۲ (سورہ فرقان ۲۲)

۶۔ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَاۗءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكُمْ اِنِّىْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝۴۸ۧ
(سورۃ انفال ۴۸)

۷۔ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ۝۹۴
(سورۃ یوسف ۹۴)

۸۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۡ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۝۱۷ (سورۃ مریم ۱۷)

ترجمہ

۱۔ہم نے یوں ابراہیم کوزمین وآسمان کی ملکوت دکھائیں تاکہ وہ اہلِ یقین بن جائے۔

۲۔کہہ دو کہ عمل کیے جاؤ۔خدا اس کا رسول اور مؤمنین تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔اورتم بہت جلد ہی اس کی طرف پلٹ جاؤ گے جو چھپی ہوئی اور ظاہری چیزوں کو جانتا ہے۔اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے تمہیں باخبر کرے گا۔

۳۔جو کچھ اس (پیغمبرؐ) نے دیکھا، اس کے دل نے ہرگز جھوٹ نہیں بولا۔کیا تم اس کے ساتھ اس چیز میں جھگڑتے ہو جو کچھ اس نے دیکھا ہے اور ایک اور مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہے، سدرۃ المنتہٰی کے قریب؟

۴۔اس طرح نہیں ہے جیسے تم سمجھتے ہو۔اگر تم علم الیقین رکھتے ہوتو دوزخ کو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھو گے۔

۵۔جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو وہ دن مجرمین کی خوشخبری کا نہیں ہوگا (بلکہ ان کی سزا کا دن ہوگا)۔وہ کہیں گے ہمیں امان دو ہمیں معاف کردو۔

۶۔اور (جنگ بدر کے دن کو یاد کرو) جب شیطان نے ان (مشرکین) کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر کے کہا آج لوگوں میں سے کوئی شخص تمہارے اوپر کامیاب نہیں ہوسکتا۔اور میں تمہارے ساتھ ساتھ (تمہارا پشت پناہ) ہوں۔لیکن جب انہوں نے (مسلمانوں اور ان کے حامی فرشتوں کے) دو گروہوں کو دیکھا تو وہ پیچھے پلٹ کر کہنے لگا میں تم سے بیزار ہوں میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے میں خدا سے ڈرتا ہوں، اور خدا تو شدید العقاب ہے

۷۔جب (مصر کی سرزمین سے) قافلہ جُدا ہوا تو ان کے باپ (یعقوبؑ) نے کہا: میں یوسف کی خوشبو کو محسوس کر رہا ہوں، اگر تم مجھے نادانی اور بے عقلی کی نسبت نہ دو تو!!

۸۔اور (مریمؑ نے) ایک پردہ اپنے اور ان کے درمیان ڈال دیا (تاکہ اس کی خلوت کا مقام ہر لحاظ سے آمادہ ہو) اور اس حالت میں ہم نے اس کی طرف اپنی روح کو بھیجا اور وہ (روح) ایک بے نقص وعیب انسانی شکل و صورت میں مریمؑ پر ظاہر ہوئی۔

الفاظ کی تشریح

"**ملکوت**" دراصل ''مُلک'' (بروزن حُکم) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنیٰ ''حاکمیت'' اور ''مالکیت'' ہیں اور اس کے ساتھ ''و'' اور ''ت'' کا اضافہ تاکید اور مبالغہ کے لیے کیا گیا ہے اور "**ملکوۃ**" (بروزن مرُدمک) کے معنیٰ ''حکومت اور عزت'' ہیں۔

علامہ ''طریحی'' مجمع البحرین ''میں کہتے ہیں کہ ''ملکوت'' (بروزن برہُوت) عزت، سلطنت اور مملکت کے معنی میں آیا ہے۔ اور بعض اربابِ لغت نے تو اس کا معنی ''عظیم حکومت'' کیا ہے اور وہ ''مفرداتِ راغب'' کے معنی کے بھی مطابق ہے۔ اور تفسیر المیزان میں اس کے متعلق یوں تحریر ہے:

عرفِ قرآن میں ''ملکوت'' کے معنی چیزوں کی باطنی صورت'' ہیں، جس کا ہمیشہ خداوند متعال سے رابطہ اور تعلق رہتا ہے اور ہمیشہ اس باطنی صورت کا مشاہدہ ''یقینی ایمان کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے' جیسا کہ سورہ یٰس کی ۸۳ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے "فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شی" یعنی پاک ومنزہ ہے وہ ذات جس کے دستِ قدرت میں ہر چیز کی حکومت ہے۔ [1]

''فؤاد'' کے بارے میں جیسا کہ پہلے بھی تفصیل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے، اس کے معنی ''قلب'' اور ''روح'' ہیں جب وہ پختگی کی حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ اور ''وأد'' (بروزن ابر) کے بادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ''بھونا'' ہے۔

"آجِدُ" ''وجود'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا منی ''پانا'' ہے کبھی تو یہ ''پانا'' حواس کی ظاہری صورت سے عمل میں آتا ہے، جیسے کہ آنکھ کے ساتھ دیکھنا کان کے ساتھ سننا خوشبو یا بدبو کا قوتِ شامہ کے ذریعہ سونگھنا اور کبھی اندرونی حواس کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، جیسے بھوک اور پیاس کا احساس، یا سیر ہونے کا احساس یا رنج وغم کا احساس، اور کبھی عقل کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، جیسے خدا کو مختلف دلائل کے ساتھ پالینا۔

"تمثل" "مثول" (بروزن عقول) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی شخص یا چیز کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا، کیونکہ "مُمثل" بروزن مفصل اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں کہ جو کسی دوسرے شخص یا دوسری چیز کے سامنے نمایاں یعنی ظاہر ہو، اسلامی روایات اور تواریخ میں "تمثل" کا بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً ''دارالندوہ'' میں ابلیس کا عرب کے مشرکین کے سامنے ظاہر ہونا، جس دن کہ وہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا چراغ گُل کرنے کے لیے اکٹھے ہو کر سازشیں تیار کرنے میں مصروف تھے، تو وہ (ابلیس) خیر اندیش اور خیر خواہ شخص کی صورت میں ''ممثل'' (ظاہر) ہوا۔ [2]

اسی طرح حضرت امیر علیہ السلام کے سامنے ''دنیا'' کا ایک دلربا اور دلفریب عورت کی صورت میں ظاہر ہونا اور آنجنابؑ پر اس کا کوئی جادو نہ چلنا کہ یہ داستان بہت مشہور ہے۔

یا قبر اور قیامت میں انسان کے اعمال کا مناسب صورت میں مجسم ہو کر سامنے آجانا، جسے اسلامی روایات میں ''تمثل'' کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔

اور ان سب کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص یا کوئی صورت ایک اور شکل اختیار کر لے گی لیکن اس کے باطن اور ماہیت میں کسی قسم کی تبدیلی

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۸ ص ۳۶۴

[2] تفسیر المیزان، جلد ۱۴ ص ۳۷

رونما نہیں ہوگی۔[1]

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

غیب کا مشاہدہ

زیرِ بحث آیات کے سلسلے کی پہلی آیت میں توحید کے علمبردار نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شرک اور بت پرستی کے ساتھ نبرد آزمائی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ابراہیمؑ ہی کے ایمان ویقین کی بلند منزلوں اور اس کے دلائل کا ذکر ہے۔ اور شاید یہ اُن حضرتؑ کے لیے خداوندِ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا انعام ہو جو انہوں نے بت پرستی کے ساتھ نبرد آزمائی کی ہے اور وہ یہ کہ خدا نے انہیں آسمان اور زمین کی ملکوت دکھائیں اور وہ اہلِ یقین ہو گئے یعنی عین الیقین اور حق الیقین کے مقام ومرتبے تک پہنچ گئے۔

"السمٰوات" جمع کا صیغہ ہے اور اس پر الف لام بھی داخل ہے جو عموم کے معنی میں ہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی ملکوت یعنی حاکمیت سے آگاہ کیا، خواہ وہ آسمانوں میں تھی یا کواکب اور ثوابت وسیار اور کہکشانوں وغیرہ میں۔ اسی طرح تمام روئے زمین کی حاکمیت سے بھی آگاہ کیا خواہ وہ ظاہری تھی یا باطنی۔ اور قرآن مجید نے اس آگاہ سازی کو "اراۂ" (دکھلانے) سے تعبیر کیا ہے۔ اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ انسان ظاہری آنکھ اور عقلی دلائل سے ان تمام حقائق کا مشاہدہ نہیں کر سکتا اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے اندرونی شہود کے ذریعہ اور ان پردوں کو ہٹا کر ہی یہ حقائق ابراہیمؑ کو دکھلائے جو عام طور پر ہماری آنکھوں پر پڑے رہتے ہیں اور ہم سے بہت سے حقائق کو چھپائے ہوئے ہیں۔

"فخر الدین رازی" نے اپنی تفسیر میں اس "ارائہ" (دکھلانے) کے بارے میں دو احتمال ذکر کیے ہیں ایک تو یہ کہ اس سے مراد "حسی ارائہ" ہے اور دوسرا یہ کہ عقلی دلائل کے ذریعہ اراۂ ہے۔ پھر اس بارے میں نو مختلف دلائل بیان کرنے کے بعد دوسرے احتمال کی آیت کی تفسیر میں وضاحت کرتے ہیں۔[2]

لیکن جس طرح کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کوئی انسان نہ تو حس کے ذریعہ اور نہ ہی عقل کے ذریعہ تمام کائنات پر خدا کی حاکمیت کے تمام اسرار سے مطلع ہو سکتا ہے، بلکہ اس بات کے لیے ایک اور ادراک اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم تفسیر "فی ظلال القرآن" میں پڑھتے ہیں کہ:

"اس سے مراد حضرت ابراہیمؑ کو آفرینش کے مخفی امور سے آگاہ کرنا ہے اور ان آیات سے پردہ اٹھانا ہے جو کتابِ ہستی (کائنات)

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۴ ص ۳۷

[2] تفسیر کبیر، جلد ۱۳ ص ۴۳

کے اوراق پر مشتمل ہیں، تا کہ وہ یقینِ کامل کے درجہ تک پہنچ جائیں [1]۔

بالفاظ دیگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے فطری اور استدلالی توحید کے مراحل کو سورج چاند اور ستاروں کے طلوع اور غروب سے طے کیا، اور بُت پرستوں کے ساتھ نبرد آزمائی میں لگ گئے اور اس عظیم جہاد کے پَرتو میں توحید کے مراحل یکے بعد دیگر لے طے کرتے رہے۔ آخر کار اس مرحلہ تک جا پہنچے کہ خداوند نے ان کے دل میں تمام پردے ہٹا دیئے اور وہ عالم کے باطن کے شہود تک جا پہنچے۔

اسی لیے ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اسی آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ایک حدیث پڑھتے ہیں:

"کشط لابراهیم علیہ السلام السموات السبع حتی نظر مافوق العرش و کشط له الا رضون السبع و فعل بمحمد مثل ذالك ..... والائمة من بعده قد فعل بهم مثل ذالك"

"خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے سے ساتوں آسمانوں کے پردے ہٹا دیئے، حتّٰی کہ ان کی نگاہیں عرش کے اوپر تک پہنچ گئیں۔ اسی طرح ساتوں زمینوں کے پردے بھی ہٹا دیئے، اور یہی کام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا..... اور آپؐ کے بعد آنے والے آئمہ علیہم السلام کے ساتھ بھی۔ [2]

تفسیر "برہان" میں اس بارے میں بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں جو ساری کی ساری اس بات کی شاہد ہیں کہ اس قسم کا درک اور بصیرت، حسّی اور عقلی درک و بصیرت سے بالکل مختلف ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، تفسیر المیزان میں ہے کہ "ملکوت" اشارہ ہے اشیاء کے وجود کی طرف کیونکہ ان کی نسبت ان کی طرف ہوتی ہے اور وہ اس کی ذاتِ پاک سے وابستہ ہوتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کا ابراہیمؑ نے مشاہدہ فرمایا تھا اور جس کے ذریعہ وہ خالص توحید سے آشنا ہوئے تھے۔ [3]

تفسیر "درمنثور" میں بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت ابنِ عباس کے ذریعہ نقل ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم نے پردے ہٹا دیئے تھے اور ملکوتِ آسمانی یعنی پوری کائنات پر اپنی قدرت اور حاکمیت کے اسرار ابراہیم علیہ السلام کو دکھا دیئے تھے۔ [4]

دوسری آیت میں زکوٰۃ، صدقات اور توبہ کے حکم کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے

---

[1] فی ظلال القرآن، جلد ۳ ص ۲۹۱

[2] تفسیر برہان، جلد ۱، ص ۵۳۱ حدیث ۲ (حدیث ۳ و ۴ بھی اسی چیز کو بیان کر رہی ہیں)۔

[3] المیزان، جلد ۷، ص ۱۷۸

[4] المیزان، جلد ۳، ص ۲۴

''مومنین سے کہہ دیجئے کہ عمل بجالاتے رہو کیونکہ خدا، رسول اور مومنین تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کی طرف سے اعمال کا مشاہدہ تمام انسانوں کے تمام اعمال کا مشاہدہ ہے، خواہ وہ نیک ہیں یا بد کسی کے سامنے انجام دیئے جائیں یا چھپ کر۔ اسی دلیل کے تحت (سیاق کے اتحاد کے پیشِ نظر) پیغمبرِ اکرمؐ کا مشاہدہ بھی اسی قسم کا ہونا چاہیئے، کیونکہ آیت مطلق ہے اور اس میں کسی قسم کی قید اور شرط نہیں ہے۔ لیکن ''مومنین'' سے کون لوگ مراد ہیں؟ اگر مختلف قرائن کو دیکھا جائے تو اس سے مراد پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم جانشین ہیں (نہ کہ تمام مؤمنین)۔

اور چونکہ حسّی مشاہدہ یا عقلی دلائل کے ساتھ تمام انسانوں کے تمام اعمال سے آگاہی حاصل نہیں ہوسکتی لہٰذا یہ آیت بھی اس حقیقت کو بیان کررہی ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہارؑ ایک اور ادراک وبصیرت کے حامل ہیں جو مومنین کے نیک وبد اعمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اور فخر رازی نے اپنی تفسیر میں جو یہ کہا ہے کہ ''اس سے مراد تمام مومنین ہیں'' تو پھر وہ اس مشکل میں پھنس گئے ہیں کہ تمام مومنین ایک دوسرے کے اچھے اور برے اعمال سے باخبر نہیں ہوتے۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ''ان اعمال کی خبر ان تک پہنچ جاتی ہے'' حالانکہ یہ ایک لاحاصل تکلف ہے اور مکمل طور پر ظاہر کے خلاف ہے

علاوہ ازیں اسی آیت کی تفسیر میں آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب اس بات کی شاہد ہیں کہ ''ہر صبح کو (صبح کے ذکر کے بغیر) بندوں کے اعمال پیغمبرِ خداؐ اور آئمہ اطہارؑ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور وہ ان کے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ اگر یہ اعمال معصیت اور گناہ پر مبنی ہوں تو وہ غمگین ہوجاتے ہیں (اور اگر اطاعت پر مبنی ہوں تو خوش ہوتے ہیں)[1]۔

یہ آیت، اس قدر روایات کے ساتھ تمام راہیانِ راہِ حق کے لیے ایک عظیم درس ہے کہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے اعمال ہمیشہ عظیم ہستیوں کے زیرِ نگرانی انجام پارہے ہیں، اور اس حقیقت پر ایمان زبردست تربیتی اثر کا حامل ہوسکتا ہے۔ لہٰذا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے معصوم امام کے بارے میں اس سلسلے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ امام فرماتے ہیں:

"اذا صار الامر الیه جعل الله له عمودا من نور یبصر به مایعمل به اهل کل بلدة"

جب امام کے پاس امامت پہنچتی ہے تو خداوند عالم اس کے لیے نور کا ایک ستون قرار دیتا ہے جس کے ذریعہ سے

---

[1] تفسیر برہان، اسی آیت کے ذیل میں۔ بحارالانوار جلد ۲۳، ص ۳۲۶ اور اس کے بعد بیسیوں روایات اس بارے میں نقل کی گئی ہیں اور انہیں مجموعی طور پر تواتر کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور اصول کافی، جلد ۲، ص ۱۵۷ اور جلد اول ''باب عرض الاعمال'' میں تفصیل کے ساتھ یہ ذکر موجود ہے۔

وہ ہر شہر کے لوگوں کے اعمال دیکھ سکتا ہے۔ [1]

اسی سلسلے کی تیسری آیت بہت سے مفسرین کے بقول پیغمبرِ اکرمؐ کے حضرت جبرائیلؑ کو دیکھنے کی طرف اشارہ ہے۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تمام عمر میں دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں مشاہدہ کیا۔ایک مرتبہ تو بعثت آغاز میں ''جبرائیل'' بالائی افق میں ظاہر ہوئے اور تمام مشرق اور مغرب کو اپنے احاطہ میں لے لیا اور اس قدر باعظمت تھے کہ آنحضرتؐ بھی متعجب ہو گئے۔اور دوسری مرتبہ معراج کے موقعہ پر۔اور سورہ نجم کی آیات بھی اس سے پہلے اور دوسرے مشاہدات کی طرف اشارہ ہیں۔

ان دونوں مشاہدات کے بارے میں ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ شہود ہے جو آپؐ کو ذاتِ کردگار کی طرف سے نصیب ہوا۔ذاتِ باری تعالیٰ کا یہ مشاہدہ ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ باطنی آنکھوں سے تھا، اور اس دنیا میں ''لقاءاللہ'' کا روشن مصداق تھا۔اس کی تفصیل تفسیرِ نمونہ میں سورہ نجم کی آیات کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔ [2]

بہرحال زیرِ بحث آیات کہہ رہی ہیں کہ پیغمبرؐ نے دل کی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا وہ حق اور سچ تھا۔ان کے دل نے جو کچھ دیکھتا تھا سب صحیح تھا اور رہرگز جھوٹ نہ تھا۔

یہ تعبیر صورت کشف اور شہود باطنی کے مسئلہ پر ایک شاہد ہے جو انسان کی معرفت کے منابع میں سے ایک منبع ہے۔انسان بھی عام نہیں رسولِ اکرمؐ جیسے انسان۔

تفسیر المیزان میں ہم پڑھتے ہیں کہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ خداوندِ عالم نے یہاں پر مشاہدہ کو قلب کی طرف نسبت دی ہے، کیونکہ انسان ایک اور قسم کے شہودی ادراک کا حامل ہے جو ظاہری حواس کے ساتھ ادراک اور باطنی قوتوں کے ساتھ تخیل اور تفکر سے ماوراء ہے، جیسا کہ ہم اسی شہد کے ساتھ اپنے وجود کا ادراک کرتے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ ہم موجود ہیں، ہماری اپنے وجود سے یہ آگاہی نہ تو ظاہری آنکھوں کے ساتھ ہے اور نہ ہی غور وفکر کے ذریعہ سے بلکہ نفس کے سامنے ایک قسم کا ظہور اور حضور ہے، قرآن میں جسے ''فؤاد'' کہا گیا ہے۔ [3]

بعض اور مفسرین نے بھی صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس آیت میں ''رؤیت'' سے مراد وہی دل کی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام علی بن موسیٰؑ (رضا) علیہ السلام سے آپ کے ایک صحابی نے پوچھا:

"هل رای رسول الله (ص) ربه عزوجل؟" آیا پیغمبرِ کریمؐ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ تو آپؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

---

[1] ''منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ'' جلد ۵ ص ۲۰۰ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس بارے میں احادیث بہت ہیں جو اسی کتاب میں جمع کی گئی ہیں) اور تفسیر برہان میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

[2] تفسیر نمونہ، جلد ۲۲۔

[3] تفسیر المیزان، جلد ۱۹، ص ۲۹

"نعم بقلبه رآه، اما سمعت الله عزوجل يقول: ما كذب الفواد ماراى، لم يره بالبصر ولكن رأه بالفواد" جی ہاں! انہوں نے خدا کو دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آیا تم نے خدا کا یہ قول نہیں سنا کہ قلب نے جو کچھ دیکھا جھوٹ نہیں بولتا۔ یقیناً پیغمبر اکرمؐ نے خدا کو ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ چشمِ دل کے ساتھ مشاہدہ فرمایا۔ [1]

یقیناً "مشاہدۂ قلبی" سے مراد فکر و استدلال نہیں کیونکہ یہ چیز تو دنیا کے تمام خدا پرستوں اور صاحبانِ ایمان کو حاصل ہے، صرف پیغمبرِ اکرمؐ ہی سے مخصوص نہیں۔

چوتھی آیت میں مومنین یا تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ بات وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ اگر تمہیں علم الیقین حاصل ہوتا تو تم جہنم کو دیکھ لیتے" پھر فرماتا ہے "ثم لترونها عين اليقين" پھر تم اس کے بعد جہنم کو عین الیقین کے ساتھ دیکھ لو گے۔

آیا یہ مشاہدہ دنیا میں ہوگا یا آخرت میں؟ یا پہلا مشاہدہ دنیا میں اور دوسرا آخرت میں؟ تو اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ جو کچھ ظاہری طور پر آیات سے سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دوسری آیت (ثم لترونها عين اليقين) آخرت میں دوزخ کے مشاہدے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس کے بعد فرماتا ہے "ثم لتسئلن يومئذ عن النعيم" یعنی پھر اس دن تم سے الٰہی نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

بنابریں قاعدہ کی رو سے پہلی آیت یعنی (لترون الجحيم) دنیا کی طرف اشارہ ہونا چاہیئے۔

تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے کہ اس آیت کا ظاہر روزِ قیامت سے قبل دوزخ کا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بھی دل کی آنکھوں کے ساتھ جو ایمان اور یقین کے آثار میں سے ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی داستان میں آسمان و زمین کے ملکوت کے مشاہدہ کی بابت مذکور ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں بعض مفسرین ہر دو طرح کی رؤیت کو قیامت سے مربوط سمجھتے ہیں، لیکن ان دونوں کے فرق و بیان کرنے میں سخت مشکل میں پھنس گئے، جیسا کہ فخر رازی کی تفسیر کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ [2]

بہرحال زیرِ بحث آیت کا ظاہر بتا رہا ہے کہ ممکن ہے کوئی شخص یقین کے اس مرحلہ پر پہنچ جائے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے قردے ہٹا دیئے جائیں اور وہ عالمِ غیب کے بعض حقائق کو دیکھ لے۔

پانچویں آیت کافروں کے بار بار کے تقاضوں کی طرف اشارہ ہے جب وہ کہتے تھے "ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے یا ہم خدا کو کیوں نہیں دیکھتے" (فرقان ۲۱)

قرآن اس سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ جب وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو پانی سر سے گزر چکا ہوگا اور وہ اس وقت خدا کے عذاب میں مبتلا ہو چکے ہوں گے اور اس دن مجرمین کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ۱۵۳ حدیث ۳۴۔

[2] تفسیر کبیر، فخر رازی، جلد ۳۲، ص ۸۰

''اس دن'' سے مراد کونسا دن ہے، اس بارے میں مفسرین کے دونظریئے ہیں۔ کچھ تو اسے روزِ قیامت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ انسان فرشتوں کو دیکھیں گے، لیکن بعض دوسرے حضرات ان آیات کو پیشِ نظر رکھ کر جو ''قبضِ ارواح'' کے فرشتوں کے بارے میں ہیں، کہ اس سے مراد جان کنی کے موقع پر فرشتوں کا مشاہدہ ہے، جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۹۳ میں ہے:

"ولوتری اذا الظالمون فی غمرات الموت والملائکة باسطوا ایدیهم اخرجوا انفسکم"

اگر تو ظالموں کو اس وقت دیکھے جب وہ موت کی لہروں میں پھنسے ہوئے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو کھولے ہوئے ہوتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں کہ اپنی جانوں کو باہر نکالو۔

یا پھر اس سے مراد مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے فرشتوں کا مشاہدہ ہے۔ اور یہ نظریہ مشہور مفسر ابنِ عباس سے نقل ہوا ہے۔[1]

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

''جب جان کفار کے گلے تک پہنچ جائے گی تو فرشتے ان کے چہرے اور پشت پر ماریں گے اور کہیں گے اپنی جانوں کو باہر نکالو.....

اور یہی ہے معنی اس آیت کا کہ جس میں کہا گیا ہے "یوم یرون الملائکة لابشری یومئذ للمجرمین"[2]

اس تفسیر کے مطابق، موت کے قریب ہی انسان کی آنکھوں سے پردے اٹھا دیئے جائیں گے اور وہ خدا کے فرشتوں کو دیکھیں گے اور ان پر کشف و شہود کی حالت طاری ہو جائے گی۔

چھٹی آیت ''جنگِ بدر'' سے متعلق ہے جس دن کہ شیطان نے مشرکین کے اعمال کو مزین کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کیا تا کہ وہ کاموں سے امیدوار، دلگرم اور مطمئن رہیں۔

ادھر دوسری طرف سے مشرکین کی فوجِ قریش اپنی بھاری تعداد اور پوری قوت کے ساتھ (مسلمانوں کے مقابلے میں کئی گناہ زیادہ) مسلمانوں کی صفوں کے سامنے کھڑے تھے اور شیطان مسلسل ان کے دلوں میں یہ بات ڈال رہا تھا کہ اس قدر وسیع، آمادہ اور اسلحہ سے لیس لشکر کے ہوتے ہوئے تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور میں بھی تمہارے دوش بدوش تمہاری حمایت کر رہا ہوں۔

لیکن جب جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور فرشتے حکمِ خدا سے لشکرِ توحید کی حمایت میں کمر بستہ ہو کر کھڑے ہو گئے تو شیطان پیچھے ہٹ گیا اور آواز دے کر کہا: ''اے مشرکین! مَیں تم سے بیزار ہوں'' میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ مَیں مسلمانوں کی فتح کے آثار اور خدائی رحمت اور غیبی امدادوں کی علامتیں دیکھ رہا ہوں میں خدا کی دردناک سزا سے ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ خدا کی سزا بہت ہی سخت ہے۔

اس آیت کے دو حصوں کے بارے میں مفسرین کے درمیان تفصیلی گفتگو ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۲۴، ص ۷۰

[2] تفسیر برہان، جلد ۳، ص ۱۵۸، حدیث ۱

ا۔آیا واقعاً ''شیطان'' انسانی صورت میں مجسم ہوکر مشرکین کے سامنے آ گیا تھا اوران کے دلوں میں اس قسم کی باتیں ڈالی تھیں یانہیں بلکہ معمول کے مطابق باطنی طور پران میں نفوذ کر کے ان کے دلوں میں اثر ڈال رہا تھا؟ بہت سے مفسرین نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے اور معروف روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں کہ وہ ''سراقہ بن مالک'' جو قبیلہ ''بنی کنانہ'' کا مشہور ومعروف شخص تھا، کی صورت میں ان کے سامنے ظاہر ہوا۔

جس طرح کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کی داستان میں ہے کہ جب مشرکینِ مکہ نے ''دارالندوۃ'' میں اکٹھے ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی تجویزوں پرغور وخوض کرنا شروع کیا تو شیطان نے بھی ''نجدیوں'' کی صورت اختیار کر کے ان کی میٹنگ میں شرکت کی تھی۔اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے کہ شیطان مجسم ہوکر سامنے آجائے، جس طرح کہ فرشتوں کے بارے میں یہ بات ممکن ہے۔(جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ اور جناب مریمؑ کی داستان میں بیان ہوا ہے)۔

ب۔آیا واقعاً شیطان نے فرشتوں کو دیکھ لیا تھا کہ وہ میدان میں اتر چکے ہیں یانہیں۔بلکہ جب اس نے میدانِ جنگ میں غیر متوقع کامیابی کے آثار دیکھے تو اس نے فرشتوں کے نزول اور غیبی امداد کا یقین کرلیا؟ تو اس مقام پر بھی دونظریئے ہیں۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد وہی فرشتوں کا دیکھنا ہے اور بعد کی آیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جو میدانِ بدر میں فرشتوں کے نزول کو صریحاً بیان کررہی ہیں، آیت کا ظاہر بھی یہی ہے۔

اس طرح سے ''مومنین'' اور ''مشرکین'' میں سے کوئی بھی میدانِ جنگ بدر میں فرشتوں کی موجودگی کو نہیں دیکھ رہا تھا جبکہ شیطان کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹائے جاچکے تھے اور وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

یہ شیطان کے لیے ایک قسم کا کشف وشہود تھا جو ایک خاص مقصد کے تحت خدا کے حکم سے معرضِ وجود میں آیا۔

ساتویں آیت حضرت یوسفؑ کی داستان کی طرف اشارہ کررہی ہے۔یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت یعقوبؑ کے فرزند ایک کاروان کے ہمراہ خوشی خوشی مصر سے کنعان کی طرف چل پڑے تھے اور اپنے بھائی جنابِ یوسفؑ کو تختِ قدرت پر دیکھ چکے تھے اور ان کا کُرتا باپ کی ''روشنی چشم کے لیے'' تحفہ لیے جارہے تھے۔جونہی قافلے نے مصر سے حرکت کی یعقوب علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا ''میں یوسفؑ کی خوشبو سونگھ رہا ہوں، اگر تم مجھے نادانی کی نسبت نہ دو'' یقیناً یعقوب علیہ السلام سچ فرمارہے تھے اور دور دراز کے فاصلے سے یوسفؑ کے کُرتے کی خوشبو سونگھ رہے تھے۔یہ ایک ایسا کام تھا جو عام قسم کی قوتِ شامہ کے بس کی بات نہیں تھی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھیوں میں سے کسی نے اس چیز کو باور نہیں کیا تھا کیونکہ انہوں نے اس طرح محسوس نہیں کیا تھا۔اسی لیے انہوں نے اللہ کے بزرگ نبی کو گمراہی کی نسبت دیتے ہوئے کہا: ''تاللہ انك لفی ضلالك القدیم'' یعنی خدا کی قسم تم تو اپنی سابقہ غلط فہمیوں اور گمراہی پر ہی ہو۔

لیکن جب برادرانِ یوسف آ گئے تو معلوم ہوا کہ حق پیرِ کنعانؑ کے ساتھ ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ ''مصر'' اور ''کنعان'' کے درمیان دس دن کا فاصلہ ہے اور بعض میں آٹھ دن کا اور بعض میں دس

فرسخ کا۔[1]

کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس آیت کو مجاز پر حمل کریں اور کہیں کہ یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو سونگھنا اس بات سے کنایہ تھا کہ ان کی عنقریب ملاقات ہونے والی ہے اور یہ چیز باپ کے دل پر الہام ہوئی تھی (جیسے بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اسلام کی کامیابی کی خوشبو سونگھنے میں آ رہی ہے) کیونکہ ادبیات کے مسلّم قواعد کی رو سے جب تک الفاظ کا حقیقت پر عمل کرنا ممکن ہے، مجاز پر حمل کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اور آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ''مکاشفہ'' ہوا تھا، پردے ہٹ چکے تھے اور وہ اس ظاہری احساس سے مافوق ایک اور احساس کی وجہ سے اپنے فرزندِ یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو سونگھ رہے تھے۔

زیرِ بحث آیات کے سلسلے میں آٹھویں اور آخری آیت حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے خدا کے فرشتے کا مجسم اور ممثل ہو کر آنے کو قرآنِ مجید صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے:

> ''مریم اپنے کنبے سے جُدا ہو کر مشرقی طرف (بیت المقدس) چلی گئیں۔ اپنے اور لوگوں کے درمیان پردہ ڈال دیا (یہ پردہ یا تو اس لیے تھا تاکہ اطمینانِ خاطر کے ساتھ مکمل طور پر اپنے رب کی عبادت کر سکیں اور اس کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول رہیں۔ یا پھر نہانے دھونے کے لیے تھا) جو کچھ بھی تھا، ایسی حالت میں خدا کی روح یعنی وہ عظیم فرشتہ ان کی طرف آیا اس وقت وہ بالکل صحیح سالم اور ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک، انسانی صورت میں ان کے سامنے آ موجود ہوا۔ مریمؑ نے پہلے تو اس سے وحشت کی، لیکن پھر فوراً سمجھ لیا کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے اور حضرت مسیحؑ کی ولادت کی خوشخبری دینے کے لیے آیا ہوا ہے، اور وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنے لگیں۔

یہ داستان سورہ مریم کی آیات میں تفصیل سے مذکور ہے۔[2]

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خدا کا فرشتہ حضرت مریمؑ کی حسّ بینائی کے سامنے یوں مجسم ہوا (نہ کہ ظاہری حالت میں) لیکن یہ نظریہ آیت کے ظاہر کا مخالف ہے اور اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہود صرف اور صرف حضرت مریم علیہا السلام کے لیے واقع ہوا تھا، اگر کوئی اور وہاں پر موجود ہوتا تو شاید وہ اسے نہ دیکھ سکتا۔ بنا بریں ممکن ہے کہ یہ آیت غیرِ انبیاء کے لیے امکانِ شہود کے مسئلہ پر ایک اور قرینہ ہو۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۲۶۲ تفسیر فخر رازی، جلد ۱۸، ص ۲۰۷

[2] تفسیر نمونہ، جلد ۱۳ سورہ مریم کی تفسیر۔

نتیجہ

اس وقت تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شناخت اور معرفت کے جو منابع اب تک شمار کیے گئے ہیں ان کے علاوہ ایک اور ضبع بھی ہے جو کئی لحاظ سے ہمارے لیے نامعلوم اور مبہم ہے، لیکن قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ اس قسم کا منبع موجود ہے جو صرف انبیاء اور آئمہ ہی کو نہیں بعض اوقات کئی دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوتا ہے، کیونکہ بالفرض اگر ہم مندرجہ بالا بعض آیات کی دلالت کے بارے میں شک بھی کریں تاہم مجموعی طور پر مدعا کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ہر اس شخص کی باتوں کو مان لیں جو بھی اس کا دعویٰ کرے۔ اس سے تو ناجائز مفاد اٹھانے کی راہیں کھل جائیں گی۔ اسی لیے اس موضوع کے لیے کئی علامات ہیں جو انشاءاللہ بعد میں بیان ہوں گی۔

چند توضیحات

ا۔ روایت میں کشف و شہود کے چند دلچسپ نمونے

معرفت کے اس منبع پر دلالت کرنے والی روایات کم نہیں ہیں۔ اور ''علم حدیث'' کی اصطلاح میں حدِ ''استفاضہ'' تک پہنچی ہوئی ہیں۔ مندرجہ ذیل روایات اس قسم کے چند نمونے ہیں۔

ا۔ جنگ ''احزاب'' (خندق) کی تاریخ میں ہے کہ ایک دن مدینہ کے اطراف میں خندق کی کھدائی کے دوران (جو کہ مشرکین کے لشکر کے حملوں سے بچاؤ کا ذریعہ تھا) سخت اور بڑے پتھر کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا۔ یہ ایک ایسا پتھر تھا جس کو نہ تو مجاہدینِ اسلام ہلا سکتے تھے اور نہ ہی توڑ سکتے تھے، کیونکہ اس پر کوئی بھی ہتھوڑا کارگر نہیں ہوتا تھا مسلمانوں نے رسالت مآبؐ کی خدمت میں یہ خبر پہنچائی تو آنحضرتؐ بذاتِ خود خندق میں تشریف لے گئے اور ہتھوڑا پتھر کے سر پر مارا جس سے کچھ حصے ٹوٹ کر الگ جا گرا، اور ایک بجلی کی سی چمک پیدا ہوئی۔ یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح کی تکبیر بلند کی۔ یہ سن کر مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔

آپؐ نے پھر زور سے ہتھوڑا مارا، اسی طرح کچھ پتھر اور ٹوٹ کر اس سے الگ ہو گئے اور بجلی کی سی چمک پیدا ہوئی آنحضرتؐ نے بھی تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی۔

آپؐ نے پھر تیسری بار وار کیا تو تمام پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اسی طرح آپؐ نے بھی تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی۔

حضرت سلمان کہتے کہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان تکبیروں کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

بجلی کی پہلی چمک میں میں نے سرزمین ''حیرہ'' اور ''ایرانی بادشاہوں کے محلات دیکھا'' اور جبرائیل نے مجھے خوشخبری دی ہے کہ میری امت انہیں فتح کرے گی، دوسری چمک میں ''روم اور شام کے سرخ محلات'' کو دیکھا

اور جبرائیل نے مجھے خبر دی کہ میری امت انہیں بھی فتح کرے گی، اور تیسری چمک میں مجھے صنعا، اور یمن کے محلات نظر آئے اور جبرائیل نے انہیں بھی فتح کرنے کی خوشخبری سنائی ہے۔ مسلمانو! تمہیں بھی خوشخبری ہو!![1]

البتہ اس دور کے منافقین ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس چیز کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور کہنے لگے: ''یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ مدینے میں بیٹھ کر ایران، روم اور یمن کے بادشاہوں کے محلات کی خوشخبری دے رہے ہیں، حالانکہ اس وقت خود مُٹھی بھر عربوں کے گھیرے میں ہیں۔ کیا بے بنیاد اور بے تکی باتیں ہیں؟

لیکن بعد کے حالات نے ثابت کر دکھایا کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خاص شہود میں اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا وہ بالکل حقیقت تھی۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس موقع پر ''مشاہدہ'' اور ''رؤیت'' کو اس کے مجازی معنوں پر محمول کریں لیکن ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ ہم اسے مجازی پر حمل کریں جبکہ حقیقی معنی پر حمل کرنا ممکن ہے۔

۲۔ جنگ موتہ'' (جو جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں مشرقی روم اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہوئی) اس جنگ کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

(جب مسلمان جعفر بن ابی طالب کی کمان میں رومی فوجوں سے لڑنے کے لیے ''مُوتہ'' جا چکے تھے تو) ایک دن پیغمبرِ اکرم مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اچانک زمین کی تمام بلندیاں اور پستیاں آپؐ کے سامنے ہموار ہو گئیں اور آپؐ نے (میدانِ موتہ) میں جعفر کو دیکھا کہ وہ کفار کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: جعفر شہید ہو گئے۔[2]

بعض روایات میں اس بارے میں قدرے زیادہ تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کی نماز کے بعد منبر پر تشریف لے گئے اور لوگوں کے سامنے جنگِ موتہ کے تفصیل حالات بیان کرنے لگے اور حضرات جعفر صادق بن ابی طالب، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ کی شہادت کے تفصیلی حالات بیان فرمائے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپؐ میدانِ جنگ کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ مشہور تاریخوں کے مطابق آپؐ نے اسی دوران یہ بھی فرمایا:

''یہ تینوں شہد سونے کے تخت پر بہشت کی جانب لے جائے جا چکے ہیں اور مَیں نے اس بارے میں پوچھا تو جواب ملا، جعفر اور زید نے پورے عزمِ راسخ کے ساتھ قدم بڑھائے لیکن عبداللہ نے اپنے اندر تھوڑے سے

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد ۲، ص ۱۷۹ اور سیرت ابن ہشام میں بھی یہی ماجرا تھوڑے سے فرق کے ساتھ موجود ہے۔

[2] بحار الانوار، جلد ۲۱، ص ۵۸، حدیث ۹

شک سے کام لیا پھر آگے بڑھا۔[1]

(''میں نے دیکھا'' کی تعبیر روایت کے اس حصے میں بڑی معنی خیز ہے جو شہود کا ایک نمونہ ہے)۔

۳۔''وان من اهل الكتاب لمن يومن بالله وما انزل اليكم وما انزل اليهم'' کی تفسیر میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول ''حبشہ'' کا بادشاہ ''نجاشی'' ہے۔ چنانچہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی موت کی خبر آنحضرتؐ کو جبرائیل امینؑ نے پہنچائی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''باہر آجاؤ اور اپنے اس بھائی پر نماز پڑھو جو دوسری سرزمین میں فوت ہوا ہے'' صحابہ کرام نے عرض کی ''حضور وہ کون ہے؟'' تو آپؐ نے فرمایا ''نجاشی'' ہے!

پھر سب لوگ قبرستان بقیع میں آئے اور مدینہ سے سرزمین حبشہ آنحضرتؐ کی مبارک آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوئی، آپؐ نے نجاشی کے تابوت کو دیکھا اور اس پر نماز (جنازہ) پڑھی۔[2]

۴۔حضور پاکؐ کی والدہ گرامی جناب آمنہ علیہا السلام کی تاریخ زندگی میں لکھا ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے شکم مبارک میں تھے تو ایک فرشتے نے جناب آمنہؑ سے کہا ''آپ کے شکم بارک میں اس امت کا سردار اور آقا ہے۔ جب وہ پیدا ہو تو آپ کہیں کہ میں اسے ہر حاسد کے شر سے خدا کی پناہ میں دیتی ہوں۔ پھر آپ اس کا نام ''محمد'' رکھیں''

چنانچہ اس معظم خاتون نے حمل کے دوران ہی مشاہدہ فرمایا کہ آپ کے جسم مبارک سے ایک نور ظاہر ہوا جس سے انہوں نے سرزمین شام میں ''بصریٰ'' کے محلات کا مشاہدہ کیا۔[3]

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء اور آئمہ کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی کشف وشہود طاری ہوسکتا ہے۔

۵۔حضرت علی علیہ السلام سے ایک مشہور روایت ہے، آپؑ فرماتے ہیں کہ:

''میں ایک دن فدک کے ایک باغ میں کام کر رہا تھا جبکہ فدک حضرت زہراؑ کو منتقل ہو چکا تھا، تو اچانک دیکھا کہ ایک اجنبی عورت بڑے اطمینان کیساتھ میرے پاس آپہنچی، اس وقت میرے ہاتھ میں بیلچہ تھا جس سے میں کام میں مشغول تھا۔ اس نے آتے ہی کہا:

''دائے ابوطالب کے بیٹے! کیا آپؑ میرے ساتھ عقد کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اس طرح سے میں آپؑ کو بیلچے چلانے سے بے نیاز کردوں گی اور زمین کے ایسے خزانے آپؑ کو بتاؤں گی کہ آپؑ اور آپؑ کی اولاد ساری زندگی دولت سے مالا مال رہیں گے''

میں نے کہا: تُو کون ہے؟ تاکہ تیرے خاندان والوں سے تیری خواستگاری کروں گا''

اُس نے کہا: میں دنیا ہوں''

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد ۲، ص ۲۳۷

[2] بحارالانوار، جلد ۸، ص ۴۱۱

[3] سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۱۶۶

میں نے کہا: تُو واپس چلی جا، اور میرے علاوہ کسی اور کو جا کر اپنا شوہر بنا، پھر میں نے یہ اشعار پڑھے''

(ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت امامؑ لوگوں کو دنیا کے فریب سے باخبر کرتے ہوئے اس سے جینے کی تاکید کرتے ہیں اور اس دنیاوی زندگی کی ناپائیدری کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار فرماتے ہیں اور اسے فرماتے ہیں کہ جا کسی اور کو جا کر فریب دے، کیونکہ میں تجھے اچھی طرح پہچانتا ہوں)۔[1]

ممکن ہے کچھ لوگ اس روایت کو بھی ''تشبیہ''، ''تمثیلی یا مجاز'' پر محمول کریں، لیکن اگر ہم روایت کے ظاہر کا بھی تحفظ کریں تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ عالمِ مکاشفہ میں دنیا کی حقیقت ایک فریب کار خوب صورت عورت کی صورت میں امامؑ کے سامنے آئی اور آپؑ نے اسے نفی میں جواب دے کر واپس بھیج دیا۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا بھی ہے کہ دنیا ان کے سامنے بھی ایک فریب کار عورت کی صورت میں مجسم ہو کر آئی تھی۔[2]

۶۔ حضرت امام سجاد علی بنؑ الحسین زین العابدین کے حالات میں ہے کہ (جب عبداللہ بن زبیر کے فتنہ نے تمام حجاز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور سب لوگ اس فکر میں تھے کہ آخر اس کا کیا انجام ہوگا؟) امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

''میں گھر سے باہر آیا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے پاس پہنچ کر اس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ (اور سوچ رہا تھا) کہ اچانک ایک مرد کو دیکھا جس نے سفید کپڑے زیبِ تن کیے ہوئے تھے، وہ میرے پاس آ کر کہنے لگا:

''اے علی بن الحسینؑ آپ کیوں غمگین اور مغموم نظر آ رہے ہیں۔ آیا آپؑ کو دنیا کا غم ہے؟

خدا کا رزق تو ہر نیک اور بد سب کے لیے آمادہ ہے

میں نے کہا: نہیں، مجھے دنیا کا غم نہیں ہے۔ اور حقیقت وہی ہے جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔

اس نے کہا: پھر آخرت کا غم ہے؟ وہ تو خدا کا وعدہ برحق ہے، سلطانِ قاہر (یا قادر) اس دن فیصلہ کرے گا۔

میں نے کہا: نہیں آخرت کا غم بھی نہیں ہے! اور حقیقت وہی ہے جو آپ کہتے ہیں''۔

اس نے کہا: ''تو پھر غم کس بات کا ہے؟''۔

میں نے کہا: عبداللہ بن زبیر کے فتنہ سے گھبرا رہا ہوں کہ لوگوں کی کیا حالت ہو رہی ہے''۔

وہ مسکرا کر کہنے لگا: اے علی بن الحسینؑ! آیا آپؑ نے اب تک کسی کو دیکھا ہے کہ اس نے خدا کو پکارا ہو اور خدا نے اسے جواب نہ دیا ہو؟

---

[1] مکاسب شیخ انصاری، منقول از ''امام جعفر صادق علیہ السلام کا خط والی اہواز ''نجاشی'' کے نام'' (بحث ولایت جائر)

[2] بحارالانوار، جلد ۷۰، ص ۱۲۶، باب ''حب الدنیا وذمھا'' حدیث ۱۲۰۔

میں نے کہا: نہیں!''

اس نے کہا: ''اچھا تو کسی کو دیکھا ہے کہ اس نے خدا پر توکل کیا ہو اور خدا نے اس کی مشکل دور نہ کی ہو؟''

میں نے کہا: ''نہیں!''

اس نے کہا: ''تو پھر کسی کو دیکھا ہے کہ اس نے خدا سے درخواست کی ہو اور خدا نے اسے عطا نہ کیا ہو؟''

میں نے کہا: ''نہیں!''

اس نے کہا اور میری آنکھوں سے غائب ہو گیا''۔[1]

۷۔ انہی حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

''گویا میں دیکھ رہا ہوں قبر حسین علیہ السلام کے اردگرد محل اور خوبصورت عمارتیں بن چکی ہیں اور گویا مَیں دیکھ رہا ہوں کہ قبر کے چاروں طرف بازار لگے ہوئے ہیں۔ کوئی دن اور رات ایسی نہیں ہے جس میں روئے زمین کے لوگ وہاں نہ آ رہے ہوں، اور یہ اس وقت ہو گا جب نبی مروان کی حکومت منقرض ہو جائے گی۔[2]

۸۔ امالی شیخ صدوق میں ''حُر بن یزید ریاحی'' کے حالات میں مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

"لماخرجت من الكوفة نوديت ياحر بالجنة، فقلت ويل للحر يبشر بالجنة وهو يسير الى حرب ابن بنت رسول الله (ص)"

''جب میں کوفہ سے باہر نکلا تو مجھے ایک آواز سنائی دی کہ اے حُر! تجھے جنت کی خوشخبری ہو، لیکن میں نے اپنے آپ سے کہا پھٹکار ہے حُر پر! اسے بہشت کی کیونکر خوشخبری دی جا رہی ہے جبکہ وہ رسولؐ کے نواسے کے ساتھ جنگ کرنے جا رہا ہے۔[3]

۹۔ ایک اور روایت میں رسول پاکؐ کی زوجہ محترمہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ گفتگو کا تذکرہ ہے جس میں امام علیہ السلام نے انہیں سرزمین کربلا کی زیارت کرائی اور اپنی شہادت کا مقام انہیں دکھایا۔[4]

۱۔ مکاشفہ کے بارے میں بزرگ علماء، باتقویٰ افراد اور سچے مؤمنین کے حالات میں بھی بہت سے مکاشفات نقل کیے گئے ہیں جن کو بیان کرنے سے کتاب طولانی ہو جائے گی۔ لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ان مکاشفات کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ خبرِ واحد سے باہر اور علمِ

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، باب تفویض الی اللہ، حدیث ۲۵۔

[2] بحار الانوار، جلد ۹۸، ص ۱۱۴، ''کتاب المزار''، حدیث ۳۶۔

[3] امالی صدوق، ص ۹۳، مجلس ۳۰۔

[4] مدینۃ المعاجز، ص ۲۴۴

حدیث کی اصلاح میں خبر مستفیض کی حدتک پہنچی ہوئی ہے۔اوراس بارے میں ہماری بہترین موید ثابت ہوسکتی ہے۔

۲۔ پردے کیونکر اٹھتے ہیں؟

مندرجہ بالا احادیث وروایات جو کہ کشف وشہود کا عملی نمونہ ہیں کے علاوہ کچھ ایسی تعبیرات بھی روایات میں بیان ہوئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے انسان کا ایمان اور یقین جتنا پڑھتا جائے گا اور گناہوں اور بُری صفات کی وجہ سے جو پردے دل پر پڑے ہوئے ہیں، وہ اس سے ہٹتے جائیں گے، اس کے لیے کائنات کے بہت سے حقائق منکشف ہوتے جائیں گے۔آخر کار وہ یقین کی اس منزل تک جا پہنچے گا کہ ابراہیمؑ کی مانند زمین وآسمان کی ملکوت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

انسان کا قلب وروح اس آئینہ کی مانند ہے جس پر گاہے گناہ ومعصیت کا زنگ اور برے اخلاق کی گرد پڑ جاتی ہے اور وہ کسی حقیقت کو منعکس نہیں کر پاتا، لیکن جب وہ توبہ کے پانی سے اس گرد وغبار کو دھوڈالتا ہے اور تہذیبِ نفس کے ذریعہ اس زنگ کو دور کر کے اسے صیقل کر دیتا ہے تو حقیقت اس میں پرتو افگن ہوجاتی ہے اور صاحبِ قلب محرم اسرارِ الٰہی بن جاتا ہے اور جن پیغامات کو نامحرم لوگوں کے کان سننے سے محروم ہوتے ہیں، وہ انہیں سن لیتا ہے۔

درج ذیل احادیث اس بات کی گواہ ہیں۔

۱۔پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"لولا ان الشیاطین یحرمون الی قلوب بنی آدم لنظر والی الملکوت"

''اگر شیاطین نے بنی آدم کے دلوں کو نہ گھیرا ہوا ہوتا تو وہ ملکوتی کائنات کو دیکھ لیتے۔''[1]

۲۔ ایک اور روایت میں آنحضرتؐ ہی سے منقول ہے:

"لیس العلم بکثرة التعلم و انما العلم نور یقذفه الله فی قلب من یحب، فیفتح له، ویشاهد الغیب، وینشرح صدره، فیتحمل البلاء، قیل یا رسول الله وهل لذالك من علامة؟ قیل التجا فی عن دار الغرور، والا نابة الی دار الخلود والاستعداد للموت قبل نزوله"

''(حقیقی) علم زیادہ پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ایسا نور ہوتا ہے جسے خداوند عالم اس شخص کے دل میں ڈال دیتا ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے۔اس کے دل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ غیب کو

---

[1] بحارالانوار، جلد ۷ ص ۵۹، باب باب القلب وصلاحہ، حدیث ۳۹

دیکھنے لگتا ہے، سینہ کشادہ ہوجاتا ہے اور وہ بلا اور آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لیے پختہ ہوجاتا ہے! کسی نے پوچھا یا رسول اللہؐ! اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا اس کی علامت دنیا سے بے اعتنائی اور آخرت کی طرف توجہ اور موت کے آنے سے پہلے اس کے لیے (اعمالِ صالح کے ساتھ) مکمل تیاری ہے۔''[1]

۳۔ نہج البلاغہ میں ان لوگوں کی تعریف ہے جو زمین میں لوگوں پر خدا کی حجت ہیں، علیؑ فرماتے ہیں:

''جعم بهم العلم على حقيقة البصير و باشروا روح اليقين، واستلانوا ما استعوره المترفون، وانسوا بما استوحش منه الجاهلون، وصحبوا الدنيا بابدان، ارواحها معلقة بالمحل الاعلىٰ، اولئك خلفاء الله فى ارضه، و الدعاة الى دينه''

''علم اور دانش ان کی حقیقت بینائی کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور خود وہ روح یقین کے ساتھ مل چکے ہیں، جس چیز کو ہوس باز دنیا پرست مشکل سمجھتے ہیں وہ ان کے لیے آسان ہے اور جس چیز سے جاہل لوگ وحشت کھاتے ہیں وہ اس کے ساتھ مانوس ہیں اور دنیا میں ایسے ابدان کے ساتھ زندہ رہتے ہیں کہ جن کی روحیں عالم بالا کے ساتھ پیوند ہیں۔ وہ زمین میں خدا کے ہیں اور دین خدا کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔''[2]

۴۔ ''ذعلب یمانی'' حضرت امیر علیہ السلام کے سخنور اور زیرک دوستوں میں سے تھے۔ نہج البلاغہ میں ان کی ایک مشہور داستان ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے ایک دن حضرت امیرؑ سے یہ عجیب سوال کیا:

ذعلب: ''هل رأيت ربك يا امير المومنين؟'' یا علی! آپؑ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟

امامؑ: ''افاعبد مالا ارى'' تو کیا جس کو میں نہ دیکھوں اس کی عبادت کروں؟

ذعلب: ''و كيف تراه؟'' تو پھر آپؑ اسے کیونکر دیکھتے ہیں؟

امامؑ: ''لاتدركه العيون بمشاهدة العيان، ولكن تدركه القلوب بحقائق الايمان'' ظاہری آنکھیں حسی مشاہدہ کے ساتھ اسے نہیں دیکھ سکتیں، لیکن قلوب (دل) اسے حقائق ایمان کے ساتھ درک کر لیتے ہیں۔ (اور دیکھ لیتے ہیں)۔

پھر فرمایا:

''قريب من الاشياء غير ملابس، بعيد منها غير مباين''

---

[1] تفسیر الصراط المستقیم جلد ۱ ص ۲۶۷

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۱۴۷

''وہ ہر شے کے نزدیک لیکن اس طرح سے نہیں کہ اس کے ساتھ چمٹا ہوا ہو اور ہر چیز سے دور ہے لیکن ایسے نہیں کہ اس سے بیگانہ ہو۔''[1]

ظاہر ہے امام علیہ السلام کی مراد عقلی دلائل کے ساتھ وجود خدا کی پہچان نہیں ہے کیونکہ یہ مقام تو ہر خدا پرست کو حاصل ہے حتی کہ وہ بڑھیا بھی اس راہ کو طے کر چکی ہے جس نے اپنے چرخے کے معروف استدلال سے عظیم چرخ گردوں کے چلانے والے کا پتہ بتایا۔

پس اس سے مراد وہ درک اور نظر ہے جو اس درک ونظر سے بالاتر ہے اور اندرونی شہود ہے جو اس قدر روشن ہے کہ گویا اسے یہ آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں۔(غور کیجیے گا)

۵۔ امیر المومنین علیہ السلام ہی کی ایک معروف حدیث ہے کہ:

"لو کشف الغطاء لما ازددت یقینا"

''اگر پردے ہٹا بھی دیئے تاہم میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا۔''[2]

یعنی میں اس وقت تک تمام حقائق کو غیب کے پس پردہ سے اندرونی شہود کے ساتھ دیکھ رہا ہوں اور میری چشم بصیرت پردوں کو شگافتہ کر کے غیب کے پردوں سے پار نکل جاتی ہے۔

۶۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الا ان للعبد اربع اعین: عینان یبصر بهما امر دینه و دنیاه، وعینان یبصر بهما امر آخرته، فاذا اراد الله بعبد خیرا فتح له العینین اللتین فی قلبه، فابصر بهما الغیب وامر آخرته"

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر بندے کی چار آنکھیں ہیں۔ دو آنکھیں تو وہ جن کے ذریعہ وہ دین اور دنیا کے کاموں کو دیکھتا ہے اور دو آنکھیں وہ ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنی آخرت کے کاموں کو دیکھتا ہے۔ جب خداوند عالم کسی بندے سے نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کے دل کی اندرونی آنکھوں کو کھول دیتا ہے تا کہ وہ غیب اور

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۹

[2] اس حدیث کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ابن سینا نے ''معراج نامہ'' میں ''علی بن فضل اللہ جیلانیؒ سے یہ چیز نقل کی ہے کہ ''یقینا چونکہ بصیرت کی آنکھوں کے ساتھ ہی عقل اسرار کا ادراک کرتی ہے جو تمام حقائق کے درک کرنے اور دیکھنے کا حکم دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولا علیؑ نے فرمایا "لو کشف الغطا لما ازددت یقینا"۔ (منقول از ترجمہ وتفسیر نہج البلاغہ جلد ۷ ص ۱۴۹)

آخرت کے امر کو دیکھے۔''[1]

اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت ہے جو حقیقی شیعوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔[2]

۷۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک روایت میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا آپؐ کے ایک صحابی ''حارثہ'' سے ہوا۔ آنحضرتؐ نے ان سے پوچھا:

''حارثہ! تمہارا کیا حال ہے؟''

حارثہ: "انا یا رسول الله مومن حقا" اے رسولؐ خدا! میں صحیح معنوں میں مومن ہوں

فرمایا: "لكل شیء حقیقة وما حقیقة قولك؟" ہر چیز کی حقیقت اور علامت ہوتی ہے، تمہاری اس بات کی کیا علامت ہے؟

حارثہ: ''وہ علامت یہ ہے کہ میں دنیا سے بالکل بے اعتنا ہوں، رات کو بیدار رہتا (اور عبادت کرتا) ہوں، سخت گرمی میں پیاسا رہتا (اور روزہ رکھتا) ہوں، گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے پروردگار کا عرش حساب کے لیے آمادہ ہے اور گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ اہل بہشت، بہشت میں ایک دوسرے سے ملاقات کر رہے ہیں اور گویا میں جہنمیوں کی جہنم میں چیخ و پکار سن رہا ہوں''

فرمایا: "عبد نور الله قلبه، ابصرت فاثبت" یہ ایسا بندہ ہے خدا نے جس کے دل کو نورانی بنا دیا ہے۔ تو نے حقیقت کو دیکھ لیا ہے۔ اسی پر ثابت قدم رہ۔

حارثہ: "یا رسول الله! ادع الله لی ان یرزقنی الشهادة معك" اللہ کے رسولؐ! آپ خدا سے دعا کریں کہ میں آپؐ کی مدد کرتا ہوا شہید ہو جاؤں۔''

فرمایا: "اللهم ارزق حارثه الشهادة" خداوند! حارثہ کو شہادت نصیب فرما۔

ابھی چند دن ہی گزرے تھے، پیغمبر اکرمؐ نے کچھ لوگوں کو جنگ کے لیے بھیجا جس میں یہی ''حارثہ'' بھی تھے۔ انہوں نے جنگ کی اور ۸ یا ۹ لوگوں کو قتل کرنے کے بعد جام شہادت نوش فرمایا۔[3]

۸۔ کتب اہلسنت میں پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث درج ہے کہ:

"لولا تكثير فی كلامكم و تمريج فی قلوبكم لرأيتم ما اری و لسمعتوم ما اسمع"

''اگر تم زیادہ باتیں نہ کرتے ہوتے اور فساد کے لیے تمہارے دلوں میں آزادی نہ ہوتی تو تم بھی وہی کچھ دیکھتے

---

[1] خصال صدوق ص ۲۶۵ حدیث ۹۰

[2] بحار الانوار جلد ۶۷ ص ۵۸ حدیث ۳۵

[3] اصول کافی جلد ۲، باب حقیقۃ الایمان والیقین، حدیث ۳

جو میں دیکھتا ہوں، اور وہی کچھ سنتے جو میں سنتا ہوں۔ [1]

یہ اور اس قسم کی دوسری احادیث روحانی مکاشفات کے ایمان اور یقین کے ساتھ رابطے کو واضح کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ انسان کے معنوی ارتقاء کے ساتھ ممکن ہے کہ اسے اس طرح ادراک اور نظر حاصل ہو جائیں، ایسے ادراک اور نظر جن کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں کہ یہ ہیں اور بس!

۳۔ قرآن میں سات سچے خواب

شہود اور مکاشفہ کی ایک قسم ''رویائے صادقہ'' ہیں، یعنی ایسے خواب جو حقیقت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اس قسم کے خوابوں کو مکاشفہ کی ایک قسم سمجھا جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ روحانی فلاسفہ کا نظریہ ہے کہ خواب اور رویا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں جبکہ اس کے برخلاف مادی فلاسفہ خواب اور رویا کو روزمرہ کے کاموں کا براہ راست نتیجہ یا حاصل نہ ہونے والی آرزوؤں کا نتیجہ یا مختلف امور کی بدولت حاصل ہونے والے خوف اور وحشت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ بہرحال روحانی فلاسفہ کے خوابوں کی چند قسمیں ہیں۔

۱۔ ایسے خواب کہ جن کا تعلق ماضی کی آرزوؤں اور تمناؤں سے ہوتا ہے۔

۲۔ ایسے خواب جو پریشان اور غیر مفہوم ہوتے ہیں، عرب جنہیں ''اضغاث احلام'' کہتے ہیں اور یہ نتیجہ ہوتے ہیں قوت خیال اور قوت وہم کا۔

۳۔ ایسے خواب جن کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے اور وہ مستقبل کے کئی رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں، یا بالفاظ دیگر ایسا شہود ہوتا ہے جو حالت خواب میں انجام پاتا ہے۔

مادی فلاسفہ کے پاس تیسری قسم کی نفی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس ایسے بہت سے شواہد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری قسم واقعیت اور حقیقت کی حامل ہے۔ ہم نے اس کے کئی زندہ نمونے جو قطعاً ناقابل انکار ہیں، تفسیر نمونہ میں ذکر کیے ہیں۔ [2]

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں بھی کم از کم سات مقامات پر ان رویائے صادقہ (سچے خوابوں) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تفسیر موضوعی کی بحث میں جن کا ذکر بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱۔ قرین مجید سورۂ ''فتح'' میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک سچا خواب بیان کرتا ہے کہ ''آنحضرت نے خواب میں دیکھا کہ اپنے

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۵ ص ۲۹۲

[2] تفسیر نمونہ جلد ۹

ساتھیوں کے ہمراہ خانہ خدا کی زیارت اور عمرہ کے مناسک انجام دینے کے لیے مکہ میں داخل ہوئے۔'' آپؐ نے اپنا یہ خواب اپنے ساتھیوں سے بیان کیا۔ سب لوگ خوش ہوگئے۔ لیکن انہوں نے پہلے تو گمان کیا کہ اس کی تعبیر ہجرت کے چھٹے سال ظاہر ہوگی جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوتی تھی۔ لیکن یہ تعبیر اس سال ظاہر نہ ہوئی۔ البتہ پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں یقین دلایا کہ یہ خواب سچا تھا اور ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

قرآن مجید نے اس بارے میں ان لوگوں کو مندرجہ ذیل جواب دیا ہے جن کے دلوں میں شکوک پیدا ہو گئے تھے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ (فتح ۲۷)

''جو خواب خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دیکھایا وہ سچ ہے۔ یقیناً تم سب انشاء اللہ مسجد الحرام میں امن کے ساتھ داخل ہوگے (عمرہ کے مناسک کے مطابق) اپنے سروں کو مونڈے ہوئے اور اپنے ناخنوں کو کوتاہ کیے ہوئے، اور تم کسی سے کسی قسم کا خوف کھائے بغیر یہ کام انجام دوگے۔ خداوند عالم وہ کچھ جانتا تھا جو تم نہیں جانتے تھے (اور اس تاخیر میں بھی کوئی حکمت ہے) اور اس سے پہلے قریبی فتح قرار دی۔ (خیبر کے مضبوط قلعوں کی فتح یا صلح حدیبیہ جو بذات خود ایک عظیم فتح ہے)۔''

یہ خواب ہجرت کے ساتویں سال ذوالقعدہ کے مہینے میں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ پورا ہوگیا۔ جو تاریخ میں ''عمرۃ القضاء'' کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ مسلمان تو چاہتے تھے کہ یہ عمرہ اس کے ایک سال قبل بجالائیں لیکن قریش کی ممانعت کی وجہ سے اس سال ایسا نہ ہوسکا۔ باوجود یکہ تمام مسلمان غیر مسلح ہوکر ہی مکہ میں داخل ہوئے تھے، جو اس وقت دشمن کی طاقت کا مرکز تھا۔ لیکن ان کی عظمت اور دبدبہ اس قدر محیط تھا کہ "آمنین" (مطمئن ہوکر) اور "لا تخافون" (کسی سے خوف کھائے بغیر) کی تعبیر ان پر مکمل طور پر صادق آرہی تھی۔ انہوں نے دشمن سے خوف کھائے بغیر خانہ خدا کی زیارت کے مراسم انجام دیئے، جو تاریخ اسلام کے عجائبات میں سے ایک ہے۔

اس طرح سے وہ خواب اپنی تمام خصوصیات سمیت پورا ہوگیا جس کی ایسے حالات میں پیش گوئی کسی طرح بھی ناممکن تھی۔

۲۔ سورہ بنی اسرائیل میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور خواب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اشارہ بھی مختصر اور نہایت سربستہ۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾ (بنی اسرائیل ۶۰)

''جو خواب ہم نے آپ کو دیکھایا وہ تو لوگوں کے لیے صرف ایک آزمائش تھا۔ اسی طرح جس شجرہ ملعونہ (لعنت

شدہ درخت) کا ہم نے قرآن میں ذکر کیا ہے ہم انہیں ڈراتے (اور تنبیہ کرتے) ہیں لیکن ان کے طغیان اور سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا۔''

ایک مشہور و معروف حدیث جسے بہت سے شیعہ اور سنی مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ایک مشہور خواب کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ بندر آپؐ کے منبر پر اچھل کھود رہے ہیں اس پر آپؐ بہت غمگین ہوئے کیونکہ یہ خواب آپؐ کے بعد مسلمانوں کی قیادت کے بارے میں ناخوشگوار حوادث کی طرف اشارہ تھا۔ (اس خواب کی حکومت بنی امیہ سے تفسیر کی گئی ہے۔ جو یکے بعد دیگرے رسول اللہؐ کے منبر پر بیٹھے، انہوں نے رسوم جاہلیت میں ایک دوسرے کی تقلید کی، وہ بے حیثیت افراد تھے، وہ اسلامی حکومت اور خلافت رسول اللہؐ کو تباہی کی طرف لے گئے)۔[1]

بعض مفسرین نے اس رویا سے مراد مسجد الحرام میں داخل ہونے کے رویا کو لیا ہے جبکہ سورہ بنی اسرائیل مکہ میں نازل ہوئی اور یہ رویا مسلم طور پر مدینہ میں دیکھا گیا اور وہ بھی ۶ ھ میں حدیبیہ کے ماجرا سے بھی پہلے۔

''فخر رازی'' کی طرح کے دوسرے علماء نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ رویا کے معنی رویت یعنی بیداری کی حالت میں دیکھنا ہے اور وہ واقعہ معراج کی طرف اشارہ ہے۔[2]

یہ احتمال بہت کمزور ہے کیونکہ ''رویا'' کا اصل لغوی معنی نیند کی حالت میں دیکھنا ہے، نہ کہ بیداری کی حالت میں بنابریں صحیح وہی پہلی تفسیر ہے۔

''شجرہ ملعونہ'' (لعنت شدہ درخت) سے کیا مراد ہے؟ بعض نے تو اس کی ''شجرۂ زقوم'' سے تفسیر کی ہے جو سورہ صافات کے مطابق جہنم کی بنیادوں میں اگتا ہے اور نہایت ہی بدمزہ اور ناخوشگوار پھل ہے اور سورہ دخان کی ۴۶ ویں اور ۴۷ ویں آیت کے مطابق جہنمیوں اور گناہ گاروں کی غذا ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہود کی سرکش قوم سے کی ہے۔ وہ ایسے درخت کی مانند تھی کہ جس کی شاخ و برگ بہت ہوں، لیکن درگاہ رب العزت سے دھتکاری ہوئی قوم۔

لیکن بہت سی شیعہ اور سنی مشہور کتابوں میں ''شجر ملعونہ'' سے ''بنی امیہ'' تفسیر کیے گئے ہیں۔ امام فخر رازی نے مشہور اسلامی مفسر ابن

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۰، ص ۲۳۶

[2] یہ روایت تفسیر قرطبی، مجمع البیان، صافی اور تفسیر فخر رازی میں بیان ہوئی ہے اور مرحوم فیض کاشانی فرماتے ہیں کہ یہ ایسی روایت ہے جو خاصہ اور عامہ (شیعہ اور سنی) کے درمیان مشہور ہے۔

عباس سے یہی تفسیر نقل کی ہے [1] اور یہ تفسیر اس موضوع سے مکمل مطابقت رکھتی ہے جو پیغمبر اکرمؐ کے خواب کے بارے میں بیان ہوا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ بات کہی جائے کہ قرآن مجید میں اس شجرہ ملعونہ کا کہیں ذکر نہیں ہوا ہے، لیکن اگر اس بات پر توجہ دی جائے کہ قرآن مجید نے منافقین کو سخت لعنت کی ہے (ملاحظہ ہو سورہ محمد آیت ۲۳) اور بنی امیہ ایسے منافقین کے سرغنے تھے، تو یہ مشکل بھی حل ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ "نخوفهم فما يزيدهم الا طغيانا كبيرا" (ہم انہیں ڈراتے اور تنبیہ کرتے ہیں لیکن ان کے طغیان اور سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا) کی تعبیر بھی پوری طرح انہی پر صادق آتی ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے کچھ صحابیوں نے آپؑ سے (یا آپؑ کے والد گرامی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے) اسی آیت کے بارے میں سوال کیا تو انہیں نے فرمایا "شجرہ ملعونہ سے مراد بنی امیہ ہیں۔" [2]

یہی چیز امیر المومنین علیؑ اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی بیان ہوئی ہے اور علی بن ابراہیم نے اسے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ [3]

"سیوطی" نے بھی تفسیر "درمنثور" میں "شجرۂ ملعونہ" اور "پیغمبر اکرمؐ کے خواب" کے بارے میں متعدد روایات بیان کی ہیں، جن میں سے بعض میں "بنی امیہ"، بعض میں "بنی الحکم" اور بعض میں "بنی العاص" کا ذکر ہے (جو سب کے سب ایک ہی شجرہ خبیثہ سے ہیں)۔ [4]

بہر حال یہ خواب بعد از وفات پیغمبرؐ تعبیر ہوا اور آخر کار اس شجرہ ملعونہ کے افراد یکے بعد دیگرے پیغمبرؐ کی جگہ پر بیٹھتے رہے اور عظیم بلاؤں اور فتنوں کو وجود میں لاتے رہے اور مسلمانوں کے لیے بہت بڑی آزمائش کا سبب بنے۔

۳۔ ایک اور رویا صادقہ (سچا خواب) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب ہے جو ان کے فرزند (حضرت اسماعیلؑ) کے ذبح کے بارے میں ہے۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو کہ مخلوق خدا کی رہبری اور امامت کے منصب تک پہنچنے کے لیے آزمائش کی عظیم وادی میں قدم رکھ چکے تھے، انہیں اپنے عزیز بیٹے "اسماعیل" کے ذبح کا حکم ہوا اور عجیب بات یہ ہے کہ انہیں یہ حکم خواب کے عالم میں دیا گیا۔ ایسا خواب جو ان کے لیے وحی کی حیثیت رکھتا تھا اور وحی کی مانند حقیقت کا حامل تھا۔ چنانچہ سورہ صافات کی آیت ۱۰۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

"فلما بلغ معه السعي قال يبني اني اري في المنام اني اذبحك فانظر ماذا

---

[1] قرطبی نے اس روایت کو ابن عباس سے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے (جلد ۶، ص ۳۹۰۶ اور فخر رازی نے بھی اسے ابن عباس ہی سے نقل کیا ہے) (جلد ۲۰ ص ۲۳۷)

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۱۸۰، حدیث ۲۷۸

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۳، ص ۱۸۰، ۱۸۱، حدیث ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۶

[4] تفسیر المیزان، جلد ۱۳ ص ۱۵۷

ترى قال يا ابت افعل ما تومر ستجدنى ان شاء الله من الصابرين"

''جب (حضرت ابراہیمؑ) ان (حضرت اسماعیلؑ) کے ساتھ مقام سعی پر پہنچے تو کہا میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے ذبح کروں، دیکھو تو تمہاری کیا رائے ہے؟ تو (اسماعیلؑ) نے) کہا بابا جان! جو آپ کو حکم ملا ہے اسے کر گزریئے۔ انشاءاللہ آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔''

لفظ "اری" (میں دیکھ رہا ہوں) فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے یہ خواب کئی مرتبہ دیکھا: اس حد تک کہ انہوں نے مکمل اطمینان پیدا کرلیا کہ حکم خدا ہے۔ اسی لیے ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ نے انہیں کہا: بابا جان! جو آپ کو حکم ملا ہے اسے کر گزریئے۔ میں نے سر تسلیم خم کیا ہوا ہے اور صبر کروں گا۔

نیز اسی دلیل کی بنا پر، اسی سورہ کی آیت ۱۰۴ اور ۱۰۵ میں آیا ہے ''ہم نے اسے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ! جو حکم تمہیں خواب میں دیا گیا تھا وہ تم نے سچ کر دکھایا'' (ونادیناہ ان یا ابراھیم قد صدقت الرویا)۔

یہ ماجرا ان لوگوں کے لیے روشن دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین کے لیے خواب بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے اور روایات میں بھی آیا ہے کہ:

"ان الرویا الصادقة جزء من سبعین جزء امن النبوة"

''یعنی سچا خواب نبوت کی نوے اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔''[1]

اگرچہ بعض اصولیوں نے اس حکم کے بارے میں شک کا اظہار کیا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ حکم الٰہی عمل کیے جانے سے پہلے ہی منسوخ ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ اپنے مقام پر بتایا جا چکا ہے یہ اس وقت ہے جب ''امتحان کا حکم'' نہ ہو کہ جس سے کسی شخص یا چیز کو آزمایا جاتا ہے اور "قد صدقت الرویا" (جو خواب تو نے دیکھا ہے اس کی تصدیق کر دی اور اسے سچا کر دکھایا) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے فرزند جناب اسماعیلؑ کے ذبح کے تمام مقدمات تیار کر لیے تھے اور بے نظیر اور عظیم ایثار کے لیے مکمل طور پر تیار ہو چکے تھے اور جو ان کا فریضہ تھا وہ سارے کا سارا انجام دے دیا تھا۔

۴۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے والد کے گھر میں خواب ہے جو دوسرے سچے خوابوں میں شمار ہوتا ہے، جس کے بارے میں سورہ یوسف کے آغاز میں ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝ (یوسف ۴)

---

[1] بحار الانوار جلد ۵۸، ص ۱۶۷، ۱۷۷، ۱۷۸

''اس زمانے کو یاد کرو جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا: باب جان! میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو اپنے لیے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

باپ نے یہ خواب سن کر آئندہ کے حادثات کی پیش گوئی کر دی اور انہیں کہا ''خدا تمہیں ایک بلند مقام عطا فرمائے گا اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی پوری نعمتیں کرے گا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے یہ خواب بارہ سال کی عمر میں دیکھا اور اسے پورا ہوتے ہوتے چالیس سال کا عرصہ لگ گیا، اس وقت کہ جب وہ مصر کی حکومت پر فائز اور تخت حکومت پر براجمان ہوئے اور انکے گیارہ بھائی اور ماں، باپ انہیں کنعان سے ملنے مصر تشریف لے گئے اور انہیں خضوع کے لیے، یا نعمت کے شکرانہ کے طور پر خدا کا سجدہ ادا کیا۔ چنانچہ اسی سورت کے اواخر میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ:

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ (یوسف ۱۰۰)

''اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب کے سب ان کے لیے سجدہ میں گر گئے اور کہا: بابا جان! یہ اسی خواب کی تعبیر ہے جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔ خدا نے اسے سچ کر دکھایا۔''

اس ماجرا سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ ممکن ہے کہ جو حوادث چالیس سال بعد واقع ہوں، وہ ایک سچے خواب کی صورت میں ایک پاک اور ذی استعداد دل میں منعکس ہو جائیں۔ اگرچہ چالیس کا عدد قرآنی آیات کے متن میں مذکور نہیں ہے، لیکن آیات کے قرائن سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ خواب دیکھنے اور اس کی تعبیر ظاہر ہونے کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ تھا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اس خواب کے دیکھنے کے بعد اپنے معصوم چھوٹے بچے کو جو خوشخبری دی وہ یہ تھی:

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (یوسف ۶)

''تجھے تعبیر خواب کی تعلیم دے گا۔''

اس جملہ کی خواہ علم تعبیر خواب کے معنی میں تفسیر کی جائے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے، خواہ تفسیر المیزان کی تصریحات کے مطابق اس کی تعبیر خواب کے علم سے بھی وسیع تر معنی میں تفسیر کی جائے، یعنی اس کے حوادث اور نتائج کے سرچشمہ کی معرفت،[1] صورت حال خواہ کچھ بھی ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بات ممکن ہے کہ بعض خواب سچے ہوں اور ان کی تاویل عینی اور واقعی ہو۔

۵، ۶۔ جب حضرت یوسفؑ پاکدامنی کے جرم میں عزیز مصر کی قید میں تھے اس وقت ان کے ساتھ زندان میں رہنے والے دو قیدیوں نے دو

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۱، ص ۸۶

الگ الگ خواب دیکھے۔قرآن نے ان خوابوں کواسی سورہ یوسف میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (یوسف ۳۶)

''دو جوان اس کے ہمراہ قید خانے میں داخل ہوئے۔ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے شراب (کے لیے انگور) نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ روٹیوں کو سر پر اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں۔ہمیں اس کی تعبیر سے آگاہ کرو کیونکہ ہم آپ کو نیکوکاروں میں سے دیکھتے ہیں۔''

یوسف علیہ السلام نے پہلے تو انہیں خدائے واحد کی توحید اور عبادت کی طرف دعوت دی۔پھر ان کے لیے خواب کی یوں تعبیر بیان کی۔

جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ شراب کے لیے انگور نچوڑ رہا ہے، اس سے کہا:

''تم قید خانے سے رہا ہو جاؤ گے۔''

لیکن دوسرے شخص سے، جس نے خواب میں دیکھا تھا کہ روٹیاں سر پر اٹھائے ہوئے ہے اور اس میں سے پرندے کھا رہے ہیں، کہا:

''تمہیں سزائے موت ہوگی۔''

چنانچہ دونوں کی تعبیریں سچی ثابت ہوئیں۔(فطری بات ہے کہ مصر جیسے فاسد ماحول میں جہاں خودخواہ اور جبار بادشاہوں کی حکومت ہو اور یوسفؑ جیسے معصوموں کو پاکدامنی کے جرم میں زندان میں ڈالا جاتا ہو، وہاں پر ظالم حکام کے ساتھ سودے بازی اور ان کے لیے شراب تیار کرنا آزادی کا موجب ہی ہوسکتا ہے۔لیکن جب لوگوں میں مظلوم اور مستضعف لوگوں کی حمایت کا جذبہ اور پرندوں کو کھانا کھلانے کی فکر ہو انہیں سزائے موت ہی مل سکتی ہے)۔

بہرحال یہ دونوں خواب کہ تشریح قرآن مجید میں بڑی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے، اس سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ کبھی خواب بھی معرفت کے منبع کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، ہاں البتہ نہ تو ہر خواب اور نہ ہی ہر تعبیر وتفسیر کرنے والے کے لیے۔

۷۔سلطان مصر کا خواب

یوسف علیہ السلام کی اسی داستان میں، قرآن مجید میں ایک اور خواب کا بھی ذکر ہے جو سچے خوابوں کا ایک روشن اور واضح نمونہ ہے۔

بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ:

''سات دبلی پتلی گائیں، سات موٹی تازی گایوں پر حملہ کر کے انہیں کھا گئی ہیں اور گندم کی سات خشک بالیاں، سات سرسبز بالیوں

کے گرد لپٹ کر انہیں چٹ کر گئی ہیں۔''

وہ اس خواب سے وحشت زدہ ہو گیا اور اپنے اطراف والوں سے اس کی تعبیر کا مطالبہ کیا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ (یوسف ۴۳)

اور چونکہ اس کی اطراف والے خواب کی تعبیر کو نہیں جانتے تھے، لہٰذا انہوں نے کہا:

''یہ تو خواب پریشاں ہیں جن کی تعبیر نہیں ہوتی اور ہم تاویل خواب سے بھی بے خبر ہیں۔''

شاید اس طرح سے وہ سلطان مصر کو اس پریشانی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ (توجہ رہے کہ مصر کا بادشاہ یا فرعون مصر، اس پورے ملک کا حاکم تھا۔ بعض مفسرین کے مطابق ''عزیز مصر'' اس ملک کے وزیر خزانہ کو کہتے تھے۔ جو فرعون مصر جناب یوسف علیہ السلام کا ہمعصر تھا اس کا نام ''ریان بن ولید'' تھا اور عزیز مصر کا نام ''قطفیر'' یا ''عطفیر'' تھا)۔ [1]

لیکن یہاں پر بادشاہ کے ساقی (یا ندیم) جو اپنے خواب کے ماجرا کے بعد قید خانے سے رہا ہو چکا تھا، کو ایک مرتبہ اپنے عالم، زیرک اور صدیق اور راستباز دوست یعنی یوسفؑ کی یاد آئی اور تمام ماجرا بادشاہ سے بیان کیا۔ بادشاہ نے یوسفؑ کو قید خانے سے باہر نکالا اور اپنے پاس بلا کر ان سے اپنا خواب بیان کیا تو انہوں نے خواب کی یوں تعبیر ارشاد فرمائی:

''تمہارے آنے والے سات سال نہایت ہی بابرکت ہوں گے۔ ہر چیز کی فراوانی ہوگی۔ خوب محنت سے کام لو، زراعت پر زیادہ توجہ دو، گندم کے جو کھیت کاٹو انہیں بالیوں سمیت اکٹھا کرتے جاؤ، اپنی ضروریات کی حد تک ہی اس سے مصرف کرو، بچت سے کام لیتے رہو، کیونکہ ان سات سالوں کے بعد دوسرے سات سال نہایت ہی خشک ہوں گے، بارشیں بہت کم ہوں گی، کھیتی باڑی میں نہایت کمی واقع ہو جائے گی، اس لیے تمہیں اس غلے سے سات سال تک استفادہ کرنا ہوگا وگرنہ ہلاک و برباد ہو جاؤ گے اور پھر قحط کے ان سات سالوں میں تمہیں تمام غلے کو بھی خرچ نہیں کرنا ہوگا بلکہ کچھ غلہ اس سے اگلے سال کے لیے بھی بچائے رکھنا جو بارشوں اور برکتوں کا سال ہوگا۔'' (یوسف ۴۷ تا ۴۹)

---

[1] فخر رازی کی تفسیر کبیر میں یہی معنی بعض مفسرین سے نقل کیے گئے ہیں۔ (جلد ۱۸، ص ۱۰۸) اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے کتاب ''اعلام القرآن'' ص ۶۷۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔ ابوالفتوح رازی نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ یوسف علیہ السلام انجام کار سلطنت مصر کے عہدہ تک جا پہنچے۔ تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۶، ص ۴۰۱

یہ تعبیر بھی حرف بحرف پوری ہوئی اور چونکہ اس میں یوسفؑ کی صداقت، راست بازی، معرفت اور ذکاوت نمایاں تھی لہٰذا اس کی آزادی وزارت خزانہ تک پہنچنے کا سبب بن گئی۔ پھر ان کی حکومت تمام مصر پر مسلم اور مستحکم ہوگئی۔

نتیجہ

ان مجموعی آیات سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے کچھ خواب ایسے ہوں جو کچھ حقائق کے ادراک کا منبع بن جائیں۔ یا بالفاظ دیگر ممکن ہے کہ کشف وشہود کا مسئلہ خواب میں جامہ عمل پہنے لیکن بیداری میں نہیں۔ تو صرف اس قسم کے خواب کی آیات بالا کی دو سے تین قسمیں ہیں:

۱۔ بعض تو بعینہٖ اور بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے بیداری ہی میں نظر آجاتے ہیں جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب کہ آپؐ خانہ کعبہ کی زیارت کررہے ہیں اور جس کا تذکرہ سورہ فتح میں آیا ہے۔

۲۔ ایسے خواب بھی ہیں جو تعبیر کی صورت میں جامہ عمل پہنتے ہیں۔ یعنی ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تفسیر کی جائے اور تفسیر بھی ایسے جسے صاحب علم وآگاہ معبر ہی جانتا ہے (جیسے حضرت یوسف، سلطان مصر اور قیدیوں کے خواب میں جو سارے کے سارے سورہ یوسف میں بیان کیے گئے ہیں)۔

۳۔ ایسے خواب جو حکم اور فرمان کی حیثیت رکھتے ہیں اور نیند کی حالت میں وحی کی حیثیت رکھتے ہیں (جیسے حضرت ابراہیمؑ کا خواب ہے)۔

لیکن اس قسم کی گفتگو کا یہ مقصد نہیں کہ ہر ایک خواب کو کشف وشہود سمجھا جائے، بلکہ بہت سے ایسے خواب ہیں جو ''اضغاث احلام'' (پریشان خواب) ہوتے ہیں اور ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ ایسے خواب ہوتے ہیں جو وہم کی طاقتوں کی فعالیت کا نتیجہ ہوتے ہیں یا پھر محرومیوں، ناکامیوں اور پرکار دعمل ہوتے ہیں۔

سوال

ممکن ہے کہ اس مقام پر کچھ لوگ یہ سوال کریں کہ آیا آئندہ کے حالات کے ساتھ خوابوں کا تعلق علمی حیثیت کا حامل ہوتا ہے، جبکہ مشہور ماہر نفسیات ''فرائیڈ'' کی پیروی کرتے ہوئے کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ خواب تو صرف پوری نہ ہونے والی خواہشات اور ضروریات کا ردعمل ہوتے ہیں جو ''من'' کو دھوکہ دینے کے لیے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ ذہن کے خود آگاہ میدان میں آپہنچتے ہیں، یا بالفاظ دیگر ضمیر باطن میں جو خواہشات پوری نہیں ہوتیں اور کبھی تو بغیر تعبیر کے ظاہر ہوتے ہیں (جیسا کہ وہ عاشق کا محبوب اس سے جدا ہوگیا ہو اور وہ اسے خواب میں دیکھتا ہے) اور کبھی شکل تبدیل کرکے مناسب صورت میں منعکس ہوتے ہیں، تو ایسی صورت میں اس کی تعبیر کی ضرورت ہوگی۔

جواب

یہ ایک مفروضہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس اس مدعا کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ خواب ایسے ہوں لیکن یہ دعویٰ کہ تمام خواب ایسے ہیں، دعویٰ بلا دلیل ہے۔ [1]

اس میں شک نہیں ہے کہ خوابوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک قسم ایسی ہے جس کا نام ''رویا صادقہ'' ہے اور یہ بعض حقائق کے انکشاف کی دلیل ہے۔ ان حقائق کو ہم نے سب سے پہلے مرحلے میں تو قرآن پاک سے اخذ کیا ہے جو کہ خدائی وحی ہے اور دوسرے مرحلہ پر وہ تجربات ہیں جو اس بارے میں انجام پائے ہیں۔ اس سے مراد بے بنیاد قصے کہانیاں نہیں ہیں بلکہ وہ واقعات ہیں جو ہمارے زمانے میں یا اس سے پہلے کے زمانے میں عظیم اور مشہور و معروف افراد کے درپیش آئے ہیں اور انہوں نے ان کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ (ہم نے بھی تفسیر نمونہ، جلد ۹ میں، اس کے کئی واضح نمونے درج کیے ہیں)۔

ضمنی طور پر ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ خواب کو خواب ہونے کی حیثیت سے ''معرفت کے منبع'' کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ خواب حجت نہیں بن سکتا، بلکہ کئی دوسرے بیرونی قرائن اور شواہد کا بھی ان کے ساتھ ہونا ضروری ہے تاکہ اس طرح سے وہ واضح اور ناقابل تردید اور ٹھوس ثبوت بن سکیں۔

۴۔ ''رحمانی'' اور ''شیطانی'' مکاشفے

شاید اس بات کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو کہ حقیقی اور واقعی کشف و شہود وہ ہوتا ہے جو یا تو کامل ایمان اور یقین کی وجہ سے وجود میں آتا ہے یا پھر ریاضتوں اور مشقتوں کے بعد۔ اس کے مقابلے میں بہت سے کشف اور شہود ایسے ہوتے ہیں جن کا منبع اور مرکز وہم اور خیال ہوتے ہیں، جو یا تو فکر و ذہن کے بار بار کی راہِ راست سے لغزشوں یا کبھی شیطانی وسوسوں کی وجہ سے ایسی صورت حال انسان کے سامنے مجسم ہوکر آجاتی ہے جس کا حقیقت اور واقعیت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا اور سوائے چند وہم و خیال کے اور کچھ نہیں ہوتا، اکثر و بیشتر ''صوفیا'' جس قسم کے کشف و شہود کا دعویٰ کرتے ہیں۔

سادہ لوح مرید آغاز کار میں کچھ لوگوں کے پراپیگنڈہ سے متاثر ہوکر معتقد ہوجاتا ہے اور خواب اور رویا کے ذریعہ اپنے حقیقی راہنما اور ''مرشد'' کو تلاش کرنا چاہیے اور روز بروز اس کی یہ فکر مستحکم ہوتی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ عالم خواب میں اپنے مرشد کی زیارت کرے (غالباً وہ کچھ لوگوں کو اپنی نگاہوں میں اس منصب کے لیے منتخب کرلیتا ہے، اگرچہ بطور کامل کسی کو منتخب نہ بھی کرے کئی لحاظ سے

---

[1] دور حاضر کے دانشمند آج تک اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ خود ''نیند'' کی اصل وجہ کیا ہے؟ آیا انسان کسی ''فزیکل'' عامل کی وجہ سے نیند کرتا ہے یا کسی ''کیمیکل'' وجہ سے سوتا ہے، یا دونوں کی وجہ سے؟ یا بلکہ اعصاب کی فعالیت کا ایک علیحدہ سسٹم ہے۔ خود ''نیند'' کا اصل مسئلہ ہی معمہ بنا ہوا ہو تو پھر وہاں کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ ''خواب'' کے مسئلہ کو حل کیا جائے جو نیند سے کئی درجے پیچیدہ ہے۔

اس کی حدود اور خاص امتیاز صفات کو ذہن میں ضرور مدنظر رکھتا ہے)۔

کبھی مشقت آور ریاضتوں اور مزاجی انحراف کی وجہ سے انسان اپنی فکر کے طبعی توازن کو کھو بیٹھتا ہے اور اس میں قوت خیال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ناگہاں ایک رات عالم خواب میں اشخاص کو اپنے مقصود کی حدود میں دیکھ لیتا ہے۔ اگر مکمل طور پر انہیں نہ بھی دیکھ سکے تو تھوڑی سی توجیہہ اور تفسیر کے ساتھ اس میں ترمیم کر لیتا ہے اور اس طرح سے اس کی ''مریدی'' عملی جامہ پہنتی ہے۔

ممکن ہے یہی صورتِ حال اسے عالم بیداری میں بھی حاصل ہو جائے، کیونکہ اس سادہ لوح اور سادہ ذہن ''مرید'' کی آنکھیں اور کان راہ پر لگے ہوئے ہیں اور وہ عالم غیب کی طرف متوجہ ہے۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس جہان کا کوئی دروازہ اس پر کھل جائے یا اس کے کان میں کوئی آواز پہنچ پائے۔ وہ ہمیشہ اسی چیز کو اپنے اندر دہراتا رہتا ہے اور عالم ذہن میں اسے پروان چڑھاتا رہتا ہے اور رات دن اسی بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ قوت خیالی کی سرگرمیوں کی وجہ سے اچانک اس کے کان میں کوئی آواز پہنچتی ہے یا کوئی صورت اس کے سامنے مجسم ہو کر آجاتی ہے اور وہ اسے بنیاد بنا کر اپنے عقائد کی عمارت اس پر استوار کرتا ہے۔

ذوق پر مبنی اور نشاط آور مطالب جو کبھی تو دلچسپ اشعار اور دماغ کو مسحور کر دینے والی دھنوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اس قسم کی صورت حال کو جلا بخشتے ہیں۔

صوفیاء کا وہ گروہ جو وجد اور سماع [1] کا حامی ہے، وجد اور سماع کی حالت میں اس قدر مست ہو جاتے ہیں کہ جوش و خروش میں آکر بے خود اور بے سدھ ہو جاتے ہیں اور قوت عاقلہ کو گم کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں قوت وہمیہ کی فعالیت کے لیے میدان خالی ہو جاتا ہے اور جو لوگ ہمیشہ عالم غیب کے کشف اور مشاہدہ کے خیال میں مگن رہتے ہیں انہیں تمام عالموں کی سیر کے لیے لے اڑتی ہے اور ان عالموں کی سیر کراتی ہے جو ان کی قوت خیال میں سمائے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے نور کے دریا اور کوہ طور کو اور ساتوں طبق آسمان اور زمین کو مجسم دیکھتے ہیں۔ ان کی قوت وہمیہ جس شکل و صورت کو پسند کرتی ہے وہی ان کے سامنے مجسم ہو کر آجاتی ہے۔

وہ ایسی صورت حال کو دیکھ کر زبردست مسرور اور شادمان ہوتے ہیں اور اس گمان سے کہ وہ اپنے مطلوب و مقصود کو بالمشاہدہ پا چکے ہیں، نعرے لگانا اور شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور یہی چیز ان کی کیفیت میں شدت پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ آخر میں غشی جیسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں اور جب اس سے افاقہ ہوتا ہے تو اس دوران انہوں نے جو کچھ دیکھا ہوتا ہے وہ اپنے مکاشفات کے عنوان سے دوسروں کو بتاتے ہیں۔

درحقیقت وہ لوگ ''آب'' کے گمان سے ''سراب'' کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی جگہ تک پہنچے بغیر ان امور میں پھنس جاتے ہیں جو کلی طور پر حقیقت سے خالی ہوتے ہیں۔

---

[1] ''سماع'' سے مراد موسیقی کی مختلف دھنیں یا گانے والوں کے نغمے ہیں جو صوفیوں کی بعض مجالس میں رائج ہیں اور ''وجد'' سے مراد ذوق اور شوق کی وہ حالت ہے جو سماع پسند صوفیوں کی حالت ہوتی ہے اور رقص سے ملتی جلتی حرکات سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔

قصہ مختصر ایسی بات ہرگز نہیں ہے کہ جو شخص بھی کشف وشہود کا دعویٰ کرے اس کو کسی حیل و حجت کے بغیر تسلیم کرلیا جائے، یا اگر کوئی صورت اس کی نگاہوں میں مجسم ہوکر آجائے، یا کوئی آواز اس کے کانوں میں پہنچ جائے، اسے خدائی اور واقعی سمجھا جائے، کیونکہ شیطانی مکاشفے بھی تو کم نہیں ہیں۔

کتاب ''احتجاج طبرسی'' میں ایک روایت ابن عباس سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ''حسن بصر'' کے پاس گزر رہے تھے اور وہ (حسن بصری) وضو میں مشغول تھے۔ (اور وہ وضو کا پانی استعمال کرنے میں سختی سے کام لیتے تھے) حضرت امامؑ نے ان سے فرمایا ''حسن! وضو کو زیادہ پانی کے ساتھ انجام دیا کرو (سختی سے کام نہ لیا کرو)۔''

حسن بصری نے کہا: ''اے امیر المومنین! آپ نے کل (میدانِ جنگ جمل میں) ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے جو خدا کی وحدانیت، پیغمبرؐ کی رسالت کی گواہی دیتے تھے، پنجگانہ نمازیں پڑھتے تھے وضو کے لیے کھلا پانی استعمال کرتے تھے۔''

امام نے فرمایا: ''اگر ایسا ہی ہے تو پھر تم نے ان کی مدد کیوں نہیں کی؟''

حسن نے کہا: ''خدا کی قسم میں آپ کی باتوں کی تصدیق کرتا ہوں اے امیر المومنین! سو اس بارے میں عرض ہے کہ میں پہلے دن باہر آیا، غسل کیا، حنوط ملا اور اسلحہ اٹھا کر چل پڑا اور مجھے اس بارے میں ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ عائشہ کی امداد سے دستبرداری کفر ہے۔ چنانچہ جب میں (بصرہ کے قریب) ''حزینہ'' کے مقام پر پہنچا تو ایک آواز میرے کان میں پہنچی کہ اے حسن! کہاں جارہے ہو؟ واپس لوٹ جاؤ کیونکہ قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہیں۔ میں گھبرا کر واپس آگیا اور گھر میں بیٹھ گیا۔

دوسرے دن بھی مجھے یقین کامل تھا کہ عائشہ کی امداد نہ کرنا کفر ہے۔ چنانچہ میں نے پہلے دن کی طرح غسل وحنوط کا بندوبست کیا اور ہتھیار لگا کر باہر آگیا اور کل والی جگہ پر پہنچا تو وہی آواز سنی کہ اے حسن! 'بار بار کہاں جارہے ہو؟ قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔''

حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا: ''تم نے سچ کہا، لیکن معلوم بھی ہے کہ وہ ندا دینے والا کون تھا؟''

حسن نے کہا: ''نہیں!''

امام نے فرمایا: ''وہ تمہارا بھائی شیطان تھا اور ایک لحاظ سے اس نے ٹھیک کہا تھا، کیونکہ اس گروہ کے قاتل اور مقتول دونوں قسم کے لوگ جہنمی ہیں۔ (کیونکہ وہ جمل کے بلوائی تھے جنہوں نے مسلمانوں کی حکومت اور امام وقت یعنی حضرت علی علیہ السلام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا)۔ [1]

اس قسم کے غیبی مکاشفے اور آوازیں بعینہٖ وہی چیزیں ہیں جن کو قرآن مجید میں ''شیطانی وحی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ سورہ انعام ۱۱۲ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى

---

[1] احتجاج طبرسی جلد ۱ ص ۲۵۰

بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ

''اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے مقابلے میں جنوں اور انسانوں سے کچھ شیاطین قرار دیئے ہیں جو بے بنیاد اور دھوکے پر مبنی باتوں کو مخفی طور پر ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔''

درحقیقت یہ ایک قسم کی آزمائش عمل میں آتی ہے اور امتحان ہوتا ہے کہ مومنین کی صفیں غیر مومنین سے جدا ہو جائیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں سورہ انعام ہی کی ۱۲۱ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ

''یعنی شیاطین مخفی طور پر کچھ باتیں اپنے دوستوں تک پہنچاتے ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ جب انسان ''صوفیا'' کی کتابوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو انہیں ایسے مکاشفوں سے لبریز دیکھتا ہے جو نہایت ہی وحشت ناک ہوتے ہیں اور جن کے غلط آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر ہم صرف چند نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ ہم اصل مطلب سے دور نہ نکل جائیں۔ اس اجمال سے آپ خود ہی تفصیلی جائزہ مرتب فرمالیں۔

۱۔ کتاب ''صفوۃ الصفا'' جو ''شیخ صفی الدین اردبیلی'' کے حالات میں اس کے ایک مرید نے لکھی ہے، میں یوں لکھا ہوا ہے:

''ایک کارکن شخص نے شیخ سے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ شیخ کی آستین کا سرا عرش سے تحت الثریٰ تک پہنچا ہوا تھا تو شیخ نے کہا یہ تو تجھے تیرے حوصلے کے مطابق دکھایا گیا ہے۔''

۲۔ ''محی الدین عربی'' کتاب ''مسامرۃ الابرار'' میں کہتے ہیں:

''رجبیون وہ لوگ ہیں جن میں ایک قسم کی ریاضت پائی جاتی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ مکاشفے کی حالت میں وہ ''رافضیوں'' (شیعوں) کو خنزیر کی حالت میں دیکھتے ہیں۔''

۳۔ شیخ عطار کتاب ''تذکرۃ الاولیاء'' میں ''بایزید بسطامی'' کے حالات میں لکھتے ہیں کہ بایزید نے کہا میں ایک مدت تک خانہ کعبہ کا طواف کرتا رہا جب میں حق تک پہنچ گیا تو خانہ کعبہ کو دیکھا کہ وہ میرے گرد گھوم رہا ہے..... حق تعالیٰ نے مجھے ایسے مقام تک پہنچا دیا کہ تمام مخلوق کو دو انگلیوں کے درمیان دیکھنے لگا۔''[۱]

۴۔ اسی کتاب میں لکھا ہے ''بایزید'' نے کہا:

''حق تعالیٰ نے مجھے دو ہزار مقام اپنے سامنے حاضر کیا اور ہر مقام میں مجھے ایک مملکت پیش کی، لیکن میں نے قبول نہیں کی۔''[۲]

یہ اس قسم کے دعوے ہیں کہ جن کے متعلق نہ تو کسی نبی مرسل سے اور نہ ہی کسی معصوم امام سے سنا گیا ہے بلکہ بارگاہ رب العزت اور

---

[۱] تذکرۃ الاولیاء ص ۱۰۲

[۲] تذکرۃ الاولیاء ص ۱۰۱

خانہ کعبہ کے پاس دعائیں اور مناجاتیں ان کے خضوع وخشوع اور تذلل وزاری کی غماز ہیں اور اس بات کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے مکاشفات اگرچہ عمدی طور پر نہ بھی ہوں، شیطانی اوہام اور خیالات ضرور ہیں، جو مختلف عوامل کی بناء پر جن میں سے بعض کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے بعض لوگوں کے ذہن منقش ہوجاتے ہیں اور اس کی وسعت ان لوگوں کے تخیلات اور بلند پروازی کے مطابق ہی ہوا کرتی ہے۔

سوال

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ آیا ''رحمانی'' اور ''شیطانی'' مکاشفات یا ''واقعیت'' اور ''خیال'' کی کوئی شناختی علامات ہیں یا نہیں؟

جواب

جی ہاں! اس کی تین اہم ترین علامتیں ہیں اور اجمالی طور پر ان دونوں کا آپس میں فرق یوں معلوم کیا جاسکتا ہے کہ:

''رحمانی مکاشفے'' یقینی اور قطعی ہونے کے ساتھ ساتھ یقین، ایمان، معرفت، اخلاص، توحید اور عمل صالح کے اعلیٰ معیار سے مزین ہوتے ہیں، جبکہ ''شیطانی مکاشفے'' اور خیالات واوہام ان چیزوں سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ بنابریں اگر اس قسم کی باتیں ان لوگوں سے سنی جائیں جن میں یہ شرائط نہیں پائے جاتے تو وہ ہر لحاظ سے ناقابل اعتبار ہوں گے۔

ہم ابھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بیان کر چکے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''علم ایک نور ہے جسے خداوند عالم اس شخص کے دل میں ڈالتا ہے جسے وہ دوست رکھتا ہے۔ دل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ غیب کو دیکھتا ہے۔ اس کا سینہ کشادہ ہوجاتا ہے اور وہ مشکلات وآزمائش کو برداشت کرتا ہے۔''

آپؐ سے پوچھا گیا یا رسول اللہؐ! کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ تو فرمایا:

''ہاں اس کی نشانی یہ ہے کہ اس فریب کار اور دھوکہ باز دنیا سے بے اعتنائی، ہمیشگی سرائے جاودانی کی طرف پوری توجہ اور (ایمان و عمل صالح کے ذریعہ) موت کے لیے آمادگی قبل اس کے کہ وہ نازل ہو۔''[1]

دوسری بات یہ ہے کہ ''حقیقی مکاشفات'' ہمیشہ کتاب اور سنت کے ہم آہنگ ہوتے ہیں، آیات الٰہی اور اقوال معصومین کی روشنی میں ہوتے ہیں اور سوئی کی نوک کے برابر خدا کی اطاعت سے باہر نہیں ہوتے اور گناہ وعصیان سے ذرہ بھی ملوث نہیں ہوتے۔

تیسرے یہ کہ ان کے مضامین اور متعلقات مکمل طور پر عقل کے دوش بدوش ہوتے ہیں اور نامعقول بلند پروازیوں اور خیالی پلاؤ پکانے سے بالکل پاک صاف ہوتے ہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے مکاشفہ کی حالت میں ''رافضیوں'' کو سور کی شکل میں دیکھا ہے درحقیقت انہوں نے اپنے اندرونی آئینہ میں اپنی ہی صورت کو دیکھا ہے۔

اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے خدا کا اس قدر قرب حاصل کرلیا کہ خانہ کعبہ کو اپنے گرد گھومتے دیکھا ہے، درحقیقت وہ خود سرگردانی کا

---

[1] تفسیر الصراط المستقیم، جلد ۱، ص ۲۶۷

شکار ہوا ہے کیونکہ وہ خود کو خدا کے گھر کے طواف سے بے نیاز اور اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، جبکہ خود سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری سال میں ''حجۃ الوداع'' ادا کیا، مراسم حج کے طور پر خانہ کعبہ کا طواف اور دیگر مراسم بجالائے۔

کشف وشہود کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ معرفت کا یہ منبع، دوسرے منابع کی مانند نہیں ہے جیسے عقل، حس اور تاریخ وغیرہ ہوتے ہیں، بلکہ یہ ایک خصوصی منبع ہے جس کی سخت اور کڑی شرطیں ہیں۔ (غور کیجئے گا)

معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں

اشارہ

اب تک ہم معرفت اور شناخت کی منزلیں طے کرنے کے سلسلے میں کئی منازل طے کر چکے ہیں۔

ہم اپنے فکر اور عقل سے باہر کی حقیقتوں اور واقعیتوں کو قبول کر چکے ہیں اور یہ بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان کسی حد تک ان حقائق تک پہنچ سکتا ہے۔

حقیقت کی شناخت و معرفت کے لیے چھ منابع کو بھی اچھی طرح پہچان چکے ہیں۔

اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں سے پانچ منابع یعنی ''حس''، ''عقل''، ''فطرت''، ''تاریخ'' اور ''وحی'' کی عمومی حیثیت ہوتی ہے لیکن چھٹا منبع شہود باطنی کی حیثیت عمومی نہیں ہوتی بلکہ یہ مومنین اور اللہ کے اولیاء کے لیے خاص ہے۔

اب ہمارے راستے میں صرف دو منزلیں باقی رہتی ہیں جن سے گزر کر ہم اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں گے۔ ایک تو ہے ''معرفت کی راہ میں رکاوٹیں'' اور دوسری ہے ''معرفت کے معاونین'' لیکن اس وقت ہماری بحث کا موضوع ''معرفت کی راہ میں رکاوٹیں'' ہے۔

اس بات میں کسی قسم کا شک نہیں کہ دنیا کی مختلف موجودات اور اشخاص کے چہروں کو دیکھنے کے لیے صرف دو آنکھیں ہی کافی نہیں، بلکہ درمیان میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ اور حجاب بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہماری فضا کے اطراف کو سیاہ دھوئیں یا گہرے گرد و غبار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو تو ہم اپنے پاؤں کے ساتھ تک کی چیزوں کو بھی نہیں دیکھ پاتے۔ اسی طرح اگر آفتاب عالمتاب کہ جس کی روشنی ہر جگہ ضرب المثل ہے، تاریک اور گہرے بادلوں کے پیچھے چھپ جائے تو اسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔

اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں پر سیاہ عینک چڑھائے تو وہ یقیناً کسی بھی چیز کو نہیں دیکھ سکے گا اور اگر وہ رنگین ہو تو سب کچھ رنگین نظر آئے گا اگر اس کے شیشے میلے اور ناموزوں ہوں تو چیزوں کے چہرے کج مج یعنی ٹیڑھے ہی نظر آئیں گے۔ اگر کوئی شخص یرقان کی بیماری میں مبتلا ہو تو وہ ہر چیز کو زرد ہی دیکھے گا۔ اگر بھینگا کسی چیز کو دیکھتا ہے تو وہ اسے خلاف حقیقت نظر آتی ہے۔

بعینہٖ اسی طرح اس بات کا امکان بھی ہوتا ہے کہ انسان کی عقل اور فطرت کے لیے کچھ رکاوٹیں پیدا ہو جائیں اور تاریخ کے آئینہ کے سامنے ممکن ہے کہ کچھ موانع معرض وجود میں آ جائیں۔ جب رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں یا موانع ایجاد ہو جاتے ہیں تو ان کی وجہ سے وحی کا صحیح معنی میں ادراک اور کلام معصومین علیہم السلام کا صحیح معنی میں سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ ایسی رکاوٹوں اور موانع کے بارے میں تحقیقات کتنا ضروری ہے؟

چونکہ تفسیر موضوعی کی بحثوں میں ہم قرآنی روایات کی پیروی کرتے ہیں لہٰذا اس بارے میں بھی سب سے پہلے آیات کو بیان کریں گے اور ہم صرف ان موانع اور آفات کی بحث کریں گے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور یہ کام بنیادی ہے۔

معرفت کی رکاوٹوں کے بارے میں آیات قرآنی نے دوطرح سے بحث کی ہے، ایک تو کلی بحث ہے جو ''خبردار کرنے والی'' ہے اور دوسری جزئی بحث ہے جو'' آگاہ کرنے والی'' ہے۔لیکن فی الحال ہم کلی بحث کوشروع کرتے ہیں۔

کلی طور پر معرفت کے پردے

سب سے پہلے ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

آیات

(۱) اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ (سورہ فاطر ۸)

(۲) وَلٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَزَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴿۴۳﴾

(سورہ انعام ۴۳)

(۳) فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ

(سورہ آل عمران ۷)

(۴) کَلَّا بَلۡ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ﴿۱۴﴾ (سورہ مطففین ۱۴)

(۵) یَجۡعَلَ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ فِتۡنَۃً لِّلَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ (سورہ حج ۵۳)

(۶) وَّجَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً اَنۡ یَّفۡقَہُوۡہُ وَفِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرًا ؕ

(سورہ بنی اسرائیل ۴۶)

(۷) وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ لَّعَنَہُمُ اللّٰہُ بِکُفۡرِہِمۡ فَقَلِیۡلًا مَّا یُؤۡمِنُوۡنَ﴿۸۸﴾

(سورہ بقرہ ۸۸)

(۸) وَنَطۡبَعُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ﴿۱۰۰﴾ (سورہ اعراف ۱۰۰)

(۹) وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَفۡقَہُوۡنَ﴿۸۷﴾ (سورہ توبہ ۸۷)

(۱۰) خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫

(سورہ بقرہ ۷)

(۱۱) اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ (سورہ جاثیہ ۲۳)

(۱۲) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (سورہ محمد ۲۴)

(۱۳) فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

(سورہ حج ۴۶)

(۱۴) لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

(سورہ اعراف ۱۷۹)

ترجمہ

(۱) آیا وہ شخص جس کا برا عمل مزین ہوا ہے اور وہ اسے اچھا دیکھتا ہے.....

(۲) لیکن ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور وہ جو عمل بھی کرتے ہیں شیطان نے انہیں ان کے لیے مزین کر دیا ہے۔

(۳) لیکن وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی اور انحراف ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں تا کہ وہ فتنہ انگیزی کریں۔

(۴) بات وہ نہیں ہے جو وہ لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال ان کے دلوں پر زنگ کی طرح بیٹھ چکے ہیں۔

(۵) مقصد یہ تھا کہ خداوند عالم نے شیطانی القاء کو ان لوگوں کے لیے آزمائش قرار دیا جن کے دل میں بیماری ہے۔

(۶) جن کے دلوں پر ہم نے پردے قرار دیئے ہیں تا کہ وہ کچھ نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ہیں۔

(۷) اور انہوں نے (مذاق کے طور پر) کہا ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ خداوند عالم نے انہیں ان کے کفر کی وجہ سے دور کر دیا ہے۔ (اسی وجہ سے وہ کسی چیز کو درک نہیں کرتے) اور بہت کم ایمان لے آتے ہیں۔

(۸) اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں تا کہ وہ (حق کی آواز کو) نہ سن سکیں۔

(۹) اوران کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے لہٰذا وہ کچھ نہیں سمجھتے۔
(۱۰) خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اوران کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔
(۱۱) آیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات کو معبود قرار دے دیا ہے؟ اور خداوند عالم نے اسے جانتے ہوئے (کہ ہدایت کے لائق نہیں) گمراہ کیا ہے اوراس کے کان اور دل پر مہر لگادی ہے اوراس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔
(۱۲) آیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔
(۱۳) ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ جو دل سینوں میں ہیں وہ بینائی اور بصیرت کو کھو چکے ہیں۔
(۱۴) ان کے دل (عقلیں) ہیں وہ ان کے ساتھ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں وہ ان کے ساتھ دیکھتے نہیں۔ وہ تو چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ، وہی لوگ ہی تو غافل ہیں۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

سب سے پہلے ہم ان مختلف اور ظریف الفاظ پر ایک تحقیقی نظر ڈالتے ہیں جو مندرجہ بالا آیات میں انسان کے معرفت سے محروم ہونے اور شناخت کے مانع ہونے کے بارے میں استعمال ہوئے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک انسانی فکر کے انحراف اور معرفت سے محروم ہونے کے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے جو کہ کمزور مرحلے سے شروع ہوکر سخت اور خطرناک قسم کے مراحل تک جا پہنچتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ تشخص کی حس اس سے سلب ہوجاتی ہے، بلکہ حقیقت کا چہرہ اس کی نگاہوں میں الٹا نظر آتا ہے۔ وہ دیو کو فرشتہ، بدصورتی کی خوبصورتی اور باطل کو حق کی صورت میں دیکھتا ہے۔

"زیغ" ارباب لغت کے بقول "انحراف" یا "حق وصداقت سے انحراف" کے معنی میں ہے۔ اسی لیے ہم قرآن میں پڑھتے ہیں "ربنا لا تزغ قلوبنا" اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ایمان اور حق سے منحرف نہ فرما۔[1]

"ران"، "رین" (بروزن عین) کے مادہ سے ہے جس کے معنی وہ زنگ ہے جو قیمتی اشیاء پر چڑھتا ہے۔ یہ قول "مفردات" میں راغب" کا ہے۔ بعض دوسرے ارباب لغت نے کہا کہ "وہ سرخ رنگ کی تہہ ہے جو ہوا کی نمی کی وجہ سے لوہے جیسی دھاتوں پر چڑھ جاتی ہے" جسے اردو میں "زنگ" اور فارسی میں "زنگ" یا "زنگار" کہتے ہیں۔ اور یہ چیز عام طور پر دھات کی چیزوں کے گلنے سڑنے اور ضائع ہونے کی علامت اوران کی چمک اور شفافیت کے ختم ہوجانے کا سبب بنتی ہے۔

بعض ارباب لغت نے اس کی "ایک چیز کا دوسری چیز پر تسلط" یا "ایسے حادثے کا شکار ہونا جس سے نکلنا دشوار ہو" کے معنی میں تفسیر کی

---

[1] آل عمران ۸

ہے۔اسی لیے ''شراب'' کو بھی ''رینہ'' کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی عقل پر غالب آجاتی ہے۔[1]

''وقر'' (بروزعقل) اس قدر بہرے پن کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کسی بات کو بڑی مشکل سے سن سکے۔

''وقر'' (بروزن فکر) ہر طرح کے بوجھ کو کہتے ہیں خواہ وہ انسان کی پیٹھ پر ہو یا سر پر اور بوجھل اور بھاری چیزوں کو ''وقر'' بھی کہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ صاحبان عقل ومتانت کو ''صاحب وقار'' کہتے ہیں۔

''غشاوۃ'' کا معنی ہے ہر وہ چیز جو دوسری چیز کو چھپا لے۔اسی لیے پردے کو ''غشاوۃ'' کہتے ہیں اور قیامت کو بھی اسی لیے ''غاشیہ'' کہتے ہیں کہ اس سے اٹھنے والے ہر قسم کے اضطراب اور بے چینی سے سب چیزیں چھپ جائیں گی اور رات کی ایسی گہری تاریکی کو بھی ''غشاوۃ'' کہتے ہیں جو پردے کی مانند سطح زمین پر پڑتی ہے اور یہ لفظ ''خیمہ'' کے معنی میں بھی بولا گیا ہے۔

''اکنۃ''، ''کنان'' (بروزن زیان) کی جمع ہے جو دراصل ہر قسم کے اس پردے کے معنی میں ہے جس سے کسی چیز کو چھپایا جاتا ہے اور ''کن'' (بروزن جن) اس ظرف (برتن) کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھیں اور گھر پر بھی اور ہر اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جو انسان کو سردی اور گرمی سے بچاتی ہے اور دلوں پر ''اکنہ'' کے پڑنے کا مقصد یہ ہے کہ ان سے تشخص کی قوت سلب ہوگئی ہے۔

''غلف'' (بروزن قفل) ''اغلف'' کی جمع ہے جو ''غلاف'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں تلوار یا کسی اور چیز کا پردہ (نیام) وغیرہ اور ''قلوب غلف'' ایسے دلوں کی طرف اشارہ ہے جن میں حقائق اور واقعیت کے درک کی قدرت نہیں ہوتی۔گویا کہ وہ غلاف میں بند پڑے ہیں۔

''قست''، ''قسوۃ'' (بروزن مردہ) اور ''قساوت'' کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی ہیں سخت اور ٹھوس ہونا اور نرمی اور جھکاؤ کو ختم کر دینا اور ''قسی'' ناخالص چاندکو کہتے ہیں اور ''با قساوت دل'' وہ دل ہوتے ہیں جو حق اور عدالت کے سامنے ہر قسم کی نرمی اور جھکاؤ سے عاری ہوں۔

''نطبع''، ''طبع'' کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی کسی چیز پر نقش قائم کرنا ہے۔اسی لیے کرنسی سکوں اور ان پر قائم ہونے والے نقوش کو ڈھالنے کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے اور ان مہروں کو ''طابع'' (بروزن خاتم) کہتے ہیں جن کے ذریعہ خطوط پر مہر لگائی جاتی ہے۔

اور جب یہ کلمہ ''عقل'' اور ''دل'' کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے یہ اشارہ مقصود ہوتا ہے کہ ان میں حقیقت کے درک کرنے کی صلاحیت مفقود ہے۔کیونکہ ان کے دروازے بند کر کے ان پر مہر لگا دی گئی ہے۔

''طبع'' (بروزن عمل) کا لفظ ایسے زنگ کے معنی میں ہے جو تلوار پر چڑھ جاتا ہے اور جو گناہ اور معصیتیں انسان کے دل کو ڈھانپ دیتی ہیں ان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

''ختم'' (بروزن حتم) دراصل کسی چیز کے ختم کر دینے کو کہتے ہیں۔چونکہ خط کے مضمون کو مہر لگا کر ختم کیا جاتا ہے لہٰذا مہر کو

---

[1] تفسیر فخر رازی، سورہ مطففین کی ۱۴ ویں آیت کے ذیل میں اور ''المنجد'' مادہ ''دین''۔

''خاتم'' کہتے ہیں اور چونکہ گزشتہ زمانے میں بہت سے لوگوں کے نام کی مہران کی انگوٹھیوں پر ہوتی تھی اور وہ اپنی انگوٹھی کے ساتھ خطوط پر مہر لگایا کرتے تھے اس لیے مہر کو ''خاتم'' کہا جاتا ہے۔

گزشتہ زمانے سے اب تک یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ جب کسی خط، صندوق یا گھر کو بند کرنا چاہتے ہیں تا کہ اسے کوئی نہ کھول سکے ت و پہلے اسے دھاگے یا تالے سے بند کر دیتے ہیں پھر اس پر لاکھ یا مٹی رکھ کر مہر لگا دیتے ہیں تا کہ اگر کوئی اسے کھولنا بھی چاہے تو حتما اس لاکھ اور مہر کو توڑے۔

دلوں اور عقلوں کے بارے میں ایسی تعبیر کا استعمال کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر ناقص اور بے کار ہو چکے ہیں کہ انہیں کسی بھی صورت میں نہیں کھولا جا سکتا اور نہ ہی معرفت اور شناخت کی راہوں کو ان تک باز کیا جا سکتا ہے۔

آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

معرفت کی آفات کا بالتدریج اثر ورسوخ (کجی، زنگ، بیماری، پردہ اور تالہ)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ''معرفت کی رکاوٹوں'' کی بحث کی اہمیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے دو مرحلوں میں پیش کیا جائے۔

مرحلہ اول میں ان آفات اور موانع کے اجمالی وجود کا تذکرہ ہے۔ اس مرحلے میں یہ بتایا جائے گا کہ یہ انسان کی عقل، ادراک اور فطرت پر کیونکر اثر انداز ہوتے ہیں؟ اور معرفت کے ان عظیم سرچشموں کو کیونکر آلودہ کر دیتے ہیں؟ اور پھر انہیں معرفت کے کاموں سے کس طرح بیکار کر دیتے ہیں؟

مرحلہ دوم میں ان آفات وموانع میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی گفتگو، ان کے جزئیات اور خصوصیات کا بیان ہوگا اور اس بارے میں وارد ہونے والی قرآنی آیات کا ذکر ہوگا۔ یہ نہایت ہی مفصل، مدلل اور سبق آموز بحث ہوگی۔

سب سے پہلے ہم مرحلہ اول کا ذکر کریں گے۔ قابل توجہ یہ چیز ہے کہ قرآن مجید ان آفات کے بالتدریج اور مخفی اثر ورسوخ کے بارے میں اس قدر جچی تلی اور دقیق گفتگو کرتا ہے کہ علم ودانش اور معرفت کے راہیوں کو ان عظیم خطرات سے مکمل طور پر آشنائی حاصل ہو جاتی ہے اور انہیں پے در پے متنبہ کر رہا ہے کہ مبادا ہماری زندگی آب کی بجائے سراب کی تلاش میں گزر جائے اور ہم اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں اور سالہا سال حقیقت کی تلاش میں گزارنے کے بعد بھی ہم باطل کے دروازے پر کھڑے نظر آئیں۔

اب ہم مل کر مندرجہ بالا آیات کی تحقیق کرتے ہیں۔

پہلی اور دوسری آیات میں انسانی اعمال کے مزین ہونے کی بات ہو رہی ہے اور تزیین یا تو شیطان کے ذریعے عمل میں آتی ہے (جیسا کہ دوسری آیت میں بیان ہوا ہے) یا پھر خود انسان کی ذہنی سجاوٹوں اور خیالی پلاؤ پکانے کے ساتھ ساتھ ''سبز باغوں'' کی سیر کے ذریعہ، یا کسی اور عامل کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ (جیسا کہ پہلی آیت میں بصورت سربستہ اور فعل مجہول کے عنوان سے اس کا تذکرہ ہے)۔ ارشاد ہوتا

ہے: ''آیا وہ شخص جس کا برا عمل مزین ہوا ہے اور وہ اسے اچھا دیکھتا ہے'' اس شخص کی مانند ہے جو اس طرح نہیں ہے؟ یقینی بات ہے کہ پہلا شخص حتمی تباہی اور بربادی کی طرف جا رہا ہے جبکہ دوسرا شخص خدا کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر گامزن ہے اور اگر اس سے کوئی برائی سرزد ہو بھی جاتی ہے تو فوراً اس کی توبہ، بازگشت اور تلافی کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔

دوسری آیت میں اضافہ ہوتا ہے کہ پہلے تو انسان کا دل سخت اور مڑنے کی قابلیت سے نکل جاتا ہے۔ پھر وہ شیطانی وسوسوں اور اچھائیوں کے لباس میں ظاہر ہونے والی برائیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کچھ لوگ نہ صرف اپنے نازیبا اعمال سے متنفر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ان پر نازاں بھی ہوتے ہیں، حتی کہ ان اعمال کے مفید اور منطقی ہونے پر مصر ہوتے ہیں۔

یہی چیز حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان میں بیان ہوئی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی انہیں کنویں میں ڈال کر ان کا خون آلود کرتہ اپنے باپ (حضرت یعقوبؑ) کے پاس لے آئے اور اس بات کا دعویٰ کرنے لگے کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے اور ہم اس بات میں سچے ہیں، تو ان کے روشن ضمیر بوڑھے باپ نے انہیں کہا:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ

''تمہاری نفسانی خواہشوں نے اس کام کو تمہارے لیے مزین کیا ہے۔'' (یوسف ۱۸)

یعنی تم یہ خیال کرتے ہو کہ اس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر کے تم نے اچھا کام کیا ہے اور یوسف کو ضائع کر دینے سے باپ کے دل میں ان کی خالی جگہ تم لے لو گے اور یوسف ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے؟ حالانکہ تم اس بات سے غافل ہو کہ تم خود ہی تو یوسف کی عزت اور حکومت کے اسباب اپنے ہاتھوں سے فراہم کر رہے ہو اور باپ کے دل میں ان کی جگہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خالی کر رہے ہو تا کہ ''بارِ دیگر گمشدہ پیدا شود'' (ایک بار پھر گمشدہ مل جائے گا)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآنی آیات میں ''تزئین کی'' کہیں پر تو ''شیطان'' کی طرف نسبت دی گئی ہے اور کہیں پر ''نفس'' کی طرف اور کہیں پر فعل مجہول کی صورت میں بیان ہوئی ہے اور پھر کہیں پر خدا کی طرف منسوب ہے۔ جیسے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ

''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، حساب و کتاب، سزا و جزا اور خدائی انصاف کی عدالت سے بے خبر ہیں، ہم ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں مزین کر دیتے ہیں۔'' (سورہ نمل ۴)

درحقیقت یہ سب ایک ہی چیز کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ شروع شروع میں ایسے کاموں کے مقدمات خود انسان فراہم کرتا ہے پھر شیطان اس میں رنگ بھرتا ہے۔ چونکہ خداوند عالم مسبب الاسباب اور علت و معلول کا خالق ہے لہٰذا ان کاموں کے نتیجہ کی نسبت اس کی طرف دی جاتی ہے۔ اس کی حکمت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایسے افراد ایسے ہی انجام سے دوچار ہوں۔ کس قدر دردناک ہے اس شخص کا حال جس کی نظر میں برائیاں، اچھائیوں میں تبدیل ہو کر جلوہ افروزی کرتی ہیں۔

تیسری آیت میں انحراف قلب کے سب سے پہلے مرحلہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد قرآنی آیات کو ''محکمات'' (یعنی وہ آیات جن کا مفہوم مکمل طور پر واضح اور روشن ہے) اور ''متشابہات'' (جن آیات کے معانی پیچیدہ ہیں) یعنی دو حصوں میں تقسیم کر کے فرماتا ہے۔ ''علم و دانش میں راسخ لوگ ان سب آیات پر ایمان لے آتے ہیں'' (اور متشابہ آیات کی محکم آیات کے ساتھ تفسیر کرتے ہیں)۔ لیکن جن کے دلوں میں ''زیغ''، یعنی کجی ہے وہ متشابہ آیات کی اپنی مرضی کے مطابق تفسیر کر کے فتنہ انگیزی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔''

وہ ہمیشہ اپنے غلط اور ناجائز مقاصد کی توجیہہ کے لیے آیات متشابہ کا سہارا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے منافقین، صاحبان بدعت اور گمراہ کن مکتب کے پیروکار جہاں پر دیکھتے ہیں کہ وہاں پر رہنے والے لوگ خلوص قلب کے ساتھ قرآنی آیات پر مکمل طور پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ اس پاکیزہ عقیدے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے متشابہ آیات کی ''تفسیر بالرائے'' کر کے اپنی بدعتوں کو فروغ دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر چونکہ ان کے اپنے ہی قلب و فکر ہوتے ہیں لہٰذا وہ قرآنی آیات کو بھی منحرف دیکھتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے ٹیڑھے اور کج مج آئینے میں صورتیں بھی ٹیڑھی ہی نظر آتی ہیں۔

چوتھی آیت میں دلوں کے زنگ کا مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے۔ گناہ آلودہ اعمال سے جو گرد و غبار دل پر بیٹھ جاتا ہے اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تہہ در تہہ جم کر پتھر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور زنگ کی مانند تمام دل کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے: ''بات وہ نہیں جو یہ لوگ سمجھے ہوئے ہیں بلکہ ان کے برے اعمال زنگ کی مانند ان کے دلوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ حقیقت کے چہرے کو نہ دیکھ کر اس کی تشخیص نہ کریں تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔

پانچویں آیت میں اس حالت میں شدت پیدا ہو جانے اور اس کے ایک اندرونی بیماری میں تبدیل ہونے کا تذکرہ اور شیطانی وسوسوں اور وہ بھی انبیاء اور مرسلین کی موجودگی میں ذکر کے بعد فرماتا ہے: ''یہ ماجرا اس لیے ہے تا کہ خداوند عالم شیطانی القاء کو ان لوگوں کے لیے فتنہ قرار دے جن کے دلوں میں بیماری ہے۔''

جی ہاں! یہ بیمار دل ہی تو ہیں، حقیقت کا لذیذ ذائقہ جن کے کام و دہن میں تلخ ہوتا ہے اور تلخی جن کے لیے شیرینی ہوتی ہے اور یہ سب شیطانی وسوسوں کی بدولت ہوتا ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ قرآن مجید کی بارہ آیات میں "فی قلوبهم مرض" یا "فی قلبه مرض" کا جملہ ذکر ہوا ہے۔ یہ تکرار اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید نے اس چیز کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ یہ بھی قابل غور بات ہے کہ قرآن پاک کی یہ آیات غالب طور پر منافقین کے بارے ہی میں ہیں اور بارہ آیات میں سے کئی آیات میں بڑی صراحت کے ساتھ منافقین کا نام لیا گیا ہے۔[1]

لیکن مذکورہ آیات میں سے بہت کم آیات میں یہ ''مرض''، ''سرکش شہوات اور ہوس آلود رجحانات'' کے معنی میں ہے، جیسا کہ سورہ احزاب کی ۳۲ ویں آیت ازواج پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے "فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبه مرض" ہوس

---

[1] انفال ۴۹، احزاب ۱۲، احزاب ۳۲

انگیز طریقے سے باتیں نہ کرو ورنہ جن لوگوں کے دل میں بیماری ہے وہ طمع کریں گے۔

بہرحال ان آیات سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ جسمانی بیماری کے علاوہ ایک اور بیماری بھی انسان کو عارض ہوتی ہے جو روحانی یا قلبی بیماری کہلاتی ہے اور بیماری کی یہ قسم کبھی تو ''نفاق'' کی وجہ سے اور کبھی ''سرکش نفسانی خواہشات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے؟ انسان کے روحانی ذائقہ کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے جس طرح اکثر جسمانی امراض کے مریضوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لذیذ اور شیریں غذاؤں سے متنفر ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات وہ نفرت انگیز غذاؤں کی خواہش کرتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ اس قسم کے لوگ حقائق کے ادراک پر قادر نہیں ہوتے، اور صحیح اور سچے معارف سے اجنبی ہوتے ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر قابل افسوس بات یہ ہے کہ وہ جس قدر بھی اس راہ پر گامزن ہوتے جاتے ہیں یہ مرض اس قدر شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ پہلے وہ شک کے مرحلے میں ہوتے ہیں، تو آہستہ آہستہ نوبت انکار تک پھر انکار سے استہزا اور حق کے ساتھ مخالفت کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: "فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا" ان کے دلوں میں بیماری ہے اور خداوند عالم ان کی بیماری میں اضافہ کر دیتا ہے۔ "ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون" اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (بقرہ ۱۰)

چھٹی آیت میں گونا گوں حجابوں اور پردوں کا ذکر ہے جو دلوں پر پڑتے ہیں، ایک نہیں کئی پردے۔ جیسا کہ فرماتا ہے ''ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تا کہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں سنگینی قرار دی ہے۔''

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "اکنہ" کی تعبیر بہت زیادہ تعداد میں پردوں پر دلالت کرتی ہے۔[1] اس میں شک نہیں ہے کہ ان کے ظاہر کان بہرے نہیں ہیں بلکہ ان کے دل کے کان سنگین اور بہرے ہوتے ہیں اور حق کی باتیں نہیں سن سکتے۔ اسی طرح اس دل پر پردہ نہیں پڑتا جو بدن میں خون کی گردش کا وسیلہ ہوتا ہے بلکہ ان کی عقل اور روح پر پڑتا ہے۔

لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ممکن ہے کہ خداوند عالم کسی کے دل پر پردے ڈال دے اور کانوں کو بہرا کر دے تا کہ وہ نہ تو حق کو سن سکے اور نہ ہی اس کا ادراک کر سکے؟

بہت سے مفسرین اس سوال کے جواب میں اشکال کا شکار ہو گئے ہیں۔ کبھی تو یہ کہا کہ یہ ایک معجزہ تھا کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متعصب دشمنوں کی نگاہوں سے چھپ جایا کرتے تھے اور وہ آپؐ کی باتوں کو نہیں سن پاتے تھے تا کہ وہ اس طرح سے آنجنابؐ کے پروگراموں میں روڑے نہ اٹکائیں اور آپؐ کی اذیت سے باز رہیں۔

کبھی کہا کہ خداوند عالم اس قسم کے لوگوں سے اپنی مہربانیاں سلب کر لیتا تھا اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا تھا اور دلوں پر پردہ ڈالنے اور کانوں کو بہرہ کرنے کے معنی یہی ہیں۔

---

[1] تفسیر روح المعانی، جلد ۱۵، ص ۸۲

لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ اس آیت کے اور اس جیسی دوسری اور اس سے ملتی جلتی کئی اور آیات کے معنی کچھ اور ہیں۔ درحقیقت یہ ایک سزا ہے جو خداوند عالم نے متعصب، تنگدل، خودخواہ، مغرور اور گناہگار لوگوں کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ان کا حقیقت کے ادراک سے محروم ہوجانا ان کی منحوس صفات اور قبیح افعال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے یہ خاصیت ان کے ان افعال میں ہی خلق فرمادی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے زہر قاتل میں خلق فرمائی ہے کہ جب کوئی انسان اسے جان بوجھ کر کھاتا ہے یا خود کو آگ میں ڈالتا ہے تو آگ اور زہر کے خالق کا قصور نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس شخص کو ہی ملامت کیا جاتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟

ساتویں آیت میں یہود کی زبان سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ وہ استہزاء کے طور پر پیغمبر اسلامؐ (یا دوسرے انبیاء) سے کہتے تھے ''تم تو جانتے ہو کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں اور ہم تمہاری کسی بات کو نہیں سمجھ سکتے۔'' قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "**بل العنهم الله بكفرهم فقليلا مايومنون**" یعنی جی ہاں یہی بات ہے کہ خداوند عالم نے انہیں ان کے کفر کی خاطر ہی لعنت کی ہے اور اپنی رحمت سے دور کردیا ہے اور اس قسم کے لوگ حقیقت کا خوبصورت چہرہ کیونکر دیکھ سکتے ہیں!

ممکن ہے کہ ''غلاف'' کی تعبیر کا مفہوم "اکنہ" (کئی پردے) کے مفہوم سے بالاتر ہو کیونکہ ''غلاف'' کسی چیز کو تمام اطراف سے ڈھانپ لیتا ہے، جبکہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ پردہ کسی چیز کی ایک طرف کو چھپائے اور دیکھنے سے مانع ہو۔ یا دوسرے لفظوں میں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ معرفت سے روکنے والی چیز صرف ایک طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً صرف فطری مسائل یا عقلی مسائل کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تمام جہات سے معرفت اور شناخت کے منابع پر پردے پڑ جاتے ہیں اور تمام انسانی ادراکات ایک غلاف میں چھپ جاتے ہیں۔

اور بات بھی یہی ہے کہ انسان جس قدر گناہوں سے آلودہ اور فساد میں گرفتار ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کا قلب اور روح بھی حقائق کے مشاہدہ سے دور سے دور تر اور محروم سے محروم تر ہوتے جائیں گے۔

آٹھویں اور نویں آیت میں دلوں پر مہر لگانے کی بات ہو رہی ہے جو اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ انسان حقائق اور واقعیات کا ادراک نہیں کرسکتا۔ (آٹھویں آیت میں) فرماتا ہے "**فهم لايسمعون**" (وہ نہیں سنتے) اور نویں آیت میں فرماتا ہے: "**فهم لايفقهون**" (وہ نہیں سمجھتے) اور چونکہ سننے سے مراد دل کے کانوں سے سننا ہوتا ہے، لہٰذا دونوں کے معنی ایک ہوتے ہیں۔

یہ نہایت ہی سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے دل پر پردہ پڑتا ہے، پھر دل غلاف میں لپٹ جاتا ہے اور آخرکار ہر قسم کے اثر و رسوخ کو روکنے اور دل میں کسی کے اثر کرنے سے بچاؤ کے لیے اس پر مہر لگادی جاتی ہے، جیسا کہ قبل ازیں الفاظ کے معانی اور تشریح کی بحث میں بیان کیا جاچکا ہے۔

البتہ وہ اس رسوا کن انجام سے بلاوجہ دوچار نہیں ہوتے بلکہ اس سے پہلے کی آیات کی رو سے یہ صراحت موجود ہے کہ منافقین کے اس گروہ کو جب جہاد کا حکم ملتا ہے تو وہ کہتے ہیں ''آپ ہمیں رہنے دیں تاکہ ہم قاعدین کے ساتھ رہیں۔'' کیونکہ قاعدین (جہاد نہ کرنے والے) جہاد سے ہوتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے کہ ''وہ اس بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ وہ جہاد نہ کرنے والوں کے ساتھ رہیں'' اور جو شخص جہاد کی قدرت رکھنے کے

باوجود جہاد سے روگردانی کریں، بعید نہیں ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہو۔

دوسری آیت میں فرماتا ہے: باوجودیکہ انہوں نے اپنے سے پہلے لوگوں کی حالت کو دیکھ لیا ہوا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے کیونکر عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے ہیں، پھر بھی وہ بیدار نہیں ہوتے، البتہ ایسے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک مقام پر (آٹھویں آیت میں) فرماتا ہے: ''ہم ان کے دلوں پر مہر لگاتے ہیں۔'' اور دوسرے مقام پر (نویں آیت میں) فرماتا ہے۔ ''اس کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔'' جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ان کی اپنی بداعمالیوں اور برے کاموں کا نتیجہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس قسم کی آیات میں ''طبع'' سے مراد وہ نقش ہوتا ہے جو سکے پر بنایا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک بادوام، پائیدار اور باقی رہنے والا نقش ہوتا ہے اور آسانی کے ساتھ نہیں مٹتا۔[1] ان کے دل کے سکوں نے بھی کفر و نفاق اور گناہ کا نقش اپنایا ہوا ہے جو اتنی جلدی سے تبدیل نہیں ہوگا۔

دسویں اور گیارھویں آیت میں ''ختم'' کی بات ہو رہی ہے اور جیسا کہ الفاظ کے معانی کی بحث میں بیان ہو چکا ہے اس کے معنی کسی چیز کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے، اور چونکہ خطوط کو آخر میں مہر لگا دیتے ہیں لہٰذا یہ لفظ مہر لگانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور مہر لگانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اس حد تک بند کر دیا جائے اور لاکھ لگا دی جائے کہ اسے کوئی شخص کھول نہ سکے۔ مندرجہ بالا آیات میں جو فرماتا ہے کہ ''خداوند عالم کچھ متعصب کفار کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دیتا ہے'' ''مہر'' سے مراد یہ ہے کہ ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ان سے تشخیص کی حس کو مکمل طور پر اس طرح سے سلب کر لیتا ہے کہ وہ حق کو باطل سے اور نیک کو بد سے تشخیص نہیں دیتے۔ اسی لیے اس سے پہلی آیت میں فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝٦

(بقرہ ٦)

''جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے ان کے لیے فرق نہیں ہے کہ ان کو خدائی عذاب سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ وہ ایمان نہ لائیں گے۔''

یقیناً یہ حکم تمام کفار کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ ان سے مراد وہ متعصب کفار ہیں جو حق کے ساتھ عناد اور دشمنی رکھتے ہیں اور گناہ، ظلم اور فساد میں اس قدر آلودہ ہو چکے ہیں کہ ان کے دل مکمل طور پر تاریک اور ظلمانی ہو چکے ہیں، وگرنہ پیغمبر کا کام ہی منحرفین اور کفار کو ڈرانا، بشارت دینا اور ہدایت کرنا ہی تو ہوتا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان آیات میں صرف دل پر مہر لگانے کی بات ہی نہیں ہے بلکہ فرماتا ہے: ''آنکھیں اور کان بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔'' یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف عقلی ادراکات ہی بے کار نہیں ہو جائیں گے بلکہ جو وہ حس کے ذریعہ دیکھتے یا سنتے

---

[1] تفسیر المنار، جلد ۹، ص ۳۳

ہیں، اس حد تک بے اثر ہو جائیں گے کہ گویا نہ تو انہوں نے کچھ دیکھا ہے اور نہ ہی سنا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انسان کو اکثر و بیشتر علوم انہی دو راستوں سے ہی حاصل ہوتے ہیں، حتی کہ انسانی وحی اور دعوت انبیاء کی حقانیت کو بھی ان دو راستوں سے پیدا کرتا ہے اور ان دونوں عظیم راستوں کے بیکار ہو جانے سے ہدایت اور نجات کے راستے ان کے لیے بالکل بند ہو جاتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جسے وہ خود چاہتے تھے، یعنی ایسی آگ ہے جسے انہوں نے خود ہی بھڑکایا ہے اور یہ ہرگز جبر کا نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ بعض بے خبر لوگ سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید کی جن بعض آیات میں ''طبع'' کا لفظ آیا ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ مثلاً فرماتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ

''یہ وہ لوگ ہیں خدا نے جن کے ''قلب''، ''کان'' اور ''آنکھوں'' پر مہر لگا دی ہے اور وہی لوگ ہی حقیقی غافل ہیں۔'' (نحل ۱۰۸)

اس سے پہلے کی آیات بھی یہ بتاتی ہیں کہ یہ تمام کفار کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ان کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنا سینہ کفر کے لیے کھول دیا ہے اور اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا (نحل ۱۰۶)

بارھویں آیت میں ان تالوں کی بات ہو رہی ہے جو دلوں پر ڈالے جاتے ہیں، ایسے تالے کہ بسا اوقات ان کی تاثیر مہروں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔[1] ارشاد فرماتا ہے ''آیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟'' یعنی قرآنی آیات اس طرح ہیں کہ اگر انسان کی عقل یا دل کا تھوڑا سا راستہ بھی کھلا ہوا ہو تو اس میں نفوذ کر جاتی ہیں۔ قرآن کی منطق، قرآن کا دلچسپ اور شیریں بیان، قرآن کی عمیق و دقیق تحلیلیں اور قرآن کا وہ مخصوص نور اور روشنائی ہر اس دل پر اثر کرتے ہیں اور اسے اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں جس میں آمادگی پائی جاتی ہے اور جو لوگ سنتے تو ہیں لیکن ان پر ذرہ بھر اثر نہیں ہوتا، ان میں حق کی قبولیت کی قطعاً کوئی آمادگی نہیں ہوتی۔

''اقفال''، ''قفل'' کی جمع ہے۔ جو دراصل ''قفول'' کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ''لوٹ آنا'' اور چونکہ جب دروازے کو بند کرنے کے بعد اسے تالا لگا دیتے ہیں تو جو بھی وہاں آتا ہے وہ واپس پلٹ جاتا ہے، یہ لفظ معمولی تالے پر بولا جاتا ہے۔

''افقال'' (جمع کے صیغہ کی صورت میں) کا استعمال شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ دل پر صرف ایک تالہ ہی نہیں پڑتا بلکہ بعض اوقات تو کئی تالے پے در پے اس پر ڈالے جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کو کھولا جائے تو بقیہ تالوں کا وجود دل کے دروازوں کے کھلنے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ چیز درک حقائق سے محرومی کا بالاترین مرحلہ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ ''قلوب'' کو ان کی طرف اضافت نہیں کی گئی بلکہ اسے ''نکرہ'' کی صورت میں لایا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کے دل، جو کسی کام کے نہ ہوں، گویا وہ ان کے دل نہیں ہیں اور پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ ''اقفال'' کو ''قلوب'' کی

---

[1] فخر رازی نے بھی اپنی تفسیر میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد ۲۸ ص ۶۶

طرف مضاف کیا گیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ گویا اس طرح کے دل اسی قسم کے تالوں کے لائق ہوتے ہیں اور یہ تالے انہی کے لیے ہیں اور انہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تیرھویں آیت میں ایک اور لرزا دینے والی تعبیر نظر آتی ہے۔ آیت کہتی ہے: ''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں موجود دل نابینا ہوجاتے ہیں۔'' یعنی اگر ظاہری آنکھیں اندھی ہوجائیں تو پریشانی کی بات نہیں ہے کیونکہ بیدار عقل اس کے قائم مقام ہوسکتی ہے۔ بدبختی اور بے چارگی تو اس دن ہوگی جب چشم دل نابینا ہوجائے اور یہی کوردلی حقیقت کے ادراک سے بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جسے انسان خود ہی اپنے ہاتھوں سے فراہم کرتا ہے، کیونکہ تجربہ گواہ ہے کہ اگر انسان ایک لمبے عرصے تک تاریکی میں رہے، یا آنکھیں کو مضبوطی سے باندھے رکھے تو وہ آہستہ آہستہ اپنی حس بینائی کھو دیتا ہے۔ اس طرح جو لوگ اپنی چشم دل کو حقائق کے دیکھنے سے بند کر دیتے ہیں اور ایک مدت مدید تک جہالت، خودخواہی، غرور اور گناہوں کے گڑھے میں پڑے رہتے ہیں، وہ دل کی بنائی کو کھو دیتے ہیں۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جو دل سینے کے اندر ہے وہ روح اور عقل کے معنی میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ تو گوشت کا وہی ٹکڑا ہے جو تمام اعضائے بدن تک خون پہنچانے پر مامور ہوتا ہے۔ لیکن ایک نکتے پر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ ''صدر کا ایک معنی انسان کی ذات اور سرشت ہے۔ بنابریں ''اقلوب التی فی الصدور'' اس عقل وادراک کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ''قلب'' انسانی جسم کا سب سے پہلا عضو ہے جس میں تمام عاطفے، ادراکات اور جذبات واحساسات منعکس ہوتے ہیں۔ ایک اہم فیصلہ، سخت غصے کی ایک حالت، قومی محبت اور دوستی کا ایک حساس فوراً دل کی دھڑکنوں کو دگرگوں کر دیتا ہے اور اگر یہی ظاہری دل عقل سے کنایہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا روح اور جان کے ساتھ قریبی رابطہ ہوتا ہے۔ [1]

زیر بحث سلسلے کی چودھویں اور آخری آیت میں معرفت سے محرومی کا مرحلہ اپنی انتہا کو جا پہنچتا ہے اور عقل وفطرت اور گوش وچشم مکمل طور پر بے کار ہوجاتے ہیں اور وہ بھی اس حد تک کہ انسان چوپایوں بلکہ ان سے بھی پست تر حد تک جا گرتا ہے۔

یہ آیت جہنمیوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہے جو گویا جہنم ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ''ان کے لیے دل ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں، وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں'' یقیناً وہ اس کیفیت کے ساتھ اپنا انسانی طرۂ امتیاز کھو کر جانوروں کی صف میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں۔ لہٰذا آگے فرماتا ہے ''وہ چوپایوں جیسے ہیں'' اور چونکہ چوپائے انسانی استعداد سے محروم ہوتے ہیں، لیکن یہ گروہ اس چیز کے ہوتے ہوئے بھی اس انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی لیے خدا فرماتا ہے ''بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں اور حقیقی معنی میں غافل یہی لوگ ہیں۔''

اس طرح سے وہ اپنی ''انسانی خاصیت'' کو کھو چکے ہوتے ہیں اور واپسی کی راہیں بھی گم کر چکے ہوتے ہیں۔ اوج سعادت سے بدبختی

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول، سورہ بقرہ کی ساتویں آیت کی تفسیر اور جلد ۱۴ کی طرف رجوع فرمائیں۔

کے گڑھوں اور ذلت ورسوائی کے کھڈوں میں جا گرتے ہیں۔ معارف کے تمام دروازے ان پر بند ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ ان لوگوں کا انجام ہے جنہوں نے اپنے اعمال ہی کے ذریعے اور اپنے ہی ہاتھوں سے جس کے اسباب فراہم کیے ہیں۔

آخری نتیجہ

مندرجہ بالا چودہ آیات کہ جن کے نمونے قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں اور ہم نے ان خصوصیات کے تحت ان آیات کو یہاں پر بحث کے لیے درج کیا ہے، جو ان میں پائی جاتی ہیں، مجموعی طور پر اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کرتی ہیں کہ انسانی معرفت کے ذرائع اور منابع، خصوصاً عقل وفطرت اور احساس، ممکن ہے کہ ایسی آفتوں کا شکار ہو جائیں جو بعض اوقات خفیف ہوتی ہیں اور بعض اوقات شدید ہوتی ہیں اور کبھی تو اس قدر غالب آ جاتی ہیں کہ انسان کو مکمل ظلمت اور تاریکی میں اس حد تک غرق کر دیتی ہیں کہ وہ واضح ترین حسی حقائق تک کو بھی درک نہیں کر سکتا۔

ہماری کوشش رہی ہے کہ اس تدریجی انحراف کو اس کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر آخری مرحلہ تک قرآنی آیات کے ساتھ بیان کریں۔ ہمیں اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ اس کی طبعی ترتیب بھی وہی ہے جو مندرجہ بالا آیات کی ترتیب میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ آیات مندرجہ بالا آفات کے اثر ورسوخ اور نفوذ کو اس کے تمام مراحل میں بیان کر سکتی ہیں۔

اس بارے میں قرآن مجید کی تعبیریں کس قدر زیبا اور کیسی حساب شدہ ہیں، کبھی تو بیرونی عوامل مثلاً ''شیطانی تزئین'' کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہیں:

کبھی تو قلب وفکر کے انحراف کی باتیں ہوتی ہیں۔

کبھی زنگ کے مرحلہ تک بات جا پہنچتی ہے۔

کبھی یہ انحراف ایک بیماری اور مرض مزمن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کبھی دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔

کبھی دل مکمل طور پر پردوں میں لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔

کبھی دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور مستقل نقش اس پر قائم کر دیا جاتا ہے۔

کبھی اسے بند کر کے لاکھ کے ذریعہ اس پر مہر لگا دی جاتی ہے۔

کبھی بات اس سے آگے چلی جاتی ہے اور آنکھ اور کان بھی پردوں میں لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔

کبھی دلوں پر پختہ تالے ڈال دیئے جاتے ہیں۔

کبھی مطلق نابینائی کی نوبت آ جاتی ہے۔

اور آخر کار اس سے انسانی خصوصیات چھین لی جاتی ہیں اور اسے حیوانوں اور چوپایوں کے مرحلہ تک لے جا کر پھر اسے اس سے بھی

پست درجے میں گرادیا جاتا ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اس قسم کی گوناگوں بدبختیوں اور مختلف الانواع مصائب کا سبب کیا چیز ہے اور کیا چیز انہیں فراہم کرتی ہے، تو یہ بات آئندہ کی بحثوں کا موضوع ہے۔ یہاں پر تو صرف واضح طور پر یہ بیان کرنا تھا کہ معرفت کے یہ منابع کیونکر بے کار ہوجاتے ہیں، تاکہ ہم ان کے مختلف علل اور عوامل تک رسائی حاصل کرلیں۔

پھر اس بیماری کے علاج، ان پردوں کے ہٹانے اور اس زنگ کو دور کرنے اور اس مرحلہ تک پہنچنے کے سدباب کہ جس سے واپسی ناممکن ہوتی ہے کے راستے تلاش کیے جائیں۔

ہم اس بحث کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس فرمان مبارک پر ختم کرتے ہیں کہ:

"ان لك قلبا و مسامع وان الله اذا اراد ان يهدى عبد الفتح مسامع قلبه واذا ارادبه غير ذالك ختم مسامع قلبه فلا يصلح ابدا، وهو قول الله عزوجل ام على قلوب اقفلها"

"تمہارے لیے ایک دل ہے اور کئی کان (تیرے دل تک پہنچانے کے رستے ہیں) اور جب خدا کسی بندہ کو (اس کے جہاد وتقویٰ کی بدولت) ہدایت کرنا چاہتا ہے تو اس کے کانوں کو کھول دیتا ہے اور جب اس کے علاوہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل کے کانوں پر مہر لگا دیتا ہے، اس طرح کہ اس کی ہرگز اصلاح نہیں ہوسکتی اور یہ ہیں خداوند عزوجل کے اس قول کے معنی "ام علی قلوب اقفلها"۔ [1]

---

[1] تفسیر نورالثقلین، جلد ۵، ص ۴۱

معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں

(تفصیل کے ساتھ)

اشارہ

گزشتہ بحث میں انسان پر شناخت کے دروازے اور معرفت کے راستوں کے بند ہونے کا اجمالی تذکرہ تھا۔لیکن اب اس دردناک چیز کے ''عوامل اور اسباب'' کی بات ہوگی۔ یہ ایسی دردناک چیز ہے جو انسان کو ایک چوپائے یا اس سے بھی کمتر درجے تک پست کر دیتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے امور ہیں جو اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ انسان کے دل پر زنگ چڑھ جائے، اس کے دل کے کان بہرے ہو جاتے ہیں، اس کی چشم دل اندھی ہو جاتی ہے۔اس کی عقل کا ترازو اپنا توازن کھو دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کو نہیں دیکھ سکتا یا اگر دیکھتا ہے تو الٹا؟

قرآن مجید میں اس اہم مسئلے کے بارے میں بہت سے مقامات پر گفتگو ہوئی ہے اور اس کے اصل عوامل کو بیان کیا گیا ہے۔ایک سادہ سی گروہ بندی میں اسے تین حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ روحانی اور اخلاقی صفات جو دل کی آنکھوں کا حجاب بن جاتی ہیں۔

۲۔ وہ اعمال اور کردار جو دل کے آئینہ کو تاریک کر دیتے ہیں۔

۳۔ وہ بیرونی عوامل جو انسان کی فکر، عقل، عواطف اور فطرت پر اثر اور ان پر پردے ڈالتے ہیں۔

ان تینوں عنوانات میں سے ہر ایک پر ہم جداگانہ تفصیلی نگاہ ڈالیں گے اور مفصل بحث کریں گے (ایک بار پھر تاکید کی جاتی ہے کہ ایسے امور کو بیان کیا جائے گا جو قرآنی آیات میں منعکس ہیں اور واضح طور پر ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔

الف: وہ صفات جو معرفت سے مانع ہیں:

یہ ایسی صفات ہیں جو کہیں پر تو صریحی طور پر اور کہیں پر اشاروں اشاروں میں قرآنی آیات میں ان پر گفتگو کی گئی ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ خواہش پرستی کا حجاب

سب سے پہلے ہم مندرجہ ذیل آیات کو دل کے کانوں کے ساتھ سنتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلۡمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنۡ یَّهۡدِیۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۳﴾ (جاثیہ ۲۳)

(۲) كُلَّمَا جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَهۡوٰۤی اَنۡفُسُهُمُ ۙ فَرِیۡقًا كَذَّبُوۡا وَفَرِیۡقًا یَّقۡتُلُوۡنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوۡۤا اَلَّا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ فَعَمُوۡا وَصَمُّوۡا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ ثُمَّ عَمُوۡا وَصَمُّوۡا كَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۱﴾ (سورہ مائدہ ۷۱-۷۰)

(۳) وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُ اِلَیۡكَ ۚ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ قَالُوۡا لِلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ ﴿۱۶﴾ (سورہ محمد ۱۶)

ترجمہ

(۱) آیا تو نے اسے دیکھا ہے جس نے اپنا معبود اپنی نفسانی خواہشات کو قرار دیا ہے اور خداوند عالم نے (یہ جانتے ہوئے (کہ وہ شائستہ ہدایت نہیں) اسے گمراہ کیا ہے اور اس کے کان اور آنکھ پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے، تو پھر کون ہے کہ خدا کے علاوہ اسے ہدایت کرے؟ کیا تم نہیں سمجھتے ہو؟

(۲) جب کوئی بھی پیغمبر ان کی خواہشات کے خلاف ان کے پاس آیا تو کچھ انبیاء کو تو وہ جھٹلاتے تھے اور کچھ کو وہ قتل کر دیتے تھے، اور گمان کرتے تھے کہ کوئی سزا نہیں ہوگی، لہٰذا وہ (حق کی بات سننے اور حقائق کو دیکھنے سے) اندھے اور بہرے ہو گئے۔ پھر (وہ بیدار ہو گئے اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کی۔ پھر وہ (خوابِ غفلت میں چلے گئے اور ان میں سے بہت سے لوگ) اندھے اور بہرے ہو گئے اور خداوند عالم ان کاموں سے آگاہ ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

(۳) ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جو تمہاری باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں، لیکن جب وہ تمہارے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو (از روئے تمسخر) ان لوگوں سے کہتے ہیں جنہیں خداوند عالم نے علم و دانش عطا کی ہے کہ اس

شخص (پیغمبر) نے ابھی کیا کہا ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کی ہے۔ (لہٰذا وہ کچھ نہیں سمجھتے)۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

"ھویٰ" کے معنی ہیں نفس کا خواہشات کی طرف میلان اور کہتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل "ھوی" (بروزن نہی) بمعنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا سے لیا گیا ہے کیونکہ یہ سبب ہوتا ہے کہ انسان پستی میں جا گرے اور دنیا میں کئی قسم کی مصیبتوں میں گرفتار ہو اور آخرت میں آتش جہنم میں جلتا رہے۔ جہنم کو "ہاویہ" اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی گہرائی اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی کوئی حد و حساب نہیں ہے۔

بعض ارباب لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں "اوپر لے جانا" اور "اوپر سے نیچے کی طرف گرانا"۔ اور بعض نے ان دونوں معانی کو ملا کر بھی اس کے معنی کیے ہیں۔ یعنی پہلے اوپر لے جا کر نیچے گرانا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "ھوی" (بروزن تہی) کے معنی سقوط (گرنا) اور ھوی (بروزن قوی) کے معنی اوپر جانا ہے۔[1]

آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

۱۔ ھوی پرستی دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے

سب سے پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسی معبود کے بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ چونکہ خدا اچھی طرح جانتا ہے کہ کون لوگ ہدایت کے اہل نہیں ہیں، لہٰذا انہیں گمراہ کر دیا ہے، ان کے دلوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ شائستہ ہدایت نہیں ہیں۔

دوسری آیت میں کچھ یہودیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب بھی خدا کی طرف سے انبیاء اور مرسلین ان کی خواہشات نفسانی کے خلاف خدا کا کوئی حکم ان کے پاس لے جاتے تو وہ کچھ انبیاء کی تکذیب کرتے اور کچھ کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ حق کے مقابلہ میں یہ تعصب اور ڈھٹائی پھر طرہ یہ کہ خود کو عذاب الٰہی سے محفوظ بھی سمجھتے تھے۔ انجام کار یہ بات سبب ہوگئی کہ وہ حقائق کے سامنے اندھے اور گونگے بن جائیں۔ سب سے پہلے تو خدا نے انہیں اپنی رحمت میں شامل کر لیا اور ان کی توبہ قبول فرمالی، لیکن پھر ان میں سے کچھ لوگوں نے خدا کے ساتھ کیا ہوا عہد و پیمان توڑ ڈالا، سرکشی کی راہیں اختیار کر لیں اور ایک بار پھر ان کے دل کے کان اور آنکھ بیکار

---

[1] ملاحظہ ہوں مندرجہ ذیل کتب: مفردات راغب، مجمع البحرین، کتاب العین، اقرب الموارد اور المنجد

ہو گئے۔

خواہشات نفسانی کی اتباع منحوس آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کا خون تک بہا دیتے ہیں لیکن انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

"یقتلون" کو فعل "مضارع" کی صورت میں لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہودیوں کے اس ٹولے کا یہی شیوہ رہا ہے کہ وہ ہر اس نبی کو قتل کر دیتے تھے جو ان کی خواہشات نفسانی کی مخالفت کرتا تھا۔

تیسری آیت کچھ دل کے اندھے منافقین کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر بھی ہوتے، آپؐ کی باتیں بھی سنتے، لیکن جونہی آپؐ کی خدمت سے اٹھ کر باہر جاتے تو سمجھدار مومنین کے سامنے حضورِ اکرمؐ کا مذاق اڑاتے اور استہزاء کرتے۔ قرآن کہتا ہے: "خداوند عالم نے اس گروہ کے دلوں پر مہر لگا دی ہے کیونکہ وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہیں۔"

یہ اور اوپر کی دو آیتیں بخوبی واضح کر رہی ہیں کہ جب انسان خواہشات نفسانی کی پیروی کر لیتا ہے تو وہ قدرت کی تشخیص کھو دیتا ہے۔

خواہش پرستی، حقیقت کے ادراک سے کیوں مانع نہ ہو، جبکہ انسان کا کسی چیز سے حد سے زیادہ تعلق اس کے تمام وجود کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ وہ صرف اس ہی چیز کو دیکھتا اور اس ہی کے بارے میں سوچتا ہے۔ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو کئی بار سنا ہے کہ "حبك الشيء يعمي ويصيم" یعنی تیرا کسی چیز کو محبوب رکھنا تجھے اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔[1]

یہ نورانی فرمان پیغمبر اسلامؐ سے بھی اور امیر المومنینؑ سے بھی منقول ہے اور غالباً ہم میں سے اکثر لوگوں نے سنا ہے کہ "اما اتباع الهوىٰ فيصد عن الحق" یعنی خواہشات نفسانی کی پیروی انسان کو حق سے روک دیتی ہے۔[2]

یہ بات اس قدر واضح ہے کہ ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں "صاحب الحاجة اعمى لا يرى الا حاجته" (ضرورت مند اندھا ہوتا ہے اور اپنی ضرورت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں دیکھتا)۔[3]

جو انسان اپنے دل و جان کو عہدے، منصب، جاہ و مال اور شہوت میں کھو چکا ہو بلکہ ہار چکا ہو اور اپنے تمام وجودی سرمائے کو ان کے حصول کے لیے وقف کر چکا ہو، وہ اس کے علاوہ کچھ اور دیکھ بھی نہیں سکتا اور یہ ہوس آلود عشق اس کی عقل و فکر پر پردے ڈال دیتا ہے۔

کیا خوبصورت فرمان ہے امیر المومنین علیہ السلام کا جو آپ نے اپنے ایک نورانی خطبے میں ارشاد فرمایا ہے کہ: "من عشق شيئا اعشى بصره" یعنی جو شخص کسی چیز سے عشق کرتا ہے وہ اس کی آنکھوں کو کم نور بنا دیتی ہے۔"[4]

---

[1] روضۃ المتقین، جلد ۱۳، ص ۲۱

[2] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۷۵ و نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۹

[4] تفسیر مراغی، جلد ۲۵، ص ۲۷

سورہ جاثیہ کی ۲۳ویں آیت جس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے، کی شانِ نزول میں یوں منقول ہے:

''ایک رات کا قصہ ہے کہ ''ابوجہل''، ''ولید بن مغیرہ'' کے ساتھ خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول تھا۔ (زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ خانہ کعبہ کا احترام کیا کرتے تھے اور طواف بجالایا کرتے تھے) اور طواف کے دوران پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں چل نکلیں۔ ''ابوجہل'' نے ''ولید'' کی طرف منہ کرکے کہا "واللہ انی اعلم انہ لصادق" (خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ وہ (محمدؐ) سچ کہتے ہیں)۔

ولید نے چیخ کر کہا: ''خاموش رہو! یہ باتیں کہاں سے کہہ رہے ہو؟''

ابوجہل نے کہا: ''ولید! ہم انہیں بچپن اور جوانی سے ہی صادق اور امین کہتے آرہے ہیں۔ اب جبکہ ان کی عقل کامل اور پختہ ہوچکی ہے انہیں جھوٹا اور خائن سمجھیں؟ میں پھر بھی کہتا ہوں کہ میں انہیں سچا سمجھتا ہوں۔''

ولید نے (غصے میں آکر) کہا: ''تو پھر تم ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟''

ابوجہل نے کہا: ''تم چاہتے ہو کہ قریش کی لڑکیاں بیٹھ کر یہ کہیں کہ میں ابوطالبؑ کے بھتیجے کے خوف سے ان کے سامنے جھک گیا ہوں؟ ''لات'' اور ''عزیٰ'' بتوں کی قسم! میں ان کی پیروی نہیں کروں گا۔''

اسی موقع پر "وختم علی سمعه و قلبه" (خدا نے اس کے کان اور دل پر مہر لگادی) کی آیت نازل ہوئی۔[1]

کیا پیارا فرمان ہے امیرالمومنین علی علیہ السلام کا اس بارے میں کہ "آفة العقل الهوی" (انسانی عقل کی آفت ہوا پرستی اور خواہشات نفسانی کی اتباع ہے) اور دوسرے الفاظ میں آنجنابؑ نے یہ بھی فرمایا ہے "الهوی آفة الالباب" (خواہش پرستی عقلوں کی آفت ہے)۔[2]

۲۔ حب دنیا کا پردہ

اس بارے میں خدا فرماتا ہے:

آیات

(۱) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ

---

[1] تفسیر مراغی، جلد ۲۵، ص ۲۷

[2] غررالحکم

وَاَبۡصَارِهِمۡ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾ (سورہ نحل ۱۰۷-۱۰۸)

ترجمہ

(۱) یہ اس لیے ہے کیونکہ انہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے اور خداوند عالم بے ایمان (اور متعصب) لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ وہ وہی لوگ ہیں، خدا نے (گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے) جن کے دل، کان اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے۔ (اسی لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے) اور صحیح معنوں میں وہ غافل لوگ ہیں۔

آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

یہ آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جنہوں نے پہلے تو دل وجان سے اسلام کو قبول کیا لیکن بعد میں مرتد ہو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے، ان کا یہ ارتداد اس لیے نہیں ہے کہ انہوں نے اسلام میں حق کے خلاف کچھ دیکھا ہے۔ نہیں، بلکہ انہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اسلام کو الوداع کہہ کر کفر کی وادی میں قدم رکھ لیا ہے اور چونکہ وہ ہدایت کے لائق نہیں ہیں لہٰذا خدا بھی انہیں ہدایت نہیں کرتا، بلکہ دنیا پرستی کی وجہ سے خدا نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے اور معرفت کے دروازے ان پر بند کر دیئے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ غفلت کا شکار ہو گئے ہیں۔

دنیا کی محبت، خواہ مال وثروت کے ساتھ عشق کے سلسلے میں ہو، یا جاہ ومقام اور منزلت کے ساتھ عشق کے بارے میں، کئی دوسری شہوات کے ساتھ عشق کے متعلق ایسے طوفان کی مانند ہوتی ہے جو انسان کی جان کے اندر چلتا ہے اور ترازوئے عقل کے توازن کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ دقیق ترین ترازوؤں کو ایسی پناہ گاہ میں محفوظ رکھتے ہیں جہاں معمولی سے معمولی ہوا کا گزر تک نہ ہوتا ہو، حتی کہ وزن کرتے وقت انسان کے منہ سے نکلنے والی سانس کو بھی عارضی طور پر سینوں میں بند کر دیا جاتا ہے مبادا اس کے منہ سے نکلنے والی ہوا کی کوئی موج اس کے توازن پر اثر انداز ہو۔ تو ایسے ترازو کی اس قدر شدید طوفان کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہے؟

دنیا پرستی خواہ قارونی شکل میں ہو یا فرعونی، سامری یا کسی اور صورت میں، ہر حالت میں انسان کو صحیح وسالم فکر اور صحیح فیصلے کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر مندرجہ بالا آیت میں فرماتا ہے کہ خدا نے ان کے دل، کان اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے تو درحقیقت یہ وہی تاثیر ہے جو دنیا پرستی میں اس نے رکھی ہے، اور چونکہ وہ لوگ سبب کے پیچھے جا کر مسبب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسلامی روایات میں اس بارے میں بہت سی دلکش تعبیریں دیکھنے میں آتی ہیں، منجملہ ان کے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث ہے۔ امام فرماتے ہیں:

"مثل الحريص على الدنيا كمثل دوره القز كلما ازدادت من القز على نفسها لفا كان ابعد لها من الخروج حتى تموت غما"

''دنیا کے حریص کی مثال ایسی ہے جیسے ریشم کے کیڑے کی ہوتی ہے۔ وہ یقیناً جتنا ریشم اپنے اوپر لپیٹتا جاتا ہے اتنا ہی اس میں پھنستا چلا جاتا ہے اور وہاں سے اس کے نکلنے کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور آخر کار ایک دن اس رنج و غم میں مر جاتا ہے۔''[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الدنيا تغر تضر تمر"

''دنیا فریب دیتی ہے، نقصان پہنچاتی ہے اور گزر جاتی ہے۔''[2]

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت امیرؑ نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا جس میں آپؑ نے اسے نصیحت فرمائی۔ اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے:

"فارفض الدنيا فان حب الدنيا يعمى ويصم ويبكم ويذل الرقاب فتدارك ما بقى من عمرك ولا تقل غدا اوبعد غدفانما هلك من كان قبلك باقامتهم على الاماني والتسويف"

''دنیا کو چھوڑ دو کیونکہ دنیا کی محبت آنکھوں کو اندھا، کانوں کو بہرا اور زبان کو گونگا اور گردنوں کو جھکا دیتی ہے۔ اپنی باقی ماندہ عمر کے ذریعہ اپنی گزشتہ کوتاہیوں کا ازالہ کرو اور یہ کہو کہ کل کروں گا یا پرسوں! کیونکہ تم سے پہلے کئی لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی آرزوؤں پر بھروسہ کیے رکھا اور لیت و لعل سے کام لیتے رہے۔ بالآخر وہ ہلاک ہو گئے۔''[3]

---

[1] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۲۳، حدیث ۱۳

[2] نہج البلاغہ

[3] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۷۵، اصول کافی جلد ۲ باب "ذم الدنيا و الزهد فيها" حدیث ۲۳

۳۔تکبر،غروراورقدرت کے نشے کا پردہ

ارشادقدرت ہوتا ہے:

آیات

(۱) اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

(سورہ غافر ۳۵)

(۲) وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾ (سورہ فصلت ۴۴)

ترجمہ

(۱) جولوگ آیات خداوندی میں مجادلہ کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آچکی ہو، یہ بے بنیاد جدال خدااور ان لوگوں کے نزدیک جوایمان لا چکے ہیں بہت بڑی ناراضگی کا موجب بن جاتا ہے۔اس طرح خداوندعالم متکبراور جباردل پر مہر لگادیتا ہے۔

(۲) اگرہم اسے عجمی قرآن بنادیتے تویقیناوہ کہتے کہ کیوں اس کی آیات واضح طور پر بیان نہیں ہوئیں؟ آیا عجمی قرآن اورعربی پیغمبر؟ (یہ کہاں تک درست ہے؟) آپ کہہ دیں کہ یہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اورشفا ہے، لیکن جولوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں سنگینی ہے، گویاوہ اندھے ہیں اوراسے نہیں دیکھتے گویاوہ ایسے لوگ ہیں جنہیں دور سے بلایا جاتا ہے۔''

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

مغرور اور متکبر حق کو نہیں سمجھتے

بیدار دل مومن جو فرعون جیسے طاغوت کے دربار میں تھا اور ''مومن آل فرعون'' کے نام سے مشہور تھا اور مخفی طور پر حضرت موسیٰ بن عمران کی حمایت کرتا تھا، پہلی آیت اس کی گفتگو کے بعد مذکور ہوئی ہے، اور بڑی صراحت سے کہہ رہی ہے کہ ''جو لوگ خدائی آیات کے مقابلے میں غرور، تکبر، خود خواہی اور خود پسندی کی وجہ سے مجادلہ اور مقابلہ پر اتر آتے ہیں، ان کے دل تاریک ہیں اور ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، انہیں تکبر اور غرور اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ حق کو سمجھ سکیں، لہٰذا وہ واقعیات کے سمجھنے سے محروم ہیں۔

بارے حق کے مقابلے میں تکبر اور تعصب وعناد انسانی افکار پر ظلمانی پردے ڈال دیتے ہیں اور اس سے تشخیص کی حس سلب کر لیتے ہیں۔ نوبت می رسد کہ اس کا دل ایک بند برتن کی مانند ہو جاتا ہے جس سے فاسد اور غلیظ مواد باہر نکل سکتا ہے اور نہ ہی صحیح وسالم اور جان پرور مواد اس کے اندر جا سکتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ''متکبر'' اور ''جبار'' کے درمیان فرق یہ ہے کہ ''تکبر'' ''حق کے سامنے خضوع'' کے مقابلے میں ہے اور ''جباریت'' ''مخلوق کے بارے میں محبت اور شفقت'' کے مقابلے میں ہے۔ یعنی مغرور ظالموں کی یہ کیفیت ہے کہ نہ تو وہ اپنے سے بالا دست ہستی کے سامنے خضوع وخشوع کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے زیر دستوں پر شفقت اور مہربانی کرتے ہیں۔

دوسری آیت متعصب اور ہٹ دھرم متکبرین کے ایک گروہ کی گفتگو کو نقل کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں: ''قرآن عجمی زبان میں کیوں نازل نہیں ہوا؟ تاکہ ہم اس کی مزید اہمیت کے قائل ہوتے اور غیر عرب قومیں بھی اس سے استفادہ کرتیں!'' (شاید انکا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے مختلف گروہ اسے نہ سمجھیں اور بے خبر ہی رہیں)۔

قرآن نے ان کے اس اعتراض کا ان لفظوں میں جواب دیا ہے کہ ''اگر قرآن غیر عربی زبان میں نازل ہوتا تو وہ دوسرا اعتراض کرتے اور کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں؟ اس کے مضامین کیوں پیچیدہ ہیں؟ ہمیں اس کی سمجھ نہیں آتی اور یہ بھی کہتے کہ واقعاً عجیب ہے کہ قرآن عجمی ہے اور پیغمبر عربی ہیں۔''

پھر قرآن مجید پیغمبر سے کہہ رہا ہے کہ آپؐ ان حیلہ ساز اور بہانہ گیر مغروروں سے کہہ دیجیے: ''یہ قرآن مومنین کے لیے ہدایت اور شفا ہے، اور جو لوگ حق کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے ان کے کان اس کے سننے سے عاجز ہیں اور ان کی آنکھیں اس کو دیکھنے سے محروم ہیں، بالکل ان لوگوں کی طرح جنہیں دور سے بلایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے دور افتادہ لوگ نہ سنتے ہیں اور نہ ہی دیکھتے ہیں۔

آفتاب قرآن بالکل واضح اور روشن ہے۔ اس کے سامنے کوئی پردہ نہیں ہے۔ یہ لوگ خود آپ نابینا اور اندھے ہیں۔ یہ کائنات زمزمہ حق سے معمور ہے لیکن یہ لوگ بہرے ہیں۔

۴۔احادیث کی رو سے غرور کے پردے

۱۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"ما دخل قلب امرئ شیء من الکبر والا نقص من عقله مثل ما دخله من ذالك قل ذالك او کثر"

''کسی شخص کے دل میں جتنا تکبر داخل ہوگا اتنی مقدار اس کی عقل میں کمی واقع ہوجائے گی، خواہ کم ہو یا زیادہ۔''[۱]

۲۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کلمات قصار میں سے ایک مختصر کلمہ میں ارشاد ہوتا ہے:

(اس میں آنجنابؑ نے گناہ گاروں اور منحرفین کے ایک گروہ سے مخاطب ہوکر فرمایا)

"بینکم و بین الموعظة حجاب من العزة"

''تمہارے اور وعظ و نصیحت کے درمیان غرور کا حجاب حائل ہے۔''[۲]

جب انسان کے اندر جب ذات، ''خودمحوری'' کی صورت میں داخل ہوجاتی ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ تمام اشیاء کو اپنے اندر ہی خلاصہ کی صورت میں موجود پائے۔

اور جب حب ذات ''خود برتری'' کی صورت میں داخل ہوتی ہے تو وہ خود کو سب سے ''برتر'' اور بڑھ کر'' سمجھتا ہے اور جس دن ''خود پسندی'' کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو خوبصورتی اور اعلیٰ اقدار کا معیار صرف اپنی ہی ذات کو سمجھتا ہے اور بس!!

ایسے حالات میں انسان کی عقل پر عجیب پردہ پڑ جاتا ہے اور اس کے اور حقیقت کے درمیان حجاب حائل ہوجاتا ہے اور وہ تمام اقدار کا اپنے اندر خلاصہ سمجھتا ہے اور اپنے سوا باقی تمام دنیا کو بھلا دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیب نفس اور حقائق عالم کے ادراک کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان ''کبر و غرور کی سواری'' سے نیچے اترے۔اس کے بغیر محال ہے کہ انسان کو خدا کا قرب حاصل ہو اور اس کی مقدس ذات کا جلوہ اس کے دل پر پڑے۔

۳۔ اسی وجہ سے ہم حضرت امیرؑ کے کلام میں پڑھتے ہیں کہ:

"شوافات العقل الکبر"

---

[۱] بحارالانوار جلد ۷۵، ص ۱۸۶، باب وصایای امام باقرؑ، حدیث ۲۶

[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۲۸۲

''انسانی عقل کی بدترین آفت تکبر ہے۔''[1] اور

''العجب آفة''

''خود پسندی عقل کی آفت ہے۔''[2]

۵۔ جہالت اور غفلت کے پردے

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۝۵۹ (سورہ روم ۵۹)

(۲) لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۝۶

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ۝۹ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝۱۰

(سورہ یس ۶، ۹، ۱۰)

ترجمہ

(۱) اسی طرح خداوند عالم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

(۲) تا کہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے آباء و اجداد کو نہیں ڈرایا گیا اسی لیے وہ غافل ہیں۔ ہم نے ان کے سامنے بھی بند باندھ دیا ہے اور ان کے پیچھے بھی بند باندھ دیا ہے اور ان کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا ہے۔ لہٰذا وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے اور ان کے لیے برابر ہے خواہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

---

[1] غرر الحکم

[2] غرر الحکم

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

زیر بحث آیات کے سلسلہ کی پہلی آیت میں اس بات کی تاکید کے بعد کہ ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں اور حقائق کو مختلف لباسوں میں لوگوں کے لیے بیان کیا ہے، کبھی تو آفاق وانفس کے حوالے سے، کبھی وعدہ وعید کی صورت میں، کہیں پر امر ونہی کے انداز میں، کسی مقام پر بشارت اور انذار کے ذریعہ، کبھی فطری اور عاطفی ہونے کے ناطے سے اور کسی جگہ پر استدلالی انداز میں۔

لیکن کچھ لوگ اس قدر جاہل اور غافل ہیں کہ ان کے سامنے جس قدر بھی آیات اور نشانیاں لے آؤ پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ تم اہل باطل ہو۔

ارشاد ہوتا ہے ''یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ خداوند تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے اور ادراک وتشخیص ان سے سلب کر لیتا ہے، جو علم نہیں رکھتے اور اپنی جہالت پر مصر ہیں اور اس بات کے لیے ہرگز آمادہ نہیں ہیں کہ غیر جانبدار ہو کر حق کو تلاش کریں۔''

درحقیقت یہ آیت جہالت کی ایک بدترین قسم کی طرف اشارہ کر رہی ہے جسے اصطلاح میں ''جہل مرکب'' کہتے ہیں۔ یعنی انسان اپنے جاہل ہونے کے باوجود خود کو عالم سمجھتا ہے اور اگر کوئی شخص اسے اس کی جہالت سے بیدار کرنا بھی چاہے تو اس کے کان اس بات کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی لیے اس قسم کا شخص اپنے جہل مرکب میں ابدالدہر تک باقی رہتا ہے۔

اگر مخالف ''جاہل بسیط'' ہو، یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ وہ جاہل ہے اور حق کو قبول کرنے کے لیے تیار بھی ہوتا ہے تو ایسے شخص کی ہدایت بہت آسان ہوتی ہے۔

جب دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور مہریں لگ جاتی ہیں تو جہالت مرکب صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی عدم تسلیم کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔

اس مقام پر کسی عرب کا ایک شعر بعض تفسیروں میں نقل کیا گیا ہے:

قال حمار الحکیم یوما
لوالصفونی لکنت ارکب
لاننی جاهل بسیط
وصاحبی جاهل مرکب

''ایک دن اس (مغرور ومتکبر) دانشور کے گدھے نے کہا: اگر میرے حق میں انصاف کریں تو مجھے ہی سوار ہونا چاہیے، کیونکہ میں جاہل بسیط ہوں اور میرا مالک جاہل مرکب ہے۔''[1]

---

[1] روح المعانی، جلد ۲۱، ص ۵۵، اسی آیت کے ذیل میں

ان آیات کی دوسری قسم غافلوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جن کی جہالت، غفلت اور ہٹ دھرمی کی بدولت ان کے بارے میں عذاب الٰہی کا فرمان صادر ہو چکا ہے اور وہ قابل ہدایت نہیں ہیں۔

پھر قرآن مجید نے ان حجابوں کا عجیب نقشہ کھینچا ہے جو ان کی عقول کا احاطہ کر چکے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق و زنجیر ڈال دیئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ہم نے ان کے سامنے بند باندھ دیا ہے اور ان کے پیچھے بھی بند باندھ دیا ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں، لہٰذا وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔''

ان کے آگے اور پیچھے بند باندھنے سے ان حجابوں کی طرف اشارہ ہے جو انہیں ''آفاقی آیات'' اور کائنات عالم میں خدائی آثار کو دیکھنے سے روکتے ہیں۔

اور گردنوں میں طوق اور زنجیر ہیں اور ان کے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ''انفسی آیات'' اور اپنے وجود میں خدائی نشانیوں کے دیکھنے سے محروم ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ان کے دلوں پر پردہ پڑ چکے ہیں، جہل و غرور اور غفلت کے پردے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ان پردوں کے ہوتے ہوئے، خواہ انہی کوئی ڈرائے یا نہ ڈرائے، چاہے وہ قرآنی آیات کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک لبوں سے سنیں یا نہ سنیں، وہ کبھی ہدایت حاصل نہیں کر پائیں گے۔ وہ ایک زنجیر میں نہیں بلکہ کئی زنجیروں اور کئی زندانوں میں مقید ہیں۔ (یاد رہے کہ ''اغلال'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ''غل'' کی جمع ہے)۔

بعض مفسرین ''سامنے کے بند'' سے ان موانع اور رکاوٹوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو انہیں ''نظری یا استدلالی ہدایت'' سے محروم کر دیتی ہیں، اور ''پیچھے کے بند'' سے ان رکاوٹوں اور موانع کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو انہیں ''فطری ہدایت'' کی طرف لوٹ آنے سے روکتے ہیں۔ [1]

احادیث اور جہالت کے پردے

۱۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں، جو آپ نے جاہل کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے:

"الجاهل ميت بين الاحياء"

''جاہل، زندہ لوگوں کے درمیان ایک مردہ ہے۔'' [2]

۲۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۶، ص ۴۵

[2] غرر الحکم، ص ۹۹

"الحمق من ثمار الجهل"

''حماقت، جہالت کا ثمرہ ہے۔''[1]

ظاہر ہے جس طرح مردہ کسی چیز کا ادراک اور احساس نہیں رکھتا، ہٹ دھرم، بے خبر اور متعصب جاہل سے بھی حقیقی فہم کی امید نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ جاہل مرکب اور ہٹ دھرم و متعصب افراد کی حالت تو یہ ہے کہ وہ حقیقی علماء تک کو اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ خود کو ہی گمراہ نہیں سمجھتے، انہیں بھی گمراہ جانتے ہیں۔ لہٰذا حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

"تعجب الجاهل من العاقل اكثر من تعجب العاقل من الجاهل"

''اتنا عقلمند شخص کو جاہل سے تعجب نہیں ہوتا جتنا جاہل کو عاقل سے ہوتا ہے۔''[2]

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امیر المومنینؑ کے اس فرمانِ ذیشان پر ختم کرتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:

"ان قلوب الجهال تستفزها الاطماع و ترتهنها المنى وتستعلقها الخدائع"

''جاہل افراد کے دلوں کو لالچ ہی حرکت میں لاتی ہے، آرزوئیں انہیں اپنا مرہون بنا لیتی ہیں اور دھوکہ بازی اور فریب کاری انہیں اپنے ساتھ ملا لیتی ہے۔''[3]

اور تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر اس قسم کا دل درک حقیقی سے خالی ہو۔

۶۔ نفاق کے پردے

ارشاد رب العزت ہے:

آیات

(۱) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

---

[1] غرر الحکم، ص ۹۹

[2] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۱۹۹

[3] کافی جلد ۱، ص ۲۳ (کتاب العقل والجہل، حدیث ۱۸)

يَشْعُرُوْنَ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝ (سورہ بقرہ ۱۰-۹)

(۲) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۝ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۝ (سورہ بقرہ ۱۸-۱۷)

(۳) اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ (سورہ انفال ۴۹)

(۴) وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا۝ (سورہ احزاب ۱۲)

ترجمہ

(۱) وہ خدا اور مومنین کو فریب دینا چاہتے ہیں، (لیکن اپنے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے، (البتہ) وہ سمجھتے نہیں۔ ان کے دل میں ایک طرح کی بیماری ہے، خدا ان کی بیماری کو اور بڑھاتا ہے اور یہ جو جھوٹ بولتے ہیں اس کی وجہ سے دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

(۲) وہ (منافقین) ایسے شخص کی مانند ہیں جس نے آگ جلائی (تاکہ تاریک بیابان میں اپنی راہ تلاش کرے) لیکن جب آگ نے اپنے چاروں اطراف کو روشن کیا تو خداوند عالم نے (طوفان بھیج دیا جس نے اسے بجھا دیا اور) ایسی وحشت ناک تاریکی میں اسے چھوڑ دیا جہاں آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں اور غلط رستوں سے لوٹ کر واپس نہیں آتے۔

(۳) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے کہتے تھے: ان (مسلمانوں) کو اپنے دین نے مغرور بنا دیا ہے اور جو شخص خدا پر توکل کرے (وہ کامیاب ہو جاتا ہے کیونکہ) خدا عزیز اور حکیم ہے۔

(۴) (اس وقت کو یاد کرو) جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے، کہتے تھے: خدا اور اس کے

رسول نے ہمارے ساتھ سوائے جھوٹے وعدے کے اور کچھ نہیں دیا۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

دل کے اندھے منافقین

سورۂ بقرہ کے اوائل میں تیرہ آیات ایسی ہیں جو منافقین کے بارے میں بحث کرتی ہیں اور نہایت ہی گویا حالت میں نفاق اور منافقین کی صحیح صحیح تصویر کشی کرتی ہیں۔ زیر بحث موضوع کی پہلی آیت میں بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے کہ ان کی ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ خدا اور اسی طرح مومنین کو فریب دینا چاہتے ہیں، جبکہ وہ صرف اور صرف خود کو ہی فریب دیتے ہیں، لیکن وہ یہ چیز سمجھتے نہیں، کیونکہ روح نفاق نے ان کے فہم وادراک پر پردے ڈال رکھے ہیں۔ پھر فرماتا ہے ''ان کے دل میں ایک قسم کی بیماری ہے'' اور ان کے اس راہ کے طے کرنے کے اصرار کی وجہ سے خدا ان کی بیماری میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔

یقیناً اس بیماری سے مراد وہی ''نفاق کی بیماری'' ہے جو ان کے دل پر مسلط کر دی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک بیمار شخص کی نہ تو فکر خوب فیصلہ کر سکتی ہے (کیونکہ عقل سالم، بدن سالم ہی میں پیدا ہوتی ہے) اور نہ ہی ان کے ظاہری حواس۔ یہی وجہ ہے اکثر اوقات بیمار لوگوں کے ذائقہ میں تلخی اور بدمزگی ہوتی ہیں اور بسا اوقات بدمزہ غذائیں ان کے لیے لذیذ ہوتی ہیں۔

دوسری آیت منافقین کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دیتی ہے ''جو ایک تاریک اور ظلمانی رات کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گھر جاتا ہے اور راہ پیدا کرنے کے لیے آگ جلاتا ہے تاکہ اپنی اطراف کو تھوڑا سا دیکھ لے اور پھر قدم اٹھائے لیکن اچانک طوفان اور آندھی اس کے چاروں اطراف کو گھیر لیتی ہے اور اسی مختصر سی آگ کو بجھا کر رکھ دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ ماحول تاریکی میں ڈوب جاتا ہے اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اسی طرح ان منافقین کی کیفیت ہے جو نہ تو کچھ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ سن پاتے ہیں، حتیٰ کہ ان کی زبان تک گنگ ہو جاتی ہے اور وہ واپسی کا راستہ تک کھو بیٹھے ہیں۔

اس نور سے مراد شاید وہ ظاہری ایمان ہے جس کا وہ اظہار کرتے ہیں اور اسی کی پناہ میں اپنے اطراف کو تھوڑا سا روشن کرتے ہیں اور ان کی جان و مال اسلام کی پناہ میں محفوظ رہتے ہیں۔

یا یہ کہ روشنائی سے مراد فطرت کا نور ہے جو آغازِ فطرت میں ہر ایک کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ منافقین بھی آغاز میں اسی نور سے مختصر سی بہرہ اندوزی کرتے ہیں، لیکن زیادہ دیر نہیں گزر پاتی کہ نفاق کے جھکڑ اس کو مٹی کے ڈھیر میں چھپا دیتے ہیں، یا اسے بالکل ہی بجھا دیتے ہیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں پھر بیمار دل منافقین کی بات ہو رہی ہے۔ گزشتہ آیات کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "والذین فی

قلوبهم مرض" کی تعبیر "عطف تفسیری" کے طور پر ہے اور بیمار دل وہی منافق لوگ ہیں اور منافقین وہی بیمار دل ہے۔[1] البتہ تیسری آیت جنگ بدر میں ان منافقین کی قلبی نوعیت کو اور چوتھی آیت جنگ احزاب (جنگ خندق) میں ان کی دلی کیفیت کو بیان کر رہی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ جنگ بدر میں منافین شرک کے لشکر میں اسلام کے خلاف صف آراء تھے اور جنگ احزاب (خندق) میں مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھے۔

وہ کہتے تھے یہ (مسلمان) اپنے دین پر مغرور ہو گئے ہیں اور اس مختصر سی تعداد اور تھوڑے سے اسلحہ کے ساتھ کامیابی کے گمان سے یا شہادت کے خیال سے، اس خطرناک میدان میں اتر پڑے ہیں جس کا انجام موت ہے۔"

البتہ وہ لوگ قلبی بیماری کی وجہ سے صحیح ادراک سے قاصر تھے اور فتح و کامرانی کے حقیقی عوامل، یعنی ایمان و استقامت اور جوانمردی، جو ایمان کی پیداوار ہیں، کو نہیں پہچانتے تھے اور یہ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ جو خدا پر توکل کرتا ہے خدا اس کا یار و مددگار ہوتا ہے۔

ہماری اس بات کا گواہ وہ تاریخی واقعہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بعض مسلمان اسلام قبول کرنے کے بعد اسی طرح مکہ ہی میں رہ گئے اور ہجرت نہیں کی اور اس سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ جب قریش کے لشکر میدانِ بدر کی طرف حرکت کرنے لگے تو وہ ان کی صفوں میں جا پہنچے اور آپس میں کہنے لگے "ہم میدانِ جنگ کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لشکر تعداد میں زیادہ ہوا تو اس سے جا ملیں گے، اگر وہ اقلیت میں ہوا اور لشکر قریش اکثریت میں تو انہی میں رہ جائیں گے۔"[2]

تو کیا اس سے بڑھ کر منافقت کسی اور چیز کا نام ہے؟ اگر یہ لوگ منافق نہیں تو پھر کون منافق ہے؟

جنگ احزاب (خندق) کے موقعہ پر اسلام کی تقویت حاصل ہو چکی تھی اور یہی منافق ٹولہ مسلمانوں کی صفوں میں گھس آیا تھا۔ لیکن جب لشکر احزاب نے مدینہ کا سخت محاصرہ کر لیا اور منافقین نے ان کے ٹڈی دل لشکر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، تو وہ سخت متزلزل ہو گئے اور صاف لفظوں میں کہہ دیا "خدا اور اس کے رسول نے ہمیں جھوٹے وعدوں کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔" یہ وہی نفاق کا حجاب تھا جو انہیں حق کے ادراک کی اجازت نہیں دے رہا تھا، حالانکہ وہ بارہا آزما چکے تھے کہ عددی قوت پر کامیابی کا دارومدار نہیں ہے، مگر وہ ایمان اور ایمانی استقامت کے سائے میں ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۶، ص ۳۰۲۔ اسی طرح تفسیر فخر رازی، جلد ۱۵، ص ۱۷۶ میں ہے کہ "الذین فی قلوبهم مرض" سے مراد ضعیف الایمان افراد ہیں جو منافقین کے علاوہ ہیں۔ حالانکہ ضعیف الایمان ہونے کا دل کی بیماری سے چنداں تعلق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں سورۂ بقرہ کے اوائل کی پہلی تیرہ آیات ہیں جن میں منافقین کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ یہ تعبیر انہی کے بارے میں استعمال ہوئی ہے اور بعض لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ "بیماری" کی تفسیر "شک اور تردد" سے کریں۔ یہ بھی کوئی اچھی بات نظر نہیں آتی کیونکہ بیماری ایک قسم کا انحراف ہے اور شک ایک طرح کی گمشدگی اور ضیاع ہے۔

[2] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۵، ص ۱۷۶ (سورۂ انفال کی ۴۹ ویں آیت کے ذیل میں)۔

سوال

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت کے ادراک کے لیے نفاق کیونکر حجاب ہوسکتا ہے؟

جواب

ایک نکتے کی طرف توجہ کے ساتھ ہی اس سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ روح نفاق اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ انسان ہر گروہ اور ٹولے سے ہم صدا ہوجائے، ہر ماحول میں اسی ماحول کے ساتھ رنگ جائے اور ہر رخ کی ہوا کے ساتھ چلنے لگ جائے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی اصلیت اور اپنے روحانی اور فکری استقلال سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان حالات میں انسان صحیح فیصلے کی قدرت سے عاری ہوجاتا ہے۔

بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ اس قسم کے مقامات پر ''بیماری قلب'' کی تعبیر اس لیے ہے کہ قلب (عقل) کا مخصوص اثر معرفت خدا اور اس کے عبودیت ہے اور جب انسان کے دل میں ایسی صفات پیدا ہوجائیں جو اس آثار سے مانع ہوجائیں تو اس وقت دل کی بیماری شمار ہونے لگتی ہے۔ (کیونکہ ان صفات نے اسے اپنے مخصوص اثر سے روک لیا ہے اور اس کے آگے حجاب بن گئی ہیں)۔[1]

اسی لیے سورہ میں آیا ہے کہ فرماتا ہے: "ولکن المنافقین لا یفقهون" لیکن منافقین واقعیت کو درک نہیں کرتے۔ (منافقون ۷)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان القلوب اربعه: "قلب فیه نفاق و ایمان و قلب منکوس و قلب مطبوع و قلب ازهر اجرد" قلب "ما الازهر" قال فیه کهیئة السراج" "فاما المطبوع فقلت المنافق، واما الازهر فقلت المومن، ان اعطاه شکر وان ابتلاه صبر و اما المنکوس فقلت المشرك"

''یعنی دل چار قسموں پر ہیں: ایک دل وہ ہوتا ہے جس میں نفاق اور ایمان ہوتا ہے، ایک دل الٹا ہوتا ہے، ایک دل پر مہر لگی ہوتی ہے اور ایک دل نورانی اور پاک ہوتا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا قلب نورانی کیا ہے؟ تو فرمایا جس میں چراغ کی مانند حقیقت چمکتی ہے۔ رہا وہ دل جس پر مہر لگی ہوتی ہے وہ منافق کا دل ہے۔ نورانی قلب مومن کا ہوتا ہے۔ اگر خدا اسے کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ شکر بجالاتا ہے

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲، ص ۶۴ (سورہ بقرہ کی دسویں آیت کے ذیل میں)۔

اور اگر کوئی مصیبت اس پر آ ٹوٹتی ہے تو وہ صبر کرتا اور شکیبائی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن وہ دل جو الٹا ہوتا ہے وہ مشرک کا دل ہے۔''[1]

ہم اس گفتگو کو حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے فرمان ذیشان پر خاتمہ دیتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:

"والنفاق علی اربع دعائم: علی الهوی و الهوینا و الحفیضة والطمع"

''نفاق کا سرچشمہ ان چار چیزوں میں سے ایک ہے: خواہشات پرستی، دینی امور میں سستی اور غفلت، غضب اور طمع۔''[2]

اور ہم جانتے ہیں کہ مندرجہ بالا چار امور میں سے ہر ایک بجائے خود عقل انسانی کے سامنے ایک دبیز پردہ ہے۔

۷۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے

آیات

(۱) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (سورہ انعام ۲۵)

(۲) وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَّجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝

(سورہ بنی اسرائیل ۴۵-۴۶)

(۳) فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۴۴۲، "فی ظلمة قلب المنافق"

[2] اصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۳۹۳، "فی ظلمة قلب المنافق"

اَنۡتَ بِهٰدِى الۡعُمۡىِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ ؕ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ۝۵۳ (سورہ روم ۵۳-۵۲)

(۴) وَلَقَدۡ ضَرَبۡنَا لِلنَّاسِ فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنۡ جِئۡتَهُمۡ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوۡلَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُبۡطِلُوۡنَ۝۵۸ كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ۝۵۹ (سورہ روم ۶۹-۵۸)

(۵) وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِىۡۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَيۡهِ وَفِىۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ وَّمِنۡۢ بَيۡنِنَا وَبَيۡنِكَ حِجَابٌ فَاعۡمَلۡ اِنَّنَا عٰمِلُوۡنَ۝۵ (سورہ فصلت ۵)

ترجمہ

(۱) ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو تیری طرف کان لگا کر بات سنتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں، تا کہ وہ اسے نہ سمجھ پائیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن قرار دے دیا ہے (وہ اس قدر ہٹ دھرم ہیں کہ) اگر حق کی تمام نشانیوں کو بھی دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہ لائیں، حتی کہ جب وہ تیری طرف آتے ہیں تو بھی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

(۲) اور جب تو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور ان لوگوں کے درمیان مخفی حجاب قرار دے دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں تا کہ وہ نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں سنگینی اور بہرہ پن ہے اور جب تو اپنے رب کی وحدانیت کا قرآن میں ذکر کرتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور تجھ سے روگردان ہو جاتے ہیں۔

(۳) تو اپنی آواز کو مردوں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی بہرے لوگوں کے کانوں میں جب وہ پیٹھ پھیر کر پلٹ جائیں اور نابیناؤں کو (بھی) ان کی گمراہی سے ہدایت نہیں کر سکتا۔ تو تو فقط اپنی باتوں کو ان لوگوں تک پہنچاتا ہے جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

(۴) ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں اور مطالب بیان کیے ہیں اور اگر کوئی آیت ان کے لیے آئے تو کافر کہتے ہیں کہ تم تو اہل باطل ہو (اور یہ سب سحر اور جادو ہے) اسی طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

(۵) انہوں نے کہا کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کان بہرے ہیں اور ہمارے اور تمہارے

درمیان حجاب ہے۔لہٰذاتم اپنا عمل کرواور ہم اپنا عمل کرتے ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

چلتے پھرتے مردے

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت کے شانِ نزول کے بارے میں منقول ہے کہ قریش کے سرداروں میں سے ابوجہل، ولد بن مغیرہ اور ابوسفیان وغیرہ جیسے کچھ لوگ سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر آپؐ کی باتیں سننے لگے۔ان میں نضر بن کنانہ بھی تھا، جوایک تاجر آدمی تھااور تجارت کی غرض سے کئی بار ایران جاچکا تھااور ایرانیوں کی قدیم کہانیوں سے کافی حد تک مطلع تھا۔ان سب نے اس کی طرف رخ کرکے کہا:''محمد(ص) کیا کہتے ہیں؟''اس نے کہا:''مجھے معلوم نہیں کہ کیا کہتے ہیں، پس اتنا معلوم ہے کہ اپنے لبوں کو ہلاتے ہیں اور پرانے زمانے کے وہی قصے کہانیاں جو میں تمہیں سناتا ہوں، وہ بھی وہی کچھ سناتے ہیں۔''

پھر ابوسفیان نے کہا:''میں ان کی بعض باتیں صحیح نہیں سمجھتا۔''ابوجہل نے کہا''بالکل ایسا ہی ہے!''اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی[1] اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ''ان ہٹ دھرم، متعصب اور خودخواہ لوگوں کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ان کے کان بہرے ہیں اور ان کی عقل حقیقت کو درک کرنے کے قابل نہیں ہے۔''لہٰذا وہ آپؐ کے ساتھ مسلسل لڑائی جھگڑا کرتے رہتے ہیں، ہٹ دھرمی، خود خواہی اور غرور کے بول بولتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خدا نے یہ جو فرمایا ہے کہ''ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں''تو اس سے مراد یہ ہے کہ حق کے بارے میں ان کا کفر وعداوت پر اصرار اور ہٹ دھرمی بذاتِ خود اس پردے کی مانند ہے جو ایمان سے مانع ہوتا ہے۔''[2]

دوسری آیت میں اس پردے کے بارے میں گفتگو ہورہی ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کچھ کفار کے درمیان پڑا ہوا تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد واقعی پردہ ہے جو آنحضرتؐ اور ان لوگوں کے درمیان اس طور سے ایجاد ہوجاتا تھا کہ وہ آپؐ کو نہیں دیکھ پاتے تھے۔لیکن اگر ان آیات پر توجہ دی جائے جو اسی سورہ میں اور اسی موضوع کے بارے میں نازل ہوئی ہیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حجاب اور پردہ''ہٹ دھرمی، تعصب، غرور، جہالت اور نادانی''کے پردوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جو قرآنی حقائق کو ان کے فکر و عقل کی نگاہوں سے چھپا دیتے تھے اور انہیں حق کے ادراک کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۱۲ ص ۱۸۶

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۱۲ ص ۱۸۷

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ ہم انہی آیات میں پڑھتے ہیں کہ ''جب تو اپنے پروردگار کی وحدانیت کا ذکر کرتا ہے تو وہ اسے پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتے ہیں۔'' اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے تو آنحضرتؐ کی باتوں کو سنتے تھے لیکن جب ہٹ دھرمی ان کے آڑے آجاتی تھی تو وہ پابہ فرار ہوجاتے تھے۔(ولوا علی ادبارھم نفورا)۔

اسی سورہ میں اور انہی آیات کے تسلسل میں کچھ اور تعبیریں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو سب کی سب ان کی لجاجت (ہٹ دھرمی) اور عناد پر دلالت کرتی ہیں، تو کیا ایسی حالت میں ممکن ہے کہ کوئی شخص حقیقت کو درک کر سکے؟

تیسری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: ''تمہاری باتیں نہ تو مردوں تک پہنچتی ہیں، اسی طرح نہ ان بہروں تک پہنچتی ہیں جب وہ فرار کرتے ہیں، اور اندھوں کو بھی تم گمراہی سے نجات نہیں دلا سکتے۔ تمہاری باتوں کو صرف وہی کان ہی سن سکتے ہیں جو حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں'' (یعنی ان کے دل و جان حق کے پیاسے ہیں۔ یہ دل ایسی زمین کی مانند مستعد اور آمادہ ہیں جو سورج کی دھوپ اور بارش کے قطرات کے سامنے موجود ہوتی ہے اور معرفت کا بیج جس میں بہت جلد نشوونما پاتا ہے۔ لیکن جن دلوں پر تعصب، جہالت اور ہٹ دھرمی کے پردے پڑے ہوتے ہیں وہ ان حقائق سے محروم ہوتے ہیں۔[1]

ان آیات کے چوتھے حصے میں بھی ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو سختی کے ساتھ پیغمبرؐ کے مقابلہ پر کمر بستہ تھے اور جو کچھ آنحضرتؐ سے سنتے تھے اس کی مخالفت کرتے تھے اور کہتے تھے: ''تم تو صرف اہل باطل ہو اور یہ سب سحر و جادو اور گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں جن میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں ہے۔''

قرآن کہتا ہے کہ ان جاہلوں کے دل پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اسی لیے اس آسمانی کتاب، جو حقائق کا منبع ہے، سے انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اور یہ آیت ضمنی طور پر ''جہالت'' اور ''لجاجت'' کے رابطے کو واضح کرتی ہے۔

اس سلسلے کی پانچویں اور آخری آیت میں مخالفین کی لجاجت اور ہٹ دھرمی کا نمونہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اب تک جو کچھ بتایا گیا تھا وہ خدا کی طرف سے اس کے پیغمبرؐ کے ساتھ بات چیت تھی۔ لیکن اس آیت میں خود انہی کی طرف سے اعتراف جرم کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ہمارے دل غلافوں میں چھپے ہوئے ہیں، ہمارے کان سنگین ہو چکے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان حجاب ہیں۔ ہم کبھی آپ کی باتوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے۔ تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کرتے ہیں۔''

اس قسم کی تعبیروں سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے حجابوں، پردوں اور کانوں کی سنگینی کا اصلی عامل کیا تھا؟ یہ ایسی تعبیرات ہیں جن سے ''تعصب'' اور ''لجاجت'' ٹپکتے ہیں اور ان کی بدبختی کے سرچشمے اور منبع کو واضح کرتے ہیں۔

ضمنی طور پر ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ ''تعصب''، ''عصب'' کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی وہ چربی ہے جو عضلات کو آپس

---

[1] اس سے ملتی جلتی آیت البتہ قدرے تفاوت کے ساتھ سورہ نمل آیت ۸۱ میں آئی ہے۔

میں یا انہیں ہڈیوں سے متصل کرتی ہے اور ان تک مغز کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی ساخت نہایت محکم اور پختہ ہوتی ہے لہٰذا یہ لفظ شدت اور استحکام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ''یوم عصیب'' کا معنی سخت اور شدید ہے۔ اسی بنا پر کسی چیز کے ساتھ سخت وابستگی کی حالت پر ''تعصب'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ''عصبہ'' (بروزن اسوہ) (طاقتور) مردوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو دس لوگوں سے کم نہ ہوں اور ''عصبہ'' (بروزن قصبہ) باپ کی طرف سے رشتہ داری کے معنی میں ہے۔[1]

''لجاجت''، ''لج'' کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ''کسی چیز کے بارے میں بے جا اصرار اور اس سے روگردانی نہ کرنا'' اور ''لجہ'' (بروزن حجہ) کا معنی ہے۔ ''سمندر کی لہروں کی حرکت'' یا ''رات کی تاریکی کی لہریں'' اور ''بحر لجی'' عظیم اور ٹھاٹھیں مارتے سمندر'' کو کہتے ہیں۔ اور ''کلام میں تلجلج'' کا معنی ہے ''زبان میں لکنت'' یا ''کلام کا تکرار'' یا ''آوازوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا۔''[2]

نتیجہ کلام

درحقیقت ''تعصب'' اور ''لجاجت'' ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ کسی چیز سے وابستگی انسان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اس کے بارے میں اصرار کرے، اس پر زور دے اور اس کا غیر مشروط دفاع کرے۔

البتہ کبھی تعصب بمعنی امر حق سے وابستگی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ البتہ عام طور پر باطل کے ساتھ وابستگی کے لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

لجاجت اور تعصب کا سرچشمہ خواہ کچھ بھی ہو، لیکن عام طور پر جہالت اور کوتاہ اندیشی اس کے ساتھ ضرور ہوتی ہے، کیونکہ ان کے حامل کی سوچ ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنے اس نظریئے سے دستبردار ہو جائے تو وہ سب کچھ کھو دے گا، یا پھر اس کی شخصیت مجروح ہوگی۔

اور کبھی ان کا سرچشمہ تکبر اور خود خواہی ہوتا ہے یعنی وہ اس بات کے لیے آمادہ نہیں ہوتا کہ حق کے آگے سر تسلیم خم کرے اور کبھی دوسرے عوامل اور اسباب ہوتے ہیں۔

تعصب اور لجاجت، عقل انسانی کے آگے ضخیم پردے ڈال دیتے ہیں اور اسے اجازت نہیں دیتے کہ وہ حقائق اور واقعات کو دیکھے۔ یقیناً بہت سے ایسے افراد ہیں جو کسی قیمت پر بھی اس بات پر راضی نہیں ہوتے کہ وہ اپنے عقیدے یا اپنی بات سے دستبردار ہو جائیں، خواہ ان کے لیے کتنے ہی وزنی دلائل پیش کیے جائیں یا بقولِ معروف اگر ان کے لیے ایک ہزار ایک دلائل پیش کیے جائیں کہ مرغے کے دو پاؤں ہیں پھر بھی وہ کہیں گے کہ نہیں ایک ہی ہے!! اور اگر ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں سورج کے سامنے لا کھڑا کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ سورج ہے! تو بھی وہ آنکھیں بند کر کے کہیں گے کہ نہیں، رات ہے۔

---

[1] کتاب ''العین''، ''مفردات''، ''مجمع البحرین'' اور ''لسان العرب''۔

[2] کتاب ''العین''، ''مفردات''، ''مجمع البحرین'' اور ''لسان العرب''۔

مندرجہ بالا آیات اس حقیقت کو بخوبی منعکس کر رہی ہیں اور اس قسم کے افراد کو اندھا، بہرہ بلکہ بعض اوقات مردہ کہہ کر پکار رہی ہیں۔ اور یہ کبھی کہتی ہیں کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اور وہ کسی محفوظ برتن میں بند کر دیئے گئے ہیں۔

اور روایات میں بھی اس چیز کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے، حتی کہ امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ:

"اللجوج لا رای له"

''ہٹ دھرم افراد صائب الرائے نہیں ہوتے۔''[1]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"اللجاج یفسد الرای"

''ہٹ دھرمی، صحیح رائے کو خراب کر دیتی ہے۔''[2]

اور یہ بھی فرمایا کہ:

"لیس للجوج تدبیر"

''ہٹ دھرم بے تدبیر ہوتا ہے۔''[3]

اور آپؑ ہی نے نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۹۲ میں فرمایا ہے جس کا نام ''خطبہ قاصعہ'' ہے:

"فالله فی کبر الحمیة وفخر الجاهلیة، فانه ملاقح الشنان ومنافخ الشیطان، التی خدع بها الامم الماضیة والقرون الخالیة حتی اغلفوا فی حنادس جهالته ومهاوی ضلالته"

''تمہیں خدا کا واسطہ، زمانہ جاہلیت کے تکبر، نخوت، تعصب اور افتخار سے بچتے رہو، کیونکہ یہ بغض و کینہ کی پرورش گاہ اور شیطانی وسوسوں کی آماجگاہ ہے، جس سے گذشتہ قومیں اور امتیں بہلائی پھسلائی گئیں، حتی کہ وہ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوب گئیں اور ہلاکت کے گڑھوں میں جا گریں۔''

اس گفتگو کو ہم امام اول کے اس کلام پاک کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو آپؑ نے مختلف شہروں کے لوگوں کے نام اپنے مبارک خط میں صفین کے ماجرا کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

---

[1] غرر الحکم

[2] غرر الحکم

[3] غرر الحکم

"من لج و تمادی فهو الراکس الذی ران الله علی قلبه و صارت دائرة السوء علی راسه"

''جو شخص باطل کے کاموں میں ہٹ دھرمی کرے اور اپنی بات پر ڈٹا رہے وہ ایسا پیمان شکن ہے جس کے دل کو خدا نے زنگ آلود کر دیا ہے اور خود سر لوگوں کی حکومت اس کے سر پر سایہ فگن ہے۔''[1]

البتہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حق پر اصرار اور ڈٹ جانا تعصب نہیں ہے اور اگر اسے تعصب کہیں بھی تو ''تعصب ممدوح'' ہوگا، جیسا کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے عصبیت یعنی تعصب کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"العصبیة التی یاثم علیها صاحبها ان یری الرجل شرار قومه خیرا من خیار قوم آخرین ولیس من العصبیة ان یحب الرجل قومه ولکن من العصبیة ان یعین قومه علی الظلم"

''یعنی وہ عصبیت، یعنی تعصب جس کی وجہ سے انسان گناہگار ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اپنی قوم کے بدکاروں کو دوسری قوموں کے نیک لوگوں سے بہتر سمجھے، لیکن یہ عصبیت نہیں ہے کہ انسان اپنی قوم کو دوست رکھے۔ عصبیت تو یہ ہے کہ اس کے ظلم میں اس کی اعانت کرے۔''[2]

۸۔ اندھی تقلید کے پردے

اس بارے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو دل کے کانوں سے سنیے۔

آیات

(۱) قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝ (سورہ شعراء ۱۳۶ تا ۱۳۸)

(۲) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۸

[2] بحار الانوار، جلد ۷۳، ص ۲۸۸

وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

(سورہ مائدہ ۱۰۴)

(۳) وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ (سورہ اعراف ۲۸)

(۴) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾

(سورہ لقمان ۲۱)

(۵) وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ (سورہ زخرف ۲۳)

ترجمہ

(۱) اس (قوم عاد) نے کہا ہمارے لیے کوئی فرق کی بات نہیں ہے خواہ تو ہمیں نصیحت کرے یا نہ کرے، یہ تو بالکل پہلے لوگوں کی عادتیں ہیں اور ہم ہرگز سزا نہیں پائیں گے۔

(۲) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جسے خدا نے نازل کیا ہے اور اپنے پیغمبر کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے آباء کو جو کرتے ہوئے پایا ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے، تو کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباء کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے؟

(۳) اور جب وہ برے کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آبا (واجداد) کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ آپ کہہ دیں کہ خدا کبھی بھی برے کاموں کا حکم نہیں دیتا تو کیا خدا کے بارے میں وہ باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

(۴) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس چیز کی پیروی کرو جو خدا نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے، آیا حتیٰ کہ اگر انہیں شیطان بھی جلنے والی آگ کے عذاب کی دعوت کرے (پھر بھی وہ اسی کی اتباع کریں گے؟)۔

(۵) اسی طرح آپؐ سے پہلے ہم نے کسی شہر و دیار میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ مست و مغرور

دولت مندوں نے کہا: ہم نے اپنے آباءواجداد کوایک مذہب پر پایا ہےاورانہی کے آثار کی اقتداء کریں گے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

اگرچہ مندرجہ بالا آیات میں ''تقلید'' کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کی جگہ گذشتہ لوگوں کے آثار کی ''اقتداء'' یا ''اھتداء'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یا پھر آباءواجداد کی اتباع وغیرہ کا ذکر ہے، لیکن پھر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ (تقلید) کا مفہوم بھی اچھی طرح واضح کر دیا جائے۔

یہ لفظ "قلد" (بروزن قند) کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی مفردات میں راغب کے بقول ''رسی باٹنا'' ہیں اور ''قلادہ'' کو اس لیے قلادہ کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک بٹی ہوئی رسی ہوتی ہے جو کسی کے گلے میں ہوتی ہے۔ اور قرآن آیات میں ''قلائد'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ''قلادہ'' کی جمع ہے جس کا معنی ایام حج میں وہ جانور ہیں جن کی گردن میں کوئی چیز ڈال دی جاتی ہے تا کہ دوسرے جانوروں سے ان کی پہچان ہو جائے۔ (سورۂ مائدہ ۲)

دوسروں کی پیروی کو اسی لیے تقلید کہتے ہیں کہ کیونکہ ان کی باتوں کو وہ قلادہ کی مانند اپنی گردنوں میں ڈال لیتے ہیں یا ذمہ داری کو قلادہ کی مانند اس کے گلے میں ڈال دیتے ہیں جو کسی کی پیروی کرتا ہے۔

لیکن ''مقالید'' کا لفظ، بعض اہل لغات کے نزدیک ''مقلید'' یا ''مقلد'' (بروزن محنت) کی جمع ہے۔ (زمخشری کے بقول اس لفظ یعنی مقالید کا مفرد اپنی جنس سے نہیں ہے)۔

''مقلید'' اور ''اقلید'' دونوں ''کلید'' (چابی) کے معنی میں ہیں۔ حتیٰ کہ ''ابن منظور'' نے ''لسان العرب'' میں اور اس قسم کے دوسرے ارباب لغت نے اپنی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس لفظ کو فارسی کلمہ ''کلید'' سے لیا گیا ہے اور عربی میں بھی اس (چابی کے) معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور ''مقالید'' (خزانوں) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ خزانوں کو تالا لگاتے ہیں اور چابی کے بغیر وہاں تک رسائی قطعاً ناممکن ہوتی ہے۔

اسی لیے ''مقالید'' کا ''تقلید'' اور ''قلادہ'' کے مادہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ [1]

ہاں البتہ ایک احتمال ضرور ملتا ہے کہ دونوں ایک ہی مادہ کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ کلید یعنی چابی کو بہت سے لوگ دھاگے میں ڈال کر گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ [2]

بہرحال دوسروں سے پیروی جس کا نام ''تقلید'' ہے کبھی تو قابل مذمت ونفرت ہوتی ہے اور کبھی ممدوح اور قابل تعریف۔ اس کی مزید

---

[1] مفردات راغب، مجمع البحرین، لسان العرب، برہان قاطع اور دیگر کتب

[2] بعض لوگ ''اقلید'' کو لغت ''یمن'' یا لغت ''روم'' سے جانتے ہیں۔ (مجمع البحرین ولسان العرب، مادہ ''قلد'')

تفصیل انشاءاللہ آگے بیان ہوگی۔ یہاں پر جس چیز کے بارے میں بحث کی جارہی ہے وہ مذموم قسم کی تقلید ہے جسے اندھی تقلید'' کہتے ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

دنیا کو تقلید نے برباد کردیا

مندرجہ بالا آیات میں سے سب سے پہلی آیت میں ''قوم عاد'' کی کچھ ان باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کے سامنے بیان کیں۔ ان کے اس دلسوز اور مہربان نبی کا اسم گرامی حضرت ''ہود'' علیہ السلام تھا۔ حضرت ہودؑ نے انہیں توحید، ظلم وستم اور تعیش کے ترک کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں کہا ''ہمارے لیے یہ بات یکساں ہے خواہ آپ ہمیں نصیحت کریں یا نہ کریں۔ ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ کام جو آپ دیکھ رہے ہیں، یعنی بت پرستی وغیرہ، یہ ہمارے بزرگوں کا شیوہ ہے اور ہم آپ کی باتوں کی وجہ سے اس سے دستبردار نہیں ہوں گے اور آپ کے خیال کے برعکس ہمیں خدا کی طرف سے بھی عذاب نہیں ہوگا۔

اس طرح سے انہوں نے پیغمبر خدا کی منطقی گفتگو کو اپنے لیے مکمل طور پر غیر موثر ہونے کا علی الاعلان اظہار کردیا، کیونکہ تقلید کا حجاب انہیں حقائق اور واقعات کے دیکھنے کے لیے مانع ہوا۔

دوسری آیت میں مشرکین عرب کی حالت کو بیان کیا گیا ہے کہ جب انہیں کہا جاتا تھا کہ جس چیز کو خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف آؤ اور بتوں اور اپنے بارے میں بہت سے حلال جانوروں کو حرام قرار دینے کی بدعت سے دستبرداری اختیار کرلو، تو وہ کہتے تھے ''ہمارے بزرگوں کا طریقہ کار ہی ہمارے لیے کافی ہے ہمیں کسی اور ہدایت کی ضرورت نہیں، نہ قرآن کی اور نہ ہی غیر قرآن کی۔

لیکن قرآن نے انہیں اس خواب غفلت سے بیدار کرنے اور تقلید کے حجاب کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کہا ہے ''تو کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباء واجداد کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے؟'' آیا جاہل اور گمراہ افراد کی غیر مشروط تقلید اور اتباع جائز ہے؟

تیسری آیت میں مشرکین عرب (یا کچھ شیطان صفت انسانوں) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب وہ کوئی برا عمل انجام دیتے ہیں اور کسی برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، اگر ان سے اس کی دلیل طلب کی جائے، تو ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں کہ وہ یہ کہیں: ''یہ ہمارے آباؤ اجداد کی عادت اور ان کا طریقہ کار ہے'' اور وہ صرف اسی بات پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں ''خدا نے بھی ہمیں اسی بات کا حکم دیا ہے۔'' (واللہ امرنا بھا)۔

قرآن مجید فوراً اس تہمت کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے: ''خداوند عالم ہرگز برے کاموں کا حکم نہیں دیتا، تو کیوں تم ایسی باتوں کو اس کی طرف منسوب کرتے ہو جو تم خود نہیں جانتے؟''

اس آیت میں ''فحشاء'' (برے کاموں) سے مراد کیا ہے، اس بارے میں بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ کچھ عربوں کی اس رسم کی طرف اشارہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں ان کے درمیان رائج تھی اور وہ یہ کہ اس دور میں تمام زن ومرد مادرزاد ننگے ہوکر خانہ کعبہ کا

طواف کرتے تھے۔اس بارے میں ان کا گمان یہ تھا کہ جس لباس میں ہم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس میں خانہ خدا کا طواف کیا جائے۔

اس طرح سے وہ اس قبیح اور بدترین فعل کا ارتکاب اس اندھی تقلید کی بناء پر کرتے چلے آرہے تھے جو انہیں نسل درنسل ورثے میں ملی تھی اور تقلید کا حجاب انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس عمل کی برائی اور قباحت کا ادراک کرسکیں۔

چوتھی اور پانچویں آیت میں زمانہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشرکین کے گروہ یا گزشتہ زمانوں کے بت پرستوں اور گمراہوں کی باتوں کو بیان کیا گیا ہے جو وہ آنحضرتؐ کو یا انبیائے ماسلف کو کہا کرتے تھے کہ ''ہم نے اپنے آداب ورسوم اور عقائد کو اپنے آباء و اجداد سے ورثے میں پایا ہے، لہٰذا ہم ان کی پیروی کریں گے اور انہی کی اقتدار کریں گے۔'' یعنی ان کی انبیاء سے مخالفت کی واحد دلیل اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید ہی ہے اور بس!

اس طرح سے کفر، بت پرستی، انواع واقسام کے گناہ اور عاداتِ قبیحہ انہیں نسل درنسل منتقل ہوتی چلی آئیں اور روح تقلید نے ان کی عقل وفکر پر تقلید کے دبیز پردے اس حد تک ڈال دیئے تھے کہ وہ ہر ایک حقیقت کا انکار کردیتے تھے۔قرآن پاک ایسے افراد کو ہی کہتا ہے ''تو کیا تمہارے آباء واجداد جاہل اور گمراہ نہیں تھے؟'' آیا جاہل کی تقلید صحیح ہے؟ (اولو کان اباؤھم لا یعلمون شیئا ولا یھتدون) (مائدہ ۱۰۴)

اور کبھی کہتا ''آیا تمہارے آباء واجداد شیطان کے آلہ کار نہیں تھے؟ اور شیطان انہیں جہنم کی آگ کی طرف نہیں بلاتا؟'' تو پھر تم ان کی کیسے پیروی کرتے ہو؟'' (اولو کان الشیطان یدعوھم الی عذاب السعیر) (لقمان ۲۱)

اور کبھی کہتا ہے: ''جو کچھ پیغمبر علیہ السلام تمہارے پاس لایا ہے وہ تمہارے آباء واجداد کی راہ ورسم سے زیادہ ہدایت کرتا ہے'' تو پھر تم اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ (قال اولو جئتکم باھدی مما وجدتم علیہ اباءکم)۔ (زخرف ۲۴)

تشریح

۱۔تقلید کی مختلف قسمیں

دوسروں کی پیروی، خواہ زندہ افراد کی پیروی ہو یا مردوں کی، خواہ ایک فرد کی پیروی ہو، یا ایک جماعت کی، چار صورتوں سے خالی نہیں۔

۱۔ جاہل کی تقلید عالم سے۔یعنی جو شخص نہیں جانتا وہ اس کی تقلید کرے جو کسی فن کا ماہر اور عالم ہو، جیسے ناسمجھ مریض کا آگاہ، دلسوز اور باسمجھ طبیب کی طرف رجوع کرنا۔

۲۔ عالم کی تقلید عالم سے۔جیسے اہل فن کا ایک دوسرے کی طرف رجوع کرنا۔

۳۔ عالم کی تقلید جاہل سے۔ جیسے ایک عالم شخص اپنے علم کو خیر باد کہہ کر جاہلوں کے پیچھے لگ جائے۔

۴۔ جاہل کی تقلید جاہل سے۔ جیسے جہلاء کا ایک گروہ کسی رسم ومنت یا عقیدے کو اپنے لیے انتخاب کرے اور بے سمجھ لوگوں کا دوسرا گروہ آنکھ اور کان بند کر کے ان کی اتباع کرے۔ چنانچہ ایک قوم سے دوسری قوم کی غلط رسوم اور فاسد عقائد کے منتقل ہونے کا سب سے زیادہ سبب یہی قسم ہے اور قرآن پاک میں بھی اسی قسم کی تقلید کی شدید مذمت کی گئی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ان چار قسموں میں سے بہترین، منطقی، مرغوب، ممدوح اور مطلوب پہلی قسم ہی ہے اور اصولی طور پر ماہرانہ امور میں انسانوں کی زندگی کے محور کو بھی اسی قسم کی عاقلانہ اور منطقی پیروی ہی تشکیل دیتی ہے، کیونکہ مسلم ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی نابغہ روزگار ہو پھر بھی وہ تمام امور میں مہارت تامہ کا دعویٰ نہیں کرسکتا، خاص کر ایسے دور میں کہ ایک فن میں کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم کے کئی سر رشتے ہیں۔ مثلاً طب ہی کو لے لیجئے جس کی سینکڑوں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے کئی سر رشتے ہیں اور عام طور پر یہ بات محال ہے کہ ایک فرد اسی فن کے تمام سر رشتوں میں مہارت تامہ حاصل کرلے، چہ جائیکہ تمام فنون کا کلی طور پر ماہر ہو۔

اس صورت میں جو شخص جس سر رشتے میں ماہر ہوگا اسی کے بارے میں اپنے اجتہاد پر عمل کرے گا اور جو لوگ اس بارے میں صاحب نظر اور مجتہد نہیں ہیں ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہِ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اس فن کے صاحبان نظر اور ماہرین کی طرف رجوع کریں۔

اگر کوئی تعمیراتی انجینئر بیمار ہوگا تو وہ یقیناً طبیب کی طرف ہی رجوع کرے گا اور اگر وہی طبیب کوئی عمارت بنانا چاہے گا تو اس انجینئر کی طرف رجوع کرے گا۔ یعنی اگر ہر شخص ایک رشتہ میں ''مجتہد'' ہے تو دوسرے رشتہ میں ''مقلد'' ہوگا اور یہ ایک معقول اصول ہے (جاہل کا عالم کی طرف، غیر مجتہد کا مجتہد کی طرف اور غیر ماہر کا ماہر کی طرف رجوع) جو ازل سے چلا آرہا ہے۔ بلکہ اصولی طور پر انسانی زندگی کا پہیہ اس اصول سے ہٹ کر گھوم ہی نہیں سکتا۔ البتہ صاحبانِ نظر اور ارباب اجتہاد کی کچھ شرائط جن کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا۔

یہ وہی چیز ہے جسے بعض اوقات ''اسوۂ حسنہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے "لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنه" یعنی تمہارے لیے رسولؐ خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ (احزاب ۲۱) اور سورۂ انعام میں ہم پڑھتے ہیں "اولئك الذين هدى الله فبهو اهم اقتده" یعنی (حضرت اسماعیلؑ، یونسؑ، یحییٰ، یوسفؑ اور موسیٰ علیہم السلام جیسے انبیاء) ایسے لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہدایت کی ہے۔ پس تو ان کی ہدایت کی اقتدا کر۔ (انعام ۹۰)

اگرچہ اس آیت میں خطاب پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے لیکن بعید نہیں ہے کہ اس سے مراد امت ہو۔

رہ گئیں تقلید کی دوسری تین قسمیں تو وہ سب کی سب باطل، بے بنیاد اور غیر منطقی ہیں۔ کیونکہ:

(الف) جاہل سے عالم کی تقلید اور (ب) جاہل اسے جاہل کی تقلید تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں قسمیں باطل ہیں۔ لیکن عالم سے عالم کی تقلید اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اسے تقلید نہیں کہا جاتا، ہرگاہ عالم کا عالم کی طرف رجوع کسی مسئلے کے بارے میں مشورے اور مزید معلومات کے حصول کے لیے بھی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ یہ صورت حال مذموم اور نامعقول نہیں لیکن یہ ''تقلید'' بھی نہیں ہے، بلکہ اسے ''تحقیق'' کی ایک قسم کہا جائے گا جو اس سر رشتہ میں مہارت کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔

تقلید یہ ہوتی ہ کہ انسان کسی رشتے میں اپنے علم وعمل کونظر انداز کر کے اپنے کان اور آنکھیں بند کرتے ہوئے دوسرے شخص کی پیروی کرے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ایسا شخص جو خود تحقیق اور اجتہاد پر قادر ہے اگر وہ یہ طریقہ کار اختیار کرے گا تو اس کے لیے قابل مذمت ہوگا۔ اسی لیے تو فقہ اسلامی میں مجتہدین کے لیے کسی کی تقلید حرام ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر تقلید کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے کہ غیر فقہی افراد کو فقہی مسائل میں فقہاء اور مجتہدین کی تقلید کیوں کرنی چاہیے اور یہی فلسفہ تمام علمی رشتوں میں کارفرما ہے۔ چونکہ اسلامی فقہ اس قدر وسیع اور گہری ہے کہ جو شخص اس میں مہارت اور تخصص حاصل کرنا چاہتا ہے اسے اپنی ساری زندگی اس کے حصول اور تحقیق کے لیے وقف کر دینا پڑتی ہے اور یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے مجبوراً اس کے لیے ایک خاص گروہ کو کمر ہمت باندھنا پڑتی ہے اور دوسرے لوگوں کو فقہی مسائل میں ان کی تقلید کرنا پڑ جاتی ہے۔ لیکن اسلامی اصولوں (اصولِ دین) میں تقلید جائز نہیں ہوتی کیونکہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ان کی تحقیق پر قادر ہوتا ہے۔

۲۔ صحیح تقلید کی شرائط

عموماً تقلید کی تعریف میں کہتے ہیں کہ ''کسی دوسرے کی بات کو تفصیل دلیل کے بغیر قبول کرنے کا نام ''تقلید ہے۔ اور بعض لوگوں نے اسے مزید وسعت دی ہے اور قول وگفتار سے ہٹ کر عملی پیروی کو بھی اس کا جز وسمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض دوسرے حضرات نے تو تقلید کو اس سے بھی وسیع تر معنی میں بیان کیا ہے اور ''دوسروں کے اعمال، رفتار وگفتار اور صفات جو کسی انسان میں لاشعوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں'' کو بھی تقلید کا حصہ سمجھتے ہیں۔

البتہ تعریف کا یہ آخری حصہ یعنی لاشعوری تاثیر ہماری بحث کے موضوع سے خارج ہے، لیکن اس کا پہلا اور دوسرا حصہ بھی اس وقت قابل ستائش تقلید کہلائیں گے جب اس شخص (مرجع تقلید میں) یہ دو شرائط پائی جائیں۔ (الف) علم (ب) صداقت۔ یعنی وہ صاحب علم ونظر ہو اور اپنی تشخیص کو دوسروں تک پوری صداقت کے ساتھ منتقل کرے اور اگر ان دو میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو جائے تو تقلید نا قابل ستائش قسم میں داخل ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس موضوع میں تقلید کی جا رہی ہے وہ ان موضوعات میں سے ہو جن کا تعلق تخصص سے ہوتا ہے، تا کہ اس میں تقلید جائز ہو سکے۔ رہے وہ مسائل جو عمومی ہوتے ہیں، یعنی ہر شخص ان کی تحقیق کر سکتا ہے (جیسے اعتقادی اصول سے متعلق مسائل، یا کچھ وہ اخلاقی اور اجتماعی مسائل جن کا تخصص سے تعلق نہیں ہوتا) ہر شخص کو اپنی بساط کے مطابق ان میں تحقیق کرنی چاہیے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مقلد خود بھی استنباط پر قادر نہ ہو۔ کیونکہ اگر وہ اس پر قادر ہو اور کسی شخصی مسئلے کو پوری تحقیق کے ساتھ زیر بحث لا سکتا ہے اور اس سے نتیجہ اخذ کر سکتا ہے تو اس کے لیے تقلید ممنوع ہے۔

یہیں سے تین جہات کے لحاظ سے (مرجع کی شرائط، مقلد کی شرائط اور موضوع کی شرائط کہ جس میں تقلید کی جا سکتی ہے) قابل ستائش اور نا قابل ستائش تقلید کے درمیان موجود سرحد واضح ہو جاتی ہے۔

اس بحث کو ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ ہی ختم کرتے ہیں:

حضرت امام علیہ السلام کی خدمت میں کسی نے عرض کیا جناب! باوجود یکہ یہودی عوام اپنی آسمانی کتاب کی اطلاع اپنے علماء کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے نہیں رکھتے تھے تو پھر خداوند عالم نے ان کی اس تقلید کی وجہ سے ان کی اس قدر مذمت کیوں فرمائی ہے؟ (اس کا اشارہ سورہ بقرہ کی ۷۸ویں اور ۷۹ویں آیات کی طرف تھا یعنی "ومنهم اميون لا يعلمون الكتاب الا اماني" اور "فويل للذين يكتبون الكتاب بايديهم" کی طرف)۔

تو کیا یہودی عوام میں اور ہمارے عوام میں اس بارے میں کوئی فرق ہے؟

امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ہمارے عوام اور یہودی عوام کے درمیان ایک لحاظ سے فرق ہے اور ایک لحاظ سے برابری ہے۔ جس لحاظ سے برابری ہے وہ یہ کہ خداوند عالم نے ہمارے عوام کی بھی اسی طرح مذمت کی ہے جس طرح یہودی عوام کی مذمت کی ہے۔ لیکن جس لحاظ سے ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ یہودی عوام اپنے علماء کی کیفیت سے آگاہ تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ مطالب کو بیان کرنے میں جھوٹ سے کام لے رہے ہیں، حرام اور رشوت کھا رہے ہیں اور خدائی احکام کو تبدیل کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی فطرت کے ذریعہ اس حقیقت کو بخوبی دریافت کر لیا تھا کہ اس قسم کے لوگ فاسق ہیں اور خدا اور احکام خدا کے بارے میں ان کی باتوں کو تسلیم کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی خدا کے رسولوں کے بارے میں ان کی کوئی بات قابل قبول ہے۔ اسی لیے خدا نے ان کی مذمت کی ہے۔

اگر ہمارے عوام بھی اپنے علماء سے آشکار افق، شدید تعصب اور دنیا اور حرام مال کے لیے ان کی حرص کو دیکھیں اور پھر ان کی اتباع کریں تو ان یہودیوں کی مانند ہیں جن کی خدا نے اپنے فاسق علماء کی پیروی کرنے کی وجہ سے مذمت کی ہے۔

پھر آپؑ نے ارشاد فرمایا:

"فا ما من كان من الفقهاء صائنا لنفسه حافظا لدينه مخالفا على هواه مطيعا لا مر مولاه فللعوام ان يقلدوه"

''یعنی جو فقہاء اپنی حفاظت کرنے والے، دین خدا کو بچانے والے، اپنی نفسانی خواہشات کے مخالف اور اپنے مولا کے فرمان کے مطیع ہوں، تو عوام کو چاہیے کہ وہ ان کی تقلید کریں۔''[1]

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۸، ص ۹۴، باب ابواب صفات القاضی، حدیث ۲۰۔ البتہ کتاب وسائل الشیعہ میں اس حدیث کا کچھ حصہ بیان ہوا ہے اور مکمل حدیث آپ کو ''احتجاج طبرسی'' اور تفسیر امام حسن عسکری میں ملے گی۔ مرحوم علامہ مجلسی نے بھی اسے اپنی کتاب بحار الانوار، جلد ۲، ص ۸۶ تا ۸۹ میں اسے نقل کیا ہے۔

۳۔اندھی تقلید کے اسباب

اندھی تقلید یا دوسرے لفظوں میں ''جاہل کی جاہل سے تقلید'' اوراس سے بھی بدتر ''جاہل سے عالم کی تقلید'' فکری وابستگی کی علامت ہےاور یہ امر بہت سے اسباب کا حامل ہے جن میں سے چیدہ چیدہ یہ ہیں:

۱۔فکری نابالغی:

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو جسمانی طور پر تو بالغ ہو چکے ہوں لیکن آخری عمر تک فکری بلوغ اور استقلال کو نہ پہنچ سکیں۔ایسے لوگ اسی وجہ سے اپنی ساری زندگی ہر کس وناکس کی پیروی کرنے میں گزار دیتے ہیں اور کسی بھی وقت ذاتی طور پر کسی مسئلے کا تجزیہ وتحلیل نہیں کر سکتے۔

ان کی آنکھیں ہمیشہ دوسروں پر لگی رہتی ہیں۔جو وہ کہہ دیں اسے دہراتے رہتے ہیں اور اس میں ان کا اپنا کوئی ارادہ اور اختیار نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ کبھی تو وہ اپنے ماحول کی تبدیلی سے اپنی راہوں کو مکمل طور پر تبدیل کر لیتے ہیں اور اصطلاح کے مطابق ان کے اندر ۱۸۰ درجے کی تبدیلی آجاتی ہے۔

اس قسم کی اندھی تقلید کا مقابلہ کرنے اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ معاشرے کی تعلیمی سطح کو بلند کیا جائے اور معاشرے میں موجود افراد کے اندر خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے اور ان کے افکار کو جلا بخشی جائے۔

۲۔شخصیت پرستی:

اس طرح کہ انسان کسی شخص کو بے نظیر اور عدیم المثال ہیرو کے عنوان سے قبول کر لیتا ہے اور اس کے سامنے اسے اپنے نظریہ کو بیان کرنے کی جرأت نہیں ہوتی اور وہ آنکھ اور کان بند کر کے اس کے پیچھے لگ جاتا ہے،خواہ وہ شخصیت تقلید اور اتباع کی اہل نہ بھی ہو۔

۳۔آباؤاجداد سے شدید تعلق:

اور وہ بھی اس حد تک کہ کبھی کبھی تو عظمت اور تقدس کے ہالہ کے اس قدر اندر چلے جاتے ہیں کہ وہ لوگ خواہ کسی قسم کی اہلیت اور لیاقت نہ بھی رکھتے ہوں پھر بھی نسل در نسل ان کے خیالات وافکار ان لوگوں کے لیے قابل عمل ہوتے ہیں اور کانوں اور آنکھوں کو بند کر کے ان کی اتباع کی جاتی ہے اور عام طور پر بھی ہوتا ہے کہ بعد کی نسلیں جو گزشتہ لوگوں کے علوم کی وارث ہوتی ہیں اور جو بھی تازہ اور جدید معلومات کی حامل ہوتی ہیں اور گزشتہ لوگوں سے علم میں بھی زیادہ ہوتی ہیں،لیکن پھر بھی آنکھیں اور کان بند کر کے ان کی تقلید پر اڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

۴۔گروہ بندی یا قبائلی تعصّبات:

اس قسم کے رجحانات اور تعصّبات اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ کچھ لوگ آنکھیں اور کان بند کر کے اپنے گروہ، پارٹی،قبیلہ اور

جماعت کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کہیں وہ اس کا تکرار کرتے ہیں اور اپنی طرف سے مسائل کے تجزیہ و تحقیق اور فکری استقلال کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

یہ چار اور دوسرے کئی عوامل ایسے ہیں جو اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ بہت سی خرافات، موہومات، باطل عقائد، غلط آداب و مراسم، جاہلانہ رسومات اور بدعملی ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے میں اور ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

بالفاظ دیگر مندرجہ بالا غلط رجحانات، میلانات اور تعصّبات ان کے افکار کے آگے حجاب ہوتے ہیں اور حق کی معرفت سے انہیں باز رکھتے ہیں۔

۹۔عیش پرستی کا پردہ

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو غور سے سنتے ہیں۔

آیات

(۱) وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾ (سورہ توبہ ۸۶-۸۷)

(۲) اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾ (سورہ توبہ ۹۳)

ترجمہ

(۱) اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ تم خدا پر ایمان لے آؤ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ مل کر جہاد کرو، تو ان (منافقین) میں سے کچھ لوگ، جو طاقتور ہیں، آپ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ہمیں قاعدین (جن سے جہاد معاف ہے) کے ساتھ رہنے دیں۔ وہ اسی بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر لگائی جا چکی ہے۔ اس لیے وہ نہیں سمجھ پاتے۔

(۲) مواخذے کی راہ صرف ان لوگوں کے لیے کھلی ہوئی ہے جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں جبکہ وہ بے

نیاز ہیں (اور کافی امکانات رکھتے ہیں) وہ اس بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ جائیں اور خداوند عالم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ لہٰذا وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

بچوں کی طرح ہمیں بھی جہاد سے معاف رکھا جائے

ان آیات کی پہلی قسم ان لوگوں کی حالت بیان کر رہی ہے جو جہاد کے سلسلے میں خدائی احکام پر عملدرآمد کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ حالانکہ وہ جسمانی اور مالی لحاظ سے اس قدر طاقتور تھے کہ وہ میدان جنگ میں حاضر ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کی ہر ممکن یہی کوشش رہتی کہ وہ خود کو کمزور و ناتواں افراد کی صف میں شامل رکھیں۔ یعنی ایسے لوگوں کی صف میں جو جسمانی یا مالی لحاظ سے جہاد کی توانائی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اصرار رہتا تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اجازت دے دیں کہ وہ ''قاعدین'' اور ''خوالف'' کی صف میں شامل رہیں۔

''قاعدین''، ''قاعد'' (بیٹھا ہوا) کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ لوگ جو جہاد سے معذور ہوتے ہیں اور ''خوالف'' ''خالفہ'' کی جمع ہے جو ''خلف'' (بروزن حرف) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں پچھلا حصہ۔ اسی لیے ان عورتوں کو ''خالفہ'' کہا جاتا ہے جو مردوں کے گھر سے باہر جانے کے بعد گھر میں رہ جاتی ہیں۔ لیکن بعید نہیں ہے کہ یہاں پر اس کا عمومی مفہوم مراد ہو، یعنی جو لوگ بھی کسی نہ کسی قسم کے عذر کی وجہ سے میدانِ جہاد میں حاضر ہونے سے قاصر ہوتے ہیں، خواہ وہ عورتیں ہوں یا بچے، بوڑھے ہوں یا بیمار۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''خالف'' اس شخص کو کہتے ہیں جو زیادہ خلاف ورزی کرتا ہے۔[1]

یہ لفظ کبھی ''بدبو'' کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ بدبو خوشبو کی قائم مقام ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے اس کے معنی انحطاط اور پستی کی طرف رجحان بھی کئے ہیں کیونکہ یہ خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن پہلا معنی سب معانی سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

معنی خواہ کچھ بھی ہو اصل مقصد یہ ہے کہ یہ عیش پرست اور رفاہ طلب لوگ جو اس بات کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوتے کہ طوفانوں اور اجتماعی بحرانوں میں دوسرے لوگوں کی مانند ایثار کا مظاہرہ کریں، بلکہ وہ اس کے خواہاں ہوتے ہیں کہ خواہ انہیں بچوں اور بیماریوں کی صف میں کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے، جہاد سے بچے رہیں۔ اسی لیے آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے ''ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اسی لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے۔''

جی ہاں! راحت طلبی، تن پروری اور عیش و نوش بھری مرفہ زندگی حجاب بن کر ان کی فکر کی آنکھوں پر پڑ چکی ہے۔ انہیں یہ سمجھ نہیں ہے

---

[1] المنار، جلد ۱۰، ص ۵۷۲

کہ انسان کی سعادت اور خوش بختی خواب وخوراک میں نہیں بلکہ کبھی تو اس کی سعادت میدانِ جہاد میں قدم رکھنے اور اپنے پیکر کو خاک وخون میں غلطاں دیکھنے میں ہے۔ اس طرح اس کے لیے لقاءاللہ، قرب حق کے جوار اور ضیافت حق کی راہیں کھلتی ہیں۔ لیکن جو شخص ان مسائل کو نہیں سمجھتا ممکن ہے کہ وہ ان کا مذاق اڑائے اور توہین کرے۔

دوسری آیت میں پہلے تو ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں میدان جہاد میں حاضر ہونے سے معاف قرار دیا گیا ہے، جیسے کمزور، بیمار اور وہ لوگ جو کسی اور وجہ سے میدان جہاد میں شریک ہونے سے قاصر ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دل عشق جہاد کے شوق میں دھڑکتا رہتا ہے اور اس راستے میں خرچ کرنے کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے سیل اشک ان کی آنکھوں سے جاری رہتا ہے۔ پھر فرماتا ہے ''ایسے لوگ قابل مواخذہ نہیں ہیں، بلکہ مواخذہ تو ان لوگوں سے کیا جائے گا جو صاحبانِ ثروت اور طاقت ہیں اور پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ پیچھے رہ جانا چاہتے ہیں۔''

اس مقام پر ہی قرآن کہتا ہے ''خداوند عالم نے ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اسی لیے وہ کچھ نہیں جانتے۔'' کیونکہ عیش و عشرت اور راحت طلبی کا ضخیم حجاب ان کے دل کی آنکھوں پر پڑا ہوا ہے۔ اس طرح سے دونوں آیتیں ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہی ہیں اور واضح کر رہی ہیں کہ ''راحت طلبی اور عیش وعشرت کی وجہ سے جہاد سے باز رہنے اور حقیقت کے ادراک سے محروم رہ جانے'' کے درمیان ایک خاص تعلق اور ربط موجود ہے۔

۱۰۔ آرزوؤں کا حجاب

آیات

(۱) يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ (سورہ حدید ۱۴)

ترجمہ

(۱) وہ (منافقین بروزِ قیامت) مومنین کو آواز دیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ ضرور تھے، لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور (پیغمبرؐ کی موت کا) انتظار کرتے رہے اور شک وتردد میں پڑے رہے اور لمبی آرزوؤں نے تمہیں فریب میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ خدا کا حکم (یعنی تمہاری موت کا پیغام) آپہنچا اور شیطان نے خدا کے بارے میں تمہیں فریب دیا۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

لمبی آرزوئیں

"امانی"، "امنیه" کی جمع ہے جس کے معنی ایسی حالت ہیں جو انسان کے نفس میں کسی چیز کی تمنا سے پیدا ہوتی ہے۔[1] جسے فارسی میں "آرزو" کہتے ہیں۔ البتہ چونکہ معقول قسم کی آرزو معیوب ہی نہیں بلکہ مستقبل کے بنانے کے لیے تحرک کا ایک عامل بھی ہے۔ جو چیز معیوب اور قابل اعتراض ہے وہ لمبی لمبی اور غیر منطقی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ اسی لیے "امنیه" اور "امانی" کی ایسے مواقع پر ان لمبی چوڑی اور دور دراز کی آرزوؤں سے تفسیر کی جاتی ہے جو انسان کو ہر چیز سے غافل کر دیتی ہیں اور اس کی عقل و فکر پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔

"ابن اثیر" کہتے ہیں "تمنی" کا معنی کسی مطلوب امر کے حصول سے تعلق ہے اور اسی طرح ان حوادث کے بارے میں دل میں پیدا ہونے والی باتیں بھی "تمنی" کہلاتی ہیں جو حوادث مستقبل میں رونما ہوتے ہیں یا رونما نہیں ہوتے اور "منیه" (بروزن کنیہ) اور "امنیه" کا ایک معنی ہے[2] اور بعض لوگوں نے "امنیه" کو جھوٹ کے معنی میں ذکر کیا ہے، کیونکہ دروغ گو انسان کسی بات کو اپنے دل میں پروان چڑھا رہا ہوتا ہے۔[3]

راغب کہتے ہیں کہ چونکہ جھوٹ ایسی چیز کا تصور ہوتا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، آرزوئیں بھی جھوٹ اور دروغ گوئی کا سرچشمہ سمجھی جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر جھوٹ کو "امنیه" کہا جاتا ہے تو اسی وجہ سے ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے اس کلمہ کی اصل کسی چیز کا تصور میں لانا، فرض کرنا اور اندازہ لگانا، بتایا ہے[4] اور آرزوؤں کو اس لیے "امانی" کہتے ہیں کیونکہ انسان اپنے دل میں انہیں فرض کرتا، تصور میں لاتا اور ان کا اندازہ لگاتا ہے۔

بہرحال جب مومنین قیامت کے دن نورِ ایمان کی روشنی میں عرصہ محشر کو جلدی جلدی طے کر کے بہشت کی طرف جا رہے ہوں گے تو منافقین پکار کر کہیں گے "ایک نظر ہم پر بھی ڈالتے جایئے تا کہ ہم آپ کے نور سے کچھ روشنی حاصل کر سکیں۔ تو وہ جواب میں کہیں گے تم (دنیا میں) واپس لوٹ جاؤ اور وہاں سے جا کر نور حاصل کرو۔ اس موقع پر ایک دیوار انکے درمیان حائل ہو جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا جس کے اندر کی طرف رحمت اور باہر کی طرف عذاب ہوگا۔"

---

[1] مفردات راغب۔ توجہ رہے کہ "امانی"، "امنیه" کی جمع ہے اور "منی" (بروزن شا) "منیه" (بروزن کنیہ) کی جمع ہے۔

[2] لسان العرب

[3] المنجد، مادہ "منی"

[4] مجمع البحرین طریحی

یہی موقعہ ہوگا کہ منافقین کی آواز بلند ہوگی اور وہ کہیں گے کہ کیا ہم آپ کے ساتھ نہیں تھے؟ کیا ہم دنیا میں ایک معاشرے میں نہیں رہ رہے تھے اور یہاں پر بھی کچھ دیر کے لیے ہم آپ کے ہمسفر رہے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ آپ ہم سے اچانک جدا ہو گئے، آپ تو رحمت الٰہی کی طرف چلے گئے اور ہمیں عذاب کے چنگل میں ڈال گئے؟

اس مقام پر وہ انہیں جواب دیں گے ''ٹھیک ہے کہ ہم اکٹھے رہے ہیں، کوچہ و بازار میں، حتیٰ کہ بعض اوقات سفر و خضر میں بھی ساتھ رہے ہیں، ایک دوسرے کے ہمسائے بھی رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض مواقع پر تو ایک گھر میں بھی رہے ہیں، لیکن تم نے پانچ عظیم غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ پہلی تو یہ کہ تم نے کفر و نفاق کی راہوں پر چل کر خود کو ہلاکت میں ڈال دیا اور فتنہ پردازی کی۔(ولکنکم فتنتم انفسکم)

دوسری یہ کہ تم ہمیشہ مسلمانوں کی شکست، حتیٰ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کے منتظر رہے اور ہر کام میں لیت و لعل سے کام لیتے رہے۔(وتربصتم)

تیسری یہ کہ تم ہر چیز میں شک اور تردد کا اظہار کرتے تھے، خصوصاً معاد اور اسلام کی حقانیت کے معاملے میں۔(وارتبتم)

چوتھی یہ کہ لمبی چوڑی اور طولانی امیدوں نے تمہیں فریب دیا اور تمہاری عقل و فکر پر پردہ ڈال دیا، حتیٰ کہ تمہاری موت کا وقت آن پہنچا۔(وغرتکم الامانی حتیٰ جاء امر اللہ)۔

پانچویں ان سب کے علاوہ فریب کار شیطان نے بھی تمہیں خدا کے بارے میں فریب دیا اور تمہیں کہا خدا کی عفو و بخشش کے ساتھ دل لگائے رکھو، وہ تمہیں ہرگز سزا نہیں دے گا۔(وغرکم باللہ الغرور)۔

جی ہاں! یہی عوامل تھے جو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلے اور وہ منظر تشکیل دیا جو تم دیکھ رہے ہو اور یہ دیوار جو تمہیں نظر آ رہی ہے انہی عوامل نے ایجاد کی ہے۔

ہماری بات کا شاہد چوتھا جملہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ لمبی چوڑی اور طولانی امیدوں نے تمہیں فریب دیا۔ جی ہاں! بسا اوقات انسانی آرزوؤں کا سلسلہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ انسان کے تمام افکار کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور اسے ہر چیز سے غافل اور بے خبر کر دیتا ہے اور خیالوں اور سوچوں کی ایک دنیا میں لے جاتا ہے، آنکھوں اور کانوں کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے اور دانا اور ہوشیار لوگوں کو ہر طرف سے بے خبر کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بسا اوقات اپنی زندگی کے لیے ایسے ایسے منصوبے تیار کرتے ہیں جو عمر نوح میں بھی قابل عمل نہیں ہوتے اور بعض اوقات اپنے مادی مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسی مقدمہ سازی کرتے ہیں کہ ہر شخص ایک سادہ سے اندازے سے ہی بتا دیتا ہے کہ اس تک صدیوں میں بھی رسائی ناممکن ہے اور اسی کا نام حجاب معرفت ہے۔

کچھ اور مفسرین نے "امانی" کی تفسیر میں مذکورہ پانچ چیزوں کے علاوہ پانچ اور چیزیں بھی بتائی ہیں اور وہ یہ ہیں: ''مومنین کی شکست و کمزوری کی آرزو، شیطانی فریب کاری، دنیا، اپنے لیے پیغمبر کے استغفار کی انتظار اور نیکیوں کو یاد رکھنا اور برائیوں کو فراموش کر دینا،[1] جبکہ بعض

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۹، ص ۵۶۴۱۷

دوسرے مفسرین نے انہیں ''اباطیل'' سے تفسیر کیا ہے۔

لیکن بغیر بتائے یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کچھ لمبی چوڑی آرزوؤں کے جامع مفہوم میں آجاتا ہے۔

مزید تشریح

آرزوؤں کا حجاب روایات کی رو سے

یہ ایک حقیقت ہے کہ خیال باقی پر مبنی اور واقعیت سے دور آرزوئیں انسانی عقل وشعور پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اس واقعیت کا تذکرہ صرف قرآن مجید ہی میں نہیں بلکہ روایات اور تاریخ میں بھی اس کے کافی حد تک شواہد ملتے ہیں۔ چنانچہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی ایک معروف حدیث میں ہے:

"ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان، اتباع الھوی و طول الامل، فاما اتباع الھوی فیصد عن الحق و اما طول الامل فینسی الاخرۃ"

''سب سے زیادہ خطرناک چیزیں جن سے مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے، دو ہیں۔ ایک تو خواہشات نفسانی کی پیروی اور دوسرے لمبی آرزوئیں۔ کیونکہ خواہشات نفسانی کی پیروی حق سے مانع ہوجاتی ہے اور لمبی آرزوئیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں۔''[1]

حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہی سے ایک اور حدیث کلمات قصار میں موجود ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

"الامانی تعمی اعین البصائر"

''لمبی آرزوئیں بصیرت کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہیں۔''[2]

ایک اور حدیث میں آپؑ ہی فرماتے ہیں:

"جماع الشر فی الاغترار بالمھل والاتکال علی الامل"

''شر اور فساد جمع کر دیئے گئے ہیں، خدا کی طرف سے دی گئی مہلتوں اور لمبی آرزوؤں پر بھروسہ کرنے میں۔''[3]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۲۷۵

[3] غرر الحکم (حرف ج نمبر ۵۵)

اسی طرح اسی سلسلے میں آپؑ ہی فرماتے ہیں:

"غرور الامل یفسد العمل"

''آرزوؤں کا دھوکا اعمال کو برباد کر دیتا ہے۔''[1]

قصہ مختصر وہی شخص حقیقت کے زیبا چہرے کو جیسا کہ وہ ہے دیکھ سکتا ہے اور معرفت کے چشمۂ زلال تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جو اپنی عقل کی آنکھوں پر آرزوؤں کا پردہ نہ ڈالے اور اس تیز و تاریک بادل کے درمیان نہ پھنس جائے۔

اس بحث کو حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہی کے فرمان ذیشان پر ختم کرتے ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں،

''واعلموا ان الامل یسهی العقل وینسی الذکر فاکذبوا الامل فانہ غرور وصاحبہ مغرور'' ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے لمبی آرزوئیں عقل کو گمراہ اور یادِ خدا کو فراموشی کے سپرد کر دیتی ہیں۔ اسی لیے تم آرزوؤں کی پروانہ کرو کیونکہ یہ دھوکہ باز ہیں اور اپنے صاحب کو فریب میں ڈال دیتی ہے۔''[2]

---

[1] غرر الحکم

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۸۶

دوسرا حصہ

وہ اعمال جو معرفت کے لیے حجاب بن جاتے ہیں

۱۱۔ گناہوں کا حجاب

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں:

آیات

(۱) الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (سورہ مطففین ۱۱ تا ۱۴)

(۲) فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ۝ (سورہ محمد ۲۳-۲۲)

(۳) اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَاۗءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ (سورہ اعراف ۱۰۰)

(۴) ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (سورہ روم ۱۰)

ترجمہ

(۱) جو لوگ کہ قیامت کا انتظار کرتے ہیں اور اس کا صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے اور گناہگار ہوتے ہیں۔ وہی لوگ کہ جب ان پر ہماری آیات کو تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو

گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے جس کا وہ گمان کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال اس زنگ کی مانند ہیں جو ان کے دل پر چڑھ چکا ہے۔

(۲) اگر تم روگردانی کرو تو کیا اس کے علاوہ کسی اور بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ تم زمین میں فساد برپا کرو اور قطع رحمی کرو؟ وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے دور کر رکھا ہے۔ ان کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

(۳) کیا وہ لوگ عبرت حاصل نہیں کرتے جو گزشتہ لوگوں کے وارث ہوتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں بھی ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیں تا کہ (حق کی آواز کو) نہ سن سکیں۔

(۴) جن لوگوں نے گناہ کیے ہیں ان کا انجام کار یہ ہوا کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا (اور راہِ ہدایت کو گم کر دیا)۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

گناہ انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتے ہیں

زیر بحث آیات میں سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو مکمل طور پر قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ پھر فرمایا ہے کہ قیامت کے دلائل واضح ہیں۔ صرف وہ لوگ ہی اس کے انکار پر اصرار کرتے ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے اور گناہگار ہوتے۔ وہ کسی بھی صورت میں خدائی آیات کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ اسی لیے جب ان کے سامنے خدائی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اس کا انکار کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں ''یہ سب کچھ گذشتہ لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔''

قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے جس کا وہ گمان کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے اس قسم کی باتیں اس لیے ہیں کہ ان کے برے اعمال اور گناہ زنگ بن کر ان کے دلوں پر چڑھ چکے ہیں۔

یہاں پر قرآن پاک نے لفظ "رین" کو استعمال کیا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ ارباب لغت کی طرف سے اس لفظ کی تین تفسیریں کی گئی ہیں۔ (۱) وہ زنگ جو قیمتی اشیاء پر چڑھ جاتا ہے۔ (۲) وہ زنگ جو دھاتوں پر چڑھ جاتا ہے اور ان کے گل سڑ جانے کی علامت ہوتا ہے۔ (۳) ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز پر تسلط اور غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ لہٰذا عقل پر شراب کے غلبے، زندہ انسانوں پر موت کے غلبے اور آنکھوں پر نیند کے غلبے پر اسی لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۳، ص ۹۴ و روح المعانی، جلد ۳۰، ص ۷۲

البتہ یہ سب معانی ایک جامع مفہوم میں جمع ہیں اور وہ ''زنگ'' ہے جو چیزوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ پھر اس کا اطلاق عمومی طور پر ایک چیز کے دوسری چیز پر غلبہ پانے پر ہونے لگا۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ گناہ دل کی شفافیت کو اس طرح ختم کر دیتا ہے کہ اس آئینہ الٰہی میں حقائق منعکس نہیں ہو پاتے، جبکہ مبداء و معاد کے سلسلے میں حق کی آیات بے حد و حساب اور واضح و آشکار ہیں۔

لہٰذا بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مرحلے میں برے اعمال انسان کے نفس میں نقش اور صورتیں ایجاد کرتے ہیں، دوسرے مرحلے پر یہ نقش اور صورتیں حق کے ادراک سے مانع ہو جاتے ہیں، تیسرے مرحلے پر انسانی روح اپنی اصل طبیعت کے پیش نظر، جو کہ صفا اور جلا کی حامل ہوتی ہے، حقیقت کو جیسا کہ ہے، اسی طرح درک کرتی ہے اور حق و باطل کے درمیان جدائی ڈالتی ہے اور تقویٰ کو فجور اور بے تقوائی سے جدا کرتی ہے۔ جیسا کہ سورہ شمس کی ساتویں اور آٹھویں آیت میں مذکور ہے کہ "**ونفس و ما سواها فالهمها فجورها و تقواها**" یعنی قسم ہے انسانی روح کی اور اس کی جس نے اسے پیدا کیا ہے اور پھر اسے فجور اور تقویٰ کا الہام کیا ہے۔[1]

بعض دوسرے مفسرین نے اس بارے میں ایک اور تحلیل پیش کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

''جب انسان کچھ اعمال کا تکرار کرتا ہے تو بالتدریج اس کے اندر ملکہ نفسانی پیدا ہو جاتا ہے جیسے لکھنا، پڑھنا وغیرہ کیونکہ ابتداء میں تو انسان بڑی مشکل سے اسے انجام دیتا ہے لیکن تکرار اور مشق کرنے سے اس پر یوں مسلط ہو جاتا ہے جیسے کسی قسم کے مطالعہ اور غور و فکر کی ضرورت محسوس کیے بغیر اسے انجام دیتا ہے۔''

''گناہوں کی بھی یہی صورت حال ہے۔ جب پے در پے انسان گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل میں گناہ کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ گناہ کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ اسے غیر اللہ کے ساتھ مشغول کر دیتا ہے جبکہ غیر اللہ کی طرف توجہ ظلمت اور تاریکی ہے اور جب اس قسم کی ظلمتیں یکے بعد از دیگرے دل پر غالب آ جاتی ہیں تو اس سے پہلی شفافیت کو سلب کر لیتی ہیں۔ ان ظلمتوں کے کئی مراتب و مراحل ہیں۔ پہلے مرحلے میں ''رین'' یا زنگ ہے، دوسرے میں ''طبع'' (مہر لگانا) ہے اور ان سے بالاتر مرحلہ ''اقفال'' (تالوں) کا ہے۔''

آیات کی دوسری قسم ان منافقین کی کیفیت بیان کر رہی ہے جو ایمان کے جھوٹے دعوے کرتے تھے اور جب جہاد کی آیات نازل ہوتی تھیں تو وہ بیمار دل لوگ ایسی حالت اختیار کر لیتے جیسے انہیں ابھی موت آیا ہی چاہتی ہے اور ان کی روح ابھی قبض ہوا ہی چاہتی ہے۔ قرآن مجید انہیں کہتا ہے ''اگر تم نے اپنی مخالفت جاری رکھی، خدا کے فرمان اور اس کی کتاب پر عملدرآمد سے روگردانی کرتے رہے، تو تم سے اس کے سوا اور کوئی توقع نہیں کی جائے گی کہ تم زمین میں فساد برپا کرو، حتی کہ تم قریب ترین رشتہ داروں پر رحم نہ کرو۔ پھر فرماتا ہے: ''خدا نے ایسے لوگوں پر (ان کے اپنے گناہوں کے جرم میں) لعنت کی ہے اور ان کی دیکھنے اور سننے کی طاقت سلب کر لی ہے، ان کی آنکھیں اندھی اور کان بہرے ہیں،

---

[1] المیزان، جلد ۲۰، ص ۳۴۹

وہ حق کے چہرے کو دیکھ نہیں سکتے اور حق کی آواز کو سن نہیں سکتے۔''

یہ آیات بھی جہاں ایک طرف یہ بتا رہی ہیں کہ نفاق دل وجان پر ایک حجاب ہے تو وہاں دوسری طرف پر بھی بتا رہی ہیں کہ گناہ، خاص کر ''فساد فی الارض''، ''قطع رحمی'' اور ''ظلم وستم'' بھی انسان کے ادراک اور تشخیص پر ضرور اثر ڈالتے ہیں۔

''ان تولیتم'' کے جملہ کی بعض مفسرین نے ''روگردانی'' کے معنی میں تفسیر کی ہے اور بعض دوسرے حضرات نے ولایت اور حکومت حاصل کرنے کے معنی میں۔ یعنی اگر کسی دن حکومت تمہارے ہاتھ آ جائے تو تم زمین میں فساد برپا کر دو، لوگوں کا خون بہا دو اور قطع رحمی سے کام لینے لگو۔[1] اسی لیے حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت میں آیا ہے کہ ''یہ آیت بنی امیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے''[2] جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب انہوں نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی، نہ تو چھوٹوں پر رحم کیا اور نہ ہی بڑوں پر۔ حتیٰ کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی خاک وخون میں غلطاں کر دیا۔

لیکن ''تولی'' خواہ جہاد سے روگردانی کے معنی میں ہو خواہ منصب حکومت کو پانے اور ظلم وفساد کے ارتکاب کے معنی میں، ہماری بحث پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ دونوں حالتوں میں ثابت ہوتا ہے کہ ''گناہ، دلوں کے پردے ہیں۔''

تیسری آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو گذشتہ لوگوں کے وارث ٹھہرے ہیں لیکن ان کے انجام سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ ارشاد ہوتا ہے ''اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کے گناہوں کی بدولت سزا دیں اور عذاب میں مبتلا کر دیں، ان کے دلوں پر مہر لگا دیں اور انکے سننے والے کان ان سے لے لیں۔''

گناہوں کی سزا کے ساتھ دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کا تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان گہرا رابطہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں ان دو عذابوں میں سے کسی ایک میں مبتلا کر دیں گے۔ گناہوں کی وجہ سے ہم یا تو انہیں تباہ وبرباد کر دیں گے یا پھر انہیں زندہ رکھ کر ان کے حق وباطل کی تشخیص کی حس سلب کر لیں گے اور یہ ایسی سزا ہے جو تباہی وبربادی اور خدا کے دوسرے عذابوں سے زیادہ دردناک ہے۔

لیکن اگر ''اصبناھم'' جو کہ فعل ماضی کی صورت میں ہے اور ''نطبع علی قلوبھم'' جو فعل مضارع کی صورت میں ہے، پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسرا جملہ ایک مستقبل حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پہلے جملے پر عطف نہیں ہے۔ تو پھر ایسی صورت آیت کا معنی یہ ہوگا ''ہم

---

[1] تفسیر روح المعانی، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر المیزان، انہی آیات کی بحث میں دونوں تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔

[2] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ص ۴۰ حدیث ۵۹

ہر حالت میں ان کے دلوں پر مہر لگا دیں گے اور ان پر حجاب ڈال دیں گے" (خواہ ان کو عذاب دینے میں جلدی کریں یا نہ کریں)۔[1]

اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت میں ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو برے اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے" آخر کار انہوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا" جو کہ کفر کا بالاترین مرحلہ ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ گناہ کوڑھ کی بیماری کی طرح انسان کی جان لے لیتا ہے اور اس کے ایمان کو بالتدریج برباد کر دیتا ہے، اس کے دل و جان پر پردے ڈال دیتا ہے اور اسے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے، وہ صرف ایمان ہی نہیں لاتا بلکہ اپنے کفر پر فخر بھی کرتا ہے۔ تاریخ اس قسم کے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ قرآن مجید کی مختلف آیات گناہوں اور معاصی کو معرفت کا ایک بڑا مانع بتلاتی ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو درک کی جا سکتی ہے اور بہت سے لوگوں کے لیے قابل لمس ہے اور وہ اس کا تجربہ بھی کر چکے ہیں۔ کیونکہ جب کوئی گناہ ان سے سرزد ہوتا ہے تو ان کے دل میں ایک خاص قسم کی تاریکی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس نیکی اور تقویٰ کی طرف رجحان کے وقت وہ ایک قسم کی روشنی اور معرفت کے لیے بہتر آمادگی محسوس کرتے ہیں۔

تشریح

روایات کی رو سے گناہ کا حجاب ہونا

یہ حقیقت وسیع طور پر اسلامی روایات میں توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے جن میں سے چند ایک روایات کو بطور نمونہ ہم پیش کر رہے ہیں:

۱۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے:

"ان العبد اذا اخطاء خطیئة نکتت فی قلبه نکتة سوداء فاذاهو نزع و استغفر الله و تاب صقل قلبه فان اعاد زید فیها حتی تعلو علی قلبه، و هو الران (الرین) الذی ذکر الله فی کتابه، کلا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون"

"جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ ظاہر ہو جاتا ہے، اگر تو اس نے اس گناہ سے

---

[1] یہ تفسیر ایک احتمال کی صورت میں انہی آیات کی تفسیر کے ضمن میں فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر میں بیان ہوئی ہے، جبکہ تفسیر المیزان میں اس جملہ کو "اصبنا" پر عطف کیا گیا ہے جس کا مستقبل کا معنی کیا گیا ہے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

رکنے کا قصد کر لیا اور توبہ کر لی تو اس کا دل صیقل ہو جاتا ہے اور نقطہ مٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پھر اس کا ارتکاب کیا تو وہ سیاہ نقطہ بڑھ جاتا ہے اور بار بار کے گناہوں سے اس کا تمام دل سیاہ ہو جاتا ہے اور یہ وہی زنگ ہے جس کے متعلق خداوند عالم نے اپنی کتاب میں یہ فرمایا ہے: "کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔"[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"کان ابی یقول ما من شیء افسد للقلب من خطیئة ان القلب لیواقع الخطیئة فما تزال به حتی تغلب علیه فیصیر اعلاه اسفله"

"میرے والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ گناہوں سے بڑھ کر کوئی چیز ایسی نہیں جو دل کو فاسد کر دیتی ہو۔ دل گناہوں کا اثر قبول کرتا ہے اور گناہ اس میں تدریجی طور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور ایک نہ ایک دن اس پر غالب آ جاتے ہیں۔ اس وقت دل الٹا ہو جاتا ہے اور اس کے اوپر کا حصہ نیچے آ جاتا ہے۔"[2]

ظاہری بات ہے کہ قلب کے الٹا ہونے سے مراد انسان کی حس تشخیص کی دگرگونی ہے، یعنی انسان گناہوں سے اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک اچھائیاں برائیاں بن جاتی ہیں اور برائیاں اچھائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ انسانی زندگی کا زبردست خطرناک مرحلہ ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں آپؐ ہی سے روایت ہے:

"اذا اذنب الرجل خرج فی قلبه نکتة سوداء فان تاب انمحت، وان زاد زادت حتی تغلب علی قلبه فلا یفلح بعدها ابدا"

"جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر تو وہ توبہ کر لے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور اگر گناہ میں اضافہ کرتا ہے تو اس کے تمام دل کو گھیر لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ہرگز نجات نہیں پا سکتا۔"[3]

واضح ہے کہ نجات اور فلاح کی سب سے پہلی شرط حقائق کا ادراک ہے۔ جس شخص کا قلب یعنی اس کی عقل بیکار ہو جائے تو وہ کیونکر

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۷۰۵۰۔ روح المعانی، جلد ۳۰، ص ۷۳۔ تفسیر فخر رازی جلد ۳۱ ص ۹۴

[2] اصول کافی، جلد ۲، باب الذنوب، حدیث ۱

[3] اصول کافی، جلد ۲، باب الذنوب، حدیث ۱۳

سعادت منداور کامیاب ہوسکتا ہے؟

یہی مفہوم حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی بیان ہوا ہے جو آنجنابؑ سے "کلا بل ران علی قلوبھم..." کی تفسیر کے سلسلے میں منقول ہے۔ اس میں دونقطوں کا ذکر ایک سفید نقطہ اور ایک سیاہ نقطہ، یعنی گناہ کی وجہ سے سیاہ نقطہ، سفید نقطہ پر غالب آ جاتا ہے اور اسے ڈھانپ دیتا ہے۔[1]

۴۔ ایک اور حدیث میں سرکاری رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"کثیرۃ الذنوب مفسدۃ للقلب"

''گناہوں کی کثرت انسان کے قلب (عقل) کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔''[2]

۵۔ کتاب الخصال میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"اربع خصال یمتن اقلب، الذنب علی الذنب....."

''چار ایسی خصلتیں ہیں جو دل کو مردہ کر دیتی ہیں: ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ.....''[3]

اسی لیے دل پر چھا جانیوالے گناہوں کے آثار کو دور کرنے کے لیے توبہ کے علاوہ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ دینی راہنماؤں کے فرامین کا مطالعہ کیا جائے جیسا کہ تفسیر نور الثقلین میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تذاکروا وتلاقوا وتحدثوا فان الحدیث جلاء للقلوب، ان القلوب لترین کما یرین السیف، وجلائہ الحدیث"

''ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کیا کرو، اپنے دینی بھائیوں سے ملاقات کیا کرو اور (دینی رہنماؤں کی) حدیثوں کو بیان کیا کرو، کیونکہ حدیث دلوں کو جلا عطا کرتی ہے، اس لیے کہ جس طرح تلوار پر زنگ چڑھ جاتا ہے اسی طرح دلوں پر زنگ بیٹھ جاتا ہے، جس کو حدیث ہی صیقل کرتی ہے۔''[4]

۶۔ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ایک خطبے کے ضمن میں ان لوگوں کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو دل کے مریض ہیں، ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] ایضا۔ حدیث ۲۰۔ مجمع البحرین میں ''رین'' کا مادہ بھی اسی چیز کو بیان کر رہا ہے

[2] تفسیر درمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۶

[3] الخصال جلد ۱ ص ۲۵۲ حدیث ۱۶۵ اسی سے ملتی جلتی روایت درمنثور جلد ۶ ص ۳۲۶ میں بھی ہے۔

[4] نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۳۱ حدیث ۲۳۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۳

"قد خرقت الشهوات عقله و اماتت الدنيا قلبه وولهت عليها نفسه فهو عبدلها"

''خواہشات نفسانی نے اس کی عقل کو پھاڑ دیا ہے، دنیا نے اس کے دل کو مردہ کردہ کر دیا ہے اور اس کا نفس والہانہ طور پر دنیا کا دلدادہ ہوگیا ہے اور وہ اس (دنیا) کا غلام بن چکا ہے۔''[1]

۷ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"اذا اظهر العلم و احترز العمل وائتلفت الا لسن واختلف القلوب و تقاطعت الاحرام هنالك لعنهم الله فاصمهم و اعمى ابصارهم"

''جب علم واضح طور پر آشکار ہوجائے گا اور عمل سے کنارہ کشی کی جائے گی، زبانیں متحد لیکن دلوں میں اختلاف ہوگا، رشتہ داروں سے قطع رحمی کی جائے گی، تو اس وقت خداوند عالم انہیں لعنت کرے گا اور اندھا اور بہرا بنادے گا۔''[2]

۸ اس چیز کی بعض گناہوں کے بارے میں مزید وضاحت کی گئی ہے جیسا کہ حضرت علیؑ ان لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں جو جہاد کو ترک کرتے ہیں:

"البسه الله ثوب الذل... وضرب على قلبه بالاسهاب واديل الحق منه تبضيع الجهاد"

''خداوند عالم ان کے بدن پر ذلت کا لباس پہنائے گا اور ان کی عقل وفہم تباہ ہوجائے گی اور جہاد کو ضائع کر دینے کے سبب ان کا حق پامال کر دیا جائے گا۔''[3]

---

[1] نہج البلاغۃ، خطبہ ۱۰۳

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۱۱ حدیث ۶۳

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷

۱۲۔ کفر اور روگردانی کا حجاب

سب سے پہلے ان آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آیات

(۱) تِلۡكَ الۡقُرٰى نَقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۱﴾ (سورہ اعراف ۱۰۱)

(۲) فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَكُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّقَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۱۵۵﴾ (سورہ نساء ۱۵۵)

(۳) وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعۡرَضَ عَنۡهَا وَنَسِىَ مَا قَدَّمَتۡ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا ؕ وَاِنۡ تَدۡعُهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى فَلَنۡ يَّهۡتَدُوۡۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾ (سورہ کہف ۵۷)

(۴) ..... وَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرٌ وَّهُوَ عَلَيۡهِمۡ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّكَانٍۢ بَعِيۡدٍ ﴿۴۴﴾ (سورہ فصلت ۴۴)

ترجمہ

(۱) یہ ایسی آبادیاں ہیں جن کی خبریں ہم آپ سے بیان کرتے ہیں وہ (اس قدر ہٹ دھرم تھے کہ) ان کے پاس خدا کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے لیکن جن چیزوں کی وہ پہلے سے تکذیب کر چکے تھے وہ ان پر ایمان نہیں لائے، خداوند عالم اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے (اور ہٹ دھرمی اور گناہ سے اصرار ان سے تشخیص کی حس سلب کر لیتے ہیں۔

(۲) چونکہ انہوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا اور خدائی آیات کا انکار کیا اور انبیاء کو ناحق قتل کیا اور مذاق کے طور پر کہا کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں (اور ہم انبیاء کی بات کو درک نہیں کر سکتے، اسی لیے درگاہ الٰہی سے دھتکارے گئے ہیں)۔ جی ہاں! خدا نے ان کے کفر ہی کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اسی لیے چند ایک لوگوں کے سوا کوئی بھی ایمان نہیں لاتے۔

(۳) اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو سکتا ہے جو پروردگار کی آیات کی یاددہانی کے وقت ان سے روگردانی کرتا ہے اور جو گناہ انجام دے چکا ہے، انہیں فراموش کر چکا ہے۔ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تا کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں سنگینی ڈال دی ہے (تا کہ حق کی آواز کو نہ سن سکیں) لہٰذا اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ تب بھی وہ ہرگز ہدایت نہیں پائیں گے۔

(۴) .....لیکن جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں سنگینی ہے اور وہ اس حد تک غلطی پر ہیں گویا وہ اندھے ہو چکے ہیں، (حق کی بات کو نہیں سنتے) ان لوگوں کی مانند ہیں جنہیں دور سے بلایا جائے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

گناہ کیونکر حجاب بن جاتا ہے؟

سب سے پہلی آیت میں پہلے تو گذشتہ اقوام کے پانچ گروہوں (قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط اور قوم شعیب) کی سرگزشت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ قومیں آیات الٰہی کی تکذیب کی وجہ سے خدائی عذابوں میں گرفتار ہوئیں۔ پھر فرماتا ہے کہ ''یہ وہ قومیں ہیں جن کی خبریں ہم آپ کو بتا رہے ہیں۔ یہ ایسی قومیں نہیں تھیں کہ جن پر اتمام حجت نہ ہو چکی ہو، بلکہ انبیاء الٰہی روشن دلائل لے کر ان کے پاس آئے لیکن انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر اپنے کفر اور تکذیب پر اصرار جاری رکھا اور کفر پر ان کا یہ اصرار اس بات کا سبب بن گیا کہ خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دے اور تشخیص کی حس ان سے سلب کر لے۔''

"و كذالك يطبع الله على قلوب الكافرين" (اسی طرح خدا کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے) کا جملہ ہر کافر کی طرف اشارہ نہیں ہے کیونکہ بہت سے حق طلب افراد ایسے ہیں جو انبیاء کرام کی دعوت کو سننے سے پہلے کافر تھے، بعد میں مومنین کی صفوں سے آ ملے۔ لہٰذا اس سے مراد ایسے کافر ہیں جو اپنے کفر پر اصرار کرتے ہیں اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں اور یہی کفران کے درک و دید سے مانع ہوتا ہے۔ اس بات کی دلیل یہ جملہ ہے "فما كانوا ليئومنوا بما كذبوا به من قبل" کیونکہ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ ''جن چیزوں کی یہ پہلے تکذیب کر چکے ہیں اس پر ایمان نہیں لائیں گے'' یعنی وہ اس قدر متعصب ہیں کہ قطعاً اپنی روش کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں اور نہ ہی باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف

پلٹنے کے لیے تیار ہیں۔تفسیر المیزان میں اور فخر رازی کی تفسیر میں ہر ایک نے اس کے پانچ پانچ معانی ذکر کیے ہیں۔[1] لیکن بظاہر اس کا مفہوم وہی ہے جو اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

دوسری آیت میں کچھ یہودیوں کی خلاف ورزیوں اور خدا کے پیغمبروں کے ساتھ ان کی دشمنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''ہم نے بوجہ ان کی پیمان شکنی، خدائی آیات سے انکار اور انبیاء کے قتل کے ان پر لعنت کی ہے اور ان سے اپنی رحمت کو دور رکھا ہے۔اسی طرح ان کے آیات الٰہی کے مذاق اڑانے کی وجہ سے بھی جب وہ کہتے تھے کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں اور (اے موسیٰ) ہم تمہاری کوئی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔''

قرآن کہتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ وہ کسی چیز کو درک نہیں کرتے اور یہ اس لیے ہے کہ خدا نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں پر کفر سے مراد وہ کفر ہے جس کے ساتھ ہٹ دھرمی ملی ہوتی ہے، وہ کفر ہے جس کے ساتھ انبیاء کے بارے میں دشمنی اور عناد ملا ہوتا ہے، وہ کفر ہے جس کے ساتھ مسلسل عہد شکنی اور آیات الٰہی کا مذاق ملا ہوتا ہے۔مسلم بات ہے کہ ایسا کفر ہی حجاب ہوتا ہے اور حجاب بھی ایسا سخت جو انسان کو حقائق کے درک کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ وہ چیز ہے جسے خود ان لوگوں نے اپنے لیے پسند کیا ہے اور جس کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ "**قلوبنا غلف**" (ہمارے دل غلاف میں ہیں) کے جملہ سے ان کی مراد آیات الٰہی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استہزاء اور مذاق اڑانا ہے، نہ یہ کہ وہ اپنے لیے واقعی اسی طرح کا عقیدہ رکھتے تھے، نہ ہی اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ ہم اس طرح پیدا کیے گئے ہیں کہ کسی حقیقت کو درک نہ کریں۔(جیسا کہ بعض مفسروں نے یہی کچھ لکھا ہے)۔[2] لیکن خدا نے ان کی ان باتوں کو حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے اور انہیں کہا ہے: ''جی ہاں! خدا نے تمہارے دلوں پر تمہارے کفر و ہٹ دھرمی کی وجہ سے مہر لگا دی ہے اور تم کچھ نہیں سمجھتے۔''

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ ہمارے دل ایسے ظروف ہیں جو علم و دانش سے لبریز ہیں۔جس طرح تلوار نیام میں ہوتی ہے اسی طرح ہم بھی علم و دانش سے سیر ہو چکے ہیں۔اب ہمیں کسی اور علم و دانش کی ضرورت نہیں ہے۔[3] لیکن یہ احتمال بھی بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح سے آیت کی تفسیر میں تین احتمال مذکور ہیں جن میں سے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی ہے۔بعض تفاسیر میں اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک روایت نقل کی گئی ہے جو نہایت ہی بامقصد اور پر معنی ہے۔فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۸ ص ۲۱۵ و تفسیر فخر رازی، جلد ۱۴ ص ۱۸۶

[2] تفسیر المیزان، جلد ۵، ص ۱۳۸ اور تفسیر قرطبی، جلد ۳، ص ۲۰۰۴

[3] یہ احتمال تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۱۱، ص ۸۷، تفسیر قرطبی، جلد ۳، ص ۲۰۰۴ اور تفسیر روح المعانی، جلد ۶، ص ۸ میں ذکر ہوا ہے۔

"الطباع معلق بقائمة العرش فاذا انتهكت الحرمة و عمل بالمعاصی و اجتری علی الله تعالی بعث الله تعالیٰ الطابع فطبع علی قلبه فلا یعقل بعد ذالك شیاء"

''خداوند عالم کی مہر ستون عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔ جب کسی قسم کی ہتک حرمت ہوتی ہے، یا گناہوں پر عمل ہوتا ہے، یا خدا کے مقابلے میں جرأت اور دیدہ دلیری سے کام لیا جاتا ہے تو خداوند عالم مہر لگانے والے کو بھیج دیتے ہیں کہ وہ اس مہر کے ساتھ اس شخص کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور وہ اس کے بعد کسی چیز کا ادراک نہیں کر پاتا۔''[1]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''طابع'' (بروزن قابل) کے معنی ہیں مہر لگانے والا اور ''طابع'' (بروزن آمد) کے معنی ہیں خود مہر اور معلوم ہوتا ہے کہ حدیث بالا میں پہلا لفظ ''باء کی زبر'' اور دوسرا لفظ ''باء کی زیر'' کے ساتھ ہے۔

یہ حدیث ایک بار پھر اس حقیقت کو واضح طور پر ثابت کر رہی ہے کہ اس موضوع میں ''جبر'' کا کسی قسم کا تعلق نہیں ہے بلکہ دل کے حجاب، خود انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اسی سلسلے کی تیسری آیت میں تقریری استفہام کی صورت میں فرماتا ہے ''آیا اس شخص سے بڑھ کر کوئی اور بھی ظالم ہو سکتا ہے جو خدا کی آیات کو سن کر روگردانی کرتا ہے اور اپنے گناہوں کو فراموش کر دیتا ہے؟ ایسے فراموش کرنے والے ہٹ دھرم قسم کے لوگ جو اپنے کفر، انکار اور تکذیب پر اصرار کرتے ہیں، ہم ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں تا کہ وہ کچھ نہ سمجھیں اور ایمان کے فیض و سعادت سے محروم ہو جائیں۔ ہم ان کے کانوں کو حق کی آواز سننے سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس طرف کو بھی بلائے جائیں ہرگز ہدایت نہیں پائیں گے۔''

اور یہ کہ قرآن نے ایسے لوگوں کو ظالم ترین لوگ کہا ہے، جس کی دلیل واضح ہے، کیونکہ ایسے لوگ خود پر بھی ظلم کرتے ہیں اور دوسرے افراد پر بھی اور ساتھ ہی وہ خداوند متعال اور اس کے دین کے معاملے میں بھی ظالم ہیں۔ بنابریں مذکورہ آیت نہ صرف جبر پر ہی دلالت نہیں کرتی بلکہ اختیار پر بھی دلالت کر رہی ہے۔

ایک اور دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ فخر رازی جو خود بھی مسلک جبر کے حامی ہیں، جب اس آیت پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں ''اس آیت کی انتہا ''جبر'' کے حامیوں کے لیے دلیل ہے جبکہ اس کی ابتداء اختیار کے حامیوں کے لیے'' پھر کہتے ہیں ''ہمیں قرآن میں بہت کم ہی کوئی ایسی آیت ملے گی جو ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کے حق میں ہو مگر یہ کہ اس کے ساتھ ہی ایک اور آیت ہے جو دوسرے گروہ کے حق میں ہے اور تجربہ ہماری گفتار کی صداقت کا گواہ ہے اور خدا کی طرف سے یہ بندوں کے لیے ایک بہت بڑا امتحان ہے تا کہ خداوند عالم اس طرح سے علمائے

---

[1] تفسیر روح المعانی، جلد ۶ ص ۸

راسخون فی العلم کومقلدین سے ممتاز کرے۔''[1] کیسا عجیب اعتراف ہے۔

ہمیں فخر رازی صاحب کی گفتگو پر جس چیز کا اضافہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کوایک دوسری سے جدا کر کے قطعاً زیر توجہ نہیں لانا چاہئے، چہ جائیکہ ایک آیت کے ابتدائی حصے کواس کے انتہائی حصے سے جدا کر کے!! اوراگر ہم اس آیت کی ابتدااورانتہا کو باہم ملا کر توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ مجموعی طور پر تاکید ہے ''اختیار'' کے مسئلہ کی۔ کیونکہ آیت کا آغاز کہتا ہے کہ آیات الٰہی سے روگردانی اور گناہوں کی بجا آوری خود انسان کا فعل ہے اورانسان ہی اپنے افعال کا باختیار فاعل ہے، جبکہ آیت کی انتہا کہتی ہے کہ خداوند عالم ان لوگوں کوسزا دیتا ہے جو اسی موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں اور خدا کی سزاان کے دلوں پر پردہ ڈالنا ہے۔

بالفاظ دیگر خداوند عالم نے ان گناہوں میں ایسا اثر پیدا کر دیا ہے کہ وہ دل کی شفافیت اور تصفہ کوختم کر دیتے ہیں اورانسان سے تشخیص کی قدرت سلب کر لیتے ہیں۔تو یہ چیز جبر کی دلیل کہاں سے بن گئی؟ یعنی اگر زہر ایک قاتل چیز ہے اورانسان جان بوجھ کراسے استعمال کرتا ہے تو وہ جواثر دکھائے گی کیااس کے اثر کو جبر سے موسوم کریں گے؟

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں بہانہ جواور ہٹ دھرم قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جوکبھی کبھی یہ کہہ دیتے تھے کہ قرآن عجمی زبان میں نازل کیوں نہیں ہوا تا کہ ہمیں اس سے زیادہ سے زیادہ کا قائل ہونا پڑے اوراس کا فائدہ صرف عربوں ہی کے لیے نہ ہو۔(شایدان کی غرض یہ ہوکہ عوام الناس اس سے کچھ نہ سمجھ سکیں اوراس کی طرف رغبت نہ کرسکیں)۔

قرآن مجید آیت کے آغاز میں ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے "**ولو جعلناہ قرانا اعجمیا لقالوا لولا فصلت آیاتہ**" یعنی اگر ہم قرآن کوعجمی بناتے تو یقیناوہ لوگ کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں ہیں؟ اور پھر کہتے "**اعجمی و عربی**" یعنی آیا عجمی قرآن عربی پیغمبر(سے ٹھیک بات ہے)؟!

پھر خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ کوحکم دیتے ہوئے فرماتا ہے ''کہہ دیجئے کہ یہ ان لوگوں کے لیے شفااور ہدایت کا موجب ہے جوایمان لاتے ہیں،لیکن ہٹ دھرم افراد جوایمان نہ لانے پراصرار کرتے ہیں ان کے کانوں میں سنگینی ہےاوروہ حق کونہیں سنتے، گویاانہی دور دراز سے پکاراجاتا ہےلیکن وہ صرف آواز کے زمرے کوہی سنتے ہیں اورکوئی مطلب انہیں حاصل نہیں ہوتا۔''

یہ آیت بھی بخوبی واضح کررہی ہے کہ بہانہ تراشی، ہٹ دھرمی اورکفر پراصرارانسان کے دل کے کانوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں اوراس

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۱، ص ۱۴۲۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب ''آلوسی'' نے اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں اس جملے کونقل کیا ہے تولکھا ہے کہ فخر رازی کہتے ہیں یہ آیت عقیدہ جبر کے قائل لوگوں کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے اوراس سے پہلی آیت عقیدہ اختیار کے قائل حضرات کے لیے دلیل ہے۔تفسیر المیزان میں بھی یہی چیز تفسیر روح المعانی سے نقل کی گئی ہے جبکہ خود فخر رازی کہتے ہیں کہ ایک آیت کی ابتداء اور انتہا۔(خوب غور کیجیے گا)۔

سے دل کی بینائی کو سلب کر لیتے ہیں۔[1]

۱۳۔ تجاوز اور سرکشی کا پردہ

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) ثُمَّ بَعَثْنَا مِنۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ۝۷۴

(یونس ۷۴)

ترجمہ

(۱) پھر ہم نے اس کے (نوحؑ کے) بعد کچھ رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ واضح دلائل لے کر ان کے پاس آ گئے، لیکن وہ جس چیز کی اس سے پہلے تکذیب کر چکے تھے اس پر ایمان نہ لائے، ہم اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

آیت کی تفسیر اور اس کا نتیجہ

سورہ یونس میں اس آیت سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم میں تبلیغ و ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے، لیکن اس قوم نے ان کو جھٹلایا اور خداوند قدیر نے اس سرکش قوم کو طوفان کے ذریعہ ہلاک کر دیا اور جو مومنین جناب نوح علیہ السلام کے ساتھ تھے، انہیں کشتی کے ذریعہ نجات دی اور زمین کا وارث ٹھہرایا۔

اس کے بعد فرماتا ہے ''نوحؑ کے بعد ہم نے کچھ رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، ہر رسول اپنی قوم کی طرف آیا اور معجزات،

---

[1] "وھو علیھم عمی" کے بعض مفسرین نے یہ معنی کیے ہیں کہ ''قرآن اس گروہ کی نابینائی کا سبب بن جاتا ہے'' جبکہ ''لسان العرب'' میں ''ابن منظور'' نے اور ''مفردات'' میں ''راغب'' نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ "عمی علیہ" کا معنی "اشتبہ علیہ حتی صاء کالا عمی" ہے یعنی مطلب ان پر اس طرح مشتبہ ہو چکا ہے گویا وہ اندھے ہو چکے ہیں۔ (غور کیجیے گا)۔

روشن اور منطقی دلائل اور وہ دین جو سراسر حقیقت پر مبنی ہے، اس کے پاس لایا۔ لیکن قوم نے سر تسلیم خم نہ کیا اور اسی طرح اپنی سابقہ تکذیب پر بھی ڈٹے رہے۔''

آیت کے آخر میں جو ہماری بات کا شاہد ہے فرماتا ہے ''اسی طرح ہم حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں'' (كذالك نطبع على قلوب المعتدين)۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حد سے تجاوز اور سرکشی دل پر پردے ڈال دیتی ہے اور ساتھ ہی مہر بھی لگا دیتی ہے۔ یعنی انسان جس قدر بھی آیات الٰہی کو دیکھتا ہے حق کو باطل سے جدا نہیں کر سکتا۔

خدا کی یہ مہر جو اس سرکش قوم کے دلوں پر لگتی ہے ممکن ہے خدائی سزا کی حامل بھی ہو اور تجاوز کے آثار میں سے کسی ایک اثر کی حامل بھی اور یہاں پر تجاوز سے مراد حق سے سرکشی اور عصیان و گناہ اور رسولوں سے دشمنی کا تسلسل ہے۔

''فما كانوا ليومنوا بما كذبوا'' (وہ لوگ اس سے پہلے جس چیز کو جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان نہیں لائیں گے) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب سے پہلے کچھ انبیاء ان لوگوں کے پاس آئے، لیکن ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا۔ پھر کچھ اور انبیاء ان کے پاس آئے اور واضح دلائل بھی اپنے ساتھ لائے، پھر بھی ان پر ایمان نہ لائے اور یہ اس لیے ہے کیونکہ عناد اور ہٹ دھرمی نے ان کی عقلوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جھٹلانے والوں سے مراد وہی قوم نوح ہی ہے جو طوفان میں ہلاک ہوگئی تھی اور ان لوگوں سے مراد جو ایمان نہیں لائے وہ لوگ ہیں جو اس ہلاک شدہ قوم کے بعد پیدا ہوئے لیکن نوح علیہ السلام کی سرکش قوم کے نقش قدم پر چلے۔ [1]

(لیکن اس تفسیر سے یہ لازم آتا ہے کہ ''كذبوا'' اور ''ليومنوا'' میں ضمیر کے مرجع مختلف ہوں اور یہ بعید معلوم ہوتا ہے۔ بنا بریں بہتر تفسیر وہی پہلی تفسیر ہی ہے)۔

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو نوح علیہ السلام کے بعد پیدا ہوئیں اور ان کے سامنے گزشتہ انبیاء کی دعوت کے حقائق بیان کیے گئے لیکن انہوں نے ان حقائق کو جھٹلا دیا، پھر انبیاء کرام علیہم السلام واضح معجزے اور دلائل لے کر آئے۔ پھر بھی انہوں نے انہیں جھٹلایا تو گویا پہلی تکذیب کا تعلق ان چیزوں کے ساتھ ہے جو بیان کی صورت میں ان تک پہنچیں اور دوسری تکذیب کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو انہوں نے بذات خود انبیاء علیہم السلام سے دیکھیں۔ [2]

یہ تفسیر بھی مناسب معلوم ہوتی ہے اور دونوں تفسیروں کو جمع کرنا بھی بعید نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵ ص ۱۲۵

[2] تفسیر روح المعانی، جلد ۱۱، ص ۱۴۳

۱۴۔ سطحی نگاہ اور تدبر سے کام نہ لینے کا پردہ

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ (سورہ بنی اسرائیل ۱۱)

(۲) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (سورہ محمد ۲۴)

ترجمہ

(۱) اور انسان (اپنی جلد بازی کی وجہ سے) برائیوں کی طرف جاتا ہے جبکہ وہ نیکیوں کو طلب کر رہا ہوتا ہے۔

(۲) آیا وہ لوگ قرآن میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں کافروں کی بے ایمانی کی اہم علتوں میں سے ایک علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو امور میں اچھی طرح مطالعہ نہ کرنے اور پوری طرح غور وفکر اور سوچ بچار سے کام نہ لینے کی وجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ''وہ لوگ جلد بازی اور عجلت کے ساتھ سوچے سمجھے اور معاملات میں غور وفکر کیے بغیر برائیوں کے پیچھے ایسے دوڑتے رہتے جیسے اچھائیوں اور سعادتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ وہ ہلاکتوں اور تباہیوں کی جانب ایسے لپکتے ہیں جیسے کسی امن وامان کی جگہ جا رہے ہوں، ننگ اور ذلت کے مقامات کی جانب یوں پیشقدمی کرتے ہیں جیسے قابل فخر جگہ کی طرف جا رہے ہوں۔''

یعنی جلد بازی، سطحی مطالعہ اور غور وفکر سے کام نہ لینے نے ان کے دلوں اور ادراک وبصیرت پر ایسے پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ بدی کو نیکی اور شقاوت کو سعادت اور گمراہی کو صراط مستقیم سمجھنے لگے ہیں۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ انسان کے جلد باز ہونے سے یہ مراد ہے کہ جب بھی وہ کسی چیز کو طلب کرتا ہے تو وہ اس کے پیچھے آرام اور سکون کے ساتھ نہیں جاتا اور اس کے نفع ونقصان کے پہلوؤں پر اچھی طرح غور وفکر نہیں کرتا تاکہ خیر کے تمام پہلو اس کے سامنے آجائیں اور وہ اسے حاصل کرے۔ بلکہ جونہی کسی چیز نے اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا، بغیر سوچے سمجھے، اس کے پیچھے لگ گیا اور اکثر اوقات ایسا ہوتا

ہے کہ وہ چیز اس کے لیے شر ہی شر ہوتی ہے اور اس سے اس کو نقصان پہنچتا ہے۔ جلد باز انسان خیر اور شر کے درمیان فرق پیدا نہیں کر سکتا اور باطل کے پیچھے ایسے دوڑتا جیسے وہ حق کے پیچھے دوڑ رہا ہو۔ [1]

یہاں پر "یدع" (پکارتا ہے) سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر قسم کی طلب ہے، خواہ دعا کے لفظ کے ساتھ ہو یعنی خدا سے طلب کرے یا عملی طور پر اس کے پیچھے جائے کیونکہ ان سب کو دعا کہا جاتا ہے۔ [2]

لیکن بعض تفسیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی مشہور معنی دعا کرنا اور خدا سے درخواست کرنا ہے۔ اسی لیے تو اس آیت کی شان نزول کے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ آیت عرب کے مشہور مشرکین میں سے ایک مشرک "نضر بن حارث" کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب اس نے یہ کہا تھا "اللھم ان کان ھذا ھو الحق فامطر علینا حجارۃ من السماء" (بارالہا! محمدؐ جو کچھ کہتا ہے اگر ہو حق ہے اور تیری ہی طرف سے ہے تو آسمان سے ہمارے سروں پر پتھر برسا) (انفال ۳۲)۔ چنانچہ اس کی یہ دعا قبول ہوئی اور وہ ہلاک ہو گیا۔ [3]

مرحوم طبرسی نے بھی مجمع البیان میں دونوں تفسیروں کو ذکر کیا ہے اور ظاہری طور پر آیت کا مفہوم وسیع ہے اور دونوں تفسیروں کو شامل ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"واعرف طریق نجاتك و ھلاكك، كیلا تدعوا الله بشی فیه ھلاكك وان تظن ان فیه نجاتك، قال الله تعالی و یدع الانسان بالشر دعائه بالخیر و كان الانسان عجولا"

"تو اپنی نجات اور ہلاکت کو (اچھی طرح اور مکمل طور پر) جان لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا سے ایسی چیز طلب کرے جس میں تیری ہلاکت ہو، جبکہ تو یہ سمجھتا ہوگا کہ وہ تیری نجات کا ذریعہ ہے۔ خداوند متعال فرماتا ہے: انسان شر کو بھی اسی طرح مانگتا ہے جس طرح خیر کو طلب کرتا ہے اور انسان جلد باز ہی ہے۔" [4]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اس طرح نصیحت کی:

---

[1] المیزان جلد ۱۳، ص ۵۱ (اختصار کے ساتھ)

[2] المیزان، جلد ۱۳ ص ۵۰ (چونکہ "بالشر" اور "بالخیر" میں "باء" صلہ کی ہے لہٰذا اس کا معنی یہ ہوگا "یدع الشر کہ عائد الخیر" یعنی وہ شر بھی خیر کی طرح طلب کرتا ہے)۔

[3] تفسیر قرطبی، جلد ۶ ص ۱۳۸۴۱ اور تفسیر رازی، جلد ۲۰، ص ۱۶۲

[4] نور الثقلین، جلد ۳، ص ۱۴۱

"کل عمل تریدن ان تعملوا فقفوا له ساعة فانی لو قفت ساعة لم یکن اصابنی ما اصابنی"

''جس کام کو تم انجام دینا چاہو تو ایک ساعت اس کے بارے میں سوچ بچار سے کام لے لیا کرو، کیونکہ اگر میں ایک ساعت غور و تامل سے کام لیتا تو جس مصیبت میں گرفتار ہوا، گرفتار نہ ہوتا۔''[1]

اسی لیے عربوں میں مشہور ہے "العجلة ام الندامات" (جلد بازی تمام پشیمانیوں کی ماں (جڑ) ہے)۔

نیز یہ بھی کہا جاتا ہے:

''جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے مگر چھ امور میں ۱۔نماز کی ادائیگی میں جب اس کا وقت داخل ہو جائے۔ ۲۔میت کی تدفین میں جب سب لوگ پہنچ جائیں۔ ۳۔دوشیزہ کی تزویج میں جب وہ بالغ ہو جائے۔ ۴۔قرض کی ادائیگی جب اس کا وقت آن پہنچے۔ ۵۔مہمان کو کھانا کھلانا جب وہ گھر آ جائے اور ۶۔توبہ میں جلدی جب گناہ سرزد ہو جائے۔''[2]

اس آیت کا ایک جملہ ہے "وکان الانسان عجولا" اور اسی طرح قرآن پاک کی دوسری آیات میں جن سے انسان کے نہایت ہی کمزور نقاط کی نشاندہی کی گئی ہے، سے کیا مراد ہے اور کون لوگ؟ ہم تفسیر نمونہ میں بتا چکے ہیں کہ اس سے مراد ایسے انسان ہیں جو خدائی تربیت کرنے والوں کی تربیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور خود روصورت میں سر نکالے ہوتے ہیں، نہ کہ وہ انسان جو مہذب اور تربیت یافتہ ہیں۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں ہٹ دھرم منافقین کے اس گروہ کا تذکرہ ہے جنہیں اس سے پہلی آیات میں دل کے اندھے اور نابینا افراد کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگ حکومت تک رسائی حاصل کر لیں تو کسی رحم نہ کریں اور یہی لوگ راندہ درگاہ الٰہی ہیں۔ پھر اس آیت میں فرماتا ہے ''آیا ایسے لوگ قرآنی آیات میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے تاکہ حقیقت کو دریافت کر لیں؟ یا ان کے دلوں پر قفل لگائے جا چکے ہیں؟ ایک نہیں کئی تالے! اور ایسے تالوں کے ہوتے ہوئے وہ حقیقت کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں؟''

اس مقام پر "ام" متصلہ ہے یا منقطعہ، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔[3] اگر متصلہ ہو تو آیت کا یہ معنی ہوگا ''آیا وہ قرآنی آیات میں غور و فکر نہیں کر پاتے یا ان کے دلوں پر تالے (پڑے ہوئے) ہیں'' اور اگر منقطعہ ہو تو آیت کا یہ معنی ہوگا ''آیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے، نہ بلکہ ان کے دلوں پر تالے (پڑے ہوئے) ہیں۔''

اور ہر صورت میں اس بات پر دلیل ہے کہ ''تدبر'' (غور و فکر کرنے) اور ''دلوں پر حجاب'' کے درمیان ایک تضاد موجود ہے اور اسے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۱۴۱

[2] تفسیر روح البیان، جلد ۵ ص ۱۳۷

[3] آلوسی روح المعانی میں سیبویہ سے نقل کرتے ہیں کہ ''ام'' متصلہ ہے اور ''ابوحیان'' اور دوسرے اہل علم سے منقول ہے کہ منقطعہ ہے۔ جلد ۲۶، ص ۶۷

''غور وفکر کے ترک کرنے کے حجاب'' کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے۔

تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں مذکور ہے کہ اس آیت کے مطابق قرآن مجید میں غور وفکر سے کام لینے سے دلوں پر سے پردے اٹھ جاتے ہیں، دل کے دریچے باز ہوتے ہیں، نورِ معرفت دل پر جاری ہوتا ہے، افکار حرکت میں آجاتے ہیں، عقول میں جوش وخروش پیدا ہوتا ہے، باطن میں خلوص آجاتا ہے اور روح زندہ، روشن اور منور ہوجاتی ہے۔[1]

اس آیت میں ''قلوب'' کو نکرہ کی صورت میں کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں اس کی دو دلیلیں ہوسکتی ہیں۔

پہلی یہ کہ ان کے دلوں کی وحشتناک کیفیت کو واضح طور پر بیان کرے کہ وہ غیر معروف، ان جانے، شقاوت بھرے اور تاریک و ظلمانی ہیں۔

دوسری یہ کہ اس سے ان میں سے کچھ لوگ کے دل مراد ہیں نہ کہ سب لوگوں کے، کیونکہ ان سب کے قلوب ابھی تک ایسے مرحلے تک نہیں پہنچے کہ ان کا ادراک اور بصارت مکمل طور پر ختم ہوچکے ہوں اور ان کے دلوں پر تالے پڑ چکے ہوں۔

''اقفال'' کو جمع کی صورت میں ذکر کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گونا گوں حجاب ہیں جو ان کے دلوں پر پڑ چکے ہیں، مثلاً نفاق، عناد، ہٹ دھرمی، خود خواہی اور غرور وغیرہ۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ''غور وفکر کا ترک کرنا'' اور ''دلوں کا حجاب'' ایک دوسرے پر تقابلی اثر ڈالتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی نسبت ایک مرحلہ پر علت اور دوسرے مرحلہ پر معلول واقع ہوسکتے ہیں۔ کبھی ترک تدبر دلوں کی تاریکی کا سبب بن جاتا ہے اور کبھی دلوں کی تاریکی ترک تدبر کا سبب بن جاتی ہے۔

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:

''قرآن کے قاری تین طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو اسے پڑھتے ہیں اور اپنا سرمایہ قرار دے کر اس کے ذریعہ سے بادشاہوں کو دوہتے (یعنی ان سے دولت اینٹھنے کی تگ ودو میں لگے رہتے) ہیں، اور اسے لوگوں پر اپنی برتری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

دوسرے وہ ہیں جو قرآن کو پڑھتے ہیں اور صرف اس کے الفاظ کو یاد کرتے ہیں اور اس کی حدود کو ضائع کر دیتے ہیں اور اس طرح سے وہ کبھی بھی اپنے مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ خداوند عالم حاملین قرآن میں ایسے لوگوں کو کبھی زیادہ نہ کرے۔

تیسرے وہ ہیں جو قرآن مجید کو پڑھتے ہیں اور اس کی دوا کو اپنے دلوں کے درد پر رکھتے ہیں۔ اسی کے ذریعہ شب بیداری کرتے ہیں (عبادت میں مصروف رہتے ہیں)، دن کو پیاسے رہتے ہیں (روزہ رکھتے ہیں)، اسی کے ذریعہ اپنی مسجدوں میں قیام کرتے ہیں اور اپنے بستروں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خداوند عزیز وجبار ایسے لوگوں کے ذریعہ بلاؤں کو دور کرتا ہے اور انہی کے ذریعہ اپنے دشمنوں پر حملے کرتا

---

[1] فی ظلال القرآن، جلد ۷، ص ۴۶۲

ہے، انہی کی وجہ سے آسمان سے بارش نازل کرتا ہے۔لیکن "فو الله لهولاء فی قراء القرآن اعزمن الکبریت الاحمر" خدا کی قسم! اس قسم کے قاری قرآن کبریت امر (سرخ گندھک) سے بھی زیادہ کمیاب ہیں۔"[1]

۱۵۔ارتداد کا پردہ

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو دل وجان سے سماعت فرمائیں۔

آیات

(۱) اِتَّخَذُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ جُنَّۃً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ۲ (سورہ منافقوں ۲)

(۲) ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَفۡقَہُوۡنَ۳ (سورہ منافقوں ۳)

ترجمہ

(۱) ان (منافق) لوگوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے تاکہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکے رکھیں۔ یہ بہت ہی برا کام کرتے ہیں۔

(۲) یہ اس لیے ہے کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔اسی لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔اسی وجہ سے وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

آیات کی تفسیر اور تشریح

یہ آیات منافقین کے حالات کو بیان کر رہی ہیں۔اگرچہ نفاق بذات خود معرفت کے پردوں میں سے ایک حجاب ہے لیکن اس مقام پر قرآن مجید نے ایک اور چیز پر زور دیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے "وہ پہلے ایمان لے آئے، پھر کفر کی راہ کو اختیار کیا۔اسی لیے ان کے دلوں پر اس طرح مہر لگا دی گئی ہے کہ وہ کسی حقیقت کے ادراک پر نہیں ہیں۔"

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، ص ۶۲۷۔کتاب فضل القرآن باب النوادر، حدیث نمبر ۱

وہ لوگ کون تھے؟اس بارے میں مفسرین کے ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ وہ ایسے لوگ تھے جو بظاہر تو ایمان لا چکے تھے لیکن باطن میں کفر پر قائم تھے۔

حالانکہ آیت کا ظاہر بتاتا ہے کہ وہ آغاز میں حقیقی طور پر مومن تھے، بعد میں کفر کے رستے کو اختیار کیا اور کفر بھی وہ جس کے ساتھ نفاق بھی تھا۔ کیونکہ ''ثم'' کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا کفران کے ایمان کے بعد رونما ہوا نہ کہ ایمان کے ساتھ، کہ ایک ظاہری ہو اور ایک باطنی تو اس طرح سے آیت ہذا میں ارتداد کے حجاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

اور تعجب بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جب انسان ایمان کے ذائقے کو چکھ لیتا ہے اور دین خدا کی حقانیت کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا ہے، پھر کفر کا راستہ اختیار کر لے اور کفر بھی وہ جس کے ساتھ نفاق ہوتا ہے اور خداوند عالم اس کی عقل وفکر پر پردہ ڈال دے اور اس کے دل پر مہر لگا دے، تو باعث تعجب نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص پہلے ہی سے حق کو نہ پہچان سکے تو ممکن ہے اس کا عذر قابل قبول ہو۔ لیکن جب حق کو پہچان لیا جائے اور معرفت کے بعد ایمان لایا جائے، پھر اسے ٹھوکر ماردی جائے، تو غالباً یہی سمجھا جائے گا کہ یہ اس کے بغض وعناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے اور خداوند عالم ایسے شخص سے معرفت کی نعمت سلب کر کے اس کے دل پر حجاب ڈال دیتا ہے۔

البتہ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جس سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ تمام منافقین آغاز کار ہی سے بے ایمان ہوں۔ بلکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آغاز کار میں واقعاً ایمان لے آتے ہیں، جیسا کہ سورہ توبہ کی ۷۴ ویں آیت میں بھی مذکور ہے کہ "**و کفروا بعد اسلامھم**" (وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے) اور ہٹ دھرمی پر مبنی یہ ارتداد دلوں پر حجاب ہے۔

ایک بار اور بتاتے چلیں کہ یہ چیز ''جبر'' پر ہرگز دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ مشاہدہ حق کی اس محرومیت کے مقدمات انہوں نے خود ہی فراہم کیے ہیں۔

۱۶۔ جھوٹ اور افترا پردازی کا پردہ

پہلے تو اس بارے میں مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آیات

(۱) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُدۡعَوۡنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ وَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمۡ فِىۡ دِيۡنِهِمۡ مَّا كَانُوۡا

يَفْتَرُوْنَ﴿۲۴﴾ (سورہ آل عمران ۲۴-۲۳)

(۲) وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴿۲۶﴾

(سورہ احقاف ۲۶)

ترجمہ

(۱) آیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (آسمانی) کتاب سے حصہ عطا کیا گیا ہے اور انہیں کتاب الٰہی کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں۔ (لیکن انہوں نے جان بوجھ کر) اس کی طرف پشت کرلی جبکہ انہوں نے (حق کو قبول کرنے سے) روگردانی کرلی۔ یہ عمل اس لیے ہے کہ وہ کہتے تھے چند دنوں کے سوا (جہنم کی) آگ ہم تک نہیں پہنچے گی (اور ہماری سزا دوسری اقوام پر امتیاز رکھنے کی وجہ سے نہایت محدود ہے) اور اس افتراء (اور دروغ نے جو خدا پر باندھتے ہیں) انہیں دین میں مغرور کردیا تھا۔

(۲) ہم نے ان (قوم عاد کے لوگوں) کو وہ قدرت عطا فرمائی جو تمہیں نہیں دی اور ان کے لیے کان، آنکھ اور دل بنائے۔ لیکن (عذاب نازل ہونے کے وقت) نہ تو ان کے کانوں اور آنکھوں نے اور نہ ہی ان کے دلوں نے انہیں کوئی فائدہ پہنچایا، کیونکہ وہ مسلسل خدائی آیات کا انکار کرتے تھے اور آخرکار وہ جس چیز کا مذاق اڑایا کرتے تھے ان پر آ ٹوٹا۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

جھوٹ کی فریب کاری

بعض مفسرین پہلی آیت کے شان نزول کے بارے میں کہتے ہیں:

یہودیوں میں سے ایک مرد و زن نے زنائے محصنہ کا ارتکاب کیا۔ اگرچہ تورات میں اس قسم کے لوگوں کی سزا ''رجم'' کی صورت میں مقرر تھی لیکن انہوں نے اس حکم کے اجراء کو قبول نہیں کیا۔ کیونکہ وہ معاشرے کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس بارے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرلیں۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے میں ان کی سزا میں تخفیف ہوجائے۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی وہی حکم دیا۔لیکن جب انہوں نے اس پر اعتراض کیا تو آپؐ نے فرمایا ''میں تمہاری موجودہ تورات سے ہی فیصلہ لوں گا'' انہوں نے اس بات کو قبول کرلیا اور ''ابن صوریا'' جو ایک یہودی دانشمند تھا، کو اس مقصد کے لیے بلایا گیا۔ لیکن تورات کی تلاوت کے وقت اس نے اس حصے کو نہ پڑھا اور وہاں پر موجود عبداللہ بن سلام نے جو پہلے یہودی تھے، پھر مسلمان ہو گئے تھے، اس راز سے پردہ اٹھایا۔

اسی سلسلے میں قرآن کہتا ہے ''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا حصہ عطا کیا گیا ہے۔ جب انہیں اس کتاب کے ذریعہ فیصلہ کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ سرتابی اور سرپیچی کرتے ہیں۔''

بعد میں فرماتا ہے ''یہ اس لیے ہے کہ وہ خود کو عذاب الٰہی سے امان میں سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہنم کی آگ چند گنتی کے دنوں کے سوا ہم تک نہیں پہنچے گی۔ آخر کار جھوٹ، دروغ گوئی اور افترأ پردازی نے انہیں فریب میں مبتلا کر دیا اور انہیں معرفت سے روک دیا۔''

"یفترون"، "افترأ" کے مادہ سے ہے جس کی اصل ''فری'' (بروزن نہی) ہے جس کے معنی ''اصلاح کی غرض سے چمڑے کو کاٹنا'' ہے۔لیکن جب ''افرا'' (باب افعال کا مصدر) ہو کر آئے تو اس وقت اس کے معنی ''چمڑے کو بگاڑ کی غرض سے کاٹنا'' ہو جائیں گے اور "افتراء" کا معنی چمڑے کو کاٹنا ہے خواہ اصلاح کی غرض سے ہو خواہ بگاڑ کے مقصد کے لیے ہر چند کہ ''بگاڑ'' اور تخریب کاری'' کے معنی میں ہے، زیادہ استعمال ہوتا ہے اور یہ مادہ جھوٹ، شرک اور ظلم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[1]

"غرهم" ''غرور'' کے مادہ سے ہے جو اصل میں "غر" (بروزن حر) ہے اور اس کے معنی ہیں کسی چیز کا واضح اور آشکار نشان واثر۔ اسی لیے گھوڑے کی پیشانی پر جو نشان ہوتا ہے اسے "غرہ" کہتے ہیں اور جب کسی کپڑے کو لپیٹتے ہیں تو اس میں لپٹنے کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ وہاں پر بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پھر یہ لفظ فریب دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے، گویا فریب دینے والا فریق ثانی کو کپڑے کی مانند لپیٹ رہا ہوتا ہے۔[2]

اور ''غرور'' بروزن ''شرور'' ہر اس شخص یا چیز کے معنی میں ہوتا ہے جو انسان کو فریب دے اور فریب کار شیطان کو بھی ''غرور'' کہتے ہیں۔[3]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جھوٹ اور افتراء انسان کو کس طرح فریب دیتے ہیں اور معرفت کے حقائق سے کیونکر باز رکھتے ہیں؟ بعض مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے:

''انسان اپنے افعال واعمال میں نفسانی حالات اور ملکات اور ان ذہنی صورتوں کی بنیاد پر کہ اس کے نفس نے جنہیں مزین کیا ہوا

---

[1] مفردات راغب، مادہ ''فری''

[2] مفردات راغب، مادہ ''غرور''

[3] مفردات راغب، مادہ ''غرور''

ہے، قدم اٹھاتا ہے، نہ کہ اپنے علم اور ادراک کی بنیاد پر، جیسا کہ بہت سے ایسے لوگ جو نشے کے رسیا ہوتے ہیں وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ منشیات ضرر رسان ہیں اور ایسے مواد کا استعمال انسان کے شایان شان نہیں۔ پھر بھی وہ اس کا استعمال جاری رکھتے ہیں، کیونکہ نفسانی ملکہ اور حالت نے ایسے مواد کو لذت بخش بنا کر ان کے پیش کیا ہے اور ان کے لیے جاذبیت پیدا کر دی ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ ان کی سوچ و بچار اور اس سے اجتناب کی کوئی مجال باقی نہیں چھوڑی۔''

بالفاظ دیگر اس قسم کے لوگ کبھی تو اس قدر جھوٹ کا تکرار کرتے ہیں اور خود کو تلقین کرتے ہیں اور سمجھاتے ہیں، پھر بالتدریج اس کا باور کر لیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تلقین اور سمجھانا بھی علم اور یقین کا اثر رکھتا ہے۔ لہٰذا دینی امور میں بار بار دروغ گوئی کی تلقین نے انہیں فریفتہ کر لیا ہے اور خداوند عالم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور حق کے آگے سر جھکانے سے باز رکھا ہے۔ [1]

یہ بات تجربہ میں آ چکی ہے کہ بعض اوقات کچھ لوگ کوئی جھوٹ بولتے ہیں اور پہلے پہل وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ یا افترا ہے، لیکن اس عمل کو بار بار دہرانے سے وہ آہستہ آہستہ اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ سچ ہو اور پھر اس کے تکرار سے وہ تدریجی طور پر اس بات کو باور کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ ایک خبر ہے۔ پس اس طرح سے جھوٹ کا تکرار اور تسلسل غیر واقعی امور پر عقیدہ رکھنے، انسان کو فریب دینے اور اس کی آنکھوں کے سامنے پردہ ڈالنے کا سبب بن جاتا ہے۔

اسی لیے نوبت اس حد تک نہیں پہنچتی جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جھوٹ بولنے والے یہودی تھے اور دھوکہ کھانے والے دوسرے لوگ۔

دوسری آیت ''قوم عاد'' کی طرف اشارہ ہے، ایسی قوم جو سرزمین ''احقاف'' میں رہتی تھی۔ (احقاف جزیرۃ العرب کے جنوب کی طرف ہے اور بعض کہتے ہیں جزیرۃ العرب کے شمال کا علاقہ ہے)۔ انہوں نے اپنے پیغمبر جناب ''ہود'' علیہ السلام کی تکذیب کی اور حد سے بڑھ کر ظلم اور فساد کا ارتکاب کیا جس کے نتیجہ میں وہ مہلک آندھیوں کے ذریعے تباہ و برباد ہو گئے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ ''ہم نے انہیں تم سے زیادہ طاقت عطا کی تھی، ان کی آنکھیں، کان اور عقلیں بھی تھیں لیکن آیات الٰہی کے انکار اور انبیاء کرام کی تکذیب نے ان کی آنکھوں، کانوں اور عقلوں پر پردے ڈال دیئے اور معرفت کے یہ ذرائع ان کے لیے مفید واقع نہ ہو سکے۔ آخر کار اسی عذاب میں مبتلا ہو گئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

یہ آیت بھی اس بات پر زور دے رہی ہے کہ آیات الٰہی کی تکذیب اور ان کا مسلسل انکار اس بات کا سبب بن گیا کہ یہ قوم ادراک اور معرفت کھو بیٹھی۔ ظاہری طور پر ان کی آنکھیں دیکھتی تھیں، کان سنتے تھے اور فکری طور پر بظاہر وہ عقلمند بھی تھے لیکن حقیقت میں ان پر پردے پڑے ہوئے تھے اور معرفت کے یہ وسائل اور ہتھیار انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے اور عذاب الٰہی نے ان کی خوب سرکوبی کی اور ہمیشہ کے لیے

---

[1] المیزان، جلد ۳، ص ۱۳۲

انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

"یجحدون"، "جحود" کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی کسی ایسی چیز کی نفی کرنا ہوتے ہیں جس پر انسان کو یقین ہوتا ہے۔ یا کسی ایسی چیز کا اثبات ہوتا ہے جس کی نفی پر انسان کا ایمان ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر جان بوجھ کر پوری معرفت کے ساتھ حقائق کا انکار، جحد کہلاتا ہے۔[1]

تجربہ شاہد ہے کہ اگر انسان اس طرح کے کام کو جاری رکھے تو آہستہ آہستہ ان مسائل کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے جن کے متعلق اسے یقین ہوتا ہے اور اگر یہی سلسلہ مزید آگے بڑھے تو اس کی تشخیص بالکل الٹ ہو جاتی ہے اور باطل کو حقیقت سمجھنے لگ جاتا ہے۔

اس کام، یعنی حقائق کے انکار کے ممکن ہے کہ کئی اور مختلف سرچشمے بھی ہوں، یعنی کبھی تو وہ ہٹ دھرمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، کبھی تعصب، تکبر، غرور اور کبھی کوئی مادی منفعت ہوتی ہے کہ حقیقت کے آشکار ہو جانے سے اس کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور کبھی دوسری نفسانی خواہشات کی وجہ ہوتی ہے۔ لیکن ہر حالت میں اس کا اثر ضرور ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی وجہ سے انسان کی عقل وفطرت پر پردے پڑ جاتے ہیں اور تشخیص کے سلسلے میں الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔

۱۷۔ گمان کا ضخیم پردہ

بے بنیاد گمانوں، باطل اوہام اور تخیلات کی پیروی بھی تدریجی طور پر انسانی عقل کو دگرگون کر دیتی ہے۔ اسے خالص، صاف ستھرے معارف سے منحرف کر دیتی ہے اور اس کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیتی ہے۔

اس بارے میں مندرجہ ذیل آیت مجیدہ پر غور کی دعوت دی جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۷۱ (سورہ مائدہ ۷۱)

ترجمہ

(۱) اور انہوں نے گمان کر لیا کہ سزا وغیرہ نہیں ہوگی، لہٰذا وہ (حقائق کے دیکھنے اور حق بات سننے سے) اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں۔ پھر (وہ بیدار ہوئے، خدا سے توبہ کی اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی، لیکن پھر (دوسری مرتبہ خواب غفلت میں چلے گئے اور ان میں سے بہت سے لوگ اندھے اور بہرے ہو گئے اور جو کچھ وہ

---

[1] مفردات راغب مادہ "جحد" جوہری بھی کہتے ہیں "الجحود" الانکار مع العلم۔ مجمع البحرین نے بھی جحد کے یہی معنی کیے ہیں۔

انجام دیتے ہیں خداوند عالم اس سے باخبر ہے۔

آیت کی تفسیر اور جمع بندی

یہ آیت یہودیوں کے اس گروہ کی کیفیت بیان کر رہی ہے جس نے خدا سے یہ پختہ عہد کیا تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کی دعوت کے آگے سر تسلیم خم کریں گے اور خدا کے فرمان کی بجا آوری کریں گے۔ لیکن جب بھی کسی زمانے میں کوئی پیغمبر ان کی نفسانی خواہشات کے خلاف کوئی بات کرتے تو ان کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے، حتیٰ کہ انہوں نے انبیاء کی ایک بہت بڑی تعداد کو تہ تیغ کر دیا۔

اس بحث کے سلسلے میں آیت کہتی ہے ''انہوں نے گمان کیا کہ سزا وغیرہ کچھ نہیں ہے ان کا یہ گمان باطل جو حب ذات، تکبر اور غرور کی وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوا، ایسا باطل گمان جسے شیطان اور خواہشات نفسانی نے پروان چڑھایا اور اس باطل گمان اور خیال خام نے ان کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیئے، لہٰذا انہوں نے نہ تو دوسری اقوام کے دردناک انجام کے آثار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نہ ہی اس چیز کو کانوں سے سنا جو ان کے بارے میں تاریخ میں نقل ہوا۔ اس طرح معرفت کے ان دو اہم ذرائع یعنی آنکھ اور کان کو انہوں نے عملاً ضائع کر دیا اور خود کو عذاب الٰہی سے امان میں سمجھنے لگے۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد اپنی غلطیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کا راستہ اختیار کیا۔ چونکہ خدا کی رحمت بے حد و حساب ہے لہٰذا ان کی توبہ قبول ہوگئی۔

ایک بار پھر انہی غلط سوچوں، باطل گمانوں، خام خیالوں اور بے دلیل امتیازات نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے (اور نوبت بایں جا رسید کہ وہ خود کو خدا کی اولاد سمجھنے لگ گئے) اور ان کے کانوں کو ایسا بند کر دیا کہ وہ اندھے اور بہرے ہو کر راندہ درگاہ الٰہی ہوئے۔

یہ آیت صاف طور پر کہہ رہی ہے کہ باطل گمان، خاص طور پر عذاب الٰہی سے محفوظ ہو جانے کا گمان، انسان کی آنکھ اور کان پر ایک ضخیم پردہ ہے۔ بنا بریں ''**فعموا وصموا**'' (پس وہ اندھے اور بہرے ہو گئے) کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ ان کی آنکھوں نے آیات الٰہی اور گذشتہ اقوام کے باقی رہ جانے والے آثار کو نہیں دیکھا اور ان کے کانوں نے اس بارے میں کسی قسم کے وعظ و نصیحت کو قبول نہیں کیا۔

ظاہر ہے کہ صرف ایک یا چند مرتبہ کی باطل اور بے بنیاد گمانوں اور خیالات کی اطاعت و پیروی سے اس قسم کی حالت پیدا نہیں ہوتی بلکہ تکرار اور تسلسل کی وجہ سے ہی یہ دردناک انجام دیکھنا پڑتا ہے۔

اس جملے کے تکرار اور وہ بھی ''**ثم**'' (پھر) کے لفظ کے ساتھ، جو عام طور پر زمانی فاصلے پر دلالت کرتا ہے، سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل کو درپیش آنے والی دو مختلف سرگزشتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس کی طرف جب اہل باطل نے ان پر حملہ کر دیا تھا اور دوسری اس طرف جب ایرانیوں اور رومیوں نے ان پر حملہ کیا تھا اور ان کی حکومت کو تہس نہس کر دیا تھا۔[1] اس کی

---

[1] تفسیر ''المنار'' جلد ۶، ص ۴۸۱

تفصیل ہم نے تفسیر نمونہ میں سورہ بنی اسرائیل کے آغاز میں بیان کردی ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلا جملہ جناب زکریا، جناب یحییٰ اور جناب عیسیٰ علیہم السلام کے زمانے کی طرف اشارہ ہے۔ جب بنی اسرائیل ان انبیاء کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تھے اور دوسرا جملہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی اور ان کی نبوت و رسالت کے انکار کی طرف اشارہ ہے۔[1]

جبکہ بعض اور مفسرین نے کہا ہے کہ پہلا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ خداوند متعال نے انہیں اس گمان کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور کر دیا اور انہیں اندھا اور بہرا کر دیا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ خدا کی برگزیدہ ملت ہیں اور جو کام بھی وہ انجام دیں انہیں سزا نہیں ہوگی۔ لیکن ایک بار پھر خداوند عالم نے اپنا لطف اور اپنی رحمت ان کے شامل حال فرمائی، باطل گمان ان کے دل سے نکال دیا اور ان کے آنکھ اور کان کو دیکھنے اور سننے والا بنا دیا، لہٰذا انہوں نے اس حقیقت کی طرف توجہ کی کہ وہ بھی خدا کے دوسرے بندوں کی طرح کے بندے ہیں اور تقویٰ کے سوا کسی کو کسی پر کوئی امتیاز اور فضیلت حاصل نہیں۔

لیکن بیداری کی یہ حالت اور کیفیت مستقل نہ تھی۔ پھر ان کا ایک گروہ اسی غلط گمان کا شکار ہو گیا اور نسلی امتیاز ان کے خیالات اور اوہام پر چھا گیا اور خدا نے ایک بار پھر ان کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیئے۔[2]

ان تمام تفاسیر کو آپس میں جمع کرنا بعید نہیں ہے اور ان سب کا نتیجہ ایک ہے اور وہ یہ کہ باطل گمان اور فاسد خیالات (جیسا کہ یہودی لوگ اپنے لیے جھوٹے امتیازات کے قائل تھے) تدریجی طور پر انسان کے عقل و شعور اور ادراک و انظار پر اثر ڈالتے رہتے ہیں اور منحرف کرتے رہتے ہیں، اگرچہ آغاز میں وہ زیادہ پروان نہیں چڑھے ہوتے۔ اگر انسان بیدار ہو جائے تو ممکن ہے کہ راہ راست پر آ جائے، لیکن جب وہ انسانی روح میں اچھی طرح رچ بس جاتے ہیں اور پھل پھول جاتے ہیں تو پھر انسان کے لیے بازگشت کی راہ ناممکن ہو جاتی ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۲ ص ۵۷ تفسیر روح المعانی جلد ۶ ص ۱۸۴ یہ تفسیر ایک احتمال کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہے۔

[2] تفسیر المیزان، جلد ۶ ص ۱۷

بیرونی حجاب

۱۸۔فاسد اور گمراہ رہنماؤں کا پردہ

اشارہ

بیرونی حجابوں سے مراد ایسے حجاب ہیں جو انسان کے اپنے صفات و اعمال کے علاوہ ہیں جو کہ اس کے عقل و ادراک اور حس تشخیص پر اثر ڈالتے ہیں اور حقیقتوں کی شناخت اور معرفت سے مانع ہوتے ہیں اور وہ بھی کافی تعداد میں ہیں اور ایک وسیع حلقہ کے حامل ہیں۔قرآن مجید نے مختلف آیات میں نہایت ہی دلکش طریقہ سے ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۠ ﴿۶۷﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ (سورہ احزاب ۶۸-۶۷)

(۲) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ (سورہ سبا ۳۲-۳۱)

(۳) قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ (سورہ اعراف ۳۸)

ترجمہ

(۱) اور وہ کہتے ہیں، پروردگار! ہم نے اپنے روسا اور بزرگوں کی اطاعت کی ہے اور انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے۔ پروردگار! تو انہیں دوگنا عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت فرما۔

(۲) اور اگر کسی وقت ظالم وستمگر لوگ (حساب وکتاب اور سزا وجزا کے لیے) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے گئے تو تو دیکھے گا کہ ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن پر ڈالے گا، اور تو تعجب کرے گا تو اس وقت مستضعفین مستکبرین سے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ لیکن مستکبرین مستضعفین کو جواب دیں گے آیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکے رکھا۔ جبکہ ہدایت تمہارے پاس آچکی تھی (اور تم نے اسے اچھی طرح پا بھی لیا تھا) بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔

(۳) (خداوند عالم انہیں) فرمائے گا، تم اپنے جیسے جنوں اور انسانوں کی صف میں جہنم میں داخل ہوجاؤ اور جب بھی اس میں کوئی گروہ داخل ہوگا تو وہ دوسرے پر لعنت کرے گا، تاکہ وہ سارے کے سارے ذلت اور رسوائی کے ساتھ اس میں رہیں۔ (تو اس وقت) پیروکاروں کا ایک گروہ اپنے پیشواؤں کے بارے میں کہے گا: خداوند! یہی تو وہ لوگ تھے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، لہٰذا انہیں تو آتش جہنم کا دوگنا عذاب دے۔ خدا فرمائے گا تم میں سے ہر ایک کے لیے دوگنا عذاب ہے، لیکن تم نہیں جانتے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

اہل جہنم کا باہمی جھگڑا

مندرجہ بالا آیات کا پہلا حصہ جہنمی کفار کے ایک گروہ کی حالت کو بیان کر رہا ہے کہ جب وہ اپنے کام کے نتیجے کو دیکھیں گے تو بارگاہِ رب العزت میں عرض کریں گے ''اس برے انجام کا سبب ہم خود بنے ہیں کیونکہ ہم نے اپنے روسا اور بزرگوں کی پیروی کی ہے، وہ ہم پر مسلط تھے اور ہماری فکری قیادت ان کے ہاتھ میں تھی اور ہم ان پر تکیہ کرتے رہے اور گمراہ ہوگئے۔ پروردگارا! ان کے عذاب کو دوگنا کردے، (ایک تو ان کے اپنے کفر کا عذاب اور دوسرے ان کا ہمیں گمراہ کرنے کا عذاب) اور ان پر بڑی لعنت بھیج۔''

وہ اس طرح سے اپنی جان چھڑانا چاہیں گے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ گمراہ سرداروں نے بھی ان کے انحراف وکجروی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس طرح سے بری الذمہ ہوجائیں گے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان فاسد رہنماؤں کے وسوسے اور ضال ومضل (خود گمراہ اور گمراہ کن) رہنماؤں کی قیادت نے ان کے عقل وفکر پر

پردے ڈال دیئے تھے، لیکن اس کام کے مقدمات تو انہوں نے خود فراہم کیے تھے، کیونکہ وہ مکمل طور پر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکے تھے اور یہ نہیں دیکھا تھا کہ یہ لوگ قیادت اور رہبری کے اہل ہیں بھی یا نہیں!

لفظ "سادتنا" اور "کبرائنا" آیا دو مختلف مفہوموں کے حامل ہیں یا ان دونوں کا مفہوم ایک ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ "ساوتنا" کا اشارہ ان بادشاہوں اور سلطانوں کے بارے میں ہے جو شہروں اور ملکوں پر مسلط رہ چکے ہوں گے اور "کبرائنا" کا اشارہ مقامی اور علاقائی رئیسوں اور سرداروں کی طرف ہے، کیونکہ وہ پہلے گروہ کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کی بجائے بجالاتے تھے اور دوسرے گروہ کی اطاعت کو سورلؑ کی اطاعت کی بجائے۔ اسی لیے قدرت اور طاقت کے لحاظ سے پہلا گروہ زیادہ ہوگا اور اسی وجہ سے عبارت میں بھی اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے پہلے کو بادشاہوں اور صاحبانِ اقتدار کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور دوسرے کو ان لوگوں کی طرف جو سن کے لحاظ سے بڑے ہیں اور اسی بزرگی کی وجہ سے ان لوگوں نے ان کی اطاعت کی ہوگی۔

بعض کا احتمال ہے کہ دونوں الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں اور تاکید ہے۔[1]

اور یہی آخری معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "سادۃ"، "سید" کی جمع اور سید اسے کہتے ہیں کہ جس کے پاس "سواد" کی سرپرستی ہو۔ (سواد یعنی انبوہ کثیر۔ اور انبوہ کثیر کی تعداد کو "سواد" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کثرت کی وجہ سے سیاہ معلوم ہوتی ہے) پھر ہر بزرگ کو "سید" کہا جانے لگا۔

دوسری آیت میں بھی ظالم کفار کا ذکر ہے جو بروز قیامت خدا کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے اور ہر ایک اپنا گناہ دوسروں پر ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ اسی اثناء میں مستضعفین یعنی وہ بے خبر افراد جو آنکھ اور کان بند کر کے دوسروں کے پیچھے لگے ہوئے تھے، "مستکبرین" یعنی ایسے ظالم تسلط گر جو دوسروں کو فکری طور پر گمراہ کرتے رہے، کی طرف منہ کر کے کہیں گے "اگر تمہارے شیطنت آمیز گمراہ کن وسوسے نہ ہوتے یقیناً ہم مومنین کی صفوں میں ہوتے۔ تم ہماری ذہنی صفائی کرتے رہے اور غیر شعوری طور پر تم ہمیں اپنے پیچھے لگائے رہے اور اپنا آلہ کار بنائے رکھا جس سے اپنی شیطانی آرزوؤں کی تکمیل کرتے رہے۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہم کس قدر غلطی پر تھے۔"

البتہ مستکبرین بھی خاموش نہیں رہیں گے اور وہ جواب میں کہیں گے "ہم نے تمہیں کیسے ہدایت سے روکے رکھا حالانکہ انبیاء نے وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو بتانا ضروری تھا اور کافی حد تک اتمام حجت کیا تم خود غلط رہے ہو۔ ہم تمہاری گمراہی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ تم خود ہی گناہگار تھے اور اپنے ارادہ اور اختیار کے باوجود انبیاء کے منطقی کلام کو نہیں مانا اور ہماری بے بنیاد باتوں میں آ گئے۔"

تیسری آیت میں بھی جہنم میں گمراہ "پیشواؤں" اور "پیروکاروں" کی چپقلش کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جب کوئی گروہ جہنم میں داخل ہوگا تو دوسرے گروہ پر لعنت اور نفرین کرے گا اور اسے ہی اپنی شقاوت و بدبختی کا ذمہ دار ٹھہرائے گا۔ گمراہ پیروکار خدا کی بارگاہ میں عرض

---

[1] دیکھیے تفسیر روح المعانی، جلد ۲۲، ص ۸۷۔ تفسیر المیزان، جلد ۱۶، ص ۳۶۹ اور تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، ص ۲۳۲

کریں گے ''یہ گمراہ کن لوگ ہی تھے جنہوں نے ہمیں راہ راست سے بھٹکا دیا تھا۔تو ان کے عذاب کو دو چند کر دے، ایک عذاب خود ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے دوسرا ہمیں گمراہ کرنے کی بنا پر۔

لیکن خداوند عالم ارشاد فرمائے گا ''تم سب لوگوں کے لیے دوگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔'' (قال لکل ضعف ولکن لا تعلمون)۔

باطل کے گمراہ کن سرداروں کو دوہرا عذاب ملنا ہی چاہیے لیکن گمراہ ہونے والے پیروکاروں کو دوگنا عذا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ ہر چند کہ اچھی طرح غور وفکر سے معلوم ہوجاتا ہے کہ انہیں بھی ایسی ہی سزا ملنا چاہیے، کیونکہ ایک تو خود ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے اور دوسرے کافر سرداروں کی ظلم کی چکی میں دانے ڈالنے اور ان کے تنور ظلم کو گرم رکھنے، یعنی ان کے آلہ کار بننے کی وجہ سے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے بنی امیہ کے ایک کارندے سے ارشاد فرمایا جو آپ کے ایک صحابی کے ہمراہ توبہ کی غرض سے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا:

"لولا ان بنی امیة وجدوا من یکتب لهم ویجبی لهم ایفی ولقاتل عنهم ویشهد جماعتهم لما سلبونا حقا"

''اگر بنی امیہ ایسے افراد کو حاصل نہ کرتے جو ان کے لیے لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتے تھے، خراج وصول کرتے تھے، ان کی طرف سے جنگ کرتے تھے، ان کی جماعت میں حاضر ہوتے تھے، تو وہ ہرگز ہمارا حق ہم سے نہ چھین پاتے۔''[1]

تشریح

''مستضعفین'' اور ''مستکبرین'' قرآن کی نگاہ میں

قرآنی آیات میں کئی مرتبہ ''مستکبرین'' اور ''مستضعفین'' کا ذکر آیا ہے اور یہ ایک اہم اور قابل غور موضوع ہے جو تفسیر موضوعی کی آئندہ بحثوں میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے جالب توجہ ہوسکتا ہے، لیکن اس مقام پر اس بارے میں آیات بالا کی وضاحت کے لیے ہم اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں۔

''راغب''، ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ ''کبر، تکبر اور استکبار'' ایسے الفاظ ہیں جن کے معانی تقریباً ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔'' پھر کہتے ہیں کہ ''استکبار'' کے دو معانی ہیں، ایک تو یہ کہ انسان سعی وکوشش کرے کہ وہ بڑا بن جائے، گویا وہ بزرگی کے تمام ضروری شرائط کو ہر لحاظ سے پورا کرنے کی کوشش کرے اور بڑا بن جائے۔ یہ استکبار قابل ستائش ہے۔ دوسرے یہ کہ بزرگی کے شرائط کا حامل نہ ہو

---

[1] بحارالانوار جلد ۷۲ (وجلد ۷۵) ص ۳۷۵، سفینۃ البحار، جلد ۲، ص ۱۰۷، مادہ ظلم

اور نہ ہی اس کے لائق ہو، لیکن بڑائی کو اپنے ساتھ چسپاں کر دے۔ ایسا استکبار قابل نفرت اور باعث مذمت ہے اور قرآن مجید میں اس کی زبردست مذمت کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم شیطان کے بارے میں پڑھتے ہیں: "ابی واستکبر" (اس نے آدمؑ کا سجدہ کرنے سے انکار کیا اور بڑا بنا۔ سورہ بقرہ ۳۴)

راغب کہتے ہیں "قرآن مجید نے کہیں پر "مستکبرین" کو "ضعفا" کے مقابلے میں قرار دیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی برتری طبی یا جسمانی طاقت کی وجہ سے ہے یا پھر مال و دولت کے بل بوتے پر۔"[1]

"استکبار" کا نقطہ مقابل "استضعاف" ہے جس کے معنی ہیں "کمزوری اور ناتوانی کو طلب کرنا" لیکن چونکہ یہ کلمہ قرآن مجید میں "فعل مجہول" یا "اسم مفعول" کی صورت میں استعمال ہوا ہے، لہٰذا اس کے معنی یہ ہوں گے "ایسا ضعف (کمزوری) جو مستکبرین کی طرف سے کسی گروہ پر مسلط کر دیا جائے اور انہیں ناتوان سمجھا جائے"۔ البتہ کہیں پر فعل معلوم کی صورت میں بھی استعمال ہوا ہے، اور وہ فرعون کے ماجرے میں ہے جس نے بنی اسرائیل کو کمزور اور ناتوان بنایا ہوا تھا اور انہیں اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ

"فرعون زمین پر بڑا بن بیٹھا اور لوگوں کو گروہوں میں بانٹ دیا اور ان میں سے ایک گروہ کو کمزور و ناتوان بنائے رکھا۔" (القصص ۴)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "مستضعف" کا لفظ قرآن مجید میں دو معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ایک تو وہ مظلوم افراد جو ناحق طور پر کسی کے ظلم تلے دبے ہوئے ہوتے ہیں اور خداوند عالم کا لطف و کرم انکے شامل حال ہوتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کے ستم رسیدہ افراد کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝

"ہم ارادہ کر چکے ہیں کہ زمین میں موجود مستضعف افراد پر احسان کریں اور انہیں پیشوا بنائیں اور حکومت کے وارث قرار دیں۔" (القصص ۵)

اور دوسرا معنی جو قرآن میں بھی عام طور پر استعمال ہوا ہے اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو اپنی جہالت، نادانی، بے سمجھی، کم عقلی، اندھی تقلید اور تعصب کی وجہ سے ذہنی اور فکری کمزوری کا شکار بنا دیئے گئے ہیں اور آنکھیں اور کان بند کر کے ظالم اور گمراہ قائدین کے پیچھے پیچھے حرکت کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں مندرجہ بالا آیات گفتگو کر رہی ہیں کہ وہ بروز قیامت مستکبرین کے ساتھ جھگڑا کریں

---

[1] مفردات راغب، مادہ "کبر"

گے اور ساتھ ہی یہ بھی تصریح کر رہی ہیں کہ انہیں بھی مستکبرین کی مانند دوہرا عذاب ہوگا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ گمراہ ہیں اور دوسرا اس لیے کہ وہ مستکبرین کے تنور کو گرم رکھتے ہیں اور ظالم و جابر مستکبرین کی حکمت کی بنیادوں کو مستحکم بنائے ہوئے ہیں۔

قائدین کا مقام اسلامی روایات میں

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"الناس بامرائهم اشبه منهم بآبائهم"

''لوگ اپنے آباؤ اجداد کی نسبت اپنے امراء اور حکمرانوں سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔''[1]

ممکن ہے یہ شباہت اس لحاظ سے ہو کہ کچھ لوگ آنکھ اور کان بند کر کے اپنے امراء اور حکمرانوں کے پیچھے حرکت کرنے لگتے ہیں اور اپنا دین اور اپنا دل سب کچھ ان کے فرمان پر قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ضرب المثل مشہور ہوگئی ہے کہ "الناس علی دین ملوکھم" (لوگ اپنے حکام اور بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں)۔

حکمران اور بادشاہ قسم کے لوگ بعض لوگوں کی نگاہ میں ہیرو، نمونہ اور اسوہ ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض کم عقل لوگ انہیں اس بات سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں کہ ان کے اعمال و کردار کا محاسبہ کیا جائے، یا ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی کی جائے اور کبھی تو ایسا ہوتا ہے بعض مطلق العنان حکمران اپنے آپ کو ''تقدس'' کے ہالہ میں قرار دے کر سادہ لوح لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتے ہیں کہ وہ خدا کی مقدس مخلوق ہیں اور ہر قسم کے محاسبہ سے ماوراء۔ اس طرح سے وہ سیدھے سادے اور بھولے بھالے عوام کے افکار و عقول پر پردے ڈال دیتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ بعض لوگ ''طاقت'' کو ''حق'' سمجھتے ہیں اور ہر کامیاب اور فاتح فرد یا گروہ کو برحق جانتے ہیں اور یہی طرزِ تفکر اس بات کا باعث بن جاتا ہے کہ وہ اجتماعی اور معاشرتی حساب و کتاب میں زبردست غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

ظالم اور جابر بادشاہ اور حکمران لوگوں کی اس فکری ناتوانی اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں پر بھی وہ قدم رکھتے ہیں وہاں پر ہی فساد برپا کر دیتے ہیں، لوگوں کو بے راہروی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہاں کی سرزمین کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ملکہ سبا کی زبانی یہ بات نقل ہوئی ہے کہ:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ

''جب بادشاہ کسی آباد علاقے میں داخل ہوتے ہیں اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ان کا کام ہی یہی ہے۔'' (نمل ۳۴)

---

[1] بحار الانوار، جلد ۷۵، ص ۴۶۔ کتاب الروضہ کلمات الروضہ حضرت علیؑ، حدیث ۵۷

اگرچہ یہ گفتگو بھی خود ایک ظالم بادشاہ کی زبانی نقل ہوئی ہے لیکن قرآن مجید میں اس کا ذکر بغیر کسی تنقید اور نکتہ چینی کے اور دوسرے کسی ظالم بادشاہ کی اپنے جیسے لوگوں کی معرفت اور شناخت اس کے حقیقت ہونے کے اعتراف کی دلیل ہے۔

اسی لیے ملکہ سبا نے کہا: ''میں سلیمان کی آزمائش کرنا چاہتی ہوں اور دیکھنا چاہتی ہوں کہ آیا وہ واقعاً پیغمبر ہیں یا عام دنیاوی بادشاہ؟ میں ان کے لیے کچھ تحفے روانہ کر کے معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس بارے میں ان کا کیا ردعمل ہوتا ہے کیونکہ دنیاوی بادشاہوں کے دل و دماغ ہمیشہ مقام و منصب، تحفے تحائف اور زر و زیورات کے گرویدہ ہوتے ہیں، جبکہ انبیاء کو صرف امتوں کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔''

۱۹۔ گمراہ دوستوں کا حجاب

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾ (سورہ فرقان ۲۷ تا ۲۹)

ترجمہ

اس دن کو خاطر میں لاؤ جب ظالم شدید حسرت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول خدا کے ساتھ کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے افسوس! کاش کہ میں نے فلاں (منحرف شخص) کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے تو مجھے حق کی یاد سے گمراہ کیا ہے جبکہ معرفت و آگاہی میرے پاس آ چکی تھی اور شیطان تو ہمیشہ انسان کو چھوڑتا چلا آ رہا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

یہ آیات قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی جھلک کو پیش کر رہی ہیں، ایسا منظر کہ جس میں ظالم لوگ اپنی کارستانیوں کی وجہ سے سخت حسرت اور افسوس کا اظہار کریں گے اور وہ بھی اس حد تک کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹیں گے۔

''یعض''، ''عض'' (بروزن حظ) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں دانتوں سے کاٹنا اور یہ تعبیر عربی اور فارسی (نیز اردو) میں سخت

افسوس اور پشیمانی سے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی سخت مشکل میں پھنس جاتا ہے (اور مشکل بھی وہ جو اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے پیش آجاتی ہے) تو وہ یا تو اپنی انگلیوں کو کاٹتا ہے یا پھر ہتھیلی کی پشت کو۔ شاید یہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو تنبیہ کرے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

ہاں البتہ اگر وہ مشکل زیادہ سخت نہ ہو تو ممکن ہے کہ صرف ہاتھ کی انگلیوں کے سرے کو ہی کاٹے جیسا کہ سورہ آل عمران کی ۱۱۹ ویں آیت میں بعض کفار کے بارے میں مذکور ہے کہ:

وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ

''جب وہ خلوت میں جاتے ہیں تو تمہارے اوپر سخت غصے کی وجہ سے وہ اپنی انگلیوں کے سروں کو دانتوں سے کاٹتے ہیں۔''

یا ایک ہتھیلی کی پشت کو کاٹتے ہیں اور اگر مصیبت بہت ہی زیادہ ہو تو کبھی اس ہتھیلی کو اور کبھی اس ہتھیلی کو کاٹتے ہیں اور زیر بحث آیت میں ''یدیہ'' (دونوں ہاتھ) کا لفظ آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بروز قیامت ان کی مصیبت نہایت درجہ شدید ہوگی۔ عام طور پر اس کام کے ساتھ ایسے جملے استعمال ہوتے ہیں جن کا مفہوم اپنی سرزنش ہوتا ہے اور تعصب کے وسائل و ذرائع سے گفتار اور عمل ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

وہ بھی قیامت میں ایسا ہی کہیں گے ''اے کاش کہ ہم نے پیغمبر کے ساتھ کا راستہ اختیار کیا ہوتا اور اے کاش کہ فلاں شخص کا اپنے دوست کے لیے انتخاب نہ کیا ہوتا، حالانکہ خدا کی آیات بھی ہمارے پاس پہنچ چکی تھیں جو ہماری سعادت اور خوش قسمتی اور خوش بختی کی ضامن تھیں۔ لیکن اس گمراہ دوست نے ہمیں بیداری کی اجازت نہیں دی۔''

اس طرح سے وہ اپنی بدبختی اور شقاوت کا اصل عامل اپنے گمراہ کن دوست کو ہی سمجھیں گے جس نے ان کی آنکھوں کے آگے پردہ ایجاد کر دیا تھا اور وہ جمال حق کے مشاہدہ سے محروم رہے۔

اس آیت میں ''فلاں'' سے کون مراد ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد شیطان ہے جسے انسان نے بطور دوست کے انتخاب کیا ہوا تھا کیونکہ اسی آیت کے آخر میں ہم پڑھتے ہیں ''وکان الشیطان للانسان خذولا'' یعنی شیطان انسان کو مشکلات میں چھوڑ ہی دیتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہی شخص ہے جو آیت کے شان نزول میں بیان ہوا ہے۔ (یعنی ''عقبہ'' جو ایک مشہور کافر تھا اور اس نے اسلام قبول کر لیا، لیکن اپنے دوست ''ابی'' کی خاطر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامانِ شفقت کو چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور جنگ بدر میں مارا گیا، جبکہ اس کا دوست ''ابی'' بھی جنگ احد میں قتل کر دیا گیا)۔ [1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان (انہی آیات کے ذیل میں)۔ بعض مورخین کے مطابق ''ابی'' وہ تنہا شخص ہے جسے پیغمبر اسلامؐ نے اپنی پوری زندگی میں اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔ ملاحظہ ہو تفسیر روح البیان، جلد ۶، ص ۲۰۵

لیکن جیسا کہ بہت سے مفسرین کا قول ہے۔آیت کا بظاہر مفہوم کلی ہے اور تمام گمراہ کن اور دل میں وسوسہ پیدا کرنے والے دوستوں کو بھی شامل ہے اور شانِ نزول کسی بھی صورت میں آیت کو خاص نہیں کرتا، خصوصاً جبکہ ''شیطان'' کا معنی وسیع اور عمومی ہے جو تمام انسانی اور جناتی شیطانوں کو شامل ہے اور پھر کلمہ ''فلان'' پر زور دیا گیا ہے جو نکرہ کی صورت میں آیا ہے اور آیت کے مفہوم کے عام ہونے پر ایک واضح قرینہ ہے۔[1]

سورہ انعام کی ۱۳۷ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ

''اسی طرح مشرکین کے شریک کاروں نے ان کی اولاد کے قتل کو ان کی آنکھوں میں مزین کر دیا ہے تا کہ وہ انہیں ہلاک کر ڈالیں اور ان کا دین ان پر مشتبہ کر دیں۔''

اس آیت کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین کے شریک کار لوگوں سے مراد بت خانوں اور بتکدوں کے متولی ہیں جو انہیں راہ راست سے بھٹکاتے اور گمراہ کرتے ہیں تا کہ وہ اپنی اولاد کو بتوں کی بھینٹ چڑھائیں اور اس طرح سے وہ ان پر راہ حق کو مشتبہ کر دیں اور ان کی عقل و فکر پر پردے ڈال دیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت مذکورہ بھی ہمارے مدعا کا بہترین شاہد ہے، یعنی گمراہ دوست بھی حجاب بن جاتے ہیں۔

تشریح

ہمارے طرز فکر میں دوستوں کا کردار

اس بارے میں اسلامی روایات میں کئی تعبیرات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ منحرف دوست اور گمراہ مشیر انسان کی فکر پر کیونکر ڈاکے ڈالتے ہیں، اس کی تشخیص کو کیسے دگرگوں کر دیتے ہیں اور انجام کار حق تک پہنچنے کی راہیں اس پر کیسے بند کر دیتے ہیں۔ چنانچہ چند ایک روایات کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اپنے فرزند جناب حسن مجتبیٰؑ سے فرماتے ہیں:

"یا بنی ایاك ومصادقة الاحمق فانه یرید ان ینفعك فیضرك... و ایاك

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن، جلد ۶، ص ۱۵۶

ومصادقة الكذاب فانه كالسواب يقرب عليك البعيد ويبعد عليك القريب"

''میرے پیارے فرزند! احمق کی دوستی سے بچے رہو کیونکہ وہ تجھے نفع پہنچانا چاہے گا لیکن نقصان پہنچائے گا..... اور دروغ گو کی دوستی سے بھی بچتے رہو، کیونکہ وہ سراب کی مانند ہے اور دور کی چیز تمہیں نزدیک اور نزدیک کی چیز دور کر کے دکھائے گا۔''[1]

۲۔ آپؑ ہی نے مالک اشتر کے نام تاریخی فرمان میں ''مشیروں'' کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، ہمارے مدعا کی بہترین دلیل ہے:

"ولا تدخلن فی مشورتك بخيلا يعدل بك عن الفضل ويعدك الفقر، ولا جبانا يضعفك عن الامور ولا حريصا يزين لك الشرة بالجور"

''بخیل کو اپنے مشوروں میں کبھی داخل نہ کرو کیونکہ وہ تمہیں احسان اور نیکی سے باز رکھے گا اور فقر و فاقہ سے ڈرائے گا۔ ڈرپوک آدمی سے بھی مشورہ نہ کرو کیونکہ وہ اہم کاموں میں تمہارے حوصلے پست کر دے گا اور حریص اور لالچی شخص سے بھی مشورہ نہ کرو کیونکہ وہ ظلم و ستم سے ملے ہوئے حرص کو تمہاری نگاہوں میں مزین کر دے گا۔''[2]

اس تعبیر سے بخوبی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غلط اور منحرف قسم کے مشیر انسانی فکر پر کیونکر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور انسان کی معرفت کے لیے کیسے پردے بن سکتے ہیں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں آپؑ ہی فرماتے ہیں:

"مجالسة الاشرار تورث سوء الظن بالاخيار"

''غلط اور شریر قسم کے لوگوں کے ساتھ ہم نشینی انسان کو شریف اور نیک لوگوں سے بدظن کر دیتی ہے۔''[3]

۴۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۳۸

[2] نہج البلاغۃ

[3] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۱۶۸

"المرء علی دین خلیله وقرینه"

''انسان اپنے دوست اور ساتھی کے دین پر ہے۔''[1]

اس طرح سے کسی صالح یا غیر صالح دوست کی دوستی کے اچھے یا برے اثرات جو انسان کے طرز تفکر اور اس کی شناخت و معرفت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

پروپیگنڈے اور ماحول کا پردہ

پہلے تو مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

آیات

(۱) قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ ------ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۙ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ (سورہ طٰہٰ ۸۵ تا ۸۸)

(۲) فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ (سورہ قصص ۷۹)

(۳) فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ (سورہ اعراف ۱۱۶)

(۴) وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ (سورہ آل عمران ۷۲)

(۵) اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، ص ۳۷۵۔ باب مجالسۃ اہل المعاصی، حدیث ۳

فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ (سورہ زخرف ۵۲ تا ۵۴)

ترجمہ

(۱) فرمایا ہم نے تیرے بعد تیری قوم کی آزمائش کی اور سامری نے انہیں گمراہ کیا اور ان کے لیے ایک گوسالے کا مجسمہ تیار کیا کہ جس کی آواز گوسالے جیسی آواز تھی۔ اور ان لوگوں سے کہا یہ تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے اور اس نے (جو پیمان خدا سے باندھا ہوا تھا) فراموش کر دیا۔

(۲) (قارون) اپنی تمام زینت کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے ظاہر ہوا جو لوگ دنیاوی زندگی کے طالب تھے انہوں نے کہا اے کاش! جس طرح قارون کو عطا ہوئی ہے، ہمیں بھی عطا ہو جاتی، یقیناً اس کا اس دنیا میں بہت بڑا حصہ ہے۔

(۳) (موسیٰ نے) کہا تم ڈالو۔ جب انہوں نے اپنے جادو کے ساز و سامان کو زمین پر ڈالا، لوگوں کی آنکھیں بند کر دیں اور انہیں ڈرایا اور ایک عظیم سحر کو وجود میں لائے۔

(۴) اہل کتاب میں سے (یہودیوں کے) ایک گروہ نے کہا (جاؤ اور بظاہر) دن کے اول حصے میں ایمان لے آؤ اس چیز پر جو مومنین پر نازل ہوئی ہے اور دن کے آخری حصے میں کافر ہو جاؤ شاید کہ وہ (اپنے دین سے) پلٹ جائیں۔

(۵) (فرعون نے) کہا میں اس شخص سے برتر ہوں جو پست خاندان اور طبقہ سے ہے اور فصیح طریقے پر بھی گفتگو نہیں کر سکتا۔ اگر وہ سچ کہتا ہے تو اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں اترے یا اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے۔ اس (فرعون) نے اپنی قوم کو احمق بنایا اور قوم نے اس کی اطاعت کی، کیونکہ وہ فاسق قوم تھی۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

زہریلا پروپیگنڈا

پہلی آیت سامری کی داستان کی طرف اشارہ کر رہی ہے، وہی جاہ طلب اور خود غرض انسان، جس نے موسیٰ علیہ السلام کی چالیس شبانہ روز غیبت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جب وہ معیاد گاہ الٰہی یعنی کوہِ طور پر اپنے رب سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نے اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے تمام زر و زیورات کو جمع کر کے گوسالے (بچھڑے) کی شکل کا ایک بت بنایا۔ وہ اسے مخصوص حالت میں ہوا کے رخ پر

کھڑا کر دیتا تھا جس سے بچھڑے سے ملتی جلتی آواز نکلتی تھی۔قرآن نے اس آواز کو ''خوار'' (بروزن غبار) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا معنی ہے ''گائے کی آہستہ آواز''۔

اس نے اپنے کام کے لیے خاص قسم کی فرصت سے فائدہ اٹھایا۔جب جناب موسیٰ علیہ السلام کی غیبت کو پینتیس (۳۵) دن گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام کی توحیدی تبلیغات کے اثرات بنی اسرائیل کے دلوں سے کم ہونے لگے تو اس نے یہ اقدام کیا، خصوصاً جبکہ پہلے یہ طے پا چکا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی کوہ طور پر قیام کی مدت تیس دن سے زائد نہ ہو لیکن خدا نے بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے دس راتوں کا اضافہ کر دیا اور چالیس راتیں مکمل ہوئیں۔

قرآن مجید کہتا ہے: ''خداوند عالم نے موسیٰ سے فرمایا: ہم نے تیرے بعد تیری قوم کی آزمائش کی اور اسے سامری نے گمراہ کیا۔''

بہرحال ایک عظیم گروہ کو بے راہروی کا شکار کر دینا اور اسے راہ راست سے گمراہ کر دینا کوئی آسان بات نہیں (اور بعض روایات کی رو سے گمراہ ہونے والوں کی تعداد چھ لاکھ تھی) اور انہیں خالص توحید کی راہ سے ہٹا کر خالص شرک کی راہوں پر ڈال دینا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس ماجرے سے متعلق جو آیات سورہ طٰہٰ اور دوسری سورتوں میں بیان ہوئی ہیں اور تاریخوں اور تفسیروں میں اس کا ذکر آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے لوگوں کے افکار پر ڈاکہ ڈالنے اور ان کی دماغی صفائی کے لیے ایک خاص قسم کے پروپیگنڈے سے کام لیا جس سے لوگوں کی عقل پر پردے پڑ گئے اور وہ آہستہ آہستہ باور کرنے لگے کہ یہ بچھڑا ہی موسیٰ علیہ السلام کا خدا ہے۔

اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہم مندرجہ بالا آیت میں پڑھتے ہیں کہ ایسا صرف سامری ہی نے نہیں کیا، بلکہ بنی اسرائیل بھی اس کے ہم آواز ہو کر کہنے لگے ''یہ بنی اسرائیل اور موسیٰ کا خدا ہے۔'' (''قالوا'' کا لفظ اس بات کا گواہ ہے)۔

یہ تعبیر سامری کے پروپیگنڈے کی تاثیر کی واضح دلیل ہے۔اس نے مندرجہ ذیل وجوہات سے خوب فائدہ اٹھایا:

۱۔موسیٰ علیہ السلام کی غیبت سے استفادہ۔ ۲۔ان کی مدت قیام کا چالیس راتوں تک طویل ہو جانا۔ ۳۔زروزیورات سے استفادہ کرنا جو کہ عوام الناس اور خاص کر بنی اسرائیل کے نزدیک زبردست اہمیت کے حامل تھے اور ان کی آنکھوں اور دلوں میں سمائے ہوئے تھے۔ ۴۔گمراہی کے لیے مناسب موقع کی تلاش، چنانچہ جب بنی اسرائیل نے دریائے نیل سے نجات پائی اور ان کا ایک ایسی قوم کے پاس سے گزر ہوا جو بتوں کی پرستش کر رہی تھی تو انہوں نے بھی موسیٰ سے بتوں کے بنانے کا تقاضا کیا۔سورہ اعراف کی ۱۳۸ ویں آیت میں ہے:

"قالوا یا موسی اجعل لنا الها کما لهم الهة"

''اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایسا خدا بناؤ جیسے ان کے لیے خدا ہیں۔''

۵۔سامری کا بنی اسرائیل میں مقام و منزلت اور اس پر ان کا اس قدر اعتماد کہ وہ اس کے لیے کسی حد تک تقدس مآبی کے بھی قائل تھے اور اسے جبرائیل علیہ السلام کا پرورش یافتہ بھی جانتے تھے۔[1]

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۷، ص ۴۸۲ تفسیر روح البیان، جلد ۵ ص ۴۱۴۔دائرۃ المعارف، دبخد امادہ سامری

٦۔ضعیف العقیدہ لوگوں کا ''محسوس خدا'' سے انس وتعلق اور ایسے خدا سے بے توجہی جو جسمانی صفات سے مکمل طور پر منزہ اور مبرا ہے۔اسی لیے تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ تقاضا کر ڈالا کہ وہ انہیں خدا کا دیدار کرائیں تا کہ وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔(بقرہ ۵۵)

یہ اور اس طرح کی کئی دوسری وجوہات تھیں جن کے ذریعہ سے وہ لوگ کلی طور پر خدائے واحد و یکتا سے منحرف ہو گئے اور سامری کے مسموم پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے اور بت پرستی کو اپنا لیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب جناب موسیٰؑ واپس لوٹے اور ان کی برائیوں اور کجروی کو دیکھ کر تڑپ اٹھے اور انہیں ان کی سخت نازیبا حرکت کی طرف متوجہ کیا تو وہ یوں متنبہ ہوئے گویا نیند سے بیدار ہو گئے اور پکار پکار کر اپنی ندامت اور پشیمانی کا اظہار کیا، بلکہ اس حد تک راضی ہو گئے کہ توبہ کی قبولیت اور گناہوں کے کفارہ کے طور پر آپس میں ایک دوسرے کے خلاف تلوار چلائیں اور مرتدین کے ایک گروہ کا خون زمین پر بہا ڈالیں۔(سورہ بقرہ ۵۵)

بہر حال یہ آیت غلط پروپیگنڈہ کے حجاب ہونے پر روشن دلیل ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں بنی اسرائیل کے مشہور دولتمند قارون کی بات ہو رہی ہے جو ایک دن بنی اسرائیل کے سامنے اپنی دولت وثروت کی نمائش کے لیے کمر بستہ ہوا۔

تاریخوں میں اس بارے میں کئی داستانیں اور افسانے منقول ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے جسے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ:

''قارون ایک دن اپنے چار ہزار دوستوں اور نوکروں چاکروں سمیت بنی اسرائیل کے درمیان ظاہر ہوا، جبکہ ان میں سے ہر ایک قیمتی گھوڑے پر سوار سرخ لباس پہنے ہوئے تھا۔ان کے ساتھ کنیزوں کا بھی ایک جھرمٹ تھا، جو سفید رنگ کے خچروں پر سوار تھیں، جن کی زینیں سونے کی تھیں اور مختلف قسم کے طلا و جواہرات کے زیوروں سے مزین تھیں۔''[1]

بعض مورخین نے ان افراد کی تعداد ستر ہزار بھی لکھی ہے اور اگر ہم اس تعداد کو صحیح نہ بھی مانیں تب بھی قرآنی تعبیر ''فخرج علی قومه فی زینته'' (وہ اپنی تمام قسم کی زینت کے ساتھ اپنی قوم میں ظاہر ہوا) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منظر عام اور معمولی قسم کا نہیں تھا۔اس نے ایسا شاید اس لیے کیا تا کہ موسیٰ علیہ السلام کی غربت کا مذاق اڑائے، یا بنی اسرائیل میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اپنی پوزیشن کو مستحکم کرے، یا پھر قدرت وطاقت اور ثروت ودولت کی نمائش کا جنون تھا جو عام طور پر صاحبانِ قدرت وثروت میں پایا جاتا ہے۔صورتحال خواہ کچھ بھی ہو اور مقصد خواہ کوئی بھی ہو، مذکورہ منظر اور اس کے ساتھ اس حد تک پروپیگنڈا ہم آہنگ تھا کہ اس نے بنی اسرائیل کے بہت سے لوگوں کی عقلوں کو چرا لیا اور ان کی روح وفکر پر اس حد تک پردے ڈال دیئے کہ وہ اسے ''ذوحظ عظیم'' (بڑی قسمت والا) خوش قسمت، خوش بخت اور سعادت مند سمجھنے لگ گئے اور اس آرزو کی خواہش کرنے لگے کہ اے کاش! وہ بھی اس کی جگہ پر ہوتے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، قرطبی اور روح المعانی کا سورہ قصص کی آیات کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب اس کے دوسرے دن خداوند عالم نے جرائم کے ارتکاب اور خلاف ورزیوں کی وجہ سے قارون کو اس کے خزانے سمیت زمین کی گہرائیوں میں بھیج دیا تو سب لوگ خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ وہ اس کی جگہ پر نہیں تھے۔

اس طرح کے پروپیگنڈے کی تاثیر کا نہ تو اس زمانے میں انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور دور میں اور ماضی میں بھی اور حال میں بھی بہت کچھ ایسے ظالم و جابر لوگ ہیں جو لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرنے اور انہیں احمق اور بے وقوف بنانے کے لیے اس قسم کی نمائش کے ذریعہ پروپیگنڈے کا اہتمام کرتے ہیں۔ صرف زبردست مفکرین اور دانشور افراد ہی اس قسم کے حجابوں کو اپنے اور دوسرے لوگوں کے اذہان و افکار پر نہیں پڑنے دیتے اور اس طرح کے مناظر کے پس پردہ اس قسم کے لوگوں کے اصلی چہرے کو دیکھ سکتے ہیں۔

تیسری آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جادوگروں کے ساتھ جنگ کے منظر کو بیان کر رہی ہے، ایسے جادوگر جنہیں موسیٰ کے ساتھ نمٹنے کے لیے فرعون نے کئی قسم کے لالچ دے کر ملک کے دور دراز حصوں سے بلایا تھا۔ بعض روایات کی رو سے ان کی تعداد کئی ہزار تھی، اور ایک روایت کے مطابق ان کی تعداد پندرہ ہزار سے بھی اوپر تھی۔ (ممکن ہے کہ یہ تعداد خود جادوگروں، ان کے معاونوں اور ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی ہو۔ اس بات کی طرف بھی توجہ رہنی چاہیے کہ اس زمانے میں جادو اور جادوگری کا رواج عروج پر تھا)۔

لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایک عید کے دن، جبکہ سورج کافی بلند ہو چکا تھا، اس جنگ کو دیکھنے کے لیے میدان میں آ چکی تھی۔ (جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی ۵۹ ویں آیت میں "یوم الزینۃ" کی اور "ضحی" کی تعبیر میں اس بات کو گواہ ہیں)۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون کو اطمینان تھا کہ وہ لڑائی میں کامیاب ہو جائے گا کیونکہ اس نے لوگوں پر اثر انداز ہونے کے لیے پروپیگنڈا کے تمام وسائل فراہم کیے ہوئے تھے۔

مندرجہ بالا آیت کہتی ہے "جب جادوگروں نے اپنے فراہم کردہ جادو کے تمام ساز و سامان کو پھینکا لوگوں کی آنکھوں پر جادو چلایا، انہیں وحشت زدہ کر کے عظیم جادو کا مظاہرہ کیا۔"

آیت کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے "سحر" اور "استرھاب" کے لفظوں کی اچھی طرح وضاحت ہونا ضروری ہے۔

لغوی طور پر "سحر" دو معنوں کے لیے آتا ہے، ایک تو دھوکا دینا اور دوسرا وہ جس کے وجود کے اسباب و عوامل غیر مرئی (نا قابل دید) اور مرموز و مخفی ہوتے ہیں اور بعض ارباب لغت نے دونوں معانی کو ایک ہی اصل کی طرف لوٹایا ہے اور کہا ہے: "جادو کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقت کو دگرگوں کر دیا جائے اور اسے دوسری صورت میں پیش کیا جائے۔"[1]

جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورۃ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں بیان کر چکے ہیں کہ جادو عام طور پر اجسام کے ناشناختہ فزیکل اور کیمیکل آثار اور خواص سے مل کر معرض وجود میں آتا ہے اور جادوگر وہ لوگ تھے جو ان خاصیتوں اور اثرات سے بخوبی واقف تھے اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ اندر سے خالی لکڑیوں اور چمڑے کی رسیوں کو فراہم کیا اور ان میں پارہ بھر دیا، چنانچہ پارہ نہایت ہی فرار کرنے والا مادہ ہوتا ہے۔ جب ان چیزوں پر دھوپ پڑی، یا شاید میدان مقابلہ میں گرم کرنے والی چیزیں بچھائی گئیں تھیں، اسی لیے وہ چیزیں متحرک

---

[1] قاموس اللغۃ، مفردات راغب، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم اور تاج العروس کا مطالعہ فرمائیں۔

ہوکر ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔[1]

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جادوگر لوگ اپنے ہاتھوں کی صفائی اور پھرتی سے ایسے مناظر دکھاتے ہیں جن میں ذرہ بھر بھی حقیقت نہیں ہوتی۔ہم میں سے اکثر لوگوں نے ایسے مناظر دیکھے ہوں گے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عطریات کے ذریعہ یا مخصوص نباتات کی دھونی کے ذریعہ سے مخصوص کیمیکل مواد پھیلا دیا جاتا ہے جس سے حاضرین کی قوت بینائی، قوت سامعہ، بلکہ ان کے اعصاب پر تصرف کرلیا جاتا ہے اور انہیں غیر واقعی مناظر دکھائے جاتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آنکھ کی مقناطیسیت اور ہپناٹزم کے ذریعہ حاضرین کے دل میں کچھ چیزیں ڈالی جاتی ہیں جو ایسی حالت میں بہت ہی موثر ہوتی ہیں اور انہیں ایسے مناظر دکھائے جاتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

البتہ جادو کی ایک اور قسم بھی ہے جو شاید جنات یا بعض روحوں کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔(جادوگروں کے جادو کے یہ پانچ عمدہ طریقے ہیں)۔

کبھی ''سحر'' کا لفظ ان تمام معانی سے وسیع تر معنی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔مثلاً جو شخص بہترین تقریر کرتا ہے اسے ''جادو بیان مقرر'' کہا جاتا ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ''چغل خوری''، ''جادو'' کی ایک قسم ہے، کیونکہ دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتی ہے۔لیکن جو چیز اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ "سحروا اعین الناس" (لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا) وہی قوت باصرہ (حس بینائی) میں تصرف اور لوگوں کی آنکھوں میں حقیقی مناظر کو تبدیل کرنا ہے۔نہ کہ انہوں نے واقعاً کوئی سانپ یا اژدہا پیدا کرلیا تھا۔ہماری اس بات کی شاہد سورہ طہ کی ٦٦ ویں آیت ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"فاذا حبالهم وعصيهم يخيل اليه من سحرهم انها تسعى"

''تو اس وقت ان کی رسیاں اور ڈنڈے ان کے جادو کی وجہ سے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ تیزی سے دوڑ رہے ہیں۔(حالانکہ وہ چل نہیں رہے تھے۔اس پارے وغیرہ کے اثر کی وجہ سے حرکت کر رہے تھے)۔''

"استرهبوا" "رهب" (بروزن عہد یا بروزن قبح) کے مادہ سے ہے، جس کے معنی ہیں ایسا خوف جس میں پرہیز اور اضطراب ملا ہوا ہو۔(جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے) اور بہت سے مفسروں نے "استرهاب" کو "ارهاب" کے معنی میں لیا ہے، یعنی خوف اور اضطراب پیدا کرنے کے معنی میں۔اس تعبیر سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سحر و جادو کے علاوہ جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے، نہایت ہی وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے سے بھی کام لیا ہے (اور اکثر طور پر جادوگر ایسا ہی کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کا اکثر و بیشتر دارومدار اسی قسم کے پروپیگنڈے پر ہوتا ہے)۔

---

[1] روح المعانی، جلد ۹، ص ۲۲۔تفسیر فخر رازی جلد ۱۴، ص ۲۰۳۔روح البیان جلد ۳، ص ۲۱۳ اور تفسیر المنار جلد ۹، ص ٦٦ اور کئی دوسری تفسیریں

بعض کتابوں میں ملتا ہے کہ جس میدان کا انتخاب کیا گیا تھا وہ ایک مربع میل پر مشتمل تھا۔(ایک میل لمبا اور ایک میل چوڑا)۔[1] اسی طرح بعض اور کتابوں میں ملتا ہے کہ جادو کے لیے جمع شدہ لکڑیاں اور رسیاں جو سانپ اور اژدھا کی شکل میں تھیں ان کا ایک پہاڑ بن چکا تھا۔[2]

پھر مندرجہ ذیل قسم کی گفتگو سے لوگوں کو حد سے زیادہ اپنے زیر اثر کرلیا اور ان کی عقول وافکار کو گمراہ کرنے اور ان پر پردہ ڈالنے کی پوری پوری کوشش کی تا کہ واقعیات اور حقائق کی معرفت کی قدرت اور طاقت بھی ان سے سلب کرلی جائے۔

''لوگو! میدان سے دور رہو! کہیں سانپ اور اژدھے تم پر حملہ نہ کردیں کیونکہ وہ نہایت ہی خطرناک اور وحشت ناک ہیں.....''

یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں جن کی طرف بعض تفسیروں میں مختلف اشارے کیے گئے ہیں۔[3]

چوتھی آیت اسلام کے مقابلے میں یہودیوں کے اس پروپیگنڈا کی قلعی کھول رہی ہے جس کے لیے انہوں نے لوگوں کو متزلزل کرنے کے لیے ایکا کرلیا تھا۔انہوں نے یہ سازش کی کہ علی الصبح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر ظاہری طور پر اسلام لے آئیں لیکن اسی دن کے آخر میں اسلام سے برگشتہ ہوجائیں۔جب ان سے پوچھا جائے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا،تو وہ جواب دیں کہ ہم نے محمد(ص) کی صفات کو نزدیک سے دیکھا ہے لیکن وہ ہماری دینی کتابوں اور ہمارے دانشوروں کے اقوال سے مطابقت نہیں کرتی تھیں،لہٰذا ہم واپس آ گئے۔

پروپیگنڈے کا یہ انداز اس بات کا موجب بنے گا کہ لوگ یہ کہیں گے:''جو لوگ اہل کتاب اور پڑھے لکھے تھے اور ہم سے بہتر سمجھتے تھے انہوں نے اس دین کو باطل پایا،لہٰذا اس کی کوئی محکم بنیاد نہیں ہے۔''

اس طرح سے سادہ لوح افراد کے افکار کو گمراہ کرکے ان کی عقل اور ان کی قوت تشخیص پر پردے ڈال دیئے جاتے ہیں۔

"**وقالت طائفة**" کے جملے میں لفظ "**طائفه**" ''طواف'' کے مادہ سے ہے۔جس کے معنی ہیں ایسا گروہ جو ایک حلقہ کی صورت میں ہوتا ہے،گویا کسی بات کے گرد طواف کررہا ہوتا ہے۔بعض مفسرین کے مطابق یہاں پر طائفہ سے مراد خیبر کے یہودیوں کا ایک بارہ نفری گروہ تھا،یا مدینہ کے یہودیوں کا گروہ تھا،یا پھر نجران کے یہودیوں کا گروہ تھا جنہیں بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی پر سخت دکھ ہوا اور انہوں نے ایسی سازش تیار کی۔[4]

"**وجه النهار**" (دن کا چہرہ) کی تعبیر سے دن کے آغاز کی طرف اشارہ ہے،کیونکہ چہرہ ہی وہ پہلی چیز ہوتا ہے جس سے انسان روبرو ہوتا ہے اور نہایت ہی باعزت عضو ہے۔البتہ آیت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتی کہ انہوں نے ایک دوسرے سے اس طرح کی پیشکش کی، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیش کش پر عملدرآمد کیا گیا،وگرنہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اس اہمیت سے بیان ہو اور بعد کی

---

[1] تفسیر روح المعانی،جلد ۹،ص ۲۲

[2] تفسیر المنار،جلد ۹،ص ۶۶،ان باتوں کو ابن اسحاق نامی ایک مفسر نے نقل کیا ہے۔

[3] تفسیر فخر رازی،جلد ۱۴،ص ۲۰۳

[4] تفسیر فخر رازی جلد ۸،ص ۸۵،روح المعانی،جلد ۳،ص ۱۷۶،تفسیر قرطبی،جلد ۲ ص ۱۳۵۴

آیات اس بات کو بیان کر رہی ہیں۔

لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس قسم کے پروپیگنڈے کا کوئی شایانِ شان اثر نہیں ہوا اور صدرِ اسلام کے پاک دل اور پاکباز مومنین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس سلسلہ کی پانچویں اور آخری آیت ایک بار پھر فرعون کی موسیٰ علیہ السلام سے جنگ کا ایک اور گوشہ بیان کر رہی ہے۔یعنی جب لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کو قبول کر رہے تھے اور یہ بات فرعون کے لیے ناگوار تھی اور اس نے اپنے پروپیگنڈے کے ذریعہ لوگوں کے افکار کو منحرف کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے مختلف قسم کے پروپیگنڈوں کو آزمایا، جن میں ایک یہ ہے جسے درج ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

اس نے پہلے تو اپنی نام نہاد خاندانی شرافت کو پیش کیا اور کہا: ''اس میں تو شک ہی نہیں کہ میں اس شخص (موسیٰ) سے کئی درجے زیادہ برتری رکھتا ہوں، کیونکہ اس کا تعلق ایک پست (بنی اسرائیل کے غلام اور چرواہے) خاندان سے ہے۔''

''اور یہ بھی ہے کہ وہ کھل کر اور پوری وضاحت سے بھی نہیں بول سکتا اور میں اس سے زیادہ فصیح ہوں۔''

''اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں ہیں جو اس کی شخصیت کی علامت ہوتے؟''

''اور ان سب سے بالاتر یہ کہ اگر وہ سچ کہتا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے تو اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے تا کہ وہ اس کی باتوں کی تصدیق کرتے۔''

گویا وہ اس طرح کے چار نام نہاد دلائل کے ذریعے موسیٰ کے دعوائے نبوت کو جھوٹا ثابت کر رہا تھا۔

قرآن مجید انہی آیات میں کہتا ہے کہ ''اس نے اپنی قوم کا استخفاف کیا، لہٰذا قوم نے اس کی اطاعت کی۔''

''استخفاف''، ''خفیف'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں سبک یعنی ہلکا۔اور یہاں پر یہ مراد ہے کہ فرعون کی کوشش یہ تھی کہ وہ قوم کے افراد کو سبک سر (احمق) بنا دے۔اسی لیے تفسیر مجمع البیان میں پڑھتے ہیں کہ اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ ''فرعون نے افرادِ قوم کی عقلوں کو سبک (ہلکا) سمجھا، یا ہلکا کر دیا، تا کہ وہ اس کی اطاعت کریں۔''[1]

تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں ہے کہ ظالم اور جابر حکمرانوں کی طرف سے عوام الناس کو بے قوف بنانے کا شیوہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ان کا پہلا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ عوام کو معرفت کے تمام طریقوں سے باز رکھتے ہیں اور حقائق کے درمیان پردے حائل کر دیتے ہیں تا کہ لوگ سب کچھ فراموش کر دیں اور ان کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔پھر وہ اپنی مرضی کے مسائل عوام میں پیش کرتے ہیں اور انہیں لوگوں کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ان کے افکار اسی کے مطابق ڈھل جائیں۔اس کے بعد لوگوں کو سبک سر اور بیوقوف بنانا آسان ہو

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹، ص ۵۱

جاتا ہے اوران پر حکومت کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتا اور جدھر کو چاہیں ان کا رخ پھیر دیا جاتا ہے۔[1]

لیکن مزے کی بات ہے کہ قرآن آیت کے آخر میں کہتا ہے کہ: ''اگر قوم فرعون نے اس کے اس قسم کے پروپیگنڈے کو قبول کرلیا تھا اوراس کی اطاعت کرنے لگ گئی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گناہ گار اور فاسق قوم تھی۔''

اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومن، بامقصد اور بامعرفت افراد اس قسم کے پروپیگنڈے کا ہرگز شکار نہیں ہوتے۔ یہ فسق اور گناہ ہی ہیں جو اس قسم کے بے بنیاد پروپیگنڈے کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔

باالفاظ دیگر جب ''نفس امارہ'' انسان کے اندر سے اور ''شیطانی وسوسے'' جیسے فرعون وغیرہ ہیں، اس کے باہر سے مل جاتے ہیں، تو حقیقت کے چہرے کو چھپا دیتے ہیں۔

مزید تشریح

حقائق کو چھپانے میں پروپیگنڈے کا اثر

پروپیگنڈے کے اثرات ہمارے زمانے میں اس قدر واضح ہیں کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور ماضی میں بھی یہ مخفی نہیں تھے۔

جو ظالم اور جابر حکمران اپنی حکومت کے لوگوں پر مسلط رکھنا چاہتے ہیں وہ کئی طرح کے پروپیگنڈوں سے کام لیتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے افکار اور اذہان کو گمراہ کریں؟ قدیمی مکتب خانوں سے لے کر محراب ومنبر تک اور قہوہ خانوں میں قصہ کوؤں کی داستانوں سے لے کر علمی کتابوں تک۔

غرضیکہ تاریخ کی تحریف، ثناخوان اور مداح، شعراء کے اشعار، لوگوں کے مقدس مقام اور عقیدت کے مراکز، جھوٹے اور خودساختہ قصے کہانیاں، کرامات اور غیر حقیقی اقدار اور ہر طرح کے دوسرے ذریعوں سے اپنے مقصد کے حصول کے لیے تگ ودو کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک دیو کو پروپیگنڈا کی عظیم موجوں سے فرشتہ کی صورت میں پیش کردیا جاتا اور شیطان کو ایک مقدس انسان کے لبادے میں سجا کر لوگوں کے سامنے لے آتے۔

بعض مشہور اسلامی تاریخوں میں ملتا ہے کہ شام کے لوگ معاویہ کے اس قدر اطاعت گزار ہوچکے تھے کہ جب وہ صفین کی طرف جانے لگا تو ''وقت کی تنگی'' کے پیش نظر اس نے نمازِ جمعہ بدھ کے دن پڑھا دی (اور لوگوں نے بھی اس ''نماز جمعہ'' میں شرکت کی)۔ مروج الذہب میں مسعودی کی عبارت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن، جلد ۷، ص ۳۴۰

"ولقد بلغ من امرهم فی اطاعتهم له انه صلی بهم عند میسر هم الی صفین الجمعة فی یوم الاربعاء"

''لوگوں کی بنی امیہ سے اطاعت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جب معاویہ صفین کی طرف جانے لگا تو اس نے لوگوں کو جمعہ کی نماز بدھ کے دن پڑھادی۔''[1]

اور یہ واقعہ بھی مشہور ہے، (اگر یہ مشہور تاریخی کتابوں میں نہ ہوتا تو اس کا ماننا مشکل تھا)۔

''کوفے کا ایک شخص اونٹ پر سوار ہوکر دمشق پہنچا اور لوگ اس وقت صفین سے واپس آ رہے تھے۔ اچانک ایک شامی نے اس کا دامن پکڑ لیا اور کہا کہ ''یہ ناقہ (اونٹنی) میری ہے جو تو نے صفین میں مجھ سے لی تھی۔'' جھگڑا طویل ہوگیا اور معاملہ معاویہ تک جا پہنچا (شاید اس لیے کہ جھگڑے نے سیاسی رخ اختیار کرلیا تھا)۔ شامی شخص نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پچاس گواہ پیش کر دیئے جنہوں نے کہا کہ یہ اونٹنی اس (شامی) کی ہے اور معاویہ نے ان (پچاس) لوگوں کی شہادت کی بناء پر اس کا فیصلہ شامی کے حق میں دے دیا۔

کوفی نے پکار کر کہا ''معاویہ! یہ اونٹنی نہیں، اونٹ ہے اور تم خود اسے چل کر دیکھ لو۔ معاویہ سمجھ گیا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔ لہٰذا اس نے کہا ''جو فیصلہ میں نے کرنا تھا کر دیا اور بات ختم ہوگئی۔''

جب لوگ منتشر ہوگئے تو معاویہ نے کسی کو بھیج کر اسے اپنے پاس بلایا اور اونٹ کی قیمت سے دوگنی رقم اسے دے کر کہا:

"ابلغ علیا انی اقاباه بمائة الف ما فیهم من یفرق بین الناقة والنجمل"

''علیؑ کو میری طرف سے یہ کہہ دینا کہ میرے پاس تمہارے خلاف لڑنے کے لیے ایک لاکھ ایسے افراد موجود ہیں جو اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہیں کر سکتے۔''[2]

قصہ مختصر، گزشتہ تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے شواہد اور نمونے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی لیڈر ایک عظیم ملت کے افکار اور اذہان کو کیونکر گمراہ کرتے رہے اور کس طرح انہیں سالہا سال تک گمراہیوں اور تاریکیوں میں سرگردان رکھے رہے، جس سے افراد ملت زبردست مصائب کا شکار رہے لیکن جب سیاسی حالات تبدیل ہوئے اور وہ جابر شخص اقتدار سے جدا ہوا اور پروپیگنڈے کے پردے ہٹے تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ افراد ملت خواب سے بیدار ہوئے ہوں اور جب ان کی نگاہ اپنے ماضی پر پڑی تو اس پر زبردست افسوس کا اظہار کیا اور سخت نادم اور پشیمان ہوئے۔

دور حاضر میں پروپیگنڈا مشینری اس قدر طاقتور ہے کہ بعض نام نہاد ترقی یافتہ ممالک میں ذرائع ابلاغ عامہ کچھ پڑھے لکھے اور

---

[1] مروج الذہب مسعودی، جلد ۲، ص ۷۲، مطبوعہ مصر ۳۴۶

[2] مروج الذہب جلد ۲ ص ۷۲۔ الامام علی صوت العدالۃ الانسانیۃ جلد ۴، ص ۹۵۶

کسی حدتک باخبر افراد کوایسے افراد کے انتخاب کے لیے، جو ذرائع کے مالک لوگوں کے منظورنظر ہوتے ہیں، ووٹوں کے صندوقوں تک لے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے منظورنظر اور پسند کے افراد کو ووٹ دیں، حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مکمل طور پر آزاد ہیں، جبکہ اس بارے میں قطعاً بےاختیار ہوتے ہیں۔

سمعی وبصری وسائل کی وسعت اور پیشرفت، نفسیات کے لیے فنون لطیفہ اور ظریفہ سے استفادہ نے پروپیگنڈے کے اثرات کو اس قدر وسعت دی ہے کہ باہر کے لوگ جو غیر جانبدارانہ رائے قائم کرنا چاہیں حیران اور پریشان ہوجاتے ہیں۔

یہ بات سیاسی مسائل کی حدتک محدود نہیں ہے، اقتصادی اور معاشی مسائل میں بھی اس نے اس قدر وسعت پیدا کرلی ہے کہ اچانک اور کسی قسم کی سوچ اور غوروفکر کی فرصت دیئے بغیر پروپیگنڈے کی لہر معاشرے کو ایسی غیر پیداواری اشیاء کے مصرف کی ترغیب دلاتی ہیں جو بسا اوقات معاشرے کے لیے بےسود، بلکہ مضر اور نقصان دہ ہوتی ہیں اور اس طرح سے معاشرے پر غیر صحیح اور ناقص اقتصاد مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

''جھوٹی اقدار'' (مثلاً ''فیشن'' وغیرہ) کے عنوانات سے معاشرے کو غلط اور غیر مشروع مقاصد کی طرف دھکیلا جارہا ہے۔

اسی طرح مختلف فکری مذاہب کے بارے میں پروپیگنڈے کا حال ہے کہ ان کو لوگوں پر مسلط کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ اپنے طور پر اس قدر پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ایک مکمل بےسروپا مکتب کو منطقی، فلسفی اور انسانی مکتب ثابت کردیتے ہیں۔

لیکن بہرصورت اس بات میں شک نہیں ہے کہ کسی معاشرے کی معرفت کے ستونوں کو مستحکم کرنے اور افراد کی معرفت کے راستوں کو ہر قسم کی کجروی سے محفوظ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قسم کے پردے ہٹائے جائیں جو وسیع ذرائع ابلاغ سوچتے اور فیصلہ کرتے ہیں اور اس سوچ کو دوسروں کے افکار پر مسلط کرتے ہیں۔ ان کی بجائے افراد سوچیں اور غوروفکر کریں۔ ذرائع ابلاغ کا کام صرف یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کی معرفت کو زیادہ سے زیادہ کریں اور صحیح فیصلہ کرنے کے لیے انسانی ذہن کو ہر طرح سے آمادہ کریں اور بس!

ذرائع ابلاغ کا کام ہرگز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ لوگوں کے افکار پر پردے ڈالیں بلکہ جہالت، تعصب، کوتاہ اندیشی، اندھی تقلید اور اس قسم کے دوسرے حجابوں کی دھجیاں بکھیرنی چاہییں اور کسی باوقار، باشعور اور ترقی یافتہ معاشرے کے ذرائع ابلاغ کے ترقی یافتہ پروگراموں کو ایک نمونہ ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کی دنیا میں اس قسم کا معاشرہ کہیں خال خال ہی ملتا ہے۔

اصل عیب یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ غالباً سیاستدان کے آلہ کار ہیں، بلکہ اس سے بدتر اقتصادی ڈائنوں کے قبضہ میں ہیں اور مختلف معاشروں کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں ایسی ایسی جگہوں میں لیے پھرتے ہیں جہاں ان کا جی چاہتا ہے۔

۲۰۔ شیطانی وسوسوں کا حجاب

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کی سماعت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آیات

(۱) فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۴۳ (سورہ انعام ۴۳)

(۲) وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ۝۲۴ (سورہ نمل ۲۴)

(۳) وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ۝۳۸

(سورہ عنکبوت ۳۸)

(۴) وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۝۳۶ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝۳۷

سورہ زخرف (۳۶-۳۷)

(۵) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ (سورہ انعام ۱۱۲)

(۶) اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَاَمْلٰى لَهُمْ۝۲۵ (سورہ محمد ۲۵)

(۷) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۝۵ (سورہ فاطر ۵)

ترجمہ

(۱) جب ہماری سزا ان کے پاس آ پہنچی تو انہوں نے (خضوع کیوں نہیں کیا اور) کیوں سر تسلیم خم نہیں کیا؟ لیکن ان کے دل قساوت پیدا کر چکے تھے اور جو کام وہ کرتے تھے شیطان انہیں انکی نظروں میں

مزین کر دیتا تھا۔

(۲) (لیکن) میں نے اس (ملکہ سبا) کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ غیر اللہ، سورج کو سجدہ کر رہے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کیا ہوا ہے اور انہیں راستے سے باز رکھا ہوا ہے اور وہ ہدایت نہیں پائیں گے۔

(۳) ہم نے عاد اور ثمود کو بھی ہلاک کر دیا اور ان کے (ویران شدہ) ٹھکانے تمہارے لیے آشکار ہیں۔ شیطان نے ان کے اعمال کو زینت دی ہوئی تھی۔ لہٰذا انہیں راہ (راست) سے باز رکھا، حالانکہ وہ دیکھتے تھے (لیکن تشخیص نہیں کرتے تھے)۔

(۴) جو شخص خدا کی یاد سے روگردانی کرتا ہے تو ہم شیطان کو اس کے لیے بھیج دیتے ہیں اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور وہ (شیاطین) اس ٹولے کو یادِ خدا سے روکتے ہیں، جبکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہیں۔

(۵) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسان اور جن کے شیطانوں سے ایک دشمن بنایا ہے جو فریب دینے والی اور بے بنیاد باتیں (لوگوں کو خواب غفلت میں ڈالنے کے لیے) راز کے طور پر (اور کانوں میں) ایک دوسرے کو بتاتے ہیں اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے (لیکن انہیں آزمائش کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے)۔

(۶) جن لوگوں نے حق کے روشن ہو جانے کے بعد اس کی طرف پشت کی شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر دیا اور انہیں لمبی آرزوؤں کے ذریعہ فریب میں مبتلا کر دیا۔

(۷) اے لوگو! خدا کا وعدہ حق ہے۔ مبادا دنیاوی زندگی تمہیں فریب میں مبتلا کر دے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں شیطان خداوند کریم سے مغرور کر دے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''شیطان'' ابلیس کا خاص نام نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ اس کا مفہوم عام ہے اور نحوی اصطلاح کے لحاظ سے ''اسم جنس'' ہے جو ہر سرکش، متمرد اور تخریب کار کو شامل ہے، خواہ وہ جن ہو یا انسان، یا کوئی اور چیز اور اس لفظ کی بنیاد دو اقوال پر استوار ہے۔

پہلی یہ کہ اس کا مادہ ''شطون'' (بروزن ستون) ہے جس کے معنی بعد اور دوری ہیں۔ لہٰذا وہ گہرا کنواں جس کی تہہ انسانی دسترس سے دور ہو، اسے ''شطون'' (بروزن زکون) کہتے ہیں اور خلیل بن احمد نحوی نے بھی ''شطن'' (بروزن وطن) کو لمبی رسی کے معنی سے تفسیر کیا ہے اور چونکہ شیطان حق اور رحمت سے دور ہوتا ہے لہٰذا یہ کلمہ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دوسری یہ کہ یہ کلمہ ''شیط'' (بروزن بیت) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ''غیظ وغضب کی وجہ سے آگ جیسی صورت اختیار کر لینا اور برافروختہ ہوجانا۔ چونکہ شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کے سجدے کے سلسلے میں آگ جیسے غصے میں مبتلا ہوگیا تھا، اسی لیے اسے شیطان کہا جاتا ہے اور لفظ ''ابلیس'' اور ابلیس جیسی دوسری مخلوقات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔[1]

''غرور'' (بروزن شہرور) یہ کلمہ ''شرور'' (بروزن شعور) کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی دھوکا، فریب اور بیداری کی حالت میں غفلت ہیں اور شیطان کو اس لیے ''غرور'' کہتے ہیں کہ وہ انسان کو اپنے دھوکہ اور فریب کے ذریعہ راہ سے باہر نکال لے جاتا ہے اور اس کی نگاہوں میں حق اور باطل کو دگرگوں کر دیتا ہے۔

ویسے اصولی طور پر ''غرور'' ہر فریب دینے والی چیز کو کہتے ہیں خواہ وہ جاہ و مال ہی یا مقام و منصب، خواہش و شہوت ہو یا شیطان وغیرہ اور اگر کہیں پر اس کی شیطان سے تفسیر کی جاتی ہے تو اس لیے کہ وہ تمام فریب دینے والی چیزوں سے زیادہ خبیث ہوتا ہے۔

''تسویل''، ''سول'' (بروزن قرب) کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی ایسی حاجت اور آرزو ہیں جو انسان کو اپنی طرف شوق دلاتی ہے اور ''تسویل'' کے معنی ہیں ''کسی چیز کو ایسا مزین کرنا کہ نفس اس کی طرف رغبت کرنے لگ جائے۔'' اور ''خوبصورت چہرے پر موجود برائیوں کے دکھانے'' کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یہ وہ تفسیر ہے جسے راغب نے بھی مفردات میں بیان کیا ہے، جبکہ ''صحاح اللغۃ'' اور ''خلیل بن احمد'' کی کتاب ''العین'' سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصلی معنی ''غرور و غفلت سے ملی ہوئی سستی'' ہیں۔ اسی لیے امور کو مزین کرنا، کسی چیز کو برعکس دکھانا، ناپسندیدہ چیز کو ایسی پسندیدہ صورت میں پیش کرنا کہ انسان اس پر فریفتہ ہو کر سست ہوجائے۔ ان سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

بہرحال آیات مذکورہ میں ''شیطانی تسویلیت'' سے مراد یہ ہے کہ وہ برائیوں کو انسان کی نظر میں اچھائیاں بنا کر پیش کرتا ہے اور فریب دیتا اور منحرف کرتا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

باطل کو کیسے زینت دیتے ہیں؟

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت گزشتہ اقوام کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کے پاس خدا کے نبی آئے لیکن ان لوگوں نے حق کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ خداوند عالم نے ان کو بیداری اور سخت مشکلات و حوادث سے باخبر ہونے کے لیے فقر و فاقہ، بیماری، خشک سالی، قحط سالی، درد و الم اور رنج و غم سے دوچار کر دیا۔ لیکن وہ بیداری، توبہ اور راہِ حق کی طرف پلٹنے کے بجائے اسی طرح اپنی گمراہی

---

[1] کتاب التحقیق فی کلمات القرآن الحکیم۔ کتاب مفردات راغب۔ کتاب لسان العرب اور کتاب مجمع البحرین (مادہ شیطان)

اورانحراف پر قائم رہےاوراسی راہ پر چلتے رہے۔

قرآن مجیداسی آیت میں کہتا ہے: جب ہماری ''بیدار کرنے والی سزائیں'' ان کے پاس پہنچیں توانہوں نے کیوں نہ ہمارے سامنے خضوع وخشوع کیااور کیوں نہ سرتسلیم خم کیا؟''

پھراس کے اسباب خودہی بتائے اوروہ دو چیزیں ہیں پہلی چیز یہ کہ ان کے دل تیرہ وتاریک، سخت اورنا قابل اطاعت ہو چکے تھے۔'' (ولکن قست قلوبھم)۔

دوسری یہ کہ ''شیطان نے ان کے اعمال کوان کی نگاہوں میں مزین کیا ہوا تھا کہ وہ غلط کاموں کوصحیح اور برائیوں کواچھائیاں سمجھتے تھے اورشیطان کوان میں اپنا اثرورسوخ قائم کرنے کا موقع اس لیے ملا کہ ان پرخواہشات نفسانی کی پرستش حکم فرما تھی'' (وزین لھم الشیطان کاکانوا یعملون)

بالفاظ دیگر نہ تو خدا کے رسولوں کی زبانی نصیحتوں نے ان پر کوئی اثر کیااور نہ ہی خداوند عالم کی عملی اورتکوینی نصیحتیں ان کے لیے کارگر ہوئیں اوراس کا عامل دو چیزیں تھیں، ایک توقساوت اورسنگدلی اور دوسرے شیطانی زینتیں۔ ان دونوں نے مل کران سے خضوع وخشوع اور تضرع وزاری کی روح کوسلب کرلیا۔

اس مقام پر ''شیطانی زینتوں'' سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

کچھ مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد شیطانی وسوسے ہیں جو برائیوں کواچھائیوں میں تبدیل کرکے ان کی نگاہوں کے سامنے لاتے ہیں، یا مختلف خارجی برے اعمال کوشیطان مزین کرکے پیش کرتا ہے، جیسا کہ بعض اوقات سم قاتل اورزہر ہلاہل کو میٹھے کیپسول میں رکھ کرکھلایا جاتا ہےاورعظیم انحراف اورگمراہیوں کومختلف ناموں مثلاً تمدن، روشن فکری، آزادی فکروغیرہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

بعد کی آیت ''ہدہد'' پرندے کی زبانی ہے جب وہ ملکہ سبا کی سرزمین گیااوران کے عظیم اوروروشن تمدن اوران پرایک عورت (بلقیس) کوحکمت کرتے دیکھااورواپس آکرتمام ماجراجناب سلیمانؑ سے بیان کرنے کے بعد کہا: ''میں نے اسے اوراس کی قوم کودیکھا کہ وہ آفتاب کے سامنے سجدہ کررہے ہیں اورشیطان نے ان کے اعمال کومزین کرکے ان کے سامنے پیش کیا ہوا ہے۔ اسی لیے وہ انہیں راہ سے روکے ہوئے ہے اورہدایت کے دروازوں کوان پرمکمل بند کیا ہوا ہے۔''

اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''ہدہد'' پرندہ بھی جواپنے عالم میں عقل وہوش کا حامل ہے، معرفت اورآشنائی کے حجابوں سے بھی اجمالی طور پرواقف تھااورجانتا تھا کہ شیطانی زینتیں انسانی فکر کی پردہ پوشی کردیتی ہیں، اسے حقیقت تک پہنچنے سے باز رکھتی ہیں، ہدایت کے دروازے اس پر بند کردیتی ہیں اورمنزل مقصود تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہیں۔

آیا جانورکبھی صحیح طریقے پران مسائل سے آشنا ہوسکتے ہیں جو عالم انسانی پرگزرتے ہیں اوراگرایسا ہے تو پھران کی معرفت اور آگاہی کس حدتک ہے؟ اس بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۱۵ سورہ نمل کی ۱۸ ویں آیت اورجلد ۵ سورہ انعام کی ۳۸ ویں آیت میں تفصیل سے بحث کرچکے ہیں۔

نیز یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ ہدہد نے شام اور یمن کے درمیانی راستے کو طے کیا ہو اور ملکہ سبا کی سرزمین میں جا پہنچا ہو؟ اس بارے میں بھی تفسیر نمونہ کی ۱۹ ویں جلد میں اسی آیت کے ضمن میں گفتگو کر چکے ہیں۔

تیسری آیت میں عاد و ثمود اور ان کی سرکشیوں اور بغاوتوں کا ذکر ہے اور پھر ان کی تباہی کا تذکرہ ہے اور ضمنی طور پر ان کے ویران شہروں اور نیست و نابود ہو جانے والے ٹھکانوں کا تذکرہ ہے جہاں سے عموماً حجاز کے باشندے یمن اور شام کی طرف جاتے ہوئے گزرتے تھے۔ (ایک قوم عاد کی سرزمین تھی اور دوسری قوم ثمود کی)۔ ان شہروں اور ٹھکانوں کو آئینہ عبرت کے طور پر دکھا رہا ہے، پھر ان کی ہلاکت و تباہی کے اصل اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے مزین کیا ہوا تھا۔ باوجودیکہ ان کی ظاہری آنکھیں اور عقل و خرد بھی تھے، لیکن شیطان نے ان کی آنکھوں اور ادراک پر پردے ڈال دیئے تھے اور راہ حق سے انہیں گمراہ کر دیا تھا'' (وزین لهم الشیطان اعمالهم فصدهم عن السبیل و کانوا مستبصرین)۔

''و کانوا مستبصرین'' (وہ بینا اور آگاہ تھے) کا جملہ بہت سے مفسرین کے بقول اس معنی میں ہے کہ وہ صاحبان عقل و شعور اور حاملانِ قدرت استدلال تھے اور حق و باطل کی پہچان بھی اچھی طرح رکھتے تھے۔ لیکن (شیطانی وسوسوں کی وجہ سے) غفلت کا شکار ہو گئے اور حقائق میں غور و فکر سے کام نہ لیا۔ [1]

تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے کہ وہ لوگ فطرت کے الہام کی وجہ سے حق کے رستوں کو جانتے تھے، لیکن شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر کے ان کے سامنے پیش کیا اور انہیں راہ حق سے بھٹکا دیا۔ [2]

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور تعلیمات کے ذریعہ حق کی معرفت ہے۔ [3]

ان تینوں تفسیروں میں سے جو بھی قابل قبول ہو (یا وہ ساری کی ساری قابل قبول ہوں، کیونکہ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے) ہمارے مقصود کی گواہ ہے، کیونکہ شیطانی زینتیں انسانی عقل و فکر کے لیے حجاب بن جاتی ہے۔

چوتھی آیت میں ایک کلی حکم کی صورت میں اس شخص کی سرنوشت کو بیان کیا ہے جو خدا کی یاد سے روگردان ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں جو ہمیشہ اس کا ہم نشین ہوتا ہے اور شیطانوں کا کام ہمیشہ لوگوں کو غفلت میں ڈالنا اور گمراہ کرنا ہوتا ہے اور انسان اپنے گمراہ ہونے کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہدایت کی راہوں پر گامزن ہے، تو اس طرح شیطان ہدایت کی راہیں اس پر بند کر دیتا ہے۔''

مفسرین اور ارباب لغت نے لفظ ''یعش'' کے دو معانی ذکر کیے ہیں:

بعض مفسرین تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ''عشی'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ایک خاص تاریکی ہیں، جو آنکھ میں پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۷، ص ۲۸۳۔ تفسیر روح البیان، جلد ۶، ص ۱۴۶۸ اور تفسیر قرطبی میں بھی یہ معنی بعض مفسرین سے نقل ہوئے ہیں۔

[2] تفسیر المیزان، جلد ۱۶، ص ۱۳۱

[3] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، ص ۶۶

سے آنکھ بینائی سے محروم ہوجاتی ہے، یا شب کور ہوجاتی ہے (انسان رات کو اندھا ہوجاتا ہے)۔ اسی لیے "عشوا" اس اونٹ کو کہتے ہیں جو اپنے سامنے کی چیزوں کو نہیں دیکھ سکتا اور راہ چلتے ہوئے اکثر بھٹک جاتا ہے۔ (خبط عشوا بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ہے) اور "اعشی" اس شخص کو کہتے ہیں جو نابینا ہوتا ہے یا رات کو اندھا ہوتا ہے۔

اس تعبیر کی رو سے آیت کے معنی یہ ہوں گے "جو شخص آیات الٰہی کو اس کائنات میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے اور خدا کے انبیاء کی زبان سے نہ سنے، وہ شیطانی پھندوں اور اس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔"

بعض دوسرے مفسرین نے اسے "عشو" (بروزن نشو) کے مادہ سے لیا ہے کہ جب وہ لفظ "الی" کے ساتھ ذکر ہو تو اس کا معنی ضعیف اور کمزور آنکھوں سے ہدایت پانا ہوتا ہے اور جب "عن" کے ساتھ ذکر ہو تو اس کے معنی اعراض کرنا اور منہ پھیرنا ہوتے ہیں۔ [1]

اس تفسیر سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ "جو لوگ یادِ خدا سے روگردان ہوں گے ہم شیطان کو ان پر مسلط کردیں گے۔" [2]

باقی رہا جملہ "نقیض" جو "قیض" (بروزن فیض) کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی "انڈے کا چھلکا" ہیں، تو یہ مسلط کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ آیت میں اس لفظ کا استعمال نہایت ہی قابل توجہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ان پر اس قدر مسلط ہو جاتا ہے کہ ان کا ہر طرف سے احاطہ کرلیتا ہے اور ان کا رابطہ باہر کی دنیا سے مکمل طور پر منقطع کردیتا ہے اور کسی انسان کی معرفت کے لیے یہ بدترین حجاب ہوتا ہے اور یہ تعبیر کلمات عرب میں بھی ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں "استیلا القیض علی البض" (انڈے پر چھلکے کا تسلط)

اس سے بدتر یہ کہ شیطان کا یہ تسلط اور گھیرا برابر جاری رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اس کی نوبت اس حد تک جا پہنچتی ہے کہ وہ اپنی گمراہی پر ناز کرنے لگتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ راہِ ہدایت پر ہے۔ (ویحسبون انهم مهتدون)۔

پانچویں آیت میں ان جنوں اور انسانوں کے شیاطین کا ذکر ہے جنہوں نے انبیاء کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے اور ان کی تعلیمات اور تبلیغات کو بے اثر کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ وہ فریب دینے والی اور بے بنیاد باتیں اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں تاکہ اس طرح سے لوگوں کو خواب غفلت میں پڑا رہنے دیں اور حقائق کو ان سے چھپائے رکھیں اور شیاطین ایک دوسرے کو فریب اور نیرنگ کے طریقے سکھاتے ہیں تاکہ حقیقتوں کے چہرہ پر پردہ ڈالے رکھیں اور لوگوں کو انبیاء کی تعلیمات سے دور رکھیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں "شیاطین" جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے جبکہ "عدو" مفرد کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ یہ

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر یہ لفظ "عشا یعشو" کے مادہ سے ہو تو اس کے معنی ہوں گے آنکھ میں کسی بیماری کے بغیر خود کو اندھا بنالینا اور اگر عشی یعشی کے مادہ سے ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ آفت جو آنکھ میں ہوتی ہے۔ (تفسیر روح البیان جلد ۸ ص ۳۶۸) لیکن یاد رہے کہ زیر بحث آیت میں یہ "عشا یعشو" کے مادہ سے ہے۔

[2] لسان العرب، مفردات راغب، تفسیر قرطبی، تفسیر روح البیان اور تفسیر المیزان کی طرف رجوع فرمائیں۔

تعبیر اس لیے ہو کہ تمام شیاطین لوگوں کے اغواء اور گمراہ کرنے کے سلسلے میں متحد، متفق اور ایک دشمن کی مانند عمل کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں پر "عدو"، "اعداء" کے معنی میں ہے۔ (یعنی مفرد کا صیغہ جمع کے معنی دے رہا ہے)۔[1]

جبکہ بعض دوسرے حضرات نے تصریح کی ہے کہ "عدو" کا اطلاق، مفرد، تثنیہ اور جمع تینوں پر ہوتا ہے۔[2]

چھٹی آیت کا تعلق سورہ محمد سے ہے اور اس سورت میں معرفت کے بہت سے حجابوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کبھی تو فساد فی الارض اور قطع رحمی کو باطنی نابینائی اور بہرے پن کا سبب بتایا گیا ہے (آیت ۲۳) اور کبھی قرآن میں غور و فکر نہ کرنے کو دلوں پر قفل پڑنے کے ہم ردیف قرار دیا گیا ہے۔

زیر بحث آیت میں بھی شیطان وسوسوں اور ابلیسی زینتوں اور آرزوؤں کو گمراہ لوگوں کے مرتد ہو جانے کا سبب بتایا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ جو لوگ پہلے تو راہ حق کو پا لیتے ہیں لیکن پھر شیطانی آرزوؤں کی بنا پر منحرف ہو جاتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس انحراف کو قابل فخر کارنامہ سمجھتے ہیں۔

اس آیت کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ملتے ہیں اور وہ یہ کہ آیا یہ آیت اس یہودی قوم کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے تھی اور وہ لوگ جو نشانیاں اپنی کتابوں میں دیکھ چکے تھے ان کی بناء پر آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے لیکن جب ظہور رسالت ہوا تو مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے جو بذات خود ایک طرف کا ارتداد ہے۔

یا ان منافقین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے پہلے تو حق کو قبول کر لیا اور بعد میں منحرف ہو گئے۔

یا ظاہر میں تو مان لیا لیکن باطن میں مخالف ہو گئے۔

لیکن اگر آیات کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اکثر کا تعلق منافقین سے ہے۔ اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی منافقین کی طرف اشارہ ہو، ایسے منافقین جنہوں نے ابتداء میں تو حق کو پہچان لیا لیکن بعد میں اس سے روگردان ہو گئے۔

"املی لھم" کا جملہ "املاء" سے ہے جس کے معنی لمبا کرنا اور مہلت دینا ہیں۔[3] اور یہاں پر مراد شیطان کی طرف سے لمبی چوڑی اور دور دراز کی آرزوؤں کا ایجاد کرنا ہے، ایسی آرزوئیں جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں اور اس کی نگاہوں میں باطل کو مزین کر دیتی ہیں اور اسے حق سے باز رکھتی ہیں۔

اسی سلسلے میں ساتویں اور آخری آیت با آواز بلند اور ببانگ دہل لوگوں کو خبردار کر رہی ہے کہ خدا کا وعدہ برحق ہے۔ اس کے بعد حق سے انحراف، دھوکہ کھانے اور معرفت سے باز رہنے کے دو عوامل کا ذکر کرتا ہے۔ پہلا عامل دنیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "مبادا دنیاوی زندگی

---

[1] روح المعانی جلد ۸ ص ۴

[2] المنار، جلد ۸، ص ۵

[3] یاد رہے کہ یہ لفظ دراصل "ملو" (بروزن سرو) کے مادہ سے ہے نہ کہ "ملائ" ہمزہ کے ساتھ۔

تمہیں فریب دے'' اور دوسرا عامل شیطان ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے'' کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں خدا کے بارے میں دھوکہ دے دے۔'' کبھی تو وہ تمہیں اس کے رحم و کرم کا امیدوار بنا کر اس کے عذاب سے بے خبر کر دیتا ہے اور کبھی تمہیں اس قدر سرگرم کر دیتا ہے کہ بالکل ہی خدا اور اس کے فرمان کے بارے میں تو سوچتے ہی نہیں، یا پھر اس کے احکام و فرامین کو برعکس کر کے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔

''غرور'' (بروزن شرور) جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہر دھوکا دینے والی چیز کو کہتے ہیں، خواہ وہ جاہ و مال ہو یا مقام و منصب، خواہ خواہشات نفسانی ہوں یا شہوات شیطانی اور خواہ فریب کار انسان ہو یا شیطان۔ لیکن چونکہ واضح ترین اور خبیث ترین فرد شیطان ہے لہٰذا عام طور پر اسے شیطان سے ہی تفسیر کرتے ہیں۔[1]

''لایغرنکم باللہ الغرور'' کی تعبیر بہت سے مفسرین کے عقیدہ کے مطابق شیطان کے انسان کو خدا کے فضل اور رحم و کرم کے ذریعہ دھوکہ دینے کی طرف اشارہ ہے اور وہ اسے اس قدر فریب میں ڈال دیتا ہے کہ وہ ہر گناہ سے آلودہ ہو جاتا ہے اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا یہ اقدام اس کے ایمان و معرفت کے کمال کی دلیل ہے کہ اس نے خدا کو ان (رحمان و کرم اور فضل کی) صفات کے ساتھ پہچانا ہے!!

اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص کو دھوکہ دے کر اس عنوان سے زہر کھلا دیں کہ وہ طاقتور ہے اور زہر کے اثرات کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتا ہے، یا اس کے پاس زہر کا تریاق ہے۔ اس طرح سے تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔

مزید تشریح

شیطان کون ہے؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں شیطان ایک فرد کا نام نہیں ہے، بلکہ ''ابلیس'' جس نے جناب حضرت آدمؑ کو سجدہ نہیں کیا تھا، شیاطین میں سے ایک تھا۔

اس کے پاس اپنی جنس کے بھی بہت سے فوجی سپاہی ہیں اور انسانوں سے بھی۔ اور شیطان کا نام سب پر بولا جاتا ہے۔ اسی لیے کفر، ظلم، شرک، فساد فی الارض کرنے والوں کے سرغنے اور گمراہ کرنے والے تمام کارندے، غرض سب کے سب شیطان کے فوجی ہیں بلکہ ایک روایت کی رو سے تو انسانی شیطانوں کے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو جنات شیطانوں سے بدتر ہیں، جیسا کہ ہم حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ آپؐ نے ابوذرؓ سے فرمایا:

''ھل تعوذت باللہ من شر شیاطین الجن والانس''

---

[1] ''غرور'' مبالغہ کا صیغہ ہے۔

''یعنی آیا تو نے جن وانس کے شیطانوں کے شر سے خدا کی پناہ طلب کر لی ہے؟''

توانہوں نے عرض کی:

''آیا انسانوں میں بھی شیطان ہیں؟''

تو رسالت مآبؐ نے فرمایا:

"نعم هم شر من شياطين الجن"

''جی ہاں! بلکہ وہ تو جنات کے شیطانوں سے بھی بدتر ہیں۔''[1]

قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے پاس باقاعدہ منظم لشکر ہیں جن میں سے کچھ سوار ہیں اور کچھ پیدل۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے:

"واجلب عليهم بخيلك ورجلك"

''بے شک تو اپنے سوار اور پیدل، غرض سب کو انسانوں کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کرے۔'' (بنی اسرائیل ۶۴)

"اجلب"، "اجلاب" کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں فوری جمع آوری، یا کسی جماعت اور گروہ کو چلنے کے لیے نعرے لگانا۔

شیطان کے سوار اور پیدل لشکر سے کیا مراد ہے؟ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ جو شخص بھی خدا کی نافرمانی کے لیے سوار ہو کر یا پیدل چل کر جاتا ہے یا اس راستے میں جنگ کرتا ہے، وہ شیطان کا سوار اور پیدل لشکر ہے۔[2]

بعض نے کہا ہے کہ اس کا صحیح معنوں میں سوار لشکر بھی ہے اور پیدل فوج بھی، جو اس کے یار و مددگار ہیں۔

بعض نے اسے کنایہ کے معنی پر حمل کیا ہے اور کہا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ اس نے مقابلے کے تمام وسائل فراہم کیے ہوئے ہیں اور پوری قوت کے ساتھ انسان کے مقابلہ کے لیے آتا ہے۔[3]

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ شیطان کا سوار لشکر کفر، ظلم اور فساد کے سرغنے ہیں اور اس کی پیدل نچلے یا متوسط قسم کے لوگ ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ شیطان کے سوار لشکر سے انسان کی شہوات اور صفات رذیلہ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے قلب و روح پر مسلط ہو جاتی ہیں اور اس کی پیدل فوج سے مراد وہ عوامل ہیں جو باہر سے آ کر انسان کو منحرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۳، ص ۱۵۴

[2] قرطبی نے اس تفسیر کو اکثر مفسرین سے نقل کیا ہے۔

[3] فخر رازی نے اس تفسیر کو ایک احتمال کے عنوان سے ذکر کیا ہے، (جلد ۲۱، ص ۶) اور تفسیر فی ظلال القرآن میں بھی اسی طرح کی بات ہوئی ہے۔ (جلد ۵، ص ۳۴۳)

۲۔ایک سوال اوراس کا جواب

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ خداوند عالم ہمیں ایسے طاقتور لیکن بے رحم لشکر کے سامنے تن تنہا اور بے یارو مددگار چھوڑ دے اور کیا یہ چیز اس کی حکمت اور اس کے عدل سے ہم آہنگ ہے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے پر توجہ کرنے سے مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح قرآن مجید میں آیا ہے کہ خداوند عالم مومنین کو فرشتوں کے ذریعہ منظم کرتا ہے اور اپنی غیبی اور معنوی طاقتیں ان لوگوں کے ہمراہ کر دیتا ہے جو جہاد نفس اور جہاد دشمن میں بھرپور حصہ لیتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ

''بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ اس پر ڈٹ گئے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ تو ڈرو اور نہ ہی غم کھاؤ اور تمہیں اس بہشت کی خوشخبری ہو جس کا تمہارے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا اور ہم تمہارے اس دنیاوی زندگی میں بھی یار و مددگار تھے اور آخرت میں بھی۔'' (سورہ فصلت ۳۰۔۳۱)

۳۔ایک اور اہم نکتہ

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ شیطان کبھی بھی ہمارے دل کے گھروں میں بغیر اجازت کے داخل نہیں ہوتا اور ہماری روح کے ملک میں پاسپورٹ کے بغیر قدم نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ غافل گیر کر کے حملہ کرتا ہے۔ بلکہ وہ خود ہماری ہی اجازت سے اندر داخل ہوتا ہے۔ جی ہاں! وہ دروازے سے اندر آتا ہے روشندان یا کھڑکی سے نہیں۔ ہم خود ہی اس کے لیے اپنے دل کے دروازے کھولتے ہیں۔ جس طرح قرآن کہتا ہے:

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۹۹ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝۱۰۰

''اس کا تسلط ان لوگوں پر نہیں ہے جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ (بلکہ) اس کا تسلط تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں اور اسے اپنی سرپرستی کے لیے انتخاب کرتے ہیں اور اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں (یعنی اس کے فرمان کو بھی خدا کے فرمان کے برابر سمجھتے ہیں۔'' (سورہ نحل ۹۹۔۱۰۰)

اصولی طور پر یہ انسان کے اعمال ہی ہیں جو شیطان کے اثر و رسوخ کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ

''فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔(بنی اسرائیل ۲۷)

لیکن ہر حالت میں اس کے اور اس کے مختلف لشکریوں کے رنگ برنگے داموں سے جو شہوات کی مختلف صورتوں یعنی بدکاری کے اڈوں کی شکل میں، استعماری سیاست کے روپ میں، انحرافی مکاتب فکر کے انداز میں، فاسد اور مفسد ثقافت کی صورت میں قدم قدم پر موجود ہیں، نجات حاصل کرنے کے لیے ایمان، تقویٰ، سایہ لطف ورحمت پروردگار اور اپنے آپ کو اس کی ذات کے حوالے کر دینے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

''اگر خدا کا فضل وکرم اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ تم سب اس شیطان کی پیروی کرتے۔''(نساء ۸۳)

یہاں پر معرفت کے بیس حجابوں کا تفصیلی تذکرہ اختتام کو پہنچتا ہے۔ اب ہم معرفت کے ذرائع کا پتہ چلاتے ہیں۔

۵۔معرفت کے ذرائع

اشارہ

جس طرح بیج آمادہ زمین میں اگتے ہیں اور شورہ زار زمین میں کبھی پھول نہیں کھلتے ،خواہ وہاں پر بہترین بیج کاشت کیا جائے اور آب باران سے اس کی آبیاری کی جائے ، اسی طرح معرفت کا بیج بھی فقط آمادہ دلوں میں نشوونما پاتا ہے اور معرفت کے پھول پاک و پاکیزہ روحوں میں کھلتے ہیں۔

اسی وجہ سے ان صفات ،روحیات اور اعمال سے آگاہی جو معرفت کی راہ ہموار کرتے ہیں۔''شناخت ومعرفت'' سے متعلق اہم ترین مباحث میں سے ہیں۔اس بارے میں قرآن مجید نے نہایت ہی بامعنی تعبیرات اور بہت ہی لطیف وزیبا اشاروں سے کام لیا ہے۔

اگرچہ معرفت کے ذرائع بہت ہیں لیکن زیادہ اہم اصول کہ جن کی طرف قرآن مجید کی مختلف آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تقوی

۲۔ ایمان

۳۔ خوف اور احساس ذمہ داری

۴۔ تزکیہ نفس

۵۔ ہوشیاری

۶۔ آگاہی

ان میں سے ہر ایک امر کو جداگانہ فصل میں بیان کیا جائے گا۔پہلے اس موضوع سے متعلق آیات کو بیان کیا جائے گا، پھر اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوگی اور اس بارے میں اسلامی روایات سے بہرہ برداری کی جائے گی تا کہ موضوع کی اچھی طرح وضاحت ہوجائے۔

ا۔تقوی اور معرفت کا رابطہ

اس بارے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

آیات

(۱) الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ (سورہ بقرہ ۲-۱)

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (سورہ انفال ۲۹)

(۳) وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۲۸۲

(سورہ بقرہ ۲۸۲)

(۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۸

(سورہ حدید ۲۸)

ترجمہ

(۱) یہ باعظمت کتاب ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں اور پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔

(۲) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم خدا (کے فرمان) کی مخالفت سے پرہیز کروتو وہ تمہارے لیے ''فرقان'' (باطل سے حق کی جدائی کا ذریعہ) قرار دے گا۔

(۳) اور خدا سے ڈرو اور خدا تمہیں تعلیم دے گا اور خداوند عالم ہر چیز کو جانتا ہے۔

(۴) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! خدا سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ تا کہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا کر دے اور تمہارے لیے ایسا نور قرار دے جس کے ذریعہ سے تم اپنی راہ کو پیدا کرو اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور خداوند عالم غفور اور رحیم ہے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''تقویٰ'' دراصل ''وقایہ'' (بروزن درایہ) کے مادہ سے ہے، جیسا کہ راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ''کسی چیز کو آفات سے بچانا۔'' پھر وہ کہتے ہیں کہ ''تقویٰ کے معنی ہیں روح اور نفس کو ان چیزوں سے بچانا جن سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر ڈر، خوف (اور پرہیز) کو بھی تقویٰ کہا جانے لگا اور زبان شرع میں گناہوں اور حرام کاموں سے اپنے آپ کو بچانے کا نام تقویٰ ہے اور کمال تقویٰ یہ ہے کہ بعض مشکوک مباح چیزوں کو ترک کر دیا جائے۔''[1]

---

[1] مفردات راغب مادہ ''وقی''

دوسرے ارباب لغت نے بھی مندرجہ بالا مفہوم سے ملتا جلتا مفہوم بیان کیا ہے۔بعض نے اس کے معنی ''صانت''[1] (بچاؤ) اور بعض نے ''اتقاء'' کے معنی ''برائیوں اور ہواوہوس سے رکنا'' بیان کیے ہیں۔[2]

بعض مفسرین نے بعض صحابہ کرامؓ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ جب آنحضرتؐ سے تقویٰ کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:

''آیا تم کسی پرخار رستے سے گزرے ہو؟ جب مثبت جواب سنا تو فرمایا، تو اس وقت کیا کرتے تھے؟ آیا اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر اور کانٹوں سے بچ کر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی؟ اسی کا نام تقویٰ ہے۔''

جی ہاں! زندگی کی راہیں طے کر کے خدا تک پہنچنے کے رستے میں کئی قسم کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔خواہشات نفسانی، ہواوہوس، جھوٹی امیدوں، لمبی آرزوؤں اور لغزشوں کے کانٹے قدم قدم پر انسان کے مزاحم ہوتے ہیں۔اسی لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ ہوشیار اور خبردار رہے مبادا اس کی روح کا دامن ان کانٹوں سے الجھ پڑے اور تار تار ہو جائے، مبادا کسی کانٹے کی نوک اس کی جان کے پاؤں میں چبھ جائے اور اسے زخمی کر ڈالے، مبادا کوئی کانٹا اسے اس راستے کے طے کرنے سے باز رکھے اور اپنی جانب متوجہ کر لے۔

اور یہ اس وقت ہوگا جب انسان ہمیشہ بیدار، خبردار، آگاہ اور ہر طرح سے ہوشیار رہے۔

سادہ ترین الفاظ میں تقویٰ روح کے ارتقاء کو درپیش آنے والی آفات سے پرہیز اور گناہوں اور شبہات سے بچنے کا نام ہے۔

بعض مفسرین نے تقویٰ کے متعدد معانی ذکر کیے ہیں اور ان معانی کے لیے قرآنی آیات سے شواہد اور دلائل بھی پیش کیے ہیں، حقیقت میں جن میں سے ہر ایک معنی تقویٰ کے مصداقوں میں سے ایک مصداق ہے، مثلاً توبہ، اطاعت، اخلاص، ایمان (پرستش اور توحید)۔[3]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی آفت کے مقابلے میں کسی چیز کو ڈھال قرار دے۔جس طرح انسان ڈھال کے ذریعہ اپنے دشمن کے وار کو روکتا ہے اسی طرح پرہیزگار افراد بھی فرمانِ الٰہی کی اطاعت کے سپر کے ذریعہ اپنے آپ کو عذاب خداوندی سے بچا لیتے ہیں۔[4]

بعض لوگوں نے تقویٰ کو تین مراحل میں تقسیم کیا ہے: کفر کے مقابلے میں تقویٰ، گناہ کے مقابلے میں تقویٰ اور ان چیزوں کے مقابلے

---

[1] لسان العرب، وہی مادہ

[2] مجمع البحرین، وہی مادہ۔(توجہ رہے کہ ''تقوی'' کا اصل لفظ ''وقوی'' تھا بعد میں ''واؤ'' کو ''تا'' میں تبدیل کر دیا گیا، جیسا کہ خلیل بن احمد نے کتاب العین میں لکھا ہے۔

[3] وجوہ القرآن، ص ۵۵ اور تفسیر فخر رازی، جلد ۲، ص ۲۰

[4] روح البیان، جلد ۱، ص ۳۰

میں تقویٰ جو انسان کو یادِ خدا سے غافل کر دیتی ہیں۔[1]

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب معانی اس اصل کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس کا آغاز میں ذکر ہوا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

تقویٰ اختیار کرو تا کہ نورِ علم تمہارے دلوں میں روشن ہو

سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید بڑی صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے ''یہ آسمانی کتاب صاحبانِ تقویٰ اور پرہیزگاروں کے لیے موجبِ ہدایت ہے۔'' اس تعبیر سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ ہدایت کی راہیں ہموار کرنے کے لیے کس قدر موثر ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جب تک انسانی وجود میں ایک مرحلے کی حد تک تقویٰ موجود نہ ہو، قطعاً ناممکن ہے کہ وہ آسمانی کتابوں اور ہدایت کے سرچشموں سے بہرہ ور ہو۔ تقویٰ کی کم سے کم حد یہ ہے کہ انسان حق کے سامنے سرِ تسلیم ختم کر لے اور ہٹ دھرمی، عناد اور دشمنی کا مظاہرہ نہ کرے۔ جو لوگ تقویٰ کے اس مرحلے سے بھی محروم ہیں یقیناً وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی کسی ہدایت کو قبول کر سکتے ہیں۔

یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان میں تقویٰ اور حق کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے اور حقائق کو قبول کرنے کی روح جس قدر طاقتور ہوگی منابعِ ہدایت سے بھی وہ اتنا زیادہ بہرہ ور ہوگا۔

ہدایت کے منابع کہ جن میں قرآن مجید سرِفہرست ہے، کی مثال ایسی ہے جیسے زندگی عطا کرنے والی بارش ہوتی ہے جو صرف آمادہ اور شیریں زمینوں میں معرفت کے مختلف النوع پھول اگاتی ہے کیونکہ شورہ زار اور کلراٹھی زمین میں تو صرف خس و خاشاک ہی اگتے ہیں۔

''ھدی'' (ہدایت کو مصدر کی صورت میں لایا گیا ہے جو اس حقیقت کی تاکید کر رہا ہے کہ اگر انسان میں تقویٰ کی روح زندہ ہو جائے تو قرآن اس کے لیے مجسم ہدایت ہوتا ہے۔ (غور کیجیے گا)

بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے کہ اس عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرہیزگار لوگ دو طرح کی ہدایت کے حامل ہیں جیسا کہ کفار و منافقین دو طرح کی ضلالت (گمراہی) کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت تو انہیں فطرت کی سلامتی کی جانب سے حاصل ہوتی ہے اور اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ اسے ایک ایسی حقیقت کی ضرورت ہے جو اس کے وجود سے باہر ہے۔ ایسی صورت میں وہ حس سے مخفی ایک مبداء کے وجود پر ایمان پیدا کرتا ہے کیونکہ اس ضرورت کو وہ دوسری مخلوق میں بھی دیکھتا ہے اور وہ اس حقیقت پر بھی پہنچتا ہے کہ جس طرح تخلیقی امور میں اس کی کسی بھی ضرورت کے پورا کرنے سے چشم پوشی نہیں کی گئی ہے، اس چیز کی ہدایت جو اعمال اور اخلاق کی تباہیوں سے اسے بچاتی ہے کا

---

[1] روح البیان، جلد ۱، ص ۳۱

مسئلہ بھی اس کے بارے میں انجام پاتا ہے اور یہی چیز درحقیقت توحید، نبوت اور معاد پر ایمان ہے، جو دین کے اصلی اصول ہیں۔[1]

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآنی ہدایت کو پرہیزگاروں کے ساتھ اس لیے مخصوص کیا گیا ہے کہ صرف وہی لوگ قرآنی ہدایت سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور چونکہ دوسرے لوگ اس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھاتے، لہٰذا قرآن کی ہدایت ان سے منطقی ہے۔[2]

فخر الدین رازی اپنی ایک تعبیر میں اس طرح کا نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر متقین کے لیے اس آیت کے علاوہ کوئی اور فضیلت نہ بھی ہو، پھر بھی کافی ہے اور یہ فضیلت دوسری تمام فضیلتوں پر بھاری ہے۔ ادھر دوسری طرف قرآن مجید کی سورہ بقرہ کی ۱۸۵ ویں آیت میں بتایا گیا ہے کہ قرآن "ھدی للناس" (تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے)۔ اگر اس آیت کو اور مذکورہ آیت کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ "جو لوگ قرآنی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھاتے، درحقیقت انسان کے زمرے ہی میں ان کا شمار نہیں ہے۔"[3]

اگرچہ ان تمام تفسیروں میں کسی قسم کی منافات نہیں ہے لیکن جو تفسیر ہم نے آغاز میں بیان کی ہے وہ سب سے زیادہ روشن معلوم ہوتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ لفظ "متقین" کو مجاز پر حمل کریں اور کہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تقویٰ کی راہ پر چلیں تاکہ تحصیل حاصل (حاصل شدہ چیز کو حاصل کرنا) کا اشکال پیش نہ آئے۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوی، کیونکہ جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں تقویٰ کے کئی مراحل ہیں۔ اس کا ایک مرحلہ تو قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے جبکہ اس کے بالاترین مراحل قرآنی ہدایت کا موصول ہوتے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید "ھدی للمتقین" کے بعد والی آیات میں پرہیزگاروں کا اس عنوان سے تعارف کراتا ہے کہ وہ مبدا و معاد پر ایمان رکھتے ہیں، نماز برپا کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ تو کیا قرآن ہدایت ان کے لیے تحصیل حاصل نہیں ہے؟

لیکن ایک نکتہ پر توجہ دینے سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایمان اور عمل کے اس مرحلہ تک پہنچ جانا آخری مرحلہ نہیں ہوتا۔ ابھی انسان کے شایانِ شان ارتقائی مراحل تک پہنچنے کے لیے کئی اور مراحل درمیان میں ہیں کہ جنہیں طے کیا جانا ضروری ہے اور متقین اور پرہیزگار افراد تقویٰ کے اس مرحلہ تک پہنچنے کے بعد قرآن ہدایت کی روشنی میں اس سے بالائی مراحل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس قسم کی دوسری تعبیریں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سورہ حاقہ کی ۴۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے "وانه لتذكرة للمتقين" یقیناً قرآن مجید پرہیزگاروں کے لیے یادآوری کا ذریعہ ہے۔

سورہ بقرہ کی دوسری آیت قرآن کو "پرہیزگاروں کے لیے ذریعہ ہدایت" بیان کرتی ہے اور یہاں پر ذریعہ تذکر و یادآوری تو معلوم ہے کہ "تذکر"، "ہدایت" کے مقدمات میں سے ہے۔ اسی لیے کچھ مفسرین ایسے ہیں کہ جب وہ آیت پر پہنچتے ہیں تو کہا ہے کہ اس آیت میں بھی

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱، ص ۴۲

[2] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲، ص ۲۰

[3] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲، ص ۲۱

وہی بات ہے جو سورہ بقرہ میں ہے۔

بہرحال ان آیات کی حالت اس بات کی شاہد ناطق ہے کہ تقویٰ کی تاثیر ہدایت اور معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت تقویٰ اور معرفت کے رابطے کو پہلے سے زیادہ طور پر واضح کرتی ہے۔ روئے سخن مومنین کی طرف ہے اور ارشاد ہو رہا ہے ''اے مومنین! اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو خداوند عالم تمہارے لیے فرقان قرار دے گا۔''

بعض ارباب لغت کی تصریحات بتاتی ہیں کہ لفظ ''فرقان''، ''اسم مصدر'' ہے اور بعض کے نزدیک ''مصدر'' ہے۔ لیکن اکثر مفسرین کی تصریح کے مطابق اس قسم کے مقامات پر فاعل کے معنی میں ہے اور ساتھ ہی تاکید بھی پائی جاتی ہے، (صیغہ مبالغہ کے مفہوم کے مشابہ) اور اس کے معنی ہیں وہ چیز کہ جس کے ذریعہ حق کو باطل سے جدا کیا جائے۔ اس کا وسیع مفہوم ہے جو کہ قرآن مجید، معجزات انبیاء، عقلی روشن دلائل، شرح صدر، باطنی اور معنوی توفیق اور نورانیت وغیرہ سب کو شامل ہے۔[1]

اس طرح سے قرآن مجید کہتا ہے کہ ''تقویٰ'' معرفت کی راہیں ہموار کرتا ہے، جو بعض مراحل میں مکمل طور پر قابل استدلال ہوتا ہے اور بعض دوسرے مراحل میں خداوند عالم کی غیبی امدادوں کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے جنگ بدر کے دن کو ''یوم الفرقان'' سے موسوم کیا ہے کیونکہ اس دن خداوند عالم کی طرف سے لشکر کفر کے مقابلے میں لشکر ایمان کو واضح تائید حاصل ہوئی تھی۔ دشمنانِ اسلام ساز و سامان اور افرادی قوت کے لحاظ سے تین گنا زیادہ تھے لیکن سپاہ اسلام سے وہ شکست فاش کھائی کہ کوئی اس کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور چونکہ جنگ بدر مسلمانوں اور مشرکوں میں پہلی مسلح جنگ تھی، لہٰذا اہل حق کی صفیں اہل باطل سے جدا ہو گئیں۔ اسی لیے اسے ''یوم الفرقان'' لکھا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں ''فرقانا'' کو نکرہ اور مطلق صورت میں بیان کیا گیا ہے جو ایک طرف تو اس کی عظمت کی دلیل ہے اور دوسری طرف اس کی وسعت کی اور وہ اعتقادی، عملی اور زندگی کے ہر قسم کے اہم امور کے بارے میں ہر قسم کی اظہار رائے کو شامل ہے۔

اس طرح سے درخت تقویٰ کا پھل ہر خیر و برکت کی شناخت تک رسائی اور ہر طرح کے شر و فساد سے دوری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں فخر رازی کہتے ہیں کہ یہ لفظ مطلق ہے۔ لہٰذا اسے کفار اور مومنین کے درمیان ہر قسم کے فرق اور جدائی پر حمل کرنا چاہیے اور یہ فرقان یا تو دنیاوی احوال کے بارے میں ہے یا اخروی احوال کے یا قلب و باطن سے متعلق ہے یا ظاہر سے۔ قلب اور باطن کے سلسلے میں یہ ہے کہ خداوند عالم مومنین کو ہدایت اور معرفت عطا کرتا ہے اور انہیں شرح صدر کی نعمت سے نوازتا ہے، حسد، کینہ اور دشمنی کو ان کے دلوں سے اکھاڑ پھینکتا ہے، جبکہ کفار اور منافقین کے دل اس قسم کی بری عادات سے معمور ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب دل، اطاعتِ الٰہی سے منور ہوتا ہے تو اس سے یہ تمام تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں اور ظاہری لحاظ سے بھی خداوند عالم مسلمانوں کو برتری،

---

[1] مفردات راغب، کتاب العین، لسان العرب، مجمع البحرین، المیزان اور کشاف کا مطالعہ فرمائیں۔ (زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

کامیابی، نصرت اور ظفر عطا فرماتا ہے۔[1]

اسی سلسلے کی تیسری آیت جو قرآن کی سب سے لمبی آیت (بقرہ ۲۸۲) کا چھوٹا سا حصہ ہے، جس میں مختلف ہدایات اور فرامین کے بعد فرماتا ہے ''خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور خداوند عالم تمہیں تعلیم دیتا ہے۔''

''قرطبی'' اپنی تفسیر میں کہتے ہیں ''یہ خدا کا ایک وعدہ ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا خدا اسے تعلیم دے گا یعنی اس کے دل میں ایک نور قرار دے گا کہ اس کے ذریعہ سے وہ ہر اس چیز کا ادراک کرے گا جو اس کی طرف القاء کی جائے۔''[2]

اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم علم و دانش کے حصول سے دستبردار ہو جائیں اور یہ کہنا شروع کر دیں کہ تقویٰ اور تہذیب نفس ہی کافی ہے جیسا کہ بعض صوفیا اور دیگر منحرف قسم کے لوگ کہتے ہیں۔ بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ تقویٰ صحیح معنوں میں علم و دانش کے حصول کے لیے راہ ہموار کرتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے تیار شدہ اور اچھی زمین ہر قسم کی تخم ریزی کے لیے آمادہ ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ "اتقوا اللہ" اور "یعلمکم اللہ" کے دونوں جملے شرط اور جزاء کی صورت میں ذکر نہیں ہوئے اور یہی بات سبب بن گئی ہے کہ بعض مفسرین نے اس آیت سے علم و تقویٰ کے رابطے کا انکار کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے پہلو میں واقع ہونا بھی بے حساب نہیں ہے اور ان کے آپس میں رابطے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کے بغیر آیت کے جملوں کا باہمی رابطہ زیر سوال آجائے گا۔

چوتھی اور آخری آیت میں تقویٰ اور معرفت کے درمیان باہمی رابطے کی ایک بار پھر بخوبی وضاحت کی گئی ہے، کیونکہ جو لوگ خدا کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور رسول پاکؐ پر ایمان لے آتے ہیں ان کو تین قسم کی جزا ملتی ہے۔

ایک تو یہ کہ خداوند عالم ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دو حصے عطا فرمائے گا، ایک بوجہ ایمان کے اور دوسرا بوجہ تقویٰ کے، یا ایک حصہ بوجہ گزشتہ انبیاء پر ایمان لانے اور دوسرا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے، کیونکہ باوجود یکہ آیت میں مخاطب مومنین ہیں اور انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئیں اور آیت کا شان نزول بھی بتا رہا ہے کہ یہ حبشہ کے ان اہل کتاب اور عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے قرآن کو سنا اور آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے۔[3]

دوسری یہ کہ خداوند عالم ان کے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے ان کے لیے ایک نور قرار دے گا جس کے ذریعہ وہ اپنے رستہ پر چلیں گے۔ (ویجعل لکم نورا تمشون بہ)۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۵، ص ۱۵۳ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۲ ص ۱۲۱۴

[3] کفل (بروزن طفل) کے معنی ایسا فائدہ ہیں جس سے انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ درحقیقت ایک حبشی لفظ ہے جو لغت عرب میں وارد ہوا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے آیت کے مفہوم کو مقید کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے اس نور کی طرف اشارہ جانا ہے کہ جو بروز قیامت مومنین کے آگے آگے اور دائیں طرف میں حرکت کرے گا، جیسا کہ سورہ حدید کی ۱۲ ویں آیت میں مذکور ہے کہ "یوم تری المومنین والمومنات یسعی نورھم بین ایدیھم و بایمنھم"۔ لیکن ہماری زیر بحث آیت میں قید کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ لیکن اس کا مفہوم عام ہے جیسا کہ تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے اور یہ دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔ تو گویا اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ "تقویٰ" اور "روشن بینی" کے درمیان ایک قوی رابطہ ہے۔

تیسری یہ کہ ان کے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے ان کے گناہوں کو معاف کردے گا اور وہ اس کی رحمت خاص میں شامل ہوجائیں گے۔ (ویغفرلکم واللہ غفور رحیم)

مزید تشریح

۱۔ احادیث میں علم اور تقویٰ کا رابطہ

اسلامی روایات میں بھی علم پر تقویٰ کی تاثیر کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان روایات سے بخوبی واضح ہوگیا ہے کہ تقویٰ کے ذریعہ قلب اور روح کی طہارت معارف الٰہیہ کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل احادیث پر توجہ فرمائیں:

۱۔ امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

"من غرس اشجار التقی جز ثمار الھدی"

"جو تقویٰ کے درخت کاشت کرتا ہے وہ ہدایت کے پھل چنتا ہے۔"[1]

۲۔ امیرالمومنین علی علیہ السلام ہی کے ایک خطبہ میں آیا ہے:

"اما بعد فانی اوصیکم بتقوی اللہ..... فان تقوی اللہ دواء قلوبکم و بصر عمی افتدتکم و شفاء مرض اجباد کم و صلاح فساد صدور کم و طھور و نس انفسکم وجلاء عشاء ابصارکم" امابعد

"میں تمہیں خدا کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں..... کیونکہ خدا کا تقویٰ تمہارے بیمار دلوں کی دوا، تمہارے دلوں کی بینائی کا سبب ہے، تمہارے جسموں کے دردوں کی دوا ہے، تمہاری جانوں کے زخموں کی مرہم ہے،

---

[1] غررالحکم

تمہاری آلودہ روحوں کی طہارت ہے اور تمہاری آنکھوں کی نابینائی کی جلا ہے۔''[1]

۳۔ ایک اور روایت میں آنجنابؑ ہی سے منقول ہے:

"للمتقی هدی فی رشاد و تحرج عن فساد"

''متقی کے لیے سوجھ بوجھ پر مبنی ہدایت ہے اور فساد سے پرہیز ہے۔''[2]

۴۔ نہج البلاغہ میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"این العقول المستصبحة بمصابیح الهدی والابصار اللامحة الی منار التقوی"

''کہاں ہیں چراغ ہدایت سے روشن ہونے والی عقلیں اور کہاں ہیں نورِ تقویٰ سے دیکھنے والی آنکھیں؟''[3]

۵۔ اپنی اس گفتگو کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان ذیشان پر ختم کرتے ہیں، آپؐ فرماتے ہیں:

''حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ وصیت کی کہ: "یا موسی وطن نفسك علی البصر تخلص من الذنب" اے موسیٰ اپنی جان کو صبر کے لیے آمادہ کرلو تا کہ حلم اور بردباری تک رسائی حاصل کرو، تقویٰ کو اپنے دل میں جگہ دو تا کہ علم و معرفت تک جا پہنچو اور اپنے نفس کو صبر کے ساتھ ریاضت دو تا کہ گناہوں سے بچ جاؤ۔''[4]

۲۔ علم اور تقویٰ کا باہمی رابطہ

تقویٰ اور گناہوں اور آلودگیوں سے اجتناب کا آگاہی اور معرفت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ بالفاظ دیگر علم اور اخلاق کا منطقی رابطہ کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کا آپس میں نزدیکی رابطہ ہے اور اس سے بڑھ کر اور کیا قرب ہوگا کہ وہ ایک دوسرے پر برابر کے گہرے نقوش اور اثرات مرتب کرتے ہیں۔ تقویٰ علم کا سرچشمہ ہے اور علم تقویٰ کا اور یہ صرف عجیب ہی نہیں بلکہ معرفت کی راہیں طے کرنے کے لیے ایک بنیادی اصل بھی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۸

[2] غرر الحکم

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۴

[4] منیۃ المرید، شہید ثانی (منقول از بحار الانوار، جلد ۱، ص ۲۲۷)

تقویٰ علم ومعرفت پر مندرجہ ذیل دلائل کے ساتھ اثر ڈالتا ہے:

الف۔ہم جنس اور ہم آہنگ ہونا ہمیشہ باہمی جاذبیت اور رابطے کا سبب ہوتا ہے۔

جب انسانی روح تقویٰ کی وجہ سے پاک و پاکیزہ ہوجاتی ہے اور اس کے اور حقیقی علوم ومعارف کے درمیان ایک قوی جاذبیت پیدا ہوجاتی ہے، کیونکہ کند جنس باہم جنس پرواز۔

ب۔تقویٰ کی درانتی انسانی روح کی کھیتی سے تمام خاروخس کو کاٹ ڈالتی ہے جو اس کے لیے پریشان کن ہوتے ہیں اور دل کو علم و دانش کے بیج کے نشوونما پانے اور پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ بلکہ اگر خوب غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آفریدگار کے ہاتھ سے علوم کے تمام بیج آغاز ہی سے اس کھیتی میں بوئے جاچکے ہیں۔اہم بات یہ ہے کہ نشوونما اور پروان چڑھنے سے روکنے والی چیزوں کی بیخ کنی کرکے صحیح آبیاری کی جائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دوستوں سے ارشاد فرمایا:

"لیس العلم فی السمآء فینزل الیکم ولا فی تخوم الارض فیصعدعلیکم ولکن العلم مجبرل فی قلوبکم مرکوز فی طبایعکم، تخلقوا باخلاق الروحانیین یظهرلکم"

''علم نہ آسمان پر ہے کہ تم پر نازل ہو، نہ زمین کی گہرائیوں میں ہے کہ تمہارے لیے باہر نکل آئے، بلکہ علم خود تمہارے دلوں کی گہرائیوں اور تمہاری سرشت اور طبیعت میں مخفی ہے۔فرشتوں اور پاک دل لوگوں کے اخلاق اپناؤ تاکہ علم تم پر ظاہر ہوجائے۔''[1]

ج۔ہم جانتے ہیں کہ بخل اور حسد عالم ہستی (کائنات) کے مبدا میں نہیں ہیں اور "وان من شی الاعندنا خزائنه و ماتنزله الابقدر معلوم" یعنی ہر چیز کے منابع اور خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ان سے صرف معلوم مقدار کے مطابق ہی نازل کرتے ہیں۔سورۂ حجر ۲۱ کے مطابق تمام نعمتوں کے ختم نہ ہونے والے خزانے خداوند عالم کے پاس ہیں اور وہ جواد ہے اور بہت بڑا سخی ہے۔وہ جس قدر بھی زیادہ فرمائے اس کے خزانوں میں کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ اس کی سخاوت اور کرم مزید آشکار ہوتا ہے کیونکہ ''ولا یزیده کثرة العطا الا جود اوکرما'' اسی لیے اگر کوئی اس سے محروم ہوجاتا ہے تو اس کی اپنی بے لیاقتی اور عدم استعداد ہوتی ہے اور تقویٰ انسان کو خدائی فیض کے لائق بناتا ہے اور معارف الٰہیہ اور معرفت بھرے علوم سے بڑھ کر اور کیا فیض الٰہی ہوسکتا ہے۔

یہ دل پیمانوں اور ظروف کی مانند ہیں جیسا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر الصراط المستقیم، جلد ۱، ص ۲۶۷

"ان هذه القلوب اوعية فخيرها اوعيها"

''بہترین دل وہ ہیں جن کی ظرفیت اور گنجائش زیادہ ہو۔''[1]

اہم بات یہ ہے کہ ہمارے وجود کی ظرفیت اور گنجائش زیادہ ہونی چاہیے اور ہمارے دلوں کو الٹے برتنوں کی مانند نہیں ہونا چاہیے کہ جن میں ایک قطرہ بھی نہ ٹھہر سکے اور یہ امر تقویٰ کے بغیر ناممکن ہے۔

۳۔علم اور تقویٰ کی باہمی تاثیر

حقیقی علم، اخلاقی رذالتوں اور گناہ کے سرچشموں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور ان امور کے نتائج انسان کو دکھا دیتا ہے اور یہ آگاہی، تقویٰ اور گناہوں سے پرہیز کی پیدائش میں موثر معاون ثابت ہوتی ہے اور یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں علم، تقویٰ کا سرچشمہ ہوتا ہے وہاں تقویٰ علم کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ البتہ تقویٰ کا ہر ایک مرحلہ علم کے مرحلہ کا سبب بنتا ہے اور علم کا وہ مرحلہ تقویٰ کے ایک بالاترین مرحلے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح سے یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے میں اثر کرتے رہتے ہیں اور شاید سورہ اعراف کی آیت ۲۰۱ اسی برابر کی تاثیر کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ان الذين اتقوا اذا مسهم طائف من الشيطان تذكروا فاذا هم مبصرون"

''پرہیز گار لوگ جب شیطانی وسوسوں کا شکار ہوتے ہیں تو یادِ خدا میں لگ جاتے ہیں اور بابصیرت ہو جاتے ہیں۔''

یعنی پہلے نمبر پر تقویٰ، پھر تذکر اور یادآوری۔ اس کے بعد بصیرت ہے اور ان سب کا نتیجہ شیطانی وسوسوں سے نجات کا حصول ہے۔

۴۔علم اور تقویٰ کے باہمی رابطہ سے ناجائز مفاد اٹھانا

جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، تقویٰ اور معرفت کے درمیان ایسا رابطہ ہے جس کا انکار ممکن نہیں، قرآن وحدیث کی رو سے بھی اور دلائل اور عقل کے لحاظ سے بھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ اس بات کا مقصد یہ ہے کہ ہم معمول کے طریقہ کے مطابق تحصیل حصول علم کے طریقوں کو ترک کر دیں اور یہ کہنا شروع کر دیں کہ ''صرف اپنے باطن کی ہی اصلاح کرنا چاہیے تاکہ تمام علم ودانش ہمارے دل کی طرف امڈ کر آ جائیں۔'' جیسا کہ اکثر صوفیاء کا عقیدہ ہے، یہ کہہ کر انہوں نے مروجہ علوم سے نبرد آزمائی اور دانش کے حصول کے ساتھ محاذ آرائی کا بہانہ تراشا ہے اور ہمیشہ کے لیے جہالت اور لاعلمی کے بوجھ تلے دب چکے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷

اسلام نے ایک طرف تو حصول علم کو واجب قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ کسی علمی محفل کو بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ کے ہم پلہ قرار دیا ہے (مجلس العلم روضة من رياض الجنة) اور عالم کے چہرے کو دیکھنا عبادت قرار دیا ہے (النظر الی وجه العالم عبادة)۔[1] طلب علم اور حصول علم کے لیے قدم اٹھانے کو بہشت کی طرف قدم اٹھانا قرار دیا ہے۔[2] قلم علماء کی سیاہی کو خون شہداء سے افضل قرار دیا ہے[3] اور حدیث کے یاد کرنے اور اسے قلمبند کرنے کو بہت بڑی فضیلت قرار دیا ہے۔[4]

اور دوسری طرف تقویٰ اور تہذیب نفس کی دعوت دی ہے تا کہ روح اور جان معارفِ الٰہیہ کے قبول کرنے کے لیے مکمل طور پر آمادہ ہوں۔

اس طرح سے ایک طرف تو وہ لوگ زبردست غلطی پر ہیں جو خود بھی حصول علم کی راہوں کو چھوڑ چکے ہیں اور اپنے دوسرے ہمدرس ساتھیوں کو بھی بار بار یہی کہتے ہیں کہ ''دھوڈالو اوراق کو کیونکہ عشق کا علم کتابوں میں نہیں ہوتا'' اور صرف باطن کے تصفیہ کے قائل ہیں جبکہ یہ تصفیہ، باطن بھی غالباً بوجہ بے علمی اور ناآگاہی کے انحرافی راہوں پر چل نکلتا ہے۔

اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی پر ہے اور گمراہ ہیں جو صرف رسمی علوم کے حصول کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور تقویٰ اور تہذیب نفس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ حق تک پہنچنے کے لیے دونوں ضروری ہیں۔

۲۔ایمان اور معرفت

اشارہ

ایمان کی روح یہی ہے کہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے اور حقائق اور واقعیات کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے اور چونکہ اس کائنات میں سب سے اعلیٰ اور سب سے عظیم حقیقت اور واقعیت خداوند ذوالجلال کی ذات پاک ہے اسی لیے ایمان کی روح اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔

ایمان انسان کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ واقعیات اور حقائق کو اسی طرح پہچاننے کی کوشش کرے جس طرح کہ وہ ہیں، خواہ وہ حقائق تلخ ہوں یا شیریں، اس کی طبیعت کے مطابق ہوں یا خلاف۔

---

[1] غرر الحکم

[2] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۱۶۴

[3] بحار الانوار، جلد ۲، ص ۱۴

[4] محجۃ البیضاء، جلد ۱، ص ۱۵

جولوگ حق کے آگے نہیں جھکے ہیں ان کی معلومات درحقیقت خواہشاتِ نفسانی اور ہوا و ہوس کا مجسمہ ہیں، نہ کہ اس خارجی دنیا میں موجود حقائق کا۔ وہ دنیا کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں جو وہ خود چاہتے ہیں، نہ کہ اس کے اپنے اصل رنگ اور کیفیت میں۔

پس اس اشارے کے ساتھ ہی اجمالی طور پر پتہ چل گیا کہ ایمان اور معرفت کے درمیان کیسا رابطہ ہے؟

اب ہم قرآن کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کو دل کی گہرائیوں سے سنتے ہیں۔

آیات

(۱) اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا ؕ (سورہ انعام ۱۲۲)

(۲) اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّجِّىٍّ يَّغۡشٰهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ۞ (سورہ نور ۴۰)

(۳) وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيۡقُوۡنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ وَنُوۡرُهُمۡ ؕ (سورہ حدید ۱۹)

(۴) اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰهُ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيۡلٌ لِّلۡقٰسِيَةِ قُلُوۡبُهُمۡ مِّنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۞ (سورہ زمر ۲۲)

ترجمہ

(۱) آیا وہ شخص جو مر چکا ہو، پھر ہم نے اسے زندہ کیا ہو، اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جسے ہم نے زندہ کیا اور اس کے لیے نور قرار دیا کہ جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو ظلمتوں میں گھر چکا ہو اور ان سے باہر نہ آئے؟

(۲) یا ظلمتوں کی مانند ہے ایک بیکراں سمندر میں کہ جسے موج نے ڈھانپ رکھا ہے، تاریکیاں ہیں ایک دوسرے کے اوپر، اس طرح کہ جب کوئی اپنا ہاتھ باہر نکالتا ہے تو اسے نہیں دیکھ سکتا۔ جس کے لیے خدا نے نور نہیں بنایا اس کے لیے کوئی نور نہیں۔

(۳) جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لا چکے ہیں، وہی صدیق بھی ہیں اور شہداء اپنے رب کے پاس ہیں۔ ان کے لیے اعمال کا اجر اور نور (ایمان) ہے۔

(۴) آیا وہ شخص کہ جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور وہ اپنے رب کے نور کی سواری پر ہے (ایسے لوگوں کی مانند ہوسکتا ہے جو دل کے اندھے ہیں اور نور ہدایت ان کے دل میں داخل نہیں ہوا؟) پس عذاب ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل ذکر خدا کے سامنے سخت ہیں۔ وہی لوگ تو واضح گمراہی میں ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

ایمان کی تاثیر

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جو پہلے مردہ تھے پھر خدا نے انہیں زندہ کر دیا اور پھر ان کے لیے ایک نور قرار دیا جس کے ذریعہ وہ اپنی راہ دیکھتے ہیں۔

مرنے اور زندہ ہونے سے مراد وہی بعد از کفر ہے، جیسا کہ سورہ انفال کی ۲۴ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

"یا ایھا الذین امنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعا کم لما یحییکم"

''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو خدا اور اس کے رسول کی دعوت کا جواب دو جب وہ تمہیں بلائے تا کہ تمہیں زندہ کرے۔''

پس معلوم ہوا کہ زندگی وہی ایمان حقیقی کی زندگی ہے جس میں معرفت کا نور ملا ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کا گروہ ہے جو کفر کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں اور ہرگز اس سے خارج نہیں ہوئے (کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا)

بہت سے مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ اس نور سے مراد قرآن مجید ہے۔ بعض نے دین کا نور مراد لیا ہے اور دوسرے کئی مفسرین نے نور حکمت سمجھا ہے۔[۱] بعض نے نورِ اطاعت بھی مراد لیا ہے۔[۲] لیکن اس بات میں شک نہیں کہ اس نور کا مفہوم وسیع ہے جو ہر قسم کی شناخت اور معرفت کو شامل ہے اور صاف بات ہے کہ قرآن پاک بھی اس کے مصداقوں میں سے ایک اتم و اکمل مصداق ہے۔

"یمشی بہ فی الناس" (اس کے ساتھ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے) کی تعبیر دنیا کی اجتماعی زندگی کے ساتھ بہت ہی مناسبت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ایمان'' انسان کے دل میں ''معرفت'' کی راہیں ہموار کرتا ہے اور دنیاوی زندگی میں غلطیوں سے بھی باز

---

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۳، ص ۱۷۲، تفسیر قرطبی، جلد ۴، ص ۲۵۱۴، تفسیر المنار، جلد ۸، ص ۳۰

[۲] تفسیر ابوالفتوح، جلد ۵، ص ۵۰

رکھتا ہے۔

زیر بحث سلسلے کی دوسری آیت بے ایمان افراد (یا ان کے اعمال) کو ایسی ظلمتوں سے تشبیہ دے رہی ہے جو عمیق سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑے ہوئے ہوں، جن کے اوپر موجیں ہی موجیں ہوتی ہیں اور موجوں کے اوپر اور فضاؤں میں تاریک بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اس طرح کہ اگر کوئی وہاں پر موجود ہو اور اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے نہ دیکھ سکے۔ (اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا) اور آخر میں تاکید کے ساتھ کہتا ہے، جس کے لیے خدا نے نور قرار نہ دیا ہو اس کے لیے کوئی نور نہیں ہے۔ (من لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور)۔

اس آیت کی عبارت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ بے ایمانی اور کفر ظلمت ایجاد کرتے ہیں، جبکہ ایمان اور اسلام نور آفرین ہوتے ہیں۔

بے ایمان اور منحرف لوگوں سے وہ وہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور اس حد تک زیادہ ہوتی ہیں کہ انسان کبھی کبھی حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے کہ وہ اپنے سامنے کی نزدیکی چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتے اور اپنے نفع نقصان کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظلمت کے بارے میں جو مندرجہ بالا آیت میں نقشہ کشی کی گئی ہے اس سے بڑھ کر کوئی ظلمت زیادہ گہری اور ظلمانی نہیں ہوتی۔ سمندر کی گہرائی ویسے بھی قدرتی طور پر تاریک ہوتی ہے، کیونکہ سورج کی روشنی پانی میں زیادہ سے زیادہ سات سو میٹر کی گہرائیوں تک ہی پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد ظلمت ہی ظلمت اور تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے اور نور آفتاب اس حد تک اس وقت پہنچتا ہے جب سمندر میں ٹھہراؤ ہو اور اس میں پیچ و تاب کھاتی موجیں اپنے زوروں پر نہ ہوں جن سے نور کی شعاعیں اپنا اثر کھو دیتی ہے، نیز تاریک اور سیاہ بادل بھی ان شعاعوں کا راستہ نہ روکیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ان تاریکیوں سے مراد کافروں میں تین قسم کی تاریکیاں ہیں: اعتقاد کی تاریکی، گفتار کی تاریکی اور کردار و عمل کی تاریکی۔

جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد دل کی تاریکی، آنکھ کی تاریکی اور کان کی تاریکی ہے۔ مگر کچھ اور حضرات نے کہا ہے یہ تین طرح کی ظلمت اس بات سے عبارت ہے کہ: ۱۔ وہ نہیں جانتے۔ ۲۔ اس بات کو بھی نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے۔ ۳۔ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔ لیکن ان تفسیروں میں آپس میں کوئی منافات نہیں بلکہ ممکن ہے کہ یہ سب آیت کے مفہوم میں جمع ہوں۔

تیسری آیت میں پہلے تو مومنین کو ''صدیق'' اور ''شہید'' کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے، پھر فرماتا ہے کہ: ''ان کے لیے ان کے اعمال کی جزاء اور ان کے ایمان کا نور ہے۔'' (لھم اجرھم و نورھم)۔

''صدیق'' مبالغہ کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں بہت سچ بولنے والا اور بعض نے کہا ہے کہ جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، بلکہ بعض اور حضرات نے اس سے بھی بالاتر معنی ذکر کیے ہیں اور وہ یہ کہ اس کے معنی ہیں ایسا شخص جس نے سچائی کی عادت کو اس طرح اپنا لیا ہو کہ جھوٹ بولنا اس کے لیے ناممکن ہو۔ بالفاظ دیگر سچ اس کی عادت ثانوی بن چکا ہو۔

بعض اور حضرات نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ شخص جو عقیدے اور گفتگو کے لحاظ سے سچا ہو اور اعمال اس کی گفتار اور عقائد کی

تصدیق کریں۔[1]

چونکہ ان معانی کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے اور سب معانی مبالغہ کے مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں لہٰذا ان کی ایک جگہ پر اکٹھا کیا جا سکتا ہے اور وہ یوں کہ یقیناً آیت کی مراد تمام مومنین نہیں ہیں بلکہ وہ مومنین ہیں جو ایمان کے بالائی مراتب پر فائز ہیں۔

اور ممکن ہے کہ ''شہدا'' سے مراد یہ ہو کہ سچے مومنین شہیدوں کے ثواب کے حامل ہوتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا، دعا فرمایئے خدا مجھے شہادت عطا فرمائے، تو امام علیہ السلام نے فرمایا ''ان المومن شهيد'' مومن تو شہید ہوتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی ''والذين امنوا بالله و رسوله...'' (یہی زیر بحث آیت)۔[2]

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ شہید سے مراد، اعمال کا گواہ ہے، کیونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کا ایک گروہ (انبیاء اور آئمہ) امتوں کے اعمال کے گواہ ہیں۔

ان دونوں معانی کو اکٹھا کرنا بھی بعید نہیں ہے۔[3]

''لهم اجرهم و نورهم'' میں ''اجر'' کے معنی ان کے اعمال کی جزا ہے اور ''نور'' کو بعض مفسرین نے قیامت کے دن مومنین کا نور مراد لیا ہے جو بہشت کی راہیں کھولے گا۔ لیکن اس محدودیت پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس جگہ پر نور مطلق صورت میں بیان ہوا ہے جو دنیا میں معرفت اور آگاہی کے نور کو بھی شامل ہے اور آخرت میں میدانِ قیامت کے نور کو بھی۔

اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت ایک تقریری استفہام کی صورت میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ''آیا خدا نے جس شخص کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور اس کے پاس نورِ الٰہی کی سواری ہے، ان لوگوں کے برابر ہو سکتا ہے جو دل کے اندھے ہیں اور نورِ معرفت کو ان کے دلوں تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی؟ (افمن شرح الله صدره للاسلام فهو على نور من ربه) اور یہ بات بذاتِ خود اس چیز کی روشن دلیل ہے کہ ایمان کی قبولیت شرح صدر کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور شرح صدر خدائی نور کی راہ ہموار کرتا ہے۔ وہ خدائی نور جو دنیا کو مومن کی آنکھوں کے سامنے روشن کر دیتا ہے اور وہ حقائق کو اسی طرح درک کرتا ہے کہ جس طرح کہ وہ ہیں۔

''شرح صدر'' سے مراد یہ ہے کہ انسان کی روح اس قدر وسعت اختیار کر لیتی ہے کہ بہت سے حقائق کو قبول کرنے کے لیے مکمل طور پر تیار ہو جاتی ہے۔ اس کا مقابل نقطہ ''ضیق صدر'' ہے، جسے تنگی سینہ کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح اس قدر تنگ اور چھوٹی ہو

---

[1] مفردات راغب، مادہ صدق۔ مجمع البحرین، مادہ صدق۔ تفسیر المیزان، جلد ۱۹، ص ۱۸۶۔ تفسیر مراغی، جلد ۲۷، ص ۱۷۴۔ تفسیر مجمع البیان، جلد ۶، ص ۲۳۸

[2] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹، ص ۲۳۸

[3] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۷۴، حدیث ۲

جاتی ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے اندر محفوظ رکھنے پر بھی قادر نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر شرح صدر وہی روح کی عظمت اور بزرگی ہے کہ جن میں سے ایک اہم عامل خدا کی غیر متناہی ذات کے ساتھ رابطہ ہے۔ جی ہاں! جو روح رنگ الٰہی اور صبغۃ اللہ میں رنگ جائے وہ کشادہ ہو جاتے ہے اور زیادہ سے زیادہ علوم کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

نہ صرف یہ کہ کشادہ نہیں ہوتی بلکہ نرم بھی ہوتی ہے اور حقائق و معارف کی تخم پاشی کے لیے بھی تیار ہوتی ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''عذاب ہے ایسے سنگدل لوگوں پر جن کے دل ذکر خدا قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' (فویل للقاسیة قلوبهم من ذکر الله)۔

مزید تشریح

احادیث کی رو سے علم اور ایمان کا رابطہ

۱۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

"ان المومن ینظر بنور الله"

''مومن خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ [۱]

امام علیہ السلام کے ایک دوست نے آپؑ سے اس کی وضاحت چاہی تو آپؑ نے فرمایا:

''خدا نے مومن کو اپنے نور سے خلق فرمایا ہے اور اسے اپنی رحمت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔''

۲۔ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث شریف ہے:

"اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله، ثم تلا، ان فی ذالك لا یات للمتوسمین"

''مومن کی فراست سے بچتے رہو کیونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے پھر آپؐ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا جس کے معنی ہیں اس (قوم لوط جیسی قوموں کے افسوسناک انجام) میں صاحبانِ ہوش کے لیے نشانیاں ہیں۔'' [۲]

۳۔ ایک اور روایت بھی ہے جو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ہے۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے اور انہوں نے سرور رسالت

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۴۷، حدیث ۲

[۲] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۴۷، حدیث ۴

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی بات کو دوسرے لفظوں میں بیان فرمایا:

"ایاکم و فراسة المومن فانه ینظر بنور الله تعالیٰ"

''تم مومن کی فراست سے بچتے رہو، کیونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔''[1]

۴۔ بعض روایات میں تو بات اور بھی آگے بڑھی ہوئی نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت امیرؑ نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اتقوا ظنون المومنین فان الله سبحانه جعل الحق علی السنتهم"

''تم مومنین کے تخمین وگمان سے بچو، کیونکہ خداوند عالم حق کو ان کی زبان پر جاری کر دیتا ہے۔''[2]

۵۔ نہج البلاغہ ہی میں آنجنابؑ کا فرمان ہے:

"و بالصالح یستدل علی الایمان و بالایمان یعمر العلم"

''عمل صالح کے ذریعہ ایمان کا پتہ چلایا جاسکتا ہے اور ایمان کے ذریعہ علم کا محل آباد ہوتا ہے۔''[3]

۶۔ ہم اپنی اس بحث کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے فرمان پر ختم کرتے ہیں:

"ما من مومن الا وله فراسة فانه ینظر بنور الله علی قدر ایمانه"

''کوئی مومن ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے خاص ہوشمندی اور ہوشیاری ہوتی ہے اور وہ اپنے ایمان کی مقدار کے مطابق نورِ خدا سے دیکھتا ہے۔''[4]

جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں بتا چکے ہیں سچا ایمان انسان کو حق اور حقیقت کا عاشق بنا دیتا ہے اور انسان کے اندر واقعیات اور حقائق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی روح پھونک دیتا ہے اور اس طرح سے اس کی روح اور جان ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد ہو کر ہر قسم کی معرفت قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

۳۔ صبر و شکر اور معرفت کا رابطہ

اس بارے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو پڑھتے ہیں:

---

[1] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۷۵، حدیث ۸

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۳۰۹

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۶

[4] عیون الاخبار، جلد ۲، ص ۲۰۰ (منقول از الحیاۃ جلد ۱ ص ۹۲)

آیات

(۱) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵

(سورہ ابراہیم ۵)

(۲) اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۳۱ (سورہ لقمان ۳۱)

(۳) فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۱۹

(سورہ سبا ۱۹)

(۴) وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝۳۲ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۳۳

(سورہ شوریٰ ۳۲۔۳۳)

ترجمہ

(۱) ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات کے ساتھ بھیجا (اور حکم دیا) کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکال اور انہیں ایام اللہ کی یاد دلا، اس میں صبر اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں۔

(۲) کیا تو نے نہیں دیکھا کشتیوں کی طرف جو سطح سمندر پر خدا کے حکم اور اس کی نعمت کے ساتھ چلتی ہیں تا کہ وہ اپنی بعض نشانیاں تمہیں دکھائے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے آیات اور نشانیاں ہیں جو صبر اور شکر کرتے ہیں۔

(۳) لیکن ان (بے شکرے) لوگوں نے کہا پروردگار! ہمارے سفروں کے درمیان دوری پیدا کر دے (تا کہ بے نوا لوگ امیر لوگوں کے دوش بدوش سفر نہ کر سکیں، تو اس طرح سے) انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور ہم نے انہیں (دوسروں کے لیے) خبریں اور داستانیں قرار دے دیا اور ان کی جماعتوں کو منتشر کر دیا۔ اس ماجرے میں عبرت کی آیات اور نشانیاں ہیں ہر صابر اور شاکر کے لیے۔

(۴) (اس کی نشانیوں میں سے کشتیاں ہیں جو پہاڑوں کی مانند سمندر میں چلتی رہتی ہیں، اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے تو وہ بھی پشت سمندر پر رک جائیں گی، اس بات میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

''آفاق'' اور ''انفس'' کی سیر اور صابر و شاکر ہم سفر

سب سے پہلی آیت میں ''بنی اسرائیل'' کا تذکرہ ہے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ہدایت کا فریضہ سونپا گیا اور وہ خدائی آیات اور معجزات لے کر ان کے پاس آ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملا تھا کہ وہ ان لوگوں کو کفر و شرک اور فساد کی ظلمتوں سے نکال کر توحید کے نور کی طرف لے جائیں جو تمام برکتوں کا منبع اور سرچشمہ ہے اور انہیں خدائی ایام کی یاد دلائیں اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''اس ماجرے میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں اور عبرت کے اہم درس پوشیدہ ہیں جو صبر اور شکر کرتے ہیں'' (ان فی ذالك لایات لکل صبار شکور)۔

اس آیت میں ''ایام اللہ'' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان مختلف اقوال ہیں:

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد خدا کی نعمتوں اور آزمائشات کے دن ہیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء کرام اور خدا کی نیک امتوں کی کامیابی کے دن ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سرکش اقوام کے عذاب کے دنوں کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن بظاہر ان تمام تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ سب ''ایام اللہ'' ہیں۔

اصولی طور پر ''ایام'' (دنوں) کے معنی میں ہے اور اس لفظ کی خدا کی طرف اضافت اصطلاحی طور پر ''اضافہ تشریفی'' ہے اور اس سے مراد ہر وہ دن ہے جس کی حد سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور وہ اس طرح سے کہ یا تو اس کا تعلق خدا کی عظیم نعمتوں سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے شامل حال ہوتی ہے، مثلاً ظلم اور شرک و کفر کے لشکروں پر عظیم فتح و کامرانی، ظالموں اور طاغوتوں کے چنگل سے نجات، جہاد یا کسی اور فریضہ کی ادائیگی کے موقع پر کامیابی کا حصول۔ یا پھر ان کا تعلق خدائی عذاب سے ہوتا ہے جس نے کسی سرکش قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا تھا، یا عبرت کے ان تازیانوں سے ہوتا ہے جو امتوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ان کی جانوں پر پڑتے ہیں۔ غرض یہ سب ''ایام اللہ'' ہیں اور انکا وسیع مفہوم ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ان آیات الٰہی اور عبرت کے دروس سے استفادہ کو صابروں اور شاکروں کے ساتھ

---

[1] یہ تفسیر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند روایات میں سے نقل ہوئی ہے، ملاحظہ ہو تفسیر المیزان، جلد ۵، ص ۱۵-۱۶ اور تفسیر نور الثقلین، جلد ۲، ص ۵۲۶

کیوں مخصوص کیا ہے؟ (توجہ رہے کہ ''صبار'' اور ''شکور'' دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، ایک میں صبر واستقامت کے اضافے کے معنی پائے جاتے ہیں اور دوسرے میں شکرگزاری کے اضافے کے تو اس کا جواب یہ ہے چونکہ اس قسم کے حوادث اور واقعات کی صحیح معنی میں تحقیق اور ان پر غور و فکر اور ان کے آغاز وانجام پر پوری طرح غور وخوض کے لیے صبر وشکیبائی اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور پھر ان حوادث کے نتائج سے وہی لوگ بہرہ ور ہو سکتے ہیں جو ان کی نعمتوں کی قدر جانتے اور ان پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اس طرح سے ''صبر'' اور ''شکر'' معرفت آگاہی کی راہ ہموار کرنے کے دو بہترین ذرائع ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں صبر اور شکر کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر ہونا اس وجہ سے ہے کہ ایسے افراد مصائب اور آلام کے مقابلے کے لیے صبر وشکیبائی کے ہتھیار سے مسلح ہو جاتے ہیں اور نعمتوں کے موقعہ پر شکر کے اسلحہ سے، گویا وہ نہ تو مصیبت کے آگے گھٹنے ٹکاتے ہیں اور نہ ہی نعمتوں کے موقع پر مغرور ہو جاتے ہیں اور کسی بھی حالت میں خود کو گم نہیں کر پاتے۔ اسی وجہ سے وہ ان حوادثات سے معرفت کو حاصل کرنے اور عبرت کا سبق لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

دوسری اور چوتھی آیت میں ''ان فی ذالک لایات لکل صابر شکور'' کا جملہ سطح سمندر پر کشتیوں کے چلنے کے بعد کہتا ہے کہ وہ کشتیاں خدا کے حکم اور ہواؤں کی منظم حرکت کے نتیجہ میں تیزی سے چلتی رہتی ہیں اور دور دراز کا سفر طے کر کے منزل مقصود تک جا پہنچتی ہیں۔

مسلم ہے کہ یہ موضوع تکوینی آیات میں سے ایک ہے اور اس کائنات میں خداوند عالم کی قدرت اور تخلیقی نظام کی ایک نشانی ہے۔

لیکن آیا خدائی نشانیوں سے بہرہ گیری اور استفادہ ہر شخص کے لیے ممکن ہے جو کہ کائنات کے نظام حتیٰ کہ ہواؤں کے چلنے تک میں موجود ہے، یا صرف ان لوگوں سے مخصوص ہے جو غور وخوض اور صبر وشکیبائی کے ساتھ اس عجیب نظام کی انسانی عقل و دانش کی حد تک ریزہ کاری کے ساتھ زیر تحقیق لاتے ہیں اور پھر یہ کہ ''شکر منعم'' بھی ان کی شناخت اور معرفت کے سلسلے میں ان کی تلاش اور ان کے تحرک کا سبب بنتے ہیں۔ ''قرطبی'' اپنی تفسیر میں کہتے ہیں ''یہاں پر آیات بمعنی علامات کے ہیں اور یہ علامات اور نشانیاں ہر ایک شخص کے دل میں ظاہر نہیں ہوتیں، بلکہ ان لوگوں سے مخصوص ہیں جو اس کی بلاؤں کے سامنے صابر اور نعمتوں کے لیے شاکر ہوتے ہیں۔ [1]

تفسیر روح البیان میں منقول ہے کہ ''صبار'' کے معنی ہیں وہ شخص جو سخت مشکلات اور مصائب کے مقابلے میں پائیداری کا مظاہرہ کرتا ہے اور خود کو آفاق وانفس کی آیات میں سوچ وبچار اور غور وفکر کے لیے تکلیفوں میں ڈالتا ہے۔ [2]

کس قدر قابل غور بات ہے کہ جس ہوا نے گرہ زمین کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے کائنات کی لطیف ترین چیز ہے۔ لیکن جب اس لطیف جسم میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ عظیم اور غول پیکر کشتیوں کو سطح سمندر پر متحرک کیے رکھتی ہے بلکہ ان بادلوں کو بھی خشک اور مردہ زمینوں کی طرف لے جاتی ہے جو زندگی عطا کرنے والی بارش کے حامل ہوتے ہیں۔ وہاں پر بارش ہوتی ہے اور بنجر زمینیں آباد ہو

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۸، ص ۵۱۶۱

[2] روح البیان، جلد ۷، ص ۹۸

جاتے ہیں۔سرد ہواؤں کو گرم علاقوں میں اور گرم ہواؤں کو سرد علاقوں میں منتقل کرتی رہتی ہیں۔جس سے کرہ ارضی انسانی زندگی کے قابل رہتا ہے۔اس کے علاوہ نباتات کے بیجوں اور دانوں کو اپنے ساتھ حمل کر کے ادھر ادھر پہنچا دیتی ہیں، پھولوں کے اندر کے سفوف کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہیں تا کہ اس طرح سے درختوں کا تخم گابھ میں تبدیل ہو۔تو کیا یہ سب خدائی نشانیاں نہیں ہیں؟ اور صابر و شاکر لوگوں کے علاوہ اور کون اس سے استفادہ کر سکتا ہے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"الایمان تضفان نصف صبر و نصف، شکر"

''ایمان کے دو حصے ہیں: ایک کا نام صبر ہے اور دوسرے کا نام شکر ہے۔''[1]

اور یہ حدیث آیات بالا کے مفہوم پر تاکید ہے۔

بالآخر تیسری آیت میں قوم سبا کی داستان کی طرف اشارہ ہے کہ جب توفیق الٰہی ان کے شامل حال ہوئی اور وہ سرزمین یمن میں پہاڑوں کے درمیان ایک عظیم ''سد'' (ڈیم) ایجاد کر کے پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر اس ذخیرہ شدہ پانی سے بہت سے سرسبز اور شاداب باغات کی آبیاشی کرتے تھے، ان کی زندگی خوشی اور نعمت سے معمور تھی۔لیکن انہوں نے ناشکری کا رستہ اختیار کیا۔خوش حال لوگوں نے مظلوم و مستضعف عوام پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عظیم سد ٹوٹ گئی، باغات ویران ہو گئے اور وہ خود اس طرح تتر بتر اور منتشر ہو گئے کہ قرآن پاک نے ان کی اس طرح نقشہ کشی کی ہے کہ ''ہم نے انہیں دوسروں کے لیے خبریں اور داستانیں بنا دیا'' (**فجعلنهم احاديث**) اور ہم نے ان کی اجتماعیت کو مکمل طور پر منتشر اور تتر بتر کر دیا'' (**ومزقناهم كل ممزق**)۔ پھر فرماتا ہے ''اس داستان میں آیات اور نشانیاں اور عبرت کے درس ہیں، ان سب لوگوں کے لیے جو صبر کرنے والے اور شکر گزار ہیں'' (**ان فی ذالك لايات لكل صبار شكور**)۔

کیونکہ وہ اس ماجرے میں غور و فکر کر کے بہت سے نکات حاصل کرتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ انسان کی زندگی اور موت کا فاصلہ بہت کم ہوتا ہے، اس قدر کم کہ موت خود اس کی زندگی میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔وہی وافر مقدار کا پانی جو قوم سبا کی آبادی، تہذیب اور تمدن کا ذریعہ تھا ایک دن اسی کی تباہی اور بربادی کا سبب بن گیا۔

ادھر دوسری طرف سے اس مغرور انسان کی انتہائی کمزوری اور عاجزی کا بھی پتہ چلتا ہے، کیونکہ کہتے ہیں کہ قوم سبا کی عظیم سد جسے ''سد مآرب'' کہتے ہیں، کو جنگلی چوہوں نے سوراخ کر دیا، جس سے پانی نے آہستہ آہستہ باہر نکلنا شروع کر دیا اور وہ سوراخ بالتدریج وسیع ہوتا گیا۔انجام کار سد مآرب ٹوٹ پھوٹ گئی۔تو اس طرح سے چند جنگلی چوہوں نے ایک عظیم تمدن کو کیونکر ملیا میٹ کر دیا!!

تیسری بات یہ ہے کہ قوم سبا کے مستکبرین جو غریب عوام کا اپنے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کرتے تھے اور انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ گنتی

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۷، ص ۳۲۳۔تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، ص ۱۶۲۔تفسیر مراغی، جلد ۲۱، ص ۹۷۔تفسیر قرطبی جلد ۵، ص ۱۳۵۷ اور دوسری تفسیریں۔

کے چند امیروں اور مستضعف عوام کے درمیان سد مآرب جیسی عظیم حد اور سد حائل ہے، انہوں نے خدا سے درخواست کی کہ ان کے شہروں اور آبادیوں کو غریب اور مستضعف عوام کے شہروں اور آبادیوں سے دور قرار دے تا کہ عام لوگ سفر کر کے آسانی کے ساتھ ان تک نہ پہنچ سکیں اور یہ امتیاز ان کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے!!(فقالوا ربنا باعد بین اسفارنا) لیکن خدا نے انہیں ایسا تتر بتر اور منتشر کیا کہ انہوں نے اس سوچ کو ہمیشہ کے لیے دماغ سے نکال دیا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ آسودہ اور خوشحال زندگی نے انہیں یاد خدا سے غافل کر دیا اور اس وقت ہوش میں آئے جب ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے:

اے روزگارِ عافیت شکرت نکفتم لاجرم
دستی کہ در آغوش بودا کنون بہ دندان می گزم

''یعنی اے خوشحالی اور عافیت کے زمانے میں نے تمہارا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اسی لیے جو ہاتھ پہلے آغوش میں ہوا کرتا تھا اب اسے دانتوں سے کاٹ رہا ہوں۔''

اس طرح سے صبر و شکیبائی اور حوصلے کے ساتھ اور عقل و خرد کے تعاون سے اس داستان کی بہت سی نشانیوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔[1]

نتیجہ کلام

مندرجہ بالا چاروں آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص بھی اسرار و آفرینش اور اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی کے اسرار میں زیادہ سے زیادہ اور گہرا مطالعہ کرے اور پورے صبر و شکیبائی کے ساتھ اس مطالعہ میں مگن رہے اور شکر گزاری کی روح یعنی معرفت کے وسائل و ذرائع اس پر حکم فرما ہوں تو شناخت اور معرفت کا بیشتر حصہ اس کے نصیب میں آجائے۔ اسی لیے صبر اور شکر معرفت کی راہ ہموار کرنے کا موثر ذریعہ ہیں۔

۴۔ معرفت خود معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے

اشارہ

مشہور ہے کہ دولت کو دولت ہی کماتی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک مقدارِ سرمایہ خود ہی بیشتر منافع اور سرمایہ کمانے کا

---

[1] توجہ رہے کہ مندرجہ بالا آیت میں لفظ ''احادیث'' جمع منتہی الجموع ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی سرگزشت کی ایک نہیں بلکہ کئی داستانیں ہیں۔

سبب بنتا ہے۔اس کی مقدار جتنا زیادہ ہوگی ،منافع بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔

یہی اصول علم ودانش اور معارف پر بھی حکم فرما ہے۔جولوگ علمی سرمایہ کے حامل ہوتے ہیں ان کے لیے مزید علمی سرمایہ کے حصول کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔اسی لیے تو ہم کہتے ہیں معرفت بذات خود معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے۔یعنی ایک مرحلہ کا علم اور دانش سبب بن جاتا ہے کہ اس سے بالاتر کئی دوسرے مراحل تک رسائی حاصل کی جائے۔

اب اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آیات

(۱) وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۝۲۲ (سورہ روم ۲۲)

(۲) فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۝۵۲

(سورہ نمل ۵۲)

ترجمہ

(۱) اور اس کی آیات میں سے ہیں زمین وآسمان کی تخلیق اور تمہارے رنگوں اور زبانوں کا مختلف ہونا۔اس میں عالم لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

(۲) یہ وہی گھر ہیں جو اپنے ظلم وستم کی وجہ سے خالی رہ گئے ہیں اور اس میں ان لوگوں کے لیے روشن نشانی ہے جو عالم ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

پہلے آشنا بنو پھر پتہ چلے

زیر نظر آیات میں سب سے پہلی آیت سورہ روم کی متعدد آیات کے ضمن میں سے ایک آیت ہے جس میں آفاقی اور انفسی آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور خداوند عالم کی عالم اکبر (اس کائنات) میں اور عالم اکبر (وجود انسان) میں موجود آیات وعلامات کو شمار کیا گیا ہے۔اس آیت میں ایک طرف تو عالم اکبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''خداوند عالم کی آیات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق''

(ومن ایاته خلق السموات والارض)۔ اس کے بعد وجود انسانی کی باریکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''اس کی دوسری نشانی تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے'' (و اختلاف السنتکم والوانکم)۔

نہ صرف ظاہری زبان اور رنگ کا اختلاف بلکہ اندرونی زبان اور رنگ ذوق اور سلیقوں کا رنگ بھی، جو اس قدر مختلف اور متفرق ہے کہ ممکن نہیں ہے کہ دو ایک جیسے انسان مل جائیں، حتیٰ کہ یہ اختلاف دو جڑواں بھائیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

یہ فرق ایک طرف تو لوگوں کی پہچان اور ایک دوسرے سے شناخت کا سبب ہوتا ہے، کیونکہ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو اجتماعی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ چنانچہ جو لوگ ایسے جڑواں افراد کے ساتھ رہتے ہیں جو ایک دوسرے سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں بسا اوقات سخت مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس قدر دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک سفر سے واپس آتا ہے تو وہ دوسرے کو ملنے چلے جاتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ اس کے قریبی رشتہ دار دھوکہ کھا جاتے ہیں، بیمار ایک ہوتا ہے دوا دوسرے کو دی جاتی ہے۔

اب آپ خود ہی سوچئے کہ اگر تمام لوگ ہر لحاظ سے ایک دوسرے جیسے ہوتے تو پھر کیا ہوتا؟

ادھر دوسری طرف یہ انواع و اقسام کا اختلاف اس بات کا سبب ہے کہ ہر گروہ معاشرہ کی کسی نہ کسی قسم کے پورا کرنے میں لگا ہوا ہے اور یہ معاشرتی ضروریات ہر گروہ کے ذوق کی تسکین اور استعداد کے مطابق پوری ہو رہی ہیں، اور انسانی معاشرے میں کسی قسم کا خلا بھی رونما نہیں ہوتا۔ تو کیا یہ سب خداوند عالم کی آیات اور نشانیاں نہیں ہیں؟ اس خالق کی نشانیاں جس نے اس عظیم کائنات کو خلق فرمایا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ''زبانوں کے اختلاف'' کے بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ''بولیوں'' (زبانوں) کا اختلاف ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں ایک ہزار بولیاں (زبانیں) بولی جاتی ہے اور یہ تنوع (سر دست ہمیں جس کے اصل سرچشمہ سے سروکار نہیں ہے) مختلف اقوام کی ایک دوسرے سے پہچان کا موثر ذریعہ ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے لوگوں کے لہجے اور طرزِ بیان مراد ہیں، جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص کا اپنا ایک اندازِ گفتگو ہے جس سے اس کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔

بعض صاحبان تفسیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد صوتیں یا باصطلاح اداروں کی ''ٹیونیں'' ہیں جو آپس میں بہت مختلف ہوتی ہیں۔ اسی لیے نابینا لوگ بہت سے افراد کو ان کی آوازوں سے بخوبی پہچان لیتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے آنکھوں والے کسی کو دیکھ کر پہچان جاتے ہیں۔

اور یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر رنگوں اور زبانوں کے اختلاف کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ اس بات کی وضاحت کرے کہ کائنات کی عظیم سے عظیم تر چیز سے لے کر (بظاہر) اس کی عام اور سادہ ترین چیز تک سب کی سب ایک باقاعدہ منظم اور مرتب نظام کے تحت موجود ہیں اور اس ذات کردگار کے علم و قدرت کی نشانیاں ہیں۔

اور قابل توجہ بات ہے کہ آیت کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے: ''ان موضوعات میں صاحبان علم کے لیے نشانیاں ہیں'' (ان فی ذالك لایات للعالمین)۔ جی ہاں! وہی صاحبانِ علم جو بڑے غور و خوض اور موشگافیوں کے ذریعے ایک ایک کر کے ان اسرار و رموز کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور ان کی سابقہ آگاہی ان کی آئندہ آگاہی کا موجب بنتی ہے۔

دوسری آیت ان فسادی اور فتنہ پرور ٹولوں کی بات کر رہی ہے جو مفسرین کے بقول سرزمین ''وادی القریٰ'' اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم میں رہتے تھے، جن کی تعداد نو تھی اور وہ کافر اور منافق ٹولے تھے، جن کا کام ہمیشہ تخریب کاری اور فتنہ پروری تھا، جیسا کہ اسی سورہ نمل کی آیات میں آیا ہے "وکان فی المدینة تسعة رهط یفسدون فی الارض" (شہر میں نو گروہ تھے جو زمین میں فساد پھیلاتے تھے)۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں توبہ و بازگشت اور اپنی اصلاح کی کافی مہلت دی، لیکن انہوں نے اصلاح کی بجائے غرور اور تکبر کا رستہ اختیار کیا اور دن بدن اس میں بڑھتے گئے۔ انجام کار عذاب الٰہی نے انہیں آلیا اور کڑاکے کی مہلک بجلیوں اور زلزلوں نے ان کی بے شرمانہ زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

زیر بحث آیت کہتی ہے ''یہ وہ گھر ہیں جو اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے خالی رہ گئے'' (فتلك بیوتهم خاویة بما ظلموا)۔

پھر فرماتا ہے ''اس ماجرے میں ان لوگوں کے لیے واضح نشانی ہے جو عالم ہیں'' (ان فی ذالك لایة لقوم یعلمون)۔

"بما ظلموا" کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے گھروں کی ویرانی کا سبب خود ان کے مظالم ہی تھے، اسی لیے ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ وہ کہتے تھے ''میں نے اس حقیقت کو کتاب خدا میں پایا ہے کہ ظلم انسان کا خانہ خراب کر دیتا ہے۔ پھر انہوں نے اسی آیت کو تلاوت فرمایا۔ تورات میں بھی آیا ہے:

''اے فرزند آدم! ظلم نہ کر کیونکہ وہ تیرا خانہ خراب کر دے گا۔''[1]

البتہ اس طرف بھی توجہ رہے کہ "خاویه" کا لفظ اصل ''خالی'' کے معنی میں ہے، لیکن بہت سے مفسرین نے اس کی ''ویران'' کے معنی سے تفسیر کی ہے اور یہ شاید اس لیے ہے کہ جب مکان اپنے مکینوں سے خالی ہو جائے تو تھوڑے ہی عرصے میں ویران ہو جاتا ہے۔[2]

نتیجہ کلام

یہ حقیقت ہے کہ خدا کی آیات، خواہ آفاقی ہوں یا انفسی اور خواہ وہ درس عبرت سے متعلق ہوں کہ جن میں گذشتہ لوگوں کی سرگزشت ہوتی ہے، تمام لوگوں کے لیے یکساں ہیں۔ لیکن چونکہ ان سے تمام لوگ بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے اسی لیے قرآن کہتا ہے ''ان امور میں آگاہ اور عالم لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

کہیں پر کہتا ہے کہ ''صاحبانِ تقویٰ لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

---

[1] تفسیر روح المعانی، جلد ۱۹، ص ۱۹۴

[2] تفسیر روح البیان میں ''خوی'' کے مادہ کے دو معانی ذکر کیے گئے ہیں، ایک ''خالی ہونا'' دوسرا ''گرنا اور منہدم ہونا''۔ اسی لیے عرب ''خوی النجم'' کہتے ہیں، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ مادہ صرف اسی پہلے معنی کے لیے ہے اور ''خوی النجم'' وہاں پر بولا جاتا ہے کہ جہاں پر کوئی ستارہ غروب کرے، لیکن وہاں پر بارش نہ ہو۔ (زمانہ جاہلیت کے عربوں کے عقیدہ کے مطابق بہت سے ستاروں کے ساتھ بارش بھی ہوتی ہے اور جب بارش نہیں آتی تھی تو اس ستارے کے بارے میں یہی تعبیر استعمال کرتے تھے)۔

کہیں پر کہتا ہے کہ ''غور وفکر کرنے والے اور صابر وشاکر افراد کے لیے.....''

اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف اس قسم کے لوگ جن کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں، ان آیات سے استفادہ کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارے سے خالی نہیں ہیں کہ ہمیشہ علم ومعرفت ہی بیشتر علم ومعرفت کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ مثلاً: كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴿۳۲﴾

''ہم اپنی اس طرح کی آیات کو ان لوگوں کے لیے تفصیلی طور پر بیان کرتے ہیں جو عالم ہیں۔'' (اعراف ۳۲)

یا پھر يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

''خداوند عالم اپنی آیات کو اس قوم کے لیے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے جو عالم ہے۔'' (یونس ۱۵)

یا پھر كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

''ایسی کتاب ہے کہ جس کی آیات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور فصاحت اور وضاحت ہے اس قوم کے لیے جو آگاہ ہے۔'' (فصلت ۳)

اور یا وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

''یہ قوانین الٰہی کی حدود ہیں جنہیں وہ ایسے لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کرتا ہے جو عالم ہیں۔'' (بقرہ ۲۳۰)

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ ان آیات سے اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل جاتا ہے کہ ''علماء کو آیات الٰہی کی تفصیل، تشریح اور توضیح کی کیا ضرورت ہے۔

تفسیر موضوعی
جلد دوم

زیر نظر
آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

علامہ سید صفدر حسین نجفیؒ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔

فہرست

تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن جلد نمبر 2

عنوان	صفحہ نمبر
خدا جوئی اور خدا شناسی قرآن کی روشنی میں	16
چند اہم اور بنیادی سوال	17
خُدا جوئی کیوں؟	18
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	20
ہر انسان کا پہلا فریضہ تحقیق ہے۔	20
نتیجہ	26
چند مزید وضاحتیں	26
اسلامی روایات میں مذہب کے عقلی ہونے کے اسباب	26
۲۔متعصب دشمن	27
۳۔عاطفی سبب	28
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	30
شکرِ منعم، معرفتِ الٰہی کا زینہ ہے	30
شُکرِ منعم اسلامی روایات میں:	33
۳۔فطری سبب	34
چند توضیحات	35
ا۔انحرافی توجیہات	35
ا۔''جہالت'' کا مفروضہ	36
۲۔ڈر کا مفروضہ	37
۳۔''اقتصادی عوامل'' کا مفروضہ	38
۴۔''جنسی'' مفروضہ	39
۵۔''اخلاقی ضروریات'' کا مفروضہ	40
خدا شناسی کے دلائل بُرہانِ نظم	43
برہانِ نظم کی خصوصیات	44
برہانِ نظم کی بنیادیں۔	45
''نظم اور علم'' کا رابطہ	45
ا۔انسانی تخلیق میں اس کی نشانیاں	48
الفاظ کے معانی	49
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	50
سب سے پہلے ''انفسی آیات''	50
نظامِ تخلیق نہایت پیچیدہ اور نازک ہے	54
۲۔جنین کے پروان چڑھنے میں خدا کی نشانیاں	57
الفاظ کے معانی اور تشریح	59
آیات کی تفسیر اور اُن کی جمع بندی	60
جنین کی اسرار آمیز کائنات	60
چند وضاحتیں	64
ا۔نقش بر آب	64
۲۔تین تاریکیوں کے اندر	64
۳۔امن کا مقام	65
۴۔''خَصِيمٌ مُّبِينٌ'' یا کھلم کھلا جھگڑالو	65

عنوان	صفحہ نمبر
۵ جنین کی غذا رسانی	66
۶۔جنین کی جنسی سرنوشت	66
۷۔اسرار آمیز اور جلد انجام پانے والی تبدیلیاں	67
۸۔رحم کی مستقبل پر نگائیں	67
۹ ہڈیوں کا لباس	68
۱۰۔جنین باہر آتا ہے	68
۱۱۔بوقتِ ولادت محیر العقول تبدیلیاں	69
۱۲۔بچے کا رونا	70
۱۳۔بچوں میں بالتدریج عقل اور حواس کی بیداری	71
۱۴۔غذا پہلے، بچہ بعد میں	72
۳۔عالمِ حیات میں اس کی نشانیاں	74
الفاظ کے معنی اور تشریح	76
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	78
حیات کی آفرینش، آفرینش کا شاہکار ہے:	78
مزید تفصیل	83
۱۔زندگی ایک عظیم معمہ ہے:	83
۲۔کیا انسان کوئی اور زندہ چیز بنا سکتا ہے؟	84
۴۔روح کی پیدائش میں اس کی نشانیاں	88
الفاظ کے معانی اور ان کی تشریح	89
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	91
عالمِ تخلیق کا عجوبہ۔۔۔۔۔۔۔روح	91
چند توضیحات	95
۱۔روح کی ظاہری اور باطنی قوتیں	95
۲۔کائنات کی اسرار بھری مخلوق۔۔۔روح	95
۳۔روح کی مختلف سرگرمیاں	96
۴۔انسانی مغز کا الیکٹرانک مغز (کمپیوٹر) سے تقابل	99
۵۔روح کی اصالت اور استقلال	99
۶۔قرآنِ مجید میں روح کی خصوصیات	100
۷۔روح کے بارے میں آخری بات	101
۵۔انسان اور حیوان کی فطری اور غریزی ہدایت میں اس کی نشانیاں	102
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	104
استادِ ازل!	104
چند ضروری وضاحتیں	110
علوم جدید میں ''فطری'' اور ''غریزی'' ہدایت	110
۶۔نیند اور بیداری میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	116
الفاظ کے معانی اور تشریح	117
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	118
تمہاری نیند خدا کی آیت ہے	118
مزید تشریح	120
نیند ایک مخفی مخلوق	120
۷۔زمین و آسمان کی وسعتوں میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	122
الفاظ کے معانی اور تشریح	125
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	127
بلند آسمان آیتِ حق ہے	127
چند ضروری وضاحتیں	137
۱۔آسمان کی عظمت اور وسعت	137
۲۔زمین و آسمان پر حکم فرما جچے تلے قوانین	138

عنوان	صفحہ نمبر
۳۔سات آسمان	139
۴۔آسمان کی طرف نگاہ کیوں نہیں کرتے؟	141
۸۔سورج ، چانداورستاروں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	143
آیات کی تفسیراورجمع بندی	146
سورج، چانداورستاروں کی قسم	146
چندضروری وضاحتیں	154
۱۔سورج کیاہے؟	154
۲۔سورج کی عظیم برکتیں	155
۳۔چانداوراس کی برکتیں	157
۴۔سورج اور چاندکلامِ معصوم کی روشنی میں	158
۹۔رات اوردن کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	160
آیات کی تفسیراورجمع بندی	163
شب وروز کا عجیب نظام	163
چندضروری وضاحتیں	168
۱۔نوراورظلمت کی اہمیت اورشب وروز کے فوائد	168
۱۰۔پہاڑوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	170
الفاظ کی تشریح	172
آیات کی تفسیراورجمع بندی	173
پہاڑوں کی برکتیں اورعجیب اسرار	173
چندضروری وضاحتیں	178
۱۔پہاڑاورقرآنِ پاک کاعلمی معجزہ	178
۲۔پہاڑوں کے بارے میں امام جعفرصادق علیہ السلام کافرمانِ ذیشان	179
۳۔ایک عظیم دانشورکا کلام	180
۴۔پہاڑوں کی تخلیق کے بارے میں اعجازبھری حدیث	181
۱۱۔بادل، ہوااور بارش کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	182
الفاظ کے معانی اورتشریح	186
آیات کی تفسیراوران کی جمع بندی	188
دواسرار بھری چیزیں۔۔۔۔۔۔ہوااور بارش	188
نتیجہ کلام	195
چندضروری وضاحتیں	196
۱۔ہواؤں کی پیدائش اوران کے فوائد	196
۲۔بادلوں کی پیدائش کے اسراراور بارش کانزول	197
۳۔اسلامی روایات میں ہوااور بارش کی حیثیت	199
۱۲۔رعدوبرق کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	203
الفاظ کے معانی اورتشریح	204
آیات کی تفسیراورجمع بندی	205
رعدوبرق کی پیدائش کے اسرار	205
چندوضاحتیں	207
۱۔جدیدعلوم کی روشنی میں برق ورعد کی پیدائش	207
۲۔رعدوبرق کے فوائد	208
الف: آبپاشی	208
ب: زہرپاشی	208
ج: غذااورکھادکا کام	208

عنوان	صفحہ نمبر
۱۳۔سمندروں اور کشتیوں میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	210
الفاظ کے معانی اور تشریح	212
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	213
سمندر اور اس کے عجائبات	213
چند ضروری وضاحتیں	217
ا۔مختلف نعمتوں کا گھر۔۔۔۔۔۔۔۔سمندر	217
ا۔کشتی رانی	217
۲۔کھانے پینے کا مواد	218
۳۔گھاس اور دوا کی جڑی بوٹیاں	218
۴۔معدنیات اور تیل کے ذخائر	218
۵۔توانائی کی پیدائش کا بہترین ذریعہ	219
۶۔مختلف زیورات	220
۷۔سمندروں کے ذریعہ موسم میں اعتدال	220
۸۔سمندری پانی سے طبی سہولتوں کا حصول	221
۹روئے زمین کے پانی کا اصل منبع	221
۱۰۔میٹھے پانی کا حصول	221
۲۔سمندر۔۔۔یا۔۔۔عجائبات کا گھر!	221
۳۔سمندر۔۔کلامِ معصومینؑ کی روشنی میں	223
۱۴۔سایہ کی تخلیق میں خلاقِ عالم کی نشانیاں	225
الفاظ کے معانی اور تشریح	226
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	227
کیا سایہ بھی ایک عظیم نعمت ہے؟	227
چند ضروری وضاحتیں	230
اگر سایہ نہ ہوتا	230

عنوان	صفحہ نمبر
۱۵۔نباتات اور میوہ جات میں پروردگارِ عالم کی نشانیاں	232
الفاظ کے معانی اور تشریح	236
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	237
سبز درختوں کے پتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔!	237
چند ضروری وضاحتیں	249
ا۔نباتات کی حیرت انگیز ساخت	249
۲۔نباتات کے فوائد اور برکتیں	251
ا۔بہترین غذائی مادہ	251
۲۔ہوا میں تبدیلی	251
۳۔لباس اور پوشاک	252
۴۔گھر اور اس کا اثاثہ	252
۵۔نباتاتی دوائیں	252
۶۔چلتی ریت کے آگے رکاوٹ	252
۷۔کاغذ کی تیاری	252
۸۔موسم میں اعتدال	253
۹۔ذرائع آمد و رفت	253
۱۰۔خوبصورتی اور تر و تازگی	253
۱۱۔توانائی کا اہم منبع	253
۱۲۔مختلف عطریات اور کیمیکل مواد	253
۳۔نباتات کی بے شمار قسمیں	254
۴۔نباتات کی بوالعجبیاں	254
۵۔توحیدِ مفضل میں نباتات کی تخلیق کے اسرار	257
۱۶۔عمومی رزق کی پیدائش میں خالقِ کائنات کی نشانیاں	260
الفاظ کے معانی اور تشریح	262

عنوان	صفحہ نمبر
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	264
ہے اس خوانِ نعمت پہ دشمن و دوست!	264
چند ضروری توضیحات	273
۱۔رزق کی دنیا میں محیر العقول کارنامے	273
۲۔کیا روزی تقسیم شدہ ہے؟	276
۳۔۔۔۔۔۔پھر یہ بھُوکے کیوں ہیں؟	278
۳۔رزق میں وسعت اور تنگی	279
۱۷۔پرندوں کی تخلیق میں خالقِ کائنات کی نشانیاں	281
الفاظ کے معانی اور تشریح	282
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	283
پرندے تو تسبیح پڑھیں اور میں۔۔۔۔۔۔۔۔؟	283
چند ضروری توضیحات	288
۱۔پرواز کا پیچیدہ فن	288
۲۔پرندوں کے ''عجائبات'' اور عجیب'' پرندے	289
۳۔پرندے، انسانوں اور ماحول کی خدمت میں	292
۴۔پرندوں کے وجود سے توحید کا درس ملتا ہے	293
۱۸۔شہد کی مکھیوں کی زندگی میں خلاقِ عالم کی نشانیاں	294
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	295
آیئے شہد کا ملک دیکھیں!!	295
چند ضروری توضیحات	299
۱۔شہد کی مکھیوں کا عجیب تمدن	299
۲۔پھلوں کے رس سے شہد سازی	301
۳۔شہد غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے	303
۴۔زنبورِ عسل کی اور خدمات جو شہد سے بھی زیادہ قیمتی ہیں	305
۵۔شہد کی مکھیوں کی جسمانی ساخت بھی عجیب ہے!	306
۱۹۔جانوروں کی تخلیق میں پروردگارِ عالم کی نشانیاں	308
الفاظ کے معانی اور تشریح	311
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	312
حیوانات کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟	312
چند ضروری وضاحتیں	325
حیوانی دنیا کے عجائبات	325
۱۔حیوانوں کا رام اور مطیع ہونا	325
۲۔جانوروں کا ہوش و خرد	326
۲۰۔جسمانی اعضاء کی تخلیق میں باری تعالیٰ کی نشانیاں	329
الفاظ کے معانی اور تشریح	330
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	332
چند ضروری وضاحتیں	338
۱۔اعضائے بدن کے عجائبات	338
۱۔متغیر عدسہ	338
۲۔آنکھ کے سات طبقے	339
۳۔روشنی کے سامنے حساسیت	339
۴۔تیز ترین تحرک	339
۵۔سادہ اور لطیف پرزے	339
۶۔فلم بنانے کا مسئلہ	339
۷۔ضمنی طور پر کام کرنے والی مشینری	340

عنوان	صفحہ نمبر
۲۔ ہر فن مولا عضو.....زبان	340
ا۔ غذا کو دانتوں کے نیچے بھیجنا	341
۲۔ غذ کو لعابِ دہن سے مخلوط کرنا	341
۳۔ غذا اور پانی کے نگلنے میں کمک کرنا	341
۴۔ غذائی مواد پر ضبط و اختیار	341
۵۔ منہ کی صفائی کا کام	341
۶۔ بولنے کا کام	342
۲۱۔ انسان کی اجتماعی زندگی میں ذات پروردگار کی نشانیاں	344
الفاظ کے معانی اور تشریح	346
آیات کی تفسیر اور جمع بندی	347
انسان کی اجتماعی روح.....خدا کا بہت بڑا عطیہ	347
چند ضروری وضاحتیں	353
کیا معاشرہ کی روح ہوتی ہے؟	353

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اہداء

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زُلال سے زیادہ آبِ حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی

۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی

۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی

۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی

۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی

۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی

کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

مقدمہ کی بجائے

یہ سب قرآن کی تفسیریں!

ایک بھائی صاحب کہہ رہے تھے ''میں نے سنا ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں تقریباً دو ہزار تفسیر لکھی جا چکی ہیں جب کہ قرآن مجید ایک حقیقت سے زیادہ نہیں ہے کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اسلامی دانشور اور اہل علم و فضل.....خصوصاً اسلامی حکومت میں.....ایک جگہ مل بیٹھ کر قرآنی آیات کی تفسیر کا مسئلہ حل کر دیں؟''

تو میں نے کہا ''بھائی جان! آپ چند اہم نکات سے غافل ہیں۔

ا۔ ''ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قرآن مجید کے کئی پہلو ہیں اور مختلف زاویے ہیں اور عظیم مفسرین میں سے ہر ایک اسے اس کے ایک خاص پہلو اور معین زاویہ سے دیکھتا اور اس کی تفسیر کرتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے ایک گراں قیمت شاخِ گل کو ''باغ کا مالی'' ایک بڑا ذریعہ آمدنی تصور کرتا ہے، ایک ''داروساز حکیم'' اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کے برگ و پنکھڑیاں فلاں بیماری کے لئے مفید ہیں، اس کی لکڑی فلاں مرض کے لئے فائدہ مند ہے اور س کے ریشے ایک مخصوص بیماری کیلئے کارآمد ہیں۔

اور شاعر اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ یہ شاخِ گل اس کیلئے لطیف ترین اشعار کے الہام کا سبب اور ہنر شاعری کا حربی ہے۔ اس کے گل برگ معشوق کے رخسارے کی مانند اور اس کے غنچے محبوب کے دہن کی طرح ہیں۔ اس کا رنگ و بو محبوب کے رنگ و بو کی یاد دلاتے ہیں۔

جب کہ خدا پرست فیلسوف اس شاخِ گل کے ایک ایک جز میں عظیم معبود کے آثار کو ملاحظہ کرتا ہے، دل کے کانوں سے اس کے ہر ذرہ سے حمد و تسبیح کی آواز سنتا ہے، اس کے نظم وضبط اور لطافت و ظرافت کو دیکھ کر اس بے نشان ذات کی نشانیوں کا ادراک کرتا ہے اور بے خود ہو کر یہ شعر گنگنانے لگتا ہے ۔

برگِ درختانِ سبز درنظر ہوشیار
ہرورق عشق دفتری است معرفتِ کردگار

''یعنی ایک صاحب علم وادراک شخص کی نگاہ میں سبز درختوں کا ایک ایک پتا معرفت پروردگار کی کھلی کتاب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادیب، مفسر اور نکتہ پرداز ارباب قلم قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت کے پہلو سے دیکھتے ہیں، فیلسوف مفسر اور حکماء فلسفی نقطہ نظر سے مورخین اس کے تاریخی پہلو سے اور سائنس دان، دانشور قرآن کے آفاقی اسرار سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

معلمین اخلاق تربیت کے نہایت موثر دروس کے نقطہ نظر سے، فقہاء وقانوں دان حضرات اس کے قانونی مسائل کی رو سے اور آیات الاحکام کے نقطہ نظر سے اور متکلمین مبداء ومعاد کے سلسلے میں قرآن کے بلند معارف کے بارے میں بحث وتفسیر کرتے ہیں۔خلاصہ کلام ع

ہر کسی سوزد بہ نوعی درغم جانا نہ ای

ہماری نظر میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے جس نے قرآن مجید کو اس کے تمام پہلوؤں سے دیکھا اور اس کی تفسیر کی ہو، کیونکہ تمام علوم میں ماہر ہونا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

۲۔قرآن مجید بحر اوقیانوس کی مانند ایک ناپیدا کنار سمندر ہے، ہر مفسر اس کی ''گہرائی'' کے ایک حصے تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اپنے ساتھ گراں قیمت موتی لے آتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ غواصانِ بحر، کم گہرائی والے سمندروں میں غوطے لگا کر ''مروارید'' اور ''جواہرات'' حاصل کرتے تھے۔لیکن سمندروں کی گہرائی تک پہنچنے کے وسائل جوں جوں کامل ہوتے گئے، اسی قدر غوطہ خور بھی پیش رفت کرتے گئے۔ اب سمندر میں نت نئی دریافتیں ہورہی ہیں اور جدید سے جدید تر جواہرات ومعاون تک رسائی حاصل ہورہی ہے۔

بعینہٖ انسانی علم ودانش کی سطح فکری زمانے کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی جاری ہے، محققین ومفسرین کلامِ الٰہی کے عمیق ترین اوقیانوس میں غوطہ خوری کیلئے دن بدن زیادہ سے زیادہ آمادگی پیدا کرتے جارہے ہیں، ہر روز نت نئے جواہرات وگوہر حاصل کررہے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اس تلاش وکوشش وسعی وجدوجہد کا نقطہ اختتام ہرگز قابل تصور نہیں ہے کیونکہ کلام الٰہی بھی اس کی پاک ذات کی مانند غیر متناہی ہے۔

اور یہی بات تفاسیر کے مختلف النوع اور گوناگوں ہونے کے علاوہ ان کی کثرت کی وجہ بھی ہے۔

۳۔علاوہ ازیں، حقائق کا انکشاف ہمیشہ افکار کی باہم ملاقات کی وجہ سے معرض وجود میں آتا ہے جس طرح پتھر

اورفولاد کے ٹکڑوں کے ٹکراؤ سے چنگاریاں اٹھتی ہیں۔ بنابریں کتب تفسیر کی کثرت سے گھبرانہیں جانا چاہیے بلکہ یہ قوت وطاقت کا ایک اہم نقطہ ہے جسے برقرار رہنا چاہیے۔

ہم نے تفسیر موضوعی کے میدان میں اترنے کے بعد اسی چیز کا بخوبی تجربہ کیا ہے کیونکہ ہم اس آسمانی کتاب سے جس قدر زیادہ آشنا ہوتے جارہے ہیں، ہمارے ذہن میں قرآنی معارف وحقائق کے خزانوں کے دریچے اتنا ہی زیادہ کھلتے جارہے ہیں۔ جو حقائق تفسیر ترتیبی میں اس حدتک منکشف نہیں ہوئے تھے وہ اب ہورہے ہیں اوراس بات پر ہم خداوند منان کے سپاس گذار ہیں۔

واٰخر داعوان ان الحمد للہ رب العالمین

قم حوزہ علمیہ

ناصر مکارم شیرازی

ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِہٖ

مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ، لَا سَیَّمَا

الۡاِمَامِ الۡمَھۡدِی الۡمُنۡتَظَرِ، اَرۡوَاحُنَا فِدَاہُ۔

خداجوئی۔۔۔اور۔۔۔خداشناسی

قرآن

کی روشنی میں

تاریخ آغاز

۱۸۔رجب المرجب ۱۴۰۸ھ

چند اہم اور بنیادی سوال

ہر شخص مندرجہ ذیل سوالات کا جواب چاہتا ہے کہ:

ہم کہاں سے آئے ہیں؟

اب کہاں ہیں؟ اور کہاں جارہے ہیں؟

ظاہری بات ہے کہ ان تین اہم سوالوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور اہم سوالات بھی ہیں، اور وہ یہ کہ ''ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟'' کیا ہمارے آنے کا کوئی مقصد بھی ہے؟ اگر کوئی مقصد ہے تو وہ کیا ہے؟

اور اس مقصد تک پہنچنے کیلئے ہمارے پاس کوئی اسباب ہیں؟

اس کائنات کا کوئی مبداء اصلی ہے؟ اگر ہے تو وہ کون ہے؟

اس کائنات کی ابتداء کب سے ہوئی؟

اور بالآخر اس عظیم مبداء کی شناخت کا کوئی راستہ ہے؟

یہ ہیں انسان کے اہم ترین سوالات!

ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کیلئے صرف وہی لوگ خود کو پابند نہیں سمجھتے جو اس مادی زندگی میں اس حد تک غرق ہیں کہ سوائے ''کھانے، پینے، سونے اور شہوت'' کے کسی اور چیز کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے اور ''جانوروں'' کی مانند ''عالمِ انسانی'' سے بے خبر ہیں۔

یا وہ لوگ جو ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کیلئے کافی تگ و دو کر چکے ہیں لیکن کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے اور تھک ہار کر مایوس ہو چکے ہیں۔

چونکہ ہمیشہ ''سوال'' ''حرکت'' کا سبب ہوتا ہے، یعنی جواب کی جانب حرکت کا، اور اس قسم کے سوالات جس قدر گوناگوں اور عمیق ترین ہوں گے، جواب کی طرف حرکت بھی زیادہ وسیع اور زیادہ پائیدار ہوگی۔ اسی لئے ان عظیم سوالات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا چاہیے۔ سوالات کی کثرت اور اہمیت سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ کھلے دل کے ساتھ ان کا استقبال بھی کرنا چاہیے۔

بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ انسانی عمر کا حاصل درحقیقت ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اور تمام دنیا کے علماء، فلاسفہ اور سائنس دان غرض تمام دانش وران قسم کے اہم ترین سوالات کا جواب حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ماہرین فلکیات کی یہ کوشش ہے کہ آسمان کی تخلیق اور ان پر حکم فرما نظام کی تشریح کریں۔ علمِ اراضیات کے ماہرین زمین اور اس کی ساخت کے بارے میں جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ انسان شناس، ماہرین نفسیات اور تمام وہ لوگ جنہوں نے انسانی اور اجتماعی علوم کا مطالعہ کیا ہے چاہتے ہیں کہ اس عجیب و غریب موجود چیز کے بارے میں اپنی معلومات اکٹھا کریں جس کا نام ''انسان'' ہے۔

فلاسفہ کی سعی مسلسل یہ ہے کہ ۔۔۔ عقل انسانی کے تقاضوں کے مطابق ۔۔۔۔ کائنات کی ابتدا اور انتہا سے واقفیت حاصل

کریں۔اگرمکمل طور پرنہیں توکم ازکم کسی حدتک تو یہ مسئلہ حل ہوجائے۔

اس تمام گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''کائنات کے خالق'' کے بارے میں اوراس عظیم کائنات کہ جس میں ہم رہ رہے ہیں، کے سلسلے میں اگر بحث کا سلسلہ قدیم الایام سے چلا آرہا ہے تو اس میں تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

اسی بناء پر ہم اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ اپنی حدِ امکان تک ہم بھی اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں کہ:

''اس کائنات اور عالمِ ہستی کا مبداء کون ہے؟

اوراسے کیونکر پہچانا جاسکتا ہے؟''

خُدا جوئی کیوں؟

اشارہ:

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کوئی حرکت بغیر سبب اور موجب کے نہیں ہوتی۔واضح سی بات ہے کہ اس کائنات کے مبداء کی شناخت کیلئے بھی کوئی حرکت کسی سبب اور موجب کے بغیر نہیں ہوسکتی۔اسی لئے فلاسفہ اور دانشوروں نے خدا جوئی کے تین بنیادی اسباب بتائے ہیں اور قرآن مجید نے بھی واضح طور پر ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۱)عقلی (۲)فطری اور (۳)عاطفی

ان میں سے بعض اسباب کی پھر کئی اقسام ہیں۔ہم سب سے پہلے ''عقلی سبب'' پر تفصیلی گفتگو کریں گے اور سب مل کر مندرجہ ذیل آیات کو دل کے کانوں سے سنتے ہیں:

۱۔یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ

(انفال/ ۲۴)

۲۔لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ

(آلِ عمران/ ۱۶۴)

۳۔لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

(حدید/۲۵)

۴۔یَأۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ

(اعراف/۱۵۷)

۵۔قَالَ هَلۡ یَسۡمَعُوۡنَکُمۡ اِذۡتَدۡعُوۡنَ اَوۡیَنۡفَعُوۡنَکُمۡ اَوۡیَضُرُّوۡنَ ۔۔۔۔فَاِنَّهُمۡ عَدُوٌّ لِّیۡٓ اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ

(شعراء/۷۲۔۷۳۔۷۷)

۶۔فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُکُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوۡدَ

(حٰمٓ السجدہ/۱۳)

۷۔قُلۡ اِنَّمَآ اَعِظُکُمۡ بِوَاحِدَةٍ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰی وَفُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوۡا مَا بِصَاحِبِکُمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ لَّکُمۡ بَیۡنَ یَدَیۡ عَذَابٍ شَدِیۡدٍ(سبا/۴۶)

ترجمہ:

۱۔۔۔اے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہو خدا اور رسول کی دعوت کا جواب دو، جب تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہاری زندگی کا سبب ہو۔

۲۔۔۔خداوندِ عالم نے مومنین پر احسان کیا ہے (اور عظیم نعمت عطا کی ہے) جب کہ ان کے اندر انہی کی جنس سے پیغمبر مبعوث کیا جو کہ ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔

۳۔۔۔ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دے کر بھیجا ہے اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتاب اور (حق اور منصفانہ قوانین کی معرفت کا) میزان نازل کیا ہے تا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

۴۔۔۔پیغمبرؑ انہیں نیکیوں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، پاک و پاکیزہ چیزوں کو ان کیلئے حلال کرتا ہے۔ ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے اور جو سنگین بوجھ اور زنجیریں ان کیلئے تھیں، اُن سے اٹھالیتا ہے۔

۵۔۔۔(ابراہیمؑ نے) کہا کہ جب تم بتوں کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آواز کو سنتے ہیں؟ یا تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟۔۔۔۔۔۔وہ سارے کے سارے میرے دشمن ہیں، سوائے عالمین کے پروردگار کے۔

۶۔۔۔اگر وہ روگرادنی کریں تو تم ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں ایسے صاعقہ سے ڈراتا ہوں جو عاد اور ثمود جیسا صاعقہ ہے۔

۷۔۔۔کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ دو، دو ہو کر یا ایک، ایک ہو کر خدا کیلئے قیام کرو، پھر اپنی فکر سے کام لو، تمہارا یہ ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہرگز مجنون نہیں ہے وہ تو تمہیں (خدا کے) سخت عذاب سے ڈرانے والا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

ہر انسان کا پہلا فریضہ تحقیق ہے۔

ہر انسان کمال کا عاشق ہوتا ہے اور یہ جاودانی عشق تمام لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ البتہ ہر شخص اپنا کمال جس چیز میں دیکھتا ہے اسی کے پیچھے چل پڑتا ہے، جیسا کہ کچھ لوگ آب کی بجائے سراب کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں، موہوم وخیالی اقدار کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور انہیں واقفیت اور حقیقت سمجھتے ہیں۔

کبھی اس صول کو ''حصولِ منفعت اور دفعِ ضرر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کے لئے انسان خود کو اس بات کا پابند سمجھتا ہے کہ ہر وہ موضوع جو (سود وزیاں کے لحاظ سے) اس کی سرنوشت اور انجام سے کسی قسم کا تعلق اور رابطہ رکھتا ہے، اس سے صحیح معنوں میں اپنا تعلق رکھے۔

البتہ اس عشق کو ''غریزہ'' کا نام دینا بہت مشکل ہے کیونکہ عموماً غریزہ ان امور کو کہا جاتا ہے جو انسانوں یا حیوانوں کے افعال میں کسی قسم کی سوچ اور غور وفکر کے بغیر موثر ہو۔ اسی لئے حیوانات کیلئے بھی لفظ ''غریزہ'' کا اطلاق ہوتا ہے۔

اسی لئے بہتر یہی ہے کہ اسے ''اعلیٰ تمایل'' کے نام سے یاد کیا جائے۔

بہرحال کمال اور معنوی ومادی منافع ومفادات کی طرف تمایل اور ہر قسم کے ضرر اور نقصان کو دور کرنے کی خواہش انسان کو اس بات

پر آمادہ کرتی ہے کہ احتمال کے مواقع پر بھی تحقیق سے کام لے۔

یہ احتمال جتنا قوی ہوگا اور وہ سود وزیاں جتنا عظیم ہوگا، انسان اس تحقیق کو اتنا ہی لازمی سمجھے گا۔

یہ بات قطعاً محال ہے کہ کوئی شخص اس بات کا احتمال دے کہ کوئی بات اس کے انجام میں اہم کردار ادا کر رہی ہے اور وہ اس سلسلے میں خود کو تحقیق کا پابند نہ سمجھے۔

خدا پر ایمان اور مذہب کی جستجو کا مسئلہ بھی یقیناً اسی قسم کے مسائل کے زمرہ میں آتا ہے، کیونکہ مذہب کے سلسلے میں انجام اور سرنوشت کے مسائل کی گفتگو ہوتی ہے، ایسے مسائل کی گفتگو جو انسان کے خیر وشر سے قریبی اور گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

بعض لوگ اس مطلب کو مزید واضح کرنے کیلئے ایک مثال ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرض کیجئے ایک شخص کسی دوراہے پر کھڑا ہے اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ ''یہاں ٹھہرنا قطعاً خطرناک ہے اور (ایک راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس راستے کا انتخاب بھی ہر حالت میں خطرناک ہے اور دوسرا راستہ نجات کا راستہ ہے'' پھر وہ ہر ایک کیلئے قرائن اور شواہد اور دلائل بھی بیان کرتا ہے۔

ایسی صورت میں ہر را ہگذر خود کو اس بات کا پابند سمجھے گا کہ وہ اس بارے میں تحقیق کرے اور اس سے بے اعتنائی حکم عقل کے مخالف ہے۔

مندرجہ بالا مقدمہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہم آیاتِ مذکور کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔

زیر بحث آیات میں سب سے پہلی آیت، پیغمبر اسلامؐ کی اسلام کی طرف دعوت کی حقیقی حیات اور صحیح معنوں کی زندگی سے تعبیر کر رہی ہے۔ اس دعوت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام تر مفاہیم کو صرف ایک مفہوم میں سمویا جاسکتا ہے اور وہ ہے ''حیات'' کا مفہوم، وہ حیات جو معنوی اور مادی دونوں طرح اور ہمہ جہاتی حیات پر مشتمل ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں ''حیات'' کی تفسیر خاص طور پر ''قرآن'' یا ''ایمان'' یا ''جہاد'' یا اس قسم کے دوسرے مفہوم سے کی ہے۔[1] لیکن مسلم بات یہ ہے کہ حیات کہ حیات کا مفہوم وسیع ہے جو مذکورہ چیزوں کو بھی اور دوسری ان چیزوں کو بھی اپنے دائرہ میں لے لیتی ہے جس میں مادی اور معنوی دونوں طرح کی زندگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

بہر حال اگر ہم میں سے کوئی شخص اس قسم کا دعویٰ کرے تو کیا ہم اُسے نظر انداز کر دیں گے؟ اور کیا ہم اتنا بھی نہیں کریں گے کہ اس کے بارے میں کسی قسم کی تحقیق کریں؟

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اس قسم کی تعبیر سے ان لوگوں کے اندر مذہبی تحقیق کے ملکہ کو بیدار کرنا چاہتا ہے جو اس کام کیلئے آمادہ ہوتے ہیں۔

''راغب''، ''مفردات'' میں لکھتے ہیں کہ ''استجابت'' درحقیقت جواب حاصل کرنے کیلئے کوشش کرنا ہے اور آمادہ ہونا ہے، اور چونکہ

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱۵ ص ۱۵۷، تفسیر المیزان جلد ۹ ص ۴۳، تفسیر روح المعانی جلد ۸ ص ۱۶۹، تفسیر قرطبی جلد ۴ ص ۲۸۲۵ میں یہ احتمالات ذکر کئے گئے ہیں۔

یہ موضوع عام طور پر جواب پر ختم ہوجاتا ہے،لہٰذا اجابت'' کے معنی سے تفسیر کی گئی ہے۔ [1]

دوسری آیت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کو بیان کررہی ہے جو خداوندِ عالم کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔خدا نے مومنین کو یہ نعمت عطا فرمائی ہے اور پھر اس نعمت کی تفسیر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین اہم پروگراموں کو ذکر فرمایا ہے۔

۱۔۔۔آیات خداوندی کی تلاوت (یتلوا علیھم اٰیاتہٖ)۲۔۔۔تزکیہ اور تربیت (وتزکیھم)۳۔۔۔کتاب وحکمت کی تعلیم (ویعلمھم الکتاب والحکمۃ)

اوران تمام کا نتیجہ ''ضلال مبین'' (کھلی گمراہی) سے نجات ہے۔(وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین)

یہ سب تعبیریں اس لئے ہیں کہ لوگوں کو اسلام کی جانب متحرک کرنے کے اسباب کو اُجاگر کیا جائے اور کم از کم ہر شخص خود کو اس سلسلے میں تحقیق کرنے کیلئے پابند سمجھے کیونکہ ممکن ہے کہ انسان کا بہت بڑا نفع یا نقصان امر میں مضمر ہو۔

''منّت''''مَنّ'' کے مادہ سے مشتق ہے اور بعض مفسرین کے مطابق ''کاٹنے'' اور''قطع کرنے'' کے معنی میں ہے ۔لہٰذا''اجر غیر ممنون'' اس جزا کو کہتے ہیں جو کبھی منقطع نہیں ہوتی۔اسی طرح ان چھوٹے چھوٹے قطرات کو جو شبنم کی مانند درختوں کے پتوں پر بیٹھتے ہیں (گوند کی مانند چھوٹے چھوٹے ذرے جن میں مٹھاس پائی جاتی ہے) کو بھی ''من'' کہتے ہیں۔

لیکن ''راغب'' کے بقول ''من'' دراصل اس پتھر کو کہتے ہیں جس کے ساتھ چیزوں کو تولا جاتا ہے۔پھر اس کا اطلاق ہر عظیم اور گراں قدر نعمت پر ہونے لگا۔

جب اس لفظ کا اطلاق خداوندِ عالم کے بارے میں ہوتا ہے تو اس کے معنی نعمت عطا کرنے کے ہوتے ہیں اور جب انسانوں کے بارے میں ہوتا ہے تو غالباً اس کے معنی ایسی خدمت کے بارے میں بات کرنا ہوتے ہیں جو وہ دوسروں کے لئے انجام دیتے ہیں۔اسی لئے پہلے معنی محبوب وقابلِ محبت ہیں اور دوسرے منفور اور قابل نفرت ہیں۔

تیسری آیت بعثت انبیاء کے ایک اور اہم ہدف یعنی ''عدالت اجتماعی'' کے طرف اشارہ کررہی ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انبیاء کو تین چیزوں کے ساتھ آراستہ کیا ہے، سب سے پہلے تو وہ روشن دلائل ہیں جو''معجزات'' اور عقلی دلائل'' دونوں پر مشتمل ہیں ۔(لقد ارسلنا رسلنا بالبینات)

دوسری آسمانی کتاب ہے جو تمام لوگوں کے معارف اور فرائض کو بیان کرتی ہے۔نیز وہ میزان ہے جس کے ذریعہ سے حق اور باطل کو پرکھا جاتا ہے (خدائی قوانین، اقدار اور مخالف اقدار کا بیان جو نیکیوں اور برائیوں کے وزن کرنے کا معیار ہے۔(وانزلنا معھم الکتاب والمیزان)

''میزان'' دراصل ''ترازو'' کے معنی میں ہے،یعنی وہ ذریعہ جس کے ساتھ چیزوں کو تولا جاتا ہے۔

---

[1] البتہ توجہ رہے کہ''اجابت'' کا لفظ حرف جر کے بغیر متعدی ہوا ہے،جب کہ''اجابت'' عام طور پر''لازم'' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں بعض مفسرین نے ''میزان'' کو اسی معنی میں لیا ہے جب کہ غالب مفسرین نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ''میزان'' سے مراد وہ ذریعہ ہے جس سے انسان عدالت کی کمی بیشی اور حق و باطل کو پہچان کرتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس کی ''خدائی قوانین'' اور اقدار و مخالف اقدار'' کے معنی سے تفسیر کی جاسکتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ امور آسمانی کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن ان کا مستقل صورت میں ذکر کرنا ان کی اہمیت کی وجہ سے ہے۔

صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو، کیا یہ بات ممکن ہے کہ انسان یہ سنے کہ ایک شخص اس قسم کے تاریخ ساز حقائق کی طرف دعوت دے رہا ہو اور وہ خود کو اس بارے میں تحقیق کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے؟

فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم وہ ہے جو ''نفس مطمئنہ'' کے مقام پر پہنچی ہوئی ہے، اسے بارگاہِ ایزدی کے قرب کا شرف حاصل ہے اور کتاب خدا کے سوا کسی اور چیز پر عمل نہیں کرتی، خدا کے سوا اس کا کوئی اور ہدف اور مقصود نہیں ہوتا۔ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ اسی قسم کے لوگوں کا ہدف ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جو ''نفس لوّامہ'' کی حامل ہے، جس کا شمار ''اصحاب الیمین'' میں ہوتا ہے ایسے لوگوں کے اخلاق اور معرفت کی پہچان کیلئے ایک معیار کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ وہ افراط و تفریط سے بچے رہیں اور ''المیزان'' کی تعبیر ایسے ہی لوگوں کیلئے ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو ''نفس امارہ'' کا مالک ہے، اور اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (ہم نے لوہا نازل کیا) اس قوم کے لوگوں کیلئے جنہیں سزا کی ضرورت ہوتی ہے۔ [1]

چوتھی آیت میں مختلف امور کی طرف شارہ کیا گیا ہے، خصوصاً بعثتِ انبیاء کے سیاسی اور اجتماعی پہلو کو بھی اور آسمانی ادیان کے نزول کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ لوگوں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کی ترغیب دلانے کیلئے آنحضرتؐ کے کچھ اوصاف بیان کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں: ''آپؐ انہیں نیکیوں کی دعوت دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں، جو پاک و پاکیزہ چیز ہے ان کیلئے حلال اور جو خبیث و پلید ہیں اُن کیلئے حرام قرار دیتے ہیں'' یہاں تک کہ فرمایا ''پیغمبر اکرمؐ سنگین بوجھ کو ان کے کندھوں سے اتارتے ہیں اور جو طوق و زنجیر ان پر تھے، انہیں اُن سے اتارتے ہیں۔'' (وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ)

یقیناً یہ ایسے امور ہیں جو انسان کی تقدیر کو سنوارتے اور اس کے ارتقاء اور سود و زیاں کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس کا احتمال ہی کافی ہے کہ وہ انسان کو تحقیق پر آمادہ کرتا ہے۔

''اِصْر'' (بروزن مصر) دراصل کسی چیز کو زبردستی باندھنے اور انہیں قید کرنے کے معنی میں ہے پھر اس کا اطلاق سنگین بوجھ اور ہر اس بھاری کام پر ہونے لگا جو اس کو اپنی سرگرمیوں سے باز رکھے۔ اور پھر اسی مناسبت کے پیش نظر ان طنابوں، میخوں اور کیلوں کو بھی

---

[1] تفسیر کبیر از فخر الدین رازی جلد ۲۹ صا ۲۴

''آصار'' کہا جانے لگا جس کے ساتھ ستونوں کو باندھتے ہیں۔اسی مناسبت کی وجہ سے عہد و پیمان اور گناہ کو بھی ''اصر'' کہتے ہیں۔ [1]

ارباب لغت اور صاحبانِ تفسیر کی تعبیروں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، جس سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ لفظ دراصل ''اصر'' اس سنگین چیز کو کہتے ہیں جو قیدی کے پاؤں میں باندھتے ہیں تاکہ وہ اس سے چل پھر نہ سکے (جسے ہم ''جولان'' کہتے ہیں) اس کا ''اغلال'' کے ساتھ ساتھ بیان ہونا اسی معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔اغلال کے معنی وہ طوق اور زنجیر ہیں جو قیدی کے گردن میں ڈالتے ہیں۔پھر ''اصر'' کے کئی اور معنی بھی ذکر ہوئے ہیں جو اس کے اصلی معنی سے مناسبت رکھتے ہیں۔

اگرچہ بہت سے مفسرین نے اس آیت میں ''اصر'' اور ''اغلال'' کو گزشتہ امتوں میں محنتِ شاقہ یا مشکل اور پیچیدہ امتحانات کے معنی میں لیا ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں الفاظ کا ایک نہایت ہی وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے اسارت کی زنجیروں اور سنگین بوجھ کو شامل ہے، خواہ وہ ''جہالت'' ہو یا ''شہوات''، ''گناہ'' ہوں یا ''استبداد'' و ''استعمار'' اور اس قسم کی دوسری چیز، جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس وجود اور ان کی آزادی بخش تعلیمات کے صدقے میں اٹھالی جائیں گی۔

پانچوں آیت حضرت ابراہیمؑ بت شکن کی زبانی بیان ہوئی ہے جب انہوں نے بت پرستوں کو مخاطب کر کے انہیں اُن کے ان قبیح فعل پر سرزنش کی اور ان کی سوئی ہوئی عقلوں کو بیدار کرتے ہوئے فرمایا:

''جب تم بتوں کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آوازیں سُن لیتے ہیں؟ کیا انہوں نے کبھی تمہیں کوئی فائدہ پہنچایا ہے؟ یا وہ کسی کو نقصان بھی پہنچاسکتے ہیں؟ کیونکہ کسی کی عبادت یا تو اس کے فائدہ اور مفاد پہنچانے کی وجہ سے کی جاتی ہے یا نقصان اور سزا سے بچنے کیلئے ا

یقیناان کے پاس ان سوالات کا کوئی مثبت جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنے ماسلف لوگوں کے دامن سے متمسک ہوں اور یہ کہیں: ''بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ'' (ہم نے اپنے آباواجداد کو ایسا کرتے دیکھا ہے اور بس ا)

اس قسم کی تعبیروں سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ نفع اور نقصان کا باعث ہی معرفت خدا کی طرف حرکت کا موجب بن جاتا ہے (صرف مادی نفع اور نقصان ہی نہیں، معنوی نفع اور نقصان بھی ہے جو اس سے بالاتر و برتر ہے)

زیر بحث آیات کی چھٹی آیت جس کا تعلق سورہ فصلت سے ہے، ہم پڑھتے ہیں کہ ''ولید بن مغیرہ'' جو زمانہ جاہلیت میں عرب کا مشہور شخص تھا اور مشکلات میں لوگ اس سے مشورے لیا کرتے تھے: اس سے ''ابوجہل'' نے پوچھا: ''محمدؐ جو کچھ کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ جادو ہے؟ کہانت ہے؟۔۔۔۔۔کیا ہے؟'' تو ولید نے کہا: ''پہلے مجھے اس کا جائزہ لینا چاہیے اور اس کی تحقیق کرنی چاہیے''۔جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا تو حضور اکرمؐ نے سورہ فصلت کی کچھ آیات پڑھیں اور زیر بحث آیت کو تلاوت فرمایا: ''اگر وہ روگردانی کریں تو آپ اُن سے کہہ دیں کہ میں تمہیں اس صاعقہ سے ڈراتا ہوں جو عاد اور ثمود جیسا صاعقہ ہے'' (فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۵ ص ۴۸۸ و تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱۵ ص ۲۵ تفسیر روح المعانی جلد ۹ ص ۷۲، مفردات راغب مادہ ''اصر'' اور کتاب ''العین'' جلد ۷ ص ۱۴۷

عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ)

یہ سن کر ولید لرزہ براندام ہوگیا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہاں سے اٹھا، سیدھا گھر پہنچا اور گھر کا دروازہ بند کرلیا، حتیٰ کہ قریش کے سرداروں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ مائل بہ اسلام ہوچکا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے پاس پہنچے اور وضاحت چاہی تو اس نے کہا ''میں ہرگز مسلمان نہیں ہوا، لیکن سچ بات یہ کہ محمدؐ کی باتوں میں بلا کی کشش ہے جس سے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ میری پیش کش یہ ہے کہ تم انہیں ساحر کہا کرو۔ [1]

کیا اس قسم کی تہدیدات (ان لوگوں کیلئے جو ایمان نہیں لائے) تحقیق کی طرف قدم اٹھانے کا باعث نہیں بنیں گی؟

زیر بحث آیات کی ساتویں آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جارہا ہے کہ وہ اپنے تمام مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں ایک مسئلے کی نصیحت کریں اور وہ یہ کہ ''وہ انفرادی یا اجتماعی صورت میں خدا کے لئے کھڑے ہوجائیں اور اپنی فکر کو کام میں لائیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ پیغمبر اسلامؐ نہ تو مجنون ہیں اور نہ ہی ساحر بلکہ وہ سخت عذابِ الٰہی سے ڈرانے والے ہیں۔'' (اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ)

اس آیت کی تمام تعبیریں جچی تلی ہیں۔

''انّما'' کے ساتھ تعبیر، جو حصر کیلئے ہے (صرف ایک ہی چیز ہے)

''موعظہ'' کے لفظ کے ساتھ تعبیر، جو عام طور پر ایسے مقامات پر بولا جاتا ہے کہاں پر عقل کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرتی ہے، لیکن چونکہ انسان اس سے غافل ہوتا ہے لہٰذا کوئی دل سوز شخص اسے نصیحت کرتا اور خوابِ غفلت سے جگاتا ہے۔

''قیامؐ کی تعبیر پختہ مقاصد کی بجا آوری کیلئے مکمل طور پر تیاری کی علامت ہے۔

''مثنیٰ'' اور ''فُرادیٰ'' کی تعبیر اس راہ میں اجتماعی اور انفرادی سرگرمیوں اور ہر قسم کی تلاش اور کوشش کی طرف اشارہ ہے (مسلم بات ہے کہ جب انسان تنہائی میں سوچتا ہے تو گہری سوچ ہوتی ہے اور اگر اجتماعی صورت میں غور وفکر کرتا ہے تو وہ کامل ترین سوچ ہوتی ہے، کیونکہ اسی صورت میں کئی افکار آپس میں مل جاتے ہیں اور ان دونوں کو ملا کر ایک نئی راہ نکلتی ہے جو بہترین راہ ہوتی ہے۔ [2]

''تفکر'' کی تعبیر ان افکار کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے اندر سے پیدا ہوتے ہیں اور واضح عقلی دلائل کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷ ص ۲۱۱ اور دوسری تفاسیر (اصل حدیث تو بڑی مفصل ہے لیکن ہم نے اس کو خلاصہ کے طور پر پیش کیا ہے۔) اس کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۲۰ میں ملاحظہ فرمائیں

[2] بعض کہتے ہیں کہ ''مثنیٰ'' کا لفظ ''مناظرہ'' کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ حق کی دریافت میں اس کا وافر حصہ ہے، جب کہ ''فرادیٰ'' کا لفظ تنہائی کے مطالعات کی طرف اشارہ ہے۔ بعض لوگوں کا احتمال یہ بھی ہے کہ ''مثنیٰ'' کا لفظ ایسی سوچ کی طرف اشارہ ہے جو انسان دن کو دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر سوچتا ہے اور ''فرادیٰ'' ایسے افکار ہیں جو رات کو یا اور تنہائی کی حالت میں سوچے جاتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۳ اور ۹۳)

''للم'' (تمہارے لئے) کی تعبیر اور وہ بھی ڈرانے کے مسئلے اور عذاب شدید کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ مربوط ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں صرف تمہارے ہی نفع اور نقصان کی بات کی جارہی ہے اور پیغمبر اسلامؐ کا بھی صرف اور صرف یہی مقصد ہے۔ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی کیا ہم قرآن کی دعوت کو صحیح معنوں میں دعوت نہ سمجھیں، اس پر غور وفکر نہ کریں اور حق کو حاصل کر کے اس کی اتباع نہ کریں؟

نتیجہ

مندرجہ بالا آیت اور اس طرح کی کئی اور آیات اس بات کا بخوبی پتہ دیتی ہیں کہ ''معرفت الٰہی'' کے راستے میں تلاش اور جستجو عقل کا تقاضا ہے۔یہ اس بات کی غماز ہیں کہ خدا کی جانب دعوت دینے والے انبیاء ومرسلین کی دعوت کا کوئی عقل مند انکار نہیں کرسکتا اور دعوت بھی ایسی جس کا ہر ایک شخص کی تقدیر وانجام کے ساتھ گہرا تعلق ہو۔

یہ مذہبی تحقیقات کے اسباب کی پہلی سیڑھی ہے۔

چند مزید وضاحتیں

ا۔اسلامی روایات میں مذہب کے عقلی ہونے کے اسباب

ا۔ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ان کے ایک صحابی نے ''ضعفاء (مستضعفین) کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے اُسے یہ جواب دیا۔

''العیف من لم ترفع الیه حجة ولم یعرف الاختلاف ،فاذا عرف الاختلاف فلیس بمستضعف''یعنی مستضعف وہ ہے جس کے پاس کوئی دلیل نہ پہنچی ہو، (دین ومذہب کے سلسلے میں) اسے اختلاف کا کوئی علم نہ ہو اور جب وہ اختلاف سے باخبر ہوگیا، تو پھر مستضعف نہیں رہا۔ [1]

۲۔یہی چیز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

''من عرف الاختلاف الناس فلیس بمستضعف''یعنی جس کو لوگوں کے اختلاف کا علم ہوگیا وہ مستضعف نہیں رہا۔ [2]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان اختلاف سے باخبر ہوگیا تو اس کی عقل تحقیق اور مطالعہ کے میدان میں پہنچا دیتی ہے، پھر وہ

---

[1] صول کافی جلد ۲ ص ۴۰۶ حدیث ۱۱ (باب المستضعف)

[2] (۲) اصول کافی جلد ۲ ص ۴۰۶ حدیث ۱۱ (باب المستضعف)

مستضعف نہیں رہتا ہے۔البتہ یہاں پر مستضعف سے مراد وہی ''فکری مستضعف'' ہے جسے ہم کبھی ''جاہلِ قاصر'' کے نام سے پکارتے ہیں۔

۳۔ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اربعة تلزم کل ذی حجی وعقل من امتی ،قیل یارسول اله ماهن؟قال استماع العلم وحفظه ونشره والعمل به'' چار چیزیں ایسی ہیں جو میری امت کے ہر ذی عقل اور باشعور انسان پر لازم ہیں ،علم ودانش کو کان لگا کر سننا،اسے یاد کرنا اس کی نشر واشاعت کرنا اور اس پر عمل کرنا۔ [1]

اس طرح آنحضرتؐ نے کان لگا کر سننے اور تحقیق وجستجو سے کام لینے کو عقل ودرایت کی علامت قرار دیا ہے۔

۲۔متعصب دشمن

ہمیشہ آزاد منش اور آزاد طبع لوگ جو تحقیق حق کو عقل فریضہ سمجھتے ہیں ،کے مقابلے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو چمگادڑوں کی مانند چہرۂ حق دیکھنے سے وحشت کرتے ہیں۔حتیٰ کہ اگر ان کے کانوں کے نزدیک خدا کی ندا دینے والوں کی آواز پہنچ جائے تو وہ اپنے کانوں کو بند کر لیتے ہیں تا کہ حق کی آواز کو نہ سن پائیں۔

قرآن مجید نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگوں کے بارے میں خود نوح علیہ السلام کی زبانی یہ کیفیت بیان کی ہے۔جب حضرت نوح علیہ السلام نے رب العزت کی بارگاہ میں ان کے بارے میں شکایت کی:

''وَاِنِّیْ کُلَّمَادَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَلَهُمْ جَعَلُوْآاَصَابِعَهُمْ فِیْ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْ اوَسْتَکْبَرُوْ ااسْتِکْبَارًا'' جب بھی میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ ایمان لے آئیں اور تو انہیں معاف کر دے،تو وہ اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اپنے لباس کو اپنے اوپر اچھی طرح لپیٹ لیتے ہیں۔(تا کہ وہ میری آواز کو نہ سن سکیں یا میرے چہرے کو نہ دیکھ سکیں؟) اور اپنی تعصب آمیز مخالفت میں اصرار کرتے ہیں اور شدید استکبار کا اظہار کرتے ہیں۔(سورہ نوح/۷)

مشرکین مکہ بھی گویا متعصب قومِ نوحؑ کے وارث تھے،لہٰذا اس سے پیچھے نہیں رہے،قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے:

''وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْالَتَسْمَعُوْالِهٰذَاالْقُرْاٰنِ وَالْغَوْافِیْهِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ''اور کافروں نے کہا اس قرآن کو کان نہ دو اور شور شرابا مچاؤ(تا کہ لوگ قرآن کی آواز کو نہ سن پائیں)شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔(حم السجدہ/۲۶)

اس قسم کے لوگوں کے پیروکار ہر دور،ہر زمانے میں ہوتے ہیں اور وہ کبھی بھی مسائل کی تحقیق نہیں کرتے۔یہ لوگ ایسے بے عقل اور احمق ہوتے ہیں جیسے چمگادڑ جسے آفتابِ عالمتاب کی روشنی سے خطرہ لاحق ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ تاریکی ہی میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔ان کو اپنی جہالت پر فخر ہوتا ہے اور یہی لوگ ساری دنیا سے زیادہ محروم ہوتے ہیں کیونکہ وہ کھلم کھلا آفتابِ عالم کے دشمن ہوتے ہیں۔

---

[1] تحف العقول مواعظ النبی ص ۴۰

۳۔عاطفی سبب

اشارہ:

ایک مشہورضرب المثل ہے کہ:''اَلْاِنْسَانُ عَبِیْدُ الْاِحْسَانِ''یعنی انسان،احسان کا بندہ ہے۔

یہی چیز تھوڑے سے فرق کے ساتھ حضرت امیر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے،آپؑ فرماتے ہیں:

''اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ''انسان،احسان کا بندہ ہے۔

ایک اورروایت میں آپؑ ہی سے منقول ہے کہ:''بِالْاِحْسَانِ تُمْلَكُ الْقُلُوْب''احسان کے ذریعے انسانی قلوب کومسخر کیا جاسکتا ہے۔

نیز ایک اورحدیث میں حضرت علیؑ ہی فرماتے ہیں''وَاَفْضِلْ عَلٰی مَنْ شِئْتَ تَكُنْ اَمِیْرَہ''جس پرتم نیکی کروگے اسی کے امیر بن جاؤگے۔

ان سب کی اصل پیغمبرؐ خدا کی وہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے ارشادفرمایا:

''اَنَّ اللّٰہَ جَعَلَ قُلُوْبَ عِبَادِہٖ عَلٰی حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اَلَیْھَا وَبُغْضِ مَنْ اَسَلَمَ اِلَیْھَا''خداوندِعالم نے دلوں کوان لوگوں کی محبت میں مسخر کردیا ہے جواُن کے ساتھ اچھائی کرتے ہیں اوران لوگوں کے لئے بغض قرار دیا ہے جوان سے برائی کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام ا یہ ایک حقیقت ہے کہ جوشخص کسی کی خدمت کرتا ہے،یا کوئی نعمت عطا کرتا ہے تومحبت وعطوفت کے تمام وسائل انسان کو اسی کی طرف متوجہ کردیتے ہیں۔اس طرح سے اس کا اس کے ساتھ تعلق قائم ہوجاتا ہے۔اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اسی طرح پہچانے اوراس کا شکریہ ادا کرے اورپھر یہ نعمت جس قدراہم اورزیادہ پائیدار ہوگی،''منعم''کی طرف اس کے عاطفوں کا تحرک بھی زیادہ ہوگا اوراس کی''پہچان اورمعرفت''کیلئے بھی زیادہ خواہش مند ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ علمائے علمِ کلام(علم العقائد)نے قدیم الایام سے ہی''شکرِ منعم''کے مسئلے کومذہب کی تحقیق کے بارے میں اورمعرفتِ الٰہی کے سلسلے میں ایک اہم سبب قرار دیا ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ''شکرِ منعم''ایک عقلی حکم ہونے سے پہلے ایک عاطفی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔اس مختصر سے اشارے کوہم عرب کے مشہورشاعر''ابوالفتوح بستی''کے شعر پرختم کرتے ہیں۔شعرعرض ہے ؎

اَحْسِنْ اِلَی النَّاسِ تَسْتَعْبِدْ قُلُوْبَھُمْ

فَطَالَمَا اسْتَعْبَدَ الْاِنْسَانَ اِحْسَانٌ

لوگوں کے ساتھ احسان اورنیکی کروتا کہ ان کے دلوں کواپنا غلام بنالو،کیونکہ انسان ہمیشہ سے احسان کا بندہ چلا آرہا ہے۔

اسی اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی خدمت میں حاضر ہوکر درجِ ذیل آیات کوگوشِ دل سے سماعت کرتے ہیں۔ارشادرب

العزت ہے:

۱۔وَاللّٰہُ اَخرَجَکُمۡ مِّنۡ بُطُوۡنِ اُمَّہٰتِکُمۡ لَاتَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئاً وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡئِدَۃَ لَعَلَّکُمۡ تَکُرُوۡنَ

(نحل/۷۸)

۲۔وَھُوَالَّذِیۡ سَخَّرَالۡبَحۡرَلِتَاۡکُلُوۡامِنۡہُ لَحۡمًاطَرِیًّاوَّتَسۡتَخۡرِجُوۡا مِنۡہُ حِلۡیَۃً تَلۡبَسُوۡنَھَا وَتَرَی الۡفُلۡکَ مَوَاخِرَ فِیۡہِ ۔ وَلِتَبۡتَغُوۡمِنۡ فَضۡلِہٖ وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ

(نحل/۱۴)

۳۔فَکُلُوۡامِمَّارَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلَالاًطَیِّبًاوَّاشۡکُرُوۡانِعۡمَتَ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ

(نحل/۱۱۴)

ترجمہ

۱۔۔۔اورخداوندِ عالم نے تمہیں ماؤں کے شکم سے نکالا، حالانکہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔لیکن اس نے تمہارے لئے کان، آنکھیں، اور عقلیں قرار دی ہیں تا کہ تم اس کا شکر بجالاؤ۔

۲۔۔۔وُہ خداتووہ ہے جس نے سمندرکو(تمہارے لئے)مسخرکردیاہے تا کہ تم (اس کا)تازہ گوشت کھاؤاور پہننے کیلئے زینت کے وسائل اس سے باہرنکالو۔اورتوکشتیوں کودیکھتاہے کہ وہ پانی کے سینہ کوشگافتہ کرتی ہیں تا کہ تم (تجارت کرکے) خداکے فضل سے بہرہ مندی کرو، شاید کہ اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

۳۔۔۔جب یہی حالت ہے توخدانے جوروزی تمہیں عطا کی ہے تم حلال اور پاکیزہ کوکھاؤاورخدا کی نعمت کا شکر بجالاؤ، اگرتم اس کی عبادت کرتے ہو۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

شکرِ منعم، معرفتِ الٰہی کا زینہ ہے

سب سے پہلے آیت خداوندِ عالم کی اہم ترین نعمتوں کا ذکر کررہی ہے تا کہ انسان کی شکرگزاری کی حس کو متنبہ کردے اوراس طرح سے وہ اسے ''منعم'' کی معرفت کی دعوت دے رہی ہے۔نعمت کی گفتگو معرفت کا ذریعہ ہے''آنکھ''،''کان''اور''عقل'' کے متعلق فرماتا ہے: ''جب تم اپنی ماؤں کے شکم سے باہرآئے تھے تو اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے۔خداوندِ عالم نے تین ذرائع تمہارے اختیار میں دیدیئے :کان،آنکھ،اور عقل''(وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ)

کان کے راستے سے تم''نقلی علوم''اور دوسرے لوگوں کی دانش سے آشنا ہوتے ہو۔

آنکھ کے ذریعہ اسرارطبیعت اورعجائب آفرینش کے مشاہدہ سے''سائنسی''اور''تجرباتی علوم''سے ،اورعقل کے ذریعہ''عقلی علوم''اور منطقی تجزیہ وتحلیل سے۔

اگرچہ آیت میں یہ تین موضوع واوعاطفہ کے ذریعہ ایک دوسرے پرعطف ہورہے ہیں اورضروری بھی نہیں ہے کہ اس میں ترتیب کے معنی پائے جائین ،لیکن پھربھی بعیدنہیں ہے کہ فطری ترتیب شایداسی طرح ہو کیونکہ انسان اپنی پیدائش کے کچھ عرصہ بعدتک مشاہدہ اوردیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ چونکہ تاریکی کا عادی ہوتا ہے لہٰذا نور سے وحشت کرتا ہے اوراپنی آنکھوں کوایک عرصہ تک بند رکھا ہے جب کہ کان پہلی آواز کوسُن لیتا ہے اورظاہر ہے کہ قدرتِ عقلی اورتمیز وشعورانسان میں شنوائی اور بینائی کے بعدہی زندہ ہوتے ہیں، خاص کر جو''فُؤاد''بقولِ اربابِ لغات''پختہ اورعمیق عقل'' کے معنی میں ہیں،نہ کہ عقل کا ہرطرح کا سادہ مرحلہ،اورظاہر ہے کہ پختہ عقل توان سب کے بعدہی وجود میں آتی ہے۔

ضمنی طور پربھی ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ مندرجہ بالاآیت اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتی ہے کہ''کلیات عقلیہ'' تک رسائی جس کے ذریعہ''جزئیات'' کے علم کے بعدہی ہوتی ہےاورمندرجہ بالاآیت اس بات کی صراحت کررہی ہے کہ اس قسم کی نعمتوں کے عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی شکرگزاری کی حس کومتحرک کیا جائے کیونکہ وہ اسے خالق کی محبت،اللہ کی معرفت اوراس کے احکام واوامر کی اطاعت کی طرف بلاتی ہے۔

البتہ یہ چیزانسان کے بعض علوم کے فطری ہونے کے منافی نہیں ہے، کیونکہ فطری معلومات بوقتِ ولادت انسان کی سرشت مین استعداداورلیاقت کی صورت میں تو ہوتی ہیں لیکن وہ بالفعل ظاہرنہیں ہوتیں، بلکہ آہستہ آہستہ بارآور ہوتی رہتی ہیں۔

دوسری آیت میں خدا کی نعمتوں میں سے ان تین نعمتوں کا ذکر ہے جن کا تعلق سمندر کی تسخیر کے ساتھ ہےاوراسے فضلِ خدا سے فائدہ اٹھانے اورشکراداکرنے کا سبب بتایا گیاہے۔

پہلی نعمت گوشت کا مواد ہے جو سمندر سے حاصل کیا جاتا ہے اور اسے ''لَحْمًا طَرِيًّا'' (زیادہ گوشت) سے تعبیر کیا گیا ہے، ایسا گوشت جس کی پرورش کی انسان کو تکلیف نہیں اٹھانی پڑی صرف دستِ قدرت الٰہی نے ہی اسے دریاؤں کے دل میں پروان چڑھایا اور اب بلا کسی قیمت کے اس کے اختیار میں دے دیا۔ اور یہ چیز خدا کی بہت بڑی نعمت شمار ہوتی ہے، خصوصاً اس زمانے میں جب پرانے گوشت کی فراوانی تھی اور لوگ مجبور تھے کہ نمک لگا کر یا بھون کر یا دھوپ میں خشک کر کے اُسے محفوظ کر لیتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا گوشت مسافروں کے لئے کئی قسم کی بیماریوں کا سبب بن جاتا، زہریلے مواد کی صورت اختیار کر لیتا، جب کہ دریائی سفر یا ساحلی سفر میں بڑے آرام کے ساتھ تازہ گوشت سے استفادہ کرتے تھے۔

پھر اس آرائش اور زیبائش مواد کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے جو سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالا جارہا ہے اور انسان اس سے استفادہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''تم اس سے زینتی وسائل نکالتے ہو اور پہنتے ہو'' (وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا)

یعنی خداوندِ عالم نے غذا جیسے ضروری مواد سے لے کر ایسے وسائل تک تمہارے اختیار میں دے دیئے ہیں جن کا مصرف صرف آرائش و زیبائش ہے۔

اور آخری مرحلہ میں سمندر کی برکتوں میں سے ایک اور برکت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ایسی برکت ہے جو آج تک انسانی زندگی میں نہایت مؤثر ہے اور وہ ہے ضروریات زندگی کے مال و متاع اور انسانوں کی نقل و حمل کیلئے سمندر کے وسیع و عریض راستوں سے استفادہ کرنا۔ اگر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ دنیا کے تقریباً ۷۵ فیصد حصے کو سمندر نے ڈھانپ رکھا ہے اور دنیا کے ہر حصے تک اس کے ذریعہ رسائی ہو سکتی ہے، تجارتی مال کا اہم حصہ اور ضروریات زندگی کا اہم مواد اسی راستے سے جا بجا ہوتا ہے اور بیشتر مسافرت بھی اسی راستے سے انجام پاتی ہے، لہٰذا اس بات کی اہمیت اور واضح ہو جاتی ہے ارشاد ہوتا ہے ''تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ پانی کے سینے کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔'' (وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ)

آخر میں فرماتے: ان نعمتوں کی بخشش اس لئے ہے ''کہ تم خدا کے فضل سے بہرہ برداری کرو اور اس کا شکر بجالاؤ'' (وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ)

۲۔ اس طرح ان نعمتوں کی طرف توجہ کو بھی شکر گزاری کی روح کو زندہ کرنے اور اس کے ساتھ ہی معرفت الٰہی کے حصول کا ذریعہ قرار دیا ہے، اگرچہ خدا کو ہمارے شکر کی کیا ضرورت ہے؟

یہ سب کچھ اس کی ذات اور صفات کی معرفت اور کمالِ مطلق کی طرف حرکت کے بہانے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ''مواخر''، ''ماخرة'' کی جمع ہے جو ''مخر'' (بروزن فخر) کے مادہ سے ہے، صاحبانِ لغت اور اربابِ تفسیر کی مجموعی گفتگو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے اصل معنی ''چیرنا'' یا ''پھاڑنا'' ہیں۔ کشتی کے سینہ سے ''پانی کی موجوں'' کو چیرنا یا چہرے، ناک اور جسم کے اگلے حصے کے ذریعہ ''ہوا کی موجوں'' کو چیرنا، یا زمین کے سینے کو زراعت کیلئے چیر پھاڑ کرنا، چونکہ یہ امور غالباً آواز کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے

ہیں لہٰذا یہ لفظ تیز وتند آندھیوں کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔[1]

اصولی طور پر انسان کی ساری زندگی کائنات کی رکاوٹوں کے درمیان سے ہوکر گزرتی ہے لہٰذا اس کو چاہیے کہ وہ ان رکاوٹوں کے سینے کو چیرتے ہوئے آگے نکل جائے اور یہی اہم نکتہ ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ ''مواخر'' اس کشتی کو کہتے ہیں جو چل رہی ہو۔ اسی لئے ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے اس کی ''جاریہ'' کے معنی میں تفسیر کی ہے۔[2] اور کشتی کی اہمیت بھی تو اسی وقت ہوتی ہے جب وہ چل رہی ہو۔

تیسری اور آخری آیت میں مشرکین مکہ، یا مومنین یا قوی احتمال کے مطابق ان سب کی طرف خطاب ہے۔ حکم ہو رہا ہے کہ ''جو کچھ خدا نے تمہیں روزی عطا فرمائی ہے اس سے حلال و پاکیزہ کو کھاؤ اور اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ'' (فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ) قابل توجہ بات یہ ہے کہ آخر میں فرماتا ہے ''اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو'' (إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ)

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر قضیہ شرطیہ اس لئے لایا گیا ہے کہ وہ خدا پرست نہیں ہیں، اس کی نعمت کا شکر بالکل ہی بجا نہیں لاتے اور منطقی اصطلاح کے مطابق ''سالبہ بانتفائے موضوع ہے''۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس قضیہ شرطیہ کی جزا وہی جملہ ''فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ------'' ہے جو اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یعنی اس اسم کی روزی تمہارے لئے اس وقت حلال اور طیب ہے جب تم خدا کے بندے اور اس کے فرمانبردار ہوگے، کیونکہ اس کی اس دنیا کی تمام نعمتیں مومن انسانوں کیلئے پیدا کی گئی ہیں، جس طرح باغ کا مالی پھولوں کی خاطر پودوں کی آبیاری کرتا ہے نہ کہ کانٹوں کے لئے، ہر چند کہ کانٹے بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

ایک تیسری تفسیر بھی ذکر کی گئی اور وہ یہ کہ خطاب بت پرستوں کو ہے کہ اگر تم کسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو تو اس کی عبادت کرو جو تمہارا ولی نعمت ہے۔ تم کیوں بتوں کی پرستش کرتے ہو جن کا کوئی بھی اثر نہیں۔[3]

ان تفاسیر کو آپس میں جمع کرنا بھی ممکن ہے کیونکہ ظاہر میں مخاطب تمام مومنین اور کفار ہیں، اگرچہ اس آیت سے پہلے اور بعد کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ روئے سخن زیادہ تر کفار کی طرف ہے۔

صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو اس سے ''نعمت''، ''شکر''، ''عبادت'' اور پھر ''معبود کی معرفت'' اور ''ولی نعمت'' کے درمیان باہمی تعلق بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اس طرح معرفت کے دوسرے سبب کا پتہ چلتا ہے کہ جو شکرِ منعم کا مسئلہ ہے۔

---

[1] کتاب ''العین''، ''مفرداتِ راغب''، تفسیر قرطبی، اور لغات کی دوسری کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۲۰ ص ۷ یہی معنی تفسیر روح المعانی اور تفسیر قرطبی میں بھی اس آیت کے ذیل میں بیان ہوئے ہیں۔

[3] تفسیر کشاف جلد ۲ ص ۶۴۰۔ آخری تفسیر ایک احتمال کے طور پر تفسیر المیزان اور تفسیر روح المعانی میں انہی آیات کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔

شُکرِ منعم اسلامی روایات میں:

۱۔ایک حدیث میں حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لولم یتوعداللہ علی معصیۃ لکان یجب اَلّایُعْصٰی شکرًالنعمہ"اگرخداوندِ عالم نے گناہوں پرعذاب سے نہ بھی ڈرایا ہوتا پھربھی اس کی نعمتوں کا تقاضا یہی تھا کہ اس کا شکرضرور بجالا جائے۔[۱]

اس حدیث میں"واجب" کی تعبیر درحقیقت وہی فریضہ ہے جوانسانی عاطفہ کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔

۲۔حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ کے پاس تھے۔انہوں نے سرکاررسالت مآبؐ سے پوچھا: آپؐ (عبادت کیلئے) اپنے آپؐ کواس قدررحمت میں کیوں ڈالتے ہیں۔ جب کہ خدانے آپ کے گزشتہ اورآئندہ گناہ معاف کردیئے ہیں۔[۲] آپؐ نے ارشادفرمایا:اَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا کیامیں خدا کا شکرگزار بندہ بنوں۔[۳]

۳۔امام چہارم حضرت علی ابن الحسین زین العابدین علیہ السلام صحیفہ سجادیہ کی ایک دعامیں فرماتے ہیں:

"حمدوستائش اس خدا کیلئے ہے کہ اگراس نے اپنے بندوں پر پے درپے اورفراواں نعمتوں کے بدلے میں اپنی حمدوکا طریقہ نہ بتایا ہوتا کہ اس کی نعمتوں سے تو بہرہ مند ہوں لیکن اس کی حمدکو بجانہ لائیں، اس کے رزق سے بہرہ ورہوں لیکن اس کا شکربجانہ لائیں، تواس وقت انسان اپنی انسانی حدود سے نکل کرپستی میں حیوانوں کی سرحدتک جاپہنچتے اورخدا کے اس فرمان کا مصداق بن جاتے کہ (اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ) وہ چوپایوں کی مانند بلکہ اس سے بھی زیادہ گمراہ ہوتے۔[۴]

۴۔نہج البلاغہ میں حضرت امیر علیہ السلام کا ایک اورفرمان ذیشان ہے:

"ولوفکروافی عظیم القدرۃ وجسیم العنمۃ لرجعواالی اطریق وخافواعذاب الحریق ولکن القلوب علیلۃ والبصائر مدخوالۃ"یعنی اگروہ لوگ خدا کی قدرت کی عظمت اوراس کی نعمتوں کی بزرگی میں غورفکرکرتے توراہِ (راست) کی طرف لوٹ آتے،اورجلانے والی آگ سے خوف کھاتے،لیکن (کیا کیا جائے) دل بیمار ہیں اورآنکھیں معیوب ہیں۔[۵]

---

[۱] نہج البلاغہ،کلمات قصار،کلمہ ۲۹۰

[۲] سورہ فتح کی پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیلی تفسیرنمونہ کی بائیسویں جلد میں بیان ہوچکی ہے۔

[۳] اصول کافی جلد ۲ باب الشکرحدیث ۶۔

[۴] صحیفہ سجادیہ (کاملہ) دعائے اول۔

[۵] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۵۔

ان روایات سے ''شکرِنعمت'' اور ''معرفتِ الٰہی اوراس کے فرمان کی اطاعت کا باہمی رابطہ عیاں ہوجاتا ہے۔

۳۔فطری سبب

اشارہ:

جب ہم فطرت کی بات کرتے ہیں اس سے مرادوہی اندارونی احساسات وجذبات اورادراکات ہیں جن کیلئے کسی قسم کے عقلی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جب ہم کسی نہایت ہی خوبصورت اوردلفریب قدرتی منظرکودیکھتے ہیں یا کسی بہت ہی خوبصورت اورخوشبودارپھول کودیکھتے ہیں توایک نہایت ہی پُرزوراورطاقت ورکشش کااپنے اندراحساس کرتے ہیں۔ایسی کیفیت کانام حُسن کی طرف رجحان،میلان یاعشق ہے۔ایسے مواقع پرکسی قسم کےاستدلال کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

جی ہاں!حِس زیبائی انسانی روح کےاعلیٰ رجحانات میں سے ہیں۔

مذہب خاص کرخدا کی معرفت کی طرف کشش بھی ان ذاتی اوراندرونی احساسات میں سے ایک ہے،بلکہ تمام انسانوں کی سرشت اورجان میں طاقت ورترین اسباب میں سے ہے۔یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں،خواہ وہ گزشتہ دورکی ہو یاموجودہ دورکی ہمیں کوئی ایسازمانہ نظرنہیں آتا جس میں لوگوں کی روح اورفکر پرعقائدِمذہبی کی کوئی نہ کوئی حکم فرمانہ ہو۔اوریہی چیزاس عمیق احساس کےاصل ہونے کی دلیل ہے۔

چونکہ خداشناسی کے دلائل کے حصے میں توحیدِفطری ایک مستقل دلیل کےعنوان سے اپنی تمام آیات کے ساتھ زیربحث آئے گی ،لہٰذااس پرزیادہ گفتگوکرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔اورصرف ایک نکتہ پراکتفاکرتے ہوئے اس کی مزیدتشریح کواُسی بحث پرملتوی کرتے ہیں۔

قرآن مجیدنے انبیائے عظام کےقیام کی داستان کوبیان کرتے ہوئے بہت سےمقامات پراس بات پرزوردیاہے کہ انبیاءکرام علیہم السلام کااصل فریضہ شرک اوربت پرستی کےآثارکی بیخ کنی تھا(نہ کہ اثباتِ وجودخدا،کیونکہ یہ چیزتوہرشخص کےسرشت میں چھپی ہوئی ہوتی ہے)

بالفاظ دیگران کا کام یہ نہ تھا کہ ''خداپرستی کاپودا'' انسانی دلوں میں کاشت کریں بلکہ ان کا مقصداس موجودپودے کی آبیاری کرکے اس کےاطراف میں موجودشرک وبت پرستی کی خاردارجھاڑیوں کے بیکاراورفضول گھاس کامکمل طور پرخشک کرکےاس کی بیخ کنی کریں۔

''اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰہَ''یا''اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ'' (خداکےعلاوہ کسی کی عبادت مت کرو) کا جملہ جوکہ بتوں کی نفی کی صورت ہے،نہ کہ خداکے

وجود کے اثبات کی ،قرآن مجید کے بہت سے مقامات پر انبیاء کی زبانی بیان ہوا ہے۔خصوصاً حضرت محمد مصطفی [1] حضرت نوحؑ [2] حضرت یوسفؑ [3] اور حضرت ہود [4] علیہم السلام کی دعوت میں ذکر ہوا ہے۔

علاوہ ازیں ہم خود اپنی جانوں میں اور بھی حقیقی فطری احساسات رکھتے ہیں جن میں ایک علم ودانش اور شناخت ومعرفت کے ساتھ ہمارا حد سے زیادہ لگاؤ ہے، جو ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔

آیا یہ بات ممکن ہے کہ ہم اس عظیم کائنات میں اس عجیب نظام کا تو مشاہدہ کریں،لیکن اس بات سے قطعاً بے تعلق ہو جائیں کہ اس نظام کے منبع اور سرچشمہ کو نہ پہنچانیں۔

کیا یہ بات ممکن ہے کہ کوئی دانشور چیونٹیوں کی زندگی کے بارے میں بیس سال تک تحقیقات میں لگا رہے، یا کوئی دوسرا محقق بیسیواں سال بعض پرندوں یا درختوں یا مچھلیوں کے بارے میں کاوش اور عرق ریزی سے کام لے،لیکن اس بے پایا سمندر کے اصل منبع ومرکز اور سرچشمے کو نہ پہچانیں جو ازل سے لے کر ابد تک جاری وساری ہے؟

یہ وجوہات ہیں جو ہم ''معرفت اللہ'' کی طرف دعوت دیتی ہیں، ہماری عقلوں کو اس راستے پر چلاتی ہیں، ہماری عاطفوں کو اس طرف کھینچتی ہیں اور ہماری فطرت کے رُخ کو اسی جانب موڑتی ہیں۔یہ تھا خلاصہ مذہب اور معرفتِ خداوندی کی حقیقی اور سچی پیدائش کے اسباب کا۔

چند توضیحات

ا۔انحرافی توجیہات

کچھ مادہ پرست مشرقی اور مغربی جامعہ شناس اور ماہرین نفسیات کا عجیب اصرار ہے کہ خداشناسی اور مذہب کی پیدائش کا سبب ''جہالت''، ''خوف'' یا کئی اور عوامل ہیں۔

البتہ یہ بات ایک لحاظ سے عجیب نہیں، کیونکہ گویا وہ پہلے سے یہ طے کر چکے ہیں اور اس بات کا فیصلہ کر چکے ہیں کہ کائنات میں مادہ کے علاوہ کوئی اور چیز موجود نہیں ہے۔اس لئے وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ ہر ایک چیز کی تخلیق کو مادہ کا مرہون منت سمجھیں اور انہی خطوط پر وہ اس کی تفسیر کریں۔

---

[1] سورہ ہودؑ/ ۲

[2] سورۂ ہود/ ۲۶

[3] سورۂ یوسف/ ۴۰

[4] سورۂ احقاف/ ۲۱۔

ادھرہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہبی عقائد کے وجودہی نے ہمیشہ سے مادیت کے ایوانوں کولرزہ براندام کیاہوا ہے ۔اوراگرہم قرونِ وسطی میں کلیسااورسائنسدانوں کے درمیان ہونے والی بدترین لڑائی کوبھی اس کے ساتھ ملادیں تو یہ نتیجہ نکالنے میں آسانی ہوجاتی ہے کہ خدااورمذہب کے لئے اس قسم کی مادی تفسیریں مادیت کی مذہب کے ساتھ لڑائیوں کاایک حصہ ہیں۔

اگرچہ اس قسم کے تمام نظریات کے بارے میں تفصیلی بحث کیلئے لمبی گفتگو کی ضرورت ہے کہ اگرہم اس میں داخل ہوجائیں توہمیں تفسیری بحث کی کیفیت سے خارج کردے گی،لہٰذاہم آن پر تفصیلی گفتگو سے پرہیز کرتے ہوئے فہرست وارصرف اس کی طرف ایک اشارہ ضروری سمجھے ہیں۔ہم ایک بار پھرتکرارکرتے ہیں کہ اس قسم کی تفسیریں پہلے سے طے شدہ امر کے تحت کی گئی ہیں اوروہ یہ کہ ماوراءالطبیعۃ جہان کاکوئی وجودنہیں ہے۔جوکچھ ہے وہ یہی مادی دنیاہے۔یہ تمام نظریات،یاواضح ترالفاظ میں یہ تمام مفروضات،پانچ اہم مفروضوں میں خلاصہ کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔''جہالت'' کامفروضہ

ایک مشہورومعروف ماہراجتماع کاکہناہے کہ''اگرچہ علم وہنرنے بہت سے اسرارآمیزعوامل کی حقیقت کوواضح کردیاہےلیکن پھربھی بہت سےعوامل ایسے ہیں جوابھی تک سربستہ رازوں کی حیثیت سے حیطۂ علم سے دوربھاگ رہے ہیں اوران عوامل کے حقائق کوجاننے اوران کے بارے میں تحقیقات ہی مذہب کی پیدائش کاسبب بنی ہے۔[۱]

ایک مادی فلسفی اس بات پراضافہ کرتاہے کہ جب انسان حوادثات کوتاریخی نقطہ نظرسے دیکھتاہےتووہ علم اورمذہب کودوصلح ناپذیردشمن ہونے پرایک واضح دلیل تصورکرتاہے۔کیونکہ جوشخص علت کے قانون کےتحت اس کائنات میں تبدیلی کاعقیدہ رکھتاہے وہ ایک آن تک کے لئے بھی اپنے دماغ میں یہ تصورنہیں کرسکتاکہ حوادثات کےاس مرحلے میں کوئی چیزاس کی سدراہ بن سکتی۔[۲]

سادہ سےلفظوں میں وہ اس بات کادعویٰ کرناچاہتے ہیں کہ طبعی اسباب وعلل سےانسان کی ناآگاہی اس بات کاموجب بن گئی ہے کہ وہ یہ تصورکرے کہ طبیعت اورنیچرسے ماوراءکوئی طاقت ہےجس نے اس کائنات کوایجادکیاہےاوراب اسے چلارہی ہے۔اسی لئےطبعی اسباب وعلل جس قدرواضح ہوتے جائیں گےخداپرستی اورمذہب کاعقیدہ اسی قدرسست ہوتاجائے گا!!!

''جہالت کےمفروضہ'' کےحامیوں کی یہ غلط فہمی یہاں سے پیداہوتی ہے کہ:

۱۔انہوں نے یہ تصورکرلیاہے کہ خداکے وجودایمان کامقصدیہ ہے کہ''قانونِ علیت'' کاانکارکیاجائے اورہم اس مرحلے پرایک

---

[۱] ''جامعہ شناسی''ازم سمونیل کنوٹیک ص۲۰۷

[۲] کتاب''دنیائی کہ من می بینم''ص۵۸اورا گسٹ کنیٹ'' کایہ قول کس قدرخندہ آورہے کہ سائنسی علم نے کائنات کے باپ کواپنے کام سے ہٹاکراسے گوشہ نشین کردیاہے''۔(یعنی عللِ طبیعی کی دریافت کے بعدخداپرایمان کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ملاحظہ ہوکتاب''علل گرائش بہ مادیگری''ص۷۶

دوراہے پر کھڑے ہوں۔(الف) یا تو طبیعی اسباب اور علل کو قبول کریں۔(ب) یا پھر خدا کے وجود کو!

حالانکہ خدا پرست فلاسفہ کے نقطہ نظر سے ''قانونِ علیت'' پر ایمان اور طبیعی علتوں کی دریافت درحقیقت معرفتِ خداوندی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

ہم خداوندِ عالم کو بدنظمیوں اور مبہم وتاریک حوادث میں ہرگز تلاش نہیں کرتے، بلکہ روشنائیوں اور کائنات کے جانے پہچانے نظاموں میں ڈھونڈتے ہیں کیونکہ ایسے نظاموں کا وجود کائنات میں علم وقدرت کے ایک مبداء پر واضح ترین دلیل ہے۔

۲۔وہ اس نکتہ سے کیوں غافل ہیں کہ انسان قدیم ترین زمانے سے لے کر اب تک اس کائنات پر ہمیشہ سے ایک خاص نظم کو حکم فرما دیکھتا آرہا ہے، ایسا نظم جس کی توجیہ عقل وشعور سے خالی علتوں کے ساتھ امکان پذیر نہیں ہے، اور وہ ہمیشہ سے اسی چیز کو وجود خدا کی نشانی سمجھتا آرہا ہے۔البتہ گزشتہ دور میں یہ نظام بہت کم متعارف تھا لیکن انسانی علم ودانش جس قدر ترقی کرتے جائیں گے اس نظم کے مزید دقیق اور ظریف گوشے سامنے آتے جائیں گے اور کائنات کے مبداء کا علم وقدرت اسی قدر آشکار اور واضح ہوتے جائیں گے۔

اسی وجہ سے ہمارا عقیدہ ہے کہ ''خدا کے وجود'' اور ''مذہب'' پر ایمان ''سائنسی علوم'' کی ترقی کے ساتھ ساتھ پیش گام ہے اور اس کائنات کے بارے میں نت نئے انکشافات اور تازہ دریافت خدا کی بہتر معرفت کے بارے میں ایک نیا قدم ہوگا۔چنانچہ جس طرح ہم آج خدا کو پہچان سکتے ہیں اس طرح ہم سے پہلے لوگ نہیں پہچان سکتے تھے کیونکہ اس وقت علم نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی۔

۲۔ڈر کا مفروضہ

مشہور مغربی مؤرخ ''ویل ڈورانٹ'' اپنی تاریخ میں روم کے حکیم ''لوکرتیوس'' سے ''دین کے سرچشمے'' کے عنوان کے تحت ایک بحث میں یوں رقمطراز ہیں:

''ہمارا سب سے پہلا ڈر اور خوف خداؤں کے بارے میں ہے اور موت سے خوف کی قسموں میں سے اُسے سب سے اہم مقام حاصل ہے۔۔۔۔۔اسی لئے ابتدائی زمانہ کے لوگ اس بات کو باور نہیں کرتے تھے کہ موت ایک طبیعی چیز ہے۔اسی لئے وہ ہمیشہ اس کیلئے ایک مافوق طبیعت علت کے قائل تھے۔[۱]

اسی چیز کو مشہور فلسفی ''رسل'' نے ایک اور انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں:

''میرا گمان یہ ہے کہ مذہب کی پیدائش کا اصل سبب خوف اور ڈر ہی ہوسکتا ہے۔طبیعی بلاؤں کا ڈر، جنگ اور اس جیسی دوسری چیزوں کا ڈر، اور ان غلط چیزوں کا ڈر جنہیں انسان غلبہ شہوت کے وقت انجام دیتا ہے۔[۲]

---

[۱] ''تاریخ تمدن'' ویل ڈورانٹ جلد ا ص ۸۹۔

[۲] ''جہانی کہ من فی شناسم'' ص ۵۴

اس مفروضہ کا باطل ہونا یہاں سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس کے تمام حامیوں نے گویا اس بات پر معاہدہ کرلیا ہے کہ مذہب اور خدا پرستی کے عقیدہ کے لئے مافوقِ طبیعت کوئی چیز موجود نہیں ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا عامل بھی خود طبیعت ہی میں تلاش کیا جائے، ایسا عامل جس کی بازگشت ایک قسم کے گمان اور خیال کی طرف ہو۔اسی لئے انہوں نے ہمیشہ اس سلسلے میں فرعی مسائل ہی کو پیشِ نظر رکھا ہے اور اصلی مسئلہ کو فراموش کردیا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ خدا پر ایمان انسان کو ایک قسم کی روحانی طاقت اور سکون عطا کرتا ہے،اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اسے موت اور دیگر سخت حوادث کے مقابلے میں شجاع بنادیتا ہے اور یہاں تک اس میں روح پھونک دیتا ہے کہ وہ ہر قسم کی جانبازی اور ایثار کو اپنالیتا ہے،لیکن ہم اس بات کو آخر کیوں فراموش کردیں، جو ہمیشہ کیلئے انسان کی آنکھوں کے سامنے ہے،یعنی یہ نظام جو زمین وآسمان،حیوانات ونباتات اور خود انسان کے اپنے وجود میں حکم فرما ہے۔

باالفاظ دیگر انسان جس قدر بھی علمِ تشریح (آپریشن) اور فزیالوجی وغیرہ سے بے خبر ہو، جب وہ اپنے ہی بدن میں موجود آنکھ،کان ،قلب اور ہاتھ، پاؤں کی عجیب بناوٹ کو دیکھتا ہے تو اس کے ساتھ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ یہ ''اتفاق'' اور ''بے شعور'' عوامل کی تخلیق نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں ایسی چیزوں کی تخلیق سے تفسیر کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح ایک پھول،ایک زنبورِ عسل،سورج و چاند کی تخلیق،ان کی ایک نظم ونسق کے ساتھ گردش اور دوسری مخلوقات کا بھی یہی حال ہے۔

یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ انسان کے پیشِ نظر رہی ہے اور اب تک چلی آرہی ہے جب یہ خدا کی ذات پر ایمان کا اصل عامل ہے تو پھر یہ لوگ اس روشن حقیقت کو نظرانداز کرکے ''خوف'' اور ''جہالت'' ہی کو اس کا سبب کیوں سمجھتے ہیں؟ ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ خود لوگ اس قسم کی روشن حقیقت کے بارے میں ''جاہل'' ہیں اور مذہبی عقائد کی ترقی اور پیش رفت سے ''خائف'' ہیں۔اصل راستے سے ہٹ کر اور واضح راہ کو چھوڑ کر کیوں بھٹک جاتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ انہوں نے پہلے سے جو فیصلہ کرلیا ہے وہ انہیں حق بات تسلیم کرنے سے روک رہا ہے۔

۳۔''اقتصادی عوامل'' کا مفروضہ

اس مفروضہ کے حامی وہ لوگ ہیں جو تاریخ کی متحرک رکھنے والی طاقت کو بھی پیداواری مشینری کی مانند سمجھتے ہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ تمام اجتماعی چیزیں،خواہ وہ ثقافتی ہوں یا علمی،سیاسی ہوں یا فلسفی،حتیٰ کہ مذہبی،غرض سب چیزوں کو اقتصادی عوامل کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

انہوں نے مذہب کی پیدائش اور اقتصادی مسائل کو آپس میں ربط دینے کیلئے عجیب وغریب توجیہات گھڑی لی ہیں۔ان کا کہنا ہے:

''انسانی معاشرے میں سامراجی طبقے نے استعمار کا شکار ہونے والے غریب لوگوں کی قوت مزاحمت کو ختم کرنے اور ان کی اذہان کو اآلودہ کرنے کیلئے ''مذہب'' کو ایجاد کیا ہے۔''لینن'' کا مشہور جملہ جو اس نے ''سوشلزم اور مذہب'' نامی کتاب میں لکھا ہے اس کی عکاسی

کرتا ہے کہ ''معاشرے میں مذہب تریاک اورافیون کی حیثیت رکھتا ہے۔''

اس سلسلہ میں ان کی طرف سے بہت سی باتیں کہی گی ہیں جن کا تکرار بے سود ہوگا۔لیکن خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس مفروضہ (سوشلزم) کے حامی خود ہی اپنے متضاد بیان اورمتضاد کلام سے اس کا جواب دیتے ہیں۔وہ جب اسلام کا سامنا کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس نے کیونکر ایک پسماندہ قوم میں تحرک اورجنبش پیدا کی ہے اورساسانی شہنشاہوں،رومی بادشاہوں،مصری فرعونوں اوریمنی تبابعہ کوآسمانِ قدرت سے قصرِ مذلت کی طرف کس طرح پھینکا،تو وہ مجبور ہوجاتے ہیں کہ اسلام کوتاریخ کے اس حصے سے مستثنیٰ قرار دے دیں۔

اس سے بھی بالاتر عصرِ حاضر میں سامراج کے خلاف خاص کرشرق غرب کے شیطانی تسلط کے خلاف عمیق اسلامی تحریکوں کو دیکھتے ہیں،خصوصاً صہیونزم کے خلاف فلسطینی عوام کے جدوجہد پرنگاہ ڈالتے ہیں،توان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کارنہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے ہی تجزیوں پرشک کریں ۔ ہم یہاں ان لوگوں کی بات نہیں کررہے جوحصاراندرحصار میں جکڑے ہوئے ہیں اورآفتاب نصف النہارتک کودیکھنا گوارہ نہیں کرتے۔

بہرحال موجودہ گزشتہ تاریخ،خاص کراسلامی تاریخ کی طرف توجہ کرتے ہوتے ،یہ بات بخوبی روشن ہوجاتی ہے کہ ان کے زعم کے برعکس مذہب صرف نشہ آورچیزاورافیون ہی نہیں ہے بلکہ نہایت ہی طاقت وراور پُرکشش اجتماعی تحریکوں کا سبب بھی ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اقتصادی مسائل بھی انسانی کے ایک حصے کوتشکیل دیتے ہیں،لیکن انسان کواقتصادیات میں منحصر کردینے میں انسان کی معرفت میں بہت بڑی غلطی ہوگی اوراس کے اعلیٰ رجحانات اورارفع مقاصد کوسمجھنے میں زبردست کوتاہی ہوگی۔

۴۔''جنسی''مفروضہ

اب آیئے اور''مسٹرفرائیڈ'' کی چندباتیں سنیئے جو''مذہب کی پیدائش'اور''جنسی غریزہ'' کے درمیان ایک پل قائم کرناچاہتے ہیں اورمذہب کوجنسی غریزہ کامرہون سمجھتے ہیں۔

ان کی یہ کوشش ہے کہ وہ اس بات کوایک موہوم قبیلہ کے بارے میں اپنے مفروضہ میں پیوندلگائیں۔(اس موہوم اورخیالی قبیلہ میں ایک باپ ہوتاہے جس کی بہت سی بیویاں ہوتی ہیں اورکئی جوان اولادیں،جوسب کے سب محرومیت کی زندگی بسرکرتے ہیں،انجام کارانہوں نے باپ کے خلاف علمِ بغاوت بلندکرکے اسے قتل کرڈالااوراس کا گوشت کھاگئے۔پھروہ اپنے اس فعل پرنادم ہوئے اورقبیلہ کی عورتوں سے لاتعلقی اختیارکرکے اپنے فعل سے توبہ کی اوراسے ناپسندیدہ گردانا)یہیں سے ان کے درمیان ایک قسم کی ممانعت پیداہوگئی(یافرائیڈ کے بقول''تابو'') جسے محارم کے ساتھ ازدواج کیاجاتاہے۔وہ(فرائیڈ) کہتے ہیں کہ آج کے وحشی قبائل میں بھی''توتم'' نامی چیزپائی جاتی ہے(جیسے باپ یاارا کین میں سے کوئی بزرگ) جوان کا محافظ اورولیِ نعمت ہے۔

وہ اس''توتم'' کا بڑااحترام کرتے ہیں اوران کا تصورہوتاہے کہ وہ خودکواس جیسابنائیں (ان کا''توتم'' پراعتقادبھی ویسے ہی جیسے موہوم اورخیالی قبیلہ کے بارے میں اعتقادکی بنیاد بتائی گی ہے) فرائیڈاکے بقول''تابو'اور''توتم'' پراعتقادہی مذہبی عقائدکی پیدائش کی

بنیاد ہے۔مندرجہ بالاتصریحات کے مطابق اس کا تعلق بھی جنسی مسئلہ سے ہے۔[1]

اس بات سے قطع نظر کی فرائیڈ کے جنسی مفروضہ کی بنیادایک افسانے پر رکھی گئی ہے(موہوم اورخیالی قبیلہ کے افسانے پر)،اس کے اپنے تجزیئے بھی کہانیوں اورافسانوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔اس کی بنیاد یہ ہے کہ فرائیڈ نے انسان کے روح اورجسم کو جو کہ گونا گوں حیثیتوں کا حامل ہے،صرف ایک زاویئے اورایک حیثیت سے دیکھا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کے اندر جنسی غریزہ موجود ہے،لیکن یہ بات بھی تومسلم ہے کہ انسان کا تمام وجود غریزۂ جنسی کا نام تونہیں،اس کا جسم اوربھی مختلف غرائز کا حامل ہے اوراس کی روح میں اعلیٰ میلان بھی پایا جاتا ہے ہے۔''صرف ایک پہلو سے دیکھنا''ایک ایسی مصیبت ہے جس میں نہ صرف فرائیڈ گرفتار تھے بلکہ تمام سوشلسٹ بھی اس مصیبت کا شکار ہیں جوانسان کوصرف اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں یہ دونوں قسم کے اصحاب انسانی معرفت کے بارے میں سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

کیاہی بہترتھا کہ مسٹرفرائیڈموہومات کا سہارلینے کی بجائے ان حقائق پرنظرڈالتے جنہیں انسان روزِ اول سے اب تک دیکھتا آرہاہے،یعنی وہ نظام جواس وسیع وعریض کائنات پربھی اورخودانسان کے اپنے جسم پربھی حکم فرماہےاوربےعقل وشعورطبیعی علتوں کے ساتھ اس کا موازنہ نہیں کیاجاسکتاہے یہ چیزہی خداپراعتقادکی پیدائش کا سبب ہے ،اس قدرواضح بات کوچھوڑکرکیوں دوسرے گمراہ کن راستوں کواختیارکیاجائے؟

۵۔''اخلاقی ضروریات''کامفروضہ

مسٹر''آین اسٹائن''،''مذہب اورسائنس''کے تحت ایک بحث میں کہتے ہیں:

''تھوڑاسا غورکرنے کے ساتھ یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ وہ جذبات واحسات اور ہیجانات جومذہب کی پیدائش کا سبب بنے ہیں ،بہت زیادہ اوربہت مختلف ہیں۔۔۔۔۔''

پھروہ''خوف''کے مفروضےکوذکرکرنے کے بعدکہتے ہیں:

۔۔۔۔۔انسان کے اجتماعی ہونے کی خصوصیت بھی مذہب کی پیدائش کےعوامل میں سےایک ہے۔ایک انسان دیکھتاہے کہ ماں، باپ یاعزیزواقارب اوررہبراوربزرگ ایک ایک کرکے مررہے ہوتے ہیں اورباری باری اس کے اطراف سے ان کی جگہ خالی ہوتی جاتی ہے ۔اسی لئے وہ ہدایت پانے ،دوست بنانے ،محبوب ہونے اورکسی پربھروسہ کرنے اورامیدرکھنے کی آرزوکرتے ہیں۔ یہی چیزاس کے اندرخداکے بارے میں عقیدہ کی راہیں ایجادکرتی ہے۔[2] توگویااس طرح سے آئن سٹائن یہ بتاناچاہتے ہیں کہ یہ اخلاقی اوراجتماعی اسباب ہی

---

[1] ''فرائیڈاورفرائیڈزم''نام کتاب سے اقتباس

[2] ''دنیائے کہ من می بینم''ص ۵۳

ہیں جوانسان کے اندر مذہب کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔

لیکن ہم یہاں پر بھی وہی چیز دیکھتے ہیں کہ انہوں نے غلطی سے ''اثر'' اور ''سبب'' کو ایک چیز تصور کرلیا ہے، جب کہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر اثر سبب بھی ہو۔ممکن ہے کہ ہم ایک گہرا کنواں کھودتے وقت خزانہ بھی پالیں، تو یہ ایک ''اثر'' ہوگا اس کھدائی کا۔جب کہ مسلم ہے کہ کنواں کھودنے کا اصلی محرک اور سبب کوئی اور چیز تھی اور وہ تھا حصولِ آب نہ کہ خزانے کی دریافت۔

بنابریں یہ ٹھیک ہے کہ مذہب انسان کو روحانی دردوں اور بے چینیوں سے تسکین دلاتا ہے۔عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کی جدائی کے وقت خدا پر ایمان ہی ہے جو اسے تنہائی سے نجات دلاتا ہے اور ان کی جدائی سے جو خلا پیدا ہوجاتا ہے وہ اس کی تلافی کرتا ہے۔لیکن یہ ایک اثر ہے نہ کہ سبب۔

مذہب کا اصلی سبب جو بہت ہی مستدل اور منطقی معلوم ہوتا ہے پہلے درجے پر تو وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔انسان خود کو اس کائنات میں ایک ایسے نظام کے سامنے پاتا ہے کہ اس کے بارے میں جس قدر بھی غور وفکر کرے اسی قدر اس نظام کی عظمت، گہرائی اور گیرائی میں چلا جاتا ہے اور اس کی عظمتوں سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوتا جاتا ہے۔

وہ ''ایک پھول'' کو جو اس قدر لطیف وظریف اور ایک عجیب وزیبا ساخت کا حامل ہے، یا ''ایک آنکھ'' کو جو نہایت ظریف اور پیچیدہ سسٹم کی حامل ہے، اندھی اور بہری بے جان وبے شعور فطرت کی اچانک پیداوار نہیں سمجھتا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اس نظام کے مبداء کی تلاش کرتا ہے۔البتہ اس سلسلے میں کئی اور معاون امور بھی ہیں جن کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہی ''آئن سٹائن'' جس نے اس مفروضے کی پیش کش کی ہے ایک اور جگہ اپنی گفتگو کے انداز کو تبدیل کرتے ہوئے اپنے عقیدے کو کائنات کے پیدا کرنے والے اور اپنے ایمان راسخ کو اس عظیم مبداء کے ساتھ اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ نہایت ہی جاذب توجہ ہے۔وہ ایسے عقائد کا انکار کرتا ہے جن کے ساتھ خرافات ملے ہوئے ہوتے ہیں، نہ کہ ایسے عقائد کا جو خالص توحید پر مشتمل اور ہر قسم کے خرافات سے خالی ہوں۔وہ کہتا ہے:

''خدا کے وجود کے حقیقی معنی ان اوہام کی رائے سے معرض وجود میں آتے ہیں جنہیں بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے''۔

پھر وہ اپنے اور دوسرے عظیم دانشوروں کے عقیدہ کو بیان کرتا ہے جسے وہ ایک قسم کا مذہبی عقیدہ بنام ''آفرینش کا مذہبی اعتقاد'' یا ''وجود'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ایک اور مقام پر اسے ''کائنات'' کا عجیب ودقیق اور حیران کن نظام کا نام دیتا ہے۔

ان سب سے بڑھ کر جو بات لائق توجہ ہے یہ ہے کہ وہ کہتا ہے:

''یہی مذہبی ایمان ہی تو ہے جو دانشوروں کی تحقیقی زندگی کیلئے چراغِ راہ ہے'' البتہ اس مقام پر کہنے کی بہت سی باتیں ہیں اور اگر ہم عنانِ قلم کو چھوڑ دیں تو ہم تفسیرِ موضوعی کی بحث سے خارج ہوجائیں گے۔

لہٰذا ایک بار پھر ہم اپنی اصل بات کی طرف واپس آتے ہیں اسی پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور یہ چیز ہر ایک کی خاطر میں لاتے ہیں کہ: ''مذہب کی پیدائش کے اسباب کو سب سے پہلے تو جہان آفرینش کے مطالعہ (عقلی اور منطقی اسباب) میں تلاش کرنا چاہیے

، پھر طاقت واندرونی کشش (فطری سبب) میں اوراس کے بعد اس مبداء بزرگ کی طرف توجہ میں جو بے پایاں نعمتوں کا والی ہے (عاطفی سبب) تلاش کرنا چاہیے"۔[1]

[1] اس بارے میں مزید معلومات کیلئے ہماری کتاب "انگیزہ پیدائش مذہب" کی طرف رجوع فرمائیں۔

خداشناسی کے دلائل

بُرہانِ نظم

اشارہ

خداشناسی کے سلسلہ میں قرآن مجید کی بہت سی آیات اور سورتوں میں جس مسئلہ پر زیادہ روز دیا گیا ہے وہ ''برہانِ نظم'' ہے، اور وہ بھی اس حدتک کہ قرآنِ پاک میں دیگر براہین ودلائل اس برہان کے سامنے کمتر حیثیت کی ہیں۔

اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ اس عظیم آسمانی کتاب یعنی قرآنِ مجید کے نقطۂ نظر سے خدا کی شناخت ومعرفت اور ہر قسم کے شرک کی نفی کیلئے بہترین اور سب سے روشن راہ نظامِ آفرینش اسرارِ کائنات اور ''آفاق'' و''انفس'' پر مشتمل آیات کا مطالعہ ہے۔

برہانِ نظم کی خصوصیات

اس برہان کی کچھ ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے قرآن مجید میں اس حدتک اس کے بارے میں تاکید کی گئی ہے اور اس پر اتنا زور دیا گیا ہے۔

۱۔ برہانِ نظم جہاں ایک طرف دانشوروں کو قانع کرتی ہے وہاں دوسری طرف عوام الناس بھی اپنی حیثیت کے تحت اس سے استفادہ کر سکتے ہیں ، کیونکہ آفرینش کے اسرار کا ادراک کرنے کیلئے لوگوں کی مختلف قسمیں ہیں۔

۲۔ برہانِ نظم میں خشک فلسفی دلائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے برعکس اس میں ایک خاص لفظ ہوتا ہے اور اس مبداء بزرگ کی معرفت جس قدر زیادہ ہوتی جائے گی انسان کا عقل وشعور اور نشاط ومسرت بھی اتنا زیادہ ہوتے جائیں گے اور اس عظیم مبداء کے متعلق مزید جذبہ اور شوق پیدا ہوتا جائے گا۔ وہ ایسے خضوع وخشوع پر آمادہ ہوجائے گا جس کے اندر عشق ومحبت ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ انسان کی عقل کو بھی سیراب کرتی ہے اور اس کے عواطف واخلاق کو بھی۔ المختصر اس کائنات کے دوسرے تمام نظاموں کے بارے میں تحقیقات کے ضمن میں خداوندِ عالم کی مختلف نعمتوں کے بارے میں غور وفکر کرنے کیلئے جب برہانِ نظم کا سہارا لیتے ہیں تو وہ شکرِ منعم کی حدود تک لے جاتی ہے جو بذاتِ خود، خداشناسی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔

۳۔ برہانِ نظم ایک ایسی برہان ہے جو نشوونما ہی پاتی رہی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر ختم ہونے میں نہیں آتی، کیونکہ اس کی کبریٰ ہر چند کہ اپنی جگہ پر ثابت وبرقرار اور دائم وپائیدار ہے۔ لیکن اس کی صغریٰ ہمیشہ نئی کونپلیں نکالتی رہی اور اس کی شاخیں اور پتے ہمیشہ پروان چڑھتے رہتے ہیں کیونکہ اسرار آفرینش کے بارے میں ہر ایک نئی علمی دریافت، اس کیلئے نیا مصداق یا نئی صغریٰ کو وجود عطا کرتی رہتی ہے۔ اس طرح سے وہ ہر روز نئی شکل اختیار کرتی رہتی ہے اور انسانی علوم ودانش کی پیش رفت کے دوش بدوش یہ بھی ترقی اور پیش روی کی منازل طے کرتی رہتی ہے۔

۴۔ برہانِ نظم انسان کو ''انفسی'' اور ''آفاق'' سیر کی دعوت دیتی ہے۔ یہ بابرکت سیر روز بروز انسانی معرفت کی سطح کو بلند سے بلند تر کرتی رہی ہے ، اس کی سوچوں کو پروان چڑھاتی رہتی ہے، خاص کر اس کی وجہ سے بھی برہانِ نظم کی بنیادیں انسانی زندگی کے ساتھ اہم آہنگ ہیں اور قدم قدم پر اس کے ساتھ ہیں، توحید کے بعض دوسرے دلائل کی مانند نہیں ہیں جو روزمرہ کی انسانی زندگی سے الگ تھلگ یا علیحدہ ہوں۔

۵۔ برہانِ نظم وہ واحد برہان ہے جو تجربی فلاسفہ کو بھی قائل کر دیتی ہے، جو خالص عقلی دلائل کے منکر ہیں اور اس سائنسی اور علمی حربے کو خود انہی کے خلاف استعمال کرتی ہے جس سے وہ مادیت کے حق میں دلائل کا کام لیتے ہیں۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی وہ بہت مؤثر ہے۔

پس بنابریں تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر قرآن مجید نے اپنے توحیدی مباحث کی اکثریت کو اسی برہان کی بنیادوں پر استوار کیا ہے لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض محققین جو (خالص فلسفی برہانوں جیسی) دوسری دلیلوں سے متاثر ہو کر اس برہان کی زبردست اہمیت سے چشم پوشی کر لیتے ہیں، گویا وہ اس کی خصوصیات اور گہرے اثرات سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔

برہانِ نظم کی بنیادیں۔

یہ برہان دو اصل بنیادوں پر استوار ہے جو منطقی اصطلاح میں صغریٰ، کبریٰ کو ملا کر شکل اول کو تشکیل دیتی ہیں۔

الف: اس کائنات پر ایک منظم اور جچا تُلا نظام حکم فرما ہے۔

ب: جہاں پر بھی ایسا نظم حاکم ہو وہاں پر یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ اتفاق روئداد کی پیداوار ہو بلکہ ضروری ہے کہ اس کا تعلق علم اور عظیم قدرت سے ہو۔

پس نتیجہ یہ نکلے گا کہ علم اور عظیم قدرت کا ایک مبداء اس تخلیقی کائنات کے نظام کے ماوراء موجود ہے خواہ آپ اسے خدا کہیں یا اللہ، یا کسی اور نام سے یاد کریں، کیونکہ اس بحث میں نام سے زیادہ غرض نہیں ہے۔

''نظم اور علم'' کا رابطہ

سب سے پہلے دوسرا مقدمہ جسے اصطلاح میں قیاس کا کبریٰ کہا جاتا ہے وہ ثابت ہو اور اس کیلئے ضروری ہے کہ ''نظم'' کی مختصر سی تعریف کی جائے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہر تنظیم یا کوئی دوسری چیز جو ایک خاص پروگرام کے مطابق عمل کرتی ہے، جس کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، وہ منظم ہے۔ اس طرح سے ''حساب''، ''پروگرام'' اور ''مقصد'' اس نظم کے تین اصلی عناصر ہیں۔ مثلاً ''گھڑی'' ایک نمونہ ہے ''منظم چیز'' کا۔ کیونکہ اس کے اجزا ایک صحیح صحیح حساب کے تحت بنائے گئے ہیں۔ پھر اسے جوڑنے کیلئے ایک پروگرام مرتب ہوا اور اس کا مقصد صحیح وقت کا بتلانا ہے۔ اور اس رابطہ (علم اور نظم کے رابطہ) کی تحقیق کیلئے چند دلائل سے امداد لی جا سکتی ہے:

ا۔ سب سے پہلی دلیل تو خود انسان وجدان ہے کیونکہ ہم نے کئی ایسے بزرگ عالم اور دانشمند یا زبردست موجد اور ہنرمند افراد کو دیکھا ہے جن کے علم و ہنر کے آثار باقی رہ گئے ہوں اور جب ان آثار مثلاً تصنیفات و تالیفات، مصنوعات نفیس مناظرہ پر مشتمل بورڈ، حیرت انگیز تعمیرات کو دیکھتے ہیں تو کسی قسم کی دلیل کی ضرورت محسوس کئے بغیر اس کے عقل، ذوق، علم، صنعتی اور ہنر مہارت کا اعتراف کریں گے۔

۲۔اس رابطے کے ثابت کرنے کیلئے وجدان کے علاوہ منطقی دلیل سے بھی کمک لی جاسکتی ہے کیونکہ کسی منظم عمارت کو وجود میں لانے کیلئے کم ازکم انتخاب کے سات مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔مثلاً ایک باشکوہ، پختہ اور خوبصورت عمارت کی پیشِ نظر رکھیں تو مندرجہ ذیل سات انتخابی مراحل کو دیکھیں گے:

(۱)مسالہ جات کی جنس (۲)ان کی مقدار اور تعداد (۳)مسالہ جات کی کیفیت (۴)مختلف اشکال اور اندازے (۵)اجزاء کے درمیان ہم آہنگی (۶)ان کے درمیان تناسب (۷)ہر ایک جزو کا اپنی مناسب جگہ پر ہونا۔

مذکورہ سات چیزوں کا انتخاب باقاعدہ حساب وکتاب کے تحت ہوا اور علم وعقل کے ساتھ حساب وکتاب بھی ایسا ہو کہ جس میں ذرہ بھر فرق نہ ہو۔ چنانچہ مذکورہ انتخابات کے تحت جس عمارت پر ہماری نگاہ پڑتی ہے تو ہم یقین سے کہہ دیتے ہیں کہ بے شک اس کا بنانے والا کافی سوجھ بوجھ اور علم وعقل کا مالک تھا۔

۳۔اور (نظم اور علم کے) اس رابطے کو ایک اور طریقے (برہان ریاضی کے طریقے) سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔''احتمالات کا حساب'' جو دورِ حاضر میں، یونیورسٹیوں میں ایک مستقل علمی رشتے کی صورت میں اختیار کر چکا ہے،''علم ونظم'' کے رابطے کیلئے نہایت ہی موثر اور کارگر ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم اپنی زندگی میں اجمالی طور پر درک کر چکے ہیں۔لیکن''احتمالات کا حساب'' اسے ایک روشن ریاضی صورت میں پیش کرتا ہے۔

ہم ہرگز یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ ایک اَن پڑھ انسان''اچانک'' کی صورت حال سے فائدہ اُٹھا کر کسی موضوع پر، مثلاً''فلسفہ'' یا''شعروادبیات'' یا''طب'' کے موضوع پر نہایت ہی مفصل اور بامقصد کتاب لکھ ڈالے۔وہ اس طرح کہ ہم ایک ٹائپ مشین اس کے سامنے رکھ دیں اور مکمل طور پر اس کے اختیار میں دے دیں۔وہ کسی ایک حرف کو بھی نہ پہچانتا ہو۔حروف کی شناخت کے بغیر ٹائپ کرتا جائے اور ایک مفصل ومدلل کتاب معرضِ وجود میں آجائے۔اس طرح سے صرف یہی نہیں کہ کتاب نہیں لکھی جائے گی بلکہ''اچانک'' کی اس طرح کی کیفیت سے ایک معمولی سا خط بھی تحریر نہیں کیا جاسکے گا۔

کیونکہ اگر ہم ٹائپ مشین کے تیس حروف ہی فرض کریں (البتہ اس تعداد سے زیادہ بھی ہیں کیونکہ بعض حروف کی کئی مختلف صورتیں ہیں، مثلاً''ب''اول،''ب''درمیانی۔''ب'' آخری اور''ب''مفرد، تو اس طرح سے ب کی چار مختلف صورتیں بن جاتی ہیں) تو یہاں پر احتمالات کا حساب یہ کہتا ہے کہ ایک دوحرفی کلمہ مثلاً''من'' کی اچانک پیدائش کیلئے نوسو میں سے صرف ایک احتمال ہے۔(1/30*1/30=1/900) اور ایک تین حرفی کلمہ کی اچانک پیدائش کیلئے ۲۷ ہزار میں سے صرف ایک احتمال ہے، اسی طرح کسی پانچ حرفی کلمہ کی پیدائش کیلئے اکیس ملین (دو کروڑ دس لاکھ) احتمالات کی حد سے بھی بڑھ جائیں گے۔

اب اگر ایک مختصر سے خط میں صرف ایک سو حروف ہوں تو اس کے احتمالات کا مجموعہ ۳۰ عدد سے ۱۰۰ عدد کی طاقت میں بدل جائے گا۔پس ہمارا زیرِنظر خط اس مذکورہ عدد سے زبردست عظیم ہوگا جس کی کوئی حد وانتہا نہیں ہوگی۔یعنی ایک کسری عدد جس کی صورت ایک اور اس کا مخرج ایک ۳ عدد ہے جس کے دائیں جانب ایک سو صفر ہو، تو عظمت وبزرگی کے لحاظ سے اس کسر کا مخرج کسی حساب میں نہیں آسکتا اور کائنات میں اس عدد کی بزرگی کو کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی۔

اس حقیقت کی مزید وضاحت کیلئے اتنا کافی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اگر روئے زمین کے تمام سمندروں کے پانی کو ایک ایک قطرہ کر کے شمار کریں تو ایک ایسا عدد بنے گا جس کے دائیں طرف اکیس صفر سے کم ہوں۔اس طرح اگر ایک ہزار صفحہ کی کتاب کا اندازہ لگائیں تو اس کے احتمالات کا عدد اس قدر عظیم ہوگا کہ اس کے کسری عدد کا احتمال صفر کے برابر جا پہنچے گا یعنی حساب و کتاب کی حد سے نکل جائے گا، جو کہ عام طور پر محال ہے۔(خوب غور کیجئے گا)

اسی دلیل کی بنا پر اگر کوئی شخص اس بات کا دعویٰ کرے کہ مثلاً ''قانون'' نامی طب کی کتاب کا لکھنے والا ''بوعلی سینا'' بالکل ہی اَن پڑھ تھا، ''سعدی'' ذوقِ شعری سے عاری تھا۔''آئن سٹائن''، ''ریاضی'' سے مطلقاً بے خبر تھا، دنیا کی معروف تاریخی عمارتوں کے بنانے والے معمار ذرہ بھر معماری کا علم نہیں رکھتے تھے، لہٰذا ان تمام مذکورہ افراد کے باقی رہ جانے والے آثار جو انہوں نے یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں، وہ سب اچانک ہی معرضِ وجود میں آ گئے تھے۔وہ صرف لاشعوری طور پر ہاتھوں کو صفحات پر رکھتے جاتے تھے یا عمارتی مسالہ جات کو ہاتھ لگاتے جاتے تھے اور کتاب یا عمارت از خود معرضِ وجود میں آ جاتی تھی۔ایسا کہنے والا شخص اگر مذاق نہیں کر رہا تو دیوانہ ضرور ہے۔

قصہ مختصر علم اور نظم کا باہمی رابطہ اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اس پر بہت سے انسانی علوم اور دانش کی بنیاد استوار ہے۔مثلاً انسانی تمدن کی تاریخ گزشتہ لوگوں سے یادگار کے طور پر باقی رہ جانے والے آثار پر تحقیق و ریسرچ کے بعد لکھی گئی ہے۔دانشور حضرات ان آثار پر تحقیق کرتے ہیں جو کھدائیوں کے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں یا گزشتہ اقوام کی قبور اور عبادت گاہوں پر تحقیق کر کے اس دور کے لوگوں کو ثقافت، تمدن، بود و باش، عقائد اور اس قسم کی کئی دوسری چیزوں کا پتہ چلاتے ہیں، جب کہ اگر ہم نظم و علم کے رابطے کا انکار کریں تو یہ سب استنباط اور نتائج بے کار ہو جائیں۔اب جب کہ علم اور نظم کا رابطہ اچھی طرح واضح ہو گیا اور گویا برہانِ نظم کی کبریٰ پر ثابت ہو گی ہے تو ہم کائنات میں اس کے مصداقوں کی تلاش میں نکلتے ہیں جن پر قرآن پاک نے بڑی تاکید کی ہے اور زور دیا ہے۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ قرآنی آیات میں برہانِ نظم کی کبریٰ کے بارے میں قطعاً کہیں ذکر نہیں آیا، یعنی کسی جگہ پر بھی ''علم و نظم کا رابطہ'' دکھائی نہیں دیتا، کیونکہ یہ اس قدر واضح اور عیاں ہے کہ اس کے بیان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اگر کوئی شخص اس کا انکار کرتا ہے تو اسے بہت سے حقائق سے ہاتھ دھونا پڑا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس رابطے کے منکرین ٹھیک ''سوفسطائیوں'' کی مانند ہیں جو زبانی حد تک تو بہت سے حقائق کا انکار کرتے ہیں، لیکن اپنی روزمرہ کی زندگی میں دوسرے لوگوں کی مانند ان کا اعتراف کرتے ہیں۔مثلاً اگر وہ بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر اور دوا کے پیچھے جاتے ہیں، ڈاکٹر کے نسخہ پر حرف بہ حرف عمل کرتے ہیں تو گویا ڈاکٹر، دوا، علمِ طب، دوا سازی اور اس قسم کی سینکڑوں چیزوں کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔''علم اور نظم کے رابطہ'' کے منکر افراد ہر علم، صنعتی، ادبی اور ہنری اثر سے علمی اور عملی دونوں لحاظ سے ایک آگاہ، باذوق و باشعور ہنرمند مبداء کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی بھی صورت میں جنون آمیز احتمالات پر تکیہ نہیں کرتے۔یہاں پر اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مادہ پرست فلاسفہ کا ایک گروہ جو برہانِ نظم سے برسرِ پیکار ہیں (کائنات میں یا تو نظم کے وجود کے منکر ہیں یا پھر علم اور نظم کے رابطہ کا انکار کرتے ہیں) جن کا سرخیل ''ہیوم'' ہے۔ان کے پاس چند بے وقعت اور ناقابل اعتناء وسوسوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔وسوسے بھی ایسے جنہیں اپنی زندگی میں وہ خود بھی قبول نہیں کرتے۔

۱۔انسانی تخلیق میں اس کی نشانیاں

سب سے پہلے مل کر مندرجہ ذیل آیات کا دل وجان سے مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔۔۔وَمِنْ اٰيَاتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ

(روم/۲۰)

۲۔۔۔اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعاً بَصِيْرًا

(دھر/۲)

۳۔۔۔وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ

(مؤمنون/۱۲۔۱۳)

۴۔۔۔ذٰلِكَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَأَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُوْنَ

(الم سجدہ/۶تا۹)

۵۔۔۔وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيَاتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ

(جاثیہ/۴)[1]

---

[1] اس بارے میں کئی اور آیات بھی ہیں جنہیں ہم نے مضمون کی ہم آہنگی کی وجہ سے یہاں پر تحریر نہیں کیا۔ ملاحظہ ہوں سورہ نجم کی آیات ۴۵،۴۶ سورہ مومن کی آیت ۶۷ سورہ فاطر آیہ ۱۱، سورہ کہف آیت ۳۷،۳۸۔ سورہ نحل آیت ۴ سورہ انعام آیت ۲ وغیرہ۔

ترجمہ

۱۔۔۔اوراس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھرتم انسان بن گئے اورروئے زمین پرپھیل گئے۔

۲۔۔۔ہم نے انسان کو ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کیااوراُسے آزمائیں گے،(لہٰذا) اُسے سننے اوردیکھنے والا بنایا۔

۳۔۔۔ہم نے انسان کومٹی سے پیدا کیا پھراُسے نطفہ بنا کرایک قابل اطمینان جگہ(رحم) میں ٹھہرایا۔

۴۔۔۔وہ ایساخداہے جو پوشیدہ اورظاہر سے باخبر ہے اورطاقتوراورمہربان ہے۔ وہ وہی تو ہے جس نے جس کو پیدا کیا،اچھا پیدا کیا۔اورانسان کی پیدائش کا آغازمٹی سے کیا۔پھراس کی نسل کو پست اور بے قدرو قیمت پانی کے نچوڑ سے خلق کیا۔ اس کے بعد اس کے اعضاء واندام کوموزوں بنایااوراس میں اپنی روح کواس میں پھونکا،اورتمہارے لئے کان،آنکھ،اوردل بنائے،لیکن تم اس کی نعمتوں کا بہت کم ہی شکریہ ادا کرتے ہو۔

۵۔۔۔اوراسی طرح تمہاری تخلیق میں اوردوسری ساری زمین میں چلنے والی مخلوق میں جوپھیلی ہوئی ہے،ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جواہل یقین ہیں۔

الفاظ کے معانی

''بَشَر'' دراصل ''بِشرۃٌ'' سے ہے جس کا معنی ہے انسان کی ظاہری جلد۔لیکن کتاب ''مقائیس اللغۃ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کا حسن وجمال کے ساتھ ظاہر ہونا۔لہٰذا ''بشر'' (بروزن یُسر) کی حالت مسرت اورشادمانی کی حالت کہلاتی ہے۔چونکہ یہ حالت انسان کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے لہٰذا ''بشر'' کالفظ نوعِ انسان کیلئے اسم بن گیاہے۔ اوریہ لفظ زن ومرد، مفرد تثنیہ اورجمع سب پر بولا جاتا ہے۔

''سلالۃ'' (بروزن عصارہ) اس چیز کے معنی میں ہے جوکسی دوسری چیز سے لی جائے اوروہ اس کا خلاصہ اورنچوڑ تصور کی جائے۔یہ لفظ دراصل ''سَلّ'' (بروزن حل) سے لیا گیا ہے،جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ کھینچنا اوراتارنا۔تلوار کو نیام سے نکالنے کیلئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔پھراس کا اطلاق ان اشیاء پر ہونے لگا ہے جو نچوڑ اورخالص ہیں۔ اوریہ جومذکورہ بالا آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے انسان کومٹی کے سلالہ سے پیدا کیاہےتواس کا معنی ہے کہ اس کے صاف شدہ نچوڑ سے پیدا کیا ہے، جب کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے

مراد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام روئے زمین کی ہر قسم کی مٹی کے نچوڑ سے پیدا ہوئے ہیں (اس لئے ان تمام کے آثار کو اپنے وجود میں خلاصہ پاتا ہے) ''سلیل'' کے لفظ کا اطلاق ''اولاد'' پر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ماں باپ کے وجود سے حاصل ہوتا ہے۔

''نطفہ'' دراصل ''صاف پانی'' کے معنی میں ہے اور بعض اہلِ لغت نے اسے ''کم پانی'' کے معنی میں بھی لیا ہے وہ پانی جو انسان کی پیدائش کا مبداء اور اصل ہے چونکہ قلیل بھی ہوتا ہے اور صاف شدہ بھی، نیز تمام وجود کا نچوڑ بھی اسی لئے اس لفظ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔ جاری ہونے والی مائع چیزوں کو ''بھی'' ''ناطف'' کہتے ہیں۔

''امشاج'' ''مشج'' (بروزن نسج ۹ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں مخلوط اور ملی جلی چیز، اور بعض اسے ''مشیج'' کی جمع سمجھتے ہیں۔ چونکہ انسان کے نطفہ کے منعقد ہونے کے وقت مرد اور عورت دونوں کا پانی ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط اور مرکب ہوجاتا ہے، اسی لئے اسے ''امشاج'' کہتے ہیں۔

''لسان العرب'' میں ہے کہ یہ مادہ دراصل ایسے دو مختلف رنگوں کے معنی میں آتا ہے۔ جو آپس میں ملے جُلے ہوتے ہیں۔ (پھر اس کو مختلف ملی جلی اشیا کے معنی میں بولا جانے لگ گیا ہے)۔

''نطفہ امشاج'' انسان کی آفرینش شاید ان مختلف مواد کی طرف اشارہ ہو جن سے نطفہ ترکیب پاتا ہے، یا ان مختلف صلاحیتوں اور لیاقتوں کی طرف اشارہ ہو جو وارثت وغیرہ کے ذریعہ سے نطفہ میں جمع ہوجاتی ہیں، یا ان تمام قسم کی ترکیبات کی طرف اشارہ ہو۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلے ''انفسی آیات''

قرآن مجید میں انسان کی پیدائش کے آغاز کے بارے میں مختلف تعبیریں ملتی ہیں، زیر بحث آیات کے سلسلہ کی سب سے پہلی آیت میں فرماتا ہے ''اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے'' (وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ)

چوتھی آیت میں فرماتا ہے۔ ''ہم نے انسان کی تخلیق مٹی سے قرار دی ہے۔'' (وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ)

تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''خدا نے انسان کو مٹی کے نچوڑ سے پیدا کیا'' (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ)

سورہ صافات، آیت ۱۱ میں فرماتا ہے ''ہم نے انسان کو چپکنے والی مٹی، یا سخت اور محکم مٹی سے پیدا کیا'' (اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ)

سورہ حجر کی ۲۶ ویں آیت میں فرماتا ہے ''خدا نے انسان کو بدبودار کیچڑ سے پیدا کیا'' (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ)

سورہ الرحمن کی ۱۴ ویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے ''خدا نے انسان کو خشک اور کھنکھنانے والی مٹی سے پیدا کیا'' (خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ

صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ)

''صلصال'' کے اصل معنی ''خشک جسم میں آواز کا پلٹ جانا'' میں ۔اسی لئے خشک شدہ مٹی کو''صلصال'' کہتے ہیں کہ جب کوئی چیز اُسے لگتی ہے تو اس سے آواز اٹھتی ہے اور جب وہ پک جائے تو اُسے ''فخار'' کہتے ہیں۔

''فخار''، ''فخر'' کے مادہ سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں بہت فخر کرنے والا، جو فخر کرنے والے افراد شور تو بہت مچاتے ہیں لیکن ان کا اندر خالی ہوتا ہے، اسی لئے انہیں فخار کہا جاتا ہے ۔کوزہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور ہر قسم کی سفال وغیرہ جس کا اندر خالی ہوتا ہے، کو بھی فخار کہا جاتا ہے، بلکہ ہر اس چیز کو فخار کہتے ہیں جو مٹی سے بنا کر آگ میں پکائی جائے۔[1]

مندرجہ بالا آیات کے مجموعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان آغاز میں خاک اور مٹی تھا۔اُس خاک میں پانی ملایا گیا تو وہ گیلی مٹی میں تبدیل ہوگیا۔کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ مٹی کیچڑ بن گئی اور کیچڑ ایک عرصہ گزرنے کے بعد ایک نچوڑ کی صورت میں آدم کے اصل مادہ میں تبدیل ہوگئی اور اس کے بعد وہ خشک ہوگئی اور کئی اہم مراحل گزرنے کے بعد آدمؑ کی صورت بن گئی۔

لیکن قرآن پاک کی دوسری آیات مثلاً اسی سلسلہ بحث کی دوسری آیت میں انسانی تخلیق کو ملے قلے نطفے سے بیان کیا گیا ہے۔(مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ)

اور تیسری آیت میں پہلے تو ''مٹی کے نچوڑ'' سے، پھر ''رحم میں ٹھہرے ہوئے نطفہ'' سے (مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ)

ظاہر ہے کہ ان آیات سے مراد انسان کے مراحل اور بعد کی نسلیں ہیں۔وہ اس طرح سے کہ ہمارے جداول یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے مٹی سے پیدا کیا گیا اور ان کی بعد کی نسل کو نطفۂ امشاج سے۔[2]

یہ احتمال بھی مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں ملتا ہے کہ چونکہ نطفہ کو تشکیل دینے والا مواد سارے کا سارا مٹی سے حاصل ہوتا ہے ۔لہٰذا صرف پہلا انسان ہی مٹی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ بعد کے تمام انسان بھی مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔

بہرحال یہ بات واقعاً کائنات کے عظیم عجائبات اور تخلیقِ عالم کی محیر العقول صورتِ حال ہے کہ مٹی جیسی ایک بے جان مردہ اور کم قیمت چیز سے انسان جیسی زندہ، ہوشیار اور انمول چیز پیدا ہو۔یہ اس عظم مبداء کی روشن نشانیوں میں سے ایک واضح ترین آیت اور نشانی ہے ۔بقولِ شاعر

شائستہ ستائش آن آفریدگاری است
کاردچنیں نقش دلآویز نقشی زماء وطینی

---

[1])مفردات راغب، مجمع البحرین اور لسان العرب

[2] تفسیر المیزان جل ۱۶ ص ۱۷۳ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(حمد وثنا کے لائق وہ خالق کائنات ہے جو اس قسم کا نقش دل آویز پانی اور مٹی سے معرضِ وجود میں لاتا ہے)

اصولی طور پر موت کے دل سے حیات کی پیدائش ابھی تک علمی دنیا کا ایک ناقابل حل معمہ بنی ہوئی ہے کہ کن حالات وشرائط کے تحت انسان جیسا زندہ وجود خاک جیسے بے جان وجود سے منصۂ شہود پر آتا ہے، کیوں کہ تمام دانشورانِ عالم کا پختہ عقیدہ ہے کہ جب کُرۂ زمین آفتاب سے جُدا ہوں تو اس وقت مکمل طور پر جل کر بھسم کر دینے والی آگ کا ایک گولہ تھا اور اس میں زندگی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ سرد ہونا شروع ہوا اور بڑے پیمانے پر گیسوں کی سیلاب آور بارشیں اس کے اطراف میں برسنے لگیں، سمندر معرضِ وجود میں آ گئے لیکن کوئی زندہ چیز اس دنیا میں موجود نہیں تھی۔

پھر حیات وزندگی کی کونپلیں، نباتات اور حیوانات کی صورت میں ظاہر ہونے لگیں، انجام کار انسان کی تخلیق عمل میں آ گئی۔

ہم خواہ انسان کی مستقل تخلیق کے معتقد ہوں (جیسا کہ آیاتِ قرآن سے ظاہر ہوتا ہے) یا اسے دوسرے حیوانوں کی ارتقا یافتہ اقسام میں سے کوئی تسلیم کریں (جیسا کہ ڈارون کے عقیدہ اور ارتقاء کے مفروضہ کے حامیوں کا نظریہ ہے) ہر صورت میں اس انسان کی اصلیت مٹی پر جا کر ختم ہوتی ہے اور وہ اسی خاک ہی کا پتلا تسلیم کیا جاتا ہے۔ جہاں پر زمین سے ایک باریک سے باریک ترین خلیے کی پیدائش نے دنیا کے تمام دانشوروں کو حیرت زدہ کیا ہوا ہو، وہاں پر مردہ اور بے جان زمین سے انسان کی پیدائش کی کیا حالت ہوگی؟

یہیں پر ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہم آیاتِ حق میں سے ایک عظیم آیت اور عظمتِ رب العالمین کی ایک محیر العقول نشانی کے سامنے موجود ہیں۔ جو ''عالمِ اصغر'' میں ایک نشانی ہے اور یہ عالمِ اصغر، عالم اکبر کا ایک مکمل نمونہ ہے۔

''کرسی موریسن'' نامی ایک معرف مؤلف ''رازِ آفرینشِ انسان'' نامی کتاب میں کرہ زمین میں زندگی کی پیدائش کے آغاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کرۂ زمین میں حیات کے ظہور کے آغاز میں ایک عجیب اتفاق رونما ہوا جس نے زمین پر موجود چیزوں کی زندگی میں زبردست اثر کیا۔ خلیوں میں سے ایک خلیے میں یہ عجیب خاصیت موجود تھی کہ وہ سورج کے نور کے ذریعہ سے بعض کیمیکل ترکیبوں کا تجزیہ کرے اور اس عمل کے نتیجہ میں اپنے لئے بھی اور اپنے جیسے دوسرے خلیوں کے لئے بھی غذا کا مواد فراہم کرے۔ ان اولین خلیوں کی اولاد میں سے کچھ خلیوں نے اسی غذا سے استفادہ کیا ہے جو ان کی ماں نے آمادہ کی تھی۔ اس طرح سے نسلِ حیوانی کو وجود میں لے آئے، جب کہ دوسرے خلیوں کی اولاد نے جو کہ نباتات کی شکل اختیار کر چکے تھے، دنیا بھر کی نباتات کو تشکیل دیا۔ اور آج تمام جاندار چیزیں زمین سے غذا حاصل کرتی ہیں۔''

اس کے بعد کہتے ہیں:

''کیا یہ ماننے والی بات ہے کہ ایک خلیہ اتفاقی طور پر حیوانات کی زندگی کا منشاء اور دوسرے خلیے نباتات کی اصل بنے ہوں؟''

کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ:

''دانشور حضرات مادی دنیا کی موجود چیزوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتے ہیں۔ ایک ''آلی'' (یعنی وہ موجودات جو خراب ہو جاتی ہیں جیسے نباتات اور حیوانات کے اعضاء واجسام) دوسرے 'معدنی'' جو خراب نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے کیمسٹری کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک

کا نام ہے ''آلی کیمسٹری'' اور دوسری کا نام ہے ''معدنی کیمسٹری''

''تقریباً تمام انسانی غذا کا تعلق آلی مواد سے ہے جو سارے کے سارے زمین سے حاصل کئے جاتے ہیں اور جب وہ بدن میں داخل ہوتے ہیں تو ہر عضو کی مناسب غذا کے مطابق جدید کیمیکل ترکیب حاصل کرتے ہیں۔ یہ وہی حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے: ''ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے'' یا ''تمہیں مٹی کے نچوڑ سے خلق کیا ہے۔''[1]

یہ ٹھیک ہے کہ انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے، یعنی خاکی مادہ کے علاوہ روحِ الٰہی کا حامل بھی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ جس کی ہم اہنگی کے ساتھ ہی روح مختلف اعمال وافعال کی مظہر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے روح کی ہم آہنگی کے ساتھ یہ خاکی مادہ مختلف قسم کی ایسی مختلف صلاحیتوں، مختلف ذوقوں، مختلف ایجادات اور مختلف اعمال کا مظاہرہ کرتا ہے کہ عقلِ انسانی جن پر ششدر رہ جاتی ہے۔

باوجود یکہ انسان عرصہ دراز سے مختلف علوم کا موضوع بنا ہوا ہے اور اس کے ہر پہلو پر ایک نہ ایک مخصوص علم تحقیق اور ریسرچ میں مشغول ہے، پھر بھی وہ ایک ناشناختہ چیز کی صورت میں باقی ہے اور ایک لمبا عرصہ درکا ہے کہ دانشورانِ عالم اپنی شبانہ روز سرتوڑ کوششوں کو بروئے کار لائیں، کائنات کے اس عظیم معمہ کو حل کریں اور اس کے مختلف گوشوں کو نمایاں کریں۔ پھر بھی ممکن ہے کہ وہ یہ کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

انسانی جسم کا ہر ایک عضو بذاتِ خود ایسے احتمالات کے حساب کا ایک مستقل موضوع بن سکتا ہے۔ آنکھ، کان، دل، رگیں، نظامِ تنفس، گردے، معدہ، جگر بلکہ مغز اور اعصاب کا نہائی پیچیدہ نظام ریاضی کے ایک سادہ سے حساب کے تحت واضح کرتا ہے کہ کوئی بھی عقل اسے اچانک پیائش کا نتیجہ قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

ان اعضاء میں سے ایک عضو کی سرگرمیوں اور فزیکل ساخت کے بارے میں ہزار ہا دانشوروں اور مفکرین نے سینکڑوں یا ہزاروں کتابیں لکھ ڈالی ہیں اور یہ کس قدر عجیب بات ہے!

کیا کوئی شخص باور کرسکتا ہے کہ ان اعضاء میں سے ہر ایک کی شناخت کیلئے اس قدر علم، عقل ہوش اور ذکاوت ضروری ہو، لیکن ان کی ساخت وتخلیق کے لئے علم وعقل کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک کارخانہ کے کام کرنے کے طریقہ کار کو سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے کے طریقہ کو جاننے کیلئے سالہا سال کا مطالعہ درکار ہو لیکن اس کے بنانے اور ایجاد کرے میں عقل وخرد کا کوئی عمل دخل نہ ہو، بلکہ وہ شعور عوامل کے ہاتھوں منصۂ شہود پر آجائے!! اسے کون سی عقل باور کرسکتی ہے؟؟

یہیں پر نہ صرف انسان کی اس سادہ مٹی (خاک) کے مادہ سے اور ''سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ'' (یعنی مٹی کے نچوڑ) سے اور ''حَمَإٍ مَسْنُونٍ'' (یعنی بدبودار کیچڑ) سے پیدائش، خدا کے وجود کی عظیم آیات اور تخلیق کائنات کے عظیم ترین شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے بدن کا ایک ایک خلیہ اس کا آئینہ تمام نما بن جاتا ہے۔

---

[1] عجاز قرآن از نظر علوم امروز ص ۲۳، ۲۴ سے اقتباس

نظامِ تخلیق نہایت پیچیدہ اور نازک ہے

کہتے ہیں کہ فلاں مشینری کا نظام پیچیدہ ہے۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کی ساخت میں مختلف اجزاء اور تنصیبات کام میں لائے جائیں۔ اس کا رابطہ کثیر اور کئی طرح کی چیزوں سے ہو اور وہ کئی طرح کے اہم کام دے۔ مثال کے طور پر ایک کلکولیٹر (حساب کرنے کی مشین) کو ہی لے لیجئے جو اپنے اصلی کام یعنی حساب کرنے کے علاوہ ہندسہ یعنی جیومیٹری اور الجبرا کے مسائل کو بھی آناً فاناً حل کر دیتی ہے ،اور ریاضی کے مختلف مسائل کو بھی سریع انداز میں حل کر دیتی ہے یا اُسے محفوظ کر لیتی ہے، تو کہتے ہیں کہ اس کا نظام پیچیدہ ہے۔

دانشوروں کا کہنا ہے کہ آنکھ کے پردے کے پیچھے نوے ہزار باریک اعصابی رگیں ہیں جو پردے کے خلیوں کو اعصابی سلسلہ سے ملاتی ہیں (یاد رہے کہ نوے ہزار کی یہ تعداد صرف ایک آنکھ میں ہے، نہ کہ دونوں میں) اور یہ ایک نہایت ہی ظریف، باریک اور پیچیدہ ساخت ہے۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اصل بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس جہانِ آفرینش میں نزاکت وظرافت کے مسئلہ کے علاوہ ایسا حد سے زیادہ پیچیدہ نظام موجود ہے کہ انسان کا دماغ کا چکرا جاتا ہے اور بعض دانشوروں کے بقول انسان کے عظیم بدن کے شہر میں ایسی عمارتیں بھی موجود ہیں جن کے سامنے اس کائنات کی سربفلک عمارتیں ایک معمولی سی جھونپڑی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مثال کے طور پر بطور نمونہ ہم اس کائنات کے پیچیدہ نظاموں میں سے ایک خلیے کی ساخت کا نظام پیش نظر رکھ کر اس کے بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں جس کے بارے میں دور حاضر میں عجیب وغریب انکشافات ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان متوسط طور پر ''دس ملین ارب'' (یا ایک کروڑ ارب) چھوٹے چھوٹے خلیوں سے ملکر بنا ہے۔

سب سے پہلے جس شخص نے ان خلیوں کو دریافت کیا ہے اور ان کیلئے یہ نام تجویز کیا ہے، ایک دانشور بنام ''ہوک'' ہیں جو سترھویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں۔ البتہ انہیں اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ اس اکائی کی ساخت کس حد تک پیچیدہ اور محیر العقول ہے۔ لیکن بعد کے دانشوروں نے اس کی تحقیق کے بارے میں اپنی کوششیں جاری رکھیں اور تا بحال جن اسرار تک ان کی دسترسی ہو سکی ہے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔۔۔خوردبین سے دیکھے جانے والے ایک چھوٹے سے خلیئے کو ایک ایسے شہر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس میں غذائی مواد کو انسانی جسم کی ضرورت پورا کرنے کے مواد میں تبدیل کرنے کیلئے ہزاروں تنصیبات، لیبارٹریاں اور کارخانے ہوں۔ لیکن پھر بھی انسان کے ذریعہ معرضِ وجود میں آنے والی عظیم ترین اور جدید ترین مصنوعات کا اس کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔۔۔یہ چھوٹا لیکن حیران کُن شہر تین حصوں پر مشتمل ہے۔

(الف) جِلد، جو اس کی فصیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ب) خلئے کا درمیان حصہ (سفیدہ یا سیٹوپلاز)

(ج) جوہر، یا کمانڈ نٹ ہیڈ کوارٹر۔(نیوکلین)

جلد یا فصیل جو خلیے کے گرد بنائی گئی ہے اس قدر لطیف، طریف اور نازک ہے کہ اگر اس قسم کی پانچ لاکھ فصیلوں کو ایک دوسرے پر رکھ دیا جائے تو بڑی مشکل سے ایک عام سے کاغذ کی ضخامت کے برابر بنے۔لیکن اس کے باوجود وہ بیرونی حملہ آور اور مشکل ایجاد کرنے والے عوامل کے مقابلے میں اس قدر حساس اور محکم ہے کہ شہرۂ آفاق دیوارِ چین بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے!!!

یہ نازک حصار تین تہوں پر مشتمل ہیں، اوپر کی دو تہیں تو پروٹین کی ہیں اور نچلی تہہ چربی سے بھرپور ہے، اور یہ چربی کسی چیز کو کسی بھی صورت میں اپنے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی، جب تک کہ اس کے پاس رمز بھری چابی نہ ہو۔وہ چابی یہ ہے۔

''جو مواد اندر داخل ہونا چاہتا ہے وہ اس حصار کی چربی کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اُسے جذب کر کے اندر چلا جائے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دوست ہے نہ کہ دشمن۔'' اس طرح سے یہ شہر کسی چوکیدار اور سنتری کے بغیر ہر طرف سے اور ہر طرح سے محفوظ ہے۔

۳۔۔۔اس شہر (خلیے) کے اندر بہت سی نہریں CANALS ہیں جو جلد سے شروع ہو کر جوہر یعنی کمانڈ نٹ ہیڈ کوارٹر تک جا پہنچتی ہیں اور غذائی مواد کو اپنے اندر لے کر اُسے پروٹین میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تیزابیت ACIDITY کی ۲۳ مخصوص قسمیں ان خلیوں میں داخل ہوتی ہیں جن کی کئی قسموں کی باہمی ترکیب سے پروٹین حاصل ہوتی ہے۔

۴۔۔اس کا اصل جوہر ہی بذاتِ خود کئی ہزار منزلہ سر بفلک عمارت کی مانند ہے، نیویارک کی سر بفلک عمارتیں جس کے مقابلے میں ایک حقیر سا مکان معلوم ہوتی ہیں۔

خلیے کا اصلی جوہر جو کہ کمانڈ نٹ ہیڈ کوارٹر بھی ہے خود اس کی لمبی چوڑی تفصیل ہے۔اس کا بیرونی پردہ ہے، اندرونی شیرہ ہے اور اس کے اطراف میں باریک باریک نسیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص کام ہے۔

۵۔۔۔عجیب بات تو یہ ہے کہ خود جوہر ہی میں کئی باریک، چھوٹی چھوٹی اور ظریف اکائیاں موجود ہیں۔دانشمندوں کی تحقیق کے مطابق جن کی تعداد ۲۵ ہزار بنتی ہے اور انا کائیوں کا نام جین GEN ہے۔

ان GENS نے نہ صرف خلیوں کا سارا کام سنبھالا ہوا ہے بلکہ جسم کی تمام سرگرمیوں پر بھی کڑی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ان کا اہم ترین مسئلہ رواشتی امور کا کنٹرول اور صفات و خصائص کو آئندہ خلیوں میں منتقل کرنا ہے۔یعنی انسانوں اور دوسرے جانوروں کی موروثی صفات ان GENS ہی کے ذریعہ منتقل ہوتی ہے۔اور چونکہ جینز کا عمدہ ترین کام جوہر کی مخصوص تیزابیت کے ذمہ ہوتا ہے لہٰذا اسے الیکٹرانک مغز یا جینز کا کمپیوٹر کہا جاتا ہے۔اس سے بڑھ کر جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ خود ان جینز GENS کی تشکیل بھی کئی اور اجزاء سے ہوئی ہے جن کے تیس ہزار سے پچاس ہزار طبقے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ عظیم شہر جس کی اس قدر عجیب و غریب فصیل، ہزاروں خوبصورت دروازے، بے شمار کارخانہ، گودام اور پائپوں

کا بچھا ہوا جال، کمانڈنٹ ہیڈکوارٹر، بیحد وحساب تنصیبات اوراس دوسری کے ساتھ ربطِ باہم اوراس قسم کے کئی دوسرے اہم اورزندہ کام ہیں۔ وہ بھی ایک چھوٹے اورمحدود سے رقبہ میں جو کہ کائنات کے بہت بڑے پیچیدہ اورحیرت ناک شہروں میں سے ہے۔ اگرہم چاہیں کہ ایسی تنصیبات ایجادکریں جواس قسم کے کام انجام دے سکیں، جو یقیناہمارے بس سے باہر ہے۔۔۔تواس کیلئے ہزارہا ایکڑزمین کی ضرورت ہوگی جس پر یہ تنصیبات، عمارات اورمشینیں نصب کرنا پڑیں گی تاکہ اس قسم کا کارنامہ انجام دے سکیں۔لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ صناعِ ازل نے یہ سب کچھ ایک ملی میٹر کے دس لاکھ حصہ کے پندرھوں حصہ میں قرار دیا ہے۔[1]

پس انسان کی تخلیق میں اس قادرمطلق کی ایک نہیں بلکہ ہزاروں اورلاکھوں آیات اورنشانیاں پوشیدہ ہیں جن کی وجہ سے مجبوراً کہنا پڑتا ہے:

العظمة لله الواحد القهار

[1] ''فزیالوجی حیوانی''، فزیالوجی وراثت''اورسفربہ اعماق وجوادانسان''نامی کتابوں سے اقتباس

۲۔جنین کے پروان چڑھنے میں خدا کی نشانیاں

اشارہ

ماں کے پیٹ میں جنین کی تبدیلیاں کافی عرصے تک دانشوروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں۔آخرکار علم نے اس اسرارآمیز دنیا کی نقاب بھی اُلٹ دی اور بتادیا کہ ایک نطفہ جب ''رحم'' میں جاٹھہرتا ہے تو وہاں پر اس کی سرگرمیاں شروع ہوجاتی ہیں اور اپنی ارتقائی منزلیں طے کرنا شروع کردیتا ہے۔ اس دوران وہ کیسے کیسے مراحل طے کرتے ہوئے اس مرحلے تک جا پہنچتا ہے کہ ایک مکمل انسان کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

پھر عجیب بات تو یہ ہے کہ اس دور میں قرآنِ مجید نے مختلف آیات میں جنین کے مختلف مراحل طے کرنے کی بات کی ہے اور بار بار اس بات پر زور دیا ہے جب اس قسم کی دریافت کا نام ونشان تک نہ تھا، مگر قرآن پاک نے کبھی توحید کے اثبات کیلئے اور کبھی معاذ (قیامت) کے ثبوت کے طور پر اس چیز کو بیان کیا ہے۔

اگر ''جنین شناسی'' کا علم اب بھی اپنی بچپن کی منزلوں سے گزر رہا ہے اور اس اسرار بھری دنیا کے متعلق ہماری معلومات اب بھی ناچیز اور بہت محدود ہیں، تاہم اب تک جو کچھ ہوچکا ہے اس نے دانشوروں کے سامنے عجائب واسرار کی ایک دنیا رکھ دی ہے۔ چنانچہ اسی اشارے کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل آیات کو جان ودل کے کانوں سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾

(مومنون/ ۱۲ تا ۱۴)

۲۔۔۔اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى {} ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى {} فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى

(قیامت/ ۳۷ تا ۳۹)

۳۔۔۔اَوَلَمْ يَرَى الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ

(یٰس/۷۷)

۴۔۔۔قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا

(کہف/۳۷)

۵۔۔۔هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ

(مومن/۶۷)[1]

ترجمہ

۱۔۔۔ہم نے انسان کو مٹی کے نچوڑ سے پیدا کیا۔ پھر اُسے نطفہ بنا کر مطمئن جگہ ((رحم میں) رکھا۔ پھر نطفہ کو جمے ہوئے خون (علقہ) میں اور علقہ کو ''مضغہ'' (خون کے لوتھڑے) میں اور مضغہ کو ہڈیوں میں تبدیل کیا۔ اس کے بعد اسے تازہ تخلیق عطا کی۔ پس بابرکت ہے وہ خدا جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔

۲۔۔۔آیا انسان ایک ناچیز منی کا نطفہ نہیں تھا جسے رحم میں ڈالا گیا؟ پھر وہ لوتھڑے کی صورت میں ہو گیا۔ اور خدا ہی نے اُسے پیدا کیا اور موزوں بنایا اور اس سے دو جوڑے مذکر اور مؤنث خلق فرمائے۔

۳۔۔۔کیا انسان یہ نہیں جانتا کہ ہم نے اُسے ایک (حقیر سے) نطفہ سے پیدا کیا ہے؟ پھر وہ (اس قدر قدرت، شعور اور گفتگو کرنے والا ہو گیا کہ) آشکارا لڑائی کرنے لگا۔

۴۔۔۔اُسے اس کے (ایماندار) دوست نے باتیں کرتے ہوئے کہا: آیا تو اس خدا سے کافر ہو گیا ہے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا ہے اور پھر تجھے مکمل مرد قرار دیا؟

---

[1] اس بارے میں اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ لیکن چونکہ وہ انہی آیات سے ملتی جلتی ہیں لہٰذا نہیں ذکر کرنے کی بجائے ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ فاطر ۱۱ و سورہ حج۔۵

۵۔۔۔وہ تو وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، اس کے بعد جمے ہوئے خون سے پھر تمہیں بچے کی صورت میں باہر بھیجتا ہے، پھر تم کمالِ قوت کے مرحلے تک جا پہنچتے ہو، اس کے بعد بوڑھے ہوجاتے ہو (اور اس دوران) تم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس مرحلہ تک پہنچنے سے پہلے ہی مرجاتے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ تم اپنی مقررہ مدت تک جا پہنچو اور شاید کہ عقل سے کام لو۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''علقۃ''، ''علق'' (بروزن شفق) کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی تو کسی چیز سے تعلق اور رابطہ ہیں، اسی لئے ''علق'' کا معنی ''جما ہوا خون'' اور ''جونک'' بھی آیا ہے۔ اور ''علقہ'' کو کہ رحم مادر میں جنین کے تدریجی مراحل کا ایک حصہ ہے۔ اسی لئے علقہ کہلاتا ہے کہ وہ جمے ہوئے خون کی صورت اختیار کئے ہوئے ہوتا ہے۔[1]

''کتاب'' مقاییس اللغۃ'' میں اس لفظ کے اصل مفہوم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اس تعلق پر دلالت کرتا ہے جو کسی چیز کا اپنے سے بلند ترین چیز کے ساتھ ہوتا ہے۔ بعد میں اس کے مفہوم نے وسعت اختیار کر لی۔[2]

''مضغہ''، ''مضغ'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ''غذا کا چبانا'' اور گوشت کی اس بوٹی کے معنی میں ہے جسے منہ میں لے کر انسان چباتا ہے اور وہ ابھی تک پوری طرح پکی نہیں ہوتی، یعنی ناپختہ ہوتی ہے۔ جنین پر ''علقہ'' کے مرحلہ کے بعد اس کا اطلاق اس قسم کی بوٹی کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر جنین ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے اور لوتھڑے کی شکل بن چکا ہوتا ہے۔ اس میں سبز رنگ کی رگیں بھی نمودار ہو چکی ہوتی ہیں۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے ''قَلْبُ الْاِنْسَانِ مُضْغَةٌ مِّنْ جَسَدِہٖ'' (انسان کا دل اس کے جسم کے گوشت کا ایک ٹکڑا (لوتھڑا) ہوتا ہے) یہ اور اس قوم کی دوسری تمام تعبیرات ایک ہی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہیں۔[3]

''مَنِیّ'' دراصل ''منی'' (بروزن سعی) کے مادہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اندازہ لگانا اور چونکہ نطفہ کا پانی ایک انسان یا حیوان کے اندازے کے مطابق ہوتا ہے، اسی لئے اس لفظ کا اطلاق اس پر ہوتا ہے ''موت'' کو اس لئے ''منیّہ'' کہتے ہیں کسی انسان یا حیوان کی زندگی کے اندازہ کی حامل ہوتی ہے۔

''تمنی''، یعنی ''تمنّا'' کے لفظ کا آرزوؤں اور امیدوں پر اطلاق اسلئے ہوتا ہے کہ انسان ان آرزوؤں کا اپنے دل میں اندازہ

---

[1] مفردات راغب۔

[2] لغت کی اور کتابیں مثلاً لسان العرب اور مجمع البحرین میں بھی اسی طرح کی تعبیرات ملتی ہیں۔

[3] ملاحظہ ہو، مقاییس اللغۃ، مجمع البحرین، لسان العرب، اور صحاح اللغۃ۔

کرتا ہے اورانہیں تصور میں لاتا ہے۔ چونکہ بہت سی آرزوئیں واقعہ کے مطابق نہیں ہوتیں لہٰذا ''امنیہ'' کا لفظ کبھی کبھی جھوٹی آرزوؤں پر بھی بولا جاتا ہے۔[1]

آیات کی تفسیر اور اُن کی جمع بندی

جنین کی اسرار آمیز کائنات

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید نے رحم مادر میں جنین کے ارتقائی مراحل کی طرف کئی مرتبہ اشارہ کیا ہے، اس پر تاکید بھی کی ہے، اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ لوگ اس بارے میں خوب غور وفکر سے کام لیں اور اس بارے میں دقیق مطالعہ کریں۔ اسی بات کو قرآن نے معرفتِ الٰہی تک پہنچنے کا ایک راستہ بھی بتایا ہے اور معاد کے ثبوت کیلئے بھی اسے ایک دلیل قرار دیا ہے۔

چنانچہ زیر بحث سلسلہ کی آیات میں سے پہلی آیت کے آخری الفاظ ''فَتَبَارَكَ اللهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ'' (پس بابرکت ہے وہ خدا جو بہترین خالق ہے) کے مطابق خداشناسی کے مسئلہ کو بیان کیا جارہا ہے۔ ہرچند کہ اسی سورت (مومنون) کی اور بھی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد (قیامت) کے مسئلہ کو بھی زبردست اہمیت دی گئی ہے۔ اس طرح یہ سورت مبداء اور معاد دونوں کے مسائل کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

پہلے تو آفرینش انسان کو ''مٹی کے نچوڑ'' سے پھر ''جونطفہ رحم کی امن وامان کی قیام گاہ میں موجد ہے'' سے بتایا گیا ہے۔ ان دو مراحل کا ذکر کرنے کے بعد پانچ اور مراحل کا بھی ذکر کیا ہے جو مجموعی طور پر سات مراحل بن جاتے ہیں۔

۱۔۔۔ پہلا مرحلہ ''علقہ'' ہے جب نطفہ جمے ہوئے خون کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس میں بہت سی رگیں وجود میں آجاتی ہیں۔

۲۔۔۔ دوسرا مرحلہ ''مضغہ'' ہے جو خون کے لوتھڑے کی شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

۳۔۔۔ تیسرا مرحلہ ''عظام'' کا ہے جب گوشت کے تمام خلیے ہڈیوں کے خلیوں میں بدل جاتے ہیں۔

۴۔۔۔ چوتھا مرحلہ ہڈیوں پر گوشت کو پوشش کا ہے جو تمام ہڈیوں کے عضلات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ (فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا)

اب اس مقام پر قرآن کا لہجہ تبدیل ہوتا ہے اور جنین کے بارے میں تبدیلیوں اور نئی اور اہم آفرینش کی خبر دیتے ہوئے ایک اسرار آمیز اور راز بھری صورت میں کہتا ہے ''پھر ہم نے اُسے نئی آفرینش عطا کی'' (ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ)

جب یہ ساتوں مراحل اختتام کو پہنچتے ہیں تو (فَتَبَارَكَ اللهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ) کے جملہ کے ساتھ اس عجیب مخلوق کی خوبصورت انداز میں تعریف کرتا ہے، ایسا جملہ کہ نہ تو قرآن کی کسی اور آیت میں استعمال ہوا ہے اور نہ ہی کسی اور مخلوق کے بارے میں بیان ہوا ہے ''کیا کہنے

---

[1] مفردات راغب، مجمع البحرین اور لسان العرب۔

ایسی مخلوق کے،کیا کہنے اس قدرت نمائی کے اور آفرین ہے اس کے عظیم و بزرگ و برتر خالق پر۔''

اس مجمل اور سربستہ جملہ ''خلقِ جدید'' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں بیان فرمائی ہیں، اور جو تفسیر سب سے زیادہ مناسب اور بہتر معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ جب جنین انسان حس وحرکت یعنی زندگی اور حیات کے مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے، حرکت کرنے لگتا ہے، حیوانات اور انسانوں کی کائنات میں قدم رکھنے لگتا ہے، اسی تحرک اور جست وخیز کو ''انشاء'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جو اس طولانی راستے کی طرف اشارہ ہے جسے انسان مختصر سی مدت میں طے کرتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث ہے جو آپؑ نے ''ثُمَّ اَنْشَاْنَاهُ خَلْقًا اٰخَرَ'' کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں اس کی تفسیر ہے ''ھو نفخ الروح فیہ'' یعنی اس میں روح پھونکنا مراد ہے [1]

یہ ٹھیک ہے کہ جنین اپنے پہلے لمحہ ہی سے ایک زندہ موجود چیز ہوتا ہے لیکن جب تک شکم مادر میں کسی قسم کی حس وحرکت نہیں کرتا، اس وقت تک وہ انسان یا حیوان کی نسبت نباتات کے زیادہ مشابہ ہوتا ہے لیکن چند ماہ گزرنے کے بعد اس میں انسانی روح زندہ ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں ہے کہ جنین جب تک اس مرحلہ تک نہیں پہنچ جائے اس کی مکمل دیت نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ اس مرحلہ پر پہنچ جائے تو پھر اس کی دیت ایک مکمل انسان کی سی دیت ہوگئی۔ [2]

''اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ'' (سب خالقوں سے بہترین خالق) کی تعبیر کیوں استعمال کی گئی ہے حالانکہ خدا کے علاوہ اور کوئی بھی خالق نہیں ہے؟ اس لئے کہ ''خلق'' کے معنی صرف ''عدم سے وجود میں لانے'' (کتم عدم سے منصۂ شہود میں لانے) کا نہیں ہیں، بلکہ اس کے اور بھی بہت سے معانی ہیں۔ مثلاً ''کسی چیز کا اندازلگانا''، ''صنعت'' اور ''دنیا کی موجودہ چیز وں کو نئی شکل عطا کرنا''، اور مسلم ہے کہ انسان اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس دنیا کی مختلف چیزوں کے موادمیں تبدیلی پیدا کرکے کسی چیز کو ایجاد کرتا ہے، مثلاً لوہے یا فولاد سے اوزار اور ہتھیار یا کوئی کارخانہ وجود میں لاتا ہے، یا عمارتی سامان سے ایک باشکوہ اور حیران کن عمارت مختلف اندازوں میں تعمیر کرتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ''خلق کرنے'' کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں یہ سب معانی داخل ہوجاتے ہیں اس لئے قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ مسیح کا ایک قول اس طرح نقل کیا ہے:

''اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ'' ''یعنی میں مٹی سے پرندے کی طرح کی چیز بناتا ہوں اور پھر اس میں اپنی روح پھونکتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے'' (آلِ عمران/۴۹)

البتہ خالقِ حقیقی، یعنی وہ ذات جس نے مادہ اور صورت کو عدم سے وجود بخشا ہے اور اشیاء کی ہر قسم کی قدرت اور خواص کی اسی کی طرف بازگشت ہے، وہ صرف اور صرف خدا ہے، جب کہ دوسرے ''خالقوں'' کا کام، جو کہ مجازی خالق ہیں، صرف صورت کو تبدیل

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۳ ص ۵۴۱ حدیث ۵۶ و ۵۷

[2] تفسیر نورالثقلین جلد ۳ ص ۵۴۱ حدیث ۵۶ و ۵۷

کرنا یا مواد کو جوڑنا ہوتا ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں انسان کی پیدائش کے آغاز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی اس زمانے کی طرف جب وہ ''منی'' نام کا ایک ناچیز قطرہ تھا اور اس کے بعد فقط اس کے ''علقہ'' کے مرحلہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور باقی مراحل جنین کو ''فَخَلَقَ فَسَوّٰی'' (خدا نے پیدا کیا اور نظام بخشا) کے عنوان کے تحت ایک نہایت ہی جامع تعبیر کو ذکر فرمایا ہے۔ خصوصی طور پر ایک ایسی چیز پر زور دیا ہے جو ''جنین شناسی'' سے متعلق نہایت ہی پیچیدہ صورت حال ہے، یعنی ''مذکر'' و ''مؤنث'' کی جنس کی پیدائش پر زور دیا ہے فرماتا ہے: ''فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى''

''سوّی'' دراصل ''تسویۃ'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ''صاف کرنا'' اور ''نظم ونظام عطا کرنا''۔ چنانچہ بعض حضرات اسے روح کی تخلیق کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو اس سے پہلی آیت میں ایک اور صورت میں بیان ہو چکا ہے۔ لیکن بعض اور حضرات نے ''خلق'' کو ''روح کی تخلیق'' کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور ''سوّی'' کو انسانی جسم کے اعضاء کو منظم اور معتدل ہونے کی طرف جانا ہے دوسرے حضرات نے اسے معتدل بنانے اور مکمل کرنے کے ساتھ تفسیر کیا ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت کی تعبیریں اسقدر جامع اور وسیع ہیں کہ ''علقہ'' پر وضع حمل تک جس قسم کی تخلیق، نظم ونظام، تعادل وتوازن اور ارتقاء وتکمیل کا تقاضا ہوتا ہے، اسپر استعمال ہوتا ہے۔[1]

''راغب'' اپنی کتاب ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ ''تسویہ'' کا اطلاق اس مقام پر ہوتا ہے جہاں کسی چیز کو اندازہ اور کیفیت کے لحاظ سے افراط اور تفریط سے بچایا جائے۔

تیسری آیت میں ایک نئے نکتہ کو بیان کیا گیا ہے۔ انسان کی نطفہ سے پیدائش کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرماتا ہے ''اس کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ ''خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ'' (کھلم کھلا جھگڑالو) بن جاتا ہے۔''

اس تعبیر کی بھی کئی تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ یہ انسان کے ''قوت'' اور ''ضعف'' کے دو مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ ایک وقت وہ تھا جب وہ ایک ناچیز اور حقیر نطفہ تھا اور ایک وقت یہ بھی ہے کہ جھگڑے، تنازع پر اُترا ہوا ہے حتیٰ کہ خدا کے ساتھ بھی!!

دوسری یہ کہ یہ انسان کی قوت گویائی (قوۃ ناطقہ) اور فہم وشعور کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ناچیز سا نطفہ اب اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ صرف بات ہی نہیں کرسکتا بلکہ مختلف قسم کے دلائل وگفتگو اور عقل کی توانائی کا حامل بھی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ نطق وبیان اور منطق واستدلال وجودِ انسانی کے اہم ترین موجودات ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اس عجیب وغریب تنازعہ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے دو خلیوں CELLS کے درمیان واقع ہوتا ہے اور دو خلیے نر (اسپرماٹوزئید) اور مادہ (اوول) ہیں۔ نر خلیے مادہ خلیوں پر غلبہ پانے اور ان کے ساتھ مرکب ہونے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ

---

[1] تفسیر قرطبی، روح المعانی، فی ظلال القرآن، المیزان اور تفسیر فخر رازی، اسی آیت کے ذیل میں۔

جب نرنطفہ رحم میں داخل ہوتا ہے تو کئی ہزار ''اسپر ماٹوزئیڈ'' بڑی تیزی سے حرکت میں آجاتے ہیں اور فوراً ہی مادہ نطفہ سے ملنے کی کوشش میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

سب سے پہلے اسپر ما جب اس میں داخل ہوجاتا ہے تو دوسروں پر اس کا دروازہ بند کردیتا ہے، کیونکہ ''اوول'' کے اطراف میں ایک ایسا محکم غلاف وجود میں آجاتا ہے جو دوسروں کو داخل نہیں ہونے دیتا۔ اس عجیب داروگیر اور محاز آرائی میں دوسرے ''اسپر'' شکست کھاجاتے ہیں اور خون میں جذب ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے نطفہ کے مرحلہ کے ذکر کے بعد اس کے ''خصیم مبین'' ہونے کے مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔[1]

چوتھی آیت میں بھی انسان کی مٹی سے خلقت کی طرف اشارہ ہے، پھر نطفہ اور بعد میں تعادل اور نظام ونظم کی طرف۔ پانچویں آیت، جو اس سلسلے کی آخری آیت ہے، میں اس مرحلہ کے علاوہ ''ولادت'' اور طفل نومولود کی صورت میں ''جنین'' کے شکم مادر سے نکلنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ ''ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا''

جیسا کہ ہم جانتے ہیں جنین کی اہم ترین حیرت ناک صورتوں میں ایک صورت اس کے ولادت کے ساتھ ایک دورانیہ اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں جو جنین کو ایک مقرر وقت پر شکم مادر سے نکلنے کا حکم دیتے ہیں اور اسے عادی صورت سے منقلب کرکے دوسری صورت میں بدل دیتے ہیں (عادی صورت میں جنین کا سراوپر ہوتا ہے اور اس کا چہرہ ماں کی پیٹھ کی طرف) جو اس کے سر کو نیچے کردیتے ہیں تاکہ اس کی ولادت آسان ہوجائے۔

سب سے پہلے پانی کی وہ تھیلی پھٹ جاتی ہے جس میں جنین تیرتا رہتا تھا، پانی باہر نکل آتا ہے اور جنین اکیلا دنیا میں جانے کیلئے تیار ہوجاتا ہے۔ ماں کو زبردست درد لاحق ہوجاتا ہے۔ شکم پیٹھ اور پہلو کے تمام پٹھے جنین پر دباؤ ڈالتے ہیں اور اُسے باہر نکلنے کی راہنمائی کرتے ہیں۔

بوقت ولادت ماں کے جسم میں کیمیکل فعل وانفعالات اور فزیکل تبدیلیاں شروع ہوجاتی ہیں یہ پروگرام اسقدر عجیب اور حیرت ناک ہوتا ہے کہ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک بے پناہ اور بے انتہائی علم وقدرت ہی ہے جس نے کسی اہم مقصد کیلئے یہ پروگرام مرتب کیا ہے۔

اس طرح مندرجہ بالا تمام آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ جنین کے مختلف مراحل کے طے کرنے کا پیچیدہ اور محیرالعقول نظام اس بات کی ایک اہم ترین علامت اور نشانی ہے کہ اسے کسی بے انتہا اور لازوال علم ودولت نے کتم عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ گر فرمایا ہے ساتھ ہی اس بات کی دلیل بھی ہے کہ وہ خالق اس بات پر بھی قادر ہے کہ مرنے کے بعد زندگی عطا کرے اور معاد کو وجود میں لائے، کیونکہ جنین بھی تو ہر زمانے میں ایک نئی معاد سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ پس ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات بخوبی کہی جاسکتی ہے کہ جنین کے مختلف مراحل سے گذرنے کے بعد اس کائنات میں قدم رکھنے سے توحید بھی ثابت ہوجاتی ہے اور معاد بھی۔

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب ''اعجاز قرآن از نظر علوم روز'' ص ۲۷۔

چند وضاحتیں

۱۔ نقش برآب

ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ جب کسی چیز کی ناپائیداری کو ثابت کرنا چاہیں تو کہتے ہیں کہ ''وہ نقش برآب ثابت ہوئی'' کیونکہ تھوڑی سی حرکت اور نسیم کی وجہ سے سب کچھ ملیامیٹ ہوجاتا ہے۔لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خداوندِ عالم مختلف قسم کے انسانوں اور بہت سے دوسرے جانداروں کا نقش پانی پر قائم کرتا ہے اوران تمام صورتوں کو نطفہ کے قطرۂ آب پر بنایا ہے۔ خداوندِ عظیم واعظم کے علاوہ اورکون ہے جوایسی تصویرکشی کرسکتا ہے؟

۲۔ تین تاریکیوں کے اندر

اس سے بڑھ کر جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ بقول قرآنِ مجید خداوندِ عالم ان پے درپے تخلیقات کو جو کہ نطفہ کے پانی میں وجود میں لاتا ہے،حتیٰ کہ وہ مختصرسی مدت میں ایک مکمل انسان کی صورت اختیار کرلیتا ہے،خالقِ کائنات یہ سب کچھ ایک ظلمت کدہ میں انجام دیتا ہے جہاں تک کسی اور کی دسترسی قطعاً! ناممکن ہے جیسا کہ سورہ زمر کی چھٹی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

''یَخْلُقُکُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھَاتِکُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ذَالِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ لَہُ الْمُلْکُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ'' وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں یکے بعد دیگرے کئی خلقتیں عطا کرتا ہے اوروہ بھی تین تاریکیوں میں یہ ہے تمہارا خداوند پروردگار کہ کائنات کی حکومت اسی کیلئے سزاوار ہے،اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے ان روشن آیات کے ہوتے ہوئے تم راہِ حق سے کیوں منحرف ہوتے ہو؟

تین تاریکیوں سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ بہت سے مفسرین نے بتایا ہے اوربعض روایات میں بھی ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،ان سے مراد(۱)شکم مادر کی ظلمت (۲)رحم کی ظلمت اور(۳)''مشیمہ'' کی ظلمت (مشیمہ اس مخصوص تھیلی کو کہتے ہیں جس میں جنین موجود ہوتا ہے) ہیں جو تین ضخیم پردوں کی صورت میں جنین کے گرد لپٹے ہوتے ہیں۔[1]

نقاش اورمصور کتنا ہی ماہراورزبردست کیوں نہ ہووہ ہمیشہ مکمل نوراورروشنی میں ہی تصویرکشی کرسکتا ہے۔لیکن نقاشِ ازل اورخالقِ باعظمت ایسے عجیب تاریک خانے میں،اس قدردل کشی نقش برآب بناتا ہے کہ بے ساختہ کہنا پڑتا ہے''جَلّ الخالق''

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔المیزان۔تفسیر فخررازی اورکئی دوسری تفسیریں۔(مرحوم طبری نے مجمع البیان میں بھی اسی معنی کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے)

۳۔امن کا مقام

قرآن مجید (سورہ مومنوں کی ۱۳ویں آیت میں) مکمل صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ ہم نے انسان کے نطفہ کو ایک مکمل امن کے مقام پر رکھا ہے۔(ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ)

درحقیقت بدن کے محفوظ ترین مقامات سے وہ جگہ ہے جہاں پر نطفہ اور جنین ٹھہرتے ہیں، جو ہر طرف سے زیر حفاظت اور زیر حراست ہوتے ہیں۔ایک طرف سے تو ہڈیوں اور پسلیوں کے ستون ہوتے ہیں، دوسری طرف لگن حاصرہ کی طاقت ور ہڈی ہوتی ہے اور تیسری طرف بہت سے ایسے پٹھے اور پردے ہیں جنہوں نے شکم کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔اس کے علاوہ بعض خطرناک حوادث کے ظاہر ہونے کے وقت ماں کا ہاتھ بھی لاشعوری طور پر ڈھال کا کام دیتا ہے۔

ان سب صورتوں سے قطع نظر ایک اور بات جو باعثِ حیرت ہے وہ یہ کہ جنین ایک ایسی تھیلی میں ہوتا ہے جو ہمیشہ لیسدار پانی سے بھری رہتی ہے اور مکمل طور پر بے وزن ہوتی ہے، یعنی اس پر کسی بھی طرف سے کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوتا، کیونکہ جنین کی ساخت خاص کر اس کے اوائل میں اس قدر نرم نازک، لطیف اور باریک ہوتی ہے کہ اگر اس پر تھوڑا اور معمولی سا دباؤ بھی پڑ جائے تو اسے مکمل طور پر تباہ و برباد کر سکتا ہے۔

یہ تھیلی اپنے اس مخصوص پانی کے ساتھ ایک اور خصوصیت کی حامل بھی ہے اور وہ یہ کہ اس میں چوٹ کے برداشت کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے کسی مکمل ترین موٹر کار میں نہایت ہی نرم نرم سپرنگ SPRING لگا دیئے جاتے ہیں۔لہٰذا تیز چلنے کی وجہ سے ماں کو اگر کسی قسم کی چوٹ لگ جائے تو اس چوٹ کا اثر اس تھیلی تک جا کر ختم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اُسے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ تھیلی جنین کیلئے درجہ حرارت کو حد اعتدال پر رکھتی ہے اور اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ باہر کی سردی یا گرمی، جو ناگہانی طور پر ماں کے شکم کو لگ جاتی ہے، آسانی کے ساتھ جنین تک جا پہنچے۔کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور امن وامان کا مقام مل سکتا ہے؟ کیا خوبصورت تعبیر ہے قرآن کی کہ نطفہ کے ٹھکانے کا نام ''قرار مکین'' رکھا ہے۔

۴۔''خَصِيمٌ مُّبِينٌ'' یا کھلم کھلا جھگڑالو

یہ بھی جنین کی ایک اور حیرت ناک صورت حال ہے، خواہ ہم اس کی انسان کی قوتِ گویائی، قدرت تکلم اور طرز استدال واحتجاج سے تفسیر کریں، جیسا کہ مفسرین نے ایسا کیا ہے، یا رحم مادر میں نر و مادہ کے نطفوں کی باہمی محاذ آرائی اور چپقلش ونزاع سے تفسیر کریں، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے یا دونوں صورتیں مراد لی ہیں۔ ہر صورت میں یہ جنین کے ایک عجیب وغریب اور لطیف وظریف نکات میں سے ایک ہے کہ بظاہر پست اور ناچیز شے سے ایک ایسا قیمتی اور والا شان گوہر پیدا ہوتا ہے۔

۵ جنین کی غذا رسانی

جنین کے عجائبات میں سے ایک اور بات اس کی غذا رسانی ہے کیونکہ جنین کی پرورش اور اس کی جلد کی نشوونما کیلئے مکمل غذائی مواد کی ضرورت ہے، جو ہر لحاظ سے پاک وصاف ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُسے آکسیجن OXYGEN کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور پھر کافی مقدار میں پانی بھی ضروری ہے، جو ہمیشہ اسے ملتا رہے۔ خداوندِ عالم نے یہ فریضہ ایک اور چیز پر عائد کیا ہے جسے ''جفت'' PLY CENTA کہتے ہیں، جو جنین کے اولین لمحات ہی سے اس کے ہمراہ ہوتی ہے یہ ایک طرف سے تو دو شریانوں اور ایک ورید (رگ) کے ذریعہ ماں کے دل سے مربوط ہے اور دوسری طرف سے ناف کے بند کے ذریعہ جنین سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ تمام غذائی مواد اور ضروری پانی اور آکسیجن کو ماں کے جریانِ خون کے ذریعہ سے جذب کر لیتا ہے اس کو صاف (ریفائن) کر کے دوبارہ جنین میں منتقل کر دیتا ہے اور غیر ضروری مواد مثلاً کاربن CARBON وغیر کو یکجا کر کے ماں کے خون کی طرف پلٹا دیتا ہے۔

اس طرح ''جفت'' دو طرح کے کام انجام دیتا ہے، ایک ''حاصل کرنے'' کا اور دوسرا ''عطا کرنے'' کا۔ اور نیز وہ فلٹر FILTER اور کاربوریٹر CARBORATOR کی مانند ہے، جس سے صرف اس کا مطالعہ کرنے سے ہی خالق کی بے پناہ عظمت کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے:

''بچہ اس نسیم سے حصہ لیتا ہے جسے ماں حاصل کرتی ہے۔''

کتنے سال ہوئے ہیں کہ دانشوروں کو اس بات کا پتہ چلا ہے کہ جس بچے کا پھیپھڑا کام نہیں کرتا اور وہ پانی میں بھی تیر رہا ہوتا ہے اُسے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے؟ کتنا عرصہ ہوا ہے کہ انہوں نے اس بات کا پتہ چلایا ہے کہ جو آکسیجن ماں استعمال کرتی ہے وہ اس کے خون میں داخل ہو کر ''جفت'' تک جا پہنچتی ہے اور بچہ ناف کے بند کے ذریعہ اس سے استفادہ کرتا ہے؟ صورت حال جو بھی ہو اس بات کے معلوم ہونے کی زیادہ مدت نہیں گزری، لیکن امامؑ کی چشم بینا نے اسے پہلے ہی سے دیکھ لیا تھا اور فرما دیا تھا: ''بچہ اُسی نسیم سے استفادہ کرتا ہے۔'' کیا جس آلودہ ہوا میں ہم سانس لے رہے ہیں، اس کے مقابلے میں ''نسیم'' سے بڑھ کر اور کوئی تعبیر ہو سکتی ہے جسے امامؑ نے آکسیجن کو بیان کے طور پر استعمال کیا ہے؟[1]

۶۔ جنین کی جنسی سرنوشت

جنین کیونکر اور کن عوامل کے تحت مذکر یا مؤنث بنتا ہے، اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ یعنی ابھی تک سائنس نے بھی اس کا جواب دریافت نہیں کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ غذائی مواد یا دوائیں اس بارے میں مؤثر ثابت ہوں، لیکن اُنکی یہ تاثیر تقدیر بدلنے اور بگاڑنے یا مقرر کرنے کیلئے نہیں ہوتی۔ تاہم عجیب بات یہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ان دو جنسوں (مرد و زن) کے درمیان ہمیشہ نسبتی

---

[1] کتاب ''اولین دانشگاہ'' جلد اص ۲۵۳ سے اقتباس

توازن پایا جاتا ہے۔ یہ توازن تمام معاشروں میں موجود ہوتا ہے، اگر کہیں کوئی فرق ہو بھی تو وہ اس قدر اہم اور قابل توجہ نہیں ہوتا۔

ذرا تصور کیجئے کہ اگر یہ توازن کسی دن ختم ہوجائے اور مثال کے طور پر مرد، عورتوں سے دس گناہ زیادہ ہوجائے یا اس کے برعکس عورتیں مردوں سے دس گنا بڑھ جائیں تو کیا کیا خرابی نہیں ہوگی جو معاشرے میں پیدا نہ ہوجائے !انسانی معاشروں میں کس حد تک بگاڑ پیدا ہوجائے گا؟ کیا وہ معاشرہ جس میں عورتوں کی نسبت مرد دس گنا ہوں یا مردوں کی نسبت عورتیں دس گنا، اس میں معاشرتی سکون اور اجتماعی امن وامان ملے گا؟ لیکن جس ذات نے انسان کو صحیح اور سالم زندگی بسر کرنے کیلئے پیدا کیا ہے اُسی نے اس کے عجیب اور اسرار آمیز توازن کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ خداوندِ عالم اپنی حکمت اور مشیت کے پیش نظر جسے چاہے بیٹا عطا کردے اور جسے چاہے بیٹی دیدے ۔(یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۔شوریٰ/ ۴۹) لیکن اس کی یہ مشیت حساب وکتاب کے تحت اور جچی تلی ہوتی ہے۔

۷۔ اسرار آمیز اور جلد انجام پانے والی تبدیلیاں

جنین کی اور محیر العقول باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کا اصل نطفہ اوائل میں ایک یکتا خلیہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اور تقسیم کے طریقہ سے صعودی صورت میں پروان چڑھتا ہے، افزائش اور تبدیلیاں بہت جلد عمل میں آتی رہتی ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ''ہر وقت ایک دوسری آفرینش کے بعد ایک نئی آفرینش عطا کرتا ہے۔'' (خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ) یہ ایسی نشوونما اور افزائش ہوتی ہے کہ انسان کی ولادت کے بعد بھی اگر یہی سلسلہ جاری رہے تو وہ ایک مختصر سے عرصے میں ایک بلند وبالا پہاڑ کی بلندیوں تک جا پہنچے اور زمین کی سطح اس کیلئے تنگ ہوجائے۔ لیکن جو ذات جنین کو ارتقاء کی یہ تیزی عطا کرتی ہے، وہی ذات انسان کے ایک مقررہ مرحلے پر پہنچ جانے کے بعد اسے روک کر تدریجی رفتار بخشتی ہے۔

۸۔ رحم کی مستقبل پر نگائیں

آخر کیا وجہ ہے کہ ایک خلیہ تقسیم کے وقت مختلف صورتوں میں تبدیل ہوجاتا ہے، گوشت کے خلیئے، ہڈیوں کے خلیے، پٹھوں کے خلیئے ،جلد کے خلیئے وغیرہ؟ کیا رحم کا کام ہوتا ہے کہ وہ اس کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے بارے میں پیش بینی کرتا اور ہر ایک خلیئے کو اس کے اپنے مقام پر متعین کرتا ہے اور اس کی تصور کشی کرتا ہے؟ اگر واقعاً اس میں اس قسم کا ہوش وذکاوت اور قدرت وطاقت ہے تو یہ سب کچھ اسے کس نے عطا فرمایا ہے؟

مشہور دانشور ''الکسیس کارل'' اپنی کتاب ''انسان موجودِ ناشناختہ'' میں کہتے ہیں:

''گویا بدن کا ہر ایک جزو مجموعی طور پر بدن کی موجودہ اور آئندہ ضروریات کو سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق تبدیل کرلیتا ہے۔ اجزاء کی بناوٹ کے زمان اور مستقبل کو حال کی طرف سمجھتے ہیں، مثلاً حمل کے آخری ایام میں عورت کے نرم بیرونی جسم کی بناوٹ مزید نرم اور پھیلنے کی قابل ہوجاتی ہے۔ اور تبدیلی کی یہی صورت حال چند دن بعد ہونے والے وضع حمل کے دوران جنین کے عبور کو آسان کردیتی

ہے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ پستان کے خلیوں کو زیادہ کر کے اُسے بڑا بنا دیتی ہے، حتیٰ کہ بچے کی پیدائش سے پہلے ہی پستان اپنا کام شروع کر دیتے ہیں یعنی ان میں دودھ آجاتا ہے اور بچے کی غذا آمادہ ہوجاتی ہے۔۔۔۔جنین کے شکم مادر میں پروان چڑھنے کے دورانیہ میں عضلات اور پٹھوں کا طریقہ کار ہی کچھ ایسا ہوتا ہے گویا وہ مستقبل کے تمام پروگرام کو پہلے ہی سے جانتے ہیں۔اور دو مختلف زمانی فاصلوں یا دو مختلف مکانی نقاط کو بھی اچھی طرح پیش نظر رکھا جاتا ہے۔[1]

ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ اس موضوع کا کیا نام رکھیں، کیونکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ اس کے پس پردہ ایک عظیم اور صاحبِ علم وقدرت مبداء ضرور موجود ہے جو اس نظام کو چلا رہا ہے۔

۹۔ہڈیوں کا لباس

سورہ مومنوں کی چودھوں آیت کی تفسیر میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قرآن مجید عضلوں اور پٹھوں کے بارے میں ایک خاص تعبیر پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے۔''پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت پہنایا'' لفظ ''کسونا'' کا انتخاب قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کیونکہ جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ'' ہڈیاں گوشت سے پہلے ظاہر ہوتی ہے۔[2]

۱۰۔جنین باہر آتا ہے

جیسا کہ ہم سورہ حج کی پانچویں آیت کی تفسیر میں پڑھ چکے ہیں۔''خداوندِ عالم نے جنین کو شکم مادر سے باہر بھیجنے کی نسبت اپنی طرف دی ہے اور فرمایا ہے۔''ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلاً'' (پھر ہم تمہیں طفل بنا کر باہر بھیجتے ہیں) یہ تعبیر ولادت کے مسئلہ کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کرتی ہے جس کو دانشور بھی تسلیم کر چکے ہیں۔

وہ کون سے عوامل ہیں جو ولادت کے زمانہ کو مقرر کرتے ہیں؟ کن حالات کے تحت جنین کو باہر جانے کا حکم ملتا ہے؟ بدن کے تمام اعضاء کیونکر اپنے آپ کو اس عظیم تبدیلی کیلئے آمادہ کرتے ہیں؟ کن عوامل کی وجہ سے بچہ شکم مادر میں الٹا ہوجاتا ہے تاکہ وہ سر کے بل متولد ہو؟ کیا وہ جانتا ہے کہ پاؤں کے بل اس کی ولادت ناممکن یا نہایت مشکل ہے؟ ماں کے جسم کے تمام پٹھوں کو کون حکم دیتا ہے کہ وہ جنین پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالیں کہ وہ باہر نکلے؟

جب گاہ وبے گاہ اس سسٹم میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے اور ڈاکٹر صاحبان ''آپریشن'' پر مجبور ہوں تو اس کی اہمیت اس وقت بہتر طور پر واضح ہوجاتی ہے۔اس قسم کے ذریعہ سے پیدا ہونے والے افراد کا وجود شاید سب کیلئے اس امر کی تنبیہ ہے کہ وہ اس موضوع کی اہمیت کو سمجھیں۔البتہ بعض مواقع پر تخمینی طور پر بچے کی ولادت کی پیش گوئی کرتے ہیں، لیکن بسا اوقات اس کی ولادت یا تو اس زمانے سے پہلے

---

[1] کتاب ''انسان موجود شناختہ'' ص ۱۹۰

[2] کتاب ''اعجاز قرآن از نظر علوم امروز'' ص ۲۹

ہوجاتی ہے یا بعد میں۔اس طرح سے ولادت کا مسئلہ اپنے تمام منظمہ لوازمات سمیت خداوندِ عالم کی آیات میں سے ایک آیت ہے۔

۱۱۔بوقتِ ولادت محیر العقول تبدیلیاں

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کوئی بھی شخص صحیح طور پر ولادت کے مقررہ لمحہ کو نہیں بتا سکتا ہے اور اگر کسی وقت ڈاکٹروں اور حکیموں کی طرف سے عمومی یا خصوصی صورت میں پیش گوئی کے طور پر کچھ بتایا بھی جاتا ہے تو وہ ظن اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید نے سورہ رعد کی ۸ ویں آیت میں کہا ہے:

''اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ'' (خداوندِ عالم ہر جنین کے بارے میں علم رکھتا ہے جسے کوئی بھی مؤنث اپنے ساتھ اٹھائے پھرتی ہے اور اس کو بھی جانتا ہے جسے رحم کم کرتے ہیں (معمول کی مدت سے پہلے جنم دیتے ہیں) اور اسے بھی جسے زیادہ کرتے ہیں (معمول کی مدت کے بعد جنم دیتے ہیں) اور اس کے پاس ہر چیز کا اندازہ ہے۔[1]

آیت کا ظاہر یہ ہے کہ یہ چیز خدا کے خاص علوم میں سے ہے کیونکہ وہ جنین کی ہر طرح کی خصوصیات کو اس کے متولد ہونے سے پہلے جانتا ہے۔نہ صرف جنسیت کے مسئلہ کو جانتا ہے، بلکہ اس کی تمام لیاقتوں، استعداد، ذوق اور اس کی ظاہری اور باطنی صفات سے بھی باخبر ہوتا ہے۔اس طرح جنین کی ولادت کے لمحہ کو بھی صرف وہی جانتا ہے، کہیں یہ بات ذہن میں نہ آجائے کہ اس قسم کی کمی اور زیادہ کسی حساب اور دلیل کے بغیر ہوتی ہے بلکہ اس کا ایک لمحہ ایک ایک پل اور ایک ایک گھڑی حساب وکتاب کے تحت ہے ارشاد فرماتا ہے ''وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ'' (اس کے نزدیک ہر چیز کا اندازہ اور معینہ مقدار ہوتی ہے)

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نومولود کے زندگانی سسٹم میں بوقت ولادت عجیب وغریب قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو اس کو جدید ماحول میں ڈھالنے کیلئے نہایت ہی ضروری ہوتی ہیں، ان میں سے صرف دو کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(الف) گردش خون کا سسٹم تبدیل ہوجاتا ہے۔وہ اس طرح کہ جنین میں گردشِ خون کا مسئلہ ایک سادہ سی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔کیونکہ جنین میں صفائی کی غرض سے آلودہ اور غلیظ خون پھیپھڑوں کی طرف حرکت نہیں کرتا، اسلئے کہ وہاں پر نظام تنفس نہیں ہوتا۔لہٰذا اس کے قلب کے دونوں حصے (دایاں اور بایاں حصہ) جن میں سے ایک تو اعضاء تک خون پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور دوسرا صفائی کی غرض سے خون کو پھیپھڑوں تک پہنچانے کا پابند ہوتا ہے) ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں، لیکن جونہی جنین باہر کی

---

[1] ''تغیض''، ''غیض'' (بوزن فیض) کے مادہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی مائع چیز کو نگل جانا یا اسے تہہ میں لے جانا ہے۔پھر اس کا اطلاق ''نقصان'' (کم ہونا) نیز ''فساد'' (بگڑ جانا) پر ہونے لگا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے ''تغیض'' کے معنی کم ہونا اور بعض نے وقت مقررہ سے قبل پیدا ہونا بتایا ہے۔اور مفسرین کے درمیان بھی یہی معنی مشہور ہیں۔یہی تفسیر حضرت امام محمد باقر یا حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے بھی منقول ہوئی ہے اور آیت کا ذیل بھی اسی پر گواہ ہے۔

دنیامیں قدم رکھتاہے وہ دریچہ بند ہوجاتاہے اورخون کے دوحصے ہوجاتے ہیں، ایک حصہ توغذارسانی کی غرض سے تمام خلیوں کوپہنچایاجاتاہےاوردوسراسانس لینے کیلئے پھیپھڑوں کی طرف۔

پس جب تک جنین شکم مادرمیں ہے وہ اپنے لئے ضروری آکسیجن ماں کےخون سے حاصل کرتاہےلیکن چونکہ ولادت کے بعداسے خودکفیل ہوناہےاورپھیپھڑوں اورتنفس کےذریعہ اسے آکسیجن لینی ہے۔لہٰذاجوپھیپھڑے پہلے ہی سے شکم مادرمیں مکمل ہوکرکام کرنے کیلئے پوری طرح آمادہ ہوچکے تھے،وہ خداکےایک فرمان کےذریعہ اچانک کام کرناشروع کردیتے ہیں جویقیناعجائبات میں سے ہے۔

(ب)بندِناف بندہوجاتاہےاورخشک ہوکرگرجاتاہے۔(بندناف جو''جفت''کےتوسط سے ماں کےخون سے غذاحاصل کرنے کاایک ذریعہ ہوتاہے،اسے عام طور پرکاٹ دیتے ہیں،لیکن اگراسے نہ بھی کاٹیں توہ بالتدریج خشک ہوکرگرپڑے۔

یعنی بوقت ولادت جس طرح آکسیجن کےحصول کاراستہ تبدیل ہوجاتاہے اسی طرح غذاحاصل کرنے کاراستہ بھی اچانک بدل جاتاہےاورمنہ معدہ اورانتڑیاں جوجنینی کی مدت کے دوان مکمل طور پربن کرتیارہوچکی تھی لیکن ابھی تک اپنا کام شروع نہیں کیاتھا،اچانک کام شروع کردیتی ہیں اوریہ انسانی تخلیق کی ایک اہم حیرت آفرین صورتِ حال ہے۔

۱۲۔بچے کارونا

نومودبچے عام طوربہت گریہ کرتے ہیں،اورممکن ہے کہ ان کا یہ گریہ ان کی پریشانی اورتکلیف کی وجہ سے ہو،کیونکہ ان کے پاس اپنی تکلیفوں کے بیان کیلئے''گریہ کی زبان''کےعلاوہ اورکوئی زبان نہیں ہوتی،یاپھربھوک اور پیاس کی وجہ سے بھی ہوسکتاہےاورممکن ہے کہ دنیا کی نئی صورت حال کی وجہ سے،کیونکہ زندگی کی نئی کیفیت ممکن ہے ان کے رونے کاسبب بن سکتی ہے۔مثلاً گرمی ہے،سردی،تیزروشنی ہے وغیرہ۔لیکن ممکن ہےاس کےعلاوہ بھی بچے روتے ہوں اوران کا یہ گریہ ان کی زندگی اورحیات کی بقاء کی علامت ہے۔

کیونکہ اس موقع پر بچے کوسخت ورزش اورتحرک کی ضرورت ہوتی ہے،جب کہ وہ ورزش پرقادرنہیں ہوتے صرف ایک ہی ورزش ہوتی ہے جواس کے ہاتھ،پاؤں،سینہ اور پیٹ کےڈھانچے کومتحرک کرے،خون کوتیزی سےتمام رگوں میں پہنچانے کاسبب بنےاورمتواترتمام خلیوں کوغذارسانی کاموجب بنے وہ صرف اورصرف''رونے کی ورزش''ہے جوایک نومولودکیلئے ایک مکمل ورزش سمجھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اگرنومولودگریہ نہ کرےتواسے سخت نقصان پہنچنے کازبردست اندیشہ ہوتاہےاوراس کی زندگی مکمل طور پرخطرے میں پڑجاتی ہے۔

علاوہ ازیں بچوں کے مغزمیں رطوبت فراوانی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔اگروہ وہیں پررہ جائےتواس کیلئے کئی خطرناک بیماریوں اوردردوں کاسبب بن جائے،یابچے کے اندھاہوجانے کاموجب بن جائے۔اسی لئے روناس بات کاسبب بن جاتاہے کہ اضافی رطوبتیں آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے باہرگرتی ہیں جس سے بچے کی تندرستی اورسلامتی کی ضمانت مل جاتی ہے۔

حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام اپنی ایک مشہورحدیث''توحیدمفضل''میں اس چیز کی طرف اشارہ فرمانے کے بعد ارشادفرماتے ہیں:

''چونکہ والدین کو رونے کے فوائد کا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ کوشش کرتے ہیں کہ اسے ہر ممکن طریقہ سے چپ کرایا جائے اور رونے سے باز رکھا جائے، کیونکہ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ رونے کے فوائد کیا ہیں۔[1]

نیز اسی روایت میں حضرت امام علیہ السلام نے بچے کے منہ سے لعاب جاری رہنے کے متعلق بھی ارشاد فرمایا ہے کہ بچے کے منہ کا لعاب درحقیقت اس کے آنسوؤں کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔:

''خداوندِ دانا و بینا نے اس طرح مقرر رکھا ہے کہ بچے کی اضافی رطوبتیں اُس کے منہ سے نکلتی رہیں تا کہ وہ بڑا ہو کر ہر قسم کی صحت سے بہرہ مند رہے۔[2]

۱۳۔ بچوں میں بالتدریج عقل اور حواس کی بیداری

اگر اوائل ہی سے بچے کے پاس عقل ہوتی تو وہ یقینی طور پر بہت ہی پریشان ہوتا، کیونکہ وہ اپنی ناتوانی اور ذلت کا احساس کرتا، وہ اس لئے کہ وہ یہ احساس کرتا کہ وہ آخر کیوں چل پھر نہیں سکتا؟ کیوں غذا کھا نہیں سکتا؟ کیوں معمولی سی بھی حرکت نہیں کر سکتا؟ کیوں اسے دوسرے لوگ ایک کپڑے میں لپیٹ کر گہوارے میں سلائیں یا اسے خشک و تر کریں وغیرہ وغیرہ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشہور حدیث ''توحید مفصل'' میں بیان فرماتے ہیں:

''علاوہ ازیں اگر وہ عاقل پیدا ہوتا اور مستقل زندگی کا حامل ہوتا تو طفلانہ حرکات کی شیرینی، تربیتِ اولاد کی مٹھاس اور اس راہ سے اولاد اور والدین کے درمیان پیدا ہونے والا عمر بھر کا رابطہ بالکل ختم ہو جاتے۔''[3]

ان سے باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کے ایک مکمل طور پر نئی اور اَن جانی دنیا میں قدم رکھنے سے اس کے دل میں اسقدر وحشت اور اضطراب اور پریشانی پیدا کر دیتا کہ اس کے اعصاب اور افکار بڑی حد تک متاثر ہوتے اور کرب و تلخی سے دوچار ہوتے۔ لیکن وہ لایزال قدرت جس نے انسان کو ارتقاء کیلئے خلق فرمایا ہے، اس نے ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھ کر اسے اس جہان میں بھیجا ہے۔

اسی طرح اگر اس کے حواس مکمل ہوتے تو وہ جب ایک مرتبہ آنکھ کھولتا تو اچانک نئے ماحول کا مشاہدہ کرتا اور اس کے کان نئی نئی آوازوں کو سنتے ممکن ہے کہ بسا اوقات ان کے سننے کی تاب ان میں نہ ہوتی۔ اس لئے یہ امور تدریجی طور پر اور یکے بعد دیگرے انجام پاتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

''وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ

---

[1] بحار الانوار، جلد ۳ ص ۶۵، ۶۶

[2] بحار الانوار، جلد ۳ ص ۶۵، ۶۶

[3] بحار الانوار، جلد ۳ ص ۶۴، ۶۵

تَشْکُرُونَ" (خداوندِ عالم نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا جب کہ اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے کان ،آنکھیں اور عقول بنائے تا کہ تم اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ) (نحل/ ۷۸)

اس آیت کی رُو سے ابتدا میں انسان کے پاس کچھ بھی علم نہیں ہوتا حتیٰ کہ اس کے کان اور آنکھیں بھی نہیں ہوتی، پھر خداوندِ عالم اُسے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ "ابصار" (آنکھوں) کے ذکر سے پہلے "سمع" (کانوں) کا ذکر شاید اس لئے ہے کہ نومولود میں سب سے پہلے کانوں کی سرگرمی کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر ایک مدت کے بعد آنکھیں دیکھنے کی توانائی پیدا کرتی ہیں حتیٰ کہ جس طرح پہلے بتایا جاچکا ہے ،بعض افراد اس بات کے قائل ہیں کہ عالمِ جنین ہی میں کم وبیش سننے کی قدرت ہوتی ہے اور وہ ماں کے دل کی دھڑکنوں کو سنتا ہے اور اس کے ساتھ مانوس ہوتا ہے۔

۱۴۔غذا پہلے، بچہ بعد میں

انسان اور بہت سے دوسرے حیوانات کے نومولود آغازِ ولادت میں سخت اور ثقیل غذا سے استفادہ کی قدرت نہیں رکھتے۔اسی لئے آفرینش کے قدرت مند ہاتھ نے "دودھ" نامی مخصوص غذا ان کی ماؤں کے پستانوں میں فراہم کردی ہے۔ یہ دودھ درحقیقت وہی خون ہوتا ہے جو جنین کے شکم مادر میں ہونے کے دروان جنین کی غذا کا کام دیتا ہے۔ایک نہایت ہی وسیع اور جلدی سے انجام پانے والی تبدیلی کے ذریعہ وہ دودھ کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور ایک ضروری مدت تک بچے کی غذا کا کام دیتا رہتا ہے۔

حمل کے ایام میں ماں کے پستان تدریجی صورت میں تبدیلی اختیار کرتے رہتے ہیں۔"جفت" PLACENTA سے ٹپکنے والی رطوبتیں ماں کے خون میں پڑتی ہیں تو وہ پستانوں کو خبردار کردیتا ہے کہ جس سے پستان دن بدن بڑھنے لگتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک اہم اور سنگین وظیفہ کی ادائیگی کیلئے تیار کرنا شروع کردیتے ہیں۔ پستان میں جو نالیاں ہوتی ہیں اور وہ نپل NIPPLE تک ملی ہوتی ہیں، ایک تو بڑھ جاتی ہیں اور دوسرے پھیلی جاتی ہیں اور اُن سے مختصر سا ترشح بھی ہونے لگتا ہے یہ بچے کی پیدائش کے وقت اپنے کام کی انجام دہی کیلئے مکمل طور پر آمادہ ہوچکی ہوتی ہے۔

اور پھر قابل توجہ یہ بات ہے کہ دودھ کا پستانوں سے ترشح مستقل صورت میں نہیں ہوتا، وگرنہ وہ ہمیشہ باہر بہتا رہتا، بلکہ جونہی نومولود کے لب ماں کے پستان تک پہنچے اور اُسے چوسنا شروع کیا تو اعصاب میں حرکت پیدا ہونا شروع ہوگئی اور وہاں سے حرام مغز MYLO اور حرام مغز سے ہیپوٹالیموس تک جا پہنچی اور دو طرح ترشح کا موجب بن گئی۔ایک قسم کا ترشح تو یہ ہوتا ہے کہ خون نالیوں سے پستان کی طرف جاتا ہے دودھ کے راستوں کے اطراف کی باریک باریک رگوں کی مقبض (سیکٹر) دیتا ہے، اور ان پر یہ دباؤ ڈالتا ہے کہ سارے کے سارے دودھ کا رخ NIPPLE کی طرف موڑ دیں۔ یہ سارا عمل صرف (۳۰) سیکنڈ میں مکمل ہوجاتا ہے۔اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ دودھ صرف اسی پستان ہی سے جاری ہونا شروع نہیں ہوتا جسے نوزاد نے منہ لگایا ہے بلکہ دونوں پستانوں سے یہ عمل شروع ہوجاتا ہے۔اسی لئے تو اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ نومولود کو دونوں پستانوں سے دودھ پلایا جائے۔

دودھ ایک مکمل غذا ہے خصوصاً نومولود کیلئے ماں کا دودھ ایک کامل ترین غذا سمجھا جاتا ہے اور دنیا میں کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

دودھ میں کئی VITAMIN پائے جاتے ہیں خصوصاً وٹامن A، وٹامن B وٹامن D اور وٹامن P وغیرہ دانشوروں کی طرف سے اس میں موجود بائیس قسم کے مختلف مادے بھی دریافت ہو چکے ہیں علاوہ ازیں کئی ''آفزیم''[1] ۔بھی اور نومولود کیلئے ضروری دوائیں بھی ماں کے دودھ کے ساتھ اس کو منتقل ہوجاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جو بچے ماں کے دودھ سے محروم ہوجاتے ہیں وہ کئی قسم کی ناتوانیوں اور کمزوریوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا دودھ صرف بچے کی غذا ہی کا کام نہیں دیتا بلکہ اس کی باطنی مہر ومحبت اور روحانی غذا کا موجب بھی بنتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ماں کے دودھ سے محروم ہوتے ہیں ان میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور مہر ومحبت کے جذبہ سے بھی محروم ہوتے ہیں۔اسی لئے قرآن مجید فرماتا ہے:

''وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَاَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ'' مائیں اپنی اولاد کو مکمل دوسال دودھ پلاتی رہیں، یہ ان کیلئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو مکمل کریں۔(بقرہ/ ۲۳۳)

دودھ کی حیران کن تفصیلات اور بھی ہیں جو اس مختصر سی کتاب میں درج نہیں کی جاسکتیں ۔اگر عنان قلم کو اس قسم کی مباحث کیلئے چھوڑ دیا جائے تو پھر ہم تفسیری بحث سے خارج ہوجائیں گے۔

---

[1] مزید تفصیل کیلئے ''دائرۃ المعارف قرن بیستم'' (مادہ ''لبن'') اور ''اولین دانش گاہ'' جلد ۶۔نیز ''اعجاز قرآن از نظر علوم امروز'' کا مطالعہ فرمائیں البتہ ''توحید مفضل'' والی حدیث میں بھی اس بارے میں دلچسپ اشارے ملتے ہیں ملاحظہ ہو بحار الانوار جلد ۳ ص ۶۲

۳۔عالمِ حیات میں اس کی نشانیاں

اشارہ:

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے حیات یعنی زندگی کائنات کی ایک ایسی پیچیدہ ترین چیز ہے کہ تمام دانشوروں کی عقلیں اس کے بارے میں حیران ہیں۔ ہزاروں سال سے صاحبِ فکرونظر افراد اس کے بارے میں غوروفکر کرتے چلے آرہے،لیکن ابھی تک یہ معمہ حل نہیں کرسکے۔ آخروہ کیسے اسباب اورکون سے عوامل ہیں کہ ایک ہی جنبش سے ایک بے جان چیز حیات اورزندگی کے مرحلہ میں داخل ہوجاتی ہے،غذا حاصل کریت ہے،نشوونما پاتی ہے اوراپنی طرح کی چیزیں پیدا کرتی ہے؟

ممکن ہے کہ انسان کئی صدیوں کے تجربے کے بعد کوئی پیچیدہ آلہ (مثلاً نہایت درجہ ترقی یافہ الیکٹرانک دماغ وغیرہ) بنالے۔اگرچہ یہ بھی بجائے خوداس کے موجدین کے علم ودانش کے وسیع ہونے کی دلیل ہے ،لیکن وہ آلہ خواہ کتنا ظریف ،لطیف اورپیچیدہ کیوں نہ ہوقطعاً نشوونمانہیں پائے گا،اپنے عیوں اورٹوٹ پھوٹ کا علان نہیں کرے گا،اپنے طرح کی چیزوں کی تولید کی توبات ہی اورہے۔

زندہ اورموجود چیزیں اپنی اعلیٰ درجے کی ظریف ولطیف،پیچیدہ اورمحیرالعقول ساخت کے علاوہ یہ سارے کام انجام دیتی ہیں اوران کے علاوہ اوربھی کئی کام سرانجام دیتی ہیں کہ ان کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔اوران کے امور کی انجام دہی کے بارے میں مختصر سے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ ایسی چیزوں کا وجودان کے خالق کے بے انتہاعلم اورقدرت کی واضح روشن اورآشکاردلیل ہے ۔

قرآنِ مجید نے خدا کے وجود کے ثابت کرنے اور ہرطرح کے شریک کی نفی کرنے کیلئے ''حیات اورموت'' کے موضوع پرزیادہ زوردیاہےاورکئی مختلف آیات میں اس موضوع کی اہمیت کواچھی طرح بیان فرمایاہےاوریہ ہے بھی حقیقت۔

اس مختصرسے اشارے کے بعدہم مل کرمندرجہ ذیل آیات کوگوشِ دل سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ

(انعام/۹۵)

۲۔۔۔كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ

(بقرہ/۲۸)

۳۔۔۔هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ(یونس/۵۶)

۴۔۔۔وَهُوَ الَّذِیْ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اَفَلَا تَعْقِلُوْن

(مؤمنون/۸۰)

۵۔۔۔اِنَّ اللهَ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيْتُ وَمَالَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَانَصِيْرٍ(توبہ/۱۱۶)

۶۔۔۔لَااِلٰهَ اِلَّاهُوَيُحْيِي وَيُمِيْتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْن(دخان/۸)

۷۔۔۔اَلَمْ تَرَاِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰهُ اللهُ الْمُلْكَ اَذْقَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ يُحْيِي وَيُمِيْتُ قَالَ اَنَااُحْيٖ وَاُمِيْتُ(بقرہ/۲۵۸)

۸۔۔۔اِنَّانَحْنُ نُحْيِي وَيُمِيْتُ وَاِلَيْنَاالْمَصِيْرُ(ق/۴۳)

۹۔۔۔اَللهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ

(روم/۴۰)

۱۰۔۔۔وَاللهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَابِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَااِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ(نحل/۶۵)

ترجمہ

۱۔۔۔خداوندِ عالم دانے اور گٹھلی کو شگافتہ کرنے والا ہے، زندہ کو مردے سے خارج کرتا ہے اور مردے کو زندہ سے، یہ ہے خداوند یکتا، پس تم راہِ حق سے کیونکر منحرف ہوتے ہو؟

۲۔۔۔تم خداوندِ عالم کے ساتھ کیونکر کفر کرتے ہو جب کہ تم مردہ جسم تھے، اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں موت دے گا اور دوبارہ زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف پلٹا جاؤ گے۔

۳۔۔۔وہ وہی ہے جو تمہیں زندہ کرے گا اور مارے گا اور تم اسی کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔

۴۔۔۔خداتو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور دن اور رات کا آنا جانا بھی اسی کیلئے ہے، تو کیا تم غور وفکر سے کام نہیں لیتے؟

۵۔۔۔آسمانوں اور زمین کی حکومت اسی کیلئے ہے (وہ) زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے، خدا کے علاوہ تمہارا کوئی اور مددگار نہیں ہے۔

۶۔۔۔اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ وہ تمہارا پروردگار ہے اور تمہارے پہلے آباؤاجداد کا بھی۔

۷۔۔۔کیا تو نے نہیں دیکھا (اور نہیں جانتے) اس شخص کو جس نے ابراہیمؑ کے ساتھ اس کے رب کے بارے میں مناظرانہ گفتگو کی کیونکہ خدا نے اُسے حکومت دی ہوئی تھی، جب ابراہیمؑ نے کہا میرا رب زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے، تو اس نے کہا میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔

۸۔۔۔ہم ہیں کہ زندہ کرتے اور موت دیتے ہیں اور ہماری ذات کی طرف ہی بازگشت ہے۔

۹۔۔۔خداوندِ عالم وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں رزق وروزی دی، پھر موت دے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ کیا جن لوگوں کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، ان کاموں میں سے کچھ کر سکتے ہیں؟ وہ پاک ہے اور ہر اس چیز سے بالا و برتر ہے جس کو اس کا شریک بناتے ہیں۔

۱۰۔۔۔خدا نے آسمان سے پانی بھیجا اور زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد زندہ کیا، اس میں ان لوگوں کیلئے واضح نشانی ہے جو سننے والا کان رکھتے ہیں۔

الفاظ کے معنی اور تشریح

''حیات'' کے بارے میں ''راغب''، ''مفردات'' میں کہتے ہیں:

''حیات کے مختلف معانی ہیں۔ حیاتِ نباتی (نباتات کی زندگی)، حیاتِ حسی (حیوانات کی زندگی) اور حیاتِ عقلائی (انسانی زندگی) حیات کے ایک معنی ''غم واندوہ کا برطرف ہونا'' بھی ہیں۔ حیاتِ اخروی آور جاودانی اور وہ حیات جو خداوندِ عالم کے اوصاف میں شمار ہوتی ہے۔''

وہ اس موقعہ پر ہر ایک کیلئے قرآن مجید کی آیات سے شاہد لاتے ہیں لیکن کتاب ''مقائیس اللغۃ'' میں اس لفظ کے دو اصلی معنی ذکر کرتے ہیں، ایک وہ ''حیات'' جو ''موت'' کے مقابلے میں ہے اور دوسرا ''حیاء'' جس کا مخالف نقطہ ''بے حیائی'' اور ''بے شرمی'' ہے۔

لیکن بعض دوسرے دانشوروں کا عقیدہ ہے کہ دونوں معانی ایک ہی اصل کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ جو شخص حیا اور شرم کا حامل ہوتا ہے وہ خود کو ضعف اور ناتوانی سے بچائے رکھتا ہے اور خیر اور پاکیزگی کی طرف گامزن رہتا ہے۔ اگر بڑے سانپ کو ''حیہ'' کہا جاتا ہے تو یہ اس کی شدت کے ساتھ حرکت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ''حیہ'' کہلاتا ہے۔ اور یہی حرکت اس کی زندگی کے واضح ترین آثار میں شمار ہوتی ہے۔ نیز قبیلہ کو ''حی'' اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی اجتماعی اور گروہی حیات موجود ہوتی ہے۔[1]

''موت''، ٹھیک ''حیات'' کا نقطہ مقابل ہے۔ لہٰذا حیات کی طرف اس کی بھی کئی مختلف قسمیں ہیں، جن میں سے ایک ''موتِ نباتی'' ہے، جیسا کہ خداوندِ عالم نے قرآن مجید میں فرمایا ہے ''اَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا'' یعنی ہم نے اس کے ذریعہ مُردہ زمین کو زندہ کر دیا ہے (سورہ ق/ ۱۱) اور ''حیوانی موت'' اور ''عقلائی موت'' یعنی جہالت، ''موت'' بمعنی غم واندوہ کے بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

''وَیَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَیِّتٍ'' اس کے پاس ہر طرف سے غم واندوہ پہنچ جاتے ہیں جب کہ وہ مردہ نہیں ہے۔ (ابراہیم/ ۱۷) موت نیند کے معنی میں بھی آتی ہے، جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ''نیند خفیف سی موت ہے'' جب کہ ''موت گہری نیند ہے''۔

بعض لوگوں نے موت کے یہ معنی بھی کئے ہیں ''کسی زندہ موجود کی تدریجی تحلیل'' اور ''موتہ'' جنون یعنی دیوانگی جیسی حالت کو کہتے ہیں، گویا عقل اور علم اس حالت میں مرجاتے ہیں۔

بعض حضرات نے ''میت'' اور ''مائت'' کے درمیان فرق بتایا ہے اور کہا ہے ''میت تو ''مردہ'' کو کہتے ہیں، ''مائت'' اس چیز کو کہتے ہیں جو حل ہوتی جارہی ہو اور مرنے کے قریب جا پہنچی ہو۔ اس لفظ کے کنایہ والے معانی تو بہت ہی زیادہ ہیں جن سے ''کفر''، ''خواب'' اور ''خوف'' وغیرہ ہیں۔

بنجر زمینوں کو ''موات'' اسی لئے کہتے ہیں کہ ان میں نباتاتی حیات کا فقدان ہوتا ہے۔ اور وہ زراعت اور کاشتکاری کیلئے آمادہ نہیں ہوتی۔ لیکن جب زراعت اور کاشتکاری کے قابل ہوجاتی ہے تو اسے ''مہیات'' کہتے ہیں۔

''مقائیس اللغۃ'' میں آیا ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی ''طاقت کا ختم ہوجانا ہیں'' اور زندہ موجودات کی موت اس کے ظاہر تین مصداقوں میں سے ایک ہے۔

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، مفردات راب، لسان العرب، مجمع البحرین اور لغت کی دوسری کتابیں

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

حیات کی آفرینش، آفرینش کا شاہکار ہے:

مذکورہ بالا دس آیات میں اور قرآن مجید کی کئی دوسری آیات میں موت وحیات کے مسئلہ پر بعنوان ''خداوندِ جل شانہ کی دو عظم ترین آیات'' کے بہت زیارہ زور دیا گیا ہے۔ بیشتر آیات میں تو انسان کی موت وزندگی پر گفتگو کی گئی ہے۔ بعض آیات میں بطور عام موت وحیات کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی تمام ذی حیات چیزوں کا اور بعض میں نباتات کی موت وحیات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں خداوند قادروقہار کی قدرت کے ذریعہ دانے اور گٹھلی کے شگافتہ ہونے، زندہ چیز کو مردہ سے اور مردہ چیز کو زندہ سے باہر نکالنے کا تذکرہ ہے۔ یعنی موت وحیات کے وسیع معنی کے لحاظ سے نباتات، حیوانات اور انسان کی قوت کا ذکر ہے۔

جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ نباتات کے دانے محکم اور مضبوط ہوتے ہیں اور گٹھلیاں ان سے بڑھ کر مضبوط، کہ جن کا آسانی سے چیرنا بھی ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن ان سے جو کونپلیں پھوٹتی ہیں وہ اس قدر نازک، باریک اور لطیف ہوتی ہیں کہ جن کا کوئی حدوحساب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہوتا ہے کہ یہ لطیف ونازک کونپلیں اس قدر مضبوط ومحکم قلعہ کو پھاڑ کر اس سے اپنا سر باہر نکال لیتی ہیں؟ اور صرف سر ہی باہر نہیں نکالتیں، پروان بھی چڑھتی رہتی ہیں؟ تو کیا یہ سب کچھ خداوندِ قادروقدیر کی قدرت کے بغیر ممکن ہوسکتا ہے؟ اور ان اللہ فالق الحب والنوی کا جملہ گویا اسی بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

خداوندِ عالم مردے کو وزندہ سے اور زندہ کو مردہ سے کیونکر باہر نکالتا ہے؟ اس بارے میں بہت سے متقدم مفسرین نے نمونہ کے طور پر انڈے سے چوزے کا پیدا ہونا، گٹھلی اور دانے سے درختوں اور نباتات کا پیدا ہونا اور نطفہ سے انسان کا پیدا ہونا ذکر کیا ہے، جب کہ موجودہ تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ زندہ چیزیں ہمیشہ زندہ چیزوں سے ہی وجود میں آتی ہیں۔ یعنی درختوں اور دیگر نباتات کے دانوں (بیجوں) اور گٹھلیوں میں غذائی مواد FOOD NATTER کے علاوہ ایک زندہ خلیہ بھی ہوتا ہے جو حقیقت میں ایک نہایت ہی باریک اور ناقابل رؤیت درخت یا نباتات ہوتا ہے۔ جب اُسے کوئی مناسب ماحول میسر آجائے تو وہ اس غذائی مواد سے بہرہ وری کرتے ہوئے نشوونما پانا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح انسان اور جانوروں کے نطفہ میں بھی بے حد زندہ خلیے ہوتے ہیں، جو درحقیقت انسان یا حیوان کی پیدائش کا مبداء واقع ہوتے ہیں۔

بعض معاصر مفسرین (تفسیر مراغی اور تفسیر المنار کے مفسرین کی مانند) اس بات کی طرف اس اشکال کی وجہ سے متوجہ ہوئے ہیں اور اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ مخصوص خلئے اگرچہ سائنسدانوں کے عرف میں وہ زندہ محسوب ہوتے ہیں لیکن عرفِ عام اور لغت میں وہ اس عنوان کے شائستہ اور لائق نہیں ہیں کیونکہ ان میں زندگی اور حیات کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے: مردہ سے زندہ کے نکلنے سے مراد ان دو معانی میں سے ایک لیا جائے۔

ایک تو یہ کہ اگرچہ موجودہ حالات میں زندہ اور موجود چیزیں ہمیشہ زندہ بیجوں، دانوں اور نطفوں سے باہر آتی ہیں، لیکن یہ بات بھی مسلم ہے کہ وہ آغاز میں ایسے نہیں تھے۔ کیونکہ جب کرۂ زمین، چاند سے جدا ہوا تو اس وقت یہ کرہ مکمل آگ تھا، اور کوئی بھی زندہ چیز اس میں موجود نہیں تھی۔ پھر ان حالات کے تحت جن کی حقیقت آج تک ہم سے مخفی ہے، خداوند عالم کے حکم کے مطابق پیچیدہ ترین قوانین کے تحت سب سے پہلی زندہ چیز، بے جان چیزوں کے وجود سے معرض وجود میں آئی۔

لیکن بعض لوگوں کا یہ مفروضہ ہے کہ پروہ مصر بھی ہیں کہ کُرہ زمین پر حیات دوسرے کُروں سے آسمانی پتھروں کے ذریعہ منتقل ہوئی ہے لیکن یہ مفروضہ کسی مشکل کو حل نہیں کرتا، کیونکہ اس طرح سے بات پھر دوسرے کُروں تک چلی جائے گی، کیونکہ آغاز میں بطورِ مسلم وہ بھی گرم اور بھسم کر دیتے تھے، اور جن چیزوں کو ہم جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی حرارت میں زندگی کی تاب نہیں رکھتی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اولین بیج اور دانہ یا نطفہ ایک نہایت ہی مختصر اور چھوٹی سی چیز ہے۔ لیکن اسی بے جان مواد سے غذا حاصل کرنے کے طریقے نشوونما پاتے ہیں اور حقیقت میں وہ بے جان موجودات کو جذب کر کے جاندار بناتے ہیں۔ لہٰذا اس طرح لاکھوں کروڑوں زندہ خلیئے، مردہ موجودات سے خارج ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کہہ سکتے ہیں کہ ''خداوندِ علم مردہ کو زندہ سے اور زندہ کو مردہ سے باہر نکالتا ہے۔''

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تعبیر سے مراد، ''کافر'' کا ''مومن'' سے اور ''مومن'' کا ''کافر'' سے پیدا ہونا ہے، یا سقط شدہ بچے کا زندہ ماں کے پیٹ سے باہر آنا اور زندہ بچے کا ناگہانی طور پر مرنے والی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا ہے۔

لیکن بطورِ مسلم یہ سب اس آیت کے کلی مصداقوں میں سے چند ایک مصداق ہیں نہ کہ آیت کا تمام مفہوم، آیت کا اصل مفہوم مذکورہ مفہوموں میں سے ایک ہے جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ بہرحال زندگی اور حیات کا مسئلہ اسقدر پیچیدہ ہے کہ دانشور صاحبان اب تک اس کے اسرار سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس مقام پر دعوتِ فکر یہ ہے کہ اگر کسی چیز کے اسرار کو سمجھنے کیلئے اسقدر عقل اور ہوش وذکاوت کی ضرورت ہوتی ہے تو کیا اس چیز کی ایجاد بغیر کسی عقل وہوش کے حاصل ہو جاتی ہے؟

اس لئے تو قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں صراحت کے ساتھ فرماتا ہے: ''ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ'' یہی خداوند وحدہ لاشریک ہے جو گٹھلی اور دانے کو شگافتہ کرتا ہے، زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے باہر نکالتا ہے پس تم کس طرح حق سے روگردانی کرتے ہو؟''

دوسری آیت میں متنبہ کر کے سوال کیا گیا ہے ''تم کیونکہ خداوند یگانہ کا انکار کرتے ہو؟ جب تم مردہ تھے خدا نے تمہیں زندہ کیا اور پھر مارے گا اور اس کے بعد زندہ کرے گا۔'' (كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ) اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف موت اور حیات کا مسئلہ ہی خدا کی شناخت کیلئے کافی ہے۔

باالفاظ دیگر تخلیق کی دنیا میں موت اور حیات سے پہلے اسی چیز کو ملاحظہ کرتا ہے۔ انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی حیات اس کی اپنی حرف سے نہیں ہے کیونکہ ایک دن تھا کہ وہ بے جان چیزوں کے زمرے میں شمار ہوتا تھا، کسی اور نے اسے حیات کا یہ تحفہ دیا ہے اور وہ بھی بڑے اسرار ورموز اور ظرافتوں، لطافتوں اور پیچیدگیوں سے بھرا ہو۔

بعض مفسرین نے یہاں پر ''کفر'' سے مراد ''کفرانِ نعمت'' لیا ہے، یعنی موت وحیات کی نعمت کا کفران، وہی موت جو دوسری حیات

کا پیش خیمہ ہوتی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہاں پر کفر خدا کے وجود کا انکار یا توحید کے انکار کے معنی میں ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی مدنظر رہے کہ اس آیت میں مسئلہ معاد پر بھی توجہ دی گئی ہے یعنی موت اور حیات کی تخلیق جہاں پر خدا کی توحید کی دلیل ہے وہاں پر معاد کے امکان کی دلیل بھی شمار ہوتی ہے۔

تیسری آیت اگرچہ آیاتِ معاد کے ذیل میں قرار پائی ہے، لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، موت اور حیات کا مسئلہ خدا کے وجود کے ثبوت کیلئے بھی اور معاد کے وجود کیلئے بھی دلیل ہے ((هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ '' کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ موت اور حیات صرف اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس قسم کی محیر العقول اور تعجب خیز تخلیق اس کے سوا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

چوتھی آیت، سورہ مومنوں میں آیاتِ توحید کے بعد ذکر ہوئی ہیں اور اس میں دو مسائل پر زور دیا گیا ہے، ایک تو ہے ''موت وحیات'' کا مسئلہ اور دوسرا ''رات اور دن کے آنے جانے'' کا مسئلہ اور ان دونوں کی آپس میں بڑی حد تک مشابہت بھی ہے، موت تاریکی کی مانند ہے جب کہ حیات روشنی کی طرح، رات کو پہلے اور دن کو بعد میں ذکر کرنے کا مقصد بھی شاید یہی ہو کیونکہ موت، حیات سے پہلے تھی اور انسان پہلے مردہ اجزاء تھا، پھر خدا نے اسے زندگی کا لباس پہنایا۔

''اختلاف لیل ونہار'' خواہ رات اور دن کے آنے جانے کے معنی میں ہو (اگر ''خِلفہ'' (بروزن حرِفہ کے مادہ سے ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں یکے بعد دیگرے آنا اور ایک دوسرے کا جانشین ہونا) یا فرق واختلاف اور سال کے مختلف موسموں میں بتدریج تبدیلی کے معنی میں ہو (اگر ''خلاف'' کے مادہ سے ہو جس کا معنی یہی ہوتا ہے) اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک ایسا نظام حکم فرما ہے جس میں بال برابر بھی فرق نہیں ہے اور اس میں چار موسم پائے جاتے ہیں۔ اور ان چار موسموں کی اپنی اپنی برکات ہیں، جیسا کہ موت وحیات کا مسئلہ اور اس پر حکم فرما دقیق نظام ہے جس کے انسان معاشرے میں بڑی حد تک آثار اور نتائج ملتے ہیں، جن کے بغیر انسانی زندگی کا نظام درہم برہم ہوسکتا ہے۔

اگر کوئی بھی شخص نہ مرتا تو زمین رہنے کے قابل نہ ہوتی۔ اگر سب لوگ جلدی جلدی مرتے جاتے تو زمین پر رہنے والا کوئی دکھائی نہ دیتا، لیکن اس کائنات کے خالق نے ایسے جچے تلے نظام کو ان پر حکمران بنا دیا ہے کہ اس زمین پر ہمیشہ کئی قومیں رہ رہی ہوتی ہیں جو زندگی کے عطیہ سے استفادہ کرتی رہتی ہیں اور ان ہی میں سے کچھ لوگ جا رہے ہوتے ہیں تو کچھ آ رہے ہوتے ہیں۔

اسلئے تو آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ'' کیا تم غور وفکر نہیں کرتے؟ خالق کی قدر، ربوبیت اور وحدانیت میں بھی اور اس بات میں بھی کہ اس اچھوتے نظام کا کسی علم وتدبیر کے بغیر وجود میں آنا محال ہوتا ہے۔

پانچویں آیت میں زمین اور آسمانوں کی مالکیت اور حاکمیت کے ذکر کے بعد موت اور حیات کے مسئلہ کو بیان فرمایا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ موت وحیات کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اُسے زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہی بیان کیا جائے

آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ '' یعنی جب ہر قسم کی قدرت وطاقت اور زمین وآسمان کی حاکمیت خداوند تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے علاوہ نہ تو کوئی ولی، سرپرست اور محافظ وناصر ومددگار ہے، تو پھر اس کے غیر کے پاس پناہ ڈھونڈنے کا کیا مقصد؟

چھٹی آیت میں موت وحیات کا مسئلہ ربوبیت کے مسئلہ کے ساتھ ہی بیان ہوا ہے۔وہی خدا جو تمہارا اپنا اور تمہارا آباؤاجداد کا رب اور پرورش کرنے والا ہے، وہی موت اور حیات کا خالق ہے۔

اصولی طور پر موت اور حیات کا مسئلہ خدا کی ربوبیت کی ایک شاخ ہے کیونکہ ''ربوبیت'' کے معنی اصلاح کرنا، نظام عطا کرنا اور پرورش کرنا ہیں، اور یہ موت اور حیات کی راہوں کے علاوہ ناممکن ہے۔''حیات'' انسان کو''ارتقاء'' کے امکانات عطا کرتی ہے۔اور''موت'' بھی ایک اور وسیع تر کائنات میں نئی زندگی اور ایک اور ارتقاء کا مقدمہ ہوتی ہے۔

ساتویں آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے زمانے کے جبار بادشاہ''نمرود'' کے ساتھ گفتگو کو بیان کیا گیا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو حضرت ابراہیمؑ کے بت شکن کے واقعہ کے بعد عمل میں آئی ہے، جب آنجناب ایک ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور آپؑ کا شہر چہار دانگ عالم میں پھیل چکا تھا اور نمرود لعین نے آپ کو اپنے دربار میں طلب کر کے آپ کے ساتھ بات چیت کی۔[1]

یہ مغرور شخص جو نشہ حکومت میں بدمست ہو چکا تھا اس نے ابراہیم علیہ السلام سے سب سے پہلا سوال یہی کیا''تیرا خدا کون ہے؟''

ابراہیم علیہ السلام نے بھی جواب میں سب سے پہلے حیات اور موت کا مسئلہ کا سہارا لیا اور کہا''میرا پروردگار تو وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے''(رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ)

جبار اور سرکش نمرود باوجودیکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرمان کی صداقت اور حقانیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا لیکن اپنے اردگرد والوں کے دماغ اور افکار کو منحرف کرنے اور انہیں غفلت میں ڈالنے کیلئے کہا کہ ایسا تو میں بھی کرسکتا ہوں''میں زندہ بھی کرتا ہوں اور مارتا بھی ہوں''(أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ)

اس موقعہ پر اپنے دعویٰ کی صداقت کیلئے نمرود نے کیا کیا؟ قرآن میں تو اسکا تذکرہ نہیں ہے، البتہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس نے فوراً حکم دیا کہ دو قیدیوں کو لایا جائے ان میں سزائے موت کا حکم تھا، اسے رہا کر دیا گیا اور دوسرے کو جو بے قصور تھا، سزائے موت دے دی اور کہا،''دیکھا آپ نے موت وحیات میرے ہاتھ میں ہے۔''

فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں اس چیز کو بعید تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حاضرینِ مجلس ایسے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ وہ نمرود کے کاموں اور موت وحیات میں، جو کہ خدا کا کام ہے کوئی فرق محسوس نہ کریں!

حضرت رازی کہتے ہیں کہ دراصل نمرود کا مقصد یہ تھا کہ''کیا آپ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا کسی واسطے کے بغیر یہ کام انجام دیتا ہے؟ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے، لہٰذا عالمِ اسباب کے ذریعہ ہی ایسا ممکن ہوتا ہے۔ایسی حالت میں، مَیں بھی یہ کام انجام دے سکتا ہوں''۔[2]

---

[1] یہ بات کہ''مندرجہ بالا گفتگو حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی کے بعد عمل میں آئی''متعدد تفسیروں میں مذکورہ ہے، جن میں''تفسیر مراغی'' جلد ۳ ص ۱۲۱ اور''تفسیر فخر رازی جلد ۷ ص ۲۵ زیادہ قابل ذکر ہیں۔

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۷ ص ۲۴

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جناب رازی نے اس نکتہ کوفراموش کردیا ہے کہ ہردوراور ہرزمانے میں نادان افراد کی تعداد کم نہیں رہی ہے ،خصوصاً جب حاکم جابر ہوتو اس کے اطراف میں خوشامدیوں اور چاپلوسوں کی بھرمار ہوتی ہے۔

اسی سے ملتی جلتی کیفیت حضرت موسیٰ علیہ السلام اورفرعون کے حالات میں بھی پائی جاتی ہے کہ فرعون نے اپنے بودے اور مضحکہ خیز دلائل کے ساتھ اہلِ مصر کواحمق بنایااورانہیں اپنے بندگی کی دعوت دی۔جوتفسیر جنابِ فخر رازی نے بیان فرمائی ہے وہ ان فلسفیوں کی مانند ہے جوآپس میں بیٹھ کر نقطے درست کرتے رہتے ہیں کہ اگر فاعل بالواسطہ ہوتو یوں ہوجائے اوراگر بلاواسطہ ہوتو یوں ہوجائے!!

آٹھویں آیت میں تیسری آیت کی طرح بتایا جارہا ہے کہ حیات وموت کی تخلیق خداہی کے ساتھ خاص ہے اورسب کی بازگشت خداہی کی طرف ہے۔

نویں آیت میں مشرکین کودوٹوک الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''خداوہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا،زندگی بخشی اورروزی عطافرمائی ہے۔تمہاری موت اور بروزِ قیامت تمہاری دوبارہ زندگی بھی اسی کے دست قدرت میں ہے۔تمہارے بتوں میں سے کوئی بت اس طرح کا کام کرنے پرقادر ہے؟ کیاوہ کوئی چیز پیدا کرسکتے یا کسی چیز کوموت دے سکتے ہیں؟ کسی کوروزی عطا کرسکتے ہیں؟اب جب کہ یہ سب کچھ خداہی کیلئے خاص ہےتو پھرتم کسی کواس کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ وہ ان تمام شریکوں سے منزہ اور برتر ہے جوتم اس کیلئے قرار دیتے ہو۔''(سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ)

آخرکاردسویں اورآخری آیت میں نباتات کی حیات کے مسئلہ کوپیش کیا گیا ہے جوحیات کا زیبااور پراسرار چہرہ ہے،اورمردہ زمینوں کی اس کیفیت کوانسانوں کے سامنے پیش کیاجارہا ہے کہ خداوندِ عالم کیونکرخشک اورزندگی سے عاری بیابانوں کوایک یا کئی بارشوں کے ذریعہ لباسِ زندگی پہناتا ہے کہ اس کے ہرگوشے سے نغمہ حیات اُٹھ رہا ہوتا ہےاورروز رستاخیز (قیامت) کا منظر پیش ہورہا ہوتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے''نباتات کی حیات کے اس مسئلہ میں ان لوگوں کیلئے بہت بڑی نشانی ہے جن کے ہاں سننے والے کان ہوتے ہیں''نباتات کی حمدوتسبیح کے نغموں کو سنتے ہیں اور ہر پودے کے زمزمہ توحید کوجوزمین سے لگ رہا ہوتا ہے اورسربلند کرکے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ذکر جاری کئے ہوئے ہوتا ہے،گوشِ جان سے سنتے ہیں۔(اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ)

مزید تفصیل

۱۔زندگی ایک عظیم معمہ ہے:

انسانی علم ودانش کی پیش رفت نے بہت سے حقائق سے پردہ اٹھادیا ہے اوراس عظیم کائنات کے بہت سے مسائل کوواضح کردیا ہے۔لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اس تمام ترقی کے باوجودانسان کے سامنے بہت سے معمے موجودہیں جوابھی حل کرنے کے قابل ہیں،جن میں سے ایک اورہم ترین معمہ''معمۂ حیات'' ہے۔یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جولاکھوں کروڑوں دانشمندانسانوں کی تلاشِ بسیاراورسعی مسلسل کے باوجودابھی تک لاینل چلا آرہا ہےاورابھی تک ابہام کے پردوں میں اسی طرح چھپا ہوا ہے۔

پھرلطف کی بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے چودہ سال قبل مشرکین کوان الفاظ میں مخاطب کرکے کہہ دیا ہے:

''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ'' اے لوگو!ایک مثال بیان کی گئی ہے جسے تم بھی غورسے سن لو۔خدا کے علاوہ جن لوگوں کوتم پکارتے ہووہ توایک مکھی پیدا کرنے پر بھی ہرگز قادرنہیں ہیں،اگرچہ اس کام کیلئے وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ بھی دے دیں اوراگران سے ایک مکھی کوئی چیز لے اڑے تووہ اس سے واپس نہیں لے سکتے ۔طالب اورمطلوب دونوں کمزوراورناتواں ہیں۔(بتوں کےعبادت گزاربھی اوران کے معبودبھی)۔(حج۔۷۳)

پھرمزے کی بات یہ ہے کہ مکھی کے پیدا کرنے کیلئے آج کے ترقی یافہ انسان کی ناتوانی اورعجزاسی حدتک ہے جوآج سے چودہ سوسال پہلے تھے، بلکہ اس کے برعکس آج کے ترقی یافتہ دورمیں بھی انسان اسقدرعاجز ہے کہ جب کبھی مکھیاں یاٹڈیاں یاکوئی اورحشرات الارض اس پرحملہ آورہوتے ہیں توزیر پاشی کے تمام جدیداورماڈرن وسائل کواستعمال کرکے بھی ان سے چھٹکارحاصل نہیں کرسکتا۔

ہوسکتا ہے کہ اس موقعہ پرکوئی یہ کہہ دے کہ انسان نے ایسی ایسی چیزیں ایجادکرڈالی ہیں جوایک مکھی سے کئی گنا اہم ہی نہیں،اہم ترین بھی ہیں۔مثلاً خلائی جہاز،پیچیدہ الیکٹرانک مغز(کمپیوٹر)وغیرہ۔

لیکن یہ بہت بڑی غلطی ہوگی اگرہم ان دونوں کوایک جیسا سمجھیں۔ایک خلائی جہاز یاپیچیدہ الیکٹرانک مغزمیں قطعاً نشوونمانہیں پائی جاتی۔محال ہے کہ وہ اپنے جیسی کسی چیزکوجنم دےسکیں۔وہ اپنے اوپرنازل ہونے والی مصیبتیں دورنہیں کرسکتے،اپنے پرانے اورفرسودہ پرزوں کی ازخودمرمت نہیں کرسکتے،انہیں بیرونی ہدایت اوررانہمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔جب کہ مکھی اس بارے میں خلائی جہازاورکمپیوٹر پرواضح برتری کی حامل ہے۔ہاں البتہ مکھیوں کی فراوانی اس بات کاموجب بن چکی ہے کہ ان کی اہمیت ہماری آنکھوں میں بڑی حدتک کم ہوگئی ہے ۔اگرتمام دنیامیں صرفایک مکھی موجودہوتی تومعلوم ہوتا کہ دانشوروں نے اس بارے میں کس قدرتوجہ منعطف کی ہے؟

اس سے بھی قطع نظرہمیں اس موازنہ اورمقابلہ کی ضرورت بھی نہیں۔مقصدیہ ہے کہ واضح ہوجائے کہ کسی زندہ موجودکی ساخت،حتیٰ کہ

ایک خلیے کی ساخت، جس کی طرف ہم گذشتہ مباحث میں واضح اشارہ کر چکے ہیں، اس قدر اسرار آمیز اور پیچیدہ ہے کہ جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا بنانے والا غیر محدود علم وقدرت کا مالک ہے اور حیات وزندگی کے پیچیدہ قوانین سے اچھی طرح واقف ہے بلکہ صحیح ترین الفاظ میں یہ کہا جائے گا کہ ''ان قوانین کی بنیاد اس نے خود ہی رکھی ہے'' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی چیزوں کی شناخت کیلئے اس قدر علم اور شعور کی ضرورت ہو لیکن ان کی تخلیق کیلئے کسی قسم کے عقل وشعور کی ضرورت نہ ہو؟

یہ وہی چیز ہے جس کے اثبات کیلئے ہم نے ان مباحث کو شروع کیا ہے۔ ان آیات میں اور ان آیات سے ملتی جلتی دوسری قرآنی آیات میں اسی چیز کو پیش کیا گیا ہے۔ اس گفتگو کو ہم ایک نکتہ بیان کر کے ختم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ حیات اور زندگی اگرچہ کائنات کی واضح ترین چیزوں میں سے ہے، لیکن اس کی حقیقت ابھی تک کسی پر واضح نہیں ہوسکی۔ البتہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ زندگی کے آثار اور علامات ہیں (مثلاً نشوونما، رشد وبلوغ، غذا کا حصول، اپنے جیسی مخلوق کی تولید، حس وحرکت، غور وفکر وغیرہ) لیکن وہ حقیقت جو ان آثار وعلامات کا سرچشمہ ہے، وہ کیا ہے، وہ اب تک کسی پر واضح نہیں ہوسکی اور عقلاء کی عقلیں اس بارے میں حیران ہیں۔

۲۔ کیا انسان کوئی اور زندہ چیز بنا سکتا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ یہ زندہ چیزیں آغاز میں بے جان چیزوں سے معرض وجود میں آئی ہیں اور یہ امر خواہ کرہ زمین پر انجام پایا ہو یا کسی اور آسمانی کرے میں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن وجوہات کے تحت اور کن فارمولوں کے مطابق اس قدر عظیم تحرک پیدا ہوا؟ اب تک یہ بات کسی پر واضح نہیں ہوسکی۔

البتہ کچھ دانشوروں نے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ ہم بتدریج ان وجوہات اور فارمولوں کو دریافت کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نہ کسی دن بے جان مواد سے کسی زندہ خلیے کی ایجاد کر لیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان کی یہ امید کس حد تک بجا ہے اور انجام کار یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوگا بھی یا نہیں؟ بالفرض اگر انسان میں اس بات کی قدرت پیدا ہو جائے کہ وہ حیات کی وجوہات اور اس کے فارمولے دریافت کر بھی لے اور لیبارٹریوں میں کوئی زندہ خلیہ ایجاد کر بھی لے، لیکن یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ:

اوّلا!: ان کا یہ کام اس کائنات کی تخلیق کی تقلید اور دنیا میں موجود مختلف مواد کی باہمی ترکیب کے بغیر قطعاً ناممکن ہوگا، گویا چند مختلف چیزوں کو ''جوڑ لیا جائے گا جسکا نام ''ایجاد'' رکھا دیا جائے گا۔

ثانیاً' فرض کر لیا جائے کہ کوئی زندہ خلیہ ایجاد کر بھی لیا جائے تو بات یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ اصل مسئلہ تو کائنات کی خلیوں بھری پیچیدہ مخلوق کا ہے، مثلاً ایک مکھی کی تخلیق، ایک ٹڈی کی پیدائش، ایک پرندے کی بناوٹ ایک عظیم مچھلی کی ساخت اور ایک انسان کی ایجاد۔ کوئی شخص امید وار بن سکتا ہے ایسے امور صنعتی راہوں سے ممکن ہو سکتے ہیں! ایک دانشور ''پروفیسر ہینز'' کہتے ہیں:

''ایک ہزار سال بعد انسان کو حیات وزندگی کے رازوں کا پتہ چلے گا۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہو ایک مکھی یا کوئی اور حشرہ

حتیٰ کہ کوئی زندہ خلیہ ایجاد کرڈالے۔''[1]

ثالثاً: فرض کیا کہ خداداد عقل کے تعاون، علم کی پیش رفت اور طبعی قوانین کی تقلید کرتے ہوئے یہ مقصد حاصل ہوجائے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے معاد پر اسکا کوئی اثر پڑے گا یا ہمارا دعویٰ کمزور ہوجائے گا۔ کیونکہ اگر کسی ایک زندہ خلیے کی ایجاد کیلئے پہلے سے موجود نمونوں، آمادہ طبعی مواد کے باوجود بھی اسقدر علم ودانش کی ضرورت ہوتی ہے تو اس قدر بے شمار زندہ موجودات کی تخلیق کیلئے جس سے پہلے نہ تو کوئی نمونہ موجود تھا اور نہ ہی مواد طبعی کسی قدر علم اور دانش کی ضرورت ہوگی؟ کیا اندھی گونگی اور ہر قسم کی شعور سے عاری NATURE کو اس کی تخلیق کا عامل سمجھا جاسکتا ہے؟ اس مقام پر ہم آپ کی توجہ سائنس اکیڈمی نیویارک کے چیئرمین ''کرسی موریسن'' کے ایک دلچسپ جملے کی طرف مبذول کراتے ہیں، جو انہوں نے اپنی کتاب ''رازآفرینش انسان'' میں لکھا ہے:

''ہیگل نے کہا ہے کہ مجھے آپ ''ہوا''، ''پانی''، ''کیمیکل مواد'' اور ''زمانہ'' دے دیں، میں اس کے ذریعہ سے انسان تخلیق کردوں گا۔ لیکن ہیگل یہ بات بھول گئے کہ اس کام کیلئے نطفہ اور جرثومۂ حیات بھی نہایت ضروری ہے، بالفرض انہوں نے کچھ نامرئی ذرات جمع کر بھی لئے اور ایک انسان کی تخلیق کیلئے انہیں بڑے نظم اور ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو جوڑ بھی دیا اور ایک قالب وضع کر بھی لیا، اس میں جان بھی تو ڈالنی ہے! چلو فرض کرلیا کہ انہوں نے ان تمام خارق العادت امور پر قابو پا بھی لیا تو لاکھوں کروڑوں احتمالات میں سے صرف ایک احتمال ہے کہ وہ ایسا کرسکیں یعنی کوئی ایسی جاندار شئے پیدا کرسکیں کہ چشم روزگار نے اس سے انوکھی چیز نہ دیکھی ہو، مگر جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اس کامیابی کے حاصل ہوجانے کے بعد جود جناب ہیگل بھی نہیں کہیں گے کہ یہ چیز ''اتفاق'' سے وجود میں آگئی ہے بلکہ وہ کہیں گے ''میری عقل اور میرے ہوش ونبوغ نے اسے تخلیق کیا ہے''۔[2]

بسا اوقات بعض افراد اس خوش فہمی میں مبتلا ہوکر یہ تصور کرلیتے ہیں کہ زندگی کی پیدائش کئی اتفاقی حوداثات کا نتیجہ ہوسکتی ہے اور اسی کی توجیہ کی جاسکتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم احتمالات کے حساب سے ''پروٹھیڈ'' کے ایک ذرہ کی تخلیق کی اس طرح توجیہہ کریں تو کرہ زمین کی عمر اس کی پیدائش کیلئے ناکافی ہوگی۔ ''پروٹھیڈ'' زندہ موجودات کو تشکیل دینے والے موادوں میں سے ایک ہے۔

''ہارورڈ'' یونیورسٹی کے ماہر حیاتیات پروفیسر ''جارج والڈ'' نے حیات کی پیدائش کی کیفیت احتمالات اور اس کی ازخود یا ''اتفاقی صورت'' میں تخلیق کی نفی کرتے ہوئے بڑی اچھی بات کی ہے کہ جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''ایک ''پروٹھیڈ'' کی تشکیل کیلئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مالیکیول MOLE CULES کو مختلف نسبتوں میں مختلف صورتوں میں زنجیر کی طرف باہم پیوستہ ہونا پڑتا ہے اور اس قسم کے پروٹھیڈ کی قسمیں حدوحساب اور شمار سے باہر ہیں، کیونکہ ہمیں کہیں بھی دو قسم کے جانور ایسے نہیں ملیں گے جن کے پروٹھیڈ ایک جیسے ہوں۔ اسی وجہ سے آلی مواد کی مالیکیول بڑے گروہ کی تشکیل دیتے ہیں کہ جن کا مالیکیول تنوع غیر محدود ہوتا ہے

---

[1] کتاب ''آیۃ الکرسی'' ص ۹۳

[2] ملاحظہ ہو کتاب ''رازآفرینش'' ص ۱۳۹ تا ۱۴۱

اور پیچیدگی حیران کن۔اور کسی چیز زندہ کی تخلیق کیلئے نہ صرف بے انتہا پروٹھیڈ کی کافی مقدار میں ضرورت ہوگی بلکہ انہیں مخصوص نسبت کے مطابق بھی لیا جانا ضروری ہوگا، بلکہ ان کی صحیح ترتیب بھی نہایت ضروری ہوگی۔یعنی ان کی ساخت کا ان کی کیمیکل ترکیب کے اندازے کے مطابق ہونا بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔'' وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

'' پروٹھیڈ کی ساخت واقعاً نہایت ہی پیچیدہ ہے۔کمپیوٹر جیسی پیچیدہ ترین چیز جنہیں انسان نے بنایا ہے،ایک عام اور سادہ سی زندہ مخلوق کے سامنے بچوں کا کھیل دکھائی دیتی ہیں۔بس اتنا کافی ہے کہ انسان اس کام کی عظمت پر غور کرے تا کہ اسکے سامنے کسی چیز کو خود بخود تخلیق یا اتفاقی پیدائش کا غیر ممکن ہونا واضح ہو جائے۔''[1]

ہم اپنی اس گفتگو کو دو مقدس اور معصوم ہستیوں کے فرمان ذیشان پر ختم کرتے ہیں۔ایک تو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا گراں قدر اور بیش قیمت کلام ہے اور دوسرا حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا انمول کلام۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنی مشہور حدیث ''توحید مفضل'' میں انسان اور اس کے مختلف اعضاء کی تخلیق کے بارے میں مفضل کے سامنے بڑی وضاحت کے ساتھ تشریح فرماتے ہیں۔مفضل عرض کرتے ہیں۔

''مولا! کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ طبیعت (نیچر) کا کام ہے۔'' امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"سلهم عن هذه الطبيعة اهي شئ ،له علم وقدرة علىٰ مثل هذه الافعال؟ ام ليست كذٰلك ؟ فان اوجبوالهاالعلم والقدرة فهما يمنعهم من اثبات الخالق؟ فان هذه صنعته ،ان رعموا انهاتفعل هذه الافعال بغيرعلم ولاعمدهو كان فى افعالها ماقدترامن الصواب والحكمة علم ان هذاالفعل للخالق الحكيم وان الذى سمّوه طبيعة ،هوسنة فى خلقه الجارية علىٰ ما اجراها عليه"

تم ان سے پوچھو کہ یہ طبیعت (نیچر) ہے؟ کیا وہ ایسی چیز ہے جس میں ان کاموں کیلئے علم اور قدرت پائی جاتی ہے ،یا ایسا نہیں ہے ؟ اگر وہ اس کیلئے علم اور قدرت کے قائل ہیں تو پھر وہ خدا کے وجود کو تسلیم کیوں نہیں کرتے (درحقیقت وہ نام رکھنے میں غلطی سے کام لیتے ہیں نہ کہ اصلِ خدا کے وجود میں) کیونکہ یہ اسی کی تخلیق ہے۔اور اگر گمان کرتے ہیں کہ طبیعت نے ہی ان افعال کو علم اور ارادے کے بغیر انجام دیا ہے ،اس کے

---

[1] کتاب ''شناخت حیات'' ص ۱۱

باوجوداس کے تمام اعمال مکمل طور پر صحیح اور حکمت پر مبنی ہیں، تومعلوم ہوگا کہ یہ تمام ایسے خالق کی پیداوار ہیں جوصاحبِ حکمت ہے۔جس چیز کا نام انہوں نے طبیعت رکھا ہے درحقیقت وہ خدا کے وہ قوانین اور طریقہ کار ہیں جواس کی مخلوق پر نافذ ہیں اوراس کے ارادہ اور منشاء کے مطابق جاری وساری ہیں۔[1]

امیرالمومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ارشادفرماتے ہیں:

''ولواجتمع جميع حيوانهامن طيرهاوبهائمها.....واجناسهاومتبلدة امهاوا كياسها،على احداث بعوضة ماقدرت على احداثها،ولاعرفت كيف السبيل الى ايجادها،ولتحيرت عقولهافى علم ذالك ''اگرکائنات کی تمام زندہ چیزیں اکٹھی ہوجائیں ،خواہ وہ پرندے ہوں یاچوپائے ۔۔۔۔۔۔۔اور ہرقسم کے حیوانات ،چاہے وہ کم عقل ہیں یازیرک اورعقلمند، پھربھی ایک مچھر کی تخلیق پرقادرنہیں ہوں گے۔کسی بھی صورت میں اورکسی بھی وقت اس کی ایجاد کے طریقے کونہیں پہچان سکیں گے اوراس مخلوق (مچھر) کی تخلیق کے اسرارتک پہنچنے سے حیران رہ جائیں گے۔[2]

---

[1] بحارالانوارجلد ۴ ص ۱۶۷

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۶

۴۔روح کی پیدائش میں اس کی نشانیاں

اشارہ:

روح بھی عالمِ ہستی (کائنات) کی نہایت ہی عجیب اور پُراسرار مخلوق ہے۔باوجودیکہ وہ سب سے زیادہ ہمارے نزدیک ہے ۔پھربھی ہم اس کی شناخت اورمعرفت سے کوسوں دور ہیں۔

دانشوروں اورفلاسفہ نے روح کی شناخت کیلئے سرتوڑکوشش کی ہے،کسی بھی لمحے ان کی یہ کوشش متوقف نہیں ہوئی اوراسی کے پرتو میں انہوں نے بہت سے رازوں سے بھی پردہ اٹھایاہےلیکن ابھی تک روح اسرار بھرا چہرہ تبدیل نہیں ہوا۔اس بارے میں بہت سے سوال ایسے ہیں جوتشنہ جواب ہیں۔اسی وجہ سے پروردگارِعالم کےعلم وحکمت اورتدبیر کی ایک اہم ترین دلیل اس نسانی روح کی تخلیق ہے۔قرآنی آیات نے بھی کائنات کی اس عظیم تخلیق پر بہت زور دیاہےاوراسے زبردست اہمیت کے ساتھ ذکرکیاہے۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات کوگوشِ دل کے ساتھ مل کرسماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰهَا{}فَاَلْهَمَهَافُجُوْرَهَاوَتَقْوٰهَا

(شمس/۷۔۸)

۲۔۔۔وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ مِنْ اَمْرِرَبِّیْ وَمَآاُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلاَّ قَلِيْلاً

(بنی اسرائیل/۸۵)

۳۔۔۔وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًامِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍمَّسْنُوْنٍ{}فَاِذَاسَوَّيْتُه،وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْالَه،سٰجِدِيْنَ

(حجر/۲۸۔۲۹)

۴۔۔۔ثُمَّ خَلَقْنَاالنُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَاالْعِظٰمَ لَحْمًاثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًااٰخَرَفَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

(مؤمنون/۱۲)

۵۔۔۔اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَا مِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَيْهَاالْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ

(زمر/ ۴۲)

ترجمہ

۱۔۔۔قسم ہے نفسِ آدمی کی اور اس کی جس نے اُسے منظم بنایا ہے۔ پھر فجور اور تقویٰ (خیر اور شر) اسے الہام کیا ہے۔

۲۔۔۔آپ سے ''روح'' کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے روح میرے پروردگار کے فرمان سے ہے، تھوڑے سے علم کے سوا تمہیں اور کچھ نہیں دیا گیا؟

۳۔۔۔اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں بشر کو خشک مٹی سے جو کہ بدبودار کیچڑ سے لی گئی، خلق کرنے والا ہوں، جب میں اُسے منظم کرلیا اور اس میں اپنی عظیم (ایک عظیم شائستہ) روح پھونک دوں تو ہم سے اس کیلئے سجدہ میں گر جاؤ۔

۴۔۔۔پھر نطفہ کو علقہ (جمے ہوئے خون) کی صورت میں اور علقہ کو مضغہ (لوتھڑے) کی صورت میں اور مضغہ کو ہڈیوں کی صورت میں لے آئے، پھر اُسے تازہ تخلیق عطا کی، بابرکت ہے وہ خدا جو بہترین خالق ہے۔

۵۔۔۔خداوندِ عالم، روحوں کو ''موت'' کے بعد قبض کرلیتا ہے، اور وہ روحیں جو نہیں مری ہیں انہیں بھی نیند میں قبض کرلیتا ہے۔ پھر جن روحوں کو موت کا فرمان صادر کیا ہوتا ہے انہیں اپنے پاس روک لیتا ہے اور دوسری روحیں (جنہیں زندہ رہنا چاہیے) ایک معین مدت تک واپس بھیج دیتا ہے۔ اس بارے میں (خداوندِ عالم کی عظمت وقدرت کی) روشن نشانیاں ہیں، ان لوگوں کیلئے جو غور فکر کرتے ہیں۔

الفاظ کے معانی اور ان کی تشریح

''روح'' کے لفظ کا اصل معنی ''سانس لینا'' یا ''پھونک مارنا'' ہے جب کہ بعض ارباب لغت کا عقیدہ ہے کہ یہ (روح) دراصل ''ریح'' سے مشتق کیا گیا ہے جس کے معنی ''ہوا'' اور ''نسیم'' ہیں۔ چونکہ انسانی روح یعنی وہی مستقل اور مجرد گوہر جو زندگی اور غور فکر کا سرچشمہ اور مرکز ہے ایک لطیف جوہر ہے اور حرکت وتحرک اور زندگی عطا کرنے کی وجہ سے سانس اور نسیم کی مانند ہے۔ لہٰذا اس لفظ کو اسی معنی کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ روح کا بدن کے ساتھ نزدیکی رابطہ سانس لینے کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اس لفظ کو انسانی روح کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ اس لفظ کا اصل مادہ ''ایک لطیف امر کا ظاہر اور جاری ہونا'' ہے خواہ وہ جسم کے عالم میں ہو یا جان اور معنی کے عالم میں۔ اسی لئے مقام نبوت کے ظہور وحی کے جاری ہونے اور نورِ حق کی تجلی کیلئے بھی اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

''روح'' (بروزن قوم) جس کے معنی مسرت وخوشی، آسائش وآرام اور رنج وغم سے نجات ہیں، وہ بھی اسی سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح خدا کی مہربانیوں اور رحمت کو بھی ''روح اللہ'' کہا جاتا ہے۔

''ریحان'' کا لفظ جو کہ کلامِ عرب میں ''پھول'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس لئے ہے کہ اس کی خوشبو ہوتی ہے جو مشامِ جان کو معطر کر دیتی ہے۔

''رِواح'' کا لفظ 'غروب کی جانب'' کے معنی میں ہے کیونکہ موقعہ پر حیوانات استراحت وآرام کیلئے اپنی اپنی جگہوں کو واپس لوٹ آتے ہیں۔

بہرحال قرآن مجید میں یہ لفظ بہت سے مختلف معانی کیلئے استعمال ہوا ہے، کبھی ''فرشتہ وحی'' کے معنی میں کبھی خدا کے خاص فرشتوں میں سے ایک بڑے فرشتے کے معنی میں (یا فرشتوں سے بڑی مخلوق کے معنی میں)، گاہے خداوندِ عالم کی معنوی طاقت کے معنی میں جس کے ذریعہ وہ مومنین کو قوت پہنچاتا ہے اور کبھی انسانی روح کے معنی کیلئے استعمال ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

''نفس'' کے بارے میں راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں ''نفس بمعنی روح کے ہے۔ اور کبھی کسی چیز کی ذات کے بارے میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ''نفس'' (بروزن ففس) اس ہوا کو کہتے ہیں جو منہ کے ذریعہ انسان کے بدن میں داخل یا اس سے خارج ہوتی ہے یعنی سانس''۔ یہ لفظ ''نفس'' خون پر بھی بولا جاتا ہے کیونکہ اگر خون وفرامقدار میں انسان کے جس سے بہہ جائے تو روح اس سے جدا ہو جاتی ہے اور بسا اوقات یہ لفظ تمام انسانی وجود پر بھی بولا جاتا ہے۔ بہرحال نفس کا ایک مشہور معروف معنیٰ وہی ''روح'' ہے قرآن مجید میں جس کے کچھ مراتب ذکر کئے گئے ہیں۔

۱۔ ''نفسِ امارہ'' جو انسان کو برائیوں کے ارتکاب کا حکم دیتا ہے۔ ''اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ'' (سورہ یوسف/ ۵۳)

۲۔ ''نفس لوامہ'' اگر کبھی انسان گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اس سے وہ پشیمان ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت اور سرزنش کرتا ہے۔ ''وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ'' (قیامت/ ۲)

۳۔ ''نفس مطمئنہ'' وہ نفس ہوتا ہے جو سکون واطمینان کے مراحل تک پہنچ چکا ہوتا ہے اور مکمل طور پر خدا کا مطیع اور اس کی عنایات اس کے شاملِ حال ہوتی ہیں۔ ''يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً'' (فجر/ ۲۷۔۲۸)

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

عالمِ تخلیق کا عجوبہ۔۔۔۔۔۔۔روح

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں انسان کی روح اور اس کے خالق کی قسم اٹھائی گئی ہے وہی خدا جس نے روح کو پیدا کیا، انسان کی روح کی تمام قوتوں کو یکجا اور منظم کیا، ظاہری حواس سے لے کر جو کہ روح کے ادراکات کا مقدمہ ہیں ،غور فکر، حافظہ ،تخیل ،ادراک ،ایجاد، ارادہ اور عزمِ صمیم کی قوت تک سب کو شامل ہے (وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا)

ان تمام قوتوں کو منظم کرنے کے بعد انسان کو ہدایت کے طریقے تعلیم فرمائے اور فجور و تقویٰ کی راہیں دکھلائیں۔ (فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا)

باوجود یکہ انسان کی روحانی قوتیں بہت زیادہ اور مختلف قسم کی ہیں ،لیکن ان تمام میں سے قرآن مجید نے یہاں پر ''الہام، فجور، اور تقویٰ'' (حسن و قبح کے ادراک) کی نشاندہی کی ہے کیونکہ یہ مسئلہ انسان کی تقدیر اور خوش قسمتی اور بدبختی میں بڑی حد تک مؤثر ہے۔ ہم بار بار بتا چکے ہیں کہ ہمیشہ کسی چیز کی قسم اس کی اہمیت اور عظمت پر دلالت کرتی ہے یعنی قسم کے موضوع اور مقسم لہٗ (جس کیلئے قسم کھائی جارہی ہے) کی اہمیت کو بیان کرتی ہے۔

خصوصاً قرآن مجید کی قسمیں انسان کو آیاتِ الٰہی کی ''عظمت'' کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کرنے کیلئے آمادہ کرتی ہیں۔

علاوہ ازیں اس آیت میں لفظ ''نفس'' کو نکرہ کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے جو کہ اس جیسے مقامات پر موضوع کی اہمیت یا اس کی کثرت اور تاکید پر دلالت کرتا ہے۔[1]

دوسری آیت میں ایک سوال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کچھ مشرکین یا اہل کتاب کی طرف سے کیا گیا ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کئی ایک سوالات کئے، جن میں سے ایک روح کے بارے میں بھی تھا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے ''آپؐ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ (وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ)

پھر قرآن پاک میں پیغمبر اکرمؐ سے فرمایا: ''انہیں کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے فرمان میں سے ہے'' (قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ)

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۲ اور تفسیر روح المعانی جلد ۳۰ ص ۱۴۲۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں ''نفس'' کے لفظ کے ذریعہ روح اور جسم دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ہر چند کہ ''فالهمها فجورها وتقوٰها'' کا جملہ روح کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح قد افلح من زکھا

یہ سربستہ جواب خدا کی اس عظیم مخلوق کے اسرار آمیز ہونے کی طرف ایک معنی خیز اشارہ ہے۔ نیز تا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ روح کے تمام اسرار کو کیوں نہیں بیان کیا گیا، آیت کے آخر میں کہا گیا کہ ''تمہیں تھوڑے سے علم و دانش کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا گیا'' (وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا)

اور اس ''قلیل علم'' اور ''تھوڑی سی معلومات'' کی بنا پر اگر تم روح کے اسرار سے واقف نہ ہوسکو تو تعجب نہیں کرنا چاہیے (خاص طور پر اس دور اور اس ماحول میں)

بعض روایات میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ قریش نے اپنے بعض سرداروں کو مدینہ کے علماء یہود کی طرف روانہ کیا اور کہا کہ ''ان سے محمدؐ کے بارے میں سوال کریں، کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں اور انہیں اس بارے میں وہ معلومات حاصل ہیں جو ہمیں حاصل نہیں''

چنانچہ وہ مدینہ پہنچے اور ان علماء سے اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے تین سوال پوچھنا! ایک ذوالقرنین کے بارے میں، دوسرے اصحاب کہف کا واقعہ اور تیسرے روح کے متعلق۔ اگر تو انہوں نے تینوں کے جوابات دے دیئے یا کسی کا بھی جواب نہ دیا تو پیغمبر نہیں ہیں، لیکن اگر کچھ کا جواب دے دیا اور کچھ کا نہ دیا تو پیغمبر ہیں۔''

جب وہ مدینہ سے واپس آئے اور مذکورہ سوالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھے تو آنجنابؐ نے ذوالقرنین اور اصحاب کہف کے واقعات کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا لیکن روح کے متعلق صرف اسی سربستہ جواب پر اکتفاء کی کہ وہ خدا کا فرمان ہے۔[1]

اگرچہ اس آیت میں روح کے معنی کے بارے میں معصومین علیہم السلام کی روایات میں بھی اور مفسرین قرآن کی گفتگو میں بھی مختلف تفاسیر ذکر ہوئی ہیں، ان میں سے زیادہ تر تفسیریں ایسی ہیں جن میں باہمی مفافات نہیں اور انہیں آپس میں جمع کیا جاسکتا ہے۔ روحِ انسانی کا تعلق اس مفہوم سے ہے جو آیت بالا کے مدلول میں داخل ہے۔[2]

تیسری آیت میں خداوندِ عالم کی فرشتوں سے گفتگو کا تذکرہ ہے، جو آفرینش بشر کے بارے میں ہوئی ہے۔ خداوندِ عالم نے اس وقت ان سے خطاب کر کے فرمایا ''میں ایک انسان کو خشک کی ہوئی سیاہ رنگ کی بدبودار مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کرلوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا''۔

اس آیت میں دو نکتے قابل توجہ ہیں، ایک تو انسان کے روح کی اضافت خداوندِ عالم کی طرف کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ''اپنی روح سے'' جو کہ انسانی روح کی عظمت اور اہمیت کی انتہاء کی دلیل ہے، جسے اصطلاح میں ''اضافتِ تشریفیہ'' کہتے ہیں جیسے ''بیت اللہ'' یعنی

---

[1] تفسیر المیزان، اس بارے میں اقوال نقل کئے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی کہ اس روح سے مراد وہ روح ہے جو ''یوم یقوم الروح والملئکة صفا'' والی آیت میں مذکور ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد جبرائیل، بعض نے کہا ہے کہ قرآن مجید ہے اور آخری تفسیر یہ ہے کہ یہ روح انسانی ہے اور تبادر بھی اس روح کا ہوتا ہے۔

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۱۵ ص ۲۴۱

خدا کا گھر، ''شہراللہ'' یعنی خدا کا مہینہ، جوخانہ کعبہ اور ماہ رمضان المبارک کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے، وگرنہ ساری جگہیں خدا کا گھر ہیں اور سارے مہینے اسی کے مہینے ہیں۔

دوسرا نکتہ آدمؑ میں روح پھونکنے کے بعد اس کے سامنے تمام فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہے جو مقامِ انسانی کی عظمت کی ایک اور دلیل ہے کیونکہ سجدہ یعنی خضوع اور وہ بھی تمام فرشتوں کی طرف آدمؑ کے مقامِ والا کی بہترین علامت شمار ہوتا ہے۔

چوتھی آیت میں نطفہ کی تخلیق اور جنین کے دقت مراحل طے کرنے اور مختلف مراحل میں اس بے مقدار ذرہ کے نازک اندام پر گوناگوں لباس پہنانے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد انداز سخن کو تبدیل کر کے فرمایا ہے'' پھر ہم نے انسان کو ایک نئی تخلیق عطا کی (ثُمَّ اَنْشَاْنَاهُ خَلْقًا اٰخَرَ)

اس مرحلہ پر دوسرے مراحل کے برخلاف ''انشاء'' (ایجاد) کی تعبیر جو بمعنی تخلیق کے ہے اور اس کے ساتھ ہی ''ثم'' کا لفظ جو عام طور پر فاصلے کیلئے استعمال ہوتا ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ آفرینش انسانی اس مرحلہ پر سابقہ مراحل سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد روح کی وہی تخلیق ہے جو جسم کے ارتقاء کے بعد اس سے متعلق ہوتی ہے

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''خَلْقًا اٰخَرَ'' (دوسری تخلیق) کی تعبیر ایک اسرار آمیز اور سربستہ تعبیر ہے جو سابقہ تعبیرات سے بالکل مختلف ہے۔ جن میں ''نطفہ''، ''علقہ''، ''مضغہ''، ''عظام'' اور ''لحم'' کا ذکر ہے اور یہ سارے کے سارے جانے پہچانے مفہوم ہیں۔ یہ بھی اس آخری مرحلے کی دوسری مراحل سے اختلاف کی ایک اور دلیل ہے۔

قابل تعجب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے اس ''نئی تخلیق'' کیلئے کئی تفسیریں ذکر کی ہیں۔ جو آیت کی روح سے کسی طرح سازگار نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔ ''اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ'' سے مراد انسان کے بدن میں دانتوں اور بالوں کا اُگنا ہے۔[1] حالانکہ آیت کی تعبیروں سے اس کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ دانتوں اور بالوں کا اگنا اہمیت کے لحاظ سے کسی بھی طرح جنین کے مختلف مراحل طے کرنے کے زمرے میں نہیں آتا۔

آیت کے آخر میں ایک اور عجیب جملہ آیا ہے جو اس مرحلہ پر یا ان تمام مراحل میں انسانی تخلیق کی حد سے زیادہ اہمیت کی ایک اور علامت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ'' صد آفرین اس علم اور حکمت پر جس نے ان تمام استعدادوں اور شائستگیوں کو اس طرح کی ناچیز مخلوق میں پیدا کر دیا ہے۔ آفرین ہے اس پر اور اس کی بے نظیر تخلیق پر۔

''تبارک''، ''برک'' کے مادہ سے ہے (جو کہ برگ کے وزن پر ہے) کا منعی ہے اونٹ کا سینہ۔ چونکہ جب اونٹ اپنا سینہ زمین پر رکھتا ہے تو اس میں ایک قسم کا ثبات و قرار پیدا ہو جاتا ہے، اسی لئے یہ لفظ ''ثبات اور دوام'' کے معنی میں آیا ہے ہے چونکہ جو بھی دائمی نعمت ہوتی ہے، اس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے اس قسم کی نعمتوں کو بابرکت کہتے ہیں۔ خدا کے بارے میں اس لفظ کا استعمال اس کی ذاتِ

---

[1] یہ احتمال تفسیر روح المعانی جلد ۱۸ ص ۱۴ اور تفسیر قرطبی جلد ۷ ص ۵۰۲۴ میں بعض مفسرین سے نقل کیا گیا ہے

پاک کی عظمت،ثبات اور جاودانی کی طرف اشارہ ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں بقاءروح کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے''خداوندِ عالم موت کے وقت ارواح کو لے لیتا ہے اور قبض کرتا ہے۔(اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا)

اس بات کی طرف توجہ کرنے سے''توفی'' کا معنی''قبض کرنا''اور''مکمل طور پر کسی چیز کو حاصل کر لینا'' ہے اور''انفس'' کا معنی''ارواح'' یعنی روحین ہے۔یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ موت کی حالت میں روح خدا کے حکم سے مکمل طور پر بدن سے جدا ہوجاتی ہے لیکن نیند کی حالت میں یہ جدائی ناقص طور پر ہوتی ہے۔''وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا)

پھر نیند کی حالت میں بعض روحوں کے واپس نہ لوٹنے اور بعض روحوں کے ایک مقررہ مدت تک واپس آجانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔''ان میں خداوندِ عالم کی عظمت اور قدرت کی اُن لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔''اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ''۔[1]

اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسان روح اور جسم کی ترکیب کا نام ہے۔روح ایک غیر مادی جوہر ہے اور نیند موت کا ضعیف سا مرحلہ ہے جس سے روح اور جسم کا رابطہ کمزور پڑ جاتا ہے۔یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ موت کے معنی فنا اور نیستی اور نابودی نہیں ہیں بلکہ یہ بقا اور زندگی کے دوام کی ایک قسم ہے۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی روح اپنی تمام طاقتوں اور قوتوں کے ساتھ جو کہ کائنات کی ایک عجیب ترین مخلوق ہے،خداوندِ عالم کی عظیم ترین نشانیوں میں سے ہے۔یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اس قدر علم وقدرت،فہم وفراست،غور وفکر،ذوق وجدت اور مقصد وارادے کی خالق ایک بے شعور فطرت ہو جو ہر قسم کے علم اور غور وفکر اور جدت وقصد اور ارادے سے عاری ہو۔بلکہ اس کے برعکس اس قسم کے قطرات اور چھوٹی ندیاں اس عظیم اوقیانوس کی نشانی ہیں جس سے ان کے سوتے پھوٹتے ہیں اور یہ کم رنگ شعاعیں اس عظیم آفتاب کا ایک پرتو ہیں۔

---

[1] فخر رازی اپنی تفسیر میں اسی آیت کے ذیل میں کہتے ہیں''خداوند عالم حکیم نے انسان کی روح کے اس کے جسم کے ساتھ پیوند کو تین طرح سے منظم کیا ہے کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ روح کا پرتو بدن کے تمام ظاہری اور باطنی اجزاء پر پڑا تا ہے اور یہ بیداری کی حالت ہوتی ہے۔کبھی ظاہر میں تو روح کو لے لیا جاتا ہے،لیکن وہ باطن میں باقی ہے،یہ نیند کی حالت ہوتی ہے اور کبھی ظاہری اور باطنی دونوں صورتوں میں اس پرتو کو لے لیا جاتا ہے،یہ موت کی حالت ہوتی ہے۔

چند توضیحات

۱۔روح کی ظاہری اور باطنی قوتیں

قدمار نے انسان کی روح کیلئے پانچ ظاہری اور پانچ باطنی قوتیں شمار کی ہیں۔ظاہر قوتیں حِس باصرہ (دیکھنے کی حِس)، حِس سامعہ (سننے کی حس) حس شامہ (سونگھنے کی حس) حس ذائقہ (چکھنے کی حس) اور حس لامسہ (چھونے کی حس) جو کہ عالم محسوسات میں انسانی روح کے دریچے اور اس مجرد جوہر اور عالم مادہ کے درمیان ایک رابطہ ہیں۔

پھر ان میں سے ایک قوت بذات خود ایک وسیع اور اسرار آمیز کائنات ہے، ان کے آلات وہتھیار جو آنکھ، کان، زبان، ناک، اور پورے بدن کے پوست میں پھیلے ہوئے اعصاب ان میں سے ہر ایک خداوندِ عالم کی آیات میں سے ایک آیت ہے اور اپنے اندر علم وحکمت کی ایک دنیا لئے ہوئے ہیں۔باطنی قوتوں کو بھی قدیم فلاسفہ نے پانچ بتلایا ہے۔

(۱) حِس مشترک (۲) خیالی، جو کہ حس مشترک کا حافظہ سمجھا جاتا ہے۔(۳) قوتِ واہمہ، جو دوستی اور دشمنی جیسے مفہوموں کا ادراک کرتا ہے۔(۴) قوتِ حافظہ، جو کہ واہمہ ادراکات کو اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے۔

(۵) قوتِ متخیلہ، جو کہ جمع شدہ خیال اور حافظہ کی جزئی صورتوں اور مفہوموں کو تصرف میں لاتی ہے، اور جو دل خواہ صورتیں خارج نہیں ہوتیں، ان کو وجود میں لاتی ہیں۔

ان پانچوں قوتوں میں سے ہر ایک اپنے طور پر اسرار کا ایک عالم ہے۔

لیکن دور حاضر کے دانشور اور فلاسفہ نہ تو ظاہری قوتوں کو پانچ قوتوں میں محدود سمجھتے ہیں اور نہ ہی باطنی قوتوں کو پانچ میں محدود کرتے ہیں، بلکہ وہ نفس انسانی کیلئے بہت سی قوتوں کے قائل ہیں اور انسانی روح کو ایک ایسا عجیب خزانہ سمجھتے ہیں جس میں بہت سی گوناگوں طاقتیں، بیشمار ذوق اور استعداد وادراکات پائے جاتے ہیں کہ جن میں انسانی افراد مختلف ہوتے ہیں۔

دور حاضر کی سائیکالوجی اور نفسیات شناسی نے انسانی روح کے مرموز اور تاریک گوشوں تک بھی رسائی حاصل کر لی ہے، ایک تازہ اور اسرار آمیز دنیا تک جا پہنچے ہیں اور ''مخفی ضمیر'' یا ''ناخود آگاہ وجدان'' کو دریافت کرلیا ہے اور اس مرموز چیز کی بہت سی تعجب آور چیزیں انسانوں کو دکھائی ہیں۔

۲۔کائنات کی اسرار بھری مخلوق۔۔۔روح

باوجودیکہ قرآنِ مجید جب آیت الٰہی کا ذکر کرتا ہے،، خواہ وہ آیات آفاقی ہوں یا انفسی، ان کا تعلق آسمان سے ہو یا زمین سے، نباتات سے ہو یا حیوانات سے تو ان کی بہت سی تفصیلات اور جزئیات کو بیان کرتا اور ان کی تشریح کرتا ہے لیکن جب روح کے مسئلہ کی بات ہوتی

ہےتوصرف یہ کہہ دیتا ہے۔ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ (کہہ دیجئے روح میرے رب کے امر سے ہے۔اوراس کے اسرارکوسمجھنے کیلئے تمہارا علم بالکل ناچیز ہے۔(وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا)

یا کہتا ہے کہ''اس کی قسم جس نے انسان کی جان کونظام عطا فرمایا''(وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا) یا پھر''ایک اورمخلوق کے انشاء'' سے تعبیر کرتا ہےاورکہتا ہے''ہم نے نطفہ کےارتقاء کے بعد ''انسان کونئی تخلیق عطا کی ہے۔(ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ)

یا پھرروح کواپنی طرف نسبت دے کرکہتا ہے''وَنَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ''(جب اس میں اپنی روح پھونک دوں) یہ سب کی سب تعبیرات اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ روح کی تخلیق دوسری چیزوں کی تخلیقات سے ہٹ کر ہےاورصرف اورصرف مسئلہ روح کی پیچیدگی اوراس کے حدسے بڑھ کراسرارآمیز ہونے کی بدولت ہے۔

۳۔روح کی مختلف سرگرمیاں

ہمارے اندر بہت سی فکری اورروحی سرگرمیاں پائی جاتی ہیں،خواہ وہ خودآگاہی کی صورت میں ہوں یا ناخودآگاہی کی صورت میں جن میں سے ہرایک جداگانہ موضوع کی صورت میں قابل بحث ہیں۔(اورغالباً کتابوں میں ایسا ہے بھی)ان سرگرمیوں میں سے چندایک کی مختصرتشریح کچھ یوں ہے:

(الف)غوروفکر!مجہولات تک رسائی کیلئے غوروفکر سے کام لینا، یافلاسفہ کے الفاظ میں فکرکی مبادی کی طرف حرکت، پھردورحرکت مبادی سے مقصودومراد کی طرف۔

(ب)ابتکار،زندگی میں اچانک پیش آنے والی مشکلات کےحل کیلئے ابتکار یانت نئی ترکیبوں اورگوناگوں حوادث سے نمٹنے کیلئے حل کاسوچنا،مختلف ضروریات کوپورا کرنا،دریافتیں ایجادات اورانکشافات سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔

(ج)حافظہ،مختلف قسم کی معلومات جوحس یاغوروفکر کے ذریعہ انسان کوحاصل ہوتی ہیں، ان کومحفوظ رکھنا،ان کودرجوں میں بانٹنا،ریکارڈ میں رکھنااوربوقت ضرورت انہیں خاطر میں لانا۔

(د)مسائل کاتجزیہ وتحلیل،ذہنوں مفہوموں کوایک دوسرے سے جداکرکے حوادث کی وجودہ واسباب تلاش کرنے کیلئے مسائل کاتجزیہ وتحلیل،پھراُن کی آپس میں ترکیب اورحوادث کےاسباب ونتائج تک رسائی۔

(ھ)تخیل،یعنی ذہنی صورتوں کی ایجادجوکبھی خارج میں موجودنہیں ہوتیں،جن کا کام جدید مسائل کوسمجھنے کیلئے مقدمہ کی صورت میں ہوتا ہے۔

(و)عزم وارادہ:کسی کام کےانجام دینے یااسے توقف کرنے یا پھراسے دگرگوں کرنے کیلئے پختہ ارادہ کرنا۔

(ز)فطری اورعقلی ادراکات:نظری اورغیر بدیہی استدلالات کی بنیادفطری اورعقلی ادراکات پراستوار ہوتی ہے۔

(ح)کسی سے محبت کرنا،دوستی بنانااوردشمنوں سے دشمنی کرنااوراس قسم کی بیسیوں دوسرے روح سے تعلق رکھنے والے کام ہیں جن

کے انسانی اعمال پر مثبت یا منفی اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

البتہ یہ ایسے مسائل ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ یہ سب کے سب انسان کی روح کے اندر تمرکز کئے ہوئے ہیں، اس ناپیدا کنار سمندر کی موجیں ہیں اور اس نیر تاباں کی شعاعیں ہیں۔ انہیں کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ روح خدا کی سب سے بڑی آیت اور اس کی اہم ترین نشانی ہے۔

یہ جو قرآن مجید کی سورہ ذاریات کی ۲۱ ویں آیت میں خدا فرماتا ہے کہ ''تمہارے وجود (یا تمہاری روح کے اندر) خداوندِ عالم کی آیت اور نشانیاں ہیں، تو کیا تم انہیں نہیں دیکھتے، اسی حقیقت اور واقعیت کی طرف اشارہ ہے۔

زیادہ دور نہ جائیں۔ اسی انسانی حافظہ ہی کو لے لیں جو اس کی مختلف معلومات کا ریکارڈ روم ہے، اس قدر عجیب اور تعجب آور کہ اگر ہم سینکڑوں افراد کو اپنے معلومات کی حفاظت اور ان کا ریکارڈ رکھنے کیلئے مامور کر دیں تو بھی محال ہے کہ اس تیز اور پُھرتی سے حافظے کا کام انجام دے سکیں۔

اگر ایک گھنٹے کیلئے ہم سے حافظے کی قوت چھین لی جائے تو ہمارے لئے زندہ رہنا محال ہو جائے۔ صرف ہم اپنے گھر کی راہ کو نہیں بھول جائیں گے بلکہ اپنی غذا کھانے تک کو بھی فراموش کر دیں گے کہ لقمے کو منہ سے کھایا جائے یا کسی اور جگہ سے! تمام چیزیں ہمارے لئے غیر معروف، غیر مانوس، غیر معلوم اور حیرت ناک ہو جائیں گی۔

وہ جوان جو ڈرائیونگ کے حادثے میں مغز پر چوٹ لگنے کی وجہ سے اپنے حافظے کا صرف ایک حصہ کھو چکا تھا، جب اسے اپنے گھر لے جایا گیا تو وہ اسے نہ پہچان سکا اور کہنے لگا: پہلی بار میں اس گھر میں قدم رکھ رہا ہوں۔ حتیٰ کہ اپنی والدہ کو اجنبی عورت سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ پینٹنگ بورڈوں کو نہیں پہچان رہا تھا، بلکہ کہہ رہا تھا انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

ہزارہا موجودات، ہزارہا انسان، ہزارہا مختلف مواد، ہزارہا یادداشتیں اور ہزارہا مختلف معلومات ایسی ہیں جنہیں ہم نے ریکارڈ کے طور پر اپنے حافظے میں جگہ دی ہوئی ہے اور پھر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ کسی چیز کی یادآوری کیلئے ایک سیکنڈ کے ایک ہزارویں حصے سے زیادہ عرصہ درکار نہیں ہوتا۔ یعنی اگر کسی وقت انسان کو ایک لمحہ قبل یا ایک سال قبل یا پچاس سال قبل کی یاد کو خاطر میں لانا ہو تو حافظہ اسے درجہ بندی شدہ معلومات میں سے باہر لانے کیلئے ایک سیکنڈ کے ایک ہزارویں حصے سے بھی کم ووقت میں باہر لا کر اپنی توجہ میں لے آتا ہے۔ خصوصاً دانشوروں نے حافظہ کے حیرت ناک کاموں میں سے ایک ایسے کی طرف اشارہ کیا ہے جسے وہ ''حافظہ کا معجزہ'' کا نام دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی شخص یا کسی موضوع کو فراموش کر دیتا ہے، پھر اسے تلاش کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے اور حافظہ کے ریکارڈ روم میں ''فائلوں'' کو کھنگال ڈالتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان اس نام یا موضوع کو جانتا ہے تو پھر اس کی تلاش کسی؟ اور اگر نہیں جانتا تو پھر انجانی چیزوں کی تلاش کس لئے؟ کیا ممکن ہے کہ انسان ایسی گمشدہ چیز کی تلاش میں دوڑتا پھرے جسے وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے، یا کون ہے؟

لیکن اس کے باوجود یہ بات انسانی حافظہ کے بارے میں صادق آتی ہے کہ نسیان اور بھول جانے کے موقع پر ایسی چیزوں کی تلاش میں نکلے جنہیں وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہیں اور وہ اچانک ایسی ''الماریوں کی طرف جاتا ہے جن کی ''فائلوں'' میں اپنی گمشدہ چیزوں کو پالیتا ہے۔[1]

یہاں پر ایک لطیف نکتہ موجود ہے جس میں مسئلے کا حیرت ناک حل پنہاں ہے اور وہ یہ کہ ایسے مواقع پر انسان خود اس نام یا اس موضوع کی تلاش میں نہیں جاتا کہ جسے وہ نہیں جانتا، بلکہ اسے حاصل کرنے کیلئے کچھ ایسے حوادث کی جستجو کرتا ہے جو مطلوبہ نام کے ساتھ اس کے ذہن میں جمع اور ریکارڈ میں آچکے ہیں (کیونکہ حوادث ہمیشہ مجموعی اور اجتماعی صورت میں ریکارڈ میں آتے ہیں) مثلاً وہ جانتا ہے کہ فلاں شخص سے جسکا نام وہ فراموش کر چکا ہے فلاں دن اور فلاں موقع پر سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اس طرح وہ فوراً اس دن اور اس موقع کی فائل کو حافظہ کے ریکارڈ سے طلب کرلے گا اور بجلی کی رفتار سے اس کی ورق گردانی کرے گا۔ یہاں تک کہ اس کے اندر سے اس مطلوبہ شخص کے نام کو ڈھونڈ نکالے گا۔

اس گفتگو کو ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس کلام پر ختم کرتے ہیں۔ جو توحید مفضل میں بیان ہوا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اے مفضل! ان قوتوں اور طاقتوں کے بارے میں غور وفکر کرو جو انسان کے نفس اور روح میں ہیں، یعنی قوتِ تفکر، قوتِ وہم، قوتِ عقل اور قوتِ حافظہ وغیرہ میں اگر ان تمام طاقتوں کے درمیان سے صرف حافظہ ہی ختم ہوجائے تو انسان کی کیا حالت ہوجائے اور معاش اور تجارت میں کیا کیا خلل پڑ جائیں۔ اگر انسان ایسی باتوں کو یاد نہ رکھ سکے جو اس کے نفع یا نقصان میں ہیں، یا جو کچھ اس نے لیا ہے یاد دیا ہے یاد دیکھا ہے یا سنا ہے، یا کسی کے بارے میں کچھ کہا ہے یا جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے، غرض ان سب کو فراموش کردے تو کیا ہوجائے؟

فراموشی کی صورت میں اگر ہزار ہا مرتبہ کسی راستے پر چلے، پھر بھی اُسے تلاش نہ کرسکے۔ اگر ساری زندگی درس پڑھتا رہے تب بھی ایک حرف کو یاد نہ کرسکے اور نہ ہی کسی دین اور مذہب پر عقیدہ رکھ سکے نہ ہی کسی قسم کے تجربہ سے فائدہ اٹھا سکے نہ ہی کسی حادثے سے عبرت حاصل کرسکے، بلکہ بہتر یہی ہے کہ ''انسانیت'' کا نام مکمل طور پر اس سے اٹھالیا جائے''۔ پھر امام علیہ السلام نے فرمایا:

''حافظہ کی نعمت سے بالاتر فراموشی کی نعمت ہے (مقررہ مواقع کیلئے فراموشی اگر نسیان اور فراموشی نہ ہوتے تو انسان کی زندگی میں جو بھی مصیبت درپیش آتی اسے ہمیشہ کیلئے داغدار کردیتی۔ اس کے حسرت اور غم واندوہ کہیں ختم ہونے میں نہ آتے وہ ہمیشہ انہی آفات ومشکلات کی یاد میں کھویا رہتا اور دنیا کی کوئی نعمت اسے گوارا نہ ہوتی۔''[2]

---

[1] ''حافظہ'' نامی کتاب کے سیریل 'چہ می دانم'' سے اقتباس

[2] بحارالانوار جلد ۳ ص ۸۰ و ۸۱ (مختصر تلخیص کے ساتھ)

۴۔انسانی مغز کا الیکٹرانک مغز (کمپیوٹر) سے تقابل

بعض اوقات کچھ نادان لوگ انسانی روح وفکر اور اس کے مغز کی ساخت کا الیکٹرانک مغز یعنی کمپیوٹر کی ساخت سے تقابل کرتے ہیں، حالانکہ ان دونوں کا باہمی تفاوت ایسا ہے جیسے ایک حقیقی غول پیکر ہوائی جہاز اور بچوں کے کھلونے ہوائی جہاز میں ہوتا ہے۔

الیکٹرانک مغز کی فعالیت صرف اس حافظہ کے دائرہ کار ہی میں محدود ہے اور اس کا حافظہ وہی ہوتا ہے جسے انسان غذا بہم پہنچاتا ہے۔ اسی لئے وہ اس محدود حافظے سے ہٹ کر اور کسی قسم کی فعالیت کو انجام نہیں دے سکتا۔ جب کہ انسان کے مغز وفکر کی کارکردگی غیر محدود ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ الیکٹرانک مغز کسی جدید حادثے کے موقعہ پر خود سوچنے اور کوئی راہ نکالنے پر قادر نہیں ہوتا خواہ وہ حادثہ کتنا معمولی اور سادہ ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً کسی وقت جھگڑ چلنے کے موقعہ پر کیا درعمل کیا جائے، تو اس بارے میں وہ کچھ بتانے سے عاجز ہے، چہ جائیکہ وہ کسی چیز کی ایجاد عمل میں لائے یا کوئی نئی رائیں نکالے، اور پیچیدہ واہم مسائل کے بارے میں کوئی راہنمائی کرے

اگر فرض کر بھی لیا جائے کہ دونوں کا تقابل کیا جاسکتا ہے تو کون سی عقل یاور کرسکتی ہے کہ ایک جدید ترین اور ترقی یافتہ الیکٹرانک مغز جو بشری مصنوعات کا ایک عجوبہ ہے۔ ایک اَن پڑھ، بے عقل یا اندھے اور بہرے شخص کی خلاقیت کا شاہکار ہے؟

کیا بے جان طبیعت (نیچر ۹) جو عقل وفکر اور ابتکارِ عمل سے عاری ہے وہ روح، عقل اور ابتکار عمل کو وجود میں لاسکتی ہے؟ اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ انسان کی روح میں پروردگار کی ہزارہا آیات اور نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

۵۔روح کی اصالت اور استقلال

اگرچہ خداوندِ عالم کی آیات اور نشانیوں سے متعلق مباحث میں یہ بات ہمارے لئے کسی فرق کی حامل نہیں ہے کہ انسان کی روح وفکر ایک مستقل گوہر اور مادہ سے جُدا جوہر ہے یا مادہ سے وابستہ ہے اور اس کے آثار میں سے ہے (جیسا کہ فلاسفہِ الٰہی اور مادہ پرستوں کا مشہور دعویٰ ہے) لیکن یہ بات بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اگر روح کا استقلال اور اس کا اصل ہونا ثابت ہوجائے تو خدا کی اس آیت کی چمک دمک اور درخشندگی میں اضافہ ہوجائے گا اور وہ سونے پر سہاگے کا کام دے گی۔

بہرحال مادہ پرستوں کا اس بات پر اصرار ہے کہ انسان کی روح وفکر اس کے بدن کے مغزی خلیوں کے ''فزیکل کیمیکل'' (فزیکوکیمیکل) خواص میں سے ہے اور جسم وبدن کے خاتمے کے ساتھ وہ بھی بالکل نیست ونابود ہوجاتے ہیں جب کہ انسانی روح وفکر کے وہ آثار ہوتے ہیں جو مادہ پرستوں کی تفسیروں کے ساتھ بالکل قابل توجہ نہیں ہے۔

مثلاً ہر شخص اپنے اندر ایک واقعیت اور حقیقت رکھتا ہے جسے ''من'' یعنی میں کہتے ہیں جو آغاز عمر سے آخر عمر تک ایک اکائی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ''من'' یعنی میں بچپن سے لے کر اب تک ایک فرد سے زیادہ نہیں تھا۔ میں وہی شخص تھا اور آخر عمر تک وہی رہوں گا، البتہ میں نے درس پڑھے ہیں، تعلیم حاصل کی ہے اور اسی نسبت سے میں نے ارتقاء کی منزلیں طے کی ہیں لیکن وہی پہلا شخص ہی ہوں، کوئی دوسرا شخص نہیں بنا۔

حالانکہ اگر بدن کے مادی اجزا کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ بدن کے تمام ذرات تبدیل اور دگرگوں ہوتے رہتے ہیں۔اور تقریباً ہر سات سال کے بعد بدن کے تمام خلیئے تبدیل ہوجاتے ہیں۔یعنی ستر سال کے کسی انسان کے مادی اجزاء دس مرتبہ تبدیل ہوجاتے ہیں۔لیکن اس کے باجود اس کا ''من'' (یا انسانی شخصیت) حسبِ دستور ثابت اور برقرار ہے جس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ''من'' کی واقعیت حقیقی ہے جو مادہ سے ہٹ کر ہے اور مادہ کی تبدیلیوں سے وہ تبدیل نہیں ہوتا۔

اس کے علاہ ہم اپنے ذہن میں کچھ ایسے حقائق کا تصور کرتے ہیں جو ہمارے مغزی خلیوں سے کئی ہزار گنا بڑے ہوتے ہیں مثلاً آسمانی ،کہکشاؤں،سورج اور چاندستاروں وغیرہ کا تصور،ان مادی تصویروں کا ہمارے ذہن کے مادی حصے میں آنا محال ہے اور اس کے علاوہ کوئی راہِ چارہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے غیر مادی حصے روح یعنی میں منعکس ہوں کیونکہ مادی حصہ یعنی مغز تو ایک چھوٹی اور معمولی سی چیز کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

ان سب باتوں سے ہٹ کر تمام مادی اشیا قابل تقسیم وتجزیہ ہیں۔جب کہ ہمارے ذہنی مفاہیم میں کئی ایسے مفہوم بھی ہیں جو ہرگز تجزیہ اور تقسیم کو قبول نہیں کرتے۔

''واقعہ نمائی'' کی خاصیت اور اپنے وجود سے باہر کی کائنات جو کہ ہمارے علم ودانش میں موجودہ ایسی حقیقتیں ہیں جو مغز کے ''فزیکو کیمیکل'' خواص کے طریقوں سے کسی بھی طرح قابل توجیہہ نہیں ہیں۔یہ چار اور کئی دوسرے روشن دلائل اس بات کی بخوبی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہماری روح ایک مستقل گوہر ہے جو مادہ سے بالکل جدا ہے۔[1]

۶۔قرآنِ مجید میں روح کی خصوصیات

قرآن مجید کی آیات سے انسانی روح کی مندرجہ ذیل خصوصیات اور امتیازات کا پتہ چلتا ہے۔

(الف) انسانی روح ایک مستقل چیز ہے جو بدن سے جدا ہوجانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے ۔''اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ۔۔۔۔(سورہ زمر/ ۴۲)

(ب)انسانی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد ممکن ہے کہ عالم برزخ میں خداوندِ عالم کی مختلف نعمتوں سے بہرہ ور ہو یا اس کے دردناک عذاب میں معذب ہو۔سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۶۹ جو ''حیاتِ شہداء'' کی نشاندہی کرتی ہے اور سورہ مومن کی ۴۶ ویں آیت جو ''آلِ فرعون کے عذاب کے متعلق بتاتی ہے،اس دعویٰ کی بین ثبوت ہیں۔

(ج)روح کی ساخت کا جسم کی ساخت سے بہت بڑا فرق ہے۔جیسا کہ اس سلسلے سے متعلق آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں، خداوندِ عالم نے روح کو ''عالم مراد'' سے خلق فرمایا ہے اور اس کی آفرینش کو ''خلقِ آخر کی ایجاد'' سے تعبیر فرمایا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ اسراء آیت ۸۵ اور سورہ مومنون آیت ۱۴)

---

[1] مزید تفصیل کے لئے تفسیر نمونہ کی بارہویں جلد میں سورہ بنی اسرائیل ۸۵ ویں آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

(د) روح اوراس کی کیفیت کے بارے میں انسانی معلومات نہایت ہی قلیل اور ناچیز ہیں اور سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) کی ۸۵ ویں آیت ''وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلاً'' اس بات کی شاہد ہے۔

(ھ) نیند کی حالت میں روح کا جسم کے ساتھ رابطہ کمزور ہوجاتا ہے جب کہ موت کے وقت مکمل طور پر منقطع۔ (زمر/ ۴۲)

(و) مجموعی طور پر روح اوراس کے اثرات خدا کی عظمت کی اہم ترین آیات اوراس کی معرفت کا نہایت ہی اہم ذریعہ ہیں (ملاحظہ ہوسورۂ زمر کی ۴۲ ویں آیت ''اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ''

۷۔ روح کے بارے میں آخری بات

روح کی بحث اس قدر وسیع اور مفصل ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو اس مختصر سی گفتگو میں بالتفصیل بیان نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر عنان قلم کو رہا کردیں تو تفسیری بحث سے خارج ہوجائیں گے۔ اسی لئے مزید تفصیل کیلئے آپ فلسفہ کلام اور روایات پر مبنی کتابوں کا مطالعہ فرمائیں تفسیر نمونہ میں بھی اس بارے میں کافی حد تک بحث کی گئی ہے۔ تفسیر المیزان جلد ۱ ''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ'' (سورہ بقرہ / ۱۵۴) کی تفسیر میں بھی مبسوط اور مفصل بحث کی گئی ہے۔

حضرت علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس چیز کے ثبوت کیلئے سترہ عقلی اور نقلی دلائی پیش کئے ہیں کہ انسان کی حقیقت فقط جسم کا نام نہیں ہے۔[1]

اسی کتاب میں حقیقتِ روح کے بارے میں محقق کاشانی سے ۱۴ اقوال ذکر کئے گئے ہیں[2] ہم اس بحث کو حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

''اَلرُّوْحُ فِي الْجَسَدِ كَالْمَعْنٰى فِي اللَّفْظِ'' روح انسان کے بدن میں ایسے ہے جیسے لفظ میں معنی ہوتے ہیں[3]

صفدی نامی ایک دانشور کہتے ہیں۔

''میں نے روح کے بارے میں اس مثال سے بڑھ کر خوبصورت اور بالمعنی مثال دیکھی ہے نہ سنی''۔

پس روح ایسے ہے جیسے معنی اور جسم ایسے ہے جیسے لفظ!

---

[1] بحارالانوار جلد ۵۸ ص ۶ تا ۱۰

[2] ایضاً ص ۵۷

[3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۷۵۳ مادہ روح

۵۔انسان اور حیوان کی فطری اور غریزی ہدایت میں اس کی نشانیاں

اشارہ:

نہ صرف انسان بلکہ دوسرے بہت سے حیوانات بھی کچھ فطری اور غریزی علوم ودانش لے کر شکمِ مادر سے متولد ہوتے ہیں۔ایسے علوم ودانش جن کے حصول کیلئے مسلماً کوئی معلم موجود نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی تجربہ اور آزمائش کا حاصل اور نتیجہ ہیں بلکہ اولین معلم نے آغاز ہی سے اسرار آمیز اور تعجب آور طریقہ پر انسانی اور دوسرے جانوروں کے وجود کی گہرائیوں میں انہیں ودیعت کر دیا ہے۔

ان فطری اور غریزی ہدایات اور علوم ودانش کا مطالعہ خداوندِ عظیم کی عظمت کی عظیم ترین آیات اور اس کے علم وقدرت کی واضح نشانیوں میں شمار ہوتا ہے۔اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی

(طٰہٰ/۵۰)

۲۔۔۔اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ{}وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ{}وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ

(بلد/۸تا۱۰)

۳۔۔۔فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا

(شمس/۸)

۴۔۔۔فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ

(روم/۳۰)

۵۔۔۔اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ{}عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

(علق/۴۔۵)

۶۔۔۔اَلرَّحْمٰنُ{}عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ{}خَلَقَ الْاِنْسَانَ{}عَلَّمَهُ الْبَیَانَ

(الرحمن/۱تا۴)

۷۔۔۔فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ

(غاشیہ/۲۱)

ترجمہ

۱۔۔۔(موسیٰ علیہ السلام نے) کہاہمارا پروردگارتووہ ہے جس نے ہرچیزکووہ کچھ عطاکیاجواس کالازمہ تھااورپھررہبری کی۔

۲۔۔۔کیاہم نے اس (انسان) کیلئے دوآنکھیں نہیں بنائیں؟۔۔۔۔۔اورایک زبان اوردولب؟۔۔۔۔۔اوراسے اسکے خیروشرکی ہدایت نہیں کی؟

۳۔۔۔پھر(انسان کی تخلیق کے بعد)فجوروتقویٰ(خیراورخیرکی آگاہی)اُسے الہام کی۔

۴۔۔۔اپنے چہرے کو پروردگارِعالم کے خالص دین کی طرف متوجہ کرلے۔یہ وہ فطرت ہے جس پرخداوندِعالم نے لوگوں کو پیدا کیاہے،خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے،یہی وہ محکم اوراستواردین وآئین ہے لیکن اکثرلوگ یہ نہیں جانتے۔

۵۔۔۔وہی جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم،اورانسان جوکچھ نہیں جانتاتھااسے سکھایا۔

۶۔۔۔خداوندرحمان۔۔۔۔۔۔۔قرآن کی تعلیم دی۔۔۔۔۔۔۔۔انسان کو پیدا کیا۔۔۔۔۔۔اوراُسے بات کرناسکھایا۔

۷۔۔۔پس تویاددلا،توتوصرف یاددلانے والا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

استادِ ازل!

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں حضرت موسیٰ بن عمران کی اس گفتگو کا تذکرہ ہے کہ جب وہ اوران کے بھائی ہارون فرعون کے سامنے آئے تواس نے ان سے پوچھا: ''تمہارا یہ پروردگارتم جس کی طرف دعوت دے رہے ،کون ہے ؟''جناب موسیٰؑ نے فوراًارشادفرمایا''ہمارا پروردگاروہی ہے جس نے ہر چیز کی خاص تخلیق عطافرمائی پھراسے ہدایت بھی کی''(قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی)

معلوم ہے کہ چیز کسی نہ کسی مقصد کیلئے بنائی گئی ہے اور ہر چیز خواہ نباتات ہوں یا حیوانات، پرندے ہوں یا حشرات الارض اور صحرائی اور دریائی جانور،غرض ہر ایک کسی خاص ماحول اور مقصد کیلئے بنایا گیا ہے اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر چیز اپنے ماحول کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور اسے جس چیز کی بھی ضرورت ہے وہ اُسے دے دی گئی ہے یہ ہے تخلیق کے مرحلہ آغاز میں۔

لیکن ہدایت تکوینی کے مرحلہ میں ہم اچھی طرح دیکھ رہے ہیں کہ تخلیق کے بعد کسی بھی چیز کو آوارہ نہیں چھوڑا گیا بلکہ رمزی ہدایت کے ذریعہ ہر موجد کی اس کے مقصد کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے۔ان میں سے بہت سی ایسی مخلوق بھی ہے جس کے پاس بہت سے علم اور دانش کے خزانے ہیں لیکن یہ خزانے اس کو نہ تو ذاتی تجربے کی بنا پر حاصل ہوئے ہیں اور نہ کسی معلم کی تعلیم وتدریس کے ذریعہ یہ تکوینی ہدایت اور علوم اور دانش اس ذاتِ مقدس کی نشانیاں ہیں جس نے اس عظیم کائنات کو خلق فرمایا ہے اور وہی اس کی ہدایت اور رہبری فرمارہی ہے۔

البتہ اس بات کا صرف انسان ہی کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ آیت کا انداز بتارہا ہے کہ یہ ایک کلی جامع وعمومی بحث ہے جو تمام انسانی افراد کو بھی شامل ہے اور یہ ہدایت انبیاء ومرسلین کی اس ہدایت سے ہٹ کر ہے جسے''ہدایت تشریعی'' کہتے ہیں اور صرف انسانوں کے ساتھ خاص ہے۔

ایک بچہ جب شکمِ مادر سے متولد ہوتا ہے وہ کسی مقدمہ کے بغیر ہی اپنی ماں کے پستان کو اپنے منہ میں لے لیتا ہے،اس کو شیرہ جان کو چوسنا شروع کر دیتا ہے۔اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے اور نازک ہاتھوں سے پستان کو سہلاتا ہے اور پستان کے اندر موجود دودھ کے منبع کو حرکت میں لاتا ہے۔اس نے کہاں سے یہ سبق سیکھا ہے کہ وہ زندہ رہنے کیلئے یہ رستہ اختیار کرے؟

اس نے کہاں سے سیکھ لیا کہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے جن کاموں کی بجا آوری اس کے بس میں نہیں،اس کا بہترین راہ''گریہ'' ہے،ایسا گریہ جو خواب اور بیداری میں ماں کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے اور اسے اُس کی امداد پر آمادہ کر دیتا ہے۔اسی طرح کئی اور علوم بھی ہیں جن سے معلم اور استاد کے بغیر انسان بہرہ مندی کرتا ہے۔

اس سے ملتے جلتے ایک اور معنی قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی نظر آتے ہیں۔چنانچہ سورہ اعلیٰ کی آیت ۳ میں ہم پڑھتے ہیں

''وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی'' خداوندِعالم وہ ہے جس نے موجودات کا اندازہ لگایا اور پھر ہدایت فرمائی۔

آیات کی دوسری قسم میں خدا انسان کو اپنی نعمتوں کی یاددہانی کرانے کے بعد آنکھ، زبان اور لبوں کی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''ہم نے اسے اس کی خیر وشر کی ہدایت کی ہے۔'' (وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ)

''نجد'' کے لغوی معنی بلند اور سپاٹ جگہ کے ہیں جو ''تھامہ'' کے مقابلے میں ہے، جس کے معنی پست، نچلی اور سمندر کی ہم سطح زمین وغیرہ ہیں۔ چونکہ خوش بختی کے اصولوں اور سعادت کی راہوں کی آگاہی اور اس راستے کو طے کرنا ایسے ہی ہے جیسے مرتفع زمینوں کو طے کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور نہایت ہی مشکلات اور زحمات کا حامل۔ یہاں پر ''نجد'' لفظ خیر کی راہوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور پھر شر کے راہوں سے آگاہی پر اسکا اطلاق اس کے ساتھ ہی ''تغلیب'' کے عنوان سے قرار پایا ہے۔ بنابریں آیت کا تحت الفاظ ترجمہ یوں ہوگا ''ہم نے انسان کو دو مرتفع زمینوں کی ہدایت کردی ہے'' یہ دو سرزمینیں وہی خیر وشر کی راہیں ہیں۔

اسی لئے ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

''يَاأَيُّهَا النَّاسُ! هُمَا نَجْدَانِ، نَجْدُ الْخَيْرِ وَنَجْدُ الشَّرِّ، فَمَا جُعِلَ نَجْدُ الشَّرِّ أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنْ نَجْدِ الْخَيْرِ'' اے لوگو! دو مرتفع زمینیں موجود ہیں، ایک خیر کی سرزمین اور دوسری شر کی سرزمین اور تمہارے نزدیک شر کی سرزمین، خیر کی سرزمین سے ہرگز زیادہ محبوب قرار نہیں پائی۔[1]

بعض کوتاہ نظر افراد نے آیت کے وسیع مفہوم کو ایک محدود موضوع میں خلاصہ کردیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان دو مرتفع زمینوں سے مراد ''ماں کے پستان'' ہیں۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''وَهَدَيْنَا النَّجْدَيْنِ'' دو پستان کی طرف اشارہ ہے، تو آپؑ نے ارشاد فرمایا ''هُمَا الْخَيْرُ وَالشَّرُّ'' نہیں بلکہ مراد خیر اور شر ہیں۔''

البتہ اس بارے میں ہدایتِ الٰہی مختلف طریقوں سے حاصل ہوتی ہے، وجدانِ اخلاقی، فطرت، عقلی دلائل اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے ذریعہ سے (گویا ہدایت تکوینی اور تشریعی ہدایات کی مختلف انواع پر مشتمل) لیکن آیات کا سیاق زیادہ تر ہدایت تکوینی سے مناسبت رکھتا ہے۔

تیسری آیت میں انسان کی جان اور جان روح کے خالق کی قسم کھانے کے بعد ''فجور اور تقویٰ کے الہام'' کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ''خداوندِعالم نے نفسِ انسانی کو فجور اور تقویٰ الہام کیا'' (فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا)

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۸۱، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر قرطبی، انہی آیات کے ذیل میں۔ نیز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی یہی بات نقل کی گئی ہے۔

''الہام''، ''لھم'' (بروزن فھم) کے مادہ سے ہے۔جس کے معنی کسی چیز کا ''نگلنا'' یا ''پینا'' ہیں۔[1] پھر اس کا اطلاق ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلبِ انسانی پر کسی چیز کے ڈالنے'' پر ہونے لگا ہے، گویا انسان کا دل اس بات کو اپنے تمام وجود کے ساتھ پی لیتا ہے اور نگل جاتا ہے ۔البتہ الہام کے ایک اور معنی بھی ہیں اور وہ ''وحی'' ہیں جو کبھی اسی معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

''فجور'' کے معنی تقویٰ کے پردے کو خاک کر دینا اور گناہوں کا ارتکاب کرنا ہیں (''فجر'' کے مادہ سے ہے جو پھاڑنے اور چاک کرنے کے وسیع معنی میں ہے، یا تاریکیِ شب کو صبح کی سفیدی کے ذریعہ پھاڑنے کے معنی میں ہے)۔

''تقویٰ''، ''وقایہ'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں۔حفاظت، اور یہاں پر وہ امور مراد ہیں جو انسان کو گناہوں اور بدکاریوں کی آلودگی سے باز رکھتے ہیں۔

خلاصہ کلام، اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ خداوندِ عالم نے حسن وقبحِ عقلی کے ادراک اور نیک وبد کے سمجھنے کے مسئلے کو فطری طور پر انسان کی جان میں ودیعت کر دیا ہے۔تاکہ وہ اسے اس طریقے سے سعات اور ارتقاء کی راہوں کے طے کرنے کی ہدایت کرے ۔اس آیت کی تفسیر کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے:

''بِيَّنَ لَهَا مَا تَأْتِي وَمَا تَتْرُكُ'' مراد یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے انسان کیلئے واضح طور پر بیان فرمایا ہے کہ کن چیزوں کو انجام دینا چاہیے اور کن چیزوں کو انجام نہیں دینا چاہیے (باالفاظ دیگر ''چاہیے'' اور ''نہ چاہیے'' کی تعلیم دی ہے)۔[2]

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''فجور'' کو ''تقویٰ'' پر کیوں مقدم رکھا گیا ہے؟ بعض مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے۔''کیوں کہ گناہوں سے پاک ہونا مقدمہ ہوتا ہے تقویٰ اس آراستہ ہونے کا۔کیونکہ ہمیشہ ''پیراستہ ہونا''، ''آراستہ ہونے'' پر مقدم ہوتا ہے اور پاک سازی تعمیر نو پر مقدم ہوتی ہے۔[3]

بہرحال اگر انسان کیلئے افعال کے حسن وقبح کا ادراک فطری نہ ہوتا اور مثلاً ظلم کی برائی اور عدل واحسان کی اچھائی اور اسی طرح کے دیگر اعمال کی اچھائی وبرائی کو سمجھنے کیلئے استدلال کی ضرورت ہوتی تو یقیناً انسانی معاشرہ کی عمارت دھڑام سے گر جاتی، کیونکہ نظری دلائل کے قیام میں بڑی حد تک عقائد کا اختلاف پیدا ہوجاتا اور چونکہ اس کیلئے کوئی وجدانی بنیاد موجود نہیں ہے، لہٰذا ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام انجام دیتا رہتا ہے۔

پس خداوندِ عالم کی یہ ہدایت انسان کی اجتماعی زندگی کیلئے حد سے زیادہ مؤثر اور تقدیر ساز ہے اور یہ نعمت اور یہ عظیم ہدایت اس

---

[1] ''لسان العرب''، ماد ''لھم''، بنابریں جب یہ مادہ باب افعال کے وزن پر آتا ہے تو اس کا معنی نگلوانا اور پلانا ہوجاتا ہے۔بعض مفسرین کہتے ہیں کہ الہام کا لفظ صرف امر خیر میں استعمال ہوتا ہے اور اس آیت میں بھی الہام فجور سے مراد مجور سے پرہیز ہے۔

[2] تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۵۸۶ حدیث ۷

[3] روح المعانی جلد ۳ ص ۱۴۳

قدراہمیت کی حامل ہے کہ اس کا مقابلہ کسی اور نعمت سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

چوتھی آیت میں دین کے فطری ہونے کی بات کی گئی ہے اور وہ بھی دین ''حنیف'' کی یعنی جو ہر قسم کے باطل اور کجی کی طرف میلان اور رجحان سے خالی اور ہر طرح کے شر اور اس طرح کی دوسری آلودگیوں سے مکمل طور پر پاک ہے۔(فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا)

''دین'' کے وسیع مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ وہ اصول دین کے تمام مبادیات، یا کم از کم فروعِ دین کے تمام کلیات کو شامل ہے۔''دین'' کے لفظ کا استعمال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ صرف خدا شناسی اور توحید ہی نہیں بلکہ تمام اصول اور فروعِ دین اجمالی طور پر فطری ہونے کے لحاظ سے روزِ اول ہی سے انسانی کے اندر قرار پائے ہیں، اور یہ ''تکوینی ہدایت'' جب انبیاء علیہم السلام کی ''تشریعی ہدایت'' سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو انسان کے اندر نہایت ہی موثر جاذبیت پیدا کرسکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت میں جس قسم کی دعوت بھی موجود ہے اس کی جڑیں خود انسانی فطرت کی گہرائیوں میں مخفی ہیں۔کوئی بھی آسمانی مذہب انسان کی فطری خواہشات کے ساتھ محاذ آرائی اور نبرد آزمائی نہیں کرتا بلکہ جائز اور شرعی طریقہ سے ان کو روایت بھی کرتا ہے۔انہیں پایہ تکمیل تک بھی پہنچاتا ہے اور اس طرح ہدایت تکوینی کے عنوان سے خداپرستی اور دینداری انسان کی جان کے اندر موجود ہے اور اگر کسی وقت انحراف اور کجروی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ عارضی ہوتی ہے۔اسی لئے انبیاء کرامؑ کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ ان عارضی کجرویوں اور انحرافات کو زائل کردیں تاکہ اصلی فطرت میں شگوفا ہونے کے امکانات بڑھ جائیں۔اور چونکہ ہم انشاءاللہ توحید فطری کی بحث (تیسری جلد) میں اس آیت کے بارے میں تفصیلی گفتگو کریں گے اس لئے یہاں پر صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ساتویں آیت میں پہلے تو قلم کے ذریعہ خدا کے تعلیم کرنے کی بات کی گئی ہے۔پھر کلی طور پر انسان کو ان مسائل کی تعلیم دینے کا تذکرہ ہے جو وہ نہیں جانتا۔ارشاد ہوتا ہے ''خداوندِ عالم وہی تو ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور انسان کو ان چیزوں کی تعلیم کی جو وہ نہیں جانتا تھا''(اَلَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ)

قلم کے ذریعہ تعلیم دینے سے مراد شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ لکھنا اور پڑھنا پہلی بار انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف سے انجام پایا۔[1] یا پھر اس وجہ سے ہے کہ خداوندِ تبارک وتعالیٰ نے یہ ذوق اور استعداد انسانی روح کے اندر ایک فطری ہدایت کے عنوان سے ایجاد کردی ہوئی ہے جو لکھنے اور پڑھنے کی وجہ سے منصۂ شہود پر آتی ہے۔تاریخ بشر کا دورانیہ خط کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔(سب جانتے ہیں کہ زمانۂ تاریخ اور زمانہ قبل از تاریخ کی درمیانی حداسی خط کے پیدائش کی تاریخ کا مسئلہ ہی ہے) ہرصورت میں قلم کے ذریعہ تعلیم کا طریقہ ہدایتِ الٰہی کے ذریعہ ہی معرض وجود میں آیا ہے۔

''عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ'' کا جملہ ان مختلف فطری علوم کی طرف ہوسکتا ہے جنہیں خداوندِ عالم نے انسانی وجود کے

---

[1] بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے قلم کے ساتھ لکھا ہے وہ حضرت آدمؑ تھے۔تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۲۱۰ ۷ اور تفسیر روح المعانی جلد ۱۰ ص ۴۷۳

اندر یادگار کے طور پر رکھ دیا ہے، خواہ وہ عقلی حسن وقبح یا فجور وتقویٰ کا ادراک ہو یا ''بدیہی قضیے'' ہوں جو استدلالی علوم ''میں نظری قضیوں'' کی بنیاد قرار پاتے ہیں، یا پھر دین کے بنیادی قواعد اور احکامِ الٰہی کے اصول ہوں۔

چھٹی آیت میں پہلے تو قرآن کی تعلیم کو خداوندِ ''رحمان'' کی طرف نسبت دی گئی ہے جو رحمان تمام قسم کی رحمتوں اور کرامتوں کا منبع ہے۔ پھر انسانی تخلیق کی بات کی ہے اور فرمایا ہے ''انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان (بولنے) کی تعلیم دی (خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ)

''بیان'' کا عمومی مفہوم ہے جس کا اطلاق ہر آشکار کرنے والی چیز پر ہوتا ہے، خواہ وہ مختلف عقلی ومنطقی دلائل ہوں جو پیچیدہ مسائل کو واضح اور آشکار کر دیتے ہیں یا خط وکتابت ہو یا پھر بات کرنا ہر چند کہ ان تمام معانی سے واضح ترین معنی بات کرنا ہی ہے۔

مفسرین نے ''بیان'' کی تفسیر کے بارے میں کئی احتمالات ذکر کئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے اس کا مطلب ہے خیر وشر کی وضاحت، کسی نے کہا حلال وحرام کا بیان، کسی نے کہا اسمِ اعظم اور کسی نے کہا لغت کی تعلیم۔[1] لیکن واضح سی بات ہے کہ ''بیان'' ہیں ظاہری معنی بات کرنا ہی ہیں اور دوسرے تمام احتمالات ضعیف معلوم ہوتے ہیں۔[2]

خداوندِ عالم نے انسان کو بات کرنا کیونکر سکھایا، اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے، چونکہ ''لغات کا وضع کرنے والا'' (زبانوں کا بنانے والا) خود خداوندِ عالم ہے اور اسی نے وحی کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کو تعلیم دی ہے۔ لیکن ظاہری طور پر اس بات پر کوئی واضح دلیل نہیں مل سکی۔ بلکہ اس سے مراد بنی نوعِ انسان کو خدا کی جانب سے باطنی الہام ہے جو کہ حنجرہ (حلق) کے ذریعہ صوت (آواز) کی ایجاد کے ساتھ شروع ہوا ہے اور پھر مخارج حروج کا سہارا لے کر زبان کی گردش کے ذریعہ حروف ایجاد ہوئے۔ پھر ان حروف کو آپس میں ملایا گیا جن سے کلمات ایجاد ہوئے۔ پھر مختلف چیزوں اور مفہوموں کے نام رکھے گئے۔ اس طرح انسان نے بولنے پر قدرت حاصل کر لی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو اس طریقے سے ادا کرے جو ایک طرف تو ہر ایک کے بس میں ہے اور دوسرے آسان اور سہل بھی۔ اس طرح وہ ہر قسم کے مادی اور معنوی، جزئی اور کلی، نیز مستقل اور غیر مستقل مفاہیم کو بخوبی ادا کرنے پر قادر ہو گیا۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ اگر یہ خداداد خلاق لیاقت انسان کے اندر نہ ہوتی اور وہ بات تک کرنا نہ جانتا تو نہ تو یہ تمدن ہوتا اور نہ ہی علم ودانش کا وجود، چہ جائیکہ وہ اس حد تک ترقی کر پاتا۔ اور نہ ہی انسان اپنی زندگی کی بنیادیں تعاون اور اجتماعی ہمکاری پر استوار کر سکتا کیونکہ اجتماعی ہمکاری۔ ایک دوسرے کے ساتھ نزدیکی رابطے کی ایک شاخ ہے۔

تفسیر المیز ان میں مذکور ہے کہ اس بات کی ایک اہم ترین دلیل کہ الہام خداوندی کی ذریعہ انسان کو ''بیان'' کی صلاحیت بخشی گئی جس میں اقوام وملل کی زبانوں کا اختلاف ہے کیونکہ ہر قوم اور ملت کی ایک مخصوص زبان ہے جس میں روحانی، اخلاقی ونفسانی اور علاقائی

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۳۲۲ اور تفسیر روح المعانی جلد ۲۷ ص ۸۶

[2] اگر بعض روایات میں بیان بمعنی اسم اعظم تفسیر ہوا ہے تو درحقیقت اس کے ایک واضح مصداق کا ذکر ہے۔

خصوصیات پائی جاتی ہیں۔[1]

بعض محققین نے دنیامیں موجودزبانوں کی تعداد تین ہزار سے زائد بتائی ہے۔ جب کہ بعض دوسرے صاحبانِ تحقیق نے یہ تعداد اس سے بھی زیادہ بتائی ہے۔[2]

واقعاً یہ چیز عجیب اورخداوندِ تبارک وتعالیٰ کی قدرت وعظمت کی نشانیوں میں سے ایک ہے خود بات کرنا بھی حق تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے جب کہ زبانوں کا اختلاف اس کی ایک اور عظیم آیت ہے اور ہر دو کا شمار تخلیقِ انسانی کی خصوصیات میں ہوتا ہے۔

ممکن ہے بعض پرندے بار بار کے سدھانے اور پڑھانے سے دلکش باتیں کرنے لگ جائیں۔لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ کام انسان کی طرف سے دیئے گئے چند محدود الفاظ کے دائرہ میں تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس جملہ کے مفہوم سے آشنا ہوتے ہیں یہ صرف انسان ہی ہے جو غیر محدود طریقے پر جملے بنائے اور مختلف مفاہیم کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر بیان کرے اور اس کام کو مکمل آگاہی کے ساتھ انجام دے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی توحیدِ مفضل کی حدیث کے ضمن میں خدا کی اس عظیم آیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور مفضل سے ارشاد فرمایا:

''آواز، بات کرنے اور اس کے ذرائع اور آلات کے بارے میں خوب غور وفکر کرو کہ جو انسان میں فراہم کر دیئے گئے ہیں۔''

پھر امامؑ نے اس کی تمام تفصیلات مفضل سے بیان فرمائیں اور انہیں اس کے بارے میں مطالعہ کرنے کی دعوت دی۔[3]

اس سلسلے کی ساتویں اور آخری آیت میں پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا جارہا ہے۔''تم یاددہانی کراؤ کیونکہ تم تو صرف یاددہانی کرانے والے ہو۔''(فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ)

''تذکر''(یاددہانی کرنا) سے شاید یہ معنی مراد ہو کہ ان علوم ودانش کے حقائق اور ان تعلیمات کا نچوڑ، ہدایت الٰہی کے بموجب انسان کے دل وجان میں موجود ہوتے ہیں۔ انبیاء ومرسلین کی تعلیمات کے سایہ میں پروان چڑھتے ہیں اور''خفا'' سے''ظہور''، ''اجمال'' سے ''تفصیل''اور''اندرون'' سے''بیرون'' کے مراحل میں منتقل ہوتے ہیں۔

مندرجہ ذیل آیت قرآنِ مجید کی سورۂ قمر میں چار مرتبہ دہرائی گئی ہے، ایک تو اس وقت جب قومِ فرعون کا ذکر ہوا، دوسرے جب قومِ عاد کا ذکر ہوا، تیسرے قوم ثمود کے اور چوتھے قومِ لوط کے ذکر کے موقع پر، اور وہ آیت ہے''وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۹ ص ۱۰۷

[2] دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد ۸ ص ۳۶۴

[3] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۷

مُّدَّكِرٍ ''(ہم نے قرآن کو یاددہائی کیلئے آسان کردیا ہے۔پس کیا ہے کوئی جو یادحاصل کرے؟)[1]

بعض یونانی فلاسفہ کا یہ قول مشہور ہے کہ ''علم ودانش، یاددہانی کے سوااور کچھ نہیں تمام علمی اصول بغیر کسی استثنا کے انسان کی روح میں ودیعت کئے گئے ہیں جنہیں وہ فراموش کرچکا ہے،لیکن معلمین کی مدد سے انہیں یاد کرلیتا ہے۔''

حضرت فخر رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ کوئی چیز پہلے سے انسان کے اندر موجود تھی،لیکن پھر وہ اسے فراموش کرچکا ہے '' تو ہم جواب میں کہیں گے ''جی ہاں !ایسا ہی حق کے سامنے سر جھکا دینا ہر انسانی فطرت میں موجود ہے،لیکن وہ کبھی اُسے فراموش کردیتا ہے اور ایسے مواقع پر جب اسے یاددہانی کرادی جائے تو وہ اپنی فطرت کی طرف لوٹ آتا ہے۔[2]

بہرحال یہ آیت مجموعی طور پر بنی نوع انسان کیلئے خداوندِ عالم کی طرف سے فطری ہدایت پر زندہ دلیل ہے۔

چند ضروری وضاحتیں

علوم جدید میں ''فطری'' اور ''غریزی'' ہدایت

سائنس اور نفسیات شناسی کی پیش رفت اور حیوانات کے اسرار آمیز حواس کے بارے میں دانشوروں کے مطالعہ اور تحقیق نے زندہ موجودات کی کائنات میں فطری اور غریزی ہدایت کے بہت سے محیرالعقول اور حیرت ناک اسرار دریافت کئے ہیں ہمیں ایسے حیرت ناک امور نظر آتے ہیں جن کی توجیہہ وتفسیر سے موجودہ علوم بھی عاجز ہیں۔وہ یہ نہیں بتاسکتے ہیں کہ اس طرح کی ہدایتوں کا اصل سرچشمہ کہاں ہے،مگر یہ کہ یہ تسلیم کرلیں کہ کائنات کے عظیم مبداء نے،جس نے تمام موجودات عالم کی ہدایت کا فریضہ اپنے ذمہ لیا ہوا ہے، یہ علوم ایک اندرونی رمزی الہام کے ذریعہ انسان یا دوسرے حیوانات کو عطا فرمائے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمارے پاس اس قدر شواہد اور نمونے موجود ہیں کہ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔لیکن اختصار کے طور پر ذیل کے چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

(ا)انسان بوقت ولادت کسی استاد اور معلم کے سکھائے پڑھائے ،پستان کو جوسنا،دودھ پینا اور اس کام کیلئے ہاتھ اور پنجے سے مدد لینا اچھی طرح جانتا ہے اور یہ بات بھی بخوبی جانتا ہے کہ روکر اپنی ضرورتوں سے کس طرح آگاہ کیا جاتا ہے؟

انسان زبان کا وضع کرنا، الفاظ کا ایجاد کرنا،منہ سے بات کرنا اور اس قسم کے دوسرے مسائل ایک مرہوز اور مخفی استعداد کی صورت

---

[1] سورہ قمر آیات ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰۔

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۴۲

میں شکم مادر سے اپنے ساتھ لاتا ہے، اسی طرح حسن وقبح کا ادراک، اچھائی اور برائی کی تمیز اور ''چاہیے'' اور نہ چاہیے'' کی قسم کی بہت سی دوسری چیزوں سے آشنائی، عالم تخلیق کے عظیم مبداء سے واقفیت اور معرفت الٰہی بھی اپنی ذات کے اندر رکھتا ہے۔

ایک دانشور کا کہنا ہے کہ جب مائیں اپنے بچوں کو خاموش کرنے کیلئے انہیں اپنی آغوش میں لیتی ہیں تو عام طور پر اپنے بائیں سینے کی طرف ہی لے جاتی ہیں اور وہ یہ کام لاشعوری طور پر کرتی ہیں۔ یعنی خود بھی نہیں جانتیں کہ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ درحقیقت وہ اس طرح بچے کا سر اپنے دل کے قریب لے جاتی ہیں، جس سے وہ ماں کے دل کی دھڑکنیں سن کر خاموش ہو جاتا ہے، کیونکہ دھڑکنوں کی آواز اس کیلئے جانی پہچانی ہوتی ہے، جس سے وہ جنینی دورانیہ میں آشنا ہو چکا ہوتا ہے اور اسے سننے کا عادی بن چکا ہے۔ بہت کم مائیں ایسی ہیں جو اس نکتہ سے باخبر ہوتی ہیں۔ اسی لئے ماں کا یہ کام اور انداز صرف اور صرف ایک فطری الہام کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

(۲) فطری اور غریزی ہدایت کا مسئلہ عالم حیوانات میں تو اس سے بھی زیادہ وسیع اور عمومی نوعیت کا حامل ہے۔ آج کے دور کے دانشوروں نے اس کے کئی محیر العقول نمونے ذکر کئے ہیں۔ چنانچہ ''فرڈ دنیانڈ لین'' کی لکھی ہوئی کتاب ''دیار دیار عجائب'' میں یوں لکھا ہے:

''بعض مچھلیوں کا طریقہ کار، فطرت کا شاہکار ہے اور اس کی توجیہہ کسی کے بس میں نہیں۔ ''قزل آلا'' نامی مچھلی، سمندروں کو چھوڑ کر میٹھے پانی کی ان نہروں یا دریاؤں کا رُخ کرتی ہے جہاں سے اس نے زندگی کا آغاز کیا تھا، پانی کی مخالف سمت میں پوری توانائی صرف کر کے تیر کر اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے، راستے میں درپیش چٹانوں سے چھلانگ لگا کر اس پار ہوتی ہے، حتیٰ کہ آبشاروں کے اوپر سے اُڑ کر آگے بڑھتی ہے۔ بسا اوقات اس قسم کی مچھلیوں کی تعداد اسقدر زیادہ ہوتی ہے کہ بڑی بڑی نہروں کو پُر کر دیتی ہے جب یہ مچھلیاں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتی ہیں تو وہیں پر تخم گزاری کر کے مر جاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مچھلیاں کس طرح مناسب نہریں یا دریا تلاش کر لیتی ہیں؟ یہ کام تو ریڈیو اور ٹیلیویژن کی ایجاد سے بھی زیادہ عجیب ہے، کیونکہ نہ تو اس کے پاس نقشہ ہوتا ہے جس سے وہ راہنمائی حاصل کریں۔ نہ ہی پانی کے نیچے زیادہ دور تک ان کی نگائیں کام کر سکتی ہیں اور نہ ہی کوئی ایسا راہنما ہوتا ہے جو انہیں راستہ بتائے۔[1]

(۳) اسی کتاب میں ہے: ''مار ماہی'' (سانپ مچھلی) کا طریقہ کار اس سے بھی زیادہ عجیب ہے، انگلستان کی یہ مچھلیاں جب آٹھ سال کی ہوتی ہیں تو اس جھیل یا نہر کو ترک کر دیتی ہیں جن میں وہ اب تک رہ رہی تھیں۔ یہ شب کو مرطوب گھاس پر آ کر سانپ کی مانند اس پر رینگنا شروع کر دیتی ہیں، حتیٰ کہ سمندر کے کنارے پر پہنچ جاتی ہیں۔ پھر وہ بحر اوقیانوس اطلس کو تیر کر طے کرتی ہوئی ''برمودا'' کے نزدیکی پانیوں تک پہنچ جاتی ہیں، وہاں پر زیر آب جا کر انڈے دیتی اور پھر مر جاتی ہیں۔۔۔۔!

اس سے بھی عجیب تر یہ کہ ان کے بچے سطح آب پر آ جاتے ہیں اور پھر اپنے مادری وطن کی طرف دور دراز کے سفر کا آغاز کر دیتے ہیں اور ان کا یہ سفر دو تین سال تک جاری رہتا ہے۔

---

[1] یار دیار عجائب ص ۱۱۶

یہ مچھلیاں اپنی منزلِ مقصود کو کیونکر پہچانتی ہیں جب کہ انہوں نے اس رستے کو نہیں دیکھا ہوتا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کیلئے آپ بھی دوسرے عقل مند ترین دانشوروں کی مانند جواب دیں، کیونکہ کوئی بھی دانشور اس سوال کا جواب نہیں جانتا۔[1]

(۴) کتاب ''حواسِ اسرار آمیز حیوانات'' کے لکھنے والے ''ویٹس دروشر'' کہتے ہیں:

''چمگادڑ کے بارے میں دانشوروں نے بہت سے محیر العقول موضوعات دریافت کئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں چار قسم کی ایسی چمگادڑ پائی جاتی ہیں جو مچھلی کا شکار کرتی ہیں، وہ تاریک راتوں میں پانی کی سطح پر پرواز کرتی ہیں، اچانک اپنے پاؤں کو نیچے لے جاتیں ہیں اور ایک مچھلی کو وہاں سے نکال کر اپنے منہ میں لے لیتی ہیں! حیرت ناک راز تو یہ ہے کہ انہیں کہاں سے معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں مخصوص نقطہ پر ایک مچھلی پانی کے اندر تیر رہی ہے؟ اپنے تمام وسائل اور فنی ترقیوں کے باوجود انسان ابتک اس بارے میں کامیابی حاصل نہیں کرسکا۔ ایک بمبار طیارہ پانی کے اندر موجود کشتی (تارپیڈو) کی صحیح صحیح نشاندہی نہیں کرسکتا ہے بلکہ اسے یہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ مخصوص لہروں کی نشانیاں دریا پر ڈالے تاکہ وہ ان علامتوں کی وجہ سے جوان نشانیوں کے ذریعہ معرض وجود میں آتی ہیں، ریڈیو ٹیلیگرافی کی صورت میں ہوائی جہاز تک پہنچیں اور وہ پانی میں موجود کشتی کی موجودگی کا پتہ چلائے۔

(جی ہاں!) چمگادڑ کے برخلاف، ہوائی جہاز پانی کے اندر موجود اپنے ٹھکانے کا براہِ راست پتہ نہیں لگا سکتا۔ پروفیسر ''گری فن'' کہتے ہیں کہ ''اس موضوع کیلئے کوئی قابلِ قبول وضاحت نہیں ملتی۔

موصوف آگے چل کر کہتے ہیں ''انسان نے اب تک جو کچھ بھی فنی دریافتیں کی ہیں اس نے دیکھ لیا ہے کہ فطرت اس سے پہلے وہ کام انجام دے چکی ہے۔ البتہ یہ دریافت اس کی انا کی اور خود پسندی کی حس کی تسکین کا موجب ضرور بنتی ہے، لیکن وہ ہمیشہ متوجہ ہوجاتا ہے کہ اس حصے میں بھی فطرت سے بہت پیچھے ہے!

اسی وجہ سے امریکی دانشور نے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی ہے جس کا نام ''بائیونی'' ہے۔ اس علم کا مقصد یہ ہے کہ فطرت ہمیں نمونے عطا کرتی ہے جن کے رازوں پر غور کرکے اس سے نئے فنی اور تکنیکی نتائج اخذ کئے جاسکیں۔

وہ کہتے ہیں ہیں: اگر ان دودھ دینے والے اور پروں سے اڑنے والے جانوروں (چمگادڑوں) میں سے کسی ایک کو کسی مکمل طور پر بند ڈبے میں رکھ کر اس کے آشیانے سے تین سو کلومیٹر دور لے جائیں اور اسے وہیں پر چھوڑ دیں، پھر بھی وہ دن میں اندھی ہونے اور اس جگہ سے بے خبر ہونے کے باوجود تھوڑی سی مدت میں براہ راست اپنے گھونسلے کو واپس آجائے گی۔[2]

(۵) مشہور صاحبِ قلم ''کرسی موریسن'' اپنی کتاب ''رازِ آفرینش انسان'' کی ایک فصل بنام ''شعور حیوانی'' کے تحت اس قسم کے بہت سے نمونے بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

---

[1] یاردیار عجائب ص ۱۱۶

[2] کتاب ''حواص اسرار آمیز حیوانات'' ۱۷

''پرندے فطری اورغریزی طو پراپنا آشیانہ بناتے اوراس تک پہنچ جاتے ہیں (ہرچندکہ اس سے پہلے کانمونہ انہوں نے نہیں دیکھا ہوتا) ابابیل SWALLOW جوآپ کے گھر کے ورانڈے میں گھونسلہ بناتا ہے، وہ سردی کے موسم میں گرم علاقوں میں چلا جاتا ہے ۔لیکن جونہی موسم بہار کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ واپس آجاتا ہے۔

بہت سے پرندے جنوبی اورگرم علاقوں کی طرف سفرکرجاتے ہیں اوراکثراوقات تووہ زمین اورسمندر کے اوپر سے سینکڑوں فرسخ کا فاصلہ طے جاتے ہیں،لیکن وہ کبھی اپناراستہ نہیں بھولتے۔

آزادمچھلی کئی سال تک سمندر میں رہتی ہے پھروہ اسی دریا کی طرف لوٹ جاتی ہے جہاں سے وہ سمندر میں آئی تھی۔اس سے بھی بڑھ کرعجیب بات یہ ہے کہ وہ دریا کے کنارے کنارے چل کراس نہرتک جاپہنچتی ہے جہاں وہ پیداہوئی تھی۔۔۔آزادمچھلی اپنے باطنی شعورکی پیروی میں اس ساحل تک جاپہنچتی ہے جواس کے نشوونما کی جگہ تھا۔آخرکون سی حس اس بات کا سبب بنتی ہے کہ یہ مچھلی اس قدردقیق اورقطعی طور پراپنے اصلی وطن کی طرف لوٹ جاتی ہے؟(اسے کوئی نہیں جانتا)

اگرکسی چوزےکواسی کے آشیانے سے باہرنکال کردوردارز کے ماحول میں اس کی پرورش کی جائے ،تووہ جب بھی اپنے شعوراورارتقاء کی منزل پر پہنچے گااپنے باپ دادا کی مانندآشیانہ بنانا شروع کردے گا۔۔۔۔۔۔آیاروئے زمین پر بسنے والی مختلف مخلوق کے جداگانہ اورمخصوص اعمال جوان سے سرزدہوتے ہیں وہ سب اتفاق اوربغیرسوچے سمجھے معرض وجودمیں آجاتے ہیں یانہیں ، بلکہ کلی عقل وشعوران کے سرزدہونے کا سبب بنتا ہے۔[1]

(۶)ایک فرانسیسی دانشورجن کانام''وارڈ'' ہے،''اکسیکلپ'' نامی پرندے کے بارے میں کہتے ہیں:

''میں نے اس پرندے کے بارے میں بہت مطالعہ کیاہے ۔اس کی خصوصیات میں یہ بات ہے کہ جب اس کی مادہ کے انڈے دینے کی مدت ختم ہوجاتی ہےتووہ مرجاتی ہے،یعنی وہ اپنے نومولودبچوں کارخ ہرگزنہیں دیکھ پاتی ،اس طرح اس کے بچے اس کی صورت نہیں دیکھ پاتے۔

جب وہ انڈے کےخول سے باہرآتے ہیں تووہ کیڑوں کی شکل کے ہوتے ہیں جن کے پروبال نہیں ہوتے اورنہ ہی ان میں غذااوردوسری ضروریات زندگی کے حصول کی قدرت ہوتی ہے،حتیٰ کہ وہ اپنے دفاع پربھی قادرنہیں ہوتے یعنی جوجوداثات ان کی زندگی سے نبردآزماہوتے ہیں،اُن کاوہ دفاع نہیں کرسکتے اس لئے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک سال کی مدت تک اسی حالت میں کسی محفوظ جگہ پررہیں اوران کی غذاہمیشہ ان کے پاس رہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ان کی ماں کومحسوس ہوتا ہے کہ اس کے انڈے دینے کاوقت قریب آگیاہےتووہ لکڑی کاایک ٹکڑاتلاش کرتی ہے اوراس میں ایک گہراسوراخ بناتی ہے،پھروہ خوراک اکٹھا کرناشروع کردیتی ہے جواس کے نومولودبچوں کی غذاکے قابل پتے اورکونپلیں ہوتی ہیں۔ان میں سےایک کیلئے ایک سال کی غذاکےطور پروہیں جمع کرکےسوراخ کے نیچےرکھ

---

[1] کتاب''رازآفرینش انسان''،فصل۸''شعورحیوانی''۔

دیتی ہے اس کے اوپر اس سوراخ میں ایک انڈا دیتی ہے، پھر لکڑی کے برادے سے اس سوراخ کے اوپر پختہ چھت بنا دیتی ہے۔ پھر مذکورہ غذا جمع کر کے اس پر انڈا دیتی ہے اور سابق طریقہ کو اپنائے ہوئے اس پر مضبوط چھت بنا دیتی ہے۔ اس طرح وہ کئی منزلیں تیار کرتی ہے جب وہ اپنے اس عمل سے فارغ ہو جاتی ہے تو پھر مر جاتی ہے!

(آپ غور تو فرمائیں کہ یہ کمزور سا پرندہ کہاں سے جان لیتا ہے کہ اس کے نومولود بچوں کو ان چیزوں کی ضرورت ہوگی اور پھر اس نے یہ تعلیمات کہاں سے حاصل کی ہیں، کس سے سیکھا ہے؟ کیا اپنی ماں سے یہ سب کچھ سیکھا ہے حالانکہ اپنی ماں کی تو صورت ہی نہیں دیکھی، یا تجربے سے سیکھا، حالانکہ ایسا کام اس کی زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہی انجام پاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا اس مقام پر اس بات کا اعتراف نہیں کرنا پڑتا کہ یہ سارے کے سارے کام ایسے ہیں جن کا غیب کے الہام اور غریزے کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، جسے خداوندِ عالم وعالمِ کے طاقت ور ہاتھوں نے اس کے اندر ودیعت کر دیئے ہیں!)

(۷) روس کے مشہور ماہر نفسیات اور دانشور ''پلاتونوف'' اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں:

''جنگِ عظیم میں اچانک میری ملاقات ایک ایسے ڈاکٹر سے ہوئی جو کئی راتوں کی بیداری کے بعد تھوڑا سا سو گیا۔ ابھی وہ سویا ہی تھا کہ بہت سے زخمیوں کو اسی وقت لایا گیا۔ ان کا معاملہ یہ تھا کہ ان کا فوراً آپریشن کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹر کو بیدار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے اسے ہلایا، اس کے چہرے پر پانی ڈالا، اس کے سر کو جھنجھوڑا لیکن بے سود، سر اٹھاتا اور پھر سو جاتا۔

میں نے سب لوگوں کو اشارہ کیا کہ چپ ہو جائیں (تاکہ میں انہیں بیدار کروں) چنانچہ میں نے آہستہ لیکن واضح طور پر اُسے کہا:

''ڈاکٹر صاحب! زخمیوں کو لے آئے ہیں اور تمہاری سخت ضرورت ہے'' یہ سن کر وہ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اس موضوع کی یوں تو جیہہ کی جا سکتی ہے کہ وہ لوگ جو پہلے اس کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہ اس کے مغز کے ممنوع حصے پر اثر ڈال رہے تھے جب کہ میں نے اس کے مغز کی حفاظتی، چوکی'' پر اثر ڈالا یہ حصہ گہری سے گہری نیند میں بھی بیدار رہتا ہے یہی وہ ''حفاظتی چوکی'' ہوتی ہے جس کے ذریعہ انسان باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کرتا ہے (اور غیر شعوری طور پر اپنی دلچسپی کے امور کو اسی ''حفاظتی چوکی'' کے حوالے کر دیتا ہے)

جو ماں اپنے بیماری بچے کے پہلو میں سوئی ہوئی ہے، وہ اپنے اطراف والوں کے شور وغل سے اتنا جلدی بیدار نہیں ہوگی جتنا اپنے بچے کے معمولی سے رونے سے بیدا ہو جائے گی۔ آٹا پیسنے کی چکیوں پر مامور افراد طوفانی ہواؤں اور بجلی کی گرج اور کڑک کی حالت میں تو سو جائیں گے اور نیند کے مزے لیں گے لیکن جونہی چکی کا پتھر رکا ان کی نیند بھی اچاٹ ہوگئی۔ (یہ سب کچھ صرف اس لئے ہے کہ ان لوگوں نے غیر شعوری طور پر اپنی دلچسپی کے امور کو اپنے مغز کی ''حفاظت چوکی'' کے سپرد کیا ہوا ہوتا ہے)[1]

(۸) ''چھٹی رسان کبوتروں'' اور ان کی اپنے اپنے آشیانوں کو اسرار آمیز واپسی کے بارے میں ''دردشر'' اپنی کتاب میں یوں لکھتے ہیں:

---

[1] کتاب ''روانشناسی در شوروی'' جلد ۱۹ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

''اگرانہیں بنداورتاریک ترین ڈبوں میں بندکرکے ان کے گھونسلوں سے سینکڑوں میل دورچھوڑ دیا جائے اور یہ سفر طے کرنے کیلئے پیچ وخم بھرمختلف راستے اختیار کئے جائیں،لیکن جونہی وہ ان ڈبوں سے باہرآئیں گے صرف دس یا بیس سیکنڈسورج کی طرف نگاہ کریں گے ،پھرسیدھے اپنے گھونسلوں کی طرف محوپرواز ہوجائیں گے۔یہ بات مشہوردانشورڈاکٹر''کریمر'' کے متعددبارکے تجربوں سے ثابت ہوچکی ہے ڈاکٹرموصوف کے طریقے کارکی ان الفاظ میں تشریح کی جاسکتی ہے کہ مثلاً''ہمبرگ'' شہرکاایک کبوتر جانتاہے کہ دن کے فلاں گھنٹے میں سورج کس موقعہ پرہوتاہے۔اگراُسے مثلاً''برم'' لے جایاجائے تواس جانورکومعلوم ہوتاہے کہ کہ سورج وہاں پرنیم درجے شمالی اور۱/۲۵ درجے شرقی حصہ پرواقع ہے،تواسے ہمبرگ شہرکیلئے پروازکرنے کیلئے وہاں پرسورج کے درجہ کوپیش نظررکھ کراڑنا پڑے گا۔چنانچہ وہ ایک ہی لمحہ میں شمال مشرق کی طرف محوپرواز ہوجائے گا۔لیکن یہ معلوم نہیں کہ جب آسمان پربادل ہوں اورسورج ظاہرنہ ہوتووہ کیسے اپنے راستوں کوپہچان لیتے ہیں۔ تجربہ سے ظاہرہوتاہے کہ ان میں سے بہت سے کبوترایسے ہیں جواس قسم کے''خورشیدی قطب نما'' کے بغیرہی اپنی راہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔[1]

بالفرض اگر یہ پرندے''خورشیدہ قطب نما'' ہی سے استفادہ کرتے ہیں تاہم یہ بات تویقینی ہے کہ زاویوں کی تعیین اوروہ بھی بہت ہی چھوٹے اوردقیق زاویئے جوآلات واوزار کے غیرحاصل نہیں ہوسکتے ،یہ ایسے مسائل ہیں جوخدا کی ہدایت تکوینی کے بغیرقابل تفسیرنہیں ہیں۔یہ اوراس قسم کے سینکڑوں دوسرے زندہ گواہ موجودہیں کہ فطرت کے ماوراءایک ایسا علمِ بے پایاں اورایسی بے انتہا قدرت کارفرما ہے جو ہرچیزکواپنی زندگی کی ہدایت اوررانہما کرتی ہے۔یہ سب اس بےنشان ذات کی نشانیاں اوراس کےعلم وقدرت کے شاہکارہیں۔

(۹)اس گفتگوکوہم حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام کے اس فرمان پرختم کرتے ہیں جو''حدیث مفصل'' میں بیان ہوا ہے۔امامِ عالی مقام علیہ السلام فرماتے ہیں۔

''اے مفضل!ان چوپاؤں کی عجیب وغریب خلقت کے بارے میں غوروفکرکرو۔وہ بھی انسانوں کی طرح اپنے مُردوں کوزمین میں چھپادیتے ہیں۔وگرنہ بیاباں کے ان وحشی جانوروں اوردرندوں وغیرہ کے مُردے کہاں ہیں جودیکھے نہیں جاتے؟ان کی تعدادکوئی کم تونہیں ہے جوکسی سے چھپی رہے بلکہ اگرکوئی یہ کہے کہ ان کی تعدادانسانوں سے کئی گنازیادہ ہے،تووہ غلط نہیں کہے گا۔۔۔۔۔[2]

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ جب وہ اپنے موت کے قریب آجانے کااحساس کرتے ہیں تووہ کہیں دورجاکرچھپ جاتے ہیں اوروہیں پرجامرتے ہیں!اگرایسانہ ہوتاتوجنگل اور بیابان ان کے مردوں سے بھرجاتے اورہوامتعفن ہوکررہ جاتی جس سے مختلف بیماریاں پھوٹ پڑتیں اوروبا پھیل جاتی۔پس اچھی طرح اورغورسے دیکھوکہ جوکام انسان سوچ سمجھ کراورغوروفکرکے بعدانجام دیتاہے،وہی کام حیوانات ایک غریزہ کےطور پرانجام دیتے ہیں،تاکہ انسان اُن کے بُرے آثارسے محفوظ رہیں۔

---

[1] کتاب''حواسِ اسرارآمیزحیوانات''ص ۱۸۳

[2] بحارالانوارجلد ۳ص۹۹(قدرے تلخیص کے ساتھ)

۶۔نیند اور بیداری میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

قرآن مجید نے آسمان ،زمین ،سورج ،چانداورانسانی روح جیسے اہم ترین موضوعات پر ہی روزنہیں دیااورانہیں خدا کی آیات اورنشانیوں کے عنوان سے متعارف نہیں کرایا، بلکہ کبھی ان مسائل کوبھی بڑی تاکید کے ساتھ بیان فرمایاہے جوعام طور پرہمیں سادہ اورمعمولی دکھائی دیتے ہیں تاکہ وہ یہ بات واضح کرے کہ اس کائنات میں کوئی بھی چیز سادہ اورمعمولی نہیں ہے بلکہ سب چھوٹی بڑی چیزیں حق تعالیٰ کی آیات اوراس کے علم وقدرت کی نشانیاں ہیں۔

ان بظاہرسادہ اورمعمولی مسائل میں سے نیند اور بیداری کا مسئلہ بھی ہے جس پرقرآن مجید نے کافی روز دیاہے۔اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اب ہم ذیل کی آیات کوگوشِ جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ

(روم/۲۳)

۲۔۔۔وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًاوَّ النَّوْمَ سُبَاتًاوَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا

(فرقان/۴۷)

۳۔۔۔وَجَعَلْنَانَوْمَكُمْ سُبَاتًا{}وَّجَعَلْنَاالَّيْلَ لِبَاسًا

(نبا/۹۔۱۰)

۴۔۔۔اِذْيُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ

(انفال/۱۱)

ترجمہ

۱۔۔۔اوراس کی نشانیوں میں سے تمہاری شب روز کی نیند اور معاش (کے حصول) اورفضل پروردگار سے بہرہ مندی کیلئے تمہاری تلاش اورکوشش ہے۔اوران امورمیں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں، جن کے پاس سننے والے کان ہیں۔

۲۔۔۔وہ وہی تو ہے جس نے رات کوتمہارے لئے لباس قرار دیا ہے اوردن کوتحرک اورزندگی کا سبب۔

۳۔۔۔اورہم نے تمہاری نیندکوتمہارے سکون کا ذریعہ قرار دیا۔اوررات کو(تمہارے لئے) پردہ۔

۴۔۔۔اور(اس وقت کو یادکرو) جب خفیف سی نیند جوتمہارے لئے خدا کی طرف سے سکون کا ذریعہ تھی ،تم پر چھا گئی۔اورتمہارے لئے پانی نازل کیا تا کہ اس کے ذریعہ تمہیں پاک قرار دے۔

الفاظ کے معانی اورتشریح

بعض ارباب لغت جب ''نوم'' (نیند) کے لفظ پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس کے وہی مشہور معنی اور مفہوم ہیں۔[1]

لیکن ''راغب'' اپنی کتاب ''مفردات'' میں کہتے ہیں:

''نوم کی مختلف تفسیریں ہیں جوساری کی ساری صحیح ہیں،البتہ مختلف نکتے نظر کے تحت،بعض نے کہا ہے کہ نوم سے مراد وہی رطوبتوں اور بخارات کی وجہ سے مغز کے اعصاب کا سست ہونا ہے جب کہ بعض نے کہا ہے کہ ''نوم'' یہ ہے کہ خداوندِ عالم انسان کی روح کوموت دیئے بغیر قبض کرلیتا ہے۔بعض کہتے ہیں ''نوم'' خفیف سی موت ہے جب کہ موت گہری نیند ہوتی ہے[2]

''نعاس'' (بروزن غبار) کے معنی مختصر اور ہلکی سی نیند ہیں۔اوربعض نے کہا ہے کہ نیند کے آغاز کونعاس کہتے ہیں۔اور چونکہ نیند ابتداء میں خفیف اورہلکی ہوتی ہے لہٰذا دونوں معانی ایک حقیقت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

''سُباب''، ''سَبت'' (بروزن ثبت) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ''قطع کرنا اور کاٹنا'' ہوتے ہیں اور سنیچر کے دن کوعربی زبان میں اسی وجہ سے ''یوم السبت'' کہتے ہیں کہ وہ آرام وسکون کے لئے کام کاج سے چھٹی کا دن ہوتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ سنیچر کو یہ نام یہودیوں کے پروگراموں سے متاثر ہوکر دیا گیا ہے کیونکہ وہ سنیچر کو چھٹی کا دن سمجھتے ہیں۔

---

[1] لسان العرب مادہ نوم

[2] مفردات راغب مادہ ''نوم''

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ یہودیوں کے عقیدے کے مطابق خداوندِ عالم نے کائنات کی تخلیق کا آغاز اتوار کے دن سے کیا۔ شش روزہ تخلیق کے بعد شنبہ کا دن تخلیقی کاموں کے خاتمے اور آرام کا دن تھا، اسی لئے اسے ''یوم السبت'' کہا جاتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ عقیدہ یہودیوں کی عظیم ترین غلطیوں میں سے ایک ہے۔ کیونکہ جب آسمان وزمین اور ماہ خورشید ہی نہیں تھے تو دن اور ہفتے کہاں سے آگئے؟ اور اگر قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ ''خداوندِ عالم نے اس کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے'' تو اس سے مراد ''چھ ایام'' نہیں بلکہ ''چھ دورانئے'' ہیں۔ ''سبت'' کا لفظ اسی مناسبت کی وجہ سے آرام واستراحت کے معنی میں آیا ہے۔[1]

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

تمہاری نیند خدا کی آیت ہے

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید نے رات اور دن میں انسان کے خواب کو خدا کی قدرت اور اس کے علم کی نشانیوں میں شمار کیا ہے۔ (وَمِنْ اٰيَاتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ)

حتیٰ کہ آیت کے آخر میں ایک بار پھر تاکید کرتے ہوئے کہتا ہے ''ان امور (نیند، بیداری اور فضلِ خداوندی سے استفادہ کرنے کیلئے تلاش وکوشش) میں ان لوگوں کیلئے آیات اور نشانیاں ہیں جن کے پاس سننے والے کان ہیں۔'' (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ)

اس میں شک نہیں ہے کہ زندگی کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کیلئے دنیا کے تمام جانداروں کو طاقت کی تجدید اور لازمی اور ضروری قوت کے حصول کیلئے ایسے آرام وسکون کی ضرورت ہوتی ہے جو زبردستی اُسے آلے، حتیٰ کہ حریص اور لالچی لوگوں تک کو بھی نہ چھوڑے۔

اس مقصد کے حصول کیلئے نیند سے بڑھ کر اور کون سے عوامل متصور ہو سکتے ہیں جو لازمی طور پر انسان کو تلاش کر کے اسے اس بات پر مجبور کر دیں کہ اس کی تمام جسمانی حتیٰ کہ اہم فکری حصے کی سرگرمیوں کو متوقف کر دے جس کے نتیجہ میں وہ ایک گہری استراحت میں گم ہو جائے اور تمام مدت میں اس کے بدن کے تمام حصے اور اعضا وجوارح ایک مرتبہ پھر چاق وچوبند ہو کر نئی تلاش اور نئی سرگرمیوں کیلئے آمادہ ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ اگر نیند نہ ہوتی تو انسان بہت جلدی پژمردہ، فرسودہ، بوڑھا اور شکستہ حال ہو جاتا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ مناسب نیند اور آرام میں صحت وسلامتی، طولِ عمر اور جوانی کے عیش ونشاط کا راز مضمر ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اسی آیت میں ''نو'' اور ''اِبْتِغَآءَ فَضْلَ اللّٰهِ'' ایک دوسرے کے مقابل میں قرار پائے ہیں جو بعض مفسرین کے بقول پہلا کلمہ موت کی علامت ہے اور دوسرا قیامت کی نشانی۔

''اِبْتِغَآءَ فَضْلَ اللّٰهِ'' (فضل خداوندی کی طلب) ایک ایسے لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی زندگی میں اس کی سعی

---

[1] مفردات راغب، مجمع البحرین اور لسان العرب

وکوششوں پر بھی توجہ رکھے ہوئے ہے اور خداوند کریم کے فضل پر بھی۔یعنی ان دونوں کے باہمی ملاپ سے انسان کائنات کی نعمتوں سے بہرمند ہوتا ہے۔یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں رات کی نیند کے ذکر کے ساتھ دن کی نیند کا بھی تذکرہ ہے (مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ) جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ نیند کا تعلق اصول طور پر رات ہی کے ساتھ ہوتا ہے اور قرآنی آیات بھی اسی چیز کی گواہ ہیں ،لیکن انسان کی زندگی میں کچھ حالات ایسے بھی پیدا ہوجاتے ہیں کہ وہ رات کو بیدار رہے اور دن کو آرام کے ساتھ سوئے۔رات کے سفر میں یا گرم علاقوں میں موسم گرمی کی وجہ سے دن کی تمام سرگرمیاں موقوف ہوجاتی ہیں اور رات کو کام کیا جاتا ہے۔ایسی صورت میں یہ مکمل طور پر سامنے آجاتے ہیں۔

ہمارے اس موجودہ دور میں جب کہ بہت سے صنعتی اور معالجاتی ادارے مجبور ہیں کہ دن رات کام کریں اور یہ بات بھی ممکن نہیں کہ کام کو بند کردیا جائے ،لہٰذا کام کرنے والوں کو تین باریوں (شفٹوں) میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ایسی صورت میں دن کو نیند کی ضرورت دوسرے اوروقتوں سے بڑھ کر واضح ہوجاتی ہے۔اب اگر نیند کے پروگرام کی ترتیب انسان کے اختیار میں نہ ہوتی اور رات کی نیند کو دن میں پورا نہ کیا جاتا تو یقینی بات ہے کہ اس کی زندگی میں بہت بڑی مشکلات پیدا ہوجاتیں۔

دوسری آیت میں پہلے تو اس بات کی تصریح کرتا ہے،''خدا تو وہ ہے جس نے رات کو تمہارے لئے پردہ مقرر کیا ہے۔(وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا) پھر نیند کے مسئلہ پر زور دے کر کہتا ہے کہ''اس نے نیند کو تمہارے لئے آرام اور سکون کا سبب قرار دیا ہے۔(وَالنَّوْمَ سُبَاتًا)

''هُوَ الَّذِي''(وہ وہی ہے۔۔۔۔۔۔) کی تعبیر سے ممکن ہے کہ ان امور کے توحیدی پہلو کی طرف اشارہ ہو جن میں سے ایک امر اس کی پاک ذات کی ایک نشانی ہے، یا نعمت کی بخشش کے شناخت بھی اس کی معرفت کا مقدمہ ہوگا۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد فرماتا ہے''اور دن کو چلنے پھرنے اور زندگی کیلئے حرکت وتحرک کا سبب قرار دیا ہے''۔(وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا)[1]

پس دن کی روشنی میں روح وسعت پذیر ہوجاتی ہے اور انسان مکمل طور پر بیدار ہوجاتا ہے جو روزِ قیامت کے حشر ونشر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے مشابہ ہے۔یہ احتمال بھی ہے کہ یہ بات میدان حیات میں انسانوں کی وسعت اور زندگی کے مختلف مقاصد کی طرف ان کی حرکت کی طرف اشارہ ہو۔اس طرح رات کے آتے ہی نیند اور آرام کا صور پھونکا جاتا ہے اور طلوع آفتاب سے بیداری کا۔

تیسری آیت میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی بات کو دہرایا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے کہ''ہم نے تمہاری نیند کو آرام کا سبب قرار دیا ہے اور رات کو لباس!''(وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا) جس طرح لباس انسان کو مختلف خطرات سے محفوظ

---

[1] توجہ رہے کہ''نشور'' بھی مصدری معنی میں ہے اور''سبات'' کا بھی یا مصدری معنی ہے یا اسم مصدر کا معنی ہے اور ان کا لیل ونہار پر اطلاق مبالغہ اور تاکید کے عنوان سے ہے۔

رکھتا ہے اور اس کی سلامتی کا سبب ہوتا ہے اس طرح تاریکی شب بھی اسی اثر کی حامل ہے۔

اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت، جس میں جنگ بدر کی گفتگو کی گئی ہے، اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اس تاریخی رات میں مومنوں پر خداوندِ عالم کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی تھی کہ ''تم پر مختصر سی نیند چھا گئی اور یہ نیند خداوندِ عالم کی طرف سے تمہارے جسم و جان کے سکون کا سبب بن گئی'' (اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ)

سکون عطا کرنے والی یہ نیند، خصوصاً اس قدر طولانی راستہ طے کرنے کے بعد ان کی طاقتوں کی تجدید اور میدان بدر میں کل کی فیصلہ کن جنگ کی آمادگی کا سبب بن گئی، وہ جنگ جو مسلمانوں کی واضح فتح پر ختم ہوئی۔

''نُعاس'' (خفیف سی نیند) کی تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عین آرام و استراحت کے وقت گہری نیند ان پر ایسی مسلط نہ ہو سکی جس سے دشمن کو اپنے مقاصد کے حصول کو موقعہ مل جاتا ہے وہ ان پر شب خون مارتا۔ اس طرح وہ نیند بھی بذات خود ایک نعمت تھی اور اس کی وہ کیفیت ایک اور نعمت۔ بہر حال مندرجہ بالا آیت انسان کے اعصاب اور جسم و جان اور مزید سعی و کوشش اور جہاد کی خاطر طاقتوں کی تجدید کیلئے تمام مراحل میں نیند کی تاثیر و افادیت پر تاکید بھی ہے۔

مزید تشریح

نیند ایک مخفی مخلوق

باوجودیکہ نیند اور خواب دونوں ہمارے لئے معمول کی چیزیں ہیں، لیکن ان کے بارے میں دانشوروں نے جس قدر بھی تحقیق اور جستجو سے کام لیا ہے اور اس بارے میں سرتوڑ کوششیں کی ہیں پھر بھی وہ ان کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکے۔

آخر وہ کون سے فعل و افعال اور اثرات و تاثیرات ہوتے ہیں جو انسان کے جسم میں پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے روحانی اور جسمانی سرگرمیوں کا بہت بڑا حصہ رک جاتا ہے اور تمام جسم و روح میں تبدیل رونما ہو جاتی ہے؟ نہ تو وہ کچھ سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی حرکت ظاہر ہوتی ہے اور وہ مردہ وار ایک کونے میں پڑا ہوتا ہے۔ اگر ساری دنیا سیلاب کی لپیٹ میں آجائے، وہ بے خبر سو رہا ہے!

اس بارے میں جس قدر بھی تشریح کی گئی ہے، نظریات پیش کئے گئے ہیں اور مفروضے بیان کئے گئے ہیں پھر بھی نیند کے اسرار سے پردہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر عجیب مسئلہ ''خواب'' کا ہے جو خود روح کی مانند ایک عظیم معمہ شمار ہوتی ہے۔

البتہ ان دونوں چیزوں کی حقیقت اور اسرار کے بارے میں تفصیل سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے کیونکہ مندرجہ بالا آیات نیند کے بے شمار فوائد اور بے حد مفادات کو بیان کر رہی ہیں اور اس کے نعمت ہونے کے پہلو کو اجاگر کر رہی ہیں۔ معتدل نیند ہمیشہ انسان کے روح و اعصاب کی سلامتی کی دلیل ہوتی ہے۔ اسی لئے نفسیاتی مریضوں سے اطباء جو سب سے پہلا اور اہم سوال کرتے ہیں وہ ان کی نیند کی کیفیت کے بارے میں ہوتا ہے۔

نیند کی حالت میں بدن کے اعصاء رئیسہ مثلاً دل اور پھیپھڑے کام کرتے رہتے ہیں لیکن نہایت ہی آہستہ۔اعضاء میں خون کی گردش کم ہوجاتی ہے،مغز کی سرگرمیاں معطل ہوجاتی ہیں اور تمام عضالات بھی آرام میں چلے جاتے ہیں۔یہ امور مجموعی طور پر اس بات کا موجب بن جاتے ہیں کہ مذکورہ چیزیں مزید کام کیلئے اپنے آپ کو ایک مرتبہ پھر آمادہ کرلیں۔نیند کی وجہ سے بدن کے زہریلے مادے ختم ہوجاتے ہیں اور بہت سی بیماریوں کا علان ہوجاتا ہے۔

''روخلین''اپنی کتاب''خواب ازنظر پاولف''میں''درمان باخواب طولانی''کے عنوان سے ایک بحث درج کرتے ہیں اور اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''پاولوف''کے مفروضے کے مطابق نیند حفاظت اور طاقتوں کی تجدید پر مشتمل ایک حالت ہے۔اسی لئے مختلف بیماریوں کے علاج کے ایک عامل کے طور پر اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔روزمرہ کے تجربات سے بھی نیند کے ذریعہ علاج کے نظریئے کی تائید ہوتی ہے۔''

''گہری اور لمبی مدت کی نیند مرض سے شفاء کی ایک علامت ہے کیونکہ ایک طویل المیعاد بیماری کے بعد تجدید طاقت اور قوت اور سلامتی کیلئے مریض کو معمول سے زیادہ سونے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''سویت یونین میں نیند کے ذریعہ علاج معالجہ کی عملی صورت کو زیادہ وسعت ملی ہے اور''شیزوفرنی''(جنون جوانی)جو کہ ایک عام نفسیاتی بیماری ہے کے علاج کیلئے اس طریقہ کار کو پہلی مرتبہ کام میں لایا جاچکا ہے۔''وہ ایک اور جگہ پر کہتے ہیں:

''ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا افراد کو طویل نیند کے ذریعہ علاج کرنے سے واضح نتیجہ نکلا ہے۔۔۔۔۔طولانی نیند جو کہ مکمل آرام واستراحت کی ایک حالت ہوتی ہے وہ اعصاب کے لئے لب لباب کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس سے اعصاب کی طاقت کی تجدید ہوجاتی ہے، داخلی اعضاء کی فعالیت کے عمل کو معتدل بنادیتی ہے اور انسان کی عمومی حالت پر مثبت اثر کرتی ہے۔

جی ہاں! جس ذات نے انسان کو سعی وکوشش اور فعالیت وسرگرمی کیلئے پیدا کیا ہے اس کے تمام وسائل بھی اس کے اختیار میں دے دیئے ہیں جن میں سے ایک نیند اور بیدار کی حالت ہے۔یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں حق تعالیٰ کی حکمت اور تدبیر کی نشانیاں مکمل طور پر واضح اور آشکار ہیں۔

۷۔زمین وآسمان کی وسعتوں میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

''انفسی آیات'' کے ذکر کے بعداب'' آفاقی آیات'' کی باری ہے۔آیئے دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں قرآن کیا کہتا ہے اور آفاق میں اس ذات کی کیا کیا نشانیاں ہیں؟

آسمانوں اور زمین کا مشاہد ہمیشہ سے انسان کیلئے فکر انگیز چلا آرہا ہے لیکن انسان کے علم ودانش نے جوں جوں ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اسرار آمیز بالائی کائنات کی عظمت بھی اس کی آنکھوں میں زیادہ ہوگئی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر دورِ حاضر کے دانشوروں کی نظریں آسمانوں کی عظمت کا تقابل گزشتہ دانشوروں سے کریں تو صحیح معنوں میں ''دریا'' اور قطرہ'' والی بات ہوگئی۔یہ بھی معلوم نہیں کہ'' آنے والی کل'' کا'' آج'' کے ساتھ جب تقابل کیا جائے گا تو شاید اس وقت بھی یہی نہ کہا جائے۔

ان عظیم منظوموں، کہکشاؤں اور ثوابت وسیارستاروں میں کیا ہورہا ہے، وہاں پر کتنے عالم موجود ہیں، ان کی پیدائش کا کب سے آغاز ہوا ہے؟ کیا ان میں کوئی مخلوق رہتی ہے یا نہیں؟ اگر رہتی ہے تو کیا اس کی زندگی بھی ہماری طرح ہے یا اس سے مختلف؟ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوال ایسے ہیں جنہوں نے آسمانوں کے بارے میں متجسس اور محقق انسان کی فکر کو اپنی طرف مصروف رکھا ہوا ہے۔دورِ حاضر کے دانشور کہتے ہیں:

''اس وقت آسمان میں ہمیں کچھ ایسے ستارے بھی نظر آرہے ہیں جن کا وجود آج سے ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے ختم ہو چکا ہے اور وہ اس لئے ہے کہ نہایت ہی دور دراز کے فاصلے کی وجہ سے ان کی روشنی ابھی تک راہ میں ہے اور ہم تک پہنچ رہی ہے جو ہزاروں یا لاکھوں سال پہلے ان ستاروں کے مبداء ومرکز سے چلی تھی۔اگر واقعاً ایسا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔اور یقیناً ہے پھر آسمان کی حقیقتِ وسعت اور بظاہر جو ہمیں نظر آرہی ہے، میں کس قدر فرق ہے؟ اس سوال کا جواب کسی کے بھی پاس نہیں ہے۔(غور کیجئے گا)

اس طرح کے کئی اور سوال بھی ہیں جن کا کسی دانشور کے پاس جواب نہیں ہے۔ ہمارے سامنے اس قسم کے رازوں سے بھرہوئی کائنات ہے۔ایک طرف اس کی عظمت ہے اور دوسری طرف اس حکم فرما نظم اور حساب ہیں، جو اس بے انتہا علم اور قدرت کی غمازی کررہے ہیں جو اس کی تخلیق وآفرینش میں موثر عامل ہیں۔اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اب ہم مل کر مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں:

۱۔۔۔اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ

(آلِ عمران/۱۹۰)

۲۔۔اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلَ وَالنَّهَار۔۔۔۔لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ

(بقرہ/۱۶۴)

۳۔۔۔وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَاَلۡوَانِکُمۡ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ

(روم/۲۲)

۴۔۔اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ

(جاثیہ/۳)

۵۔۔۔خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ

(عنکبوت/۴۴)

۶۔۔اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مَامِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡ بَعۡدِ اِذۡنِهٖ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ

(یونس/۳)

۷۔۔۔وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ

(عنکبوت/۶۱)

۸۔۔۔لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَایَعۡلَمُوۡنَ

(مؤمن/۵۷)

۹۔۔۔قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(ابراہیم/۱۰)

۱۰۔۔۔وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ{}وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمَاهِدُوْنَ

(ذاریات/۴۷،۴۸)

۱۱۔۔۔وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ

(انبیاء/۳۲)

۱۲۔۔۔اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

(رعد/۲)

ترجمہ

۱۔۔۔یقیناً آسمانوں اورزمین کے پیدا کرنے اوررات دن کے آنے جانے میں صاحبانِ عقل کیلئے (روشن) نشانیاں ہیں۔

۲۔۔۔یقیناً آسمانوں اورزمین کے پیدا کرنے اوررات دن کے آنے جانے میں۔۔۔۔(خداوندِ عالم کی ذات پاک اوراس کی وحدانیت کی) ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جوعقل رکھتے اورسوچتے ہیں۔

۳۔۔۔اوراس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اورزمین کی تخلیق اورتمہاری زبانوں اورتمہارے رنگوں کا اختلاف۔اوراس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جوعالم ہیں۔

۴۔۔۔اس میں توشک ہی نہیں کہ آسمانوں اورزمین میں اہل ایمان کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

۵۔۔۔خداوندِ عالم نے آسمانوں اورزمین کو برحق پیدا کیا،اس میں مومنین کیلئے نشانیاں ہے۔

۶۔۔۔تمہارا پروردگار تووہ ہے جس نے آسمانوں اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔پھروہ تخت (قدرت) پر متمکن ہوااور(کائنات کے) کاموں کی تدبیر کی۔اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرنے والانہیں ہے۔یہ ہے خداوندِ

عالم جوتمہارے پروردگار ہے۔لہٰذاتم اسی کی پرستش کرو۔کیاتم غورنہیں کرتے؟

۷۔۔۔اگرتم اُن سے پوچھوکہ آسمانوں اورزمین کوکس نے پیدا کیاہےاورسورج وچاندکوکس نے مسخرکیاہے۔تووہ کہیں گے''اللہ''!تو پھروہ(عبادتِ خداسے) کیوں روگردانی کرتے ہیں؟

۸۔۔۔آسمانوں اورزمین کی پیدائش انسانوں کی پیدائش سے زیادہ اہم ہےلیکن اکثرلوگ نہیں جانتے۔

۹۔۔۔ان کے رسولوں نے ان سے کہا،کیاخداکے بارے میں شک ہے جس خدانے آسمانوں اورزمین کو پیدا کیاہے؟

۱۰۔۔۔ہم نے آسمان کواپنی قدرت سے بنایاہےاور ہمیشہ اسے وسعت دیتے رہتے ہیں۔اورزمین کوبھی ہم نے ہی بچھایااورہم کیسے اچھے بچھانے والے ہیں۔

۱۱۔۔۔اورہم نے آسمان کومحفوظ چھت بنایالیکن وہ لوگ خدا کی آیات سے روگردانی کرتے ہیں۔

۱۲۔۔۔خداوند عالم تووہ ہے جس نے آسمان کو۔۔۔قابل رویت ستون کے بغیر۔۔۔۔۔۔پیدا کیا، پھرعرش پرمتمکن ہوا(اورکائنات کے کاموں کی تدبیرکی باگ ڈورسنبھالی)اورسورج وچاندکومسخرکیا۔

الفاظ کے معانی اورتشریح

''خلق'' کے بارے''مقائیس اللغۃ'' کا کہناہے کہ اصل میں اس کے معنی درمیانی ہیں۔ایک توچیزوں کااندازہ لگانا،اوردوسرے صاف اورمسطح ہونا۔

''راغب'' بھی''مفردات''میں کہتے ہیں کہ اس لفظ کےاصل معنی منظم اورصحیح طریقہ پراندازہ لگاناہیں۔پھرکہتے ہیں:یہ لفظ''بغیرکسی پہلےنمونے اورمادے کی اشیاء کی ایجاد''کے معنی میں بھی استعمال ہوتاہے''کیونکہ ایجادکرنے میں اندازہ لگانااورمنظم کرنابھی ساتھ ہوتاہے۔

پھرکہتے ہیں:''خلقت کے ایک معنی عدم سے معرضِ وجودمیں لاناہوتے ہیں۔جوخداکے ساتھ مخصوص ہے اوردوسرااشیاء کی صورتوں کی تبدیلی اورایک چیزکودوسری چیزمیں تبدیل کرناہوتاہے جوانسانوں کے بارے میں بھی تصورکیاجاسکتاہے۔اس لفظ کوجھوٹ کے معنی میں بھی استعمال کیاجاتاہے(شایداس لئے ہے کہ جوچیزحقیقت نہیں رکھتی وہ اپنے ذہن یاسننے والے کی فکرمیں ایجادکرتی ہے)

''ابن منظور''لسان العرب''میں کہتے ہیں کہ کلامِ عرب میں خلق کے معنی کسی سابقہ نمونہ کے بغیرکسی چیزکومعرضِ وجودمیں لاناہوتے ہیں۔

اس طرح''خلق''کے معنی اگرچہ اشیاءکااندازہ لگانا،یاان کامنظم اورصاف کرناہوتے ہیں۔لیکن بعدمیں اسی مناسبت کے تحت

اشیاء کی ایجاد اور صورت کے تبدیل کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اور اب اس سے یہی معنی ہی فوراً ذہن میں آتے ہیں۔

''سماء'' ارباب لغت کے بقول اس چیز کے معنی میں ہے جو اوپر ہو۔ اسی لئے بعض ارباب لغت اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ لفظ نسبت کے پہلو کا حامل ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ ایک چیز کس دوسری چیز کی نسبت تو ''آسمان'' ہو لیکن تیسری چیز کی نسبت ''زمین'' ہو۔ ''اسم'' بھی اسی مادہ سے مشتق ہے کیونکہ کسی چیز کا نام رکھنا مسمّٰی کی بلندی اور اہمیت کا سبب ہوتا ہے۔

''التحقیق'' کے مصنف کا کہنا ہے کہ ''سماء'' کبھی مادی اور محسوس ہوتا ہے جیسے ''اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَائً'' (خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا) اور کبھی معنوی ہوتا ہے جیسے (قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ۔ بقرہ/ ۱۴۴) یعنی ہم آسمان میں تیری انتظار آمیز نگاہوں کو دیکھتے ہیں۔ ''ابن منظور'' بھی ''لسان العرب'' میں کہتے ہیں ''سمو'' کا معنی علو اور بلندی ہے۔[1]

اسی لئے ''سما'' کے معنی صرف آسمان ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی بلندی ارتقاع اور علو کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن جو آیات اس بحث کیلئے منتخب کی گئی ہیں ان میں عام طور پر آسمان کے معنی میں آیا ہے۔

''ارض'' دراصل ہر چیز کے نچلے حصے کو کہا جاتا ہے اور ''سماء'' کے مقابل میں ہے جو ہر چیز کا بالائی حصہ ہے۔ یہ بات ''مقائیس اللغۃ'' نے کہی ہے۔ لیکن ''راغب'' اس سے ملتی جلتی تفسیر میں کہتے ہیں: ''ارض وہ جرم ہے جو ''سماء'' کے مقابل میں ہے اور ہر چیز کے نچلے حصے کو ''ارض'' کہتے ہیں۔''

کتاب ''التحقیق'' میں آیا ہے کہ ''ارض'' کے مختلف اطلاقات میں جو ایک دوسرے سے وسیع تر ہیں، رہائش گاہ، محلہ، گاؤں، شہر، ملک، کرۂ زمین اور جو کچھ کہ اس آسمان کے نیچے ہے، ان سے پر ارض کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان تمام مفاہیم میں دو شرائط ملحوظ ہیں۔ ایک تو نیچے ہونا اور دوسرا ''اوپر'' کے مقابل میں قرار دپاتا ہے۔

''ارضہ'' (بروزن حَلَقہ) کا معنی دیمک ہے جو زمین سے نکلتی ہے اور لکڑی کو کھا جاتی ہے لطف کی بات ہے کہ ''ارض'' کے معانی میں سے ایک معنی ''زکام کی بیماری'' ہے اور دوسرا ''لرزہ'' یعنی کپکپی۔ (شاید یہ اس لئے ہے کہ اس قسم کی بیماری انسان کو بستر پر ڈال دیتی ہے اور اسے زمین گیر بنا دیتی ہے)[2]

---

[1] کتاب ''العین'' میں خلیل ابن احمد نے بھی ''سماء'' کو ارتفاع اور بلندی کے معنی میں ذکر کیا ہے۔

[2] کتاب ''مقائیس اللغۃ'' مفردات راغب، لسان العرب، مجمع البحرین، اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

بلند آسمان آیتِ حق ہے

زیر بحث آیات کی سب سے پہلی آیت میں پہلے تو آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات دن کے اختلاف کا تذکرہ ہے جو زمین کے سورج کے گرد حرکت کرنے کے نتیجے میں عمل میں آتا ہے۔ پھر فرماتا ہے ''ان کی پیدائش میں اس کی عظمت اور علم وحکمت کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو صاحبان عقل اور دردِ اندیش ہیں۔ (لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ)

جیسا کہ ہم اسی کتاب کی پہلی جلد کے ''شناخت ومعرفت'' کی بحث میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ ''الباب''، ''لب'' کی جمع ہے جس کا معنی خالص اور گہری عقل ہے۔ جو لوگ اس قسم کی عقل اور اندیشے کے حامل ہوتے ہیں وہ زمین آسمان کی تخلیق اور شب وروز کی آمد رفت میں خدا کی ایک دو نہیں بلکہ بہت سی آیات اور نشانیاں دیکھ سکتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسی آیت کے ذیل کے بہت سی تفسیروں میں یہ مشہور ومعروف روایت نقل کی گئی ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ ایک رات حضرت عائشہؓ کے گھر میں آرام فرما رہے تھے ابھی آپؐ کے مبارک بدن نے مکمل استراحت نہیں فرمائی تھی کہ اپنی جگہ سے اُٹھے، لباس پہنا، وضو کیا اور نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ نماز میں معنوں جذبہ کے تحت آپ نے اس قدر آنسو بہائے کہ لباس کے سامنے والا حصہ بھیگ گیا۔ پھر سجدہ میں چلے گئے اور اس قدر روئے کہ زمین تر ہو گئی۔ آپؐ کی یہی حالت طلوعِ صبح تک رہی۔ جب آپؐ کے مخصوص مؤذن بلال آپؐ کو نماز صبح کیلئے لینے آئے تو حضورِ گرامیؐ کو روتا پایا۔ پوچھا یا رسول اللہؐ! آپ کیوں روتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنی رحمت ومغفرت اور عفو ولطف سے نوازا ہوا ہے؟ یہ سن کر سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''میں کیوں نہ روؤں؟ کیا میں خدا کا شاکر بندہ نہ بنوں؟ جب کہ اس رات مجھ پر وہ آیات نازل ہوئی ہیں، جنہوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے؟ پھر آپؐ نے سورۂ آلِ عمران کی یہی آیت اور اس کے بعد کی چار آیات کو تلاوت فرمایا اور آخر میں ارشاد فرمایا: ''وَیْلٌ لِّمَنْ قَرَاَهَا وَلَمْ یَتَفَکَّرْ فِیْهَا'' (افسوس ہے اس پر جو انہیں پڑھتے لیکن ان میں غور وفکر نہ کرے۔)[1]

یہ ٹھیک ہے کہ جو شخص بھی آسمانوں اور دیگر اجرام سماوی کا مشاہدہ کرتا ہے وہی خدا کی آیات کے بارے میں سوچتا ہے لیکن صاحبانِ عقل وخرد اس سے اور بھی زیادہ بہرہ برداری کرتے ہیں۔ وہ آسمان کے ایک ایک چپہ میں قدرتِ الٰہی کے آثار ملاحظہ کرتے ہیں اور ہر منظومے اور ہر کہکشاں اور ان کی منظم اور عجیب حرکات میں ایسے ایسے اسرار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو غیر اولی الالباب نہیں کر پاتے۔

اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ دوسری آیت میں ''اُولِی الْاَلْبَابِ'' کی بجائے ''قَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ'' (وہ لوگ جو عقل سے کام لیتے

---

[1] تفسیر ابوالفتوح جلد ۳ ص ۲۸۴، تفسیر فخر رازی جلد ۹ ص ۱۲۴، روح المعانی جلد ۴ ص ۱۴۰، تفسیر قرطبی جلد ۳ ص ۱۵۵۲ اور دوسری تفسیریں۔

ہیں) تیسری آیت میں ''عالمین'' (صاحبان علم ودانش) اور چوتھی اور پانچویں آیت میں ''مؤمنین'' کا ذکر ہے۔

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مندرجہ بالا صفات میں سے ہر ایک صفت (قوی افکار، قوتِ عقل علم اور ایمان) بیشتر معرفت اور آیاتِ الٰہی سے آگاہی کے لئے پیش خیمہ کی حیثیت رکھتی ہے، جیسا کہ ہم اسی تفسیر کی پہلی جلد میں معرفت کی بحث میں تفصیل سے بتا چکے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ''اُولُو الْاَلْبَابَ'' جن کیلئے آسمان وزمین کی آفرینش کے مشاہدہ کے ساتھ ہی خدا کی معرفت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، قرآن مجید نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

''اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً'' وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کو قیام وقعود کی حالت میں بھی یاد کرتے ہیں اور اس وقت بھی جب وہ پہلو کے بل لیٹے ہوئے ہوں۔ اور آسمان وزمین کی تخلیق کے بارے میں بھی غور وفکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ بے کار پیدا نہیں کیا۔ (آلِ عمران/ ۱۹۱)

یعنی ایک تو ذکر خدا، دوسرے غور وفکر اور تیسرے مقصد تخلیق کی طرف توجہ، انہیں عظمت پروردگار کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے سائنس دان اگر ان تمام جزئیات کو دیکھ کر بھی خدا تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ صرف مخلوق اور معلول تک ہی محدود رہتے ہیں اور علت العلل، خالق اور مقصدِ تخلیق کے بارے میں کوئی ذکر وفکر نہیں کرتے۔

دوسری آیت میں بھی پہلے آیت کی طرح آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے مسئلے کو رات اور دن کے اختلاف یعنی شب وروز کی آمد ورفت (یا سال کے چار موسموں میں ان کا تدریجی فرق) کے ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے جو خود اسی آسمان اور زمین کی اہم پیداوار ہیں۔ اور ان پر ایسا دقیق اور منظم نظام حکم فرمایا ہے کہ ان کے واقع ہونے سے کئی سال قبل آفتاب کے طلوع وغروب اور سال کے ہر موقع اور ہر موسم میں روئے زمین کے کسی بھی خطے اور نقطے کیلئے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جہاں پر بھی دقیق اور صحیح صحیح نظام موجود ہے، وہیں پر عقل اور علم ودانش اس کے پس پردہ حکم فرما ہے۔

تیسری آیت میں آسمانوں اور زمین کی آفرینش جو کہ ''آفاقی آیات'' میں سے ہے، کے ساتھ ہی زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کا تذکرہ کیا ہے جس کا تعلق ''انفسی آیات'' سے ہے ارشاد ہوتا ہے'' اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمان اور زمین کی تخلیق اور زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ''(وَمِنْ اٰیَاتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ)

زبانوں اور رنگوں کا اختلاف، خواہ زبانوں کے فرق کے معنی میں ہو کہ بنی نوع انسان جس کے ذریعہ کلام کرتے ہیں اور ان کے چہروں کے رنگ کا اختلاف ہو، یا صداؤں کی آہنگ اور انسان کی زندگی، طرزِ فکر، ذوق، سلیقہ اور استعداد کا رنگ ہو یا ہر دو، یہ عجیب وغریب قسم کا تنوع جو لوگوں کی ایک دوسرے سے شناسائی اور واقعیت کا سبب ہوتا ہے اور جو دقیق اور حیرت انگیز نظام اس پر حکم فرما ہے، اس عجیب نظام سے مختلف نہیں ہے جو آسمانوں اور زمین پر حکومت کر رہا ہے۔ ہر ایک کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور سب کے سب خداوندِ قادر وقدیر کی ذات پر واضح دلیل ہیں۔

چوتھی اور پانچویں آیت صرف آسمانوں اورزمین کی آفرینش کی طرف اشارہ کررہی ہیں اوراس آفرینش کوآیتِ حق میں شمارکررہی ہیں کیونکہ کسی بھی ضمیمہ کے بغیر یہ عظیم تخلیق بذات خودخداوندِعالم کی روشن آیات میں سے ہے۔البتہ پانچویں آیت میں اس تخلیق کوقانون اورکلیہ کےتحت اوراس کے بامقصد ہونے پرزیادہ رزوردیا گیاہےاورلفظ''بالحق'' کےساتھ اسے واضح کیا یاہے۔

چھٹی آیت میں ایک نئی بات کو بیان کیا گیاہے اوروہ ہے زمین وآسمان کی چھ دن میں تخلیق۔ارشادہوتاہے کہ''تمہارا پروردگاروہی توہے جس نے آسمان اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیاہے۔'' (اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ)

زمین وآسمان کی شش روزہ تخلیق کوقرآن پاک کی سات آیات میں بیان کیا گیاہے۔[1] جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآنِ مجیدنے اس کائنات کی تدریجی تخلیق پرخاص توجہ مبذول فرمائی ہے جوخالق کی عظمت کی ایک اوردلیل ہے۔

بعض میٹریالسٹ یامادہ پرست غیرشعوری طورپر''یوم'' (دن کے معنی پرغورنہ کرتے ہوئے اس طرح کی آیات کو یاتواپنی تنقید کانشانہ بناتے ہیں یاپھران کامذاق اڑاتے ہیں۔[2] وہ یہاں پر''یوم'' کودن کی سفیدی یاچوبیس گھنٹے کا مجموعہ سمجھتے ہیں،حالانکہ ہرایک جانتاہے کہ''یوم''اس معنی کےلحاظ سے زمین کی گردش اورسورج کی چمک کے نتیجے میں معرضِ وجودمیں آتاہے،اورجب زمین وآسمان ہی نہیں تھےتواس معنی کےلحاظ سےشب وروزکیسے وجودمیں آگئے؟

وہ لوگ اس نکتہ سے غافل ہیں کہ''یوم''یااس کےہم معنی لفظ فارسی میں''روز''یاکسی اورزبان میں یہ کلمہ مفہوم اورروزمرہ استعمال کےلحاظ سےمختلف معانی کا حامل ہوتاہے۔ان میں سےایک معنی''دوران'' بھی ہے،خواہ یہ دوران مختصرہو یابہت ہی طویل چنانچہ راغب اپنی لغت کی معروف کتاب مفردات میں کہتے ہیں۔

''الیوم یعبربه عن وقت طلوع الشمس الی غروبهاوقدیعبربه عن مدة من الزمان ای مدة کانت''یوم کے معنی ہیں طلوعِ آفتاب سےغروبِ آفتاب تک کاعرصہ لیکن کبھی زمانے کی مدت کیلئے بھی۔۔۔۔۔۔۔۔خواہ وہ کتنی ہی ہو۔۔۔۔استعمال ہوتاہے۔روزمرہ کے استعمالات میں بھی ہم کہتے ہیں''ایک دن لوگ سفرکیلئے جانوروں پرسوارہوتے تھےاورآج تیزرفتارٹرانسپورٹ ذرائع پر۔'' حالانکہ ان دونوں تعبیرات (ایک دن اورآج)میں ہرایک ایک دورانیہ کی طرف اشارہ ہے۔حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ایک مشہورحدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

''وَاعْلَمْ بِاَنَّ الدَّهْرَیَوْمَانِ :یَوْمٌ لَّكَ وَیَوْمٌ عَلَیْكَ''جان لوکہ دنیا کی ساری زندگی دوہی دن توہے،ایک دن

---

[1] سورہ فرقان۔۵۹،سورہ سجدہ۔۴،سورہ ق۔۳۸،سورہ حدید۔۴،سورہ اعراف۔۵۴،سورہ ہود۔۷

[2] ماتریاسیم تاریخیص ۸۷

تمہارے فائدہ میں اور ایک روز تمہارے نقصان میں۔[1]

حتیٰ کہ تعبیرات میں تو ساری کی ساری دنیا ایک دن اور ساری کی ساری آخرت ایک دن کے عنوان سے شمار کی گئی ہے۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

"وَاِنَّ الْیَوْمَ عَمَلٌ بِلَاحِسَابٍ وَغَدًا حِسَابٌ وَّلَاعَمَلٌ" آج عمل کا دن ہے نہ کہ حساب کا اور کل حساب کا دن ہے نہ کہ عمل کا"۔

اس بارمیں کلیمؔ کاشانی کا مشہور شعر بھی ایک لطیف تعبیر ہے، کلیمؔ کہتے ہیں ؎

بدنامی حیات دو روزی نبود بیش
آں ہم کلیمؔ باتو گویم چسان گزشت؟
یک روز صرفِ بستنِ دل شد بہ ایں وآں
روزِ گر بہ کندِ دل ایں وآں گذشت

(زندگی کی بدنامی دو دن سے زیادہ نہیں تھی، وہ بھی کلیمؔ میں تجھے بتاؤں کہ کیسے گزرے؟
ایک دن تو اِس سے اور اُس سے دل لگانے میں گذر گیا اور دوسرا دن اُس سے اور اِس سے دل توڑنے میں)

یا جیسا کہ اُردو کا ایک شعر ہے:

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

(از مترجم)

تو گویا زمین و آسمان کی چھ دن میں تخلیق سے مراد چھ دورانیے ہیں اور ممکن ہے کہ ان میں سے ہر ایک دورانیہ کروڑوں بلکہ اربوں سال پر مشتمل ہو۔ واضح سی بات ہے کہ اس عدد کے خلاف کوئی علمی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔[2]

بلکہ ممکن ہے کہ یہ چھ دورانیہ کچھ اس طرح سے ہوں۔

(ا) جس دن ساری کائنات، گیس کی صورت میں تھی اور یک نہایت ہی عظیم گولے کی مانند اپنے محور کے گرد گھوم رہی تھی۔

---

[1] نہج البلاغہ خط نمبر ۷۲

[2] تورات اور انجیل کے الفاظ کی شرح پر مشتمل کتاب "قاموس مقدس" میں بھی زمین و آسمان کی چھ دن کی پیدائش کے مسئلہ کے بارے میں ایک شرح لکھی گئی ہے، جو بعض جہات سے ہماری مذکورہ بالا گفتگو سے تقریباً مختلف نہیں ہے، ہر چند کہ بعض باتیں خرافات کی مظہر ہیں، مثلاً خداوندِ عالم کا ساتویں دن آرام کرنا وغیرہ، (قاموس مقدس ص ۸۴ لفظ آفرینش

(۲) جس دوران کئی عظیم تودے اس سے جدا ہوئے اور مرکزی تودے کے گرد گھومنے لگے۔

(۳) جس دوران بعض تودوں نے اپنی دورانی حرکت کی بناء پر ہمارے منظومہ شمسی جیسے منظومے تشکیل دیئے۔

(۴) جس دوران زمین ٹھنڈی ہوکر زندگی کے قابل ہوگئی، پانی ظاہر ہوا اور سمندر تشکیل پائے۔

(۵) جس دوران درخت اور دیگر نباتات معرضِ وجود میں آئے اور زمینی غذائیں تیار ہوئیں۔

(۶) جس دوران حیوانات اور پھر انسان روئے زمین پر ظاہر ہوئے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آٹھ آیات میں تو آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو چھ دن میں بیان کیا گیا ہے اور چار مقامات پر صرف آسمان اور زمین کی آفرینش کا ذکر ہے۔[۱] اور تین مقامات پر زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کا بیان ہے۔[۲]

صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں جمالی طور پر ان چھ ادوار کا ذکر ہے، دو دورانیے آسمانوں کی تخلیق کیلئے، دو دورانیے زمین کی آفرینش کیلئے اور دو دورانیے نباتات وحیوانات کی پیدائش کیلئے۔ (اَلَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ۔۔۔وَقَدَّرَ فِیْهَآ اَقْوَاتَهَا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ)[۳]

پس بنابریں مذکورہ بالا چھ دورانیے، آسمانوں، زمین اور ان کی مختلف موجودات کی آفرینش سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس بارے میں مزید تفصیل کیلئے تفسیر نمونہ کی ان جلدوں کا مطالعہ فرمائیں جو مذکورہ بالا آیا۔ کی تفسیر میں لکھی ہیں (جلد ششم سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کی تفسیر اور جلد بیستم سورہ حٰمٓ السجدۃ کی ۱۰ ویں آیت کی تفسیر)

زیر بحث آیات میں سے ساتویں آیت کہتی ہے ''یہ بات تو بت پرستوں کے نزدیک بھی تسلیم شدہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور سورج اور چاند کا مسخر کرے والا صرف خدا ہی ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ عظیم کائنات اور عجیب نظام بتوں کی مخلوق نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کا وجدان وضمیر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ سب اس خدا کی مخلوق ہیں جو عالم بھی ہے اور قادر بھی ہے۔ (وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ)

بنابریں صرف دانشمند اور صاحبان فکر ونظر ہی اسرارِ آفرینش کا مطالعہ کرکے اس کی ذات پاک کا اعتراف نہیں کرتے بلکہ ان پڑھ اور جاہل بت پرست بھی اس نظام کا مشاہدہ کرکے اس کی ذاتِ اقدس سے آشنا ہو جاتے ہیں، ہر چند کہ عملی طور پر خرافات کی وجہ سے وادیِ شرک میں سرگرداں ہیں۔

آٹھویں آیت اگرچہ اپنی بعد کی آیات کے قرینہ سے روزِ قیامت اور یوم نشور کا پتہ دیتی ہے اور کہتی ہے ''جو ذات آسمانوں

---

[۱] حدید/ ۴، اعراف/ ۵۴، یونس/ ۳، ہود/ ۷

[۲] فرقان/ ۵۹، سجدہ/ ۴، ق/ ۳۸

[۳] سورہ حٰمٓ السجدۃ/ ۹۔۱۰)

اورزمین کواس عظمت کے ساتھ پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ مُردوں کودوبارہ زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہے، کیونکہ آسمانوں اورزمین کی تخلیق، انسانوں کی تخلیق سے زیادہ اہم ہے''۔

لیکن پھر بھی خداشناسی کے مسئلہ کی روشن دلیل ہے کیونکہ انسان کا صرف وجود ہی نہیں بلکہ آنکھ اورکان جیسے اس کے اعضاء بلکہ ان اعضاء میں سے ہرایک خلیہ بھی اس قدرپیچیدگی اسرارورموزاورنظامات کا حامل ہے جو بذات خودحق کی ایک روشن آیت بن سکتا ہے ۔بنابرین ''آسمان وزمین کی آفرینش'' جوانسان کی آفرینش سے کئی گنابرتراور بالاتر ہے وہ تواس کی عظمت کی بدر جہاروشن آیت اوردلیل ہوگی۔(لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ)

یہ صحیح ہے کہ اگرانسان کی تخلیق کا جداگانہ طور پراس کائنات کے اجزاء سے تقابل کیا جائے تواس کی خلقت یقیناہرجزو سے بالاتر ہے،لیکن یقیناً اگراس کا کُل آسمان اوزمین سے تقابل کیا جائے توان کی تخلیق ہی برتراور بالاتر ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے یہ باتیں اس وقت بیان کی ہیں جب انسان خصوصاً حجاز کے اس پسماندہ ماحول میں۔۔۔۔آسمانوں کی عظمت سے بے بہرہ تھے،ان کی اس بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات شاید یہ تھیں کہ وہ آسمان کواپنے قریب ایسی نیلگوں چھت سمجھتے تھے جس میں نقرئی ستاروں کی میخیں گڑی ہوئی ہیں۔

لیکن آج ہم اس آیت کے عمیق مفہوم کوبخوبی درک کررہے ہیں، کیونکہ دانشوروں نے عظیم ٹیلی سکوپوں کے ذریعہ اس چوڑے چکلے آسمان کودیکھ لیاہے اوروہاں سے اس پرحکم فرمانظام اورخالق کی عظمت کے حیرت انگیزعجائبات ہمارے لئے ارمغان لائے ہیں۔ اورکیامعلوم کہ جوکچھ وہ آج دیکھ رہے ہیں وہ اس عالم کی عظمت کاعشرعشیر بھی نہ ہو! شاید کل یہ حقیقت بھی برملاہوجائے۔ بظاہراسی وجہ سے آیت کے آخر میں ارشادہوتاہے۔لیکن اکثرلوگ نہیں جانتے۔''(وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ)[1]

نویں آیت میں توحیداورخداشناسی کے درس کے سلسلے میں ایک استفہامی انکارکے طور پرارشادہوتاہے''کیاوہ خداجوآسمان اورزمین کا خالق اورشگافتہ کرنے والاہے،اس کے وجودمیں کسی قسم کا شک وشبہ ہے؟''(اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)

مزے کی بات یہ ہے کہ''فاطر''دراصل''شگافتہ کرنے والا''کے معنی میں ہےاوراس کلمہ کویہاں پر یاتواس لئے استعمال کیا گیاہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق کے موقع پرگویاعدم کا تاریک پردہ شگافتہ کیا گیااورنورِہستی آسمان وزمین کا وجودآشکارہوگیا، یاپھراس چیز کی طرف اشارہ ہے جوآج ماہرین فلکیات کے درمیان مشہورہے کہ یہ تمام کُرے اورسارے منظومے پہلے دن توایک تودے کی صورت میں ایک دوسر

---

[1] ''لایعلمون'' (وہ نہیں جانتے) کا مفعول کیاہے،اس بارسے میں کئی احتمالات بیان کئے گئے ہیں۔پہلا یہ کہ لوگ انسانوں کی نسبت ان کی عظمت کونہیں جانتے۔ دوسرا یہ کہ وہ حق کی بے انتہا قدرت سے بےخبرہیں۔تیسرا یہ کہ لوگ معاد کے مسئلہ پراس کی قدرت کونہیں جانتے یا یہ کہ وہ جانتے تو ہیں لیکن چونکہ اپنے علم کے مطابق قدم نہیں اٹھاتے،درحقیقت وہ جاہلوں،نادانوں کے حکم میں ہیں(لیکن بعیدنہیں ہے کہ پہلے تینوں معانی آیت میں جمع ہوں جیسا کہ کہا جاتا ہے۔متعلق کا حذف کرنا عموم کی دلیل ہے۔

ے کے ساتھ مربوط تھے اپنے محور کے گرد گھومنے اور مرکز سے گریز طاقت کی وجہ سے شگافتہ ہو گئے اور ان سے کچھ ٹکڑے باہر نکل گئے، جن سے منظومے کہکشائیں اور ثوابت وسیارو وجود میں آ گئے۔[1]

بہرحال اس آیت کے مخاطبین خواہ مشرکین ہوں یا وجودِ خدا کے منکرین یا دونوں، آیت سے اس حقیقت کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ آسمان وزمین کی آفرینش کے بارے میں خوب غور وفکر کافی ہے جس سے خدا کے وجود کے بارے میں اور اس کی وحدانیت اور قدرت کے متعلق انسان کے دل میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے شک وشبہ کو دور کر دیتا ہے۔

دسویں آیت میں آسمان وزمین کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا'' (وَالسَّمَآءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ)

اس طرح کے عظیم عالموں کو بنانے کیلئے یقیناً قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو خداوندِ قدیر کے علاوہ کسی اور کی قدرت نہیں ہوسکتی۔

بعد میں فرماتا ہے ''ہم ہمیشہ اسے وسعت دیتے رہتے ہیں'' (وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ)

اگرچہ کچھ مفسرین نے اس کے معنی ''بارش کے نازل کرنے یا اس طرح کے دوسرے طریقوں سے رزق وروزی میں وسعت'' کئے ہیں۔[2] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے معنی نہایت ہی اہم اور نہایت ہی دقیق ہیں جو دورِ حاضر کے دانشوروں کیلئے ثابت ہو چکا ہے، جس نے قرآنِ مجید کے ایک اور علمی معجزہ سے پردہ اٹھا دیا ہے اور وہ یہ کہ یہ دنیا ہمیشہ وسیع ہوتی جارہی ہے اور ستارے، منظومے اور کہکشائیں بڑی تیزی سے ایک دوسرے سے جدا ہوتی جارہی ہیں۔

''جارج گاموف'' نامی ایک مشہور دانشور اپنی کتاب ''آغاز وانجامِ جہان'' میں لکھتے ہیں:

''اس کائنات کی فضا جواربوں کہکشاؤں سے تشکیل پا چکی ہے، بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتی چلی جارہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری کائنات جمود وسکون کا شکار نہیں بلکہ اس کا پھیلاؤ اور وسعت پذیری مسلم ہے۔ اس بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ ہماری یہ دنیا دن بدن پھیلتی جارہی ہے، جہان شناسی کے معمہ کے خزانے کی اصل چابی ہے۔ کیونکہ اگر آج یہ کائنات پھیلاؤ کی حالت میں ہو تو لازم آئے گا کہ ایک ایسا تھا جب یہ کائنات نہایت ہی سمٹی ہوئی تھی۔[3]

اور عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ وسعت پذیر اس قدر تیزی کے ساتھ انجام پارہی ہے کہ جو بقول ''فورڈ ہوئل'':

---

[1] راغب مفردات میں کہتے ہیں: ''فُطُر'' (بروزن سَتر) طول یعنی لمبائی میں چیرنے اور شگافتہ کرنے کے معنی میں ہے۔ لیکن پھر اس کا استعمال ایجاد کے معنی میں ہونے لگا ہے اور ''فِطر'' (بروزن مِتر) افطار اور ترک روزہ کے معنی میں ہے گویا روزہ کو شگافتہ کر دیا جاتا ہے۔ (اور فطرت بمعنی خلقت بھی اسی مادہ سے لیا گیا ہے)

[2] بعض مفسرین نے ''موسعون'' کی بمعنی ''قادرون'' کے تفسیر کی ہے کیونکہ ''وسعت'' بمعنی ''قدرت'' کے بھی آتا ہے لیکن ''وسیع'' کرنا اور وسعت دنیا کا معنی زیادہ واضح اور آشکار ہے

[3] کتاب ''آغاز وانجام جہاں'' ص ۷۷ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

''گُروں کی بڑی تیزی کے ساتھ عقب نشینی کی تیز ترین رفتار جس کا اب تک اندازہ لگایا جاچکا ہے، تقریباً ۶۶ ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے ۔۔۔۔۔۔جو تصویریں آسمان سے لی جاچکی ہیں یہ اہم انکشاف کرتی ہیں کہ دور ترین کہکشاؤں کا نزدیک ترین کہکشاؤں سے فاصلہ بہت بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتا جارہا ہے''[1]

ان گُرات اور نہایت ہی عظیم منظوموں کے پسِ پشت کونسی ایسی عظیم طاقت ہے جو انہیں نہایت ہی کم نظیر رفتار کے ساتھ مرکزِ کائنات سے دور کررہی ہے اور وہ بھی اس انداز کے ساتھ کہ وہ اس حرکت کے نتیجے میں تباہی کا شکار نہیں ہوتے؟

پھر زمین کی طرح اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''ہم نے اسے بچھایا اور کیا خوب بچھانے والے ہیں۔''

''فرش'' کی تعبیر ایک طرف اور ''ماھدون'' جو کہ ''مھد'' کے مادہ سے ہے، دوسری طرف، بہت سی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے جو زمین کی پیدائش کے آغاز ہی سے عمل میں آرہی ہیں اور اُسے انسانی زندگی کیلئے آمادہ کردیا ہے اور اسے آرام بستر یا گہوارے کی مانند بنادیا ہے (توجہ رہے کہ ''مہد'' کے معنی گہوارہ یا ہر وہ جگہ ہے جو بچے کے آرام کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

یہ سب اس ذاتِ لایزال ولاشریک کی قدرت اور علم کی نشانیاں ہیں۔

گیارہویں آیت میں آسمان کی آفرینش کے بارے میں ایک نئی تعبیر کے سلسلے میں ارشاد ہورہا ہے ''ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ہے۔'' (وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظاً)

کیا اس کائنات میں محفوظ چھت کی صورت میں کوئی آسمان موجود ہے جو ہر قسم کے خارجی اثر ونفوذ سے محفوظ ہو؟

جی ہاں! ممکن ہے یہاں پر آسمان سے گُرۂ ہوا کی طرف اشارہ ہو جو زمین کے اطراف کو گھیرے ہوئے اور جس کی ضخامت سینکڑوں کلومیٹر ہے۔ یہ ضخامت جو لطیف ہوا کے جوہر اور دوسری گیسوں پر مشتمل ہے اور گول چھت کی صورت میں کرہ زمین کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور وہ اس قدر مستحکم اور طاقت ور ہے کہ بعض دانشوروں کے بقول وہ ایک ایسی فولادی چھت کی مانند ہے جس کی موٹائی دس میٹر کے برابر قوت مزاحمت رکھی ہے۔ وہ صرف مہلک آسمانی شعاعوں کی نفوذ ہی سے مانع نہیں ہوتی بلکہ ان پتھروں کو بھی روک لیتی ہے جو ہمیشہ کرہ زمین کی طرف جذب ہوتے رہتے ہیں کیونکہ وہ جس رفتار سے اس ہوائی ضخامت سے ٹکراتے رہتے ہیں، ایک طرف تو ان کی حرکت کو ایک طاقت ور رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف ان میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ جل کر بھسم ہوجاتے ہیں۔

اب آپ سوچیں کہ اگر ہوا کی یہ ضخیم چھت نہ ہوتی اور زمین پر رہنے والی مخلوق رات دن لاکھوں کروڑوں چھوٹے بڑے پتھروں کی بمباری کا نشانہ بنتی رہتی تو اس دنیا کا کیا بنتا؟ کیا ''زمین کے گہوارے'' میں آرام وسکون کا وجود ہوتا؟ کیا اسے آرام واستراحت کا گہوارہ اور آغوش کہا جاسکتا تھا؟

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس مقام پر ایک مشہور دانشور بنام ''فرانک آلن'' کی گفتگو کو بھی سنتے چلیں جو انہوں نے اپنی کتاب ''نجوم

---

[1] مرزہائے نجوم ص ۳۳۸

برائے ہمہ''میں درج کی ہے۔وہ کہتے ہیں:

''جوفضا سطح زمین پرزندگی کی حفاظت کیلئے تشکیل پا چکی ہے وہ (تقریبا ۸ سوکلومیٹر موٹی ہے) اور یہ وہ ضخامت اور موٹائی ہے جو زمین کیلئے زرہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اُسے ہرروز بیس ملین (۲ کروڑ) ایسے آسمانی پتھروں کی تباہی سے بچاتی ہے جن کی رفتار (۵۰) پچاس کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے!''[1]

یہ ٹھیک ہے کہ جوشہابئے زمین پرگرتے ہیں ان میں سے بعض کا وزن 1/1000 گرام (ایک ملی گرام) ہوتا ہے،لیکن حد سے زیادہ تیز رفتاری کی وجہ سے اس کی طاقت ایٹم بم کے ذروں کے برابر ہوتی ہے۔

البتہ بعض اوقات ان شہابیوں کا حجم اور ثقل اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ وہ فضا کی موٹائی اور ضخامت کو عبور کر کے سطح زمین تک پہنچ جاتے ہیں۔ایسے شہابیوں میں سے ایک سائبیریا کا مشہوراور عظیم شہابیہ ہے جو ۱۹۰۸ء میں زمین پرگرا تھا،اوراسکا قطراس قدرزیادہ تھا کہ اس سے چالیس کلومیٹر رقبہ متاثر ہوا جس سے زبردست تباہی پھیل گئی تھی (گویا خداوندِ عالم نے اس ذریعہ سے لوگوں کو خبردار کیا تھا کہ ذرا سوچو!اگرتم پر ایسے پتھروں کی بارش ہوتی رہے تو تمہارا کیا حشر ہو؟)

حتیٰ کہ اگرزمین کے اطراف میں فضا تو ہوتی لیکن اس قدرضخیم نہیں بلکہ قدرے باریک ہوتی تو''رازِ آفرینش'' کے مصنف ''کرسی موریسن'' کے بقول:

''روزانہ چندملین آسمانی جرم اورثابت شہابئے زمین پرگرتے رہتے (اورکرہ زمین رہنے کے قابل نہ ہوتا)[2]

البتہ فراموش نہ کریں کہ اگر یہ محفوظ چھت نہ ہوتی تو مہلک آسمانی شعاعیں زمین پر وہ تباہی پھیلاتیں جو مذکورہ پتھروں کی تباہی سے کئی گنا زیادہ ہوتی۔اورشاید یہی وجوہات ہیں کہ آیت کے آخر میں فرماتا ہے''وہ (کفار) لوگ زمین میں آیاتِ خداوندی سے روگردان ہیں''(وَهُمْ عَنْ اٰيَاتِهَا مُعْرِضُوْنَ)

بارہویں اورآخرآیت میں آسمانوں کی ایک اورخصوصیت کی طرف اشارہ رکرتے ہوئے قرآن مجید کے ایک اورعلمی معجزہ کو بیان کیا گیا ہے۔ارشادہوتا ہے''خداوندِ عالم وہی تو ہے جس نے آسمانوں کوایسے ستونوں کے بغیر بلند کیا ہے جنہیں تم دیکھ سکو''(اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا)

یہ تعبیراس بات کی غماز ہے کہ آسمان ،ستونوں پراستوار ہیں لیکن وہ ستون قابلِ مشاہدہ نہیں ہیں۔یہ ستون ''جاذبہ''اور''دافعہ''(مرکزگریز طاقتوں کے) قانون کے اعتدال وتوازن پرقائم ہونے کے علاوہ اورکیا ہوسکتے ہیں؟''جاذبہ''اور''دافعہ'' کا اعتدال اورتوازن ایک نہایت ہی عظیم طاقت ورستون ہے جو دیکھنے میں نہیں آتا۔اس نے منظومہ شمسی اوردیگرمنظوموں کواپنے اپنے مدار پرقائم

---

[1] کتاب''نجوم برائے ہمہ''ص ۷۵

[2] رازآفرینش ناانس ص ۴۳

اور برقرار رکھا ہوا ہے۔ انہیں ایک دوسرے پر گرنے سے روکا ہوا ہے اور ساتھ ہی ان کو ایک دوسرے سے دوڑ ہونے سے بھی بچایا ہوا ہے تا کہ وہ آپس میں دور ہو کر مکمل طور پر جدا نہ ہو جائیں۔

اس بات پر توجہ رہے کہ لفظ 'عمدٌ'' (بروزن صَمَد) اسم جمع ہے جو 'عمود' کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ''ستون'' ہے اگر قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ ''آسمانوں میں ستون نہیں ہیں'' تو کافی تھا کہ اتنا کہہ دیتا ''رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ'' لیکن ''ترونھا'' کے جملہ کا اضافہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ یہاں پر ایسے ستونوں کی نفی ہے جو قابل رؤیت ہیں، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ستون تو ہیں لیکن دکھائی نہیں دیتے۔ اسی لئے حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام بعض نادان لوگوں کے جواب میں فرماتے ہیں جو یہ کہا کرتے تھے کہ ''آسمانوں کے ستون نہیں ہیں'':

''سبحان الله اليس الله يقول بغير عمد ترونها'' یعنی سبحان اللہ! کیا خداوندِ عالم نہیں فرماتا کہ ان ستونوں کے بغیر جو تم دیکھ سکو؟'' تو دوسرا شخص کہتا ''جی ہاں!'' پھر آپؑ فرماتے:

''ثم عمد ولكن لا ترونها'' تو ستون تو ہیں لیکن نہیں دیکھ پاتے۔[1]

یہی چیز حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ایک دلچسپ فرمان میں بھی ذکر ہو چکی ہے، جو آپ نے ''عمود من نور'' (نور کا ستون) کے تحت ارشاد فرمایا۔ چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں:

''هذه النجوم التي في السماء مدائن مثل المدائن التي في الارض مربوطة كل مدينة الى عمود من نور'' یہ سارے جو کہ آسمان میں ہیں، تمہارے شہروں کی مانند ہیں جو روئے زمین پر ہیں، جن میں سے ہر ایک شہر دوسرے شہر کے ساتھ نور کے ایک ستون کے ذریعہ ملا ہوا ہے۔[2]

اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علماء متقدمین کے زمانے میں جب کہ ''جاذبہ'' اور ''رافعہ'' کا قانون واضح نہیں ہوا تھا، بعض مفسرین نے وہی تفسیر کی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ آیت کا مضمون بتاتا ہے کہ آسمانوں میں ستون تو ہیں لیکن دکھائی نہیں دیتے، ہر چند کہ بعض حضرات نے ان غیر مرئی ستونوں کو قدرتِ خدا سے تعبیر کیا ہے۔[3]

بہر حال یہ خداوندِ عالم کی عظیم آیات میں سے ایک ہے کہ ان طاقت ور نا قابل رؤیت ستونوں اور نظاموں کے ذریعہ آسمانی کروں کو قائم اور برقرار رکھا ہوا ہے جو جاذبہ اور رافعہ کے قانون پر حکم فرما ہیں اور اس توازن میں تھوڑی سی کم بیشی پیدا ہو جائے تو یا تو وہ بڑی شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے جا ٹکرائیں یا پھر ایک دوسرے سے اس حد تک دور ہو جائیں کہ ان کا آپس میں کسی قسم کا رابطہ ہی نہ رہے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲، ص ۲۷۸

[2] بحار الانوار جلد ۵۵ ص ۹۱

[3] مجمع البیان جلد ۵ ص ۲۷۴۔ روح المعانی جلد ۱۳ ص ۷۸۔ تفسیر فخر رازی جلد ۸ ص ۲۳۲ اور قرطبی جلد ۵ ص ۳۵۰۸

نتیجہ

اگرچہ قرآن مجید میں زمین وآسمان کی آفرینش سے متعلق آیات صرف وہی نہیں ہیں جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اور اگر ہم ''قرآن مجید میں آسمان اور زمین'' کے موضوع کے تحت ہی گفتگو کرنا شروع کر دیں تو یہ ایک مستقل کتاب بن جائے۔[1] لیکن یہی بارہ آیات جو ہم نے نمونہ اور خلاصہ کے طور پر اوپر ذکر کی ہیں، خداشناسی کی بحث اور عالمِ اکبر میں اس کی نشانیوں کے سلسلے میں بڑی حد تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں اور بتا سکتی ہیں کہ اس عظیم تخلیق میں یقیناً راہِ حق کے راہیوں کے لئے بہت نشانیاں موجود ہیں۔ اس عظیم اور اسرار بھری کتاب کا مطالعہ روز بروز اس سے نزدیک تر کر دیتا ہے، اسکے عشق کا پیمانہ لبریز تر کر دیتا ہے اور ہمیشہ زبان پر یہ ورد جاری رہتا ہے کہ ''رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً'' (خداوندا! تو نے اس وسیع وعریض جہان کو باطل اور بے فائدہ خلق نہیں فرمایا)

چند ضروری وضاحتیں

۱۔ آسمان کی عظمت اور وسعت

کوئی شخص اچھی طرح نہیں جانتا کہ آسمانوں کی کیا وسعت اور چوڑائی ہے۔ ہم تو صرف یہی جانتے ہیں کہ انسان کے علم ودانش نے جس قدر ترقی کی ہے انسان کی نگاہ میں آسمانوں کی عظمت بھی اسی قدر بڑھ گئی ہے۔ یعنی ان کے کئی پہلو دریافت ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں دانشور اور ماہرین فلکیات کی آخری معلومات ہمیں بتاتی ہیں کہ:

''ہمارا منظومہ شمسی جو اسی کہکشاں سے تعلق رکھتا ہے، یہ کہکشاں جو درحقیقت ستاروں کا ایک شہر ہے اور جہاں تک دانشوروں کی تحقیق کا تعلق ہے اس میں سو ملین (سو ارب) ستارے موجود ہیں، جن میں ہمارا سورج اسکے متوسط اور اگر اس عدد کو سو ارب سے ضرب دیں تو نتیجہ سو ملین ارب گنا زیادہ ہے۔

اگر اس حساب کے ساتھ ایک اور حساب کا اضافہ کر دیں جو دانشوروں کی آخری تحقیق کا نتیجہ ہے، یعنی اس کائنات میں ہماری کہکشاں جیسی کم از کم ایک ارب کہکشائیں دریافت ہو چکی ہیں، تو اس موقعہ پر انسانی عقل بے ساختہ طور پر اس بات کا اعتراف کرے گی کہ عظمت اور بزرگی صرف اسی ذات کبریا کیلئے خاص ہے جس نے اس بے انتہا کائنات کو خلق فرمایا ہے۔ (ایک بار پھر مذکورہ اعداد کا مطالعہ فرمائیں اور اس ذات ذوالجلال کی عظمت کے بارے میں غور فرمائیں)

پھر یہ کہ اعداد وشمار انسان کی زمانہ حال کی تحقیق اور علم وآگاہی سے متعلق ہیں، اور معلوم نہیں کہ مستقبل میں کتنے جدید عوالم اور کائناتیں

---

[1] قرآن مجید میں تین سو مرتبہ لفظ ''سمار'' مفرد اور لفظ ''سماوات'' جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔

دریافت ہوں؟اس موقعہ پر آسمانوں کی عظمت کے بارے میں ''پالومار'' رصدخانہ کی شہادت قابلِ توجہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

''جب تک پالومار رصدخانہ کی (عظم) دوربین ایجاد نہیں ہوئی تھی اس وقت تک اس دنیا کی وسعت پانچ سونوری سال سے زیادہ نہیں تھی (نوری سال سے مراد اس فاصلے کی مقدار ہے جسے روشنی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے ایک سال تک طے کرتی ہے۔اور تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کا مقصد ہے گویا آنکھ جھپکنے کے دوران اس پورے کرہ ارضی کا سات بار چکر) لیکن اس دوربین نے ہماری دنیا کو ایک ہزار ملین (ایک ارب) نوری سال تک پہنچا دیا ہے جس کے نتیجہ میں کئی لاکھ جدید کہکشائیں دریافت ہوئی ہیں جن میں سے کچھ تو ایک ہزار ملین (ایک ارب) نوری سال ہم سے دور ہیں اور اس ایک ہزار ملین نوری سال کے فاصلے کے بعد عظیم، مہیب اور تاریک فضا دکھائی دیتی ہے جس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

لیکن کسی قسم کے شک وشبہ کے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس مہیب اور تاریک فضا میں بھی لاکھوں کروڑوں کہکشائیں موجود ہیں اور جو دنیا ہماری جانب ہے وہ انہی کہکشاؤں کی کشش کی وجہ سے محفوظ ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ جس دنیا کو ہم دیکھ رہے ہیں وہ ایک عظیم ترین دنیا کے مقابلے میں ایک حقیر اور چھوٹے سے بے مقدار ذرہ سے زیادہ نہیں ہے۔اسکے باوجود پھر بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس دوسری دنیا کے اس پار کوئی اور دنیا موجود نہ ہو۔[1]

۲۔زمین وآسمان پر حکم فرما جچے تلے قوانین

عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ چیزیں جیسی عظیم ہوں گی ان پر حکم فرما قوانین اتنے ظریف نہیں ہوں گے، جب کہ یہ بات اس وسیع وعریض کائنات پر صادق نہیں آتی۔یعنی یہ کائنات عجیب وغریب انداز میں وسیع وعریض ہونے کے باوجود نہایت دقیق، پیچیدہ اور ظریف قوانین کی حامل ہے۔اس مدعا کی صداقت کیلئے کافی ہے کہ مندرجہ ذیل امور پر غور کیا جائے۔

(الف) ہم سب جانتے ہیں کہ آخر کار انسان اس مہم میں کامیاب ہو ہی گیا کہ فضائی گاڑی ایجاد کر کے دو افراد کو کرہ ماہ کے اس حصے پر اتارے جو دانشوروں نے متعین کر دیا تھا۔اور پھر اُسی طرح انہیں واپس بھی لے آیا گیا۔اب اس بارے میں آپ اچھی طرح غور فرمائیں کہ تین دن کی اس مدتِ میں جب کہ یہ گاڑی زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ طے کر رہی تھی، اس دوران زمین اپنے محور کے گرد بھی گھوم رہی تھی اور آسمان میں سورج کے گرد اپنی جگہ کو بھی تبدیل کر رہی تھی۔اس طرح چاند ہے کہ اپنے محور کے گرد گھوم رہا تھا اور کرہِ ارض کے اطراف میں بھی حرکت کر رہا تھا۔یہ حرکتیں کس قدر جچی تلی، منظم اور حساب شدہ ہونی چاہئیں کہ سائنس دان کمپیوٹر کے ذریعہ سے کرہِ زمین اور کرہ مادہ میں تبدیلیوں اور حرکتوں کا صحیح صحیح اندازہ لگا کر فضائی گاڑی کو چاند کی طرف روانہ کریں اور وہ اپنے صحیح ٹھکانے پر جا کر اُتر جائے اور پھر وہاں سے واپس زمین کو آجائے۔اگر ان مختلف حرکات میں سے کسی ایک میں تھوڑی سی بھی کمی بیشی ہوتی اور ان میں ایک لمحہ کا بھی فرق ہوتا تو یقیناً دانشوروں کے تمام

---

[1] رسالہ ''فضا'' شمارہ ۵۶ مجریہ فروردین ماہ ۱۳۵۱ ہجری شمسی

اندازے اور حسابات غلط ہوجاتے اور ان کا کام بگڑ جاتا۔ کائنات کا یہ جچا تُلا نظام ہی تھا جس نے انسان کو اس قدر عظیم کارنامہ سرانجام دینے کی اجازت دی کہ وہ کرہِ ماہ کی معین اور دل خواہ جگہ پر اس گاڑی کو اتارے۔

(ب) ماہرین فلکیات بیسیوں سال قبل چاند اور سورج گرہنوں کے بارے میں درپیش حوادث کا حساب اور اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسی طرح رات اور دن کے گھنٹوں کی مقدار اور سورج اور چاند کے طلوع وغروب کا حساب اور اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسی جچے تلے اور منظم حساب وکتاب اور منظم حرکت کی بدولت ہے۔

(ج) جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ جاذبہ (کشش) کی طاقت آسمانی کروں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہے جب کہ دافعہ کی قوت گردش دورانی حرکت سے وجود میں آتی ہے، جسے مرکز گریز طاقت کا نام دیا جاتا ہے جو انہیں ایک دوسرے سے دور بھگانے کی کوشش کرتی ہے۔

اب اگر کسی کُرے کو اپنے مقرر مدار کے گرد لاکھوں سال حرکت کرنا مقصود ہو اور وہ حرکت بھی بالکل ٹھیک اور دقیق، تو ان دونوں طاقتوں کو مکمل اعتدال اور توازن پر رہنا چاہیے یہ بات بھی ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ جاذبہ یا کشش موجودات کے اجرام کی مقدار کے ساتھ ''مستقیم'' نسبت اور مجذور کے ساتھ ''معکوس'' نسبت کا فاصلہ ہے (اگر اجرام زیادہ ہوں گے تو جاذبہ کشش) زیادہ ہوگی اور اگر فاصلے زیادہ ہوں گے تو مذکورہ بالا حساب کے مطابق جاذبہ یعنی کشش کم ہوجائے گی)

بنابریں اگر مثلاً کرہ زمین کو مقرر مقدار میں سورج کے گرد ایک کافی لمبے عرصے کیلئے ایک ثابت مدار میں گردش کرنا مقصود ہو تو چاہیے کہ سورج کے جرم کی مقدار نیز ان کا باہمی فاصلہ اور سورج کے گرد زمین کی حرکت کی رفتار غرض ہر ایک چیز کو صحیح صحیح، دقیق اور جچے تلے حساب کے تحت ہونا چاہیے تاکہ ان کے درمیان اعتدال اور توازن برقرار رہے۔ یہ سب مسائل ایسے ہیں جو کسی بے انتہاء علم اور ایک عقلِ کل کی مداخلت کے بغیر قطعاً ناممکن ہیں۔

۳۔ سات آسمان

قابلِ توجہ بات ہے کہ قرآنِ مجید کی سات آیات میں ''سماوات سبع'' (سات آسمانوں) کا تذکرہ آیا ہے۔[1] ان آیات میں سے ایک میں تو زمین کے سات طبقات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

''اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ'' یعنی خدا تو وہ ہے جس نے سات آسمانوں کو پیدا کیا اور زمین کو بھی اسی طرح ایجاد کیا۔ (طلاق/ ۱۲)

---

[1] بقرہ۔ ۲۹، اسراء۔ ۴۴، مومنون۔ ۸۶، فصلت۔ ۱۲، طلاق۔ ۱۲، ملک۔ ۳، نوح۔ ۱۵، (نیز دو آیات میں سبع طرائق یعنی سات راستے اور سبعا شدادا یعنی سات مضبوط موجودات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو ممکن ہے سات آسمانوں کی طرف اشارہ ہو۔ (مومنون۔ ۱۷، نباء۔ ۱۱)

سات آسمانوں کے متعلق جومختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں اُن میں سے جوتفسیر سب سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ''سبع سمٰوٰت'' کے معنی واقعی وہی سات آسمان ہی ہیں۔یعنی آسمان کے معنی کُرہ نہیں بلکہ عالمِ بالا کے ستارگانِ اورکواکب کا مجموعہ ہے اورسات سے مرادہی مشہورتعداد ہے نہ کہ تکثیری عدد یعنی جو کثرت پر دلالت کرتا ہو۔

ہاں البتہ قرآن مجید کی کئی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم جوثوابت، سیارات، کہکشائیں اورشہابئے وغیرہ دیکھتے ہیں، ان سب کاتعلق ''آسمان اول کے مجموعہ'' سے ہے۔بنابریں اس عظیم مجموعہ کے ماوراءایک اورعظیم مجموعہ (جو چھ آسمانوں پر مشتمل ہے) موجود ہے ،جن میں سے بعض کودوسرے بعض پر برتری حاصل ہے،اوروہ (کم ازکم آج تک) انسانی علم کی دسترس سے باہر ہے۔

سورہ صافات کی چھٹی آیت میں ہم پڑھتے ہیں''اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةَ الْکُوَاکِبِ''(ہم نے نچلے آسمان کوستاروں کے ساتھ زینت بخشی ہے)

سورہ حٰم السجدہ کی بارہویں آیت میں آیا ہے:''وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ''(ہم نے نچلے آسمان کو چراغوں سے مزین کیا ہے)

اوریہی چیزتھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ ملک کی پانچویں آیت میں بھی بیان ہوئی ہے یہ بات قابل توجہ ہے کہ علامہ مجلسی مرحوم نے بحارالانوریں اسی احتمال کوآیتِ مذکورہ کی تفاسیر میں سے ایک تفسیر کےطور پر ذکرفرمایا ہے وہ فرماتے ہیں:

''تیسرااحتمال جومیرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ جن تمام افلاک کوستاروں کیلئے ثابت کیا گیا ہے وہ سارے کے سارے نچلے آسمان کے نام سے موسوم ہیں''۔

ٹھیک ہے کہ ابھی تک ہمارے علمی اوزاروآلات نے دوسرے چھ عالموں سے پردہ نہیں اٹھایا۔لیکن علمی لحاظ سے ان کے وجود کی نفی پر بھی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔اورکیامعلوم کہ بہت جلد یہ معمہ بھی حل ہوجائے بلکہ بعض ماہرین فلکیات کی دریافتوں سےتو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دوسرے عالموں کی بہت سی علامات دور سے دکھائی دیتی ہیں،جیسا کہ ابھی ہم''پالومار'' کے معروف رصدخانے کی رپورٹ درج کرچکے ہیں اورجو جملہ ہمارے اس مدعا کا شاہد ہے۔اسے ہم دوبارہ یہیں پرنقل کئے دیتے ہیں۔

''پالومارر صدخانے کی دوربین کی ایجاد کی بدولت کئی لاکھ جدید کہکشائیں دریافت ہوئی ہیں جن میں سے کچھ توایک ہزارملین (ایک ارب) نوری سال ہم سے دور ہیں اوراس ایک ارب نوری سال کے فاصلے کے بعد عظیم،مہیب اورتاریک فضادکھائی دیتی ہے جس میں کوئی چیز نظرنہیں آتی۔لیکن کسی قسم کے شک وشبہ کے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس مہیب اورتاریک فضامیں بھی لاکھوں کروڑوں کہکشائیں موجود ہیں اورجودنیا ہماری جانب ہے وہ اپنی کہکشاؤں کی کشش کی وجہ سے محفوظ ہے معلوم ہوتا ہے کہ جس دنیا کوہم دیکھ رہے ہیں وہ ایک عظیم ترین دنیا کے مقابلے میں ایک حقیراورچھوٹے سے بے مقدارذرے سے زیادہ نہیں ہے۔اسکے باوجود پھربھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس دوسری دنیا کے اس

پارکوئی اور دنیا موجود نہ ہو!۔"[1]

ایک اور دانشور نے اس کائنات کی عظمت کے بارے میں ایک مفصل مقالہ تحریر کیا ہے جس میں اس نے کہکشاؤں کے درمیانی فاصلوں کے حیرت ناک اور محیر العقول اعداد و شمار پیش کئے ہیں جو سارے کے سارے نوری سالوں کی بنیاد پر مشتمل ہیں، وہ لکھتا ہے:

"علمِ نجوم (ستارہ شناسی) کے ماہرین کا اس مقام پر یہ نظریہ ہے کہ ابھی تک انہوں نے اس باعظمت کائنات کے قابل رؤیت راستوں کے آدھے کنارے کو طے کیا ہے، جب کہ ان فضاؤں کے راستے ابھی طے کرنے میں جواب تک دریافت نہیں ہو پائیں۔"[2]

اس طرح ابھی تک بنی نوعِ انسان نے جو عالم دریافت کئے ہیں وہ اپنی وسعت اور عظمت کے باوجود اس عظیم کائنات کے ایک مختصر سے حصے پر مشتمل ہیں اور سات آسمانوں کے تصور سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔[3]

۴۔ آسمان کی طرف نگاہ کیوں نہیں کرتے؟

آسمانوں کی وسعتوں میں آیاتِ خداوندی کی کثرت اور رات کو آسمان کی بے مثال خوبصورتی اس بات کا موجب بنی ہے کہ قرآن مجید اور اسلامی روایات تمام لوگوں کو عموماً اور مومنین کو خصوصاً زیادہ سے زیادہ ایمان پیدا کرنے کیلئے ہمیشہ آسمانوں کے مطالعہ کی دعوت دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی سورہ ق کی چھٹی آیت میں فرماتا ہے:

"اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ" کیا انہوں نے اس آسمان کی طرف نہیں دیکھا جو ان کے سر پر ہے کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے اور اسے ستاروں کے ذریعہ زینت بخشی ہے اور اس میں کوئی غیر موزونیت اور شگاف نہیں ہے؟"

خصوصاً اسلامی روایات میں حکم دیا گیا ہے کہ جب "سحر خیز مومنین" نماز تہجد کیلئے اٹھیں تو سب سے پہلے آسمان پر نگاہ ڈالیں اور سورہ آلِ عمران کی آخری آیات کی تلاوت کریں جو "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ۔۔۔۔" سے شروع ہوتی ہیں کیونکہ ان میں تمام حقائق عارفانہ صورت میں بیان کئے گئے ہیں پھر اپنے رب کی عبادت کو شروع کریں (ایسی عبادت جو توحید اور معرفتِ رب کے عطر سے معطر ہو)[4]

---

[1] رسالہ "فضا" شمارہ ۵۶ مجریہ ۱۳۵۱ ہجری شمسی

[2] رسالہ "نیوز ویک" فریہ ۱۹۶۵ء (یاد رہے کہ یہ گواہی آج سے ستائیس سال پہلی کی ہے

[3] مزید تفصیل کیلئے تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں جس میں سات آسمانوں کے بارے میں مختلف تفسیریں درج کی گئی ہیں۔

[4] تفسیر مجمع البیان جلد ۲ ص ۵۵۴ سورہ آل عمران کی آخری آیات کے ذیل میں

ایک اور روایت میں منقول ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی نمازِ تہجد کیلئے کھڑے ہوتے سب سے پہلے مسواک فرماتے پھر آسمان پر نگاہ ڈال کر انہی آیات کی تلاوت فرماتے۔[1]

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے حالات میں ہے کہ آپؑ کے ایک دوست بنام ''حبہ عُرنی'' کہتے ہیں کہ:

''ایک رات کا واقعہ ہے کہ میں (حضرت علی علیہ السلام کے صحابی) ''نوف'' کے ساتھ دارالامارہ میں سویا ہوا تھا کہ رات کے آخری حصے میں، میں نے دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنا ہاتھ دیوار پر رکھا ہوا تھا اور والہانہ انداز میں (آسمان کی طرف نگاہ کرے) ان آیات کی تلاوت فرما رہے تھے ''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ۔۔۔۔'' اور ان کا بار بار تکرار کر رہے تھے گویا آپؑ کی عقل پرواز فرما رہی تھی۔

پھر آنجناب نے میری طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا ''حبہ! جاگتے ہو یا سو رہے ہو؟'' میں نے عرض کی، جناب میں بیدار ہوں، جب آپؑ کی یہ حالت ہو تو ہم کیسے (سو) سکتے ہیں؟''

پھر آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ارشاد فرمایا ''حبہ! خداوندِ عالم کی طرف سے کئی موقف مقرر ہیں جہاں جا کر ہمیں رُکنا پڑے گا۔ ہمارے اعمال میں سے کچھ بھی اس پر مخفی نہیں اور وہ میری اور تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔۔۔۔۔۔[2]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء خدا کے خاص بندے کسی بھی وقت اس فکر انگیز اور ایمان آفرین مطالعہ سے غافل نہیں ہوتے تھے اور آسمانوں کی تخلیق اور ان پر حکم فرما نظام سے ہمیشہ الہام لیا کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۲ ص ۵۵۴ سورہ آل عمران کی آخری آیات کے ذیل میں

[2] بحار انوار جلد ۴۱ ص ۲۲

۸۔سورج، چانداورستاروں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

اگرچہ سورج اور چاند کو ستاروں اور آسمانی کروں میں شمار کیا گیا ہے اور آسمانوں کی عظمت کے بارے میں علیحدہ گفتگو کی گئی ہے لیکن چونکہ یہ دونوں ہمارے کرہ ارضی سے زیادہ قریب ہیں لہٰذا ان دنوں کا ہماری زندگی میں بڑا دخل ہے، قرآن مجید نے بھی ان پر خصوصی توجہ دی ہے اور ہر ایک کو خداوندِ عالم کی عظیم آیات میں سے ایک آیت کے عنوان سے متعارف کرایا ہے۔ نیز بعض ستاروں کے فوائد کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور انہیں بھی آیاتِ خداوندی میں شمار کیا ہے اور سچ مچ ان میں سے ہر ایک ۔۔۔۔۔۔خصوصاً دورِ حاضر کی دریافتوں کی روشنی میں ۔۔۔۔۔۔ایک طرف تو وہ ہمارے لئے خداوندِ عالم کی عظمت وقدرت کی اور دوسری طرف قرآنی تعلیمات کی عظمت کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔هُوَالَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَنُوْرًاوَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَالسِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلاَّ بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ

(یونس/۵)

۲۔۔۔اَلَمْ تَرَوْا کَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا{}وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًاوَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا

(نوح/۱۵۔۱۶)

۳۔۔۔وَسَخَّرَلَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ

(ابراہیم/۳۳)

۴۔۔۔وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی

(فاطر/۱۳)

۵۔۔۔وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لاَ تَسْجُدُوْ لِلشَّمْسِ

وَلاَ لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ

(حٰمٓ السجدۃ/۱۳۷)

۶۔۔۔وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ {}وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ {}لاَ الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلاَ الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ

(یٰس/۳۷تا۴۰)

۷۔۔۔وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ

(انبیاء/۳۳)

۸۔۔۔فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ

(معارج/۴۰)

۹۔۔۔كَلَّا وَالْقَمَرِ ۙ﴿۳۲﴾ وَالَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۙ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۙ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَی الْكُبَرِ ۙ﴿۳۵﴾

(مدثر/۳۲تا۳۵)

۱۰۔۔۔وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ

(انعام/۹۷)

ترجمہ

۱۔۔۔وہ وہی تو ہے جس نے خورشید کو روشنی دی اور چاند کو نور قرار دیا اور اس کیلئے منزل مقرر کیں تا کہ تم سالوں کے عدد اور (کاموں کے) حساب کو جانو۔ خداوندِ عالم نے یہ سب کچھ حق کے سوا پیدا نہیں کیا۔ وہ (اپنی) آیات کو ایسے لوگوں کیلئے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے جو عقل رکھتے ہیں۔

۲۔۔۔کیا تم نہیں جانتے کہ خداوندِ عالم نے سات آسمانوں کو یکے بعد دیگرے کیونکر پیدا کیا ہے ؟

اور چاند کو آسمانوں کے درمیان میں روشنی کا سبب اور سورج کو روشن چراغ قرار دیا ہے۔

۳۔۔۔اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے جو ہمیشہ منظم طریقہ سے چل رہے ہیں۔

۴۔۔۔اس نے سورج اور چاند کو (تمہارے لئے) مسخر کر دیا ہے اور ان میں سے ہر ایک مقررہ وقت تک چلتے رہیں گے۔

۵۔۔۔اس کی نشانیوں میں سے رات، دن، سورج اور چاند ہیں۔سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، اس خدا کا سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر تم اس کی ہی عبادت کرتے ہو۔

۶۔۔۔اور سورج (بھی ان لوگ کیلئے ایک آیت ہے) جو کہ ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں رہتا ہے، یہ خداوندِ قادر اور عالم کی تقدیر ہے۔نہ تو سورج کیلئے سزاوار ہے کہ وہ چاند تک پہنچ جائے اور نہ ہی رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے اور ہر ایک فلک میں تیر رہا ہے۔

۷۔۔۔وہ وہی تو ہے جس نے رات، دن، سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے، ان میں سے ہر ایک فلک میں تیر رہا ہے۔

۸۔۔۔مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم کہ ہم قدرت رکھتے ہیں۔

۹۔۔۔ایسا نہیں ہے جیسے وہ تصور کرتے ہیں، چاند کی قسم۔۔۔۔۔۔اور رات کی قسم جب وہ (اپنے دامن سمیٹ کر) پیٹھ پھیرے۔۔۔۔اور صبح کی قسم جب وہ اپنا منہ کھولے۔۔۔۔۔۔کہ وہ (قیامت کا ہولناک حادثہ) اہم مسائل میں سے ایک ہے۔

۱۰۔۔۔وہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو پیدا کیا ہے تا کہ تم بری اور بحری تاریکیوں میں ہدایت حاصل کرو۔ہم نے ان لوگوں کیلئے اپنی نشانیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو عقل رکھتے ہیں (اور غور وفکر سے کام لیتے ہیں)

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سورج، چاند اور ستاروں کی قسم

باوجودیکہ ان آیات کے نازل ہونے کے زمانے میں سورج، چاند اور ستاروں کے بارے میں انسانی معلومات بہت ہی محدود تھیں اور بھی خرافات سے بھری ہوئی، (خاص کر جس علاقہ میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئیں) پھر بھی قرآن مجید سورج، چاند اور ستاروں کی عجیب قسم کی عظمت سے یاد کرتا ہے اور ان کی بہت سی خصوصیات کو بیان کرتا ہے اور مجموعی طور پر ان سب کو آیات حق اور اس کی پاک ذات کی نشانیاں قرار دیتا ہے۔

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں فرماتا ہے ''وہ وہی ہے کہ جس نے سورج کو ضیا اور روشنی اور چاند کو نور قرار دیا ہے'' (هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا)

بعض اربابِ لغت نے (جیسے طریحی نے مجمع البحرین میں) اور بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ ''ضیاء'' اور ''نور'' میں یہ فرق ہے کہ ''ضیاء'' اس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کی ذات سے اُٹھے اور ''نور'' اس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے سے لی جائے۔ بنابریں مندرجہ بالا آیت اس نکتے کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ سورج کی روشنی ذاتی ہے جب کہ چاند کی روشنی سورج کی روشنی کی مرہونِ منت ہے۔ قرآن نے یہ بات اس وقت کہی جب دنیا کے لوگ اس چیز سے قطعاً آگاہ نہیں تھے۔

البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں لفظوں میں سے ہر ایک ممکن ہے کہ ایک ہی معنی کے لئے استعمال کیا جائے اور وہ ہے ''روشنی'' یعنی ''ذاتی'' اور ''اکتسابی'' روشنی، چنانچہ قرآنِ مجید اور کلماتِ عرب میں اس کا اس طرح کا استعمال ہمارے مدعا کی دلیل ہے۔ البتہ جب دونوں باہم استعمال ہوں گے تو ان کے مختلف معانی ہوں گے، جیسا کہ اسی آیت میں استعمال ہوا ہے۔

یہی چیز دوسری آیت میں دوسرے لفظوں میں بیان ہوئی ہے، یعنی پہلی تو سات آسمانوں کی تخلیق کا تذکرہ ہے پھر فرمایا ہے ''خدا نے آسمانوں میں چاند کو نور قرار دیا ہے اور سورج کو روشنی عطا کرنے والا چراغ۔'' (قرآن کی دوسری دو آیات میں بھی سورج کو ''سراج'' (چراغ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ فرقان کی ۶۱ ویں اور سورۂ نباء کی ۱۳ ویں آیت میں، اور ہم جانتے ہیں، کہ سورج کی روشنی خود اس کے اندر سے ہی پیدا ہوتی ہے باہر سے نہیں لی جاتی اور بعض لغات میں یہ بھی ذکر ہے کہ ''ضیا'' ''نور'' سے زیادہ شدید ہے۔ ممکن ہے کہ معنی کا یہ فرق پہلے فرق سے لیا گیا ہو اور اسی کی طرف اس کی بازگشت ہو۔ بہرحال یہاں ہر چیز سے پہلے ''سورج'' اور ''چاند'' کے نور کی بات کی گئی ہے اور انہیں خدا کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے۔

سورج کی روشنی صرف موجوداتِ عالم ہی کو گرم اور روشن نہیں کرتی بلکہ نباتات کی پرورش اور حیوانات کی زندگی میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

آج یہ حقیقت ثابت ہوچکی ہے کہ کرہ زمین پر جو جنبش اور تحرک پایا جاتا ہے وہ سب سورج کی روشنی کی بدولت ہے۔ ہواؤں کا چلنا، بادلوں کی حرکت، سمندروں کی امواج، دریاؤں کا چلنا، آبشاروں کی گونج اور حیوانوں اور انسانوں کی سرگرمیاں سب سورج کے نور کی برکت سے ہیں۔ اگر اچھی طرح سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ روئے زمین کی ہر چیز میں زندگی کی علامات نورِ آفتاب کی مرہونِ منت ہیں (غور کیجئے گا)

اگر ایک دن ایسا آجائے جس میں سورج ماند پڑ جائے اور کرۂ ارضی سے سورج کی شعاعیں منقطع ہوجائیں، تو نہایت ہی قلیل عرصے میں موت، خاموشی، سکون اور ظلمت ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔

چاند کی پیاری پیاری اور میٹھی روشنی نہ صرف ہماری راتوں کیلئے چراغ کا کام دیتی اور رات کے مسافروں، شہروں اور جنگلوں میں راہنمائی کرتی ہے بلکہ اس کی لطیف اور ملائم روشنی تمام انسانوں کو آرام وسکون اور مسرت ونشاط بھی عطا کرتی ہے۔ بعض زرعی ماہرین کا کہنا ہے کہ چاند کا نور پھلوں کے پکنے اور نباتات کے پروان چڑھنے کیلئے کافی مؤثر ہوتا ہے۔ البتہ یہ سب کچھ سورج اور چاند کی صرف روشنی کے بارے میں بتایا گیا ہے، ان کی دوسری برکتوں کے بارے میں علیحدہ گفتگو ہوگی۔

پھر قرآنِ مجید اسی آیت کے آخر میں ان دونوں آسمانی کُروں کی ایک اور اہم برکت اور فائدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''خداوندِ عالم نے چاند کیلئے کچھ منزلیں مقرر فرمائی ہیں تاکہ تم سالوں کی تعداد اور (اپنی زندگی اور کاموں) کے حساب کو جان لو'' (وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ)

چاند اپنی منظم رفتار اور دقیق حرکت کی وجہ سے ایک نہایت روشن اور طبعی زندہ تقویم (کیلنڈر) ہے، اس قدر روشن کہ ہر عالم اور جاہل، جو ''پڑھ'' سکتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر اپنی زندگی کے پروگراموں کو مرتب کرسکتا ہے۔ اور ہم اچھی طرح غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی کا سال، مہینے اور منظم وعمومی تقویم کے ساتھ نہایت ہی گہرا تعلق ہے اور چاند، سورج اور زمین کی اپنے اور سورج کے گرد منظم حرکت اس مہم کو سرانجام دیتے ہیں۔

موجودہ دور کے کیلنڈر اور تقویمیں جو منجمین کے حساب سے مرتب کی جاتی ہیں، ان لوگوں کے کام آسکتی ہیں جو ان کی ان تحریروں تک دسترس رکھتے ہیں۔ یہ صرف طبعی تقویم ہی ہے جو سب کیلئے محسوس، قابلِ مشاہدہ اور مفید واقع ہوسکتی ہے اور وہ چاند کی حرکت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس زمانے سے لے کر جب کہ وہ ''ہلال'' ہے، اس وقت تک جب وہ ''بدر کامل'' کی صورت اختیار کرلیتا ہے، پھر وہ ''محاق'' کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ اگر انسان تھوڑی سی بھی توجہ کرے اور اس بارے میں قدرے غور وفکر سے کام لے تو مہینے کی راتوں کو اچھی طرح دیکھنے سے مہینہ کی مقدار اور اندازہ متعین کرسکتا ہے، کیونکہ چاند ہرگز دو راتوں میں آسمان پر ایک جیسا نہیں ہوتا۔

اسلامی عبادات کے پروگرام قمری مہینے کی بنیاد پر مقرر کرنے کی شاید یہی وجہ ہے۔ سب اطراف پیشِ نظر رکھنے کی وجہ سے قرآنِ مجید اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ ''خداوندِ عالم اپنی ان آیات اور نشانیوں کو ان لوگوں کیلئے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے جو عالم ہیں'' (يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ)

تیسری اور چوتھی آیت میں انسانوں کیلئے سورج اور چاند کی تسخیر کا ذکر ہے۔(وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ)

ہاں البتہ ایک آیت میں ان دونوں کی حرکت کو''دائبین'' (ایسی حرکت جو معمول کے مطابق اور ثابت صورت میں ہے)اور دوسری آیت میں''كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ''(ان دونوں میں سے ہر ایک مقررہ مدت تک کیلئے اپنی حرکت میں لگا ہوا ہے) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے جو آج ثابت ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ سورج اور چاند کی حرکت ایک لمبے عرصے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور منظومہ شمسی کا نظام لاکھوں کروڑوں سال بعد درگرگوں ہو جائے۔ یہ چیز بذات خود قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ایک ہے۔

البتہ سورج کی حرکت سے مراد درحقیقت زمین کی سورج کے گرد حرکت ہے، کیونکہ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ سورج حرکت کر رہا ہے۔لیکن دراصل یہ زمین کی حرکت ہوتی ہے جو انسان کے اندر یہ احساس پیدا کر رہی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خورشید بھی ہمیشہ کہکشاں کے اندر منظومہ شمسی کے ہمراہ حرکت میں ہے جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا۔

سورج، چاند اور دیگر موجودات کی تسخیر جس کی طرف قرآنِ مجید نے اشارہ کیا ہے کہ خدا نے انہیں انسان کیلئے مسخر کر دیا ہے، یہ ہے کہ خدا نے انہیں انسانی مفادات اور اس کی خدمت کی راہوں پر چلا دیا ہے، جیسا کہ ابھی بتا چکے ہیں کہ سورج اور چاند کا نور انسانی زندگی اور تمام دیگر زندہ موجودات کیلئے نہایت ہی اہم اور مؤثر کردار ادا کرتا ہے، خصوصاً سورج کی روشنی کے بغیر روئے زمین پر زندگی کا ایک لمحہ بھی ناممکن ہے۔حتیٰ کہ رات کی تاریکی میں بھی ہم آفتاب عالمتاب کی نور کی بچی کھچی حرارت اور گرمی سے استفادہ کرتے ہیں جو زمین اور ہوا میں باقی رہ جاتی ہے۔اگر ایسا نہ ہو تو رات کی تاریکی میں تمام زندہ چیزیں منجمد ہو جائیں۔اس کے علاوہ اور بھی کئی فائدے ہیں، سمندروں میں مدوجزر کا وجود میں لانا جو بہت سی خدمات کا موجب بن جاتا ہے۔انشاء اللہ ہم آگے چل کر''سمندروں میں خدا کی نشانیاں'' کی بحث میں اس طرف اشارہ کریں گے ،اسی طرح طبعی تقویم کی تشکیل اور اسی طرح کی اور بھی بہت سی خدمات۔

اس میں شک نہیں کہ آج جو کچھ ہم سورج اور چاند کی برکتیں سمجھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جو ان آیات کے نزول کے زمانہ میں موجود لوگ اور ان کے مخاطب افراد سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان آیات کی جبین پر لکھا ہوا توحید کا جو درس ہم پڑھ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہے جو گذشتہ زمانے کے لوگ پڑھ سکتے تھے۔ اسی لئے تو زیر بحث آیت کے آخر میں فرماتا ہے،''خداوندِ عالم تمہارا پروردگار وہی تو ہے جس نے ان موجودات کو تمہاری خدمت پر مقرر کر دیا ہے اور تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے، لیکن تم لوگ جنہیں خدا کا ہمسر سمجھتے ہو اور اس کا شریک بناتے ہو وہ تو اس جہاں میں کھجور کی گٹھلی کی جھلی کے برابر کی ملکیت اور حاکمیت نہیں رکھتے۔(وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ)[1]

پانچویں آیت میں بڑی صراحت کے ساتھ رات، دن، سورج اور چاند کی آفرینش کو خداوندِ عالم کی آیات اور نشانیوں میں سے

---

[1] قطمیر کے متعلق بہت سے مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ سفید رنگ کی جھلی ہے جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتی ہے اور بعض کہتے ہیں اس سے مراد وہ معمولی سا گڑھا ہے جو گٹھلی کی پشت میں ہوتا ہے۔بہرصورت یہ ایک نہایت ہی معمولی، بے قیمت اور بہت ہی چھوٹی سی مخلوق سے کنایہ ہے۔

شمار کیا گیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ مبادا تم یہ تصور کرلو کہ یہ ہی تمہارے پروردگار اور رب ہیں، جیسا کہ سورج پرست یا چاند پرست سمجھتے ہیں۔ نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔ تم ان کو سجدہ مت کرو بلکہ اس خدا کیلئے سجدہ کیا کرو جو ان سے کا خالق اور آفریدگار ہے، اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو! (لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ)

قرآن مجید کس قدر جچی تلی اور حساب شدہ بات کہہ رہا ہے کیونکہ شب و روز آفتاب و ماہتاب اور کائنات کی دیگر اشیاء کی مختلف برکات کا شمار کرنا ممکن ہے کسی کوتاہ فکر شخص کے ذہن میں یہ فتور پیدا کردے کہ ''چونکہ ہم ان موجودات کی نعمتوں کے مرہونِ منت ہیں لہٰذا انہیں کا سجدہ بجالائیں اور ان کی عبادت کریں'' جیسا کہ تاریخ میں بہت سے بت پرست ایسے ہی طریقے سے بت پرستی کا شکار ہوگئے تھے۔ قرآن کہتا ہے آنکھیں کھولو اور اپنی بصیرت سے اسباب پر نگاہ ڈالو، اسباب کے پس پردہ ذات مسبب الاسباب کا دیدار کرو اور اسی کی درگاہ پر اپنی پیشانیاں جھکادو، اسباب کے فریب میں آکر عالمِ اسباب میں گم نہ ہوجائے۔

اسی سلسلے کی چھٹی اور ساتویں آیت میں بڑی وضاحت کے ساتھ سورج اور چاند کی حرکت اور ان منزلوں کی بات کی گئی ہے۔ آیات کے آخر میں صراحت کی گئی ہے کہ یہ اجرامِ سماوی اپنے اپنے لحاظ سے فلک، مدار اور راستوں میں تیرتے پھرتے ہیں (وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ)[1]

قرآن مجید کی یہ تعبیریں ایک طرف تو قرآن پاک کے عجائبات میں شمار ہوتی ہیں اور دوسری طرف عالمِ آفرینش اور خداوندِ عالم کے علم وقدرت کی شاہکار ہیں۔

''وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ'' (سورج چل رہا ہے) کے جملے اور ''لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا'' (اپنے ٹھکانے کی طرف) کے جملے سے کیا مراد؟ اس بارے میں متعدد تفسیریں ملتی ہیں۔

پہلی تو یہ ہے کہ اس سے مراد خورشید کی یہ ظاہری حرکت ہے جو طلوعِ آفتاب سے شروع ہوتی ہے اور ٹھکانہ غروب ہے، جب سورج آنکھوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ (البتہ معلوم ہے یہ زمین کی اپنے محور کے گرد گھومنے کے نتیجہ میں یہ صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے)

دوسرا یہ کہ اس سے مراد سورج کے محور کی حرکتیں ہیں جو فصلِ بہار کے آغاز سے کرۂ زمین کے شمال کی طرف ہونا شروع ہوتی ہیں اور موسمِ گرما کے آغاز تک برابر جاری رہتی ہیں۔ پھر موسمِ گرما کے آغاز میں (شمال نیم کُرے میں) راس السرطان کے مقابل (۲۳° درجہ شمال کے مدار) میں جا پہنچتی ہیں، اور اسے ''شمالی مَیلِ اعظم'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس حرکت کا جنوب کی طرف آغاز ہوتا ہے اور موسمِ خزاں کے اوائل میں خطِ استوا کے مقابل پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد کرۂ زمین کی طرف مائل ہوجاتی ہے، موسمِ سرما کے آغاز تک برابر جاری رہتی ہے اور راس الجدی کے مدار (۲۳° درجہ جنوبی کے مدار) تک جا پہنچتی ہے۔ اُسے ''جنوبی مَیلِ اعظم'' کہتے ہیں۔ پھر اس کا آغاز شمال کی طرف ہوجاتا ہے اور فصلِ بہار میں خط استوا کے مقابل میں ہوتی ہے۔

---

[1] یسبحون'' ''سباحت'' کے مادہ سے ہے جس نے معنی ہیں، پانی یا ہوا میں تیز حرکت کرنا۔ (مفردات راغب)

اسی لئے سورج کے چلنے سے مراد یہی شمال اور جنوبی مَیل اعظم ہیں اور مستقر سے مراد شمالی اور جنوبی مَیل اعظم کا آخری نقطہ ہے، یعنی راس السرطان اور راس الجدی کا مدار۔

البتہ معلوم ہے کہ یہ حرکت سورج کے گرد زمین کی حرکت انتقالی ہے اور وہ بھی محورِ زمین کے ۲۳ درجہ کے جھکاؤ کے ساتھ، لیکن ہمیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سورج ہی ایسی حرکت کا حامل ہے۔

تیسرا یہ کہ اس سے مراد خورشید کی اپنے محور کے گرد وضعی حرکت ہے۔ کیونکہ یہ بات آج ثابت ہو چکی ہے کہ سورج بھی اپنے محور کے گرد گھومتا ہے (اس حرکت کے ایک مکمل دورانئے کا عرصہ ساڑھے پچیس دن بتایا گیا ہے۔) اس صورت میں ''لمستقر لھا'' میں ''لام'' بمعنی ''فی'' (میں) کے ہوگا۔ یعنی سورج اپنے ٹھکانے میں حرکت کرتا ہے۔ (البتہ بعض مفسرین نے اس تفسیر میں اشکال کیا ہے کیونکہ یہ معنی ''تجری'' کلمہ کے مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

چوتھا یہ کہ سورج کی آسمانی برجوں میں حرکت مراد ہے جو سال کے بارہ مہینوں میں انجام پاتی ہے اور سورج ہر زمانے میں ان بارہ برجوں میں سے کسی ایک برج کے مقابل قرار پاتا ہے اور ستاروں کی ان فلکی صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے سامنے ہوتا ہے۔ یہیں سے سال کے بارہ بُرج ظاہر ہوتے ہیں۔[1] بنابریں ''مستقر'' یا ٹھکانہ سے مراد اس دورانیہ کی انتہا ہے۔

پانچواں اور چھٹا یہ کہ اس سے مراد وہ حرکتیں ہیں جو دورِ حاضر کی دانشوروں نے دریافت کی ہیں، وہ یہ کہ ہماری کہکشاں کے گرد مجموعہ شمسی سمیت سورج کی حرکت ہے جو ایک مشہور فلکی صوت بنام ''صورت الجائی'' کی طرف ہوتی ہے۔ ''صورت الجائی'' سورج کے شمال میں واقع ہے۔ ہم اس حرکت میں ہر سال چھ سو ملین (ساٹھ کروڑ) کلومیٹر سے زیادہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ حرکت بالکل ویسے ہی ہے جیسے کچھ لوگ کسی ایسے ہوائی جہاز کے کمرے میں بیٹھے ایک مرکز کے گرد گھوم رہے ہوں جو انہیں ایک سمت کی طرف لئے بڑی تیزی سے محو پرواز ہو، اور یہ پرواز اس قدر نرم اور ملائم ہو کہ اس کی تیز رفتاری مسافروں کو بھی معلوم نہ ہو۔

ایک اور حرکت بھی ہے، وہ یہ کہ منظومہ شمسی جس میں ہم رہ رہے ہیں بقیہ کہکشاں کے ہمراہ اسی کہکشاں کے اصلی مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔ اگر آپ تعجب نہ کریں تو اس کی رفتار کا اندازہ نو لاکھ کلومیٹر (سے قدر کم) فی گھنٹہ لگایا گیا ہے۔[2]

اس تفسیر کے مطابق مستقر سے مراد ہی قرارگاہ ہے جو اس کائنات کے خاتمے کے ساتھ مقرر کی گئی ہے۔ قیامت کے قریب سورج وہاں جا پہنچے گا جہاں پہنچ کر وہ بے نور ہو جائے گا اور اس کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ البتہ جو بھی تفسیریں بیان کی گئی ہیں ان میں آپس میں کوئی منافات نہیں ہے بلکہ یہ تمام تفسیریں آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتی ہیں کیونکہ نہ تو زمین کی ایک

---

[1] یہاں: ''برج'' سے مراد ستاروں کا وہ مجموعہ ہے جو ایک خاص صورت اختیار کئے ہوئے ہے اور بارہ برج اس ترتیب کے ساتھ ہیں: حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت

[2] کتاب ''از جہانہائے دور'' ص ۲۹۳ اور ''تسخیر ستارگان'' ص ۳۹۲ کا مطالعہ فرمائیں۔

حرکت ہے اور نہ ہی سورج کی۔

''یسبحون'' (تیر رہے ہیں) کی تعبیر ایک نہایت ہی لطیف تعبیر ہے جو سورج اور چاند کی سریع، لیکن نرم اور موزون ومعتدل حرکت کو بیان کر رہی ہے۔ چاند کے بارے میں بھی قرآن مجید نے آیاتِ بالا میں اس کے متعلق منزلیں طے کرنے کا ذکر کیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہم نے چاند کیلئے بھی منزلیں مقرر کی ہیں۔(وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ)

ان منزلوں سے مراد ہی اٹھائیس منزلیں ہیں جنہیں چاند ''ہلال'' کے آغاز سے لے کر ''محاق'' (مطلق تاریکی) تک طے کرتا رہتا ہے، پھر وہ ہلال کی صورت میں نہات باریک شکل اختیار کر لیتا ہے اور زرد رنگت، کم فروغ وکم نور ہو جاتا ہے۔ نیز آخری دو راتیں جنہیں محاق کہا جاتا ہے، میں قابل رؤیت نہیں ہوتا۔

قرآن پاک نے آخر ماہ کے باریک ہلال کو ''عرجون قدیم'' (کھجور کی قوسی شکل کی زرورنگ کے پرانے خوشے) سے تشبیہ دی ہے۔[1] یہ تعبیر مختلف لحاظ سے نہات ہی لطیف اور دلکش ہے۔

ہم اس بحث کو جو شاید تھوڑی سی لمبی بھی ہوگی ہے دو نکتے بیان کرنے کے بعد ختم کرتے ہیں۔ پہلا نکتہ یہ کہ آیاتِ بالا میں ''فلک'' سے مراد اس کے وہی لغوی معنی ہیں نہ کہ وہ معنی جس کے قدیم زمانے میں علمائے ہیئت قائل تھے۔ کیونکہ لغت میں ''فلک'' ستاروں کے مدار کو کہتے ہیں اور کبھی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دائرے کی مانند ہو اور اس کے دونوں اطراف بڑھے ہوئے ہوں۔ راغب کے اعتقاد کے مطابق دراصل یہ ''فلک'' کے مادہ سے لیا گیا ہے (جس کا وزن قفل بنتا ہے) جس کے معنی کشتی ہیں۔ کیونکہ کشتیاں، دریاؤں اور سمندروں میں اپنے اپنے راستوں پر حرکت دورانی کے تحت رواں دواں رہتی ہیں۔[2]

لیکن قدیم منجمین (ستارہ شناس) بطلمیوس کی پیروی میں اس بات کے معتقد تھے کہ آسمان پیاز کی مانند نو طبقوں پر مشتمل ہے۔ چونکہ یہ طبقے سلور کے مانند صاف وشفاف ہیں، ستارے ان کے درمیان میخ کی مانند گاڑ دیئے گئے ہیں اور افلاک کی گردش کے ساتھ گردش کر رہے ہیں، لہٰذا صرف ستارے ہی نظر آتے ہیں، افلاک کی گردش کا پتہ نہیں چلتا۔

یہ نظریہ آج مکمل طور پر باطل ہو چکا ہے اور یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ ستارے اس فضائے بیکراں میں لٹکے ہوئے ہیں و ''دافعہ اور جاذبہ کے قانون'' کے تحت اپنے مقررہ راستوں پر گامزن ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید اس زمانے میں نازل ہوا جب بطلمیوس کی قدیم ہیئت تمام علمی معاشروں پر حکم فرما تھی۔ لیکن قرآن مجید کی تعبیریں کسی بھی صورت میں قدیم ہیئت کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ (جیسے ''جریان'' اور ''سباحت'' (تیرنا) وغیرہ کی تعبیریں جو مذکورہ بالا آیات میں مذکورہ ہیں) اور دورِ حاضر کی مسلم

---

[1] ''عرجون'' ''انعراج'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی کجی ہیں۔ بعض نے اس کا معنی کھجور کا وہ خوشہ لیا ہے جس سے پھل چن لیا جائے اور وہ خالی رہ جائے۔ اور ''قدیم'' بمعنی کہنہ یعنی پرانا۔

[2] لسان العرب اور مفردات راغب مادہ ''فلک''

علمی دریافتوں سے بھی ہم آہنگ ہیں (خوب غور کیجئے)

آٹھویں اورنویں آیت میں ایسی قسمیں بیان کی گئی ہیں جن سے غوروفکر کی دعوت کا اشارہ ملتا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے ''مشرقوں اورمغربوں کے رب کی قسم'' (فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ) ممکن ہے کہ ''مشرقوں اور''مغربوں'' کی تعبیر سے مختلف ''مکانی'' مشرقوں اورمغربوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ زمین کا گول ہونا اوراس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ اس کُرہ کے جتنے بھی منطقے ہیں، انکی اتنی ہی مشرقین اورمغربین ہوں۔ یا پھراس کرہ کی ''زمانی'' مشرقوں اورمغربوں کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کے گرد زمین کی حرکت اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ کبھی بھی دودنوں میں سورج ایک جگہ اورایک نقطہ سے طلوع اورغروب نہ کرے۔

مشرقوں اورمغربوں کا یہ فرق جو کائنات کے نہات ہی جچے تلے نظام کے ساتھ عمل میں آتا ہے، ایک طرف تو سال کے ''چارموسموں'' اوران کی مخصوص برکتوں کی پیدائش کا سبب بنتا ہے، دوسری طرف سطح زمین پرسردی، گرمی اوررطوبت کے اعتدال کا موجب بھی ہوتا ہے اورانسانوں، حیوانوں اورنباتات کی زندگی کو رونق بھی عطا کرتا ہے۔ ان چیزوں میں سے ہرایک خدا کی آیات میں سے ایک آیت اورنشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

ایک اورجگہ چاند کی قسم کھاتا ہے اوررات کی جب وہ پشت پھیرے اورصبح کی جب وہ اپنا چہرہ ظاہر کرے۔ پھرفرماتا ہے کہ یہ سب خبریں معاد کے بارے میں خبردار کرنے کیلئے ہیں اورفرماتا ہے ''قیامت اوردوزخ کے ہولناک حوداث اہم مسائل میں سے ہیں'' (اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبِرِ)[1]

سورہ شمس کے آغاز میں بھی سورج اس کی جان پرور شعاعوں اور چاند جب کہ سورج کے غروب ہونے پر ظاہر ہو، کی قسم کھائی گئی ہے[2]

سب کومعلوم ہے کہ ہمیشہ قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جس کی کوئی خاص اہمیت ہو۔ اگر یہ قسم کسی عظیم ہستی سے صادر ہوتو اس کی اہمیت کو چار چاندلگ جاتے ہیں اوراگر اہم موضوع کیلئے ہوتو اس کی عظمت اوربھی بڑھ جاتی ہے۔ اب آپ ہی سوچیئے کہ جب خداوندِ عالم معاد کے اہم ترین مسئلہ کیلئے سورج اور چاند کی قسم کھارہا ہے توان تابناک ستاروں کی کتنی عظمت اورشان ہوگی، اوراس حقیقت کوواضح کیا جارہا ہے کہ یہ دونوں قرآن کی نگاہ میں کس قدراہم ہیں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم نے مسئلہ قیامت کے اثبات اورآسمانی کواکب اورشب وروز کے حساب کیلئے کیوں قسم کھائی

---

[1] حضرت فخررازی کہتے ہیں کہ دوزخ کے سات طبقے ہیں جن کی ترتیب یہ ہے: جہنم لظی، حطمہ، سعیر، سقر، جحیم اور ہاویہ (تفسیر فخررازی جلد ۳۰ ص ۲۰۹

[2] بہت سے مفسرین اسے بدرکامل (چودھویں کے چاند) کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جوسورج کے غروب ہوتے ہیں فوراً طلوع ہوتا ہے اوریہ چاند کا خوبصورت اورکامل ترین چہرہ ہوتا ہے۔

ہے،اس لئے کہ ان امور پر حکم فرما نظام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ حساب وکتاب کے تحت اپنے اپنے کام میں لگا ہوا ہے،لہٰذا یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ انسان جو کہ عالمِ ہستی کا گلِ سرسبد ہے، کے اعمال کا نہ تو کوئی حساب ہو اور نہ ہی کتاب؟ اس کے اعمال کیلئے نہ تو معاد ہو اور نہ ہی کوئی محکمۂ عدالت؟

اسی سلسلے کی دسویں اور آخری آیت میں ستاروں کے وجود کی نعمت اور ان پر حکم فرما منظم اور دقیق نظام کا تذکرہ کیا ہے اور فرماتا ہے ''خداوندِ عالم تو وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو بنایا ہے تاکہ تم صحرا اور دریا کی تاریکیوں میں ان کے ذریعہ ہدایت پاسکو''(وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ)

پھر فرماتا ہے''ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کیلئے تفصیل کے ساتھ بیان کردی ہیں۔ جو عالم ہیں'(قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ)

تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں انسان کے سفر کیلئے رات کی تاریکیوں میں آسمانی ستاروں نے اس کی بہت راہنمائی کی ہے اور ستاروں ہی کے ذریعہ سے انسان نے خشکی اور تری کے سفر کامیابی سے طے کئے ہیں۔حتیٰ کہ بہت سے دانشور اس بات کے قائل ہیں کہ مہاجر پرندے یعنی جو پرندے بسا اوقات سال میں ہزار ہا کلومیٹر رہ طے کرتے ہیں،جن میں سے کچھ پرندے تو ایسے بھی ہیں جو چوبیس گھنٹے کسی وقفہ کے بغیر محو پرواز ہوتے ہیں،وہ بھی اپنی راہوں کا پتہ دن میں سورج کے ذریعہ اور رات کو ستاروں کے ذریعہ لگاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اگر آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں تو وہ عارضی طور پر اپنی پرواز کو موقوف کردیتے ہیں۔جب مطلع صاف ہوجاتا ہے اور بادل چھٹ جاتے ہیں تو وہ اڑانیں بھرنا شروع کردیتے ہیں۔

اور یہ بات بھی ہے کہ سال کے موسموں کو ستاروں کے ذریعہ بھی پہچانا جاسکتا ہے۔بہرحال یہ آیت تمام صاحبانِ فکر ونظر کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کررہی ہے کہ ستاروں کی آسمان میں حرکت اور ان کی اس عظیم ووسیع وعریض میدان میں قرارگاہیں ایک مخصوص نظم اور جچے تلے حساب وکتاب کے پیشِ نظر ہیں،وگرنہ کوئی بھی شخص رات کی تاریکی میں ان کے ذریعہ راہ نہ پاسکتا۔

یہ نظام ظاہر کرتا ہے کہ اس کائنات کا سارا نظام ایک ایسے خالق کے ہاتھ میں ہے جو مدبر اور علیم ہے۔اس طرح ہمارے آسمان پر موجود ستاروں کا نظام ہمیں شرک اور کفر کی تاریکیوں سے بھی نجات عطا کرتا ہے۔

علم ہیئت کی ترقی کے ساتھ ہی دانشوروں کو بہت سے آسمانی ستاروں کی رفتار،ان کے حجم،باہمی فاصلے اور دوسری بہت سی خصوصیات کا پتہ چلانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے اس طرح وہ اس عظیم نظام کے تازہ حقائق تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہوگئے۔یہ ٹھیک ہے کہ آج نہایت ہی پیچیدہ،دقیق اور ظریف آلات واوزار ایجاد ہوچکے ہیں،جن کے ذریعہ انسان بر وبحر میں اپنی راہیں تلاش کرلیتا ہے،لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ تمام بری اور بحری مسافر ایسے آلات سے بہرہ ور نہیں ہیں۔پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر کسی وقت ان آلات میں خرابی پیدا ہوجائے تو وہ گمراہی کا موجب بھی بن سکتے ہیں اور اگر انسان نجوم وکواکب کے نظام سے آگاہ ہو تو ان آلات کی وجہ سے حاصل ہوجانے والی گمراہی کی اصلاح بھی کرسکتا ہے۔

آیتِ بالا کی تفسیر میں روایات اہلبیت اطہارعلیہم السلام سے ایک اورتفسیر بھی منقول ہے جوآیت کا باطنی اورثانوی معنی شمار ہوتی ہے ،وہ یہ کہ ''نجوم'' سے مراد ''خدا کی طرف سے مقررکردہ رہبر'' اورمعصوم پیشوا ہیں،لوگ جن کے ذریعہ زندگی کے تاریک بیابانوں میں گمراہی سے نجات حاصل کرتے ہیں، جیسا کہ تفسیرعلی بن ابراہیم میں ۔''وَهُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوابِهَافِیْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّوَالْبَحْرِ '' کے معنی کی وضاحت میں فرماتے ہیں۔''اَلنُّجُوْمُ اٰلُ مُحَمَّدٍ'' (ستارے،آلِ محمدؐ ہیں)۔[1] ان دونوں معانی کوآپس میں جمع کرنا بھی ممکن ہے،یعنی ستارے مادی بھی ہیں جوآسمانی ہیں اورمعنوی بھی ہیں جوآلِ محمدؐ ہیں۔نجات ظاہری ہے جوخشکی اورتری میں ہوتی ہے اورباطنی بھی ہے جوقیامت میں نصیب ہوگی۔

چندضروری وضاحتیں

ا۔سورج کیا ہے؟

اسوقت کُرہ خورشید ہمارے لئے تقریباًجانا پہچانا کرہ ہے اورہم جانتے ہیں کہ سورج زمین سے تیرہ لاکھ گنابڑا ہے۔یعنی اگرسورج کادرمیان خالی ہوتاتواس میں ہماری زمین کے کرہ جیسے تیرلاکھ کُرے سماجاتے ۔دماغ کوورطۂ حیرت میں ڈال دینے والی اس کی یہ عظمت اس کے قطرکودیکھ کراوربھی واضح ہوجاتی ہے، جب کہاجاتا ہے کہ اس کا قطرقریباًچودہ لاکھ کلومیٹر ہے۔(ایک ملین چارسوہزارکلومیٹر)

اسکاہماری زمین سے فاصلہ قریباًڈیڑھ سوملین (پندرہ کروڑ) کلومیٹر ہے۔اس کی روشنی تین سوہزار(تین لاکھ) کلومیٹرفی سیکنڈ کی رفتارسے ہم تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔

سورج کاعظیم جرَم اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ اشیا کامخصوص وزن اس میں بہت ہی بھاری ہوجاتا ہے۔مثلاًاگرکرہ زمین پرکسی شخص کاوزن ساٹھ کلوگرام ہےتوسطح خورشید پراسکاوہی وزن پندرہ سوکلوگرام سے زیادہ ہوجائے گا۔

دانشوروں کا کہنا ہے کہ خورشیدکاوزن دوبلین ضرب ،بلین ضرب بلین ٹن ہے۔(یعنی (۲) کے عدد سے پہلے ستائیس صفریں لگادی جائی)اورجب سے اس نے موجودہ صورت اختیارکی ہےاس زمانے سے اب تک اس کی عمرکے بارے میں تخمینہ لگایا گیاہے کہ پانچ بلین (پانچ ارب سال کا ہوچکا ہے۔

سورج کی کم ازکم تین طرح کی حرکتیں ہیں:

(الف)اپنےمحورکرگردحرکت (جوتقریباًپچیس دن میں ایک مرتبہ مکمل ہوتی ہے)۔

(ب) کہکشاں کے مرکزاوردل میں رہ کرمنظومہ شمسی کے ہمراہ''الجائی'' فلک کی طرف حرکت جس کے تحت وہ ہرگھنٹے میں چھ سوکلومیٹر

---

[1] تفسیرنورالثقلین جلد ا ص ۷۵۰ حدیث ۲۰۳

سے زیادہ اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں سے دوری اختیار کر رہا ہے۔

(ج) کہکشاں کے مرکز کے گرد حرکت، جس کے تحت وہ ہر ڈھائی سو ملین (پچیس کروڑ) سال میں ایک مرتبہ اسے مکمل کرتا ہے۔

لیکن سورج کے مرکز اور سطح کی حرارت بہت عجیب ہے۔ سائنسدانوں نے جو حساب کیا ہے اس کے مطابق سطحِ خورشید کم از کم چھ ہزار (۶۰۰۰) سینٹی گریڈ ہے۔ یہ وہ درجہ حرارت ہے جسے روئے زمین کی کسی تجربہ گاہ میں اور نہ ہی کسی بھٹی میں وجود میں لایا گیا ہے۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے، کیونکہ اس دنیا میں جس قدر بھی دیرپا مواد ہے یا اسے کسی بھٹی میں جلایا جاسکتا ہے وہ اس قسم کی حرارت میں صرف پگھل ہی نہیں جائے گا بلکہ بخارات میں تبدیل ہوجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سطحِ خورشید پر جو بھی مواد موجود ہے وہ سارے کا سارا بخارات کی صورت میں ہے۔ اس سے بھی عجیب تر اس کے عمق کا درجہ حرارت ہے جو دو بلین (۲۰ لاکھ) سینٹی گرید سے بھی بڑھ کر ہے۔

سورج کی سطح سے ایسے شعلے بھی اٹھتے ہیں جن کی بلندی ایک سو ساٹھ ہزار (ایک لاکھ ساٹھ ہزار) کلومیٹر ہوتی ہے اور کرہ زمین بڑی آسانی کے ساتھ ان میں گم ہوسکتا ہے (کیونکہ کرہ زمین کا قطر بارہ ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے)۔

یہ حرارت ''جلنے'' سے عمل میں نہیں آتی۔ وگرنہ پیدائش ومرگِ خورشید نامی کتاب میں ''جارج گاموف'' کے بقول اگر سورج کا جرم پتھر کے کوئلہ سے بنا ہوتا تو چند ہزار سال کی مدت میں مکمل طور پر ختم ہوچکا ہوتا، اور راکھ کے سوا کچھ باقی نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ سورج کے بارے میں ''جلنے'' کا مفہوم صادق نہیں آتا۔ اگر اس مفہوم کو بیان کرنا ہو تو ''ایٹمی تجزیوں سے حاصل شدہ توانائی'' سے ہی ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود سائنسدانوں کے حساب اور تجزیوں کے مطابق ہر ایک سیکنڈ میں سورج سے چار ملین (چالیس لاکھ) ٹن وزن کم ہو رہا ہے۔ یعنی اس کے ان ایٹموں کی مقدار توانائی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اگرچہ یہ چیز سورج کیلئے مختصر عرصے کیلئے تو زیادہ موثر نہیں ہے لیکن صاف سی بات ہے کہ طویل عرصے کے بعد اس کی نابودی کا سبب بن سکتی ہے۔ قرآن مجید نے اپنی آیات میں بڑی صراحت کے ساتھ کہا ہے:

''ایک دن یہ مہر درخشاں اور (نیر تاباں) بے نور ہوجائے گا۔[1]

۲۔ سورج کی عظیم برکتیں

ہم اس آسمانی کُرے کے وجود کے فوائد اور انسان و دیگر زمینی مخلوق پر اس کے گہرے اثرات پر جس قدر تفصیل سے بحث کریں، پھر بھی ہم اس کو بہت کم کہیں گے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس بارے میں ایک بہت بڑی کتاب لکھی جاسکتی ہے جس کی فہرست کا کچھ حصہ یوں ہوگا۔

۱۔ سورج سے پیدا ہونے والی حرارت جو دن کو براہِ راست ہم تک پہنچتی ہے اور رات کو زمین پر موجود اجسام میں ذخیرے کی صورت میں ہماری طرف لوٹتی ہے، وہ نباتات کی نشوونما اور حیوانات کی زندگی اور تحریک کیلئے موثر کردار ادا کرتی ہے۔

---

[1] ''ساختمان خورشید''، ''نجوم بے تلسکوپ''، ''پیدائش ومرگ خورشید''، ''تاریخ علوم''، ''از جہانہائے دور'' اور ''اسلام وہیئت'' نامی کتابوں سے اقتباس۔

۲۔سورج ہمیشہ نہات ہی صحیح وسالم اور کسی معاوضہ کے بغیر ہمیں ایسی روشنی عطا کرتا رہتا ہے جو اس قدر گرم بھی نہیں ہوتی جو جلا کر بھسم کردے اور اس قدر سرد بھی نہیں ہوتی جس میں روح نہ ہو۔اگر سورج کی عطا کردہ روشنی اور حرارت کی قیمت ادا کرنا مقصود ہو کہ روزانہ جو روشنی اور حرارت زمین تک پہنچتی ہے ان کی معمولی ''بجلی'' کی قیمت کے مطابق قیمت لگائی جائے ،تو ضروری بن جائے گا کہ روئے زمین پر رہنے والے تمام انسان اس کے ایک گھنٹے کا بل BILL ایک بلین سات سو ملین (ایک ارب ستر کروڑ) ڈالر فی گھنٹہ ادا کریں۔آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ اس حساب سے ایک سال کا کیا بل بنے گا؟

باالفاظِ دیگر اگر روئے زمین پر رہنے والے لوگ سورج کی حرارت کے برابر پتھر کا کوئلہ جلا کر وہ حرارت خود ہی ایجاد کریں تو اس کیلئے سالانہ اکسٹھ ہزار بلین (۶۱ ہزار ارب) ٹن کوئلے کی ضرورت ہوگی۔گویا ہر شخص کیلئے سالانہ بیس ہزار ٹن کوئلے کی!![1] کس قدر سنگین خرچہ!

۳۔ہم جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی سات نوروں سے مرکب ہے جو ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں جن کے مجموعہ سے سفید رنگ نمایاں اور تاباں ہے۔یہ نور نباتات میں بڑی حد تک مؤثر ہے اور ان کی کمک کرتا ہے جس سے کاربن ڈائی اکسائیڈ ہوا کو جذب کرتی ہے اور اس کے مقابلے میں ہمیں آکسیجن واپس دیتی ہے جو ہماری زندگی کا سرمایہ ہے اور کاربن نباتات کی پرورش اور نشوونما کیلئے ہے۔

ہم عام طور پر چیزوں کو ان کے رنگ سے پہچانتے ہیں اور یہ رنگ بطور کامل نور آفتاب کے پرتو ہی میں وجود میں آتے ہیں۔کیونکہ ہر موجود اپنی بناوٹ کے لحاظ سے سورج کے رنگوں کا ایک حصہ اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔جو حصہ اپنے اندر جذب نہیں کرتا ہم اسے اسی رنگ کا نام دیتے ہیں۔مثلاً ایک سبز پتہ ،سورج کے تمام رنگ کو چوس کر اپنے اندر جذب کرلیتا ہے سوائے سبز رنگ کے۔گویا نور خورشید تمام رنگوں کو وجود میں لاتا ہے۔

۴۔ماورائے بنفش شعاعین جو خورشید کے پرتو میں سے ایک ہیں۔۹۰ فیصد جراثیم تلف کرنے کے لئے مفید ہیں اور انٹی بیوٹک کا پورا فریضہ انجام دیتی ہیں۔اگر یہ نہ ہوتیں تو کرّہ زمین ایک ہسپتال بن چکا ہوتا۔شاید یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مطہرات میں سے ایک سورج کی براہِ راست روشنی بھی ہے۔(البتہ خاص شرائط کے ساتھ)۔

۵۔سائنسدانوں نے بہت بڑے عدسوں کے ذریعہ سورج کی حرارت اور روشنی کو ایک جگہ اکٹھا کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے اور اس طرح بہت سی حرارت پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہوگئے ہیں وہ دن دور نہیں جب بہت بڑے صنعتی ادارے اور تنصیبات شمسی توانائی سے چلنے لگیں اور یہی توانائی گھریلو استعمال میں بجلی کی جگہ لے لے۔

۶۔بادلوں کی پیدائش کا سبب یہ ہوتا ہے کہ دھوپ سمندروں کی سطح پر پڑتی ہے جس سے بخارات اٹھتے ہیں اور وہ بادلوں کی صورت اختیار کرلیتے ہیں ،پھر روئے زمین پر دھوپ ہی کی وجہ سے زمین کے منطقوں کے درجہ حرارت کے مختلف ہونے کی بناء پر ہوائیں بنتی ہیں جو بادلوں کو پیاسی زمینوں کی طرف لے جاتی ہیں،جن سے نزولِ باراں ہوتا ہے،یہ بھی سورج کے نور اور حرارت کی بدولت ہے۔

---

[1] ''نجوم بے تلسکوپ''ص ۴۷

۷۔آسمانی برجوں (فلکی صورتوں) میں سورج کی منظم حرکت اوراس کا حساب شدہ طلوع وغروب کا پروگرام جوسال کے دنوں میں دقیق اورمنظم تفاوت کے ساتھ عمل میں آتا ہے،جس سے ایک تو چارموسم وجود میں آتے ہیں،دوسرے طرف تقویم اورمنظم حساب کی پیدائش کا موجب ہوتی ہے انسان کی اجتماعی زندگی کیلئے نہات ہی مؤثر ہے۔[1]

۳۔چانداوراس کی برکتیں

سورج کی نسبت چاندایک چھوٹا سا کرہ ہے جوسائنسدانوں کے بقول کرہ زمین سے ۴۹ گنا چھوٹا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی کشش کی توانائی زمین کی توانائی کشش کا چھٹا حصہ ہے۔اس کا کرہ زمین سے فاصلہ تقریباً ۳۸۴ہزار(۳لاکھ ۸۴ہزار) کلومیٹر رہے۔اسی لئے اس کی روشنی ہم تک ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پہنچ جاتی ہے۔

کرہ زمین کے گرداس کی رفتارتقریباًایک سیکنڈ فی کلومیٹر ہے اوراسی مدت کے دوران وہ اپنے گرد بھی ایک چکرلگالیتا ہے، چونکہ یہ دونوں حرکتیں ہم آہنگ ہوتی ہیں،لہٰذا زمین کی طرف چاند کا رُخ ہمیشہ ثابت ہوتا ہے۔اگرآپ تعجب نہ کریں توہم آپ کو بتاتے چلیں کہ شبِ بدر(چودھویں رات کے چاند) کی روشنی اپنے کمال کی حدوں کوچھورہی ہوتی ہے۔اس وقت بھی سورج کی روشنی سے چارسوساٹھ ہزار(چارلاکھ ساٹھ ہزار) گنا کم ہوتی ہے۔لیکن یہی مختصرنور چاندنی راتوں کوروشن کرتا ہے اورایسے پُرفروغ،زیبااوردل انگیز چراغ کووجود میں لاتا ہے جونہات ہی شاعران اوردلپذیر ہوتا ہے۔

نہ صرف مندرجہ بالاآیت میں ہی چانداوراس کی برکتوں اورفوائد کا تذکرہ ہے بلکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں یہ ذکر ہے ،نیز جن آیات میں اس کی قسم کھائی گئی ہے ان کی مجموعی تعداد ستائیں ہے۔سات آیات میں چاند کی تسخیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اوریہ کہ انسانی زندگی کیلئے اس تسخیر کے کیا فوائد ہیں۔چاند کے فائدے اوراس کی برکتیں بھی بہت زیادہ ہیں جن میں سے چندایک کی فہرست یہ ہے:

۱۔زمین کے گرد چاند کی منظم گردش نہایت ہی دلکش طبعی تقویم کووجود میں لاتی ہے جس کی تفصیل ہم گذشتہ تفسیری مباحث میں بیان کرچکے ہیں۔

۲۔چاند کی ملائم روشنی اگرچہ رات کی تاریکی کومکمل طور پرختم تونہیں کرسکتی (اورنہ ہی ختم کرنا چاہیے کیونکہ اس تاریکی کا بھی ایک نہات اہم فلسفہ ہے) لیکن ایک قابل توجہ حدتک بہت سی راتوں میں انسان کی مدد کرتی ہے تاکہ وہ شہروں،جنگلوں اورسمندروں میں اپنی راہیں تلاش کرے۔اورپھر یہ بات بھی ہے کہ چاند کی روشنی اتنی آرام دہ اورملائم ہے کہ انسان اوردوسری چیزوں کی نیندوآرام میں بھی خلل نہیں ڈالتی، بلکہ اس روشنی میں انسان ایک خاص قسم کاسکون محسوس کرتا ہے۔

---

[1] جیسا کہ ہم بتاچکے ہیں کہ ان امورکا اصل حامل سورج کے گردزمین کی انتقالی حرکت ہے،لیکن چونکہ ظاہر میں سورج کی حرکت کی وجہ سے عمل میں آتی ہے،قرآن مجید نے سورج اورچاندونوں کو''حسبان''(نظم وحساب کا ذریعہ) بتایا ہے۔سورہ انعام/۹۶

۳۔سمندروں کے مدوجزر کا مسئلہ بھی چاند کے اہم ترین اثرات میں سے ہے۔جولوگ آزاد سمندروں کے کنارے جا چکے ہوں وہ ہررات اس چیز کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں کہ سمندر کا پانی دومرتبہ اوپر اور نیچے آتا ہے جسے ''مدوجزر'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اور مد یا جزر کی ہرصورت تقریباً چھ گھنٹے تک جاری رہتی ہے۔

''مد'' کی صورت میں سمندر کا پانی اوپر آتا ہے اور بہت سے ساحلوں کو ڈھانپ لیتا ہے جب کہ ''جزر'' کی صورت میں نیچے چلا جاتا ہے اور سمندر کی کچھ تہہ ظاہر ہوتی ہے۔

سمندروں کا یہ مدوجزر انسانی زندگی کیلئے بہت ہی مفید ہوتا ہے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دریاؤں کے میٹھے پانی کو جب کہ وہ سمندر میں گر رہے ہوتے ہیں، پیچھے دھکیل دیتا ہے اور اس کے ذریعہ وسیع پیمانے پر زمینوں کی آبپاشی کی جاتی ہے جس طرح خوزستان کے ساحل میں وسیع وعریض نخلستان میں ہوتا ہے۔

مدوجزر کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ کارخانوں کے ٹربائنوں کیلئے بھی مفید رہتا ہے جن سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔نیز جہاز رانی کیلئے بھی مفید ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ ''مد'' کے دوران بڑے بڑے جہاز بہت سے ساحلوں پر پہنچ جاتے ہیں جن سے سامان اتارنے یا چڑھانے میں سہولت ہوتی ہے۔اسی طرح بندرگاہوں کی صفائی، ماہی گیری، سمندروں کے پانی کی تبدیلی، حرارت کے اعتدال اور اس کے ترکیبی مواد میں توازن پیدا کرنا وغیرہ۔[1]

۴۔سورج اور چاند کلامِ معصوم کی روشنی میں

جب حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی چشمِ مبارک ہلال (پہلی کے چاند) پر پڑتی تو آپ اسے مخاطب کرکے یہ کلمات ارشاد فرماتے جو سراسر توحید اور خداشناسی کے آئینہ دار ہیں۔

''ایها الخلق المطیع الدائب السریع المتردد فی منازل التقدیر المتصرف فی ملك التدبیر، اٰمنت بمن نوربك الظلم ،واوضح بك البهم ،وجعلك اٰیة من اٰیات ملكه وعلامة من علامات سلطانه .....سبحانه ما اعجب ما دبر فی امرك والطف ما صنع فی شأنك جعلك مفتاح شهر حادث لامر حادث.....''اے اطاعت شعار مخلوق! اور اے تیزی سے گردش کرنے والے! جو اپنی مقررہ منزلوں پر ہمیشہ آجارہے ہو، اور فلک تدبیر میں تجھ میں تصرف کیا جاتا ہے، میں اس ذات پر ایمان لاچکا ہوں جس نے تیرے لئے تاریکیوں کو روشن کیا ہے، مبہم چیزوں کو تیرے ذریعہ واضح کیا ہے، تجھے اپنی حکومت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اپنی سلطنت کی علامتوں میں سے ایک علامت قرار دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔پاک ومنزہ ہے وہ جس نے تیرے کام کی کس قدر عجیب انداز میں تدبیر فرمائی ہے اور تیری شان میں اس نے جو کچھ انجام دیا ہے وہ کس قدر لطیف ہے۔تجھے اس نے نئے کاموں کیلئے نئے

---

[1] کتاب ''اعجاز قرآن از نظر علوم امروز''، ''دائرۃ المعارف'' از مصاحب اور دوسری کتابیں

مہینے کی چابی قرار دیا ہے۔۔۔۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مفضل کی روایت میں فرماتے ہیں:

''اے مفضل! تم ذرا سورج کے طلوع وغروب کے بارے میں غور کرو کہ خداوندِ عالم روز وشب کی حاکمیت کو اسی کے ذریعہ قرار کرتا ہے۔ اگر سورج کا طلوع کرنا نہ ہوتا تو دنیا کے تمام کام ٹھپ ہو کر رہ جائے، لوگ نہ تو اپنے معاشی امور کو سنبھال سکتے اور نہ ہی اپنے دوسرے کام انجام دے سکتے۔ دنیا ان کیلئے تاریک اور زندگی نورِ خورشید اور اس کے آثار نہ ہونے کی وجہ سے تلخ اور ناگوار ہو جاتی۔ غرض طلوعِ آفتاب کے فوائد آشکار بھی ہیں اور توضیح وتشریح سے بے نیاز بھی! اب ذرا اس کے غروب کے فوائد پر غور کرو۔ اگر غروب آفتاب نہ ہوتا تو لوگوں کا آرام وسکون غارت ہو جاتا، حالانکہ انسان کو جسم کی آسائش اور روح کے آرام کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔''

پھر سورج کی بلندی اور پستی کے بارے میں سوچو جو چار موسموں کی پیدائش کا سبب ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اسی طرح سالانہ دورانیہ مکمل کرنے کیلئے خورشید کے بارہ برجوں میں منتقل ہونے کے بارے میں سوچو۔۔۔۔۔ آفتاب کی یہ تبدیلی میووں اور غلات کے پکنے کا موجب ہے اور نباتات کی نشوونما کے آغاز کا سبب بنتی ہے۔۔۔۔۔ اس دنیا میں سورج کے طلوع کی کیفیت کو دیکھو کہ خدا نے اس کیلئے کیا کیا پروگرام ترتیب دیئے ہیں کیونکہ اگر یہ سیارہ کسی ایک جگہ پر رُکا رہتا تو اس کی شعاعیں زیادہ جگہوں تک ہرگز نہ پہنچ سکتیں جن سے تمام مخلوق بہرہ مند ہوتی۔

کیا لوگ نہیں دیکھتے کہ یہ اہم امور کیونکر انجام پاتے ہیں اور جن امور میں دنیا کے لوگوں کا فائدہ وبقاء ہے ان میں کسی قسم کے ناموزونیت ونافرمانی نہیں پائی جاتی۔

چاند کے ذریعہ بھی خدا کو پہچانو! کیونکہ لوگ ایک مخصوص نظم کے تحت مہینوں کو پہچانتے اور سالوں کا حساب کرتے ہیں۔۔۔۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ وہ تاریک راتوں کو کیسے منور کرتا ہے اور اس میں کیا کیا فوائد مضمر ہیں؟ کیونکہ باوجودیکہ لوگوں کو سکون اور آرام کیلئے رات کی خنکی اور تاریکی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مصلحت کا بھی تقاضا نہیں ہے کہ تمام راتیں مکمل طور پر تاریک رہیں کہ جن میں دوسرے کوئی بھی کام انجام نہ دیا جا سکے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وقت کی تنگی یا دن میں ہوا کی گرمی کی وجہ سے جو کام دن میں انجام نہیں دے پاتے وہ رات کو انجام دیتے ہیں یہ کام بعض اوقات چاند کی روشنی میں بھی انجام پاتا ہے۔ اور تمام راتوں میں روشنی ایک جیسی نہیں ہوتی یا سورج کی روشنی سے کم ہوتی ہے اس لئے کہ لوگ مکمل طور پر اپنے کاموں کا پروگرام راتوں کو مقرر نہ کرلیں اور جو سکون مقصود ہے وہ ضائع نہ ہو جائے۔[2]

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

[1] بحار الانوار جلد ۵۵ ص ۱۷۸ حدیث ۳۶

[2] بحار الانوار جلد ۵۵ ص ۱۷۵ حدیث ۳۵ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

۹۔رات اوردن کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

اگرچہ رات اوردن ایسی چیزیں ہیں جواپنے وجود کیلئے آفتاب کے نوراورزمین کی حرکت کی مرہون منت ہیں اورانہی کی برکتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔لیکن چونکہ قرآنِ مجید نے اپنی توحیدِ آیات میں ان دونوں پراپنی خصوصی توجہ مبذول فرمائی ہے اور بہت سی آیات میں ان پرتاکید کی ہے،لہٰذاضروری بن جاتا ہے کہ ان پرجداگانہ بحث کی جائے تاکہ اس بےنشان کی نشانیاں ان میں تلاش کرسکیں،کائنات کے خالق اور پروردگار سے زیادہ سے زیادہ آشنائی حاصل کرسکیں اوراسی سے محبت کرکے اس کے درآستان پرجبہ سائی کریں۔توآیئے سب سے پہلے مندرجہ ذیل بارہ آیات کوگوشِ جان سے سنتے ہیں:

۱۔۔۔وَهُوَالَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَوَالشَّمْسَ وَالقَمَرَ

(انبیاء/۳۳)

۲۔۔۔یُقَلِّبُ اللهُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ

(نور/۴۴)

۳۔۔۔هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْافِیْهِ وَالنَّهَارَمُبْصِرًااِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ

(یونس/۶۷)

۴۔۔۔وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُوَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

(حٰمٓ السجدۃ/۳۷)

۵۔۔۔وَجَعَلْنَاالَّیْلِ وَالنَّهَارَاٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَآ اٰیَةَ الَّیْلِ وَجَعَلْنَااٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْافَضْلًامِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْاعَدَدَالسِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ

(بنی اسرائیل/۱۲)

۶۔۔۔وَجَعَلْنَاالَّیْلَ لِبَاسًا{}وَّجَعَلْنَاالنَّهَارَمَعَاشًا

(نباء/۱۰۔۱۱)

۷۔۔۔وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا

(فرقان/۶۲)

۸۔۔۔وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ

(نحل/۱۲)

۹۔۔۔اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ

(یونس/۶)

۱۰۔۔۔قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِضِیَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ﴿۷۱﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِلَیْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِیْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴿۷۲﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴿۷۳﴾

(قصص/۷۱ تا ۷۳)

۱۱۔۔۔وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی {} وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰی

(اللیل/۱۔۲)

۱۲۔۔۔ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ

(حج/۶۱)

ترجمہ

۱۔۔۔وہ وہی ہے جس نے رات، دن، سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے۔

۲۔۔۔خدا ہی رات اور دن کو اُلٹ پھیر کرتا رہتا ہے، بے شک اس میں صاحبانِ بصیرت کیلئے عبرت ہے۔

۳۔۔۔وہ وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے تا کہ تم اس میں آرام کرسکو اور ان کو روشنی عطا کرنے والا بنایا ہے، اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔

۴۔۔۔اس کی نشانیوں میں سے رات، دن، سورج اور چاند ہیں۔

۵۔۔۔ہم نے رات اور دن کو (اپنی توحید اور عظمت کی) دو نشانیاں قرار دیا ہے، پھر رات کی نشانی کو مٹا کر روشنی کی نشانی کو روشنی عطا کرنے والا بنایا، تا کہ تم (اس کے اُٹھ کھڑے ہو) اور برسوں کی گنتی اور حساب کو جانو۔

۶۔۔۔اور ہم نے (تمہارے لئے) رات کو پردہ اور دن کو تمہاری زندگی اور معاش کا ذریعہ بنایا ہے۔

۷۔۔۔وہ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین قرار دیا ہے، ان لوگوں کیلئے نصیحت حاصل کرنا چاہتے ہیں، یا شکر گزاری کرنا چاہتے ہیں۔

۸۔۔۔اس نے تمہارے لئے رات اور دن مسخر کر دیا ہے۔

۹۔۔۔یقیناً رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان چیزوں میں جنہیں خدا نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان لوگوں کیلئے آیات (اور نشانیاں) ہیں جو پرہیزگار ہیں۔

۱۰۔۔۔کہہ دیجئے کہ مجھے بتاؤ اگر خداوندِ عالم رات کو تمہارے لئے قیامت کے دن تک جاودانی قرار دے دیتا تو خدا کے علاوہ کوئی اور معبود تمہارے لئے روشنی لاسکتا؟ کیا تم سنتے نہیں ہو۔۔۔۔کہہ دیجئے کہ مجھے بتاؤ اگر خدا قیامت تک برابر تمہارے سروں پر دن کئے رہتا تو خدا کے علاوہ کون معبود ہے جو تمہارے لئے رات لے آتا کہ جس میں تم آرام کرو؟ آیا دیکھتے نہیں ہو؟ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا ہے تا کہ تم اس میں آرام کرو اور فضل خدا سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو، شاید اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ۔

۱۱۔۔۔رات کی قسم جب وہ دنیا پر چھا جائے۔۔۔۔اور دن کی قسم جب وہ خوب روشن ہو۔

۱۲۔۔۔یہ اس لئے ہے کہ خداوندِ عالم رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور خدا سننے اور دیکھنے والا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

شب و روز کا عجیب نظام

قرآن مجید میں ستر سے زائد مرتبہ ''لیل'' (رات) کا لفظ اور پچاس سے زائد مرتبہ ''نہار'' (دن) کا لفظ دہرایا گیا ہے جن میں سے مذکورہ بالا بارہ آیات ایک نمونہ ہیں۔ اوران میں لیل ونہار کی تخلیق کو توحید نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں شب و روز اور شمس وقمر کی اصل تخلیق کو بیان کیا گیا ہے جو توحید اور خداشناسی کی راہوں کے راہی ہیں ان کیلئے ایک دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ''وہ وہی ہے جس نے رات اور دن کو پیدا کیا ہے۔'' (وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارُ)

یہ چیز دوسری صورت میں اسی سلسلے کی چوتھی آیت میں بھی ذکر ہوئی ہے، فرماتا ہے ''اس کی نشانیوں میں سے رات، دن اور سورج اور چاند ہیں۔'' (وَمِنْ اٰیَاتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ)

جب کہ دوسری آیت میں خدا کے حکم سے رات اور دن کے الٹ پھیر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اسے صاحبان بصیرت کیلئے عبرت قرار دیا گیا ہے۔ (یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ)

تبدیلی کا یہ اشارہ ممکن ہے کہ رات اور دن کے آنے جانے کی طرف ہو یا پھر ان کے وقت کے کم اور زیادہ ہونے کی طرف ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سردی اور گرمی کے دنوں میں ان میں جو تفاوت رونما ہوتا ہے، اس کی طرف اشارہ ہو۔[1] لیکن اس بات میں بھی کوئی حرج نہیں کہ رات اور دن کا یہ ہیر پھیر ان سب معانی کو شامل ہو۔

تیسری آیت میں ''شب'' و ''روز'' کے ایک نہایت ہی اہم فائدے پر زور دے کر کہتا ہے کہ ''خداوندِ عالم تو وہ ہے جس نے رات کو تمہارے سکون کیلئے بنایا ہے اور دن کو روشنی دینے کیلئے۔'' (هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا)

واضح سی بات ہے کہ رات کی تاریکی میں آرام وسکون خداوندِ متعال کی ایک اہم ترین نعمت ہے جس طرح کہ دن کی روشنی مختلف سرگرمیوں کیلئے ایک اور اہم نعمت ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ ''مبصر'' استعمال کیا گیا ہے جس کا اصل معنی ہے۔ ''بینا'' (دیکھنے والا) اور سب کو معلوم ہے کہ دن خود تو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ دوسروں کی بینائی کا سبب بنتا ہے لہٰذا اسے ''مبصر'' کہا گیا ہے۔ یہ تعبیر شاید تاکید اور مبالغے کے عنوان کے تحت اس پر اطلاق ہوئی ہے۔

---

[1] یہ تینوں احتمالات تفسیر روح المعانی جلد ۱۸ ص ۱۷۳ اور تفسیر فخر رازی جلد ۲۴ ص ۲۵ میں ذکر ہو چکے ہیں جب کہ تفسیر مجمع البیان نے صرف پہلی اور دوسری تفسیر کو ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ۷ ص ۱۴۸)

یہ ہے بھی حقیقت کہ اگر نور اور روشنائی کی چمک نہ ہوتو ہزاروں بینا آنکھیں بھی بیکار ہیں، اسی لئے آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''اس بارے میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جن کے کان ہیں اور وہ سنتے ہیں'' اور سُن کر ان کے بارے میں غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔(اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ)

پانچویں آیت میں شب وروز میں سے ہر ایک کو آیات الٰہی میں سے ایک آیت کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ''ہم نے رات کی آیت کو مٹا کر دن کی آیت کو روشنی عطا کرنے والا بنایا''۔ پھر اس کے دو اہم فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''مقصد یہ ہے کہ اس کے پرتو میں تم زندگی کی تلاش میں کھڑے ہو جاؤ اور خداوندِ عالم کے فضل سے بہرہ مند ہوتے رہو اور سالوں کی تعداد اور حساب کو جانو''۔(لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ)

کیا خداوندِ عالم کے فضل وکرم سے بہرہ برداری کا تعلق صرف دن سے ہوتا ہے اور سال اور ماہ کے حساب کا جاننا رات اور دن دونوں کے آثار میں سے ہے یا نہیں بلکہ دونوں کا رات اور دن سے قریبی تعلق ہے؟ کیونکہ رات کا سکون اور آرام دن میں کام کرنے اور خداوندِ عالم کے فضل وکرم سے بہرہ حاصل کرنے کیلئے یقیناً مؤثر ہوتا ہے۔ دوسرے معنی آیت کی ہم آہنگی کے پیش نظر زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں، ہر چند کہ کچھ مفسرین نے پہلے معنی کو ہی ذکر کیا ہے۔

چھٹی آیت میں یہی چیز ایک اور صورت میں توجہ کو مبذول کرا رہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے رات کو لباس اور پردہ بنایا ہے اور دن کو معاش''(وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا)

''معاش'' ممکن ہے کہ اسم زمان ہو یا اسم مکان ہو اور پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مصدر میمی ہو۔ اور یہی معنی مناسب ہیں۔[1]

''رات'' کے بارے میں ''لباس'' کی تعبیر نہایت ہی عمدہ اور پُرکشش ہے کیونکہ رات اس نیم کرہ ارضی کیلئے ایک پردہ کی حیثیت رکھتی ہے یا انسانوں کیلئے پردہ پوشی کا کام دیتی ہے، جس طرح کہ لباس، انسانی جسم کو مختلف قسم کی تکلیفوں سے بچاتا ہے اور اسے خوبصورتی عطا کرتا ہے اسی طرح رات کی تاریکی اور گہری نیند جو رات کی برکت سے حاصل ہوتی ہے انسانی جسم کو خوشحال اور سرور عطا کرتی ہے اور اسے مختلف بیماریوں سے بچاتی ہے۔

ساتویں آیت میں رات اور دن کے ایک دوسرے کا جانشین ہونے کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ''خدا وہ ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے کا جانشین بناتا ہے۔''(وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً)

''خلفہ''(بروزن فتنہ) ''مفردات'' میں ''راغب'' کے بقول وہاں پر استعمال ہوتا ہے جہاں پر دو چیزیں ہمیشہ ایک دوسرے کا جانشین ہوتی رہتی ہوں۔ لیکن ''فیروز آبادی'' اپنی کتاب ''قاموس اللغۃ'' میں کہتے ہیں کہ ''خلفہ مختلف کے معنی میں ہے۔ پہلی صورت میں شب وروز کا باری باری آنا مدنظر رکھا گیا ہے کیونکہ اگر ان کا باری باری ایک دوسرے کے بعد آنا نہ ہوتا تو زمین پر موجود تمام چیزیں سورج کی

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دن کے ساتھ ''معاش'' (زندگی) کا ذکر اس لئے ہے۔ کہ رات کی نیند موت کی مانند ہوتی ہے جیسا کہ مشہور مثال ہے کہ ''نیند موت کی بہن ہے'' اس لئے اس کا مقابل نقطہ جو کہ دن ہے وہ بیداری اور حیات کا موجب ہوتا ہے (حیات وزندگی اپنے تمام آثار کے ساتھ)

تمازت کی شدت کی وجہ سے جل کر بھسم ہوجاتیں یا پھر رات کی شدتِ سرما کی وجہ سے منجمد ہوکر رہ جاتیں۔ جب کہ دوسری صورت میں شب وروز کا باہمی فرق اور سال کے چار مختلف موسموں کی طرف اشارہ ہے جن کے واضح اور مخصوص آثار انسانی زندگی میں ملتے ہیں۔

بعض مفسرین نے پہلے معنی کو لیا ہے جب کہ بعض حضرات نے دوسرے معنی کو اختیار کیا ہے۔لیکن اگر دونوں معانی کو آپس میں جمع کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

اسلامی روایات میں آیا ہے کہ انسان کی وہ عبادتیں جو وہ رات میں نہیں بجالا سکا، دن کو ان کی قضا بجالاسکتا ہے (یا اس کے برعکس) اور شاہد کے طور پر یہی آیت لائی گئی ہے۔[1]

یہ تفسیر بھی مذکورہ بالا تفاسیر سے نہیں ٹکراتی کیونکہ اس میں بھی ایک خاص نظام اور شب وروز کے باری باری آنے کی طرف اشارہ ہے جس میں خداوندِ قادروقدیر کے بے پناہ علم اور قدرت کی حکایت کی گئی ہے۔مثال کے طور پر اگر کرہ زمین کی حرکت اپنے محور کے گرد کرہ زمین کی حرکت موجودہ صورت سے زیادہ تیز یا زیادہ سست ہوتی تو ممکن تھا کہ دن یا راتیں اس قدر طولانی ہوتیں کہ روئے زمین کی تمام مخلوق، حتیٰ کہ انسانوں تک کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

آٹھویں آیت میں شب وروز کی تسخیر کا ذکر ہے اور ان کے انسانی خدمت گار ہونے کا بیان ہے۔چنانچہ ارشار ہوتا ہے۔''خداوند عالم نے رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کردیا ہے۔''(وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ)

چونکہ تسخیر کی تشریح اس سے ملتی جلتی آیات میں بیان ہوچکی ہے، دوبارہ لکھنے ضرورت نہیں ہے۔

نویں آیت میں پہلے تو رات اور دن کے اختلاف کو خدا کی نشانی بتایا گیا ہے۔پھر تمام ان مخلوقات کو اس کی قدرت علم اور عظمت کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے جو خدا نے زمین وآسمان میں پیدا کی ہیں۔''(إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُوْنَ)

اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو کی تخلیق کس حد اہم ہے۔

ان آیات کے دسویں حصے میں تین آیات میں رات اور دن کے اہم فوائد کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔''اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر خداوندِ عالم رات کو قیامت تک طولانی کردیتا تو اس کے بغیر کوئی اور ہے جو تمہارے لئے نور اور روشنی لے آتا تاکہ تم اس کے فوائد اور برکات سے بہرہ مند ہوتے؟ یا اگر خدا دن کو اسی قدر طولانی بنادیتا تو خدا کے علاوہ کوئی اور ہے جو تمہارے لئے رات کی تاریکی خلق کرتا، جو تمہارے لئے آرام وسکون کا باعث ہوتی؟ یہ خدا ہی تو ہے جس نے اپنی رحمت کی بدولت شب وروز اور نور وظلمت کو مقرر فرمایا ہے جس سے تم ایک تو ضروری آرام وسکون حاصل کرتے ہو اور دوسرے زندگی کی سرگرمیاں خداوندِ عالم کے فضل وکرم

---

[1] یہ تفسیر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں بیان ہوئی ہے (جیسا کہ تفسیر رازی میں ہے) اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں آئی ہے۔(جیسا کہ تفسیر نورالثقلین جلد ۳ میں اسی آیت کی ذیل میں ہے۔)

کے حصول کیلئے جاری رکھتے ہوتا کہ یہ عظیم نعمتیں تمہاری شکر گزاری کی حس کو بیدار کریں اور تم خالق کی تلاش کو نکلو!

قابل توجہ یہ بات ہے کہ ایک آیت کے ذیل میں تو فرماتا ہے۔''اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ'' (کیا تم سنتے نہیں؟) اور دوسری کے ذیل میں فرماتا ہے''اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ'' (کیا تم دیکھتے نہیں؟)

شاید ان عبارتوں کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ شب و روز کے اس دقیق نظام میں حسّی دلائل بھی موجود ہیں، جو آنکھ سے دیکھے جاسکتے ہیں نقلی دلائل بھی موجود ہیں جو کان سے سنے جاسکتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رات کے سرمدی ہونے کے بارے میں ''کیا تم نہیں سنتے ؟'' کہا گیا ہے اور دن کے جاودانی ہونے کے بارے میں ''کیا دیکھتے نہیں؟'' کی تعبیر کو استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ عام طور پر تاریکی میں کان کام کرتے ہیں اور روشنی میں آنکھیں بیشتر کام کرتی ہے۔

شب و روز کے موضوع کی اہمیت تو اس حد تک ہے کہ قرآن مجید نے متعدد آیات میں ان دونوں کی قسم کھائی ہے۔منجملہ ان آیات کے اسی سلسلے کی گیارہویں آیت میں فرماتا ہے:''رات کی قسم جب وہ تمام چیزوں کو ڈھانپ لے اور دن کی قسم جب وہ جلوہ گر ہو جائے۔''(اس کا زندگی بخشنے والا نور، اس دنیائے حیات میں مختلف برکتوں سمیت، بیداری کی گھنٹی بجاتا ہے)''وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى''

یہی چیز ایک اور آیت میں دوسری تعبیر کے ساتھ آئی ہے ارشاد ہوتا ہے:

''اللَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ'' رات کی قسم جب وہ پیٹھ پھیر لے (اور روشنی کی طرف رخ کرے) اور دن کی قسم جب اپنا چہرہ ظاہر کرے (اور اپنی روشنی کے ساتھ مسکرائے) (مدثر/ ۳۳۔ ۳۴)

ایک اور جگہ پر فرماتا ہے:

''وَاللَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ'' رات کی قسم جب وہ پیٹھ پھیر کر اپنی آخری حد تک جا پہنچے اور دن کی قسم جب وہ سانس لے (اور اپنی گہری سانسوں کے ساتھ تمام موجودات کے ڈھانچے میں روح پھونک دے) (سورہ تکویر/ ۱۷)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

''وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى'' دن کی قسم جب آفتاب اوپر آجائے اور رات کی قسم جب وہ آرام میں ہو۔ (اور سکون عطا کرے) (ضحیٰ/ ۱۔ ۲)

اس کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی قسمیں ہیں جو ایک بہت بڑی اہمیت کی نشاندہی کر رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ قرآن رات اور دن کی اہمیت کا کس حد تک قائل ہے، تاکہ لوگ اس بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کریں اور خداوندِ عالم کی نشانیوں کا ان دونوں کے چپے چپے میں نظارہ کریں، کیونکہ قسم ہمیشہ کسی چیز کی اہمیت کی دلیل اور غور و فکر کرنے کا سبب ہوتی ہے۔

اسی سلسلے کی بارہویں اور آخری آیت میں ہم اس بارے میں ایک نئی تعبیر کا سامنا کر رہے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے''یہ سب اس لئے ہے کہ خداوندِ عالم رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔''(ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ)

''یولج''، ''ایلاج'' کے مادہ سے ہے جس نے معنی ہیں داخل کرنا۔اور چونکہ یہ فعل مضارع کا صیغہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ فعل

مضارع استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ جو ممکن ہے کہ سال کے مختلف موسموں میں دن رات کے تدریجی اور منظم طریقے سے کم اور زیادہ ہونے کی طرف اشارہ ہو کہ ان میں سے ایک سے کمی اور دوسرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تدریجی نظام نباتات کی پرورش اور زندہ موجودات کے ارتقاء کیلئے ایک موثر عامل ہے اگر یہ چیز ناگہانی صورت میں عمل پذیر ہوتی تو تمام موجودات کا توازن بگڑ جاتا اور اس سے زبردست نقصان ہوتا۔ اسی لئے خداوندِ عالم یہ کام تدریجی طور پر عمل میں لاتا ہے۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سورج کے طلوع وغروب کی طرف اشارہ ہو کیونکہ جب سورج طلوع کرنے کے قریب ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی کرنیں فضا کے بالائی حصہ کو روشن کرتی ہیں جس سے یہ فضا قدرے روشن ہوتی ہے۔ سورج جس قدر افق کی پشت سے اوپر آتا جائے گا اسی قدر یہ روشنی بھی بڑھتی جائے، اور پھر وقتِ غروب، رات یک دم ہی نہیں آجاتی بلکہ سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ فضا کے نچلے حصے سے سمٹنا شروع ہوجاتی ہیں۔ تاریکی ان کی جگہ لینا شروع کردیتی ہے اور یہ تدریجی تبدیلی جو نور سے ظلمت میں اور ظلمت سے نور میں عمل میں آتی ہے، اس بات کا باعث بنتی ہے کہ انسان جسمانی اور روحانی لحاظ سے اس سے ہم آہنگ ہوجائے۔ اگر رات یا دن یک دم رونما ہوجاتے تو یقیناً اس کے نتائج بہت بُرے نکلتے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کا ظاہر یہ بتا رہا ہے کہ رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا ایک ہی وقت میں عمل میں آتا ہے۔ درحقیقت ہے بھی ایسا ہی کیونکہ خطِ استواء کے شمالی علاقوں میں گرمیوں کے موسم میں رات بتدریج کم ہوکر دن کا حصہ بنتی جاتی ہے، یعنی ''يُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارَ'' کا مصداق ہوتی ہے۔ انہی اوقات میں خطِ استواء کے نیچے کے حصے میں دن کم ہوکر رات کا حصہ بنتے جاتے ہیں جو ''يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ'' کا مصداق ہوتے ہیں۔ [1]

''توحید مفضل'' والی معروف حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

''اے مفضل! رات اور دن کے ایک دوسرے میں تدریجی طور پر داخل ہونے میں اچھی طرح غور کرو۔۔۔۔ اگر ایک کا دوسرے میں یکبارگی داخل ہونا ہوتا تو اس سے جسم کو نقصان پہنچتا، جس سے لوگ بیمار ہوجاتے، بالکل ویسے ہی جیسے تم میں سے کوئی شخص یکدم گرم حمام سے باہر نکل کر بالکل ٹھنڈی جگہ پہنچ جائے، یقیناً اس سے اسے نقصان پہنچے گا اور وہ بیمار ہوجائے گا۔۔۔ اگر اس بارے میں خدائی تدبیر نہ ہوتی، تو یہ تبدیلی ایسی صورت میں کیونکر رونما ہوتی کہ جس سے انسان کی صحت وسلامتی برقرار رہ جائے۔ [2]

---

[1] طریحی نے مجمع البیان میں ''ولج'' کے مادہ میں اسی نکتہ کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔

[2] بحار جلد ۳ ص ۸۱۱

چند ضروری وضاحتیں

۱۔نور اور ظلمت کی اہمیت۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔شب و روز کے فوائد

ہم مندرجہ بالا آیت میں دیکھ چکے ہیں کہ خداوندِ عالم انسانوں کو کیونکر ان دو موجودات جو بظاہر سادہ ہیں، مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور انہیں اپنی آیات میں شمار کرتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اس بارے میں ہم جس قدر بھی غور کریں نت نئے نکات تک جا پہنچیں گے۔

۱۔ہم جانتے ہیں کہ کائنات کے مختلف حصوں کے شب و روز میں یقیناً بہت فرق ہے۔خطِ استواء کے علاقوں میں رات بھی بارہ گھنٹے کی ہوتی ہے اور دن بھی بارہ گھنٹے کا۔لیکن قطبی منطقے میں ۹۰ درجے کے مدار میں تمام سال ایک دن رات سے زیادہ نہیں ہے۔جن میں سے ہر ایک تقریباً چھ ماہ کا ہوتا ہے (البتہ ایسے منطقوں میں عموماً آبادی اور سکونت نہیں ہوتی) اور کائنات کے دیگر حصوں میں ان دونوں کے درمیان مراحل تشکیل پاتے ہیں۔

لیکن تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اس قدر فرق کے باوجود روئے زمین کے تمام نقاط سال بھر میں سورج کی روشنی سے ایک جیسا استفادہ کرتے ہیں اور یہ ایک نہایت ہی منصفانہ اور عادلانہ نظام ہے۔

۲۔ہمیشہ گرمیوں کے موسم میں دن لمبے ہوتے ہیں اور سردیوں میں راتیں طولانی ہوتی ہیں، یعنی دو باتیں بیک وقت ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتی ہیں۔دنوں کی لمبائی اور دھوپ کا عمودی (یا قائل بہ عمودی) پڑنا اور یہ دونوں اثر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں جن سے میوے اور غلہ و نباتات پک جاتے ہیں اور ہوا گرم ہو جاتی ہے۔موسم سرما میں زیادہ سردی درختوں اور دانوں کے نیند میں چلے جانے کا موجب ہوتی ہے اور مزید اربات یہ ہے کہ استوائی علاقوں میں جہاں پر دھوپ پوری طرح عمودی پڑتی ہے دن زیادہ طولانی نہیں ہوتے وگرنہ گرمی لگنے اور نباتات کے جلنے کا اندیشہ تھا۔

۳۔ہمیشہ سورج کی روشنی بیداری، ہوشیاری، تحرک اور جوش و خروش کا سبب ہوتی ہے جب کہ اس کے برعکس تاریکی آرام و سکون اور نیند کا موجب۔خاص کر حیوانات کی دنیا میں یہ چیز واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔کیونکہ پرندے صبح صادق کے طلوع کے ساتھ ہی بیدار ہو کر صحرا کا رُخ کرتے ہیں، اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی اپنے اپنے آشیانوں کو واپس لوٹ آتے ہیں اور رات کو آرام کرتے ہیں۔دیہاتوں کے جہاں کے اکثر لوگ صحیح و سالم اور طبعی زندگی کے حامل ہوتے ہیں ان کا بھی ایسا ہی پروگرام ہوتا ہے، جب کہ مشینی تمدن کی ترقی کی وجہ سے اور مصنوعی روشنیوں کی ایجاد کے سبب بہت سے لوگ رات کا کافی حصہ جاگتے اور دن کے بہت سے حصے میں سوتے رہتے ہیں۔یہ چیز بہت سی بیماری کا عامل ہوتی ہے۔قرآن مجید سورہ یونس کی ۶۷ ویں آیت میں ''هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ اللَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا'' (وہ ذات تو وہ ہے جس نے رات اس لئے بنائی ہے کہ تم اس میں آرام کر سکو اور دن کو روشنی عطا کرنے والا بنایا ہے) کہہ کر درحقیقت ایسے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ رات کی نیند کو چھوڑ دینے سے روحانی امن سکون غارت ہو جاتا ہے۔

۲۔قرآنِ مجید میں رات اوردن

قرآنِ مجید میں تیس سے زیادہ مقامات پررات اوردن کوخدا کے وجودکی نشانی اوراس کے علم وقدرت پردلیل کے عنوان سے ذکرکیا گیاہے۔لیکن:

کبھی کہتاہے: یہ صاحبان عقل کے لئے عبرت ہے۔(نور/ ۴۴)

کبھی کہتاہے: یہ ''پرہیزگاروں'' کیلئے آیات ہیں۔(یونس/٦)

کبھی کہتاہے: یہ ''صاحبان ایمان'' کیلئے آیات ہیں۔(نمل/۸٦)

اورحقیقت میں ان تینوں امورکارابطہ یہیں سے واضح ہوجاتاہے کہ غوروفکراوروہ بھی پختہ اورگہراغور(جیسا کہ ''اُولُوا الْاَلْبَابِ'' کے مفہوم میں پایاجاتاہے)ایمان کے ظہورکاسبب اوراس کی تقویت کاموجب ہوتاہے،جب کہ ایمان بھی اپنے لحاظ سے دل وجان کے اندرتقویٰ کے ظہورکاسبب ہوتاہے۔اس طرح خداوندِعالم کی کائنات میں علم وقدرت اورعظمت کی آیات میں غوروفکرکرنے سے ایک توعقیدے کوتقویت ملتی ہےاوردوسرےعمل کےلحاظ سےانسان کی تربیت ہوتی ہے۔

۱۰۔ پہاڑوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ

ہر شخص اجمالی طور پر جانتا ہے کہ بڑی بڑی آبادیاں اور بہت سے اہم شہر بڑے بڑے پہاڑوں کے دامن یا ان کے اندر آباد ہیں۔ عظیم نہریں، جو شہروں کی آبادی کا سبب ہوتی ہیں وہ بھی انہی پہاڑوں کی بدولت ہیں، لیکن انسانی زندگی میں پہاڑوں کا عمل دخل صرف اسی حد تک نہیں ہے، ہر چند کہ یہ چیزیں بھی اپنی جگہ پر بڑی اہم ہیں۔

پہاڑوں کا صرف انسانی زندگی کے ساتھ ہی گہرا تعلق نہیں ہے بلکہ روے زمین پر موجود تمام چیزوں کی حیات پہاڑوں کی مرہون منت ہے۔ ان کے فوائد اور برکتیں بے شمار ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ کرہِ زمین پہاڑوں کے بغیر زندگی کے قابل نہیں ہے تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔

اس لئے قرآن مجید نے بہت سی آیات میں پہاڑوں کی تخلیق پر بڑا زور دیا ہے اور انہیں توحید کی آیات اور پروردگارِ عالم کے علم وقدرت کی نشانیاں قرار دیا ہے۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ دل وجان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ{}وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ{}وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ

(غاشیہ/۱۷تا۱۹)

۲۔۔۔اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا{}وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا

(نبا/۶۔۷)

۳۔۔۔وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّالْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَارَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا

(رعد/۳)

۴۔۔۔وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَاَنْهٰرًاوَّسُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ

(نحل/۱۵)

۵۔۔۔وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ ۪ وَجَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ﴿۳۱﴾ (انبیاء/۳۱)

٦۔۔۔وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ

(حٰمٓ سجدہ/١٠)

٧۔۔۔وَجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا

(مرسلات/٢٧)

٨۔۔۔اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

(نمل/٦١)

٩۔۔۔وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا

(نحل/٨١)

١٠۔۔۔وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ

(فاطر/٢٧)

ترجمہ

١۔۔۔آیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے وہ کیسے بنایا گیا ہے ؟ اور آسمان کی جانب نہیں دیکھتے کہ کیونکر بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے گاڑے گئے ہیں؟

٢۔۔۔آیا ہم نے زمین کو تمہارے لئے سکون کی جگہ نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو میخیں؟

٣۔۔۔اور وہ وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں۔۔۔۔۔

٤۔۔۔اور اس نے زمین میں محکم اور پختہ پہاڑ گاڑے ہیں تاکہ زمین تمہیں لے کر جُھک نہ جائے، اور اس نے نہریں ایجاد کیں اور راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

٥۔۔۔اور ہم نے زمین میں بھاری بھرکم پہاڑ بنائے تاکہ وہ (انسان) سکون میں رہیں اور ان میں درّے اور راستے بنائے تاکہ لوگ ہدایت پا جائیں۔

٦۔۔۔اوراس نے زمین میں اوپر سے پہاڑ بنائے اوراس میں برکتیں پیدا کیں اورخوراک کامختلف مواداس میں مقررفرمایا، یہ سب کچھ چاردنوں میں تھااورتمام طلب گاروں کی ضرورت کے مطابق۔

٧۔۔۔اورہم نے اس میں مضبوط اور بلند پہاڑ قرار دیئے اورتمہیں خوشگوار پانی پلایا۔

٨۔۔۔بھلاوہ کون ہے جس نے زمین کوٹھہرنے کی جگہ بنایااوراس کے درمیان نہریں چلائیں اورزمین کیلئے ٹھوس اورمحکم پہاڑ بنائے اوردودریاؤں کے درمیان حدفاصل بنایا(تاکہ وہ آپس میں مخلوط نہ ہوں،تو پھرایسی صورت میں) خداکے ساتھ کوئی اورمعبودبھی ہے؟ بالکل نہیں! بلکہ ان میں سے اکثرتو کچھ جانتے ہی نہیں(اورجاہل ہیں)

٩۔۔۔اورخداہی نے تمہارے(آرام کے) لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے،اُسی نے تمہارے لئے پہاڑوں سے پناہ گاہیں بنائیں۔

١٠۔۔۔اور پہاڑوں سے بھی (خدا کی مہربانی سے) راستے بنائے گئے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں کچھ توسفیداورسرخ اورکچھ بالکل کالے سیاہ

الفاظ کی تشریح

''جَبَل''(بروزن عَسَل) کے معنی ہیں پہاڑ اگرچہ بعض ارباب لغت نے اس کی تفسیر میں کہاہے کہ اس کے معنی ہیں مسطح زمینوں کے مقابل کا نقطہ۔بعض نے کہاہے کہ اس کے معنی ہیں زمین کی وہ سطح مرتفع جو بلنداورلمبی ہو۔بظاہر یہ تمام تعبیریں ایک ہی معنی کی طرف اشارہ ہیں۔

کبھی کبھی کنایہ کے طور پر دلیراورعظیم لوگوں کوبھی ''پہاڑ'' کہاجاتا ہے۔''جبلی'' ان صفات کوکہاجاتا ہے جوانسان کی طبیعت میں پائیدارہوتی ہیں اورکسی قسم کی تبدیلی کوقبول نہیں کرتیں۔(جیسے پہاڑ ہوتے ہیں)اورکسی گروہ یاجماعت کو''جِبِل''(جیم اور باکے کسرے اورتشدیدلام کے ساتھ) کہاجاتا ہے بوجہ عظمت میں کوہ کے مشابہ ہونے کے۔[1]

''رَوَاسِیَ''،''راسیۃ'' کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ٹھوس اورمحکم پہاڑ،اس کی اصل ''رسو''(بروزن رَسم،یابروزن غُلُوّ) ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کااپنی جگہ پرڈٹے رہنااورثابت رہنا۔جن برتنوں کوزمین میں گاڑکران سے کام لیتے ہیں،انہیں بھی ''راسیۃ'' کہاجاتا ہے۔(جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات کے سلسلے میں قرآنِ مجید میں ہے''قدورراسیات''یعنی زمین میں گڑی ہوئی بڑی بڑی دیگیں)جوستون خیمہ کے درمیان میں گڑے ہوتے ہیں انہیں ''رسی'' کہاجاتا ہےاور''مرسات'' کشتی کے اس لنگرکوکہتے ہیں جوایک جگہ پرکشتی کے ثبات وقرارکاباعث ہوتا ہے۔یہ لفظ کبھی کبھی لوگوں کے درمیان صلح برقراررکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ صلح ہی ملک کے ثابت اور پائیدار ہونے کا سبب ہوتی ہے

---

[1] مفردات راغب،مجمع البیان اورلسان العرب

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

پہاڑوں کی برکتیں اور عجیب اسرار

ان آیات کے پہلے حصے میں خداوندِ عالم نے اپنی زمین وآسمان میں موجود نشانیوں کے مطالعہ کیلئے لوگوں کو دعوت دی ہے، اس کے بعد اونٹ کی تخلیقی کیفیت اور اسی طرح آسمان کی بلندی کے مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ ستونوں کے بغیر کیونکر برپا ہے۔ پہاڑوں کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ''کیا وہ پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیونکر اپنی جگہ پر گڑے ہوئے ہیں؟'' (وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ)

ممکن ہے کہ تعبیر پہاڑوں کے اپنی جگہ پر ثابت وبرقرار رہنے اور زمین کو لرزہ براندام ہونے جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا، سے روکنے کی طرف اشارہ ہوا، یا پھر اُن کے طوفانوں اور جھگڑوں کے مقابلے میں استواری، انسان کیلئے قابل اطمینان پناہ گاہیں ایجاد کرنے اور چشموں ندیوں، نالوں اور نہروں کی صورت میں پانی کیلئے ذخیرہ ایجاد کرنے کی طرف اشارہ ہو۔ ممکن ہے یہ تعبیر پہاڑوں کی طرزِ ساخت اور ان کی پیدائش کی طرف ظریف اشارہ ہو، موجودہ دور میں سائنس نے جس سے پردہ اٹھایا ہے، کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ یہ پہاڑ مختلف عوامل کی بنا پر معرضِ وجود میں آئے ہیں، کہیں پر تو زمین کی پیچیدگی کیوجہ سے اور کہیں پر آتش فشانوں کے سبب، نیز کہیں بارش کے پانی کے مسلسل بہاؤ کی وجہ سے کہ پانی کے مسلسل بہا ہونے اس کی اطراف کو مکمل طور پر صاف کر دیا لیکن ٹھوس اور پختہ حصہ اپنی جگہ پر قائم رہا۔

سمندروں کے اندر بھی مرجان جیسے حیوانی پہاڑ وجود میں آتے رہتے ہیں جنہیں مرجانی پہاڑ یا مرجانی جزائر کہتے ہیں۔ یہ تمام معانی ممکن ہے کہ ''كَيْفَ نُصِبَتْ'' (کیونکر نصب کئے گئے ہیں) کے جملہ میں جمع ہوں آیات کی دوسری قسم میں خداوندِ متعال کی نعمتوں کے عنوان کے تحت فرماتا ہے ''کیا ہم نے زمین کو (تمہارے) سکون کی جگہ نہیں بنایا۔۔۔اور پہاڑوں کو میخیں''؟ (اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهَادًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا)

''اوتاد''، ''وتد'' (بروزن حسد) کی جمع ہے جو محکم اور مضبوط میخوں پر بولا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے معنی وہ میخیں ہیں جنہیں زمین میں گاڑ کر خیمے کی رسیوں کو ان سے باندھتے ہیں۔[1]

پہاڑوں کی میخوں کی حیثیت کیونکر حاصل ہے؟ اس بارے میں متعدد تفسیریں بیان ہوئی ہے۔ پہلی تو یہ کہ آج یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ زمین کے سینے مین پہاڑوں کی عظیم جڑیں ہیں ور یہ جڑیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں اور زرہ کی مانند زمین کے اندرونی حصے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ یہ زمین کو اس کی اندرونی حرارت کے باعث پیدا ہونے والے دباؤ سے محفوظ رکھتی ہیں وگرنہ زمین کی

---

[1] تفسیر مراغی جدل ۳۰ ص ۴

سطح بے قرار اور بے سکون رہتی۔

علاوہ ازیں جس طرح چاند اور سورج کی کشش سمندروں پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے سمندروں میں مدوجزر پیدا ہوا ہے، اسی طرح وہ خشکیوں پر بھی اثر ڈالتی ہے، لیکن پہاڑوں کے زِرہی جال زمین کو اس عظیم دباؤ کے سامنے مستحکم بنائے ہوئے ہیں۔

پھر یہ بھی کہ یہ پہاڑ بلند و بالا دیواروں کی مانند زمین کے مختلف حصوں کو ہوا کے تند و تیز جھکڑوں اور طوفانوں سے بچاتے ہیں، کیونکہ اگر زمین کی ساری سطح بیابان کی صورت میں ہوتی تو ان تباہ کن اور مہلک طوفانوں کی وجہ سے انسانی زندگی کے لئے قطعاً نامناسب ہوتی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر پہاڑوں کی حیثیت روئے زمین پر پانی کے ذخیرے کی ہے جو انسانی زندگی کے نظم وضبط اور انتظام کیلئے پختہ میخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تفسیر المیزان میں آیا ہے کہ ''اوتاد'' (میخوں) کی تعبیر شاید اس لئے ہے کہ زمین کے اکثر پہاڑ آتش فشانی کا نتیجہ ہوتے ہیں جو زمین کے اندرونی مواد کے پگھل کر آتش فشانوں کے دہانہ پر پہنچنے کی صورت میں زمین پر باقی رہ گئے ہیں اور آتش فشانوں کو اپنے قابو میں رکھے ہوئے ہیں۔[1]

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیات میں پہاڑوں کی ''رواسی'' (پختہ اور محکم اشیاء) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ''خداوندِ عالم نے زمین میں پہاڑ اور نہریں بنائی ہیں'' (وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا)

ایک اور جگہ فرماتا ہے ''زمین میں پہاڑوں کو ڈال دیا ہے تا کہ وہ اس کی حرکت اور لرزش کو روکے رکھیں، اور نہریں اور راستے ایجاد کر دیئے ہیں تا کہ تم ہدایت پا جاؤ'' (وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ)

اور یہی بات پانچویں آیت میں نظر آتی ہے۔

غرض ان تینوں آیات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوئی ہے کہ پہاڑوں کے اہم فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ زمین کی غیر موزوں حرکتوں اور لرزشوں کو روکے ہوئے ہیں۔

''تمید''، ''مَیْد'' (بروزن صَید) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں بڑی بڑی چیزوں کے اضطراب اور زلزلے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے معنی دائیں بائیں ہچکولے کھانا ہیں جیسے خالی کشتی لہروں کی دوش میں ہچکولے کھاتی ہے۔ ''میدان'' کو اس لئے میدان کہتے ہیں کہ مقابلے یا جنگ کے موقعہ پر اس بھاگ دوڑ اور حرکت وتحرک ہوتا ہے۔

زمین کے اندرونی دباؤ سورج اور چاند کے مدوجزر کی کشش اور دائمی طوفانوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کیلئے پہاڑوں کے کردار کے بارے میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے، دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نیز ان آیات سے اجمالی طور پر یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ نہروں کی پیدائش کا پہاڑوں کی تخلیق سے گہرا تعلق ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ

---

[1] المیزان جلد ۲۰ ص ۲۵۰

بڑی بڑی نہریں جوسارا سال بہتی رہتی ہیں اور پیاسی زمینوں کوسیراب کرتی رہتی ہیں، اس پانی کے وجود سے ہیں جو پہاڑوں کے اندر ہوتا ہے ، یاان کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں ذخیرہ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کے عظیم پہاڑ، دنیا کی عظیم نہروں کا سرچشمہ ہیں۔

ممکن ہے کہ پہاڑوں کے وجود سے یہ غلط فہمی پیدا ہوکہ انہوں نے زمین کومختلف حصوں میں تقسیم کررکھا ہےاورآمدورفت کے راستوں کوروکے ہوئے ہیں۔اس قسم کے نظریہ کی اصلاح کے لئے مندرجہ بالاآیات کو بیان فرمایا ہے کہ خداوندِ عالم نے ان میں درّے اورراستے بنائے ہیں تا کہ لوگ ہدایت پاجائیں اوراپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ہمیشہ بڑے بڑے ،عظیم اورسربفلک پہاڑوں کے اندرمضبوط پناہ گاہیں اورراستے ہیں جوانسان کوآمدورفت کی اجازت دیتے ہیں۔یعنی وہ طوفانوں کے مقابل میں عظیم دیوار ہونے کے باوجودانسانوں کوآنے جانے سےنہیں روکتے اور یہ اتفاق بہت ہی کم پیش آتا ہے کہ یہ پہاڑ زمین کے حصوں کومکمل طور پرایک دوسرے سے جدا کرتے ہوں۔

یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اگرزمین کی سطح صاف ہوتی تواس کی اپنے محور کے گردحرکت اوراس کی سطح پرقشر ہوا کی تندوتیزلہروں کی وجہ سےوہ آگ کی صورت میں اس قدرگرم ہوتی کہ کسی ذی روح کااس پرزندہ رہنامشکل ہوجاتا۔

لیکن وہ عظیم خداجس نے زمین کوانسانوں کےسکون اورآرام کا گہوارہ قرار دیا ہے،اُسی نے پہاڑوں کوحکم دے رکھا ہے کہ وہ اپنے ٹھوس اورآہنی پنجے قشرہوا پراچھی طرح گاڑدیں اوراسے اپنے ہمراہ زمین پرگھماتے رہیں تا کہ ہوائی لرزے اورگرمی وحرارت پیدانہ ہونے پائیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اچھی طرح دیکھ رہے ہیں کہ بے جان پتھروں کے یہ ٹکڑے روئے زمین پرموجودچیزوں کی زندگی کیلئے کس قدرمؤثر ہیں۔

ضمنی طور پرہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ پہاڑ بوجہ نشیب وفرازاور بلندی اورپستی کے وسیع پیمانے پرسطحیں ایجادکرتے ہیں اورزمین کے قابلِ استفادہ حصے کوکئی گناوسیع کردیتے ہیں، جب کہ ایسے بہت سے حصوں میں درخت پیدا ہوتے ہیں، وسیع پیمانے پرجنگل وجودمیں آتے ہیں ،دواؤں میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں اورغذامیں کام آنے والی نباتات اور چراگاہیں وجودمیں آتی ہیں جواہل فن پرمخفی نہیں۔

شایدانہی وجوہات کی بناء پرچھٹی آیات میں پہلےتوزمیں میں پہاڑوں کےنصب کرنے کی بات کی ہے، پھرزمین کی برکتوں اوراس کی غذاؤں کے بارے میں گفتگوفرمائی ہے ۔ارشادہوتا ہے ’’زمین کے اوپر پہاڑ بنائے اوراس میں برکتیں پیدا کیں اوراس میں خوراکی مواد پیدافرمایا‘‘(وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارِكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا)

کیوں کہ ایک توخود پہاڑوں کااوردوسرے اس پانی کا جو پہاڑوں کے دامن سے بہہ نکلتا ہے خوراکی اشیا کی پیدائش میں بڑی حدتک عمل دخل ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیت کے آخرمیں فرماتا ہے۔’’سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ‘‘جوشایداس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خوراکی اشیاءضرورت مندوں کی ضرورت کےعین مطابق ہیں،اور’’سائلین‘‘ کی تعبیرممکن ہے تمام انسانوں،حیوانوں اورنباتات کی طرف ہو(اگرجمع

مذکر عاقل کی صورت میں ذکر ہوا ہے تو نحوی اصطلاح میں ''غلبہ'' کی صورت میں ہے) یقیناً یہ تمام چیزیں زبانِ حال سے ''اقوات'' کا تقاضا کر رہی ہیں۔

''اقوات''، ''قوت'' کی جمع ہے جس کے معنی ہیں خورا کی مواد۔ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر صرف ''بارش'' سے کی ہے اور بعض نے اس خورا کی مواد سے کی ہے جو دلِ خاک میں چھپا ہوا ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تمام خورا کی مواد کی طرف اشارہ ہے، خواہ وہ زمین سے باہر نکلے یا زمین کے اندر پروان چڑھے اور ''قدر'' کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ ''تقدیر'' کے مادہ سے ہے اور شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اور تمام دوسری مخلوق کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی تمام ضروریات کا اندازہ لگا کر اس کا پہلے ہی سے بندوبست کر لیا جاتا ہے۔

ساتویں آیت کا مضمون اس سے پہلی آیات کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔

اٹھویں آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی چار اہم نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ زمین کی تخلیق اس انداز میں کہ اسے اس حد تک قرار گاہ اور آرام دہ بنایا گیا ہے کہ اس پر انسان اور دوسری زندہ موجودات آرام وسکون کے ساتھ رہ سکتی ہیں، زمین کے حصوں کے درمیان نہروں اور دریاؤں کی ایجاد، محکم اور ٹھوس پہاڑوں کی تخلیق اور (میٹھے اور کھاری پانی کے) دو سمندروں کے درمیان رکاوٹ کی ایجاد، تاکہ ایک دوسرے میں مل نہ جائیں۔

یہ چاروں نعمتیں بڑے دلکش انداز میں ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہاڑ زمین کے سکون کا موجب اور نہروں کی پیدائش کا سرچشمہ ہیں۔ یہ نہریں اور دریا جب کھاری پانی کے سمندر میں گرتے ہیں تو ان پانی طویل مدت تک ایک نادیدہ اور غیر مرئی حجاب کی وجہ سے جدا رہتا ہے اور آپس میں نہیں ملنے پاتا۔ یہ حجاب ''میٹھے'' اور ''کھاری'' پانی کے ہلکے اور بھاری ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر ان کے مخصوص وزن کا فرق اس بات کا موجب بن جاتا ہے کہ نہروں اور دریاؤں کا پانی کافی عرصے تک کھاری پانی میں حل نہیں ہو پاتا۔ اس کا بہت بڑا فائدہ ساحلی علاقوں کی زراعت اور کاشتکاری کیلئے ہوتا ہے کیونکہ یہ میٹھا پانی مدوجزر کے ذریعہ پیچھے کو دھکیلا جاتا ہے جس سے بڑی مقدار میں زمین کی آبپاشی ہوتی ہے اور نہایت ہی سرسبز باغات اور آبادکھیت معرض وجود میں آتے ہیں۔

اسی لئے تو آیت کے آخر میں فرماتا ہے، ''کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟'' (ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ) بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ)

جی ہاں! وہ ان تمام نعمتوں اور برکتوں کی اسرار سے بے خبر ہیں جو نعمتیں کائنات کے گوشے گوشے میں موجود ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس بے نشان ذات کی نشانی ہے، لیکن یہ بے خبر لوگ اس سے محجوب ہیں۔

نویں اور دسویں آیت میں پہاڑوں کی بعض دوسری خصوصیات اور فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو ''سایوں'' کی تخلیق کا تذکرہ ہے جو لوگوں کو سخت گرمی اور جلا دینے والی دھوپ سے بچاتے ہیں۔ پھر ان پناہ گاہوں کی طرف اشارہ فرماتا ہے جو پہاڑوں میں موجود ہیں فرماتا ہے۔ ''اور پہاڑوں سے تمہارے لئے پناہ گاہیں بنائیں۔'' (وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا)

''اکنان''، ''کن'' (بروزن جن) کی جمع ہے جو مجمع البیان کے بقول اس جگہ کے معنی ہیں جو انسان کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے، لیکن

بعض نے اسے ہر قسم کے ڈھانپنے والی چیز کے معنی میں ذکر کیا ہے ،حتیٰ کہ وہ قمیص کو بھی انسان کیلئے ''کن'' سمجھتے ہیں اور ''پہاڑوں کی اکنان'' سے مراد وہی غاریں اور شگاف ہیں جن سے انسان پناہ گاہ کے عنوان سے اپنے لئے استفادہ کرتا ہے ممکن ہے کہ کوہستانی پناہ گاہیں اور غاروں کی اہمیت شہر کے آسودہ خاطر مکینوں کیلئے ہرگز واضح نہ ہو،لیکن بے دفاع مسافروں، بیابانوں میں سفر کرنے والوں، گڈریوں، چرواہوں اوران تمام دوسرے لوگوں کیلئے تو ان کی اہمیت زندگی کی حیثیت رکھتی ہے جو موسمِ گرما کی سخت اور جلا دینے والی دھوپ یا موسمِ سرما کی زبردست کڑاکے کی سردی یا بادو باران سے دوچار ہوتے ہیں ۔بسا اوقات تو انہیں حتمی موت سے نجات دلاتی ہیں، خاص کر یہ کہ اس قسم کی پناہ گاہیں سردیوں میں عام طور پر گرم اور گرمیوں میں بالعموم سرد ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ پرانے زمانے میں ، بلکہ اب بھی کچھ لوگ پہاڑوں کو تراش کر ان کے درمیان اپنا گھر بناتے ہیں جو نہات ہی محکم اور مختلف طبعی حوادث کے مقابلے میں مکمل طور پر محفوظ ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید نے ''اصحاب الحجر'' یعنی قوم ثمود کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ'' (وہ اپنے لئے امن وامان کے گھر، پہاڑوں کے درمیان میں تراشتے تھے۔سورہ حجر/ ۸۲)

یہ پہاڑوں کا ایک اور فائدہ ہے۔

ان آیات کے ایک اور حصے میں ایسے راستوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہیں خداوندِ عالم نے مختلف رنگوں یعنی سفید، سرخ اور کہیں پر مکمل طور پر سیاہ پیدا کیا ہے۔(وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ)

''جُدد''، ''جُدّہ'' (بروزن غُد داور غُدّہ) کی جمع ہے جس کے معنی جادہ اور راستہ ہیں ''بیض''، ''ابیض'' کی جمع ہے جس کا معنی سفید ہے ۔''حمر''، ''احمر'' کی جمع ہے جس کے معنی سُرخ ہے۔''غرابیت''، ''غربیت'' (بروزن کبریت) کی جمع ہے جس کے معنی ''گہرا سیاہ'' ہیں کوّے کو اسی لئے تو ''غراب'' کہتے ہیں کہ وہ گہرا سیاہ ہوتا ہے۔''سود''، ''اسود'' کی جمع ہے جس کے معنی بھی سیاہ ہیں اور یہاں پر ''غرابیت'' کے کلمہ کے بعد تاکید کے طور پر بیان ہوا ہے۔

مختلف کوہستانی راستے ، جو ایک دوسرے رنگوں کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں ،مسافروں کو اپنے اپنے راستے اختیار کرنے کیلئے معاون ہوتے ہیں اور انہیں بھٹکنے سے بچاتے ہیں ۔علاوہ ازیں رنگوں کا یہ اختلاف پتھروں کے موادِ ترکیبی کی علامت ہوتا ہے جو ان مختلف معدنیات کے جو وکی دلیل ہوتا ہے جو ان پہاڑوں کے اندر چھپی ہوتی ہے۔

ان آیات کی مجموعی بندی سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ پہاڑوں کی تخلیقان کے نہایت ہی اہم فوائد، خداوند عالم کے علم وقدرت کی اہم نشانیاں اور اس ذات کردگار کی انسانوں پر رحمت اور حکمت کی دلیل ہیں ۔ان سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھی جاتی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور اس کی ایک ایک چیز کس حد تک مفید و بامقصد ہے کہ ان کے بارے میں جتنا غور وخوض کیا جائے اتنا ہی نت نئے اسرار کا انکشاف ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان کا اپنے رب سے عشق اور تعلق بڑھ جاتا ہے۔

چند ضروری وضاحتیں

۱۔ پہاڑ اور قرآنِ پاک کا علمی معجزہ

شاید ایک صدی پہلے تک سائنسدانوں کا پہاڑوں کے متعلق ایک سطحی نظریہ تھا اور عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ تمام پہاڑ پتھروں کے عظیم ٹکڑوں کا مجموعہ ہیں جو روئے زمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ ہی اس اہم راز سے بھی پردہ اٹھ گیا اور سائنسدانوں نے اس حقیقت کا پتہ چلا لیا کہ ہر پہاڑ کا بہت بڑا حصہ زمین کے اندر موجود ہے۔

چنانچہ ''جارج گاموف'' اپنی کتاب ''سرگزشتِ زمین'' میں لکھتے ہیں:

''جدید نظریہ کے مطابق، زمینی پہاڑوں کی نوعیت بالکل ویسی ہے جیسے برفانی پہاڑوں کی ہوتی ہے، جو برف کے دباؤ کی وجہ سے قطبی علاقوں میں وجود میں آتے ہیں جس نے بھی قطبی علاقوں کو دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جب دباؤ کی وجہ سے برف کے عظیم تودے ٹوٹتے ہیں تو وہ ایک دوسرے پر گرتے رہتے ہیں (اور سمندر میں گرتے ہیں تو اس صورت میں) برف کا بیشتر حجم عام طور پر پانی پر چلا جاتا ہے۔ (شاید صرف اس کا 10/1 دسواں حصہ پانی سے باہر ہوتا ہے۔ جب کہ 10/9 حصے پانی کے اندر) اس طرح جو پہاڑ بھی سطح زمین سے بلند ہوتا ہے، ایک ''کوہ منفی'' ''سنگ خارا GRANITE کی جنس سے زمین کو نرم اندرونی سیاہ دلدلی حصے BAGALITE میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔''[1]

یہاں سے ہمیں قرآنِ مجید کے اس نکتے کی سمجھ آتی ہے کہ اس نے پہاڑوں کو ''اوتاد'' یعنی زمین کی میخوں کا نام کیوں دیا ہے؟ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ میخ کا بہت بڑا حصہ دیوار یا لکڑی یا کسی اور چیز کے اندر ہوا ہے اور شاید کم حصہ اس سے باہر۔

نیز چونکہ میخوں کو کسی چیز کے استحکام یا کسی چیز کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں جوڑنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے، لہٰذا اس مقام پر بھی یہ تعبیر ایک لطیف اشارہ ہے پہاڑوں کی اس اہم تاثیر کی طرف وہ کرہ زمین پر اندرونی دباؤ یا مدوجزر کی وجہ سے زمین کے مختلف ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے سے بچاتے اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

۲۔ پہاڑ صرف زمین کے سکون کیلئے ہی موثر نہیں ہوتے بلکہ زمین کی اطراف میں ہوا کیلئے بھی بہت بڑی حد تک مؤثر ہوتے ہیں۔ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک وسیع وعریض بیابان میں رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے کیونکہ وہاں کی ہوا عام طور پر طوفانی اور گرد آلود ہوتی ہے۔ وہاں آرام وسکون تو کجا سانس لینا بھی مشکل ہوتا ہے۔

یہ پہاڑوں کی بلند وبالا قامت ہی ہے جو ان دیوانہ وار چلنے والی ہواؤں کو روک کر یا تو پیچھے کو دھکیل دیتی ہیں یا پھر فضا کے بالائی حصے میں بھیج دیتی ہیں۔

---

[1] ''سرگزشت زمین'' تحریر جارج گاموف ص ۱۲۶ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

۳۔اس کے علاوہ برف اور بارش کے برسنے میں بھی پہاڑوں کا بڑی حد تک عمل دخل ہے کیونکہ وہ سمندروں سے اٹھنے والے بادلوں اورطوبتوں کے آگے دیوار بنے ہوئے ہیں جوانہیں روک کر برسنے پرآمادہ کرتے ہیں ،بادلوں کے کچھ حصے کواپنے دامنوں میں اورکچھ حصے کو یاتواپنے درمیانی حصہ میں برسنے پرمجبورکرتے ہیں یا پھراپنی چوٹیوں پر برف کی صورت میں انہیں روکے رکھتے ہیں۔

۴۔اسی طرح ہوا کی گرمی کوحدِّ اعتدال پر رکھنے میں پہاڑوں کا گہراہاتھ ہے۔خصوصاًاستوائی علاقے میں توان کی اہمیت اوربھی بڑھ جاتی ہے،کیونکہ پہاڑوں کی بلندی سطح زمین سے اُن کی دوری کا سبب بن جاتی ہے،اورہم جانتے ہیں کہ ہم جس قدربھی سطح زمین سے دورہوتے جائیں گے ہواسی قدرخنک ہوتی جائے گی۔

۵۔پہاڑمختلف معدنیات کااہم منبع بھی ہیں اوراپنے دل میں بہت بڑے سرمائے کوجگہ دئے ہوئے ہیں اورانسان کی ہمیشہ سے ان سرمایوں کےحصول کیلئے کاوش چلی آرہی ہے۔

۶۔پہاڑوں کی ایک بہت بڑی تاثیر یہ بھی ہے کہ وہ چلنے پھرنے والی ریت کے آگے بندثابت ہوتے ہیں،کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب ہوائیں چلتی ہیں توصحراؤں کی ریت ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی رہتی ہے، بلکہ بڑے بڑے صحراؤں میں تودرختوں،انسانوں،جانوروں،قافلوں حتیٰ کہ آبادیوں کوبھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہےاورجاندارچیزوں کی تباہی کا موجب بن جاتی ہےاگراس کومہارنہ کیاجائےتوروئے زمین کےتمام علاقوں کواپنی لپیٹ میں لے لے۔پہاڑوں سے بڑھ کراورکوئی مؤثر بندنہیں ہیں جواس ''شترِبےمہارکوروکیں۔

یہ اوراس قسم کے کئی اورعظیم فوائد جوہم آیاتِ بالا کی تفسیر میں بیان کرچکے ہیں ہمیں ایک توپہاڑوں کے اہم طور پردخل انداز ہونے اوردوسرے اس بارے میں قرآنِ پاک کی عظمت سے آگاہ کرتے ہیں۔

۲۔پہاڑوں کے بارے میں امام جعفرصادق علیہ السلام کافرمانِ ذیشان

خداوندِعالم کی معرفت کے بارے میں ''توحیدمفصل'' کابہت بڑااورنمایاں حصہ ہےجس میں توحید کےمختلف پہلوؤں پرروشنی ڈالی گئی ہےاورکئی اسرارورموز کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔اس میں حضرت امام جعفرصادق علیہ لسلام پہاڑوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اےمفضل!پتھروں اورمٹی سےمل کربنے ہوئے ان پہاڑوں کی طرف دیکھوجنہیں بےخبرلوگ اضافی اوربے فائدہ سمجھتے ہیں ،جب کہ ان کے اندربڑی تعدادمیں فوائداورمنافع پائے جاتے ہیں،جن میں سے کچھ یہ ہیں:ان کے اوپر برف پڑتی ہےاوران کے چوٹیوں پرضرورت مندوں کیلئے ذخیرہ ہوتی رہتی ہے،پھربتدریج پگھل پگھل کربہتی رہتی ہے،اس سے چشمے جاری ہوتے رہتے ہیں۔اورچشموں کے آپس میں ملنے سے بڑے بڑے دریااورنہریں وجودمیں آجاتی ہیں۔نباتات اورجڑی بوٹیاں جن سے دوائیاں تیارکی جاتی ہیں انہی پہاڑوں پراُگتی ہیں صحراؤں میں نہیں اُگتیں۔

پہاڑوں کے اندروحشی جانوں کے لئے غاریں اورپناہ گاہیں موجودہیں ،نیزدشمن سے مقابلے کرنے کیلئے پہاڑوں میں محکم اورمضبوط قلعے بنائے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ پہاڑوں سے ایسے ایسے پتھرتراش کئے جاتے ہیں جوعمارتوں اورچکی کے پاٹوں کے

طور پر کام میں آتے ہیں۔

نیز پہاڑوں میں مختلف قسم کی قیمتی دھاتوں کی کانیں پائی جاتی ہیں۔جن کے اور بھی بے بہا فوائد ہیں جنہیں خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا اور خدا نے انہیں اپنے علم میں رکھا ہوا ہے۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کلام کے آخر میں جو ایک سربستہ جملہ ارشاد فرمایا ہے ممکن ہے کہ وہ کئی اور اہم فوائد کی طرف اشارہ ہو جو سائنس اور دیگر علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ دریافت ہوتے جائیں اور جن کی طرف گزشتہ مباحث میں بھی اشارہ ہو چکا ہے ۔یا پھر ایسے فوائد اور منافع کی طرف اشارہ ہو جو ابھی تک انسانی علم و دانش کی تیز بین نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔

۳۔ایک عظیم دانشور کا کلام

مرحوم علامہ مجلسی اپنی کتاب بحارالانوار میں جب پہاڑوں کے بارے میں بحث کرتے ہیں اور اس آیت کی تفسیر پر پہنچتے ہیں کہ ''خداوندِ عالم نے پہاڑوں کو زمین کی میخیں بنایا ہے'' تو اس کے سات تفسیریں ذکر کرتے ہیں جن میں سے تیسری تفسیر کچھ یوں ہے:

''جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کہ زمین کو ہلنے مضطرب اور لرزہ براندام ہونے سے بچانے کیلئے پہاڑوں کا تاثیر کا سبب یہ ہے کہ (پہاڑ) زمین کی گہرائیوں میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ایک جال کی حیثیت رکھتے ہیں،جس سے زمین متفرق اور پراگندہ ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ وہ درحقیقت ایسی میخوں کی مانند ہیں جنہیں لکڑی کے مختلف ٹکڑوں سے جوڑ کر بنایا جائے اور اس میں میخیں ٹھونکی جائیں،جن کے ٹکڑے آپس میں جڑ جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو پاتے۔یہ حقیقت ان لوگوں پر واضح ہے جو کنواں کھودتے ہیں کیونکہ اگر وہ اسی طرح زمین کو کھودتے جائیں تو سخت،ٹھوس اور پختہ پہاڑوں تک پہنچ جاتے ہیں۔علاوہ ازیں آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ زمین کے اکثر قطعے پہاڑوں کے درمیان ہوتے ہیں،جنہیں چاروں طرف سے پہاڑ گھیرے ہوئے ہوتے ہیں،گویا وہ نیچے سے آپس میں ملے ہوئے ہیں جیسے ایک ایک ظرف ہوتا ہے جو زمین کے مختلف قطعوں کو متفرق اور پراگندہ ہونے سے بچاتا ہے اور جب لرزوں کے عوامل فراہم ہوتے ہیں تو وہ انہیں ان لرزوں سے محفوظ کر لیتا ہے۔''[2]

اگر آپ اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ بعض دانشوروں نے یہ تصریح کی ہے کہ پہاڑوں کے بارے میں ابھی ایک صدی پیشتر نئی دریافتیں سامنے آئی ہیں،اسی طرح علامہ مجلسی مرحوم کا نظریہ بھی بہت ہی دقیع اور وزنی ہے کیونکہ اس عظیم اسلامی دانشور نے تین سو سال پہلے اس کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔

---

[1] بحارالانوار جلد۳ص۲۱۷

[2] بحارالانوار جلد۶۰ص۱۰۶(مطبوعہ دارالکتب الاسلامیہ)

۴۔ پہاڑوں کی تخلیق کے بارے میں اعجاز بھری حدیث

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ کسی شخص نے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے سوال کیا:

''مِمَّا خُلِقَتِ الْجِبَالُ'' پہاڑ کس چیز سے پیدا کئے گئے ہیں؟ آپؑ نے ارشاد فرمایا ''مِنَ الْاَمْوَاجِ'' (موجوں سے)

یہ حدیث بھی موجودہ دور کے سائنسدانوں کے نظریہ سے مکمل مطابقت رکھتی ہے جو کہتے ہیں کہ ''بہت سے پہاڑ بوجہ قشر زمین کے سکڑنے کے اور اس میں نشیب وفراز کے وجود میں آجانے سے معرض وجود میں آئے ہیں'' (جیسا کہ سیب کے خشک ہوجانے کے بعد اس کی جلد پر نشیب وفراز وجود میں آجاتے ہیں (کیونکہ یہی نشیب وفراز بعینہٖ ان امواج کی مانند ہیں جو پانی کے سطح پر رونما ہوتی ہیں ''اور ''وَاَلْقٰی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ'' (خدا نے زمین میں ٹھوس اور محکم پہاڑ ایجاد کئے ہیں نحل/ ۱۵ (بھی زمین کی تخلیق کے بعد پہاڑوں کی تخلیق کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۱۔ بادل، ہوا اور بارش کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

بادلوں اور بادوباراں کا تعلق انسان اور کائنات کی دیگر زندہ اشیاء سے اس قدر واضح اور آشکار ہے کہ اس کی تشریح کی ذرّہ بھر بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ زمین کے تقریباً تین چوتھائی حصے کو پانی نے گھیرا ہوا ہے لیکن ایک تو یہ پانی کھاری ہے جو زراعت اور کاشتکاری کیلئے قابل نہیں اور نہ ہی انسانوں اور حیوانوں کے پینے کے قابل ہے دوسرے بالفرض اگر تمام سمندروں کا یہ پانی شیریں ہوتا تو کون سا ایسا ذریعہ تھا جس سے اس پانی کو مرتفع سرزمینوں اور ان زمینوں کو جو سطح سمندر سے کئی ہزار میٹر بلند ہیں، منتقل کیا جاتا؟

یہیں سے ہمیں عظیم مبداء کی قدرت نمائی کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ یہ کام دھوپ کے ذمہ لگایا ہے کہ وہ سمندروں کی سطح پر پڑے اور ان کے پانیوں کو بخارات میں تبدیل کر کے انہی بادلوں کے ٹکڑوں کی صورت میں بدل دے، پھر ہواؤں کے تعاون سے انہیں خشک سرزمینوں کی طرف روانہ

کرے اور پھر بارش کے چھوٹے چھوٹے اور پیارے پیارے دانوں کی صورت میں آہستہ آہستہ ان زمینوں پر بھیجے جس سے تمام روئے زمین پر زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ہر جگہ آباد سرسبز اور خرم وشاداب ہوجاتی ہے، وہ بھی ایک نہایت ہی جچے تلے اور حساب شدہ نظم ونظام کے ساتھ۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اس بارے میں قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں:

۱۔۔۔اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ

(روم/۴۸)

۲۔۔۔وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(روم/۴۶)

۳۔۔۔وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ

الثَّمَرٰتِ

(اعراف/۵۷)

۴۔۔۔وَاللّٰهُ ۙ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیۡرُ سَحَابًا فَسُقۡنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحۡیَیۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا

(فاطر/۹)

۵۔۔۔اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔۔۔۔۔۔وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ

(بقرہ/۱۶۴)

۶۔۔۔اَفَرَءَیۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِیۡ تَشۡرَبُوۡنَ{}ءَاَنۡتُمۡ اَنۡزَلۡتُمُوۡهُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ{}لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰهُ اُجَاجًا فَلَوۡ لَا تَشۡکُرُوۡنَ

(واقعہ/۶۸تا۷۰)

۷۔۔۔اَمَّنۡ یَّهۡدِیۡکُمۡ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَمَنۡ یُّرۡسِلُ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَی اللّٰهُ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ{}

(نمل/۶۳)

۸۔۔۔وَاَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ فَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسۡقَیۡنٰکُمُوۡهُ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ لَهٗ بِخٰزِنِیۡنَ

(حجر/۲۲)

۹۔۔۔اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَهٗ یَنَابِیۡعَ فِی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهٗ۔۔۔۔۔اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ

(زمر/۲۱)

۱۰۔۔۔وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا {}لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا {}وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا

(نبا/۱۴تا۱۶)

۱۱۔۔۔وَهُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا

(فرقان/۴۸)

۱۲۔۔۔اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَی الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ

(الم سجدہ/۲۷)[1]

ترجمہ

۱۔۔۔خداوندِ عالم وہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تا کہ وہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں، پھر انہیں جس طرح وہ چاہتا ہے آسمان کی وسعتوں میں پھیلا دیتا ہے اور انہیں اکٹھا کرتا ہے، اس صورت میں تو بارش کے قطروں کو دیکھتا ہے کہ ان کے اندر سے باہر آتے ہیں اور جب اس زندگی عطا کرنے والی بارش کو اپنے ان بندوں تک پہنچاتا ہے جنہیں وہ چاہتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

۲۔۔۔خدا کی (قدرت وعظمت کی) نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو خوشخبری عطا کرنے والے عنوان سے بھیجتا ہے تا کہ وہ تمہیں اپنی رحمت چکھائے (اور سیراب کرے) اور اس کے حکم کے مطابق کشتیاں چلتی رہیں اور تم اس کے فضل سے حصہ حاصل کرو، شاید اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ۔

۳۔۔۔وہ وہی تو ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے بھیجتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ سنگین بادلوں کا بوجھ (اپنے

---

[1] اس سلسلے میں قرآنِ مجید کی کئی اور آیات بھی موجود ہیں لیکن ہم نے جو چند ایک آیات اوپر لکھی ہیں ان سب کے نچوڑ کی حیثیت رکھتی ہیں جو ان تین اہم مسائل کی نشاندہی کرتی ہیں جو اوپر عنوان کے طور پر لکھے ہیں دوسری آیت مندرجہ ذیل ہیں: انعام/۹۹۔ابراہیم/۳۲۔نحل/۶۵۔طٰہٰ۔۵۳حج/۶۳۔نمل/۶۰۔عنکبوت ۶۳۔ لقمان/۱۰۔۱۱۔فاطر/۲۷۔حٰم سجدہ/۳۹۔رعد/۱۷۔اعراف/۵۷۔حجر/۲۲۔نمل/۶۳

دوش پر) اٹھاتی ہیں تو ہم انہیں مُردہ زمینوں کی طرف بھیج دیتے ہیں اوراس ذریعہ سے ہم (زندگی عطا کرنے والا) پانی نازل کرتے ہیں اوراس سے ہرطرح کے میوے (تاریک مٹی سے) باہرنکالتے ہیں۔

۴۔۔۔خداوندِ عالم وہی تو ہے جوہواؤں کوبھیجتا ہے کہ وہ بادلوں کوحرکت میں لے آئیں، پھران بادلوں کوہم مردہ زمینوں کی طرف چلاتے ہیں اوراس کے ذریعہ زمین کواس کے مرنے کے بعدزندہ کرے۔

۵۔۔۔آسمان وزمین کی پیدائش میں ن۔۔۔۔۔اوراس پانی میں جوخداوندِ عالم نے آسمان سے نازل کیا ہے اوراس کے ذریعہ زمین کواس سے مردہ ہونے کے بعدزندہ کیا، اورکئی چلنے والی مخلوق کواس میں پھیلایا (اسی طرح) ہواؤں اوران بادلوں کے راستوں میں بھی جوزمین اورآسمان کے درمیان معلق ہیں (اس کی پاک ذت اورتوحید) کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جوعقل رکھتے اوراس سے کام لیتے ہیں۔

۶۔۔۔کیاتم اس پانی کے بارے میں بھی سوچتے ہوجوتم پیتے ہو؟ کیاتم اسے بادلوں سے نازل کرتے ہو یاہم نازل کرتے ہیں؟ اگرہم چاہیں تواس خوشگوار پانی کوکڑواورنمکین بنادیں، پس تم شکرکیوں نہیں کرتے؟

۷۔۔۔یاوہ جوتمہیں خشکی اورتری کی تاریکیوں میں ہدایت کرتا ہےاوروہ جوہواؤں کواپنی رحمت کے نازل ہونے سے پہلے خوشخبری دینے والا بنا کربھیجتا ہے، توکیا خدا کے ساتھ کوئی اورمعبود ہے؟ خداوندِ عالم اس سے بالاتر ہے کہ لوگ اس کیلئے جوشریک قراردیتے ہیں۔

۸۔۔۔ہم نے وہ ہوائیں بھیجیں جوبادلوں کو پانی سے بھرے ہوئے ہیں (ہوابادلوں کو پانی سے بارورکرتی ہے) اورہم نے آسمان سے پانی نازل کیا جس کے ذریعہ ہم نے تمہیں سیراب کیا، جب کہ تم اس کی حفاظت کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

۹۔۔۔کیاتونے نہیں دیکھا کہ خداوندِ عالم نے آسمان سے پانی بھیجااوراُسے چشموں کی صورت میں زمین پروارد کیا۔ پھراس کے ساتھ زراعت کوباہرنکالتا ہے کہ جس کے مختلف رنگ ہیں۔۔۔۔۔۔۔اس ماجرا میں صاحبانِ فکر (اوربلندسوچ رکھنے والوں) کیلئے یاددہانی ہے۔

۱۰۔اوربارش برسانے والے بادلوں سے ہم نے بڑی مقدارمیں پانی نازل کیا تاکہ اس کے ذریعہ بہت سے دانے اورگھاس اگائیں۔۔۔۔اوردرختوں سے بھرے ہوئے باغات۔

۱۱۔۔۔اور وہ وہی ہے جس نے اپنی رحمت کے آگے آتے ہواؤں کو خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا اور ہم نے آسمان سے پاک پانی اُتارا۔

۱۲۔۔۔کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک زمینوں کے طرف چلاتے ہیں اور اس کے ذریعہ زراعتوں کو آگاتے ہیں جس سے ان کو چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی اُن سے خوراک حاصل کرتے ہیں، تو کیا وہ یہ نہیں دیکھتے؟

الفاظ کے معانی اور تشریح

''ریاح'' کا لفظ دس مرتبہ قرآنِ پاک میں دہرایا گیا ہے اور نو مرتبہ میں ان ہواؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بادلوں کو متحرک کرکے برسنے کیلئے آمادہ کرتی ہیں۔

''ریاح'' اصل میں ''ریح'' کی جمع ہے جس کے معنی متحرک ہوا ہے، اس کا اصل ''روح'' ہے۔ عام طور پر اسے مؤنث لفظ سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآنِ مجید میں جہاں پر بادلوں کی حرکت اور بارش کے نزول کا ذکر ہے وہیں پر جمع کا صیغہ (ریاح) استعمال کیا گیا ہے جس کو بعض حضرات اس بات کی دلیل سمجھتے ہیں کہ اگر ہوائیں اکٹھا ہوکر چلیں تو بادلوں کو آسمان میں پھیلا دیتی ہیں، بارشیں برساتی ہیں اور برکت کی حامل ہوتی ہیں لیکن جب ہوا اکیلی حرکت کرے تو ممکن ہے کہ بانجھ ثابت ہو اور اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکے بلکہ نقصان دہ بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دعا میں آیا ہے۔ ''اللّٰھم اجعلہ ریاحًا والا تجعلہ ریحا'' خداوندا تو اُسے کئی ہوائیں قرار دے نہ کہ ایک ہوا۔[1]

''راغب''، ''مفردات'' میں کہتے کہ خداوندِ عالم نے (قرآن مجید کے) جن جن مقامات پر لفظ ''ریح'' کو مفرد صورت میں ذکر فرمایا ہے وہاں پر عذاب کی حکایت کی گئی ہے اور جہاں پر جمع کا ذکر کیا ہے وہاں پر رحمت کی حکایت کی گئی ہے۔

راغب کا یہ فرمان ''جمع'' کے بارے میں تو صحیح ہے لیکن مفرد (ریح) کے متعلق عمومی نہیں ہے کیونکہ ریح کا لفظ قرآنِ مجید میں نعمت کے بارے میں بھی استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ یونس کی بائیسویں آیت میں ہے:

''حَتّٰٓی اِذَا کُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡکِ وَجَرَیۡنَ بِہِمۡ بِرِیۡحٍ طَیِّبَۃٍ وَّفَرِحُوۡا بِہَا'' حتیٰ کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور بہتر اور موافق ہوا اُسے (منزل مقصود کی طرف) حرکت دیتی ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے بارے میں بھی ہم پڑھتے ہیں۔ سورہ سبا/ ۱۲)

''وَلِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ غُدُوُّہَا شَہۡرٌ وَّرَوَاحُہَا شَہۡرٌ'' ہم نے ہوا کو سلیمان کیلئے مسخر کردیا کہ صبح کے وقت ایک ماہ کا راستہ طے

---

[1] مجمع البحرین مادہ ''ریح''

ہوتا تھا اور شام کے وقت ایک ماہ کا راستہ۔

''تَصْرِیْفِ الرِّیَاح'' کا معنی ہے ہواؤں کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل کرنا (شمالی کو جنوبی کی طرف اور جنوبی کو شمالی کی طرف ۔۔۔۔۔۔۔۔)اور یہ ''صرف'' (بروزنِ حرف) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہے کس چیز کو ایک حالت سے دوسرے حالت کی طرف پھیرنا یا کسی چیز کو دوسری چیز میں تبدیل کرنا۔[1]

ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہا گر ہوائیں ہمیشہ ایک رُخ پر چلتی رہیں تو ممکن ہے سمندروں سے اٹھی ہوئی رطوبتوں اور بادلوں کو صرف ایک سمت چلاتی رہیں ۔لیکن ہواؤں کی تبدیلی اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ بادل ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک اور ایکسمت سے دوسری سمت کی طرف حرکت کرتے ہیں اور خشک زمینوں کا اکثر حصہ اس بارش سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں، جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، ہواؤں کا فائدہ صرف بادلوں کے چلانے ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ان کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں جنہیں ہم انشاءاللہ آیات کی تفسیر میں بیان کریں گے۔[2]

''سَحَاب''، ''سحب'' (بروزن محو) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کھینچنا، اور چونکہ بادل ہواؤں کے ذریعہ کھینچے جاتے ہیں یا بادل پانی کو ہر طرف کھینچے پھرتے ہیں اسی لئے انہیں ''سحاب'' کہتے ہیں یہ لفظ کبھی تشبیہ کے طور پر سایہ، ظلمت اور تاریکی پر بھی بولا جاتا ہے۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ بعض آیات میں ''سقناہ'' کا لفظ ''سوق'' کے مادہ سے استعمال ہوا ہے جس کے معنی چلانا ہیں ۔ یہ تعبیر اس لئے استعمال کی گئی ہے کہ خداوندِ عالم اسے معین اور مقررہ جگہ کی طرف تیزی سے چلاتا ہے (ہر چند کے سحاب کی طبیعت میں ہی حرکت ہے)

''مُزن'' (بروزن حُزن) کا معنی ''روشن بادل'' ہے جب کہ بعض مفسرین نے ''بارش برسانے والے بادلوں سے اس کی تفسیر کی ہے۔[3]

اسی لئے جب چاند بادلوں کے درمیان سے رونما ہوتا ہے تو اسے ''ابن مزنہ'' یعنی بادل کا بیٹا کہتے ہیں۔''مازن'' ایک ایسی تعبیر ہے جو سفید چیونٹیوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

''بُشر'' (بروزن عُشر) مصباح اللغہ کے بقول ''بَشَر'' (بروزن سَفَر) سے لیا گیا ہے جس نے معنی خوشی اور سرور ہیں۔[4]

---

[1] مجمع البحرین اور مفرداتِ راغب

[2] عرب حضرات ہوا کو چار قسموں میں تقسیم کرتے ہیں، ۱۔شمال جو شمال کی جانب سے چلتی ہے۔ ۲۔جنوب، جو جنوب کی طرف سے حرکت کرتی ہے۔ ۳صبا، جو مشرق سے چلتی ہے۔ ۴۔اور دبور، جو مغرب کی طرف سے چلتی ہے۔

[3] ''مفردات راغب'' اور ''لسان العرب'' مادہ مزن

[4] ''نشر'' اسم مصدر ہے جو اسم فاعل (خوشخبری دینے والا) کے معنی میں بھی آتا ہے۔

اگر قرآنِ مجید نے ہواؤں کو ''بُشر'' یا کبھی ''مبشرات'' کا نام دیا ہے تو اس لئے کہ وہ عام طور پر زندگی دینے والی بارش کی خوشخبری دیتی ہے۔

آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

دو اسرار بھری چیزیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہوا اور بارش

زیر بحث آیت میں سے سب سے پہلی آیت میں ہواؤں کے چلنے اور اُن کی وجہ سے بادلوں کے حرکت کرنے کے ذریعہ خداوندِ عالم کی پاک ذات کا تعارف کرایا جارہا ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ''خداوندِ عالم وہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تا کہ وہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں۔ (اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیَاحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا)

پھر آسمان میں بادلوں کے پھیل جانے اور ان کے ایک دوسرے پر جمع ہوجانے کی طرف اشارہ ہے اور آخر میں ان بادلوں کے درمیان سے زندگی عطا کرنے والی بارش کے قطروں کے نکلنے کا ذکر ہے ،فرماتا ہے ۔''فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ''

یہاں پر ''کِسَف'' بادلوں کے ان ٹکڑوں کے معنی میں ہے جو ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے ہوں اور برسنے کیلئے بالکل تیار ہوں۔''وَدق'' (بروزن خلق) پانی کے چھوٹے چھوٹے اور غبار کی مانند ذروں کو کہتے ہیں۔بعض نے اس کی معنی بارش بھی کئے ہیں۔

آیت کے آخر میں بارش کے برسنے کی وجہ سے بندوں کے اندر خوشی کی جو لہر دوڑ جاتی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:(فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ)

اس طرح ہوائیں صرف بادلوں ہی کو متحرک نہیں کرتیں بلکہ انہیں آسمانوں میں بھی پھیلاتی اور ایک دوسرے پر اکٹھا بھی کرتی ہیں۔یہ ہوائیں ہی تو ہیں جو بادلوں کے ماحول واطراف کو ٹھنڈا کرنے ور پھر بادلوں کو برسنے پر آمادہ کرنے پر مامور ہیں۔

ہواؤں کی مثال ایسے ہے جیسے تجربہ کار گڈریئے ہوتے ہیں بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کو معین ومقرر موقع پر جنگل اور بیابان سے اکٹھا کر کے انہیں مقررہ راستے پر چلاتے ہیں اور پھر انہیں دودھ دوہنے کیلئے تیار کرتے ہیں۔

نہ تو بادلوں کے اندر اس قدر موٹائی اور ذبازت ہے جو بارش کے قطروں کو روک لے اور نہ ہی ہواؤں کی شدت اس انداز سے ہے کہ وہ ان کے حیات بخش قطروں کو زمین تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہو۔نہ ہی بارش کے قطر اس قدر چھوٹے اور باریک ہیں کہ فضا میں معلق ہوکر رہ جاتے ہوں اور نہ ہی اس قدر موٹے ہیں کہ گھروں اور کھیتوں کا ستیاناس کر دیں۔

بارش صرف اس لئے نہیں ہوتی کہ اس سے آبادی عمل میں آئے اور انسانوں کی شادی اور مسرت کا باعث بنے بلکہ چونکہ وہ ہوا کا تصفیہ کر کے اسے لطیف بناتی ہے،اس لئے بذات خود بھی فرحت انگیز اور نشاط بخش ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ اسی آیت کے آخر میں

اسی سورہ روم میں فرماتا ہے:

''فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا'' خداوندِ عالم کی رحمت کے آثار کو دیکھو کہ وہ مردہ زمین کو کیونکر زندہ کرتا ہے؟ (روم۔۔۔۵)

اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے کیلئے کافی ہے کہ ان تصویروں کو دیکھا جائے جو افریقی زمینوں کے صحراؤں اور زرعی علاقوں سے لی گئی ہیں ۔ جہاں متواتر خشک سالی کی وجہ سے موت کے آثار نمایاں ہیں اور فرشتۂ حیات وہاں سے اپنا بور یا بستر گول کر چکا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ہوا کی یہی لطیف موجیں بارش کے قطرے بھی آسانی سے جن میں سوراخ کر دیتے ہیں جب حکم پالیتی ہیں تو بڑے بڑے تناور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں اور سر بفلک عمارتوں کو زمین بوس کر دیتی ہیں، انسان کو اپنے ساتھ آسمان میں اڑائے پھرتی ہیں اور کہیں دور دراز علاقے میں جا گراتی ہیں۔

دوسری آیت بھی اسی چیز کو مختصر سے فرق کے ساتھ بیان کر رہی ہے جس میں ہواؤں کا تعارف خوشخبری دینے والے کے عنوان سے کرایا گیا ہے، ہواؤں کے ذریعہ بارش کے نازل ہونے کے علاوہ کشتیوں کو بھی حرکت میں لانے کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور آخر میں فرمایا ہے ۔ ''مقصد یہ ہے کہ تم خدا کے فضل کو حاصل کرو، شاید اس کا شکر بجالاؤ'' (وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ)

''وَلِیُذِیْقَکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِہٖ'' (مقصد یہ ہے کہ وہ تمہیں اپنی رحمت سے چکھائے) کا جملہ ممکن ہے ہواؤں کے دوسرے فوائد کی طرف اشارہ ہو۔ مثلاً درختوں کے پھلوں کی افزائش، بدبوؤں کا دور کرنا اور فضا کو آلودگیوں سے صاف رکھنا وغیرہ جیسا کہ تفسیر ''المیزان'' میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[1]

سچی بات تو یہ ہے کہ جب تک کوئی نعمت انسان سے سلب نہ ہو جائے اس وقت تک اسے اس کی قدر معلوم نہیں ہوتی۔ اگر کسی دن نسیم سحر اور یہ ہوائیں متوقف ہو جائیں تو بہترین باغوں اور بہاروں کی زندگی بھی کال کوٹھڑیوں کی زندگی سے بدتر ہو جائے۔ اسی طرح اگر قید تنہائی کی کال کھوٹھڑی میں باد نسیم کے جھونکے پہنچ جائیں تو اس کی قدر و قیمت کھلی فضا سے کم نہیں ہوتی۔

علیٰ ہذا القیاس اگر سمندروں کی سطح پر چلنے والی ہوائیں بند ہو جائیں اور موجیں وجود میں نہ آئیں تو آکسیجن کی کمی کی بنا پر بہت سے سمندری جانوروں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے، اور سمندر وحشت ناک بدبودار دلدلوں میں بدل جائیں۔

تیسری آیت میں بھی اسی معنی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ ہوائیں اس کی رحمت کے آگے آگے چلتی ہیں اور بادلوں کی ''ثقال'' (ثقیل کی جمع اور بوجھل کے معنی ہے) کے ساتھ توصیف کی گئی ہے۔ کیونکہ بارش برسانے والے بادل دوسرے بادلوں کی نسبت زیادہ ثقیل ہوتے ہیں اور زمین سے نزدیکی فاصلے پر ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآنِ مجید نے انہیں ''ثقیل بادل'' کا نام دیا ہے۔

''اقلت''، ''اقلال'' (بروزن اجلال) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ایسی چیز کا ٹھکانا جو اٹھانے والے کی طاقت کے لحاظ سے

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۶ ص ۲۰۹

ہلکی ہوتی ہے اور اٹھانے والا اسے معمولی چیز سمجھے۔مندرجہ بالا آیت میں اس تعبیر کا وجود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بھاری پھر کم اور ثقیل بادل جو بسا اوقات لاکھوں، کروڑوں ٹن پانی اپنے ساتھ لئے ہوتے ہیں، ہوا کے دوش پر زیادہ بوجھل نہیں ہوتے اور یہ خدا کی قدرت کی نشانی ہے

چوتھی آیت میں ہواؤں کے ان عظیم امور کی انجام دہی کیلئے بھیجنے کو اسکی پاک ذات کے آثاروں میں شمار کیا گیا ہے کہ مردہ زمینوں کو ان کے ذریعہ زندہ کرتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں ''تُثیر'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یعنی ہوائیں بادلوں کو برانگیختہ کرتی ہیں۔ممکن ہے کہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ بادلوں کا وجود میں آنا گرم علاقوں میں سمندروں کی سطح پر ہواؤں کے چلنے کا مرہونِ منت ہوتا ہے کیونکہ بادلوں کی حرکت کا مسئلہ ''فَسُقْنَاهُ'' کے جملہ سے قابلِ توجہ قرار پاتا ہے۔اس طرح بادلوں کے وجود میں آنے کیلئے ہواؤں کا بھی گہرا تعلق ہوتا ہے کہ وہ انہیں خشک علاقوں میں حرکت میں لاتی ہیں پھر بلند فضا میں لے جا کر باتش برسنے کا ماحول پیدا کرتی ہیں۔

''تثیر'' کا جملہ فعل مضارع کی صورت میں ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عمل دائمی اور ہمیشہ سے جاری ہے۔

بہرحال یہ مسئلہ بھی ایک تو خالقِ کائنات کے علم وقدرت کی نشانی ہے اور دوسرے اس کی معاد پر قدرت رکھنے کی دلیل ہے، لہٰذا اس قسم کی بعض آیات کے ساتھ ساتھ معاد کے مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

پانچویں آیت میں سات قسم کی مختلف چیزوں کی آفرینش کو ان لوگوں کے لئے خدا کی نشانیاں بتایا گیا ہے جو صاحبانِ عقل وفکر ہیں، آسمان وزمین کی تخلیق، رات اور دن کی آمدورفت جو کشتیاں سطحِ سمندر پر لوگوں کے مفادات کیلئے چلتی ہیں اُن کی حرکت، زندگی عطا کرنے والی بارش، ہواؤں کا الٹ پھیر اور ان بادلوں کی گردش، جو زمین وآسمان کے درمیان معلق ہیں۔

اس آیت میں بھی ایک تو ہواؤں کی مختلف حرکتوں کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے (وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ) اور دوسرے ان بادلوں کی حرکتوں کو بیان کیا گیا ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہیں۔(وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ) ایسے بادل جو پانی کے سمندروں کو اپنے اندر لئے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی زمین اور آسمان کے درمیان معلق رہتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ یہ چیز خداوندِ عالم کی عظیم ترین نشانیوں میں سے ایک ہے۔اسی طرح ''زندگی عطا کرنے والی بارش کا نزول جو ایک طرف تو مردہ زمینوں کو زندہ کرتی ہے اور دوسری طرف روئے زمین پر چلنے والی چیز کو حرکت میں لاتی ہے'' (فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ)

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں ہواؤں اور بادلوں کا تذکرہ بارش کے نازل ہونے کے بعد ہوا ہے تو یہ شاید اس دقیق نکتے کی تعلیم کیلئے ہے کہ ہواؤں کا فائدہ صرف بادلوں کی حرکت اور نزول باران میں منحصر نہیں ہے بلکہ ان کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں کہ پہلے بھی جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اور جمع بندی کے باب میں بھی اشارہ کیا جائے گا۔

اس طرح بادل بھی بارش کے نزول کے بغیر بذاتِ خود ایک عجیب مسئلہ ہیں کیونکہ یہ پانی کے سمندر اپنے اندر لئے ہوتے ہیں لیکن اس

کے باوجود وہ زمین وآسمان کے درمیان معلق رہتے ہیں۔[1]

چھٹی آیت میں انسان کے پینے کے پانی کی بات کی گئی ہے اور ایک نئے نکتے کی یادآوری کی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے ''کیا تم نے اس پانی کے بارے میں بھی سوچا ہے جو تم پیتے ہو؟ کیا تم بارش کے ساتھ نازل کرتے ہو یا ہم نازل کرتے ہیں؟'' پھر فرمایا ''اگر ہم چاہیں تو اس خوشگوار او میٹھے پانی کو کڑوا یا نمکین بنادیں پس تم اس عظیم نعمت کا شکر کیوں نہیں بجالاتے؟''(لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ)

اگر سمندر کا پانی تبخیر (بخارات بننے) کے موقعہ پر نمک کے چھوٹے چھوٹے ذرات اپنے ساتھ آسمان کی طرف لے جاتا اور بادلون سے نمکین اور کڑوا پانی برستا تو سارے کا سارا کرۂ ارضی شورہ راز میں بدل جاتا نہ تو اس پر کسی قسم کی گھاس اُگتی اور نہ ہی کوئی درخت پیدا ہوتا، اگر انسان پیاس سے مرنے لگتا تو اس سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پی سکتا۔

یہی موضوع کہ اس نے پانیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بخارات بن جائیں اور سمندری پانی میں موجود نمک کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے جگہ پر باقی رہ جائیں، انسان بلکہ تمام چیزوں کی زندگی کے چہرے کو مکمل طور پر تبدیل کئے ہوئے ہے کیا کوئی شخص ساری زندگی صرف اسی ایک نعمت ہی کا شکر ادا کرسکتا ہے۔

''مُزن'' جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس کے معنی بارش برسانے والے بادل ہیں اور ''اُجاج'' کے معنی وہ پانی ہیں جو زبردست کڑوا یا نمکین ہو۔

ساتویں آیت میں خداوندِ عالم کی اپنے بندوں پر عظیم نعمتوں میں سے دو نعمتوں کی طرف اشارہ ہے، ایک تو صحرا اور دریا کی (خشکی اور سمندری) تاریکیوں میں (ستاروں کے ذریعہ) ہدایت کی نعمت ہے اور دوسری بارانِ رحمت کا نزول سے پہلے خوشخبری عطا کرنے والی ہواؤں کا بھیجنا ہے کہ جہاں پر بھی باران رحمت کا نزول ہوتا ہے وہیں پر زندگی کے نغمے گونجنے لگتے ہیں اور مختلف خیر و برکتیں وجود میں آتی ہیں۔آیت کے آخری میں خداوندِ متعال کی وحدانیت پر ان دونوں موضوعات کو سند قرار دے کر مشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ خداوندِ متعال اس بات سے کہیں بلند و بالا ہے کہ اس کیلئے شریک قرار دیتے ہیں۔(ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ)

ان دو عطیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب مطلع صاف ہو تو وہ ستاروں کے ذریعہ رات کے وقت منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے راہیں تلاش کر لیتے ہیں اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو ایک اور رحمت ان کے پاس آجاتی ہے۔لہٰذا دونوں صورتوں میں خدا کی رحمت اور عنایت ہے جو اس کی ذات پاک کی معرفت کی علامت ہے۔

آٹھویں آیت میں ایک نئی تعبیر کے ساتھ ہواؤں اور بارش کے نزول کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''ہم نے ہواؤں

---

[1] توجہ رہے کہ یہ بادل وہی بخارات ہیں جو تہہ در تہہ موجود ہوتے ہیں، اگر زمین پر ہوں تو عرب انہیں ''ضباب'' (بروزن سَراب) یعنی کُہر کہتے ہیں اور جب آسمان پر چڑھ جاتے ہیں تو انہیں ''سحاب''، ''غیم اور غمام'' کہتے ہیں۔(المیزان جلد اول ص ۴۱۱

کو بارور کرنے کیلئے بھیجا ہے''۔(وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ)

کیا بارور کرنے سے مراد نباتات کا بارور کرنا ہے اور وہ یوں کہ ہواؤں کے ذریعہ نر نباتات کا بُور مادہ نباتات کے بُور پر ڈالنا اور میوہ جات اور دانوں کو بارور کرنا ہے، یا بادلوں کے ٹکڑوں کو بارور کرنا اور انہیں آپس میں ملانا ہے؟ چونکہ آیت کے دوران فرماتا ہے۔''فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْتَيْنَاكُمُوْهُ''(ہم نے آسمان سے پانی بھیجا ہے اور تمہیں اس سے سیراب کیا ہے) لہٰذا دوسرا معنی زیادہ مناسب معلوم ہتا ہے، ہر چند کہ دونوں معانی سے باہم استفادہ بھی ممکن معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا تعبیر نہات ہی دلکش ہے کیونکہ اس میں بادلوں کے ٹکڑوں کو ماں اور باپ سے تشبیہ دی گئی ہے جن کا ہواؤں کی مدد سے آپس میں ملاپ ہوتا ہے جس سے وہ باردار ہوتے ہیں اور وضع حمل کرتے ہیں اور اپنے نومولودوں یعنی بارش کے قطروں کو زمین پر بٹھاتے ہیں۔

آیت کے آخر میں زیر زمین پانیوں کے ذخائر کی طرف ایک سربستہ اشارہ ہے جو خداوندِ عالم کی طرف سے زمین کے اندر چھپائے گئے اور ارشاد فرمایا ہے''تم ہرگز بارش کے پانی کو محفوظ اور ذخیرہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔''(وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخَازِنِيْنَ)

یعنی یہ ہم ہیں کہ زمین کی قشر کو حکم دیا ہے کہ وہ بارش کے پانی کو اس کے نازل ہوتے ہیں صاف کر کے اپنے اندر ذخیرہ کرلے۔ یہ تمہارے کنوؤں اور کاریزوں کا پانی ہی تو ہے جو ذخیرے کی صورت میں ہزار ہا سال سے زیر زمین موجود ہے اور آج تم اس سے استفادہ کر رہے ہو۔ اب تک نہ تو آلودہ ہوا ہے اور نہ ہی خراب۔

یا پھر اسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں منجمد کر کے رکھا ہوا ہے جو آہستہ آہستہ پگھلتا رہتا ہے، جس سے تم بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانور بھی اور کھیتوں کیلئے آبپاشی بھی کرتے ہو۔ کیا معلوم جو پانی آج تم استعمال کر رہے ہو وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں موجود ہزاروں سال قبل کا ہو!

نویں آیت میں آسمان سے پانی کے نازل ہونے کے علاوہ چشموں کی پیدائش کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہوئے کہتا ہے۔''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خداوندِ عالم نے آسمان سے پانی بھیجا ہے اور پھر اسے چشموں کی صورت میں زمین کے اندر داخل کر دیا ہے؟''(اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ)

''ینابیع''،''ینبوع'' کی جمع ہے جس کے معنی چشمہ ہیں اور دراصل ''نبع'' کے مادہ سے ہے جس نے معنی ہیں پانی کا زمین سے پھوٹنا۔ البتہ زمین سے چشموں کی پیدائش جن سے انسان کسی طاقت کے خرچ کئے بغیر بہرہ مند ہوتا ہے، خاص شرائط کی مرہونِ منت ہے۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ زمین کی قشر پانی کے نفوذ کو قبول کرتی ہوتا کہ پانی اس کے اندر چلا جائے۔ پھر اس کا نچلا حصہ ایسی قشر ہو جو پانی کو قبول نہ کرے تا کہ پانی وہاں پر کار ہے اور ذخیرہ کی صورت میں موجود رہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ پانی کے ذخیرے اور دوسرے نقاط کی سطح کا آپس میں فرق ہوتا کہ پانی وہاں سے بہہ کر دوسرے مقامات کو چلا جائے۔ ظاہری بات ہے کہ یہ سب کچھ ایک باقاعدہ منظم اور جچے تلے پروگرام کے بغیر ناممکن ہے اور یہ پروگرام ایک مبدائے علم وقدرت کے نقشے کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔

اسی آیت میں آگے چل کر فرماتا ہے ''پھر خداوندِ عالم اس کے ذریعہ ایسی کھیتی اُگاتا ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔'' (ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ)

ممکن ہے رنگوں کا یہ اختلاف نباتات کے ان رنگوں کی طرف اشارہ ہو جو پوری طرح مختلف ہیں، یا مختلف نباتاتوں اور زینت کے پھولوں اور دواؤں، غذاؤں اور مصنوعات کے لئے استعمال ہونے والے پھولوں کی طرف اشارہ ہو جو حقیقت میں بے شمار انواع پر مشتمل ہیں۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ خداوندِ عالم اس بے رنگ پانی سے اس گلزارِ ہستی میں لاکھوں رنگ کے پھول اور سبزے آگاتا ہے اور بقول شاعر

زآبِ بے رنگ صد ہزاراں رنگ
لالہ وگل نگردراین گلزار
بے بری گربہ رازشان دانی
کہ ہمیں است سِرِّ این اسرار
کہ یکی ہست وہیچ نیست جزاو
وَحْدَہٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

یعنی بے رنگ پانی سے لاکھوں رنگ کے گل اور لالے اس گلزارِ ہست وبود میں دیکھو۔ اگر تم اس بات پر غور کرو تو تمہیں ان تمام رازوں کا پتہ چل جائے کہ ان کا خالق ایک اور صرف ایک ہے جو وحدہ لاشریک ہے۔ اسی لئے آیت کے آخر میں فرماتا ''اس تمام ماجرا میں ان لوگوں کیلئے نصیحت کی باتیں ہیں جو صاحبانِ عقل وخرد ہیں'' (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ)

دسویں آیت میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''ہم نے معصرات سے بڑی مقدار میں پانی نازل کیا ہے۔'' (وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا)

''معصرات''، ''معصر'' کی جمع ہے اور ''عصر'' یعنی نچوڑنے کے مادہ سے لیا گیا ہے، ''معصرات'' کے معنی ''نچوڑنے والے'' ہیں۔ اس تعبیر کا کیا مقصد ہے، اس بارے میں متعدد تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔ بعض مفسرین نے اسے بادلوں کی صفت قرار دیا ہے، اور اسے ایک سسٹم کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جب بادل آپس میں مل جاتے ہیں تو یہ سسٹم اسوقت ان پر حکم فرما ہوتا ہے، گویا وہ خود کو نچوڑتے اور خود پر دباؤ ڈالتے ہیں تا کہ اُن سے بارش برسے اور اس تعبیر کو وہ قرآنِ پاک کے علمی معجزات میں سے ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔[1]

لیکن بعض دوسرے مفسرین اس (معصرات) کو ہواؤں کی صفت سمجھتے ہیں اور ہوائی طوفانوں اور بگولوں کی طرف اشارہ جانتے ہیں جن کا موسلا دھار بارش کے وجود میں آنے کا بڑی حد تک عمل دخل ہے (یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ ''اعصار'' کے معنی بگولا ہیں۔

---

[1] ''بادوباران'' نامی کتاب کے ص ۱۲۶ کا مطالعہ کریں۔

وہ کہتے ہیں کہ جب زبردست قسم کے بگولے سمندروں اور بحراوقیانوس کی سطح پر چلتے ہیں تو وہ ان سمندروں کی سطح کے بخارات اپنے ساتھ اوپر لے جاتے ہیں اور جب وہ فضا کے بالائی حصے میں انہیں لے جاتے ہیں جو زبردست سرد ہوتا ہے تو وہاں پر شدید قسم کی موسلا دھار بارش کا وجود عمل میں آجاتا ہے۔اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ''ثجاج'' مبالغہ کا صیغہ ہے۔اور ''ثج'' (بروزن حج) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ''پانی کا مسلسل اور زور زور سے گرنا'' یہ معنی اس قسم کی موسلا دھار بارش سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔[1]

بعض مفسرین اسے ان بادلوں کی طرف اشارہ جانتے ہیں جو بگولوں اور طوفانوں کے ساتھ [2] ہوتے ہیں۔ یہ طوفان بادلوں کو اٹھا کر اُوپر لے جاتے ہیں اور انہیں فضا کے سرد علاقوں تک جا پہنچاتے ہیں۔ جہاں جا کر بارش کے قطروں میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ چونکہ یہ کام بڑی تیزی سے انجام پاتا ہے اسی لئے موسلا دھار بارش اور ''ماء ثجاج'' کا وجود عمل میں آجاتا۔اس قسم کی بارش عموماً موسم بہار میں ہوتی ہے۔شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ اس موسم میں اس قسم کے بگولے اور طوفان زیادہ ہوتے ہیں۔

انہی آیت میں فرماتا ہے۔''مقصد یہ ہے، کہ اسکے ذریعہ سے ہم اناج، بڑی مقدار میں نباتات اور درختوں سے بھرہوئے باغات اُگائیں۔''(لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا)

اور یہ تعبیر ہر قسم کی نباتات اور اناج اور پھل دار درختوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

گیارہویں آیت میں، اس بیان کے بعد جو اس سے پہلی آیات میں گزر چکا ہے، (خداوندِ عالم وہی تو ہے جو اپنی رحمت کے نازل ہونے سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے) یوں فرماتا ہے: ''ہم نے آسمان سے پاک اور پاک کرنے والا پانی نازل کیا۔''(وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا)

یہ ایک نیا نکتہ ہے جس پر اس آیت میں زور دیا گیا ہے۔

''طھور''، ''طھارت'' اور پاکیزگی کا مبالغہ کا صیغہ ہے جس میں ''پاک ہونے اور پاک کرنے'' کے معنی پائے جاتے ہیں۔حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر پانی میں پاک کرنے کی خاصیت نہ ہوتی تو ایک ہی دن میں ہماری تمام زندگی اور تمام جسم وجان آلودہ ہوکر رہ جاتے۔اس بات کی حقیقت کا ادرک تو ہم اس وقت کرے ہیں جب کسی ایسی جگہ پھنس جاتے ہیں جہاں نہانے اور دھونے کیلئے پانی موجود نہیں ہوتا، نہ تو وہاں پر غذا تیار کی جاسکتی ہے اور نہ ہی بدن کی صفائی، جس سے فرحت وسرور اور صحت وسلامتی کا فقدان ہوجاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ پانی جراثیم کو ختم نہیں کرتا لیکن چونکہ بہت سی چیزوں کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا کسی قسم کے جراثیم کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔اسی لئے یہ صحت وسلامتی کیلئے ایک نہایت موثر عامل ہے۔اس کے علاوہ وضو اور غسل کے ذریعہ انسانی روح کو بھی آلودگیوں سے پاک کرتا ہے۔

---

[1] ''اعجاز قرآن از نظر علوم امروزی'' ص ٦٧

[2] تفسیر کبیر از فخر رازی جلد ٣١ ص ٨ میں اس معنی کو آیت کی ایک تفسیر کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔

اس لئے تو اس کے بعد کی آیت میں آیا ہے۔ ''لِنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا'' (تا کہ ہم اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کریں)

اسی سلسلے کی بارہویں اور آخری آیت میں ایک بار پھر ایک اور نئے نکتے سے آگاہ ہوتے ہیں، وہ یہ کہ خداوندِ عالم پانیوں کو ''جرز'' یعنی خشک و بے آب و گیاہ زمینوں کی طرف بھیجتا ہے۔ اشارہ ہوتا ہے۔ ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو ایسی خشک زمین کی طرف ہنکا کر لے جاتے ہیں جس میں گھاس تک نہیں اُگی؟'' (اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ)

''اور اس کے ذریعہ کھیتی اگاتے ہیں جس سے اُن کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی (فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ اَنْفُسُهُمْ)

اربابِ لغت کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ''جُرُز'' (بروزن شُتُر) دراصل جَرز (بروزن مَرَض) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ''منقطع ہونا'' (پانی کا منقطع ہونا، گھاس اور نباتات کا منقطع ہونا، خوشی و خرمی اور تروتازگی کا منقطع ہونا) اسی لئے ''ناقۃ جروز'' اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو سب کچھ کھائے اور منقطع کر دے اور ''رجل جزور'' اس شخص کو کہتے ہیں جو دستر خوان پر موجود سب کچھ چٹ کر جائے۔[1]

آیت کے آخر میں خداوندِ عالم عظیم نعمتوں اور توحید کی نشانیوں کا دقیق مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے۔ ''کیا وہ نہیں دیکھتے؟'' (اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ)

مندرجہ بالا آیت میں ''انعام'' (چوپاؤں) کو انسان پر کیوں مقدم کیا گیا ہے؟ اس بارے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کیونکہ نباتات زمین سے اُگتے ہیں چوپاؤں کیلئے قابلِ استفادہ ہوتی ہیں۔ نیز چوپائے فقط نباتات سے ہی غذا حاصل کرتے ہیں جب کہ انسان دوسری غذائیں بھی کھاتا ہے۔[2]

نتیجہ کلام

آیاتِ بالا میں مذکور دقیق اور ظریف نکات کو پیشِ نظر رکھ کر اُن سے بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ ہواؤں، بادلوں اور بارشوں کے مسال پر نہایت ہی جچا تلا اور حساب و کتاب شدہ نظام حاکم ہے۔ اس سلسلے میں انسان جتنا زیادہ غور کرے گا اسی قدر اس کی باریکیوں، ظرافتوں، فوائد اور برکات سے بیشتر مطلع ہوتا جائے گا۔ ان آیات کے ایک حصے میں پانی کو مایۂ حیات بتایا گیا ہے کچھ آیات میں اُسے طہارت اور پاکیزگی کا ذریعہ، بعض میں بابرکت چیز (سورہ ق/۹) کہیں پر ایک خوشگوار مشروب قرار دیا گیا ہے (مَآءً فُرَاتًا۔ مرسلات/۲۷)

مجموعی طور پر ہم اس کے جس گوشے اور پہلو پر نگاہ ڈالیں، وہیں ہمیں خداوندِ عالم اور اس کی حکمت کے آثار نظر آئیں گے اور جس حصے کو بھی دیکھیں وہیں اس کے نشانات دکھائی دیں گے۔

---

[1] کتاب ''التحقیق فی کلمات الکریم'' اور ''مصباح اللغۃ''

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۲۵ ص ۱۸۷

چند ضروری وضاحتیں

۱۔ ہواؤں کی پیدائش اور ان کے فوائد

ہوا کی پیدائش کا سرچشمہ اور اصل سبب تو وہی زمین کے دو مختلف منطقوں کے درجہ حرارت کا اختلاف ہی ہے، جس کا ہم موسم سرما میں آسانی کے ساتھ تجربہ کر سکتے ہیں جب ہمارے کمرے کی فضا گرم ہو اور بیرونی فضا سرد ہو، جب ہم دروازے کو تھوڑا سا کھول دیں اور دو رموم بتیاں جلا دیں۔ ایک کو در کے اوپر اور دوسری کو نیچے رکھ دیں تو پتہ چلے گا کہ ٹھنڈی ہوا ثقیل ہونے کی وجہ سے نیچے سے داخل ہوتی ہے اور گرم ہوا ہلکا ہونے کی وجہ سے اُوپر کی طرف سے باہر نکل جاتی ہے اور موم بتی کے شعلے کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں (گرم ہوا پھیلی ہوئی اور ہلکی ہوتی ہے جب کہ سرد ہوا سکڑی ہوئی اور بھاری ہوتی ہے۔ اگر ہواؤں میں یہ خاصیت نہ ہوتی اور ہوائیں رُک جاتیں تو اندازہ لگائیے کہ بنی نوع انسان پر کیا گزرتی؟)

یہ بات بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کرہ زمین پر تین منطقے ہیں، ایک نہایت ہی سرد (قطبی علاقہ) دوسرا نہایت گرم (استوائی علاقہ) اور تیسرے معتدل (ان دونوں منطقوں کا درمیانی علاقہ) روئے زمین پر درجہ حرارت کا یہ اختلاف ہوا کے ہمیشہ کیلئے ایک طرف سے دوسری طرف کو چلنے کا سبب بنتا ہے جن میں سے اہم ترین ہواؤں کہ ''آلیزہ'' کہتے ہیں (وہ ہوائیں جو قطبی علاقہ سے استوائی منطقہ کی طرف چلتی ہے۔ چونکہ یہ طبعی طور پر سرد ہوتی ہیں لہٰذا کرہ زمین کے قریب قریب چلتی ہے اور ان کو ''کاؤنٹر آلیزہ'' کہتے ہیں (وہ ہوائیں جو استوائی منطقہ سے قطبی علاقہ کی طرف چلتی ہیں۔ چونکہ گرم ہوتی ہیں لہٰذا فضا کے بالائی حصے میں چلتی ہیں۔ [1]

علاوہ ازیں جب سمندروں پر سورج کی دھوپ پڑتی ہے تو ان کا پانی ساحل کی گرمی کے مطابق گرم نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ رات کے وقت سمندر کا پانی ساحل کی نسبت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ساحل اور سمندر کے درمیان درہ حرارت کا یہ اختلاف بھی ہمیشہ کیلئے ہواؤں کے ساحل کی طرف سے سمندر کی طرف سے ساحل کی طرف چلنے کا سبب بنتا ہے۔

ان سب وجوہات سے قطع نظر زمین کو گول ہونا بھی اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ زمین کے بعض منطقے (بوقت ظہر) سورج کے عین سامنے آجاتے ہیں اور بعض دوسرے منطقوں میں سورج کی شعاعیں ترچھی پڑتی ہیں۔ (سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے وقت) درجہ حرارت کا یہ اختلاف بھی مختلف علاقوں میں ہواؤں کی پیدائش کا ایک عامل ہے۔ (اسی طرح کئی اور پیچیدہ عوامل ہیں)۔

یہ سب عوامل مل کر اور ایک دوسرے کے نیچے میں پنجہ ڈال کر پورے کرہ زمین پر ہواؤں کو حرکت میں لاتے ہیں اور مندرجہ ذیل بہت سے فوائد کو ہمراہ لاتے ہیں جن کی طرف مذکورہ بالا آیات میں اشارہ ہو چکا ہے:

---

[1] کتاب ''اعجاز قرآن از نظرِ علوم امروز'' ص ۶۵

۱۔ہوائیں سمندروں کی سطح پر چلنے کی وجہ سے بادلوں کو وجود میں لانے میں بڑی حد تک مؤثر ہوئی ہیں۔

۲۔ہوائیں اپنے ساتھ بادلوں کو لے کر خشک اور بے آب وگیاہ علاقوں میں جا پہنچتی ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو کرہ زمین کا بیشتر حصہ خشکی کی وجہ سے جل جاتا۔

۳۔ہوائیں فضا کو صاف اور لطیف کر دیتی ہیں اور دور دراز کے علاقوں سے ضروری آکسیجن اپنے ہمراہ لاتی ہیں۔

۴۔ہوائیں تعفن اور بدبو کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں جس سے فضا پاک و پاکیزہ ہو جاتی ہے۔

۵۔ہوائیں پتوں اور پودوں اور درختوں پر گرمی کے دباؤ کو کم کرتی ہیں، سبزہ جات کو جلنے سے بچاتی ہیں اور روئے زمین کے مختلف علاقوں میں فضا کو اعتدال پر رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہوتی ہیں۔

۶۔جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ہوائیں بادلوں کو نچوڑتی اور انہیں بارش برسانے کیلئے آمادہ کرتی ہیں۔

۷۔ہوائیں بادلوں کو فضا کے بالائی حصوں تک ہنکا کر لے جاتی ہیں، جہاں وہ سردی کی وجہ سے بارش کے قطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

۸۔ہوائی بادبانی کشتیوں کو سطح سمندر پر متحرک رکھتی ہیں جو حقیقت میں توانائی کے اہم منابع میں شمار ہوتی ہیں۔

۹۔ہوائیں چکیوں کو چلانے کیلئے ہواؤں سے ہی استفادکیا جاتا ہے۔

۱۰۔گندم کے صاف کرنے کے موقع پر ہوائیں کسانوں کیلئے مفید ہوتی ہیں کیونکہ وہ ان سے بھوسے کو علیحدہ کرنے کا کام لیتے ہیں۔

۱۱۔ہوائیں سمندری پانی کو آپس میں ٹکراتی اور بڑی تعداد میں موجیں پیدا کرتی ہیں، یہ موجیں ہوا کی آکسیجن کو پانی میں ملاتی ہیں جو سمندر میں رہنے والی زندہ مخلوق کی زندگی کا سبب بنتی ہیں۔اگر ہوائیں اور موجیں نہ ہوتیں تو سمندر دلدلوں میں تقسیم ہو چکے ہوتے۔

۱۲۔آخر میں یہ کہ ہوائیں نباتات کو بارور کرتی اور نر کے سفوف کو مادہ نباتات کے سفوف میں ملاتی ہیں۔اگر ہوائیں ایک سال ''ہڑتال'' پر چلی جائیں تو ہم پھلوں کی ایک بہت بڑی مقدار سے محروم ہو جائیں۔

یہ ہیں ہواؤں کے چلنے کی کچھ برکتیں، سائنس نے اب تک جن کو دریافت کیا ہے۔یقینی بات ہے کہ یہ برکتیں صرف یہیں تک ہی محدود نہیں ہیں۔انتظار کرنا چاہیے کہ علم ودانش ابھی اور کئی رازوں سے پردے اٹھائیں گے۔لیکن مذکورہ امور میں ہر ایک تنہا طور پر بھی ہمارے لئے کافی ہے کہ وہ خدا کے علم اور قدرت کی دلیل بن سکے، چہ جائے کہ وہ سب کس قدر رحمان اور رحیم ہے وہ ذات جو اپنے بندوں پر اس قدر مہربانی فرمائے ہوئے ہے اور کس قدر ''بابرکت'' ہے وہ ''حرکت'' کہ جب ہوا کے ذرے متحرک ہو جاتے ہیں تو وہ اس قدر مثبت اور جان بخش آثار اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ جاتے ہیں۔

۲۔بادلوں کی پیدائش کے اسرار اور بارش کا نزول

ساری دنیا کو معلوم ہے کہ بادل پانی کے بخارات کے وہی ذرات ہیں، یا زیادہ دقیق الفاظ میں، پانی کے وہ ذرات ہیں جن کے

مالیکیول ان سے جدا ہو چکے ہیں وہ بخارات کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ چنانچہ بادل اور بارش کی پیدائش کے بارے میں غور وفکر ہمیں ان کے بہت سے دلچسپ اسرار سے مطلع کرتا ہے، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ اکثر مائع چیزیں ایسی ہیں کہ جب تک وہ گھولنے کے درجہ تک نہ پہنچ جائیں، بخارات نہیں بنتیں۔ لیکن استثناء پانی ایک ایسا مائع ہے جو ہر طرح کے درجہ حرارت میں بخارات بن سکتا ہے۔ اگر پانی میں یہ خصوصیت نہ ہوتی تو سمندر کے پانی کا ایک قطر بھی بخارات نہ بن سکتا اور کوئی بادل پیدا نہ ہوسکتا۔ بارش نہ ہوتی تو تمام خشکی بے آبی کی وجہ سے جل جاتی۔

۲۔ یہ بات بھی زبردست اہمیت کی حامل ہے کہ بخارات بنتے وقت صرف خالص پانی ہی بخارات بنتا ہے اور نمک اور دوسرے ذرات جو اس میں ہوتے ہیں، وہ اپنی جگہ پر باقی رہتے ہیں، یعنی ہمیشہ طبعی تصفیہ ہوتا رہتا ہے تا کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ صاف اور خالص پانی ملتا رہے۔

۳۔ اگر فضا کا بالائی حصہ اس کے نچلے حصے سے زیادہ سرد نہ ہوتا تو فضا میں پھرنے والے سرگرداں بادل کبھی نہ برستے۔ لیکن درجوں کا یہ اختلاف بارش کے برسنے کا سبب ہوتا ہے۔ اور اگر بخارات کے ذروں کی کیفیت ٹھنڈی اور گرم ہوا میں ایک جیسی ہوتی تو بھی بارش نہ ہوتی۔ لیکن گرم فضا میں یہ قوت کم ہوتی ہے، لہٰذا بخارات کو پانی میں تبدیل کر کے نیچے بھیجتی ہے۔

۴۔ نباتات کی پرورش کیلئے ضروری پانی مہیا کرنے کے علاوہ بارش سطح زمین کو بھی دھو دیتی ہے اور ان تمام آلودگیوں کو اپنے ساتھ لے کر سمندر میں پہنچا دیتی ہے۔

۵۔ بارش فضا کو بھی دھوتی رہتی ہے اور فضا میں معلق گرد وغبار اور دوسرے ذرات کو اپنے اندر حل کر کے زمین پر لے آتی ہے۔ اگر بارش نہ برستی تو ایک عرصے کے بعد فضا اس قدر آلودہ اور غلیظ ہو جاتی کہ کسی ذی روح کیلئے سانس لینا بھی ناممکن ہو جاتا۔

۶۔ بارش پہاڑوں کے پتھروں کو آہستہ آہستہ ''حل کرتی'' رہتی ہے، ان سے استفادہ کے قابل مٹی کو وجود میں لاتی رہتی ہے اور اس مٹی کو کھلی زمینوں میں بہا کر لے آتی ہے۔

۷۔ بارش زرخیز مٹی کو دور دراز کے علاقوں سے اپنے ساتھ لے آتی ہے اور زرعی زمینوں کو طاقت ور بنانے کیلئے اسے اس طرح پھیلا دیتی ہے کہ بعض علاقوں (مثلاً نیل کے ساحلی علاقوں) میں یہ نباتات کیلئے طبعی کھاد کا کام دیتی ہے۔

۸۔ بارش صرف خشکیوں ہی میں زندگی عطا نہیں کرتی بلکہ سمندروں کیلئے بھی بہت موثر ہوتی ہے۔ بعض دانشوروں کے بقول اس کا اثر خشکی سے کم نہیں ہے کیونکہ سمندروں میں بارش کے ہونے سے پانی کی موجوں کے درمیان موجود گھاس اور دوسری نباتات کی پرورش ہوتی ہے جو مچھلیوں اور بعض دوسری سمندری مخلوق کی غذا ہوتی ہے۔ چنانچہ جس سال بارش کم برسے اس سال مچھلی کے شکار کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے

۹۔ سطح زمین سے بادلوں کی بلندی روئے زمین کے بلند ترین مقامات سے بھی زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے زمین کا کوئی حصہ بارش سے محروم نہیں رہتا۔

۱۰۔ پہاڑوں کے بلند ترین مقامات پر درخت بھی اُگتے ہیں اور دوا اور غذا کے کام آنے والی جڑی بوٹیاں بھی۔ اسی لئے بارش ان

کے پانی کا لازمی حصہ ان تک پہنچاتی ہے۔اگر بارش نہ ہوتی تو وہ سب سوکھ کر ختم ہو جائے۔

۱۱۔آج بڑے بڑے ڈیم بنائے جا چکے ہیں جن سے دنیا میں کام آنے والی بجلی کا بڑا حصہ تیار کیا جاتا ہے،اور اس سے عظیم کارخانے ہلیں اور فیکٹریاں چلائی جاتی ہیں۔اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی کوہساروں پر بارش برسنے کی برکتیں ہیں۔

۱۲۔بادلوں کی تراوش کا کچھ حصہ پہاڑوں پر برف کی صورت میں بیٹھ جاتا ہے جس کا زیادہ تر حصہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پانی کے عظیم منبع کی صورت میں جمع ہوتا رہتا ہے اور دوسرے مناطق میں بھی زیرزمین آبی ذخائر کیلئے معاون ثابت ہوتا ہے، کیونکہ برف بتدریج پگھل پگھل کر زیرزمین چلی جاتی ہے۔لیکن اگر بارش کی بجائے ہمیشہ برف ہی پڑتی رہتی تو اوپر بتائے گئے فوائد میں سے بہت سے فوائد حاصل نہ ہو سکتے۔

۱۳۔بادل کیا ہیں؟ آسمانوں میں معلق سمندر ہیں۔اور کس قدر عظیم ہے وہ خدا جو کششِ ثقل کے قانون کے خلاف ان کو آسمان کی طرف بھیجتا۔اور ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی طرف بھیجتا ہے۔

۱۴۔علاوہ ازیں بادل موسم سرما میں سردیوں کے کم کرنے اور موسم گرما میں گرمیوں کے کم کرنے میں نہایت ہی موثر ثابت ہوتے ہیں۔

۱۵۔بادل مختلف برقی بار کے حامل ہوتے ہیں جو رعدوبرق کی پیدائش کا سبب ہوتے ہیں۔انشاء اللہ ہم ان دنوں کی تاثیر کے بارے میں ''رعدوبرق'' کی بحث میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

مجموعی طور پر یہ دونوں چیزیں جن سے ہم بڑی حد تک مانوس ہو چکے ہیں اور انہیں عام اور معمولی سی چیز سمجھتے ہیں،نہایت ہی محیرالعقول اور اسرارآمیز ہیں،ان کے اسرار میں خداوندِ عالم کی توحید ہے،عظیم آیات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور ان عظیم نشانیوں سے اس بے نشان ذات کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۳۔اسلامی روایات میں ہوا اور بارش کی حیثیت

توحید مفضل نامی مشہور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اے مفضل! میں تمہیں ہوا کے چلنے کے فوائد سے آگاہ کرتا ہوں۔کیا تم نہیں دیکھتے جب ہوا رُک جاتی ہے تو انسان وجود میں کس قدر غم واندوہ پیدا ہو جاتا ہے،سانس سینے میں رُک جاتی ہے،تندرست آدمی بیمار اور بیمار شخص مشکل میں پڑ جاتا ہے،پھل اور میوے خراب اور سبزیاں بدبودار ہو جاتی ہیں،غلوں میں وبا اور آفات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے ہواؤں کا چلنا بھی خداوندِ عالم کی تدبیر اور مخلوق کے احوال کی اصلاح کیلئے ہے۔

اگر کوئی بادشاہ اپنی رعایا میں بڑی مقدار میں سونا اور چاندی تقسیم کرے تو کیا وہ ان کے دلوں میں محبوب اور نگاہوں میں عظیم ہوگا اور اس کی شہرت ہر جگہ کے لوگوں کیلئے دور دور تک نہیں جا پہنچے گی؟ لیکن کہاں وہ اور کہاں ایک بابرکت اور وافر مقدار میں بارش، کیونکہ بارش

کے ذریعہ شہر آباد ہوتے ہیں اور غلہ جات اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ روئے زمین پر موجود سونے اور چاندی کی مقدار سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔

اچھی طرح غور کرو کہ بارش کیونکہ زمین پر برستی ہے۔خداوندِ عالم اسے اوپر سے نیچے بھیجتا ہے تا کہ سخت اور ٹھوس زمینیں نرا ور سیراب ہوں اگر بارش ایک طرف سے آتی ہے تو بلند مقامات تک نہ پہنچ پاتی اور زراعت کم ہوتی۔اس کے علاوہ بارشیں لوگوں کے آبپاشی کے بہت سے جھگڑوں اور طاقت وروں کے غریبوں پر بہت سے ظلم کو کم کر دیتی ہیں۔

''خداوندِ عالم اسے چھوٹے چھوٹے قطروں کی صورت میں بھیجتا ہے تا کہ وہ آہستہ سے زمین میں جائیں اور سیراب کریں۔اگر اُسے تیز رفتار دھارے کی صورت میں نازل کرتا تو زمین کے اندر جانے کی بجائے کھیتوں اور کھلیانوں کا ستیاناس کر دیتی۔علاوہ ازیں بارش کے برسنے سے ہوائیں مرطوب، بدن کی جلد نرم، ہوا کی آلودگی برطرف، وبا کی بیماری نابود، درختوں زراعت کی صفائی دُھلائی اور زراعت کی بیماریاں ختم ہوجاتی ہیں۔''

اسی روایت کے اور حصے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اے مفضل! سوچو تو سہی کہ اس علم میں کس طرح صاف ہوا اور بارش ایک دوسرے کے پیچھے آتی رہتی ہیں۔اگر ان میں سے کوئی ایک ہمیشہ جاری رہتی تو فاسد ہوجانے کا موجب بن جاتی۔کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب بارشیں پے در پے اور حد سے زیادہ ہونے لگیں تو سبزیاں اور کھیتیاں خراب ہوجاتی ہیں، جانوروں کے بدن سست پڑ جاتے ہیں، ہوا ٹھنڈی اور انواع واقسام کی بیماریوں کا موجب بن جاتی ہے اور راستے خراب ہوجاتے ہیں اس کے برعکس اگر مطلع ہمیشہ کیلئے صاف ہوتا اور اس پر کبھی بادل کا نام ونشان نہ ہوتا تو زمین خشک ہوکر رہ جاتی، نباتات سوکھ کر جل جاتی، چشموں اور نہروں کا پانی نیچے چلا جاتا اور لوگوں کو نقصان پہنچاتا، ہوا کی خشکی کئی اور بیماریوں کو موجب بن جاتی۔لیکن جب یہ دونوں کیفیات باری باری دنیا میں رونما ہوتی ہیں تو فضا میں اعتدال آجاتا ہے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے نقصان کا ازالہ کرتی رہتی ہے اور ہر چیز روبراہ رہتی ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

''خداوندِ عالم بارشیں آسمان سے اتارتا ہے تا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور ٹیلوں اور گڑھوں، غرض کہ تمام مرتفع اور ہموار علاقوں تک پہنچ جائیں (اور سب کو سیراب کریں) انہیں قطرہ قطرہ اور نرم صورت میں پے در پے برساتا ہے، کبھی موٹے موٹے دانوں کی صورت میں بھیجتا ہے تو کبھی نہات ہی خوشگوار پھوار کی شکل میں۔تا کہ اچھی طرح زمین کے اندر چلی جائے اور اسے سیراب کرے۔اسے سیلاب کی صورت میں نہیں برساتا کہ تمہاری زمینوں، درختوں، کھیتوں اور پھلوں کو خراب نہ کر دے۔[2]

---

[1] بحارالانوار جلد۳ ص۹۱۱ تا ص۶۲۱

[2] تفسیر نورالثقلین جلد ا ص۴۱، بحارالانوار جلد۵۶ ص۳۴۴ تا ص۳۷۴ میں بھی ایسی روایات درج ہیں جن میں بادلوں اور بارشوں کی تشکیل کے بارے میں بہت سے رازوں کو بیان کیا گیا ہے۔

۴۔سائنسدانوں کے جدید مطالعہ نے کئی اور نئے اسرار سے پردہ اٹھایا ہے اور بارش کے برسنے میں ہواؤں کی زبردست تاثیر کے بارے میں نئی دریافتیں واضح کی ہیں ،مندرجہ ذیل بیان جس کا ایک نمونہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''بادل کی تشکیل اور بارش کے برسنے کیلئے دوشرائط ضروری ہیں۔

(الف) فضا میں آبی بخارات کا وجود۔

(ب) بخارات سے فضا کا بھر جانا اوران کی تقطیر کا عمل۔''

پہلی شرط کے بارے میں یہ ہے کہ اگر چہ فضا کسی بھی وقت آبی بخارات سے خالی نہیں ہوتی اور ہوا میں نمی کا تناسب زیادہ سے زیادہ پچاس گرام فی مکعب میٹر ہوتا ہے،لیکن نمی کا یہ تناسب بادل کی تشکیل اور بارش کے برسنے کیلئے کافی نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اسے امداد ملتی رہنی چاہیے، یعنی بادل کی تشکیل اور بارش کے برسنے کے بعد آبی بخارات کی حامل تازہ ہوا اسے مسلسل ملتی رہنا چاہئے ،ہوا مسلسل چلتی رہے اوراس کا مبداء یا راستہ سمندر یا انبوہِ جنگلات ہونے چاہئیں تاکہ وہ رطوبت اورنمی اپنے ساتھ کافی مقدار میں اٹھائے رکھے۔

دوسری شرط یعنی بخارات سے فضا کا بھر جانا اوران کی تقطیر کے عمل کے بارے میں (فضا عرق آلود ہوجائے اور بخارات ،مائع صورت اختیار کرلیں) یہ ہے کہ اس امر کیلئے ضروری ہے کہ فضا سرد ہو،جیسا کہ موسمِ سرما میں کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے ہانڈی یا سماوا وغیر کے گم ہونے سے بخارات اُٹھنے سے عرق آلود ہوکر قطر سے ٹپکاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

فضا کے سرد ہوکر بادل کی ایجاد اوراس کی تقطیر کا واحد موثر عامل ہوا کا اوپر کو جانا ہے یہ کیفیت تین قسم کی ہوتی ہے یا تین مقامات پر پیش آتی ہے۔جس سے ہر مقام پر خاص قسم کی بارش نازل ہوتی ہے۔

(الف) ہوا کا زمین کی چٹانوں سے ٹکرا کر پہاڑوں کے دامن سے بلندی کی طرف چلے جانا کہ اس طرح وہ کوہستانی بارشوں کو وجود میں لاتی ہے۔

(ب) دھوپ کی حدت اور گرم علاقوں سے اٹھ کر ہوا کا گرم اور ہلکا ہوجانا اور نہایت بلندی کی طرف چلے جانا کہ اس طرح وہ طوفانی بارشوں کو وجود میں لاتی ہے۔

(ج) ہوا کے دونوں بازوؤں یعنی سرد اور گرم بازوؤں کا آپس میں ٹکراؤ اور ایک دوسرے کا اوپر نیچے ہوجانا کہ اس طرح سے عام بارشیں وجود میں آتی ہیں۔

چنانچہ بادلوں اور بارشوں کے وجود کے اسباب مذکورہ تین عوامل ہیں جن میں اہم ترین عامل آخری ہے۔پس ہوا کا ابر و باراں کے تمام مراحل میں دخل ہے،یعنی وہ پانی کے بخارات کو اٹھا کر انہیں خشک زمینوں تک لے جاتی ہے،پھر اوپر لے جا کر ٹھنڈا کرتی اور بادلوں کی صورت دیتی ہے ،پھر انہیں بارور کرتی ہے ،اسی لئے بادل اور بارش کا وجود ہوا کے بغیر ناممکن ہوتا ہے ، بلکہ اصول طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بادل ہوا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے،ایسی ہوا جو پانی کی حامل ہوتی ہے۔

اس تحقیق کے ایک اور حصے میں بتایا گیا ہے کہ موسلا دھار طوفانی بارشیں ایک دوسرے پر جمے ہوئے کئی منزلہ بادلوں سے برستی ہیں

جودس کلومیٹر کی بلندی پر ہوتے ہیں، یہ پر جوش خروش بادل پہاڑوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن کا بالائی طبقہ برف کی سوئیوں اور ٹکڑیوں سے ڈھکا رہتا ہے اور بعض اوقات اولوں سے بھی لبریز ہوتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم سے پہلے تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آسمانی بادلوں میں یخ، برف اور اولے بھی ہوتے ہیں، لیکن اس جنگ کے موقع پر جب ہوائی جہاز ایسے بادلوں کے اوپر پہنچے تو پائلٹوں نے وہاں پر بلند بادلوں کی صورت میں برف کے بنے ہوئے پردے مشاہدہ کئے۔

مرطوب اور گرم شدہ ہواؤں کا انقلابی اور طبقے طبقے ہو کر اوپر کو چلے جانا، یخ زدہ بلند و بالا بادلوں کو پہاڑوں کی صورت عطا کر دیتا ہے، جن میں شدید اور موسلا دھار بارشیں بھی ہوتی ہیں اور پے در پے ظاہر ہونے والی رعد و برق بھی۔[1]

یہ تصریحات سورۂ نور کی ۴۳ ویں آیت کی تازہ تفسیر بن سکتی ہے جن کے ذریعہ قرآنِ پاک کے ایک دلچسپ علمی معجزہ سے پردہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ'' (یعنی خداوندِ عالم آسمان سے جو پہاڑ اس میں ہیں، ان میں سے اولے برساتا ہے اور ان کے ذریعہ جن کو چاہتا ہے نقصان پہنچاتا ہے اور جن سے چاہتا ہے یہ نقصان روکے رکھتا ہے، قریب کہ اس کی بجلی آنکھوں کو لے جائے۔''

آسمان میں کون سے پہاڑ ہیں جن میں اولے ہوتے ہیں ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب بہت سے لوگوں کیلئے مشکل اور پیچیدہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس بارے میں مختلف تفسیریں کی ہیں۔

لیکن مذکورہ بالا دریافت کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ بالا آیت کے لئے کسی قسم کی توجیہ، تقدیر، مجاز وغیر کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور ان تصریحات کی روشنی میں آیت کی معنی بالکل واضح ہیں۔[2]

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

[1] کتاب ''بادو باران'' ص ۵۷ تا ۶۵ (خلاصہ کے ساتھ)

[2] مزید تفصیل کیلئے تفسیر نمونہ، جلد ۱۴، اسی آیت کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

۱۲۔رعدوبرق کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ

بہت کم ایسے لوگ ہیں جورعدوبرق کے اسرار کے بارے میں مطالعہ کرنے سے پہلے ان کی کسی اہمیت کے قائل ہوں۔عام طور پر ہرشخص بڑی سادگی کے ساتھ ان کے پاس سے گزرجاتا ہے۔شاید بعض لوگ اسے فطرت کا مذاق سمجھے ہیں جب کہ بعض لوگ انہیں خرافاتی افسانے کہتے ہیں۔لیکن حقیقت یہ کہ یہ دونوں چیزیں ایک خاص قسم کے نظرونسق کے تحت وجود میں آتی ہیں اورانسان کیلئے کئی قسم کے آثاراور بہت بڑی حدتک برکات کی حامل ہوتی ہیں جن کی تشریح مندرجہ ذیل آیات کی تفسیر میں آتی ہیں۔اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اس بارے میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل چندآیات کوگوشِ دل کے ساتھ سنتے ہیں:

۱۔۔۔وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ

(روم/ ۲۴)

۲۔۔۔هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ

(رعد/ ۱۲)

۳۔۔۔وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ

(رعد/ ۱۳)

ترجمہ

۱۔۔۔اوراس کی آیات میں سے یہ ہے کہ وہ برق (اوررعد) تمہیں دکھاتا ہے جوخوف کا سبب بھی ہے اورامید کا بھی۔(خوف بجلی کے گرنے کا اورامید بارش کے برسنے کی) اورآسمان سے پانی نازل کرتا ہے جس کے ذریعہ زمین کواس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جواپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔

۲۔۔۔وہ وہی تو ہے جو تمہیں برق دکھاتا ہے، جو خوف اور اُمید کا سبب ہے اور بھاری اور بوجھل بادل پیدا کرتا ہے۔

۳۔۔۔اور رعد اس کی تسبیح اور حمد بیان کرتا ہے اور فرشتے (بھی) اس کے خوف سے اور وہ صواعق (گرنے والی بجلیوں) کو بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے گرفتار کر لیتا ہے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''برق'' کے بارے میں راغب اپنی کتاب ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ اس کے معنی وہ چمک ہے جو بادلوں سے اٹھتی ہے، پھر اس کا استعمال ہر چمک دار چیز کے بارے میں ہونے لگ گیا، مثلاً ''سیف بارق'' براق اور چمک دار تلوار کو کہتے ہیں۔

''مقائیس اللغہ'' سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ''برق'' کے اس کے علاوہ ایک اور معنی بھی ہیں یعنی کسی ایک چیز میں سفیدی اور سیاہی کا اکٹھا ہو جانا۔ لیکن بظاہر دوسرے معنی پہلے معنی کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ جب سفیدی سیاہی کے ساتھ مل جاتی ہے تو اس میں زیادہ چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض حضرات نے برق کے معنی میں شدت اور دباؤ کو بھی داخل سمجھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''برق'' وہ مخصوص چمک ہے جو شدت اور دباؤ کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔[1]

''رعد'' کے بارے میں ''مفردات'' میں ''راغب'' کہتے ہیں کہ اس کے معنی بادلوں کی گرج ہیں۔ کنایہ کے طور پر کسی بھاری چیز کے گرنے کے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے اُسے بھی ''رعد'' کہتے ہیں۔ لیکن ''مقائیس اللغہ'' نے اس کے اصل معنی حرکت اور بے چینی بتائے ہیں۔ لیکن لغت کی کتابوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی وہی بادلوں کی گرج ہی ہیں، دوسرے معانی حیثیت کنایہ کی ہے۔

''صواعق''، ''صاعقہ'' کی جمع ہے جس کے معنی بجلی کی وہ کڑک ہیں جو فضا میں پیدا ہوتی ہے اور جسمیں کوندا بھی ہوتا ہے شدید آوازوں کے سننے کے بعد رج جو بیہوشی طاری ہو جاتی ہے اس وقت بھی اسی مادے کو استعمال کیا جاتا ہے اور یہ کبھی ہلاک ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اربابِ لغت کہتے ہیں کہ ''صاعقہ'' کے استعمال کے تین مقامات ہیں، (۱) موت (۲) عذاب (۳) آگ۔[2] لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ یہ سب اس اصلی معنی کے لوازمات سے ہیں۔

---

[1] کتاب ''التحقیق فی کلماتِ القرآن الکریم'' ''مادہ''، ''برق''

[2] مفردات راغب، لسان العرب اور التحقیق فی کلماتِ القرآن الکریم۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

رعدو برق کی پیدائش کے اسرار

سب سے پہلی آیت میں بڑی صراحت کے ساتھ آسمانی بجلی کو خدا کی آیت میں شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے''ایک ایسی آیت ہے کہ جو کبھی تو خوف کے ہمراہ ہوتی ہے اور کبھی امید کے ساتھ ہوتی ہے۔''(وَمِنْ اٰيَاتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا)

ایسا خوف جو اس کی مہیب آواز کے ساتھ ہوتا ہے ،جس سے یہ احتمال ہوا ہے کہ اس میں مہلک گرنے والی بجلی ہے۔ اور طمع اور امید اس بات کی ہوتی ہے شاید بارش نازل ہو، کیونکہ بہت سے مواقع پر گرج اور چمک کے بعد بابرکت موسلا دھار بارش برستی ہے

شاید یہی وجہ ہے کہ اسی آیت میں فرماتا ہے کہ بُو آتی ہے، جو چند ایک معمولی اور موسلا دھار بارشوں کے بعد یوں زندہ ہوجاتی ہے اور سبزہ وگل اس میں اُگ آتے ہیں، گویا وہ پہلی زمین ہی نہیں۔اس لئے تو آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرماتا ہے۔''ان امور میں آیات اور نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو سوچ وبچار سے کام لیتے ہیں۔''(وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا)

وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں کوئی عام اور معمولی نہیں ہیں جو اتفاق سے اور اچانک وجود میں آ گئی ہوں۔ وہ اس میں خوب سوچتے ہیں اور ان کے اسرار ورموز سے آشنا ہوتے ہیں۔یہی چیز اسی سلسلے کی دوسری آیت میں دوسرے الفاظ میں بیان کی گئی ہے اور اس میں خدا کے آثار کے ذریعہ اس کی ذات کا تعارف کرایا گیا ہے۔فرماتا ہے''وہ وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے، جو خوف کا موجب بھی ہے اور امید کا سبب بھی۔''(هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا)

خوف تو اس کی کڑک سے ہوتا ہے اور اُمید بارش کے نازل ہونے کی ، یا خوف مسافروں کو ہوتا ہے اور امید شہروں اور آبادیوں میں رہنے والوں کو۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد فرماتا ہے''خداوندِ عالم سنگین بادلوں کو پیدا کرتا ہے۔''(وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ)

اس جملے کی وضاحت کیلئے کہا گیا ہے کہ:

''شدید طوفانوں کے ساتھ ساتھ موسلا دھار بارش فضا کے بالائی حصہ سے لے کر زمین کی قریب کی فضا کو ڈھانپ لیتی ہے ،فضا تاریک ہوجاتی ہے۔ہواؤں کا تلاطم مسلسل برق ایجاد کرتا اور اسے بے بار کرتا رہتا ہے۔بجلی کی پے در پے گرج اور چمک زمین کو لرزہ براندام کردیتی ہے۔آخر کار جو بادل گہرے اور فضا کے نچلے طبقے میں ہوتے ہیں ایک دوسرے پر سوار ہوجاتے ہیں اور اوپر لے جانے والی تیز وتند ہواؤں کی وجہ سے بارش کے کثیر مقدار میں موٹے موٹے قطروں کے حامل بن کر نہایت ہی ثقیل اور بوجھل بن جاتے ہیں۔[1]

---

[1] بادو باران ص ۱۳۸

اسی سلسلے کی تیسری اورآخری آیت میں ''رعد'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ۔''رعداس کی تسبیح اورحمد کہتا ہے ۔''(وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ)

یہ تعبیراس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ آسمانی مخلوق کوئی معمولی چیزنہیں ہے بلکہ خداوندِ عالم کےعلم اورقدرت کو بیان کرنے والی چیز ہے، کیونکہ ''تسبیح'' کے معنی ہیں ہرعیب ونقص سے منزہ ومبرا سمجھنا، اور''حمد'' کے معنی ہیں ۔کمالات کے مقابلے میں اس کی تعریف ۔اس طرح سے بجلی کی گرج اورکڑک خدا کی جمالی اورجلالی صفات کو بیان کرتی ہے۔

ممکن ہے اس کی یہ تسبیح ''زبان حال'' کے ساتھ ہو، جیسا کہ ایک اہم ایجاد ہے جواس کے موجدعلم اورسمجھ کو بیان کرتی ہے، ایک دل انگیز، شعر، شاعر کے ادبی ذوق کو بیان کرتا اوراس کی مدح وثنا کرتا ہے، یا پھر''زبان قال'' کے ساتھ ہو، جیسا کہ بعض مفسرین بھی اس کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنے لحاظ سے عقل وشعور کا حامل ہوتا ہے اوران کی حمد وتسبیح بھی عقل وشعوراوراسی ادراک کی رو سے ہوتی ہے۔حضرت فخر رازی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''بعیدنہیں ہے کہ خداوندِ عالم ابر کے اجزاء میں حیات، علم، قدرت اورنطق ایجادکردے اوربجلی کی جوآواز کانوں تک پہنچتی ہے یہ اس کے اختیاری افعال میں سے ہوجس طرح پہاڑوں نے حضرت داؤدؑ کے زمانے میں اورکنکریوں نے پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں خدا کی تسبیح کہی ہے۔''[1]

احتمال جوبھی ہواس سے ہماری بحث متاثرنہیں ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آسمانی مخلوق میں کچھ اسرار پوشیدہ ہیں جوخالق کی عظمت کے غماز اوراس کی آیات میں سے ایک آیت ہیں۔

اصولی طور پر پانی اور بخارات نیز ان سے پیدا ہونے والے بادل ایسی چیزیں ہیں جوآگ کے مخالف ہیں، لیکن پروردگار کی قدرت کاملہ سے اس کے اندر سے ایسی عظیم آگ پیدا ہوتی ہے جوروئے زمین کی ہرقسم کی آگ سے زیادہ جلانے والی ہوتی ہے۔اسی طرح بخارات میں جونہایت ہی لطیف اجسام ہوتے ہیں، لیکن ان سے ایسی آواز اٹھتی ہے جوکسی سنگین اور بھاری بھرکم چیز کے دوسرے چیز پر گرنے سے پیدانہیں ہوتی۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ''رعد'' ہو یا''برق'' ہرایک اس کائنات کی قابل توجہ مخلوق ہے، جن کا اچھی طرح سے مطالعہ کرنا چاہیے، ان کے اسرار کوسمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے اورپھراس سے خالق کی عظمت سے آشنائی حاصل کرنا چاہئے ۔اس بارے میں وضاحتوں کی بحث میں ہم مزید تفصیل سے بات کریں گے۔

---

[1] تفسیر کبیر جلد۱۹ص۵۲

چند وضاحتیں

۱۔جدید علوم کی روشنی میں برق ورعد کی پیدائش

دورِ حاضر کے سائنس دان اس بات کے معتقد ہیں کہ آسمان پر بجلی کا کوندا اس وجہ سے وجود میں آتا ہے کہ برقی بار کے حامل دو ٹکڑے یعنی مثبت اور منفی آپس میں ٹکراتے ہیں، یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے بجلی کی دو مثبت اور منفی تاریں آپس میں ٹکراتی ہیں تو ان سے چنگاری یا شعلہ اٹھتا ہے۔

چونکہ برقی بار کے حامل بادلوں کے ٹکڑوں میں بہت بڑی مقدار میں بجلی ہوتی ہے، لہٰذا اس کا کوندا بھی بہت بڑا ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر کوندے کی آواز ہوتی ہے اور طبعی طور پر کوندا جتنا بڑا ہوگا اس کی آواز بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اسی لئے اس آسمانی کوندے کو مہیب آواز بھی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ عمارتیں ہل جاتی ہیں اور بڑے بڑے بموں کی صدا کی مانند اس کی بھی خوفناک آواز ہوتی ہے۔

لیکن یہ بجلی ہمیشہ دو بادلوں کے درمیان ہی ظاہر نہیں ہوتی جو انسانی پہنچ سے دور اور خطرے سے خالی ہوں، بلکہ بعض اوقات وہ بادل جن میں مثبت الیکٹرک سٹی ہوتی ہے، زمین کے نزدیک آجاتے ہیں۔ اور چونکہ زمین میں منفی الیکٹرک سٹی ہوتی ہے تو اس وقت ''زمین'' اور ''بادلوں'' کے درمیان میں ہی کوندا ایجاد ہوجاتا ہے اور اس کا نام ''صاعقہ'' (گر کر جلا دینے والی بجلی) ہوتا ہے جو بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ ایک تو اس سے اس علاقہ میں زبردست لرزہ پیدا ہوتا ہے، دوسرے اس میں اس قدر شدید اور حد سے بڑھ کر حرارت ہوتی ہے جہاں پر گرتی ہے اسے جلا کر خاک کر دیتی ہے۔[1]

چونکہ الیکٹرک سٹی ہمیشہ اجسام کی نوک سے خارج ہوتی ہے لہٰذا جنگلوں اور بیابانوں میں جہاں پر صاعقہ پیدا ہوتی ہے وہاں اس کا شعلہ چیزوں کے بلند حصوں مثلاً درختوں، بلند ترین شاخوں حتیٰ کہ راہ چلتے انسانوں کے سروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لئے جب فضا کا ماحول طوفانی بن چکا ہو۔ اور فضا رعد و برق سے بھر چکی ہو تو کھلی زمین اور بیابانوں میں ٹھہرنا بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر گڑھوں، درختوں کے نزدیک، پہاڑوں کے نچلے حصے اور ٹیلوں کے نیچے پناہ لینے سے کسی حد تک خطرہ کم ہوجاتا ہے۔ (البتہ درختوں یا آہنی کھڑکیوں وغیرہ سے ٹیک لگانا بھی خطرناک ہوتا ہے) مندرجہ بالا وضاحت سے برق کے خطرات اور خوف کے اسباب جن کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے بخوبی واضح ہوجاتے ہیں۔

---

[1] اگرچہ صاعقہ کی مدت 10/1 سیکنڈ بلکہ بسا اوقات 100/1 سیکنڈ ہوتی ہے لیکن چونکہ اس سے پیدا ہونے والی حرارت ۱۵۰۰۰ درجے سینٹی گریڈ تک جا پہنچتی ہے، لہٰذا اس سے زبردست اور حد سے زیادہ خطرات پیدا ہوسکتے ہیں، جب کہ سورج کی حرارت صرف آٹھ ہزار سینٹی گریڈ درجے تک ہوتی ہے۔ (کتاب ''اعجاز قرآن'' ص ۷۸

۲۔رعدوبرق کے فوائد

رعدوبرق کے جوخطرات اُوپر بیان ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ ان دونوں کے فوائد بھی بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند ایک کو یہاں پر بیان کیا جاتا ہے۔

الف: آبپاشی

بجلیاں عام طور پر حد سے زیادہ حرارت پیدا کرتی ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات تو وہ پندرہ ہزار درجہ سینٹی گریڈ کی حد تک جا پہنچتی ہیں۔ یہ حرارت اطراف کی فضائی حدود کو جلا دینے کیلئے کافی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہوا کا دباؤ فوراً کم ہوجاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہوا کے کم دباؤ ہی میں بادل برستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً بجلی کے کوندے کے فوراً ہی بعد موسلا دھار بارش شروع ہوجاتی ہے۔ موٹے موٹے قطروں کی صورت میں بادل برسنا شروع ہوجاتے ہیں اور آبپاشی کے اسباب فراہم ہوجاتے ہیں۔

ب: زہر پاشی

جب بجلی اپنی اس حرارت کے ساتھ آشکار ہوتی ہے تو بارش کے قطروں میں اضافی آکسیجن کا کچھ حصہ مل جاتا ہے اور بھاری پانی OXIEGENATED وجود میں آجاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بھاری پانی کی خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اجراثیم کو ختم کر دیتا ہے۔ اسی لئے اسے طبی مصارف میں زخموں کے دھونے کیلئے کام میں لایا جاتا ہے۔ اور جب OXIEGENATED پانی کے قطرے زمین پر پڑتے ہیں تو وہ نباتات کیلئے وجود میں آنے والی آفتوں اور بیماریوں کے تخم کو ہی ختم کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ زہریلی دواؤں کا کام دیتے ہیں۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ جس سال رعدوبرق کم ہو اس سال نباتات کی آفتیں زیادہ ہوتی ہیں۔

ج: غذا اور کھاد کا کام

برق اور اس کی شدید حرارت، نیز خصوصی ترکیب کی بنا پر بارش کے قطرے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی حالت پیدا کر دیتے ہیں۔ پھر جب وہ زمین پر پھیلتے اور اس سے مل جاتے ہیں تو نباتات کے لئے ایک قسم کی موثر کھاد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جس سے نباتات اپنی غذا کا کام لیتی ہیں۔ بعض سائنس دان کہتے ہیں کہ کرہ زمین میں ایک سال میں برق سے پیدا ہونے والی کھاد کی مجموعی مقدار کئی لاکھ ٹن بنتی ہے۔ اور یہ تعداد اور مقدار بہت زیادہ ہے۔

بنابریں معلوم ہوا کہ یہ چیز جو ظاہراً عام اور معمولی سی ہے اور بظاہر بے خاصیت ہے، کس قدر مفید اور بابرکت ہے، آبپاشی کیلئے بھی اور غذا رسانی کیلئے بھی۔ یہ اس عالم ہستی کے وسیع اور حیرت ناک اسرار میں سے ایک مختصر سا نمونہ ہے جو خدا شناسی کی راہوں کی رہنمائی کرنے کے قابل ہوسکتا ہے۔

یہ سب برکتیں ہیں برق کی ،لیکن ادھراس کی ایک قسم یعنی صاعقہ سے آگ لگنے کا عمل بھی وجود میں آتا ہے جوممکن ہے کہ کبھی انسان یا انسانوں یا زراعت اور درختوں کوجلادے، ہر چند کہ یہ اتفاق بہت کم اور شاذ ونادر ہی ہوتا ہے۔عام طور پر اس سے بچا بھی جاسکتا ہے لیکن خوف اورڈر کا موجب تو بن سکتا ہے۔اس طرح جوہم نے مندرجہ بالا آیت میں پڑھا ہے کہ برق موجب خوف بھی ہے اور باعثِ امید بھی، ان تمام امور کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

نیز ممکن ہے کہ ''وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ'' کا جملہ جوآیت بالا کے آخر میں میں آیا ہے، برق کی اسی خاصیت کے ساتھ مربوط اور متعلق ہو کہ برق بادلوں کو بارش کے قطرات سے سنگین بھی بنادیتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۳۔ سمندروں اور کشتیوں میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ

ہم جانتے ہیں کہ زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی پر مشتمل ہے اور چھوٹے بڑے سمندر سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ نیز یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان سمندروں کے ذریعہ قدیم الایام سے نقل وحمل اور باربرداری کا کام لیتا آرہا ہے۔ اس کے علاوہ اشائے خوردنی اہم حصہ بھی سمندروں اور دریاؤں سے حاصل ہوتا ہے، اسی طرح صنعتوں میں کام آنے والا بہت سا مواد بھی ۔ ان سب باتوں سے قطع نظر بادلوں کی ایجاد اور خشکیوں کی سیرابی کے بارے میں سمندروں کے تعلق سے تو کوئی بھی بے خبر نہیں ہے۔ اسی طرح سمندروں جانوروں اور ان کی مختلف محیر العقول اقسام تقریباً سب ہی کو معلوم ہیں۔

یہی وجوہات ہیں کہ قرآنِ مجید نے سمندروں، دریاؤں اور کشتیوں کو حق کی آیات میں شمار کیا ہے اور انسانوں کو ان کے اسرار کے مطالعہ کی دعوت دی ہے۔

اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اسلسلے میں نازل ہونے والی کچھ آیات کو دل کے کانوں سے سنتے ہیں:

۱۔۔۔ وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(نحل/ ۱۴)

۲۔۔۔ وَمَا یَسْتَوِی الْبَحْرٰنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَكُلٍّ یَّاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِیْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(فاطر/ ۱۲)

۳۔۔۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(جاثیہ/ ۱۲)

۴۔۔۔وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ

(شوریٰ/۳۲/۳۳)

۵۔۔۔اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ

(لقمان/۳۱)

۶۔۔۔اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔۔۔۔۔۔۔۔۔وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ۔۔۔۔۔لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ

(بقرہ/۱۶۴)

۷۔۔۔رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا

(اسرا/۶۶)

ترجمہ

۱۔۔۔وہ وہی ہے جس نے سمندر کو (تمہارے لئے) مسخر کر دیا ہے تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور پہننے کیلئے زینت کے وسائل اس سے باہر نکالو۔ اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ سمندر کے سینے کو چیرتی ہیں تا کہ تم (تجارت کرو اور) خدا کے فضل سے بہرہ برداری کرو، ہوسکتا ہے کہ اس طرح سے اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

۲۔۔۔یہ دو سمندر ایک جیسے نہیں ہیں۔ یہ وہ سمندر ہے جس کا پانی شیریں اور جس کو پینا خوشگوار ہے اور یہ جو نمکین اور کڑوا ہے (لیکن) تم دونوں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور زینت کے وسائل اس سے باہر نکالتے اور پہنتے ہو۔ اور اس میں تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ پانی کو چیرتی (ہوئی آگے بڑھتی رہتی) ہیں تا کہ تم فضلِ خدا سے اپنا حصہ حاصل کرو۔ اور شاید اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

۳۔۔۔خداوندِ عالم وہی تو ہے جس نے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تا کہ اس کے فرمان کے مطابق اس میں کشتیاں چلیں اور تم اس کے فضل سے اپنا حصہ حاصل کر سکو اور شاید اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

۴۔۔اس کی نشانیوں میں سے وہ کشتیاں ہیں جو پہاڑوں کی مانند سمندوں میں روں دواں ہیں۔اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے اور وہ پشتِ سمندر پر رُک جائیں،اس میں ہر صبر کرنے اور شکر کرنے والے کیلئے نشانیاں ہیں۔

۵۔۔۔کیا تو نے کشتیوں کو نہیں دیکھا کہ وہ خدا کے حکم سے سمندروں میں اس کی نعمت کی برکت سے چل رہی ہیں۔وہ چاہتا ہے کہ تمہیں اپنی آیات کا کچھ حصہ دکھائے اور اس میں ان لوگوں کیلئے آیات اور نشانیاں ہیں جو صابر اور شکر گزار ہیں۔

۶۔۔۔آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات ودن کے آنے جانے میں اور کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کیلئے حرکت کر رہی ہیں (اس کی ذات پاک اور توحید) ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں اور سوچ وبچار سے کام لیتے ہیں۔

۷۔۔۔تمہارا پروردگار تو وہ ہے جو تمہارے لئے کشتیوں کو سمندروں میں چلاتا ہے تا کہ تم اس کی نعمت سے بہرہ حاصل کرو،وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ مہربان ہے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''بَحر'' کے بارے میں ''راغب'' اپنی کتاب ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ اس کے اصل معنی ہر وہ کھلی جگہ ہے جہاں پر پانی فراوانی کے ساتھ جمع ہو،پھر بطور کنایہ کے ہر وسیع شے کو ''بحر'' کہتے ہیں۔''متبحر'' اور ''مستبحر'' اس شخص کو کہتے ہیں جس کا علم وسیع ہو۔جب شدید بیماریوں میں ناگہانی طور پر تبدیل آجائے تو طبیب لوگ اسے ''بحران'' کہتے ہیں۔(پھر بحران کا لفظ دوسرے شدید حادثات پر بھی بولا جانے لگا ہے) بعض لوگوں نے نمکین ہونے کو بھی ''بحر'' کے مفہوم میں داخل سمجھا ہے جب کہ بحر کا اطلاق میٹھے پانی کے دریاؤں پر ہوتا ہے۔[1]

''فلک'' (بروزن قفل) کا معنی کشتی ہے اور یہ لفظ مفرد،جمع،مذکر اور مونث پر یکساں بولا جاتا ہے۔''فلک'' (بروزن فَلَک) کا لفظ جس کے معنی ستاروں کی حرکت کا مقام اور مدار ہیں،وہ بھی اسی مادہ سے لیا گیا ہے۔

''جواری''،''جاریہ'' کی جمع ہے جو دراصل ''جری'' یعنی جلدی سے گزر جانا کے مادہ سے لیا گیا ہے۔''جاریہ'' ان کشتیوں کو کہتے

---

[1] صحاح اللغہ،مقائیس اللغہ،مفردات راغب،مجمع البحرین اور لسان العرب۔

ہیں جو سمندروں اور دریاؤں میں چلتی پھرتی ہیں لغتِ عرب میں نوجوان لڑکیوں کو بھی ''جاریہ'' کہتے ہیں کیونکہ ان کے مکمل وجود میں جوانی کی نشاط جاری اور ساری ہوتی ہے۔کتاب ''مصباح المنیر'' میں آیا ہے کہ کنیز پر ''جاریہ'' کے لفظ کا اطلاق اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنے مولا کے فرمان کے مسخر ہے اور اس کے حکم کی بجا آوری کیلئے ہمیشہ جاری وساری رہتی ہے۔سورج، دھوپ، اور چلتے پھرتے ستاروں پر بھی ''جاریہ'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔

''مواخر''، ''ماخرۃ'' کی جمع ہے جس کے معنی کشتی ہیں۔''مخر'' (بروزن فخر) سے لیا گیا ہے، جس کے معنی زمین میں پانی کی بیشتروی اور اُسے چیر کر آگے بڑھانا ہیں۔اسی طرح کشتی کے سینہ کے ذریعہ پانی کو دائیں اور بائیں طرف چیرنے کیلئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ہواؤں کے چلنے کی آواز پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب پہلے معنی کے لوازمات سے ہیں۔[1]

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سمندر اور اس کے عجائبات

سب سے پہلی آیت خداوندِ عالم کا تعارف کراتے ہوئے کہتی ہے ''وہ وہی ہے جس نے سمندر تمہارے لئے مسخر کر دیئے ہیں'' (وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ)

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر اپنے تمام وجود کے ساتھ انسان کی خدمت میں ہے اور ہے بھی ایسا ہی زندگی کی سب سے پہلی کونپل سمندر ہی سے پھوٹی اور آج بھی وہی سمندر انسان کی مختلف، اہم ضروریات اور اس کی زندگی کو برقرار رکھنے کا اہم ذریعہ ہے۔اسی آیت کے تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے تین موضوعات پر زیادہ تاکید کی گئی ہے پہلا یہ کہ انسان سمندر سے تازہ گوشت حاصل کرتا ہے۔(لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا)

بڑی مقدار میں گوشت جس کی پرورش کی تم نے کوئی زحمت نہیں اٹھائی اور روئے زمین کے بہت سے مقامات پر انسان کے پاس مکمل طور پر تازہ صورت میں پہنچ جاتا ہے۔اس گوشت کی تازگی کے علاوہ اس کی زبردست لطافت کا ذکر مچھلی کے گوشت کی طرف اشارہ ہے جو اس نکتہ کی یاددہانی کر رہا ہے کہ اس اور میں تازہ گوشت کے حصول میں مشکلات اور دشواریوں کی وجہ سے پرانے گوشت کو استعمال کرتے تھے۔اسی لئے یہ نعمت ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔موجودہ دور میں بھی کئی دوسرے لحاظ سے پُرانا اور یخ زدہ گوشت بڑی مقدار میں موجود ہے۔اسی لئے اس تعبیر کی اہمیت بھی نہایت مناسب ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ تعبیر نمکین اور کڑوے پانی میں لطیف اور خوش ذائقہ گوشت کی آفرینش خداوندِ عالم کی قدرت نمائی

---

[1] مفرداتِ راغب، مصباح المیزان، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم اور لسان العرب

کی طرف اشارہ ہے۔[1]

''لحم'' (گوشت) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ مچھلی کا اکثر و بیشتر حصہ گوشت پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں ہڈی بہت کم ہوتی ہے، جب کہ دوسرے جانوروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ پھر اس بات کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے کہ عصرِ حاضر میں غذائی مواد کی کمی کی وجہ سے انسان کی خوراک کیلئے مچھلی سے استفادہ کی طرف زیادہ توجہ جارہی ہے تو اس خدائی نعمت کی اہمیت اور واضح ہوجاتی ہے۔ سمندر کا دوسرا فائدہ یہ بتایا ہے کہ اسے زیب و زینت اور آرائش کے وسائل اور مخصوص جواہر نکالے جاتے ہیں۔ (وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا)

گویا فرماتا ہے: غذائی مواد جیسی ضروری چیزوں سے لے کر غیر ضروری اور زینت کی چیزوں تک سمندر سے حاصل کی جاتی ہے اور یہ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔

سمندر کے تیسرے فائدے کے بارے میں پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ''آپ کشتیوں کو دیکھیں گے کہ سمندر کے سینے میں پانی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔'' (وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ)

خداوندِ عالم نے یہ نعمت تمہیں عطا کی ہے تاکہ تم اس فضل و کرم سے بہرہ برداری کرو۔ شاید اس کی نعمت کا شکر ادا کرسکو۔ (وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ)

کشتیوں سے چھوٹے اور بڑے سمندروں میں تجارت کا مال اٹھانے اور انسانوں کے سفر کیلئے سلسلہ وار چند امور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں گے تو کہیں جا کر ان سے یہ استفادہ کیا جاسکے گا۔ بھاری اور ہلکے مواد پر کچھ کیفیتیں اور قوانین حکم فرما ہیں جن کی وجہ سے کشتیاں پانی پر برقرار رہ سکیں، پانی کی لرزش، منظم ہوائیں جو سمندروں کی سطح پر چلتی ہیں اور سمندروں کی کافی حد تک گہرائی، غرض اسطرح کے اسباب اکٹھے ہوں تاکہ غول پیکر کشتیاں (اور جہاز) پانی سطح پر چل سکیں موجودہ دور کے جہاز جو بھاپ کی طاقت سے سمندروں میں چلتے ہیں، انسانی مصنوعات کے اہم شاہکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ان میں سے بعض تو پورے ایک شہر کی وسعت کے حامل ہوتے ہیں اور جو کام لاکھوں موٹر گاڑیاں انجام دیتی ہیں وہ تنہا اُسے بجالاتے ہیں (پانچ لاکھ ٹن کا وزن اٹھانے والے جہاز دس ٹن کی حامل پچاس ہزار موٹر گاڑیوں کا اسباب اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں!!!)

یہ بات ایک طرف اُدھر دوسری طرف غذائی، آرائشی اور دوسرے قسم کے مواد کی بات اور ہے جو اس کے علاوہ ہے۔ یہ سب خالقِ کائنات کے علم اور قدرت کی روشن دلیل ہیں کہ اس نے یہ سب نعمتیں مفت میں انسان کو عطا فرمائی ہیں۔

دوسری آیت مین وہی تینوں نعمتیں بیان کی گئی ہیں جو اس سے پہلی آیت میں ذکر کی جاچکی ہیں (تازہ گوشت، زینت کے وسائل اور سطح سمندر و پر کشتیوں کی آمد و رفت) اور اس بات پر ایک بار پھر زور دیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس آیت کے آغاز میں نمکین اور میٹھے سمندروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے ''یہ دو سمندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان میں سے ایک کا پانی شیریں اور اس کا پینا خوشگوار ہے۔ اور وہ

---

[1] روح المعانی جلد ۱۴ ص ۱۰۲

دوسرا نمکین اور کڑوا ہے جو حلق سے نیچے نہیں اترپاتا۔ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔''(وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ)

اگرچہ روئے زمین کے اکثر سمندر، کڑوے اور شورزدہ ہیں لیکن میٹھے پانی کے سمندر، بحیرے اور جھیلیں بھی کم نہیں جن کا نمونہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دیکھا جاسکتا ہے اور ان سے استفادہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے دریا بھی ہیں جن کا پانی سمندر کے شورزدہ پانی میں گرتا ہے اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے جو کافی مدت تک اس سے نہیں مل پاتا اور عملی طور پر میٹھے پانی کا ایک سمندر بن جاتا ہے۔ جب مدوجزر کا موقع ہوتا ہے تو یہ پانی ساحل کی زمین کے وسیع رقبے کی آبپاشی کا کام دیتا اور بڑے بڑے باغات اور زرعی زمینوں کی پرورش کرتا ہے۔

فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ''دو دریاؤں کے میٹھے اور کڑوے پانی کے ذریعہ مومنین اور کفار کی طرف اشارہ اور تمثیل بیان کی گئی ہے لیکن آیات کے لب ولہجہ پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد صفحۂ گیتی پر موجود خالق کا شاہکار بیان کرنا ہے۔

تیسری آیت میں انسان کیلئے سمندروں کے مُسخر کرنے کی بات ہے، ارشاد ہوتا ہے۔(اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ)

لیکن سمندروں کی مختلف برکات میں سے صرف ایک بات کو بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے کشتی رانی کا مسئلہ جس کی طرف پہلے بھی اشارہ ہوچکا ہے۔ چوتھی آیت میں ان بڑی بڑی کشتیوں کو خدا کی عظیم آیات میں شمار کیا گیا ہے جو پہاڑوں کی مانند سطح سمندر پر ظاہر ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔''(وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ)

کس نے ان سمندروں کو اس قدر وسعت، گہرائی اور خصوصیات کے ساتھ خلق فرمایا ہے؟ کس نے لکڑی اور لوہے کو یہ خاصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ صفحہ آب پر ثابت اور برقرار رہیں؟ اور کس نے ہواؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ منظم صورت میں صفحۂ سمندر پر چلیں اور انسان کو ایک نقطے تک جا پہنچنے اور لاکھوں کروڑوں کی ثروت و دولت کو سمندروں کے ذریعہ جابجا کرنے کی اجازت دی ہے؟ کیا یہ پختہ اور محکم نظام، اسی طرح وہ نظام جو بخارات اور بجلی کی توانائی پر حکم فرما ہے، پروردگارِ عالم کے علم وحکمت کی روشن دلیل نہیں ہے؟

اس مقام پر قرآنِ مجید نے بڑی بڑی کشتیوں کو ''اعلام'' سے تشبیہ دی ہے۔ ''اعلام''، ''علم''(بروزن قلم) کی جمع ہے جو دراصل (مفردات میں راغب کے بقول) اس اثر کے معنی میں ہے کہ جس کے ذریعہ کس چیز کا علم حاصل ہوجائے، جیسے وہ نشانات جو راستوں میں لگائے جاتے ہیں، یا لشکر کے جھنڈے وغیرہ۔ پہاڑ کو اسی لئے علم کہتے ہیں کہ وہ ایسا روشن نشان ہوتا ہے۔ جو دُور سے دیکھا جاتا ہے اور عظیم کشتیوں کو پہاڑ سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ پہاڑ کی مانند وہ بھی دُور سے ظاہر ہوتی ہے۔ مزید اربات یہ ہے کہ قرآن اسی آیت کے اندر کہتا ہے ''اگر خدا چاہے تو ہواکو روک دے تاکہ کشتیاں سمندر کی سطح پر رُک جائیں۔''(اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ)

یا اگر چاہے تو ہواؤں کو اس قدر نامنظم اور درہم برہم کردے کہ صرف یہی نہیں کہ کوئی کشتی منزل مقصود تک نہ پہنچ پائے، بلکہ وہ سمندر میں الٹ کر غرق ہوجائے۔ اسی لئے آیت کے آخر میں ایک بار پھر تاکید کے طور ارشاد فرماتا ہے۔''اس امر میں صبر وشکر کرنے والوں کیلئے

نشانیاں ہیں۔''(اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ)

وہی لوگ جوصبروحوصلے کے ساتھ ان آفاقی آیات میں غوروفکرکرتے ہیں اورجب حقیقت کاادراک حاصل کرلیتے ہیں تو پھرشکرگزاری کے مرحلہ تک جا پہنچتے ہیں اورحق کے باعظمت آستانے پراپنی جبین جھکادیتے ہیں۔

پانچویں آیت میں بھی اسی چیزکو بیان کیا گیاہے۔سمندروں میں کشتیوں کی حرکت کوخداوندِعالم کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت کے طور پر بیان فرمایاہے،البتہ قدرے فرق کے ساتھ چنانچہ ارشادہوتاہے۔''اس نعمت کے عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خداتمہیں اپنی بعض آیات دکھائے۔''(لِیُرِیَکُمۡ مِّنۡ اٰیٰتِہٖ)

نیز اسی وجہ سے چھٹی آیت میں جہاں پرحق تعالیٰ کی نشانیوں میں سے سات آیات کا ذکرکیاہےاورتیسری آیت اورنشانی ان کشتیوں کو بتایاہے جوسمندروں میں انسان کے مفادات میں چلتی پھرتی رہتی ہیں۔(وَالۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ)

اسی آیت کے آخر میں تاکید کے ساتھ فرماتاہے کہ ان امور میں خداوندِکریم کی پاک ذات اوراس کی توحید کی نشانیاں ہیں،ان لوگوں کیلئے جوعقل سے کام لیتے ہیں۔''(لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ)

ساتویں آیت میں خداوندِتبارک وتعالیٰ کی ربوبیت کو بیان فرماتے ہوئے کہتاہے۔''تم بتوں کے پیچھے مت بھاگو،کیونکہ وہ تمہارے خدانہیں ہیں۔ بلکہ''تمہاراپروردگاروہ ہے جوسمندر میں تمہارے مفادات کی خاطرآرام سے اور ہمیشہ کیلئے کشتیوں کوچلاتاہے۔''(رَبُّکُمُ الَّذِیۡ یُزۡجِیۡ لَکُمُ الۡفُلۡکَ فِی الۡبَحۡرِ)

یہاں پرایک نئی تعبیر کا سامنا کررہے ہیں۔''یُزجی''،''ازجاء''کے مادہ سے ہے۔جس طرح کہ''مصباح اللغۃ''میں آیاہے،اس کے معنی''کسی چیزکوآہستہ آہستہ آرام آرام سے اورنرمی کے ساتھ چلانا''ہیں۔''مقائیس اللغۃ''سے معلوم ہوتاہے کہ اس کے معنی''ہمیشہ چلانا''ہیں۔،سطح سمندر پرکشتیوں کے چلنے میں یہی دونوں نکتے قابلِ توجہ ہیں،خاص کربادبانی کشتیوں کے بارے میں عام طور پرہوائیں ہمیشہ کیلئے کشتیوں کونرمی اوراستمرار کے ساتھ متحرک رکھتی ہیں۔ اگرہواؤں میں شدیداتارچڑھاؤ ہوتایاان میں دوام واستمرارنہ ہوتاتوکشتیوں میں زبردست ہچکولے پیداہوتے اوروہ مستقل طورپرشدیدلرزوں کی زدمیں رہتیں،یاپھرسمندرکے درمیان میں ہی متوقف اور پریشان رہتیں۔قرآن کی یہ تعبیراس خدائی آیت کے نئے رازوں کاانکشاف کررہی ہے۔

پس اس طرح مندرجہ بالاتمام آیات سے سمندروں کی تخلیق کے مختلف فوائدمعلوم ہوجاتے ہیں جن میں سے ہرایک فائدہ آیات الٰہی میں سے ایک آیت ہے،خصوصاً سمندروں کی سطح پرکشتیوں کی حرکت۔ ہمیشہ کسی نعمت کی اہمیت کااس وقت پتہ چلتاہے جب وہ ہاتھ سے چلی جائے۔چنانچہ اگرسمندرنہ ہوتےتوصرف سمندروں کے راستے سے نقل وحمل ہونے والامال ہی اپنی جگہ پرنہ پڑارہتا بلکہ غذائی،صنعتی اورزینتی موادکی بہت بڑی مقداربھی حاصل نہ ہوپاتی۔ پھران سب سے بڑھ کرنہ توکوئی بادل اٹھتااورنہ کوئی بارش ہوتی،اورخشک اوربھسم کردینے والی ہوائیں چلتی رہتیں جوزندہ موجودات کاستیاناس کرتی رہتیں۔

چند ضروری وضاحتیں

۱۔مختلف نعمتوں کا گھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔سمندر

جب سمندروں کا وجود عمل میں آیا اس وقت کوئی شخص موجود نہیں تھا کہ اسے معلوم ہوتا کہ وہ کس طرح وجود میں آئے ہیں۔لیکن سائنسدانوں اور دانشوروں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارا یہ خاکی کرہ گرم اور جھلسا دینے والے سورج سے جُدا ہونے کے بعد بھی گرم رہا اور پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوا۔اس کی پوست ایک پکے ہوئے اور خشک سیب کی پوست کی مانند ہوگئی جس میں سلوٹیں بھی ہیں، دراڑیں بھی ہیں۔ نشیب و فراز ہیں اور اس میں پہاڑ اور سمندر ظاہر ہو گئے۔

ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ سمندروں کا پانی کہاں سے وجود میں آیا؟ یہاں دو طرح کے نظریئے ہیں۔بعض لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ یہ پانی کرہ زمین کی گہرائیوں میں موجود آکسیجن اور ہائیدروجن کے مل جانے کی وجہ سے تشکیل پایا اور پھوٹ پھوٹ کر نکلنے والے چشموں کی مانند زمین سے باہر آیا جیسا کہ آج بھی باہر آرہا ہے۔پھر بتدریج قشرِ زمین کی پستیوں کو اُس نے پُر کر دیا۔

لیکن زیادہ مشہور نظریہ یہ ہے کہ کرہ زمین کے آسمان کو گہرے بادلوں نے ڈھانپا ہوا تھا۔جب وہ سرد ہوئے تو سیلابی بارشوں کی صورت میں زمین پر برس پڑے، ہزاروں سال تک برستے رہے اور اس کرہ ارضی کو طوفانوں نے اس حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ جس کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔اس سے سمندر وجود میں آ گئے۔البتہ ایک لمبے عرصے تک ان کے بے نظیر تلاطم بھی سمندروں کی گہرائیوں، چٹانوں اور ساحلوں کو گھساتے رہے اس کے بعد تبدریج ان میں سکون آتا گیا اور آج موجودہ صورت میں موجود ہیں۔

بہرحال سمندروں کی تاریخ بہت پرانی اور اسرار سے بھری ہوئی ہے۔لیکن اسے بھی زیادہ اہم ان کی برکتیں اور مفادات ہیں جو انسان کو ان سمندروں سے حاصل ہوتے ہیں۔ہم اس جگہ فہرست وار ان میں سے چند ایک کو بیان کرتے ہیں۔ان کی تشریح اس مختصر بحث سے خارج ہے۔

۱۔کشتی رانی

انسانی نقل و حمل اور تجارتی مال کے جا بجا لے جانے میں سمندروں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں انسانوں کیلئے حمل و نقل کا اہم ترین ذریعہ یہی سمندر ہیں، خصوصاً جب کہ سمندری راستے طبعی طور پر روئے زمین کے تمام نقاط تک جا پہنچتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کی طرف توجہ کریں کہ آج کے دور میں ایسے غول پیکر جہاز بھی تیار ہو چکے ہیں جو پانچ لاکھ ٹن تیل اپنے اندر لاد کر دنیا کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک پہنچاتے ہیں ، جب کہ اس قدر وزن اٹھانے کیلئے بیس ٹن کا بوجھ اٹھانے والی ۲۵ ہزار موٹر گاڑیاں درکار ہوتی ہے۔

۲۔کھانے پینے کا مواد

سمندروں کے اہم ترین فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اس سے اپنے کھانے پینے کا مواد حاصل کرتا ہے۔اس موضوع کی اہمیت کیلئے بس اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ہر سال ۲۶ ملین (دو کروڑ ساٹھ لاکھ) ٹن مچھلی سمندروں سے پکڑی جاتی ہے۔یہ اعداد وشمار آج سے تقریباً تیس سال پہلے کے ہیں اور یقیناً آج یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوچکی ہے۔نہ صرف انسان بلکہ بہت سے پرندے بھی اپنی غذا سمندروں اور دریاؤں سے حاصل کرتے ہیں جو خشکی میں پیدا ہونے والی غذا کی بچت کا سبب ہے۔

بعض سائنسدانوں کے حساب کے مطابق صرف وہ پرندے جو ساحلی علاقوں یا چٹانوں والے جزائر میں رہتے ہیں کہ آج کے دور میں پولٹری فارموں (مرغی خانوں) کی غذا کا عمدہ حصہ سمندری مچھلی ہڈیوں سے یا خود مچھلیوں سے تیار کیا جاتا ہے اور پھر بالواسطہ طور پر یہ انسان کی غذا بنتی ہیں۔

۳۔گھاس اور دوا کی جڑی بوٹیاں

سمندر کے ہر ایک ہیکٹر سے پانچ سو ٹن سبز گھاس حاصل ہوتی ہے جب کہ یہ زمین کے بہترین حصہ سے چار ٹن سے زیادہ حاصل نہیں ہو پاتی۔بعض ملکوں میں یہ گھاس جانوروں کو بھی کھلاتے ہیں اور اس کی خاکستر سے زمین کی کھاد کا کام لیتے ہیں۔سمندری گھاس سے مختلف مواد حاصل ہوتے ہیں،مثلاً جامد الکوحل،سیلز،نشاستہ اور GELATIN(JELLY) جو کیمیکل صنعتوں اور غذاؤں (اور بعض دواؤں) کے کام آتے ہیں۔

۴۔معدنیات اور تیل کے ذخائر

سمندر،معدنیات سے سرشار علاقہ ہے۔ان معدنیات کا کچھ حصہ سمندر کی گہرائیوں میں ہے جب کہ ان کا اہم حصہ سمندر کے پانی پر تیر رہا ہے،معدنیات میں سے جن دھاتوں کو سمندر کے پانی سے نکالا جاسکتا ہے ان میں سے ایک MAGNESIUM میگنیزیم ہے،جو صنعتوں کے کام آتی ہے۔اسی طرح پوٹاشیم POTASSIUM،برم BOTANIST اور سودیم سلفیٹ SODIUM SULPHATE وغیرہ ہیں۔

سائنسدان کہتے ہیں کہ چالیس عناصر سے زیادہ (علاوہ اس کے جو بتائے گئے ہیں) سمندر کے اندر موجود ہیں،جو مصنوعات میں استعمال ہوتے ہیں،حتیٰ کہ سونا بھی ملتا ہے،اگرچہ ابھی ان میں سے بہت سی دھاتوں کے نکالنے پر سنگین اخراجات اٹھتے ہیں جو ناقابلِ برداشت ہیں۔ہوسکتا ہے کہ یک دن ایسا آئے کہ انسان ایسی دھاتوں کو مختصر سے اخراجات کے ساتھ نکال سکے۔بعض بڑی بڑی کمپنیاں سمندر کے معدنی مواد سے پانچ سو سے زیادہ مختلف چیزیں تیار کرتی ہیں جب کہ سمندر کے پانی میں کروڑوں اربوں ٹن معدنی مواد موجود ہیں۔

اصولی طور پر تیل جو نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے،اس کا شمار بھی سمندر کے تحفوں میں ہوتا ہے،کیونکہ زیادہ قدیم میں اربوں سمندری

جانور سمندر کے عظیم علاقے میں اکٹھا ہوئے اوران کے اوپر براعظموں کا جودعمل میں آ گیا۔ریت اورمٹی کے ٹیلے بنے جو پہاڑوں کی شکل اختیار کر گئے۔وہ اس میں دب کر رہ گئے اور جو تیل حاصل ہو رہا ہے وہ زمین کی گہرائیوں میں باقی رہ گیا۔

ایک اوراہم معدنی مواد جو سمندر سے حاصل ہوتا ہے،نمک ہے نمک کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرتعلق ہے اور گذشتہ زمانے میں قلت کی وجہ سے اس کی اس قدر اہمیت تھی کہ لکھا ہے کہ رومی فوجی اپنی تنخواہ میں نمک وصول کیا کرتے تھے۔اور روس میں تو نمک کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے ''نمکین بغاوتیں'' سر اٹھاتی رہیں۔

نمک کے اخراج کا اہم ترین منبع بھی سمندر ہے حتیٰ کہ جہاں پر نمک کی کانیں ہیں اوران کا قطرہ آٹھ آٹھ سو میٹر ہے وہ بھی سمندروں کے آثار میں سے ہیں،جب ایک زمانے میں وہ ساری زمین کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے۔ساری دنیا میں نمک کے سالانہ مصرف بائیس ملین (دو کروڑ بیس لاکھ) ٹن کا اندازہ لگایا گیا ہے۔یعنی اگر انسان اسی انداز سے خشکی کے نمک کا مصرف کرتے رہے تو جلد یا بدیر اس کی کانیں ختم ہو سکتی ہیں جب کہ سمندر نمک کا ایسا منبع ہے جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آئے گا،کیونکہ سمندر میں موجود نمک کا ذخیرہ اس حد تک زیادہ ہے جو ایک ملین سات سو ہزار (ستر لاکھ) سال تک انسانی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کافی ہے۔

۵۔توانائی کی پیدائش کا بہترین ذریعہ

انسان نے قدیم الایام سے اس نکتہ کی طرف توجہ مرکوز کی ہوئی ہے کہ سمندر کے ''مد'' کے موقع پر جب اس کا پانی چڑھاؤ پر ہوتا ہے اُسے کنٹرول میں لایا جائے اور ''جزر'' کے موقع پر جب وہ گھٹاؤ کی طرف مائل ہوتا ہے،اس سے توانائی پیدا کی جائے اور پھر اس سے پن چکیاں وغیرہ کے چلانے کا کام لیا جائے۔

دورِ حاضر کے سائنسدانوں کے اندازوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس توانائی سے بڑی مقدار میں بجلی پیدا کی جاسکتی ہے اور اس سے توانائی کی پیدائش کے عظیم منبع کا کام لیا جاسکتا ہے۔سمندر کے پانی کا مدوجزر جو چاند کی کشش کی وجہ سے رات دن میں دو مرتبہ معرضِ وجود میں آتا ہے،پانی کی سطح کو بڑی حد تک اوپر اور نیچے لے جاتا ہے اور اس سے توانائی کے حصول کے علاوہ سمندر کے ساحلی علاقوں کی آبپاشی کا بھی بہت بڑی حد تک کام لیا جاتا ہے۔کیونکہ جس جگہ پر دریاؤں کا پانی سمندر میں گرتا ہے،وہاں پر میٹھے پانی کا سمندر ہوتا ہے اور ''مد'' کی وجہ سے وہی شیریں پانی ساحل کی طرف دھکیلا جاتا ہے،جس سے بڑی مقدار میں زمین کی آبپاشی ہوتی ہے۔اسی لئے انسان قدیم الایام سے ہی ایسے علاقوں میں نہریں کھود کر بڑی مقدار میں زمینوں کو زیر کاشت لایا ہے۔

آج بھی خلیج فارس کے ساحلی علاقوں میں شاید کروڑون کھجوروں کے درخت ایسے ہیں جو صرف اسی طریقہ سے سیراب ہوتے ہیں کیونکہ وہ پانی کافی دور تک پیچھے کو ہٹ جاتا ہے اور یہ عذب وفرات (میٹھا اور خوشگوار) پانی جو ملح واجاج (کڑوے اور کھاری) پانی کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے،لیکن اس میں مخلوط نہیں ہوتا،اس علاقہ کے ساحل نشینوں کیلئے ایک عظیم سرمایہ ہے۔

۶۔مختلف زیورات

سمندر کے فوائد سے ایک اور فائدہ، آیات بالا میں بھی جس کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے وہ زیورات، میں جو سمندر سے حاصل کئے جاتے ہیں، جیسے وہ موتی ہیں جو مخصوص صدف کے سینے میں پروان چڑھتے ہیں، اور مرجان ہے جو ایک قسم کا دریائی جانور ہے لیکن درخت کی شاخوں کی صورت میں ہوتا ہے اور نہایت ہی دلکش اور دیدزیب منظر کا حامل ہوتا ہے، زینت کے علاوہ طب میں بھی کام آتا ہے۔

۷۔سمندروں کے ذریعہ موسم میں اعتدال

نہ صرف وہ ہوائیں جو سمندر سے خشکی کی طرف چلتی ہیں، ان سے موسم میں نمی آجاتی ہے اور وہ حد اعتدال پر رہتا ہے بلکہ آپ تعجب نہ کریں تو خود دنیا کے عظیم سمندروں کے اندر بھی بڑے بڑے دریا بہہ رہے ہیں جو گرم علاقوں سے سرد منطقوں کی طرف اور سرد علاقوں سے گرم منطقوں کی جانب رواں دواں ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی اس قسم کی حرکت سے کرہ زمین پر موسم کے اعتدال پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔

ان دریاؤں میں سے زیادہ موثر اور طاقت ور ''گلف اسٹریم'' GULF STREAM ہے یہ عظیم دریا مرکزی امریکہ کے ساحلوں سے چلنا شروع ہوا ہے اور تمام اوقیانوس اطلس کو طے کرتا ہوا شمالی یورپ کے ساحلوں تک جا پہنچتا ہے۔ یہ پانی جو خطِ استواء کے نزدیکی علاقوں کے قریب جاری ہیں، گرم ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات ان کا رنگ بھی پڑوسی پانیوں کے رنگ سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ عظیم سمندری دریا جس کا صرف عرض ڈیڑھ سو کلومیٹر اور گہرائی کئی سو میٹر ہے [1] بعض علاقوں میں اس کی رفتار اس قدر ہے کہ ایک دن میں صرف ایک سو ساٹھ کلومیٹر سفر کرتا ہے اور اس کی حرارت کا نزدیکی پانیوں کی حرارت سے پندرہ درجہ کا فرق ہوتا ہے۔

''گلف اسٹریم'' گرم ہواؤں کو وجود میں لاتا ہے اور اپنی حرارت کا بیشتر حصہ یورپ کے شمالی ملکوں کو بھیجتا ہے جس سے ان ملکوں کی آب وہوا نہایت ہی خوشگوار رہتی ہے۔ اگر یہ صورت حال نہ ہوتی تو ان ملکوں میں زندہ رہنا اگر ناممکن نہ ہوتا تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ عظیم سمندری دریا جن کی پیدائش کا اصلی عامل زمین کے استوائی منطقہ کے درجہ حرارت اور قطبی منطقوں کے درجہ حرارت کا باہمی اختلاف ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے اطراف کے پانی سے بہت کم مخلوط ہو پاتے ہیں اور اسی صورت حال کے ساتھ ہزاروں میلوں کا فاصلہ طے کرتے ہیں، سورہ الرحمن کی ۱۹ ویں آیت کا دلچسپ مصداق ہیں کہ ''مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ'' خداوندِ عالم نے دو دریاؤں کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ قرار دیا ہے اور ان کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تو چلتے ہیں لیکن ان کے درمیان رکاوٹ موجود ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ [2] یہ آیتِ مذکورہ کی ایک دلکش تفسیر ہے۔

---

[1] بعض کتابوں میں صراحت کی گئی ہے کہ اس کی بعض علاقوں میں گہرائی آٹھ سو میٹر تک جا پہنچتی ہے۔ (کتاب ''دریا و یا رعجائب'' ص ۴۶

[2] اس بارے میں مزید تفصیل کیلئے تفسیر نمونہ جلد ۲۳ میں انہی آیات کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

۸۔سمندری پانی سے طبی سہولتوں کا حصول

اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ سمندر کا پانی انسان کے بداور اعصاب کے لئے نہایت ہی مفید ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے اکثر نقاط میں بعض جلد ہی اور اعصابی بیماریوں کے علاج کیلئے یا مکمل صحت وسلامتی اور حفظانِ صحت کے حصول کیلئے ،سمندری پانی سے استفادہ ایک معمول کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اگر اخلاقی جرائم ومقاصد اور آلودگیوں کو اس سے نکال دیا جائے تو سمندر کا پانی انسان کی صحت وسلامتی اور فرحت ونشاط کا بہترین منبع بن سکتا ہے۔

۹روئے زمین کے پانی کا اصل منبع

سمندر کا اہم ترین،عظیم ترین اور وسیع ترین فائدہ تو اس سے اٹھنے والے وہی بخارات ہیں جو بعد میں بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہ خشک اور پیاسی زمینوں کی طرف روانہ کر دیئے جاتے ہیں جو بارش کی صورت میں ان زمینوں کو زندگی عطا کرتے ہیں،جس کی تفصیل ہم بادو باران کی فصل میں بیان کر چکے ہیں۔

۱۰۔میٹھے پانی کا حصول

آج بہت سے علاقوں میں جن کی میٹھے پانی تک رسائی نہیں ہے وہ اسی سمندری پانی کو عملِ تقطیر کے ذریعہ پینے کے قابل بنا کر اس سے استفادہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے نا قابلِ رہائش علاقے بھی رہنے کے قابل ہو گئے ہیں۔یہ سمندروں کی برکتوں اور فوائد کا مختصر سا نمونہ جن سے آج انسان واقف ہوا ہے اور معلوم نہیں کہ مستقبل میں اور کون سے فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں؟ یہیں سے ہم قرآن مجید کی اس تعبیر کی عظمت سے واقف ہوتے ہیں کہ فرماتا ہے ''وَسَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ''(خدا نے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور تمہاری خدمت میں قرار دے دیا ہے)۔[1]

۲۔سمندر۔۔۔یا۔۔۔عجائبات کا گھر!

اگر ہم خوب غور سے سوچیں تو معلوم ہوگا کہ ویسے تو دنیا کی تمام موجودات تعجب آور ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی سمندر کے اندر رہنے والے جانے پہچانے جانوروں کی اقسام ایک لاکھ چالیس ہزار تک بتائی ہیں۔ان اقسام کی تعداد سمندروں کی سطح پر تو بہت زیادہ ہے،لیکن ہم جس قدر گہرائیوں میں چلتے جائیں اسی قدر ان کی تعداد کم تر یا کم از کم ہم ان سے کم تر پر مطلع ہو سکیں گے۔

---

[1] اس سلسلے میں مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۱۔دریا دیار عجائب۔۲۔اسرار دریا،۳۔شگفتہائے دریا،۴۔رسالہ بندرودریا،۵۔فرہنگ نامہ جلد ۱۲،۶۔بہترین راہِ شناختِ خدا

سمندروں کے بارے میں اہم بات یہ ہے کہ ماضی میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ سمندروں کی گہرائی میں قطعاً! کوئی زندہ چیز موجود نہیں ہے، کیونکہ سورج کی شعاعیں زیادہ سے زیادہ چھ سو میٹر سمندری پانی کے اندر جاسکتی ہیں اور اس گہرائی میں آخری شعاع بھی ناپید ہوجاتی ہے ۔اس کے بعد ''تاریکیِ مطلق'' کی فرمانروائی ہوتی ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ اس منطقہ میں سمندر کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات زیادہ اہم ہوتی ہے، وہ یہ کہ وہاں پر موجود اشیاء پر پانی کا زبردست دباؤ ہوتا ہے، کیونکہ ایک کلومیٹر کی گہرائی میں پانی کا دباؤ سو کلوگرام فی مربع سینٹی میٹر ہوتا ہے۔ظاہر سی بات ہے کہ اگر کوئی انسان وہاں حفاظتی تدابیر کے بغیر چلا جائے تو اس کی ہڈیاں چکنا چور ہوجائیں۔[1] یہی وجہ ہے کہ سمندروں کی گہرائی میں جانے کیلئے دس میٹر کے بعد کیلئے حفاظتی تدابیر اور حفاظتی لباس کے بغیر جانا قطعاً ناممکن ہے۔اس سے بھی مزید نیچے جانے کیلئے تو فولاد کی موٹی موٹی چادروں کی مکمل پناہ گاہ کی ضرورت ہوتی ہے وگرنہ پانی کا دباؤ ہر چیز کا کچومر نکال دے ۔اس سے بھی مزید نیچے جانے کیلئے بھی ذریعہ سے سفر بالکل ہی ناممکن ہے کیونکہ آج تک دنیا میں کوئی ایسی چیز نہ تو ایجاد ہوئی ہے اور نہ ہی دریافت ہوئی ہے جو اس دباؤ سے بچا سکے۔

لیکن سائنسدانوں کے بعد کے مطالعات نے یہ چیز ثابت کردی ہے کہ سمندر کی نہات ہی اتھاہ گہرائیوں میں بڑی تعداد میں اور نہایت ہی عجیب وغریب اقسام کی مخلوق رہتی ہے اور اُن کے اندر جو قوت مدافعت ہوتی ہے اس کے ذریعہ وہ پانی کے عجیب دباؤ کا سامنا کرتی ہے۔وہاں مطلقاً کسی قسم کے گھاس نہیں نہیں اُگتی جس سے بحری جانور غذا کے طور پر استفادہ کریں لیکن آفریدگارِ کائنات کا دستِ قدرت ان کی ضرورت کی غذا بھی تیار کرتا ہے، جو مختلف نباتاتی مواد ہوتے ہیں اور سمندر کی سطح اور نُور آفتاب کے نیچے پرورش پاتے رہتے ہیں اور جب وہ غذا کیلئے آمادہ ہوجاتے ہیں تو آسمانی مائدہ کی صورت میں سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والی مخلوق کے سر پر پہنچ جاتے ہیں۔اِن کے لاشے بھی اُن کی لذیذ غذا کا کام دیتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنی تاریکی کی مشکل کو کیسے حل کرتے ہیں؟ جس قدرت نے انہیں اس منطقہ کیلئے پیدا کیا ہے اس نے ان کی روشنی کا بھی بندوبست کردیا ہے کیونکہ ان میں سے سب سے جانور ایسے ہیں جو از خود روشنی باہر نکالتے ہیں، ٹھنڈی روشنی جیسے جگنو کی ہوتی ہے۔مچھلی کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کے سر سے سرخ اور دُم سے نیلی روشنی باہر آتی ہے جب کہ بعض مچھلیاں سُرخ، سفید اور نیلی روشنی بھی باہر نکالتی ہیں۔

ایک سائنسدان کا کہنا ہے کہ سمندر کے عجیب ترین علاقوں میں وہ حصے ہوتے ہیں جو نہ تو آبی سطح کے نزدیک ہوتے ہیں اور نہ ہی سمندر کی تہیں ہوتی ہیں، بلکہ ان دونوں حصوں کے درمیان کا علاقہ ہوتا ہے۔جس کے اوپر نہ تو آسمان ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے نیچے زمین ہوتی ہے ، بلکہ اوپر، نیچے آگے اور پیچھے غرض ہر طرف پانی ہی پانی ہوتا ہے۔جو مخلوق وہاں پر رہ رہی ہوتی ہے اسکا کوئی خانہ وکاشانہ نہیں ہوتا۔اسی لئے وہ ہمیشہ چلتی پھرتی رہتی ہے۔وہاں ایسی مچھلیاں رہتی ہیں جو آپ کو حیرت میں ڈال دیں۔ان میں سے بعض کے دانت تو اس قدر لمبے ہوتے ہیں کہ وہ ان

---

[1] غوطہ خور لوگ غوطہ خوری کا لباس پہنے بغیر تیس میٹر کی گہرائی تک جاسکتے ہیں اور لباس کے ساتھ ڈیڑھ سو میٹر تک، جبکہ سمندر کے گہرے سے گہرے مقام پر پانی کا دباؤ سات ٹن فی مربع انچ ہے۔(ملاحظہ ہو کتاب دریا دیار عجائب ص ٦٨

کی وجہ سے کبھی اپنا منہ بند نہیں کرسکتیں۔مچھلی کی ایک قسم ایسی ہے جو اپنے پیٹ کو اس قدر بل دیتی ہے کہ اپنے سے تین گنا بڑی مچھلی کو نگل سکتی ہے۔ اس طرح کی مچھلیوں کو عجیب وغریب نامون سے موسوم کیا گیا ہے۔مثلاً ''نگلنے والی سیاہ مچھلی''،''سمندری سانپ''اور''اژدہا مچھلی''وغیرہ۔

اوقیانوس کی گہرائیوں کو اپنے مقام پر رہنے دیتے ہیں اوراب پانی کی سطح کی طرف آتے ہیں۔یہاں پر بھی ایک غوغا برپا ہے۔ایسی ایسی مچھلیاں موجود ہیں جو ایک دوسرے سے بڑھ کر عجیب ہیں۔ان میں سے بعض ایسی ہیں جن میں بجلی جیسا کرنٹ ہوتا ہے،جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مغز سے ایک ایسا فرمان جاری کرتی ہے کہ اس سے بڑی حد تک بجلی پیدا ہوتی ہے۔وہ اسے اپنے دشمن یا شکار کو بری طرح مفلوج کردیتی ہیں اور وہ ایسی بجلی ہوتی ہے جو انسان تک کے لئے خطرناک ہوتی ہے۔

''پرندہ مچھلیاں''جو کبھی پانی سے باہر آکر ساٹھ میٹر کی بلندی تک پرواز کرسکتی ہیں،حتیٰ کہ بسا اوقات درختوں سے اوپر بھی چھلانگ لگا سکتی ہیں۔

''مرکب مچھلیاں''جو دشمن سے بچنے کیلئے پانی میں سیاہ رنگ کا مادہ پھیلا دیتی ہیں اور سیاہی پھیل جانے سے اپنی جان بچا کر بھاگ جاتی ہیں،جیسے آج کل کی کلاسیکی جنگوں میں معمول ہے کہ میدانِ جنگ کو دھوئیں جیسے مواد سے بھر دیتے ہیں تاکہ فوجی دشمن کی آنکھوں سے مخفی رہیں۔

''سُفرہ ماہی''(دسترخوان مچھلی) مچھلیوں کی ایک اور عجیب قسم ہے جو بہت ہی بڑی اور کافی حد تک چوڑی ہوتی ہے۔یہ دسترخوان کی مانند اپنے آپ کو سطح سمندر پر پھیلا دیتی ہے اور جونہی کوئی شکار اس کے دسترخوان پر آدھمکا اس نے اپنے پروں کو سمیٹنا اور اسے کھانا شروع کردیا۔ سمندر میں چھوٹے سے چھوٹے جانور بھی رہتے ہیں اور بڑے سے بڑے جانور بھی۔ایسے ایسے مگرمچھ بھی رہتے ہیں جن کی لمبائی تیس میٹر،قطر چودھ میٹر سے زیادہ اور جبڑوں کی لمبائی سات میٹر سے زائد ہوتی ہے۔زبان کا وزن تین ٹن،دل کا تقریباً آدھا ٹن ہوتا ہے۔بسا اوقات نومولود بچے کی لمبائی سات میٹر ہوتی ہے۔[1]

ایک مرتبہ''نیوجارجیا''میں ایک ایسے مگرمچھ کو شکار کیا گیا جس کی لمبائی تینتیس میٹر تھی اور وزن پچیس ہزار کلوگرام تھا۔[2] سمندر میں ایسی نباتات بھی اُگتی ہیں جو خوردبینوں سے دیکھی جاسکتی ہیں اور ایسی بھی جن کی لمبائی پچاس میٹر تک ہوتی ہے۔

۳۔سمندر۔۔۔۔۔۔۔۔کلامِ معصومینؑ کی روشنی میں

آیئے اس مقام پر بڑے خضوع وخشوع اور پورے خلوص کے ساتھ دعائے جوشن کبیر کا یہ جملہ زبان پر جاری کرنے کی سعادت

---

[1] کتاب شگفتہائے دریا''و''فرہنگنامہ

[2] ''دریا دیار عجائب''

حاصل کرتے ہیں کہ ’’یَامَنْ فِی الْبِحَارِ عَجَآئِبُہ‘‘ (اے وہ ذات جس کی قدرت کے عجائبات سمندروں کے اندر موجود ہیں۔[1]

جس دن پیغمبر گرامی اسلام کی زبان مبارک سے یہ جمل نقل کیا گیا تھا اس دن تک سمندروں کے راز واسرار کسی پر منکشف نہیں ہو پائے تھے۔ اور آج اس جمل کی عظمت ہمارے لئے دوسرے تمام ادوار کی نسبت زیادہ واضح اور روشن ہوجاتی ہے۔

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی دعاومناجات کا ایک اور جملہ ہے: ’’اَنْتَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ عَظَمَتُكَ وَفِی الْاَرْضِ قُدْرَ تُكَ ،وَفِی الْبِحَارِ عَجَآئِبُكَ‘‘ (تو تو وہ ذات ہے جس کی عظمت آسمان میں جس کی قدرت زمین میں اور اس کے عجائبات سمندروں میں ہیں۔[2]

اس بحث کو امیر المومنینؑ کی ایک اور حدیث کے ساتھ آگے چلاتے ہیں، امام فرماتے ہیں: ’’سخرلکم الماء یغدوعلیکم ویروح صلاحالمعاشکم والبحرسببالکثرۃ اموالکم ‘‘ (خداوندِ عالم نے پانی کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، جو صبح کے وقت جاتا ہے اور شام کے وقت واپس آج جاتا ہے، تاکہ تمہاری زندگی کو سنوارتا رہے (ممکن ہے یہ تعبیر سمندر کے مدوجزر اور اس کے زندگی عطا کرنے والے اثرات کی طرف اشارہ ہو) اور سمندر کو تمہارے اموال کی کثرت اور فراوانی کا ذریعہ قرار دیا ہے)۔[3]

اس بحث کو توحید مفضل کے ایک اہم اور برگزیدہ حصے کو بیان کر کے ختم کرتے ہیں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

’فاذااردت ان تعرف سعۃ حکمۃ الخالق وقصرعلم المخلوقین فانظرالی مافی البحارمن ضروب السمك ودواب الماء ،والاصداف والاصناف التی الاتحصٰی ولاتعرف منافعھاالاالشئی بعد الشیئی یدرکه الناس باسباب تحدث ‘‘اگر تم خالقِ کائنات کی حکمت کی وسعت اور مخلوقات کے علم کی کوتاہ دامنی کو جاننا چاہتے ہو تو قدرے اپنی نگاہ اور قیانوسوں اور سمندروں میں انواع واقسام کی مچھلیوں، دوسرے چلنے پھرنے والے جانوروں اور صدفوں پر ڈالو۔ ان کی اس قدر انواع واقسام ہیں کہ جن کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ ہی حساب اور جن کے فوائد بتدریج ان حالات کے پیش آنے کیلئے بعد ظاہر ہوتے رہیں گے جو (انسانی زندگی میں) رونما ہوں گے۔

پس سمندروں، دریائی جانوروں اور بحری نباتات وغیرہ میں ایسے فوائد اور برکتیں ہیں کہ جُوں، جوں انسانی عمر آگے بڑھتی جائے گی اسی قدر ان کے نت نئے اسرار ورموز منکشف ہوتے جائیں گے اور نئے فوائد انسان کیلئے ظاہر ہوتے جائیں گے جن کی وجہ سے وہ ان نعمتوں کے خالق کے سامنے اپنے خضوع وخشوع کے اظہار پر مجبور ہوجائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

[1] دعائے جوشن کبیر فضل ۵۷

[2] بحارالانوار جلد ۹۷ (۹۴)

[3] بحارالانوار جلد ۶۰ ص ۳۹ حدیث ۳ (باب الماء وانواعہ والبحار)

۱۴۔سایہ کی تخلیق میں خلاقِ عالم کی نشانیاں

اشارہ

کیا سایہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے خالقِ کائنات کی عظمت کا پتہ چل سکتا ہو؟ قرآنِ پاک میں خداوندِ عالم کی نعمتوں کے بیان اوراس کی پاک ذات کے تعارف کے موقع پر اس بظاہر سادہ سے مسئلہ کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس اسرار بھری کائنات میں جس چیز کی طرف بھی آپ دیکھیں گے اس میں اس کی عظمت کے آثار نظر آئیں گے اور تمام چھوٹی بڑی چیزوں کی پیشانی پر اس کی حکمت وعظمت کے دلائل ثبت ہیں مختصر سے اشارہ کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ دل کے ساتھ سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔اَلَمْ تَرَاِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّالظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَه، سَاكِنًاثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلاً ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَاقَبْضًايَّسِيْرًا

(فرقان/۴۵۔۴۶)

۲۔۔۔وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّاخَلَقَ ظِلَالاً وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًاوَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّوَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَه، عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ

(نحل/۸۱)

۳۔۔۔اَوَلَمْ تَرَوْااِلٰی مَاخَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ يَّتَفَيَّؤُ اظِلاَلُه، عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًالِلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ

(نحل/۴۸)

۴۔۔۔وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًاوَّ كَرْهًاوَّظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ

(رعد/۱۵)

ترجمہ

۱۔۔۔کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے سایہ کو کس طرح پھیلایا ہے؟ اور اگر وہ چاہتا تو اُسے ٹھہرائے رکھتا، پھر ہم نے سورج کو اس کے وجود پر دلیل قرار دیا۔ پھر اُسے آہستہ آہستہ اکٹھا کرتے ہیں۔

۲۔۔۔خداوندِ عالم نے تمہارے لئے جو چیزیں خلق فرمائی ہیں ان کے سائے بھی بنائے ہیں، اور پہاڑوں سے پناہ گائیں اور تمہارے کپڑے بنائے جو تمہیں (سردی اور) گرمی سے محفوظ رکھیں، اور کرتے جو تمہیں جنگ سے بچاتے ہیں۔ یوں خدا اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے تا کہ تم اس کی فرمانبرداری کرو۔

۳۔۔۔کیا انہوں نے خداوندِ عالم کی مخلوقات کو نہیں دیکھا کہ ان کے سائے ان کے دائیں بائیں حرکت کرتے ہیں اور خضوع وخشوع کے ساتھ خدا کا سجدہ کرتے ہیں۔

۴۔۔۔جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے طوعاً وکرہاً اور اسی طرح ان کے سائے بھی صبح وشام کو خدا کا سجدہ کرتے ہیں۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''ظلال''، ''ظل'' کی جمع ہے جس کا معنی سایہ ہے۔ لیکن دانشوار مشہور مفسر ''راغب'' اپنی کتاب ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ جہاں پر سورج کی روشنی نہ پڑی ہو، سایہ شمار ہوتا ہے۔ خواہ اس سے پہلے اس پر وہ روشنی پڑی ہو یا نہیں! لیکن فئے (بروزن شیئے) اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پہلے سورج کی روشنی اور پھر سایہ پڑ گیا ہو، جب کہ بعض اربابِ لغت نے ان دونوں الفاظ کو ایک ہی معنی میں لیا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ''ظل'' صبح سے ظہر تک کے اور ''فیئ'' ظہر کے بعد کے سایہ کو کہتے ہیں۔ لیکن ان دونوں الفاظ کے استعمال کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے معنی بہتر نظر آتے ہیں۔ ''ظل'' کا لفظ کنایہ کے طور پر عزت، قدرت، رفاہ اور آرائش وآرام کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، کیونکہ یہ چیزیں عموماً سایہ میں حاصل ہوتی ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

کیا سایہ بھی ایک عظیم نعمت ہے؟

ان آیات میں سایوں کی بات کی گئی ہے۔ بات تو بظاہر سادہ سی ہے لیکن اس کا عمیق مطالعہ ہمیں خالقِ کائنات سے زیادہ قریب اور بہتر آشنا کرسکتا ہے۔

''سب سے پہلے آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے'' کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے پروردگار نے سایہ کو پھیلایا ہے؟'' (اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ) ''اگر وہ چاہتا تو اسے ایک جگہ پر ٹھہرائے رکھتا۔'' (وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا) اس آیہ مبارکہ کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے: ''پس ہم نے سورج کو سایہ کے وجود پر دلیل قرار دیا۔'' (ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا) اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''پھر ہم اُسے آہستہ آہستہ اکٹھا کرتے ہیں'' (ثُمَّ قَبَضْنَاهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا)

یہاں کون سا سایہ مراد ہے جسے خدا پھیلاتا اور بتدریج سمیٹتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مرادرات کا سایہ ہے جو بتدریج تمام زمین پر پھیلتا اور سمیٹتا ہے، اور سورج کا وجود اس بات کا گواہ اور اس پر دلیل ہے، کیونکہ ہر چیز کو اس کی ضد سے پہچانا جاتا ہے، یعنی (تُعْرَفُ الْاَشْيَآءُ بِاَضْدَادِهَا)

بعض مفسر اسے اس لمبے اور وسیع سائے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو بین الطلوعین (صبح اور طلوع آفتاب کے درمیانی وقت) صفحہ زمین کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اس وقت یہ نہایت ہی پُرلطف سایہ اور پُرکیف لمحات ہوتے ہیں۔ بعض مفسرین اس سے مراد وہ سایہ سمجھتے ہیں جو دن کے وقت پہاڑوں، درختوں اور دوسرے اجسام پر سورج کی شعاعیں پڑنے سے معرضِ وجود میں آتا ہے اور بتدریج گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ چونکہ ان تینوں تفسیروں کے درمیان کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے اور آیت کی تعبیر بھی مطلق اور جامع ہے لہٰذا ہوسکتا ہے کہ ان سب کی طرف اشارہ ہو جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک انمول نعمت ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ رات درحقیقت زمین کے اس نیم کرے کا سایہ ہے جو سورج کے مقابل میں ہوتا ہے۔ یہ ایک مخروطی شکل کا سایہ ہوتا ہے جو فضا میں مخالف سمت میں پھیلا ہوا ہوتا ہے اور بطور دائم چلتا رہتا ہے۔ اگر رات کا سایہ نہ ہوتا تو دھوپ اور اس کی گرمی سے تمام موجودات جل کر راکھ ہوجاتیں اور نسلِ انسانی بہت جلد صفحہ ہستی سے مٹ جاتی۔

اگر دوسرے سائے نہ ہوتے اور انسان کو مجبوراً سارا دن دھوپ میں بسر کرنا پڑتا تو وہ بہت مشکل سے دوچار رہتا اور اس کیلئے موسم گرما میں زندہ رہنا ہی دشوار ہوجاتا۔ خداوندِ کریم نے انسان کو سائے جیسی نعمت عطا فرمائی ہے کہ اس سے وہ خود بھی اور اس سے متعلق دوسری چیزیں بھی آرام و آسائش سے رہ سکیں۔

باالفاظ دیگر کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ''گدلی'' پیدا کی گئی ہیں اور بعض وہ ہیں جو ''شفاف'' خلق فرمائی گئی ہیں اور روشنی جن کے اندر سے

پارہوجاتی ہے۔لہٰذااگرروئے زمین کی تمام چیزیں شفاف ہوتیں اورسائے کامطلق وجودنہ ہوتاتوانسانی زندگی آفتاب عالمتاب کی دائمی روشنی اوردھوپ کی وجہ سے جہنم میں بدل جاتی۔لہٰذااگراس بارے میں انسان تھوڑاسابھی غوروفکرسے کام لےتووہ اس نعمت کی عظمت واہمیت کواچھی طرح جان سکتاہےاوراس سے صاحب حکمت خالق کی عظمت کوتسلیم کرسکتاہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ''سایہ کے تدریجی نظام'' کاذکرکرکے شاید حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیاہے کہ اگراسائے یکبارگی پیداہوتے یامٹتے رہتےتوان سے بہت بڑے نقصانات کااندیشہ تھا کیونکہ روشنی سے تاریکی یاتاریکی سے روشنی کی یکبارگی تبدیلی، یااس طرح سردی سے گرمی یاگرمی سے سردی میں یکدم تبدیلی کانقصان کسی پرمخفی نہیں ہے۔لیکن اگراپنی تمام برکتوں اورخوبیوں کے باوصف''سایہ''ایک ہی جگہ اورایک ہی صوت میں برقرارہےتوبھی نقصان دہ ہوگا کیونکہ وہ انسان کوروشنی کی نعمت سے محروم کردے گا۔اسی لئے مندرجہ بالاآیت میں فرماتاہے۔''اگرخداچاہتاتواسے ایک جگہ ٹھہرائے رکھتا(لیکن اس نے اپنی کرم نوازی کی وجہ سے ایسانہیں کیا،تاکہ اس کے بندے نوراورسایہ دونوں کی نعمتوں سے مستفیدہوتے رہیں۔)

دوسری آیت جوکہ سورہ نحل کی توحیدی آیات کے ضمن میں بیان ہوئی ہے،اس میں چندآفاقی آیات اور پروردگارِ عالم کی نعمتوں کوشمارکرنے کے بعدفرماتاہے،''خداوندِعالم نےتمہارے لئے جوکچھ پیداکیاہےاس کیلئے سایہ قراردیاہے''(وَاللّٰهُ جَعَلَ مِمَّا خَلَقَ ظِلٰلاً)

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں وہ چیزیں مرادہیں جوسائے کووجودمیں لاتی ہیں،جیسے پہاڑ،درخت،بادل،چھت، دیواریں اورگھروغیرہ۔[1] اس بات میں شک نہیں کہ اگرتمام اشیاء۔۔۔۔۔۔۔جیسا کہ ہم پہلے بتاچکے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔شیشے کی مانندصاف وشفاف اورچمکدارہوتیں اورکائنات میں کوئی سایہ نہ ہوتاتوانسان کیلئے زندگی مہلک تباہ کن اور بھیانک چیز ہوتی۔

اسی آیت کےسلسلےکوآگے بڑھاتے ہوئے کئی اورنعمتوں کی طرف اشارہ کررہاہے جودرحقیقت سایہ کےوجودکی تکمیل کررہی ہیں،جیسے وہ پناہ گاہیں جو پہاڑوں میں غاروں اورشگافوں کی صورت میں پیدا کی گئی ہیں۔اسی طرح وہ لباس ہیں جوانسان کوسورج کی جلسادینے والی تپش سے بچاتے ہیں،یامیدانِ جنگ میں(زرہ کی مانند)سامنے سے دشمن کے وارکوروکتے ہیں۔(وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ)[2]

یہاں پر یہ سوال پیداہوتاہے کہ مندرجہ بالاآیت میں لباس کوصرف گرمی سے بچاؤ کاذریعہ بتایاہےاورسردیوں کے بارے میں کسی قسم کااشارہ نہیں کیا۔اس بارے میں بعض مفسرین نے کہاہے کہ چونکہ جن علاقوں میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں وہاں پرگرمی زیادہ پڑتی ہےاور یہ مسئلہ وہاں پرزیادہ درپیش تھا،یا پھر یہ کہ سورج کی گرمی اورتپش کے خطرات سب سے زیادہ اورسب سے سریع ہوتے ہیں،جب کہ سردی سے بچاؤ کے

---

[1] تفسیرروح المعانی جلد ۱۴ص ۱۷۶اورتفسیرقرطبی جلد ۶ص ۳۷۷۵

[2] ''سرابیل''،''سربال''(بروزن مثقال) کی جمع ہے۔بعض نے اسےطرح کےلباس کےمعنی میں تفسیر کی ہےاوربعض نے اسےقمیص کےمعنی میں بتایاہے(اسی طرح زرہ ہے جسےقمیص کی مانندپہناجاتاہے)لیکن یہاں پر پہلےمعنیٰ زیادہ مناسب ہیں

طریقے انسان کے پاس زیادہ ہوتے ہیں۔لیکن اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ عربی ادب میں بہت سے مقامات پر جہاں دومتضاد چیزوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں تو ایک کو اختصار کیلئے حذف کر دیتے ہیں اور صرف ایک ہی کے بیان پر اکتفاد کرتے ہیں جس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اسی آیت کے آخر میں ان تین نعمتوں (سائے ،مساکن ،اور لباسوں کے ذکر) کے بعد فرماتا ہے:''اس طرح سے خداوندِ علم اپنی نعمتیں تم پر مکمل کرتا ہے تا کہ تم اس کے فرمان کے مطابق سرِ تسلیم خم کردو۔''(كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ)

ان نعمتوں اور ان کے مختلف اسرار کی طرف توجہ ایک تو انسان کو خدا کے علم اور اس کی قدرت سے آشنا کرتی ہے اور دوسرے حسِ شکرگزاری کے متحرک ہوجانے سے اسے خداوندِ متعال کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر آمادہ کرتی ہے کہ یہ خداوندِ عالم ہی ہے جس کے اس قدر احسان اور مہربانیاں ہیں۔

تیسری آیت میں توحیدی آیات کی صورت میں مشرکین کو جھنجوڑ کر فرماتا ہے''کیا انہوں نے خدا کی مخلوق کو نہیں دیکھا کہ اُن سے سائے دائیں اور بائیں سے خدا کا کیونکر سجدہ کرتے ہیں جب کہ وہ خضوع کی حالت میں ہوتے ہیں۔''(اَوَلَمْ تَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ) [1]

کس قدر بہترین تعبیر ہے کہ تمام سائے زمین پر سر ٹکائے اسکی پاک ذات کے سامنے سجدہ ریز ہیں کیونکہ اس کے فرمان کے تابع ہیں اور ان کا یہ خضوع اور سرِ تسلیم خم کرنا،پیش گاہِ حق میں ان کے سجدہ کی تخلیق کے قوانین کے آگے خضوع وخشوع کا اظہار ہے۔لیکن انسان سایہ سے بھی کتنا گیا گزرا ہوتا ہے کہ وہ بتوں کے آگے تو سرِ خم تسلیم کرتا ہے لیکن پروردگار کا سجدہ نہیں کرتا۔

سایوں کا سجدہ زمین وآسمان میں موجود تمام موجودات کے عمومی سجدہ کا ایک جز ہے۔لہٰذا آیت کا سلسلہ جاری ہے اور اس میں عمومی سجدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔''زمین وآسمان میں جو بھی چلنے والی چیز ہے خدا کیلئے سجدہ کرتی ہے۔''(وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ)(نحل۔٦٩)

یہاں پر ایک تفصیلی بحث ہے جسے''حق کے آگے کائنات کا عمومی سجدہ'' کے عنوان سے بیان کیا جائے گا۔بہرحال یہ آیت بھی سایوں اور ان کے آثار کی اہمیت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو توحید کے الہام عطا کرنے والے منبع کے عنوان سے توجہات کا مرکز بن سکتی ہے۔

چوتھی آیت میں سایوں کو آسمان وزمین کی تمام موجودات کے رویف میں بیان فرمایا ہے جو سب کی سب خدا کیلئے خضوع وخشوع اور سجدہ کرتی ہے۔اشارہ ہوتا ہے۔''تمام مخلوقات جو بھی آسمان اور زمین میں ہیں،اسی طرح ان کے سائے بھی ہر صبح وشام

---

[1] ''یتفیؤا''،''ظلال''کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں بازگشت اور لوٹنا۔بعض حضرات اسے موجودات کے ان سایوں میں منحصر سمجھتے ہیں جو بوقت عصر ہوتے ہیں،جب سورج لوٹ رہا ہوتا ہے۔اس لفظ کا اطلاق جنگی غنیمتوں کے ایک حصے پر اس لئے ہوتا ہے کہ یا تو مسلمانوں کی طرف رہا ہوتا ہے یا اس لئے کہ اسے بھی سائے کی مانند زوال اور فنا ہے اور''داخر''کا معنی تواضع کرنے والا

اطاعت وتسلیم یاجبرواکراہ کے ساتھ خداکیلئے سجدے کرتے ہیں ۔''(وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًاوَّ كَرْهًاوَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ)

''طوعًاوکرھًا'' کی تعبیرممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہوکہ عقلمنداور باشعورمخلوق اپنی رضاورغبت سے اورعقل سے عاری مخلوق ،جیسے سایہ وغیرہ،تخلیقِ عالم کے لازمی قوانین کےتحت فرمانِ الٰہی کے سامنے سرتسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

یایہ کہ مومنین تواپنی خوشی اوررضاسےلیکن غیرمومنین جوخوداختیاری طور پرسجدہ کرنے کیلئے حاضرنہیں ہوتے ان کے وجودکاایک ایک حصہ تخلیقِ کائنات کے لازمی قوانین کےمطابق خداوندِعالم کےحکم کےآگےسرجھکائے ہوئے ہےاوراس کی ذات پاک کےسامنےسجدہ تکوینی بجالارہاہے۔یایہ کہ مومنین تمام حالات میں (خوشی اورغم کےزمانے میں بھی سکون اوربےچینی کےدورمیں بھی) خداکےآگےسربسجود ہوتے ہیں ،لیکن کفارصرف مجبوری اورمشکلات کےموقع پراس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ان تینوں تفسیروں کےدرمیان کوئی تضادنہیں ہےاوران سب کواسی آیت کےمفہوم میں جمع کیاجاسکتاہے۔

مندرجہ بالاآیت''من'' کی تعبیرسےاگرچہ بظاہریہی معلوم ہوتاہے کہ اس کاتعلق صاحبان عقل سے ہے،لیکن یہ احتمال زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتاہے کہ یہاں اس کامفہوم عام ہےاورتمام عاقل وغیرعاقل مخلوق اس میں شامل ہےاور''من'' کی تعبیرغلبہ کے باب سے ہے۔ (کیونکہ عقلمندوں کے بےعقلوں پرغلبہ حاصل ہے)

البتہ''غدو''اور''اصال''(صبح اورشام کاوقت) کی تعبیرشایداس وجہ سے ہے کہ دن کے درمیانی حصہ میں بعدمواقع پرسایہ مٹ جاتاہے ہے،یاپھرنہات ہی محدوداور بالکل چھوٹاہوتاہے جب کہ صبح اورشام کے وقت ایسانہیں ہوتا۔علاوہ ازیں یہ تعبیربہت سے مواقع پردوام اورعموم کے بیان کرنے کیلئےبھی آتی ہے۔مثلاً ہم کہتے ہیں کہ''فلاں آدمی ہرصبح وشام درس پڑھتاہے''یا''فلاں شخص صبح وشام دوسروں کے کام میں مداخلت کرتاہے''یعنی ہمیشہ ایساہوتاہے۔ان تمام آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ قرآن مجیدسایہ تک کی خصوصی اہمیت کا قائل ہےاوراُسے خداوندِعالم کی عظمت کی آیات میں شمارکرتاہے۔''سجدہ'' کی تعبیرجوخضوع وخشوع کی آخری حدہوتی ہے،اسی بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

چندضروری وضاحتیں

اگرسایہ نہ ہوتا

کسی چیز کی اہمیت کااندازہ لگانے کیلئےضروری ہے کہ ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ ایک لمحہ یاایک دن یاایک ماہ کیلئے وہ ختم ہوچکی ہے اورپھراس کےانجام کااندازہ کریں۔سایہ جوکہ بادی النظرمیں ایک عام اورسادہ سی چیز ہےجس کی بظاہرکوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔اس کے بارے میں بھی ایساہی فرض کیاجاسکتاہے۔فرض کیجئے کہ ایک ہفتہ کیلئے ہرقسم کاسایہ کرہ ارض سے اٹھایاجاچکاہے،نہ پہاڑوں کاسایہ ہےاورنہ ہی

درختوں، دیواروں، چھتوں کا سایہ حتیٰ کہ زمین کی نیم کرہ کا سایہ بھی موجودہ نہیں ہے جسے رات کہتے ہیں، اور ہر قسم کے یہ سائے ایک ہی مرتبہ اٹھالئے گئے ہیں، اس کائنات کی ہر چیز بلوری (شیشے کی) صورت اختیار کر چکے ہیں اور دھوپ ان کے آر پار ہو رہی ہے آپ ہی بتایئے کہ زندہ رہنا کس قدر مشکل اور طاقت فرسا بن چکا ہے؟ مسلسل دھوپ پڑ رہی ہے، ہر شئے پر اس کا دباؤ ہے، انسان اور دوسری تمام مخلوق سے آسائش وآرام سلب ہو چکا ہے۔ اگر یہ مفروضہ موسم گرمہ میں عمل پذیر ہو تو ایک ہفتہ کی یہ مختصر مدت تمام زندہ چیزوں کو ہلاک کر ڈالے۔ بنابریں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سائے کا وجود انسانی زندگی کیلئے بہت ہی مؤثر ہوتا ہے اور اسے حیات بخشتا ہے، کیونکہ:

۱۔ سورج کی روشنی اور حرارت کی حدِ اعتدال پر رکھنے کیلئے سائے کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ سورج کی حیات عطا کرنے والی شعاعیں اگر سایہ کی تدریجی نوازشوں سے معتدل نہ ہوں تو وہ مختصر اور کوتاہ مدت میں ہر چیز کو پژمردہ کر کے جلا ڈالیں۔ فخر رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

''خالص تاریکی سے انسان نفرت کرتا ہے اور خالص روشنی بھی اُسے تکلیف پہنچاتی ہے۔ اسی لئے بہترین حالت سایہ ہی ہے، جو بہشت کی ایک بہترین نعمت کے طور پر ''ظل ممدود'' (وراز سایہ) کی صورت میں مذکور ہوا ہے۔[1]

۲۔ سایہ کی اہمیت خصوصاً متحرک سایہ کی اہمیت مسافرین اور بیابان میں چلنے والے لوگوں کے لئے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ایسے لوگ سائبانوں، خیموں اور دوسرے چھت والے ذرائع حمل نقل کی کمک سے اپنے آپ کو دھوپ سے بچا سکتے ہیں۔

۳۔ ایک اور بات جو نہایت ہی قابل توجہ ہے، یہ ہے عام تصور کے برخلاف کسی چیز کو دیکھنے کیلئے صرف روشنی ہی کافی نہیں، بلکہ نور کے ساتھ ہمیشہ ''سایہ'' بھی ہوتا کہ اشیا کے دیکھنے کا امکان حاصل ہو۔ باالفاظ دیگر اور واضح تر کہ اگر کسی جسم کے چاروں طرف سایہ اور نیم سایہ کا وجود نہ ہو تو روشنی میں غرق وہ جسم کسی بھی طرح قابل مشاہدہ نہیں۔ پس جس طرح مطلق تاریکی میں انسان کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتا اسی طرح مطلق روشنی میں بھی وہ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ یہ دونوں باہم ہوں تو چیزوں کے مشاہدہ کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ (غور کیجئے گا)

جس خالق نے سایہ جیسی بظاہر عام اور سادہ سی چیز کو اس قدر اہمیت عطا فرمائی ہے وہی ہر قسم کی بندگی، خضوع اور سجدے کے لائق ہے۔ ہم اپنی اس گفتگو کو ایک مفسر کے ایک جملہ کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ اس نے ایک ایسے شخص سے جو خالق کے سجدہ کو فراموش کر چکا تھا، کہا تیرا سایہ (جو کمزور اور بے قیمت سی چیز ہے) وہ تو خدا کا سجدہ کرتا ہے لیکن تو خود سجدہ نہیں کرتا'' (یہ کس قدر بری اور ناشائستہ بات ہے۔[2]

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۴ ص ۸۸

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۲۰ ص ۴۳

۱۵۔نباتات اور میوہ جات میں پروردگارِ عالم کی نشانیاں

اشارہ:

روئے زمین پر موجود وسیع ترین مخلوق نباتات ہے، انواع واقسام اور کثرت، عجائبات، شگفتگی اور حسن کے لحاظ سے بھی اور افادیت کے نقطہ نظر سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنی توحیدی آیات میں بارہا نباتات کی پیدائش اور اُن کی مختلف خصوصیات پر زور دیا ہے اور انسان کو کائنات کی ان محیر العقول مخلوقات کے اسرار کے مطالعہ کی دعوت دی ہے، ایسی مخلوق کہ جس کا ایک ایک پتا معرفت پروردگار کی ایک کائنات لئے ہوئے ہے۔ اس اشارے کے ساتھ آیئے مل کر مندرجہ ذیل آیات اور ان کے دلچسپ نکات کو گوشِ جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الۡاَرۡضِ کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ {}اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً وَمَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (شعراء/۷۔۸)

۲۔۔۔اَمَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَاَنۡزَلَ لَکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا بِہٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَہۡجَۃٍ مَا کَانَ لَکُمۡ اَنۡ تُنۡۢبِتُوۡا شَجَرَہَا ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ یَّعۡدِلُوۡنَ (نمل/۶۰)

۳۔۔۔خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا وَاَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ وَبَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ؕ وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ {}ہٰذَا خَلۡقُ اللّٰہِ فَاَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ {} (لقمان/۱۰۔۱۱)

۴۔۔۔وَاٰیَۃٌ لَّہُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَۃُ ۚۖ اَحۡیَیۡنٰہَا وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡہَا حَبًّا فَمِنۡہُ یَاۡکُلُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلۡنَا فِیۡہَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِیۡہَا مِنَ الۡعُیُوۡنِ ۙ﴿۳۴﴾ لِیَاۡکُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتۡہُ اَیۡدِیۡہِمۡ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَمِمَّا لَا

يَعْلَمُوْنَ﴿۳۶﴾ (یٰس/۳۳۔۳۶)

۵۔۔۔وَهُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴿۹۹﴾(انعام/۹۹)

۶۔۔۔وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴿۴﴾ (رعد)

۷۔۔۔هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ﴿۱۰﴾ یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴿۱۱﴾(نحل/۱۰۔۱۱)

۸۔۔۔وَهُوَالَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ﴿۱۴۱﴾(انعام/۱۴۱)

۹۔۔۔وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَاوَاَلْقَیْنَافِیْهَارَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَافِیْهَامِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ{}وَجَعَلْنَالَكُمْ فِیْهَامَعَایِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ{}(حجر/۱۹۔۲۰)

۱۰۔۔۔اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی۔۔۔۔۔۔ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰی تُؤْ

فَكُوْنَ{}(انعام /۹۵)[1]

ترجمہ

۱۔۔۔کیاانہوں نے زمین میں نگاہ نہیں کی ، ہم نے اس میں کس قدرانواع واقسام کی نباتات اُگاتی ہیں؟۔۔۔۔اس میں (خداکے وجود) روشن نشانیاں ہیں،لیکن ان میں سے اکثرلوگ مومن نہیں تھے۔

۲۔۔۔کیاوہ بت جوتمہارے معبودہیں بہترہیں یاوہ جس نے آسمان اورزمین کو پیدا کیاہے؟ اورتمہارے لئے آسمان سے پانی بھیجاہے جس سے ہم سے خوبصورت اورمسرت بخش باغ اُگائے ہیں،تمہارے بس کی بات نہیں تھی کہ تم ان درختوں کواُگاؤ کیاایسی صورت میں خُدا کے ساتھ کوئی اورمعبودہے؟ ہرگزنہیں وہ ایسے لوگ ہیں (جوبےسمجھی کی وجہ سے)خُدا کی مخلوق کواس کے برابرقراردیتے ہیں۔

۳۔۔۔اُس نے آسمانوں کوایسے ستونوں کے بغیر پیدا کیاہے جوقابلِ رؤیت ہیں۔اورزمین میں پہاڑوں کوڈال دیاہے تاکہ وہ تمہیں لرزے میں نہ ڈال دے اوراس پر ہرقسم کے چلنے والی مخلوق کو پھیلادیا۔اورہم نے آسمان سے پانی نازل کیااوراس کے ذریعہ روئے زمین میں مختلف قسم کے نباتات کے قیمتی جوڑے اُگائے ۔۔۔۔۔۔یہ خدا کی تخلیق ہےلیکن مجھے خُدا کےعلاوہ وہ معبوددکھاؤ کہ انہوں نے کیا پیدا کیاہے؟لیکن ظالم لوگ واضح گمراہی میں ہیں۔

۴۔۔۔مُردہ زمین اُن کیلئے ایک آیت ہے۔ہم نے اُسے زندہ کیاہےاوراس سے دانے باہرنکالے ہیں اوروہ اس سے کھاتے ہیں اوراس میں کھجوروں اورانگوروں کے باغات بنائے ہیں اوراس سے چشمے باہرنکالے ہیں۔۔۔۔تاکہ وہ ان کے میوے کھائیں جب کہ ان کے ہاتھوں کا اُن کی تخلیق میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔کیاوہ خداکاشکرنہیں بجالاتے ؟ ۔۔۔۔پاک ہے وہ خُدا جس نے تمام ’’جوڑے‘‘ بنائے ،ان سے بھی جوزمین سے اُگتے ہیں اورخودان سے بھی جووہ نہیں جانتے۔

---

[1] قرآن مجید میں اوربھی بہت سی آیات ہیں جواسی چیز کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔مثلاً سورہ نبا کی آیت/ ۱۵۔طٰہٰ/ ۵۳۔عبس/ ۲۷۔ق/ ۷۔بقرہ/۲۶۱۔بقرۃ۔۲۲۔ ابراہیم/ ۳۲۔انعام/۱۴۱۔اعراف/ ۵۷۔نحل/ ۲۷۔

۵۔۔۔وہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے اوراس کے ذریعہ مختلف قسم کی نباتات اُگائی۔اور ہم نے اس سے تنے اور سبز شاخیں نکالیں،اوراس سے ایک دوسرے میں جڑے ہوئے دانے،اور کھجور کے درخت کے شگوفوں سے باریک لڑیوں کے ساتھ خوشے باہر نکالے،اورانگور،زیتون اورانار کی مختلف قسمیں جوایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور مختلف بھی ہیں۔ان کے میووں اوران کے پکنے کے طریقہ کار کو دیکھو جب کہ میوے بن رہے ہوتے ہیں کیونکہ اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو صاحب ایمان ہیں۔

۶۔۔۔روئے زمین میں کئی ایسے ٹکڑے بھی ہیں جوایک دوسرے کے قریب قریب ہیں جوآپس میں مختلف ہیں اورانگور کے باغات ہیں اورزراعتیں اور کھجور کے درخت ہیں جوکبھی توایک تنے پراُگتے ہیں اور کبھی دو پر۔وہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔اوراس صورت میں ہم ان میں سے کچھ کو پھلوں کی وجہ سے ایک دوسرے پر برتری عطا کرتے ہیں۔اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جواپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔

۷۔۔۔وہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا کہ جس سے تم پیتے ہو،اوراس سے گھاس اوردرخت اُگتے ہیں کہ تم اپنے جانوروں کو وہاں پر چرانے کیلئے لے جاتے ہو۔۔۔۔خداوندِعالم اس (بارش کے پانی) سے تمہارے لئے زراعت،زیتون،کھجوراورانگوراگاتا ہے اورمختلف قسم کے میوے۔یقیناًاس میں ان لوگوں کیلئے روشن نشانیاں ہیں جوغوروفکر کرتے ہیں۔

۸۔۔۔وہ وہی خدا تو ہے جس نے بہت سے باغ پیدا کئے،جو کچھ تو (ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے ہیں اور (کچھ) بے چڑھائے ہوئے،اور کھجوروں اورمختلف زراعتوں کو جوذائقے کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں۔(نیز) زیتون اورانار کے درختوں کو جوایک لحاظ سے توآپس میں ملتے جلتے ہیں اوردوسرے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں (پتوں اوردرختوں کی ساخت کے لحاظ سے توایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں جب کہ اُن کے پھلوں کا ذائقہ مختلف ہوتا ہے) جب وہ پک کرتیار ہوجائیں تواُن کے پھل اورمیوے کھاؤ،اوراُن کی چنائی اور کٹائی کے موقعہ پران کا حق ادا کرو،اوراسراف نہ کرو کہ خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

۹۔۔۔اورہم نے زمین کو بچھایا اوراس میں استوار پہاڑ ڈال دیئے اور ہرموزوں نباتات کو اس میں اُگایا۔اوراس میں تمہارے لئے زندگی کے کئی قسم کے وسائل قرار دیئے اوران لوگوں کیلئے بھی جنہیں تم روزی نہیں دے سکتے۔

۱۰۔۔۔خداوندِ عالم دانے اور گٹھلی کے چیرنے والا ہے۔ زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے، یہ ہے تمہارا خدا، پس تم حق سے کیونکر روگردانی کرتے ہو؟ یہ اس خداوندِ عالم کے اندازے ہیں جو ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''نبات'' دراصل ہر قسم کی انگوری ہے جو زمین سے اُگتی ہے خواہ اس کا تنا ہو جیسے درخت وغیرہ یا جیسے گھاس وغیرہ کہ عرب جسے ''نجم'' کہتے ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ ایسی نباتات کیلئے بولا جاتا ہے جس کا تنا نہیں ہوتا اور زیادہ وسیع تعبیرات کے مطابق ''نبات'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں نشوونما پائی جاتی ہے، خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوانات اور انسان۔[۱]

''شجر'' ایسی نباتات کو کہتے ہیں جس کا تنا ہو اسی لئے قرآن میں ''نجم'' کے مقابلے میں ذکر ہوا ہے کہ جس کا تنا نہیں ہوتا۔ ''وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ'' یعنی گھاس اور درخت اسے سجدہ کرتے ہیں (سورہ رحمان/۶)

''مقائیس اللغۃ'' میں ہے کہ دراصل ''شجر'' کے دو معانی ہیں: ۱۔ اونچائی اور بلندی۔ ۲۔ کسی چیز کے اجزاء کا ایک دوسرے میں داخل ہونا۔ چونکہ درخت بلند بھی ہوتے ہیں اور اُن کی ٹہنیاں بھی ایک دوسرے میں داخل ہوتی ہیں، لہٰذا انہیں ''شجر'' کہا جاتا ہے۔ ''مشاجرۃ'' کا معنی لڑائی جھگڑا، اختلافِ باہم اور زبانی کلامی لڑائی ہے، کیونکہ اس طرح سے فریقین کی باتیں ایک دوسرے میں داخل ہو جاتی ہیں۔

لیکن بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ اس مادہ کے اصل معنی ایسی چیز ہیں، جس میں نشوونما پائی جاتی ہے وہ اُوپر کو اٹھتی اور شاخیں اور پتے وغیرہ لے آتی ہے۔ کبھی معنوی امور پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے۔ ''وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ'' (بنی اسرائیل/۶۰) (کہ جسے ''زقوم کے درخت'' یا ''قوم یہود'' یا ''بنی امیہ'' سے تفسیر کیا گیا ہے)[۲]

''زرع'' کے بارے میں جس طرح کہ لغت کی مختلف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، اس کا اصل معنی بیج اور دانوں کو زمین میں ملانے کا نام ہے۔ چونکہ نباتات کا اگنا اور اس کے محصول کی برداشت، زمین میں بیج ملانے کے بعد ہوتا ہے۔ اسی لئے ان امور کو ''زرع'' کہتے ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ ''زرع'' کا معنی اُگانا ہے اور یہ درحقیقت خدا کا کام ہوتا ہے۔ اگر زارع کا لفظ بندوں پر بولا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے اسباب اور مقدمات فراہم کرتے ہیں۔ کبھی ''مزروع'' (اُگی ہوئی چیز) کو بھی ''زرع'' کہا جاتا ہے۔ ''زرع'' کا لفظ عام طور پر گندم اور جو پر بولا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا مفہوم وسیع ہے ان دو کو بھی شامل ہے اور ان کے علاوہ کو بھی شامل ہے۔[۳]

''ثمر'' کے بارے میں کتاب ''مقائیس اللغۃ'' میں آیا ہے کہ دراصل اس لفظ کا معنی ''ہر وہ چیز ہے جو دوسری چیز سے پیدا ہو۔'' بعض

---

[۱] ''نبات'' میں مصدری اور اسم مصدری دونوں قسم کے معانی پائے جاتے ہیں۔

[۲] مفردات راغب، مقائیس اللغۃ، مصباح اللغۃ اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

[۳] مفردات راغب، لسان العرب اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم وصحاح اللغۃ۔

حضرات نے کہا ہے کہ اس کا معنی فقط وہ نتیجہ اور پھل ہے جو درخت سے حاصل ہوتا ہے۔ بعض دیگر اربابِ لغت کا کہنا ہے کہ ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز سے متولد اور حاصل ہو، خواہ کھائی جاتی ہو یا کھائی نہ جاتی ہو، حسبِ منشا ہو یا نہ ہو شیریں ہو یا تلخ ''ثمر'' کہلاتی ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ ثمر دراصل ایک محدود مفہوم کا حامل ہے جو صرف اس میوہ پر بولا جاتا ہے جو درخت سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں اس مفہوم نے وسعت پیدا کر لی اور کنایہ کی صورت میں ہر چیز کے محصول اور مولود پر بولا جانے لگا حتیٰ کہ کہا جانے لگا کہ اس مکتب یا ان تعلیمات کا ثمرہ یا میوہ یہ یہ چیز ہے اور روایت میں ہے ''اُمُّكَ اَعْطَتْكَ مِنْ ثَمَرَةِ قَلْبِهَا'' (تیری ماں نے تجھے اپنے دل کا میوہ عطا کیا ہے یعنی ماں کے دودھ یا مامتا کی طرف اشارہ ہے) اور روایات میں اولاد کو بھی ''ثمرہ فواد'' (دل کا میوہ) کہا گیا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سبز درختوں کے پتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

سب سے پہلی آیت میں مشرکین یا منکرین خدا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، ''کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کس قسم کی قیمتی نباتات اس میں اُگائی ہیں؟'' (اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ) پھر صراحت کے ساتھ فرماتا ہے۔ ''اس موضوع میں خدا کے وجود پر روشن نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ہرگز ایمان نہیں لاتے۔'' (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ)

اگر وہ لوگ ان تمام رنگارنگ نباتات، پھولوں، پھلوں، درختوں، سبزہ جات سنبل کے درختوں اور مختلف النوع زراعت کی طرف غور سے نگاہ کریں تو ان میں اس کی نشانیوں کی اچھی طرح پائیں گے۔ لیکن وہ ایمان نہیں لانا چاہتے اور اس کی ذاتِ مقدس کے چہرہ کو چشمِ دل سے نہیں دیکھنا چاہتے، وگرنہ اس کا جمال کسی پر مخفی نہیں۔ پس نہ تو وہ سننے والے کان رکھتے ہیں جن سے وہ خدا کی تشریعی آیات کو سن اور نہ ہی دیکھنے والی آنکھیں رکھتے ہیں جن سے اس کی تکوینی آیات کو دیکھ سکیں۔ یہاں پر ''زوج'' سے کیا مراد ہے؟ بہت سے مفسرین نے اس کی صنف اور نوع کے معنی میں تفسیر کی ہے اور اسے نباتات کی کئی مختلف اقسام کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو واقعاً کسی حد اور حساب سے باہر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خدا کی آیات شمار ہوتی ہے۔

کئی اور مفسرین کا احتمال ہے کہ ''زوجیت'' کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے جو عالمِ نباتات میں (نر اور مادہ کی صورت) میں ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا انکشاف سوئڈن کے مشہور ماہرِ نباتات BOTANIST مسٹر ''لینے'' نے وسیع تجربے کی بنیا پر اٹھارہوں صدی عیسوی کے درمیان کیا کہ اکثر نباتات بھی حیوانات کی مانند نر اور مادہ کی باہمی ملاقات سے بارور ہو کر اپنا ثمر دیتے ہیں جب کہ قرآنِ مجید نے یہ حقیقت کئی صدی پہلے بتا دی ہے۔ چونکہ ان دونوں معانی کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے لہٰذا دونوں معانی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

''زوج'' کی صفت ''کریم'' کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور ''کریم'' کے معنی قیمتی چیز کے ہوتے ہیں۔لہٰذا اس سے نباتات کی مختلف انواع کی اہمیت اوران کی بے حدوحساب قدرو قیمت کی طرف اشارہ ہے۔نباتات کی انواع واقسام اس قدرزیادہ ہیں کہ بعض سائنسدانوں نے لکھا ہے کہ ''کھجور'' کی تین ہزار سے زائد قسمیں ہیں،''انجیر ہندی'' یابرگد کی ایک ہزارسات سو سے زائد،''گل ثعلب'' کی بارہ سو سے زائد، ''کھمبیوں'' کی ایک لاکھ سے زائداور''جلبک''(کوندر) کی چار ہزار سے زائدقسمیں ہیں۔اسی طرح ''سیب'' کی سات ہزارانواع اورگندم کی پینتیس ہزاراقسام ذکر کی گئی ہیں۔[1] واقعی ان انواع کے ساتھ نباتات کا یہ وسیع عالم کس قدرعجیب ہےاوران کا خالق ومدبر کس قدرعظیم ہیں؟

دوسری آیت میں ''توحیدمعبود'' کے اثبات کیلئے لوگوں کوزمین وآسمان کی تخلیق اورنزولِ باران کے اسرار کے مطالعہ کی دعوت دینے کے بعدفرماتا ہے۔''ہم نے اس کے ذریعہ خوبصورت تروتازہ اورسرسبزوشاداب باغات اُگائے ہیں۔''(فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ)[2]

''تم ان باغات کے خوبصورت درختوں کو ہرگزنہیں لگاسکتے۔''(مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا)

''کیاایسی صورت میں بھی کہت یہیں کہ خدا کے ساتھ کوئی اورمعبود ہے؟''(ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ)

لیکن یہ نادان لوگ ہیں جواپنے عظیم پروردگار سے منہ موڑے ہوئے ہیں جوان تمام عجائبات اورمحیرالعقول اشیاء کا خالق ہےاورایسی موجودات کواس کا شریک اور برابرقرار دیتے ہیں جن میں کسی قسم کی قدرت اورتوانائی نہیں ہے۔(بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ)

''يَّعْدِلُوْنَ'' کی تعبیر یاتواس لئے بیان ہوئی ہے کہ اس میں عدول کا معنی پایاجاتا ہے اورمرادخداوندِ واحد ولاشریک سے ان کاعدول ہے یاپھراس کاعدیل اورشریک قراردیتے ہیں۔یقیناانسان کا کام بیج ڈالنااور پانی دیناوغیرہ ہوتا ہے۔لیکن جوذات اس چھوٹے سے بیج کے دل میں زندگی کی روح ڈالتی اوراسے اس قدرقدرت عطا کرتی ہے کہ وہ ایک بلندقامت درخت کی صورت اختیارکرکے بارور،خرم سرسبزوشادات ہوکر باغات میں دلفریبی کا منظراختیارکرلیتا ہےاور جسے دیکھ کرانسان وجداورسرور میں آجاتا ہے،خداوندِعالم ہی ہے۔

اگر بہار کے کسی دن میں انسان ان خرم وسرسبزوشاداب باغات میں سے کسی ایک میں قدم رکھےاورظاہری آنکھوں کے ساتھ دل کی آنکھوں کوبھی کھول کران انواع واقسام کی زیبائیوں،شگفتگیوں،رنگ برنگے پھولوں،پتوں اورمختلف پھل اورمیووں کودیکھےتوبادۂ توحید سے یوں سرمست ہوجائے کہ بےاختیارنغمۂ توحیدالاپناشروع کردےاوراس حقیقت کے اعتراف پرمجبورہوجائے کہ:

یک ہست وہیچ نیست جزاو

وَحْدَهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

---

[1] کتاب ''جہانِ گلہا''صفحہ ۹۹ تا ۱۱۸

[2] ''حدائق''،''حدیقہ'' کی جمع ہے جس کا معنی باغ ہےاوردراصل یہ اس زمین کے معنی ہے جہاں پر پانی اکٹھا ہو۔بہت سے مفسرین نے اس کی ایسے باغ کے معنی سے تفسیر کی ہے جس کی چاردیواری ہواوراس میں کافی مقدار میں پانی ہو۔

(صرف اورصرف وہی ایک ذات ہی ہے جووحدہٗ لاشریک ہے اوراس کے سوا کوئی معبودنہیں)اوریہیں پراس مطلب کوتسلیم کرلے کہ:

ہرگیاہی کہ اززمین رودید
وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ گوید

(جوتنکا بھی زمین سے اُگتا ہے،''وَحْدَہٗ لَاشَرِیْكَ لَہٗ'' کہتا ہے)

مندرجہ بالاآیت میں تیسری آیت میں پروردگارِعالم کی توحید کے پانچ دلائل اوراُن کی آفاقی آیات (آسمان کی غیرمرئی ستونوں کے بغیرتخلیق، پہاڑوں کی پیدائش،حیوانات اورزمین کے دوسرے چلنے والوں کی آفرینش،بارش کی پیدائش اورنباتات کی تخلیق) کے ضمن میں مشرکین کومخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے،''یہ خداوندِ عالم کی تخلیق ہے ،لیکن تم مجھے دکھاؤ کہ اس کے علاوہ دوسرے معبودوں نے کس چیزکو پیدا کیا ہے؟''(هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ)

آیت کے آخر میں فرماتا ہے''بلکہ ظالم (مشرک) لوگ کھلم کھلا گمراہی میں ہیں۔''(بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ) یہ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص چشم بینا بھی رکھا ہواورکائنات میں پروردگارِعالم کی قدرت اورحکمت اورعظمت کے آثارکوبھی آنکھوں سے دیکھے، پھربھی اس کے غیر کے آگے سرتسلیم خم کرے!

ان آیات میں ایک بارپھرنباتات کے بارے میں ہم''كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ'' کے جملہ کو پاتے ہیں جس میں مفیداورسودمندنباتات کی حدسے زیادہ انواع واقسام اورعالمِ نباتات میں ان کے جوڑا جوڑا ہونے کی غمازی ملتی ہے اوراہِ توحید کے تمام راہیوں کواس موضوع کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے۔

''ظلم'' کالفظ وسیع مفہوم کا حامل ہے جس میں ہرچیزکواس کے غیرمحل میں رکھنا بھی شامل ہے۔چونکہ مشرکین اس کائنات کانظم ونسق سنبھالنے کااختیاربتوں کیلئے سمجھتے تھے یاانہیں خلق اورخالق کے درمیان واسطہ سمجھ کران کے آگے سجدہ کرتے تھے ،لہٰذابہت بڑے گناہ اورضلالت کے مرتکب ہوتے تھے۔پس یہ حکم آیتِ بالا میں شرک کے معنی میں آیا ہے یا پھراپنے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہےاورشریک اس کاواضح ترین مصداق ہے۔بغیربتائے یہ بات واضح ہے کہ''ارونی''(مجھے دکھاؤ) کا جملہ درحقیقت پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ہے ۔بالفاظِ دیگرآنجناب کاحکم دیا گیاہے کہ یہ جملہ مشرکین سے کہیں کیونکہ خداکودکھلانا توبے معنی بات ہوتی ہے۔

اسی سلسلے کی چوتھی آیت میں جوسورہ یٰس کی آیت ہےصراحت کے ساتھ فرماتا ہے''جس مردہ زمین کوہم نے زندہ کیا ہے،ان کیلئے پروردگارِعالم کی ایک اہم آیت اورنشانی ہے۔''(وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ اَحْیَیْنٰهَا)

حقیقت یہ ہے کہ حیات وزندگی کا مسئلہ توحید کےاہم ترین دلائل میں سے ایک ہےخواہ یہ عالم نباتات میں ہو یا حیوان اورانسانوں کی دنیامیں یہ ایک نہایت ہی اسرارآمیزاورمحیرالعقول مسئلہ ہے۔جس نے بڑے بڑے دانشوروں کے افکارکوورطہ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔سائنس کی اس قدرعظیم پیمانے پرترقی کے باوجودزندگی کا معمہ ہنوزحل نہیں ہوسکااورکوئی شخص اچھی طرح نہیں جانتا کہ کس طرح اورکن عوام کی

بنیاد پر بے جان مخلوق، زندہ مخلوق میں تبدیل ہوجاتی ہے۔اس کے بعد مردہ زمینوں کے زندہ ہونے ،غذا کے طور پر استعمال ہونے والے اناج (مثلاً گندم ،جَو ، جوار، باجرہ ،مکئی وغیرہ) انگور کے سرسبز باغات ،نخلستانوں اور آب زلال کے چشموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ،''مقصد یہ ہے کہ وہ ان میووں کو کھائیں ، ایسے میوے جن کے باغات میں ان کے ہاتھوں کا کوئی دخل نہیں ہے ۔اس کے باوجود بھی وہ خدا کا شکر بجا نہیں لاتے ؟''(لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ)

''وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ''(ان کے ہاتھوں کو ان کی تخلیق میں کوئی دخل حاصل نہیں)اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ پھل میوے ہر لحاظ سے آمادۂ غذا ہوتے ہیں،مکمل اور پسندیدہ غذا جسے نہ تو پکانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی جس میں کسی اور چیز اضافہ کرنے کی ، وہ پکی پکائی مکمل غذا ہوتے ہیں ۔نہ تو خود ان کے اصل وجود میں انسان کو کوئی دخل حاصل ہے اور نہ ہی ان کے کھانے کیلئے آمادہ کرنے میں انسان کا کام تو صرف بیج ڈالنا اور کھیتی کا سینچنا ہوتا ہے اور بس![1]

بہرحال ان تمام رنگ برنگی نعمتوں کی تخلیق کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انسان انہیں جانوروں کی طرح چٹ کر جائے !اور صحرائے زندگی میں انہیں چرتا پھرتا اسی حالت میں عمر ضائع کردے۔ پھر مرجائے اور مٹی بنی جائے !!یہ مقصد نہیں تھا۔منتہائے مقصود یہ تھا کہ انہیں دیکھے اور شکرگزاری کی حس اس میں زندہ ہو اور ''شکرِ منعم'' کے راستے سے ان نعمتوں کے عطا کرنے کی معرفت حاصل کرے جو سب سے بڑھ کر ایک نعمت ہے اور انسانی ارتقاء کا بالاترین مرحلہ ہے۔

ایک نکتہ جو مندرجہ بالا آیت میں مکمل طور پر توجہ مبذول کراتا ہے وہ یہ ہے کہ نباتات کی دنیا میں جوڑا جوڑا ہونے کے مسئلہ کو انسانوں کی دنیا کے جوڑا جوڑا ہونے کے ساتھ ساتھ فرماتا ہے اور کہتا ہے'' پاک ہے وہ کہ جس نے تمام جوڑوں کو خلق فرمایا، وہ بھی زمین سے اُگتے ہیں ،خود انسان کے وجود سے اور وہ بھی جو وہ نہیں جانتے ۔''(سُبْحَانَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ)

یہ تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں مراد نر و مادہ کی جنس سے اور نباتات کی دنیا میں زوجیت کے وجود کو وسیع انداز میں ثابت کرتا ہے جو قرآنِ مجید کے علمی معجزات میں سے ایک ہے، کیونکہ اس زمانے میں یہ بات انسان کو معلوم نہیں تھی کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ حصے ہوتے ہیں اور سفوف جو کہ نر کا نطفہ ہوتا ہے نباتات سے اُڑ کر مادہ حصے پر جا بیٹھتا ہے اور اس ملاپ کا کام دیتا ہے،جس سے نباتات کا نطفہ منعقد ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ 'وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ''(اور ان چیزوں سے جو تم نہیں جانتے)کے جملہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ زوجیت کا مسئلہ بہت وسیع ہے اور ابھی کس قدر موجودات ایسی ہیں جن کی زوجیت کے وجود سے تم آگاہ نہیں ہو اور علم و دانش اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی

---

[1] یہ اس صورت میں ہے جب ''ماعملتہ ایدھم'' کے جملہ میں ''ما'' نافیہ ہو(اور ظاہراً ہے بھی ایسا ہی)لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ شاید موصولہ ہو،ان میووں کی طرف اشارہ ہوگا جو پیوند کی وجہ میں آتے ہیں،اور جن میں انسان کو عمل دخل حاصل ہوتا ہے یا پھر وہ چیزیں مراد ہوں جو پھلوں سے حاصل کی جاتی ہیں۔مثلاً انگور اور کھجور سے حاصل ہونے والا شیرہ یا سرکہ ہے۔البتہ پہلی معنی زیادہ مناسب ہیں۔

اس سے پردہ اٹھائے گی۔(جیسا کہ یہ مسئلہ ایٹموں ATOMS کے بارے میں پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ وہ دومختلف حصوں سے مرکب ہیں، جیسا کہ دوجفت ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک الیکٹران ELECTRONاوردوسرا پروٹون PROTON ہے۔الیکٹران میں منفی الیکٹرک سٹی ہوتی ہےاور پروٹون میں مثبت)اس طرح کے کئی اورموضاعات ہیں جہاں تک ہنوز انسانی علم ودانش کی رسائی نہیں ہوسکی ہے۔

پانچویں آیت میں جومختلف طریقوں سے خداوندِ عالم کے تعارف کے ساتھ شروع ہورہی ہے، پہلےتو آسمان سے بارش کےنزول کی طرف اشارہ کیاہے پھرفرماتاہے۔''ہم نے اس کے ذریعہ ہرقسم کی اُگنے والی چیزوں کوزمین سے نکالا''(فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ)ممکن ہے کہ یہ''نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ''(ہرچیز کی نباتات) سے مرادمختلف نباتات کی طرف اشارہ ہوجن کی ایک ہی پانی سے آبیاری ہوتی ہےاورایک ہی قسم کی مٹی سے پرورش پاتی ہیں۔لیکن ان کی صورتیں مختلف، ذائقے مختلف اورخواص مختلف بلکہ بسااوقات متضاد ہوتے ہیں۔ یہ چیز خداوندِعالم کی تخلیق کے عجائنات میں سے ہے۔

یایہ کہ اس سے مرادایسی نباتات ہیں جوتمام پرندوں اوربّری اوربحری جانوروں اورانسانوں کی ضروریات کوپوراکرتی ہیں۔[1] دونوں معانی کویکجا کرناممکن ہے) پھرایک اورنکتہ کوبیان کرنے کیلئے فرماتاہے،''پھرہم اس (پانی یانباتات) سے سبز تنے،شاخیں اورپتے باہرنکالتے ہیں۔''(فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا)

اس طرح نباتات کے سبزمادہ''کلوروفل'' CHLOROFIL کی طرف اشارہ کیاگیاہے جونباتات کاایک اہم ترین اورمفیدترین جزوہے۔وہی خوبصورت،دلربا،دلکش اورفرحت بخش سبزہ جوتاریک مٹی اوربےرنگ پانی سے وجودمیں آتاہے۔

''خَضِرًا'' کی تعبیراگرچہ مطلق ہے،لیکن بعد کے جملہ کوپیش نظررکھتے ہوئے فرماتاہے۔''ہم اس سے وہ دانے باہرنکالتے ہیں جوایک دوسرے پرسوارہوتے ہیں''(نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا) جواشارہ ہے گندم،جو،جوار،باجرہ اورمکی وغیرہ کے تنے اورخوشوں کی طرف۔[2]

اس کے بعدکھجور کے درختوں کوپیش نظررکھتے ہوئے فرماتاہے''طلع (کھجور کےسربستہ خوشے جوسبزرنگ کےخوبصورت غلاف میں لپٹے ہوئے ہیں) سے باریک اورلطیف ریشے باہرآتے ہیں''۔(وَّمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ)

''قنوان''،''قنو''(بروزن حزب) کی جمع ہےجس کےمعنی باریک ریشے ہیں جو''طلع'' کے پھٹنے کے بعداس سے باہرنکلتے ہیں اور بعد میں کھجور کےخوشےان سےتشکیل پاتے ہیں۔

''دانیۃ''(نزدیک) کی تعبیر سے شایدان خوشوں کےآپس میں قریب ہونے کی طرف اشارہ یاپھرکھجور کےپھل کی وجہ سےسنگین

---

[1] اس صورت میں جملہ کامفہوم(فاخرجنابہ نباتاًالکل شیء'' ہوگا۔

[2] 'مترا کب''،''رکوب'' کے مادہ سے ہےجس کےمعنی ہیں سوارہونااوریہ ان دونوں کی طرف اشارہ ہے جوخوشے (بالی) کی صورت میں ایک دوسرے پرسوارہوتے ہیں اورنہایت ہی خوبصورت منظرپیش کرتے ہیں۔

ہوکران کے زمین کی طرف جھکنے کی طرف اشارہ ہے۔بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ خرما کے خوشے مختلف ہوتے ہیں،بعض تو کھجوروں کی نچلی طرف واقع ہوتے ہیں اور آسانی کے ساتھ ان تک رسائی ہوجاتی ہے اور بعض انسانی کی دسترس سے دور ہوتے ہیں جن سے استفادہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔خداوندِعالم نے پہلی قسم کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو زیادہ مفید ہوتی ہے۔[1]

آیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انگور،زیتون اور انار کے باغات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔(وَجِنّٰتٍ مِنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ) کہ ایک دوسرے کے مشابہ ہونے کے باوجود بھی آپس میں مختلف ہوتے ہیں ، اور مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔(مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ)

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ میوہ جات اور پھل دیکھنے میں تو ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن ذائقے میں مختلف ہیں (جیسے کھٹے میٹھے انار وانگور)۔بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں ان میں سے کچھ کے درختوں کے پتے آپس میں ملتے ہیں جیسے زیتون اور انار کے پتے،جب کہ اُن کے پھل مختلف ہوتے ہیں۔لیکن بہتر یہی ہے کہ اس آیت کا وسیع تر مفہوم بیان کیا جائے جو مختلف قسم کی شباہتوں اور باہمی فرق کی طرف اشارہ ہو۔پھر مزے کی بات یہ ہے کہ آیت کے آخر میں سب لوگوں کو پھلوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے۔''میوے کی ساخت کی طرف دیکھو جب وہ ظاہر ہوجاتا ہے،میوے کے پکنے کی کیفیت کو دیکھو۔''(اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ)

''کیوں اس میں خداوندِ عالم کی عظمت،قدرت اور حکمت کی ان لوگوں کیلئے آیات اور نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں۔''(اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ)

ایک نشانی نہیں بلکہ کئی نشانیاں ہیں۔کیونکہ پھلوں کی پیدائش بھی عالمِ حیوانات میں بچوں کی پیدائش کی مانند ہوتی ہے۔نر کا نطفہ ہواؤں یا حشرات کے ذریعہ مادہ حصہ میں جا بیٹھتا ہے اور ''لقاح'' کے عمل اور ایک دوسرے سے مل جانے کے بعد سب سے پہلا تخم اور نطفہ تشکیل پاتا ہے پھر اس کے اطراف میں میوے کا تانا بانا شروع ہوجاتا ہے۔پھر عضلات ،گودا اور باریک اور ظریف رگیں اسے غذا پہنچانا شروع کردیتی ہیں۔

اس چھوٹے سے پھل کے اندر ایک عظیم لیباٹری پنہاں ہے جو مسلسل سرگرم رہتی ہے اور تازہ ترین خواص کے ساتھ نئی نئی ترکیبیں عمل میں لاتی رہتی ہے۔پھل آغاز میں تو بے مزہ ہوتا ہے،پھر مکمل طور پر ترش اور بعد میں بطور کامل شیریں۔ہر وقت کوئی نئی ترکیب اس میں وجود میں آتی رہتی ہے اور اس کا رنگ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔یہ خُدائی تخلیق کے عجائبات میں سے ایک ہے اور خداوندِ عالم نے قرآنِ مجید کی مندرجہ بالا آیات میں انسان کو خصوصی طور پر اس کے مطالعہ کی دعوت دی ہے۔

اسی سلسلے کی چھٹی آیت میں پہلے تو زمین کے مختلف قطعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں مختلف درختوں اور دیگر نباتات وغیرہ کی پرورش کی استعداد پائی جاتی ہے پھر فرمایا ہے۔''زمین میں مختلف قطعات ہیں جو ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں''۔(جن میں مکمل

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۴ ص ۲۴۸۴

طور پر مختلف طرح کی لیاقتیں اور استعداد پائی جاتی ہیں)(وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ)

باوجود یکہ یہ قطعات ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ تو شیریں اور زراعت کے قابل ہوتے ہیں اور بعض شورہ زار کہ جھاڑی تک جس میں نہیں اُگ پاتی ۔بعض ایسے قطعے ہوتے ہیں جو صرف درختوں یا ان کی بھی کسی خاص قسم کیلئے کاشت کا کام دیتے ہیں۔ جب کہ دوسرے بعض جو زراعت یا زراعت کی بھی کسی خاص قسم کیلئے مناسب ہوتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ زمینیں تو آپس میں ملی ہوتی ہیں لیکن ان کے کام جُدا جُدا ہوتے ہیں۔

اس مقدمہ کے ذکر کے بعد درختوں اور زراعت کی دیگر مختلف قسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''اور اسی زمین میں انگور، زراعت اور کھجور کے باغات کی مختلف قسمیں ہیں جن میں سے کچھ تو ایک تنے پر اُگتی ہیں اور کچھ کئی تنوں پر''(وَجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ)

''اعناب''۔''عنب'' کی جمع ہے جس کے معنی انگور ہے اور ''نخیل''، ''نخل'' اور ''نخیلہ'' کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کھجور کا درخت ۔ان دونوں صیغوں کو جمع کی صورت میں شاید اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ یہ انگور اور کھجور کی مختلف اقسام کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ان دونوں کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں مختلف قسمیں ہیں۔

'صِنْوَانٌ غَیْرُ صِنْوَانٍ'' کی تعبیر اس بات کی پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ ''صنوان''، ''صنو'' کی جمع ہے جس کے معنی وہ شاخیں ہیں جو درخت کے اصلی تنے سے نکلتی ہیں۔ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ مختلف اور گوناگوں پیوندوں کے ذریعہ ایک درخت میں مختلف میوہ جات کی پرورش کی صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے۔اس طرح یک ہی تنے، ایک ہی جڑ، ایک ہی پانی اور ایک ہی مٹی سے ایک درخت کی ایک شاخ کی مختلف ٹہنیوں پر گوناگوں میوے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ تخلیق عجائبات میں سے ایک ہے۔ممکن ہے یہ تفاوت شاخوں کے اس تفاوت کی طرف اشارہ ہو جو ایک ہی تنے پر تو اُگتی ہیں لیکن ان کے طبعی پھلوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

پھر صراحت کرتے ہوئے فرماتا ہے ''یہ اپنے تمام تر فرق کے باوجود ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔''(یُسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ)''اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم میووں کے لحاظ سے بعض کو دوسرے بعض پر فضیلت دیتے ہیں۔''(وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ)

یقینی بات ہے کہ اس بارے میں عقلمندوں کیلئے کئی آیات اور نشانیاں ہیں۔''(اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ)

یقیناً تعجب آور ہے یہ بات کہ پانی بھی ایک ہے اور مٹی بھی ایک ہے، لیکن ان پھلوں کا باہمی فرق اس قدر زیادہ ہے کہ ایک تو مکمل طور پر شیریں ہے اور دوسرا پوری طرح کھٹا (بہت سے علاقوں میں لیموں اور کھجوروں کے درخت ساتھ ساتھ اُگتے ہیں) یا ایک ہی کھیت میں روغن دار اجناس کو کاشت کیا جاتا ہے۔جن کے خواص یقیناً مختلف ہوتے ہیں، حتیٰ کہ خود ان پھلوں یا ان غلات کی بھی کئی قسمیں ہیں جن کا آپس میں بھی فرق ہوتا ہے۔ یہ کسی عجیب وغریب مشینری درختوں کی شاخوں اور ان کے رگ وریشوں میں چھپی ہوئی ہے جس میں اس قدر قدرت ہوتی ہے کہ وہ مختلف کیمیکل مواد کو مکمل طور پر مختلف خواص میں تبدیل کردے اور وہ بھی ایک قسم کی مٹی اور پانی سے استفادہ کرتے ہوئے!!

اگر خالقِ کائنات کے علم وقدرت پر اسی مسئلے کے سوا کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتا ہم وہ اس عظیم مبذاء کی معرفت کیلئے یقیناً کافی تھا،

اور بقول یکے از شعرائے عرب:

والارض فیهاعبرة للمعتبر
تخبرعن صنع ملیك مقتدر
تسقٰی بماء واحداشجارها
وبقعة واحدة قرارها
والشمس والهواء لیس یختلف
واکلهامختلف لایأتلف
فمالذی اوجب ذاالتفاضلاً
الاحکیم لمه یرده جابطلاً

یعنی زمین عبرت حاصل کرنے والے کیلئے عبرت ہے، کیونکہ وہ ایک صاحبِ اقتدار سلطان کی مصنوعات کی خبر دے رہی ہے۔
اس کے تمام درخت ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں، ایک ہی زمین ان کی قرارگاہ اور اُن کے اُگنے کا مقام ہے۔
دھوپ اور ہوا بھی مختلف نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود اس کے تمام پھل اور میوے مکمل طور پر مختلف ہیں
ان تمام اختلافات کا باعث کون سی چیز ہے سوائے اس خداوندِ حکیم کے جس کا عظیم ہدف ہے، اس کے ارادہ میں باطل کا کوئی دخل نہیں ہے۔[1]

ساتویں آیت میں جو اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے توحیدی دلائل کی تشریح اور خداشناسی کے دلائل کی تفصیل بیان کررہی ہے ،ارشاد ہوتا ہے، ''خداوندِ عالم وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی بھیجا جو ایک تو تمہارے پینے کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور دوسرے اس سے درخت اور دیگر نباتات کو اُگاتا ہے جس میں تم اپنے جانوروں کو چراتے ہو'' (هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ)

نہ تو ہر پانی انسان کے پینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی ہر پانی نباتات کی پرورش کیلئے مفید ہوتا ہے، لیکن آسمانی پانی ہر ایک کیلئے مفید اور سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ''شجر'' کے لغوی معنی بڑی وسعت کے حامل ہیں۔ اس میں ہر قسم کی نباتات شامل ہیں خواہ ان کا تنا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا اور ''تسیمون'' کا لفظ ''اسامہ'' سے اور وہ ''سَوم'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ''جانوروں کا چرانا'' ہیں۔[2] چونکہ جانور چرتے وقت گھاس اور درخت کے پتوں دونوں قسموں سے استفادہ کرتے ہیں، اس لئے درختوں کے پتوں کی شجر سے تعبیر نہایت ہی مناسب

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۱۳ ص ۹۳

[2] البتہ ''سَوم'' کا اصل معنی تو ہے ''علامت لگانا'' اور چونکہ جانور چرنے کے موقعہ پر درحقیقت زمین پر علامت لگاتے ہیں اسی لئے یہ لفظ ان کے استعمال ہوتا ہے۔

معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ ہر دو کو شامل ہے۔

پھر فرماتا ہے ''خداوندِ عالم تمہارے لئے بارش کے اس پانی کے ذریعہ زراعت، زیتون، کھجوریں اور انگور کی تمام قسمیں اگاتا ہے اور ہر قسم کے دوسرے میوہ جات بھی۔'' (یُنۢبِتُ لَكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالنَّخِيۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرَاتِ)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں تمام میووں، تمام قسم کی زراعت اور غلہ جات کا ذکر آجاتا ہے۔ لیکن تین قسم کے پھلوں پر خصوصاً زیادہ زور دیا گیا ہے اور یہ ان کی حد سے زیادہ اہمیت کے پیشِ نظر ہے کیونکہ یہ تینوں میوے غذائی نقطہ نظر سے بھی اور وٹامن کی کئی اقسام کے لحاظ سے بھی جو آج کے سائنسی دور میں واضح تر ہو چکی ہیں، بڑی افادیت کے حامل ہیں۔ [1]

اس آیت کے آخر میں ایک بار پھر تاکید کے ساتھ فرماتا ہے، ''ان امور میں خداوندِ عالم کی حکمت، عظمت اور قدرت کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو صاحبانِ عقل وفکر ہیں۔'' (اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ)

اور جو لوگ ان واضح اور آشکار آیات میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے وہ انسان کہلانے کے اہل نہیں ہیں اور بقول شاعر ؎

اینہمہ نقشِ عجب بر در و دیوارِ وجود
ہر کہ فکرت نکند نقش بود بر دیوار
کہ تواند کہ دہد میوۂ رنگین از چوب؟
یا کہ داند کہ بر آرد گلِ صد رنگ از خار
''ارغوان'' ریختہ بر درگہ خضرائی ''چمن''
چشمۂ ہائی کی در آن خیرہ بماند ابصار

''یعنی شہرِ وجود کے در و دیوار پر یہ عجیب وغریب قسم کے نقش ونگار موجود ہیں، اور جو شخص اس بارے میں غور وفکر سے کام نہ لے اسے دیوار دے مارا جائے۔

کس کی جرأت ہے کہ لکڑی سے رنگین قسم کے پھل نکالے؟ یا کون ایسا ہے جو کانٹوں صد رنگ کے پھول اُگائے؟

''ارغوان'' کے پھول ''چمن'' کے سبزہ زار کی بارگاہ پر نچھاور کئے ہیں اور ایسے چشمے جاری کئے ہیں جن کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

آٹھویں آیت میں عالمِ نباتات کی ایک قسم کا تذکرہ ہے جسے توحید کی دلیل اور عظمت پروردگار کے تعارف کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے ''وہ وہی ہے جس نے ایسے باغات پیدا کئے جو (چھجوں کی ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ایسے باغات بھی جن کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (وَهُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَ جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ وَّغَيۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ)

---

[1] اس گفتگو کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۱۱ میں مطالعہ فرمائیں۔

''معروش''، ''عرش'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں بلند پایوں والا تخت یا چھت اس آیت میں اس کا کیا مفہوم ہے، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ معروشات کے لفظ سے ایسے باغات کی طرف اشارہ ہے جس کے درخت کو چھجے کی ٹیٹوں SHEAFFOLDING پر چڑھاتے ہیں جیسے انگور کی بیلیں ہیں کہ جن کیلئے بہت سے مقامات پر ایسے چھجے بنائے جاتے ہیں۔ ''غیر معروش'' ایسے باغات ہیں جن کے درختوں کیلئے اس قسم کے چھجوں کی ٹیٹوں کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، یعنی جیسے کھجوروں کے یا سیب اور انجیر کے باغات ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے ''معروش'' کو گھریلو درختوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو باغ کی دیواروں کے ذریعہ محفوظ کئے جاتے ہیں اور ''غیر معروش'' کا جنگل اور بیابان کے درختوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اس بارے میں تیسرا نظریہ یہ ہے کہ پہلا لفظ ان درختوں کی طرف اشارہ ہے جو اپنی بلند قامتی کے ساتھ پوری رعنائی کے ساتھ سر اٹھائے کھڑے ہیں اور دوسرا ان درختوں کی طرف جو بیلوں کی صورت میں زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔[1]

لیکن پہلی تفسیر سب زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال یہ عجیب بات ہے کہ سرو اور صنوبر جیسے بلند و بالا درخت جو بالکل سیدھے اور مستقیم، آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑے ہیں اور اس حد تک پائیداری اور رعنائی کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں، آندھیوں کے زبردست جھکڑ اور پے در پے طوفان بھی انہیں اپنے اس ''صراط مستقیم'' سے ذرہ برابر بھی منحرف نہیں کر سکتے، جب کہ بعض دوسرے درخت جیسے بیلیں وغیرہ ہوتی ہیں، جو بل کھاتی اور پیچ وخم کے ساتھ آگے بڑھتی رہتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک قسم اپنے اندر ایک کائنات لئے ہوئے ہے۔

انگور کی بیلیں اپنے کثیر تعداد میں وزنی خوشوں کے ساتھ صنوبر کے درخت کی مانند اٹھی ہوئی ہوتیں تو ایک ہی دن میں ٹوٹ کر زمین پر آرہتیں۔ پھر یہ بھی کہ انسانوں کی دسترس سے مکمل طور پر دور ہو جاتیں جب کہ انگور کے باغات میں ایک بچہ بھی تمام انگور چُن سکتا ہے۔ پھر چار قسم کے میوہ جات اور زراعت پر زور دیتے ہوئے فرماتا ہے ''اور کھجور اور زراعت کہ جس کے مختلف پھل ہوتے ہیں، اسی طرح زیتون اور انار ہیں جو ایک لحاظ سے تو آپس میں ملتے جلتے ہیں اور دوسرے لحاظ سے مختلف ہیں، یعنی اُن کی ظاہری ساخت تو ایک جیسی ہوتی ہے جبکہ ان کے پھل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ (وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ)

اس بات کی طرف بھی توجہ رہنی چاہیے کہ ''جنات''، ''جنت'' کی جمع ہے جس کا اطلاق باغ پر بھی ہوتا ہے اور زراعت سے ڈھکی ہوئی زمین پر بھی، اور ''اکل'' (بروزن دُہل) ''اکل'' (بروزن مکر) کے مادہ سے ہے جس کا اطلاق کھائی جانے والی تمام چیزوں پر ہوتا ہے۔ بہرحال صرف درخت، زراعت اور نباتات ہی ظاہری طور پر انواع واقسام کی حامل نہیں ہیں بلکہ ان کے میوے اور دیگر محصولات بھی بہت مختلف انواع واقسام پر مشتمل ہیں۔ رنگ ذائقے اور ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے بھی غذائی مواد اور گوناگوں خواص کی حیثیت سے بھی۔ علاوہ ازیں ان میں کچھ ایسے قسمیں بھی ہوتی ہیں جو حد سے زیادہ مرغوب اور پسندیدہ ہوتی ہیں اور کچھ ایسے جو درمیانی قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ سب قدرتِ کاملہ کے

---

[1] مذکورہ تینوں تفسیریں قرطبی جلد ۴ ص ۲۵۳۴ میں بیان ہوئی ہیں۔

شاہکار ہیں کہ خالقِ کائنات نے اس قسم کی عظیم انواع واقسام کی چیزوں کونہایت وسیع پیمانے پر عالمِ نباتات میں خلق فرمایا ہے اوران میں سے ہرایک اپنے اپنے انداز میں اس کی حمد وثنا بجالا رہی ہے۔

آیت کے آخر میں حکیمانہ طور پر فرماتا ہے ''ان کے پھلوں سے کھاؤاوران کے (چننے یا) کاٹنے کے وقت ان کا حق بھی ادا کرواوراسراف نہ کرو کیونکہ خداوندِ عالم اسراف کرنے والوں کودوست نہیں رکھتا'' (كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ)

اس طرح سے ''کلوا'' (تم کھاؤ) کا فرمان ان چیزوں کے حلال ہونے کی دلیل ہے۔لیکن دوشرائط کے ساتھ ایک توضرورت مندافراد کا حق ادا کرنے اوردوسرے اسراف نہ کرنے کے ساتھ۔اگرچہ بعض مفسرین نے کہاہے کہ یہاں پر ''حق'' سے مُرادزکوٰۃ ہے لیکن بہت سے مفسرین نے اہل بیت اطہارعلیہم السلام اورحضرات اہلسنت کے طریقوں سے بیان ہونے والی روایات کی روشنی میں یہ صراحت کی ہے کہ اس سے مرادزکوٰۃ کے علاوہ حق ہے۔[1]

بنابریں ایک خدائی حکم کے عنوان سے بہتر یہی ہے کہ زراعت اور باغات کے مالکان جب زراعت اورمیوہ جات کا محصول اٹھانے لگیں توضرورت منداورصاحبانِ احتیاج افراد کیلئے زکوٰۃ کے علاوہ ایک حصہ ضروری پیشِ نظر رکھیں۔اس حصہ کی شریعت میں حدود معین نہیں ہیں بلکہ یہ ان کی ہمت پر منحصر ہے کہ وہ زیادہ نکالیں یا کم!

اس طرح آیت کا اختتام ایک اخلاقی حکم پر ہوتا ہے جب کہ اس کا آغاز درسِ توحید سے۔

نویں آیت درختوں اورنباتات کی دنیا کے عجائبات کے ایک اورنکتہ کی طرف اشارہ کررہی ہے۔زمین کے بچھانے اور پہاڑوں کی تخلیق کے مسئلہ کے ذکرکے بعد فرماتا ہے ''اورہم نے زمین میں ہرقسم کے موزوں نباتات کو پیدا کیا'' (وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ)

اگرچہ ''موزون'' کا لفظ ''وزن'' کے مادہ سے لیا گیا ہے،لیکن یہاں پر جچے تلے اورمکمل طور پر ہم آہنگ نظم ونظام کی طرف اشارہ ہے جونباتات کے ایک ایک ذرے پر حکم فرماہے۔علاوہ ازیں مفردات میں راغب کے بقول ''وزن'' کے اصل معنی ہر چیز کے اندازہ کی شناخت ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہاہے کہ اس تعبیر سے مرادیہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہرنباتات کوانسانوں کی ضروریات کے مطابق پیدا کیا ہے۔[2] نیز یہ بھی کہاہے کہ ''موزوں'' سے مرادیہ ہے کہ پانی،ہوا،مٹی اوردھوپ ایک معین اندازے کے مطابق ملکرکام کریں تاکہ نباتات اگیں۔بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ ''کل شیء'' کی تعبیر معدنیات کوبھی شامل ہے لیکن چونکہ ''انتنا'' (ہم نے اگایا)

---

[1] سنن بیہقی جلد ۴ ص ۱۳۲،وسائل الشیعہ جلد ۶ کتاب الزکوٰۃ ابواب غلات الزکوٰۃ،تفسیر المیزان،تفسیر نمونہ اورتفسیر قرطبی میں انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] فخر رازی نے اپنے تفسیر میں اس کو پہلے احتمال کے عنوان سے اوردوسری تفسیر کوتیسرے احتمال کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔(جلد ۱۹ ص ۱۷۱

کا جملہ معدنیات سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتا لہٰذا یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔ البتہ دونوں تفسیروں کو جمع کرنا ممکن ہے اور بعض روایات میں بھی دوسرے معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔[1] اس کے فوراً بعد انسان اور ان حیوانات کی زندگی کے مختلف وسائل کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے بس میں ہوتے ہیں یا اس کے بس سے باہر ہوتے ہیں۔ سب اسی دسترخوان سے روزی پا رہے ہیں۔ فرماتا ہے ''وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ''

''معایش''، ''معیشۃ'' کی جمع ہے اور اس کے بہت وسیع معنی ہیں۔ یہ ہر اس چیز کو شامل ہے جو انسانی زندگی کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ ''وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ'' کا جملہ حیوانات اور ان دوسری چیزوں کی طرف اشارہ ہے جنہیں روزی بہم پہنچانا انسان کے بس سے باہر ہے اور خداوندِ متعال اس دنیا پر حکم فرما خاص نظم کے تحت ان میں سے ہر ایک کیلئے مناسب غذا فراہم کرتا ہے۔ اگر ہم اپنی آنکھیں اور عالمِ نباتات سے حیوانات کی روزی کے حصول کے طریقوں کو غور سے دیکھیں تو اس میں ہمیں معرفتِ الٰہی کے دلائل کی ایک کائنات ملے گی۔

کچھ مخلوقات پھل میوے کھاتے ہیں، کچھ دانے، کچھ پتوں سے استفادہ کرتے ہیں، بعض تنے سے درخت کی چھال کھاتے ہیں بعض پھولوں کے شیریں شیرے سے کام و دہن کی تواضع کرتے ہیں جب کہ بعض وہ ہیں جو جڑوں کو کھاتے ہیں۔

اسی سلسلے کی دسویں اور آخری آیت میں ایک بار پھر نباتات کی دنیا کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے زمین کے اندر دانوں اور گٹھلیوں کے شگافتہ ہونے کا مسئلہ۔ چنانچہ اس آیت میں خداوندِ عالم کا اس طرح تعارف کرایا گیا ہے: ''خداوندِ عالم دانے اور گٹھلی کو شگافتہ کرنے والا ہے۔'' (اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى)

''فالق''، ''فلق'' (بروزن خلق) کے مادہ سے ہے اور مفردات میں راغب کے بقول کسی چیز کے چیرنے یا پھاڑنے اور ایک حصے کو دوسرے حصے سے جُدا کرنے کے معنی میں ہے۔[2] اور ''حَبّ'' کا معنی کھانے کا دانہ ہر قسم کا نباتاتی دانہ ہے اور ''نوی'' کا معنی گٹھلی ہے۔ اگر بعض لوگوں نے اس کو کھجور کی گٹھلی سے تفسیر کیا ہے تو اس لئے کہ اُس ماحول میں کھجوریں زیادہ تھیں۔

بہرحال نباتات کا ایک اہم اور دلچسپ ترین مرحلہ دانے اور گٹھلی کے شگافتہ ہونے کا مرحلہ ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ حالت ماں کے پیٹ سے بچے کے متولد ہونے سے ملتی جلتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ نباتات کی سب سے پہلے کونپل نہایت ہی باریک اور ظریف ہونے کے باوجود اس محکم اور مضبوط قلعے کو شگافتہ کر کے اپنا سر اس سے باہر نکالتی ہے اور اندر سے ایک زندہ موجود باہر آتا ہے جو اس لمحہ تک دانے یا گٹھلی کے مضبوط اور ضخیم پردوں میں محبوس تھا اور اس کا باہر کی دنیا سے بالکل کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یہ پیدا ہو کر فوراً اپنا رابطہ بیرونی دنیا سے استوار کرتا ہے، مٹی کے غذائی سے بہرہ

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۶۔ اس روایت میں حضرت امام علیہ السلام نے مختلف معدنیات اور ان کی کانوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جنہیں خداوندِ عالم نے پہاڑوں میں بنایا ہے اور ان کی خرید و فروخت وزن کے ساتھ ہوتی ہے۔

[2] یہ لفظ کبھی ''تخلیق'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، گویا عدم کا ظلماتی پردہ شگافتہ ہو جاتا ہے اور وجود کا نور اس سے آشکار ہوتا ہے۔ (تفسیر روح المعانی جلد ۷ ص ۱۹۶) صبح کی سفیدی کو بھی اسی لئے ''فلق'' (بروزن شفق) کہتے ہیں۔

مند ہوتا ہے ،اپنے اطراف میں موجود پانی اور رطوبتوں سے سیراب ہوتا ہے اور بڑی سُرعت کے ساتھ دومختلف اطراف میں حرکت کرنا شروع کر دیتا ہے،ایک طرف تو جڑ کی صورت میں زمین کے اندر اور دوسری طرف تنے کی صورت میں زمین کے اُوپر۔زندگی کے اس مرحلہ میں نباتات کی دنیا پر حساب شدہ اور جچے تُلے قوانین حکم فرما ہیں جو یقیناً حیرت انگیز اور پروردگارِ عالم کے علم وقدرت پر زندہ دلیل شمار ہوتے ہیں۔

ان تمام قرآنی آیات سے جو کہ نباتات کی تخلیق اور ان کی مختلف خصوصیات کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں،اس بے نشان ذات کی نشانیاں ،ربوبیت کی توحید اور ہر قسم کے شرک کی نفی کی زندہ دلیل ہیں۔نباتات کے اُگنے سے لے کر ان کی مختلف انواع واقسام کی روئیدگی اور بالیدگی ،باروری اور زوجیت ،انسانوں اور جانوروں کیلئے مختلف غذائی مواد بننے تک ، اور کھجور کے پھلوں کا اُن کے خوشے سے نمودار ہونے ،گندہ اور جو کے دانوں کا بالیوں میں ایک دوسرے پر سوار ہونے ،ایک ہی مٹی اور پانی سے مختلف الانواع میووں اور زراعت کے پیدا ہونے ،تمام مراحل میں ان سب پر یکساں قوانین کے حکم فرما ہونے اور دانے اور گٹھلی کے شگافتہ ہونے ،غرض تمام امور میں اس کی ذاتِ اقدس کی نشانیاں موجود ہیں۔

چند ضروری وضاحتیں

ا۔نباتات کی حیرت انگیز ساخت

عام طور پر جو چیز ہماری آنکھوں میں معمول کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے اسرار اور عجائبات بھی نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔سورہ یوسف کی ۱۰۵ ویں آیت وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ کے مصداق ہم ان کے پاس سے سادگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں جب کہ ان میں خالق کی قدرت اور عظمت کی ایک کائنات مخفی ہوتی ہے۔سب سے پہلے ہم نباتات کی جڑوں سے شروع ہوتے ہیں،جڑیں جو کہ نہایت ہی لطیف اور نرم ونازک ہوتی ہیں،اُن میں حیرت انگیز طاقت پائی جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ سخت پتھروں اور سنگاخ زمینوں کے اندر گھستی چلی جاتی ہیں۔بسا اوقات تو کئی کئی ٹن بھاری پتھروں کے اندر گھُس کر انہیں اوپر اٹھا دیتی ہیں۔کنکریٹ سے بنی ہوئی عمارتوں اور حوضوں کے اطراف میں درختوں کے اُگنے سے اُن کے اندر دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور وہ ''لرز'' جاتے ہیں۔جڑوں کا کام ہر طرف سے غذائی مواد اور رطوبتوں کا جذب کرنا ہوتا ہے ،گویا وہ اپنے عجیب احساس کے ساتھ رطوبتوں اور غذائی مواد کے مراکز کو پہچان کر اُن کی طرف آگے بڑھتی رہتی ہیں۔

ہر ایک جڑ اپنے طور پر ایک عظیم کارگاہ work shop کی حیثیت رکھتی ہے جو غذا کی نوع کا انتخاب کر کے اسے خصوصی توانائی کے ذریعہ تبدیل کر دیتی ہے اور غذائی مواد میں تبدیلی پیدا کر کے اسے شاخوں کی طرف بھیج دیتی ہے، وہاں سے میووں کی جانب، اور اس بارے میں ہر ایک مرحلے پر نت نئے کیمیکل تغیر وتبدل اور فعل وانفعال وجود میں آتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے تاریک مٹی سے شہد کی طرف میٹھے پھل یا شفا عطا کرنے والی دائیں وجود میں آجاتی ہیں۔

جڑوں کا ایک اہم ترین کام NITROGEN یا AZOTE کی جمع آوری بھی ہوتا ہے جو نباتات کی نشوونما اور ساخت و پرداخت کیلئے

ضروری ہوتی ہے اور نباتات کا کوئی اور جُزا سے جذب نہیں کرسکتی ۔ پھر پتوں کی ساخت ہے جوان سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ اگرایک پتے کوآفتاب کے سامنے کرکے دیکھیں تواس میں نہایت ہی باریک باریک رگیں نظرآئیں گی جومنظم صورت میں تمام پتے میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں جن کا کام پتے کے تمام خلیوں تک آب وغذا کا پہنچانا ہوتا ہے۔ درحقیقت ہرایک پتہ بذات خودایک شہر کی حیثیت رکھتا ہے اوراس میں موجود یہ رگیں اس میں پانی کے نلوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں چھوٹے اور بڑے نل ہوتے ہیں اوران کا تعلق سب سے بڑے نل سے ہوتا ہے۔

باوجودنرم ونازک ہونے کے پتے کے سات طبقے ہوتے ہیں اور ہرایک طبقہ کی اپنی مخصوص ساخت اورخصوصی پروگرام ہوتا ہے جسے معلوم کرکے انسان ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ پتے کے اوپر کی نازک پوست ایسے ہے جیسے انسان کی جلد ہوتی ہے جس میں نہایت ہی باریک باریک سوراخ ہوتے ہیں اور ہرسوراخ کی ایک حفاظتی چوکی ہوتی ہے جواس کے کھلنے اور بند ہونے کا کام دیتی ہے۔

پتے انہی سوراخوں سے سانس لیتے ہیں اور ہوا کواپنے اندر لے جاتے ہیں، جوکاربن CARBON کواس سے جُدا کرکے اس سے نباتی ''کلوروفل'' بناتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہوا کوصاف ستھرا رکھنے کیلئے آکسیجن اوررطوبت کی صورت میں دوعظیم تحفے عالمِ انسانیت کی خدمت میں پیش کرتی ہے۔ سائنس دان اس موقع پر جواعدادوشمار بیان کرتے ہیں وہ بڑے حیرت انگیز ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''نباتات کے ایک پونڈشکر پیدا کرنے کیلئے تین لاکھ گیلن ہوا کی ضرورت ہوتی ہے جو پتوں کی ذریعہ اندر جا کر تحلیل ہوجائے''۔

پھولوں اورانکے بعد پھلوں کی ساخت تو پتوں سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ نراور مادہ کی تقسیم ،نر کے نہایت ہی ظریف اور باریک سفوف کے مادہ کے ساتھ ملنے کی کیفیت ، پھراس خاموش شادی کے نتیجے میں وجود میں آنے والے تخم کی تشکیل اوراس کی پرورش کی کیفیت ،غرض ان میں سے ہرایک اپنی ذات میں عجائبات کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے جس سے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اوردریائے حیرت میں غرق ہوجاتی ہے۔

نباتات ، پھولوں اورپھلوں کی جسمانی ساخت کی مکمل تشریح اس مختصرکتاب میں نہیں لکھی جاسکتی ۔ دانشوروں اورسائنسدانوں کی طرف سے اس بارے میں بہت سی کتاب لکھی جاچکی ہیں اوراس سلسلے میں علم النباتات BOTANY نامی علم وسیع پیمانے میں وجود میں آچکا ہے ۔بہتر ہے کہ اس مقام پرایک ماہرزراعت کی باتوں کوکافی سمجھتے ہوئے اس گفتگوکویہیں پرختم کرتے ہیں مشہور ماہرنباتات ''چرالدت'' کہتے ہیں:

''خداموجود ہے اور یہ اس کے نباتات کی دنیامیں برقرارثابت اوراسرار بھرے قوانین کو چلانے سے ظاہر ہوتا ہے۔''اس کی تجلی کاظہوران طریقوں سے ہوتا ہے۔

۱۔نظم اورترتیب: جوکہ نباتات کی نشوونمااورتولیدنسل اورخلیوں کی تقسیم اورنباتات کی مختلف اجزاء کی تشکیل میں منظم طور پرانجام دیتا ہے۔

۲۔پیچیدگی: انسان کے ہاتھوں سے بنی ہوئی کوئی بھی مشینری ایک معمول سی نباتات کی پیچیدہ اورتعجب خیزمشینری سے قابلِ قیاس نہیں ہے۔

۳۔خوربصورتی: تنے ،پتے اورپھول کی خوبصورتی ایک خداداد چیز ہے، کیونکہ کوئی بھی ماہرمجسمہ سازاورکوئی بھی نقاس ان جیسانہ توکوئی خوبصورت مجسمہ بناسکتا ہے اورنہ ہی کوئی دلآویزسینری تیاری کرسکتا ہے۔

۴۔توارث: نباتات کی ہرقسم اپنی جیسی چیزکوہی پیدا کرتی ہے اورنسل کی یہ تولید مکمل طور پرمشیت اور پروگرام کے تحت انجام پاتی ہے،خواہ

اُسے کسی جگہ پر کاشت کریں اور جس طرح کاشت کریں تو ''گندم از گندم بروید جَو ز جَو'' یعنی گندم سے گندم ہی اُگے گی اور جَو سے جَو۔ وہ کہتے ہیں ''میرے نظریہ کے مطابق یہ سب کچھ خالقِ کائنات کے وجود اور اس کی حکمتِ کاملہ اور بے انتہا قدرت کے مظاہر ہیں۔''[1]

ٹائیلر یونیورسٹی کے سابق BIOLOGIST مسٹر ''منچسٹر'' کہتے ہیں کہ:

''شبدر'' CLOVER کے ایک پودے کی پیشِ نظر لایئے جو سڑک کے کنارے پوری آب وتاب کے ساتھ اپنی رعنائی دکھا رہا ہے۔ اب تک جو مشینیں بھی ایجاد ہو چکی ہیں کیا کوئی ایک مشین بھی اس خودرو پودے کی برابری کر سکتی ہے؟ یہ پودے بذاتِ خود ایک ایسی مشین ہے جو محیر العقول اور تعجب خیز ہے جو ہمیشہ نشوونما کی صورت میں رہتا ہے اور روزانہ ہزاروں کیمیکل اور فزیکل تبدیلیاں انجام دیتا رہتا ہے وہ سب ایک ہی PROTOPLASMA پمادہ کے زیر کنٹرول ہوتے ہیں جس سے تمام طبعی حیات تشکیل پاتی ہے۔ یہ عجیب زندہ مشین کس کی قدرت کا شاہکار ہے؟''[2]

۲۔ نباتات کے فوائد اور برکتیں

کرۂ زمین پر نباتات کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے اور باقی تمام زندہ موجودات انہی کے رحم وکرم پر ہیں۔ نباتات کے بہت زیادہ فوائد ہیں جن میں سے بارہ فوائد کو فہرست وار ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ بہترین غذائی مادہ

ہم انسانوں کی مناسب ترین غذائیں نباتات، غلے اور میوہ جات سے ہی تیار ہوتی ہیں۔ ہمیں توانائی، قوت اور سلامتی بھی نباتاتی غذائیں کھا کر ہی حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے پرندے، چوپائے، رینگنے والے جانور اور مچھلیاں بھی نباتات ہی سے استفادہ کرتی ہیں۔ اسی بنا پر جو ملک بھی زرعی محصولات یعنی پیداوار کے ذریعہ اپنی غذائی ضروریات پورا کر سکتا ہے، وہی درحقیقت خودکفیل ملک کہلاتا ہے۔

۲۔ ہوا میں تبدیلی

ہم جانتے ہیں کہ انسان اور بہت سی دوسری زندہ موجودات ہمیشہ آکسیجن گیس استعمال کرتی اور اُسے جلاتی رہتی ہیں۔ اگر اس کمی کو پورا کرنے کیلئے کوئی منبع اور مرکز نہ ہوتا تو بہت کم عرصے میں زمین کی فضا میں موجود تمام آکسیجن ختم ہو جاتی اور سانس لینے والی تمام مخلوق دم گھٹ کر مر جاتی۔ لیکن حکمت کے مالک خدا نے اس نقصان کو پورا کرنے کا کام نباتات کے ذمہ لگا دیا ہے۔ وہ انسانوں کے سانس لینے کے برعکس سانس لیتی ہیں۔ وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو استعمال کرتی ہیں اور اس کا تجزیہ کر کے اسے آکسیجن کی صورت میں واپس لوٹاتی ہیں۔

---

[1] کتاب ''جہان گلہا'' (اختصار اور تلخیص کے ساتھ)

[2] کتاب ''جہان گلہا'' (اختصار اور تلخیص کے ساتھ)

یہی وجہ ہے کہ باغات اور کھیتوں کی ہوا مسرور کن اور کیف ونشاط سے معمور ہوتی ہے۔ اسی لئے حفظانِ صحت کے اصولوں کے طور پر اس بات کی سفارش کی جاتی ہے کہ ہر شہر میں درختوں پر مشتمل پارک بنائے جائیں اور ماہرین فی نفر مربع میٹر کے حساب سے ہر شخص کا ایسے پارکوں میں حصہ پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

۳۔لباس اور پوشاک

ہمارے لباس کا عمدہ حصہ نباتاتی ریشوں سے تیار کیا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی پوشاک کا کبھی ختم نہ ہونے والا منبع پہلے درجہ میں نباتات ہی ہیں۔

۴۔گھر اور اس کا اثاثہ

اگر ہم اپنے اطراف میں نگاہ دوڑائیں تو ہمیں اس کے بہت سے در، دروازے، کھڑکیاں الماریاں، روشندان وغیرہ درختوں کی لکڑی ہی سے بنے ہوئے نظر آئیں گے، اور وہ بھی اس طرح کہ اگر ہم چاہیں کہ انہیں اپنی زندگی کے حصے سے حذف کردی تو ہمارے لئے زندہ رہنا دوبھر ہوجائے۔ بعض علاقوں میں تو لوگ اپنے تمام گھروں کو لکڑی سے بناتے ہیں اور اس قسم کے گھروں کو خصوصیات حاصل ہوتی ہیں۔ آج کے دور میں ہماری زندگی کے اہم وسائل میں سے ٹائر یا ربڑ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ''کاؤچو'' CAOUTCHOUE نامی درخت کے شیرے سے حاصل ہوتا ہے۔

۵۔نباتاتی دوائیں

گذشتہ زمانے میں اکثر دوائیں جڑی بوٹیوں ہی سے حاصل کی جاتی تھیں اور آج بھی ان کا عمدہ حصہ انہی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ کیمیکل دواؤں کے نامطلوب ردِعمل اور منفی اثرات کی وجہ سے اُن کے خلاف اور نباتی دواؤں کے حق میں تحریک شروع ہوچکی ہے اور ایسے دواخانے اور میڈیکل سٹورز ہیں جو نباتات کی دوائیں بناتے ہیں۔

۶۔چلتی ریت کے آگے رکاوٹ

جو شہر ریتیلے بیابانوں اور صحراؤں کے نزدیک واقع ہیں اُن کیلئے سب سے بڑا خطرہ چلتی پھرتی ریت ہے کہ جو بعض اوقات تو اچھی خاصی آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اس قسم کی ریت کے آگے رکاوٹ کھڑی کرنے کا بہترین راستہ یہ ہوتا ہے۔

۷۔کاغذ کی تیاری

ہم جانتے ہیں کہ کاغذ کی ایجاد کا انسانی تمدن اور اس کے علم ودانش کی ترقی اور پیش رفت میں بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کا اصل

منبع یہی نباتات ہیں۔

۸۔موسم میں اعتدال

نباتات سے ملائم اورمعتدل رطوبتیں پیداہوکرفضامیں پھیلتی رہتی جن کی وجہ سے سردی کی شدت اورگرمی کے دباؤ پر بہت بڑااثر ہوتاہے۔یہی وجہ ہے کہ درختوں سے معمورعلاقوں کی آب وہوامعتدل ہوتی ہے۔

۹۔ذرائع آمدورفت

زمانہ ماضی اورحال میں بھی بڑے بڑے بحری جہازوں اورکشتیوں کولکڑی ہی سے بنایاجاتاہے جوانسان کے ذرائع آمدورفت اورحمل ونقل کا بہت اہم ذریعہ ہیں،ماضی میں بھی اوراب بھی۔

۱۰۔خوبصورتی اورتروتازگی

درختوں،پودوں اورپھولوں کی یہ دلکش اثرکسی سے پوشیدہ نہیں ہے جن کی زیبائی اورخوبصورتی سے انسانی روح کوفرحت،دل کوسکون اورزندگی کے سخت دباؤ کے موقع پرذہنی سکون ملتاہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ہسپتالوں کومختلف درختوں اورپودوں سے مزین کرتے ہیں،تاکہ مریضوں کوتسکین حاصل ہو۔عمومی حالت میں بھی تھکاوٹ دُورکرنے کیلئے ہمیشہ انسان کودرختوں باغوں اورلہلہاتے کھیتوں کی فطری آغوش میں ہی پناہ ملتی ہے۔

۱۱۔توانائی کااہم منبع

ماضی اورحال میں ENERGY یعنی توانائی اورحرارت وگرمی پیداکرنے کاایک اہم ترین ذریعہ درختوں کی لکڑی پتے،اوران کی دوسری چیزوں ہیں۔حتیٰ کہ پتھرکاکوئلہ بھی جوانرجی پیداکرنے کاایک اہم ترین ذریعہ ہے۔درختوں اوردوسری نباتات سے حاصل شدہ مادہ ہے۔درختوں کی لکڑی اورپتوں سے حاصل ہونے والی حرارت زیادہ مناسب ہے اورماحولیات کے لئے ان کی آلودگی بہت کم ہوتی ہے،حتیٰ کہ درختوں کے جلنے سے حاصل ہونے والی راکھ بھی انہی درختوں کیلئے کھادکاکام دیتی ہے جن سے دوبارہ استفادہ کیاجاتاہے۔

۱۲۔مختلف عطریات اورکیمیکل مواد

ہم جانتے ہیں کہ روح اورجان کوہشاش بشاش رکھنے کیلئے ماضی سے لے کراب تک پھولوں کے نچوڑ سے بہترین عطریات تیارکی جاتی رہی ہیں،حتیٰ کہ خودایسے درخت اوردوسری نباتات جومعطراورخوشبودارہیں،وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔اس کے علاوہ بھی مختلف مصنوعات میں استعمال کیلئے نباتات ہی سے کیمیکل موادلیاجاتاہے۔

بزرگ ہے وہ خداجس نے اس قسم کی مخلوق میں اس قدرفوائداور برکتیں پیدا کی ہیں اورانہیں اپنےعلم وقدرت کی آیات میں سے ایک عظیم آیت قراردیاہے ۔ جوجامع تعبیرات ہم آیات بالامیں پڑھ چکے ہیں ان میں سے ایک جملہ یعنی ''معایش'' کی تعبیربھی ہے جو''معیشہ'' کی جمع ہےجس کامعنی وسیلۂ زندگی ہے،جس میں یہ تمام فوائدجمع ہیں۔

۳۔نباتات کی بےشمارقسمیں

جیسا کہ پہلے اشارہ کیاجاچکاہے نباتات کی اقسام اس قدرزیادہ ہیں جن کی کوئی حدمقررنہیں کی جاسکتی ،یہاں تک کہ درخت خرما کی تین ہزارقسمیں ہیں،برگدیاانجیرہندی کی سترہ سواقسام ہیں،اورگلِ ثعلب کی بارہ سوانواع ہیں۔

''جہان گلہا'' (پھولوں کی دنیا) نامی کتاب کےمصنف مسٹر''فرڈینالڈن'' نےمخفی دانے والی نباتات کی ڈیڑھ لاکھ سےزیادہ قسمیں بتائی ہیں۔نباتات شناسی BOTANY کی بعض کتابوں میں نباتات کی اٹھارہ ہزارسےزیادہ اقسام کی تشریح اورتوضیح کی گئی ہے۔[1]

کھمبیوں کی ایک لاکھ اقسام شمارکی گئی ہیں ،''جب کہ''ALGAE کی چالیس ہزارسےزیادہ سیب کی چار ہزاراورگندم کی پینتیس ہزاراقسام پرتحقیقات کی گئی ہیں۔[2]

نباتات میں کچھ ایسی قسمیں بھی پائی جاتی ہیں جوخوردبینوں ہی کے ذریعہ سے دیکھی جاسکتی ہیں اورکچھ ایسی ہیں جن کی لمبائی پچاس میٹرتک جاپہنچتی ہے۔کچھ نباتات ایسی ہیں جوپتھروں کے درمیان سے اگتی ہیں اورکچھ وہ ہیں جو پانی کے درمیان تیرتی رہتی ہیں بعض وہ ہیں جن کی جڑیں پانی کےاندراورپھول پانی سے باہرہوتے ہیں۔بہرحال قسم کوئی بھی ہوہرایک کااپنامقام،اپنی خصوصیت اورمخصوص منظرہوتاہے جواپنی دنیامیں توحید کے نغمےالاپ رہی ہے۔

۴۔نباتات کی بوالعجبیاں

جوکچھ نباتات کے بارے میں عام طور پر بیان کیا گیاہے،اگرہم ان سے گزرکریں تونباتات کی دنیامیں ہمیں بڑے عجائبات نظرآئیں گےجن میں سے کچھ توایسے ہیں جواسقدرعام ہیں اورہمارے لئے عادی بن چکے ہیں اورہم انہیں فراموش کرچکے ہیں۔عظیم درختوں کے تنے اورشاخیں کشش ثقل کے قانوں کے خلاف روزانہ لاکھوں کروڑوں ٹن پانی زمین سے اٹھاکراوپرلے جاتے ہیں اورپھربخارات کی صورت میں اسےفضامیں پھیلادیتے ہیں۔اس مقام پر یہ سوال پیداہوتاہے کہ آخر یہ کون قانون ہے جونباتات کواس بات کی اجازت دیتاہے کہ کشش ثقل کے قانون جس کے تحت ہرچیز نیچے کوکھینچتی ہے۔خاص کر پانی ۔۔۔۔۔وہ اس کے خلاف اسے اوپرلےکراپنی قدرت کامظاہرہ کرتی ہیں؟

---

[1] تاریخ علوم ص ۳۵۲

[2] شناخت خداص ۲۹۱ وص ۲۹۲

سورج مکھی کے پھول سورج کی حرکت کے ساتھ ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں۔صبح کے وقت ان کا رُخ مشرق کی طرف ہوتا ہے توغروب کے وقت مغرب کی جانب۔اس قسم کے دوسرے پھول بھی کم نہیں ہیں۔نباتات کی دنیامیں گوشت خور پودے تو بہت ہی محیرالعقول ہیں۔''فرانسیسی طبعی تاریخ کے قومی عجائب خانہ'' کے ڈائریکٹر پروفیسر''لون برٹین'' نے اس عجیب قسم کی نباتات کے بارے میں کافی ریسرچ کی ہے۔وہ کہتے ہیں''سائنسدانوں نے اب تک گوشت خورنباتات کی چارسوقسمیں دیکھی ہیں جن میں سے دس توصرف فرانس میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل قسمیں زیادہ مشہور ہیں:

''آلڈروونڈ''جواس ملک کے مغربی صوبے''جیرونڈ''میں اوقیانوسِ اطلس کے ساحلوں میں اُگتا ہے،اس کے دومخصوص پتے ہوتے ہیں جوکتاب کے دوصفحوں کی مانندآمنے سامنے کھلے ہوتے ہیں جو نیچے کی طرف سے ایک مخصوص نلی کے ذریعہ آپس میں چپکے ہوئے ہوتے ہیں اورپتوں کوحساس قسم کی مخمل نے چھپایا ہوتا ہے۔جب کوئی بدبخت مکھی اس کے قریب پھٹکتی ہے اوراسکا پاؤں یاجسم کا کوئی حصہ اس سے چھوجاتا ہےتو دونوں صفحے جلدی سے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور یہ بیچاری اس میں گرفتار ہوجاتی ہےاورآخرکارایک مخصوص شیرے کے ذریعہ جوپتوں سے ٹپکتا ہے بتدریج حل ہوکراس پودے کا جزوبن جاتی ہے۔

''دروزرا''اس قسم کی ایک اورنباتات ہےجس کے پتے سرخ رنگ کے ہوتے ہیں،جن پر باریک باریک بال ہوتے ہیں۔جب کوئی حرماں نصیب مکھی اپناراستہ گم کرکے ادھرآپہنچتی ہےاوران پتوں کوخلوت اورسکون کامقام سمجھ کرسستانے کیلئے ان پربیٹھتی ہےتووہ باریک بال فوراًاس کے سامنے سے اوپرکواُٹھ جاتے ہیں۔اسے دست بستہ پتے کے اندربھیج دیتے ہیں اوروہ اس کےلیسدارمادہ کے درمیان پھنس کراس کے اندرہضم اورجذب ہوکررہ جاتی ہے۔

''نیانٹس''گوشت خورنباتات کی عجیب ترین قسم ہے۔اس کی باریک شاخوں کے آخرمیں چھوٹے کوزے کی مانندایک چیز ہوتی ہے جس کا منہ اُوپرکوہوتا ہےاوراس کامخصوص دروازہ ہوتا ہے جوعام طورکھلا ہوتا ہے۔یہ کوزہ بےاحتیاط اورلاابالی قسم کےحشرات کیلئے خطرناک دام ہوتا ہے۔اس کوزہ کے اندرہمیشہ شہد کی مانندلیساراورشیریں مادہ ہوتا ہے جو''شکم پرست''حشرات کواپنی طرف بلاتا ہے۔'خوش ذوق''حشرات کیلئے کوزے کا خوبصورت اورشفاف رنگ بھی کشش کا باعث ہوتا ہے۔اگرکوئی حشرہ ہوائے نفس کااسیر ہوکراس کے اندرآجائےتووہ فوراًاپنے منہ کو بندکرلیتا ہےاوروہ ایسے زندان کے اندرچلاجاتا ہےجس سے کبھی بھی چھٹکاراحاصل نہیں ہوسکتا۔بہرحال یہ کوزہ اس نباتات کیلئے معدہ کی حیثیت رکھتا ہےاوراس کے اندرموجودشیرہ بھی معدوں میں موجودشیروں کی مانند ہوتا ہے جوحشرات کوجذب ہونے کے قابل بنادیتا ہے۔سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ پوداحشرات کا شکاراس لئے کرتا ہے کیونکہ اس کے ریشے آکسیجن AZOTE کے جذب کرنے پرقادرنہیں ہوتے لہٰذاوہ اپنی کمی اس طریقے سے پوری کرتے ہیں۔

سائنسدانوں نے اس اُمید کااظہارکیا ہے کہ شایدایک دن ایسا آئے کہ اس قسم کے پودوں کی گھروں میں اوردوسرے اہم مقامات پر پرورش کیاجائے اوراس صحیح وسالم اورطبعی ذریعہ سے مکھیوں اوردیگرموذی جانوروں کوتلف کیاجاسکے۔سیاحوں کی یادداشتوں میں آدم خوردرختوں کی بھی عجیب وغریب داستانیں ملتی ہیں۔بعض سائنسدان کہتے ہیں یہ درخت ان حشرہ خوارپودوں کی ہی ایک قسم ہوجوزیادہ قابل

زمینوں میں پروان چڑھ کر اس خصوصیت کے حامل ہو چکے ہوں اور بڑے بڑے جانوروں کو اپنی شاخوں اور پتوں میں گرفتار کر کے بتدریج چٹ کر جاتے ہوں۔(لیکن اس نظریہ کی تائید یا اسے قبول کرنا آسان نہیں ہے)[1]

نباتات کا عجیب ترین اور دلچسپ ترین حصہ پھل اور میووں کی ساخت ہے۔اُن کے سینکڑوں دلچسپ نکات میں سے ایک یہ ہے کہ ان میں بہت سے میووں میں نہایت ہی شیریں اور لذیذ جُوس چھوٹے چھوٹے مخصوص پیکٹوں میں نہایت ہی خوبصورت انداز ہ میں اُن کے اندر بھر دیا گیا ہے کہ ہمارا ترقی یافتہ دور میں کی جائے والی پیکٹ بندی ابھی ابتدائی کوشش معلوم ہوتی ہے۔

ایک مالٹے کو کھول کر دیکھئے گویا اس کی ایک قاش سینکڑوں چھوٹی چھوٹی شیشیوں سے بھری ہوتی ہے ،جس میں نہایت ہی لذیذ اور خوشبودار جوُس ہوتا ہے ،اور شیشیاں بھی ایسی کہ جو کسی فاصلے کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔(اگر ان میں فاصلہ اور خلا ہوتا تو وہ بہت جلد خراب ہو جاتیں)

لیکن یہ شیشیاں کبھی نہیں ٹوٹتیں اور پوری طرح حمل ونقل کے قابل ہوتی ہیں۔پھر لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے اندر موجود مواد کے ساتھ کھانے کے قابل ہوتی ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی اور باریک شیشیوں کا ہر ایک مجموعہ ایک ضخیم پوست میں بند کیا گیا ہے جو ایک ڈبہ CARTON کی حیثیت رکھتا ہے اور قاش کی صورت اختیار کئے ہوتا ہے(یہ ڈبہ بھی اپنے اندر موجود مواد سمیت کھانے کے قابل ہوتا ہے ، بلکہ ہاضمہ کے لئے بہت مفید ہوتا ہے)

یہ چھوٹے چھوٹے ڈبے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ جڑے ہوتے ہیں جن کے درمیان نہ تو کسی قسم کا فاصلہ ہوتا ہے اور نہ ہی ہوا کا گزر ،اور حفاظت و بچاؤ کیلئے چند مختلف لفافوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔مجموعی طور پر ایک بنڈل کی صورت میں میں دور ترین فاصلوں تک لے جانے کیلئے حمل ونقل کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی صورتِ حال بلکہ اس سے بھی لطیف اور ظریف صورت میں انگور،انار اور انجیر میں دیکھی جاسکتی ہے

خوب غور کیجئے کہ اگر ان میوہ جات میں سے کسی ایک کے جوس کو کھلی فضا میں رکھ دیا جائے تو ایک گھنٹہ کے اندر اندر اس میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی اور بسا اوقات چند گھنٹوں میں خراب اور بدبودار ہو جائے گا۔لیکن قدرتی طور پر ان کی پیکنگ اس طرح سے منظم طریقہ پر کی گئی ہے کہ ان کے اندر ہوا کے نفوذ کی اجازت نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ پھل کئی کئی مہینوں تک خراب نہیں ہو پاتے۔یہ بات تو صرف سادہ طریقہ پر پیکنگ کے بارے میں ہے ،لیکن ان میں سے ہر ایک پھل کی کیمیکل ترکیب ،غذائی اور طبی خواص وٹامنز کی اقسام اور ان کے حیاتی مواد کی انواع کی بجائے خود اپنی ایک نہایت مفصل داستان ہے جو ماہرین غذا کی بحث کا موضوع ہے اور اس بارے میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔اگر ہم ان مسائل کی تفصیل میں پڑ جائیں تو تفسیری کتاب کی صورت میں نکل جائیں گے اور پھر کئی کتابوں کی ضرورت ہوگی۔

---

[1] کتاب ''نظری بہ طبیعت واسرار آن''ص ۱۳۱ تا ص ۱۳۴ مؤلفہ لٹون برٹین (کچھ تلخیص کے ساتھ)

۵۔توحیدِ مفضل میں نباتات کی تخلیق کے اسرار

توحیدِ مفضل میں نباتات میں ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی یوں پڑھتے ہیں:

''اے مفضل! اس نباتات اور اس کے مختلف فوائد کے بارے میں غور کرو۔اس کے پھل، میوے، انسانوں اور بسا اوقات جانوروں کی غذا کا کام دیتے ہیں۔ایندھن آگے جلانے کیلئے اور لکڑی مختلف مصنوعات کے کام آتی ہے۔اس کی چھال، پتے، ریشے اور مختلف قسم کی گوند غرض ان میں سے ہر ایک کے اپنے مخصوص فوائد ہیں۔اگر یہ نہ ہوتے تو ہماری زندگی میں کس قدر مشکلات پیدا ہوتیں۔علاوہ ازیں ہم اُن کے روح پرور اور جاذبِ نظر مناظر سے جو لذت اٹھاتے ہیں، دنیا میں کوئی منظر اس کی برابری نہیں کرسکتا۔''

''اے مفضل! ذرا سوچو کہ بعض اوقات ایک دانے سے سو یا کم وبیش دانے وجود میں آتے ہیں جب کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ایک دانہ سے صرف ایک ہی دانہ پیدا ہو۔یہ صرف اور صرف اس لئے ہے کہ انسان کیلئے وسعت پیدا ہو اور وہ اگلے سال تک اپنی خوراک کو پورا کرسکیں۔

''اچھی طرح غور کرو! عدس، ماش، باقلا جیسے غذائی دانے کس قسم کی پوست اور تھیلیوں میں رکھ کر آفات سے بچائے جاتے ہیں۔بالکل ویسے ہی جنین کی ایک باریک سی جھلی میں حفاظت کی جاتی ہے۔پھر گندم اور اس جیسے دوسرے غلات کی بالیوں پر نظر ڈالو کہ اس خصوصیت کے علاوہ ہر بالی کے سر پر نیزوں کے مانند سیخیں ہوتی ہیں تاکہ وہ پرندوں کے حملوں سے بچی رہیں۔

''درختوں اور دوسری نباتات کی تخلیق کے بارے میں اچھی طرح غور وفکر کرو۔ان سب کو بھی غذا اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہیں حالانکہ وہ خود حرکت نہیں کرسکتے۔لہٰذا ان کی جڑیں زمین کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی ہیں تاکہ وہ غذائی مواد کو وہاں سے حاصل کرکے ہر ایک حصے تک پہنچائیں۔یہ جڑیں غذائی مواد کو زمین سے چوستی ہیں، جیسا کہ شیر خوار جانوروں کے بچے ماں کے پستانوں سے دودھ چوستے ہیں۔کیا نہیں دیکھتے ہو کہ جڑوں کے ریشے خیمہ کی طنابوں کی مانند زمین کے اندر ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں تاکہ بلند قامت درختوں کو سیدھا اور برقرار رکھیں؟ اگر جڑیں نہ ہوتیں تو کھجور کے اس قدر بلند اور بالا درخت اپنی بڑی بڑی اور ہر طرف پھیلی ہوئی شاخوں کے ساتھ طوفانوں اور جھکڑوں کا مقابلہ کیونکر کرسکتے؟

''اے مفضل! پتوں کی آفرینش کے بارے میں بھی اچھی طرح غور وفکر سے کام لو۔ان میں تم نہایت ہی باریک اور ظریف ریشے دیکھو گے جس طرح جسم کی نرم ونازک رگیں ہوتی ہیں، جن میں سے کچھ تو ضخیم اور نہایت ہی لمبے ہوتے ہیں اور کچھ بالکل ہی ظریف اور پتلے۔اگر انسان ان میں سے کسی ایک پتے کو بنانا اور اس لطافت اور ظرافت کے ساتھ اس کا تانا بانا بننا چاہے تو ایک سال تک بھی ایسا نہیں کر پائے گا اور کس قدر اوزار اور آلات کی ضرورت پیش آئے گی؟ لیکن بہار کے چند دنوں میں درختوں پر اسقدر پتے ظاہر ہوجاتے ہیں کہ کوہ صحرا اور زمین کے کئی دوسرے علاقے ان سے بھر جاتے ہیں۔یہ سب کچھ پروردگارِ عالم کے ناقابلِ تردید ارادے اور کائنات میں اس کے واجب الاطاعت امر سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔''

امام علیہ السلام سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پھل میووں اور گٹھلیوں کے عجائبات بیان فرماتے ہیں، ہر سال نباتات کی زندگی اور موت کا فلسفہ ارشاد فرماتے ہیں، نباتات کی باروری کا طریقہ ذکر کرتے ہیں کہ کیونکر نر حصہ سے مادہ حصہ کی آمیزش ہوتی ہے، اسی طرح یہ بھی فرماتے ہیں کہ

صحت عطا کرنے والی دوائیں کس طرح جڑی بوٹیوں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ پھر جانوروں کی غذا بننے والی اناجوں اور دوسری نباتات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ہرایک کی دلچسپ تشریح فرماتے ہیں۔ اگر اختصار مطلوب نہ ہوتا تو ان سب کو یہاں پر ذکر کیا جاتا۔ ضرورت مند حضرات مندرجہ بالا طویل حدیث کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔ [1]

اس لمبی چوڑی بحث کو ہم مجبوراً یہاں پر سمیٹ رہے ہیں اور اُسے توحید پر مبنی چند خالص اشعار کے ساتھ ختم کر رہے ہیں۔ اگر عنانِ قلم کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس بارے میں کئی کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

آفرینش ہمہ تنبیہِ خداوندِ دل است
دل ندارد کہ ندارد بہ خداوند اقرار
کوہ ودریاودرختان ہمہ درتسبیحند
نہ ہمہ مستمعیِ فہم کنداین اسرار
عقل حیران شوداز خوشہ زرین عنب
فہم عاجز شوداز حقہ یاقوتِ انار
بندہائی راطب ازنخل فروآویزند
نخل بندانِ قضاوقدرِ شیریں کار
تانہ تاریک بودسایہ انبوہِ درخت
زیرہر برگ چراغی بنہدازگلِ نار
ژالہ برلالہ فرودآمدہ نزدیکِ سحر
راست چون عارض گلبوی عرق کردہ یار
گونظربازکن خلقتِ نارنج جبین
ایکہ باورنکنی ”فی الشجر الاخضر نار“
پاک وبے عیب خدائی کہ بہ تقدرعزیز
ماہ وخورشید مسخرکندولیل ونہار [2]

---

[1] بحارالانوار جلد۳ص۱۲۹ تاص۱۳۶ (تلخیص کے ساتھ)

[2] ”کلیات سعد“ حصہ قصائد، ص۴۴۳

ترجمہ : ان سب چیزوں کی تخلیق درحقیقت دلوں کے مالک خدا کی تنبیہ ہے ۔جوشخص خداکااقرارنہیں کرتااس کادل ہی نہیں ہے۔ پہاڑ،دریا،سمندراوردرخت سب خدا کی تسبیح میں مشغول ہیں،لیکن یہ ایسی اسرار بھری تسبیح ہے جسے ہر سننے والانہیں سمجھ سکتا۔

انگور کے سنہری گچھے کودیکھ کرعقل دنگ رہ جاتی ہےاور یاقوتی انار کی ڈبیہ کودیکھ کرفہم انسانی عاجز ہوجاتی ہے۔

کھجوروں کے پھل اس کے خوشوں کے نیچے جھکے ہوئے ہیں،قضاوقدر کے مشتاق ہاتھوں نے اس میں شیرینی بھر دی ہے۔

جب تک درختوں کے انبوہ کے سائے تاریک اور گھنے نہ ہوں اس وقت تک ہر پتے کے نیچےگلِ انار کے چراغ روشن نہیں ہوسکتے۔

بوقت سحرگلِ لالہ پرشبنم کے قطرے یوں آکر بیٹھتے ہیں جیسے گُل رُخِ محبوب کے رخساروں پر پسینہ آیاہوا ہو۔ جولوگ ''فِی الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا'' کونہیں مانتے اُن سے کہو کہ وہ اپنی آنکھیں کھولیں اورنارنگی کی تخلیق کودیکھیں۔

پاک اوربےعیب ہے وہ خداجس نے اپنی غالب تقدیر کے ذریعہ سورج چاندورلیل ونہارکومسخرکیاہوا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶۔عمومی رزق کی پیدائش میں خالقِ کائنات کی نشانیاں

اشارہ:

ہرزندہ موجودکواپنی زندگی کی بقاء کیلئے کچھ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، یابالفاظ دیگرزندگی کی سرگرمیاں توانائی پیدا کرنے والے مواد چاہتی ہیں جوہمیشہ اس زندگی موجودکو ملتے رہیں جوضائع ہوجانے والے موادکی تلافی کریں۔صحیح معنی میں اور ہرلحاظ سے ان موادکواس زندہ موجو کے مناسب ہوناچاہیئے تاکہ وہ ان سے کماحقہٗ استفادہ کرسکے۔

عالمِ تخلیق میں رزق اورروزی کانظام ،اس کے تیارکرنے کی کیفیت ک،پھراس کاہرزندہ چیز کے اختیارمیں ہونے کاطریقہ کاراوراسی طرح ان سے استفادہ کرنے کاانداز نہایت ہی ظریف ،پیچیدہ بلکہ اسرارآمیز ہیں جن میں خداوندِعالم کی توحید،علم اورقدرت کی اہم نشانیاں پوشیدہ ہیں۔اسی لئے قرآن مجید نے مختلف آیات میں کئی بارانہی چیزوں پرزوردیاہے۔اس مختصرسے اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اورمندرجہ ذیل آیات کوجان ودل سے سماعت کرتے ہیں۔

۱۔۔۔یٰٓاَیُّهَاالنَّاسُ اذْكُرُوْانِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُاللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآاِلٰهَ اِلَّا هُوَفَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ(فاطر/۳)

۲۔۔۔اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝۴۰

(روم/۴۰)

۳۔۔۔اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ(نمل۔۶۴)

۴۔۔۔اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ؕ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ۝۲۱

(ملک/۲۱)

۵۔۔۔اَوَلَمْ يَرَوْااَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ(روم/۳۷)

٦۔۔۔اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ(ذاریات/۵۸)

۷۔۔۔وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَاوَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَاوَمُسْتَوْدَعَهَاكُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ(هود/٦)

۸۔۔۔قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ وَاِنَّآاَوْاِيَّاكُمْ لَعَلٰی هُدًی اَوْفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ(سبا/۲۴)

۹۔۔۔وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ }(ق/۹تا۱۱)

۱۰۔۔۔فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِهٖۤ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ۝(عبس/۲۴تا۳۲)[1]

ترجمہ

۱۔۔۔اے لوگو! خدا کی اپنے اوپر نعمت کو یاد کرو، کیا خدا کے علاوہ کوئی اور خالق ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دے؟ اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے تو پھر تم باطل کی طرف کیوں رُخ کرتے ہو؟

۲۔۔۔خداوندِ عالم وہی تو ہے جس نے تم پیدا کیا، پھر تمہیں روزی دی، پھر تمہیں موت دے گا، پھر زندہ کرے گا کیا جو خدا تم نے بنا رکھے ہیں، ان کاموں میں سے کوئی کام انجام دے سکتے ہیں؟ وہ پاک و پاکیزہ اور برتر ہے اس سے کہ جو تم اس کے شریک قرار دیتے ہو۔

۳۔۔۔یا وہ جس نے تخلیق کا آغاز کیا اور پھر اس کی تجدید کرے گا اور وہ جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لے آؤ!

---

[1] اس بارے میں اور بھی بہت سی آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جو مندرجہ بالا آیت سے ملتی جلتی ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ آیات ہیں۔ یونس/۳۱، بقرہ/۱۷۲، روم/۲۸، شوریٰ/۱۹، رعد/۲۶، شوریٰ/۱۲، بقرہ/۲۲، ابراہیم/۳۲، نحل/۷۳، عنکبوت/۱۷، مؤمن/۱۳۔

۴۔۔۔یاوہ کہ جوتمہیں روزی دیتاہے، اگروہ اپنی روزی کوروک لے (توپھرتمہاری ضروریات کوکون پوراکرے گا)لیکن وہ لوگ سرکشی اورحقیقت سے فرارکرنے میں ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں۔

۵۔۔۔کیاانہوں نے نہیں دیکھا کہ خداوندِ عالم جس کیلئے چاہے روزی کشادہ کردے اورجس کیلئے چاہے تنگ کردے؟اس بارے میں اُن لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جوایمان لے آئے (اورحق قبول کرنے کوتیارہیں)

۶۔۔۔خداوندِعالم ہی توروزی رساں اورصاحب قدرت وطاقت ہے۔

۷۔۔۔زمین پرکوئی چلنے والاایسانہیں ہے مگر یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے،وہ ان کے ٹھکانے اورآنے جانے کی جگہوں کوجانتاہے،یہ سب کچھ(خداوندِعالم کے علم) کی واضح کتاب ہے۔

۸۔۔۔کہہ دو! کون ہے جوتمہیں آسمان اورزمین سے روزی دیتاہے؟ کہو!اللہ!!اورہم تمہارے ساتھ ہدایت پرہیں یاکھلم کھلا گمراہی میں!

۹۔۔۔اورہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا،اوراس کے ذریعہ باغات اوراُن دانوں کواُگایاجووہ کاٹتے ہیں اوربلندقامت کھجوروں کوکہ جن کے پھل ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں۔یہ سب کچھ بندوں کوروزی عطاکرنے کیلئے ہے۔

۱۰۔۔۔انسان کوچاہیے کہ وہ اپنی غذا کی طرف دیکھے۔ہم نے فراوانی کے ساتھ پانی کوآسمان سے بھیجاہے۔پھرزمین کوشگافتہ کیاہے۔اوراس میں فراوان صورت میں دانے اُگائے۔اورانگوراور بہت سی سبزیاں ۔۔۔۔۔۔اورزیتوں اوربڑی مقدارمیں کھجور۔۔۔۔۔۔اوردرختوں سے لدے پھندے باغات۔۔۔۔۔اورمیوہ اورچراگاہ۔۔۔تاکہ وہ خودتمہارے اورتمہارے جوپاؤں کیلئے بہرہ مندی کاذریعہ بنیں۔

الفاظ کے معانی اورتشریح

''رِزْق''کے بارے میں راغب نے مفردات میں لکھاہے کہ اس کے معنی ہیں مسلسل عطااوربخشش،خواہ وہ دنیاوی ہویااُخروی، نصیب اورحصہ کوبھی رزق کہتے ہیں۔اسی طرح اس غذائی موادکوبھی رزق کہاجاتاہے جوانسان کے پیٹ کےاندرجاتاہے۔

''ابن منظور''کتاب''لسان العرب''کہتے میں کہ''رزق''کی دوقسمیں ہیں،ایک جسمانی رزق،جیسےمختلف قسم کی غذائیں ہیں

اوردوسرے دل وجان کیلئے روحانی رزق جیسے مختلف علوم ومعارف۔

کتاب ''التحقیق'' میں بھی آیا ہے کہ رزق کے معنی ہیں ''وہ خاص عطاوبخشش جوفریقِ ثانی کے حال کے مطابق اوراس کی ضروریات کے پیشِ نظر ہوتی ہے جس سے وہ زندہ رہتا ہے۔''

قرآن مجید میں بھی دونوں معانی استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورہ ملک کی پندرھویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

''هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ'' ''وہ وہی تو ہے جس نے زمین کوتمہارے لئے رام کردیا ہے، لہٰذا تم اس کے شانوں پر چلتے رہو۔ اورخدارزق کھاتے رہو۔''

اورسورہ آلِ عمران کی ۱۶۹ویں آیت میں شہداء کے بارے میں اشاد ہوتا ہے:

''بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ'' وہ تو زندہ ہیں اوراپنے پروردگار کے پاس سے روزی پاتے ہیں۔

لیکن عام طور پراس کا استعمال مادی رزق کیلئے ہوتا ہے، ہرچند کی معنوی روزی کیلئے بھی اس کا استعمال کم نہیں ہے۔ اور چونکہ مختلف مادی اورمعنوی روزیوں کا عطا کرنے والا خدا ہے لہٰذا ''رزق'' کا لفظ اس کی خصوصی صفات میں سے ہے۔[1]

''طعام'' میں مصدراوراسم مصدر دونوں قسم کے معنی پائے جاتے ہیں، یعنی ''غذا کھانے'' کو بھی اورخود ''غذا'' کو بھی طعام کہتے ہیں۔ کبھی یہ لفظ خاص طور پر گندم پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث ہیں ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم فرمایا کہ زکوٰۃِ فطرہ ایک صاع (تین کلو) ''طعام'' سے، یا ایک صاع ''شعیر'' (جو) سے ادا کیا جائے۔ (اس مقام پر طعام بمعنی گندہ ہے جو کہ جُو کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے)

''لسان العرب'' میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ طعام ایک ایسا جامع اسم ہے جو ہر قسم کی کھانے کی چیزوں پر بولا جاتا ہے لیکن خودلسان العرب میں اورراغب کی کتاب مفردات میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ لفظ پینے کی چیزوں پر بھی بولا جاتا ہے، جیسے سورہ بقرہ آیت ۲۴۹ میں ہے:

''فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ'' جواس سے پئے گا وہ مجھ سے نہیں اور جونہیں پئے اوہ مجھ سے ہے۔ خلیل بن احمد نے بھی اپنی کتاب ''العین'' میں کہا ہے۔

''کلامِ عرب میں عام طور پر طعام خصوصی طور پر گندم کو کہا جاتا ہے (لیکن ظاہراً یہ اس لئے ہے کہ غالباً اصل غذا روٹی ہوتی ہے اوروہ بھی گیہوں سے تیار کی جاتی ہے وگرنہ بہت سے اربابِ لغت نے تصریح کردی ہے کہ طعام کا مفہوم عام ہے)۔[2] بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ طعام بمعنی خرما ہے۔ یہ بھی بظاہر اس لئے ہے کہ اس دروا ور ماحول میں خرما (کھجور) ایک اصل غذا تھی۔

---

[1] لسان العرب، مفرداتِ راغب، مجمع البحرین اورالتحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

[2] لسان العرب، مفردات، العین اورنہایہ ابن اثیر

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

ہے اس خوانِ نعمت پہ دشمن و دوست!

ہم بارہا بتا چکے ہیں کہ عرب کے مشرکین کبھی بھی بتوں کو اپنا خالق نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کا عقیدہ تھا کہ اس کائنات کے چلانے ،انسانوں کی مشکلات کے حل کرنے اور انہیں نعمتیں عطا کرنے میں ان کا دخل ہے، کیونکہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے شفیع ہیں یا یہ کہ اس حصے میں کائنات کا چلانا ان کے ذہ لگایا گیا ہے۔ اسی لئے مندرجہ بالا آیات میں اس خرافاتی عقیدہ کی نفی کیلئے مختلف تعبیرات کے ساتھ اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ خالق اور رازق ایک ہی ہے اور ہر قسم کی روزی اسی کی طرف سے ہے۔

واضح سی بات ہے کہ جب کسی شخص کو کھانے کی دعوت دی جاتی ہے اور دسترخوان پر رنگ برنگے کھانے چنے جاتے ہیں تو وہ اپنا اولین فریضہ یہی سمجھتا ہے کہ اپنے میزبان کا شکریہ ادا کرے۔ اسی لئے وہ اپنے میزبان کو تلاش کرتا ہے تا کہ اسے پہچانے، کائنات میں تخلیقِ عالم کے دسترخوان سے بڑھ کر بھی کوئی دسترخوان ہوسکتا ہے؟ کیا ایسا دسترخوان جس پر دوست اور دشمن بیٹھ کر بہرہ ور ہوتے ہیں اس کے مالک کو نہ پہچانا جائے اور جس کی نعمتیں سر سے پاؤں تک اور ظاہر اور باطن کے طور پر ہمیں ڈھانپے ہوئے ہیں اس کا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہئے؟ یہی وجہ ہے کہ ''معرفتِ الٰہی'' اور اسی طرح اس کی شناخت کی راہوں میں سے ایک یہی رزق اور روزی ہے۔ اسی لئے سب سے پہلی آیت میں تمام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: ''اے لوگو! اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو۔'' (یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ)

''کیا خدا کے علاوہ کوئی اور خالق ہے جو تمہیں آسمان و زمین سے روزی بہم پہنچاتا ہے؟'' (هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ)

آسمان سے تمہارے لئے آفتابِ عالمتاب کی زندگی عطا کرنے والی روشنی، بارش کے حیات عطا کرنے والے قطرے اور نسیم کے روح پرور جھونکے بھیجتا ہے اور زمین سے مختلف نباتات، میوے اور دوسرا غذائی مواد اُگاتا ہے۔ زمین کے اندرونی ذخائر اور کانین ان کے علاوہ ہیں۔ اسی لئے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ''اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں اور تمہاری عبادت کی لائق بھی صرف وہی ہے ۔ پھر تم راہِ راست سے منہ کیوں موڑتے ہو اور اس عظیم خالق اور روزی رساں کی طرف پشت کر کے بتوں کے آگے کیوں سجدہ کرتے ہو؟'' (لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ)[1]

دوسری آیت میں توحیدِ ربوبیت (خدا کی وحدانیت) نیز توحیدِ عباس کے اثبات کیلئے چار چیزوں پر زور دیا گیا ہے، یعنی انسانی تخلیق

---

[1] ''تؤفکون''، ''افک'' (بروزن صفت) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اصلی حالت سے وگرگوں ہونا۔ اس لئے جھوٹ، تہمت اور حق سے باطل کی طرف انحراف کو بھی ''افک'' کہتے ہیں۔ اسی طرح ان ہواؤں کو ''مؤتفکہ'' کہتے جو اپنے مقررہ راستوں سے ہٹ کر چلتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مفردات راغب)

،اسے روزی عطا کرنے ،موت اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے جیسے مسائل ہیں۔ یہ تمام امور خدا کی طرف انجام پاتے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہرایک کا اپنا مخصوص اور پیچیدہ نظام ہے اور وہ علم وقدرت کے مبداء سے وجود میں آتا ہے۔ارشاد فرماتا ہے:

''خداوندِ عالم وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر روزی عطا کی، اس کے بعد تمہیں مارے گا اور جلائے گا۔''(اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ)

''کیا جن لوگوں کو تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو ان میں سے کوئی بھی اس طرح کے کاموں کی قدرت رکھتے ہیں۔''(هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ)

اسی لئے تمہیں اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ''وہ اس بات سے پاک و پاکیزہ اور برتر ہے کہ تم اس کا شریک قرار دو۔''(سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ)

جب ہم یہ جان لیں گے کہ ہماری پیدائش، روزی، موت اور حیات غرض سب کچھ اسی کے پاس ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت کریں اور اس کے غیر کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پیدائش اور تخلیق کا مسئلہ رزق، موت اور حیات کو شامل ہے کیونکہ ہر قسم کے رزق کی بازگشت خدائی تخلیق کی طرف ہی ہے۔ اسی طرح حیات بھی خداوندِ عالم کی خلقت اور روزی کی طرف لوٹ جاتی ہے، جب کہ موت، زندگی کے واپس لے لئے جانے کا نام۔ بنابریں ان تین چیزوں پر ہی اکتفا کرنا اس لئے کافی ہے کہ یہ تخلیق کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، بلکہ اس کلی موضوع کے اہم مصداق ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا، اگرچہ مشرکین عرب کے نزدیک قابلِ قبول نظریہ نہیں تھا،لیکن یہ آیت اس استدلال کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ پہلی تخلیق اور اوائل کار میں حیات کی نعمت بروزِ قیامت اس کے تکرار کی روشن دلیل ہے۔ بلکہ اگر ہم اچھی طرح غور وفکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ موت وحیات کا مسئلہ تو اسی دنیا میں بھی مستقل طور پر جاری وساری ہے۔ ہر سال اور ہر مہینے میں بلکہ ہر زور ہر گھڑی انسانی وجود موت اور حیات کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ ہزارہا خلیے مر رہے ہیں تو ہزارہا پیدا ہو کر اُن کے جانشین بن رہے ہیں اور معاد کا مسئلہ دائمی صورت میں اسی دنیا میں موجود ہے۔ پھر اگر یہ کہہ دیا جائے کہ آخرت میں تمام مردے نئی زندگی کی طرف آئیں گے تو اس میں تعجب کیسا؟

تیسری آیت میں جو کہ توحیدی آیات کی لڑی میں واضع ہوئی ہے اور آسمان وزمین میں توحید کی نشانیوں کا پتہ بتارہی ہے، ایک بار پھر تین چیزوں کو تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، تخلیق کا آغاز، اس کی بازگشت اور آسمان وزمین سے انسان کو روزی کی فراہمی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے''کیا تمہارے معبود بہتر ہیں یا وہ جس نے تخلیق کا آغاز کیا اور پھر اسے پلٹادے گا؟''(اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ)[1] اور وہ

---

[1] اس جملے کا ایک محذوف ہے کہ جو سابقہ (اسی سورت کی ۵۹ ویں آیت) کے قرینہ سے واضح ہوتا ہے اور تقدیری طور پر یوں ہے''امن یبدؤالخلق ثم یعیدہ۔۔۔۔خیرام مایشرکون''(کیا جس خدا نے آفرینش کا اغاز کیا ہے۔۔۔۔۔بہتر ہے ان کے معبود؟)

جواس آغاز اوراس کے بازگشت کے درمیانی وفقہ میں آسمان اورزمین سے تمہیں روزی عطا کرتا ہے۔''(وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ) آخر میں فرماتا ہے''پھر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟''(ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ)''آپ کہہ دیں کہ میں نے تو خدا کی الوہیت کی دلیل پیش کردی ہے۔اگر تم سچ کہتے ہوتو اپنی دلیل لے آؤ''(قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ)

بالفاظ دیگر''یہ وہ برکتیں ہیں جن کا براہِ راست تعلق خداوندِ عالم کی پاک ذات سے ہے۔لیکن ہرخوبی سے عاری بتوں سے کسی خیراور برکت کی اُمید نہیں رکھی جاسکتی،ان کا لائق عبادت ہونا تو دور کی بات ہے۔''

اس آیت میں''خیر''(بہتر) کی تعبیر جو کہ اس میں محذوف ہے اور سابقہ آیات کے قرینہ کی رو سے معلوم ہوتی ہے،اس لئے نہیں ہے کہ بتوں میں کسی قسم کا فائدہ اور خیروخوبی پائی جاتی ہے جو خدا کے مقابلے میں کم ہے۔بلکہ یہ تعبیر اس جگہ پر بھی استعمال ہوتی ہے جہاں پر کسی قسم کی خیروخوبی کا سروکار نہیں ہوتا،مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں غذا سے پرہیز کروتا کہ صحیح سالم رہو،کیا تندرستی بیماری سے بہتر نہیں ہے؟''ظاہری بات ہے کہ بیماری کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے جس سے تندرستی بہتر ہو۔قرآن مجید میں بھی ہے''وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ''(مومن بندہ ،مشرک اور بت پرست سے بہتر ہے۔بقرہ/۲۲۱)

ایک اور جگہ فرماتا ہے''قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ''(کہہ دو کہ آیا دوزخ کے دردناک عذاب بہتر ہیں یا جاودانی بہشت؟)(فرقان/۱۵)

خلاصہ کلام لفظ''خیر''اگرچہ''افعل التفضیل''کا صیغہ ہے اور اس کو دو چیزوں کے بارے میں استعمال ہونا چاہیے جن میں سے ایک خوب ہوتی ہے اور دوسری خوب تر،لیکن بہت سے مقامات پر مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو غوروفکر میں ڈال دیا جائے اور اسے باور کرایا جائے کہ اس نے جس چیز کا انتخاب کیا ہے اس میں کسی قسم کی اچھائی اور خوبی نہیں ہے۔

معاد کے مسئلہ پر زیادہ تاکید جب کہ مشرکین اس پر ایمان نہیں رکھتے تھے،اس لئے ہے کہ پہلی تخلیق،معاد کی دلیل ہے۔

چوتھی آیت میں یہی بات ایک اور طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے''اگر خداوندِ عالم اپنا رزق تم سے روک لے تو پھر کون ہے جو تمہیں روزی دے؟(اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ)[1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا کے حکم سے ایک سال آسمان سے بارش نہ برسے تو زمین سے کسی قسم کی نباتات نہ اُگنے پائے گی،خشک اور قحط سالی ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔کیا یہ بت یا کوئی اور چیز اس بات پر قادر ہوگی کہ تمہیں روزی بہم پہنچائے؟ یا اگر آسمانی روحانی،یا معنوی روی منقطع ہوجائے تو تمہیں کون ہدایت کرسکتا ہے؟ ظاہری بات ہے کہ ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ پھر بت پرست اس بیہودہ عقیدہ پر کیوں اڑے ہوئے ہیں؟ کیا یہاں ہٹ دھرمی،ضد اور تعصیب کے علاوہ کوئی اور عامل ہے؟ اس لئے تو آیت

---

[1] اگرچہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت میں محذوف موجود ہے لیکن بظاہر موجود نہیں ہے اور اس کے معنی یوں ہیں۔''ان امسك الله رزقه من هذا الذی یرزقکم''اور یہاں پر''ام''''بل''کے معنی میں ہوگا۔(غور کیجئے گا)

کے آخر میں فرماتا ہے ''بلکہ وہ تو سرکشی اور حقیقت سے فرار پر اڑے ہوئے ہیں۔''(بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ)[1]

پانچویں آیت میں رزق کے مسئلے کے بارے میں ایک اور نکتے کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ بات ذہن نشین کرائی جارہی ہے کہ رزق کی کشادگی یا تنگی خدا کی منشاء کے مطابق ہوتی ہے۔ فرمایا ہے ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خداوندِ عالم جس کے لئے چاہے روزی کو کشادہ کردیتا ہے اور جس کیلئے چاہے تنگ کردیتا ہے۔''(اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ)

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی کوشش وتلاش، لیاقت اور شائستگی بھی رزق وروزی کے حصول میں بڑی حد تک موثر ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور جو لوگ اس کی تلاش میں لگے رہتے ہیں انہیں اس کا کافی حد تک حصہ ملتا ہے جب کہ سُست اور کاہل افراد اس سے کمتر حصہ پاتے ہیں لیکن پھر بھی اس سلسلے میں مستثنیات زیادہ ہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپاہج اور بے دست و پا افراد کو بڑی حد تک روزی ملتی ہے جب کہ روزی کی لگن میں افراد کو بڑی حد تک ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور عرب کے مشہور شاعر کے بقول:

كم عاقل عاقل اعييت مذاهبه
وجاهل جاهل تلقاه مرزوقاً

کتنے عقلمند اور زیرک انسان ایسے ہیں جن پر زوری کی رائیں مسدود ہیں جب کہ بہت سے بے عقل اور نالائق افراد مختلف قسم کی روزی سے بہرہ مند ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ انسان صرف عالمِ اسباب ہی میں کھو کر نہ رہ جائے اور اسے معلوم جانا چاہیے کہ اس کے پیچھے دستِ قدرت بھی کارفرما ہے جو تمام طاقتوں سے بالاتر ہے۔ نیز صاحبانِ ثروت اور تمام وسائل سے بہرہ مند ہونے والے لوگ بھی مغرور نہ ہوں اور سرکشی اور غرور کی رائیں نہ اپنائیں، اسی طرح تنگدست افراد مایوس اور ناامید نہ ہوں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی بھی وقت خدا کے ارادے اور مشیت سے حالات پلٹا کھالیں۔

بالفاظ دیگر ہر انسان کو رزق اور روزی فراہم کرنے کیلئے بیسیوں اسباب باہم جمع ہوں تا کہ انہیں روزی میسر ہو جن میں سے ایک انسان کی اپنی سعی وکوشش بھی ہے۔ بلکہ سعی وکوشش پر اس کی قدرت بھی اور اس کا موجب بھی خدا ہے۔ اس مقام پر انسان روزی کی تنگی یا وسعت کا مسئلہ خدا کی ذات کی طرف لے جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآنِ مجید اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ''اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں۔''(اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ)

وہی جو اپنے ایمان کی وجہ سے حق کے قبول کرنے کی آمادگی رکھتے ہیں اور ان آیات کو دیکھ کر روز بروز خدا سے زیادہ آشنا ہوتے جاتے ہیں۔ درحقیقت مندرجہ بالا آیت جس کا مضمون اور مواد قرآن کی دس آیات میں دہرایا گیا ہے اس بات سے ملتی جلتی ہے جو حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمائی ہے کہ: ''عَرَفْتُ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ بِفَسْخِ الْعَزَآئِمِ وَحَلِّ الْعُقُوْدِ وَنَقْضِ

---

[1] ''لجوا''، ''لجاجت'' کے مادہ سے ہے اور ''عتو'' کا معنی سرکشی ہے اور ''نفور'' کا معنی کسی چیز سے دوری اور فرار ہے۔

الْهِمَمْ ''میں نے اللہ سبحانہ،کوارادوں کوٹوٹنے،گرہوں کے کھلنے اورہمتوں کے ناکارہ ہوجانے کی وجہ سے پہچانا۔[1]

اس بات سے بھی ملتی جلتی ہے جسے بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ ایک عالم سے پوچھا گیا کہ خداوندِ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے وجود کی کیا دلیل؟اس نے فرمایا:

''تین دلیلیں ہیں،یعنی (۱) بہت سے عقلاء کی ذلت ورسوائی۔(۲)لائق اورشائستہ افراد کی غربت وتنگدستی اور۔(۳)حکیموں کی بیماری۔یعنی''ذُلُّ اللَّبِيْبِ وَفَقْرُ الْاَدِيْبِ وَسَقْمُ الطَّبِيْبِ''[2]

''اَوَلَمْ يَرَوْا''(آیاانہوں نے نہیں دیکھا) کی تعبیراس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگرانسان لوگوں کی زندگی کے بارے میں تھوڑاسا غوروفکرکرے تواس طرح کے نشیب وفراز کا بخوبی مشاہدکرسکتا ہے۔اس نکتے کو بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ خدا کی مشیت اوراس کے ارادے سے روزی کی تنگی یاوسعت یاتعلق ایسی مشیت کے معنی میں ہے جس میں اس کی حکمت کارفرماہوتی ہے،ورنہ نہ تو یہاں اورنہ ہی کسی اورموقعہ پرغرض کہیں بھی اس کی مشیت،حکمت اورحساب سے خالی نہیں ہوتی ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس آیت میں (اوردوسری دس آیات میں)روزی کی تنگی کا مطلب روزی سے مطلقاً محرومی نہیں ہے ، تاکہ سورہ ہودکی چھٹی آیت وغیرہ کے اس کا تضاداورمنافات نہ ہو،جس میں فرماتا ہے''وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلاَّ عَلَى اللهِ رِزْقُهَا''(زمین پر ہرچلنے والے کی روزی کا ذمہ خداپر ہے)،بلکہ یہاں پرروزی کے وجود کے ساتھ ہی اس میں محدودیت اورقلت مراد ہے۔

چھٹی آیت میں پہلے تواس نکتہ پرتاکید کرتا ہے کہ خداوندِ عالم کو بندوں کی ضرورت نہیں ہے۔اگروہ انہیں اپنی بندگی اوراطاعت دیتا ہےتواس لئےنہیں کہ اسے ان کی عبادت واطاعت کی ضرورت ہے(سورہ ذاریات/۵۶۔۵۷)فرماتا ہے کہ صرف خداوندِ عالم ہی روزی عطا کرنے والااورصاحبِ قوت وقدرت ہے''(اِنَّ اللهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ)

''رزّاق''مبالغہ کا صیغہ ہےجس کے معنی ہیں بہت زیادہ روزی دینے والا،اوریہ صرف خداوندِ عالم کی ذات پاک پرہی صادق آتا ہے جواس وسیع کائنات کے ہرگوشے اورکنارے میں ، پہاڑاوں کی بلندوبالاچوٹیوں پر، پتھروں کے دلوں کے اندر،پہاڑکے درّوں اورتاریک غاروں میں ،سمندروں کی گہرائیوں میں ،غرضیکہ کائنات کے ایک ایک گوشے میں ہرزندہ موجودکوروزی بہم پہنچاتا ہے اوروہ اس کے فیض عام سے بہرہ مندہورہے ہیں۔چونکہ اس قسم کی عطااوربخشش اوربے حدوحساب احسان وفضل کیلئے بے انتہا قدرت اورمکمل قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی لئے اس وصف کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ وہ ''ذوالقوّة''(قدرت)اور''المتین''(بہت بڑی طاقت)کا مالک ہے۔

''متین''،''متن''کے مادہ سے ہےجس کا معنی وہ دوطاقت ورپٹھے ہیں جو پیٹھ کے مہروں کے دنوں طرف واقع ہیں اورانسان کی

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ص ۲۵۰

[2] تفسیر روح البیان جلد ۷ ص ۳۹

پشت کو بھاری کاموں کے انجام دینے کیلئے محکم کرتے ہیں۔ یہاں پر حد سے زیادہ قدرت اور طاقت سے کنایہ ہے۔ یہ جملہ درحقیقت روزی عطا کرنے کے طریقوں میں اس کی پاک ذات کی توصیف بیان کررہا ہے، کیونکہ یہ صفت صرف اسی ہی کی پاک ذات کے ساتھ خاص ہے۔ دوسروں کے پاس جو کچھ بھی ہے اُسی سے لیا ہوا ہے۔ اگر بعض لوگوں یا طبعی اسباب کو ''روزی رسان'' کی صفت سے موصوف کیا جاتا ہے تو درحقیقت وفیض کے انتقال میں واسطہ کے معنی میں ہوتے ہیں نہ کہ خود فیاض اور نعمت آفرین۔

ساتویں آیت میں ایک اور نکتے کو بیان کیا گیا ہے وہ ہے خدا کی رزق کی ہر چلنے پھرنے والے تک رسائی، اور یہ وہ کام ہے جو کائنات کی تمام چیزوں کو مکمل طور پر جانے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔ میزبان پہلے ہی سے مہمانوں کی تعداد، ان کی ضرورت کی مقدار اور ان سے برتاؤ کے طریقوں کا علم رکھتا ہو، تاکہ مناسب طور پر اُن کی خاطر تواضع کرسکے۔ اسی لئے اس آیت میں فرماتا ہے ''روئے زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں ہے جس کا رزق اور روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔'' (وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ الْاَرْضِ اِلاَّ عَلَى اللهِ رِزْقُهَا)

اس تعبیر سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اس نے تمام بندوں کی روزی اپنے ذمہ لی ہوئی ہے تاکہ اس طرح ایک تو کچھ لوگوں کے حرص اور لالچ کا سدباب کیا جاسکے اور دوسرے کچھ لوگوں کا بعض دوسرے افراد پر ظلم وستم، اُن کے حقوق کا غصب، ذخیرہ اندوزی، مصنوعی قلت کی ایجاد یا کم از کم خدا کے اس وسیع دسترخوان سے استفادہ کرنے کیلئے تلاش وکوشش کا ترک کردینا۔ غرض یہ ایسے عوامل اور اسباب ہیں جو تواکیلے اور فی نفسہ یا دوسرے اسباب کے ساتھ ملکر کچھ لوگوں کی ان کی رزق وروزی سے محروم ہوجانے کا موجب بن جاتے ہیں، وگرنہ خدا نے تو ہر چلنے والے کی روزی اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ چونکہ انہیں روزی کا پہنچانا، ان کے ٹھکانوں اور ان خصوصیات کو مکمل طور پر جانے بغیر ممکن نہیں ہے لہٰذا فرماتا ہے ''وہ ان ٹھکانوں اور آنے جانے کی جگہوں کو اچھی طرح جانتا ہے'' (وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا)

''یہ سب کچھ ایک واضح اور آشکارا کتاب (لوح محفوظ، لوحِ علمِ پروردگار) میں درج ہے'' (كُلٌّ فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ)

''دابّة''، ''دبیب'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی آہستہ آہستہ چلنا ہیں۔ یہ لفظ (دابہ) چلنے والوں، جانوروں اور حشرات الارض پر بولا جاتا ہے۔ ہرچند کہ بعض تعبیرات میں خاص طور پر گھوڑے کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن مسلم ہے کہ یہاں پر اس کے وسیع معنی مراد ہیں جو تمام چلنے والوں کو شامل ہے۔[1]

''مستقر'' کے لفظ کا معنی رہائش گاہ اور مستقل ٹھکانہ ہے۔ یہ دراصل ''قُر'' (بروزن حُر) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی سخت سردی ہیں جس سے انسان گھر میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔

''مستودع'' کا معنی ''غیر مستقل ٹھکانہ ہے'' جو ''ودیعة'' کے مادہ سے لیا گیا ہے، جس کے اصل معنی کسی چیز کا ترک کرنا اور اسے چھوڑ دینا ہیں، اسی لئے ناپائیدار امور کو ''مستودع'' کہا جاتا ہے۔

یہ تعبیرات اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ خداوندِ عالم مخلوقات کی روزی صرف ان کے گھروں میں ہی انہیں بہم

---

[1] تفسیر فخر رازی جلس ۱۷ ص ۱۸۵

پہنچاتا ہے بلکہ وہ جہاں بھی ہوں اور زمین وآسمان کے جس کسی کونے میں بھی رہتے ہوں، خدا ان کی ہر ہر جگہ کو جانتا ہے، انہیں دیکھتا ہے اور ان کی روزی وہیں پر ان کے حوالے کرتا ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے ذیل میں بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی (اور وہ بیابان اور طوروادی میں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ تھے) جس میں انہیں حکم ملا کہ وہ فرعون کے پاس جائیں، لیکن اس وقت ان کی توجہ اپنے بیوی بچوں کی طرف تھی کہ ان کا کیا حال ہوگا؟ خداوندِ عالم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنا عصا چٹان پر ماریں۔ چنانچہ چٹان شگافتہ ہوئی جس سے ایک اور چٹان ظاہر ہوئی۔ انہوں نے اس پر پھر عصا مارا تو وہ بھی شگافتہ ہوگئی۔ اس کے اندر سے تیسری چٹان نکلی جس پر انہوں عصا مارا تو دیکھا کہ اس کے اندر چیونٹی کے برابر ایک کیڑا ہے جس کے منہ غذا جیسی چیز ہے جسے وہ کھا رہا ہے۔ اس وقت خداوندِ عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کانوں سے پردے اٹھا دیئے تو انہوں نے سنا کہ کیڑا یوں کہہ رہا ہے:

''سُبْحَانَ مَنْ یَّرَانِیْ ،وَیَسْمَعُ کَلَامِیْ، وَیَعْرِفُ مَکَانِیْ، وَیَذْکُرُنِیْ وَلَایَنْسَانِیْ'' پاک ہے وہ ذات جو مجھے دیکھ رہی ہے، میرا کلام سن رہی ہے، میری رہائش کی جگہ کو جانتی ہے، مجھے یاد رکھتی ہے اور مجھے فراموش نہیں کرتی۔ [1]

نیز ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ایک تلوار تھی جس پر یہ چار جملے لکھے ہوئے تھے: ''اَلرِّزْقُ مَقْسُوْمٌ وَالْحِرِیْضُ مَحْرُوْمٌ ،وَالْبَخِیْلُ مَذْمُوْمٌ، وَالْحَاسِدُ مَغْمُوْمٌ'' رزق تقسیم شدہ ہے، لالچی شخص محروم ہے، بخیل قابل مذمت ہے اور حاسد مغموم ہے۔ [2]

اس گفتگو کو ہم شعرائے عرب میں سے ایک شاعر کے دو اشعار پر ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں ؎

کیف اخاف الفقروالله رازقی
ورازق هٰذا الخلق فی العسروالیسر
تکفل بالارزاق للخلق کلهلم
وللضب فی البیداء وللحوت فی البحر

میں فقرہ تنگدستی سے کیوں ڈروں جب کہ خدا میرا بھی روزی دینے والا ہے اور دوسری تمام مخلوقات کا بھی روزی دینے والا ہے، سختی میں بھی اور آسانی میں بھی۔ وہ تمام مخلوق کی روزی اپنے ذمہ لئے ہوئے ہے، حتیٰ کہ سوسمار کو خشک صحرا میں اور مچھلی کی سمندر و دریا میں روزی دیتا ہے [3]

آٹھویں آیت میں گویا مشرکین کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے ان کے عقیدہ کے باطل ہونے کو کائنات کی ہر چیز کو روزی

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۱۷ ص ۱۸۶، تفسیر روح البیان جلد ۴ ص ۹۷، تفسیر روح المعانی جلد ۱۲ ص ۲

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۴ ص ۹۷

[3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۵۱۸ مادۂ ''رزق''

پہنچانے کے ذریعہ روشن اور واضح کرتا ہے اور توحید ربوبیت کو آشکارا کرتے ہوئے فرماتا ہے، ''ان سے پوچھو کہ تمہیں آسمانوں اور زمین سے کون روزی عطا کرتا ہے'' (قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)

سورج کی روشنی سے، بارش کے زندگی بخش قطروں سے، اس زندگی آفرین ہوا سے اور اسی طرح مختلف غذائی مواد سے جو تاریک مٹی کے دل میں چھپے ہوتے ہیں اور میووں، غلوں اور انواع واقسام کی سبزیوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر ان کے کسی قسم کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے'' کہہ دو کہ خدا ہے جو ہمیں یہ سب روزیاں عطا کرتا ہے'' (قُلِ اللّٰهُ)

''بنا بریں ہم یا تم میں سے ایک ہدایت پر اور دوسرا واضح گمراہی پر ہے۔'' (وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ)

کیونکہ دو متضاد عقیدے باہم اکٹھے نہیں ہو سکتے اور چونکہ تم بتوں کے برکات کا سرچشمہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں رکھتے، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور تم کھلم کھلا گمراہی میں ہو۔ اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے جواب کے انتظار میں نہیں بیٹھتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعاً ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، سوائے شرمساری بھرے سکوت کے، اسی لئے اس قسم کے مقامات پر ایک فصیح مقرر کو از خود سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے جواب بھی خود دینا چاہیے۔

فنون فصاحت میں سے ایک فن یہ بھی ہے کہ بعض مقامات پر مدِ مقابل کے ساتھ سربستہ گفتگو کی جاتی ہے اور اس کا فیصلہ خود انہی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی فرماتا ہے'' کہہ دو ہم یا تم میں سے ایک ہدایت پر ہے اور دوسرا آشکار گمراہی پر۔'' یقینی بات ہے کہ یہاں پر گمراہ شخص بھی معین تھا اور ہدایت یافتہ بھی معین تھا۔ اور کس قدر بہتر بات ہے کہ ظاہری عبادت سربستہ راز رہے تا کہ ان کی ہٹ دھرمی کی حس بھی نہ پھڑکے اور نتیجہ نکالنا بھی انہی کے ذمہ رہے۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض مفسرین نے اس جملہ کو ''تقیہ'' پر محمول کیا ہے جب کہ یہاں پر تقیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور بات ۔۔۔۔۔۔۔ بڑی لطافت کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بیان کردی گئی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پہلے تو فرماتا ہے ''ہم'' اور پھر کہتا ہے ''تم'' اور اس کے بعد فرماتا ہے ''ہدایت'' پر یا ''گمراہی'' پر ہیں۔ یہ ترتیب بھی بات کو مزید واضح کر رہی ہے۔

نویں آیت میں پہلے تو آسمان سے بابرکت پانی نازل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پھر روزی کے تین عمومی فوائد پر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے ''ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ باغات اور اناج اُگائے جو تم کاٹتے ہو۔'' (وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ) اور بلند قامت کھجوروں کو بھی کہ جن کے میوے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ (وَالنخل باسقاتٍ لها طلعٌ نضيدٌ [1])

''یہ سب کچھ بندوں کی روزی کیلئے ہے'' (رِزْقًا لِّلْعِبَادِ)

---

[1] ''حصید'' کا معنی کٹا ہوا (یا کٹنے کے قابل) ہے۔ ''باسقات'' م ''باسقۃ'' کی جمع ہے جس کا معنی بلند ہے۔ ''طلع'' کے معنی درخت خرما کا وہ پھل ہوتا ہے جو آغاز پیدائش میں ہوتا ہے۔ اور ''نضید'' کا معنی جڑا ہوا اور کثیر تعداد میں'' ہے جو خاص طور پر درخت خرما پر ہی قابلِ دید ہوتا ہے۔

درحقیقت اس آیت میں خاص طور پر میوہ جات اور غذائی اناجوں پر خاص طور پر تاکید کی گئی ہے جو انسانی غذا کا اہم ترین اور صحیح وسالم ترین حصہ ہیں، پھل میووں میں سے خرما پر زیادہ تاکید کی گئی ہے کیونکہ اس میں غذائی مواد سب سے زیادہ ہوتا ہے جس کے بارے میں ہم بڑی تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔[1]

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ رزق اور روزی کی ان تین قسموں پر زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ ان میں کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو صرف انہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کیونکہ بعض نباتات ایسی ہیں جو ہر سال پھل دیتی ہیں اور نئے سرے سے بیج ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے جیسے کئی پھلدار درخت ہیں اور کچھ ایسی ہیں جن کے لئے ہر سال بیج ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔، جیسے دانے دار غذائی نباتات (مثلاً گندم، جُو، چاول اور مکئی وغیرہ) اور کچھ ایسی ہیں جو ان دونوں کے درمیان درمیان ہیں، جیسے خرما کا درخت، جس کا اصل تو ثابت اور برقرار ہے لیکن ہر سال ''گردہ ڈالنے POLLINATION کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ نر کے سفوف یا گردے POLLEN کو لے کر مادہ کے ثمر پر چھڑک دیتے ہیں تاکہ وہ مکمل طور پر بارور ہو جائے، البتہ ایسا کئے بغیر بھی ان کا بارور ہونا ممکن ہے (ہواؤں اور حشرات کے ذریعہ سے) لیکن صحیح معنون میں بارور نہیں ہوں گی۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "رِزْقًا لِّلْعِبَادِ"[2] کی تعبیر اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ خدائی نعمتوں کو اس کی بندگی اور عبادت کی راہوں میں کام میں لانا چاہیئے۔ یہ تمام موجودات بطور کامل انسان کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے اس کے تابع فرمان ہیں تاکہ وہ رزق حاصل کر کے غفلت کے ساتھ نہ کھائے۔ بقول شاعر ؎

خوردن برای زیستن وذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

کھانا جینے اور خدا کو یاد کرنے کیلئے ہے۔ تو نے سمجھ رکھا ہے کہ جینا کھانے کیلئے ہے۔ اسی سلسلے کی دسویں اور آخری آیت میں ان مختلف غذاؤں پر زیادہ تاکید کی گئی ہے جنہیں خداوندِ متعال نے انسانوں اور جانوروں کے اختیار میں دے رکھا ہے اور انسان کو ان کے بارے مطالعہ کی دعوت دی ہے تاکہ ایک تو اس کی شکرگزاری کی حس کو اجاگر کیا جائے اور پھر اس کے ساتھ ہی منعم حقیقی کی پہچان اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی معرفت کیلئے آمادہ کرے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ''انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کی طرف دیکھے'' (فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ)

ذرا دیکھو تو سہی سورج، زمین، ہوا اور بارش جیسے مختلف عوامل ایک دوسرے سے مل کر رزق وروزی کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔ یہ سب نعمتیں انسان کے اختیار میں آتی ہیں۔ اور یہ بھی دیکھے کہ کس طرح ''ہم نے آسمان سے زیادہ مقدار میں پانی نازل کیا ہے، پھر زمین کو شگافتہ کیا ہے اور اس سے کھانے کے اناج بڑی مقدار میں پیدا کئے ہیں؟'' (أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا)

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۳ میں سورہ مریم کی ۲۵ آیت کا مطالعہ کریں

[2] ''رزقًا''، ''مفعول لہ'' ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور ''مفعول مطلق'' یا ''حال'' کا احتمال بہت بعید ہے۔

''اسی طرح انگور اور بڑی تعداد میں سبزیاں''(وَعِنَبًا وَّقَضْبًا)[1]

اور زیتوں اور نخل اور درختوں بھرے باغات اور میوہ اور چراگاہ(وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا)[2]

اگرچہ ''فاکھۃ'' بمعنی ''میوہ'' ہے جو ہر قسم کے میوں کو شامل ہے اور ''حدائق'' کا معنی ''باغات'' ہے، جس میں ہر قسم کے باغات شامل ہیں۔ تاہم ''انگور''، ''زیتون'' اور ''خرما'' کا خصوصی ذکر اس لئے ہے کہ ان تین میووں کے بہت اہم خواص ہیں اور آج علمِ غذا شناسی نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

اگرچہ ''طعام'' عام طور پر جسمانی طعام کے معنی ہے، خاص کر اس آیت میں، کیونکہ اس کے بعد مادی غذا اور میوہ جات اور خورا کی اناجوں کا ذکر آیا ہے، لیکن جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے طعام کے وسیع معنی ہو سکتے ہیں جو کہ معنوی طعام کو بھی شامل ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اچھی طرح نگاہ کرے کہ وہ جس علم و دانش کو حاصل کرنا چاہتا ہے کس سے حاصل کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں زہریلی تعلیمات نہ ہوں۔

اس آیتِ شریفہ کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ ''فلینظر'' (چاہیے کہ دیکھے) کا جملہ ہوسکتا ہے کہ مبدأ اور معاد کے اسرار پر غور کرنے کو بھی شامل ہو اور خبیث و ناپاک سے پاک و پاکیزہ کو ناجائز سے جائز کو اور مضر اور نقصان دہ سے مفید اور فائدہ مند نوع کو انتخاب کرنے کو شامل ہو۔ ان آیات کی تشریح میں کچھ بتایا گیا ہے اس سے مجموعی طور پر بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ خداوندِ عالم کی خداداد مختلف روزیاں اس کی آیت اور اس کی عظمت کے آثار ہیں۔ ان کی ساخت میں استعمال ہونے والا محیر العقول نظم، ہر ایک پر حکم فرما خصوصیت، ہر ایک میں موجود حیاتیاتی مواد اور اسی طرح ان زرقوں کو ضرورت مندوں تک پہنچانا اور ان کی ضروریات کی تشخیص کرنا، غرض ان میں سے ہر ایک اس کی ذاتِ پاک کی حکمت اور عظمت کی ایک ایک آیت اور نشانی ہے۔

چند ضروری توضیحات

۱۔ رزق کی دنیا میں محیر العقول کارنامے

یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم دنیا میں موجود چیزوں کے طبعی منابع سے روزی حاصل کرنے کے بارے میں قدرے غور و فکر سے کام لیں تو پروردگار عالم کی قدرت کے بڑے دلچسپ اور حیرت انگیز نکتے ہم پر روشن ہوں گے۔ سب سے پہلی بات جو دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ روئے زمین پر موجود غذائی مواد محدود ہونے کے باوجود ہزاروں، لاکھوں سال سے انسانوں اور جانوروں کے استفادہ کے باوجود کم نہیں ہوتا، آخر کیوں

---

[1] ''قضب''(بروزن جذب) جس کا معنی کاٹنا اور چننا ہے اور مفسرین نے اس کی تفسیر ان سبزیوں سے کی ہے جنہیں کئی بار چنا جاتا ہے۔

[2] ''حدائق''، ''حدیقہ'' کی جمع ہے جس کا معنی وہ باغات ہیں، جس کے اطراف میں دیوار کھینچ کر اسے محصور کر دیا جائے۔ ''غلب''، ''اغلب'' کی جمع ہے جو ''غلبہ'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہٹا کٹا اور موٹا تازہ ہیں، اور ''اب'' کا معنی خودرو گھاس یا طبعی چراگاہیں ہے یا وہ میوے ہیں جنہیں سکھایا ذخیرہ محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

؟ یہ بے دریغ جوانِ نعمت جو ہر جگہ پھیلا ہوا ہے، ختم ہونے میں نہیں آتا، آخر کس لئے؟

جب ہم اچھی طرح غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا غذائی مواد اپنی ایک مخصوص صورت رکھتا ہے کہ اگر کروڑوں اربوں سال تک بھی اس سے استفادہ کیا جاتا رہے تو پھر بھی سوئی کی نوک کے برابر اس میں کمی واقع نہ ہو اور یہ سب کچھ اس کی ''دورانی گردش'' کی وجہ سے ہے۔ مثلاً پانی، سمندر سے بخارات میں تبدیل ہو کر بادل اور بارش کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس کا ایک حصہ پھر سمندر میں چلا جاتا ہے، ایک حصہ انسانوں جانوروں اور نباتات کے بدن کا جزُ بن جاتا ہے اور وہ بخارات میں تبدیل ہو کر فضا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ دورانی گردش کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ درخت زمین سے غذائی مواد کو حاصل کرتے ہیں جس سے اُن کی شاخیں اور پتے پروان چڑھتے ہیں، پتے جھڑتے ہیں تو گل سڑ کر کھاد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پھر انہی درختوں کیلئے غذائی مواد کا کام دیتے ہیں۔ جانور غذائی مواد سے استفادہ کرتے ہیں اور پھر مٹی بن کر زمین کے غذائی مواد میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

انسان اور جانور سانس کے ذریعہ ''آکسیجن'' اپنے اندر لے جاتے ہیں اور ''کاربن ڈائی آکسائیڈ'' خارج کرتے ہیں جب کہ درخت اس کے برعکس عمل کرتے ہیں۔ وہ ''کاربن ڈائی آکسائیڈ'' استعمال اور ''آکسیجن'' خارج کرتے ہیں اور یہ باہمی تبادلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہیں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا یہ بچھایا ہوا دسترخوان ہمیشہ سے بچھا ہوا ہے اور آئندہ بھی بچھا رہے گا۔ تمام زندہ مخلوق اس خوانِ نعمت پر بیٹھی اپنا رزق کھا رہی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی وجود میں نہیں آتی۔ مختلف نباتات کی روزی کے حصول کا طریقہ کار بھی عجیب ہے بعض نباتات، غذائی مواد اور رطوبتیں زمین سے حاصل کرتی ہیں بعض پانی سے (جیسے تیرنے والی گھاس) بعض ہوا سے اور بعض دوسری نباتات کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے (جیسے آکاس بیل وغیرہ)

سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والے جانور ایسی جگہ زندگی بسر کرتے ہیں جہاں گھاس وغیرہ کا نام ونشان تک نہیں ہوتا۔ کیونکہ سورج کی شعاعیں زیادہ سے زیادہ چھ یا سات سو میٹر تک مکمل طور پر مٹ جاتی ہیں اور اس کے بعد مکمل پر سمندر کے پانی پر تاریک اور جاودانی رات کی حکمرانی ہوتی ہے، لیکن خداوندِ عالم ان کی روزی کا بھی بندوبست کرتا ہے، وہ اس طرح کی سطح سمندر پر وہ تیار ہوتی ہے اور سمندر کی گہرائیوں میں بھیج دی جاتی ہے جو نباتات بڑی تعداد میں موجوں کے درمیان اور سورج کی روشنی کے مقابل پرورش پاتی ہیں، جب وہ قابلِ استفادہ ہو جاتی ہیں تو سطح سمندر میں موجود زندہ مخلوق کو ان کا حصہ دیتی ہیں اور باقی بوجھل ہو کر اس کی گہرائیوں میں از خود چلی جاتی ہی، اسی طرح سطح سمندر پر باقی رہ جانے والی زندہ مخلوق بھی آسمانی فائدہ کی صورت میں سمندر کی گہرائیوں میں موجود زندہ مخلوق کی طرف بھیج دی جاتی ہے۔

کبھی ہوا کے پرندوں کو دریا کی مچھلیوں کے نصیب میں کر دیا جاتا ہے تو کبھی دریا کی مچھلیوں کو ہوا کے پرندوں کے نصیب میں کبھی نباتات کو حیوانات کی غذا قرار دیا جاتا ہے تو کبھی گوشت خور نباتات کیلئے جانوروں کو اُن کی غذا بنایا جاتا ہے، کبھی ایک مخلوق کی بچی ہوئی اور اس کیلئے مشکل پیدا کر دینے والی غذا کو دوسری مخلوق کیلئے لذیذ غذا بنا دیتا ہے (مثال کے طور پر بعض سمندری مگر مچھ، مچھلیاں کھاتے ہیں۔ اس غذا سے ان کے دانتوں میں کچھ بچ رہتی ہے۔ پھر وہ ساحل پر آجاتے ہیں اور اپنی غاز نما منہ کھول دیتے ہیں۔ ساحلی پرندوں کا ایک دستہ ان کے منہ کے اندر چلا جاتا ہے اور وہ ان کے دانتوں میں بچے کھچے گوشت کو کھانا شروع کر دیتے ہیں جو ان کی لذیذ غذا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ان کیلئے

مسواک کا کام دیتے ہیں اور وہ بھی ان کے اس تعاون کی قدر کرتے ہیں جب تک آخری پرندہ ان کے منہ سے باہر نہیں آجاتا اپنا منہ بند نہیں کرتے۔ جب تمام کام مکمل ہوجاتا ہے اور مشکل پیدا کرنے والی غذا مکمل طور پر ختم ہوجاتی ہے۔ جب پرندے بھی اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں تو وہ جانور اپنا منہ بند کرکے دوبارہ پانی کے اندر چلا جاتا ہے۔[1]

قصہ مختصر یہ کہ ہم جس قدر اس مسئلہ کی گہرائی میں جائیں خالقِ کائنات کے علم وحکمت اور رزق رساتی کی تدبیر کے سلسلے میں اسی قدر تازہ ترین نکات ہمیں حاصل ہوں گے، اور وہ بھی اس طرح کہ ''اچانک'' ہر قسم کے احتمال کی نفی کریں گے۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم انسان کے تین ادوار کے بارے میں دورِ جنین (دورِ رضاعت یا دودھ پینے کا دورانیہ اور غذا کھانے کا دورانیہ) غور وفکر کریں کہ کس طرح خداوندِ عالم اس کے حال کے مطابق ان تین حساس مراحل میں بغیر کسی کمی وپیشی کے اسے غذا بہم پہنچاتا ہے۔ جب وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو PLACENTA بند ناف اور ماں کے خون سے مستقیم پیوند کے پیچیدہ سسٹم کے ذریعہ، اور پیدا ہوجانے کے بعد جب نہ تو غذا چبانے کیلئے اس کے دانت ہوتے ہیں اور نہ ہی غذا کے ہضم کرنے کیلئے مضبوط معدہ آنتیں تو اس وقت ماں کے دودھ بھرے پستان اس کے اختیار میں دے دیتا ہے، جو تمام حیاتیاتی مواد سے بھرپور ہوتے ہیں، نہ سرد ہوتے ہیں نہ گرم، نہ زیادہ میٹھے نہ کھاری، نہ جنہیں چبانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی معدے کو ہضم کرنے کیلئے زیادہ فعالیت کی ضرورت۔

تیسرے مرحلہ پر ''خوشگوار'' غذا اس کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ درحقیقت اگر انسان اور دوسرے جانوروں کیلئے ''خوشگوار'' غذا کا بندوبست نہ ہوتا اور کڑوی دوا کی مانند اسے استعمال کیا جاتا تو انسانی زندگی میں کتنی مشکل درپیش ہوتی، اور کیا اکثر لوگ صحیح غذا نہ ملنے کی وجہ سے نیست ونابود نہ ہوجاتے؟ پھر یہ کہ انسان کے اندر بھوک اور پیاس کا احساس پیدا کردیا تاکہ خود کار صورت میں جب بھی اسے ان دو حیاتیاتی مواد کی ضرورت درپیش آئے تو ان کی طرف متوجہ ہوجائے۔ ذرا سوچیئے تو سہی کہ اگر یہ احساس اس کے اندر نہ ہوتا تو کیا صورتِ حال ہوتی؟ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مشہور حدیث توحید مفضل میں فرماتے ہیں:

''اے مفضل! ان کاموں میں اچھی طرح غور کرو جو خدا نے انسان کے اندر قرار دیئے ہیں؟ مثلاً کھانا کھانا، سونا، جنسی ملاپ اور جو تدبیر ان میں کارفرما ہے۔ خداوندِ عالم نے ان میں سے ہر ایک کیلئے انسانی طبع میں محرک اور عامل قرار دیئے ہیں تاکہ وہ اس کی طرف حرکت کرے۔ بھوک، انسان کو کھانے کی طرف بھیجتی ہے، جس میں جسم کی حیات اور استواریہ ہے۔ تھکاوٹ نیند کا تقاضا کرتی ہے جس میں جسم کی راحت اور تروتازگی ہے۔ اور شہوت جنسی اسے جنسی ملاپ کی دعوت دیتی ہے جس میں نوع انسانی کی بقاء ہے۔ اگر انسان میں ایسے عوامل اور محرکات نہ ہوتے اور وہ سوچ وبچار کے ذریعہ ہی اپنی ساری ضرورتیں پوری کرتا رہتا تو ان اُمور کو تاہی برتنے کی وجہ سے تھوڑے عرصے ہی کے اندر ہلاک ہوجاتا۔ لیکن خداوندِ بزرگ وبرتر نے ان اہم ترین ضرورتوں کے پورا کرنے کیلئے انسانی طبع میں کچھ محرک پیدا کئے ہیں جو اُسے اُن کی طرف

---

[1] فخر رازی اپنی تفسیر میں اس موضوع کی طرف مختصر سا اشارہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس قسم کے پرندوں کے سر پر ''کانٹے'' کی مانند کوئی چیز ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی وقت کوئی مگرمچھ ان پرندوں کو نگلنے کا ارادہ کرتا بھی ہے تو وہ کانٹا اسے ایسا نہیں کرنے دیتا۔ (تفسیر فخر رازی جلد ۲۴ ص ۱۱

لے جاتے ہیں۔[1]

یہی وجہ ہے کہ تندرست انسان کیلئے کس قسم کی رغبت، خاص کر اس کی غذا کی طرف، بدن کی ضرورت کی دلیل ہے، نیز اسی وجہ سے اس قسم کے لوگ ایسی اندرونی رغبت کا مثبت جواب دیتے ہیں مشہور روسی دانشور ''پالوف'' کہتے ہیں:

''طبعی اور مفید غذا وہ ہوتی ہے جو لذت اور بھوک کے ساتھ کھائی جائے۔''اسی لئے ان غذاؤں کے مقابلے میں جن کی انسان کو خواہش ہوتی ہے، کسی خاص قسم کے چارت کے مطابق غذا کا استعمال ایک تندرست اور صحیح سالم انسان کیلئے بے معنی سی بات ہے کیونکہ انسان کا غذاؤں کی طرف رغبت کرنا ہی بدن کی ضرورت کی ایک بہترین دلیل ہے۔آخر یہ کون سی تشکیلات ہیں جو اس قدر منظم اور حساب وکتاب کے تحت کام کر رہی ہیں۔جو خود ہی اپنی ضروریات کی تعین کر رہی ہیں، ادھر ذرا سی کمی محسوس ہوئی اور اُدھر راز بھرے مواصلاتی ذریعہ نے انسانی طبع کو بیدار کر دیا اور اس کیلئے اسے روانہ کر دیا۔کیا اس قسم کے امور کو 'اتفاق'' کا شاخسانہ اقرار دیا جاسکتا ہے ؟ کیا عقل اور وسیع تدبیر کے بغیر ایسا منظم کام کرنا ممکن ہے؟

۲۔کیا روزی تقسیم شدہ ہے؟

مندرجہ بالا آیات میں سے بعض آیات میں یہ نکتہ آیا ہے کہ ہر چلنے والے کا رزق خدا پر موقوف ہے اور خدا ہی ان کی کفالت کرتا ہے ،جیسے ارشاد ہوتا ہے۔''وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلاَّ عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا.....''(ہود/ ۶)جب کہ بعض دوسری آیات میں آیا ہے کہ رزق کی وسعت اور تنگی خدا کی منشاء کے مطابق ہوتی ہے، جیسے سورہ روم کی ۳۷ ویں آیت میں اور اس کے علاوہ دوسری بہت سی آیات ہیں۔

روایات میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ملتا ہے۔امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :"وقدر الارزاق فکثرھاوقللھاوقسمھا علی الضیق واسعة" خداوندِ عالم نے روزیوں کو مقدر کر دیا ہے ،زیادہ اور کم بنایا ہے اور معیشت کو تنگی اور وسعت کی بنیادوں پر تقسیم کیا ہے۔[2]۔اور آپؑ ہی تحصیل علم کا شوق دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان طلب العلم اوجب علیکم من طلب المال ،اَنَّ الْمَالَ مقسوم مضمون لکم قدقسمه عادل بینکم وضمنه وسیفی لکھ.والعلم مخزوں عنداھله قدامرتم بطلبه''تم پر علم کا طلب کرنا مال کے طلب کرنے سے زیادہ واجب ہے، کیونکہ رزق تقسیم شدہ ہے اور اس کی ضمانت دی جا چکی ہے اور وہ اس کو پورا کرے گا لیکن علم ودانش اہل علم کے پاس ہے اور تم کو اس کے طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[3]

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ ص ۷۸، ۷۹، توحید مفضل

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱

[3] معالم (الدین فی) الاصول ص ۹

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعاً ایسا ہے تو پھر روزی اور معاش کے حصول اور معاشرہ کی اقتصادی بہبود کیلئے منصوبہ بندی کے کیا معنی؟ لیکن باقی دوسری آیت اور روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم ان کو آپس میں ملا کر دیکھیں تو اس سوال کا جواب روشن ہوجائے گا کہ خداوندِ عالم کی طرف سے روزی اور رزق کی ضمانت، اس کی طرف سے روزی کی کفالت اور تقسیم سے مراد وسائل کا فراہم کرنا اور ان کے لئے راہ ہموار کرنا ہے۔ ان میں سے کچھ تو انسانی وجود سے باہر ہیں اور کچھ اس کے اندر جب یہ سب آپس میں مل جائیں تو انسان کو اپنی روزی کا حصہ مل جاتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے جیسے کسی ادارے کے ملازمین کی تنخواہیں اس ادارے کے سربراہ کے ذریعہ مقرر ہوتی ہیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کی یہ تنخواہیں ان کو گھر بیٹھے مل جائیں اور وہ کوئی کام نہ کریں۔ نہیں! بلکہ انہیں کام کرنا ہوگا۔ ذاتی طور پر حاضر ہوکر تنخواہ رجسٹر پر دستخط کرنا ہوں گے اور خود تنخواہ وصول کرنا ہوگی۔ یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خداوندِ عالم بسا اوقات ایسے لوگوں کو رزق عطا کرتا ہے جو قطعاً محنت نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو محروم کر دیتا ہے جو سعی و کوشش میں لگے رہتے ہیں، تاکہ لوگ ''عالم اسباب'' میں گم ہوکر روزی کی صرف تلاش و کوشش میں ہی محدود نہ سمجھیں بلکہ یہ سمجھیں کہ اس سب کچھ کے پیچھے کوئی اور قدرت ہے جو اس انظام کو چلا رہی ہے۔ (لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ چند استثنائی مثالیں ہوتی ہیں، اصل بنیاد جب کہ تلاش اور کوشش ہی ہے)

شاید اسی لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''واعلموا ان الرزق رزقان تطلبونه ورزق يطلبكم ،فاطلبوا رازاقكم من حلال ،فانكم ان طلبتموها من وجوهها اكلتموها حلالاً وان طلبتمو ها من غير وجوهها اكلتموحراما'' جان لو کہ رزق دو قسموں پر ہے، ایک رزق وہ ہے جس کے پیچھے تم جاتے ہو اور دوسرا وہ ہے جو تمہارے پیچھے آتا ہے۔ اسی لئے رزق کو حلال راہوں سے طلب کرو کیونکہ اگر تم حلال طریقوں سے طلب کروگے تو حلال کر کے کھاؤ گے اور اگر غلط طریقوں سے طلب کروگے تو اسے حرم کر کے کھاؤ گے۔[1]

رزق کی ان دو قسموں پر تقسیم درحقیقت ان آیات اور روایات کو جمع کرنے کی دلیل ہے جن میں روزی کی تقسیم اور ضمانت کی بات کی گئی ہے اور جس کے نقطہ مقابل میں روزی کا حصول جدوجہد اور سعی و تلاش کے ساتھ مشروط بتایا گیا ہے۔[2]

علاوہ ازیں رزق کی ان دو قسموں میں تقسیم سے آگاہی اس بات کا موجب ہوتی ہے کہ حریص اور لالچی لوگ حرص اور لالچ سے باز رہیں، مؤمنین زیادہ رزق کے حصول کیلئے اپنے آپ کو حرام کاموں سے آلودہ نہ کریں اور رزق سے محروم لوگ مایوسی و نا اُمیدی کا شکار نہ ہوجائیں۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ص ۲۹

[2] ان روایات سے مطلع ہونے کیلئے کتاب وسائل الشیعہ جلد ۱۲ کتاب التجارہ صفحات ۹، ۱۶، ۱۸، ۲۲، ۲۴، اور ۲۶ کا مطالعہ فرمائیں۔

۳۔۔۔۔۔پھر یہ بھُوکے کیوں ہیں؟

آیات بالا میں یہ حقیقت اچھی طرح بیان کی گئی ہے کہ خداوندِ عالم نے تمام زندہ مخلوق کی روزی اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور وہ جہاں بھی ہوں روزی انہیں وہیں پر مل کر ہی رہتی ہے۔لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس دنیا میں تاریخی طور پر کچھ لوگ بھوک کی وجہ سے مر چکے ہیں اور مر رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ کہ! ان کی روزی کی ذمہ داری نہیں لی گئی تھی؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کیلئے مندرجہ ذیل نکات کی طرف توجہ کرنی چاہیے ۔

اولاً: روزی کی ضمانت اور ذمہ داری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے عقلمند اور باشعور افراد کیلئے فراہم کر دیا گیا ہے اور ان کے گھروں میں بھیج دیا جاتا ہے، یا لقمہ بنا کر ان کے منہ میں دیا جاتا ہے۔نہیں بلکہ اس کیلئے راہیں ہموار ہوتی ہیں اور انسان کی تلاش اور کوشش اس کے حصول کی شرط ہے، حتیٰ کہ جناب حضرت مریم سلام اللہ علیہا جو ایک خاموش بیابان میں وضعِ حمل کی سخت تکلیف میں مبتلا تھیں اور خداوندِ عالم نے اس بیان میں موجود خرما کے ایک درخت پر تازہ کھجوروں کے پھل ظاہر کر دیئے، انہیں بھی تحرک کرنے کا حکم ملا اور اس جملہ سے انہیں خطاب ہوا ''وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ... ''(اے مریم! تم اس درکت خرما کو ہلاؤ تا کہ تم پر تازہ کھجوریں گریں۔)

ثانیاً: اگر کچھ لوگ ماضی یا حال میں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالیں اور انہیں غصب کریں تو یہ خدا کی طرف سے روزی کی عدم ضمانت کی دلیل نہیں ہے۔بالفاظ دیگر سعی اور کوشش کی شرط کے علاوہ عدالت اجتماعی کا وجود ہونا بھی ضروری ہے، جو روزی کی منصفانہ تقسیم کیلئے بنیادی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔اگر اس مقام پر یہ کہا جائے کہ پھر خداوندِ عالم ظالموں کے ظلم کا ادراک کیوں نہیں کرتا، تو ہم جواب میں کہیں گے کہ انسانی زندگی کی اساس اس کے ارادے کی آزادی پر ہے تا کہ سب کی آزمائش ہو، نہ کہ جبر و اکراہ پر۔اگر ایسا نہ ہو تو پھر ارتقاء کا امکان مدوم ہو جاتا ہے۔(غور کیجئے گا)

ثالثاً: اس کرّۂ ارضی میں غذا کے حصول کے کئی منبع (ذرائع) موجود ہیں جنہیں سوچ و بچار اور عقل و شعور کے ذریعہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔اگر اس بارے میں انسان کوتاہی کرے تو خود ہی قصوروار ہوگا نہ کہ خدا!

ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ افریقی علاقے جہاں کے باسی بھوکوں مر رہے ہیں، ان میں سے بعض تو دنیا کے دولت مند ترین علاقے ہیں لیکن مذکورہ بالا تباہ کن عوامل جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے انہیں یہ روز بد دکھا رہے ہیں۔اس اجمالی بحث کو ہم نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۵ سے مولا علی علیہ السلام کے فرمانِ مبارک پر ختم کرتے ہیں۔امامؑ فرماتے ہیں:

''انظروا الی النملة فی صغر جثتها ولطافة هیئتها لاتکاد تنال یلحظ البصر ولا بمستدرك لفکر کیف دبت علی ارضها، وصبت علی رزقها، تنقل اجثة الی جُحرها وتعدها فی مستقرها، تجمع فی حرها لبردها وفی وردها لصدرها ''اس چیونٹی کو دیکھو جس کا جثہ بہت چھوٹا لیکن اندام بہت نازک ہیں جو اس کے چھوٹا اور لطیف ہونے کی وجہ سے آنکھوں سے نہیں دیکھے جا سکتے نہ ہی اس بارے میں عقل سے سوچا جا سکتا ہے کہ وہ کیونکر زمین پر چلتی ہے اور کیسے اپنی روزی تلاش کرتی ہے وہ

دانوں کو اپنے بل میں لے آتی ہے، مخصوص جگہ پر انہیں محفوظ کر لیتی ہے اور گرمی کے موسم میں سردیوں کے ایام اور ان دنوں کیلئے جب نکلنا ممکن نہیں ہوتا اسے ذخیرہ کر لیتی ہے۔

۳۔رزق میں وسعت اور تنگی

مندرجہ بالا آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ خداوندِ عالم جس کیلئے چاہے روزی وسیع کر دے اور جس کیلئے چاہے تنگ کر دے یہ اکثر آیات میں بیان ہوا ہے، جس سے ہوسکتا ہے کہ یہ شبہ پیدا ہو کہ روزی کا نظام ایسا نظام ہے جو مکمل طور پر انسان کے بس سے باہر ہے ۔لہٰذا اگر اس دنیا میں کچھ لوگ مالدار اور دولت مند ہیں، یا کچھ غریب اور محروم ہیں تو یہ سب کچھ خدا کی مرضی ہی سے ہے اور اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ نظریہ ان لوگوں کیلئے مناسب وستاویز قرار پاسکتا ہے جو خود مذہب ہی کو شکوک وشبہات کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اُسے استعماری چالوں اور سامراجی سازشوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔لیکن اگر ان آیات واحادیث میں ہی غور وفکر سے کام لیں اور روزی کی وسعت اور تنگی کے اسباب پر غور کریں تو ان آیات کی تفسیر اور احادیث کے اسرار مکمل طور پر روشن ہوجائیں ،تمام زہریلا پروپیگنڈا کافور ہوجائے اور ایسے اہم نکات سامنے آجائیں جو نہایت ہی کارآمد ہوتے ہیں۔ہم کئی دفعہ کہہ چکے ہیں کہ ''مشیتِ الٰہی'' کا مطلب حدوحساب سے خارج ارادہ نہیں، بلکہ ''حکمت'' بھرا ارادہ مراد ہے۔خداوندِ عالم کی حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جو شخص جتنی سعی وکوشش اور اخلاص وفداکاری سے کام لے گا اتنا ہی اس کی روزی کشادہ اور رزق وسیع ہوگا۔کیونکہ ''وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی'' (نجم/ ۳۹) یعنی ہر شخص کا حصہ اس کی کوشش کے مطابق ہے، اور ''وَ کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ'' (مدثر/ ۳۸) یعنی ہر شخص اپنی کوشش اور اعمال کے گروی ہے ۔''وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ'' (طلاق ۲۔۳) یعنی جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا خداوندِ عالم اس کے لئے راہیں کھول دے گا اور اسے وہاں سے روزی عطا کرے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوگا۔تقویٰ اجتماعی عدالت کی حکمرانی کا اور اجتماعی عدالت روزی کی وسعت کا موجب ہوتی ہے اس لئے مذکورہ بالا تعلیمات صرف سکون اور ترکِ تلاش کا ہی موجب نہیں بلکہ اس کا ایک مؤثر عامل بھی ہیں۔اس کی گواہ مولا علی علیہ السلام کی وہ حدیث ہے جسے ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔

''ان الاشیاء لما ازدوجت ازدوج الکسل والعجز فنتجا بینهما الفقر'' جب (ابتدائے کار میں) کائنات کی چیزوں نے باہم ازدواج کیا تو ''کاہلی'' اور ''ناتوانی'' نے آپس میں عقد کر لیا۔اس سے جو اولاد پیدا ہوئی اس کا نام ''فقر'' ہے۔[1]

حقیقت یہی ہے کہ کسی قوم کی تنگدستی اور غربت ان کی کمزوریوں اس سستیوں کا براہِ راست نتیجہ ہوتی ہے اور خداوندِ کریم کی حکمت اس بات کا موجب بنتی ہے کہ ایسے لوگوں کی روزی تنگ کر دے۔اسلامی روایات کے مطابق رزق وروزی کی وسعت اور تنگی کے عوامل کے بارے میں غور وفکر اس امر کا ایک اور شاہد ہے۔چنانچہ انہی روایات کے مطابق جو امور روزی کی وسعت اور اضافے کا موجب بنتی ہیں، ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں: صلہ رحمی

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ص ۲۸

،گھر، برتنوں اور جسم کی صفائی، مسلمان بھائیوں سے مواسات اور ہمدردی، صبح سویرے کام پر جانا، نعمتوں کا شکر ادا کرنا، حرص کو ترک کر دینا، جھوٹی قسم سے پرہیز کرنا، گناہوں سے توبہ اور استغفار کرنا، ہر کام میں نیک نیتی کا اظہار کرنا، ہمسایوں سے نیک کرنا اور خدا کی طرف متوجہ ہونا۔[1]

معاشرے کو صحیح خطوط پر چلانے، اقتصادی مقاصد کی ترقی کی راہیں ہموار کرنے اور رزق وروزی کے اضافے کیلئے ان میں سے ہر ایک امر کی تاثیر روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

''طِیبُ الْکَلَامِ یَزِیدُ فِی الْاَرْزَاقِ'' پاکیزہ کلام روزی کے اضافے کا موجب ہوتا ہے۔[2]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''فِیْ سَعَةِ الْاَخْلَاقِ کُنُوْزُ الْاَرْزَاقِ'' روزی کے خزانے وسیع اور کھلے اخلاق میں پوشیدہ ہیں۔[3]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''کَثْرَةُ السُّحْتِ یَمْحَقُ الرِّزْقَ'' حرام کی کثرت روزی کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔[4]

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۳ ص ۱۴ ۳ اور کے بعد (باب مایورث الفقر والغنی) اور سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۱۹ و ۵۲۰

[2] بحار الانوار جلد ۷۳ ص ۱۴ ۳ اور کے بعد (باب مایورث الفقر والغنی) اور سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۱۹ و ۵۲۰

[3] بحار الانوار جلد ۷۳ ص ۱۴ ۳ اور کے بعد (باب مایورث الفقر والغنی) اور سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۱۹ و ۵۲۰

[4] بحار الانوار جلد ۷۳ ص ۱۴ ۳ اور کے بعد (باب مایورث الفقر والغنی) اور سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۱۹ و ۵۲۰

۱۷۔ پرندوں کی تخلیق میں خالقِ کائنات کی نشانیاں

اشارہ

انسان ہمیشہ سے اور تاریخی طور پر پرندوں کو دوست رکھتا چلا آرہا ہے، ان کی زندگی سے لطف اندوز ہوتا چلا آرہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ وہ بڑے خوبصورت انداز میں اوپر آسمان کی بلندیوں میں محوِ پرواز ہیں۔ یہ چیز اس کے تعجب کا سبب بنی ہوئی ہے کہ ایک بھاری بھرکم جسم زمین کی کشش کے برخلاف آسانی کے ساتھ آسمان کی طرف کیونکر اٹھتا اور تیزی کے ساتھ پرواز کرتا ہے؟

صرف یہ خصوصیت ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی خصوصیات ہیں۔ مثلاً پرندوں کے رنگ برنگے پر، ان میں سے بعض کا پیارے انداز میں آوازیں نکالنا اور چہچہانا، گھونسلے اور آشیانے بنانا، اپنے نومولود بچوں کی پرورش اور انہیں غذا کھلانا، کچھ پرندوں کا لمبی مدت کیلئے ہجرت کرجانا اور اس طرح کے کئی دوسرے امور انسان کے تعجب کے سبب بنے ہوئے ہیں، اگرچہ ایسے حالات کا تکرار اس بات کا موجب بنا ہے کہ کچھ لوگ انہیں عام اور معمولی باتیں سمجھتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے توحیدی آیات کے حصے میں اس مسئلہ کی نشاندہی کی ہے اور ساتھ ہی سب لوگوں کو پرندوں کی دنیا کے مطالعہ کی دعوت بھی دی ہے تاکہ خداوندِ عالم کی آیات اور نشانیوں کو ان کے اپنے ہر ایک مقام پر دیکھیں۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اب ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلاَّ اللّٰهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (نحل/۷۹)

۲۔۔۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ یَقْبِضْنَ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلاَّ الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍۭ بَصِیْرٌ (ملک/۱۹)

۳۔۔۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ (نور/۴۱)

۴۔۔۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلاَّ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ (انعام/۳۸)

ترجمہ

۱۔۔۔کیاانہوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جوآسمان کی بلندیوں میں مسخر ہیں،جنہیں خداکےعلاوہ کسی نے نہیں روکا ہوا،اس میں اُن لوگوں کیلئے (خداوندِعالم کی عظمت اورقدرت کی) نشانیاں ہیں جوایمان رکھتے ہیں

۲۔۔۔کیاانہوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جوان کےسروں پراپنے پروں کوپھیلاتے اورسمیٹتے ہیں،خداوندِ رحمان کےعلاوہ انہیں آسمان کی بلندیوں پراورکوئی نہیں روکتا،کیونکہ وہ ہرچیزکودیکھتا ہے۔

۳۔۔۔کیاتونے نہیں دیکھا کہ خداوندِ عالم کیلئے ہروہ تسبیح کرتا ہے جوآسمانوں اورزمین میں ہے اوروہ پرندے جو پرواز کے وقت آسمان کی بلندی میں پرپھیلائے ہوتے ہیں،ان میں سے ہرایک اپنی نمازاورتسبیح کوجانتا ہے اورخداوندِعالم اس چیزکوجانتا ہے جووہ انجام دیتے ہیں

۴۔۔۔زمین پرکوئی چلنے والااورکوئی پرندہ جواپنے دوپروں سے پرواز کرتا ہے کچھ نہیں ہے مگرتمہاری مانندامتیں ہیں۔ہم نے اس کتاب میں کسی چیزکوفروگذاشت نہیں کیا،پھرسب کواپنے پروردگارکی طرف محشورہونا ہے۔

الفاظ کےمعانی اورتشریح

''طیر''،''طائر'' کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ جانورجس کے پروبال ہوتے ہیں اوروہ ہوامیں حرکت کرتا ہے اوراس کامصدر''طیران'' ہے[1] ''تطیر''اس بدشگونی کوکہتے ہیں جوزمانہ جاہلیت میں پرندوں کی وجہ سےلیا کرتے تھےلیکن بعد میں ہرقسم کی بدفالی اوربدشگونی کو''تطیر'' کہاجانے لگا۔

''تطایر'' کالفظ بھی پھرتی سے چلنے کےمعنی میں استعمال ہوا ہے۔[2]

''صافّات''،''صف'' کے مادہ سے ہےجس کے معنی چیزوں کوایک مساوی خط میں قراردینے کے ہیں،جیسے وہ لوگ یادرخت جوایک خط میں قرارپاتے ہیں۔جب یہ لفظ طیرکیلئے استعمال ہوتا ہےاورکہاجاتا ہے۔''وَالطَّيْرُ صَآفَّاتٍ'' تواس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ آسمان میں حرکت کے وقت اپنے پروں کوپھیلائے ہوئے ہیں جب کہ اس کے مقابل میں نقطہ''یقبضن'' ہے،جس کے معنی ہیں وہ اپنے پروبال کوجمع کرتے اورسمیٹتے ہیں۔

---

[1] کبھی اس فعل کےمصدرکوبھی''طیر'' کہتے ہیں اور''طیور''جمع کی جمع ہے۔(طیرکی جمع)اوربعض حضرات نے''طیور''کو''طائر'' کی جمع بتایا ہے۔

[2] مفردات راغب،لسان العرب،کتاب العین اورمجمع البحرین۔

''اصطفات'' کا لفظ تسلیم محض اور مکمل خضوع واطاعت سے کنایہ ہے جوان نوکروں چاکروں اور خدمت گاروں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جوایک صف میں کھڑے ہوکر خدمت کے لئے تیار ہوتے ہیں۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ ''طیر صافات'' کے ذریعہ ان پرندوں کی طرف اشارہ ہو جو اجتماعی صورت میں ایک یا کئی صفوں میں پرواز کرتے ہیں اور ان کی ہم آہنگی بڑی دلچسپ ہوتی ہے لیکن ''یقبضن'' کا جملہ اس تفسیر سے مانع ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

پرندے تو تسبیح پڑھیں اور میں ۔۔۔۔۔۔۔۔؟

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں اس بات پر تاکید کی گئی ہے کہ زمین کی کشش ثقل کے باوجود پرندوں کی آسمان پر بلندیوں میں پرواز خداوندِ عالم کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ارشاد ہوتا ہے ''کیا انہوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو آسمان کی بلندی پر اڑتے پھرتے ہیں۔''(اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ)،[2]

چونکہ اجسام کی فطرت میں زمین کی طرف کھنچنا ہوتا ہے،فضا کی بلندیوں میں پرندوں کا محوِ پرواز ہونا تعجب انگیز ہوتا ہے اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیئے۔یقیناً اس موقعہ پر پرندوں میں کچھ خاص قسم کی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ مختلف اور پیچیدہ فطرت قوانین کے ذریعہ آسمان میں آسانی کے ساتھ پرواز کر سکتے ہیں۔اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے کہ ان عجائبات اور قوانین کا خالق ایسا قادر ہے جو پوری طرح حکمت کا مالک ہے اور تمام علوم کے اسرار وموز سے پوری طرح باخبر ہے۔بلکہ علوم ان قوانین کے علاوہ اور کچھ نہیں جو اس نے مقرر فرمائے ہوئے ہیں۔اسی لئے تو آگے فرماتا ہے ''خدا کے علاوہ کوئی اور انہیں آسمان میں نہیں روکتا'' (مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ)

آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''اس امر میں خداوندِ عالم کی عظمت اور قدرت کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور حق کو قبول کرنے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں۔''(اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ)

انشاء اللہ العزیز ان آیات کے آخر میں ''ضروری وضاحتوں'' کے ضمن میں ہم بتائیں گے کہ وہ کون سے ایسے پیچیدہ قوانین ہیں جو اگر باہم مل جائیں تو ''طیران'' (پرواز) نامی عمل وجود میں آئے۔اسی لئے تو قدم قدم پر ہمیں اس مبدائے بزرگ وتر بر کی نت نئی نشانیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم،مفردات راغب

[2] ''جوّ'' کے لفظ کو بعض مفسرین نے زمین سے دور کی فضا کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے اس کے معنی ''فضا'' لیا ہے۔خواہ وہ زمین کے نزدیک ہو یا دور۔لیکن جو بات روزمرہ کے استعمالات سے ذہن میں آتی ہے وہ پہلا معنی ہے اور آیت بالا سے بھی یہی معنی مناسبت رکھتا ہے۔

دوسری آیت بھی کئی لحاظ سے پہلی آیت سے ملتی جلتی ہے،لیکن ان دونوں کے درمیان کئی طرح کے فرق بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ان آیات میں انسانوں (خصوصاً مشرکین) کو پرندوں کے حالات کے مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے،ایسی مخلوق جو زمین کی کششِ ثقل کے باوجود زمین سے اٹھتی ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ،نہایت ہی تیزی کے ساتھ کئی ہفتے حتیٰ کہ کئی مہینے تک مسلسل (اور وقفہ کے بغیر) آسمان کی بلندیوں میں اڑتی پھرتی ہے،ایسی پرواز جو نرم بھی ہوتی ہے اور تیز بھی،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پرواز میں کسی قسم کی کوئی مشکل درپیش نہیں آتی ہے۔

ارشادفرماتا ہے"ان لوگوں نے اپنے سروں پراڑنے والے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو اپنے پروبال پھیلاتے ہیں اور سمیٹتے ہیں۔"(اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقۡبِضۡنَ)[1]

"کوئی بھی خداوندِ رحمان کے علاوہ،جس کی رحمتِ عامہ تمام موجودات پر چھائی ہوئی ہے انہیں ایسی حالت میں نہیں روک سکتا"(مَا یُمۡسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ)

درحقیقت یہ خداوندِ عالم ہی ہے جس نے پرواز کے تمام وسائل انہیں عطا فرمائے ہیں اور ساتھ ہی انہیں اس کے راہ ورسم بھی سمجھائے ہیں۔نیز ایسے قواعد قوانین مقررفرمائے ہیں جن سے استفادہ کرکے وہ پرواز کے قابل ہوتے ہیں۔"کیونکہ وہ تو ہر چیز کی ضروریات سے اچھی طرح باخبر ہے اور ہر چیز کو دیکھتا ہے"(اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیۡءٍۭ بَصِیۡرٌ)

ایٹمی ذرات سے لے کر منظومہ شمسی اور دوسرے کئی منظوموں تک،خوردبینوں کی مدد سے دیکھی جانے والی نباتات اور حیوانات سے لے کر غول پیکر موجودات تک،غرض سب کچھ اسی کی تدبیر سے چل رہا ہے،ایسی تدبیر جو ہر مرحلہ پر ہمیں نئی آیات قدرت سے آشنا کرتی ہے۔ہر قسم کے"اتفاق"اور"اچانک"وجود میں آجانے کی نفی کرتی ہے اور اس کے ایمان اور عشق سے دلوں کو معمور کردیتی ہے۔

"صٰٓفّٰت"اور"یقبضن"کی تعبیر شاید اس لئے ہے کہ یہ پرندوں کی اس کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی تو وہ اپنے پروں کو پھیلاتے اور کبھی سمیٹتے ہیں اور وہ ان دو طریقوں سے پرواز کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔یہ احتمال بھی ہے کہ یہ بات شاید پرندوں کی قسموں کی طرف اشارہ ہے،ایک قسم تو وہ ہے جس کے پروبال فضا میں عموماً کھلے اور پھیلے ہوتے ہیں اور وہ ہوا کی موجوں پر سوار بڑی تیزی کے ساتھ اِدھر اُدھر چلتے پھرتے رہتے ہیں،گویا کوئی مخفی طاقت ہے جو انہیں متحرک رکھتے ہوئے ہے اور وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔

پرندوں کی دوسری قسم وہ ہے جو ہمیشہ اپنے پر پھڑپھڑاتے رہتے ہیں یعنی پھیلاتے اور سمیٹتے رہتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو ان دو قسموں کے درمیان

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر"رؤیت"کو"الی"کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی"حسی مشاہدہ"ہے اور اگر"فی"کے ساتھ متعدی ہو تو اس سے قلبی اور فکری مشاہد اور مطالعہ ہے(روح البیان جلد ۱۰ ص ۹۱)

درمیان ہیں۔[1]

تیسری آیت میں پرندوں کی زندگی سے متعلق امور میں توحید کی نشانیاں بتائی گئی ہیں آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے ''کیا آپؐ نے ان سب کو نہیں دیکھا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خدا کی تسبیح کرتے اور اس کو ہر نقص وعیب سے پاک وپاکیزہ جانتے ہیں'' (اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَه مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) اسی طرح وہ پرندے ہیں جو آسمان میں پُر پھیلا کر پرواز کرتے ہیں۔(وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ)

وہ پرندے جو صف در صف آسمان کی بلندیوں میں محوِ پرواز ہیں اور اس قدر شکوہ وعظمت وزیبائی اختیار کئے ہوئے ہیں کہ آنکھ ان کے مشاہدہ اور دیدار سے کبھی سیر نہیں ہوتی، اس قدر منظم انداز میں صف باندھے اور مختلف ہندسی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں جس سے انسان محوِ حیرت ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سینکڑوں یا ہزاروں پرندے باہم پرواز کرتے ہیں، ایک مخفی فرمان کے ذریعہ اپنی راہیں تبدیل کرتے رہتے ہیں اور اس بارے میں ان کے درمیان کسی قسم کا تصادم بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی آیت میں فرمایا ہے ''ان میں سے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے'' (كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَه وَتَسْبِيْحَه)[2]

جی ہاں! ان میں سے ہر ایک کیلئے اپنے طور پر نماز، راز ونیاز اور دعا ہوتی ہے، اور ہر ایک کی اپنی تسبیح وتقدیس اور حمد وستائش ہوتی ہے۔ اصولی طور پر ان میں سے ہر ایک کے وجود کا ذرہ، ذرہ، ان کے مختلف اعضاء کی ساخت، حرکات وسکنات ایسے عظیم مبداء کا پتہ دیتی ہیں جو تمام صفاتِ کمال کا جامع اور ہر قسم کے نقائص سے منزہ ومبرا ہے جو اپنی زبانِ حال سے ہمیشہ اس کی حمد وثنا میں مشغول ہیں۔

بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ ان کی حمد وتسبیح اور نماز آگاہانہ طور پر انجام پاتی ہے اور ان میں سے ہر ایک کیلئے عقل وشعور کے قائل ہیں حتیٰ کہ ان چیزوں کیلئے جنہیں ہم جامد اور بے روح سمجھتے ہیں، ہر چند کہ ہم اس سے ناواقف ہیں، جیسا کہ سورہِ اسرار کی ۴۴ ویں آت میں ہم پڑھتے ہیں:

---

[1] ''صافات'' اسم فاعل کا صیغہ ہے اور ''یقبضن'' فعل مضارع کی صورت میں آیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے کئی تفسیریں ذکر کی ہیں جن میں سے سب سے بہتر یہ تفسیر ہے کہہ یہ کہا جائے کہ جب پرندہ پر کھولتا ہے تو اس کی کیفیت ایک جیسی ہوتی ہے، جب کہ پروں کے سمیٹنے اور پھیلانے کی صورت میں یہ عمل مسلسل دہرایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ فعل مضارع سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جو کہ استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ ایک اور تفسیر کتابِ تفسیر کشاف میں مذکورہ موئی ہے اور کچھ مفسرین نے بھی اس کی پیروی کی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ اس لئے بیان ہوا ہے کہ پہلی صورت پرندوں کی پرواز کی اصلی حالت ہوتی ہے جب وہ پرواز کرتے ہیں جب کہ دوسری حالت عارضی ہوتی ہے، لیکن مفہوم پھر بھی روشن نہیں ہے

[2] اس مقام پر آیا علم میں ضمیر ''اللہ'' کی طرف لوٹ رہی ہے یا ''کل'' کی طرف، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن آیت کی کیفیت سے جوابات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ''کل'' کی طرف لوٹ رہے ہے جو یاں پر ''کل واحد'' کے معنی میں ہے، یعنی زمین وآسمان میں موجود ہر مخلوق اور پرندے ہر ایک اپنی اپنی نماز اور تسبیح بخوبی جانتے ہیں۔

''وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ'' ہر ایک شے خدا کی تسبیح اور حمد کرتی ہے لیکن تم نہیں سمجھتے۔

ان دونوں میں سے جو تفسیر بھی صحیح ہو ہمارے اس دعویٰ کی شہادت دیتی ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز، خاص کر آسمان کی بلندیوں پر محوِ پرواز پرندے، خالقِ کائنات کے علم وقدرت کی نشانیاں ہیں۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''خداوندِ عالم ہر اس چیز سے آگاہ ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔ (وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ)

وہ تمام اعمال، سب پروگراموں اور ان کی ضروریات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس آیت میں صرف پرندوں کے پروں کے پھیلاؤ پر ہی کیوں زور دیا گیا ہے جیسے ''صافّات'' ہے؟ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں یہ شاید اس لئے ہے کہ ان کی یہ حالت سب سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے کہ پروں کے ہلائے بغیر بڑی تیزی کے ساتھ آسمان کی بلندیوں میں حرکت کرتے ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے ان پرندوں کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے جو اجتماعی طور پر حیرت ناک طریقے سے آسمان میں حرکت کرتے رہتے ہیں، ایسی حرکت جو منظم اور سلیقے پر مبنی ہوتی ہے اور مکمل طور پر ہم آہنگ، جب کہ بظاہر ان کا کوئی رہبر اور لیڈر بھی نہیں ہوتا۔ اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت میں پرندوں کے ایک اور حیرت انگیز نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''زمین پر نہ کوئی چلنے والا ایسا ہے اور نہ ہی کوئی ایسا پرندہ ہے جو اپنے دو پروں کے ساتھ پرواز کرتا ہے مگر یہ کہ وہ تمہاری مانند امتیں ہیں'' (وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ)

''اُمم'' جو ''امت'' کی جمع ہے، کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے لحاظ سے عقل وشعور رکھتے ہیں اور ''امثالکم'' (تمہارے جیسے) کی تعبیر اسی بات کی تاکید ہے ہے، کیونکہ انسان جیسا ہونا صاحبِ درک وشعور ہونے کی دلیل ہے۔ یہ آیت، سابقہ آیت کی تفسیر کی تاکید ہے یعنی وہ بھی اپنے طور پر آگاہی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ خدا کی حمد وتسبیح بجالاتے ہیں۔ [1]

پرندوں اور دوسرے جانوروں میں موجود قرائن بتاتے ہیں، بلکہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ان میں ہوش اور شعور موجود ہے۔

اوّلا بہت سے حیوانات، گھونسلہ بنانے، دانہ ونکا اکٹھا کرنے، نومولود بچوں کی تربیت کرنے، ان کی حفاظت کرنے اور زندگی کی دوسری ضروریات کو پیدا کرنے کیلئے اس قدر ماہرانہ اور زیرکانہ عمل کرتے ہیں کہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کام عقل وشعور کی وجہ سے عمل میں نہیں آیا۔ وہ ایسے حوادث کے مقابلہ میں بھی مناسب ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جن کے بارے میں انہیں کسی قسم کا تجربہ نہیں ہوتا، مثلاً جس بکری نے زندگی بھر بھیڑیئے کو نہیں دیکھا اس کے خطرات سے ضرور آگاہ ہے اور اس کے مقابلے میں ہر ممکن صورت میں اپنا دفاع کرتی ہے۔

بہت سے جانوروں کو اہم مقاصد کیلئے سدھایا جاتا ہے جیسے چٹھی رساں کبوتروں اور بازار سے سودا سلف خرید کر لانے والے جانوروں کی تربیت، یا شکاری جانوروں کی تربیت کتوں کو مشیات کا پتہ چلانے اور مجرموں کا پیچھا کرنے اور اس قسم کے دوسرے کاموں کیلئے

---

[1] مفسرین نے ان کی انسان کے ساتھ مشابہت کے بارے میں بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں لیکن ہم نے جو اوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ہر چند کہ ان احتمالات میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر المنار جلد ۷ ص ۳۹۲ اور تفسیر قرطبی جلد ۴ ص ۲۴۱۷

تربیت کی جاتی ہے اور وہ بھی اس انداز میں بسااوقات وہ انسان سے بھی زیادہ زیرکانہ اور بہتر انداز میں اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں۔حتیٰ کہ آج جب کہ جرائم کا پتہ چلانے کیلئے نت نئے انداز اختیار کئے جارہے ہیں، انسان اس قسم کے کتوں کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔

بعض پرندے ایسے ہیں جن کی زندگی نہایت پراسرار اور بہت دقیق ہے جسے غریزہ کی پیداوار نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ غریزے عمومی طور پر ایک ہی نوعیت کی طرز کے ہوتے ہیں جب کہ ان حیوانات کی زندگی اس طرح نہیں ہے ان کے اعمال نسبتاً عقل وشعور کی غمازی کرتے ہیں، مثلاً شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں، دیمک اور بعض اس قسم کے پرندے ہیں، مثلاً مہاجر پرندے اور بعض بحری جانور مثلاً آزاد مچھلیاں ہیں جو انڈے دینے کے وقت ہزاروں کلومیٹر بحری راستے طے کرکے اپنی اصل زادگاہ کو جا پہنچتی ہیں۔تفسیر ''روح المعانی'' کے مصنف کہتے ہیں:

''مجھے یہ بات کہنے میں باک نہیں ہے کہ حیوانات کیلئے نفسِ ناطقہ، عقل اور شعور بھی ہے۔وہ بھی انسان کی طرح ادرک کے مراتب میں ایک دوسرے مختلف ہیں، لیکن وہ کسی بھی طرح انسان کی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتے۔اس بات کے کئی دلائل ہیں اور ان دلائل کے مقابے میں کوئی ایسی قطعی دلیل بھی موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے ان دلائل کی توجیہہ یا تاویل کی جاسکے۔[1]

بظاہر شواہد سے ان کی مراد وہ اشارے یا تصریح ہے جو ''ہدہد اور سلیمان'' اور ''چیونٹی اور سلیمان'' کی داستان میں قرآنِ مجید میں بیان ہوئی ہیں۔نیز وہ روایات بھی ہیں جو اسی آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہیں کہ قیامت میں حیوانات کا بھی حشر ونشر اور حساب وکتاب ہوگا۔[2]

لیکن اس سے مراد خواہ ان کے اعمال اور کردار ان کے عقل وشعور کی وجہ سے ہوں یا ان کے غریزے کی بنا پر یہ بات ہماری بحث میں مؤثر نہیں ہے، بلکہ ہر حالت میں حق کی آیات میں سے ایک آیت اور اس کے علم وقدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ آیت کے آخر میں فرماتا ہے ''ہم نے اس آسمانی کتاب میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا'' یعنی خدا کی عظمت کی جو جو بھی اور کائنات کے کسی بھی گوشے اور کنار میں موجود نشانیاں ہیں ہم نے اس کی تشریح کردی ہے۔(مَا فَرَّطْنَا[3] فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ)

''پھر وہ سب اپنے پروردگار کی طرف محشور کئے جائیں گے۔''(ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ)

''حشر'' کی تعبیر سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات بھی ایک طرح کے عقل وشعور کے حامل ہیں۔مذکورہ بالا تمام آیات سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوجاتی ہے کہ مختلف جہات کے پیش نظر پرندے بھی حق کی نشانیوں میں سے ہیں اور یہ نہایت ہی ظریف، پیچیدہ اور اسرار بھری مخلوق قطعاً اندھے اور بہرے اتفاقات یا بے شعور طبیعت کا معلول نہیں ہوسکتے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۷ ص ۱۲

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۳ ص ۲۹۸

[3] ''فرطنا'' کا لفظ ''تفریط'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کام انجام دینے میں کوتاہی کرنا اور اسے طرح ضائع کردینا کہ وہ پھر ہاتھ نہ آئے (صحاح اللغہ) یہ احتمال بھی ہے کہ اس آسمانی کتاب میں عدیم تفریط سے مراد یہ ہے کہ قرآن ایک جامع مفہوم کا حامل ہے جس میں تمام انسانی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن مندرجہ بالا مفہوم آیت کے ذیل میں پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

چند ضروری توضیحات

۱۔ پرواز کا پیچیدہ فن

سالہا سال سے انسان اس سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ وہ کون سی مخفی طاقت ہے جو پرندوں کے کسی حد تک سنگین جسم کو کشش ثقل کے باوجود آسانی سے اوپر لے جاتی ہے۔ نرمی، آسانی اور چابکدستی کے ساتھ انہیں آسمانی بلندیوں پر اڑائے پھرتی ہے۔ بڑی تیزی کے ساتھ انہیں اِدھر اُدھر لئے پھرتی ہے؟ لیکن ہوائی جہاز کی ایجاد اور اس کی تکمیل کے ساتھ ہی یہ بات سامنے آئی کہ ایک طاقت موجود ہے جس کا نام ELEVATOR FORCE ''اوپر لے جانے والی طاقت'' ہے اور یہ صرف پرندوں ہی کو نہیں بلکہ نہایت ہی بھاری اجسام کو بھی آسمان میں اڑا سکتی ہے جس کی وضاحت ہر قسم کی فنی اصطلاحات سے ہٹ کر نہایت ہی سادہ لفظوں میں یوں کی جا سکتی ہے۔

اگر کسی جسم کی دو مختلف سطحیں ہوں (جیسے پرندوں یا ہوائی جہازوں کے پَر ہوتے ہیں اور ان کے اوپر کی سطح منحنی اور ابھار والی ہوتی ہے) اور اس قسم کا جسم افقی صورت میں حرکت کرے تو اس میں ایک خاص طاقت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے اوپر کی طرف چلاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہوا کا دباؤ اس کی اوپر کی سطح کی نسبت اس کی نچلی سطح پر زیادہ ہوتا ہے (کیونکہ اوپر کی سطح نیچے کی سطح سے زیادہ ہوتی ہے)

اس قانون سے استفادہ ہی ہوا میں سنگین اجسام کی پرواز کا اصل مرکز تشکیل دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم پرندوں کے پروں کو خوب غور سے دیکھیں تو ہمیں یہ فزیکل قانون واضح طور پر نظر آئے گا۔ لیکن یہ پرواز بیسیوں اہم مسئلوں میں صرف ایک مسئلہ ہے اور اس کی تکمیل میں مندرجہ ذیل امور کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۔ اوپر لے جانے والی طاقت کی ایجاد کیلئے ابتدائی رفتار (ہوائی جہاز یہ رفتار حاصل کرنے کیلئے کافی دیر تک زمین پر چلتے ہیں، لیکن پرندے تھوڑی دیر کیلئے دوڑتے ہیں یا فضا میں ایک تیز رفتا جھٹکے سے یہ مقصد حاصل کرتے ہیں)

۲۔ نیچے اترنے کیلئے اس طاقت کو ختم کرنے کی کیفیت (یہ صورتِ حال پرندوں اور ہوائی جہازوں میں رفتار کو کم کرنے اور پروں کی صورت کو تبدیل کرنے سے حاصل ہوتی ہے)

۳۔ بوقتِ پرواز راستہ تبدیل کرنے کی کیفیت۔ (یہ صورتِ حال بھی عام طور پر ہوائی جہاز کی دم کی حرکتوں اور پرندوں کی دُم کے مخصوص پروں کے ذریعہ عمل میں آتی ہے اور پرندہ جدھر کا ارادہ کرتا ہے اسی طرح کو لے جاتی ہے)

۴۔ پرواز کیلئے مناسب صورت اختیار کرنا، اس طرح کہ پرندے کے جسم کیلئے ہوا کی مزاحمت کم سے کم ہو سکے۔ (پرندوں کیلئے یہ بات ان کی THREAD SPUN ON A SPINDLE کی صورت میں جسم، گول اور بیضوی سر اور لمبی اور تیز چونچ کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اور ہوائی جہاز کی شکل وصورت میں بھی پرندوں کی تقلید کی گئی ہے)

۵۔ پرواز سے ہم آہنگ کیفیت۔ (یہ کیفیت پروبال کا لباس پہننے سے حاصل ہوتی ہے، جس سے وہ ہوا کے دوش پر ہوتے ہیں

،حاملہ ہونے کے کی بجائے انڈے دیتے ہیں تا کہ ان کا جسم سنگین نہ ہونے پائے، تیز بین نگاہیں ہوتی ہیں تا کہ وہ دور سے اپنی منزل مقصود، غذا یا شکار کو دیکھ سکیں، وغیرہ)

۶۔ایک مدت تک سائنسدانوں اس بات پر سوچ رہے تھے کہ ہوائی جہاز کے پہیے WHEEL ایک تو اس کی رفتار میں کمی کا باعث بنتے ہیں دوسرے پرواز کے دوران خطرے سے خالی بھی نہیں ہیں۔لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ پرواز کے آغاز کے وقت پرندے اپنے پاؤں سکیڑ لیتے ہیں اور زمین پر اترنے سے ذرا پہلے اپنے پاؤں کھول دیتے ہیں، تو انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہوائی جہازوں کیلئے متحرک پہیوں سے استفادہ کرنا چاہیے تا کہ جب وہ بلندی پر پہنچ جائے تو پہیے اکٹھے ہو جائیں اور جب زمین پر اترنے لگے تو لینڈنگ سے کچھ دیر پہلے کھل جائیں۔

اصولی طور پر اگر آپ تعجب نہ کریں تو ہم آپ کو یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ ایک طویل عرصے سے سائنسدان پرندوں کی مختلف انواع کے بارے میں مطالعات کرتے چلے آرہے ہیں کہ ان کی پرواز کی کیا کیفیت ہے، وہ زمین پر کیسے اترتے ہیں، اُن کے پروں اور دُموں کی کیا کیفیت ہے، وغیرہ وغیرہ، انہی مطالعات کی روشنی میں وہ پرندوں کی مختلف انواع کی تقلید کرتے ہوئے ہوائی جہاز تیار کر چکے ہیں۔(غور کیجئے گا)

پرواز کے جو اصول ابھی بتائے جا چکے ہیں کیا ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب اندھی اور بہری فطرت (نیچر) کا عطیہ ہیں؟ کیا یہ سب کچھ مبداء آفرینش کیلئے بے مثال علم وقدرت کا شاہکار نہیں ہے؟ کیا ''مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ'' پرندوں کو خداوند رحمان کے علاوہ کوئی اور ہستی روکے ہوئے نہیں، ان تمام اصولوں کی طرف لطیف اور خوبصورت اشارہ نہیں، خصوصاً جب کہ اس کے بعد فرماتا ہے ''اَنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍۭ بَصِیْرٌ'' (بے شک وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے) اس معنی کی تکمیل نہیں کرتا؟

۲۔ پرندوں کے ''عجائبات'' اور عجیب'' پرندے

پرندوں کے مختلف قسمیں ہیں اور ساری عجیب۔لیکن اُن میں کچھ ایسی قسمیں بھی ہیں جو دوسروں سے زیادہ عجیب ہوتی ہیں۔بعض دانشور کہتے ہیں کہ اب تک کبوتروں کی ۲۸۹ قسمیں، کبک کی ۲۰۹ قسمیں اور پروانوں کی ایک لاکھ قسمیں دیکھی جا چکی ہیں۔[1]

عجیب اور استثنائی پرندوں میں سے ''چمگاڈر'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔وہ دوسرے پرندوں کے برخلاف سورج کی روشنی سے بیزار ہوتی ہے اور رات کی ظلمت اور تاریکی میں بڑی شجاعت کے ساتھ اور بے کا نہ طور پر ہر سُو پرواز کرتی ہے۔اس کے جسم پر ایک ''پَر'' بھی نہیں ہے بلکہ اس کے پَر گوشت کی نازک جھلی کے بنائے ہوئے ہیں۔حاملہ ہوتی ہے۔اس کے پستان ہیں عورتوں کی طرح ''ایام'' دیکھتی ہے اور گوشت کھاتی ہے، کہتے ہیں کہ تمام پرندے اس کے دشمن ہوتے ہیں اور وہ دوسرے تمام پرندوں کی مخالف ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ تنہائی میں رہتی ہے۔

---

[1] ''اسرار زندگی حیوانات'' نامی کتاب کے صفحہ ۱۳۲ تا ۱۹۶، مجلہ ''شکار وطبیعت'' مجریہ مرداد ۱۳۵۳ ہجری شمسی کا مطالعہ فرمائیں۔

رات کی تاریکی میں کسی رکاوٹ سے ٹکرائے بغیر اس کی تیز اور بے باک پرواز حیرت انگیز ہے۔ بہت سے پیچ وخم کے درمیان سے بڑی آسانی کے ساتھ گزر جاتی ہے، کسی چیز سے بھی نہیں ٹکراتی اور اپنا راستہ بھی نہیں کھوتی۔ اپنی خوراک کو بھی اچھی طرح تلاش کر لیتی ہے خواہ وہ کہیں بھی چھپی ہوئی ہو۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اس کے پاس ''ریڈار'' RADAR کی مانند مشینری سیٹ ہوتا ہے۔

وہ اپنے کان سے ''دیکھتی'' ہے (جی ہاں کان سے) کیونکہ وہ اپنے نرخرے سے مخصوص لہریں WAVES ایجاد کرتی اور اپنی ناک کے ذریعے انہیں باہر بھیجتی ہے۔ یہ لہریں ہر اس رکاوٹ سے جا ٹکراتی ہیں جو اس کے اطراف میں ہوتی ہے، ٹکرا کر فوراً واپس آجاتی ہیں، وہ اپنے کانوں سے لہروں کے ردعمل کو حاصل کرتی ہے، اپنے اطراف میں موجود صورت حال کا جائزہ لیتی اور ان رکاوٹوں کا پوری طرح ادراک کر لیتی ہے۔

اس کے نرخرے، ناک اور کان کی ساخت بھی واقعاً عجیب ہوتی ہے اور اس کے اندر بے انتہا غور وفکر کی طاقت ہوتی ہے جو کسی بھی دوسرے پستان دار جانور میں نہیں ہوتی۔ وہ جو لہریں باہر بھیجتی ہے وہ ماوراء صورت (ریڈیائی لہریں) ہوتی ہیں جسے ہم نہیں سن سکتے۔ جب کہ وہ یہ لہریں ایک سیکنڈ میں ۳۰ سے ۶۰ بار اپنے اطراف میں پھیلاتی اور اس کے ردعمل کو دریافت کرتی ہے۔

چمگاڈر کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس بارے میں بے انتہا مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں جن میں خداشناسی کے درس کی ایک دنیا پنہاں ہے۔ اسی لئے تو حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں جس کا نام ہی ''خطبہ خفاش'' (چمگاڈر پر مبنی خطبہ) ہے، اس جانور کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے اور اس کے وجود کی باریکیوں اور ظرافتوں کو فصیح وبلیغ انداز اور زوردار بیان کے ساتھ ظاہر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''خداوندِ عالم نے اپنی ذات کی صفت کے عجائبات اور اپنی تخلیق کی محیر العقول حکمت کے پیچیدہ اسرار ہمیں چمگاڑ کے وجود میں دکھائے ہیں۔'' پھر اس کی بلیغ انداز میں توصیف فرمائی ہے۔[1]

بہت کم جانور ایسے ہیں جو اپنے بچے کو اپنی آغوش میں لے کر چلتے پھرتے ہیں۔ اگر آپ تعجب نہ کریں تو ان نادر جانوروں میں سے ایک چمگاڈر بھی ہے جو بوقت پرواز رات کی اس تاریکی میں اپنے نونہال کو اپنے پروں میں لے کر یا اپنے منہ میں اُٹھا کر اِدھر اُدھر اڑتی پھرتی رہتی ہے، اور اڑتے ہوئے بھی اسے دودھ پلاتی رہتی ہے۔[2]

اس طرح ایک اور پرندہ بھی ہے جس کا نام ''طاؤس'' (مور) ہے۔ اس کا شمار بھی عجائبات خلقت میں ہوتا ہے۔ اس کے ایسے خوبصورت پر ہوتے ہیں کہ جب انسان ان پروں کے بارے میں غور کرتا ہے تو ان کی رنگ آمیزی پر ششدر رہ جاتا ہے، گویا ابھی ابھی وہ کسی ماہر اور زبردست نقاش کے ہاتھوں سے نکل کر باہر آیا اور رنگ سے رنگا گیا ہے۔ زیبا، دل انگیز، مسرور کن، پختہ، پائیدار اور صاف وشفاف لیکن دلکش رنگ، اور پھر ان پروں کا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو قرار پانا، پھر مور کا ان پروں سے چھتری بنانا جو عجیب بھی معلوم ہوتی

---

[1] نہج البلاغہ خطہ ۱۵۵

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۰۳

ہے اور نا قابل فراموش بھی۔ یہ سب کچھ خدائی تخلیق کی آیات میں سے ایک اور آیت ہے۔ اسی لئے تو توحید اور خداشناسی کے عظیم معلم علی بن ابی طالب علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک اور خطبہ میں جس کا نام ''طاؤس'' (مور پر مبنی خطبہ) ہے، اسی چیز پر زور دے دے کر فرماتے ہیں:

''ومن اعجبها خلقا الطاووس الذی اقامه فی احکم تعدیل.....'' ''تخلیق کے لحاظ سے پرندوں میں سے ایک پرندہ ہے جسکا نام مور ہے، جسے خداوندِ عالم نے موزوں ترین شکل میں پیدا کیا ہے اور مختلف رنگوں کے ساتھ عالی ترین صورت میں رنگ آمیزی کی ہے۔

اپنی مادہ کی طرف بڑھتے وقت اپنے پروں کو پھیلا دیتا ہے اور چھتری کی مانند اپنے سر پر سائبان بنالیتا ہے، گویا وہ کسی کشتی کا بادبان ہے جسے ملاح نے اس کے اوپر پھیلا دیا ہے اور ہر لحہ اسے کسی نہ کسی طرف گھماتا ہے۔ وہ اس خوبصورتی اور رنگوں کی زیبائش کی وجہ سے دریائے غرور میں غرق ہوجاتا ہے اور اپنی ناز وادا کی چال پر اتراتا اور فخر کرتا ہے۔۔۔۔۔[1]

''مہاجر پرندے'' بھی پرندوں کی محیرالعقول قسموں میں سے ہیں۔ وہ کبھی کبھار تو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے درمیان کی تقریباً تمام مسافت طے کرجاتے ہیں اور پھر اپنی پہلی منزل پر واپس آجاتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نہایت ہی طولانی اور دوردراز سفر جو ہزاروں کلومیٹر بنتا ہے طے کرتے ہیں۔ اس بارے میں جو قابل غور بات ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس دوردراز کے طویل ترین سفر میں مخفی راہنمائی کے وسائل سے استفادہ ہیں اور اُن کی مدد سے جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں اور صحراؤں میں بھی اپنی راہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔

پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ کبھی تو کئی کئی ہفتے ایک لحہ کا توقف کئے بغیر شب وروز محو پرواز رہتے ہیں اور غذا وخوراک کی بھی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنا سفر شروع کرنے سے پہلے ایک اندرونی الہام کے ساتھ ہی حد سے زیادہ غذا کھالیتے ہیں جو چربی کی صورت میں ان کے جسموں میں ذخیرہ ہوجاتی ہے تاکہ وہ اپنی طولانی پرواز کے دوران اس ذخیرہ سے اپنے لئے ضروری توانائی حاصل کرتے رہیں۔

کیا وہ اپنی راہوں کا تعین زمین کی مقناطیسی طاقت کے ذریعہ کرتے ہیں یا آسمان میں سورج کی وضعی نوعیت سے، یا رات کے ستاروں کی مدد سے؟ اگر ایسا ہے تو پھر انہیں نہایت ہی ماہر اور لائق ستارہ شناس سمجھنا چاہیئے یا کوئی اور صورتِ حال ہے جو مخفی ذریعہ کہلاتا ہے، جس سے ہم بے خبر ہیں؟

اس سے بھی زیادہ اہم اور باعث تعجب یہ ہے کہ وہ آسمانی بلندیوں میں پرواز کے دوران ہی نیند کرتے رہتے ہیں اور اپنی منزل کی جانب بھی رواں دواں ہوتے ہیں۔ نیز وہ اندرونی الہام کے ذریعہ فضا میں تبدیلی پیدا ہونے کا احساس بھی پہلے سے کرلیتے ہیں۔ اسی لئے وہ فضائی تبدیلیوں کے وجود میں آجانے سے پہلے ہی حرکت کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔[2]

شاید آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ مہاجر پرندے اجتماعی صورت میں دوطرفہ قطار بنا کر چلتے ہیں جو انگریزی لفظ وی (V) کی صورت میں ہوتی ہے۔ کیا یہ کوئی اتفاقی صورتِ حال ہوتی ہے یا اس کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہے؟ دانشوروں کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ جب

---

[1] اس گفتگو کا تتمہ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۶۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] مجلہ ''دانشمند'' شمارہ شہریور ۱۳۶۳ شمسی

کوئی پرندہ فضا میں اپنے پرَ مارتا ہے اور مسلسل اسے اُوپر سے نیچے کرتا رہتا ہے تو اس سے بعد والے پرندے کی پرواز کیلئے آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔اسی لئے جب پرندے مذکورہ صورت میں حرکت کرتے ہیں تو بہت کم تھکتے ہیں اور کافی حد تک اپنی توانائی کو ذخیرہ کرتے رہتے ہیں۔اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں یہ سب کچھ کس استاد نے سکھایا ہے؟

مچھلیاں بھی مہاجرت کے دوران اجتماعی صورت میں اور مخروطی شکل میں حرکت کرتی ہیں کہ ان کا سر آگے آگے ہوتا ہے۔ماہرینِ فن نے اس بارے میں جو حسابات اور تخمینے لگائے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ طریقہ اختیار کرنے سے مچھلیوں کی رفتار میں انفرادی طور پر حرکت کی نسبت چھ گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔[1]

۳۔ پرندے، انسانوں اور ماحول کی خدمت میں

کسی دانشور کا قول ہے کہ انسان کی شقاوت، بے رحمی، غفلت اور کم علمی کی بھی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ پرندوں کے مارے سے اسے کس قدر عظیم نقصان پہنچتا ہے، کیونکہ پرندوں کو مارنے سے اسے ایسے قیمتی مددگاروں اور دوستوں کی امداد اور دوستی سے محروم ہونا پڑتا ہے جو اس کو چوسنے والے موذی اور نقصان دہ حشرات کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نقصان دہ اور موذی حشرات کے ساتھ نمٹنے کیلئے دو راستے اختیار کرتا ہے۔ایک تو ابتدائی راستہ ہے اور وہ یہ کہ باغات اور زراعت کیلئے نقصان دہ کیڑوں، ٹڈیوں اور سنڈیوں کو پکڑا جائے یا انہیں زہریلی دواؤں کے ذریعہ تلف کیا جائے، اور دوسرا ایک بایولوجیکل سائنسی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وائرس اور طفیلی کیڑوں کی پرورش کی جائے جو موذی کیڑوں کو ہڑپ کر جائیں۔لیکن نمٹنے کے یہ دونوں طریقے ایک تو بہت ہی مہنگے پڑتے ہیں اور دوسرے زبردست مشکلات کا باعث ہوتے ہیں، جب کہ اگر پرندوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور رس چوسنے والے کیڑوں کے دشمن پرندوں مثلاً اُلّو وغیرہ کی نسل کشی کی جائے اور کیڑے کھانے والے پرندوں کی حمایت کی جائے تو نبرد آزمائی اور نمٹنے کی صورت میں آسان بھی ہو اور معمولی بھی۔

ایک سائنسدان بنام ''میشلے'' کہتے ہیں:

''اگر پرندے نہ ہوں تو زمین حشرات الارض کھا جائیں''۔

جب کہ ایک اور سائنسدان بنام ''فیبر'' ان کی تائید میں کہتے ہیں۔

''اگر پرندے نہ ہوں تو قحط سے بنی نوع انسان تباہ ہوجائے، اس موقعہ پر اعداد و شمار ہمارے ساتھ ہمکلام ہیں کیونکہ اگر صحیح صحیح حساب لگایا جائے کہ پرندے سالانہ کس حد تک کیڑے مکوڑے اور دوسرے حشرات الارض کو ہڑپ کر جاتے ہیں تو یہ بات صاف طور پر واضح ہوجاتی ہے۔''رواتو بے'' نامی ایک پرندہ سالانہ تیس لاکھ موذی اور نقصان دہ کیڑوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔''نیلا سار'' ایک چھوٹا سا پرندہ ہے جو ہر سال ساڑھے

---

[1] ایضاً ''شمارہ خرداد ۱۳۶۴ شمسی

چھ ملین (پینسٹھ لاکھ) حشرات کا صفایا خود کرجاتا ہے اور چوبیس ملین (دو کروڑ چالیس لاکھ) حشرت اپنے بچوں کو کھلاتا ہے جو بارہ یا سولہ بچوں سے کم نہیں ہوتے۔ ابابیل روزانہ چھ سو کلومیٹر سفر کرتا ہے اور کئی لاکھ مکھیوں کو چٹ کرجاتا ہے۔ ''ٹرگلوڈیٹ'' ایک اور پرندہ ہے جو انڈے سے باہر نکلنے کے دن سے لے کر گھونسلے سے باہر نکلنے کی درمیانی مدت میں نو ملین (نوے لاکھ) حشرات کو ''نوش جان'' کرجاتا ہے۔ لوگ کالے کوے کو بڑا سمجھتے ہیں لیکن اگر کسی کوئے کو ذبح کر کے اس کے پوٹے کو ٹٹولا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سفید کیڑوں سے بھرپور ہے۔ [1]

یہ پرندوں کو کسانوں اور ماحول کی حفاظت کیلئے خدمات کا صرف ایک گوشہ ہے لہٰذا اگر وہ اپنی اس خدمت کے بدلے میں ہمارے اناج یا پھلوں میں سے کچھ کھا پی لیں تو اس میں کیا حرج ہے، کیونکہ یہ تو ان کی مزدوری کا ایک ہزارواں حصہ بھی نہیں بنتا۔ کیا ہم صرف اس بنا پر ایسے خدمتگار پرندوں کو نقصان دہ اور ضرر رساں سمجھیں؟ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ یہ خدمات کس نے پرندوں کے ذمہ لگائی ہیں کہ حیوانات اور حشرات کی دنیا میں توازن کو برقرار رکھنے کیلئے یہ فریضہ انجام دیں اور ان کے اپنے بھی فوائد ہیں۔

۴۔ پرندوں کے وجود سے توحید کا درس ملتا ہے

توحید کے عظیم معلم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مشہور حدیث ''توحید مفضل'' میں ارشاد فرماتے ہیں: ''اے مفضل! پرندوں کے اجسام اور ان کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کرو۔ چونکہ ان کے مقدر میں یہ تھا کہ وہ ہوا میں پرواز کریں، لہٰذا ان کے جسم کو ہلکا اور خلاصہ کی صورت میں بنایا، چار ستونوں کی بجائے ان کے بدن کے دو ستون ہیں پانچ انگلیوں کی جگہ پر چار انگلیاں ہیں، فضلے کے نکالنے کیلئے دو سوراخوں کی بجائے ایک سوراخ ہے، سینہ ''مُحدب'' بنایا گیا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ ہوا کو چیر سکیں جیسے کشتی کا سینہ ہوتا ہے اور وہ پانی کو چیرتی ہے، ان کے دونوں پروں اور دم میں لمبے اور محکم پر ہوتے ہیں جن کے ذریعہ وہ پرواز کرنے پر قادر ہوتے ہیں، ان کا پورا بدن بالوں سے ڈھکا ہوتا ہے تاکہ ہوا ان کے اندر داخل نہ ہونے پائے اور اُن کے حجم کی نسبت ان کا وزن کم ہوجائے، چونکہ یہ بات بھی ان کے مقدر میں ہوتی ہے کہ ان کی غذا اناج یا گوشت ہو اور وہ فوراً اسے نکل جائیں اور چبائے بغیر ہی پرواز کرجائیں، لہٰذا ان کے وجود سے دانتوں کو حذف کردیا گیا ہے اور دانتوں کی بجائے ان کی نوکیلی، پختہ، تیز اور لمبی چونچ ہوتی ہے تاکہ وہ دانہ اٹھانے اور گوشت کو جدا کرنے سے تھک نہ جائیں اور کسی زحمت میں نہ پڑیں۔ چونکہ دانتوں سے محروم ہوتے ہیں، اسی لئے ان کے اندر ایک خاص قسم کی حرارت ہوتی ہے جس کی وجہ سے موٹے موٹے دانے بھی ہضم ہوجاتے ہیں اس طرح ان کا اپنا مخصوص ہاضمہ ہوتا ہے جو انسانی ہاضمے سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر انڈے دیتے ہیں، بچے نہیں دیتے، تاکہ حمل کی وجہ سے ان کا جسم بھاری نہ ہوجائے اور پرواز کرنے پر قدرت رکھیں۔'' پھر امام علیہ السلام نے پرندوں کے بارے میں بہت سے دوسرے دلچسپ اور دقیق نکات بیان فرمائے، جنہیں اختصار کی بنا پر ہم یہاں درج نہیں کرسکتے۔ [2]

---

[1] کتاب ''نظری بہ طبیعت و اسرار آن'' ص ۱۹۵ تا ۱۹۷ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

[2] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۰۳ اور اس کے بعد

۱۸۔شہد کی مکھیوں کی زندگی میں خلاقِ عالم کی نشانیاں

اشارہ

شہد کی مکھیوں کی زندگی تخلیق کائنات کی دنیا کا عجیب ترین شاہکار ہے،سائنسدانوں کے مطالعات کی روشنی میں اس چھوٹے سے حشرہ کی زندگی کے کئی عجائبات دریافت ہو چکے ہیں جن کی وجہ سے بعض سائنسدانوں نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی انسان کی زندگی سے زیادہ پیش رفتہ اور ترقی یافتہ ہے۔آپ کو دنیا میں کوئی ایسا ترقی یافتہ معاشرہ نہیں ملے گا جس نے ''بیکاری'' اور ''بھوک'' جیسے مسائل کو مکمل طور پر حال کر دیا ہو،لیکن یہ مسائل شہد کی مکھیوں کے ملک (چھتہ) میں مکمل طور پر حل ہو چکے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس سارے شہر میں ایک بھی مکھی بیکار اور بھوکی نہیں ملے گی۔

گھر کا تیار کرنا، پھولوں کے رس کی جمع آوری کا طریقہ،شہد کا بنانا اور ذخیرہ کرنا،نومولود کی پرورش پھولوں سے معمور علاقے کی دریافت اور دوسری مکھیوں کو ان کا پتہ بتانا، ہزاروں چھتوں کے درمیان میں سے اپنے ہی چھتے کو تلاش کرنا، یہ اور اس قسم کی کئی اور باتیں ہیں جن سے ان کی حد سے زیادہ ذکاوت اور عقل وشعور کا پتہ چلتا ہے۔البتہ یہ بات یقینی ہے کہ ماضی میں انسان کو ان چیزوں کا علم نہیں تھا،لیکن قرآنِ مجید نے آج سے چودہ سو سال پہلے ایسی باتوں کا انکشاف کر دیا تھا اور اس کے اندر اسی حشرہ کے نام کی ایک سورہ بھی جس کا نام سورت ''نحل'' ہے،جس میں اس مختصر سے حشرہ کی زندگی کے پیچیدہ اور حیرت ناک پہلوؤں کی طرف کئی اشارے کئے گئے ہیں۔اس اشارے کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ جان کے ساتھ سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًاوَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ (نحل/۶۸)

۲۔۔۔ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَاشَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُه، فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (نحل/۶۹)

ترجمہ

۱۔۔۔تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ پہاڑوں ،درختوں اوران چھجوں

پر اپنا گھر بنائیں جولوگ بناتے ہیں۔

۲۔۔۔پھر تمام پھلوں سے کھا،اوران راہوں پر آسانی کے ساتھ چل جو تیرے پروردگار نے مقرر کررکھی ہیں۔

اس کے شکم سے خاص قسم کا مشروب نکلتا ہے،جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں،جس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔

اس امر میں صاحبانِ فکر کیلئے (خدا کی عظمت کی) نشانیاں ہیں۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''نحل''،شہد کی مکھی کو کہتے ہیں اور''نحلہ''(بروزن قبلہ)بغیر معاوضہ کے بخشش کو کہتے ہیں اوراس کا مفہوم''ہبہ''(بخشش) کے مفہوم سے زیادہ محدود ہے،کیونکہ''ہبہ''یعنی بخشش بغیر معاوضہ اورعوض کے بخشش کو کہتے ہیں جب کہ''نحلہ''صرف اس بخشش کو کہتے ہیں جو بلاعوض ہوتی ہے۔''نُحول''کا معنی لاغری ہے جیسے شہد کی مکھیاں لاغر(نحیف) ہوتی ہیں اور''نواحل''ان تلواروں کو کہتے ہیں جو تیز(لاغرونحیف) ہوتی ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اصل بنیاد وہی''نحلہ''ہے جس کا معنی بخشش ہے۔اگر نبورِ عسل کو''نحل''کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ عالمِ انسانیت کیلئے شریں عطیہ اور بخشش لاتی ہے۔[1]

''اَوْحٰی''،''وحی''کے مادہ سے ہے جس کے بہت سے معانی ہیں جنہیں ہم نے''پیام قرآن''کی جلداول''معرفت کے منابع''کی بحث میں ذکر کیا ہے اور جس کی اصل بنیاد''سریع اشارہ ہے۔چونکہ خداوندِ عالم کا فرمان زنبورعسل کی مختلف اور پیچیدہ سرگرمیوں پر مبنی ہوتا ہے جو سریع اشارے یا قلبی الہام سے ملتا جلتا ہے لہٰذا یہ لفظ شہد کی مکھیوں کے بارے میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔گویا ان تمام پیچیدہ کاموں کو خدا کے ایک سریع اشارے سے انجام دیتی ہیں۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

آیئے شہد کا ملک دیکھیں!!

قرآنِ مجید نے مذکورہ بالا آیت میں شہد کی مکھیوں کی زندگی کے چند مختلف حصوں کو بیان فرمایا ہے جن میں سے ہر ایک دوسرے سے زیادہ جاذب اور عجیب ہے۔سب سے پہلے تو ان کے گھر بنانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے،''تیرے پروردگار نے زنبورِ عسل کی طرف وحی کی ہے کہ وہ اپنے گھروں کو پہاڑوں،درختوں اور ان چھجوں سے انتخاب کرے جنہیں لوگ بناتے ہیں۔''(وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ)

---

[1] مفردات راغب

''اِتخذی'' (تو انتخاب کر) کی تعبیر مؤنث فعل کی صورت میں شاید اس لئے ہے کہ جب شہد کی مکھیاں نیا گھر تلاش کرنے کو نکلتی ہیں تو ایک ''ملکہ'' کے پیچھے چلتی ہیں جو چھتے کی فرمانروا ہوتی ہے۔ بنابریں اصل انتخاب کرنے والی ملکہ ہوتی ہے

''اوحٰی'' کی تعبیر ایک نہایت ہی خوبصورت تعبیر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم نے ایک مخفی الہام کے ذریعہ اس حیوان کو گھر بنانے کی تعلیم دی ہے جو اس کا ایک ظریف ترین کام ہوتا ہے۔ اس کی باقاعدہ تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی۔ چنانچہ وہ بھی اسی وحی الٰہی کے مطابق اپنا فریضہ انجام دیتی ہے کبھی پہاڑوں کی چٹانوں میں کبھی درختوں پر اور کبھی غاروں میں وہ اپنا چھتہ بناتی ہے تو کبھی مصنوعی چھتوں اور گھروں کو انتخاب کرتی ہے جنہیں انسان بناتا اور چھجوں پر رکھتا ہے۔ یا خود بھی وہ چھجوں پر اپنا گھر بناتی ہے، اس طرح سے زنبورِان عسل کے مختلف انواع کے گھروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آیت کی تعبیریں بتاتی ہیں کہ اُن کا یہ گھر بنانا کوئی سادہ سی بات نہیں ہے وگرنہ قرآن اسے وحی سے تعبیر نہ کرتا، اور ہم عنقریب دیکھ لیں گے کہ بات بھی یہی ہے۔

دوسری آیت میں ان مکھیوں کے شہد بنانے کی بات کی گئی ہے کہ ''خداوندِ عالم نے اپنی وحی اسے حکم دیا ہے کہ تمام میوہ جات سے کھا۔'' (ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ)

''اور میٹھا شہد پیدا کرنے کیلئے ان راستوں پر چل جو تیرے پروردگار نے تیرے لئے خاضع اور مسخر کر رکھے ہیں۔'' (فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً)

''سُبُل''، ''سبیل'' کی جمع ہے جس کے معنی آسان راستہ'' ہیں (جیسا کہ مفرداتِ راغب میں آیا ہے۔)

مندرجہ بالا آیت میں راہوں سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کئی احتمال ذکر کئے ہیں بعض نے کہا ہے کہ وہ راستے مراد ہیں جو شہد کی مکھیاں پھولوں کی طرف طے کرتی ہیں۔ (''ذلل''، ''ذلول'' کی جمع ہے جس کے معنی رام اور سر جھکائے ہوئے ہیں ''ذلل'' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ راہیں اس حد تک صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک طریقے سے متعین کی گئی ہیں کہ جن کا طے کرنا ان مکھیوں کیلئے آسان اور معمولی سی بات ہے۔

آج شہد کی مکھیوں کے ماہرین بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں۔ وہ کہتے کہ مکھیوں کا جتھ پھولوں کی جگہ کی پہچان کیلئے صبح صبح باہر نکلتا ہے، اس جگہ کے دریافت کرنے کے بعد چھتے کی طرف واپس آجاتا ہے اور آکر اس جگہ کی نشان اور صحیح صحیح پتہ نہایت ہی اسرار آمیز اور حیرت ناک صورت میں دوسرے کو بتاتا ہے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ راہ میں کچھ نشانیاں چھوڑ جاتا ہے جو ایک مخصوص قسم کا بودار مواد ہوتا ہے جس سے رستے کا تعین خود بخود ہوتا جاتا ہے اور وہ اس کے ذریعہ کسی قسم کی مشکل محسوس کئے بغیر منزلِ مقصود تک پہنچ جاتی ہے

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سے مراد چھتے تک پہنچنے کی راہیں ہیں کیونکہ بعض اوقات مکھی دور، دراز کا سفر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے لیکن واپسی پر کسی بھی صورت میں سرگردانی کا شکار نہیں ہوتی بلکہ بلا تکلف اپنے چھتے تک پہنچ جاتی ہے، حتیٰ کہ ایک جیسے سینکڑوں

چھتوں کے درمیان وہ صرف اپنے ہی چھتے کو پہچان لیتی ہے۔[1]

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ پر ''سبل'' کا معنی مجازی ہے اور شہد کی مکھی کے اس طریقہ کار کی طرف اشارہ ہے جو وہ شہد تیار کرنے کیلئے پھولوں کے رس کو چوسنے کیلئے استعمال کرتی ہے، کیونکہ وہ ایک خاص طریقے سے رس کو چوستی ہے اور چوسنے کے بعد اپنے مخصوص ''پوٹے'' یا تھیلی میں ذخیرہ کرلیتی ہے جہاں پر کیمیکل طریقہ سے اس میں تبدیلیاں عمل میں آتی ہیں اور شہد تیار ہوتا ہے۔ پھر مکھی اسے مخصوص تھیلی میں واپس پلٹا دیتی ہے۔ مکھی اس کام کیلئے ضروری طریقوں کو اختیار کرتی ہے وہ خدائی الہام کے ذریعہ ایسا کرنا بخوبی جانتی اور اس راہ کو طے کرتی ہے۔

چونکہ ان تینوں تفسیروں میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے لہٰذا آیت کا ظاہر عام ہے جس سے کہا جاسکتا ہے کہ تینوں تفسیریں اس میں شامل ہیں، شہد کی مکھیاں خداداد شعور یا عریزی الہام کے ذریعہ ان پیچ وخم بھرے راستوں کو بڑی آسانی کے ساتھ طے کرتی ہیں اور ان سے استفادہ کرتی ہیں۔ بعد کے مرحلہ میں ''شہد'' کے اوصاف اور اس کی برکتوں اور فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''ان کے شکم سے ایک خاص قسم کا مشروب باہر آتا ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔'' (يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُه)

''بطون''، ''بطن'' کی جمع ہے (جس کا معنی پیٹ ہے) اس تعبیر کو بعض مفسرین نے مجازی معنی پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے معنی ''افواہ'' (منہ) ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ شہد جو پھولوں کا رس ہوتا ہے، مکھیوں کے منہ میں ذخیرہ ہوکر چھتے میں منتقل ہوجاتا ہے۔[2] جب کہ بعض کا گمان ہے کہ شہد، زنبورانِ عسل کا فضلہ ہوتا ہے۔[3]

بعض مفسرین اسے بھی ایسے اسرار آمیز مسائل میں شمار کرتے ہیں جو ابھی تک انسان پر منکشف نہیں ہو پائے۔[4]

لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں سائنسدانوں کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کوئی نظریہ درست نہیں ہے، بلکہ شہد کی مکھیاں پھولوں کا رس چوسنے کے بعد اسے بدن میں مخصوص تھیلی میں بھیج دیتی ہے جسے ''پوٹا'' کہا جاتا ہے اور پھر وہاں وہ مختلف قسم کی تبدیلیوں کے بعد شہد بن کر واپس ان کے منہ آجاتا ہے۔ ''بطون'' کی تعبیر اسی بات کی گواہ ہے، اور پھر اس سے بھی زیادہ واضح ''کلی'' تو کھا[5] کی تعبیر ہے کیونکہ عرب کبھی بھی کسی چیز کو منہ میں رکھنے کو ''اکل'' (کھانا) نہیں کہتے۔ اس جملہ کی تفسیر ''اٹھانے'' اور ''پکڑنے'' سے بھی ایک مجازی تفسیر ہے جس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

---

[1] ''ذلاً''، ممکن ہے کہ ''سبل'' کا حال ہو یا ''نحل'' کا۔ پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] مجمع البیان، جلد ۶ ص ۳۷۳

[3] تفسیر قرطبی، جلد ۶ ص ۲۷۵

[4] اسی تفسیر قرطبی میں ارسطو کی ایک داستان نقل کی گئی ہے کہ راسطو نے شیشے کا ایک چھتہ تیار کیا تا کہ وہ یہ جان سکے کہ شہد کس طرح تیار کیا جاتا ہے، لیکن جب مکھیوں نے اپنا عمل شروع کیا تو پہلے انہوں نے شیشے کو سیاہ کردیا تا کہ ان کا راز کسی پر عیاں نہ ہونے پائے۔

[5] کتاب ''پرورش زنبورِ عسل'' مصنفہ محمد مشری ص ۱۱۳ اور کتاب ''نظری بہ طبیعت واسرار آن'' ص ۱۲۶

اب اس جگہ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر ''مختلف الوان'' (مختلف رنگوں) سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں بھی مختلف نظریات ملتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس سے یہی ظاہری ''رنگ'' مراد لئے ہیں، جن میں سے یہ شہد ہوتا ہے۔ بعض شفاف سفید ہوتے ہیں، بعض زرد یا سرخ اور بعض سیاہ ہی مائل بھی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ رنگوں کا یہ فرق شہد کی مکھیوں کے سن کی وجہ سے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پھولوں کے مختلف منبع کی وجہ سے ہو اور ہوسکتا ہے کہ دونوں وجوہات شامل ہوں۔

یہ امکان بھی ہے کہ اس سے مراد خود ''شہد کی کیفیت'' ہو کیونکہ بعض شہد گاڑھے ہوے ہیں اور بعض پتلے۔ یا پھر مختلف پھولوں کے مختلف شہدوں کا اثر جداگانہ ہوتا ہے اور ہر ایک کے اپنے مخصوص خواص ہوتے ہیں۔ اسی طرح خاص قسم کا شہد ''JELLY'' (چھتے کی ملکہ کے لئے تیار کیا جانے والا مخصوص شہد) سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے، کیونکہ مشہور ہے کہ JELLY غذائی نقطہ نظر سے اس قدر قیمتی ہے کہ ملکہ مکھی کی زندگی کے طولانی ہونے کا سبب بنتا ہے اگر انسان بھی اس سے کھالے تو اس کی طولانی عمر کیلئے بھی موثر ہوتا ہے۔

بعض ملکوں میں ایک طرح کے پھولوں کے کھیت ہوتے ہیں اور مخصوص شہد کے چھتوں کی وہاں پرورش کی جاتی ہے جس سے ہر قسم کے پھولوں کی قسم کا مخصوص شہد حاصل کیا جاتا ہے اور خواہشمند افراد اپنی پسند کے پھولوں کا شہد خرید سکتے ہیں۔ اس طرح شہد کے ایک اور ایوانِ مختلف کا سراغ ملتا ہے جو ممکن ہے کہ آیت کے عمومی اور وسیع مفہوم میں شامل ہو۔

''شراب'' (مشروب) کی تعبیر اس لئے ہے کہ بعض مفسرین کے بقول کلامِ عرب میں شہد کے بارے میں ''اکل'' (کھانے) کی تعبیر میں استعمال نہیں ہوتی بلکہ اس سلسلے میں ہمیشہ ''شرب'' (پینے) کی تعبیر استعمال ہوتی ہے (شاید اس لئے کہ وہاں شہد پتلا ہوتا ہے)[1]

آخر میں عَسل (شہد) کی شفا عطا کرنے والی تاثیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''اس میں لوگوں کیلئے خصوصی شفا ہے'' (فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ)

''شفا'' کی تعبیر نکرہ کی صورت میں اس کی بے حد اہمیت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ انشاءاللہ ''توضیح'' کے عنوان کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا شہد میں بہت سے پھولوں اور نباتات کے جیتے جاگتے اور زندہ خواص موجود ہیں۔ دانشوروں نے اس کیلئے خصوصاً دورِ حاضر میں بہت سے خواص کا تذکرہ کیا ہے جس میں حفظانِ صحت کے خواص بھی شامل ہیں اور حفظ ماتقدم کے خواص بھی۔

عَسل بہت سی بیماریوں کے علاج کیلئے حیرت انگیز حد تک مؤثر ہے۔ اس کی وجہ اس کے اندر حیاتیاتی مواد VITAMIN کی موجودگی ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ ''شہد'' انسان کی صحت، سلامتی اور خوبصورتی کی خدمت سرانجام دیتا ہے۔

آیت کے آخر میں گذشتہ تین حصوں، مکھیوں کے گھر بنانے کا مسئلہ، پھولوں کے رس کی جمع آوری و شہد ساز اور اس کے طبی (خواص) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''ان میں خداوندِ عالم کی عظمت کی نشانیاں ان لوگوں کیلئے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں'' (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ)

---

[1] روح المعانی جلد ۱۴ ص ۱۶۸

اس طرح شہد کی مکھیوں کی زندگی کے تمام مراحل میں بھی اوراس جفاکش، سمجھداراورذی استعدادحشرے کی محنت کے ثمرے میں بھی خالقِ کائنات کی قدرت اورعلم کی صرف ایک نہیں کئی آیات نظرآتی ہیں کہ اس نے اس قدرحیرت ناک مخلوق کو پیدا کیا ہے۔

چندضروری توضیحات

ا۔شہد کی مکھیوں کا عجیب تمدن

حیوان شناسی ZOOLOGY اورحیات شناسی BIOLOGY جیسےعلوم کی وسعت اور باحوصلہ سائنسدانوں کے وسیع مطالعات کی وجہ سے اس چھوٹے سے حشرہ کی زندگی کے کئی اورعجیب اورنئے مسائل کاانکشاف ہواہے ،جس سے انسان حیران رہ جاتا ہے اس بات کو ہرگز باورنہیں کرسکتا کہ ان مکھیوں پرحکم فرمایہ سب نظام وتدبیراور پروگرام کسی طبعی شعورسے خالی ہے۔ ایک حیات شناس BIOLOGIST سائنسدان ''مترلنگ'' نے زنبورانِ عسل کی زندگی کے بارے میں سالہاسال تک کافی تحقیق کی ہے،وہ ان کے شہرمیں حکم فرماعجیب وغریب نظام کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

''شہد کی مکھیوں کے شہرمیں ملکہ اس طریقہ پرحکم فرمانہیں ہوتی جس طرح ہم سمجھتے ہیں بلکہ وہ بھی اس شہرکے دوسرے افرادکی مانند ایک طرح کے آئین وقوانین کی پابندہوتی ہے۔'' پھرکہتے ہیں:

''ہمیں آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ آئین اورقوانین کہاں اورکیونکرتیارہوتے ہیں۔ممکن ہے ایک دن ایسا آجائے جس میں ہم یہ معمہ بھی حل کرسکیں اورقانون وضع کرنے والےکو پہچان سکیں لیکن سرِدست ہم اس کا عارضی نام ''شہد کی جان'' رکھتے ہیں۔ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ جان کہاں ہےاوراس شہرکے باشندے میں حلول کئے ہوئے ہے؟ البتہ یہ ضرورجانتے ہیں کہ ملکہ بھی دوسری مکھیوں کی طرح ''شہد کی جان'' کی فرمانبردارہوتی ہے۔''شہد کی جان'' پرندوں کےغزیزے کی مانندنہیں ہےاورایک عادت اوراندھےارادے کی طرح عمل نہیں کرتی۔''شہد کی جان''اس شہرکے ہرایک باشندے کیلئے اس کی استعداد کے مطابق علیحدہ علیحدہ فرمان جاری کرتی ہے،کبھی تو کچھ افرادکوگھربنانے کاحکم دیتی ہے اورکبھی سب کوکوچ اورہجرت کا فرمان صادرکرتی ہے۔''

''غرض ہم اب تک نہیں سمجھ سکے کہ مکھیوں کے ملک کے قوانین جو''شہد کی جان'' کے ذریعہ وضع ہوتے ہیں،کس ''اسمبلی'' یا''پارلیمنٹ''میں پیش ہوکرمنظورکئے جاتے ہیں اورکون ہے جوانہیں ایک مقررہ دن میں حرکت کاحکم جاری کرتا ہے۔[1]

لیکن قرآنِ مجید نے ان تمام سوالات کاجواب ایک مختصرسے جملے سے دے دیاہے اوروہ ہے ''وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ'' (تیرے پروردگارنے شہدکی مکھی کی طرف وحی کی ہے)وہی تعبیرجوانبیاءبزرگ کے بارے میں استعمال کی ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ اس

---

[1] کتاب ''زنبورعسل'' ازمترلنگ ص ۳۵ ص ۳۶ (اختصار کے ساتھ)

وحی اور اُس وحی میں بڑا فرق ہے، لیکن تعبیر کا ایک جیسا ہونا اس علم و دانش کی اہمیت کی دلیل ہے جو خداوندِ عالم نے زنبورانِ عسل کو عطا فرمایا ہے ،اور وہ بھی اس حد تک کہ مفکرین عالم کو اس کے بارے میں مطالعہ کی دعوت دی ہے۔

زنبورِ عسل کا گھر بنانا یقیناً خداوندِ عالم کے الہام کے ساتھ ہے کیونکہ وہ اپنا گھر منظم طور پر مسدس شکل میں بناتی ہے جس پر موم تو بہت کم خرچ آتی ہے لیکن گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے اس کے تمام زاویے استفادہ کے قابل ہوتے ہیں اور دباؤ کے مقابلہ میں اس کی قوت مزاحمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے گھر دو منزلہ ہوتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب ان کا چھتہ درختوں یا پہاڑوں پر ہو، لیکن مصنوعی چھتوں میں دو دو کر کے اضافہ کرتی جاتی ہیں، جتنا کہ چھتے بنانے کی گنجائش ہوتی ہے۔

ہر ایک گھر کی گہرائی PYRAMID صورت کی ہوتی ہے جس کی تین سطحیں لوزی (بادامی) شکل کی ہوتی ہیں اور ایک منزل کی راس اور اس کا ابھار دوسری اور نچلی منزل کی تہہ میں ہوتا ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ اگر موم کی کسی سطح کو مربع یا کسی دوسرے شکل میں مصنوعی قالبوں کے ذریعہ ڈھالا جائے، جو شہد کی مکھی کیلئے حسبِ منشاء نہیں ہے، اور اس میں مکھی کو چھوڑ دیا جائے تو وہ خدائی الہام کی طاقت کے ذریعہ اس غلط بنیاد کی پیروی نہیں کرے گی بلکہ وہ اسے صحیح شکل میں اوپر لے جائے گی۔

کسی دانشور نے زنبورِ عسل کے گھر کی گہرائی لوزی (بادامی) شکل کا اندازہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس کا بڑا زاویہ ایک سو نو درجے اور اٹھائیس منٹ ہے۔ پھر اس مسئلے کو جرمنی کے ایک عظیم انجینیر بنام ''کنیک'' کے پاس بھیج کر اس سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص کم سے کم مواد کے ذریعہ بڑی سے بڑی PYRAMID نانا چاہے جس سے لوزی (بادامی) شکل کی تین سطحیں حاصل ہوں تو اس کے زاویئے کس اندازے کے ہوں گے؟

اس نے DIFFERENTIAL حساب کے ذریعہ اس مشکل مسئلے کو حل کر دیا اور جواب میں لکھا ''ایک سو نو درجے اور چھبیس منٹ'' حالانکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ سوال شہد کی مکھیوں کے گھر کے بارے میں کیا جا رہا ہے۔ اس طرح اس کے جواب میں اور شہد کی مکھیوں کے گھر میں صرف ''دو منٹ'' کا فرق ظاہر ہوا۔

اس کے بعد ایک اور انجینیر بنام ''میگ لورن'' نے مزید غور کے ساتھ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ''دو منٹ'' کا فرق پہلے انجینیر کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے وگرنہ صحیح جواب وہی ہے جو شہد کی مکھیوں نے انجام دیا ہے۔[1]

بلجیئم کے مشہور سائنسدان مسٹر ''مترلنگ'' اپنی کتاب ''زنبورِ عسل'' میں ایک اور سائنسدان سے نقل کرتے ہیں جس کا نام ''رائٹ'' ہے وہ کہتے ہیں:

الجبراء میں منظم فاصلوں کو تقسیم کرنے، ان کو آپس میں ملانے اور چھوٹی اور بڑی شکلیں بنانے کیلئے صرف تین علمی طریقہ کار ہیں، اور وہ

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی حاشیہ مرحوم شعرانی جلد ۷ ص ۱۲۳ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

ہیں۔۱۔''مثلث قائم الزاویہ''۔۲۔''مربع''اور۔۳۔''مسدس''زنبورِعسل کے''حجرے'' کی بناوٹ میں تیسرے طریقے یعنی مسدس سے استفادہ کیا گیاہے اور یہ شکل کسی مکان کی پائیداری کیلئے بہت ہی مناسب ہے(کیونکہ اگر ہم تھوڑے سے غوروفکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسدس شکل ہرطرف سے ضربی طاقتوں کی مانند ہوتی ہے جو کہ زیادہ سے زیادہ دباؤ کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جب کہ مثلث اورمربع میں اس قدرصلاحیت نہیں ہوتی)

علاوہ ازیں شہد کی مکھی کا جسم ستون نماCYLENDRICAL ہوتا ہے جو اس قسم کے گھر میں آنے اور جانے کیلئے نہایت ہی موزوں ہوتا ہے۔

بہرحال قرآنِ مجید نے شہد کی مکھیوں کے گھر بنانے کے بارے میں جو اشارہ کیا ہے اس بارے میں ہم جس قدر بھی گہرائی میں جائیں گے اسی قدر حیرت انگیز اور تازہ ترین نکات سے باخبر ہوں گے، اور اس عجیب حشرہ کے خالق موجد اور مربی کی عظمت کے سامنے سرِ تعظیم جھکادیں گے۔

۲۔پھلوں کے رس سے شہدسازی

دوسری بات جسے قرآنِ مجید نے تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ ہے پھولوں کے رس سے شہد کا تیار کرنا، اور درحقیقت یہ بات ہے بھی حد سے زیادہ حیرت ناک اور تعجب انگیز۔بعض سائنسدان کہتے ہیں:''ایک کلوگرام شہد کے حصول کیلئے پچاس ہزار شہد کی مکھیوں کو سفر کرنا پڑتا ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ صرف ایک گرام پھولوں کا رس حاصل کرنے کیلئے ان مکھیوں کو کتنے پُھول چُوسنے پڑتے ہیں؟ اس بارے میں بھی سائنسدانوں نے حساب لگایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک گرام رس حاصل کرنے کیلئے اوسط حدتک ساڑھے سات ہزار پھولوں کو چُوسیں اوران سے اُن کا رس نکالیں۔اس حساب کی روشنی میں ایک کلوگرام شہد حاصل کرنے کیلئے انہیں سات ملین (پچھتر لاکھ) پھولوں کو چُوس کر اُن کا رس نکالنا پڑتا ہے۔[1]

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ شہد کی مکھیاں روزانہ سترہ سے چوبیس بار سے بھی زیادہ مرتبہ رس حاصل کرنے کیلئے سفر کرتی ہیں۔اگر آپ تعجب نہ کریں تو ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ شہد کی کوئی بھی مکھی اپنی ساری زندگی آرام نہیں کر پاتی، بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ عمر بھر نہیں سوتی، یعنی ساری زندگی بیدار رہتی ہے۔[2]

اس جفاکش حشرہ کے مشقت بھرے کام کا اندازہ لگانے کیلئے اتنا کہنا کافی ہے کہ صرف چارسوگرام شہد کے حصول کیلئے شہد کی مکھی کو چھتے سے صحرا کے درمیان کم ازکم اسی ہزار بار چکر لگانا پڑتے ہیں۔اگر اس آمدورفت کو پیشِ نظر رکھ کر تخمینہ لگایا جائے اور اوسط طور پر ہر مرتبہ

---

[1] کتاب''پرورش زنبورعسل''،ص ۱۱۲وص ۱۱۵

[2] کتاب''پرورش زنبورعسل''،ص ۱۱۲وص ۱۱۵

کوایک کلومیٹرحساب کیاجائے تونتیجہ یہ نکلے گا کہ چارسوگرام شہد کے حصول کیلئے شہد کی مکھی جوسفر طے کرتی ہے وہ کرہ زمین کے محیط کادوگنا سفر ہوتا ہے۔یعنی چارسوگرام شہد کی تیاری کیلئے جس رس کی ضرورت ہوتی ہے اس کے حصول کیلئے یہ محنت کش حشرہ زمین کے گردہ دومرتبہ چکرلگانے کے برابرسفر طے کرتا ہے۔[1]

اس نکتے کی طرف بھی پوری توجہ کی ضرورت ہے کہ بہت سے پھول ایسے ہوتے ہیں جن میں رس سارا دن نہیں ہوتا کہ کسی قت بھی مکھی جا کراس سے وہ رس چُوس لے، بلکہ دن میں صرف ایک مرتبہ اوروہ بھی مقررہ وقت پر اپنارس پیش کرتے ہیں۔وقت کے تعین کاتعلق خود پھول سے ہی ہوتا ہے۔بعض پھول وہ ہیں جوصبح کے وقت رس دیتے ہیں،بعض ظہر کے وقت اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بعد ازظہر دیتے ہیں۔عجیب بات تو یہ ہے کہ شہد کی مکھیاں اُن کے اس طرح کے پروگراموں سے اچھی طرح واقف ہوتی ہیں۔لہٰذا وہ ان کے پاس اس وقت جاتی ہیں جب اُن کے رس دینے کا وقت ہوتا ہے۔اس لئے وہ اپناوقت فضول ضائع نہیں کرتیں۔[2]

درحقیقت جب انسان ان اعدادوشمار پرنگاہ ڈالتا ہے اورشہد کے حاصل کرنے کیلئے پروازوں کی تعداداور پھولوں کی تعداد کوپیشِ نظرلاتا ہےتواس کا سرشرم سے جُھک جاتا ہے کہ اس حیات بخش مادے کے ایک گرام کیلئے جواس نے دسترخوان پر رکھا ہوا ہے کہ ابھی اُسے نوشِ جان کرے،کس قدر مشقت اٹھائی گئی ہے۔لیکن اگراسی وقت اس جفاکش اورمحنت شعارحشرے کے خالق اور پروردگار کی عظمت اوراس کے علم وقدرت کے بارے میں سوچ وبچاراورغوروفکر سے کام لےاوراس کے آگے اپنا سر جھکادےتواس کی نعمت کاشکر بجالائے گا۔ممکن ہے کہ یہ سب کچھ اسی اعلیٰ مقصد کیلئے ہو!!

اس موقعہ پرآخری نکتہ جوذکرکرنا ضروری ہےاورتفسیری بحث کی کیفیت سے خارج ہونے سے پہلے اس سلسلے کوختم کرنالازمی ہے،وہ یہ ہے کہ شہد کی مکھیوں کا کام،جہاں پھولوں کے رس کوجمع کرنا ہے وہاں وہ پھولوں کے''زردرنگ کے سفوف'' کوبھی اکٹھا کرتی ہیں جس کا نام ''پولین'' POLLEN ہےاوراسے شہد میں ملاتی ہیں۔

زردرنگ کے اس سفوف کے زبردست خواص ہیں جن میں سے چندایک یہ ہیں۔اس میں تیزابیت AMINO ACID کی بارہ قسمیں پائی جاتی ہیں،چربی کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں،نشوونما کے ہارمون ہوتے ہیں،شکر SUGAR پائی جاتی ہے وغیرہ۔جن عفونتوں اورورموں کا انٹی بیوٹک دوائین علاج نہیں کرسکتیں۔وہاں اس کے اثرات کارگراورنہایت ہی مفید ہوتے ہیں۔[3]

شہد کی مکھی کے پچھلے پاؤں کے پنجے کنگھی اورمسواک نما ہوتے ہیں جن کے ذریعہ وہ پھول کے اس سفوف کوجمع کرتی اوراس کی ایک گولی بنالیتی ہے۔نیز انہیں پنجوں کے ساتھ ہی''ٹوکری'' اور''چمٹے'' جیسی چیز ہوتی ہے جس سے اس گولی کو پکڑکرٹوکری میں رکھ لیتی ہےاور جب

---

[1] کتاب''جہان حشرات''(منقول ازکتاب''شگفتہائے آفرینش''ص ۱۴۳

[2] کتاب''حواس اسرارآمیزحیوانات''منصفہ ویٹس دروشر۔ص ۱۵۷ قدرے خلاصہ کے ساتھ

[3] کتاب''فطری بہ طبیعت واسرارآن''ص ۱۲۷

وہ چھتے کی طرف پلٹ کر جاتی ہے تو جہاں پھولوں کا رس اپنے ساتھ لے جاتی ہے وہاں زرد رنگ کی دو گولیاں بھی ساتھ لے جاتی ہے۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول ہوتا ہے۔[1]

۳۔شہد غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے

قرآنِ مجید نے مندرجہ بالا آیات کی تیسری قسم میں بیماریوں کی شفا کے سلسلے میں شہد کی اہم تاثیر کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے اور مختصر سربستہ تعبیر کا استعمال کیا ہے۔(فیہ شفاء للناس)

آج ماہرین غذا کے مطالعات اور تحقیقات کی روشنی میں اس کے اسرار و موز سے پردہ اُٹھ چکا ہے۔انہوں نے شہد کے ایسے بے شمار خواص اور اسرار ذکر کئے ہیں جنہیں جان کر انسان ورطہ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ عَسل ایک ایسا مادہ ہے کہ اگر وہ بالکل صحیح اور خالص ہو تو ہزار ہا سال تک خراب نہیں ہو پاتا کیونکہ وہ کسی بھی قسم کے جراثیم کو قبول نہیں کرتا۔[2] ۔فراعنہ مصر کی قبروں سے ایسے شہد کے برتن بھی ملے ہیں جس کا تعلق کئی ہزار سال پہلے سے ہے اور یہ شہد بالکل ٹھیک حالت میں صحیح و سالم اور طبعی صورت میں تھا۔ یہ بات مندرجہ بالا دعویٰ کی دلیل ہے۔ چونکہ شہد مختلف پھولوں کے رس سے حاصل کیا جاتا ہے (معلوم ہے کہ ہر ایک پھول کی اپنی مخصوص طبّی خاصیت ہوتی ہے)اسی لئے شہد میں ان پھولوں کے مجموعی طور پر خواص موجود ہوتے ہیں۔

سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ شہد وٹامنز اور دیگر خاصیات کے حامل ہونے کی وجہ سے ایک زندہ مادہ ہوتا ہے۔اس میں چھ وٹامنز یعنی A,B,C,D,E,K پائے جاتے ہیں اور معدنی مواد یعنی پوٹاشیم ،آئرن، فاسفورس، سکہ ،میگنیشم، تانبا، سفلر، سوڈیم اور دوسرے کئی مواد پائے جاتے ہیں نیز تیزابیت کی کئی انواع کا حامل بھی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ ان مواد میں سے ہر ایک کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔اسی لئے شہد بھی مندرجہ ذیل خواص کا حامل ہوتا ہے:

شہد، خون بنانے کیلئے مؤثر ہے۔

شہد، عضلات کی تھکاوٹ کے دور کرنے کیلئے کارآمد ہے۔

شہد، معدہ اور آنتوں میں عفونت کو دُور کرتا ہے۔

شہد، اس بات کا موجب بن جاتا ہے کہ حاملہ عورتوں سے پیدا ہونے بچوں کے پٹھے مضبوط ہوں۔

شہد، ان لوگوں کیلئے مفید ہوتا ہے جس کا نظامِ ہضم کمزور ہوتا ہے۔

---

[1] مجلہ ''تندرست

[2] کتاب اولین دانش گاہ جلد ۵ ص ۱۲۹ (قدرے اختصار کے ساتھ)

شہد، کا شمار ایسی چیزوں میں ہوتا ہے جو کمزوری کی تلافی کرتی ہیں۔

شہد، دل کی تقویت کیلئے مؤثر ہوتا ہے۔

شہد، مُسن لوگوں کیلئے کافی حد تک طاقت ایجاد کرتا ہے۔

شہد، معدہ اور انتڑیوں کے زخم کا مؤثر علاج ہے۔

شہد، تنگی نفس (دمہ) کیلئے مفید ہے۔

شہد، پھیپھڑے کی بیماریوں کیلئے بہترین معاون ہے۔

شہد، جوڑوں کے درد کیلئے معالج دوا ہے۔ پٹھوں کی نشوونما کیلئے مفید ہے اور اعصاب کی تکلیف کیلئے مؤثر علاج ہے۔

شہد، اسہال کی تکلیف میں مبتلا افراد کیلئے مفید ہے کیونکہ اس میں جراثیم ختم کرنے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔

شہد، سے ایسی دوائیں بنائی جاتی ہیں جو جلد کی خوبصورتی اور لطافت کیلئے فائدہ مند ہوتی ہیں اور جلد کی ناہمواریوں کو دور کرتی ہے۔

شہد، سے ایسی دوائیں تیار کی جاتی ہیں جن سے منہ کے ورم کو تسکین ملتی ہے اور ان سے خوشبو پیدا ہوتی ہے۔

شہد، جلد کی خشکی، اس کے پھٹنے، چلنے، اس پر پھنسیاں پیدا ہوجانے، جانوروں کے دردناک ڈنک، آنکھ کے ورم اور کھانسی کے علاج کیلئے بھی مفید دوا ہوتی ہے۔

بعض دانشوروں نے پھولوں کے رس ایسی گولیاں TABLETS تیار کی ہیں جن میں شہد جیسے خواص ہیں، جن کا اہم ترین اثر جوانی کی توانائیوں میں اضافہ کرنا، خلیوں کو فعال بنانا خوشگواری پیدا کرنا اور عمر کا لمبا بنانا ہے۔[1]

اسی لئے تو مشہور ہے کہ مشہور دانشور ''فیثاغورث'' PYTHAGORAS اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتے ہوئے کہتے تھے ''جتنا ہوسکے شہد اور روٹی کھایا کرو'' اور ''بقراط'' کہا کرتے تھے ''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری عمر لمبی ہو تو شہد کھایا کرو۔''

شہد کے مقوی اثرات اور طبی خواص وغیرہ اس قدر زیادہ ہیں کہ اس مختصر سی کتاب میں نہیں سما سکتے، حتیٰ کہ بعض دانشوروں نے تو شہد کے غذائی اور طبّی خواص کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ قرآنِ مجید نے ان سب مطالب کو ایک ہی جملہ میں دلچسپ انداز میں بیان فرمادیا ہے: ''فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ''

اگر آپ تعجب نہ کریں تو ہم یہاں پر بھی بتاتے چلیں کہ شہد کی مکھی کا ڈنک اور اس میں موجود زہر بھی بہت سی بیماریوں کے علاج کیلئے مفید ہے، جیسے جوڑوں کا درد، ملیریا، گلٹیوں کا پیدا ہوجانا، اعصاب کا درد، آنکھوں کی بعض بیماریاں وغیرہ۔ یہ ڈنک باقاعدہ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انجام پایا جانا چاہیئے۔ مثلاً پہلے دن ایک ڈنک، دوسرے دن دو، تیسرے دن تین اسی طرح دسویں دن دس ڈنک لگائے جانے چاہئیں جب کہ علاج کا یہ پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ بعد کے مرحلہ کیلئے پروگرام دوسری صورت اختیار کرلیتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن

---

[1] کتاب ''اولین دانش گاہ'' جلد ۵ ص ۲۱۲ تا ۲۹۰، رسالہ ''طب ودارو'' اور دوسری کتابیں۔

نشین رہنی چاہیئے کہ ڈنک کے ذریعہ علاج اگرمقررہ حد سے تجاوزکرجائے توخطرے کا سبب بھی بن سکتاہے ۔جولوگ اس سے حساس ALLERGIC ہیں اُن کیلئے کم مقدار میں مضرہوتی ہے۔

بعض دانشوروں نے اس بارے میں ایک یا کئی مقالے بھی تحریر کئے ہیں اورکئی لوگوں نےتو''زنبورِعسل کی زہر کا ماحصل اوراس کے خواص'' کےتحت مقالہ نگاری کرکے ڈاکٹری کی سندبھی حاصل کی ہے۔(ڈاکٹریٹ کی ہے)[1]

۴۔زنبورِعسل کی اورخدمات جوشہد سے بھی زیادہ قیمتی ہیں

شہد کی مکھیوں کی زندگی بڑے بڑے عجائبات کی حامل ہے جوکچھ ابھی تک بتایا جاچکاہے وہ توصرف اس کا ایک حصہ ہے موم بنانے کی داستان، جوکہ شہد کی مکھیوں کا گھر ہے، بجائے خودایک مفصل داستان ہے۔تعجب کی بات تویہ ہے کہ موم صرف ان کے گھر بنانے کے ہی کام نہیں آتی بلکہ بعض اوقات وہ اس سے ایسے حشرات کوبھی''مومیا'' دیتی ہے جواس کیلئے مزاحمت کا سبب بنتے ہیں اوراس طرح وہ اُن کے شرسے محفوظ ہوجاتی ہیں۔زنبورانِ عسل کےایک ماہر کا کہناہے:

''ایک دن چھتے کے اندرموجودایک گولی نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جونسبتاً بڑی سی گولی تھی۔جب اس نے اُسے کھول کردیکھاتواس میں ٹڈی کا ایک ڈھانچہ تھاجومکھیوں کے ذریعہ''مومیایا'' جاچکا تھا''۔

بعض دانشوروں کا قول ہے کہ''موم،شہد کی روح اورشہد پھولوں کی روح ہوتی ہے۔اوراس قدرت لطیف ہوتی ہے کہ زنبورِعسل کے شہر کے پانچ سوگھروں کا وزن چندگرام سے زیادہ نہیں ہوتا،اگرچہ ہمارے لئے یہ جاننا مشکل ہے کہ شہد کی مکھیاں اسے کیونکرتیار کرتی ہیں؟لیکن آج اتناضرورجانتے ہیں کہ موم کا مصنوعات میں اہم مصرف ہوتاہے۔پھولوں کے بارورکرنے میں شہد کی مکھیوں کا بڑی حدتک دخل ہےاور یہ اُن کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ایک دانشور کے بقول:

''حشرات کے بغیر ہماری ٹوکریاں،پھل اورمیووں سے خالی ہوجائیں کیونکہ جن حشرات کا پھولوں سے واسطہ ہوتاہے وہ دوسرے تمام عوامل سے بڑھ کرایک پھول کے سفوف کودوسرے پھول میں منتقل کرسکتے ہیں۔جب ایک پھول کا دوست حشرہ اپنی سونڈ کو پھول میں داخل کرتاہے، یاجیسا کہ عام طور پر دیکھنے میں آتاہے وہ اپنے بدن کا ایک حصہ پھول کے کاسہ میں داخل کرتاہے،تواُس کا بدن پھول کے زردرنگ کے سفوف سے ڈھکا ہوتاہےاوروہ فوراًاسے پھول میں پہنچادیتاہے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں پھول کا سفوف ایک مؤثر عامل ہوتاجس کے بغیرنہ تو بیج دانے میں تبدیل ہوسکتاہےاورنہ ہی تخمدان میوہ میں۔فلسفی نکتہ نظرسے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پھولوں کے دوست حشرے اپنی پیدائش کے پہلے ہی دن سے پھولوں سے واسطہ رکھتے ہی۔۔۔یہ دونوں برابر کی سطح پر بڑھتے اورارتقاء پاتے رہتے ہیں،اورآج اس مرحلہ تک جاپہنچے ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیرزندہ نہیں رہ سکتے ۔۔۔۔پھولوں کے اہم ترین حشرے،جنہیں یقیناً آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں،

---

[1] اولین دانش گاہ۔ص ۱۷۴

پروانے ،شہد کی مکھیاں اور بھڑیں ہوتی ہیں۔۔۔لیکن ان تمام حشرات میں سب سے زیادہ پھولوں کا سفوف منتقل کرنے اور رس حاصل کرنے کیلئے شہد کی مکھیاں زیادہ موثر اور کارگر ہوتی ہیں۔[1]

یہ بات بھی باقل توجہ ہے کہ جن درختوں کے پھول دوطرح کے ہوتے ہیں ،ایک نر اور دوسرے مادہ ،ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ درخت جو از خود پھول نہیں دیتے کیونکہ ان میں اپنے پھولوں کو بارور کرنے کی قدرت نہیں ہوتی اور دوسرے وہ درخت جو پھل دیتے ہیں، ان میں یہ قدرت ہوتی ہے۔

پہلی قسم کو بارور کرنے کیلئے کسی واسطے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ''واسطہ'' زنبورانِ عسل ہی ہوتی ہیں۔ یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ بارور سازی کا اسّی فیصد عمل شہد کی مکھیوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔شہد کی مکھیوں کے عمل اور سرگرمیوں کو جاننے کیلئے اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ سیب، ناشپاتی، چیری، بادام اور اس قسم کے دوسرے پھلدار درختوں کا شمار پہلی قسم میں ہوتا ہے۔

زنبورانِ عسل کی بجائے کیمیکل، مکینیکل اور دوسرے ذرائع سے درختوں کی باروری کی تمام کوششیں شکست سے روبرو ہوچکی ہیں ،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پھلوں کے حصول کیلئے زنبورانِ عسل کا کس حد تک دخل ہے؟[2]

بعض سائنسدان کہتے ہیں:

''اگر شہد کی مکھیاں ہمیں ایک ہزار روپے کا شہد اور موم عنایت کرتی ہیں، تو کم از کم دو لاکھ روپے کی ہمیں زراعت میں امداد کرتی ہیں۔[3]

ہم اپنی اس گفتگو کو ماہرِ حیاتیات مسٹر ''مترلنگ'' کے اس عجیب جملے سے ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''اگر آج شہد کی مکھیاں (خواہ وہ پالتو ہوں یا غیر پالتو) ختم ہوجائیں تو نباتات، پھولوں اور میووں کی ایک لاکھ قسمیں تباہ ہوجائیں اور معلوم نہیں کہ اصولی طور پر ہمارا تمدن ہی ختم ہوجائے''۔[4]

۵۔شہد کی مکھیوں کی جسمانی ساخت بھی عجیب ہے!

شہد کی مکھیوں کی جسمانی ساخت کی بھی بجائے خود ایک طولانی اور حیرت انگیز داستان ہے۔اس میں اس کی آنکھ سب سے زیادہ عجیب ہوتی ہے۔سائنسدان کہتے ہیں ''شہد کی مکھی کی آنکھ ڈھائی ہزار چھوٹے صفحات پر مشتمل ہوتی ہے جن کا ایک دوسرے کا باہمی زاویہ دو سے تین

---

[1] ''نظری بہ طبیعت واسرار آن''ص ۱۲۶

[2] پرورش زنبور عسل۔ص ۲۳۳و۲۳۴ (اختصار کے ساتھ)

[3] اکتاب جہاں حشرات۔سے اقتباس

[4] اولین دانشگاہ جلد ۵ ص ۵۵

درجے ہوتا ہے۔ان آنکھوں میں اس قدر طاقت ہوتی ہے کہ بادلوں کے پیچھے چھپے ہوئے سورج کے اصل مقام کو دیکھ سکیں اور یہ ماورائے بنفش ULTRA.VIOLET شعاعوں کے ذریعہ ہی ہوتا ہے جوان کی آنکھوں پر اثر ڈالتی ہیں۔شہد کی مکھیوں کی زبان اوران کا باہمی مشورہ ایسے علمی حقائق ہیں جوان آخری چندسالوں میں دریافت ہوئے ہیں[1]

شہد کی مکھیاں رنگ برنگے پھولوں کوان کی شکل وصورت میں نہیں دیکھتیں جیسے ہم دیکھتے ہیں، بلکہ وہ انہیں ماورائے بنفش ULTRA.VIOLET روشنی کے ذریعہ دیکھتی ہیں۔یہ روشنی ان کی زیبائش اورجلوؤں میں اوراضافہ کردیتی ہے(اورمکھیوں کوان کی طرف کھینچ لاتی ہے۔[2]

افسوس کہ ہماری بحث کی نوعیب ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس بارے میں اس سے زیادہ گفتگوکریں،لیکن اتناضرویرکہیں گے کہ اس حشرہ کے بارے میں خداوندِ عالم نے قرآن مجید میں جوکچھ فرمایاہے،ہم اس پرجتنازیادہ غوروفکرکریں گے اتناہی زیاداس کے خالق کی عظمت وقدرت کے اسرارہم پرآشکارہوتے جائیں گے۔اور''حسن اختام'' کے طور پرہم حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام کے کلام کی طرف دل کے کان لگاتے ہیں جوآپ نے''توحیدمفضل''میں ارشادفرمایاہے:

''اے مفضل!شہد کی مکھی،اس کے شہد کی صنعت اورچھوکنے والاگھربنانے کی طرف نگاہ کرواوراس کی زندگی اورہوشیاری کے مختلف گوشوں کی طرف خوب غورکرو۔اگرتم اس بارے میں خوب اوراچھی طرح غورکروتوتمہیں معلوم ہوگا کہ وہ ایک عجیب اورغریب مخلوق ہے۔۔۔۔۔اس بارے میں روشن نشانیاں اس بات پرہیں کہ عسل تیارکرنے کی صنعت میں مندربالاحکمت شہد کی مکھی کی نہیں بلکہ اس کی ہے جس نے اس مکھی کو پیدا کیاہےاورانسانی مصلحتوں کے لئے اسے مسخرکیاہے۔''[3]

---

[1] حواس اسرارآمیزحیونات ص۱۳۷،ص۱۴۰،ص۱۴۳

[2] ''رازآفرینش انسان''ص۹۳

[3] بحارالانوارجلد۳ص۱۰۸

۱۹۔جانوروں کی تخلیق میں پروردگارِعالم کی نشانیاں

اشارہ:

کائنات کی زندہ مخلوق کاایک عظیم حصہ جانوروں پر مشتمل ہے۔حیوانات اپنی مختلف ساخت ،گوناگوں شکلوں ،نوع بہ نوع صورتوں اورعظیم تعجب خیزیوں کی وجہ سے ہر دیکھنے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ان میں سے ہرایک جانور کے بارے میں مطالعہ انسان کوان کے خالق کے بے انتہاعلم اوراس کے بے مثال قدرت سے آگاہ کرتا ہے۔اس مسئلہ کی اہمیت اوربھی واضح ہوجاتی ہے جب ہم ان جانوروں کوایک جگہ پراورایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دیکھیں۔مثلاً ہم چڑیا گھر چلے جائیں اورمچھلیوں کی قسموں،مختلف پرندوں، بندروں ،شیروں ،چیتوں ،زرافوں اورہاتھیوں کی مختلف انواع کو یکے بعد دیگرے دیکھیں، ان میں سے ہرایک کی حرکات وسکنات ،عادات واطواراورعجائباتِ تخلیق کوغور سے ملاحظہ کریں،توممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی شخص جس میں رتی بھربھی عقل وشعور ہےان کے دیکھنے کے وقت گہری سوچ میں نہ پڑجائے اوران عجیب وغریب جانوروں کے خالق کے سامنے سرِتعظیم نہ جھکادے۔

ان جانوروں میں پالتو جانوربھی ہیں جوانسان کی خدمت کیلئے ہمہ وقت کمربستہ نظرآتے ہیں اورانسان کیلئے گوناگوں فوائدوبرکات کے حامل ہیں۔ایسے جانورزیادہ قابل توجہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ خداوندِعالم نے قرآن مجید میں اپنی توحیدی آیات میں ویسے توکلی طور پرروئے زمین پرچلنے والی تمام مخلوق پر،لیکن چوپایوں اورجانوروں پرخصوصی طور پرزوردیاہے اورمتعددآیات میں ان کی محیرالعقول زندگی کے مختلف گوشوں کوذکرفرمایاہے:اس مختصرسے اشارے کے ساتھ،ہم مندرجہ ذیل آیات کوگوشِ جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾(شوریٰ/۲۹)

۲۔۔۔اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾(جاثیہ/۳۔۴)

۳۔۔۔اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ (غاشیہ۔۱۷)

۴۔۔۔وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

(مومنون۔۲۱۔۲۲)

۵۔۔۔وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ﴿۶۶﴾

(نحل۔۶۶)

۶۔۔۔وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴿۸۰﴾

(نحل۔۸۰)

۷۔۔۔وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ﴿۲۸﴾

(فاطر۔۲۸)

۸۔۔۔اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ﴿۷۱﴾

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ﴿۷۳﴾

(یٰس۔۷۱ تا ۷۳)

۹۔۔۔وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ﴿۱۲﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ﴿۱۳﴾

(زخرف۔۱۲۔۱۳)

۱۰۔۔۔اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ﴿۷۹﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ

تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۚ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

(مؤمن ۷۹ تا ۸۱)[1]

ترجمہ

۱.....اور اس کی آیات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان جانداروں کا پیدا کرنا جو اس نے زمین وآسمان میں پھیلا رکھے ہیں اور جب چاہے ان کے جمع کر لینے پر قادر ہے۔

۲.....اس میں شک نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں اس کی ان لوگوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں جو اہل ایمان ہیں۔ اسی طرح تمہاری پیدائش میں بھی اور ان چلنے والوں کی پیدائش میں بھی جو اس نے زمین پر پھیلا رکھے ہیں ان لوگوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔

۳.....کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیا گیا ہے؟

۴.....اور تمہارے لئے چوپاؤں میں عبرت ہے، اور جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے اس سے ہم تم کو (دودھ) پلاتے رہتے ہیں اور چوپایوں میں تمہارے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ ان کا گوشت تم کھاتے ہو، اور ان پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو۔

۵.....اور چوپایوں کے وجود میں بھی تمہارے لئے عبرت (کا درس) ہے کہ ان کے پیٹ میں سے ان کی ہضم شفہ غذا اور خون سے ہم تم کو خالص اور خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔

۶.....اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں میں (آرام اور) سکون کی جگہ قرار دی ہے اور چوپایوں کے چمڑے سے بھی تمہارے لئے گھر بنائے ہیں۔ جنہیں تم اپنے کوچ اور اپنے قیام کے دن آسانی کے ساتھ جا بجا کرتے رہتے ہو۔ اور ان چوپایوں کی اون، روؤں اور بالوں سے ایک خاص وقت تک کیلئے (تمہاری زندگی کے مختلف وسائل) اسباب اور کارآمد چیزیں بنائی ہیں۔

۷.....اور انسانوں، چلنے والوں اور چوپایوں کی بھی طرح طرح کی رنگتیں پیدا کی ہیں۔ (جی ہاں) حقیقت بھی

---

[1] اس بارے میں قرآن مجید کی اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں جیسے شعراء۔ ۳۳، انعام۔ ۱۴۲، زمر۔ ۶ اور زخرف۔ ۱۱

یہی ہے کہ خدا کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں خداوند عالم ہی غالب اور بخشنے والا ہے۔

۸.....کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ ہم اپنی قدرت کے ساتھ عمل میں لائے ہیں؟ چوپایوں کو ان کیلئے پیدا کیا ہے کہ وہ ان کے مالک ہیں..... انہیں ان کیلئے مطیع بنادیا ہے، ان میں سے کچھ تو ان کی سواریاں ہیں اور کچھ سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں.....اور ان کیلئے ان میں بہت سے دوسرے فوائد بھی ہیں اور پینے کی خوشگوار چیزیں بھی، آیا پھر بھی وہ شکر بجا نہیں لاتے؟

۹.....وہ وہی تو ہے جس نے تمام چیزوں کے جوڑے پیدا کئے ہیں، اور تمہارے لئے کشتیوں اور چوپایوں سے سواریاں بنائی ہیں، جن پر تم سواری کرتے ہو.....تاکہ تم ان کی پشت پر اچھی طرح بیٹھ سکو۔ پھر جب تم ان پر اچھی طرح سوار ہوجاؤ تو اپنے پروردگار کی نعمتوں کو یاد کرو، اور کہو پاک ومنزہ ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے لئے مسخر کردیا ہے ورنہ ہم میں تو اس کی طاقت نہیں تھی۔

۱۰.....خداوند عالم ہی تو ہے جس نے چوپایوں کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے تاکہ تم ان میں سے کچھ پر سواری کرو اور کچھ سے غذا حاصل کرو اور تمہارے لئے ان میں بہت سے اہم فوائد ہیں، مقصد یہ ہے کہ تم ان کے ذریعہ اپنی منزل مقصود تک جا پہنچو، اور ان پر اور کشتیوں پر سواری کرو.....وہ ہمیشہ اپنی آیات تمہیں دکھاتا ہے، تم اس کی کس کس آیت کا انکار کروگے؟

الفاظ کے معانی اور تشریح

''دابة'' جیسا کہ ہم پہلے بیان چکے ہیں۔''دبیب'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں آہستہ اور نرمی سے چلنا۔لیکن عام طور پر اس کا اطلاق تمام چلنے والوں پر ہوتا ہے یہ لفظ مذکر، مؤنث اور ان تمام چیزوں کیلئے استعمال ہوتا ہے جو زمین پر چلتی ہیں حتیٰ کہ آسمان کے پرندوں پر بھی بولا جاتا ہے اس کی جمع ''دواب'' ہے جس کے معنی ''چلنے والے'' ہیں۔

کبھی اس کا اطلاق ایک چیز کے دوسری چیز میں حلول کرجانے اور راسخ ہوجانے پر بھی ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے ''دب الشراب فی الجسم ودب السقم فی البدن'' یعنی مشروب جسم میں اور بیماری بدن میں رسوخ کرچکی ہے۔

یہ لفظ انسان پر بھی بولا جاتا ہے اور قرآن مجید میں اس کے استعمال کے بہت سے مقامات اس مدعا کے شاہد ہیں[1]

---

[1] لسان العرب، مفردات راغب اور مجمع البحرین (مادہ دب)

''انعام''''نعم'' (بروزن قلم) کی جمع ہے جو اصل میں ''نعمت'' سے لیا گیا ہے پھر اس کا اطلاق ''اونٹ'' پر ہونے لگا کیونکہ عربوں کے نزدیک اونٹ بہت بڑی نعمت تھا۔ دوسرے چوپایوں مثلاً گائے اور گوسفند پر بھی لفظ بولا جاتا ہے بشرطیکہ اونٹ بھی ان میں شامل ہو۔[1]

کچھ ارباب لغت نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ''نعم'' میں جمع کا معنی پایا جاتا ہے جس کا مفرد نہیں ہے اور ''انعام'' جمع الجمع ہے۔[2]

''ان منظور''، ''لسان العرب'' میں کہتے ہیں ''نعم'' اس جانور کو کہتے ہیں جو چرنے جاتا ہے پھر وہ بعض لوگوں سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''نعم'' خصوصی طور پر ''اونٹ'' کو کہا ہے اور بعض دوسرے لوگوں سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''نعم'' اونٹ اور گوسفند کو کہا جاتا ہے۔

''نعامة'' شترمرغ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ جسم کے بڑا ہونے کی وجہ سے ''اونٹ'' سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے پھر اسی مناسبت سے پہاڑوں وغیرہ میں بنائے جانے والے سائبانوں اور راہ پیدا کرنے کیلئے نصب کئے جانے والے جھنڈوں کو بھی ''نعمامہ'' کہا جاتا ہے۔

بہرحال ''انعام'' پہلا معنی خواہ کچھ بھی ہوں، معمول کی بول چال میں ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو چرنے کو جاتے ہیں جیسے گائے بھیڑ بکری اور اونٹ وغیرہ۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

حیوانات کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

اس سلسلے کی پہلی اور دوسری آیت میں پہلے تو زمین و آسمان میں خداوند عالم کی نشانیوں انسان کی تخلیق اور زمین و آسمان میں چلنے والی تمام مخلوق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پھر فرماتا ہے ''خداوند عالم کی نشانیوں میں آسمان و زمین اور چلنے والی وہ چیزیں ہیں جنہیں اس نے پیدا کیا اور پھیلا دیا ہے'' (ومن اٰیاتہٖ خلق السمٰوٰت والارض ومابث فیھما من دآبۃٍ)

''بث'' دراصل اس چیز کو کہتے ہیں جسے منتشر کیا جائے جیسا کہ ہوا مٹی کو منتشر کر دیتی ہے ان آیات میں اس کے معنی مختلف چیزوں کا ایجاد و خلق کرنا، آشکار کرنا اور مختلف مقامات پر انہیں پھیلانا ہے۔

بہرحال یہ تعبیر تمام چلنے والوں جانوروں اور انسانوں کو شامل ہے۔ خوردبین سے دیکھی جانے والی مخلوق جو ظریف اور مرموز حرکت

---

[1] مفردات راغب

[2] مجمع البحرین اور اقرب الموارد۔

کرتی ہے سے لے کر غول پیکر جانوروں تک اس میں شامل ہیں کہ جن کی لمبائی بیسیوں میٹر اور وزن سوٹن سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔[1] ہذا القیاس پرندوں کی مختلف قسمیں، گونا گوں حشرات کی لاکھوں قسمیں جنگلی اور پالتو جانوروں کی ہزار ہا قسمیں ،درندے ،خزندے ،چھوٹی اور بڑی مچھلیاں اور تمام دریائی مخلوق غرض دنیا کی ساری زندہ مخلوق اس میں شامل ہے۔

اگر ہم ''دابۃ'' کے مفہوم کی وسعت اور ہر قسم کی چلنے والی مخلوق کی تمام اقسام پر اس کے اطلاق کے بارے میں غور وفکر کریں تو عجائبات الٰہی اور اس کی قدرت نمائی کی ایک کائنات ہمارے سامنے مجسم ہو کر آجاتی ہے جن میں ہر ایک چیز بذاتِ خود خداوند عالم کے علم وقدرت سے آگاہ کرتی ہے۔

مختلف جانوروں کی ساخت اور ان کی زندگی کی خصوصیات کے بارے میں مختلف زبانوں میں ہزار ہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس بارے میں حد سے زیادہ فلمیں بھی تیار کی جا چکی ہیں، مختلف زبانوں میں اخبارات ومجلّات شائع کئے جا چکے ہیں اور کئے جا رہے ہیں کہ جن کا مطالعہ اور مشاہدہ انسان کو حیرت اور استعجاب کے سمندر میں غرق کر دیتا ہے۔ پھر یہ کہ ان چیزوں کی شناخت کیلئے دانشوروں کی طرف سے ہزار ہا سال سے جو کوشش کی جا رہی ہے اور کی جا چکی ہے ابھی تک ان کی زندگی کے ایک گوشے سے ہی پردہ اٹھایا جا چکا ہے۔ اور جوں جوں دن گزرتے جائیں گے نت نئے انکشافات سامنے آتے جائیں گے۔

بعض دانشوروں نے اپنی زندگی کے بیس سال صرف چیونٹیوں کی تحقیقات پر ہی صرف کر دے ہے، اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور تمام جانوروں پر اسی طریقے سے تحقیقات جاری رکھی گئی تو معلوم نہیں کہ انسانیت کی تمام عمر اسی پر صرف ہو جائے۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہم جو بات کر رہے ہیں۔ وہ سب اسی زمین پر رہنے والی مخلوق کے بارے میں ہے جب کہ ''فیھما'' (آسمان وزمین میں موجود) کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں میں بھی بہت سے چلنے والی مخلوق موجود ہے جو ہمارے دانشوروں کی دسترس سے مکمل طور پر خارج ہے، شاید ایک دن ایسا آجائے کہ انسان خلائی سفر کے ذریعہ دوسر کروں میں موجود دوسرے عجیب وغریب مخلوق تک رسائی حاصل کرے کہ آج جن کی صورت اور خصوصیات کا تصور بھی ہمارے لئے محال ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آسمان میں چلنے والی مخلوق سے مراد فرشتے ہیں۔ حالانکہ ''دابۃ'' کے لفظ کا فرشتے پر اطلاق نہیں ہوتا۔ بعض حضرات نے اس گمان کے تحت کہ آسمان میں فرشتوں کے علاوہ کوئی اور زندہ مخلوق نہیں ہے آیت کی کئی دوسری تفسیریں بیان کی ہیں جب کہ آج یہ بات ہم پر روشن ہو چکی ہے کہ زندہ مخلوق صرف ہماری ہی زمین پر نہیں ہے بلکہ سائنسدانوں کے بقول اس بیکراں فضا میں لاکھوں

---

[1] بعض غول پیکر مگر مچھ ایسے بھی ہیں کہ جن کا وزن ایک سو بیس ٹن تک جا پہنچتا ہے۔ کتاب ''نظری بہ طبیعت واسرار آن'' کے مصنف ''پروفیسر لٹون برٹین'' کے مطابق وزن کی یہ مقدار پندرہ سو قوی ہیکل مردوں یا جو بیس بڑے ہاتھیوں کے وزن کے برابر ہے۔ موصوف نے اس کے اجزاء بدن کا بھی حساب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے دل کا وزن چھ سو کلوگرام خون کا وزن آٹھ ہزار کلوگرام پھیپھڑوں کا وزن ایک ٹن، پٹھوں کا وزن پچاس، چمڑے، ہڈیوں معدے اور انتڑیوں کا وزن ساتھ ٹن بنتا ہے۔ ص ۲۳۸

،کروڑوں کُرّے موجود ہیں جومختلف قسم کی چلنے والی مخلوق اور جاندار چیزوں کیلئے سکونت اور رہائش کے قابل ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ زندہ موجودات صرف اپنی ساخت اور زندگی کے مختلف اطوار کے لحاظ سے ہی آیات الٰہی میں شمار نہیں ہوتیں بلکہ اپنے گوناگوں اور مختلف فوائد و برکات کی وجہ سے بھی جو وہ عالم انسانیت کی خدمت کیلئے انجام دیتے ہیں ،خدا کی آیات میں شمار ہوتے ہیں۔

اور اگر وہ یہ فرماتا ہے کہ ''یہ آیات ان لوگوں کیلئے ہیں جو اہل یقین ہیں'' تو اس سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو حق کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں نہ کہ وہ جو ہٹ دھرم،منکر اور خودخواہ ہوتے ہیں۔

اسی سلسلہ کی تیسری آیت میں جھڑک کر پوچھا جارہا ہے ''کیا وہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا ہے ؟(افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت)

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد ہی آسمان کی تخلیق کی عظمت ،پھر پہاڑوں اور بعد میں زمین کی عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ان امور کے ساتھ ہی اونٹ کا قرار پانا بذاتِ خود اس جانور کی عظمت کی دلیل ہے۔

اس حیوان کے حالات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں اور ان خصوصیات کو پیش نظر رکھا کر یہ بات بخوبی روشن ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید نے اس موضوع کو زور دے کر کیوں بیان فرمایا ہے؟ چنانچہ اس کی خصوصیات میں سے کچھ کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔اونٹ کے اندر قوت مزاحمت بہت پائی جاتی ہے بڑی حد تک بھوک کو برداشت کرلیتا ہے اور پیاس جو بھوک سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے کو دس دس دن بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے تک برداشت کرسکتا ہے۔اسی لئے تو یہ خشک اور جھلسا دینے والے صحراؤں میں سفر کرنے کیلئے بہترین سواری ہے۔اس کی اس ادا کی وجہ سے ہی تو اسے ''ریگستان کا جہاز'' کہتے ہیں کیونکہ وہ غذائی مواد اور اپانی کو اپنے اندر کافی عرصے کیلئے ذخیرہ کرلیتا ہے اور اسے خرچ کرنے میں کفایت شعاری سے کام لیتا ہے۔

۲۔وہ اپنی غذا کے حصول کیلئے کسی خاص قسم کی خوراک کا پابند نہیں ہے بلکہ عموماً جنگل میں اگنے والی ہر نباتات کو کھالیتا ہے۔

۳۔اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ وہ گردوغبار سے اَٹے ہوئے صحراؤں میں ،جن کی ریت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے بڑے آرام سے سفر جاری رکھ سکتا ہے و ہ اپنے نتھنوں کو وقتی طور پر بند کرسکتا ہے ،اپنے کانوں کو ریت اور دوسرے گردوغبار سے بھی بچاسکتا ہے۔ اس کی آنکھ کی دوہری پلکیں ہوتی ہیں اور وہ ایسے مواقع پر ایک کو بند کرکے اس کے اندر سے دیکھتا رہتا ہے اور چلتا بھی رہتا ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ اونٹ آنکھیں بند کرکے چلتا ہے، اس سے مراد یہی چیز ہے،حتیٰ کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ تاریک راتوں میں بھی اپنی راہ بخوبی پالیتا ہے۔

۴۔چوپایوں کی مختلف قسمیں ہیں۔بعض وہ ہیں جن سے گوشت حاصل کیا جاتا ہے،بعض وہ ہیں جو سواری کے کام آتے ہیں کچھ وہ ہیں جن سے صرف دودھ حاصل کیا جاتا ہے اور کچھ وہ ہیں جن سے باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔لیکن اونٹ ان تمام چاروں صفات کا حامل

ہوتا ہے۔سواری اور بار برداری کا کام بھی دیتا ہے اور اس کے دودھ، گوشت پرست اور اون سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔

۵۔اس جانور کے استثنائی عجائبات میں یہ بات ہے کہ دوسرے جانوروں پر اس وقت بوجھ لادتے ہیں جب وہ کھڑے ہوتے ہیں لیکن اس پر اس وقت بوجھ لادتے یا سوار ہوتے ہیں جب وہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور پھر ایک ہی حرکت سے کھڑا ہوجاتا ہے جب کہ دوسرے جانوروں میں ایسی قدرت نہیں ہے۔

بعض دانشوروں نے لکھا ہے کہ اس کا سبب اس کی وہ عجیب وغریب طاقت ہے جو اس کی لمبی گردن میں چھپی ہوئی ہے اور ''فزکس'' کے قانون کے مطابق (جو''ارشمیدس'' ARCHIMEDES کے ذریعہ دریافت ہوا)''لیور'' LEVER کا کام دیتی ہے (کہا جاتا ہے کہ ارشمیدس کہا کرتے تھے کہ اگر کُرہ زمین کے باہر مجھے کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں میں ''لیور'' کو ٹیک سکوں، تو ایک عظیم لیور کے ذریعہ اس پورے کُرہ ارضی کو اپنی جگہ سے ہلا دوں! اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ لیور کے قانوں کے مطابق لیور کی مدد سے تھوڑی دقوت لگا کر بھاری وزن آسانی کے ساتھ اٹھایا جاسکتا ہے جس میں لیور کے ایک سرے لیور پر قوت ہوتی ہے اور دوسرے سرے پر وزن ہوتا ہے) اس طرح سے اونٹ کی گردن لیور کی حیثیت پیدا کرلیتی ہے اور ایک سریع اور محکم حرکت سے اپنی پیٹھ پر لدے ہوئے بوجھ کو ہلکا بنادیتی ہے۔پھر اونٹ اپنے پچھلے پاؤں کو آزادانہ طور پر کھڑا کردیتا ہے اور آسانی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔[1]

یہ اور دوسرے عجائبات اور خصوصیات اس بات کا سبب بن گئی ہیں کہ اسے خداوند بزرگ وبرتر کی آیات میں سے ایک آیت کے طور پر یاد کیا جائے، نہ صرف اس لئے کہ اونٹ عربوں کی زندگی کا ایک اہم رکن تھا جب انہیں پہلی بار ان آیات میں مخاطب کیا گیا تھا۔

کس کی طاقت ہے کہ یہ سب عجائبات اور برکات اس مخلوق میں پیدا کرے اور پھر اسے اس انسان کا اس طرح مطیع اور فرمانبردار بنادے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اونٹوں کی قطار کی مہار تھام کر جہاں اس کا جی چاہے لئے پھرے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ (حدی خوانی جیسی) موزوں آوازیں میں اس پر اثر کرتی ہیں اور اسے شوق وشغف کے ساتھ حرکت پر آمادہ کرتی ہیں۔

کیا یہ سب کچھ خالق کائنات کی عظمت اور قدرت کی نشانیاں نہیں ہیں؟ جی ہاں! بالکل ہیں!! لیکن ان لوگوں کیلئے جو بے اعتنائی کے ساتھ ان آیات کے پاس سے نہیں گزرتے۔یقیناً ایسے لوگ ہی ان آیات کا ادراک کرسکتے ہیں (یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ''افلا ینظرون'' کا جملہ''نظر'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی دیکھنا اور نگاہ کرنا ہیں، لیکن عام اور معمولی آنکھوں سے نہیں بلکہ غور وفکر کے ساتھ دیکھنا مراد ہے۔(غور کیجئے گا)

چوتھی اور پانچویں آیت میں انسان کیلئے چوپایوں کے مختلف فوائد کے ضمن میں ارشاد فرماتا ہے۔تمہارے لئے چوپایوں میں زبردست عبرت ہے۔(وان لکم فی الانعام لعبرۃً)

---

[1] کتاب اولین دانشگاہ، جلد۶، ص۳۲، میں اس مسئلہ کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے جب کہ دوسری کتابوں میں اس سے زیادہ وصاحت کے ساتھ اشارے موجود ہیں۔

یہاں پر ''عبرت''، ''نکرہ'' کی صورت میں ذکر ہوئی ہے جو اس کی زبردست اہمیت کی دلیل ہے۔ ''مفردات'' میں ''راغب'' کے بقول ''عبرت''، ''عَبر'' (بروزن ابر) کے معنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرنا اور عبور کرنا ہیں۔ چونکہ عبرت حاصل کرنے والا شخص کسی حالت کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس سے ایک ایسی حقیقت کو پالیتا ہے جو قابل مشاہدہ نہیں ہے اسے عبرت کہتے ہیں۔

بنابریں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم چوپایوں کے اسرار و عجائب کو دیکھ کر خداوند بزرگ و برتر کی عظمت و علم اور آفرینش کے مبدء بزرگ کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہو۔

پھر قرآن مجید نے اس بات کی تشریح کرتے ہوئے چوپایوں کے چار اہم فوائد کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرماتا ہے: ''ہم اس سے جو کچھ کہ ان کے اندر ہے تمہیں سیراب کرتے ہیں (نسقیکم مِّمَّا فی بطونہا)

دودھ جو خوشگوار مادہ و مشروب بھی ہے اور طاقت ور اور مکمل غذا بھی ان جانوروں کے اندر سے اور ان کے خون اور گوشت کے درمیان سے باہر آتا ہے یہی بات مزید تاکید کے ساتھ پانچویں آیت میں بیان ہوئی ہے۔ فرماتا ہے: ہم جانوروں کے شکم ہضم شدہ غذاؤں اور خون کے درمیان سے خالص اور خوشگوار دودھ تمہیں پلاتے ہیں (نسقیکم مما فی بطونہ من بین فرثٍ ودم لبناً خالصًا سابغا للشربین)[1]

یہ کون سی قدرت ہے جو اس قدر آلودہ چیزوں کے درمیان سے اس حد تک پاک و پاکیز، خالص اور لذیذ غذا باہر نکالتی ہے جس کا رنگ سفید، ذائقہ شیریں بو معطر اور ہر لحاظ سے خوشگوار ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دانشوروں کے بقول جانور کے پستانوں میں ایک لیٹر دودھ بننے کیلئے اس عضو سے قریباً پانچ سو لیٹر خون کو گذرنا چاہیے تاکہ اس خون سے ایک لیٹر دودھ کیلئے ضروری مواد حاصل کیا جاسکے اور رگوں میں ایک لیٹر خون بننے کیلئے زیادہ مقدر میں مواد کو انتڑیوں میں سے گذرنا چاہیے تب کہیں جاکر اس مقدار میں دودھ حاصل ہوگا، یہیں سے ''من بین فرثٍ ودم'' کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

دودھ کی ترکیب، پستانوں میں اس کی پیدائش کی کیفیت، حیاتی مواد اور اس میں موجود حیاتین، طاقت بخشنے والے خواص اور دودھ سے بننے والی دوسری مختلف چیزیں، اس کا ہر سن و سال کے لوگوں کیلئے مفید ہونا وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جاچکا ہے کہ اگر ان سب کو

---

[1] ''فرث'' کے معنی ہضم شدہ غذا، ''دم'' کے معنی خون اور سائغ کے معنی خوشگوار ہیں، وہی چیز جو آسانی کے ساتھ حلق سے گزر کر بڑے آرام سے ہضم ہوجاتی ہے، بات یہ قابل توجہ ہے کہ سورہ مومنون کی آیت میں بطونہا مونث کی ضمیر کے ساتھ ذکر ہوا ہے جو ایسے مقامات پر جمع کے معنی کا حامل ہے۔ اور سورہ نحل میں۔ بطونہ مذکر کی ضمیر کے ساتھ ذکر ہوا ہے جن میں مفرد کے معنی ہوتے ہیں بعض مفسرین کہتے ہیں لپ ''انعام'' اسم جمع ہے لہٰذا اگر ظاہر کو دیکھا جائے تو مفرد کی ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے اگر معنی کو ملاحظہ کیا جائے تو جمع کی ضمیر اور بعض کہتے ہیں کہ مفرد کی ضمیر جمع کے مفہوم کی وجہ سے ہے اور مونث کی ضمیر جماعۃ کے مفہوم کی خاطر ہے (دیکھئے تفسیر کشاف، تفسیر فخر رازی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر ابوالفتوح رازی)

اکٹھا کیا جائے تو ایک اہم کتاب بن جائے لیکن ہم تفسیر کی اصل بحث سے خارج ہو جائیں گے البتہ ہم یہاں پر حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مختصر لیکن جامع حدیث کو نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ آپؐ ارشاد فرماتے ہیں:

اذا اکل احدکم طعامًا فلیقل اللّٰھم بارك لنا فیه واطعمنا خیرًا منه ،واذا شرب لبنًا فلیقل اللّٰھم بارك لنا فیه وزدنا منه ،فانی لا اعلم شیئا انفع فی الطعام والشراب منه

جب تم میں سے کوئی ایک کھانا کھائے تو کہے: اے اللہ! تو ہمارے لئے اس میں برکت عطا فرما اور اس سے بہتر روزی عنایت فرما!! لیکن جب دودھ پیئے تو کہے: خداوندا! تو ہمیں اس میں برکت دے اور زیادہ عطا فرما! کیونکہ میں کھانے اور پینے کی چیزوں میں سے دودھ سے بڑھ کر کوئی اور چیز مفید نہیں سمجھتا۔ [1]

پھر چوپایوں کے دوسرے فائدوں کو بیان کرتے ہوئے ایک مختصر اور سربستہ جملہ ارشاد فرماتا ہے: اس میں تمہارے لئے بہت سے فوائد ہیں۔ (ولکم فیھا منافع کثیرۃٌ)

ممکن ہے یہ تعبیر جانوروں کی اون، پشم اور بالوں کی طرف اشارہ ہو، جس سے مختلف قسم کے لباس، پوشاک اور نیچے بچھانے کیلئے چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ان کے چمڑے، رودے، کھل، میشے، ہڈیوں اور سینگوں کی طرف بھی اشارہ ہو جن سے زندگی کی مختلف چیزیں تیار کی جاتی ہیں، حتیٰ کہ ان کا گوبر بھی درختوں کی پرورش اور زراعت و نباتات کی تقویت کیلئے مفید ہوتا ہے۔

تیسرے مرحلہ پر ایک اور فائدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "اور تم ان سے کھاتے ہو" (ومنھا تاکلون)

کچھ غذا شناس گوشت کے نقصانات کو بیان کرتے ہیں اور گوشت خوروں کیلئے گوشت کے طبی، اخلاقی اور دوسرے نقصانات بتاتے ہیں لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں کو نظر یہ ہے کہ تھوڑی مقدار میں گوشت کا استعمال نہ صرف مضر ہی نہیں بلکہ انسانی جسم کیلئے ضروری بھی ہے سبزی خوروں کے بارے میں تجربہ شاہد ہے کہ وہ کئی قسم کے اختلالات کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں بہت سی چیزوں کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ان کے چہروں کا اڑا اڑا رنگ اس کمی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ گوشت اور پروٹین میں ایسے حیاتیاتی اجزا پائے جاتے ہیں جو کسی بھی سبزی یا دوسری نباتات میں نہیں پائے جاتے۔ قرآن مجید کا اس مسئلے کو اہمیت دینا بھی اسی بات کی دلیل ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ بے تحاشا گوشت خوری السام کی نظر میں مذموم ہے اور موجود طب کی نظر میں بھی۔

اس آیت کے چوتھے اور آخری حصے میں چوپایاں اور دوسری چیزوں پر سواری کے طور پر استفادہ کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ تم ان پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو۔ (وعلیھا وعلی الفلك تحملون)

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۵ ص ۴۸

یہ جانور، ہمیشہ، بار برداری اور سواری کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں، حتیٰ کہ دور حاضر میں بھی جو کہ موٹر کاروں اور دوسری مشینی سواریوں کا دور ہے انسان سواری اور بار برادری کیلئے ایسے جانوروں کے وجود سے بے نیاز نہیں ہے۔ خاص کر بعض کو ہستانی علاقوں اور ان راستوں میں جہاں جدید وسیلہ نقلیہ (ٹرانسپورٹ) سے استفادہ ناممکن ہوتا ہے، حمل ونقل کیلئے بھی خچروں اور ٹٹوؤں جیسے طاقت ور جانوروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور ان کے بغیر جنگی اہمیت کی چوٹیوں پر تسلط حاصل کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

اس طرح خداوند عالم نے ان جانوروں میں سے بہت سے فوائد پیدا کئے ہیں اور اپنی عظمت اور لطف وکرم کے آثار انسانوں کیلئے ظاہر فرمائے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیت کے اس حصے میں چوپایوں کو کشتیوں کے شابہ بشانہ ذکر فرمایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جانور ''بری کشتیاں'' ہیں۔[1]

چھٹی آیت میں خداوند عالم کے تعارف کے طور پر یا ان نعمتوں کی صورت میں جو انسان کو اس کی معرفت کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہیں۔، جانوروں کے چمڑے اور پشم کے کچھ فوائد کا ذکر فرمایا گیا ہے جو انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ''خداوند عالم نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو سکون وآرام کی جگہ بنایا ہے۔ (واللہ جعل لکم من بیوتکم سکناً)

پھر فرماتا ہے ''اور تمہارے لئے چوپایوں کے چمڑے سے گھر بنائے ہیں جو بہت ہی ہلکے اور کم وزن ہوتے ہیں جنہیں تم کوچ کرنے کے دن اور قیام کرنے کے دن آسانی کے ساتھ جابجا کرتے ہو۔'' (وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ)

ثابت اور مستقل گھر ہمیشہ کیلئے انسانی ضروریات کو پورا نہیں کرے۔ بہت سے موقعوں پر انسان کو چلتے پھرتے اور متحرک گھروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جنہیں وہ آسانی کے ساتھ اِدھر اُدھر منتقل کر سکے اور وہ سردی، گرمی، ہواؤں اور طوفانوں کا مقابلہ بھی کر سکیں۔ ایسے چلتے پھرتے گھروں کی ایک قسم وہ خیمے ہوتے ہیں جو چمڑے سے بنائے جاتے ہیں جن کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ اون یا کپاس سے بنے ہوئے خیموں سے بدرجہا بہتر، پائیدار اور آرام دہ ہوتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان کے ایک اور اہم فائدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''ان کی پشم، اون اور بالوں سے تمہارے لئے ایک خاص مقرر وقت تک زندگی کا اثاثہ اور مال ومتاع قرار دیا ہے۔'' (وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا

---

[1] اس طرح کی بات سورہ نحل کی پانچوں تا آٹھویں آیت میں بھی آچکی ہے جس میں چوپایوں کے مختلف فوائد کو بتایا گیا ہے۔

وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾ [1]

البتہ ہم جانتے ہیں کہ بھیڑ کے بالوں کو پشم اور اون اونٹ کے بالوں کی جت یا مَلَس اور بکری کے بالوں کو اون یا بال کہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ یہ تینوں مادے مختلف قسم کے لباس، فرش، پوشاک، پردے، خیمے دسترخوان اور رسیاں تیار کرنے میں بہت ہی اہم حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اور انسانی زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

اگرچہ آج صنعتی اور کیمیادی اجزاء سے لباس اور فرش کی مختلف قسمیں تیار کی جارہی ہیں لیکن سائنسدانوں کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ یہ انسانی زندگی کی حفظان صحت کے اصولوں کے مخالف ہیں، جس سے انسان کی صحت وسلامتی پر بُرا اثر پڑ رہا ہے، جب کہ ریشمی اور اونی لباس سالم ترین لباس سمجھے جاتے ہیں۔

''اِلٰى حِيْنٍ'' کی تعبیر کو بعض لوگوں نے ان وسائل کی پائیداری کی مقررہ مدت مراد لیا ہے کچھ دوسرے لوگوں نے اسے اس بات کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ یہ سب وسائل فانی ہیں، لہٰذا ان سے دل نہیں لگانا چاہیے اور یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

ساتویں آیت میں جو کہ سورہ فاطر کی توحیدی آیات کے ضمن میں ذکر ہوئی ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہ انسانوں، چوپایوں اور زمین پر چلنے والی دوسری مخلوق کی طرف مبذول کراتے ہوئے فرماتا ہے: جیسا کہ خداوند عالم نے میووں اور پہاڑوں میں سے مختلف رنگ کی چیزیں پیدا کی ہیں ''اسی طرح اس نے انسانوں، زمین پر چلنے والی دوسری مخلوق اور چوپایوں سے بھی ایسی مخلوق پیدا کی ہے جس کے مختلف رنگ ہیں'' (وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ) [2]

یعنی جیسا کہ خداوند عالم نے مختلف قسم کے پھلوں کو مختلف رنگوں میں پیدا کیا ہے اور پہاڑوں کے رنگ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی طرح جاندار مخلوق میں خواہ وہ انسان ہوں یا چوپائے اور دوسری چلنے والی مخلوق کو بھی مختلف رنگوں کے معنی میں لیا ہے۔ [3] لیکن ظاہر یہ

---

[1] ''بیوت''، ''بیت'' کی جمع ہے جس کے معنی کمرہ یا گھر یا انسان کے رات بسر کرنے کی جگہ ہیں اور ''بیتوتہ'' کا لفظ بھی اسی سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ''رات گزارنا'' ''ضعن'' کا معنی ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ کی طرف منتقل ہونا اور کوچ کرنا ہے۔ ''اصواف'' صوف کی جمع ہے جس کے معنی اون ہیں۔ ''اوبار''، ''وبر'' کی جمع ہے جس کے معنی ''جت'' ہیں، ''اشعار'' ''شعر'' کی جمع ہے جس کے معنی ''بال'' ہیں۔ ''اثاث''، ''اث'' کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کثرت اور ایک دوسرے میں لپٹنا۔ یہ لفظ گھر کے مال واسباب پر بولا جاتا ہے کیونکہ وہ کثیر مقدار میں ہوتا ہے۔ بعض نے اسے لباس، پوشاک اور لحاف کے معنی میں لیا ہے جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے اسے اوڑھنے بچھونے کے سامان کے معنی میں لیا ہے۔ جب کہ دوسرے بعض نے اسے ایسے مال ومتاع کے معنی میں لیا ہے جو انسان کی زندگی میں اس کے کام آتا ہے۔

[2] ''وَمِنَ النَّاسِ'' مبتدا محذوف کی خبر ہے اور تقدیری طور پر یوں ہے۔ ''ماھو مختلف الوانه'' اور ''كذالك'' مختلف اور رنگ برنگے پھل میووں اور مختلف قسم کے پہاڑوں کی طرف اشارہ ہے جن کا سابقہ آیت میں ذکر ہوا ہے۔

[3] تفسیر المیزان، ابوالفتوح رازی، فی ظلال القرآن اور تفسیر قرطبی وغیرہ

ہے کہ مذکورہ تعبیر کا مفہوم اس سے بھی وسیع تر ہے اور یہ انسانوں، زمین پر چلنے والوں اور چوپایوں کی مختلف انواع واقسام کی طرف اشارہ ہے جو تخلیق کائنات کے اہم ترین عجائبات میں شمار ہوتی ہیں۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آج زمین پر چلنے والے اور چوپایوں کی لاکھوں قسمیں اس دنیا میں موجود ہیں، بلکہ بعض دانشوروں نے تو ان کی انواع واقسام پندرہ لاکھ سے بھی زیادہ بیان کی ہیں اور یہ عجیب قسم کا تنوع، اپنی ان خصوصیات کے ساتھ، جو اس میں پائی جاتی ہیں، آیات حق کی ایک آیت اور خالق کی قدرت اور علم کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

اس ماہر نقاش نے ایک قلم اور ایک قسم کے رنگ کے ساتھ بے شمار نقوش اور رنگ برنگے نمونے ایجاد فرمائے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس کی صنعتِ تخلیق کا ایک شاہکار ہے۔

ہاں البتہ یہ صرف علماء اور دانشور ہی ہیں جو دل کی آنکھیں کھول کر جانِ جہان کو اس صفحہ ہستی پر دیکھتے ہیں اور ''جو دکھائی نہ دینے والی چیز ہے اسے بھی دیکھتے ہیں'' اسی لئے تو اسی آیت کے ذیل میں فرماتا ہے: ''خداوند عالم کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں اور خدا عزیز اور غفور ہے۔ (اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾)

مخلوق کے مختلف ظاہری رنگ سطحی قسم کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، لیکن باطنی رنگ اور ان کی مختلف قسم کی تخلیق اہل دل اور معنویت پر رکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔

پھولوں کے ظاہری رنگ حشرات اور شہد کی مکھیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ وہ باروری کے معاملہ میں ان کی امداد کریں نیز نر اور مادہ کو (خصوصاً پرندوں کے درمیان) ایک دوسرے کی طرف کھینچتے ہیں۔ لیکن باطنی رنگ اور ان کی مختلف قسم کی ساخت علماء اور صاحبانِ فکر ونظر کو ہی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ وہ اپنے غور وفکر کو توحید کے بیج کے ذریعہ بارور کریں۔

''خَشْيت'' کے معنی ''تعظیم پر مبنی خوف ہیں جو علم اور آگاہی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، یہ درحقیقت ''ڈر'' اور ''امید'' کا مجموعہ ہوتا ہے اسی لئے خداوند عالم نے فوراً ہی اپنی دو صفات بیان فرمائی ہیں۔ ایک ''عزیز'' اور دوسری ''غفور'' (یعنی غالب اور مہربان) پہلی صفت سے ڈر پیدا ہوتا ہے اور دوسری سے امید لگتی ہے۔ اس طرح آیت درحقیقت علت اور معلول سے مرکب ہے۔

ضمنی طور پر ''انعام'' (چوپائے) کا ذکر ''دواب'' (زمین پر چلنے والے) کے ذکر کے بعد، عام کے بعد خاص کے ذکر کی قسم سے ہے۔ اس کی وجہ وہ اہمیت ہے جو وہ انسانی زندگی کیلئے رکھتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں ایک توبیخ آمیز استفہام کے ساتھ ان کفار ومشرکین کی سرزنش کرتا ہے جو راہِ راست کو کھو کر اور خالقِ کائنات کو چھوڑ کر بتوں کی چوکھٹ پر جبہ سائی کئے ہوئے ہیں۔ فرماتا ہے ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہم نے جو کچھ اپنی قدرت سے پیدا کیا؟ چوپائے ان کیلئے بنائے جن کے وہ مالک ہیں۔ (اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾)

''لھم'' (ان کیلئے) کی تعبیر کا مفہوم نہایت ہی وسیع ہے جو ان چوپایوں کے تمام اجزاء کے گوناگوں منافع کو شامل ہے، پس اس کا لطف وکرم تو دیکھئے کہ ''خالق'' وہ ہو اور ''مالک'' دوسرے!!

پھر چوپایوں کے بارے میں ایک تازہ نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے'' ہم نے انہیں ان لوگوں کے لئے رام کردیا اور مطیع بنادیا ہے اس طرح کہ ان کی سواری بھی انہی میں سے ہے اور ان کا غذا پانا بھی۔ نیز دوسرے مفادات اور پی جانے والی چیزیں بھی''(وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ)

اور آخر میں فرماتا ہے ان تمام نعمتوں کے باوجود بھی جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہیں وہ اس کا شکر بجا نہیں لاتے اور اس کی پاک ذات کی معرفت حاصل نہیں کرتے؟(اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾)

ہوسکتا ہے کہ''مما عملت ایدینا'' کی تعبیر زندگی اور موت کے پیچیدہ مسئلہ کی طرف اشارہ ہو، جس کا معمہ ابھی تک انسان کیلئے حل نہیں ہو پایا اور صرف اس کی بے انتہا قدرت کے سامنے ہی اس کا تعلق ہے۔

''مشارف''(پی جانے والی چیزوں) کا ذکر''منافع'' کے ذکر کے بعد خاص کا ذکر عام کے بعد کی قسم سے ہے جو اس کی اہمیت کی دلیل ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتادیں کہ''مشارب''،''مشرب'' کی جمع ہے جس کے معنیٰ ہیں۔''پینے کی چیز''(کیونکہ یہ مصدر میمی ہے جو کہ اسم مفعول کے معنی میں ہے)۔ممکن ہے کہ یہ چوپایوں کے دودھ کی مختلف قسموں کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ان میں سے ہر ایک میں خصوصی اثرات اور خصوصیات ہوتی ہیں، یا پھر دودھ کی مختلف مصنوعات کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ان سب مصنوعات کا سرچشمہ دودھ ہی ہوتا ہے۔''مشارب'' کا لفظ ان سب پر بولا گیا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ دورِ حاضر میں بھی انسانی غذا کا اہم حصہ دودھ اور اس کی مصنوعات پر مشتمل ہے [1]

''وَذَلَّلْنٰهَا''(ہم نے ان چوپایوں کو انسان کیلئے رام اور ذلیل کردیا ہے) کے بارے میں دلچسپ بحث ہے جو انشاء اللہ ''وضاحتوں'' کے حصے میں بیان ہوگی۔

نویں آیت بھی خداشناسی اور توحید کی آیات کی سلک میں منسلک ہے کیونکہ اس سے پہلی آیات میں فرماتا ہے''اگر تم ان سے سوال کرو کہ زمین وآسمانوں کا خالق کون ہے تو وہ کہیں گے ان کا خالق خداوند قادرِ ودانا ہے'' پھر قادر ودانا خدا کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے''وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ مردہ زمینوں کو زندہ فرمایا'' پھر زیر بحث آیات میں فرماتا ہے''وہ وہی ہے جس نے تمام چیزوں کو جوڑا جوڑا بنایا''(وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر''ازواج'' سے مراد جانوروں کے نر اور مادہ جوڑے ہیں، خصوصاً جب اس کے آگے فرماتا ہے ''اور خداوند عالم نے تمہارے لئے کشتیوں اور چوپایوں کو تمہاری سواری کا وسیلہ قرار دیا ہے(کشتی پانی میں اور چوپائے خشکی میں (وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾)

---

[1] بعض مفسرین نے''مشارب'' کو ان مختلف ظروف کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو جانوروں کی کھال سے بنائے جاتے ہیں، جیسے مختلف قسم کی مشکیں اور دوسرے برتن۔لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ موضوع بہت زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ منافع کے ذکر کے بعد اسے اس زور شور سے بیان کیا جائے

اس طرح ''ازواج'' کے بعد ''انعام'' کا ذکر خاص کا ذکر، عام کے بعد کی قسم سے ہے۔

لیکن کچھ مفسرین کا عقید ہے کہ یہاں ''ازواج'' کا لفظ دنیا کی مختلف قسموں کی طرف اشارہ ہے، خواہ وہ حیوانات ہوں یا نباتات اور جمادات، کیونکہ ہر جنس کا اپنا ایک مخالف ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات میں نر اور مادہ اور ان کے علاوہ نور اور ظلمت، آسمان اور زمین، سورج اور چاند، خشک اور تر، حتیٰ کہ خود انسانی افکار کے اندر بھی یہ جوڑے موجود ہیں، جیسے خیر اور شر، کفر اور ایمان، تقویٰ اور فجور وغیرہ۔ اس کائنات میں صرف ایک وجود ایسا ہے جس میں دوگانگی نہیں اور وہ ہر نظر اور ہر لحاظ سے یکتا اور یگانہ ہے وہ ذاتِ خداوند ذوالجلال ہے۔ لیکن قرینہ کے لحاظ سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال اس آیت میں جوڑوں کی تخلیق ایک طرف اور سواری کیلئے چوپایوں کی آفرینش دوسری طرف، خداوند عالم کی نشانیوں کے طور پر انہیں ذکر کیا گیا ہے۔

زندہ موجودات اور حیوانات پر تولیدِ نسل اور تولید مثل کا جو حیرت انگیز نظام حکم فرما ہے وہ نہایت ہی پیچیدہ اور عجیب وغریب نظام ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے رحم مادر میں جنین مذکر یا مونث بنتا ہے وہ کون سے ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے نر اور مادہ کی جنس میں توازن برقرار ہے؟ کون سی ایسی وجوہات ہیں جو انہیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ لاتی ہیں تاکہ اس طرح سے باروری کے مقدمات حاصل ہوں؟ کون سے عوامل ہیں جو جنین کی نشیب وفراز بھری زندگی کے دوران اسے ہدایت اور ارتقاء عطا کرتے ہیں؟

اگر ہم اچھی طرح غور وفکر سے کام لیں تو ہر ہر قدم پر ہمیں خداوند عالم کی عظیم آیات نظر آئیں گی۔ اسی طرح سواری کے مطیع ہونے کے سلسلے میں بھی یہی کیا جاسکتا ہے۔

پھر ان طاقت ور اور قوی پیکر جانوروں کو انسان کیلئے مسخر کرنے کی بات کرتے ہوئے فرماتا ہے، ''مقصد یہ ہے کہ تم آسانی کے ساتھ ان چوپایوں کی پشت پر سواری کرو، پھر اپنے پروردگار کی نعمت کو یاد کرکے کہو: پاک اور منزہ ہے وہ خدا جس نے ان کو ہمارے لئے مسخر کردیا ہے وگرنہ ہم میں تو اس کی طاقت نہیں تھی۔ (لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾)

یہ ٹھیک ہے کہ ہم روزمرہ کی عادت کے پیش نظر اس بات کو معمول سمجھتے ہیں کیونکہ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ اونٹوں اور گھوڑوں، بلکہ ان سے بڑے بڑے جانوروں مثلاً ہاتھیوں کے قافلے ہمارے سامنے سے گذرتے ہیں۔ جو ایک کمزور سے بچے کے تابع فرمان ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان کی ایک ایک قطار کی مہار ایک بچہ اپنے ہاتھ میں تھام کر انہیں جدھر چاہے لے جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اگر ان جانوروں میں تھوڑی سی بھی سرکشی اور غصے کی حالت ہوتی تو کبھی بھی ان پر سواری نہ کی جاسکتی، بلکہ انسانی ماحول میں ان کی نگہداشت خطرناک کام ہوتی۔

ہم ایک غصیلے شکاری باز کو، یا ایک غصیلی بلی کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے چہ جائیکہ ان طاقت ور اور عظیم الجثہ جانوروں کو، جن میں سے بعض کے سینگ ہیں تو بعض کے تیز دانت اور طاقت ور جبڑے، اور کچھ کے لات مارنے کیلئے بڑے اور مضبوط پاؤں۔ اگر یہ رام اور مطیع نہ ہوں

توکس طرح ہم ان کی حفاظت کر سکتے ہیں یا ان پر سوار ہو سکتے ہیں؟ یقیناً اگر خدا کی طرف سے وہ ہمارے لئے مسخر نہ ہوتے تو ''ہم کبھی بھی ان سے استفادے کی قدرت نہ رکھتے۔(وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿١٣﴾)[1]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ چوپایوں کی پشت اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے انسان کی سواری کیلئے مناسب اور موزوں ہوتی ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ پہلا مقصد ان سواریوں پر سوار ہونا بیان فرمایا ہے، درمیانی مقصد پروردگار کی نعمتوں کی یادآوری ہے اور آخری مقصد اس کی پاک ذات کی معرفت اور تسبیح وتقدیس بتایا ہے۔ ہمیشہ نعمتوں کی طرف توجہ انسان کو منعم کی طرف لے جاتی ہے۔ لہٰذا سب عطائیں اور بخششیں معفرت خداوندی کا ذریعہ اور اس کی پہچان کا مقدمہ ہیں۔

یہی چیز اسی سلسلے کی دسویں اوآخری آیت میں دوسرے منافع کے ساتھ ذکر ہوئی ہے درحقیقت اس آیت میں جانوروں میں موجود پانچ عمدہ فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انہیں خدائی آیات میں شمار کیا گیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے ''خداوند عالم وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے چوپائے پیدا کئے ہیں تا کہ تم بعض چوپایوں پر سواری کرسکو۔''(اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا) ''اور بعض سے غذا حاصل کرو''(وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٧٩﴾)

میں مختلف فوائد مثلاً دودھ، اون، چمڑا اور ادویات کے مواد وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجموعی طور پر فرماتا ہے: ''اور تمہارے لئے ان میں بہت اہم فوائد ہیں(وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ)

(منافع کا لفظ نکرہ کی صورت میں بیان ہوا ہے تا کہ وہ ان فوائد کی اہمیت پر دلالت کرے)

چوتھے مرحلہ پر فرماتا ہے: ''مقصد یہ ہے کہ ان کے ذریعہ تم اس منزل تک جا پہنچو جہاں تمہارا دل چاہتا ہے۔(وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ)

اس چیز کو مستقل فائدے کے طور پر بیان کرنا..... باوجودیکہ سواری کی بات کہیے ہو چکی ہے .....شاید اس لئے ہے کہ اس سے مراد سامان اور دیگر ضروریات زندگی کی حمل ونقل ہے جیسا کہ سورہ نحل کی چھٹی آیت میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ موجود ہے، یا پھر تفریحی، سیاحتی مقابلہ بازی کا مقصد مراد ہے، یا میدانِ جہاد میں حصول قدرت مراد ہے یا وحشی جانوروں کے ساتھ نبرد آزمائی مقصد ہے، یا پھر جانوروں کا پیراکی کے ذریعہ دریاؤں اور نہروں کو پار کرنا مراد ہے، کیونکہ یہ سب کچھ سفر میں سواری کے علاوہ دوسری ضروریات کے زمرے میں آتا ہے۔

پانچویں اور آخری فائدے کے بارے میں فرماتا ہے ''اور ان پر اور کشتیوں پر سوار کئے جاتے ہو۔(وَعَلَيْهَا وَعَلَى

---

[1] ''ظہورہ''، ''علیہ'' اور ''لہ'' میں مفرد کی ضمیریں ''انعام'' کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ کیونکہ جیسے ہم بیان کر چکے ہیں ''انعام'' کے جمع کے معنی ہیں۔ لیکن لفظی طور پر یہ مفرد ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ ضمیریں ''ماترکبون'' میں موجود ''ما'' کی طرف اشارہ کر رہی ہیں ایسی صورت میں چوپایوں اور کشتیوں کو بھی شامل ہوں گی ، نیز ''مقرنین''، ''اقران'' کے مادہ سے ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز پر قدرت رکھنا اور بعض نے اس کی حفاظت کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ)

''حَمْل'' کا مفہوم ''رکوب'' (سوار ہونے) کے مفہوم سے مختلف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ محمل اور کجاوے ہیں جو پہلے زمانے میں چوپایوں پر رکھے جاتے تھے جہاں ان عورتوں اور بچوں کو ان میں بٹھایا جاتا تھا جن میں سوار ہونے کی طاقت نہیں ہوتی تھی اسی طرح بیماروں، بوڑھوں اور کمزور اور ناتواں لوگوں کیلئے ان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔

''تُحْمَلُوْنَ'' (تم اٹھائے جاتے ہو) کے جملے کا ذکر فعل مجہول کی صورت میں اور اسے کشتیوں کے ساتھ ساتھ بیان کرنے سے ان کی آپس میں شباہت کا مفہوم ملتا ہے (کشتی تو پانی میں اور چوپائے خشکی میں) مندرجہ بالا تفسیر پر دوسرے قرینے ہیں۔ اس طرح ان تین جملوں (لِتَرْكَبُوْا .....وَلِتَبْلُغُوْا.....وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ) کا فرق واضح ہوجاتا ہے، ہرچند کہ کچھ مفسرین ان کی تفسیر میں مشکلات سے دوچار ہوئے ہیں اور بعض لوگوں نے ان سے کی ایک ہی معنی سے تفسیر کی ہے۔

اگرچہ بہت سے مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ اس آیت میں انعام کے معنی صرف اونٹ ہیں، لیکن ''انعام'' کے مفہوم کی وسعت اور آیت میں کسی قسم کی قید کا نہ ہونا اور پھر اسے محدود کردینے پر کوئی دلیل نہیں ملتی خاص کر جب کہ ''منھا'' کا تکرار (ایسے مقامات پر ''من'' بعض کے معنی میں ہے) یہ واضح کرتا ہے کہ بعض چوپائے صرف سواری کا کام دیتے ہیں بعض سے غذا کا کام لیا جاتا ہے۔ اگر اونٹ مراد ہوتا تو ان سب کے کام آتا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ بعد کی آیت میں ایک کلی نتیجے کے طور پر فرماتا ہے: ''خداوند عالم ہمیشہ اپنی آیات تمہیں دکھاتا ہے۔ پس تم اس کی کون کون سی آیات کا انکار کروگے؟ (وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۚ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ)

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان امور میں سے ہر ایک امر علماء اور دانشوروں کے لئے خداوند عالم کی آیات میں سے ایک آیت ہے، ایسی آیت جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور جو لوگ اس کے منکر ہیں، وہ ہر قسم کی ملامت اور سرزنش کے مستحق ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی آیات کی اس قسم میں یعنی حیوانات میں، خصوصاً چوپایوں کی دنیا میں، ہر ہر قدم پر اس کی آیات میں سے ایک ایک آیت اور اس کے علم وقدرت، حکمت، لطف وکرم اور عنایت ومہربانی کی نشانیوں میں سے ایک ایک نشانی ملتی ہے اور ان میں سے ہر ایک قسم اپنی زبان بے زبانی سے ہمیں توحید اور خداشناسی کا درس دے رہی ہے اور ہماری شکر گزاری کی حس کو بیدار کررہی ہے اور یہی شکر گزاری ہمیں اس کی معرفت کی دعوت دیتی ہے۔

چند ضروری وضاحتیں

حیوانی دنیا کے عجائبات

آفرینش اور تخلیق کی کتاب ایک ایسی کتاب ہے جس کے ہر ہر جملہ بلکہ ہر ہر کلمہ اور ہر ہر حرف میں کئی کئی نکتے مخفی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے مطالعہ سے انسان نہ تو تھکتا ہے اور نہ ہی اسے اس میں کوئی تکراری پہلو ملتا ہے اگر وہ اس عظیم کتاب کے صرف ایک جملے کا سو بار بھی مطالعہ کرے تو اسے ہر بار یقیناً ایک تازہ مفہوم ملے گا اور نت نئے اسرار اس پر منکشف ہوں گے۔

''حیوانات اور چوپایوں کی دنیا'' جو اس عظیم کتاب کا ایک حصہ ہے وہ بھی ان عجائبات و اسرار سے پھر پور ہے۔ اس جگہ ہم ان عجائبات کے صرف ایک حصے کو بیان کرنے پر قناعت کرتے ہیں۔ اس کی مزید تشریح کیلئے ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اس بارے میں لکھی جا چکی ہیں۔

۱۔ حیوانوں کا رام اور مطیع ہونا

حیوانات کے اندر پالتو ہونے کی صلاحیت ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے اور کسی نعمت کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہاتھ سے چلی جائے۔

اگر آج پالتو جانور وحشی بن جائیں، اونٹ چیتے کی مانند حملہ کرنے لگ جائیں اور اور اپنے طاقت ور دانتوں سے انسان کو چیرنا پھاڑنا شروع کر دیں، گائے، بیل سینگ مارنا شروع کر دیں، گھوڑے لاتوں کے ذریعہ انسان کی خبر لینا شروع کر دیں تو اس وقت انسانی دنیا پر قیامت آجائے! اس وقت بھیڑ بکریوں، اونٹوں اور گایوں کے ریوڑ سرمایہ موجودی ہی نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ ان کے شر سے نجات حاصل کرنے سے گریز نہیں کیا جائے گا، ان کے نہ ہونے کو ہونے سے ہزار ہا درجہ بہت سمجھا جائے گا۔ اس وقت بھی کبھی کبھار یہ مطیع اور سر جھکائے ہوئے جانور غصے میں آکر خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہاتھیوں کو ہندوستان کی یاد ستانے لگ جاتی ہے، اونٹ غصے میں پاگل ہو کر اپنے مالک کو کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر تھوڑی سی غفلت سے کام لیا جائے تو مالک کی تباہی ہو جائے اس طرح گویا خداوند عالم ہمیں یہ دکھانا چاہتا ہے کہ دیکھ لو اگر میں ان سے اطاعت و تسلیم کا فرمان واپس لے لوں تو ان کی کیا کیفیت ہو جائے!!

قرآن مجید نے مختلف تعبیرات کے ساتھ اس واقعیت کو ذکر فرماتا ہے۔ کبھی فرماتا ہے: ''وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ'' (ہم نے انہیں انسان کیلئے ذلیل (اور رام) کر دیا سورہ یٰس۔ ۷۲) اور کبھی فرماتا ہے: ''جب تم چوپایوں پر سوار ہو جاؤ تو کہو'' (سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ)، (پاک اور منزہ ہے وہ خدا جس نے اسے ہمارے لئے مسخر کر دیا جب کہ ہم میں اس بات کی قدرت نہیں تھی۔ زخرف۔ ۱۲)

''توحید مفصل''میں بھی اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور چوپایوں کی تخلیق کے بیان کے بعد فرماتے ہیں:

ثم منعت الذهن والعقل لتذل للانسان فلا تمتنح عليه اذا كدها الكد الشديد وحملها الحمل الثقيل

پھر خداوند عالم نے چوپایوں سے عقل اور ہوش کو روک لیا تا کہ وہ انسان کے لئے مطیع اور رام بنے رہیں اور جب سخت مشقت اور بھاری بوجھ ان پر لادا جائے تو وہ سرپیچی نہ کریں۔[1]

عقل وذہن کا نہ ہونا ان کے مطیع اور رام ہونے کی دلیل کا ایک حصہ ہے علاوہ ازیں خداوند عالم نے انہیں اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ بہت جلد رام ہوجاتے ہیں اور ہمیشہ کیلئے وہ اس حال پر باقی رہتے ہیں جب کہ بعض جانور ایسے ہوتے ہیں جن میں عقل وہوش بھی انہی جانوروں جیسا ہوتا ہے (مثلاً بھیڑ یا اور چیتا وغیرہ۔ اگر مشکل سے وہ رام ہو بھی جائیں تو ان کا یہ عارضی پہلو ہوگا اور پھر بھی ان سے ہر وقت محتاط رہنا پڑے گا کیونکہ کسی بھی وقت وہ مختصر سی غفلت کے باعث اپنے مالک کی تکا بوٹی کر سکتے ہیں۔

۲۔ جانوروں کا ہوش وخرد

سابقہ تفصیلی گفتگو کے بعد اس عنوان کا انتخاب شاید عجیب بھی معلوم ہو اور متضاد بھی حالانکہ ایسی بات نہیں ہے کیونکہ حیوانات ظاہری طور پر ایسی مخلوق ہیں جن میں ہوش وخرد کی کمی ہوتی ہے یا بالکل ہی بے عقل ہوتے ہیں اور ہم انسان بھی عام طور پر کودن آدمی کو چوپایوں سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن وہ بعض مسائل میں اس قدر ہوش وعقل کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ انسان کو حیرت ہوتی ہے۔

ہم میں سے بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے کہ جب بھیڑ بکریوں کا ریوڑ جنگل میں چرنے کے بعد دیہات میں واپس آتا ہے (ایسے دیہاتوں میں جہاں بھیڑ بکریاں مختلف گھروں کی ملکیت ہوتی ہیں) تو آبادی کے نزدیک پہنچتے ہی بڑی تیزی کے ساتھ بستی کے گلی کوچوں سے گزر کر سیدھی اپنی مالک کے گھر پہنچ جاتی ہیں۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کوئی مادہ اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کے اپنے بچے کے علاوہ کوئی اور بچہ اس کے پستانوں سے دودھ پیئے۔ جب بھی رات کی تاریکی میں بھیڑ بکریوں کے بچوں کو ان کی ماں کا دودھ پینے کیلئے چھوڑا جاتا ہے تو ہر بچہ اپنی ماں ہی کی طرف دوڑتا ہے اور ماں بھی اسے پہچان لینے کے بعد دودھ پلانے کیلئے تیار ہوتی ہے۔ یہ پہچان صرف ''سونگھنے'' سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ دنیا بھر کے گوسفندوں کی بو مختلف ہوتی ہے اور ہر گوسفند اپنے بچے کی بو کو ان تمام بچوں کی بو سے پہچان لیتی ہے۔

''کورسی موریسن'' اپنی کتاب ''راز آفرینش انسان'' میں کہتے ہیں:

''اکثر حیوانات تاریک راتوں میں اپنی راہ تلاش کر لیتے ہیں اور بڑی آسانی کے ساتھ اس پر چلتے رہتے ہیں۔ اگر ان کی آنکھیں

---

[1] ''توحید مفصل'' (بحارالانوار جلد ۳ ص ۹۱

رات کی تاریکی میں کمزور ہوں تو وہ راستے کی اطراف کی ہوائے اختلاف کو درک کر لیتے ہیں اور راستے کی سطح سے اٹھنے والی نہایت ہی کمزور روشنی جو ''ماورائے قرمز'' کہلاتی ہے، ان کی آنکھوں میں اثر کرتی ہے۔''

جانوروں کے گھر بنانے کا طریقہ، بچوں کی پرورش، دشمن سے نبرد آزمائی کی کیفیت، حتیٰ کہ جب وہ بیمار ہوتے ہیں تو ان کے طرزِ علاج کی کیفیت بھی عجیب ہے اور ان میں سے ہر ایک کی تشریح کیلئے مفصل بحث کی ضرورت ہے۔

مشہور حیاتیات شناس (BIOLOGIST) پروفیسر ''آنرمزؤ'' اپنی کتاب میں بعض جانوروں کی اپنی بیماریوں کے علاج معالجہ کی استعداد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بعض طبی دریافتیں ان جانوروں کے طرزِ علاج سے حاصل ہوئیں، مثلاً مچھلی کھانے والے پرندوں کی ایک قسم ایسی ہے جس کی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں اور اجتماعی پرواز یا زمین پر بیٹھتے وقت اس کی ٹانگ لوٹ جاتی ہے اسے پلاسٹر PLASTOR OF PARIS اور ٹانگ کے ٹوٹنے کے علاج سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہے۔ وہ ساحل سمندر اور ایسے دلدلی علاقوں میں چلا جاتا ہے جس کی گیلی مٹی ٹولتے ہوئے اعضاء کے لئے پلستر کا کام دیتی ہے اور اسی کام کیلئے مخصوص ہوتی ہے۔

چنانچہ وہ اپنا ٹوٹا ہوا پاؤں ایسی مٹی کے اندر لے جاتا ہے اور اس سے نکال کر دھوپ میں بیٹھ جاتا ہے تاکہ وہ خشک ہو جائے پھر وہ ایک مدت تک اپنے پاؤں کو ایسی ہی حالت میں رکھتا ہے تاکہ ٹوٹی ہوئی جگہ اچھی طرح جڑ جائے۔۔۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جو پلستر PLASTOR OF PARIS ہسپتالوں میں ڈاکٹر صاحبان کام میں لاتے ہیں وہ بھی اسی قسم کا ہوتا ہے کیونکہ اس کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔[1]

سائنسدانوں کا عقیدہ ہے کہ بہت سے جانوروں کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کی باتوں کو سمجھتے ہیں۔ چیونٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ اپنا جسم ملا کر یا اپنے سینگ نما بالوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر باتیں کرتی ہیں اور پیغامات پہنچاتی ہیں بعض ایسی چیونٹیاں بھی ہیں جو خطرے کے وقت اپنے بلوں میں اپنا پاؤں زمین پر مار کر (ٹیلیگرام کی طرح) اپنا خفیہ پیغام دوسروں تک پہنچاتی ہیں۔

بہت سے جانور ایسے بھی ہیں جن کی اپنی خصوصی زبان کے علاوہ ایک عمومی زبان بھی ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کی باتوں کو سمجھتے ہیں۔ اسی زبان کے ذریعہ کوئے (جب وہ خطرہ محسوس کرتے ہیں) اپنی مخصوص آواز کے ساتھ دوسرے جانوروں کو خبردار کرتے ہیں تاکہ جتنا جلدی ہو سکے وہ خطرے کی جگہ سے بھاگ جائیں یہ جانور درحقیقت ''جنگلی جاسوس'' ہوتے ہیں۔

''ماہرین حیاتیات'' اپنے مطالعہ کی مدد سے اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ انسانوں کے بعد حشرات الارض ہی ایک ترقی یافتہ رابطہ سسٹم کے مالک ہیں، بالخصوص شہد کی مکھیوں کی باہمی گفتگو اور ان کی خبر رسانی کا سسٹم تو سب سے زیادہ عجیب بھی ہے اور بے نظیر بھی۔[2]

---

[1] کتاب ''بہترین راہِ شناخت خدا'' ص ۱۹۷

[2] رسالہ ''شکار و طبیعت'' شمارہ ص ۷۲

سویڈن کے ایک ماہر حیوانات نے ''لینڈ'' یونیورسٹی میں شہد کی مکھیوں کے بارے میں بڑی دلکش تقریر کی اور بتایا کہ مدت کی تحقیق وتجربہ سے جو بات ثابت ہوئی ہے وہ جانوروں کی زبان ہے۔اس نے اپنی مشینری کے ذریعہ یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کی زبان کے آسانی سے معنی سمجھے جاسکتے ہیں۔[1]

حیوانات کی دنیا کے عجائبات اس قدرزیادہ ہیں جن کا ایک یادسیوں کتابوں میں بھی حق ادانہیں کیا جاسکتا۔لیکن ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں،اس موضوع کو یہیں پر ختم کرتے اور نہایت ہی خضوع وخشوع کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہیں:

سبحانك اللّٰهم وبحمدك لاتحصیٰ عجائب خلقتك وانك علیٰ کل شیءٍ قدیر۔ پاک ہے تو اے میرے اللہ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں تیری مخلوق کے عجائبات کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے اور تو یقیناً ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

---

[1] کتاب ''پرورش زنبورِعسل''ص ٦٠

۲۰۔جسمانی اعضاء کی تخلیق میں باری تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

انسان کو اپنے وجود سے باہر کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کیلئے مختلف اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے جن سے خالق نے اس کو آراستہ فرمایا ہے۔کسی چیز کی صورت رنگ کمیت اور کیفیت کے مشاہدہ کیلئے آنکھ اور بنیائی کی حِس عطا فرمائی ہے۔مختلف آوازوں کو محفوظ کرنے اور پہچاننے کیلئے کان اور شنوائی کی حِس بخشی ہے۔لُو،سردی،گرمی،سختی اور نرمی وغیرہ کے ادراک کیلئے دوسرے حواس عطا فرمائے ہیں۔

ان اوزاروں کی ساخت اس قدر پیچیدہ،ظریف اور دقیق ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی تشریح ایک مستقل علم کا موضوع بن سکتی ہے اور اس بارے میں بڑی تعداد میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو درحقیقت توحید کے اسرار،خداشناسی کے درس اور ان اعضا کی طرف سے انسانی جان کے کانوں میں الاپے جانے والے معرفتِ الٰہی کے نغموں کا مجموعہ ہیں۔

یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ کوئی شخص ان اعضاء کی ساخت میں غور وفکر کرے اور ان کے خالق کی عظمت وقدرت کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرے،خواہ زبان سے اس بات کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن مجید کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ذیل کی آیات کو دل کے کانوں سے سنتے ہیں:

۱...وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۷۸

(نحل۔۷۸)

۲...وَهُوَالَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۝۷۸ (مؤمنون۔۷۸)

۳...قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ.....وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۝۳۱

(یونس۔۳۱)

۴...اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ۝۸ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ۝۹ (بلد۔۸۔۹)

۵...قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ

اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

(انعام۔۴۶)

۶۔۔۔سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

(حٰمٓ سجدہ۔۵۳)

ترجمہ

۱.....اوراللہ نے تمہیں ماؤں کے پیٹ سے باہر نکالا ہے جب کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔اس نے ہی تمہارے لئے کان،آنکھ اور عقل قرار دی کہ شاید تم اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ۔

۲.....وہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے کان،آنکھ اور دل (عقل) کو پیدا کیا،لیکن تم اس کا شکر کم بجالاتے ہو۔

۳.....کہہ دو کہ کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک (وخالق) ہے؟.....اور کون ہے جو کائنات کے امور کو چلاتا ہے؟ تو وہ فوراً (جواب میں) کہتے ہیں،خدا تو کہہ دیجئے کہ پھر تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے (اور خدا سے کیوں نہیں ڈرتے؟)

۴.....کیا ہم نے اس (انسان) کیلئے دو آنکھیں نہیں بنائیں اور ایک زبان اور دو لب؟

۵.....کیا تم نے سوچا بھی ہے کہ اگر خداوند عالم تمہارے کان اور آنکھوں کو لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگادے (کہ کسی چیز کو نہ سمجھ سکو) تو خدا کے علاوہ کون ہوگا جو انہیں واپس لوٹادے؟ تم دیکھو تو،ہم کس طرح اپنی آیات کی ان کیلئے مختلف طریقوں سے تشریح کرتے ہیں،پھر بھی وہ روگردانی کرتے ہیں۔

۶.....عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں کائنات کے اطراف میں اور خود ان کی جانوں میں انہیں دکھائیں گے تا کہ ظاہر ہوجائے کہ وہ حق ہے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''سَمْع'' دراصل سننے کی قوت کی معنی میں ہے اور بسا اوقات خود کان کو بھی ''سمع'' کہا جاتا ہے۔یہ لفظ کبھی کان لگانے،دعوت کو قبول کرنے اور جستجو کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور جب اس کا اطلاق خدا کے بارے میں ہو تو اس کے معنی سنی جانے والی چیزوں کے متعلق

خدا کا علم اور آ گاہی ہوتے ہیں۔''سمع'' کی جمع ''اسماع'' ہے،لیکن قرآن پاک میں یہ لفظ (اسماع) کہیں بھی استعمال نہیں ہوا شاید اس لئے کہ خود لفظ ''سمع'' جمع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[1]

''بصر'' بھی ''عضوِ بنیائی'' یعنی ''چشم'' اور ''قوت بنیائی'' دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔عقل وادراک کی طاقت کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اسے ''بصر'' اور ''بصیرت'' کہتے ہیں (''بصر'' کی جمع ''ابصارُ ہوتی ہے اور ''بصیرت'' کی جمع ''بصائر'')

لیکن آنکھ کیلئے بصیرت کا لفظ کبھی استعمال نہیں ہوتا بلکہ اسے بصر ہی کہتے ہیں البتہ عجیب بات یہ ہے کہ نابینا افراد پر ''بصیر'' کا لفظ بولا جاتا ہے لیکن بظاہر یہ استعمال متضاد تعلق کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ نابینا حضرات رام طور پر زیادہ طاقت ور ادراک سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور اور اپنی حس بنیائی کے معدوم ہونے کی تلافی قوتِ فکر اور بصیرت سے کرتے ہیں۔[2] جیسا کہ فارسی زبان میں نابینا لوگوں کو ''روشن دل'' کہا جاتا ہے۔

صاحب ''مصباح اللغۃ'' جیسے اربابِ لغت نے ''بصر'' کا اصل معنی ایسای نور لیا ہے جس سے موجودات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ''مقاییس اللغۃ'' میں اس کے دو معانی ذکر ہوئے ہیں؟ایک تو کسی چیز سے آ گاہی حاصل کرنا اور دوسرے کسی چیز کی موٹائی معلوم کرنا لیکن پہلے معنی جن کو راغب نے بھی مفردات میں ذکر کیا ہے اس لفظ کے استعمال کے مقامات کی وجہ سے زیادہ مناسب اور زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

''افئدۃ''، ''فؤاد'' کی جمع ہے اور ''فأد'' (بروزن وعد) کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی بھوننا ہیں۔اسی لئے پختہ عقول وافکار کو ''فؤاد'' کہا جاتا ہے۔یہ لفظ کبھی دل یا دل کی پوست کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔جب ان میں فروغ روشنائی پائی جائے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''فؤاد'' کا معنی دل کا مرکز ہے جب کہ ''قلب'' اس کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔

''عین'' کے بہت سے معانی ہیں اور مشہور ہے کہ اس لفظ کے عربی زبان میں ستر معانی ہیں۔اتفاق سے فارسی میں بھی ''چشم'' کے تقریباً اتنے ہی معانی ہیں۔

لیکن ''عین'' کا اصل معنی بنیائی کا وہی مخصوص عضو یعنی ''آنکھ'' ہے کبھی کبھی یہ قوت بنیائی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔لیکن کنایہ کے اور مجازی معنی بہت زیادہ ہیں جن میں سے بہت سے معانی کثرت استعمال کی وجہ سے حقیقت بن چکے ہیں۔مثلاً چشمہ کو ''عین'' کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔جاسوس اور اطلاعات حاصل کرنے والے افراد کو بھی ''عین'' کہتے ہیں، جیسا کہ یہ لفظ باشخصیت افراد، سورج اور رسونے پر بھی بولا جاتا ہے کیونکہ سونا دھاتوں کے درمیان وہی حیثیت رکھتا ہے جو اعضاء جسمانی کے درمیان آنکھ کی ہے۔اسی طرح ستاروں کے درمیان سورج کی اور ایک قوم کے درمیان باشخصیت افراد کی حیثیت ہوتی ہے، جیسا کہ (اردو اور) فارسی میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاح شخص اپنے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔نیز سرمایہ، اور قابل استفادہ اموال گول چیز کے سوراخ، کسی چیز سے آ گاہی اور بصیرت پر بھی مناسبت کے

---

[1] لسان العرب، مفردات، مجمع البحرین اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

[2] مفردات راغب

لحاظ سے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ ''حورالعین'' کو بھی اس نام سے اس لئے موسوم کیا گیا ہے کہ ان کی آنکھیں خوبصورت اور موٹی ہوتی ہیں۔

''لسان'' بھی بولنے کے مخصوص عضو (زبان) کے معنی میں ہے کنایہ کے طور پر ان لوگوں کو بھی لسان کہتے ہیں جو کسی قوم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لغات کو بھی ''السنۃ'' لسان کی جمع) کہتے ہیں جیسا کہ ''زبان'' کا لفظ فارسی میں انہی معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ عربی میں مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی لیکن قرآن مجید میں مذکر ہو کر استعمال ہوا ہے۔

''شفة'' (بروزن قمر) کا اصل معنی ''ہونٹ'' ہے جو تثنیہ (شفتین یعنی دوہونٹ) ہو کر استعمال ہوتا ہے۔[1] مشافهه'' کے لفظ کے معنی کسی کے روبرو ہونا اور اس کے ہونٹوں سے کسی چیز کا سننا ہوتے ہیں۔ یہ لفظ نہر، دریا اور سمندر کے کنارے کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ کنارہ ان کے ہونٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں خداوند عالم کی پاک ذات کے تعارف اور انسان کے وجود میں اس کی نشانیوں کو بیان کرنے کے عنوان سے فرماتا ہے ''خدا وہی تو ہے جس نے تمہیں اپنی ماؤں کے شکم سے باہر نکالا۔ اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے۔'' (وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ)

اس تعبیر سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ انسان کی پیدائش کے وقت اس کے دل کا صفحہ تمام معارف سے خالی ہوتا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد انسان کے اپنی ذات کے بغیر دوسری چیزوں کا علم ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس سے بیرونی اشیاء کا علم مراد ہے۔ اس پر انہوں نے سورہ نحل کی ۷۰ ویں آیت دلیل کے طور پر پیش کی ہے کہ ''وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا'' (تم میں سے بعض لوگ بالائی عمر اور زندگی کے بدترین سالوں کو جا پہنچتے ہیں۔ اس طرح کہ جاننے کے باجود کسی چیز کو نہیں جان پائیں گے) کیونکہ بڑھاپے کی اس عمر میں انسان یقیناً اپنی ذات سے تو باخبر ہوتا ہے، لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ نومولود اپنی ولادت کے آغاز میں اپنی ذات سے بھی بے خبر ہوتا ہے اور سب سے پہلے جس چیز سے وہ باخبر ہوتا ہے وہ اس کا اپنا وجود ہوتا ہے۔

پھر فرماتا ہے ''خداوند عالم نے تمہارے لئے کان، آنکھ اور عقل قرار دی ہے تاکہ تم اس کا شکر بجالاؤ'' (وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ)

آنکھ اور کان اس لئے کہ تم محسوسات کا ادراک کرسکو۔ عقل کو اس لئے بنایا کہ معقولات کا ادراک کرسکو۔ اور شناخت کے ان تینوں ذریعوں سے اپنے وجود کی بیرونی دنیا سے آگاہی حاصل کرسکو۔ پھر ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کیلئے کھڑے ہوجاؤ اور سب سے پہلے اس مبدا کو تلاش کرو جس نے تمہارے لئے علم و معرفت کے یہ ذرائع بنائے ہیں۔

---

[1] بعض لوگوں نے اس کی اصل بنیاد ''شفو'' (ناقص واوی) بتائی ہے اور بعض نے اسے ''شفة'' سمجھا ہے کیونکہ اس کی تصغیر ''شفيهة'' ہے اور جمع ''شفاة'' ہے۔

آنکھ، کان اور عقل کی اہمیت کا اندازہ لگانے کیلئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اس حالت کو اپنے تصور میں لاؤ جو ان میں سے کسی کے (چہ جائیکہ تمام کے) مفقود ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک اندھے شخص، یا ایک بہرے انسان، یا ایک فاتر العقل آدمی یا تمام صفات سے عاری شخص کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور وہ اس عظیم کائنات کی نعمتوں سے کس قدر دور ہوتا ہے؟ سب سے پہلی چیز جس سے وہ محروم ہوتا ہے وہ علم وآگاہی ہے جو بالاترین نعمت اور دوسری نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کا مقدمہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں ''شیئا'' سے مراد ''منعم کا حق'' ہے جب کہ بعض دوسرے مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد انسان کے اپنے مفادات ہیں۔ بعض نے اس سے سعادت (نیک بختی) اور شقاوت (بدبختی) مراد لیا ہے، یا پھر روز الست کے میثاق کے معنی میں تفسیر کی ہے لیکن آیت کا مطلق ہونا ہر قسم کی قید وشرط کی نفی کرتا ہے اور ان تمام چیزوں کو شامل ہے۔

''سمع'' (کان) کو ''ابصار'' (آنکھوں) پر کیوں مقدم کیا گیا ہے؟ شاید اس لئے کہ آنکھ سے پہلے کان اپنا کام کرنا شروع کرتا ہے کیونکہ رحم مادر کے ماحول میں جہاں تاریکی مطلق حکم فرما ہوتی ہے، انسان کی آنکھ میں دیکھنے کی آمادگی نہیں ہوتی، پیدائش کے بعد بھی ایک مدت تک روشنی کے سامنے بہت ہی حساس ہوتی ہے اور اسی لئے عام طور پر بند رہتی ہے، اور بالتدریج روشنی کے لئے آمادگی پیدا کرتی ہے۔ لیکن کان کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض دانشوروں کے عقید کے مطابق عالم جنین میں بھی وہ آوازوں کو سنتا ہے اور ماں کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سے آشنائی پیدا کرلیتا ہے۔

علاوہ ازیں وحی الٰہی کے پیغام کے سننے کا ذریعہ کان ہی ہوتا ہے جو تمام سنی جانے والے چیزوں سے بالاتر چیز ہے۔ نیز ایک نسل سے دوسری نسل کیلئے علوم کے منتقل ہونے کا عمومی ذریعہ بھی یہی ہوتا ہے جب کہ آنکھ اس طرح نہیں ہوتی کیونکہ لکھنا اور پڑھنا اگرچہ علوم کے منتقل ہونے کا ذریعہ ہیں لیکن عمومی حیثیت کے حامل نہیں۔

''افئدۃ'' (پختہ عقلوں) کے ان دو کے بعد مذکور ہونے کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ انسان سنی اور دیکھی جانے والی چیزوں کو عقل کی طرف منتقل کرتا ہے، پھر ان کا تجزیہ وتحلیل کرتا ہے، اس سے تازہ معلومات حاصل کرتا ہے اور کائنات کے کلی قوانین کو دریافت کرتا ہے۔[1]

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جو اس سے پہلی آیت میں بیان کی گئی ہے۔ خداوند عالم کی معرفت کیلئے کان، آنکھ اور دل کی تخلیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انسانوں کی شکر گزاری کی حس کو بیدار کیا گا ہے جو معرفت الٰہی کی ایک سیڑھی ہے۔ البتہ پہلی آیت میں اور اس آیت میں فرق یہ ہے کہ اس آیت میں اعضاء کی تخلیق کو ''انشاء'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور آخر میں ان لوگوں کی سرزنش اور ملامت کی گئی ہے جو خداوند عالم کا کم شکر ادا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ''وہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے کان آنکھ اور دل کو ایجاد کیا ہے لیکن تم (ان عظیم اور بے نظیر نعمتوں کا) بہت کم شکر بجالاتے ہو۔ (وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ)

---

[1] یاد رہے کہ ''سمع'' کا اطلاق مفرد اور جمع ہر دو پر ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات اسے ''اسماع'' یعنی جمع کی صورت میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

''انشاء'' کے بارے میں ''راغب'' کا کہنا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو ایجاد کرنا اور اسے پروان چڑھانا ہے اسی لئے جوان لوگوں کو ''ناشی'' کہتے ہیں۔

''انشاء'' کا لفظ عام طور پر جانوروں کی تخلیق کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ ان کے غیر کے بارے میں بھی کبھی استعمال ہوجاتا ہے جیسے سورہ واقعہ کی ۷۲ویں آیت میں ہے ''ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ'' کیا تم نے آگ پیدا کرنے والے درختوں کو پیدا کیا ہے یا وہ ہم نے ایجاد کئے ہیں؟)

ممکن ہے مندرجہ بالا آیت میں جنین کے شکم مادر میں ہونے کے دوران آنکھ، کان اور عقل کے ارتقائی مراحل کی طرف اشارہ ہو اور طفلی کے دوران ارتقائی مراحل کی طرف کہ خداوند عالم نے ان سب کو ایجاد فرمایا اور پھر ان کی پرورش کرتا ہے۔

تیسری آیت میں ایک ''تقریری استفہام'' کی صورت میں ان مشرکین سے سوال کیا جارہا ہے جو خدا کو چھوڑ کر بت پرستی کی وادی میں سرگردان ہیں۔ فرماتا ہے ''اے پیغمبر! ان سے کہہ دیں کہ تمہیں آسمان اور زمین سے کون روزی عطا کرتا ہے، یا کون تمہارے کان اور آنکھوں کا مالک ہے؟ (قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ)

یقیناً جو روزی انسان کو ملتی ہے اس کا تعلق یا تو آسمان سے ہوتا ہے (جیسے بارش، ہوا اور دھوپ وغیرہ) یا پھر زمین سے (جیسے مختلف نباتات، درخت اور معدنیات وغیرہ)۔ اسی طرح انسان کو جو علوم و معارف حاصل ہوتے ہیں وہ بھی غالباً آنکھ اور کان کے ذریعہ ہی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ یہ دونوں حسیں انسان کیلئے بیرونی دنیا سے تعلق قائم کرنے کا اہم ترین ذریعہ شمار ہوتی ہیں اور یہ سب مادی اور معنوی روزی خداوند عالم کی طرف سے ہے۔

پھر مزید اربات یہ ہے کہ یہاں پر مالکیت کی تعبیر کی گئی ہے اور چونکہ یہاں پر مالکیت سے مراد، تکوینی مالکیت ہے، لہٰذا ''تخلیق اور آفرینش'' کے مسئلہ سے ہرگز جدا نہیں ہ اور نہ ہی ''تدبیر امور'' کے مسئلہ سے جدا ہے۔ اسی لئے آیت کے آخر میں استفہام کی صورت میں ایک بار پھر فرماتا ہے ''ان سے پوچھیئے کہ کائنات کے امور کو کون چلا رہا ہے؟ (وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ)[1]

اور پھر فوراً ہی فرماتا ہے: (وہ لوگ فطری ندا کے الہام سے) ''جلدی سے کہیں گے: خدا ہی تو ہے جو ان تمام امور کا مالک و خالق اور چلانے والا ہے۔'' (فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ)

آپ ان سے کہہ دیں تو پھر تم تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کیوں نہیں کرتے؟'' (فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ)

یعنی بت پرستی اور غیر اللہ کی طرف رخ کرنے سے پرہیز اور گناہوں اور بے اعتدالیوں سے پرہیز۔

چوتھی آیت میں خداوند بزرگ و برتر کی انسان پر کچھ نعمتوں کا تذکرہ کرنے کے ضمن میں اس کی شکرگزاری کی حس کو بیدار کرتے

---

[1] بعض اربابِ لغت کہتے ہیں کہ ''ملک'' (میم کے فتحہ اور لام کے کسرہ سے) اسے کہتے ہیں جو لوگوں میں امر و نہی کے ذریعہ تصرف کرتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ قدرت و طاقت اور تدبیر امر ہوتا ہے۔

ہوئے، جو''معرفت خدوندی'' کا مقدمہ ہے،فرماتا ہے:''کیا ہم نے انسان کیلئے دوآنکھیں نہیں بنائیں؟''(اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ)

وہ آنکھیں جن کے ذریعہ وہ عالم ہستی کو دیکھتا ہے،تخلیق کے عجائبات کا نظارہ کرتا ہے،سورج، چاند، ستاروں نباتات اور درختوں کی مختلف قسموں اورانواع واقسام کی زندہ مخلوق اور جانداروں کا مشاہدہ کرتا ہے۔صنعت الٰہی کے عجوبوں کا تماشا دیکھتا ہے،راہ اور چاہ میں فرق سمجھتا ہے دوست اور دشمن کی تمیز کرتا ہے اور خود کو ناخوشگوار حوادث کے چنگل سے چھڑاتا ہے۔

پھر فرماتا ہے:''اور کیا اس کیلئے ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے''(وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ)

زبان، جو دوسروں کے ساتھ تعلق کا ذریعہ ہوتی ہے،زبان جو علوم ودانش کے ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف،اور ایک قوم سے دوسری قوم کی جانب منتقل کرنے کا سبب ہوتی ہے زبان جو اپنی ضروریات کو بیان کرتی ہے اپنے معبود کے ساتھ راز ونیاز کا کام دیتی ہے اور انسان کے وجود کے تمام ذروں کی ترجمان ہے۔

اسی طرح ہونٹ ہیں جو گفتگو کرنے کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں اور بہت سے حروف کے مقطع کو تشکیل دینے کا کام بجالاتے ہیں۔[1] علاوہ ازیں پانی پینے غذا کھانے اور چبانے میں امداد کرتے اور منہ کی رطوبتوں کی حفاظت کرتے ہیں،وہ بھی اس طرح کہ اگر لبوں کا ایک حصہ کٹ جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ کام انجام دینے انسان کیلئے مشکل ہوجائیں گے بلکہ اس کے چہرے کا منظر بھی افسوس ناک حد تک بگڑ جائے گا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ان دو آیات کے بعد قرآن مجید نے انسان کی خیروشر کی طرف ہدایت کی بات کی ہے اور فرماتا ہے:''کیا ہم نے اسے دو بلند سرزمینوں (خیروشر کی پہچان) کی ہدایت نہیں کی؟''(وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ)

یہ واضح تعبیر آنکھ،زبان اور ہونٹوں کے خیروشر کے مسئلہ کی شناخت اور ہدایت کے ساتھ رابطے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ چیزیں اس عظیم ہدف کیلئے ایک ذریعہ شمار ہوتی ہیں۔

پانچویں آیت اس حالت کی طرف توجہ دلا رہی ہے جو کان،آنکھ اور عقل کے مفقود ہونے کی صورت میں انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے،''کہہ دیجئے،اگر خداوند عالم تمہارے کان اور آنکھوں کو تم سے لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگادے (جس سے تم نہ تو کسی کی بات کو سن سکو اور نہ ہی کسی چیز کو دیکھ سکو اور نہ ہی حق اور باطل اور اچھے اور بُرے میں تمیز کرسکو) تو کون ہوسکتا ہے جو تمہیں یہ چیزیں

---

[1] یہ حروف فارسی میں پانچ ہیں۔(ب۔پ۔ف۔م۔و) اور عربی میں چار ہیں (پ کے علاوہ) اور چونکہ یہ چند حروف بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں لہٰذا لبوں کے مفقود ہوجانے کی صورت میں انسان بڑی حد تک قوت گویائی سے ہاتھ دھوسکتا ہے۔ان حروف کو''حروف شفوی'' کہتے ہیں۔

پلٹادے؟''(قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ)[1]

پھرآیت کے آخر میں فرماتا ہے''دیکھوتو،ہم اپنے آیات اورنشانیوں کومختلف صورتوں میں ان کیلئے کیونکر وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں،پھربھی وہ حق سے روگردانی کرتے ہیں؟''(اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ)[2]

درحقیقت قرآنِ مجیدایک طرف تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ معرفت کے یہ اہم اوزاروسائل تمہارے اپنے نہیں ہیں کیونکہ اگرتمہارے اپنے ہوتے تو ہرگز واپس نہ لئے جاسکتے ایسے لوگ دنیامیں کم نہیں ہیں جومختلف عوامل کی وجہ سے کان،آنکھ اورعقل کھو بیٹھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں کس یااورکی طرف سے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ہرچیز کی اہمیت اس کی ضد سے معلوم ہوتی ہے۔قرآن مجیداس دردناک حالت کے ذریعہ جوان اعضاء کے کھودینے سے انسان کولاحق ہوتی ہے،انسان کوان نعمتوں کے لاحق اورعطا کرنے والے کی عظمت کی طرف متوجہ کرتااوراس ذریعہ سے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑکرخالق کے آگے سرتسلیم خم کرنے کیلئے آفادہ کرتا ہے۔

آنکھ اورکان کیلئے''اخذ''(پکڑنے)کی تعبیرممکن ہے خودان اعضاء کے پکڑنے کے معنی میں ہو،یا پھر سننے اوردیکھنے کی طاقت کے یادونوں کے۔

اسی سلسلے کی آخرآیت میں توحیداورخداشناسی کی جامع ترین آیات میں سے ہے،پوری کائنات میں موجوداس کی نشانیوں پر نظرڈالتے ہوئے فرماتا ہے:''ہم ان کوہمیشہ اپنی آیات کائنات کے اطراف میں اورخودان کے اپنے وجودمیں دکھاتے رہتے ہیں تاکہ ان پر اچھی طرح واضح ہوجائے کہ خداوندعالم برحق ہے''(سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ)

''افاق''،''افق''کی جمع ہے جس کے معنی اطراف اورکنارے ہیں بنابریں''آفاق ارض''سے مرادزمین کی اطراف اور''آفاق آسمان''سے مرادآسمان کے اطراف ہیں چونکہ قرآن مجید میں مطلق صورت میں اس کا ذکر ہوا ہے لہٰذا تمام جہان کوشامل ہے خواہ وہ شمال ہو یاجنوب،مشرق ہو یامغرب۔

''انفس''بھی یہاں پروسیع معنی کا ذکر ہے جوروح،جسم اوربدن کے تمام اعضاءکوشامل ہے،جوہماری بحث کا موضوع ہے۔

---

[1] ''ارءیتم''اور''ارءیتکم''اواس قسم کے جملوں کا بہت سے مفسرین نے''اخبرونی''(مجھے بتاؤ)سے معنی کیا ہے۔یا پھر''ھل علمتم''(آیاتمہیں معلوم ہے)سے کیا ہے لیکن بعض محققین کے عقیدہ کے مطابق یہ جملے اپنے اصلی معنی دے رہے ہیں۔مثلاً''ارائیتم کے جملہ کے معنی''تم نے مشاہدہ کیا ہے؟''لیکن چونکہ اس قسم کے مواقع پر مشاہدہ کرنا کے معنی جاننااورخبر دیناہوتے ہیں کبھی تومعنی کے لازم سے تفسیر کیا گیا ہے۔صورت حال خواہ کچھ ہوان جملوں کے ذکر سے مرادمخاطب کومتوجہ کرنااورغورکرنے کیلئے آمادہ کرنا ہوتا ہے اوراگران کی لازم معنی سے تفسیر کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ''غورکرو''

[2] ''نصرف''کا کلمہ''تصریف''کے مادہ سے تفسیر کیا گیا ہے اوریہاں پرایک حقیقت کومختلف لباسوں اوربیانوں میں ذکر کیا گیا ہے۔''یصدفون''،''صدف''(بروزن ہدف)کے مادہ سے ہے جو یہاں پرمنہ پھیرنے کے معنی میں ہے۔

''انه الحق'' میں ضمیر کس طرح لوٹ سرہی ہے اس بارے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے اور آفاقی آیات سے مراد وہ کامیابیاں ہیں جو مسلمانوں کو دنیا کے مختلف گوشوں میں حاصل ہوئی ہیں اور انفسی آیات سے مراد ان کی عرب ملکوں میں کامیابیاں ہیں۔ گویا یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو ساری دنیا میں اور عرب ممالک میں کامیابیاں دکھائیں گے تاکہ وہ جان لیں کہ قرآن برحق ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ''رسولِ خدا'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، یا پھر ان کا دین وآئین ہے، جو پہلی تفسیر سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے (جیسا کہ بہت سے مفسرین نے سمجھا ہے) کہ اس سے مراد ''خداوند عالم'' ہے یعنی ہم اپنی آفاقی اور انفسی آیات انہیں دکھائیں گے تاکہ خدا کی حقانیت ان پر واضح ہوجائے۔

''آیات'' کی تعبیر ایک طرف ''آفاق وانفس'' کی تعبیر دوسری طرف اور توحید پر مبنی بعد کی آیت، غرض یہ سب اسی تفسیر کے گواہ ہیں۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی ذہن نشین کرلیں کہ یہ آیت قرآن مجید کی کئی دوسری آیات سے بھی ہم آہنگ ہے جو خدا کی آیات کو تخلیق کائنات اور خود انسان کے وجود میں موجود انسان کو دکھاتی ہیں۔ مثلاً ''وَفِي الْاَرْضِ اٰيَاتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ'' (اور زمین میں خدا کی نشانیاں ہیں مومنین کیلئے اور خود تمہارے اندر بھی (نشانیاں ہیں)۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو؟ (سورہ ذاریات ۲۰۔۲۱)

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں بھی یہی معنی مذکور ہیں۔ ہرچند کہ بعض روایات میں ''انہ'' کی ضمیر کا مرجع حضرت امام مہدی علیہ السلام کو بتایا گیا ہے، لیکن یہ تفسیر آیات کے بطون سے لی گئی ہے۔ (البتہ سب تفسیروں کو بھی جمع کیا جاسکتا ہے۔)

بہرحال ہم اس کی جس آیت کو بھی دیکھتے ہیں اسی میں اس کی ذات کے علم اور قدرت کو پاتے ہیں، اور

ہر گیا ہی کہ ازز مین روید
وحدہٗ لاشریك له گوید

(جو سبزہ بھی زمین سے اُگتا ہے، وہ وحدہ لاشریك له کہتا ہے)

اور

دل ہر ذرہ رابشگافیم
آفتابس درمیان ببینیم

(جس ذرے کو بھی توڑتے ہیں، اس کے اندر ایک آفتاب نظر آتا ہے)

''سَنُرِيْهِمْ'' (ہم انہیں دکھاتے رہیں گے) کی تعبیر (اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ فعل مضارع ایسے مقام پر استمرار کے معنی میں آتا ہے) اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ انسان کی عمر کا جو دن بھی گذرتا رہتا ہے اس پر اس کائنات کے نت نئے حقائق

واضح ہوتے رہتے ہیں اور نئے سے نئے راز کھلتے رہتے ہیں۔ دانشور اور علماء اپنی تجربہ گاہوں اور لائبریریوں میں نت نئی دریافتوں سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں، ہر روز ان پر آیاتِ الٰہی میں سے کوئی نہ کوئی نئی آیت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر لاکھوں کروڑوں برس انسانی عمر پر گزرتے رہیں پھر بھی صورت حال اسی طرح برقرار رہے گی۔ مجبوراً کہنا پڑتا ہے کتنی عجیب ہے تخلیق کی عظیم کائنات اور کس قدر باعظمت ہے اس کا پیدا کرنے والا!!

پھر یہ کہ یہ سب کچھ تو ہم اس دور زندگی کے متعلق کہہ سکتے ہیں جب کہ اس سے اربوں کھربوں سال پہلے کا علم بھی نہیں اور نہ ہی اس کے اربوں کھربوں سال بعد کا پتہ ہے اور اگر کچھ جانتے بھی ہیں تو وہ بہت ہی ناچیز ہے جو اس عظیم کائنات کے صرف ایک حصے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کتاب کی ایک فصل ہے ''العظمة لله الواحد القهار''

گذشتہ آیات سے مجموعی طور پر جو بات سامنے آتی ہے اور ان کا جو بخوبی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی جسم کا ہر عضو بلکہ ہر عضو کی ایک ایک جزو حق کا مکمل آئینہ اور خالقِ عالم کے علم وقدرت اور حکمت وتدبیر کی ایک مستقل اور روشن نشانی ہے۔

چند ضروری وضاحتیں

۱۔ اعضائے بدن کے عجائبات

اگر ساری کائنات میں سوائے انسانی بدن کے ایک جزو کے اور کچھ بھی نہ ہوتا اور جسم انسان میں صرف ایک آنکھ یا ایک کان ہی ہوتا تو وہی اس خالق کائنات کی ذات پاک اور اس کے علم وقدرت کی شناخت اور معرفت کیلئے کافی تھا کیونکہ ان کی ساخت اس قدر ظریف، پیچیدہ، دقیق اور جچی تلی ہے کہ کوئی بھی عقل یہ باور نہیں کرسکتی کہ یہ ''اتفاق'' یا اندھی اور بہری فطرت کی پیداوار ہے، بلکہ اس کے مطالعہ کے ہر ایک مرحلہ پر اس حکیم خالق اور صانع عالم کے علم وقدرت کی نت نئی آیت اور جدید نشانی کا پتہ چلتا ہے۔

عضو بنیائی یا آنکھ کی سینکڑوں خصوصیات اور ریزہ کاریوں میں سے صرف ان چند موضوعات پر ہی غور کیا جائے تو پتہ چل جائے گا کہ اس میں کیا محشر برپا ہے۔

۱۔ متغیر عدسہ

عام طور پر آنکھ کو کیمرے سے تشبیہ دی جاتی ہے جب کہ دنیا کے جدید ترین اور ترقی یافتہ ترین کیمرے انسانی آنکھ کے سامنے بازیچۂ اطفال معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان سب میں غیر متحرک عدسے ہوتے ہیں اور مختلف مناظر کی تصویر کشی کے وقت فلم لینے والے شخص کے ذریعے ہمیشہ مرتب اور کنٹرول کئے جاتے ہیں۔ لیکن آنکھ کے عدسے جو آنکھ کی پتلیوں کے پیچھے ہوتے ہیں، ہمیشہ خودکار AUTOMATIC طریقے سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں کبھی تو ان کا قطر بہت ہی کم یعنی ۱/۵ ملی میٹر تک جا پہنچتا ہے اور کبھی اس قدر زیادہ ہوجاتا ہے کہ ۸ ملی میٹر سے بھی بڑھ

جاتا ہے جس سے دورترین اورنزدیک ترین مناظر کی تصویر کشی کی جاسکتی ہے۔

۲۔آنکھ کے سات طبقے

عمدہ طور پر آنکھ سات پردوں یا سات طبقوں سے تشکیل شدہ ہے جن کے نام یہ ہیں:۱۔''صلبیہ''(آنکھ کی سفیدی)،۲۔ ''عنبیہ''،۳۔''مشیمیہ''،۴۔''جلیدیہ''،۵۔''زلالیہ''،۶''زجاجیہ''،اور ۷''شبکیہ''۔ان میں سے ہرایک کی اپنی مخصوص ساخت اورمخصوص فریضہ ہوتا ہے۔ان کی تشریح بہت لمبی ہے۔ ہمارے لئے بس اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ ان میں تھوڑی سی تبدیلی بھی بنیائی کے نظام میں گڑ بڑ پیدا کردیتی ہے،البتہ''شبکیہ'' کے پیچھے بھی بنیائی کے کچھ اعصاب ہیں جن کے ذریعہ شبکیہ کے مناظر مغز تک پہنچائے جاتے ہیں۔

۳۔روشنی کے سامنے حساسیت

فلم تیار کرنے اورتصویر لینے کا کام ایک مشکل ترین کام ہے۔بسااوقات اس کام کے لئے ماہرین کی ٹیم کو مامور کیا جاتا ہے جب کہ آنکھ کم یا زیادہ روشنی کے مقابلے میں اپنی حساسیت کے ذریعہ اس بات پر قادر ہوتی ہے کہ بہت زیادہ طاقت ور یا بہت زیادہ کمزور روشنی میں مختلف مناظر کی نہایت ہی دقیق اورنہایت ہی خوبصورت تصویر لے سکتی ہے۔

۴۔تیزترین تحرک

فلم لینے والے اپنے سیٹ کو ہمیشہ دائیں،بائیں اوراوپر نیچے گھماتے رہتے ہیں اوراس کام کیلئے مختلف آلات واوزار کا سہارا لیتے ہیں جب کہ اطراف چشم میں موجود عضلے (پٹھے) بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آنکھ کو چاروں طرف مکمل طور پر گھماتے رہتے ہیں اورفلم لینے کیلئے اس کی طاقت میں حد سے زیادہ اضافہ کردیتے ہیں۔

۵۔سادہ اورلطیف پرزے

فلم برداری کیلئے تیار کئے جانے والے کیمروں کیلئے محکم ترین شیشوں اوردھاتوں کو کام میں لایا جاتا ہے جب کہ آنکھ نہایت ہی لطیف اورنازک پرزوں سے بنائی گئی ہے۔اس کے باوجود بسااوقات وہ ایک سوسال تک مسلسل کام کرتی رہتی ہے اوریہ صرف اس لئے ہے کہ وہ ایک زندہ سیٹ ہے جو ہمیشہ خود کو بناتی اوراپنی تجدید کرتی رہتی ہے جب کہ انسانی ہاتھوں کے بنے ہوئے سیٹ مردہ ہوتے ہیں۔

۶۔فلم بنانے کا مسئلہ

فلم لینے والے سیٹوں کیلئے خود فلم کی تیاری بھی کوئی معمولی کام نہیں ہے،فلم برداری کیلئے مسلسل متعدداورمختلف فلمی حلقہ جات سے استفادہ کیا جاتا ہے جب کہ آنکھ کا''شبکیہ'' خودکار طریقہ پر مسلسل فلم تیار کرتا رہتا ہے۔ جب اسے مغز میں منتقل کرکے اس کا ریکارڈ

تیار کر دیتا ہے تو فلم کو صاف کر کے دوسرے مناظر کی تصویر کشی کیلئے آمادہ کر دیتا ہے اور یہ کام نہایت ہی حیرت انگیز حد تک تیزی کے ساتھ فوراً عمل میں آتا ہے۔ البتہ یہاں پر ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس جگہ پر فلم ''دھلائی'' اور ''چھپائی'' کی بات نہیں ہو رہی جو ایک علیحدہ اور مستقل مسئلہ ہے اور نہایت ہی مشکل کام ہے۔

۷۔ ضمنی طور پر کام کرنے والی مشینری

آنکھ کے بخوبی اور بہتر طور پر کام کرنے کیلئے اسے بہت سے لطیف پرزوں سے آراستہ کیا گیا ہے تا کہ وہ اپنا کام بخوبی اور بہتر طریقے سے انجام دے سکے۔ یہ لطیف پرزے بھی اپنے طور پر حیرت انگیز اور محیر العقول ہیں۔ آنکھ میں موجود پانی کے چشمے جن کا مائع مخصوص اور شفاف کنندہ ہوتا ہے، مسلسل آنکھ میں ٹپکتا رہتا ہے، پلکوں کو آنکھ کے ڈھیلے پر کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر گردش کرنے کی اجازت دیتا ہے ،اس کے نچلے حصے میں فاضل پانی موجود رہتا ہے، جو اس مائع کو ہمیشہ باہر جانے کی ہدایت کرتا اور ناک کے گڑھوں میں بھیجتا رہتا ہے اسی طرح خود پلکیں اور ان کا وہ سریع ردعمل ہوتا ہے جن سے وہ آنکھ کو چوٹ لگنے کے موقع پر یا گرد و غبار کے حملے یا شدید اور تیز روشنی کے وقت فوراً اسے ڈھانپ دیتی ہیں۔ اسی طرح آنکھ کے پپوٹے ہیں۔ جو آنکھ کیلئے پردے کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح آنکھ کا پیالے نما ہڈی کے اندر قرار پانا جو کہ بہت ہی قوی اور محکم ہوتی ہے، جیسے محفوظ قلعہ ہوتا ہے اور پھر اس ''محفوظ و مضبوط قلعہ'' کا جسم کے بلند ترین مقام قرار پانا اسے اس بات کے موادقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے اطراف و جوانب کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ جیسے فوج کی دیدبان چوکی ہوتی ہے اسی طرح آنکھ کے ابرو ہوتے ہیں۔ جو حفاظت کے لیے پر کا کام دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے دوسرے امور ہیں جن میں سے ہر ایک کی اپنے مقام پر ایک علیحدہ، دلچسپ اور حیرت ناک داستان ہے

اگر ہم ان تمام جہات اور سارے پہلوؤں کو ایک ساتھ ملا کر اس بارے میں قدرے غور و فکر سے کام لیں تو یقیناً اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ آنکھ کا بنانے والا عدسے، نور کے منعکس ہونے اور اس قسم کے کئی دوسرے پیچیدہ امور سے اچھی طرح واقف اور پوری طرح آگاہ تھا اور اس نے اپنے علم و بے پناہ قدرت کی بدولت اس قسم کی عجوبۂ روزگار چیز کو خلق فرمایا۔

۲۔ ہر فن مولا عضو.....زبان

مذکورہ بالا آیات میں جن اعضاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک زبان کا مسئلہ ہے جو صحیح معنی میں خالق کائنات کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ اگر زبان کی ''زبان'' ہوتی اور وہ اپنا ماجرا خود بیان کرتی، باوجودیکہ ہم اس سے مانوس ہیں، پھر بھی اس سے ایسے محیر العقول کارنامے بیان ہوتے جس سے ہمیں پتہ چل جاتا تا کہ قرآن مجید نے کیوں اس کا تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے۔

زبان کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں ویسے تو بہت زیادہ ہیں لیکن اس کے چھ عمدہ کام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔غذا کو دانتوں کے نیچے بھیجنا

اگر زبان نہ ہوتی تو غذا کا کچھ حصہ پوری طرح چبایا جاتا اور کچھ حصہ مکمل طور پر چبائے جانے سے رہ جاتا اور ہم مجبور ہوتے کہ غذا کو انگلی کے ذریعہ جا بجا کرتے، یہ زبان ہی ہے جو اپنی سریع اور ماہرانہ حرکتوں سے غذا کو مسلسل طور پر تینوں طرف سے دانتوں کے نیچے پہنچاتی رہتی ہے لیکن خود ان کے نیچے آنے سے بچ جاتی ہے۔ہاں البتہ بعض اوقات جب وہ تھک جاتی ہے اور کمزور ہوجاتی ہے تو ممکن ہے دانتوں کے درمیان پھنس جائے اور اچھی خاصی چوٹ کھا جائے، تو یہ اور بات ہے۔گویا اس طرح خداوند عالم ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ عجیب مہارت جو خداوند عالم نے زبان کو عطا فرمائی ہے اگر اسے عطا نہ کرتا تو ہر روز یہ صورت حال پیش آتی رہتی اور زبان دانتوں میں آکر مجروح ہوتی رہتی۔

۲۔غذ کو لعابِ دہن سے مخلوط کرنا

وہی لیسدار مادہ جو ایک طرف تو غذا کو نرم، متحرک اور نگلنے کے قابل بناتا ہے اور دوسری طرف اس میں خاص کیمیکل تبدیلیاں عمل میں لاتا ہے، اسے جذب اور ہضم ہونے کیلئے تیار کرتا ہے یہ زبان ہی ہے جو اس مادہ کے ساتھ غذا کو مخلوط کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔

۳۔غذا اور پانی کے نگلنے میں کمک کرنا

غذا بلکہ پانی کو نگلنے کیلئے زبان کا بڑی حد تک دخل ہے۔غذا اور پانی کے نگلنے کیلئے زبان پہلی ہوجاتی ہے، پھر منہ کے بلائی حصہ پر دباؤں ڈالتی ہے اور اسے فوراً ہی گلے کی طرف بھیج دیتی ہے۔اگر بالفرض کسی دن زبان مفلوج ہوجائے تو ایک لقمہ غذا کا نگلنا ممکن ہی نہ رہے بلکہ محال بھی ہوجائے۔

۴۔غذائی مواد پر ضبط واختیار

زبان میں چکھنے کی زبردست حس موجود ہے۔اسی لئے وہ بدن کیلئے بہت سے نامناسب مضر اور مسموم مواد کی پہلے پہچان کرتی ہے۔ پھر اسے فوراً باہر نکال دیتی ہے۔اگر بدن کے بیرونی دروازے پر ''یہ خبردار چوکیدار'' نہ ہوتا تو انسان نامناسب غذا کے استعمال کی وجہ سے بہت جلد بیمار ہوجاتا اور اس کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ایک کڑوی اور بہت ہی نمکین یا زبردست تیز قسم کی یا فاسد اور خراب غذا سے سب سے پہلے زبان باخبر ہوتی ہے اور اسے ''جسم کے ملک'' میں داخل ہونے سے روک دیتی ہے۔یہ فدا کار سپاہی چوبیس گھنٹے کیلئے تمام کھانے پینے کی اشیاء پر قابو رکھنے کیلئے کمربستہ رہتا ہے۔

۵۔منہ کی صفائی کا کام

یقیناً آپ نے تجربہ کیا ہوگا کہ کھانا کھا لینے کے بعد منہ اور زبان کافی دیر تک حرکت کرتے رہتے ہیں۔ان کی یہ حرکت منہ میں بچی

کچھی غذا کی صفائی کیلئے ہوتی ہے، جو منہ کی فضا میں اِدھراُدھر رہ جاتی ہے۔ زبان اسے ہر طرف اکٹھا کر کے اندر بھیج دیتی ہے اور عام طور پر یہ کام زبان کے ذمہ ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ دانتوں کو بھی بڑی حد تک صاف کر دیتی ہے۔ خلاصہ کلام زبان صحیح معنوں میں ''منہ کا صفائی کرنے والا ملازم'' شمار ہوتی ہے۔

۶۔ بولنے کا کام

آخر میں زبان کا اہم ترین اور حساس ترین فریضہ ''بیان'' ہے جسے قرآن مجید نے سورہ رحمٰن کے آغاز میں خدا کے تعارف کے طور پر خصوصی طور پر بیان فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے:

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ ﴿۴﴾

خداوندِ رحمٰن نے قرآن کی تعلیم، انسان کو پیدا کیا اور اسے بات کرنا سکھایا۔

اگرچہ بار بار کی مشق کرنے کی وجہ سے بات کرنے کا مسئلہ ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ معمولی بات معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نہایت ہی پیچیدہ کام ہے جسے انسان اپنی ''زبان'' اور ''سوچ'' کے ذریعہ انجام دیتا ہے۔

سب سے پہلی ہزاروں، لاکھوں بلکہ اس سے بھی زیادہ کلموں کے درمیان سے اُسے پہلے کلمہ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے پھر زبان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے سریع اور ماہرانہ پیچ وخم کے ذریعہ حرفوں کے مقطع کے گرد چکر لگائے، پھیپھڑے، نرخرے اور صوتی تاروں کی مدد سے منظور نظر حروف مرتب کرے، ان کو آپس میں ملا کر ایک کلمہ بنائے، پھر اسی تیزی سے دوسرے کلمہ کا انتخاب کرے مقررہ آوازیں ایجاد کرے اور اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے ایک جملہ مقرر کرے۔ اگر کلمات کے انتخاب میں سوچ اور فکر تھوڑی سی غلطی کر جائے، یا منہ کے اطراف میں قدرے کوتاہی رونما ہو جائے، تو پورے کا پورا جملہ غلط ہو جائے گا۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ ایک مقرر جب ایک گھنٹہ موزوں اور فصیح وبلیغ تقریر کرتا ہے اور اس کی زبان کئی ہزار مرتبہ منہ کے اطراف میں گردش کرتے ہوئے حروف کے مقطع پر تکیہ کرتی ہے.....وہ بھی مختصر اور محدود ماحول میں جہاں پر مشق کرنے کی قدرت بہت ہی کم ہوتی ہے.....کس قدر عجیب اور معجزانہ کام انجام دیتی ہے۔ یہ سب کچھ پروردگار عالم کی قدرت نمائی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یقینی طور پر ہونٹ بھی زبان کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور حروف کا کچھ حصہ بنانے میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ وہ اعضاء کے درمیان یہ ہم آہنگی بذاتِ خود ایک دلچسپ، حیران کن اور تعجب آور موضوع ہے۔ ان سب سے بڑھ کر اس کے ساتھ فکری تعاون ایک اور اہم کام ہے۔

خلاصہ کلام ظاہری اعضاء اور اندرونی اعضاء مثلاً دل، مغز، رگیں اور اعصاب کا دوسرا سلسلہ غرض ہر ایک کی ایک مفصل اور دلچسپ داستان ہے۔ اگر ہم ان میں سے ہر ایک کے اسرار لکھنا چاہیں تو ''ایک عمر چاہئے اس داستان کیلئے'' کے مصداق ہزاروں کتابیں درکار ہوں گی۔

کتنی اچھی بات ہے کہ یہاں ہم اپنے قصور کا اعتراف کریں اور خالقِ کائنات کے آگے سرِ تسلیم جھکا دیں، اور شاعر کے بقول اپنی تخلیق کے بارے میں درج ذیل اشعار زبان پر لائیں اور کہیں کہ اے انسان!

عجب ترا ز تو ندارد جہاں تماشا گاہ
چرا بہ چشمِ تعجب بہ خود نظر نکنی !

اس کائنات میں تجھ سے بڑھ کر اور کوئی تماشا گاہ نہیں ہے ۔لہذا تو اپنی طرف تعجب کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھتا۔ یا کہیں

عالم ہمہ در تو است ولیکن از جہل
پنداشتہ ای تو خویش را در عالم!

ساری کائنات تیرے اندر سموئی ہوئی ہے لیکن تو اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے تو خود کائنات کے اندر سمویا ہوا ہے۔

۲۱۔انسان کی اجتماعی زندگی میں ذات پروردگار کی نشانیاں

اشارہ:

اس میں شک نہیں کہ انسان ایک اجتماعی مخلوق ہے اور اپنی ہر چیز کو اجتماعی زندگی میں ہی حاصل کرتا ہے۔انسان کی معنوی اور مادی لحاظ سے ارتقاء علم ودانش، تمدن اور مصنوعات اور آداب ورسوم، غرض اس کا سب کچھ اجتماعی زندگی کا مرہون منت ہے۔گویا یہ بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر انسان اجتماعی زندگی سے محروم ہوجائے تو وہ اپنی ہر چیز گنوا بیٹھے اور ایک حیوان کی حدتک جا گرے۔

انسان کا اس قسم کا طرز زندگی اس کے فطری تقاضوں کے علاوہ اس کی گوناگوں اور کثیر تعداد میں ضروریات اور بلندترین اور کامل ترین مراحل تک پہنچنے کیلئے اس کی ہمت عالی کو بھی بڑی حدتک عمل دخل حاصل ہے۔ان جسمانی اور روحانی ضروریات کو اجتماعی زندگی کے بغیر پورا نہیں کیا جاسکتا، ایک فرد کیا کام کرسکتا ہے؟

لیکن یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ انسان کو اجتماعی زندگی کیلئے بہت سے روحانی اور جسمانی عوامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنہیں خالق کائنات نے اس کے اختیار میں دے رکھا ہے۔اگر انسانی زندگی کے اس پہلو کا تجزیہ وتحلیل کیا جائے تو یہ بڑا ہی دلچسپ اور خالق کی آیات میں سے ایک آیت معلوم ہوگا۔

اس اشارے کے ساتھ قرآن کی ان آیات کی تلاوت کرتے ہیں جو اسی چیز کو بیان کرتی ہیں اور انہیں گوشِ جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱

(سورہ روم۔۲۱)

۲۔۔۔هُوَالَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ (سورہ اعراف۔۱۸۹)

۳۔۔۔اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۲ (سورہ دھر۔۲)

۴۔۔۔يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ

لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ

(سورہ حجرات۔ ۱۳)

۵۔۔۔هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۶۳﴾

(سورہ انفال۔ ۶۲۔ ۶۳)

ترجمہ

۱.....اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لئے جوڑ کو پیدا کیا، تا کہ تم ان کے ساتھ سکون حاصل کرسکو۔ اور تمہارے درمیان مودت اور رحمت کو قرار دیا۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں۔

۲.....خدا تو وہ ہے جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کا جوڑ بھی اسی سے بنایا ہے تا کہ اس کے ساتھ اسے سکون مل سکے۔

۳.....ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا اور اسے آزمائیں گے (اسی لئے) ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔

۴.....اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور گروہ اور قبیلے بنایا ہے تا کہ تم ایک دوسرے پہچان سکو، لیکن تم میں سے زیادہ باعزت خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔

۵.....وہ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد اور مومنین کی مدد سے تجھے تقویت بخشی ہے اور اس نے دلوں میں الفت ایجاد کی، اگر تم روئے زمین پر موجود سب کچھ اس لئے خرچ کرتے کہ ان کے دلوں میں الفت ایجاد کرتے، تو ایسا نہ کرسکتے، لیکن خدا نے ان میں الفت ایجاد کی ہے یقیناً وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

الفاظ کے معانی اور تشریح

''زَوْج'' کا اصل معنی مذکر اور مؤنث حیوان ہیں جن میں سے ہر ایک پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، کبھی وسیع تر معنی کیلئے بھی بولا جاتا ہے۔ دو چیزیں جو ایک دوسرے کا جوڑ ہوتی ہیں ''زوج'' کہلاتی ہیں خواہ ان کا جوڑ ہونا ایک دوسرے سے مشابہت کی وجہ سے ہو یا ایک دوسرے سے تضاد کی بنا پر، جیسے جوتوں کا جوڑا یا جرابوں کا جوڑا یا دن اور رات اور خیر و شر وغیرہ۔ جو اعداد دو پر مساوی تقسیم ہوتے ہیں انہیں بھی زوج (جفت) کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک حصہ دوسرے کا جوڑ ہوتا ہے۔ لیکن انسانوں کے بارے میں ''زوج'' ان دو افراد کو کہا جاتا ہے جو آپس میں زناشوئی کا پیمان باندھتے ہیں۔

بعض ارباب لغت کہتے ہیں کہ ''زوج'' ایسی شکل وصورت کا نام ہے جس کی نظیر اور مثال ہو، جیسے مختلف صنفیں اور مختلف رنگ ہوتے ہیں، یا جس چیز کی ضد ہو، جیسے تر اور خشک، مذکر اور مؤنث، رات اور دن، شیریں اور تلخ وغیرہ، نیز انہوں نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ ''زوج'' کا لفظ دو افراد میں سے ایک پر علیحدہ بولا جاتا ہے نہ کہ دونوں کیلئے بیک وقت بلکہ دونوں کیلئے ''زوجان'' کا لفظ بولا جاتا ہے اور دونوں افراد پر ''زوج'' کا اطلاق جاہل اور انجان لوگ کرتے ہیں۔[1]

''کتسکنوا''، ''سکون'' کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی کسی چیز کا حرکت کے بعد ٹھہر جانا ہیں۔ کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں ہے کہ اس کے اصل معنی ٹھہراؤ اور اضطراب وحرکت کے خلاف حالت کا نام ہیں۔ کبھی اس کا اطلاق طوفان، ہوا، گرمی، سردی، بارش یا غیظ وغیب کے تھم جانے پر بھی ہوتا ہے۔ کشتی کے ''ساکنین'' کو اس لئے ساکنین کہتے ہیں کہ وہ کشتی کے ٹھہراؤ اور اس کے صحیح راستوں پر چل نکلنے کا سبب ہوتے ہیں۔ چھری کو اس لئے ''سکین'' کہتے ہیں کہ وہ جانور کا سر کاٹنے کے بعد اس کی حرکتوں کو روک دیتی ہیں۔ اندرونی آرام اور اطمینان کو ''سکینہ'' کہتے ہیں ''مسکین'' اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت اور شدید فقر و فاقہ کی وجہ سے گویا ساکن ہو چکا ہوتا ہے۔ اور ''مسکن'' ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو انسان کے سکونت اور آرام کا مقام ہوتی ہے۔[2]

''شعوب'' کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ''شَعْب'' (بروزن صعب) کی جمع ہے اور بعض کے بقول ''شِعب'' (بروزن فعل) کی جمع ہے جب کہ صاحب مجمع البحرین جیسے بعض دوسرے مفسرین کے نزدیک ''شَعب'' کی جمع ''شعوب'' اور ''شِعب'' کی جمع ''شعاب'' ہے۔ دونوں حالتوں کے بارے میں ''لسان العرب'' کا کہنا ہے کہ اصل میں ان کے معنی جمع اور تفریق کے معنی ہیں یا پھر کسی کے بنانے یا بگاڑنے کے معنی میں ہے۔ (یہ اس لئے ہے کیونکہ اس کی اصل پہاڑ کے درے کے معنی میں ہے جس کا وہ حصہ جو پہاڑ کی طرف ہوتا ہے تنگ اور جو دوسری طرف ہوتا ہے وہ کھلا ہوتا ہے اور اس سے راہیں جدا ہوتی ہیں۔ (مفردات میں راغب کے بقول اس میں دونوں مفہوم جمع

---

[1] مفردات راغب، مصباح اللغۃ، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم اور لسان العرب۔

[2] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، لسان العرب، مفرداتِ راغب، مجمع البحرین اور کتاب العین۔

ہیں) اسی لئے ''شعب'' اس قبیلے کو کہتے ہیں جو ایک عظیم خاندان سے جدا ہوا ہو۔ (اجتماع کا معنی بھی اس میں پایا جاتا ہے اور جدائی کا بھی) ۔بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ''شعوب'' کا لفظ عجمی گروہوں پر بولا جاتا ہے اور ''قبائل'' کا لفظ عرب گروہوں پر [1] نیز اسی دلیل کی بنا پر ''تشعب'' کا معنی منتشر ہونا بھی آتا ہے اور مجتمع بھی سنوارنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور بگاڑنے کے بھی۔

''اَلَّفَ''، ''اِلف'' (بروزن جلف) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ایسا اجتماع ہیں۔ جس میں ملنے اور جڑنے کو دخل ہوتا ہے۔'' تالیفِ قلوب'' کے معنی دلوں کے درمیان الفت، ربط اور پیوند ایجاد کرنا ہیں (کتاب کی تالیف کو اس لئے تالیف کہتے ہیں کہ اس کے الفاظ ومعانی اور مباحث کے درمیان ایک طرح کی الفت اور باہمی جوڑ ہوتا ہے اور ''ہزار'' کے عدد کو اسی لئے ''الف'' کہتے ہیں کیونکہ عربوں کے عقیدے کے مطابق تمام اعداد اس میں جمع ہیں، کیونکہ عدد، اکائی، دہائی، سینکڑہ، اور ہزار سے تشکیل پاتا ہے اور ہزار کے بعد کوئی اور عدد نہیں ہے۔ [2] بلکہ وہی عدد پھر اکائی، دہائی، سینکڑہ اور ہزار سے مرکب ہوتا ہے۔ دس ہزار سو ہزار، ہزار ہزار وغیرہ۔

آیات کی تفسیر اور جمع بندی

انسان کی اجتماعی روح.....خدا کا بہت بڑا عطیہ

سورہ روم میں جب خداوند متعال نے اپنی آیات اور نشانیوں کو یکے بعد دیگرے سات آیتوں میں بیان فرمایا تو ہر ایک آیت کا آغاز ''وَمِنْ اٰيٰتِهٖ.....'' سے فرمایا، چنانچہ کائنات میں خداوند عالم کی عظمت کی نشانیوں کی نہایت دل نشین، جاذب، دلکش، لطیف اور دلپذیر انداز میں کیا۔ اس سلسلے کی پہلی آیت بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ [3]

اس آیت میں پہلے تو انسانی معاشرے کے بنیادی پہلو یعنی خاندانی اکائی، اس کے باہمی تعلق اور اس پر حکم فرما روحانی رابطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ''اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑ پیدا کئے تاکہ تم ان کے ساتھ سکون حاصل کرسکو'' (وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا)

لطف کی بات یہ ہے کہ یہاں پر زناشوئی اور ازدواجی زندگی کا مقصد نسل کی بقا نہیں بتایا گیا، بلکہ حصول سکون ذکر کیا گیا ہے۔ ازدواجی زندگی سے جو سکون میسر ہوتا ہے وہ اس لئے ہے کہ یہ دونوں (نر و مادہ کی) جنسیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور ایک دوسرے کے پروان، نجات اور پرورش کا موجب ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر وہ نامکمل ہیں اس طرح وہ اپنے ارتقاء کو حاصل کرتی رہتی ہیں۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۹، ص ۱۳۸

[2] مجمع البحرین، لسان العرب اور مفردات راغب۔

[3] آیات کا یہ سلسلہ اسی سورت کی بیسویں آیت سے شروع ہوکر پچیسویں آیت پر ختم ہوجاتا ہے۔ (مسلسل چھ آیات)

یہ آرام وسکون جسمانی حدتک ہی نہیں ہے بلکہ اس کا روحانی پہلوزیادہ اہم اورقوی ہے۔ترکِ ازدواج اورتجرد پر مبنی زندگی سے نفسیاتی بےچینی اور بےآرامی، روحانی سکون کا فقدان اورکئی قسم کی دوسری بیماریوں کا ظہوراس بات کا واضح ثبوت ہے۔

پھرفرماتا ہے:''اورخدانے تمہارے درمیان مودت اوررحمت کو پیدا کیا ہے۔''(وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط)

وہی محبت اوررحمت جودرحقیقت لوگوں کے درمیان اتصال، رابط، جوڑ اورملاپ کا کام دیتی ہے، بکھرے ہوئے منتشرلوگوں کوایک جگہ پراکٹھا کرتی ہیں اوراس سے ایک طاقتورمعاشرہ تشکیل دیتی ہے جس طرح دیوار کی چنائی کیلئے مٹی اورگارا کام دیتا ہے اور پتھروں، اینٹوں کوآپس میں ملاکراورجوڑ دے کرایک عظیم و پرشکوہ عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

پھرلطف کی بات یہ ہے کہ آیت کے آخر میں ایک بار پھراسی توحیدی نکتے پرزوردے کرفرماتا ہے''اس میں ان لوگوں کیلئے آیات اورنشانیاں ہیں جوغوروفکر سے کام لیتے ہیں۔''(اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ)

گرہم ازدواجی زندگی کی تشکیل کے بارے میں سوچیں جوسب سے پہلی اجتماعی اکائی ہے اسی طرح ان دومختلف اجتماعی جنسوں کے درمیان طاقت اورعجیب کشش پرغورکریں جوان کے درمیان پیدا کی گئی ہے، پھراس سے بڑی بڑی اجتماعی اکائیوں کی تشکیل مثلاً خاندان، قوم ،قبیلہ،عشیرہ، پھرشہرملک اورآخرکارکل انسانی معاشرے میں غوروفکر سے کام لیں توہمیں ہرہرقدم پرخدا کی ایک ایک آیت نظرآئے گی۔

وہ کون ہے جس نے زن ومرد، ماں باپ اوراولاد کے درمیان محبت اورمودت کے رشتے استوار کئے ہیں، بلکہ کلی طور پرتمام انسانی معاشرے کے درمیان محبت اورمودت کا پیوندلگایا ہے؟

وہ کون ہے جس نے انسانی معاشرے میں مرداورعورت کی جنس میں توازن پرقراررکھا ہواہے، یہاں تک کہ انسانی معاشروں میں وفات اورولادت کےلحاظ سے جوبھی پیچیدہ تبدیلیاں اورحوادث رونماہوتے رہتے ہیں، یہ توازن ہرصورت میں برقراررہتا ہے۔

وہ کون ہے جس نے سروں میں مختلف ذوق اوردلوں میں مختلف تعلقات ایجاد کئے ہیں، اورہرگروہ کواپنے اپنے کام اور پروگرام کی طرف کھینچ کرلے جاتا ہے تاکہ مجموعی طور پرانسانی معاشرہ ایک مکمل اکائی کی صورت اختیارکرلے؟

شاید یہی وجہ ہے کہ بعدکی آیت میں زبانوں کے اختلاف اوررنگوں کے تفاوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بھی خدا کی آیات میں شمارکرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ (روم۔ ۲۲)

کیونکہ زبانوں اوررنگوں کے اختلاف کی تفسیروں میں سے ایک تفسیروہ اختلاف اورتفاوت ہے جولوگوں کی بولیوں، ذوق اورفکری کشش میں پایا جاتا ہے جواس تاب کا موجب ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ مکمل طور پرمتحداور بےنیاز ہواورانسان کی مادی ومعنوی ضروریات میں کسی قسم کا خلاواضح نہ ہونے پائے۔

''مَوَدَّتْ''، ''وُدّ''[1] (بروزن حُبّ) کے مادہ سے ہے نیز اس کا اطلاق ''کسی چیز کے پورا ہونے کی آرزو'' پر بھی ہوتا ہے (اور دونوں معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں) ''وَدّ'' (بروزن حَدّ) زمانہ جاہلیت کے بتوں میں سے ایک بت کا نام ہے بوجہ اس شدید تعلق کے جو لوگ اس کے ساتھ رکھتے تھے، یا اس وجہ سے کہ لوگوں کا تصور تھا کہ اس بت کے اور خدا کے درمیان مودت کا رابطہ ہے۔ ''میخ'' پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ''وَتِد'' کا لفظ جو عربی زبان میں ''میخ'' کے معنی رکھتا ہے، اسی ''وُدّ'' ہی سے لیا گیا ہے کیونکہ مضبوط میخیں دیوار یا کسی اور چیز سے چمٹ جاتی ہیں۔ اسی لئے محبت کے مفہوم سے ملتی جلتی ہیں۔

''رَحْمَتْ'' کا معنی وہ نرمی کی حالت ہے جو انسانی دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسے قابل رحم چیز پر نیکی کرنے کیلئے مائل کرتی ہے۔ جب اس کا استعمال خداوند عالم کے بارے میں ہوتا ہے تو اس کے معنی انعام، بخشش اور احسان ہوتے ہیں۔

اس آیت میں دو لفظوں (مودت اور رحمت) مین کیا فرق ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے متعدد احتمالات ذکر کئے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام تفسیری معانی میں جو جامع معنی ہیں وہ یہ ہیں کہ ''مودت'' کا اطلاق وہاں پر ہوتا ہے جہاں فریقین کا تعلق اور دونوں کی طرف سے برابر کا اظہار محبت کیا جائے جیسے زن و مرد یا دو بھائیوں کے درمیان محبت موجود ہوتی ہے اور ہر ایک کو دوسرے کی خدمت کیلئے آمادہ کرتی ہے جب کہ ''رحمت'' یکطرفہ ہوتی ہے اور اس میں ایثار کا پہلو پایا جاتا ہے جیسے والدین کا چھوٹے بچوں کے ساتھ محبت کا رابطہ یا زن و شوہر میں سے کسی کا دوسرے کے ساتھ تعلق جب وہ ناتوان اور بوڑھے ہوجاتے ہین۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے وہ یہ کہ ازدواجی اور اسی طرح اجتماعی زندگی میں کلی طور پر دو طرح کا معنوی رابطہ ہونا چاہیے ایک تو برابر کی خدمات کی صورت میں اور ہر فرد اور ہر قوم دوسرے فرد اور قوم کی برابر کی خدمت کرے، دوسرا ''اعزازی خدمات'' کے طور پر، کیونکہ ہمیشہ انسانی معاشروں میں یا خاندانوں میں جو چھوٹے چھوٹے معاشروں کی حیثیت رکھتے ہیں، کمسن اور ضعیف و کمزور اور ناتوان قسم کے لوگ رہتے ہیں، جن سے برابر کی خدمت کی توقع نہیں کی جاسکتی، وگرنہ وہ ہمیشہ کیلئے اس سے محروم ہوجائیں۔ ایسے مواقع پر ''مودت'' اپنا مقام ''رحمت'' کو دے دیتی ہے اور برابر کی خدمات کی بجائے ایثار پر مبنی نکات کس قدر لطیف ہیں، جن پر عملدرآمد کئے بغیر انسانی معاشرہ آرام وسکون کا حامل نہیں ہوسکتا۔

دوسری آیت میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا جارہا ہے جو اس سے پہلی آیت میں بیان ہوچکی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس آیت میں فرماتا ہے ''وہ وہی تو ہے جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کے جوڑے کو بھی اسی جنس ہی سے بنایا ہے تاکہ اسے اس کے پاس سکون مل سکے۔ (هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ)

---

[1] مفرداتِ راغب ''مادہ وَدّ''

بہت سے مفسرین کے عقیدہ کے مطابق ''نَفۡسٍ وَّاحِدَةٍ'' سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔[1] لیکن جو تعبیریں اس آیت کے ذیل میں ذکر ہوئی ہیں ان سے شرک کی بو آتی ہے اور یہ شرک یقیناً نہ تو عقیدے میں شرک کے معنی میں ہے اور نہ ہی عبادت میں بلکہ ممکن ہے اس سے مراد وہ رجحان اور میلان ہو جو آدم کا اپنی اولاد کی طرف ہوتا ہے جو بعض اوقات جلد گزر جانے والے لمحات میں انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور دوسری تمام باتوں سے غافل کر دیتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ''نَفۡسٍ وَّاحِدَةٍ'' سے مراد ''نوع کی اکائی'' ہو یعنی ''تم سب کو ایک اکائی سے پیدا کیا ہے۔

''وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا'' کے جملہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ حضرت آدمؑ کی زوجہ جناب حوا کو ان کے بدن کے جزو سے پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ جعلی روایات میں منقول ہے کہ حضرت حوا کو جناب آدم کے بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اسی لئے مرد کی بائیں طرف کی پسلیوں میں دائیں طرف کی پسلیوں کی نسبت ایک پسلی کم ہے کیونکہ یقینی بات ہے کہ انسان کے دونوں طرف کی پسلیوں کی تعداد ایک جیسی ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہے یقین نہ آئے تو گن کر دیکھ لیں۔

بلکہ آیت میں یہ مراد ہے کہ آدم کی زوجہ کو ان کی جنس سے پیدا کیا ہے تا کہ ان کے درمیان جنسیت کی کشش برقرار رہے نہ کہ کسی اجنبی اور ناواقف جنس سے، جیسا کہ ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں پڑھتے ہیں:

''هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ'' خدا وہ ہے جس نے درس نہ پڑھے ہوئے لوگوں مین ان ہی کی جنس سے ایک رسول کو بھیجا (جس نے نہ تو کسی سے پڑھنا سیکھا اور نہ ہی لکھنا، لیکن ساری دنیا کا استاد ٹھہرا)

تیسری آیت میں انسان کی ایک مخلوط نطفے سے پیدائش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا ہے اور اسے آزمائیں گے اسی لئے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے۔'' (اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ۖ نَّبۡتَلِيۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًا بَصِيۡرًا)

اس آیت میں انسان کی تین خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی خصوصیت اس کے نطفہ کا مخلوط ہونا ہے۔ اس کا یہ اختلاط ''اَمۡشَاجٍ'' کے لفظ سے سمجھا جاتا ہے جو ''مشیج'' یا ''مشج'' (بروزن مدد) کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مخلوط چیز اس معنی میں وسعت پائی جاتی ہے جو زن و مرد کے نطفہ کے مخلوط ہونے کو بھی شامل ہے اور معدنی اور غیر معدنی مواد کو بھی جن کی وجہ سے نطفہ وجود میں آتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد مختلف طاقتیں، مختلف لیاقتیں اور گوناگوں ذوق ہوں جو انسان کے نطفہ میں موجود ہوتے ہیں اور اسے ان تمام امور میں اجتماعی زندگی کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

دوسری خصوصیت، ''نَّبۡتَلِيۡهِ'' کا جملہ ہے جو انسان کی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے اور اس کی مسلسل

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۴، ص ۵۰۸، تفسیر فخر رازی جلد ۱۵ ص ۸۵، تفسیر روح البیان جلد ۳، ص ۲۰۹۴، تفسیر المیزان جلد ۸ ص ۳۹۱، اور تفسیر قرطبی میں یہ معنی جمہور مفسرین سے نقل کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ۴، ص ۲۷۷۳۔

امتحانی اورآزمائشی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے جس سے وہ ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس سے انسان کی ذمہ داریوں اوراس پر عائدشدہ فرائض کا پتہ چلتا ہے کیونکہ ارادے کی آزادی اور ذمہ دارایوں سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت رکھے بغیر امتحان وآزمائش ناممکن ہوتے ہیں۔

تیسری خصوصیت شناخت ومعرفت کے وسائل وذرائع کا حامل ہونا ہے جن میں سے اہم ترین ذریعہ کان اورآنکھ ہیں۔کانوں سے منقولہ علوم اوردوسروں کے افکار سے استفادہ کرنے اورآنکھوں سے حقائق جہان کو دیکھنے اور براہِ راست رابطہ قائم کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

اس قسم کا انسان جواس طرح کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے،خلافت الٰہیہ کے منصب کی لیاقت اوراجتماعی زندگی کی طاقت رکھتا ہے۔

چوتھی آیت میں روئے سخن تمام بنی نوع انسان کی طرف کرکے فرماتا ہے''اے لوگو! ہم نے تم سب کوایک مرداورایک عورت سے پیدا کیا ہے۔''(یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى)

بنابریں انسانوں کی ذاتوں،قوموں اورقبیلوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے کیونکہ سب کی بنیاد ایک ہے،جڑ ایک ہے اوراصل ایک ہے۔''ابوھم اٰدم والام حوآءُ''(ان سب کا باپ آدمؑ اور ماں حوا ہے)

پھرانسانوں کے قبائل،اقوام اورذاتوں کی طرف تقسیم ہونے کے فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے،''ہم نے تمہیں شعوب اورقبائل قرار دیا ہے تاکہ تم پہچانے جاؤ۔''(وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا)

کیونکہ اجتماعی زندگی کی ابتدائی ترین شرائط میں سے ایک افراد کی ایک دوسرے کی شناخت ہے۔اگر یہ نہ ہوتوایک دن انسانی معاشرے کے نظام کی عمارت دھڑام سے گرجائے،نہ گناہگار کا پتہ چلے اورنہ بے گناہ کا،نہ قرض خواہ کا علم ہوسکے نہ مقروض کا،نہ فرمانروا کی پہچان ہوسکے نہ فرمانبردار کی نہ پیشوا پہچانا جائے نہ پیروکار۔۔۔۔وغیرہ یہ خداوندعالم ہی ہے جس نے انسان کواس قسم کی زندگی کیلئے پیدا کیا ہے اوراسے مختلف قبیلوں ، ذاتوں اور برادریوں میں بانٹ دیا ہے،جن میں سے ہرایک کی اپنی علیحدہ شناخت اورپہچان ہے اور ہرایک اپنی خصوصیات سے مختص ہے۔اس طرح سے تعارف کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔

آیت کے آخر میں اس اجتماعی مسئلہ سے ایک اخلاقی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مختلف اورگوناگوں قبائل واقوام کی طرف نسبت کسی قسم کی فضیلت کی دلیل نہیں ہے بلکہ''خداوندعالم کے نزدیک تم میں سے زیادہ باعزت شخص وہ ہے جوتم میں سے زیادہ متقی ہے''(اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ)

''تقویٰ''صرف ایک اخلاقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ اہم اجتماعی اورمعاشرتی مسئلہ بھی ہے۔انسان کی اجتماعی زندگی کوسدھارنے کیلئے صرف تقویٰ ہی ہے جواسے ہرمرحلہ پرسدھارتا ہے۔اقتصادی مرحلہ ہوتوتقویٰ ضروری ہے سیاسی مرحلہ ہوتوتقویٰ ضروری ہے،حتیٰ کہ فکری مرحلہ ہوتوبھی تقویٰ ضروری ہے۔غرض ہرموقع اور ہرمرحلہ پرتقویٰ

اسی سلسلے کی پانچویں اورآخری آیت میں پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی کے اہم دلائل میں سے ایک دلیل کوذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے''تالیفِ قلوب''(دونوں کوملانا)ارشاد ہوتا ہے''خداتووہ ہے جس نے اپنی اورمومنین کی مدد کے ذریعہ آپ کی تائید کی اوران کے دلوں میں

الفت ایجادکی۔'' (هُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۲﴾ وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ؕ)

اس تعبیر سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی مشکلات پر قابو پانے کیلئے تالیفِ قلب ضروری ہے اور خداوند عالم نے انسان کے اندر یہ استعداد و آمادگی پیدا کردی ہے کہ اگر یہ آمادگی نہ ہوتی تو دلوں میں الفت پیدا کرنا ناممکن ہوتا۔ اگر تالیفِ قلوب حاصل نہ ہوتی تو انسان کی اجتماعی زندگی دگرگوں ہوکر رہ جاتی۔

پھر ایک اور لطیف نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا یہ بتانا چاہتا ہے کہ تالیف قلوب مادی طریقوں سے ناممکن ہے بلکہ ایمان ،روحانیت اور اعلیٰ انسانی اقدار کے ذریعہ ہی اس کا امکان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''جو کچھ کہ روئے زمین پر ہے اگر آپ اسے خرچ بھی کردیتے ،پھر بھی ان کے دلوں میں الفت ایجاد نہ کرسکتے ۔ یہ خدا ہی تو ہے جس نے ایمان کے ذریعہ ان کے درمیان الفت پیدا کردی ہے۔'' (لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیۡنَہُمۡ ؕ)

''کیونکہ وہ صاحب قدرت وصاحب حکمت ہے'' (اِنَّہٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ)

ٹھیک ہے کہ یہ آیت اصحابِ پیغمبرؐ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن واضح سی بات ہے کہ اس کا مفہوم عام اور تمام اہل ایمان کو شامل ہے جیسا کہ المیزان جلد ۹ ص ۱۲۰ میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اصولی طور پر چونکہ مادی وسائل محدود ہوتے ہیں، اسی لئے ہمیشہ سے باعث نزاع اور موجب کشمکش چلے آرہے ہیں اور اگر بالفرض کسی وقت وحدت واتحاد کا سبب بن بھی جائیں تو ایسا اتحاد ناپائیدار ہوتا ہے پائیدار اتحاد صرف اور صرف ایمان تقویٰ اور معنوی اقدار کے سایہ ہی میں حاصل ہوتا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور تعبیر بھی ہے جو سورہ فتح کی ۲۹ ویں آیت میں بیان ہوئی ہے اور جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یاران باوفا کے بارمیں ہے:

''اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ '' یعنی وہ دشمن کے سامنے سخت ہیں اور اپنے درمیان (یعنی آپس میں) رحیم اور مہربان ہیں

لیکن زیر بحث آیت کے سلسلے میں جو چیز ہماری توجہ کیلئے زیادہ شایان شان ہے وہ ہے ''ھو الذی'' کی تعبیر جو آیت کے اول میں ذکر ہوئی ہے، جو خدا کا تعارف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت اور مومنین کے دلوں کی تالیف کے ذریعہ کرا رہی ہے اور اسے وجودِ حق کی دلیل بتا رہی ہے۔ ایسی الفت جو دوسری تمام الفتوں سے بالاتر حتیٰ کہ نسبی اور قریب کی رشتہ داری سے بھی برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قبائلی تعلقات بھی اس الفت کے آگے ماند پڑ گئے جو زمانہ جاہلیت میں عرب کے مختلف قبائل میں شدید تعصب کی بنا پر وہ جود میں آچکے تھے اور اس کی جگہ ایمان اور تقویٰ پر مبنی تعلقات نے لے لی جو اس کے انفرادی اور اجتماعی آثار زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر ہوکر رہے اور دنیا نے بہت ہی جلد اس کی عظمت کے ساتھ سر تسلیم خم کردیا ہے۔

چند ضروری وضاحتیں

کیا معاشرہ کی روح ہوتی ہے؟

جانداروں کی دو قسمیں ہیں جن میں سے اکثریت ایسے جانداروں کی ہے جو انفرادی طور پر زندگی بسر کرتے ہیں حتیٰ کہ ان میں چھوٹی سے چھوٹی اجتماعی زندگی کے آثار بھی دکھائی نہیں دیتے۔ یعنی ان میں جاندانی اجتماعی زندگی بھی نہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ایک قدیم ان سے بھی آگے ہیں اور اپنے جیون ساتھی کے ساتھ رہتے ہیں، جب کہ کچھ ایسے بھی ہیں جو گروہوں کی صورت میں رہتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو پیش رفت اور ترقی یافتہ تمدن کے مالک ہیں جیسے شہد کی مکھیاں چیونٹیاں اور دیمک وغیرہ۔

لیکن ان (اجتماعی حیوانات کے) گروہوں میں دو طرح کی کمی پائی جاتی ہے، ایک تو یہ کہ ان مختلف گروہوں (دو یا اس سے کچھ زائد چھتوں کی مکھیوں) کیلئے ممکن نہیں ہے کہ وہ آپس میں ایک مشترک زندگی گزار سکیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی زندگی ہمیشہ ایک طرز کی چلی آتی رہی ہے، یعنی دور حاضر کی شہد کی مکھیاں بھی اسی طرح رہ رہی ہیں جس طرح آج سے لاکھوں سال پہلے رہتی تھیں۔

ان میں سے صرف ایک جاندار مخلوق ایسی ہے جو غیر محدود اجتماعی زندگی گزار رہی ہے اور ہمیشہ ترقی، پیش رفت اور ارتقاء کی منزلوں پر گامزن ہے، وہ ہے نوع انسانی، اس کی اس وسعت اور تغیر وتبدل کی وجہ اس کی اجتماعی زندگی پر علم وعقل کی فرمانروائی ہے۔

اس مقام پر کافی حد تک بحث کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں تو اپنی تفسیری بحث سے خارج ہو جائیں گے۔ البتہ ان میں سے چند ایک نکات کی یاد آوری ضروری ہے۔

ا۔ انسان کے اجتماعی زندگی کی طرف رجحان کا کیا سبب ہے؟ اس بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ ان میں سے جو نظریہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سبب تین عوامل کا مجموعہ ہے اور وہ ہیں: ''غریزی''، ''عاطفی'' اور فکری'' عوامل۔ عقل کہتی ہے کہ ارتقاء صرف باہمی متحد اور اجتماعی زندگی کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔ اور ارتقاء خواہ مادی ہو یا معنوی اور روحانی کیونکہ ظاہری بات ہے کہ اگر ہر فرد یا ہر خاندان ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر زندگی بسر کرے تو نہ تو یہ علوم ودانش وجود میں آئیں اور نہ ہی اس قدر مصنوعات ایجادات وانکشافات منصۂ شہود میں آہیں، کیونکہ یہ سب کچھ فکری اور جسمانی طاقتوں کے باہمی میل وملاپ اور اجتماع کی بدولت حاصل ہوتا ہے اور ہر نسل اپنے تجربات بعد کی نسلوں کو منتقل کرتی ہے اور ان تجربات کے باہمی اجتماع سے ایک عظیم ترین نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔

پھر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ انسان اپنے اندر کچھ خواہشات اور تمنائیں رکھتا ہے جو اسے اس قسم کی یعنی اجتماعی زندگی سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ وہ تنہائی سے بیزار ہوتا ہے اور اپنے ساتھ ہم دل اور ہم آہنگ دوستوں کے ساتھ رہ کر بہت بڑی لذت اور عظیم لطف حاصل کرتا ہے۔ تجرد اور تنہائی کی زندگی اس کیلئے اذیت ناک ہوتی ہے۔ دانشوروں کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر تنہائی کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہے تو انسان کئی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے فوائد سے قطع نظر بذاتِ

خودایسی زندگی کودوست بھی رکھتا ہے۔

۲۔اسلام نے انسان کی اجتماعی زندگی کوایک اہم ترین اصول کے طور پر بھی تسلیم کیا ہے اس کے نزدیک صرف سیاسی اوراقتصادی رابطے ہی قابل احترام نہیں ہیں ،عبادتوں کے مسئلہ کوبھی جومخلوق کا خالق کے ساتھ رابطہ ہوتا ہے،لائق احترام سمجھتا ہے اور(نماز باجماعت نماز جمعہ اورمراسم حج جیسی)اجتماعی عبادتوں پراس کی خصوصی نظرعنایت ہے۔

نماز کی ترکیب اوراذان واقامت بھی اجتماعی صورت میں نماز کی ادائیگی کی دعوت دیتی ہیں اورسورہ حمد میں جمع کی ضمیروں کواستعمال ،نماز کا آخری سلام غرض اس قسم کی دوسری تعبیریں ظاہر کرتی ہیں کہ نماز میں اجتماعی روح شامل ہے اوراس کی انفرادی صورت میں بجا آوری ایک فروعی حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔

اسلام میں اجتماع اورانسان کی اجتماعی زندگی کواس قدراہمیت دی گئی ہے کہ اختلاف وانتشار کے ہرطرح کے عامل کوگناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے(جیسے حسد،چغلی،غیبت اورتفرقہ اندازی وغیرہ)اورجوچیز انسانی معاشرے میں صلح وصفائی اوراصلاح وسدھار کا موجب ہوتی ہے۔ اسے بلندترین عبادت شمارکیا گیا ہے۔

۳۔انسان کی اجتماعی زندگی کا وقوع پذیر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے کیونکہ اس امر کیلئے استعدادوں اورمختلف فکری اور جسمانی جذبوں کی تقسیم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اوردلوں میں ہم آہنگی،ہم نوائی اورالفت کی ضرورت بھی،جیسا کہ آیات کی تفسیر میں ابھی بتایا جاچکا ہے کہ افرادِبشر کی مثال ایسے ہے جیسے کسی عمارت کیلئے پتھراوراینٹ وغیرہ،جب تک ان کوآپس میں جوڑنے کیلئے موثرگل گارا کی چنائی نہ کی جائے اس وقت تک کوئی بھی عالی شان عمارت معرض وجود میں نہیں آسکتی۔یہاں پربھی خداوندعالم کادستِ قدرت بنی نوع انسان کی امداد کیلئے آگے آیااورتالیف قلوب،فکری اورجسمانی استعدادوں کی تقسیم اورمختلف قسم کے ذوق اورہنر کی صحیح صحیح منصوبہ بندی کی اوربنی نوع انسان کوایسی عظیم نعمتوں سے نوازا جن کے بغیر بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کا پہیہ ہرگزنہیں گھوم سکتا۔انہی امور کے مجموعہ کوبھی ''معاشرے کی روح'' کا نام دیا جاتا ہے،وگرنہ ہم جانتے ہیں کہ مذکورہ چیز کےعلاوہ معاشرہ کی کوئی اورخاص روح نہیں ہے۔

سچ بتایئے کہ انسان کوارتقاء کی اڑہوں پر چلانے کیلئے اس معاشرتی روح کواپنی تمام خصوصیات سمیت کس نے نعمت وجودعطا کی ہے؟ کیااندھی اوربہری فطرت(نیچر)نے جوخودعقل وشعور سے عاری ہے؟کیاایسی بےعقل اورلاشعورفطرت اس قسم کی منصوبندی کرسکتی ہے؟اس نوع کی محبت،مودت اوررحمت کے وجود کے زیور سے مرصع کرسکتی ہے؟اس طرح کے آرام وسکون کوخلق کرسکتی ہے؟اس نوعیت کے نقطہ امشاج کو پیدا کرسکتی ہے؟اس تعارف اورعمومی شناخت اوراس طرح کی تالیفِ قلوب کا فریضہ انجام دے سکتی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں ان امورکوخداوندجل شانہ کی عظمت،علم اورقدرت کی عظیم نشانیاں قراردیا گیا ہے۔

ہم اپنی اس گفتگوکوحضرت رسول خداﷺ کی ایک پاک وپاکیزہ حدیث پرختم کرتے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے انسان کی اجتماعی روح کوکس قدراہمیت دی ہے۔ارشادِرسالت ہے:

ان المسلم اذالقی اجاہ المسلم فاخذ بیدہ تحاتت عنھما ذنوبھما کما تتحات الورق عن الشجرۃ الیابسۃ فی یوم ریح عاصف و(لایفترقان)الاغفرلھما ذنوبھما ولوکان مثل زبدالبحار

جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کرتا ہے اوراس کا ہاتھ پکڑتا (اوراسے محبت سے دباتا) ہے تواس وقت ان دونوں کے گناہ ایسے جھڑجاتے ہیں جس طرح طوفانی ہوا کی وجہ سے خشک درخت کے پتے جھڑجاتے ہیں اوروہ دونوں ایک دوسرے سے ابھی جدانہیں ہوتے کہ خداوندعالم ان کے گناہوں کوبخش دیتا ہے ،خواہ وہ گناہ سمندروں کی جھاگ کے برابرہی ہوں۔[1]

حرفِ آخر

اس کتاب کی مختلف بحثوں میں جوکچھ بیان ہواہے اس سے یہ حیثیت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ بے پردہ محبوب ہردرودیوار سے ظاہر ہوگیاہے،اپنے جلوے موجودات عالم کی ہرچیز میں دکھاچکاہے اور ہرچیز کی پیشانی پراس کے اسماءوصفات کی مہرلگی ہوئی ہے۔

وہ لاکھوں جلووں کے ساتھ باہرآچکاہے تاکہ ہم لاکھ بینائیوں کے ساتھ اس کا دیدارکریں۔اس نے ہرذرہ کے دل میں ایک آفتاب چھپایاہواہے اورآسمان وزمین میں اپنے علم وقدرت کے مظاہرکوعیاں کردیاہے۔

قرآنی آیات کی ایک ایک جگہ پراس کا تعارف کرایاگیاہے اوراس کی نشانیاں آفاق وانفس میں دکھائی ہیں جن کے دیدار کیلئے دیکھنے کی دوآنکھیں،سننے کے دوکان اور بیداردل کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان اچھی طرح اس کے جلووں کودیکھ سکے،اس کے توحیدی نغموں کوسن سکے،اس خوب خوباں کواپنے دل کی سراء میں دعوت دے سکے،اس انس کی خلوت گاہ میں جوخدا کاایک عرش عظیم ہے اس کی خاطرتواضع کر سکےاورایک روحانی جذبہ کے ساتھ اسے مخاطب کرکےان اشعارکاوردشروع کردے۔

اے جلوگراز ہردرودیوار توئی تو
ظلمت بوداین عالم وانوار توئی تو
بی خارنباشدگلی اندرہم عالم
درگلشن ہستی گل بے خارتوئی تو
ازعشقِ توبلبل کنداین نغمہ سرائی

---

[1] ''طبرانی''منقول ازتفسیر''فی ظلال القرآن'' جلد ۴ ص ۵۷

چون حسن گل ونگہت گلزار توئی تو
عالم از تو ظاہر شداز علوی وسفلی
برہر دوجہان جملہ نگہدار توئی تو
نورتو بودجلوہ گراندار ہمہ اشیاء
ہرلحظہ بہ صد جلوہ نمودار توئی تو

یعنی: اے وہ ذات جو ہر درودیوار سے ظاہر ہے، وہ تو ہی تو ہے، یہ کائنات ایک ظلمت کی حیثیت رکھتی ہے اور تو مجسم نور ہے، اس عالم میں کوئی پھول کانٹوں کے بغیر نہیں ہے۔ اگر گلشن ہستی میں کوئی پھول بغیر کانٹے کے ہے تو وہ صرف تو ہی ہے تیرے ساتھ عشق کی وجہ سے ہی بلبل اس قدر نغمہ سرائی کرتی ہے کیونکہ گل کا حسن اور گلزار کی زینت صرف اور صرف تو ہے۔ تیری ہی ذات سے علوی وسفلی عالم کا ظہور ہوا۔ دونوں طرح کے جہانوں پر مکمل نگہبانی تجھے ہی حاصل ہے تیرا ہی نور ہر ایک چیز کا جلوہ گر ہے ہر ہر لمحے تو سینکڑوں جلووں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے

خدا ندا! ہمارے دلوں کو اپنے عشق وایمان اور معرفت سے لبریز اور مالا مال فرمادے! پروردگارا! ان تشنہ کاموں کو اپنے صہبائے عرفان کا ایک گھونٹ پلا اور ہمیں اس کے روحانی جذبہ میں تا ابد سرمست رکھ۔

بارالٰہا! تیری پاک ذات کی معرفت کی راہوں کو طے کرنا، تیرے لطف وکرم، عنایت اور توفیق کے بغیر ناممکن ہے۔ ہمیں اپنے عنایات والطاف اور توفیقات میں شامل فرما۔ آمین بارب العالمین

پیامِ قرآن کی دوسری جلد تمام ہوئی
بتاریخ ۱۱۔۴۔۱۳۶۷ ہجری شمسی
مطابق ۱۷۔ذیقعدہ ۱۴۰۸ ہجری قمری

تفسیر موضوعی

جلد سوم

زیرِ نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

علامہ حافظ سید ریاض حسین نجفی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔

فہرست

تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن جلد نمبر 3

عنوان	صفحہ نمبر
معرفتِ خدا کے راستے	16
(۱) برہانِ نظم	17
(۲) برہانِ تغیر وحرکت	18
مفردات کی تشریح	19
تفسیر اور اہم مطالب پر ایک نظر	21
بت پرستوں کے مقابلے میں حضرت ابراہیم کا مضبوط استدلال	21
افول اور حدوث کا باہمی تعلق:	25
توضیحات	29
(۱).....برہان حرکت اور اس کے مقدمات:	29
ا۔حرکت کی تعریف:	29
ب۔حرکت کا وجود	30
ج.....حرکت کے ارکان	30
د.....وہ امور جن میں ''حرکت'' واقع ہوتی ہے	30
جوہر میں پائی جانے والی حرکت کے دلائل	31
(۲) برہان حرکت کے ذریعے وجودِ خدا کی پہچان:	33
(۳) تمام جہان متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہے	35
(۴) عصر حاضر کے علمی قوانین اور جہان کا حادث ہونا	36
(۳) برہان وجوب وامکان (غنیٰ وفقیر)	38
الفاظ کی تشریح	39
آیات کی تفسیر اور اہم مطالب کا ذکر	40
سب اسی کے محتاج ہیں:	40
توضیحات	44
(۱)۔برہان وجوب وامکان فلسفی نقطۂ نظر سے:	44
(۲) اسلامی روایات میں دلیل غنیٰ وفقر کا ذکر:	46
برہان علت ومعلول	48
الفاظ کی تشریح:	49
تفسیر آیات	50
ایک عجیب سوال:	50
توضیحات	53
برہان علت ومعلول فلسفہ وعلم کلام میں	53
(۱) قانون علیت کی تعریف:	53
(۳) قانون علیت کی وسعت وکارگزاری:	53
(۳) قانون علیت کی شناخت کا سرچشمہ:	54

عنوان	صفحہ نمبر
(۴) علت کی قسمیں:	55
برہان علیت کی وضاحت:	56
(۴) برہان صدیقین	58
مفردات کی تشریح:	59
تفسیر اور آیات کے مطالب پر ایک نظر	61
قرآن اور برہان صدیقین	61
سورج اپنے وجود کی دلیل بن کر آیا:	62
خدا کا احاطہ وجودی:	63
ابتداء بھی تو اور انتہاء بھی تو:	64
وہ کائنات کو روشنی دینے والا ہے:	65
توضیحات	68
(۱) اسلامی حدیثوں اور دعاؤں میں برہان صدیقین	68
(۲) توضیح برہان صدیقین	70
خدا کی پہچان کا باطنی راستہ فطری خداشناسی	72
مفردات کی تشریح:	75
جمع آوری آیات وتفسیر	76
خلقت ثابت و پائیدار	76
جب طوفان حوادث کا شکار ہوتے ہیں:	77
وہ لوگ بھی اعتراف کرتے ہیں:	80
عالم ذر میں عہد و پیمان:	82
(۱) محدثین واہلِ ظاہر کا مسلک	83
(۲) عالم ذر	83
۳۔ عالم ذر سے مراد عالم ارواح ہے	84
۴۔ سوال وجواب بوسیلہ پیغمبران:	84
(۵) یہ سوال وجواب بزبان حال ہوا	84
(۶) المیزان میں منقول تفسیر	85
قول اوّل:	86
قول دوم	87
قولِ سوم:	87
قول چہارم:	87
قول پنجم	88
قول ششم	88
عالم ذر کی بحث کا نتیجہ:	88
توضیحات	89
(۱) اسلامی روایات میں عالمِ ذر''	89
۲۔ کونسی فطرت؟ فطرت عقل یا قلب	91
ایمان بہ خدا کے فطری ہونے کی زندہ دلیلیں:	92
تاریخی واقعات:	92
(۲) آثار قدیمہ کے شواہد:	93
(۳) ماہرین نفسیات کے مطالعات واکتشافات:	93
(۴) مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کی ناکامی:	94

عنوان	صفحہ نمبر
۵۔شدید زندگی میں شخصی تجربے:	95
۶۔فطرت مذہبی پر دانشوروں کی گواہی:	96
(۴) اسلامی روایات میں فطرت کا ذکر	98
ذاتِ خدا کی یکتائی معرفتِ خدا میں اہم ترین اصل	100
مفردات کی تشریح:	104
جمع آوری آیات اور تفسیر	105
گناہِ ناقابل بخشش	105
سب سے بڑا ظلم:	107
خوفناک سقوط:	108
مشرکین پر بہشت حرام ہے:	109
اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بیزار ہے:	109
شرک کا مقابلہ کرنا حضرت ابراہیمؑ سے سیکھیں:	112
توضیحات	113
مسئلہ توحید وشرک کی اتنی اہمیت کیوں؟	113
دلائل توحید	115
(۱) توحیدِ خدا پر فطرت کی گواہی	116
تفسیر آیات	118
نور توحید کی روشنی:	118
تمام شدائد اور سختیوں میں اس کی پناہ لیتے ہو:	119
امواج ظلمت میں نور درخشاں:	121
موجوداتِ جہاں کا باہمی ارتباط وہم آہنگی	123
مفردات کی تشریح:	124
آیات کی جمع آوری وتفسیر	125
اگر دنیا میں دو خدا ہوتے:	126
توضیحات	128
(۱)۔علوم کی رو سے آفرینش جہان کی وحدت:	128
(۲) برہان تمانع کی ایک وضاحت	129
دو سوالوں کا جواب:	129
جواب:	130
توضیح:	130
اسلامی روایات اور برہان وحدت وتمانع:	131
۳۔دلیل صرف الوجود	133
آیات کی جمع آوری وتفسیر	134
خود خدا اپنی ذات کی وحدت کا گواہ ہے:	134
وہی ہے اوّل وآخر، ظاہر باطن:	135
توضیحات	137
(۱) خدا ایک لامتناہی حقیقت اور غیر محدود ہے:	137
(۲) وجود غیر متناہی ولامحدود یقیناً ایک ہے:	138
(۳) دلیل صرف الوجود اسلامی روایات میں	138
دلیل فیض وہدایت تمام انبیاءؑ نے توحید خدا کی دعوت دی	140
آیات کی جمع آوری وتفسیر	141
خدائے واحد کی طرف سے پیغمبروں کی عمومی دعوت	141
کیا شرک کے حق میں کوئی دلیل ہے؟	142

عنوان	صفحہ نمبر
توضیحات	143
فیض وہدایت اسلامی روایات میں	143
(۵) برہان ترکب	144
توحید اور الدلہ ءنقلی:	145
شِرک کے اہم سرچشمے شرک کا پہلا سرچشمہ اوہام کی پیروی	146
مفردات کی تشریح:	148
آیات کی جمع آوری وتفسیر	149
وادی اوہام میں جا پڑنا:	149
نامہائے بے اصل:	150
اندازہ وتخمینہ پر بھروسہ	151
شرک کا دوسرا سرچشمہ، حسی میلان ورغبت	155
آیات کی جمع آوری وتفسیر	157
ہم خدا کو کیوں نہیں دیکھ سکتے:	157
یہی سوال حضرت موسیٰ سے کیا گیا:	158
مجھے آسمان پر جانے دو کہ خدا کو دیکھوں:	158
وہ منتظر ہیں کہ خدا ان کے پاس آئے:	160
توضیحات	161
صرف عالمِ محسوسات ہی پر کیوں تکیہ کرتے ہیں؟	161
شرک کا تیسرا سرچشمہ خیالی فوائد ومنافع	163
مفردات کی تشریح:	164
آیات کی جمع آوری وتفسیر	165

عنوان	صفحہ نمبر
بت ہمارے شفیع ہیں:	165
توضیحات	166
ا۔مفروضہ شفاعت کا سرچشمہ	166
۲۔عربوں میں بت پرستی کا رواج	168
(۳).....شرک وبت پرستی کے دیگر عوامل	169
شرک کا چوتھا اور پانچواں سرچشمہ تقلید واستعمار	170
مفردات کی تشریح:	172
آیات کی جمع آوری وتفسیر	172
بت پرستی ہمارے اسلاف کا دستور ہے:	172
بت پرست ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے رہے:	175
توضیحات	177
(۱) تقلید، اقوام کی ترقی یا انحطاط کا عامل:	177
(۲).....ہوائے نفس اور شیطانی وسوسے	177
(۳) بت پرستی غلامی اور استعمار کا عامل ہے:	178
(۴)۔عوامل شرک کے متعلق آخری بات:	179
اقسام توحید	182
(۱) توحید ذات (۲) توحید صفات (۳) توحید عبادت (۴) توحید افعال	182
توحید کی بنیادی اقسام:	182
توحید ذات وصفات	184
آیات کی جمع آوری وتفسیر	185
اے وہ ذاتِ جو وہم وخیال سے بلند تر ہے:	185

عنوان	صفحہ نمبر
توضیحات	190
(۱) توحید ذات کا گہرا مفہوم:	190
(۲) توحید صفات کا مفہوم:	190
(۳) توحید صفات کی دلیل:	191
توحید در عبادت	193
مفردات کی تشریح:	196
آیات کی جمع آوری تفسیر	197
معبود فقط وہی ہے:	197
میں غیر خدا کی پرستش نہیں کرتا:	199
جس جگہ خدا کی عبادت نہ کرسکوں وہاں سے ہجرت کر جاؤ:	201
توضیحات	205
(۱) توحید عبادت کا شجر میوہ دار:	205
۲۔رُوح عبادت اور افراط وتفریط سے پرہیز:	206
(۳).....وہابیوں کی شرک آلود توحید:	208
توضیح:	209
۴۔توحید افعالی (۱).....توحید خالقیت	212
مفردات کی تشریح:	213
آیات کی جمع آوری وتفسیر	214
وہ عرش کا مالک ہے:	214
بُت پرست بھی خدا کو خالق جہان مانتے ہیں:	216
توضیحات	218

عنوان	صفحہ نمبر
(۱) شرک در خالقیت کی طرف پہلا قدم:	218
(۲) راہِ شرک میں دوسرا قدم:	219
اشاعرہ:	220
معتزلہ:	220
(۲) توحید ربوبیت	223
مفردات کی تشریح:	224
آیات کی جمع آوری وتفسیر	226
اے خدا.....تو سارے جہان کا پروردگار ہے	226
خدا ہی مدبر امور ہے:	229
توضیحات	231
(۱) توحید یعنی درمیانی واسطوں کو حذف کرنا:	231
(۲) تاریخ مذاہب اور بے اصل واسطے:	232
(۱)۔ رومیوں کے خدا:	232
(۲) یونانیوں کے خدا:	232
(۳) مصریوں کے خدا:	233
(۴) ایرانیوں کے خدا:	233
(۵) چینیوں کے خدا:	234
(۶) عرب کے بُت پرست:	234
(۷) مختلف ممالک کے خدا:	235
(۸) مثل افلاطونی پر اعتقاد:	235
(۳) تفویض بھی شرک ہے:	236

عنوان	صفحہ نمبر
(۴)ایک سوال کا جواب: کیا فرستے مدبر امر ہیں؟	237
(۵) احادیث اسلامی اور توحید ربوبیت:	238
(۳)توحیدِ مالکیت وحاکمیت تکوینی	240
مفردات کی تشریح:	242
آیات کی جمع آوری وتفسیر	242
یااللہ! تو ہی مالک الملک ہے:	242
توضیحات	246
(۱) توحید مالکیت وحاکمیت پر ایمان کے تربیتی اثرات:	246
(۲) خدائی مالکیت سے غلط استفادہ:	247
(۴)توحید قانُون گذار یحاکمیت تشریعی	249
مفردات کی تشریح:	251
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	252
حکم بس اللہ ہی کا ہے:	254
اپنے اختلافات میں خداوند پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرو:	255
توضیحات	258
(۱) خدائی حاکمّیت عقل کی روشنی میں:	258
(۲) حکومت ایک امانتِ خداوندی ہے:	259
(۳)حکومت کی تشکیل صرف خدا کی طرف سے ہے	259
(۴)توحید حاکمیت پر ایمان رکھنے کے اخلاقی اثرات	261
(۵)توحید اطاعت	262
مفردات کی تشریح:	264
آیات کی جمع آوری وتفسیر	265
خداوند! ہم صرف تیرے فرمان کے مطیع ہیں:	265
عالموں اور رہبروں کی پرستش نہ کرو:	268
توضیحات	270
(۱) مطاعِ مطلق صرف خدا ہے	270
(۲) توحید اطاعت اور احادیث:	271

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اہداء

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زُلال سے زیادہ آب حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

ابتدائیہ

اللہ کی طرف.....راستے

جیسا کہ آغاز کتاب میں ذکر ہوا۔ ہر دل میں خدا کی طرف ایک راستہ کھلا ہے! اور ہر انسان کی روح کا پرندہ اس کے گیت گا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسانی نفوس کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں اور ہر شخص اس بارے میں ایک خاص قسم کا شعور اور ادراک رکھتا ہے۔ تاہم اپنی اپنی نظر کے باوجود سب کی جہت ایک اور پورا کاروان ہستی اسی کی طرف رواں دواں ہے۔ اس کی ذات وصفات کے عرفان کا شگوفہ ہر دل کی گہرائی میں مہکتا ہے اور ہر انسان کے باغِ دل میں معرفت خدا کا پھول کھلا ہوا ہے۔

انسانی دل کی 'وادیٔ ایمن' سے ''اِنّی انا اللہ'' کا آوازہ ہمیشہ سنائی دیتا ہے اور وہ انسانی نفوس کے موسیٰ کو اپنی طرف دعوت دے رہا ہے۔ وہ ''فاخلع نعلیك انك بالوادالمقدس طوٰی'' کے فرمان سے انسانوں کو ہدایت دے رہا ہے، کہ وہ نہایت احتیاط اور خضوع وخشوع کے ساتھ اس مقدس و پاکیزہ وادی میں قدم رکھیں۔

جناب مریمؑ کی طرح ''وھزی الیك بجذع النخلة'' کے حکم سے سب بنی آدم کو یہ تاکید کی جا رہی ہے کہ شجر توحید کی شاخوں کو ہلا کر ایمان معرفت کے ثمر ہائے شیریں حاصل کریں۔ وہ وقت کے نمرودیوں کی آتش شرک کے شعلوں سے ہراساں نہ ہوں اور ابراہیمؑ کی طرح پورے اطمینان کے ساتھ اس میں کود پڑیں تا کہ شرک کے شعلوں کو ٹھنڈا کر کے انہیں گلستان توحید میں بدل دیں۔ نوحؑ کی طرح معرفت الٰہی کی نجات بخش کشتی پر سوار ہوں اور جو اس کے غیر کی بات کرتا ہے اس کے علاوہ کسی اور کی طرف دعوت دیتا ہے۔ خواہ وہ کوئی کنعان ہی کیوں نہ ہو۔ اسے طوفان میں غرق کر دیں۔ ہر سامری کا سر پوری قوت سے کچل دیں اس کے چمکتے دمکتے طلائی بت کو اپنے جذبہ صادق کی آگ میں جلا دیں جو دنیا پرستوں اور تشنہ ثروت میں بدمست لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔

ہاں.....انبیاء الٰہی نے اپنی ''ظاہری'' تبلیغ میں.....معرفت خدا کے حصول کا.....جو فریضہ انجام دیا۔ ان کی راہ پر چلنے والے منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے وہی کام اپنے ''باطن'' میں انجام دیتے رہے بالآخر انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کی حیات بخش

ندائے حق وحقیقت اورصدائے سعادت وخوش بختی .....قولولا الٰہ اللہ تفلحوا... پرلبیک کہہ کرانہوں نے اپنے وجود کے ہرجز یہاں تک کہ شہ رگ اورشریانوں میں بھی اس حیات آفریں اورروح پرورندا کوجگہ دی اورفلاح وکامیابی کے بلند مقامات تک پہنچ گئے۔

اس طرح ان لوگوں نے اس الٰہی سفرِ سعادت .....سیر وسلوک ..... کی بدولت سرائے طبیعت سے نکل کرکوئے حقیقت اورمقامِ قرب الٰہی کی راہ پالی۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس راہ میں بڑے نشیب وفراز اور پیچ وخم ہیں اس کی ہرگز رگاہ میں شیاطین جن وانس گھات لگائے بیٹھے ہیں جواپنی ملمع سازیوں اورفریب کاریوں سے رہروان راہِ حقیقت کومنحرف کرنے میں کوشاں ہیں۔وہ اس لیے کہ ان کے پیشوا ابلیس نے ابتداء ہی سے اولاد آدم کوگمراہ کرنے کی قسم کھالی اورجس طرح وہ خودراندہ درگاہ الٰہی ہوا..... چاہتا ہے کہ ان سب کوبھی اپنا ہمدم اورہمرنگ بنالے۔

لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنے والے بد باطن افراد اپنے مکروہ چہرے چھپا کر.....عرب کے آوارہ منش اور بدکردار اشخاص کی طرح دکھاوے کیلئے چندیوم صحیح راستے پر چلتے ہیں۔جب ایک گروہ کواپنا ہم نوا بنالیتے ہیں تو''صراطِ مستقیم '' سے منحرف ہو جاتے ہیں اوراپنے ساتھ والوں کو''ضالین''.....گمراہوں.....اور''مغضوب علیہم''.....خدا کے غضب کا شکار ہونے والوں.....کی ہولناک اوروحشت آوروادی میں دھکیل دیتے ہیں۔

اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

اورنجات کا راستہ کہاں ہے؟

کیا ہم اپنے عقلی قوت کا سہارا لے کراس .....نہایت دشوار گزار ..... راستے کو طے کرسکتے ہیں؟اگرچہ عقل ،خداداد وسیلوں میں ایک وسیلہ اورانوار الٰہی میں سے ایک نور ہے!..... یاہمیں چاہیے کہ وحی کے رہوار پرسوار ہوکر آسمانِ معرفت کی طرف پرواز کرجائیں اورچراغ محدود کی روشنی سے آگے نکل کرتابندہ سورج کی جانب ہاتھ بڑھائیں کہ اسی ..... خدا..... سے مدد طلب کرتے ہوئے اس تک پہنچیں اوراسی ذات کواس پر دلیل قرار دیں؟ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث میں وارد ہوا ہے۔

من ابتغی العلم فی غیر القرآن اضلہ اللہ

''جوشخص قرآن کے علاوہ کسی سے علم وہدایت حاصل کرنا چاہےتو خدااسے گمراہی کے راستے پرڈال دے گا۔''

کیااس کا غیر،اس کی حقیقی معرفت رکھتاہے تاکہ وہ دوسروں کوبھی اس سے بہرہ مند کرسکے..... ہرگزنہیں:

ہماری یہ کتاب.....تفسیر موضوعی، پیام قرآن.....کی تفسیر جلد، درحقیقت حق کی پہچان کے سلسلے کی ایک کوشش ہے اوراس کتاب کا مقصد معرفت الٰہی کے حصول کی راہ میں گوناگوں ذریعوں سے استفادہ کرنا ہے۔اس ضمن میں ہم اپنے دلائل کی پختگی کے لئے آیات وحی کا سہارالیں گے اورمختلف آیات قرآنی سے رہنمائی حاصل کریں گے عقلی فیصلے کی تائید میں احادیث وروایات بھی پیش کریں گے۔

ناصرمکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم.....محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی

۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی

۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی

۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی

۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی

۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی

کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِہٖ

مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاہِرِیۡنَ، لَا سَیَّمَا

الۡاِمَامِ الۡمَہۡدِیِّ الۡمُنۡتَظَرِ، اَرۡوَاحُنَا فِدَاہُ۔

معرفتِ خدا کے راستے

اگرچہ معرفت کردگار کے راستے محدُود نہیں، بلکہ بعض صاحبانِ علم وفہم کے بقول معرفتِ خدا کے راستے مخلوق کی تعداد کے برابر ہیں۔

"الطرق الی اللہ بعدد نفوس الخلائق۔"[1]

''خدا کی معرفت اور پہچان کے راستے مخلوق کی تعداد کے برابر ہیں۔''

البتہ خدا کی مقدس ذات کے اثبات کے لیے بنیادی طور پر پانچ عقلی اور ایک فطری راستہ ہے۔

معرفتِ خدا کے عقلی راستے (دلیلیں) یہ ہیں۔

۱۔ برہانِ نظم

۲۔ برہانِ حرکت

۳۔ برہان وجُوب وامکان (غنیٰ وفقر)

۴۔ برہانِ عِلّت ومعلول

۵۔ برہانِ صدیقین

معرفتِ خدا کا چھٹا راستہ (دلیل) فطرت، عالم باطن کا مطالعہ اور انسانی رُوح کی گہرائیوں میں خدا کی تلاش ہے!

---

[1] بعض اہلِ دانش نے اس جملے کو یوں ذکر کیا ہے: الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق، یعنی انسان کے ہر سانس میں خدا کی معرفت کا راستہ ہے، بہرحال یہ جملہ حدیث کے طور پر کسی مستند کتاب میں نہیں مل سکا۔ بلکہ یہ ارباب علم ودانش ہی کا قول ہے۔

(۱) برہانِ نظم

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے ان براہین سے کام لیا ہے، لیکن ان سب میں وسیع ترین برہان کہ جسے قرآن نے مخالفین کے سامنے پیش کیا ہے، وہ ''برہانِ نظم'' ہے۔ یہ دلیل و برہان اس لازوال سرچشمۂ فیض کے وجود اور اس کے علم وقدرت کو تخلیق کائنات کے عظیم شاہکاروں، جہانِ ہستی کے عجائبات اور اس کے دلچسپ نظام کے ذریعے ثابت کرتی ہے۔ اس دلیل (یعنی برہانِ نظم) کی وسعت و ہمہ گیری کی وجہ سے.....تفسیر موضوعی، پیامِ قرآن.....کی دوسری جلد اس برہانِ نظم کے بیان اور اس کے جملہ پہلوؤں کے ذکر کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔

اب ہم وجودِ خداوند متعال کے اثبات سے متعلق دیگر آیاتِ قرآن کا ذکر کرتے ہیں اور پھر قرآنی ہدایت و رہنمائی کی روشنی میں ''فطرت'' کے بارے میں بحث کریں گے۔

مذکورۂ بالا مطالب..... پیامِ قرآن.....کی زیرنظر تیسری جلد کے مباحث کی ایک اجمالی تصویر ہے۔

تاکید و تکرار کے طور پر ہم ایک بار پھر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا مسائل نہ فلسفی بحثوں کی طرح اور نہ ہی اعتقادی و کلامی بحثوں کی صورت میں پیش کیے جائیں گے۔ بلکہ اس کتاب کے عنوان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر بحث ''تفسیر موضوعی'' کی شکل میں ہوگی، یعنی ہر مقام پر ہمارا سفرِ بحث آیاتِ قرآن کے سائے میں ہوگا اور ہم خدا کے اس نور سے بھرپور استفادہ کریں گے۔ اگر ہم کچھ دوسرے مطالب کا بھی ذکر کریں تو وہ علیحدہ عنوان.....توضیحات..... کے تحت ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ ان تمام بحثوں کا مقتضائے طبع کچھ اور نہیں ہے.....یعنی اگر ہم اس روش کو نہ اپنائیں تو ''تفسیر'' کے دائرے سے نکل جائیں گے۔

(۲) برہانِ تغیر وحرکت

اشارہ

جس دنیا میں ہم زندگی گزار رہے ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ معرضِ تغیر وتبدل میں ہے، یہاں کوئی چیز ایک حال پر نہیں رہتی بلکہ تمام موجودات شاہراہِ تغیر پر گامزن ہیں۔ ایسے عالم میں انسانوں، حیوانوں اور درختوں کی زندگی کا تغیر وتبدل وجنبش وحرکت کے ساتھ آمیختہ ہونا اس قدر واضح ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے وجود میں یا مادی دنیا کی دوسری موجودات میں اس تغیر وتبدل کا انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ انسان شب وروز اس تغیر وتبدل کے مختلف پہلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے، بلکہ آنے جانے والی یہی دو چیزیں یعنی دن اور رات.....اس دنیا کے تغیر وتبدل کی نہایت واضح اور روشن مثالیں ہیں۔

یہ تغیر وتبدل اور تحرک جو کائنات کے ظاہر و باطن پر حکم فرما ہے، اس حقیقت کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے کہ اس جہان میں ایک ایسا ''ثابت'' اور مضبوط واحد مرکز موجود ہے جو ان تمام تغیرات وتحرکات کا سرچشمہ ہے اور سب پرکار کی طرح اس کے گرد گھومتے ہیں۔

اصولی طور پر یہ بات ناقابل انکار ہے کہ موجودات میں تغیر وتبدل اور حرکات وتحرک کا پایا جانا ان کے ''حادث'' اور نو پید ہونے کی دلیل ہے۔ ان کا حدوث اور نو پید ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا کوئی خالق ہے، جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ خدا کے وجود پر دلیل قائم کرنے کا یہ اسلوب (جس کی وضاحت آنے والی بحثوں میں کی جائے گی) ایک خاص سادگی کے ساتھ قرآنی آیات میں اپنایا گیا ہے۔

اس اشارے کے بعد اب ہم دوبارہ قرآن کی طرف رُخ کرتے ہیں اور درج ذیل آیات پر بھرپور طریقے سے غور کرتے ہیں۔

۱۔ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۷۵ ﴿الأنعام: ۷۵﴾

۲۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا١ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ١ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ۷۶ ﴿الأنعام: ۷۶﴾

۳۔ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ١ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ۷۷ ﴿الأنعام: ۷۷﴾

۴۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ١ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۷۸ ﴿الأنعام: ۷۸﴾

۵۔ اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿الأنعام: ۷۹﴾

۱۔ اس طرح ہم نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھائے تاکہ وہ اہلِ یقین میں سے ہوجائے۔

۲۔ جب رات.....کی تاریکی.....اس پر چھا گئی تو اس نے ایک ستارے کو دیکھا تو کہا۔ یہ میرا رب ہے، لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو کہا کہ میں غروب ہوجانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۳۔ اور جب اس نے چاند کو دیکھا کہ وہ سینۂ افق کو چیر کر نکلا ہے.....تو اس نے کہا، یہ میرا پروردگار ہے، لیکن جب وہ بھی غروب ہوگیا، تو کہا، کہ اگر میرا (حقیقی) رب میری ہدایت ورہنمائی نہ کرے تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہوجاؤں گا۔

۴۔ پھر جب اس نے سورج کو دیکھا کہ وہ سرخیٔ افق سے ابھرا اور اپنی خاص چمک دمک کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے تو کہا، یہ میرا رب ہے کہ یہ تو سب سے بڑا ہے، مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا تو کہا کہ اے لوگو! میں ان شریکوں سے بہت ہی بیزار ہوں جنہیں تم خدا کے لیے قرار دیتے ہو۔

۵۔ میں نے تو اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کرلیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، میں اپنے ایمان میں مخلص ہوں اور میں شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں ہوں۔

مفردات کی تشریح

۱۔ ''اَفَلَ'' اور اَفَلَتْ'' کا مادہ ''افول'' ہے، اہلِ لغت میں سے چند ماہرین کہتے ہیں کہ اس کے معنی ''پوشیدہ ہونا ہے، لیکن راغب اصفہانی نے ''المفردات'' میں زیادہ باریکی سے کام لیتے ہوئے کہا ہے:

''افول'' کا معنیٰ نورانی اجسام مثلاً سورج، چاند وغیرہ کا پوشیدہ ہونا ہے، صحیح بات وہی ہے جو راغب اصفہانی نے کہی ہے۔ کیونکہ جب بھی ''افول'' کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کا یہی مطلب (نورانی اجسام کا غروب ہونا) سمجھا جاتا ہے، البتہ بعض مقامات میں کنایہ کے طور پر دوسری چیزوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کسی بزرگ عالم کی وفات کو ''افول'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یوں حقیقت میں اس عالم کو سورج یا ستارے کے ساتھ تشبیہ دے کر ''افول'' کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے، ''افول'' یا غروب ہونے کے

الفاظ کا یہ استعمال صحیح ہے۔

۲۔ ''بازغ'' اور ''بازغۃ'' کا مادہ ''بزوغ'' ہے، جس کا معنی طلوع اور نور کا پھیلاؤ ہے، کتاب ''المفردات'' میں راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ ''بزوغ'' اصل میں علاج کی غرض سے خون حیوان جاری کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن بعد میں اسے ''طلوع'' کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔

لغت کی مشہور کتاب ''لسان العرب'' میں ابن منظور نے لکھا ہے کہ لفظ ''بزوغ'' اصل میں ''چیرنے'' کے معنیٰ میں آتا ہے، لیکن بعد میں اسے انسان یا حیوان کی رگوں کو علاج کی غرض سے چیرنے اور شگافتہ کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، چونکہ طلوعِ فجر وغیرہ بھی تاریکی شب کے پردے کو چاک کرتا ہے، اس لیے وہاں بھی یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ (اس استعمال کی باریکی پر غور کیجئے)۔

۳۔ ''کوکب'' کا مادہ ''وَکَبَ'' یا ''کَوَبَ'' ہے۔ اکثر اہلِ لغت نے اسے ''ستارہ'' کے معنی میں استعمال کیا ہے لیکن راغب نے ''المفردات'' میں اسے ''ستارہ بوقت طلوع'' کے لیے ذکر کیا ہے۔ بعض اربابِ دانش نے اس سے خاص طور پر ستارۂ زہرہ مراد لیا ہے، اس لیے کہ وہی اس کا واضح مصداق ہے، کیونکہ زہرہ ایسا ستارہ ہے جو تمام آسمانی ستاروں میں سب سے زیادہ درخشندہ اور روشن ہے۔

لفظ ''کوکب'' کبھی خوبصورت اور نوجوان افراد کے لیے یا کسی چیز کے نہایت اہم حصے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی گروہ کے سربراہ اور بزرگ شخصیت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، لیکن یہ سب استعمالات مجازی ہیں۔

۴۔ ''قمر'' اگرچہ عام طور پر چاند کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس مقام پر ایک خاص نکتہ ملحوظ رہے کہ بہت سے اہل لغت نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ لفظ ''قمر'' ہر مہینے کی تیسری رات سے پانچویں رات تک کے چاند کو کہتے ہیں۔ لہٰذا پہلی دو راتوں اور آخری دو راتوں کے چاند کو ''قمر'' نہیں کہا جاتا بلکہ ''ہلال'' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اہل لغت ''قمر'' اور ''قمار'' کو ایک ہی اصل سے سمجھتے ہیں اور معنی ہے ''غلبہ کرنا'' چھا جانا۔۔۔ چونکہ چاند کی روشنی تیسری رات کے بعد دوسرے ستاروں پر غالب آتی ہے۔ لہٰذا لفظ ''قمر'' اس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ [1]

۵۔ ''شمس'' اگرچہ اس لفظ کا مشہور عام معنی سورج ہے، لیکن اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں قرص آفتاب کو ''شمس'' کہتے ہیں اور اس سے پھوٹنے والی روشنی کو بھی شمس کہتے ہیں۔ چونکہ سورج آسمان میں ایک جگہ ثابت و قائم نہیں بلکہ متحرک ہے اور (اہل زمین کی نظر میں) ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ اس لیے یہ لفظ ان افراد اور حیوانات کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو ایک جگہ نہیں ٹھہرتے بلکہ ہمیشہ متحرک رہتے ہیں۔ چنانچہ سرکش اور منہ زور جانوروں کو ''شموس'' کہا جاتا ہے۔

---

[1] لسان العرب، مفردات، راغب، کتاب العین

تفسیر اور اہم مطالب پر ایک نظر

بت پرستوں کے مقابلے میں حضرت ابراہیم کا مضبوط استدلال

پہلی آیت میں ابراہیمؑ کو آسمان وزمین کے ملکوت دکھانے کا تذکرہ ہے کہ ان کے مشاہدے سے ان کی روحِ یقین کو زندگی ملے اور ان کے فطری ایمان میں تازگی آجائے۔

اس سلسلے میں خداوند عالم کا فرمان ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۷۵﴿الأنعام: ۷۵﴾[1]

''اور اسی طرح ہم نے دکھائے ہیں ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت، تاکہ وہ اہل یقین میں سے قرار پائیں۔

آسمانوں اور زمین کے ملکوت کا مشاہدہ کروانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس جہان مادی کی تغیر پذیر موجودات کو دیکھ کر کائنات ہستی پر خدا کی حاکمیت کا نظارہ کرلیں۔ کیونکہ ''ملکوت'' عربی زبان میں ''ملک'' سے ہے جس کا معنیٰ حکمرانی اور مالک ہونا ہے الفاظ میں ''وت'' کا اضافہ تاکید کے لیے ہے۔

کائنات پر خدا کی حاکمیت مطلقہ اور مالکیت مسلمہ کا تذکرہ بعد والی آیات میں ہوا ہے۔ درحقیقت ان آیات میں اجمالی اور تفصیلی دونوں طرح سے مطالب کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز اہم مطالب کے بیان وتشریح میں قرآنی روش یہی ہے کہ پہلے اجمالی طور پر بات ہوتی ہے تاکہ سننے والا تفصیلی بیان کے گوش برآواز ہوجائے۔ اس کے بعد کسی مطلب کی تشریح وضاحت کی جاتی ہے چنانچہ ''فلما'' کے لفظ میں ''ف''..... کہ جو تفریع کے لیے ہے..... اسی قرآنی طریقے اور روش کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے۔

بہرحال بعد والی آیت میں اس اجمال کا تفصیل بیان موجود ہے..... اسی قرآنی طریقے اور روش کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے۔

بہرحال بعد والی آیت میں اس اجمال کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ سب سے پہلے ستاروں کا تذکرہ ہے اور ستارہ پرستوں کے مذہب ونظریے کی نفی وتردید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے استدلال کا اس طرح سے ذکر کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ ﴿الأنعام: ۷۶﴾

---

[1] بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں تشبیہ (اسی طرح) کا مقصد یہ ہے کہ اسے ہمارے نبی (محمدؐ) جس طرح سے آپ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت دکھائے گئے اسی طرح ابراہیم کو بھی دکھائے گئے، (گویا اس آیت میں ایک جملہ مقدور پوشیدہ ہے، یعنی جس طرح سے)

''جب رات۔کی تاریکی۔اس پر چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے۔''

اس آیت میں ''راکوکباً'' (ستارہ دیکھا) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ (کوکب) سے مراد نہایت روشن ستارہ ہے کہ جس نے ابراہیمؑ کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ورنہ رات کے وقت تو ان گنت ستارے اپنا جلوہ دکھا رہے ہوتے ہیں۔ان سب میں سے کسی ایک کا خصوصی طور پر مشاہدہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں ایک خاص ستارہ مقصود ہے۔اس تائید کے لیے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ''زہرہ'' ابتداءشب میں طلوع ہوتا ہے اور ''کوکب'' کا لفظ ''ستارہ بوقت طلوع'' کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس سے اکثر مفسرین کرام کے نظریات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ اس ستارے سے مراد ''زہرہ'' یا ''مشتری'' ہے اتفاق کی بات یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں ان دو ستاروں کو بھی خدا تصور کیا جاتا تھا۔اور لوگ ان کی پوجا کرتے تھے۔جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ جس ستارے کی طرف اشارہ کرکے حضرت ابرہیمؑ نے اس کے خدا ہونے کی بات کی.....وہ ستارۂ زہرہ تھا۔

بہرحال تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ ستارہ غروب ہوگیا۔اس وقت حضرت ابرہیمؑ نے کہا.....جو چیز غروب ہوجائے میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا،(عبادت کے قابل نہیں سمجھتا)۔

قرآن نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿الأنعام:٧٦﴾

دوسری مرتبہ ابراہیمؑ چاند کی طرف متوجہ ہوئے کہ جو پردہ افق سے نکل کر روشنی بکھیرنے لگا تھا اور اپنے خوبصورت اور دل کش نور سے آسمان وزمین کو منور کررہا تھا.....اسے دیکھ کر ابراہیمؑ نے کہا یہ میرا پروردگار ہے فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ﴿الأنعام:٧٧﴾ ۔

لیکن زیادہ دیر نہ گزری کہ اس کا انجام بھی کوکب (ستارے) جیسا ہوا اس نے افق مغرب میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور آسمان کو ایک بار پھر گھپ اندھیرے ڈال دیا۔ابراہیمؑ جو معبود حقیقی کی تلاش میں تڑپ رہے تھے اور اسے پالینے میں پوری طرح کوشاں تھے،اس وقت انہوں نے کہا: اگر میرا پروردگار میری رہنمائی نہ کرے تو یقینا میں گمراہ لوگوں میں شامل ہوجاؤں گا۔ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿الأنعام:٧٧﴾ ۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اس عمل سے واضح کیا کہ حق تک پہنچنے کے لیے صرف انسان کو اپنی کوشش ہی کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ خدائی توفیق اور مدد بھی شاملِ حال ہوتا کہ انسان گمراہوں کی صف میں مل جانے سے محفوظ رہے۔یہ بات ہر لحاظ سے ناقابل انکار ہے۔کہ خدائی توفیق واعانت صرف انہیں کو حاصل ہوتی ہے جو حق کی طلب سچے دل سے کرتے ہیں۔اور دل وجان سے خدا کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

بالآخر رات ڈھل گئی اور اس نے اپنے تاریک دامن کو سمیٹ کر آسمانی فضا سے فرار کی راہ اختیار کرلی،اچانک سورج نے اپنے چمکتے دمکتے چہرے کو افق مشرق سے ظاہر کیا اور اپنی سنہری کرنوں کو پہاڑوں اور میدانوں پر بکھیر دیا۔قرآن نے اسے یوں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ﴿الأنعام: ۷۸﴾ [1]

''پس جب اس نے چمکتے دمکتے سورج کو دیکھا تو کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے، یہ تو سب سے بڑا ہے۔لیکن جونہی دن ختم ہوا سورج تاریکی شب میں ڈوب گیا اور اس نے اپنے چہرے پر مغرب کی نقاب ڈال لی،تو ابراہیم سے رہا نہ گیا اوہ پکار کر کہنے لگے اے لوگو! جن کو تم پروردگار حقیقی کے ساتھ شریک قرار دیتے ہو میں ان سے بری و بیزار ہوں۔فلما افلت قال یاقوم انی بری مما تشرکون۔

میں ان سب کے غروب ہونے اور مخفی ہوجانے سے اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ یہ سب مخلوق ہیں اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔یہ ایسی مخلوق ہیں جو قوانین خلقت و آفرینش کے سامنے بے بس ہیں اور ہر لحہ تغیر اور افول وغروب کے مقررہ اصول انہیں اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ان کی حالتیں دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اس تمام صورت حال کے پیچھے ایک ایسی عظیم قوت موجود ہے۔جس کے بارے میں افول وغروب کا تصور ہی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس پاک ذات میں کسی قسم کے تغیر وتبدل کی کوئی گنجائش ہے.....پھر فرمایا:.....

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۷۹﴿الأنعام: ۷۹﴾

''میں نے اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کرلیا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں اپنے ایمان وعقیدے میں پختہ اور سچے دل کے ساتھ قائم ہوں اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

اب سوال یہ ہے کہ یہ تینوں واقعات (ستارے، چاند اور سورج کا دیکھنا اور ان کے بارے میں اظہار خیال) ایک ہی رات میں رونما ہوئے یا دو راتوں میں؟؟اس سلسلے میں بعض مفسرین نے ان تینوں واقعات کے ایک ہی رات میں رونما ہونے کو اچھی طرح نہ سمجھنے کے باعث کہا کہ یہ دو راتوں میں رونما ہوئے ہیں جب کہ آیاتِ کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ سب واقعات پے در پے اور ایک ہی رات اور دن میں ہوئے ایسا ہونا ممکن بھی ہے کیونکہ مہینے کے درمیانے حصے (دنوں) میں رات کو پہلی گھڑیوں ہی میں ستارہ زہرہ افق مغرب میں واضح طور پر نظر آتا ہے پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد غروب ہوجاتا ہے۔اس کے بعد چاند اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ افق مشرق سے جلوہ گر ہوتا ہے (آیت میں چاند کے لیے بازغ ''لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بدر کامل یا اس کے نزدیک تھا) ایسے میں جب چاند افق مغرب میں چھپ جاتا ہے تو اس کے تھوڑی دیر بعد سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے لہٰذا یہ تینوں واقعات ایک ہی رات دن میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔

بہرحال یہ بات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی غور طلب بات یہ ہے کہ ابراہیمؑ جیسی عظیم شخصیت علم وعرفان کے بلند مقام پر فائز ہونے

---

[1] اگرچہ لفظ شمس مونث مجازی ہے اور ''ھذا'' کی بجائے ''ھذہ'' کہنا چاہیے۔لیکن عبارت میں مذکر ومونث کی بابت کوئی مشکل درپیش نہیں آتی۔ لہٰذا اس مقام پر ممکن ہے کہ ھذا کا اشارہ ''الموجود'' یا ''المشاھد'' دیکھا جانے والا۔کی طرف ہو۔

کے باوجود۔ جبکہ یہ بھی مسلم امر ہے کہ انبیاء اکرام احبثت سے پہلے ہی عصمت کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ آپ اپنی زبان پر ایسے کلمات لائے کہ جو بظاہر شرک سے بھرے ہوئے ہیں؟

اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جاسکتا ہے۔

(۱) آیات کے ذیل میں ابراہیمؑ کا یہ ارشاد کہ اے لوگو! جن کو تم خدا کے ساتھ شریک قرار دیتے ہو، میں ان سے بری دبیزار ہوں۔ (یاقوم انی بری ممّاتشر کون)۔ اس بات کی دلیل ہے کہ آنجنابؑ مشرکین کے ساتھ بحث وگفتگو اور مناظرے کے ماحول میں تھے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ بابل میں ستارہ، چاند اور سُورج کی پوجا کرنے والے لوگ موجود تھے، اس صورت میں ایک سمجھ دار استاد اور بحث ومباحثہ کا ماہر شخص جو متعصب اور ضدی قسم کے مخالفین کے مقابل ہو تو وہ ان کے اعتقادات کی مخالفت میں کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لیتا مقابل ہو تو وہ ان کے اعتقادات کی مخالفت میں کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ عارضی طور پر ان کے ساتھ چلتا ہے اور ظاہری طور پر ان کا ہمنوا بن کر اپنے مقصد کے حصول کی خاطر قدم قدم آگے بڑھتا ہے اور پھر ان پر غلبہ پالیتا ہے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے اور جو کچھ وہ کہتے تھے ابراہیم نے بھی وہی کیا تا کہ ان کے عقیدے کی غلطی اور کمزوری کو ستارے، چاند اور سُورج کے غروب ہونے کے وقت ظاہر کرسکیں۔ بحث ومباحثہ کا یہ طریقہ نہایت موثر پائیدار اور دل موہ لینے والا ہے۔ لہٰذا اسے کسی صورت میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے بلند مقام ومرتبہ اور توحید ومعرفت میں ان کے پختہ اعتقاد کے منافی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس سلسلے میں ایک روایت بھی موجود ہے۔

مامون الرشید عباسی کو جو ان آیات کو انبیاء کی عصمت کے منافی سمجھتا تھا۔ امام علی رضا علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا..... حضرت ابراہیمؑ کا مقابلہ تین قسم کے مشرکین سے تھا، ایک گروہ ستارۂ زہرہ کی پوجا کرتا تھا۔ دوسرا اگروہ چاند کو اپنا خدا مانتا تھا اور تیسرا اگروہ سورج کو پرستش کرتا تھا لہٰذا ابرہیمؑ نے ان سب کے ساتھ ایسی گفتگو کی جس کا مقصد استفہام واستخبار کے سوا کچھ نہ تھا (انہیں سمجھانا مقصود تھا)[1]

(۲) حضرت ابراہیمؑ نے یہ سب باتیں (ستارے، چاند اور سورج کی خدائی کے) ایک مفروضے کے تحت کی ہیں اور یہ محققین کا عام طریقہ ہے یعنی جب کوئی کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں میں تحقیق کرنے لگتا ہے تو وہ ہر پہلو کو فرض کر کے غور کرتا ہے۔ چنانچہ کوئی شخص کسی بات سے وجدانی دلال اور فطری شواہد کی بنیاد پر آگاہ ہو تو وہ ایک امر سے مطلع تو ہو جاتا ہے لیکن اس کے دل میں اس عقلی دلیل قائم کرنے کا جذبہ موجزن رہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ اسے معلوم ہو چکا ہے۔ اسے عقل کے آئینے میں بھی دیکھ لے۔ لہٰذا وہ اس امر کی بابت ہر طرح کا تصور کرتا ہے۔ ہر پہلو پر غور کرتا ہے۔ اور ہر پہلو کی بنیاد پر تحقیق کرتا ہے۔ پھر اس تحقیق وتدقیق کے نتیجے میں عقلی دلائل مرتب کرلیتا ہے۔ مثلاً جو محقق وجدانی کے طور پر رُوح کی اصل کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ مادی چیز نہیں ہے تاہم وہ اس سلسلے

---

[1] عیون اخبار الرضا (خلاصہ بمطابق تفسیر المیزان جلد ۷ صفحہ ۲۱۴۔

میں عقل دلیل بھی قائم کرنا چاہتا ہے لہٰذا وہ سب سے پہلے یہ فرض کرتا ہے کہ روح ایک مادی چیز اس میں مادہ یا اس میں مادہ کے خواص پائے جاتے ہیں۔ پھر مادہ اور اس کے خواص والوازم کے بارے میں سے ہر ایک (مجرد) حقیقت ہے۔ اسی اصول اور طریقہ تحقیق کے مطابق حضرت ابراہیم بھی توحید اور خدا کی یکتائی کو عقلی و منطقی طور پر ثابت کرنے کے لیے (جب کہ ان کا دل توحید کی پاکیزہ روشنی سے بھرا تھا) مختلف پہلوؤں کو فرض اور تصور کرنے کے طریقے سے کام لیا اور۔ ..... هذا ربی ..... هذا ربی کہتے رہے۔ تاکہ ان (ستارے چاند اور سورج) کے افول وغروب کو بنیاد قرار دے کر ان کے بارے میں خدائی کے اعتقاد کی نفی کر سکیں یہاں تک کہ انہوں نے ''اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ'' کہہ کر عقلی و منطقی طور پر توحید کو ثابت کر[1] د

بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ کہ آپ نے فرمایا: انبیاء کی بعثت سے پہلے لوگ ہدایت کی راہ پر گامزن نہ تھے اگرچہ وہ فطری طور پر توحید سے آشنا تھے۔ لیکن اس فطری حقیقت کی پہچان کرائیں اور ہدایت کی منزل پر فائز کریں۔ (پھر فرمایا) کیا تم نے حضرت ابرہیمؑ کا یہ قول نہیں سنا کہ اگر خدا مجھے ہدایت نہ کرے تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔ یعنی فطری عہد و پیمان کو بھول جاؤں گا (لئین لم یدیهدنی ربی لا کونن من القوم الضالین)[2]

بہرحال آیات کریمہ اور قول امام رضا علیہ السلام کی روشنی میں پہلا جواب زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

افول اور حدوث کا باہمی تعلق:

حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں، چاند اور سُورج کے افول وغروب کے ذریعے ان کی خدائی کی نفی کی اور کہا: اس قسم کے موجودات کا خدا ہونا ہرگز ممکن نہیں اور یہ کائنات کے پروردگار نہیں بن سکتے۔

سوال یہ ہے کہ افول وغروب اور عدمِ الوہیت (خدا نہ ہونے) میں کیا ربط وتعلق ہے؟

اس سوال کا جواب مختلف پہلوؤں سے دیا جاسکتا ہے۔

''افول'' اور غروب تغیر وتبدیلی کی علامت ہے بلکہ یہ خود ایک قسم کی تغیر ہے..... کسی چیز میں تغیر وتبدیلی اس کے ناقص ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ کیونکہ جو چیز ہر لحاظ سے کامل اور ہر پہلو سے مکمل ہو اس میں نہ تو کسی قسم کی تبدیلی اور نہ ہی حرکت کا تصور ہوسکتا ہے۔ (فلسفی اصطلاح میں حرکت کا مطلب ایک حالت سے دوسری حالت اختیار کرنا ہے) اس لیے کہ وہ (کامل) نہ کسی چیز سے محروم ہوتا ہے اور نہ ہی کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود کمال مطلق ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تمام متغیر اور متحرک موجودات ناقص ہیں،

---

[1] ان آیات کی تفسیر میں کئی دیگر احتمالات بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو استفہام انکاری یا استفہام استہزائی پر مبنی تھی۔ چنانچہ تفسیر تبیان اور تفسیر رازی میں کئی ایک احتمالات ذکر کیے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی آیت کے انداز سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ا صفحہ ۷۳۶ حدیث ۱۴۸۔

وہ یا تو کسی کمال سے محروم ہوتے ہیں، یا کسی نئے کمال کے حصول میں کوشاں ہوتے ہیں، بنابریں کوئی ناقص شے واجب الوجود نہیں ہوسکتی۔

(۲) جو چیز افول وغروب رکھتی ہو۔ وہ ہمیشہ حوادث کی زد میں ہوتی ہے، یعنی اس پر نت نئے حوادث عارض ہوسکتے ہیں، جو چیز اس طرح کی ہو وہ قدیم، ازلی اور واجب الوجود نہیں ہوسکتی..... کیونکہ اس سے ''حدوث'' اور ''ازلیت'' کا یک جا ہونا لازم آئے گا کہ جو ممکن نہیں جب کہ حدوث اور ازلیت کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے (غور کریں)

(۳) ہر حرکت کسی محرک کی محتاج ہوتی ہے اگر وہ محرک (حرکت دینے والا) خود متحرک ہو تو پھر کسی اور محرک کی ضرورت ہوگی کہ جو متحرک نہ ہو، اسی طرح محرک کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس محرک کے وجود کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ جس میں مطلقاً حرکت نہ پائی جائے۔

(۴) ہر حرکت اور خاص طور پر افول کی طرف جانے والی حرکت اس بات کی علامت ہے کہ مادی دنیا کی طرف رواں دواں ہے (اس کا ذکر بعد میں ہوگا)..... جو چیز رو بہ فنا ہو وہ ہرگز ابدی نہیں ہوسکتی اور ایسی چیز ازلی بھی نہیں ہوتی، لہٰذا وہ واجب الوجود بھی نہیں ہوسکتی۔

مذکورہ بالا چاروں پہلو حضرت ابراہیمؑ کے استدلال کی بنیاد قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بیانات ان سب کی طرف لطیف اشارہ کے طور پر ہوں۔

فخر الدین رازی نے بعض محققین کا یہ قول نقل کیا ہے: ''حضرت ابراہیمؑ کا استدلال اس قدر بلند پایہ اور جامع ہے کہ اس سے خواص، متوسط اور عوام سبھی استفادہ کرسکتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

خواص (دانش منداور صاحب فکر افراد) ''افول'' سے امکان'' کی حقیقت کو سمجھیں گے..... پھر یہ کہ ہر ممکن الوجود چیز خالق کی محتاج ہوتی ہے، اگر وہ خالق بھی ممکن الوجود ہو تو اس کے لیے کسی اور خالق کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح یہ سلسلہ وہاں تک جا پہنچے گا جہاں ''امکان'' (ممکن الوجود ہونا) نہ پایا جائے جیسا کہ سورۂ نجم کی آیت ۴۲ میں ارشاد ہوا: وان الی ربک المنتھی۔ یعنی آخر کار تیرے پروردگار تک پہنچنا ہے۔''

متوسط طبقہ کے افراد اس استدلال سے اس طرح استفادہ کریں گے کہ ''افول'' اور غروب مطلق حرکت کی نشاندہی کرتا ہے، ہر متحرک حادث ہوتا ہے اور ہر حادث اپنے وجود میں ایک قدیم وازلی ذات کا محتاج ہوتا ہے۔

عوام الناس اس بیان سے یوں استفادہ کریں گے کہ وہ ''افول'' کا معنی ''غروب'' قرار دیں گے اور پھر اس بات کا مشاہدہ کریں گے کہ سُورج اور چاند اور ستارے غروب ہونے کے وقت مدہم پڑ جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ محو ہوجاتے ہیں، پھر ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا، کائنات پر ان کی حکمرانی کا دور ختم ہوجاتا ہے اور جو چیز ایسی ہو وہ الوہیت اور خدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ لہٰذا ابراہیم کے استدلال و بیان میں ''لا اُحِبُ الافلین'' ایسا جامع جملہ ہے کہ جس سے مقربین، اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال..... سبھی استفادہ کرسکتے ہیں، کیونکہ یہ نہایت بلند پایہ اور مکمل دلیل و برہان ہے [1]

---

[1] فخر الدین رازی، تفسیر کبیر جلد ۱۳ صفحہ ۵۲۔

اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے ان ستاروں کے ''طلوع'' کو اپنے استدلال کی بنیاد کیوں قرار نہیں دیا جبکہ طلوع وغروب دونوں ہی حرکت کے زمرے میں آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ''زوال وفنا'' نیستی ونابودی اور فیض وبرکت کا منقطع ہونا.....''غروب'' میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جب کہ ''طلوع'' میں یہ بات ہرگز نظر نہیں آتی.....لہٰذا فصاحت اور بلاغت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ''غروب'' ہی کو استدلال کی بنیاد قرار دیا جائے اور اسی کے ذریعے استدلال قائم کیا جائے تا کہ مسئلہ پورے طور پر واضح ہوسکے اور سب کے لیے قابل قبول ہو،اس مقام پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ حرکت کی کئی قسمیں ہیں (جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا) ان تمام قسموں میں سب سے واضح مکانی حرکت (ایک سے دوسری جگہ منتقل ہونا) ہے اور آیت میں اسی سے استدلال کیا گیا ہے (البتہ اس مقام پر مکانی حرکت اور کیفی حرکت دونوں آپس میں ملی ہوئی ہیں، کیونکہ ان اجرام (سورج، چاند اور زہرہ) کے نور کی کیفیت، حرکت کے ساتھ بدل جاتی ہے، چنانچہ غروب کے وقت ان کی روشنی کم ہوتی ہے، پھر اس سے بھی کم ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ دکھائی ہی نہیں دیتی۔)

بعض فلاسفہ کے نزدیک سورۂ نمل کی آیت ۸۸ بھی ''برہان حرکت'' کی طرف ایک اشارہ ہے، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۸۸ (النمل: ۸۸)

''تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کرتے ہو کہ وہ ایک جگہ پر کھڑے ہیں۔ حالانکہ وہ بادلوں کی طرح متحرک ہیں یہ خدائی تخلیق ہے کہ اس نے ہر شے کو نہایت مضبوط طریقے پر بنایا ہے، بہ تحقیق وہ تمہارے کاموں سے آگاہ ہے۔

اس آیت کی بابت بعض فلاسفہ کا خیال ہے کہ اس سے ''جوہری حرکت'' مراد ہے۔یعنی وہ حرکت اشیاء کی ذات میں اور ان کے اندر موجود ہے۔ایسی حرکت جو مادی دُنیا کے حادث ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔اور اس بات کی ثابت کرتی ہے کہ یہ دنیا ایک خالق کی محتاج ہے۔ (اس کی وضاحت جلد ہی ہوگی)۔

بہرحال اگر یہ مان لیا جائے کہ آیت ''جوہری حرکت'' کے سلسلہ میں ہے تو بھی اس سے توحید پر استدلال اور حرکت کے ذریعے خدا کے وجود کا اثبات ہرگز نہیں ہوتا۔(غور کریں)

اکثر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ آیت ''اشراط الساعۃ'' سے متعلق ہے (جن سے وہ خوفناک حوادث مراد ہیں) جو قیامت کے وقت رونما ہوں گے۔خصوصاً یہ کہ پہاڑ چل پڑیں گے اور اس قدر متحرک ہوں گے کہ ریزہ ریزہ ہوکر دھواں بن جائیں گے جیسا کہ اس سلسلے میں قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوا ہے[1]۔

ہاں تو جس طرح ہم نے تفسیر نمونہ میں بھی بیان کیا ہے کہ یہ چیز (اشراط الساعۃ) آیت کے ظاہری لب ولہجہ سے مطابقت نہیں رکھتی

---

[1] اس سلسلے میں مزید تفصیلات تفسیر نمونہ جلد ۱۳، سورۂ طٰہٰ آیت ۱۰۵ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

کیونکہ آغازِ قیامت میں پہاڑوں کا پھٹنا اس طرح خوفناک ہوگا کہ انسان کو نہایت وحشت زدہ کر دیگا۔ جب کہ اس آیت میں یہ ذکر ہوا ہے کہ کیا تم پہاڑوں کی حرکت (آگے پیچھے ہونے) سے آگاہ نہیں ہوتے۔

لہٰذا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ بیان کر رہی ہے کہ جس طرح زمین متحرک ہے اسی طرح پہاڑ بھی متحرک ہیں چنانچہ اس آیت میں ''ترٰی'' (تم دیکھتے ہو) کا جملہ ہے جس میں پہاڑوں کی حرکت کو بادلوں کی حرکت کے ساتھ تشبیہ دینا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا تعلق اسی دنیا سے ہے..... پھر یہ کہنا: صنع اللہ الذی اتقن کل شیئٍ یہ خدائی تخلیق ہے کہ اس نے ہر چیز کو نہایت مضبوط اور حکمت کے ساتھ بنایا ہے..... اس کے بعد یہ کہنا 'انہ خبیرٌ بما تفعلون۔'' خدا تمہارے کاموں سے آگاہ ہے، یہ جملے اس امر کا ثبوت ہیں کہ یہ آیت مبارکہ اسی دنیا میں پہاڑوں کے متحرک ہونے کو بیان کر رہی ہ[1] ے

سورۂ رحمن کی آیت ۲۹ میں ہے۔''یسئلہ من فی السمٰوٰت والارض کل یوم ھو فی شانٍ'' آسمانوں اور زمین میں رہنے والے سب اس کے بارے میں پوچھتے ہیں، وہ ہر روز ایک (نئے) کام میں ہے۔ بعض مفسرین اس کو ''جوہری حرکت'' کی دلیل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے (برہان حرکت کے ذریعے) خالق کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔

لیکن یہ آیت بھی مذکورہ بالا دعوے کی دلیل نہیں بن سکتی بلکہ اس کا ظاہری لب ولہجہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر روز نئی مخلوق پیدا کرتا ہے اور اس کا ایسا کرنا دائمی اور باقاعدہ طور پر جاری ہے۔ وہ نت نئی چیز ایجاد کرتا ہے۔ ہر روز ایک نئی نعمت عطا کرتا ہے اور اس کا کام سائلین (مانگنے والوں کی) حاجت روائی ہے۔

آیت کے ظاہری کلمات اور انداز بیان، اسی طرح وہ روایات جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ ان سب سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے جو ہم نے جو بیان کیا ہے ۱۲ (تفسیر نمونہ میں ہم نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے)[2]

مذکورہ بالا تمام مطالب و بیانات سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ''برہان حرکت'' کے اثبات کے لیے سب سے بہتر اور عمدہ آیات وہ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ذکر کی جا چکی ہیں۔ ان میں ستاروں کے افول وغروب کو ان کے خدا نہ ہونے اور اپنے وجود میں خالق کے محتاج ہونے کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] اس کی مزید وضاحت تفسیر نمونہ جلد ۱۵۔ سورۂ نمل آیت ۸۸ کے ذیل میں دیکھیں۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۲۳ صفحہ ۱۳۷ (فارسی)

توضیحات

(ا).....برہان حرکت اوراس کے مقدمات:

برہان حرکت کواچھی طرح سمجھنے اور یہ جاننے کے لیے کہ اس سے خدا کے وجود پر کس طرح دلیل قائم کی جاسکتی ہے، ذیل میں چند اُمور پیش کیے جاتے ہیں، جن سے اجمالی واقفیت ضروری ہے۔

ا۔ حرکت کی تعریف

ب۔ حرکت کا وجود

ج۔ حرکت کے ارکان

د۔ وہ چیزیں جن میں حرکت واقع ہوتی ہے

ا۔حرکت کی تعریف:

حرکت کی تعریف کئی طرح سے بیان کی گئی ہے، لیکن ان تمام تعریفوں میں واضح اور بہتر یہ دو ہیں۔

ا۔ کسی چیز کا قوت کے دائرے سے نکل کر فعل کی طرف تدریجی طور پر آنا۔

۲۔ زوال وحدوث مستمر (ہمیشہ کی تبدیلی)۔

جب بارش کے قطرے آسمان کی طرف سے گرتے ہیں یا گھاس اُگتی ہے یا کوئی میوہ تدریجی طور پر پکتا ہے، ان تمام موارد میں جسم ایک خاص حالت میں ہوتا ہے جسے (فلسفی اصطلاح میں) فعلیت کہتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود وہ جسم اس بات کی استعداد وصلاحیت رکھتا ہے کہ اس حالت سے دوسری حالت اختیار کرے۔ جب وہ اپنی موجودہ حالت کو تدریجی طور پر چھوڑ کر دوسری حالت اختیار کرتا ہے (جس چیز کی اس میں قوت تھی وہ فعلیت میں آجاتی ہے) تو گویا وہ جسم زوال وحدوث کے باقاعدہ نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو چکا ہے۔مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ''حرکت'' ایسے اجزاء سے مرکب ہے جنہیں ''سکون'' کہتے ہیں یا یہ وہ کئی ایک ''وجود'' یا کئی ایک ''عدم'' سے مل کر بنی ہے۔ بلکہ ''حرکت'' ایک ہی حقیقت ہے جو ظاہری استمرار رکھتی ہے۔اور عقلی تجزیہ وتحلیل میں اس کے اجزاء فرض کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ جو چیز کامل ''فعلیت'' اور ''وجودِ مطلق'' رکھتی ہو اس میں ''حرکت'' کا تصور ہی نہیں ہوسکتا بلکہ اس پر ثبات کامل کی حکمرانی ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہیں گے کہ ''حرکت'' ہمیشہ وہاں قابل تصور ہے جہاں کسی چیز کی کمی ہو، لہٰذا خدا کی ذات میں ''حرکت'' کا تصور ہی نہیں پایا جاتا۔

ب۔حرکت کا وجود

حرکت کے وجود کا ثابت کرنا کوئی مشکل امر نہیں، یہ ایک بدیہی امر ہے اور ہم روز وشب اپنی آنکھوں اور دوسرے حواس کے ذریعے عالم خارج میں ''حرکات'' کے وجود کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ دلائل جو ''حرکت'' کے وجود کا انکار کرنے والے حضرات (مثلاً یونانی فلسفی) ''ذنون'' اور اس کے پیروکار) نے پیش کیے ہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور وہ ایک بدیہی امر کی مخالفت کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں کیونکہ ہم یہ بات کسی صورت میں تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ پانی جو کسی ندی یا نہر میں چل رہا ہے یا سیب کا وہ پھل جو درخت کی شاخوں پر تدریجی طور پر پک رہا ہے جب ہم گاڑی میں سوار ہو کر ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہیں تو یہ سب خیالی چیزیں ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ صرف ذہن کی دنیا میں گھومنے والے امور ہیں کہ جو عالم خارج میں عملی جامہ پہنتے ہیں۔ ہم یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ تو بدیہیات کا انکار ہے اور بدیہی امور تو ایسی حقیقتیں ہیں کہ جن کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ البتہ اس بات کا انکار ممکن نہیں کہ ''حرکت'' کے وجود کا ادراک اور اسے اچھی طرح سمجھنا قوت حافظہ کو بروئے کار لائے بغیر ناممکن ہے کیونکہ حرکت پل بھر کے احساس سے ورک نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ وہ ایک تدریجی امر ہے (یعنی تدریجی وتحقیق پذیر ہوتی ہے)۔

ج.....حرکت کے ارکان

فلاسفہ نے ''حرکت'' کے چھ رُکن ذکر کیے ہیں:

(۱) مبداء (۲) منتہا (۳) محرک (۴) متحرک (۵) وہ موضوع جس میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

(۲) وہ وقت جس میں حرکت رونما ہوتی ہے۔

(البتہ ہم اس بات کو بعد میں بیان کریں گے کہ وقت ''زمان'' مقدار حرکت کا دوسرا نام ہے) پھر یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ چھ ارکان قدیم فلاسفہ کے نظریئے کے مطابق ہیں۔ ورنہ اگر ''حرکت جوہری'' کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو ''موضوع حرکت'' کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

د.....وہ امور جن میں ''حرکت'' واقع ہوتی ہے:

پہلے زمانے کے فلاسفہ کا نظریہ تھا نو مقولات (مقولات عرضیہ)[1] میں سے صرف چار مقولات میں ''حرکت'' واقع ہوتی ہے۔

۱۔ حرکت در ''مکان'': مثلاً بارش کے قطروں کی حرکت، سڑک پر گاڑی کی حرکت۔

---

[1] نو مقولات عرضیہ ہیں: کم، کیف، وضع، متی، این، ان یفعل، ان ینفعل، ملک، اضافہ ان سب کی تفصیلات مناسب مقامات پر بیان کی جا چکی ہیں۔

ب۔ کمیت (مقدار) میں حرکت: جیسے نشوونما کی حالت میں گھاس کے حجم کا بڑھنا۔

ج۔ وضع میں حرکت: جیسے کرہ زمین کی گردش۔

د۔ کیفیت میں حرکت: جیسے درخت پر کسی پھل کے رنگ، بو اور ذائقہ تدریجی تبدیلی۔

وہ حضرات! قدیم فلاسفی) اس بات کے قائل تھے کہ ان چار موضوعات کے علاوہ کسی چیز میں ''حرکت'' نہیں پائی جاتی (اگر ایسا ہو تو جوہر اشیاء میں حرکت ناممکن ہونا بطریق اولی ثابت ہوگا) یونان کے فلاسفہ مثلاً ''ارسطو'' اور اس کے ہم خیال مسلم فلاسفہ جیسے ''ابن سینا'' اور دیگر بزرگ محققین بھی ''حرکتِ جوہری'' کو ناممکن ومحال سمجھے تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ حضرات ''متحرک'' کو حرکت کے ارکان میں شمار کرتے تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ جب تک کوئی ثابت (غیر متحرک) موضوع موجود نہ ہو کہ جس پر حرکت واقع ہو، اس وقت تک ''حرکت'' کے وجود کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ (حرکت نہیں پائی جائے گی)۔

لیکن مشہور معروف فیلسوف اسلام ''صدرالمتالہین'' (ملاصدرا) نے ایک جدید نظریہ پیش کیا، انہون نے کہا: جو ہر اشیاء میں ''حرکت'' نہ صرف یہ کہ محال نہیں بلکہ جب تک ''جوہر'' میں نہ ہو ''عوارض'' میں حرکت کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں یا یوں کہیں کہ ''عرضی حرکات'' کا سرچشمہ جوہر'' میں پائی جانے والی حرکت'' ہے اور اس کے بغیر ''حرکت'' ممکن ہی نہیں ہے۔

صدرالمتالہین کہتے: اس بات کی ضرورت ہی کیا ہے کہ کسی ''امر ثابت'' (غیر متحرک چیز) کے وجود کو فرض کریں؟ ہاں اس بات کو تسلیم کر لینے میں کیا حرج ہے کہ ''جوہر'' اپنے آپ ہی میں مصروف حرکت ہے؟ یعنی ہمیشہ اس حالت میں ہے کہ اپنی پہلی حالت کو چھوڑ کر نئی حالت اپنا لے۔

البتہ ہادی النظر یہ موضوع (جوہر کا اپنے آپ میں حرکت کرتے رہنا) عجیب محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ''متحرک'' اور ''حرکت'' ایک ہی شے ہو، نیز یہ کہ شے خود ہی اپنے لیے محور حرکت ہو لیکن ملاصدرا یہ کہتے ہیں۔ کہ اگر ہم کچھ غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بات عجیب نہیں بلکہ ایک لازمی وضروری چیز ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ عمدہ اور دلکش بھی محسوس ہوگی۔

صدرالمتالہین شیرازی نہایت تاکید کے ساتھ کہتے ہیں: ''حرکت جوہری'' کا بنیادی نظریہ قدیم فلاسفہ کے بیانات میں موجود ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اس نظریئے کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیات کو بطور دلیل پیش کیا ہے (مبادا کہ اسے جدید نظریہ سمجھ کر مخالفین کو ہنگامہ آرائی کا موقع نہ مل جائے۔ کیونکہ عموماً جدید نظریات کے بارے میں ایسا ہی ہوتا ہے)۔

لیکن اگر ہم یہ بات تسلیم بھی کر لیں کہ یہ کوئی جدید نظریہ نہیں ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں اس قدر وسعت ضرور ایک نئی چیز ہے۔

جوہر میں پائی جانے والی حرکت کے دلائل

صدرالمتالہین کا نظریہ ہے کہ وجود کی دو قسمیں ہیں:

(۱).....وہ وجود جس میں ثبات وقرار پایا جاتا ہے۔اس میں مطلقاً حرکت نہیں پائی جاتی، نہ اس کی ذات میں اور نہ ہی اس کی صفات میں!

(۲).....وہ وجود جو ذاتاً سیال ہے، یعنی سیلان اور تحرک اس کی ذات کا جزء سمجھا جاتا ہے اور کسی صورت میں اس میں ثبات وقرار نہیں پایا جاتا، اس کا یہ ذاتی عدم قرار اور بے قرار اور بے ثباتی کبھی تو اس کے عوارض میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے اور کبھی وہ تبدیلی ظاہر بظاہر نظر نہیں آتی۔ جب کہ وہ باطنی واندرونی طور پر ہمیشہ ''نیا'' ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ سیال (ہمیشہ حرکت میں رہنے والی) موجودات لحہ بہ لحہ ایک نئے وجود میں آتی ہیں اور ''نئی'' ہوتی ہیں۔لیکن چونکہ ان کے درمیان ایک طرح کا اتصال وارتباط بھی ہے، اس لیے وہ ایک ہی وجود شمار ہوتا ہے۔

''جوہری حرکت'' کے قائل حضرات نے اپنے نظریئے اور مدعا کے اثبات کے لیے دلائل ذکر کیے ہیں۔اگرچہ یہاں اِن مسائل کی تفصیلات ذکر نہیں کی جاسکتیں لیکن ہم ان کی تین بنیادی اور ہم دلیلوں اور اہم دلیلوں کو اجمالی طور پر ذکر کرتے ہیں:

(۱) ایک قاعدہ کلیہ ہے: **کل ما بالعرض ینتھی الی ما بالذاتِ**، یعنی ہر وہ شے (موجود) جس نے کسی سے کوئی صفت حاصل کی ہو، ضروری ہے کہ اس منبع اور سرچشمہ تک پہنچے کہ جہاں سے وہ صفت نکلی ہو، ورنہ ''تسلسل'' لازم آئے گا۔مثلاً گرم پانی کی حرارت کہ جو اس کی اپنی نہیں بلکہ کسی سے لی ہوئی ہے۔ بالآخر آگ'' تک پہنچنی چاہیے کہ جس کی حرارت ذاتی ہے۔اور حرارت کا سرچشمہ بھی وہی ہے۔

اس قاعدے کے ملحوظ رکھتے ہوئے جسم کے عوارض (کمیت وکیفیت وغیرہ) میں پائی جانے والی حرکت کو دیکھیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ''حرکت'' اصل میں جسم کی ذات میں پائی جانے والی بے ثباتی اور عدم قرار سے نکلی ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے مثال کے طور پر اگر سیب میں ذاتی طور پر ثبات وقرار پایا جائے تو اس کے عوارض میں تبدیلی کیونکر آسکتی ہے؟ پس اس سے معلوم ہوجائے گا کہ ظاہری حرکت سے باطنی حرکت کی نشاندہی ہوتی ہے۔یعنی ظاہری حرکت کو دیکھ کر باطن میں پائی جانے والی حرکت کا پتہ چلتا ہے۔(ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ باطن میں حرکت موجود نہ ہو لیکن ظاہر میں حرکت پائی جائے)۔

(۲) ہر متغیر ''معلول'' کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ایک متغیر علت ہونی چاہیے یعنی کوئی متغیر چیز اپنی اپنی متغیر علت وسبب کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔اگر ہم کسی باغ میں درخت کے سایے میں بیٹھے ہوں اور دیکھ رہے ہوں کہ درخت کا سایہ باقاعدہ حرکت میں ہے (تبدیل ہورہا ہے) تو اس سے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس سائے کی علت وسبب یعنی سُورج کی گرمی میں ''حرکت'' پائی جاتی ہے اور وہ مصروف حرکت ہے..... بناء بریں ہم جسم کے عوارض کی حرکت وتبدیلی سے اصل جسم (ذات جسم) میں حرکت وتبدیلی سے آگاہ ہوجائیں گے۔

(۳) مسئلہ زمان (وقت۔زمانہ) حرکت جوہری کی ایک اہم دلیل ہے۔کیونکہ واضح طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ حوادثاتِ زمانہ ایک ساتھ رونما نہیں ہوتے۔''آج'' کے حوادث گزرے ہوئے کل کے بعد.....اور آنے والے کل سے پہلے ہیں، یہ ایک حقیقت اور امر واقع ہے..... یہ فرق وہی چیز ہے، جسے ہم وقت کا فرق کہتے ہیں۔

حسب الظاہر اور سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ''زمان'' (وقت، زمانہ) موجودات سے الگ ایک مستقل حقیقت کا نام ہے اور حوادث کے لیے ایک ظرف اور بستر کی مانند ہے، لیکن اگر ایک لمحہ کے لیے یہ فرض کرلیں کہ ان تمام مادی موجودات میں سے کوئی بھی موجود نہیں پایا جاتا، اس بات کو واضح الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ''زمان'' مادہ کی اولاد ہے اور اس سے پیدا ہوا ہے یا پھر یوں کہیں کہ ''زمان'' مقدارِ حرکت کا دوسرا نام ہے۔

جن موضوعات میں ''حرکت'' واقع ہوتی ہے، اگر ہم ان کو مذکورہ چار موضوعات میں منحصر سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی ''موجود'' چیزان'' حرکات'' سے محروم ہو اور اس میں کوئی ظاہری حرکت دکھائی نہ دے تو وہ چیز ''زمان'' سے بھی محروم ہوگی یعنی اس کے لیے کوئی زمان و وقت بھی فرض نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ ''وجدان'' کا فیصلہ ہے کہ اگر یہ چاروں حرکات نہ ہوں تو بھی ہم ''زمان'' (وقت۔زمانہ) کا احساس کرتے ہیں..... یہ صرف اس لیے ہے کہ ''مادہ'' ذات کے لحاظ سے حرکت رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں زمان اور نظم اوقات قبل تصور ہے۔ (غور کریں)

یہ تھیں ''حرکتِ جوہری'' کے قائل دانش وروں کی دلیلیں جو ہم نے نہایت ہی اختصار کے ساتھ ذکر کردی ہیں۔

لیکن ابھی کچھ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال باقی ہے کہ یہ تصور کرنا کہ ''متحرک خود ہی'' ''حرکت'' ہے اور اس کے سوا ''حرکت'' کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں..... کیونکر ممکن ہے؟ پھر جس چیز کا تصور ہی سوالیہ نشان رکھتا ہے۔ اس کی تصدیق کس طرح کی جاسکتی ہے؟ اس کے علاوہ عجیب بات یہ ہے کہ ''حرکت جوہری'' کا جدید نظریہ پیش کرنے والا خود بھی اس پیچیدگی کا شکار ہو کر اسے حل کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے، چنانچہ اس کے مختلف اقوال سے اس بات کا پتہ چلتا ہے، کہ خود اس کے لیے بھی یہ موضوع کچھ ایسا آسان نہیں تھا۔[1]

خلاصہ کلام یہ کہ حرکت جوہری کی ساری بحث اس موضوع کی فرع ہے کہ ''حرکت'' کسی موضوع کے بغیر بھی قابلِ تصور ہونا معقول ہی نہیں ہے۔ لیکن کچھ اور دانش ور یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اس بات کا تصور درحقیقت ان مفاہیم کو ذہن سے نکال دینے پر موقوف ہے جن سے حرکت کی بابت انسان مانوس ہے..... تاکہ موجود کا تصور کیا جاسکے جو عین حرکت ہے۔ اور متحرک و حرکت اس مقام پر ایک ہیں۔

یہ تھا حرکت سے مربوط مسائل کا خلاصہ!

(۲)..... برہان حرکت کے ذریعے وجودِ خدا کی پہچان:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''حرکت'' صرف ''حرکت جوہری'' میں منحصر نہیں یہی وجہ ہے کہ ذات واجب الوجود کے اثبات کیلئے ''برہان حرکت'' محض ''حرکت جوہری'' کی بحث تک محدود نہیں۔۔۔ اگر ''حرکت جوہری'' کو تسلیم کرلینے سے خداشناسی کے بارے میں ''برہان حرکت'' نہایت واضح و آشکار ہوجاتی ہے۔

---

[1] اس بارے میں مزید معلومات کے لیے کتاب ''اسفا'' میں بحث ''حرکت'' اور ''ورسہائے شہید مطہری'' میں اسفار'' کی بحث حرکت کے باب کا مطالعہ کریں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہوتی ''حرکت جوہری سے ثابت ہوتا ہے کہ سارا ''جہان مادہ'' ہی حرکت میں ہے یعنی ہمیشہ حادث اور نیا ہے ہر ایک لمحہ میں اس کا ایک نیا وجود ہے۔ یہ حدوث مستمر (لگاتار نئے وجود میں آنا) اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس کائنات اور مادی جہان کا باقاعدہ اور مسلسل رابطہ اس ذات سے ہے جو ''حادث'' نہیں بلکہ واجب الوجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ جہان ہمیشہ ''بدلتے رہنے کی حالت میں ہے نہ کہ ''ایک سا رہنے کی حالت میں.....اور ایسا ہونا اس کے عوارض ہی میں نہیں بلکہ اس کی اصل ذات کی گہرائی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ہمیشہ ایک ''مبداء'' کا محتاج رہتا ہے جو اسے ہر لمحہ نئی آفرینش عطا کرے۔

اس بارے میں کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

دائماً نومی شود عالم وما
بے خبر از نو شد اندر بقاء
شد مبدل آب ایں جو چند بار
عکس ماہ وعکس اختر برقرار

''یہ جہاں ہمیشہ بدلتا اور نیا بنتا رہتا ہے۔ لیکن ہم اس کے نئے ہونے سے بے خبر ہیں۔ ندی کا پانی کئی بار تبدیل ہو چکا ہے۔ مگر چاند تاروں کا عکس اسی طرح برقرار ہے۔''

اس بیان سے ایک یہ دلچسپ نتیجہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے کہ جہان کی تخلیق صرف ابتداء ہی میں نہیں۔ بلکہ ہر لمحہ اس کی ایک نئی تخلیق وآفرینش ہے جب ایسا ہے تو کائنات کا ایک ازلی وابدی میں نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ کیونکہ اس کی خلقت استمراری ہے اور وہ ہر لمحہ تخلیق کے مرحلے میں ہے، اس لیے کہ یہ بات مفہوم حرکت کی گہرائی میں موجود ہے اور اس کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔ ''لہٰذا'' حرکت جوہری'' کو تسلیم کر لینے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ جہان جس طرح آغازِ خلقت میں واجب الوجود کا محتاج تھا.....اسی طرح اپنی بقاء میں بھی اس کا محتاج ہے اور یہ احتیاج اس میں ہر وقت موجود ہے۔ بلکہ ''حرکت جوہری'' کے نظریے کی روشنی میں ''بقا'' کا کوئی مفہوم ہی نہیں کہ ہمیشہ حدوث ہی ہے۔ البتہ یہ ایسا حدوث ہے جس میں باہم اتصال پایا جاتا ہے۔ اور یہ پورے وجود پر طاری ہے، پس لفظ ''بقاء'' کا استعمال بھی ''حدوث'' کے متصلاً اور لگاتار واقع ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اس مقام پر ''مبداء ازلی'' کے ساتھ اس جہان کی تمام اشیاء کے رابطے کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت ناقص اور کم مایہ مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ تمام موجودات عالم کی برقی قمقمے کی طرح تصور کریں کہ جو برقی مرکز سے رابطہ رکھنے کے باعث روشن رہتا ہے چونکہ یہ روشنی ہر لحظہ اس قمقمے تک پہنچتی رہتی ہے اس لئے وہ اپنی روشنی قائم رکھنے کی خاطر روشنی دینے والی اس علت وسبب کا محتاج ہے۔ ان برقی قمقموں کے روشن ہونے کی کیفیت اس بات کو سمجھنے میں مدد دیتی کہ وہ دائمی طور پر برقی مرکز سے رابطہ رکھنے حاجت مند ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ''برہان حرکت'' کی بازگشت ''برہان وجوب وامکان'' کی طرف ہے لیکن چونکہ اس کی پہچان ایک نئے رنگ میں ہوئی اور اس پر نئے عنوان سے بحث ہوئی ہے اس لیے اس ایک مستقل حیثیت حاصل ہوگئی ہے.....(غور کریں)

(۳) تمام جہان متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہے

اکثر متکلمین (علماءِ عم عقائد) نے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے اسی (دلیل تغییر) کا سہارا لیا ہے، انہیں ''حرکت جوہری'' سے کوئی سروکار نہیں اور موجودات عالم میں ظاہر بظاہر نظر آنے والی ہمیشہ کی تبدیلیاں ان کے نقطہ نظر کے اثبات کے لیے کافی ہیں۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ ''جہاں مادہ'' کی کوئی چیز کسی وقت بھی ایک حالت پر باقی نہیں رہتی۔ بلکہ بلا استثناء تمام اشیاء تغیر و تبدیل کی حالت میں ہیں۔ یہ امر بھی واضح ہے کہ تبدیلی ''اور حرکت'' ایک ''حادث'' چیز ہے چونکہ ''مادہ'' ہمیشہ تغیرات اور تبدیلیوں کا شکار رہتا ہے لہٰذا وہ بھی ''حادث'' ہوگا کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ''مادہ'' ازلی ہو اور ازل سے حوادث کا شکار ہو، اگر ایسا ہو تو ''عدوث'' اور ''ازلیت'' کا یکجا ہونا لازم آئے گا جو محال ہے.....اس لیے کہ ان دونوں کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے (غور کریں)

مادہ کے بارے میں آج کل کے جدید نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ استدلال مزید واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ طبیعات کے نئے نظریوں کے مطابق ہر مادہ کئی ایک ایٹموں سے تشکیل پاتا ہے اور ہر ایٹم ''حرکات'' کا مجموعہ ہے چونکہ ہر ''حرکت'' حادث ہے لہٰذا مادہ کہ جو متعدد والیکٹرون (ELECTRON) اور پروٹون (PROTON) کی ''حرکت'' کا مجموعہ ہے وہ کس طرح ازلی ہو سکتا ہے؟ دوسرے الفاظ میں ہر حرکت کا آغاز اور ایک انجام ہے.....جس چیز کا آغاز و انجام ہو وہ کیونکر ازلی ہو سکتی ہے؟

یہ مسئلہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس بیان میں نہایت لطیف انداز ہی میں مذکور ہے جو آپ نے ''مادہ'' کی ازلیت کے قائل ایک دانش ور ''ابن ابی العوجائ'' کے لیے ارشاد فرمایا تھا۔

امامؑ نے فرمایا: اسئل عما شئت .....یعنی جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، پوچھو!

ابن ابی العوجاء نے کہا: ما الدلیل علی حدث الاجسام .....اجسام کے حدوث کی دلیل کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: میں نے کوئی چھوٹی یا بڑی چیز نہیں دیکھی، مگر یہ کہ جب بھی اس کے ساتھ اسی جیسی کوئی چیز ملائی جائے تو وہ بڑی ہو جاتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دوسری چیز کے ملنے سے وہ ایک سے دوسری حالت میں تبدیل ہوئی ہے یہ زوال اور تبدیلی اس بات کی دلیل ہے کہ اگر وہ شے قدیم اور ازلی ہوتی تو کبھی ایک سے دوسری حالت میں تبدیل نہ ہوتی کیونکہ جو چیز زائل اور تبدیل ہوتی ہے۔ یعنی ایک سے دوسری حالت میں داخل ہو سکتی ہے.....اس میں وجود عدم دونوں آ سکتے ہیں۔ یعنی وہ موجود بھی ہو سکتی ہے اور معدوم بھی ہو سکتی ہے۔ پس وہ ''عدم'' سے وجود میں آنے کی وجہ سے ''حادث'' چیزوں سے ہو جائے گی.....اور اگر ''ازل'' میں ہو تو پھر ''حادث'' نہیں بلکہ ''قدیم'' ہوگی.....جب کہ ''ازلیت'' اور ''حدوث''.....یعنی ''قدم'' اور عدم'' ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے ان دونوں کا ایک شئے میں یک جا ہونا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے [1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۴۶۔ اصولِ کافی جلد ا صفحہ ۷۷ باب حدوث العالم

(۴) عصر حاضر کے علمی قوانین اور جہان کا حادث ہونا:

آج کی علمی بحثوں (خاص طور پر THERMODY NANIC اور ENTHROPY) میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ گرم اجسام سے سرد اجسام کی طرف سرایت حرارت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، یہ عمل خود بخود نہیں ہوسکتا بلکہ ایسا ہونا ایک نا قابل استفادہ قوت کا ایک قابلِ استفادہ قوت کی طرف مخصوص زاویے کے ساتھ منتقل ہونا ہے۔ یہ امر بھی واضح ہے کہ یہ سلسلہ جسے (ENTHROPY) کہا جاتا ہے اس کا اثر ساری دنیا میں بڑھ رہا ہے۔ پس اگر یہ جہاں ازلی ہوتا تو تمام اجسام کی حرارت کب سے ہی ایک جیسی ہوچکی ہوتی اور کوئی قابلِ استفادہ قوت باقی نہ رہتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پوری دنیا میں کیمیائی اثرات ختم ہوکر رہ جاتے اور روئے زمین پر زندگی ممکن ہی نہ رہتی۔ جب کہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کیمیاوی فعل وانفعالات باقاعدگی کے ساتھ جاری ہیں اور روئے زمین پر زندگی امکان پذیر ہے۔ پس موجود علوم اگرچہ اس طرف متوجہ نہیں لیکن اس حقیقت کو ثابت کررہے ہیں کہ اس جہاں کی کوئی ''ابتدائ'' تھی (یعنی وہ نہیں تھا اور پھر ہوگیا).....اس طرح وہ (علوم) خدا کے وجود کے ضروری ہونے کو بھی ثابت کررہے ہیں۔ کیونکہ کوئی ''حادث'' چیز خود بخود وجود میں نہیں آسکتی بلکہ اس کے ''حادث'' ہونے اور وجود میں آنے کے لیے محرک اوّل کا ہونا ضروری ہے [۱]

''دُنیا کے ''حادث'' ہونے کو ثابت کرنے کے لیے جو دوسرا راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ ریڈیو ایکٹو اجسام کے بارے میں تحقیق کا عمل ہے (یہ وہ اجسام ہیں جو ایسے ناپائدار ذرات رکھتے ہیں جو بکھرتے رہتے ہیں، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ ناپائدار ایٹمی ذرّے.....مضبوط و پائدار ایٹمی ذروں میں.....تبدیل نہ ہوجائیں یہ ایسے ایٹم ہیں کہ عام طور پر ایٹمی لحاظ سے ۸۰ سے زیادہ ہیں اور وہ ایسے بھاری اور ناپائیدار اجسام کی طرح ہیں جو ہمیشہ ایٹمی شعاعیں بکھیرنے میں مصروف رہتے ہیں، گویا وہ اپنے اضافات وزوائد کو نکال باہر کرتے ہیں تاکہ ایک پائیدار عنصر میں تبدیل ہوسکیں) اس جہان طبیعت میں ایسے اجسام کا پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ جہان ''حادث'' ہے اور اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ مشہور معروف دانش ور'' جیوکیمسٹری کے ماہر اور کتاب.....زمین کی عمر کی تعیین، قدرتی ریڈیو ایکٹو کاربن کے ذریعے.....کے مولف کے بقول: (DONAL DRERTMR) اگر یہ دُنیا ازلی وابدی ہوتی تو یہاں کوئی ریڈیو ایکٹو عنصر پایا ہی نہ جاتا (کیونکہ وہ سب پائیدار اجسام میں تبدیل ہوچکے ہوتے) [۲]

مذکورہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ جدید علوم نے اپنے تجربات کی روشنی میں مختلف طریقوں سے اس کائنات کے حدوث کو ثابت کیا ہے اور یہیں سے جہان ہستی کی تخلیق کے لیے ایک ازلی وابدی خالق کی ضرورت کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے۔

اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس چیز کا ثبوت ہے کہ اس دنیا کی اپنی ایک تاریخ ہے کہ جس سے اس کے حادث ہونے اور اس کے آغاز وابتداء کا پتہ چلتا ہے، پھر اگر یہ مادی دُنیا ازلی ہوتی تو اب تک اتنا طولانی زمانہ گزرنے کے باعث حرارت

---

[۱] کتاب ''اثبات'' وجودِ خدا، صفحہ ۵۵ (سے تلخیص)

[۲] کتاب ''اثبات وجودِ خدا، صفحہ ۱۵۵

پوری کائنات میں پھیل چکی ہوتی، اس کی فعالیت وکارآرائی باقی نہ رہتی اور اب تک اس پوری دنیا پر موت کے سائے پھیل چکے ہوتے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر ہم گرم پانی سے بھرے ہوئے ایک برتن کو ایک کمرے میں رکھ دیں تو جب تک اس پانی کی حرارت اردگرد کی فضاء سے مختلف ہوگی، اس وقت تک برتن کے اردگرد کی ہوا مسلسل حرکت میں ہوگی۔ یعنی اپنی گرمی کی حالت میں اوپر جارہی ہوگی اور اس کے نزدیک کی ہوا اس کی جگہ لے رہی ہوگی۔ یہی عمل اردگرد کی ہوا کے مسلسل حرکت میں آنے کا سبب ہے۔

لیکن جب حرارت اور گرمی کی یہ قوت کمرے کی فضاء میں برابر طور پر پھیل جائے تو پھر کوئی حرکت باقی ہی نہ رہے گی اور پانی کا کھولنا ختم ہوجائے گا) اس مثال کی روشنی میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اس جہان کی انتہا بھی اس طرح سے ہوگی۔ اگر اب بھی کوئی حرکت باقی ہے تو وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی اس دنیا پر اتنا زمانہ نہیں گزرا کہ وہ اپنے اختتام کو پہنچ جائے یعنی ابھی اس کے حدوث کی مدت باقی ہے اس کے لیے یہ مثال بھی دی جاسکتی ہے کہ باہم ملے ہوئے کئی ایک برتن ایک جگہ رکھے ہوں ہم ان میں سے ایک میں پانی ڈالیں تو وہ اان تمام برتنوں میں ''حرکت'' کرتا ہوا نظر آئے گا، یعنی سب میں پہنچ جائے گا۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ پانی ایک ہی سطح پر نہ پہنچ جائے۔ جب پانی سب برتنوں میں ایک سطح پر پہنچ جائے گا تو پھر ان میں سکوت اور ٹھہراؤ پیدا ہوجائے گا۔ علم فلکیات کے ماہر دانش ور اسٹونٹر'' (ASTONTER) کا کہنا ہے کہ جدید علوم نے اب تک بہت سی چیزوں کی عمر کا سراغ لگایا ہے، مثلاً زمین، چمکیلے پتھر چاند، سورج کہکشاں ..... یہاں تک کہ اس دُنیا کی عمر اور مختلف عناصر کی ترکیب کے لیے ضروری مدت کے بارے میں میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی تخلیق پر چھ کروڑ سال گزر رہے ہیں (یعنی جہان کی ابتداء کو اتنے سال ہوگئے ہیں) [1]

اس مقالے کے آخر میں ہم ایک بار پھر اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مذکورہ آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان خدا کے وجود کے اثبات کی بابت اس عقلی دلیل کے پیش نظر ہے کہ کوئی متغیر چیز ابدی اور ہمیشہ رہنے والی نہیں ہوسکتی۔ البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیان میں حرکت کی دیگر دلیلیں بھی پوشیدہ ہیں۔ (غور کریں)

---

[1] کتاب ''اثباتِ وجود خدا'' صفحہ ۱۶۰۔

(۳) برہان وجوب وامکان
(غنیٰ وفقیر)

اشارہ:

علم عقائد کے ماہر علماء اور فلاسفہ نے وجودِ خدا کے اثبات کے لیے گوناگوں دلائل ذکر کیے ہیں کہ جن میں سے بعض بنیادی طور پر ایک جیسے ہیں۔ ایسے ہی دلائل میں سے ''برہان وجوب وامکان'' اور ''برہان علت ومعلول'' ہے.....عنقریب ان دونوں کی تشریح کی جائے گی۔ ان شاءاللہ!

چونکہ ان دلائل کو مختلف طریقے اور مختلف پیرایہ میں پیش کیا ہے اور ان میں ہر ایک کی مستقل صورت ہے۔ لہٰذا ہم بھی انہیں الگ الگ بیان کریں گے البتہ ان کی مشترکہ بنیاد کو بھی بیان کیا جائے گا۔

''برہان وجوب وامکان'' یا ''غنیٰ وفقر'' کی بنیاد یہ ہے کہ جب ہم اپنے آپ اور اس جہان کے دیگر موجودات کو دیکھتے ہیں تو وہ سب سراپا احتیاج نظر آتے ہیں۔.....ایسی احتیاج جو ان کے وجود سے باہر کی طرف ہے، یہ بات بدیہی اور واضح (ناقابلِ انکار) ہے تو نہیں مانا جاسکتا کہ سارے کا سارا جہانِ ہستی فقر واحتیاج رکھتا ہے۔ (اور یہاں کوئی بھی بے نیاز نہیں).....ہاں سارے جہان کی حاجت مندی اس امر کی دلیل ہے کہ غنیٰ وبے نیازی کا ایک سرچشمہ موجود ہے اور ہم اس سرچشمے کو ''خدا'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہم اس جہان کی تمام موجودات کو کسی سے مربوط اور وابستہ پاتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ یہ وابستگی کوئی انتہا ہی نہ رکھتی ہو۔ جہان ہی وابستہ ہو اور یہ وابستگی پورے جہان پر چھائی ہوئی ہو۔ یہ وابستگی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ جہانِ ہستی میں ایک ایسی ذات موجود ہے جو مستقل بالذات وجود رکھتی ہے اور اس سے وابستہ یہ تمام موجودات اس کے سہارے پر قائم ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم قرآنی آیات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اور درج ذیل آیات پر غور کرتے ہیں۔

(۱) يَاأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللهِ ۖ وَاللهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۱۵

[1] فاطر: ۱۵

(۲) وَاللهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ ﴿محمد: ۳۸﴾

---

[1] ان اللہ غنی حمید'' (اس قسم کی تعبیر پورے قرآن میں دس مقامات پر ذکر ہوئی ہے۔ (بقرہ۔ ۲۶۷، ابراہیم۔ ۸ حج۔ ۶۴ لقمان ۲۰۔ ۲۶ حدید ۲۴، ممتحنہ ۶، تغابن۔ ۶ نساء۔ ۱۳۱ فاطر۔ ۱۵) خدا کی صفت غنیٰ کا ذکر متعدد آیات میں موجود ہے۔ ان تاکیدی وتکراری بیانات سے اس موضوع کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

(۳) يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۲۹ ﴿الرحمن: ۲۹﴾

ترجمہ

(۱).....اے لوگو! تم سب خدا کی طرف محتاج ہو، فقط خدا ہی بے نیاز اور حمد وثناء کے لائق ہے۔''

(۲).....''خدا بے نیاز اور تم سب محتاج ہو۔''

(۳).....آسمانوں اور زمین میں رہنے والے سب اس سے مانگتے ہیں، وہ ہر روز نئے کام (نئی شان) میں ہے۔''

الفاظ کی تشریح

''فقرآء'' فقیر کی جمع ہے، راغب اصفہانی نے کتاب ''المفردات'' میں لکھا ہے کہ ''فقیر'' اصل میں اسے کہتے ہیں جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو۔ چونکہ نادار و تہی دست لوگ بھی اسی کی مانند ہوتے ہیں۔ جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہو۔ اس لیے انہیں بھی ''فقیر'' کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ''مسکین (جو سکون کے لفظ سے بنا ہے) اس شخص کو کہتے ہیں جو راستہ چلنے پر قادر نہ ہو، یہ لفظ بھی نادار لوگوں پر بولا جاتا ہے۔ لہٰذا ''فاقرۃ'' اس حادثے یا بت بڑی مصیبت کو کہتے ہیں۔ گویا جس نے ہڈیاں توڑ ڈالی ہوں۔

''مجمع البیان'' کے مطابق بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ ''فقرا'' سے کہتے ہیں جس کی حالت ''مسکین'' سے بہتر ہو چنانچہ ایک بیابان کے رہنے والے عرب سے کہا گیا.....کیا تو فقیر ہے؟.....اس نے جواب دیا.....نہیں! خدا کی قسم میں تو مسکین ہوں [1]

بہرحال لفظ ''فقیر'' کو چار مقامات پر استعمال کیا گیا ہے:

(۱) ایسی ضروری احتیاجات جو تمام انسانوں بلکہ تمام موجودات کو درپیش ہیں۔ اس سلسلے میں آیہ مبارکہ ''یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ'' (اے لوگو! تم سب خدا کی طرف احتیاج رکھتے ہو) کہ دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) وسائل زندگی کی احتیاج یعنی کم سے کم حد تک زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وسائل کی حاجت اس سلسلے میں آیہ مبارکہ ''انما الصدقات الفقراء'' (صدقات فقراء کے لیے مخصوص ہیں) کو ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

(۳) نفسانی احتیاج کہ جسے ''طمع'' کہا جاتا ہے اور مشہور حدیث میں اسے ''کفر'' کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ کاد الفقر ان یکون کفراً۔ اس کے مقابلے میں نفس کی بے نیازی ہے۔

(۴) خدا کی طرف احتیاج جیسا کہ حدیث میں ہے ''اللھم اغنی بالا فتقار الیك ولا تفقرنی بالاستغناء عنك (

---

[1] بعض حضرات کا نظریہ اس کے برعکس ہے کہ مسکین.....فقیر سے بہتر ہے۔

خدایا! اپنی ذات کی طرف احتیاج کے ساتھ مجھے بے نیاز بنادے اور اپنے سے بے نیازی کے احساس کے ساتھ دوسروں کا محتاج نہ بنا)[1]

کتاب ''العین'' میں ہے ''فقرہ (بروزن نقرہ) اس گڑھے کو کہا جاتا ہے جسے کوءِ شخص پودا لگانے کے لیے کھودتا ہے ممکن ہے کہ لفظ ''فقیر'' کی اصل یہی ہو کیونکہ فقر کی وجہ سے اس کی زندگی میں گڑھے کی طرح) خلا پیدا ہوجاتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس لفظ کا استعمال (ستون فقرات) یعنی ریڑھ کی ہڈی کے جوڑوں کے لیے بھی اس وجہ سے ہو کہ ان کے درمیان گڑھوں کی طرح خلا پیدا ہوتا ہے۔

''غنیٰ'' کا مادہ ''یعنی بے نیازی اور ''غنیٰ'' ''فقر'' کے برعکس ہے اس لیے اس کے استعمال کے بھی چار مقامات ذکر کیے گئے ہیں:

(۱).....کسی چیز کی احتیاج نہ رکھنا (مطلق بے نیازی)، یہ معنی خدا کے لیے مخصوص ہے۔

(۲).....زندگی کے ضروری وسائل میں کمی نہ ہونا۔

(۳).....نفس کی بے نیازی یعنی قناعت۔

(۴).....خدا سے بے نیازی.....اور یہ ناممکن ہے، البتہ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں اس بے نیازی کی سوچ پیدا ہوجاتی ہے جو ان کے طغیان وسرکشی کا سبب بن جاتی ہے، چنانچہ اس کے متعلق قرآن میں آیا ہے۔

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ ﴿العلق: ۶۔۷﴾

ابن منظور نے ''لسان العرب'' میں لکھا ہے: ''غناء''.....غین پر زبر کے ساتھ.....کا معنی نفع ومنفعت اور.....غنا''.....غین کے زیر اور مد کے بغیر.....کا معنی بے نیازی ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص ان سب معانی کی ایک ہی بنیاد قرار دے اور یہ کہے کہ گانے کو اس لیے ''غنا'' کہا جاتا ہے کہ اس میں انسان اپنی آواز کو بلند اور بھرپور انداز سے نکالتا ہے، وہ اس طرح ہی ہے کہ جیسے مالدار اور ثروت مند لوگ اپنے مال ودولت کی وجہ سے بے نیازی کے ساتھ بلند قامت کہلاتے ہیں۔

آیات کی تفسیر اور اہم مطالب کا ذکر

سب اسی کے محتاج ہیں:

پہلی آیت میں بلا استثناء سب انسانوں کو مخاطب کر کے کہا جارہا ہے: ''یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ'' (اے لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو) اس مقام پر ''فقر'' کا معنی بہت وسیع ہے اور وجود وہستی کی تمام احتیاجات اس میں آجاتی ہیں مثلاً اپنی مادی زندگی کی بقاء کے لیے سورج کی روشنی پانی ہوا اور کئی قسم کی غذاؤں، لباس اور مکان کے محتاج ہیں.....نیز ہم اپنی جسمانی زندگی کے لیے بدن کے اندرونی

---

[1] راغب اصفہانی، کتاب ''المفردات'' مادہ فقر

اعضاء جیسے دل۔رگوں اور سانس کے نظام مغز اور اعصاب کے محتاج ہیں، اسی طرح ہم اپنی معنوی زندگی میں گمراہی کے اندھیرے میں سیدھے راستے کے تلاش اور حق و باطل کے درمیان تمیز پیدا کرنے کے لیے عقل کی قوت اور اس کے علاوہ خدا کے بھیجے ہوئے رہبروں اور آسمانی کتابوں کے محتاج ہیں..... چونکہ یہ تمام امور خدا کی طرف سے ہیں.....لہٰذا ہم سب اسی کے محتاج ہیں۔

اگرچہ بعض مفسرین کرا[1] مکا خیال ہے کہ درحقیقت یہ آیت ان لوگوں سے مخاطب ہے جو پیغمبرؐ کی طرف سے عبادت الٰہی کی تاکید کے جواب میں کہتے تھے کہ آیا خداوندِ عالم ہماری عبادتوں کا محتاج ہے؟ ان کے اس تعجب انگیز بیان کے جواب میں قرآن نے کہا.....تم خود ہی اس کے محتاج ہو اور اس کی عبادت کے سائے میں اپنے جسم و روح کو کمال کی منزل پر فائز کرتے ہو۔

لیکن یہ خیال بھی آیہ کریمہ کے مختلف پہلوؤں اور مفہوم میں وسعت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا، کیونکہ خدا کی بے نیازی اور ہماری احتیاج بہت سے مسائل کے حل کی واحد بنیاد ہے۔ یہ فقر و احتیاج تمام انسانوں کی ذات کی گہرائی بلکہ تمام موجودات کی اصل و بنیاد میں داخل ہے۔ایسا بھی نہیں کہ یہ فقر و احتیاج محض اور بنیادی ضروریاتِ زندگی تک محدد ہو بلکہ ان کا اصل وجود ہستی بھی لحہ بہ لحہ اس کردگار عالم کے فیض کی محتاج ہے.....اگر ایک لحہ کے لیے بھی مخلوق میں بے نیازی کا احساس پیدا ہو تو دنیا تہہ و بالا ہو جائے اور اجسام ٹوٹ پھوٹ جائیں۔

ہاں.....اس عالم ہستی میں صرف ذاتِ الٰہی ہے جو ہر لحاظ سے بے نیاز ہے، انسان کہ جو قدرت کا عظیم شاہکار اور جہانِ خلقت کا لہلہاتا پھول ہے.....جب وہی سر سے پاؤں تک ذاتِ الٰہی کا محتاج ہے تو پھر دوسری موجودات کا حال خود بخود معلوم ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں یوں ارشاد ہوا: واللہ ھو الغنی الحمید'' (صرف خدا ہی ہے جو بے نیاز اور ہر قسم کی حمد و ثناء کا مستحق ہے) چونکہ یہ جملہ ادبی اصولوں کی روشنی میں ''حصر'' پر دلالت کرتا ہے۔لہٰذا اس مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ مطلق غنی و بے نیاز صرف اور صرف خدا کی پاک ذات ہی ہے اگر انسانوں میں کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ غنی ہے اور وہ فقیر.....تو یہ تقسیم حقیقی نہیں نسبی ہے یعنی وہ شخص دوسرے کی نسبت غنی ہے اور فلاں شخص فلاں شخص کی نسبت فقیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ تمام موجودات سراپا فقر و احتیاج ہیں۔ جب کہ ذات پاک الٰہی سراسر غنیٰ و بے نیازی ہے اور یہی پہلی اور آخری بات ہے۔

بنابریں خدا کی ہرگز ہماری اطاعت و عبادت کی احتیاج نہیں اور نہ اسے ہماری مدح و ثناء کی ضرورت ہے، بلکہ روحانی تکامل کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ ہم جس قدر اس مبداء نور کے قریب تر ہوں گے اتنا ہی زیادہ نور اور روشنی پائیں گے اور جس قدر اس سرچشمہ فیض کے نزدیک ہوں گے اتنا ہی زیادہ فائدہ اٹھائیں گے۔اس کی ایک نہایت ناقص سی مثال یہ ہے کہ ہم اس گھاس پات اور درختوں کی طرح ہیں جو اپنے آپ کو سورج کی روشنی کے سامنے لاتے ہیں تاکہ روشنی پا سکیں جبکہ سورج کو ان کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اس حقیقت کا ادراک انسانوں کو توحید اور یکتا پرستی کا درس دیتا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی کے در پر نہ جھکیں، اس کے غیر کے سامنے سر تسلیم و تعظیم خم نہ کریں اور صرف اس کے سامنے دست سوال دراز کریں کہ وہی غنی و بے نیاز، رحم و کریم اور عنایتوں اور مہربانیوں والا ہے۔

اس حقیقت پر توجہ کرنا انسان کی تربیت پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ایک تو یہ اسے غرور اور خود پرستی کی سواری سے نیچے اتارتا

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر روح المعانی میں مورد بحث آیت کے ذیل میں دیکھیں۔

ہے.....دوسرے اسے ہر قسم کی وابستگیوں سے آزاد کر دیتا ہے اور خدا کے علاوہ ہر ایک سے بے نیاز کر دیتا ہے۔اس ادراک کی بدولت وہ عالم اسباب میں گم اور گمراہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی نگاہیں ہمیشہ صرف اور صرف ذات کردگار ہی کو مسبب الاسباب مان کر اسی پر جمی رہتی ہیں۔

اس مقام پر دو اہم مطالب پر توجہ کرنا ضروری ہے.....پہلی بات یہ کہ خداوند عالم کی صفت ''غنی'' کے بعد اس کی صفت ''حمید'' لائی گئی ہے اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ قرآن مجید میں اس صفت کا ذکر دس بار ہوا ہے، اس سے اس میں پائے جانے والے اہم نکتے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ممکن ہے وہ اہم نکتہ یہ ہو کہ عام طور پر اغنیاء و مالدار لوگوں میں مذموم صفات مثلاً تکبر، غرور، حرص اور بخل وغیرہ موجود ہوتی ہیں حتیٰ کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کے بھائی کے پاس ایک بکری ہو اور خود ان کے پاس ننانوے بکریاں ہوں تو وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک بکری بھی ان کے پاس آ جائے اور ایک بکری والا اس سے بھی محروم ہو کر رہ جائے۔لہٰذا غنی و ثروت مند کا لفظ اکثر ذہنوں میں ظلم و تکبر اور بخل و کنجوسی کی علامت بن چکا ہے۔.....لیکن خداوندِ عالم ''غنی'' ہونے کے ساتھ ساتھ رحیم، مہربان، عطا کرنے والا اور سخی بھی ہے۔اسی وجہ سے ہر طرح کی مدح و ستائش کے لائق ہے۔

ہاں.....وہ غنی جو ہر عیب (نقص سے پاک اور فضل و کرم، لطف و عنایت اور رحمت والا ہے۔وہ صرف اور صرف خدائے قدوس ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں خطاب انسانوں سے ہو رہا ہے اور وہی اس کے مخاطب ہیں (یاایھا الناس) اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام دیگر موجودات بھی ''فقیر الی اللہ'' خدا کی محتاج ہیں تو صرف انسانوں ہی کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے؟ اس کے جواب میں اکثر مفسرین کرام نے کہا ہے کہ جو چیز درجہ کمال پر ہو اس کا دائرہ احتیاج بھی وسیع ہوتا ہے۔اس لیے انسان کی احتیاجات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔وہ اپنی زندگی کے سفر میں احتیاجات کا طویل راستہ طے کرتا ہے۔اس لیے اس کی ضرورتیں بھی زیادہ ہیں۔اور وہ ان ضرورتوں اور حاجتوں کا احساس بھی زیادہ کرتا ہے.....جیسا کہ مادی احتیاجات میں بھی ایسا ہی ہے۔مثلاً ایک پرندہ سادہ سے آشیانے اور تھوڑی سی غذا پر قناعت کرتا ہے، جبکہ قسم قسم کے محلات و مکانات طرح طرح کے ملبوسات اور کثیر التعداد پکوان بھی انسانی روح کو سیر نہیں کر[1] تے

دوسری آیت ''انفاق فی سبیل اللہ'' کے سلسلے میں ہے کہ جس میں کچھ لوگ بخل اور کنجوسی کرتے ہیں۔جو لوگ اس میں بخل سے کام لیتے ہیں، حقیقت میں وہ اپنے آپ سے بخل کرتے ہیں (کیونکہ وہ خدا کے فیض و رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں) اس مقام پر ارشاد ہوتا ہے: واللہ الغنی وانتم الفقراء (خدا بے نیاز ہے جب کہ تم محتاج ہو) ممکن ہے کہ خدا کے غنی و بے نیاز ہونے و ہمارے فقیر و محتاج ہونے کا ذکر اس خاص انداز میں اس لیے ہو کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا حکم خدا نے اس لیے دیا کہ اسے ہمارے انفاق (خرچ کرنے

---

[1] بعض مفسرین نے اس مقام پر اس نکتے کی طرف بھی توجہ کی ہے کہ آیت میں ''الفقراء'' کا لفظ معرفہ ہے۔جب کہ ادبی لحاظ سے عام طور پر خبر نکرہ ہوتی ہے کیونکہ معرفہ ہونے کی صورت میں جب کہ مخاطب کو اس آیت پہچان ہو جاتی ہے۔تو پھر خبر کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی) اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر مقصد یاد آوری اور توجہ دلانا ہے یعنی مخاطب بھی جانتا ہے کہ وہ خدا کا محتاج (فقیر الی اللہ) ہے لہٰذا اس کا ذکر صرف یاد آوری کے لیے ہے۔اور علم بلاغت میں ہے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو جانتا ہو لیکن اس پر عمل نہ کرتا ہو تو اسے یاد دلانے کے لیے اسے جاہل فرض کرنا پڑتا ہے۔تاکہ وہ عمل کرنے کی طرف مائل ہو۔(غور کریں)

) کی ضرورت وحاجت ہے یا یہ جملہ سابقہ جملے۔''ولا یسئلکم اموالکم ''(خدا تمہارے اموال میں سے کچھ نہیں مانگتا)
ارشاد ہوا خداوندِ عالم غنی مطلق ہے اور سب اس کے محتاج ہیں اگر خدا نے لوگوں کو'انفاق فی سبیل اللہ''(اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) کا حکم دیا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کا محتاج ہے بلکہ یہ حکم خود ان ہی کے حاجت مند ہونے کے پیش نظر دیا گیا ہے کہ لوگ اس طریقے سے حصولِ کمال کا راستہ آسانی سے طے کر سکتے ہیں اور خدائے متعال کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آیت کا آغاز''مالی فقر وغنیٰ''سے متعلق ہے اور یہ''انفاق فی سبیل اللہ''کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کے ذیل میں آخری جملے کے مطلق ہونے کی وجہ سے پتہ چلتا ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے یہ آیت جس طرح خدا کو غنی مطلق کا نام دیتی ہے اسی طرح انسان کو سراپا احتیاج بناتی ہے ایسا محتاج کہ فقر واحتیاج اس کی ذات کی گہرائی تک پہنچ چکا ہے اس لیے اس آیت کو اس بحث میں دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے بہر حال قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ سب نعمتیں خدا نے ہی اپنے بندوں کو عطا کی ہیں اور پھر انہیں ان نعمتوں کو اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہا ہے کہ جو ان نعمتوں میں اضافے کا ذریعہ ہے یہ مفاد صرف مسئلہ انفاق ہی میں نہیں بلکہ خدا کی طرف سے دیئے گئے تمام احکامات میں جاری وساری ہے کیونکہ ان تمام اعمال کے نتائج خود بندوں ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ چیز قرآن کی متعدد آیات میں ذکر ہوئی ہے۔جیسے سورۂ سبا کی آیت ۴۷ میں ہے:''قل ماسالتکم من اجر فھو لکم ان اجری الا علی اللہ'' کہہ دیجئے کہ میں نے جو اجر تم سے مانگا ہے۔وہ خود تمہارے ہی لیے ہے میرا اجر تو خداوند عالم کے پاس ہے) سورۂ عنکبوت کی آیت ۶ میں آتا ہے:ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العالمین، جو شخص جہاد کرے وہ اپنے ہی لی جہاد کرتا ہے ، بے شک خدا تو کائنات سے بے نیاز ہے)۔

اس بحث کی تیسری اور آخری آیت میں موجودات کی احتیاج اور خدا کا غنی مطلق ہونا ایک نہایت عمدہ اور نئے انداز میں بیان کیا گیا ہے.....ارشاد ہوتا ہے۔:یسئلہ من فی السمٰوٰت والارض''(آسمانوں اور زمین میں رہنے والے سبھی اس سے مانگتے ہیں)اور وہ بھی ہر روز نئی عنایتوں اور نئی شان کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے(کل یوم ھو فی شان) چونکہ آیت میں''یسئل''فعل مضارع کے ساتھ آیا ہے جو استمرار اور ہمیشگی کو ثابت کرتا ہے لہٰذا یہ آیت وسیع معنی رکھتی ہے اور تمام انسانوں،فرشتوں اور آسمان وزمین کے رہنے والوں کو شامل ہے(بلکہ قوی امکان یہ ہے کہ تمام موجودات عالم(عاقل وغیرہ عاقل)اس میں آجاتے ہیں۔''لفظ''من کا استعمال جو صرف عاقل افراد کے لیے مخصوص ہے وہ غلبہ کی بنیاد پر ہے) چونکہ اس آیت میں مانگنے کا موضوع(مانگی جانے والی چیز) بھی مذکور نہیں.....اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مفہوم وسیع ہے وہ یوں کہ جہان خلقت کی تمام موجودات زبان سے زبانِ حال سے ہمیشہ اور مسلسل اس چشمہ فیض سے وجود ہستی کا فیض اور اس سے متعلق امور کا فیض طلب کرتے ہیں کیونکہ ممکن الوجود مخلوق کی ذات ہی میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ''حدوث''ہی میں نہیں بلکہ اپنی بقاء میں بھی ہر لحہ ذات واجب الوجود کی محتاج ہے اور اس سے اپنی ہستی ووجود کی طلب گار ہے۔

تفسیر روح البیان اور تفسیر روح المعانی میں قریباً ایک جیسے الفاظ وعبارت میں یہ ذکر ہوا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بسنے والی تمام مخلوق اپنی ذات اپنے حدوث وبقا اور دوسری تمام جہتوں اور پہلوؤں میں اپنی احتیاجات کو ہمیشہ کے مطالبے کی صورت میں خدا کے حضور پیش

کررہی ہے۔ کیونکہ وہ سب ''ممکن الوجود'' ہونے کے ناطے اپنی ذات کے لحاظ سے وجود اور اس کے کمالات سے محروم ہیں وہ یوں کہ اگر عنایت الہیہ سے ان کا رابطہ ایک لمحہ کے لیے بھی منقطع ہوجائے تو ان میں ''وجود'' کا نام ونشان تک باقی نہ رہے گا۔ لہٰذا وہ اس لحاظ سے ہر لمحہ سائل اور دستِ نیاز وراز کیے ہوئے ہیں [1]

مذکورہ بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جن لوگوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس آیت میں مخلوق کا خالق سے مانگنا اور اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا صرف رزق وروزی یا رحمتِ خداوندی اور دین ودنیا کی احتیاجات یا اپنی عاقبت اور خوش بختی وبدبختی سے آگاہ ہونے سے تعلق رکھتا ہے.....ان کا یہ خیال کسی ٹھوس دلیل کے بغیر ہے۔ اگرچہ یہ سب احتیاجات اس آیت کے وسیع مفہوم میں آجاتی ہیں.....لیکن ان پر انحصار ثابت نہیں ہے۔

توضیحات

(۱)۔ برہان وجوب وامکان فلسفی نقطۂ نظر سے:

یہ برہان ودلیل ان دلائل میں سے ایک ہے جنہیں سب لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اے عوام الناس کے عام انداز اور سادہ زبان نیز فلسفہ کی مخصوص اصطلاحات وتعبیرات کے ساتھ بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔

عام اور سادہ الفاظ میں اس طرح کہ..... جب ہم اپنی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنے آپ کو سراپا احتیاج پاتے ہیں۔ ایسی احتیاج کہ جسے ہم اپنے وجود کی اندرونی قوت سے پورا نہیں کرسکتے۔ اس احتیاج کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے وجود سے باہر کی دنیا کی طرف دستِ سوال دراز کریں، اس سلسلے میں ایک مشہور ضرب المثل ہے جو جس قدر غنی ہوگا اسی قدر محاج بھی ہوگا۔ پس کوئی انسان (مادی یا معنوی لحاظ سے) جس قدر طاقت ور ہوگا.....اس کی احتیاجات اس قدر وسیع ہوں گی۔ ایک جنگلی پرندہ تھوڑے سے دانے پانی اور درخت کے ایک پتے کے برابر آشیانے پر راضی وخوش ہے۔ لیکن ایک مقتدر بادشاہ کی زندگی میں ہزاروں ضرورتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک بڑے محقق کی ضرورتیں ایک عام طالب علم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں.....اس مشاہدے سے انسان اپنے وجدان کے ذریعے اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ اس کائنات میں غنیٰ وبے نیازی کا ایک ایسا سرچشمہ موجود ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں اور ہی ذاتِ والاصفات ہے جسے ہم ''خدا'' کہتے ہیں۔

علم کلام اور فلسفے ی رو سے اس مسئلے کا اس طرح ذکر کیا جاسکتا ہے کہ.....''وجود'' کی دو قسمیں ہیں، ایک ''ممکن'' اور دوسری ''واجب''.....واجب الوجود اسے کہتے ہیں جس کا وجود ذاتی ہو اور اس کی ہستی خود اس کی ذات ہی سے ہو اور اس کی ذات میں کسی قسم کی کوئی احتیاج نہ ہو جب کہ ممکن الوجود وہ جو خود کچھ نہیں رکھتا بلکہ سراپا احتیاج اور حاجت مند ہے یہی وجہ ہے ممکن الوجود کا علت کی طرف محتاج ہونا ایسے بدیہی اور واضح امور میں سے شمار کیا گیا ہے جس کے لیے کسی قسم کی دلیل وبرہان قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور کوئی شخص اس سلسلے میں

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۹ صفحہ ۲۹۹ تفسیر روح المعانی، جلد ۲۷ صفحہ ۹۵

شک کا شکار ہوتو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''ممکن'' الوجود'' کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکا ہے۔

اب سوال ہے کہ ممکن الوجود کیوں علت کا محتاج ہے اور اس کی احتیاج کی اصلی وجہ کیا ہے؟ آیا اس کی موجودیت یعنی اس کا موجود ہونا اس کی وجہ سے یا اس کا ''حدوث'' اور نو پید ہونا اس کا سبب ہے؟ یعنی اشیاء ''حادث'' ہیں، اس لیے علت کی محتاج ہیں۔ نہ اس لیے کہ موجود'' ہیں یا یہ کہ اصل وجہ نہ ان کا وجود ہے اور نہ ہی ان کا حدوث..... بلکہ اصل وجہ صرف امکان ''یعنی ان کا ممکن الوجود ہونا ہے کہ جس سبب سے وہ علت کے محتاج ہیں۔ لہٰذا ان کے محتاج ہونے کی علت وسبب کو ان کے اصل وجود یا ان کے حدوث میں نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ بلکہ ان کے احتیاج کی اصل وجہ وعلت ان کا ''امکان''، ممکن الوجود'' ہونا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تین جوابات میں سے صحیح جواب تیسرا ہے۔ کیونکہ اگر ہم امکان کے معنی کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور اس کی اصل بنیاد کو درک کر لیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں ''علت کی حاجت'' پوشیدہ ہے۔ یعنی ''ممکن الوجود'' اسے کہتے ہیں جسے فلاسفہ نے اپنی اصطلاح میں ''لا اقتضاء'' سے تعبیر کیا ہے کہ اس کی ذات نہ تو ''وجود'' کی طلب واقتضاء ہے اور نہ ہی ''عدم'' کی.....تو اس کے اپنی ذات میں بے حقیقت ہونے کے سبب اس کے وجود وعدم کے لیے کسی عامل کی ضرورت ہے.....اس لیے فلاسفہ کہتے ہیں ''حاجة الممكن اولية'' یعنی ممکن الوجود کا محتاج علت ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

مذکورہ بیان سے ایک اور نتیجہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ممکن الوجود کا واجب الوجود کی طرف محتاج ہونا صرف ابتداء وجود میں نہیں بلکہ اس کی بقاء کے تمام مراحل میں یہ احتیاج باقی ہے اور یہ احتیاج رہے گا گویا امکان اور احتیاج ہر دو لازم وملزوم ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ جب ہم قلم ہاتھ میں لے کر کاغذ پر کچھ لکھنے کے لیے اسے حرکت دیتے ہیں تو اس قلم کا چلنا اپنے سے باہر کی قوت کا محتاج ہے اور وہ ہماری انگلیاں ہیں جب ہمارا ہاتھ اور انگلیاں حرکت میں ہیں تو قلم بھی چل رہا ہے پھر جونہی ہاتھ اور انگلیاں رک گئیں تو قلم بھی رک گیا۔ اس سے بھی واضح مثال ہماری رُوح کے افعال ہیں۔ مثلاً ہم ارادہ کرتے ہیں کہ فلاں کام کو بجالائیں..... یہ ارادہ ہماری رُوح کا ایک فعل ہے اور اسی سے وابستہ ہیں اور ہمارا یہ وجود اپنی وابستگی کے پیش نظر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا ہماری اس وابستگی اور ہر لمحہ ذاتِ حق تعالیٰ سے احتیاج کو ایک فارسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

نے زنالہ واماند چوں زلب جدا ماند

وای اگر دل خودرا ازخدا جدا داری

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ جب کوئی معمار ہمارا مکان بناتا اور پھر کسی وقت اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ہمارا مکان اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ امکان موجود ہے کہ کوئی ''فعل'' اپنی بقاء میں ''فاعل'' کا محتاج نہ ہو۔ اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ یہ بقاء اس وجہ سے ہے کہ ایک علت کی جگہ دوسری علت نے لے لی ہے وہ یوں کہ ابتداء میں معمار کے تجربہ کار ہاتھوں نے اینٹوں کو نہایت مناسب اور موزوں طریقے سے لگایا۔ یعنی اس نے ایک اینٹ پر دوسری اینٹ اس طرح رکھی کہ اب اینٹوں کا بوجھ، ان کی قوت جاذبہ اور گارے یا سیمنٹ کی پیوستگی اس مکان کو باقی رکھے ہوئے ہے۔

خلاصہ یہ کہ ممکن الوجود کا ''ایک ''ربطی'' وجود ہے یعنی کسی کے ساتھ مرتبط ہے جب اس کا ربط کسی مستقل اور ہمیشہ پابرجا وجود سے نہیں ہوگا تو وہ قائم نہیں رہ سکے گا۔ بنابریں ایک ''ربطی وجود'' کو اچھی طرح سمجھ لینا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس سے ہم ایک ''مستقل وجود'' کا سراغ لگا سکیں۔ اگر ایسا ہوجائے تو پھر طویل بحثوں اور ''دور وتسلسل'' کی گہرائیوں میں جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ (غور کریں)

(۲).....اسلامی روایات میں دلیل غنیٰ وفقر کا ذکر:

امام حسین علیہ السلام کی مشہور ومعروف دعاء روز عرفہ جو معصومین علیہم السلام کی ان بلند پایہ دعاؤں میں سے ہے کہ جن خصوصاً مسائل توحید نہایت عمیق اور عظیم مطالب کے ساتھ مذکور ہیں۔

اس دعا میں امام علیہ السلام یوں فرماتے ہیں۔

''کیف یستدل علیك بما هو فی وجودہٖ مفتقر الیك؟ ایکون لغیرك من الظهور مالیس لك حتیٰ یکون هو المظهر لك۔ [۱]

''جو موجودات اپنے وجود ہی میں تیرے محتاج ہیں ان کے ذریعے تیری ذات پر کیونکر استدلال کیا جاسکتا ہے؟ کیا کوئی تجھ سے زیادہ ظاہر وجلوہ نما ہے۔ کہ وہ تیری ذات کی پہچان کروائے؟''

اسی دعا میں ایک اور مقام پر اس طرح ارشاد فرمایا:

''الهی انا الفقیر فی غنای فکیف لاا کون فقیراً فی فقیری''۔

خدایا! میں اپنی غنا وتونگری کی حالت میں تیرا محتاج ہوں تو اپنے فقر وناداری میں کیسے تیرا محتاج نہ ہوں گا۔

ایک مشہور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے۔

''الفقر فخری وبہٖ افتخِرُ''[۲]

''فقر میرا فخر ہے اور میں اس پر ناز کرتا ہوں۔

اس روایت کی ایک مشہور توضیح اس طرح کی گئی ہے کہ آنحضرتؐ نے فقر کو اپنے لیے فخر ومباہات کا سبب اس لیے قرار دیا کہ خدا کے حضور اپنی ذات میں فقر کا احساس ہی سرمایہ افتخار ہے۔ یہاں فقر کا مطلب تنگ دستی اور مخلوق کی طرف احتیاج نہیں ہے۔ کیونکہ روایات میں اس

---

[۱] اس جملے سے ''برہان صدیقین'' میں بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ انشاءاللہ مذکورہ برہان میں اسے وضاحت سے بیان کیا جائے گا۔

[۲] بحارالانوار جلد ۶۹ صفحہ ۵۵ (بیروت) تفسیر روح البیان، جلد ۷ صفحہ ۳۳۴۔

کی مذمت آ چکی ہے:

"کادَ الفقر ان یکون کفرًا۔ [1]

''قریب ہے کہ فقر وتنگدستی کفر قرار پائے۔''

یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض کیا:

"اللھم اغنی بالافتقارِ الیك ولا تفقرنی بالاستغناءِ عنك۔ [2]

''خدایا! اپنی طرف احتیاج کی بدولت مجھے (اپنے غیر سے) بے نیاز فرما اور اپنی ذات سے استغناء و بے نیازی کے احساس سے مجھے (کسی کا) فقیر ومحتاج نہ بنا۔''

ہرچہ جز عشق حقیقی شد، وبال!
ہرچہ جز معشوق باقی شد، خیال
ہست درد صلت غنا اندر غنا!
ہست درہجرت غم وفقر وعنا!

عشق حقیقی کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ وبال اور مصیبت ہے، معشوق کے سوا جو کچھ باقی ہے اور خیال ہی خیال ہے، تیرے وصل میں غنا اور غیروں سے بے نیازی ہے، تیرے ہجر میں غم فقر وتنگی اور مشکلات ہیں۔

---

[1] بحارالانوار، جلد ۶۹ صفحہ ۳۰۔

[2] سفینۃ البحار، جلد ۲ صفحہ ۳۷۸، تفسیر روح البیان، جلد ۷، صفحہ ۳۲۴۔

برہانِ علت ومعلول

اشارہ:

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جس دنیا میں ہم زندگی بسر کررہے ہیں وہ علت ومعلول کا ایک مجموعہ ہے.....اور ''علیت'' اس دنیا جہان کا ایک نہایت واضح اصول وقانون ہے۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ ہم یہ کرہ ارض کہ جس پر ہم زندگی گزار رہے ہیں..... ہمیشہ سے نہیں تھے بلکہ کسی علت کا معلول ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آیا ''علت ومعلول'' کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے..... یہ یونہی چلتا رہے گا اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے؟ اگر ایسا ہو تو اس سے تسلسل لازم آئے گا یعنی ہر علت'' اپنے مقام پر کسی اور ''علت'' کی معلول ہوگی اور یہ سلسلہ کہیں بھی ختم نہیں ہوگا یعنی کوئی ایسی انتہا نہیں ہوگی کہ پھر ''علت'' کی ضرورت نہ ہو۔

یہ ایسی بات ہے کہ جسے وجدان تسلیم نہیں کرسکتا..... یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم صفر (۵) کو لامتناہی صورت میں یک جا کریں، ایک دوسرے کے ساتھ رکھیں اور وہ ''ایک'' کا عدد بن جائیں؟ (اس مثال میں صفر سے مراد وہ شئے ہے جو اپنی ذات میں اپنا کوئی وجود ہستی نہیں رکھتی.....اس کا وجود خود سے نہیں..... بلکہ ''علت'' کی وجہ سے وجود میں آتی ہے) تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ سب فقیر ومحتاج لامتناہی صورت میں یکجا ہوجائیں اور ان کے اکٹھے ہونے سے ایک غنی وبے نیاز کا وجود تحقیق پذیر ہوجائے۔

بنابریں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ ''علت ومعلول'' کا یہ سلسلہ بالآخر ایک ایسے مقام پر جا کر رک جائے گا کہ جہاں صرف علت ہی ہو اور معلول نہ ہو.....یعنی اس کا وجود خود سے ہو، اگر اس بات کی گہرائی میں جائیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ آخری علت، خود سے موجود، لامتناہی ہستی اور واجب الوجود ہے۔

خداوند عالم کے ازلی وابدی ہونے کی یہ نہایت واضح دلیل ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وجود خدا کے اثبات کے لیے قائم کی جانے والی تمام دلیلوں کی بازگشت اسی ''برہان علت ومعلول'' کی طرف ہوتی ہے اور اس سے استفادہ کیے بغیر ہر دلیل وبرہان ناممکن اور ناقص رہتی ہے۔ اس مختصر اشارے کی روشنی میں ہم چند آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

(۱) اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾ (الطور: ۳۵)

(۲) اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳۶﴾ (الطور: ۳۶)

(۳) اَمۡ لَهُمۡ اِلٰهٌ غَیۡرُ اللّٰهِ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۴۳﴾ (الطور: ۴۳)

(۱) ''کیا وہ کسی سبب کے بغیر ہی پیدا ہو گئے یا پھر خود ہی اپنے خالق ہیں؟''

(۲) ''کیا آسمانوں اور زمین کو انہوں نے پیدا کیا ہے، بلکہ وہ یقین سے محروم ہیں۔''

(۳) ''کیا خدا کے علاوہ ان کا کوئی معبود ہے؟ خدا اس سے پاک ہے جسے وہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔''

الفاظ کی تشریح:

''خلقوا'' کا مادہ ''خلق'' ہے.....اس کا معنی صحیح طور پر اندازہ گیری کرنا ہے کسی اصل و مادہ اور کسی سابقہ مثال کے بغیر ایک چیز کا ایجاد کرنا اور بنانا بھی ایک طرح کی اندازہ گیری ہی تصور کی جاتی ہے جو اس کے تمام پہلوؤں سے متعلق ہو.....اسی طرح یہ لفظ (خلق) ''ابداع'' بغیر نمونے کے بنانے اور نئی تخلیق کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہ لفظ ایک چیز سے دوسری چیز بنانے کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۂ نحل آیت (۴) میں ارشاد ہوا: خلق الانسان من نطفةٍ (خدا نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا)۔

یہ ایک واضح امر ہے کہ ''خلقت'' ابداع اور عدم سے وجود میں لانے کے معنی میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا.....لہٰذا اس طرح کی خلقت اور تخلیق کی خدا کے علاوہ ہر ایک سے نفی کی گئی ہے چنانچہ ارشاد فرماتا ہے۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۱۷ ﴿النحل: ۱۷﴾

''کیا وہ جو ابداع و ایجاد کرتا ہے اور وہ جو ایسا نہیں کرتا دونوں برابر ہیں؟ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے ہو۔'' البتہ دوسرا معنی یعنی کسی چیز کا کسی اور چیز سے تخلیق کرنا اور اس کی اندازہ گیری کرنا.....خدا کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس مفہوم کو سورۂ مومنون کی آیت (۱۴) میں یوں بیان کیا گیا ہے:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۱۴ ﴿المؤمنون: ۱۴﴾

''بابرکت ہے وہ خدا جو سب تخلیق کرنے والوں میں احسن اور بہتر ہے۔''

یہ لفظ ''خلق'' کبھی جھوٹ کے معنی میں بھی آتا ہے شاید یہ اس لیے ہو کہ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو گویا ایک ایسی چیز ایجاد کرتا ہے جو موجود نہیں ہوتی اور وہ اسے زبان سے بول کر خلق کرتا ہے۔

کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں لفظ ''خلق'' کے دو بنیادی معنی ذکر ہوئے ہیں ایک اندازہ گیری (ناپ تول) اور دوسرے صاف و نرم ہونا.....یہی وجہ ہے کہ ایک صاف اور نرم پتھر کو ''صخرۂ خلقاء'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ پرانی چیزیں جو کافی عرصہ گزر جانے کے باعث صاف

اورنرم ہوجاتی ہیں۔ان پر بھی لفظ ''بروزن ''شفق'' استعمال کیا جاتا ہے نیز لفظ ''اخلاق'' جس کا معنی ''اچھی اور پسندیدہ عادات'' ہے.....وہ پہلے معنی یعنی اندازہ گیری سے لیا گیا ہے۔(کیونکہ وہ انسان کی شخصیت اور روحانی قدروں کی صحیح اندازہ گیری کرتی ہے)۔

تفسیر آیات

ایک عجیب سوال:

مذکورہ آیات سورۂ طور کی نو آیات میں سے ہیں.....اس مقام پر مجموعی طور پر گیارہ سوالات ہیں جو استفہام انکاری کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ آیات انسان کو ملے جلے سوالات کے عجیب سے موڑ پر لا کھڑا کرتی ہیں اور پھر اسے اپنی ہی عقل کے سامنے اس طرح لاجواب کر دیتی ہیں کہ وہ حق کو تسلیم کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔

یہ گیارہ تین مقاصد سے متعلق ہیں.....ایک توحید کا اثبات، دوسرے قیامت اور تیسرے نبی اکرمؐ کی رسالت.....لیکن ان میں سے اہم اور بنیادی مسئلہ خالق کی توحید اور اس کی معبودیت ہے۔

مذکورۂ آیتوں (طور۔ ۳۵۔۳۶، ۴۳) میں سے پہلی آیت میں یوں ارشاد ہوا: **ام خلقوا من غیر شیءٍ ام ھم الخالقون** (کیا وہ کسی سبب کے بغیر پیدا ہوئے یا وہ اپنے خالق خود ہی ہیں)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر انسان مخلوق اور حادث ہے اور وہ تین حالتوں سے خالی نہیں یعنی وہ کسی علت وسبب کے بغیر پیدا ہوا خود ہی اپنے وجود کی علت ہے یا اس کے وجود کی علت وسبب ایک ازلی وابدی وجود (خدا) ہے چونکہ پہلا اور دوسرا احتمال کسی طرح بھی عقل ووجدان کے مطابق نہیں ہے لہٰذا صحیح جواب وہی تیسرا احتمال ہے یہی وجہ ہے کہ آیات میں پہلے اور دوسرے احتمال کو ''استفہام انکاری'' کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے.....جب یہ دونوں احتمال بھی سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ ہر انسان کسی اور علت کا معلول ہو وہ علت بھی اپنے مقام پر کسی اور علت کی معلول ہو اسی طرح یہ سلسلہ لامتناہی طور پر چلتا رہے.....لیکن اس قسم کا احتمال عام طور پر فلاسفہ ہی دیتے ہیں اور عوام الناس اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں شاید اسی وجہ سے مذکورہ بالا آیت میں اس کا تذکرہ نہیں ہوا پھر بھی اس احتمال کا بطلان اور نادرست ہونا واضح ہے کیونکہ علت ومعلول کا تسلسل عقل ومنطق اور وجدان کی روشنی میں محال ہے اس سلسلے میں مزید وضاحت اور تفصیل ''توضیحات'' کے زیرعنوان بیان کی جائے گی۔

اس مقام پر اکثر مفسرین نے اس آیت کی کئی دیگر تفسیریں بھی ذکر کی ہیں لیکن الفاظ وعبارات کے مختلف ہونے کے باوجود سب کا ہدف ومقصد آفرینش اور مسئلہ تخلیق کسی ہدف ومقصد فرائض ووظائف امر ونہی جزا وسزا اور ثواب وعقاب کے بغیر نہیں ہوئی ہے.....اس مفہوم کو سورۂ مومنوں کی آیت ۱۱۵ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا ﴿المؤمنون: ۱۱۵﴾ [1]

''کیاتمہاراخیال ہے کہ ہم نے تمہیں عبث اور بے مقصد پیدا کیا ہے:۔

لیکن آیت کے ذیل کو ملاحظہ کریں تو اس احتمال کی سرے ہی سے نفی ہوجاتی ہے کیونکہ اس میں آیا ہے۔ ام ھم الخالقون (یا وہ خود خالق ہیں) اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا جملہ بھی انسان کی تخلیق کی علت وسبب کے بارے میں ہے نہ کہ اس کی تخلیق کے ہدف کے بارے میں دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس آیت کا تعلق اور توجہ علت فاعلی کی طرف ہینہ کہ علت غائی کی طرف!

دوسری آیت میں آسمانوں کی خلقت کا تذکرہ ہے اور اس دلیل یعنی علت ومعلول کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں بھی پیش کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ام خلقو السمٰوٰت والارض (کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟) یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ آسمان اور زمین حادث اور نو پیدا ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ تغیرات وحوادث کا شکار ہو کر نت نئی حالت میں آتے ہیں جو چیز اس طرح کی ہو کہ اس میں ہر قسم کی تبدیلی آسکتی ہو وہ کبھی حادث ہونے سے بچ نہیں سکتی، اس صورت میں ان کے خالق کی بات سامنے آئے گی کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ آیا وہ آپ اپنے خالق ہیں یا ان کا کوئی خالق نہیں اور وہ یونہی پیدا ہو گئے یا انہیں انسانوں نے خلق کیا ہے؟

چونکہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے لہٰذا معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کا کوئی خالق ہے اور وہ ایسا ہے جو خود مخلوق نہیں بلکہ ازلی وابدی ہے اس مقام پر نہایت قابلِ توجہ اور دلچسپ بات ی ہے کہ اس آیت میں صرف انسانوں کے خالق کی بابت سوال ہوا ہے یعنی انسانوں کے خالق کے بارے میں استفہام انکاری کی صورت میں سوال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے احتمالات کے بارے میں پہلی دو آیات میں واضح بیان گزر چکا ہے۔ اس لیے فصاحت وبلاغت کا تقاضا ہے کہ اس کا دوبارہ ذکر نہ کیا جائے اور تکرار سے پرہیز کیا جائے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا دو آیتیں برہان علت ومعلول کو ''آفاق'' اور ''نفس'' دونوں کے لیے ذکر کر رہی ہیں نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ دوسری آیت اس حقیقت پر گواہ ہے کہ بات علت فاعلی کی ہے نہ کہ علت غائی اور تخلیق کے ہدف کی بات ہوئی ہے۔

اس آیت کے آخر میں حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس موضوع کی بابت تمام مسائل واضح ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ لوگ خود ایمان ویقین کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے (بل لا یوقنون)

یقیناحق واضح ہے لیکن لوگ حق کے دشمن اور جھگڑالو ہیں..... درحقیقت یہ جملہ (بل لا یوقنون) اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے جو سورۂ جاثیہ کی آیت ۴ میں آچکا ہے: (وفی خلقکم وما یبث من دآبۃٍ اٰیاتٌ لقومٍ یوقنون) (تمہاری تخلیق اور جو چلتے پھرتے حیوان زمین میں پھیلے ہوئے ہیں، ان سب میں ان لوگوں کے لیے واضح نشانیاں ہیں جو اہلِ یقین ہیں..... اسی طرح سورۂ ذاریات کی آیت ۲۰ ہے کہ جس میں کہا گیا ہے: وفی الارض اٰیاتٌ للموقنین (زمین میں ان لوگوں کے نشانیاں موجود ہیں جو اہل یقین ہیں)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر المیزان، تفسیر روح المعانی اور تفسیر روح البیان میں اس مطلب کو آیت کے اصل معنی یا ایک (احتمال کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اس بیان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں نے یقین پیدا کرلیا ہوتا اور اہل یقین بن چکے ہوتے تو نشانیوں کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔لہٰذا یہ بات ان لوگوں کے بارے میں ہے کہ جو یقین کی دولت سے محروم ہیں لیکن اسے حاصل کرنے اور حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ وتیار ہیں۔

چند مفسرین نے اس جملے کی تفسیر اس طرح کی ہے.....انہیں یقین نہیں ہے کہ وہ خود آسمانوں اور زمین کے خالق ہیں بلکہ وہ خدا ہی کو ان کا خالق مانتے ہیں،جیسا کہ سورۂ لقمان آیت ۲۵ میں آیا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴿لقمان: ۲۵﴾ [1]

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا ہے۔

لیکن اس طرح تفسیر کرنا بظاہر درست نظر نہیں آتا،اس سے بھی کمزور اور ناپختہ بات ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ آیت کا معنی یہ ہے: وہ لوگ اپنے اس قول پر پختہ یقین نہیں رکھتے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے.....انہیں ایسا یقین نہیں ہے جو ان کو خدا کی اطاعت وبندگی کی طرف لے جائے۔اس نظریے کا نادرست ہونا اسی سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان آیات میں خدا کا آسمانوں اور زمین کا خالق ہونا موضوع کلام ہی نہیں تو پھر اس جملہ میں کیونکر اس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

بالآخر تیسری آیت میں گذشتہ استدلال سے نتیجہ گیری کے طور پر اس طرح ارشاد ہوا: کیا خدا کے علاوہ ان کا کوئی معبود ہے؟ (اٰلٰهٌ مع الله غیر الله) پاک ہے خدا اس سے کہ جو شرک وہ کرتے ہیں!

(سبحان الله عما یشرکون)

درحقیقت یہ خدا کی توحید وحدانیت کی ایک دلیل ہے،یعنی جب وہ کائنات کا خالق ہے تو عبادت بھی صرف اسی کی ہونی چاہیے،نہ کہ بتوں کی،نہ سورج،چاند اور ستاروں کی اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی مخلوق کی عبادت ہونی چاہیے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ان تین آیات میں جو تین سوالات ''استفہام انکاری'' کی صورت میں پیش کیے گئے ان کے علاوہ مزید سات سوالات بھی ان کے ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں کہ جن کا تعلق نبوت اور دیگر موضوعات سے ہے.....لہٰذا یہ بحث کہ جس کا تعلق توحید سے ہے،اس میں ان سوالات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے [2]

---

[1] تفسیر کشاف میں زمخشری نے اس مطلب کو تسلیم کیا ہے البتہ فخر رازی اور کچھ دیگر مفسرین نے سے ایک احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے۔

[2] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ فارسی،جلد ۲۲ صفحہ ۴۵۲ سے آگے دیکھیں۔

توضیحات

برہان علت ومعلول فلسفہ وعلم کلام میں

برہان علت ومعلول وجود خدا کے اثبات کے سلسلے میں قدیم ترین اور مشہور ترین دلیل ہے کہ جسے اس موضوع میں پیش کیا جاتا ہے، یونان کے قدیم فلاسفہ میں سے ''ارسطو'' جو میلاد مسیح سے پہلے قرن چہارم میں ہوگزرا ہے.....اس کے بعد سے آج تک سب فلاسفہ نے اسی دلیل کا سہارا لیا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ توحید کے اثبات کے سلسلے میں جتنے دلائل پیش کئے گئے ہیں ''وہ برہان علیت'' کے بغیر نامکمل رہتے ہیں۔

اس دلیل واستدلال کی اصل بنیاد اساس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے درج ذیل امور سے آگاہی حاصل ہو۔

(۱) قانون علیت کی تعریف:

علیت دو چیزوں کے درمیان ایسے وجودی رابطے کا نام ہے کہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو، یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ''علیت سے مراد (حوادث کا پے در پے ظاہر ہونا ہے۔علیت کی یہ تعریف ناقص ہے اصل بات یہ ہے کہ ہر ''معلول'' اپنی علت کے بعد ہی حادث ہوتا (وجود میں آتا) ہے لیکن علیت کے مفہوم کے لیے اتنا کہنا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ رابطہ اس طرح کا ہو کہ ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر وجود ہی میں نہ آسکے (صرف بعد میں آنا کافی نہیں ہے)۔

(۳) قانون علیت کی وسعت وکارگزاری:

بعض محققین کے بقول، فلسفی مسائل میں قانون علت ومعلول سب سے پہلا اور قدیم ترین مسئلہ ہے کہ جس نے انسانی سوچ کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور اسے اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے وجود وہستی کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔جو شخص عظیم فکری صلاحیت کا مالک ہو اس کے لیے قانونِ علت ومعلول کی کلیت اور ہمہ گیری کا ادراک ہی اہم ترین فکری عمل ہے، کیونکہ یہ قانون انسان کے لیے اس امر کو واضح کرتا ہے کہ ہر ''حادث'' کے لیے علت'' ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ اس قانون کی روشنی میں انسان کے ذہن میں ''کیوں'' کا مفہوم جنم لیتا ہے.....اگر انسان علت ومعلول کے کلی مفہوم کو نہ سمجھتا اور قانون علیت کو تسلیم نہ کرتا تو اس کے ذہن میں ''کیوں'' کا مفہوم کبھی پیدا نہ ہوتا[1]

حقیقت یہ ہے کہ وہ ''کیوں'' ہی ہے جو تمام انسانی علوم کے وجود میں آنے کا سبب ہے اسی نے انسان کو اس جہان ہستی کی موجودات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے حوادث وواقعات کے اسباب کو سمجھنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

---

[1] کتاب ''اصول فلسفہ جلد ۳ ص ۱۷۵ کے حاشیے سے اقتباس وتلخیص

دوسرے الفاظ میں تمام علوم کی اصل بنیاد یہی قانون علیت ہے اور سب علوم اس کے آثار شمار کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ قانون ان علوم سے الگ کرلیا جائے تو ان کی اپنی کوئی حقیقت باقی نہیں رہے گی اسی طرح اگر علیت کا قانون ختم ہوجائے تو فلسفے کی بلند و بالا عمارت گر کر پاش پاش ہوجائے گی۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام علوم وافکار اور فلسفہ کی اصل بنیاد اور سہارا یہی قانون ہے۔

(۳) قانون علیت کی شناخت کا سرچشمہ:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا کہ انسان نے قانون علیت کو کہاں سے پہچانا؟ یقینی بات ہے کہ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں بہت پیچھے جانا ہوگا اور اپنے بچپن کے حالات کی اس وقت سے چھان بین کرنا ہوگی۔ کہ جب ہمیں عقل وشعور حاصل ہوا تھا۔

بچہ جب آگ کو چھوتا ہے تو جلن محسوس کرتا ہے، جب دوبارہ ایسا کرتا ہے تو اسے وہی احساس ہوتا ہے اور بار بار ایسا کرنے سے اس کو یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ ان دو چیزوں (آگ میں ہاتھ ڈالنے اور سوزش کا احساس کرنے کے درمیان ایک رابطہ اور تعلق ہے، اسی طرح جب وہ پیاسا ہوتا ہے اور پانی پیتا ہے تو پیاس کے ختم ہونے اور سکون حاصل ہونے کا احساس کرتا ہے پھر بار بار ایسا کرنے سے ان دو امور کے درمیان رابطے وہ تعلق کا یقین حاصل کرلیتا ہے جب وہ اس طرح کا تجربہ دوسرے موارد اور موضوعات میں کرے اور مختلف امور میں اس تجربے کو انجام دے تو اسے یہ یقین حاصل ہوجائے گا کہ ہر حادث اور نو پید چیز کی کوئی نہ کوئی علت ہے اس طرح وہ قانون علیت سے اجمالی طور پر آگاہ ہوجائے گا۔

پھر جوں جوں عمر گزرے گی اور وہ زندگی کے مختلف مراحل، روزمرہ کے معمولات ومعارف میں تجربات حاصل کرلے گا تو اس قانون (قانون علیت) کی وسعت کو مزید درک کرے گا (اور اس کے بعد فلسفی دلائل سے بھی اس قانون کو سمجھ لے گا) ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ دو حوادث کا پے درپے رونما ہونا اور وجود میں آنا ہی علت ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کام (دو حوادث کا پے درپے ہونا) اس تکرار سے اور بار بار ہو کہ ان دونوں کے درمیان پایا جانیوالا رابطہ اور دوسرے کا پہلے سے وابستہ ہونا معلوم وواضح ہوجائے جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ قانون علیت کا تعلق تجربے سے ہے۔ ان کی مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہر چیز کی اصل وبنیاد کو تجربے سے سمجھتا اور پھر عقلی تجزیہ وتحلیل کے ذریعے علیت کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ درحقیقت وہ ایک مقدمہ حس وتجربے سے اور دوسرا عقل وخرد سے حاصل کرتا ہے کیونکہ کلی قانون کا مقام ''عقل'' ہے اور وہ ہمیشہ عقل ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے..... حس وتجربے کا کام مختلف موضوعات کو سمجھنا ہے، پھر عقل ان سب کو یک جا کرکے نتیجہ اخذ کرلیتی ہے۔

بعض دانشوروں کا نظریہ ہے کہ قانون علیت جو ایک علم حصول ہے وہ نفس کے علم حضوری سے حاصل ہوا ہے کہ جو نفس ہی کے افعال سے تعلق رکھتا ہے وہ اپنے اس خیال کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ انسانی رُوح اپنے اندر کچھ ایسے امور کو محسوس کرتی ہے جو خود اسی سے وابستہ ہیں مثلاً ہر قسم کے تصورات، فکر وارادہ اور تصمیم یہ سب انسانی روح کے افعال اور اسی کے معلول ہیں ان افعال اور رُوح کے درمیان جو رابطہ ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے ہم قانون علیت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس نظریئے کی تصدیق میں ''بوعلی سینا'' کا یہ قول پیش کیا ہے: اگر

کوئی شخص یہ گمان کرے کہ علیت کے رابطے کو ''حس'' سے کشف کیا جاسکتا ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے کیونکہ قوت ''حس'' ہمیں دو چیزوں کے درمیان مقارنت کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتا سکتی [1]

لیکن یہ نظریہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے..... یہ بات بھی صحیح نظر نہیں آتی کہ ''بوعلی سینا'' کے بیان کا وہی مطلب ہو جو ان دانشوروں نے لیا ہے۔ کیونکہ رُوح اور اس کے افعال کے بارے میں تجزیہ وتحلیل فلاسفہ کا کام ہے نہ کہ عام لوگوں کا..... جب کہ قانون علیت کو عام لوگ حتیٰ کہ بچے بھی سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں اس امر میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ انہوں نے یہ سب کچھ اپنے ''حسی'' وخارجی تجربات سے حاصل کیا ہے جس کی وضاحت ہم نے پہلے کردی ہے۔ البتہ جب تک عقل ان تجربات کا تجزیہ وتحلیل نہ کرے اور جزئی امور کو ایک کلیہ کی صورت میں پیش نہ کرے تو ہمارے پاس ''قانون علیت'' نام کی کوئی چیز موجود نہ ہوسکتی تھی۔ پس واضح ہوا کہ اس قانون کو جاننے پہچاننے کی بنیاد تجربہ ہے اور عقل بھی اس میں مدد دیتی ہے۔ شاید بوعلی سینا کا مدعاء بھی یہی ہے اور اس کے علاوہ مذکورہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے تاہم اس امر سے ہمیں کوئی انکار نہیں کہ فلاسفہ وروں کے لیے قانونِ علیت کا پہچاننا جس طرح حس وحواس کے ذریعے امکان پذیر ہے۔ اسی طرح اسے افعال نفس کے ذریعے بھی اچھی طرح پہچانا جاسکتا ہے۔

ان کے علاوہ اس سلسلے میں ایک اور واضح دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ اگر ہم قانون علیت کا انکار کریں تو دنیا میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کے وجود میں آنے کی شرط نہ ہوگی اور سب چیزیں اس طرح ہونگی کہ ہر چیز ہر دوسری چیز سے وجود میں آسکے۔ اس صورت میں ہمیں ہر قسم کے عقلی استدلالات کا بھی انکار کرنا ہوگا اور پھر کوئی منطقی نتیجہ حاصل کرنے کے لیے خاص دلائل سے استفادہ نہیں کیا جاسکے گا جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا اور کوئی عقل مند اسے قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ عقلی وخارجی تمام اُمور میں علیت کا رابطہ پایا جاتا ہے۔

(۴) علت کی قسمیں:

علت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس کی بہت زیادہ قسمیں ہیں۔

علت تامہ: یعنی وہ چیز کہ جب بھی وہ وجود میں آئے تو بلا فاصلہ اس کا معلول بھی وجود میں آجائیگا۔ علت ناقصہ: یعنی اسی چیز جو اپنے معلول تک پہنچنے کے لیے کئی دیگر اُمور کی محتاج ہو۔

اسی طرح علت کی چار قسمیں ہیں کہ جو نہایت معروف ہیں۔ علت مادی، علت صوری، علت فاعلی اور علت غائی..... انہیں ایک نہایت سادہ اور عام فہم مثال کے ذریعے بیان کیا جاسکتا ہے جو لباس ہم نے پہنا ہوا ہے اس پر غور کریں تو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی تیاری کے لیے سب سے پہلے ایک مواد (مثلاً روئی یا پشم کے کپڑے) کی ضرورت ہوتی ہے، پھر یہ ضرورت ہوتی ہے، کہ وہ مواد ایسی صورت میں تبدیل ہوجائے کہ جسے لباس کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔

---

[1] کتاب ''الشفاء فصل اول، پہلا مقالہ از الٰہیات صفحہ ۸۔

پس ایک ماہر درزی اسے لباس کی شکل دینے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرے، ظاہر ہے کہ اس درزی نے اسے ایک خاص مقصد (پہننے) کے لیے بنایا ہے۔اس طرح ایک لباس میں یہ چاروں علتیں وجود میں آ گئیں، یعنی ایک مواد ہے، جسے ''علت مادی'' کہتے ہیں، جو شکل وصورت اسے دی گئی ہے وہ ''علت صوری'' جس نے اسے لباس کی شکل دی ہے وہ ''علت فاعلی'' اور جس غرض کے تحت اسے بنایا گیا ہے اسے ''علت غائی کہتے ہیں یہ بات واضح ہے کہ ''برہان علت ومعلول'' جس کی بابت ہم یہ سب مطالب بیان کر رہے ہیں۔اس میں ہماری بنیادی توجہ ''علت فاعلی'' کی طرف ہے اور اسی پر ہماری تمام تر کاوش مرکوز ہے۔

برہان علیت کی وضاحت:

مذکورہ مقدمات اور تمہیدی بیانات کے بعد اب ہم اصل ''برہان علیت'' کو بیان کرتے ہیں۔

برہان علت ومعلول درحقیقت چند بنیادوں پر استوار ہے:

(۱) یہ جہان جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں ''حادث'' اور ''ممکن الوجود'' ہے۔

(۲) ہر ''حادث'' اور ممکن الوجود ''چیز کی بازگشت'' ''واجب الوجود'' کی طرف ہونی ضروری ہے.....دوسرے لفظوں میں تمام وابستہ وجود ایک مستقل وجود تک پہنچنے چاہئیں۔

پہلے مقدمے یعنی اس جہان کے ''حادث'' (نو پید) ہونے کی بابت ہم اس سے پہلے بہت کچھ بیان کر چکے ہیں اب ہم دوسرے مقدمے کے اثبات کی طرف توجہ کرتے ہیں:

یہ مقدمہ اس قدر واضح ہے کہ مادیین اور خدا کے وجود کا انکار کرنے والوں نے بھی اسے تسلیم کیا ہے، البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ''مادہ'' (MATTER) ہی ازلی، ابدی اور مستقل بالذات وجود ہے لیکن اس سلسلے میں اس سے پہلے جو دلائل ذکر کیے جا چکے ہیں ان کی روشنی میں ثابت ہو چکا ہے کہ ''مادہ'' ہرگز ازلی وابدی نہیں ہوسکتا اور اسے مستقل بالذات'' تسلیم کرنا غلط ہے اس کی مزید وضاحت کے لیے اس کی مزید وضاحت کے لیے اس سے بہتر کوئی دلیل نہیں ہوسکتی کہ جب ہم اس جہان کو ''حادث'' مان لیں تو درج ذیل پانچ صورتوں کے علاوہ کوئی چھٹی صورت نہیں ہوگی:

(۱) یہ جہان کسی علت کے بغیر وجود میں آیا۔

(۲) یہ جہان خود ہی اپنے وجود کی علت ہے۔

(۳) اس کا معلول ہی اس کی علت ہے۔

(۴) یہ خود ایک علت کا معلول ہے اور وہ علت ایک اور علت کی معلول ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی صورت میں چل رہا ہے۔

(۵) اس جہان ہستی کی تمام حادث موجودات ایک ایسے ازلی وابدی ''موجود'' سے وابستہ اور اس کے ساتھ قائم ومربوط ہیں جو ''ماوراء مادہ'' ایک حقیقت ہے یہ سب موجودات اس سے فیض پا رہی ہیں اور علت ومعلول کا یہ سلسلہ بالآخر اس ''واجب الوجود'' تک جا پہنچا ہے

کہ جس کے بعد کوئی علت قابلِ تصور نہیں ہے۔

پہلی ''شق اور فرضیہ'' کہ جسے ''صدفہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ واضح طور پر نادرست اور باطل ہے کیونکہ اگر کوئی حادث چیز علت کی محتاج نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ''موجود'' (وجود رکھنے والا) ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے تحت وجود میں آ جائے جب کہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ ہر حادث اور وجود میں آنے والی چیز کے لیے خاص حالات اور مناسب اسباب ضروری ہیں۔

اسی طرح دوسری شق اور فرضیہ یعنی یہ جہان اپنی علت خود ہی ہو، اس کا باطل اور نادرست ہونا بھی ایک بدیہی اور واضح امر ہے۔ کیونکہ یہ ضروری ہے کہ ہر علت اپنے معلول سے پہلے موجود ہو، اگر کوئی چیز خود ہی اپنے وجود کی علت ہو تو ضروری ہوگا کہ وہ اپنے آپ سے موجود ہو (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ''وجود'' اور ''عدم'' یکجا ہو جائیں) اور یہ درست نہیں کہ اسی کو علمی اصطلاح میں ''دور'' کہتے ہیں۔

تیسری شق کا غلط اور نادرست ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں کیونکہ کسی چیز کا معلول ہی اس کی علت ہو..... یہ کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہے۔

چوتھی شق یعنی علت و معلول کے سلسلے کا لامتناہی طور پر چلنا ان امور میں سے ہے جن کے نادرست ہونے کے لیے عقلی فیصلہ ہی کافی ہے، کیونکہ عقل کا فیصلہ ہے کہ ہر معلول کے لیے علت کا وجود ضروری ہے۔ اگر یہ سلسلہ لامتناہی ہو اور ''واجب الوجود'' پر منتہی نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام حاجت مندوں کے مجموعے (جہانِ موجودات) کو غنی و بے نیاز تسلیم کیا جائے۔ جب کہ یہ امر نہایت واضح ہے کہ فقیر و حاجت مند جس قدر زیادہ ہوں۔ پھر بھی وہ فقر و حاجت مند ہی رہی گے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بے انتہا تاریکیاں اکٹھی ہو کر بھی روشنی میں تبدیل نہیں ہو سکتیں، بے انتہا جہالت کبھی علم نہیں بن سکتی اور لاتعداد صفر ( ) کبھی کسی عدد میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔

بنابریں ہے کہ ''علت و معلول'' کا یہ سلسلہ اس مقام تک پہنچے کہ پھر وہ کسی کا محتاج نہ ہو، وہ ایسا وجود ہو جو مستقل بالذات اور بے نیاز ہو کہ اس کا وجود ہستی اس کی اپنی ہو..... یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ عین وجود اور وجود مطلق ہو۔ اس تمام تفصیلی بیان کے بعد یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ تمام موجودات اور حوادثِ جہاں کی بازگشت اس واجب الوجود اور ازلی ذات کی طرف ہونی چاہیئے۔ جسے ہم ''خدا'' کہتے ہیں۔

(۴) برہان صدیقین

وجود خدا کے اثبات کے لیے ''برہان صدیقین'' ان دلائل میں سے ایک ہے جسے علماء اور فلاسفہ اسلام نے آیات وروایات سے استفادہ کرتے ہوئے مورِدِتوجہ قرار دیا ہے جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ عام لوگوں کی دلیل نہیں ہے بلکہ صرف ان خواص کے لیے ہے جو عقائد وفلسفہ کے مسائل میں وسیع معلومات رکھتے ہیں اور گہری سوچ کے ساتھ ساتھ لطیف کے حامل ہیں۔

یہ دلیل کچھ پیچیدہ تو ہے، لیکن عمدہ لطیف اور رُوح پرور بھی ہے اس دلیل کی اساس وبنیاد یہ ہے کہ ہم مخلوقات کے ذریعے سے خالق کو پہچاننے کی بجائے خود اسی کی پاک ذات کے ذریعے اس کی پہچان کرتے ہیں اور ''یامن دل علی ذاتہ بذاتیہ) کی روشنی میں خود اسی کی ذات کو اس کی پہچان کرنے اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اس دلیل کی پیچیدگی اور لطافت اسی بات میں ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ''دلیل'' اور ''مدعا'' کو ایک شے قرار دیں؟ یعنی ایک چیز دلیل بھی ہو اور مدعا بھی ہو۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس جہان میں ایک ''وجود'' ہے پھر ہم اصل وجود کے بارے میں تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں۔ اور ایک لطیف وعمدہ تجزیہ وتحلیل کے بعد اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ اصل وجود ''واجب'' ہونا چاہیے۔

یہ ایک مختصر اشارہ ہے اور ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ مختصر اشارہ اس قدر اہم موضوع کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہم اس کی مزید وضاحت اور تشریح بعد میں کریں گے، اب ہم قرآن مجید کی چند آیات کو زیر نظر لاتے اور ان پر غور وفکر کرتے ہیں۔

(۱) اَوَلَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴿فصلت: ۵۳﴾

(۲) شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ اُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۸﴾ ﴿آل عمران: ۱۸﴾

(۳) وَّ اللّٰہُ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ مُّحِیۡطٌ ﴿۲۰﴾ ﴿البروج: ۲۰﴾

(۴) ہُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاہِرُ وَ الۡبَاطِنُ ۚ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳﴾

(حدید: ۳)

(۵) اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ﴿النور: ۳۵﴾ [1]

---

[1] اس مضمون کی متعدد آیات قرآن مجید میں ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں: حج، ۱۷۔ سبا، ۴۷۔ مجادلہ، ۶۔ بروج، ۹۔

ترجمہ:

(۱) کیا یہ بات کافی نہیں کہ خدا ہر چیز پر شاہد و گواہ ہے۔''

(۲) ''خدا (کائنات کے موزوں نظام کو ایجاد کر کے) اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں.....فرشتے اور صاحبان علم و دانش (اپنے انداز میں) گواہی دے رہے ہیں، جب کہ خداوند عالم جہان ہستی میں عدل و انصاف قائم کیے ہوئے (یہ عدل و انصاف بھی خدا کے یکتا ہونے کا ثبوت ہے، لہٰذا تم بھی ان سب کے ساتھ ہم آواز کر کہو کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔

(۳) خداوندِ عالم سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(۴) وہی اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے اور وہ ہر شے سے آگاہ ہے۔

(۵) خداوندِ عالم آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

مفردات کی تشریح:

''شہید'' کا مادہ ''شہود'' ہے جیسا کہ راغب اصفہانی نے کتاب ''المفردات'' میں کہا ہے کہ اصل میں اس کا معنی ''حضور مع مشاہدہ'' ہے کہ خواہ وہ مشاہدہ ظاہری آنکھوں سے انجام پائے یا دل کی نگاہوں سے ہو کبھی اس لفظ کو صرف ''حضور'' کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کہ اس میں مشاہدے کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ لیکن لفظ ''شہود'' کا استعمال ''حضور'' کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جب کہ اس میں مشاہدے کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ لیکن لفظ ''شہود'' کا استعمال حضور اور ''شہادت'' کی بجائے ''حضور مع مشاہدہ'' میں بہتر ہے۔

کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں ہے کہ لفظ ''شہادت'' کے معنی میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ حضور علم اور دوسروں کو آگاہ کرنا.....اگر خدا کی راہ میں جان قربان کرنے والوں کو ''شہید'' کہا جاتا ہے۔ تو وہ اس لیے کہ وہ ان نعمات الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہیں جو خدا نے ان کے لیے مہیا کی ہوئی ہیں یا پھر اس لیے وہ بارگاہ الٰہی میں حاضر ہیں۔

کتاب العین میں ہے کہ ''شہید'' اس عسل کو کہتے ہیں جو ابھی موم سے نہ لیا گا ہو۔ مصنف نے اس کو لفظ ''شہید'' کے اصلی اور بنیادی معنی کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اس کا مطلب یہ ہے، کہ لغت کے لحاظ سے اس لفظ کی اصل یہی ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر

مسئلہ ''حضور'' کے ساتھ اس کا کیا ارتباط ہے؟ اس سلسلے میں مصنف نے کوئی وضاحت نہیں کی [1]

''محیط'' کا مادہ ''احاطہ'' ہے جس کا معنی گھیر لینا اور چھا جانا ہے.....لغت کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''احاطہ'' ہے کی دو قسمیں ہیں: ایک اجسام کا احاطہ جیسے دیوار مکان کو گھیر لیتی ہے اس لیے عربی زبان میں سے ''حائط'' کہتے ہیں.....دوسرے معنوی احاطہ، جس کا معنی حفاظت ونگہبانی یا کسی چیز سے مطلع وآ گاہ ہونا ہے۔

یہ لفظ کبھی کسی چیز سے ممنوع ہونے کے معنی میں آ تا ہے یعنی اس سے روک دیا جاتا ہے، جیسے کسی شخص کا ہر طرف سے محاصرہ کرلیا جائے تا کہ وہ کہیں نہ جاسکے یا جس چیز تک پہنچنا چاہتا ہے نہ پہنچ سکے.....جیسا کہ لفظ ''احتیاط'' بھی وہاں استعمال کیا جاتا ہے، جہاں کوئی انسان کچھ کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کی خواہش ہے کہ غلطی واشتباہ یا گناہ ومعصیت سے محفوظ رہے۔

کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں ہے کہ یہ لفظ اصل میں ''حوط'' (بروزن فوت) سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے وہ چیز جو کسی دوسرے چیز کے اردگرد محفوظ رہے۔

ممکن ہے لفظ ''محیط'' بھی احاطہ وجودی یا احاطہ قدرت یا احاطہ علم کے معنی میں ہ[2] و

''نور'' اس شعار کو کہتے یں جو پھیل جاتی ہے اور چیزوں کو دیکھنے میں آنکھوں کی مددگار ثابت ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ مادی اور معنوی.....مادی نور وہ ہے جو ظاہری نگاہوں سے دکھائی دیتا ہے اور ''معنوی'' نور وہ ہے جو چشم بصیرت سے دیکھا جاتا ہے جیسے نورِ عقل اور نور قرآن.....اور اگر ''فتنہ'' کو ''نائرہ'' کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پھیلتا اور وسعت پیدا کرتا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ (نور) دراصل ظاہری آنکھوں سے دکھائی دینے والی روشنی ہی کے معنی میں تھا، پھر معنوی امور مثلاً ایمان، علم، عقل، قرآن..... یہاں تک کہ ذاتِ الٰہی کے لیے استعمال ہوا۔

''نار'' یعنی آگ بھی اسی عنوان سے ہے اور بہت سے معانی میں دونوں یکجا طور پر مراد لیے جاتے ہیں.....''منارہ'' کو بھی اس لیے منارہ کہتے ہیں کہ وہاں چراغ جلائے جاتے ہیں یا ''اذان'' کے ذریعے اس سے نور معنویت ہر طرف پھیلتا ہے۔

''نور'' بروزنِ قول درختوں کے شگوفوں یا خاص طور پر سفید شگوفوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جب وہ نکلنے لگے ہیں تو ان میں ایک مخصوص نورانیت ہوتی ہے۔

---

[1] المفردات۔لسان العرب، مقاییس اللغۃ اور کتاب العین ملاحظہ ہوں۔

[2] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، المفردات مقاییس اللغۃ اور لسان العرب ملاحظہ ہوں۔

تفسیر اور آیات کے مطالب پر ایک نظر

قرآن اور برہان صدیقین [1]

اس موضوع کے سلسلے میں پیش کی جانے والی سب سے پہلی آیت میں خدا کے وجود کو ثابت کرنے والی آفاقی اور نفسی نشانیوں کے ذیل میں ارشاد الٰہی ہے: کیا وجودِ کے اثبات کے لیے اتنا کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔(اولم یکف بربك انه علی کل شیءٍ شهیدٌ)۔

ممکن ہے اس آیت میں ''شہید'' کا معنی شاہد اور گواہ یا حاضر و ناظر یا دونوں معانی کے لیے استعمال کیا گیا ہو کیونکہ یہ دونوں معنی خدا کی ذات پر صادق آتے ہیں نیز مذکورہ آیت مطلق ہے (یعنی کسی ایک معنی کے ساتھ مختص نہیں کی گئی [2])

اس تفسیر کی روشنی میں، خدا کی مقدس ذات کے اثبات کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا حضور و شہود ہر جگہ ہے اور جس بھی ممکن الوجود کو دیکھیں۔ اس کے ساتھ واجب الوجود نظر آتا ہے۔، جدھر بھی دیکھتے ہیں اس کا وجود مطلق نمایاں ہے۔ جس شے پر نظر ڈالیں اس کا جلوہ دکھائی دیتا ہے اور بڑے بڑے لوگوں کے سر اس کے حضور جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس بات کو حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ما رأیتُ شیئاً الا ورأیتُ الله قبله وبعدهٗ ومعهٗ۔

''میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر یہ خدا کو اس سے پہلے، اس سے پہلے، اس کے بعد اور اس کے ساتھ دیکھا۔

تفسیر المیزان میں اس مقام پر ''شہید'' کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر آیت کا مفہوم یہ ہوگا، کیا اس قدر کافی نہیں ہے کہ تیرا پروردگار ہر چیز کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔، کیونکہ تمام موجودات اپنی تمام جہات اور پہلوؤں میں اس کے محتاج ہیں [3]

اس تفسیر کی رُو سے بھی مذکورہ آیت کے ذریعے وجودِ خدا کا اثبات ہوتا ہے۔ لیکن یہ ''برہان غنیٰ وفقر'' کے تحت آتا ہے۔

فخر رازی کے بقول، مذکورہ آیت سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس کائنات کی تمام چیزوں میں ایسے دلائل اور نشانیاں پیدا کی

---

[1] بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کو ''برہان صدیقین'' اس لیے کہا گیا ہے کہ ''صدیق'' صیغہ مبالغہ ہے جس کا معنی ہے بہت زیادہ سچا، یہ صحیح ہے وجود خدا کے اثبات کے لیے جو دلائل پہلے ذکر کیے گئے ہیں وہ سب صداقت پر مبنی ہیں لیکن یہ برہان زیادہ سچائی کی حامل ہے کیونکہ اس میں ہم ذاتِ خدا کے ذریعے ذات خدا تک پہنچتے ہیں اور کسی کو درمیان میں نہیں لاتے۔

[2] کئی ایک مفسرین نے کہا ہے کہ ''برتک'' میں ''رب'' زاید اور تاکید کے لیے آئی ہے اور موقع کے لحاظ سے ''ربک'' فاعل ہے اور جملہ علی کل شیءٍ شهید، اس کا بدل ہے اس کا معنی یہ ہے۔ اولم یکفهم ان ربك علی کل شیء شهید،

[3] تفسیر المیزان جلد ۱۷ صفحہ ۴۳۱۔

ہیں جو اس کے وجود کی گواہی دیتی ہے [1]

(تاہم اس قول کی روشنی میں یہ آیت ''برہان نظم، کے ذریعے خدا کے وجود کا اثبات کرے گی)۔

بعض مفسرین کرام نے کہا ہے کہ یہ آیت قیامت سے متعلق ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے: خداوندِ عالم تمام انسانوں کے اعمال کو گواہ اور ناظر ہے یہی بات قیامت کے دن عدالت کرنے میں کافی ہے [2]

بعض مفسرین نے اس آیت کو قرآن مجید کی حقانیت اور مسئلہ نبوت سے مربوط قرار دیا اور اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے: آیا اس قدر کافی نہیں کہ خداوند عالم قرآن کی حقانیت اور پیغمبر اکرمؐ کی دعوت حق پر گواہ ہے۔ [3]

مذکورہ بالا پانچ تفسیروں میں سے پہلی تین تفسیریں کہ اس آیت کو مسئلہ توحید اور خدا کے وجود کے اثبات سے مربوط قرار دیتی ہیں وہ زیادہ مناسب اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس بناء پر یہ آیت ''برہان صدیقین'' پر گواہ بن جائے گی۔

آخر میں ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک معتبر حدیث نقل کرتے ہیں کہ امام کے ایک دانش ور صحابی نے بیان کیا: میں نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ ایک گروہ کے ساتھ مناظرہ کرتے ہوئے میں نے کہا ہے کہ خداوندِ عالم اس سے بالاتر ہے کہ اسے اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق کے ذریعے پہچانا جائے بلکہ اس کے بندے ہی اس کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں (کیا میں نے ٹھیک کیا ہے؟) امامؑ نے میری تصدیق کرتے ہوئے فرمایا: رحمك الله (خدا تم پر رحمت نازل کرے) یعنی تم نے ٹھیک بات کہی [4]

البتہ یہ بیان موجودات عالم میں خدا کی توحید عظمت کے دلائل پائے جانے اور ''برہان نظم'' سے استفادہ کے ساتھ منافات نہیں رکھتا، برہان نظم کا ایک مقام ہے۔ لیکن ''برہان صدیقین'' اس سے بلند و بالا درجے پر ہے۔

سورج اپنے وجود کی دلیل بن کر آیا:

دوسری آیت میں خود اپنی یکتائی پر خدا کی گواہی کا ذکر ہے، پھر فرشتوں و رصاحبان علم کی گواہی کا تذکرہ ہے چنانچہ ارشاد ہوا: خدا گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اسی طرح فرشتے اور صاحبان دانش بھی (اپنے اپنے انداز میں) گواہی دیتے ہیں (شهد الله انه لااله الا هو والملائكةُ واولوا العلم (اس کے بعد فرمایا: یہ اس حال میں ہے کہ خداوند عالم نے عدل قائم کیا ہوا ہے اور وہ اس جہان ہستی کو عدل کی بنیاد پر چلا رہا ہے'' (قآئما بالقسط) چونکہ عدل و انصاف کے قیام میں بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک قدرت اور دوسرے علم تا کہ علم کے ذریعے عدل کے معیاروں کی پہچان کرے اور قدرت وقوت کے ساتھ ان کا نفاذ و اجرء عمل میں لائے آیت

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۱۴۰

[2] تفسیر قرطبی جلد ۸ صفحہ ۵۸۱۹۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۲۰۔

[4] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۸۶ باب ''انہ لایعرف الا بہ، حدیث ۳۔

کے آخر میں یوں ارشاد ہوا۔کوئی معبود نہیں ہے سوائے اس کے، وہ قدرت والا اور حکمت والا ہے۔(لاالہ الا ھو العزیز الحکیم)

فرشتوں اور صاحبان علم کا گواہی دینا تو واضح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خداوندِ عالم کے گواہی دینے کا مطلب کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کرام کے درمیان گفتگو ہے بعض کا نظریہ ہے کہ اس سے قولی وعملی دونوں گواہیاں مراد ہیں۔یعنی ایک طرف خداوندِ عالم نے جہان ہستی اور آفاق وموجودات میں اپنی عظمت کی واضح نشانیاں دکھائیں اور دوسری طرف کتب آسمانی میں آیات توحید نازل کر کے اپنی توحید و یکتائی کی گواہی دی ہے۔

بعض ودیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے صرف قولی گواہی مراد ہے اور چند ایک مفسرین نے صرف عملی گواہی مراد لی ہے۔لیکن درحقیقت یہاں اس سے بالاتر گواہی مقصود ہے کہ جس کا ذکر آیت کے مفہوم میں موجود ہے اور وہ ''گواہی'' کا نہایت اہم مصداق ہے وہ یوں کہ اس کی ذات ہی اس کی گواہ ہے اور ''یامن دل علی ذاتہ (اے وہ کہ جس نے اپنی ہی ذات کے ذریعے اپنی ذات کو ظاہر اور ثابت کیا ہے) کے مطابق وہ خود ہی اپنی ذات اور وجود کی سب سے اہم دلیل ہے..... یہ وہ امر ہے جو ''برہان صدیقین) میں ملحوظ ہے ان تمام مطالب ے باوجود اس میں کوئی مانع کہ یہاں ''شہادت''یعنی گواہی کے تینوں معنی (گواہی ذات گواہی قول اور گواہی عمل) مفہوم آیت میں یکجا ہوں۔

چند حضرات نے ''قائماً بالقسط'' کے جملے کا معنی اس طرح کیا ہے کہ اس جہان ہستی میں عدل وانصاف اور نظم وترتیب ہی خداوندِ عالم کی طرف سے اپنی واحدانیت پر ایک قسم کی گواہی ہے۔یہ استقلال نہایت عمدہ ہے (اور بقول المیز ان درمیان میں فرشتوں اور صاحبان علم کے ذکر کا اس معنی پر اثر نہیں ہوتا) پھر یہ کہ اس سے آیت کی وسعت اور مفہوم کی عمومیت میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔

جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عدل وانصاف کا قیام علم اور قدرت پر موقوف ہے یہ دونوں اوصاف خداوندِ عالم کی مقدس ذات میں یکجا ہیں، آخر آیت میں خدا کی صفات ''عزیز وحکیم'' (قدرت والا اور حکمت والا) اس بات کی طرف ایک نہایت لطیف اشارہ ہے۔

خدا کا احاطہ وجودی:

تیسری آیت میں ان لوگوں کے تذکرے کے بعد کہ جنہوں نے خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء کے مقابلے میں صف آرائی کی اور ان کے ساتھ نبرد آزما ہوئے.....خاص طور پر اس کی دو واضح مثالیں.....ان میں ایک بہت ہی قدیم زمانے میں جیسے ''قوم ثمود'' اور دوسری نسبتاً نزدیک کے زمانے میں گزرے ہوئے جیسے ''قومِ فرعون'' ان کے تذکرے کے بعد فرمایا: بلکہ کافر ہمیشہ آیات حق اور واضح نشانیوں کی تکذیب میں لگے رہتے ہیں۔(بل الذین کفروا فی تکذیب) اس آیت میں لفظ ''فی'' استعمال کیا گیا ہے۔جس کا تکذیب کے ساتھ نہایت لطیف تعلق ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر، تکذیب کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں یہاں کفار سے وہ جھگڑالو کفار مراد ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں تھے کہ وہ خدا کی توحید و یکتائی کا انکار کرتے تھے، آنحضرت کی نبوت کے بھی منکر تھے اور قیامت سے بھی انکاری تھے۔اس بات کا امکان ہے کہ یہ آیت ان سب طرح کے انکاروں اور تکذیبوں کو شامل ہو کیونکہ قومِ ثمود اور قوم فرعون بھی ایسا ہی کرتی تھیں، نیز تکذیب کو ''نکرہ'' کے طور پر لانا اس بات کی دوسری دلیل بن سکتا ہے جو ایسے موارد میں کسی امر کی اہمیت کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔

پھرارشاد ہوا: خداوندعالم ان سب پرمحیط ہے(واللہ من ورآئھم محیط)اس میں''من ورآئِھم ''اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ سب ہرطرف سے گھرے ہوئے ہیں اور خداوندعالم انہیں ہرطرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس''احاطہ''الٰہی'' سے کیا مراد ہے؟اس سلسلے میں مفسرین کرام کے درمیان بحث ہے،بعض حضرات کا خیال ہے اس سے مراد یہ ہے کہ خدا کا علم ان کے اعمال پرمحیط ہے۔بعض صاحبان کہتے ہیں کہ اس سے خدا کی قدرت کا احاطہ مراد ہے یعنی سب کے سب خدا کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ خدا کی گرفت اور عذاب سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔کچھ حضرات نے علم وقدرت دونوں کا احاطہ مرادلیا ہے،لیکن اس آیت کا مفہوم ان سب معانی سے وسیع تر ہے اور وہ خدا کے احاطہ وجودی''احاطہ ظرف ومظروف(مکان کو دیوار کے گھیر لینے) کی طرح نہیں اور نہ ہی احاطہ کل وجزء کی مانند ہے بلکہ اس سے احاطہ قیومیت مراد ہے یعنی وہ ایسا وجود ہے جو مستقل اور قائم بالذات ہے اور باقی سب موجودات اس سے وابستہ اور اس کے ساتھ قائم ہیں یہی وہ اہم نکتہ ہے جس کے باعث اس آیت میں وجود خدا کے اثبات کے لیے''برہان صدیقین'' کا راستہ نکلتا ہے،اس کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

ابتداء بھی تو اور انتہاء بھی تو:

سورۂ حدید کی ابتدائی آیات کہ جن میں خدا کے اوصاف نہایت وسیع وعمیق انداز میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سے چوتھی آیت میں ارشاد الٰہی ہے: وہ آغاز ہے وہ انجام ہے وہ ظاہر ہے، وہ باطن ہے اور وہ ہرچیز سے آگاہ ہے۔(ھوالاول والا خر والظاھر والباطن وھو بکل شیءٍ علیمٌ) یہ پانچ صفات جو اس آیہ شریفہ میں ذکر کی گئی ہیں وہ ذات الٰہی کے لامتناہی ہونے کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں۔

وہ اول ہے''یعنی وہ''ازلی'' ہے کہ اس کا آغاز قابلِ تصور ہی نہیں،وہ آخر یعنی''ابدی'' ہے اور اس کی کوئی انتہاء نہیں ہے وہ ظاہر ہے اور کسی سے چھپا ہوا نہیں وہ باطن ہے یعنی اس کی کہنہ ذات کسی پر ظاہر نہیں(کیونکہ لامتناہی ذات کی حقیقت کو سمجھنا،محدود موجودات مثلاً انسان کے لیے ممکن نہیں)لیکن وہ اپنے بندوں سے پوشیدہ بھی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ہرچیز کا عالم ہے،کیونکہ وہ شروع ہی سے تھا اور آخر تک باقی رہے گا اور اس جہان کے ظاہر وباطن دونوں میں جگہ حاضر وموجود ہے۔

پہلی چار صفات''اول''''آخر''''ظاہر''''باطن'' کے سلسلے میں مفسرین کرام نے متعدد معانی بیان کیے ہیں۔

وہ سب ایک دوسرے سے منافات بھی نہیں رکھتے۔اور ان سب کو آیت کے مفہوم میں داخل قرار دیا جاسکتا ہے۔

کبھی کہتے ہیں کہ وہ اول ہے ہرچیز کے وجود سے پہلے اور آخر ہرچیز کے ختم ہونے کے بعد۔اس کے وجود کی دلیلیں ظاہر اور اس کی ذات کے باطن کا ادراک ناممکن ہے۔

کبھی کہتے ہیں کہ وہ نیکی میں ابتداء کرنے والا،کیونکہ اس نے ہمیں نیکی کی ہدایت دی اور وہی عفو وبخشش میں انتہا ہے کہ توبہ قبول کرتا

ہے، اطاعت کے وقت توفیق واحسان میں ظاہر ہے اور معصیت کے وقت بندوں کے عیوب مخفی کرنے میں باطن ہے۔

الاول ببرہٖ اذهداك والا خر بعفوہٖ اذ قبل توبتك والظاهر باحسانہٖ

توفيقهٖ اذا اطعته والباطن بسترہ اذا عصيتهُ[1]

دعا کے سلسلے میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے۔

اللهم انت الاول فليس قبلك شيءٌ وانت الاخر فليس بعدك شيءٌ[2]

''خدایا! تو اول ہے تجھ سے پہلے کوئی چیز نہ تھی تو آخر ہے تیرے بعد کوئی چیز نہیں، تو ظاہر ہے، تجھ سے برتر کوئی چیز نہیں اور تو باطن ہے تجھ سے الگ کچھ نہیں۔

اول او، اول بے ابتداء
آخر او، آخر بے انتہاء
بود، ونبود آنچہ بلند است وپست
باشدوایں نیز نباشد کہ ہست

وہ اوّل ہے اور ایسا اوّل جس کی کوئی ابتداء نہیں، وہ آخر ہے ایسا آخر جس کی انتہا کوئی نہیں، وہ تھا جب کوئی بلند وپست نہ تھا، وہ ہوگا اور یہ جو کچھ بھی ہے نہیں ہوگا۔

بہرحال مذکورہ آیت صوفیوں کے نظریے کو مسترد کرتے ہوئے اس جہان مخلوق سے خدا کی علیحدگی اور خالق سے مخلوق علیحدگی کو ثابت کرتی ہے اس کے ساتھ ہی یہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ خدا کی پاک ذات کی کوئی انتہا نہی اور وہ مطلق ہے یعنی وہ ایک ایسی ہستی اور وجود ہے جو عدم سے آمیختہ نہیں ہے۔ اگر ہم ہستی و وجود کی حقیقت پر اچھی طرح سے غور کریں اور اسے عدم کے ساتھ آلودہ ہونے سے پاک سمجھیں تو اس کی پاک ذات تک پہنچ سکتے ہیں، یہی بات ''برہان صدیقین'' کا خلاصہ اور اس کی روح ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی ''موجود'' (وجود رکھنے والا) محدود ہو تو وہ آغاز میں یا انجام پر یا اشیاء کے ظاہر یا باطن میں ہوگا، چونکہ خداوند عالم بھی ہے اور انتہاء بھی ظاہر بھی ہے اور باطن بھی..... یہ سب اس لیے کہ اس کا وجود لامتناہی اور مطلق ہے۔ اس کی ہستی کی کوئی انتہا نہیں۔

وہ کائنات کو روشنی دینے والا ہے:

اس بحث کی پانچویں اور آخری آیت میں ایک نہایت مختصر مگر پر معنی جملہ موجود ہے: خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے (اللہ نور

---

[1] مجمع البیان، تفسیر المیزان تفسیر کبیر فخر رازی، روح البیان۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۲۴۰۶۔

السمٰوٰت والارض) البتہ اس جملے کے بعد ''خدا کے نور'' کے بارے میں نہایت عمدہ اور دلکش تشبیہ پیش کی گئی ہے۔ کہ جس میں محترم مفسرین کے لیے بحث کا وسیع میدان موجود ہے۔ لیکن ہماری اس بحث میں چونکہ پہلا جملہ ہی موردِ نظر ہے، اس لیے ہم صرف اسی جملے کی تشریح اور وضاحت بیان کرتے ہیں:

یہ بات واضح ہے کہ پیچیدہ اور عظیم حقائق کی تفہیم کے لیے ایک اہم ترین طریقہ یہ ہے کہ واضح تشبیات پیش کی جائیں تا کہ عقلی اُمور وحقائق کو حسی مثالوں کے ذریعے ذہن نشین کیا جاسکے، لہٰذا اس مقام پر اسی روش کو اپنایا گیا ہے۔ (اگرچہ خدا کے بارے میں جو مثالیں ذکر کی جاتی ہیں وہ سب ناقص ہوتی ہیں، کیونکہ خدا کی ذات بے مثال ہے) اس مثال کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ''نور'' اس کی صفات وخصوصیات اور اس کی برکات پر غور کریں اور سمجھیں۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ''نور'' مادی جہان کی تمام موجودات میں سے نہایت لطیف، خوبصورت اور بابرکت شے ہے اور مادی جہان کی تمام برکتیں اور خوبصورتیاں اسی سے نکلتی ہے، سورج کا نور (روشنی) تمام زندہ موجودات کی حیات اور بقاء کا سرچشمہ ہے اور پھولوں، گھاس پھونس اور تمام جانداروں کی پرورش کا بہترین ذریعہ ہے۔

یہ نور ہی ہے جو تمام انرجی (قوتوں) مثلاً ہواؤں کی حرکت، بارشوں کا برسنا اور انرجی پیدا کرنے والے مواد (مثلاً تیل کوئلہ وغیرہ) کے وجود میں آنے کی اصل بنیاد ہے۔ اگر سورج کا نور ختم ہوجائے تو ہمارے جہان میں پائی جانے والی تمام حرکات اور قوتیں ختم ہوجائیں۔

نور.....مختلف موجودات کے مشاہدے اور ان کے ظاہر ہونے کا ذریعہ ہے، یعنی وہ تمام چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اس کی رفتار ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کے برابر ہے، یعنی آنکھ جھپکنے تک سات مرتبہ سے زیادہ کرہ ارض کا چکر لگا سکتا ہے بہرحال سورج کا نور ''زندگی کے لیے نہایت موثر ومفید عامل ہے اور انسانی زندگی کے راستے میں ہر قسم کے موانع ورکاوٹیں دور کرنے اور موذی میکروب (جراثیم) کو ختم کرنے والا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حسی نور میں پائی جانے والی خصوصیات کے پیش نظر ذاتِ الٰہی کو نور کے ساتھ تشبیہ دینے کا راز معلوم ہوجاتا ہے۔

یہ وجود کا نور ہی ہے جو موجودات کی زندگی کو اجاگر کرتا اور ان کی حفاظت ونگہداری کا کام انجام دیتا ہے مادی ومعنوی زندگی اسی سے ہے کائنات کی تمام حسن آرائیاں اسی سے ہیں۔ اور کمال کی طرف ہر حرکت وعمل اسی کے مقدس وجود کے فیض سے ہے۔ ہر ہدایت اسی سے وجود میں آتی ہے۔ وہی ہے جو اپنے بندوں کے راستے سے ہر طرح کی رکاوٹیں دُور کرتا ہے اور وہی ہے جو کمال کے راستے اور اپنی ذات کے تقرب کے سلسلے میں آنے والے پیچ وخم کو انسان کے لیے دور کرتا ہے۔

ان سب باتوں کا خلاصہ ایک جملے میں اس طرح ہے کہ اس کائنات میں سب کچھ اسی ذات سے ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ نور جو تمام اشیاء وموجودات کے ظہور ان کے آشکار ہونے کا سبب ہے۔ آیا وہ خود کسی ایسے (نور) کا محتاج ہے یا نہیں کہ جو اسی نور کے پرتو میں ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ اس نور سے زیادہ روشن ہیں کہ نور کے معرف قرار پائیں یا نہیں؟ مطلب یہ کہ کیا ''نور'' خود اس کے علاوہ کسی ذریعے سے دیکھا جاسکتا ہے؟ یہی ''برہان صدیقین'' کی اصل بنیاد ہے!

مفسرین کرام نے اس آیت کے ذیل میں کئی احتمالات ذکر کیے ہیں کہ جو دیگر مورد کی طرح ایک دوسرے سے منافات نہیں رکھتے

اورسب یکجا ہو سکتے ہیں یعنی ان میں سے ہر ایک کسی خاص زاویے سے آیت پر ناظر ہے۔

بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ ''اللہ نور السمٰوت والارضِ، کا جملہ ''منور السمٰوت والارض کے معنی میں ہے یعنی خدا آسمانوں اور زمین کی روشنی عطا کرنے والا ہے۔

بعض مفسرین نے اسے ''کائنات کے ہادی ورہبر'' کے معنی میں لیا ہے اور انہوں نے اس نظریئے میں حضرت امام علی رضا علی السلام کی ایک روایت کی پیروی کی ہے جس میں امامؑ نے فرمایا: ھادٍ لاھل الارض یاھادلا ھل السمٰوت وھادٍ لاھل الارض [1]

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین میں ہر عیب سے منزہ و پاک ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد آسمانوں اور زمین کی تدبیر ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد، سورج اور چاند ستاروں کے ذریعے روشنی پہچانا اور انبیاء فرشتوں اور صاحبان علم کے ذریعے نور ہدایت پہنچانا ہے۔

بعض نے کہا ہے اس سے مراد، آسمان وزمین کو نظام عطا کرنا ہے۔

بعض نے کہا ہے اس مراد دونوں جہان کو زینت عطاء کرنا ہے۔

بعض نے کہا ہے اس سے مراد آسمانوں اور زمین کا خالق ہونا ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ تمام مطالب اس جملے اللہ نور السمٰوت والارضِ'' میں یکجا ہیں بلکہ یہ آیت اس سے بالاتر معنی کو بھی بیان کرتی ہے۔ چونکہ ''نور'' اپنی ذات کے لحاظ سے روشن ہے اور خود ہی اپنے وجود کی دلیل ہے اور کسی روشنی دینے والے کا محتاج نہیں، کیونکہ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اور اسی کی برکت سے ظاہر روشن ہے۔

زہی ناداں کہ اوخورشید تاباں
بہ نورِ شمع جوید دربیاباں!
جہاں جملہ فروغ نورحق داں
حق اندرووی زپیدائی است پنہاں
اگر خورشید بریک حال بودے
شعاع اوبہ یک منوال بودے
ندانستی کہ آں پر تواداست
نبودی ہیچ فرق از مغز تابوست

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۱۳۳ حدیث ۱۔ ۲ تفسیر نورالثقلین جلد ۳ صفحہ ۶۰۳۔

توضیحات

(۱) اسلامی حدیثوں اور دعاؤں میں برہان صدیقین:

تمام موجودات عالم کے مطالعے سے زیادہ قریب اور دقیق ترین راستہ خدا کی پاک ذات کی پہچان کے لیے خود اس کی ذات مقدس کا مطالعہ ہے۔ ہمیں اس کی ذات کے ذریعے ہی اس تک پہنچنا چاہیئے، یہ چیز اسلامی حدیثوں اور معصومینؑ کی دعاؤں میں وسیع پیمانے پر پیش کی گئی ہے اور یہی امر ''برہان صدیقین'' کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

ہم اس بات کے قائل نہیں کہ اس جہان کی موجودات سے ذاتِ الٰہی کی پہچان نہیں ہوسکتی اور ہم ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ''آفاقی'' اور ''انفسی'' آیات اور نشانیاں، اس کی قدرت، عظمت اور علم کا ثبوت نہیں ہیں کیونکہ اس کی بابت قرآن مجید میں مفصل بیان موجود ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس مقام پر ایک نہایت لطیف عمیق اور عظیم راستہ موجود ہے اور وہ ہے اصل وجود کا مطالعہ..... اس کی ذاتِ مقدس سے اس کی پہچان اور اس تک رسائی..... یہ راستہ عام طور پر خواص اور حقیقی اہل عرفان کا ہوتا ہے، یہاں نمونے کے طور پر چند موارد ذکر کیے جاتے ہیں۔

(۱) مشہور و معروف دعا صباح ہے۔

"یامن دل علی ذاتہٖ بذاتہٖ وتنزہ عن مجانسۃِ مخلوقاتِہٖ"

''اے وہ کہ جس کی ذات ہی اس کی ذات کی دلیل ہے اور تو مخلوقات کے ساتھ مشابہت سے منزہ و پاک ہے۔

(۲) دعاء ابوحمزہ ثمالی میں ہے:

بك عرفتك وانت والتنی علیك۔

میں نے تجھے تیرے ہی ذریعے سے پہچانا ہے اور تو نے ہی اپنی طرف میری رہبری کی ہے۔''

(۳) دعاء عرفہ میں ہے:

کیف یستدل علیك بما ھو فی وجودہٖ مفتقرٌ الیك ایکون لغیرك من الظھورِ مالیس لك حتی یکون ھوا المظھر لك؟

''جو موجودات اپنے وجود میں تیرے محتاج ہیں وہ تیرے وجود پر کیسے دلیل بنیں گے۔ کیا تیرے غیر کا ظہور کچھ زیادہ ہے کہ جو تجھ میں نہیں تا کہ وہ تیرے ظاہر ہونے کا ذریعہ بنے؟''

(۴) اسی دعا عرفہ میں ہی ہے:

متی غبت حتی تحتاج الیٰ دلیل یدل علیك، ومتیٰ بعدت حتیٰ تکون الاثارُ ھی التی توصل الیك عمیت عینٌ لاتراك علیھا رقیباً۔

تو کب مخفی ہے کہ ایسی دلیل کی ضرورت ہو جو تیری پہچان کرنے والی بنے، تو کب دور ہے کہ آثار کے ذریعے تجھ تک پہنچایا جائے، اندھی ہے وہ آنکھ جو تجھے اپنے اوپر ظاہر اور نگہبان نہیں سمجھتی۔''

(۵) ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے ایک صحابی منصور بن حازم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ ایک گروہ کے ساتھ مناظرہ کے دوران میں نے ان سے کہا۔

ان اللہ اجل واکرم من ان یعرف بخلقه بل العباد یعرفون باللہ۔

''اللہ برتر ہے اس سے کہ مخلوق کے ذریعے پہچانا جائے۔ بلکہ بندے اس کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔

امام صادقؑ نے بعنوان تصدیق فرمایا: خدا تجھ پر رحمت کرے، تو نے ٹھیک کہا ہے [1]

(۶) امیر المومنین امام علیؑ کا فرمان ہے۔

اعرفوا اللہ باللہ، والرسول بالرسالةِ، واولي الامر، بالامر بالمعروفِ والعدل والاحسان [2]

''خدا کو خدا کے ذریعے اور رسولؐ کی رسالت کے ذریعے پہچانو، اولی الامر کو امر بالمعروف اور عدل واحسان کے ذریعے پہچانو۔

(۷) ایک روایت میں آیا ہے کہ امیر المومنینؑ امام علیؑ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اپنے پروردگار کو کس چیز سے پہچانا؟ امامؑ نے فرمایا: اس چیز سے کہ جس سے میں نے اپنے نفس کو پہچانا ہے [3]

ہاں.....ذات پروردگار کی پہچان خود اسی کی ذات سے ہوتی ہے (آفتاب آمد دلیل آفتاب) یعنی اس کی ذات ہی اس کی معرفت اور

---

[1] اصولِ کافی جلد ا صفحہ ۸۶ باب، انہ لایعرف الابہ، حدیث۔ ا

[2] اصولِ کافی جلد ا صفحہ ۸۵ باب، انہ لایعرف الابہ، حدیث۔ ۲

[3] اصولِ کافی جلد ا صفحہ ۸۵ باب، انہ لایعرف الابہ، حدیث ۳۔

پہچان کی دلیل ہے، اس کو کسی تعارف کرانے والے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ کسی کی نظر میں مخفی ہے تو اپنی شدتِ ظہور کی وجہ سے..... کیونکہ روشنی اگر حد سے زیادہ ہو تو اس میں انسان کچھ نہیں دیکھ سکتا۔

حجاب روی تو ہم روی تو است درہمہ حال
نہاں زچشم جہانی زبس کی پیدائی

(۲) توضیح برہان صدیقین

اب موقع ہے کہ فلسفۂ اسلامی کے نقطۂ نظر سے ''برہان صدیقین'' کی تشریح کی جائے۔ اگرچہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے..... لیکن ہم تا حد امکان اس کو فلسفی اصطلاحات سے ہٹ کر عام فہم اور آسان الفاظ میں واضح کریں گے۔

ہر بات سے پہلے اس امر کی طرف توجہ رہے کہ ''برہان صدیقین'' میں وجود خدا کے اثبات کے دلائل میں ''دور و تسلسل'' موثر سے اثر کی طرف رجوع'' مخلوق سے خالق کی پہچان یا ممکن سے واجب کے تصور کا کوئی گزر نہیں ہے، بلکہ اس میں خود وجود اور حقیقت وجود کی تحلیل ہے اور ہم خدا کی ذات کا سراغ خود اس کی ذات ہی سے پاتے ہیں اور یہی ایک اہم نکتہ ہے۔ (اگرچہ بعض عبارات میں ایسا نظر آتا ہے کہ ''برہان صدیقین'' کے استدلال میں ''برہان علت و معلول'' اور ''وجوب و امکان'' کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ جن کی تشریح اس سے پہلے ہو چکی ہے[۱]

''برہان صدیقین'' کے بارے میں مختلف بیان ذکر ہوئے ہیں (پہلی تقریر ''اسفار'' میں صدر المتالہین کی ہے۔ محقق سبزواری کا بیان ''حاشیہ اسفار'' میں علامہ طباطبائی کا قول ''نہایۃ الحکمہ'' میں اور دیگر حضرات نے بعض دوسری کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن سب سے واضح اور مناسب بیان جو برہان وجوب و امکان اور علت و معلول کی طرف نہیں پلٹتا اور دور و تسلسل میں بھی داخل نہیں ہوتا وہ یہ ہے:

حقیقت وجود وہی ''عینیت'' خارج میں اس کا ہونا اور بالفاظ دیگر اس کی ''واقعیت'' یعنی صفت وجود کا حامل ہونا ہے..... اس کے لیے عدم ممکن ہی نہیں کیونکہ کوئی بھی چیز اپنی ضد کو قبول نہیں کرتی، چونکہ عدم..... وجود کی ضد ہے، لہٰذا حقیقت وجود عدم کو کبھی قبول نہیں کرتی۔

اس سے ہمیں یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ''وجود'' ذاتی لحاظ سے ''واجب الوجود'' ہے یعنی وہ ازلی وابدی ہے، دوسرے لفظوں میں مطالعہ ''حقیقتِ وجود'' ہمیں اس مقام پر پہنچاتا ہے کہ ''وجود'' میں عدم ہرگز راہ نہیں پاتا۔ وہ چیز کہ جس میں عدم کا گزر نہیں ہوتا وہی ''واجب الوجود'' ہے (غور کریں[۲])

صدر المتالہین کہ جو ''برہان صدیقین'' پر لکھنے والوں میں سب کے پیش رو ہیں، ان کا خیال یہ ہے۔

معرفتِ خدا کے بہت سے طریقے اور راستے ہیں، اس لیے کہ فضلتیں اور جہتیں بہت زیادہ ہیں اور ہر شخص کسی ایک راستے سے اس تک پہنچتا ہے (ولکل وجۃ ھو مولیھا) لیکن بعض طریقے اور راستے دیگر طرائق سے اطمینان بخش با شرف اور زیادہ روشن اور واضح ہیں..... سب سے مضبوط

---

[۱] نہایۃ الحکم صفحہ ۲۶۸ شرح مختصر منظومہ از شہید مطہری صفحہ ۸۔۹۔

[۲] یہ بیان اس تحریر کے مطابق ہے جو ''اسفار'' پر محقق سبزواری کے حاشیہ میں آئی ہے (جلد ۸ صفحہ ۱۴ طبع بیروت)

طریقہ اور دلیل وہ ہے، جس میں غیر از ذات (حق) واسطہ نہ بنے یعنی مقصود تک پہنچنے کا راستہ خود وہ مقصود ہی ہے۔ یہی ''صدیقین'' کا راستہ ہے کہ وہ خداوند متعال کے ذریعے سے اس تک رسائی حاصل کرتے ہیں، اس کے بعد اس کی ذات سے اس کی صفات پر اور صفات سے اس کے افعال پر استدلال کرتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ علماء عقائد اور ماہرین طبیعات ذاتِ الٰہی تک پہنچنے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اس کی صفات اور کچھ دیگر امور کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں۔ جیسے حدوث موجودات اور حرکت اجسام کے مسائل کہ جو ان کے استدلال کی بنیادیں ہیں تاہم ان لوگوں کے مہیا کردہ دلائل بھی خدا کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں ایک قیمتی سرمایہ ہیں لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ برہانِ صدیقین'' خدا کی ذات سے خدا کی پہچان کا راستہ سب سے مضبوط اور محکم ہے۔ قرآن مجید میں معرفتِ خدا کے دیر راستوں کی طرف یوں اشارہ ہوا:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

معرفت خدا کے جس راستے کی ہم نے نشاندہی کی ہے اس کی طرف اس جملہ میں اشارہ ہوا ہے۔

اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۵۳﴾

پھر فرماتے ہیں: اس کی وجہ یہ ہے کہ علما زبانی خود وجود کی طرف نظر رکھتے ہیں اسی کو مورِدِ تحقیق قرار دیتے ہیں۔ اسی کو ہر چیز کی اصل سمجھتے اور اسی کی حقیقتِ وجود جانتے ہیں۔ وجود حقیقت میں واجب اولوجود ہے باقی رہا، امکان، احتیاج اور معلولیت وغیرہ جس کا وجود کے ساتھ تعلق ہے تو یہ اصل وجود نہیں بلکہ یہ کچھ نقائص کا اثر ہے جو اصل وجود سے خارج ہوتے ہیں۔ [1]

خلاصہ یہ کہ ہم وجود حقیقی کا مشاہدہ کریں تو ظاہر ہوگا کہ ''وجود'' کبھی بھی عدم'' کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ نیستی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ وجود وعدم ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ یعنی اگر عدم کو لیا جائے تو وجود نہیں رہے گا۔ لہٰذا وجود ''واجب الوجود'' اور عدم ''ممتنع الوجود'' ہے۔ البتہ ایک اہم اشکال یہاں وارد ہوتا ہے اور صدر المتالین بھی ''اسفار'' میں اس کا جواب دینے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

وہ یہ ہے کہ اس استدلال کے مطابق ہر موجود کو ''واجب الوجود'' ہونا چاہیے کیونکہ یہ چیز تمام وجودوں پر صادق آتی ہے۔ جبکہ ہم جانتے کہ ممکنات ''حادث'' ہوتے ہیں۔ اور یہ ازلی وابدی یعنی واجب الوجود نہیں ہیں۔ اس کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ امکانی وجود'' اصلی اور حقیقی وجود نہیں۔ اس قسم کے وجود محدود ہیں اور عدم سے ملے ہوئے ہیں، ان کی محدودیت سے ان کا عدم سے تعلق واضح ہوتا ہے۔ لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہر وجود دو چیزوں سے مرکب ہوتا ہے تو اس کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی موجودات ممکنہ چونکہ محدود ہیں اس لیے ان میں ایک قسم کا عدم بھی ہے۔ پس تو اس کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی موجودات ممکنہ چونکہ محدود ہیں اس لیے ان میں ایک قسم کا عدم بھی ہے۔ پس وجود ممکن وجوہ اصلی نہیں ہے کیونکہ حقیقت وجود عین واقعیت وجود ہے۔ اور اس میں کوئی قید شرط اور نقص نہیں ہے اس دلیل سے سمجھا جاسکتا ہے کہ وجود حقیقی یقینا واجب الوجود ہے۔ البتہ اعتراف کرلینا چاہیے کہ ان تمام وضاحتوں کے باوجود استدلال کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مسلسل فکر اور وقت نظر کی ضرورت ہے (غور کریں)

---

[1] اسفار جلد ۸ صفحہ ۱۳۔ ۱۴ سے کچھ تلخیص کے ساتھ

خدا کی پہچان کا باطنی راستہ
فطری خداشناسی

اشارہ:

ہمیں معلوم ہے کہ عقلی ادراکات رُوح انسانی کے عمل کا ایک جزو اس انسان تمام چیزوں کا علم عقلی دلیل سے حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کے معلومات کا بیشتر حصہ فطری چاہتوں اور باطنی ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے عقلی دلائل کی بنیاد بھی انہی پر قائم ہوتی ہے جب کہ حیوانات کی تمام خواہشیں اور یافتیں صرف فطری طریقے سے تشکیل پاتی ہیں بناء بریں جن لوگوں نے انسان کی بعد عقلی میں محدود کیا ہے درحقیقت انہوں نے وجود انسان کے تمام تر العباد کو نہیں پہچانا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ''خداشناسی'' کے بہت سے راستوں میں ایک راستہ یہی فطری اور باطنی راستہ ہے اس میں انسان اپنے ''اندر'' جھانکتا ہے ''جاننے کی بجائے'' پاتا ہے ''سوچنے'' کی بجائے دیکھتا ہے اور ''مقدمات'' قائم کرنے کی بجائے ''مقصد'' تک پہنچتا ہے یہ راستہ خوبصورت پرسکون اور مسرت بخش ہے۔

بہت سی آیاتِ قرآن اس (خدا کی پہچان کے باطنی راستے) کا بڑے عمدہ طریقے سے ذکر کرتی ہیں۔ اب اس اشارے کے ذیل میں ہم ان آیات پر نظر ڈالتے ہیں۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۙ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾ [۳۰:۳۰] (روم)

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُم مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُم مِّنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾ [۳۰:۳۳] (روم)

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۖ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾ [۲۹:۶۵] (عنکبوت)

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ ۖ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ

مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ (یونس ۲۲۔۳۲)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿٩﴾ [۴۳:۹] (زخرف)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٨٧﴾ (زخرف:۸۷)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ [۲۹:۶۱] (عنکبوت)

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٣١﴾ [۱۰:۳۱] (یونس)

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٤﴾ [سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٥﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٨٦﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٨٧﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٨﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿٨٩﴾ (مومنون:۸۴۔۸۹)

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٧٢﴾ [۷:۱۷۲] (اعراف)

ترجمہ:

(۱) اپنے پروردگار کے خالص آئین کی طرف رُخ کرو، یہی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی آفرینش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہی محکم ومضبوط دین وآئین ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔''

(۲) ''جب لوگوں کو کوئی ضرر وتکلیف ہو تو خدا کو یاد کرتے اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، مگر پھر جب وہ انہیں اپنی رحمت کا ذائقہ چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک فریق اپنے پروردگار کی نسبت مشرک ہوجاتا ہے۔''

(۳) ''جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خلوص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں (یعنی غیر خدا کو بھول جاتے ہیں) لیکن جب خدا ان کو نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو وہ مشرک بن جاتے ہیں۔''

(۴) وہ وہی ہے جو تمہیں خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور موافق ہوائیں انہیں منزل کی طرف لے جارہی ہوں تو وہ خوش ہوجاتے ہیں۔ جب سخت آندھیا نچلنے لگتی ہیں اور دریا کی موجیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیتی ہیں، تب انہیں اپنی ہلاکت کا گمان ہوتا ہے تو وہ خدا کو خلوصِ قلب کے ساتھ پکارتے ہیں کہ اگر تو ہمیں نجات دے تو ہم شکر گزار ہوں گے (لیکن نجات پانے کے بعد کافر ہوجاتے ہیں)

(۵) ''اگر ان لوگوں سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ یقینا کہیں گے خدا نے انہیں پیدا کیا ہے جو قادر ودانا ہے۔''

(۶) ''اگر تم ان سے پوچھو کہ خود ان (لوگوں) کو کس نے پیدا کیا؟ یقینا کہیں گے خدا نے تو (ان سے کہو) پھر کیوں اس کی عبادت سے منحرف ہوتے ہو؟''

(۷) ''اگر تم نے پوچھا کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا، سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا۔

وہ کہیں گے اللہ نے پس پھر وہ خدا کی عبادت سے کیوں منحرف ہوتے ہیں۔''

(۸) کہو کہ کون تم کو آسمان وزمین سے روزی دیتا ہے یا تمہارے کانوں اور آنکھوں کا خالق کون ہے؟ کون مردہ کو زندہ سے اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے؟ کون دنیا کے اُمور کی تدبیر کرتا ہے؟ وہ جلدی سے کہیں گے ''خدا'' پس کہو کہ پھر کیوں تم تقویٰ اختیار کرتے؟''

(۹) کہو بھلا زمین اور اس کے رہنے والے کس کے ہیں اگر جانتے ہو، کہیں گے۔ سب اللہ ہی کے ہیں، کہو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے، کہو کون سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا رب ہے وہ کہیں گے یہ سب خدا کے قبضے میں ہیں۔ کہو کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (اور شرک سے باز نہیں آتے) کہو اگر تم سچ کہتے ہو تو بتاؤ تمام موجودات پر کس کی حکومت ہے، کون بے سہاروں کو پناہ دیتا ہے اور خود پناہ کی حاجت نہیں رکھتا..... وہ کہیں گے (یہ سب) خدا کی ملکیت میں ہیں، کہو اس کے باوجود کیوں کہتے ہو کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے؟''

(۱۰) اس وقت کو یاد کرو، جب خدا نے بنی آدم کو صلبوں سے ان کی ذریت کو لیا اور انہیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا، فرمایا کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ سب نے کہا ہاں ہم گواہی دیتے ہیں (خدا نے ایسا کیوں کیا) اس لیے کہ قیامت کے دن یہ عذر پیش نہ کریں کہ ہمیں اس کا علم نہیں ہوا اور ہم خدا کی پہچان کے فطری عہد سے بے خبر تھے۔

مفردات کی تشریح:

''فطرت'' کا مادہ ''فطر'' (بروزن سطر) ہے جب کہ ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا ہے کہ اس کا معنی کسی چیز کو طول سے شگافتہ کرنا ہے، پھر اس کا اطلاق ہر قسم کی شگافت پر ہونے لگا..... پھاڑنا کبھی تخریب اور کبھی اصلاح کے عنوان سے ہوتا ہے، اس کا اطلاق ہر دو صورتوں پر ہوتا ہے۔

چونکہ خلقت و پیدائش درحقیقت پردۂ عدم سے نکال کر وجود عطا کرنا ہے لہٰذا اس لفظ (فطرت) کا ایک معنی ''خلقت'' بھی ہے، اسی لحاظ سے اسے ابداع واختراع پر بھی بولا جاتا ہے۔ روزہ کھولنے کے لیے بھی لفظ ''استعمال ہوتا ہے، کیونکہ غذا وغیرہ کے ذریعے ایک مسلسل کیفیت کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

لفظ فطرت زمین میں نباتات کے اُگنے اور پیداوار ہونے پر بھی بولا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ نباتات زمین کے شگافتہ ہونے سے ہی باہر آتی ہے، اسی لیے دو انگلیوں سے دودھ دوہنے کے عمل پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا، گویا تھن پھٹتا ہے اور اس سے دودھ خارج ہوتا ہے۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ ''فاطر السموٰت والارض'' کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، حتی کہ دو عرب باہمی اختلاف کرتے ہوئے میرے پاس آئے.....ان کا جھگڑا ایک کنویں کے بارے میں تھا۔ ایک نے کہا ''انا فطرتھا'' میں نے یہ کنواں کھودا ہے۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ ''فطرت'' کا معنی آغاز و ایجاد کرنا ہے۔ جوان لڑکے لڑکیوں کے چہروں پر پہلے پہل جو دانے نکلتے ہیں ان کو ''تقاطیر'' یا نفاطیر'' کہا جاتا ہے۔[1]

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اہل لغت اس لفظ (فطرت) کو دین و آئین کے معنی میں لیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دین انسان کی پیدائش و آفرینش کے وقت سے موجود چلا آ رہا ہے جیسا کہ آیندہ مباحث میں اس کا بیان آئے گا۔

جمع آوری آیات وتفسیر

خلقت ثابت و پائیدار

پہلی آیت کہ جس میں دین کو ایک فطری چیز شمار کیا گیا ہے، اس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اپنے پروردگار کے آئین خالص کی طرف رُخ کرو (فاقم وجهك للدين حنيفاً[2])

پھر اس حکم کی علت وسبب بیان کرنے یا ترغیب وتشویق کی غرض سے فرمایا: یہی فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ (فطرت الله التي فطر الناسّ عليها[3])

چونکہ تشریع وتکوین میں ہم آہنگی مسلم ہے لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی چیز خلقتِ انسان میں بنیادی حیثیت رکھتی ہو، مگر انسان کا عمل وکردار اس سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس تعبیر سے آپ یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ اصل توحید کی پیروی واجب اور ہر قسم کے شرک سے دور ہونا ضروری ولازم ہے،

اس کی تاکید مزید کے لیے ارشاد ہے: خدا کی آفرینش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی (لاتبديل لخلق الله) یعنی وہ چیز جو انسان

---

[1] لسان العرب۔ مفردات راغب۔ نہایہ ابن اثیر مجمع البحرین۔

[2] حنیف'' کا مادہ ''حنف'' ہے کہ جس کا معنی ہر قسم کا میلان یا انحراف ہے اور گمراہی سے ہدایت کی طرف میلان کو بھی ''حنف'' کہتے ہیں اسی طرح باطل سے حق کی طرف آنے کو بھی ''حنف'' کہا جاتا ہے۔ وجہ'' خدا کی ذات کے لیے کنایہ ہے، کیونکہ وجہ (چہرہ) تمام اعضاء بدن میں اہم ترین اور قوائے سامعہ! باصرہ اور ذائقہ کا مرکز ہے۔

[3] فطرت اللہ۔ منصوب یعنی زبر کے ساتھ آنے کے کئی وجوہ ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اس میں ''اتبع'' یا الزام'' مقدر ہے۔

کے باطن کی گہرائی میں موجود ہے۔ وہ ایک اصل ثابت اور باقی رہنے والی چیز کے عنوان سے موجود ہے) جیسا کہ توضیحات کے ذیل میں اس کا ذکر آ رہا ہے یہ جملہ پر معنی اور اعجاز آمیز ہے۔ چنانچہ موجود دور کے دانش مندوں کے مطالعات وتحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی جذبہ وانگیزہ انسان کے مضبوط ترین جذبوں میں سے ہے جو تاریخ کے طویل زمانے میں موجود رہا اور آیندہ بھی موجود رہے گا۔

لیکن چونکہ جاہل و بے خبر لوگوں نے اس کو شرک کی خرابیوں سے آلودہ کر دیا تھا ''لہٰذا'' حنیفاً'' کہہ کر اس کو پاک وخالص رکھنے کا تذکرہ کیا ہے [1]۔

پھر تاکید مزید کے لیے فرمان آیا: یہ آئیں مضبوط، مستحکم اور مستقیم ہے (ذلك الدين القيم) لفظ قیم کا مادہ ''قیام'' ہے جس کا معنی ثابت و مستقیم ہے نیز معاش ومعاد کے معاملے کو قائم کرنے والا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے [2]

چونکہ بہت سے لوگ اس حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اسے بت پرستی سے آلودہ کر دیا ہے آیت کے آخر میں کہا گیا: لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ (ولكن اكثر الناس لا يعلمون)

یاد رہے کہ اس آیت میں جس چیز کو فطری شمار کیا گیا ہے وہ توحید پرستی نہیں بلکہ دین کامل مع اصول وفروع کے ہے خدا نے چاہا تو ہم توضیحات کے ذیل میں اس عمدہ بحث کی تفصیل بیان کریں گے۔''

جب طوفان حوادث کا شکار ہوتے ہیں:

آیات ۲۔ ۳۔ ۴ میں (بہ اختلافِ تعبیر) ایک قاعدہ کلیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تکلیف سختی میں جب انسان کو عام ذرائع کام نہ دے رہے ہو تو وہ اپنی اصلی فطرت کی طرف لوٹ آتا ہے اور خدا شناسی کا چھپا ہوا نور شعلہ زن ہوتا ہے اس وقت انسان کی توجہ علم وقدرت کے اسی مبداء کی طرف ہوتی ہے اور اس کی تمام مشکلات بہ آسانی حل ہو جاتی ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے: جب لوگ تکلیف میں ہوں تو اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں (واذا مس الناس ضر دعوا ربهم منيبين اليه) مگر جب طوفان ٹل جاتا ہے اور خدا انہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھاتا ہے تو ان میں ایک فریق مشرک بن جاتا ہے (ثم اذا اذاقهم منه رحمة اذا فريقٌ منهم بربهم يشركون)

ایک اور مقام پر ایک روشن مثال کے ساتھ سختیوں اور دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے اسی مضمون کو بیان کیا ہے: جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں۔ اور سمندر کی ہولناکی اور طوفان وگرداب اور بلند وبالا موجوں میں گھر جاتے ہیں تو خدائے واحد کو پکارتے ہیں جب کہ دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ انہیں ساحل پر پہنچاتا اور نجات دیتا ہے تو وہ پھر سے شرک کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ (فاذا ركبوا في

---

[1] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ لا تبديل لخلق الله'' میں ''لا'' نافیہ ہے لیکن نہی کا مفہوم ادا کرتا ہے (مجمع البیان۔ المیزان) تفسیر ابوالفتوح رازی) لیکن ہم نے سطور بالا میں اس آیت کو جو تفسیر کی ہے اس کے مطابق یہاں نفی کے معنی مناسب ہیں (غور کریں)

[2] مفردات راغب ودیگر کتب لغت۔

الفلك دعوا الله مخلصين له الدين فلما نجاهم الى البر اذا هم يشركون)

ایک اور آیت میں اسی خطرات سے دریا کے مسئلہ کو ایک اور انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا: خدا وہی ہے جو تمہیں خشکی اور دریا کی سیر کراتا ہے جب تم کشتی میں بیٹھتے ہو اور موافق ہوائیں تمہیں منزل کی طرف سے لے جارہی ہوتی ہیں تو وہ ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں، اچانک سخت طوفان ان کو گھیر لیتا ہے۔ دریا بپھر جاتا ہے ہر طرف سے موجیں کشتی کی طرف آنے لگتی ہیں اور موت سامنے نظر آرہی ہوتی ہے۔ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا وقت آجاتا ہے اور اس وقت انہیں خدا یاد آجاتا ہے اور وہ اسے خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں وہ سب یہ عہد کرتے ہیں کہ اگر ہمیں اس مصیبت سے نجات مل جائے تو ہم اس کے شکر گزار ہوں گے (شکر بامعرفت)

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۲۲ [۱۰:۲۲]

لیکن جب خدا ان کو نجات عطا فرماتا ہے ساحل نجات پر پہنچ جاتے ہیں تو خدا کے ساتھ کیا ہوا عہد و پیمان بھول جاتے ہیں اور زمین میں ناحق ظلم کرتے ہیں (شرک کا راستہ اپنا لیتے ہیں جو ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ نعمتوں پر غرور کی بدولت وہ کمزور لوگوں پر ستم رانی کرتے ہیں) فلما انجھم اذا ھم یبغون فی الارضِ بغیر الحق)۔

یہ مفہوم و دیگر دو آیتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ ان میں سے ایک میں ارشاد ہوا: جب انسان کو رنج و تکلیف ہوتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے لیکن جب ہم اس کی مشکل حل کر دیتے ہیں تو وہ ایسا لگتا ہے کہ اس نے ہمیں حل مشکل کیلئے پکارا ہی نہ تھا (وہ ہر بات بھول جاتا ہے)

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَاۗىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ [۱۰:۱۲]

اس کے باوجود کہ یہ پانچ آیات ایک ہی حقیقت کا ذکر کرتی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک میں نئی ادا اور نئی لطافت پائی جاتی ہے، بعض آیتوں میں نقصانات اور مشکلات کا ذکر ہے جن میں بیماریاں اور قحط وغیرہ جیسے مصائب و آفات سبھی شامل ہیں جب کہ کچھ آیات میں دریائی سمندری خطرات کا تذکرہ ہے ان میں موجیں، گرداب طوفان نیز خطرناک آبی جانور اور راستہ بھول جانا وغیرہ شامل ہے۔ لیکن بعض آیات میں فقط امواج اور طوفان کا ذکر ہے پھر چند ایک آیتوں میں مشکلوں کے حل ہو جانے، مصائب کے دُور ہونے اور تکلیفوں کے ازالے کے بعد لوگوں کا شرک کی طرف پلٹ جانا مذکور ہوا کچھ آیتوں میں ظلم اور سرکشی کا ذکر ہے جو شرک کی نسبت وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔

کئی آیات میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ مشکلوں اور مصیبتوں کو خدا کی طرف سے اور نعمتوں کو اپنی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں کہیں ذکر ہے کہ وہ سب کے سب مشرک بن جاتے ہیں اور کہیں یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ شرک کی طرف پلٹ جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے باہم مختلف ہوتے ہیں، یعنی بعض پہلی قسم میں اور بعض دوسری قسم میں داخل ہیں۔

کسی آیت میں ہے کہ وہ مصیبت کے وقت، خدا سے عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن آرام وراحت خاص ہونے کے بعد اسے بھول جاتے ہیں لیکن بعض آیتوں میں فقط دعا کرنے اور خدا کو پکارنے کا ذکر ہے بعض مقامات پر معمولی تکلیف کا ذکر ہے (مس کی تعبیر میں اسی طرف اشارہ ہے) لیکن بعض موقعوں پر کہا ہے جس وقت ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوں تو وہ خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، یہ کیفیت شاید انسانوں کے مقامات اقسام کی وجہ سے ہے کہ کچھ پہلی قسم میں اور کچھ دوسری قسم میں ہوتے ہیں۔

ان میں سے اکثر آیات میں لفظ ''اخلاص'' آیا ہے جو خداوند عالم کے بغیر کسی اور معبود کی نفی کی طرف اشارہ ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ لوگ آرام وراحت میں بھی خدا پرست ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں، مگر جب بپھری ہوئی موجیں یا طوفان ان کے سامنے آتا ہے۔ تو خدا کے وہ تمام شرکاء ان کے دل و دماغ سے محو ہو جاتے ہیں اور توحید و یکتا پرستی کا نور ان کے وجود پر پھیل کر اسے روشن کر دیتا ہے۔

دِلچسپ بات یہ ہے (جیسے تفسیر روح البیان میں ہے) کہ بت پرست کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو بت بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں (یاد رہے کہ بحری سفر ہمیشہ خطرات سے پُر ہے، لیکن پہلے وقتوں میں یہ خطرات بہت زیادہ تھے اور آج کے وسائل اس زمانے میں نہیں تھے) جب طوفان میں گھر جاتے تو بتوں کو دریا میں پھینک دیتے اور یارب! یارب! کی آوازیں بلند ہوتیں عجیب تر بات یہ تھی کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے تمام لطیف و منطقی دلائل سنتے رہتے۔ مگر ایمان نہیں لاتے تھے، لیکن جب طوفان کی مشکل اور مصیبت میں پھنس جاتے تو اپنے پورے جسم و جان کے ساتھ خدائے واحد کی طرف جھک پڑتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداشناسی کا فطری طریق بہت سے لوگوں کے لیے دیگر طرائق سے بڑھ کر صاف اور روشن ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو افراد مشکلات کے دورانِ فطرت کی آواز پر کان لگاتے اور تنگی و سختی کے دور ہو جانے پر اسے بھول جاتے ہیں قرآن مجید ان افراد کو خبردار کرتا ہے اور بڑے لطیف انداز میں انہیں اس شک وتردد اور غلط فہمی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾ [۱۷:۶۸]

کیا تم اس سے مامون ہو کہ خداوند عالم تمہیں شدید زلزلہ سے زمین میں دھنسا دے یا تم پر سنگریزوں کا طوفان بھیج دے تو تمہیں کوئی نگہبان و مددگار نہیں ملے گا۔''

کیا بحر و بر کے دو خدا ہیں یا خداوند کریم سمندر پر قدرت رکھتا ہے اور خشک زمین پر قدرت نہیں رکھتا؟ ہوسکتا ہے کہ اس کے حکم سے زمین تمہیں تمہارے شہروں سمیت اپنے اندر لے جائے اور نگل لے، حتیٰ کہ ان کے آثار بھی باقی نہ رہیں[1]۔

نیز کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک گرد باد سے سنگریزے اور جڑی بوٹیاں بلندی پر گئے اور دوسرے مقام پر بارش کی طرح برس پڑے، کبھی ایسا بھی ہوا کہ نہ صرف ایک انسان بلکہ پورا قافلہ ہی ان کنکروں کے نیچے دفن ہوگیا پس وہ خدا جو دریا و سمندر میں موجوں اور گرداوبوں کو حکم دیتا ہے۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ صحرا میں آندھی اور زلزلے کو بدکاروں کی موت کا ذریعہ بنادے!

اس کے بعد ایک اور آیت میں ان لوگوں کے جواب میں فرماتا ہے: کیا تم اس چیز سے محفوظ ہوکر وہ تمہیں پھر سے دریا میں دھکیل دے اور سخت آندھی اور طوفان کو مامور کرے کہ وہ تمہیں غرق کردیں، جب کہ تمہارے خون کا دعویٰ کرنے والا بھی کوئی نہ رہے۔

اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ يُّعِيۡدَكُمۡ فِيۡهِ تَارَةً اُخۡرٰى فَيُرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيۡحِ فَيُغۡرِقَكُمۡ بِمَا كَفَرۡتُمۡ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَكُمۡ عَلَيۡنَا بِهٖ تَبِيۡعًا ﴿۶۹﴾ [۱۷:۶۹]

یعنی تم یہ خیال کرتے ہو کہ یہ آخری موقع ہے کہ تمہیں دریا میں سفر کرنے کی ضرورت پڑی تو یہ کتنی بڑی غلط فہمی ہے!

آری چو بہ کشتی طبیب از خود میازار
چراغ از بہر تاریکی نگہ دار

وہ لوگ بھی اعتراف کرتے ہیں:

مورد بحث آیات میں پانچویں سے نویں آیت میں اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: جب ان (بت پرستوں) سے آسمان و زمین کے خالق کے متعلق سوال کریں تو وہ جھجک جواب دیتے ہیں، خداوند قادر ان کا آفریدگار ہے۔ (ولئن سالتهم من خلق السموت والارض ليقولن خلقهن العزيز العليم) اور اگر ان سے خود ان کے خالق کے بارے میں پوچھا جائے تو کہتے ہیں: ان کا خالق خدائے تمہیں آسمان و زمین سے رزق بتاتا ہے۔ کس نے آنکھیں اور کان دیئے کون مردہ میں سے زندہ اور زندہ میں سے مردہ کو نکالتا ہے اور کون امورِ عالم کو چلانے والا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ خدائے یکتا (قل من يرزقكم من السماء والارض امن يملك السمع والابصار ومن يخرج الحي من الميت ويخرج الميت من الحي ومن يدبر الامر فسيقولون الله) اسی طرح بت پرستوں سے مخلوقات کی پیدائش و تدبیر کے متعلق سوال کیا جائے تو وہ خداوند یکتا ہی کا نام لیتے ہیں۔

---

[1] چند سال قبل شمالی افریقہ میں ایسا زلزلہ آیا کہ ایک گاؤں اپنے تمام باشندوں اور عمارات سمیت کچھ اس طرح زمین میں دھنس گیا کہ اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔ جب لوگ وہاں گئے تو انہیں اس گاؤں کے کھنڈرات بھی نہ ملے۔

یہ آیات اوراسی طرح کی دیگر آیات قرآن، توحیدِ فطری کی زندہ مثالیں [1] ہیں۔ممکن ہے ان (بت پرستوں) کا یہ جواب ''برہان نظم'' کے عنوان سے توحید پر عقلی استدلال کے مشابہ ہو،لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ عرب کے مشرک لوگ ان پڑھ علم واستدلال سے ناواقف تھے ان کے جوابات کی یہ ہم آہنگی بتائے گی کہ ان کے جوابات کا سرچشمہ فطرت ہے جس مین وہ سب برابر ہیں.....ورنہ عقلی استدلال کتنا ہی واضح وروشن کیوں نہ ہو۔وہ لوگوں میں عمومی ہم آہنگی پیدانہیں کرسکتا جب کہ وہ بت پرست علم ودانش سے کوسوں دور تھے۔

اسی بناء پر ہم کہہ رہے کہ کہ یہ پانچوں آیات درحقیقت، توحیدفطری، کی سند بن کر آئی ہیں جیسا کہ تفسیر روح البیان میں سورۂ زخرف کی آیت ۹ کے ذیل میں ہے:اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ معرفت الٰہی انسان کی سرشت میں رکھ دی گئی ہے [2]

تفسیر فخر رازی میں بھی سورۂ زخرف کی آیت ۸۷ کے ذیل یہی بات سوال وجواب کی صورت میں مذکور ہے:

ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ یہ آیت اوراسی طرح کی دیگر آیات دلالت کررہی ہیں کہ ''معرفت وجودخدا'' فطری یز ہے لیکن بعض علماء کہتے ہیں کہ ایسانہیں ہے کیونکہ قوم فرعون.....فرعون کے سوا کسی معبود کا تصورؑ نہیں رکھتی تھی اور قوم ابراہیمؑ نے پیغمبروں سے کہا تھا۔انا لفی شك مما تدعوننا الیه یعنی تم ہمیں خدا کی طرف جودعوت دیتے ہواس کے متعلق ہم شک وشبہ رکھتے ہیں۔

پھر فخر رازی نے اس کے جواب میں لکھا ہے: ہم یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں کہ قوم فرعون وجودخدا کی منکر تھی کیونکہ قرآن میں ہے:وجحدُوبها واستیقنتها انفسهم ظلماً۔وہ آیاتِ الٰہی کا ظلماً انکار کررہے ہیں۔حالانکہ وہ وجودِ خدا پر یقین رکھتے ہیں۔نیز حضرت موسیٰؑ نے بھی اسی (توحیدفطری) سے فرعون کے سامنے استدلال کرتے ہوئے فرمایا:لقد علمت ما انزل هولاءِ الا رب السمٰوٰت والارض بصآئر۔تو جانتا ہے کہ زمین اورآسمان کے پروردگار کے علاوہ کسی اور نے ان آیات کودلوں کی روشنی کے لیے نازل نہیں کیا ہے [3]

تو جانتا ہے''.....کے جملے میں، توحیدفطری، کی طرف اشارہ ہے.....دلچسپ بات یہ ہے کہ آیات میں سے دوآیتوں میں کفار ومشرکین اقرار کرتے ہیں کہ آسمانوں اورزمین کا خالق خدا ہے.....اس لیے فرمایا گیا: ہے [4]

فانی یوفکون (یعنی حق کا اقرار کرنے کی صورت میں کیوں خدا کی بندگی سے منہ موڑتے ہو؟)۔ [5]

اس فعل کا مجہول ہونا اسی طرف اشارہ کررہا ہے کہ اپنی ذات میں وہ حق کا اقرار کرتے ہیں لیکن خارجی عوامل جن وانس کے شیاطین اور داخلی عوامل ''نفسانی خواہشات اور جاہلی تعصب، انہیں حق سے منحرف کررہے ہیں۔حالانکہ یہ ان کی فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے ایک اور

---

[1] جیسا کہ سورۂ عنکبوت کی آیت ۶۳، سورۂ لقمان کی آیت ۲۵، سورۂ زمر کی آیت ۳۸ میں یہی مضمون آیا ہے۔

[2] تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۳۵۳ ذیل آیت ۹ نیز اسی تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۳۹۹ ذیل آیت ۸۷ میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔

[3] تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۳۵۳ ذیل آیت ۹ نیز اسی تفسیر روح البیان جلد ۸ صفحہ ۳۹۹ ذیل آیت ۸۷ میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔

[4] (تفسیر کبیر جلد ۲۷ صفحہ ۲۳۳)

[5] یوفکون از مادہ ''افک (بروزن اسم) پلٹانے اور پھرانے کے معنی میں ہے۔اسی لیے ''دروغ'' کو بھی ''افک'' کہا جاتا ہے اور مخالف ہواؤں کو بھی ''موتفکات' کہتے ہیں۔

مقام پر ''فانی تسحرون، کی تعبیر تم پر کہاں سے جادو کیا گیا ہے میں بھی فعل مجہول آیا ہے.....اس طرح سے ایسے شخص کو خطاب کیا جاتا ہے جو بلاارادہ کسی کام کے پیچھے پڑا ہو۔

البتہ ان آیات کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے.....پیغمبر اکرمؐ چاہتے ہیں کہ ہمیں راہ حق سے پلٹا دیں یا یہ کہ وہ ساحر ہیں اور انہوں نے ہم پر سحر کر دیا ہے قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے اس کے باوجود کہ تم اعتراف کرتے ہو کہ خدا ہی آسمانوں، زمین، شمس وقمر اور انسانوں کا خالق اور اس جہان کی تدبیر امور کرنے والا ہے.....پھر تمہیں اس شخص نے کیونکر منحرف یا مسحور کر دیا ہے جو اس کی عبادت اور اس غیر کی نفی عبادت کی دعوت دیتا ہے کونسی عقل ایسی بات سوچتی ہے؟

بہت سے مفسرین جیسے طبرسی مجمع البیان میں، علامہ طباطبائی المیزان میں فخر رازی تفسیر کبیر میں، آلوسی روح المعانی میں اور قرطبی تفسیر قرطبی میں پہلی ہی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ دوسری تفسیر بھی مذکورہ آیت کے مفہوم سے چنداں مغائرت نہیں رکھتی۔

عالم ذر میں عہد و پیمان:

زیر بحث آیات میں سے دسویں اور آخری آیت میں ''توحید فطری'' کی ایک ایسی صورت ذکر کی گئی ہے جس کی نظیر قرآن مجید کی دیگر آیات میں نہیں ہے.....اس آیت کا مفہوم ومطلب کیا ہے؟ چونکہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اس لیے اس بارے میں علماء مفسرین متکلمین اور محدثین کے مابین بہت زیادہ گفتگوئیں ہوئی ہیں.....اس آیت کی تفسیر کے بعد ہم ان کے مختلف نظریات اور اپنے موقف کو مختصر طور پر بیان کریں گے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو کہ جب تمہارے پروردگار فرزندانِ آدم کے صلبوں سے ان کی ''ذریت'' کو نکالا (حاضر کیا) اور انہیں خود انہی پر گواہ بنا کر ان سے پوچھا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ **واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهور هم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربكم۔''**

ان سب نے بھی یکبارگی کہا.....ہاں! ہم گواہی دیتے ہیں۔**قالو بلیٰ شهدنا۔**

پھر فرمایا: خدا نے یہ عمل اس لیے انجام دیا کہ وہ قیامت کے روز یہ نہ کہیں کہ ہم اس موضوع (توحید ومعرفت خدا) سے غافل وبے خبر تھے۔**انتقولو یوم القیامة انا کنا عن هذا غافلین۔** یا بجائے۔''غفلت'' کا عذر لانے کے ''تقلید کا بہانہ بنائیں اور کہیں کہ ہمارے آباء واجداد پہلے ہی مشرک تھے (ہم ان کی اولاد تھے اور اس کے علاوہ ہمارا کوئی چارہ نہ تھا) تو کیا ان بے راہ لوگوں کے گناہ کی سزا ہمیں دی جائے گی۔**اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ﴿۱۷۳﴾** (اعراف ۱۷۳)

یہ آیات اجمالی طور پر ایک سلسلہ حقائق سے پردہ اٹھا رہی ہیں۔

(۱) ایک وقت خداوند عالم نے قیامت تک آنے والے تمام فرزندانِ آدم کو ظاہر کیا۔

(۲) خداوندعالم نے ان کوخود ان کے نفسوں پر گواہ بنایا اوران سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا۔

(۳) اس اقرارعہد کا مقصد یہ تھا ''اولاً'' قیامت کے دن مشرک لوگ غفلت و بے خبری کا دعویٰ نہ کریں۔ثانیاً پہلے لوگوں کی تقلید کو اپنی بے گناہی کی دلیل نہ بنائیں۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اولادِ آدم کا یہ ظہور و بروز کب واقع ہوا.....اس کی کیفیت کیا تھی۔عالم ذر سے کیا مراد ہے؟ یہ کس طرح تحقیق پذیر ہوا؟

اس سوال کے جواب، عالم ذر کی تشریح اور مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں چھ قول ہیں:

(۱) محدثین واہلِ ظاہر کا مسلک

بعض احادیث کے مطابق ان کا خیال ہے کہ فرزندانِ آدم.....آدم سے قیامت تک.....چھوٹے چھوٹے ذرات کی صورت میں پشتِ آدم سے نکلے اور فضا ان سے بھر گئی ان میں عقل وشعور موجود تھا اور وہ کلام بھی کر سکتے تھے۔خدا تعالیٰ نے انہیں مخاطب کیا اور فرمایا کہ میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں الست بربکم۔سب نے ایک ساتھ جواب دیا کہ.....ہاں.....بلیٰ خدا نے اس ترتیب سے توحید پر عہد و پیمان لیا۔اپنی ربوبیت پر خود انسان ہی کو گواہ بنایا۔[۱]

(۲) عالم ذر

عالم ذر کے حوالے سے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ انسانی وجود کے ذرات یعنی ''نطفہ'' باپ کے پشت سے ماں کے رحم میں منتقل ہوا اور درجہ بدرجہ عالم جنین میں انسانی صورت میں آیا۔اسی حالت میں خداوندعالم نے ان میں قوت واستعداد رکھ دی ہے کہ وہ حقیقت توحید اور آئین حق کا ادراک کر سکیں گویا توحید فطری کا تصور خود انسان کے وجود میں رکھ دیا گیا ہے۔اس تفسیر کو مفسرین کے ایک گروہ جیسے المنار اور فی ظلال القرآن نے اختیار کیا اور بعض دوسرے مفسروں نے بھی اسے نقل کیا ہے[۲]

اس نظریئے کے مطابق ''عالم ذر'' یہی ''عالم جنین'' ہے اور مذکورہ سوال وجواب زبان حال سے ہے نطق وزباں سے نہیں اس مطلب کے شواہد عرب وغیرہ عرب کے کلام میں بہت ہیں۔جیسا کہ سید مرتضیٰ نے بعض حکماء سے نقل کیا ہے: اسد لا ارض من شق انهارك وغرس اشجارك وجنى ثمارك ؟ فان لم تجبك حوارًا اجابتك اعتبارًا زمین سے پوچھو کہ تیرے دریاؤں کو کس نے جاری

---

[۱] علامہ مجلسی اصولِ کافی کی شرح ''مرأۃ العقول، جلد ۷ صفحہ ۳۸ میں لکھتے ہیں: یہ محدثین اور متقین کا طریقہ ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ایمان ظاہر پر ہے اور ہم مزید غور نہیں کرتے نہ توجیہ وتاویل کی طرف جاتے ہیں۔فخر رازی نے اس قول کو محدثین ومسرین کی طرف منسوب کیا ہے جلد ۱۵ صفحہ ۴۶۔

[۲] لمنا جلدہ صفحہ ۳۸۷ البتہ ان کی بعض تعبیریں قول پنجم کے مطابق معلوم ہوتی ہیں) فی ظلال القران جلد ۳ صفحہ ۱۷۶۔

کیا، درختوں کو کس نے بو یا میووں کو کس نے چنا۔۔۔اور وہ (زمین) تجھے ظاہر کی زبان سے جواب نہ دے تو زبان حال سے جواب دے گی۔ یہ بات اس بیان کے مطابق ہے کہ جو مفسرین نے موجودات جہان کی عمومی تسبیح وتحمید حتی کہ بے جان اشیاء کی تسبیح کے ذیل میں تحریر کیا ہے۔

۳۔عالم ذر سے مراد عالم ارواح ہے

یعنی خدائے تعالیٰ نے اجسام سے پہلے ارواح کو پیدا کیا، انہیں مخاطب کیا اور ان سے توحید کا اقرار لیا۔۔۔یہ تفسیر بعض روایات سے لی گئی ہے جن کا ذکر بعد میں ہوگا۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس بحث میں لفظ ''ذریت'' کا مادہ ''ذر'' بروزن ''شر'' ہے جس کا معنی غبار کے چھوٹے چھوٹے ذرات یا نطفہ کے اجزاء وذرات ہیں یا اس کا مادہ ''ذرو'' بروزن ''مرو'' ہے جس کا معنی منتشر و پراگندہ ہونا ہے یا یہ لفظ ''ذراء'' بروزن ''زرع'' سے ہے جس کا معنی خلقت و پیدائش ہے بناء بریں اس بات کو مسلم نہیں قرار دینا چاہیے کہ ''ذریت'' کا مادہ ''ذر'' ہی ہے جس کا معنی چھوٹے چھوٹے ذرات واجزاء ہیں (غور کریں)

۴۔ سوال وجواب بوسیلہ پیغمبران:

یہ سوال وجواب خدائے تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان پیغمبروں کے وسیلے سے ہوا جو نطق اور دربان سے ادا ہوا۔ کیونکہ انسانوں میں سے ایک گروہ نے پیدا ہونے کے بعد کمال عقل اور دلائل توحید و یکتا پرستی کو پیغمبروں کی زبان سے سنا اور اس کا مثبت جواب دیا یعنی بلیٰ (ہاں) کہہ کر اس کا اقرار کیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ''ذریت'' ذر سے ہے جس کا معنی چھوٹے چھوٹے ذرات ہیں تو یہ مطلب صحیح نظر نہیں آتا اس قول کے طرفدار کہتے ہیں کہ ذریت کا معنی فرزند اولاد ہے خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے.....پھر ذریت کا اطلاق اکثر عاقل وبالغ انسانوں پر ہوا لہٰذا یہ تشریح درست نہیں ہوگی۔ اس تفسیر کو سید مرتضیٰ نے مذکورہ آیت کے ذیل میں ایک احتمال کے طور پر درج کیا اور فخر الدین رازی نے بھی یہی اشارہ دیا ہے۔[1]

(۵) یہ سوال وجواب بزبان حال ہوا

خداوند اور انسانوں کے درمیان یہ سوال وجواب بزبان حال ہے اور یہ بلوغ اور کمال عقل کے بعد ہوا ہے کیونکہ کمال عقل کے بعد جب انسانوں نے انفس وآفاق میں خدا کی قدرت کو دیکھا تو زبانِ حال سے اس ذاتِ واحد کے وجود کا اقرار واعتراف کیا گویا خداوند عالم نے اپنی آیات اور نشانیاں دکھانے کے بعد ان سے سوال کیا۔ الست بربکم کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں اور وہ زبانِ حال سے جواب دیتے ہیں ۔بلیٰ (ہاں).....زبان قال سے اس گفتگو کے بہت سے شواہد ونظائر موجود ہیں۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح۔رازی جلد ۵ صفحہ ۳۲۶

اس تفسیر کو علامہ طبرسیؒ نے تبیان میں بلخی اور رمانی سے نقل کیا ہے۔ [1]

(۶) المیزان میں منقول تفسیر

اس آیت کی تفسیر جو علامہ طباطبائی نے المیزان میں بہ صورت انتخاب نقل کی ہے، اس میں آپ نے پہلے اس بات کو محال شمار کیا ہے کہ افراد انسان ظاہری پیدائش سے قبل حیات وعقل وشعور کے ساتھ مستقل وجود رکھتے تھے، خداوند تعالیٰ نے ان سے اعتقاد بہ توحید کا پیمان لیا اور پھر انہیں پہلی حالت کی طرف پلٹا دیا، تا کہ وہ اپنی پیدائش کا طبعی راستہ طے کریں اور پھر دنیا میں آئیں۔ بعد فرماتے ہیں:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ (یٰس۔ ۸۲۔۸۳)

جب وہ کچھ چاہے تو فرمانِ خدا یہی ہے کہ فرماتا ہے ''ہوجا'' اور وہ ''ہوجاتا ہے پس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضے میں ہر چیز ہے۔''

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾ [۵۴:۵۰]

ہمارا حکم ایک سے زیادہ مرتبہ نہیں ہوتا۔ جیسے ایک بار پلک جھپکنا۔''

ان آیات سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ اس دنیا کی چیزوں کی دو حالتیں ہیں..... ایک دنیا میں آنے کی صورت..... اس کا حکم یہ ہے کہ ایک چیز مرحلہ وار ''قوت'' سے ''فعل'' اور ''عدم'' سے ''وجود'' میں آتی ہے..... ابتداء میں ناقص اور پھر کامل ہوجاتی ہے اس کے بعد فنا ہو کر اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جاتی ہے۔..... دوسری خدا کے ہاں (وجود میں آنے کی صورت..... اس میں اشیاء عالم خدا کی طرف سے امر ہیں کہ وہ فعل محض اور غیر تدریجی بجز اس کے کہ وہ قوت یا نقص کی حامل اور فعلیت کے آنے کے منتظر ہوں۔ بہ الفاظ دیگر موجودات دو طرح کا وجود رکھتے ہیں..... ایک وجود جمعی نزد خدا کہ قرآن میں اسے ملکوت کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے..... دوسرا وجود پراگندہ کہ جو وقت گزرنے کے ساتھ مرحلہ وار پروان چڑھتا ہے۔

اس ترتیب سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں عالم انسانیت سے پہلے ایک اور عالم انسانیت ہے کہ جس میں انسان شہود باطنی کے ذریعے ذات الٰہی کا مشاہدہ کر رہا ہے اور واحدانیت کا اقرار کرتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اگر مذکورہ آیات میں غور وفکر کیا جائے تو معلوم ہوگا یہ اسی معنی ومطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہیں [2]

---

[1] تفسیر تبیان جلد ۵ صفحہ ۲۷، تفسیر المنار جلد ۹ صفحہ ۳۸۶ میں بھی یہ بیان موجود ہے۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۸ صفحہ ۲۳۴۔

اگرچہ محولہ بالا چھ تفسیریں اجمالی طور پر آیت کا مفہوم واضح کر رہی ہیں تو بھی مناسب ہے کہ ہم کچھ تنقید و تبصرہ کریں۔

قول اوّل:

بہت سے محققین نے پہلے قول کو سب سے ضعیف و کمزور قرار دیا ہے اور اسی پر زیادہ اشکالات بھی وارد کیے ہیں۔ علامہ طبرسی نے مجمع البیان'' اور سید مرتضیٰ نے ایک کلام میں اس پر نکتہ چینی کی ہے جسے علامہ مجلسی نے امراۃ العقول'' میں ان سے نقل کیا ہے۔ فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اس قول پر بارہ اعتراضات کیے ہیں۔ ان میں سے بعض کچھ زیادہ قابل توجہ نہیں ہیں۔ بعض میں تکرار ہے اور بعض ایک دوسرے میں جمع ہو سکتے ہیں لیکن ان کا سرسری جائزہ لینے سے اس قول پر یہ پانچ اشکالات جاندار معلوم ہوتے ہیں:

الف: یہ تفسیر لفظ۔ بنی آدم'' اور جمع کی ضمیروں کے ساتھ جو آیت میں ہیں..... فرزندان آدم کے بارے میں گفتگو کرتی ہے یہ حضرت آدم '' اور جمع کی ضمیروں کے ساتھ جو آیت میں ہیں..... فرزندان آدم کے بارے میں گفتگو کرتی ہے یہ حضرت آدم کے متعلق نہیں ہے کیونکہ لفظ ظہور'' جو ''ظہر'' (پشت) کی جمع ہے اس سے مناسبت نہیں رکھتا..... خلاصہ یہ کہ آیت کہہ رہی ہے فرزندانِ آدم کی ''ذریت'' ظاہر ہوئی لیکن یہ نہیں کہا کہ حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد ظاہر ہوئی حالانکہ روایات میں اولاد آدم کے ظاہر ہونے کا ذکر ہوا ہے۔

ب: واقعتاً اگر اسی طرح کا عہد و پیمان اس جہان سے پہلے ایک جہان میں لیا گیا ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ سبھی لوگ اس کو بھول جائیں..... یہ سب کا بھول جانا اس کے عدم پر دلالت کرے گا۔ کیونکہ آیاتِ قرآن سے بخوبی واضح ہے کہ روز قیامت انسانوں کو اس دنیا کے واقعات اور مسائل یاد ہوں گے کیا اس دنیا سے عالم ذر کا فاصلہ دُنیا و آخرت کے درمیانی فاصلے سے زیادہ ہے؟

ج: بالفرض اگر ہم مان لیں کہ عمومی نسیان قابل فہم ہے تو پھر ایسے عہد و پیمان کا کیا فائدہ؟ کیونکہ یہ عہد تبھی مفید ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو یاد ہو۔ لیکن وہ عہد کہ جس کو سب بھول گئے ہوں اس کا نہ کوئی تربیتی فائدہ ہے نہ ہی یہ اتمام حجت کے لیے مفید ہے۔

د: سورۂ مومن کی آیت نمبر ۱۱..... ربنا امتنا اثنتین واحیتنا اثنتین۔ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ کہ انسانوں کے لیے دو موتیں اور دو زندگیاں ہیں یعنی پہلے مردہ تھے زندہ ہوئے پھر مریں گے اور قیامت کے دن زندہ ہوں گے۔ جب کہ اس تفسیر کے مطابق دو سے زیادہ موتوں اور زندگیوں کا قائل ہونا پڑے گا۔ (یعنی ایک موت و حیات عالم ذر میں اور دو بار موت اور دو بار زندگی اس دنیا میں ماننا ہوگی)

ھ: اس تفسیر کو قبول کرنے میں مسئلہ تناسخ کو ماننا لازم ہے کیونکہ تناسخ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ایک روح مختلف اجسام میں زندگی گزرتی ہے اس تفسیر کو رُو سے قبل ازیں روح کا تعلق ان ذرات کے ساتھ تھا جو پشتِ آدم سے ظاہر ہوئے اور پھر موجودہ بدن کے ساتھ تعلق ہوا..... یہ صورت ہی تناسخ ہے اور تناسخ کا باطل ہونا دینِ اسلام کے مسلمات میں سے ہے۔ اسی لیے کتاب جواب المسائل السرویہ'' میں جب شیخ مفید اس تفسیر کو بعض روایات کے تحت ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں یہ روایات قائلین تناسخ کی ہیں جہاں انہوں

نے حق و باطل کو خلط ملط کر رکھا ہے۔[1]

یہ گفتگو شیخ المفسرین علامہ طبرسی کے کلام میں بھی آئی ہے[2]

قول دوم

اس میں کہا گیا ہے کہ انسان کو سرشت توحیدی اور خداشناسی کی خاص استعداد رحم مادر ہی میں عطا کر دی گئی ہیں، اس قول پر اشکالات کی تعداد کم ہے.....اس پر اہم ترین اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ آیۂ مورد بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوال و جواب قولی ہے، زبانِ حال سے نہیں (جسے مجاز و تشبیہ کہا جاسکتا ہے) علاوہ ازیں لفظ ''اخذ'' (لیا) اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ عمل گذشتہ زمانے میں واقع ہوا حالانکہ توحید فطری دائمی طور پر جنینوں سے تعلق رکھتی ہے اور ہر زمانے میں جاری رہتی ہے۔ لیکن ان ہر دو سوالات کا جواب دیا جاسکتا ہے:

قرینہ کی موجودگی میں اس سوال جواب کو زبانِ حال پر حمل کیا جاسکتا ہے اور اس میں کوئی مانع نہیں عرب و غیر عرب لوگوں کے نظم نثر میں اس کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں پہلی تفسیر پر جو اشکالات وارد ہوتے ہیں وہ بھی اس تفسیر کی صحت کا ذریعہ بن جائیں گے۔ باقی رہا استمرار'' تو فعل ماضی کبھی استمرار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ البتہ اس کے لیے قرینہ کی ضرورت ہے اور یہ قرینہ محل بحث میں موجود ہے[3]۔

قولِ سوم:

اس میں ارواح سے سوال و جواب کا ذکر ہے تاہم یہ آیت مورد بحث کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ آیت میں بنی آدم کی پشتوں سے ذریت کو نکالنے اور ان سے سوال و جواب کا بیان ہے، اس کا ارواح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

قول چہارم:

سوال و جواب اس ظاہری زبان میں ہوا اور یہ انسانوں کے اس گروہ سے متعلق ہے جس نے بلوغ کے بعد انبیاء کی دعوت کا مثبت جواب دیا ہے۔ اس تفسیر پر کئی اشکالات وارد ہوتے ہیں۔ لیکن مذکورہ آیت میں تمام انسانوں کا ذکر ہے نہ کہ ایک گروہ کا جو انبیاء پر ایمان لایا اور پھر کافر ہو گیا۔ جب کہ حسب ظاہر سوال و جواب خدا کی طرف سے ہے انبیاء کی طرف سے نہیں ہے۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آیت انما اشرك اٰبآئونا من قبل ہمارے باپ دادا پہلے ہی سے مشرک تھے دلالت کرتی ہے کہ

---

[1] مراۃ العقول جلد ۷ صفحہ ۴۱۔

[2] مجمع البیان جلد ۴ صفحہ ۴۹۷۔

[3] یہ تعبیر بہت سی قرآنی آیات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ انه كان عليما قديراً (فاطر۔۴۴) وما كان لبشرٍ ان يكلمه الله الا وحياً (شوریٰ۔۵۱) بل كان الله بما تعملون خبيراً (فتح۔۱۱) و كان الله عزيزًا حكيماً (فتح۔۱۹)

اس کا تعلق ایک گروہ سے ہے کہ جن کے باپ دادا پہلے ہی مشرک تھے یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ آیت میں ان کے دوعذر ہائے لنگ کا ذکر ہوا ہے ایک غفلت اور دوسرا تقلید آباء.....ممکن ہے ان میں سے ہر عذر کسی ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔خصوصاً اس لحاظ سے کہ کلمہ اَوْ کے ساتھ ان کو باہم ملایا گیا ہے۔

قول پنجم

یہ قول کئی جہات سے قول دوم سے مشابہ ہے، اس معمولی تفاوت کے ساتھ قولِ دوم میں فطرت قلبی اور اس قول میں فطرتِ عقلی کا تذکرہ ہے اس سے قبل بتایا جاچکا ہے کہ بہت سے مفسرین نے اسے قبول کیا کیا ہے۔

قول ششم

یہ قول تفسیر المیز ان میں آیا ہے اور اس پر دو بڑے اشکال وارد ہوتے ہیں۔

(۱) مذکورہ بالا بیانات میں اس کی جو شرح ہوئی ہے اس میں دو عوالم (عالم جمعی و عالم تفصیلی) کے وجود پر کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔

(۲) اس آیت کو ایک ایسے عالم سے متعلق تصور کرنا (اگر وہ ثابت ہو جائے تو) بہت بعید نظر آتا ہے اس صورت میں اصطلاحی طور پر اصل مسئلہ ہی میں خدشہ ہے تو اس کی فرع یعنی سوال و جواب ہونا بھی مخدوش ہو جاتا ہے۔

عالم ذر کی بحث کا نتیجہ:

عالم ذر سے متعلق اس تمام بحث پر غور و فکر کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسرا اور پانچواں قول نسبتاً بہتر ہے ان دونوں اقوال پر بہت کم اشکالات وارد ہوتے ہیں۔اگرچہ بعض جہات سے ظاہری تخالف نظر آتا ہے۔لیکن قرینہ کی موجودگی اور عرب و عجم کے کلام میں اس کے نظائر کی بدولت یہ مخالفت درخور اعتنا نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے مفسرین اور علماء علم کلام نے اسے قبول کیا ہے۔اور روایات میں بھی اس کے لیے اشارات موجود ہیں جو آئندہ گفتگو میں بیان ہوں گے۔

مختصر یہ کہ اکثر محققین کا نظریہ ہے کہ یہ سوال و جواب تمام انسانوں سے تھا جو زبانِ حال سے واقع ہوا نہ کہ زبانِ قال سے..... یا استعداد فطری کے ذریعے کہ جسے انسان کے نطفہ و جنین میں رکھا گیا یا استعداد عقلی کے وسیلے سے کہ انسانوں کے سن بلوغ تک پہنچنے اور کمال عقل حاصل کرنے کے بعد خدا نے یہ ان کے اندر پیدا کر دیا۔

اس سلسلے میں کہیں فطرت کا قلب کا تذکرہ ہے جس میں کسی قسم کے استدلال کی ضرورت نہیں کہیں فطرت عقل کے لحاظ سے بات ہوئی ہے جس میں معرفتِ خدا کو بدیہی و روشن امور میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ اس کے دلائل اس قدر واضح ہیں کہ ہر انسان انہیں سمجھ سکتا ہے یہ درست ہے کہ انسانوں میں بہت سے افراد اپنی زبان سے اس کا انکار کرتے ہیں اور مادیت و مادہ پرستی کی طرف مائل ہیں لیکن اگر ہم ان کی باتوں کا تجزیہ کریں تو دیکھتے ہیں وہ مادہ و فطرت کے لیے ایک طرح کے عقل و شعور کے قائل ہیں۔دوسرے لفظوں میں انہوں نے فطرت و طبیعت کو خدا

کا درجہ دے رکھا ہے۔ یہ چیز ہمارے اعتقاد کے مطابق فطرت دل کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ (غور کریں)

توضیحات

(۱) اسلامی روایات میں عالمِ ذر''

مختلف اسلامی مدارک چاہے وہ شیعہ مسلک کے یا اہل سنت کے ہوں ان میں ''عالم ذر'' کے بارے میں بہت سی روایات پائی جاتی ہیں۔ ظاہراً یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تواتر ہے مثلاً تفسیر نور الثقلین میں تیس تفسیر برہان میں سینتیس اور شاید (حذف مکررات کے بعد) مجموعی طور پر چالیس سے بھی زیادہ ہیں، تفسیر الدر المنثور میں بھی اس موضوع پر بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں..... اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان روایات کے مضامین کسی ایک مسلک کے ساتھ مختص نہیں ہیں۔

لیکن ان میں بہت سی روایات کسی ایک ہی روای سے نقل ہوئی ہیں جو خبر واحد کے حکم میں آتی ہیں..... ان میں بہت ''سی زراہ'' سے کچھ ''ابوبصیر'' سے ایک تعداد ''جابر'' سے اور پھر بعض روایتیں ''عبداللہ بن سنان'' ''صالح بن سہل'' سے بھی ملتی ہیں۔ اس امر کی طرف توجہ دینے سے روایات کی تعداد میں خاصی کمی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان روایات کے نفس مضمون میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔

کچھ روایات قول دوم کی تائید کرتی ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ''اقرار توحید'' ایک فطری عہد ہے اور اس کی بازگشت انسان کی پیدائش و آفرینش کی طرف ہے کہ معرفت خدا اس کی سرشت میں رکھی گئی ہے جیسے امام جعفر صادقؑ سے عبداللہ بن سنان نقل کرتا ہے۔ قال سئلته عن قول الله عزوجل فطرت الله التی فطر الناس علیها ما تلك الفطرةُ؟ قال هی الاسلامُ، فطرهم الله حین اخذمیثاقهم علی التوحیدِ، قال الستُ بربکم وفیه المومن والکافرُ۔ [1]

میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا ''فطرت الله التی فطر الناس علیها۔ میں فطرت سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس سے مراد اسلام ہے کہ جسے خدا نے تمام انسانوں کی سرشت میں رکھ دیا ہے۔ جس دن یہ عہد و پیمان لیا گیا خدا تعالیٰ نے فرمایا'' کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ جب کہ ان میں مومن و کافر سب موجود تھے۔

آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ اس حدیث میں آیتِ فطرت اور عالم ذر میں رابطے کا ذکر کیا گیا ہے یہی مضمون زراہ نے امام جعفر صادقؑ سے دوسرے الفاظ میں نقل کیا ہے زرارہ نے امام جعفر صادقؑ سے واذ اخذربك کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے فرمایا ثبتت المعرفة فی قلوبهم ولسوا الموقفِ ۔ویذ کرونهٗ یوماً ۔ ولولاذٰلك لم یذر احدٌ من خالقهٗ ومن رازقهٗ؟ [2]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۷۴ حدیث ۷۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۹۵ حدیث ۳۴۵۔

[2] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۸ حدیث ۱۵۔

معرفتِ خدا ان کے دلوں میں جاگزین ہوگئی لیکن وہ اس دن کے ''موقف'' کو بھول گئے کبھی نہ کبھی یہ ان کے ذہن میں آجائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا (کہ معرفت فطری طور پر ان کے قلوب میں ودیعت کی گئی) تو کسی کو پتہ ہی نہ ہوتا کہ اس کا خالق کون اور رزاق کون ہے؟

حالانکہ روایت کا ایک دوسرا حصہ قول اوّل کے موافق ہے اور بتاتا ہے۔

فرزندانِ آدم ذرات کی شکل میں ان کی پشت سے نکلے اور خداوند تعالیٰ نے ان سے عہد زبانِ قال سے لیا جیسا کہ تفسیر برہان کے صفحات ۳۔۴۔۸۔۱۱۔۲۹ میں ذکر ہوا ہے (یہ تمام روایات زرارہ نے امام محمدؑ باقرؑ سے نقل کی ہیں اور وہ سب بطور ایک روایت کے محسوب ہوتی ہیں)۔

یہی مفہوم ومطلب تفسیر ومنثور میں کئی طرق سے ابن عباس سے منقول ہے کہ جس کا ذکر طول کلام کا موجب ہوگا۔ درحقیقت ان سب روایتوں کا مضمون ایک ہے اور بالآخر وہ ایک ہی روایت کہلائے گی۔ پھر وہ روایت بھی قول ابن عباس ہے نہ کہ پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے۔

یہی مفہوم دیگر کتابوں میں دوسرے طریقوں سے مذکور ہے۔

ان روایات پر ایک اہم ترین اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ یہ سب کی سب ظاہر قرآن بلکہ صریح طور پر قرآن کے خلاف میں کیونکہ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی آدم ذرات کی صورت میں پشت آدم سے برآمد ہوئے جبکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ ذرات پشت ہائے بنی آدم سے باہر آئے۔ من بنی ادم من ظهورهم ذريتهم ۔ان روایتوں پر دیگر بہت سے اشکالات کے علاوہ ایک اور اشکال بھی وارد ہوتا ہے۔ جس کی طرف پہلے اشارہ ہوا ہے کتب حدیث میں ان کو ضعیف روایات کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔

روایات کا تیسرا گروہ مبہم ہے کہ ان کی ایک سے زیادہ تشریحات ہوسکتی ہیں مثال کے طور پر وہ روایت جو ابوبصیر نے امام جعفر صادقؑ سے نقل کی اور کہا ہے کہ میں نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: كيف اجابوا وهم ذر انہوں نے کیونکر جواب دیا، جب کہ وہ ذرات کے سوا کچھ نہ تھے؟ امامؑ نے فرمایا: جعل فيهم ما اذا سألهم اجابوه يعني في الميثاق۔[1]

ان میں ایسی صلاحیت رکھ دی کہ جب عہد ومیثاق کا سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔

روایات کا چوتھا گروہ بتا رہا ہے کہ انسانوں سے یہ سوال جواب اس وقت ہوا جب کہ وہ ارواح کی صورت میں تھے۔ جیسا کہ مفضل بن عمر نے امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

قال الله عزوجل لجميع ارواح (بني) ادم الستُ بربكم قالو بلىٰ[2]

خداوندِ عالم نے بنی آدم کے تمام ارواح سے فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، سب نے کہا۔ ہاں!!

روایات کے پانچویں گروہ میں بتایا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسانی ارواح کو اس صورت میں حاضر کیا کہ جیسے وہ آج ہیں اور پھر ان

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۹ حدیث ۲۲۔

[2] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۹ حدیث ۲۳۔

سے عہد و پیمان لیا۔[1]

ضعیف ہے اور ان کو ایک تصورّ کر کے ان پر بھروسہ کرنا مشکل ہے۔

بہتر یہی ہے کہ ہم بزرگ علماء کی طرح ان روایات کے بارے میں کوئی فیصلہ دینے سے باز رہیں اور ان کی حقیقت حال ان کے راویوں کے ذمے رہنے دیں[2]

لہٰذا اب ہم رہ گئے اور آیت مذکورہ۔اس کے بارے میں جو کچھ قرائن سے سمجھا جاسکتا ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ چھ اقوال میں سے دوسرا قول بہت مناسب ہے ہم اسے اختیار کرلیں اس میں عالم ذر کو انسانی سرشت فطری طور پر خدا کی پہچان اور اسلام کے ہم آہنگ کہا گیا ہے پس اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ جب ذرات نطفہ کو پدران کی پشتوں میں سے رحم ہائے مادران میں منتقل کیا گیا ہے تو نور معرفت توحید اور آئین خدا کو ذاتی استعداد کے طور پر ان میں رکھ دیا گیا۔

۲۔کونسی فطرت؟ فطرت عقل یا قلب

خداشناسی کے ایک فطری امر ہونے کے بارے میں محققین اور دانشوروں کی تعبیرات وتشریحات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس میں دو مختلف راستے اختیار کیے ہیں۔

الف: بعض علماء کے نزدیک فطرت سے مراد ''واضح استدلال عقلی'' ہے کہ انسان حد کمال عقل تک پہنچ کر جہان وجود کا مشاہدہ کرتا ہے موجودات کے اسرار و رموز اس کی سمجھ میں آتے ہیں تب وہ یک دم اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے کہ اس پر پیچ اور نوع بہ نوع کائنات کا نظام کسی عقل وشعور رکھنے والی ذات کے بغیر قائم ہونا اور قائم رہنا محال ہے۔

اس عقل کو ''عقل فطری'' کا نام دیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے انسان کسی استاد و معلم کے بغیر اپنے مقصود کو پالیتا ہے، جیسے انسان کہتا ہے ''کل جزء سے بڑا ہوتا ہے'' تو یہ ایک واضح بات ہے اور اس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح جب وہ کہتا ہے کہ ''دو چیزیں جو ایک تیسری چیز کے مساوی ہوں وہ آپس میں بھی مساوی ہوں گی۔

مباحث منطق میں ایسی چیزوں کو ''بدیہیات'' کہتے ہیں علماء منطق نے انہیں چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی اولیات، مشاہدات، تجربیات، متواترات، حدسیات اور فطریات۔

فطریات یعنی عقل فقط تصوّر سے تصدیق تک نہیں پہنچتی۔اسے ایک متوسط کی ضرورت ہے اور وہ واسطہ خود ذہن انسانی میں موجود

---

[1] تفسیر درمنثور جلد ۳ صفحہ ۱۴۲۔

[2] اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے ان کتابوں کی طرف رجوع کریں کہ جن میں عالم ذر کے بارے میں روایات موجود ہیں۔ بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۷ و مابعد مرآۃ العقول صفحہ ۳۶ و مابعد تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۱۶ و مابعد تفسیر نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۹۳ و مابعد تفسیر دالمنثور جلد ۳ صفحہ ۱۴۶ و مابعد۔

وحاضر ہے۔

(ب): فطرت کا ایک اور مفہوم بھی ہے جو ہمارے محل بحث میں زیادہ مناسب وموزوں نظر آتا ہے وہ یہ کہ انسان اس کو بغیر استدلال (استدلالِ عمیق) کے درک کر لیتا ہے جب کہ وہ چیز اس کے سامنے ہے اور وہ اسے تسلیم کر رہا ہے۔ مثلاً وہ ایک شاخ اور پھول کو دیکھتا ہے اس کی خوبصورتی اور خوشبو کا اعتراف کرتا ہے۔ اور اس کے درمیان میں کوئی دلیل بھی نہیں کیونکہ واضح ہے۔ کہ وہ پھول خوبصورت بھی ہے اور خوشبودار بھی پس یہاں دلیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔

خدا شناسی کے بارے میں فطری ادراک اسی طرح کا ہے انسان جب دل کی گہرائیوں میں نورِ حق دیکھتا ہے دل کے کانوں سے صدائے حق سنتا ہے جو اسے علم وقدرت کے مبداء کی طرف دعوت دیتی ہے جو کمال مطلق ہے اس وجدانی ادراک میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے پھول کی خوبصورتی اور خوشبو کو روک کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔

ایمان بہ خدا کے فطری ہونے کی زندہ دلیلیں:

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ ایمان بہ خدا کا فطری ہونا تو صرف ایک دعویٰ ہے اور معرفتِ خدا کا ایسا کوئی فطری راستہ موجود نہیں ہے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ وجودِ خدا کا احساس سب کے دل میں ہے لیکن اگر کوئی اسے ماننا ہی نہ چاہتا ہوں تو میں اسے کیسے منواؤں گا۔

تاہم ہمارے پاس عقیدہ توحید کے فطری ہونے کے ایسے شواہد موجود ہیں کہ اگر انہیں صحیح طریقے سے پیش کیا جائے تو منکرین خدا کے منہ بند ہو جائیں ان شواہد کا خلاصہ پانچ حصوں میں کیا جا سکتا ہے۔

تاریخی واقعات:

وہ تاریخی واقعات جو زمانہ قدم سے مورخین کی تحقیق وجستجو کا مرکز رہے ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی قوم میں کوئی دین موجود نہ تھا بلکہ ہر قوم کے افراد کسی عنوان سے علم وقدرت کے ایک مبداء ومنبع پر اعتقاد رکھتے اور اس کی پرستش کرتے تھے۔ اگر ہم مان لیں کہ اس میں استثنائی صورتیں بھی رہی ہیں بعض کچھ لوگ تھے جو ایسا اعتقاد نہیں رکھتے تھے تو بھی یہ بات واضح ہے کہ انسانوں کی اکثریت ایک مبداء علم وقدرت کی قائل تھی اور طول تاریخ میں کچھ لوگوں کا نہ ماننا ایک استثناء ہے (ہر کلیہ میں استثناء نادر تو ہوتا ہی ہے۔

مشہور مغربی مورخ ''ویل ڈورانٹ'' اپنی کتاب ''تاریخ تمدن'' میں دنیا میں بے دینی کے مواقع کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے.....ان تمام اُمور کے باوجود کہ جن کا تذکرہ کیا گیا ہے لادینیت ایک نادر چیز رہی ہے اور یہ پرانا اعتقاد حقیقت کے عین مطابق ہے کہ دین وہ نظریہ ہے جو عام افراد بشر کے درمیان جاری وساری رہا ہے۔

ایک فلسفی شخص کے نزدیک یہ قضیہ بنیادی واساسی قضایا میں سے ہے وہ اس بات کو ہرگز قبول نہیں کرتا کہ ادیانِ عالم میں سبھی

تصورات لغواور بے ہودہ ہیں بلکہ اس کی توجہ اس طرف ہوتی ہے کہ دین زمانہ قدیم سے تاریخ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ موجود رہا ہے [1]

ایک اور تعبیر ذیل میں مزید کہتا ہے: سوچنے کی بات ہے کہ وہ تقویٰ جسے انسانی قلب سے نکالا نہیں جا سکتا ہے، آخر اس کا منبع کہاں ہے؟ [2]

پھر یہی مورخ اپنی کتاب ''درسہائے تاریخ'' میں ایسے الفاظ کے ساتھ کہ جن سے خفگی کا اظہار ہوتا ہے لکھتا ہے..... دین کی سو جان ہے، جب بھی اسے ذبح کیا جائے گا اور وہ دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔ [3]

اگر خدا اور مذہب پر اعتقاد صرف عادت تقلید، تلقین اور تبلیغ ہی کی بناء پر ہوتا تو یہ کبھی اتنی عمومیت حاصل نہ کرتا پس طول تاریخ میں اس کا ہمیشہ موجود رہنا اس کے فطری ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

(۲) آثار قدیمہ کے شواہد:

زمانہ قبل از تاریخ (فن تحریر کی ایجاد اور احوال انسان کی وضاحت سے پہلے) کی جو علامات اور آثار باقی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی مذہب کا تصور موجود تھا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ خدا، روز جزاء اور موت کے بعد کی دوامی زندگی پر بھی یقین رکھتے تھے اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ ایسی اشیاء کہ جن کا ان عقائد کے ساتھ تعلق ہوا انہیں میت کے ساتھ قبر میں رکھ دیتے تا کہ بعد از مرگ کی زندگی میں وہ ان سے استفادہ کر سکے۔ وہ انسان یا حیوان کے مردہ اجسام کو مخصوص طریقے سے خشک کر کے ان کی مومیائی کرتے تا کہ وہ خراب ہونے سے بچ سکیں اور اس کی زندہ مثال اہرام مصر کے مقابر ہیں جو مردگان کی بقاء کے آئینہ دار ہیں یہ سب کچھ وہ لوگ اس لیے کرتے تھے کہ انہیں مبداء و معاد کا یقین تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے اعتقادات میں بہت سی خرافات بھی شامل تھیں۔ لیکن اس سے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے معتقد تھے اور اس سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۳) ماہرین نفسیات کے مطالعات و اکتشافات:

ماہرین نفسیات نے نفس انسانی کے مختلف پہلوؤں اور اس کے رجحانات کا مطالعہ کر کے جو معلومات حاصل کیے ہیں وہ عقیدہ مذہبی کے فطری ہونے کی عمدہ دلیل ہیں۔

ماہرین نفسیات نے نفسِ انسانی کے لیے چار احساس چار میلان اور چار پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ۔

---

[1] تاریخ تمدن (ویل ڈوارنٹ) جلد ا صفحہ ۸۷ تا ۸۹۔

[2] کتاب فطرت (شہید مطہری) صفحہ ۱۵۳۔

[3] کتاب فطرت (شہید مطہری) صفحہ ۱۵۳۔

(۱)حسِ دانائی (۲)حسِ زیبائی (۳)حسِ نیکی (۴)حسِ مذہبی اس بات کا زندثبوت ہیں[1]

بعض ماہرین نے ان ابعاد کی تعداد پانچ قرار دی ہے۔(۱)مقولہ حقیقت جوئی ۲۔مقولہ نیک اخلاقی ۳۔مقولہ زیبائی ۴۔مقولہ ابداع واختراع۔ ۵مقولہ عشق و پرستش۔[2]

(۱) حسِ دانائی۔ یہ ایک قوی جاذبہ ہے جو انسان کو علوم وفنون کے حصول اور جہانِ ہستی کے اسرارِ ورموز کھولنے پر آمادہ کرتا ہے وہ اُمور جن کو انسانی زندگی میں داخل حاصل ہے یا نہیں..... یہ جاذبہ ان سب کو شامل ہے مثلاً ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ایک سال قبل اس دنیا کی حالت کیا تھی۔ یا ایک ارب سال بعد اس کی حالت کیا ہوگی یا وہ کرات جو ہماری زمین سے لاکھوں نوری سال کے فاصلے پر ہیں ان میں کیا کچھ ہوتا ہے قطع نظر اس سے کہ ان کا سمجھنا ہماری انفرادی یا اجتماعی میں کوئی اثر رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔اس حس کا وجود مختلف قسم کے علوم کی پیدائش کا سبب ہے۔

(۲) حسِ زیبائی: ہر شخص اپنے وجدان میں اس حس کا احساس کرتا ہے یہی حس انسان کو مختلف قسم کی ابداع واختراع کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور یہی ہر طرح کے فن اور ہنر کا سرچشمہ ہے۔

(۳) حسِ نیکی: حسن اخلاق، اصولوں کی پابندی، عدالت آزادی اور صدق وغیرہ ایسے اوصاف کے پیدا ہونے کا سبب ہے ممکن ہے بہت سے انسان ان اصولوں پر عمل پیرا نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ان باتوں کو پسند کرتے ہیں۔

(۴) حسِ مذہبی: یہ نفس انسانی کا بعد چہارم ہے جو انسان کو کمالِ مطلق کی طرف لے جاتا ہے اسے بعد قدسی و یزدانی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی انسان کو مذہب کی دعوت دیتا ہے اور بجز اس کے کہ کسی دلیل کا محتاج ہو یہ اس مبداء بزرگ (خدا) پر ایمان رکھتا ہے۔ممکن ہے کہ یہ ایمان مذہبی خرافات کی آمیزش سے خالی نہ ہو۔یعنی اس میں بت پرستی اور ستارہ پرستی شامل ہوگئی ہو لیکن یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مبداء کا تصور موجود ہے۔

(۴) مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کی ناکامی:

ہم جانتے ہیں گذشتہ چند صدیوں میں مذہب کے خلاف کس قدر پروپیگنڈا ہوا ہے۔خصوصاً مغرب میں جدید وسائل کی مدد سے کتنی شدت کے ساتھ مذہب کے خلاف مہم چلائی گئی اور وہ مخالف مذہب فضا تیار کی گئی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔

جب یورپ میں علمی تحریک چلی اور اس نے ان لوگوں کو علم سے مالا مال کر دیا تو انہوں نے علمی وسیاسی معاشروں کو کلیسا کے اثر سے آزاد کرنے کے لیے مذہب کے خلاف بہت شدید پروپیگنڈا ہوا البتہ یہ پروپیگنڈا دراصل مسیحیت کے خلاف تھا کیونکہ یورپ میں یہی عمومی مذہب تھا۔اور اس طرح الحاد اور انکارِ خدا کا سلسلہ چل نکلا۔ چنانچہ فلاسفہ کے نفوذ اور علماء طبیعت کے اقوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہب کے

---

[1] مقالہ کو وبتائم ترجمہ (مہندس بیائی) کتاب ''حس مذہبی یا بعد چہارم نفسِ انسانی کا ملاحظہ کریں۔

[2] لیکن ظاہراً مقولہ حقیقت اور مقولہ ابداع واختراع ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

خلاف فضاء تیار کی گئی جس سے کلیسا بے رونق ہو گیا اور مسیحی علماء گوشہ عزلت میں بیٹھ گئے تب وجود خدا معجزہ اور کتب آسمانی پر اعتقاد کو بے کار کی باتیں قرار دیا جانے لگا حتیٰ کہ زمانے کی فرضی تقسیم کے تحت حیات بشر کو چار ادوار میں تقسیم کر دیا گیا اور اسے سبھی نے درست تسلیم کر لیا (یعنی دور افسانہ و توہم دور مذہب۔ دور فلسفہ دورِ علم گویا اس تقسیم کے مطابق اب مذہب کا دور ختم ہونے کو ہے۔

تعجب ہے کہ علم معاشرت کے خدود کمال تک پہنچ جانے کے باوجود کتب میں اس بات کو ایک مسلمہ کے طور پر اختیار کیا گیا ہے کہ مذہب کسی نہ کسی طبعی عامل کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی اس کی اساس و بنیاد جہالت خوف احتیاج اور اقتصادی مسائل وغیرہ میں سے کسی ایک پر استوار ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مذہبی حکومت (کلیساء قرون وسطیٰ) سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں مسیحی علماء کا ظلم و ستم ان کی سنگدلی اور عوام کے ساتھ نیز علماء طبیع و سائنس دانوں) کے ساتھ ان کی بدسلوکی کے علاوہ ان کی مصنوعی ذاتی تکریمات اور تعیّشات میں مست رہنا اور محروم طبقے کو بھولے رہنا یہ سب کچھ ان کی بدنامی اور غیر مقبولیت کا باعث بنا..... پھر ان کو اپنے اعمال کا کفارہ دینا پڑا تاہم اس سلسلے میں سب سے بری بات یہ ہوئی کہ پوپ اور کلیسا کی چیرہ دستیوں کے ردعمل کے طور پر جو تحریک چلی اس میں عیسائیت کی بجائے نفس مذہب کے خلاف پروپیگنڈا ہونے لگا اور اس کی روز دنیا کے ہر مذہب پر پڑتی تھی۔

اسی اثناء میں کیمونسٹ بھی مذہب کو مٹانے کے لیے اپنی پوری قوت کے ساتھ میدان میں آ گئے انہوں نے اپنے تمام رسائل اور فلاسفہ کے افکار اس کام کے لیے وقف کر دیئے..... اس طرح انہوں نے اپنی تمام قوتیں، صلاحتیں اور قابلیتیں اس پر صرف کر دیں کہ مذہب معاشرہ کے لیے ''افیون'' ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ مذہب کے خلاف اتنی قوتیں صرف کرنے کے باوجود مذہب کو انسانوں کے دل کی گہرائیوں سے نکالا نہیں جا سکا۔ اور مذہبی جذبے کو ختم نہیں کیا جا سکا بلکہ اب تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ مذہبی احساسات بہت بڑھ گئے ہیں حتیٰ کہ کیمونسٹ ممالک میں بھی مذہب کے لیے وسعت قلب پیدا ہو چکی ہے۔ اور وہاں ایسی تحریکیں جنم لے چکی ہیں جو مذہب اور خصوصاً اسلام کی ترقی میں کوشاں ہیں۔

یہ حالات اس چیز کی بخوبی نشان دہی کر رہے ہیں کہ مذہب انسانوں کی فطرت کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے، اس بناء پر وہ اس قابل ہے کہ ایسے ناموافق حالات میں بھی اپنی حفاظت کرے اور باقی رہے جب کہ اس کے خلاف کئی طرفوں سے معاندانہ پروپیگنڈے ہو رہے ہوں..... پس اگر مذہب فطری و جبلی داعیہ نہ ہوتا تو کبھی کا مٹ چکا ہوتا۔

۵۔ شدید زندگی میں شخصی تجربے:

بہت سے لوگوں نے اس حقیقت کو آزمالیا ہے کہ جب مشکلات انسان کو گھیر لیتی ہیں، ہر طرف سے سختیوں کے طوفان ہجوم کر رہے ہوتے ہیں انسان گرداب میں گرفتار اور ہر طرف سے ناامید ہو جاتا ہے۔ ظاہری اسباب ناپید ہو جاتے ہیں۔ اب انساں جاں بلب ہوتا ہے (چھری) اس کی گردن تک پہنچی ہوتی ہے، تو ان خطرناک لمحات میں ''فطرت'' جوش مارتی ہے، انسان ''خلوص'' کے ساتھ ایسے مبداء کی طرف

توجہ کرتا ہے جو اس کی تمام مشکلات حل کرسکتا ہے.....انسان کا دل اس ذات کی طرف رجوع کرا اور اس سے طلب نصرت کرتا ہے۔

یہاں تک کہ جن لوگوں کو مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا وہ بھی اس صورتِ حال سے مستثنیٰ نہیں ہیں.....وہ بھی سختیوں، تکلیفوں اور بیماریوں میں اسی مبداء اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس حقیقت کے واضح شواہد ہیں، جس کا تذکرہ قرآن مجید نے گذشتہ آیات میں کیا ہے۔ کہ خداشناسی ایک فطری امر ہے اور حس مذہبی خود انسان کے اندر موجود ہے۔

.....ہاں.....انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک لطیف آواز اور پُرمحبت صدا سنتا ہے جو اسے ایک سب سے بڑی حقیقت، عالم وقادر مبداء کی طرف بلا رہی ہوتی ہے۔ جس کا نام ہے ''اللہ'' یا ''خدا'' ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے کسی اور نام سے تعبیر کریں لیکن یہاں نام کے بارے میں گفتگو نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر ایمان کی بات ہو رہی ہے۔

بہت سے نکتہ سنج شاعروں نے بھی اپنے فصیح اور شیریں شعروں میں اس ''حقیقت'' کا ذکر کیا ہے۔

شورش عشق تو درہیچ سرنیست کہ نیست
منظر روی تو زیب نظری نیست کہ نیست
نہ ہمیں ازغم تو سینہ ماصد چاک است
داغ تو لالہ صفت ، برجگری نیست کہ نیست

ایک اور شاعر یوں کہتا ہے:

دراندون من خستہ دل ندانم کیست
کہ من خموشم واودرفغاں درغوغا است

٦۔ فطرت مذہبی پر دانشوروں کی گواہی:

معرفت خدا کا فطری ہونا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو فقط قرآن مجید اور اسلامی روایات میں ہی مذکور ہے بلکہ مفکرین، دانشور اور غیر مُسلم فلاسفہ وشعراء کے کلام میں بھی اس کا بہت زیادہ تذکرہ ہے، بطور نمونہ چند ایک دانشوروں کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں۔

o۔ آئن سٹائن اپنے ایک بیان میں کہتا ہے:

بلا استثناء ایک عقیدہ و مذہب تمام انسانوں کے باطن میں موجود ہے، میں اس کا نام ''احساس مذہبی آفرینش'' قرار دیتا ہوں.....اس مذہب میں انسان خواہشوں کو کم کرتا ہے ہے۔ انسانی عظمت وجلال کا مشاہدہ کرتا ہے جو ظاہری خلقت کے باطن میں وجود رکھتے ہیں وہ اپنے وجود کو ایک طرح کا قید خانہ سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس پنجرے سے نکل جائے اور اس کائنات کو ایک حقیقت واحدہ کی طرح دیکھ لے [1]

o۔ معروف دانش ور ''پاسکل'' کہتا ہے:

---

[1] دنیاء کہ می بینم (خلاصہ) صفحہ ۵۳۔

دل کے پاس ایسے دلائل ہوتے ہیں جو عقل کی دسترس میں نہیں ہوتے [1]

- ولیم جیمز کہتا ہے۔
- میں بخوبی جانتا ہوں کہ مذہبی زندگی کا سرچشمہ ''دل'' ہے میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ترتیب وترکیب ہائے فلسفہ ایک ترجمہ کی مانند ہیں جن کا اصلی متن کسی اور زبان میں ہے۔ [2]
- میکس مولر کہتا ہے:

ہمارے بڑے خدا کے حضور اس وقت سے جھکتے رہے ہیں۔ جب وہ اسے اس کے نام (خدا) سے پکار بھی نہ سکتے تھے۔ [3]

- یہی دانش ور ایک اور جگہ اپنے عقیدے کا اظہار کرتا ہے:

مشہور نظریہ تو یہ ہے کہ ''دین'' ابتداء طبعی موجودات اور بُت پرستی سے شروع ہوا اور پھر وجود خدا کا عقیدہ پیدا ہوا (لیکن نہیں) زمانہ قدیم کے حالات وواقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائے ازلی کی پرستش اور عبادت پرانے سے پرانے وقتوں میں بھی ہوتی تھی۔ [4]

- مشہور مورخ پلوتارک کہتا ہے:

اس دنیا پر نظر ڈالی جائے تو بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جہاں آبادی علم، صنعت، سیاست اور کوئی حکومت نہیں ہے لیکن پوری کوشش کے باوجود ہم کوئی ایسی جگہ نہیں پا سکتے جہاں ''خدا'' موجود نہ ہو۔ [5]

- سموئیل کیننگ کہتا ہے:

تمام انسانی معاشروں میں مذہب موجود رہا ہے اگرچہ مورخوں سیاحوں اور عیسائی مبلغوں نے ایسی قوموں کا ذکر کیا ہے جن میں مذہب موجود نہیں تھا، لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ان کا یہ کہنا درست نہیں تھا، دراصل ان کا یہ موقف اس عنوان سے تھا کہ ان قوموں کا مذہب ان لوگوں کے مذہب کے مطابق نہیں تھا (وگرنہ اصل میں مذہب کا وجود پایا جاتا تھا) [6]۔

ہم اس بحث کو معروف مورخ ''ویل ڈوارنٹ'' کے کلام سے اختتام تک پہنچاتے ہیں جیسا کہ اس نے کہا ہے:

اگر ہم یہ تصور نہ کریں کہ مذاہب کی بنیادیں زمانہ قبل از تاریخ میں موجود تھیں تو پھر ہم طویل تاریخ میں اِن کی موجودگی کو بھی

---

[1] سیر حکمت در اروپا، جلد ۲ صفحہ ۱۴۔

[2] سیر حکمت در اروپا، جلد ۲ صفحہ ۳۲۱۔

[3] مقدمہ نیائش صفحہ ۳۱۔

[4] کتاب فطرت (شہید مطہری) صفحہ ۱۴۸۔

[5] مقدمہ نیائش صفحہ ۳۱۔

[6] جامعہ شناسی (سموئیل کینگ، صفحہ ۱۹۱۔

نہیں جان سکتے [1]

(۴) اسلامی روایات میں فطرت کا ذکر

بطورِ خاص توحید پرستی اور عمومی طور پر دین و مذہب کا تذکرہ اسلامی روایات میں موجود ہے اگرچہ روایات کے الفاظ وعبارات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بعض روایات میں توحید و یکتا پرستی کو امر فطری قرار دیا گیا ہے۔ جیسے امام جعفر صادقؑ کے معروف اصحاب میں سے علاء بن فضیل نے آنجناب سے آیہ شریفہ "فطرت الله التی فطر الناس علیها" کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے فرمایا، یہاں فطرت سے مراد توحید ہے [2]

چند دیگر روایات میں معرفتِ خدا کو امر فطری کہا گیا ہے مثلاً زرارہ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی .....هی الفطرت التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله۔ امام نے فرمایا: فطرت هم الله علی المعرفةِ۔ یعنی اس میں وہ فطرت مراد ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے خدا نے ان کی سرشت کو اپنی معرفت وشناخت پر قرار دیا ہے۔ [3]

یہی مطلب ومفہوم چند دیگر روایات میں آیا ہے۔ [4]

بعض روایات میں "تمام اصول اسلام" کو ایک فطری امر کہا گیا ہے جیسا کہ ہم پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

کل مولودٍ یولد علی الفطرَةِ حتیّٰ یکون ابواهُما الّذانِ یهودانه وینصّرانه۔ [5]

ہر نوزاد بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے ماں باپ اسے یہودیت اور نصرانیت کی طرف لے جاتے ہیں یہ روایت بہت سی شیعہ وسنی کتب میں موجود ہے اور بڑی مشہور ہے، یہی مضمون ومطلب ان روایات میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جن میں توحید، نبوت، اور ولایتِ علیؑ کا تذکرہ ہوا ہے [6]

ایک روایت میں ہے کہ ابوبصیر نے امام محمد باقرؑ سے آیہ زیر بحث کی تفسیر دریافت کی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ یہاں فطرت سے مراد ولایت" ہے [7]

---

[1] تاریخ تمدن (ویل ڈورانٹ) جلد ۱ صفحہ ۸۸۔

[2] بحارالانوار جلد ۳ کتاب التوحید صفحہ ۲۷۷ حدیث ۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۸۔ ۱۰۔

[3] بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۹ حدیث ۱۱۔

[4] بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۹ حدیث ۱۲۔ ۱۳۔

[5] غوالی اللئالی بحوالہ بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۲۸۱ حدیث ۲۲۔

[6] بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۸۰۔ حدیث ۳۔ ۹۔ ۱۸۔ حدیث ۲۔

[7] بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۲۷۷ حدیث ۲۔

واضح رہے کہ ان تمام تفسیروں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ حقیقت میں تمام اصول اسلام بطور خلاصہ انسانی سرشت میں رکھ دیئے گئے ہیں کہ بعض روایات میں سب کی طرف اور بعض میں ایک حصے کا اشارہ ہوا ہے۔ پھر فطرت توحید بقیہ اصول اعتقادی سے الگ نہیں ہوسکتی کیونکہ خداوند حکیم نے انسانوں کو عبث پیدا نہیں کیا اور یہ مسلمہ امر ہے کہ ان کے تکامل کے لیے طریقہ عمل اور فرائض وتکالیف مقرر فرمائے ہیں جو انبیاء کے توسط سے ان تک پہنچائے گئے ہیں۔ ہاں تو نبی ورسول کے بعد دستور الٰہی حفاظت کرنا جانشین رسول کے ذمہ ہے۔ جو ولایت وحکومت الٰہی کے قیام کے ذریعے ممکن ہوگی۔ اور اس کے نتائج ساری دنیا وجہاں میں نمایاں ہوں گے مختصر یہ کہ توحید اور آئین اسلام کے فطری ہونے کی بابت بہت سی روایات آئی ہیں۔ اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیں:

(۱) تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۶ ومابعد۔

(۲) مرآۃ العقول جلد ۷ صفحہ ۵۴ ومابعد۔

(۳) تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۱۸۱۔

(۴) تفسیر درمنثور جلد ۳ صفحہ ۱۴۲ ومابعد۔

(۵) بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۱۶ ومابعد۔

ذاتِ خدا کی یکتائی
معفرتِ خدا میں اہم ترین اصل

اِشارہ:

گزشتہ بحثوں میں اثبات وجودِ خدا کے مختلف طرائق پر گفتگو کی گئی اور پانچ عمدہ عقلی دلیلیں بیان کی گئیں نیز معرفت توحید کے فطری راستے کا تذکرہ بھی ہوا۔ اصل وجود پر ایمان کے بعد اب معرفتِ خدا کا مسئلہ زیر بحث ہے اور اس میں سب سے اہم مسئلہ خدا کی توحید و یکتائی ہے۔

(۱) ایک لحاظ سے یہ بحث تمام صفات الٰہی کا سرچشمہ ہے۔

(۲) دوسرے پہلو سے یہ مسئلہ تمام آسمانی مذاہب کی بنیاد اور قرآن کا مرکزی نقطہ ہے، قرآن کی اکثر ابحاث اسی محور (مسئلہ توحید) سے تعلق رکھتی ہیں حتیٰ کہ بعض دانشواروں کا کہنا ہے کہ قرآن نے اصل وجود خدا پر بحث کی ہی نہیں بلکہ اس کی ساری گفتگو توحید الٰہی کے بارے میں ہے، تاہم یہ قوا مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔

(۳) تمام اسلامی عقائد، احکام وقوانین اور اجتماعی، اخلاقی وعبادی مسائل اسی اصل (توحید) کی طرف پلٹ آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم مسئلہ توحید وشرک کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اور وہ تمام وکمال اسی مسئلہ کی طرف متوجہ ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں کوئی اور موضوع مسئلہ توحید جتنی توجہ حاصل نہیں کر سکا۔ نہ صرف پیغمبر اکرم بلکہ تمام انبیاءؤ رسل توحید کی تبلیغ ودعوت میں مصروف رہے، اور شرک کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

اس اشارے کے بعد ہم قرآن مجید میں گناہ شرک کی اہمیت واضح کرتے ہیں، پھر کچھ قرآنی دلائل کا ذکر کریں گے، جن کا ''اثباتِ توحید اور بطلانِ شرک سے تعلق ہے..... سب سے پہلے ہم آیاتِ ذیل پر متوجہ ہوتے ہیں۔

(۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ [۴:۴۸] (نساء)

(۲) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ [۴:۱۱۶] (نسأ)

(۳) وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ

وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴿٦٥﴾ [٣٩:٦٥]

(۴) وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴿١٣﴾ [٣١:١٣]

(۵) حُنَفَاۗءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴿٣١﴾ [٢٢:٣١]

(۶) قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا

(انعام۔۱۵۱)

(۷) اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴿٧٢﴾ [٥:٧٢]

(۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ [٩:٢٨]

(۹) وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْۗءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ (توبہ۔۳)

(۱۰) اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۡ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴿٣﴾ [٢٤:٣] (نور۔۳)

(۱۱) قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ﴿٣٦﴾ [١٣:٣٦] (رعد۔۳۶)

(۱۲) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴿٢٥﴾ [١١:٢٥] اَنْ لَّا

تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝ [1] ٦ [۱۱:۲۶]

(۱۳) قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۱۰۸

[۲۱:۱۰۸]

(۱۴) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ [۶۰:۴]

ترجمہ

(۱) خداوندقدوس (گناہ) شرک کو ہرگز نہیں بخشے گا۔اس کے علاوہ جو مناسب سمجھے بخش دے جو کسی کو اللہ کا شریک بنائے وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا؟

(۲) خدا شرک (کا گناہ) کبھی معاف نہیں کرتا لیکن اس کے علاوہ جو چاہے بخش دے، جو خدا کے لیے کسی شریک کا قائل ہوا وہ گمراہی میں دور تک چلا گیا۔

(۳) تمہاری طرف اور تمام انبیاء جو تم سے پہلے تھے ان کی طرف ہم نے وحی کر دی کہ اگر شرک اختیار کیا تو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

(۴) یاد کرو (وہ وقت) جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا..... بیٹے! کسی کو خدا کا شریک نہ قرار دو کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

(۵) جس نے شرک اختیار کیا گویا آسمان سے گر پڑا اور (وسط میں) پرندوں نے اسے اچک لیا یا آندھی نے اُسے کہیں دور دراز جا پھینکا۔

---

[1] یہ مضمون دیگر آیاتِ قرآنی میں بھی آیا ہے۔جیسے سورۂ ہود آیت ۲۔سورہ یوسف آیت ۴۰،سورۂ اسراء آیت ۲۳،سورۂ یٰس آیت ۶۰ سورۂ حٰم سجدہ آیت ۱۴۔علاوہ ازیں اہمیت توحید اور مذمت شرک میں مختلف صورتوں اور مختلف الفاظ میں اس قدر آیات ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو ایک بڑی کتاب مرتب ہو جائے جو آیات ہم نے اوپر نقل کی ہیں وہ ان میں اہم ہیں اور بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں۔

(۶) کہو کہ آؤ میں تمہیں وہ پڑھ کر سناؤں جو چیز خدا نے تمہارے لیے حرام کردی ہے..... یہ کہ خدا کا کوئی شریک قرار نہ دو۔

(۷) جس نے کسی کو خدا کا شریک ٹھہرایا تو خدا نے جنت اس کے لیے حرام کردی اور اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہے۔

(۸) اے ایمان لانے والو کبھی مشرک نہ بنو کہ مشرک نجس ہوتے ہیں اور اس سال کے بعد وہ کبھی مسجدالحرام کے قریب نہ آئیں۔

(۹) خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمام لوگوں کے لیے حج کے دِن یہ اعلان ہے کہ خدا اور اس کا رسول مشرکروں سے بیزار ہیں۔

(۱۰) زانی نکاح نہ کرے، مگر زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک کے ساتھ۔

(۱۱) کہو..... میں مامور ہوں کہ خدا کی عبادت کروں اور مشرک نہ بنوں، اسی خدا کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

(۱۲) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (تو اس نے ان سے کہا) میں تمہارے لیے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں (میری دعوت یہ ہے) کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو میں تم پر دردناک عذاب آنے کے عدن کا خوف رکھتا ہوں۔

(۱۳) کہو..... مجھے تو صرف یہ وحی ہوئی ہے کہ تمہارا معبود خدائے واحد ہے، کیا اس صورت میں تم حق کے سامنے سرِتسلیم خم کروگے (یعنی بتوں سے کنارہ کشی اختیار کرلوگے)

(۱۴) تم لوگوں کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں ایک اچھا نمونہ ہے، جیسا کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا..... ہم بیزار ہیں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اور تمہارے نزدیک ہم انکار کرنے والے ہیں، ہمارے تمہارے درمیان مستقل عداوت اور دشمنی رہے، تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ اور شرک کو اپنے دلوں سے نکال نہ دو۔

مفردات کی تشریح:

''شرک''، مقاییس اللغۃ میں ''شرک'' کے دومعنی بیان ہوئے ہیں۔معنی اوّل مقارنت اور شرکت ہے جس کا نقطہ مقابل ''انفراد'' ہے.....معنی دوم ہے طویل ومستقیم ، البتہ اس لفظ کے مشتقات میں پہلا معنی معروف ہے۔لیکن دوسرا معنی بھی حاصل الفاظ رکھتا ہے۔ مثلاً ''شراک'' (جوتے کا تسمہ) اور ''شرک'' بروزن ''نمک'' جس کے معنی وہ چھوٹے چھوٹے سیدھے راستے ہیں جو اصل راستہ سے پھوٹتے ہیں یا اس کا معنی سیدھے راستے کا درمیانی حصہ ہے نیز یہی لفظ ''شرک'' شکاری کے جال کا معنی بھی دیتا ہے۔

بعض ارباب لغت کا اصرار کرنے کی کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے [1]

قرآن مجید میں لفظ ''شرک'' عام طور پر خدا کی ذات وصفات،خلقت وتدبیر یا عبودیت واعبادت میں شریک قرار دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے،.....پہلا معنی شرک عظیم یعنی کسی کو خدا کا شریک قرار دیا جائے،دوسرا معنی شرک صغیر کہ اپنے کاموں میں غیر خدا کی طرف بھی نظر رکھے جس کو ریاء اور نفاق بھی کہا جاتا ہے [2]۔

''واحد'' کا مادہ ''وحدت'' ہے.....مفردات میں راغب نے کہا ہے:اس کا معنی دراصل ایک ایسی چیز ہے جس کا کوئی جز نہ ہو،پھر اس میں وسعت پیدا کی گئی اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہونے لگا جس میں کسی قسم کی یکتائی پائی جاتی ہو۔پھر اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لفظ ''واحد'' مشترک ہے اور یہ چھ معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱).....واحد نوعی یا جنسی، جیسے انسان اور گھوڑا حیوان ہونے کے لحاظ سے ایک ہیں یا زید وعُمر انسان ہونے کے ناطے ایک ہیں۔

(۲) واحد اتصالی۔جیسے ایک انسان یا ایک درخت۔

(۳) واحد.....یعنی بے نظیر و بے مثال

(۴) واحد.....جو قابل تجزیہ وتقسیم نہیں

(۵) واحد عددی.....جیسے ہم کہتے ہیں.....واحد اثنان،ثلاثہ (ایک۔دو۔تین)

(۶) واحد.....کہ جو خط کا مبداء سے جیسے ہم کہتے ہیں نقطہ واحد اور جب یہ لفظ خدا کے وصف میں جائے تو اس کا مفہوم ی ہے کہ اس کے لیے جزء یا کثرت اور شمارہ عددی نہیں ہے۔

---

[1] کتاب ''التحقیق فی کلمات القرآن'' کی طرف رجوع فرمائیں.....یہ صحیح ہے کہ کلمات مشترک بعض اوقات ایک مادہ کی طرف پلٹتے ہیں لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔کیونکہ دوگروہ ایک لفظ کے دومختلف معانی لیتے ہیں جب کہ وہ ایک دوسرے کے مطلب سے بے خبر ہوتے ہیں۔

[2] مفرداتِ راغب مادہ شرک،لسان العرب،التحقیق فی کلمات القرآن،مقاییس اللغۃ جمرہ وغیرہ۔

''احد'' بھی اسی بنیاد و اساس سے ہے اور ''واحد'' کے معنی میں ہے، بعض کے نزدیک دونوں کا معنی ایک ہے بعض کا خیال ہے کہ دونوں میں فرق ہے احد اس ذات کو کہتے ہیں جو خارج اور ذہن میں کثرت اور تعداد کو قبول نہ کرے۔ اسی لیے یہ اعداد و تعداد میں داخل نہیں بہ خلاف واحد کہ جس کے ساتھ خارج یا ذہن میں ثانی و ثالث (دوم، سوم) ہوتا ہے..... اب اگر ہم کہیں ''احد'' نہیں آیا تو اس کا مطلب ہوگا کوئی بھی نہیں آیا اور اگر کہیں کہ واحد نہیں آیا تو ممکن ہے دو یا چند آدمی آئے ہوں [1]

بعض نے یہ احتمال دیا کہ ''احد'' مرکب کے مقابل اور ''واحد'' متعدد کے مقابل ہوتا ہے لیکن قرآن مجید میں ان دونوں الفاظ کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا معنی و مفہوم ایک ہی ہے، خدا کی دی ہوئی توفیق سے ہم آئندہ صفحات میں اس کی تشریح کریں گے۔

جمع آوری آیات اور تفسیر

گناہِ نا قابل بخشش

(۱)..... مورد بحثِ آیات میں سے پہلی آیت یہ اعلان کر رہی ہے کہ شرک وہ گناہ ہے جو بخشا نہ جائے گا..... جیسا کہ فرمایا: خدا گناہ شرک کو ہرگز نہ بخشے گا لیکن اس کے علاوہ جو کچھ چاہے بخش دے گا (ان اللہ لا یغفر ان یشرك به ویغفرُ مادون ذٰلك لمن یشاء) اس گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمام گناہان کبیرہ، ظلم و ستم اور بدیوں و رزشتیوں کو ایک طرف اور شرک کو دوسری طرف رکھیں تو شرک ان سب سے بڑا اور بھاری گناہ ثابت ہوگا۔ اس لیے تاکید یا دلیل کے عنوان سے ارشاد ہوا جو خدا کے لیے شریک کا قائل ہوا وہ گناہِ عظیم کا مرتکب ہوا ہے۔ (ومن یشرك باللہ فقد افتریٰ اثماً عظیماً)

بعض مفسرین (آیات مابعد کے قرینہ سے) یہ خیال کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ کفار کو اپنا ساتھی بنانے کے لیے ان کے بتوں کی عزت و پاکیزگی کو تسلیم کرتے اور پھر خود کو اصلی نجات یافتہ بھی سمجھتے تھے بہر حال اگر اس کا شان نزول یہی ہو تو بھی اس آیت کا مفہوم محدود نہیں ہوگا۔

بعض یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ آیت مشرکین کے ایک گروہ (جیسے وحشی قاتل حمزہ اور اس کے ساتھیوں) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو ایک مدت کے بعد اپنے کیے پر پشیمان ہوئے تو حضور اکرمؐ کی طرف ایک عریضے میں لکھا: ہم اپنے فعل پر نادم ہیں لیکن ہم نے آپ سے سنا ہے کہ کچھ لوگ از قبیل مشرک قاتل نفس اور منافی، عفت عمل کرنے والے عفو و بخشش کے قابل نہیں..... چونکہ ہم ان جرائم کے مرتکب ہو چکے ہیں لہٰذا آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتے، اس وقت یہ آیت (الا من تاب وٰامن وعمل صالحاً...) نازل ہوئی یعنی مگر جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل انجام دے۔

پیغمبر اکرمؐ نے یہ آیت وحشی اور اس کے دوستوں کو لکھ بھیجی وہ کہنے لگے کہ معاملہ اب بھی سخت ہے اور ممکن ہے کہ ہم نیت عمل انجام نہ

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۲۰ صفحہ ۵۴۳

دے سکیں.....تب مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی کہ خدا گناہ شرک کو ہرگز نہیں بخشے گا۔اس کے علاوہ (بہ تقاضائے مصلحت) تمام گناہ بخشے جا سکتے ہیں۔اس پر بھی انہوں نے بہانے بنائے اور کہا: ہوسکتا ہے کہ ہمیں مرضی خدا نہ ہو۔اس کے جواب میں آیت (یا عبادی الذین اسرفو علی انفسھم لا تقنطو ا من رحمۃ اللہ، ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً۔نازل ہوئی اور رسول کریمؐ نے یہ ان کی طرف بھیج دی، ان سب نے یہ آیت پڑھی اور پھر اسلام قبول کرلیا[1]

بہر حال جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ قرآن مجید کی تمام آیات میں ایک امید بخش آیت ہے کیونکہ یہ کہتی ہے اگر ایک باایمان انسان دُنیا سے جائے تو اسے خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور اگر وہ بے ایمان اور مشرک ہو تو اس کی نجات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

(۲) دوسری آیت کا مضمون بھی پہلی آیت جیسا ہے لیکن تھوڑا سا فرق ہے یعنی ''جو خدا کے ساتھ کسی شریک کا قائل ہوا اور وہ گمراہی میں بہت دُور تک چلا گیا (ومن یشرك باللہ فقد ضل ضلالا بعیداً) اس سے پہلی آیت میں اثم عظیم (کا ذکر تھا اور یہاں دور کی گمراہی کی بات ہو رہی ہے یہ دونوں باتیں ایک دوسری کے ساتھ لازم وملزوم ہیں یعنی گناہ جتنا بڑا ہوگا اتنا ہی خدا سے دُور کرے گا اور گمراہی اس قدر گہری ہو جائے گی پہلی آیت میں شرک کا علمی واعتقادی پہلو مدنظر تھا اور دوسری آیت میں اس کے عملی آثار پیش نظر ہیں مسلم ہے کہ یہ آثار اسی بنیاد سے حاصل ہوں گے۔

(۳) تیسری آیت میں شرک یعنی توحید سے انحراف کے بارے میں دوٹوک حکم دیا ہے جس میں خود نبی اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا: صرف تمہاری طرف وحی نہیں کی بلکہ تمام انبیاء گذشتہ کی طرف بھی ہم نے وحی بھیجی کہ اگر شرک کرو گے تو تمہارے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے اور نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ولقد اُوحی الیك والی الذین من قبلك لئن اشرکت لیحبطن عملك ولتکونن من الخاسرین)۔

یہ یقینی بات ہے کہ نہ پیغمبر اکرمؐ اور نہ دیگر انبیاءؑ میں سے کسی نے اس لیے شرک نہیں کیا کہ وہ درجہ عصمت پر فائز تھے لیکن اس بات کی اہمیت ظاہر کرنے اور دوسرے لوگوں کو اپنا حساب کرنے اور اپنے مقام پر غور کرنے کے لیے آمادہ وتیار کرنے کی خاطر یہ قطعی انداز بیان اختیار کیا اور شرک کے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے۔

اس آیت کے مطابق اگر انسان ساری زندگی خدا کی عبادت وبندگی اور اعمال صالحہ کرتا رہے لیکن اگر وہ آخری لمحے میں مشرک ہو جائے اور اسی حال میں چل بسے تو اس کے وہ تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔یعنی شرک ایک ایسی آگ اور جلانے والی بجلی ہے کہ آنِ واحد میں زندگی کا ماحصل جل کر خاکستر ہو جائے گا جیسا کہ سورۂ ابرہیمؑ کی آیت ۱۸ میں ہے: ایسی تندو تیز ہوا کہ طرح ہے جو خاکستر کو اڑا کر لے جائے گی۔اور ہر چیز کو برباد کردے گی۔

لَیَحْبَطَنَّ۔کا مادہ ''حبط'' بروزن ''ربط'' ہے جس کی بنیاد ''حبط'' بروزن ھدف ہے اور اس کا معنی ہے حیوان، اس قدر گھاس کھائے

---

[1] البیان جلد ۳ صفحہ ۵۶۔

کہ ہوا پیدا ہوجائے اور وہ بیمار ہوکر مرجائے پھر اسے ایسے اعمال کے لیے استعمال کیا گیا جو بظاہر زیادہ ہوں۔لیکن بہ باطن خراب ہوں اور مکمل طور پر نامقبول اور بے فائدہ قرار پائیں[1]

یہی معنی ومطلب ''لسان العرب'' و''مصباح اللغۃ'' میں بھی آیا ہے۔لیکن ''لسان العرب'' میں ''احباط'' کا ایک معنی کنوئیں کے پانی کا خشک ہوجانا اور پھر اس کا نہ پھوٹنا ہے۔''مقاییس اللغۃ'' میں اس کا اصل معنی ''بطلان'' اور ''درد'' لیا گیا ہے نیز زخم کے بھر جانے کے بعد چہرے پر جو نشان رہ جاتا ہے اس کو بھی حبط'' کہا گیا ہے۔

حبط اعمال کی حقیقت اور یہ کہ وہ کس طرح ہوتا ہے یہاں ان کے بارے میں بحث کرنے کا موقع ومحل نہیں ہے۔

سب سے بڑا ظلم:

(۴) چوتھی آیت میں لقمان کی زبان سے شرک کی ایک بلا دینے والی تعبیر ذکر کی گئی ہے وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: بیٹے کسی چیز یا کسی شخص کو خدا کا شریک نہ بناؤ کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے: (واذا قال لقمان لابنہ وھو یعظہ یا بنی لاتشرك باللہ ط ان الشرك لظلم عظیم)

اگرچہ بناء بر مشہور لقمان پیغمبر نہیں تھے،لیکن دانا وحکیم ایسے تھے کہ قرآن نے ان کے علم وحکمت کی گواہی دی ہے اور ان کی باتوں کو اپنے فرمان کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔انہی صاحب علم وحکمت بزرگ نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنے بیٹے کو قیمتی نصیحتیں کی ہیں ظاہر ہے کہ یہ نصیحتیں ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور قابل عمل ہوں گی۔

حضرت لقمان کی دس نصیحتیں جو قرآن میں مذکور ہیں، ان میں پہلی یہ ہے کہ بیٹا! شرک سے بچو۔اس سے معلوم ہوا کہ خود سازی، اصلاح ذاتی واجتماعی اور اخلاقی بنیاد شرک کا مقابلہ کرنا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں طہارت وپاکیزگی کا ذریعہ ہے..... خدا نے چاہا تو ''توضیحات'' میں شرک کے بارے میں مزید تشریح کی جائے گی۔

ہوسکتا ہے کہ لقمان کا بیٹا مشرک ہوا اور وہ اسے روک رہے ہوں۔لیکن بزرگ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ نصیحت درحقیقت خبردار کرنے کے لیے ہے کہ اس کی اہمیت ظاہر ہو اور ان کا بیٹا اس سے دور رہنے کی کوشش کرے۔

ظلم عظیم تعبیر بڑی پر معنی ہے،اصولی طور پر ''ظلم'' کے معنی ہر طرح کا انحراف اور کسی چیز کو غیر مناسب جگہ پر رکھنا ہے.....سب ظلموں سے بڑا ظلم کہ جو خدا وخلق اور خود اپنے بارے میں ہے وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ہے اس سے بڑا انحراف اور ظلم کیا ہوگا کہ ایک بے قدر وقیمت چیز کو زمین وآسمان اور تمام موجودات کے خالق ومالک کا ثانی وشریک قرار دیا جاتا ہے،خلق خدا کے ساتھ اس سے بڑھ کر اور کیا ستم ہوگا کہ انہیں توحید کے نورانی راستے سے ہٹا کر شرک کی تاریکیوں میں دھکیل دیا جائے نیز خود اپنی ذات پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ انسان ایک ایسی آگ جلائے جس میں اس کے نیک اعمال جل کر راکھ ہوجائیں؟

---

[1] مفردات راغب (مادہ حبط)

خوفناک سقوط:

(۵) پانچویں آیت میں تمام مسلمانوں کو یہ حکم دینے کے بعد کہ وہ خالصاتوحید پرست رہیں۔اورشرک کی راہ نہ چلیں۔ایک عمدہ تشبیہ دیتے ہوئے کہا ہے: جس نے خدا کے ساتھ کسی کوشریک قرار دیا گویا وہ آسمان سے گرا دیا درمیان سے پرندوں نے اس کو اچک لیا(ومن یشرك باللہ فکانما خر من السمآءِ فتخطفه الطیرُ) یا ایسے کہ آندھی اس کو کہیں دور جا پھینکے۔(او تهوی به الریح فی مکانٍ سحیق [1]

درحقیقت ''ایمان'' کو بلند آسمان اور ''شرک'' کو ''خوف ناک سقوط'' سے مشابہت دی گئی ہے (توجہ رہے کہ ارباب لغت کے نزدیک حر کے معنی اس طرح گرنا ہے جس میں کوئی آواز اور آہٹ نہ ہو) پھر یہ سقوط (گرنا) معمولی چیز نہیں بلکہ اس میں دو بڑے خطرے بھی ہیں..... یا تو شکاری پرندوں کا لقمہ بنے گا یا آندھی اس کو آبادی سے دور پھینک دے گی۔جہاں چکنا چور ہوجائے گا۔

یہ دل ہلا دینے والی تعبیریں واضح کررہی ہیں کہ شرک میں کس قدر خطرات ہیں۔

یہ شکاری پرندے اصل میں اندرونی بری صفات یا بیرونی باطل پرست گروہ ہیں جو جاوہ توحید پر گھات لگائے رہتے ہیں اور تندوتیز ہوا (آندھی) وہی گمراہ شیاطین ہیں جن کا ذکر سورۂ مریمؑ کی آیت ۸۳ میں ہے (الم تر انا ارسلنا الشیاطین علی الکافرین توزهم (زاً) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیج دیا تا کہ وہ ان کو حرکت دیں اور ہلائیں، مشرکوں کے تعاقب میں جا میں ان کی گردنوں میں رسیاں ڈالیں اور جدھر چاہیں کھینچ لے جائیں یا یہ سخت فسادات اور سیاسی وفکری اختلافات اور فتنے ہیں کہ ان میں خالص موحدین کے بغیر کوئی ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔

(۶) چھٹی آیت میں حضرت رسولؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کے محرمات (حرام امور) سے آگاہ کریں کہ جن میں پہلی چیز شرک ہے چنانچہ ارشاد ہوا: کہو.....آؤ میں خدا کی حرام کی ہوئی چیزیں تمہیں بتاؤں (قل تعالو اتل ماحرم ربکم علیکم [2])

---

[1] تخطف، کا مادہ ''خطف' بروزن ''عطف'' ہے جس کے معنی کسی چیز کو تیزی کے ساتھ دبوچ لینا ہے ''سحیق، کا مادہ ''سحن بروزن ''سخت'' اور اس کا معنی کسی چیز کو ریزہ ریزہ کردینا ہے۔یہ لفظ پرانے لباس اور مکان کو ترک کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔آخری معنی آیت کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔

[2] تعالو'' کا مادہ ''علو'' ہے جس کا معنی ہے ایک انسان کا بلند جگہ پر کھڑے ہوکر دوسرے لوگوں کو بلانا، گویا اس کا مفہوم ہے اوپر جاؤ۔پھر اس میں وسعت پیدا ہوگئی اور دعوت کی آمد پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا (المنار جلد ۸ صفحہ ۸۳) ممکن ہے اس میں اساس اصلی دعوت ہائے الٰہی ہوں۔ کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کو بلند وبالا مقام کی طرف دعوت دیں

مشرکین پر بہشت حرام ہے:

(۷) ساتویں آیت میں ''شرک'' کی اہمیت اوراس کے خطرات کے پیش نظرایک نئی تعبیر لائی گئی ہے اور بہ زبان حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل سے خطاب کیا گیا ہے جس کسی نے بھی خدا کا کوئی شریک قرار دیا تو خدا نے اس پر بہشت حرام کر دیا اوراس کا ٹھکانہ دوزخ میں ہوگا (انه من یشرك باللّٰه فقدْحرم اللّٰه علیه الجنة وماٰوٰهُ النارُ)

پہلے جملے میں اسم ''اللّٰہ'' آیا ہے، دوسرے جملے (فقد حرم اللّٰه علیه الجنة) میں قاعدے کے مطابق ضمیر لائی جانی چاہیے تھی لیکن اس جملے میں باردیگر اسم ''ذکر ہوا ہے.....اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاکید ہے اوراس حکم کی اہمیت پر ایک واضح دلیل ہے آیت کے آخر میں فرماتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی یار و مددگار نہیں (وما للظلمین من انصار) اور یہ مشرکین کے ظالم ہونے پر ایک اور دلیل ہے نیز اس پر کہ قیامت کے روز کسی کو یہ جرات نہ ہوگی کہ وہ ان کا دفاع کرے۔

اللّٰہ تعالیٰ مشرکوں سے بیزار ہے:

(۸) آٹھویں آیت میں ہم شرک کے بارے میں ایک نئے پہلو سے آشنا ہوتے ہیں۔جس میں مومنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے اے ایمان لانے والو مشرک لوگ نجس و ناپاک ہیں (یاایها الذین اٰمنو انما المشرکون نجسٌ)

پھر فرماتا ہے: اس وجہ سے ناپاک لوگ آئندہ سال مسجد الحرام کے قریب نہ آئیں (فلا یقربوا المسجد الحرام بعد مهم هذا)

یہ آیت کئی جہات سے تاکیدات پر مشتمل ہے۔

سب سے پہلے انما کی تعبیر کہ یہ حصر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین نجس و ناپاک ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔اس سے مبالغہ اور تاکید کا پتہ چلتا ہے دوسرے لفظ ''نجس'' معنائے مصدری رکھتا ہے یعنی مشرک عین نجس ہیں جیسے کسی کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ وہ عین عدالت ہے، یہ بھی مبالغے کی ایک صورت ہے [1]

تیسرے یہ کہ یوں نہیں کہا گیا کہ (فلا یدخلو المسجد الحرام) وہ مسجد حرام میں داخل نہ ہوں بلکہ (فلا یقربو المسجد الحرام) کہا گیا ہے یعنی وہ اس قدر ناپاک ہیں کہ ان کا قریب جانا بھی مسجد کو نجس کر دیتا ہے۔

(۹) نویں آیت میں بھی ایک نئے نکتے کی طرف ''اعلان عام'' کے عنوان سے اشارہ کیا گیا ہے، ۹ھ میں یہ آیات نازل ہوئیں اور حضرت امام علی علیہ السلام کو مامور کیا گیا کہ وہ حج کے موقع پر لوگوں کو یہ فرمان سنا ہیں: حج اکبر (عید قربان) کے دن خدا اور رسولؐ کی

---

[1] ''نجس'' بروزن ''مگس'' مصدر ہے اور ''نجس'' بروزن خشن'' اس کا وصفی معنی ہے جیسا ہ راغب نے مفردات میں کہا ہے یہ لفظ ظاہری و باطنی دونوں طرح کی نجاست کے لیے بولا جاتا ہے۔علامہ طبرسی، مجمع البیان'' میں کہتے ہیں، جس چیز سے انسانی طبیعت نفرت کرے وہ نجس ہے۔

طرف سے لوگوں کے لیے ایک اعلانِ عام ہے کہ خدا مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسولؐ بھی ان سے بیزار ہے (واذا ان من اللہ ورسولہٖ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بری من المشرکین ورسولہ[1]

حج کے ایام میں ایک اہم اور حساس دن میں خدا رسول کے مشرکین سے اعلان بیزاری کا مطلب یہ ہے کہ ان کو مشرکین سے انتہائی نفرت ہے نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ''شرک'' تمام گناہوں میں سب سے بدتر اور ایک نا قابل معافی گناہ ہے۔

(۱۰) دسویں آیت میں ایک اور طرز سے اس کی مذمت بیان ہوئی ہے، یعنی مشرک مرد اور مشرکہ عورت کو زنا کار مرد اور زنا کار عورت جیسا قرار دیا گیا ہے..... ارشاد ہوتا ہے: زانی مرد زانیہ یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے۔ اسی طرح زانیہ عورت بھی زنا کار مرد یا مشرک مرد لے سوا کسی سے نکاح نہ کرے (الزانی لاینکح الا زانیہ اومشرکۃ والزانیہ لاینکحھا الا زانٍ اَوْ مشرکٌ۔'' یہ تعبیر خواہ حکم شرعی کے بیان میں ہو کہ زنا کاروں اور مشرکوں سے نکاح حرام ہے یا ایک ظاہری طریقہ کا اظہار ہے کہ ہم جنس اپنے ہم جنس کی طرف جاتا ہے یعنی بدکار اپنے جیسے بدکاروں کی طرف مائل ہوتے ہیں ہر دو صورتوں میں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ''شرک'' ایک بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ مشرکوں کو زنا کاروں اور اخلاقی خوبیوں سے محروم لوگوں کے مساوی قرار دیا گیا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے۔ لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومنٌ ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن فانہ اذا فعل ذالك خلع عنہ الایمان کخلع القمیص۔ زنا کار زنا حالت میں مومن نہیں اور چور حالت چوری میں مومن نہیں کیونکہ جب وہ ایسا کام شروع کرتے ہیں تو ان کی روح سے ایمان خارج ہو جاتا ہے۔ جیسے قمیص بدن سے اتر جائے[2]

نیز ان کے باہمی رابطے کی وضاحت انشاء اللہ بعد میں کی جائے گی۔

البتہ مومنوں کا مشرکوں سے نکاح قطعا حرام ہے۔ زنا کاروں کے ساتھ ازدواج کے بارے میں ایک اگروہ کا کہنا ہے کہ اگر وہ زنا کاری میں مشہور ہوں اور اس فعل سے توبہ نہ کریں تو ان سے نکاح حرام ہے اور ہرگز جائز نہیں اس کی شاہد وہ بہت سی احادیث ہیں جو پیغمبر اکرمؐ، امام جعفر صادق اور امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہیں۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے ام مہزول سے نکاح کے لیے حضرت رسولؐ سے اجازت مانگی تو یہ آیت نازل ہوئی تھی مذکورہ عورت زمانہ جاہلیت میں زنا کاری میں شہرت رکھتی تھی حتی کہ اس مقصد سے اس کے گھر پر جھنڈا بھی لگا ہوتا تھا۔ لہٰذا اس شخص کو اس کے ساتھ نکاح کرنے سے روکا گیا[3]

---

[1] بہت سے مفسرین نے یوم الحج الاکبر سے ''عید قربان'' مراد لی ہے جو ایام حج میں اہم ترین دن ہے اور اہل بیت و اہل سنت کی روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں لیکن بعض علماء کے نزدیک وہ دن یوم عرفہ اور بعض کے خیال میں حج کے عام ایام ہی حج اکبر ہیں کہ یہ تعبیر حج وعمرہ کے مقابل ہوئی ہے جو حج اصغر کہلاتا ہے۔ بعض علماء نے اس آیت کے سال نزول ہی کو حج اکبر کہا ہے کیونکہ اس سال مسلمان اور مشرک حج میں اکٹھے ہی موجود تھے، تاہم ان چاروں میں سے پہلا احتمال مناسب ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۵۷۱ حدیث ۲۰۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۷ صفحہ ۱۲۵۔

(۱۱) گیارہویں آیت میں عقیدہ توحید کی ضرورت اور مشرک کی برائی کو ایک اور عنوان سے بیان کیا گیا ہے چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا کہو کہ مجھے تو صرف خدائے واحد کی عبادت کرنے کا حکم ہوا ہے۔ اور یہ بھی کہ میں اس کے ساتھ کسی چیز یا شخص کو شریک قرار نہ دوں (قل انما اُمرت ان اعبد اللہ ولا اُشرك به)۔

انما'' کی تعبیر جس میں حصر کے معنی پائے جاتے ہیں..... اس سے ظاہر ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی تمام تر دعوت کا خلاصہ توحید کی ترویج اور شرک کی نفی ہے [1] واقعی ایسا ہی ہے کیونکہ توحید ہی تمام آسمانی تعلیمات کی جان ہے جیسا کہ تمام شیطانی نظریات کی اساس ونبیاد شرک پر قائم ہے۔ آخر میں یہ آیت بطور تاکید کہہ رہی ہے۔ (الیه ادو عوا الیه مابِ) یعنی میں صرف اسی (خدائے واحد) کی طرف بلاتا ہوں اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

(۱۲) بارہویں آیت میں پہلے اولوالعزم پیغمبر یعنی حضرت نوحؑ کے متعلق بات ہورہی ہے کہ انہوں نے بھی اپنی دعوت کی اساس اثبات توحید اور نفی شرکو قرار دیا اور یہ امر قابل توجہ ہے کہ دیگر انبیاء کی دعوت کے بارے میں بھی یہی تعبیر آئی ہے۔ ارشاد ہوا ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا (تو انہوں نے لوگوں سے کہا) میں تمہارے لیے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ (ولقد ارسلنا نوحاً الی قومه انی لکم نذیرٌ مبینٌ)

اس کے بعد مزید کہا: (میری سب سے پہلی دعوت یہ ہے کہ) خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو مجھے تم لوگوں پر سخت عذاب والا دن آنے کا اندیشہ ہے (ان لا تعبدوا الا اللہ انی اخاف علیکم عذاب یومٍ الیم)

(حضرت نوحؑ سے لے کر پیغمبر اکرمؐ تک) تمام انبیاء کی طرف سے اس بات کا تکرار اس امر کی دلیل ہے کہ دعوتِ انبیاء میں سب سے اہم چیز اثبات توحید اور نفی شرک ہے اور یہی تمام ادیان میں قدر مشترک ہے اسی بناء پر ہم سورہ آلِ عمران کی آیت ۶۴ میں پڑھتے ہیں: کہو کہ اے اہل کتاب (آسمانی) اس بات کی طرف آؤ کہ جو ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہے یعنی ہم سب خدائے یکتا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے بعض خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا رب تصورّ نہ کریں۔ (قل یا اهل لکتاب تعالو ا الی کلمةٍ سوآءٍ بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرك به شیاء ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ)۔

یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور اس میں کبھی شکستگی نہیں آئی یہی تمام آسمانی مذہب کی اساس ہے اور اہل مذہب کی بدبختی کی اصل وجہ اسی قاعدہ (عقیدۂ توحید) سے ان کا انحراف ہے۔

(۱۳) ترھویں آیت اسی قاعدے کی ایک نئی تعبیر ہے اور کلمہ ''انما'' کے ساتھ حصر کرکے بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام کی دعوت وتبلیغ کا خلاصہ عقیدہ توحید ہے فرمایا گیا: کہو کہ فقط ایک چیز جس کی وحی میری طرف ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تمہارا معبود خدائے واحد ہے (قل انما یوحیٰ الیٰ انما الهکم الهٌ واحدٌ)

کیا تم اصل حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر آمادہ ہو (فهل انتم مسلمون) اگر تم سر تسلیم خم کرو تم اہل نجات میں سے ہوا

---

[1] اگر اس حصر کو اضافی قرار دیا جائے تو بھی تمام عبودیت کا خلاصہ عبودیت خدا ہی ہوگا (غور کریں

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ جدائی

شرک کا مقابلہ کرنا حضرت ابراہیمؑ سے سیکھیں:

(۱۴) چودھویں اور آخری آیت میں شرک وتوحید کا مضمون ایک نئے انداز سے بیان کیا گیا ہے اور ابراہیمؑ بت شکن کو (توحید وشرک کے مقابلہ کے ضمن میں) ایک نمونہ کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں تمہارے لیے ایک نمونہ موجود ہے۔ (قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ ؑ)

پھر اس اسوہ حسنہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: انہوں نے اس زمانے کی بت پرست اور مشرک قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جن کی خدا کے سوا تم پوجا کرتے ہو۔ بیزار ہیں (اذقالو القومھم انا براءُٓ منکم ومما تعبدون من دون اللہ)

اس پر تاکید مزید کے طور پر فرمایا: ہم تمہارے نظریئے سے انکاری ہیں۔ (کفرنا بکم) البتہ اشخاص کی نسبت سے کفر وانکار کا معنی ان سے برات وبیزاری کا اعلان کرنا ہے کیونکہ اسلامی روایات میں لفظ ''کفر'' پانچ معنوں میں استعمال ہوا ہے اور ان میں سے ایک معنی یہی برائت وبیزاری ہے لیکن اس پر قناعت نہیں کی گئی اور یہ بھی کہا گیا اب ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ دشمنی وعداوت رہے گی (وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضا ابداً) فقط ایک ہی صورت ہے کہ یہ دشمن ختم ہو جائے اور وہ یہ کہ وہ سب سے سب خدائے واحد پر ایمان لے آئیں۔ (حتی تومنوا باللہ وحدہ)

یہ تعبیرات (بیزاری برات اور عداوت ابدی کا اعلان) بہ بانگ دہل بتا رہی ہیں کہ توحید کے حامل لوگ کبھی بھی شرک وبت پرستی میں آلودہ لوگوں کے ساتھ دوستی نہیں کر سکتے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کو بہ عنوان نمونہ پیش کرتا ہے تو اس سے ہم یہ مفہوم اخذ کرتے ہیں کہ اسلام بھی توحید پرستوں اور مشرکوں کے درمیان دوستی کے رابطے کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت کے مطالب پر غور وفکر کرنے سے مسئلہ شرک وتوحید کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے قومھم کی تعبیر بتا رہی ہے کہ ان میں اکثریت بت پرست اور موحد بہت کم تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قائم ہے۔ اس لحاظ سے مومنین کی ایک چھوٹی سی جماعت نے بھی اس چیز کو پسند نہیں کیا وہ مشرکوں (کے اکثریتی گروہ) سے دوستی اور رابطہ رکھیں اور یوں انہوں نے کلمہ توحید کا پرچم بلند کیے رکھا)۔

دوسری تعبیر: ہم تم سے بیزار ہیں اور تمہارے نظریئے کے کافر (انکاری) ہیں۔

تیسری تعبیر: ہم تمہارے معبودوں سے بری اور دُور ہیں۔

چوتھی تعبیر: ہم تمہیں اپنا دشمن گردانتے ہیں۔

پانچویں تعبیر: ہمارے دلوں میں تمہارے لیے کینہ ہے۔

گویا ہر تعبیر واضح کر رہی ہے کہ یہ فیصلہ اٹل ہے اور ہمارے تمہارے درمیان کبھی تعلق نہ ہوگا۔ عداوت اور بغضاء کا فرق کتب لغت کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے یعنی عداوت عملی پہلو رکھتی ہے اور بغضاء ایک قلبی کیفیت ہے..... اگرچہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ

بھی استعمال ہوتے ہیں۔

اس طرح حضرت ابراہیمؑ اوران کے ساتھیوں نے واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ مشرکین سے بری و بیزار ہیں اور ہر صورت میں ان کا مقابلہ کریں گے یہی وہ اُسوۂ حسنہ ہے جو ہر شخص اور ہر زمانے کے لیے ایک نمونہ ہونا چاہیے۔

''اُسوہ'' مقاییس اللغۃ کے بقول اس کے معنی ہیں مداوا اور اصلاح اسی لیے طبیب کو آسی کہا جاتا ہے''اسیٰ'' بروزن ''عصا'' کے معنی غم واندوہ کے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ بیمار اور زخمی کے علاج معالجے میں دُکھ درد کی آمیزش ہوتی ہے اس کے بعد لفظ'' (اُسوہ) پیروی اطاعت اور پیچھے پیچھے چلنے کے معنی میں بولا جانے لگا کیونکہ علاج معالجے میں اس کام کے پیچھے لگے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن راغب نے المفردات میں''اسوۂ'' کے معنی پیروی ہی قرار دیئے ہیں خواہ یہ پیروی نیکی میں کی جائے یا بدی میں کی جائے۔[1]

مذکورہ بالا چودہ آیات کہ جن کی مثالیں قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں ان سب سے ایک نکتہ واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ بروائے قران مسئلہ اثبات توحید ونفی شرک بڑی اہم اور اساسی حیثیت رکھتا ہے یہاں تک کہ مشرکین کے ساتھ کسی قسم کی دوستی اور رابطہ رکھنا جائز نہیں ہے۔اور شرک کی جڑ بنیاد کو اکھاڑ پھینکنا چاہیے اگر علمی ومنطقی استدلال سے شرک کو روکا جاسکے تو بہتر.....ورنہ پوری قوت اور ثابت قدمی کے ساتھ شرک اور اہل شرک کے مقابلے میں اُٹھ کھڑا ہونا ضروری ہے۔

مومن کا اصل سرمایہ عقیدہ توحید ہے اور قیامت میں جس سامانِ نجات کی قدر و قیمت ہوگی وہ توحید ہے گناہ شرک ہرگز قابل بخشش نہیں اور مشرک ایک ایسا موجود ہے جس سے مکمل طور پر الگ دور اور بیزار ہونا چاہیے مگر یہ کہ وہ اپنے غلط طریقے کو چھوڑ دے۔اپنی اصلاح حال کرلے اور ایمان بر توحید کی طرف پلٹ آئے۔

توضیحات

مسئلہ توحید وشرک کی اتنی اہمیت کیوں؟

ہم سب اس بات کو اجمالی طور پر جانتے ہیں کہ اسلام بلکہ تمام مذاہب شرک کے بارے میں بہت حساسیت رکھتے ہیں۔لیکن اس کی دلیل سب پر ظاہر واضح نہیں یعنی اثبات توحید اور نفی شر کے دلائل اکثر لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔تاہم اس بارے میں چار دلیلیں دی جاسکتی ہیں۔

(۱) توحید تمام صفات الٰہیہ کی شناخت میں اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔اصل توحید کی طرف توجہ کیے بغیر ہم صفات خداوندی کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے۔کیونکہ (بعد میں کی جانے والی وضاحت کے مطابق) خدا کی یکتائی کا سرچشمہ اس کا لامحدود ہونا ہے اور

---

[1] بعض لوگوں ے مطابق''اَسیٰ'' ناقص وادی وناقص یائی ہر دوصورتوں میں استعمال ہوتا ہے،اگر ناقص یائی ہوتو اس کا معنی حزن وغم ہے اور ناقص وادی ہوتو پھر اس کا معنی معالجہ واصلاح ہے۔

اس کی ذات تمام صفات کمال کی جامع اور ہر قسم کے نقص وعیب سے مبرا ومنزہ ہے پس اگر ہم توحید حقیقی کو سمجھ لیں تو گویا ہمیں خدا کی تمام صفات کی معرفت ہوگئی.....خلاصہ یہ کہ شرک میں مبتلا ہونے کی صورت میں ہم صفات خداوندی کی معرفت کے حصول میں ناکام رہیں گے۔

(۲) اس جہانِ ہستی پر خدا کی ذات کے نور توحید کی شعاعیں بھر رہی ہیں، یہ ساری کائنات اور اس کے موجودات باہم متصل ہیں اور وحدت کا رنگ رکھتے ہیں۔ اس عالم دنیا کی صحیح شناخت اور پہچان کے لیے اس کے تمام اجزاء کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم موجودات عالم کو متفرق اور بے ترتیب تصور کریں تو پھر ہم جہان وجہانیات کو پہچانتے ہیں غلط فہمی سے بچ نہیں سکیں گے۔

جہانِ ہستی ایک وحدت ہے..... یہ درس ہمیں کہاں سے ملا؟ اس کی بنیاد خدا کی یگانگی اور یکتائی ہے وحدت خدا وحدت جہان کی دلیل ہے وحدت جہان وحدت خدا کی نشانی ہے (مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ [۶۷:۳])تم خدائے رحمن کے خلق کرنے میں تفاوت نہیں پاؤ گے۔ دوبارہ دیکھو کیا کوئی شگاف ورخنہ نظر آ رہا ہے؟

(۳) جہانِ انسانیت کی ترقی وپستی اور پس ماندہ رہ جانے کا موجب ہوتا ہے.....اتحاد ویگانگت، قوت، وقدرت اور عمران وآبادی کا ذریعہ ہے۔

خدائے یکتا کی وحدت کا عقیدہ کروڑوں انسانوں کے قلوب کے لیے حلقہ اتصال ہے۔ یہ ان میں اتحاد ویکجہتی پیدا کرتا ہے اور رنگ ونسل قوم اور وطن کے تعصّبات کی بیخ کنی کرتا ہے (وہ سب ایک ہیں کیونکہ ان کا خالق ایک ہے)۔

زمانہ جاہلیت میں عرب معاشرہ توحید وایمان سے دُور اپنے اپنے قبیلے کے بتوں کے نام پر بٹ جانے سے کمزور ہو چکا تھا اور بدبختی ان لوگوں پر مسلط تھی۔ پھر اسلام آیا بت ٹوٹے اور زنجیر توحید نے ان کے دلوں کو باہم جوڑ کر انہیں ایک متحد اور مضبوط ملت بنا دیا۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ میں وہ معاشرہ اس قدر ترقی یافتہ اور طاقتور ہوا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام متمدن ممالک اس کے زیر نگیں آ گئے۔

(۴) اخلاقی تربیت اور انسانی صفات کا تکامل بھی سایہ توحید ہی میں ممکن ہے کیونکہ اخلاق کی بنیاد اخلاص اور غیر خدا سے دل کو دُور رکھنا ہے اس کی اصل اور بنیاد ہی یہ ہے کہ انسان کی عملی حرکت وتحرک فقط تحریکِ الٰہی سے ہو۔ یعنی فقط اسی کے لیے قدم اُٹھے۔ اسی کی راہ میں جہاد کیا جائے اور اسی کی طرف حرکت ہو، اس کے سوا ہر حرکت وتحرک سے دور رہے۔

توحید ہی انسان کو خلوص نیت کا درس دیتی ہے.....کیسا درس؟ ہر قسم کی ریاکاری، نفس پرستی اور جاہ طلبی کی مخالفت اور دنیا پرستی، شیطان دوستی وشرک کے مقابلے کا درس اسی عقیدہ توحید ہی سے ملتا ہے اگر آپ اس پہلو سے غور کریں تو مسئلہ توحید وشرک عقائد سے اعمال تک نیتوں سے اخلاق تک اور فرد سے معاشرے تک ہر ایک کو اپنے زیر اثر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تمام مذکورہ باتوں کی نسبت مسئلہ اثبات توحید ونفی شرک کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی اور اس پر استدلال میں وہ قوت دکھائی ہے کہ اس کے سامنے کوئی باطل نظریہ ٹھہر ہی نہیں سکتا۔

یہاں دو حدیثوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس بحث کو اختتام تک پہنچاتے ہیں:

(۱) ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے عبداللہ بن مسعود سے فرمایا: یابن مسعود! ایاك ان تشرك بالله طرفة عين وان تشرت بالمنشار، اوقطعت، اوصلبت، اواُحرِقت بالنارَ[1]

اے ابن مسعود! ہوشیار ہو مبادا کہ چشم زون کے لیے بھی شرک میں جا پڑا، خواہ تجھے آرے سے چیر دیا جائے یا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا تجھے آگ میں جلا دیا جائے۔ اس روایت سے توحید کی ضرورت واہمیت واضح وآشکار ہے۔

(۲) ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ان بنی امية اطلقوا للناس تعليم الايمان ولم يطلقوا تعليم الشرك لكى اذا حملوهم عليهِ لم يعرفوه[2]

بنی اُمیہ نے لوگوں کو ایمان کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دے رکھا تھا۔ لیکن انہیں مسئلہ شرک پر توجہ دینے کی اجازت نہ دی گئی (کہ وہ شرک کی حقیقت کو سمجھ لیں) تاکہ جب چاہیں ان لوگوں کو شرک کی وادی میں دھکیل دیں۔

اس حدیث سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ شرک دشمنان دین کے ہاتھ میں ایک سیاسی واجتماعی تخریبی ہتھیار تھا جس سے وہ کام لیا کرتے تھے۔ جبکہ توحید اور اس کے آثار پر ایمان ہی ایک ایسی قوت ہے جس سے کالموں کی جڑ بنیاد قطع کی جاسکتی ہے۔

دلائلِ توحید

مسئلہ توحید میں ہم سب سے پہلے دو مسائل کی جستجو کرتے ہیں:

(۱) یہ کہ ذات خداوندی کسی طرح کے اجزاء ترکیبی (خارجی وعقلی) سے مرکب نہیں ہے۔

(۲) یہ کہ ذاتِ الٰہی کی کوئی مثل ومثال نہیں اور وہ ہر لحاظ سے واحد ویکتا ہے۔

قرآن مجید میں اس ضمن میں بہت سے دلائل نظر آتے ہیں۔ یہاں ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۴ صفحہ ۱۰۷ (طبع بیروت)

[2] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۱۵ حدیث ۱۔

(۱) توحیدِ خدا پر فطرت کی گواہی

اشارہ:

جیسا کہ اس جلد کے آغاز میں اصل مسئلہ معرفتِ خدا میں ''برہان فطرت'' سے استفادہ کیا ہے اسی طرح یہ صفات خدا بلکہ مسئلہ معاد نبوت میں ہمارے لیے رہنما بن سکتا ہے۔ اس لحاظ سے گویا ہم نے اس برہان کے ساتھ عہد و پیمان کرلیا ہے کہ اسے ہرگز ترک نہیں کریں گے اور اکثر مباحث میں اس کا ذکر کرتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

توحید ذات اور توحید صفات میں ''برہان فطرت'' ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ یعنی ہم نہ صرف اپنی رُوح کی گہرائی اور عمق قلب سے وجودِ خدا کے ہونے کی آواز سن رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس آواز کے سوا ہمارے باطن میں کوئی اور آواز ہی نہیں ہے۔ جب مشکلوں سختیوں اور مصیبتوں میں ہم پر جان کنی کی کیفیت طاری ہوجائے۔ وسائل و اسباب کا دروازہ بند نظر آئے تو ایسے میں ہم اپنے اندر سے آوزۂ توحید سُن رہے ہوتے ہیں جو ہمیں مبداء یکتائی کی طرف بلا رہا ہوتا ہے۔ کہ یہی وہ قوت ہے جو تمام مشکلات میں کام آسکتی ہے اور یہی وہ مسبب الاسباب ذات ہے جو عالم اسباب سے بلند و بالا ہے۔

اب ہم اس سلسلے کی چند آیات پر نظر ڈالتے ہیں:

(۱) فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ [۲۹:۶۵] (روم)

(۲) وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ [۳۰:۳۳] (انعام)

(۳) قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ [۶:۴۰] بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ [۶:۴۱] (نحل)

(۴) وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ [۱۶:۵۴] (نحل)

(۵) قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ

لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ [٦:٦٣] قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾ [٦:٦٤] (انعام)

ترجمہ:

(۱) جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو اخلاص سے پکارتے ہیں اور اس کے غیر کو بھول جاتے ہیں) لیکن جس وقت خدا ان کو خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو پھر سے مشرک بن جاتے ہیں۔

(۲) جب لوگوں کو تنگی و سختی ہوتی ہے تو وہ اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ انہیں اپنی رحمت کے کچھ حصے کا ذائقہ چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ والے اپنے پروردگار کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

(۳) کہو کہ کیا تم نے کچھ سوچا ہے کہ اگر تم پر تمہارے پروردگار کا عذاب آ جائے یا قیامت برپا ہو جائے تو کیا تم (حل مشکلات کے لیے) غیر خدا کو پکارو گے، اگر تم سچے ہو۔ نہیں صرف اسی کو پکارو گے اور جس مشکل کے لیے تم نے اسے پکارا ہو وہ چاہے تو اسے حل کر دے، وہ جسے آج تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، اس روز (بوقت مشکل اسے فراموش کر دیتے ہو۔

(۴) جو نعمتیں تمہارے پاس ہیں وہ خدا کی طرف سے ملی ہیں پھر جب تمہیں تکلیف آ پڑتی ہے تو خدا ہی کو پکارتے ہو اور جب وہ تکلیف تم سے دور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔

(۵) کہو کہ کون تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے نجات دیتا ہے جب تم اسے ظاہراً اور پوشیدہ طور پر پکارتے (اور کہتے) ہو کہ اگر تو ہمیں ان خطرات سے نکال لے تو ہم تیرے شکر گذاروں میں سے ہوں گے کہو کہ خدا تم کو ان مشکلوں اور دیگر مصیبتوں سے بچاتا ہے پھر تم اس کے لیے شریک ٹھہراتے ہو۔

تفسیر آیات

نورتوحید کی روشنی:

(۱).....(۲).....اس جلد کے آغاز میں ''معرفت خدا کے فطری راستے، کے ذیل میں پہلی اور دوسری آیت کی تفسیر ہوچکی ہے۔ اب ہم اس کی طرف مختصر اشارہ کرکے آگے بڑھ جائیں گے۔ پہلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے۔ جو کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور خلوص نیت سے اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔ دوسری آیت میں اسی مسئلہ کو کلی طور پر بیان کیا ہے کہ لوگ جب بھی کسی تنگی میں پڑتے ہیں مشکلیں ان کو ہر طرف سے گھیر لیتی ہی تو بے ساختہ ان کے دستِ دعا معبود حقیقی کے حضور بلند ہوتے ہیں اسی کے سایہ رحمت میں پناہ حاصل کرتے ہیں لیکن جب خدا انہیں اپنے لطف وکرم کا ذائقہ چکھاتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ شرک کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ ان ہردو آیات میں دو باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) آفات وحوادث کے وقت اکثر لوگوں میں خلوص دل پیدا ہوجاتا ہے۔

(۲) طوفان حوادث کے ٹل جانے کے بعد ان میں سے ایک بڑا گروہ شرک کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مسئلہ معرفت خدا کی طرح توحید پرستی بھی فطرت انسانی میں موجود ہے لیکن عام زندگی میں جب عالم اسباب کی طرف توجہ نہ ہو اور زندگی خوشحالی سے گزر رہی ہو تو اس سے لوگوں میں شرک نمودار ہونے لگتا ہے، لیکن روز مرہ زندگی میں تنگی وسختی پیدا ہوجائے اور وسائل حیات کم یا مفقود ہوجائیں تو غفلت اور بدمستی کے تاریک بادلوں کے پیچھے سے انسان کی ''فطرت توحید پرستی'' طلوع کرتی اور اپنا جلوہ دکھانے لگتی ہے۔ گویا انسان توحید کی طرف پلٹ آتا ہے۔ یہ آیات واضح وروشن راستے سے غفلت کے مارے ہوئے انسانوں کے کانوں کو ندائے فطرت سے آشنا کرتی ہیں، یہ انسان کی دستگیری کرتے ہوئے اسے ایسی جگہ لے جاتی ہیں۔ جہاں عالمِ اسباب کا شور وشغب نہ ہو اور انسان لذاتِ زندگی میں ڈوب نہ جائے..... ہاں! ایسے ہی فطری وطبیعی ماحول میں انسان اپنے ضمیر اور وجدان کی آواز سن پاتا ہے اس عالم میں معرفت خدا کی روشنی اس تک پہنچتی ہے اور اسے توحید پرستی کا درس بھی ملتا ہے لیکن یہ دلنواز صدا وہاں بہت کم سنائی دیتی ہے جہاں نفسانی خواہشات کا ہجوم ہو اور دنیا کی عیش وعشرت کے علاوہ کچھ یاد ہی نہ آتا ہو۔ کبھی کبھی یہی صدا انسان کا باز وپکڑ کر اسے سمندر میں جا اتارتی ہے کبھی اسے زندانوں میں لے جاتی ہے۔ اور کبھی اسے ناقابل علاج بیماروں کے پاس پہنچاتی ہے یہ ایسے مقامات ہیں، جہاں شیاطین جن ونس کی صدائیں خاموش ہوجاتی ہیں اور فقط فطرت ووجدان کی سچی ندا کانوں میں رس گھول رہی ہوتی ہے کتنی پسندیدہ اور کتنی دلکش ہے یہ آواز!

(۳) تیسری آیت میں مشرکوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نئی تعبیر کے ساتھ فطری توحید پرستی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہوا۔ ان سے کہو، تم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ اگر پروردگار کا عذاب آجائے یا قیامت اپنی سختیوں کے ساتھ برپا ہوجائے تو کیا تم غیر خدا کو پکارو گے اگر تم سچے ہو (قل ارء تیکم ان انا کم عذاب اللہ او اتتکم الساعۃ اغیر اللہ تدعون ان کنتم صدقین)۔

عذاب اللہ'' سے مراد دنیا میں پیش آنے والے مصائب وتکالیف ہیں اور'' اتتکم الساعة '' سے علاماتِ قیامت، آخری زمانے کے خوفناک حادثے اور ابتداء قیامت مراد ہے۔ ان مصیبتوں کا ذکر بہت سی آیات قرآن میں آیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرب قیامت میں ہولناک سختیاں آئیں گے۔

بہت سے مشرک عذاب الٰہی اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ لیکن جب وہ ان لوگوں کی تاریخ پڑھیں گے جن پر عذاب آیا'' خصوصاً جزیرہ عرب وحجاز کے نزدیک گزری ہوئی قومیں تو ان کے آثار اور علامات کا مشاہدہ کر کے عذاب الٰہی کا یقین کر لیں گے۔ یہ بھی فصاحت وبلاغت کا ایک پیرایہ ہے کہ جس چیز کو فریق مخالف تسلیم نہ کرتا ہو اس کا ذکر ایسے امر کے ساتھ کیا، جسے وہ قبول کرتا ہو تا کہ وہ ان دونوں کی باہمی مشابہت کو دیکھتے ہوئے اس کو بھی قبول کر لے۔

لیکن قرآن مجید ان مشرکوں کے جواب کا انتظار نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی طرف سے جو نسا جواب دیا جا سکتا ہے اسے خود ہی دہراتے ہوئے کہتا ہے: تم لوگ فقط انہی (سخت) اوقات میں پکارتے ہو، وہ اگر چاہے تو بہ لحاظ مصلحت تمہاری مشکل کو حل کر دے۔ (بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیه ان شآء) تو ایسی حالت ضرور ہے کہ جن کو تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو۔ انہیں بھول جاؤ گے۔ (وتنسون ما تشرکون)۔

اس سے پہلے ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ بہت سے مفسرین نے'' ارء یتکم '' کو'' اخبرونی '' (مجھے خبر دو) کے معنی میں لیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنی اصلی کا لازمہ ہے اور اس کا اصل معنی یہ ہے کہ کیا تم نے مشاہدہ کیا؟ آیا تم نے سوچا؟ بہر حال قرآن نے ان آیات میں مشرکوں کی عملی روش کا ذکر کیا اور اسے خود انہی کے مقابل بطور استدلال پیش کیا ہے [1]

تمام شدائد اور سختیوں میں اس کی پناہ لیتے ہو:

(۴) چوتھی آیت میں اس مفہوم کو ایک نئے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے فرمایا ہے جو بھی نعمت تمہارے پاس ہے وہ خدائے واحد کی دی ہوئی ہے (وما بکم من نعمة فمن الله)

تمہارے بنائے ہوئے بتوں اور معبودوں نے تمہارے لیے کونسا کام انجام دیا ہے۔ تمہیں ان کی طرف سے کونسی نعمت ملی ہے اور انہوں نے تمہارے سروں پر کونسے پھول لگائے ہیں؟

اصولی طور پر تو وہ اپنی ذات اور اپنے وجود میں تمہارے ہی محتاج ہیں (تمہی انہیں تراشتے ہو اور ان کی حفاظت کرتے ہو) پھر کیونکر وہ تمہیں کوئی نعمت اور برکت دے سکتے ہیں؟

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: وہ تو نعمت وبرکت عطا کرنے کی بات تھی۔ لیکن تم تو مشکلوں اور مصیبتوں میں بھی خدائے واحد ہی کو پکارتے ہو اور خانہ خدا کے دروازے پر نالہ وفریاد کرتے ہو (ثم اذا مسکم الضر فالیه تجرون)

---

[1] پہلی صورت میں'' روت'' اور مشاہدہ ظاہری آنکھ سے اور دوسری صورت میں دل کی آنکھ سے'' مشاہدہ کرنا مراد ہے۔

تجئرون کا مادہ جئار ''بروزن'' غبار'' ہے اس کا اصل معنی جنگلی اور پالتو جانوروں کا سخت وتکلیف کی حالت میں بے تابی سے آوازیں بلند کرنا ہے.....پھر بطور کنایہ اسے انسانوں کی فریاد واستغاثہ کے معنی میں استعمال کیا گیا جو وہ مشکلوں اور مصیبتوں میں بلند کرتے ہیں۔ راغب اصفہانی المفردات میں کہتا ہے کہ یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب انسان دُعاوتضرع کی حالت میں آواز بلند کرے جیسے تکلیف واذیت کے وقت جنگلی جانور آوازیں بلند کرتے ہیں۔

واضح ہے کہ ایسے حالات میں انسان اپنی فطرت کی طرف لوٹ آتا ہے، مصنوعی رکھ رکھاؤ کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ خیالی محلات زمین بوس ہوجاتے ہیں.....پھر انسان ہوتا ہے اور اس کی فطرت انسان ہوتا ہے اور اس کا وجدان، اس وقت وہ ایک ہی نکتہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ہاں وہی ایک نکتہ کہ جس کو ہم ''اللہ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ جملہ الیہ تجئرون'' میں حصر اور یکتائی پر دلالت پائی جاتی ہے یعنی تم لوگ صرف اسی خدائے واحد کی طرف متوجہ ہوتے ااور اسی سے حل مشکلات کے طلبگار ہوتے ہو۔

پھر فرمایا ہے: لیکن جب اللہ تعالیٰ تمہارے رنج وتعب کو دُور کر دیتا ہے اور تم اپنی پہلی سی اطمینان کی زندگی میں داخل ہوجاتے ہو تو تم میں سے ایک گروہ پھر شرک کی طرف چلا جاتا ہے (ثم اذا کشف الضر عنکم اذا فریق منکم بربھم یشرکون)

فریق (ایک گروہ) کے لفظ میں اشارہ ہے کہ ان میں ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو ان سخت حالات سے گزرنے کے بعد اپنے آپ کو بدل لیتا ہے اور اپنی زندگی میں شرک کی بجائے توحید پرستی کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے مختلف آفات وبلیات میں ایک یہ فلسفہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے باعث ایک گروہ کی روحانی تربیت ہوتی ہے اور اس کا ضمیر بیدار ہوجاتا ہے [1]۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ ''ضر بروزن ''حر'' اور ''ضر'' بروزن ''شر'' ہر دو کا معنی ایک ہی ہے اور وہ ہے ضد نفع جب کہ کچھ دوسرے ماہرین لغت پہلے لفظ کو بدحالی اور دوسرے لفظ کو ضرر کے معنوں میں لیتے ہیں۔ المفرادت میں راغب اصفہانی نے کہا ہے ''ضر'' کا معنی بدحالی اور دوسرے لفظ کو ضرر کے معنوں میں لیتے ہیں المفردات میں راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ ''ضر'' کا معنی بدحالی ہے کہ چاہے وہ عقل ودانش کی کمی کے باعث ''روحانی بدحالی'' یا کسی عضو میں نقص کی وجہ سے ''بدنی بدحالی'' یا مالی پریشانی وبدحالی کی صورت میں ظاہری پہلو رکھتی ہو جو فقر وفاقہ اور بے آبروئی کی شکل میں ہوتی ہے۔ [2]

بہرحال لفظ ''ضر'' ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر قسم کا رنج وغم اور تکالیف ومصائب کے علاوہ کمی مال بھی شامل ہے۔

اس نکتے پر بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ جیسا کہ لسان العرب میں آیا ہے۔ کہ ''کشف'' کے معنی کسی چھپی ہوئی چیز پر سے حجاب و پردہ ہٹا دینا ہے جس کا لازمہ اس کا ظاہر ہوجانا ہے، (پھر یہ لفظ ہر قسم کے غم واندہ اور مشکل ومصیبت کو دور کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا گویا یہ اذیتیں انسان کے تن بدن کو ایک حجاب کی طرح ڈھانپ لیتی ہیں اور کسی چیز یا شخص کے ذریعے چھٹ جاتی ہیں)۔

---

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جملہ میں ''من'' تبعیض کا نہیں بیانیہ ہے لیکن یہ بعید نظر آتا ہے اور پھر سورۂ لقمان کی آیت ۳۲ کے مضمون کے مخالف بھی ہے۔ فلما نجھم الی البر فنھم مقتصدٌ۔ (تفسیر روح المانی)

[2] لسان العرب مجمع البحرین مفردات راغب۔

امواج ظلمت میں نور درخشاں:

(۵) پانچویں اور آخری آیت میں مذکورہ بالا آیات کے مضمون کو ایک دوسرے ڈھب سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: کہو کہ صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں کون تمہیں نجات دیتا ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ اسی کو نالہ وفریاد کرتے ہوئے پکارتے ہو۔ (قل من ینجیکم من ظلماتِ البر والبحر تدعونه تضرعاً وخفیة)

اس حالت میں تمہارے سب بناوٹی معبود تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں صرف خدائے واحد کا دامن رحمت ہی تھامتے اور کہتے ہو کہ اگر خدا ہمیں (ان خطروں اور تاریکیوں سے) نجات دے تو ہم اس کے شکر گذار بنیں گے۔ (لئن انجانامن هٰذه لنکونن من الشکرین

ظلمات البرو البحر (دریا صحراؤں کی تاریکی) کی خوبصورت ترکیب میں شاید ظاہری تاریکیوں کی طرف اشارہ ہو، ممکن ہے راتوں کو سمندری طوفانوں اور زمینی جھگڑوں کا ذکر ہو کہ ایسے وقت بڑے ہی خوفناک اور خطرناک ہوتے ہیں۔

شب تاریک وبیم موج وگردابی چنیں ہائل
کجا دانند حال ما سبکسار ان ساحل ہا

ہوسکتا ہے کہ یہاں بری وبحری تمام وحشی وموذی حیوانات کا خوف مراد ہو! نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مفسرین کے بیان کردہ مطلب کے مطابق یہ تاریکیاں سبھی مشکلوں مصیبتوں تنگیوں اور سختیوں کی طرف کنایہ ہوں[1]۔

بہرحال یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں دونوں طرح کی تاریکیاں شامل ہوں۔ یعنی ظاہری تاریکی جو انسان کے لیے ہولناک ہے اور معنوی تاریکی کہ وہ بھی تکلیف دہ اور وحشت ناک ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اس قسم کی تکالیف عموماً سفر میں پیش آتی ہیں اور آیت کا اشارہ اسی طرف ہے۔

''تضرعاً وخفیةً۔ کی ترکیب بھی بڑی پسندیدہ ہے کیونکہ ''تضرع'' کا معنی دعا گڑگڑاہٹ اور اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے۔[2] جب کہ خفیہ کا مطلب پوشیدہ طور پر اور دل ہی دل میں دعا مانگنا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں تعبیریں ایک ہی انسان کی دو حالتوں کو بیان کرتی ہوں یعنی مشکلات کی تاریکیوں کے آغاز میں وہ خدا کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے اور جب تکلیفوں اور مصیبتوں میں بُری طرح پھنس جاتا ہے۔ گویا چھری گردن پر ہوتی ہے تو جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر آجاتا ہے۔ پھر وہ آہ وزاری اور عاجزی کرتے ہوئے خدا کو پکارتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ تضرع اور خفیہ کی تعبیریں مختلف گروہوں کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہوں کہ بعض گروہ ایسی ابتلا ومصیبت میں خدا کو آشکار

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۷ صفحہ ۱۳۶۔ تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۳ صفحہ ۲۶۹۔

[2] راغب اصفہانی کہتا ہے کہ ''تضرع'' سے مراد ''اظہر الضراعۃ یعنی ظاہر بظاہر فریاد وپکار کرنا ہے۔

اطور پر پکارتے ہیں اور بعض پوشیدہ طور پر اسے یاد کرتے ہیں، گویا ابھی وہ خدا کو ظاہر اطریقے سے پکارنے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں یا ان لوگوں سے ندامت کا احساس رکھتے ہیں۔ جن کے نزدیک وہ بت پرست قرار دیئے جاتے ہوں۔ لیکن اب بتوں کی بجائے خدا کو پکار رہے ہوں اور مشکلوں میں اس سے مدد مانگنے لگے ہوں۔

بہرحال ایسے سخت حالات میں وہ (مشرک) لوگ اپنی فطرت (خداشناسی) کی طرف پلٹ آتے ہیں اور نور توحید ان کے قلب ونظر کر روشن کر دیتا ہے اور وہ خدا کے سوا ہر دوسری ذات کو خود سے دو ہٹا دیتے ہیں۔ ایسے میں انہیں یقین ہوجاتا ہے کہ ہمارے یہ بت نہایت بے حیثیت اور ناکارہ ہیں اس لیے ہماری زندگی اور بقا کا راستہ صرف اور صرف عقیدہ توحید و یکتا پرستی ہی ہے۔

اس حال میں وہ لوگ غالباً اپنے خدا کے ساتھ عہد و پیمان باندھتے منتیں مانتے اور قول وقرار کرتے ہیں۔ کہ اگر وہ ہمیں ان مشکلوں اور سختیوں سے رہائی بخشے اور ہماری جانوں کو اپنے لطف وکرم سے آرام وراحت عطا کرے تو ہم ہمیشہ ہمیشہ اس کے فضل واحسان پر اس کے شکرگزار رہیں گے۔ لیکن جب وہ مصیبتوں کی تنگ گھاٹیوں سے نکل آتے ہیں تو زیادہ تر اپنے قول وقرار کو فراموش کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ اس آیت میں آگے چل کر کہا گیا ہے: کہو کہ خدا ہی تمہیں ان تاریکیوں اور ہر قسم کی ناراضی سے نجات دیتا ہے لیکن تم پھر سے اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتے ہو (قل الله ينجيكم منها ومن كل كرب ثم انتم تشركون [1])۔

البتہ جیسا کہ اس سے پہلے کی آیات میں ذکر آیا ہے کہ یہ اکثر مشرکین کی حالت بیان ہوئی ہے۔ لیکن ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جس میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت اور آمادگی پائی جاتی ہے۔ یہ گروہ جب بیدار ہوتا ہے اور فطرت خداشناسی کی طرف پلٹتا ہے تو شرک و بت پرستی کو ترک کر کے خدائے واحد پر ایمان لے آتا ہے۔ آیات قرآن کے مذکورۂ بالا مجموعے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے۔ کہ قرآن فقط خداشناسی کو ہی فطرت قرار نہیں دیتا۔ بلکہ وہ توحید و یکتا پرستی کو بھی تقاضائے فطرت سے تعبیر کرتا ہے چونکہ انسان کی فطرت غالباً آداب ورسوم گمراہ کن نظریات اور غلط قسم کی تعلیم وتربیت کے باعث پس منظر میں چلی جاتی ہے اس لیے وہ ایسے زمانے کے انتظار میں رہتی ہے جس میں اس پر سے غلط اثرات کے پردے ہٹ جائیں اور وہ اپنی اصلی صورت میں نمودار ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن اس سلسلے میں انسان کی زندگی کے حساس ترین لمحات کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ سخت ترین حوادث ان پردوں کو ہٹا دیں پھر انسان ہو اور فطرت انسان.....انسان ہو اور اس کا ضمیر و وجدان ایسی حالت میں انسان صرف اسی (خدا) کو پکارتا ہے اور اس کے غیر سے رُخ پھر لیتا ہے۔ اس سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ خدا کی توحید و یکتائی انسان کی جان وروح میں پوشیدہ ہے اس بارے میں اس جلد کے ابتدائی صفحات میں فطرت اور خداشناسی کے زیرِعنوان تفصیلی بحث وگفتگو ہو چکی ہے۔

---

[1] کرب'' کے معنی ہیں شدید غم واندوہ لسان عرب میں ہے کہ الالہ..... ہر وہ چیز جسے خدا کے علاوہ معبود بنایا جائے ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں اہل لغت کے بیانات نقل کرنے کے بعد کہا گیا ہے ان بیانات سے ظاہر ہے کہ الاالہ کا معنی ''عبادت'' ہے مجمع البحرین میں ہے'' الالھۃ'' کے معنی ہیں اصنام کیونکر مشرکوں کے نزدیک وہ عبادت کے لائق ہیں کتاب امین ازمیل بن احمد میں بھی ہے۔ کہ الثالہ کا معنی ہے التعبد عبادت کرنا قاموس اللغہ میں بھی یہی معنی آئے ہیں گویا یا تمام اہل لغت کا نظریہ یہی ہے کہ ''الہ'' کا معنی معبود ہی ہے

موجوداتِ جہاں کا باہمی ارتباط وہم آہنگی

اشارہ:

معرفت ذات خدا کے جو طریقے علماء عقائد اور فلاسفہ نے بتائے ہیں۔ان میں سے ایک اس جہان ہستی کا مطالعہ ہے، یہ جہان ایک مربوط نظام رکھتا ہے۔جس میں ہر چیز دوسری چیز سے ہم آہنگ ہے اور یہ وحدت وارتباط اس جہان کے خالق کی وحدانیت و یکتائی کی خبر دے رہا ہے اس لحاظ سے اس دلیل کو برہان وحدتو ارتباط.....کا نام دیا جائے تو بہتر ہے۔

بعض اوقات اس دلیل کو ایک اور طریقے سے ذکر کیا جاتا ہے۔وہ اس طرح اگر اس عالم وجود میں دو ارادے کارفرما ہوں اور دو مدبر اس کی تدبیر کر رہے ہوں تو اس میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔چونکہ اس کائنات میں ایسا کوئی فتور و فساد نہیں ہے پس یہ سمجھا جائے گا کہ اس جہان کا خالق و مدبّر ایک ہی ہے،اس اعتبار سے اس دلیل کو.....برہان تمانع.....کہا جا سکتا ہے۔

بنابریں برہان وحدت وارتباط اور برہان تمانع کی اصل وروح ایک اور تعبیریں دو ہیں بہ الفاظ دیگر ایک مفہوم مطلب کی طرف دو زاویوں سے نظر کی جاتی ہے کبھی وحدت عالم سے وحدت حالق کی طرف اور کبھی اس عالم ہستی میں عدم فساد سے وحدت مدبر کی طرف جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایک صورت میں اوپر سے نیچے اور دوسری صورت میں نیچے سے اوپر کو نظر کی جارہی ہے۔بہرحال دلائل توحید میں یہ ایک بہترین دلیل ہے اور آیات قرآن میں اس کا ذکر ہوا ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف متوجہ ہوتے اور آیات ذیل میں دل وجان سے نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝۴ [۶۷:۳] ملك

(۲) اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝۲۱ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۲۲ [۲۱:۲۲] (انبیاء)

(۳) مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۹۱ [۲۳:۹۱] (مومنوت)

ترجمہ:

(۱) تم رحمن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے پھر پلٹ کر دیکھو کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر ناکام پلٹے گی۔

(۲) کیا ان لوگوں کے (بنائے ہوئے) ارضی خدا ایسے ہیں کہ موجودات جہان کو پیدا کرنے کے بعد منتشر کریں اور پھیلائیں؟ اگر آسمان وزمین میں ایک اللہ کے علاوہ دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین وآسمان کا نظام بگڑ جاتا پس اللہ.....رب عرش ان باتوں سے پاک ہے جو وہ بنا رہے ہیں۔

(۳) اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور خود ہی اس کے امور کو چلاتا۔ پھر وہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتے (تو یہ دُنیا تباہ ہو جاتی) پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بنایا کرتے ہیں۔

مفردات کی تشریح:

''فطور'' کا مادہ ''فطر'' بروزن ''سطر'' ہے.....اصل میں اس کا معنی شگاف پیدا کرنا اور پھاڑنا ہے بعض ماہرین لغت مثلاً المفرادت میں راغب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا معنی طول میں شگاف ڈالنا ہے، پھر یہ ہر قسم کے ابداع وایجاد اور خلقت کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ عمل پردہ عدم سے وجود کو ظاہر کرتا ہے گویا پردہ عدم میں شگاف پیدا ہوتا ہے تو کوئی چیز وجود میں آتی ہے۔

یہ لفظ ''دو انگلیوں سے دودھ دوہنے پر بھی بولا جاتا ہے اسی طرح روزہ کھولنے کو بھی افطار کہا جاتا ہے۔ اس پر ضروری بحث ہم ''برہان فطرت'' کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

''الٰہ'' ماہرین لغت کے نزدیک یہ لفظ ''معبود'' کے معنی رکھتا ہے، اس کا مادہ ''الاھلہ'' بہ بمعنی عبادت سے لیا گیا ہے، اس کے بارے میں دیگر ماہرین کی آراء حاشیے میں ملاحظہ فرمائیں۔[1]

قرآن مجید میں بہت سی آیات میں اس کے یہی معنی لیے گئے ہیں جیسا کہ ہم بنی اسرائیل کی داستان میں پڑھتے ہیں کہ بت پرستوں

---

[1] مصباح اللغۃ، میں کہا گیا ہے ''اَلَہَ۔لَہُ۔الھۃ، باب ''تعب'' (عبدعبادۃ) تالہ (تعبد) اور الٰہ کے معنی ''معبود'' ہیں۔ نیز صحاح اللغۃ میں بھی کچھ فرق کے ساتھ یہی معنی لئے گئے ہیں اور اغب اصفہانی نے المفردات میں کہا ہے کہ ''الٰہ'' ہر معبود کے لئے مستعمل ہے الہ فلان یالہ (عَبَدَ) یعنی عبادت کی لسان العرب میں کہ ہے الاَلٰہ۔۔۔۔ ہر وہ چیز جسے خدا کے علاوہ معبود بنایا جائے ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں اہل لغت کے بیانات نقل کرنے کے بعد کہا گیا ہے ان بیانات سے ظاہر کہ اِلٰہ کا معنی ''عبادت'' ہے مجمع البحرین میں ہے اَلْاُلْھَۃُ کے معنی ہیں اصنام کیونکہ مشرکوں کے نزدیک وہ عبادت کے لائق ہیں کتاب العین از جیل بن احمد میں بھی ہے کہا اَلتَّاَلُّہُ کا معنی ہے اَلتَّعَبُّدُ عبادت کرنا قاموس اللغۃ میں بھی یہی معنی آئے ہیں گویا تمام اہل لغت کا نظریہ یہی ہے کہ ''الہ'' کا معنی ''معبود'' ہی ہے۔

کے ایک گروہ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا(یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ)یعنی اے موسیٰ! ہمارے لیے ایک معبود بنادو، جیسے ان کے معبود اور بت ہیں۔(اعراف ۱۳۸)

قصہ سامری میں آیا ہے(وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ)اس معبود کی طرف دیکھو جس کی تم ہمیشہ عبادت کیا کرتے تھے ہم تو یقیناً اس کو جلائیں گے(طٰہٰ ۔۹۷) دیگر بہت سی آیات بھی اس پر دال ہیں خلاصہ یہ کہ تمام اہل لغت اور بہت سے مفسرین نے ''الٰہ'' کا معنی معبود ہی لیا ہے اور عام طور پر اس کا استعمال بھی اس معنی میں ہوتا ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مورد میں اس کو خالق یا مدبر کائنات کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے تو وہ اس لحاظ سے کہ یہ اوصاف معبود والٰہ کا لازمہ ہیں پھر محض کسی لفظ کا استعمال ہی حقیقت کی علامت نہیں ہوتا جب کہ علماء لغت کی تصریحات اس کے خلاف ہیں اور موارد استعمال بھی اس کے شاہد ہیں۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ ان معنوں کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ عرب وعجم کی قوموں میں خدا کے سوا دیگر معبود بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس سوال کا جواب واضح ہے۔ کیونکہ معبود سے مراد معبود برحق ہے نہ معبود باطل یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود برحق نہیں اور بت عبادت کے لائق نہیں ہیں اس معنی کے قرائن خود اسی جملہ میں موجود ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں۔ لاعلم الا ما نفع کوئی علم نہیں مگر وہ جو نفع بخش ہو یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اہل لغت الٰہ کو مادہ ''ولہ'' سے مشتق مانتے ہیں کہ جس کا معنی ''تحیر'' ہے یعنی اس میں ایک ایسی ذات کی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں عقلیں حیران راہ جاتی ہیں۔ تاہم اہل لغت میں سے اکثریت کے نزدیک پہلے معنی کو ہی ترجیح حاصل ہے کہ الٰہ کا مادہ الہ (عبادت) ہے اس ساری گفتگو سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں الٰہ کا معنی معبود نہیں ان کا یہ قول کسی بھی صورت میں قابلِ لحاظ نہیں ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

اس جہان کو غور سے دیکھو۔ کوئی بے ترتیبی نہیں پاؤ گے۔

(۱) پہلی آیت میں آسمانوں کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ رحمن کی تخلیق میں تم کسی قسم کی بے ربطی۔ عیب نقص اور تضاد نہیں پاؤ گے(ما تریٰ فی خلق الرحمن من تفاوتٍ)یعنی یہ وسیع وعریض دنیا اپنی تمام پہنائیوں کے باوجود ہم آہنگ مربوط متحد اور منظم ہے۔

بدیہی امر ہے کہ اس جہان ہستی میں رنگ، صورت اور دیگر ظاہری وباطنی کیفیات میں تو فرق اور تفارت ہے لیکن یہاں جس تفاوت کی نفی کی جارہی ہے وہ بے ربطی، بدنظمی اور اختلال ہے۔ اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے پھر فرماتا ہے پھر سے دیکھو..... اس کائنات کو بڑے غور سے دیکھو، کیا تمہیں کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے۔

(فارجع البصر هل تریٰ من فطورٍ)

جملہ ''فارجع البصر'' سے مراد گہری اور باریک نگاہ ہے اس میں خطاب اگرچہ نبی اکرمؐ سے ہے لیکن اس میں سبھی لوگ شامل

وداخل ہیں اس سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے تاکیداً فرمایا: بار بار نگاہ دوڑاؤ اس وسیع وعریض دنیا کا نظارہ کرو (لیکن) تمہاری آنکھیں تھک کر ناکام پلٹیں گی اور تمہیں اس میں کسی قسم کی خامی نظر نہیں آئے گی (ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیك البصر خاسیاً وھو حسیرٌ[1]

اس طرح قرآن اپنے مختلف بیانات کے ذریعے انسانوں کو اس دنیا و جہان کا مشاہدہ ومطالعہ کرنے کی دعوت دے رہا ہے صرف دعوت ہی نہیں بلکہ وہ انہیں تشویق وترغیب دے کر اس کیلئے آمادہ وتیار بھی کر رہا ہے تاکہ انہیں یقین ہوجائے کہ واقعی اس جہان کی خلقت میں کوئی کسی اور نقص نہیں ہے جب ان کو اس میں کوئی بے ربطی وبدنظمی نہیں ملے گی تو ان کے دل وزبان سے نغمہ لَآ اِلٰہَ اَلاَّ اللّٰہُ پھوٹ نکلے گا اور یہ سہانے صدا بہت سے دلوں کو موہ لے گی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک نفی تفاوت سے نقص وعیب کی نفی مراد ہے اور بعض کے خیال میں یہاں بے ربطی کی نفی ہورہی ہے۔ بعض اسے اضطراب وتزلزل کی نفی اور بعض اسے تناقص اور کسی طرح کی کجی کی نفی کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں جب کہ اس آیت کا مفہوم وسعت رکھتا ہے اور یہ ہر قسم کے نقص کو شامل ہے۔ اس لفظ (تفاوت) کا مادہ ''فوت'' ہے کیونکہ جب دو چیزوں میں تفاوت ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں دوسری چیز کے صفات نہیں پائے تھے۔

اگر دنیا میں دو خدا ہوتے:

(۲) دوسری ایت میں وہی مطلب ومفہوم ایک اور انداز میں بیان ہورہا ہے فرمایا گیا۔ کیا ان کے (مٹی پتھر) کے زمینی معبود ایسے ہیں کہ قیامت میں مردوں کو زندہ کرسکیں۔ یا ان میں یہ طاقت ہے کہ موجودات کو پیدا کریں اور انہیں زمین میں پھیلا دیں (اِمِ اتخذ والٰھة من الارض ھم ینشرون)

من الارضِ (زمین سے) کے الفاظ میں ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ وہ (مشرک) اپنے معبودوں یعنی بتوں کو مٹی پتھر لکڑی اور دھاتوں سے بناتے ہیں کہ وہ سب زمین چیزیں ہیں کیا ایسی چیزیں وسیع آسمانوں کی خلاق وحاکم اور ان کو قائم رکھنے والی ہوسکتی ہیں؟ پھر مشرکوں کے عقیدے کو جھٹلانے کے لیے بطور استدلال فرماتا ہے۔ اگر آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کچھ خدا موجود ہوتے تو اس کائنات کا نظام تہ وبالا ہیں جاتا اور وہ ویران ہوکر رہ جاتی ہے۔ (لو کان فیھما اٰلھة الا اللہ لفسدتا)

المفرادت میں راغب اصفہانی نے خیال ظاہر کیا ہے ''فساد'' کے معنی کسی چیز کا حد اعتدال سے نکل جانا ہے کہ وہ کمی ہو یا بیشی جسم میں

---

[1] ارجع البصر'' (پلٹ کر دیکھو) بار بار توجہ سے دیکھنے سے کنایہ ہے'' خاسئ کا مادہ ''خسأ'' بروزن ''کسب'' ہے اور اس کا معنی ذلت وخوری کے ساتھ بند ہوجانا ہے۔ گویا یہ محرمیت وناکامی سے کنایہ ہے حسیر مادہ ''حسر'' بروزن ''قیصر'' سے ضعف وناتوانی کے معنی میں ہے، اصل میں اس کا معنی برہنہ ہونا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی چیز کمزور ہوجائے تو قوت وطاقت سے خالی وبرہنہ ہوجاتی ہے۔ یہ لفظ کمزور کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے

ہو یا روح میں یا دنیا کی دیگر اشیاء میں واقع ہو۔فساد کا نقطہ مقابل اصلاح ہے، یہاں فساد کے معنی خرابی تباہی بدنظمی اور ٹوٹ پھوٹ ہیں۔آخر میں نتیجہ کلام کے طور پر ذکر کیا جارہا ہے کہ پروردگار عرش ان باتوں سے پاک ہے جو یہ (مشرک) کہہ رہے ہیں اور وہ ہر قسم کے شریک اور ساجھی سے منزہ و بے نیاز ہے (فسبحان اللہ رب العرش عما یصفون)[1]

اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مدبر، مدبر خالق حاکم اور تصرف کرنے والے اس دنیا میں دو ہوں تو اس میں نظم وضبط کا پیدا ہونا ممکن نہیں کیونکہ متعدد خداؤں کے باعث تدبیر وتصرف کرنے والے زیادہ ہوں گے، جس سے جہانِ ہستی میں بے ترتیبی اور فساد وتباہی پھیل جائے گی اس لیے کہ ہر خدا کی خواہش ہوگی کہ وہ دنیا میں اپنی پسند کا نظام قائم کرے۔

البتہ اس ذیل میں ایک مشہور اشکال ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ کہ ہوسکتا ہے دونوں خداؤں میں اتحاد اور ہمکاری ہو اور وہ متفق ہوکر اس دنیا کا نظام چلاتے ہوں جس سے یہاں ایک واحد ومربوط نظام قائم ہوگیا ہو۔اس اشکال کا جواب توضیحات میں دیا جائے گا۔

تیسری اور آخری آیت میں اس دلیل وبرہان کو نئے پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔فرمایا: اللہ نے مسیحیوں اور بت پرستوں کے خرافات کے برعکس) کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور (مشرکوں کے قول کے برخلاف) کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ شریک نہیں (ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معہ من الہٍ)۔

اگر کوئی دوسرا خدا بھی ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہوجاتا (اپنی تدبیر وتصرف میں لے آتا) اور پھر یہاں غیر مربوط اور مختلف نظام) اور قانون کی حکومت ہوتی۔اس طرح دنیا میں بڑی بے ترتیبی اور بدنظمی پیدا ہوجاتی (اذاً لذھب کل الہٍ بما خلق)

یہ امر بذات خود وحدت خدا اور توحید کی ایک مضبوط دلیل ہے جو انہیں دمقدموں سے مرکب ہے جن کا ذکر ہو چکا ہے یعنی ایک طرف یہ منظم ومربوط کائنات ہمارے سامنے ہے کہ جس میں معین ومقرر قوانین جاری ہیں۔

دوسری طرف یہ چیز ہے کہ اگر یہاں دو خالق دو مدبر اور دو تصرف کرنے والے موجود ہوتے تو متعدد تدبیروں اور تعبیروں کی وجہ سے اس دنیا میں ناموزنیت ہوتی۔اس آیت کے آخر میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے اگر اس جہان میں کئی ایک خدا ہوتے تو ہر ایک اپنی قلمرو میں وسعت کے لیے کوشاں ہوتا اور وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے (ولعلی بعضھم علی بعض) چنانچہ خداؤں کی یہ باہم آویز دنیا کے نظام میں فساد اور بگاڑ کا سبب بن جاتی۔

اس موقع پر ایک مشہور اشکال وارد ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے وہ دانا وحکیم خدا اپنے اپنے دستور العمل کو ایک دوسرے سے ہم اہنگ بنائیں اور یوں اس دنیا کے نظام میں خلل اور بدنظمی پیدا نہ ہو، لیکن جیسا کہ پہلے کیا گیا ہے.....ہم اس اشکال کا جواب توضیحات کے ذیل میں دیں گے۔

آخر میں ان دونوں دلائل کا نتیجہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ پاک ومنزہ ہے خدائے واحد ان باتوں سے جو یہ لوگ اس کے بارے میں کیا کرتے ہیں (سبحان اللہ عما یصفون)

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک اس آیت میں لفظ ''اَم'' منقطع ہے اور ''بَلْ'' کے معنی میں ہے بعض اسکو ''ھل'' (استفہامیہ) کے معنی میں لیتے ہیں چونکہ مشرکین اپنے بتوں کیلئے خالقیت کے دعوے دار نہیں ہیں اس لیے بہتر ہے کہ اس استفہام انکاری تصور کیا جائے۔

توضیحات

(۱)۔علوم کی رو سے آفرینش جہان کی وحدت:

جب اس وسیع عالم کی طرف نظر کی جائے تو بادی النظر میں پراگندگی اور تفریق دکھائی دیتا ہے۔سورج چاند، ستارے زمین آسمان، انسان، حیوان، درخت پودے اور عناصر جدا جدا اور مختلف نظر آتے ہیں لیکن جب قدرے غور کریں تو اجزاء وزارت عالم اس طرح مربوط دکھائی دیتے ہیں۔جیسے ان میں ایک ربط اور وحدت موجود ہے۔جب مطالعہ اور بھی دقیق وعمیق ہو پھر وحدت وارتباط پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے.....اس لیے کہ

(۱) نظامِ شمسی کے تمام کرات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ ایک ہی شمار ہوتے ہیں اور مفکرین کا بدیہی خیال ہے کہ شروع میں یہ سب ایک ہی کرہ کی شکل میں تھے۔پھر جدا جدا ہو گئے۔لیکن جدائی کے باوجود بھی باہم مربوط ہیں۔ادھر ماہرین فلکیات کا نظریہ ہے کہ ہمارا نظام شمسی اپنی جگہ مستقل نہیں بلکہ یہ ایک بہت بڑی کہکشاں کا حصہ ہے جو دوسری کہکشاؤں کے ساتھ مل کر ایک واحد نظام کی تشکیل کرتے ہیں اور قانون جاذبہ نے ان سب کو ایک زنجیر میں جکڑ رکھا ہے.....بہرحال ان ماہرین کے نزدیک یہ تمام کہکشاؤں میں ابداء ایک وحدت تھیں اور پھر آہستہ آہستہ ان میں علیحدگی اور جدائی پیدا ہوئی گئی۔

(۲) وہ مختلف اجسام جو ہمیں باہم متفاوت نظر آتے ہیں اور ان کی تحلیل وتجزیہ سے ظاہر ہوا ہے کہ یہ سب معینہ عناصر سے مرکب ہیں اس وقت تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق ان عناصر کی تعداد ایک سو سے کچھ زیادہ ہے۔ان کے ظاہری اختلاف کے باوجود جب ان عناصر کو شگافتہ کیا اور توڑا جائے یعنی ''اٹیم'' کی صورت میں لایا جائے تو یہ ذات ایک دوسرے سے مشابہ نکلیں گے، ان میں جو فرق ہوگا فقط الیکٹرون اور پروٹون کی تعداد میں کمی بیشی کی بناء پر ہوگا۔

(۳) یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ جو نظام اس ذرہ ناچیز یعنی ''ایٹم'' میں ہے وہی نظام اس پوری کائنات پر حکم فرما ہے یہی نظام جاذبہ ودافعہ اس نظامِ شمسی کے تمام سیارات اور ''ایٹم'' کے الیکٹرون کی اپنے اپنے خاص مداروں، ان کے اصل مرکز کے گرد حرکت دیتا ہے لیکن نہ تو وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور نہ باہم جذب ہوتے ہیں۔

(۴) روئے زمین کے تمام موجودات رنگارنگ کے نظارے دکھاتے ہیں اور ہماری نظر میں ان رنگوں کے درمیان بڑا فرق ہوتا ہے۔لیکن اگر ہم ان کا تجزیہ کریں تو سب رنگوں کی بازگشت امواج کی طرف ہوتی ہے ان میں جو بھی فرق نظر آتا ہے وہ شدت ارتعاش اور ان موجوں کی بلندی وپستی کی وجہ سے ہے۔

(۵) ہم مختلف قسم کی آوازیں سنتے ہیں لیکن آج علم طبیعات بتا رہا ہے کہ ان اچھی بُری اور بلند وپست سبھی آوازوں کی بنیاد ایک ہے یہ اصل میں خاص قسم کی امواج ہیں کہ ان کا ارتعاش ان کے درمیان اختلاف اور تنوع کا موجب بن رہا ہے۔

(۶) دنیا میں جانوروں کی بہت سی اقسام ہیں اور فقط کیڑے مکوڑوں کی قسمیں ہی لاکھوں تک پہنچتی ہیں نباتات میں اس سے بھی زیادہ

تنوع ہے لیکن ماہرین کہتے ہیں کہ ان سب کی اصل اور بنیاد ایک ہے یہ سب نباتات میں اس سے بھی زیادہ تنوع ہے لیکن ماہرین کہتے ہیں کہ ان سب کی اصل بنیاد ایک ہے یہ سب سلول اور جرثومہ سے مرکب ہیں اور ان میں ایک نظام جاری ہے.....یہی وجہ ہے ایک دواء کی انسان پر ہونے والی تاثیر کا پتہ چلانے کے لیے اس کا تجربہ حیوانات پر کیا جاتا ہے۔

(۷) آسمان کے ستارے خواہ ہم سے نزدیک ہیں یا دور.....ان کے نور اور روشنی کا تجزیہ کرنے والے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جن عناصر سے یہ ستارے مرکب ہوئے ہیں وہ ان اجزا ترکیبی سے مشابہ ہیں جو کرہ زمین کا وجود تشکیل دیتے ہیں ان تمام کرات اور ستاروں میں ایک عجیب طرح کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

(۸) اس دنیا پر حکم فرما قوانین (مثلاً قانون جاذبہ، رفتار نور اور قانونِ حرکت وغیرہ) ایک جیسے ہیں اور سب کا اُصول وقاعدہ ایک ہی ہے جب ہم کرہ زمین کی بعض چیزوں پر ایک قانون جاذبہ کو دیکھیں کہ جو نظامِ شمسی اور کہکشاؤں پر حاوی ہے اور نیوٹن نے اس قانون کو ایک درخت سے سیب کے گرنے سے دریافت کیا تھا۔

اس ساری بحث کے خلاصہ کے طور پر معلوم ہوا کہ خداوند رحمن کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہیں اس میں کسی قسم کا نقص خلل اور رخنہ نہیں ہے۔ جوں جوں انسان کے علم وادانش میں وسعت اور اضافہ ہوگا اسی قدر اس آیہ کریمہ کی عظمت اس کے مطالب کی گہرائی اور اس کے مفاہیم کی جامعیت واضح اور روشن ہوتی چلی جائے گی.....موجوداتِ عالم کی یہ ہم آہنگی وحدتِ خالق اور توحید الٰہی کی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔

(۲) برہان تمانع کی ایک وضاحت

برہان تمانع جس کو ''برہان ممانعت'' اور برہان ''وحدت وہم آہنگی'' کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ وہ دو مقدمات سے مرکب ہے۔ اوّل جہان آفرینش میں وحدت وہم آہنگی کہ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے دوم اگر اس جہان کے خالق ومالک دو ہوں تو اس میں اختلاف وفساد ہوگا چونکہ اس دنیا جہان کے موجودات میں بدنظمی اور ناموزنیت نہیں.....اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب موجودات کا سرچشمہ ایک مبداء حقیقی ہے سب کا خالق ایک ہے کہ وہی ان کا خالق اور مدبر ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں پہلی مقدمہ اول کے بارے میں اور دوسری وتیسری آیت مقدمہ دوم سے متعلق ہیں۔ لہٰذا کبھی مقدمہ اوّل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس (برہان تمانع) کو ''برہان وحدت'' کہا جاتا ہے اور کبھی مقدمہ دوم کو سامنے رکھتے ہوئے اسے ''برہان تمانع'' سے تعبیر کیا جاتا ہے پس ان دونوں تعبیروں کی بازگشت ایک ہی دلیل کی طرف ہے البتہ دو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے اسے دو ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

دو سوالوں کا جواب:

(۱) پہلے سوال کے ضمن میں اکثر کہا جاتا ہے کہ مبداء وخالق کے تعدد کا نتیجہ ہمیشہ بدنظمی کی صورت میں رونما نہیں ہوتا۔ ہم نے ایسے کئی گروہ دیکھے ہیں جو باہمی مشاورت سے ایک دستور العمل پر عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر اس کائنات میں دو خدا ہوں تو فساد اس وقت پیدا ہوگا۔ جب ان کے درمیان کشمکش اور مقابلہ ہو لیکن اگر ہم یوں تصور کریں کہ وہ دونوں حکیم اور خبیر ہیں تو یقیناً وہ ایک دوسرے کے

معاون و مددگار ثابت ہوں گے اور باہمی مشاورت سے دنیا کا نظام قائم رکھ سکیں گے۔

جواب:

یہ سوال پہلی نظر میں تو کچھ معقول دکھائی دیتا ہے۔لیکن درحقیقت اس میں مفہوم ''تعدد'' کی طرف توجہ ہی نہیں کی گئی۔

توضیح:

جب ہم کہتے ہیں کہ متعدد خدا ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا نقطۂ نظر ایک نہیں..... کیونکہ اگر ان میں ہمہ جہتی واتحاد فکر وعمل ہو تو پھر وہ واحد (ایک ہی) شمار ہوں گے۔ یہ الفاظ ودیگر جب بھی تعداد وتکثر ہو، چاہے ہم بھی تصوّر کریں کہ ان کے نقطہ نظر میں تفاوت واختلاف نہیں۔تو بھی یہ امر محال ہے کہ دو موجود تمام جہات سے متحد ومتفق ہوں علاوہ ازیں فعل وفاعل میں ایک مناسبت ضروری ہے۔ کیونکہ ہر فعل اپنے فاعل کا یک اثر اور نشان ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ چیز محال ہے کہ دو فعل جن کے فاعل دو الگ الگ ید قدرت ہوں وہ تمام جہات سے باہم مطابقت رکھتے ہوں۔جیسا کہ یہ بھی محال ہے کہ وہ فاعل ارادہ وعمل میں بالکل متحد اور ایک ہوں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب وجود دو ہیں اور ان میں تفاوت ہے تو اس کا اثر ان کے ارادہ وعمل پر بھی ضروری ہوگا خلاصہ یہ کہ یہ صورت ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ایسا نظام جس میں دوئی نہیں اس کا مبداء وسرچشمہ ایسا ہو کہ جس میں تعداد ہی تعدد ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر ایک گروہ اور ایک تنظیم کے افراد مِل جل کر کوئی کام کرتے ہیں ایسے کاموں میں وحدت دیک رنگی محض ظاہری حیثیت میں ہوتی ہے اور نظم واقعی وحدت واقعی نہیں ہوتی اس لیے کہ شوریٰ یعنی چند آدمیوں کا مل کر کام کرنا اس طرح جاری رہتا ہے کہ وہ شرکت وہم کاری کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے تصورات ونظریات سے صرفِ منظر کرتے ہیں (تاکہ وحدت برقرار ہے) نہ یہ کہ ہمیشہ ان سب کا نقطۂ نظر اور ان کی تشخیص وترجیح ایک ہوتی ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ شورائی نظام میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ سبھی ایک چیز پر متفق ہو جائیں، بلکہ اس میں غالب اکثریت کی آراء پر عمل کیا جاتا ہے اور یہ بات خود ہمارے دعوے کی صحت پر ایک دلیل ہے نیز یہ اکثریت ثابتہ نہیں ہوتی اور افراد میں تبادلہ ہوتا رہتا ہے کبھی سات نفری مجلس میں جن چار آدمیوں کی اکثریت شمار ہوتی ہے ایک دوسرے موقع پر تین افراد تو انہیں میں سے ہوتے ہیں۔لیکن چوتھا ان کے پہلے حمایتی کی بجائے کوئی اور شخص ہوتا ہے اور اس پہلے شخص کی رائے ان کے برعکس ہو جاتی ہے۔ اکثریت میں چونکہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے لہٰذا افعال میں یکسانیت نہیں ہوگی۔

ان تین دلیلوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شوارئی نظام میں افراد کے درمیان اختلاف فکر ونظر ہوتا ہے۔لیکن اس لیے کہ وہ ظاہری اتفاق رائے پر قناعت کر لیتے ہیں۔انہیں ایک لحاظ سے باہم مربوط ومنظم کہا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس دنیا کا طبعی وفطری نظام محض ظاہری تناسب نہیں رکھتا بلکہ وہ حقیقی واصلی ارتباط اور کامل ہم آہنگی کا مظہر ہے ایک اور تعبیر کے مطابق اگر اس عالم کے مبداء وموجد دو ہوں اور ان میں ہر لحاظ سے یکسانیت ہو تو پھر وہ ایک ہی ہوں گے یا ان میں تمام جہات سے اختلاف ہو تو یہاں نظام وتدبیر میں دو مقابل نقاط ہوں گے

یا بعض امور میں اتفاق اور بعض میں اختلاف ہو تو اس افتراق وتفاوت کا اثر ان کے افعال پر ہوگا کیونکہ فعل وجود فاعل کا سایہ ہوتا ہے۔

(۲) مذکورہ بالا آیات میں جو جملہ (ولعلیٰ بعضھم علی بعض) آیا ہے۔ اس پر غور کرنے سے یہاں ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ دو خدا جو دانا وحکیم ہیں ان کے درمیان ہمیشہ اختلاف وکشمکش رہے اور وہ ایک دوسرے پر غلبہ وتفوق حاصل کرنا چاہیں اہل تفسیر حضرات نے کیوں انہیں دو ایسے بادشاہوں کے مشابہ فرض کرلیا ہے جو صرف اپنا اختیار واقتدار چاہتے ہیں اور ان میں ہمیشہ اختلاف وکشمکش رہے اور وہ ایک دوسرے پر غلبہ وتفوق حاصل کرنا چاہیں اہل تفسیر حضرات نے کیوں انہیں دو ایسے بادشاہوں کے مشابہ فرض کرلیا ہے۔ جو صرف اپنا اختیار واقتدار چاہتے ہیں اور ان میں ہمیشہ ہی کشاکش رہے گی۔ کیوں ان دونوں خداؤں کو باہم متحد نہیں سمجھا جاتا جب کہ وہ حکیم ہیں؟

جواب:

یہ سوال اس لیے پیدا ہوا ہے کہ اختلاف کی وجہ ہمیشہ خود خواہی اور خواہشات نفسانی ہی کو قرار دیا گیا۔ جب کہ کسی وقت تقادستہ نظریات کے باعث بھی اختلاف ہوسکتا ہے اور یہ دو خداؤں کے درمیان بھی واقع ہوسکتا ہے۔

ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کا بار بار ذکر کریں کہ جب اس کائنات کے دو مبداء وخالق ہوں تو اس دوئی کا مطلب یہ ہے کہ وہ دو الگ الگ وجود ہیں اور یقیناً ان میں کئی جہات سے تفاوت واختلاف بھی ہوگا وگرنہ ان کا وجود ایک ہوگا نہ کہ.....لہٰذا ممکن نہیں کہ ان دونوں کا فعل ایک ہو۔ ان میں سے ایک اس دنیا کے نظم وتکامل میں ایک طریقہ اختیار کرنا چاہے گا اور دوسرا اس سے مختلف رائے رکھتا ہوگا۔ یہ تصویر کرنا کہ وہ دونوں (خدا) ہر لحاظ سے کامل ہوں گے ایک بہت بڑا استثناہ ہے کیونکہ جب ان کو دو مانا گیا ہے تو ان میں سے ایک بعض کمالات سے تہی دامن ہوگا۔ جبکہ دوسرا ان کمالات کا حامل ہوگا اس کا مفہوم یہ ہوا کہ کمال مطلق موجود نہیں بلکہ نسبتاً ان دونوں میں نقص پایا جاتا ہے لہٰذا کوئی تعجب نہیں کہ ان دونوں کے علم وقدرت میں باہمی تفاوت ہو اور ہر ایک نظام کائنات کو اپنے نظریے کے مطابق چلانا چاہتا ہو۔

اسلامی روایات اور برہان وحدت وتمانع:

اسلامی روایات میں مندرجہ ذیل دلیل موجود ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ہشام بن حکم نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا: ہم اس پر کیا دلیل رکھتے ہیں کہ خداوند عالم واحد یکتا ہے؟

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: اتصال التدبیر وتمام الصنع کما قال اللہ عزوجل ولو کان فیھما اٰلھۃٌ الا اللہ لفسدتا.....تدبیر عالم میں اتصال اور خلقت جہان کا کامل ہونا ہی خدا کی واحدانیت کی دلیل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر زمین وآسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہوتا تو ان میں تباہی وبربادی آجاتی [1]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۵۵ حدیث ۱۔

ایک اور حدیث جو الکافی میں شیخ کلینی نے ہشام بن حکم سے نقل کی اس میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ایک زندیق کے جواب میں فرمایا: لما اینا الخلق منتظما والفلك جاريا والتدبير واحدًا والليل والنهار والشمس والقمر دل صحة الامر والتدبير واتلافِ الامر على ان المدبر واحدٌ۔ جب ہم اس دنیا کو منظم و مرتب دیکھتے ہیں کشتی کو چلتا پاتے ہیں یہاں ایک تدبیر کو رواں محسوس کرتے ہیں..... رات دن، سورج چاند اپنے راستے پر چل رہے ہیں تو تدبیر کے کامل ہونے اور تمام امور کے باہمی رابطے سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان سب کا مدبر ایک ہے [1]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۵۵ حدیث ۲۔

۳دلیل صرف الوجود

اشارہ:

وجودخدا غیر محدود ہے۔جیسا کہ بعد میں بیان ہوگا۔

واضح سی بات ہے کہ جوغیر محدود ہواس کے ساتھ دوائی کا سوال ہی پیدانہیں ہوتا، کیونکہ دو وجودوں کا غیر محدود ہونا ممکن نہیں اس لیے کہ جب دوئی کی بات ہوگی توان دو میں سے ہر ایک اپنے غیر کے وجود کو مفقود اور ختم کرے گا یا واضح الفاظ میں ایسی جگہ جائیں جہاں ایک کے وجود کی انتہا اور دوسرے کے وجود کی ابتدا ہو، اس صورت میں پہلا اور دوسرا ہر دو وجود محدود ہو جائیں گے کہ ان میں سے ہر کسی کی ابتداء اور پھر انتہاء بھی ہوگی۔

آیئے اس مطلب کو ایک مثال سے واضح کریں.....دو شخص ہیں اور دونوں ہی ایک ایک باغ کے مالک ہیں، ظاہر ہے کہ جب باغ دو ہیں تو وہ محدود ہی ہوں گے۔اگر فرض کیا جائے کہ ایک شخص کے باغ نے اتنی وسعت پیدا کر لی کہ روئے زمین کی پہناؤں کو گھیر لیا تو یہ مسلمہ امر ہے کہ پھر دوسرے باغ کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہے گی اور دُنیا میں بس وہ ایک ہی باغ ہوگا۔پس جہاں کوئی ذات لامحدود ہوگی اور واحد بھی ہوگی۔ برہان صرف الوجود سے مراد یہی ہے کہ خدا جو مطلق ہے اور وہ بلا قید و شرط ہر لحاظ سے لامحدود ہے۔ظاہر ہے کہ اب اس کا ثانی اور دوسرا قطعاً فرض نہیں کیا جا سکے گا۔

اس اشارے کے بعد ہم قرآن کریم کی طرف توجہ کرتے اور آیات ذیل پڑھتے ہیں۔

(۱) شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ [۳:۱۸] (عمران)

(۲) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲﴾ [۵۷:۲] هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳﴾ [۵۷:۳] (حدید)

(۳) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ [۱۲:۳۹] (یوسف)

ترجمہ:

(۱) خدائے تعالیٰ (عالم وجود کے ایک نظام کی ایجاد کے ساتھ) گواہی دے رہا۔ ہے کہ معبود بس وہی ہے۔فرشتے اور صاحبان علم (اپنے اپنے طریقے سے) گواہی دے رہے ہیں۔ جب کہ خدا نے (عالم ہستی میں) انصاف وعدالت کو قائم کیا (عدالت خدا کی واحدانیت کی علامت ہے) لہٰذا تم بھی اس آواز کے ساتھ آواز ملا کر کہو، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی قادر وحکیم ہے۔

(۲) آسمانوں اور زمین کی مالکیت وحاکمیت اسی کی ہے وہی زندہ کرتا اور موت دیتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے وہی اوّل آخر۔ظاہر اور باطن ہے اور ہر چیز کا عالم ہے۔

(۳) (یوسفؑ نے کہا) اے میرے قیدی دوست.....مختلف خدا بہتر ہیں ۔ یا ایک واحد وقہار (خدا بہتر ہے)

آیات کی جمع آوریتفسیر

خودخدااپنی ذات کی وحدت کا گواہ ہے:

(۱) پہلی آیت کی تفسیر ''برہان صدیقین'' کے ذیل میں ہوچکی ہے۔اس لیے اب ہم اسے اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔اس آیت کا مضمون یہ ہے: خدائے تعالیٰ گواہی دے رہا ہے۔کہ معبود بس وہی ہے فرشتے اور صاحبانِ علم (اپنے اپنے طریقے سے) گواہی دے رہے ہیں (شهدالله انه لااله الاهو والملكة واولوالعلم)۔

خدا کی ذات پاک کی وحدت کی ایک علامت ونشانی اس کا وہ نظم وعدالت ہے جو پوری کائنات پر حکم فرما ہے اسی لحاظ سے آیت میں ارشاد ہوا وہ ایسی حالت میں ہے کہ اس نے انصاف قائم کیا ہوا ہے۔(قائما بالقسط) اس کے ساتھ ہی بار دیگر اپنی ذات کی وحدت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس کے سوا کوئی معبود نہیں (لااله الاهو) وہی خدا ہے جو قادر وحکیم ہے۔(العزيز الحكيم)

یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر اس بہان میں کئی خدا حکمران ہوں تو ایک کی سلطنت دوسرے کے ہاتھ میں نہیں ہوگی یعنی ان میں سے ہر ایک دوسرے کے کمال وقدرت کا حامل نہیں ہوگا۔لیکن یہ چیز خدائے تعالیٰ کی صفت ''عزیز'' سے مناسبت نہیں رکھتی نیز اس دنیا میں اس کی جو ''حکمت'' کارفرما ہے۔وہ بھی اس کی وحدت کو ثابت کرتی ہے کیونکہ خداؤں کے تعدد کی صورت میں یہاں فساد وتباہی ہوگی۔

وحدت خدا کے بارے میں فرشتوں اور صاحبان علم کی گواہی تو واضح ہے۔لیکن اپنی ذات کی وحدت پر خدا کی اپنی گواہی کی صورت کیا ہے؟ اس پر مفسرین نے خیال آرائیاں کی ہیں۔بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد لفظی شہادت ہے جو قرآن کریم کی بہت سی آیات میں آئی ہے،لیکن بعض کہتے ہیں اس عالم ہستی کے آفاق وانفس میں خدا کی قدرت وحکمت کے نشانات ظاہر وہویدا ہیں اور سب پر ایک ہی نظام حکم فرما ہے.....پس یہی اپنی وحدت پر خدا کی گواہی ہے۔

بہرحال یہ دونوں تصورات اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔یہاں گواہی کی ایک اور صورت بھی ہوسکتی ہے اور اسی کی تشریح کرنا ہمارا مقصد ہے وہ گواہی کچھ یوں ہے کہ خدا کی ذات ہے ہی ایسی کہ اس میں تعدد ممکن نہیں، کیونکہ وہ ایک غیر محدود وجود ہے اور غیر محدود لامتناہی ہی وجود ایک سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتا۔پس وہ ذات (خدا) ہی اپنی ذات کی وحدت پر گواہ اور اس پر ایک زبردست دلیل ہے (غور کریں)

البتہ ان تینوں نظریات میں کوئی تناقض نہیں اور یہ مذکورہ آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتے ہیں۔لہٰذا بعض بزرگ مفسرین (مثلاً صاحب المیزان) کا یہ اصرار قابل تسلیم نہیں کہ اس آیت کی تفسیر فقط معنی اوّل (یعنی شہادت قولی ولفظی) کے مطابق ہی درست ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے الفاظ مطلق ہیں اور ان پر کسی ایک معنی کی قید نہیں لگائی جاسکتی۔

اس آیت میں جملہ ''لاالہ الاللہ'' کا تکرار کیوں ہوا؟ ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ بار اوّل بطور مقدمہ اور بار دوم بطور نتیجہ کے لایا گیا ہے ،شاید اہل سنت کی مشہور تفسیر.....تفسیر قرطبی میں امام جعفر صادقؑ کے ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہوا ہے جہاں آپ نے فرمایا: الاولیٰ وصفٌ وتوحیدٌ الثانیةٌ رسم وتعلیم یعنی قولوا لااله الا الله العزیزم الحکیم۔یعنی یہ جملہ پہلی دفعہ وصف اور توحید کے لیے اور دوسری دفعہ تعلیم اور طریق عمل سے آگاہ کے لیے مذکور ہے۔یعنی (اے انسانو!) تم بھی کہو کہ خدائے واحد کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور وہ قدرت وحکمت والا ہے۔[1]

وہی ہے اوّل وآخر، ظاہر باطن:

(۲) دوسری آیت سورۂ حدید کی آیات میں سے ہے (ان آیات میں امام علی زین العابدین علیہ السلام کے حساب ارشاد صاحبانِ فکر ونظر کے لیے صفات جمال وجلالِ خداوندی بہترین طریق اور عمیق پیرایہ میں ذکر ہوئی ہیں) چنانچہ فرمانِ ایزدی ہے: آسمانوں اور زمین کی ملکیت اور حاکمیت اسی کے لیے۔(له ملك السمٰوٰتِ والارض[2])

اس دلیل کے تحت موت وحیات بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔(یحی و یمیت وهو علی کل شیءٍ قدیر)

اس بناء پر عالم ہستی میں صرف وہی مالک، حاکم، اور مدیر ومدبر ہے۔

پھر انہی آیات میں ایک اور پہلو سے بات کی گئی ہے ممکن ہے کہ وہ بھی خدا کی توحید مالکیت، وحاکمیت اور اس کے مدبر موجودات

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۲ صفحہ ۱۲۸۵

[2] یاد رہے کہ۔لہٗ۔کا مقدم ہونا حصر پر دلالت کرتا ہے۔یعنی آسمانوں اور زمین کی مالکیت وحاکمیت اسی کی ذاتِ اقدس میں مسخر ہے۔

ہونے کی دلیل ہو.....فرماتا ہے۔ وہی اوّل، آخر، ظاہر اور باطن ہے اور وہی ہر چیز سے آگاہ اور عالم ہے (هو الاوّل والاخر ولظاهر والباطنُ وهو بكل شيءٍ عليم)

اس آیت میں اس ذاتِ مقدس کے پانچ اوصاف بیان ہوئے ہیں جو مجموعی طور پر اس کی لامحدودیت کی دلیل ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ ہر چیز کی ابتداء اسی سے ہے۔ ہر چیز کی انتہا اسی سے اور وہ ظاہر و باطن میں وجود رکھتا ہے وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اس کے سوا کوئی اور ایسا وجود نہیں کیونکہ اگر کوئی دوسرا خدا بھی ہوتا ہے تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا آغاز و انجام ہوتا اور وہ ظاہر و باطن میں موجود نہ ہو سکتے۔ ان کا علمی حضور بھی ہر جگہ نہ ہوتا۔ اگر وہ دو ہوتے تو دونوں ہی محدود ہوتے کیونکہ ان میں سے ہر ایک جب دوسرے تک پہنچتا تو ختم ہو جاتا ہے یعنی اس کی انتہا ہوتی اور دوسرے کی ابتداء پس خدا کا غیر محدود ہونا اس کی توحید و وحدت کی دلیل ہے۔

فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ بہت سے مفسرین نے ھوالاول کو وحدت خدا کی دلیل قرار دیا ہے۔[1]

(۳) تیسری اور آخری آیت میں حضرت یوسفؑ اور دو قیدیوں کا ذکر ہے۔ جو زندان میں آپ کے ساتھ تھے انہوں نے حضرت یوسفؑ سے اپنے اپنے خواب کی تعبیر دریافت کی تھی حضرت نے خواب کی تعبیر بتانے کے مسئلہ کو توحید باری تعالیٰ کے ساتھ منسلک کر دیا کیونکہ توحید ہی تمام سعادتوں کی بنیاد و اساس ہے.....آپ نے فرمایا: اے میرے قیدی ساتھیوں! متعدد معبود بہتر ہیں یا خدائے واحد و قہار بہتر ہے۔ (يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ [۱۲:۳۹])

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ قرآن میں صفت قہار چھ بار استعمال ہوئی[2]

اور ہر موقع پر اسے واحد کے بعد ذکر کیا گیا ہے، گویا کہ ان دونوں صفات میں ایک خاص رابطہ ہے اور قاہری بھی خدا کی وحدت اور یکتائی کی دلیل ہے (غور کریں)

حضرت یوسفؑ نے یہ مسئلہ ان کے وجدان کے سامنے پیش کیا کیونکہ حقیقت توحید (جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے) فطرت انسانی کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے۔ اس لیے آپ نے فرمایا: تم بہت سے خداؤں کے قائل ہو کہ جن میں زمین، آسمان، آگ اور پانی کے الگ الگ خدا شامل ہیں پھر جن اور فرشتے بھی تمہارے معبود ہیں اور فرعون مصر بھی تمہارا خدا ہے۔ علاوہ ازیں مٹی، پتھر، لکڑی اور بعض دھاتوں سے بنے ہوئے بت بھی تمہارے الٰہ و معبود ہیں اور تم ان سب کی بندگی، پوجا اور عبادت کرتے ہو.....اچھا تو بتاؤ کہ اتنے بہت سے خدا بہتر ہیں یا واحد قہار خدا کہ جس کی ہر جگہ حکمرانی ہے؟

قہار'' مبالغے کا صیغہ ہے جس کا مادہ قہر ہے.....المفردات میں راغب اصفہانی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا معنی غلبہ کرنا اور فریق ثانی کی پستی کی طرف دھکیلنا ہے۔ لیکن یہ لفظ ان دونوں معنوں میں علیحدہ علیحدہ بھی استعمال ہوا ہے مجمع البیان میں طبرسی کہتے ہیں۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ صفحہ ۲۱۳۔ تفسیر روح البیان جلد ۹ صفحہ ۳۴۷۔

[2] ملاحظہ ہوں آیات۔ ۱۶۔ رعد۔ ۱۶ ابراہیم۔ ۶۵ ص ۴۸ زمر۔ ۱۶ غافر اور آیت زیر بحث۔

القاهر هو القادر الذی لایمتنع علیه شیءٌ یعنی قاہر وہ صاحب قدرت ہے جس کے لیے کوئی چیز غیر ممکن نہیں اس سے وحدت اور قہاریت کے مابین رابطہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جب ہم اس امر کے قائل ہو گئے کہ اس کی قدرت ہر چیز پر غالب یعنی غیر محدود ہے تو پھر اس کا ثانی اور دوسرا تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ اس لیے کہ جو بھی اس کا غیر ہے وہ اس کے سامنے مغلوب ہے اور جو مغلوب و مقہور ہوگا وہ واجب الوجود اور لامحدود نہیں ہوسکتا۔

توضیحات

(۱) خدا ایک لامتناہی حقیقت اور غیر محدود ہے:

سب سے اہم چیز جس کو باب صفات خدا میں ثابت کرنا ہے تا کہ مسئلہ توحید مشخص وظاہر ہو اور صفاتِ الٰہی جیسے علم وقدرت وغیرہ ثابت ہوں..... وہ ہے ذات مقدس کا لامتناہی ہی ہونا۔ کیونکہ اگر یہ چیز ثابت ہو اور سمجھ میں آ جائے تو تمام صفات جمال وکمال (صفات ثبوتیہ وصفات سلبیہ) کے اثبات کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

ذاتِ خدا کے وجود کو غیر محدود ثابت کرنے کے لیے درج ذیل اُمور کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

(۱) محدودیت وجود یعنی عدم سے آمیزش کیونکہ اگر اس میں عدم نہ ہو تو محدودیت کا کوئی مطلب ہی نہ ہوگا مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں کی عمر محدود ہے یعنی اس کی عمر کی انتہا عدم پر ہوگی اس لیے کہ اس کے وجود میں نیستی ونابودی شامل ہے۔ پس علم وقدرت وغیرہ کی محدودیت کا بھی یہی حال ہے۔

(۲) وجود ضد عدم ہے اور جس کی ذات میں اقتضاء وجود پایا جاتا ہو۔ اس میں عدم کا گزر نہیں ہوتا۔

(۳) برہان علت وملعول میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ علت ومعلول کی زنجیر اس کائناتِ عالم میں ایک ایسے نقطے تک پہنچنی چاہیے جو ازلی وابدی ہو ہم اس کا نام واجب الوجود قرار دیتے ہیں۔ یعنی اس کا وجود اس کی ذات سے ہے خارج سے نہیں، اس لیے عالم موجودات کی علت اوّلیہ ذاتی طور پر اقتضاء وجود رکھتی ہے۔ ان تینوں مقدمات پر خوب غور وفکر کریں ان سے واضح ہو جائے گا کہ اگر ذات واجب الوجود ہو وہاں عدم ونیستی کا اقتضاء ہرگز نہیں ہوسکتا پس اگر محدودیت ہوگی تو وہ خارج سے آئے گی اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ چیز واجب الوجود نہ ہو کیونکہ وہ اپنے وجود میں غیر کی مخلوق اور معلول ہوگی۔

بہ الفاظ دیگر اس میں شک نہیں کہ اس کائنات میں ایک واجب الوجود ہے (توحید کی بحث اثبات وجود خدا کے بعد ہے) اگر واجب الوجود لامحدود ہو تو ہمارا مدعا ثابت ہو گیا اور اگر محدود ہے تو یہ محدودیت ذاتی نہیں کیونکہ ذات تو مقتضی وجود ہے جس میں عدم کا شائبہ نہیں پس معلوم ہوا کہ محدودیت خارج سے آئی ہے جس کا لازمہ یہ ہوگا کہ کوئی بیرونی علت ہے اور یہ ذات اس کا معلول ہے..... اس صورت میں وہ ذات واجب الوجود ہی نہ رہے گی۔ اس بناء پر یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ اس کا وجود ہر لحاظ سے غیر محدود ہے۔

(۲) وجود غیر متناہی ولامحدود یقیناایک ہے:

سابقہ بحث میں ثابت ہوا ہے کہ خدا کا وجود لامحدود ہے.....اب ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی حقیقت میں دوئی نہیں ہوسکتی اور وہ یقینا ایک ہے، کیونکہ بار بار واضح کر چکے ہیں کہ دو اشیاء غیر محدود ہوں۔ یہ بات تصور میں بھی نہیں آ سکتی کہ دوئی تو محدودیت کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ چیز واضح روشن ہے کہ جب دو جودوں کا تصور کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک اپنے غیر سے الگ ایک وجود ہوگا اور کسی نہ کسی حد پر پہنچ کر تمام ہوجائے گا پھر وہاں سے دوسرے وجود کا آغاز ہوگا۔

ایک سادہ سی مثال ہے اس گفتگو کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ ایک نور وروشنی کا تصور کرتے ہیں جو زمان ومکان، وسعت اور منبع کے لحاظ سے بلاقید وشرط ہے اور ہر پہلو سے غیر محدود ہے کیا اسی طرح کا کوئی دوسرا نور بھی قیاس کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ ان میں سے ہم جس نور کا بھی تصوّر کریں وہی نور اوّل شمار ہوگا۔ مگر یہ کہ اس میں قید وشرط کا اضافہ کریں اور کہیں کہ وہ جو فلاں منبع سے اور فلاں جگہ پر ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں ہے کہ جب ہم کہیں خارج میں دونوں موجود ہیں تو اگر ان کا وقت وزمانہ اور جگہ ومکان دو ہیں یا منابع جدا جدا ہیں یا ایک کی روشنی زیادہ اور دوسرے کی کم ہے لیکن اگر وہ ان تمام پہلوؤں سے بلاقید وشرط ہوں تو پھر دونہیں ایک ہی نور ہوگا۔ (غور کریں)

آیت کریمہ ومن یدع مع اللہ الھاً اٰخر لا برھان لہٗ بہ، فانما حسابہٗ عند ربہٖ انہ لا یفلح الکافرون۔ یعنی جو شخص خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے کہ جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل وبرہان نہیں اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے وہ کافروں کو کبھی کامیابی نہیں دیتا۔ (مومنون ۱۱۷) شاید یہ آیت اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خدا کے لیے کسی شریک کا تصورِ کسی استدلال کے قابل نہیں اس پر استدلال کیونکر قائم ہوگا۔ جب کہ یہ بات فرض بھی نہیں کی جاسکتی۔

(۳) دلیل صرف الوجود اسلامی روایات میں:

برہان صرف الوجود ایک لطیف بیان کی صورت میں حضرت امام زین العابدینؑ کے فرمان میں موجود ہے۔ ان اللہ لا یوصف بمحدودیۃٍ عظیم ربنا عن الصفۃ و کیف یوصف بمحدُودیۃ من لا یحد۔ خدائے تعالیٰ کسی حد بندی کے ساتھ متصف نہیں (وہ ذات پاک کسی حد کو قبول نہیں کرتی) وہ اس قسم کی توصیف سے بلند وبالا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہ ہو وہ محدودیت کے ساتھ متصف ہوجائے [1]

دوسری روایت امام علی رضا علیہ اسلام کے فرمان پر مشتمل ہے: ھو اجل من ان تدرکہ الابصار او یحیط بہ وھم ویضبطہ عقلٌ۔ وہ ذات اس سے برتر ہے کہ آنکھیں اسے دیکھ سکیں یا فکر اس کا احاطہ کرسکے یا عقل اسے کسی قید وشرط کے تحت لاسکے۔

---

[1] اصول کافی جلد ا صفحہ ۱۰۰، باب النہی عن الصفۃ حدیث ۲۔

سائل نے عرض کیا کہ پھر اس کی حد بیان فرمائیں، تب امامؑ نے ارشاد فرمایا۔

انه لا یحد قال لم ؟ قال (ع) لان کل محمدودٍ متنا ہ الی حدٍ، فاذا احتمل التحدیدَ احتمل الزیادۃ واذا احتمل الزایادۃ احتمل النقصان فھو غیرُ محدودٍ، ولا متزآئدٍ لا متجزٍ ولا متوھمٍ۔

اس لیے کہ ہر متناہی ایک حد میں محدود ہوگا پس اگر اس کا وجود حد کو قبول کرلے تو زیارت کو بھی قبول کرلے گا۔ اگر وہ قابل زیارت ہوگا تو اس میں نقصان و کمی بھی ہو سکے گی۔ (جو زیارت و نقصان کے قابل ہو، وہ ممکن الوجود ہوگا) پس وہ ذات غیر محدود ہے، وہ نہ زیادت کو قبول کرتا ہے نہ اس کا تجزیہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی وہ وہم و خیال میں آ سکتا ہے۔[1]

[1] بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۱۵ حدیث ۱۔

دلیل فیض وہدایت

تمام انبیاءؑ نے توحید خدا کی دعوت دی

اشارہ:

خداوندقدوس وجود کامل ہے اور ایسا ہی وجود دوسروں کو فیض وکمال پہچانے والا منبع ہوتا ہے۔کیا یہ ممکن ہے کہ اس طرح کا منبع کمال دوسرے موجودات کو اس سے محروم رکھے اور کم سے کم انہیں اپنا تعارف اور پہچان بھی نہ کرائے۔جبکہ یہ معرفت ان کی ترقی وکمال کا سبب اور انہیں اس وجود کامل اور منبع فیض کی طرف لانے کا ذریعہ ہے۔

اس بیان سے واضح ہوا کہ اگر کئی ایک خدا ہوں تو ضروری ہوگا کہ ہر خدا کے رسول ہوں۔جو مخلوق کو اپنے اپنے خدا کی پہچان کرائیں اور فیض تکوینی وتشریعی ان سب تک پہنچے،لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ سب رُسول ایک ہی خدا کی طرف دعوت دیتے رہے،پس معلوم ہوا کہ معبود بس ایک ہی ہے(کسی دوسرے معبود کا کوئی وجود نہیں ہے)

اس کے ساتھ ہی ہم قرآن کریم کی طرف آتے اور درج ذیل آیات پر غور کرتے ہیں۔

(۱) وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ۝۲۵ [۲۱:۲۵] (انبیاء)

(۲) وَسۡـَٔـلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلۡنَا مِنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اٰلِهَةً يُّعۡبَدُوۡنَ۝۴۵ [۴۳:۴۵] (زخرف)

(۳) قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَرُوۡنِىۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَهُمۡ شِرۡكٌ فِى السَّمٰوٰتِ ؕ اِيۡتُوۡنِىۡ بِكِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ هٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَةٍ مِّنۡ عِلۡمٍ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۝۴ [۴۶:۴] (احقاف)

ترجمہ:

(۱) تم سے پہلے ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا،مگر یہ کہ ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔پس میری ہی عبادت کرو۔

(۲) تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے ہیں۔ان سے پوچھو کہ آیا ہم نے خدائے رحمان کے علاوہ ان کے لیے کچھ دوسرے معبود مقرر کیے تھے؟

(۳) ان سے کہو کہ تم خدا کے سوا جن معبودوں کو پکارتے ہو کیا تم سمجھتے ہو کہ انہوں نے زمین میں کوئی چیز خلق کی یا آسمانوں کی آفرینش میں ان کا کوئی حصہ ہے تو مجھے دکھاؤ، اس سے پہلے کی کسی آسمانی کتاب یا علمی آثار میں ایسی کوئی بات ہے تو وہ میرے سامنے لاؤ، اگر تم سچے ہو۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

خدائے واحد کی طرف کے پیغمبروں کی عمومی دعوت:

(۱) پہلی آیت میں انبیاء سابق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: تم سے پہلے ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا۔مگر یہ کہ ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو(واما ارسلنا من قبلك من رسولٍ الانوحی الیه انه لا اله الا انا افاعبدونِ)

ہاں تو تمام انبیاء سابق بھی توحید ہی کے مبلغ تھے انہوں نے انسانوں کو خدائے یکتا کی طرف دعوت دی جیسا کہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔یہ کیونکر ممکن ہے کہ شرک اپنی کوئی اصلیت رکھتا ہو اور پھر بھی سب انبیاء توحید کی طرف دعوت دیں۔

کیا کوئی اور خدا موجود تھا۔لیکن اس نے اپنی معرفت اور پہچان نہی کرائی اور اپنے فیض کو روکا یا اس کے مامور کیے ہوئے رسول نے اس کا پیغام پہچانے میں کوتاہی برتی؟ عقل سلیم ان میں سے کسی بات کو بھی قبول نہیں کرسکتی۔بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سورۂ انبیاء میں پہلے دلیل عقلی سے استدلال کیا گیا ہے۔(لو کان فیهما اٰلهةٌ الا الله.....) پھر دلیل نقلی پیش کی جو آیت زیر بحث میں مذکور ہے یعنی تمام پیغمبروں نے توحید کی طرف دعوت دی ہے اور یہ خود اس مسئلہ میں ایک اہم دلیل ہے [1]

(۲) دوسری آیت میں ہی بات ایک اور طرح سے کہی گئی ہے اور اس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہے (اگرچہ مقصود پورا گروہ انسانی ہے) چنانچہ فرمایا: تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے ہیں، ان سے پوچھو کہ آیا ہم نے خدائے رحمان کے علاوہ ان کے لیے کچھ دوسرے معبود مقرر کیے تھے؟ (واسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا واجعلنا من دون الرحمن اٰلهةً یعبدون)

نبی اکرمؐ کو کیونکر انبیاء سابق سے پوچھنے کا حکم دیا گیا، جب کہ وہ آپ کے عہد میں موجود نہ تھے، اس بارے میں مفسرین نے کئی

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۶ صفحہ ۴۳۲۰

احتمالات ذکر کیے ہیں۔

بعض کے خیال کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ ان انبیاء کی امتوں سے سوال کریں تا کہ یہ مدعا خبر متواتر کے ذریعے سے ثابت ہوجائے، کیونکہ وہ امت جو تین خداؤں کا دم بھرتی ہے وہ بھی خود کو توحید کا پرستار کہتی ہے اور وہ لوگ اس کو تثلیث سے توحید کی طرف رجوع سے تعبیر کرتے ہیں.....اصل میں اس آیت کا مفہوم سورہ یونس کی آیت ۹۴ کے مشابہ ہے کہ (فسئل الذین یقرئو ان الکتاب من قبلك) یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان انبیاء کی کتابوں کی طرف رجوع کریں جو اس وقت بھی ان کی امتوں کے پاس موجود ہیں اور کتابوں کے مطالعہ سے اس مسئلے کی حقیقت معلوم کرنا گویا ان انبیاء ہی سے پوچھنا ہے۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے پوچھنے سے مراد آپ کا ارواحِ انبیاء سے سوال کرنا ہے جو شب معراج اور اس کے علاوہ بھی ممکن ہے، کیونکہ روح پیغمبر اس قدر بزرگ و بلند ہے کہ اس کے لیے زمان و مکان کا فاصلہ اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتا، اور آپ کے لیے انبیاء سابق کی ارواح سے تمامی و ملاقات ناممکن نہیں ہے۔

مگر اس لحاظ سے کہ یہاں مقصد اصلی مشرکوں کے مقابل استدلال کرنا ہے۔ اس لیے پہلے اور دوسرے معنی مناسب رہیں گے، کیونکہ ارواح انبیاء کے ساتھ باطنی رابطہ اہل شرک کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ پھر یہ باطنی رابطہ محض ذاتِ پیغمبر کے لیے مفید ہے حالانکہ یہ واضح ہے کہ توحید پر آپ کا ایمان اس قدر بلند درجہ رکھتا ہے کہ کسی سے سوال کرنے اور پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

تیسرے احتمال کو اس آیت کی تفسیر باطنی قرار دیا جاسکتا ہے اور اس بارے میں متعدد روایات میں واضح اشارے ملتے ہیں[1]

بہرحال اصل مطلب یہ ہے کہ نبی کریمؐ کا توحید کی طرف دعوت دینا کوئی نیا اور عجیب عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی دعوت ہے جس پر تمام انبیاء کا اتفاق ہے جو عقیدہ توحید کی صداقت پر ایک روشن دلیل ہے۔ اس سلسلے میں یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ آیت زیر بحث میں خدا کے اسماء حسنیٰ میں سے ''رحمان'' کو اختیار کیا گیا ہے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہی خدائے واحد لائق عبادت ہے جو رحمت عام کا مالک ہے حتیٰ کہ کافر مشرک بھی اس سے محروم نہیں رہتے۔ یعنی تمام انسان سر سے پاؤں تک اس کے احسان و کرم کے بحر نا پیدا کنار میں ڈوبے ہوئے ہیں.....پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے ولی نعمت کو چھوڑ کر بتوں کا دامن جا پکڑے۔

کیا شرک کے حق میں کوئی دلیل ہے؟

(۳) تیسری اور آخری آیت میں دلیل عقلی کو دلیل نقلی کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: ان سے کہو کہ تم خدا کے سوا معبودوں کو پکارتے ہو کیا تم سمجھتے ہو کہ انہوں نے زمین میں کوئی چیز خلق کی یا آسمان کی آفرینش میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ تو مجھے دکھا (وقل اریتم ماتدعون من دون اللہ اروني ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرك في السمٰوٰت)۔

اگر وہ حقیقی معنی میں خدا ہوتے تو انہیں مبداء فیض و کرم ہونا چاہیے تھا کم سے کم انہوں نے زمین کے کسی حصے کو پیدا کیا ہوتا یا آسمانوں

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ صفحہ ۱۴۷۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۰۶۔۶۰۷۔

کی خلقت میں تھوڑی بہت شرکت کرتے (وہ تو کچھ کر ہی نہیں سکتے) کیا یہ ممکن ہے کہ خدا معبود فیض وکمال سے خالی ہو؟ ایک اور پہلو سے دیکھیں کہ وہ کونسا پیغمبر آیا، کہ جس نے لوگوں کو دوسرے خداؤں کی طرف دعوت دی ہو پہلی کتابوں میں سے کوئی کتاب لاؤ یا اپنے بڑوں کا کوئی ایسا علمی نوشتہ دکھاؤ کہ جس میں ان معبودوں کی بندگی کرنے کی کمزور دلیل موجود ہو اگر تم سچے ہو۔ (ایتونی بکتابٍ من قبل هذآ او اثارةٍ من علمٍ ان کنتم صٰدقین۔ اس تعبیر سے واضح ہے کہ توحید پر تمام انبیاء کا اجماع رہا ہے اور یہ خدا کی توحید واحدانیت پر ایک کھلی ہوئی دلیل ہے اس طرح ثابت ہوا کہ کتاب کائنات اور کتب انبیاء بھی توحید خداوندی پر مضبوط دلائل پیش کرتی ہیں پس توحید الٰہی ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کا انکار صرف کوئی بے عقل وخرد شخص ہی کرسکتا ہے۔

''اثارةٍ من علمٍ ''میں ''اثارةٍ'' کا مادہ ''اثر'' ہے مقاییس اللغۃ کے مطابق الفظ کے تین معنی ہیں یعنی مقدم رکھنا یاد کرنا اور کسی چیز کا باقی ماندہ نشان واثر۔

یہی معنی تفسیر فخر رازی میں ایک اور صورت میں آیا ہے۔ اثار کے تین معنی ہیں یعنی باقی ماندہ علامت اور روایت .....لیکن بہت سے مفسرین نے اس کا معنی ''بقیہ'' قرار دیا ہے۔ یعنی سابقہ علماء ودانشوروں کے علمی آثار، تاہم ان تینوں معنی کی بازگشت ایک مطلب کی طرف ہونا کچھ بعید نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب معانی ایک ہی بنیاد سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اور وہ ہے ''ایک ایسی چیز جو کسی دوسری چیز کے وجود پر دلالت کرے[1]

توضیحات

فیض وہدایت اسلامی روایات میں

برہان فیض وہدایت قران مجید کے علاوہ روایات میں بھی مذکور ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے اپنے ہر دو عظیم فرزندان حضرت حسن وحسین علیہما السلام کو وصیت کرتے وقت اس برہان کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

واعلم یابنی انه لوکان لربك شریك لاتتك رسوله ولرایت اثار ملکهٖ وسلطانه، ولعرفت افعالهٗ وصفاته ولکنهٗ الهٗ واحدٌ کما وصف نفسَهٗ۔

یعنی اے فرزند! آگاہ رہو کہ اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی رسول آتے، اس کی سلطنت وفرمانروائی کے آثار بھی دکھائی دیتے اور اس کے کچھ صفات وافعال بھی ظاہر ہوتے

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم جلد ا۔ مادۂ اثر۔

مگر یہ کہ وہ ایک اکیلا خدا ہے جیسا کہ اس نے خود بیان فرمایا ہے۔[1]

توضیح:

خدا حکیم ہے.....خداوند حکیم سے یقیناً فیض وہدایت کے آثار ظاہر ہوں گے، عالم تکوین اور عالم تشریع ہر دو میں یہ آثار ہویدا ہیں۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ کوئی دوسرا خدا بھی موجود ہو جبکہ ہم اس وسیع کائنات میں اس کی کسی صفت کا اظہار نہیں دیکھتے نہ ہمیں اس کے رُسولوں کا کوئی نشان دکھائی دیا۔ یہ صورت خدا کے حکم ہونے کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی کہ اس طرح انسان اس کی شناخت اور اس کی عظمت کے تصور سے محروم رہیں گے۔

علاوہ ازیں اگر خدا واقعی دو ہوتے تو سب انبیاء کا ایک ہی خدا کا تذکرہ کرنا کچھ مناسب نظر نہیں آتا، کیا یہ ممکن ہے کہ سبھی انبیاء ایک خدا کی طرف دعوت دے کر (نعوذ باللہ) غلط بیانی کرتے رہے اور وہ خدا جس نے انہیں بھیجا وہ ان کو حقیقت کے خلاف توحید کی دعوت دینے پر مامور کرتا رہا ہے۔ یہ بات خدا کے حکیم ہونے کے ساتھ سازگار نہیں لہٰذا خدا ایک ہی ہے کہ جس کی خبر تمام انبیاء نے دی ہے۔ البتہ خدا کی توحید کے اثبات کے لیے فقط یہی ایک دلیل نہیں، اس کے علاوہ اور بھی دلائل ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے، بہر حال اجماع انبیاء بھی وحدت خدا کی ایک مستقل دلیل ہے۔

(۵) برہان ترکب

فلاسفہ اور علماء علم کلام نے وحدتِ خدا کے اثبات میں ایک پانچویں دلیل بھی پیش کی ہے اس کے لیے ہمیں قرآن مجید کی صریح آیت نہیں مل سکی لہٰذا اسے توضیحات کے ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اگر خدا کا کوئی شریک ہو تو وجود میں وہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے، لیکن ان میں پائی جانے والی دوئی کا تقاضا ہے کہ ان میں باہم فرق اور افتراق بھی ہونا چاہیے تا کہ ایک دوسرے سے جدا جدا محسوب ہوں۔ گویا ان میں سے ہر ایک دو اجزاء سے مرکب ہوگا۔ ان میں ایک مابہ الاشتراک (مشترک پہلو) اور ایک مابہ الامتیاز (پہلوئے تفاوت) ہوگا۔ اس صورت میں کہنا پڑے گا۔ کہ ان دونوں میں سے ہر خدا اپنے اجزائے ترکیبی کا محتاج ہوگا۔ کیونکہ مرکب کا وجود اجزاء کے بغیر ممکن نہیں.....جو محتاج ہو وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتا اس لیے کہ واجب الوجود وہی ہوگا۔ جو بے نیاز ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح خدا کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح اس کے ایک سے زیادہ اجزاء بھی نہیں ہیں کیونکہ اگر اس کا کوئی شریک ہو تو پھر اس کے اجزاء بھی ہوں گے پس وہ (خدا) ہر لحاظ سے ایک بسیط وجود اور ہر پہلو سے لاشریک ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

توحیداور الدلہءنقلی:

اس سے پہلے اثبات توحید کے لیے جن پانچ دلیلوں کا ذکر ہوا وہ اس کی عقلی دلیلیں تھیں اس ضمن میں نقلی دلیلیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔اثبات وجودِ خدا اقرار نبوت پیغمبر اسلام اوران کے صدق دعوت کا لازمہ ہے کہ اس آسمانی کتاب (قران کریم) میں جو کچھ بیان ہوا۔وہ ناقابل انکار ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پیغمبر صادق وامین ہے،اس کو بھیجنے والا خدا صادق القول ہے۔پس یقین کامل ہوگیا کہ اس کتاب میں کوئی بھی بات خلاف واقع نہیں ہے۔

بنابریں اثبات توحید میں آیات قرآن سے تائید حاصل کی جاسکتی ہے۔قرآن تو اثبات توحید سے متعلق،آیات سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس میں کسی موضوع کا اس قدر تکرار نہیں جتنا توحید کے بارے میں ہوا ہے اور خدا کی کسی صفت پر اتنی تاکید نہیں جتنی توحید پر ہوئی ہے۔

بحارالانوار میں علامہ مجلسی رحمہ اللہ اس استدلال کے ضمن میں فرماتے ہیں: کتاب وسنت میں اثبات توحید کی نقلی دلیلیں بہت زیادہ ہیں اور باب توحید میں سب سے عمدہ اور مفید دلیل نقلی ہی ہے۔

وھذہ ھی المعتمد علیھا عندی۔[1]

لیکن یہ چیز کچھ کہے بغیر ہی ظاہر ہے کہ دلیل نقلی سابقہ عقلی استدلالات سے کوئی تناقض نہیں رکھتی کیونکہ دلیل عقلی کی بنیادیں خود کتاب وسنت میں موجود ہیں۔پس اثبات توحید میں پیش کیے جانے والے دلائل عقلی ونقلی کا منبع ومصدر ایک ہی ہے اور وہ کتاب وسنت ہے۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۲۳۴۔

شِرک کے اہم سرچشمے شرک کا پہلا سرچشمہ اوہام کی پیروی

اشارہ:

اس کے باوجود کہ فطرت انسانی توحید سے ہم آہنگ ہے جیسا کہ ہم نے بحث توحید کے آغاز میں کہا ہے۔ نیز عقلی ونقلی دلائل بھی اس فطرت کی تائید کرتے ہیں۔ انسان کیوں شرک کی خاردار وادیوں میں جا پھنستا ہے؟ انسان کے قلب ونظر جو فطرت خداشناسی پر خلق کیے گئے ہیں کیوں ان میں شرک آن گھستا ہے.....اب سوال یہ ہے کہ شرک کہاں سے اور کدھر سے آتا ہے؟

مختلف انبیاءؑ اور متعدد اقوام کی تاریخ کے مطالعہ سے طولِ زمانہ میں بت پرستوں کے دعوے سامنے آتے ہیں تو شرک پر سے پردہ اُٹھنے لگتا ہے۔ اور شرک کے اصل سرچشمے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ شِرک کے سرچشمہ کی شناخت اس بہت بڑی آفت کا مقابلہ کرنے میں موثر ہوگی کیونکہ مرض کی پہچان کے بعد ہی اس کے علاج کا طریقہ واضح ہوتا ہے۔ اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے اور درج ذیل آیات پر نظر ڈالتے ہیں:.....

(۱) وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ [۲۳:۱۱۷] (مومنون)

(۲) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾ [۱۲:۴۰] (یوسف)

(۳) وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾ [۲۲:۷۱] (حج)

(۴) اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ [۱۰:۶۶] (یونس)

(۵) وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۝۳۶ [۱۰:۳۶] (یونس)

(۶) اِنْ هِىَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى۝۲۳ [۵۳:۲۳] (نجم)

(۷) اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِىَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِىْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝۲۴ [۲۱:۲۴] [1] (انبیاء)

ترجمہ:

(۱) جو شخص خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے کہ جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے وہ کافروں کو کبھی کامیابی نہیں دیتا۔

(۲) یہ معبود کہ خدا کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو، ان کی حیثیت اسماء (بلا مسمیٰ) کے علاوہ کچھ بھی نہیں، تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے ان کو خدا قرار دے رکھا ہے۔ خدا نے ان کے لیے کوئی دلیل نازل نہیں کی، حکم کرنے کا حق تو صرف خدا ہی کو ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ کسی اور کی عبادت نہ کرو مگر اس کی یہی ہے آئین ثابت وقائم لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۳) یہ (مشرک) لوگ خدا کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور نہ یہ خود اس بارے میں کوئی علم رکھتے ہیں، ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

(۴) آگاہ رہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا ہے، جو لوگ غیر خدا کو اس کا شریک بنا کر اسے پکارتے ہیں وہ ان شرکاء کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ اپنے وہم وگمان کی پیروی

---

[1] علاوہ ازیں بہت سی آیات ہیں جن کا مضمون ان آیتوں سے ملتا جلتا ہے۔

کررہے ہیں۔اوروہ بس جھوٹ ہی بولتے ہیں۔

(۵) ان میں سے اکثر بے بنیادظن وگمان کے سوا کسی کی پیروی نہیں کرتے حالانکہ ظن انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا (حق کی جگہ نہیں لے سکتا) بے شک خدااس سے آگاہ ہے جو کچھ وہ کررہے ہیں۔

(۶) یہ بُت تو فقط نام ہی ہیں۔جوتم نے اورتمہارے بڑوں نے ان کے لیے قرار دے رکھے ہیں۔(جن کی کوئی اصلیت نہیں) خدانے ان کے متعلق کوئی دلیل وحجت نازل نہیں فرمائی، یہ بت پرست فقط بے بنیادگمانوں اورنفسانی خواہشوں کی پیروی کررہے ہیں، حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے لیے ہدایت آچکی ہے۔

(۷) کیا اُنہوں نے خدا کو چھوڑ کر کچھ اور معبود بنالیے ہیں، کہو کہ اس کے لیے اپنی دلیل لاؤ یہ میری اوران انبیاء کی دعوت ہے جو مُجھ سے پہلے ہوگزرے لیکن ان میں سے اکثر لوگ حق کو نہیں جانتے پس وہ اس سے منہ موڑتے ہیں۔

مفردات کی تشریح:

''ظن''المفردات میں راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ''ظن'' وہ کیفیت ہے، جو کسی چیز کے ملاحظہ سے پیدا ہوتی ہے۔اگر یہ قوی ہو جائے تو علم ہے اور ضعیف ہو تو محض خیال ہی ہے۔لسان العرب میں ابن منظور کہتا ہے کہ''ظن'' شک اور یقین ہر دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایسا یقین نہیں جو روایت (دیکھنے) سے حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ یقین تدبر وتفکر سے ہوا کرتا ہے علم تو بس اسی یقین کو کہا جاتا ہے جو مشاہدے سے حاصل ہو۔نہایہ ابن اثیر میں ہے کہ''ظن'' کبھی علم کبھی شک اور کبھی تہمت کے معنی میں ہوتا ہے۔لیکن آیات زیر بحث میں یہ لفظ بے بنیاد خیالات کے مفہوم میں آیا ہے (اس کے قرائن خود انہیں آیات میں موجود ہیں جن کا تذکرہ آگے چل کر ہوگا)

''خرص'' بروزن''غرس'' ہے اور صحاح اللغۃ کے مطابق یہ درخت خرما سے حاصل ہونے والے خرما کی مقدار کا اندازہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، المفردات میں راغب اصفہانی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، پھر اس کا اطلاق ہر قسم کے تخمینہ واندازہ پر ہونے لگا، چونکہ اندازہ اور تخمینہ ہمیشہ درست نہیں ہوتا، اس لیے یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور اصولی طور پر ہر بے بنیاد گمان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

لفظ''خرص'' کے مشتقات کے کچھ اور معانی بھی بتائے گئے ہیں جیسے''نیزہ''''حلقہ''''حوض'' (وہ حوض جو نہر کے کنارے پر ہو کہ

اس میں نہر کا پانی آئے اور پھر لوٹ جائے) لیکن بعید نہیں کہ ان سب معافی کی بازگشت بے اساس و بے بنیاد ظن کی طرف ہو یعنی ایسا گمان جس میں تزلزل اور تذبذب ہو، مذکورہ بالا نیز ہ حلقہ اور خاص حوض بھی یہی معنی رکھتے ہیں [1]

''برہان'' محکم اور قاطع دلیل کو ''برہان'' کہتے ہیں، یہ لفظ ہر طرح کی دلیل اور وضاحت کے لیے بھی بولا جاتا ہے، المفردات میں راغب اصفہانی لکھتا ہے..... برہان'' یعنی دلیل محکم، بعض ماہرین کا خیال ہے کہ لفظ ''برہان'' مادۂ ''برہ'' (بہ معنی سفید ہونا) سے لیا گیا ہے پھر اس کا اطلاق ہر ایسے کلام واضح پر ہوا۔ جس میں کسی قسم کی کمزوری وسُبکی نہ پائی جائے [2]

اسی طرح ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ الصدقۃُ برھانٌ یعنی صدقہ ایک محکم دلیل ہے، شاید اس لیے کہا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ..... اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا صحت ایمان ویقین کی ایک مضبوط اور محکم دلیل ہے کیونکہ جب تک کسی انسان کو ایک عقیدے پر گہرا ایمان وایقان نہ ہو وہ اس کی خاطر اپنا مال خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

''سلطان''..... مقابیس اللغۃ میں کہا گیا ہے کہ اس لفظ کے معنی ایسی قدرت وقوت ہے جس میں تفوق وبرتری پائی جاتی ہو چونکہ قوی استدلال ایک شخص کی اپنے مدمقابل پر قاہریت اور غلبے کا سبب ہوتا ہے اس لیے لفظ ''سلطان'' مضبوط ومحکم دلیل پر بھی بولا جاتا ہے۔

''سلیط''..... یہ لفظ کبھی ''فصیح'' کے معنی میں ہوتا ہے کبھی اس انسان کو ''سلیط'' کہا جاتا ہے جو سروصدا میں کامل ہو۔ نیز اسے ''بدزبان'' شخص کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسی عورتوں جو کو تسلیط'' کہتے ہیں، جو بدزبان ہوں..... یہ سب الفاظ مادہ ''سلطہ'' سے لیے گئے ہیں۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

وادی اوہام میں جا پڑنا:

(۱) یہاں زیرِ بحث پہلی آیات میں مشرکین کے خودساختہ معبودوں، دیوتاؤں اور اتاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ ان بناوٹی خداؤں کے لیے ان لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہیں بس یہ سب ان کے توہمات اور خام خیالیاں ہیں۔ ارشاد ہوا: جو شخص خدا کے سوا کسی معبود کو پکارے کہ جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے وہ کافروں کو کبھی کامیابی نہیں دیتا۔ (ومن یدعُ مع اللہ الٰھاً اٰخرَ لا برھان لہ بہٖ فانما حسابہُ عند ربہٖ انہ لایفلح الکافرونَ)

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، مادۂ خرص۔

[2] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔ اس مادہ سے فعل ''برھن۔ یبرھن، یا وصف ''مبرھنٌ'' آتا ہے، ایسا اشتقاق انتزاعی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ''سلطان'' جو مادہ ''سلطان'' جو مادہ سلط'' سے ہے۔ سلطن یسلطِنُ کی صورت میں بھی آتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس مقام پر مشرکوں کو ملنے والی سزا کا ذکر نہیں ہوا اور صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ یہ بہت بڑی تہدید اور دھمکی ہے۔ کیونکہ ایک عظیم وقاہر ذات ان سے حساب لینے والی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا انجام بہت ہی بُرا ہوگا۔

اس آیت میں مذکورہ جملہ لا برهان له به واضح کر رہا ہے کہ شرک کی اصلاً کوئی دلیل عقلی ونقلی ہے ہی نہیں یہ نہ فطرت کے مطابق ہے نہ عقل ومنطق سے سازگار ہے بلکہ اس پر جس قدر غور کیا جائے اس کا بطلان اور واضح ہوتا جائے گا۔

''لا یفلح الکافرون'' کی تعبیر اپنی جگہ پر بڑی وسعت رکھتی ہے، یعنی کافر لوگ دنیا وآخرت میں کسی بھی طرح کی فلاح وکامیابی حاصل نہیں کر پائیں گے، جیسا کہ بے ایمان اشخاص کے بارے میں روزمرہ کا مشاہدہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے۔

نامہائے بے اصل:

(۲) دوسری آیت میں یہی مفہوم ایک نئے پیرایہ میں ذکر ہو رہا ہے۔ جہاں حضرت یوسفؑ اپنے قیدی ساتھیوں سے کہہ رہے ہیں: یہ معبود کہ خدا کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو ان کی حیثیت اسماء (بلا مسمی) کے علاوہ کچھ بھی نہیں تم نے اور تمہارے بزرگوں نے ان کو خدا قرار دے رکھا ہے (ما تعبدون من دونه الا اسمآءً سمیتموها انتم واٰباؤکم) اس کی دلیل یہ ہے کہ خدا نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی (ما انزل الله بها من سلطانٍ)

اگر ان خداؤں کی کوئی حقیقت ہوتی تو ان کے لیے کسی دلیل کا ہونا ضروری ہے یہ امر محال ہے کہ کسی کے خدا کا شریک ہونے جیسی اہم بات بے سند وثبوت ہو، پس اس کے لیے کسی دلیل کا موجود نہ ہونا، خود اس کے شریک کے نہ ہونے کی دلیل ہے اس آیت کے اگلے جملے میں نتیجہ گفتگو کے طور پر کہا گیا ہے حکم کرنے کا حق تو صرف خدا ہی کو ہے۔ (ان الحکم الا للہ) اس نے حکم فرمایا ہے کہ کسی کی عبادت نہ کرو مگر اس کی (امر الا تعبدو الا ایاہ) یہی ہے آئین ثابت وقائم۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے (ذلك الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

دراصل اس آیت کا ہر جملہ نفی شرک پر ایک واضح دلیل ہے..... ایک طرف کہتا ہے: خدا نے تمہارے خداؤں کے وجود رکھنے اور موجود ہونے کی دلیل نازل نہیں فرمائی۔

دوسری طرف یہ نکتہ بیان کرتا ہے: اس کائنات کی تدبیر اور اس پر حاکمیت کا حق تو صرف خدائے واحد کے ہاتھ میں ہے۔ جیسا کہ اس دنیا میں ایک نظام اور ایک تدبیر کے علامات بہت سی مناسبتوں کی صورت میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ خدا نے تو خدائے واحد ویگانہ کی عبادت اور پرستش کا حکم دیا ہے کیا ایسا ممکن ہے کہ خدائے حکیم اپنے بندوں کو ایک غلط اور نادرست حکم دے رہا ہو؟

اس آیت کے آخر میں قول فیصل کے طور پر شرک کو جہالت اور نادانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا..... لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے اور حق اور حقیقت کو نہیں جانتے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ بت پرستوں کا اعتقاد یہ تھا کہ خدائے قدوس نورِ اعظم ہے اور فرشتے اس نور کے تحت چھوٹے چھوٹے انوار ہیں۔ وہ ان انوار میں سے ہر نور کے مظہر اور نشانی کے طور پر ایک ایک بت بناتے اور اس کا کوئی سا نام رکھ لیتے پھر اس کو اپنا معبود قرار دیتے ،اور اس کی پوجا پاٹ کیا کرتے ،اس سے ظاہر ہے کہ وہ بت اور ان کے نام محض فرضی تھے اور وہ کوئی حقیقت و واقعیت نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا وہ اسماء بلا مسمیٰ کے سوا کچھ نہ تھے [1]

اگر ہم مفسرین کے اس بیان سے صرف نظر کرتے ہوئے ان بتوں کو مظہر و نشانی کی بجائے خدا و معبود بھی کہہ لیں تو بھی یہ اسم بے مسمیٰ ہی ہوں گے، کیونکہ پتھر اور لکڑی کے ان بے جان بتوں میں الٰہ اور معبود ہونے کی کوئی علامت موجود نہیں ہے۔

(۳) تیسری آیت کا مضمون بھی دوسری آیت سے مطابقت رکھتا ہے اس میں بت پرستوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے: یہ مشرک لوگ خدا کے ماسوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی (ویعبدون من دون الله مالم ینزل به سلطناً)

یہ اصل میں دلیل نقلی نہ ہونے کا ذکر ہے جیسا کہ اس کے بعد کہا گیا: اور نہ یہ خود اس (بت پرستی کے بارے میں علم رکھتے ہیں (ومالیس لهم به علمٌ) پھر آیت کے آخر میں کہا: ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ وما للظالمین من نصیر) یعنی عذاب الٰہی کے ہنگام ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا نہ ہدایت و رہنمائی میں کوئی ناصر و یاور اور نہ انہیں کوئی عقلی دلیل میسر آئے گی ممکن ہے آیت کے مفہوم میں یہ تینوں تفسیریں جمع ہو جائیں۔

اندازہ و تخمینہ پر بھروسہ

(۴) چوتھی آیت کے آغاز میں آسمانوں اور زمین کے خدا کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: آگاہ رہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا ہے۔ (الا ان الله من فی السمٰوٰت ومن فی الارض) ممکن ہے یہ تعبیر شرکوں کے اعتقاد کی طرف اشارہ کرتی ہو، کیونکہ وہ معترف تھے کہ آسمانوں اور زمین کا مالک خدا ہی ہے اور اس کے باوجود بتوں کی پرستش بھی کرتے تھے، نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عالم ہستی کے واحد نظام کی طرف اشارہ ہو جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں ایک مدبر حکمرانی کر رہا ہے..... پھر فرمایا: جو لوگ غیر خدا کو اس کا شریک بنا کر اسے پکارتے ہیں وہ (ان شرکاء کی) پیروی نہیں کرتے (وما یتبع الذین یدعون من دون الله شرکاءِ) بلکہ وہ اپنے وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں (وہ اندازے لگا لگا کر باتیں بناتے ہیں) وہ بس جھوٹ ہی بولتے ہیں (

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۸ صفحہ ۱۴۱

ان یتبعون الا الظن وان هم الا یخرصون)[1]۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ''یخرصون'' کا مادہ ''خرص ہے جس کا معنی اندازہ وتخمینہ ہے اور سے جھوٹ کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔آیت زیر بحث میں اس کے ہر دو معنی لیے جاسکتے ہیں۔

(۵) یہی مفہوم پانچویں آیت میں بھی کچھ فرق کے ساتھ موجود ہے۔بت پرستوں کی روگردانیوں کے تذکرے کے بعد فرماتا ہے ان میں سے اکثر بے بنیاد ظن وگمان ہے سوا کسی کی پیروی نہیں کرتے۔حالانکہ ظن انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا (حق کی جگہ نہیں لے سکتا).....وما یتبع اکثرهم الاظناً ان الظن لا یغنی من الحق شئیاً) پھر ان خام خیالیوں کے پیچھے چلنے والوں کو دھمکی دی گئی ہے فرمایا: بے شک خدا اس سے آگاہ ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں (ان الله علیم بما یفعلون) ہاں تو ظن وتخمین اور تخیلات وتوہمات سبھی اندھیرے میں تیر چلانے کی مانند ہیں جو انسان کو اصل ہدف ومقصد تک نہیں پہنچاتے۔اگر کبھی یہ درست بھی نکلیں تو پھر بھی ان سے مقصد ومنزل کی پہچان نہیں ہوگی۔اور یہ فقط ایک اتفاقیہ امر ہی شمار ہوگا۔

''ظن'' لغت کے اعتبار سے ظن ہر قسم کے گمان، خیال اور وہم کو شامل ہے کبھی یقین پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔لیکن آیت مورد بحث میں پہلے معنی ہی مراد ہیں۔یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت میں وہم وگمان کی پیروی کو اکثریت سے منسوب کیا ہے اور سب کو اس میں شامل نہیں کیا گیا.....اس بات کی طرف بہت سے مفسرین نے ضروری توجہ دی ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہاں اکثر سے وہ سبھی مراد لیے گئے ہیں لیکن اس تعبیر کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔بہتر ہے کہ اس مقام پر اکثر سے اکثر ہی کو مراد لیا جائے کیونکہ اکثریت ہمیشہ بے خبر اور نادان ہوتی ہے چنانچہ اکثر لوگ تصورات وخیالات سے متاثر ہوتے اور شرک میں مبتلا ہوجاتے ہیں، ان کے مقابل ایک گمراہ اقلیت ہوتی ہے اور یہ گنے چُنے افراد رہبروں اور رہنماؤں کی حیثیت سے ان بے چاروں کو خطا وغلطی کی طرف دھکیلتے ہیں[2]

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ''اکثر'' سے مراد وہ جمعیت ہے جو ساری زندگی وہم وگمان ہی میں پڑے رہتے ہیں اور شرک بھی ان توہمات

---

[1] اس تفسیر کے مطابق ''ومایتبع'' میں ''ما'' نافیہ ہے اور ''یتبع'' کا فاعل ''الذین'' ہوگا جس کا مفعول، ''شرکاء'' ہے یعنی مشرک درحقیقت ان کی پیروی نہیں کرتے جن کو وہ خدا کے شریک ٹھہراتے ہیں (کیونکہ خدا کا شریک تو کوئی ہے ہی نہیں۔یہ فقط ان لوگوں کے وہم وخیال کی گڑھت ہے) لیکن بعض مفسرین کے بقول یہاں ''ما'' استفہامیہ ہے اب اس جملے کے معنی یہ ہوں گے مشرکین کس چیز کو خدا کا شریک قرار دیتے اور کس کی پیروی کرتے ہیں، کیا یہ وہم گمان کے سوا بھی کچھ ہے؟ البتہ ان دونوں تفسیروں کا نتیجہ قریباً ایک ہی ہے.....تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر کشاف اور تفسیر روح المعانی میں زیر بحث آیت کی طرف رجوع کریں۔بعض نے ''ما'' کو موصولہ کیا ہے لیکن یہ خیال بعید نظر آتا ہے۔

[2] تفسیر روح البیان جلد ۴ صفحہ ۵۴۔تفسیر روح المعانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۳ میں بھی قریباً یہی معنی لیا گیا ہے۔

میں سے ایک توہم ہے، یہ لوگ ہمیشہ بے بنیاد خیالات اور اوہام کی تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں[1]

(۶) چھٹی آیت کا مضمون دوسری آیت کے مشابہ ہے جیسا کہ فرمان ہوا: یہ بت تو فقط نام ہی ہیں جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے ان کے لیے قرار دے رکھے ہیں۔ خدا نے ان کے متعلق کوئی دلیل و حجت نازل نہیں فرمائی (ان ھی الا اسماءٌ سمیتموھا انتم واٰبآئُو کم مآ انزل اللہ بھا من سلطٰنٍ)

آیت کا یہ جملہ ان مشرکوں میں پائی جانے والی اندھی تقلید کی واضح طور پر نشاندہی کر رہا ہے۔ کہ وہ لوگ آنکھ کان بند کیے نادانیوں میں پڑے ہیں۔ پھر فرمایا: یہ بت پرست فقط بے بنیاد گمانوں اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ (ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس)[2]

اس جملے میں ایک نیا نکتہ وہم وگمان پر ہونفس کا عطف ہے اور یہ بڑی پر معنی تعبیر ہے اس میں یہ اشارہ ہوا ہے کہ ان کے اوہام وتصورات کا سرچشمہ ان کی خواہش نفس ہے جو باطل کو ان کے سامنے حق کے طور پر پیش کرتی ہے، حقیقت میں وہ اپنی خواہش نفس کے بت کی پرستش کرتے ہیں اور یہ پتھر اور لکڑی کے بت اسی کے زیر اثر بنائے گئے ہیں۔

گویا ان مشرکوں کی گمراہی وانحراف اور بت پرستی کے دو سبب میں اوّل عقلی واعتقادی لحاظ سے یقین سے کام نہ لینا اور خیالی باتوں پر بھروسہ رکھنا، دوم میلان ورجحان کے لحاظ فطرت توحیدی سے صرف نظر کرنا اور ہواءِ نفس کی پیروی کرنا۔

یہ چیز بھی خاص توجہ چاہتی ہے کہ "یتبعون" اور "تھوی" ہر دو فعل مضارع میں، اس لحاظ سے معنی یہ ہوں گے کہ وہ (مشرک) ہواءِ نفس اور ذاتی خواہشوں کی پیروی کرنے میں روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں اور ان کا وہم وگمان انہیں نئی سے نئی صورت میں یہ افعال جاری رکھنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آیت کے آغاز میں روئے سخن مشرکوں کی طرف تھا۔ لیکن آخر آیت میں انہیں ضمیر غائب سے یاد کیا گیا ہے (اس کو اصطلاح میں حاضر سے غائب کی طرف التفات کا نام دیا جاتا ہے) اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ وہ لوگ اتنے پست اور بے وقعت ہیں کہ مخاطب کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہیں۔

(۷) زیر بحث ساتویں اور آخری آیت میں یہی حقیقت ایک اور انداز میں بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوا کیا انہوں نے خدا کو چھوڑ کر کچھ اور معبود بنا لیے ہیں؟ (ام اتخذوا من دونہ الھۃ) ان سے کہو کہ اس کے لیے اپنی دلیل لاؤ (قل ھاتو برھانکم) یعنی جو کچھ تم کر رہے ہو، جب تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں تو یہ فعل سراسر باطل اور غلط ہے۔

پھر ان کے عقیدے کا بطلان کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ میری اور ان انبیاء کی دعوت ہے، جو مجھ سے پہلے ہو گزرے (ھذا ذکر من

---

[1] تفسیر رُوح المعانی میں بھی یہی احتمال دیا گیا ہے۔

[2] ممکن ہے جملہ "ماتھوی الانفس، میں "ما" موصولہ ہو یا مصدرہ۔ پہلی صورت میں ان کی یہ پیروی ہواءِ نفس کے تحت ہے، دوسری صورت میں خود یہ پیروی ہی ہوا نفس ہے..... یہ دونوں معانی قریب قریب ایک کی بنیاد رکھتے ہیں۔

معی وذکر من قبلی)اس کا مطلب یہ ہے کہ میری اور مجھ سے پہلے کے انبیاء کی کتابیں تمہارے سامنے ہیں۔انہیں دیکھو اور پڑھو کیا ان میں شرک کی تائید میں کوئی ایک لفظ نظر آتا ہے؟ ہاں ان آسمانی کتابوں میں تو خالصِ توحید اور خدا کی یکتائی کی دعوت وتعلیم ہے۔[1]

آسمانی کتابوں کو ذکر کے نام سے موسوم کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ سبھی کتابیں انسانوں کو نصیحت کرنے اور ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے نازل کی گئی ہیں۔بعض مفسرین نے ذکر کے اور معنی بھی بیان کیے ہیں لیکن وہ مناسب حال نہیں ہیں۔

آیت کے آخر میں اسی مطلب کی مزید تاکید کے لیے فرمایا: لیکن ان میں سے اکثر لوگ حق کو نہیں جانتے پس وہ اس سے منہ موڑتے ہیں (بل اکثرھم لایعلمون الحق فھم معرضون)۔اگرچہ ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ حق سے آگاہی رکھتا ہے لیکن وہ اپنے ناجائز فوائد ومنافع کو بحال رکھنے کی خاطر اظہار حق سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا سات آیات سے مجموعی طور پر نتیجہ بخوبی نکالا جاسکتا ہے کہ شرک یعنی دو یا اس سے زیادہ خداؤں کی پرستش کے لیے کوئی عقلی ونقلی دلیل موجود نہیں ہے۔محال ہے کہ ایک اتنے اہم موضوع کے لیے کوئی دلیل نہ ہو۔پس دلیل نہ ہونا شرک کے بطلان پر ایک ناقابلِ تردید دلیل ہے۔

---

[1] اس آیت میں دلیل نقلی سے استدلال کیا ہے۔جب کہ اس سے پہلے ذکر شدہ دو آیتوں میں دلیلِ عقلی اور برہان تمانع سے تائید حاصل کی گئی ہے۔

شرک کا دوسرا سرچشمہ، حسی میلان ورغبت

اشارہ:

جب انسان اس دنیا جہان میں آنکھ کھولتا ہے تو وہ اپنے حواس خمسہ یعنی دیکھنے، سننے، چکھنے، ٹٹولنے اور سونگھنے کے ذریعے اپنے گردوپیش کی اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے اور انہیں کو اپنے علم وخبر کی اساس قرار دیتا ہے۔ پھر جوں جوں اس کے علم ودانش میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ تدریجا مسائل عقلی وفکری سے واقف ہوتا ہے۔

لیکن کچھ لوگ اپنی علمی پسماندگی کے باعث محسوسات ہی پر رُک جاتے ہیں۔ اس کے بعد نہ انہیں کسی چیز کا علم ہوتا ہے اور نہ وہ اس پر ایمان لا سکتے ہیں۔ اس بناء پر وہ چاہتے ہیں کہ خدا کا وجود حسی ہو کہ وہ اسے دیکھیں اور اپنے ہاتھوں سے مس کریں۔

طول تاریخ میں خدایان محسوس اور بت پرستی کا سب سے اہم سرچشمہ یہ حسی میلان ورغبت ہی رہا ہے، اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن عظیم کی طرف متوجہ ہوتے اور درج ذیل آیات پر غور کرتے ہیں۔

(۱) وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ [۲۵:۲۱] (فرقان)

(۲) يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ [۴:۱۵۳] (نساء)

(۳) وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ [۲۸:۳۸] (قصص)

(۴) وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ [۱۷:۹۰] اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ [۱۷:۹۱] اَوْ

تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾

(اسراء)

(۵) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ [۲:۲۱۰] (بقرة)

ترجمہ:

(۱) جولوگ ہمارے حضور پیش ہونے کی فکرنہیں رکھتے (روز قیامت کے منکر ہیں) وہ کہتے ہیں کیونکہ فرشتے ہم پر نازل ہوتے ہیں یا ہم اپنے پروردگار کو ان آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے؟ انہوں نے اپنے بارے میں بڑا گھمنڈ کیا اور طغیان وسرکشی میں حد سے گزر گئے۔

(۲) اہل کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ آسمان سے ایک کتاب ان پر یکبارگی نازل کردو (یہ تو صرف ایک بہانہ ہے) کیونکہ حضرت موسیٰ سے انہوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا، کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا کی دید کراؤ، اس ظلم اور غلط روش کے سبب آسمانی بجلی نے اُنہیں آلیا۔ پھر باوجود کہ ان کے لیے روشن دلائل آچکے تھے، انہوں نے گوسالۂ سامری کو اپنا معبود بنایا، لیکن ہم نے ان کو معاف کردیا اور موسیٰ کو واضح برتری عطا فرمائی۔

(۳) فرعون نے کہا اے زعماء دربار! میں اپنے سوا تمہارے لیے کسی اور خدا کو نہیں جانتا (لیکن تحقیق مزید کی خاطر) اے ہامان میرے لیے زمین پر آگ جلاؤ (اینٹیں پکاؤ) پھر میرے لیے ایک بڑا بُرج بنادو تا کہ میں موسیٰؑ کے خدا کا پتہ چلاؤں۔ اگرچہ مجھے گمان ہے کہ موسیٰ جھوٹے ہیں۔

(۴) انہوں نے کہا کہ ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک تو ہمارے لیے (بنجر) زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کردے یا ہم پر آسمان سے سنگریزے گرادے، جیسا کہ تیرا خیال ہے یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ۔

(۵) بہت سے واضح دلائل کے باوجود) کیا وہ مشرک انتظار کررہے ہیں کہ خدا اور فرشتے بادلوں

کے سائے میں ان کے پاس آئیں گے (اور کوئی نئی دلیل دیں گے) جبکہ معاملہ انجام پاچکا اور تمام امور کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

ہم خدا کو کیوں نہیں دیکھ سکتے:

(۱) پہلی آیت میں کافر ومشرک لوگوں کا قول نقل کیا گیا ہے۔ وہ لوگ یہ خیال کرتے تھے خدا جسم رکھتا ہے اور وہ قابل مشاہدہ ورویت ہے..... ارشاد ہوا: جولوگ ہمارے حضور پیش ہونے کی فکر نہیں رکھتے۔ وہ کہتے ہیں کیوں فرشتے ہمارے پاس نہیں آتے (تاکہ ہم پیغام حق کو خود سنیں اور وہ پیغمبر کے گواہ ہوں) یا ہم اپنے پروردگار کو ان آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے (وقال الذین لا یرجون لقآء نالولا اُنزل علینا الملیکة اونریٰ ربنا)۔

ان لوگوں نے پہلے تو فرشہ وحی کے مشاہدے کا تقاضا کیا پھر اس سے بھی آگے نکلے اور خدا کو دیکھنے کا اظہار کرنے لگے، گویا غیر محسوس اور غیر مجسم خدا ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا معلوم ہوتا ہے کہ بائیں شرک وبت پرستی کے پیشواؤں کی طرف سے ہوتی تھیں جو حقیقت امر کو تو جانتے تھے لیکن عوام الناس کو غافل رکھنے کے لیے سب چیزوں کو حس ومشاہدے کی چاردیواری میں بند کردیتے تھے۔ وہ اس طرح کی باتیں پیغمبر اکرمؐ کے سامنے کیا کرتے تاکہ اپنے گمان کے مطابق انہیں شکست دیں لہٰذا قرآن نے انہیں ان الفاظ میں یاد کیا کہ وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہیں کسی باز پرس کا احساس ہی نہیں ہے اس لیے آیت کے آخر میں ارشاد ہوا: انہوں نے اپنے بارے میں بڑا گھمنڈ کیا اور طغیان وسرکشی میں حد سے گزر گئے۔ (لقد استکبروا فی انفسھم وعتو عتواً کبیراً)

مفسرین نے آیت زیر بحث کے بعد اس سلسلے کی آیتوں میں آیت ۲۷ کے نشان نزول میں کہا ہے کہ یہ مشرک سرداران قریش کے بارے میں نازل ہوئی۔

بہرحال آیت زیرِ بحث کے ذیل میں یہ بات واضح ہورہی ہے کہ ان لوگوں کے اس بہت بڑے مطالبے کا سبب ایک تو ان کا تکبر وغرور تھا۔ دوسرے ان کا طغیان وسرکشی کہ جس میں عناد وعداوت بھی شامل ہے اسی لیے انہوں نے فرمانِ حق سے روگرانی کی تھی یہ صرف مشرکین عرب ہی کا معاملہ نہیں، بلکہ آج بھی مغرور وسرکش ماہرین علوم عصریہ تصوّر رکھتے ہیں۔ کہ ہر چیز کو تجربی لحاظ سے دیکھا جائے۔ یعنی حسی تجربے کے بغیر کوئی چیز قابل تسلیم نہیں ہے، چنانچہ وہ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ جب تک خدا کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ ہم اس کا یقین واعتقاد نہیں کریں گے۔ اس لحاظ سے قدیم وجدید مشرکین کے یہ دونوں گروہ تکبر وغرور میں اندھے ہوکر حس ومادہ کی چاردیواری میں بند ہوکر رہ گئے ہیں حالانکہ حس ووجود اور مادہ ومادیات کے علاوہ کئی عوالم وجود رکھتے ہیں جو صرف دل کی آنکھوں سے ہیں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اور خدا بھی حواس کی بجائے دل ہی میں آنے والی ذات ہے۔

یہی سوال حضرت موسیٰ سے کیا گیا:

(۲) دوسری آیت میں یہود کے حیلے بہانوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اہل کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ آسمان سے ایک کتاب ان پر ایک بارگی نازل کردو۔(یسئلك اهل الكتاب ان تنزل عليهم كتاباً من السمآءِ)اس جملے کی تفسیر میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہاں ان لوگوں کی طرف سے طلب کی گئی کتاب سے مراد اوراق کی صورت میں تحریر ہے جس کو وہ آنکھوں سے دیکھیں اور ہاتھوں سے مس کریں[۱]

بجلی نے انہیں آلیا(فاخذتهم الصعقة بظلمهم) ہاں تو ان لوگوں نے بہانے تلاش کر کے اپنے اوپر ظلم کیا، اپنی عقل کو حس وتجربہ کی چاردیواری میں بند کردیا اور اسے موقع نہ دیا کہ وہ اس محدود دنیا کے علاوہ حقائق کے وسیع عالم کی طرف پرواز کرے۔ اس وجہ سے ان پر آسمانی بجلی گری اور وہ نابود ہوگئے آخر کار حضرت موسیٰ کی دعا سے دوبارہ زندہ ہوگئے۔

لیکن یہ حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ آسمانی بجلی گرنے کے اس خوفناک واقعہ سے گزرنے پر بھی ان کے دل ودماغ میں بیداری پیدا نہیں ہوئی اور جب سامری نے انہیں گوسالہ پرستی کی دعوت دی تو انہوں نے اسے قبول کرلیا جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہوا: پھر باوجود یکہ ان کے پاس روشن دلائل آچکے تھے۔ انہوں نے گوسالۂ سامری کو اپنا معبود بنایا(ثم اتخذوا العجل من بعدِ ما جاءتهم البينٰتُ)

گویا انہوں نے غیر محسوس اور دکھائی نہ دینے والے خدا کو تسلیم وقبول نہ کیا اور ان کی روح اس مادی دنیا کے سوا عالم مجردات کی طرف پرواز کرنے سے قاصر رہی پھر بھی لطف خداوندی ان کے شامل حال ہوا جیسا کہ آخر آیت میں آیا ہے لیکن ہم نے ان کو معاف کردیا اور موسیٰ کو واضح برتر عطا فرمائی(فعفونا عن ذلك واتينا موسىٰ سلطاناً مبينًا)

سلطان مبین سے مراد وہ واضح سرداری ہے جو خدائے حضرت موسیٰ کو دی اور اس طرح دلیل ومنطق کے اعتبار سے مخالفین پر برتری وفوقیت عطا فرمائی، بعض مفسرین نے اسے صرف بحث واستدلال میں کامیابی قرار دیا ہے، جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں علامہ طبرسیؒ نے اسی تشریح کو اختیار کیا ہے[۲]

مجھے آسمان پر جانے دو کہ خدا کو دیکھوں:

(۳) تیسری آیت میں یہی بات ہم فرعون کی زبان سے سن رہے ہیں جس سے مصر کے لوگوں کے افکار کا پتہ چلتا ہے، فرعون نے یہ گفتگو اس وقت کی جب حضرت موسیٰ کو جادوگروں پر کھلی برتری حاصل ہوئی اور ان کی شہرت مصر کے طول وعرض میں عام ہوگئی تھی۔ فرعون

---

[۱] اس تفسیر کو فی ظلال القرآن جلد ۲ صفحہ ۵۸۷ پر اختیار کیا گیا ہے فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اسے ایک قول کے عنوان سے ذکر کیا اور مناسب قرار دیا بہرحال اس آیت کی دوسری تفسیر جو یہاں درج کی گئی وہ بھی اس سے منافات نہیں رکھتی

[۲] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۱۳۴۔

نے سوچا کہ اب کوئی ایسی بات کی جائے کہ لوگوں کے دل ودماغ سے حضرت موسیٰ اور ان کے معجزوں کا اثر زائل ہوجائے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا: فرعون نے کہا اے زعماء دربار! میں اپنے سوا تمہارے لیے کسی اور خدا کو نہیں جانتا (وقال فرعون یاایها الملا ما علمیت لکم من الهٍ غیری [1])

مگر اس لیے کہ میں اہل تحقیق ہوں لہٰذا حتیاط کا دامن نہیں چھوڑوں گا، میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے کہ جس سے موسیٰ کا صدق وکذب ظاہر ہوجائے.....اے ہامان! میرے لیے زمین پر آگ جلاؤ۔ (اینٹیں پکاؤ) پھر میرے لیے ایک بڑا برن بنادو تاکہ میں موسیٰ کے خدا کا پتہ چلاؤں۔ (فاوقدلی یاهامان علی الطین فاجعل لی صرحاً لعلی اطلع الی الهِ موسیٰ [2]

اگرچہ مجھے گمان ہے کہ موسیٰ جھوٹے ہیں (وانی لاظنهٗ من الکذبین)۔

اس میں شک نہیں کہ فرعون بڑا ہوشیار آدمی تھا، اس لیے ممکن نہیں کہ وہ اس بات کو سمجھ نہ رہا ہو کہ وہ خدا نہیں ہے اسی طرح وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خداوند آسمان کہنے میں موسیٰ کی مراد یہ ہے کہ خدا خالق آسمان ہے۔ نہ یہ کہ خدا آسمان پر رہتا ہے۔ بالفرض اگر آسمان ہی خدا کی جائے سکونت ہو تو پھر بھی ایک بلند سے بلند مینار کے ذریعے بھی وہاں پہنچا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ اونچے مقام پر سے آسمان کی بلندی ایسی ہی نظر آتی ہے۔ جیسی زمین سے نظر آتی ہے یہ ایسے مسائل نہیں تھے جو فرعون کے علم میں نہ ہوں یا وہ انہیں سمجھتا نہ ہو۔

لیکن فرعون کا مقصد کچھ اور تھا.....وہ چاہتا تھا کہ اس طرح کے مسائل پیدا کر کے لوگوں کے افکار وخیالات کو منتشر کردے جو حضرت موسیٰ کی طرف جھکے جارہے تھے۔ چنانچہ اس کا ارادہ ہوا کہ ایک بلند مینار کی تعمیر شروع کردینے سے وہ عوام کو بہت مدت تک اس میں مشغول رکھ سے گا۔ جب سینکڑوں افراد اس پر کام کر کے مال ودولت بھی کمائیں گے پھر جب یہ مینار بن چکے گا تو وہ خود اس کی بلندی تک پہنچے گا۔ اور واپس آکر بتائے گا کہ مینار کے اوپر جا کر بھی مجھے موسیٰ علیہ السلام کے خدا کا کوئی نشان نہیں ملا۔ تاہم ان سب باتوں سے ایک چیز واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مصر کے عوام کے افکار کتنے پست تھے۔ کہ وہ محسوس ہونے اور نظر آنے والے خدا کے سوا کسی ان دیکھے اور حقیقی خدا کے وجود کو بادر ہی نہیں کرتے تھے جس طرح وہ فرعون کو اپنا آلہ ورب مان رہے تھے اس طرح یہ خیال کرتے تھے کہ موسیٰؑ کا خدا بھی ظاہری ومادی جسم رکھنے والا اور اس آسمان کی بلندیوں پر مقیم ہوگا.....ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے اور ماحول میں بت سازی اور بت پرستی کا رواج ہوتا ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں مشرکوں کی گفتگو، حیلے بہانے اور عجیب وغریب اعتراضات ہیں جو وہ رسول اکرمؐ پر وارد کرتے تھے.....قرآن کہتا ہے انہوں نے کہا ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائے گے۔ جب تک تو ہمارے لیے (بنجر) زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کردے۔ (وقالولن نومن لك حتیٰ تفجر لنا من الارض ینبوعاً [3])

---

[1] صاحبانِ لغت کہتے ہیں کہ لفظ ''ملاء'' اس گروہ پر بولا جاتا ہے، جن کا عقیدہ ایک ہو اور ان کا ظاہر آنکھوں کو پر کر رہا ہو۔ اس کا مادہ ''ملا'' بروزن ''مرد'' ہے اور اس کے معنی پر ہانا ہے اس لیے یہ لفظ ایک قوم کے روساء اور بادشاہ کے درباریوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[2] ''صرح'' کھوٹ سے پاک، پھر اس کا اطلاق بلند وبالا محلات پر ہوا، اس طرح کہ محل کو ایسا مکمل بنایا جس میں کوئی نقص وعیب نہیں۔

[3] ینبوع کا مادہ نبع بروزن طبع ہے جس کا معنی چشمہ آب ہے۔

بعض مشرکین نے ایک اور بہانہ تراشا اور کہنے لگے: یا ہم پر آسمان سے سنگریزے گرادے جیسا کہ تیرا خیال ہے (اوتسقط اسماء کما زعمت علینا کسفاً)..... یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ (اوتاتی باللہ والملآئکۃِ قبیلاً[1])

ان مشرکوں کا آخری تقاضا واضح طور پر بتا رہا ہے کہ یہ لوگ خدا کی جسمیت کے قائل ومعتقد تھے اور وہ چہار دانگ عالم میں جسم و مادہ کے علاوہ کسی کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ فرشتوں کی آمد کے سوال میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ وہ آئیں اور خدا کی مدد کریں[2] یا یہ کہ فرشتے آ کر خدا کی الوہیت کی گواہی دیں اس سے بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ ان بہانہ تراشیوں کے سلسلے میں ان لوگوں کے فکر وخیال کس قدر پست اور لغو تھے۔

وہ منتظر ہیں کہ خدا ان کے پاس آئے:

(۵) یہاں تک کہ پانچویں اور آخری آیت میں مشرکوں اور کافروں کے پست خیالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: کیا وہ مشرک انتظار کر رہے ہیں کہ خدا اور فرشتے بادلوں کے سائے میں ان کے پاس آئیں گے۔ (ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ فی ظللٍ من الغما مو الملئکۃُ)[3]

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے اور اس کی تفسیر محکمات کے مطابق کی جانی چاہیے[4]

اس کے علاوہ بعض مفسروں نے اس آیت کی سات مختلف تفسیریں بیان کی ہیں[5]

گویا اس آیت کے بارے میں ان کا تصور کچھ اس طرح کا تھا کہ ایک دن ایسا بھی ہوگا۔ جب خدائے تعالیٰ اور اس کے فرشتے بادلوں کے سائے میں زمین پر اُتر پڑیں گے لیکن یہ بات قرآن کی آیتِ صریحہ کے خلاف ہے۔ (کہ خدا جسم وجسمانیات سے مبرا و پاک ہے) لہٰذا اس کی کوئی مناسب حال تاویل ہونی چاہیے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا مفہوم ومطلب ان خیال آرائیوں سے یکسر جدا اور الگ ہے چنانچہ اس میں انکار استفہامی کی صورت میں بات کی گئی ہے۔ مثلاً اس طرح کہ کچھ لوگ حصولِ علم میں سستی کرتے ہوں اور آپ ان سے کہیں کہ کیا تمہیں اس وقت کا انتظار ہے کہ علم لقمہ کی صورت میں تمہارے منہ میں ڈالا جائے گا؟

---

[1] لفظ قبیل کبھی بمعنی مقابل کفیل، شاہد اور کبھی جماعت وگروہ کے معنی ہیں استعمال ہوا ہے اور آیت میں تینوں معنی قابلِ قبول ہیں۔

[2] تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۳۵۹۔

[3] مفسرین کا اتفاق ہے کہ ''نظر'' کے معانی میں ایک معنی ''انتظار'' بھی ہے (تفسیر فخر رازی جلد ۵ صفحہ ۲۱۲)

[4] تفسیر المیزان جلد ۲ صفحہ ۱۰۵۔

[5] تفسیر فخر رازی جلد ۵ صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۶۔

مذکورہ آیت بھی یہی کہہ رہی ہے..... کیا ان کو انتظار ہے کہ خدا وفرشتے ان کی ملاقات کو آئیں گے اور ان کے سامنے کھڑے ہوکر گواہی دیں گے؟ ان کا یہ انتظار کس قدر بے بنیاد اور نادرست ہے کہ خدا کا جسم ومکان کا جسم ومکان اور اس کی آمدورفت تو ممکن ہی نہیں ہے پس اس آیت کا مفہوم واضح اور صاف ہے اور اس میں کسی پیچیدہ اور دقیق تفسیر کی قطعاً ضرورت نہیں اور نہ اسے متشابہات میں شمار کرنے کی حاجت ہے۔

آخر آیت میں اس بہانہ ساز گروہ کی تہدید کے لیے کہا گیا..... یہ امر اپنے انجام کی پہنچ گیا (وَ قضی الامر) اور ان لوگوں کو یقیناً سزا ملے گی گویا کہ وہ انہیں مل چکی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جملے میں فعل ماضی استعمال کیا گیا ہے پھر فرمایا: اور تمام کاموں کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے (والی اللہ تُرجع الامور)

خدا کے مقابل کسی شخص کی کوئی طاقت وہمت نہیں اور نہ اس کے حکم کے سامنے کسی سرتابی کی مجال ہے لہٰذا جب وہ کسی گروہ کو سزا دینے کا ارادہ کرے تو گویا وہ واقع ہوگئی کیونکہ کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔ آیا سزا دیتے جانے کی یہ دھمکی قیامت سے تعلق رکھتی ہے یا اس دُنیا یا ان دونوں سے تعلق رکھتی ہے؟ یہ امر بعید نہیں کہ یہ سزا دنیا وآخرت دونوں ہی سے تعلق رکھتی ہو۔ کیونکہ آیت کے مفہوم میں وسعت ہے اور اس کے محض دنیا یا آخرت تک محدود ہونے کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

ان پانچوں آیات کی تفسیر میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ طول تاریخ میں انبیاء سابق کی قوموں کے محسوس معبودوں کی طرف میلان کے نتیجے میں وہ نقطہ توحید سے ہٹ کر عقیدۂ شرک سے وابستہ ہوتی رہی ہیں، یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا پھر وہ قومیں جو علمی وفکری لحاظ سے پسماندہ تھیں۔ یا طاغوتوں اور منکرین خدا کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے باعث خدا شناسی کو محسوسات ہی میں منحصر سمجھتی تھیں..... انہوں نے فطرت خدا شناسی کا رُخ خود ساختہ خداؤں اور قسم قسم کے بتوں کی طرف موڑ دیا تھا..... چنانچہ تاریخ انسان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیدہ شرک کا سب سے بڑا عامل یہی رہا ہے کہ لوگ وجود کو صرف محسوس وجود کا تصور ان کے دل ودماغ میں سماتا ہی نہ تھا۔

توضیحات

صرف عالمِ محسوسات ہی پر کیوں تکیہ کرتے ہیں؟

یہ ایک واضح بات ہے کہ ابتدائی طور پر انسانی معلومات کی بنیاد حس وحواس پر ہی ہوتی ہے، جب ایک انسان پہلی بار آنکھ کھولتا ہے تو اس کی نظر اس مادی دُنیا پر پڑتی ہے اور وہ اس عالمِ محسوسات سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کی توجہ ماوراء حواس موجودات کی طرف سے وقت ہوگی۔ جب وہ مسائل عقلی وفکری اور معاملاتِ روحانی کا تجزیہ وتحلیل کرے گا وگرنہ وہ ایک ایسے وجود کا تصور نہیں کرسکے گا۔ جو مادہ ومدیات اور زبان ومکان سے مبرا ہو اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ فکری وعلمی طور پر پسماندہ قوموں نے بت پرستی کو اپنا مذہب بنا رکھا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کی فطرت انہیں خدا پرستی کی سمت بلا رہی ہے معرفت خدا کا جاذبہ انہیں دعوت دے رہا ہے اور

دوسری طرف وہ اس جہان میں محسوسات و مادیات کا غلبہ دیکھ رہے ہیں اس لیے زبان و مکان سے مبرا خدا کی معرفت ان کے لیے مشکل ہوجاتی ہے۔ پس وہ بت پرستی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور اپنی پیاسی روح کو خیالی معبودوں اور مندروں کے مہنت اور اکثر حاکمان طاغوت بت پرستی کی رسوم سے مالی فائدے حاصل کرتے ہیں اس لیے وہ بھی ان خیالات کو عام کرتے اور آگے بڑھاتے ہیں بلکہ وہ بت سازی و بت پرستی کو اپنے ملک کا سرکاری مذہب بناڈالتے ہیں اور اس کو ترقی دیتے ہیں۔

حقیقت میں یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بعض قائلین توحید بھی ان خیالات سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ مثلاً عام لوگ قسم کھاتے وقت کہتے ہیں کہ اس خدا کی قسم جو آسمان میں ہے یا دعا مانگتے ہوئے اپنے ہاتھ اور چہرہ آسمان کی طرف بلند کرتے ہیں..... گویا کہ ایسے خدا کی طرف اشارہ کررہے ہوں جو آسمان میں رہتا ہے اور فرشتے اس کے چاروں طرف کھڑے رہتے ہیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ خدائے تعالیٰ آسمان میں سکونت پذیر نہیں ہے وہ نہیں جانتے کہ ہاتھوں کو بلند کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ خدا وہاں رہتا ہے بلکہ یہ عاجزی اور بے چارگی کی علامت ہے یا جیسا کہ روایات میں ہے کہ وقت دعا ہاتھوں کو اس لیے بلند کیا جاتا ہے کہ تمام نعمتیں آسمان ہی سے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر بارانِ رحمت اور سورج کی روشنی کہ جو انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں..... گویا آسمان کی طرف توجہ خالق کی معنوی بلندی کی طرف توجہ کرنے کے مترادف ہے۔

بہرحال جب تک فکر انسانی میں بلندی نہ آئے۔ اس وقت تک اس کا شرک سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔

مقام غور ہے کہ بنی اسرائیل جن کی تربیت ایک طویل مدت تک حضرت موسیٰؑ ایسے اولوالعزم پیغمبر کے مکتب توحید میں ہوئی۔ انہوں نے فرعون سے نجات اور دریائے نیل کا معجزانہ عبور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا..... اس کے باوجود جب وہ بت پرستوں کے قریب سے گزرے اور بتوں پر نظر پڑی تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے لیے بھی ایسے ہی بت بنوائیں۔ ان کی اس بے ہودہ خواہش پر حضرت موسیٰؑ سخت ناراض ہوئے تو وہ لوگ خاموش ہوگئے۔

لیکن اس واقعہ پر کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حضرت موسیٰؑ الواح توریت لینے کے لیے کوہِ طور پر چلے گئے ایسے میں سامری نے ایک بچھڑے کا بُت بنایا اور بنی اسرائیل کو اس کی پرستش کرنے کی دعوت دی تو اکثریت نے توحید کو چھوڑ کر گوسالہ پرستی شروع کردی بس ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ حضرت ہارون کی قیادت میں نظریہ توحید پر قائم رہا۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علمی و فکری لحاظ سے پسماندہ اقوام میں خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رہبر کیسی کیسی مشکلات میں گرفتار رہے۔ اصولاً شرک کے آثار کو مٹانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے لوگوں کے فکر و نظر کو بلند کرنا اور انہیں صحیح تربیت دینا بہت ضروری ہے۔

شرک کا تیسرا سرچشمہ خیالی فوائد ومنافع

اشارہ:

وہم وخیال اور غلط فہمی وغرور وہ چیزیں ہیں جن پر بت پرستی کی بنیادیں قائم ہوتی تو ہم پرستی اور ضدیت جتنی زیادہ ہوگی بت پرستی کے آثار ونتائج کا دامن اتنا ہی وسیع ہوگا۔ یہاں تک کہ بے جان اور بے شعور موجودات یعنی مٹی اور پتھر کے بت اور چوب وآہن سے بناء ہوئے مجسمے اتنی قدر و قیمت کے لائق سمجھے جاتے ہیں کہ انہیں زمین وآسمان میں تمام قدرتوں کے مالک تصور کیا جاتا ہے۔ اور ان کی خیالی قوتوں کے آگے سر جھکائے اور ماتھے ٹیکے جاتے ہیں۔

ہاں بتوں سے حاصل ہونے والی خیالی برکتیں اور فرضی فائدے بت پرستی کے سرچشموں میں سے دوسرا سرچشمہ ہیں اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتے اور آیاتِ ذیل کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۱) وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ [۱۰:۱۸] (یونس)

(۲) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ [۳۶:۷۴] (یٰس)

(۳) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ [۱۹:۸۱] (مریم)

(۴) اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾ [۳۹:۳] (زمر)

ترجمہ:

(۱) وہ خدا کے بجائے کچھ چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ نفع دیتی ہیں اور وہ کہتے ہیں یہ خدا کے ہاں ہمارے شفیع وسفارشی ہیں، کہو..... کیا تم خدا کو زمین وآسمان میں ایسی چیز کی خبر دیتے ہو کہ جسے وہ نہیں جانتا؟ وہ ان شریکوں سے پاک ومنزہ ہے جو

وہ اس کے لیے قرار دیتے ہیں۔

(۲) انہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ کچھ اور معبود بنا رکھے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید ان کی مدد کی جائے گی۔

(۳) انہوں نے اپنے لیے خدا کے سوا معبود بنا رکھے ہیں تا کہ وہ ان کی عزّت کا ذریعہ بنیں۔

(۴) آ گاہ رہو کہ دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے وہ لوگ جنہوں نے خد کے علاوہ اپنے کچھ سرپرست قرار دیئے ہیں، وہ کہتے ہیں ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر اس لیے کہ وہ ہمیں خدا کے نزدیک کر دیں گے، جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے قیامت کے روز خدائے تعالیٰ ان کے درمیان اس کا فیصلہ کر دے گا۔ بیشک خدا جھوٹوں اور کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

مفردات کی تشریح:

''شفعاء'' شفیع کی جمع ہے، اس کا مادہ ''شفع'' بروزن ''نفع'' ہے مصباح اللغۃ کے بقول اس کا معنی ایک چیز کو دوسری میں ضم کرنا اور ملانا ہے۔ مفردات راغب کے مطابق اس کا مطلب ایک چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملانا ہے۔ مقابیس اللغۃ میں ہے کہ اس کا معنی دو چیزوں میں قرب ونزدیکی ہے۔

بہرحال ان سب معانی کی بازگشت ایک معنی کی طرف ہے، اب اس لفظ کا استعمال ایک کمزور فرد کا کسی طاقت ور شخص کے ساتھ تمسک کرنے کے معنی میں ہے تا کہ وہ اس کی مدد کرے اور اس کے لیے نجات کا وسیلہ بنے، آیت زیر بحث اور دیگر آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔

عدد ''شفع'' بہ بمعنی زوج بہ مقابل ''وتر'' بمعنی فرد کے آتا ہے۔

''زلفی'' کا مادہ ''زلف'' بروزن ''ظرف'' ہے اور اس کا اطلاق درجہ منزلت میں قرب پر ہوتا ہے کبھی اسے ''قدم'' کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے کیونکہ قدم اٹھانے سے مقصد ومنزل قریب تر آتی ہے۔ آیات زیرِ بحث میں اس سے قرب معنوی بھی مراد لیا جاسکتا ہے اور مشرکین بتوں کے ذریعے ایسا ہی قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن بعض محققین کے نزدیک ''زلفی'' کا معنی قرب کامل ہے جس کا مطلب قرب کا بلند ترین مقام حاصل کرنا ہے۔[1]

مگر اس مقام پر اس لفظ کے استعمال کے پیشِ نظر اس کا یہ مفہوم بعید نظر آتا ہے۔

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

یہ لفظ رات کی پہلی ساعتوں کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے اقم الصلوٰۃ طرفی النہار وزلفاً من اللیل۔ یعنی نماز دن کے دونوں سروں اور رات کے اوائل میں قائم کرو۔'' (ہود۔ ۱۱۴)

آیات کی جمع آوری وتفسیر

بت ہمارے شفیع ہیں:

(۱) پہلی آیت میں بت پرستوں کے مشہور مفروضے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: یہ لوگ خدا کے بجائے کچھ چیزوں (بتوں) کی پوجا کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ نفع دیتی ہیں اور وہ کہتے ہیں یہ خدا کے ہاں ہمارے شفیع وسفارشی ہیں۔ گویا قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں (ویعبدون من دون اللہ مالا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھولاءِ شفعآؤنا عنداللہ۔)

اب ایک سوال سامنے آتا ہے کہ وہ لوگ ان بے جان مجسموں کو کیونکر درگاہ خداوندی میں اپنا شفیع وسفارشی سمجھ رہے تھے؟ اس کے جواب میں بعض مفکرین کا خیال ہے کہ مشرکین کا اعتقاد یہ تھا کہ بتوں کی پوجا خدا ہی کی عبادت ہے اور اس کے تقرب کا ذریعہ ہے..... یہ عقیدہ مختلف وجوہات کی بناء پر پیدا ہوا تھا۔

ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہم خدا کی عبادت کرنے کے لائق نہیں۔ لائق نہیں کیونکہ وہ بڑی بلند وبرتر ذات ہے۔ اس لیے ہم ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں تا کہ ان کے واسطے سے ہم اس کے نزدیک ہوسکیں۔ بعض کو سوچ یہ تھی کہ فرشتے خدا کی بارگاہ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ہم اس لیے بتوں کی پوجا کرتے ہیں کہ یہ ان کے مظہر ہیں ہم فرشتوں کی مورتیوں کو پوجتے ہیں تا کہ ان کے وسیلے سے قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔

کچھ مشرکین کہا کرتے کہ ہم خدا ہی کی عبادت کرتے ہیں اور یہ بت ہمارے لیے بمنزلہ قبلہ کے ہیں۔ جیسے مسلمان عبادت کے وقت اپنے قبلہ کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ جب کہ بعض یہ کہتے ہیں کہ ہر بت کے پاس ایک شیطان ہوتا ہے ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو وہ شیطان ہماری مراد پوری کر دیتا ہے۔..... اگر بتوں کی پوجا نہ کی جائے وہی شیطان خدا کے حکم سے انسان کو گمراہ اور بدبخت بنا دیتا ہے اسی طرح کے اور بھی خرافات ہیں جن کے لوگ قائل ہیں[1]

(۲) دوسری آیت میں مشرکین کے ایک اور مفروضے کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: انہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ کچھ معبود بنا رکھے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید ان کی مدد کی جائے گی (واتخذوا من دون اللہ الھۃ لعلھم ینصرون)۔

وہ تمنا رکھتے تھے کہ یہ بت مشکلوں مصیبتوں اور جنگوں بیماریوں میں ان کی مدد کریں، قحط اور خشک سالی میں وہ ان کی فریاد کو پہنچیں اور عالم آخرت میں ان کے حمایتی بن کر آئیں..... یہ ان لوگوں کی کتنی بڑی غلط فہمی تھی۔ لیکن معاملہ بالکل الٹ ہو گیا کیونکہ بتوں کو کسی طرح

---

[1] بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۱۹۷۔

کا خطرہ ہوتا تو یہ لوگ خود ان کی مدد کو دوڑ پڑتے اور ان کے دشمنوں سے ان کا دفاع کرتے تھے، جیسے حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں آیا ہے: قالوا حرقوهُ وانصروا الهتكم ان كنتم فاعلين ۔یعنی انہوں نے کہا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ اگر تم کوئی کام کرنے والے ہو۔(انبیا۔٦٨)

ان کا یہ عقیدہ کہ بت ان کی مدد کریں گے ایک وہم وخیال سے زیادہ کچھ نہ تھا کیونکہ اس کی اصل واساس علمی پسماندگی اور فکری پستی ہے۔یہی وہ چیز ہے جو طول تاریخ میں بت پرستی کی نمود کا سرچشمہ رہی ہے۔

(۳) تیسری آیت میں یہی معاملہ ایک اور انداز میں بیان ہوا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا: انہوں نے اپنے لیے خدا کے سوا کچھ معبود بنا رکھے ہیں تا کہ وہ ان کی عزت کا ذریعہ بنیں (واتخذوا من دونِ الله الهة ليكونوا لهم عزاً)

عزت سے مرتبہ وحیثیت ہی نہیں بلکہ قوت، نصرت اور خدا کے ہاں شفاعت مراد ہے۔یہ بھی محض ان کا خیال ہی ہے کیونکہ اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے اسی سورہ (مریم) میں فرمایا ہے: جب اوہام کے پردے اُٹھیں گے تو عقل کی حکومت ہوگی اور بت پرستوں کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوگا وہ ان بتوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔جیسے سورۂ انعام کی آیت ۲۳ رمیں ہے کہ قیامت کے روز بت پرست کہیں گے (والله ربنا ما كنا مشركين) قسم اس خدا کی جو ہمارا پروردگار ہے کہ ہم مشرک نہ تھے۔

(۴) چوتھی اور آخری آیت میں (الا لله الدين الخالص) خالص دین خدا ہی کے لیے ہے کا اعلان کرنے کے بعد مشرکوں کو دھمکی دیتے ہوئے فرمایا: وہ لوگ جنہوں نے خدا کے علاوہ اپنے کچھ سرپرست قرار دے رکھے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر اس لیے کہ وہ ہمیں خدا کے نزدیک کر دیں گے جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے خدائے تعالیٰ قیامت کے روز ان کے درمیان اس کا فیصلہ کر دے گا، بے شک خدا جھوٹوں اور کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔(والذين اتخذو امن دونه اولياءُ ما نعبدوهم الا ليقربونا الى الله زُلفى ان الله يحكم بينهم فيما هم فيه يختلفون ان الله لايهدى من هو كاذِب كفارٌ[1])

توضیحات

۱۔مفروضہ شفاعت کا سرچشمہ

بت پرستی کے فعل کو دیکھ کر ہر عقلمند انسان حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک عاقل شخص مٹی اور پتھر کے بتوں کے سامنے سر

---

[1] بہت سے مفسرین کا کہنا ہے کہ والذین'' مبتداء ہے اور ان الله يحكم بينهم'' اس کی خبر ہے۔نیز جملہ ما نعبدوھم میں ایک محذوف ہے جو بمنزلہ حال کے ہے۔ (قائلين ما نعبدهم)

جھکائے (جواس نے خود ہی بنائے ہوں) اگر معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس پر غور کرے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ بت پرستی ایک احمقانہ عمل ہے لیکن جب ہم اس کے اسباب وعلل پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ محض سطحی سا نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ خیال، اوہام، عادات اور غلط فہمیاں عقلی دلائل کے طور پر سامنے آتی ہیں جن سے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

فخر الدین رازی سورہ یونس کی آیت ۱۸ کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں کس طرح بتوں کو بارگاہ الٰہی میں شفیع تصور کیا گیا؟ اس کی تحلیل میں کئی ایک اقوال نقل کیے ہیں۔

(۱) ایک گروہ کا اعتقاد ہے کہ دنیا کی ولایات وممالک میں ہر ولایت وملک کی سرپرست ایک روح ہوتی ہے چونکہ ہر روح تک رسائی (ان کے بقول) ممکن نہیں ہے اس لئے بت بنا کر انہیں اس روح کا مظہر قرار دیا گیا اور ان کی عبادت شروع کر دی گئی جب کہ اصلاً اسی روح کی عبادت کی جارہی ہے پھر یہ خیال باندھ لیا گیا کہ یہ روح خدا کی مطیع اور اس کی عبادت گزار ہے۔

(۲) ایک اور گروہ ستارہ پرستی کرتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں ستارے ہی خدا کی عبادت کرنے کے اہل ہیں نہ کہ خود وہ لوگ.....اور جب انہوں نے دیکھا کہ ستارے ہمہ وقت موجود نہیں رہتے کہ ان میں طلوع وغروب کا سلسلہ جاری ہے، تب ان لوگوں نے ہر ستارے کی ایک شکل قرار دے کر اس کے نام پر بت بنالیا اور ان بتوں کی پوجا کرنے لگ گئے جب کہ اصل میں وہ ان ستاروں کی پرستش تھی۔

(۳) ہر بت کے لیے ایک خاص طلسم ہے۔ یعنی نقش بناتے اور وہ اس کے سامنے پیش کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس نقش کے ذریعے ان کو اس بت کا قرب حاصل ہوتا ہے طلسم سحر وجادو کی ایک قسم ہے، اس میں پڑھے جانے والے افسوس اور نقوش واشکال شامل ہیں ،بعض لوگوں کا نظریہ ہے۔ کہ ان طلسمات کے وسیلے سے آسمانی قوتیں زمین پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کی عجیب وغریب اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ لوگ مختلف چیزوں پر یہ نقوش بناتے ہیں اور یہ تصور کرتے تھے کہ ان کے ذریعے سے موذی جانور اور دیگر امراض وبلیات ہم سے دور رہیں گے)[1]

(۴) انبیاء اولیاء کی مزعومہ صورتوں کے بت بنائے گئے اور وہ اس امید پر ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے کہ وہ خدا کے حضور ہماری شفاعت وسفارش کریں گے۔

(۵) وہ لوگ یہ تصور رکھتے تھے کہ خدا ایک بزرگ تر نور ہے اور فرشتے چھوٹے چھوٹے انوار ہیں لہٰذا وہ خدا کو ایک بہت بڑے بت کی صورت میں مجسم کرتے اور فرشتوں کے ناموں پر کئی چھوٹے بت بناتے تھے۔

(۶) بت پرستوں میں سے بعض لوگ حلول کا نظریہ رکھتے تھے۔ یعنی وہ یہ اعتقاد ظاہر کرتے کہ خدا بعض اجسام میں حلول کرتا ہے اور وہ ان بتوں میں بھی داخل ہوتا ہے.....اس لیے وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے[2]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ بت پرستی حضرت نوحؑ کے زمانے میں شروع ہوئی.....وہ یوں کہ حضرت نوحؑ کے پانچ بیٹے تھے، ود،

---

[1] مزید تشریح کے لیے دائرۃ المعارف، ''دہ خدا، جلد ۲ ۳۲ اور دائرۃ المعارف ''مصاحب'' جلد دوم میں مادہ ''طلسم'' کا مطالعہ کریں۔

[2] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۷ صفحہ ۶۰ (معمولی تلخیص کے ساتھ)

سواع، یعوق، یغوث، نسر.....ان میں سے ''دؤ'' فوت ہوگئے تو لوگ بڑے غمگین ہوئے اور ہر وقت ان کی قبر پر بیٹھتے رہتے۔ تب شیطان نے ان سے کہا کہ آؤ میں تمہیں ''دؤ'' کا مجسمہ بنادوں کہ جب تم فرزندِ نوح کو دیکھنا چاہو تو اسے دیکھ کر اس کی یاد تازہ کرلیا کروگے، انہوں نے کہا: ہاں ایسا ہی کرو، اس وقت ابلیس نے ''دؤ'' کا مجسمہ بنایا تھا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور حضرت نوحؑ کا جو بیٹا بھی فوت ہوتا، اس کا بت بنالیا جاتا۔ یونہی وقت گزرتا رہا اور شیطان نے ان لوگوں کو باور کرادیا کہ تمہارے بزرگ انہی بتوں کی پوجا کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا تم بھی ایسا ہی کرتے ہو..... یہ وہ وقت تھا جب خدا نے حضرت نوحؑ کو حکم دیا کہ وہ اس بت پرستی کو روکیں [1]

۲۔ عربوں میں بت پرستی کا رواج

وہ پہلا شخص جس نے اہل عرب میں بت پرستی شروع کی وہ بنوخزاعہ کا ایک فرد ''عمرو بن لحی'' تھا وہ اپنے کسی کام سے شام ہوگیا اور وہاں ہونے والی بت پرستی کو دیکھا اس نے ان لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں.....ان سے بارش طلب کرتے ہیں تو بارش ہوجاتی ہے اور ان سے مدد مانگتے ہیں تو وہ مشکلوں میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

عمرو بن لحی نے اہل شام سے کہا، اگر ممکن ہو تو ایک بت مجھے بھی دو۔ تاکہ عرب کے لوگ بھی بُت پرستی سے نفع حاصل کریں انہوں نے اسے ایک بت ''ہبل'' دیا جو انسانی شکل میں تھا اور عقیق سے بنایا گیا تھا۔ وہ یہ بت لے کر شام سے مکہ پہنچا اور اسے کعبہ کے اندر نصب کرکے لوگوں کو اس کی عبادت پر آمادہ کیا۔ اب صورت حال یہ ہوگئی کہ سفر سے واپس آنے والے افراد پہلے ان بتوں کی زیارت کرتے اور پھر اپنے گھروں کو جاتے تھے [2]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بت پرستی کا اصل سبب یہ ہے کہ ان وقتوں میں افراد انسانی کے نزدیک خدا کی ذات اس سے بلند و برتر تھی کہ ہم جیسے اس کی عبادت کریں۔ چنانچہ ایک درمیانی واسطہ کے طور پر بت بنائے وہ ان کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل کرنا چاہتے تھے یا صورت یہ تھی کہ ان کے خیال میں خدا حواس و عقل سے ماوراء ذات ہے جس کی پرستش نہیں کیا جاسکتی۔

لہٰذا انہوں نے چاہا کہ ان محسوس موجودات (بتوں) کے وسیلے سے اس کا تقرب حاصل ہے۔

چند ایک تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ بنی اسماعیل یعنی اہل مکہ میں بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب ان میں سے کوئی شخص سفر پر جاتا تو مکہ سے شدید محبت کی بناء پر وہ اپنے ہمراہ وہاں سے ایک پتھر لے جاتا۔ پھر وہ جہاں جہاں قیام کرتا، اس پتھر کو سامنے رکھتا اور اس

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۴، صفحہ ۲۶۔

[2] روح البیان جلد ۴ صفحہ ۲۶، بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۴۸ روایت ۱، ۷، ۸ بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۲۰۰۔ عمرو بن لحی خزاعی کے شام سے نامبارک سوغات لانے کا واقعہ، سیرت ابنِ ہشام جلد اوّل صفحہ ۷۸ پر بھی اسی طرح کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

کا طواف کر لیتا تھا۔ جیسے کعبہ کا طواف کر رہا ہو..... پھر وقت گزرنے کے ساتھ ان کی یہ عادت بت پرستی کی شکل اختیار کر گئی [1]

تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: بت پرستوں کا خیال تھا کہ ہماری بشریت، ہمارے گناہ اور ہمارے برے افعال ایسی رکاوٹیں ہیں جو ہمیں رب الارباب تک پہنچنے نہیں دیتے۔ کیونکہ اس کی ذات اعلیٰ وارفع اور پاک و پاکیزہ ہے پس ہم میں اس میں کوئی نسبت ہی نہیں..... لہٰذا ہم اس کو محبوب ترین چیزوں کے ذریعے سے اس کا تقرب حاصل کر سکتے ہیں، وہ چیزیں ہمارے وہی خدایان زمینی ہیں۔ جن کے ذمے دنیا کی خلق و تدبیر کا کام ہے پس ہم ان کی شکلیں اور مورتیاں بنا کر ان کو پوجا کریں اور ان کے نزدیک ہوں تا کہ وہ خدائے بزرگ کے ہاں ہمارے شفیع و سفارشی بنیں، اس طرح ان کی خاطر سے ہمیں خیر و فلاح حاصل ہوگی اور ضرر و تکلیف ہم سے دور رہے گی..... گویا وہ ان بتوں کی پوجا اس لیے کرتے کہ ان کے دیوتا خوش ہوں اور خدا کے ہاں ان کی سفارش کریں، کبھی وہ خود ان بتوں ہی کو شفیع و سفارشی قرار دے لیتے ہیں [2]

بہرحال ان لوگوں نے ان اوہام اور غلط اندیشیوں کے ذریعے سے اپنی گمراہیوں اور بے ہودہ رسوم کو عقلی اور منطقی طور پر درست ثابت کرنا چاہا لیکن اصل میں انہوں نے ضلالت کو ہدایت اور شیطانی وسوسوں کو عقلی دلائل کا نام دے رکھا تھا۔

(۳).....شرک و بت پرستی کے دیگر عوامل

شرک و بت پرستی ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے اور دیگر مشکل مسائل کی طرح اس کا بھی کوئی ایک عامل نہیں ہے، بلکہ یہ چیز بہت سے عوامل کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ قومیں سورج، چاند اور ستاروں کی پوجا کرتی ہیں۔ بعض اقوام آگ کی پجاری بنی ہوئی ہیں اور بعض نے بڑے دریا کو اپنا معبود بنایا، جیسے مصر میں دریائے نیل اور ہندوستان میں دریائے گنگا کو پوجا گیا۔ یعنی جس جس چیزوں کو اپنے لیے فائدہ بخش دیکھا یا اس کی بڑائی کا مشاہدہ کیا اسے مقدس قرار دے دیا اور پھر یہ تقدس..... ان کے نزدیک..... اس قدر بڑھا کہ اس چیز کے لیے رُوح خاص کے قائل ہو گئے اور اسے بھی اپنے خداؤں کی صف میں شامل کر لیا۔

ایک اور تعبیر کے مطابق شرک کرنے والے عالم اسباب میں گم ہو کر رہ گئے اور انہوں نے ان اسباب کو پیدا کرنے والے (مسبب الاسباب) خدائے واحد کو فراموش کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسی نظر نہ رکھتے جو وجود کائنات کے اصل سبب تک پہنچ سکے، وہ اس فکر و فہم سے عاری تھے جو سبب کی کہنہ و اصلیت کو پا سکتی ہو..... پس ان کے مفروضوں، غلط اندیشوں اور خام خیالیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بت پرستی اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔

---

[1] سیرت ابنِ ہشام جلد اوّل صفحہ ۷۹۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۰ صفحہ ۲۷ سورہ یونسؑ۔ آیت ۱۸ء کے ذیل میں۔

شرک کا چوتھا اور پانچواں سرچشمہ
تقلید واستعمار

اشارہ:

بت پرستی کے ایک سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہونے کا سب سے بڑا سبب تقلید ہے اور تقلید ہی کی بدولت اس میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔قرآن نے بھی بار بار یہی کہا ہے کہ بت پرستی کی نمو اور فروغ میں تقلید کا بہت بڑا حصہ ہے بلکہ بعض موقعوں پر تو اسے مشرکین عرب کی طرف سے اپنے شرک بت پرستی کی ایک مستقل دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

بت پرست معاشرے میں پرورش پانے، باپ داداؤں کا طریقہ اپنانے اور بچپن میں سُنی ہوئی باتوں سے اثر پذیر ہونے سے جیسے عوامل ایک دوسرے کے معاون بنتے ہیں تو ایک بے ہودہ اور بے بنیاد فعل یعنی لکڑی اور پتھر کے بت جو محض ناکارہ ہوتے ہیں.....انہیں ان لوگوں کی نظروں میں ایک قابلِ قدر اور مقدس وجود کے طور پر متعارف کرادیتے ہیں۔

اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن مجید کی طرف نظر کرتے اور آیاتِ ذیل کی آواز پر کان لگاتے ہیں:

(۱) بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ [۴۳:۲۲]
وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ [۴۳:۲۳] (زخرف)

(۲) قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾ [۲۶:۷۱] قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ [۲۶:۷۲] اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ [۲۶:۷۳] قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ [۲۶:۷۴] (شعراء)

(۳) قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ [۱۰:۷۸] (یونس)

(۴) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ [۲:۱۷۰] (بقرہ)

(۵)وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ[۳۴:۴۳](سبا)[1]

ترجمہ:

(۱) بلکہ وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے آباء واجداد کو جس مذہب پر پایا ہم کو بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت کی گئی ہے، اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا، مگر یہ کہ وہاں کے مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک مذہب پر پایا ہے، اور ہم انہی کے آثار کی پیروی کرتے ہیں۔

(۲) انہوں نے کہا کہ ہم بُتوں کی پوجا کرتے اور انہی کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں۔ اس نے کہا جب انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں یا تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے پایا ہے۔

(۳) (فرعون کے ساتھی موسیٰؑ سے) کہنے لگے کیا تو اس لے آیا ہے کہ ہمیں اس (پنتھ) سے پھیر دے جس پر ہمارے باپ دادا رہے اور تم اس ملک میں حکومت وریاست حاصل کرو، ہم تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(۴) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں۔ ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے پر چلیں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، لیکن اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو اور راہ راست پر نہ رہے ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کرتے رہیں گے؟

(۵) جب ہماری واضح آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بس ایک ایسا

---

[1] ان آیات کے مضمون کے ساتھ ملتی جلتی اور بھی آیات ہیں، بوجہ اختصار ان پر اکتفاء کیا گیا ہے، ملاحظہ ہوں سورہ اعراف آیت ۷۰، ۱۷۳م سورۂ ابراہیم آیت ۱۰، سورہ ہود آیت ۶۲

شخص ہے جو تمہیں ان کی پرستش کرنے سے روکنا چاہتا ہے، جن کی پرستش تمہارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔

مفردات کی تشریح:

''صنم'' راغب اصفہانی المفردات میں کہتا ہے کہ ''صنم'' ایسا مجسمہ ہے جسے چاندی تانبے یا لکڑی سے بناتے اور اس کی پوجا کرتے تھے، وہ لوگ اسے تقرب الٰہی کا وسیلہ تصور کرتے تھے، لسان العرب میں ہے کہ لفظ دراصل ''کلمہ'' ''شمن'' سے لیا گیا ہے جو فارسی، آرامی یا عبرانی زبان سے ہے [1]

بعض اہلِ لغت کا نظریہ ہے کہ ''صنم'' اور ''وثن'' کے درمیان فرق یہ ہے کہ ''صنم'' ان بتوں کو کہا جاتا ہے جو خاص شکل وصورت رکھتے ہیں اور ''وثن'' وہ بت ہیں جو کسی خاص شکل میں نہ ہوں۔

''اب'' یہ لفظ ''باپ'' کے معنی میں ہے، کبھی یہ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی چیز کے وجود میں آنے کا سبب ہو یا اس کی اصلاح کرے یا اسے ظاہر کرے، لیکن یہ معانی مجازی وکنائی ہیں۔ اس سبب سے کہ ''باپ'' اپنے بچوں کو روزی بہم پہنچاتا ہے اس لفظ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔

کلیات ابوالوفا میں ہے پہلی شریعتوں میں لفظ ''اب'' کا اطلاق ''خدا'' پر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ اس مخلوقات کی پیدائش کا سبب ہے پھر بہت سے جاہل اور بے خبر لوگوں نے اس ''اب'' کو والدہ اور جسمانی باپ کے معنی میں قرار دے لیا اور خدا کو ''اب'' کہہ کر کفر کی راہ اختیار کر لی۔

کتاب ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں اس مادہ کو تربیت کے معنی میں استعمال کیے جانے کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس اعتبار سے اس لفظ کے مصداق بہت سے ہیں مثلاً خداوندِ متعال، والد پیغمبر، معلم، چچا اور دادا وغیرہ، پس لفظ ''اب'' میں پدر اور باپ کے معنی کے لحاظ سے بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

بت پرستی ہمارے اسلاف کا دستور ہے:

(۱) مشرکین عرب میں ایک گروہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتا اور ان کی پرستش کرتا تھا۔ پہلی آیت میں ان کے اس جاہلانہ خیال کو کئی طرح سے روک گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: تم لوگ بیٹوں کی پیدائش پر خوش ہوتے اور بیٹیوں کی ولادت پر ناراحت ہوتے ہو..... پھر خدا کے لیے بیٹیوں کے قائل کیوں ہوئے ہو؟ تاہم یہ جواب ان لوگوں کی عقل وفکر کی سطح کے مطابق دیا گیا ہے۔

---

[1] لغت فارسی ''شمن'' کے معنی بت پرست کے ہیں نہ کہ بت دیکھیں فرہنگ معین اور غیاث اللغات۔

کبھی فرشتوں اور بتوں کی پرستش پر ان کے کمزور دلائل کا ذکر کیا اور ان کا جواب دیا گیا اور آخر کار ان کی اس دلیل کا ذکر کیا ہے ''بلکہ وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے آباء واجداد کو جس مذہب پر پایا ہم کو بھی انہی کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت کی گئی ہے (بل قالو انا وجدنا اٰباءنا علیٰ امةٍ وانا علی اثارهم مهتدون[1])

لیکن اس کے بعد قرآن بلا فاصلہ پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ کورانہ تقلید اور پہلے لوگوں کے عقائد ونظریات کی بلا قید شرط پیروی نیز اس قسم کے کمزور اور بے اصل عذر صرف مشرکین عرب ہی پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ ''اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک مذہب پر پایا ہے۔ اور ہم انہی کے آثار کی پیروی کرتے ہیں (و کذالك ما ارسلنا من قبلك فی قریةٍ من نذیرٍ الا قال مترفوها انا وجدنا اٰباءنا علی اُمةٍ وانا علیٰ اثارهم مقتدونَ)

معلوم ہوا کہ بت پرستی کے ایک سے دوسری نسل میں منتقل ہونے کا بڑا سبب آندھی تقلید یعنی اپنے باپ دادا کی غلط روش کو بلا قید وشرط قبول کرنا ہے گویا یہ عقل وتدبیر سے کام نہ لینا، تلاش وتحقیق کی زحمت نہ اُٹھانا اور پہلے لوگوں کی فضولیات کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

''مترفون'' مغرور دولت مندوں کی بطور خاص نشاندہی کرنے کی بقول مفسرین یہ وجہ ہے کہ دُنیا سے محبت، قسم قسم کی مادی لذات سے رغبت، عافیت کوشی وسہل پسندی اور تحقیق وجستجو کی زحمت نہ اُٹھانا یہ سب دولت مند لوگوں کی بُری صفات ہیں اور یہی اندھی تقلید اور بے سوچے سمجھے کسی کی پیروی کرنے کے اسباب ہیں جو خاص وعام سب کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں۔

اگر وہ ثروت مند لوگ ان تاریکیوں سے باہر آجاتے تو حق وحقیقت تک پہنچنا اور ان کو پہچاننا کچھ بھی مشکل نہ تھا..... چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کا فرمان ہے: ہر گناہ وغلطی کا سرچشمہ دُنیا کی محبت ہے (حب الدنیا راس کل خطیئةٍ)[2]

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں ان کا یہ قول نقل ہوا ''.....ہم کو ان کے آثار کی پیروی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے'' جب کہ دوسری آیت میں ان کا یہ قول آیا ہے ''ہم ان کے آثار کی پیروی کرتے ہیں'' ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق علت ومعلول کے طور پر ہو۔ یعنی ان کا مدعا یہ ہو کہ ہم اپنے اسلاف کی پیروی اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا طریقہ حق وہدایت سے تعلق رکھتا ہے۔

لیکن قرآن ان آیات کے مضامین کو آگے بڑھاتے ہوئے مضبوط دلائل کے ساتھ ان کے اس خیال باطل کی تردید کرتا ہے اور انبیاءؑ سابق کی زبانی نقل کرتا ہے کہ انہوں نے مشرکین کو اس کورانہ تقلید پر ٹوکتے ہوئے کہا تم نے اپنے بڑوں کو جس طریقہ پر کاربند پایا اگر ہم اس سے بہتر وبرتر آئین حیات لائے ہوں تو کیا پھر بھی اس کا انکار کرو گے؟'' اس پر انہوں نے بڑے تعجب وغرور سے کہا تم جو آئین

---

[1] اُمةٍ کا لفظ مفسرین کے بقول اس آیت میں ایک آئین دوستور کے معنی میں ہے کہ جس پر ایک قوم کا اجماع ہو، لیکن بعض علماء اسے جماعت اور گروہ کے معنی میں لیتے ہیں، تاہم اس مقام پر بناء پر مشہور پہلے معنی ہی کو ترجیح حاصل ہے۔ اگرچہ قرآن کی دیگر آیات میں لفظ ''امة'' جماعت کے لیے آیا ہے اور اس کا ایک معنی گناہ بھی لیا جاتا ہے۔

[2] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۲۰۶ تفسیر رُوح البیان اور تفسیر المیزان میں بھی اس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

لے کر آئے ہو، ہم اس کا انکار کرتے ہیں''

البتہ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، تقلید کی کئی ایک اقسام ہیں یعنی ایک تقلید اپنی جگہ پر مفید اور نفع بخش ہے کہ جس کے ذریعے علوم وفنون ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں، دوسری تقلید وہ ہے جو فضول اور احمقانہ ہے کہ اس سے بے بنیاد اور بے فائدہ رسوم اور طرح طرح کی بُری عادات واطوار غلط اعتقادات ونظریات آئندہ نسلوں میں سرایت کرتے ہیں.....ان تقلیدوں میں سے ہر ایک کی خاص علامات اور نشانیاں ہیں۔جن کی طرف ہم آیندہ صفحات میں اشارہ کریں گے۔

(۲) دوسری آیت میں بابل کے بُت پرستوں سے حضرت ابراہیمؑ کے مبارزہ کا ذکر ہے، آپ نے نہایت بلیغ انداز میں ان سے سوال کیا: یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم لوگ پرستش کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: انہوں نے کہا ہم ان بتوں کی پوجا کرتے اور انہی کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں۔(قالوا نعبد اصناماً فنظل لها عا کفین)۔اس طرح انہوں نے نہ صرف بت پرستی کا اقرار کیا بلکہ اس پر فخر کا اظہار بھی کررہے تھے۔

حضرت ابراہیم نے ایک کڑا سوال کر کے ان کا ناطقہ ہی بند کر دیا.....انہوں نے کہا جب انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں یا تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں۔(قال هل یسمعونکم اذ تدعون ۔او ینفعونکم اویجرون) یعنی اگر یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ہیں تو کم از کم اپنے پجاریوں کی آواز ہی سنتے ہوتے، وگرنہ اس عبادت اور پوجا کا کیا فائدہ ہے۔ہاں وہ لوگ یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے تھے کہ یہ لکڑی اور پتھر کے بت ان کی دعا وپکار اور تضرع وزاری کو سنتے ہیں اور نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے کہ یہ ان کو کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے اسلاف کو رانہ تقلید کا سہارا لیا: انہوں نے جواب دیا..... بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے(قالو بل وجدنآ اٰبآءَ کذلك یفعلون) ایسا بے پایہ جواب دینا اگرچہ موجب ندامت ہے، لیکن ان کے لیے ان کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔

ان آیات کے سلسلہء بیان میں حضرت ابراہیمؑ ایک محکم اور جاندار دلیل سے ان مشرکین کو لاجواب کر دیتے ہیں.....فرماتے ہیں: یہ بت جن کو پرستش تمہارے اسلاف کرتے تھے اور تم بھی کررہے ہو۔یہ سب میرے دشمن ہیں اور میں ان دکا دشمن ہوں) اور میں تو صرف اس ذات کی عبادت کرتا ہوں جو سبھی اہل جہان کا پروردگار ہے۔میری پیدائش میری ہدایت میری خورد ونوش میرے بیماری وشفا۔میری زندگی موت اور بالآخر بخشش کرنے والا وہی ہے۔یعنی ایک ایسی ہستی لائق پرستش ہے جو ساری کائنات کا خالق اور تمام فوائد ومنافع کا مالک ہے۔نہ ایسے بے جان اور بے شعور مجسمے کو جو نہ اپنے اور نہ کسی اور کے کام آسکتے ہیں۔

(۳) تیسری آیت کہ جس میں قومِ فرعون کی زبانی بات کی گئی ہے۔اس میں یہی مضمون ایک دوسرے انداز میں بیان ہوا ہے۔فرمایا: (فرعون کے ساتھی موسیٰؑ سے) کہنے لگے کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس (پنتھ) سے پھروے جس پر ہمارے باپ دادا رہے اور تم اس ملک میں حکومت وریاست حاصل کرو(قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیه ابائنا وتکون لکما الکبریآءُ

فی الارض[1])

چونکہ معاملہ اسی طرح ہے لہٰذا ہم تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے (وما نحن لکما بمومنین)

درحقیقت ان کے پاس اپنے اس آئین زندگی اور اعتقاد وعمل کی حقانیت و پاکیزگی کی صرف یہی دلیل ہے کہ یہ ہمارے بزرگوں کا طریقہ اور ان کی رسم وراہ ہے، انہوں نے حضرت موسیٰ وہارونؑ پر الزام لگایا کہ تم دونوں شرک وبت پرستی کی مخالفت اور توحید کی دعوت کے ذریعے سے محض حکومت وریاست تک پہنچنا چاہتے ہو۔ ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو فرعون کے درباریوں نے کی ہے۔ اس میں انہوں نے موسیٰؑ وہارونؑ کی دعوتِ توحید کے مقابلے کے لیے دو شیطانی راہیں نکالی ہیں۔

(۱) جاہل عوام کے جذبات کو برانگیختہ کیا ہے کہ تمہارے بزرگوں کا دین خطرے میں ہے۔

(۲) عوام میں موسیٰؑ وہارونؑ کی طرف سے بدظنی پیدا کی ہے۔ کہ ان کا مقصد حکومت پر قبضہ کرنا ہے وگرنہ شرک وتوحید کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

جابر حکومتیں اور طاغوتی حکمران عوام کو بے وقوف بنانے اور اپنے اقتدار غلبہ کو قائم رکھنے کے لیے یہی دو راستے اختیار کرتے ہیں، جیسے سورۃ طٰہٰ کی آیت ۶۳ میں اس کا بڑی صراحت سے ذکر کیا گیا ہے (قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ [۲۰:۶۳]) انہوں نے کہا کہ یہ دونوں (موسیٰؑ وہارونؑ) ضرور جادوگر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے وطن سے نکال باہر کریں اور تمہارے بہترین (اور قابل فخر) مذہب کو مٹا ڈالیں۔''

بت پرست ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے رہے:

(۴) چوتھی آیت میں اسی بیان کو مشرکین مکہ کے ہمیشگی جواب کے طور پر ذکر کیا اور فرمایا: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو تو (ہمیشہ) جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ (واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالو بل نتبع ما الفینا علیہ اٰبآئنا)۔

درحقیقت ہر مخالف اور دشمن کی گفتگو ایسی ہی ہوتی ہے کہ جب کوئی جواب بن نہ پڑے تو تقلید آباء کا سہارا لیتا ہے پھر تقلید بھی کورکورانہ اور بے سوچے سمجھے کی گئی اور جن کی تقلید کی ہے وہ گمراہ اور بے خبر لوگ ہیں لیکن وہ اس تقلید پر فخر بھی کرتے ہیں، جب کہ پیغمبروں کی طرف سے اپنی تبلیغ ودعوت کی حقانیت پر دیئے جانے والے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

قرآن کریم ایک مختصر سے جملہ میں مشرکین کی اس کمزور اور بودی دلیل کو رد کرتے ہوئے ایک سوال اٹھاتا ہے ''لیکن اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو اور راہ راست پر نہ رہے ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی (تقلید) کرتے رہیں گے؟ (اولو کان اٰباؤھم

---

[1] لتلفتنا۔ اس کا مادہ ''لفت'' بروزن ''حرف'' ہے کہ جس کے معنی کسی چیز سے ہٹانا یا اس کی طرف متوجہ کرنا ہے اگر یہ ''عن'' کے ساتھ متعدی ہو تو اس کے معنی پھر جانا ہیں اور اگر ''الیٰ'' کے ساتھ آئے تو اس کے معنی توجہ کرنا ہوں گے۔

لا یعقلون شیاءً ولا یهتدون[1]

یعنی اگر ان کی تقلید ''جاہل کے عالم کی تقلید کرنے'' کے مطابق ہوتی تو قابل قبول تھی لیکن وہاں یہ صورت نہیں تھی بلکہ ان کی تقلید ''جاہل کے جاہل کی تقلید کرنے'' کی شکل میں تھی کہ ایک گمراہ دوسرے گمراہ کی تقلید و پیروی کر رہا تھا۔ چنانچہ مشرکین مکہ کی تقلید آباء یہ تھی کہ بہت سے اندھے ایک اندھے کی لاٹھی پکڑے ہوئے تھے اور وہ انہیں تباہی کے گھڑھے کی طرف لیے جا رہا تھا۔

اس آیت اور اس سے پہلے کی آیات کا انداز بتاتا ہے کہ یہاں مشرکین عرب کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، بعض لوگوں نے جو یہ احتمال دیا ہے کہ ان آیات کو روئے سخن یہود کی طرف ہے اور انہوں نے اس ضمن میں ابن عباس سے اس کا شانِ نزول بھی نقل کیا ہے، لیکن یہ بعید نظر آتا ہے (غور کریں)۔

پانچویں اور آخری آیت بھی مشرکین عرب کے بارے میں ہے: جب ہماری واضح آیات (بذریعہ پیغمبر) ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ (پیغمبر) بس ایک ایسا شخص ہے جو تمہیں ان کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے، جن کی پرستش تمہارے باپ دادا کرتے تھے (واذا تتلیٰ علیهم اٰیتنا بیناتٍ قالو ما هذآ الا رجلٌ یرید ان یصد کم عما کان یعبد و آباؤ کم)

قرآن کہتا ہے یہ بُری عجیب بات ہے کہ مشرکین آیات بینات (واضح آیات، نشانیوں اور محکم دلائل) کے مقابلے میں تقلید آباء جیسی بے اصل حجت لاتے ہیں اور پیغمبر اکرم کی اس قدر تحقیر کرتے ہیں کہ انہیں ''رجل'' یعنی ایک شخص کہہ کر پکارتے ہیں اور عام لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر ہمارے بزرگ کہنے کی بجائے تمہارے بزرگ کہتے ہیں۔ اور ان کی تقلید کا واسطہ دیتے ہیں تاکہ پیغمبر اکرمؐ کے مقابل ان کے تعصب اور دشمنی کو ابھاریں۔

ان تمام آیات پر نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ بت پرستی وسعت اور اس کے آئندہ نسلوں تک پہنچنے کا اہم اور بڑا ذریعہ تقلید ہی ہے۔ جب پیغمبر اکرمؐ نے بت پرستوں کی روک ٹوک کی تو سورۂ سباء کی آیت ۴۳ اور زخرف کی آیت ۲۲ کے مطابق ان لوگوں نے آپ کے جواب میں اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے تقلید آباء کو بطور دلیل پیش کیا۔ مزید یہ کہ زمانہ موسیٰؑ (سورۂ یونس'' آیت ۸۷) عہد ابراہیمؑ (سورۂ شعراء۔ آیت ۷۰ تا ۷۴) عصر ہود (سورۂ اعراف۔ آیت ۷۰) اور ایام صالحؑ (سورۂ ہود۔ آیت ۶۲) کے مطابق مشرک و بت پرست سب لوگ اسی تقلید آباء پر ہی تکیہ کرتے رہے ہیں۔

تقلید آباء کا یہ بہانہ صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ سورۂ زخرف کی آیت ۲۳ کے پیشِ نظر مشرکین اٹھ کھڑے ہوتے تھے، وہ لوگ ہر عہد میں پیغمبران الٰہی کی دعوت سے انکار کرتے ہوئے اپنے آباء کی تقلید پر قائم رہنے اور ان کے طریقے پر چلنے کی آواز بلند کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ تقلید بت پرستی کے پیدا ہونے کا سبب نہیں بلکہ یہ اس کے دوام اور ایک سے دوسری نسل تک پہنچنے کا ایک بڑا عامل ہے۔

---

[1] یہ آیت ایک محذوف جملہ رکھتی ہے اور اصل میں اس کی صورت یہ ہے: ایتبعون الفوعلیه اٰبآءهم فی کل حالٍ وفی کل شیءٍ ولو کان اٰبائوهم لا یعقلون شیئاً ولا یهتدون۔''

توضیحات

(۱) تقلید، اقوام کی ترقی یا انحطاط کا عامل:

اگر جاہل لوگ تقلید کے طور پر عالم و دانش مند افراد کی طرف رجوع کریں تو بلا شک اس سے معاشرے میں تکامل آتا ہے بلکہ اس سے علوم وفنون۔ اعلیٰ آداب ورسوم اور بہترین تربیتی مسائل ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ بچے اپنی تمام معلومات معاشرے سے اسی طریقے سے حاصل کرتے ہیں اور اسی تقلید سے صنعت وحرفت میں ترقی اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اگر تقلید میں معاشرہ ساز اور مثبت رُوح نہ ہو تو معاشرے میں تکاملی حرکت کا وجود ناپید ہو جاتا ہے۔

مثبت تقلید کی مثال خالص پانی جیسی ہے کہ جو انسانی زندگی کی اساس ہے لیکن اگر یہی پانی مختلف کثافتوں سے آلود ہو جائے تو کئی ایک بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک جاہل دوسرے جاہل کی تقلید کرے یا ایک عالم کسی جاہل کی تقلید کرے تو اس سے فساد بگاڑ بڑھ جاتا ہے۔ ناپسندیدہ عادات عام ہوتی ہیں۔ فکری بے راہ روی اور قسم قسم کے خرافات اور انحرافات ایک سے دوسری نسل اور ایک سے دوسری قوم تک پہنچتے رہیں گے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ تقلید کاہلی اور تعصب سے جنم لیتی ہے۔ جو لوگ تن آسانی کے باعث تحقیق وتلاش کی زحمت اٹھانا نہیں چاہتے وہ تقلید کی طرف رُخ کر لیتے ہیں۔ پھر ایسے متعصب اور ضدیت پسند افراد جو دوسری قوموں کی قوت وشوکت اور عروج وترقی کے علل واسباب کو جاننے اور انہیں اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتے وہ اپنی قوم کی منفی سوچوں اور کمزور نظریوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں پس یہی وہ تقلید ہے جو تعصب اور جہالت سے ملی ہوئی اور پستی کی طرف لے جانے والی ہے۔ نیز یہی وہ کورانہ تقلید ہے جو طول تاریخ میں شرک وبت پرستی کے فروغ کا ایک بڑا عامل رہی ہے [1]

(۲).....ہوائے نفس اور شیطانی وسوسے

آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا پرستی بھی شرک وبت پرستی کے عوامل میں سے ہے، جیسا کہ ہم قصہ سامری میں دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: میں نے کچھ چیزیں دیکھیں جو یہ لوگ نہیں دیکھ سکے۔ میں نے فرستادہ خدا (جبریل) کے آثار پائے، پھر انہیں اپنے ذہن سے دور ہٹا دیا اور بت پرستی کی طرف لوٹ گیا۔ اس طرح میرے نفس نے اس چیز کو میری نظروں میں پسندیدہ بنا دیا (و كذالك سولت لی نفسی)

علاوہ ازیں آیاتِ قرآن سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فریب ہائے شیطانی اور اس کی طرف سے دلوں میں ڈالے جانے والے وسوسے

---

[1] بحث ہائے اقسامِ تقلید، شرائط تقلید ممدوح کورانہ تقلید کے اسباب اور لفظ ''تقلید'' کی شرح کے لیے اس تفسیر کی جلد اوّل میں ''حجاب تقلید'' کے باب کا مطالعہ کریں۔

بھی بت پرستی کانمود یااس کی بقاء ووسعت میں ایک عامل کی حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ قصہ بلقیس میں ایا تا ہے۔وجدتھاوقومھا یسجدون للشمس من دون اللہ وزین لھم الشیطان اعمالھم فصدھم عن السبیل فھم لایھتدون یعنی نے ملکہ سباوراس کی قوم کواس حال میں پایا کہ وہ خدا کوچھوڑ کرسورج کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں،شیطان نے ان کے اعمال کوان کی نظروں میں پسندیدہ بنایااورانہیں سیدھے راستے سے ہٹادیا۔لہٰذاوہ راہ ہدایت کونہیں جانتے۔(نمل۔ ۲۴)

لیکن یادرہے کہ ہوائے نفس اورشیطانی وسوسے اصل میں وہم وخیال،اندھی تقلیداورتعصب وضدیت سے نمود پاتے ہیں،یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہوائے نفس کاالگ سے ذکرنہیں کیاہے۔

(۳)..... بت پرستی غلامی اوراستعمارکاعامل ہے:

شرک وبت پرستی ہمیشہ جابروں اورآمروں کاہتھیاررہاہے۔اورکے وجوہات یہ ہیں۔

(۱) عوام کی علمی وفکری سطح جتنی پست ہوگئی اسی قدروہ جہلا طاغوتوں کے آلۂ کار بنے رہیں گے۔اس لیے استعمال تحریکیں ہمیشہ جاہل ونادان لوگوں میں پروان چڑھتی ہیں،استعماری سدااس کوکوشش میں رہتے ہیں کہ بے چارے عوام پرعلم کے دروازے بندرہیں تحقیق وجستجو کی کھڑکی نہ کھُلنے پائے اوروہ ہمیشہ ہمیشہ اندھی تقلید کی ذلتوں میں پڑے رہ جائیں جیسا کہ قرآن فرعون کے بارے میں کہتا ہے(فاستخف قومہ فاطاعوئہ)اس نے اپنی قوم کوذہنی طور پر پست کردیااوروہ اس کی اطاعت میں لگے رہے۔ (زخرف ۵۴)

بت پرستی کی بنیادجھوٹے وہم اوربے سروپاخیالات ہیں لہٰذایہ عوام کوبے وقوف بنانے کاایک بڑاموثر ذریعہ ہے،اسی لیے بت پرستی جابرحکام کے ہاتھوں میں ایک کارآمدہتھیاررہاہے۔

(۲) شرک لوگوں میں اختلاف وانتشار کاسبب ہے جوہرگروہ کوکسی نہ کسی چیز کی پرستش کرنے کی دعوت دیتاہے.....کچھ لوگ سورج کی پرستش کرتے،بعض چاندکوپوجتے اوربعض ہبل،لات یاعزیٰ کی پوجاکیاکرتے،حتیٰ کہ عرب میں ایک چھوٹی سی قوم قسم قسم کے بتوں کی پوجاکرنے کے باعث سینکڑوں گروہوں میں تقسیم ہوچکی تھی،لیکن توحیدایک ایسا حلقۂ اتصال ہے جس نے ان کے دِلوں کوجوڑکر ان کے خیالات میں یکسانیت پیداکرکےانہیں اتحادواتفاق کی نعمت سے ہم کنارکردیا۔

یہ یادرہے کہ جب تک اختلاف وافتراق کابازارگرم رہےگااس وقت تک استعمارکوآنکھوں سُکھ کلیجےٹھنڈک ہے،کیونکہ پھوٹ ڈالو اورحکومت کرو،استعمارواستثمار(لوگوں کوغلام بنانے اوراُن کی کمائی کھانے) کے لیے ایک قدیم ترین اصول ہے۔اس بناء پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ فرعونوں،نمرودوں اورابوجہلوں نے ہمیشہ بت پرستی کی طرف داری میں ایڑی چوٹی کازورلگایا۔

(۳) متکبرحکمران ہمیشہ اس بات کےخواہاں رہے ہیں کہ عوام ان کے آگے اس طرح جھکیں جیسے خدا کے سامنے جھکتے ہیں اوران کے احکام کومقدس فرمان کی طرح بے چون وچراں تسلیم کریں۔

ظاہر ہے کہ جولوگ لکڑی اور پتھر کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں میں سے زندہ خداؤں کو ماننے کے لیے بے عذر آمادہ ہوجاتے ہیں، اس لیے ہم دیکھ رہے ہیں کہ فرعون نے مصر میں اعلان کیا (انا ربکم الاعلیٰ) یعنی میں تمہارا سب سے بڑا خدا ہوں (نازعات۔ ۲۴) اس طرح فرعون نے خود کو تمام بتوں سے بڑا معبود قرار دیا۔

ان تین وجوہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ استعماری افکار ہمیشہ شرک و بت پرستی کی حمایت کرتے اور اسے فروغ دیتے رہے ہیں لیکن طریق انبیاء کہ جو جبر و استبداد اور ضعف و غلامی کی جڑیں کاٹتا رہا ہے وہ توحید و یکتا پرستی اور بیداری و آگاہی کا طریق راستہ ہے۔

اس مقام پر ہم ایک بار پھر حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی حدیث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا: ان بنی اُمیة اطلقو اللناس تعلیم الایمان ولم یطلقو العلیم الشرك لکی اذا حملوهم علیه لم یعرفوه[1]

یعنی بنی اُمیہ نے لوگوں کو اسلام و ایمان کی تعلیم حاصل کرنے کی آزادی دے رکھی تھی لیکن انہیں شرک کے بارے میں معلومات کے حصول کا موقع نہ دیا تاکہ جب چاہیں ان پر شرک کے رسوم ٹھونس دیں اور وہ سمجھ ہی نہ پائیں۔

یہ امر قرآن کریم میں صراحتاً تو نہیں مگر اشارتاً موجود ہے۔ جیسا کہ سورۂ سباء کی آیت ۳۱ میں ہے: جب ظالمین (مشرکین) دربارِ خداوندی میں حاضر ہوں گے اور ایک دوسرے کے خلاف باتیں کریں گے تو جو لوگ دنیا میں کمزور اور دبے ہوئے تھے وہ ان جابروں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن بن جاتے (ولو تریٰ اذ الظالمون موقوفون عند ربهم یرجع بعضهم الیٰ بعضٍ نِ القول یقول الذین استضعفو اللذین استکبرو الولا انتهم لکنا مومنین)۔

(۴)۔ عوامل شرک کے متعلق آخری بات:

ان تمام مباحث سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ دیگر اجتماعی امور کی طرح شرک و بت پرستی کا بھی کوئی ایک عامل نہیں ہے، بلکہ بہت سے عوامل کے نتیجے میں شرک کی نمود اور نشوونما ہوئی ہے..... ان میں انسان کی محسوسات سے رغبت اور محسوس خدا کی خواہش کے علاوہ علمی و فکری طور پر پسماندہ معاشروں میں فرضی قوتوں کے سہارے ڈھونڈنے کے باعث بت پرستی اور شرک کی بنیاد پڑتی ہے۔ مثلاً شفاعت، عزت اور تقرب الٰہی میں بتوں کے موثر ہونے کا فرضیہ یہ توہم کہ براہِ راست خدا کی عبادت نہیں کی جاسکتی، لہٰذا اس کے لیے کچھ وسائط ہونا ضروری ہیں اور انبیاءؑ و صلحاء کے نام پر بنائے ہوئے مجسموں کی طہارت و برکت کا نظریہ اور اسی طرح کے دیگر خیالات کے تحت شرک وجود میں آیا اور پروان چڑھا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اپنے آباء کی اندھی تقلید اور خداشناسی کے ضمن میں ضروری تحقیق و تلاش پر لوگوں کے آمادہ نہ ہونے، نیز جابر حکمرانوں کی طرف سے عوام کی شرک و بت پرستی سے رغبت کا غلط فائدہ اٹھانے اور اپنے شیطانی مقاصد کو پورا کرنے کی کوششیں بھی طول تاریخ میں شرک و بت پرستی کی پیدائش اور اس کے فروغ کا باعث بنتی رہی ہیں۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۱۵ مطبوعہ بیروت۔

شرکِ وبت پرستی کی پیدائش اوراس کی بقاء کےان قوی اسباب وذرایع کے مقابلے میں انبیاء کا توحیدی راستہ ہمیشہ کھلا رہا ہے جس پر قائم رہتے ہوئے ایک طرف وہ انسانوں کومحسوسات کی چار دیواری سے نکل کر مادہ سے بلندتر دنیا کی تسخیر کے لیے علمی وفکری پرواز کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ دوسری طرف سے انہیں خدا کی براہ راست عبادت کرنے، وہم وخیال کی باتوں سے آزاد ہونے، خدا کی بارگاہ میں اس کو سارے جہان کا پروردگار سمجھتے ہوئے سر جھکانے اور ہر حال میں اس کی پناہ حاصل کرنے کی تعلیم دے کر انسانیت کے بلند مقام پر پہنچاتے تھے۔ تیسری جہت سے انبیاء نے بنی نوعِ انسان کو جاہلانہ تقلید کی دیوار توڑنے، عالم ہستی کے بارے میں تحقیق وجستجو کرنے اور خدائے تعالیٰ کی آفاقی وانفسی آیات ونشانیوں کو جاننے پہچاننے کا شوق دلایا۔ انبیاء کے پیغام کی چوتھی جہت یہ ہے کہ انہوں نے انسانوں کو نااتفاقی اور تفرقہ بازی کے بتوں کو نابود کرنے، اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے، جابروں کی غلامی اور استحصالیوں کے پنجوں سے نکلنے کی ترغیب اور حوصلہ دیا۔

یہ ہیں کفر وایمان اور شرک وتوحید کے اصلی خدوخال!

اپنی اس گفتگو کو ہم تفسیر المیز ان میں علامہ طباطبائی کے ان ارشادات کے ساتھ تمام کرتے ہیں۔ جوانہوں نے سورۂ ہود کی آیات ۳۶ تا ۳۹ کے ذیل میں..... بت پرستی کیسے شروع ہوئی..... کے عنوان سے رقم فرمائے ہیں!

گذشتہ مباحث سے معلوم ہوا کہ انسان ہمیشہ معنوی چیزوں کو مجسم کرنے اور غیر محسوس چیز کو محسوس ہونے والی چیز کے قالب میں ڈھالنے کے لیے مجسمہ سازی، تصویر کشی اور نقاشی کے جھنجھٹ میں پڑا رہا ہے۔ اس کے علاوہ فطری طور پر وہ ہر طاقت اور بلندی کے سامنے جھکتا اوراس کا احترام کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسان معاشروں میں بت پرستی ہمیشہ جاری وساری رہی ہے، یہ گمراہی نہ صرف ترقی یافتہ معاشروں میں موجود ہے بلکہ وہ انسانی گروہ جنہوں نے اپنی زندگی کی بنیاد انکار خدا پر رکھی ہے۔ وہ بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ جیسا کہ ان کے ہاں بڑی شخصیتوں کے مجسمے نظر آتے ہیں اور وہ ان کے سامنے اسی طرح جھکتے اور ان کا احترام کرتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر زمانہ قدیم کے انسانوں کی بُت پرستی یاد آنے لگتی ہے، قطع نظر اس سے آج بھی مشرق ومغرب میں کروڑوں انسان بُت پرستی کو اپنائے ہوئے ہیں۔

اس سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ وہ لوگ بطور یادگار اپنے بزرگوں اور نامور افراد کے مجسمے بناتے یا ان کی لاشوں کو محفوظ کر لیتے تھے اور پھر احتراماً ان کے آگے جھکتے اور کورنش بجالاتے تھے اسی بنا پر آج بھی بت کدوں اور عجائب گھروں میں بہت سے بت دیکھے جاسکتے ہیں جو مختلف قوموں کے دینی پیشواؤں کے نام پر بنائے گئے ہیں..... جیسے گوتم بدھ اور برہما جی کے مجسمے سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

ان لوگوں کا مردہ افراد کے مجسموں اور بتوں کے آگے حاضری بھرنا ان شواہد میں سے ہے جو یہ بتاتے ہیں کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ افراد مرنے کے بعد ان سے دور نہیں ہوتے اور ان کی رُوحیں یہاں موجود رہتی ہیں نیز یہ کہ موت کے بعد ان کی توجہات اور افعال اور بھی کامل ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ مادی جسم اور مادی اسباب کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ پھر یہ اعتقاد یہاں تک راسخ ہوجاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں فرعونِ مصر باوجود یکہ اس کے بت کی پوجا ہورہی تھی اور وہ دعوائے خدائی کرتا تھا تاہم قوت وبرکت کے حصول کی خاطر وہ بھی دوسرے بتوں

کی پوجا کرتا تھا[1]

ہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم اس بحث کے آخر میں اس عجیب اور حیرت انگیز نکتے کی طرف اشارہ کریں جس کا ذکر مشہور مغربی مورخ ویل ڈورانٹ نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ نیز ہمارے زمانے میں دوسرے ملکوں کا سفر کرنے والے لوگوں نے اپنے مشاہدات کے ضمن میں اس کی تائید کی ہے کہ وہاں بعض بت ایسے بھی ہیں جو مرد وزن کی شرمگاہوں کی صورت میں ہیں اور اکثر لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔

ویل ڈورانٹ لکھتا ہے۔

وہ پہلی چیز جس کی پرستش کی گئی شاید وہ ''چاند'' تھا کہ جو بلند مقام پر موجود رہتا ہے۔ اور چاند عورتوں کا محبوب ترین معبود تھا اور وہ اسے اپنا خاص خدا سمجھ کر اس کی پوجا کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ چاند فضائے عالم پر حکومت کرتا ہے۔ اور برف و بارش اسی سے حاصل ہوتی ہے، حتیٰ کہ قدیم روایتوں کے مطابق مینڈک بھی بارش کے لیے چاند ہی کے آگے تضرع وزاری کرتے ہیں۔

وہ اس سلسلے میں مفصل بیان کے بعد اور سورج، زمین، پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کیے جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے۔

چونکہ قدیم ادوار کے لوگ اس بات سے بے خبر تھے کہ انسانی نطفے کا انعقاد ''اسپرز'' اور ''اوول'' کی باہمی آمیزش سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ یہ تصور کرتے تھے کہ انسان کی یہ عجیب پیدائش مرد وزن کی جنسی آلتوں سے ہو رہی ہے، وہ یہ بھی باور کرتے تھے یہ ان آلتوں میں ایک رُوح پوشیدہ ہے جو ایک انسان کی عجیب وغریب پیدائش کا سرچشمہ ہے پس ان کا یہی مفروضہ آہستہ آہستہ اس کی بنیاد بن گیا کہ وہ ان ہر دو انسانی آلتوں کی الوہیت کے قائل ہوئے اور ان کی شکلوں کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش کرنے لگے۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ویل ڈورانٹ یہ بھی لکھتا ہے کہ قدیم اقوام میں کوئی ایسی قوم نہیں ہوئی جو ان دونوں انسانی آلتوں کو پوجتی نہ رہی ہو۔[2]

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے اشارہ کیا ہے کہ اب بھی جاپان اور بھارت میں بڑے فخر وناز کے ساتھ مرد وزن کی آلتوں کی شکل کے بتوں کو پوجا کی جاتی ہے۔

اس بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اگر انسان انبیاء کی تعلیمات سے انحراف کرے تو کیسے کیسے بدبودار گڑھوں میں جا پڑتا ہے اور کیسے کیسے مضحکہ خیز اور شرمناک افعال انجام دینے لگتا ہے۔

اس دنیا میں رہنے والے پاکیزہ دین کے پیروکار توحید پرست مسلمین ومومنین اس پر جتنا بھی شکر ادا کریں وہ کم ہے کہ انبیاء کی تعلیمات نے انہیں شرک وبت پرستی کی آلودگی اور ایسے ہی دیگر بدترین طریقوں اور راستوں کی طرف جانے سے بچائے رکھا ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۰ صفحہ ۲۷۴ (ملخصاً)

[2] ویل ڈورانٹ۔ تاریخ جلد ا صفحہ ۹۵ (ملخصاً)

اقسام توحید

(۱) توحید ذات (۲) توحید صفات (۳) توحید عبادت (۴) توحید افعال

توحید کی بنیادی اقسام:

گذشتہ مباحث میں یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کے مطابق تمام انبیاء اور کتبِ آسمانی کی دعوت و پیغام کی جڑ بنیاد مسئلہ توحید ہی ہے جس کے لیے قرآن نے عقلی و منطقی دلائل دیئے ہیں۔ اب ہم اس مقام پر آ پہنچے ہیں کہ توحید کے مختلف گوشوں اور اس کے گوناگوں اقسام کی طرف متوجہ ہوں، ہماری اس بحث سے ''مسئلہ توحید'' کی اہمیت اور بھی واضح ہو گئی۔

علماء علم کلام کے درمیان یہ چیز معروف ہے کہ توحید کے اصلی اور بنیادی شعبے اور قسمیں چار ہیں۔

(۱) توحید ذات: خدا کی ذات یکتا اور بے مثل و بے نظیر ہے۔

(۲) توحید صفات: تمام صفات کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے اور یہ اس کی عین ذات ہیں۔

(۳) توحید عبادت: عبادت و پرستش بس اسی ذات ہی کے لیے ہے۔

(۴) توحید افعال: خلقت و آفرینش اور کائنات کا انتظام و تدبر یعنی ہر فعل اور ہر حرکت جو اس وسیع عالم میں ہے وہ اسی ذات واحد کی طرف سے ہے۔ (لاموثر فی الوجوء الا اللہ) البتہ جیسا کہ اس کی شرح آگے آئے گی یہ چیز انسان کے بااختیار و مختار ہونے سے کوئی منافات نہیں رکھتی۔

خود ''توحید افعال'' کی بھی کئی اقسام ہیں جن میں سے اہم ترین قسمیں یہ ہیں:

(۱) توحید خالقیت: خلقت و آفرینش صرف اسی کی طرف سے ہے۔

(۲) توحید ربوبیت: تدبر عالم تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے۔

(۳) توحید مالکیت: وہی تکوینی مالک و حاکم ہے۔

(۴) توحید حاکمیت: تشریع و قانون سازی اسی کا کام ہے۔

(۵) توحید اطاعت: صرف اسی کے فرمان یا اس کے مامورین کی اطاعت و فرمانبرداری ہو گی۔

یاد رہے کہ خدا کے افعال صرف یہ پانچ ہی نہیں ہیں۔ اس لیے توحید افعالی بھی ان میں منحصر نہیں ہے۔ لیکن اس کی پانچ اقسام ایسی ہیں کہ اصلی و بنیادی تقسیم انہی میں آ جاتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ایک اور نقطہ نظر سے ہم توحید کو دو قسموں یعنی توحید خاص اور توحید عام میں بھی تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) توحید خاص: اس میں توحید کی وہی قسمیں شامل ہیں جن کو اس طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے:

(۲) توحید عام: اس کے مختلف پہلو ہیں جن کو اس طرح تعبیر کیا جاسکتا ہے:

(الف) توحید در نبوت: سارے انبیاء ایک ہی ہدف ومقصد کے لیے سرگرمِ عمل رہے اور ان کا لائحہ عمل ایک ہی تھا، لہٰذا اساس دعوت اور ان کی ماموریت کے لحاظ سے ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے (لانفرق بین احد من رسلہ)

(ب) توحید در معاد: سب انسان قیامت کے روز ایک ہی عدالت میں حاضر ہوں گے۔

(ج) توحید در امامت: سب آئمہ ایک ہی بات کہتے رہے ایک ہی حقیقت کی پیروی کرتے رہے اور وہ سب ایک ہی نور تھے۔

(د) توحید در نظم وعدالت: تمام انسانوں کے لیے خدائی قانون ایک جیسا ہی ہے۔

(ر) توحید در جامعہ انسانی: خدا کے سب بندے ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں، ان میں رنگ، نسل اور زبان کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور سبھی مل کر ایک ہی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔

اس مختصر مقدمے کے بعد ہم آیاتِ قرآن کی طرف توجہ کرتے اور توحید کی اقسام میں سے ہر ایک کا جداگانہ تذکرہ کرتے ہیں۔

توحید ذات وصفات

اشارہ:

جب توحید ذات کا ذکر ہوتو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی کوئی شبیہ، نظیر اور مثال نہیں اور وہ ہر لحاظ سے واحد و یکتا اور یگانہ ولاشریک ہے۔

چونکہ گزشتہ مباحث میں معمولا ذات کا ذکر ہوا اور جن آیات قرآن پر نظر کی گئی وہ بھی توحید ذات ہی سے متعلق تھیں، اس لیے اب ہم اس سے صرف نظر کر رہے ہیں اور یہاں از روئے قرآن خود مسئلہ توحید کی تحقیق کریں گے۔

سب سے پہلے ان آیات پر توجہ کریں:

(۱) لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪ [۴۲:۱۱] (شوری)

(۲) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ⑬ (مائدہ)

(۳) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ① اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ② لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ ③ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ ④ [۱۱۲:۴] (سورہ اخلاص)

ترجمہ:

(۱) کوئی اس کی مثل نہیں اور وہ سننے دیکھنے والا ہے۔

(۲) جن لوگوں نے کہا کہ خدا تین میں سے ایک ہے۔ وہ کافر ہو گئے، خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں، اگر انہوں نے اپنی اس بات کو ترک نہ کیا تو ان کافروں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔

(۳) کہو..... خدا یکتا و یگانہ ہے، خدا بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کی کوئی شبیہ و مثال نہیں۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

اے وہ ذاتِ جو وہم وخیال سے بلند تر ہے:

(۱) پہلی آیت مختصر الفاظ میں توحید ذاتی کا ذکر کررہی ہے ،اس میں توحید کی گویا مکمل اور بولتی ہوئی تفسیر ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔(لیس کمثلہٖ شیءٍ)

یہ درست ہے کہ توحید ذات ایک ایسی چیز ہے جو خیال وقیاس اور وہم وگمان سے بلند ہے اور اس ذات کی اصلیت کو سمجھنا ہمارے لیے غیر ممکن ہے کیونکہ ہم ایسی چیزوں کا تصور کر سکتے ہیں جن کی مثل ہم نے دیکھ رکھی ہو یا دیکھی ہوئی چیزوں کا تجزیہ کرنے سے ان دیکھی چیزوں کو جانتے سمجھتے ہیں،لیکن وہ چیز کہ جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو وہ ہمارے وہم وعقل میں نہیں آتی۔ہم اس ذات کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے سمجھتے ہیں،لیکن وہ چیز کہ جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو وہ ہمارے وہم وعقل میں نہیں آتی۔ہم اس ذات کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ ''موجود'' ہے اور اس دُنیا کی وسعتوں میں اس کے افعال اور آثار کو دیکھ کر اس کے اوصاف سے اجمالی واقفیت حاصل کرتے ہیں،حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان حتیٰ کہ انبیاء ومرسلین اور ملائکہ مقربین بھی اس ذاتِ مقدس کی واقعیت سے شناسا نہیں ہیں۔

چنانچہ اسی بات کا اعتراف ہی اس کے بارے میں انسان کی معرفت کا آخری درجہ ہے، جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں ہے۔ (ماعرفناك حق معرفتك)'' ہم نے تجھے نہیں پہچانا جیسے تجھ کو پہچاننے کا حق ہے۔'' پس پیغمبر اکرمؐ کا یہ فرمان خدا کی نسبت انسان کے عرفان کا آخری نقطہ ہے۔

اس کی واضح دلیل موجود ہے جیسا کہ بحث توحید میں بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے لامتناہی اور غیر محدود ہے لہٰذا خدا کو اس کے غیر کے ذریعے سے نہیں پہچانا جا سکتا۔ جب ہماری عقل وفکر محدود ہے تو وہ ایک غیر محدود حقیقت کو کیسے پا سکتی ہے؟

اس تفسیر کے پیشِ نظر کلمہ کاف جملہ (لیس کمثلہٖ شیءٍ) میں زاہد ہے[1] یعنی کوئی ایسی چیز وجود نہیں رکھتی جو اس ذات کبریاء کی مانند ہو..... ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کے وجود،علم اور قدرت کی کوئی نشانی اس عالم ممکنات میں ظاہر ہو جائے لیکن کائنات میں کوئی بھی مخلوق اس کی مثل نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔

لیکن بعض علماء جو کاف کو زائدہ نہیں سمجھتے انہوں نے کہا ہے: آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مثل خدا جیسی کوئی چیز نہیں اور اس صورت میں مثل کا معنی ذات ہوگا، جیسے ہم کہتے ''تیرے مثل اس غلط راہ پر قدم نہیں بڑھائے گا (یعنی تجھ یہ کام نہیں کرنا چاہیے) بعض کا کہنا ہے کہ یہ ''مثل'' صفات کے معنوں میں ہے کوئی وجود خدا جیسے اوصاف نہیں رکھا، ظاہر ہے کہ ہمارے بحث میں ان تینوں تفسیروں کا نتیجہ ایک ہی ہے

---

[1] تفسیر روح المعانی آیا ہے کہ بعض مفسرین اس آیت میں لفظ ''مثل'' کو زاہدہ تصور کرتے ہیں لیکن ابوحیان نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''لغتِ عرب میں اسم کبھی زائدہ نہیں لایا جاتا۔

اگر چہ وہ مختلف طریقوں سے اس مطلب تک پہنچتی ہیں۔

یہاں اس حدیث کی طرف توجہ کرنا چاہیے جس میں ہم یوں پڑھتے ہیں: ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے یہ سوال کیا۔ (ما راس العلم) یعنی علم کا اعلیٰ ترین مرحلہ کونسا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا (معرفة الله حق معرفته) خدا کی شناخت کرنا جیسا کہ شناخت کا حق ہے۔ پھر فرمایا ان تعرفهٗ بلا مثالٍ لا شبة وتعرفه الها واحدًا خالقاً قادرًا اوّلا واٰخراً وظاهراً وباطناً، لا كفوله ولا مثل له فذاك معرفةُ اله حق معرفته[1] یعنی جان لو کہ اس کی نہ مثال ہے نہ شبیہ..... وہ معبود، یکتا، خالق، قادر، اوّل، آخر، ظاہر اور باطن ہے، اس کی نہ کوئی مثال ہے نہ نظیر پس یہ ہے کہ معرفتِ خدا جیسے معرفت کا حق ہے۔

واضح ہے کہ ''حق معرفت'' نسبتی حیثیت رکھتا ہے۔ ویسے اس کی معرفت تک تو کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا۔

نہ برواج ذاتش پرد مرغ وحی
نہ برذیل وصفش رسد دست فہم
چوخا صا دریں راہ فرس رندہ اند
بہ ''لااحصٰی'' ازتک فرد ماندہ اند

(۲) جولوگ کہتے ہیں کہ خدا تین اقانیم میں سے ایک اقنوم ہے[2]

دوسری آیت میں قرآن ان کو کافر قرار دے رہا ہے (لقدْ كفر الذين قالو ان الله ثالثِ ثلاثةٍ) اس طرف توجہ کرنا چاہیے کہ یہ آیت نہیں کہتی کہ جو تین خداؤں کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ کافر ہیں بلکہ وہ کہہ رہی ہے کہ جو لوگ خدا کو تیسری اصل یا تیسری ذات تصور کرتے ہیں وہ کافر ہیں۔

مفسرین نے اس کا مطلب سمجھنے کیلئے کئی راہیں اختیار کی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو خدا کو ''اب'' ''ابن'' روح القدس تین میں سے ایک جوہر سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تعدد کے باوجود وہ واحد و یکتا ہے جیسے لفظ ''خورشید'' کہ اس میں سورج کا وجود، روشنی اور حرارت تینوں ہی شامل ہیں اور وہ وجودی طور پر ایک ہی ہے[3]

ایک اور تعبیر کے مطابق اس آیت میں اسی عقیدہ توحید در تثلیث'' کا ذکر ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر چہ خدا تین ہیں لیکن وہ ایک ہی ہیں (تاہم یہ بات غیر معقول ہے کیونکہ تین کا عدد کبھی ایک کے برابر نہیں ہوتا مگر یہ کہ ان دونوں اعداد میں سے ایک حقیقی اور دوسرا مجازی ہو)

تفسیر قرطبی میں کہا گیا ہے۔ کہ یہ آیت نصاریٰ کے خاص فرقوں کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی ملکیہ یا ملکانیہ یعقوبیہ اور نسطوریہ کہ جو

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۱۴۔

[2] ''اقنوم'' کے معنی اصل اور ذات کے ہیں اور اس کی جمع اقانیم ہے، یہ وہ تعبیر ہے جو مسیحی حضرات تین خداؤں اور مسئلہ تثلیث کے لیے پیش کرتے ہیں۔

[3] تفسیر فخر رازی جلد ۱۲ صفحہ ۶۰۔

معتقد ہیں کہ ''اب'' ''ابن'' روح القدس'' (باپ خدا۔ بیٹا خدا۔ روح القدس) تینوں ایک ہی ذات ہیں [1]

لیکن ظاہراً یہ اشتباہ ہے، کیونکہ یہ عقیدہ تو تمام مسیحیوں کا ہے کہ وہ ''تثلیث میں توحید'' کے قائل ہیں علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ تینوں میں سے ہر ایک خدا ہے خدا کا فقط ان میں سے ہر ایک پر منطبق ہے اور (باپ۔ بیٹا، روح القدس) تین ہیں لیکن دراصل ایک ہی ہیں [2]

مگر ظاہر آیت سے مراد کچھ اور ہے، اصل بات یہ ہے کہ خدا کو تیسرا اقرار دینا کفر ہے بلکہ خدا کو مادی موجودات کے مانند اور ہم پلہ تصور کرنا اور تیسری ذات شمار کرنا یا بہ الفاظ دیگر اس میں وحدت عددی کا قائل ہونا کفر ہے (غور کریں)

اس مفہوم و مطلب کی عمدہ تشریح امیر المومنینؑ کے ایک فرمان میں موجود ہے۔

جنگِ جمل کے دوران ایک اعرابی حضرت امیر المومنینؑ کی خدمت میں آیا اور کہا: یا حضرت! کیا آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے؟ اچانک لوگوں نے اس پر ہجوم کیا اور کہنے لگے: اے اعرابی! کیا تو نہیں دیکھتا کہ امیر المومنینؑ بہت سے اہم مسائل کی طرف متوجہ ہیں اور پھر ہر بات کا ایک موقع ہوتا ہے۔

لیکن امیر المومنینؑ نے فرمایا: (دعوہ فان الذی یریدہ الاعرابی ھو الذی نریدہ من القوم) اس کو چھوڑ دو کہ کچھ یہ اعرابی ہم سے پوچھ رہا ہے وہی چیز ہم اپنے دشمن گروہ میں دیکھنا چاہتے ہیں (وہ توحید ہی ہے کہ جس کی خاطر ہم ان سے جنگ کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا: اے اعرابی! یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے تو اس کے چار معنی ہیں، ان میں سے دو معنی ایسے ہیں جو خدا کے بارے میں درست اور روا نہیں اور دو معنی وہ ہیں جو اس ذات کے لیے ثابت اور مسلم ہیں۔

وہ دو معنی جو اس کے لیے روا نہیں، یہ ہیں کہ کوئی کہے ''خدا واحد ہے'' اور اس کا مقصد واحد عددی ہو یا یہ درست نہیں..... اس لیے کہ جو چیز جیسی دوسری نہیں رکھتی وہ اعداد میں داخل نہیں ہوتی اور اس کے بارے میں ایک۔ دو کے اعداد غیر ضروری ہیں) پھر کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو یہ کہتا ہے کہ انہ ثالث ثلاثۃٍ یعنی خدا تین میں تیسرا ہے، قرآن اسے کافر گردانتا ہے۔ اسی طرح جو یہ کہے کہ وہ احد ہے اور اس کے خیال میں واحد نوعی کی بات ہو تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی مثال اور شبیہ متصور ہو سکتی ہے۔ جب کہ وہ کسی نوع میں شمار ہونے سے بلند و برتر ہے۔

ہاں توحید کے دو معنی جو خدا کی شان کے لائق ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ کوئی کہے ''وہ واحد ہے'' یعنی اس کی کوئی مثال و شبیہ نہیں ہے اور ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے دوسرا معنی جو توحید الٰہی کے لیے مناسب ہے وہ یہ ہے کہ کوئی کہے خداوند متعال احدی المعنی یعنی اس کی ذات میں وہم، عقل اور خارج میں ہرگز تقسیم نہیں ہو سکتی یقیناً ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے [3]

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۴ صفحہ ۲۲۴۶ اور یہی بات دیگر تفسیروں جیسے رُوح البیان و المنار میں بھی اس آیت کے ذیل میں آئی ہے۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۶ صفحہ ۷۳۔

[3] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۰۶ حدیث ۱

(۳) آیات کے تیسرے اور آخری مجموعے میں جو سورۂ اخلاص میں شامل ہیں.....خدائے تعالیٰ کی یگانگی و یکتائی کو بطریق احسن بیان کیا گیا ہے۔ ان آیتوں میں وہ جامعیت پائی جاتی ہے کہ یہ بیک وقت نصاریٰ کی تثلیث کو نابود کرتی ہیں مجوس (آتش پرست پارسیوں) کے عقیدۂ ثنویت (دوگانہ پرستی) کی نفی کرتی ہیں اور مشرکین کے متعدد معبودوں (دیوتاؤں) کے مقابل خدا کی وحدانیت کو ثابت کرتی ہیں سب سے پہلے فرمایا کہو.....خدا یکتا و یگانہ ہے (قل هو الله احد)

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے توحید کے متعلق مختلف سوالات کیے جاتے تھے، آپ کو حکم دیا گیا کہ ان سب کا جواب ایک مختصر سی آیت میں دے دیں، جس کے الفاظ کم اور معانی بہت زیادہ ہیں یعنی یہ قلیل کلمات بہت سے مضامین اور کثیر دلائل پر مشتمل ہیں۔

''احد'' اصل میں ''وحد'' تھا جس کا مادہ ''وحدت'' ہے اس کا واؤ ہمزہ میں تبدیل ہو گیا اور یوں، ''وحد'' سے ''احد'' بن گیا ہے اس لیے بعض علماء کے نزدیک ''واحد'' اور ''احد'' کا معنی ایک ہی ہے بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے کہ ان دونوں لفظوں کا معنی ایک ایسی ذات ہے، جس کی کوئی مثال نہیں[1]

لیکن بعض لوگوں نے ''واحد'' اور ''احد'' میں فرق کیا اور کہا ہے کہ ''احد'' خدا کی خاص صفات میں سے ہے اور یہ انسان یا کسی اور شے پر نہیں بولا جاتا، بعض کا کہنا ہے کہ ''واحد'' نفی و اثبات دونوں میں استعمال ہوتا ہے جب کہ ''احد'' صرف نفی کے لیے لایا جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ''احد'' میں وحدتِ ذات اور ''واحد'' میں وحدت صفات کی طرف اشارہ ہے، ''احد'' اس ذات پر بولا جائے گا، جو کثرت کو قبول نہ کرتی ہو، یعنی خارج اور ذہن میں اس کے لیے کثرت کا شائبہ نہیں لہٰذا اسے شمار نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن ''واحد'' کے بعد دو اور تین کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''احد'' اس ذات کے بسیط ہونے اور ہر قسم کے اجزاء سے پاک و منزہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ ''واحد'' اس کی یکتائی اور بے مثل و بے مانند ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے کسی کے لیے بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے، مثلاً اتوار کو یوم الاحد کہتے ہیں اور قرآن میں خدا کو ''الٰہ واحد'' کہا گیا ہے (بقرہ۔ ۱۶۳) اسی طرح ''احد'' اثبات کی صورت میں بھی آیا ہے جیسے آیت زیرِ بحث اور دیگر آیاتِ قرآن میں[2] ہے

بہرحال قول صحیح یہی ہے کہ ''احد'' ''احد'' دونوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں، بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ''اللہ احد'' خدائے تعالیٰ کی معرفت کے لیے کامل ترین جملہ ہے جو عقل انسانی میں آ سکتی ہے۔ کیونکہ ''الٰہ'' میں ایسی ذات کی طرف اشارہ ہے جو تمام صفات کمال یعنی تمام صفات ثبوتیہ کو چاہے۔ اور ''احد'' اس ذات سے تمام صفات سلبیہ کی نفی پر دلالت کرتا[3] ہے۔

قرآن مجید ان آیات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے: خدا قائم بالذات، بے نیاز ہے، ہر حاجت مند اسی کی طرف توجہ کرتا اور اسکی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے (الله الصمد)

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۲۲۔

[2] مثلاً سورۂ توبہ آیت، سورۂ نساء آیت ۴۳، سورۂ مریمؑ آیت ۲۶، سورۂ بقرہ آیت ۱۸۰ سورۂ کہف آیت ۱۹ وغیرہ ہم۔

[3] تفسیر فخر ارازی جلد ۳۲ صفحہ ۱۸۰

''صمد'' مقاییس اللغۃ کے مطابق اس میں بنیادی طور پر دو چیزیں شامل ہیں..... پر ہونا، قصد وارادہ رکھنا اور استحکام وصلابت..... جب یہ لفظ خدا کے لیے بولا جائے تو مطلق استغناء اور کامل بے نیازی مقصود ہوتی ہے، کیونکہ تمام حاجت منداس کی طرف رجوع کرتے ہیں، نیز اس سے خدا کا واجب الوجود اور قائم بالذات ہونا مراد ہوتا ہے۔

ممکن ہے ان دونوں باتوں کی بنیاد ایک ہی ہو اور اس سے بھی ایسی ذات مراد ہو جس میں استحکام وصلابت اور قیام بالذات پایا جاتا ہے۔ اس طرح وہ ذات کامل طور پر بے نیاز ہوگی کہ سبھی نیاز منداس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے لفظ ''صمد'' کے ذریعے تمام صفات ثبوتیہ وسلبیہ کی طرف اشارہ پایا جائے گا یہی وجہ ہے کہ روایات میں ''صمد'' کے بہت سے معنی ذکر کیے گئے ہیں جو خدا کی کسی نہ کسی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہیں [1]

بہرحال اس ایت کا پہلی آیت سے رابطہ وتعلق پوشیدہ نہیں کہ جس میں خدا کی وحدانیت کا تذکرہ ہوا ہے، اس لیے کہ ''واجب الوجود'' بے نیاز ہوگا اور تمام محتاجوں کا اس کی طرف رجوع کرنا ضروری اور ایسی ذات کی یکتائی ویگانگت اس کا لازمہ ہے۔

اس سے اگلی آیت بھی حقیقت توحید پر زور دیتی ہے کیونکہ یہ نصاریٰ کے تین خداؤں (باپ، بیٹا، روح القدس) کے عقیدے کی تردید کرتی ہے، یہودیوں کی طرف سے عزیز کے خدا کا بیٹا ہونے کو باطل قرار دیتی اور مشرکین عرب کے اس نظریئے کی تغلیط کرتی ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں چنانچہ ان بے اصل اعتقادات اور ایسے ہی دیگر مفروضات کی نفی کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ نہ تو اس کی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے (لم یلد ولم یولد)

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جو وجود فرزند یا باپ رکھتا ہو یقیناً اس کی مثال اور شبیہ بھی ہوتی ہے، کیونکہ باپ اور بیٹے کی مماثلت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے لہٰذا ایسا وجود یکتا و بے نظیر نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اس بیان کو مکمل کرنے کے لیے فرماتا ہے۔ اس کی کوئی شبیہ ومثال نہیں ہے (وَلم یکن له کفواً احداً)

اس ترتیب کے ساتھ اس سورۂ کی آیات خداوند کریم کی یکتائی ویگانگی اس ذات کی واحدانیت اور اس کی مثل ونظیر کے نہ ہونے کی تاکید پر تاکید کرتی چلی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر اس سورۂ کی ہر آیت اپنے سے پہلی آیت کی تفسیر کرتی ہے اور مجموعی طور پر توحید ذات کو جامع اور کامل طریقے سے واضح کرتے ہوئے توحید کے شجر ثمر دار کو اس کے تمام تر شاخ وبرگ کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲۷ میں سورۂ اخلاص کی تفسیر میں لفظ ''صمد'' پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے۔

توضیحات

(۱) توحیدذات کا گہرا مفہوم:

بہت سے لوگ توحید کے معنی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور دو نہیں ہیں۔ جیسا کہ امیر المومنینؑ کی فرمودہ حدیث میں آیا ہے جو انہیں آیات کی تفسیر میں مذکور ہوئی۔ توحید کے لیے یہ تعبیر درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مفہوم واحد عددی ہے (یعنی خدا کے ساتھ کسی دوسرے کا تصور ممکن نہیں لیکن وہ وجود خارجی نہیں رکھتا) یقیناً یہ قول درست نہیں اور صحیح یہ ہوگا کہ کہا جائے .....خدا ایک ہے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کا تصور نہیں آتا۔ بہ الفاظ دیگر خدا کی کوئی مثل، نظیر اور شبیہ نہیں ہے کہ نہ کوئی چیز اس جیسی ہے اور نہ وہ کسی چیز جیسا ہے اس لیے کہ ایک بے نہایت ولامحدود وجود اسی صفت کا مالک ہوتا ہے۔

اسی دلیل کے مطابق ہم ایک حدیث میں بھی دیکھتے ہیں کہ امام جعفر صادق نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا (ای شئی اللہ اکبر) اللہ اکبر کا کیا مطلب ہے؟ اس نے عرض کیا (اللہ اکبر من کل شیءٍ) خدا ہر چیز سے بڑا ہے۔ امامؑ نے فرمایا (فکان ثم شیءٍ فیکون اکبر منہ) آیا کوئی چیز اس کی مانند ہے کہ خدا اس سے بڑا ہے؟ صحابی نے عرض کیا: (فما ھو) پھر اللہ اکبر کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا (اللہ اکبر من ان یوسف) خدا اس سے بلند ہے کہ اس کا وصف بیان ہو سکے [1]

(۲) توحیدصفات کا مفہوم:

جب ہم کہتے کہیں توحید کی ایک شاخ ''توحیدصفات'' بھی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ جس طرح اپنی ذات میں ازلی وابدی ہے اسی طرح اس کی صفات .....علم، قدرت، ارادہ وغیرہ بھی ازلی وابدی ہیں۔ دیگر یہ کہ اس کی یہ صفات زائد بر ذات نہیں بلکہ عین ذات ہیں اور پھر یہ صفات ایک دوسری سے جدا نہیں یعنی علم وقدرت وغیرہ باہم ایک ہی ہیں اور عین ذات بھی ہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ جب ہم اپنی طرف نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ابتداء ہم صفات سے عاری تھے اور پیدائش کے وقت علم وقدرت وغیرہ نہیں رکھتے تھے۔ بعد میں ہم آہستہ آہستہ پلے بڑھے تو یہ صفات پیدا ہوئیں، لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ ہماری یہ صفات ہماری ذات پر زائد ہیں اور ممکن ہے کہ ایسا وقت بھی آ جائے کہ ہم تو ہوں مگر یہ زور بازو اور علم ودانش ہم میں موجود نہ ہوں۔ نیز یہ بھی واضح ہے کہ یہ علم وقدرت ہمارے اندر جدا جدا ہیں۔ یعنی قوت بازوؤں میں ہے اور علم ہماری رُوح میں جاگزیں ہے۔

لیکن خدا کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے، اس کی تمام ذات علم اور وہ بذاتہٖ قدرت ہے پس اس کی سب صفات مرکز وحدت میں باہم یگانگت رکھتی ہیں۔ البتہ ہم مانتے ہیں کہ ہم ایسی صفت سے عاری ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے اس مطلب

---

[1] معانی الاخبار شیخ صدوق صفحہ ۱۱ حدیث ۱۔

ومفہوم کو سمجھنا بہت مشکل ہے اور سوائے عقلی دلائل کے اس تک ہماری رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں۔

(۳) توحید صفات کی دلیل:

مخلوقات کی صفات میں گم ہو جانا اور توحید صفات کے مفہوم کو سمجھ نہ پانا ہی اس کا سبب بنا کر بہت سے ماہرین علم کلامِ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں صحیح راستے سے دُور جا پڑے، ان میں سے ایک گروہ ''کرامیہ'' کا ہے جو محمد بن کرام سیستانی کے پیرو ہیں.....وہ کہتے ہیں کہ آغاز میں خدا کسی صفت سے متصف نہ تھا اور بعد کے زمانہ میں وہ تمام صفات کا مالک بنا ہے۔

یہ قول یہ گفتار اس قدر غلط ہے اور ناپسندیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ ایک شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ شروعات میں خدا عاجز وناتواں تھا اور بعد میں صاحب قدرت ہوا پھر یہ قدرت کس نے اسے دی اور کس نے اسے علم وآگاہی سے ہم کنار کیا؟

اس سلسلے میں یہ احتمال دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی مراد صفاتِ فعلی رہی ہیں۔ جیسے خالقیت اور رازقیت کہ جن کے لیے ضروری ہے کہ خدا کسی چیز پر قدرت ہونا، اس کو وجود میں لانے سے الگ ہے)۔

لیکن توحید صفات پر گفتگو کرنے کا صفاتِ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہمارا رُوئے سخن خدائے تعالیٰ کی صفات ذات میں سے علم وقدرت کی طرف ہے، جیسا کہ آگے تفصیل سے بیان ہوگا۔ صفات ذات اور صفات فعل کا معاملہ باہم گرا لگ الگ ہے۔ صفات فعل ایسی ہیں کہ ہماری عقل افعال خداوندی کا مشاہدہ کرنے کے بعد ان سے واقف ہوتی اور اور انہیں ذات الٰہی سے نسبت دیتی ہے۔ (اس چیز کی شرح آپ کو اسی کتاب میں ملے گی)

آیات قرآن میں وحدت صفات کے اثبات کی طرف واضح ترین اشارہ (لیس کمثلہٖ شیءٌ) اور (قل ھو اللہ احد.....) ہے کہ جن کی تفسیر اوپر گزر چکی ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ذاتِ مقدس میں کسی طرح کی دوئی کا گزر نہیں ہے۔

اس بارے میں عقلی دلائل کو رُو سے درج ذیل نکایت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے:

(۱) گذشتہ مباحث سے ثابت ہو چکا ہے کہ خدائے تعالیٰ ایک ایسا وجود ہے جو ہر جہت سے لامحدود ہے اس دلیل کے مطابق کوئی صفت کمال اس کے وجود سے باہر نہیں اور جو کچھ بھی ہے وہ اس کی ذات میں جمع ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری صفات حادث ہیں، یعنی ہم میں آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم وجودی طور پر محدود ہیں اور اسی محدودیت کے باعث اوصاف وکمالات ہماری ذات سے باہر ہیں۔ کہ وقتاً فوقتاً ہم انہیں حاصل کرتے ہیں، لیکن ذات الٰہی کہ جو کمالِ مطلق ہے تو کوئی وصف کیونکر اس سے باہر تصورّ کیا جا سکتا ہے؟

(۲) اگر ہم اس کی صفات کے زائد بر ذات ہونے کے قائل ہو جائیں اور اس کی صفات مثل علم وقدرت کو اس سے الگ سمجھیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے مرکب یعنی جوہر وعرض بلکہ بہت سے عوارض کا مجموعہ تصور کیا جائے حالانکہ سابقہ بیانات میں ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی ذات میں عقلی وخارجی کسی طرح کی ترکیب وتقسیم نہیں ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں بڑے ہی لطیف انداز میں توحید صفات کی طرف اسی طرح اشارہ فرمایا ہے۔

وکمال الاخلاصِ لهٗ نفی الصفاتِ عنه ، لشهادة کل صفةٍ انها غیر الموصوفِ وشهادة کل موصوفٍ انه غیر الصفَةِ، فمن وصف الله سبحانهٗ فقدْ قرنَهٗ۔ ومن قرنهٗ فقد ثناهُ، ومن ثناهُ فقد جزأَهٗ، ومن جزأهٗ فقد جهلهٗ۔

کمال اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے۔ کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے، ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی چیز ہے، لہٰذا جس نے ذاتِ الٰہی کے لیے صفات تسلیم کیں اس نے ذاتِ کا دوسرا ساتھی مان لیا جس نے اس کی ذات کا کوئی اور ساتھی مانا اس نے دوئی پیدا کی جس نے دوائی پیدا کی، اس نے اس کے لیے جز بناڈالا اور جس نے اس کے لیے جزء مان لیا وہ اسے جان نہیں سکا۔

امیر المومنینؑ اس مختصر سی عبارت میں نہایت مدلل طریقے سے خداوند تعالیٰ سے نفی صفات (جیسے ممکنات کی صفات جو زائد بر ذات ہیں) کے بعد واضح طور بیان فرماتے ہیں کہ جو خدا کی ایسی صفات کا قائل ہو وہ اسے قابلِ تقسیم یا مرکب تصور کرتا ہے اور یہ اس کی انتہائی جہالت اور معرفت سے دور ہونے کی علامت ہے۔

توحید در عبادت

اشارہ:

اقسام توحید میں سب سے اہم توحید در عبادت ہے، اس کے سوا ہم کسی کی پرستش نہیں کرتے، اس کے غیر کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے اور اس کے بغیر کسی کے آگے سر بہ سجود نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دعوتِ انبیاء کی بنیاد اور آئین (اسلامی) کی پہلی شق یہی مسئلہ توحید در عبادت ہے، اور مشرکین کے ساتھ بحث و تکرار کا محور بھی یہی ہے۔

توحید عبادت، توحید ذات و صفات کا لازمہ ہے۔ کیونکہ جب یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ وہ واجب الوجود اور اس کا غیر ممکن الوجود اور محتاج ہے تو پھر اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ عبادت صرف اور صرف اسی کی ہو۔ وہی کمال مطلق ہے کوئی اور نہیں۔ عبادت کا مقصد کمال کی طرف جانا ہے لہٰذا عبادت اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیات قرآن دعوت توحید سے بھری ہوئی ہیں، ان میں دیئے گئے اس اہم پیغام تک رسائی کے لیے ہم چند آیات کا بطور خاص ذکر رہے ہیں اور اس ضمن کچھ اور آیتوں کو بھی سامنے لائیں گے۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجدی کے حضور پیش ہوتے اور آیات ذیل کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۱) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ [۱۶:۳۶] (نحل)

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (انبیاء)

(۳) لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ [۷:۵۹] (اعراف)

(۴) وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ [۹:۳۱]

(۵) قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ

اَهۡوَآءَكُمۡ ۙ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۵۶﴾

(انعام)

(۶) وَاعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتّٰى يَاۡتِيَكَ الۡيَقِيۡنُ ﴿۹۹﴾ ﴿الحجر: ۹۹﴾

(۷) وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيۡنُ الۡقَيِّمَةِ ﴿۵﴾ ﴿البینة: ۵﴾

(۸) وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ﴿۳۶﴾ ﴿مریم: ۳۶﴾

(۹) يٰعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِىۡ وَاسِعَةٌ فَاِيَّاىَ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾ ﴿العنکبوت: ۵۶﴾

(۱۰) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ﴿النور: ۵۵﴾

(۱۱) وَلَا يَاۡمُرَكُمۡ اَنۡ تَتَّخِذُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرۡبَابًا ؕ اَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡكُفۡرِ بَعۡدَ اِذۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۰﴾ [۳:۸۰] ﴿آل عمران: ۸۰﴾

(۱۲) وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّظِلٰلُهُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ ﴿الرعد: ۱۵﴾

ترجمہ:

(۱) ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب برتیں، ان میں ایک گروہ کو خدا نے ہدایت دی اور ایک گروہ پر گمراہی چھا گئی، پس تم روئے زمین پر چلو پھرو، اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

(۲) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ جس کی طرف یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔

(۳) ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم! تم لوگ صرف خدائے یگانہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (اگر تم کوئی اور راہ اپناؤ گے تو) میں تمہارے اوپر عذاب کے بڑے دن سے ڈرتا ہوں۔

(۴) انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اس سے پاک ومنزہ ہے، جیسے وہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔

(۵) (اے نبی) کہو کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے، جنہیں خدا کے سوا تم پکارتے ہو، کہو کہ میں تمہاری ہوا وہوس کی پیروی نہیں کرتا، ایسا کروں تو گمراہ ہوجاؤں گا، اور ہدایت پانے والوں سے نہ ہوں گا۔

(۶) اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتا رہ..... یہاں تک کہ تجھے یقین (موت) آجائے۔

(۷) اور انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ اپنے دلوں کو خالص کرکے اور یکسو ہوکر اللہ کی بندگی کریں، نماز قائم کریں اور زکات دیں۔ یہی نہایت سیدھا اور صحیح دین ہے۔

(۸) اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

(۹) اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی کرتے رہو۔

(۱۰) وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح بجالاتے ہیں، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ یقیناً وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا کی تھی۔

(۱۱) وہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم انبیاء اور فرشتوں کو اپنے معبود بنالو، کیا وہ تمہیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جب کہ تم مسلمان ہوچکے ہو۔

(۱۲) جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی یا مجبوری سے خدا کے لیے سجدہ ریز ہے۔ اسی طرح ان رات اور ان کے سائے (بھی سجدہ گزار ہیں)

مفردات کی تشریح:

''عبادت'' و ''عبودیت'' ہر دو کا معنی اظہار خضوع وفروتنی ہے۔

المفردات میں راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ ان ہر دو الفاظ کا عمیق ترین مفہوم یہ ہے کہ اس ذات کے سامنے انتہائی خضوع وعاجزی کرنا کہ جس کے انعام واکرام بے انتہا ہوں.....یعنی خداوند قدوس۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کی اساس لفظ ''عبدٌ'' ہے جس کا معنی ''بندہ'' ہے البتہ کبھی اس کا اطلاق ہر انسان پر ہوتا ہے خواہ وہ آزاد یا غلام ہو (جیسے لسان العرب وکتاب العین میں ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ سبھی انسان خدا کے بندے ہیں اور کبھی لفظ ''عبدٌ'' خاص طور غلام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ راغب اصفہانی مزید کہتا ہے کہ ''عبدٌ'' کی چار اقسام ہیں:

(۱) ''عبدٌ'' بہ معنی غلام جن کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔

(۲) ''عبدٌ'' بہ معنی مخلوق۔

(۳) ''عبدٌ'' بہ معنی خادم جو مقام خدمت وعبودیت میں ہو، اس کی دو قسمیں ہیں۔

۔ بندہ خدا..... بندۂ دنیا.....لہٰذا کبھی عباد الرحمان کہا جاتا ہے۔ اور کبھی عبید الدنیا۔

(۴) مجمع البحرین میں ہے کہ ''عبدٌ'' کبھی حزب وگروہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے۔

آیہ شریفہ: فادخلی فی عبادی (فجر۔۲۹) یعنی میرے بندوں کے گروہ میں داخل ہو جا یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ''عبادت'' کی دو اقسام ہیں۔

(۵) عبادت اختیاری.....جس کا آیاتِ قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

(۲) عبادت غیر اختیاری.....جیسے قرآن میں آیا ہے۔ وان من شیءٍ الا یسبحُ بحمدِہٖ۔

(اسراء ۴۴) یعنی ہر موجود خدا کی حمد کر رہا ہے۔

مجمع البحرین میں طریحی کہتے ہیں، حکماء کے نزدیک عبادت کی تین قسمیں ہیں:

(۱) جسمانی عبادت.....جیسے نماز، روز.....

(۲) روحانی عبادت.....جیسے توحید، نبوت، معاد وغیرہم عقائد دینی پر یقین رکھنا۔

(۳) اجتماعی عبادت.....جیسے دشمن کے خلاف جہاد اور مجاہدین کی کمک کرنا۔

طاغوت ''مبالغے'' کا صیغہ ہے اور اس کا مادہ ''طغیان'' [1] ہے جس کا معنی حد سے تجاوز ہے۔ لہٰذا لفظ طاغوت کا اطلاق ہر سرکش اور

---

[1] بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں ''طغوت'' تھا پھر لام الفعل کو عین الفعل کی جگہ لایا گیا اور ''واؤ'' ماقبل مفتوح ''الف'' میں تبدیل ہوا اور یہ ''طاغوت'' ہو گیا۔

متجاوز پر ہوتا ہے جیسے شیطان، جادوگر، ظالم حاکم اور غلط حاکم اور غلط راستے کو بھی طاغوت کہا جاتا ہے ہے، یہ لفظ مفرد وجمع ہر دوصورتوں میں مستعمل ہے۔

مجمع البیان میں طبرسی نے آیۃ الکرسی کی تفسیر میں ''طاغوت'' کے پانچ معنی ذکر کیے ہیں یعنی شیطان، کاہن، جادوگر سرکش جن وبشر بت.....لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام اقوال کی بازگشت، ایک ہی جامع مفہوم کی طرف ہے کہ جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے۔

آیات کی جمع آوری تفسیر

معبود فقط وہی ہے:

(۱) پہلی آیت میں ''توحید عبادت'' کو تمام انبیاء کا بنیادی ہدف ومقصد قرار دیا گیا ہے، فرمایا: ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب برتیں۔

(ولقد بعثنا فی کل امةٍ رسولاً ان اعبدوا اللہ واجتنبو الطاغوت)

یہ قول ان لوگوں کے جواب میں ہے جن کا تذکرہ اس سے پہلی آیت (۳۵ نحل) میں آیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ خدا یہ چاہتا ہے ہ ہم بت پرستی کریں اور وہ ہمارے اس عمل پر راضی ہے۔ ان کے اس بے اصل نظریئے کے رد میں قرآن کہتا ہے ''بلا استثناء تمام انبیاء کی دعوت وتبلیغ وعبادت خدا کے لیے تھی سبھی نے غیر خدا کی پرستش سے روکا، یہ کیسی جھوٹی نسبت ہے جو تم خدا کی طرف دے رہے ہو، پھر فرماتا ہے کہ ''انبیاء کی دعوت کے بعد لوگوں کے دو گروہ بن گئے..... پہلا گروہ ان کا مخالف تھا جس پر گمراہی چھا گئی۔ (ومنهم من حقت علیه الضللة)

پھر حکم دیا جارہا ہے، پس تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا (فسیروا فی الارض فانظرو کیف کان عاقبَةُ المکذِبین) ہاں یہ لوگ توحید سے منہ موڑ کر طاغوت کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔ تو گمراہی کی بدبختیوں نے انہیں گیر لیا اور وہ تاریکیوں میں ڈوب گئے۔ یوں عذاب الٰہی نے انہیں آ پکڑا۔

یہاں ایک نکتہ لائق توجہ ہے کہ لوگوں کے ہدایت پانے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے کیونکہ جب تک اس کی توفیق اور امداد شامل حال نہ ہو، کوئی شخص اپنی ہمت سے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اس کے مقابلے گمراہی کی نسبت خود ان لوگوں کی طرف ہے کہ یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ تھا۔

(۲) دوسری آیت میں اسی چیز کا ذکر ایک اور انداز سے ہو رہا ہے جو ایک قاعدہ کلیہ اور اصل دائمی کی صورت میں ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: ''ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ جس کی طرف یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو، (وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ الانوحی الیه انه لاالٰه الاانا فاعبدونِ)

توجہ رہے کہ ''نوحی''، فعل مضارع ہے جو ''استمرار ودوام'' کی دلیل ہے یعنی ''توحید عبادت'' کا دائمی حکم سب انبیاء کو دیا گیا اور سب کی دعوت کا بنیادی اصول یہی تھا وہ اپنی پوری دعوت میں یہ پیغام پہنچانے اور اسی کی تبلیغ کرنے پر مامور تھے لہٰذا مسئلہ ''توحید عبادت'' ایک قاعدہ

کلیہ اور اساس و بنیاد کے طور پر تمام انبیاء کے وقتوں میں پیشِ نظر اور ریزعمل رہا ہے۔

(۳) تیسری آیت میں سب سے پہلے اولوالعزم پیغمبر شیخ الانبیاء نوحؑ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان کی دعوت کے آغاز سے اختتام تک توحیدِ عبادت اور بتوں سے دوری کے سوا کوئی اور مسئلہ امیت نہیں رکھتا تھا، جیسا کہ فرماتا ہے ہے: ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا کہ اے میرے قوم! تم لوگ صرف خدائے یگانہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (لقد ارسلنا نوحاً الیٰ قومیه فقال یٰقومِ اعبدو الله مالکم من الهٍ غیرهٗ)

اس جملے سے بخوبی طاہر ہوتا ہے کہ بت پرستی سعادت انسانی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے یہی وجہ ہے کہ باغ توحید کے باغبان پیغمبروں نے رُوح انسانی کی سرزمین میں فضیلت کے پھولوں کی آبیاری اور پورش کے لیے ہر کام سے پہلے گمرہ ہمت باندھی تا کہ توحید کے ہتھوڑے سے اس راستے کے پتھر کو چکنا چور کر دیا جائے، خاص طور پر حضرت نوح کے زمانے میں قسم قسم کے بت موجود تھے جیسا کہ سورۂ نوح کی آیت ۲۳ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ودّ سواع، یغوث، یعوق اور نسر سمیت پانچ مشہور بت تھے، جو بالترتیب مرد، شیر، گھوڑے اور باز کی شکل میں تھے۔ وہ لوگ ان کی پرستش کرتے اور اس پر فخر بھی کیا کرتے تھے۔

جب حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ یہ لوگ بت پرستی پر اصرار کرتے ہیں تو آپ نے انہیں عذاب الٰہی سے ڈرایا جیسے اس آیت کے آخر میں ہے، تمہاری اس گمراہی اور بت پرستی کی وجہ سے میں ''تمہارے اُوپر عذاب کے بڑے دن سے ڈرتا ہوں، ظاہری طور پر عذابِ عظیم سے مراد وہی تباہ کن طوفان تھا جس نے اس قوم کو گھیر لیا سابقہ اقوام میں سے کسی کو ایسا عذاب نہ ہوا تھا کہ جو اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہو اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے قیامت کے دن کا عذاب مراد ہے۔ (انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم [۱])

تفسیر المیزان میں ہے کہ اس چھوٹی سی آیت میں اصول دین میں سے دو اصلوں کا یکجا ذکر ہوا ہے۔ یعنی توحید اور معاد [۲]

تیسری اصل یعنی نبوت کا ذکر (یعقوم لیس بی ضلالة) میں آیا ہے۔

چوتھی آیت میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جو راہ توحید سے منحرف ہو چکے ہیں۔

یہود نے اپنے اخبار (علماء دین اور نصاریٰ نے راہبوں (تارک دنیا افراد) اور حضرت مسیحؑ کو معبود قرار دے رکھا ہے، پھر کہتا ہے یہ سب کچھ انہوں نے اس کے باوجود کیا ہے کہ اُنہیں خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش کرنے کا حکم نہیں دیا گیا (وما امروا الالیعبدو اِلٰهاً وّاحِدًا) پھر مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے (لاالٰهَ الاهو) یعنی اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اس کے ساتھ ہی بار دیگر تاکید کے طور پر فرمایا: وہ اس سے پاک و منزہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ (سبحانه عما یشرکون) بہرحال یہ آئین و دستور کہ جس کی بنیاد حضرت نوحؑ نے رکھی، ان کے بعد ہونے والے اولوالعزم پیغمبروں .....حضرت موسیٰؑ

---

[۱] یہ دونوں تفسیریں مفسرین کے ہاں واضح طور پر ذکر ہوئی ہیں، ان میں سے تفسیر فخر رازی جلد ۱۴ صفحہ ۱۴۹ میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

[۲] تفسیر المیزان جلد ۸ صفحہ ۱۸۰۔

وحضرت عیسیٰؑ..... نے بھی پوری کوشش سے اسے رواج دیا اور آگے بڑھایا۔

یہ صحیح ہے کہ مسیحی لوگ حضرت مسیحؑ کی پرستش کرتے تھے اور کر رہے ہیں۔لیکن نہ تو یہودی اپنے احبار کی پرستش کرتے اور نہ مسیحیٰ اپنے راہبوں کی پرستش کرتے تھے مگر اس لیے کہ وہ دین میں ان افراد کی طرف سے کی گئی تحریفوں کے باوجود بلاقید وشرط ان کی اطاعت وپیروی کرتے تھے۔ان کے اس عمل کو بت پرستی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی بناء پر احادیث میں آیا ہے: اما واللہ ما صاموا لھم ولا صلوا ولکنھم احلوا لھم حراماً وحرموا علیھم حلالا فاتبعوھم وعبدُوھم من حیث لا یشعرون[1]

یعنی آگاہ رہو کہ بخدا وہ (یہود ونصاریٰ) اپنے مذہبی پیشواؤں کے لیے نہ روزہ رکھتے اور نہ نماز پڑھتے تھے،لیکن یہ کہ وہ پیشوا اپنے پیروکاروں کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیتے۔پس وہ ان کی پیروی کرتے اور یُوں وہ ان کی پرستش کرتے تھے جب کہ وہ جانتے نہ تھے۔اس موضوع کی مزید تشریح انشاءاللہ توحید اطاعت'' کی بحث میں آئے گی۔

میں غیر خدا کی پرستش نہیں کرتا:

(۵) پانچویں آیت میں ''توحید عبادت'' کے سلسلے میں بات پیغمبر اکرمؐ تک آ پہنچی ہے اور خداوند تعالیٰ انہیں حکم دیتا ہے: (اے نبی) کہو کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے جنہیں خدا کے سوا تم پکارتے ہو (قل انی نھیت ان اعبد الذین تدعون من دون اللہ)۔

''الذین'' کی تعبیر جو عام طور جمع مذکر عاقل کے لیے آتی ہے۔یہ مشرکوں کے معبودوں کے لیے یا تو اس وجہ سے آئی ہے کہ وہ لوگ اپنے وہم وگمان میں بتوں کو عقل وروح سے متصف تصور کرتے تھے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے معبودوں میں مسیحؑ،فرشتوں اور جنوں جیسی ذی شعور شخصیات شامل تھیں۔

پھر یہ بتانے کے لیے کہ خدا کی طرف سے پیغمبر کو غیر خدا کی پرستش سے منع کرنے کی دلیل کیا ہے؟ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتا ہے: کہو کہ میں تمہاری ہوا وہوس کی پیروی نہیں کرتا ایسا کروں تو گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا۔(قل لا اتبع اھواء کم قد ضللت اذاً وما انا من المھتدین)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بت پرستی کی بنیاد یں خواہشوں کی پیروی اور وہم وخیال ہی پر کھڑی ہوا کرتی ہیں یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خواہشوں کے پیچھے چلنے کا نتیجہ گمراہی ہے اور اس طریقے سے نیک بختی اور راہ راست ہرگز نصیب نہیں ہوتی۔

(۶) چھٹی آیت میں بھی رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ ہی کی طرف ہے،انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدائے یگانہ کی عبادت کرنے اور شرک وبت پرستی کی ہر شکل سے دوری پر ثابت قدم رہیں جیسا کہ فرماتا ہے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتا رہ..... یہاں تک کہ تجھے یقین

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۰۹۔

(موت) آ جائے (واعبد ربك حتیٰ یاتیك القین)

مفسرین نے عمومی طور پر زیر بحث آیت میں آنے والے لفظ ''یقین'' کو ''مرگ'' کے معنی میں تصور کیا ہے۔ اور اس حضرت عیسیٰؑ کی گفتار کے مشابہ قرار دیا ہے خدا نے مجھے نماز وزکات کی وصیت کی ہے جب تک کہ میں زندہ ہوں، (واوصانی بالصلوٰۃ والزکاتِ مادمت حیاً).....(مریم۔۳۱) اور قرآن میں ایک اور مقام پر ہم اہل دوزخ کا قول دیکھتے ہیں (وما کنا نکذب بیوم الدین حتیٰ اتانا الیقینُ) یعنی ہم قیامت کے دن کا متواتر انکار کرتے رہے، یہاں تک کہ ہماری موت آ پہنچی۔

اسلامی روایت میں بھی مرگ کو ''یقین'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ہم امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: لم یخلق اللہ یقیناً لاشك فیہ اشبہُ بشكٍ لا یقین فیہ من الموتَ۔

خدا نے ایسا کوئی یقین پیدا نہیں کیا کہ جس میں شک کی آمیزش نہ ہو، مثلاً موت کہ اس میں اس طرح شک رہتا ہے، گویا اس کے ساتھ یقین کا ہرگز تعلق نہیں ہے (یہ اس لیے فرمایا کہ لوگ موت سے یوں بے پرواہیں کہ موت کی آمد کو باور نہیں کرتے)[1]

موت کو یقین سے تعبیر کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے، جیسے مذکورہ بالا حدیث میں آیا ہے کہ سبھی انسان موت پر یقین رکھتے ہیں اور اس میں کسی مذہب ومسلک کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے وقت (غفلت کے) پردے اُٹھ جاتے ہیں اور حقائق آشکارا ہو جاتے ہیں، اس طرح ایسے بہت سے امور کا یقین ہو جاتا ہے جن کے بارے میں انسان اس سے پہلے شک وشبہ میں رہا کرتا ہے (بہرحال ان دونوں تفسیروں میں جمع بھی ممکن ہے۔

(۷) ساتویں آیت میں یہی مضمون بعض اضافوں کے ساتھ سامنے آتا ہے اس میں اہل کتاب کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہوا ہے جو مرکز توحید سے منحرف ہو کر عبادت وعبودیت میں خدا کے ساتھ دیگر شرکاء کے قائل ہو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے اور انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ اپنے دلوں کو خالص کر کے اور یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں۔ (وما اُمرُوا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاءَ[2])

یہ بات قابل توجہ ہے کہ تمام ادامر الٰہی کو مخلصانہ عبادت میں شامل کرنے کے بعد نماز قائم کرنے اور زکات دینے کا حکم فرمایا ہے (ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام احکام دینی کی اساس وبنیاد عبادت میں اخلاص پر قائم ہوتی ہے پھر یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ آیت کے آخر میں یہ اضافہ کرتا ہے، یہی نہایت سیدھا اور صحیح دین ہے، (وذلك دین القیمۃ[3])

---

[1] تحف العقول صفحہ ۱۷۲۔

[2] المفردات میں راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ ''حنف'' بروزن ''کتف'' کا معنی ضلالت وگمراہی کو ترک کر کے سیدھے راستے پر آجانا ہے دینِ اسلام کو بھی اسی لیے دینِ حنیف کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو صراطِ مستقیم سے گمراہی کی طرف جانے سے باز رکھتا ہے۔

[3] المفردات میں راغب اصفہانی کا قول ہے کہ ''قیم مادۂ'' ''قیام'' سے قیام ثابت اور مستقیم کے معنی میں ہے، یہاں یہ لفظ ایسی اُمت کے لیے ہے جو عدل وانصاف کے لیے قیام کرتی ہے۔ جیسے آیت کونو قوامین بالقسط میں آیا ہے۔

(۸) آٹھویں آیت میں یہی نکتہ حضرت عیسیٰؑ کی زبانی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: (اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے (وان اللہ ربی وربکم فاعبدوہُ ھذا صراطٌ مستقیمٌ)

ہم جانتے ہیں کہ دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم ایک ہی ہوتا ہے جب کہ غیر مستقیم اور ٹیڑھے خطوط بہت سے ہو سکتے ہیں، خط توحید بھی بس ایک ہی ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہوگا وہ شرک و بت پرستی میں داخل سمجھا جائے گا۔

''مستقیم کا مادہ'' استقامت'' ہے اور اصل میں یہ ''قیام'' سے لیا گیا ہے۔ چونکہ انسان کھڑے ہونے کی حالت میں بالکل سیدھا ہوتا ہے، اس لیے یہ لفظ ہر قسم کے انحراف سے مبرا صاف سیدھے اور معتدل راستے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن نے سورۂ حمد میں ''صراطِ مستقیم'' کے مقابل ''مغضوب علیہم) وہ لوگ جن پر خدا کا غضب ہوا اور (ضالین) جو گمراہ ہوئے ان کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گروہ میں وہ گمراہ لوگ ہیں جو اپنی گمراہی پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی اور دوسروں کی گمراہی کو درست قرار دیتے اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ دوسرے گروہ میں ایسے گمراہ لوگ شامل ہیں جو بے خبر اور سادہ دل ہیں کہ اوروں کی دیکھا دیکھی اس راہ پر چل رہے ہیں۔

جس جگہ خدا کی عبادت نہ کرسکوں وہاں سے ہجرت کر جاؤ:

(۹) نویں آیت میں ایک نئے نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ایک وطن یا مقام جس کے ساتھ محبت ہے اگر اس میں سکونت رکھنا خدا کی عبادت میں مانع ہو (توحید عبادت پر عمل نہ ہو سکے) تو اس مقام اور وطن سے ہجرت کو جانا چاہیے۔ جیسا کہ فرمایا۔ اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے۔ پس تم میری ہی بندگی کرتے رہو۔ (یعبادی الذین اٰمنوا ان ارضی واسعۃٌ فایای فاعبدونِ)

ہاں! خدا کی زمین وسیع ہے۔ لہٰذا کسی وقت بھی گھر، وطن اور کنبہ، برادری میں رہنے کی مجبوری یا ان کی محبت کے باعث شرک و بت پرستی کے ماحول میں رہ کر خدا کی بندگی اور توحیدِ عبادت کے اہم فریضے کو ترک نہ ہونے دیا جائے بلکہ ہر مومن و موحد کا وظیفہ و ذمہ داری ہے کہ ایسی حالت میں وہ اس جگہ سے ہجرت اختیار کرے اور ایسی سرزمین پر چلا جائے جہاں چراغ توحید ضوفشاں ہو، تاکہ آغازِ اسلام میں ہجرت کرنے والے مہاجرین کی طرح اپنے دامن کو شرک و بت پرستی سے آلودہ نہ ہونے دے اور ضروری قوت و طاقت فراہم کر کے اپنے وطن مالوف میں لوٹ آئے۔

اس آیت میں (یا عبادی) اے میرے بندو (ارضی) میری زمین (فایای فاعبدونِ) پس تم میری ہی بندگی کرتے رہو۔ یہ سب ایسی تعبیرات ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں خدا کی رحمت شامل ہے جو موحدوں اور توحید پرستوں پر ہر جگہ اور ہر حال میں سایہ فگن

رہتی ہے اور اس ذاتِ مقدس کی حمایت ان کے ساتھ ہوتی ہے [1]

توجہ رہے کہ اس آیت میں مخاطب خدا کے عباد یعنی اس کے بندے ہیں لیکن پھر سے انہیں خدائے واحد کی عبادت و پرستش کا حکم دیا جارہا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں تا زندگی توحید پرستی لے راستے پر گامزن رہنا چاہیے اور اسے ذرہ بھر انحراف نہ کرنا چاہیے یہ اعادہ تکرار ایسا ہی ہے جیسے خدا کے بندے باوجود راہ ہدایت کی پیروری کرنے کے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾ ''یعنی ہمیں سیدھی راہ پر قائم رکھ۔ کہہ کر اس سے ہر دم طلب ہدایت وتوفیق کرتے رہتے ہیں۔ تا کہ ان کے عمل میں کوئی کجی وخامی پیدا ہونے نہ پائے۔

زیر بحث آیت سورہ عنکبوت کی ہے اور مفسرین کہتے ہیں کہ اس سورے کی پہلی گیارہ آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی، یہ مکہ کے ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو اظہار اسلام تو کرتے تھے لیکن مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اس سے اگلی آیت (کل نفسٍ ذائقة الموت) بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ آخر کار سبھی کو مرجانا ہے۔ زن وفرزند اور مال ووطن سے جدا ہونا ہے۔ پس ہجرت سے پہلو تہی کرنے والے یہ لوگ سمجھ لیں کہ اس طرح وہ اپنے کنبہ مال اور وطن سے ہمیشہ آسودہ خاطر نہیں رہ سکیں گے بلکہ موت انہیں ان سب سے جدا کر دے گی، پس ان کا ہجرت نہ کرنا غلط فہمی اور نادانی کی بات ہے کیونکہ وہ مکہ میں بھی ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ [2]

(۱۰) دسویں آیت میں بھی ایک نئے نکتے کا ذکر ہوا ہے اس میں سارے مومنین کو یہ نوید دی جارہی ہے۔

کہ تم روئے زمین کے ملکوں کے مالک وحاکم بن جاؤ گے جیسا کہ توحید نے ساری کائنات کو روشن کر دیا ہے اور خدا کے سوا کسی اور معبود کی عبادت نہیں ہوسکتی اس بیان میں مومنین کو توحید پر ایمان لانے اور توحید عبادت پر قائم رہنے کے باعث تبریک اور خوشخبری دی جارہی ہے جیسا کہ فرمایا ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالح بجالاتے ہیں۔ ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ یقیناوہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطاء کی تھی (وعدہ الله الذين امنو منكم وعملو الصٰلحٰتِ ليستخلفنهم فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم)۔

جولوگ اس سے پہلے زمین کے وارث بنے وہ کون تھے؟ اس میں مفسرین نے بہت کچھ بحث وگفتگو کی ہے لیکن ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے قیام اور فرعون کی تباہی وغرقابی کے بعد اس زمانہ میں آباد زمین کے بہترین خطوں اور علاقوں کے مالک وحاکم بنے تھے جیسے قرآن مجید سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۷ میں بیان فرماتا ہے (واورثنا القوم الذين كانو يستضعفون مشارق الارض ومغاربها التى باركنا فيها) یعنی ہم نے ایک کمزور جماعت (بنی اسرائیل) کو (خدا پر ایمان لانے اور اخلاص ظاہر کرنے کے بعد) مشرق ومغرب کی پر برکت زمین کا وارث وحاکم بنایا

(۱۱) گیارہویں آیت میں ایک اور پہلو سے توحیدِ عبادت کی توجیہ کی گئی ہے وہ اس طرح کہ مجسمے اور مورتیاں تو مٹی اور پتھر کے بے

---

[1] فایای فاعبدون من مفعول کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ جو حصر کا فائدہ دیتا ہے یعنی عبادت صرف اور صرف خدا ہی کی ہے اور اس کے سوا کوئی اور دوسرا لائق عبادت و پرستش نہیں ہے۔

[2] تفسیر روح البیان، تفسیر روح المعانی، تفسیر قرطبی میں آیت زیر بحث کے ذیل میں اسی طرف اشارہ ہوا ہے۔

حقیقت ٹکڑے ہیں ان کا تو کیا ذکر خود ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین بھی یہ منزلت نہیں رکھتے کہ ان کی عبادت و پرستش کی جائے ۔فرماتا ہے وہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم ابیاء اور فرشتوں کو اپنے معبود بنالو کیا وہ تمہیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔(ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکۃ والنبیین ارباباً ایامرکم بالکفر بعد اذانتم مسلمون)[1] بھال اور پرورش میں کوشاں ہو جیسا کہ رب الدار ''رب الابل'' جن کا مطلب گھر اور انٹوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ غیر خدا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورۂ یوسف کی آیت ۴۲۔۵۰ میں لفظ ''رب'' مصر کے بادشاہ کے لیے آیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں عموماً اس لفظ کو بڑے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

لیکن قرآن میں لفظ ''رب'' سینکڑوں مرتبہ آیا اور قریباً ہر مقام پر اس سے خدائے تعالیٰ کی ذات مقدس ہی مراد ہے کیونکہ درحقیقت ہر چیز کا مالک اور پرورش کرنے والا وہی ہے یہاں اہم بات یہ ہے کہ بہت سی اقوام کچھ چھوٹے خداؤں کی قائل رہی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو ''رب النوع'' کہتی اور خداوند تعالیٰ کو رب الارباب'' (خداؤں کا خدا) کہتی ہیں۔اسی طرح بعض قومیں انبیاء اور فرشتگان کے متعلق بھی یہی عقیدہ رکھتی ہیں۔لیکن مذکورہ بالا آیات ان باطل عقائد کی صریحاً نفی کرتے ہوئے ثابت کر رہی ہیں کہ ''رب'' اور رب الارباب'' خدائے قدوس ہی ہے۔اس کے علاوہ کسی کو ''رب'' تصور کرنا اور ماننا کفر محض اور اسلام کے خلاف ہے۔

(۱۲) بارہویں اور آخری آیت میں اس تمام بحث کے نتیجے کے طور پر فیصلہ کن گفتگو کی گئی ہے، کہ توحید عبادت صرف انسانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ''جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی یا مجبوری سے خدا کے لیے سجدہ ریز ہیں، اسی طرح دن رات اور ان کے سائے بھی سجدہ گذار ہیں۔(واللہ یسجد من فی السمٰوٰتِ والارض طوعاً و کرھا وظللھم بالغدُووالاصالِ)۔

اگرچہ لفظ ''من'' باشعور مخلوق کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس سے بعض مفسرین نے خیال کیا کہ آیت میں انسانوں اور فرشتوں کی عبادت کا تذکرہ ہوا ہے لیکن اس آیت کی ایک اور قرائت بھی ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عاقل وغیرہ عاقل جمادات، حیوانات، نباتات.....تمام موجودات کی طرف اشارہ ہے اور سجدہ بھی عام داخل ہے جو انسان اور دیگر ذی شعور مخلوق بجالاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے:

(۱) طوعاً و کرہاً (خوشی و مجبوری) سے ظاہر ہے کہ سجدہ کے عمومی معنی مراد ہیں۔

(۲) ظلال (سایہ) کی شرکت بتاتی ہے یہاں عمومی عبادت کا ذکر ہے۔

(۳) دیگر آیات میں یہ بات واضح طور پر آئی ہے۔

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہے۔

---

[1] اس بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۴ صفحہ ۵۲۷ (فارسی) میں حکومت جہاں مستضعفان کے عنوان سے مفصل بحث ہوئی ہے اس کا ایک نمونہ فتح مکہ کے بعد پیغمبر اکرم کی حکومت کی شکل میں سامنے آیا اور اس کا مکمل ترین نمونہ حضرت قائم آل محمدؑ (ارواحنا فداہ) کے ظہور کے وقت ساری دنیا دیکھے گی جو کمزوروں کی عالمی؟ حکومت ہوگی۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴿النحل: ۴۹﴾

درخت اور ستارے سجدہ کرتے ہیں۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۶ ﴿الرحمن: ۶﴾

معلوم ہوا کہ تمام موجودات عالم خدائے تعالیٰ کے سامنے سربہ سجود ہیں اور تکوینی طور پر اس کی فرمانبرداری کررہے ہیں۔ان میں مومنین سجدہ تکوینی کے علاوہ سجدہ تشریعی بھی کررہے ہیں جو ان کے ارادہ واختیار سے تعلق رکھتا ہے۔[1]

اس سجدہ کی عمومیت یہاں تک کہ اس میں ظلال اور سایوں کی شرکت واقعاً حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ عدم کا پہلو رکھتے ہیں، دراصل سایہ اس جگہ پر ہوتا ہے۔ جہاں روشنی نہ پہنچ رہی ہو۔لیکن اس بناء پر کہ سایہ اجسام کے تابع ہے،اس میں وجودی پہلو بھی پایا جاتا ہے۔قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ سائے جو مشابہ وجود ہیں وہ بارگاہ الٰہی میں سجدہ کررہے ہیں تو پھر حقیقی موجودات کی سجدہ گزاری میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔مشہا بہت کا اصلیت سے ایک طرح کا تعلق ہوتا ہے،جیسا کہ ہم کہتے ہیں فلاں شخص کی فلاں سے ایسی شدید دشمنی ہے کہ وہ اس کے سائے پر بھی تیر بارانی کرتا ہے۔علاوہ ازیں سائے عموماً زمین پر ہوتے ہیں اور ان کی اس حالت کو سجدے سے تعبیر کرنا ان کی کیفیت کی بڑی عمدہ تصویر کشی ہے۔

سائے ساتھ یہ جو صبح وشام (بالغدو والاصالِ) کا ذکر ہوا ہے۔تو ممکن ہے یہ سائے کا وصف ہو اور ان دو وقتوں کا انتخاب اس لیے کیا کہ ان میں ہر چیز کا سایہ طویل ہوتا ہے جب کہ دوپہر کے وقت سایہ نسبتاً چھوٹا اور بعض اوقات معدوم بھی ہوتا ہے اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ صبح وشام کا ذکر موجودات عالم (آسمانی وزمینی) کے وصف میں آیا ہو اور اس کا مقصد سجدے کا دوام ظاہر کرنا ہو، جیسے ہم روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں کے کان میں صبح وشام یہ بات پہنچانا چاہیے۔یعنی یہ بات اس سے ہمیشہ کہتے۔

ان آیات کی جمع آوری اور تفسیر سے یہ نتیجہ برآمد ہورہا ہے کہ توحید عبادت اتنی اہم چیز ہے کہ انبیاء کی دعوت کا آغاز اسی سے ہوا اور یہی ان کی تعلیمات کا اصل اصول تھا۔نیز اولوالعزم انبیاء کی دعوت وتبلیغ کی بنیاد اسی پر قائم ہوئی اور رسول کریمؐ بھی تاحین حیات مختلف پیرایوں میں اس کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔

توحید عبادت ہی صراطِ مستقیم کی طرف لے جانے والا وسیلہ ہے، یہاں تک کہ بشرط ضرورت اس کی خاطر ترک وطن کرنا اور شرک وبُت پرستی کے ماحول کو چھوڑ کر وہاں سے ہجرت کرجانا چاہیے۔

وہ وقت جب عادلانہ الٰہی حکومت اس دنیا میں قائم ہوگئی۔اس کی اہم خصوصیات میں سے بڑی خصوصیت توحیدِ عبادت ہے جو سارے جہان میں ظہور پذیر ہوگئی۔اس بابرکت عہد میں نہ صرف انسان بلکہ تمام موجوداتِ عالم خدائے یگانہ کے آستان پر جبین سائی

---

[1] پہلی صورت میں جارومجرور کا تعلق ایک مقدر فعل یا وصف سے ہے (اس کا امتیاز اقرب کی طرف لوٹنا ہے) دوسری صورت میں جارومجرور کا تعلق یسجد کے فلع سے ہے اس کا امتیاز یہ ہے کہ خود مذکور ہے۔

کریں گے اگر چہ وہ زبان قال سے تسبیح نہ کریں، اور اپنے اختیار سے سجدہ نہ کریں تو بھی زبانِ حال سے اس کی تسبیح اور تکوینی طور پر اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں گے۔

توضیحات

(۱) توحید عبادت کا شجر میوہ دار:

اس نکتے پر توجہ دینا ضروری ہے کہ خضوع خشوع اور ادب واحترام کے کئی مراتب ہیں، ان میں سے سب سے اعلیٰ اور آخری درجہ یہی عبادت و پرستش ہے۔

یہ ایک واضح سی بات ہے کہ اگر کوئی انسان کسی کے لیے اس قدر احترام کا قائل ہو کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے گر جائے۔ سرزمین پر رکھ دے اور سجدہ ریز ہو جائے تو لازماً وہ اس کے فرمان پر سر تسلیم خم کر دے گا۔ کیا ممکن ہے کہ وہ اس کی لامحدود تعریف اور پرستش کرنے کے باوجود اس کا حکم نہ مانے؟ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی انسان عبادتِ خالص کی روح سے واقف ہو جائے تو گویا اس نے خدا کی اطاعت کی طرف بہت بڑا قدم اُٹھایا، اس نے نیکیاں کمانے اور برائیوں سے بچنے کا راستہ اپنا لیا ہے اس طرح کی عبادت اگر استمرار و ہمیشگی رکھتی ہو تو یہ انسان کی روحانی تربیت اور تکامل کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی قسم کی مخلصانہ عبادت اگر استمرار و ہمیشگی رکھتی ہو تو یہ انسان کی روحانی تربیت اور تکامل کا سبب بن جاتی ہے۔

اسی قسم کی مخلصانہ عبادت میں عشقِ محبوب بھی شامل ہوتا ہے جو عبادت کرنے والے کو اس معشوقِ حقیقی کی سمت لیے لیے جاتا ہے اور اس کمال مطلق کی طرف یہ حرکت وسفر بدی کی پستیوں اور گناہ کی آلودگیوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنتا ہے اس بناء پر توحید عبادت کا مسئلہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ کہ قرآن نے اس کا واضح اعلان کرنا ضروری سمجھا.....(ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین مومن۔ ۶۰) یعنی جو لوگ میری عبادت سے سر پھیرتے ہیں وہ جلد ہی ذلت کے ساتھ جہنم میں وارد ہوں گے۔

عبادت کرنے والا شخص اپنے انتہائی عجز و دل سوزی کے ساتھ خدا کی رضا و تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا اور مانتا ہے کہ قرب خداوندی عمل ہی کے ذریعے نصیب ہو سکتا ہے، لہٰذا وہ اس کے ہر حکم و فرمان کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے توحیدِ عبادت پر اعتقاد رکھنے اور خدا کی عبادت بجالانے والا بندہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ خدا کو اپنا معبود اور معشوق بنانے کا میاب ہو جائے۔ اس لیے وہ اس کی صفات کمال و جمال کو اپنے وجود پر منعکس کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ طریقہ عمل انسان کی اصلاح اور اس کے تکامل میں اتنا موثر ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں۔

۲۔رُوح عبادت اورافراط وتفریط سے پرہیز:

اکثر مسائل کی طرح عبادت کے معنی میں بھی افراط وتفریط پیدا ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے (مالکیت وربوبیت کا تصور نہ رکھتے ہوئے) غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز قرار دے دیا ہے اور اس کے لیے فرشتوں کے سجدہ برائے آدمؑ اور برادران یوسف کے سجدہ برائے یوسفؑ کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔اس کے مقابل کچھ لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ وائمہ دین کی طرف ہر قسم کی توجہ،توسل اور طلب شفاعت کو شرک اور ایسا کرنے والے کو مشرک کہا ہے،لیکن درحقیقت یہ دونوں نظریئے صحیح نہیں ہیں۔

اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے۔جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں بتایا جاچکا ہے کہ علماء لغت کی تشریح کے مطابق حقیقت عبادت معبود کے سامنے خضوع وخشوع، بے انتہا تواضع اور تذلل ہے اسلامی نظریئے کی رو سے یہ سب کچھ خدا کے لیے مخصوص ہے اور کسی دوسرے کے سامنے ایسا کرنا شرک درعبادت ہوگا۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خضوع کے مختلف مراتب ہیں مثلاً دستوں کے سامنے خضوع کہ اس کے قابل تکبر ہے اس طرح باعظمت افراد کے لیے خضوع اوران میں پہلا مقام والدین کا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا نرمی اور ملائمت کے ساتھ ان کے سامنے جھکے رہو۔(وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ﴿الإسراء: ۲۴﴾

خضوع اور عجز کا اس سے بالاتر مرحلہ وہ ہے جو پیغمبروں اور معصوم اماموں کے لیے انجام دیا جانا چاہیے۔

حتیٰ کہ مُسلمانوں کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنی آواز پیغمبر اکرمؐ کی آواز سے بلند تر کریں۔اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو تم اپنی آواز پیغمبر اکرمؐ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ان کے سامنے اونچی آواز سے بات نہ کرو جیسے تم میں سے بعض افراد دوسروں کے ساتھ کیا کرتے ہیں(یاایھاالذین اٰمنو الا ترفعوا صواتکم فوق صوتِ النبی ولا تجھروالہٗ بالقول کجھرِ بعضکم لبعضٍ)۔(حجرات۔۲)

لیکن خضوع اور کسی کے سامنے جھکنے،تواضع اور خود کو پست ظاہر کرنے اور تذلیل یعنی اپنے عجز وشکستگی کا اظہار کہ جس کا نام عبادت وعبودیت ہے وہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس کی واضح صورت ''سجدہ'' ہے لہٰذا خضوع مطلق اور انتہائی تذلل (مالکیت وربوبیت کے اعتقاد کے بغیر بھی) عبادت ہے اور وہ صرف خدا ہی کے لیے ہے۔اسی بنا پر غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

تفسیر المنار کے مولف نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں عبادت کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

عبادت فقط انتہائی خضوع کا نام نہیں ہے۔بلکہ اس کے ساتھ معبود کی عظمت اس کے تسلط اور کلی احاطہ رکھنے اعتقاد ہونا ضروری ہے وہ تسلط واحاطہ ایسا ہے کہ جس کی اصلیت فہم وادراک سے بلند ہے۔پس یہ ممکن ہے کہ عاشق اپنے معشوق کے سامنے اتنا خضوع کرے کہ اس کا ارادہ وخواہش معشوق کی مرضی میں گم ہوجائے،لیکن پھر بھی اس کو عبادت نہیں کہا جائے گا۔اسی طرح بہت سے افراد کا اپنے حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے انتہائی خضوع بھی عبادت نہیں کہلاتا۔[1]

---

[1] تفسیر المنار جلد ۱ صفحہ ۵۶۔۵۷۔

بزرگ مفسّر علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں مذکورہ بالا کلام کے مشابہ بات کہتے ہیں۔

''عبادت فقط خضوع کا نام نہیں ہے بلکہ بندے کا خود کو اپنے پروردگار کا مملوک قرار دینا عبادت ہے، پھر سورۂ بقرہ میں آدم کو فرشتوں کے سجدے.....کی بحث میں اس قول کا اعادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''فعل عبادی'' وہ فعل ہے جس میں مولا کی مولویت وحاکمیت اور اپنی عبودیت وبندگی کا اظہار ہوتا ہو۔لہٰذا ان کے نزدیک غیر خدا کے سامنے وہ سجدہ ممنوع ہے جس میں اس کی ربوبیت کا اعتقاد شامل ہو۔پس وہ سجدہ جس میں ربوبیت کا تصور نہ ہو اور صرف احترام کا خیال ہو تو اس میں کوئی مانع نہیں۔لیکن وہ دینی بصیرت اور ذوقِ عبودیت جو دین کے ظاہری احکام کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔اس کا فیصلہ یہ ہے کہ سجدہ خاص خدا ہی کے لیے ہے اور غیر خدا کے سامنے سجدہ نہیں کیا جانا چاہیے [1]

بہرحال اگر لفظ ''عبادت'' کے بارے میں قرآن، سنت، لغت اور روزمرہ کے استعمالات پر باریک بینی سے نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا لغوی مفہوم ''انتہائی خضوع ہے، جس میں معبود کی مالکیت وربوبیت کے اعتقاد کا کوئی دخل نہیں ہے: لہٰذا اگر کوئی فرد پرانے زمانے کے لوگوں کے مجسموں اور بادشاہوں کے سامنے سجدہ کرے تو یہ بھی عبودیت وپرستش ہی ہوگی۔نیز اگر کوئی آئمہ علیہم السلام کی عظمت وبزرگی کے پیشِ نظر ان کو سجدہ کرتا ہے تو اسے پرستش ہی سمجھا جائے گا اور یہ ممنوع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن سورۂ حٰم سجدہ کی آیت ۳۷ میں سُورج اور چاند کو سجدہ کرنے سے واضح طور پر منع کرتے ہوئے کہتا ہے۔ (لاتسجدوا للشمس ولا للقمر) اور پھر اسی دلیل کے مطابق احادیث وروایات میں بھی بار بار غیر خدا کو سجدہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ان میں سے ساٹھ روایتیں وسائل الشیعہ ابوابِ سجود باب ۲۷ میں وارد ہوئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ مشرکین سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اخبرونی عنکم اذا عبدتم صورمن کان یعبدوالله فسجد تم لهه او سلیتم ووضعتم الوجوه الکریمة علی التراب بالسجودبها فما الذی بقیتم لرب العالمین؟ اما علمتم ان من حق من یلزم تعظیمهُ و عِبادتُهٗ ان لایساوٰی عبیدُهٗ [2]

یعنی مجھے بتاؤ کہ جب تم خدا کے سامنے عاجز مخلوق کے مجسموں کی پرستش کرتے ہو، ان کی نماز پڑھتے اور ان کو پکارتے ہو، پھر ان کے آگے سجدہ کرنے کے لیے اپنی پیشانی زمین پر رکھتے ہو تو کہو کہ اب رب العالمین کے لیے کیا باقی رہا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ جس کی تعظیم اور عبادت لازم سمجھی جائے، اس کا حق ہے کہ اس کی ناتواں مخلوق کو اس کے برابر نہ سمجھا جائے۔

ایسی بہت سی روایات ہیں جن میں آدم کو فرشتوں کے سجدے اور یوسفؑ کو ان کے بھائیوں کے سجدے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

---

[1] تفسیر المیزان جلد ا صفحہ ۲۲۔۱۲۴۔

[2] وسائل الشعہ جلد ۴ صفحہ ۹۸۵، حدیث ۳۔

ان مواقع پر سجدہ خدا ہی کے لیے تھا اور اس میں شکر کا پہلو نمایاں تھا لیکن آدمؑ و یوسفؑ کا احترام بھی پیشِ نظر رکھا گیا[1]

بعض روایات میں ہے کہ آدمؑ و یوسفؑ بہ منزلہ قبلہ کے تھے کہ رُخ ان کی طرف اور سجدہ خدا کی بارگاہ میں تھا[2]

بعض روایتوں میں کہا گیا ہے کہ جب سجدہ خدا کے حکم سے کیا گیا تو اسی کے لیے شمار ہوگا[3]

ان روایات سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غیر خدا کو سجدہ نہیں کیا جانا چاہیے.....علاوہ ازیں علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں اس مضمون کی بہت سی روایتیں نقل فرمائی ہیں[4]

مسلمانوں کی ہجرت حبشہ کے مشہور واقعہ میں مذکور ہے کہ جب ان مہاجرین نے نجاشی کے دربار میں حاضری دی تو مسیحی راہبوں نے ان سے کہا کہ تم لوگ بادشاہ کو سجدہ کرو! اس پر جعفر بن ابی طالب نے صاف صاف کہہ دیا۔ لا نسجد الا اللہ یعنی ہم خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔

(۳).....وہابیوں کی شرک آلود توحید:

حجاز کے موجودہ وہابی حکمران محمد بن الوہاب کے پیروکار ہیں کہ جس نے اپنے افکار ونظریات ابنِ تیمیہ، احمد بن عبدالحمید دمشقی (متوفی ۷۲۸ھ) سے اخذ کیے ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب نے ۱۱۶۰ھ سے ۱۲۰۶ (اپنے سال وفات تک) کے درمیانی عرصے میں مختلف مقامات کے رئیسوں اور قبائلی سرداروں کے تعاون سے خانہ بدوش عربوں میں تعصبات کی آگ بھڑکائی اور ان کے انبوہ کثیر کی مدد سے اپنے مخالفوں کو زیر کرلیا۔ اس طرح وہ حکومت پر دسترس حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے اس نے حجاز و بیرون حجاز میں ہزاروں مسلمانوں کو بے دریغ قتل کردیا۔

اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے پیروکار حجاز سے اُٹھ کر عراق پر چڑھ دوڑے اور کربلا تک جا پہنچے۔ وہ عید غدیر کا دن تھا۔ اس لیے کربلا میں عام تعطیل تھی اور وہاں کے لوگ نجف اشرف گئے ہوئے تھے۔ وہابی آوروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور فصیل توڑ کر اس مقدس شہر میں داخل ہوگئے اور وہاں قتل وغارت کا بازار گرم کردیا۔ انہوں نے پانچ ہزار مومنین کو قتل کیا۔ مرقد حسین سے قیمتی تبرکات اٹھالیے، کھڑکیاں دروازے اکھاڑے اور عام لوگوں کے گھر لوٹتے ہوئے پلٹ گئے۔

پھر ۱۳۳۴ھ کا نا مبارک سال آیا کہ جس میں ان وہابی حکمرانوں نے حجاز میں تمام مزارات مسمار کردیئے جن میں اہل بیتؑ رسولؐ،

---

[1] وسائل الشیعہ جلد صفحہ ۹۸۵، حدیث ۲۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۹۸۵، حدیث ۷۔

[3] وسائل الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۹۸۵، حدیث ۴۔

[4] بحارالانوار۔

اصحاب بنی اور دیگر بزرگان کے مزار شامل ہیں.....انہوں نے صرف بنی اکرمؐ کا روضہ پاک باقی رہنے دیا ہے۔(شاید اسے جمہور مسلمین کے خوف سے مسمار نہیں کر سکے)۔

وہابیوں کی واضح صفات میں تعصّب، تیز مزاجی، سخت دلی، ظاہر بینی اور ضدیت شامل ہے۔لیکن اس کے باوصف وہ خود کو توحید کے محافظ اور موحد خالص قرار دیتے ہیں۔اپنی اس خود ساختہ توحید پرستی کے نتیجے میں وہ شفاعت، زیارت قبور، اور بزرگان اسلام کو وسیلہ، تقرب الٰہی سمجھنے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔لہٰذا مسلمانوں کی بڑی اکثریت یعنی (شیعہ وسنی) ان کے عقائد کی تغلیط کرتے بلکہ کبھی کبھی ان کو کفر سے بھی نسبت دے دیتے ہیں[1]

اس گروہ کے عقائد اعمال پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے، یہاں ہم صرف اتنی ہی گفتگو کریں گے جو توحید عبادت سے تعلق رکھتی ہے۔

وہ کہتے ہیں: کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ پیغمبر اکرمؐ سے طلب شفاعت کرے، کیونکہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو(لاتدعوا مع الله أحدًا)

الہدیۃ السنیہ کا (وہابی) مولف لکھتا ہے، جو شخص انبیا اور فرشتوں کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ بنائے وہ کافر و مشرک ہے اور اس کا خون و مال مباح ہے، اگرچہ وہ شہادتین کا قائل اور نماز و روزہ کا پابند ہو[2]

انبیاء ائمہ اور صالحین کا وسیلہ پکڑنے اور ان کے مزارات کی زیارت کے بارے میں بھی وہ ایسا ہی نظریہ رکھتا ہے۔

ان سطح بین وہابی لوگوں سے یہ ایک بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔کہ وہ اس دنیا کے موجودات کے اثر و تاثیر کو مستقل سمجھتے ہیں۔اس لیے وہ انہیں خدا کی توحید افعال و توحید عبادی کے مقابل تصور کر لیتے ہیں۔جب کہ یہ طرز فکر بذاتِ خود شرک کے حکم میں داخل ہے۔

توضیح:

موحدِ کامل کی نظر میں مستقل اور قائم بالذات صرف وجود خدا ہے اور دیگر سبھی موجودات (جو ممکن ہیں) اسی سے وابستہ ہیں جیسے آفتاب کی شعاعیں آفتاب ہی کا وجود ہے۔اور اس سے الگ نہیں ہیں۔کیونکہ ان میں استقلال نہیں یہ اپنے وجود و بقاء میں آفتاب کی محتاج اور اسی سے تعلق رکھتی ہیں۔اسی طرح ہر موجود اور جو کچھ وہ رکھتا ہے یہ اسے خدا ہی سے ملا ہے کہ وہی ذات مسبب الاسباب ہے اور جملہ لاموثر فی

---

[1] مشہور اہل سنت عالم دین احسان عبداللطیف البکری نے ''الوہابیۃ فی نظر علماء المسلمین، کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا ہے جس میں محمد بن عبدالوہاب اور وہابی گروہ کے بارے میں بزرگ علماء کے ارشادات مع حوالہ جات تحریر کیے ہیں کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے جو مختلف علماء نے وہابیوں کے ردّ میں لکھی ہیں اور ان کی تعداد پچاس ہے، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں کو اس فرقے سے بہت زیادہ نفرت ہے۔

[2] الہدیۃ السنیہ صفحہ ٦٦۔

الوجودالا اللہ۔ کے معنی بھی یہی ہیں۔ایسانہیں ہوسکتا کہ ہم اسباب کوسببیت سے الگ کردیں یاان کے استقلال کے قائل ہوجائیں،ان میں سے کوئی صورت بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ پیغمبراکرمؐ جوشفاعت کریں گے وہ خدا کے اذان وجازت سے ہوگی جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔مامن شفیع الا من بعداذنہٖ (یونس۔۳)

اسی طرح اگرحضرت عیسیٰ مردوں کوزندہ کرتے ہیں۔ پیدائشی نابیناؤں کو بینائی دیتے ہیں اورلاعلاج بیماروں کوشفاءبخشتے ہیں تووہ خدا کے اذان وحکم ہی سے یہ کام انجام دیتے ہیں۔یعنی میں خدا کے اذن سے نابینا ؤں کو بینا، برص زدوں کوشفایاب اورمُردوں کوزندہ کرتا ہوں(واُبری الاکمہ والابرص واُحیِ الموتیٰ باذن اللہ)(آل عمران۔۴۹)

پھراگرحضرت سلیمانؑ کے وزیرآصف بن برخیا کہ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے(الذی عندہٗ علمٌ من الکتاب)یعنی وہ شخص جوکتاب میں سے کچھ علم رکھتا ہے،اس کے اندراتنی قوت ہے کہ بقول قرآن ملکہ سبا کاتخت پلک چھپکنے میں حضرت سلیمان کے سامنے لاحاضرکرے خوداس شخص کے بیان کے مطابق یہ کام من فضل ربی میرے پروردگار کے فضل سے ہواہے(نمل۔۴۰)

لیکن قرآن سے ناآشناوہابیوں نے یہ سمجھ لیاہے کہ ان بزرگان دین کے یہ افعال مستقل اورذاتی ہیں۔لہٰذااس مشکل کوحل کرنے میں انہوں نے بعض ضروریات دین مثلاً شفاعت کاانکارکرناشروع کردیا۔یہ بیچارے بزعم خویش پایہ توحیدوکومستحکم کرنے اورتوحید پرستی کی بنیاد واستوارکرنے کی کوشش میں گاہےخودہی شرک کی دلدل میں جاپھنسےاورپھرتعلیم قرآن وضروریات دین سے انکارتک جاپہنچے۔

اس سلسلے میں توحیدوشرک کی سرحد، کےعنوان سے استادمرتضیٰ مطہری شہید نے بڑی مدلل گفتگوفرمائی ہےجس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جیسےایک طرح کی وحدت وجود کے حامی اس کے قائل ہیں کہ کوئی موجود بالذات وجودِخدامیں شریک نہیں، کیونکہ تمام موجودات اس کی مخلوق اوراس سےوابستہ ہیں.....ان میں سے کوئی بھی خدا کے مقابلے میں اپنی مستقل حیثیت کا حامل نہیں ہے۔

(۲) مخلوقات کی تاثیر کااعتقاداس کی خالقیت میں شرک تصورنہیں کیاجاسکتا(جیس کہ اشاعرہ وجبریہ اس کے قائل ہیں) کیونکہ جس طرح مخلوقات استقلال ذاتی نہیں رکھتے۔اسی طرح وہ تاثیرات میں بھی مستقل نہیں، بلکہ وہ اس ذات مقدس سے وابستہ ہوتے ہیں۔

(۳) اگرہم مخلوقات کے لیے مستقل تاثیر کے قائل ہوجائیں اورکہیں کہ مخلوقات کاتعلق خدا کے ساتھ ایسا ہے جیسا کہ تعلق ایک مشین یا گھڑی کااپنے بنانے والے سے ہوتا ہےیعنی یہ چیزیں آغاز میں ایک مانع کی محتاج تھیں،لیکن بعدازاں چاہےوہ مرجائے توبھی وہ اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔یہ وہی نظریہ تفویض اورایک طرح کا شرک ہے(جس پرمعتزلہ اعتقادرکھتے ہیں)

(۴) موجودات کی مافوق الفطرت قوت وقدرت اوراذان الٰہی سے اشیاء عالم میں ان کی تاثیرکااعتقادشرک نہیں جیسا کہ وہابی خیال کرتے ہیں۔ بلکہ خودان کااعتقادشرک کی ایک بدترین صورت ہے، کیونکہ اگران کی تاثیرکااعتقادشرک ہےتو پھران کے وجودکو تسلیم کرنا بھی شرک ہوگا۔

(۵) اسی طرح ایک ایسے انسان کی قدرت اورتاثیرکااعتقادرکھنا بھی شرک نہیں جواس دنیا سے جاچکا ہو۔کیونکہ موت کے بعدانسان جمادات میں شمارنہیں ہوتا،ان سب باتوں کےعلاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہابیوں کاعقیدہ انسان کی مخالفت کا پہلوبھی رکھتا

ہے وہ اس طرح کہ خدا نے انسان کو فرشتوں سے برتر گردانا کہ وہ خدا کا خلیفہ اور مسجود ملائکہ ہے، لیکن یہ لوگ اسے ایک حیوان کے مقام پر کھینچ لاتے ہیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے کہ جب ہم پیغمبر اکرمؐ کی مشہور حدیث کے مفہوم سے آشنائی حاصل کرتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا: عقائد ونظریات میں شرک اس قدر آہستہ سے اور کسی آہٹ کے بغیر داخل ہوتا ہے۔ جیسے تاریک رات میں ایک چیونٹی کسی سخت پتھر پر چلتی ہے [1]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہابی شفاعت اور توسل کی نفی کیلئے جس آیت سے استدلال کرتے ہیں اسی آیت میں ان کے اس ادعاء باطل کا جواب پوشیدہ ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ فلا تدعوا مع اللہ احدًا خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔ (جن۔۱۸) یعنی کسی کو خدا کی مثل اور اس کے مقابل ایک وجود مستقل سمجھ کر نہ پکارو، لیکن اگر کسی کی تاثیر خدا کے اذان اور اس کے فرمان سے ہو تو (اسے پکار) نہ صرف یہ کہ شرک نہیں ہوگا بلکہ یہ توحید کی تائید ہے کہ ہر چیز اصل توحید کی طرف منتہی ہوتی ہے۔

یہ بعینہٖ وہی صورت ہے، جیسے فرزندان یعقوبؑ نے اپنے عظیم باپ کے سامنے ایک تجویز پیش کی تھی، جیسے انہوں نے قبول فرمایا۔ فرزندانِ یعقوب نے کہا: یا ابانا استغفر لنا۔ اے بابا! آپ ہمارے لیے مغفرت طلب کریں (یوسفؑ۔۹۷) حضرت یعقوبؑ نے فرمایا: سوف استغفر لکم ربی۔ عنقریب میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے مغفرت طلب کروں گا۔ (یوسف۔۹۸)

یہ ہے توحید عبادت کی حقیقت نہ وہ کہ جو سطح بین وہابیوں کا نظریہ ہے۔ توحید افعالی کی طرف آئندہ صفحات میں اشارہ ہوگا۔

---

[1] کتاب ''مقدمہ ای بر جہاں بینی، صفحہ ۱۱۳ (تلخیص)

۴۔توحیدافعالی

(۱).....توحیدخالقیت

اشارہ:

''توحیدافعالی'' کاایک سادہ اورروشن مفہوم یہ ہے کہ سارا جہان فعل خدا ہے، ہرفعل ۔حرکت اورتاثیر کی انتہا خداہی کی طرف ہے۔ درحقیقت (لا موثر فی الوجود الا اللہ) خدا کے سوا کوئی موجود مستقل تاثیرنہیں رکھتا۔حتیٰ کہ اگرتلوار کاٹتی ہے آگ جلاتی ہے اور پانی نباتات کواگاتا ہےتو یہ سب کچھ خدا کے ارادے اورحکم ہی سے ہوتا ہے، خلاصہ یہ کہ ہرموجود کااثرتاثیرخدا کی طرف سے ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہاجاسکتا ہے کہ تمام موجودات اپنے اصل وجود میں خداسے وابستہ ہیں اوراپنے فعل وتاثیر میں بھی اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیکن یہ چیز عالم اسباب اورقانونِ علت کی حاکمیت کی ہرگزنفی نہیں کرتی جیسا کہ امام جعفرصادقؑ سے مروی ایک مشہورحدیث میں ہے(ابی اللہ ان یجری الاشیاء الا باسبابٍ)[1]

خدانے چاہا کہ تمام اموراسباب کے ذریعےانجام پاتے رہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ توحیدافعالی'' کااعتقادکسی بھی صورت میں اصل جبراورانسان کے ارادے کی آزادی کے خلاف نہیں جاتا، خدا نے چاہاتوآئندہ صفحات میں اس پرگفتگوکی جائے گی۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف متوجہ ہوتے اور''توحیدافعالی'' کی اقسام کو محل بحث قراردیتے ہیں،اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم''توحیدِ خالقیت'' سے تعلق رکھنے والی مندرجہ ذیل آیات پرنظرڈالتے ہیں۔

(۱) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۱۰۲ ﴿الأنعام: ۱۰۲﴾

(۲) قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۱۶ ﴿الرعد: ۱۶﴾

(۳) هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۳ ﴿فاطر: ۳﴾

(۴) وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

---

[1] اصول کافی جلد ا باب مغرفتہ الامام.....صفحہ ۱۸۳ حدیث،

لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ٦١ ﴿العنکبوت: ٦١﴾

(۵) وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ٩٦ ﴿الصافات: ٩٦﴾

(٦) اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ٥٤ ﴿الأعراف: ٥٤﴾ [1]

ترجمہ:

(۱) وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ ہر چیز کا خالق ہے اسی کی عبادت کرو، وہی ہر شے کا نگہبان ہے۔

(۲) کہہ دو کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ وہ یکتا اور سب پر غالب ہے۔

(۳) کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے؟ وہی تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟

(۴) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور شمس و قمر کو کس نے مسخر کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے، پھر یہ کدھر بہکے جا رہے ہیں؟

(۵) خدا نے تمہیں اور بتوں (کے بنانے میں کام آنے والی چیزوں) کو پیدا کیا۔

(٦) آگاہ ہو کہ خلق اور امر اسی (خدا) کے لیے ہے وہی صاحبِ برکت ہے۔ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

مفردات کی تشریح:

''خلق'' المفردات میں راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کا صحیح اندازہ کرنا ہے، اب یہ ایجاد و ابداع یعنی اسی چیز بنانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہ ہو۔

مقاییس اللغۃ میں ''خلق'' کے دو معنی درج ہیں (۱) صحیح اندازہ (۲) کسی چیز کا صاف ہونا

---

[1] قرآن میں اس مضمون کی اور آیات بھی ہیں جیسے زمر۔ ٦٢۔ غافر۔ ٦٢۔ حشر۔ ٢٤۔ شوریٰ۔ ٢٩، الٓمٓ سجدہ۔ ٧، لقمان۔ ١١، روم۔ ٢٢، رعد۔ ١٦، یونس۔ ٣٤

اسی لیے صاف وشفاف پتھر کو ’’خلقاء‘‘ کہا جاتا ہے اور اندرونی اوصاف کو ’’اخلاق‘‘ کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کی آفرینش ہے، بہرحال اس بناء پر کہ خلقت وآفرینش میں اندازہ کیا جاتا ہے۔اس میں تنظیم وزیبائش بھی ہوتی ہے۔لہٰذا یہ ابداعی خلقت یعنی پہلے سے موجود کسی مثال کے بغیر پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

وہ عرش کا مالک ہے:

(۱) زیرِ بحث پہلی آیت میں صفات جلال وجمال میں سے بعض کا ذکر کرنے کے بعد خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے‘‘ (ذلکم اللہ ربکم) ‘‘یعنی یہ بے حقیقت بُت نیز فرشتے اور جن تمہارے معبود نہیں، کیونکہ یہ خود مخلوق ہیں رزق اور تحفظ کے محتاج ہیں، پروردگار تو صرف خدا ہی ہے [۱]

اس کے بعد مزید کہا ہے: اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں (لاالہ الاھو) کیونکہ عبادت وبندگی کیے جانے کے لائق وہی ہے جو سب کا ’’رب‘‘ ہو یعنی تمام اشیاء کا مالک، ان کی پرورش اور تدبیر کرنے والا ہو پھر اس پر تاکید کرنے اور ایک ہی معبود کو ماننے کی دوسری دلیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ ہر چیز کا خالق ہے (خالق کل شیئٍ) اور اب نتیجہ کلام کے طور پر کہا کہ جب وہ ان اوصاف کا مالک ہے۔تو ’’اسی کی عبادت کرو‘‘ (فاعبدوئہ)

اس کے ساتھ ہی اس غرض سے کہ غیر خدا سے ہر قسم کی امید کو قطع کرے، افراد انسانی کو عالم اسباب میں دل لگانے سے باز رکھے اور شرک کی جڑوں کو جلا کر راکھ کر دے.....فرماتا ہے۔وہی ہر چیز کا نگہبان ہے (وھو علی کل شیءٍ وکیلٌ)

لفظ ’’شیءٍ‘‘ علماء لغت کے بقول ہر اس چیز کے معنی میں ہے جس سے انسانی علم واطلاع کا تعلق ہوسکتا ہے [۲] لیکن آیت زیر بحث میں اس سے خدا کے علاوہ تمام موجودات مراد لی گئی ہے۔بہرحال اس لفظ کا مفہوم بڑی وسعت رکھتا ہے اس میں موجودات مادی ومجرد، ذہنی وخارجی، جوہر وعرض وغیرہ بلکہ خدا کے سوا ہر معلوم ونامعلوم شے شامل ہے، یہ آیت خدا کی خالقیت کے عام ہونے اور اس کے ہر چیز کا خالق ہونے پر ایک واضح وروشن دلیل ہے۔

اس مقام پر ایک مشہور نزاع واختلاف ہے جو لفظ ’’شیء‘‘ میں انسانی اعمال کے شامل ہونے کے خیال سے ایک گروہ میں

---

[۱] ذٰلکم اللہ ربکم کا لفظی ترجمہ ہے ’’وہ ہے اللہ تمہارا پروردگار۔لغت عرب میں ذٰلکم اشارہ بعید کے لیے آتا ہے۔ایسے مقامات پر حد سے زیادہ عظمت کا اظہار ہے جو فکر وخیال سے باہر ہے۔

[۲] شیء ’’دراصل ’’شاءٍ‘‘ کا مصدر ہے، جو کبھی اسم فاعل (ارادہ کرنے والا) کے معنی میں اور کبھی اسم مفعول (ارادہ شدہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے غور کریں۔

پیدا ہوجیسا کہ قائلین جبر میں سے فخر رازی کہتا ہے: ہمارے اعمال بھی لفظ ''شی ء'' میں داخل ہیں، پس ان کا خالق بھی خدا ہی ہے.....وہ اس آیت کوعقیدہ جبر کی دلیل قرار دیتے ہیں لیکن انسان کی آزادی ارادہ کے حامی اس کا واضح اور مدلل جواب دیتے ہیں جس کا ذکر توضیحات میں آئے گا۔

ایک گروہ اس آیت سے اشاعرہ کے مقابل صفات زائد برذات کی نفی پر استدلال کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کی صفات زاید برذات ہیں، حالانکہ اگر یہ صورت ہوتو وہ صفات لفظ ''شی ء'' کے مفہوم میں داخل ہوکر خدا کی مخلوق قرار پاتی ہیں اور یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ خدا اپنی صفات، مثل علم وقدرت کا خالق ہے۔ نیز یہ چیز اس کے واجب الوجود ہونے کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔

اس ضمن میں بعض اشاعرہ کہتے ہیں ہ ہم اس آیت کے عموم کوتخصیص میں بدل سکتے ہیں۔یعنی ہم یوں کہیں کہ ''صفاتِ خدا'' خالق کل شی ء'' میں شامل نہیں ہیں! لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آیت کا طرزِ بیان ہر قسم کے استثناء کی نفی کرتا ہے اور خدا نے چاہا تو ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ آیت زیرِ بحث کے متعلق کوئی تخصیص وارد نہیں ہوئی ہے۔

(۲) دوسری آیت مذکورہ بالا آیت کے مضمون کو خدا کی وحدانیت وقہاریت پر تاکید کا اضافہ کرتے ہوئے بیان کرتی اور کہتی ہے ان مشرکوں سے کہو: جن کوتم خدا کے شریک قرار دیتے ہوکیا انہوں نے خدا کی طرح کوئی چیز پیدا کی ہے؟ ان مخلوقات کے بارے میں وہ دھوکہ کھا گئے ہیں، چونکہ وہ ان کے متعلق ایسا دعویٰ ہرگز نہیں کرتے لہٰذا'' کہہ دو کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے، وہ یکتا اور سب پر غالب ہے''(قل اللہ خالق کل شیء وھو الواحد القھار)۔

''قھار'' کا مادہ ''قہر'' ہے۔اس کے اصلی معنی مدمقابل کی تحقیر کے ساتھ اس پر غلبہ پانا ہے۔اس لیے یہ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ یہاں اس کا صیغہ مبالغہ آیا ہے۔لہٰذا اس کے معنی ہر چیز اور ہر فعل میں بلا قید وشرط مطلق طور پر غلبہ وکامیابی حاصل کرنے کے ہیں۔حتیٰ کہ اس سے مشرکوں کے معبود اور بت بھی مستثنیٰ نہیں ہیں.....پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ خدا کے شریک قرار پاسکیں۔

(۳) تیسری آیت میں ایک بات استفہام انکاری کی صورت میں ذکر ہوئی ہے۔جیسا کہ فرمایا: کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے؟ وہ تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے۔(ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السمآءِ والارض)۔

نہ.....اس کے سوا کوئی خالق نہیں کہ جس نے اولاً تمہیں پیدا کیا اور اَب تمہاری بقاء وحیات کے لیے اس کی طرف سے تمہیں متواتر روزی مل رہی ہے۔وہی ہے جو آسمان سے سُورج کی حیات بخش روشنی، زندہ رکھنے والی بارش اور رُوح پرور ہوا کے جھونکے بھیجتا ہے۔وہی ہے جو زمین سے تمہیں سبز یاں میوے، اناج اور قیمتی معدنی ذخائر عطا فرماتا ہے۔

جب اس کے سوا کوئی خالق ورزاق نہیں اور تمہارا آغاز وانجام اسی کے ہاتھ میں ہے تو اس کے سوا کوئی معبود بھی نہیں ہے۔اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں پھر تم کدھر بہکے جارہے ہو،(لا الہ الا ھو فانی توفکون)

بُت پرست بھی خدا کو خالق جہان مانتے ہیں:

(۴) چوتھی آیت میں ''توحید خالقیت'' کا ایک اور انداز سے ذکر ہوا ہے وہ یوں کہ بت پرست بھی اس بات کے معترف ہیں کہ آسمان وزمین کے خالق بت نہیں بلکہ خدا ہی ان کا خالق ہے۔ ارشاد ہوا: اگر آپ ان (مشرکوں) سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور شمس وقمر کو کس نے مسخر کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے (ولئن سالتهم من خلق السمٰوٰتِ والارض وسخر الشمس والقمر ليقولن الله)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین اپنے بُتوں کو عبادت یا انسانوں کی تقدیر میں تاثیر رکھنے میں خدا کے شریک وہم پایہ سمجھتے تھے نہ کہ خالقیت میں..... کیونکہ کوئی عاقل انسان ان بتوں کو زمین وآسمان کے خالق نہیں کہتا کہ جو پتھر اور لکڑی سے خود انسانوں نے بنائے اور وہ گویا انسان کی تخلیق ہیں، حتیٰ کہ وہ انبیاء واولیاء کے لیے بھی اس مرتبے کے قائل نہ تھے۔

یہ آیت ضمنی طور پر اس عقیدے کے انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہونے کی طرف ایک اشارہ بھی قرار پاسکتی ہے، لیکن توحید خالقیت اور توحید عبادت میں کوئی تناقض نہیں لہٰذا خدا کو خالق ماننا اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرلینا بہت بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ عبادت کے لائق وہی ہے۔ جو خالق ورازق ہے جس نے آفتاب ومہتاب کو مسخر کیا اور انہیں انسان کا خدمت گذار بنایا، اس لیے خالقیت اور بوبیت میں کوئی جدائی نہیں، نہ ربوبیت اور الوہیت میں کوئی غیریت ہے۔ اس سے واضح تر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہی خالق وہی مدبر جہان اور وہی بندوں کے لیے عبادت اور پرستش کے لائق ہے۔

بعض مفسرین مثلاً تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کے مولف کا خیال ہے کہ مشرکین عرب میں توحید خالقیت کا اعتقاد حضرت ابراہیمؑ جیسے انبیاءؑ کی تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات میں سے تھا[1] لیکن اس بات پر مصر ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ عقل ووجدان کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہر انصاف پسند انسان اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اس جہان کو پیدا کرنے والی ایک ہستی لازماً وجود رکھتی ہے جیسا کہ تفسیر روح البیان میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[2]

بہرحال مسئلہ آفرینش اور تسخیر کا ایک ساتھ ذکر کرنے میں دو چیزیں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان میں سے ایک معاملہ خلقت اور دوسرا مسئلہ تدبیر ہے کہ یہ دونوں خدا ہی کے فرمان سے انجام پاتے ہیں۔

اس آیت اور تسخیر سے متعلق دیگر آیات میں ''تسخیر'' سے مراد (آفتاب ومہتاب سے) انسان کے منافع کیلئے کام لینا ہے

''فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ'' کا مادہ ''افک'' بروزن ''فکر'' ہے..... اس کا معنی کسی چیز کو اس کے اصل راستے سے ہٹادینا ہے اس پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ممکن ہے یہ اس چیز کی طرف اشارہ ہو کہ صحیح راستہ یہ ہے کہ خالقیت وتدبیر کا اعتقاد رکھنے کے بعد اس کے سوا کسی کی

---

[1] تفسیر ''فی الطلا القرآن'' جلد ۶ صفحہ ۴۲۸۔

[2] تفسیر روح البیان جلد ۶ صفحہ ۴۸۸

عبادت نہ کی جائے لیکن ان لوگوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کرلیا اور نفسانی وشیطانی خیالوں کے گرداب میں پھنس گئے جس نے انہیں تنکوں کی طرف ادھر سے اُدھر پھینک دیا اور وہ غلط رہوں پر چل پڑے (توجہ رہے کہ مخالف ہواؤں کو مؤتفکات کہا جاتا ہے)

(۵) پانچویں آیت میں بتوں کے مخلوق ہونے کا ذکر ہے جیسا کہ فرمایا: خدا نے تمہیں اور بتوں (کے بنانے میں کام آنے والی چیزوں) کو پیدا کیا (وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ)

یہ اس لئے کہا گیا کہ اس سے پہلی آیت میں توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیمؑ کی زبانی مشرکین سے یوں خطاب ہوا ہے: کیا تم اس چیز کی پرستش کرتے ہو جسے تم نے خود تراشا اور بنایا ہے؟ اس کے بعد آیت زیر بحث میں فرمایا: تم اور تمہارے یہ بت (جو تم نے بنائے) خدا کی مخلوق ہیں، لہٰذا تم مین سے کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں بلکہ یہ بت تو تم سے پست تر ہیں کہ انہیں تم لوگوں نے اپنے ہاتھوں یہ شکل وصورت دی ہے۔

البتہ ان معنوں کے لحاظ سے ''ماتعملون'' میں ''ما'' موصولہ ہوگا لیکن بعض علماء نے یہ احتمال دیا ہے یا ان کا اصرار ہے کہ یہ ''ما'' مصدریہ ہے مگر اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ قرار پائے گا۔ خدا نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے جب کہ یہ مفہوم کئی وجوہ سے مناسب نہیں ہے۔

(۱) اس آیت میں خداوند تعالیٰ مشرکوں کو ان کی بت پرستی پر سرزنش کر رہا ہے۔ اگر خود خدا ہی ان کے اعمال کا خالق ہے تو یہ سرزنش کس بنا پر ہے۔

(۳) آیت ماقبل میں بُتوں کے بارے میں بات ہو رہی ہے کہ وہ انہیں اپنے ہاتھوں تراشتے ہیں'' مناسب یہی ہے کہ اس آیت میں بھی انہیں کا ذکر ہو ورنہ ربط آیات ٹوٹ جائے گا۔ اسی بناء پر بہت سے مفسرین جیسے زمخشری نے کشاف میں، آلوسی نے روح المعانی میں اور علامہ طباطبائی نے المیزان میں تفسیر اوّل ہی کو ترجیح دی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے یہ کیونکر ممکن ہے کہ بت انسان کی صنعت بھی ہوں اور پھر خدا کی مخلوق بھی ہوں زمخشری نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے: بتوں کا مواد خدا کی مخلوق اور ان کی شکل انسان کی صنعت ہے جنہوں نے ان کو تراشا ہے [1]

لیکن بتوں کی صورت وشکل بھی ایک طرح سے خدا کی مخلوق ہے کیونکہ خدا نے ہی انسان کو قوت، علم اور مہارت دی اگرچہ اس نے ان صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھانے سے منع بھی کر رکھا ہے۔

(۶) چھٹی اور آخری آیت میں ہم توحید خالقیت کا ذکر ایک نئے انداز میں پاتے ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے آگاہ رہو کہ خلق اور امر (تدبیر عالم) اسی (خدا) کے لیے ہے۔ (الالهُ الخلق والامرُ)

وہی صاحب برکت ہے جو عالمین کا پروردگار ہے (تبرك الله رب العلمين)۔

بلاشک یہ آیت ''خلق'' اور ''امر'' کے خدا کی ذات کے لیے حصر وانحصار پر ایک واضح دلیل ہے اس بناء پر یہ آیت بڑی وضاحت کے

---

[1] تفسیر کشاف جلد ۴ صفحہ ۵۱۔

ساتھ ''توحید خالقیت'' کو بیان کر رہی ہے [1]

لیکن اس بارے میں کہ ''امر'' سے کیا مراد ہے.....مفسرین کے درمیان بہت زیادہ بحث وگفتگو رہی ہے، ان میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس سے مراد تدبیر جہان اور وہ نظم وقانون ہے جو یہاں تکوینی طور پر جاری وساری ہے ان کے بیان کا قرینہ وہ کثیر آیات ہیں جن میں یہی بات کہی گئی ہے۔ مثلاً ان فرشتوں کی قسم کہ جو تدبیر امور تدبیر جہان اور وہ نظم وقانون ہے جو یہاں ان فرشتوں کی قسم کہ جو تدبیر امور کرتے ہیں فالمدبراتِ امراً (نازعات، ۵) خدا وہ ہے جس نے دریا کو تمہارے لیے مطیع بنایا تا کہ اس میں اسی کے امر سے کشتیاں حرکت کریں الله الذی سخر لکم البحر التجری الفلك فیه بأمره (جاثیہ ۱۲) ان کے ایسی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

بعض مفسرین نے ''امر'' کو نہی کے مقابل امر تشریعی واحکام الٰہی کے معنی میں تصور کیا ہے، اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوتے ہیں: خلق وآفرینش خدا کے ساتھ مخصوص ہے، اسی کی طرف سے بندوں کے لیے احکام تشریعی صادر ہوتے ہیں، جیسے ایک آیت میں کہا گیا: جو لوگ امرِ خدا کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس سے باز رہیں۔ فلیحذرِ الذین یخالفون عن امره (نور، ۶۳)

لفظ ''امر'' کی تیسری تفسیر میں اس سے مراد ''ارادہ'' ہے۔ جیسے خدا جس امر کا ارادہ کرتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے ان الله بالغ امره (طلاق ۳)

چوتھی تفسیر میں عالم ''خلق'' سے عالمِ مادہ اور عالم ''امر'' سے عالم مجردات مراد لیا گیا ہے، اس میں یہ آیت پیش نظر رکھی گئی ہے۔ یہ آپ سے رُوح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہیں کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی۔ (اسراء ۸۵)

لیکن یہ بات واضح ہے کہ پہلی تفسیر قرآنی آیات اور زیرِ بحث آیت کے مضمون سے بھی مناسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ قرآن مشرکین کو باور کرانا چاہتا ہے کہ خلقت وآفرینش اور مخلوقات کی تدبیر خدا کے ساتھ مخصوص ہے، پھر ''رب العالمین'' کا جملہ بھی اس کا شاہد ہے۔

پس بتوں کا نہ خلقت میں اور نہ ہی تدبیر وربوبیت میں کسی طرح کا دخل ہے لہٰذا ان کی پرستش کیوں کرتے ہو؟

توضیحات

(۱) شرک در خالقیت کی طرف پہلا قدم:

ممکن ہے زبردستی وہ پہلے لوگ ہوں جنہوں نے خالقیت میں خدا کا شریک ٹھہرایا، اگر ایسا نہ ہو تو بھی وہی شرک پر اعتقاد رکھنے میں زیادہ مشہور ہیں۔

زردشتیوں نے موجودات کی دو اقسام قرار دیں.....نیک وبد.....(خیر وشر).....پھر انہوں نے ان دونوں اقسام میں سے ہر ایک

---

[1] خلق وامر پر ''لہ'' کی تقدیم خدا کے لیے ان کے حصر اور غیر سے نفی کی دلیل ہے۔

کے لیے ایک الگ خالق تجویز کیا یعنی ''یزدان واہرمن، یا ''نور وظلمت'' اس کے لیے ان کی دلیل یہ ہے کہ خالق اور مخلوق میں مناسبت ہونا چاہیے اور ''خیر'' کے خالق کی ''شر'' سے کوئی نسبت نہیں لہٰذا ''خیر'' کا خدا ''خیر'' اور ''شر'' کا خدا ''شر'' کا حامل ہے۔[1]

بہرحال اگر موجودات جہان میں یہ گروہ بندی موجود ہوتی ہے تو ممکن ہے ان کا یہ استدلال صحیح قرار پاتا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جہان میں ''خیر'' کے علاوہ کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جس چیز کو ''شر'' کا نام دیا جاتا ہے وہ یا تو عدمی ہے یا نسبتی پہلو سے شر کہلاتی ہے۔مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ''فقیر'' شر ہے، جب کہ فقر ضروریات زندگی سے تہی دامن ہونے کے سوا کچھ نہیں، یہ ناداری ایک امر عدمی ہے اور عدم ایک ایسی چیز ہے، کہ اس کا کوئی آفریدگار نہیں ہے۔

یا یوں سمجھ لیں کہ ہم شہد کی مکھی کے ''ڈنک'' اور درندے کے ''نیچے'' کو شر کہہ دیں جب کہ ہم خود کو مرکز ومحور تصور کرتے ہوئے اس طرح کا فیصلہ دیتے ہیں۔لیکن اگر ہم شہد کی مکھی کی طرف توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ڈنک اپنے دشمن سے دفاع کے لیے اس کی اہم ضرورت ہے اسی طرح درندے کا پنجہ اس کے لیے شکار کرنے اور اپنی خوراک بہم پہچانے کا وسیلہ ہے۔لہٰذا یہ چیزیں ان کے لیے ''خیر'' کا پہلو رکھتی ہیں۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے موجودات ہیں جن کو ہم اپنے حسابوں ''شر'' کہتے ہیں لیکن ان کی اصلیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

کبھی ہماری جہالت اور بے علمی اس کا سبب بنتی ہے کہ ہم بعض چیزوں کو برا (شر) سمجھ لیتے ہیں۔

مثلاً ممکن ہے کہ ہم میکروب (جراثیم) کے وجود کو شر سمجھیں کہ وہ بیماری پیدا کرتے ہیں۔لیکن اگر ہم بعض ماہرین کے نظریئے پر توجہ کریں کہ میکروب انسانی بدن کے سلول (خلیوں) کو ہمیشہ مقابلے پر اکساتے ہیں جس سے ان میں زیادہ سے زیادہ طاقت اور فعالیت پیدا ہوتی ہے۔اگر یہ میکروب نہ ہوں تو شاید ایک انسان کا وجود اسی (۸۰) سال سے اوپر زندہ نہ رہتا اور اس زندگی میں بھی وہ کمزور وناتواں ہوتا، اس لحاظ سے ہم مانتے ہیں کہ ہمارا ان میکروب کو شر (برا) سمجھنا خود ہماری ہی نادانی کا نتیجہ ہے اور وہ حیات انسانی کے لیے مفید اور نافع ہیں۔

یاد رہے کہ جس خالق نے ان میکروب کو پیدا کیا، جب وہ حد سے بڑھ جائیں تو ان سے مقابلہ کرنے اور انہیں زیر کرنے کا سامان بھی کر دیا ہے۔چنانچہ انسان کے جسم میں ایسے خیلے موجود ہیں جو ان کا سامنا کرتے ہیں۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہے آج کے دور میں حیوانات کے زہر سے کئی ایک شفا بخش دوائیں تیار کی جارہی ہیں اسی لیے قسم قسم کے سانپ اور دوسرے زہریلے جاندار اپنے اندر زہر کی تیاری اور حفاظت کرتے ہیں۔پس ایسے جانداروں کے ڈنک اور ان میں پائے جانے والے زہر مطلق طور پر بُرے (شر) نہیں ہیں اس موضوع کے بارے میں مزید وضاحت انشاءاللہ عدلِ الٰہی کی بحث کے ضمن میں کی جائے گی۔

(۲) راہِ شرک میں دوسرا قدم:

مسئلہ شرک میں مسلمانوں کے دو گروہ صحیح راستے سے بھٹک گئے وہ شاعرہ اور معتزلہ (مفوضہ) ہیں۔

---

[1] بعض کے نزدیک یہ عقیدہ مزدک اور اس کے پیروکاروں کا ہے لہٰذا وہ زردشت کو موحد سمجھتے ہیں۔

اشاعرہ:

اشاعرہ، ابوالحسن اشعری (متوفی ۳۲۴ھ) کے پیروکار ہیں، یہ لوگ عالمِ خلقت میں علت ومعلول اور ہر قسم کی تاثیر کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں: اگر آگ کسی چیز کو جلا رہی ہے تو یہ محض ایک مفروضہ ہے اور دراصل جلانے والا خدا ہے، لیکن خدا کا ارادہ یہ ہے کہ آگ اس وقت جلائے گی جب انسان کا ہاتھ اس سے مس کرے خدا ہی نے اس کے ہاتھ کے لیے جلنا مقرر کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اس جہان میں علت ومعلول کے وجود سے انکار کیا ہے، ان کے نزدیک بلا وسطہ اور براہ راست سب کاموں کی علت صرف خدا ہی ہے۔

انہوں نے ایک محسوس بلکہ محسوس سے بھی بالاتر چیز کا انکار کر دیا۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہم عالم اسباب کا اعتقاد کر لیں تو ''توحید خالقیت'' اُلٹ پلٹ ہو کر رہ جائے گی[1]

اشاعرہ اس بہت بڑی غلط فہمی کے باعث ایک زبردست انحراف میں گرفتار ہو گئے وہ یہ کہ انہوں نے انسان کے اعمال وافعال کو بھی خدا کی مخلوق سمجھ لیا اور یہ خبر کی بدترین قسم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات جبر سے بھی کچھ بڑھ کر رہے کہ وہ کہتے ہیں: یہ ہم نہیں ہیں جو اچھے برے اعمال انجام دے رہے ہیں، بلکہ ان کا خالق خود خدا ہی ہے، اصل میں یہ براہ راست اسی کے اعمال ہیں اور یہ ہمارے جبری اعمال نہیں ہیں۔ (غور کریں)

معتزلہ:

اشاعرہ کا نقطہ مقابل معتزلہ ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ اس جہان میں اسباب وعلل ہیں اور یہ اپنی تاثیر میں مستقل ہیں۔ مثلاً وہ معتقد ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے بعض انبیاء اور اولیاء کو پیدا کیا اور پھر امرِ خلقت ان کے سپرد کر دیا نیز وہ انسان کو اپنے اعمال میں کلی طور پر مختار ومستقل جانتے ہیں۔ اس طرح وہ انسان کو خالق اصغر اور خدا کو خالق اکبر تصور کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں گروہ غلط فہمی میں پڑ گئے اور دونوں ہی ایک طرح سے شرک میں مبتلا ہوئے ہیں، ان میں سے ایک گروہ شرک جلی میں اور دوسرا شرک خفی میں گرفتار ہے۔

چنانچہ معتزلہ جو ''تفویض'' کے قائل ہیں وہ شرک جلی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے اعمال میں انسان کے مستقل ومختار کل ہونے کے معتقد ہیں یا وہ اس چیز پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے زمین وآسمان کی خلقت وآفرینش اپنے اولیاء کے سپرد کر دی اور خود ایک طرف ہو بیٹھا ہے۔ یہ نظریہ اور یہ تصور صریحاً قرآنی آیات کے خلاف ہے کیونکہ قرآن پکار پکار کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا شرکت غیرے اس کائنات کا خالق اور مدبر ہے۔ یہ بڑی تعجب کی بات کہ کوئی شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہو اور پھر اسی لایعنی گفتگو کرے۔

---

[1] قانون علت صرف حسی چیز نہیں ہے بلکہ وجدان اور علم حضوری سے بھی اس تک رسائی ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص واضح طور پر دیکھتا ہے کہ اس کی روح ایک ارادہ اور تفکر پیدا کرتی ہے۔

اسی طرح اشاعرہ کا گروہ بھی شرک کی ایک اور قسم کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ اولاً دنیا میں اصل علیت کے وجود سے انکار وجدان وحسن کے برخلاف ہے ثانیاً اگر اصل علیت کو ماننا شرک ہے تو پھر وجود انسان کو ایک اصل کے طور پر تسلیم کرنا بھی شرک ہوگا۔

انسان اپنے اعمال وافعال کی انجام دہی میں مختار اور آزاد ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کی قوت وطاقت یہاں تک کہ اس کے ارادے کی آزادی بھی خدا کی عطا کردہ ہے وہی ہے جو چاہتا ہے کہ انسان آزاد ہو۔اس لیے انسانی اعمال جو انسان ہی کے ہیں، ان کی خدا کی طرف نسبت دی جاسکتی ہے اور وہ اس کے دائرہ خلقت سے خارج نہیں ہیں، جیسے یہ اعتقاد کہ وجود انسان اسی سے وابستہ ہے اور یہ شرک نہیں۔

ایک مثال پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ بہت سی گاڑیاں بجلی سے چلتی ہیں جس کے تار پٹڑی کے ساتھ ساتھ اُوپر تنے ہوتے ہیں، ان تاروں سے انجن کا رابطہ ایک آہنی حلقے کے ذریعے قائم رہتا ہے گاڑی چلانے والا (ڈرائیور) اپنے عمل میں آزاد ہے کہ اپنی مرضی سے گاڑی کو چلاتا اور ٹھہراتا ہے لیکن اس سارے عمل کی مرکزی قوت کسی اور کے ہاتھ میں ہے کہ جس کو بجلی کے تاروں کے اس سارے سلسلے پر قابو حاصل ہے اور وہ جب چاہے ایک بٹن دبا کر گاڑی کو روک دے۔لہٰذا وہ یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ گاڑی کی حرکت میرے بس میں ہے اور گاڑی کا ڈرائیور بھی یہ بات کہنے کا حق دار ہے کہ گاڑی کا چلنا اور ٹھہرنا میرے ہاتھ میں ہے۔درحقیقت وہ دونوں ہی سچ کہہ رہے ہیں کیونکہ وہ دونوں گاڑی چلانے ٹھہرانے کے فعل کے فاعل ہیں لیکن ان کا فعل ایک دوسرے کے طول میں یعنی یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتا ہے نہ کہ ایک دوسرے کے مقابل۔

ایک پہلے مرحلے میں گاڑی چلانے کے فعل کا فاعل ہے اور وہ بلند وبالا ہے۔

دوسرا مرحلہ دوم میں اس فعل کا فاعل ہے جو پہلے کے ساتھ وابستہ اور اس سے پست ہے۔

گاڑی کو چلانے اور روکنے کے عمل کی نسبت دونوں کی طرف ہے۔لیکن اس کے باوجود ڈرائیور اپنے کام میں آزاد اور جواب وہ ہے نہ کہ مجبور..... بناء بریں انسان کے اپنے ارادے میں آزاد ہونے کا اعتقاد خدا کی خالقیت میں شرک متصور نہیں ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر اصل وجود انسان جو خدا سے وابستہ ہے اور اس کو تسلیم کرنا موجب شرک نہیں تو انسان کے افعال کو اس سے نسبت دینا بھی شرک قرار نہیں پاتا۔

اشاعرہ وجودِ انسان کو مستقل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، لیکن اگر ایک وجود وابستہ توحید میں مزاحم نہیں تو اس کے افعال بھی توحید میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتے۔

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک اور مثال سے اس بحث کو کچھ اور بھی واضح کر دیا جائے۔

اشاعرہ کی طرف سے اصل علیت وسببیت کا انکار اس گمان کی بناء پر ہے۔ یہ شرک شمار ہوتا ہے یعنی اگر جلانے کے عمل کو آگ کی طرف نسبت دیں تو بقول ان کے یہ شرک ہے، جب کہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آیا خدا کے مقابل آگ کے اصل وجود کا قائل ہونا شرک نہیں ہے؟ اس کے جواب میں وہ لازماً یہ کہیں گے۔

کہ آگ کا وجود ذاتِ خداوندی سے وابستہ ہے۔لہٰذا آگ کے وجود کو تسلیم کرنا شرک نہیں ہے (جیسا کہ وہ روشنی جو قمقمے سے مرتعش ہوتی ہے وہ اس قمقمے کے بجلی گھر سے رابطے کی بدولت اسی سے وابستہ ہے اور جب یہ رابطہ منقطع ہوجائے تو وہ روشنی ناپید ہوجاتی ہے)۔

بعینہٖ یہی بات ہم اس دنیا میں اسباب وعلل کی تاثیر کے بارے میں کہتے ہیں کہ آخرش وہ خدا کے وجود سے وابستہ ہیں، انسان کی قوت واختیار بھی اسی ذات سے وابستہ ہے۔ بہ ایں طوران تمام موارد میں توحید ثابت ومحفوظ رہے گی، گویا ہر چیز کا خالق خدا ہے۔ اصل علیت اور انسان کی آزادی ارادہ کو تسلیم کرنے سے اس کی خالقیت ووحدانیت میں کوئی خلل نہیں آتا۔

جبر واختیار کی بحث میں انشاءاللہ اس موضوع سے متعلق مزید تشریحات سپردِ قلم کی جائیں گی۔

(۲) توحید ربوبیت

اشارہ:

توحید ربوبیت کے معنی یہ ہیں کہ اس عالم ہستی کا منصوبہ ساز، اس کا نظام قائم کرنے والا اور اسے چلانے والا صرف خدائے واحد ہے۔

لفظ ''رب'' کہ خدا کے صفات میں سے ایک ہے اور فارسی میں اس کا بدل ''پروردگار'' آتا ہے۔ شاید یہ تمام اوصاف خداوندی میں سے قرآن میں سب سے زیادہ دوہرایا گیا ہے۔ (یعنی رب، ربك، ربكم، ربنا، اور ربی کی صورت نو سے زیادہ مرتبہ قرآن میں مذکور ہے)۔

بہت سی آیات قرآن میں خداوند تعالیٰ کو ''رب العالمین'' (اہل جہان کو پالنے والے) کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن مسئلہ توحید ربوبیت پر خاص طور پر توجہ دیتا ہے، کیونکہ مشرکین ایسے لوگ تھے جو تدبیر جہاں (دنیا کا نظام چلانے) مین بعض موجودات کو خدا کے ساتھ شریک اور ساجھی قرار دیتے تھے۔ چونکہ اکثر مشرکین جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ توحید خالقیت پر یقین رکھتے تھے، لیکن توحید ربوبیت کے ضمن میں شرک کے مرتکب ہو رہے تھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن عقیدے کی اس غلطی اور اس بہت بڑی گمراہی کی بار بار تردید کرتا ہے۔ جو مختلف اقوام میں موجود رہی ہے، نیز یہ کہ شرک وروبیت بجائے خود بہت سی گمراہیوں اور بے لگامیوں کا سرچشمہ ہے جن کے بارے میں آئندہ مباحث میں گفتگو کی جائے گی۔

اس اشارے کے ساتھ ہی ہم توحید روبیت سے متعلق آیات قرآن میں سے درج ذیل آیتوں پر توجہ دیتے ہیں۔

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (فاتحه [1]۔۱)

(۲) قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۔ ﴿الأنعام: ۱۶۴﴾

(۳) قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قُلِ اللّٰهُ ﴿رعد: ۱۶﴾

(۴) فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۱۱۶ ﴿المؤمنون: ۱۱۶﴾

---

[1] رب العالمین'' کی ترکیب آیاتِ قرآن میں کچھ اوپر چالیس بار آئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے مسئلہ توحید ربوبیت کی وضاحت اور تشریح پر بہت زیادہ توجہ دی ہے جس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۵) اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۱۲۶ ﴿الصافات: ۱۲۶﴾

(۶) قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ؕ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۳۱ ﴿یونس: ۳۱﴾

ترجمہ:

(۱) تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں جو تمام اہل جہان کا پالنے والا ہے۔

(۲) کہو کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی پروردگار ڈھونڈوں، جب کہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے۔

(۳) کہو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہو کہ اللہ!

(۴) پس برتر ہے وہ خدا جو بادشاہ حق ہے (اس سے بالاتر ہے کہ تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہو) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرشِ کریم کا پروردگار ہے۔

(۵) وہی اللہ تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا پروردگار ہے۔

(۶) کہو کہ کون تمہیں آسمان وزمین سے روزی دیتا ہے؟ کون کان آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے؟ کون زندہ کو مردہ میں سے، اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا ہے؟ زندہ کو مردہ میں سے، اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا؟ کون امور عالم کی تدبیر کرتا ہے؟ فوراً وہ (تمہارے جواب میں) کہیں گے.....اللہ.....کہو کہ پھر کیوں تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟ (کیوں خدا سے نہیں ڈرتے اور راہ شرک پر چلتے ہو)۔

مفردات کی تشریح:

''رب'' یہ ایک بنیادی لفظ ہے، اس کی شاخیں اور مواردواستعمال بہت زیادہ ہیں۔ یہ ایک اساسی و بنیادی لفظ اس اس طرح ہے کہ المفرادات میں راغب اصفہانی کہتا ہے: اس کے معنی تربیت دینا اور کسی چیز کو کمال کی راہ پر ڈالنا ہیں۔

مقاییس اللغۃ میں اس کے چند ایک اساسی معنی بیان ہوئے ہیں۔

(۱) وہ شخص جو کسی چیز کی اصلاح کرے اور اس عمل پر قائم رہے۔

(۲) جو کسی چیز کو لازم کرے اور اسے قائم رکھے۔

(۳) دو چیزوں کو آپس میں ملانا۔

لیکن جیسا کہ ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں کہا گیا ہے کہ ان سب معانی کی بازگشت ایک اصل کی طرف ہے جس کی تعبیر کچھ یوں ہے: رب ور بوبیت سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو مختلف جہات مثلاً مادی ومعنوی ذاتی وعرضی، نیز اعتقاد، صفات اور اخلاق میں کمال حاصل کرنے اور نقائص دور کرنے کے راستے پر لگانا اور اس میں اس کی نصرت کرنا۔

چونکہ ایسے عظیم کام کے لیے اقدام کرنے میں دیگر مفاہیم، جیسے اصلاح، تدبیر، حکومت مالکیت مصاحبت، سیادت، اجتماع، تعلیم اور تغذیہ بھی شامل ہیں، اس لیے ان معانی میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کتب لغت میں اس کے متعدد معانی ذکر ہوئے ہیں، مثلاً لسان العرب میں ہے۔ کہ لفظ ''رب'' کا اطلاق خداوند کریم کی ذاتِ پاک پر کیے جانے کے علاوہ اسے مالک وقاء مدیر، مربی، قیم اور منعم کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے یہ اصل میں اس کے معنی وہی پرورش، تربیت اور کمال کی طرف لے جانا ہیں پھر ان کے ساتھ لزوم رکھنے والے ہر امر پر اس کا اطلاق ہونے لگا، اسی بنا پر لفظ ''رب'' کے فارسی ترجمہ میں اسے ''پروردگار'' سے تعبیر کیا جاتا جو ان تمام معانی کا جامع ہے [۱]

بہرحال علماء لُغت کے اقوال سے اس کا جو مفہوم سمجھ آتا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ ''رب'' مفرد طور پر صرف ذات الٰہی کیلئے بولا جاتا کیونکہ وہی تمام چیزوں کا مالکِ حقیقی، دلی اور مصلح ہے لیکن جب یہ غیر خدا کے لیے استعمال ہو تو یہ کسی اور کلمہ کی طرف مضاف ہوگا، جیسے ''رب الدار'' (گھر کا مالک) ''رب الابل'' اُونٹ کا مالک) اور ''رب الصبی'' (بچے کی پرورش وتربیت کرنے والا)'' [۲]

جب لفظ ''رب'' خدائے تعالیٰ کے لیے استعمال کیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ ربوبیت کے مختلف جہات کو ظاہر کر رہا ہو۔ جیسے مالکیت، تدبیر، اصلاح اور سرپرستی وعطائے نعمت وغیرہ (غور کریں)۔

''تدبیر'' اس کا مادہ ''دبر'' بروزن ''ابر'' ہے جس کا معنی کسی چیز کے بعد یا پیچھے آنا ہے، تدبیر سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کا انجام خوب ہو اور وہ مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کے قابل بن جائے..... یہ کام علم وآگاہی کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ''مدبر'' ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو مختلف کاموں کے نتیجے پر نظر رکھیں، ان کو مطلوبہ مقاصد تک پہنچائیں اور اس بارے میں ضروری علم وآگاہی رکھتے ہوں [۳]

---

[۱] یاد رہے کہ رب کا مادہ ''دبب'' ہے جیسے تربیت کا مادہ ''ربو'' ہے لغت میں ''رب'' کے جو معنی دیئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''ربب ور بو'' ایک ہی معنی رکھتے ہیں، علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان جلد ا صفحہ ۳۲ میں ان دونوں لفظوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔

[۲] لسان العرب، مفرداتِ راغب اور قاموس اللغۃ میں مادۂ ''رب'' کے ذیل میں دیکھیں۔

[۳] ملاحظہ فرمائیں۔ مقاییس اللغۃ، مفرداتِ راغب، اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

اے خدا.....تو سارے جہان کا پروردگار ہے

(۱) پہلی آیت جسے ہم اپنی نمازوں میں دوہراتے ہیں اس میں کہا گیا ہے تمام تعریفیں خدا کیلئے ہیں جو تمام اہل جہاں کا پالنے والا ہے۔ (الحمدللہ رب العلمین)

یہ جملہ اسی صورت میں قرآن کی متعدد آیات میں بندوں کی طرف سے اور خدا کی طرف سے بار ہا دہرایا گیا ہے، ان مواقع پر کبھی اس کا تعلق دنیا سے ہے اور کبھی قیامت سے مربوط ہے۔[1]

درحقیقت یہ آیت اپنے اندر ایک پر معنی استدلال لیے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ خدائے بزرگ وبرتر ہر طرح حمد، ستائش اور تعریف کے لائق ہے کیونکہ وہ اہل جہاں کا حقیقی وواقعی مربی وسرپرست ہے۔ وہ ان کا خالق بھی ہے اور رازق بھی، ان کا مالک بھی ہے اور کمال کی طرف لے جانے والا بھی، وہ ان کے کام بنانے والا ہے بھی ہے۔ اور ان کو نیک وبد سجھانے والا بھی وہ ان کا معلم بھی ہے اور ہادی بھی۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ''الحمد'' جب جنس کی صورت میں آئے تو اس میں تمام اقسام کی تعریفیں اور ستائشیں شامل ہوجاتی ہیں، اسی طرح العالمین'' جب الف لام کے ساتھ جمع کی صورت میں آئے تو یہ تمام موجودات عاقل وغیر عاقل مادی ومجرد کو شامل ہوتا ہے۔ اس کے صیغہ جمع عاقل آنے کی وجہ مخلوق عاقل کی تغلیب وکثرت ہے[2])

بنابریں اگر اس دُنیا میں کچھ لوگ تعلیم وتربیت اور رزق ونعمت دے رہے ہیں تو یہ اس خدائے واحد کی ربوبیت ہی کا پرتو ہے اگر کوئی شخص مالکیت رکھتا ہے تو یہ اسی کی مالکیت مطلقہ کی ایک شعاع ہے لہٰذا قبل اس کے کہ ہم اس کے بندوں کے احسان پر ان کا شکریہ ادا کریں اور ان کی تعریف کریں، ہمیں خدا کی ذات مقدس کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

چونکہ ''حمد وسپاس'' اس کی طرف سے عطاء ہونے والی نعمتوں پر ہے لہذا فخر رازی نے اس مقام پر خداوند تعالیٰ کی نعمتوں کا اجمالی تذکرہ کیا ہے وہ کہتا ہے، اگر صرف انسانی بدن پر بغور نظر ڈالی جائے تو بقول ماہرین علم الاعضاء اس میں قریباً پانچ ہزار مختلف اعضاء اور طرح طرح کی مفید وامنافع بخش رگیں اور نسیں ہیں جو خدا نے اپنے کرم سے ہمیں عنایت فرمائی ہیں نیز یہ کہ ان میں سے جو چیزیں معلوم ہوچکی ہیں۔ وہ ان کے مقابل بہت کم ہیں جو ابھی دریافت نہیں ہوئی ہیں بلکہ معلوم رگ وپے نامعلوم چیزوں کے سامنے سمندر

---

[1] سورۂ انعام: ۱ سورۂ یونس۔ ۱۰ سورۂ صافات۔ ۱۸۲ سورہ زمر۔ ۷۵ سورۂ مومن۔ ۶۵۔

[2] یہی وجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سامنے خداوند تعالیٰ کو رب العالمین، کی صفت کے ساتھ یاد کیا تو اس نے پوچھا رب العالمین کون ہے؟ حضرت موسیٰ نے جواب دیا: رب السمٰوٰت والارض وما بینھما یعنی رب العالمین وہ ہے جو آسمانوں وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کا پروردگار ہے۔

میں سے ایک قطرہ کی مانند ہیں۔

پھر وہ خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کے آثار اور جہان ہستی میں اس کی تدبیر وحکمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: ان چیزوں پر توجہ دی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس دُنیا کی تمام چیزوں کو انسان کے اختیار میں دے رکھا ہے، لیکن وہ تا حال ان میں سے بہت کم چیزوں کی حقیقت تک پہنچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''الحمدللہ'' کا جملہ ان تمام منکشف وغیر منکشف حقائق ومسائل کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔[1]

البتہ فخر رازی نے اپنے زمانے کے علوم کے لحاظ سے بات کی ہے۔ لیکن ہمارے زمانے تک مختلف علوم نے جو ترقی کی اور جو در یا فتیں ہو چکی ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اس نے جو اعداد وشمار دیئے ہیں وہ بہت کم بلکہ صفر کے برابر ہیں۔ کیونکہ صرف انسان کے بدن میں ایک کھرب سلول اور خلیے وجود رکھتے ہیں، جو انسان کی بقاء کے لیے مصروفِ کار اور پروردگار کی ربوبیت سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ خدا کی اس نعمت پر شکر ادا کرنا لازم ہے۔ اگر انسان اپنے بدن میں پائے جانے والے ان خلیوں کو شمار کرنا چاہے اور شب وروز اس کا کام میں لگا رہے تو تین لاکھ سال درکار ہوں گے۔ پھر وہ خدا کے شکر کا حق کس طرح ادا کر سکتا ہے۔؟ یعنی انسان خدا کی نعمتوں پر جتنا بھی شکر ادا کرے وہ کم تر ہی ہوگا۔

(۳) دوسری آیت کہ جس میں رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔ اس میں فرماتا ہے (اے پیغمبرؐ! ان مشرکوں سے) کہو کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی پروردگار ڈھونڈوں جب کہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے۔ (وقل اغیر اللہ ابغی ربا وھو رب کل شیء)۔

تم خود کو دنیا کے کلی وعمومی نظام آفرینش سے کیونکر الگ رکھنا چاہتے ہو، جب کہ خدائے واحد تمام موجودات عالم کا پروردگار ہے پھر کیوں نہ ہم اسے اپنا ''رب'' سمجھیں؟ آیا یہ ممکن ہے کوئی دوسری چیز جو خود ہی اس کی ربوبیت کے تحت ہو ہم اسے خدا کے ساتھ شریک کریں اور جو مربوب ہے اسے رب مانیں، مخلوق کو خالق کے برابر لائیں اور بندے کو مولا کا ہمسر بنا دیں؟ یہ کیا فیصلہ ہے جو تم کرتے ہو؟

اگر لفظ ''شیء'' کے مفہوم کی وسعت کی وسعت پر توجہ کی جائے کہ جو تمام ''ماسوی اللہ'' (خدا کے سوا سب چیزوں) کو شامل ہے تو اس آیت میں توحیدِ ربوبیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں آیت ہذا سے پہلی دو آیتوں میں نبی کریمؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ مشرکین سے صاف کہہ دیں: میری نماز اور دیگر عبادات میری زندگی اور میری موت سب کچھ اس خدا کے لیے ہے جو سب اہل جہان کا پروردگار ہے۔ (قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین)۔

میں غیر خدا کی پرستش کیوں کروں؟ سوائے خدا کے کسی آستان پر کیوں سجدہ کروں؟ اس کے غیر کی یاد کے لیے کیوں زندہ رہوں؟ اس کے غیر کے لیے کیوں اپنی جان دُوں؟ حالانکہ میرا خالق، مالک، مربی اور پالنے والا صرف وہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں توحید عبادت

---

[1] تفسیر فخری رازی جلد ۱ صفحہ ۶۔

اورتوحید ربوبیت باہم جڑی ملی ہوئی ہیں اور ایک روحانی مرکب کا نمونہ پیش کررہی ہیں[1]

(۳) تیسری آیت میں بھی پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہے اور نتیجہ کلام کے طور پر زمین وآسمان کے پروردگار کا ذکر ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ ''رب العالمین'' اور ''رب کل شیءٍ'' میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے اگر الفاظ مختلف ہیں، جیسا کہ فرمایا: (مشرکوں سے) کہو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ (قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)

چونکہ مشرکین یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ یہ بت یا انسانوں میں سے بنے ہوئے معبود اور ایسے ہی دیگر موجودات زمین وآسمان کی تدبیر کرنے والے، ان کو قائم رکھنے والے اور ان کا نظام برقرار رکھنے والے ہیں، لہٰذا بلا فاصلہ نبی اکرمؐ کو حکم دیا ہے کہ آپ خود ہی اس سوال کو جواب دیں، جیسا کہ فرمایا: کہو کہ اللہ (ہی زمین وآسمان کا پروردگار ہے) قُلِ اللّٰہُ۔

اب جو بھی اس کا غیر ہے۔ اس کو الوداع کہہ دو، اس کے سوا جو بھی ہے اس سے دل کو ہٹالو اور صرف اسی کی ذات پاک پر تکیہ کرو، اپنا دل اس کے حوالے کردو اور اپنی پیشانی اس کے آستان پر رکھو۔ تمہیں ان موجودات (بتوں) سے کیا سروکار کہ جو اپنے سود وزیاں کے بھی مالک نہیں پھر وہ دوسروں کے کیا کام آئیں گے (لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا فرقان۔ ۳)

(۴) چوتھی آیت میں عرش کے بارے میں خدا کی ربوبیت کا ذکر ہے، لیکن اس کا آغاز اس کی ''حاکمیت'' کے بیان سے ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہورہا ہے۔ پس برتر ہے وہ خدا جو بادشاہ حق ہے (اس سے بالاتر ہے کہ تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہو (فتعالیٰ اللہ الملک الحق)۔

یہ جملہ تکمیل طور پر آیا ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلی آیت میں کہا ہے: اگر معاد وقیامت مقرر نہ ہو تو انسان کی خلقت و پیدائش بے معنی ہوجائے گی۔ کیونکہ دنیا کی یہ چندروزہ زندگی کوئی اتنا بڑا مقصد نہیں کہ آفرینش و پیدائش کا سبب قرار پائے (یہ معاد قیامت کے بارے میں ایک اہم دلیل ہے، انشاء اللہ بحث قیامت میں اس پر مفصل گفتگو کی جائے گی)۔

پھر اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی عرش کریم پروردگار ہے (لا الہ الا ھو رب العرش الکریم)۔

''ملک'' حاکم اور مالک کے معنی میں ہے اور یہ وصف خداوند تعالیٰ کے علاوہ کسی اور پر صادق نہیں آتا، کیونکہ یہ خالقیت کی ایک شان اور اس کے لوازم میں سے ہے۔ چونکہ اس کے سوا کوئی خالق وجود نہیں رکھتا۔ لہٰذا کوئی مالک اور حاکم بھی نہیں ہے۔ اسی لیے بعد ازاں اسے ''حق'' سے متصف کیا اور پھر معبود ہونے میں صرف اسی کا نام لیا ہے، کیونکہ عبادت صرف ملکِ حق، حقیقی حاکم'' ہی کے لیے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے ''رب العرش الکریم'' کہہ کر اس بیان کی تکمیل اور تائید کی ہے۔ یہ چاروں اوصاف معاد وقیامت کے اثبات کے لیے ہیں

---

[1] ''نسک'' ایک مفرد لفظ ہے، بہت سے ماہرین لغت نے اسے ہر قسم کی عبادت کے معنوں میں شمار کیا ہے، جب کہ بعض مفسرین نے اس کو خاص طور پر قربانی کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن اس کے لیے کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد تمام عبادت ہیں، اس لیے اس کا ذکر صلوٰۃ (نماز) کے بعد آیا ہے جو خاص کے بعد عام ذکر کی مثل ہے۔

جواس سے پہلے کی آیات میں آئے ہیں۔

''عرش کریم'' کے الفاظ میں تمام جہانِ ہستی کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ عرش کے معنی بادشاہوں کا بلند تر تخت ہیں اور خداوند تعالیٰ کا تختِ حکومت تمام جہان آفرینش سے کنایہ ہے، اس صورت میں عرش کا مفہوم جملہ ''رب کل شیء'' سے ہم آہنگ ہے جو آیات ماقبل میں آیا ہے۔

''کریم'' کے معنی باشرف، بہترین اور زیادہ فائدہ مند ہوتے ہیں، عرش کی اس لفظ کے ساتھ توصیف اس لیے ہوئی ہے کہ پروردگار عالم کا تخت حکومت سب سے بڑھ کر ان معنوں کا مصداق ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے گمان کیا ہے۔ کہ وصف ''کریم'' کے معنی صاحب کریم ہیں، چونکہ یہ معنی عرش کے ساتھ صادق نہیں آتے، اس لیے یہ صفت خدائے پاک کی ہے نہ کہ عرش کی..... حالانکہ ''کریم'' غیر عاقل موجودات کی صفت بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً ''لھم مغفرۃٌ ورزقٌ کریم'' یعنی مومنوں کے واسطے بخشش اور پرفائدہ وباشرف (کریم) روزی ہے۔ (حج۔ ۵۰)[1]

(۵) پانچویں آیت انسانوں کے بارے میں ربوبیت خداوندی کو بیان کررہی ہے، اس میں پیغمبرِ ربانی حضرت الیاس کی زبانی ان کا اپنی قوم سے خطاب نقل ہوا ہے، آپ نے انہیں ایک مشہور بت ''بعل'' کی پرستش پر ملامت کرتے ہوئے فرمایا: خدائے تعالیٰ کہ جو احسن الخالقین ہے، تم لوگ کیوں اسے چھوڑ کر اس بت کے پیچھے لگ گئے ہو؟ پھر اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں۔ وہی خدا تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا پروردگار ہے (اللہ ربکم ورب اٰبائکم الاوّلین[2])

یہ اصل میں دُنیا کے تمام بُت پرستوں کے لیے ایک مسکت جواب ہے، کیونکہ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کیوں ان بتوں کی پرستش کرتے ہو تو وہ اپنے اعمال کی توجیہ کے طور پر کہتے ہیں: یہ ہمارے باپ دادا کی روش ہے اور ہم ان کی اس روش کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ حضرت الیاسؑ اپنے خطاب میں اس بات کو بنیاد بنا رہے ہیں کہ عبادت و پرستش کے لائق وہ ہے جو عالم ہستی کا رب اس کو ایک نظام کے تحت قائم رکھنے اور واقعاً انسان کی پرورش کرنے والا ہے۔ وہی خدا تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا پرودگار ہے، اگر وہ اپنے معبود حقیقی اور اپنے پروردگار کی شناخت میں غلطی کر گئے تو اب تم کیوں اس غلط راہ پر چلے جارہے ہو۔

خدا ہی مدبر امور ہے:

(۶) چھٹی اور آخری آیت میں ''رب'' کی بجائے ''تدبیر امر'' پر بات ہوئی ہے جو ''ربوبیت'' کے معنی کے قریب تر ہے نہ کہ کاملاً انہی معنی

---

[1] قرآن اور لغت کے اعتبار سے ''عرش'' کے معنی کے بارے میں تفصیلی مباحث سے آگاہی کے لیے تفسیر نمونہ فارسی جلد ۶ صفحہ ۲۰۴ ذیل آیت ۵۴ سورۂ اعراف..... نیز جلد ۸ صفحہ ۲۱۹ ذیل آیت ۳ سورۂ یونس کا مطالعہ کریں۔

[2] اس آیت میں ''اللہ'' منصوب یعنی زبر کے ساتھ ہے، اس لیے کہ یہ ''احسن الخالقین'' سے بدل ہے جو اس سے پہلے موجود ہے۔ بعض کا خیال ہے یہاں لفظ ''اللہ'' عطف بیان ہے۔

میں ہو۔اس آیت میں رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا: (مشرکوں سے) کہو کہ کون تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ (قل من یرزقکم من السماءِ والارض)۔

آفتاب کی رُوح پرور روشنی جو آسمان سے تم پر چمکتی ہے کہ تمہاری حیات وزندگی اس سے وابستہ ہے۔ بارانِ رحمت کی جاں بخش بوندیں جو آسمان (کی طرف) سے نازل ہوتی اور زندگی کا بیج جا بجا بکھیرتی ہیں اور ہوا جو ایک لطیف اور رُوح پرور چیز ہے۔اس نے تمہارے چاروں طرف کی فضاء کو پُر کر رکھا ہے بتاؤ یہ سب چیزیں کس نے تمہارے لیے مہیا کی ہیں؟

اسی طرح نباتات کہ جو زمین سے اُگتے ہیں، ان سے تم اناج اور لذیز میوے حاصل کرتے ہو بیش قیمت معدنی چیزیں جو تم زمین کی تہہ سے نکالتے ہو..... بتاؤ تو یہ چیزیں تمہیں کون عطا کرتا ہے؟ آیا یہ رزق وروزی بتوں کی طرف سے مل رہی ہے؟

اس کے بعد خود انسانی بدن کی طرف متوجہ ہو کر اعضاء بدن کے دو اہم حصوں کا ذکر کیا ہے کہ جن سے انسان اس دنیا کے ساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے اور جو علم ودانش کے حصول کا وسیلہ ہیں ان کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتا ہے۔کون کان آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے؟ (امن یملك السمع و الابصار)۔

بعدہٗ عالم ہستی کے سب سے اہم معاملے یعنی مسئلہ موت وحیات پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کون زندہ کو مردہ میں سے اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا ہے؟ (ومن یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی)۔کیا یہ بتوں کی کارگزاریاں ہیں؟

آیت کے آخر میں اس کے بعد کہ تین اہم مسائل (رزق آسمانی وزمینی، کان آنکھ، اور موت وحیات) کا ذکر کیا جا چکا، سارے مضمون کو جامع طور پر بیان کرتے ہوئے فرمایا: کون امورِ عالم کی تدبیر کرتا ہے۔(وَمن یدبر الامر)۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اگر وہ (مشرکین) اپنی عقل اور وجدان کی طرف مراجعہ کریں تو ان کی طرف سے ان ساری باتوں کا کوئی اور جواب ہو ہی نہیں سکتا۔فوراً وہ (تمہارے جواب میں) کہیں گے.....اللہ.....(فسیقولون اللہ) یعنی تمام امورِ عالم کی تدبیر کرنے والا وہی اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔

پھر اپنے رسول سے فرمایا کہ اسی جواب کو بنیاد بنا کر اس گفتگو کو آگے بڑھاؤ: کہو کہ پھر کیوں تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (فقل افلا تتقون) یعنی کیوں خدا سے نہیں ڈرتے اور راہ شرک پر چلتے ہو؟

درحقیقت اس آیت میں انسان کی تمام مادی ومعنوی روزیاں اور تمام تر تدبیر وعالمیان یکجا طور پر ذکر ہوئی ہیں مادی روزیاں زمین وآسمان سے اور معنوی روزیاں، یعنی علومِ حسی، عقلی ونقلی گوش وچشم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں، تدبیر جہاں میں ان کے ساتھ دیگر بہت سے امور بھی شامل ہیں۔

اندریں صورت کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ ناتواں کر سکتا ہے کہ یہ ناتواں بندے بابتوں جیسی بے اصل چیز یہ رزق وروزی پیدا کرنے اور امورِ عالم کو چلانے کی اہل ہو سکتی ہے، پس توحید ربوبیت کوئی پیچیدہ نہیں، حتیٰ کہ اگر مشرک لوگ چندے غور وفکر کریں تو یہ ان پر بھی واضح اور روشن ہو جائے گا۔

خدا کو کان آنکھوں کی ''مالکیت'' کا حامل قرار دینا اس کے ان کو پیدا کرنے اور وجود میں لانے کی طرف اشارہ ہے یا ان کی حفاظت اور ان کے عجیب نظام کو قائم رکھنے یا ان سب امور کا خالق و مدبر ہونے کی وجہ سے ہے۔

آیات کے مذکورہ بالا مجموعے اور ان کے مشابہ دیگر آیاتِ قرآن کو جن کی تعداد بہت زیادہ ہے ان سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قرآن اس تمام عالمِ ہستی ہر شے ہر موجود، زمین و آسمان، عرش، وکرسی اور موجود و گذشتہ انسانوں کا خالق و مالک اور مدیر و مدبر خداوند تعالیٰ ہی کو قرار دیتا ہے اور بڑی صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ اس کے سوا جہانِ ہستی میں کوئی اور ''رب'' اور پروردگار نہیں ہے۔

توضیحات

(۱) توحید یعنی درمیانی واسطوں کو حذف کرنا:

قرآن مجید کی آیات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ انسان براہ راست خدا کی طرف توجہ کریں اور درمیانی واسطوں میں گم ہو کر نہ رہ جائیں، اسی سے بات کریں، اسی سے تقاضا کریں اسی کے حضور سجدہ ریز ہوں اور اسی کی بارگاہ میں شکرِ نعمت بجالائیں، تمام مشکلات کا حل اسی سے طلب کریں، اسی کے ساتھ عشق و محبت رکھیں بس اسی کیساتھ دل لگائیں اور اس کے غیر کی پرستش ہرگز نہ کریں۔

سورۂ حمد اور دیگر سورہ ہائے قرآن میں ''رب'' ''العالمین'' کی تعبیر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور رکوع وسجود میں .....سبحان ربی العظیم.....اور.....سبحان ربی الاعلیٰ.....کا کئی کئی بار دو ہرایا جانا بھی اسی بات کی تاکید کے لیے ہے۔ ہاں تو نہ صرف ہماری خلقت و پیدائش بلکہ ہماری بقاء ہماری خلقت و پیدائش بلکہ ہماری بقاء ہماری تربیت ہمارا تکامل اور ہمارے تمام امور کی تدبیر بھی خداوند تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

اس بات کی واضح دلیل موجود ہے، کیونکہ ''خالق'' اور ''رب'' اپنی مخلوق سے جدا نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر لحظہ ایک نئی خلقت اور ایک نئی پیدائش حاصل کرتا ہے جو اسی پروردگار کی طرف سے عطا ہوتی ہے، مختصر یہ کہ تمام موجودات اس کی محتاج دنیاو نیازمند ہیں اور وہ ہر جہت سے بے نیاز ہے، وہ ''صمد'' یعنی ایسا عظیم آقا و مالک ہے کہ ہر حاجت مند اسی کی بارگاہ میں پہنچتا ہے۔

تاریخ مذاہب سے پتہ چلتا ہے کہ عالم بشریت اپنے اور اپنے رب کے مابین خود ساختہ واسطوں اور وسیلوں میں گم ہو کر کیسے کیسے نامعقول اور بے ہودہ افکار و افعال میں گرفتار ہوا ہے، اس نے اپنے مقابلے میں پست تر موجودات یعنی بتوں اور مورتیوں کو اپنا معبود قرار دیا اور ان کو زندگی اور اپنے سود و زیاں کا مالک سمجھتا رہا۔ پھر خداؤں اور معبودوں کی اس کثرت نے انسانی معاشروں کو تفرقہ و نااتفاقی، بدبختی و بدحالی اور دنائت و پستی کے سوا کیا کوئی اور تحفہ دیا ہے؟ لیکن جب یہ واسطے درمیان سے ہٹا دیئے گئے اور ہم نے اسی ذات کو رب مطلق مان لیا تو جیسا کہ دلائل عقلیہ کا تقاضا ہے ہم نے ہر چیز کو اسی کا نیازمند پایا، اسی طرح ہم نور عظمت، وحدت اور یگانگت کے سرچشمے تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں خدا کی صفت ''رب'' کا نو سو سے زیادہ مرتبہ ذکر آیا ہے اور اوصافِ الٰہی میں سے کسی وصف کی اس

قدرتا کید نہیں ہوئی اس لئے اسلام کے نظریہ توحید خالص کو سب سے پہلے اسی توحید ربوبیت میں دیکھا جانا چاہیے۔

(۲) تاریخ مذاہب اور بے اصل واسطے:

تاریخ مذاہب کا جتنا زیادہ مطالعہ کیا جائے اسی قدر یہ بات کچھ اور واضح ہوتی ہے کہ مختلف قوموں میں (رب و پروردگار کے معنی میں) چند خداؤں کا عقیدہ قدیم ترین زمانے سے موجود رہا ہے۔ اگر ان کے خداؤں کے نام اور ان کے بارے میں ان لوگوں کے عقائد کا ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی جو عجیب وغریب اور بے ہودہ نظریات سے پر ہوگی تاہم اس میں کوئی ہرج نہیں کہ ہم یہاں اس موضوع کو بطور خلاصہ بیان کر دیں تا کہ قارئین اس اختصار سے اس کی تفصیلات کے بارے میں ایک تصور قائم کر سکیں۔

(۱)۔ رومیوں کے خدا:

ایک معروف مغربی مورخ اس سلسلے میں رقمطراز ہے: رومیوں کا مذہب ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں..... ان کے مذہب نے اپنے ماننے والوں کو کوئی حکم نہیں دیا تھا، اس میں لوگوں کی اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کے لیے کچھ بھی اہتمام نہ تھا اور وہ انہیں صرف اپنے خداؤں کو خوش کرنے کے رسوم سے آگاہ کرتا تھا۔

رومیوں کے خداؤں کی ایک بڑی تعداد وغیر معمولی قوتوں کی حامل تھی، کیونکہ ان میں سے ہر ایک زندگی کے کسی خاص گوشے سے تعلق رکھتا اور کوئی مقررہ کام انجام دیتا تھا۔ نہ صرف گھر کی دہلیز کا ایک خدا ہوتا تھا بلکہ جوتے اُتارنے کی جگہ اور ڈیوڑھی کے لیے بھی الگ الگ خدا ہوتے تھے علاوہ ازیں ہر فرد کا محافظ ایک ایک خدا ہوتا اور پھر ذیلی خدا ہوتے، مثلاً ایک خدا نومولود کو پہلی آواز نکالنے کا ڈھنگ سکھاتا، دوسرا کھانے پینے کا طریقہ بتاتا، ایک اور خدا گھر سے نکلنے کی ترکیب سمجھاتا اور ایک خدا گھر واپس آنے کی تعلیم دیتا تھا۔ ایک مخصوص خدا ہل چلانے میں، ایک خدا کیاریاں بنانے میں اور ایک تیسرا خدا بیج بونے میں مدد کرتا اسی طرح کچھ اور خدا بھی تھے جو مختلف کاموں میں برکت دیا کرتے۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ رومیوں کے ایک ہزار خدا ہوں۔ جیسا کہ ان کے روساء میں سے ایک نے مذاق کے طور پر کہا تھا کہ ہمارے ملک کے مندروں اور گھروں میں خداؤں کی تعداد ہماری قوم کے افراد سے کہیں زیادہ ہے [1]

(۲) یونانیوں کے خدا:

وہی معروف مورخ لکھتا ہے: دوسری بہت سی قوموں کی طرح یونانیوں نے بھی سُورج، آسمانی بجلی، سمندر، آندھی، دریا، چشمہ، ہوا اور بارش جیسی تمام طبعی چیزوں کو مقام الوہیت پر فائز کرتے اور ان کو پوجتے تھے ہر باطنی اثر و تاثیر کو ایک ان دیکھی شخصیت سے نسبت دیتے اور انہیں خیر و شر کے مالک تصوّر کرتے تھے وہ ان کی پرستش کرتے تا کہ وہ ان پر مہربانی کریں یا اپنے ضرر کو ان سے دُور رکھیں:۔

---

[1] تاریخ آلبرمالہ۔ تاریخ روم جلد ا صفحہ ۲۹۔۳۰۔

پھر وہ ''کرونوس'' کے بیٹے ''زوس'' کا ذکر کرتا ہے جو یا نانیوں کا بڑا خدا تھا وہ اسے ایک ایسا آدمی تصور کرتے جو قوی ہیکل، بارعب، کشادہ پیشانی، لمبی زلفوں اور گھنی گھنگھریالی داڑھی والا ہے۔ زوس یونان میں رب الارباب اور خدائے شر سمجھا جاتا ہے اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے خداؤں کے بت رکھے ہوتے اس کی بیوی ''ہرا'' جس کا مسکن آسمان میں تھا، اس کے تین بیٹے، ہرمس، آرتمیس، آپولون، مانے جاتے اور یہ تینوں ترتیب وار بارش، چاند، سورج کے مالک تصور کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ یہ لوگ اور بھی بہت سے خداؤں کے قائل تھے۔ مثلاً دریاؤں کے خدا، زمین کے خدا، تہہ زمین کے خدا اور پھر ہر کام کے لیے الگ الگ خدا ہونے کے معتقد تھے [1]

(۳) مصریوں کے خدا:

قدیم مصریوں میں سے اکثر لوگ کئی خداؤں (ملی تہہ السیم) کے معتقد اور ان میں سے ایک کو دوسروں سے برتر اور خدائے خدایان کے طور پر مانتے تھے۔ مصر کے ہر حصے میں لوگ اپنا خدا اور اپنا معبد (مندر) بنائے ہوئے تھے اور مجموعی طور پر ان کے خداؤں کی تعداد دو ہزار سے بھی کچھ زیادہ ہوا کرتی تھی۔ لیکن ان میں نو خداؤں کا بہت چرچا تھا اور وہ یہ ہیں: سورج کا خدا، فضاء کا خدا زمین کا خدا صحرا کا خدا، پہاڑوں کا خدا، سمندروں کا خدا، آباوزمین کا خدا، صحرا کا خدا، پہاڑوں کا خدا، سمندروں کا خدا، آباوزمین کا خدا اور بنجر زمین کا خدا [2] ایک اور مورخ ''ویل ڈورانٹ، اپنی کتاب'' تاریخ تمدن'' میں کہتا ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں اتنے زیادہ خدا نہیں پائے گئے جتنے مصر میں تھے۔ اہل مصر کہا کرتے کہ خلقت وآفرینش کا آغاز آسمان سے ہوا اور آسمان میں دریائے نیل سب سے بڑا رب النوع شمار ہوتا ہے۔ مصریوں کے اعتقاد میں ستارے صرف ایک جسم ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ خداؤں کے ارواح کی مادی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ستاروں، حیوانوں اور درختوں کی شکلوں پر بنائے ہوئے بتوں کی صورت میں بہت زیادہ خدا تھے، یہاں تک کہ ان کی عبادت گاہیں اچھے خاصے نمائش گھروں کا نقشہ پیش کرتی تھیں [3]

(۴) ایرانیوں کے خدا:

قدیم ایرانی بھی پہلے ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش اور پھر کئی خداؤں کی پوجا میں لگے رہے، تاہم کہیں کہیں، امشاسپندان، یعنی چھ خداؤں کی پرستش بھی ہوتی تھی۔ یعنی پالتو حیوانوں کا خدا، آگ کا خدا، دھاتوں کا خدا، زمین کا خدا، دریاؤں اور درختوں کا خدا، ستاروں اور سیاروں کا خدا [4]

---

[1] تاریخ ''آلبرمالہ'' تاریخ ملل شرجلد ۲ صفحہ ۱۷ تا ۱۷۹ (خلاصہ)

[2] اسلام وعقائد وآراء بشری صفحہ ۴۶۔

[3] ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن جلد ۱ صفحہ ۲۹۸، ۳۰۰ (خلاصہ)

[4] اسلام وعقائد وآراء بشری صفحہ ۳۴۔

(۵) چینیوں کے خدا:

چین کے قدیم باشندے معتقد تھے کہ دنیا میں دو اصلیں حکومت کر رہی ہیں، پہلی اصل ''نر'' یا ''مثبت'' یا ''نور'' اور دوسری اصل ''مادہ'' یا ''منفی'' یا ''ظلمت'' ہے۔ اپنے اسی فکر وخیال کے نتیجے وہ ثنویت، دوگانہ پرستی اور دو خداؤں کی پرستش کرنے لگے۔

''شانگتی'' اصل نرینہ و مذکر شمار کیا جاتا اور اسے خدائے آسمان تصوّر کیا جاتا تھا، ان کا خیال تھا، کہ یہی اس دنیا میں انسان کو نیک وبد اعمال کی جزا و سزا دیتا ہے۔ اور جب گناہ عام ہو جائے تو لوگوں پر سخت مصیبت نازل کرتا ہے۔

وہ ''ہاتن'' کو اصل مادہ و مونث قرار دیتے اور اس کی تعریف و توصیف کرتے تھے، پھر آہستہ آہستہ کچھ دوسرے خدا بھی بنا لیے گئے اور وہ لوگ بہت سے خداؤں کی پرستش کرنے لگے، مثلاً پیداوار کا خدا، بارش کا خدا، ہوا کا خدا، برف کا خدا، آگ کا خدا، اور پہاڑوں کا خدا وغیرہ [1]

(۶) عرب کے بُت پرست:

بعض مورخین اور مفسرین کا خیال ہے کہ عرب کے لوگ خدائے واحد ہی کو جہانِ ہستی کا خالق ورزاق اور رب و مدبر سمجھتے تھے، اس کے ثبوت میں وہ ایسی آیات قرآن پیش کرتے ہیں، جن میں ان لوگوں کی زبانی خدا کی خالقیت وراز قیت پر اعتقاد رکھنے کے اعتراف کا ذکر ہے۔ اس لیے ان کی بت پرستی کا موجب کئی خداؤں کا ماننا نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان سے حصولِ شفاعت اور تقرب خدا کی امید رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا اعتقاد تھا کہ ہر بت کے ساتھ بہ حکم خدا ایک شیطان کو موکل بنایا جاتا ہے، اگر کوئی شخص کسی بُت کی قرار واقعی عبادت بجالاتا ہے تو وہی شیطان خدا کے حکم سے اس کی حاجتیں پوری کرتا ہے [2]

لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربوں کا ایک گروہ ستارہ پرستی کی طرف مائل تھا، ان کا نظریہ تھا کہ کچھ ستارے طلوع وغروب کے وقت بارش برساتے ہیں۔ وہ ان ستاروں کو ''انواء'' سے تعبیر کرتے تھے (انواء جمع ہے، ''نوء'' کی ''اور اس سے مراد وہ ستارہ ہے جو ڈوبتا جارہا ہو) وہ اپنی حرکت وسکون اور سفر وقیام کو ان ستاروں کے ساتھ مربوط رکھتے تھے (کیونکہ انہیں قسمت اور نصیب میں موثر خیال کرتے تھے) لہٰذا انہوں نے سورج، چاند اور زہرہ وغیرہ کی پرستش کے لیے بڑے بڑے عبادت خانے بنا رکھے تھے [3]

جزیرنما عرب کے جنوب میں یمن کا علاقہ ہے اور وہاں آباد عرب قبائل میں بھی ستارہ پرستی کا رواج تھا۔ ان میں ایک گروہ ''آفتاب پرست'' تھا کہ جس کی طرف قرآن نے ملکہ سبا کی داستان میں واضح اشارہ کیا ہے، بعض قبائل ''مہتاب پرستی اختیار کیے ہوئے تھے بعض ستارہ

---

[1] اسلام وعقائد وآراء بشری صفحہ ۱۵۷۔

[2] بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔

[3] بلوغ الارب صفحہ ۲۲۳۔

شعریٰ کے پرستار اور اسی طرح دیگر قبائل بعض دوسرے ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔[1]

(۷) مختلف ممالک کے خدا:

دنیا کے دیگر ملکوں جیسے ہندوستان وجاپان وغیرہ میں بھی لوگ اربابِ انواع اور بہت سے خداؤں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ''صائبین'' (ستارہ پرست) سات سیاروں کو ہفت اقلیم کے نگہبان سمجھتے تھے نیز وہ انہیں اہل زمین کے لیے سرچشمہ خیر اور ان کی مصیبتوں کو رفع کرنے والے خداؤں کا درجہ دیتے تھے۔

''توتم'' کا نظر جو اس وقت دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلا ہوا تھا، وہ ابھی ارباب انواع کے عقیدے کے ساتھ ملتا جلتا ہی تھا۔ کیونکہ ہر قبیلے کا ایک ''توتم'' ہوا کرتا کہ جو اس قبیلے کے باپ اور رُوح کی منزلت کا حامل ہوتا تھا، وہ لوگ اسے حیوانات کی شکل میں ان جیسا تصور کرتے تھے۔

(۸) مثل افلاطونی پر اعتقاد:

افلاطون نے عالمِ طبیعت کی ہر انواع کے لیے ایک ایک مجرد عقلی فرد قرار دیا اور وہ لوگ اسے قائم بالذات سمجھتے تھے چونکہ وہ ان مجرد وافراد کو اسماء وصفاتِ الٰہی کے مظاہر وامثال خیال کرتے تھے۔ اس لیے انہیں ''مثال'' کے نام سے موسوم کرنے لگے اور مثال کی جمع مثل بروزن رُسل ہے۔

افلاطون کا نظریہ تھا کہ جو چیز کوئی حقیقت رکھتی ہے وہ وہی مثال ہے کہ جو مطلق، غیر مبدّل، زمان ومکان سے بلند اور کلی وابدی وجود ہے۔ یہ مادی وجسمانی افراد وجسمانی افراد جو نظر آتے ہیں۔ متعدد تغیر پذیر، یا پابند زمان ومکان اور فانی ہیں، یہ فقط اس مثال کے پرتو کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا یہ جسمانی افراد انسان اس مثالی انسان سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو کسی سائے اور اصل وجود میں ہوتی ہے، گویا افلاطون کے نزدیک یہ عالم ظاہر وعالم محسوسات ''مجاز'' ہے اور حقیقت وہی عالمِ معقولات ہے[2]

مثل افلاطون پر اعتقاد اگرچہ ارباب انواع کے عقیدے سے مختلف ہے، لیکن بعض جہات سے اس کے مشابہ ہے اور یہ ارباب انواع کے یونانی عقیدے کا مدہم سا فلسفی نقش ہے، اسی طرح، عقول مجرد فلکیہ کا نظریہ بھی ارباب انواع کے عقیدے سے ایک طرح کی قربت رکھتا ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ بعض فلاسفہ کے بقول چونکہ خدائے تعالیٰ ہر جہت سے بسیط ہے۔ لہٰذا اس کی مخلوق بھی ایک ہی ہوگی اور وہ مخلوق مجرد ہے کہ اسے ''عقل اوّل'' کا نام دیتے ہیں۔ پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ ''عقلِ اوّل'' جب ایک وجود اور ماہیت ہے اور دو

---

[1] اسلام اور جاہلیت صفحہ ۲۹۵

[2] دیکھیے کلیات فلسفہ اسلامی، سیر حکمت در اروپا اور ایسی ہی دیگر کتب۔

جنبے رکھتی ہے، لہٰذا اس سے ''عقل دوم'' او ''فلک اوّل پیدا ہوا اور اسی ترتیب سے وہ دس عقول اور نو آسمانوں کی پیدائش کے قائل ہیں۔

ان میں سے کچھ فلاسفہ بہ لحاظِ تعداد عقول کو بے شمار قرار دیتے ہیں اور ''عقول طولی (دس عقول جن میں سے ہر ایک دوسرے کی مخلوق ہے) کے علاوہ ''عقولِ عرضی'' کے معتقد بھی ہیں، وہ انہیں ''صور نوعیہ'' کے فیض کا واسطہ اور موجوداتِ جسمی کا مرتبہ اعلیٰ تصور کرتے ہیں، جیسے ارباب انواع اور مثل افلاطونی ہیں۔ البتہ ان مسائل میں سے ہر ایک کے بارے میں بہت سے مباحث ہیں، چونکہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لیے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اس بیان میں جو چیز ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ قرآن مجید نے ان تمام افکار کا مقابلہ کیا ہے، چنانچہ اس نے ان سبھی شرک آلود افکار اور مختلف مشرکانہ فلسفی مکاتب میں گزرتے ہوئے جس وضاحت اور خوبی کے ساتھ عالمِ ہستی میں توحید خالقیت و توحید ربوبیت (یعنی خالق ورب واحد) کے وجود کو ثابت کیا اور توحید خالص کو اجاگر کیا ہے اسے قرآن کے معجزات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

قرآن نے ان فرضی خداؤں اور خیالی ارباب انواع کے وجود بے سود پر خط تنسیخ اور فقط ''رب العالمین'' کو ''اللہ'' قرار دیا یہاں تک کہ ہر چیز اور ہر شخص کو مخلوق اور اس کی تدبیر و تربیت کے تحت شمار کیا، انسانوں کے دلوں اور جانوں کو نور وحدت سے روشنی بخشی اور ان کی توجہ ہر طرف سے ہٹا کر اس خدائے واحد لایزل کی ذات پر مرکوز کردی۔

ہاں ان حالات سے یہ بات بخوبی واضح ہورہی ہے کہ توحید خالص کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ انسان اپنے پاؤں چل کر اس تک جا پہنچے، بلکہ ضروری ہے کہ طریق وحی سے ایک غیبی ہاتھ اس کی طرف بڑھے اور اسے سنبھالا دے کر منزلِ توحید پہنچا دے۔ یعنی وہ ذاتِ مقدس جو وصف یکتائی کی حامل ہے۔ اس کے پیغمبر آئیں اور انسان کا ہاتھ پکڑ کر خضر راہ کی صُورت میں اس کو شرک کی تاریک وادی سے نکال کر توحید خالص کے آبِ حیات تک لے جائیں اور اسے سیراب کردیں۔

(۳) تفویض بھی شرک ہے:

اگرچہ تفویض کے کئی معنی ہیں اور بعض نے اس کے سات اقسام شمار کیے ہیں۔ نیز ان میں سے ہر ایک کے بارے میں بڑے بڑے مباحث موجود ہیں۔ لیکن یہاں جس نوع تفویض کا ذِکر لازم ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تفویض گروہ پیدا ہوا جن کا اعتقاد ہے کہ خدا نے پیغمبر اکرمؐ وائمہ معصومینؑ کو پیدا کیا اور پھر خلق ورزق اور موت وحیات کا کام انہی کے سپرد کردیا ہے۔

اس عقیدے کے متعلق بہترین تبصرہ وہی ہے جو علامہ مجلسیؒ نے ''مرأۃ العقول'' میں کیا اور فرمایا ہے۔ کہ ان قائلین تفویض کا یہ قول دو معنوں کا حامل ہوسکتا ہے۔

(۱) معصومین اس دنیا میں خلق ورزق اور موت وحیات کے اُمور اپنی قوت اور اپنے ارادے سے انجام دیتے ہیں اور وہ ان کے فاعلِ حقیقی ہیں، یہ صراحتاً کفر ہے اور دلائل عقلی ونقلی اس عقیدے کا بطلان کرتے ہیں، نیز اس عقیدے کے حامل لوگوں کے کفر میں کسی بھی عاقل کو ذرہ بھر شک نہیں ہے۔

(۲) معصومینؑ کے قصد وارادہ کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی ان کاموں کو انجام دیتا ہے، جیسے شق القمر، مردہ کو زندہ کرنا اور انبیاء سابقین کے معجزات رونما ہوتے رہے ہیں، اگر تفویض سے ان کی مراد یہی ہو تو خلافِ عقل نہیں۔ مگر ہم نے بحارالانوار میں ایسی بہت سی روایات کا ذکر کیا ہے۔ جو معجزات کے علاوہ معصومینؑ سے ان اُمور کے صدور کی نفی کرتی ہیں [1]

بہرحال دوسرا احتمال عقلاً محال نہیں ہے، لیکن روایات اس کی تائید نہیں کرتیں، ایسے بہت سے امور ہیں جو عقلاً محال نہیں مگر شرعاً ان کی نفی کی گئی ہے، جیسے انبیاء وائمہ علیہم السلام کی تعداد.....یعنی عقلی طور پر ممکن تھا کہ ان کی تعداد اس سے زیادہ ہوتی، تاہم نقلی دلائل نے اسے اس تعداد میں منحصر کر دیا ہے، جس کا ہمیں علم ہے۔

اس سلسلے میں ایک تیسرا احتمال بھی وجود رکھتا ہے وہ یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی پیغمبر یا امام کو یہ قوت عطا کر دیتا ہے کہ وہ اذنِ الٰہی سے کسی مُردہ کو زندہ کرے یا کسی لاعلاج مریض کو شفا دے دے، بلکہ حضرت عیسیٰؑ سے متعلق آیاتِ قرآن کے ظاہری معنی یہی ہیں اور یہ امر دیگر معصومینؑ کے بارے میں بھی ممکن ہے۔ لیکن جیسا کہ عبارتِ بالا میں ذکر ہوا۔ یہ بات صرف معجزات وکرامات تک محدود ہے نہ کہ خلقت آسمان وزمین اور امورِ کائنات کی تدبیر تک وسعت رکھتی ہو۔ کیونکہ قرآن بڑی صراحت کے ساتھ ساری کائنات کی خلقت، تدبیر وربوبیت کو خاص خدائے تعالیٰ ہی کے لیے قرار دیتا ہے۔ (اس فصل میں توحید ربوبیت سے متعلق پیش کی گئی آیات اس امر کی نشاندہی ہیں)

البتہ اس لحاظ سے کہ خلقت وآفرینش کا اصلی ہدف ''انسان کامل'' ہے اور معصومینؑ بھی کامل انسانوں سے بلند وبالا ہیں، اس لیے کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عالمِ ہستی کو انہی کی خاطر وجود میں لایا گیا ہے اور بہ الفاظ دیگر عالمِ ہستی کی علت غائی وہی ہیں۔

(۴) ایک سوال کا جواب:

کیا فرشتے مدبر امر ہیں؟

سورۂ نازعات (آیت ۵) میں مدبرات امر کی قسم کھائی گئی ہے، جیسا کہ فرمایا: فالمدبرات امراً۔ اس میں مفسرین کا مشہور قول ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو امورِ دُنیا کی تدبیر کرتے ہیں آیا یہ مسئلہ توحید ربوبیت کے منافی نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب بڑا واضح ہے کہ اگر یہ فرشتے اپنے فرشتے اپنے فعل اور تاثیر میں مستقل ہیں تو یہ چیز عقیدۂ توحید کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی، لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ محض فرمان الٰہی کو عمل میں لاتے ہیں اور خدا کی مشیت وارادہ کے تحت ان اُمور کے ذمہ دار ہیں، جیسے عالم طبیعت میں اسباب ہیں کہ فرمانِ خداوندی کی بناء پر ایک اثر رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بہت سے مفسرین کے زیرنگاہ رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے خداوند تعالیٰ کے ''رب العالمین'' اور رب کل شئ ہونے اور جہانِ کائنات میں عالمِ اسباب کی تاثیرات اور فرشتوں کی طرف سے بحکم خدا امورِ عالم کی تدبیر کرنے کے درمیان کوئی تناقض محسوس نہیں کیا، یہاں وہی

---

[1] مرآۃ العقول جلد ۳ صفحہ ۱۴۳ (خلاصہ)

صورت ہے، جیسا کہ خدائے تعالیٰ قرآن میں خود کو تمام موجودات جہاں کا رازق وروزی دہندہ شمار کرتا ہے: وما من دابةٍ فی الارض الاعلیٰ اللہ رزقها۔ (ھود ۶)

لیکن ایک اور مقام پر فرماتا ہے: وعلیٰ المولودلهٗ رزقهن و کسوتهن بالمعروفِ (بقرہ۔ ۲۳۳) یعنی ہر شیر خوار بچے کے باپ پر لازم ہے کہ اس کی ماں کو (دودھ پلانے کی مدت میں) عمدہ خوراک و پوشاک مہیا کرے (اگرچہ طلاق لے چکی ہو)۔

یہ مسلمہ بات ہے کہ شیر خوار بچے کے باپ کو ''روزی دینے والا کہنے'' اور خداوند تعالیٰ کو روزی دینے والا، کہنے میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ کیونکہ ان میں سے ایک ظاہری، عارضی اور اپنے خالق سے وابستہ ہے دوسرا مستقل اور بالذات روزی رساں ہے۔

نیز یہ کہ اگر ہم کہتے ہیں کہ شہد میں شفا ہے ''فیه شفآءٌ للناس (نحل۔ ۲۹) یہ اس بات کے منافی نہیں کی شفا دینے والا صرف خدا ہے، جیسے عقیدہ توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بقول قرآن میں آیا ہے: واذا مرضت فهو یشفین (شعرائ۔ ۸۰) یعنی جب میں بیمار ہوجاتا ہوں تو خدا مجھے شفا دیتا ہے۔

یہ سب آیاتِ علت ومعلول کے سلسلے کو بیان کررہی ہیں۔ یعنی معاملہ ایک علت غیر مستقل سے شروع ہوکر کر علت العلل تک پہنچتا ہے جو مسبب الاسباب خدا ہے کہ ہر سبب اپنی تاثیر اور اپنے نتیجے میں اس کا محتاج ہے۔

(۵) احادیث اسلامی اور توحید ربوبیت:

توحیدِ ربوبیت کا ذکر معصومینؑ کی کی حدیثوں اور دعاؤں میں بھی پوری تابانی کے ساتھ موجود ہے، وہ بہت سی دعائیں جو اصولِ کافی کی جلد دوم میں منقول ہیں، ان میں درج ذیل عبارات میں اس مسئلے کی طرف واضح اشارات دیکھے جاسکتے ہیں۔

اللهم رب السمٰوٰت اسبع ورب الارضین السبع...رب العرش العظیم ...رب المشعرالحرامِ ورب البلد الحرامِ ورب الحل والحرام...الحمد الله رب الصباح...رب الملائکةِ والروح...رب المستضعین...رب جبرآئیل ومیکآئیل واسرافیل ورب القرآنِ العظیم ورب محمدٍ خاتم النبین۔ [1]

ان عبارات میں سے بعض روایات اہل سنت میں بھی آئی ہیں [2]

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۵۱۴ تا ۵۸۵۔

[2] مزید وضاحت کے لیے ''المعجم المفہرس الالفاظ الحدیث النبوی ۳ صفحہ ۲۰۷ کی طرف رجوع کریں۔

اس طرح آسمان وزمین، انبیاء وملائکہ امراء وغرباء صبح وشام، مکہ وکعبہ اور عرشِ عظیم کا رب خدائے قادر ویکتا کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

اصولی طور پر امورِ جہان کی ہم آہنگی اور اس میں کارفرما نظاموں کا باہم مربوط ہونا ہی اس کے منتظم کی وحدت ویکتائی کی ایک روشن دلیل ہے چنانچہ امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب ایک زندیق نے واحدنیت پروردگار کے بارے میں آپ سے سوال کیا تو فرمایا۔

فلما راينا الخلق منتظماً ،والفلك جارياً ، واختلافِ اليل والنهارِ وَ لشمس والقمر، دل صحة الامر والتدبير وائتلافِ الامرِ علىٰ ان المدبر واحدٌ۔

یعنی جب ہم مخلوقات کو منظم حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ افلاک کی حرکت، دن رات کی آمدورفت، سورج اور چاند کا ایک نظام کے تحت طلوع وغروب فرمان وتدبیر کی یہ درستی اور تمام امور کا ایک دوسرے سے یہ ارتباط اس بات کی دلیل ہے کہ اس ساری کائنات کے نظام کو چلانے والا مدبر و پروردگار ایک اور صرف ایک ہے [1]

---

[1] توحید صدوق باب ۳۶ باب الرد علی التنویہ والزنادقہ صفحہ ۲۴۴۔

(۳) توحیدِ مالکیت وحاکمیت تکونی

اشارہ:

''توحید افعالی'' کی اہم ترین شاخوں میں سے ایک شاخ ''توحید مالکیت'' ہے یعنی بہ لحاظ تکوین و بہ لحاظ تشریع مالکِ حقیقی خدا ہی کی ذات پاک ہے اور دیگر تمام مالکیتیں غیر مستقل اور عارضی (مجازی) ہوتی ہیں، اس کی توضیح یہ ہے کہ مالکیت کی دو اقسام ہیں..... مالکیت حقیقی (تکوینی) اور مالکیت حقوقی (تشریعی)

مالکِ حقیقی وہ ہے جو کسی چیز پر تکوینی و خارجی تسلط رکھتا ہو، لیکن مالکیت حقوقی و تشریعی وہ قرارداد ہے جس سے کسی چیز پر قانونی حکم کا اجراء کیا جاتا ہے، جیسا کہ انسان کی مالکیت اپنے اموال پر ہے۔ ہر دو قسم کی مالکیت ایک موحد کی نظر سے پہلے درجہ میں خدا کے لیے خاص ہے کہ وہ دنیا کی تمام چیزوں کے وجود پر مالکیت کا اختیار رکھتا ہے، کیونکہ سب موجودات اسی کی مخلوق اور اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ وہ وجود کا فیض لحہ بہ لحہ اسی سے حاصل کرتی اور اس کی محتاج اور نیاز مند ہیں، اس ترتیب سے اس کی مالکیت حقیقی ہر چیز پر ہر جہت سے ثابت ہوتی ہے۔

مالکیت تشریعی وحقوقی یعنی قانونی مالکیت کے اعتبار سے بھی ہر چیز اسی کی مالکیت ہے، کیونکہ تمام اشیاء عالم کا خالق، پیدا کرنے والا اور انہیں وجود میں لانے والا وہی ہے۔ حتیٰ کہ جن چیزوں کو ہم وجود میں لاتے ہیں ان کے لیے مواد اور دیگر وسائل بھی اسی کے عطا کردہ ہیں، بناء بریں سب چیزوں کا مالک اصلی خدا ہے۔ اگرچہ کچھ مدت کے لیے اس نے یہ اشیاء امانت ہمارے سپرد کر رکھی ہیں۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف رُجوع کرتے اور آیاتِ ذیل پر نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۶ ﴿آل عمران: ۲۶﴾

(۲) اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۱۰۷ ﴿البقرۃ: ۱۰۷﴾

(۳) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۶ ﴿الزمر: ۶﴾

(۴) وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاءُ ۖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۲۴۷ ﴿البقرۃ: ۲۴۷﴾

(۵) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۖ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ

قِطْمِيْرٍ۝۱۳ ﴿فاطر: ۱۳﴾

(۶) قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ۝۲۲ ﴿سبا: ۲۲﴾ [1]

ترجمہ:

(۱) (اے پیغمبرؐ) کہو کہ اے اللہ تو حکومتوں کا مالک ہے، تو ہی جسے چاہتا ہے حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے، تمام خوبیاں تیرے دستِ قدرت میں ہیں، کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲) آیا تمہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کا مالک خدا ہے؟ (وہ حق رکھتا ہے کہ اپنے مصالح کے مطابق احکام میں تبدیلی کردے)، خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست و مددگار نہیں ہے۔ (وہی تمہاری مصلحت کو جانتا اور اس کا تعین کرتا ہے)۔

(۳) وہی خدا تمہارا پروردگار ہے (عالم ہستی کی) حکومت اسی کے لیے ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر کیوں تم راہِ حق سے منحرف ہو رہے ہو۔

(۴) خدا یا اپنا ملک جسے چاہے بخش دیتا ہے، خدا (احسان کرنے میں) وسعت رکھتا ہے اور وہ (افراد کی لیاقت برائے منصب سے) آگاہی رکھنے والا ہے۔

(۵) وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے (سارے جہان کی) حکومت اسی کے لیے ہے اور اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے مالک بھی نہیں ہیں۔

(۶) (اے پیغمبر!) کہو کہ جن کو بزعم خویش تم خدا کے سوا پکارتے ہو (وہ تمہاری کوئی مشکل حل نہیں

---

[1] قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں مذکورہ آیات سے ہم آہنگ بہت سی آیات آئی ہیں۔ جیسے آیت ۱۷۔۱۸۔۴۰۔۱۲۰ مائدہ، ۱۵۸۔اعراف، ۱۱۶۔توبہ، ۱۱۱۔اسراء، ۲۔فرقان، ۱۰۔ص، ۴۴۔زمر، ۴۹ شوریٰ، ۸۵۔زخرف اور دیگر آیات

کر سکتے) کیونکہ انہیں آسمانوں اور زمین میں ایک ذرہ برابر اختیار نہیں، نہ وہ ان کی خلقت میں شریک ہیں اور نہ وہ اس میں خدا کے مددگار ہیں۔

مفردات کی تشریح:

''ملک'' جیسا کہ مقابیس اللغۃ میں آیا ہے، اس کے معنی کسی چیز پر قوت رکھنا ہے اسی لیے ''تملیک'' بہ معنی قوت آتا ہے۔ بعد میں یہ لفظ وہاں استعمال ہوا جہاں انسان کسی چیز کا مالک ہو کیونکہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے، اسی لیے اس پانی کو ''ملک'' کہا جاتا ہے، جو مسافر کے پاس ہوتا ہے، کیونکہ جب مسافر کے پاس پانی ہو (خصوصاً پہلے زمانے کے بیابانی سفر میں) تو وہ اپنے کام پر مسلط ہوتا ہے۔

''ملک'' سلطان اور بادشاہ کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں قوت و اختیار رکھتا ہے۔

''ملکوت'' کے معنی عزت و سلطنت ہیں۔

''املاک'' بروزن ''اجلاس'' لغت عرب میں بہ معنی تزویج آیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک لفظ ''مملکت'' بھی ہے، جو لغت عرب میں حکومت اور عزت سلطانی کے معنی میں ہے، نیز اس کا اطلاق پانی اور مٹی پر بھی کیا گیا ہے یعنی بادشاہ کے زیر تسلط دریاؤں اور زمینوں کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آیات کی جمع آوری و تفسیر

یا اللہ! تو ہی مالک الملک ہے:

(۱) زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت کے بارے میں مفسرین نے کہا ہے کہ یہ فتح مکہ کے بعد یا جنگِ احزاب میں خندق کھدائی کے دروان اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں رُوم، ایران اور یمن کے فتح ہونے کی خوش خبری دی منافقین نے اسے حد سے زیادہ بڑا بننے، خیالی پلاؤ پکانے اور ناممکن باتوں کی طمع کرنے کے معنی پہنائے [1]

یہی وہ وقت تھا، جب یہ آیت اُتری، اس نے ان بے خبر لوگوں کو جھنجھوڑا اور بتایا کہ تمام ملکوں کا مالک خدا ہی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: (اے پیغمبر!) کہو کہ اے اللہ تو حکومتوں کا مالک ہے۔ (قلِ اللھم ملك الملك)

تو ہی جسے چاہتا ہے حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے تو جس کو چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے (توتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشآء وتعز من تشاء وتذل من تشاءُ)

نہ صرف حکومت دینا اور لے لینا، عزت و ذلت سے ہم کنار کرنا ہی تیرے اختیار میں ہے۔ بلکہ تمام خوبیاں تیرے سعت قدرت

---

[1] مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۲۷۔ تفسیر فخر رازی جلد ۸ صفحہ ۴۔

میں ہیں کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔(بیدك الخیر، انك علی کل شیء قدیر [1])

ہر چیز پر خدا کی قدرت واختیار وحقیقت زمین وآسمان کی وسعتوں پر اس کی حاکمیت کی دلیل ہے ظاہر ہے کہ خدا کے ہر چیز کا مالک ہونے کے دو پہلو ہیں۔یعنی ایک عمومی اور دوسرا حقیقی.....یعنی خدا کا ہر چیز کا مالک ہونا حقیقی ہے اور عمومیت بھی رکھتا ہے لیکن جب دوسروں کے لیے اس کا ذکر کیا ہے تو اس میں جزائی اور مجازی پہلو نمایاں کر دیا ہے۔(توتی الملك من تشآء)

یہ جو بعض مفسرین نے اس آیت کے مفہوم کو محدود کرتے ہوئے اس عہد نبوی کی فتوحات یا مومنین کی عزت اور یہودیوں کی ذلت وغیرہ مراد لی ہے تو اس پر کسی طرح کی دلیل موجود نہیں، کیونکہ یہ آیت بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے اس میں تمام حکومتیں، عزتیں اور ذلتیں شامل ہیں۔البتہ انہوں نے جن امور کا ذکر کیا ہے وہ اس کے واضح مصادیق میں سے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا جملہ آخر''(انك علی کل شیء قدیر)خدا کی اس کلی اور مطلق مالکیت پر ایک قوی دلیل ہے۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ اس آیت میں خدا کی جس مشیت واراوہ کا ذکر کیا ہے۔اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ خدا کسی قاعدے قانون کے بغیر ہی عزت دیتا ہے یا ذلت، حکومت عطا کرتا ہے یا واپس لے لیتا ہے بلکہ اس نے عالم اسباب میں فتح وشکست کے لیے عوامل کا ایک سلسلہ قرار دے رکھا ہے۔جو اس کی مشیت وارادہ کے مظاہر ہیں۔

اگر ایک روز مسلمان یورپ کے دروازہ''اندلس'' کو فتح کرتے ہیں یا کسی روز ان کو انہی کی آبادکی ہوئی اس سرزمین سے نکال باہر کیا جاتا ہے تو یہ دونوں حالتیں ان اسباب کا نتیجہ جو خدا کی مشیت وارادہ کے مظاہر ہیں۔

پھر اگر یزید اور چنگیز اسے خوں آشام افراد لوگوں پر مسلط ہو جاتے ہیں تو افسوس ہے کہ یہ خود انسانوں ہی کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ ایسی ہی ظالم حکومتوں میں رہنے کے قابل ہوتے ہیں۔جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہر قوم کے لیے وہی حکومت مناسب ہے جو اس پر حکمرانی کر رہی ہو۔

اس سے ان بہت سے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے، جو اس آیت کے بارے میں اٹھائے جاتے ہیں۔لہٰذا کسی مزید توضیح کی حاجت نہیں ہے۔

(۲) دوسری آیت میں تحویل قبلہ پر یہودیوں کے اس بودے اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔انہوں نے کہا تھا: آیا خدا ایک حکم کو منسوخ کر کے اس کی بجائے دوسرا حکم جاری کر سکتا ہے کہ حکم قبلہ کو بیت المقدس سے ہٹائے اور کعبہ کے لیے نا قد کر دے؟ اس بارے میں فرماتا ہے: آیا تمہیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کا مالک خدا ہے؟(الم تعلم ان الله له ملك السمٰوٰت والارض)

اس صورت میں آیا یہ تعجب کی بات ہے کہ ایسا عالی قدر حاکم کسی حکم کو منسوخ کر دے؟ وہ نہ فقط اپنے بندوں کے مصالح ومنافع سے آگاہ ہے، بلکہ حاکمیت بھی خاص اسی کے لیے ہے اور وہ امور عالم کی تدبیر اور اس میں تصرف کرنے کا مختار مطلق اور بندوں کا مالک

---

[1] بعض ماہرین لغت کا خیال ہے کہ''خیر واختیار'' کا مادہ ایک ہی ہے اسی لیے خوبیوں کو''خیر'' کہتے ہیں۔کہ ہر شخص ان کو پسند کرتا اور انہیں حاصل کرنا چاہتا ہے(التحقیق، المفردات، تفسیر المیزان میں آیت زیرِ بحث کے ذیل میں ملاحظہ کریں)

ہے۔اسی لیے آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے۔خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست و مددگار نہیں ہے(وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر)۔

وہ اپنے کامل وآگاہی کے ذریعے مصالح ومفاسد میں تمہاری مدد کرتا اور اپنی حاکمیت کی بدولت تمہارے لیے قانون بناتا ہے۔

علاوہ ازیں خدا کسی مقام ومکان سے بے نیاز ہے اور اس کے لیے کوئی خاص سمت قرار نہیں دی جاسکتی کہ نماز کے دوران ادھر رُخ کیا جائے۔اس لحاظ سے بطور قبلہ ایک مقام کا تعین صرف اسی لیے ہے کہ یہ اس کا حکم ہے کیونکہ وہ سارے جہان کا ملک ہے۔

خدا کے لیے ''ولی ونصیر'' کے صفات قرآن میں بہت سے مواقع پر مذکور ہیں۔ممکن ہے ان میں دو جہتوں سے تفاوت وفرق ہو:

(۱) ''ولی'' کے معنی فوائد ومنافع کی حفاظت کرنے والا ہیں اور ''نصیر'' وہ ہے جو دُشمن کے مقابلے میں انسان کی مدد کرے۔

(۲) ''ولی'' وہ ہے جو اس کے لیے شخصاً کوئی کام کرے جو اس کی ولایت کے تحت ہو،لیکن ''نصیر'' وہ ہے جو انسان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنی مشکل کو دور کرسکے۔

(۳) انسانوں اور جانوروں کی خلقت وآفرینش اور ان میں ہونے والی عجیب وغریب تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے تیسری آیت میں فرماتا ہے:وہی خدا تمہارا پروردگار ہے(عالمِ ہستی کی)حکومت اسی کے لیے ہے۔(ذلکم اللہ ربکم لہ الملك)۔

وہ خالق بھی ہے اور مربی بھی،نیز اسی وجہ سے مالک وحاکم بھی ہے،اب اس بیان کو توحید عبادت کی بنیاد قرار دیتے ہوئے فرمارہا ہے۔اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں،پھر کیوں تم راہ حق سے منحرف ہورہے ہو؟(لاالہ الاھو فانی تصرفون)۔

اے بے خبر غافلو!اور اے وادی ضلالت وگمراہی میں بھٹکنے والو!! خدا کی خالقیت،ربوبیت اور مالکیت کی ان تمام روشن دلیلوں کے باوجود کیوں تم بے راہ ہوئے جارہے ہیں۔

دراصل زیرِ بحث آیت کے اس حصے میں خدا کی توحید حاکمیت'' کو بنیاد بنا کر''توحید عبادت'' کا اثبات کیا جارہا ہے اور اس کی حاکمیت کو مسئلہ خلقت وآفرینش کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے کیونکہ مشرکین بھی تسلیم کرتے تھے کہ اس دنیا جہان کا خالق اور اسے پیدا کرنے والا وہ خدائے واحد ہی ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں طالوت وجالوت کی داستان پر نظر کی گئی ہے۔جالوت ایک ظالم وجابر شخص ہے جو بنی اسرائیل پر حکومت کررہا تھا۔اور اس نے انہیں بری طرح دبا رکھا تھا۔اس زمانے کے پیغمبر''اشموئیل[1] نے بنی اسرائیل کی درخواست پر ایک غریب کسان کے بیٹے طالوت کو ان کا سپہ سالار اور حکمران منتخب کیا تو اسرائیلی سردار اس انتخاب پر معترض ہوئے وہ سردار زادے اور سرمایہ دار ہونے کے باعث طالوت کی نسبت خود کو اس منصب کے زیادہ حق دار سمجھتے تھے۔تاہم ان بزرگ پیغمبر نے ان لوگوں کی اس غلطی فہمی کو دور کرنے کے لیے بڑی صراحت کے ساتھ کہا:وہ علم وآگاہی اور جسمانی قوت کے لحاظ سے تم پر فوقیت رکھتا ہے۔

---

[1] بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ پیغمبر شمعون یا یوشع تھے،لیکن یہ قول بیف بعید ہے،اور پھر یوشع تو اس زمانے میں ہو ہی نہیں سکتے،کیونکہ وہ حضرت موسیٰؑ کے وزیر تھے۔

اس کے بعد فرمایا: خدا اپنا ملک جسے چاہے بخش دیتا ہے (واللہ یوتی ملکہ من یشآءُ)

اس کے ساتھ ہی واضح کر دیا۔ خدا (احسان کرنے میں) وسعت رکھتا ہے۔ اور وہ افراد کی لیاقت برائے منصب سے) آگاہی رکھنے والا ہے (واللہ واسع علیم)

گویا خدا تعالیٰ اس جہان پر نہ صرف تکوینی حاکمیت رکھتا ہے، بلکہ انسانی معاشرے پر تشریعی وقانونی حکومت بھی اسی کی طرف سے ہے اور وہ جسے چاہتا ہے حکومت عطا کر دیتا ہے اگرچہ اس کا یہ چاہنا اور ارادہ کرنا افراد کی اہلیتوں اور لیاقتوں کی بناء پر ہوتا ہے۔

(۵) پانچویں آیت میں یہی مسئلہ ایک اور انداز سے ذکر ہوا ہے اس میں سورج، چاند اور نور وظلمت کے نظام پر خدا کی حاکمیت کے بیان سے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا: وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے۔ (ذٰلکم اللہ ربکم)

(سارے جہان کی) حکومت اسی کے لیے ہے۔ (لہ الملك)

اور اس کے سوا جن (معبودوں) کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے بھی مالک نہیں ہیں۔

(والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیرٍ)

مفسرین اور ماہرینِ لغت نے ''قطمیر'' کے کئی معانی بیان کیے ہیں، لیکن اس کا معروف تر معنی وہ جھلی ہے جو کھجور کے گودے اور گٹھلی کے درمیان ہوتی ہے۔

بعض نے اسے اس چھوٹے سے سفید داغ کے معنی میں لیا ہے جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے کہ وہ یہیں سے اُگتی اور درخت کی شکل اختیار کرتی ہے۔

بعض نے اس سے دانہ خرما کے اوپر کا باریک چھلکا مراد لیا ہے کچھ لوگوں نے اس کو گٹھلی کے درمیانی شگاف کے معنی پہنائے ہیں اور بعض نے اسے وہ زندہ مادہ قرار دیا ہے جو گٹھلی کے اندر ہوتا ہے۔

بہرحال یہ پانچویں معنی کھجور کی گٹھلی سے ہی تعلق رکھتے ہیں جو ہمیشہ سے عربوں کی نظروں کے سامنے رہی ہے بعض تفسیروں میں قطمیر کے معنی پیاز کا چھلکا بھی کیے گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے قبل واضح کیا ہے اس کے پہلے معنی ہی زیادہ مشہور اور معروف ہیں۔ اندریں صورت ان میں سے جو معنی بھی مراد لیا جائے وہ ایک بے اہمیت، کم قیمت اور حقیر چیز کی طرف کنایہ ہے یعنی مشرکوں کے خود ساختہ معبود کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔ [1]

مذکورہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خداوند عالم کے علاوہ کسی کے لیے کوئی مالکیت وحاکمیت نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ اپنی مشیت کے تحت کسی کو عارضی حکومت عطا کر دے۔

(۶) چھٹی اور آخری آیت میں بھی اسی مطلب کو ایک نئی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ تفسیر روح المعانی۔ تفسیر قرطبی تفسیر المیزان۔ تفسیر مراغی۔ المرادت راغب وغیرہم۔

ہوئے فرمایا گیا: (اے پیغمبران مشرکوں سے) کہو کہ جن کو بزعم خویش تم پکارتے ہو (وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے) (قل ادعو الذین زعمتم من دونِ اللہ)

پھر بتایا ہے کہ یہ اس لیے تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انہیں آسمانوں اور زمین میں ایک ذرہ برابر اختیار نہیں (لایملکون مثقال ذرةٍ فی السمٰوٰتِ ولا فی الارضِ) نہ وہ ان کی خلقت میں شریک ہیں اور نہ وہ اس میں خدا کے مددگار ہیں (ومالھم فیھما من شرکٍ ومالہ منھم من ظھیرٍ)۔

اس لحاظ سے نہ وہ زمین اور آسمانوں کے مستقل مالک ہیں نہ مالکیت میں شریک ہیں اور نہ مددگار.....اندریں حال ان کا وہ کونسا کارنامہ ہے کہ جس کے پیشِ نظر تم ان کے سامنے جھکتے اور ان کی عبادت کرتے ہو؟ ان ظاہری دلیلوں کے ساتھ قرآن اس جہان ہستی کی مالکیت وحاکمیت میں خدا کے ساتھ کسی کی شرکت کی نفی کرتا ہے یعنی کسی اور کی مستقل مالکیت وحاکمیت یا اس میں شریک ہونے یا مددگار ہونے کی تردید کرتے ہوئے اسے خاص خدا کے لیے قرار دیتا اور اسے ہر قسم کے شریک و مددگار سے منزہ و پاک شمار کرتا ہے۔

مذکورہ بالا چھ آیات اور ایسی ہی دیگر آیاتِ قرآن سے مجموعی طور پر ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کسی موحد کامل کے نقطہ نظر سے اس جہانِ ہستی میں خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی مالک وحاکم وجود نہیں رکھتا۔ اگر کوئی شخص کسی مقام ومنصب پر فائز ہے تو بھی وہ ایک ذرہ خاک تک کا مالک نہیں ہوتا، اس کے حالت میں مشرکوں کے لیے بتوں۔ اربابِ انواع یا فرشتوں اور ایسی ہی کسی دوسری مخلوق کی عبادت کرنے کا کوئی عذر و بہانہ باقی نہیں رہتا۔

توضیحات

(۱) توحید مالکیت وحاکمیت پر ایمان کے تربیتی اثرات:

انسان میں طغیانی، سرکشی وتکبر اور بخل وحسد کے پیدا ہونے کا سبب ہمیشہ اس کا یہ خیال خام ہوتا ہے کہ وہ اموال واشیاء کا حقیقی مالک ہے یا ایک چھوٹے بڑے علاقے کی حکومت اس کے ہاتھ آجائے تو وہ خود کو مطلق العنان سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی وہ شرک آلود نظریہ ہے جو معاشرہ میں مختلف قسم کے گناہوں اور خرابیوں کے پیدا ہونے اور ان میں اضافے کا موجب ہے۔

لیکن جس وقت اس دنیا کو توحید کے آئینے میں دیکھا جائے اور آیاتِ بالا کے مطابق اسے بلاشرکت غیرے خداوند تعالیٰ کی ملکیت تصور کر لیا جائے تو پھر انسان خود کو مالک نہیں امانت دار سمجھنے لگتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ حدید آیت، میں آیا ہے اس مال میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرو جس میں اس نے تمہیں اپنا نمائندہ وجانشین بنایا ہے۔ (وانفقو مما جعلکم مستخلفین فیہ۔ اگر انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ خود کو امانت دارِ الٰہی تسلیم کرے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اس امانت کے اصل مالک کے حکم پر عمل کرنے میں کوتاہی کرے یا حسد اور بخل میں مبتلا ہو جائے۔

اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس امانت کے اصل مالک کے حکم پر عمل کرنے میں کوتاہی کرے یا حس اور بخل

میں مبتلا ہو جائے۔

اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس دنیا کے اموال انسان کی سرکشی اور تکبر کا سبب بن جائیں کیونکہ یہ سب کچھ خدا کا ہے اور وہی ہر چیز کا مالک اصلی ہے۔ آیا ایک بنک آفیسر ان لاکھوں روپئوں پر مغرور ہوسکتا ہے جو روزانہ اس کے ہاتھوں میں آتے ہیں؟

یہی حال ان حکومتوں اور منصوبوں کا ہے جو افراد کو ملے ہوئے ہیں، ان کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اس عالمِ ہستی میں ایک چھوٹے سے حصے پر خدائے تعالیٰ کے نمائندہ اور اس کے امانت دار ہیں اس چیز کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے غرور اور سرکشی کے کیا معنی؟ اور اس صورت میں انسان کیونکر ظلم اور فساد پر آمادہ ہوسکتا ہے؟

یہ توحیدنظر اور الٰہی جہاں بینی انسان کو ایک اور ہی رنگ میں رنگ دیتی ہے وہ وہی خدائی رنگ (صبغۃ اللہ) ہے کہ جس سے انسان کی سیرت و کردار پر صلح پسندی، صاف باطنی، امن دوستی اور اتفاق و ایثار کے نقوش اُبھر آتے ہیں۔

(۲) خدائی مالکیت سے غلط استفادہ:

اس میں شک نہیں اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ خدا تمام جہانِ ہستی کا مالک ہے۔ نہ صرف بہت سی آیاتِ قرآن اس بات کو ثابت کرتی ہیں، بلکہ متعدد عقلی دلائل بھی ہے اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ کیونکہ اس کی ذاتِ مقدس پر واجب الوجود ہونے کا انحصار اور تمام موجودات کے اس کی بارگاہ میں محتاج و نیازمند ہونے سے ان سب پر اس کی مالکیت پوری طرح ثابت ہوتی ہے۔

لیکن یہ چیز افرادانسانی کی اس محدود اور قانونی مالکیت کے منافی نہیں ہے جس کی اجازت خدا نے دے رکھی ہے جن لوگوں نے اس خدائی مالکیت کو بہانہ بنا کر ہر قسم کی ''خصوصی مالکیت'' کی نفی کی ہے یہ دے رکھی ہے جن لوگوں نے اس خدائی مالکیت کو بہانہ بنا کر ہر قسم کی ''خصوصی مالکیت'' کی نفی کی ہے یہ اس مسئلے سے غلط فائدہ اٹھانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی اسے اسلامی فکر قرار دیا جاتا ہے اور اس ناطے سوشلزم و کمیونزم کو اسلام کے ہم رنگ ثابت کرنے کی ناکام کوشش بھی کی جاتی ہے اس کے جواب میں ہم کھل کر کہنا چاہتے ہیں کہ جو قرآن خداوند عالم کے اس جہان کا مالک ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ اسی قرآن میں ''وراثت'' ''خمس'' ''زکات'' ''تجارت'' سے متعلق آیات بھی موجود ہیں اور اموال کے ''مالکان خصوصی'' کی مالکیت کو قانونی طور پر تسلیم کرتا ہے۔

قرآن کی چودہ آیتوں میں ''اموالکم'' (تمہارے اموال) اور اکتیس آیتوں میں ''اموالھم'' (ان کے اموال) کے الفاظ آئے ہیں اسی طرح بہت سی قرآنی آیات میں مسلمانوں کو ان کے اموال کے بارے میں احکام دیئے گئے ہیں اگر خدائی مالکیت اپنے مفہوم میں انسانی مالکیت کے منافی ہو تو پھر ان پینتالیس آیتوں میں جو الفاظ آئے ہیں (اور دیگر کئی آیات میں بھی ہیں) وہ کیا معنی رکھتے ہیں؟

قرآن ایک مقام پر کہتا ہے: تم یتیموں کے اموال نہ کھاؤ (نساء ۲، ۱۰)

دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں، انہیں ایسی ایسی جزاء ملے گی (بقرہ۔ ۲۶۲)

سودخوروں کے بارے میں ارشاد ہوا: اگر سودخوری ترک کردو تو تم اپنے اصل سرمائے کے مالک ہوگے۔ (بقرہ۔ ۲۷۹)

قرآن یہ بھی کہتا ہے: جب یتیم سن رشد کو پہنچ جائیں تو ان کا مال انہیں دے دو (نساء۔٦)

قرآن میں ایسی اور تعبیرات بھی ہیں جو انسانی مالکیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

البتہ اسلام میں اسی خصوصی مالکیت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں۔ جیسے مالکیت عمومی'' اور مالکیت دولت یعنی عوامی مالکیت اور سرکاری مالکیت کہ قرآن میں ان کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی خدائی مالکیت سے اختلاف نہیں رکھتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ توحیدِ مالکیت''اس سے مانع نہیں کہ ہر فرد انسانی یا معاشرے کا ایک گروہ خاص یا خود معاشرہ شرعاً کچھ چیزوں کا مالک ہوتا ہم ان مالکیتوں کے لیے مقررہ شرائط واحکام ہیں جو فقہ اسلامی میں مدون شکل میں موجود ہیں۔

(۴) توحید قانُون گذار یحاکمیت تشریعی

اشارہ:

ہم جانتے ہیں کہ معاشروں کے نظم وضبط کے لیے تین قوتوں کی ضرورت ہے:

(۱) قوت قانونگذاری.....اس کا کام ایسے قوانین وضع کرنا ہے کہ جن سے معاشرے کے نظام کی حفاظت ہو سکے اور کسی فرد یا گروہ کے حقوق تلف نہ ہونے پائیں۔

(۲) قوت مجریہ..... یہ ایسی قوت جو قوت ہے قانون گذاری کے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ واجراء کرتی ہے اس میں عموماً حکومت، وزارتیں اور مختلف ادارے ومحکمے شامل ہوتے ہیں۔

(۳) قوت قضائیہ.....اس کا کام قانون کے خلاف چلنے والوں کو سزا دینا اور راہ راست پر لانا ہے۔ توحیدِ اسلام کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان تینوں قوتوں کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے اور اس کے فرمان کے بغیر کسی کو ان میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ وہی ذات قانون ساز ہے، وہی حکومت کرنے کا اذن واجازت دے سکتی ہے اور وہی ذات ہے جس نے قضاوت کو نظام بخشا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ یہ تینوں قوتیں خدا کے اذن سے اپنی مشروعیت اور اس کے حکم سے اپنے حدود وقواعد اخذ کریں، اگرچہ اس کے لیے بہت سے عقلی دلائل موجود ہیں، تاہم قرآن مجید میں بھی اس کا تفصیلی تذکرہ ہوا ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے اور آیاتِ ذیل پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

(۱) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۴۴ ﴿المائدۃ: ۴۴﴾

(۲) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۴۵ [۵:۴۵]

(۳) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۴۷ [۵:۴۷]

(۴) وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ

(۵) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۶۵ [۴:۶۵]

(۶) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ○ (انعام۔ ۵۷، یوسف علیہ السلام ۴۰،۶۷)

(۷)وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ [۲۸:۷۰]

(۸) وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ [۲۸:۸۸]

(۹)وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۾ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ۝ [۴۲:۱۰]

(۱۰) وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ [۶:۱۱۵] [1]

ترجمہ:

(۱) جولوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

(۲) جولوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔

(۳) جولوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔

(۴)(اہل کتاب) کے درمیان خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کرواوران کی خواہشات کی پیروی نہ کرو،ان سے بچ کررہوکہ کہیں وہ تم کوخدا کے بعداحکام سے منحرف نہ کردیں جوتم پرنازل ہوئے ہیں۔

(۵) تمہارے پروردگار کی قسم کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے،حتیٰ کہ اپنے اختلاف میں تمہیں منصف بنائیں۔پھرتمہارے فیصلے پراپنے دلوں میں کچھ تنگی محسوس نہ کریں اوراس کو پورے طور پرتسلیم کرلیں۔

(۶) حکم وفیصلہ صرف خداہی کے اختیار میں ہے.....

---

[1] قرآن میں اسی مضمون کی دیگرآیات بھی ہیں۔جیسے آیت ۴۸،۵۰۔مائدہ ۲۶۔کہف،۸۷۔اعراف،۱۰۹،یوسف ۴۵،ہود ۸۰، یوسف ۸۰، تین:۶۰۔نساء

(۷) وہ اللہ ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں دنیا میں اور آخرت میں، حاکمیت بھی اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

(۸) اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، کیونکہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کی ذات کے علاوہ تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں۔ حاکمیت صرف اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

(۹) جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو، اس کا فیصلہ صرف خدا ہی کے ہاتھ میں ہے وہی خدا میرا پروردگار ہے میں اسی پر بھروسہ کیے رہتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

(۱۰) کیا میں سوائے خدا کے کسی کو اپنا منصف بناؤں، حالانکہ وہی تو ہے، جس نے تمہارے لیے یہ آسمانی کتاب نازل کی ہے۔ جس میں ہر چیز کا ذکر ہے۔

مفردات کی تشریح:

''حکم'' بروزن ''قفل'' ہے۔ بہت سے ماہرین لغت کے نزدیک اس کے اصل معنی منع کرنا اور روکنا ہیں[1] بعد میں اس کو ''قضاوت'' اور ''حکومت'' کے لیے استعمال کیا جانے لگا، کیونکہ قاضی اور حاکم اپنے قطعی حکم کے ذریعے لوگوں کو اس حکم کی مخالفت یا دیگر ناجائز کاموں سے باز رکھتا ہے۔

حکمۃ ''بروزن'' غلبۃ'' کا نعی لوہے کا وہ حلقہ یا کیل ہے جو لگام یا نکیل میں حیوان کے منہ یا اس کی ناک میں ڈالتے ہیں۔ جب اسے کھینچا جائے تو حیوان کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ مطیع ہو جاتا ہے تاہم اس میں بھی منع اور روکنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

لسان العرب کے مولف کا کہنا ہے کہ ''حکم'' کے کئی معانی ہیں۔ جیسے علم وفہم اور حق وعدالت کے مطابق فیصلہ دینا (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ امور انسان کو ناجائز کام سے باز رکھتے ہیں)

حکیم کو اس لیے حکم کہتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ علم وآگاہی رکھتا ہے جو اسے گناہوں، نادرست کاموں اور غلطیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ لفظ (حکم) تینوں معنوں یعنی ''قانون گذاری'' ''قضاوت'' اور ''امور اجرائی'' میں استعمال ہوتا ہے اور ان ہر سہ فرائض میں سے ہر ایک کے ذمہ دار کو ''حاکم'' کہا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض کتب لغت میں ''حکم'' کے معنی تفویض اور ایک کام کسی دوسرے کے سپرد کرنا بھی ہیں۔

---

[1] المفردات راغب، مقاییس اللغۃ۔ مصباح المنیر قیومی۔

کتاب ''العین'' مین آیا ہے کہ ''حکمت'' کے لفظ میں علم، عدالت اور حلم کے معنی پائے جاتے ہیں۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ حکمت کے معنی کرنا ہے یا فساد سے منع کرنا بھی ہیں اور یہ تشریح ان تمام اہل لغت کے بیانات سے مطابقت رکھتی ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

''آیات محکمات'' کو اس لیے محکمات کہا گیا ہے کہ ان کی صراحت اور واضح دلالت ہر قسم کی نادرست تفسیر اور تاویل کا راستہ روک دیتی ہے۔

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

(۱) تا (۴) سورۂ مائدہ کی چار آیات (۴۴۔۴۵۔۴۷۔۴۹) میں مسئلہ توحید حاکمیت بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفسیر میں ان سے قریب تر آیات بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تفسیر میں ان سے قریب تر آیات ۴۸، ۵۰ بطور ضمیمہ ذکر ہوئی ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے: جو لوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ دوسری آیت میں کہا کہ وہ ظالم ہیں اور تیسری آیت میں ہے کہ وہ فاسق ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الكافرون۔ هم الظلمون... هم الفٰسقون)۔

ان تینوں تعبیرات کے مفاہیم مختلف ہیں یا سب ایک مفہوم کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اس بارے میں مفسرین نے بہت کچھ بحث کی ہے، بعض کا نظریہ ہے کہ یہاں ایک ہی گروہ کا ذکر ہے۔ جس میں متعدد صفات پائی جاتی ہیں اس کی تفسیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جو بھی شخص ما انزل اللہ (جو بھی خدا نے نازل فرمایا) کے خلاف حکم وفیصلہ کرے گا۔ چونکہ وہ خدا کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا ہے اس لیے کافر ہے۔ اس لیے کہ حقوق انسانی کی تلف کر رہا ہے وہ ظالم ہے اور اس کی وجہ سے کہ خدا کے مقرر کردہ حدود سے خارج ہو رہا ہے وہ فاسق ہے (یاد رہے کہ فسق کا مطلب وظیفہ بندگی کو ترک کر دینا ہے)۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ پہلی اور دوسری آیت یہودیوں کے متعلق اور تیسری آیت مسیحیوں کے متعلق ہے۔ چونکہ یہودیوں کی احکام الٰہی کے ساتھ دشمنی مسیحیوں سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا وہ کافر وظالم ہیں اور فقط فاسق ہیں۔

بہرحال یہ ایک واضح امر ہے کہ آیات کا کسی مورد خاص میں نزول ان کے مفہوم کو خاص اور محدود نہیں کرتا اس لیے یہ آیات ان سب افراد اور گروہوں پر صادق آتی ہیں جو احکام الٰہی کے خلاف حکم وفیصلہ دیتے ہیں۔

جو بھی شخص فرمان الٰہی کے خلاف حکم دے گا اس کا ظالم وفاسق ہونا ثابت ہے البتہ کفر کا اطلاق اس صورت میں ہوگا کہ وہ حکم خدا کو رد کرے اور اسے باطل سمجھے۔ کیونکہ ایسا قول یا اعتقاد خدا کی ذات کا انکار یا اس کے علم حکمت اور یہ قطعی طور پر کفر ہے۔ اسی طرح کسی حکم نے انکار سے انکار رسالت محمدیہ لازم آئے تو یہ بھی کفر میں داخل ہے۔

لیکن اگر ایک شخص حکم الٰہی کے خلاف فیصلہ کرے اور اس کی بنیاد خواہش نفس پر ہو یعنی وہ توحید ونبوت کا انکار نہ کرتا ہو تو اس پر کفر لازم نہیں آئے گا۔

اس سورے کی آیت ۴۸ میں بھی یہی حکم آیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا (فاحکم بینھم بما انزل اللہ) خدا کے احکام کے مطابق ان کے درمیان حکم خدا کے مطابق کرو۔ نیز اس کے ساتھ ہی آیت ۴۹ میں ہے (وان احکم بینھم بما انزل اللہ) لازم ہے کہ ان کے درمیان حکم خدا کے مطابق کرو۔

اس سے اگلی آیت ۵۰ میں فرمایا (فحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکماً لقومٍ یوقنون) کیا وہ تم سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، باایمان افراد کے لیے خدا کے سوا کون بہتر فیصلہ کرنے والا ہوگا؟

ان چھ آیتوں میں سے اس بات کی تاکید در تاکید ہوئی ہے کہ حقیقی حکم بس خدا ہی کا حکم ہے۔

ایک ہی سورے کی چھ آیتوں میں پے در پے مختلف عبارتوں میں حق حکم کو خاص خدا ہی کے لیے قرار دیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی بڑے سے بڑے عہدیدار اور بلند سے بلند منصب رکھنے والے کو قانون سازی کا حق نہیں ہے، بلکہ یہ صرف اور صرف خدا کا حق ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے لیے قانون بنائے، پس جو شخص خدا کے حکم کے خلاف فتویٰ دے یا فیصلہ کرے یا حکومت کرے، تو وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا اور اسے ظالم وستم گار شمار کیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا گناہ ہے جو اس کے بدن سے لباس ایمان اتار لے گا۔

اس ترتیب سے توحید وحاکمیت تشریعی اور حق قانون سازی کا خداوند حاکم کی ذاتِ مقدس میں منحصر ہونا نیز حکم کا حکم خدا میں انحصار پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔

(۵) پانچویں آیت میں منصب قضاوت پر بات ہو رہی ہے۔ اسے پیغمبر اکرمؐ (اور ان کی طرف سے امامت مطلقہ یا خصوصی قضاوت پر نصب کیے گئے افراد) کے لیے دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

تمہارے پروردگار کی قسم کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اپنے اختلاف میں تمہیں منصف بنائیں (فلا وربك لایومنون حتیٰ یحکموك فیما شجر بینھم)۔

پھر تمہارے فیصلے پر اپنے دلوں میں کچھ تنگی محسوس نہ کریں۔ (ثم لایجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت)

اور اس کو پورے طور پر تسلیم کرلیں (ویسلموا تسلیماً)

بنابریں ایمانِ خالص کی یہ تین علامات ہیں۔

(۱) اپنے تمام اختلافات میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم وفیصلہ کنندہ قرار دینا۔

(۲) پیغمبرؐ جو حکم یا فیصلہ صادر فرمائیں اس پر کوئی ناخوشی یا تنگی محسوس نہ کرنا۔

(۳) حضور اکرمؐ کے حکم پر بہ تمام وکمال عمل درآمد کرنا۔

اس ترتیب سے یہ آیت حاکمیت کے دوسرے شعبے یعنی حاکمیت قضاوت کو بھی خداوند تعالیٰ کے لیے قرار دیتی ہے (کیونکہ نبی اکرمؐ خدا کے نمایندہ اور اس کی طرف سے مامور ہیں)۔

حکم بس اللہ ہی کا ہے:

(۶) چھٹی آیت میں ایک مختصر جملے میں فرماتا ہے (حکم وفیصلہ صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے ان الحکم الا للہ۔

البتہ خود یہ جملہ کہ جو قرآن میں کئی بار دوہرایا گیا ہے بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے اور حکم بہ معنی قانون گذاری (قانون سازی) بھی اس میں شامل ہے نیز حکومت وقضاوت اور حکم تکوینی وتشریعی سبھی اس کے تحت آجاتے ہیں۔لیکن اس میں ایک اور پہلو بھی زیرنگاہ رکھنا چاہئے کہ سورۂ انعام آیت ۵۷ اور سورۂ یوسفؑ آیت ۶۷ میں جملہ کافروں کے لیے عذاب و پاداش کے ضمن میں حکم خا کے اجراء کو بیان کررہا ہے۔

بہرحال حکم بس اللہ ہی کے لیے ہونے کی تعبیر کا مختلف موارد میں استعمال جیسے ہم نے پہلے بھی کہا ہے۔اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ آیت بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے۔اور ہر قسم کے حکم فرمان کو خدا کے لیے مخصوص ٹھیراتی ہے، اس میں عالم تکوین اور عالم تشریع سے متعلق تمام احکام شامل وداخل ہیں۔

(۷) ساتویں آیت میں خدا کو دنیا وآخرت میں لائق عبادت اور قابلِ حمد وثنا قرار دینے کے بعد فرماتا ہے وہ اللہ ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں اس دنیا میں اور آخرت میں، حاکمیت بھی اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

(وھو اللہ الا الہ الا ھو لہ الحمد فی الاولیٰ والاخرۃ ولہ الحکم ولیہ ترجعون)۔

''ولہ الحکم'' ہر دو عالم میں حاکم وہی ہے یہ جملہ درحقیقت صرف اسی کے حمد وستائش اور عبادت و پرستش کے لائق ہونے کی دلیل کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ ''معبود'' اور ''محمود'' وہ ہے جس کا حکم ہر چیز میں جاری ونافذ ہو اگرچہ بعض مفسرین مثلاً ابنِ عباس نے کہا ہے کہ یہاں ''حکم'' سے مراد قیامت میں اس کا بندوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے [1]

لیکن اس آیت کے مفہوم کو محدود کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔اور پھر ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ کسی آیت کے سبب نزول کی خصوصیت اس کے معنی ومطلب کی عمومیت میں مانع نہیں ہوتی۔

لہٰذا مذکورہ بالا آیت عالمِ تکوین اور عالمِ تشریع میں خدائے تعالیٰ کی توحید وحاکمیت اور قانون سازی وقضاوت کے حق کو ثابت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ ان امور میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔چنانچہ تفسیر المیزان میں بھی اس آیت کے مفہوم میں عمومیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[2]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جملہ ''لہ الحکم'' دو جہتوں سے حصر پر دلالت کرتا ہے، اوّل یہ کہ ''لہ'' کو مقدم کیا گیا اور دوم یہ کہ ''الحکم'' مطلق صورت میں آیا ہے۔یعنی اس میں ہر قسم کی حکومت شامل ہے۔

یاد رہے کہ خدائے تعالیٰ کی یہ کلی حاکمیت اس سے مانع نہیں ہے کہ وہ اختیار حکومت پیغمبروں، معصوم اماموں یا اپنے دیگر صالح بندوں

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۰ صفحہ ۹۲۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۶ صفحہ ۷۰۔

کوعطاء کردے، جیسا کہ حمد وستائش کا اسی کے لیے مخصوص ہونا اس سے مانع نہیں ہے کہ انسان ان صالح بندوں کا جو حصول نعمت کا وسیلہ ہیں یا ماں باپ اور استاد کی توصیف کرے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ دراصل یہ سب تعریفیں خدا ہی کی ہیں اور یہی ہے توحید حاکمیت کا مفہوم ومطلب!

(۸) آٹھویں آیت میں پہلے توحید عبادت کا ذکر کیا اور پھر توحید حاکمیت کے بارے میں فرماتا ہے: اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو کیوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں (ولا تدع مع الله الٰهاً اٰخر لا اله الا هو)۔

اس سے اگلا جملہ کہ جو اس حکم کی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں فرمارہا ہے اس کی ذات کے سوا تمام چیزیں فنا ہوجانے والی ہیں (کل شیء هالك الا وجه)۔

پھر آخر میں فرماتا ہے: حاکمیت صرف اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ (له الحکم و الیه ترجعون)۔

یہ آیت عبادت، بقاء اور حکم وفیصلہ کو خدا کے لیے مخصوص شمار کرتی ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں ''حکم'' کو خدا کے حکم تکوینی اور اس ارادہ کے معنی میں لیا ہے جو ہر چیز میں کارفرما ہے بعض نے اسے قیامت میں فیصلہ کرنے اور بعض نے اس کو فقط حکم تشریعی سے متعلق قرار دیا ہے۔ الفاظ بتارہے ہیں۔ کہ یہ آیت مطلق اور بے قید وشرط ہے لہٰذا اس میں عالم ہستی اور عالمِ شریعت نیز اس دنیا اور دوسری دنیا کے بارے میں ہر حکم شامل ہوجاتا ہے۔

جملہ ''کل شیء هالك الا وجهه'' میں لفظ ''وجہ'' سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسروں نے اس کی تشریح ان اعمالِ صالح سے کی ہے جو خدا کے ارادہ کے تحت انجام دیئے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خدا کا دین وآئین ہے اور بعض نے اس کی تفسیر خدا کے مقام ومرتبہ کے طور پر کی ہے۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ''وجہ'' دراصل ''چہرہ'' کے معنی میں ہے پر ھ اس لیے کہ بقول راغب اصفہانی ''چہرہ'' وہ پہلی چیز ہے جو کسی دوسروں سے جدا کر کے دکھاتی ہے اور یہ برترین عضوِ بدن ہے، اس لفظ کا اطلاق اعلیٰ اور برتر موجودات پر کیا جاتا ہے۔ اور اسی مناسبت ہے یہ خدا کی ذاتِ مقدس کے لیے استعمال ہوا ہے نیز اس آیت میں بھی ظاہراً اس کے یہی معنی مراد ہیں۔

لیکن اس لحاظ سے کہ ہر وہ موجود ومخلوق جو اس باقی وابدی ذات سے رابطہ پیدا کرلے وہ بھی ابدیت کا رنگ اختیار کرلیتی ہے، لہٰذا خدا کا دین وآئین اس کے حکم سے انجام دیئے گئے اعمال اور پیغمبران الٰہی کو جو اس سے رابطہ رکھتے ہیں وہ سبھی بقاء اور ابدیت سے ہم کنار ہوجاتے ہیں..... اسی ترتیب سے آیت زیر بحث کے ذیل میں بیان کی جانے والی تمام تفسیریں اس میں جمع ہوگئی ہیں۔ اور یہ ان سب کی جامع ہے۔

اپنے اختلافات میں خداوند پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرو:

(۹) نویں آیت میں ''حاکمیت'' کو ''قضاوت'' کے معنی میں لایا گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے: جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ صرف خدا ہی کے ہاتھ میں ہے (وما اختلفتم فیه من شیء فحکمه الی الله)

ہاں وہی تو ہے جو تمہارے اختلافات کا فیصلہ کرسکتا ہے، کیونکہ وہ تمام چیزوں سے آگاہ اور باخبر ہے نیز وہ ان پر ولایت یعنی ملکیت

وحاکمیت بھی رکھتا ہے۔

پھر اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتا ہے: وہی خدا میرا پروردگار ہے (یہی وجہ ہے کہ) میں اسی پر بھروسہ کیے رہتا ہوں۔ اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (ذٰلکم اللہ ربی علیہ توکلت والیہ انیب)۔

اس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال ہیں۔ بعض مفسرین اسے لوگوں کے ذاتی اختلافات اور رنجشوں سے متعلق قرار دیتے ہیں کہ جن کا فیصلہ انہیں پیغمبر اکرمؐ سے کرانا چاہیے تھا۔ بعض اس کو آیاتِ قرآن کی تفسیر وتاویل میں اختلاف سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض اہل تفسیر اسے ان علوم میں اختلاف نظر شمار کرتے ہیں..... جو معارفِ دینی اور فرائض وذمہ داریوں سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے روح اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی شناخت کے مسائل ہیں [1]

لیکن آیت کے کسی ایک مطلب تک محدود ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے اور جیسا کہ بہت سے محققین نے کہا ہے یہ آیت ہر قسم کے حکم وفیصلے کو شامل ہے، خواہ وہ احکام ومعارف دین ہوں، خواہ لوگوں کے تنازعات یا آیات متشابہ اور دیگر مسائل ہوں۔

یہ ان آیات میں سے ہے جو اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ تمام مسائل کا حل قرآن وسنت میں موجود ہے لہٰذا از خود قانون سازی کرنے اور قیاس دوڑانے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اگر قرآن وسنت میں تمامی احکام موجود نہ ہوتے تو اختلافات کے بارے میں ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ (غور کریں)

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ فخر رازی اور دیگر مفسرین نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس آیت کو فقہی مسائل میں قیاس کے باطل ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ [2]

کیونکہ یہ آیت کہہ رہی ہے کہ تمام اختلافات کا فیصلہ خدائے تعالیٰ سے حاصل کرنا چاہیے (نیز پیغمبر اکرمؐ بھی فیصلہ دے سکتے ہیں کہ وہ لوگوں میں خدا کے نمائندہ ہیں) پس اگر کتاب وسنت میں احکام وعقائد اور شریعت سے متعلقہ اُمور کا حل پہلے سے نہ کر دیا، ہوتا تو اختلافات میں خداوند جہاں کی طرف رجوع کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں تھے۔

(۱۰) دسویں آیت میں ایک کلی نتیجہ کے طور پر پیغمبر اکرمؐ کی زبانی فرمارہا ہے: کیا میں سوائے خدا کے کسی کو اپنا منصف بناؤں حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے یہ آسمانی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا ذکر ہے۔ (افغیر اللہ ابتغی حکماً وھو الذی انزل الیکم الکتٰب مفصلاً)۔

بنابریں ''حکم'' و ''قاضی'' صرف خدا کی ذات مقدس ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تمام چیزوں سے آگاہ وباخبر ہے اور یہ قرآن اس

---

[1] روح المعانی جلد ۲۵ صفحہ ۱۵ پر یہ تینوں تفسیریں دیگر مفسرین سے نقل کی گئی ہیں۔

[2] تفسیر فخری رازی جلد ۲۷ صفحہ ۱۴۹۔

کے علم وآ گاہی پر بہترین دلیل ہے [1]

اس بارے میں ''حکمیت'' کس چیز میں مطلوب ہے؟ قرائن بتاتے ہیں کہ یہاں خداوندِ عالم سے پیغمبر اکرم کی حقانیت کے متعلق حکم وفیصلہ مراد ہے۔

اس آیت کی جوشانِ نزول نقل ہوئی ہے وہ بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے، جیسا کہ راوی کہتے ہیں:

مشرکین قریش نے نبی اکرمؐ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہمارے اور اپنے درمیان علماء یہود یا مسیحی پادریوں میں سے کسی کو حکم ومنصف ٹھہرائیں تا کہ وہ آسمانی کتابوں کی رُو سے ہمیں آپ کے مقام اور حیثیت سے آگاہ کریں [2]

اس سے یہ آیت نازل ہوئی کہ جس میں انہیں جواب دیا گیا ہے کہ خدا کے علاوہ بھی کوئی حکم ومنصف وجود رکھتا ہے؟

علاوہ ازیں اس آیت کا آخری جزء بھی اس مفہوم کا شاہد ہے کہ جہاں فرماتا ہے: جن لوگوں کو ہم نے (اس سے پہلے) آسمانی کتابیں دیں وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن حق کے ساتھ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے (والذین اٰتینھم الکتب یعلمون انه منزل من ربك بالحق)۔

بہرحال اس آیت کا مفہوم بڑی وسعت رکھتا ہے اور یہ بلا استثناء تمام امور میں حکمیت کو خدا کے لیے مخصوص قرار دیتی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آیت کا مورد نزول اس کے مفہوم کو محدود نہیں کر

مذکورہ بالا دس آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ عالم ہستی وعالمِ شرع میں حاکمیت اور نفوذ حکم وفرمان خدائے تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے نیز حاکمیت بہ معنی قانون سازی، قضاوت اور حکومتِ اجرائی (نفاذ قانون) کا سرچشمہ خداوندِ عالم ہی ہے اگر کوئی شخص ان امور میں سے کسی امر یا اس کے ایک جز کا ذمہ دار بنے تو اس کے لیے خدا کا اذن وحکم ضروری ہے۔

البتہ ان دس آیات میں مختلف تعبیرات آئی ہیں۔ بعض میں حاکمیت کے تمام شعبوں کا ذکر ہے اور بعض میں صرف قانون سازی کی طرف اشارہ ہے لیکن مجموعی طور پر ان آیات میں ''توحید حاکمیت'' اپنے تمام پہلوؤں سمیت پوری طرح واضح اور عیاں ہے۔

---

[1] ''حکم'' بروزن ''عمل'' ہے مجمع البیان وتبیاں کے مطابق حکم وہ ہے، جس کا فیصلہ ہمیشہ حق ہو، جبکہ حاکم کا فیصلہ ناحق ہوسکتا ہے، لیکن اس مفہوم کے لیے کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ لفظ ''حکم'' صفت مشبہ ہے اور دوام واستمرار رکھتا ہے۔ یہ لفظ اس پر بولا جائے گا جو ہمیشہ صحیح فیصلہ دے، لیکن جنگ صفین میں حکمین کے تقرر کا واقعہ اس کی نفی کرتا ہے۔ لیکن جب ''حکم'' یا حاکم'' کے الفاظ خدائے تعالیٰ کیلئے استعمال ہوں تو اس سے مراد ایسا فیصلہ ہوگا۔ جس میں ظلم وخطا کا شائبہ نہیں مگر یہ مطلب لُغت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

[2] تفسیر رُوح المعانی جلد ۸ صفحہ ۷۔

توضیحات

(۱) خدائی حاکمّیت عقل کی روشنی میں:

اس بات میں شک نہیں کہ ہر خداشناس شخص جس نے توحید خالق کو مانا ہوا ہے۔ وہ جہانِ ہستی میں اس کے فرمان کو بھی جاری وساری سمجھتا ہوگا۔ جب عالمِ ہستی پر اس کی حاکمیت تسلیم کی جا چکی تو پھر اس کی ولایت وحکومتِ تشریعی میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ جب اس جہان کا خالق ومالک اور مدیر ومدبر وہ ہے تو بجز اس کے کوئی دوسرا یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ نظامِ تکوین وآفرینش سے ہم آہنگ قانون سازی کر سکے۔

اس طرح جب وہ خالق ومالک اور مدیر ومدبر ہے تو ضروری ہے کہ وہی بندوں پر قانونی حکومت اور ان کے اخلافات کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری کسی کے سپرد کر دئے۔ اس کے علاوہ ہر صورت میں خدا کی مالکیت وتدبیر کے دائرۂ عمل میں بے جا مداخلت تصور کی جائے گی۔

ایک اور لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک صحیح قانون وہی ہے جو انسان کے جسم وجان سے ہم آہنگ ہو۔ اس کی مادی ومعنوی ضرورتیں پوری کرے۔ کم یا زیادہ مدت میں اس کا کوئی برا اثر ظاہر نہ ہو اور معاشرے پر اس کے اجراء کے لیے ایک قوت موجود ہو، نیز لوگوں میں اسے قبول کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہو۔

دوسرے لفظوں میں ایک اصلی قانون ساز وہ ہے جو ایک طرف کامل انسان شناس ہو اور دوسری طرف اس عام ہستی کی صحیح شناخت بھی رکھتا ہو تا کہ وہ انسانوں کے ظاہر وباطن پر نظر رکھتے ہوئے قانون سازی کرے مزید یہ کہ وضع قوانین میں اپنا کوئی فائدہ بھی اس کے پیشِ نظر نہ ہو۔

ہم انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں یہ جو بڑی خرابیاں دیکھتے ہیں تو اس کی وجوہات کچھ یوں ہیں۔

(۱) ایک ایسا شخص جو انسان کے جسم وجان کی باریکیوں کو جانتا ہو اور اس دُنیا میں کارفرما طبعی قوانین سے بھی آگاہ ہو وہ انسانی معاشرے میں نہیں مل سکتا۔ کیونکہ ابھی تو دانش وردوں کی طرف سے انسان موجود ناشناختہ.....جیسی کتابیں لکھی جارہی ہیں، جہاں خود اپنے بارے میں انسان کی معلومات اتنی کم اور اتنی کمزور ہوں وہاں اس وسیع کائنات سے متعلق اس کے علم وآگاہی کا کیا حال ہوگا؟

(۲) انسان ایک ایسا موجود ہے جو بہت سی حاجتیں رکھتا ہے لہٰذا کسی معاشرے میں جو بھی گروہ قانون سازی کرتا ہے وہ اپنے گروہ اور اپنی پارٹی کے مفاد کو مدنظر رکھتا ہے۔

(۳) ان باتوں کو چھوڑتے ہوئے بھی ایک اہم چیز باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی انسان غلطی اور غلط فہمی سے مبرا نہیں ہے، اسی وجہ سے انسانوں کے وضع کیے ہوئے قوانین ہمیشہ تغیر وتبدل کی کیفیت سے دوچار رہتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ان کی خامیاں اور نقائص سامنے آتے ہیں پھر ان میں ایک طرف سے اصلاح کرتے ہیں تو دوسری طرف سے ایک اور نقص سر نکالنے لگتا ہے اس لیے انسانوں کی بنائی ہوئی مجالس قانون ساز بطور آزمائش گاہ کے وجود میں آئی ہیں کہ ہمیشہ سے قوانین کی آزمائش کر رہی ہیں اور آزمائش کا یہ سلسلہ کہیں جا کر نہیں تھمتا۔

بنابریں خدائے تعالیٰ کی مالکیت وحاکمیت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی اصولاً انسان کو پیدا کرنے والا کہ جو اس کے جسم وجان کی تمام حاجتوں سے آگاہ، ہر چیز اور ہر شخص سے بے نیاز اور ہر طرح کی غلطی وغلط فہمی سے منزہ و پاک ہے، اس کے سوا کوئی اور شخص قانون سازی کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

لہٰذا ہمارا وظیفہ وذمہ داری صرف یہ ہے قوانین الٰہی کے کلی اصولوں کو اپنے عہد کے تقاضوں سے مربوط کریں اور ان کی روشنی میں قابل عمل جزئی احکام مرتب کر کے خدا کی زمین پر خدا کے قانون کا نفاذ ممکن بنائیں۔

(۲) حکومت ایک امانتِ خداوندی ہے:

مذکورۂ بالا آیات سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حکومت ایک امانتِ خداوندی ہے، اس لیے حکمرانوں اور عہدیداروں کو خدا کے نمایندوں کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر حالت میں حکومت کے اصلی مالک (خدا) کے بتائے ہوئے اصول وضوابط کا لحاظ رکھیں اور ان کے تحت اپنے فرائض ادا کریں۔

حضرت داؤدؑ جو تاریخ انسانی میں مذکور بڑی بڑی حکومتوں میں سے ایک حکومت کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ ان سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ (اور نمایندہ) قرار دیا ہے، لوگوں میں حق کے ساتھ حکم وفیصلہ کرو، اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ (یداوداانا جعلنك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق و لاتتبع الهوٰى فيضلك عن سبيل الله۔ (ص ۲۶)۔

یہ تعبیر بھی حکومت کے امانت خداوندی ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ نیز ایک مکمل شرعی والٰہی حکومت کے نقوش کو بڑی عمدگی کے ساتھ واضح وعیاں کرتی ہے۔

(۳)۔ حکومت کی تشکیل صرف خدا کی طرف سے ہے:

اسلام اور نظریہ توحید کی رو سے حکومت طرف بالا سے تشکیل پاتی ہے نہ جانب پست سے..... یعنی حکومت خدا کی طرف سے ہے نہ لوگوں کی طرف سے..... تاہم عوامی تائید بھی خدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اس امانت الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کی وضاحت یوں ہوسکتی ہے کہ نظریہ توحید اور نظریہ شرک میں جو فرق پائے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ ایک توحید پرست انسان حکومت کو اس کی تمام شاخوں (قانون، اجرائی، قضائی) سمیت خدا کی طرف سے تصور کرتا ہے جو انبیاء ان کے اوصیاء اور پھر علماء وصلحاء اُمت کو ملتی ہے۔

ان احکام کے لیے لازم ہے کہ وہ خود خدا کے سامنے جواب دہ سمجھیں اور ہر بات سے پہلے اس کی رضاء پر نظر رکھیں اور اس کے بندوں کے ہمدرد اور خدمت گذار بن کر رہیں۔ ایسی حکومت خالقِ اکبر کے پیغام سے الہام پا کر لوگوں کی راہنمائی کرسکتی ہے نہ یہ کہ بے راہ خواہشوں اور گناہ آلود کاموں کے پیچھے چل پڑے۔

اس صورت میں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حکومت اسلامی میں عوامی رائے کا کوئی دخل نہیں اور یہ دراصل صالحین کی آمریت ہے۔

لیکن یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے، کیونکہ اس شوریٰ کہ جو توحیدی آئین میں حکومت کی ایک بنیاد کے طور پر ذکر ہوئی، قرآن نے اس کی تاکید فرمائی اور پیغمبرؐ اکرم کا عمل اس پر گواہ ہے کہ جو عقلِ کل کے مقام پر فائز تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ جو ''مالک الملک'' اور احکم الحاکمین'' ہے.....اس نے یہ حکم دیا کہ امور حکومت میں لوگوں سے مشورہ لیا جائے تا کہ وہ ان مین شریک وحصہ دار ہوں۔

اس نظر سے حکومت توحیدی واسلامی، عوامی مذہبی حکومت قرار پائے گی، یعنی اس میں لوگوں کی آراء اور خدا کے حکم کو اہمیت دی جاتی ہے لیکن یہ عوامی رائے اصول دین اور احکام الٰہی کے حدود اربعہ میں رہنی چاہیے.....اس قول کی شرح انشاء اللہ حکومت در اسلام'' کے مباحث میں آئے گی۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ مثلاً عام لوگ جب صدر جمہوریہ یا ارکان شوریٰ کے انتخاب میں ووٹ ڈالنے جائیں تو اس نکتے کی طرف متوجہ رہیں کہ خدا نے ان کو حق رائے دہی عطا فرمایا ہے۔یعنی وہ امانت دار الٰہی ہیں اور یہ ووٹ جو حکم وفیصلہ (حکومت) کی ایک قسم ہے اسے کسی ایسے شخص کے حق میں استعمال کریں، جس میں خدا کے پسندیدہ عادات وخصائل موجود ہوں ورنہ وہ امانت میں خیانت کے مرتکب قرار پائیں گے۔

سورۂ نساء کی آیت ۵۸ میں آیا ہے: خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان حکم وفیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے کام لو(ان اللہ یامرکم ان تودوا الامٰنٰت الی اھلھا واذا حکمتم بین النّاس ان تحکموا بالعدل)۔

روایات اسلامی میں آیا ہے کہ امانت کے اطلاقات میں سب سے اہم ''حکومت'' ہے تفسیر درمنثور میں بھی اس کی تاکید ہوئی ہے: لوگوں کے امام وحاکم پر لازم ہے کہ وہ خدا کے فرمان کے مطابق حکومت ان یودی الامانۃ)[1]

بنابریں ووٹ دینے والے لوگوں کو یہ کبھی نہ سوچنا چاہیے کہ کون سا صدر جمہوریہ اور کونسا رُکن شوریٰ ان کے ذاتی یا گروہی مفادات کی حفاظت کرے گا یا ان میں سے کون ان کے ساتھ دوستی یا رشتہ داری کا تعلق رکھتا ہے اور کون انہیں پسند یا ناپسند ہے۔ بلکہ وہ ہر موقع پر خدا و رضائے خدا اور انسانی ودینی اوصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا ووٹ استعمال کریں تا کہ حق امانت ادا ہو سکے۔

لیکن مادیت پرست جمہوری وعوامی حکومتوں میں ممکن ہے کہ ووٹ دینے والے لوگ ذاتی پسند وناپسند، گروہی تعصب، سیاسی وابستگی، ناجائز مالی فوائد اور خصوصی رابطے کو پیش نظر رکھ کر اپنا ووٹ استعمال کریں اور اس امانتِ الٰہی میں خیانت کے مرتکب ہوں، جب کہ اسلامی حکومت میں صرف رضائے الٰہی اور فلاحِ انسانی کے لیے ووٹ دیا جاتا ہے۔ع

بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

---

[1] تفسیر ورالمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۷۵۔

(۴) توحید حاکمیت پر ایمان رکھنے کے اخلاقی اثرات:

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ توحید حاکمیت پر ایمان یعنی زندگی کے ہر گوشے پر خدا کی حکومت کا اعتقاد اور یہ نظریہ کہ حکومت انسانوں کے ہاتھ میں خدا کی امانت ہے، اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لوگ حکومت کے اعلیٰ ودانیٰ عہدوں کیلئے انتخاب کرنے وقت اس بات کو مدِنظر رکھتے ہیں کہ حکومت خدا کی عطاء اور اس کی امانت ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ الٰہی ضابطے کے مقابلے میں کسی شخص سے اپنے ذاتی رابطے کا لحاظ کریں اور ایسا کوئی امکان نہیں کہ وہ معاشرے کے مفاد کو اپنے شخصی مفاد پر قربان کریں۔

جہاں تک حکمرانوں اور فرماں رواؤں کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑی مصیبت یہی خودغرض صاحبان حکومت ہیں جو طول تاریخ میں ہزاروں مرتبہ دنیا کے بڑے بڑے خطوں کو اور بعض اوقات پوری دنیا کو آتش جنگ وجدل کی طرف کھینچ لائے، اس طرح انہوں نے نوع انسان کے ایک بڑے حصے کو تنگی وسختی اور رنج والم کے اندھے کنوؤں میں دھکیل دیا۔

ہمارے ماضی قریب میں ہٹلر نے لاکھوں انسانوں کو موت کے منہ میں ڈال دیا، اسٹالن کے ہموطنوں نے اس کے بارے میں وحشت ناک اعداد وشمار شائع کیے ہیں، ان کے مطابق وہ تین کروڑ انسانوں کا قاتل پایا گیا اور اب بھی دنیا کے حالات ایسے ہی ہیں اگرچہ ان کی شکل کچھ بدلی ہوئی ہے۔ آج بھی اگر کوئی حکمران توحیدی نظریہ رکھتا ہو اور حکومت مطلقہ کو خدا کیلئے مخصوص سمجھے کہ جو اسے لوگوں کی آراء اور ان کی تائید سے خدا نے عطا کی ہے تو وہ کبھی مغرور، ظالم اور خودغرض نہیں بنے گا..... وہ حکومت پر فائز ہوتے ہوئے بھی امیر المومنین امام علی بن ابی طالبؑ کی طرح کہہ اُٹھے گا: اگر خدا نے علماء حق سے یہ عہد نہ لیا ہوتا کہ وہ ظالموں کی سیری اور مظلوموں کی گرسنگی پر خاموش نہ رہیں گے تو میں ناقہ خلافت کی مہار اس کے کندے پر ڈال دیتا (اور یہ حکومت کہ جس کیلئے دنیا پرستوں کے سینے چاک ہوئے جاتے ہیں میں اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا) [1]

ہاں! ایسا حاکم ہر حال میں حکومت کو امانت الٰہی اور خود کو اس کا امانت دار اور اس مالک اصل کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے۔

یہ نقطہ نظر اس دنیا میں حکومت کے طور طریقوں کو یکسر تبدیل کر سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ انسان اس نظریئے کو اپنے دل کی گہرائیوں میں بسالے اور یہ روح انسان پر اپنا رنگ چڑھادے۔ یہ بات صرف سربراہان حکومت کیلئے نہیں بلکہ حکومت کے تمام کارگزاروں..... گورنروں، جنرلوں، افسروں مجسٹریٹوں، ججوں اور ماتحت ملازمین۔ پر بھی صادق آتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اختیارات کو امانت الٰہی تصور کرتے ہوئے اس کی رضا وفرمان کے مطابق استعمال کرے۔ گزشتہ مباحث میں جو کچھ کہا گیا ہے مجموعی طور پر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت کی شکل نہ آمرانہ ہے۔ اور نہ مغربی جمہوریت سے مشابہ ہے بلکہ ایک عوامی حکومت ہے جو اصولِ دین کی حدود میں رہ کر کام کرتی ہے۔ وہ دراصل حکومت الٰہیہ کا رنگ رکھتی ہے اور اس کے بتائے ہوئے طریقے سے عوامی تائید حاصل کرتی ہے یہی اس کا وہ امتیازی پہلو ہے جو اسے دنیا کے دیگر طریق ہائے حکومت سے الگ قرار دیتا ہے۔ حکومتِ از نظر قرآن'' کے بارے میں بحث کے کئی گوشے ہیں، یہاں فقط ''اور'' سرچشمہ حکومت خدا ہے۔ کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے کے باقی مباحث انشاءاللہ کلی حکومت'' کے زیرعنوان پیش کیے جائیں گے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ۔ ۳

(۵) توحید اطاعت

اشارہ:

اقسام توحید کے ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ ایک موحد انسان صرف خدا کو واجب الاطاعت جانتا ہے اور اسی کی بندگی کا طوق اپنی گردن میں ڈالتا ہے وہ فخر کرتا ہے کہ میں خدا کا بندہ ہوں کہ آنکھ اور کان اس کے حکم کی طرف اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھتا ہوں۔

البتہ اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں۔ان کے معصوم جانشینوں اور پھر ان کی طرف سے مقرر کیے گئے نائبوں اور عاملوں کی اطاعت بھی خدا ہی کی فرمانبرداری شمار ہوتی ہے۔لہٰذا وہ موحد انسان ان کے حکم کو بھی بسر وچشم مانتا ہے۔وہ صرف ایک ہی چیز کے خیال میں رہتا ہے۔اور وہ محبوب حقیقی (خدائے واحد) کی رضا اور اس مالک اصلی کے احکام پر عمل بجالانا ہے۔

ایک مرد موحد کسی صورت میں بھی ''ناراضی خدا'' کے بدلے میں ''خوشنودی افراد'' اور ''معصیت خداوندی کے بدلے میں'' ''پیروی انسان'' کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کیونکہ وہاں سے شرک کی ایک قسم سمجھتا ہے۔

توحید کی یہ قسم کہ جو ''توحید اطاعت'' کہلاتی ہے۔اصل میں ''توحید حاکمیت'' سے قوت پاتی ہے۔جس کا ذکر گزشتہ بحث میں کیا گیا ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کے حضور پہنچتے اور آیاتِ ذیل کی صدا دل کے کانوں سے سنتے ہیں:۔

(۱) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ [۵:۹۲] (مائدہ)

(۲) قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ [۳:۳۲] (آل عمران)

(۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ [۴:۵۹] (نساء)

(۴) فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا [۶۴:۱۶] (تغابن)

(۵) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (آل عمران ۵۰، شعرا ۱۷۹، ۱۶۳، ۱۲۶، ۱۰۸، زخرف ۶۳)

(۶) اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ [۷:۳]

(اعراف)

(۷)وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝۳۶ [۳۳:۳۶] (احزاب)

(۸)يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ① [۴۹:۱] (حجرات)

(۹)اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳۱ [۹:۳۱] (توبہ)

(۱۰) اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۶۰ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۶۱ [۳۶:۶۱] (یٰس) [1]

ترجمہ:

(۱) خدااور پیغمبر کی اطاعت کرواور (نافرمانی سے) بچتے رہوپس اگرتم روگردانی کروگے۔(سزا کے مستحق ہوگے) تو جان لوکہ ہمارے پیغمبرؐ کا فریضہ بس صاف صاف بتادیناہے۔

(۲) (اے حبیب) کہو کہ خدااوراس کے رسولؐ کی اطاعت کروپس اگروہ سرپیچی کریں تو(جان رکھیں) خدا کافروں کودوست نہیں رکھتا۔

(۳) اے ایمان لانے والو! اطاعت کرواللہ کی، اطاعت کرواللہ کے رسول اور صاحبانِ امرکی اور جب کسی چیز میں نزاع ہوتو اسے خداورسولؐ کی طرف پلٹادواگرتم خدااور یومِ آخرت پرایمان رکھتے ہو۔

(۴) جہاں تک ہوسکےتقوائے الٰہی اختیارکرو۔اس کاحکم دھیان سےسنواوراطاعت کرو۔

---

[1] قرآن میں اس مضمون کی اوربھی بہت سی آیات موجودہیں۔مثلاً۔انفال۔۲۰۔۴۶۔نور۔۵۴،محمد۔۳۳۔مجادلہ۔۱۳۔نساء۔۱۶۔انعام۔۱۵یونس۔۱۵۔زمر۔۱۳

(۵) تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

(۶) خدا کی طرف سے نازل کیے گئے احکام کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے معبودوں کی پیروی نہ کرو۔

(۷) جو کوئی خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں گرفتار ہے۔

(۸) اے ایمان لانے والو! کسی امر میں خدا اور اس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھا کرو، تقوائے الٰہی اختیار کرو، یقیناً وہ سنتا جانتا ہے۔

(۹) ان لوگوں نے اپنے علماء صلحاء کو خدا کے مقابل معبود بنا رکھا ہے اور (اسی طرح) عیسیٰ بن مریمؑ کو بھی، حالانکہ انہیں حکم نہیں دیا گیا، مگر یہ کہ خدائے واحد کی عبادت کریں۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پاک و منزہ ہے وہ اس بات سے کہ یہ لوگ اس کے شریک ٹھہراتے ہیں۔

(۱۰) اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ بھی کہ تم میری ہی عبادت کرتے رہنا کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

مفردات کی تشریح:

''اطاعت'' اس کے معنی تابع ہونا اور حکم ماننا ہیں، یہ وہ معنی ہیں کہ بہت سے ماہرین لغت نے ان کی تصریح کی ہے، پھر اسے حکم و فرمان کی پیروی کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا۔

بعض اہل لغت نے ''اطاعت'' اور ''مطاوعت'' میں فرق کیا ہے، یعنی اطاعت کے معنی تابع ہونا اور حکم کی پیروی کرنا بتائے ہیں جب کہ مطاوعت کے معنی موافقت و ہم آہنگی قرار دیئے ہیں، اسی لیے کتاب ''العین'' کے مولف خلیل بن احمد نے لکھا ہے کہ حاکم کی نسبت سے رعایا کے لیے لفظ ''اطاعت'' بولا جاتا ہے۔ اور شوہر کی نسبت سے زوجہ کے لیے ''طواعیت'' یا مطاوعت'' کا استعمال کیا جاتا ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

خداوند! ہم صرف تیرے فرمان کے مطیع ہیں:

(۱) پہلی آیت میں اگرچہ شراب، جوا، انصاب (بتوں کی ایک قسم) اور ازلام (قسمت آزمائی کے ایک کھیل) کو حرام قرار دینے کے بعد خدا اور رسُول کی اطاعت کا حکم آیا ہے۔ لیکن بن کہے ظاہر ہے کہ یہ ایک عمومی فرمان ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ خدا اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور (نافرمانی سے) بچتے رہو۔ (واطیعو اللہ واطیعو الرسول واحذروا)۔

پھر اس بات کی تاکید کے طور پر فرمایا: پس اگر تم روگردانی کرو گے (سزا کے مستحق ہو گے) تو جان لو کہ ہمارے پیغمبرؐ کا فریضہ بس صاف صاف بتا دینا ہے۔ (فان تولیتم فاعلموا انما علی رسولنا البلاغ المبین[1])

یہ سامنے کی بات ہے کہ اطاعت رسول خدا کی اطاعت کا ایک جزاور عکس ہے اور ایک طرح سے وہ بھی بعینہٖ اطاعتِ خدا ہی ہے، کیونکہ حضور اکرمؐ خدا کے قول وحکم کے علاوہ کچھ اور بیان نہیں فرماتے، یہ جو ''اطیعوا'' کا لفظ دوبارہ آیا ہے تو اس سے یہی مراد ہے کہ خدا کی اطاعت ذاتی واصلی ہے اور دوسری اطاعت فرعی وظاہری ہے۔

(۲) دوسری آیت میں یہ مضمون پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے (اے حبیب) کہو کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، پس اگر وہ سرپیچی کریں تو (جان رکھیں) خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا (قل اطیعو اللہ والرسول فان تولو فان اللہ لایحب الکافرین)۔

ذیل آیت سے واضح ہوتا ہے کہ خدا کے حکم سے سرتابی کفر ہے۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جب خدا اور رسولؐ کے فرمان کی نسبت عناد ودشمنی رکھنے کے باعث ان کے حکم سے سرتابی کی جارہی ہو۔ یا یہ کہ ہم کفر کو وسیع معنی میں لیں اور ہر قسم کی نافرمانی اور گناہ اس میں شامل سمجھا جائے بہرحال یہ آیت خدا ورسولؐ کی اطاعت کے وجوب پر ایک تاکید ہے یعنی یہ کتاب وسنت کی پیروی کو لازم قرار دیتی ہے۔

اگرچہ اس آیت میں پیغمبر اکرم کا بلاواسطہ اللہ سے عطف ہوا ہے۔ لیکن اس سے پہلی آیت میں جو کہا گیا (اے نبی) کہو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو (قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی) اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اطاعت رسولؐ

---

[1] اس آیت میں جزائے شرط محذوف ہے اور ترتیب کے لحاظ سے صورت یہ ہے ''قامت الحجۃ علیکم یا استحققتم العاب، یا ''لم تضروا بتولیکم الرسول، (تفسیر مجمع البیان تفسیر فخر رازی تفسیر روح المعانی۔ تفسیر مراغی میں آیت زیر بحث کے ذیل میں دیکھیں۔

خدا کی اطاعت ہی کی ایک شاخ ہے۔

یہ آیت بخوبی واضح کرتی ہے کہ خدا اور رسولؐ کے ساتھ سچی اور کھری محبت کی علامت یہ ہے کہ دل وجان سے ان کی اطاعت اور پیروی کی جائے ورنہ ان سے محبت کا دعویٰ ایک جھوٹ ہے یا محبت ہے تو سہی مگر بڑی کمزور ہے۔

(۳) تیسری آیت اطاعت خدا اور رسولؐ کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کو ضروری قرار دیتی اور یہ فرمان سناتی ہے: اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو خدا کی اطاعت کرو رُسولؐ اور صاحبانِ امر کی اور جب کسی چیز میں نزاع ہو تو اسے خدا اور رسولؐ کی طرف پلٹا دو، اگر تم خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو (یایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعو الرسول وأُولي الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الیٰ اللہ وارسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الأٰخرِ)۔

یہ الفاظ وعبارت بھی بڑی وضاحت سے بتا رہے ہیں کہ اطاعت خدا کے مخصوص ہے، پھر پیغمبرؐ اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم کہ ہر نزع واختلاف کے حل کی خاطر ان کی طرف ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ اگر انسان کا طرزِ عمل اس کے مطابق نہیں تو پھر خدا و قیامت پر اس کے ایمان میں تزلزل اور ڈگمگاہٹ در آتی ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں صرف اطاعت خدا کا ذکر ہے جیسا کہ فرماتا ہے: جہاں تک ہو سکے تقوائے الٰہی اختیار کرو، اس کا حکم دھیان سے سنو اور اطاعت کرو (فاتقوا اللہ ما استطعتم و اسمعوا واطیعوا)۔

سب سے پہلے تقویٰ اور گناہ سے پرہیز کا حکم دیتا ہے کیونکہ کسی چیز کو پاک وصاف کرنا اسے سجانے بنانے سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ اس لیے تقویٰ کے فرمان کے بعد حکم خدا کو سننے کو ہدایت کی ہے کہ سننا اطاعت کرنے پر مقدم ہے اور پھر شرط اطاعت و پیروی کرنے کا امر و حکم دیا ہے..... یہی وہ اطاعت ہے جو خدا کے لیے مخصوص ہے۔

یہ جو بعض نے گمان کیا ہے۔ فاتقو اللہ ما استطعتم جہاں تک ہو سکے تقوائے الٰہی اختیار کرو کہ جو تقویٰ کا حق ہے۔ لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے کیونکہ یہ دونوں جملے ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں وہ اس طرح کے حق تقویٰ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ انسان سے جہاں تک ہو سکے پرہیز گاری اختیار کیے رہے۔

(۵) پانچویں آیت جو قرآن میں بہت سے پیغمبروں کی زبان سے آئی ہے۔ یہ پہلے تقویٰ کا حکم دیتی اور پھر پیغمبروں کی اطاعت کرنے کی تاکید کرتے ہوئے کہتی ہے: تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری (پیغمبر کی) اطاعت کرو (فاتقو اللہ واطیعونِ
(

یہ جملہ جیسا کہ ہے.....حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ اور حضرت مسیحؑ کی زبانی قرآن میں نقل ہوا ہے (ایک بار بہ زبانِ نوحؑ: سورہ شعراء ۱۰۸ دوبار بزبانِ ہودؑ شعراء ۱۲۶، ۱۳۱، دوبار بزبان صالحؑ: شعراء ۱۴۴، ۱۵۰ ایک بار بزبان لوط: شعراء ۱۶۳، ایک بار بہ زبان شعیبؑ: شعراء ۱۷۹ اور دوبار بہ زبان مسیحؑ: آل عمران۔ ۵۰، زخرف۔ ۶۳)۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ درجہ اوّل میں یہ اطاعت ایمان بالتوحید اور ترک بت پرستی سے متعلق ہے اور دوسرے مرحلے میں تمام دینی احکام کی اطاعت ہے جو انبیاء سے ملتے ہیں۔ یہ اصل میں فرمانِ خدا کی اطاعت ہے کیونکہ وہ اس کے قول وحکم کے بغیر کچھ نہ کہتے تھے۔

(۶) چھٹی آیت میں احکام الٰہی کی پیروی کا ذکر ہوا ہے جو اطاعت ہی کا دوسرا نام ہے، اس میں اس بات کا اضافہ ہے کہ یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ خدا کے سوا کسی کی اطاعت و پیروی نہ کرو۔ یہ نفی واثبات ''توحیدِ اطاعت'' کا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: خدا کی طرف سے نازل کیے گئے احکام کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے معبودوں کی پیروی نہ کرو (اتبعو ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعو من دونہٖ اولیآءَ)

یہ آیت خدا کے علاوہ لوگوں کے خودساختہ معبودوں کی اطاعت پر خط بطلان کھینچتی ہے، جو کوئی بھی ہے اور جہاں بھی ہے وہ ان کی اطاعت کو چھوڑ کر خدائے واحد کی اطاعت اختیار کرے۔

یہ آیت اور ایسی ہی دیگر آیات کھلی ہوئی گواہی دیتی ہیں کہ انسانوں کے احکام وآراء جیسی کچھ بھی ہوں پیروی کے لائق نہیں ہیں (کیونکہ وہ خطاء وغلطی سے پر ہیں، جب کہ ہم خدا کے علاوہ غیروں کی اطاعت کے لازم ہونے کی کوئی دلیل بھی نہیں پاتے)۔

(۷) ساتویں آیت میں اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ کسی باایمان مرد وزن کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے حکم کے سامنے اپنا کچھ بھی اختیار رکھتے ہوں۔ جیسا کہ فرمایا: جو کوئی خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں گرفتار ہے۔ (ومن یعصِ اللہ ورسولہٗ فقد ضل ضللاً مبیناً)۔

آیت کا شروع وآخر ''توحید اطاعت'' کو بیان کرتا ہے، اسے ایمان کی علامت شمار کرتا اور اس کی مخالفت کو ضلال مبین (کھلی گمراہی) کہتا ہے، اس سے بڑی گمراہی اور کیا ہوگی کہ انسان خداوند عالم کو جو رحمان ورحیم ہے چھوڑ دے اور اس کے غیروں کے پیچھے ہوئے؟

(۸) آٹھویں آیت میں مومنین سے خطاب ہے اور اس کے لیے کئی ایک شان ہائے نزول ذکر ہوئی ہیں تاہم وہ سبھی گواہی دیتی ہیں کہ کبھی کبھار بعض مسلمان خدا اور رسولؐ سے سبقت کرتے اور کہتے تھے: اگر فلاں حکم اس طرح نازل ہوتا تو بہتر

تھا.....اس پر یہ آیت اُتری اور اس میں ان لوگوں کو خبردار کیا گیا: اے ایمان لانے والو! کسی امر میں خدا اور اس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھا کرو، تقوائے الٰہی اختیار کرو۔ یقیناً وہ سنتا جانتا ہے.....حتیٰ کہ تمہارے خفیہ باتوں کو سنتا اور تمہارے سینہ میں چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے.....(یایھا الذین اٰمنو لاتقدموبین یدیِ اله ورسولہٖ واتقوا اللہ اِن اللہ سمیعٌ علیمٌ)

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خدا مکان نہیں رکھتا تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے آگے نہ بڑھا کرو دراصل یہ اس سے کنایہ ہے کہ کسی بات اور کسی کام کے بارے میں اس پر سبقت نہ کرو[1]

بہرحال یہ آیت نہ صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو لازم کرتی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ ہر کام میں ہمیشہ اس کے فرمان کا انتظار کیا کرو، پھر جب حکم دے دیا جائے تو نہ تندی (تیز روی) کرو، اور نہ کندی (سست روی) کرو کیونکہ ان دونوں طرح کے لوگ غلط فہمی میں ہیں۔

تفسیر مراغی میں عربی ادبیات کے بعض ماہرین کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ''لاتقدمِ بین یدیِ الامامِ کا مفہوم یہ ہے کہ کاموں کی انجام دہی میں امام سے پہل نہ کرو۔

عالموں اور رہبروں کی پرستش نہ کرو:

(۹) نویں آیت میں یہود و نصاریٰ کی مذمت ہوئی ہے کہ کیوں وہ اپنے علماء و صلحا کو خدا کے مقابل اپنے معبود قرار دیتے ہیں، چنانچہ فرماتا ہے: ان لوگوں نے اپنے علماء و صلحاء کو خدا کے مقابل معبود بنا رکھا ہے۔

(اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دونِ اللہ)[2]۔

---

[1] یہاں ''لاتقدمو'' کے بمعنیٰ ''لاتقدموا'' ہونے میں مفسروں کے درمیان بحث گفتگو ہے (پہلا جملہ باب تفعل سے اور دوسرا باب تفعل سے ہے) لیکن جملہ ''بین یدی اللہ ورسولہ'' کا مفہوم پہلی صورت میں: خدا اور رسولؐ پر سبقت نہ کرنا ہے۔ دوسری صورت میں اس کا مفہوم: کسی چیز کو خدا اور رسولؐ کے احکام سے مقدم نہ سمجھنا ہے، ان میں معنی اول زیادہ مناسب ہیں۔

[2] ''احبار'' جمع ''حَبر'' بروزن ''ابر'' ہے یا ''حِبر'' بروزن ''فکر'' اچھے اثر کے معنی میں ہے۔ بعد میں اسے عالم و دانش مند کے لیے استعمال کیا گیا، جیسے ابن عباس کو ''حَبر الامۃ'' کا لقب دیا گیا ہے ''رہبان'' جمع ہے ''راہب'' کی بعض نے کہا ہے کہ یہ واحد و جمع ہر دو کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں ''خدا ترس شخص'' اور یہ عیسائیوں میں ایک گروہ ہے، کاروبار اور ازواج کو ترک کر کے خانقاہوں میں عبادت کیا کرتے ہیں۔ (المفرداتِ راغب وغیرہ)۔

اس طرح انہوں نے حضرت مسیح ابن مریمؑ کو بھی ایک معبود کا درجہ دے رکھا ہے (والمسح ابن مریم)
حالانکہ انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ خدائے واحد کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پاک ومنزہ ہے۔ وہ اس بات سے جو یہ لوگ اس کے شریک ٹھیراتے ہیں۔ (وما امروا الا لیعبدوا الھا واحدا لا الہ الا ھو سبحنہٗ عما یشرکون

یہ مانا کہ یہود ونصاریٰ اپنے علماء وصلحاء کے بارے میں الوہیت کا اعتقاد نہیں رکھتے، وہ ان کی عبادت اس طرح ہرگز نہیں کرتے، جیسے ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں، پھر کیوں قرآن نے ان کے متعلق ''رب'' اور ''الٰہ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں؟

اس کا جواب امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک روایت میں آیا ہے کہ فرمایا: اما واللہ ما صاموا لھم ولا صلوا لکنھم احلوا لھم حراماً وحرموا علیھم حلالاً فاتبعوھم وعبدوھم من حیث لا یشعرون۔ [1] قسم بخدا کہ وہ اپنے پیشواؤں کے لیے نہ روزہ رکھتے اور نہ نماز پڑھتے، بلکہ وہ پیشوا ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا دیتے تو وہ اس پر عمل کرتے..... اس طرح وہ انجانے میں ان کی پرستش کرتے تھے۔

یہ حدیث مختلف طرق سے شیعہ وسنی کتب حدیث میں آئی ہے، ہم ان میں سے بعض کتابوں میں اسے یوں پاتے ہیں: عدی بن حاتم (مشہور حاتم طائی کے فرزند) حضرت رسولؐ کی خدمت میں آئے، جبکہ ان کی گردن میں سنہری صلیب لٹک رہی تھی، حضورؐ نے فرمایا، اس بت کو اپنے گلے سے اُتار پھینکو! عدی کہتے ہیں..... میں نے سنا کہ نبی اکرمؐ آیت: اتخذوا احبارھم ..... کی تلاوت کر رہے تھے میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ لوگ ہرگز اپنے علماء پرستش نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا: آیا ایسا نہیں کہ ان کے علماء حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتے ہیں۔ اور وہ لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: ہاں ایسا ہی ہے! آپ نے فرمایا: یہی پرستش ہے جو وہ لوگ کر رہے ہیں [2]

اس طرح واضح ہو رہا ہے کہ جو لوگ حکمِ خدا کے خلاف فرمان دیتے ہیں ان کی اطاعت وپیروی بھی شرک کی ایک قسم ہے۔

(۱۰) دسویں اور آخری آیت میں تمام انسانوں (بنی آدم) کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

(الم اعھد الیکم یٰبنی ادم ان لا تعبدو الشیطٰن انہ لکم عدو مبینٌ)۔

اور یہ بھی کہ تم میری ہی عبادت کرتے رہنا کہ یہی سیدھا راستہ ہے (وان اعبدونی ھذا صراطٌ مستقیم)۔

مان لیا کہ کوئی شخص (رکوع وسجود اور نماز اور روزہ کی شکل میں) شیطان کی پرستش نہیں کرتا، پھر یہ کونسی عبادت ہے کہ جس سے نہی ہو رہی ہے؟ کیا یہ اطاعت کے علاوہ کوئی چیز ہو سکتی ہے۔

ہاں! وہ لوگ جو شیطان کے مطالبوں کو مان لیتے اور اس کے حکم کو حکم خدا پر مقدم شمار کرتے ہیں، وہ مشرک اور شیطان پرست ہیں یہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۵ ص ۲۳، تفسیر برہان جلد ۳ ص ۱۲۰

[2] تفسیر رُوح المعانی جلد ۱۰ صفحہ ۷۵، یہی مطلب دیگر تفاسیر میں بھی آیا ہے، اور کچھ تفاوت کے ساتھ تفسیر دار المنثور میں بھی منقول ہے۔

رکوع وسجود میں شرک نہیں، حکم ماننے میں شرک ہے۔

جس عہد و پیمان کا حوالہ دیا جارہا ہے، خدا نے فرزندانِ آدم سے وہ عہد کہاں اور کیسے لیا؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ عہد ''عالمِ ذر'' میں لیا گیا اور بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ وعظ ونصیحت ہے جو پیغمبرانِ الٰہی اپنی اپنی قوموں کو کرتے رہیں۔ لیکن ظاہراً یہ آیت اس عہد کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہبوط آدم کے وقت بنی آدم سے لیا گیا اور وہ سورۂ اعراف۔ آیت ۲۷ میں مذکور ہے۔ فرماتا ہے۔ اے فرزندانِ آدم شیطان تمہیں دھوکہ نہ دے جائے۔ جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ (آدمؑ وحوا) کو جنت سے نکال دیا تھا۔ (یبنی آدم لایفتننکم الشیطن کما اخرج ابویکم من الجنة)۔

اسی طرح سورۂ اعراف ہی کی آیت ۲۲ میں حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے شیطان تم دونوں (میاں بیوی کا) کھلا ہوا دشمن ہے (ان الشیطین لکما عدوٌ مبینٌ)۔

پھر سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۷ میں حضرت آدمؑ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے ہم نے کہا اے آدم! یہ شیطان تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے۔ (فقلنا یادم ان ھذا عدو لك ولزوجك)۔

ظاہر ہے کہ ایسا دشمن آدم وحوا کی اولاد کا بھی دشمن ہوگا، کیونکہ اس کی عداوت صرف آدمؑ سے نہیں، بلکہ وہ ان کے تمام فرزندان اور ان کی پوری نسل سے عدوات رکھتا تھا، لہٰذا اس نے شروع ہی میں قسم کھائی: میں تھوڑے سے مخلص بندوں کے سوا تمام فرزندانِ آدم کو گمراہ کروں گا۔ (اسراء۔ ۶۲، ص۔ ۸۲)۔

توضیحات

(۱) مطاعِ مطلق صرف خدا ہے

مذکورہ بالا آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام اور قرآن کی نظر میں ''واجب الاطاعت'' فقط خدا ہے اور جن لوگوں کی اطاعت خدا ہی کی اطاعت ہے وہ بھی اسی میں شامل ہیں لیکن فرمانِ خدا کے مقابلے میں کسی کی اطاعت وپیروی قرآن کی نظر میں ایک قسم کا شرک اور بت پرستی ہے۔

لہٰذا اگر پیغمبر وامام یا ماں باپ کی اطاعت لازم ہے تو اس لیے کہ یہ فرمانِ خدا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اس لیے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے (وما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن اللہ (انساء۔ ۶۴)۔

اس مسئلے کو دلیل عقل سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کیونکہ مطاع مطلق صرف وہی ہے جو ہر چیز سے آگاہ حکیم وخبیر، ہر طرح کی خطاء سے پاک اور رحمن ورحیم ہے، یہ صفات صرف ذات خداوندی میں جمع ہیں۔ اگر حکمرانوں، دوستوں فرزندوں، رشتہ داروں حتیٰ کہ اپنے دل کی چاہت خدا کی رضا کے مطابق نہ ہو تو اس کی پیروی طریق دراہِ شرک ہے۔

ایک توحید پرست انسان کہتا ہے: اگر میں سوئی کے ناکے برابر بھی خدا کی اطاعت سے ہٹوں تو میں مشرک ہوں۔ کیونکہ میں نے اس کی اطاعت میں کسی اور کو شریک کیا ہے۔

(۲) توحید اطاعت اور احادیث:

مختلف حدیثوں میں بھی اس مسئلے پر تاکید ہوئی ہے کہ شرک کی ایک قسم شرک در اطاعت ہے کتبِ حدیث میں جو روایات آئی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

الف:.....حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں ہے:

لاطاعة فی معصية الله، انما الطاعة فی المعروفِ۔

''خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، اطاعت صرف معروف میں جائز ہے [۱]

ب:.....نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ کا فرمان ہے۔

"لاطاعة المخلوقٍ فی معصية الخالقِ"

''حکم خدا کی مخالفت میں کسی شخص کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ [۲]

ج:.....امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

"من اطاع رجلاً فی معصيةٍ فقدْ عبدهٗ۔

''جس نے حکم الٰہی کے خلاف کسی شخص کی اطاعت کی گویا اس کی عبادت کی ہے۔

د:.....ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام اور اسی طرح امام محمد تقی علیہ السلام سے بھی منقول ہے۔

"من اصغیٰ الیٰ ناطقٍ فقد عبدهٗ۔ فانْ کان الناطق یؤدی عن الله فقد عبد الله، وان کان الناطقُ یودی عن الشیطانِ فقد عبدالشیطان۔"

''جس نے کسی کہنے والے کی آواز پر کان دھرا تو اس کی عبادت کی ہے، اگر کہنے والے نے حکم خدا بتایا تو اس نے خدا کی عبادت کی اور اگر کہنے والے نے شیطان کا حکم سنایا تو اس نے شیطان کی

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۱۴۶۹۔

[۲] نہج البلاغہ ''کلماتِ قصار'' کلمہ ۱۶۵۔

عبادت کی ہے۔''

ھ:.....ہم اس بیان کو امیر المومنین علیہ السلام کی ایک اور حدیث کے ساتھ اختتام کو پہنچاتے ہیں آپؑ نے فرمایا:۔

لادین لمن دان بطاعة المخلوقِ فی معصیة الخالق"

''جو کوئی خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر واضح ہوتا اور توحیدِ عبادت میں اسلامی معیارات معلوم ہوجاتے ہیں۔

o.....خداوند! راہِ توحید پر چلنا بڑا مشکل اور پیچیدہ عمل ہے، تو اس پر پیچ راستے میں ہماری رہنمائی فرما!

o.....بارِالٰہا! مختلف چیزیں چاروں طرف سے ہمیں اپنی اطاعت کی طرف بلاتی ہے.....ہوا و ہوس ہمارے اندر سے اور شیاطین جن وانس باہر سے.....ہم چاہتے ہیں کہ صرف تیرے ہی حکم کے مطیع رہیں، تو اس راہ میں ہماری مدد و نصرت فرما!

ناصر مکارمِ شیرازی

ختم شد جلد سوم تفسیر پیام قرآن۔

تاریخ آغاز: ۱۸ر ذی القعدہ، ۱۴۰۸ھ۔

تفسیر موضوعی

جلد چہارم

زیر نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

علامہ حافظ سید ریاض حسین نجفی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔

فہرست

تفسیر موضوعی: پیامِ قران جلدنمبر 4

عنوان	صفحہ نمبر
پیش گفتار	12
تفسیر موضوعی کیا ہے؟	12
خدا کی صفات جمال وجلال کی معرفت	16
راہ پرفراز و پرنشیب	17
مفردات کی تشریح	18
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	19
کوئی چیز اس کی مثل نہیں	19
نتیجہ بحث	24
توضیحات	25
(۱) نہ تشبیہ نہ تعطیل	25
(۲) عقل اس کی کنہہ ذات وصفات تک کیوں نہیں پہنچتی؟	26
(۳) روایات اسلامی میں تشبیہ کی نفی	27
(۴) کیا اسماء خدا توقیفی ہیں؟	29
اسمائے حسنیٰ اور اسم اعظم	33
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	34
خدا کے مخصوص نام	34
توضیحات	35
(۱) اسمائے حسنیٰ کی حقیقت کیا ہے؟	35
(۲) اسمائے حسنیٰ کی تعداد اور ان کی تفسیر	36
اسم اعظم الٰہی کون سا ہے؟	43
صفات خدا کی تقسیم	45
صفاتِ جمال	45
خداوند عالم کا غیر محدود علم	47
مفردات کی تشریح	50
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	51
خداوند متعال تمام چیزوں سے آگاہ ہے	51
خدا تمہاری نیتوں کو جانتا ہے	51
خدا ہر مخفی وظاہر سے باخبر ہے	52
غیب کے خزانے اسی کے پاس ہیں	53
خدا عالم الغیب ہے	54
وہ ہر جگہ حاضر ہے	55
وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے	56
تمام چیزوں کا خالق ہی تمام چیزوں سے آگاہ ہے	58
اگر تمام درخت قلم بن جائیں	59
(۱۰) پانچ اسرار اسی کے پاس ہیں	60
دوسوالوں کا جواب	62
سوال اول:	62
جواب	62

عنوان	صفحہ نمبر
دوسرا سوال	62
جواب	63
ہر شے کتاب مبین میں ہے	63
میں تم سے زیادہ تمہارے قریب ہوں	64
توضیحات	66
(۱) عرفان وتربیت میں علم خدا کی تاثیر	66
(۲) علم خدا کے دلائل	67
الف۔ برہانِ خلقت ونظم	67
ب۔ برہانِ امکان ووجوب	67
ج۔ برہانِ عدم تناہی	67
(۳) خدا کا علم حضوری ہے	68
(۴) علم خدا کا غیر متناہی ہونا	68
ان کی محدودیت کی دلیل امور ذیل ہیں:	69
(۵) علم خدا کے بارے میں اہم سوالات	69
(۶) علم خدا اسلامی روایات میں	72
علم کی شاخیں خدا سمیع وبصیر ہے	76
مفردات کی تشریح	78
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	79
وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے	79
وہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے	79
وہ سننے والا اور جاننے والا ہے	80
تمہاری جنگو جہاد اس کے حضور میں ہے	81
وہ تمہارے نزدیک ہے	82
وہ تمہاری دعائیں سنتا ہے	82
وہ بصیر ہے	83
وہ بندوں کے حال سے باخبر ہے	83
وہ ان کی مشکلات کو جانتا ہے	84
بلندی میں صف بستہ پرندے	85
نتیجہ بحث	86
توضیحات	86
(۱) خدا کے سمیع وبصیر ہونے کا مفہوم	86
(۲) سمیع وبصیر۔ اسلامی روایات اور نہج البلاغہ میں	87
(۳) خدا کے سمع وبصر پر ایمان کا تربیتی اثر	88
(۴) خدا مدرک ہے	90
علم کی ایک اور شاخ خدا حکیم ہے	92
مفردات کی تشریح	93
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	93
اس کی قدرت حکمت کے ساتھ ملی ہوئی ہے	93
اس کے تمام افعال حکمت سے ملے ہوئے ہیں	95
وہ حکیم وخبیر ہے	95
وہ حکیم ہے کہ اس نے توبہ کا راستہ دکھایا	96
وہ حکیم وحمید ہے	97
وہ برتر وحکیم ہے	97
جدائی کا دستور بھی مطابق حکمت ہے	97
نتیجہ بحث	98
توضیحات	98
۱۔ حکمت خدا کی دلیل	98
۲۔ معرفت حکمت خدا کے تربیتی آثار	99

عنوان	صفحہ نمبر
علم کی ایک اور شاخ خدا کا ارادہ ومشیت	101
مفردات کی تشریح	102
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	103
اس کا ارادہ تمام اشیا میں نافذ ہے	103
ارادۂ خدا کے سامنے کوئی طاقت رکاوٹ نہیں بن سکتی	104
اس نے کمزوروں کی نصرت کا ارادہ کیا ہے	105
اس نے ارادہ کیا ہے کہ تمہاری مشکلیں آسان کردے	105
وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے	106
ہر کام میں انشاءاللہ کہو	107
آسمانی وحی اسی کی مشیت ہے	107
توضیحات	108
(۱) ارادۂ خداوندی کے عقلی دلائل	108
(۲) ارادۂ خدا کی حقیقت کیا ہے؟	109
خلاصۂ کلام	109
(۳) ارادۂ تکوینی وتشریعی	109
(۴) ارادۂ خدا۔ روایات اسلامی میں	110
خدا کی بے انتہا قدرت	112
مفردات کی تشریح	114
آیات کی جمع آوری وتفسیر	115
وہ ہر کام پر قادر ہے	115
خلقت جہان کا ہدف قدرتِ الٰہی کی معرفت ہے	116
موت وحیات اسی کے ہاتھ میں ہے	117
تصوراتِ حیات اس کی قدرت کی دلیل ہیں	117
حکومت وقدرت	118
معاد پر اس کی قدرت	118
پھر مردہ کو زندہ کرنے کی قدرت کا تذکرہ	119
تغیرات اقوام پر خدا کا اختیار	119
وہ کسی چیز کے سامنے عاجز نہیں	120
وہ بخشنے والا قادر ہے	120
نتیجہ بحث	121
توضیحات	121
(۱) خدا کی قدرت لامتناہی کے دلائل	121
(۲) برہان وجوب وامکان (برہانِ فلسفی)	122
(۳) برہان وسعت وجودی (برہانِ فلسفی)	123
(۴) خدا قادر ومختار ہے	123
(۵) قدرتِ خدا کی عمومیت کے مخالفین	124
(۱) مذہب مجوس کے پیروکار	124
(۲) مکتب تفویض کے پیروکار	125
خلاصہ کلام	127
خدا کا ازلی وابدی ہونا	130
آیات کی جمع آوری وتفسیر	131
توضیحات	134
(۱) فلسفہ کی رو سے خدا کی ازلیت وابدیت	134
(۲) روایات اسلامی میں اس کا ازلی وابدی ہونا	135
(۳) ایک سوال کا جواب	136
خدا حی وقیوم ہے	138
مفردات کی تشریح	139
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	140

عنوان	صفحہ نمبر
ہم تجھ سے قائم ہیں کیونکہ تو قائم بالذات ہے	140
توضیحات	141
(۱) حقیقت حیات	141
(۲) اس کی حیات کے دلائل	142
خدا کی صفاتِ جلال ''صفات سلبیہ''	145
مفردات کی تشریح	146
آیات کی جمع آوری وتفسیر	147
سب اسی کی تسبیح پڑھتے ہیں	147
توضیحات	149
سب سے بڑا گناہ تشبیہ ہے	149
۱، ۲۔ رویت اور جسمیت کی نفی	152
آیات کی جمع آوری وتفسیر	154
اس آنکھ میں اس کے تماشائے جمال کی طاقت نہیں	154
اے موسیٰ ہمیں اپنا خدا دکھلا	156
ضروری ہے کہ ہم خدا کو دیکھیں	159
نتیجہ	159
توضیحات	160
(۱) رویت خدا کیوں محال ہے؟	160
(۲) طرف دارانِ رویت کی دلیل	160
(۳) نفی رویت خدا کے بارے میں عمدہ روایات	162
(۴) ظاہری رویت کے طرفداروں کے دلائل	165
(۵) خدا کا جسم نہیں	173
۳۔ وہ لامکاں ہے مگر ہر جگہ موجود ہے	176
آیات کی جمع آوری وتفسیر	177
جس طرف دیکھوں اسی کو دیکھتا ہوں	177
وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے	179
میں خود تم سے بھی زیادہ تمہارے نزدیک ہوں	181
نتیجہ	183
توضیحات	183
(۱) وہ زمان ومکان سے بالاتر ہے	183
(۲) خدا کسی چیز میں حلول نہیں کرتا	184
(۳) خدا کے ہر جگہ حضور کا مفہوم	184
(۴) دعا کے وقت ہم کیوں آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرتے ہیں	186
(۵) احادیث اسلامی اور خدا کا لامکان ہونا	188
(۶) مخالفین کی دلیلیں	191
وضاحت	192
(۷) صوفیہ اور حلول واتحاد کا مسئلہ	195
صفات فعل	198
صفات ذات	198
صفات فعل	198
(۱) خالق (۲) خلاق (۳) احسن الخالقین	199
وضاحت اور پیام	200
(۴) فاطر (۵) باری (۶) فالق (۷) بدیع (۸) مصور	201
وضاحت و پیام	201
(۹) مالک (۱۰) ملک (۱۱) حاکم (۱۲) حکیم (۱۳) رب	204
وضاحت و پیام	205

عنوان	صفحہ نمبر
(۱۴) ولی (۱۵) والی (۱۶) مولی (۱۷) حافظ	
(۱۸) حفیظ (۱۹) رقیب (۲۰) مھیمن	207
وضاحت و پیام	208
(۲۱) رازق (۲۲) رزاق (۲۳) کریم (۲۴)	
حمید (۲۵) فتاح	212
وضاحت و پیام	212
(۲۶) رحمن (۲۷) رحیم (۲۸) ارحم الرحمین (۲۹)	
ودود (۳۰) روف (۳۱) لطیف (۳۲) حفی	217
وضاحت و پیام	218
احادیث اسلامی میں خدا کی رحمت واسعہ کا ذکر	219
(۳۳) غافر (۳۴) غفور (۳۵) غفار (۳۶)	
عفو (۳۷) ثواب (۳۸) جبار	224
وضاحت و پیام	225
(۳۹) شکور (۴۰) شاکر (۴۱) شفیع (۴۲)	
وکیل (۴۳) کافی	229
وضاحت و پیام	230
(۴۴) حسیب (۴۵) شریع الحساب (۴۶) اسرع	
الحاسبین (۴۷) سریع العقاب (۴۸) شدید العقاب	235
وضاحت و پیام	236
(۴۹) نصیر (۵۰) نعم النصیر (۵۱) خیر الناصرین	239
وضاحت اور پیام	240
(۵۲) قاھر (۵۳) قھار (۵۴) غالب	241
وضاحت اور پیام	242
(۵۵) سلام (۵۶) مومن	243

عنوان	صفحہ نمبر
وضاحت اور قیام	243
وصف سلام کا پیغام	244
(۵۷) محی	246
وضاحت اور پیام	246
(۵۸) شھید	248
وضاحت اور پیام	248
(۵۹) ھادی	249
وضاحت و پیام	250
(۶۰) خیر	251
وضاحت و پیام	252
ہاں وہ بہترین ہے	258
توضیحات	259
(۱) یہ جہان اس کی صفات کا مظہر ہے	259
(۲) صفات فعل کے زمرہ میں آنے والی دیگر صفات	260
ا۔ خدا متکلم ہے	261
الف: خدا متکلم ہے	261
توضیحات	261
(۱) کلام اللہ سے مراد کیا ہے؟	261
(۲) آخری نتیجہ کا حصول	262
(۳) صفت تکلم اور اسلامی روایات	264
خدا صادق ہے	265
مفردات کی تشریح	266
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	267
توضیحات	269

عنوان	صفحہ نمبر
صدق خداوندی کے دلائل	269
صفات خدا کے بارے میں آخری بات	270
عدلِ الٰہی	271
مفردات کی تشریح	273
آیات کی جمع آوری اور تفسیر	274
خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا	274
خدا ''ظلام'' نہیں ہے	282
خوب و بد کی برابری کیونکر ممکن ہے؟	283
نتیجہ	284
توضیحات	284
(۱) مسئلہ عدل کی تاریخ	284
(۲) مسئلہ عدل پر عقلی دلائل	286
(۳) دو اہم یاد دہانیاں (۲) افعال انسانی تین قسم کے ہیں	288
(۴) عدل الٰہی کے دلائل کی طرف رجوع	290
(۵) عدل اور روایات اسلامی	291
(۶) منکرین عدل کے دلائل	295
تنقید و تحقیق	296
اس کی وضاحت	297
(۷) زندگی بشر میں دردناک حوادث کا مشکل مسئلہ	300
ناگوار حوادث کو چند گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے	300
ناگوار حوادث کے مسئلہ کا جواب	301
مختصر اور اجمالی جواب	301
قرآن اور آفات کا اجمالی جواب	303
روایات اسلامی میں ناگوار حوادث کا تذکرہ	306
ناگوار مصائب کا تفصیلی جواب	308
(۱) تفاوت و تفریق کا فلسفہ	308
(۲) خود ساختہ مشکلات	311
قرآن مجید اور خود ساختہ مصائب	312
(۳) وہ مصائب جو خدائی سزا ہیں	314
اسلامی رایات میں گناہ اور مصیبتوں کا رابطہ	318
(۴) بیدار کرنے والے مصائب	312
قرآن اور بیدار کرنے والے مصائب	323
اسلامی روایات میں حوادث بیدار کنندہ	325
مشکلات وسیلہ آزمائش	327
(۵) قرآن اور سخت امتحان	328
(۶) مصائب میں نعمت کی پہچان	331
(۷) جہانِ ہستی میں خیر و شر کی موقعیت	333
(۱) خیر و شر کیا ہے؟	333
(۲) کیا شرور میں عدم کا پہلو ہے؟	334
(۳) شرور سے ظاہر ہونے والے خیرات	335
(۴) قرآن میں خیر و شر کا تذکرہ	337
(۵) اسلامی روایات میں خیر و شر کا ذکر	338
عدل الٰہی کے متعلق دو اہم سوال	342
(۲) آیا یہ امور عدلِ الٰہی سے تضاد رکھتے ہیں؟	343
عدلِ الٰہی کے بارے میں آخری بات	346
اخلاق و عمل میں عدلِ الٰہی کا پرتو	346

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اہداء

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زُلال سے زیادہ آب حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی

۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی

۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی

۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی

۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی

۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی

کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش گفتار

تفسیر موضوعی کیا ہے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک اور سوال کا جواب تلاش کیا جائے اور وہ یہ ہے کہ قرآن موضوعی اسلوب کے مطابق کیوں جمع نہیں کیا گیا اور یہ عام کتابوں کی طرح کیوں نہیں ہے بلکہ ان سب سے متفاوت اور جدا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عام کتابوں کی تیاری میں ان کے مولف یا مولفین ایسے مختلف موضوعات کو نظر میں رکھتے ہیں جو ایک قدرِ جامع میں شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً مختلف بیماریاں جو انسان کی سلامتی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان کو علم طب میں زیر نگاہ لایا جاتا ہے، پھر ان کے ساتھ مربوط مسائل کو مختلف ابواب وفصول میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، جیسے دل کی بیماریاں، اعصاب کے امراض، نظام ہضم کی بیماریاں، سانس کی بیماریاں جلدی امراض اور دیگر بیماریاں جن میں انسان مبتلا رہتا ہے۔

بعد میں ہر باب اور ہر فصل کے مقدمات ونتائج کو سامنے رکھتے ہوئے بحث کی جاتی ہے اور یوں ''کتاب طب'' کے نام سے ایک کتاب تیار ہو جاتی ہے۔

لیکن قرآن مجید کا معاملہ اس طرح کا نہیں کیونکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو متواتر ۲۳ سال تک مختلف احتیاجات واجتماعی شرائط، گوناگوں حوادث اور مختلف تربیتی مراحل میں نازل ہوئی، نیز جامعہ اسلامی کے ساتھ ہمسفر وہم قدم رہی ہے۔ اس کے باوجود یہ کتاب زمان و مکان سے مخصوص نہیں۔ چنانچہ ایک ہی وقت میں قرآنی مباحث کا محور شرک و بت پرستی کا مقابلہ، توحید اور اس کی تمام شاخوں کی تعلیم تھا۔ لیکن اس زمانے میں نازل ہونے والی آیات دستورِ مبنداء ومعاد سے بھی بحث کر رہی ہیں (جیسے بعثت کے پہلے تیرہ برس تک مکہ میں نازل ہونے والی سورتیں ہیں)۔

پھر ایسا وقت آیا کہ تمام ابحاث انقلاب و جہاد کے اردگرد گھوم رہی تھیں کہ جن میں داخلی وخارجی دشمنوں اور منافقوں کے ساتھ مقابلہ درپیش ہوا۔ ایک زمانہ میں جنگ احزاب سامنے تھی اور سورۂ احزاب نازل ہوئی۔ حداقل اس میں سے ۱۷ آیات میں جنگ کے واقعات و حوادث، تربیتی مسائل اور اس کے بعد کے معاملات پر بحث کی گئی۔

پھر صلح حدیبیہ کا زمانہ آیا تو سورۂ فتح نازل ہوئی، پھر فتح مکہ اور جنگ حنین واقع ہوئی تو سورۂ نصر اور دوسری آیات کا نزول ہوا۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کی حیرت ناک آمد اور اسلامی اجتماع کی عمومی حرکت کے مطابق قرآن مجید کی آیات نازل ہوئی جن میں ضروری احکام دیئے گئے اور انسان کے لیے یہ دقیق برنامہ تکمیل پاتا رہا۔ جو کچھ ابھی ذکر کیا گیا اس کی طرف توجہ کرنے سے تفسیر موضوعی کا مقصد واضح ہو

جائے گا اور وہ یہ کہ ایک موضوع کے بارے میں پورے قرآن میں مختلف واقعات وحوادث سے متعلق جو آیات نازل ہوئیں ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے، اس مجموعہ سے اس موضوع اور اس کے ابعاد کی بابت قرآنی نقطہ نظر واضح ہو جائے گا۔ مثلاً معرفت خدا کے دلائل سے مربوط آیات جیسے انسانی فطرت، برہانِ نظم، برہانِ وجوب وامکان سے مربوط تمام آیات کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو القران یفسر بعضه بعضاً (آیاتِ قرآن ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں) کی رو سے اس موضوع کے تمام ابعاد و جہات واضح وروشن ہو[1] جائیں گے۔

اسی طرح بہشت، دوزخ، پل صراط، نامہ اعمال سے مربوط آیات، مسائل اخلاقی، تقویٰ، حسن خلق اور شجاعت سے مربوط آیات، احکام نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس، انفال، عدالت اجتماعی، دشمن کے ساتھ جہاد اور جہاد بالنفس وغیرہم سے مربوط آیات کو یکجا کرنے سے ان موضوعات کو پوری طرح سمجھا یا سمجھایا جاسکتا ہے۔

مسلم ہے کہ قرآن مجید میں یہ آیات مختلف مناسبات میں نازل ہوئی ہیں، ان میں سے ہر روہ کو جدگانہ جمع کیا جائے اور پھر تفسیر بیان ہو تو بہت سے نئے حقائق کا انکشاف ہوگا۔ اس سے واضح ہوا کہ قرآن فہمی کے لیے تفسیر موضوعی کس قدر ضروری ہے۔ اس ضمن میں مزید تفصیل انشائ اللہ آئندہ بحث میں آئے گی۔

تفسیر موضوعی سے کس قسم کی مشکلات حل ہوں گی؟

مندرجہ بالا مطالب کے ذکر سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے لیکن مزید وضاحت کے لیے اس امر کی طرف توجہ کریں کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں موضوع کے ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً موضوع شفاعت۔ بعض آیات میں شفاعت کے امکان کا تذکرہ ہے۔ بعض دوسری آیات میں شفاعت کرنے والوں کی شرائط ذکر ہوئی ہیں۔ (سبا: ۲۳۔ مریم: ۸۷) بعض آیات میں قابل شفاعت

---

[1] "القران یسفر بعضه بعضا" کا جملہ ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے چونکہ مسائل قرآنی میں ان کا رابطہ پیغمبر اکرمؐ اور امیر المومنینؑ سے تھا۔ لہٰذا بعید نہیں کہ انہوں نے یہ جملہ انہی بزرگواروں سے لیا ہو۔ اس کا مضمون نہج البلاغہ میں بھی موجود ہے۔ فرمان ہے وذکر ان الکتاب یصدق بعضه بعضا۔ خدا نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ قرآن کے مختلف حصے ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں اور آپس میں ہم آہنگ ومربوط ہیں۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۰)

بعض علما نے اپنی کتابوں میں جملہ "القران یسفر بعضه بعضا" کو بعنوان حدیث ذکر کیا ہے جیسا کہ تنزیہ التنزیل میں مرحوم شہرستانی نے صفحہ ۱۰۶ میں اس جملہ کو بعنوان روایت نقل کیا ہے لیکن اس کا ماخذ نہیں بتایا۔ نہج البلاغہ میں ایک اور جگہ اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن مجید کے بارے میں فرمان ہے:

"وینطق بعضه ببعض ویشهد بعضه علی بعض۔ (بعض آیات بعض آیات کا مضمون بیان کر رہی ہیں اور بعض دیگر آیات پر گواہ ہیں)

(نہج البلاغہ خطبہ ۳۳)

اشخاص کا ذکر ہے۔(انبیاء:۲۸۔مومن:۱۸)بعض آیات خدا کے سوا سب سے حق شفاعت کی نفی کرتی ہیں۔(زمر ۴۴)

اس جگہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابہام نے (شفاعت سے مربوط مسائل) کو گھیر رکھا ہے۔حقیقت شفاعت، اس کی شرائط اور دوسری خصوصیات سب اس ابہام کی حالت میں ہیں۔لیکن جب ہم آیات شفاعت کو قرآن مجید سے لے کر ایک جگہ جمع کر دیں اور تمام آیات کو سامنے رکھ کر ان کی تفسیر کریں تو یہ ابہام دور ہو جائے گا اور یہ مشکل حل ہو جائے گی۔اسی طرح جہاد، فلسفہ احکام اسلام، دوزخ، علم الٰہی اور علم غیب کا موضوع کہ آیا غیر خدا کے لیے علم غیب ممکن ہے یا نہیں؟ اگر ان میں سے ہر موضوع کی آیات ایک جگہ لا کر مورد توجہ قرار دی جائیں تو ممکن ہے کہ حق مطلب ادا ہو جائے اور تفسیر موضوعی کے ذریعہ تمام موجودہ ابہامات دور ہو جائیں۔

آیات محکم ومتشابہ کے بارے میں جو حکم دیا گیا ہے کہ متشابہات کی تفسیر ان کو محکمات کے تحت رکھ کر کی جائے، اصولاً یہ بھی تفسیر موضوعی ہی کی ایک قسم ہے۔

بہرحال جب کسی ایک موضوع سے مربوط آیات کی تفسیر ایک دوسرے کی روشنی میں کی جائے تو اس سے نئی شعاعیں پیدا ہوں گی، ایسی شعاعیں جن میں وہ قرآنی معارف ہوں گے جن سے بہت سے عقیدتی اور اسلامی احکام کی مشکلات حل ہوں گی۔اس نکتہ نظر کے مطابق یوں تصور کریں کہ آیات قرآنی جدا جدا مفہوم رکھتی ہیں لیکن جب ہم ان کو یکجا اور مربوط کر کے دیکھیں گے تو بہت سے نئے مفاہیم سامنے آئیں گے۔یا آپ انہیں زندگی بخش مادہ کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں جیسے آکسیجن اور ہائیڈروجن کا باہم جدا جدا جسم اور صورت میں ہیں لیکن جب دونوں مرکب ہوں گے تو پانی جیسا زندگی کا اہم مبداء سامنے آئے گا۔

خلاصہ یہ کہ بہت سے اسرارِ قرآن صرف اسی طریقہ سے معلوم کیے جا سکتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے علم وفہم کا کوئی راستہ نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ تفسیر موضوعی کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے فقط یہی بیان کافی ہے۔

تفسیری موضوعی کے فوائد مختصراً یوں گنائے جا سکتے ہیں۔

(۱) بادی النظر میں بعض آیات متشابہات میں جو ابہام نظر آتے ہیں وہ تفسیر موضوعی کے ذریعہ دور ہو سکتے ہیں۔

(۲) مختلف موضوعات ومسائل، جو قرآن میں مذکور ہیں، ان شرائط، خصوصیات اور علل ونتائج تفسیر موضوعی سے ہی مل سکیں گے۔

(۳) توحید، معرفت توحید، قیامت، عبادات، جہاد، حکومت اسلامی اور اس کے اہم اجزاء کی تفصیل بھی تفسیر موضوعی ہی کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔

(۴) قرآنی اسرار، تازہ اور نئے پیام ایک مربوط انداز میں صرف آیات کے ایک دوسرے کے ساتھ انضمام ہی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزۂ علمیہ۔قم

اس بے نشان کی نشانی

خدا کی صفات جمال وجلال کی معرفت

بایچ کس نشانی زان دلستان ندیدم
یامن خبر ندارم یا اونشان ندارد
ہر شبنمی دراین رہ صد موج آتشین است
دردا کہ این معما شرح و بیان ندارد

خدا کی صفاتِ جمال وجلال کی معرفت

اشارہ

خداجوئی، خدایابی اور خداشناسی وہ تین مختلف مسائل وعناوین ہیں جو معرفت خدا کی بحث میں ہمارے پیش نظر ہیں۔

خداجوئی: معرفت خدا کے فطری جذبے کی طرف اشارہ ہے۔

خدایابی: کا تعلق اثبات وجود خدا سے ہے۔

خداشناسی: اس کی صفات سے بحث کا عنوان ہے۔

ایک سادہ تشبیہ میں آپ انسان کو ایسے پیاسے گروہ سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو اپنی پیاس بجھانے کے لیے بیابان میں پانی تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ جب وہ چشمہ کے کنارے پہنچتا ہے اور اس کو پالیتا ہے تو وہ صفات آب کی پہچان اور اس کے ایک حیات بخش شے ہونے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

خداجوئی ایک فطری معاملہ ہے جس کی تائید عقلی دلائل سے بھی ہوتی ہے جیسے پیاسے اپنی وجدانی حالت اور اپنے اس خیال کے تحت کہ ان کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے پانی کی طلب میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی چونکہ کمال کا عاشق ہے، لہٰذا وہ کمال مطلق، ذات خدا کی تلاش میں نکلتا ہے۔

خدایابی، خصوصاً، اسرارِ خلقت کا مطالعہ، اپنے روشن دلائل کے باعث کوئی پیچیدہ اور مشکل کام نہیں۔ ہاں مشکل مسئلہ معرفت خدا ہے کیونکہ تمام موجوداتِ طبیعت کہ جو خدایابی کے سلسلے میں بہترین رہنما ہیں، ممکن ہے کہ معرفت خدا میں وہ اس کو فریب دیں اور اسے قیاس وتشبیہ کے خطرناک راستے کی طرف کھینچ لے جائیں، (جیسے اس کی تشریح بعد میں آئے گی)۔

اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ ذات خدا کی طرح صفاتِ خدا بھی لامتناہی ہیں، اسماء خدا جو اس کی صفات کی معرفت کا ذریعہ ہیں، ان کا کوئی شمار نہیں، کیونکہ اسماء خدا میں سے ہر اسم کمالات ذات مقدس میں سے کسی کمال کی طرف اشارہ ہے۔ وجودِ غیر متناہی کے کمالات بھی غیر متناہی ہیں۔ پس طبعاً صفات کمالیہ اور ان کی حکایت کرنے والے اسماء بھی لامتناہی ہیں۔ بایں ہمہ کچھ اسماء اصل و بنیاد اور باقی اسمائ ان کی شاخیں ہیں مثلاً ''سمیع وبصیر'' (سننے والا، دیکھنے والا)۔ علم خدا کی شاخیں ہیں کیونکہ ان کا مفہوم آنکھ اور کان رکھنا نہیں، بلکہ سننے اور دیکھنے کے قابل چیزوں کا علم ہے۔ اس طرح خدا کا ارحم الراحمین واشد المعاقبین ہونا اس کے حکیم ہونے کے شعبے میں کیونکہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ حسب موقع ایک جگہ رحمت نازل فرمائے اور کسی دوسری جگہ نقمت وعذاب کرے۔

راہ پرفراز و پرنشیب

خدا کی پہچان اوراس کے اصل وجود کی جستجو بالخصوص جہانِ ہستی کے مطالعہ کے ذریعے جس قدر آسان ہے اسی قدر اس کے صفات کی معرفت مشکل ہے۔ کیونکہ خدایابی کے مرحلہ میں آسمان کے ستاروں، درختوں کے پتوں، طرح طرح کے پودوں اور حیوانوں کی اقسام، بلکہ اس کے وجود وہستی کے لیے ہر حیوان اور پودے کے جسمانی خلیوں (CELL) اور ایٹمی ذرات کی تعداد کے برابر دلائل موجود ہیں۔

لیکن صفات خدا کہ جن میں صحیح راہ پر چلنے کے لیے اصل شرط مخلوق کے تمام صفات اور ان کے ساتھ تشبیہ کی نفی ہے، اس سے یہ معاملہ کافی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے مشکل ہونے کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ ہم طبیعت کے خول میں پروان چڑھے اور اس کے ساتھ مانوس ہیں، ہم نے یہ بھی سن رکھا ہے کہ یہی طبیعت اور یہی طبعی چیزیں معرفت خدا میں ہماری معاون و مددگار ہیں، لیکن جب ہم بحث صفات تک پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جن صفات کے بارے میں ہم نے کچھ دیکھا اور سنا ہے، ان سے صفات خدا کا قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مخلوق کے تمام تر صفات میں سے کوئی ایک بھی نقص سے خالی نہیں جب کہ صفاتِ خدا۔ ہر قسم کے نقص سے مبرا اور عین کمال ہیں۔

لہٰذا یہی طبیعت جو معرفت وجودِ خدا کے لیے ہماری رہبر و رہنما ہے، وہ صفاتِ خدا کی معرفت کے مرحلے میں ہماری دشمن بن جاتی ہے اس بناء پر ضروری ہے کہ ہم صفات خدا کی معرفت کے لیے زیادہ احتیاط کے ساتھ قدم اٹھائیں تا کہ تشبیہ و قیاس کے خطرہ سے محفوظ رہ سکیں۔

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کو صفاتِ خدا کے موضوع کی طرف ایک اشارہ سمجھیں۔ چنانچہ اب ہم اس موضوع سے مربوط آیات کی یاد آوری کرتے ہوئے آیات ذیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:

(۱) وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ (اعراف ۱۸۰)

(۲) لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪ (شوری ۱۱)

(۳) تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑭ (نحل ۷۴)

(۴) وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ ④ (اخلاص ۴)

(۵) سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ ⑮⑨ (صافات ۱۵۹)

(۶) مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ⑭ (حج ۷۴)

(۷) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ [1] (طٰہٰ ۱۱۰)

ترجمہ

(۱) خدا کے اچھے نام میں، انہی کے ساتھ اسے پکارو، جو لوگ اسماء الٰہی میں تحریف کرتے ہیں انہیں چھوڑ دو۔

(۲) خدا کی مثل کوئی چیز نہیں۔ وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

(۳) پس خدا کے لیے مثالیں بیان نہ کرو کیونکہ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

(۴) اس کا کوئی بھی کفو و ہمسر نہیں ہے۔

(۵) خدا پاک و منزہ ہے ان صفات سے جو وہ بیان کرتے ہیں (اور اس کو مخلوقات کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں)۔

(۶) وہ لوگ خدا کی واقعی قدر نہیں پہچان سکے۔ خدا طاقت ور اور غالب ہے۔

(۷) وہ مجرموں کے سامنے اور پشت پیچھے کے حالات سے باخبر ہے۔ لیکن یہ لوگ خدا کا احاطہ علمی نہیں رکھتے۔

مفردات کی تشریح

"مثل" کا مادہ مثول ہے، یعنی صاف سیدھا کھڑا ہونا۔ چنانچہ کسی شخص یا چیز کا عکس لیا جاتا ہے یا نقاشی کی جاتی ہے تو اس کو "تمثال" کہتے ہیں۔ گویا وہ خود وہاں کھڑا ہے۔ پھر ہر اس چیز کو جو کسی کی تشبیہ ہو اس کو "مثال" کہا جانے لگا۔

مثل۔ اس بات کو بھی کہتے ہیں جو کسی دوسرے کلام کے متشابہ ہو اور اس کو واضح کرے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ مماثل اور مساوی میں فرق ہے۔ مماثل ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جن کی جنس ایک ہو۔ لیکن مساوی میں ہوسکتا ہے کہ ان دو چیزوں کی جنس ایک ہو یا دو ہوں۔ مقدار و اندازہ میں ایک ہونا باہم مساوی ہونے کے لیے کافی ہے۔

"مثل" کا معنی صفت بھی لیا گیا ہے کبھی "عمدہ و پسندیدہ صفات"، نیز دلچسپ اور عجیب داستانوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے "امثل" کا معنی نمونہ ہے۔ "مثلہ" کرنے کا معنی انسانی بدن کے اعضاء کو شکنجہ و سزا کے عنوان سے قطع کرنا ہے۔

درحقیقت جو بھی مثلہ جیسے عمل کو انجام دیتا ہے وہ دوسروں کو سمجھا رہا ہوتا ہے کہ اگر تم نے بھی کوئی ایسا جرم کیا تو اسی طرح کی سزا کے مستحق ہوگے۔

اسی لیے "مثلات" عقوبات کے معنی میں آیا ہے یعنی ایسی سزائیں جو دوسروں کے لیے وجہ عبرت ہوں تا کہ وہ دوسرے لوگوں جیسے

---

[1] اس سے ملتا جلتا مضمون سورہ انعام ۹۱، زمر ۶۷ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

برے اعمال کے مرتکب نہ ہوں۔[1]

آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ ایک مادۂ لفظی لغت میں مختلف مناسبات سے جدید اور متنوع معانی میں استعمال ہوتا ہے اور تدریجاً اپنے اصل معنی سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔اس طرح یہ معانی کا ملا ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی اصل اور اساس ایک ہی رہتی ہے۔

"کفو" کا معنی قدر اور مقام میں مشابہت ہے۔مکافات بھی اسی لفظ سے لیا گیا ہے کیونکہ اس کا معنی مساوات اور مقابلہ بالمثل ہے۔

''اکفاء'' ظرف کو اس طرح اوندھا کرنا کہ اس کا ظاہر و باطن ایک سمجھا جائے۔

مقائیس اللغۃ میں اس کلمہ کے دو معنی آئے ہیں، دو چیزوں میں مساوات اور دوسرا تمایل وانحراف، جب کہ مفردات میں راغب کے نزدیک دونوں معانی کی بازگشت ایک معنی کی طرف ہے جیسے اوپر اشارہ ہوا ہے۔

''صفت'' کا مادہ ''وصف'' ہے جو اصل میں کسی چیز کی اچھائیوں اور برائیوں کو بیان کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔پھر ایک وسیع معنی میں ہر قسم کی نیک و بد صفت پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔

''ابن منظور'' لسان العرب میں کہتے ہیں کہ وصف کرنا زینت کرنے کے لیے اور صفت بمعنی زینت استعمال ہوا ہے۔یہی معنی مقائیس اللغہ میں بھی آیا ہے لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے اس کا ایک وسیع معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

کبھی خادم اور خادمہ کو ''وصیف'' اور ''وصیفہ'' بھی کہا جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پہلے لوگ غلام و کنیز کی خرید و فروخت کرتے تو خریداروں کے لیے ان کے اوصاف اور خوبیوں کا تذکرہ کرتے تھے۔

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

کوئی چیز اس کی مثل نہیں

(۱) پہلی آیت میں مشرکوں کی وضع و حالت کی نشاندہی کی گئی ہے جو خدا کے ان اسماء میں تحریف کرتے تھے جن سے صفات کی پہچان ہوتی ہے، اس فعل پر ان کو تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

خدا کے اچھے نام ہیں، انہی کے ساتھ اسے پکارو (اوصاف جس طرح ہیں اسی طرح منعکس کرو) (ولله الاسماء الحسنى فادعوه بها)

جو اسماء خدا میں تحریف کرتے ہیں ان کو چھوڑ دیں۔وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جلد سزا پالیں گے۔(وذروا الذين يلحدون

---

[1] مفردات راغب۔مقائیس اللغۃ، لسان العرب اور مجمع البحرین۔

فی اسمائه سیجزون ما کانوا یعملون)

"الحاد" و "لحد" بروزن "مهد" ہے جس کا معنی حدوسط سے ایک طرف ہٹ جانا ہے۔

قبر میں "لحد" اس عنوان سے ہے کہ قبر کے ایک پہلو کو کھود کر جنازہ اس میں رکھا جاتا ہے تاکہ قبر پر کرتے وقت میت پر مٹی نہ پڑ جائے۔[1]

اسماء خدا میں الحاد سے کیا مراد ہے؟ اس میں بہت سے مفسرین کا خیال ہے کہ اس کا مفہوم عام ہے جس میں تین مطالب شامل ہیں:

۱۔ مشرک اپنے بتوں کے نام خدا کے ناموں سے لیتے تھے۔ چنانچہ کسی بت کو "اللات" کسی کو "العزی" اور کسی کو "منات" کہتے جو بالترتیب انہوں نے "اللہ"، "العزیز" اور "المنان" کی مناسبت سے بنائے ہوئے تھے۔

۲۔ وہ نام جو خدا نے اپنے لیے قرار نہیں دیئے اور وہ اس کی عظمت کے لائق نہیں کیونکہ ان میں ایسے نقائص بھی ہیں جو ممکنات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہ نام خدا تعالیٰ کے لیے نہیں بولے جانے چاہئیں۔ جیسے کلمہ "اب، پدر، باپ" جو نام مسیحیوں نے خدا کے لیے تجویز کیے ہوئے ہیں۔

۳۔ ان کو خدا کے ایسے نام نہیں رکھنے چاہئیں جن کا مفہوم بھی انہیں معلوم نہیں۔ بہ عبارت دیگر خدا کو خیر کے ساتھ تشبیہ دینا، اس کی صفات کے مفہوم کو چھپانا اور اس کے نام دوسروں پر بولنا جائز نہیں ہے۔

ان سب مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ صفاتِ خدا میں احتیاط سے کام لیا جانا چاہیے مبادا کہ ایسے اسماء وصفات جو ناقص موجودات کے لائق ہیں وہ اس ذات مقدس کے لیے انتخاب کر لیے جائیں۔ اسی لیے بہت سے علماء اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کے اسماء توقیفی ہیں یعنی فقط وہی نام خدا پر بولے جائیں جو آیات وروایات معتبرہ سے ثابت ہیں۔

اس بارے میں مزید بحث انشاءاللہ توضیحات میں آئے گی۔

(۲) دوسری آیت مورد بحث میں خدا کے سوا ہر قسم کے مولا، معبود اور سرپرست کی نفی، نیز خدا کے آسمانوں وزمین کا خالق ہونے پر تاکید کے بعد فرمان ہے۔

"خدا کی مثل کوئی چیز نہیں، وہی سننے والا دیکھنے والا ہے" (لیس کمثله شیء وهو السمیع البصیر)

مثل کے ساتھ کاف تشبیہ بھی آیا ہے جب کہ یہ بھی مثل ہی کے معنی میں ہے، دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رکھنا تاکید کے لیے ہے۔ (بعض کے نزدیک یہ حرف زائدہ ہے تاہم یہ بھی عام طور پر تاکید ہی کے لیے آتا ہے)۔

پس مفہوم آیت یہ ہوگا کہ "کوئی چیز، جس کو ہم پہچانیں یا نہ پہچانیں" خدا کی مثل نہیں۔

خدا ہر لحاظ سے بے نظیر و بے مثال ہے کیونکہ وہ ہر جہت سے یعنی علم وقدرت وارادہ میں مستقل بالذات اور بے پایاں ولامحدود

---

[1] مقائیس اللغۃ اور مفردات راغب

وجود ہے۔اس کا غیر جو بھی ہے وہ اسی سے وابستہ ومتعلق، محدود، متناہی اور ناقص ہے۔اس کا وجود جو کمال مطلق ہے، اس وجود کے ساتھ کوئی شباہت نہیں رکھتا جو نقص مطلق ہے۔یعنی ''موجوداتِ امکانی'' میں کوئی موجود اس جیسا نہیں کیونکہ وہ غنی مطلق اور اس کا غیر فقیر اور ہر لحاظ سے اس کا محتاج ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت فوق میں خدا کے ساتھ جس شباہت ومثل کی نفی کی جارہی ہے وہ شباہت ذات ہے کہ ذات خدا جیسی کوئی ذات نہیں۔اس سے نفی صفات مراد نہیں، کیونکہ اس کی صفات علم وقدرت کا نمونہ انسان میں موجود ہے۔یہ خیال بہت بڑا اشتباہ ہے جیسا کہ بحث علم وقدرت میں آئے گا کہ اس قسم کی صفات خدا کی ہمارے علم وقدرت وغیرہ کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں ہے۔البتہ اس کا وجود ہے اور ہم بھی موجود ہیں۔لیکن کجا وہ وجود، اور کجا ہمارا یہ وجود! اس کی صفات اور بندوں کی صفات کا بھی یہی حال ہے۔

بہرحال بحث معرفت خدا ومعرفت صفات خدا میں یہ ایک اساسی اصل ہے کہ ہم اس کو ہر قسم کی مثال ومثال سے پاک ومنزہ سمجھتے ہیں اور اس کو خیال وقیاس سے برتر جانتے ہیں۔اس طرف توجہ رہے کہ اس کی جو بھی صفات ہیں، جس طرح وہ ہر قسم کے نقص وعیب اور مادی عوارض سے پاک ہیں، اسی طرح عوارض جسمانی وامکانی سے بھی پاک ہیں۔

جل المهيمن ان تدری حقيقته
من لا له المثل لاتضرب له مثلا

ترجمہ

خداوند عالم اس سے برتر ہے کہ اس کی حقیقت کی پہچان ہو سکے جس کی کوئی مثل ومثال نہیں ہے اس کے لیے کوئی مثل قرار نہ دو!

(۳) تیسری آیت پہلی آیت کے مضمون کو ایک نئے انداز سے پیش کررہی ہے۔بت پرستوں کے معبود جو آسمان وزمین سے انسانوں کو کسی قسم کا رزق وروزی دینے کی طاقت نہیں رکھتے ان کی نفی کرنے کے بعد فرمان ہے۔

پس خدا کے لیے مثالیں بیان نہ کرو کیونکہ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔(فلا تضربو الله الامثال ان الله يعلم و انتم لا تعلمون)

مسلم ہے کہ جو وجود ہر لحاظ سے واحد ویکتا ہے وہ شبیہ ومثال نہیں رکھتا، پھر اس کے لیے انتخاب مثل کیسے ہوگا۔بعض تفاسیر کے مطابق یہ جملہ عصر جاہلیت بلکہ ہمارے اس زمانے کے جاہلوں کی گفتگو کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کہتے ہیں خدا اس سے برتر ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں، ہم ایسے موجودات کو تلاش کرتے ہیں جن کو پا سکتے ہیں۔خدا تو ایک بہت بڑے بادشاہ کی طرح ہے اور بے چارے عوام اس تک رسائی نہیں رکھتے۔اس لیے وہ وزراء اور اس کے خواص کی طرف جاتے ہیں کہ جن تک ان کی رسائی ہوسکتی ہے۔

قرآن کہتا ہے ''پس خدا کے لیے مثالیں بیان نہ کرو'' خدا اس کمزور وناتواں بادشاہ کی طرح نہیں، بلکہ وہ تو ہر جگہ حاضر ہے۔وہ تمہارے دل میں ہے۔وہ تم سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے۔نیز اس کی کوئی مثال وتشبیہ نہیں جس سے تم اس تک پہنچ سکو تا کہ اس کی عبادت

کرو یہ بت اور اس قسم کی تمام مخلوقات تمہاری ہی طرح اس کے محتاج اور اس سے وابستہ ہیں۔

ان اللہ یعلم و انتم لا تعلمون

ممکن ہے یہ جملہ اسی طرف اشارہ کرتا ہو کہ تم خدا کی ذات وصفات کی کنہہ وحقیقت معلوم نہیں کر سکتے اور ان مثالوں کے انتخاب کا سرچشمہ تو تمہاری یہ نادانی ہی ہے۔ لہٰذا خدا تمہیں خبردار کر رہا ہے کہ پھر سے ان مثالوں کی تکرار نہ کرنا۔

یہاں تک کہ ان موارد میں بھی جہاں صفت خدا سے مربوط حقائق تک پہنچنے کے لیے ہم مثالوں سے کام لیتے ہیں، مثلاً خدا کو نور سے تشبیہ دینے یا آفتاب یا عالم ہستی کی روح سے تعبیر کرنے میں یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ تشبیہات بھی ناقص ونارسا ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نور کی آیت ۳۵ (اللہ نور السموت والارض) جس میں خدا کی معرفت نورِ آسمان وزمین کے عنوان سے ہوگی یا سورۂ ق کی آیت جس میں خدا کو شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک کہا گیا ہے۔ یہ مثالیں مجازی ہیں اور اس کے منافی نہیں ہیں کہ خدا کی کوئی مثل ومثال نہیں کیونکہ جس کی نفی ہوئی ہے وہ مثل ومثال حقیقی ہے۔

یہ مجازی مثالیں اس لیے ہیں تا کہ ہم اس بے مثال حقیقت کے کچھ قریب ہوسکیں۔ چنانچہ اسی سورۂ نور کے ذیل میں اشارہ ہے (ویضرب اللہ الامثال للناس) اور خدا لوگوں کے لیے مثالیں بیان کر رہا ہے تا کہ ہم حقائق کا ادراک کر سکیں۔

(۴) چوتھی آیت جو سورۂ اخلاص کی آخری آیت ہے، اس میں ہر قسم کی تشبیہ اور مثل ونظیر کی اس سے نفی کی گئی ہے۔ فرمان ہے کہ اس کا کوئی بھی کفو وہمسر نہیں ہے (ولم یکن لہ کفواً احد)۔

اس طرح مخلوقات کی تمام صفات، مختلف موجودات کے عوارض، ہر قسم کا نقص ومحدودیت اور ہر طرح کا تغیر وتبدل جو خاصۂ ممکنات ہے، خدا کی ذات سے اس کی نفی کی جارہی ہے۔

تفسیر فخر رازی میں مذکور ہے کہ سورۂ توحید کی پہلی آیت "قل ھو اللہ احد" ذاتِ خدا سے ہر قسم کی کثرت کی نفی کر رہی ہے۔ لفظ ''صمد'' سے ہر قسم کا نقص ومغلوبیت "لم یلد ولم یولد" سے علیت ومعلولیت اور "ولم یکن لہ کفوا احد" سے ہر قسم کے اضداد اور مثالوں کی نفی کی جارہی ہے۔ ''کفو'' کا معنی ہمسر ہے اور ممکن ہے کہ یہ مثل وضد سب کو شامل ہو۔[1]

نیز فخر رازی کہتے ہیں کہ آیت مورد بحث میں مشرکوں کے نظریہ کی نفی ہو رہی ہے کیونکہ وہ بتوں کو خدا کا شریک قرار دیتے تھے۔ جبکہ پہلی آیت یہود ونصاریٰ کے مسلک کو باطل قرار دیتی ہے جو خدا کے لیے کسی نہ کسی بیٹے کے قائل تھے۔ نیز دو خداؤں (خدائے نور وخدائے ظلمت) کے قائل مجوسیوں کے عقیدے کی نفی کر رہی ہے۔[2]

(۵) پانچویں آیت میں یہی مضمون ایک نئی تعبیر کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ فرمان ہے: خدا پاک ومنزہ ہے ان صفات سے جو وہ بیان

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۳۲ صفحہ ۱۸۵

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۳۲ صفحہ ۱۸۵

کرتے ہیں۔(سبحان اللہ عما یصفون)۔

یہ مطلب کچھ تفاوت کے ساتھ قرآن مجید میں چھ مقامات پر مذکور رہے۔[1]

اگرچہ آیات قبل کو مدنظر رکھتے ہوئے ان صفات سے زن وفرزند یا بتوں کی صورت میں تشبیہ وشریک مراد ہیں لیکن درحقیقت ان کا مفہوم وسیع ہے اور سب صفات کو شامل ہے کیونکہ وہ عموماً جو صفات بیان کرتے ہیں وہ وہی ہیں جو مخلوقات وممکنات سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنابریں آخرین توصیف جو ہم خدا کے لیے تصور کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم یوں کہیں کہ وہ اس سے بزرگ ہے کہ اس کے صفات اور اوصاف بیان کیے جائیں وہ ہر خیال وقیاس اور وہم وگمان سے برتر ہے اور جو کچھ ہم نے دیکھا، پڑھا یا سنا ہے وہ اس سے بالا ہے۔ ہاں وہ ان صفات سے منزہ و پاک ہے جو ہم بیان کر سکیں۔

(۶) چھٹی آیت مورد بحث میں بھی اس مطلب کی ایک نئی تعبیر دیکھی جا سکتی ہے۔ فرمان ہے: وہ لوگ خدا کی واقعی قدر نہیں پہچان سکے (ما قدروا اللہ حق قدرہ)

انہوں نے اس کا مخلوق پر قیاس کیا اور انہیں اس کا شریک بناڈالا جب کہ کوئی اس کی شبیہ ومثل نہیں۔ خدا طاقت ور اور غالب (ناقابل شکست) ہے۔(ان اللہ لقوی عزیز) اس کے غیر کمزور اور شکست پذیر ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جو کہتے تھے کہ جب خدا آسمان وزمین کی تخلیق سے فارغ ہوا تو وہ تھک گیا اور پشت کے بل سو گیا، یوں اس نے آرام کیا اور ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھ لیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان کے قول کو غلط قرار دیا اور بتایا کہ انہوں نے خدا کو نہیں پہچانا، اس لیے اس کو مخلوقات کے مشابہ بنا دیا۔

اگرچہ آیت فوق بت پرستوں کے کلام کی نفی کر رہی ہے، لیکن اس کا مفہوم وسیع ہے جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

"ان اللہ لا یوصف و کیف یوصف و قد قال فی کتابہ" "ما قدروا اللہ حق قدرہ" فلا یوصف بقدر الا کان اعظم من ذلک"۔[2]

''خدا کی توصیف نہیں کی جا سکتی، اس کی توصیف کیسے ممکن ہے جب کہ اس کا فرمان ہے: ''ان لوگوں نے خدا کو نہیں پہچانا جیسا کہ پہچاننا چاہیے۔'' پس کسی حد واندازہ کے ساتھ خدا کی توصیف نہیں ہوگی مگر یہ کہ خدا اس سے بزرگ تر ہوگا۔''

---

[1] انعام ۱۰۰، انبیاء ۲۲، مومنون ۹۱، صافات ۱۸۰، زخرف ۸۲ اور آیت زیر بحث۔

[2] اصول کافی جلد ۱ ''باب النہی عن الصفۃ بغیر ما وصف بہ نفسہ'' حدیث ۱۱۔ توجہ رہے کہ آیہ فوق قرآن مجید کی تین سورتوں انعام ۹۱، حج ۷۴ اور زمر ۶۷ میں وارد ہے۔ دو جگہ اس کے اول میں واؤ ہے۔

نہج البلاغہ کے ایک خطبہ اشباح میں ہے:

"كذب العادلون بك اذشبهوك باصنامهم ونحلوك حلية المخلوقين باوها وجزائوك تجزية المجسامات بخواطرهم، وقدروك على الخلقة المختلفة القوى بقرائح عقولهم۔"[1]

''وہ لوگ جھوٹے ہیں جو تجھے دوسروں کے برابر سمجھ کر اپنے بتوں سے تشبیہ دیتے ہیں اور اپنے وہم میں تجھ پر مخلوقات کی صفتیں لاتے اور اپنے خیال میں اس طرح تیرے حصے بخرے کرتے ہیں جس طرح مجسم چیزوں کے جوڑ بند الگ الگ کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنی عقلوں کی سوجھ بوجھ کے مطاق تجھے مختلف قوتوں والی مخلوقات پر قیاس کرتے ہیں۔''

(۷) ساتویں اور آخری آیت مورد بحث میں قیامت کے دن مجرموں کی حالت اور خدائے بزرگ و برتر کی عدالت میں انکی حاضری کا ذکر کرتے ہوئے فرمان ہے۔''وہ مجرموں کے سامنے (آنے والی جزا وسزا) اور پشت پیچھے (دنیا میں ان کے انجام دیئے ہوئے اعمال) کے حالات سے باخبر ہے لیکن یہ لوگ خدا کا احاطہ علمی نہیں رکھتے۔(یعلم مابین ایدیهم و ما خلفهم ولا یحیطون به علما)

اس آیت کی تفسیر میں مندرجہ ذیل احتمال کے علاوہ اور احتمال بھی دیئے گئے ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا ان کی جزا اور اعمال سے آگاہ ہے،لیکن نہ انہیں اپنے اعمال اچھی طرح یاد ہیں اور نہ ہی جزاء کا علم ہے، وہ ان کو تو فراموش کر چکے ہیں،لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

بنابریں آیت بتارہی ہے کہ یہ لوگ خدا کی کنہہ ذات اور کنہہ صفات کے احاطہ علمی پر قادر نہیں کیونکہ وہ عقل وتخیل سے بالا ہے۔پھر کیسے ممکن ہے کہ مخلوق اس کا احاطہ کر سکے جب کہ احاطہ اس کی محدودیت کا تقاضا کرتا ہے اور اس میں تو کسی قسم کی محدودیت نہیں ہے۔

نتیجہ بحث

تمام آیات مافوق سے معلوم ہوا کہ خدا کے اوصاف کو مخلوق کے اوصاف سے کسی قسم کی مشابہت نہیں اور اس بارے میں ہر طرح کا قیاس گویا گمراہی وضلالت اور تشبیہ کے خطرناک درہ میں گرنا ہے۔

کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔

اس کا کوئی کفو وشریک نہیں۔

اس کی توصیف ہرگز نہیں کی جاسکتی۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۹۱ (اشباح)

کوئی بھی اس کے احاطہ پر علمی پر مطلع نہیں۔

اس لیے معرفت صفات خدا کے سلسلے میں احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانا ہوگا۔

ہاں اس کی صفات کی حقیقت و کنہہ کسی کو بھی معلوم نہیں اور فقط انسان اس سلسلے میں علم اجمالی رکھتا ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ صفات مخلوق میں جو محدودیت پائی جاتی ہے صفاتِ خالق میں اس کی نفی کی جائے اور ان الفاظ کے قالب و ڈھانچہ کو نیا مفہوم بخشا جائے۔

اس آیت کے بارے میں اس گفتگو کو ہم حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے فرمان پر تمام کرتے ہیں، چنانچہ جب ایک آدمی نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آپؑ سے پوچھا تو حضرتؑ نے جواب میں فرمایا:

"لا یحیط الخلائق باللہ عزوجل علما اذھو تبارك و تعالی جعل علی ابصار القلوب الغطاء فلا فھم ینالہ بالکیف ولا قلب یثبتہ بالحدود، فلا تصفہ الا لما وصف نفسہ لیس کمثلہ شیء وھو السمیع البصیر۔"

''مخلوق خداوند تعالیٰ کا احاطہ علمی نہیں کرسکتی کیونکہ اس نے ان کی قلبی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور کوئی دل اس کی حد ثابت نہیں کرسکتا۔ ان اوصاف کے سوا جو اس نے اپنے لیے بیان کی ہیں اس کو دیگر صفات سے متصف نہ کرو جیسا کہ اس نے فرمایا ہے: کوئی چیز اس کی مثل نہیں وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔''[1]

توضیحات

(۱) نہ تشبیہ نہ تعطیل

صفات خدا کی بحث جو معرفت خدا کے سلسلے میں مشکل ترین بحث ہے، اس میں ہر گروہ نے نئی راہ اختیار کی اور وہ سب افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے ہیں۔

۱۔ بعض نے گرداب تعطیل میں غرق ہوتے ہوئے کہا ہے کہ ہم صفات خدا میں سے کچھ بھی نہیں سمجھتے اور فقط چند ایک منفی باتیں ذہن میں رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ خدا عالم ہے تو اس سے فقط یہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ جاہل نہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا قادر ہے تو یہی سمجھیں گے کہ وہ عاجز نہیں، لیکن خدا کا علم و قدرت کیا ہے۔ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس عقیدے کو تعطیل کہتے ہیں (معرفت

---

[1] توحید صدوق۔ مطابق نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۳۹۴ حدیث ۱۱۷

صفات میں تعطیل)

۲۔ دوسرا گروہ گرداب تشبیہ میں غرق ہوکر کہتا ہے کہ وہ ممکنہ موجودات جیسے صفات کے قائل ہوئے ہیں۔ بلکہ انہوں نے تو خدا کے لیے جسم، ہاتھ پاؤں، چہرہ وغیرہ بھی بنادیا ہے۔انہوں نے اپنے خیال میں خدا کو انسان کی صورت میں قرار دے رکھا ہے، اس میں ظاہری و باطنی تمام انسانی صفات پائی جاتی ہیں، ایسا خدا ان کے لیے قابل رویت ومشاہدہ ہے۔ وہ جگہ ومکان بھی رکھتا ہے اور اس کو مختلف حالات بھی عارض ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے یہ لوگ بدترین قسم کے شرک میں جا پڑے ہیں۔

اس بات کو جاننے کے لیے کہ یہ لوگ کس حد تک کفر وشرک میں گھر گئے ہیں، گروہ مشبہ کے بارے میں معروف محقق دوانی کا کلام کافی ہے، جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

''ایک گروہ حقیقتاً جسم خدا کا قائل ہے اور ان کے کئی ایک گروہوں میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس کا جسم گوشت وخون سے مرکب ہے۔بعض کہتے ہیں کہ وہ سفید چاندی کی شمع کی طرح چمکتا ہوا نور ہے اور اس کے قد کی لمبائی اس کے اپنے ہاتھ کے مطابق سات بالشت ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے وہ انسان جیسی صورت رکھتا ہے اور پھر ان میں بھی کئی گروہ ہیں، بعض کے نزدیک خدا ایک جوان ہے کہ ابھی داڑھی کے بال نہیں آئے اور سر کے بال چھوٹے چھوٹے ملائم اور گھنگھریالے ہیں۔بعض کہتے ہیں وہ پیر مرد کی شکل میں ہے۔اس کا رنگ گندمی ہے اور اس قسم کے کئی خرافات ولغویات۔''[1]

جو کچھ قرآن مجید سے سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ نہ تمثیل کا اعتقاد صحیح ہے اور نہ ہی تشبیہ کا کیونکہ قرآن مجید معرفت خدا کی دعوت دے رہا ہے، بہت سی آیات اس کی ذات اور صفات کا تعارف کرا رہی ہیں، لیکن قرآن کے نزدیک بہرحال معرفت خدا اجمالی ہوگی اور تمثیل کا اعتقاد باطل ہے۔دوسری طرف قرآن خدا کے لیے ہر قسم کی تشبیہ، مثال اور نظیر کی نفی کر رہا ہے اور اس کو ہر قسم کے شریک سے پاک ومنزہ قرار دیتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تشبیہ کا نظریہ غلط ہے۔

اس بنا پر قول حق دقیق وعمدہ درمیانی راہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کی معرفت بہرحال اجمالی ہوگی اور یہی ہمارے لیے لازم وضروری ہے۔ تفصیلی معرفت، یعنی احاطہ علمی کی صورت میں اس کی حقیقت اور کنہہ ذات وصفات کو سمجھنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

(۲) عقل اس کی کنہہ ذات وصفات تک کیوں نہیں پہنچتی؟

پہلے اس طرف اجمالاً اشارہ ہو چکا ہے۔توضیح کے لیے یہی نقطہ کافی ہے کہ خدا کی ذات پاک نامحدود ولامتناہی ہے جب کہ عقل اور علم ودانش محدود ہیں۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۳ صفحہ ۲۸۹

وہ ہر لحاظ سے لامتناہی وجود ہے۔(جس کی دقیق بحث گزر چکی ہے)۔اس کی ذات بھی علم وقدرت اور اس کی دیگر صفات کی طرح غیر محدود ہے۔دوسری طرف ہم اور ہمارے ساتھ مربوط تمام صفات یعنی علم وقدرت، زندگی اور زمان ومکان سب ہی محدود ہیں۔اس محدودیت کے ہوتے ہوئے یہ اس ذات نامحدود کا کس طرح احاطہ کرسکتی ہیں جس کی صفات بھی نامتناہی ہیں اور ہمارا محدود علم اس غیر محدود ذات سے کس طرح باخبر ہوگا۔ہاں اپنی فکر ونظر میں دور سے ایک شبیہ دیکھ سکتے ہیں اور یہی اس کی ذات وصفات کی طرف اجمالی اشارہ ہوگا،لیکن تفصیلی طور پر اس کی کنہہ ذات وصفات تک پہنچنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

دوسری طرف دیکھا جائے کہ اس کا وجود غیر متناہی ہے،کسی لحاظ سے بھی کوئی چیز اس کی مثل وشبیہ نہیں اور وہ فردیت میں منحصر ہے۔اگر اس کی کوئی مثل ہوتی تو پھر دونوں ہی محدود ہوجاتے۔

(تیسری جلد کی بحث توحید میں یہ نکتہ مفصلا بیان ہوچکا ہے)۔[1]

ہم کس طرح اس وجود کا سراغ لگا سکتے ہیں جس کی کوئی مثل وشبیہ ہی نہیں۔اس کا غیر جو بھی ہے وہ ممکنات کی صف میں شامل ہے اور ممکنات کی صفات واجب الوجود کی صفات سے بہر طور متفاوت ومختلف ہیں۔[2]

ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ ہم اس کے اصل وجود ہی سے بے خبر ہیں اور اس کے علم وقدرت اور ارادہ سے بھی بے خبر ہیں۔بلکہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اس ذات کے بارے میں ہمارا علم اجمالی ہے،اس کے عمق وباطن تک ہماری رسائی نہیں اور عقل کی سواری بدون استثنا اس راستہ میں لنگ ہے،یا بقوئے شاعر:

به عقل نازی حکیم تا کے؟
به فکرت این راه نمی شود طے
به کنهه ذاتش خرد برد پی
اگر رسد خس به قعر دریا!

(۳)روایات اسلامی میں تشبیہ کی نفی

---

[1] جلدنمبر ۳، پیام قرآن

[2] اگر آپ تعجب نہ کریں تو میں کہوں گا کہ ہم لوگ نامتناہی کا معنی بھی نہیں سمجھتے۔اگر کہا جائے کہ پھر اس کا ذکر کیوں کرتے ہیں،اس کی خبر کس طرح دیتے ہیں،اس کے احکام کیونکر بیان کرتے ہیں جب کہ تصدیق کے بغیر تصور نہیں ہوسکتا۔اسی کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ لفظ دو اجزا سے مرکب ہے:''نا'' بمعنی عدم ''متناہی'' بمعنی محدود۔ہم ان دونوں کا جداگانہ تصور کرتے ہیں اور پھر ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔اس طرح ایک ایسے وجود کی طرف اشارہ ہوجاتا ہے جو تصور میں نہ آسکے اور یوں اس کے بارے میں اجمالی علم ہوجاتا ہے۔غور کریں۔

چونکہ تشبیہ کا خطرناک درہ معرفت خدا کے راستے پر چلنے والوں کے سامنے موجود ہے، اس لیے روایات اسلامی میں ہمیں اس سے خبردار کیا گیا ہے۔ خاص طور پر روایات اہل بیتؑ کہ جن میں علم وحکمت کی دنیا آباد ہے، ان میں اس باریک ترین راستہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ نمونہ کے طور پر روایات ذیل کی طرف توجہ کریں:

۱۔ امیر المومنینؑ خطبہ اشباح میں ارشاد فرماتے ہیں:

"واشهد ان من ساوك بشیء من خلقك فقد عدل بك، و العادل بك كافر بما تنزلت به محكمات ایاتك ونطقت عنه شواهد حجج بیناتك، و انك انت الله الذی لم تتناه فی العقول فتكون فی مهب فكرها مكیفًا ولا فی رویات خواطرها فتكون محدوداً مصرفا۔"

''میں گواہی دیتا ہوں کہ جس نے تجھے تیری مخلوق میں سے کسی کے برابر جانا اس نے تیرا ہم سر بناڈالا اور تیرا ہم سر بنانے والا تیری کتاب کی محکم آیتوں کے مضامین اور ان حقائق کا منکر ہے جنہیں تیری طرف کے روشن دلائل واضح کررہے ہیں۔ تو وہ اللہ ہے کہ عقلوں کی حدودوں میں گھر نہیں سکتا کہ نہ تو ان کی سوچ میں آکر کیفیات کو قبول کرتا ہے اور نہ ان کے غور وفکر کی جولانیوں میں تیری سمائی ہوتی ہے کہ تو محدود ہوکر ان کے فکری تصرفات کا پابند بن جائے۔''[1]

۲۔ اسی سلسلے میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ نے ایک حدیث میں بڑی عمدہ توضیح بیان فرمائی ہے جب کہ محدثین میں سے ''ابوقرہ'' نامی شخص نے آپؑ سے سوال کیا: ہم نے سنا ہے کہ خداوند عالم نے مشاہدہ اور کلام کو دو شخصوں میں تقسیم کردیا ہے، چنانچہ جناب موسیٰ سے کلام فرمایا اور حضرت محمدؐ کو رویت نصیب ہوئی (یعنی حضرت موسیٰ سے کلام فرمایا اور رسولِ اعظمؐ نے خدا کا مشاہدہ کیا)۔ امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ نے جواباً فرمایا:

''خدا کی طرف سے جن وانس کے لیے یہ آیات کون لایا کہ جن میں فرمان ہے: (لاتدرك الابصار وهو یدرك الابصار)۔ آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ رہا ہے۔ پھر فرمایا: (ولا یحیطون به علما) کوئی بھی اس کا علمی احاطہ نہیں کرسکتا۔ نیز (لیس كمثله شیئ) کوئی چیز اس جیسی نہیں۔''

کیا محمدؐ نے یہ آیات لوگوں تک نہیں پہنچائی ہیں؟

ابوقرہ نے کہا: ہاں! انہوں نے ہی پہنچائی ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۹۱

آپؑ نے فرمایا:

''پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپؐ نے خدا کی طرف سے اس قسم کی آیات تمام مخلوق کو پہنچائی ہوں اور پھر خود ہی کہا ہو کہ میں نے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا علمی احاطہ کیا کہ وہ ذات انسان کی صورت میں ہے۔ تمہیں شرم آنی چاہیے کہ اس طرح کی باتیں تو بے ایمان زندیق اور اشترا کی بھی نہیں کرتے کہ حضرت رسول خداؐ کی طرف سے کوئی پیغام لائیں اور پھر اس کے خلاف کوئی بات پیش کریں۔''

ابوقرہ نے کہا: کیا آپؑ رویت خدا کی روایات کا انکار کرتے ہیں؟

امامؑ نے فرمایا:

''ہاں جو روایات قرآن کے مخالف ہوں میں ان کی تکذیب کرتا ہوں، اسی طرح اگر کوئی قول مسلمانوں کے مسلمات کے خلاف ہو تو میں اس کا بھی انکار کرتا ہوں۔ چنانچہ (مسلمانوں کا اتفاق ہے) کہ کوئی بھی خدا کا علمی احاطہ نہیں کرسکتا، آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور نہ ہی اس کی کوئی مثال ہوسکتی ہے۔''[1]

۳۔ اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

"ان الله عظيم رفيع لا يقدر العباد على صفته ولا يبلغون كنه عظمته۔ لا تدركه الابصار هو يدرك الابصار وهو اللطيف الخبير۔"

''خدا بزرگ ہے اور بلند مقام رکھتا ہے۔ بندے اس کی توصیف پر قادر نہیں، وہ اس کی کنہہ عظمت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ لطیف و باخبر ہے۔''[2]

(۴) کیا اسماء خدا توقیفی ہیں؟

اس سے پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے کہ خداوند متعال کے نام اس کی صفات کے مظہر ہیں، جیسے اس کی صفات غیر متناہی ہیں۔ اسی طرح اس کے نام بھی غیر متناہی ہیں۔ لیکن بہت سی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کسی کو خدا کا کوئی نام تجویز کرنے یا اس کی کسی وصف کے ساتھ توصیف کرنے کا حق نہیں جب تک وہ نام یا وصف کتاب وسنت (قرآن وحدیث معتبر) میں وارد نہ ہوا ہو۔ اس کی وہی وجہ ہے (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کہ بہت سے اسماء واوصاف ایسے مفاہیم سے مخلوط ہیں کہ جن میں مخلوقات کے نقائص اور محدودیت پائی جاتی ہے۔ ان اسماء کا خدا پر اطلاق ہمیں اس کی معرفت سے دور اور شرک وتشبیہ کے بھنور میں جا پھینکتا ہے۔

اس بنا پر مفکرین میں یہی قول مشہور ہے کہ اسماء خدا توقیفی ہیں، یعنی ذات الٰہی پر، کسی نام کا اطلاق شریعت کی طرف سے اجازت پر

---

[1] توحید صدوق باب ماجاء فی الرویۃ ص ۱۱۰ حدیث ۹

[2] توحید الصدوق باب ماجاء فی الرویہ صفحہ ۱۱۵ حدیث ۱۲

موقوف ہے۔لہٰذا وہ اس امر کی اجازت نہیں دیتے کہ خدا پر عاقل، فقیہہ، طبیب اور سخی جیسے ناموں کا اطلاق کیا جائے، کیونکہ آیات وروایات معتبرہ میں اس بات کا اشارہ نہیں ملتا۔[1]

بلند پایہ اسلامی مفسر مرحوم طبرسی سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۰ (ولله الاسما الحسنی) کے ذیل میں فرماتے ہیں: یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اس کے لیے کوئی بھی نام استعمال نہیں کر سکتے جو خدا نے خود اپنے لیے قرار نہ دیا ہو۔[2]

اسی بنا پر علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں: خدا کو سخی نہیں کہا جا سکتا۔البتہ (جواد) کہا جا سکتا ہے کیونکہ سخاوت کے معنی میں ''نرمی ورقت'' پائی جاتی ہے۔ یہ کلمہ ان افراد پر بولا جاتا ہے جو لوگوں کی حاجات سنتے وقت نرم روئی سے پیش آتے ہیں۔(نرمی وخشونت خدا پر نہیں بولے جاتے بلکہ یہ مخلوق کی صفات ہیں)۔[3]

لیکن علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اسماء الٰہی کے توقیفی ہونے پر کوئی دلیل نہیں اور سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۰ بھی اس پر دلالت نہیں کرتی۔

اگرچہ فقہی لحاظ سے توقف کیا ہے اور اس مسئلے کو فقہ کی طرف پلٹا دیا ہے۔

آخر میں فرماتے ہیں دین میں احتیاط کا تقاضا ہے کہ خدا کے وہی نام بولے اور لکھے جائیں جو قرآن وسنت کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔لیکن اگر نام کے عنوان سے نہیں بلکہ ویسے ہی خدا کی کوئی صفت بتائی جائے اور لفظ بول دیا جائے تو معاملہ سہل ہے۔[4]

لیکن مرحوم کلینیؒ نے اصول کافی جلد اول باب النهی عن الصفة بغير ما وصف به نفسه تعالیٰ میں بہت سی روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماء الٰہی توقیفی ہیں۔ان میں سے ایک روایت امام موسیٰ ابن جعفرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"ان الله اعلى و اجل و اعظم من ان يبلغ كنه صفته، فصفوه بما وصف به نفسه و كفوا عما سوى ذلك"۔

''خدا اس سے بالا وبرتر ہے کہ اس کی صفات کی کنہہ معلوم ہو سکے، پس اس کے لیے انہی صفات کا اطلاق کرو جن کا اطلاق خود اس نے اپنی ذات پر کیا ہو اور اس کے غیر سے رک جاؤ۔''[5]

ایک اور حدیث حضرت امام ابوالحسنؑ سے منقول ہے کہ جب مفضل نے بعض صفات کے متعلق سوال کیا تو جواب میں فرمایا:

---

[1] تفسیر فخر الرازی جلد ۱۵ صفحہ ۷۰ لیکن بعض الفاظ دعاؤں میں موجود ہیں لہٰذا ان سے ممانعت مسلم نہیں ہے۔

[2] مجمع البیان جلد ۴ صفحہ ۵۰۳

[3] بحار الانوار جلد ۴ صفحہ ۲۰۶

[4] تفسیر المیزان جلد ۸ صفحہ ۳۷۵ ذیل آیہ ۱۸۰ اعراف

[5] اصول کافی جلد اول صفحہ ۱۰۲ باب النہی عن الصفۃ حدیث ۶

"لا تجاوز ما فی القران"

''جو کچھ قرآن میں آیا ہے اس سے تجاوز نہ کرو۔''[1]

نیز ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی کو لکھا:

"فاعلم رحمك الله۔ ان المذهب الصحيح فی التوحيد مانزل به القران من صفات الله عزوجل فانف عن الله تعالی البطلان والتشبيه فل ا نفيولا تشبيه، هو الله والثابت الموجود تعالی الله عما يصفه الواصوان ولا تعدوا القران فتضلوا بعد البيان۔"

''جان رکھو! خدا تم پر رحمت کرے۔ عقیدہ توحید میں صفات کے بارے میں صحیح اصول وہی ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا خدا سے تشبیہ اور بطلان کی نفی کرو۔ نہ صفات کی تعطیل صحیح ہے اور نہ تشبیہ کہ وہ خدا ثابت اور موجود ہے۔ لوگوں کے بیان کردہ اوصاف سے بلند و بالا ہے۔ حجت قرآن کے ظاہر ہونے کے بعد اس سے تجاوز نہ کرو نہیں تو گمراہ ہو جاؤ گے۔''[2]

ان روایات کی طرف توجہ کے بعد کتاب وسنت میں مذکورہ صفات کے علاوہ خدا کے نام تجویز کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ بالخصوص اصل برأت سے استدلال کے تحت خدا پر بعض ناموں کا مجازی طور پر اطلاق خالی از اشکال نہیں ہے۔ احتیاط یہی ہے کہ جو اوصاف شریعت میں ثابت ہیں ان کے علاوہ دوسرے اسماء واوصاف سے استفادہ نہ کیا جائے۔

بعض اوقات خدا کے ناموں کے توقیفی ہونے پر قرآن سے استدلال کیا جاتا ہے۔ جیسے قصہ نوح میں بت پرستوں سے کہا جا رہا ہے۔ "اتجادلونني فی اسمآء سميتموها انتم واباؤ كم مانزل الله بها من سلطان" کیا میرے ساتھ ان ناموں کے سلسلہ میں مجادلہ ومقابلہ کر رہے ہو جو تم نے اور تمہارے آباواجداد نے اپنی طرف سے رکھے ہوئے ہیں جب کہ خدا کی طرف سے کوئی دلیل نازل نہیں ہوئی۔'' (اعراف آیت ۷۱)

نیز قصہ نوح میں یہ بھی آیا ہے۔ "ماتعبدون من دونه الا اسمآء سميتموها انتم واباؤ كم ما انزل الله بها من سلطان" خدا کے سوا تم جن معبودوں کو پکارتے ہو وہ نام کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں اور خدا نے کوئی دلیل اس پر نازل نہیں کی۔'' (سورۂ یوسف ۴۰)

---

[1] اصول کافی جلد اول صفحہ ۱۰۲۔ باب النہی عن الصفۃ حدیث ۷

[2] اصول کافی جلد اول ص ۳۵۱۔ باب نفی از صفۃ حدیث ۶

ان آیات کی مقصود پر دلالت خالی از اشکال نہیں کیونکہ اس میں شرک و بت پرستی کی نفی کی جارہی ہے نہ یہ کہ اسماء کے توقیفی ہونے پر استدلال کیا گیا ہو۔

بعض کا استدلال ہے کہ نام تجویز کرنا معرفت کی فرع ہے اور معرفت ادراک کی فرع ہے۔ چونکہ ذات وصفات کا ادراک انسان کے لیے ممکن نہیں۔ لہٰذا اس پر اسی نام کا اطلاق کیا جائے گا جو اس کی طرف سے یا اس کے نمائندگان کی طرف سے تجویز کردہ ہو۔ ہم اس بحث کو کتاب معارف الائمہ میں مذکور عمدہ اشعار سے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔[1]

والوقف مشهور لدى الاصحاب
والعقل يستحسنه فى الباب
فانما التوصيف فروع المعرفة
والحق فى العرفان ماقد وصفه
بل جرئة لا يومن التشبيه
ويلزم القول بغير العلم
مع فقد سلطان عليه علمى

اسماء خدا کا توقیفی ہونا علماء میں مشہور ہے۔ عقل اسی کو بہتر سمجھتی ہے۔

کیونکہ توصیف معرفت کی فرع ہے۔ معرفت میں حق وہی ہے جس سے خدا نے اپنی توصیف کی ہے۔ اس کے علاوہ خدا کی تنزیہ و پاکیزگی نہیں ہوگی بلکہ ایسی جرأت اور جسارت ہے جس کی وجہ سے تشبیہ سے مامون نہیں ہوں گے۔

اس قول کا لازمہ قول بغیر علم ہوگا، یا دلیل علمی کا نہ ہونا ہوگا۔

---

[1] معرفت الائمہ ص ۴۲۷

اسمائے حسنیٰ اور اسم اعظم

اشارہ

قرآن مجید اور روایات اسلامی میں "اسمائے حسنیٰ" (خدا کے اچھے نام) کا عنوان دیکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں اجمالی طور پر اور احادیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان اسماء سے صفات سمجھے جاسکتے ہیں کیونکہ یہ نام درحقیقت صفات ہی ہیں۔ لہٰذا ان کے انتخاب میں اس اہمیت کا لحاظ ضرور کیا جائے۔ لیکن یہ اہمیت و بزرگی کس طرح پیدا ہوئی؟ اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس کا تذکرہ آیات و روایات کی تشریح کے بعد ہوگا۔

اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن مجید کی طرف رخ کرتے اور ان آیات کو گوش دل سے سنتے ہیں:

(۱) وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ (اعراف ۱۸۰)

(۲) قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ (اسراء ۱۱۰)

(۳) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸ (طٰہٰ ۸)

(۴) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ (حشر ۲۴)

ترجمہ

(۱) خدا کے بہترین نام ہیں، اسے انہی ناموں کے ساتھ پکارو اور انہیں چھوڑ دو، جو اس کے ناموں میں الحاد و بے دینی سے کام لیتے ہیں۔

(۲) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو۔ تم اس کو جس طرح بھی پکارو اس کے تمام نام بہترین ہیں۔

(۳) وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں۔ اس کے بہترین نام ہیں۔

(۴) وہ ایسا خدا ہے جو پیدا کرنے والا، متوازن کرنے والا اور بلا مثال صورتیں بنانے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

خدا کے مخصوص نام

(۱) پہلی آیت کی تفسیر قبل ازیں ذکر ہو چکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے ناموں میں تحریف اور تغیر و تبدل کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔ فرمان ہے۔

''خدا کے بہترین نام ہیں، انہی ناموں کے ساتھ پکارو۔ جو اس کے ناموں میں الحاد و بے دینی کرتے ہیں انہیں چھوڑ دو۔'' (جیسے اس سے پہلے بتوں کے نام رکھتے تھے)، یا خدا پر مخلوقات کے ناموں کا اطلاق کرتے اور شرک و تشبیہ میں گرفتار ہو جاتے تھے) "ولله الاسمآء حسنى فادعوه بها وذروا الذين يلحدون فى اسمآئه۔"

(۲) دوسری آیت میں مشرکوں کا یہ بہانہ کہ جب پیغمبر اسلام توحید کے قائل ہیں تو خدا کو مختلف ناموں سے کیوں پکارتے ہیں۔ خصوصاً رحمن کا نام کہ یہ ان لوگوں کے لیے نیا تھا۔ (توحید کا نظریہ اور اتنے زیادہ نام کیوں) ''اس بہانہ کی طرف اشارہ کے بعد فرمان ہے: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن، تم اس کو جس طرح بھی پکارو اس کے نام نام بہترین ہیں۔'' (قل ادعوا الله اوادعوا الرحمن ايا ما تدعوا فله الاسمآء الحسنى)

(۳) تیسری آیت میں خدا کی توصیف، خالقیت، مالکیت، تدبیر عالم ہستی اور تمام ظاہر و مخفی چیزوں سے اس کی آگاہی کے تذکرہ کے بعد فرمان ہے:

''وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں، اس کے بہترین نام ہیں۔'' (الله لا اله الا هو له الاسمآء الحسنى)

''ہاں وہی ان بہترین اسماء و صفات کا مالک اور الوہیت و عبودیت کے لائق ہے۔ اس کے سوا کوئی اس لائق نہیں۔''

(۴) چوتھی اور آخری آیت میں خدا کے بہت سے اوصاف جو پہلی آیات میں ذکر ہوئے (تقریباً دس صفات) کے تذکرے کے بعد فرمان ہے:

''وہ ایسا خدا ہے جو پیدا کرنے والا، متوازن کرنے والا، بلامثال صورتیں بنانے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔''

"هو الله الخالق البارى المصور له الاسماء الحسنى"

اس کے بعد کچھ اور اہم اوصاف کا تذکرہ ہو رہا ہے اور مجموعی طور پر ان صفات کی تعداد اٹھارہ ہو جائے گی۔

ان آیات سے بخوبی معلوم ہوا کہ اسمائے حسنیٰ میں صفات جمال و جلال اور عظمت حق تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے۔ ہر ایک خاص کمال یا کسی نقص کی نفی کی حکایت کر رہا ہے اور یہ فقط سادہ سا نام نہیں ہے۔ یہ اسماء و صفات قرآن کی مختلف آیات میں مذکور ہیں اور انہی پر

تکیہ وبھروسہ کیا گیا ہے۔

اب ہم اس موضوع سے بحث کرتے ہیں کہ اسمائے حسنیٰ کون کون سے ہیں؟ کیا ان کی کوئی خاص تعداد ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر وہ تعداد کتنی ہے؟

توضیحات

(۱) اسمائے حسنیٰ کی حقیقت کیا ہے؟

اسمائے حسنیٰ جیسا کہ ذکر ہوا خدا کے بہترین نام ہیں۔ مسلما خدا کے سارے ہی نام بہترین ہیں۔ لہٰذا اسمائے حسنیٰ خدا کے سب ناموں کو شامل ہوں گے جیسا کہ سورۂ اسرأ آیت ۱۱۰ (دوسری آیت مورد بحث) کے شانِ نزول میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی مشرکوں نے سنا کہ پیغمبر اکرمؐ فرمارہے ہیں: یااللہ، یارحمن۔ اس پر وہ طعن وتشنیع کے عنوان سے کہنے لگے کہ آپ ہمیں تو دو معبودوں کی پرستش سے منع کرتے ہیں اور خود دوسرے معبود کا ذکر کررہے ہیں۔ چنانچہ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور تعدد الٰہ کے خیال کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سب اسمائے حسنیٰ خدا کے بہترین نام ہیں لیکن سب کا اشارہ ایک ذاتِ حق کی طرف ہے۔[1] اس لحاظ سے سب مختلف تعبیریں ہیں جو ذات واحد، غیر متناہی کی حکایت کررہی ہیں۔ بقول شاعر

عبار اتنا شتی وحسنك واحد
وكل الى ذاك الجمال يشير

''ہماری تعبیریں مختلف ہیں، لیکن تیرا حسن ایک ہی ہے اور سب عبارتیں اس کے جمال بے مثال کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔''

قرآن مجید کی تعبیرات سے معلوم ہوا کہ سب اسماء، اسمائے حسنیٰ ہی کا حصہ ہیں۔

''واللہ الاسماء الحسنی فادعوہ بہا'' (پہلی آیت مورد بحث)

اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ خدا کے نام اس کے کمال ذات کی خبر دے رہے ہیں (جیسے عالم وقار) یا اس ذات بے مثال سے ہر قسم کے نقص کے دور ہونے کی خبر (جیسے قدوس) یا فیض وجود ''افعال'' کی مختلف جہات کی حکایت (جیسے رحمان، رحیم، خالق، مدبر اور رازق)۔

آیات فوق کی تعبیر، جس میں حصر ہے، وہ نشاندہی کررہی ہے کہ اسمائے حسنیٰ خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں کیونکہ یہ کمالات کے مظہر ہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ واجب الوجود عین کمال وکمال مطلق ہے۔ لہٰذا حقیقی کمال اسی کا ہے اور اس کا غیر ممکن الوجود اور سراپا فقر واحتیاج ہے۔

---

[1] مراۃ العقول جلد ۲ ص ۳۰

اس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ روایات میں (جیسا کہ آئندہ اس طرف اشارہ ہوگا) اسمائے حسنیٰ کی معین تعداد ذکر کی گئی ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسمائے حسنیٰ تمام صفات کے جامع نہیں بلکہ وہ مخصوص ناموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ مخصوص تعداد کا تذکرہ ان کی اہمیت کی وجہ سے ہے اور یہ حصر کی دلیل نہیں ہے۔علاوہ ازیں آیندہ بحثوں میں ذکر ہوگا کہ بعض نام ''اصل'' ہیں اور ان سے کئی شاخیں نکلتی ہیں؟ جیسے ''رازق'' (روزی دینے والا)، ''رب'' (مالک و مدبر) کی شاخ ہے۔اسی طرح ''محیی'' (زندہ کرنے والا) ''ممیت'' (موت دینے والا) کی صورتِ حال بھی یہی ہے۔

یہ امر بہت بعید ہے کہ شریعت میں (حقیقت شرعیہ کی اصطلاح کے طور پر) اسماء حسنی کا کوئی علیحدہ مفہوم و معنی ہو۔ بلکہ ان کے وہی لغوی معنی (بہترین نام) ہی ہیں جو تمام ناموں اور اوصاف کو شامل ہیں۔

قرآن مجید کہہ رہا ہے ''خدا کے بہترین نام ہیں، اس کو انہی سے پکارو'' یہ درحقیقت اشارہ ہے کہ بے دینی اور الحاد کی وجہ سے خدا کے ناموں میں تحریف نہ کرو کہ بتوں کے بھی یہی نام رکھ دیئے جائیں یا نقائص سے بھری ہوئی مخلوقات کے نام خدا پر بولے جائیں یا ہوسکتا ہے یہ مراد ہو کہ ناموں کا متعدد ہونا وحدت خدا کے منافی نہیں کیونکہ یہ تعدد مختلف جہات کی طرف توجہ کی وجہ سے ہے۔کبھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔لہٰذا اسے ''عالم'' کہہ دیا جاتا ہے، کبھی اس کی طاقت وقوت کے عنوان سے قادر کہہ دیا جاتا ہے۔بہرحال قرائن یہی بتاتے ہیں کہ تمام نام اسمائے حسنی ہیں اگرچہ بعض کی اپنی جگہ خاص اہمیت ہے۔

(۲) اسمائے حسنیٰ کی تعداد اور ان کی تفسیر

اہل بیت اور اہل سنت کے طرق سے منقول متعدد روایات میں وارد ہے کہ اسمائے حسنیٰ کی تعداد (۹۹) ننانوے ہے۔ان میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک معروف روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"ان له تسعة وتسعين اسما ـ مأة الا واحدا ـ من احصاها دخل الجنة انه وتر يحب الوتر"

''خدا کے ننانوے (۹۹) نام ہیں یعنی ایک کم سو۔ جو ان کو شمار کرے گا جنت میں داخل ہوگا۔خدا فرد ہے اور ''فرد'' ہی کو دوست رکھتا ہے۔''[1]

توحید صدوق میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک روایت میں حضرت علیؑ رسول اللہؐ سے ناقل ہیں حضرت اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

وهی الله الا له، الواحد، الاحد، الصمد، الاول، الاخر، السميع، القدير،

---

[1] یہ روایت تفسیر درمنثور (جلد ۳ صفحہ ۱۴۷) میں صحیح بخاری، مسلم، مسند احمد، سنن ترمذی اور کئی دوسری کتابوں میں منقول ہے۔

القاهر، العلی، الاعلی، الباقی، الدبع، البارى، الاکرم، الظاهر، الباطن، الحی، الحکیم، العلیم، الحلیم، الحفیظ،الحق، الحسیب، الحمید، الحفی، الرب، الرحمن، الرحیم، الذارى، الرزاق، الرقیب، الروف، الرائی، السلام، المومن، المهیمن، العزیز، الجبار، المتکبر، السید، السبوح، الشهید، الصادق، الصانع، الطاهر، العدل، العفو، الغفور، الغنی، الغیاث، الفاطر، الفرد، الفتاح، الفالق، القدیم، الملك، القدوس، القوی، الغریب، القیوم، القابض، الباسط، قاضی الحاجات، المجید، المولی، المنان، المحیط، المبین، المقیت، المصور، الکریم، الکبیر، الکافی، کاشف الضر، الوتر، النور، الوهاب، الناصر، الواسع، الودود، الهادی، الوفی، الوکیل، الوارث، البر، الباعث، التواب، الجلیل، الجواد، الخبیر، الخالق، خیر الناصرین، الدیان، الشکور، العظیم، اللطیف، الشافی۔ [1]

ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اسماءِ حسنیٰ کے احصار وشمار کا مطلب یہ نہیں کہ جو بھی ۹۹ نام زبان پر لائے گا جنت کا مستحق ہو جائے گا۔ بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ وہ ان اسماء کے مفاہیم کی معرفت اور ان پر ایمان رکھتا ہو۔ وہ ان اسما سے خدا کی پہچان کرتے ہوئے خود کو ان اوصاف سے متصف کرے۔ یعنی خدا کے علم وقدرت اور رحمت ورافت کی شعاعیں اس پر ترین کیونکہ لازمہ ایمان انہی اوصاف کمالیہ کو اپنے اخلاق وکردار میں جاری وساری کرنا ہے۔

ایک اور روایت جو توحید صدوق میں حضرت امام علیؑ رضا نے اپنے آباؤ اجداد کے توسط سے حضرت علیؑ سے نقل کی ہے، اس میں فرمایا:

"قال رسول الله: لله عزوجل تسعة و تسعون اسما من دعا الله بها

---

[1] توحید صدوق ص ۱۹۴ باب اسماء اللہ۔ حدیث ۸۔ توجہ رہے کہ اس حدیث میں ۱۰۰ نام ہیں۔ اللہ چونکہ سب کا جامع ہے اسے شمار نہ کریں۔ مجموعی طور پر ۹۹ ہو جائیں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ الرائی نسخہ بدل الرؤف ہے۔

استجاب له و من احصاها دخل الجنه۔"

''حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ خدا کے ۹۹ نام ہیں جو ان کے ذریعے خدا کو پکارے اس کی دعا قبول ہوگی اور جو ان کو شمار کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

اس روایت کے ذکر کے بعد مرحوم صدوق فرماتے ہیں: احصا سے مراد ان کا احاطہ علمی اور ان اسماء کے معانی کی معرفت ہے۔ فقط شمار کر لینا کافی نہیں۔[1]

بعض روایات میں اسماء الٰہی کچھ زیادہ ذکر کیے گئے ہیں اور بعض دعاؤں جیسے دعائے جوشن کبیر میں خدا کے ہزار نام ہیں۔ لیکن ان روایات میں باہم منافات نہیں ہے جیسے کہ پہلے اشارہ ہوا ہے کہ یہ ۹۹ نام وصفات وہ ہیں جن کی اہمیت وعظمت سب سے زیادہ ہے۔

مرحوم صدوق نے کتاب توحید میں ان ۹۹ اسماء کی مفصل شرح فرمائی ہے۔ اس بحث کی تکمیل اور ان اسماء وصفات کی زیادہ معرفت کے لیے ہم اس شرح کا بالاختصار ذکر کرتے ہیں:

(۱)(۲) اللہ والہ (تمام کمالات کی جامع ذات) جو لائق عبادت ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

(۳)(۴) الواحد، الاحد۔ یعنی وہ ذات جس کے نہ اجزاء ہیں اور نہ اس کی کوئی شبیہ، نظیر اور مثل ہے۔

(۵) الصمد۔ آقا، بزرگ۔ وہ ذات کہ سبھی جس کے محتاج ہیں اور وہ سب سے بے نیاز ہے۔

(۶)(۷) الاول والاخر۔ جس کا معنی وہ اول ہے کہ جس کا کوئی اول نہیں اور وہی آخر ہے کہ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ بہ الفاظ دیگر ایسی ذات جو ازلی وابدی ہے۔

(۸) اسمیع۔ اس کا معنی وہ ذات ہے جس کا احاطہ تمام مسموعات پر ہے۔

(۹) البصیر۔ وہ ذات جو تمام دیکھنے والوں پر محیط ہے۔

(۱۰) القدیر۔ جو سب چیزوں پر قادر ہے۔

(۱۱) القاھر۔ وہ ذات کہ ہر چیز جس کے فرمان کے تابع اور ہر شے اس کی مقہور ہے۔

(۱۲) العلی۔ جس کا مقام بلند ہے۔

(۱۳) الاعلی۔ جو کامیاب وغالب یا ہر شے سے برتر واعلیٰ ہے۔

(۱۴) الباقی۔ ایسی ذات جس کے لیے فنا نہیں

(۱۵) البدیع۔ وہ وہی ہے جس نے جہان کی تمام چیزوں کو کسی سابقہ نمونے کے بغیر پیدا کیا۔

(۱۶) الباری۔ مخلوق کو پیدا وظاہر کرنے والا۔

---

[1] توحید صدوق ص ۱۹۵۔ حدیث ۹

(۱۷) الاکرم۔ وہ جوسب سے کریم وشریف ہے۔

(۱۸) الظاھر۔ وہ ذات جواپنی آیات ونشانیوں (جواس کی قدرت وحکمت سے ظاہر ہوئیں) کی وجہ سے ظاہر وآشکار ہے۔

(۱۹) الباطن۔ جس کی کنہہ ذات افکار وخیالات کی دسترس سے باہر ہے۔

(۲۰) الحی۔ وہ ذات جوفعال، مدبراور (مالک علم وقدرت) ہے۔

(۲۱) الحکیم۔ وہ جس کے تمام افعال درست واستوار ہیں اورفساد وغلطی سے خالی ہیں۔

(۲۲) العلیم۔ وہ ذات جواپنی ذات سے آگاہ ہے۔نیز ہمارے اندرونی اسرار اور آسمان وزمین کا کوئی ذرہ اس سے مخفی نہیں۔

(۲۳) الحلیم۔ جوگناہگاروں کے گناہ کے مقابل بردبار ہے اورسزا دینے میں اسے کوئی جلدی نہیں۔

(۲۴) الحفیظ۔ وہ تمام موجودات کا حافظ ونگہبان ہے۔

(۲۵) الحق۔ جس کا وجود ثابت وپائیدار ہے اورعینیت وواقعیت بس اسی کی ہے۔اس کے سوا ہر شے مجازی ہے۔وہی حقیقت مطلقہ ہے۔

(۲۶) الحسیب۔ وہ جس کے پاس ہر شے کا شمار ہے۔وہ سب سے آگاہ ہے۔بندے کا حساب اسی کے پاس ہے۔وہی حاجتیں پوری کرنے والا ہے۔

(۲۷) الحمید۔ جوہر قسم کی حمدوتوصیف کے لائق ہے۔

(۲۸) الحفی۔ وہ عالم وآگاہ ہے۔وہی سب کے ساتھ زیادہ لطف ونیکی کرنے والا ہے۔

(۲۹) الرب۔ یعنی وہ مالک، مدبراور مصلح ہے۔

(۳۰) الرحمان۔ اس کی رحمت واسعہ سب کوشامل ہے۔

(۳۱) الرحیم۔ اس کی رحمت خاصہ مومنین کوشامل ہے۔

(۳۲) الذاری۔ وہی خالق ہے (اصل میں اس کلمہ کا معنی اظہار کرنے والا ہے چونکہ خلقت سبب اظہار ہے۔اس لیے یہ کلمہ خالق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔)

(۳۳) الرازق۔ وہ جوسب (نیک وبد) بندوں کوروزی دیتا ہے۔

(۳۴) الرقیب۔ بمعنی حافظ ونگہبان۔

(۳۵) الروف۔ وہ رحیم ومہربان ہے۔بعض نے رحیم ورؤف میں فرق قرار دیا ہے۔

رافت۔ اطاعت کرنے والوں پرمہربانی اوررحمت گناہگاروں کے لیے۔

(۳۶) الرائی۔ جوبیناوآگاہ ہے۔

(۳۷) السلام۔ وہ ذات جوسلامتی کا منبع وسرچشمہ ہے اور ہر قسم کی سلامتی اسی کا فیض ہے۔

(۳۸) المومن۔ وہ ذات جواپنے وعدے پورے کرتی ہے۔اس نے اپنی آیات اورنشانیوں، تدبیر کے عجائب اوراپنی تقدیر کے لطائف

سے دلوں میں ایمان کو ایجاد کیا۔ بندوں کو ظلم و جور سے امان دی اور مومنوں کو عذاب سے محفوظ کر دیا۔

(۳۹) المهيمن۔ یعنی گواہ و شاہد اور سب کا محافظ۔

(۴۰) الجبار۔ وہ جو ہر شے پر مسلط ہے۔ افکار و خیالات اس کی عظمت تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ اپنے ارادہ کی وجہ سے ہر شی کی اصلاح کرتا ہے۔

(۴۱) المتكبر۔ جو بزرگی کے لائق ہے۔ کوئی شے اس سے برتر نہیں۔

(۴۲) السيد۔ بزرگ، عظیم اور واجب الاطاعۃ بادشاہ۔

(۴۳) السبوح۔ ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ و پاک۔[1]

(۴۴) الشهيد۔ شاہد اور ہر جگہ حاضر۔

(۴۵) الصادق۔ جو گفتار میں سچا اور اپنے وعدوں میں تخلف نہیں کرتا۔

(۴۶) الصانع۔ ہر چیز کا بنانے والا اور ہر شے کا خالق۔

(۴۷) الطاهر۔ ہر قسم کی تشبیہ و مثال اور صفات مخلوقات سے پاک۔

(۴۸) العدل۔ ہر معاملہ میں عدالت کرنے والا حاکم۔

(۴۹) العفو۔ بندوں کے گناہوں کو مٹانے والا۔ اصل میں عفو کا معنی (محو) ہے۔

(۵۰) الغفور۔ مغفرت و بخشش کرنے والا۔

(۵۱) الغني۔ وہ ذات جو نہ کسی کی محتاج ہے اور نہ اسے آلات و اسباب کی احتیاج ہے۔

(۵۲) الغياث۔ ہر کسی کا فریادرس۔

(۵۳) الفاطر۔ جس نے جہان کو پیدا کیا، اشیاء کو کسی نمونے کے بغیر پیدا کیا اور موجودات کو پردۂ عدم سے عالمِ ہستی میں لایا۔

(۵۴) الفرد۔ وہ کہ ربوبیت بھی اسی کی ہے اور کوئی اس کا ثانی نہیں۔

(۵۵) الفتاح۔ حاکم۔ ایسی ذات جو ہر مشکل کو حل کرنے والی ہے۔

(۵۶) الفالق۔ مادۂ فلق سے بمعنی شگافتہ کرنے والا، وہ جس نے دانہ اور گیاہ کو دل زمین سے نکالا، جنین کو شکم مادر سے پیدا کیا، تاریکی شب سے نور سپیدہ صبح کو شگافتہ کیا۔ پردۂ عدم کو موجودات کی خلقت سے پارہ پارہ کیا۔

(۵۷) القديم۔ وہ جو ہمیشہ سے تھا، اس کا انجام و آغاز نہیں۔

(۵۸) الملك۔ وہی مالک حکومت اور جہانِ ہستی کا حاکم ہے۔

---

[1] توجہ رہے کہ عربی میں سوائے ''سبوح'' و ''قدوس'' کے اس وزن پر کوئی اور کلمہ پایا نہیں جاتا، ان دونوں کے معانی ایک ہی ہیں۔

(۵۹) القدوس۔ ظاہر۔ ہر قسم کی آلودگی ونقائص سے پاک۔

(۶۰) القوی۔ قدرت وطاقت رکھنے والا، اس کے افعال کسی کے محتاج نہیں ہیں۔

(۶۱) القریب۔ جوسب سے نزدیک تر ہے، ہماری باتوں کوسنتا اور دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔

(۶۲) القیوم۔ وہ قائم بالذات ہے اور تمام موجودات اسی سے قائم ہیں۔

(۶۳) القابض۔ جو ارواح کو بدنوں سے قبض کرتا ہے۔ نورِ آفتاب کو غروب کے وقت جمع کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے روزی میں بسط و وسع اور کچھ کے لیے قبض اور بندش کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جہان مصلحت دیکھے نور وجود کو اٹھالیتا ہے۔

(۶۴) الباسط۔ قابض کا نقطہ مقابل۔ جو فیض ہستی کو وسعت دیتا ہے۔ بندوں کو نعمات عطا کرتا ہے۔ سب کو اپنے فضل واحسان کے دائرہ میں لے آتا ہے۔

(۶۵) قاضی الحجات۔ اس کا مادہ قضیٰ ہے جس کا معنی حکم والزام ہے۔ کبھی خبر دینے اور کبھی اتمام کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس جگہ اتمام اور مخلوق کی حاجات کو پورا کرنے کے معنی میں ہے۔

(۶۶) المجید۔ یعنی کریم، عزیز اور صاحب مجد وعظمت۔

(۶۷) المولیٰ۔ مدد کرنے والا اور سرپرست۔

(۶۸) الحنان۔ قسم قسم کی نعمتیں دینے والا۔

(۶۹) المحیط۔ جس کا تمام چیزوں پر احاطہ ہو اور ہر چیز سے آگاہ ہو۔

(۷۰) المبین۔ اس کی قدرت کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں اور اس کا حکم عالم تشریع وتکوین میں ظاہر ہے۔

(۷۱) المقیت۔ حافظ ونگہبان کے معنی میں ہے۔

(۷۲) المصور۔ وہ ذات جو مخلوق کو صورت عطا فرمائے اور جنین کو ماں کے پیٹ میں شکل وصورت عطا فرمائے۔

(۷۳) الکریم۔ اس کا معنی عزیز اور اسی طرح اس کا معنی جواد اور بخشنے والا ہے۔

(۷۴) الکبیر۔ بزرگ وآقا۔

(۷۵) الکافی۔ وہ ذات جو بندوں کے لیے کافی ہے جو اس پر توکل کریں وہ ان کی حاجات پوری کرنے والا ہے۔

(۷۶) کاشف الضر۔ مصیبتیں، تکالیف اور دکھ درد کو دور کرنے والی ذات۔

(۷۷) الوتر۔ وہ فرد، بے نظیر اور بے مثال ہے۔

(۷۸) النور۔ وہ جہاں کو روشنی بخشنے والا، فرمان دینے والا اور ہدایت کرنے والا ہے۔

(۷۹) الوھاب۔ جس کا مادہ "ھبہ" ہے۔ یعنی عطا کرنے والا۔

(۸۰) الناصر۔ یاور ومددگار۔

(۸۱) الواسع۔ غنی و بے نیاز اور ہر لحاظ سے صاحب وسعت۔

(۸۲) الودود۔ فاعلی و مفعولی ہر دو معنی لیے جا سکتے ہیں۔ پہلی صورت میں اس کا معنی دوست رکھنے والا اور دوسری صورت میں دوستی کے قابل۔

(۸۳) الهادی۔ بندوں کو حق و عدالت کی طرف رہبری کرنے والا۔ بلکہ تمام موجودات کو عالم تکوین اور صاحبان عقل و فکر کو عالم تشریع میں ہدایت دینے والا۔

(۸۴) الوفی۔ وہ جو عہد و پیمان پورا کرے۔

(۸۵) الوکیل۔ وہ ذات جو سرپرست، حافظ اور بندوں کے لیے پناہ گاہ ہے۔

(۸۶) الوارث۔ سوائے خدا کے جو بھی کسی چیز کا مالک ہے۔ وہ آخر کو مر جائے گا۔ جو کچھ ہے وہ یہاں رہ جائے گا اور اس کا مالک خدا ہی ہوگا۔

(۸۷) البر۔ صادق، سچا۔ نیز نیک و بخشنے والا کے معنی میں بھی ہے۔

(۸۸) الباعث۔ قیامت کے دن مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا۔ اسی طرح انبیاء کی بعثت بھی اسی کی طرف سے ہے۔

(۸۹) التواب۔ بندوں کی توبہ قبول کرنے والا۔ گناہوں کی وجہ سے لطف و مہربانی منقطع ہو جاتی ہے۔ توبہ کے بعد پھر عطا فرمانے والا۔ سب کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے۔

(۹۰) الجلیل۔ بزرگ عظیم۔ صاحب جلال و اکرام ذات۔

(۹۱) الجواد۔ نیک اور زیادہ انعام دینے والا، بخشنے والا۔

(۹۲) الخبیر۔ عالم و آگاہ اور باطن و اسرار سے باخبر۔

(۹۳) الخالق۔ پیدا کرنے والا۔ اصل میں ''خلق'' کا معنی اندازہ کرنا ہے۔ چونکہ خلقت میں بھی اندازہ کیا جاتا ہے اور تمام جہات کا لحاظ کیا جاتا ہے اس لیے اس کلمہ کا اطلاق اس پر ہوتا ہے۔

(۹۴) خیر الناصرین۔ جس کی مدد و نصرت وسیع اور ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہو۔

(۹۵) الدیان۔ بندوں کو اعمال کی وجہ سے جزا دینے والا۔

(۹۶) الشکور۔ جو بندوں کے اچھے اعمال کو عظمت دے اور اچھی جزا دے۔

(۹۷) العظیم۔ بزرگ، آقا، قادر و غالب۔

(۹۸) اللطیف۔ جو بندوں کی بہ نسبت لطیف و محبت رکھتا ہو۔ ان کے ساتھ اچھائی کرے۔ اس کی تدبیر میں باریک بینی ہو اور اشیاء لطیف کا خالق ہو۔

(۹۹) الشافی۔ بیماری، تکالیف اور درد میں شفا دینے والا۔[۱]

یہ کل ۹۹ نام ہیں جن کو روایات اسلامی میں اسماء حسنیٰ کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ روایات کی تعبیر ایک جیسی نہیں، یہاں دوبارہ یاددہانی ہوجائے کہ ان اوصاف میں سے بعض اوصاف خداوندعالم کے کمالِ ذاتی ہیں۔(صفات جمال)

بعض صفات ہر قسم کے عیب ونقص کی نفی کررہی ہیں۔(صفات جلال)

بہت سی ایسی صفات ہیں جو فعل کی وجہ سے ذکر ہوئی ہیں۔(صفات فعل)

ایک تعداد ایسی صفات کی بھی ہے جن کے معانی ایک جیسے ہیں۔البتہ ان کے معانی میں ظریف وباریک فرق بہرحال موجود ہے۔

اسم اعظم الٰہی کون سا ہے؟

اسماء حسنیٰ کی بحث کی مناسبت سے بہتر ہے کہ اسم اعظم کی بات بھی ہوجائے۔بہت سی روایات میں ''اسم اعظم'' کا تذکرہ ہوا ہے، ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اسم اعظم کے ذریعے خدا سے دعا کرے تو وہ قبول ہوگی اور خدا سے جو کچھ مانگے اسے مل جائے گا۔ان میں سے بعض روایات میں آیا ہے:

"والذی نفسی بیدہ لقد سئل اللہ باسمہ الاعظم الذی اذا سئل بہ اعطاہ و اذا دعی بہ اجاب"

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، جس نے خدا کو اس اعظم سے پکارا، ایسا اسم کہ اگر اس کے ذریعے خدا کو پکارا جائے تو وہ دیتا ہے اور اگر دعا کی جائے تو قبول کرتا ہے۔''[۲]

اس قسم کی دیگر تعبیریں بھی پائی جاتی ہیں۔نیز روایات میں ہے کہ سلیمانؑ کا وزیر ''آصف بن برخیا'' جس نے تخت بلقیس یمن سے لاکر شام میں ''سلمان'' کے سامنے حاضر کردیا، وہ اسم اعظم جانتا تھا۔[۳]

بنی اسرائیل میں ایک عابد وزاہد ''بلعم باعور'' جو مستجاب الدعوۃ تھا وہ اسم اعظم سے آگاہ تھا۔[۴]

علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں اسم اعظم کے بارے میں بہت سی روایات نقل کرتے ہوئے ان پر بحث کی ہے کہ ان اسماء میں اسم اعظم کون سا ہے۔ان سب کا ذکر تو طولِ کلام کا باعث ہوگا۔لہٰذا ان میں سے ایک روایت پیش کی جارہی ہے جو حضرت امام جعفر صادقؑ سے

---

[۱] کتاب توحید شیخ صدوق ص ۱۵۹۔۲۱۷ بہ اضافہ دیگر تفاسیر کہ جو ارباب لغت اور مفسرین سے لی گئی ہیں۔

[۲] بحارالانوار جلد ۹۳ ص ۲۲۵

[۳] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۲۳ بحارالانوار جلد ۱۴ ص ۱۱۳

[۴] بحارالانوار جلد ۱۳ ص ۳۷۷

مروی ہے۔آپؑ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ''اسم اعظم'' سورۂ فاتحہ میں متفرقا موجود ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' خدا تعالیٰ کے اسم اعظم کے ساتھ آنکھوں کی سیاہی اور سفیدی سے بھی زیادہ قریب ہے۔

دیگر روایات میں خدا کے ناموں اور اسماء حسنیٰ میں سے کئی مقدس نام اور آیات قرآن ذکر ہوئی ہیں۔ان میں سے ہر ایک دوسرے سے پر معنی ہے۔(مزید اطلاع کے لیے بحارالانوار جلد ۹۳ کی طرف رجوع فرمائیں)۔[1]

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ''اسم اعظم'' ایک کلمہ یا ایک جملہ یا قرآن مجید کی آیات میں سے ایک آیت ہے کہ بلا قید وشرط اس کی تمام تاثیر وقدرت ان الفاظ وحروف میں ہی پائی جاتی ہے؟

یا یہ اثر ان الفاظ میں حالات وشرائط کے ماتحت ہوگا۔یعنی تقوی، پاکیزگی نفس، حضور قلب، خدا کی طرف خصوصی توجہ، غیر سے قطع امید اور اسی ذات پاک پر کامل توکل بھی لازمی ہے۔

یا یہ کہ ''اسم اعظم'' اصلا کسی مقولہ لفظ سے ہے ہی نہیں۔اگر الفاظ کا سلسلہ درمیان میں آ گیا ہے تو اس لیے کہ حقائق ومفاہیم کی طرف اشارہ ہو جائے۔بہ الفاظ دیگر ان الفاظ کے مفاہیم جان انسان میں جاں گزیں ہو جائیں، وہ انہی کی تصویر بن جائے، وہ کمال کے ایسے مرحلہ پر پہنچ جائے کہ اس کی دعا مستجاب وقبول ہو اور وہ اذن خدا سے تمام موجودات تکوینی میں تصرف کر سکے۔ان تین احتمالات میں سے پہلا احتمال تو بہت بعید ہے کہ حروف والفاظ میں اتنا اثر ہو کہ بغیر اس کے کہ ایک کلام اور مضمونک ی طرف نظر ہو اور بغیر اس کے کہ کلمات کہنے والے کے اوصاف وحالات کا خیال کیا جائے ان کا اثر ظاہر ہونے لگے۔اگر چہ نظم ونثر کے افسانوں میں اسی طرح بتایا گیا ہے اور بعض کتب میں تو یہ بھی ہے کہ ایک عفریت اسم اعظم کے ذریعے اتنی طاقت رکھتا تھا کہ سلیمانؑ کی جگہ لے لے اور انہی کی طرح کام سرانجام دے۔

اسم اعظم کے متعلق اس قسم کے نتائج اخذ کرنا روح تعلیمات اسلامی سے بہت دور ہے۔پھر داستانِ بلعم باعور میں بھی ذکر ہے کہ جب وہ تقوی وطہارت نفس سے خالی ہو گیا تو اسم اعظم بھی اس کے پاس نہیں رہا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسم اعظم پڑھنے والے کے حالات و اوصاف کی وجہ سے ہی اس کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے۔لہٰذا صحیح صورت دوسری دو تفسیروں میں سے کوئی ایک ہوگی، ان میں آخری تفسیر بہتر ہے یا دونوں کو ایک ساتھ رکھا جائے۔

علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں مسئلہ اسم اعظم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر چہ خدا کے اسماء عموما اور اسم اعظم خصوصا عالم وسائط اور اس جہان میں نزول فیض کے اسباب میں موثر ہے لیکن تاثیر کا رابطہ ان اسماء کے حقائق کے ساتھ ہے الفاظ سے نہیں اور نہ ہی ذہن میں متصورہ معنی کافی ہیں۔[2]

---

[1] بحارالانوار جلد ۹۳ ص ۲۲۳ تا ص ۲۳۲ باب اسم الاعظم

[2] المیزان جلد ۸ ص ۳۷۲

جو کچھ پہلے کہا گیا ہے یہ کلام بھی اس کی تائید کرتا ہے، یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اسم اعظم کے بارے میں مختلف روایات اور تعبیریں ہیں۔ان میں ہر ایک کسی جداگانہ اسم اعظم کا ذکر کر رہی ہے۔

بعض میں بسم اللہ کو اسم اعظم کے سب سے زیادہ قریب کہا گیا ہے۔

بعض میں "بسم الله الرحمن الرحيم لا حول ولا قوة الا بالله العلي العظيم" نماز صبح کے بعد سو مرتبہ پڑھنے کو اسم اعظم کہا گیا ہے۔

بعض روایات میں سورۂ حمد اور سورۂ قل ہواللہ احد اور سورۂ انا انزلناہ اور آیۃ الکرسی کو اسم اعظم شمار کیا گیا ہے۔

بعض روایات میں سورۂ حشر کی آخری چھ آیات۔

بعض دوسری روایات میں قل اللهم مالك الملك تا ترزق من تشاء بغير حساب۔ (آل عمران ۲۶، ۲۷) اور اسی قسم کی دیگر تعبیریں کی گئی ہیں۔[1]

یہ فرق ممکن ہے کہ اسم اعظم کے تعدد یا خواہشات کے اختلاف کی وجہ سے ہو، بہر حال جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ دل کی پاکیزگی، خلوص نیت، خدا کی طرف توجہ، غیر خدا سے قطع امید اور ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنا (متخلق ہونا) ہی روح اسم اعظم کو تشکیل دیتا ہے۔

صفات خدا کی تقسیم

صفات خدا دو حصوں میں منقسم ہیں۔

(۱) صفات ذات (۲) صفات فعل

صفات ذات کے دو حصے ہیں

(۱) صفات جمال (۲) صفات جلال

صفاتِ جمال

وہ صفات ہیں جو خدا کے لیے ثابت ہیں۔ جیسے علم، قدرت، ازلیت اور ابدیت۔ ان کو صفات ثبوتیہ کہتے ہیں۔

صفاتِ جلال

وہ صفات ہیں جن کی خدا سے نفی کی گئی ہے۔ جیسے جہالت، عاجزی، جسمانیت اور اسی قسم کی دیگر صفات۔ ان کو صفاتِ سلبیہ کہتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کی صفات، صفاتِ ذات کہلاتی ہیں اور اس کے افعال سے قطع نظر قابل ادراک ہیں۔

صفات فعل:

---

[1] بحار الانوار جلد ۹۳ ص ۲۲۳ تا ص ۲۲۵، اصول کافی جلد ۱ ص ۱۰۷۱

وہ صفات جن کا تعلق افعال خدا کے ساتھ ہے یعنی فعل کے صدور سے پہلے وصف کا اطلاق خدا پر نہیں ہوگا اور وہ صدورِ فعل کے بعد ہی اس صفت سے متصف ہوگا جیسے خالق، رازق، محی، ممیت، (رزق دینے والا، زندہ کرنے والا اور موت دینے والا)۔

ہم پھر تاکید کر رہے ہیں کہ صفات ذات وصفات فعل غیر متناہی ہیں کیونکہ اس کے کمالات کی کوئی انتہا نہیں اور نہ ہی اس کے افعال و مصنوعات کی کوئی انتہا ہے۔ اس کے باوجود بعض صفات، بعض صفات کے لیے اصل بنتی ہیں اور دوسری صفات اس کی شاخیں قرار پاتی ہیں۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پانچ صفات تمام اسماء وصفات مقدس کی بنیاد تشکیل دے رہی ہیں اور باقی ان اصول کی فرع ہیں۔ وہ پانچ بنیادی صفات یہ ہیں۔ وحدانیت، علم، قدرت، ازلیت اور ابدیت۔

اب جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہم ان صفات کی تشریح کر رہے ہیں، قبل ازیں وحدانیت کی تشریح کی جا چکی ہے۔ لہٰذا اب باقی صفات کی تشریح کی جائے گی۔

خداوندعالم کا غیر محدود علم

اشارہ

مسئلہ توحید کے بعد اوصاف پروردگار میں سے اہم ترین مسئلہ اس کا علم و دانائی ہے کہ جو تمام جہان اور اس کی اپنی ذات پاک سمیت سب کو شامل ہے حتی کہ اس وسیع جہان کا ایک ذرہ بھی اس کے غیر محدود علم سے پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے۔

بارش کا ہر قطرہ جو زمین پر گرتا ہے، درخت کا ہر شگوفہ جو پھوٹتا ہے، ہر دانہ جو قلب زمین میں پڑا ہے، ہر موجود زندہ جو عظیم دریاؤں کی گہرائی اور تاریکی میں حرکت کناں ہے، ہر شہاب جو وسیع آسمان میں روشن ہوتا اور خاموش ہوتا ہے، ہر موج جو دریائے اوقیانوس کے سینے پر ظاہر ہوتی ہے، ہر نطفہ جو تاریک رحم میں قرار پاتا ہے، آخر میں ہر فکر و خیال جو فکر انسانی میں نمود کرتا ہے، یہ سب حرکات و سکنات اس کے علم و دانش میں روشن و ظاہر ہیں۔

ازل و ابد کے لیے اس کا علم یکساں، لاکھوں گذشتہ و آیندہ برسوں کے لیے اس کا احاطہ علمی اس کے آج کے علم کی طرح ہے۔ اصولی طور پر اس کے حضور میں ہر مکان و زمان، دور و نزدیک، ماضی و مستقبل اور حال کا کوئی مفہوم نہیں اور یہ سب اس کے ہاں یکساں و برابر ہیں۔ یہ حقیقت آیات قرآن اسے معلوم ہوتا ہے اور اس کا تفکر ہمارے عقائد و اعمال میں بڑی وسعت کے ساتھ موجود ہے۔

اس اشارہ کے ساتھ ہم قرآن مجید کی طرف لوٹتے اور آیات زیر کی طرف توجہ کرتے ہیں:

(۱) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ (البقرہ ۲۳۱)

(۲) قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ (آل عمران ۲۹)

(۳) وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴿۳﴾ (الانعام ۳)

(۴) وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ (انعام ۵۹)

(۵) اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ سِرَّہُمۡ وَنَجۡوٰىہُمۡ وَاَنَّ اللّٰہَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿۷۸﴾

(توبہ ۷۸)

(۶) وَمَا تَکُوۡنُ فِیۡ شَاۡنٍ وَّمَا تَتۡلُوۡا مِنۡہُ مِنۡ قُرۡاٰنٍ وَّلَا تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیۡکُمۡ شُہُوۡدًا اِذۡ تُفِیۡضُوۡنَ فِیۡہِ ؕ وَمَا یَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّکَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَاۤ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِکَ وَلَاۤ اَکۡبَرَ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۶۱﴾ (یونس ۶۱)

(۷) یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَمَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۴﴾

(حدید ۴)

(۸) اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۴﴾ (ملک ۱۴)

(۹) وَلَوۡ اَنَّ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ شَجَرَۃٍ اَقۡلَامٌ وَّالۡبَحۡرُ یَمُدُّہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ سَبۡعَۃُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ کَلِمٰتُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۷﴾ (لقمان ۲۷)

(۱۰) اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ ۚ وَیُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ ۚ وَیَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ ؕ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ﴿۳۴﴾ (لقمان ۳۴)

(۱۱) وَاِنَّ رَبَّکَ لَیَعۡلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوۡرُہُمۡ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۴﴾ وَمَا مِنۡ غَآئِبَۃٍ فِی السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۷۵﴾ (نمل ۷۵-۷۴)

(۱۲) وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِہٖ نَفۡسُہٗ ۚۖ وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ﴿۱۶﴾ (ق ۱۶)

ترجمہ

(۱) یادرکھو! خداہر چیز کا جاننے والا ہے۔

(۲) کہہ دو کہ اگر تم اپنی باتوں کو چھپاؤ یا ظاہر کرو بہرحال خداتو ان کو جانتا ہے (نیز وہ آسمانوں اور زمین کی ہر شئے کو جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت واختیار رکھنے والا ہے۔

(۳) وہ آسمانوں اور زمین ہر جگہ کا خدا ہے۔ وہ تمہارے باطن اور ظاہر سے واقف ہے اور جو کام تم کرتے ہو وہ ان سب کو جانتا ہے۔

(۴) اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو کچھ خشکی وسمندر میں ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ کوئی پتا نہیں گرتا مگر یہ کہ وہ اس کو جانتا ہے۔ کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں پوشیدہ نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے۔ کوئی خشک وتر نہیں مگر یہ کہ وہ کتاب مبین کے اندر ثبت ہے۔

(۵) کیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ خدا ان کے راز دل اور ان کی سرگوشیوں کو بھی جانتا ہے اور بے شک وہ سارے غیب کا جاننے والا ہے۔

(۶) اور اے پیغمبرؐ! تم کسی حال میں بھی رہو اور قرآن کے کسی بھی حصہ کی تلاوت کرو اور اے لوگو! تم کوئی بھی عمل کرو تو ہم تمہارے گواہ ہوتے ہیں جب بھی تم کسی عمل کا آغاز کرتے ہو اور تمہارے پروردگار سے زمین و آسمان کا کوئی ذرہ مخفی نہیں۔ اور کوئی شے ذرہ سے چھوٹی ہو یا بڑی ایسی نہیں جسے ہم نے اپنی کھلی کتاب میں جمع نہ کر دیا ہو۔

(۷) وہ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتی ہے یا زمین سے خارج ہوتی ہے اور جو چیز آسمان سے نازل ہوتی ہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی رہو اور وہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔

(۸) اور کیا پیدا کرنے والا نہیں جانتا جب کہ وہ لطیف اور خبیر بھی ہے۔

(۹) اور اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائے اور اس سمندر کو مدد دینے کے لیے سات سمندر اور آجائیں تو بھی کلمات الٰہی تمام ہونے والے نہیں۔ بے شک اللہ صاحب عزت بھی ہے اور صاحب حکمت بھی ہے۔

(۱۰) یقیناً اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے اور کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ کل کیا کمائے گا اور کسی کو نہیں معلوم کہ اسے کس سرزمین پر موت آئے گی۔ بے شک اللہ تعالیٰ

جاننے والا اور باخبر ہے۔

(۱۱) اور آپ کا پروردگار وہ سب جانتا ہے جس کو ان کے دل چھپائے ہوئے ہیں یا جس کا یہ اعلان کر رہے ہیں اور آسمان و زمین میں کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں جس کا ذکر کتاب مبین میں نہ ہو۔

(۱۲) اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کا نفس کیا کیا وسوسے پیدا کرتا ہے اور ہم اس سے اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

مفردات کی تشریح

"عِلْم" اصل میں کسی چیز کی حقیقت کے درک یعنی پا لینے کو کہتے ہیں۔

درک دو قسم کا ہوتا ہے۔ درک ذات شی اور درک صفات شی۔

پہلی قسم ایک مفعول کی طرف متعدی ہے، جیسے کہتے ہیں "علمته" یعنی میں نے اس کو جانا اور اس کا ادراک کیا۔

دوسری قسم دو مفعول کی طرف متعدی ہے، جیسے قرآن کہہ رہا ہے: "فان علمتموهن مومنات۔" یعنی اگر ان کو با ایمان پاؤ۔ (ممتحنہ ۱۰)

ایک اور لحاظ سے علم کی دو قسمیں ہیں:

(۱) نظری۔ مسائل فکری و اعتقادی سے مربوط علم۔

(۲) جنبہ عملی۔ یعنی مسائل عملی سے مربوط علم جیسے عبادات و امورِ اجتماعی کا علم۔ ایک اور نکتہ نظر سے علم کی تقسیم یہ ہے:

(۱) عقلی: وہ علم جس کو دلیل و عقل سے حاصل کیا جائے۔

(۲) سمعی: وہ علم جس کو لسان وحی سے حاصل کیا جائے۔

مقائیس اللغۃ میں اسی اثر کو علم کی اصل و اساس شمار کیا گیا ہے جس سے کسی چیز کی شناخت ہو۔ لہٰذا مادہ تعلیم بمعنی علامت گزاری ہے "علم" بروزن قلم کا معنی پرچم ہے۔

"علام" بروزن جبار اور "علامہ" ہر دو سے مراد وہ شخص ہے جو بہت زیادہ عالم اور مفکر و دانش مند ہو۔ [1]

علم بروزن قلم۔ بلند پہاڑ کے معنی میں بھی آیا ہے اور "عیلم" دریا اور پانی سے بھرے ہوئے کنویں کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کلمہ "علم" کے بارے میں محققین نے جو کچھ کہا ہے یہ اس کا خلاصہ ہے۔ [2]

---

[1] توجہ رہے کہ علامہ میں "ۃ" تانیث کی نہیں بلکہ مبالغہ کے لیے ہے۔

[2] مفردات راغب۔ کتاب العین مقائیس اللغہ اور لسان العرب۔

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

خداوند متعال تمام چیزوں سے آگاہ ہے

(۱) پہلی آیت ایک مختصر اور پر معنی سا جملہ ہے جس میں بدون استثناء خدا کے ہر چیز کے عالم ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمان ہے:

یادرکھو! خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے۔(واعلموا ان اللہ بکل شیء علیم)

یہ تعبیر یا یہی عبارت یا مفہوم قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں دس سے زیادہ مرتبہ آئی ہے۔ یہ تعبیر خدائے تعالیٰ کی صفت ''علم'' کی معرفت میں ایک قائدہ کلیہ کے عنوان سے قابل توجہ ہے۔

آیہ مورد بحث میں یہ جملہ حقوق زنان اور ان سے متعلق احکام الٰہی کے بعد آیا ہے، جو لوگ قوانین الٰہی کے سلسلے میں سوا استفادہ کی نیت رکھتے ہیں اس آیت میں ان کو خبردار کیا گیا ہے۔ نیز قرآن مجید کی دیگر آیات میں لزوم تقویٰ یا دوسرے احکام یا خدا کے بعض اوصاف کے تذکرے کے بعد بھی یہ جملہ ذکر ہوا ہے۔ یہاں یہ جملہ درحقیقت نشان دہی کر رہا ہے کہ خدا نے جو احکام معین فرمائے ہیں وہ مصالح، حکمت اور فلسفہ کے لحاظ سے ہیں۔ نیز ان احکام پر عمل نہ کرنے والوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ خدا تمہارے اعمال اور تمہاری نیات سے آگاہ ہے۔ انسان کے لیے اس قسم کے اعتقاد کے تربیتی اثرات واضح ہیں۔ جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ یہ فرمان ایسی ذات سے صادر ہو رہا ہے جو تمام اسرارِ وجود اور انسان کی احتیاجات سے باخبر ہے اور جانتا ہے کہ کوئی اس کا نگران ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے مسلم ہے کہ اس طرح کا انسان کبھی بھی تخلف نہیں کرے گا۔

خدا تمہاری نیتوں کو جانتا ہے

(۲) دوسری آیت مورد بحث میں خدا کے انسانوں کی نیات سے آگاہ ہونے اور تمام موجوداتِ جہانِ ہستی کے اسرار سے آگاہی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمان ہے: کہہ دو کہ اگر تم اپنی باتوں کو چھپاؤ یا ظاہر کرو، بہرحال خدا تو ان کو جانتا ہے۔(قل ان تخفوا ما فی صدور کم او تبدوہ یعلم اللہ) اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ پھر فرمایا: وہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے۔(ویعلم ما فی السموت و ما فی الارض)

یہ آیت ان لوگوں کو خبردار کرتی ہے جو بہانہ سازی سے (جیسے ایک ماقبل آیت میں تقیہ کے بہانہ کا تذکرہ ہوا ہے) خود کو ذمہ داری اور مسولیت سے خالی قرار دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا حساب اس ذات کے ساتھ ہے جو فقط دلوں کے اسرار ہی کو نہیں بلکہ اسرارِ آسمان و زمین سے بھی باخبر ہے، یہی مضمون سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۴ میں بھی آیا ہے، حتی کہ وہاں فرمان ہوا: رازِ دل کو آشکار کر دیا چھپاؤ خدا تمھارا محاسبہ کرے گا۔(وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ)۔

مسلم ہے کہ محاسبہ تبھی ہوگا جب علم ہو۔آیہ ماقبل میں صدور (سینوں) کا معنی نفوس ہی ہے۔اس پر یہی آیت قرینہ ہے۔پھر یہ کہ قلب سینے ہی میں ہے اور حرکات قلب کا حیات انسانی سے قریبی رابطہ ہے۔علاوہ ازیں روح انسانی میں ہر قسم کی تبدیلی قلب انسانی پر اثرات رکھتی ہے۔نیز آیات قرآن میں بھی ''قلب'' روح اور جان کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بہ الفاظ دیگر روح انسانی میں ہر قسم کا احساس جیسے عشق و تنفر، حب و بغض، خوشی و غمی، خوف و وحشت، آرام و راحت، کتمان اور اظہار کا اثر جسم کے عنوان سے قلب ہی پر پڑتا ہے۔دل کی دھڑکن اور فشار یا راحت ہی سے جسم انسانی میں اس کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔وگرنہ مسلم ہے کہ احساسات روحی کا مرکز نہ قلب ہے نہ سینہ اور نہ ہی مغز بلکہ یہ تمام امور روح انسانی کے ساتھ مربوط ہیں جو ان اعضاء سے ماوراء ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کبھی قلب سے مراد عقل ہوتی ہے۔[1]

خدا ہر مخفی و ظاہر سے باخبر ہے

(۳) تیسری آیت میں اس سے پہلی آیتوں کے مفہوم کے علاوہ خداوند عالم کے علم بالخصوص اعمال انسانی بہ نسبت اس کے علم کا بیان ہوا ہے،فرمان ہے''وہ آسمانوں اور زمین میں ہر جگہ کا خدا ہے۔''

وہ تمہارے ظاہر و باطن سے واقف ہے اور جو کام تم کرتے ہو وہ ان سب کو جانتا ہے۔(**وھو اللہ فی السموت وفی الارض یعلم سرکم و جھرکم ویعلم ماتکسبون**)۔

پہلے جملے میں جہانِ ہستی میں خدا کی موجودگی و حضور کا بیان ہے،دوسرے جملے میں انسان کی باطنی و ظاہری نیات سے اس کی آگاہی کا ذکر ہے اور تیسرے جملے میں اعمال بشر کی بہ نسبت اس کے علم کا تذکرہ ہے۔مجموعی طور پر اس آیت میں تمام انسانوں کو خبردار کیا جارہا ہے۔

بدیہی ہے کہ آسمان اور زمین میں خدا کے''حضور'' سے مراد اس کا حضور مکانی نہیں ہے کیونکہ وہ جسم نہیں رکھتا کہ اس کے لیے مکان ہو۔اس کی موجودگی اور حضور سے مراد اس کا احاطہ وجود میں یہ ہے کہ سب چیزوں پر محیط ہے اور تمام چیزیں اس کی خدمت میں حاضر ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد خدا کا اس صفت کے ساتھ موصوف ہونا اور آسمان و زمین میں اس کے نام کا تذکرہ ہو۔[2] لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

جملہ''**یعلم ماتکسبون**''(جو کام تم کرتے ہو وہ ان سب کو جانتا ہے) سے مراد کیا ہے؟

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس میں خدا کے سر و جہر (پوشیدہ و ظاہر) سے آگاہ ہونے کی تاکید ہے۔[3]

---

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول میں سورۂ بقرہ کی آیت ۷ کی طرف رجوع کریں۔

[2] تفسیر المنار۔تفسیر مراغی۔آیہ زیر بحث۔

[3] روح المعانی جلد ۷۔ص ۷۹

بالفاظ دیگر نیات قلبی واعمال ظاہری مراد ہیں۔بعض کا خیال ہے کہ یہ حالات وصفات روحانی ومعنوی کی طرف اشارہ ہے جن کو انسان اپنے اعمال سے کسب کرتا ہے۔گویا یہ آیت سر وجہر کے علاوہ بھی مفہوم رکھتی ہے۔[1]

بعض کا خیال ہے کہ (سر) اشارہ ہے نیات کی طرف، جہر اشارہ ہے حالات کی طرف اور "ماتکسبون" اعمال کی طرف اشارہ ہے۔[2]

یہ تینوں تفسیریں مناسب ہیں لیکن قرآن مجید میں مادہ کسب کے موارد استعمال کو دیکھا جائے تو تیسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

غیب کے خزانے اسی کے پاس ہیں

(۴) چوتھی آیت میں بہترین تعبیروں کے ساتھ علم خدا کی وسعت بے پایاں اور اس کی جزئیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، پہلے فرماتا ہے: ''اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔(وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الاھو)۔[3]

پھر غیب سے حضورؐ کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرمان ہے ''اور جو کچھ خشکی وسمندر میں ہے وہ اس کو جانتا ہے۔''(و یعلم ما فی البر و البحر)۔

درخت سے کوئی پتا نہیں گرتا مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے(وما تسقط من ورقة الا یعلمھا)

کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں پوشیدہ نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے(ولا حبة فی ظلمت الارض)

آخر میں ایک جامع اور عمدہ کلمہ میں ارشاد ہے ''کوئی خشک وتر نہیں مگر یہ کہ کتاب مبین (علم غیر متناہی پروردگار) میں ثبت ہے۔'' (ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین)۔

یہ آیت ان جامع ترین آیات میں سے ہے جن میں خدا کے بے انتہا علم کو نہایت ہی دقیق ولطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔علم غیب کے علاوہ صحرا اور سمندر کی تہہ میں پائے جانے والے موجودات، درختوں سے گرنے والے پتے، حتی کہ وہ دانے جو جنگلوں، دروں اور بیابانوں کے گوشۂ وکنارہ میں موجود ہیں اور بارانِ رحمت کے آنے پر اپنے اگنے کے منتظر ہیں، ان سب کو خدا کے علم بے انتہا کے دائرہ میں شمار کیا گیا ہے۔اگر مفاہیم کی وسعت کا خیال کرتے ہوئے آیات میں غور وفکر کریں، خشکی ودریا میں قسم قسم کے عجیب وحیرت انگیز کروڑوں زندہ موجودات کو نظر میں رکھیں۔

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۷ صفحہ ۹

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۴ ص ۲۷۴

[3] مفاتح بعض مفسرین کا خیال ہے مفتح بروزن مکتب بمعنی خزانہ ومخزن لیا گیا ہے یا مفتح بروزن منبر بمعنی کلید ہے۔آیت بالا میں دونوں معنی ہوسکتے ہیں اور ہر ایک کی لطافت مخصوص ہے لیکن بعض منابع لغت میں دوسرے معنی کو زیادہ صحیح سمجھا گیا ہے۔

زمین کے تمام درختوں اوران کے پتوں کوفکر میں مجسم کریں کہ ہرلحظہ و ہر ساعت کتنے مقامات پر وہ کتنی تعداد میں زمین پر گر رہے ہیں، نیز مختلف سبزہ جات کے بیج جوانسانوں کے ہاتھوں، ہوا کی موجوں، حشرات الارض کی حرکتوں، سیلابوں اوراس قسم کی چیزوں سے زمین میں متفرق ہوتے ہیں اورخاک کے نیچے اپنے کونپل ظاہر کرنے کے منتظر ہیں، ان سب باتوں کونظر میں رکھیں اور سمجھیں کہ خداوندقدوس ان تمام امور کاان کے مشخصات وجزئیات کے ساتھ علم رکھتا ہے، اس سے یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس کی طرف سے ہمارے اعمال کا علمی احاطہ کس قدر آسان اور سادہ ہے۔ ائمہ اہل بیتؑ سے منقول چند روایات میں ذکر ہے کہ ''ظلماتِ ارض'' سے مراد ''ماؤں کا رحم'' ''حبہ'' بمعنی ''فرزند'' اور ''ورقہ'' سقط شدہ جنین ہے، اسی طرح ''رطب'' سے زندہ نطفے اور ''یابس'' سے خشک ہوجانے والے نطفے مراد لیے گئے ہیں۔

بعض مفسرین اہل سنت جیسے روح المعانی میں ''آلوسی'' نے اس حدیث کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا اور اسے ظاہر آیت کے خلاف بتایا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آیت کو دیکھنے سے ظاہری دانہ ہی ذہن میں آتا ہے لیکن اس حدیث سے مذکورہ بالا مفہوم دلالت التزامی کے عنوان سے مراد لیا جاسکتا ہے کیونکہ اصولی طور پر نطفہ و دانہ میں کوئی تفاوت نہیں۔ اسی طرح تہہ زمین و رحم مادر کی ظلمات میں بھی کوئی فرق نہیں اور جو اس سے آگاہ ہے وہ اس سے بھی آگاہ ہوسکتا ہے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔[1] علاوہ ازیں ائمہ اہل بیت علیہم السلام ظاہر قرآن کی طرح بطونِ قرآن سے بھی مطلع اور باخبر ہیں۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ یہ تفسیر بطن کا حصہ ہو۔

مفسرین نے ''رطب و یابس'' (تر و خشک) کی کئی تفسیریں کی ہیں۔

''رطب'' موجود زندہ۔ ''یابس'' موجود مردہ۔

''رطب'' بمعنی مومن۔ یابس بمعنی کافر۔

رطب بمعنی موجود زندہ۔ یابس بمعنی جماد۔

''رطب'' بمعنی عالم۔ ''یابس'' بمعنی جاہل لیا گیا ہے۔[2]

لیکن ظاہر ہے کہ یہ تعبیر کنایہ ہے کیونکہ آیت عمومیت رکھتی ہے اور جہانِ مادہ کی ہر چیز کو شامل ہے، چنانچہ روزمرہ کی گفتگو میں بھی اس طرح کے استعمالات ہوتے رہتے ہیں۔

خدا عالم الغیب ہے

(۵) پانچویں آیت میں آیات قبل کے قرینہ سے منافقوں کی طرف اشارہ ہو، جیسا کہ فرمان ہے ''کیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ خدا ان کے

---

[1] تفسیر برہان میں ایسی پانچ حدیثیں امام جعفر صادقؑ، امام موسیٰ کاظمؑ یا امام علی رضاؑ سے منقول ہے۔

[2] روح البیان جلد ۳ صفحہ ۴۴۔ روح المعانی جلد ۷ ص ۱۴۹

راز دل اور ان کی سرگوشیوں کو بھی جانتا ہے'' یعنی ان کی بری نیات اور شیطنت آمیز باتوں سے باخبر ہے (الم یعلموا ان اللہ یعلم سرھم و نجوٰھم)

''کیا یہ نہیں جانتے کہ وہ سارے غیب کا جاننے والا ہے۔''(وان اللہ علامہ الغیوب)۔

علام الغیوب ایک نئی تعبیر ہے کیونکہ ''علام'' صیغہ مبالغہ ہے اور ''الغیوب'' عموم رکھتا ہے جو تمام جہانِ ہستی میں پوشیدہ اسرار یعنی عالم طبیعت اور ماوراء طبیعت سب کو شامل ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت تک علم خدا کے بارے میں جن آیات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں انسان کو خبردار کیا گیا ہے کہ اپنے اعمال پر نگاہ رکھیں اور گفتگو دینات کا خیال رکھیں یعنی سب سے پہلے تربیتی امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

''نجوی'' کا مادہ ''نجوۃ'' اور ''نجاۃ'' ہے، اصل میں اس کا معنی مرتفع و بلند مکان ہے۔ جب انسان مخفی طور پر کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو اٹھ کر لوگوں سے علیحدہ چلا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ کلمہ سرگوشی کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

وہ ہر جگہ حاضر ہے

(۶) چھٹی آیت میں خداوند عالم کا انسان کے اعمال، گفتار اور حالات میں حضور و نگرانی کا ذکر ہے، پھر تمام عالم ہستی میں اس کے علم کی وسعت کا تذکرہ ہے۔ حقیقت میں یہ دونوں معنی لطیف شکل میں ایک دوسرے سے مربوط اور متصل ہیں، فرمایا:

''اور اے پیغمبرؐ! تم کسی حال میں بھی رہو اور قرآن کے کسی بھی حصہ کی تلاوت کرو اور اے لوگو! تم کوئی بھی عمل کرو تو ہم تمہارے گواہ ہیں جب بھی تم کسی عمل کا آغاز کرتے ہو۔'' (وماتکون فی شان و ماتتلوا منه من قران و لا تعملون من عمل الا کنا علیکم شھودا اذ تفیضون فیه)۔[1]

قابل توجہ یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے جملہ میں پیغمبر خود مخاطب ہیں کیونکہ اس میں شان، حالات، اہم کام اور تلاوت قرآن مجید کی

---

[1] مفسرین نے ''فیه'' کی ضمیر کے حق میں تین احتمال ذکر کیے ہیں۔

(۱) یہ خدا کی طرف لوٹ رہی ہے۔

(۲) اس کا مرجع شان ہے۔

(۳) یہ قرآن کی طرف راجع ہے۔

لیکن پہلا احتمال مناسب نظر آتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''قرآن کے کسی حصہ کی آپ تلاوت نہیں کرتے مگر یہ کہ.....'' اس تفسیر کی شاہد پہلی آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کفار بعض مطالب کی نسبت خدا کی طرف دیتے ہیں جو جھوٹ اور افتراء ہے۔ یہ آیت کہہ رہی ہے کہ پیغمبر ایسے نہیں ہیں بلکہ وہ جو بھی کہتے ہیں وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔

طرف اشارہ ہے۔لیکن تیسرے جملہ میں مطلق اعمال کا ذکر ہے جس میں تمام انسان شامل ہیں۔بہرحال چونکہ آغاز آیت میں مخاطب پیغمبر ہیں اور بعد میں تمام انسانوں کو خطاب ہے لہٰذا آیت کے عموم وشمول پر دلالت واضح ہوجائے گی۔

علاوہ ازیں یہ انسان کے اعمال وگفتار سب کو شامل ہے (جبکہ شان، تلاوت اور عمل کی تعبیرات کی طرف توجہ کی جائے) ''شہود'' شاہد کی جمع ہے جس کا معنی حاضر وناظر ونگہبان ہے (ہم نے بارہا کہا ہے کہ خدا کے بارے میں صیغہ جمع کا استعمال اس کی عظمت اور علو مقام کا کنایہ ہے) اس تعبیر کا مفہوم علم سے بھی اعلیٰ ہے اور اصل میں یہ حقیقت علم الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کو ''علم حضوری'' کہا جاتا ہے، عنقریب توضیحات میں اس کی تشریح آئے گی۔

''تفیضون'' کا مادہ ''افاضہ'' ہے۔اصل میں اس کا معنی ظرف آب کا اس طرح پر ہونا ہے کہ اطراف سے پانی گر رہا ہو، یہ کلمہ قوت کے ساتھ کام شروع کرنے یا ایک کام جمعیت وکثرت کے ساتھ شروع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔آیت زیر بحث میں اس کے یہی معنی ہیں۔

پھر فرمان ہے ''اور تمہارے پروردگار سے زمین وآسمان کا کوئی ذرہ مخفی نہیں اور کوئی شے ذرہ سے چھوٹی ہو یا بڑی ایسی نہیں ہے جسے ہم نے اپنی کھلی کتاب میں جمع نہ کردیا ہو۔(وما یعزب من ربك من مثقال ذرة فی الارض ولا فی السمآء ولا اصغر من ذلك ولا اکبر الا فی کتاب مبین)۔

''یعزب'' کا مادہ ''غروب'' بروزن ''غروب'' ہے۔اس کا معنی دوری، کنارہ گیری اور غیب ہونا ہے۔بعض ارباب لغت اور مفسر کہتے ہیں۔اصل میں اس کا معنی جانوروں کا گھر سے چرنے کے لیے دور جانا ہے۔پھر اپنے خانوداہ سے دور افراد یا وہ افراد جنہوں نے ابھی تزویج نہ کی ہو ان پر کلمہ ''عزب'' اور ''عازب'' کا اطلاق ہوا ہے۔نیز یہ کلمہ ہر قسم کی دوری اور غیبت پر بھی بولا گیا ہے۔[1]

آیہ مورد بحث میں یہ تعبیر تمام چیزوں کے خدا کے حضور میں حاضر وموجود ہونے کی طرف لطیف اشارہ ہے جیسا کہ ہم ذکر کریں گے کہ پروردگار کا علم درحقیقت ''علم حضوری'' ہوتا ہے۔''کتاب مبین'' سے مراد ''علم پروردگار'' ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔''کبھی اس کو ''لوح محفوظ'' کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے ''مثقال'' بمعنی ذرہ ووزن'' ہے۔''ذرہ'' کے کئی معنی لیے گئے ہیں۔بہت ہی چھوٹے کیڑے، ہاتھ پر لگے ہوئے غبار کے ذرات، فضا میں معلق ذرات جو تاریک کمرے کے روشندان سے پڑنے والی سورج کی شعاعوں میں نمایاں وظاہر ہوتے ہیں۔ان کا جو بھی معنی لیا جائے یہ ان کے چھوٹے ہونے اور وسعت علم الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔

وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے

(۷) ساتویں آیت میں علم خدا کے بارے میں دو نئے نکتے ذکر کیے گئے ہیں۔

---

[1] مقائیس اللغۃ۔مفردات راغب۔لسان العرب

۱۔ وہ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتی ہے یا زمین سے خارج ہوتی ہے اور جو چیز آسمان سے نازل ہوتی ہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے۔(یعلم ما یلج فی الارض و ما یخرج منها و ما ینزل من السمآء و ما یعرج فیها)۔

اس ترتیب سے نباتات کے وہ بیج جو زمین میں داخل ہوتے ہیں اور بارانِ رحمت کے قطرات، درختوں کی جڑیں، معدنیات، ذخائر، خزانے، دفینے، مردوں کے اجسام اور قسم قسم کے حشرات جو زمین کی گہرائیوں میں ہوتے ہیں، وہ ان سب کا جاننے والا ہے۔

اسی طرح وہ نباتات جو زمین سے اگتے ہیں، زندہ موجودات جو زمین سے نکلتے ہیں، معدنیات و ذخائر جو زمین سے برآمد ہوتے ہیں، تیزابی مادے جو آتش فشاں پہاڑوں کے ذریعے قلب زمین سے نکلتے ہیں، ٹھنڈے پانی اور گرم پانی کے قدرتی چشمے جو زمین سے پھوٹتے ہیں، وہ ان سب کو جاننے والا اور ان سے باخبر ہے۔ اسی طرح فرشتوں کی صفیں جو عالم بالا سے زمین کی طرف آتی ہیں، سورج کی حیات بخش شعاعیں، بارانِ رحمت جو بلندی سے نازل ہوتی ہیں، شہاب ثاقب اور آسمانی پتھر، کہکشاؤں کی شاعیں، وہ ذرے جو تیز ہواؤں اور جھکڑوں کے ساتھ زمین سے اوپر جاتے اور پھر کسی اور جگہ گرتے ہیں، اسی طرح ارواح انسانی اور فرشتوں کا آسمانوں کی طرف جانا، پرندوں کا اڑنا، سمندر سے اٹھنے والے بادل اور بالآخر بندوں کی دعائیں اور ان کے اعمال جو آسمان کی طرف جاتے ہیں۔ وہ ان سب کا عالم اور ان سے باخبر ہے۔

اگر ہم اس حقیقت کی طرف توجہ کریں کہ ہر لحظہ کس قدر موجودات اس وسیع افق کے چاروں طرف وجود میں آتے ہیں تو ہم علم خدا کی عظمت اور وسعت سے مطلع ہو سکیں گے۔

۲۔ آخر میں فرمان ہے: ''اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی رہو (اور اسی دلیل سے) وہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔'' (وھو معکم این ما کنتم واللہ بما تعملون بصیر) کس قدر لطیف و خوبصورت تعبیر ہے۔ اگر زمین و آسمان میں تمام موجودات اس کے دائرہ علم میں ہیں جیسا کہ آغازِ آیت میں ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس کو اپنے سے دور سمجھو۔ وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا رہا ''جانتا ہے'' بلکہ کہا جا رہا ہے ''دیکھتا ہے'' جس کا مطلب اس کا ظہور و شہود ہے۔

خوب تر بات یہ ہے کہ اس آیت میں مسئلہ علم الٰہی کے تذکرہ کا مقصد تربیت انسانی ہے۔ ایک طرف انسان سے کہا جا رہا ہے کہ تو تنہا نہیں اور وہ ہر جگہ تیرے ساتھ ہے۔ یہ ایسا تصور ہے جس سے روح انسانی کو راحت اور روشنی ملتی ہے۔ دوسری طرف کہا جا رہا ہے کہ اے انسان تو خدا کے حضور حاضر و موجود ہے، پورا جہان اس کے سامنے حاضر ہے۔ پس سختی کے ساتھ اپنے اعمال پر نظر رکھ۔ گویا انسان کو ''خوف و رجا'' کے درمیان قرار دیا جا رہا ہے۔

مسلم ہے کہ اس سے مکانی معیت اور ہمراہی مراد نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ علم الٰہی تمام چیزوں کو محیط ہے۔ بقول شاعر

این معیت می نگنجد در بیان
فی زمان دارد خبر زونی مکان

تمام چیزوں کا خالق ہی تمام چیزوں سے آگاہ ہے

(۸) آٹھویں آیت میں خدا کے تمام چیزوں کا عالم ہونے پر ایک زندہ اور روشن دلیل ذکر کی گئی ہے جو ایک پر مغز اور مختصر جملہ میں (جو قرآن کی روش ہے) بیان کی گئی ہے۔فرمان ہے ''کیا (موجودات کا) پیدا کرنے والا (ان موجودات عالم کو) نہیں جانتا۔''(الا یعلم من خلق)[۱]

''جب کہ وہ لطیف اور خبیر بھی ہے۔''(وھو اللطیف الخبیر)

اگر ہم اس دلیل کو سادہ طور پر بیان کرنا چاہیں تو کہیں گے: موجودات جہان کا نظام بتا رہا ہے کہ اس کو ایک معین برنامہ ونقشہ کے ماتحت پیدا کیا گیا ہے۔ بنابریں ان موجودات کا خالق ان کی خلقت سے پہلے ہی ان سے باخبر اور ان کا عالم ہوگا۔اس نکتہ کی طرف توجہ کریں کہ خدا کا مخلوق کو پیدا کرنا دائمی اور مستمر ہے، ممکنات کا واجب الوجود کے ساتھ رابطہ آغاز اور بقا ہر دو میں ہے۔فیض ہستی ہر لحظہ مبداء فیاض سے مخلوقات تک پہنچ رہا ہے۔اس سے واضح ہوجائے گا کہ اس کا تمام موجودات کا عالم ہونا بھی دائمی اور ہر زمان ومکان میں ہوگا۔غور کریں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت استفہام انکاری سے شروع ہوئی ہے اور اس میں سننے والے سے جواب کا مطالبہ ہو رہا ہے۔یعنی مطلب اس قدر واضح ہے کہ ہر عاقل اپنے وجدان کی طرف توجہ کرنے سے سمجھ جاتا ہے کہ خالق لازماً اپنی مخلوق سے باخبر ہے۔[۲]

''لطیف'' کا مادہ ''لطف'' ہے۔ یہاں اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ موجودات لطیف اور اشیاء دقیق کا خالق ہے یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ خالق ان چیزوں سے آگاہ اور باخبر ہے۔

''خبیر'' اس کا معنی ہے وہ ذات جو پوشیدہ اسرار سے باخبر ہو۔یہ دونوں وصف اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ اسرار عالم اور رازہائے پنہاں کا جاننے والا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس آیت سے پہلے خدا انسان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وہ اپنی باتوں کو چھپائیں یا ظاہر کریں، جو ان کے دلوں میں ہے، خدا اس سے باخبر ہے۔پھر اس مطلب کے اثبات کے لیے آیت کا یہ حصہ بیان ہوا ہے۔اس ترتیب سے واضح ہوگا کہ علم الٰہی کے عنوان سے اس آیت کا تذکرہ درحقیقت تربیتی اثر رکھتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔اس کو فقط اعمال، نیات اور عقاید انسانی میں

---

[۱] آیہ شریفہ کے اس جملے میں دو احتمال ہیں (۱) ''من'' یعلم کا فاعل ہے (۲) یہ مفعول ہے اور اس کا فاعل ''یعلم'' میں ضمیر مستتر ہے جس کی بازگشت ''اللہ'' کی طرف ہے۔پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا: کیا جو خالق ہے وہ عالم نہیں؟ دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا: کیا خدا اپنی مخلوقات سے باخبر نہیں؟ دونوں معنوں کا نتیجہ ایک ہی ہے مگر پہلی ترکیب زیادہ مناسب محسوس ہوتی ہے۔

[۲] استفہام انکاری نفی کے معنی دیتا ہے، چونکہ لا نافیہ آیت میں موجود ہے لہٰذا یہ نفی در نفی ہوجائے گا اور اس کا نتیجہ اثبات ہوگا۔غور کریں

محدود کرنا صحیح نہیں کہ خدا فقط ان کا عالم ہے۔ درحقیقت یہ علم الٰہی کے لیے ایک کلی و منطقی دلیل ہے جو خاص طور پر تربیت کے لیے پیش کی گئی ہے۔

اگر تمام درخت قلم بن جائیں

(۹) نویں آیت میں علم الٰہی کی وسعت کو بے نظیر و زندہ ارقام و اعداد کے ذریعے سب کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ فرمان ہے:

''اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائے اور اس سمندر کو مدد دینے کے لیے سات سمندر اور آ جائیں تو بھی کلمات الٰہی تمام ہونے والے نہیں۔ بے شک اللہ صاحب عزت بھی ہے اور صاحب حکمت بھی ہے۔'' (ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ ان اللہ عزیز حکیم)

اسی طرح کی ایک آیت معمولی سے اختلاف کے ساتھ سورۂ کہف میں بھی ہے۔

اب اگر ہم حساب کریں اور تھوڑا سا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ممکن ہے ایک درخت سے کئی ہزار قلم بنائے جائیں جب کہ تمام انسانی علوم اور بشری افکار جو ہزار ہا سال سے ہزار ہا کتابوں میں ہمارے لیے یادگار کے طور پر موجود ہیں ان کے لیے چند درختوں سے حاصل کیے ہوئے قلم ہی کافی ہیں اور روشنائی کے طور پر شاید ایک چھوٹی سی نہر بھی کفایت کر جائے۔

لیکن اگر تمام جنگلوں اور درختوں کی عظیم تعداد کو لیں جس نے بہت سے بیابانوں، پہاڑوں اور باغوں کو ڈھانپ رکھا ہے، دریاؤں کے کروڑوں مکعب فٹ پانی کو دیکھیں جس نے روئے زمین کے تین حصوں کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ پھر اس میں سات گنا تک اضافہ کر لیں تو (اس صورت میں کہ سات کا عدد تعداد کے لحاظ سے ہے، تکثیر کے عنوان سے نہیں) کس قدر عجیب وضع سامنے آئے گی اور کس قدر علوم و دانش کو ان کو لکھا جا سکتا ہے۔

مگر قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ سب ختم ہو جائیں گے تو بھی کلمات خدا کی انتہا نہیں ہوگی۔ کیا خدا کے غیر متناہی علم کی نقشہ کشی اس سے بہتر صورت ہو سکتی ہے؟

اعداد و ارقام و ہندسوں کا ذکر اور ان اعداد کے ساتھ صفر کا اضافہ کرتے جانے سے بھی ایک عدد اس کی عظمت کو واضح نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اعداد بے روح اور بے رنگ ہوتے ہیں۔

لیکن وہ عدد جس کا ذکر اس آیت میں ہو رہا ہے یہ غیر متناہی ہے اور ہمارے سوچنے کے لیے کنایہ ہے۔ یہ عدد زندہ و گویا اور پر مغز و پر معنی ہے۔

کلمہ ''البحر'' اس قسم کے موارد میں آنے والا ''الف و لام'' عموم پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے یہ روئے زمین کے تمام دریاؤں کو شامل ہو جائے گا۔ پھر غور کریں کہ سب دریا آپس میں متصل ہیں، اس عنوان سے یہ ایک ہی دریا سمجھے جائیں گے اور ان کے لیے ہم صیغہ مفرد بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ لہٰذا سبعۃ ابحر کی تعبیر ان تمام دریاؤں سے سات گنا دریاؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

''کلمات اللہ'' سے مراد کلمات علم خدا یا وہ موجودات جن کے ساتھ علم خدا کا تعلق ہے، چونکہ وہ علم غیر متناہی ہے اور تمام دریا و درخ

تا نپے عظیم حجم وتعداد کے باوجود بھی متناہی ہیں۔لہٰذا وہ علوم کے مقابلہ میں عدد قیاسی نہیں بن سکیں گے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ''شجرۃ'' مفرد ہے اور ''اقلام'' جمع ہے تا کہ اشارہ ہو کہ ایک درخت کی شاخوں سے کئی قلم بن سکتے ہیں۔

اگرچہ سات کے عدد کے بارے میں دو احتمال ہیں۔تعداد وتکثیر۔لیکن ظاہر ہے کہ سات کی کوئی خاص خصوصیت نہیں، بلکہ اس کا ذکر تکثیر کے عنوان ہی سے ہوا ہے۔پس اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ موجودہ دریاؤں میں جس قدر بھی اضافہ کر دیا جائے ان کے ذریعے کلمات خدا کی انتہا نہیں ہو سکے گی۔

آیت کا آخری جملہ بھی اسی مطلب پر تاکید ہے کیونکہ عزت خدا کا مطلب امر خلقت وآفرینش میں اس کی بے انتہا قدرت ہے اور ''حکمت خدا'' بھی موجوداتِ عالم کے اسرار ودقائق کے بارے میں اس کے علم پر تاکید ہے۔

مورد بحث آیت سے متعلق آخری بات یہ ہے کہ اس کے شان نزول کے سلسلہ میں نقل کیا گیا ہے کہ بعض یہودیوں نے کہا: خدا نے تمام چیزیں تورات میں ذکر کر دی ہیں اور کچھ باقی نہیں ہے۔پیغمبرؐ نے فرمایا: تورات میں جو کچھ ہے اس کی نسبت کلام الٰہی سے وہی ہے جو قطرہ کی نسبت دریا سے ہو سکتی ہے۔پھر یہ آیت نازل ہوئی جس میں علم الٰہی کی وسعت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔نیز منقول ہے کہ یہ آیت اس زمانے میں نازل ہوئی جب کفار نے کہا: محمدؐ جو کچھ لاتے ہیں وہ جلد تمام ہو جائے گا۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: یہ کلام خدا ہے لہٰذا یہ تمام ہونے والا نہیں ہے۔چنانچہ یہ آیت اسی بات کی وضاحت کے لیے نازل ہوئی۔[1]

(۱۰) پانچ اسرار اسی کے پاس ہیں

دسویں آیت میں بھی علم خداوندی کا تذکرہ ہے یعنی غیبی علوم جو ذات خدا کے ساتھ مخصوص ہیں اور کوئی بھی اس حقیقت سے آشنائی نہیں رکھتا، فرمان ہے: ''یقیناً اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔'' (ان اللہ عندہ علم الساعۃ) اور وہی مینہ برساتا ہے اور اس کی مقدار و کیفیت سے آگاہ ہے (وینزل الغیث) اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے جنسیت وسلامتی کے لحاظ سے بھی اور دیگر استعدادات اور قوی کے عنوان سے بھی۔(ویعلم ما فی الارحام)۔

اور کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ کل کیا کمائے گا اور کسی کو نہیں معلوم کہ اسے کس سرزمین پر موت آئے گی۔(وما تدری نفس ما ذا تکسب غدا و ما تدری نفس بای ارض تموت)

''بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور باخبر ہے۔'' (ان اللہ علیم خبیر)

اس آیت میں وضاحت کے ساتھ خداوند قدوس کے علوم کی عظمت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔وہ علم روزِ قیامت ہے۔لیکن آیت کا لہجہ بتا رہا ہے کہ اس کے بعد جو چار چیزیں ذکر کی گئی ہیں۔ان کا علم بھی خداوند کریم سے مخصوص ہے کیونکہ ان پانچوں موضوعات کے درمیان رابطہ صرف

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۵ ص ۱۵۷ وتفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۱۵۸

اسی جہت سے ہے کہ علوم خداوند ہیں۔

علاوہ ازیں بہت سی روایات (شیعہ واہل سنت) میں پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ سے صراحتاً وارد ہے کہ یہ پانچوں علوم ذات الٰہی سے مخصوص ہیں۔ ہم یہاں بطور نمونہ ایک حدیث تفسیر درمنثور سے اور ایک حدیث تفسیر نور الثقلین سے پیش کرتے ہیں:

نمبر ۱: درمنثور میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"مفاتیح الغیب خمس لا یعلمهن الا الله لا یعلم ما فی غد الا الله و لا متی تقوم الساعة الا الله، و لا یعلم ما فی الارحام الا الله و لا متی ینزل الغیث الا الله، و ما تدری نفس بای ارض تموت الا الله"

''غیب کی کلیدیں پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آنے والے کل کے حوادث کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خدا کے سوا کوئی قیامت کے دن کو نہیں جانتا۔ ماؤں کے رحم میں جو کچھ ہے اسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بارانِ رحمت کے وقت نزول کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کوئی انسان کس زمین میں مرے گا۔''[1]

نمبر ۲: تفسیر نور الثقلین میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے:

"الا اخبرکم بخمسة لم یطلع الله علیها احدا من خلقه؟ قلت بلی، قال: ان الله عنده علم الساعة و ینزل الغیث و یعلم ما فی الارحام و ماتدری نفس ماذا تکسب غدا و ماتدری نفس بای ارض تموت ان الله علیم خبیر۔"

''کیا تمہیں پانچ چیزوں کی خبر دوں کہ خداوند کریم نے مخلوق میں سے کسی کو ان سے آگاہ نہیں کیا؟ راوی کہتا ہے میں نے کہا: ہاں۔ آپؑ نے فرمایا: قیامت کا علم خدا تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہی مینہ برساتا ہے اور شکم مادر کے اندر کا حال جانتا ہے اور کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ کل کیا کمائے گا اور کسی کو نہیں معلوم کہ اس کی موت کہاں آئے گی۔ بے شک اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔''[2]

---

[1] درمنثور جلد ۵ ص ۱۶۹

[2] نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۱۸

اس ضمن میں بہت سی روایات کتب حدیث میں ہیں۔[1]

دوسوالوں کا جواب

سوال اول:

یہ پانچ علوم کیسے خداوند کریم سے مخصوص ہیں جب کہ آلات کے ذریعہ بچہ کی جنسیت (مرد عورت) معلوم کی جاسکتی ہے۔اگرچہ آج تک اس کا علم قطعی نہیں ہوسکا۔اسی طرح بارش کی صورت حال کی بھی کسی حد تک پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔

جواب

بات فقط جنین کی جنسیت ہی کی نہیں بلکہ خداوند عالم مقدار، کیفیت استعداد، سلیقہ، لیاقت، طاقت و کمزوری، لاصہ یہ کہ جنین کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے۔اسی طرح بارش کے بارے میں پوری کیفیت یعنی مقدار، قطرات کی تعداد، وزن اور محل بارش، خدا ہی ان تمام امور سے دقیقا باخبر ہے۔کوئی شخص کسی بھی وسیلے سے ان تمام باتوں کو نہیں جانتا۔

اس کا شاہد اس آیت کے بارے میں نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ کا یہ فرمان ہے:

فیعلم الله سبحانه ما فی الارحام من ذکرار انثی و قبیح او جمیل۔ و سخی او بخیل... فهذا علم الغیب الذی لا یعلمه احد الا الله۔

''خدا ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے۔نر ہے یا مادہ۔بدصورت ہے یا خوبصورت۔سخی ہے یا بخیل (بدبخت ہے یا خوش نصیب)۔یہ وہ علم غیب ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''[2]

اس عبارت سے بخوبی واضح ہے کہ آگاہی سے مراد تمام صفات سے باخبر ہونا ہے یعنی جنین کی تمام جسمی و روحی صفات کا علم نہ فقط اس کی جنسیت۔

دوسرا سوال

کس طرح اس آیت (بہ ضمیمہ روایات کثیرہ جو اس کی تفسیر میں وارد ہیں) یا بہت سی دیگر روایات جن میں کہا گیا ہے کہ پیغمبرؐ اور ائمہؑ

---

[1] مزید وضاحت کے لیے درمنثور جلد ۵ ص ۱۶۹ و بعدہ اور نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۱۸ و مابعد۔تفسیر برہان جلد ۳ ص ۲۸۰ کی طرف مراجعہ فرمائیں۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۲۸

معصومین نے بہت سے آئندہ حوادث یا اپنے روز وفات اور محل دفن اور آئندہ سرانجام پانے والے کاموں کی خبر دی ہے (اس آیت اور ان روایات میں) کس طرح جمع کی جاسکتی ہے، کیا ان کا آپس میں تضاد نہیں کیونکہ آیت کہہ رہی ہے کوئی بھی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا، کیا کرے گا اور کس سرزمین میں اس کی موت واقع ہوگی؟

جواب

اس اشکال کا اجمالی اور تفصیلی جواب دیا جاسکتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اولیاء اللہ یا فرشتے آئندہ حوادث کے بارے میں غیب کی جو خبر دیتے ہیں وہ ایک علم اجمالی سے زیادہ نہیں۔ مثلاً ان میں سے کوئی جانتا ہے کہ فلاں شخص کل مرے گا، لیکن وقت، لحظہ اور باقی خصوصیات کا علم نہیں ہوتا کیونکہ تمام خصوصیات کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ ایک علم تفصیلی و جامع ہے جب کہ اولیاء خدا کا علم اجمالی و جزئی تھا۔

مفسرین کی ایک جماعت نے ان دو علموں میں 'ذاتی اور عرضی' کے عنوان سے تفریق کی ہے۔ یعنی خدا کا علم ان امور کے متعلق ذاتی ہے۔ لیکن اولیاء خدا خود سے اس کا علم نہیں رکھتے بلکہ وہ وہی جانتے ہیں جو خدا نے انہیں تعلیم کیا ہے۔

لیکن یہ جواب بہت سی شیعہ وسنی روایات کے ساتھ سازگار و مناسب نہیں بلکہ تین موارد میں ظاہر آیت کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتا۔

(۱) قیامت کے دن کی اطلاع صرف خدا کو ہے۔ (۲) کل انسان کیا کرے گا۔

(۳) کس سرزمین میں اس کی موت ہوگی۔

ہر شے کتاب مبین میں ہے

(۱۱) گیارہویں آیت میں انسان کے سارے اندرونی و بیرونی رازوں کے متعلق خدا کے علم اور پھر آسمان و زمین کے غیب کے بارے میں علم الٰہی کا تذکرہ ہے۔ فرمان ہے ''اور آپ کا پروردگار وہ سب جانتا ہے جس کو ان کے دل چھپاتے ہیں یا جس کا یہ اعلان کر رہے ہیں۔'' (وان ربك ليعلم ما تكن صدورهم و ما يعلنون)۔

پھر فرمایا گیا ہے: ''زمین و آسمان میں کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں جس کا ذکر کتاب مبین میں نہ ہو۔'' (وما من غائبة فى السمآء ولا رض الا فى كتاب مبين)۔

''ربك'' (تیرا پروردگار) کی لطیف تعبیر اشارہ ہے کہ کیا ممکن ہے کہ تدبیر و تصرف میں مربی و مالک انسان کے اندرونی و بیرونی حالات سے خبر ہو؟ یہ ربوبیت پروردگار کے بنفسہ عالم ہونے کی دلیل ہے۔

''تكن'' کا مادہ ''كن'' بروزن ''جن'' اس کا معنی پردہ اور ہر وہ چیز جس کے ذریعے اشیاء کو چھپایا جاسکتا ہے۔ اس لیے سینے کو

اندرونی رازوں کا چھپانے والا کہا گیا ہے۔ جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سینے اور قلب کو بہت سی قرآنی تعبیرات میں روح و عقل کے معنی میں لیا گیا ہے۔

"غائبۃ" کی تعبیر میں اگر معنی وصفی ہے تو یہ ایسے امور کی طرف اشارہ ہے جو فوق العادہ مستور اور چھپے ہوئے ہوں۔ کیونکہ "تا" اس قسم کے موارد میں مبالغہ کے لیے ہے جیسے "علامہ"۔ [1]

کلمہ "مبین" آشکار اور واضح کے معنی میں آیا ہے اور اسی طرح واضح کنندہ بھی یعنی (لازم و متعدی) لیکن اس جگہ دوسرا معنی مناسب ہے (یعنی لوح محفوظ یا لوح علم پروردگار) جو حقائق کو واضح کرنے والی ہے۔ [2]

میں تم سے زیادہ تمہارے قریب ہوں

(۱۲) بارہویں اور آخری آیت میں ہم علم خدا کے سلسلہ میں تازہ اور عمدہ تعبیرات سے مطلع ہوتے ہیں۔ اس آیت میں مسئلہ علم خدا اس عنوان سے ہے کہ تمام انسانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے افکار، اسرار و نیاتِ باطنی کے مراقب و نگہبان رہیں۔ فرمان ہے:

"اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کا نفس کیا کیا وسوسے پیدا کرتا ہے اور ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔" (ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توس به نفسه و نحن اقرب اليه من حبل الوريد)۔

درحقیقت اس آیت میں خدا کے دو قسم کے علوم کی طرف اشارہ ہے۔

(۱) مسئلہ خلقت انسان کو سامنے رکھتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح ممکن ہے کہ حکیم و دانا خالق اپنے فعل سے بے خبر ہو جب کہ اس کی خلقت مسلسل اور فیض وجود ہر لحاظ تمام موجودات عالم کے لیے جاری و ساری ہے۔ ایک تشبیہ کے مطابق (اگرچہ ناقص ہے) فیض خدا مثل اس روشنی کے ہے جو مرکز بجلی سے لحظہ بہ لحظہ بلب میں پہنچ رہی ہے (اور بلب روشن ہے)۔

(۲) وہ اپنی مخلوق سے دور نہیں تجی کہ ان سے زیادہ ان کے قریب ہے۔ یہ دائمی حضور اور فوق العادۃ قربت خدا کے تمام اشیاء کا عالم ہونے کی دلیل ہے۔

"ورید"۔ کتب لغت و تفسیر میں "ورید" کے کئی معانی ذکر کیے گئے ہیں۔ راغب اسے اس رگ سے تعبیر کرتا ہے جو دل اور جگر سے متصل ہے۔ ایک جماعت نے اسے شہ رگ کہا ہے جو گردن میں ہے۔ بعض کا خیال ہے وہ رگ ہے جو حلق سے متصل اور زبان کے نیچے ہے۔

---

[1] بعض مفسرین جیسے زمخشری تفسیر کشاف میں اس کے لیے جنبہ اسمی کے قائل ہیں نہ وصفی جیسے "عاقبۃ" اور "ذبیحۃ" جبکہ وصف کا احتمال بھی دیا ہے۔ تفسیر کشاف جلد ۳ ص ۳۸۲۔ مفسرین کی ایک اور جماعت نے اس آیہ ذیل میں سے ان دونوں احتمالات کا تذکرہ کیا ہے۔

[2] بعض کا خیال ہے کہ "مبین" کا مادہ "بیان" ہے۔ اس کا معنی اصلی ابہام و اجمال کے بعد جدائی کے ذریعے انکشاف ہونا ہے۔ لہٰذا جدائی اور وضوح دونوں معنی لیے گئے ہیں۔

کبھی اس کی تفسیر ان تمام رگوں سے کی جاتی ہے جو بدن میں متفرق اور جریانِ خون کا ذریعہ ہیں۔البتہ پہلا معنی ''دل کے متصل رگ'' مفہوم آیت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اصل ہدف خدا کا انسان کے فوق العادہ قریب ہونا ہے۔رگ دل ہی میں یہ مطلب زیادہ واضح ہے بالخصوص یہ کہ گردن کی رگوں کے بارے میں ''وریدان'' ''دورگیں'' بولا جاتا ہے۔

''حبل'' ''رسی'' کا ذکر بتا رہا ہے کہ یہاں ہر قسم کی رگ مراد نہیں بلکہ بدن کی اہم رگوں کا ذکر ہو رہا ہے۔بعض کے خیال میں وہ رگیں مقصود ہیں جو نہر کی مانند ہیں نہ کہ وہ جو راجباہ کی طرح ہیں۔

بہرحال یہ کلمہ مادہ (ورود) سے لیا گیا ہے جس کا معنی پانی کا قصد کرنا اور پانی تک پہنچنا ہے۔اس کی مناسبت ایسی رگوں سے ہے جو جریانِ خون کے کام آتی ہیں اور پوشیدہ نہیں۔

گل اور شگوفہ کو بھی ''ورد'' کہتے ہیں کیونکہ پہلے پہل یہی درخت سے نکلتا ہے۔[1]

''توسوس'' کا مادہ ''وسوسہ'' اور ''وسواس'' ہے جس کا معنی آہستہ آواز، زینت آلات، مخفی پیام و آواز ہے۔پھر اس کا اطلاق تصوراتِ قلبی، آتے جاتے خیالات اور غلط افکار پر ہوا ہے۔[2]

بہرصورت جب خدا ہمارے ذہن میں آنے والے تصورات کا بھی عالم ہے تو پھر ہمارے اعتقادات ثابتہ اور اعمال و افعال پر اس کے احاطہ علمی میں تو کوئی شک ہی نہیں ہوگا۔نیز یہ تعبیر کہ ''ہم انسان کی رگ دل سے بھی زیادہ اس کے نزدیک ہیں'' انسان کو خوف زدہ کرنے کے ساتھ ایک قسم کی امید بھی دلاتی ہے (یعنی خوف و رجاء) کی یہ روشنی ہمارے تمام بدن کو اپنے دائرہ میں لے لیتی ہے۔

جب انسان کو یہ علم ہو جائے کہ اس کا دوست اس کے نفس سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے، کیا یہ عجیب بات نہیں کہ وہ اس سے دور ہو جائے۔کون یہ مصیبت درمیان میں لایا ہے کہ انسان کا دوست اس کے قریب موجود ہو اور یہ اس کی فرقت کی آگ میں جل رہا ہو۔

نحن اقرب گفت من حبل الورید
تو بکندی بتر فکرت رابعید
ای کمانِ تیر ہا پر ساختہ
صید نزدیک و تو دور انداختہ

آیات فوق کی جمع آوری سے یہ واضح ہوگا کہ قرآن مجید علم خداوند کے اثبات کے لیے ایک وسیع برنامہ رکھتا ہے۔اس نے خدا کے احاطہ علمی کو (غیر متناہی شکل میں) عمدہ دلائل اور عباراتِ مختلفہ سے واضح کیا اور ہر جگہ اس کو انسان کی تربیت کی بنیاد قرار دیا ہے۔

---

[1] مفردات راغب مقائیس اللغۃ۔لسان العرب۔تفسیر المیزان۔قرطبی۔فی ظلال القرآن۔کشاف اور دوسری تفسیریں۔

[2] وسواس اسم مصدر اور وساس (واؤ کی زیر سے) مصدر کا معنی دیتا ہے۔کبھی اسم فاعل یعنی شیطان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔(لسان العرب)

توضیحات

(۱) عرفان وتربیت میں علم خدا کی تاثیر

قرآن مجید نے جو خاص اہمیت اس مسئلہ کو دی ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسئلہ علم معرفت خدا میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے اور انسان کو خدا سے اس قدر نزدیک کرتا ہے کہ وہ اس کو ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھتا ہے، لہٰذا اصولی طور پر خدا کی معرفت اس کے علم کی معرفت کے بغیر ناقص اور نارسا ہوگی۔ اس بناء پر کہ ان معارف کا اثر ہمارے فردی وجمعی طور طریقے پر ہوتا ہے، یہ مسئلہ ایک نظریہ کے طور پر جہان بینی کے ساتھ گہرا رابطہ رکھتے ہوئے اسی سے فیض حاصل کرتا ہے اور خدا کے علم لامتناہی سے متعلق ہونے کے باعث اس سے درج ذیل تربیتی آثار ظاہر ہوتے ہیں:

(۱) جب ایک عظیم اور عالم ذات ہر وقت انسان کے اعمال کی مراقبت کر رہی ہے تو اس سے کارِ خیر کی تشویق پیدا ہوگی اور بدی سے بچنے کا جذبہ اجاگر ہوگا، جیسے قرآن کہتا ہے:

خداوند عالم دل کے وسوسوں کو بھی جانتا ہے اور انسان کی رگ دل سے بھی زیادہ اس کے نزدیک ہے، وہ تمہارے سر و جہر (یعنی باطن وظاہر سے) بھی آگاہ ہے، وہ بارش کے قطرات، درختوں کے پتوں اور نباتات کے دانوں کی تعداد کو جانتا ہے۔ آسمان وزمین میں کوئی ذرہ بھی اس کے لامتناہی علم سے پوشیدہ نہیں۔ (یہ سب کی سب تعبیرات آیت فوق میں موجود ہیں) یا فرمان ہے (و کفی بربك بذنوب عباده خبیرا بصیرا) یہی کافی ہے کہ تیرا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ اور ان کے لیے بینا ہے۔ اسراء ۱۷ (یہ تمام آیات) سخت لہجہ میں انسان کو خبردار کر رہی ہیں اور اس میں خوف ورجاء کا ملا جلا احساس پیدا کر رہی ہیں تاکہ وہ ہر کام میں یہ دھیان رکھے کہ خدا ہر چیز اور ہر فعل کو دیکھ رہا ہے۔

(۲) اس نکتے کی طرف توجہ کہ ہمارے ناظر ونگہبان ہمارا ولی نعمت بھی ہے، وہ ہمیں کہہ رہا ہے: ''اپنے ولی نعمت کے عطا یا اور بخشش کے باوجود اس کی نافرمانی کیوں کرتے ہو؟''

(۳) یہ مسلسل مراقبت اور نگہبانی انسان کے دل میں امید کی روشنی پیدا کرتی ہے کہ حوادث میں وہ تنہا نہیں اور ایک اس کا نگہبان ہے کہ جو تمام دنیا اور اس کے اندرونی و بیرونی اسرار ومشکلات سے آگاہ ہے، بایں ہمہ وہ صاحب قدرت اور مہربان ورحیم بھی ہے۔ یہ عقیدہ انسان میں طاقت وقوت پیدا کرتا اور سخت حوادث کے مقابل اسے مقاومت کی طاقت عطا کرتا ہے۔

(۴) علم خداوندی کی وسعت جہان ہستی کی وسعت اور عالم خلقت کے بے پناہ اسرار کی طرف اشارہ ہے۔ یہ خود انسان کے تحرک علمی اور بیشتر مطالعات کے لیے ایک اہم عامل ہے۔

(۲)علم خدا کے دلائل

فلاسفہ و متکلمین نے خداوند عالم کو تمام چیزوں کا علم ہونے کے بارے میں متعدد دلائل پیش کیے ہیں۔ان میں ذیل کے تین دلائل اہم ہیں،عجیب بات ہے کہ آیات فوق میں ان دلائل کی طرف اشارہ موجود ہے۔

الف۔برہانِ خلقت و نظم

جہانِ خلقت میں ایک حیرت انگیز نظام کارفرما ہے،تمام ذرات جہان پر دقیق و پیچیدہ قوانین کی حکومت ہے۔ایٹم سے لے کر نظام شمسی اور آسمانی کہکشائی زندہ ذراتی موجودات سے لے کر آفرینش خالق کے بہترین نمونہ انسان تک،سمندروں میں تیرنے والے پودوں کے خلیوں سے لے کر ایسے عظیم درختوں تک جن کا طول پچاس میٹر تک ہوتا ہے(ان سب پر دقیق الٰہی قوانین حاوی ہیں)۔

اسی طرح عجیب و پیچیدہ نظام جو روح انسانی پر حکمران ہے اور وہ عقل سے بالاتر تنوع جو تمام زندہ موجودات از قسم نباتات،حیوانات کہ جن کی انواع لاکھوں تک پہنچتی ہیں۔یہ سب خدا کے غیر متناہی علم کے گواہ ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی کسی چیز کا خالق ہو اور اس کے اسرار سے آگاہ نہ ہو؟

آنکھ کا خالق،مغز کے دقیق و باریک نظام کا موجد،الیکٹرون کی ایٹم کے گرد عجیب و غریب گردش،مسلم ہے کہ وہ ان تمام نظاموں سے آگاہ اور ان کا عالم ہے اور تھا۔

لہٰذا برہانِ نظم جیسے ہمیں اصل جود خدا سے روشناس کراتا ہے اسی طرح اس سے خدا کا لامتناہی علم بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اگر اس حقیقت کی طرف نظر کریں کہ خلقت کا معاملہ استمرار و دوام رکھتا ہے،تمام موجود ہونے نہ ہونے کی حالت میں ہیں،مبداء آفرینش کے ساتھ انکا ارتباط صرف آغاز و ابتدا میں نہیں بلکہ تمام طول حیات میں یہ رابطہ موجود رہتا ہے۔لہٰذا خدا کا علم تمام اشیاء کے متعلق ہر حال اور ہر زمان و مکان میں ثابت ہو جائے گا۔

ب۔برہانِ امکان و وجوب

معرفت خدا کی بحث میں ثابت ہو چکا ہے کہ واجب الوجود فقط وہی ہے،اس کے سوا سبھی چیزیں ممکنات میں ہیں۔نیز یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ تمام ممکنات اصل وجود اور بقا میں اسی کے محتاج ہیں اور سبھی اس کے سامنے حاضر ہیں۔ان چیزوں کا یہ دائمی حضور اس کے عالم ہونے کی دلیل ہے کیونکہ کسی چیز کا واقعی علم مبداء عاقل کے سامنے اس کے حضور کے بغیر نہیں ہو سکتا۔غور کریں۔

ج۔برہانِ عدم تناہی

مسئلہ علت و معلول سے قطع نظر خدا ہر لحاظ سے وجود لامتناہی ہے۔لہٰذا کوئی مکان و زمان اس سے خالی نہیں،ہر چند کہ وہ زمان

ومکان سے بالاتر ہے۔ کیونکہ اگر کوئی مکان یا زمان اس سے خالی ہوتو وہ محدود ہوجائے گا۔لہٰذا اس کا لامتناہی ہونا دلیل ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر ہے اور تمام جہان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بہ تعبیر واضح پوری کائنات اس کے سامنے حاضر ہے۔ کیا کسی چیز کا علم اس کے حضور کے بغیر ہوسکتا ہے؟

اصولی طور پر علم کی رکاوٹ یا مادی حجاب ہیں یا بعد، دوری اور فاصلہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کوئی شے خدا کے بارے میں متصور نہیں ہوسکتی۔

جیسا کہ آغازِ بحث میں ذکر کیا گیا ہے کہ آیات بالا میں ان عقلی دلائل کی طرف اشارہ موجود ہے جو قرآن مجید کی قوت استدلال اور اعلیٰ ترمنطق کی حکایت کررہی ہیں تفسیر کے ضمن میں ہم نے بھی اس طرف توجہ دی ہے۔

(۳) خدا کا علم حضوری ہے

جیسے حقیقت علم بدیہی ہے اس طرح یہ بھی واضح امر ہے کہ ہم خود میں علم کی دو مختلف قسموں کا وجود پاتے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا اور الگ ہیں۔

پہلی قسم: ہم اپنے وجود میں اپنے ارادہ، عزم، علاقہ، عشق، نفرت اور اپنے افکار کی موجودگی کا علم رکھتے ہیں اور بغیر کسی واسطہ کے ہمیں ان کا علم حاصل ہے۔یعنی ہم خود اپنے سامنے موجود اور ہمارے افکار بھی ہمارے سامنے حاضر ہیں، ہم میں اور ان میں کوئی حجاب نہیں ہے۔ایسے علم کا نام ''علم حضوری'' ہے۔

دوسری قسم: ہم اپنے وجود سے باہر کے موجودات کا علم بھی رکھتے ہیں۔مسلم ہے کہ آسمان وزمین اور ستارے خود ہمارے ذہن میں موجود نہیں بلکہ ان کے آثار سے ان کا عکس ونقش ہمارے ذہن میں ہے۔حقیقتاً ہمارا معلوم واقعی یہی مفاہیم ہیں جو ہمارے تصور میں ہیں اور اس کو ''علم حصولی'' کہتے ہیں۔

تمام موجودات کے متعلق خدا کا علم پہلی قسم کا ہے کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر ہے، وہ سب کا وجودی احاطہ رکھتا ہے اور کوئی چیز اس سے دور نہیں ہے۔ وہ ہرگز حواس اور موجودات کی صورت کے ذہن میں انعکاس کا محتاج نہیں۔ وہاں ذہنی مفاہیم کا وجود نہیں اور وہ اصلاً ذہن ہی نہیں رکھتا، تمام اشیاء کے بارے میں اس کا علم ''علم حضوری'' ہے۔

(۴) علم خدا کا غیر متناہی ہونا

انسان اپنی زندگی کے پہلے دن سے جن چیزوں سے تعلق ورابطہ رکھتا ہے ان کے وجود کے راز کو جاننے میں سرگرداں ہے اور تتبع و تلاش میں لگا ہوا ہے۔ وہ آج تک ان کو اپنے دل میں جگہ دیتا آیا ہے۔علوم ودانش کے خزانے، کتاب خانوں کی الماریوں میں رکھی ہوئی لاکھوں کتابوں کے مشاہدہ سے انہیں اپنے ہمراہ لارہا ہے۔(بعض لائبریریوں میں کتابوں کی تعداد ۲۵۰ لاکھ تک پہنچی ہوئی ہے)۔

یہ صحیح ہے کہ بعض مطالب میں تکرار اور بعض کتابیں ترجمہ ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان میں بے بہا حقائق موجود ہیں جو انسانی معاشرے کے طول تاریخ میں فکر و تجربہ کا نتیجہ ہیں۔ قطع نظر ان علوم سے جن کے جاننے والے انہیں اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گئے ہیں، تاہم مجہولات کے مقابلے میں یہ معلومات دریا کے مقابلہ میں ایک قطرہ اور پہاڑوں کے سامنے ایک ذرہ کی مانند ہیں۔

ان کی محدودیت کی دلیل امور ذیل ہیں:

الف) ہمارے حواس کی قوت محدود ہے، ہم موجودات عالم کے ایک تھوڑے سے حصے کا ادراک کر سکتے ہیں جیسا کہ ہماری تحلیل عقلی کی طاقت بھی فقط چھوٹے چھوٹے عقلی مسائل کے ادراک تک محدود ہے۔

ب) انسان کا دورانِ عمر اس دنیا کی عمر کے مقابلہ میں ایک ساعت کے برابر بھی نہیں ہے۔

ج) وہ جگہ یعنی ''کرہ زمین'' جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، یہ ستاروں اور کہکشاؤں کے مقابلے میں بہت ہی محدود ہے۔ (آج کل کے مفکرین کے بقول ہماری کہکشاں میں ایک کروڑ کے لگ بھگ ستارے ہیں) جب کہ آج کے علم فلکیات کے مطابق خود کہکشاؤں کی تعداد بھی ایک کروڑ ہے۔

اس سے علم پروردگار کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ کس قدر خوبصورت ہے قرآن کی یہ تعبیر (جو آیت مافوق میں ذکر کی جا چکی ہے) کہ اگر تمام درخت قلم بن جائیں، تمام دریا سیاہی، پھر ان میں سات گنا اضافہ کر دیا جائے تو بھی انسان کلمات خدا کے بیان پر قادر نہیں ہوگا۔ (لقمان ۲۷)

اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ خدا اپنی ذات کا بھی عالم ہے جب کہ اس کی ذات غیر محدود ہے تو اس کا اپنی غیر محدود ذات کا علم بھی غیر محدود ہوگا۔ لہٰذا اعداد اور ہندسے اس کی عظمت کی قدرت نہیں رکھتے۔

(۵) علم خدا کے بارے میں اہم سوالات

زمانہ قدیم سے فلاسفہ و متکلمین کے مابین علم خدا کے بارے میں کئی سوالات موجود رہے اور بعد میں ان میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ علم کا مسئلہ بالعموم اور علم خدا کا مسئلہ بالخصوص بہت پیچیدہ ہے۔ ان میں سے اہم سوالات یہ ہیں:

(ا) خدا اپنی ذات کا عالم کیسے ہو سکتا ہے جب کہ عالم و معلوم دو چیزیں ہونا چاہئیں۔ کیا خدا کے علم اور اس کی ذات کے درمیان مغائرت ہو سکتی ہے؟ یہ عبارت واضح کرتی ہے کہ خدا خود عالم بھی ہو اور معلوم بھی ہو۔

جواب: اولا: یہ سوال فقط خدا کی ذات کے بارے میں ہی نہیں بلکہ جب ہم اپنی ذات کا علم رکھتے ہوں تو بھی یہی سوال کیا جا سکے گا۔ ہم یقینا اپنے آپ کے عالم ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہم موجود ہیں۔ پس یہی سوال پیدا ہوگا کہ عالم و معلوم دو چیزیں ہونا چاہئیں جب کہ ہم اور ہماری ذات ایک ہی چیز ہے خصوصاً جب کہ ہمارا اپنی ذات کے متعلق علم ''حضوری'' ہے۔ ثانیا: مطلب وہی ہے جو محقق طوسی نے اس سوال کے جواب

میں فرمایا ہے کہ وہ خود کو اپنے سامنے حاضر دیکھ رہا ہے، وہ ''عالم'' ہے اور اس لحاظ سے کہ خود اپنے سامنے حاضر ہے، وہ ''معلوم'' ہوگا۔

بالفاظ دیگر اس ایک وجود کو دو زاویوں سے دیکھا جائے گا۔ اس زاویہ سے کہ خود کو درک کر رہا ہے۔ اسے عالم کا نام دیا جائے گا اور اس زاویہ سے کہ خود درک ہو رہا ہے۔ معلوم کے نام سے موسوم ہوگا۔ غور کریں۔

(۲) موجوداتِ عالم جب ہمیشہ تغیر و تبدل کی حالت میں ہیں تو کس طرح ان موجودات کے ساتھ علم خدا کا تعلق ہو سکے گا۔ کیا خدا کی ذات پاک میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے؟

جواب: یہ سوال اس وقت تک ہو سکتا ہے جب ان اشیاء کے بارے میں خدا کا علم اس طرح ہو جیسے ہمارا علم۔ یعنی اشیاء کی صورت کا ذہن میں آنا کیونکہ ان موجودات میں تغیر سے صورت ذہنی میں بھی تغیر و تبدل ہوگا۔ لیکن خدا کا علم تو حضوری ہے یعنی تمام چیزیں اپنے تمام وجود کے ساتھ اس کے سامنے حاضر ہیں۔ لہٰذا اس اشکال کا کوئی مفہوم نہیں رہتا کیونکہ تبدیلی موجودات عالم میں ہے ذات خدا میں نہیں۔ ذات خدا نے سب کا احاطہ کیا ہوا ہے اور خود ثابت ہے۔ یہ چیزیں محاط یعنی اس کے احاطہ میں ہیں اور متغیر ہیں۔ مثلاً ایک شخص ہمارے سامنے چل رہا ہے۔ اس کا عکس ہماری آنکھ کے شبکہ پر پڑ رہا ہے۔ اس شخص کی حرکت سے اس کے عکس میں بھی حرکت اور تبدیلی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہمارے ذہنی تصور میں بھی تبدیلی و تغیر ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم اس ذہنی انعکاس کا نتیجہ ہے۔ اگر ان اشیاء خارجیہ کے متعلق ہمارا علم اس طرح ہوتا کہ ہم نے سب کا احاطہ کیا ہوا ہے تو ہم میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوتا۔ بلکہ تبدیلی و تغیر فقط ان چیزوں میں ہوتا۔ غور کریں۔

(۳) کس طرح ممکن ہے کہ خدا جزئیات کا عالم ہو جب کہ جزئیات کی تعداد کثیر ہے؟ وہ ذات پاک جو تمام جہات سے واحد ہے، متعدد موجودات کے لیے اس میں کوئی راستہ نہیں۔

جواب: یہ اشتباہ اس لیے پیدا ہوا کہ ہم نے خدا کے علم کو بھی اپنے علم کی طرح علم حصولی سمجھ لیا ہے۔ (یعنی صورت کا ذہن میں آنا) جب کہ خدا کا علم حضوری ہے۔ پس تمام موجودات اپنی ذات کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہیں، وہ ان سب پر محیط ہے بغیر اس کے کہ عکس و نقش کی احتیاج ہو۔

(۴) آنے والے حوادث کا خدا کیسے عالم ہوگا جب کہ ان کا وجود خارجی ہی نہیں ہے تا کہ علم خدا ان کا احاطہ کر سکے؟ کیا ان کی صورت، عکس اور نقش خدا کے ذہن میں ہے جب کہ خدا کا ذہن ہی نہیں اور خدا کا علم انعکاس کی صورت میں نہیں۔ پس ہمیں قبول کر لینا چاہیے کہ خدا آئندہ حوادث کا عالم نہیں کیونکہ معدوم کا علم حضوری نہیں ہوتا اور خدا کے بارے میں علم حصولی متصور نہیں۔

اگرچہ یہ سوال آئندہ حوادث کے بارے میں اٹھایا گیا ہے لیکن حوادث گذشتہ کی صورت حال بھی یہی ہے جو محو و نابود ہو گئے ہیں کیونکہ اس وقت تو ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ فرعون، موسیٰ اور بنی اسرائیل کی تصویر ختم ہو چکی اور ان کا وقت گزر چکا ہے، ہم ان کی ذہنی تصویر کشی کر سکتے ہیں تا کہ گذشتہ تاریخ سے واقف ہو سکیں کیونکہ ہمارے علم کا ذریعہ کسی چیز کی صورت کا ذہن میں منقش ہونا ہے۔ لیکن خدا کے بارے میں ذہن اور نقش کا کوئی تصور نہیں۔ خدا کا علم تو علم حضوری ہوتا ہے، وہاں حوادث گذشتہ کا تصور کیسے ہوگا۔

جواب: اس سوال کے تین جواب دیئے جا سکتے ہیں۔

(۱) خدا تمام اشیاء کی علت ہے۔لہٰذا خدا ہمیشہ تمام اشیاء کا احاطہ رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔تمام موجوداتِ جہان کے بارے میں خدا کا یہ علم اجمالی قبل از ایجاد و بعد از ایجاد ہے۔

بالفاظ دیگر اگر ہم اشیاء کی علت کا علم رکھتے ہیں تو نتیجہ اور معلول کا بھی علم ہوگا کیونکہ ہر علت معلول کے تمام کمالات مع اضافہ سے واقف ہوتی ہے۔

اس بات کی توضیح ایک اور طرح بھی کی جاسکتی ہے۔

گذشتہ حوادث بطور کل نابود نہیں ہوئے کیونکہ ان کے آثار و نشانات موجودہ حوادث میں موجود ہیں۔اسی طرح حوادث آئندہ آج کے حوادث سے جدا نہیں بلکہ آج کے حوادث سے مربوط ہیں۔اس لحاظ سے گذشتہ، آئندہ اور آج کے حوادث علت و معلول کی طرح ایک رشتہ زنجیر میں متصل ہیں۔اگر واقعاً ہم ان سے کسی ایک سے آگاہ ہو جائیں تو ہمیں قبل و مابعد سے بھی آگاہی ہو جائے گی۔

مثلاً اگر میں تمام کرۂ زمین کی ہوا کا واقعاً تمام جزئیات، مشخصیات، اس کے علت و معلول، حرکت زمین اور مسئلہ جاذبہ و واقع سے واقف ہو جاؤں تو لاکھوں سال قبل یا لاکھوں سال بعد کی وضع ہوا کا علم بھی حاصل کرلوں گا کیونکہ گذشتہ و آیندہ سب کی حالت ایک جیسی ہے۔یہ فقط علم اجمالی نہیں بلکہ آج کے جزئیات کی تفصیل آیندہ و گذشتہ زمانے میں مکمل طور پر منعکس ہے۔آج کا معاملہ بعینہ گزرے ہوئے کل کا تسلسل ہے اور کل کی بازگشت آج کی طرف ہے، پس آج کی تمام جزئیات کا علم بعینہ گذشتہ و آئندہ حوادث کا علم بھی ہے۔لہٰذا جب آج کے حوادث تمام جزئیات و خصوصیات کے ساتھ خدا کے ہاں حاضر ہیں تو گذشتہ و آئندہ بھی اسی طرح حاضر ہیں۔

آج روز گذشتہ و روزِ آیندہ کا ہی آئینہ ہے اور تمام گذشتہ و آئندہ حوادث کو آج کے آئینہ میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔غور کریں۔

(۲) اس سوال کے جواب کے لیے ایک دوسرا راستہ بھی ہے جس کی وضاحت ہم ایک مثال سے کرتے ہیں: فرض کریں کہ ایک انسان کسی کمرے میں قید ہے، صرف ایک روشندان کھلا ہے جس سے وہ باہر کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔اگر اونٹوں کی ایک قطار گزر رہی ہے تو وہ کس اونٹ کا سر، کسی کی گردن، پھر کوہان، بعد میں پاؤں اور دم کو دیکھتا ہے اور اسی طرح باقی اونٹوں کو دیکھتا ہے جو روشندان کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ایسے انسان نے ایک چھوٹے سے روشندان سے جو کچھ دیکھا ہے اسی سے اس قطار کا آج، کل اور گذشتہ آئندہ ترتیب دے گا۔لیکن جو شخص چھت پر کھڑا سب کا یک بارگی معائنہ و مشاہدہ کر رہا ہے، کھلی فضا میں بیک وقت سب کو دیکھ رہا ہے وہ اونٹوں کی پوری قطار کو ایک جگہ کھڑے ہو کر حالت حرکت میں دیکھے گا اور اس کے لیے یہ معاملہ کسی اور طرح کا ہوگا۔اس لیے واضح ہوا کہ گذشتہ و آیندہ اور حال کے مفاہیم ہماری محدود سوچ کا نتیجہ ہیں، جو آج ہمارے لیے ماضی ہے وہ سابقہ اقوام کے لیے مستقبل تھا، جو آج ہمارے لیے مستقبل ہے وہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے ماضی سمجھا جائے گا۔

لیکن وہ ذات جو ہر جگہ حاضر ہے، ازلی و ابدی ہے، وہاں ماضی، مضارع اور حال بے معنی ہیں۔طول زمانہ کے تمام حوادث اس کے سامنے ہیں (لیکن ہر ایک اپنے مخصوص دائرہ میں ہے) وہ تمام موجودات اور حوادث عالم (گذشتہ، آئندہ و حال) کا ایک جیسا احاطہ رکھتا ہے۔

بہرحال ہمیں اعتراف ہے کہ اس بات کا تصور ہمارے لیے، جو زمان و مکان کے زندان میں محبوس ہیں، کافی مشکل ہے لیکن بہرحال

یہ بات قابل وقت ومطالعہ ضرور ہے۔

(۳) اس سوال کا ایک تیسرا جواب جس کو بہت سے فلاسفہ نے اختیار کیا، وہ یہ ہے کہ خدا اپنی ذات کا عالم ہے چونکہ یہ ذات تمام مخلوقات کی علت ہے۔علت کا علم معلول کے علم کا سبب بن جائے گا۔ بالفاظ دیگر وہ تمام کمالات جو مخلوقات میں ہیں خدا ان سب کا جامع ہے۔سب کا بطور اکمل واجد ہے لیکن ان مخلوقات کے نقائص سے مبرا ومنزہ ہے۔لہٰذا جب وہ اپنی ذات کا عالم ہے تو تمام موجودات کا عالم بھی ہوگا۔(اس جواب اور پہلے جواب میں لطیف و باریک فرق ہے جو غور وفکر کرنے سے معلوم اور واضح ہو سکے گا۔)

(۶) علم خدا اسلامی روایات میں

روایات اسلامی میں بہت سی بہترین وزندہ تعبیریں ہیں خصوصاً نہج البلاغہ میں علم خداوندی کے بارے میں ایسے فرامین ہیں جن سے گذشتہ بحثیں واضح اور روشن تر ہو جاتی ہیں۔نمونہ کے طور پر مطالب ذیل کی طرف توجہ فرمائیں۔

۱۔ امیر المومنین امام علی علیہ السلام علم خدا کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یعلم عجیج الوحوش فی الفلوت، ومعاصی العباد فی الخلوات، و اختلاف النینان فی البحار الغامرات و تلاطم الماء بالریاح العاصفات"

''وہ (خداوند عالم) بیابانوں میں چوپایوں کی چنگھاڑ سنتا ہے، تنہائیوں میں بندوں کے گناہوں سے آگاہ ہے اور اتھاہ دریاؤں میں مچھلیوں کی آمد وشد اور تند ہواؤں کے ٹکراؤ سے پڑنے والے پانی کے تھپیڑوں کو جانتا ہے۔''[۱]

۲۔ ایک اور کلام میں ارشاد ہے:

"عالم اذلا معلوم، ورب اذلا مربوب، وقادر اذلا مقدور۔"

''وہ اس وقت بھی عالم تھا جب معلوم کا وجود نہ تھا، اس وقت بھی رب تھا جب پرورش پانے والے نہ تھے اور اس وقت بھی قادر تھا جب زیر قدرت آنے والی مخلوق نہ تھی۔''[۲]

۳۔ ایک اور خطبہ میں ارشاد ہے:

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۸

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۲

"قد علم السرائر، وخبر الضمائر، له الاحاطة بكل شيئ، والغلبة لكل شيئ۔"

''وہ دل کی نیتوں اور اندر کے بھیدوں کو جانتا پہچانتا ہے۔ وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز پر اس کا زور چلتا ہے۔''[1]

۴۔ کافی باب صفات ذات میں امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے:

"لم يزل الله عزوجل ربنا والعلم ذاته، ولا معلوم ..... فلما احدث الاشياء وكان المعلوم، وقع العلم منه على المعلوم"

''ہمارے پروردگار کا علم ہمیشہ عین ذات رہا ہے حتی کہ اس وقت بھی جب معلوم کا وجود نہ تھا۔ پھر جب اشیاء کو ایجاد کیا اور معلوم موجود ہوا اور اس کا علم معلوم پر منطبق ہو گیا۔''[2]

ممکن ہے یہ تعبیر اشیاء کے حدوث سے قبل علم اجمالی اور بعدہ علم تفصیلی کی طرف اشارہ ہو۔

۵۔ ایک اور حدیث میں ایک صحابی نے حضرت امام ابوالحسن علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی خدمت میں لکھ بھیجا:

"سئل عن الله عزوجل اكان يعلم الاشياء قبل ان خلق الاشياء و كونها؟ اولم يعلم ذلك حتى خلقها و آراد خلقها و تكوينها؟ فعلم ماخلق عندما خلق و ما كون عند ما كون، فوقوع بخطه: لم يزل الله عالما بالاشياء قبل ان يخلق الاشياء كعلمه بالاشياء بعد ماخلق الاشياء"

''اس نے خدا کے علم کے متعلق سوال کیا۔ کیا موجودات کی خلقت و تکوین سے پہلے خدا جانتا تھا یا پہلے علم نہیں تھا یا اس وقت علم ہوا جب پیدا کیا اور خلقت و تکوین کا ارادہ کیا۔ امامؑ نے بدست خود رقم فرمایا: خداوند عالم جیسے خلقت اور شی کے موجود ہونے کے لیے اس کا عالم ہے اسی طرح خلقت سے پہلے بھی عالم

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۸۶

[2] اصول کافی جلد ۱ ص ۱۰۷

تھا اور ہے۔''[1]

درحقیقت ان روایات میں علم خدا کے بارے میں وہ دقیق اور عمدہ تعبیریں ہیں جن کا علمی و منطقی ابحاث میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ علم پروردگار کے بارے میں بہت سی روایات ہیں۔ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔

[1] اصول کافی جلد ا ص ۱۰۷

علم کی شاخیں

خدا

سمیع و بصیر ہے

علم کی شاخیں

خدا سمیع وبصیر ہے

اشارہ

جیسا کہ ہم جانتے ہیں صفات خدا عین ذات ہیں اور نتیجہ میں ایک دوسرے کے بھی عین ہیں۔ بہ تعبیر واضح خدا ایسی ذات ہے جو کامل طور پر علم ہے، قدرت ہے اور کامل ازلیت وابدیت ہے۔ یعنی خدا کے ہاں کمال مطلق ہے اور یہ تمام اوصاف وہاں ایک ہی جگہ جمع ہیں۔

اس بنا پر صفات کا ذات سے الگ ذکر ہماری عقل اور نگاہ کے لحاظ سے ہے۔ اس نظر سے دیکھیں تو کبھی بعض صفات کی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں اور یہ شاخیں بھی ہمارے ہی زاویہ نگاہ سے ہیں۔ جیسے خدا کا سمیع وبصیر ہونا کہ جو صفات الٰہی میں دو مشہور صفتیں ہیں اور قرآن مجید میں دسیوں بار ان کا تذکرہ ہوا ہے۔

"سمیع" مسموعات کے بارے میں خدا کے علم کی باتیں اور کلام۔

"بصیر" مبصرات یعنی میدان، اشخاص اور اعمال یعنی دیکھنے کے قابل اشیاء کا علم۔

یہ الفاظ جب انسان سے متعلق استعمال ہوں تو پھر دو وسیلوں یعنی آنکھ اور کان کی ضرورت ہوتی ہے جن سے دیکھا اور سنا جائے۔ لیکن مسلم ہے کہ جب ان کا خدا کے بارے میں ذکر ہو تو ان اعضاء (آنکھ، کان) سے نفی ہو جائے گی اور حقیقت علم سننے و دیکھنے تک پہنچنا ہوگا جیسا کہ ہم توضیحات میں اس کا مزید تذکرہ کریں گے۔

اس اشارہ کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف لوٹتے اور آیات ذیل کی طرف توجہ کرتے ہیں:

(۱) لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪ (شوری ۱۱)

(۲) اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ⑤⑧ نساء ۵۸)

(۳) لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْۗءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ⑭⑧ (نساء ۱۴۸)

(۴) وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۴﴾ (بقرہ ۲۴۴)

(۵) وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ﴿۵۰﴾ (سبا ۵۰)

(۶) هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِیَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ (آل عمران ۳۸)

(۷) وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۳۳﴾ (بقرہ ۲۳۳)

(۸) اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۳۱﴾ (فاطر ۳۱)

(۹) فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾ (مومن ۴۴)

(۱۰) اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ ۛؕ مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍۭ بَصِیْرٌ ﴿۱۹﴾ (ملك ۱۹)

ترجمہ

(۱) خدا کی مثل کوئی چیز نہیں۔ وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

(۲) خدا تمہیں حکم دے رہا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے مطابق فیصلہ کرو۔ خداوند عالم اچھی نصیحتیں فرماتا ہے، خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

(۳) خدا پسند نہیں کرتا کہ کوئی انسان بری بات کہے مگر یہ کہ اس پر ظلم ہوا ہو، خدا سننے والا ہے۔

(۴) خدا کی راہ میں جہاد کرو اور جان رکھو کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

(۵) اگر ہدایت یافتہ ہوں تو اسی کی وحی کی وجہ سے ہوں جو میرا رب میری طرف کرتا ہے۔ وہ سننے والا اور نزدیک ہے۔

(۶) جب زکریا نے (مریم میں صلاحیت ولیاقت دیکھی) تو بارگاہِ خدا میں دعا کی اور عرض کی خدایا مجھے بھی اپنی طرف سے پاکیزہ فرزند عطا فرما۔ بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔

(۷) تقویٰ اختیار کرو۔ جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو دیکھتا ہے۔

(۸) خداوند عالم اپنے بندوں کی نسبت باخبر و بینا ہے۔

(۹) (مومن آل فرعون نے کہا) جو میں کہہ رہا ہوں بہت جلد تم اسے سمجھ لوگے۔ میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کی نسبت بینا ہے۔

(۱۰) کیا یہ (بے ایمان) لوگ اپنے سروں پر پرندوں کو پر کھولتے اور بند کرتے ہوئے نہیں دیکھتے؟ خدائے رحمان کے سوا کوئی نہیں جو فضا میں انھیں تھامے ہوئے ہے کیونکہ وہی ہر چیز کا بینا و بصیر ہے۔ [1]

مفردات کی تشریح

''سمیع'' کا مادہ ''سمع'' بروزن ''منع'' ہے۔ اصل میں اس کا معنی شنوائی کی قوت ہے کہ جس کے وسیلے سے انسان صدا و آواز کو درک کرتا ہے۔ (اس میں مصدر و اسم مصدر ہر دو معنی ہیں) کبھی اس کلمہ کا اطلاق شنوائی کے عضو یعنی کان پر بھی ہوتا ہے۔ پھر دوسرے استعمالات میں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور روحانی قوت کے وسیلے سے ہونے والے باطنی ادراکات پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر خدا کو ہر صدا اور آواز پر جو احاطہ وجودیہ حاصل ہے اس پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔

کبھی یہ کلمہ فہم و درک کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے سورۂ انفال کی آیت ۲۱ میں ہے "ولا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وھم لایسمعون" تم ان لوگوں کی طرف نہ ہو جاؤ جو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا (ہم نے سمجھا) جب کہ وہ کچھ بھی نہیں سنتے (اور نہ ہی کچھ سمجھتے ہیں)۔ [2]

''بصیر'' کا مادہ ''بصر'' بروزن ''سفر'' ہے۔ مفردات میں راغب کہتے ہیں کہ اس کا معنی عضو بینائی یعنی آنکھ ہے۔ کبھی قوت بینائی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے قوت ادراک اور اندرونی بینائی ''بصیرت و بصر'' پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے جیسے سورۂ ق آیت نمبر ۲۲ میں ہے۔ "فکشفنا عنك غطاءك فبصرك الیوم حدید" ہم نے تیری آنکھ سے پردہ ہٹایا اور آج (موت یا قیامت کے دن)

---

[1] آیات بالا اوصاف سمیع و بصیر کے سلسلہ میں بطور نمونہ ذکر کی گئی ہیں جن میں مختلف نکات ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآنِ مجید میں بہت سی آیات ہیں جن کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جا رہا ہے۔ ان کی تفسیر آیات بالا سے ہی معلوم ہو جائے گی۔

بقرہ ۱۱، ۹۶، ۱۸۱، ۲۲۴، ۲۲۷، ۲۵۶، ۲۶۵۔ آل عمران: ۱۵، ۲۰، ۳۴، ۳۵، ۱۲۱، ۱۵۶، ۱۶۳۔ مائدہ: ۷۱۔ انعام: ۱۳، ۱۱۵۔ انفال: ۱۷، ۴۲، ۵۳، ۶۱۔ توبہ: ۹۸، ۱۰۳۔ یونس: ۶۵۔ اسراء ۱، انبیاء ۴، حج ۶۱، ۷۵، نور ۲۱، ۶۰، لقمان ۲۸، مومن ۲۰، ۵۶، صف ۳۶، دخان ۶، حجرات ۱، مجادلہ ۱، نساء ۱۳۴، ۱۴۸، انفال ۱۷، ۲۹، ۴۲، ۵۳، ۶۱، ہود ۱۱۲، اسراء ۱، ۱۷، ۳۰، ۹۶، سبا ۱۱، حدید ۴، ممتحنہ ۲، تغابن ۲، فرقان ۲۰، احزاب ۹، فتح ۲۴، انشقاق ۱۵، فاطر ۴۵، حم سجدہ ۴۰، شوریٰ ۲۷، حجرات ۱، ۱۸۔

[2] مفردات راغب۔ مقائیس اللغۃ۔ لسان العرب اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم

تیری نظر تیز بین ہے۔

لسان العرب میں ابن منظور نے بصر کے یہی معنی ذکر کیے ہیں، حالانکہ ''صحاح اللغۃ'' نے ''بصر'' کا معنی قوت بینائی لیا ہے، نیز اسے بمعنی علم و دانش بھی ذکر کیا ہے۔ ''مصباح'' نے ''بصر'' کو اس نور کے معنی میں لیا ہے جس کے وسیلے سے انسان دیکھنے کے قابل چیزوں کو دیکھتا ہے۔ لیکن اہل لغت کے کلمات اور موارد استعمال سے مجموعا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلمہ پہلے عضو بینائی اور پھر قوت بینائی کے معنی میں ہے۔ مزید برآں اس کا معنی باطنی ادراک اور علم لیا گیا ہے، اس کو خدا کی ذات کے لیے استعمال کرنے کی صورت میں اس کا معنی احاطہ وجود یہ ہے۔ (یعنی تمام قابل دید اشیاء کا وجودی احاطہ)

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے

(۱) پہلی آیت میں مورد بحث میں خدا کے اس وصف کے بیان کے بعد کوئی چیز اس کی مثل نہیں اس کی دو صفتیں سننے والا، دیکھنے والا بطور توصیف بیان کی گئی ہیں۔ فرمان ہے: وہ سمیع و بصیر ہے (لیس کمثلہ شیء و ھو السمیع البصیر)

واضح ہے کہ خدا کی عدم مثل سے مراد ذات، صفات اور افعال میں اس کی مثل کا نہ ہونا ہے کیونکہ اس کی ذات واجب الوجود، اس کی صفات غیر متناہی اور افعال بھی اسی طرح غیر محدود ہیں۔ بعض مفسرین کا یہ خیال غلط اور بے بنیاد ہے کہ ذات میں خدا کی شبیہ نہیں، لیکن صفات میں شبیہ ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ صفات جیسے عالم، قادر، سمیع و بصیر، خدا اور مخلوق ہر دو پر بولے جاتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے معنی ہر دو کے لیے جدا جدا ہیں۔ اس کی تشریح توضیحات میں آئے گی۔ انشاء اللہ

لہٰذا بعض مفسرین نے آیت فوق میں حصہ مراد لیا ہے، یعنی فقط خدا ہی سمیع و بصیر ہے اور اس سے سمیع واقعی اور بصیر واقعی بایں معنی مراد ہے کہ وہ ذات جو تمام اصوات اور تمام قابل دید چیزوں پر محیط ہے وہ صرف خدا ہے۔ انسان اور باقی حیوانات جو آنکھ اور کان رکھتے ہیں وہ محدود رنگوں اور بعض صوتی امواج کو درک کر سکتے ہیں۔ آج کے علوم کے مطابق وہ صوتی امواج کہ انسان و حیوانات کے کان ان کے درک کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ ان کے مقابل بہت زیادہ ہیں جن کا ادراک وہ کر سکتے ہیں۔ رنگوں اور قابل دید چیزوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔

وہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے

(۲) دوسری آیت میں امانتیں حقداروں کے سپرد کرنے اور فیصلے عدل کے مطابق کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ دونوں صفتیں جن کا خدا سے واسطہ ہے، اسے ان کے ساتھ متصف کرنے کے بعد فرمان ہے:

خداتمہیں حکم دے رہا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچادو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے مطابق فیصلہ کرو۔ خداوند عالم اچھی نصیحتیں فرماتا ہے۔ خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔(ان الله یامرکم ان تودوا الامانات الی اهلها و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان الله نعما یعظکم به ان الله کان سمیعا بصیرا)

معلوم ہے کہ امانت کا مفہوم وسیع ہے۔ حتیٰ کہ روایات اہل بیتؑ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مسئلہ امانت لوگوں پر امامت وحکومت کو بھی شامل ہے کیونکہ یہ بھی خدائی امانتیں ہیں اور ضروری ہے کہ ان کے حقداروں کے سپرد کی جائیں۔[1]

نیز لفظ ''ناس'' تمام انسانوں یہاں تک کہ غیر مسلموں کو بھی شامل ہے، یعنی اصول عدالت کو سب افرادِ بشر کے لیے جاری کرو، اس لیے کہ اس معاملے میں دشمن ودوست اور اپنا بیگانہ سب برابر ہیں۔ البتہ امانت وعدالت کی حث جو واقعاً جامعہ انسانی اور حکومت کی رو ہے، اس کا محل کوئی اور ہے۔ انشاءاللہ ہم اس پر بحث کریں گے۔ یہاں اصل ہدف سمیع وبصیر میں رابطے کا ذکر کرنا ہے۔

ہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ تم جس عہدہ پر فائز ہو۔ امانت، عدالت اور حکومت کے جس منصب پر بھی ہو، خدا تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور تمہاری گفتگو سن رہا ہے۔ لہٰذا یہاں اوصاف خدا کا تذکرہ صفات کے عنوان سے بھی ہے اور تربیتی لحاظ سے بھی مدنظر ہے۔

ممکن ہے یہ ایک اور نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو کہ حکومت اور عدالت میں ادائے امانت کے لیے سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ ضروری ہے۔ مظلوموں کی آواز سنے بغیر، ستم رسیدہ لوگوں کا حال دیکھے بغیر اور اس سلسلے میں بصیرت کامل حاصل کیے بغیر یہ کام صحیح طریقے سے نہیں ہو سکے گا۔

نیز یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ کلمہ کان (یعنی تھا) میں یہ اشارہ ہے کہ ان اوصاف کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے، وہ ہمیشہ سمیع وبصیر تھا اور ہے اور بہت سی قرآنی آیات میں سمیع وبصیر کا اکٹھا ذکر ہوا ہے۔ توجہ رہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی سمیع وبصیر اکٹھے استعمال ہوء وہاں سمیع پہلے اور بصیر بعد میں ہے۔

ممکن ہے اس میں یہ بتانا مقصود ہو کہ انسان میں عام طور پر گفتار کردار سے پہلے ہے یعنی قول عمل سے پہلے ہوتا ہے۔ چونکہ ان آیات کا رخ تربیتی پہلو کی طرف بھی ہے لہٰذا واقعاً کہا جا رہا ہے کہ اے انسان خدا تیری باتیں سن رہا ہے۔ اب وہ تیرا عمل دیکھنا چاہتا ہے۔

وہ سننے والا اور جاننے والا ہے

(۳) تیسری آیت میں سمیع وعلیم کی بات ہو رہی ہے، اس میں ان لوگوں کا تذکرہ مقصود ہے جو مظلوم ہیں انہیں حق دیا گیا ہے کہ وہ ظالموں کے خلاف آواز اٹھائیں اور ان کے ظلم کو بیان کریں۔ فرمان ہوا ہے:

---

[1] اس سلسلے میں کثیر روایات آئی ہیں اگر زیادہ اطلاع چاہتے ہوں تو تفسیر برہان جلد ۱ ص ۳۸۰ اور تفسیر نور الثقلین جلد ۱ ص ۴۹۶ رجوع فرمائیں۔

''خدا پسند نہیں کرتا کہ کوئی انسان بری بات کہے مگر یہ کہ اس پر ظلم ہوا ہو، خدا سننے والا جاننے والا ہے۔(لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم و کان اللہ سمیعا علیما)۔

جہر بالسوء (بری باتوں کے اظہار) سے مراد کیا ہے؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد مظلوم کا ظالم کے خلاف احتجاج کرنا ہے۔بعض کے نزدیک اس سے سب وشتم مراد ہے۔بعض نے اس جملے سے قاضی کے پاس شکایت لے جانا مراد لیا ہے یا لوگوں کے سامنے ظالم کے ظلم کا اظہار کرنا مراد ہے، چاہے ظالم وہاں موجود ہو یا غائب ہو۔

لیکن حکم اور موضوع کی مناسبت سے دیکھا جائے تو ظلم کے (دفیعہ) اور ظالم کے ظلم کے مقابلے میں لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ہی اس کے اظہار کی اجازت دی گئی۔لہٰذا مناسب ہے کہ ظالموں کو سب وشتم کرنا اسی وقت ہی جائز ہو جب منکر کا دفعیہ اور ظلم وفساد کا مقابلہ صرف اسی طرح کیا جا سکتا ہو وکان اللہ سمعیا علیما کا جملہ مشتثنی ومشتثنی منہ ہر دو سے متعلق ہو سکتا ہے یعنی جو لوگ مظلوم نہیں اور غیبت کر رہے ہیں ان کو خبردار کیا جا رہا ہے، نیز مظلوموں کو بھی متوجہ کیا جا رہا ہے کہ وہ حد سے تجاوز نہ کریں اور احتجاج میں بھی عدل وانصاف کا خیال رکھیں۔

قابل توجہ ہے کہ اس جگہ سمیع وعلیم ہی کہا گیا ہے کیونکہ بری باتیں اور بری نیتیں جو ان کا سبب بنتی ہیں ان سے بحث ہو رہی ہے۔ فرمان ہے: خدا ان باتوں کو سن رہا ہے اور کہنے والوں کی نیتوں سے بھی آگاہ ہے کہ آیت کا مفہوم کچھ اس طرح ہے، اگر کوئی انسان کسی کو کہے اے زانی تو جائز ہے کہ وہ بھی کہنے والے کو اسی طرح کہہ دے۔لیکن یہ خیال بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ ضروری ہے کہ ظالم کے ظلم کے مقابلے میں حق کا اظہار کیا جائے اور حق کو ثابت کیا جائے۔نہ یہ کہ وہ بھی ظلم کا ارتکاب شروع کر دے۔بلکہ نہی از منکر اور شر ظالم کا دفعیہ کرنا چاہیے نہ یہ کہ ایک اور منکر کا ارتکاب کیا جائے جس سے ایک اور ظالم کی پرورش شروع ہو جائے۔

بہرحال یہ آیت گواہ ہے کہ اسلام نہیں کہتا کہ ظالم کے مقابلے میں خاموش ہو جاؤ۔جیسے اس قسم کی غلط بات حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کی گئی ہے کہ اگر کوئی دائیں رخسار پر طمانچہ مارتا ہے تو بایاں رخسار پیش کیا جائے تاکہ اس پر بھی طمانچہ رسید کر دیا جائے۔

تمہاری جنگ وجہاد اس کے حضور میں ہے

(۴) چوتھی آیت میں ایک نئی تعبیر ہمارے سامنے ہے، اس میں لوگوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ خدا کی ان دونوں صفات ''سمیع وعلیم'' کی طرف توجہ کریں۔فرمان ہے: ''خدا کی راہ میں'' جنگ کرو اور جان رکھو کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔(وقاتلوا فی سبیل اللہ و اعلموا ان اللہ سمیع علیم)

''فی سبیل اللہ'' کی تعبیر بہت عمدہ پرمغز ہے۔سب کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ جہادِ اسلامی کا مقصد دنیوی حکومت یا ممالک پر قبضہ کرنا نہیں ہوتا جیسے کہ مغربی دانش مند ہماری طرف نسبت دیتے ہیں۔بلکہ اس کا ہدف خدا کی طرف راستہ کھولنا ہے، راہ تقویٰ وپاکیزگی اور راہِ حق وعدالت پر چلنا ہے۔''واعلموا ان اللہ سمیع علیم'' کا جملہ مجاہدین اسلام کو تنبیہ کر رہا ہے کہ ہوشیار ہو جائیں، اپنی باتوں کا دھیان رکھیں، اپنی نیتوں کا خیال رکھیں اور ہر چیز جو فی سبیل اللہ کے صاف وشفاف رنگ کو پھیکا کر سکتی ہے اس سے بچیں۔اس طرح ان کو تقویت قلب عطا فرمائی جا

رہی ہے کہ خدا ہمیشہ ان کے ساتھ اور ان کی حالت سے باخبر ہے۔

وہ تمہارے نزدیک ہے

(۵) پانچویں آیت میں ایک نئی تعبیر سامنے آتی ہے۔اس میں سمیع اور قریب کو اکٹھا لایا گیا ہے اور پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمان ہوا ہے:

''(دشمنوں سے کہو) اگر میں گمراہ ہوجاؤں تو گمراہی میری طرف سے ہوگی اور اگر ہدایت یافتہ ہوں تو اس وحی کی وجہ سے ہوں جو میرا رب میری طرف کرتا ہے، وہ سننے والا اور نزدیک ہے (قل ان ضللت فانما اضل علی نفسی و ان اهتدیت فبما یوحی الی ربی انه سمیع قریب)۔

اس میں اشارہ ہے کہ وحی کے نہ ہوتے ہوئے میں بھی گمراہ ہوسکتا ہوں۔ یہ وحی الٰہی ہے جو مجھے طریق حق و ہدایت پر چلنے میں مدد کر رہی ہے یہ انسان کے فکر و استدلال سے حاصل شدہ مطالب نہیں ہیں جب کہ فکر انسانی میں خطا و غلطی ہوسکتی ہے۔

بعض تفاسیر میں ہے کہ مشرکوں کے ایک گروہ نے حضرت پیغمبرؐ سے کہا: ''تم گمراہ ہوگئے ہو کیونکہ تم نے بزرگوں کے آئین و قانون کو ترک کر دیا ہے۔'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو جواب دیا گیا کہ اگر میں تنہا ہوتا تو تم گمراہی کی نسبت میری طرف دے سکتے تھے۔لیکن میرا تکیہ تو آسمانی وحی پر ہے۔اس صورت میں گمراہی کا کوئی تصور نہیں'' کیونکہ وہ تمام رازہائے دل سے واقف ہے اور علام الغیوب ہے۔'' (یہ تعبیر اس سے دو آیتیں قبل کی آیت میں ہے) ''وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔'' (یہ تعبیر اس سے تین آیتیں قبل ذکر ہوئی ہے۔'' وہ سب باتوں کو سنتا اور سب کے نزدیک ہے۔'' (یہ تعبیر اسی آیت کے ذیل میں آئی ہے)۔

ضمناً اس آیت سے معلوم ہوا کہ نفس انسان اس کو گمراہی کی طرف لے جانے والا ہے اور فقط عقل پر بھروسہ بھی کسی منزل تک نہیں پہنچاتا۔پس منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے وحی کے روشن چراغ ہی کی لو میں قدم اٹھانا چاہیے۔

آخری نکتہ میں ذکر ہے کہ خدا کا ہمارے نزدیک ہونا اس طرح نہیں جس طرح ہم ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے ہیں بلکہ وہ خود ہم سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے، جیسے اپنے محل و موقع پر اس کا ذکر آئے گا۔انشاءاللہ

وہ تمہاری دعائیں سنتا ہے

(۶) چھٹی آیت میں بھی ایک نئی تعبیر ہے، اس میں خدا کو ''سمیع الدعاء'' کے وصف سے متصف کیا گیا ہے۔پیغمبر بزرگ حضرت زکریاؑ کا قول نقل کیا جا رہا ہے کہ جب زکریاؑ نے مریمؑ کے مقام و لیاقت کا مشاہدہ کیا (اس وقت تک وہ بے اولاد تھے۔فرزند کا اشتیاق مزید پیدا ہوا جب کہ وہ پہلے مرجھا چکے تھے)۔اس حالت میں اپنے پروردگار کی طرف رخ کر کے عرض کیا: ''خدایا اپنی طرف سے مجھے بھی پاکیزہ فرزند عطا فرما۔بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔'' (هنالك دعا زكريا ربه قال رب هب لی من لدنك ذرية طيبة

انك سمیع الدعاء)۔ [1]

اگرچہ سمیع کا معنی سننے والا ہے لیکن اس قسم کے موارد میں اسے کہتے ہیں جو سنتا ہو اور دعا قبول بھی کرتا ہو، اس لیے کہ سننے کے بعد اگر مثبت جواب نہیں دیتا تو اس کا سننا نہ سننا برابر ہے۔ گویا اس نے نہیں سنا۔ [2]

وہ بصیر ہے

(۷) ساتویں آیت میں ''بصیر'' کو عنوان بنایا گیا ہے۔ یہ انسانوں کے اعمال کی نسبت سے ہے کیونکہ تربیتی مسائل میں یہی ہدف اصلی ہے۔ فرمان ہے: ''تقویٰ اختیار کرو۔ جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو دیکھتا ہے۔'' (واتقوا اللہ و اعلموا ان اللہ بما تعملون بصیر)۔

یہ جملہ درحقیقت شیر خوار بچوں کے بارے میں سات احکام وقوانین بیان کرنے کے بعد آیا ہے۔ ان میں بچے کا حق اور اس کے مقابل ماں، دایہ اور باپ کا وظیفہ وذمہ داری بتائی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اس سلسلے میں اگر تقویٰ غالب نہ ہو، انسان خدا کو حاضر وناظر نہ جانتا ہو تو خانوادے میں ایسے صحیح وسالم روابط پیدا نہ ہوں گے جن سے سب کے حقوق محفوظ رہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ فقط قانون کی طاقت اور سزا کے خوف سے حق وعدالت کا نظام خانوادہ میں قائم نہیں ہوسکتا مگر یہ کہ روح خوف خدا اور اس کے تمام چیزوں پر بصیر ہونے کا نظریہ اس ماحول پر سایہ فگن نہ ہو۔

وہ بندوں کے حال سے باخبر ہے

(۸) آٹھویں آیت میں پھر ایک نئی اور تازہ تعبیر ہے جس میں ''خبیر'' کو ''بصیر'' کے ساتھ لایا گیا ہے۔ ابتداء آیت میں وحی آسمانی اور دیگر کتب آسمانی کے بعد قرآن مجید کے نزول کا تذکرہ ہے۔ پھر آخر آیت میں فرمان ہے: ''خداوند عالم اپنے بندوں کی نسبت باخبر وبینا ہے۔'' (ان اللہ بعبادہ لخبیر بصیر)

یہ جملہ درحقیقت اشارہ ہے کہ یہ کتاب آسمانی ہر حال میں تمام احتیاجات بشر کے ساتھ ہم آہنگ ہے کیونکہ یہ اس خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے جو تمام چیزوں سے آگاہ اور تمام احتیاجات بشر کا بصیر وبینا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو کہتے تھے کہ قرآن محمدؐ یتیم وفقیر پر کیوں نازل ہوا؟ قرآن فرماتا ہے:

---

[1] ''ذریۃ'' کا معنی فرزند ہے۔ مفرد جمع ہر دو پر بولا جاتا ہے، لیکن اس جگہ مفرد ہے اور ولیا اس کا قرینہ ہے جو اسی سورہ کی پانچویں آیت میں ہے۔

[2] قرطبی جلد ۲ ص ۱۴ ۱۳۔ روح البیان جلد ۲ ص ۳۰۔ روح المعانی جلد ۳ ص ۱۲۸ ذیل آیہ مورد بحث

''خدا اپنے بندوں کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کون بارِ رسالت ونبوت کا حامل ہونے کی صلاحیت وقابلیت رکھتا ہے۔''بعد والی آیت ممکن ہے اس مطلب کا قرینہ ہو)۔[1]

ان دونوں تفسیروں میں جمع ممکن ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں ''خبیر'' امورِ معنوی وروحانی کی طرف اور ''بصیر'' امورِ ظاہری وجسمانی کی طرف اشارہ ہے، اس لیے ''خبیر'' کو مقدم رکھا گیا ہے۔

اگرچہ ''خبیر'' کا مادہ ''خبر'' ہے اور اس کے معنی میں وسعت ہے اور یہ تمام امور ظاہر وباطن کو شامل ہے لیکن چونکہ ''بصیر'' بھی ساتھ ہی ذکر کیا گیا ہے جو فقط امورِ بواطن کی طرف اشارہ ہے (لہٰذا ان دونوں میں فرق ممکن ہے)۔

(مفردات میں راغب نے ''خبیر'' کی ایک تفسیر ''باطنی امور پر اطلاع'' ذکر کی ہے)۔

وہ ان کی مشکلات کو جانتا ہے

(۹) نویں آیت میں صرف ''بصیر'' کا تذکرہ ہے۔لیکن ''بصیر'' بندوں کے اپنے پروردگار کی حمایت کا محتاج ہونے کے عنوان سے ہے۔ یہ کلام مومن آل فرعون کی زبانی ہے کہ جو فرعون کے اہل میں باایمان تھا اور اپنا ایمان لوگوں سے چھپائے ہوئے تھا۔ایک انتہائی حساس وقت میں جب کہ ایک جماعت نے حضرت موسیٰ کے قتل کا منصوبہ بنایا اس نے انہیں نصیحت کی، عذاب الٰہی سے ڈرایا اور اس کام سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور آخر میں کہا:

''جو میں کہہ رہا ہوں بہت جلد تم اسے سمجھ لوگے۔''(فستذکرون ما اقول لکم)

''اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ میں موسیٰ کا ساتھی ہوں اور مجھے تکلیف پہنچانے کے درپے ہو جاؤ (تو بھی کوئی پرواہ نہیں) میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔وہ اپنے بندوں کی نسبت بینا ہے۔''(وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد)

بہرحال خداوند عالم نے اس مومن مجاہد بندے کو ان کی سازشوں سے جو اس کے خلاف تیار کی گئی تھیں (قاعدہ کے مطابق شکنجہ وسخت سزا کا حکم ہونا تھا) رہائی عطا فرمائی۔

خدا کا بصیر ہونا درحقیقت اشارہ ہے کہ ایسا عظیم خدا مخلص ومجاہد بندوں کو تنہا نہیں چھوڑتا اور ایسے خدا کے باایمان بندے سخت حوادث سے کبھی نہیں گھبراتے۔اس لیے بعد کی آیت میں لطف الٰہی کی بدولت دشمنوں سے اس کی نجات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ نکتہ قابل غور ہے۔اپنے معاملے کو خدا کے سپرد کرنے اور خدا کے بصیر ہونے میں نزدیکی رابطہ پایا جاتا ہے کیونکہ جس کی ذات کے سپرد سب کام کر دیئے گئے اگر وہ باخبر نہیں تو انسانی احتیاج کو کس طرح پورا کر سکے گا۔بالفاظ دیگر تفویض وسپردگی خدا کے بصیر ہونے پر

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۲۶ صفحہ ۲۴۔تفسیر روح البیان جلد ۷ صفحہ ۳۴۶ میں بھی اس مطلب کی طرف اشارہ ہے۔

ایمان کا نتیجہ ہے۔

البتہ تفویض کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کوشش ہی نہ کرے کیونکہ یہ بات اس مومن مجاہد نے کی ہے جو موسیٰ کے دفاع میں جان دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ بلکہ تفویض یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرے اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دے۔

بلندی میں صف بستہ پرندے

(۱۰) دسویں اور آخری آیت مورد بحث میں معاملہ بندوں کے اعمال سے کچھ اوپر چلا گیا ہے۔ اب ذکر ہو رہا ہے کہ تمام جہان خلقت کے قوانین کی تنظیم خدائے ''بصیر'' کے ہاتھ میں ہے۔ فرمان ہے:

''کیا یہ (بے ایمان) لوگ اپنے سروں پر پرندوں کو پر کھولتے اور بلند کرتے نہیں دیکھتے؟ (اولم یروا الی الطیر فوقھم صافات و یقبضن)

کون ہے جو قانون جاذبہ کے خلاف ان پرندوں کو فضا میں کئی گھنٹے، ہفتے اور مہینے محفوظ رکھتا ہے۔ (حتی کہ ہم جانتے ہیں کہ مہاجر و مسافر پرندے بعض اوقات کئی ہفتے اور مہینے اپنی پرواز میں رہتے ہیں اور قعطا توقف نہیں کرتے)۔

''خدائے رحمان کے سوا کوئی بھی نہیں جو انہیں فضا میں تھامے ہوئے ہے۔'' (ما یمسکھن الا الرحمان)

''وہی ہر چیز کا بینا و بصیر ہے۔'' (انہ بکل شیء بصیر)

ان کی آرام و راحت کے ساتھ پرواز کے تمام قوانین کو وہ جانتا ہے کیونکہ وہی ان قوانین کا خالق ہے اور وہی سب کے لیے نظام معین کرنے والا ہے۔

ہاں خدائے رحمان جس کی رحمت سارے جہان کو شامل ہے، اس نے مناسب شکل، مناسب وزن، پاؤں، آنکھ اور مناسب احساسات ان پرندوں کو دیئے ہیں، جن کے ذریعے وہ آسمانی فضا میں آرام کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ پرندوں کے طرزِ علم، پرواز کے آغاز و انجام میں باہم بڑا تفاوت ہے، پھر ان کی جسمیت، طرزِ زندگی، محیط زندگی، سب کچھ متفاوت ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ آج مختلف قسم کے ہوائی جہاز اور طیارے ان ہی پرندوں کے پر و بال اور شکلوں کو دیکھ کر بنائے گئے ہیں۔

تمام اشیاء کے لیے خدا کے بصیر ہونے کا مطلب یہی ہے۔

اصل میں ہم ہر وقت یہ پرندے دیکھ رہے ہیں بلکہ یہ ہماری عادت سی ہوگئی اور ہم غور نہیں کرتے وگرنہ ہوا کے عظیم سمندر میں جو خوبصورت پرندے غوطہ زنی کر رہے ہیں اور اپنی حرکات پسندیدہ و ماہرانہ سے انسان کے لیے حیرت کا سامان مہیا کر رہے ہیں، خود ان کا وجود ہی خدا کے بصیر ہونے کے لیے کافی ہے جو اس کی قدرت اور علم ہی کا مظہر ہے۔

نتیجہ بحث

آیات بالا سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ پروردگار کی نظر سے موجودات زمین وآسمان کا کوئی ذرہ مخفی و پوشیدہ نہیں۔انسان کی بیداری اور تربیت پر اس حقیقت کی طرف توجہ کا عمیق اثر ہوتا ہے۔لہٰذا یہ آیات دیگر مطالب کے علاوہ انسانی تربیت کا محور بھی ہیں۔

توضیحات

(۱) خدا کے سمیع وبصیر ہونے کا مفہوم

مفکرین اسلام خدا کی صفات میں سمیع وبصیر کا تذکرہ کرتے ہیں کیونکہ قرآن مجید میں بارہا ان صفات کا ذکر ہوا ہے لیکن ان کی تفسیر اور مفہوم میں بڑا اختلاف ہے۔محققین کا عقیدہ ہے کہ خدا کا سمیع وبصیر ہونا ہر قسم کی آوازوں اور قابل دید چیزوں کے متعلق علم وآگاہی ہے۔(لہٰذا یہ اس کے علم کا ایک حصہ ہیں)۔البتہ یہ دونوں کلمات چونکہ قوت شنوائی وقوت بینائی کے لیے وضع کیے گئے ہیں اس لیے ان کے لیے کان وآنکھ کا ہونا ضروری ہے لیکن ظاہر ہے کہ جب ان کا اطلاق خدا پر ہوگا تو عام جسمانی مفاہیم، آلات اور مسائل سے خالی ہوں گے کیونکہ اس کی ذات پاک جسم وجسمانیات سے مافوق ہے۔

ان صفات کے خدا کے لیے استعمال کو مجازی نہ سمجھا جائے اور اگر ان کو ایسا سمجھیں تو پھر وہ مجاز مافوق الحقیقت ہی ہوگا (یعنی معنی حقیقی سے بالاتر) کیونکہ اس کا تمام اصوات ومناظر پر احاطہ اور تمام امور واشیاء کا اس کے سامنے حضور اس طرح کا ہے کہ ہر قسم کی دید وشنید سے بالاتر اور اعلیٰ وارفع ہے۔لہٰذا دعاؤں میں خدا کو اسمع السامعین (تمام سننے والوں سے زیادہ سننے والا) اور ابصر الناظرین، تمام دیکھنے والوں سے زیادہ بصیر کی صفات سے منصف کیا گیا ہے۔[1]

قدیم متکلمین میں سے بعض کا عقیدہ ہے کہ ''سمیع وبصیر'' صفت علم سے جدا ہیں (اور علم کا حصہ نہیں)، اس لیے یہ لوگ مجبور ہیں کہ صفت سمیع وبصیر کو ذات خدا پر زائد قرار دیں اور اوصاف ازلی کے تعدد کے قائل ہو جائیں حالانکہ یہ شرک ہی کی ایک قسم ہے وگرنہ سمیع وبصیر کا معنی آوازوں کو سننے اور اشیاء کو دیکھنے کے علم کے سوا کچھ اور نہیں لیا جا سکتا (لہٰذا یہ صفات بھی علم ہی کا حصہ ہوں گی)۔[2]

---

[1] جو دعا ماہ رجب میں ہر روز پڑھی جاتی ہے اس میں ہے:

"یا اسمع السامعین و ابصر الناظرین و اسرع الحاسبین"۔

[2] اشاعرہ کا اعتقاد ہے کہ خدا کی سات صفتیں علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، حیات اور تکلم۔قدیم اور زائد بر ذات ہیں۔بعض ان کو اضافہ ذات حق، قدماء ثمانیہ (۸ موجودات ازلی) کا نام دیتے ہیں۔لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ عقیدہ باطل اور شرک ہے۔

(۲) سمیع وبصیر۔اسلامی روایات اور نہج البلاغہ میں

اسلامی روایات میں ان اوصاف کے بارے میں وسیع و دقیق بحث ہوئی ہے۔ تکمیل گفتگو کے لیے ہم ان کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ امیرالمومنینؑ کے ایک خطبہ میں ہم پڑھتے ہیں:

"کل سمیع غیرہ یصم عن لطیف الاصوات، ویصمہ، کبیرھا، ویذھب عنہ مابعد منھا، وکل بصیر غیرہ یعمی عن خفی الالوان ولطیف الاجسام۔"

''اس کے علاوہ ہر سننے والا خفیف آوازوں کے سننے سے قاصر ہوتا ہے اور بہتیری آوازیں (اپنی گونج سے) اسے بہرا کر دیتی ہے اور دور کی آوازیں اس تک پہنچتی ہی نہیں اور اس کے ماسوا ہر دیکھنے والا مخفی رنگوں اور لطیف جسموں کے دیکھنے میں نابینا ہوتا ہے۔[۱]

۲۔ ایک اور خطبے میں ارشاد فرمایا:

"السمیع لا بادات والبصیر لا بتفریق الۃ۔"

''وہ سننے والا ہے، لیکن کسی عضو کے ذریعے نہیں اور وہ دیکھنے والا ہے لیکن نہ اس طرح کہ آنکھیں جھپکے۔''[۲]

۳۔ ایک اور خطبہ میں ہے:

"فاعل لا بمعنی الحرکات و لا لۃ۔ بصیرا ذلا منظور الیہ من خلقہ۔"

''وہ فاعل ہے لیکن حرکات و آلات کا محتاج نہیں۔ وہ اس وقت بھی دیکھنے والا تھا جب کہ مخلوقات میں کوئی چیز دیکھائی دینے والی نہ تھی۔''[۳]

۴۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اس سوال کے جواب میں کہ کیا خدا سمیع و بصیر ہے، فرماتے ہیں: ہاں وہ سمیع و بصیر ہے۔لیکن

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۶۵

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۲

[۳] نہج البلاغہ خطبہ ۱

"سميع بغير جارحة۔ وبصير بغير الة۔ بل يسمع بنفسه و يبصر بنفسه۔"

''وہ سننے والا ہے لیکن کان کا محتاج نہیں۔ دیکھنے والا ہے لیکن آلہ مشاہدہ وآنکھ کا محتاج نہیں بلکہ اپنی ذات ہی کے ذریعے سنتا اور دیکھتا ہے۔''[1]

۵۔ بحارالانوار میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کی۔ آپؑ کا ایک محب کہتا ہے خدا سننے والا ہے کان کے ذریعے اور دیکھنے والا ہے آنکھ کے ذریعے۔ عالم ہے بوسیلہ علم (زائد برذات) اور قادر ہے۔ قدرت کے ذریعے (زائد برذات) یہ سن کر حضرتؑ ناراض ہوئے اور فرمایا:

من قال ذلك و ذان به فهو مشرك وليس من ولا يتنا على شيء ان الله تبارك و تعالى ذات علامة سميعة بصيرة قادرة۔

''جو یہ بات کہتا اور یہ عقیدہ رکھتا ہے وہ مشرک ہے۔ ہماری ولایت ومحبت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ خداوند عالم ایسی ذات ہے جو عین عالم، عین سمیع اور عین بصیر ہے۔ (یہ صفات زائد برذات نہیں ہیں)۔[2]

(۳) خدا کے سمع وبصر پر ایمان کا تربیتی اثر

(۱) قرآن نے ان اوصاف سے معرفت خدا کے بارے میں مسلمان کی علمی سطح کو بلند کر دیا ہے۔

(۲) سب کو خدا کے اس وصف عظیم کی شباہت اور اس خلق کریم کے ساتھ متخلق ہونے کی دعوت دی ہے۔

(۳) مسلمانوں کو اطمینان عطا کیا ہے کہ وہ ہر وقت رعایت وحمایت خدا کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔

(۴) خبردار کیا جا رہا ہے کہ اپنے اعمال، افعال اور کردار کا خیال رکھیں کیونکہ خدا کی سماعت وبصارت ہر وقت ان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

اسلامی روایات میں اس اہم مسئلہ کا تذکرہ بکثرت ہوا ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

(۱) حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک صحابی (اسحاق بن عمار) سے فرمایا:

خف الله كانك تراه۔ وان كنت لا تراه فانه يراك۔ فان كنت ترى انه لا يراك فقد كفرت۔ وان كنت تعلم انه يراك ثم برزت له بالمعصية فقد جعلته من اهون الناظرين عليك

---

[1] اصول کافی جلد ۱ ص ۸۳ حدیث ۶

[2] بحارالانوار جلد ۴ ص ۶۳

''خدا کا خوف اس طرح رکھ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تو نہیں دیکھتا تو بھی وہ دیکھ رہا ہے۔ اگر تیرہ عقیدہ ہو کہ وہ نہیں دیکھتا تو تو کافر ہے۔ اگر تو جانتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے اور پھر بھی نافرمانی کرتا ہے تو گویا اس کو عام دیکھنے والوں سے بھی کم تر سمجھتا ہے (کیونکہ انسان ایک عام شخص بلکہ بچے سے بھی شرم کرتا ہے اور اس کے سامنے خلاف شرع کام انجام نہیں دیتا۔)[1]

(۲) ایک اور حدیث میں حضرتؑ نے "ولمن خاف مقام ربه جنتان" کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

"من علم ان الله يراه و يسمع مايقول و يعلم مايعمل من خير اوشر فيحجزه، ذلك من القبيح من الاعمال فذلك الذى خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى۔"

''جس شخص کا اعتقاد ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے، اس کی باتیں سنتا ہے، اس کے نیک بد اعمال سے باخبر ہے اور یہ علم اس کو برائی سے باز رکھے تو گویا وہ مقام پروردگار سے خائف ہے اور اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے روکے ہوئے ہے۔[2]

(۳) تفسیر علی ابن البراہیم میں امام جعفر صادقؑ نے "ولقد همت به وهم بها....." (یوسف ۲۴) کی تفسیر میں فرمایا: زوجہ عزیز مصر نے (جب یوسفؑ سے کام نکالنے کا ارادہ کیا تو) کمرے میں پڑے ہوئے بت پر کپڑا ڈال دیا۔ یوسفؑ نے پوچھا یہ کیوں؟ اس نے کہا: اس پر کپڑا ڈال دیا ہے تا کہ یہ مجھے نہ دیکھے کیونکہ مجھے اس سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ یوسف علیہ السلام نے کہا:

فانت تستحيين من صنم لا يسمع ولا يبصر ولا استحيي انا من ربي؟

''تو اس بت سے جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے شرم کر رہی ہے اور میں اپنے اس پروردگار سے (جو سب چیزوں کو دیکھتا اور سنتا ہے) شرم نہ کروں؟''[3]

(۴) تفسیر روح البیان میں آیت وافوض امری الی الله ان الله بصير بالعباده (مومن ۴۴) کے ذیل میں ابن مسعود سے منقول ہے کہ وہ بعض اصحاب پیغمبرؐ کے ساتھ جنگل میں گئے۔ کھانا تیار کیا اور کھانا کھاتے وقت ایک چرواہے کو بھی دعوت دی، اس نے کہا: آپ

---

[1] اصول کافی جلد ۲ ص ۶۷ حدیث ۲

[2] اصول کافی جلد ۲ ص ۷۰ حدیث ۱۰۔ ذیل حدیث میں ہے کہ حضرتؑ نے یہ بات آیت "واما من خاف مقام ربه و نهى النفس عن الهوى" (نازعات ۴۰) کی تفسیر کے ضمن میں فرمائی ہے۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۲۲ حدیث ۵۲

کھائیں۔ میں تو روزے سے ہوں۔ انہوں نے آزمائش کے طور پر کہا: تم نے اس قدر گرم دن میں روزہ رکھا ہوا ہے؟ اس نے جواب میں کہا: ان نار جھنم اشد حرا منه۔ ''جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے۔''

ان صحابہ نے چرواہے کی بات پر تعجب کیا، پھر کہنے لگے: اپنی بکریاں ہمیں بیچ دو۔ ان کی قیمت ہم گوشت کی صورت میں دے دیں گے۔ اس نے جواب میں کہا: یہ بکریاں میری نہیں ہیں۔ ان کا مالک میرا سردار و مولا ہے، اوروں کا مال کیسے بیچوں؟ صحابہ نے کہا: اپنے سردار سے کہہ دینا کہ بکریوں کو بھیڑیا کھا گیا یا یہ کہ بیابان میں گم ہوگئی ہیں۔ چرواہے نے کہا: لیکن خدائے حاضر و ناظر تو دیکھ رہا ہے۔[1]

تاریخ و روایات اسلامی میں اس طرح کی بہت سی روایات ہیں کہ جن میں خدا کے علم، حاضر و ظاہر ہونے اور سمیع و بصیر ہونے کا عقیدہ بیان ہوا ہے۔ یہ تربیت انسانی اسے گناہ سے باز رکھنے میں مدد ہے اور اسے گناہ و بدی سے روکنے میں گہرا اثر رکھتی ہے۔

(۴) خدا مدرک ہے

علماء علم کلام نے خدا کے اوصاف میں ایک صفت ''مدرک'' بھی شمار کی ہے۔ قرآن مجید سورۂ انعام کی آیت ۱۰۳ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ "لا تدرکه الابصار وهو یدرك الابصار وهو اللطیف الخبیر" آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ آنکھوں کو درک کرتا ہے (دیکھتا ہے)۔ وہ تمام اسرار سے باخبر ہے۔

متکلمین نے ''مدرک'' کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس کا معنی سمیع و بصیر ہونا ہے۔ لہٰذا یہ کلمہ ان موارد کا جامع ہوگا۔[2]

راغب ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ ادراک کا معنی کسی چیز کی انتہا تک پہنچنا ہے۔ البتہ بعض نے اس کا معنی آنکھ سے مشاہدہ اور بعض نے بصیرت و قلب سے مشاہدہ قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت ہے کہ ادراک سے مراد خاص طور پر حسی ادراک ہے۔ تاہم لغت میں اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ جیسا کہ کہا گیا ہے ادراک کا مفہوم ہے کسی چیز کی انتہا تک پہنچنا، اس کا احاطہ کرنا اور اس تک حصول ہے خواہ اس کا طریق حسی ہو یا فہم و عقل ہو۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ آیت صراحتاً کہہ رہی ہے ہرگز آنکھیں خدا کو نہیں دیکھ سکتیں اور درک نہیں کرسکتیں (خواہ دنیا ہو یا آخرت، خواہ پیغمبرؐ شب معراج میں ہوں یا کوئی اور) اس کے باوجود بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ وہ اس آیت کی ضد ہی مراد لیں گے اور کہیں گے کہ خدا قابل مشاہدہ ہے۔ (کم از کم آخرت میں) اس بارے میں انہوں نے توجیہات کی ہیں ان میں سے چار کا فخر رازی نے اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔[3]

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۲ ص ۱۸۸

[2] شرح تجرید بحث "ان الله سمیع بصیر۔"

[3] تفسیر فخر رازی جلد ۱۳ ص ۱۲۴

یہ ایسی توجیہات ہیں جو قابل افسوس اور سست و کمزور ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ کا مقصد یہ ہے کہ اپنے غلط خیالات قرآن پر ٹھونس دیں۔

مزید بحث صفات سلبیہ (بحث نفی جسمیت خداوند) میں آئے گی۔ انشاء اللہ۔ ان کی یہ روش اس صورت میں ہے جب کہ روایات اہل بیتؑ میں اس کے برعکس مطلب موجود ہے، صرف آنکھیں ہی خدا کا ادراک نہیں کرسکتیں بلکہ عقل وفکر بھی کنہہ وحقیقت ذات خدا تک رسائی نہیں رکھتے۔[1]

.....☆.....☆.....☆.....

[1] ان احادیث کے بارے میں مزید معلومات کے لیے تفسیر نورالثقلین جلد ا ص ۷۵۲ و مابعد کی طرف رجوع فرمائیں۔

علم کی ایک اور شاخ
خدا حکیم ہے

اشارہ

قرآن مجید نے خدا کی ذات پاک کو ۹۰ بار حکیم کی صفت سے متصف کیا ہے۔

بہت سے مقامات میں حکیم کے ساتھ کلمۂ عزیز، خبیر، علیم، واسع، تواب، علی اور حمید کی صفات لائی گئی ہیں۔

ان تعبیرات میں سے ہر ایک تعبیر (جیسا کہ ہم دیکھیں گے) اپنے اندر ایک نکتہ خاص رکھتی ہے، چنانچہ جب اسے حکیم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو جامع تر مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

لیکن حکمت خدا بہر حال تدبیر جہاں اور نظام خلقت کے علم کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ اس اشارہ کے ساتھ ہم آیات ذیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

(۱) اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ (توبہ ۷۱)

(۲) وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ (توبہ ۱۰۶)

(۳) كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿۱﴾ (ھود ۱)

(۴) وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ (نور ۱۰)

(۵) تَنْزِيْلٌ مِّنَ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾ (حم سجدہ ۴۲)

(۶) اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ (شوریٰ ۵۱)

(۷) وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ (نساء ۱۳۰)

ترجمہ

(۱) یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔

(۲) اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکیم و دانا ہے۔

(۳) یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ ہیں اور ایک دانا و باخبر ہستی کی طرف سے مفصل ارشاد ہوئی ہیں۔
(۴) اگر تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اس کا رحم نہ ہوتا (تو تم سخت سزا پاتے) اور بے شک وہ حکیم و دانا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔
(۵) یہ قرآن ہر قسم کی تعریف کے قابل خداوند حکیم و دانا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔
(۶) بے شک وہ برتر اور حکیم ہے۔
(۷) اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔

مفردات کی تشریح

کلمہ "حکیم" کا مادہ "حکمت" ہے۔ کتاب العین کے مصنف خلیل ابن احمد کے بقول یہ عدالت، علم اور علم تک پہنچاتا ہے۔
بعض کا خیال ہے کہ اس کا معنی اصلاح کی خاطر کسی چیز سے روکنا یا ظلم سے روکنا ہے۔ (پہلے معنی کے قائل مولف مفرداتِ راغب ہیں اور دوسرا معنی مقائیس اللغۃ نے لیا ہے) اسی لیے حیوان کی "لجام" کو "حکمہ" بروزن "صدمہ" کہتے ہیں۔ نیز اسی لیے علم و دانش کو بھی "حکمت" کہا جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کو غلط کاموں سے روکتے ہیں۔ حکم کرنا (حکومت) اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب لوگوں کو غلط کاموں سے روکا جائے۔

لسان العرب میں ہے کہ "حکم" کا معنی علم و فقہ "حق و عدالت" کے مطابق فیصلہ ہے۔
صحاح اللغۃ کے مطابق حکیم وہ ہے جو معاملات کو صحیح اور حساب شدہ طریقے سے انجام دے۔
نہایہ ابن اثیر اور لسان العرب میں ہے کہ حکمت یعنی چیزوں اور طریقوں کی بہترین کیفیت کے ساتھ پہچان اور جو دقیق مصنوعات کو بخوبی وجود میں لا سکے اس کو "حکیم" کہا جاتا ہے۔
اس کی حقیقت یہ ہے جیسے کہیں کہ (فلاں شخص نے بہترین باغ کو نزدیک ترین راستہ سے ہمیں دکھایا ہے۔ اسی طرح حکیم وہ ہوتا ہے جو بہترین مصنوعات کو بہترین طریقہ کے ساتھ ایجاد کر سکے۔)

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

اس کی قدرت حکمت کے ساتھ ملی ہوئی ہے

یہ ایک عمدہ بات ہے کہ آخر آیات میں خدا کے جو اوصاف ذکر کیے گئے ہیں ان کا اس آیت کے مفہوم کے ساتھ ایک خاص ربط ہے اور ان میں غور و فکر سے اچھے نکات سامنے آتے ہیں۔ اس بات کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب ہم آیات فوق کی تفسیر کرتے ہیں:

(۱) پہلی آیت کی ابتدا میں اسلام کے اہم قوانین۔امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامہ نماز ادائے زکوٰۃ جیسے احکام نیز اطاعت کرنے والوں کے لیے رحمت الٰہی کے شمول کے تذکرہ کے بعد فرمان ہے:

''یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔'' (ان اللہ عزیز حکیم)

''عزیز'' کا مادہ ''عزت'' ہے جس کا معنی مغلوب نہ ہونا ہے۔ یہ لفظ اصل میں سخت زمین کے لیے بولا جاتا ہے جس میں کوئی چیز نفوذ نہ کر سکے۔ لہٰذا عزیز اور حکیم کی صفات خدا کی بے انتہا قدرت اور علم لامتناہی کی طرف اشارہ ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں الفاظ جو قرآن مجید میں کئی بار باہم ذکر ہوئے ہیں، غالباً ان آیات میں آئے ہیں جن میں احکام کی تشریع، بعثت انبیاء اور نزول قرآن کی بات کی گئی ہے (جیسے سورۂ بقرہ کی آیات ۱۲۹، ۲۰۹ اور ۲۲۸۔ نیز سورہ جاثیہ آیت: ۲ اور سورۂ احقاف آیت ۲)

یہ اس امر کا اشارہ ہے کہ تشریع قوانین اور نزول آیات قرآن میں تمام احتیاجات بشر کو انتہائی صحت و عمدگی اور تمام جزئیات کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ ذات حکیم ہونے کے علاوہ مالک عزت و قدرت بھی ہے۔

بالفاظ دیگر بہترین قانون وہی معین کر سکتا ہے جو سب سے زیادہ عالم اور قدرت والا ہو اور وہ خدا کے سوا کوئی نہیں۔

البتہ بعض آیات میں ''جن کا اختتام عزیز و حکیم سے ہو رہا ہے'' آسمان و زمین کی خلقت، موجودات عالم کا خدا کی تسبیح پڑھنا یا بعض میں جنین کی خلقت اور اس قسم کی چیزوں کا تذکرہ ہے (جیسے حدید-۱، حشر-۱، ۲۴۔آل عمران-۶) گویا اس میں اشارہ ہے کہ فقط عالم تشریع ہی نہیں بلکہ عالم تکون نے بھی خدا کے علم و قدرت سے سب کچھ حاصل کیا ہے اور یہ خدا کے ''نظام احسن'' کا نمونہ کامل ہے۔

بعض ایسی آیات میں افعال خدا کا ذکر ہے جیسے قیام بہ عدالت، عیسیٰ کی پیدائش، جنگ میں مومنین کی کامیابی، افرادِ باایمان کی تالیف قلب، ایسی چیزیں درمیان میں مذکور رہیں اور آخر میں عزیز و حکیم آیا ہے۔ (جیسے آل عمران ۱۸، ۶۲، ۱۲۶، انفال ۶۳)

یہ اشارہ ہے کہ ہر ہر جگہ خدا کے افعال کا سرچشمہ اس کی زبردست قدرت اور اس کا لامتناہی علم ہے۔ بعض جگہ ثواب و جزا کا تذکرہ ہے اور اختتام عزیز و حکیم سے ہوا ہے۔ (جیسے سورۂ مائدہ آیت ۱۸) یہ اشارہ ہے کہ جزا و سزا بھی حساب و حکمت کے مطابق ہے۔ نیز خداوند عالم مومنوں کو عظیم جزا دینے پر قادر ہے جس کا اس نے وعدہ کیا ہے اور گناہگار کبھی بھی اس کے عذاب سے بچ نکلنے کی صلاحیت حاصل نہیں کر پائیں گے۔

بالآخر بعض ایسی آیات میں عزیز و حکیم کا ذکر ہے جن میں مومنوں کو راحت کی امید دلائی گئی تاکہ وہ جان لیں کہ سختی و تکالیف میں وہ تنہا نہیں۔ جیسے ''ومن یتوکل علی اللہ فان اللہ عزیز حکیم۔'' (جو بھی خدا پر توکل کرے، کامیاب ہے) کیونکہ وہ عزیز و حکیم ہے۔'' یعنی وہ توکل کرنے والوں کی احتیاج کو جانتا اور ان کی حمایت پر قادر ہے۔ (انفال ۴۹)

خلاصۂ کلام یہ کہ قدرت و عزت خدا کے سامنے کوئی قدرت وجود نہیں رکھتی اور اس کے ارادے کی مزاحمت کرنے والی کوئی طاقت موجود نہیں۔ وہ کسی کام سے بھی عاجز نہیں۔ وہ نظام عالم، نظام تشریع اور اپنے دوستوں کی نصرت و حمایت پر قادر ہے۔

وہ حکیم ہونے کی وجہ سے ہستی و وجود کے تمام اسرار، ہر کام کے فائدہ ونقصان اور بندوں کی احتیاجات سے باخبر ہے۔ خدا کے عزیز و حکیم ہونے کے یہی دو وصف اس کا سبب ہیں کہ اس جہان کا نظام بہترین صورت میں برقرار ہے۔

اس کے تمام افعال حکمت سے ملے ہوئے ہیں

(۲) دوسری آیت میں ایک اور تعبیر ہے جس میں علم وحکمت کو باہم ملایا گیا ہے اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ بعد میں بعض مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے جنہوں نے گناہ وثواب کو مخلوط کر دیا تھا فرمان ہے: ان کا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے کہ چاہے عذاب دے اور چاہے تو بخش دے۔ پھر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا: اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکیم ودانا ہے۔ (واللہ علیم حکیم)

خدا علیم ہے اور وہ اس گروہ کو بخوبی جانتا ہے۔ وہ حکیم ہے اور ہر فرد کے بارے میں وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے مناسب حال ہے۔ ایک جگہ رحمت، ایک جگہ عذاب ان کو خوف ورجا کے درمیان رکھتا ہے جو ان کی تربیت کا ایک طریقہ ہے۔

درحقیقت علیم شناخت موضوع ہے اور حکیم حکم وفیصلے سے آگاہی اور علم ہے۔[1]

مسلم ہے کہ خدا کی طرف سے سزا یا معافی بے سبب نہیں، اس میں عملی واخلاقی صلاحیت اور نیت کے اخلاص کا دخل ہوتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ آیات قبل میں ایک اور گروہ کا ذکر ہے جنہوں نے گناہ واطاعت میں آمیزش کر دی تھی۔ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی بخشش کی نوید دی گئی اور "ان اللہ غفور رحیم" سے اس پر تاکید ہوئی جو اس کے مناسب حال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان کے بارہ میں ہے جنہوں نے گناہ کے بعد فوراً توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی۔ لیکن موردِ بحث گروہ ایسا نہیں ہے۔

بہت سی آیات میں علیم وحکیم یکجا آئے ہیں اور ہر جگہ آیت کے مضمون کے ساتھ ان کا رابطہ ہے کیونکہ بہت سی آیات میں احکام و قوانین الٰہی کا تذکرہ ہے جن کا علم وحکمت کے ساتھ واضح ربط ہے۔ بعض آیات میں قوانین تکوینی کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بھی علم وحکمت کے علاوہ وجود میں نہیں آسکتے۔

بعض آیات میں توبہ اور جزا وسزا کا تذکرہ ہے اور ان میں عدالت وانصاف کو ملحوظ رکھنا بھی علم وحکمت کا محتاج ہے۔ اس کا علم لوگوں کے اعمال ونیات کو جانتا ہے اور اس کی حکمت ثواب وعقاب کا تعین کرتی ہے۔

وہ حکیم وخبیر ہے

(۳) تیسری آیت میں ایک اور تعبیر نظر آرہی ہے جس میں حکیم کے ساتھ خبیر کا تذکرہ ہوا ہے۔ فرمان ہے "یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ ہیں اور دانا وباخبر ہستی کی طرف سے مفصل ارشاد ہوئی ہیں۔" کتاب احکمت ایاته ثم فصلت من لدن حکیم

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۱۶ ص ۱۹۲، تفسیر روح المعانی جلد ۱۱ ص ۱۶ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

خبیر۔"[1]

زمخشری کہتا ہے: خدا کی یہ دوصفات ''حکیم وخبیر'' اس کے دوافعال کی طرف اشارہ کرتی ہیں جوآیت میں ذکر ہوئے ہیں۔یعنی قرآن کا مدلل و پختہ ہونا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ذات کی طرف سے ہے جو حکیم ہے۔دوسرے آیات کا واضح وروشن ہونا، اس کا سبب یہ ہے کہ ان کو اس ذات نے نازل کیا ہے جو تمام امور کی کیفیتوں سے باخبر اور آگاہ ہے۔[2]

وہ حکیم ہے کہ اس نے توبہ کا راستہ دکھایا

(۴) چوتھی آیت میں ہم ایک نئی تعبیر دیکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ صفت ''حکیم'' کے ساتھ صفت ''تواب'' آئی ہے، جب کہ فرمان ہوا: اگر تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اس کا رحم نہ ہوتا (تو تم سخت سزا پاتے) اور بے شک وہ حکیم و دانا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔(**ولولا فضل الله عليكم و رحمته و ان الله تواب حكيم**)۔

یہ آیت ''لعان'' سے متعلق آیات کے بعد واقع ہے۔لعان سے مراد یہ ہے کہ جب ایک مرد اپنی بیوی کو بے عفتی اور زنا سے متہم کرلے اور اس بات کو ثابت کرنے کے لیے چار گواہ نہ رکھتا ہو تو وہ قانون تہمت کے مطابق اسی کوڑے کھائے۔لیکن قرآن نے ایسے مرد سے یہ حکم اس شرط پر اٹھالیا کہ وہ پانچ مرتبہ خدا کے نام کی قسم کھائے جیسا کہ سورۂ نور میں بتایا گیا ہے۔

اس صورت میں اس کی بیوی پر تہمت ثابت ہوجائے گی لیکن اگر وہ اپنی صفائی کے لیے اسی طرح پانچ بار خدا کی قسم کھائے تو الزام سے بری قرار پائے گی تاہم وہ میاں بیوی ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوجائیں گے۔اس بات کی طرف توجہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''تواب'' اور ''حکیم'' کی صفات اس آیت کے مضمون کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں، وہ یوں کہ ان کے ذریعے مذکورہ مرد وزن ہر دو کے لیے توبہ و بازگشت کا راستہ نکلتا ہے تاکہ اگر ان میں سے ایک نے دوسرے کو بلاوجہ متہم کیا ہے تو وہ تہمت کی مقررہ سزا پانے کے بعد باہم زنا شوئی کا تعلق قائم کرلیں۔اس میں دوسرا پہلو یہ ہے کہ مرد وزن ایک دوسرے کے حالات سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں اور غالباً ایسی صورت میں دلیل وثبوت لانا ممکن نہیں ہوتا۔اس لیے خداوند کریم نے ''لعان'' سے متعلق احکام میں مرد وزن اور ان کے بچے کے حقوق معین فرما کر ازدواج کو ہر طرح کی خرابی سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کردیا ہے (اس کی تفصیل کتب فقہ میں احکام ''لعان'' میں دیکھی جاسکتی ہے)۔

---

[1] "من لدن حكيم خبير" میں جار ومجرور ہے۔اگر یہ "احكمت ثم فصلت" سے متعلق ہو تو اس وقت مفہوم یہ ہوگا: آیات قرآن کا استحکام اور تبیین خدا حکیم وخبیر کی طرف سے ہے۔ممکن ہے اس کا تعلق محذوف کے ساتھ ہو۔جیسے ''انزلت'' اس وقت مفہوم یہ ہوگا۔اس طرح کی کتاب خداوند حکیم وخبیر کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔(غور کریں)

[2] تفسیر کشاف، جلد ۲ صفحہ ۳۷۷

وہ حکیم وحمید ہے

(۵) پانچویں آیت میں حکیم وحمید یکجا ذکر ہوئے ہیں، اس میں عظمت قرآن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمان ہے: اس کے سامنے اور پیچھے سے کسی طرح باطل نہیں آ سکتا، یہ کتاب حکیم وحمید ذات کی طرف سے نازل ہوئی ہے (لا یا تیه الباطل من بین یدیه ولا من حلفه تنزیل من حکیم حمید)

باطل کے معنوں اور جملہ "من بین یدیه و لا من خلفه" (سامنے اور پشت سے) کے متعدد معانی ذکر کیے گئے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ باطل ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اس کتاب آسمانی کا بطلان اور بے قیمت ہونا واضح ہوتا ہے۔ "من بین یدیه ولا من خلفه" میں تمام جہات کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی لفظ ومعنی کتب سابقہ، کتب آیندہ کسی عنوان سے بھی اس کتاب میں بطلان کا گرد وغبار راہ نہیں پا سکتا۔

اس کی دلیل بھی یہی ہے کہ اس کا نازل کرنے والا حکیم ہے۔ انسان و جہان کی خلقت کے تمام اسرار ورموز سے آگاہ و باخبر ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس عظیم کتاب کے نزول سے اپنی نعمت انسان پر جاری وساری کردے، وہ نعمت جو ہر طرح سے تعریف کے لائق ہے۔ اسی لیے حکیم کے بعد حمید کی صفت آئی ہے۔

لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ وقت کے گزرنے سے اس کتاب میں کوئی کمزوری پیدا ہو یا کوئی شخص اس میں تحریف اور تغیر وتبدل کرنے پر قادر ہو سکے۔

وہ برتر وحکیم ہے

(۶) چھٹی آیت میں مسئلہ وحی اور خدا کے ساتھ پیغمبروں کے ارتباط کو مختلف طرق سے ذکر کیا گیا ہے۔ (قلبی ابہام، امواج صوتی کی ایجاد سے کلام کرنا اور فرشتہ وحی کو بھیجنا) فرمان ہے: وہ برتر وحکیم ہے (انه علی حکیم)۔

خدا کے علو و بلندی کا تقاضا ہے کہ بندے جو موجود جسمانی اور امکانی مخلوقات ہیں، ان سے ماسواء "طرق مذکورہ" کے اس کا رابطہ برقرار نہ ہو۔ پھر اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ جو وحی بھی نازل ہو وہ معارف کائنات اور ایسی تعلیمات سے مملو ہو جو انسان کو قرب خدا اور سعادت کی طرف لے جائیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت کے مطالب کے ساتھ علی وحکیم کا کس قدر گہرا رابطہ ہے۔

جدائی کا دستور بھی مطابق حکمت ہے

(۷) ساتویں آیت اور آخری آیت مورد بحث میں ناچاقی کی صورت میں مرد وزن کو جدائی وعلیحدگی کی اجازت دیتے ہوئے آیندہ زندگی میں امید کی کرن دکھائی گئی ہے تاکہ ان میں مایوسی پیدا نہ ہو اور وہ غلط کاموں میں نہ پڑ جائیں۔ چنانچہ فرمایا گیا:

''اگر مرد وزن میں (اصلاح کی کوئی صورت نہ ہو) تو انہیں جدا ہو جانا چاہیے۔ خدا اپنے فضل و کرم سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا اور اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ (وان یتفرقا یغن اللہ کلا من سعتہ و کان اللہ واسعا حکیما)

ایک طرف ان کو اپنے فضل و کرم و برکت سے خوشحال کرنے کی خوشخبری دی جا رہی ہے اور یہ خدا کی صفت ''واسع'' کے مناسب ہے۔ دوسری طرف طلاق کی تشریع کر دی ہے (قانون بنا دیا ہے) اور عورت و مرد کو شرائط خاص کے ساتھ علیحدگی کی اجازت دی گئی ہے اور یہی اس کے حکیم ہونے کا تقاضا ہے۔

کیونکہ اگر وہ اپنے قانون میں (جیسے آج کی مسیحیت کے قوانین ہیں) طلاق کا قانون نہ بناتا تو مرد و زن میں اختلاف کی صورت میں اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا اور معاملہ بند گلی میں پہنچ جائے گا اور وہ ایسے جہنم میں پڑ جائیں گے جس سے کوئی راہ نجات نہیں ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر قسم کا اخلاقی انحراف، جرم و گناہ، ہر دو طرف سے حقوق کی تلفی اور بچوں کے حقوق کا ضیاع ہوگا۔

نتیجہ بحث

آیات مافوق سے معلوم ہوا کہ خدا کی حکمت اس کے علم ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ جہان ہستی تمام جہات سے نظم و حساب اور مناسب قوانین کی اساس پر قائم ہے۔ افعال خدا تمام جہات میں حکمت پر مبنی ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس کو کبھی ''نظام احسن'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہی احسن نظام عالم تشریح قانون سازی اور احکام شرع پر بھی لاگو ہے۔ ان قوانین و احکام کی تشریع کا ایک فلسفہ ہے جس کو خداوند حکیم ہی جانتا ہے اور اس کا ایک گوشہ ہمیں بھی بتایا گیا ہے۔

توضیحات

۱۔ حکمت خدا کی دلیل

خدا کی صفت حکیم صرف قرآن مجید کی دسیوں آیات ہی سے نہیں بلکہ دلیل عقلی سے بھی ثابت ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ''حکیم'' وہ ہے جو اپنے کام بہترین طریقے اور نزدیک ترین راہ سے انجام دے سکے اور ہر غلطی و بے ترتیبی سے بچا رہے۔

درحقیقت حکمت جنبہ عملی رکھتی ہے جب کہ علم میں نظری پہلو ہوتا ہے۔ لہٰذا اثبات علم خدا کی دلیلیں ہی اس کی حکمت کی دلیلیں ہوں گی۔ لیکن ذہن میں رہے کہ خدا کے حکیم ہونے اور انسان کے اس صفت سے متصف ہونے میں بہت زیادہ فرق ہے۔ ''انسان حکیم'' وہ ہے جس کے اعمال قوانین جہان ہستی سے ہم آہنگ ہوں۔ لیکن جب ہم کہیں کہ خدا حکیم ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے ایسے قوانین کی بنیاد رکھی ہے جو ''نظام احسن'' کا مصداق ہیں۔ اس سے باریک تر تعبیر یہ ہے کہ خدا قانون ایجاد کرتا ہے اور ہم قانون کی پیروی کرتے ہیں۔

اگر ہم موجوداتِ جہان کی طرف نظر کریں تو منظومہ شمسی سیاروں اور ستاروں سے لے کر ایٹم کی ساخت تک، ایک زندہ خلیے حیوانات سے لے کر عظیم الجثہ جانوروں اور عظیم درختوں تک تمام چھوٹے بڑے موجودات حکمت خدا معلوم کرنے اور اس عظیم بناء کے بانی کی عظمت کو جاننے کے لیے کافی ہیں۔

جو کتابیں علوم طبیعی، فزکس، کیمسٹری تشریح ابدان، فزیالوجی، علم نباتات، علم حیوانات (Zoology) علم ہیئت اور علم نجوم میں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب حکمت خدا ہی کی تشریح کرتی ہیں۔ دانشمندوں کے بقول یہ تمام علوم اس کتاب کائنات ہی کا ایک ورق ہیں اور یہ خود اس کی حکمت کی بہترین دلیل ہے۔ بالفاظ دیگر جس طرح برہان نظم وجود خدا کی دلیل ہے۔ اسی طرح حکمت خدا کا اثبات بھی اس سے ہوسکتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ روایات اسلامی (جیسے روایت توحید مفضل) میں انسان، حیوان، پرندے، مچھلیاں، آسمان، سورج، چاند، ستارے، پانی، آگ، معدنیات، نباتات اور درختوں وغیرہ کی خلقت میں حکمت خدا کی طرف بہترین اشارے موجود ہیں۔

۲۔ معرفت حکمت خدا کے تربیتی آثار

معرفت خدا کے نکتہ نظر سے عام طور پر صفات خدا کی بحث کی جاتی ہے۔ لیکن قرآن نے اس میں ایک عجیب وعمدہ نکتہ سے کام لیتے ہوئے ان صفات کو انسانی تربیت کی بنیاد بنایا ہے اور اس کا نمونہ آیات بالا میں موجد ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم بھی اس آسمانی کتاب کی پیروی میں صفات خدا کو تہذیب نفس اور تکمیل عقول کے لیے اساس قرار دیتے ہیں۔

خدا کے حکیم ہونے کا نظریہ انسان میں کئی آثار اور انعکاسات رکھتا ہے۔

الف) حکمت خدا کا نظریہ انسانوں کی علمی پیش رفت اور موجودات جہان کے اسرار سے آگاہی میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ یہ انسانی علم ودانش میں گہرائی اور سرعت کا موجب ہے کیونکہ جب ہمیں یہ علم ہوگا کہ معمار عظیم نے اس پرشکوہ وعظیم عمارت کو تعمیر کیا ہے اور جگہ جگہ حکمت کے اسرار و رازر کھ دیئے ہیں تو ہم ہرگز موجودات وحوادث جہان سے بے توجہی کے ساتھ نہیں گزریں گے۔ چنانچہ ہر موجود میں اس کے شایانِ شان غور وفکر کریں گے حتی کہ درخت سے ایک سیب کے گرنے سے ہم کشش ثقل کا عظیم و پراہمیت قانون کشف کرلیں گے۔

اگر آپ تعجب نہ کریں تو ایک دانش مند معاصر آئن سٹائن معتقد ہے کہ علوم میں پیش رفت کرنے والے، اسرارِ قدرت میں کشف کرنے والے، مبدا علمی اور اس کی آفرینش میں موجود حکمت پر ایمان رکھتے تھے اور اسی سے ان کے تتبع وتلاش میں گہرائی پیدا ہوئی ہے۔

ب) تشریع وقانون سازی میں حکمت خدا کی طرف توجہ کئی مشکلات کو آسان کردے گی اور اس کے اوامر کے امتثال میں پیش آنے والے شدائد لذت بخش بن جائیں گے کیونکہ اس سے یہ تصور پیدا ہوجائے گا کہ یہ لائحہ عمل اور دستور ایسی ذات کی طرف سے ہیں جو حکیم وبزرگ ہے۔ اگر اس نے کڑوی دوا تجویز کی ہے تو اسی سے حیات نو ملے گی۔ اگر اس کام میں تکلیف ومشقت ہے تو انجام کار راحت وآرام نصیب ہوگا۔

ج) خدا کی صفت حکمت کی طرف توجہ انسان کو مصائب وحوادث کے مقابلے میں مقاومت اور صبر کی طاقت عطا کردے گی۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا کا کوئی کام بے اندازہ نہیں، یہی احساس شکستہ کردینے والے مشکلات میں اس کا معاون ہوگا کیونکہ ہمیں علم ہے کہ حوادث و

مشکلات پر غلبہ پانے کی پہلی شرط روحانیت کا بلند ہونا ہے اور یہ سب کچھ حکمت خدا کی معرفت ہی کے سایہ میں ہوگا۔

د) ہمیں معلوم ہے کہ انسان کے لیے فخر سے بھرپور اور بلند ترین مقام قرب خدا کا حصول ہے۔ لیکن تخلق بہ اخلاق خداوندی اور اس کی صفات سے کسب فیض کے سوا قرب خدا کے حصول کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ خدا کی حکمت کا نظریہ انسان کو دعوت دے رہا ہے کہ اسی کے علم و حکمت کی طرف جائے اور اسی کے اخلاق سے خود کو آراستہ کرے۔ شاید اسی لیے قرآن مجید نے حکمت کو خیر کثیر (زیادہ نیکی) سے یاد کیا ہے۔ فرمان ہے: وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ (بقرہ ۲۶۹)

امام جعفر صادقؑ کے ایک فرمان میں ہے:

"احکمة ضیاء المعرفة و میراث التقوی۔ و ثمرة الصدق و ما انعم الله علی عبد من عباده نعمة انعم و اعظم و ارفع و اجزل و ابهی من الحکمة۔"

''حکمت، معرفت کی روشنی، تقویٰ کی میراث اور سچائی کا میوہ ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کو حکمت سے بڑی، بلند اور خوبصورت کوئی نعمت عطا نہیں فرمائی۔''[1]

ہم اس بیان کو علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں جو گذشتہ ابحاث خصوصاً بحث اخیر کو واضح کرنے والا ہے۔ وہ حکمت کی تفسیر علماء سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ حکمت، علم کا تحقق، عمل کی درستگی، گفتار میں صدق، پروردگار کی اطاعت، دین کی اطلاع اور انسان کی عظمت بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہی حکمت برائیوں سے روکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی صلاح کا ذریعہ یہی حکمت ہے۔[2]

---

[1] بحار الانوار جلد ۱ ص ۲۱۵ حدیث ۲۶

[2] بحار الانوار جلد ۱ ص ۲۱۵ حدیث ۲۶

علم کی ایک اور شاخ

خدا کا ارادہ ومشیت

اشارہ

قرآن مجید میں ارادہ خداوندی کے بارے میں بہت سی آیات ہیں۔موجودات جہان کی وسیع آفرینش کا ارادہ،قوانین واحکام، بندوں کی تکالیف وتقدیر کا ارادہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا کا ارادہ دوقسم کا ہے۔تشریعی وتکوینی۔

مختلف زمانوں میں متفرق افعال وحوادث کا ظہور اس پر دلیل ہے کہ اس نے ارادہ کیا ہے کہ فلاں موجود یا فلاں حادثہ فلاں معین دن میں تحقق پائے گا،نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔(ارادہ تکوینی)

اسی طرح خدا کا ارادہ ہے کہ بندے فلاں کام انجام دیں اور فلاں کام کو ترک کریں۔(ارادہ تشریعی)

ارادۂ خدا کی حقیقت کیا ہے؟ یہ علم کلام اور عقائد وفلسفہ کا مشکل ترین مسئلہ ہے،لیکن تحلیل عقلی کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچیں گے کہ ارادۂ ومشیت خدا درحقیقت اس کے علم ہی کا حصہ ہیں۔لیکن کس طرح؟اس کا بیان آیات قرآن کے تذکرہ کے بعد''ارادہ خدا'' کے عنوان سے آئے گا۔

اب آیات ذیل کی طرف توجہ کرتے ہیں:

(۱)اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۠ ﴿۴۰﴾ (نحل ۴۰)

(۲) قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۱﴾ (فتح ۱۱)

(۳) وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ ﴿۵﴾ (قصص ۵)

(۴) یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ (بقرۃ ۱۸۵)

(۵) یَخْلُقُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۵﴾ (نور ۴۵)

(۶) وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۔ (کهف ۲۳-۲۴)

(۷) وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ﴿۵۱﴾ [1] (شوریٰ ۵۱)

ترجمہ

(۱) جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے صرف یہ کہتے ہیں ہوجا۔ پس وہ فوراً ہوجاتی ہے۔

(۲) کہو کون ایسا ہے جو تمھیں خدا سے بچا سکے، اگر وہ تمہارے لیے نقصان کا ارادہ کرلے۔ کون ہے جو اس نفع کو روک سکے جس کے پہنچانے کا وہ ارادہ کرے، جو جو کام تم کرتے ہو خدا ان سے باخبر ہے۔

(۳) ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم مستضعفین (کمزوروں) پر احسان کریں اور ان کو امام و پیشوا اور زمین کے وارث بنادیں۔

(۴) خدا تمہارے لیے راحت و آسانی چاہتا ہے، وہ تمہاری تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔

(۵) خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۶) کبھی نہ کہو کہ میں کل یہ کام کروں گا مگر اس کے ساتھ کہو انشاءاللہ۔

(۷) کوئی انسان یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ خدا اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعے یا پس پردہ سے یا پھر اپنے کسی رسول کو بھیجتا ہے جو خدا کی مشیت کے مطابق اس کی طرف وحی کرتا ہے کیونکہ وہ بلند مرتبہ اور حکیم و دانا ہے۔

مفردات کی تشریح

''ارادہ'' کا مادہ ''رود'' بروزن ''موج'' ہے۔ اصل میں اس کا معنی کسی چیز کی طلب میں نرمی کے ساتھ رفت و آمد ہے۔ لہٰذا جو حیوانات کو چرانے کے لیے چراگاہ کی طرف لے جائے اس کو ''رود'' کہا جاتا ہے۔

اس مادہ سے لیا ہوا کلمہ ''ارادہ'' تین عناصر سے مرکب ہے۔

---

[1] ان آیات میں بھی آیات بالا کا مضمون موجود ہے۔ مائدہ ۱۷۔ رعد ۱۱۔ کہف ۱۸۲ احزاب ۷۔ ۳۳۔ ۳۸۔ اسرار ۱۶۔ انعام ۱۲۵، بقرہ ۱۸۵۔ آل عمران ۱۷۶، نساء ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ مائدہ ۱۔ ۶۔ ۴۹۔ انفال ۷۔ توبہ ۵۵۔ ہود ۱۰۷۔ حج ۱۴۔ ۱۶۔ فاطر ۱۰۔ بروج ۱۶۔

چیز کی خواہش جب کہ محبت وعلاقہ ہو، اس تک پہنچنے کی امید، اپنی یا کسی اور کی طرف سے اس کے انجام دینے کا حکم۔[1]

''مشیت''، بہت سے ارباب لغت اور متکلمین کے نزدیک بمعنی ارادہ ہے۔ لہٰذا ''راغب'' ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ اکثر متکلمین کے نزدیک مشیت کا معنی ارادہ ہے۔ بعض کے نزدیک مشیت کا مطلب ایجاد شیء اور اس تک پہنچنا ہے جب کہ عام استعمالات میں یہ ارادہ ہی کے معنی میں آتا ہے۔ لہٰذا خدا کے بارے میں استعمال کی صورت میں مشیت کا معنی ایجاد ہے اور بندوں کے لیے استعمال میں کسی چیز تک پہنچنا ہے۔[2]

لیکن بعض کتب لغت میں ہے کہ ارادہ ومشیت کے معنی میں فرق ہے۔

''مشیت'' وہ میلان ہے جو تصور (وتصدیق) کے بعد حاصل ہو۔ اس کے بعد عزم وتصمیم اور اس کے بعد ارادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مشیت کئی مراحل پہلے ہے اور ارادہ فعل کے ساتھ متصل آخری مرحلہ کو کہا جاتا ہے۔

روایات اسلامی میں ہے کہ مشیت ارادہ سے پہلے مرحلے میں ہوتی ہے۔ اس کی تشریح ''توضیحات'' میں آئے گی۔

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

اس کا ارادہ تمام اشیا میں نافذ ہے

(۱) پہلی آیت مورد بحث میں اس حقیقت کی خبر دی جارہی ہے کہ ارادۂ خدا وجود اشیاء سے جدا نہیں، جب وہ ارادہ کرے اس کے ساتھ ہی چیز ایجاد ہوجاتی ہے۔ فرمان ہے: ''جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف یہ کہتے ہیں، ہوجا پس وہ فوراً ہوجاتی ہے۔'' (انما قولنا لشیء اذا اردناہ ان نقول له کن فیکون)۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام حوادث وموجوداتِ عالم ایک ہی لحظہ میں موجود ہوجاتے ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ارادہ وفرمان خدا کے مطابق بدون تاخیر وتقدیم کے وہ چیز حاصل ہوجاتی ہے۔

یعنی اگر خدا کا ارادہ ہو کہ بچہ (جنین) ۹ ماہ ۹ روز میں پیدا ہوجائے تو ایک سیکنڈ بھی کم وبیش نہیں ہوگا۔ اگر ارادہ ہو کہ اس سے کم یا زیادہ وقت میں متولد ہوجائے تو اسی طرح ہوسکتا ہے۔ اگر اس کا ارادہ ہو کہ اس طرح کا منظومہ شمسی یا عظیم عالم ایجاد ہوجائے تو اسی طرح ہی ہوجائے گا۔

حتی کہ کن (ہوجا) کی تعبیر بھی الفاظ کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے وگرنہ ارادہ کے بعد بلا فاصلہ چیز کا تحقق ہوجاتا ہے۔

---

[1] مفردات راغب۔ مقائیس اللغہ۔ لسان العرب

[2] مفردات راغب، نہایہ ابن اثیر۔ مصباح اللغۃ۔ صحاح اللغۃ۔ لسان العرب اور مجمع البحرین۔

تعجب ہے کہ بعض قدما مفسرین کا خیال ہے کہ کلمہ ''کن'' (ہوجا) خدا کہتا ہے۔ پھر اس کے بعد چیز صادر ہوتی ہے۔ اس وقت یہ بحث بھی تھی کہ اس کلمہ کا مخاطب کون ہے، کیا معدوم سے خطاب ہوسکتا ہے؟

لہٰذا وہ مجبور ہوئے کہ خطاب بہ معدوم کی توجیہ کریں یا معدوم کے لیے کسی صورت کے قائل ہوں یا اس آیہ کو کلام الٰہی کے قدیم ہونے کی دلیل سمجھا جائے جب کہ یہ سب باتیں اشتباہ پر مبنی ہیں، کیونکہ قرآن سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ کنایہ ہے کہ جب ''خدا کا ارادہ ہو فوراً چیز ہوجاتی ہے۔''

درحقیقت ذات خدا کا ارادہ ایجاد اشیا کے علاوہ اور کچھ نہیں، جیسا کہ ہم ذکر کریں گے کہ ارادہ خدا کی عین ذات ہے یعنی عین فعل ہے۔ غور کریں۔

اسی قسم کا مضمون تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ بقرہ آیت ۱۱۷۔ یسین آیت ۸۲۔ آل عمران آیت ۴۷، ۵۹۔ مریم آیت ۳۵ اور مومن آیت ۶۸ میں بھی موجود ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیات بالا میں بعض آیتیں منکرین معاد کے سامنے بیان کی گئی ہیں کہ خدا ان سے فرما رہا ہے:

خدا کے ارادہ کے سامنے کوئی چیز مشکل نہیں۔ (جیسے کہ یسین کی آیت اور آیت مورد بحث)

بعض صرف مال سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش میں ہیں۔ (جیسے مریم و آل عمران ۴۷)

بعض آسمانوں و زمین کی پیدائش کے بارہ میں ہیں۔ (جیسے آیہ ۱۱۷، سورۂ بقرہ)

ارادۂ خدا کے سامنے کوئی طاقت رکاوٹ نہیں بن سکتی

(۲) دوسری آیت میں جزا و سزا اور تقدیر انسانی کے سلسلہ میں ارادہ خدا کی بحث ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ بندوں کی جزا و سزا کے سلسلہ میں ارادہ خدا کے سامنے کوئی طاقت رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے۔ فرمان ہے (جن لوگوں نے جہاد و جنگ سے تخلف کیا ہے ان سے) کہو: کون ایسا ہے جو تمہیں خدا سے بچا سکے اگر وہ تمہارے لیے نقصان کا ارادہ کرے۔ کون ہے جو اس نفع کو روک سکے جس کے پہنچانے کا وہ ارادہ کرے۔ جو جو کام ہو خدا ان سے باخبر ہے۔'' (قل فمن یملك لکم من الله شیئا ان ارادبکم ضرا اور ارادبکم نفعا بل کان الله بما تعملون خبیرا)

میدان جہاد میں تمہاری عدم شرکت یا اس لیے ہے کہ خود کو یا اپنے خاندان کو دردناک حوادث سے بچاؤ یا تمہارا مقصد مادی منافع کا حصول اور حفاظت مال ہے، جب کہ یہ سب کام مشیت خدائی سے وابستہ ہیں۔ اس کی قدرت کے سامنے کون مقاومت کرسکتا ہے۔

یہ نظریہ موجب بنے گا کہ وظائف الٰہی کی انجام دہی میں انسان کو نہ نقصان کا خوف اور نہ منفعت کے عدم حصول کا ڈر ہوگا کیونکہ سب تقدیرات تو خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لحاظ سے اعمال انسانی میں ارادہ و مشیت پر ایمان کے اثرات اور ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے آمادگی بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔

بہرحال (اس آیت میں) ارادہ تکوینی کا تذکرہ ہے۔

اس نے کمزوروں کی نصرت کا ارادہ کیا ہے

(۳) تیسری آیت میں بھی تقدیر اقوام میں ارادۂ خداوندی کے اثرات کی بحث ہورہی ہے، ایسا کلام جو مظلوم اقوام کے لیے امید کی کرن ہے۔ فرمان ہے: ''ہمارا ارادہ ہے کہ مستضعفین اور (کمزور لوگوں) پر احسان کریں اور ان کو امام و پیشوا اور زمین کے وارث بنائیں۔'' (ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم آمۃ ونجعلھم الوارثین)

''نرید'' کی تعبیر جو کہ فعل مضارع (استمرار کی دلیل ہے) اس سے واضح ہورہا ہے کہ خدا کی سنت جاودانی اور قانون دائمی ہے کہ روئے زمین پر کمزور لوگوں (مستضعفین) کو بااختیار بناتا اور متکبرین کی بیخ کنی کرتا ہے۔

توجہ رہے کہ ''مستضعفین'' کی بات ہورہی ہے نہ ضعیف لوگوں کی یعنی وہ لوگ جو ہر وقت کوشش اور حالت جہاد میں ہیں، لیکن دشمنوں کی طرف سے ضعیف بنادیئے گئے ہیں، نہ وہ لوگ جو ذلت کی وجہ سے ضعف کو اپنا وطیرہ بنا چکے ہیں۔

اس آیت اور سورۂ انبیاء کی آیت ۱۰۵ ''ان الارض یرثھا عبادی الصالحون'' کو باہم ملانے سے معلوم ہوگا کہ ''مستضعفین'' سے مراد صالح، مجاہد و مبارز ہیں۔

اس بات کی طرف توجہ لازمی ہے کہ ''نمن'' کا مادہ ''من'' ہے اصل میں جس کا معنی ہے وزن سنگین۔ پھر عظیم نعمات پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔ جب یہ تعبیر خدا کے سلسلہ میں ہو تو اس کا معنی بلاعوض عظیم نعمات کا بخشنا ہوتا ہے۔ لیکن بندوں میں غالباً اس کا معنی ایسی نعمتوں کا ذکر ہے جو بقصد احسان دی گئی ہوں۔ البتہ اس سنت الٰہی ''یعنی عالم میں مستضعفین کی حکومت'' میں کافی بحث ہے۔ جو اپنے محل پر ذکر ہوگی۔ اس جگہ قابل ذکر یہ ہے کہ خدا کے ارادۂ تکوینی کی طرف توجہ تربیت انسانی میں فوق العادہ اثر رکھتی ہے، ظالموں کے مقابلہ میں مومنین و صالحین کے لیے موجب قوت و توانائی ہے اور انہیں کامیابی کی نوید دے رہی ہے۔

اس نے ارادہ کیا ہے کہ تمہاری مشکلیں آسان کردے

(۴) چوتھی آیت میں خدا کے ارادۂ تشریعی کی بحث ہے جس کا تذکرہ بارہا آیاتِ قرآنی میں ہوا ہے یعنی قانون سازی کے سلسلہ میں اس کا ارادہ۔

ماہِ مبارک رمضان میں روزہ کے حکم کا بیان اور مریض و مسافر کے استثناء کے بعد فرمان ہے:

(ان قوانین کے ساتھ) ''خدا تمہارے لیے آسانی و راحت چاہتا ہے۔ وہ تمہاری تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔'' (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر)

یہ ان آیات میں سے ہے جن میں تکلیف مالایطاق کی نفی ہورہی ہے۔ نیز شرعی تکالیف و فرائض میں مشقت اور ان کے موجب عسر و

تنگی ہونے کی بھی نفی ہے۔

فخر رازی کا یہ کہنا ہے کہ اس آیت کی دلالت عموم پر نہیں۔ یہ بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ العسر والیسر میں الف لام جنس کا ہے۔ ایسے مقامات پر اس کی دلالت عموم پر ہی ہوتی ہے۔

البتہ ممکن ہے کہ دیگر قوانین کی طرح یہ قانون بھی کچھ استثناء رکھتا ہو جیسے جہاد وغیرہ۔ دشمنوں کے شکنجہ میں سکوت اور ذلت کی حالت میں جہاد ''یسر وراحت'' ہے اور ''عسر یا مشکل'' نہیں۔

سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں احکام الٰہی کی دو قسمیں (عقد و پیمان کی پابندی، جانوروں کے گوشت کی حلیت) بیان کرنے کے بعد فرمان ہے:

''ان اللہ یحکم مایرید'' (خدا جس کا ارادہ کرتا ہے فرمان دیتا ہے)۔ اس تعبیر سے ارادہ تشریعی کی وسعت روشن واضح ہے۔

خدا کی طرف سے اعمال کی جزاء مومنین کے جنت میں دخول کے تذکرہ کے بعد فرمان ہے: ''ان اللہ یفعل مایرید'' (خدا جو ارادہ کرتا ہے انجام دیتا ہے)۔

مسلم ہے کہ خدا کے ارادہ تشریعی کی عمومیت سزا و جزا اور اسی طرح عالم خلقت و آفرینش کو اس کے شمول کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا ارادہ حکمت سے جدا ہے اور خلقت یا حکم یا جزا کسی مصلحت کے بغیر انجام پا رہی ہے۔

وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے

(۵) پانچویں آیت میں مشیت الٰہی اور اس کے عالم ہستی کی آفرینش اور ہر قسم کی خلقت کے لیے عموم و شمول (مشیت عامہ تکوینی) کی بات ہو رہی ہے۔ فرمان ہے ''خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ ہر شے پر قادر ہے۔'' (یخلق اللہ مایشاء ان اللہ علی کل شیء قدیر)

اس کلام سے پہلے قرآن مجید میں مختلف قسم کے متحرک حیوانات کا تذکرہ ہے۔ بعض پیٹ کے بل چلتے ہیں، بعض دو پاؤں اور بعض چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ آج تو معلوم ہے کہ جانوروں کی اقسام اس قدر زیادہ ہیں کہ فقط حشرات الارض لاکھوں قسموں کے ہیں جن میں سے چند ہزار کے بارے میں معلومات ہو سکی ہیں۔ صدہا ہزار قسم کے درخت جن کی جسامت مختلف اور خاصیتیں جدا جدا ہیں، ان سب سے اس آیت کی وسعت مفہوم واضح ہوتی ہے۔

پھر قابل توجہ امر یہ ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جانوروں کی تازہ اقسام دریافت ہوئی ہیں جن کا پہلے وجود نہیں تھا۔ لہٰذا حیوانات و نباتات کی خلقت میں کسی قسم کا تعطل نہیں۔ قاعدتاً موجودات میں تنوع اس کا ارادہ و اختیار کی دلیل ہے کیونکہ جس مبداء میں اختیار نہ ہو اس کے آثار بھی ایک جیسے ظاہر ہوتے ہیں لیکن جب خالق با ارادہ و اختیار ہو تو پھر تنوع کا سلسلہ جاری و ساری ہوگا۔ [1]

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۷ صفحہ ۴۶۸۴ میں اس موضوع کی طرف اشارہ ہے۔

ہر کام میں انشاءاللہ کہو

(۶) چھٹی آیت مورد بحث میں پھر مشیت خدائی کا تذکرہ ہے لیکن اس دفعہ صرف انسانوں کی تقدیر و اعمال کا ذکر ہے۔ پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے تاکیدی ارشاد ہے۔ کبھی نہ کہو کہ میں کل یہ کام انجام دوں گا مگر اس کے ساتھ کہو ''انشاءاللہ''۔ (ولا تقولن لشای انی فاعل ذلك غدا الا ان یشاء الله)

یعنی جب بھی کسی کام کے کرنے کا عزم کریں تو یقین کے ساتھ مشیت خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے جملہ ''انشاءاللہ'' (اگر خدا چاہے) کہیں، یہ اشارہ ہے کہ مشیت الٰہی تمام مشیتوں سے بالا ہے اور جب تک وہ نہ چاہے کوئی چیز موجود نہیں ہوسکتی۔

واضح ہے کہ اس میں مسئلہ جبر کا کوئی دخل نہیں بلکہ مشیت قاہرہ الٰہیہ کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ چاہے تو رکاوٹ بن سکتا ہے اور مقصد تک پہنچنے سے پہلے روک سکتا ہے۔ اگر انسان کو آزادی عطا ہوئی ہے تو یہ امتحان، آزمائش، تربیت اور تکامل کے لیے دی گئی ہے، آزادی کا مطلب ارادۂ خدا کا سلب ہونا نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مورد نظر ہدف تک پہنچنے کے لیے انسان کا ارادہ اور انتخاب بھی اس کے عوامل میں سے ایک عمل ہے جب کہ سینکڑوں عوامل ہیں جو انسانی قدرت سے خارج اور فقط خدا کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بات کے سلیقے اور حقیقت و واقعیت ہر دو کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے ہر عزم و ارادہ میں ''انشاءاللہ'' کہنا فراموش نہ کرے۔

اس سلسلے میں پھر اعمال انسانی میں ''معرفت خدا'' کے اثرات کی طرف توجہ ہوئی ہے کہ انسان اگر مشیت الٰہیہ پر ایمان رکھتا ہے تو خود کو کبھی اس سے مستغنی و بے نیاز نہیں سمجھے گا، کبھی مغرور نہیں ہوگا، خودغرضی کے مرکب پر سوار نہیں ہوگا، اسی طرح مشکلات و شدائد کے انبوہ میں اس کے آئینہ قلب پر یاس و ناامیدی کا غبار نہیں جمے گا اور تکلیف دہ حوادث کے سامنے کبھی گھٹنے نہیں ٹیکے گا۔ کیونکہ وہ مشیت خدا کو ہر چیز سے بلند و بالا سمجھتا ہے۔

آسمانی وحی اسی کی مشیت ہے

(۷) ساتویں اور آخری آیت میں مشیت تشریعی کی طرف لطیف اشارہ ہے۔

توجہ رہے کہ قرآن میں خلقت و احکام (تکوین و تشریع) میں کلمہ ''ارادہ'' بہت استعمال ہوا ہے لیکن لفظ ''مشیت'' عام طور پر مشیت تکوینی کے بارے میں آیا ہے اور احکام و تشریع میں اس کا استعمال کم ہے۔ اس سے نشان دہی ہوتی ہے کہ مفہوم ''مشیت'' میں تکوینی جنبہ کارفرما ہے۔ فرمان ہوا ہے: کوئی انسان یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ خدا اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعے (الہام قلبی) یا پس پردہ سے (جیسے کوہ طور پر حضرت موسیٰ سے گفتگو و کلام، یہاں حجاب سے مادی حجاب ہی مراد ہے) یا پھر وہ اپنے کسی پیغمبر کو بھیجتا ہے جو خدا کی مشیت

کے مطابق اس کی طرف وحی کرتا ہے۔(وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا اومن وراى حجاب اویرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاء)

کیونکہ وہ بلند مرتبہ اور حکیم ودانا ہے۔(انه علی حکیم)

ایک طرف اس کے علو وبلندی کا تقاضا ہے کہ وہ دیکھا نہ جائے یا زبان کے ساتھ بات نہ کرے۔

دوسری طرف اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ خلق خدا کی ہدایت وراہنمائی کے لیے انبیاء بھیجے اور مذکورہ بالا تین طرائق سے رابطہ برقرار رکھے۔

مذکورہ بالا تمام آیات سے معلوم ہوا کہ عالم تکوین وتشریع میں جہاں تک ممکن ہو اور مصلحت کا تقاضا ہو ارادۂ خدا کا تعلق ہے۔اگر انسان بھی ارادہ واختیار رکھتا ہے تو یہ بھی ارادۂ پروردگار ہی سے ہے۔

خدا کے ارادہ کے سامنے کوئی مانع ورکاوٹ نہیں اور اس کی مشیت ایجاد اشیاء سے جدا نہیں ہے۔

ہم سب کی تقدیر اسی کے ہاتھ میں ہے۔اسی کا وجود نفع،سعادت اور خیر کا سرچشمہ ہے۔اس کے ارادہ ومشیت پر اگر بھروسہ ہو تو بڑے بڑے حوادث ہمیں کمزور نہیں کریں گے اور ہم ان کے سامنے عاجز نہیں ہوں گے۔

ان صفاتِ الٰہی کی طرف خاص توجہ سے ہمیں یہی پیغام ملتا ہے۔

توضیحات

(۱)ارادۂ خداوندی کے عقلی دلائل

جب ہم موجودات جہاں کی طرف نظر کریں تو دیکھیں گے کہ اس عالم میں ہر روز نت نئے حوادث ہوتے آرہے ہیں۔ ہر موجود و حادث چیز ایک سرگذشت رکھتی ہے۔ بلکہ یہ جہان حوادث وظواہر ہی کا مجموعہ ہے۔اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام ممکنات کی علت العلل خدا ہے اور وہ ازلی وابدی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایک موجود خاص زمانہ میں ہی پیدا ہوتا ہے۔

اس کا جواب ایک ہی جملہ میں ہے اور وہ یہ کہ خدا فاعل مجبور نہیں، بلکہ فاعل مرید ومختار ہے۔نیز یہ کہ مثلاً کرہ زمین پانچ کروڑ سال قبل سورج سے جدا ہوا یا زندہ موجودات چند لاکھ سال قبل صفحہ زمین پر ظاہر ہوئے یا ہزار ہا سال قبل نوع انسانی نے عرصہ جہان میں قدم رکھا ہے تو ان سب کا تعلق خدا کے ارادۂ خاص کے ساتھ ہے۔

ایک اور جملہ میں یوں کہا جائے کہ بعض ممکنات کا وجود اور بعض کا عدم وجود، یا زمانہ خاص میں ایک چیز کا وجود نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد (جبکہ خدا کی قدرت سب کے لیے یکساں ہے) یہ دلیل ہے کہ ذات پاک کی قدرت کے علاوہ اس کی ایک صفت اور بھی ہے اور وہ اس کا ارادہ واختیار ہے۔

(۲)ارادۂ خدا کی حقیقت کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے لیے ارادہ کا معنی خدا کے ارادہ کے مفہوم سے مختلف ہے کیونکہ انسان میں پہلے چیز کا تصور ہے (مثلاً پانی پینے کا تصور) بعد میں اس کے فوائد کا تصور، پھر فائدہ کی تصدیق اور پھر اس فعل کے انجام دینے کے سلسلہ میں شوق و اشتیاق۔ جب شوق انتہا تک پہنچے گا تو پھر عضلات میں حرکت پیدا ہوگی اور کام کی طرف رخ کرے گا۔[1] ظاہر ہے کہ یہ مفاہیم (تصور، تصدیق، شوق، فرمانِ نفس اور حرکتِ عضلات) خدا میں نہیں ہیں کیونکہ یہ سب امور حادث ہیں۔ پھر ارادۂ خدا کیا ہے؟

لہٰذا مسلم علماء علم عقاید اور فلاسفہ ارادہ کا ایسا مفہوم چاہتے ہیں جو وجودِ بسیط اور ہر قسم کے تغیر و تبدل سے مبرا ذات کے مناسب حال ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا کا ارادہ دو قسم کا ہے:

(۱) ارادہ ذاتی

(۲) ارادہ فعلی۔

(۱) خدا کا ارادۂ ذاتی۔ اس سے مراد جہانِ خلقت میں نظام اصلح کا علم اور احکام و قوانین شریعت میں بندوں کی خیر و صلاح کو جاننا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ عالم ہستی کے لیے بہترین نظام کیا ہے، ہر موجود کس حالت میں حادث ہوسکتا ہے۔ یہی علم تحقق موجودات اور مختلف زمانوں میں حادث ہونے والی اشیاء کا سرچشمہ ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ قوانین و احکام میں بندوں کے لیے مصلحت کیا ہے، یہی روح قوانین و احکام اور مصالح و مفاسد علم ہے۔ غور کریں۔

(۲) خدا کا ارادۂ فعلی۔ عین ایجاد ہے اور اس کو صفات فعل کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا آسمان و زمین کی خلقت کا ارادہ ہی عین ان کی ایجاد ہے۔ وجوب نماز اور تحریم جھوٹ کا ارادہ ہی ایک کو واجب اور ایک کو حرام بنانے کا فعل ہے۔

خلاصۂ کلام

خدا کا ارادہ ذاتی عین علم و عین ذات ہے۔ (اسی لیے ہم نے اس کو علم کی شاخ قرار دیا ہے) اور خدا کا ارادۂ فعلی عین ایجاد ہے۔ اس ضمن میں جب احادیث نقل کریں گے تو اس مفہوم کی مزید توضیح آجائے گی۔ انشاءاللہ

(۳)ارادۂ تکوینی و تشریعی

ارادۂ تکوینی، وہ ارادہ، جو موجوداتِ جہاں اور وجود کائنات کا سرچشمہ ہے، یا بعبارۃ دیگر وہ (ارادہ) جو عین ایجادِ کائنات ہے۔

---

[1] بعض فلاسفہ ارادہ کو شوق موکد کہتے ہیں۔ بعض شوق مذکد کے علاوہ فعل و حرکت کے بھی قائل ہیں اور اسی فعل نفسانی کو ارادہ کہا جاتا ہے۔ (غور کریں)

ارادہ تشریعی ۔ وہ ارادہ جو خدائی اوامر ونواہی اور احکام وقوانین دینی کا سرچشمہ ہے۔ بعبارتِ دیگر وہ (ارادہ) جو عین احکام و قوانین ہے۔ آیات قرآن کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ (ارادہ کے) دونوں معانی بڑی وسعت رکھتے ہیں جبکہ مشیت کا تعلق غالباً خلقت و آفرینش اور تکوین سے ہے، تشریع میں اس کا استعمال نادر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مادۂ مشیت میں مفہوم تکوینی غالب ہے۔

(۴) ارادۂ خدا۔ روایات اسلامی میں

ارادۂ خدا کے سلسلے میں کئی گروہ اشتباہ میں پڑ گئے۔ اس لیے روایات اہل بیتؑ میں اس کا تذکرہ بہترین تربیتی انداز میں ہوا ہے۔ بطور نمونہ ہم چند روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(۱) توحید صدوق اور عیون اخبار الرضاؑ میں امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ سے منقول ہے کہ ارادۂ خدا کے سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں آپؑ نے فرمایا:

"الارادة من المخلوق الضمير ۔ ومايبدو له، بعد ذلك من الفعل ۔ واما من الله عزوجل فارادته احداثه لاغير ذلك ۔ لانه لايروى ولايهم ولايتفكر، وهذه الصفات منفية عنه، وهى من صفات الخلق، فارادة الله هى الفعل لاغير ذلك، يقول له كن فيكون بلا لفظ ولا نطق بلسان ولاهمة ولا تفكر ولا كيف لذلك كما انه بلا كف

"مخلوقات کے اندرونی و باطنی تصور اور اس کے بعد ظاہر ہونیوالے افعال کو ارادہ کہتے ہیں لیکن خدا کے بارے میں ارادہ فقط ایجاد ہے۔ وہاں تصور نہیں اور نہ ہی تصمیم گری اور نہ ہی خدا کے ہاں تفکر ہوتا ہے۔ اس قسم کی صفات کا خدا سے تعلق نہیں ہے کیونکہ یہ سب تو صفات مخلوق میں ہیں (جو حادث ہے اور ناقص ہے)۔ پس خدا کا ارادہ وہی فعل ہے نہ کوئی اور۔ خدا فرماتا ہے، ہوجا۔ بلا فاصلہ چیز موجود ہوجاتی ہے۔ وہاں زبان سے لفظ و جملہ کہنے کا معاملہ نہیں اور نہ ہی کوئی تصمیم وفکر ہے۔ اس کا ارادہ کسی قسم کی کیفیت نہیں رکھتا جیسا کہ خود خدا کی ذات بے کیفیت ہے۔"[1]

اس حدیث کو مرحوم کلینی رحمۃ اللہ نے بھی اصول کافی میں ذکر کیا ہے۔[2]

---

[1] بحارالانوار جلد ۴ ص ۱۳۷ حدیث ۴

[2] اصول کافی جلد ۱ ص ۱۰۹ باب الارادۃ۔ حدیث ۳۔

(۲) اسی کتاب میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"الشیة والارادة من صفات الافعال فمن زعم ان الله تعالی لم یزل مریدا شائیا فلیس بموحد"

''مشیت وارادہ صفات فعل ہیں جس کا یہ خیال ہو کہ خدا کا ارادہ اور مشیت ازلی ہے وہ موحد نہیں۔''[1]

ظاہر ہے کہ اس حدیث سے مراد ارادۂ فعلی ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا۔

ارادۂ ازلی کی نفی درحقیقت ان لوگوں کی نفی ہے جو ارادہ کو زائد برذات اور ازلی قرار دیتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ دو یا دو سے زیادہ وجود ہائے ازلی کے قائل ہیں اور یہ خیال عقیدۂ توحید کے مناسب نہیں ہے۔

لیکن ارادہ ذاتی تو عین علم ہے اور علم عین ذات خدا ہے۔ لہٰذا یہ عین توحید ہوگا اور اس میں کوئی شرک نہیں ہوگا۔ (غور کریں)

(۳) اصول کافی میں امام رضا علیہ السلام کا فرمان ہے:

"ال الله یابن ادم بمشیتی کنت انت الذی شاء لنفسك ماتشاء۔ وبقوتی ادیت فرائضی و بنعمتی قویت علی معصیتی، جعلتك سمیعا بصیرا قویا ما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من شیئة فمن نفسك۔"

''خدا فرماتا ہے: اے فرزند آدم! میری مشیت وارادہ ہی کی بدولت تو اپنے لیے جو ارادہ چاہے کرسکتا ہے، میری دی ہوئی قوت کی وجہ سے میرے معین کردہ واجب کو بجالاسکتا ہے، میری دی ہوئی نعمت سے تو میری معصیت کی قوت حاصل کرتا ہے کیونکہ میں نے تجھے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا اور قوی قرار دیا ہے۔ پھر تو جو نیکی کرے وہ خدا کی دی ہوئی توفیق سے ہے اور جو برائی کرے وہ تیری اپنی خواہش سے ہے۔''[2]

اس حدیث کی نظر خدا کے ارادۂ تکوینی کی طرف ہے جو انسان کے ارادہ وآزادی سے متعلق ہے۔ اسی نے انسان کو اپنے مقدورات پر قادر بنایا ہے۔ البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان سواستفادہ کرتا ہے اور خدا کی نعمتوں کی معصیت ونافرمانی کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ اس کا اپنا فعل ہوتا ہے لیکن جب ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اچھا کام کرے تو درحقیقت توفیق خدا اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ (غور کریں)

---

[1] توحید صدوق ص ۳۳۷ باب مشیت وارادہ حدیث ۵

[2] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۵۲ باب مشیت وارادہ حدیث ۶۔

خدا کی بے انتہا قدرت

اشارہ

علم کی بحث کے بعد صفات کمال و جمال میں سے اہم ترین صفت ''قدرتِ خدا'' ہے، وہ قدرت جو ہر لحاظ سے لامحدود اور لامتناہی ہے اور ہر امر ممکن کو شامل ہے، وہ قدرت جس کے ساتھ اختیار و مشیت بھی ہے کہ جب ارادہ کرے تو چیز وجود میں آجائے اور جب وہ محو اور نابودی کا ارادہ کرے تو ہر چیز ختم و نابود ہو جائے۔ موجودات جہاں اپنے حیران کن و عظیم جسموں کے ساتھ اور اسی طرح اپنی باریک و ظریف شکلوں کے ساتھ سب اسی کی قدرت کی نشانی اور اس کے لامحدود ہونے کی دلیل ہیں۔

لیکن اس بات میں بڑی گہرائی اور عمق ہے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے چند مقدمات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

۱۔ پروردگار کی قدرت لامتناہی کے دلائل۔

۲۔ خداوند فاعل مختار ہے۔

۳۔ عمومیت قدرت کے منکرین کی دلیلیں۔

۴۔ امر محال کے ساتھ قدرت خدا کا تعلق نہیں۔

پہلے ہم بحث اول کی طرف توجہ کرتے ہیں اور قرآن پاک سے مدد لیتے ہوئے آیات ذیل پر نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ﴿۱﴾ (ملك ۱)

۲۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ (طلاق ۱۲)

۳۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ﴿۲﴾ (حدید ۲)

۴۔ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾ (روم ۵۴)

۵۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۲۰﴾ (مائدہ ۱۲۰)

٦۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَہُمۡ (اسراء ۹۹)

۷۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَلَمۡ یَعۡیَ بِخَلۡقِہِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ؕ بَلٰۤی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۳۳﴾ (احقاف ۳۳)

۸۔ فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ ﴿۴۰﴾ (معارج ۴۰)

۹۔ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعۡجِزَہٗ مِنۡ شَیۡءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَلِیۡمًا قَدِیۡرًا ﴿۴۴﴾ (فاطر ۴۴)

۱۰۔ قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِیَدِ اللّٰہِ ۚ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۷۳﴾ [1]

(آل عمران ۷۳)

ترجمہ

۱۔ بابرکت وبرتر ہے وہ ذات کہ تمام جہان ہستی کی حکومت اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہر چیز پر قادر وتوانا ہے۔

۲۔ اللہ وہی ہے جس نے سات آسمانوں کو پیدا کیا اور انہی کے برابر زمین بھی۔ ان میں خدا کا حکم نازل ہوتا رہتا ہے تا کہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے۔

۳۔ آسمانوں وزمین کی حکمت اسی کے لیے ہے۔ وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

---

[1] توجہ رہے کہ ''قدیر'' قرآن مجید میں خدا کے بارے میں ۴۵ دفعہ استعمال ہوا ہے۔ کبھی بہ صورت "ان اللہ علی کل شیء قدیر" کبھی "واللہ علی کل شیء قدیر" کبھی "انك علی کل شیء قدیر" کبھی "وھو علی کل شیء قدیر" کبھی "وان اللہ علی نصرھم لقدیر" "وھو علی جمعھم اذا یشاء قدیر" اسی طرح کی دیگر تعبیریں۔

سات دفعہ لفظ قادر استعمال ہوا ہے۔ بعض آیات میں قادرون اور قادرین بھی خدا کے سلسلہ میں موجود ہے۔ اسی طرح پروردگار کا ''عدم عجز'' اور کبھی ''وسعت قدرت'' بھی آیا ہے، معاجم میں مادہ (قدرت وعجز ووسعت) جمیع ہیں۔ مذکورہ بالا ۱۰ آیات بھی ان تینوں اقسام کی جامع ہیں۔

۴۔وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا رہتا ہے، وہ سب کچھ جاننیوالا اور بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔

۵۔آسمانوں اور زمین کی حکومت اور جو کچھ ان میں ہے سب اسی کا ہے اور وہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

۶۔کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، وہ اس بات پر قدرت رکھنے والا ہے کہ ان جیسے اور پیدا کر دے۔

۷۔کیا انہوں نے نہیں دیکھا (وہ نہیں جانتے) کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے اور ان کی پیدائش سے نہیں تھکا۔(عاجز نہیں ہوا)۔اس بات پر قدرت رکھنے والا ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے۔ہاں! یقیناً وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

۸۔میں مشارق اور مغارب کے رب کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم ضرور اس پر قادر ہیں۔

۹۔اللہ ایسا نہیں کہ کوئی چیز اس کو آسمانوں اور زمین میں عاجز کر سکے۔یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا اور پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

۱۰۔اے رسولؐ کہہ دو فضل وعطا خدا کے ہاتھ میں ہے۔وہ جسے چاہتا ہے (اور لائق سمجھتا ہے) اسے دے دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور بہت جاننے والا ہے۔

مفردات کی تشریح

''قدیر'' کا مادہ ''قدرت'' ہے۔اس سے مراد وہ شخص ہے جو ارادہ کرے اور مقتضائے حکمت کے مطابق اس کو انجام دے کہ نہ کم رہے نہ زیادہ کرے۔اس لیے اس صفت کا اطلاق صرف خدا پر ہوتا ہے۔قاعدتاً وصف قدرت مطلقاً خدا ہی پر بولا جاتا ہے۔غیر کے بارے میں جب اطلاق ہو تو حدود قیود کے ساتھ ہی ہوگا کیونکہ غیر خدا ایک لحاظ سے قادر ہے تو دوسری جہات سے عاجز و ناتواں ہوگا۔[1]

یہ کلمہ دراصل ''قدر'' سے لیا گیا ہے۔اس کا معنی اندازہ اور کسی چیز کی کنہہ ونہایت ہے۔خدا کے بارے میں اس کلمہ کا اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ خدا جو چاہے اندازہ کے مطابق انجام دیتا ہے اور بندوں کو جتنی مقدار چاہے بخش دے۔[2]

''قدیر'' و ''قادر'' ہر دو صفات خدا ہیں، اصل میں ''تقدیر'' و اندازہ سے لیے گئے ہیں۔''قادر'' اسم فاعل اور ''قدیر'' صفت مشبہہ یا

---

[1] مفردات راغب۔مادۂ قدر

[2] مقائیس اللغۃ، مادۂ قدر

مبالغہ کا صیغہ ہے۔ ''مقتدر'' اس سے بھی ''ابلغ'' ہے۔[1]

''یعجزہ'' کا مادہ ''عجز'' (جیم پر پیش) ہے۔ اس کا معنی کسی چیز کا دنبالہ اور پیچھا ہے۔ ''عجز'' بروزن ''حبس'' کسی کے پیچھے رہ جانا، کسی کے پیچھے ہونا۔ اس کو کام کے سرانجام دینے میں قصور و کوتاہی پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ''قدرت'' ہے۔ ''معجز'' کا معنی وہ شخص یا چیز جو دوسروں کو عاجز بنا دے۔ ''عجوز'' کا بوڑھی عورت پر اطلاق اس کے عاجز ہونے کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ لغت کے مشہور مصادر مقائیس اور مفردات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلمہ صرف بوڑھی عورت ہی پر بولا جاتا ہے۔[2]

''واسع'' کا مادہ ''سعۃ'' اور ''وسع'' ہے۔ اس کا معنی ہے کشادگی و وسعت جس کے مقابلہ میں تنگی اور ضیق ہوتی ہے۔ یہ مکان، حالات اور افعال میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے قدرت و توانائی اور بخشش و وسعت پر اطلاق ہوتا ہے۔

خدا کا واسع ہونا وسعت رزق اور وسعت رحمت کی وجہ سے ہے کہ سب مخلوقات کو شامل ہے یا اس عنوان سے کہ اس کا احاطہ علمی تمام چیزوں پر حاوی ہے یا مراد تمام اشیاء کا احاطہ وجودی ہے۔ ''واسع'' کا معنی کثیر العطاء اور کثیر العلم بھی ہے۔ ''موسع'' (وسعت والا) قرآن مجید میں خدا کی ذات پر اطلاق ہوا ہے۔ بعض ارباب لغت نے اس کا معنی ''قادر و غنی'' بھی لیا ہے۔[3]

البتہ اس کے اور معنی بھی ہیں جو ہماری بحث سے خارج ہیں۔[4]

آیات کی جمع آوری و تفسیر

وہ ہر کام پر قادر ہے

(۱) پہلی آیت میں تمام جہان پر خدا کی لازوال حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بدون قید و شرط ہر چیز پر اس کی قدرت کی تاکید کی گئی ہے۔ فرمان ہے:

''بابرکت و برتر ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام جہانِ ہستی کی حکومت ہے۔ وہی ہر چیز پر قادر و توانا ہے۔'' (تبارك الذی بیدہ الملك و ھو علی کل شیء قدیر)

---

[1] لسان العرب مادۂ قدر

[2] مقائیس اللغۃ۔ مفردات اور لسان العرب

[3] مفردات۔ لسان العرب اور مقائیس اللغۃ۔

[4] تفسیر نمونہ جلد ۲۲، صفحہ ۳۷۳

ذیل آیہ ۴۷ سورۂ ذاریات کی طرف رجوع فرمائیں۔

"تبارك" کا مادہ "برک" جس کا وزن "برگ" ہے۔اس کا معنی اونٹ کا سینہ ہے اس لیے جب اونٹ اپنا سینہ زمین پر رکھتا ہے تو اسے "برک البعیر" کہا جاتا ہے۔پھر دوام وبقااور لازوال کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بابرکت نعمت اس کو کہا جاتا ہے جس نعمت میں دوام ہو۔ذات پاک خدا پر اس کلمہ کا اطلاق اس کی ازلیت وابدیت کی وجہ سے ہے۔

"بیدہ الملك" حصر پر دلالت کرتا ہے یعنی تمام جہان کی حکومت فقط اسی کے قبضہ قدرت میں ہے اور وہی تمام جہان کا مالک و متصرف ہے۔

"**وھو علی کل شیء قدیر**" کے مفہوم میں بہت زیادہ وسعت ہے کہ اس کی قدرت بلا استثناء ہر چیز کو شامل ہے کیونکہ خود "شیئ" کے مفہوم میں وسعت ہے اور عالم امکان کی ہر چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ رہے کہ اگر اس کلمہ کا اطلاق معدوم پر ہو تو بھی اس کی حالت وجود کی طرف توجہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔جب کہیں کہ خدا فلاں چیز پر قادر ہے جب کہ وہ چیز موجود نہ ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ اس کی ایجاد پر قادر ہے، وگرنہ عدم پر قدرت کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

انسان کی زندگی چونکہ محدود اور فکری افق بہت کم ہے، یہ شرائط کی محدودیت کا عادی ہے۔لہٰذا مسئلہ قدرت میں بھی محدودیت کو سامنے رکھتا ہے جب کہ آیت بالا تمام حدود و قیود کو توڑ رہی ہے کیونکہ قدرت پروردگار کی وسعت ان حدود و قیود سے بالا ہے۔کلمہ قدرت کے احاطہ سے فقط محالات خارج ہیں کیونکہ محال چیزیں بذاتہ وجود کو قبول نہیں کرتیں اور ان پر کلمۂ قدرت کا اطلاق غلط ہے۔

جیسے تفسیر لغات میں ذکر کیا گیا ہے "قدیر" صفت مشبہہ ہے یا صیغہ مبالغہ پر دلالت کر رہا ہے۔اس کا مفہوم قادر کے مفہوم سے اعلیٰ و ارفع ہے۔اسی لیے آیاتِ قرآن مجید میں "قدرتِ خدا" کے لیے زیادہ تر یہی کلمہ استعمال ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کلمۂ "قدیر" کے بعد موت و حیات، سات آسمانوں اور ستاروں کا خلقت اور شیاطین کے دفعیہ کا ذکر کیا گیا ہے جو خود جہانِ موجودات کا عظیم نمونہ ہیں۔

خلقت جہان کا ہدف قدرتِ الٰہی کی معرفت ہے

(۲) دوسری آیت میں آسمانوں وزمین کی خلقت کا ہدف خدا کے علم وقدرت کی وسعت سے لوگوں کی آگاہی قرار دیا گیا ہے۔فرمان ہے:

اللہ وہی ہے جس نے سات آسمانوں کو پیدا کیا اور انہی کے برابر زمین بھی۔ان میں خدا کا حکم نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے۔(**اللہ الذی خلق سبع سموت و من الارض مثلھن یتنزل الامر بنھن لتعلموا ان اللہ علی کل شیء قدیر و ان اللہ قد احاط بکل شیء علما**)

اس لحاظ سے کھلے آسمان اور بچھی ہوئی زمین کی خلقت اور ان میں خدا کی تدبیر کا مسلسل جاری رہنا خود اس کی قدرت کے عموم وشمول کی بہترین دلیل ہے کیونکہ اس متنوع مجموعہ کائنات میں ہر قسم کی مخلوق موجود ہے۔سات آسمانوں اور زمینوں کے مفہوم میں کافی بحث تھی جس کا

تذکرہ ہم نے تفسیر نمونہ میں کیا ہے۔[1]

موت وحیات اسی کے ہاتھ میں ہے

(۳) تیسری آیت میں آسمانوں اور زمین پر خدا کی حاکمیت اور موجودات کی موت وحیات کے تسلسل کو قدرتِ خدا کی علامت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔فرمان ہے: ''آسمانوں اور زمین کی حکومت اسی کے لیے ہے۔وہی زندگی عطا کرتا اور وہی موت دیتا ہے وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ (له ملك السموت والارض يحي ويميت وهو على كل شيء قدير)

موت وحیات کی خلقت کا مسئلہ اس قدر مشکل و پیچیدہ ہے کہ اس پر قدرت رکھنا ہی پروردگار کی قدرت مطلقہ کی نشانی ہے۔یہی ایسا مسئلہ ہے کہ جس میں تمام دانش مند انسان حیران ہیں۔وہ ایسے قوانین کی دریافت کے لیے سرگرداں ہیں جن کے تحت وسائل موجودہ سے استفادہ کرتے ہوئے ایک زندہ سلول پیدا کیا جائے جب کہ سب سے پیچیدہ اور مشکل مسائل (جیسے فضا میں سفر، بڑی بڑی صنعتیں اور سب ہی عمدہ الیکٹرونی مسائل) انہوں نے حل کر لیے ہیں۔تاہم ہمارے اردگرد لاکھوں بلکہ کروڑوں زندہ موجودات پائے جاتے ہیں کہ ہزار ہا سال کی کاوشوں کے باوجود انسان ان میں سے کسی ایک کے مکمل اسرار سمجھنے سے قاصر ہے۔

کیا اس طرح کی بدیہی مخلوقات خدا کی قدرت لامتناہی کی دلیلیں نہیں ہیں؟

تصوراتِ حیات اس کی قدرت کی دلیل ہیں

(۴) چوتھی آیت میں یہی مسئلہ ایک اور طریق سے ذکر کیا گیا ہے اور ضمناً انسان کے مختلف حالات، فرمانِ الٰہی سے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیلی اور مختلف موجودات کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا کے علم اور قدرت کی عمومیت کا اظہار کیا گیا ہے۔فرمان ہے: اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ضعیف و کمزور بنایا۔پھر اس ضعف کے بعد قوت عطا کی۔پھر قوت کے بعد کمزوری و بڑھاپا دیا۔وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا رہتا ہے۔وہ سب کچھ جاننے والا اور بڑی قوت رکھنے والا ہے۔''اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ۝۵۴ (روم: ۵۴)

یہ حقیقت ہے کہ جنین میں تغیرات کا ملاحظہ، پھر انسانی زندگی کے مختلف مراحل قدرت وطاقت کا قوس صعودی ونزولی جو ذرہ کی حالت میں ایک موجود زندہ (نطفہ) سے شروع ہوتا ہے اور نتیجتاً انسان قوی، باہوش و متفکر کی منزل تک پہنچتا ہے جو قدرت تخیل رکھتا ہے اور بہت سے مسائل حل کرنے پر قادر ہوتا ہے۔پھر اس کی بازگشت شروع ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ اس پر ایسا زمانہ آتا ہے کہ یہ ایک موجود کمزور حتیٰ کہ ایک چھوٹے بچے سے زیادہ ناطاقت وناتواں ہو جاتا ہے۔یہ عجیب وغریب تبدیلی اور تیزی کے ساتھ تغیر تمام اشیاء پر خدا کے قدرت رکھنے کی واضح نشانی ہے۔ قرآن مجید خدا کے علم وقدرت کی عمومیت کے اثبات کے لیے تخلیق انسان سے بات شروع کر کے اس کا سلسلہ بلند ووسیع آسمانوں کی آفرینش تک

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲۴ ذیل آیت زیر بحث

پہنچاتا ہے، انسان کوخود اپنی ذات کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرتا ہے اوران عظیم تبدیلیوں کی طرف نظر کرنے کی دعوت دیتا ہے جو انعقادِ نطفہ سے موت تک پیدا ہوتی ہیں۔

"خلقکم من ضعف" کی تعبیر بتارہی ہے کہ ضعف وناتوانی انسان کا مادۂ اولین ہے، اسی سے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ نطفہ انسانی اس قدر ضعیف وکمزور ہے کہ تھوڑی سی تکلیف سے نابود ہوجاتا ہے۔

آپ دیکھیں کہ خدا نے کمزور نطفے سے کس قدر طاقت ور موجود (انسان) بنایا جس نے آسمان وزمین کو اپنی جولان گاہ بنا رکھا ہے، علم وقدرت اور صنعت میں کسی حد بست پر قانع نہیں اور یہی انسان جب پیچھے کی طرف لوٹتا ہے تو پھر اس میں وہی ناتوانی وکمزوری عود کرآتی ہے۔

یہ تمام چیزیں خالق حکیم کی بے پایاں ولامتناہی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

حکومت وقدرت

(۵) پانچویں آیت میں آسمانوں، زمین اوران کے مابین جو کچھ ہے اس پر خدا کی ملکیت وحاکمیت اور ہر چیز پر اس کی قدرت کاملہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمان ہے:

''آسمانوں اور زمین کی حکومت اور جو کچھ ان میں ہے سب اسی کا ہے اور وہی ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے۔'' (لله ملك السموات والارض وما فيهن وهو على كل شيء قدير)۔

واضح ہے کہ یہ حاکمیت ومالکیت اس لیے ہے کہ وہی ان کا خالق ہے اور جس ذات نے اس قسم قسم کی مخلوقات کو پیدا کیا ہے وہ لامحالہ ان پر قادر ہے۔ حقیقتاً آیت کا آغاز اس کے ذیل کی دلیل کے بمنزلہ ہے۔

ممکن ہے یہ تعبیر اس لیے ہو کہ مشرکین بتوں سے ایسی کوئی امید نہ رکھیں اور نہ ہی ان کو خدا کا درجہ دیں کیونکہ ہر چیز اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یا ممکن ہے مسیحی عقیدہ کی نفی متصور ہو جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کی اولیت کا عقیدہ رکھتے تھے۔

بہرحال یہ آیت شرک کی بیخ کنی کرنے کے لیے ایک مضبوط بنیاد ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ ملک (میم کی زیر سے) کا معنی انسان کا کسی چیز پر تسلط ہے اور ملک (میم کی پیش) سے کسی نظام پر حکومت سمجھی جاتی ہے۔ گویا ملک میں جنبہ انفرادی اور ملک میں جنبہ اجتماعی ہے۔

یہ وہی چیز ہے جس کو روزمرہ کی تعبیر میں مالک وحاکم کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔

معاد پر اس کی قدرت

(۶) چھٹی آیت میں مسئلہ معاد اور اگلے جہان میں مردوں کے لیے تجدید حیات پر خدا کی قدرت کا ذکر ہو رہا ہے تاکہ معاد جسمانی کے منکرین کا جواب ہوجائے۔ ان کا عقیدہ اس سے پہلی آیت میں آیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہوکر خاک میں پراگندہ ہو

جائیں تو پھر ہم نئے سرے سے پیدا ہو جائیں۔قرآن ان کے جواب میں فرماتا ہے''کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جس نے آسمانوں وزمین کو پیدا کیا، وہ اس بات پر قدرت رکھنے والا ہے کہ ان جیسے اور پیدا کر دے۔''(اولم یروا ان اللہ الذی خلق السموت والارض قادر علی ان یخلق مثلھم)

"اولم یروا" (کیا انہوں نے نہیں دیکھا) میں چونکہ رویت سے مراد رویت قلب ہے لہٰذا اس کا معنی (کیا وہ نہیں جانتے) ہونا چاہیے۔ان کے اس علم وآگاہی کا سرچشمہ وہی مشہور حکم عقلی ہے کہ "حکم الامثال فیما یجوز و فیما لا یجوز واحد"۔(ایک دوسرے کے مشابہ اشیاء کا حکم ایک جیسا ہی ہوگا کہ اگر ممکن ہیں تو سب ممکن اور اگر محال ہیں تو سب محال ہوں گے)۔

پھر مردہ کو زندہ کرنے کی قدرت کا تذکرہ

(۷) ساتویں آیت میں جہاں آخرت میں مردوں کو زندہ کرنے پر قدرت خدا کا تذکرہ ہے یہاں یہ مفہوم ایک اور تعبیر کے ساتھ آیا ہے۔ فرمان ہے:''کیا انہوں نے نہیں دیکھا (وہ نہیں جانتے) کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور وہ ان کی پیدائش سے تھکا نہیں (عاجز نہیں ہوا)۔وہ اس بات پر قدرت رکھنے والا ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے، یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے(اولم یروا ان اللہ الذی خلق السموت والارض ولم یعی بخلقھن بقادر علی ان یحیی الموتی بلی انہ علی کل شیء قدیر)۔[1]

یہ بات بھی تاکید کرتی ہے کہ اس تنوع اور عظمت کے ساتھ آسمانوں اور زمین کی خلقت ایک طرف سے مردوں کو زندہ کرنے میں خدا کی قدرت کی دلیل ہے اور دوسری طرف تمام چیزوں پر قدرت خدا کی دلیل ہے کیونکہ جس چیز کا بھی تصور کریں اس کا نمونہ یا کئی نمونے جہانِ ہستی میں موجود ہیں اور ان کے چہروں سے موت وحیات کی کیفیتیں نمایاں ہیں۔بہت چھوٹے یا بہت بڑے موجودات، اپنے تمام ابعاد، ہر شکل، ہر نوع و ہر جنس میں پائے جاتے ہیں اور خدا کی طرف سے ان سب کی خلقت، قدرتِ خدا کی عمومیت کی بہترین دلیل ہے۔

تغیرات اقوام پر خدا کا اختیار

(۸) آٹھویں آیت میں خدا نے اپنی قدرت کو ایک عظیم پر معنی قسم کے ساتھ بیان کیا ہے۔فرمان ہے:''میں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم قادر ہیں کہ (کفار) کی زمین اور دل کو دے دیں جو ان سے بہتر ہیں اور ہم کبھی مغلوب نہیں ہو سکتے''(فلا اقسم برب المشارق و المغارب انا لقادرون علی ان نبدل خیرا منھم و ما نحن بمسوقین)۔

ممکن ہے سطحی لوگ یہ اشکال کریں کہ پروردگار کی قسم سے اس کی قدرت کس طرح ثابت ہوگی؟ لیکن قسم کے مضمون کی طرف توجہ کرتے ہوئے (مشارق ومغارب کے پروردگار کی قسم) اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کیونکہ''مشارق ومغارب'' دقیق اور پیچیدہ نظم کے ساتھ وسیع دنیا کی خلقت وآفرینش ایک پر معنی اشارہ ہے کہ ہر روز سورج مشرق سے نکلتا ہے اور نئے مغرب میں داخل ہوتا ہے۔یہ دقیق نظام کروڑوں

---

[1] "یعی" کا مادہ "عی" ہے جس کا معنی کسی کام کے کرنے سے عجز وناتوانی ہے۔یہ لفظ کلام میں عاجزی پر بھی بولا جاتا ہے۔

سال سے اسی طرح چل رہا ہے۔اس عظمت کے باوجود سورج کی خلقت، تمام اسرار کے ہوتے ہوئے زمین کی پیدائش اوران کی حرکات کے مقررہ اور دقیق انتظام میں سے ہر چیز قدرت خدا کی عمومیت کی روشن دلیل ہے۔اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ کافروں کی تباہی اوران کی جگہ اچھے انسانوں کی تخلیق پر بھی قدرت رکھتا ہے۔یہ اس صورت میں ہے جب زمین کے نئے مشرق ومغرب کا خیال کیا جائے۔لیکن اگر تمام کرات آسمانی اور منظومہ ہائے عالم کے مشارق ومغارب کی طرف نظر کی جائے تو اس مفہوم کی وسعت اور زیادہ روشن ہوجائے گی۔

اس جگہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ خدا نے ایک قوم کے جانے اور دوسری قوم کے آنے کے اثبات کے لیے مشرق ومغرب کی قسم کھائی ہے۔یہ اشارہ ہے کہ جس ذات نے سورج کو اس عظمت کے باوجود مغرب میں چھپایا اور دوسرے روز نئے مشرق سے سورج طلوع کیا، وہ غروب اقوام اور طلوع اقوام پر بھی قادر ہے۔

وہ کسی چیز کے سامنے عاجز نہیں

(۹) نویں آیت میں قدرت خدا کی عمومیت کا مسئلہ دو جہات سے مطرح ہے۔

۱۔ خدا سے ہر قسم کے عجز وکمزوری کی نفی۔

۲۔ ہر چیز پر اس کی قدرت تا اینکہ جنایت کار انسان اپنے کیفر کردار تک پہنچ جائیں۔فرمان ہے:''اللہ ایسا نہیں کہ کوئی چیز اس کو آسمانوں میں اور زمین میں عاجز کر سکے۔''(وما کان اللہ لیعجزہ من شیء فی السموت ولا فی الارض)

''یقیناوہ سب کچھ جاننے والا اور پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے۔''(انہ کان علیما قدیراً)

اگرچہ اس آیت کے ایک دو جملوں کے علاوہ ظاہراً یہاں اس مسئلہ کی کوئی اور دلیل نہیں، لیکن آسمانوں اور زمین اور وہ بہترین ودقیق نظام جوان پر حکم فرما ہے، اس کی طرف اجمالی اشارہ خدا کے لامتناہی علم وقدرت کی دلیل بن سکتا ہے۔

آغاز آیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس بیان کا ہدف یہ ہے کہ متکبر وغلط کار مشرکوں کو خبردار کیا جارہا ہے کہ تمہاری قدرت وقوت کا توڑنا خدا کے لیے آسان ہے اور اس کی کئی مثالیں سابقہ امتوں میں موجود ہیں۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ کمزوری وعجز یا تو جہل ونادانی کی وجہ سے ہوتا ہے جس سے کسی کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا یا ذاتی عجز وکمزوری کی وجہ سے ہے۔لیکن جو ذات عالم بھی ہے، قادر بھی ہے اور نہ اس پر غفلت طاری ہوتی ہے وہ کبھی عاجز وکمزور نہیں ہوسکتی۔

وہ بخشنے والا قادر ہے

(۱۰) دسویں اور آخری آیت میں''عجز وقدرت کا عنوان نہ ہوتے ہوئے، اس بات کو ایک اور لباس میں پیش کیا گیا ہے۔فرمان ہے''اے رسولؐ! کہدو فضل وعطا خدا کے ہاتھ میں ہے۔وہ جسے چاہتا ہے (اور لائق سمجھتا ہے) اسے دے دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور بہت جاننے والا ہے۔(قل ان الفضل بید اللہ یوتیہ من یشاء واللہ واسع علیم)

اگرچہ بہت سے مفسرین نے کلمہ ''واسع'' کو وسعت رحمت خدا، قدرت کی وسعت یا جود وکرم کے وسیع ہونے کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن اس قسم کی تفسیروں کے لیے کسی لفظ کے مقدر کرنے کی ضرورت ہوگی جب کہ حذف وتقدیر خلاف قاعدہ ہے اور بغیر کسی قرینہ کے قابل قبول بھی نہیں ہے۔

بلکہ ظاہر آیت وسعت وجود پروردگار پر دلالت کر رہی ہے۔ البتہ اس کی وسعت وجودی میں یہ تمام معانی آ جاتے ہیں۔ اس میں قدرت لامتناہی کی طرف بھی اور غیر محدود رحمت وفضل اور جود کی طرف بھی اشارہ ہو جائے گا۔

لہٰذا فخر رازی اپنی تفسیر میں کہتا ہے: خدا کی وسعت وجودی اس کے کمال قدرت کی دلیل اور علیم ہونا اس کے کمال علم کی دلیل ہے۔ وہی ذات جس کو چاہتی ہے اور مناسب سمجھتی ہے اس پر اپنا فضل وعطا کر دیتی ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کی احتیاج اور لیاقت سے باخبر ہے اور عطا ورحمت پر قادر بھی ہے۔

نتیجہ بحث

تمام گذشتہ آیات سے بخوبی یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ خدا کی قدرت کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی انتہا، وسیع آسمانوں اور زمین کی خلقت اور قسم قسم کے موجودات خصوصاً موت وحیات کا مسئلہ اسی مطلب کی دلیل ہے۔

آیات قرآن میں مسئلہ کبھی معاد اور حیات بعد الموت کے اثبات کے لیے، کبھی افراد متکبر ومغرور کو تہدید وسرزنش کے لیے اور کبھی صالح اور مومن بندوں کو اطمینان دلانے کے لیے آیا ہے تاکہ وہ تمام مشکلات کا حل اسی سے چاہیں، فقط اسی کی پناہ میں جائیں، اسی کے آستانہ پر سر رکھیں اور اپنے جیسے ضعیف وکمزور بندوں کے سامنے جھکیں۔

توضیحات

(ا) خدا کی قدرت لامتناہی کے دلائل

اس صفت کے اثبات کے لیے کئی دلائل ہیں۔ علمی وفلسفی

(ا) دلیل علمی۔ (اس سے مراد علوم تجربی ہیں)۔

جب ہم گھر میں بیٹھے اپنے محدود محیط کی طرف نظر کریں تو دنیا بہت سادہ اور چھوٹی سی نظر آتی ہے۔ لیکن جب باہر نکلیں، جنگل، باغ، کھیت، پہاڑ کی بلند چوٹیاں اور دریا کی گہرائیوں میں جائیں یا آسمانوں اور کہکشاؤں میں تخیلاتی سفر کریں، پھر اس قدر چھوٹے بن جائیں کہ ایٹم میں قدم رکھیں تب ایک عجیب وغریب جہان ہمارے سامنے مجسم نظر آئے گا۔ لاکھوں نباتات مختلف بناوٹ اور گوناں گوں خصوصیات کے ساتھ، ایک ذرہ کی مانند نبات جو دریا کے پانی پر تیرتے نظر آ رہے ہیں اور ان نباتات ودرختوں تک جن کی لمبائی پچاس میٹر یا اس سے زیادہ ہے۔ ایک

طرف نیشکر شیریں اور دوسری طرف تلخ حنظل۔ ایک طرف حیات وزندگی ھندہ دوا جو برگ وگل اور ان کے ریشہ سے لی گئی ہے، دوسری طرف قسم قسم کے زہریلے پودے نظر آتے ہیں۔

نیز لاکھوں اقسام کے حیوان، حشرات الارض اور وہ جاندار کہ کبھی ان کا جسم اتنا چھوٹا ہے کہ غیر مسلح چشم کے ساتھ دیکھے نہیں جا سکتے، دوسری طرف اتنے عظیم جثہ والے جانور کہ جن کی لمبائی ۳۰ میٹر سے بھی زیادہ ہے (جیسے نیلے رنگ کی ویل مچھلی جو روئے زمین پر سب سے بڑے حیوان سمجھے جاتے ہیں)۔

بعض ایسے حیوان ہیں جن کا دل ایک ٹن وزن رکھتا ہے، دسری طرف وہ جن کا دل چنے کے دانے سے بھی کم تر ہے۔ ایسے حیوانات ہیں کہ بعض اتنے کم وزن ہیں کہ تیزی کے ساتھ آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر رہے ہیں اور بعض فولاد سے بھی سخت تر ہیں جو سمندر کی گہرائیوں میں پانی کی موجوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

پھر ستارے ہیں جو بڑے چھوٹے دور ونزدیک کم وزن یا زیادہ وزن سست رفتار و تیز رفتار اور دیگر قسم قسم کی شرائط کے ساتھ وجود رکھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی اپنی جگہ ایک الگ دنیا ہے۔ اسی طرح عجیب وخوبصورت خلیے (CELL) ایٹم اور ان کا حیرت انگیز نظام جوان پر حکمران ہے، ان میں ہر ایک ہمارے سامنے جہانِ نو مجسم کرتا نظر آتا ہے۔ ان سے عجیب تر یہ کہ تمام نقش ونگار جو دنیا کے در ودیوار پر نظر آ رہے ہیں سب ایک قلم اور ایک سیاہی سے منقش ہوئے ہیں۔ تمام زندہ موجودات کا مادۂ اول سلول و خلیے ہیں اور تمام جہانِ مادہ کی بازگشت ایٹم کی طرف ہے۔ یہ سادہ مگر مشکل تنوع وہی تنوع ہے جو کتاب تدوین یعنی قرآن میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں علوم اور معارفِ الٰہی ان الفاظ کے قالب میں پیش کیے گئے ہیں جن کی تشکیل الف، باء سے انتہائی سادگی کے ساتھ ہوئی ہے۔ ان تمام مسائل سے ہم اس حقیقت تک پہنچیں گے کہ مبداء عالم کی ہستی لامتناہی قدرت کی مالک ہے اور کوئی چیز بھی اس کے لیے مشکل نہیں۔

(۲) برہان وجوب وامکان (برہانِ فلسفی)

اثبات وجودِ خدا کی بحث میں واضح ہو چکا کہ وجود وحال سے خالی نہیں۔

(۱) مستقل اور ذاتی جس کا نام واجب الوجود ہے۔

(۲) غیر کے ساتھ وابستہ ومتعلق جس کو ممکن الوجود کہتے ہیں۔

بحث توحید اور یکتائی خدا میں یہ ثابت ہو چکا کہ جہان میں واجب الوجود ایک سے زیادہ نہیں اور اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ ممکن الوجود ہے۔ تمام ممکنات، اپنے حدوث وبقا میں اسی کے محتاج، اسی پر ان کا تکیہ اور اسی کی مخلوق ہیں، تمام اشیاء پر خدا کی قدرت مطلقہ کا معنی یہی ہے۔ (غور کریں)

(۳) برہان وسعت وجودی (برہانِ فلسفی)

اگر ہم کسی کام پر قادر نہیں تو اس لیے کہ کوئی کمی ہے۔ اگر ہم زمین میں زراعت کرنا چاہتے ہیں اور نہیں کر سکتے تو یا اس لیے کہ زمین کی وسعت ہماری طاقت سے زیادہ ہے یا ہمارے پاس ضروری سامان نہیں ہے۔

یا دونوں چیزیں موجود ہیں لیکن زمین سنگلاخ ہے۔ اس کو کھیتی باڑی کے قابل بنانا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔

لہٰذا اگر زراعت کے سلسلے میں ہماری طاقت محدود نہ ہوتی تو ہم بلا استثناء زمین کو زراعت کے کام میں استعمال کر سکتے تھے۔

پس جو بھی مشکلات ہوں گی وہ ہماری محدودیت اور ہمارے وجود کے متناہی ہونے کی وجہ سے ہی ہوں گی۔

لیکن وہ وجود جو ہر لحاظ سے لامحدود ہے کس طرح ممکن ہے کہ کوئی چیز اس کی حدود قدرت سے خارج ہو۔ بہ تعبیر دیگر وہ ہر جگہ حاضر ہے، تمام شرائط اس کے اختیار میں ہیں اور وہ ہر مانع و رکاوٹ کو دور کر سکتا ہے۔ یہی تمام اشیاء پر اس کی قدرت کی دلیل ہے۔

(۴) خدا قادر و مختار ہے

ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں کہ جہاں بھی قدرت خدا کی بحث ہو تو اس سے مراد قدرت و اختیار ہوگا۔ فلاسفہ اور علمائے اسلام نے خدا کے فاعل مختار ہونے پر اس طرح دلیل قائم کی ہے:

''فاعل'' دو حال سے خارج نہیں۔ یا فاعل ''مختار'' ہے یا فاعل ''موجب'' یعنی مجبور و بے ارادہ، جیسے کرات منظومہ شمسی اور وہ موجودات جو ان کرات میں ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں اگر اس جہان کا خالق فاعل ''موجب'' ہے تو دو چیزوں میں سے ایک کو قبول کرنا ہوگا۔ ''جہانِ موجود قدیم ہے'' یا ''خدا حادث ہے'' کیونکہ فاعل ''موجب'' کا فعل اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔

لیکن عالم کا ازلی (قدیم) ہونا غیر ممکن ہے کیونکہ (بحث اثبات وجود خدا) میں حدوث عالم دلیل کے ذریعہ ثابت کر چکے ہیں۔

یہ کہنا کہ خدا حادث ہے درحقیقت اس کے وجود کا انکار ہے کیونکہ حادث ہونے کی صورت میں علت کا محتاج ہوگا۔ لہٰذا ''واجب الوجود'' نہیں رہے گا۔

دوسرے لفظوں میں اگر خدا کی خالقیت سورج کی روشنی کی طرح ہوتی تو عالم قدیم ہوتا، کیونکہ سورج کی روشنی اختیاری نہیں ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہے اور ساتھ ہی رہے گی۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ حاصل کریں گے کہ خدا فاعل مختار ہے۔ اس کی ذات ازلی ہے۔ اس کا فعل حادث ہے اور جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسی وقت وہ ہو جاتی ہے۔

سوال

فاعل مختار یعنی صاحب ارادہ۔لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ارادہ ''فعل نفسانی'' ہے جو فاعل کے لیے حادث ہوتا ہے۔خدا کے سلسلہ میں یہ چیز ممکن نہیں کیونکہ اس کی ذات محل حوادث نہیں ہوسکتی۔

جواب

(علم خدا کے ذیل میں) بحث ارادہ میں جو ذکر ہوا ہے اسی سے اس سوال کا جواب واضح ہوجائے گا۔ارادہ کا جو مفہوم انسان میں ہے وہ خدا میں نہیں۔جیسے صفت علم جس طرح ہم میں ہے اس طرح خدا میں نہیں یعنی علم حصولی اور زائد بر ذات جب کہ خدا میں اس طرح ممکن نہیں۔ ارادہ عین ذات خدا ہے۔اس کی تشریح سابقا گزر چکی ہے اور یہ علم ہی کی ایک قسم ہے۔اس سے مراد ہے ''خلقت کے احسن نظام کا علم'' جو مختلف زمانوں میں تمام جہان اور موجودات کی آفرینش وخلقت کا سرچشمہ ہے۔

پس خدا کا ارادہ ازلی ہے اور اس کے آثار تدریجی ہیں۔غور کریں

مزید وضاحت اور ارادہ ذاتی وفعلی میں فرق سمجھنے کے لیے (اسی جلد میں) بحث ارادہ کی طرف رجوع فرمائیں۔

(۵) قدرتِ خدا کی عمومیت کے مخالفین

بعض فلاسفہ اور مذاہب مختلفہ کے علماء قدرت خدا کو قبول کرنے کے باوجود (بعض اشکالات (جن کے جواب سے وہ عاجز ہیں) کی وجہ سے اس کی عمومیت کے منکر ہیں۔ہم ان میں سے چند گروہوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(ا) مذہب مجوس کے پیروکار

ان کے نزدیک موجودات عالم دو قسموں میں منقسم ہیں (خیر، شر) اور ان میں ہر ایک کے لیے جداگانہ خالق کے قائل ہیں۔ان کا خیال ہے کہ خیر کا خالق شر کو پیدا نہیں کرسکتا اور اسی طرح اس کا عکس۔لہٰذا وہ دو مبداء کے قائل ہیں۔

نیکی کا خدا یزدان، برائی کا خدا اہرمن۔

لیکن ان سے غلطی یہ ہوئی کہ کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔خیر وشر۔جب کہ کامل غور وفکر کریں تو معلوم ہوگا کہ شر مطلق کا اصلاً وجود ہی نہیں۔جس کو ہم شر سمجھتے ہیں کبھی اس میں جنبہ عدمی ہوتا ہے، جیسے فقر وجہل۔فقر یعنی مال وثروت کا نہ ہونا۔جہل علم کا نہ ہونا۔''عدم'' کے لیے خالق کی ضرورت ہی نہیں۔

یا ان میں جنبہ ''نسبی'' ہے جیسے ڈسنے والے حشرات کا نیش انسانی کے لیے شر ہے لیکن ان حشرات کے لیے تو ایک وسیلہ دفاع اور خیر ہے۔علاوہ ازیں بہت سے امورِ وجودی جن کو ہم شر سمجھتے ہیں، اصل میں ہم ان کے اسرار پر مطلع نہیں ہیں۔لہٰذا علم ودانش کی پیش رفت اور ان

کے اسرار میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ خود حضرت انسان کے لیے ان کی کس قدر ضرورت ہے۔ جیسے مثلاً سخت سردی و برف باری، بہت سی آفات نباتی کو ختم کرنے کا سبب ہے۔ سخت گرمی کی وجہ سے بہت سے نباتات و درختوں کی پرورش ہوتی ہے۔ اسی سے بخارات پیدا ہوتے ہیں جن سے بارش برستی ہے اور دریاؤں میں پانی کی زیادتی ہوتی ہے۔

لہٰذا جب شر کے دیکھنے کی عینک ایک طرف کر دی جائے تو تمام جہان میں خیر ہی خیر نظر آئے گی۔ دوگانہ پرستی کا وجود ہی نہیں رہے گا۔

اس کی مزید وضاحت انشاءاللہ بحث عدل الٰہی میں آئے گی۔

(۲) مکتب تفویض کے پیروکار

(مفوضہ) کا خیال ہے کہ خدا ہمارے افعال پر قادر نہیں۔ بعبارت واضح انسانی افعال و اعمال قدرت خدا سے خارج ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو جبر لازم آئے گا۔ اگر اعمال انسانی قدرت خدا سے ہوں تو تضاد لازم آئے گا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ خدا کا ارادہ اور ہو اور انسان کا ارادہ کچھ اور ہو۔

ان لوگوں کو اشتباہ اس لیے ہوا ہے کہ ان کے خیال میں خدا کی قدرت انسان کی قدرت کے عرض میں ہے (اور مقابل ہے) وہ توجہ نہیں کر سکے کہ یہ دونوں قدرتیں ایک دوسرے کے طول میں ہیں۔

توضیح۔ خدا نے انسانوں کو پیدا کیا، ارادہ کی آزادی اور اپنے خیالات پر قدرت و عزم عطا فرمایا۔ جب چاہے یہ قدرت واپس بھی لے سکتا ہے۔ لیکن خدا نے چاہا ہے کہ انسان قادر و مختار رہے تو بھی انسانی افعال اس کی قدرت سے خارج نہیں کیونکہ آزادی خدا نے دی ہے اور یہ (آزادی) اس کی مشیت و ارادہ کے مطابق ہے۔

(۳) اہل سنت کی ایک جماعت (پیروکارانِ نظام) کا نظریہ ہے کہ خدا ہمارے اعمال بد پر قادر نہیں کیونکہ برے اعمال کی سرچشمہ جہل و نادانی یا غلط احتیاجات ہیں۔

خدا نہ جاہل ہے اور نہ ہی محتاج۔ لہٰذا وہ ہمارے اعمال قبیح پر قادر نہیں۔

ان لوگوں کو اشتباہ اس لیے ہوا کہ (امکانِ ذاتی) اور (امکانِ وقوعی) میں فرق نہیں کر سکے۔

توضیح: بعض امور محال ذاتی ہیں جیسے ضدین کے درمیان جمع یا اس کے مورد میں وجود عدم کا اجتماع محال ذاتی ہے۔

لیکن ایسے کام جو محال ذاتی نہیں لیکن شخص حکیم مثلاً خدائے تعالیٰ سے صادر نہیں ہوئے۔ جیسے ظلم، فساد اور ہر قبیح کام۔ اس کو محال وقوعی کہا جاتا ہے۔

مسلم ہے کہ خدا ہر شے پر قادر ہے، ہر کام کرنے کی طاقت رکھتا ہے لیکن حکیم و دانا ہونے کی وجہ سے ظلم کبھی بھی نہیں کرے گا۔

یہ سلسلہ ہمارے بارے میں بھی ایسا ہی ہے۔ ہم قادر ہیں کہ اپنے کو آگ میں ڈالیں یا آگ کا شعلہ اپنے منہ اور آنکھوں میں داخل کر دیں، ہم ہرگز اس سے عاجز نہیں۔ لیکن ہم یہ کام کبھی بھی نہیں کریں گے کیونکہ عقل اس کام کی اجازت نہیں دیتی۔ لہٰذا یہ محال وقوعی

ہے محال ذاتی نہیں۔

(۴) فلاسفہ کی ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ خدا ہر لحاظ سے واحد ہے۔کسی قسم کی کثرت وتعداد اس میں نہیں پایا جاتا۔لہٰذا اس سے فقط ایک مخلوق ''عقل'' صادر ہوگی۔کوئی اور چیز اس سے پیدا وصادر نہیں ہوگی۔اس کے لیے ایک قاعدہ کو بطور سند لیا ہے، وہ ہے۔(الواحد لا یصدر منه الا الواحد)

وہ وجود جو ہر لحاظ سے ایک ہے ایک معلول کے علاوہ اس سے کوئی چیز صادر نہیں ہوگی۔

لہٰذا ان کا خیال ہے کہ خدا کی مخلوق فقط یہی موجود مجرد (عقل اول) ہے۔اب چونکہ ''عقل اول'' میں متعدد جہات ہیں (اس کا وجود، ماہیت، پھر ممکن الوجود اور ایک لحاظ سے واجب الوجود بالعرض ہے) اور جہات کثیرہ کے باعث اس سے مختلف معلولات وجود میں آئیں گے۔ پس جہانِ موجود میں کثرت کا منشاء ومنبع وہ کثرت ہے جو عقل اول اور بعد والے مراتب میں موجود ہے۔

قاعدہ مندرجہ بالا کے اثبات کے لیے (معلول وعلت کے درمیان سنخیت) کو دلیل بنایا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اگر علت ومعلول کے درمیان سنخیت (ایک تعلق خاص، جس کی وجہ سے ایک علت اور دوسری معلول ہے) نہ ہو تو ہر شے ہر معلول کے لیے علت بن سکے گی۔لیکن مسئلہ سنخیت اس سے مانع ہے۔جب علت ومعلول کے درمیان سنخیت کو ہم نے قبول کر لیا تو وہ علت جو ہر لحاظ سے واحد ہے ایک سے زیادہ معلول اس سے پیدا نہیں ہوسکیں گے۔غور کریں۔[1]

اس گروہ کا جواب چند طریق سے دیا جاسکتا ہے۔

(۱) اگر اس قاعدہ کو مان لیں تو پھر قدرتِ خدا محدود نہیں ہوگی بلکہ اس کی قدرت ہر شے پر ہے لیکن عقل اول کے لیے بلا واسطہ اور باقی موجودات کے لیے بالواسطہ۔ان دونوں کو مقدور ہی حساب کیا جائے گا۔کیا فرق ہے کہ انسان ایک کام کو اپنے ہاتھ سے انجام دے یا اس آلہ کے ذریعے کرے جس کو اس نے خود بنایا ہے؟ ہر حالت میں فعل اسی کا ہوگا۔

(۲) (الواحد لا یصدر منه الا اولاحد) کا قاعدہ محققین کے خیال میں فاعل مختار پر لاگو نہیں۔لہٰذا کشف المراد میں علامہ حلی فرماتے ہیں: ''اگر فاعل مختار ہو تو اس سے متعدد چیزیں پیدا ہوسکتی ہیں اگرچہ وہ خود ایک ہو۔اگر فاعل موجب (بے اختیار) ہو تو اکثر دانش مندوں کا نظریہ ہے کہ اس کا معلول متعدد نہیں ہوسکتا۔''

الموثر ان کان مختارا جاز ان یتکثرا ثرہ مع وحدته، وان کان موجبا فذهب الاکثر الی استحالة تکثر معلوله۔[2]

اس لحاظ سے مرکز بحث فاعل موجب ہے، فاعل مختار نہیں۔پھر انہوں نے فاعل موجب میں وحدت اثر کے قائلین کا استدلال ذکر کیا

---

[1] تلخیص از نہایۃ الحکمہ ص ۱۶۶

[2] کشف المراد صفحہ ۸۴

اوررد کیا ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ فاعل مختار کے لیے اس قاعدہ کا اطلاق کرنا کوئی اصلیت نہیں رکھتا اور یہ فقط دعویٰ ہی ہے۔

(۳) ان سب سے قطع نظر (علت ومعلول کے درمیان سنخیت) کا قانون فاعل غیر مختار میں قابل اشکال ہے کیونکہ اگر تمام جہات سے سنخیت ہوتو پھر یہ واجب الوجود اور ممکن الوجود کے مابین محال ہے۔ممکنات جو بھی ہوں اکثر جہات سے واجب الوجود کے متباین ہیں۔اگر تمام جہات سے سنخیت شرط ہوتو یہ کس طرح ممکن ہے کہ موجودات مادی، غیر مادی سے فیض حاصل کرسکیں۔

(۴) اگر سنخیت اجمالی کافی ہوتو یہ معنی خدا اور موجودات متعدد میں حاصل ہے کیونکہ سب ایک نوع ہیں، کمال ہیں اور اوقیانوس لامحدود کے سامنے ایک قطرۂ ناچیز ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عالم خلقت باوجود یکہ اس میں متعدد ومتکثر موجودات ہیں، لیکن ایک لحاظ سے وہ ایک سے زیادہ نہیں۔ بعبارت دیگر جہانِ خلقت ایک بے کنار اوقیانوس عظیم (بحر محیط) ہے جس میں موجیں اور شکنیں سطح پر ظاہر ہیں۔یہی امواج اور شکنیں ہی موجودات ہیں جن کو ہم متعدد سمجھ رہے ہیں (غور کریں یہ ہم جہانِ خلقت کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ذات خدا کے بارے میں نہیں)۔

خلاصہ کلام

اگر غور کیا جائے تو واضح ہوجائے گا کہ جہانِ خلقت باہم متصل وواحد ہے۔ان ظاہری تنوعات کے باوجود قوانین حاکم بھی ایک جیسے ہیں۔یہی موجودِ واحد خدائے واحد سے فیض پا رہا ہے یہی یکتا مخلوق خالق یکتا ویگانہ کی پیدا کردہ ہے۔پھر غور کریں۔

(۵) قدرت خدا کی عمومیت کا مخالف ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر قدرتِ خدا کا تعلق ہر چیز کے ساتھ ہوتو پھر موجودات میں ایسے تضاد پیدا ہو جائیں گے جن کے حل کی کوئی قدرت ہم میں نہیں۔مثلاً بعض کے بقول کیا خدا اپنے جیسا موجود بنا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر خدا متعدد ہو جائیں گے۔اگر ایسا نہیں تو قدرتِ خدا محدود سمجھی جائے گی۔نیز کیا خداوند عالم اس وسیع جہان، ان سب کرات وکہکشاؤں کو ایک انڈے میں سموسکتا ہے بغیر اس کے جہان کو چھوٹا یا انڈے کو بڑا کرے؟ اگر آپ کہیں یہ ممکن ہے تو قابل قبول نہیں۔اگر کہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر آپ نے خدا کے عجز کا اعتراف کرلیا۔

نیز کیا ممکن ہے کہ خدا ایسے موجود کو پیدا کرے جس کے معدوم کرنے پر قادر نہ ہو؟ جو بھی آپ کہیں گے اس کا لازمہ اعتراف عجز ہوگا۔ اس قسم کے سوالات بہت زیادہ ہیں۔

اس قسم کے اشتباہات مسائل فلسفی سے غفلت کا نتیجہ ہیں، یہ لوگ اس سے غفلت کررہے ہیں کہ جب قدرت کی بحث ہوتو دیکھنا ہوگا کہ آیا متعلق میں قدرت ہے یا نہ کیونکہ قدرت کا محال کے ساتھ تو تعلق نہیں ہوسکتا۔محال بعث وبے فائدہ ہے اور قدرت کے ساتھ تعلق

---

[1] کشف المراد صفحہ ۸۴

کے قابل ہی نہیں۔

توضیح: جب کہتے ہیں کہ خدا قادر ہے، اس موضوع کو ایجاد کرسکتا ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ موضوع ممکنات میں سے ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ قدرت خدا سے لباس وجود پہنے۔لیکن اگر کوئی امر ذاتی طور پر محال ہو تو پھر یہ سوال کہ وہ قدرت رکھتا ہے یا نہ، غلط و بے معنی ہوگا۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ''اصلاً سوال ہی غلط ہے۔مثلاً اگر کوئی کہے کہ میرے پاس بیس مالٹے ہیں اور چاہتا ہوں کہ چالیس آدمیوں کو دیئے جائیں، لیکن ہر ایک کو ایک ایک آجائے تو جواب میں کہا جائے گا کہ ''صورتِ مسئلہ ہی غلط ہے۔''

بالفاظ دیگر یہ سوال خود تناقص رکھتا ہے، اصلا قابل ذکر نہیں کیونکہ جب کہتے ہیں کہ بیس مالٹے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ چالیس نہیں۔لیکن جب کہیں کہ ان کو چالیس میں تقسیم کرنا ہے، اس طرح کہ ہر ایک کو ایک ایک مل جائے تو اس کا معنی ہوگا کہ یہ چالیس ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ بیس ہونے کے باوجود وہی چالیس بن جائیں۔مسلم ہے کہ کوئی عاقل اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا۔

مندرجہ بالا سب مثالیں اسی طرح کی ہیں کہ سوال میں تضاد ہے۔سوال ہی قابل طرح نہیں لہٰذا جواب کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

مثلاً جب کہتے ہیں کہ کیا ممکن ہے کہ خدا اپنے جیسا کسی کو بنائے؟ پیدا کرنے کا مطلب ہوگا کہ وہ ممکن الوجود ہے۔جب کہیں مثل خدا۔اس کا معنی ہے کہ وہ واجب الوجود ہے۔تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کیا خدا ایسی چیز کو پیدا کرسکتا ہے جو ''واجب الوجود بالذات'' بھی ہو اور نہ بھی ہو۔اسی طرح ممکن الوجود ہو اور ممکن الوجود نہ ہو۔ظاہر ہے کہ اس طرح کا سوال ہی غلط ہے۔

اسی طرح جب کہا جائے کہ کیا خدا اس جہان کو چھوٹے سے ظرف میں رکھ سکتا ہے بایں معنی کہ نہ جہان چھوٹا ہو اور نہ ہی ظرف کو بڑا بنایا جائے۔اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جہاں ایک ہی وقت میں بہت بڑا بھی ہو اور بہت چھوٹا بھی ہو۔چونکہ یہ سوال ہی غلط ہے۔لہٰذا جواب کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ بعض روایات کے مطابق یہی سوال حضرت امیر علیہ السلام سے کیا گیا۔کسی نے سوال کیا

هل يقدر ربك ان يدخل الدنيا فى بيضة من غيران تصغر الدنيا و تكبر البيضة

کیا تیرا پروردگار قدرت رکھتا ہے کہ پورے جہان کو انڈے میں بند کردے، اس طرح کہ جہان چھوٹا ہو اور نہ انڈہ بڑا ہو؟

حضرت علی علیہ السلام نے جواب میں فرمایا

''ان الله تبارك و تعالىٰ لا ينسب الى العجز و الذى سالتنى لا يكون۔''

''خدا کو ہرگز عاجز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن تیرا سوال ہی ناممکن ہے۔''[1]

اگر دیکھیں تو ایک روایت میں امام علی رضا علیہ سے منقول ہے کہ اس کے جواب میں فرمایا: ''ہاں! خدا کر سکتا ہے، اس سے کمتر میں بھی کر سکتا ہے کیا نہیں دیکھ رہا کہ دنیا کو تیری آنکھ میں قرار دیا ہے جب کہ آنکھ انڈے سے بھی کم ہے؟'' (وقد جعلا فی عینك وهی اقل من البیضة)[2]

بہرحال یہ جواب امتناعی ہے کیونکہ سوال کرنے والا اصل صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا کہ مزید کوئی جواب دیا جاتا۔ لہٰذا امامؑ نے یہ فرمایا۔ وگرنہ اصل جواب وہی ہے جو حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۴ صفحہ ۱۴۳ حدیث ۱۰

[2] بحار الانوار جلد ۴ صفحہ ۱۴۳ حدیث ۱۰

خدا کا ازلی وابدی ہونا

اشارہ

جو بھی خدا کے قائل ہیں وہ اس کو ازلی اور ابدی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ دو صفتیں آپس میں ایک دوسری سے جدا نہیں کیونکہ ازلی عمر و زمان کے لحاظ سے محدود نہیں ہوسکتا وگرنہ ازلی نہیں رہے گا۔ جب اس کا وجود لامحدود ہے تو ابدی ہوگا۔ (غور کریں)

الفاظ دیگر اثبات وجود خدا کے تمام دلائل صراحتاً یا اشارۃً اس کا واجب الوجود ہونا ثابت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ واجب الوجود وہی ہوگا جس کا وجود اس کا اپنا ہو، وہ ازلی وابدی ہی ہوگا۔ یہ ممکنات ہیں کہ ایک دن نہیں تھے پھر حادث ہوئے اور ایک مدت کے بعد مر جائیں گے، نابود ہو جائیں گے۔ واجب الوجود ہرگز اس طرح نہیں ہوسکتا۔

اس اشارہ کے ساتھ ہم قرآن مجید کی طرف آتے ہیں اور آیات ذیل پر توجہ کرتے ہیں:

(۱) هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (حدید ۳)

(۲) كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۝ وَّیَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (رحمان ۲۶-۲۷)

(۳) وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ (طٰہٰ ۷۳)

(۴) كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ (قصص ۸۸)

ترجمہ

(۱) وہی اول وہی آخر وہی ظاہر اور وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔

(۲) روئے زمین پر جو بھی موجود ہیں فنا ہو جائیں گے۔ فقط تیرے جلالت و کرامت والے پروردگار کی ذات باقی رہے گی۔

(۳) وہی خدا سب سے بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

(۴) اس کی ذات پاک کے سوا ہر چیز کو فنا ہو جانا ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

سورۂ حدید کی پہلی چھ آیات میں بہت سی صفات خدا جمع ہیں اوران کی تعبیریں واقعی پر معنی اور پر مغز ہیں۔بعض احادیث میں آیا ہے کہ حضرت علی زین العابدین بن الحسین علیہما السلام سے جب توحید کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: خداوند تعالیٰ جانتا تھا کہ آخر زمانہ میں مسائل کی گہرائی میں جانے والے لوگ ہوں گے لہٰذا سورۃ "قل هو الله احد" اور سورہ حدید کی پہلی آیات "علیم بذات الصدور" تک نازل فرمائیں۔

(۱) پہلی آیت مورد بحث ان چھ میں سے پہلی آیت ہے۔فرمان ہے:

''وہی اول وآخر ہے،وہی ظاہر وباطن ہے،وہی ہر چیز کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔''(هو الاول والاخر والظاهر والباطن وهو بكل شیء علیم)۔

''اول وآخر سے مراد کیا ہے،مفسرین نے مختلف تعبیریں ذکر کی ہیں جن کا مطلب ایک ہی ہے،بعض کا خیال ہے وہ اول ہے اس کی ابتدا نہیں۔وہ آخر ہے اس کی کوئی انتہا نہیں۔بعض کہتے ہیں وہ اول ہے پیدا کرنے میں۔وہ آخر ہے روزی دینے میں۔بعض کا خیال ہے وہ ہر آغاز کا اول اور ہر آخر کا آخر ہے۔[۱]

بعض کا نظریہ ہے کہ وہ اول ہے ازلیت کے ساتھ اور آخر ہے ابدیت کے ساتھ۔بعض کہتے ہیں وہ اول ہے نیکی کرنے میں اور آخر ہے عفو وبخشش میں۔[۲]

بہرحال آیت کا مفہوم واضح ہے کہ اول سے ازلیت اور آخر ہونے سے ابدیت مراد ہے۔

نہج البلاغہ میں ہے (لم یزل اولا قبل الاشیاء بلا اولیة واخرا بعد الاشیاء بلا نهایة) وہ وجود اشیاء سے پہلے ہمیشہ اول رہا بغیر آغاز کے۔وہ آخر ہے بدون اس کے کہ کوئی اس کی انتہا ہو۔[۳]

خطبہ اشباح میں فرمان ہے (الاول الذی لم یکن له قبل فیکون شیء قبله والخر الذی لیس له بعد فیکون شیء بعده)

وہ ایسا اول ہے کہ کوئی اس سے قبل نہیں ہے اور وہ ایسا آخر ہے جس کے لیے بعد ہے ہی نہیں تا کہ کوئی چیز اس کے بعد فرض کی جا

---

[۱] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۹۱۔باب البدۃ حدیث ۳

[۲] مجمع البیان۔جلد ۹ صفحہ ۲۳۰

[۳] نہج البلاغہ مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۲۳۷۔شاید یہ فرمان کسی خطی نسخہ میں ہو۔

سکے۔[1]

پیغمبر اکرمؐ کی حدیث ہے:"اللھم انت الاول فلیس قبلك شیء و انت الاخر فلیس بعدك شیئ"
خدایا تو اول ہے، تجھ سے پہلے کوئی شے نہیں اور تو ایسا آخر ہے کہ تیرے بعد کوئی شے نہیں۔[2]
یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ زمان وغیرہ کی تعبیر فقط تنگی دامن بیان کی وجہ سے ہے وگرنہ ذات خدا زمان ومکان سے بالا ہے۔
بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اول وآخر تمام زمانہ کو شامل ہے اور ظاہر و باطن تمام حقائق مکان کو شامل ہے۔لہٰذا آیت فوق اشارہ کر رہی ہے کہ خدا ہر زمان ومکان میں ہمیشہ حاضر ہے۔[3]

(۲) دوسری آیت میں روئے زمین کے باسیوں کے فنا ہونے کا تذکرہ ہے لیکن درحقیقت ان میں منحصر نہیں۔فرمان ہے:
''روئے زمین پر جو بھی موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے۔فقط تیرے جلالت و کرامت والے پروردگار کی ذات باقی رہے گی۔''
(کل من علیھا فان ویبقی وجه ربك ذوالجلال والکرام)
یہ صحیح ہے کہ کلہ (من علیھا)''جو زمین پر ہیں'' موجوداتِ عاقل کی طرف اشارہ ہے،خواہ جن ہوں یا انسان لیکن جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے بعید نہیں کہ یہ زمین کے تمام موجوداتِ زندہ کو شامل ہو۔(گویا تغلیب کے عنوان سے تذکرہ ہوا ہے)۔بہرحال ہدف اصلی سب کی فنا اور فقط ذاتِ پاک خدا کی بقا ہے۔
"وجه" کا معنی لغت میں اگرچہ''صورت'' آیا ہے لیکن اس قسم کے موارد میں وجود اور ذاتِ مراد ہے۔
"ذوالجلال و الاکرام" کی تعبیر بعید نہیں کہ خدا کی صفاتِ سلبیہ وثبوتیہ کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ذوالجلال ان صفات کی طرف اشارہ ہے جن سے خدا کی ذات اجل وارفع ہے اور یہی صفات سلبیہ ہیں اور''اکرام'' ان اوصاف کی طرف اشارہ ہے جو کسی چیز کے کمال کو ظاہر کرتی ہوں اور یہی صفات ثبوتیہ خدا ہیں،جیسے علم وقدرت۔
ہاں! وہ خدا جو صفات جمال وجلال رکھتا ہے وہی باقی رہ جائے گا اور دیگر تمام چیزوں کے لیے آخر کو فنا ہے۔
قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیت فوق سورۂ رحمن کی ان آیات میں سے ہے جن میں قسم قسم کی خدائی نعمتوں کا ذکر ہے۔کیا فنا اور موجوداتِ زندہ کی موت نعمت الٰہی کے زمرہ میں شامل ہے؟ہاں۔یہ بھی ایک نعمت ہے۔کیوں؟
(۱) انسان کو لباس شرک سے باہر نکلنے اور توحید خالص کی دعوت دی جا رہی ہے اور واضح کیا ہے کہ عبودیت والوہیت کے لائق صرف ذات خدا ہے،نہ موجوداتِ فانی وناپائیدار۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۸۹
[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفہ ۶۴۰۶
[3] تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۷ صفحہ ۷۱۸

(۲) انسان کوخبردار کیا جارہا ہے کہ اپنی زندگی کے اوقات سے فائدہ اٹھائے۔

(۳) دنیوی زندگی مصائب ومشکلات سے کسی وقت خالی نہیں۔انسان کوتسلی دی جاہی ہے کہ یہ مشکلات ناپائیدار ہیں۔

(۴) یہ فنا درحقیقت بقاء کا مقدمہ ہے۔دنیا کی تنگ زندگی سے نجات اورنعمات سے پراور وسیع عالم آخرت کی طرف انتقال کی خوشخبری دی جارہی ہے۔

(۳) تیسری آیت کے پہلے حصے میں فرعون کے ساحروں کا ایمان لانا اور فرعون کی طرف سے انہیں موت کی تہدید مذکور رہے،اس آیت کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔مومن ساحروں کی زبانی فرعون کومخاطب کرتے ہوئے کہا گیا:''ہم اپنے خدا پر ایمان لائے ہیں تا کہ خدا ہماری خطائیں بخش دے اوراس جادو (کی غلطی کوبھی) جس پرتو نے ہمیں مجبور کیا۔''انہوں نے مزید کہا:''وہی خدا سب سے بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔''(واللہ خیر وابقی)

بقاءِ مطلق ابدیت کے برابری ومساوی ہے۔پہلے کہا جاچکا ہے کہ ابدیت ازلیت سے جدانہیں ہے۔

مسلم ہے کہ اس کی ابدیت درحقیقت اس کے لطف وانعام کی ابدیت ہے۔اسی لیے ایمان لانے والے ساحر جانتے تھے کہ اس دائمی نعمت کوفرعون کی بے قیمت اورجلد اختتام پذیر نعمتوں پر مقدم کرنا چاہیے۔

(۴) چوتھی اورآخری آیت میں ہرقسم کے شرک کورد کرتے ہوئے فرمان ہے:''اس کی ذات پاک کے سوا ہر چیز کوفنا ہوجانا ہے۔''(کل شیء ھالك الا وجھه)

یہ جملہ حقیقتاً بمنزلہ دلیل کلمۂ سابق ہے۔کیونکہ موجودات فانی اور ناپائیدار خدائی اور معبودیتکی صلاحیت نہیں رکھتے،فقط وہی وجود قابل عبادت ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

بارہا ذکر کیا گیا ہے کہ "وجه"کا لغوی معنی صورت ہے۔لیکن کئی موارد میں ذات کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔(جیسے آیت مورد بحث)۔

بعض علماء نے''وجہ''کے معنی دین اورعمل صالح لیے ہیں تو وہ بدون دلیل ہیں مگر یہ کہ اس کی بازگشت ذات خدا کی طرف ہواوراسی سے اس کا رابطہ ہو۔

بہرحال یہ آیت خدا کی ذات پاک کی ابدیت پرواضح دلیل ہے۔ظاہر ہے کہ ابدیت ازلیت سے جدانہیں ہے۔

تمام موجودات،اموال،ثروت ودولت،مقام ومنصب،زمین اورآسمان سب کے سب ممکنات ہیں۔فقط یہ نہیں کہ فنا ونابود ہوجائیں گے بلکہ اس وقت بھی فانی ہیں کیونکہ ان کا وجود اپنا نہیں۔اگر ان کا تکیہ ذات خدا پر نہ ہواور لحظہ بہ لحظہ اس سے فیض حاصل نہ کریں تو محو ونابود ہوجائیں گے۔

البتہ فنا کا معنی ظاہراً موجوداتِ زندہ کی موت یا دوسرے موجودات کا فنا ہوجانا ہے۔لہٰذا ان کا تضاد ان آیات کے ساتھ نہیں جن میں کہا گیا ہے کہ انسان کی خاک باقی رہے گی۔قیامت کے دن انسان اپنی زندگی اس سے شروع کرے گا یا زمین اور پہاڑوں کے اجزا فنا ہونے

کے بعد باقی رہیں گے اور نیا عالم انہی سے بنے گا۔

اس مقام پر ایک سوال سامنے آتا ہے۔ آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت و دوزخ ہر دو موجود اور مہیا ہیں۔ بہشت کے بارے میں ہے اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران ۱۳۳) اور دوزخ کے بارے میں ہے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (آل عمران ۱۳۱) کیا یہ بھی فنا ہو جائیں گے؟

جواب میں کہا گیا ہے کہ آیت فوق کی عمومیت خدا کے ارادہ کی وجہ سے موارِدِ خاص کے استثنا کے منافی نہیں۔[1]

علاوہ ازیں ذکر ہوگا کہ موجوداتِ امکانی اپنے موجود ہونے کے باوجود فانی ہیں۔ اگر بقاء رکھتے ہیں تو اللہ کی بقاء کی بدولت۔ (غور کریں)۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن خدا کی ازلیت و ابدیت کو صراحتاً بیان کرتا ہے۔ اگرچہ کلمۂ ازل، ابد کا ذکر نہ کیا ہو تو بھی۔ لیکن اول، آخر، باقی، عدم، فنا، ہلاک کی تعبیریں فرمائیں ہیں جن کا مفہوم ازلیت و ابدیت ہے۔

قابل توجہ یہ کہ بعض کا خیال ہے ''ازل'' لایزال سے لیا گیا ہے جس کی اصل اساس ''زوال'' بمعنی تغیر و تبدل ہے۔ شاید اسی لیے آیاتِ قرآنی میں اس کا ذکر نہیں ہوا بلکہ کلمہ ''اول'' ذکر کیا گیا ہے جس کا مفہوم زیادہ روشن اور صریح ہے۔ ''ابد'' کا لغوی معنی ''زمان کی طولانی مدت'' ہے۔ کلمہ آخر کے مفہوم تک اس کی رسائی نہیں۔ لہٰذا خدا کے بارے میں قرآنی الفاظ (اول، آخر، باقی اور غیر فانی) ہر لحاظ سے ازل و ابد سے زیادہ واضح ہیں جب کہ ہمارے زمانہ میں یہ دو کلمے (ازل و ابد) اس کثرت سے استعمال ہوئے ہیں کہ ان ہر دو مفہوم میں واضح و روشن ہیں۔

توضیحات

(۱) فلسفہ کی رو سے خدا کی ازلیت و ابدیت

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ موحدین و خدا پرستوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو خدا کی ازلیت و ابدیت کا منکر ہو کیونکہ اگر وہ ازلی نہ ہوا تو حادث ہوگا اور حادث ہوا تو علت کی احتیاج ہوگی اور کسی چیز کا علت کے بغیر ہونا محال ہے۔ جب ہم نے ازلیت خدا کو قبول کر لیا تو ابدیت بھی اسی سے ثابت ہوگی کیونکہ وجود ازلی لامحدود ہوتا ہے، ظاہر ہے اس طرح کا وجود ابدی ہی ہوگا۔

علاوہ ازیں جب حقیقت وجود خدا کی طرف نظر کریں گے تو ان دونوں صفات تک رسائی آسان ہو جائے گی کیونکہ دلائل وجود خدا میں ''اس کا واجب الوجود ہونا'' مسلم ہے۔ ظاہر ہے کہ واجب الوجود کبھی وجود سے جدا نہیں ہو سکتا یا واضح تر لفظوں میں اس کا وجود اس کی ذات کا

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۵۔ صفحہ ۲۴

عین ہے، اس کو خارج سے نہیں دیا گیا۔ تاکہ اس سے لیا جا سکے، اس طرح کا وجود ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کبھی ان دونوں صفات کو ''سرمدیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ بعض ارباب لغت کی تصریح کے مطابق ''وجود سرمدی'' وہ وجود ہے جس کی ابتدا و انتہا نہ ہو۔

بعض کوتاہ فکر لوگوں نے کہا ہے: ممکن ہے ہم ایسی ذات کا تصور کریں جو کبھی واجب الوجود ہو اور کبھی واجب الوجود نہ ہو۔ یہ بات غلط اور بے بنیاد ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان لوگوں نے واجب الوجود کا معنی ہی نہیں سمجھتا جب کہ کہا گیا ہے کہ واجب الوجود کا وجود عین ذات ہے تو کیسے ممکن کہ اس کا وجود اس سے جدا ہو جائے؟

اسی طرح بعض اشاعرہ کا نظریہ ہے کہ بقاء اور ابدیت زاید بر ذات ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی واجب الوجود کے مفہوم و معنی میں غور و فکر نہیں کیا۔

(۲) روایات اسلامی میں اس کا ازلی و ابدی ہونا

نہج البلاغہ کے کئی خطبات میں اس بات کی تاکید آئی ہے، نمونہ کے طور پر ملاحظہ کریں۔

خطبہ نمبر ۱۶۳ میں ہے: (لیس لا ولیته ابتداء ولا لازلیته انقضاء)

نہ اس کی اولیت کی کوئی ابتدا اور نہ اس کی ازلیت کی کوئی انتہا ہے۔

خطبہ نمبر ۱۸۵ میں ہے: مستشهد بحدوث الا شیاء علی ازلیته ''وہ چیزوں کے وجود پذیر ہونے سے اپنی قدرت کی گواہی حاصل کرتا ہے۔''

نیز اسی خطبہ میں ہے "واحد لا بعدد، ودائم لا بأمد" وہ گنتی اور شمار میں آئے بغیر ایک اور یگانہ ہے۔ وہ کسی (معینہ) مدت کے بغیر ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

اصول کافی۔ معانی اسماء اللہ کی فصل میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے "هو الاول قبل کل شیء وهو الاخر علی مالم یزل و لا تختلف علیه الصفات والاسماء کما تختلف علی غیره" وہ اول ہے، اس کی اولیت ہر شے سے پہلے ہے اور وہ آخر ہے اور ہر چیز کے بعد رہے گا۔ اس کے اسماء و صفات میں کوئی تبدیلی نہیں جیسے دوسری چیزوں کی صفات و اسماء میں تبدیلی ہوتی ہے۔''[1]

ایک اور حدیث میں بھی وصف اول و آخر میں امام جعفر صادقؑ سے اس طرح منقول ہے:

الاول لا عن اول قبله و لا عن بله سبقه والاخر عن نهایة... لم یزل ولا یزول بلا بدء ولا نهایة"

''وہ اول ہے، اس سے کسی کو اولیت نہیں کہ وہ ابتدا ہونے میں سبقت لے سکے۔ وہ ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہے گا نہ

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۱۵۔ باب معانی الاسماء حدیث ۵

اس کا کوئی آغاز ہے اور نہ ہی انتہا ہے۔''[1]

(۳) ایک سوال کا جواب

خداشناسی کے مباحث میں نو واردوں کی طرف سے عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے: آپ کہتے ہیں کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے۔ پس بتائیں کہ اس کا خالق کون ہے؟

تعجب ہے کہ بعض فلاسفہ عرب نے بھی یہی سوال مطرح کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مباحث فلسفہ میں ان کی استعداد کس قدر کم ہے اور ان کا فکر ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔

انگلستان کے مشہور فلسفی (برٹرینڈ رسل) اپنی کتاب ''چرا مسیحی نیستم'' میں کہتے ہیں: جوانی میں خدا پر عقیدہ تھا، اس وقت برہان علت العلل کو اس کی بہترین دلیل سمجھتا تھا یعنی جہان میں جو کچھ ہے اس کی کوئی علت ہوگی۔ اگر ایک زنجیر کی حالت میں علت کے سلسلہ کو چلاتے رہیں تو آخر کار پہلی علت تک پہنچ جائیں گے جس کا نام خدا ہے۔

لیکن بعد ازیں اس اعتقاد کو چھوڑ دیا کیونکہ میں نے سوچا کہ اگر ہر چیز کی کوئی نہ کوئی علت ہے تو پھر خدا کی علت اور اس کا خالق کون ہے؟[2]

لیکن میں یہ خیال نہیں کرتا کہ کوئی شخص مباحث فلسفہ سے تھوڑا سا رابطہ رکھتا ہو، اسے خداشناسی اور ماوراء طبیعت کی تھوڑی سی شد بد ہو اور پھر اس سوال کے جواب میں عاجز ہو جائے۔

مطلب بالکل واضح ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہر چیز کا خالق کوئی ہے تو ہر چیز سے مراد ''ہر شی حادث اور ممکن الوجود'' ہے۔ پس یہ قاعدہ کلیہ فقط ان اشیاء پر صادق ہے جن کا پہلے وجود نہیں تھا اور بعد میں حادث ہوا۔ یہ بحث واجب الوجود میں نہیں کہ جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

وجود ابدی و ازلی کو خالق کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کا خالق کون ہے؟ وہ قائم بالذات ہے، وہ کبھی معدوم نہیں تھا کہ اس کو علت وجودی کی احتیاج ہو۔

یہ تعبیر دیگر اس کا وجود اپنا ہے اور خارج از ذات نہیں۔ وہ مخلوق نہیں تا کہ اس کا کوئی خالق ہو۔ علاوہ ازیں مسٹر رسل اور اس کے رفقاء کار کو یہ سوال اپنے لیے کرنا چاہیے تھا کہ اگر خدا کا کوئی خالق ہے تو اس فرضی خالق کا خدا کون ہوگا۔ اگر اس زنجیر کو اور بڑھا دیا جائے اور ہر خالق کے لیے خالق فرض کیا جائے تو تسلسل لازم آئے گا جس کا بطلان واضحات میں سے ہے۔ اگر کسی ایسے وجود تک پہنچ جائیں جس کا وجود اپنا ہے کہ

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۶۰ حدیث ۶

[2] برٹرینڈ رسل، کتاب ''چرا مسیحی نیستم''

اس کو خالق کی احتیاج نہیں یعنی وہ واجب الوجود ہے تو یہی عالم وجہان کا خدا ہوگا۔

اس بات کی وضاحت ایک اور بیان سے بھی ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ بالفرض ہم اگر خدا پرست نہ ہوں بلکہ مادیت کا عقیدہ رکھتے ہوں، تب بھی قانون علیت کو قبول کرنے کے بعد ہر چیز کو معلول علت ماننا ہوگا۔ لہٰذا ان کو بھی اس کا جواب دینا چاہیے کہ اگر خدا پرستوں کی طرف سے ان مادیین سے سوال ہو کہ ہر چیز معلول مادہ ہے تو پھر وجود مادہ کی علت کیا ہے؟ یہ لوگ بھی جواب میں مجبور ہیں، وہ کہتے ہیں: مادہ ازلی ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ علت کی احتیاج ہی نہیں۔ گویا وہ واجب الوجود ہے۔ اس لحاظ سے ہم دیکھ رہے ہی کہ تمام فلاسفہ جہان، مادی و الٰہی، ایک وجود ازلی پر ایمان رکھتے ہیں، ایسا وجود جو کسی خالق سے بے نیاز اور ہمیشہ سے ہے۔

فرق یہ ہے کہ مادیین علت اولیٰ ایسی چیز کو قرار دیتے ہیں جو فاقد علم و دانش اور محروم شعور و عقل ہے، وہ اس کے لیے جسمیت اور زمان و مکان کے قائل ہیں۔ لیکن خدا پرست اس کو علم و ارادہ و ہدف رکھنے والا سمجھتے ہیں اور اس کے لیے جسمیت اور زمان و مکان کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اس کو مافوق زمان و مکان قرار دیتے ہیں۔

خداشناسی کی بحث میں سابقہ دلائل اس حقیقت کے موید ہیں کہ جہان کا مبداء اول صاحب علم و آگاہی اور غیر متناہی ہے۔

لہٰذا مسٹر رسل اگر خدا پرستی کو چھوڑ کر مادہ پرستی کی گود میں چلے جائیں تب بھی ان کا نظریہ انہیں اس سوال کے جواب سے محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ یہ سوال پھر بھی متلاشی جواب رہے گا کیونکہ مادہ پرست بھی قانون علیت کے قائل ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ہر حادثہ علت چاہتا ہے۔ اس مشکل مسئلہ کا حل فقط یہ ہے کہ ہم موجود حادث و ازلی اور ممکن الوجود و واجب الوجود میں فرق کو سمجھیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ خالق کے محتاج وہ موجودات ہیں جو حادث و ممکن ہیں یعنی ہر مخلوق ایک خالق کو چاہتی ہے لیکن جو مخلوق ہی نہیں اس کو خالق کی کیا ضرورت ہے؟

خدا حی و قیوم ہے

اشارہ

آیات قرآن اور اسلامی روایات میں بارہا خدا کی صفات ''حی'' اور ''قیوم'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ حیات دائمی کا مالک اور ثابت و برقرار ہے۔ وہ خود بخود قائم ہے اور تمام چیزوں کا قیام اسی سے ہے۔

لیکن مسلم ہے کہ حیات کا جو مفہوم موجودات عالم میں ہے وہ خالق میں نہیں کیونکہ مادی زندگی کے کچھ آثار ہیں۔ جیسے سانس لینا، دل کا کام کرنا، حس وحرکت کا ہونا، تولید مثل، جب کہ خدا میں ان آثار میں سے کوئی نہیں پایا جاتا۔ پس دیکھنا ہوگا کہ حیات خدا کا مفہوم کیا ہے؟ مسلم ہے کہ یہ حیات اعلیٰ وارفع ہے حیات مادی سے۔ تفسیر آیات کے بعد اس کی تشریح آئے گی۔ انشاءاللہ

اس مختصر سے اشارہ کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف آتے ہیں اور گوش جان ودل سے ان آیات کی سماعت کرتے ہیں۔

(۱) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ (بقرہ ۲۵۵)

(۲) اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝۲ (آل عمران ۲)

(۳) وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ ؕ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۝۱۱۱ (طٰہٰ ۱۱۱)

(۴) وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ (فرقان ۵۸)

(۵) هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ (مومن ۶۵)

ترجمہ

(۱) خدائے یکتا و یگانہ کے سوا کوئی معبود نہیں کہ وہ زندہ اور قائم بالذات ہے، دوسرے موجودات اسی سے قائم ہیں۔

(۲) خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں کہ وہ زندہ اور قائم بالذات ہے، دوسرے موجودات اسی سے قائم ہیں۔

(۳) (اس دن) تمام چہرے خدائے حی و قیوم کے سامنے خشوع وخضوع میں ہوں گے۔ وہی لوگ مایوس (اور نقصان میں) ہوں گے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

(۴) خدائے زندہ پر توکل کرو کہ جس کے لیے ہرگز موت نہیں۔

(۵) واقعاً زندہ وہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس اسی کو پکارو، اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کرو۔

مفردات کی تشریح

''حی'' کا مادہ ''حیات'' ہے۔ مقاییس اللغۃ کے بقول حیات کے دو معنی ہیں۔ حیات، موت کے مقابلہ میں۔ دوسرے حیات بمعنی حیا جس کا نقطہ مقابل بے شرمی و وقاحت ہے۔ لیکن محققین لغت نے دونوں کی بنیاد ایک قرار دی ہے۔ ان کا کہنا ہے حیا اور استحیا ایک قسم کی حیات و سلامتی کی طلب ہے۔ اس کے مقابلہ میں وقاحت و بے شرمی ہے جو اپنے ہاتھ سے زندگی و سلامتی ختم کرنے کی ایک صورت ہے۔

بہرحال حیات کا معنی وسیع ہے زمین میں نباتات و اشجار سب میں اسی کا استعمال ہے۔ جیسے وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ (خدا زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے) (سورۂ روم ۱۹)

کبھی حیوانات کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی بات کا تذکرہ ہے۔ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ (پروردگار مجھے بتا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے)۔ (بقرہ ۲۶۰)

یا انسان کے بارے میں اشارہ ہے وَهُوَ الَّذِيْ اَحْيَاكُمْ ۫ (وہی ہے جس نے تمہیں زندہ کیا)۔ (حج ۶۶)

یا مطلق حیات و ممات میں جیسے يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ (خدا زندہ کو مردہ میں سے نکالتا ہے۔) (روم ۱۹)

یا اس سے مراد حیات معنوی ہے، جیسے اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (خدا اور رسولؐ کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں دعوت دیں (پکاریں) کہ اسی میں تمہاری زندگی ہے)۔ (انفال ۲۴)

کبھی حیات اخروی میں اس کا استعمال ہے جیسے وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ (آخرت کا گھر ہی حیات حقیقی ہے)۔ (عنکبوت ۶۴)

اس سے بالاتر اس کا استعمال خدا کے بارے میں ہے۔ جیسے آیات ''مورد بحث''۔ ہم دیکھیں گے کہ حیات حقیقی، ابدی، ازلی، ثابت اور دائمی جس میں کسی قسم کی موت و ہلاکت کا تصور نہیں ہوسکتا، وہ فقط حیاتِ خدا ہے۔ [1]

''قیوم'' صیغہ مبالغہ ہے۔ اس کا مادہ ''قیام'' ہے۔ قیام کا معنی کھڑا ہونا یا پختہ ارادہ۔ دوسرے معنی کی بازگشت پہلے معنی کی طرف ہے کیونکہ جب انسان کسی کام کے لیے مصمم ارادہ کر لیتا ہے تو اس کو انجام دینے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تصمیم قاطع میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔

بعض نے ''قیوم'' کا معنی قیام کرنے والا، حافظ، مدیر اور مدبر لیا ہے جو موجودات و افراد کے قوام کی بنیاد ان کے اختیار میں دے دیتا ہے۔

جب یہ کلمہ خدا پر بولا جائے تو اس کا معنی مخلوقات کے امور، ان کے رزق، عمر، حیات اور موت کے معاملہ میں قیام مراد ہوگا جو ان کے

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، مادہ ''حی''

مختلف امور کی تدبیر کرنا اوران کے احتیاجات کے لیے موردِ نیاز اشیاء ان کے اختیار میں دیتا ہے۔

بعض نے (قیوم کا معنی) قائم بالذات اور موجودات کا مقوم وقائم کرنے والا لیا ہے جو پہلے معنی سے چنداں فرق نہیں رکھتا۔[1]

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

ہم تجھ سے قائم ہیں کیونکہ تو قائم بالذات ہے

(۱)(۲) پہلی دوسری آیات میں وحدانیت خدا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی حیات وقیومیت کا تذکرہ ہے۔فرمان ہے:''خدائے یکتا و یگانہ کے سوا کوئی معبود نہیں کہ وہی زندہ اور قائم بالذات ہے۔تمام دوسرے موجودات اسی سے قائم ہیں۔(اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم)

جیسے اشارہ ہوا حیات خدا وحیات موجودات کے مفہوم میں فرق ہے۔اس کی حیات، حیاتِ حقیقی ہے کیونکہ وہ اس کی عین ذات ہے، موقت یا عارضی نہیں، اس کی حیات اس کا علم وقدرت ہی ہے (دوصفتیں جن کا ذکر شرح وبسط کے ساتھ پہلے ہو چکا ہے) کیونکہ اس کی حیات کی اصل علامت یہی دوصفات (علم وقدرت) ہیں۔وہ صرف خود ہی قائم بالذات نہیں، بلکہ تمام موجودات کا قیام، ان کی ربوبیت و تدبیر اسی کی طرف سے ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس کی حیات دیگر موجودات کی حیات سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی، اس کی حیات ازلی، ابدی، ناقابل تغیر، ہر قسم کے نقص ومحدودیت سے مبرا ہے۔اس کی حیات درحقیقت تمام چیزوں پر اس کا احاطہ علمی اور ہر امر پر اس کی قدرت ہے۔

(۳) تیسری آیت میں قیامت کی وضع کی طرف اشارہ ہے۔فرمایا (اس دن) تمام چہرے خدائے حی وقیوم کے سامنے خاضع وخاشع ہوں گے۔وہی لوگ مایوس (اور نقصان میں) ہوں گے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔(وعنت الوجوہ للحی القیوم و قد خاب من حمل ظلما)۔

''عنت'' کا مادہ ''عنوۃ'' جس کا معنی خضوع وذلت آتا ہے۔لہٰذا قیدیوں کو ''عانی'' کہا جاتا ہے کیونکہ وہ قید کرنے والے کے ہاتھ میں ذلیل وخاضع ہوتے ہیں۔اس جگہ خضوع وذلت کی نسبت ''چہرہ'' کی طرف دی گئی ہے کیونکہ انسانی اعضاء میں شریف ترین عضو صورت و چہرہ ہے اور پھر سب سے پہلے خضوع کے آثار چہرہ ہی سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اگلے جہان سے مربوط مسائل میں عنوان ''حی وقیوم'' پر تکیہ اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ خدا کی حیات جاوداں اور قیومیت اس دن زیادہ واضح وآشکار ہوگی۔پھر اس دن انسان کا ضعف وکمزوری اور خدا کے ساتھ اس کی وابستگی بھی واضح تر ہوگی کیونکہ تمام انسان موت کے بعد زندہ ہو چکے ہوں گے۔اس بڑی عدالت میں لطف پروردگار کی طرف احتیاج کسی سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔

---

[1] مقاییس اللغہ۔مفرداتِ راغب اور لسان العرب۔

(۴) چوتھی آیت میں خدا کی ایسی حیات کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے موت نہیں۔پیغمبر اکرمؐ کو دستور وحکم دیا جارہا ہے، ایسی ذات ہی پر توکل کریں۔فرمان ہے: خدائے زندہ پر توکل کرو کہ اس کے لیے ہرگز موت نہیں۔(وتوکل علی الحی الذی لایموت)

یہ سچ ہے کہ باایمان انسان ایسی ذات پر تکیہ وبھروسہ کی وجہ سے کبھی کسی سے بھی خوف زدہ نہیں ہوگا، کسی حادثہ میں اسے ڈر اور وحشت نہیں ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آیت ایک عقیدہ ونظریہ کا ذکر کررہی ہے، لیکن اس کا اخلاقی اور عملی نتیجہ بھی ہے کیونکہ یہ آیت انسان کی روح وجان میں توکل کی بنیادوں کو مضبوط بنارہی ہے۔

(۵) پانچویں اور آخری آیت میں یہی مضمون عملی واخلاقی نتیجہ لیے ہوئے ذکر کیا گیا ہے۔فرمان ہے: ''واقعی زندہ وہی ہے۔اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔(هو الحی لا اله الاهو)

چونکہ وہ ایسا ہے لہٰذا اسی کو پکارو، اپنے دین کو اسی کے لیے خالص بناؤ، (اس کے سوا کسی کو نہ پکارو اور نہ پرستش کرو) ''فادعوه مخلصین له الدین۔''

آیت بالا کا لہجہ جیسا کہ فخر الرازی نے اپنی تفسیر میں کیا ہے، مفید حصر ہے۔[1] یعنی زندۂ حقیقی تنہا وہی ہے۔دیگر موجودات میں اگر زندگی ہے تو لہٰذا وہ ناپائیدار اور تدریجی موت سے ملی جلی ہے۔وہ الوہیت وعبودیت کی صلاحیت نہیں رکھتے۔اسی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دین وعبادت میں اخلاص اور ہر قسم کے شرک کی نفی لازم وضروری ہے۔

ان تمام آیات سے خداوند عالم کی صفت حیات اور حیات بھی جاوداں ودائمی بخوبی معلوم ہوتی ہے۔ایسی زندگی جو موت وفنا اور تغیر وتبدل سے ملی ہوئی نہیں ہے۔ایسی زندگی وحیات کہ وہ قائم بالذات ہے اور دوسرے موجودات اس کی وجہ سے قائم ہیں۔

ایسی حیات جو توکل واخلاص کا درس دے رہی ہے۔بالآخر ایسی حیات جس سے توحید عبادت کا درس ملتا ہے اور ہر قسم کے شرک کی نفی ہوتی ہے۔

توضیحات

(۱) حقیقت حیات

تمام موجودات کی دو قسمیں ہیں، زندہ اور مردہ۔ہر ذی فہم وشعور ان دونوں کو جانتا ہے کیونکہ وہ ہر روز اپنی آنکھوں سے زندہ ومردہ کے درمیان فرق کا مشاہدہ کررہا ہے۔

---

[1] المیزان جلد ۱۷ ص ۳۶۶ وتفسیر کبیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۸۴

لیکن حقیقت حیات کیا ہے؟ بڑی بڑی ذی فہم شخصیات اس کے درک سے عاجز ہیں، سب کا اقرار ہے کہ حیات ایسا پیچیدہ ومشکل موجود ہے کہ آج بھی علم ودانش اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے۔

اسی لیے ایک زندہ موجود کی تخلیق (حتی کہ ایک سلول وسادہ خلیہ جو حیات کی ابتدائی صورت ہے) انسان کے لیے بہت مشکل اور موجب مشقت ہے۔

دانش وروں نے سالہا سال اپنی توانائی وطاقت اس پر صرف کی لیکن تخلیق حیات پر قادر نہ ہو سکے۔ بالفرض اگر اسباب ووسائل کی فراوانی سے ایک دن طبیعت کے بے جان مواد سے ایک زندہ خلیے کی پیدائش پر قادر ہو جائیں تب بھی حیات کا تنوع اور مختلف چہروں کو تحقق بخشنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔ ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ مختلف لباسوں میں حیات وزندگی پیدا کرنے والا یقیناً لامحدود علم وقدرت اور عظمت کا روشن ترین مرکز ہے۔

البتہ حیات وزندگی کی کئی اقسام ہیں، نباتات کی حیات سے لے کر حیات انسانی اور اس سے بالاتر حیات ان سب کے آثار متفاوت ہیں۔

دانش مند جب حیاتِ انسانی میں غور وفکر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ ایسی حالت ہے جس کے ساتھ لامحالہ علم وقدرت اور فعالیت بھی موجود ہے۔ لیکن ہمارا علم وقدرت حیات کے لوازم میں سے ہے اور حقیقت حیات میں دخیل نہیں، لہٰذا بعض اوقات انسان ہوتا ہے لیکن اس میں علم وقدرت نہیں ہوتے۔

انسان میں حیات جسم کے عوارض میں سے ہے، اس طرح کی زندگی کا خدا میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔ خدا میں حیات وزندگی درحقیقت اس کا لامحدود علم وقدرت ہے اور یہ حیات کا اعلیٰ ترین مفہوم ہے۔

(۲) اس کی حیات کے دلائل

الف: اسلامی دانش وروں نے وصف حیات کو اوصاف خدا میں شمار کیا ہے، وہ خدا کو ''حی وقیوم'' کہتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔ قرآن مجید کی آیات میں بارہا اس کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ مفسرین کا حیات کی تفسیر میں کافی اختلاف ہے۔

ان میں سے واضح اور قابل قبول تفسیر وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا، وہ یہ کہ خدا کی حیات تمام اشیاء کا علم اور تمام چیزوں پر قدرت ہے۔ وگرنہ حس وحرکت، دل کی دھڑکن، تنفس، فکر وخیالات کا اس کے مفہوم میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی سے اس کے ''حی وقیوم'' ہونے پر دلیل واضح ہو جائے گی کہ جس کا علم لامحدود، جس کی قدرت لامتناہی اور عین ذات ہے، درحقیقت اس کی حیات کامل ترین حیات اور عین ذات ہے۔

ب: علاوہ ازیں وہ زندگی کا خالق ہے۔ آیا ایسا ہوسکتا ہے کہ خالق حیات واحد حیات نہ ہو؟

خشک ابری کہ بود زآب تہی
کی شود منصب اد آب وہی
ذات نایافتہ از ہستی بخش
کی تو اند کہ شود ہستی بخش

''پانی سے خالی خشک بادل کب پانی دے سکتا ہے، خوش ہستی وجود سے خالی ذات کس طرح دوسروں کو زندگی و حیات عطا کرے۔''

''قومیت'' جس کی تفسیر ہے "هو القائم بذاته المقوم لغيره" (خدا قائم بالذات اور تمام اشیاء کا قوام و وجود دینے والا ہے) یہ بھی اوصاف خدا میں سے ہے۔ یہ درحقیقت پروردگار کے واجب الوجود ہونے اور اس کی خالقیت و ربوبیت ہی کا لازمہ ہے۔

بعض حضرات نے تمام موجودات کی حفاظت اور ان کی احتیاجات کے پورا کرنے کو بھی مفہوم ''قیوم'' کا حصہ قرار دیا ہے۔ بہرحال یہ بھی کوئی نیا اضافہ نہیں۔

مرحوم علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں:

اسم ''قیوم'' خدا کے تمام اسماء اضافیہ (صفات فعل) جیسے خالقیت، رازقیت، ایجاد، اعادۂ وجود، زندہ کرنا، موت دینا، بخشش و رحمت وغیرہ، سب کو شامل ہے۔[1]

اس بنا پر "یا حی یا قیوم" کا ذکر جامع ترین اذکارِ الٰہی ہے کیونکہ ''حی'' خدا کی اہم ترین صفات علم و قدرت کی طرف اشارہ ہے اور ''قیوم'' میں سب صفات فعل شامل ہیں۔

ہم اس بحث کا خاتمہ حضرت امیر المومنینؑ کے اس پر معنی کلام سے کرتے ہیں:

"قال لما كان يوم بدر جئت انظر ما يصنع النبي فاذا هو ساجد يقول يا حي يا قيوم متر ددت مرات و هو على حاله لا يزيد على ذلك الى ان فتح الله له۔"

''جنگ بدر میں میں نے چاہا کہ حضرت رسولؐ کو دیکھوں کہ وہ دشمنوں کے مقابلہ میں کیا کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا آپؐ کا سر سجدہ میں ہے اور برابر ''یا حی یا قیوم'' کہے جا رہے ہیں۔ میں بار بار آیا اور دیکھا (کہ وہ حالت

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۲ صفحہ ۳۴۸

سجدہ میں برابر ''یا حی یا قیوم'' کہہ رہے ہیں) حتی کہ خدا نے فتح عطا فرمائی۔''[1]

اس حدیث سے یہ بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ اس ذکر شریف کے کس قدر آثار و برکات ہیں۔

امیر المومنینؑ نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

''فلسنا نعلم کنه عظمتك الا انا نعلم انك حی قیوم لاتاخذك سنة ولانوم۔''

''ہم تیری عظمت و بزرگی کی حقیقت کو نہیں جانتے مگر اتنا کہ تو زندہ و کارساز (عالم) ہے، نہ تجھے غنودگی آتی ہے اور نہ ہی نیند آتی ہے (تیری ذات بندوں سے کسی وقت بھی غافل نہیں)۔''[2]

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۱ صفحہ ۴۰۰۔ ذیل آیۃ الکرسی آیت ۲۵۵۔ بقرہ

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۸

خدا کی صفاتِ جلال

''صفات سلبیہ''

اشارہ

عام طور پر خدا کے صفات سلبیہ کو ''صفات جلال'' کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ ''اجل'' ہے اس بات سے کہ اس طرح کی صفات ان تمام نقائص کے ساتھ اس میں پائی جائیں۔

ان کا نقطہ مقابل صفات جمال ہیں، جنہیں ''صفات ثبوتیہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ صفات خدا کی زیبائی اور جمال کی آئینہ دار ہیں۔

ایک کلمہ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی صفات سلبیہ اس ایک جملہ میں جمع ہیں۔ وہ یہ کہ ''خدا ہر قسم کے عیب، نقص وعوارض اور صفات ممکنات سے پاک ومنزہ ہے۔''

لیکن علم کلام میں الہام قرآن کی پیروی کرتے ہوئے ان صفات کا ایک اہم حصہ مورد بحث ہے۔ ان میں سے یہ ہے کہ:

وہ مرکب نہیں ہے۔

اس کا جسم نہیں۔

وہ قابل رویت نہیں۔

اس کے لیے مکان، زمان ومحل اور جہت نہیں۔

وہ ہر قسم کی احتیاج سے مبرا ہے۔

اس کی ذات ہرگز محل حوادث، عوارض اور تغیر وتبدل نہیں۔

اس کی صفات عین ذات میں، زائد بر ذات نہیں۔

بناء بریں ضروری ہے کہ ایک طرف صفات جمال بطور کلی ذکر کی جائیں اور دوسری طرف انکے ایک حساس حصہ کی شرح کی جائے۔

اس اشارہ کے ساتھ ہم قرآن مجید کی طرف آتے ہی اور گوش جان ودل سے آیات ذیل کو زیر غور لاتے ہیں:

(۱) يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① (جمعة ۱)

(۲) هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ (حشر ۲۳)

(۳) سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ (مومنون ۹۱)

(۴) سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ [۱] (صافات ۱۸۰)

ترجمہ

(۱) جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ ہمیشہ اللہ کی تسبیح کرتی رہتی ہیں، وہ خدا جو مالک وحاکم، ہر غیب ونقص سے پاک، غالب وحکیم ہے۔

(۲) وہ خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اصل حاکم اور مالک ہے اور ہر عیب سے پاک ومبرا ہے۔

(۳) خدا ان صفات سے پاک ہے جو یہ مشرکین بیان کرتے ہیں۔

(۴) تیرا صاحب عزت وقدرت پروردگار ان اوصاف سے پاک ہے (جو مشرکین بیان کرتے ہیں)۔

مفردات کی تشریح

"قدوس" صیغہ مبالغہ ہے جس کا مادہ "قدس" ہے۔ اصل میں اس کا معنی پاکیزگی وطہارت ہے۔ مقائیس اللغۃ کے بقول اس کا اطلاق خدا پر اس لیے ہے کہ وہ اضداد، امثال اور زن وفرزند سے پاک ومبرا ہے۔

"راغب مفردات" میں اور "ابن منظور" لسان العرب میں کہتے ہیں کہ یہ کلمہ عام طور پر خدا کی تنزیہ یا بندوں کی طہارت کے ذکر پر بولا جاتا ہے حتی کہ "مقائیس اللغۃ" میں ہے کہ بظاہر یہ مخصوص اسلامی لفظ وکلمہ ہے۔

سرزمین "قادسیہ" کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ ابراہیمؑ نے اس کے قدس وپاک ہونے کی دعا کی تھی۔ یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ بقول "راغب" یہ کلمہ صرف معنوی طہارت وپاکیزگی پر بولا جاتا ہے، ظاہری طہارت اور آلودگی سے پاک ہونے سے اس کا تعلق نہیں۔

خدا کی نسبت بندوں کی تقدیس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس ذات کو ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک شمار کریں۔

بعض ارباب لغت کے نزدیک تسبیح کے دو معنی ہیں۔

(۱) دور کرنا۔ آیات قرآن میں خدا کو ہر قسم کے عیب ونقص سے دور شمار کرنے پر اطلاق ہوا۔

(۲) پانی میں تیز وسریع حرکت کرنا اور نہانا (اس کا مادہ سبح ومباحت ہے)۔

---

[۱] یہ تعبیر اور آیات قبل کا مفہوم قرآن مجید میں چھ جگہ آیا ہے کہ خدا کی جو صفات مشرکوں اور جاہلوں نے بنا رکھی ہیں خدا ان سے منزہ ہے (انبیاء ۲۲، انعام ۱۰۰، مومنون ۹۱، صافات ۱۵۹ و ۱۸۰، زخرف ۸۲) علاوہ ازیں وہ آیات جو خدا کی تسبیح کے عنوان سے آئی ہیں وہ بھی ہمارے مقصود کو بیان کرتی ہیں، ان میں سے چند ایک اوپر ذکر ہوئی ہیں۔

لیکن آپ ان دونوں معانی کو ایک اصل کی طرف لوٹا سکتے ہیں۔ وہ ہے کہ ''حرکت سریع'' خواہ عبادت و بندگی اور ہر عیب و نقص سے خدا کی طہارت و پاکیزگی بیان کرنے میں ہو یا پانی، ہوا اور روئے زمین پر سریع حرکت ہو کیونکہ حرکت ایک طرف انسان کو نزدیک اور دوسری طرف دور کرتی ہے۔ جہاں اس کا معنی عیب سے پاکیزگی ہے وہاں دور ہونا مفید رہے گا اور جہاں اس کا معنی تیرنا اور ہوا و پانی کو شگافتہ کرنا ہے، وہاں جنبہ حرکت مورد توجہ ہوگا۔ [1]

آیات کی جمع آوری و تفسیر

سب اسی کی تسبیح پڑھتے ہیں

(۱) پہلی آیت مورد بحث میں موجودات جہان کی عمومی تسبیح کا تذکرہ ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جو بہت سی آیات قرآن میں مختلف تعبیرات کے ساتھ مورد توجہ ہوا ہے، اور اسے عمدہ قرآنی مبحث سمجھا جاتا ہے۔ فرمان ہے: ''جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتی رہتی ہیں۔ وہ خدا جو مالک و حاکم، ہر عیب و نقص سے پاک، غالب اور حکیم ہے۔'' (یسبح لله ما فی السموت وما فی الارض الملك القدوس العزیز الحکیم)

سب چیزیں زبان حال اور اپنے حیران کنندہ اسرار کے ساتھ خدا کے علم لامتناہی، قدرت لامحدود اور اس کے کمال مطلق کو ظاہر کرتی ہیں یہ سب چیزیں خدا کی تقدیس و تنزیہ اور ذات حق کے ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہونے کا اعلان کر رہی ہیں۔ کیونکہ جو بھی غور و فکر کے ساتھ ان موجودات کا نظارہ کرے گا وہ ان کے خالق و مدیر اور مدبر کی عظمت سے آگاہ ہو جائے گا۔

محققین کی ایک جماعت قائل ہے کہ تمام موجودات ''زبانِ قال'' کے ساتھ تسبیح خدا کر رہے ہیں کیونکہ ہر ایک میں خدا کی تقدیس و طہارت کا علم اور شعور رہے۔ پس اس میں کیا مانع ہے کہ زبان حال و قال اس حقیقت کے بیان میں مربوط و ہم آہنگ ہو جائیں۔

کلمہ تسبیح (یسبح) اور تقدیس (القدوس) ہر دو الفاظ آیت مورد بحث میں خدا کی تمام صفاتِ سلبیہ کی طرف بہترین اشارہ کر رہے ہیں اور اس کو ایسے امور میں کرتے ہیں کہ جن پر تمام موجودات ہم صدا و ہم زبان ہیں۔

فعل مضارع کا ذکر (یسبح) کہ عام طور پر جس کی دلالت استمرار پر ہوتی ہے، یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ تسبیح کا سلسلہ ہمیشگی اور استرار رکھتا ہے جو ابتدائے خلقت سے شروع ہوا اور انتہا زمان تک جاری رہے گا۔ پھر ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ افعال کا وجود ہمیشہ وجود وصفات فاعل پر دلالت کرتا ہے۔ (غور کریں)

یہ اہم بات ہے کہ آیت مورد بحث سورۂ جمعہ کی پہلی آیت ہے جو درحقیقت عبادت اجتماعی و سیاسی یعنی نماز جمعہ کا مقدمہ ہے، کیونکہ

---

[1] مقائیس۔ مفردات۔ مصباح اللغۃ۔ التحقیق فی الکلمات القرآن مادہ سبح۔

انسان کومتوجہ کیا جارہا ہے کہ عبادت وتقدیس خداوندی کا برنامہ وسلسلہ ہمیشگی کا حامل اورتمام ذرات جہان کے لیے اہم فریضہ ہے۔اس لیے تم بھی اس کے ہم صداوآواز ہوجاؤ۔اس کاروان مقدس کے ساتھ امواجِ ہستی میں سب ایک ہوجاؤاوراپنا سرآستانہ خداوندی پررکھوکہ وہی حاکم، پاک وپاکیزہ اوروہی قادروحکیم ہے۔[1]

(۲) دوسری آیت میں یہی مطلب ایک اورلباس میں سامنے آتا ہے،توحید خدا اوربعض اسماءحسنیٰ کی صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد ''قدوس'' کا ذکر ہے۔جوصفات سلبیہ کی نشان دہی کررہا ہے۔فرمان ہے:''وہ خدا ہے جس کے سوا کوئی معبودنہیں۔وہ حاکم ومالک ہے اور ہر عیب سے پاک ومبرا ہے۔''(هو الله الذی لا اله الا هو الملك القدوس)۔

جیسا کہ مفردات کی تشریح میں اشارہ ہوا قدوس،قداست کا صیغہ مبالغہ ہے۔اس کے معنی ذات خدا،اس کے صفات وافعال اور احکام کا ہرعیب ونقص سے پاک ہونا ہیں۔یہ ایک مختصرسی تعبیر ہے جس میں خدا کے تمام صفات سلبیہ جمع ہیں۔

نہ صرف یہ کہ اس کی ذات میں کوئی نقص نہیں بلکہ اس کی آفرینش وخلقت تکوینی وتشریعی میں بھی کوئی عیب ونقص نہیں کیونکہ سب کا سرچشمہ یہی کمال مطلق ہے۔سب اسی کے افادات میں سے ہیں۔سب میں رنگ الٰہی ہےاورسب ہی اپنی اپنی جگہ پرکامل ہیں۔

(۳) تیسری آیت میں ذات الٰہی سے فرزندوشریک کی نفی کرتے ہوئے فرمان ہے:

''خدااان صفات سے پاک ہے،جو یہ مشرکین بیان کرتے ہیں۔''(سبحان الله عما یصفون)

یہ جملہ قرآن کی کئی آیات میں ہے جو عام طور پران کوتاہ فکرلوگوں کے اس خیال کی نفی کے لیے آیا ہے کہ خدا کی کوئی اولاد یا ہمسرو شریک ہے۔اس کے معنی میں بڑی وسعت ہےاورتمام وہ صفات جوخدا کی ذات پاک کے لائق نہیں،یہ جملہ ان سب کی نفی کرتا ہے بلکہ ایک معنی کے لحاظ سے ہماری طرف سے اس کی ہرطرح کی توصیف بیان کرنے کوشامل ہے کیونکہ ہم اورتمام مخلوقات اپنے نقص ومحدودیت کی وجہ سے اس کی کنہہ صفات کے درک پرقادرنہیں ہیں لہٰذااس کی شرح سے عاجز ہیں جب کہ اس کی صفات کے وجوداجمالی سے آگاہ ہیں۔

پس وہ ہماری توصیف سے برتر واعلیٰ ہے،وہ سبھی توصیف بیان کرنے والوں کی تصویف سے منزہ ومبرا ہے۔(سبحان الله عما یصفون)

چنانچہ بعض روایات میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت امام جعفرصادقؑ نے توحید میں مذہب صحیح کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے ''تعالی الله عما یصفه الواصفون'' (خداتوصیف کنندگان کی بیان کردہ ہرتوصیف سے برتر واعلیٰ ہے۔[2]

پھراسی حدیث کے ذیل میں تاکید کرتے ہوئے فرمان ہے کہ توصیف پروردگار میں قرآن مجید میں مذکورہ صفات سے تجاوز

---

[1] تمام موجوداتِ جہان کی تسبیح عمومی اوراس کے تجزیہ وتحلیل سے متعلق ہم نے تفسیرنمونہ میں سیرحاصل بحث کی ہے۔جلد ۱۲،سورۂ اسراء آیت ۴۴۔جلد ۱۴۔سورۂ نورذیل آیہ ۴۱

[2] کافی جلداول صفحہ ۱۰۰ باب نہی ازصفت بغیر ماوصف بہ نفسہ حدیث ۱

نہ کریں۔

ای برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وزہرچہ دیدہ ایم ونوشتیم وخانداہ ایم

(۴) چوتھی اور آخری آیت میں اپنے مطلق اور بلا قید وشرط کلام میں فرماتا ہے ''تیرا صاحب عزت وقدرت پروردگار ان اوصاف سے پاک ہے (جو یہ مشرکین بیان کرتے ہیں'' ''سبحان ربك رب العزة عما یصفون''۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ممکن ہے کہ کم فکر لوگ خدا کی جو صفات بیان کرتے ہیں ان سے خدا کے پاک ومنزہ ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ کبھی وہ مسیح کو اس کا فرزند کہتے ہیں اور کبھی فرشتوں کو اس کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں کبھی اس میں اور جنوں میں رابطہ کے قائل ہوتے ہیں۔ کبھی بتوں کو اس کے شریک یا شفیع کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔ کبھی اس کے لیے ایسے اوصاف بیان کرتے ہیں جو مادی اجسام کے اوصاف ہیں، پس یہی ایک کلمہ ان سب کی نفی کرتا ہے اور ان پر خط ابطلان کھینچ رہا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد ہر قسم کی توصیف الٰہی ہو خواہ وہ کسی بھی طرف سے کی گئی ہو کیونکہ انسان جس طرح اس ذات کی حقیقت معلوم کرنے سے عاجز ہے، اسی طرح وہ اس کی صفات کو سمجھنے پر بھی قادر نہیں ہے۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات ایسی تمام صفات سے پاک ہے جن میں نقص یا عیب پایا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی صفات ثبوتیہ کے ذریعے حاصل کردہ ہماری معرفت بھی ہماری وسعتِ خیال کی حد تک ہے، نہ وہ جو ذاتِ خدا کے لائق ہے۔

یہ پاکیزگی وتقدیس ذات وصفات کے علاوہ اس کے احکام تشریعی کو بھی شامل ہے، کیونکہ ان کا سرچشمہ وہ ذات ہے جو عین کمال اور کمال مطلق ہے۔

توضیحات

سب سے بڑا گناہ تشبیہ ہے

مخلوق کی صفات جن میں نقص ہوتا ہے ان سے ذات خدا کی تنزیہ وتقدیس ایسا مضمون ہے جس پر بار ہا تاکید کی گئی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس سے اسلامی احادیث خبردار کر رہی ہیں کیونکہ اس کے بغیر خدا کی معرفت نہیں ہوسکتی یا بعبارت دیگر اس طرح توحید وشرک باہم مل جائیں گے۔

علاوہ ازیں صفات ثبوتیہ وسلبیہ کی تقسیم ہماری ذہنی ایجاد ہے وگرنہ خدا کی ذاتِ پاک ایک حقیقت سے زیادہ نہیں۔ ہم دریچہ وجود ہی سے اس کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کو کمال مطلق، علم مطلق اور قدرت مطلقہ کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ کبھی دریچۂ عدم نقص سے دیکھیں تو وہ ذات، جہل، عجز اور ہر قسم کے عیب سے پاک نظر آتی ہے۔

لہٰذا صفات سلبیہ کی معرفت نہ ہوتو صفات ثبوتیہ کی پہچان بھی نہیں ہوگی۔ایک مرحلہ میں معرفت کا نقص دوسرے مرحلہ میں بھی موجب نقص ہوگا۔اس مقام پر ضروری ہے کہ م احادیث اسلامی کے اشارات لطیفہ کی طرف بھی کچھ توجہ کریں۔

(۱) امیر المومنینؑ ایک خطبہ کے آغاز میں فرماتے ہیں: "لایشغله شانٌ، ولا یغیره زمانٌ و لا یحویه مکانٌ ولا یصفه لسان۔" خداوند عالم کو ایک حالت دوسری حالت سے سدراہ نہیں ہوتی۔نہ زمانہ اس میں تبدیلی پیدا کرتا ہے نہ کوئی جگہ اسے گھیرتی ہے اور نہ ہی کوئی زبان اس کا وصف بیان کرتی ہے۔[۱]

(۲) دوسرے خطبہ میں موت و حیات سے مربوط مسائل کو سمجھنے میں انسان کے عجز و بے چارگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمان ہے: "کیف یصف الهه من یعجز عن صفة مخلوق مثله" جو اپنے جیسی مخلوق کی صفات میں کچھ بیان نہ کر سکے وہ اپنے اللہ کے متعلق کیا بتا سکتا ہے؟[۲]

(۳) حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا "آخبرنی ای الاعمال افضل" بتائیں کون سا عمل بہتر ہے؟ امامؑ نے فرمایا: "توحیدك لربك" تیرے پروردگار کی توحید۔اس نے پھر سوال کیا "ما اعظم الذنوب" سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا "تشبهك لخالقك" تیرا اپنے خالق کے ساتھ مخلوقات کو تشبیہ دینا!

(۴) ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے: "ان الله تبارك و تعالی لا یوصف بزمان ولا مکان ولا حرکة ولا انتقال و لاسکون بل هو خالق الزمان و اعلمکان والحرکة والسکون والانتقال تعالیٰ عما یقول الظالمون علوا کبیرا" زمان و مکان، حرکت و انتقال و سکون سے خدا کی تصویف نہیں کی جا سکتی۔(خدا کی ذات ان سب سے مبرا ہے) بلکہ وہ تو زمان، مکان، حرکت، سکون اور انتقال کا خالق ہے۔خدا بہت بڑا ہے اس سے جو ظالم کہتے ہیں۔[۳]

(۵) ایک اور حدیث میں امیر المومنین "صمد" کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تأویل الصمد لا اسم ولا جسم ولا مثل ولا شبه و لا صورة ولا تمثال ولا حدولاحدود ولا موضع ولامکان ولا کیف ولا این ولا هنا ولا تمة ولا ملاء ولا خلاء ولاقیام ولا قعود ولا سکون ولاحرکة ولاظلمانی ولانورانی ولاروحانی ولانفسانی ولا یخلومنه موضع ولاسعد موضع ولا

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۰

[۳] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۳۰۹ حدیث ۱

علی لون ولا علی خطر قلب و لا علی شم رائحة، منفی عنه هذه الاشیآء

''صمد کی تفسیر یہ ہے کہ اس کا نہ اسم ہے نہ جسم، نہ مثال ہے نہ نظیر، نہ صورت ہے نہ مثال، نہ حد ہے نہ حدود، نہ موضع ہے نہ مکان، نہ کیفیت ہے نہ محل، نہ اس جگہ ہے نہ اس جگہ، نہ ملا ہے نہ خلا، نہ اٹھنا ہے نہ بیٹھنا، نہ سکون ہے نہ حرکت، نہ تاریک ہے نہ روشن، نہ روحانی ہے نہ نفسانی، کوئی جگہ اس سے خالی نہیں جب کہ کوئی جگہ اس کی گنجائش نہیں رکھتی۔ نہ اس کا رنگ ہے نہ کسی دل میں گزرتا ہے، نہ اس کی بو سونگھی گئی ہے۔ یہ سب چیزیں اس سے دور ہیں (اور وہ ان تمام چیزوں سے پاک ومنزہ ہے)۔ [1]

واضح رہے کہ نفی اسم سے مراد اس سے مخلوقات کے اسماء کی نفی ہے۔

صفات سلبیہ کی اجمالی پہچان کے بعد اب ہم ان کی تفصیلی معرفت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۳۰ حدیث ۲۱

۱، ۲۔رویت اور جسمیت کی نفی

اشارہ

بعض صفات سلبیہ کا تذکرہ مباحث توحید و یگانگی میں اس کے وجود کی بساطت، ہر قسم کی شبیہ اور اجزا کی نفی کے بیان میں گزر چکا ہے۔

بعض ایسے مسائل جن کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور طولِ تاریخ میں علم کلام کے تحت ان پر بحث ومباحثہ جاری رہا ہے، یہاں ہم ان کے بارے میں بحث کریں گے۔

ان میں ایک یہ ہے کہ خدا کا جسم نہیں، خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا، خدا کے لیے محل و مکان نہیں۔ البتہ یہ تینوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ یعنی اگر خدا (دیکھا جا سکتا) تو اس کا لازمہ جسمیت ومحل ہوتا۔ اگر محل نہیں تو جسم بھی نہیں اور بطریق اولیٰ وہ قابل مشاہدہ بھی نہیں ہے۔

خدا جسم نہیں رکھتا۔ اس مطلب کا فہم ''خدا شناسی کے دلائل'' کے بعد کوئی مشکل مسئلہ نہیں رہا۔ لیکن کم عقل لوگ جو خود کو حس کی چار دیواری سے باہر نہیں نکال سکتے غالباً ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ خدا کے لیے جسمیت کی صورت بنائیں۔ لہٰذا خدا کے جسمانی ہونے کا مسئلہ سابقہ اقوام اور مسلمانوں کے بعض گروہوں (قشری ومتحجر) میں مطرح رہا ہے۔

اسی لیے قرآن مجید نے بڑے زور کے ساتھ خدا سے جسمیت اور مکان وہیئت کی نفی کی ہے۔ اس اشارہ کے بعد اب ہم قرآن مجید کی طرف آتے اور گوش جان وقلب سے آیات ذیل کو پڑھتے ہیں:

(۱) لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾ (انعام ۱۰۳)

(۲) وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ (اعراف ۱۴۳)

(۳) يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا

مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ (نساء ۱۵۳)

(۴) وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ (فرقان ۲۱)

ترجمہ

(۱) آنکھیں اسے نہیں پاسکتیں اور وہ آنکھوں کو پالیتا ہے۔ وہ (نعمتیں) بخشنے والا اور (تمام چیزوں سے) آگاہ ہے۔

(۲) جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر آیا اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا، موسیٰ نے کہا: اے میرے پروردگار! تو مجھے اپنا جلوہ دکھادے تاکہ میں تجھے دیکھوں۔ فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھے گا۔ لیکن تو پہاڑ کی طرف نظر کر۔ پس اگر یہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔ پس جب اس کے پروردگار نے (پہاڑ پر) نور کا چمکارا ڈالا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو کہنے لگا: خداوند! تو پاک ہے (اس سے کہ قابل مشاہدہ ہو) میں نے تیری طرف رجوع کر لیا ہے اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں۔

(۳) اہل کتاب تجھ سے تقاضا کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے (یک بارگی) کتاب نازل کرے (جب کہ یہ بہانے کے سوا کچھ نہیں)۔ انہوں نے موسیٰ پر اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا یعنی یہ کہا تھا کہ ہمیں اپنا خدا کھلم کھلا دکھا دے۔ پس ان کے اس ظلم کے سبب بجلی نے ان کو پکڑ لیا۔ پھر جب ان کے پاس روشن دلائل آ گئے تو اس کے بعد انہوں نے بچھڑے کو اپنا خدا بنالیا۔ لیکن ہم نے ان سے درگزر کیا اور موسیٰ کو واضح برتری دے دی۔

(۴) وہ لوگ جو ہمارے سامنے حاضری کی امید نہیں رکھتے (قیامت کے منکر ہیں) وہ کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کیے جاتے یا ہم اپنے پروردگار کو اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے۔ یقیناً انہوں نے اپنے بارے میں تکبر کیا اور بہت ہی سرکشی دکھائی۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

اس آنکھ میں اس کے تماشائے جمال کی طاقت نہیں

(۱) پہلی آیت مورد بحث میں صراحت کے ساتھ کہا جارہا ہے: آنکھیں اسے ہرگز نہیں پاسکتیں (نہیں دیکھتیں) اور وہ آنکھوں کو پالیتا ہے یعنی دیکھ لیتا ہے۔(لا تدرکه الابصار و هو یدرك الابصار)

پھر فرمان ہے: ''وہ موجوداتِ لطیف کا خالق اور بندوں کی بہ نسبت مہربان ولطیف ہے۔ وہ (نعمتیں) دینے والا اور (تمام چیزوں سے) آگاہ ہے۔(وهو اللطیف الخبیر)

اس لحاظ سے آیت بالا خدا کے بارے میں اس جہان یا جہان آخر میں ہر قسم کی رویت کی نفی کررہی ہے۔ واضح ہے کہ (نہ دیکھنے سے مراد) انسانوں کا آنکھ کے ذریعہ نہ دیکھنا ہے اور ظاہر ہے کہ لفظ ''ابصار'' کا بصورتِ جمع لانا درحقیقت عمومیت کے لیے ہے کہ ہر قسم کی آنکھ اور ہر طرح کی قوتِ دید سمیت سب کو شامل ہو۔

تعجب ہے کہ اس قدر صراحت کے باوجود فخر رازی اور اس کے ہم فکر اس آیت کو اپنے تصورات کے تحت جواز رویت کی دلیل قرار دیتے رہے اور کئی ایک بے اصل اور کمزور دلیلوں کا سہارا لیا۔

وہ اس آیت کے سلسلے میں ایک جگہ کہتا ہے:

ہمارے علماء نے قیامت کے دن دیدار خدا کے جواز پر اس آیت سے استدلال کیا ہے۔

(۱) قرآن نے اس بات کو مدح پروردگار کے عنوان سے ذکر کیا ہے کہ آنکھیں اسے نہیں پاسکتیں۔ مدح تب صحیح ہے کہ رویت کا امکان ہو کیونکہ غیر ممکن پر مدح صحیح نہیں ہوگی۔

جب امکان رویت ثابت ہوگیا تو قبول کرلینا چاہیے کہ اس طرح کی چیز قیامت میں بھی متحقق ہوگی کیونکہ اس مسئلہ میں دو سے زیادہ قول نہیں ہیں۔

۱۔ خدا مطلقاً قابل رویت نہیں۔

۲۔ قیامت کے دن رویت ہوگی۔

جب قول اول کی نفی کردی گئی ہے تو قول دوم ثابت ہوجائے گا۔

(۲) آیت کہہ رہی ہے کہ آنکھیں اسے نہیں پاسکتیں۔ اس کا مطلب ہوگا کہ خدا آخرت میں ایک اور حس (حس ششم) پیدا کرے گا تاکہ اس کے وسیلہ سے دیدار خدا ہوسکے۔

(۳) ''ابصار'' جمع ہے جس کا مطلب ہے کہ تمام آنکھیں اسے نہیں پاسکتیں۔ اس کا مفہوم مخالف ہوگا کہ بعض آنکھیں اس کا مشاہدہ کرسکتی

ہیں۔[1]

یہ ہے ان کے استدلال کا خلاصہ

تعجب اور افسوس ہے کہ اس قدر قوت فکر کا مالک مفسر گروہی تعصّبات کی وجہ سے ایسے مطالب کا قائل ہو حیرت ہے کہ وہ واضح مطلب کے خلاف استدلال کر رہا ہے۔

ہم اس قسم کی تعبیرات کسی کے بارے میں ذکر کرنا پسند نہیں کرتے، لیکن اگر یہ سلسلہ رواج پکڑ جائے کہ کسی چیز پر استدلال اس کی ضد سے کیا جائے اور ہر چیز سے ہر چیز پر استدلال ہو تو پھر حقائق کا پائمال کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا اور قرآن سے ایسے بے بنیاد استدلال کیے جا سکیں گے۔ ہم مجبور ہوئے کہ اس قسم کی بات لکھیں، ہم اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے تینوں استدلالات پر غور کرتے ہیں:

اولا: بہت سی محال چیزیں ہیں جن سے خدا کی مدح کی جاتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں خدا کے لیے فنا نہیں (**کل شیء هالك الا وجهه**)۔ مسلم ہے کہ ہلاکت و نابودی واجب الوجود کے لیے محال ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آیت بالا دلیل ہوگی کہ ہلاکت و نابودی خدا کے لیے ممکن ہے کیونکہ اگر امکان نہ ہو تو پھر مدح نہیں ہو سکے گی۔ کیا کوئی عاقل اس طرح کی بات کر سکتا ہے؟

اسی طرح قرآن خدا کی مدح و توصیف کر رہا ہے کہ خدا کا باپ، ہمسر و فرزند و شریک نہیں۔

انی یکون له ولد ولم تکن له صاحبة (انعام ۱۰۱)"لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوا احد" (توحید ۳-۴)

قاعدتاً تمام صفات سلبیہ خدا کے لیے محال ہیں کیونکہ یہ سب ممکنات کی صفتیں ہیں جب کہ خدا واجب الوجود ہے۔

ثانیاً: اس آیت میں حس ششم کی طرف کوئی اشارہ نہیں اور نہ ہی کتب اصول کے معروف مفاہیم میں کہیں اس کا تذکرہ ہے۔ ایک اصطلاح بھی ہے کہ کسی چیز کا اثبات اس کے غیر کی نفی نہیں کرتا اور نہ ہی کسی چیز کی نفی کسی اور چیز کا اثبات کرتی ہے۔

اگر آیت میں آیا ہے کہ آنکھیں اسے نہیں دیکھ پاتیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ کوئی اور چیز اسے دیکھ سکتی ہے۔

علاوہ ازیں "حس ششم" چھٹی حس سے مراد کیا ہے؟ اگر مشاہدہ قلبی اور عقل کی آنکھ سے دیکھنا ہے تو کوئی بھی اس کا منکر نہیں لیکن رویت کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اگر کوئی اور چیز ہے تو مشخص ہونا چاہیے تا کہ بحث کی جا سکے، کیونکہ نامفہوم اور گنگ مطلب سے بحث کرنا بے فائدہ ہے۔

ثالثاً: آیت میں فرمان ہے کہ آنکھیں اسے نہیں پا سکتیں یعنی کوئی آنکھ اس کے دیکھنے پر قادر نہیں اور اصطلاح کے لحاظ سے یہ عموم افرادی ہے۔ اس کی نظریں روزمرہ کی گفتگو میں بہت پائی جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں اس کے دامن تک ہاتھ نہیں پہنچ سکتے یا لوگ اس کی قدر کو نہیں جانتے تو اس سے مراد ہوگی کوئی ہاتھ اور کوئی انسان!

جیسے کہ بعض دعاؤں میں ہے "**کلت الالسن من غایة صفته والعقول عن کنه معرفته**۔" زبانیں اس کی انتہا

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۱۳ صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶

توصیف سے عاجز ہیں اور عقل اس کی کنہہ وحقیقت معرفت سے قاصر ہیں۔[1]

نہج البلاغہ میں ہم پڑھتے ہیں "واعجز الالسن عن تلخیص صفته" زبانیں اس کی خالص توحید سے عاجز ہیں۔[2]

خلاصہ کلام یہ کہ رویت کے ممکن نہ ہونے پر آیت کی دلالت بالکل واضح ہے اور کسی بھی فریب سازی سے اس دلیل کو اس کے عکس پر دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

اے موسیٰ ہمیں اپنا خدا دکھلا

(۲) دوسری آیت میں بنی اسرائیل کے مشہور قصہ کا تذکرہ ہے۔انہوں نے حضرت موسیٰ سے اصرار کیا کہ اپنے خدا کی نشاندہی کریں۔ موسیٰ بحکم الٰہی انہیں کوہ طور پر لے گئے تا کہ وہ لوگ اپنے تقاضا کا جواب سن سکیں۔اس جگہ ایک حادثہ رونما ہوا کہ جس میں اس مطلب سے مربوط تمام حقائق جمع ہو گئے۔فرمان ہے:

''جب موسیٰ ہمارے مقرر کردہ وقت پر آیا اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا۔موسیٰ نے کہا: اے میرے پروردگار! تو مجھے اپنا جلوہ دکھادے تا کہ میں تجھے دیکھوں۔(ولما جاء موسی لمیقاتنا و کلمه ربه قال رب ارنی انظر الیك)۔

اس جگہ (موسیٰ نے) خدا کی طرف سے واضح جواب سنا۔فرمان ہے:''تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گا۔لیکن تو پہاڑ کی طرف نظر کر۔پس اگر یہ اپنی جگہ کھڑا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔''(قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانه فسوف ترانی)۔

موسیٰ اور بنی اسرائیل کے ۷۰ (ستر) نمائندوں نے اپنی آنکھوں سے پہاڑ کی طرف دیکھا۔ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔اچانک پہاڑ پر خدا کے نور (مخلوق) کا جلوہ ظاہر ہوا۔جب اس کے پروردگار کا نور چمکا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر ختم ہوگیا۔(فلما تجلی ربه للجبل جعله دکا) موسیٰ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔''(وخر موسی صعقا) ''بنی اسرائیل کے نمائندے بھی خاک پر گر پڑے۔''

جب موسیٰ ہوش میں آئے تو عرض کیا''پروردگار تو پاک ہے،(اس سے کہ قابل مشاہدہ ہو)۔میں نے تیری طرف رجوع کرلیا اور میں سب سے پہلا مومن ہوں۔(فلما افاق قال سبحانك تبت الیك وانا اول المومنین)۔

تفسیر آیہ کی تکمیل کے لیے چند سوالوں کا جواب ضروری ہے۔

(۱) اگر جمال خدا کا مشاہدہ محال تھا تو موسیٰ نے اس کا تقاضا کیوں کیا جب کہ وہ خدا کے اولوالعزم پیغمبر تھے؟ (جیسا کہ جملہ "لن ترانی" سے ظاہر ہوتا ہے)۔

جواب: اس سوال کا جواب کئی آیات قرآن سے معلوم ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ بنی اسرائیل کی اکثریت جاہل تھی اور یہ ان کا تقاضا تھا جیسا

---

[1] ملحقات صحیفہ سجادیہ۔دعائے روز دوشنبہ (سوموار)

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۳

کہ آیہ ۱۵۵ سورۂ اعراف میں ہم پڑھتے ہیں جب کہ اس سے پہلے موسیٰ کے واقعہ کا تذکرہ ہے۔ "اتهلكنا بما فعل السفهاء منا" (کیا بے وقوف لوگوں کی وجہ سے آپ ہمیں ہلاک کریں گے)۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقاضا حضرت موسیٰ کی طرف سے نہیں تھا، ان پر دباؤ تھا کہ جاہلوں کا یہ سوال بارگاہِ خدا میں کریں اور خدا سے جواب لے کر انہیں دیں۔

آیہ ۱۵۳ سورۂ نساء "يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ" اہل کتاب تجھ سے تقاضا کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے (ایک ہی دفعہ) کتاب نازل کر دے، انہوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا دکھا دے۔ پس ان کے اس ظلم کے سبب بجلی نے ان کو پکڑ لیا۔

نیز سورۂ بقرہ کی آیت ۵۵ میں فرمان ہے "وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ" اس وقت کو یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تا آنکہ خدا کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں۔ اسی حالت میں تمہیں بجلی نے آلیا جب کہ تم دیکھ رہے تھے۔

ان دونوں آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلط اور نا روا درخواست بنی اسرائیل کی طرف سے تھی۔ موسیٰ تو فقط ان کی بات پہنچانے والے اور خدا کا جواب سنانے والے تھے۔

اگر فخر رازی جیسے حضرات کو اصرار ہے کہ یہ تقاضا حضرت موسیٰ کی طرف سے تھا اور معرفت موسیٰ کی منزلت کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اہل مشاہدہ ہے وگرنہ اتنا بڑا نبی کبھی تقاضا نہ کرتا لیکن یہ اصرار بے جا اور غلط ہے اور آیات بالا اس کی نفی کر رہی ہیں۔

تعجب ہے کہ آیت صراحتاً کہہ رہی ہے "لن ترانی"۔ توجہ رہے کہ "لن" نفی دائمی کے لیے آتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم مجھے ہرگز ہرگز نہیں دیکھ سکتے اور بنی اسرائیل کے اس تقاضا کو ظالمانہ فعل شمار کیا گیا ہے۔ پھر اس کی سزا آسمانی بجلی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود متعصب گروہ کا اصرار ہے کہ اس آیت کی دلالت نفی رویت پر نہیں، بلکہ معاملہ برعکس ہے۔

اعتراف کر لینا چاہیے کہ تعصب بہت بڑی بلا ہے، اس حد تک کہ بڑے بڑے دانش ور بھی غیر منطقی باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

(۲) دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں تجلی الٰہی سے مراد "صاعقہ" ہے جو مخلوقات میں سے ایک مخلوق اور افعال خدا کی شعاع اور پرتو ہے۔ گویا اشارہ ہے کہ جب تم صاعقہ کے مشاہدہ کی طاقت نہیں رکھتے جو اس کی ایک چھوٹی سی مخلوق ہے، تمہاری آنکھیں خیرہ ہوگئی ہیں، ہولناکی اور زلزلہ کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے ہو اور پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو گیا ہے تو پھر کس طرح تم یہ خیال کرتے ہو کہ اس ذات بے مثال کا دیدار کر سکو گے۔ درحقیقت یہ تجلی الٰہی ان کے سوال کا جواب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ایک سزا بھی تھی۔

(۳) آخری سوال یہ ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد موسیٰ نے توبہ کیوں کی؟

اس کی دو دلیلیں ہو سکتیں ہیں۔

۱۔جس طرح انہوں نے بنی اسرائیل کی نمائندگی کرتے ہوئے تقاضائے رویت کیا،اسی طرح یہ توبہ بھی انہی کی نمائندگی میں کی ہے۔

۲۔موسیٰ خیال کررہے تھے کہ اس طرح کی نمائندگی بھی بارگاہِ خداوندی میں ممکن ہے مناسب نہ ہو۔لہٰذا مزید قداست کے لیے توبہ کی اوراظہارِ ایمان کیا۔

اس جگہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ فخر رازی پھر گرداب تعصب میں غرق ہورہا ہے نہ صرف یہ کہ اس نے رویت خدا کے محال ہونے پر اس آیت کی دلالت کا انکار کیا بلکہ وہ مصر ہے کہ یہ آیت کہی جہات سے جواز رویت پر دلالت کررہی ہے۔اس نے ایسے مطالب ذکر کیے ہیں جن کا ذکر وقت کا ضیاع ہے۔ان کو طرح دینا ہی بہتر ہے۔ان باتوں کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے،ان کا جواب آپ آیہ گذشتہ کی تفسیر میں ملاحظہ کرچکے ہیں۔

(۳) تیسری آیت کی تفسیر دوسری آیت کے ضمن میں ہوگئی ہے،مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ حضرت موسیٰ سے بنی اسرائیل کا یہ تقاضا خدا کے نزدیک گناہِ عظیم،ظلم اور فاحشہ شمار کیا گیا ہے،ایسا گناہ کہ جس کی سزا فوراً دی گئی۔

''اہل کتاب تجھ سے تقاضا کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے (یکبارگی) کتاب نازل کرے (یہ صرف بہانہ ہے) انہوں نے موسیٰ پر اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا۔یعنی یہ کہا تھا کہ ہمیں اپنا خدا کھلم کھلا دکھا دے۔پس اس ظلم کے سبب بجلی نے ان کو پکڑ لیا۔''

(یسئلك اهل الكتاب ان تنزل عليهم كتابا من السماء فقد سالوا موسى اكبر من ذلك فقالوا ارنا الله جهرة فاخذتهم الصعقة)

یہودی کس قدر ظلم وستم کے مرتکب ہوئے۔یہی تو ظلم تھا کہ انہوں نے خدا بزرگ کو موجود جسمانی مادی کی سرحد تک تنزل کردیا اور اس کے مشاہدہ کا تقاضا کیا۔اسی سوءادب کی وجہ سے بجلی نے ان کو آن پکڑا تا کہ ان کے لیے سزا بھی ہو اور عبرت بھی ہو۔اس سے انہیں معلوم ہو جائے کہ جب وہ اس چھوٹی سی مخلوق کا مشاہدہ نہیں کرسکتے جو عالم ہستی میں ایک شعاع سے زیادہ نہیں تو پھر وہ سورج،چاند،ستاروں اور عالم ہستی کے خالق کو کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

یہ ایک ایسا مطلب ہے کہ ایک خالی الذہن اور غیر متعصب شخص اسے فوراً سمجھ لیتا ہے۔

اشاعرہ کا یہ خیال کہ توبیخ وسرزنش اس لیے ہے کہ کیوں اس دنیا میں انہوں نے یہ تقاضا کیا،خدا چاہتا ہے کہ فقط قیامت میں اس کا مشاہدہ ہو،تو یہ نہایت ہی نحیف وضعیف قول ہے۔

کیونکہ دنیا وآخرت کا تفاوت ایسا نہیں جو سرزنش کا موجب ہو۔آیت کا لہجہ صاف بتا رہا ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں ان کی سوادبی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔یہ اس لیے کہ وہ صفت جو لائق خداوند نہیں اور ممکنات سے مخصوص ہے،انہوں نے اس کی نسبت خدا کی طرف دی اور راہِ شرک اختیار کیا ہے۔

نزول کتاب آسمانی سے متعلق اہل کتاب کا کیا خیال تھا؟اس کی کئی تفسیریں ہیں،ایک خیال یہ ہے کہ وہ قرآن سے بے اعتنائی کرتے ہوئے الواح موسیٰ کی طرح (یکجا لکھی ہوئی کتاب) کا تقاضا کررہے تھے۔

بعض کا خیال ہے کہ وہ اپنے نام کی یا بڑے لوگوں کے نام کی کتاب چاہتے تھے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ایک خصوصی خط چاہتے تھے جس میں یہ تقاضا کیا گیا ہو کہ تم میرے نبی پر ایمان لاؤ۔

ان میں سے ہر بات اصل میں ان کی لجاجت، گھٹیا پن اور حق کو تسلیم نہ کرنے کی دلیل ہے اور مسلم ہے کہ اس قسم کا تقاضا توبیخ وسرزنش ہی کا موجب ہوگا۔

ضروری ہے کہ ہم خدا کو دیکھیں

(۴) چوتھی اور آخری آیت میں رویت خدا کا تقاضا کرنے والے لوگوں کو پھر سے سخت ترین ملامت وسرزنش کرتے ہوئے فرمان ہے ''وہ لوگ جو ہمارے سامنے حاضری کی امید نہیں رکھتے (قیامت کے منکر ہیں) وہ کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل ہوئے یا ہم اپنے پروردگار کو خود اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے۔'' (وقال الذی لا یرجون لقاء نا لو لا انزل علینا الملائکة او نری ربنا)۔

پھر ارشاد ہے ''یقیناً انہوں نے اپنے بارے میں تکبر کیا اور بہت ہی سرکش دکھائی۔'' (لقد استکبروا فی انفسھم وعتو عتوا کبیراً)

درحقیقت وہ لوگ دو میں سے ایک چیز چاہتے تھے۔ فرشتوں کا نزول یا پروردگار کی رویت۔

نزول فرشتہ میں مدنظر یہ تھا کہ فرشتہ پیغمبر کی بجائے ان کی طرف وحی لائے یا وہ آکر پیغمبر کے صدق وصفا کی گواہی دے۔

قرآن کی طرف سے دیئے گئے جواب کے بھی دو حصے ہیں۔ فرشتوں کے نزول کے سلسلہ میں فرمان ہے:

''یہ لوگ متکبر ہیں، اس لیے اس قسم کا تقاضا کر رہے ہیں۔''

دوسرا حصہ رویت پروردگار کے تقاضا سے مربوط ہے۔ ارشاد ہے:

''ان لوگوں نے بڑی سرکشی ہی کی ہے۔''

اس سے بڑی سرکشی کیا ہوسکتی ہے کہ بے مثال ذات کو مادی اجسام اور موجوداتِ ممکن کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کو بھی زمان و مکان اور عوارض جسمی میں مقید کر دیا ہے۔

آیت کا لہجہ بھی پروردگار کی رویت کے ناممکن ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ اگر یہ چیز ممکن ہوتی تو پھر تقاضا بھی خلاف عقل نہیں تھا۔

نتیجہ

مذکورہ بالا تمام آیات سے بخوبی معلوم ہوا کہ خدا کو دیکھنا کسی صورت میں بھی ممکن نہیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ یہ آیت عالم آخرت کو شامل نہیں، صرف اس دنیا میں رویت خدا کی نفی ہو رہی ہے، ہرگز قابل لحاظ نہیں ہے۔

آیت کے مفہوم میں وسعت ہے اور یہ سب جہات کو شامل ہے۔ بلکہ لحن آیت سے رویت کا محال ہونا سمجھا جاتا ہے اور جو چیز محال

ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں محال ہی ہوگی۔ (غور کریں)

توضیحات

(۱) رویت خدا کیوں محال ہے؟

عقلی دلائل بھی آیات کے موید ہیں کیونکہ رویت اور قابل دید ہونے کا لازمہ ایسے امور ہیں جو خدا کے بارے میں ممکن نہیں جیسے جسم ہونا، مکان رکھنا، جہت رکھنا اور اس کے لیے اجزا کا ہونا۔ کیونکہ ہر جسم کے اجزا ہوتے ہیں، پھر جسم ہونا تغیر وتبدل کا تقاضا کرتا ہے، اس میں عوارض بھی ہوتے ہیں جیسے رنگ، حجم اور ابعاد ثلاثہ (طول، عرض، عمق) جب کہ واجب الوجود کا نہ کوئی جز ہے، نہ وہ تغیر وتبدل کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی حوادث اس کو عارض ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ سب ممکن کی صفات ہیں۔

جو لوگ رویت خدا کو ممکن سمجھتے ہیں ان میں بعض کہتے ہیں کہ کوئی دلیل نہیں کہ آنکھیں صرف جسم ہی کو دیکھ سکتی ہیں۔ کیا حرج ہے اگر غیر مادی امور آنکھ کے ذریعہ دیکھے جائیں، خصوصاً اگر آنکھ میں ایسی تبدیلی ہو جائے کہ جس سے آج کی نسبت اس کی قوت نظارہ اور زیادہ ہو جائے۔

اس کلام کا بطلان واضح ہے کیونکہ آنکھ سے مادی چیز ہی کو دیکھنا ہوتا ہے اور مادی چیز کا تعلق یقیناً مادی چیز کے ساتھ ہی ہوگا۔ یہ بات معقول ومتصور نہیں کہ انسان آلات مادی کے ذریعہ امور غیر مادی کو دیکھ سکے۔

علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں اس بارے میں فرماتے ہیں: آنکھ سے رویت خواہ آج کی طرح ہو یا تبدیلی کی وجہ سے دو چند ہو جائے پھر بھی وہ امر مادی وطبعی ہی کے لیے ہوگی۔ دیکھنے میں رنگ، شکل اور روشنی کا ہی دخل ہے اور یہ سب مادی وطبعی امور ہیں۔ پس محال ہے کہ ان کا تعلق ذاتِ پروردگار کے ساتھ ہو۔ نیز اس میں دنیا اور آخرت کا فرق نہیں۔ [1]

علاوہ ازیں آیت قرآن بالصراحت کہہ رہی ہے: کوئی چیز مثل خدا نہیں ہے۔ لیس کمثلہ شیئ (شوری ۱۱)

لہٰذا نہ اس کی شبیہ ہے نہ جسم۔ نہ وہ مادی اور قابل مشاہدہ ہے، نہ اس کے لیے زمان ہے، نہ مکان اشارہ حسی بھی اس کی طرف نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) طرف دارانِ رویت کی دلیل

رویت خدا کے بارے میں مسلمانوں کے تین گروہ ہیں۔

---

[1] المیزان جلد ۸ صفحہ ۲۹۶

پہلا گروہ: اس میں بڑے بڑے فلاسفہ اور محققین شامل ہیں۔ ان کا مسلک ہے کہ رویت خدا اصلاً محال ہے۔

دوسرا گروہ: مجسمہ ہیں اور وہ معتقد ہیں کہ خدا کا جسم ہے۔ لہٰذا وہ قابل رویت بھی ہے۔

تیسرا گروہ: اشاعرہ ہیں جو (تیسری صدی ہجری کے مشہور متکلم) ابوالحسن اشعری کے پیروکار ہیں۔ ان کا کلام عجیب سا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا جسمیت و مادہ سے مجرو ہے، اس کے باوجود قابل رویت ہے مگر یہ کہ اس دنیا میں نہیں اسے عالم آخرت میں دیکھا جا سکتا ہے اور مومنین قیامت کے دن انہی آنکھوں سے اس کا دیدار کریں گے۔[1]

فاضل قوشجی محقق طوسی کی کتاب ''تجرید العقائد'' کی شرح میں اس طرح کہتے ہیں:

اشاعرہ کا خیال ہے کہ خدا کو دیکھا جا سکتا ہے، مومنین اس کو بہشت میں دیکھیں گے، لیکن یہ دیدارِ الٰہی روبرو ہونے اور جہت و مکان کے بغیر ہوگا۔

پھر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ تمام منکرین رویت کا اتفاق ہے کہ علمی انکشاف (چشم و عقل و قلب) کے ذریعہ خدا کا مشاہدہ ہمیں میسر ہے۔ دوسری طرف رویت خدا کے قائل کہتے ہیں کہ خدا کی صورت آنکھ میں منقش ہو جائے یا آنکھ سے خارج ہونے والی شعاع اس تک پہنچ جائے۔ یہ محال ہے۔

توجہ رہے کہ فلاسفہ قدماء میں رویت کے متعلق دو نظریئے تھے۔ ایک گروہ والے خروج شعاع کے قائل تھے، ان کا خیال تھا کہ رویت کے وقت انسانی آنکھ سے شعاع خارج ہوتی ہے اور مرئی (دیکھی جانے والی چیز) تک پہنچتی ہے تو انسان اس کو دیکھتا ہے۔

لیکن دوسرے گروہ کا نظریہ ہے کہ مرئی کی صورت آنکھ میں نقش ہوتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آج کے دانش مند دوسرے نظریہ کے قائل ہیں اور اسی کو انہوں نے حسی دلائل کے ذریعے ثابت کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس نکتہ نظر کے مطابق آنکھ بالکل دستگاہ عکاسی یعنی کیمرہ کے مشابہ ہے۔ اس جسم کا عکس شبکہ چشم یا عکاس (کیمرے کی فلم) میں منعکس ہوتا ہے۔

تعجب یہ ہے کہ جب اشاعرہ کے سامنے یہ نکتہ نظر آتا ہے کہ رویت کے یہی دو طریقے ہیں، ظاہر ہے کہ خدا مادہ سے مجرد ہے پس اس کے بارے میں یہ طریقہ متصور نہیں ہے۔ وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ رویت فقط انہی دو طریقوں میں منحصر نہیں ہے۔ خاص طور پر جب امورِ غائب

---

[1] اس کا نام علی بن اسماعیل تھا۔ اس کا نسب ابوموسیٰ اشعری تک پہنچتا ہے۔ ۲۶۰ھ یا ۲۷۰ ہجری کے قریب بصرہ میں پیدا ہوا، شروع میں اس کا میلان مذہب معتزلہ کی طرف تھا۔ پھر خدا کے عادل ہونے اور قرآن کے مخلوق ہونے کے اعتقاد کو چھوڑ دیا۔ اس نے اصول دین کمگیں نیا مذہب ایجاد کیا جو عامہ کے نزدیک تر اور متعصب لوگوں کے لیے خوش کن تھا۔ لہٰذا بہت سے لوگ اس کے پیروکار بن گئے۔ کئی علماء جیسے غزالی، ابوبکر باقلانی، خوارزمی، شہرستانی اور ابوالحق شیرازی نے اسی کا مذہب اختیار کیا۔ بعض ارباب حکومت جو مذہب کو سیاسی پیش رفت کے لیے ضروری سمجھتے تھے جیسے مصر و شام کے ایوبی اور موحدین مغرب۔ انہوں نے اس کے مذہب کی ترویج کی (دائرۃ المعارف وجدا) ابوالحسن اشعری۔ باتلخیص)

اور جو چیزیں حاضر نہیں، ان کی بات ہو تو ممکن ہے کہ نابینا شخص ان چیزوں کو جو اس سے کافی فاصلہ رکھتی ہیں۔ انہیں دیکھ لے۔ مثلاً وہ بہترین عمارتیں جو اندلس میں ہیں، یہاں بیٹھے بیٹھے وہ ان کا مشاہدہ کرے۔ [1]

ان تعبیرات سے بخوبی معلوم ہوا کہ یہ لوگ صرف الفاظ سے کھیل رہے ہیں جب کہ رویت کا مفہوم عرف ولغت میں جو کچھ ہے وہ اس کے سوا تو کچھ نہیں۔

اگر ان کا مقصد دل وعقل سے رویت ہے تو یہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ اس میں بحث وجدال کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ظاہری آنکھ سے مشاہدہ مراد ہے تو یہ شبکہ چشم پر انعکاس کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اگر ان دو طریقوں کے علاوہ ان کا کوئی تیسرا دعویٰ ہے تو یہ مبہم، نامعقول اور ناقابل تصور مطلب ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تصور کے بغیر تصدیق محال ہے۔

ظاہراً جب اشاعرہ پر اشکالات وارد ہوئے اور انہوں نے جواب دینے میں تنگی محسوس کی تو تدریجاً وہ اپنے دعویٰ سے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ اب وہ ایسے مقام تک پہنچ گئے ہیں کہ صرف لفظ رویت ہی رہ گیا ہے، لیکن اس کا مفہوم بھی سوائے عقل کے مشاہدہ کے اور کچھ نہیں رہا کیونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ رویت خدا مکان وہیئت اور صورت مرئی کے انعکاس سے خالی ہے اور یہ رویت نابینا کے لیے بھی ممکن ہے تو ظاہر ہے کہ یہ رویت باطنی وقلبی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

تعجب ہے کہ بعض لوگوں نے کچھ اور مبہم تغیرات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن خدا (مومنوں کے لیے) چھٹی حس پیدا کرے گا جس سے وہ خدا کو دیکھ سکیں گے۔ اس سے قطع نظر کہ چھٹی حس بالکل گنگ ومبہم ہے اور وہ مشاہدہ ورویت کے مشکل مسئلہ کو حل نہیں کرسکتی۔ لہٰذا یہاں لفظ رویت سے معنی مجازی لینے کے سوا اور کوئی بات صحیح نہیں ہے۔

وہ چیز جس نے اشاعرہ اور اس قسم کے لوگوں کو قیامت کے دن رویت خدا کے نظریئے کو قبول کرنے پر آمادہ کیا ہے وہ درحقیقت بعض روایات پر انحصار ہے جو پڑھنے والے کو اس وہم میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ انشاء اللہ اس بحث کے بعد ہم ان روایتوں پر سیر حاصل گفتگو کریں گے۔

(۳) نفی رویت خدا کے بارے میں عمدہ روایات

رویت خدا کے سلسلہ میں نہج البلاغہ اور باقی مدارک اسلامی میں اہلبیتؑ کے ایسے فرامین موجود ہیں جن میں صراحت کے ساتھ رویت خدا کی نفی کی گئی ہے۔ خدا کی رویت فقط قلب وجان ہی سے ہوسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم بطور نمونہ چند روایات کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) نہج البلاغہ میں ایک مشہور روایت میں ہے کہ حضرت علیؑ کے ایک پیارے صحابی ''ذعلب یمانی'' نے آپؑ سے سوال کیا: ''هل رایت ربك یا امیر المومنین؟'' یا امیر المومنینؑ کیا آپؑ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟

---

[1] شرح قوشجی صفحہ ۴۳۵، ۴۳۶۔

امامؑ نے فرمایا"آفا عبدمالا اری" کیامیں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جسے میں نے دیکھا نہیں؟
اس نے پوچھا"و کیف تراہ" آپؑ اسے کیونکر دیکھتے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا

"لا تدرکه العیون بمشاهدة العیان ولکن تدرکه القلوب بحقائق الایمان۔"

''آنکھیں اسے کھلم کھلا نہیں دیکھتیں بلکہ دل ایمانی حقیقتوں سے اسے پہچانتے ہیں۔''[1]

(۲) حضرت امام محمد باقرؑ کے صحابی ابو ہاشم نے آپؑ سے "لاتدرکه الابصار هو یدرك الابصار" کی تفسیر پوچھی۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا:

اوهام القلوب ادق من ابصار العیون، انت قدتدرك بوهمك الستند والهند والبلدان التی لم تد خلها ولا تدرکها ببصرك، واوهام القلوب لا تدرکه۔ فکیف ابصار العیون۔"

''قلبی تصورات آنکھوں کے مشاہدات سے زیادہ طاقت ور اور دقیق ہیں کیونکہ دل تخیلات کی قوت سے تو سرزمین سندھ، ہند اور ایسے شہروں کا تصور کرتا ہے جن کو آنکھ سے نہیں دیکھا اور نہ ہی ان میں تو وارد ہوا لیکن خدا کو تو قلبی تصورات اور خیالات کی طاقت پر بھی درک نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ آنکھیں اس کا مشاہدہ کرسکیں۔''[2]

(۳) ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک خارجی نے امام محمد باقرؑ سے سوال کیا"ای شیء تعبد" کس چیز کی آپؑ عبادت کرتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا''اللہ تعالیٰ''۔ اس نے عرض کی"رائیته؟" آپؑ نے اس کو دیکھا ہے۔'' فرمایا:

"بل لم تره العیون بمشاهدة الابصار ولکن رأتة القلوب بحقائق الایمان لا یعرف بالقیاس، ولا یدرك بالحواس، ولا یشبه بالناس موصوف بالایات معروف بالعلامات، لایجور حکمه، ذلك الله لا اله الاهو۔"

''ظاہری آنکھ اس کا مشاہدہ نہیں کرسکتی لیکن قلب و دل حقیقت ایمان کے ساتھ اس کا تصور کرسکتے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۷۷

[2] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۹۳ حدیث ۱۱ (باب ابطال الرویہ)

موجودات پر قیاس کر کے اس کی پہچان نہیں ہوسکتی۔اس کی توصیف،اس کی نشانیوں کے ذریعہ بھی ہوسکتی ہے۔ علامات کے ذریعہ اس کی پہچان ہوسکتی ہے۔وہ اپنے حکم وحکومت میں ظلم نہیں کرتا۔یہ ہے خدا جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

خارجی نے جب یہ سنا تو یہ کہتے ہوئے باہر نکلا،خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت وامامت کہاں رکھے اور قرار دے۔(اللہ اعلم حیث یجعل رسالته)۔[1]

(۴) ایک اور حدیث میں حضرت ابومحمدؑ امام حسن عسکری (علیہ السلام) سے سوال کیا (کس طرح انسان پروردگار کی عبادت کرتا ہے جب کہ وہ اسے نہیں دیکھتا)۔آپؑ نے یہ لکھ بھیجا:

''جل سیدی مولای والمنعم علی وعلی اٰبائی ان یری'' میرا آقا،میرا مولا،مجھے اور میرے آباؤاجداد کو نعمتیں دینے والا اجل اور برتر ہے اس سے کہ ظاہری آنکھ سے دیکھا جائے۔

راوی نے پوچھا: کیا پیغمبر اکرمؐ نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا؟

امامؑ نے جواب میں لکھا''ان اللہ تبارك وتعالی اری رسوله بقلبه من نور عظمته ما احب'' خدا نے اپنا نورِعظمت جس قدر چاہا اپنے رسولؐ کے قلب کو مشاہدہ کرایا۔[2]

(۵) حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث میں روایات اہل سنت کے جواب میں رویت الٰہی میں بڑی عمدہ تشبیہ نقل کی گئی ہے۔ فرمان ہے:

''سورج نور کرسی کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے اور کرسی نورِعرش کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے اور عرش نورِحجاب کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے اور حجاب نورِسر کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔جو لوگ خدا کے دیدار کا دعویٰ کرتے ہیں اگر درست کہتے ہیں تو نور خورشید کی طرف نظر کریں اور جب بادل نہ ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے سورج کو دیکھ لیں۔''[3]

عرش،کرسی،حجاب اور سر خدا کے مختلف غیبی عوالم کی طرف اشارہ ہیں۔اصل میں کہنا یہ ہے کہ سورج اپنی عظمت کے باوجود اس جہان کے موجودات میں سے ایک موجود ہے۔جب انسان اپنی آنکھ سے اس چھوٹے سے موجود کو دیکھنے پر قادر نہیں تو ذاتِ پروردگار کے دیدار کا انتظار کیوں۔حقیقتاً یہ بات سورۂ اعراف میں حضرت موسیٰ کے واقعہ میں مذکور اشیاء کے مشابہ ہے۔(بنی اسرائیل کا پہاڑی کی طرف دیکھنا،بجلی کی

---

[1] اصول کافی جلد ا صفحہ ۹۳ حدیث ۵ (باب ابطال الرؤیت)۔

[2] توحید صدوق صفحہ ۱۰۸۔حدیث ۲

[3] توحید صدوق صفحہ ۱۰۸۔اصول کافی جلد ا صفحہ ۹۸۔باب ابطال رویت۔حدیث ۷

چمک اور عالم ہستی کے اس چھوٹے سے شعلہ کو نہ دیکھ سکنا اور دیدار کی خواہش رکھنا)۔

(۶) ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت امام علی رضا سے یہ سوال کیا گیا: کیا یہ صحیح ہے کہ خدا نے رویت اور کلام دو انبیاء میں تقسیم کر دیئے ہیں؟ موسیٰ سے کلام کیا اور رسول اکرمؐ کو اپنا جمال دکھایا۔ اس سوال کے جواب میں آپؑ نے فرمایا: خدا کی طرف سے جنوں و انسانوں کے لیے یہ پیغام کون لایا ہے:

لا تدرکه الابصار وهو یدرك الابصار" ولا یحیطون به علما۔ لیس کمثله شیئٌ"

''آنکھیں اسے نہیں پا سکتیں۔ وہ آنکھوں کو پا لیتا ہے۔ لوگ خدا کا علمی احاطہ نہیں کر سکتے۔ کوئی چیز خدا کا مثل نہیں۔''

کیا یہ سارے پیغام رسولِ اکرمؐ ہی نہیں لائے؟

راوی نے عرض کیا: ''ہاں''۔ امامؑ نے فرمایا: کس طرح ممکن ہے کہ خدا کی طرف سے اس طرح کا پیغام لانے والا رسول لوگوں سے کہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے خدا کا مشاہدہ کیا ہے، میں نے اس کا علمی احاطہ کیا ہے، وہ انسان کی شکل وصورت میں ہے۔ کیا تم لوگ شرم نہیں کرتے؟ حتی کہ زندیق و بے دین افراد بھی رسول اللہؐ کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکے کہ وہ خدا کی طرف سے پیغام لے کر آتے ہیں پھر اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ [1]

اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔ مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں چونتیس احادیث، صدوق نے کتاب توحید میں چوبیس احادیث اور مرحوم کلینی نے اصول کافی میں بارہ حدیثیں نقل کی ہیں۔ سب کی سب اہلبیتؑ کے پاکیزہ مکتب توحید کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ ان میں سے بعض کا یہاں ہم نے ذکر کیا ہے۔ انہی سے ''ظاہری آنکھ سیر رویت خدا'' جیسی خرافات کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ [2]

خلاصہ کلام یہ کہ ظاہر آنکھ سے رویت خدا کے بطلان پر عقلی دلائل، آیات قرآنی و احادیث صحیح اسلامی شاہد ہیں۔

اب ہم رویت کے قائل لوگوں کے شبہات اور ان کے جوابات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

(۴) ظاہری رویت کے طرفداروں کے دلائل

جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ اہل سنت کے علمائے قدیم بلکہ آج کے بعض علماء بھی ظاہری آنکھ سے رویت خدا کے قائل ہیں لیکن دنیا میں نہیں آخرت میں دیدار کے منتظر ہیں۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ خدا چھٹی حس پیدا کرے گا جس سے آخرت میں اس کا دیدار ہو سکے گا یا اس آنکھ

---

[1] توحید صدوق۔ حدیث ۹ (یا خلاصہ) ص ۱۱۱

[2] بحارالانوار جلد ۴ صفحہ ۲۶۔۶۱ توحید صدوق صفحہ ۱۰۷۔۱۲۳۔ اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۹۵۔۹۶

کے علاوہ کوئی اور آنکھ ہوگی۔حتی کہ آج کے نابینا انسان بھی آخرت میں اس نئی آنکھ سے خدا کو دیکھیں گے۔

بحسب ظاہر ان کا اس عقیدہ کو قبول کرنا، اس کی تفسیر میں ان کی پریشانی اور پھر عجیب وغریب تاویلیں کرنا اس کا اصل سبب بعض روایات اور قرآن مجید کی کچھ آیات ہیں جن کی صحیح تفسیر نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ اس اضطراب وحیرت میں جا پڑے ہیں۔

پہلے مرحلہ میں بطور نمونہ مندرجہ ذیل احادیث کی طرف توجہ کریں:

(۱) پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے۔فرمایا:

"انکم سترون ربکم کما ترون هذا القمر لا تضامون فی رویته۔"

"تم عنقریب خدا کو دیکھ لو گے جس طرح چاند کو دیکھتے ہو۔دیکھنے میں کوئی مشقت نہ اٹھاؤ گے اور نہ اژدہام کرو گے۔"[1]

(۲) اسی کتاب میں ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اکرمؐ نے پوچھا "تضامون فی رویة القمر لیلة البدر؟ کیا چودھویں رات کے چاند کے دیکھنے میں ایک دوسرے کے مزاحم ہوتے ہو؟ اصحاب نے کہا نہیں۔(سب دیکھ سکتے ہیں۔ایک دوسرے کے مزاحم ہونے کی ضرورت نہیں) آپؐ نے فرمایا: "فکذلك لا تضامون فی رویة ربکم یوم القیامة۔" اسی طرح قیامت کے دن تمہیں اپنے پروردگار کی رویت میں مزاحمت ومقابلہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔"[2]

(۳) اسی کتاب کی ایک اور روایت میں ابورزین ناقل ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"ضحك ربنا من قنوط عباده وقرب غیره۔" ہمارا پروردگار بندوں کے مایوس ہونے اور بجز اس کے دوسروں کے نزدیک ہونے پر مسکراتا ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے پوچھا: یارسول اللہؐ خدا بھی ہنستا ہے۔فرمایا: ہاں۔

میں نے کہا "لن نعدم من رب یضحك خیراً" جو خدا ہنستا ہے وہ کسی نیکی سے دریغ نہیں کرے گا۔[3]

(۴) ایک روایت میں ابوعاصم عبادانی جابرؓ بن عبداللہ سے ناقل ہی کہ رسولؐ خدا نے فرمایا

"بینا اهل الجنة فی نعیمهم اذسطع لهم نورفر فعوا رء وسهم فاذا الرب قد اشرف علیهم من فوقهم فقال: السلام علیکم یا اهل

---

[1] سنن ابن ماجہ جلد ۱ (مقدمہ باب ۱۳۔حدیث ۱۷۷) مجمع البحرین میں ہے۔تضام القوم ایک دوسرے سے مل گئے۔

[2] سنن ابن ماجہ جلد ۱۳ حدیث ۱۷۸

[3] سنن ابن ماجہ صفحہ ۶۴ حدیث ۱۸۱

الجنة! قال وذلك قول الله سلام قولا من رب رحيم۔ قال فينظر اليهم وينظرون اليه۔"

''جب اہل بہشت نعمتوں میں غوطہ زنی کر رہے ہوں گے ایک نور ظاہر ہوگا۔ یہ سر بلند کر کے دیکھیں گے کہ پروردگار ان کے اوپر سے ظاہر ہوا اور کہہ رہا ہے اے اہل جنت تم پر میرا سلام ہو اور قرآن میں بھی یہی آیا ہے۔"سلام قولا من رب رحیم" پھر مزید کہا ہے: وہ خدا کی طرف دیکھیں گے اور خدا ان کی طرف دیکھے گا۔''[1]

ابن ماجہ مذکورہ بالا حدیث درج کرنے کے بعد مصباح الزجاجہ سیوطی سے نقل کرتے ہیں کہ ابو عاصم عبادانی کی احادیث قابل اعتبار نہیں ہیں۔

صحیح بخاری جو اہل سنت کی مشہور ترین کتاب ہے اس میں بھی جریر بن عبداللہ سے کتاب ''مواقیت الصلوٰۃ'' کے دو مختلف ابواب میں مختصر سے تفاوت کے ساتھ حدیث اول کو نقل کیا ہے۔[2]

صحیح بخاری میں آیات کی تفسیر کرتے ہوئے بھی قیامت کے دن خدا کے دیدار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔[3]

(۵) صحیح مسلم ''کتاب الصلاۃ'' میں ابو ہریرہ سے کئی روایات منقول ہیں کہ خدا ہر رات آسمان دنیا پر تشریف لاتا ہے اور اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ انہی میں سے ایک روایت میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ

"اذا معنیٰ شطرا لليل آوثلثاه ينزل الله تبارك و تعالى فيقول هل من سائل يعطى؟ هل من داع يستجاب له؟"

رات کا ایک حصہ یا دو تہائی رات گزرتی ہے تو خدا آسمان دنیا کی طرف آجاتا ہے اور فرماتا ہے: ہے کوئی سائل تا کہ اسے عطا کیا جائے۔ ہے کوئی دعا کرنے والا تا کہ قبول کی جائے۔[4]

اس روایت میں اگرچہ رویت خدا کا ذکر نہیں، لیکن خدا کی جسمیت، مکان، حرکت نزول وصعود کا تذکرہ ہے۔

افسوس ہے کہ اس قسم کی روایات ایسی معروف ومشہور کتابوں میں بار بار نقل ہوئی ہے، ان میں سے بعض کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ

---

[1] سنن ابن ماجہ صفحہ ۶۵ حدیث ۱۸۴

[2] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۴۵، ۱۵۰ (طبع دار الجبل بیروت)

[3] صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۵۶۔ تفسیر سورۂ النساء

[4] مسلم جلد ۱۔ کتاب الصلوٰۃ المسافرین (باب ترغیب فی الدعا)

روایات صریحاً قرآن کی مخالف ہیں مثلاً کوئی آنکھ اس کو نہیں دیکھ سکتی۔ ''اے موسیٰ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے۔'' نیز حکم عقل کی بھی مخالف ہیں۔ لہٰذا ان کو ایک طرف رکھا جائے۔ اگر ان کی مناسب توجیہ یا تفسیر ہوسکتی ہے تو ٹھیک وگرنہ حتماً و یقیناً انہیں جعلی اور وضعی سمجھا جائے۔ (چونکہ صراحتاً مخالف قرآن ہیں)۔

تعجب ہے کہ ان میں بہت سی روایات حضرت ابو ہریرہؓ تک پہنچی ہیں جو خود کئی جہات سے مورد سوال ہیں۔

جیسا کہ پیشتر ہم نے ایک روایت میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے نقل کیا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی خدا کا صریحی پیغام لائے کہ خدا کو ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا اور پھر خود ہی دعوے کرے کہ مومن قیامت کے دن خدا کو دیکھیں گے یا ہر رات خدا آسمان دنیا پر نازل ہوتا ہے، اس طرح کا تضاد و تخالف ممکن نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مذکورہ روایات جس طرح رویت خدا کا اثبات کر رہی ہیں اسی طرح اس کا جسمانی ہونا بھی بیان کر رہی ہیں۔ خدا کے صعود ونزول، مسکراہٹ اور قہقہہ کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ رویت خدا کے قائل اشاعرہ بھی اس کو قبول نہیں کریں گے کیونکہ اشاعرہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کے لیے جسم وجسمانیت نہیں۔ پس یہ ان احادیث کے جعلی ہونے کا دوسرا ثبوت ہے۔

تعجب ہے کہ سنن ابن ماجہ میں عبداللہؓ بن عمر سے روایت ہے کہ اس نے کہا: میں نے پیغمبر اکرمؐ سے سنا ہے کہ فرمایا:

"یدنی المومن من ربه یوم القیامة حتی یضع علیه کنفه۔"

''قیامت کے دن خدا مومن سے اس قدر نزدیک ہوگا کہ اپنا سینہ یا بازو اس پر رکھ دے گا۔''[1]

اگر ان تعبیرات کو معنی مجازی و کنایہ پر حمل نہ کیا جائے تو یقیناً یہ ان روایات کے جعلی ہونے کی دلیل ہے کہ جن میں خدا کا سینہ اور بازو اور بال بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ اس طرح تجسم کے قائل لوگوں کے بہت سے افکار ان جعلی روایات کے قالب میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔

یہ بھی بڑے تعجب کی بات ہے کہ اب بھی ایک گروہ بے شعوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان روایات کے تحت رویت خدا کا قائل بنا ہوا ہے جب کہ مکتب اہل بیتؑ ہمیشہ اس قسم کے خرافات کی نفی کرتا رہا ہے کیونکہ نہ عقل اس کو پسند کرتی ہے اور نہ ہی آیات قرآن اس سے موافقت رکھتی ہیں۔

رویت خدا کے حامیوں نے قرآن مجید کی کئی آیات سے استدلال کیا ہے:

(۱) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾

''قیامت کے دن چہرے شاد و مسرور ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔''

(قیامت ۲۲، ۲۳)

---

[1] سنن ابن ماجہ، جلد ۱، صفحہ ۶۵۔ مقدمہ حدیث ۱۸۳۔ (کنف بروزن ہدف ہے۔ اس کے کئی معنی ہیں۔ ان میں سے بازو، سینہ، بال، پہلو اور سایہ بھی ہیں۔

کلمہ ناظرہ کا مادہ ''نظر'' ہے، جس کا معنی نگاہ کرنا اور انتظار کرنا بھی ہے۔ اس آیت کو جب دوسری آیات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جن میں ہے ''کوئی آنکھ خدا کو نہیں دیکھ سکتی'' تو اس متشابہ کی تفسیر محکم آیت کے وسیلہ سے واضح ہو جائے گی۔

اتفاقاً اس قسم کی بہت سی تعبیرات کنایہ کے عنوان سے استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں فلاں شخص کی نظر تم پر لگی ہوئی ہے۔ اس کی نظر صرف تیری طرف ہے۔ یعنی وہ تیری محبت اور عطا و لطف کا منتظر ہے۔ اہل جنت کی نظریں اور توجہ قیامت کے دن خدا کی طرف ہی ہوگی اور اس سے مراد خدا کے ہر قسم کے لطف و کرم اور محبت کا انتظار ہے۔

مزید ار بات یہ ہے کہ جملہ "الی ربہا ناظرۃ" (جار و مجرور کی تقویم کی وجہ سے) حصر پر دلالت کر رہا ہے یعنی وہ فقط خدا کی طرف دیکھ رہے ہوں گے جب کہ مسلم ہے کہ وہ قسم قسم کی نعمت ہائے جنت کا مشاہدہ کر رہے ہیں جیسے درخت، نہریں، میوے اور حوریں وغیرہ۔ یہ واضح دلیل ہے کہ ان کا اس کی طرف نگاہ کرنا صرف اس لیے ہے کہ وہ اسی کی ذات سے ان نعمتوں اور عطیوں کا انتظار رکھتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مراد شہود باطنی اور ہر قسم کے شک و تردید سے خالی رویت قلب و جان ہو۔ پیغمبرؐ کی وہ حدیث اس امر کی دلیل ہے جس کے ناقل انسؓ بن مالک ہیں۔ فرمان ہے: "ینظرون الی ربہم بلا کیفیۃ ولا حد محدود ولا صفۃ معلومۃ" یہ لوگ پروردگار کی طرف کسی کیفیت، حد معین اور صفت مشخص کے بغیر دیکھ رہے ہوں گے۔ [1]

ظاہر ہے اگر رویت آنکھ کے ذریعہ ہوتی تو پھر اس کا غیر مشخص اور بے کیفیت ہونا متصور نہیں ہو سکتا تھا۔

علامہ بزرگوار مرحوم سید شرف الدین کتاب (کلمۃ حول الرویۃ) میں رویت خدا کے سلسلہ میں محدثین اہل سنت کی احادیث کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یہ لوگ ان روایات کو صحیح سمجھتے ہوئے ایسے راستہ کے راہی بنے ہیں جو انہیں جسمیت کی طرف لے گئی ہے۔ یہ ایسی راہ ہے جو خلاف نقل و عقل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ یہ احادیث صحیح ہیں اور نہ ہی شریعت و عقل ان کو قبول کر سکتی ہے۔ لیکن احادیث کی کثرت نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ عقل کو ایک طرف رکھ دیں اور جس قدر زحمت بھی ہو آیات قرآنی کو اس کے مطابق بنائیں۔ یہ ایسا کام ہے جس میں سے خیر کی کوئی توقع نہیں ہے۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون"

پھر انہوں نے "وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے لفظ ''نظر'' خاص کر جب "الی" کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی رویت و مشاہدہ نہیں بلکہ اس کا معنی ٹکٹکی لگا کر کسی شے کی طرف دیکھنا جب کہ وہ قابل رویت بھی نہ ہو جیسا کہ اہل سنت نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

قرآن مجید میں ہے: وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ ''مشرکوں کو تو دیکھو کہ وہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں جب کہ وہ کچھ دیکھ نہیں رہے ہیں۔'' (اعراف ۱۹۸)

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۲۰۔ صفحہ ۲۰۴

آیت بالا سے ذہن میں یہی متبادر ہوگا کہ سب خدا کے فضل وکرم (جو قیامت کے دن ہوگا) کے منتظر ہیں۔ (جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا)۔ اس کلمہ کا استعمال اس معنی میں حقیقت ہے مجاز نہیں اور یہی چیز اشعار اور روزمرہ گفتگو میں کثرت سے دیکھی جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

وجوہ ناظرات یوم بدر
الی الرحمن تنتظرو الخلاصا

''بدر کے دن چہرے اور صورتیں خدائے رحمان کی طرف دیکھ رہی تھیں اور انہیں نجات ورہائی کا انتظار تھا۔''

دوسرا شاعر کہتا ہے:

انی الیك لما وعدت لناظر
نظر الفقیر الی الغنی الموسر

''میں وعدہ وفائی کے لیے تیری طرف دیکھ رہا ہوں۔ یہ درحقیقت فقیر ومحتاج کی نگاہ ایک لاپرواہ کی طرف ہے۔''

پھر فرماتے ہیں:

میں ان مسلمان بھائیوں پر تعجب کرتا ہوں کہ کس طرح وہ رویت خدا کو ممکن سمجھتے ہیں اور اس کے وقوع پر دلیلیں قائم کرتے ہیں۔ کیا ظاہری معنی بھی ان پر مخفی وپوشیدہ ہوگیا ہے جب کہ لوگ آیات متشابہ کو دیکھتے ہیں تو ان کی تاویل کرتے ہیں۔ جیسے:

"الرحمن علی العرش استوی" عرش پر خدا کا تسلط ہوا۔ (طٰہٰ ۵)

"یداللہ فوق ایدیھم" خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ (فتح ۱۰)

ایسی آیات سے انہوں نے خدا کی جسمیت ومکان اور حرکت مراد نہیں لی بلکہ پہلی آیت میں عرش پر خدا کا تسلط اور دوسری آیت کو خدا کی قدرت فائقہ کے لیے کنایہ قرار دیا ہے۔ معلوم نہیں کہ ''الی ربھا ناظرۃ'' کے صحیح معنی کو چھوڑ کر اس کا معنی رویت کس طرح سے لیا ہے؟

علاوہ ازیں ایسا ہوسکتا ہے کہ آیت سے رویت قلبی مراد ہو جب کہ کلام حضرت امیر المومنینؑ میں ہے "لو کشف العطاء ما ازددت یقینا" اگر پردے ایک طرف کردیئے جائیں تو اس سے میرے یقین میں زیادتی نہیں ہوگی۔ دوسرے کلام میں ارشاد ہے: کیا میں اس خدا کی پرستش کروں جسے میں نے دیکھا نہیں؟ پھر صراحتاً ارشاد فرمایا: ''ظاہری آنکھ اس کو نہیں دیکھ سکتی بلکہ چشم دل حقیقت ایمان سے اس کو دیکھ رہی ہے۔''

یا ان کے فرزند سردارِ شہیداں حضرت امام حسینؑ بارگاہِ خداوندی میں دعائے عرصہ میں کہہ رہے ہیں:

"عمیت عین لا ترالك علیھا رقیبا" اندھی وہ آنکھ جو تجھے اپنا نگران نہیں پاتی۔ [1]

---

[1] کتاب ''کلمہ حول الرویۃ'' صفحہ ۴۸ تا ۵۳۔ (خلاصہ)

(۲) اپنے مقصود کے اثبات کے لیے انہوں نے اس آیہ سے استدلال کیا ہے۔ کلا انهم عن ربهم یومئذ لمحجوبون (مطففین ۱۵) ''بات ہرگز اس طرح نہیں جیسے (تجاوزگران گناہگار و بےایمان) خیال کرتے ہیں کہ قیامت کے دن پروردگار سے محجوب ہوں گے۔'' یہ لوگ تصور کرتے ہیں کہ مومن محجوب نہیں ہوں گے اور خدا کو دیکھیں گے۔ جب کہ کلمہ حجاب، حجاب ظاہری اور باطنی و معنوی ہر دو ہو سکتے ہیں۔ آیہ موردِ بحث میں دوسرے معنی مراد ہیں جس کا قرینہ آیت ماقبل ہے۔ فرمان ہے:

کلا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون

''بات اس طرح نہیں جس طرح یہ خیال کر رہے ہیں بلکہ برے اعمال سے ان کے دل زنگ آلود ہو چکے ہیں اور وہ حقیقت کو سمجھنے سے عاجز ہو گئے ہیں۔'' (زنگ سے مراد زنگ معنوی ہے نہ ظاہری)

اس کی واضح شاہد سورۂ حم سجدہ کی آیت نمبر ۵ ہے کہ کفار کی زبانی کہا گیا ہے: "ومن بیننا وبینك حجاب" ہمارے اور آپ کے درمیان حجاب ہے۔ مسلم ہے کہ اس حجاب سے مراد ظاہری نہیں۔ سورۂ اسراء کی آیت ۴۵ میں ہے جعلنا بینك وبین الذین لا یومنون بالاخرة حجابا مستورا" تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے پوشیدہ حجاب قرار دیا ہے۔ لہٰذا قیامت کے دن کافر اس محبوب کی لقاء معنوی سے محروم ہیں۔ ان کے اور خدا کے درمیان حجاب اور پردہ ہے۔

(۳) تیسری آیت جس کو انہوں نے اپنے مقصود کے لیے وسیلہ بنایا ہے وہ یہ ہے "انهم ملاقوا ربهم" ''یہ لوگ قیامت کے دن اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے۔'' (بقرہ ۴۶)

ان کا خیال ہے کہ ملاقات سے مراد مشاہدہ ہے۔

جب کہ آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن ملاقات صرف مومنوں سے مخصوص نہیں بلکہ مومن و کافر اس میں برابر ہیں جب کہ یہ لوگ رویت خدا قیامت کے دن صرف مومنوں سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ اس کا شاہد انشقاق کی آیت ۶ ہے "یاایها الانسان انك کادح الی ربك کدحا فملاقیه" ''اے انسان تو رحمت و مشقت کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہے اور بالآخر اس کی ملاقات کرے گا۔

اس آیت میں مخاطب تمام انسان ہیں سورۂ توبہ کی آیت ۷۷ میں ہے (فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ)

اس عمل (عہد شکنی) نے ان کے نفاق کو ان کے دلوں میں قیامت کے روز ملاقات خدا تک برقرار کر دیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے وعدۂ الٰہی سے تخلف کیا اور اس کے لیے جھوٹ بولا ہے۔

یہ آیت منافقوں سے مخصوص ہے جب کہ اس میں ملاقات خداوندی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ لقاء اللہ جس طرح بھی ہو صرف مومنوں کے ساتھ مختص نہیں، یہ مومن و کافر ہر کسی کو شامل ہے جب کہ یہ لوگ اسے مومنوں سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ توجہ رہے کہ لقاء سے مراد

ایک چیز کا دوسری چیز کو مس کرنا ہے۔اس کا معنی رویت ومشاہدہ نہیں ہے۔ہم جانتے ہیں کہ یہ معنی خدا کے بارے میں محال ہے اور اشاعرہ بھی اس کے قائل نہیں۔لہٰذا اس معنی کو کنائی سمجھنا چاہیے۔

قرآن مجید کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے (یوم لقاء الله) روز قیامت کی طرف اشارہ ہے۔اسی دن انسان خدا کی طرف سے حساب وکتاب اور جزا سزا کا سامنا کریں گے۔

لہٰذا کئی آیات میں "لقاء الله" کی جگہ "یقاء یومهم هذا" "اس دن کی ملاقات (اعراف ۵۱) یا "لقاء یومکم هذا" "آج کے دن تمہاری ملاقات" (سجدہ ۱۴) آیا ہے۔

بعض آیات میں ملاقات کی تعبیر حساب وکتاب سے ہوئی ہے۔جیسے "ان ظننت انی ملاق حسابیه" "میں جانتا تھا کہ اپنے حساب کا سامنا کروں گا (حاقہ ۲۰) اسی وجہ سے بہت سے ارباب لغت نے "لقاء الله" سے یہی معنی مراد لیا ہے۔راغب "مفردات" میں کہتے ہیں۔"ملاقاة الله عزوجل عبارة عن القیامة" ملاقات خدا کا معنی قیامت ہے۔

"ابن اثیر نہایہ میں کہتے ہیں "المراد بلقاء الله المسیر والی دار الاخرة" لقاء اللہ سے مراد روزِ آخرت کی طرف جانا ہے۔ابن منظور نے "لسان العرب" میں یہی معنی مراد لیا ہے۔

روایات میں بھی یہی معنی دیکھا جاسکتا ہے جیسے پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہے:

"من حلف علی یمین لیقتطع بها مال امرء مسلم لقی الله وهو علیه غضبان"

"جو شخص کسی کا مال بٹورنے کے لیے خدا کی قسم کھائے قیامت میں اس طرح جائے گا کہ خدا اس پر غضبناک ہوگا۔" [1]

ظاہراً قیامت کو "لقاء اللہ" سے تعبیر کرنا اس لیے ہے کہ انسان اس دن فرمانِ خدا کو ہر جگہ محسوس کرے گا، حساب میں، عرصہ محشر، بہشت یا دوزخ میں اور وجود خدا اس قدر واضح وآشکار ہوگا کہ ہر مومن وکافر اس کو چشم دل سے واضح طور پر دیکھ رہا ہوگا۔

تعجب ہے کہ اشاعرہ نے کچھ اور آیات سے بھی استدلال کیا ہے جب کہ ان میں اس امر کی کوئی معمولی دلالت بھی نہیں پائی جاتی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے آیات قرآن کی تاویلیں کر رہے ہیں جیسے آیہ (للذین احسنوا الحسنی و زیادة) جو نیک کام کریں گے اس کی جزا نیک اور زیادہ ہوگی۔(یونس ۲۶) کہتے ہیں کہ زیادہ سے مراد رویت خدا ہے۔

جب کہ آیت میں اس بات کا اشارہ ذرہ برابر بھی نہیں۔بلکہ یہ اس مطلب کو بیان کر رہی ہے جس کا تذکرہ آیت ۱۶۔انعام میں ہے۔ فرمان ہے من جآء بالحسنة فله عشر امثالها۔ جو نیک کام کرے گا اسے دس گنا اجر دیا جائے گا۔اسی طرح "لهم مایشاءون فیها

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۳ صفحہ ۵۱ ذیل آیہ ۴۶ بقرہ

ولدینا مزید" ''جنتی اور بہشتی جو چاہیں گے دیا جائے گا اور ہمارے ہاں نعمتوں کی زیادتی بھی ہوگی۔'' (ق ۳۵) ان لوگوں کا کہنا ہے کہ "ولدینا مزید" سے رویت پروردگار مراد ہے جب کہ اس مطلب کی طرف اس آیت کا معمولی اشارہ بھی نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ رویت خدا خلاف عقل ونقل ہے۔ رویت کا جو مطلب بھی لیں وہ جسمیت خدا کو لازم ہے (مگر یہ کہ اس سے مراد رویت قلبی ہو۔ رویت عینی پر آیات وروایات میں کوئی دلیل نہیں۔ فقط متشابہ آیات سے انہوں نے استدلال کیا ہے جب کہ قرآنی دستور ہے کہ متشابہ آیات کو محکم آیات سے ملا کر ان کی تفسیر کی جائے۔

جو روایات نقل کی گئی ہیں وہ بھی خلاف عقل وقرآن ہیں اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان کو ایک طرف رکھ دیں کیونکہ ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

مرحوم علامہ شرف الدین نے اپنی کتاب (کلمہ حول الرویۃ) میں ان روایات پر تنقید کی اور جعلی قرار دیا ہے۔ (مزید وضاحت کے لیے اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں)۔[1]

آج کے زمانہ میں جب مسائل اعتقادی میں عقل وفکر سے کام لیا جا رہا ہے اور یہ مسائل قرآن کی آیات کی روشنی میں بہت واضح ہو چکے ہیں، یہ کتنی ناپسندیدہ بات ہے کہ ایسے وقت میں بھی انسان (ظاہری آنکھ سے رویت خدا جیسی) خرافات کا قائل ہو۔

(۵) خدا کا جسم نہیں

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ایک گروہ ''مجسمہ'' نام سے ہے جو خدا کے جسم کا قائل ہے۔ جسم کے جس قدر صفات وعوارضات ہیں وہ خدا کے بارے میں ان کے بھی قائل ہیں، ان سے ایسی باتیں نقل کی گئی ہیں جو مضحک اور شرم آور ہیں۔ شہرستانی نے ملل ونحل میں ان سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: خدا کو ہاتھ سے مس کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مصافحہ ہو سکتا ہے۔ مخلص مسلمان اس کو اپنی آغوش میں لے سکتے ہیں اور معانقہ کر سکتے ہیں جیسے کہ اس عقیدہ کا حامی داؤد جواربی کہتا ہے: اعفونی عن الفرج واللحیۃ و اسئلونی عما وراء ذلك۔ مجھ سے آلہ جنسی اور داڑھی کو چھوڑ کر باقی جس چیز کا چاہیں سوال کریں۔ میرا معبود جسم رکھتا ہے۔ گوشت وخون ہے، ہاتھ پاؤں، سر، زبان، دو آنکھیں اور دو کان رکھتا ہے۔ اس کا جسم ہے نہ باقی اجسام کی طرح اس کا گوشت ہے نہ دوسرے گوشت کی طرح۔ کوئی چیز اس کی شبیہ نہیں ہے۔

نیز اس سے نقل کیا گیا ہے کہ خدا سینہ تک ''بجوف'' (یعنی خالی ہے) اور سینہ سے نیچے تک پر ہے۔ اس کے بال بڑے، سیاہ اور گھنگریالے ہیں۔[2]

محقق دوانی ان لوگوں سے اور عجائب نقل کرتے ہیں: کہتے ہیں کہ ان کے مختلف گروہ ہیں، بعض کا خیال ہے کہ وہ گوشت وخون سے

---

[1] کلمہ حول الرویہ از صفحہ ۶۷ تا ۸۰۔

[2] ملل ونحل جلد ۱ ص ۱۰۵

مرکب ہے۔بعض کہتے ہیں وہ چمکتا ہوانور ہے جیسے سفید سورج۔اس کا طول سات بالشت اس کی اپنی بالشت سے ہے۔

بعض کہتے ہیں وہ نوخیز نوجوان ہے جس کے بال گھنگریالے ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ وہ پیر مرد و بوڑھا ہے۔اس کے سر وریش کے بال سیاہ وسفید ملے جلے ہیں۔[1]

ان بچگانہ باتوں سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ان میں کس قدر فکری پستی پائی جاتی ہے۔وہ خدا کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو بچے بھی اس کے حق میں استعمال نہیں کرتے لیکن ان مطالب کے اظہار سے انہیں شرم بھی محسوس نہیں ہوتی۔البتہ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ آج کے زمانہ میں مسلموں وغیر مسلموں میں کوئی ان خیالات کا حامل ہو۔

چونکہ ہر افراط کے مقابلہ میں تفریط بھی ہوتی ہے۔لہٰذا ان کے نقطہ مخالف میں وہ لوگ ہیں جو تشبیہ کے معاملہ میں اس قدر سخت گیر ہیں کہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص "خلقت بیدی" (انسان کو میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا) پڑھتے ہوئے ہاتھ کو حرکت دے تو اس کے ہاتھ کاٹ لیے جائیں یا اگر کوئی پیغمبر اکرمؐ کی اس روایت "قلب المومن بین اصبعین من اصباع الرحمان" (مومن کا دل خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہے) کو پڑھتے ہوئے دو انگلیوں سے اشارہ کرے تو اس کی انگلیاں کاٹ لی جائیں۔[2]

بہرحال ظاہراً ان نحیف وغلط عقائد کا سرچشمہ دو چیزیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) جہان مادہ ومحسوسات کے سات انس کہ جس کے ساتھ کوتاہ فکری اور جہالت میں بھی ہو، انسان کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ مادہ کے خول سے باہر نکل سکے۔یہ ایسا انس ہے جو اس کا سبب بنتا ہے کہ خدا پر بھی اپنے جیسی صفات لاگو کر دی جائیں۔

(۲) قرآن مجید وروایات میں کچھ مجازی وکنائی تعبیریں ہیں جن سے ممکن ہے کم علم لوگوں کو جسمیت کا وہم وگمان ہو گیا ہو۔

لیکن اگر اس نکتہ کی طرف توجہ کی جائے کہ خدا کے لیے جسمیت کا قائل ہونا گویا اس کی الوہیت اور واجب الوجود ہونے کی نفی کرنا ہے کیونکہ ہر جسم کے اجزاء ہوتے ہیں اور وہ زمان ومکان کا حامل ہوتا ہے۔جسم معرض حوادث وتغیرات ہے اور ہمیشہ قبا اور کہنگی کی طرف جا رہا ہے۔یہ سب صفات خدا کی الوہیت اور اس کے واجب الوجود ہونے کی نفی کرتی ہیں۔

علاوہ ازیں اگر وہ جسم ہوگا تو پھر اس کی تشبیہ بھی ہوگی جبکہ قرآن مجید کی کئی آیات میں تشبیہ ونظیر کی نفی کی گئی ہے۔اس مطلب کو ہم امام موسیٰ کاظمؑ کے فرمان سے انتہا تک پہنچاتے ہیں:

بعض لوگوں نے حضرتؑ کی خدمت میں عرض کیا: کچھ ایسے افراد ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ خدا کا جسم ہے اور وہ آسمان دنیا پر آتا ہے۔

امامؑ نے فرمایا: خدا نیچے نہیں آتا اور نہ ہی اس کو اس کی ضرورت ہے۔اس کے لیے دور ونزدیک ایک جیسے ہیں۔وہ کسی چیز کا احتیاج نہیں رکھتا بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۳ ص ۳۸۹

[2] ملل ونحل جلد ۱ ص ۱۰۴

۳۔وہ لامکاں ہے مگر ہر جگہ موجود ہے

اشارہ

مادہ سے ماوراء وجود کا ادراک ان لوگوں کے لیے مشکل ہے جو عالم مادی کے زندان میں اسیر ہیں۔وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں اور اس سے بلند ہو کر سوچنا ان کے لیے آسان کام نہیں۔لیکن جیسا کہ ابتداء بحث صفات میں جلد اول میں ذکر کیا گیا ہے اس سلسلے میں پہلا قدم مخلوقات کی صفات سے خدا کو پاک و پاکیزہ سمجھنا ہے،خصوصاً مادی صفات جیسے زمان و مکان،تبدیلی و حرکت۔

لہٰذا جب تک ہم خدا کو مکان و محل سے مبرا نہیں مانیں گے اس کی صحیح شناخت نہیں ہو سکے گی۔اصولی طور پر محل کا ہونا چیز کے جسمانی ہونے کی دلیل ہے جب کہ گذشتہ ابحاث میں معلوم ہو چکا ہے کہ خدا نہ جسم ہے اور نہ ہی جسمانی صفات رکھتا ہے۔اس کے لیے مکان نہیں اور نہ ہی زمان ہے جب کہ وہ تمام زمان و مکان کا احاطہ کامل رکھتا ہے۔(غور کیجیے)

اس اشارہ کے ساتھ ہم قرآن مجید کی طرف آتے ہیں اور آیات ذیل کی طرف دل و جان کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں:

(۱) وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ (بقرہ ۱۱۵)

(۲) وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۴﴾ (زخرف ۸۴)

(۳) وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴﴾ (الحدید ۴)

(۴) مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷﴾ (مجادلہ ۷)

(۵) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾ (ق ۱۶)

(۶) وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا

تُبۡصِرُوۡنَ۝۸۵ [1] (واقعہ:۸۵-۸۴)

ترجمہ

(۱) مشرق ومغرب اللہ ہی کے لیے ہے۔تم جس طرف رخ کرو خدا اسی طرف ہے۔خدا وسعت والا دانا ہے۔

(۲) وہی آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے۔وہی صاحب حکمت اور پورا علم رکھنے والا ہے۔

(۳) وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے۔

(۴) تین آدمی راز کی باتیں نہیں کرتے مگر خدا ان کا چوتھا ہے اور پانچ آدمی سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا ہے۔نہ اس سے کم نہ زیادہ تعداد مگر جو بھی ہو خدا ان کے ساتھ ہے، جہاں وہ ہوں۔

(۵) ہم نے انسان کو خلق کیا اور اس کے نفس کے وسوسہ کو بھی جانتے ہیں اور ہم شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

(۶) اور تم جس حالت میں (کسی کی جان کنی کا) نظارہ کر رہے ہو تو ہم تم سے زیادہ اس کے نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

جس طرف دیکھوں اسی کو دیکھتا ہوں

(۱) قبلہ کی تبدیلی کے بعد (بیت المقدس سے کعبہ) یہودیوں کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے ذہن میں اشتباہ پیدا کر دیں اور قبلہ کی تبدیلی کو پیغمبرؐ کے خود اپنے آئین پر قائم نہ رہنے کی دلیل بنائیں۔تب پہلی آیت مورد بحث نازل ہوئی اور اس نے بیان کیا کہ مشرق ومغرب خدا ہی کے لیے ہے۔تم جس طرف منہ کرو خدا اسی طرف ہے۔خدا وسعت والا اور دانا ہے۔(ولله المشرق و المغرب فاينما تولوا فثم وجه الله ان الله واسع عليم)

وہ ہر جگہ حاضر ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔لہٰذا جس طرح منہ کرو وہ اسی طرف ہوگا۔قبلہ کا مسئلہ اس لیے ہے کہ مومنوں کی توجہ کا مرکز بنے نہ یہ کہ خدا کو محل وجہت کی ضرورت ہے۔اس کا وجود اس قدر وسیع ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر وناظر ہے۔اس کے باوجود اس کے لیے محل ومکان نہیں۔

---

[1] اس مطلب کی عمدہ آیات یہی ہیں۔اس کے مشابہ اور بھی آیات ہیں جیسے بروج ۲۰ اور انعام ۳

آیہ بالا میں مشرق ومغرب سے مراد یہ دو جغرافیائی جہات نہیں بلکہ اس قسم کی تعبیر عموماً تمام جہان کے لیے ہے۔لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ دشمنوں نے علیؑ کے فضائل چھپائے اور دوستوں نے دشمنوں کے خوف سے پوشیدہ رکھے،اس کے باوجود فضائل نے جہان کو پر کر رکھا ہے تو اس سلسلہ میں ہم کہتے ہیں (آپؑ کے فضائل نے شرق وغرب عالم کو گھیر رکھا ہے)۔

بہرحال یہ تعبیر ''جس طرف رخ کرو خدا اسی طرف ہے'' یہ تعبیر خدا کے لامکان ہونے کی روشن دلیل ہے کیونکہ ہر جگہ ہونا یا تو اس طرح ہوسکتا ہے کہ موجود وسیع اطراف رکھتا ہو،اس کے اجزا زیادہ ہوں اور وہ فضا کو پر کردے کہ اس کے ہر جز نے فضا کے ایک جز کو پر کر رکھا ہو۔ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کا تصور خدا کے سلسلہ میں محال ہے کیونکہ اس کے اجزا نہیں ہیں علاوہ ازیں قرآن کہتا ہے کہ خدا اس جگہ ہے نہ وجود خدا کا جز اس جگہ ہے (غور کریں) یا اس عنوان سے ہے کہ مکان نہ رکھتا ہو۔یعنی زمان ومکان سے مافوق ہو۔ظاہر ہے کہ اس طرح کی چیز کا وجود ہر زمان ومکان میں ایک جیسا ہوگا۔اس کے لیے دور ونزدیک کا کوئی مفہوم نہیں۔

یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ وجہ اللہ قرآن مجید میں ذات مقدس خدا کے معنی میں ہے چونکہ وجہ (بمعنی صورت) اشرف اعضاء انسان ہے۔اہم ترین حواس یعنی حواس خمسہ اس میں ہیں۔لہٰذا یہ کلمہ ذات پر بولا جاتا ہے۔

بعض مفسرین نے جو اس کا معنی رضائے خدا،ثواب خدا یا قبلہ کیا ہے۔وہ صحیح نظر نہیں آتا۔

(۲) دوسری آیت میں مشرکوں اور ان لوگوں کو جواب دیا ہے جو خدا کے فرزند کے قائل تھے،خدا کو ان اوصاف سے منزہ بتاتے ہوئے فرمان ہے:''وہی آسمان میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے،وہی صاحب حکمت اور پورا پورا علم رکھنے والا ہے۔(وھو الذی فی السماء الہ وفی الارض الہ وھو الحکیم العلیم)

الوہیت ومعبودیت خدا کے لیے کوئی معین ومخصوص جگہ ومکان نہیں۔اس کی الوہیت کا دائرہ وسیع ہے۔کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر ہے۔لہٰذا ہر چیز سے آگاہ وباخبر ہے اور اس کے افعال حکیمانہ ہیں۔اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ علیم وحکیم فقط اس کی ذات ہے کیونکہ اس کے سوا ہر ایک کا علم وحکمت ناقص اور جہالت کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

طول تاریخ میں مشرک لوگ موجودات میں سے ہر کسی کے لیے خدا اور رب کے قائل تھے۔آسمان کا خدا،زمین کا خدا،دریا کا خدا،صحرا کا خدا،جنگ کا خدا،صلح کا خدا اور اس قسم کی دیگر چیزیں۔آیہ بالا ان سب کی نفی کرتے ہوئے واضح کر رہی ہے کہ وہ خدا یکتا اور لاشریک کی ربوبیت تمام عالم کے لیے ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت اس موضوع کی بہترین دلیل ہے کہ خدا آسمان میں مستقر نہیں۔آسمان وزمین کی طرف اس کی نسبت برابر ہے۔مسلم ہے کہ خدا کا زمین میں مکان نہیں اور نہ ہی آسمان میں اس کا بسیرا ہے۔[1]

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ وہ زمین وآسمان میں معبود ہے۔آسمان میں فرشتے اس کی پرستش کرتے ہیں

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۲۳۲

اور زمین میں انسان سجدہ کر رہے ہیں۔ ایک اہم حدیث میں آیا ہے کہ (حضرت امام جعفر صادقؑ کے زمانے کا دہریہ) ابوشاکر دیصانی ہشام ابن حکم سے کہتا ہے کہ قرآن میں ایک آیت ہمارے مسلک کے موافق بھی موجود ہے۔ ہشام نے پوچھا کون سی آیت؟ اس نے کہا: "وھو الذی فی السمآء الہ و فی الارض الہ" (کیونکہ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ آسمان و زمین میں خدا کا مکان ہے یا اس سے متعدد خدا سمجھ میں آتے ہیں)۔

ہشام ابن حکم کا کہنا ہے کہ میں اس کا جواب نہ دے سکا تا اینکہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں مشرف ہوا اور یہ بات عرض کی۔ حضرتؑ نے فرمایا: یہ خبیث زندیق کا کلام ہے۔ جب واپس جاؤ تو اس سے کہو کوفہ میں تیرا نام کیا ہے۔ وہ کہے گا فلاں۔ پھر پوچھو بصرہ میں تیرا نام۔ وہ کہے گا فلاں۔ کہو ہمارا پروردگار بھی اسی طرح ہے۔ زمین میں بھی معبود والہ ہے اور آسمان میں بھی۔ وہ دریا میں بھی معبود ہے اور صحرا میں بھی معبود ہے ہر مکان میں وہ الہ و معبود ہے۔ ہشام کہتے ہیں کہ واپس آکر میں نے ابوشاکر کو تلاش کرتے ہوئے پالیا اور یہ مطلب اس سے ذکر کیا۔ ابوشاکر کہنے لگا "ھذہ نقلت من الحجاز" یہ دلیل حجاز سے آئی ہے۔ یہ تیرا کلام نہیں۔ امام جعفر صادق کا کلام ہے۔[1]

یہ تعبیر خدا کے لامکان ہونے کی طرف اشارہ ہے جسے ہر جگہ اس کا حضور بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں دو سے دو ملائیں تو چار کے برابر ہوگا۔

زمین میں بھی یہی ہے اور آسمان میں بھی، بلکہ تمام کرات جہاں میں وہی ہے۔ یہ رابطہ ریاضی کے قاعدہ کے مطابق کسی محل سے مخصوص نہیں اور اپنے مفہوم خاص کے ساتھ ہر جگہ حاضر ہے۔ اس کے باوجود لامکان بھی ہے۔ (غور کریں)

وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے

(۳) تیسری آیت میں صراحت کے ساتھ کہا جارہا ہے "وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔" (وھو معکم اینما کنتم)

چونکہ وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے "جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے (واللہ بما تعملون بصیر)

اس تعبیر سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ وہ لامکان ہے یا دوسری تعبیر کہ وہ زمان و مکان سے مافوق ہے۔ ہر جگہ حاضر اور ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت (جیسے تفسیر روح المعانی میں ہے) کہتی ہے کہ اس آیت کی تاویل کرنی چاہیے اور اس معنی مجازی پر حمل کرنا چاہیے۔ یعنی اس کا علم ہمارے ساتھ ہے نہ کہ خود وہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اس سے غافل ہیں کہ خدا کا علم حضوری ہے۔ ہماری طرح کوئی صورت اس کے ذہن میں منقش نہیں ہوتی۔ علم حضوری کا مطلب ہے کہ سب چیزیں اس کے سامنے حاضر اور اس کی ذات ہر جگہ حضور کی بدولت

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۴ صفحہ ۶۱۷ حدیث ۹۸

ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔[1]

بعض مفسر کہتے ہیں کہ ہر موجود ممکن اپنا وجود خدائے واجب الوجود سے لے رہا ہے۔ جب ممکن چیزیں وجود کا لباس پہنیں گی تو گویا واجب الوجود کا فیض ان کو پہنچ رہا ہوگا۔ اس لحاظ سے خدائے تعالیٰ ہر ماہیت کے ساتھ (اس ماہیت کے وجود سے بھی) زیادہ نزدیک ہوگا۔[2]

تفسیر المیزان میں ہے کہ ''یہ معیت'' ساتھ ہونا اس لحاظ سے ہے کہ خدا ممکنات کا احاطہ وجودی کیے ہوئے ہے اور (اینما کنتم) کی تعبیر اس کی وضاحت کر رہی ہے۔ وگرنہ خدا کی نسبت مکان وزمان اور احوال مختلف کے ساتھ ایک جیسی ہے۔[3]

لیکن جو لوگ خدا کے احاطہ وجودی ''برائے ممکنات'' کو نہیں سمجھ سکے انہوں نے آیت کا مجازی معنی لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا کے ساتھ ہونے سے مراد اس کے علم وقدرت کا تمام موجودات کو شامل ہونا ہے۔[4] لیکن حق وہی احاطہ وجودی ہے جو ظاہر آیت کے مطابق اور دلائل عقلیہ کے مناسب ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں مسئلہ نجویٰ (سرگوشی) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمان ہے:

تین آدمی راز کی باتیں نہیں کرتے مگر خدا ان کا چوتھا ہے اور پانچ آدمی سرگوشی نہیں کرتے مگر خدا ان کا چھٹا ہے۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ تعداد مگر جو بھی ہو خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں وہ ہوں۔ (ما یکون من نجویٰ ثلاثة الا هو رابعهم ولا خمسة الا هو سادسهم ولا ادنی من ذالك ولا اکثر الا هو معهم اینما کانوا)

''نجوی'' اصل میں بلند جگہ کو کہتے ہیں جو اپنی بلندی کی وجہ سے اطراف سے جدا ہو۔ چونکہ جو راز و نیاز کی باتیں کرنا چاہتا ہے وہ ساتھی کو ایسی جگہ لے جاتا ہے جہاں کوئی اس کی بات نہ سن سکے۔ لہٰذا کلمہ ''نجوی'' سرگوشی پر بولا جاتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ''نجوی'' میں لازماً تین یا تین سے زیادہ آدمی ہونا چاہیں۔ اگر دو آدمی ہوں تو یہ ''سرار'' کہلائے گا لیکن یہ مسئلہ ثابت نہیں جب کہ پیغمبر کے ساتھ نجوی سے مربوط آیات ہیں (جو اسی سورۂ مجادلہ میں ہیں) ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو اکثر تنہائی میں پیغمبرؐ کے ساتھ ''نجوی'' کیا کرتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ صرف تین نفر اور پانچ نفر کا تذکرہ کیوں؟ ان دونوں کے درمیان عدد چار کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ اس سلسلے میں مفسرین کے متعدد بیانات ہیں۔ ان میں سب سے بہتر قول یہ ہے کہ جب ''چار'' کا ذکر کیا جائے تو یہ درحقیقت جملہ اول و دوم میں اس کا ہوگا

---

[1] علم خدا کی مزید وضاحت اسی جلد میں بحث علم خدا ملاحظہ فرمائیں۔

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۱۴

[3] تفسیر المیزان جلد ۱۹ صفحہ ۱۶۷

[4] تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۶۴۰۷۔ اسی طرح کا معنی تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۳۸ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ تفسیر رازی میں متکلمین سے منقول ہے کہ یہ (معیت) یا علم کی وجہ سے ہے یا حفظ ونگرانی کی وجہ سے ہے۔ جلد ۲۹ ص ۲۱۵

(تین میں چوتھا اور چار میں پانچواں)۔ یہ تکرار فصاحت کے خلاف ہے (مگر خاص موارد میں) علاوہ ازیں جب آخر کلام میں ''نہ اس سے کم اور نہ زیادہ'' کہا گیا ہے تو جو عدد وسط میں ذکر نہیں کیا وہ اس میں آجائے گا۔ لہٰذا تین سے پہلے ''دو'' اور تین کے بعد چار اور اس طرح پانچ سے زیادہ اعداد کو شمار ہو جائے گا۔ یہ بھی فصاحت ہی کا ایک نکتہ ہے۔ اس کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ''نجویٰ'' دو کو بھی شامل ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ آیت میں منافقوں کے دو واقعات کا تذکرہ ہے جن میں سے ایک میں تین آدمیوں کا اور دوسرے میں پانچ کا ''نجویٰ'' تھا۔ [1]

بہرحال ''معیت'' (یعنی خدا کا نجویٰ کی صورت میں اپنے بندوں کے ساتھ ہونا) سے مراد اس کا احاطہ وجودی ہے جس کی طرف اس سے پہلی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

تعجب ہے کہ بعض مفسرین نے سابقہ آیت میں اس کو تسلیم کیا ہے لیکن اس آیت میں احاطہ علمی مراد لیا ہے۔ شاید اس لیے کہ ابتدائے آیت میں خدا کے علم کی وسعت اور تمام موجودات کو اس کے شمول کا تذکرہ ہے۔ (الم تر ان اللہ یعلم ما فی السموت وما فی الارض)

لیکن مسلم ہے کہ خدا کا احاطہ وجودی احاطہ علمی سے جدا نہیں کیونکہ جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ خدا کا علم حضوری ہے۔ حضور کا لازمہ یہ ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہو۔ [2] (غور کریں)

میں خود تم سے بھی زیادہ تمہارے نزدیک ہوں

(۵) پانچویں آیت میں یہی مطلب نئے قالب میں ذکر کرتے ہوئے فرمان ہے:

''ہم نے انسان کو خلق کیا اور اس کے نفس کے وسوسہ کو بھی جانتے ہیں اور ہم شہ رگ (یا رگ دل) سے بھی زیادہ اس کے نزدیک ہیں۔'' (ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس به نفسه ونحن اقرب اليه من حبل الوريد)۔

''حبل'' کا معنی محکم و مضبوط طناب ہے۔ ''ورید'' بڑی کو کہتے ہیں لیکن بہت سے لوگ اس کا گردن کے قریب دو اہم رگوں (شہ رگوں) پر اطلاق کرتے ہیں۔

بعض نے اس سے دل کے نزدیک شہ رگ کو مراد لیا ہے۔

مسلم ہے جب ''حبل'' کا تذکرہ بھی ہے تو معمولی اور چھوٹی رگیں مراد نہیں۔ اس کا اطلاق کسی دور میں سے ایک شہ رگ ہی پر ہوگا۔

ذیل آیت میں مفسرین اور ارباب لغت کے حوالے سے دونوں تفسیریں ذکر کی گئی ہیں۔ [3]

---

[1] روح البیان جلد ۹ صفحہ ۳۹۸

[2] تفسیر المیزان جلدنمبر ۱۹ صفحہ ۲۱۲

[3] التحقیق مفردات راغب۔ مجمع البحرین، لسان العرب۔ المیزان اور قرطبی وغیرہ

لیکن آیہ مورد بحث کے مناسب ''رگ دل'' ہے چونکہ آیت نمبر ۲۴ سورۂ انفال میں ہے کہ: "و اعلموا ان اللہ یحول بین المرء و قلبه" (جانو کہ خدا انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہوجاتا ہے) دونوں آیات درحقیقت خدا کے بندوں کے نزدیک ترین ہونے کا کنایہ ہے کیونکہ اگر وجود انسان کا مرکز دل کو سمجھیں تو کوئی چیز شہ رگ قلب سے زیادہ اس کے قریب نہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے ''خدا انسان کے ساتھ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔''

علاوہ ازیں ابتدائے آیت میں خدا کے وسوسہ انسانی کے عالم ہونے کا تذکرہ ہے۔ اس کی مناسبت بھی گردن سے نہیں قلب کے ساتھ ہے۔

بہرحال اس آیت میں خدا کے لامکان ہونے کو بہترین انداز میں نقش کیا گیا ہے کیونکہ فرمان ہے:

''وہ ہر انسان کے ساتھ اس کی رگ قلب سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ پس وہ ہر جگہ حاضر ہے، حتی کہ ہماری جان وقلب میں بھی موجود ہے۔ مسلم ہے کہ اس قسم کی ذات مافوق مکان ہوگی کیونکہ ایک شی اپنے تمام وجود کے ساتھ متعدد مکانوں میں موجود نہیں ہوسکتی مگر یہ کہ اس کے کئی حصے ہوں اور ہر حصہ ایک مکان میں ہو۔

(۶) چھٹی اور آخری آیت میں یہی مضمون خاص طور پر ان لوگوں کے بارے میں آیا ہے جو دنیا کو الوداع کرنے اور عمر کے اختتام تک پہنچ چکے ہیں۔ فرمان ہے: ''اور تم جس حالت میں (کسی کی جان کنی کا) نظارہ کررہے ہو تو ہم تم سے زیادہ اس کے نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے۔'' (وانتم حینئذ تنظرون ونحن اقرب الیه منکم ولکن لاتبصرون)

ہم بخوبی جانتے ہیں بے چارے احتضار کی حالت میں پڑے ہوئے شخص کے اندر کیا کچھ ہورہا ہے، اس کے عمق وجود میں کیا شور برپا ہے۔ کیا خوش ہے کہ بدن کی قید سے آزاد ہوکر جنت کی طرف پرواز کررہا ہے؟ یا ترش اور غمگین ہے کہ اپنے تاریک وغلط اعمال کی وجہ سے خدا کی سزا کا مستحق ہوگیا ہے اور اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے؟ لیکن تم ان میں سے کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے اور ان سے آگاہ نہیں ہو۔

بعض مفسرین نے جو انسان کے ساتھ قرب الٰہی کے سلسلہ کو اچھی طرح درک نہیں کرسکے، آیت کا معنی مجازی لیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ موت کے فرشتے اس سے نزدیک تر ہوں گے اور تم موت کے فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتے۔

لیکن خیال رہے کہ یہ اور اس قسم کی دیگر تعبیریں جیسا کہ آیات گذشتہ میں ذکر ہوا، فقط حالت احتضار والے شخص کے ساتھ مختص نہیں اور یہ تمام انسانوں کے بارے میں ہیں۔ یہی مسئلہ مختلف تعبیرات کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ اس سے واضح ہوگا کہ یہ خیال درست نہیں اور درحقیقت اس کا مصداق ہے۔

''چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند''

اس آیت میں خدا کے نزدیک ہونے میں حالت احتضار کا ذکر کیا گیا ہے تو وہ اس لیے ہے کہ سلسلہ کلام یہی تھا۔ تاہم مجموعی طور پر یہ آیت خدا کے لامکان ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

نتیجہ

تمام آیات مافوق جو ہر قسم کی تعبیرات سے ایک حقیقت کو واضح کر رہی ہیں، ان سے بخوبی معلوم ہوجائے گا کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے جب کہ وہ لامکان ہے اور اس کا وجود زمان و مکان سے بالاتر ہے۔ چونکہ تمام چیزیں اسی سے وابستہ و متعلق ہیں اور ہرگز اس سے جدا نہیں لہٰذا وہ تمام موجودات کا احاطہ وجودی رکھتا ہے۔ یہی احاطہ قومیت اور احاطہ ربوبیت ہے۔ (غور کریں)

توضیحات

(۱) وہ زمان و مکان سے بالاتر ہے

فلاسفہ نے حقیقت زمان و مکان میں کافی بحث کی ہے چونکہ مکان و زمان ایسی چیزیں ہیں جن سے ہمیں ہر وقت سروکار رہتا ہے۔ تاہم ان کی حقیقت کا علم ہمارے لیے بلکہ فلاسفہ کے لیے بھی کافی مشکل ہے۔ کیا یہ ایک حیران کن بات نہیں؟

ایک گروہ کا خیال ہے کہ مکان یہی خاص فضا یا بعد خاص ہے جس میں اجسام کو قرار حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایسا موجود ہے جو جسم سے پہلے پیدا ہوا اور ہر جسم اس کا محتاج ہے۔

ایک اور گروہ کا خیال ہے کہ ''تمام چیزوں سے خالی فضا'' ایک بعد موہوم اور خیالی ہے اور اصولاً جہاں جسم نہیں وہاں مکان بھی نہیں۔ یہ تعبیر دیگر مکان جسم کے بعد ہے نہ کہ اس سے پہلے۔ جب دو جسموں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں اور ان کے طرزِ قرار کو دیکھیں تو اس میں انتزاع ہوگا۔ اس وقت مکان کے بارے میں ہر دو نظریوں پر بحث اور تحقیق کا موقع نہیں۔ بہرحال یہ واضح ہے کہ ان دونوں معانی میں سے کوئی بھی لے لیں خدا کے لیے مکان کا تصور محال ہے۔

کیونکہ پہلی تفسیر کی رو سے مکان وہ موجود ہے جو جسم سے پہلے ہوتا ہے، کیا خدا سے پہلے کوئی چیز ہوسکتی ہے؟ علاوہ ازیں اس نظریہ کے مطابق اجسام مکان کے محتاج ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ واجب الوجود سے بے نیاز وجود کسی دوسری چیز کا محتاج ہو؟

لہٰذا پہلی تفسیر کے مطابق ''خدا جو ہر چیز سے بے نیاز اور جس سے ہر ہستی اور موجود کا آغاز ہوتا ہے اس کے لیے کسی مکان و مقام کا ہونا محال ہے۔

دوسری تفسیر کو سامنے رکھتے ہوئے خدا کے لیے کوئی شبیہ و مثال فرض کرنی ہوگی جس سے موازنہ کیا جائے اور ہر دو کے موازنہ سے مکان منتزع ہو جب کہ مباحث توحید میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس کی کوئی شبیہ اور مثال نہیں۔

بدون محدودیت مکان کا تصور نہیں ہوسکتا کیونکہ دو جسموں کو ایک دوسرے سے جدا لینا ہوگا تاکہ باہمی مقائیسہ واضح ہو سکے۔ لہٰذا فلاسفہ کے اس گروہ کا خیال ہے کہ تمام جہان کا کوئی مکان نہیں کیونکہ جہان سے باہر کوئی چیز نہیں تاکہ اس سے مقایسہ ہو سکے۔ فقط اجزا جہاں کے

لیے مکان کی ضرورت ہوگی۔(غور کریں)

اگر خدا کا مکان ہوتو اس کے اعضاء واجزا بھی ہوں گے کیونکہ جسم کے ذرات ایک دوسرے پر قیاس کریں تو مختلف مکان رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک جز اوپر ہے ایک نیچے ہے ایک دائیں طرف، دوسرا بائیں طرف۔ اگر خدا مرکب ہوتو اجزا کے درمیان احتیاج کا سلسلہ قائم کرنا ہوگا جب کہ یہ اس کے واجب الوجود ہونے کے مناسب نہیں۔

زمان کے سلسلہ میں بھی یہی بحث ہے۔ان کا خیال ہے کہ زمان ظرف ہے، پہلے پیدا کیا گیا ہے اور پھر اشیاء مادی خلق ہوئیں اور انہوں نے اس میں قرار پکڑا۔پس وہ زمان کا محتاج ہیں۔

یہ تعبیر آخر ''زمان'' ایک حقیقت سیال و مستقل ہے جو تمام مادی اشیاء سے پہلے خلق کیا گیا ہے اور ان سے فنا ہونے کے بعد بھی موجود رہے گا۔ایسی صورت میں خدا کے لیے زمان کا نہ ہونا واضح وروشن ہے کیونکہ اس کا لازمہ نیاز واحتیاج ہیٔ اور وہ ہر ایک سے بے نیاز ہے۔

اگر آج کے فلاسفہ کے نکتہ نظر کیٔ مطابق ''زمان'' کو اشیاء جہاں کی حرکت یا اس کو اشیاء کی حرکت جوہری سمجھیں تو بھی یہ خدا کے بارے میں ممکن ہوگا کیونکہ وہ (خدا) ہر جہت سے کامل ولامحدود وجود ہے اور اس طرح کے وجود کے لیے حرکت متصور نہیں ہوسکتی۔لہٰذا اس کے لیے زمان بھی نہیں ہوگا۔

(۲) خدا کسی چیز میں حلول نہیں کرتا

مسیحیوں کا الگ گروہ معتقد ہے کہ خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کیا ہوا ہے،بعض صوفی حضرات بھی اپنے پیشواؤں میں خدا کے حلول کے قائل ہیں۔

علامہ حلقی کشف المراد میں کہتے ہیں اس عقیدہ کے ناروا اور غلط ہونے میں کوئی شک نہیں کیونکہ حلول کا مطلب ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ قیام ہے۔جیسے ہم کہیں گے کہ گلاب عطر اور بو نے پھول میں حلول کیا ہے۔اس طرح کا معنی خدا کے لیے قابل قبول نہیں کیونکہ اس کا لازمہ مکان، نیاز اور احتیاج ہے جب کہ یہ چیزیں واجب الوجود کے لیے غیر ممکن ہیں۔اگر کوئی کسی چیز میں خدا کے حلول کا قائل ہوتو وہ ایک قسم کے شرک کا قائل اور دائرہ موحدین سے خارج ہے۔

(۳) خدا کے ہر جگہ حضور کا مفہوم

ممکن ہے بعض کے نزدیک خدا کے حضور کا مطلب تمام جہانِ مادی میں قوت جاذبہ کا وجود ہو یا ''اثر'' کا حضور ہو (ایک بے وزن، بے رنگ فرضی مادہ جس نے جہان کو پر کر رکھا ہے حتیٰ کہ خلا میں بھی موجود ہے) لیکن یہ تو اس طرح ہوگا۔جیسے مکان میں وجود ہو۔اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جہان کے ہر گوشہ وکنار میں امواج جاذبہ کا کچھ حصہ یا ''اثر'' کے ذرات کا وجود ہے۔اس کا لازمہ ایک طرف سے اجزائے ترکیبی کا وجود ہے اور اس میں مکان کی طرف احتیاج بھی موجود ہے۔

جب کہ خدا کے حضور کا مطلب یہ ہے کہ وہ مافوق مکان ہے، اس لحاظ سے کوئی مکان اس کی بہ نسبت دوسرے مکان سے دور تر نہیں، اگر مثال پیش کرنا چاہیں اگر چہ وہ ناقص ہوگی تو چاہیے کہ اس کو معادلات علمی اور مسائل عقلی کے حضور وحاضر ہونے سے تشبیہ دی جائے۔ مثلاً ہم کہیں کہ کل جز سے بڑا ہے۔ اجتماع نقیضین ممکن نہیں۔ دو کو دو سے ضرب دیں تو چار ہوگا۔

اس قسم کے قضایا کرہ زمین، کرۂ ماہ، کرۂ مریخ اور ماورا کہکشاں ہر جگہ صادق آئیں گے۔ ان تمام جگہوں پر کل جز سے بڑا ہے۔ ان تمام کرات میں اجتماع نقیضین محال ہے جب کہ ان کے لیے مکان ومحل کی ضرورت بھی نہیں۔

بقول شاعر

این ''معیت'' می نگنجد دربیاں
نی زمان دارد خبر زدنی مکان
این ''معیت'' درنیا بدعقل وہوش
زین ''معیت'' دم مزن، بنشین خموش
قرب حق بابندہ دوراست از قیاس
برقیاس خود منہ آن را اساس

ترجمہ

اس معیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی اس کا زمان ہے اور نہ ہی مکان۔
یہ معیت عقل وخرد میں نہیں آسکتی۔ اس معیت کے سامنے خاموش بیٹھ جا۔
قرب حق بندہ کے ساتھ قابل قیاس نہیں۔ اس کو اپنے اوپر قیاس نہ کر۔

اس نکتہ کی طرف توجہ رہے کہ ہر چیز کا محضر خدا میں ہونا، یہ ایسی صفت الٰہی ہے جس کا اثر انسانی تربیت میں فوق العادہ ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ انسان یہ ایمان رکھتا ہو اور خود کو اپنے مولا عظیم ورحیم ومہربان اور ولی نعمت کے سامنے حاضر سمجھ رہا ہو اور پھر غلط کام کرے، اپنے آپ کو ننگ زمانہ گناہوں سے آلودہ کرے اور اس کے فرمان کو زیر پا قرار دے۔

اہم بات یہ ہے کہ خدا کے حضور کے سلسلہ میں ذکر کردہ آیات بھی اسی تربیتی اثر کی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ لہٰذا بعض میں ہے "**واللہ بما تعملون بصیر**" ''جو کام انجام دیتے ہو خدا اس کا بینا ہے۔'' اور بعض میں ہے "**ونعلم ما توسوس بہ نفسہ**"، ہم نفس انسانی کے وسوسہ کو جانتے ہیں۔

خدا کا حضور صرف ہمارے جسم سے باہر ہی نہیں بلکہ ہمارے دل وجان کی گہرائیوں میں بھی ہے۔ ہمارے اعماق قلب وروح میں بھی

اس کا حضور ہے۔توصیف خدا میں مولا متقیان حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا فرمان ہے:

"الباطن لكل خفية والحاضر لكل سريرة العالم بما تكن الصدور وما تخون العيون۔"

''وہ سبھی چھپی ہوئی چیزوں کی گہرائیوں سے آگاہ اور ہر پوشیدہ شے پر حاضر و ناظر ہے۔وہ سینوں میں چھپی ہوئی چیزوں اور آنکھوں کے چوری چھپے اشاروں کو جاننے والا ہے۔''[1]

ایک اور خطبہ میں امام علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"فاتقوا الله الذى انتم بعينه و نواصيكم بيده وتقلبكم فى قبضته ان اسررتم علمه۔ وان اعلنتم كتبه۔"

''اس اللہ سے ڈرو کہ تم جس کی نظروں کے سامنے ہو اور جس کے ہاتھ میں تمہاری پیشانیوں کے بال اور جس کے قبضہ قدرت میں تمہارا اٹھنا بیٹھنا، چلنا اور پھرنا ہے۔اگر تم کوئی بات مخفی رکھو گے تو وہ اسے جان لے گا اور ظاہر کرو گے تو اسے لکھ لے گا۔''[2]

(۴) دعا کے وقت ہم کیوں آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرتے ہیں

یہ سوال عام لوگوں کے ذہن میں آتا ہے کہ جب خدا کا مکان و محل ہی نہیں تو پھر دعا کے وقت آنکھیں آسمان کی طرف کیوں اور ہاتھ آسمان کی طرف کیوں بلند کرتے ہیں۔پناہ بخدا: کیا خدا آسمانوں میں ہے؟

یہ سوال ائمہ علیہم السلام کے زمانہ بھی کیا گیا۔چنانچہ ہشام ابن حکم کہتے ہیں کہ ایک زندیق دہریہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں آیا اور "الرحمن على العرش استوى" کے بارے میں سوال کیا۔

امام علیہ السلام نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: خدا مکان اور مخلوق کا محتاج نہیں بلکہ تمام خلق اس کی محتاج ہے۔

سوال کرنے والے نے عرض کیا: پس فرق نہیں کہ دعا کے وقت ہاتھ آسمان کی طرف بلند کریں یا زمین کی طرف کرلیں۔

امامؑ نے فرمایا:

"ذلك فى علمه واحاطته وقدرته سواء ولكنه عزوجل امرا وليائه و

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۳۰

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۳

عباده برفع ایدیهم الی السمآء نحوالعرش لانه جعله معدن الرزق فثبتنا ماثبته القران والاخبار عن الرسول (صلعم) حین قال ارفعوا ایدیکم الی الله عزوجل وهذا یجمع علیه فرق الامة کلها۔"

''ہر چیز خدا کے احاطہ علم وقدرت میں ایک جیسی ہے (اور اس میں کوئی تفاوت نہیں) لیکن خدا نے اپنے دوستوں اور بندوں کو حکم دیا ہے کہ دعا کے وقت اپنے ہاتھ آسمان کی طرف عرش کا خیال کرتے ہوئے بلند کریں کیونکہ وہ ہی مخزن رزق ہے۔ ہمیں قرآن اور حدیث کے ثابت کردہ امر کو ثابت کرنا ہے۔ انہیں کا فرمان ہے کہ ہاتھ خدا کی طرف بلند کریں۔ یہ ایسی بات ہے جس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔''[1]

کتاب خصال میں مروی ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا:

"اذا فرغ احدکم من الصلوٰة فلیرفع یدیه الی السمآء والینصب فی الدعاء"

''جب تم لوگ نماز سے فارغ ہو تو ہاتھ دعا کے لیے آسمان کی طرف بلند کرو اور دعا میں مشغول ہو جاؤ۔''

ایک شخص نے عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! کیا خدا ہر جگہ نہیں؟

حضرت نے فرمایا: ''ہاں! ہر جگہ ہے۔''

اس نے عرض کیا: پس لوگ آسمان کی طرف ہاتھ کیوں بلند کرتے ہیں؟

فرمایا: قرآن میں تم نے نہیں پڑھا "وفی السمآء رزقکم وماتوعدون" (ذاریات ۲۲) ''آسمان میں تمہارا رزق ہے اور اسی کا تمہارے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔'' پس محل رزق کے سوا انسان کہاں سے روزی طلب کرے گا۔ رزق کا محل اور وعدہ الٰہی آسمان ہی کا ہے۔[2]

ان روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے چونکہ اکثر رزق آسمان ہی کی طرف سے ہیں (زمین مردہ کو زندہ کرنے والی بارش آسمان سے، منبع زندگی وحیات سورج کا نور آسمان ہی سے جلوہ گر ہوتا ہے اور انسانی زندگی کا تیسرا اہم عامل ہوا بھی بلندی پر ہے، اس لیے آسمان کو برکتوں کے معدن اور رزق الٰہی کے مخزن کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ دعا کے وقت اسی کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ صرف مسلمانوں کے ساتھ مختص نہیں بلکہ دوسری امتوں میں بھی ایسا ہی ہوتا۔ جیسے مرحوم

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۳۳۰۔ توحید صدوق صفحہ ۲۴۸۔ حدیث ۱ باب ۳۶۔ باب الرد علی الثنویہ وزناوقہ۔

[2] بحار الانوار جلد نمبر ۹۰ صفحہ ۳۰۸۔ حدیث نمبر ۷۔ اوپر والی دو حدیثوں کو تفسیر نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۲۴ اور ۱۲۵ میں ذکر کیا گیا ہے۔

فیض کاشانی محجۃ البیضاء میں مالک بن دینار سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل قحط میں مبتلا ہو گئے۔ کئی دفعہ شہر سے باہر جا کر دعا کی (بیابان میں جا کر دعا کرتے رہے مگر قبول نہ ہوئی) تو خدا نے ان کے پیغمبر کی طرف وحی کی کہ ان سے کہو:

انکم تخرجون الی بابدان نجسة وترفعون الی اکفا قد شفکتم بها الدمآء وملاتم بطونکم من الحرام الان قد اشتد غضبی علیکم ولن تزدا دوا منی الا بعدا

''تم لوگ ناپاک بدنوں کے ساتھ باہر آ گئے ہو بے گناہوں کے خون سے رنگین ہاتھ میری طرف بلند کر رہے ہو، تمہارے شکم حرام سے پر ہیں۔ (کس طرح قبولیت دعا کی توقع کرتے ہو)۔ اب میرا غضب شدید ہو گیا ہے۔ دوری کے سوا مجھ سے کوئی نتیجہ تمہیں نہیں مل سکے گا۔''[1]

بعض دوسری روایات میں دعا کا ایک اور فلسفہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ درحقیقت خدا کے سامنے خضوع اور عاجزی کا اظہار ہے کیونکہ انسان خضوع کے اظہار یا تسلیم کے وقت کسی شخص یا چیز کے سامنے اپنے ہاتھ بلند کرتا ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے ہم آیت "فما استکانوا الربهم وما یتضرعون" (مومنون ۷۶) (انہوں نے اپنے پروردگار کے سامنے تواضع نہیں کی اور نہ ہی تضرع وزاری کی ہے) کی تفسیر میں پڑھتے ہیں کہ فرمایا:

''استکانت کا معنی خضوع ہے اور تضرع کا معنی اوپر کی طرف ہاتھ بلند کرنے اور پیش گاہ خداوندی میں اظہارِ تذلل ہے۔''[2]

(۵) احادیث اسلامی اور خدا کا لامکان ہونا

یہ مسئلہ وسعت کے ساتھ روایات اسلامی میں اصول کافی، بحار الانوار، نہج البلاغہ، توحید صدوق وغیرہ میں مطرح کیا گیا ہے۔ اختصار کے پیش نظر سب روایات کا ذکر مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا ہم گل چینی کرنے پر قناعت کریں گے۔

(۱) امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہے:

"ان الله تبارك و تعالی لا یوصف بزمان ولا مکان ولا حرکة ولا انتقال ولا سکون، بل هو خالق الزمان والمکان والحرکة والسکون والانتقال،

---

[1] المحجۃ البیضاء جلد ۲ صفحہ ۲۹۸

[2] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۷۹ (باب رغبت ورجعت۔ حدیث ۲)

تعالیٰ عما یقول الظالمون علوا کبیرا"

''خداوند تعالیٰ کو زمان، مکان، حرکت، انتقال اور سکون سے متصف نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ تو زمان، مکان، حرکت، انتقال اور سکون کا خالق ہے۔ خدا ان باتوں سے برتر ہے جو یہ ظالم لوگ خدا کے بارے میں کہتے ہیں۔''[1]

(۲) ایک اور حدیث میں ہے کہ امیر المومنین امام علی مرتضیٰ نے ایک شخص کو اس طرح قسم اٹھاتے ہوئے سنا: "والذی احتجب بسبع طباق" اس خدا کی قسم جو سات آسمانوں سے بالا حجاب و فضا میں ہے۔ اس کا خیال تھا خدا کی جگہ عرش ہے اور عرش آسمانوں سے ماوراء ہے، آپؑ نے اس کے سر پر تازیانہ مارتے ہوئے فرمایا:

"یاویلك ان الله اجل من ان یحتجب عن شیء او یحتجب عنه شیئ، سبحان الذی لا یحویه مکان ولا یخفی علیه شیء فی الارض ولا فی السمآء"

''افسوس ہے تجھ پر، خدا اس سے برتر ہے کہ وہ کسی چیز میں پوشیدہ ہو یا کوئی چیز اس سے مخفی ہو۔ وہ پاک و منزہ و لا مکان ہے۔ کوئی چیز آسمان و زمین میں اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔''

اہم بات یہ ہے کہ اس حدیث کے آخر میں اس آدمی نے امامؑ سے پوچھا: کیا اس قسم کی وجہ سے میں کفارہ دوں؟ امامؑ نے فرمایا: نہیں! تم نے خدا کی قسم نہیں کھائی کہ کفارہ دو۔ بلکہ یہ غیر خدا کی قسم ہے۔[2]

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ سلیمان بن مہران نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا:

کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خداوند متعال فلاں مکان میں ہے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"سبحان الله و تعالی عن ذلك انه لو کان فی مکان لکان محدثا لان الکائن فی مکان محتاج الی المکان والاحتیاج من صفات المحدث، لا من صفات القدیم۔"

''خدا منزہ و برتر ہے اس سے کہ (جو تو کہہ رہا ہے) اگر وہ مکان میں ہو تو حادث ہوگا کیونکہ مکان کا مکین اس کا محتاج ہوتا ہے اور احتیاج حادث کی صفت ہے، یہ خدائے قدیم و ازلی کی صفت نہیں۔''[3]

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۳۰۹ باب نمبر ۱۴ حدیث ۱

[2] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۳۲ حدیث ۳

[3] توحید صدوق صفحہ ۱۷۸ باب ۳۸ حدیث ۱۱

(۴) کسی نے حضرت امیر المومنینؑ سے سوال کیا کہ آسمان وزمین کی خلقت سے پہلے ہمارا پروردگار کہاں تھا؟ امامؑ نے فرمایا:

"این" سوال عن "مکان" و کان الله و لا مکان"

''کہاں تھا مکان جس کا سوال ہے، خدا تھا اور کوئی مکان نہیں تھا اور اب بھی اس کے لیے کوئی مکان نہیں۔''[۱]

(۵) ایک حدیث میں امام موسیٰ کاظمؑ کا فرمان ہے:

"ان الله تبارك و تعالی کان لم یزل بلا زمان ولا مکان، وهو الان کما کان لا یخلو منه مکان ولا یشغل به مکان، ولا یحل فی مکان۔"

''خدا ازل سے مکان وزمان کے بغیر موجود تھا اور اب بھی اسی طرح ہے، کوئی مکان اس سے خالی نہیں اور اس کے باوجود کسی مکان کو مشغول نہیں کر رہا اور کسی مکان میں اس کا حلول نہیں۔''[۲]

ان احادیث سے پورے طور پر واضح ہوتا ہے کہ ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے مکان خدا کے متعلق سوال کیا گیا، انہوں نے اس کی نفی کی ہے۔ یہ ایک جیسی اور پر معنی تعبیرات اس قدر صریح اور روشن ہیں کہ مشتاق قلوب میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہ جاتا۔

(۶) ''ارشاد'' اور ''احتجاج'' میں ہے کہ ایک یہودی دانشور نے مسلمانوں کے کسی خلیفہ کی خدمت میں آکر سوال کیا: آیا آپ پیغمبرؐ کے جانشین ہیں؟ خلیفہ نے کہا: ہاں! اس نے کہا: ہم نے تورات میں پڑھا ہے کہ پیغمبر کا خلیفہ پوری امت سے اعلم ہوگا۔ آپ مجھے بتائیں کہ خدا کہاں ہے، آسمان میں یا زمین میں؟ خلیفہ نے کہا کہ خدا عرش پر ہے!

یہودی نے کہا: پھر تو زمین اس سے خالی ہوگی۔ اس قول کے مطابق اس کا مکان بھی ہے اور دوسرے مکان میں (خدا) نہیں ہے۔

خلیفہ نے کہا: تو زندیق (دہریہ) ہے، مجھ سے دور ہو جاؤ ورنہ تجھے قتل کر دیا جائے گا۔

یہودی تعجب کے ساتھ لوٹا جبکہ وہ اسلام کو مذاق سمجھ رہا تھا۔

حضرت امام علی مرتضیٰ کو خبر ملی تو تشریف لائے اور فرمایا: اے یہودی! مجھے تیرے سوال و جواب کی خبر ملی ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ خدا نے تو مکان پیدا کیا ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ مکان میں ہو۔ وہ اس سے اعلیٰ و برتر ہے کہ کسی مکان کو اپنی قرارگاہ بنائے۔

کیا تم نے اپنی کتابوں میں نہیں پڑھا کہ حضرت موسیٰ بن عمران بیٹھے تھے۔ تب مشرق سے ایک فرشتہ آیا تو آپ نے فرمایا: تو کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کہا اپنے پروردگار کی طرف سے! پھر مغرب کا ایک فرشتہ آیا تو آپ نے پوچھا، تو کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کا خدا کی طرف سے! اس کے بعد ایک اور فرشتہ آیا، پوچھا تو کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کہا: ساتویں آسمان سے خدا کی طرف سے آیا ہوں۔ پھر ایک فرشتہ آیا اور پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ساتویں زمین سے خدا کی طرف سے آیا ہوں۔ حضرت موسیٰ نے اس وقت فرمایا: منزہ و پاک ہے وہ خدا کہ کوئی مکان

---

[۱] توحید صدوق۔ باب ۲۸ حدیث ۴

[۲] توحید صدوق باب ۲۸ حدیث ۱۲

اس سے خالی نہیں اور کوئی مکان اس کے لیے دوسرے مکان سے نزدیک تو نہیں۔ یہودی نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ یہی حق ہے اور آپؑ جانشینی پیغمبرؐ کے لیے سب سے زیادہ لائق اور موزوں ہیں۔[1]

(۷) اس بحث کا اختتام ہم نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنینؑ کے زندہ وناطق فرمان سے کرتے ہیں:

خطبہ نمبر ۱۷۶ میں ہے:

"لا یغیرہ زمان، ولا یجویہ مکان، ولا یصفہ لسان۔"

''نہ زمانہ اس میں تبدیلی کرتا ہے نہ کوئی جگہ اسے گھیرتی ہے اور نہ زبان اس کا وصف کرسکتی ہے۔''

خطبہ نمبر ۱۸۴ میں ہے

"وان اللہ سبحانہ، یعود بعد فناء الدنیا وحدہ لاشیء معہ، کما کان قبل ابتدآءھا... بلا وقت ولا مکان ولا حین ولا زمان۔"

''بلاشبہ اللہ سبحانہ دنیا کے مٹ جانے کے بعد ایک اکیلا ہوگا۔ کوئی چیز اس کے ساتھ نہ ہوگی جس طرح کہ دنیا کی ایجاد وآفرینش سے پہلے تھا..... بغیر وقت ومقام اور زمان ومکان کے ہوگا۔''

خطبہ نمبر ۴۹ میں ہے:

"سبق فی العلو فلاشیء اعلی منہ وقرب فی الدنو فلاشیء اقرب منہ فلا استعلآئہ باعدہ عن شیء من خلقہ ولا قربہ ساوھم فی المکان بہ"

''وہ اتنا بلند وبرتر ہے کہ کوئی چیز اس سے بلند تر نہیں ہوسکتی۔ وہ اتنا قریب ہے قریب تر ہے کہ کوئی شی اس سے قریب تر نہیں۔ نہ اس کی بلندی نے اسے مخلوقات سے دور کردیا ہے اور نہ اس کے قرب نے اسے دوسروں کی سطح پر لاکر ان کے برابر کردیا ہے۔''

خدا کے بارے میں یہی منطق صحیح اور سچے معارف ہیں جو اہل بیتؑ وحی کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں۔

(۶) مخالفین کی دلیلیں

تاریخ عقائد اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی اصولوں سے منحرف لوگ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہمیشہ آیات متشابہ کا سہارا لیتے ہیں بغیر اس کے کہ قرآنی اصول کو سامنے رکھے کہ متشابہات کی تفسیر آیات محکمات کے ذریعے کی جائے۔

---

[1] توحید صدوق باب ۲۸ حدیث نمبر ۳ (خلاصہ)

جولوگ خدا کے لیے مکان وجسمیت کے قائل ہیں، وہ آیات متشابہات کی طرف جاتے اور اپنے مقصود کے اثبات کے لیے انہیں کافی سمجھتے ہیں، ہم ان میں سے مشہور آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) سورۂ طٰہٰ آیت نمبر ۵ میں ہے

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى

''خدا نے عرش پر قرار حاصل کیا۔''

ان لوگوں کا خیال ہے کہ عرش آسمان کی بلندیوں پر ایک تخت ہے۔جس پر خدا بیٹھا ہے اور ملائکہ کو فرمان جاری کر رہا ہے۔

یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ یہ ایک کنایہ ہے جو روزمرہ کی گفتگو میں ہم بھی استعمال کرتے ہیں یعنی یہ تسلط وقدرت سے کنایہ ہے۔

وضاحت

گذشتہ زمانوں میں بادشاہوں کے دو تخت ہوا کرتے تھے، تخت بلند کہ جس کو عرب عرش کہتے ہیں یہ کسی خاص تقریب یعنی جب عام دربار لگتا تو بادشاہ خاص طور پر اس تخت پر بیٹھتا تھا۔

چھوٹا تخت جس کو بادشاہ عموماً استعمال کرتا تھا اور ہر روز اپنے دربار میں اس پر بیٹھتا اور حکمرانی ومملکت کی تدبیر کرتا تھا، عرب والوں نے اس کا نام کرسی رکھا ہوا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عرش اور کرسی دو نشان بن گئے اور یہ دونوں قدرت اور سلطنت کے لیے کنایہ ہیں۔ یہ معنی مندرجہ ذیل تعبیرات میں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

فلاں شخص کو تخت سے کھینچ لیا گیا یعنی اس کی حکومت کو ختم کر دیا گیا۔

فلان تل عرشه، فلاں شخص کا تخت گر گیا یعنی اس کی حکومت ختم ہوگئی۔فلاں حادثہ نے فلاں حکمران کے تخت میں لرزہ پیدا کر دیا یعنی اس کی حکومت متزلزل ہوگئی اور اسی قسم کی دیگر تعبیرات بھی مستعمل ہیں۔

لہٰذا عرش خدا سے مراد عالم بالا اور کرسی سے مراد عالم پائین ہے، یا عرش سے مراد ماوراء طبیعت اور مفردات ہیں جبکہ کرسی سے مراد عالم مادہ ہے، اس کلام کا شاہد یہ ہے:

وسع كرسية السموت والارض

''جب خدا کی کرسی نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو گھیر رکھا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اس کا عشر ماوراء آسمان و

زمین یعنی ماوراء جہان طبیعت ہے۔"[1]

لہٰذا جب کہا جائے کہ خدا عرش پر برقرار ہوا تو اس سے مراد عالم بالا ہے جو باوجود اپنی وسعت کے اس کی ملکیت، حکومت سلطنت میں ہے۔ یہ حکومت بطریق اولیٰ عالم پائین پر بھی ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے۔ وہ کثیر آیات جو خدا کے مکان کی نفی کرتی ہیں (جن کا ابتدائے کلام میں ذکر ہو چکا ہے) سب اس تفسیر کی شاہد بن سکتی ہیں۔ تفسیر المیزان میں سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر ۶ کے بعد کہتے ہیں:

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى

"آسمانوں اور زمین اور ان کے مابین اور تحت الثری میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے۔ یہ اس تفسیر کے لیے روشن قرینہ ہے۔"[2]

فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں مشبہ کے اس قول کہ "خدا عرش پر بیٹھا ہے" کے جواب میں دس عقلی و نقلی دلائل ذکر کیے ہیں:

(۱) عرش اور دوسری جگہوں کی خلقت سے پہلے خدا ازل سے موجود تھا۔ اس کو مکان کی احتیاج نہیں تھی تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ عرش کو پیدا کرنے کے بعد اس کا محتاج ہو جائے۔

(۲) اگر ان کا قول مان لیا جائے کہ خدا عرش پر بیٹھا ہے تو اس کے وجود کا کچھ حصہ عرش کے دائیں جانب اور کچھ حصہ بائیں جانب ہوگا، اس کا لازمہ ترکیب ہے اور ترکیب کا لازمہ احتیاج ہے۔

(۳) قرآن مجید حضرت ابراہیمؑ کا قول نقل کر رہا ہے لا احب الافلین میں غروب کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (انعام ۷۶) یہ اشارہ ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر ہے۔ اگر خدا عرش پر بیٹھا ہو تو باقی جگہوں سے غائب اور مخفی ہوگا اور یہی عین افول و غروب ہے۔

(۴) قرآن مجید میں سورۂ حاقہ آیت نمبر ۱۷ میں حاملین عرش فرشتوں کا ذکر ہے۔ مشبہ کی بات مانتے ہوئے یہ کہنا ہوگا کہ خدا ان فرشتوں کا محتاج ہے تا کہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ جب کہ خدا خود تمام چیزوں کا محافظ ہے۔

(۵) علاوہ ازیں آیات توحید اور خدا کی شبیہ کی نفی کی آیات بحسب محکمات ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ توحید اور خدا کی شبیہ و نظیر کی نفی کا لازمہ یہی ہے کہ اس کا کوئی جز نہیں اور یہ چیز اس کے مکان میں استقرار کے مناسب نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔[3]

اس گروہ کی دلیل سورۂ فجر کی آیت ہے، اس میں انتہاء دنیا اور قیام قیامت کے حوادث کا ذکر کرتے ہوئے فرمان ہے: "تیرا پروردگار اور فرشتے صف بستہ آئیں گے۔ وجاء ربك والملك صفا صفا۔

---

[1] زمخشری کشاف میں لکھتا ہے: چونکہ عرش مرادفِ حکومت ہے اس لیے یہ حکومت سے کنایہ ہے۔ جیسے کہتے ہیں فلاں بادشاہ تخت پر بیٹھا یعنی اس کی حکومت برقرار ہوگئی جب کہ وہ تخت پر نہ بھی بیٹھا ہو۔ (کشاف جلد ۳ ص ۵۲)

[2] المیزان جلد ۱۴ صفحہ ۱۳۱

[3] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۲۲ صفحہ ۵

یہ مسلم ہے جیسے اکثر مفسرین نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مقصد حساب و کتاب کے لیے فرمان خدا کا نزول ہے یا اس کی عظمت کی آیات اور نشانیوں کی آمد ہے، ان کی آمد گویا ذات پاک کی آمد ہے اور یہی چیز ہر قسم کے شک وتردید کو ختم کر دیتی ہے۔[1]

کیونکہ ہم پہلے متعدد آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ خدا ہر جگہ حاضر ہے، کوئی جگہ اس کی ذات پاک سے خالی نہیں اور اس کے باوجود اس کا محل بھی نہیں "وھو معکم اینما کنتم"

لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام میں آئے جیسے مشبہ کا گروہ کلمہ جاء سے سمجھ رہا ہے۔ وہ جو ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے حتی کہ ہم سے زیادہ ہمارے نزدیک ہے، جس طرف نگاہ کریں وہاں وہ ہے، آسمان وزمین میں اس کا حضور ہے، تو پھر اس کے لیے نقل مکانی کا تصور کیسے ہوسکتا ہے؟

علاوہ ازیں نقل وانتقال کا لازمہ تغیر وتبدل اور زوال وغروب ہے اور اس میں مکان کی طرف احتیاج بھی پائی جاتی ہے (جب کہ یہ سب امور اس میں نہیں ہیں)۔

اس تفسیر کی شاہد سورۂ نحل کی آیت نمبر ۳۳ ہے۔ فرمان خداوندی ہے:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ

"(موت یا عذاب) کے فرشتے ان کے سراغ میں آئیں یا تیرے پروردگار کا فرمان ان تک پہنچے۔"

قرآن مجید کی بعض دوسری آیات میں بھی اس قسم کی تعبیرات دیکھی جاسکتی ہیں۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (فاطر ۱۰)

پاک باتیں اور کلمے اس کی طرف بلند ہوجاتے ہیں۔"

اور تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ (معارج ۴)

"فرشتے اور روح اس کی طرف اوپر جاتے ہیں۔"

اور لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ (حج ۳۷)

(قربانیوں) کا گوشت اور خون خدا کی طرف نہیں جاتا لیکن تقویٰ اور پرہیزگاری اس تک پہنچتی ہے۔"

ظاہر ومسلم ہے کہ اس قسم کی تعبیریں معنوی صعود، عروج روحانی اور قرب باطنی کی طرف اشارہ ہیں، اس کے قرائن خود انہی آیات میں موجود ہیں۔ کیونکہ عمل ایسی چیز نہیں جو ظاہری آسمان کی طرف جائے، اسی طرح تقویٰ میں بھی جسمانی عروج مراد نہیں ہے۔ (غور کریں)

لیکن جن لوگوں کی توجہ حقائق کی طرف نہیں اور الفاظ ہی پر جم کر رہ گئے ہیں، چونکہ وہ حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے پس افسانہ کی طرف چلے

---

[1] تفسیر مجمع البیان، المیزان، قرطبی اور ابوالفتوح رازی وغیرہ آیت مورد بحث کے ذیل میں

گئے ہیں۔

بعض آیات میں ایسی تعبیرات ہیں جو حقیقتاً کافروں کے خیالات ہیں، لیکن نادان لوگوں نے انہیں جسمانیت خدا کی دلیل سمجھ لیا ہے یا خیال کیا ہے کہ خدا کا بھی مکان ہوتا ہے جیسے ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۰ میں پڑھتے ہیں:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

''کیا ان کو انتظار ہے کہ خدا اور فرشتے بادلوں کے سائے میں ان کے پاس آئیں گے تاکہ یہ ایمان لائیں؟ (ان کا یہ خیال کس قدر باطل، خام اور ناقص ہے)۔''

آیت میں موجود استفہام، استفہام انکاری ہے یعنی اس قسم کی چیز درحقیقت ممکن نہیں۔[1]

خلاصہ کلام یہ کہ تھوڑی سی باریک بینی اور آیات محکمات کی طرف رجوع کرنے سے اس طرح کی آیات سے خدا کے حق میں جسم اور مکان وزمان کی نفی سمجھی جاسکتی ہے اور اس میں کسی قسم کا شک وتردید باقی نہیں رہتا۔

(۷) صوفیہ اور حلول واتحاد کا مسئلہ

علامہ حلی کتاب ''نہج الحق'' میں فرماتے ہیں: چیزوں کے ساتھ خدا کا اتحاد اس طرح کہ دونوں (خدا اور چیز) ایک ہو جائیں، باطل ہے اور اس کا بطلان بدیہیات میں شمار ہوتا ہے۔ اہل سنت کے ایک صوفی گروہ نے اس کی مخالفت کی ہے، اس کا کہنا ہے کہ عارفین کے بدن کے ساتھ خدا ایک ہو جاتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ خدا عین موجودات ہے اور ہر موجود عین خدا ہے۔ (وحدت وجودِ مصداقی کی طرف اشارہ ہے)۔

بعد میں علامہ فرماتے ہیں کہ یہ عین کفر والحاد ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ اہل بیتؑ کی پیروی کرتے ہوئے ان باطل عقائد سے دور ہیں۔

بحث حلول میں (علامہ) کہتے ہیں کہ: اگر ایک موجود دوسرے موجود میں حلول کرنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے محل کی ضرورت ہوگی۔ چونکہ خدا واجب الوجود ہے اور کسی چیز کا محتاج نہیں لہٰذا اس کا کسی چیز میں حلول ناممکن ہے۔ بعد میں فرماتے ہیں کہ اہل سنت کے صوفی اس کے مخالف ہیں۔ وہ عارفین میں خدا کے حلول کو ممکن سمجھتے ہیں۔ پھر ان کی شدید مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے صوفیہ کی ایک جماعت کو امام حسینؑ کی قبر کے نزدیک دیکھا۔ ایک آدمی کے علاوہ باقیوں نے نمازِ مغرب باجماعت پڑھی۔ پھر ایک ساعت کے بعد نماز عشاء بھی جماعت کی صورت میں پڑھی مگر ایک آدمی نے نماز نہ پڑھی۔ میں نے پوچھا یہ شخص نماز کیوں نہیں پڑھتا؟

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے اس استفہام کو تہدیدی قرار دیا ہے اور بعض آیات کی طرح اس میں لفظ امر مقدر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کفار کے اس گروہ کو انتظار ہے کہ عذاب الٰہی کا فرمان اور فرشتے ان کو سزا دینے کے لیے آئیں گے۔

انہوں نے کہا کہ اس کو نماز کی کیا ضرورت ہے، یہ تو حق کے ساتھ پیوستہ و متصل ہے۔ کیا اس کے اور خدا کے درمیان حجاب اور مانع ایجاد کیا جا سکتا ہے جب کہ نماز تو اس کے اور خدا کے درمیان حجاب ہوگی۔ [1]

یہی مطلب مثنوی دفتر پنجم کے مقدمہ میں ایک اور شکل کے ساتھ آیا ہے۔ کہتے ہیں: چونکہ مقصد تو حقیقت تک رسائی ہے لہٰذا کہتے ہیں:

"لو ظهرت الحقائق بطلت الشرايع"

جب حقائق کا ظہور ہوگا تو شریعتیں باطل ہو جائیں گی۔ وہ لوگ شریعت کو علم کیمیا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ (ایسا علم جس کے وسیلہ سے طلاء وسنا بنایا جا سکتا ہو)۔ کہتے ہیں کہ اصل مقصد تو طلاء اور سونا ہے۔ جب مرحلہ طلاء کو پہنچ جائیں تو علم کیمیا کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

طلب الدليل بعد الوصول الى المدلول قبيح

''مطلوب تک پہنچنے کے بعد دلیل کا طلب کرنا بری بات ہے۔'' [2]

کتاب ''لائل الصدوق'' شرح نہج الحق'' میں صاحب مواقف سے منقول ہے کہ حلول و اتحاد کی نفی میں مخالفین کے تین گروہ ہیں، پھر بعض صوفیوں کو دوسرے گروہ میں شمار کرتے ہوئے کہتے ہیں ان کے کلمات حلول و اتحاد کی تردید میں ہیں (حلول سے مراد خدا کا کسی چیز میں نفوذ اور اتحاد سے مراد خدا اور چیز میں وحدت پیدا ہونا ہے)۔

پھر کہتے ہیں کہ میں نے بعض ''صوفیہ وجودی'' کو حلول و اتحاد کا منکر پایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دو کلمے ''خلق و خدا'' میں مغایرت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ہم اس کے قائل نہیں۔

ہم کہتے ہیں "ليس فى دار الوجود غيره ديار" سرائے وجود میں اس کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ اس جگہ صاحب مواقف کا کہنا ہے کہ ان کا یہ عذر بدتر از گناہ ہے۔ [3]

صوفیا کی اس طرح کی باتیں بہت ہیں جو موازین و منطق عقل کے مناسب بھی نہیں اور شریعت کے ساتھ بھی ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بہرحال جیسا کہ علامہ نے فرمایا کہ دو چیزوں کے درمیان اتحاد حقیقی محال ہے کیونکہ یہ عین تضاد ہے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ دو چیزیں حقیقتاً ایک ہو جائیں (اور دو بھی ہوں)۔ علاوہ ازیں اگر کوئی خدا کے ساتھ اتحاد کا قائل ہو مخلوقات کے ساتھ، عارفین کے ساتھ، یا ان کی اصطلاح میں واصلین کے ساتھ تو اس کا لازمہ ہوگا کہ خدا میں ممکنات کی صفات پائی جاتی ہیں۔ زمان، مکان، تغیر، تبدل وغیرہ۔

---

[1] نہج الحق صفحہ ۵۸-۵۹

[2] دفتر پنجم مثنوی صفحہ ۸۱۸ چاپ سپہر تہران

[3] دلائل الصدق جلد ۱ صفحہ ۱۳۷

حلول کی صورت میں (یعنی وہ کسی چیز میں نفوذ کر رہا ہوتو) مکان کی ضرورت ہوگی اور یہ بات خدا واجب الوجود ہونے کے مناسب نہیں۔[1]

صوفی حضرات خود کہتے ہیں کہ اس قسم کے مطالب عقلی دلیل سے ثابت نہیں کیے جاسکتے، غالباً وہ اپنا راست عقل سے جدا رکھتے ہیں اور مسائل ذوقی وتخیلاتی (جن کا نام انہوں نے ''راہِ دل'' رکھا ہوا ہے) کی پناہ لیتے ہیں۔ظاہر ہے جو منطق عقل کو نہیں مانتا تو اس کے کلام میں اسی طرح کے تناقضات اور تضادات ہوں گے اور یہی کچھ ان سے ہوسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں بزرگ علماء نے ان سے دوری اختیار کی اور ان کو ناپسند کیا ہے۔

بہت سی آیات میں قرآن نے عقل و برہان پر تکیہ کیا ہے اور اسی کو معرفت خدا کا راستہ قرار دیا ہے۔

انہی کلمات کے ساتھ ہم نفی شریک وشبیہ اور صفات کے زائد بر ذات ہونے کی نفی کے مباحث کو اختتام تک پہنچاتے ہیں۔

اس بحث کی تکمیل کے ساتھ ہی ''صفات جلال خدا'' بصورت کلی واساسی اور اس کے جزئیات، قواعد مقررہ کی روشنی میں مکمل طور پر واضح وروشن ہوجائیں گے۔

اب پروردگار کی عنایت اور فضل سے ہم صفات فعل کی بحث شروع کرتے ہیں۔

---

[1] یہی مطلب حلول واتحاد کے بطلان میں شرح تجرید العقائد علامہ حلی میں بھی آیا ہے (کشف المراد صفحہ ۲۲۷ باب ''اللہ کسی میں حلول نہیں اور اتحاد بھی نہیں رکھتا)۔

صفاتِ فعل

اشارہ

صفات خدا کی دومشہور قسمیں ہیں: صفاتِ ذات، صفاتِ فعل (جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں)۔

صفاتِ ذات

وہ صفات جو عین ذات خدا ہیں حتی کہ صدورِ فعل سے پہلے بھی یہ صفات خدا کے لیے ثابت ہیں جیسے ازلی وابدی ہونا اور علم وقدرت۔

صفاتِ فعل

وہ صفات جو انجامِ فعل کی وجہ سے خدا پر بولی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم کہتے کہ خدا خالق ورزاق ہے، مسلم ہے کہ یہ صفات مخلوق کی خلقت اور مرزوق کے رزق دینے سے پہلے متصور نہیں۔

البتہ خلق کی قدرت اور روزی دینے کی قوت پہلے سے موجود ہے، لیکن لفظ خالق اور رازق کا اطلاق (خلق ورزق سے پہلے) نہیں ہوگا۔

لہٰذا صفاتِ فعل واقع میں حادث ہیں اور عین ذات خدا نہیں۔ درحقیقت یہ فقط ہمارے ذہنی مفاہیم ہیں۔

خارج میں فقط ذات خدا اور اس کے افعال ہیں۔ جب ہم افعال کا صدور ذاتِ خدا سے دیکھتے ہیں تو ان صفات کا انتزاع کرتے ہیں اور کہتے ہیں وہ خالق ورازق ہے، وہ محی (زندہ کرنے والا) ہے اور وہ ممیت (موت دینے والا) ہے۔

(اس کی مزید توضیح بعد میں آئے گی) نیز جیسے افعال خدا لامتناہی ہیں اسی طرح صفاتِ فعل بھی لامحدود ہیں۔ البتہ قرآن مجید میں اہم ترین صفاتِ فعل جن سے معرفت خدا کی تکمیل، جنکا انسان کی تربیت میں فوق العادہ اثر ہوتا ہے اور جن میں ہر ایک سے تکامل صفات انسانی کے مراحل میں رہنمائی مل سکتی ہے۔ وہ مندرجہ ذیل صفات ہیں:

(۱) خالق (۲) خلاق (۳) احسن الخالقین (۴) فاطر (۵) بارى (۶) فالق (۷)
بديع (۸) مصور (۹) مالك (۱۰) ملك (۱۱) حاكم (۱۲) حكيم (۱۳) رب (۱۴)
ولى (۱۵) والى (۱۶) مولى (۱۷) حافظ (۱۸) حفيظ (۱۹) رقيب (۲۰) مهيمن (۲۱)
رازق (۲۲) رزاق (۲۳) كريم (۲۴) حميد (۲۵) فتاح (۲۶) رحمن (۲۷) رحيم

(۲۸) ارحم الراحمین (۲۹) ودود (۳۰) روف (۳۱) لطیف (۳۲) حفی (۳۳) غافر

(۳۴) غفور (۳۵) غفار (۳۶) عفو (۳۷) تواب (۳۸) جبار (۳۹) شکور (۴۰)

شاکر (۴۱) شفیع (۴۲) وکیل (۴۳) کافی (۴۴) حسیب (۴۵) سریع الحساب

(۴۶) اسرع الحاسبین (۴۷) سریع العقاب (۴۸) شدید العقاب (۴۹) نصیر

(۵۰) نعم النصیر (۵۱) خیر الناصرین (۵۲) قاهر (۵۳) قهار (۵۴) غالب (۵۵)

سلام (۵۶) مومن (۵۷) محیی (۵۸) شهید (۵۹) هادی (۶۰) خیر

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں مذکورہ ساٹھ صفات میں سے بعض ایسی بھی ہیں جن کے مفاہیم ومعانی ملتے جلتے ہیں۔لہٰذا ایسے الفاظ کو ہم ایک ہی بحث میں اکٹھا ذکر کریں گے۔

بعض ایسی ہیں جن کے دو مفہوم ہیں، ایک کے لحاظ سے صفات ذات اور دوسری کے لحاظ سے صفات فعل میں ان کا شمار ہوسکتا ہے جیسا کہ توضیحات میں ان کی طرف اشارہ ہوگا۔(غور کریں)

(۱) خالق (۲) خلاق (۳) احسن الخالقین

(۱) خالق (۲) خلاق (۳) احسن الخالقین

قرآن مجید میں متعدد آیات میں یہ اوصاف مختلف موارد میں استعمال ہوئے ہیں:

(۱) قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ

''کہو کہ خدا تمام اشیاء کا خالق ہے۔''(رعد ۱۶)

اس جگہ تمام موجودات جہان کی خلقت کا ذکر ہے۔

(۲) اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ﴿۷۱﴾

''میں گیلی مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔''(ص ۷۱)

اس جگہ تمام عالم خلقت کے گل سرسبد ''انسان'' کی خلت اور وہ بھی ایک ناچیز موجود یعنی گیلی مٹی سے خلق کرنے کا ذکر ہے۔

(۳) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ

''وہ ایسا خدا ہے جو پیدا کرنے والا، ایجاد کرنے والا ہے۔''(حشر ۲۴)

اس جگہ مطلق خالقیت کا ذکر ہے، کسی خاص مخلوق کا نہیں۔

(۴) اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾

''بے شک تمہارا رب بہت پیدا کرنے والا اور آگاہ ہے۔'' (حجر ۸۶)

اس جگہ نکتہ نظر وسیع ہے اور خدا کی گوناگوں مخلوق کا تذکرہ ہے۔

(۵) ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾

''پھر ہم نے انسان کو ایک دوسری مخلوق بنا دیا، کس قدر بابرکت ہے وہ خدا جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے۔'' (مومنون ۱۴)

اس جگہ خدا کی اہم ترین و اعلیٰ ترین مخلوق یعنی انسان کی خلقت کا تذکرہ ہے اور وہ بھی اعطاء روح کے مرحلہ کا۔ اس لیے خدا کو بہترین خلق کنندہ ظاہر کیا ہے۔

وضاحت اور پیام

''خالق'' کا مادہ خلق ہے جس کا معنی اندازگیری اور بدون سابقہ کسی شے کا ایجاد کرنا ہے۔[1]

بعض ارباب لغت اس کے لیے دو اساس کے قائل ہیں:

اس کا ایک معنی تو وہی ہے جس کا ذکر ہو چکا (یعنی اندازہ گیری اور بدون سابقہ شے کا ایجاد کرنا) اور اس کا دوسرا معنی صاف اور مسطح ہونا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ دونوں کی بازگشت ایک ہی مطلب کی طرف ہو یعنی اندازہ گیری مستقیم اور ابداع (نئے سرے سے ایجاد کرنا بدون سابقہ)۔

بہرحال انسانوں میں خلقت کا ذکر اور خدا کے سلسلے میں خلقت تعبیر احسن الخالقین بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے معانی متفاوت و مختلف ہیں بلکہ حقیقی معنی کے لحاظ سے خلقت فقط خلقت خدا پر صادق ہے۔ یعنی موجودات کو بدون سابقہ عدم سے ہستی کی طرف لانا۔

جب کہ انسان میں خلقت ایک صنعتی کام کرنا یا معماری کرنا ہے یعنی مختلف چیزوں کو جوڑ کر ایک چیز کا بنانا اور اس کو دنیا میں موجود شکلوں میں کوئی شکل دینا ہے (یا کئی شکلوں کی ترکیب میں سے کوئی اور شکل بنانا) لہٰذا نہ مادہ اختراع انسان ہے اور نہ ہی اس کی صورت اس کی ایجاد ہے۔

توجہ رہے کہ وصف خالقیت اور خلاقیت وسیع ترین صفات فعل میں ہے جس میں تمام جہان آجاتا ہے، اس کا مظہر آسمان، زمین، جہانِ مادہ اور ماورائے مادہ ہے۔

خالقیت خداوند اس کے وجود کی اہم ترین نشانی ہے کیونکہ جہاں بھی قدم رکھیں اس کی خلقت و آفرینش کی نشانیاں ہی نشانیاں نظر آئیں گی جب کہ صفات الٰہی میں سے ہر صفت انسان کے لیے ایک پیام ہے اور قرآن جو کتاب معرفت و تربیت ہے، اس میں ان کا تذکرہ پیام ہی کے عنوان سے ہے۔ یہ صفت بھی انسان کو بتا رہی ہے کہ تیرے وجود کی دلیل تیرے وجود کے آثار ہی ہیں۔ تیرے آثار علمی، اجتماعی ہی سے

---

[1] مفردات راغب

تیراوجود برقرار رہے گا۔اگر تو کچھ چھوڑ کر نہیں جارہا تو پھر اس ذات بے مثال سے تیری کوئی مشابہت نہیں ہوگی، گویا تو اخلاق خدا سے متخلق ہی نہیں ہوا، اس کی راہ کو گویا تو نے اختیار ہی نہیں کیا۔

بکوش تو ہم آثاری بیافرین و نقشی بیفگن!
وہ پرتوی ازایں صفت بارز الٰہی درخود داشتہ باش

کوشش کر کے آثار ونشانات چھوڑ جا کر تیرا نقش باقی رہے تو خدا کی اس روشن صفت کا پرتو خود میں پیدا کر لے

(۴) فاطر (۵) بارى (٦) فالق (۷) بدیع (۸) مصور

یہ پانچوں اوصاف شبیہ صفت خالقیت ہیں، لیکن ان میں نئے مفاہیم اور نکتے بھی ہیں۔آیئے آیات زیر کی طرف توجہ دیں۔

(۱) فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قف

''تو زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔''[۱] (یوسف ۱۰۱)

(۲) هُوَاللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ

''وہی پیدا کرنے والا، بدونِ سابقہ ایجاد کرنے والا اور صورتیں بنانے والا ہے۔''[۲] (حشر ۲۴)

(۳) اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ط

''خدا وہ ہے جو گٹھلی اور دانہ کا شگافتہ کرنے والا ہے۔'' (انعام ۹۵)

(۴) فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ج

''وہ نور سحر کا شگافتہ کرنے والا ہے۔'' (انعام ۹٦)

(۵) بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

''وہ زمین وآسمان کا ایجاد کرنے والا ہے۔''[۳] (انعام ۱۰۱)

---

[۱] اس قسم کی تعبیر قرآن مجید میں چھ آیات میں ہے انعام ۴، ابراہیم ۱۰، فاطر ۱، زمر ۴٦، شوری ۱۱، اور آیت مورد بحث۔

[۲] یہی صفت سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۵۴ میں بھی مذکور ہے۔

[۳] یہی تعبیر سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۱۷ میں بھی ہے۔

وضاحت و پیام

"فاطر" کا مادہ "فطر" بروزن ستر ہے۔اس کا معنی پھٹ جانا (شگافتہ ہونا) یا اس کا معنی لمبائی سے شگافتہ ہونا ہے جیسا کہ سورۂ انفطار کی پہلی آیت میں آیا ہے:

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ①

"جب آسمان شگافتہ ہوجائے گا۔"

یہ کلمہ گوسفند کا دودھ دوہنے، روزہ کھولنے اور اسی طرح بدون سابقہ کسی چیز کی ایجاد کے معنی میں بھی آتا ہے۔جیسے آپ کہتے ہیں کہ عدم ونیستی کا تاریک پردہ شگافتہ ہوگیا اور میدانِ ہستی میں موجود نے قدم رکھا۔

"باری" کا مادہ بر بروزن قفل ہے، اس کا معنی بیماری سے شفایاب ہونا یا ناپسندیدہ چیز سے رہائی پانا ہے۔پھر اس کا معنی ایسا پیدا کرنے والا لیا گیا جو بدون کم وکاست اور موزوں ایجاد کرے۔

بعض کا خیال ہے کہ اس کا مادہ بری بروزن برگ ہے، یعنی لکڑی تراشنا ظاہر ہے تراشنے کا مقصد لکڑی کو صاف اور موزوں بنانا بھی ہے۔یہی مطلب خالق حکیم پر بھی صادق آسکتا ہے کیونکہ اس ذات نے ہر چیز کو موزوں ہی پیدا کیا ہے۔

بعض نے صراحتاً کہا ہے، باری یعنی وہ ذات جس نے بدون نمونہ سابقہ چیزوں کو ایجاد کیا ہے۔

"فالق" کا مادہ "فلق" بروزن خلق ہے۔اس کا معنی کسی چیز کا شگافتہ کرنا، اس کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے جدا کرنا ہے، انگوری کے پیدا ہونے پر بھی اطلاق ہوتا ہے کیونکہ اس میں بیج اور درختوں کی گٹھلی اپنے استحکام اور مضبوطی کے باوجود شگافتہ ہوتی ہے اور عمدہ ولطیف پیرایہ سے زمین سے باہر آتی ہے۔

حقیقتاً زمین سے تازہ کونپل وشاخ کا ظاہر ہونا ایک حساس ترین اور خوبصورت ترین مرحلہ پیدائش ہے۔یہ درحقیقت بطن مادر سے بچے کی پیدائش کے مانند ہے۔

عجائبات خدا یہ حساس لحظہ تغیر وتبدل شکل کے بعد ایک جہان سے دوسرے جہان میں قدم رکھنا ہے۔یہ کون سی طاقت ہے جس نے تازہ کونپل کو قدرت وتوانائی دی ہے کہ بیج ودانہ کی محکم ومضبوط دیوار کو پھاڑ کر باہر نکل رہی ہے۔وہ پودہ اس بچے کی طرح ہے جو بطن مادر میں راحت کے بستر میں دراز تھا، پھر اس ظلمت کدۂ رحم مادر سے باہر قدم رکھ رہا ہے اور اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔

"بدیع" کا مادہ "بدع" بروزن "منع" ہے جیسا کہ ذکر ہوچکا ہے کہ اصل میں اس کا معنی بدون نمونہ سابقہ کسی چیز کا ایجاد کرنا ہے، کبھی نئے کھودے ہوئے کنویں کو بھی بدیع کہا جاتا ہے اور بے سابقہ کام وروش کو بدعت کہتے ہیں۔

جب اس کلمہ کا استعمال خدا کے بارے میں ہو تو اس کا معنی آلات اور زمان ومکان کی احتیاج کے بغیر کسی چیز کو ایجاد کرنا ہوتا ہے۔یہ فقط خدا ہی کے بارے میں مستعمل ہے۔کلمہ بدیع صفت مشبہ ہے اور اس کی دلالت اس بات پر ہے کہ یہ وصف خدا کے لیے ثابت و

دائمی ہے۔[1]

''مصور'' کا مادہ صورت ہے۔جس کا معنی کسی چیز کی ہیئت اور نقش ہے اور اس کی جمع صور ہے۔صورت کی دو قسمیں ہیں ''صورت محسوس'' جیسے صورتِ حیوان، انسان اور دوسرے مادی موجودات، تصورات عقلی وفکری اور ہر چیز کے ذہنی مفاہیم۔کلمہ مصور کا معنی صورت دینے والا ہے۔جب اس کا اطلاق خدا پر ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صورتیں جو خدا نے اشیاء کو عطا کی ہیں۔

بعض صاحبانِ لغت کا خیال ہے کہ لغت عرب میں اس کا معنی کسی چیز میں تبدیلی اور تمائل کرنا ہے۔''صورت'' جس کا معنی شکل و ہیئت ہے۔عبری زبان میں اس کی اصل ''صوراہ'' ہے۔(اسی سے یہ لیا گیا ہے)۔

وضاحت و پیام

جو کچھ ذکر کیا گیا ہے مجموعی طور پر اس سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ ''فاطر، باری اور بدیع ان سب سے مراد بدون نمونہ سابقہ چیز کا ایجاد کرنا ہے، لیکن بعض میں یہ مطلب زیادہ واضح ہے اور بعض میں کم۔بہر حال ان سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ خدا کا کسی چیز کو خلق کرنا اور اسی طرح انسان کا خلق کرنا، دونوں پر خلقت کے اطلاق میں بڑا فرق ہے۔ایک تو خلقت خدا میں وسعت اور لامحدودیت ہے دوسرے خدا چیز اور مادہ کے علاوہ اس کی صورت کا بھی خالق ہے جب کہ مادہ وصورت دونوں کی خلقت بدون نمونہ سابقہ ہے۔برخلاف اس کے انسان کی نسبت سے خلقت فقط مواد میں ترکیب اور بعض شکلوں میں تبدیلی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔لہٰذا خلقت کے حقیقی مفہوم کا اطلاق خدا پر ہی ہے اور انسان کے ہاتھوں خلقت پر حقیقی اطلاق نہیں بلکہ مجازی ہے۔

اسماء حسنیٰ کی تفسیر میں غزالی کا قول مرحوم کفعمی نے مصباح میں نقل کیا ہے:

بعض کا خیال ہے کہ خالق، باری اور مصور الفاظ مترادفہ ہیں اور سب کا معنی خلق کرنا اور اختراع کرنا ہے۔جب کہ ایسا نہیں (یعنی یہ الفاظ مترادفہ نہیں) بلکہ عدم سے وجود میں آنے والی اشیاء کے تین مراحل ہیں:

(۱) تقدیر (۲) ایجاد (۳) تصویر۔

پھر اس کی مثال ذکر کرتے ہوئے فرمایا ایک اچھے قصر و محل کی تعمیر کے لیے پہلے انجینئر نقشہ بناتا ہے پھر معمار تعمیر کرتا ہے اور بعد میں استادانِ فن اس پر رنگ و روغن، گچ کاری اور تزئین کرتے ہیں۔

کلمہ خالق پہلے معنی پر دلالت کرتا ہے، باری سے دوسرا معنی سمجھا جاتا ہے اور مصور میں تیسرا معنی پایا جاتا ہے۔[2]

بہر حال یہ اوصاف الٰہی وہی پیام دے رہے ہیں جو پہلے اوصاف کا پیام تھا البتہ یہ اوصاف مورد بحث میں اضافہ خاص بھی ہیں۔

---

[1] مفردات، لسان العرب، التحقیق اور مقائیس اللغۃ (مقائیس اللغۃ میں اس کا ایک اور معنی یعنی انقطاع اور خستہ ہونا بھی ذکر کیا گیا ہے)۔

[2] مصباح کفعمی صفحہ ۳۱۹۔

(۹) مالك (۱۰) ملك (۱۱) حاکم (۱۲) حکیم (۱۳) رب

یہ چاروں صفات صفات فعل ہیں۔ان کا وسیع مفہوم تمام موجودات جہان کو شامل ہے۔ترتیب منطقی کے لحاظ سے خلقت وآفرینش کے بعد انکی باری ہے۔لہٰذا ان (خالقیت خداوغیرہ) کے بعد ہی ہم نے ان صفات کا تذکرہ کیا ہے۔

اب ہم آیات زیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:

(۱) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ

''کہو خدایا تو تمام ملک کا حاکم ہے۔'' (آل عمران ۲۶)

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

''روز جزا کا مالک تو ہے۔''[1] (حمد ۴)

(۲) فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ

''پس بلند و برتر ہے وہ خدا جو بادشاہ برحق ہے۔''[2] (طٰہٰ ۱۱۴)

(۳) وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

''وہ حاکموں میں بہترین ہے۔''[3] (اعراف ۸۷)

(۴) قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ

''کہو کیا میں خدا کے علاوہ کوئی اور رب لاش کروں جب کہ وہی سب کا رب (پالنے والا) ہے۔''[4] (انعام ۱۶۴)

(۵) فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

---

[1] کلمہ مالک قرآن میں تین مرتبہ آیا ہے۔دو سے مراد خدا ہے جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے اور ایک مقام پر مامورانِ دوزخ میں سے فرشتہ مراد ہے۔

[2] کلمہ ملک قرآن مجید میں ۱۱ دفعہ آیا ہے۔پانچ مقامات میں خدا مراد ہے۔طٰہٰ ۱۱۴، مومنون ۱۱۶، حشر ۲۳، جمعہ ۱ اور ناس ۲۔

[3] کلمہ ''حاکمین'' قرآن میں پانچ دفعہ ذکر ہوا ہے۔ہر جگہ وصف خداوندی ہے۔اعراف ۸۷، یونس ۱۰۹، ہود ۴۵، یوسف ۸۰، تین ۸۔

[4] کلمہ رب قرآن مجید میں ۹۰۰ دفعہ ذکر ہوا ہے۔اس سے وصف الٰہی کی فوق العادہ اہمیت واضح ہوتی ہے۔

''جان لوخداسب پر غالب اور صاحب حکمت ہے۔''[1] (بقرہ ۲۰۹)

وضاحت و پیام

ملک، مالک، ملیک، ان تینوں کا مادہ ''ملک'' بروزن ''مرغ'' ہے۔ بقول صاحب مقائیس اللغہ اس کی دلالت قدرت وقوت پر ہے۔ چونکہ صاحبان مال اور اسی طرح حکمران وفرماں روا صاحبان قدرت وقوت ہوتے ہیں اس لیے اس کلمہ کا اطلاق ان پر ہوا ہے، مفردات میں راغب کا خیال ہے ''ملک'' اس کو کہا جاتا ہے جو عوام پر امر ونہی کے عنوان سے تصرف کر رہا ہو۔

ملک کا اطلاق عام طور پر مالکیت سیاسی پر ہوتا ہے۔ جبکہ مالک مال ومعاملات سے متعلق ہے۔

بعض کے نزدیک مالک، ملک سے زیادہ جامع ہے کیونکہ ہر مالک چیز کا ملک اور حکمران ہوتا ہے لیکن ملک کا مالک ہونا ضروری نہیں ہے۔[2]

بعض کا خیال ہے کہ مالک اپنے ملک میں ہر قسم کے تصرف کا حق رکھتا ہے جب کہ ملک (حکمران) اس قسم کے تصرف کا حق نہیں رکھتا، علاوہ ازیں مملوک اپنے ارادہ واختیار سے مالک کے تصرف سے خارج نہیں ہوسکتا جب کہ رعیت حکمران کی حکومت سے نکلنے کا حق رکھتی ہے۔[3]

البتہ یہ دونوں کلمے جب خدا کے بارے میں استعمال ہوں تو گویا مصداق ''اتم واکمل'' کی طرف اشارہ ہوتا ہے بلکہ ان کا حقیقی مصداق خدا ہی ہے۔ لہٰذا کفعمی مرحوم مصباح میں کلمہ ''ملک'' کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: خدا وہ ہے جس کی مالکیت تمام اصناف مملوکات کو شامل ہے اور اس کا ہر امر ونہی تمام مخلوق پر لاگو ہے۔ وہ ذات وصفات میں تمام موجودات سے بے نیاز ہے اور تمام موجودات اس کے محتاج ہیں۔[4]

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ مالکیت وحاکمیت کی علت اس کا خالق ہونا ہے۔ جس طرح خالق حقیقی صرف خدا ہے اسی طرح مالک حقیقی بھی خدا ہی ہے، مالک اور ملک کا اطلاق غیر خدا پر مجازی ہے۔

''حاکم'' کا مادہ ''حکم'' ہے۔ مقائیس لغت کا کہنا ہے کہ اس کا معنیٰ ''منع'' ہے بلکہ سب سے پہلے اس سے مراد ظلم وستم سے منع کرنا ہے۔ حکیم کو اس لیے حکیم کہتے ہیں کہ اس میں ایسی قوت ہوتی ہے جو اسے غلط کام سے روکتی ہے۔

---

[1] کلمہ حکیم قرآن مجید میں تقریباً ۱۰۰ دفعہ استعمال ہوا ہے اور غالب وصف خداوندی کے طور پر ہی ہے۔

[2] مجمع البیان جلد اول ص ۲۳

[3] اس فرق کو فخر رازی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے جلد اول صفحہ ۲۳۷

[4] مصباح کفعمی ص ۳۱۸

اس صفت حکیم کا اطلاق خدا پر اس عنوان سے ہے کہ وہ عالم تکوین اور عالم تشریع میں تمام موجودات کو غلط کام سے روکتا ہے۔ کلمہ حکیم چونکہ علم خدا کی حکایت کر رہا ہے اس لیے صفات ذات میں اس کا شمار ہوگا۔ پھر اس عنوان سے کہ موجودات کی خلقت میں ایک نظم خاص اور تشریع قوانین میں مصالح کامل کا خیال ہے لہٰذا کلمۂ حکیم صفات فعل سے شمار ہوگا۔ (غور کریں)

کتاب التحقیق میں مرقوم ہے کہ حکیم، حاکم اور حکم میں فرق ہیئت اشتقاق سے ہے۔ حکیم وہ ہے جس کے لیے حکم ثابت ہو۔ حاکم وہ ہوتا ہے جس سے حکم کا صدور ہو اور حکم میں یہی معنی ہے لیکن ثبات وقوام کا تصور بھی موجود ہے۔

نہایہ میں ابن اثیر کہتا ہے کہ حکم اور حکیم اسماء خدا میں حاکم کا معنی دیتے ہیں۔ پھر ان کے لیے چند معانی ذکر کیے ہیں:

(۱) اشیاء کو بنحو احسن (اچھے طریقے پر) ایجاد کرے۔

(۲) افضل اشیاء سے بہترین طریقہ پر آگاہی ہو۔

(۳) غلط کام خصوصاً ظلم وستم سے روکے۔

رب: جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے کہ رب ایک مفہوم حقیقی رکھتا ہے، اس کے لوازم اور برگ وبار کا سلسلہ کافی وسیع ہے اور اس کے موارد استعمال میں کثرت ہے۔

اس کا مفہوم اصلی، جیسا کہ مفردات میں ہے، تربیت کرنا اور کسی چیز کو کمال کی طرف لے جانا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مفاہیم اصلاح، تدبیر، ملکیت، حکومت، سیادت، تعلیم اور تغذیہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

لسان العرب میں ہے: ''رب'' خدا کی ذات پاک پر اطلاق کے علاوہ مالک، آقا، مدبر، مربی، قیم اور منعم کے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

مصباح کفعمی میں ہے: ''رب'' کا حقیقی معنی تربیت اور تدریجاً کمال کی طرف لے جانا ہے، یہ معنی مصدری مبالغہ کے عنوان سے معنی وصفی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پھر مفہوم اصلی کے سلسلہ میں چار اقوال ذکر کرتے ہیں:

(۱) مالک (۲) آقا (۳) مدبر (۴) مربی۔ بالترتیب ان کی مثالیں یہ ہیں: رب الدار (گھر کا مالک) اما احدکما فیسقی ربہ خمرا (تم دونوں میں سے ایک اپنے مالک کو شراب پلائے گا)۔ ربانیون اور ربائب (زوجہ کی اولاد جو پہلے شوہر سے ہو)۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب معانی تربیت وپرورش کا لازمہ ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ یہ پانچوں صفات ملک، مالک، حکیم، حاکم اور رب۔ صفات فعل ہیں اور ان کے مفاہیم ماسوائے صفت حکیم کے ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں کہ جو صفت اور صفت فعل ہر دو میں شامل ہے۔

خدا کی ''ربوبیت'' اس کی مالکیت وحاکمیت سے جدا نہیں، مالکیت وحاکمیت کی آمیزش ربوبیت کے ساتھ ہے۔

ان اوصاف کی طرف توجہ اور ان پر ایمان میں ایک پیام اور آثارِ تربیتی ہیں، خاص طور پر اس عنوان سے کہ یہ اوصاف معنی واقعی کے لحاظ سے خدا کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اس کی مالکیت کا اعتقاد ہمیں آمادہ کرے گا کہ اپنے اموال میں اپنے آپ کو خدا کی طرف سے امین سمجھیں اور اسی مالک اصلی کے حکم کے مطابق عمل کریں۔

خدا کی حاکمیت کا اعتقاد ہمیں ظالم اور طاغوتی طاقتوں کی حمایت کرنے سے روکے گا۔

اس کی ربوبیت کا اعتقاد اس کے غیر کی طرف توجہ سے مانع ہوگا۔یعنی تمام جہان اس کا جلوہ ہے اور سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔طبعاً ہمیں کمزور مخلوقات کی غلامی اور ان کی طرف توجہ سے مانع ہوگا۔

(۱۴) ولی (۱۵) والی (۱۶) مولی (۱۷) حافظ (۱۸) حفیظ (۱۹) رقیب (۲۰)مھیمن

ان سات صفات کے مفاہیم ایک جیسے ہیں اور یہ سب خدا کی صفاتِ فعل ہیں۔لہٰذا ہم ان سب کی بحث ایک ہی جگہ کر رہے ہیں تا کہ ان کی تفسیر (ایک دوسرے کو سامنے رکھتے ہوئے) بہتر طریقہ پر ہو سکے۔درحقیقت ان کی بحث خالقیت و ربوبیت کے بعد ہونی چاہیے تھی۔

قرآن مجید میں ان میں سے بعض صفات صرف ایک بار اور بعض کئی دفعہ ذکر ہوئی ہیں۔اب ہم آیات ذیل کی طرف گوش دل سے توجہ کرتے ہیں۔

(۱) اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ

''کیا ان لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے لیے سرپرست بنائے ہیں جب کہ فقط اللہ ہی سب کا (ولی) اور سرپرست ہے۔''(شوریٰ ۹)

(۲) وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ

''ان کے لیے خدا کے علاوہ کوئی والی (سرپرست) نہیں۔''(رعد ۱۱)

(۳) بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ

''بلکہ فقط خدا ہی تمہارا مولیٰ (سرپرست ہے)۔(آل عمران ۱۵۰)

(۴) فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۖ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

''خدا سب سے بہترین حفاظت کرنے والا اور سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''(یوسف ۶۴)

(۵) اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ

''بیشک میرا رب ہر چیز کا محافظ ہے۔''(ہود ۵۷)

(۶) وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا

''خدا ہر چیز کی نگرانی کرنے والا ہے۔''(احزاب ۵۲)

(۷) هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ

''وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں۔ وہ بادشاہ، پاکیزہ صفات، بے عیب، امان دینے والا اور نگرانی کرنے والا ہے۔''(حشر ۲۳)

وضاحت و پیام

''ولی'' کا مادہ ''ولاء'' ہے جس کا معنی دو چیزوں کا ایک دوسری کے قریب قرار پانا ہے۔ پھر قرب اور نزدیکی کے معنی میں آیا ہے، خواہ قرب مکانی یا رشتہ داری یا دین و دوستی و نصرت و اعتقاد کے عنوان سے ہو۔

راغب نے مفردات میں یہی کہا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ دلایت (ولی زیر کے ساتھ) کا معنی مدد کرنا اور ولایت (واؤ کی زبر کے ساتھ) کا معنی سرپرستی کرنا ہے۔[۱]

مقائیس اللغۃ نے اس کا اصل اسی معنی قرب کو قرار دیا ہے۔ لسان العرب نے ولی کا معنی ناصر اور جہان کا متولی لیا ہے۔ بہرحال اس کے کئی معانی ہیں۔ لیکن جب خدا پر اطلاق ہو تو بے شک اس کا معنی امورِ جہاں کا سرپرست اور بندوں کا مددگار ہی لیا جائے گا۔

کلمہ مولیٰ کا مادہ بھی یہی ہے۔ اس کے کئی معانی ذکر کیے گئے ہیں۔ لیکن سب کی بنیاد یہی قرب و نزدیکی ہے۔

علامہ امینی مرحوم نے کتب لغت میں موارد استعمال کو دیکھتے ہوئے اس کے نوے معانی ذکر کیے ہیں۔

ابن اثیر نے نہایہ میں اس کے سولہ معانی ذکر کیے ہیں اور تصریح کی ہے کہ مولیٰ کا معنی ولی ہے۔ اس میں حضرت عمر کا قول جو کہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ **اصبحت مولی کل مومن** (آپ ہر مومن کے ولی اور سرپرست ہوگے)۔[۲]

نیز ان کا کہنا ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس معاملہ کی علت یہ ہے کہ اسامہؓ نے حضرت علیؑ سے کہا کہ آپ میرے مولیٰ نہیں۔ میرے مولی صرف رسول اللہؐ ہیں۔ پیغمبرؐ نے سنا تو فرمایا: ''**من کنت مولا فعلی مولا**'' ''جس کا میں مولیٰ ہوں علی علیہ السلام بھی اس

---

[۱] کفعمی نے مصباح میں اس کا عکس مراد لیا ہے۔ اسی طرح نہایۃ میں ابن اثیر نے ولایۃ کا معنی سرپرستی اور ولایت کا معنی نصرت اور مدد لیا ہے۔ بعید نہیں کہ نسخہ مفردات میں غلطی ہو۔

[۲] رب، چچا، چچا کا بیٹا، بیٹا، بہن کا بیٹا، غلام آزاد کرنے والا، غلام آزاد شدہ، غلام، مالک، تابع، جو مورد انعام ہو، شریک، باہمی معاہدہ کرنے والا، ساتھی، ہمسایہ، مہمان، داماد، نزدیک، نعمت دینے والا، عقید، ولی، اولی، آقا، دوست، مددگار، امور میں تصرف کرنے والا، امور کا سرپرست۔ (الغدیر جلد ۱ صفحہ ۳۶۲)

کے مولا ہیں۔''[1]

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ولی (اسم فاعل) کا معنی واضح ہو جائے گا۔

لہٰذا خدا جس طرح ہمارا ولی، مولا، والی، سرپرست، صاحب اختیار حاکم اور ناصر ہے اسی طرح تمام موجودات کا بھی ہے۔

کلمہ ''حافظ کا مادہ ''حفظ'' ہے جس کا معنی نگہبانی ہے۔ مقائیس اللغہ کا خیال ہے کہ اس کا معنی کسی چیز کی مراعات ونگہبانی کرنا ہے۔ اس لیے غضب وغصہ کی حالت کو حفیظہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس حالت کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی بہت زیادہ مراقبت ونگہبانی کرے۔

کتاب التحقیق کی تفسیر زیادہ جامع ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''حفظ'' ایسا کلمہ ہے کہ اختلاف موارد اور موضوعات میں اس کے معانی مختلف ہوتے ہیں (جب کہ اس کی اساس و بنیاد ایک ہے) کبھی کہا جاتا ہے کہ مال کی حفاظت کی تلف ہونے سے، امانت کی حفاظت کی خیانت سے، نماز کی حفاظت کی فوت ہونے سے، فلاں شخص کی حفاظت کی یعنی نگہبانی کی، مخالفت سے قسم وعہد کی حفاظت کی، اس کی مخالفت نہ کرنے سے، فلاں مطلب کی حفاظت کی تا کہ ذہن سے محو نہ ہو۔[2]

اس بحث سے حافظ کا معنی واضح ہو جائے گا۔ البتہ حفیظ صفت مشبہ ہے اور حافظ اسم فاعل ہے۔ حفیظ کا معنی زیادہ گہرائی اور ثابت ہے۔ (غور کریں)

جب اس کا استعمال خدا پر ہو تو معنی میں کافی وسعت ہوگی کیونکہ خدا تمام موجودات مادی ومعنوی، زمین وآسمان، بندوں کے اعمال، آسمانی کتب وشرائع کا محافظ ہے، پیغمبروں اور ائمہ کی لغزش سے محافظت، نیز ہر قسم کے عہد و پیمان کی حفاظت کو شامل ہے۔

اس لحاظ سے خدا کا حافظ وحفیظ ہونا اس کی قومیت کو واضح کرتا ہے۔

اگر خدا کی حفاظت شامل نہ ہوتی تو وسیع زمین وآسمان میں کوئی موجود اپنی حیات کو جاری نہ رکھ سکتا جیسا کہ آیۃ ۶۱ سورۂ انعام میں ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ

''وہی خدا ہے جو اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم سب پر محافظ فرشتہ بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب اس کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے فرستادہ اسے اٹھا لیتے ہیں اور وہ کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ اس آیت سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ فرشتے حکم خدا سے حوادث وآفات سے انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔''

اسی طرح کا مضمون سورۂ رعد آیت ۱۱ میں ہے:

---

[1] نہایۃ ابن اثیر جلد ۵ صفحہ ۲۲۸ مادہ ولی۔

[2] التحقیق فی کلمات القرآن مادہ حفظ۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ یَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ ؕ

''اس کے لیے سامنے اور پیچھے سے محافظ طاقتیں ہیں جو حکم خدا سے اس کی حفاظت کرتی ہیں۔''

عجیب بات یہ ہے کہ ہم نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنینؑ کا فرمان پڑھتے ہیں:

ان مع کل انسان ملکین یحفظانه فاذا جاء القدر خلیا بینه و بینه

''ہر انسان کے لیے خدا کی طرف سے دو محافظ فرشتے ہیں جب حتمی تقدیر کا وقت آتا ہے تو وہ اس سے دور ہٹ جاتے ہیں۔''[1]

حفظ اعمال کے لیے فرشتوں کی مراقبت وحفاظت کا تذکرہ ہم سورۂ انفطار میں پڑھتے ہیں:

وَاِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ﴿۱۰﴾ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ﴿۱۱﴾ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾

''اور یقینا تمہارے سروں پر نگہبان مقرر ہیں۔ وہ لکھنے والے باعزت ہیں۔ تمام اعمال سے آگاہ ہیں اور تمہارے اعمال کو خوب جانتے ہیں۔'' (انفطار ۱۰ تا ۱۲)

لہٰذا خدا کا حافظ ہونا علم وقدرت کے وسیع لحاظ سے بھی ہے اور فرشتوں کے لحاظ سے بھی جو اس امر کی انجام دہی کے لیے مامور خاص ہیں۔

کلمہ ''رقیب'' (جیسا کہ مفردات میں ہے) کلمہ رقیب کا مادہ رقبہ ہے، جس کا معنی گردن ہے، یہ پھر محافظ، مراقب اور نگہبان پر بولا گیا ہے یا اس نکتہ نظر سے کہ جو شخص مورد توجہ ہے اس کی گردن کی حفاظت کی جائے (گردن کا ذکر اس لیے ہے کہ یہ انسان کا اہم ترین عضو ہے اور یہ کل وجودِ انسان سے کنایہ ہے) یا اس لیے کہ قتل کرنے والا ہر طرف نظر کرتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ لہٰذا جس جگہ ایسے شخص کو کھڑا کیا جائے اس کا نام ''مرقب'' ہے۔[2]

لیکن بعض کتب لغت میں اس کے برعکس معنی لیا گیا ہے۔ یعنی اس کا اصل معنی نگہبانی ومحافظت ہے، پھر اس کا معنی خاص عضو یعنی گردن لیا گیا ہے، رقیبہ اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ محافظت ونگہبانی کے وقت آنکھ، کان اور حرکات گردن سے استفادہ کیا جاتا ہے۔[3]

صاحب کتاب العین کے نزدیک اس کا اصل معنی ''انتظار'' ہے، صاحب مقائیس اللغہ کا خیال ہے کہ محافظت کے لیے قد بلند کرنے کو رقبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بہر حال جب اس کا اطلاق خدا پر ہو تو ایسی حفاظت مراد ہوگی جس میں کوئی پہلو اس سے مخفی نہ ہوگا۔[4]

---

[1] کلمات قصار جملہ ۲۰۱

[2] مصباح المیز قیومی۔

[3] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم

[4] لسان العرب مادہ رقبہ

البتہ تمام جہان ہستی، بندوں کے اعمال اور خود بندوں کی مراقبت وحفاظت کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔اس میں خدا کے نگاہ کرنے اور گردن اونچی کرنے جیسے معانی نہیں لیے جاسکتے کیونکہ خداوند متعال ان موجودات مادی کے عوارض سے منزہ ومبرا ہے۔

کلمہ "مهیمن" قرآن مجید میں دوبار استعمال ہوا ہے۔

(۱) سورۂ حشر آیت نمبر ۲۳ میں خدا کے وصف کے عنوان سے استعمال ہوا ہے جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

(۲) سورۂ مادۂ آیت نمبر ۴۸ میں قرآن مجید کی صفت کے عنوان سے استعمال ہوا ہے۔اس کلمہ کی اساس وبنیاد کے متعلق دو قول ہیں:

بعض کے نزدیک اس کا مادہ ''ھیمن'' ہے جس کا معنی مراقبت ونگہبانی ہے جب کہ بہت سارے اہل لغت اس کا مادہ ''ایمان'' قرار دیتے ہیں جس کا ہمزہ ''ھاء'' سے تبدیل ہوگیا ہے یعنی امن وامان اور آرام دینے والا۔یہ کلمہ جب خدا کے حق میں استعمال ہو تو اس کا معنی مراقبت ونگہبانی ہے۔بعض حضرات اس سے شاہد، ناظر اور امورِ خلائق کے لیے قیام کرنے والا مراد لیتے ہیں۔[1]

مصباح کفعمی میں بعض بزرگان سے نقل ہوا ہے کہ اس کا مطلب وہ ذات ہے جو بندوں کے اعمال کی مراقبت اور ان کے رزق کی ذمہ دار ہو۔[2]

بہرحال اس کے معنی میں کافی وسعت ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

پوری بحث سے معلوم ہوا کہ ان سات صفاتِ الٰہی کا مفہوم ایک جیسا ہے اور ان میں باہم تلازم بھی پایا جاتا ہے۔علاوہ ازیں کہا جا سکتا ہے کہ اس سے ہمارے قارئین کے لیے معارفِ الٰہی اور صفاتِ فعل کے کئی باب کھل جاتے ہیں۔پھر ان میں تربیت بشر کے لیے گراں بہا موتی موجود ہیں۔

ان سے انسان کو نیکی وخوبی کو اپنانے اور ہر قسم کی غلط کاری سے بچنے کا درس ملتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا میرا محافظ ہے اور ہر وقت دیکھ رہا ہے، ایسا انسان حوادثات زمانہ سے ڈرتا نہیں اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ خدا میرا محافظ ہے۔

اس لیے بارہا ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں صفات الٰہی کے ذکر کے دو فوائد ہیں:

(۱) خدا کے بارے میں معرفت انسان کی سطح کو بلند کرنا۔

(۲) مختلف جہات سے اس کی تربیت کرنا۔

---

[1] لسان العرب، مقائیس اللغۃ، نہایۃً ابن اثیر، بعض تفاسیر میں ابوعبیدہ (عالم لغت) سے نقل ہوا کہ کلام عرب میں پانچ اسم اس وزن پر آتے ہیں۔مھیمن، مسیطر، مبیطر (ڈاکٹری آلہ)، مبیقر (آگے کی طرف راستہ دینا) اور مخیمر (پہاڑ کا نام) تفسیر ابوالفتوح رازی)

[2] مصباح کفعمی صفحہ ۳۱۸

(۲۱) رازق (۲۲) رزاق (۲۳) کریم (۲۴) حمید (۲۵) فتاح

یہ پانچ اوصاف مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک اور آپس میں لازم وملزوم ہیں، یہ سب کی سب نوع انسان بلکہ تمام موجودات زندہ کے مسئلہ روزی ورزق کے حل کی حکایت کررہی ہیں۔ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے ان موجودات کو پیدا کیا ہے، ان کو روزی دینا بھی اسی کے ذمہ ہے، اس کا خوانِ نعمت ہر کسی کے لیے بچھا ہے اور بارانِ رحمت ہر کسی کو شامل ہے۔اب ہم اس سلسلہ کی آیات کی طرف توجہ کرتے ہیں:

(۱) وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ

''بے شک خداوندی بہترین روزی دینے والا ہے۔''(حج ۵۸)

(۲) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾

''بے شک خدا ہی روزی دہندہ، صاحبِ قدرت وقوت ہے۔''(ذاریات ۵۸)

(۳) يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴿۶﴾

''اے انسان تجھے رب کریم کے بارے میں کس نے مغرور بنایا ہے۔''[1] (انفطار ۶)

(۴) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

''جان لو کہ خدا بے نیاز اور قابل تعریف وستائش ہے۔''[2] (بقرہ ۲۶۷)

(۵) وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾

''وہی مشکلیں دور کرنے والا آگاہ ہے۔''(سبا ۲۶)

وضاحت وپیام

کلمہ ''رازق''اور ''رزاق'' کا مادہ ''رزق'' ہے۔اس کا معنی ہمیشہ اور اوقات معین میں بخشش کرنا ہے، خواہ دنیوی ہو یا اخروی و معنوی۔کبھی حصہ اور نصیب کو بھی رزق کہا جاتا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ ''رزق'' اس بخشش وانعام کو کہتے ہیں جو مرزوق کے مقتضاء حال کے مطابق اور اس کی احتیاج کے موافق ہوتا کہ وہ

---

[1] کلمہ کریم قرآن مجید میں ۲۷ بار استعمال ہوا ہے لیکن اس کا اطلاق خدا پر بہت کم ہے۔

[2] کلمہ حمید قرآن مجید میں ۱۷ بار آیا ہے۔اکثر اوقات وصف غنی بھی اس کے ساتھ ہے۔دونوں کو وصف الٰہی کے طور پر لایا گیا ہے۔

اپنی حیات وزندگی کو جاری رکھ سکے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں ''رزق'' کا مفہوم احسان، انعام، اعطاء، حصہ ونصیب اور انفاق وصف کے مفہوم سے جدا ہوجاتا ہے۔[1]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ''رزق'' فارسی زبان میں ''روزی'' کے معادل ہے یعنی وہ انعام وبخشش جو ہر روز ہو۔

واضح رہے کہ حقیقی روزی وہی ہے جو حلال طریقہ سے انسان کو ملے، حرام کے راستہ سے آنے والا ''رزق'' روزی کاذب ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ روزی ورزق کا مسئلہ خلقت وآفرینش کے بعد ہے۔ اس سے حیات مادی ومعنوی کا دوام ہے۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ اصل وجود انسان یا اس کی قوتیں اور استعدادیں بھی روزی ہیں۔ جیسے مصباح میں کفعمی کا خیال ہے کہ خدا کے رازق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے روزی کو پیدا کیا اور روزی کھانے والوں کو بھی پیدا کیا۔ یہ ایک مجاز ہے اور معنی حقیقی میں وسعت کا ایک پہلو ہے۔

آیات مندرجہ بالا میں خدا کو خیر الرزاقین کہنا حسب ذیل مختلف جہات کی طرف اشارہ ہے:

(۱) وہ جو کچھ دیتا ہے اس کا اپنا ہے جب کہ دوسرے دینے والے اپنی طرف سے نہیں بلکہ انتقالِ روزی کے عنوان سے دیتے ہیں۔

(۲) وہ تمام چیزیں دیتا ہے، مادی نعمات، معنوی، روحانی، دیناوی، اخروی، ظاہری، باطنی، واضح، مخفی، جس کو دیا جائے وہ آگاہ ہو یا ناآگاہ، اس کا سلسلہ محدود نہیں جب کہ کوئی دوسرا جو بھی دیتا ہے وہ ہر لحاظ سے محدود ہے۔

(۳) وہ روزی دینے میں بندوں کی احتیاج کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق عطا فرماتا ہے کیونکہ وہ روزی خواروں کے اندرونی وبیرونی اسرار سے آگاہ ہے۔ دوسرے دینے والے اس طرح کے نہیں ہیں۔

(۴) وہ ایسا روزی دہندہ ہے جس کے ہاں روزی ختم نہیں ہوتی کیونکہ ہر چیز کا خزانہ اس کے پاس ہے۔ وان من شیء الا عندنا خزائنه جب کہ دوسرے ہر لحاظ سے محدود ہیں۔

(۵) وہ دوست ودشمن ہر کسی کو رزق دیتا ہے۔ اس کی رحمانیت ورحمیت سے سبھی اس کے دسترخوان سے رزق کھا رہے ہیں۔

بقول شاعر

ادیم زمین سفرۂ عام ادست!

برایں خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست

روئے زمین پر اس کا عمومی دسترخوان سب کے لیے ہے۔

اس دسترخوان سے ہر شخص اور قبیلہ مستفید ہو رہا ہے، خواہ دشمن ہو یا دوست۔ لیکن دوسرے لوگ فقط اپنے عزیزوں یا دوستوں ہی کو دیتے ہیں۔

---

[1] مفردات راغب، مقائیس اللغۃ، اور تحقیق فی کلمات قرآن الکریم

(۶) وہ دینے میں کسی شکریہ اور کسی جزا کا انتظار نہیں کرتا کیونکہ وہ ہر لحاظ سے غنی اور بے نیاز ہے لیکن دوسرے دینے والے طرح طرح کی خواہش رکھتے ہیں۔

(۷) اس کا رزق اس قدر وسیع ہے کہ رحم مادر میں نطفہ کے انعقاد سے شروع ہوتا ہے اور تمام ایام حمل میں رزق کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پھر پیدائش کے بعد ماں کے دودھ کی اور مامتا کی محبت ونوازش کی صورت میں جاری وساری ہے، حتی کہ مرتے دم تک رزق کا انقطاع نہیں ہوتا۔ اس کے سوا کون ہے جو اس طرح رزق وروزی دے سکے۔ اسی لیے تو فرمایا ہے کہ وہی بہترین روزی دینے والا ہے۔

خوب تر یہ کہ روایات اہلبیتؑ میں آیہ شریفہ ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم کی تفسیر میں کہا گیا: ''یقیناً تم سے اس دن نعمات خدا کے متعلق سوال کیا جائے گا۔'' (تکاثر ۸) فرمایا خداوند قدوس بزرگ وبرتر ہے۔ اس سے کہ وہ آب وغذا کے متعلق سوال فرمائے، یہ تو بندوں پر خداوند کریم کا فضل وکرم ہے۔ لہٰذا اس کا سوال نہیں ہوگا۔ جس چیز کا سوال ہوگا وہ عقائد حقہ ہیں اور ان میں سے بھی (نعمتِ ولایت اہل بیتؑ) ہے۔[1]

اس لحاظ سے خداوند قدوس کا خیر الرزاقین ہونا واضح ہو جاتا ہے بلکہ وہ تو اپنی دی ہوئی روزی کے بارے میں سوال تک نہیں کرے گا۔

خداوند تعالیٰ کو رزاق کیوں کہا گیا اور پھر ذوالقوۃ المتین کیوں؟ ظاہراً اس لیے کہ رزاق صیغہ مبالغہ ہے اور یہ انواع واقسام رزق کی طرف اشارہ ہے جو خدا سب روزی کھانیوالوں کو دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کلمہ خدا کے سوا کسی پر صادق نہیں آتا۔ بلکہ جیسے کہا گیا ہے کہ غیر خدا رازق ہی نہیں ہے چہ جائیکہ رزاق کہلائے کیوں کہ کسی کے پاس کوئی چیز ہے ہی نہیں جو دے سکے، وہ تو خدا کے رزق کی منتقلی میں صرف واسطہ ہی بن سکتا ہے۔

''متین'' کا معنی محکم اور اس کا مادہ متن ہے۔ متن اس طاقت ور غصلہ کو کہتے ہیں جس نے دونوں جانب سے ریڑھ کی ہڈی کو پکڑ رکھا ہے اور اس سے پشت انسان مضبوط ہوتی ہے، بھاری بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جاتی ہے۔ پھر اسی مناسبت سے طاقت وقدرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

خداوند عالم کو ان دو صفات کے ساتھ متصف کرنا واضح کرتا ہے کہ بندے جہاں بھی ہوں، جن حالات میں ہوں، وہ ان کو روزی پہنچانے پر قادر ہے اور اس کو کسی کی احتیاج نہیں۔ خدا کے ان اوصاف خاصہ کی طرف توجہ سے ایک صاحب ایمان انسان کو اطمینان میسر ہوگا کہ وہ روزی کے لیے خود کو گناہ میں مبتلا نہ کرے اور ایمان دار ہوتے ہوئے لطف خدا سے رزق حلال کی سعی کرے۔

''کریم'' کا مادہ ''کرم'' ہے۔ مقائیس اللغۃ میں ہے کہ اس کا معنی شرافت، ذاتی واخلاقی عظمت ہے۔ لہٰذا بارش والے بادل کو

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ صفحہ ۵۰۲ حدیث ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳۔

''کریم'' اور مفید زمین کو ''مکرمہ'' کہا جاتا ہے۔

راغب کہتے ہیں کہ اگر ''کرم'' انسانی صفت ہو تو اس سے مراد وہ افعال و اخلاق پسندیدہ ہیں جو اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر خدا کی صفت ہو تو اس کا معنی اس کے واضح و آشکار انعامات و احسانات ہیں۔ جب ''کریم'' خدا کی صفت میں آئے تو اس کے بارے میں مفسرین نے کئی ایک تعبیریں کی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ''کریم'' اس بخشنے والے کو کہتے ہیں جس کے تمام افعال خود اس کا احسان ہوں اور وہ احسان کے بدلے میں کسی چیز کا خواہش مند نہ ہو۔

بعض کہتے ہیں ''کریم'' وہ ہے جو تھوڑی چیز کے بدلے میں جزا کثیر دے۔

بعض کہتے ہیں ''کریم'' وہ ہے جو چیز اس پر لازم ہو وہ دے اور جو لازم نہ ہو وہ بھی دے دے۔

ان میں سے کسی ایک معنی پر کوئی خاص دلیل نہیں۔ چونکہ خدا کا کرم کامل ترین اور ہر چیز کو شامل ہے لہٰذا یہ تمام مفاہیم تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں ''کریم'' وہ ہے جس کی عطا ختم نہ ہو۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ صفت مختلف عنوان سے آئی ہے۔

کبھی خود رزق کی صفت "رِزْقٌ كَرِيْمٌ" (انفال ۴)

کبھی ملک و فرشتہ کی صفت "مَلَكٌ كَرِيْمٌ" (یوسف ۳۱)

کبھی عرش کی صفت "رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ" (مومنون ۱۱۶)

کبھی قرآن کی صفت "اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ" (واقعہ ۷۷)

بہر حال یہ صفت جہاں بھی ہو ایک قسم کی کرامت و عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

''حمید'' کا مادہ ''حمد'' ہے جس کا معنی تعریف و ستائش ہے۔ اس کے مقابل مذمت ہے۔ اس مقام پر حمید بھی محمود ہے اور صفت و تعریف خدا ہے اس لحاظ سے کہ خدا ہر عنوان سے قابل تعریف و ستائش ہے۔

خدا کی تعریف اس لیے ہے کہ اس کی ذات بے مثال ہے۔ خدا کی تعریف اس کے اسماء و صفات کی وجہ سے ہے۔ خدا کی تعریف اس کے اعلیٰ تر اعمال و افعال کے ساتھ ہے اور پھر تعریف اس لیے ہے کہ سب نعمات و موہبات و ارزاق کی بازگشت اسی کی طرف ہے خواہ وہ مادی ہوں یا معنوی، جو وہ سب بندوں کو دینے والا ہے۔

کفعمی مرحوم مصباح میں کہتے ہیں: ''حمید'' وہ ہے کہ شادی و غمی، راحت و مصیبت ہر جگہ اس کے افعال قابل تعریف ہوں۔

ابن اثیر نہایہ میں کہتے ہیں: ''حمید'' صفت خدا ہے بایں معنی کہ وہ ہر حال میں قابل تعریف ہے۔ پھر کہا ہے کہ حمد و شکر کے مفہوم ملتے جلتے ہیں جب کہ ''حمد'' نسبتاً عام ہے کیونکہ حمد و ثنا خدا کی صفاتِ ذات کے عنوان سے بھی ہے اور عطاء و بخشش نعمات کی وجہ سے بھی ہے جب کہ شکر فقط مواہب و نعمات کی وجہ سے ہے، صفات کے باعث نہیں ہے۔

بہرحال واضح ہے کہ ''حمد'' کا مفہوم وسیع ہے جو ذات وصفات اور افعال سب کو شامل ہے۔ قابل توجہ یہ امر ہے کہ کلمہ ''حمید'' قرآن مجید میں ۱۶ بار استعمال ہوا ہے اور اکثر اوقات غنی وعزیز بھی ساتھ ہی ذکر کیے گئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ غنی افراد عام طور پر غرور کی وجہ سے غلط اور ناموزوں کام کر لیتے ہیں۔ لیکن خدا سے باوجود غنی وعین عزت ہونے کے افعال حمیدہ ہی ظاہر ہوئے۔ وہ اوصاف جمال وکمال سے آراستہ ہے اور اس میں کوئی عیب موجود نہیں۔ پس خدا ہر لحاظ سے قابل حمد وثنا ہے۔

''فتاح'' کا مادہ ''فتح'' ہے، راغب (مفردات) اور ابن فارس (مقائیس اللغۃ) کے بقول فتح کا معنی بند چیز کو کھولنا ہے خواہ دروازہ کھولنا ہو یا دوسری مشکلات کا حل کرنا ہو۔ اس لیے کامیابی کو فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے مشکل جنگ برطرف ہوتی ہے۔ فیصلہ وحکم کو بھی فتح کہتے ہیں کیونکہ اس سے مشکل تنازع کا حل ملتا ہے۔

جب اس کا اطلاق خدا پر ہو تو پھر وسیع معانی مراد ہوں گے یعنی کلمہ فتح بند دروازوں کو کھولنے تمام مشکلات مادی ومعنوی کو حل کرنے اور حق وحقیقت کے مطابق حکم وفیصلہ کرنے کو شامل ہوگا۔

کفعمی مرحوم مصباح میں کہتے ہیں: فتاح یعنی وہ جو لوگوں کے درمیان برحق فیصلہ کرے، ان پر رحمت وروزی کے دروازے کھول دے اور اپنے لطف وعنایت سے ہر بند کو کھولے۔ [1]

اس صفت الٰہی کا تربیتی اثر واضح ہے جو شخص خدا کو حاکم سمجھتا ہے اس کا نظریہ ہوگا کہ خدا ہی مشکلات کو حل کرتا ہے اور بند دروازوں کو آسانی سے کھول سکتا ہے۔ ایسا شخص مشکلات سے کبھی نہیں گھبرائے گا اور اس کے دل میں ہرگز یاس ونا امیدی پیدا نہیں ہوگی۔ وہ کامیابی کی امید اور یقین کے ساتھ اپنی کوشش میں خدا کے لطف وکرم پر نظر رکھے گا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ فتاح ایک ہی بار قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے اور وہ بھی علیم کے ساتھ۔ ''علیم'' کا رابطہ ''فتاح'' کے ساتھ واضح ہے کیونکہ حل مشکلات اور رفع مصائب کے لیے ان کا علم ضروری ہے۔ لہٰذا جو تمام مشکلات کو حل کر سکتا ہے اسے ان سب کا علم بھی ہوگا۔ اے انسان! تو بھی اپنی اور دوسروں کی جس قدر مشکلات حل کرنا چاہتا ہے اسی قدر تجھے علم بھی حاصل کرنا چاہیے۔

ہوسکتا ہے کہ خدا کا وصف ''خیر الفاتحین'' (اعراف ۸۹) جس کا تذکرہ قوم شعیب کی زبانی ہوا ہے:

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ

''خدایا میرے اور میری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما کہ تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔''

یہ اسی معنی کی طرف ناظر ہے کیونکہ ایسے فاتح جو علم نہیں رکھتے ہمیشہ سے ان کے کام مناسب طریقہ پر نہیں ہوتے۔ لہٰذا خیر الفاتحین وہی ہوگا جو علم میں سب سے زیادہ ہو اور ہر چیز کا علم رکھتا ہو۔

---

[1] مصباح کفعمی صفحہ ۳۲۱

(۲۶) رحمن (۲۷) رحیم (۲۸) ارحم الرحمین (۲۹) ودود (۳۰) روف (۳۱)لطیف (۳۲) حفی

خدا کی صفات افعال میں سے جو ہمیشہ وردِ زبان رہتی ہیں، ہر نماز، قرآن کی سورتوں کے آغاز بلکہ ہر کام سے پہلے جن کا تکرار ہوتا ہے وہ خدا کی صفات رحمانیت اور رحیمیت ہیں جن سے بندوں پر اس کے لطف بے پایاں کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ وہی ارحم الرحمین ہے۔

اس معنی کے لوازم میں سے خدا کی داد و دوستی، اس کا لطف و عنایت اور رافت ہے۔ قرآن میں ان سات صفات کا تذکرہ بڑی کثرت کے ساتھ ہوا ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم آیات ذیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:

(۱) قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ

''کہہ دو کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو، جس طرح بھی پکارو اس کے سبھی نام بہترین ہیں۔''[1] (اسراء ۱۱۰)

(۲) اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾

''بیشک خدا تمہاری نسبت مہربان تھا اور ہے۔''[2] (نساء ۲۹)

(۳) وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

''تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''[3] (اعراف ۱۵۱)

(۴) وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿۱۴﴾

''وہی بندوں کو بہت بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔'' (بروج ۱۴)

(۵) اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

---

[1] (سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ کے علاوہ) رحمان ۵۶ بار قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے، جس سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

[2] (سورتوں کے آغاز کے علاوہ) رحیم قرآن مجید میں ۱۱۴ بار ذکر ہوا۔ اس کی قدر و اہمیت فوق العادہ ہے۔

[3] یہ کلمہ قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا۔ کبھی خطاب کی صورت میں جیسے آیہ مذکورہ بالا ہے۔ کبھی غائب ضمیر کی صورت میں جیسے "وھو ارحم الرحمین" (یوسف ۶۴ - ۹۲)

''بیشک اللہ بندوں کے حال پر مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔''[1] (بقرہ ۱۴۳)

(۶) وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿۱۰۳﴾

''وہی صاحب لطف اور باخبر ہے۔''[2] (انعام ۱۰۳)

(۷) إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ﴿۴۷﴾

''خداوند میرے حال پر مہربان، محبت کرنے والا اور آگاہ ہے۔''[3] (مریم ۴۷)

وضاحت و پیام

اس تفسیر کی پہلی جلد میں رحمن و رحیم کی مفصل بحث ہوئی ہے۔ لہٰذا یہاں تکرار کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف اتنا کہیں گے کہ دونوں کا مادہ ''رحمت'' ہے۔ مفکرین اور مفسرین میں مشہور ہے کہ ''رحمان'' رحمت عام کی طرف اشارہ ہے جو دوست و دشمن، مسلم و کافر، نیک و بد سب کو شامل ہے۔ (جیسے قسم قسم کی نعمتیں اور عطیات زمین و آسمان کہ سب اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں)۔ ''رحیم'' رحمت خاص کی طرف اشارہ ہے جو فقط مومنین کے ساتھ مخصوص ہے اور اس سے نیک لوگ ہی بہرہ ور ہوں گے۔

بہرحال کلمہ ''ارحم الراحمین'' (سب مہربانوں سے زیادہ مہربان) اس لحاظ سے وصف خداوندی ہے کہ اس کی رحمت کا پرتو بندوں کے دلوں پر ہے۔ ماں باپ اپنے فرزند کے لیے مہربان ہیں، بہت سے لوگ اپنے دوستوں کے ساتھ محبت رکھتے ہیں لیکن یہ سب رحمت خدا کی معمولی شعاعیں میں بلکہ یہ رحمتیں مجازی ہیں اور رحمت خدا ہی حقیقی رحمت ہے کیونکہ ذات خدا سب سے بے نیاز ہے جب کہ انسان کی محبت ایکدوسرے کے ساتھ بعض احتیاجات کی وجہ سے ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں اوروں کی رحمت محدود ہے اور وہ حدود کے اندر ہ جب کہ رحمت خدا ہر لحاظ سے لامحدود اور لامتناہی ہے۔

قرآن مجید کی چار آیات میں اس وصف کے موارد استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وصف وہاں استعمال ہوا کہ جہاں حد سے زیادہ مشکل درپیش ہو اور معاملہ جان کنی تک پہنچ گیا ہو۔ حضرت ایوبؑ کی داستان میں جب معاملہ مشکل ہوتے ہوتے انتہا کو پہنچ گیا، داستانِ یوسفؑ میں جب برادرانِ یوسفؑ انتہائی مشقت و تکلیف میں تھے (یوسفؑ ۶۴) یا وہ وقت جب برادران یوسف نے ان کو پہچان لیا اور اپنے ظلم و ناانصافیوں کو یاد کر کے بہت زیادہ شرمندہ ہوئے۔ (یوسف ۹۲)۔

---

[1] روف ۱۱ بار قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے، بہت سے موارد میں وصف رحمت کے ساتھ ذکر ہوا ہے جیسے مافوق آیۃ بالا میں ہے اور کبھی اس صورت میں استعمال ہوا ہے روف بالعباد۔

[2] کلمہ ''لطیف'' قرآن مجید میں ۷ بار آیا ہے اور ہر جگہ اوصاف خداوندی میں سے کسی وصف کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

[3] کلمہ حفی قرآن مجید میں دو بار آیا ہے اور صرف ایک جگہ صفت پروردگار میں ہے، جیسے آیہ مافوق میں ہے۔

حضرت موسیٰ کے واقعات میں اس وقت جب وہ اپنی قوم کی طرف لوٹے، انہیں گوسالہ پرستی میں مشغول پایا اور اپنے بھائی ہارون پر سخت ناراض ہوئے۔ (اعراف ۱۵۱)

ان تمام مشکل مراحل میں اس وصف کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اس سے روشن ہوا کہ سخت مشکلات اور سنگین حوادث میں لازم ہے کہ ہم خدا کے اس امید افزاء وصف کی پناہ لیں اور خود کو اس کی رحمت کے سایہ میں قرار دیں، ہمیں کوشش کرنا ہوگی کہ خود بھی اس وصف کا مظہر نہیں یا کم از کم اس کا پرتو ہی اپنے اندر پیدا کریں۔

احادیث اسلامی میں خدا کی رحمت واسعہ کا ذکر

احادیث میں خدا کی رحمت واسعہ کا ذکر عجیب انداز اور بڑی کثرت کے ساتھ ہوا ہے۔ بطور نمونہ یہ چند حدیثیں اس حقیقت کا اظہار کرتی ہیں:

(۱) ایک حدیث میں امیر المومنینؑ سے منقول ہے:

"الله رحيم بعباده، ومن رحمته انه، خلق ماة رحمة جعل منها رحمة واحدة فی الخلق كلهم فيها يتراحم الناس و ترحم الوالدة ولدها ... فاذا كان يوم القيامة اضاف هذه الرحمة الواحدة الى تسع وتسعين رحمة فيرحم بها امة محمد" (ص)

''خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اس کی رحمت کی علامت یہ ہے کہ رحمت کی ۱۰۰ شاخیں بنائیں، ایک کو سب بندوں میں تقسیم کیا۔ اسی لیے انسان ایک دوسرے مہربانی اور محبت کرتے ہیں جیسے ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے..... قیامت کے دن اس رحمت پر ۹۹ حصص کا اضافہ کیا جائے گا۔ پھر یہ رحمت واسعہ امت محمدیہ کے شامل حال ہوگی۔''[1]

(۲) ایک حدیث میں ہم حضرت امام جعفر صادقؑ کا فرمان پڑھتے ہیں:

"اذا كان يوم القيامة نشر الله تعالىٰ رحمته حتى يطمع ابليس فی رحمته"

''جب قیامت کا دن ہوگا خدا اپنی رحمت واسعہ کو اس طرح عام کرے گا کہ ابلیس بھی رحمت کی طمع کرنے لگے

---

[1] مستدرک سفینۃ البحار از مرحوم علامہ نمازی شہرودی جلد ۴ ص ۱۳۵

گا۔"[1]

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام علیؑ ابن الحسینؑ کی خدمت میں عرض کیا گیا: حسن بصریؒ کہتے ہیں، تعجب نہیں کہ ایک گروہ گمراہ و ہلاک ہوگا، بلکہ تعجب تو اس پر ہے کہ (معارہ کی اس قدر خرابی کے ہوتے ہوئے) کوئی کیونکر نجات پائے گا۔

امامؑ نے فرمایا: لیکن میں ایک اور بات کہتا ہوں:

"لیس العجب ممن نجی کیف نجی وانما العجب مقن هلك كيف هلك مع سعة رحمة الله۔"

"ان لوگوں کے متعلق تعجب نہیں جنہوں نے نجات پائی وہ کیسے نجات یافتہ ہوگئے، بلکہ تعجب تو اس پر ہے جو ہلاک وتباہ ہوا جب کہ اللہ کی رحمت وسیع اور بے پایاں ہے۔"[2]

خدایا! تیرے بے پایاں کرم سے بعید نہیں کہ تو اپنی رحمت واسعہ کا پرتو ہم پر ڈال دے اور تیری رحمت ہمارے شامل حال ہوجائے۔

کلمہ "ودود" کا مادہ "ود" (واؤ پر پیش) ہے۔ اصل میں اس کا معنی کسی چیز کی محبت رکھنا اور اس کے وجود کی آرزو کرنا ہے۔ لہٰذا ودود محبت اور تمنا ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

یہ تشریح مفردات ومقائیس اللغۃ میں مذکور ہے۔ لیکن لسان العرب نے اس کا معنی فقط محبت کیا ہے جب کہ قرآن مجید میں یہ محبت کے ساتھ ساتھ تمنا اور آرزو کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

بہرحال یہ کلمہ مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی بہت زیادہ محبت کرنے والا۔ خوب تر یہ کہ یہ کلمہ قرآن مجید میں غفور (بہت زیادہ بخشنے والا) اور ایک رحیم کے ساتھ آیا ہے۔ یہ دونوں وصف گویا ودود کی تاکید ہیں۔

کفعمی مرحوم مصباح میں کہتے ہیں: "ودود" جب وصف الٰہی کے عنوان سے استعمال ہو تو اس کا معنی ہوگا خدا بندوں کو دوست رکھتا ہے، ان سے راضی ہے اور ان کے اعمال کو قبول کرتا ہے..... یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی کی دوستی بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے (جیسا کہ آیہ ۹۶ سورۂ مریم میں ہے)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

"بے شک جو لوگ ایمان لائے انہوں نے نیک اعمال کیے عنقریب رحمان لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا

---

[1] بحارالانوار جلد ۷ صفحہ ۲۸۷ حدیث ۱ (باب مایظهر من رحمته تعالی یوم القیامة)

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۵۱۷

کردے گا۔''[1]

بعض ارباب لغت نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ودود اسم مفعول کے معنی میں ہے۔اس کا مطلب بندوں کے دلوں میں خدا کا محبوب ہونا ہے۔[2]

لیکن دوسرا اور تیسرا معنی بعید نظر آتا ہے۔اس کے مواردِ استعمال سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصلی معنی دوست رکھنا اور آرزو کرنا ہے۔

نہ کہنے کے باوجود معلوم ہے کہ محبت کا مفہوم خدا اور انسانوں میں ایک جیسا نہیں، انسان میں محبت ایک طرح کی قلبی توجہ اور جاذبہ روحی ہے جب کہ خدا نہ قلب رکھتا ہے اور نہ روح۔لہٰذا خدا کی طرف سے محبت کا مطلب ایسے کام انجام دینا ہوگا جن سے بندوں کو خیر وسعادت نصیب ہو اور اس کا لطف وعنایت ان کے شامل حال ہو جائے۔

جن لوگوں نے ''ودود'' کو اسم مفعول لیا ہے ظاہراً اس لیے کہ محبت بمعنی اسم فاعل خدا کے لیے مناسب نہیں کیونکہ یہ موجوداتِ امکانی کے عوارض میں سے ہے۔

لیکن جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا کے بارے میں محبت اس کے آثارِ خارجی ہیں، یہ بات ہم فقط اس جگہ نہیں کہہ رہے، بلکہ بہت سے اوصاف اور افعال میں یہی مطلب لیا جاتا ہے۔مثلاً ہم کہتے ہیں کہ گناہگاروں پر خدا کا غضب ہوگا، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ایک شخص غضب ناک کی طرح ہوگا؟ نہیں، کیونکہ خشم وغضب جس کا معنی ہیجان نفس ہے وہ خدا کے بارے میں ہرگز صادق نہیں آتا۔

بہرحال دیگر اوصاف خدا کی طرح اس وصف کی طرف توجہ کا فوق العادہ تربیتی اثر ہے کیونکہ خدا کی محبت بندوں کے ساتھ ہو تو اس کا تقاضا یہ ہوگا کہ بندے بھی اس سے محبت کریں، اس لیے کہ محبت واقعی یکطرفہ نہیں ہوتی اور جب بندے خدا سے محبت کریں گے، خدا سے عشق کریں گے تو مسلماً اس کے فرمان پر عمل بھی کریں گے۔وہ اپنے آپ کو ایسا بنانے کی کوشش کریں گے جیسا خدا چاہتا ہے اور جس سے خدا راضی ہے کیونکہ عاشق ہمیشہ معشوق کا راستہ اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔

''روف'' کا مادہ رأفت ہے۔راغب کے نزدیک اس کا معنی ''رحمت'' ہے۔یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ کلمہ ۱۱ بار استعمال ہوا ہے اور ان میں سے ۹ بار وصف رحیم کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔[3] گویا روف ورحیم ایک دوسرے کی تاکید کرتے ہیں۔

یہ بات مفسرین اور ارباب لغت میں محل بحث ہے کہ رؤف ورحیم میں کیا فرق ہے۔بعض کے نزدیک ان دونوں کا معنی ایک ہے۔لہٰذا ان کا باہمی ذکر خدا کی رحمت بے پایاں پر تاکید کے لیے ہے۔

جب کہ بعض حضرات جیسے ابن اثیر نہایہ میں ان دونوں کے درمیان فرق کے قائل ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ''رأفت'' رحمت سے بالاتر

---

[1] مصباح کفعمی صفحہ ۳۲۵

[2] مجمع البحرین مادہ ''ود'' توحید صدوق صفحہ ۲۱۴

[3] بقرہ ۱۴۳، توبہ ۱۱۷، توبہ ۱۲۸، نحل ۷، نحل ۴۷، حج ۶۵، نور ۲۰، حدید ۹، حشر ۱۰

ہے، ایسے مسائل جو ناخوشی کا موجب ہوتے ہیں ان میں رأفت استعمال نہیں ہوتا بلکہ رحمت کا کلمہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً انگشت سیاہ وخراب کا قطع کرنا رحمت ہے۔ تاکہ زہر بدن کے دوسرے حصوں میں سرایت نہ کر جائے۔ لیکن اس جگہ ''رأفت'' کا استعمال جائز نہیں ہے۔''[1]

کفعمی مرحوم مصباح میں اس کلمہ کی تفسیر میں کہتے ہیں: بعض کا خیال ہے کہ رأفت کا درجہ رحمت سے اعلیٰ ہے جب کہ بعض کے نزدیک رحمت کے مقابلہ میں اس کا دائرہ محدود ہے۔ مفسر بزرگ علامہ طبرسی آیت ۱۲۸ سورۂ توبہ کے ذیل میں لکھتے ہیں: بعض کے نزدیک رؤف اور رحیم کا معنی ایک ہے البتہ رأفت، رحمت سے قوی تر ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ رؤف کا استعمال اطاعت گزاروں کے لیے ہوتا ہے جبکہ رحیم گناہگاروں کی نسبت استعمال ہوتا ہے۔

بعض قدیم مفکرین کا خیال ہے کہ خدا نے کسی پیغمبر میں دو صفات ایک جگہ جمع نہیں کی ہیں لیکن پیغمبر اکرمؐ میں دو صفات جمع ہیں (اسی آیت میں فرمان ہے ''بالمومنین رئوف رحیم'' وہ مومنوں پر مہربان اور رحمت کرنے والا ہے اور اپنے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ (ان اللہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ) (بقرہ ۱۴۳)[2]

اس مقام پر خدا کے اس وصف کے ذریعے تربیت کی جارہی ہے اور پیام دیا جارہا ہے کہ خدا رؤف ورحیم ہے، اس کا پیغمبر بھی رؤف و رحیم ہے۔ لہٰذا اس مکتب کے پیروکاروں اور خدا اور رسول کے عاشقوں کو بھی آپس میں رؤف ورحیم ہونا چاہیے۔ یعنی رحمت عام وخاص کا پرتو اپنے وجود میں منعکس کرنا چاہیے۔

''لطیف'' قرآن مجید میں سات بار استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ خدا کے کسی وصف کے ساتھ آیا ہے، اکثر اس کا تذکرہ خبیر کے ساتھ ہوا ہے[3] اور فقط دو جگہ تنہا مذکور ہے۔[4]

بہرحال اس کا مادہ ''لطف'' ہے جس کا معنی دقیق و باریک کام اور مہر ومحبت ہے۔ اس کا اطلاق موجودات باریک، ظریف حرکات، دقیق کام اور ایسے امور پر بھی ہوتا ہے جو حواس سے درک نہیں کیے جاسکتے۔ یہ وصف جب خدا کے لیے استعمال ہو تو اس کا معنی بندوں پر خدا کی مہربانی ورفق ہے، یہ ان کو موفق کرنے اور انہیں خطرات ومشکلات سے بچانے میں استعمال ہوا ہے۔[5]

ابن اثیر اس کلمہ کی تفسیر میں کہتے ہیں: لطیف وہ ہے جس کے عمل میں رفق، مصالح دقیقہ سے آگاہی اور جن کے لیے یہ مقدر ہیں ان تک پہنچائے (وہ ان تمام امور میں جمع کر سکے)۔

---

[1] نہایۃ مادہ ''رأف''، لسان العرب، مجمع البحرین

[2] مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۸۶

[3] انعام ۱۰۳، حج ۶۳، لقمان ۱۶، ملک ۱۴، احزاب ۳۴

[4] یوسف ۱۰۰، شوریٰ ۱۹

[5] مفردات، لسان العرب، مادۂ لطف

کفعمی مرحوم مصباح میں کہتے ہیں: مشکلات میں خدا کو اس وصف سے پکارنا ان کے برطرف ہونے کی تاثیر عمیق رکھتا ہے۔[1]

صدوق مرحوم کتاب توحید میں خدا کی اس صفت کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں: اس کا لطف بندوں پر ہے۔ وہ ان کے ساتھ بھلائی کرتا ہے، نعمت دیتا ہے۔ پھر فرمایا اس کا لطف یہی بھلائی کرنا اور عزت دینا ہے۔ بعد میں اس حدیث معروف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ان معنی اللطیف انه هو الخالق للخلق اللطیف" لطیف ہونے کا معنی یہ ہے کہ خدا مخلوق لطیف، حتی کہ نازک ترین مخلوق کو پیدا کرتا ہے۔ البتہ لطیف کے وسیع مفہوم کے لحاظ سے ان تمام معانی کے درمیان جمع یقیناً ممکن ہے۔

اکثر آیات میں ''لطیف'' کے ساتھ ''خبیر'' اس لیے لایا گیا ہے (جیسے بعض محققین نے کہا ہے) تاکہ بتایا جائے کہ اس ذات نے تمام حقائق کا احاطہ کیا ہوا ہے اور وہ بہت آگاہی رکھتا ہے۔ یہ معنی لطیف کے مفہوم کے نزدیک تر ہے اور اس سے مناسبت رکھتا ہے۔ (غور کریں)

اس لفظ کی طرف توجہ کرنے سے اس میں موجود پیغام اور اس کا تربیتی اثر بھی واضح ہے کیونکہ ایک طرف انسان کو مشکلات میں خدا کے الطاف خفیہ وجلیہ کا امیدوار بنایا جا رہا ہے اور دوسری طرف انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مہر ومحبت اور لطف کے ساتھ پیش آنے کو کہا جا رہا ہے۔ پھر تیسرے مرحلہ میں انسان کو خدا کی ظریف ترین مخلوق کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔

ان تینوں امور میں سے ہر ایک تربیت انسانی میں گرا اثر رکھتا ہے۔

''حفی'' کا مادہ ''خفاء'' بروزن سلام ہے اور مادہ ''خفا'' بروزن ''جفا'' ہے۔ لغت کی کتابوں میں اس کے کئی معنی ذکر کیے گئے ہیں ''ننگے پاؤں راہ چلنا، سوال کرنے میں اصرار کرنا، کسی چیز کی نسبت علم واطلاع اور نیکی کرنے میں اصرار۔''

بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مفہوم پاؤں کا چمڑا، جوتے کا تلوا اور گھوڑے کے سموں کا چلتے چلتے نازک ہو جاتا ہے۔

بعید نہیں کہ ان سب معانی کی اساس راہ چلنے میں کثرت ہو، جس سے پاؤں کا چمڑہ یا جوتے کا تلوہ نازک ہو جائے[2] یا ختم ہو جائے۔ پھر اس کا استعمال ہر قسم کے اصرار اور ہر چیز میں ''مبالغہ'' کے لیے ہوا ہے۔ سوال میں اصرار سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز کا مکمل علم حاصل کرنا، نیکی پر زور دینا اور کسی کام سے روکنے میں اصرار کرنا۔

قرآن مجید میں یہ کلمہ تین بار ذکر ہوا ہے۔ سوال میں اصرار جیسے آیت ۳۷ سورۂ محمد میں ہے:

اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا

''وہ اگر طلب کرے اور اصرار بھی کرے تو تم بخل کرو گے۔''

علم ودانش میں اصرار، جیسے

يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ

---

[1] مصباح کفعمی ص ۳۲۲

[2] مفردات، لسان العرب، مقائیس اللغۃ، نہایۃ ابن اثیر، تاج العروس اور کتاب العین۔

''یہ لوگ تم سے قیامت کے بارے میں اس طرح سوال کرتے ہیں گویا تم اس کے وقت وقوع سے باخبر ہو۔''
(اعراف ۱۸۷)

نیکی میں اصرار جیسے آیت ۴۷ سورۂ مریم میں آیا ہے کہ ابراہیمؑ اپنے چچا آذر سے کہہ رہے ہیں:

سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝۴۷

''(ابراہیمؑ نے کہا) تم پر سلام ہو، عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت طلب کروں گا کیونکہ وہ میرے حال پر بہت مہربان ہے۔''

بہرحال یہ کلمہ جب خدا کے بارے میں ذکر ہو تو ممکن ہے اس کا معنی عالم و آگاہ ہو۔ اس صورت میں یہ صفات ذات سے ہوگا نہ کہ صفات فعل سے۔ نیز ممکن ہے کہ اس کا معنی بہت زیادہ نیکی اور لطف و محبت ہو تو پھر اس کا شمار صفات فعل میں ہوگا۔ اتفاقاً قرآن مجید میں یہ کلمہ صرف ایک دفعہ وصف کی صورت میں استعمال ہوا ہے اور وہ بھی نیکی و محبت کے معنی کی صورت میں جیسے ابراہیمؑ اور آپ کے چچا آذر کے بارے میں آیا ہے۔

اس وصف کا تربیتی پیغام بھی اس کے مشابہ اوصاف کی طرح واضح ہے۔ کیونکہ ایک طرف اس وصف الٰہی کا جذبہ انسان کو اپنی طرف کھینچے گا اور نورِ امید ان کے دلوں میں پیدا ہوگا، دوسری طرف انہیں نیکی، محبت اور پیار کا درس دے گا۔

(۳۳) غافر (۳۴) غفور (۳۵) غفار (۳۶) عفو (۳۷) ثواب (۳۸) جبار

غفران و بخشش اور گناہگاروں کی توبہ قبول کرنا ان سب کا تعلق خدا کی صفاتِ فعل سے ہے اور ان کے چھ نمونوں کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی مختلف آیات میں ان چھ صفات کا تذکرہ ہوا ہے، آیئے دل و جان سے ان آیات کی طرف توجہ کریں:

(۱) غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ

''وہی گناہوں کو بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔''[1] (مومن ۳)

(۲) اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

''بے شک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''[2] (بقرہ ۱۷۳)

---

[1] یہ صفت قرآن مجید میں ایک بار ذکر ہوئی ہے۔

[2] کلمہ ''غفور'' قرآن میں ۹۱ بار آیا ہے۔ اکثر اوقات صفت رحیم بھی ساتھ ہے۔

(۳) اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ

''آگاہ رہو وہی صاحب قدرت اور بہت بخشنے والا ہے۔''[۱] (زمر ۵)

(۴) اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ

''وہ یقیناً بہت معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔''[۲] (حج ۶۰)

(۵) اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

''بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے۔''[۳] (بقرہ ۳۷)

(۶) اَلْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ

''وہی محافظ ونگرانی کرنے والا، صاحب عزت، زبردست اور کبریائی کا مالک ہے۔''[۴] (حشر ۲۳)

وضاحت و پیام

''غافر، غفور، غفار'' کا مادہ ''غفر'' ہے جس کا معنی ڈھانپنا اور پوشیدہ کر لینا ہے، خاص طور پر آلودگیوں سے چھپانا، غفیر کا معنی لمبے گیسو جو سر کو چھپا لیں، ڈھانپ لیں۔ مغفر کا معنی ڈھال ہے جو جنگ کے وقت سر کو ڈھانپ لیتی ہے۔

یہ کلمہ جب خدا کے بارے میں استعمال ہو تو اس کا معنی بخشش اور گناہوں کی پردہ پوشی ہے۔ غافر اسم فاعل ہے اور غفور و غفار مبالغہ کے صیغہ ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ جب غفور وصف خدا کے عنوان سے آئے تو اس کا معنی بندوں کو رحمت کے سایہ میں لینا ہے، یہ تفسیر بعض بزرگوں کے کلمات میں بھی آئی ہے کہ غفار کا اطلاق خدا پر اس لیے ہے کہ جب انسان غلطی کے بعد خدا کی طرف رجوع کرے تو خدا گناہ کو اپنی بخشش و

---

[۱] ''غفار'' قرآن مجید میں پانچ بار آیا ہے۔ تین مقامات پر صفت عزیز بھی اس کے ہمراہ ہے۔ ص ۶۶، زمر ۵، مومن ۴۲۔ دو مقامات پر تنہا ذکر ہوا ہے۔ طٰہٰ ۸۲، نوح ۱۰۔

[۲] یہ صفت پانچ بار قرآن مجید میں آئی ہے، ان میں چار بار ''غفور'' کے ساتھ حج ۶۰، مجادلہ ۲، نساء ۴۳، نساء ۹۹۔ ایک بار قدیر کے ہمراہ استعمال ہوئی ہے جیسے نساء ۱۴۹

[۳] تواب گیارہ بار قرآن مجید میں وصف خداوندی کے عنوان سے آیا ہے۔ تمام جگہ ماسوائے دو مقامات کے ''رحیم'' بھی ساتھ ہے۔ ایک جگہ وصف حکیم کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ نور ۱۰ اور فقط ایک جگہ تنہا ہے۔ نصر ۳

[۴] کلمہ متکبر آٹھ بار قرآن مجید میں آیا ہے۔ فقط ایک جگہ صفت خداوندی کے طور پر ہے۔

مغفرت سے ڈھانپ لیتا ہے۔[1]

کلمہ ''عفو'' کا مادہ ''عفو'' ہے۔اب منظور السان العرب میں اور ابن اثیر نہایۃً میں لکھتے ہیں کہ اس کا معنی مٹانا اور محو کرنا ہے لیکن راغب کے نزدیک یہ حقیقی معنی نہیں بلکہ اصل معنی کسی چیز کے لینے کا قصد ہے۔اسی مناسبت سے سخت آندھیاں جو مختلف چیزوں کو اڑانے اور ویران کرنے کا سبب بنتی ہیں ان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اگر اس کا محو کرنا اور مٹانا لیا جائے تو اس وجہ سے ہوگا کہ اس میں بھی چیز کے لینے کا قصد ہوتا ہے، البتہ نباتات کو بھی عفو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مٹی کو ایک طرف کر کے ظاہر ہوتی ہیں۔

مقائیس اللغۃ میں اس کا دو اساسوں کا ذکر کیا گیا ہے، کسی چیز کو ترک کرنا یا کسی چیز کی طلب کو ترک کرنا، پھر باقی معانی کی بازگشت انہی کی طرف کی ہے۔ان میں سے عفو کا معنی محو و نابودی، عفاء کا معنی خاک (متروکہ) ہے۔بہرحال جب یہ لفظ خدا کے بارے میں استعمال ہو تو اس کا معنی گناہوں کی بخشش، ترک مجازات و سزا اور آثار معصیت کا مٹانا ہوگا، لیکن چونکہ عفو صیغہ مبالغہ ہے اس لیے اس کا معنی بہت زیادہ معاف کرنے والا ہوگا۔[2]

خداوند تعالیٰ کے اس وصف پر تکیہ و بھروسہ اس عنوان سے بھی ہے کہ اگر خدا کی طرف سے عفو و معافی نہ ہو تو پھر آثارِ گناہ سے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔امیر المومنین علیہ السلام کا فرمان ہے:

''اللهم احملنی علی عفوك ولا تحملنی علی عدلك''

''خدایا میرے ساتھ عفو و بخشش کا رویہ اختیار فرمانہ کہ عدل و انصاف کا۔''[3]

مالک اشتر کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ولا غنی بك عن عفوه و رحمته۔''

''تو ہرگز خدا کی طرف سے معافی اور رحمت سے بے نیاز نہیں۔''[4]

خدا کی طرف سے معافی میں اس قدر وسعت ہے کہ اس کی کوئی حد تصور میں نہیں لائی جا سکتی، قرآن مجید نے اس سے صرف شرک کو مستثنیٰ کیا ہے۔ایک حدیث میں امام حسن عسکری علیہ السلام کا فرمان ہے:

''ان الله لیعفو یوم القیامة عفوا یحیط علی العباد حتی یقول اهل

---

[1] مصباح کفعمی صفحہ ۳۳۰، توحید صدوق صفحہ ۲۰۸، مفردات راغب، لسان العرب، مقائیس اللغۃ مادہ ''غفر''۔

[2] عفو بروزن مفول ہے۔دو واؤ اس میں ادغام ہیں۔

[3] نہج البلاغۃ خطبہ ۲۲۷

[4] نہج البلاغہ مکتوب ۵۳

الشرك والله ربنا ما كنا مشركين۔"

''خدا کی طرف سے معافی کا سلسلہ قیامت کے دن اس قدر وسیع اور محیط ہوگا کہ مشرک لوگ بھی طمع کرتے ہوئے کہیں گے ہمیں اپنے رب کی قسم کہ ہم مشرک نہیں تھے۔''[1]

اسی طرح اس کلمہ سے بندوں کو عفو و درگزر کرنے کا درس دیا جارہا ہے، انہیں نصیحت کی جارہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی غلطیوں سے درگزر کریں اس امید سے کہ خدا ان کے گناہوں سے صرف نظر فرمائے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں عجیب تعبیر ہے جس سے مقام عفو و معافی کی اہمیت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے، فرمان ہے:

"انه ينادى مناد يوم القيامة من كان له على الله اجر فليقم، فلا يقوم الا العافون، الم تسمعوا قوله تعالىٰ فمن عفا و اصلح فاجره على الله۔"

''قیامت کے دن منادی ندا دے گا کہ جس شخص کا اجر خدا پر ہو وہ کھڑا ہوجائے۔ سوائے معاف کرنے والوں کے اور کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔ کیا آپ لوگوں نے خدا کا فرمان نہیں سنا کہ جو معاف کردے اور صلح کرے اس کا اجر خدا کے ذمہ ہوگا؟''[2]

البتہ معاف کرنا صرف اخلاقی مسئلہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑا اجتماعی مسئلہ ہے کیونکہ اگر معاشرہ کی بنا انتقام، جنگ و جدال اور کشمکش پر ہو، ہر جگہ خون ریزی کا دور دورہ ہو تو پھر آرام و عزت کا سلسلہ نہیں رہے گا۔ لہٰذا پیغمبرؐ کی حدیث میں ہے:

"عليكم بالعفو فان العفو لا يزيد العبد الا عزا۔"

''معاف کرنے کو عادت بناؤ کیونکہ عفو و معافی میں عزت و عظمت ہے۔''[3]

''تواب'' مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا مادہ ''توبہ'' ہے۔ مقائیس اللغہ کے نزدیک توبہ کا معنی رجوع اور لوٹنا ہے۔ عام طور پر گناہوں سے لوٹنے کو توبہ کہا جاتا ہے جب کہ یہی لسان العرب میں بھی ہے۔

لیکن راغب نے مفردات میں اس کی ایک اور تعبیر بیان کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ توبہ کی بہترین صورت گناہ کا ترک کرنا ہے، پھر اس عذر خواہی کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) انسان یہ کہے کہ میں نے اصلاً گناہ کیا ہی نہیں (یعنی گناہ کو تسلیم نہ کرے)۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۶، صفحہ ۶ حدیث ۱۲ باب ۱۹ ''عفو اللہ''

[2] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۲۰۸

[3] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۱۰۸۔ باب العفو حدیث ۵

(۲) گناہ کو تسلیم کرے لیکن اس کی توجیہ کرنا شروع کردے (دراصل فلاں وجہ تھی جس سے گناہ ہوا)۔

(۳) انسان اقرار کرے کہ گناہ کیا ہے اور غلط کیا ہے، اب میں نادم ہوں پھر نہیں کروں گا، اس کو توبہ کہتے ہیں۔

بہرحال یہ وصف جب خدا کے بارے میں ذکر ہو تو اس کا معنی بندوں کی توبہ قبول کرنا یا توبہ کرنے کی توفیق دینا ہوتا ہے جسے مصباح میں کفعمی کا خیال ہے۔

ایک قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جب بھی توبہ کی نسبت بندوں کی طرف ہو تو یہ لفظ ''الی'' سے متعدی ہوتا ہے اور جب خدا کی طرف نسبت ہو تو پھر یہ کلمہ علی سے متعدی ہوتا ہے۔

تعبیر کا یہ فرق ظاہراً نکتہ لطیف کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ توبہ کا معنی گناہ سے بازگشت ہے۔ بندوں کی گناہ سے بازگشت کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ کو ترک کردیں اور عذرخواہی کریں۔ خدا کی بازگشت کا مطلب ہے کہ گناہ کی وجہ سے جس رحمت کو روک لیا تھا اب اس رحمت کو نازل کرنا شروع کردے چونکہ اس کا تعلق ایسی ذات ہے جو اعلیٰ و عظیم ہے، اس لیے لفظ علی توبہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

''تواب'' کو مبالغہ کا صیغہ ذکر کرنے میں بھی ایک نکتہ ہے کہ اگر انسان توبہ توڑ توڑ کر کئی مرتبہ گناہ کرے تو بھی خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ خدا ''تواب'' یعنی بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

توبہ کا تربیتی اثر پوشیدہ نہیں کیونکہ اگر توبہ کا دروازہ بند ہو تو پھر ایک ہی گناہ پر ہمیشہ کے لیے رحمت خدا سے مایوسی ہو جائے گی اور انسان بڑے بڑے گناہوں میں جا پڑے گا۔ لیکن جب توبہ کا دروازہ کھلا ہے، خدا کے تواب ہونے کی وجہ سے انسان رحمت خدا کی موجوں کا مشاہدہ کر رہا ہے تو کوشش کرے گا کہ خود اپنی اصلاح کرے اور خدا کی طرف لوٹ آئے، یہ خود تکامل انسان کے لیے ایک عمدہ زینہ ہے۔

اس سے ایک اور درس بھی ملتا ہے کہ جو لوگ تمہارے ماتحت کام کر رہے ہیں ان کے غلط کام کی صورت میں سخت گیر نہ بن جاؤ، ان کے لیے اصلاح اور بازگشت کا راستہ کھلا رکھو۔ جب خدا سے عفو و معافی کی امید رکھتے ہو تو خود بھی عفو و معافی کا راستہ اختیار کرو۔

روایات میں توبہ کے بارے میں ایسی عمدہ و خوبصورت تعبیریں ہیں کہ جن کے باعث انسان توبہ کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے، عشق الٰہی کی آگ اس کے قلب میں شعلہ زن ہو جاتی ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"ان اللہ تعالیٰ اشة فرحا بتوبة عبدہ من رجل اضل راحلته وزادہ فی لیلة ظلماء فوجدھا۔"

''جس شخص کی سواری تاریک رات میں گم ہوگئی ہو پھر مل جائے، اس کو جو خوشی ہوتی ہے خداوند قدوس کو انسان کی توبہ سے اس سے بڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔''[1]

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۳۵ حدیث ۸

ایک اور حدیث میں توبہ کو خدا کے نزدیک محبوب ترین شے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کا فرمان ہے:

"ولیس شیء احب الی اللہ من مومن تائب او مومنة تائبة۔"

''خدا کے نزدیک کوئی چیز توبہ کرنے والے مومن اور توبہ کرنے والی مومنہ سے زیادہ محبوب ترین نہیں ہے۔''[1]

کلمہ جبار کا مادہ ''جبر'' ہے۔ راغب کے نزدیک اس کے حقیقی معنی ایسی ذات کی طرف سے اصلاح جو غالب و قاہر ہے۔ اس وجہ سے یہ کلمہ کبھی اصلاح کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے ٹوٹی ہوئی ہڈی کی اصلاح کے لیے کہا جاتا ہے "جبرت العظم"۔ ایک دعا میں ہم پڑھتے ہیں "یا جابر العظم الکسیر" اے شکستہ ہڈی کی اصلاح کرنے والے۔

کبھی اس کا معنی قہر و غلبہ بھی لیا جاتا ہے۔ مقائیس اللغۃ کا کہنا ہے کہ اس کا معنی عظمت، بلندی اور استقامت سے مرکب ہے۔ (قد کا سیدھا ہونا) اس لیے کھجور کا درخت جو انسان کی دسترس سے بلند ہو اس کو جبارہ کہا جاتا ہے۔

جبر کسی کو کسی بات پر مجبور کرنا، اس کی اساس بھی قہر و غلبہ ہے۔

بہرحال جبار جب صفت خداوندی کے لیے استعمال ہو تو (بقول شیخ صدوق در کتاب توحید) اس کا معنی ہوگا کہ ایسا مصاحب سلطنت کہ کوئی ہاتھ اس کے دامن وعظمت تک نہ پہنچ سکے۔[2]

یا اس کا معنی وہ ذات جو انسان کے فقر و احتیاج کا جبران کرے۔ جیسے کفعمی مرحوم نے مصباح میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔[3]

اس طرح اس کا معنی ناکافی، شکستگی اور ندامت از گناہ کا جبران اور اصلاح بھی ہے۔

بقول علامہ طبرسی در مجمع البیان: یہ کلمہ جب خدا کے بارے میں استعمال ہو تو ایک قسم کی مدح و ثناء خداوندی ہے، جب بندوں کے بارے میں ذکر ہو تو مذمت ہوگی (کیونکہ یہی سمجھا جائے گا کہ اس شخص میں تکبر اور ظلم و فساد پایا جاتا ہے)۔

اس صفت سے ہمیں ایک طرف یہ پیغام ملتا ہے کہ خدا عظیم و اعلیٰ ہے، دوسری طرف یہ کہ اس کی رحمت و عطوفت انسان کی محرومیوں اور کوتاہیوں کا جبران و اصلاح کرتی ہے۔

(۳۹) شکور (۴۰) شاکر (۴۱) شفیع (۴۲) وکیل (۴۳) کافی

یہ پانچویں صفات فعل شمار ہوتی ہیں، ان صفات سے خدا کی نعمات، عطایا اور بندوں کی حمایت و دفاع کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ یہ صفات باہم ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے ایک ہی جگہ پر ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اب ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور گوش دل سے آیات ذیل کی تلاوت

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۲۱ حدیث ۱۵ (باب توبہ اور اس کی اقسام)

[2] توحید صدوق صفحہ ۲۰۶

[3] مصباح، ص ۳۱۹

کرتے ہیں:

(۱) اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ

''بیشک اللہ بہت زیادہ بخشنے والا اور قدردان ہے۔''[1] (شوریٰ ۲۳)

(۲) فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ

''بیشک اللہ قدردان اور آگاہ ہے۔''[2] (بقرہ ۱۵۸)

(۳) لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ

''ان کے لیے خدا کے سوا کوئی سرپرست اور شفاعت کرنے والا نہیں۔''[3] (انعام ۵۱)

(۴) وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ

''وہی ہر شے کا مدبر و نگہبان ہے۔''[4] (انعام ۱۰۲)

(۵) أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ

''کیا اللہ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں۔''[5] (زمر ۳۶)

وضاحت و پیام

''شاکر'' اور ''شکور'' کا مادہ ''شکر'' ہے۔ فروق اللغۃ کا کہنا ہے کہ اس کا معنی منعم کی عظمت کا تصور کرتے ہوئے اس کی نعمت کا اعتراف کرنا ہے۔ ''مصباح اللغۃ'' میں شکر کا مطلب نعمت کا اعتراف، حکم پر عمل اور معصیت کا ترک کرنا ہے۔ لہٰذا یہ کام کبھی زبان سے اور کبھی عمل سے ہوگا۔ بقول راغب در مفردات لغت میں اس کا اصل معنی نعمت کا تصور اور اس کا اظہار ہے۔ اس کے مقابل کفر ہے۔ کفران کا معنی نعمت کو بھول جانا اور چھپانا ہے۔ حیوانات میں سے اس حیوان کو شکور کہیں گے جس کو دیکھ کر اس کے مالک کی طرف سے کی گئی پرورش کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ شکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

---

[1] کلمہ شکور قرآن مجید میں ۹ بار آیا ہے۔ ان میں سے چار میں خدا کی صفت کے طور پر ذکر ہوا ہے۔ فاطر ۳۰، ۳۴، شوری ۲۳، تغابن ۱۷

[2] شاکر قرآن مجید میں چار بار آیا ہے۔ صرف دو جگہ وصف خداوندی ہے بقرہ ۱۵۸، نباء ۱۴۷

[3] شفیع ۵ بار قرآن مجید میں آیا ہے۔ تین جگہ وصف خدا میں ہے۔ انعام ۵۱، ۷۰، سجدہ ۴۔

[4] وکیل ۲۴ بار قرآن مجید میں آیا ہے، ان میں سے بعض میں وصف خداوندی ہے۔ آل عمران ۱۷۳، ہود ۱۲، قصص ۲۸، نساء ۸۱، ۱۰۹

[5] کافی فقط ایک بار قرآن مجید میں آیا ہے (آیہ مافوق)

(۱) شکرقلبی (۲) شکرزبانی (۳) شکرعملی۔

جب یہ کلمہ خدا کے بارے میں استعمال ہوتو اس کے کئی معانی ہیں۔ وہ ذات جوتھوڑی سی اطاعت کا ثواب زیادہ دے یا نعمت بکثرت دے اورتھوڑے سے شکر پر راضی ہوجائے، درحقیقت اس کا معنی جزاء دینا ہے لیکن عمل کے مطابق نہیں بلکہ اپنے لطف وکرم کو مدنظر رکھتے ہوئے جزا دینا ہے۔

مصباح میں جناب کفعمی اورتوحید میں جناب صدوق کا کہنا ہے کہ شکر جب خدا کے بارے میں ذکر ہوتو معنی مجازی ہوگا۔ لیکن اگر اس کا معنی حقیقی ''نیکی کی شناخت'' ہو (جیسے کتاب العین میں ہے) تو پھر خدا کے بارے میں حقیقی معنی مراد لیا جاسکتا ہے۔

(۱) اس وصف الٰہی سے یہ پیغام ملتا ہے کہ خدا کے حق کو پہچانیں۔ خداوہ ذات ہے جوتھوڑے سے عمل پر ثواب وجزا کثیر عطا فرماتا ہے، بلکہ خود بندوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ یہی تصور نیکی کرنے کا باعث وسبب بنے گا۔

(۲) ہمیں تربیت دی جارہی ہے کہ انسانوں کی نعمات کا بھی شکریہ ادا کریں، ان کی زحمات کو فراموش نہ کریں، تشکر وجزا میں صرف برابری نہ کریں بلکہ اضافہ کریں۔

امام جعفر صادقؑ کی ایک دعا میں ہم پڑھتے ہیں:

"یا من یشکر الیسیر و یعفو عن الکثیر وهو الغفور الرحیم، اغفرلی الذنوب التی ذهبت لذتها وبقیت تبعتها۔"

''اے وہ ذات جو چھوٹے عمل کی قدر کرتی ہے اور بڑے گناہ کو بخشتی ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔ میرا وہ گناہ بخش دے جس کی لذت ختم ہوجاتی ہے اور اس کی سزا باقی رہتی ہے۔''[۱]

حضرت امام جعفر صادقؑ کی حدیث میں ہے کہ یہ جملہ تورات میں موجود ہے۔

"اشکر علی ما انعم علیك و انعم علی من شکرك"

''جو تجھے کچھ نعمت دے اس کا شکریہ ادا کر، جو تیرا شکر بجالائے اس کو نعمت عطا کر۔''[۲]

''شفیع'' کا مادہ ''شفع'' بروزن نفع ہے جس کا مطلب ایک چیز کے ساتھ کسی اور چیز کا ضمیمہ کرنا اور ملانا ہے۔ تاکہ مطلوبہ نتیجہ حاصل کیا جاسکے۔ اس کے بالمقابل ''وتر'' ہے اور ایسی گوسفند جس کے ساتھ بچہ چل رہا ہو اس کو شافع کہتے ہیں۔

حق شفعہ دو شریکوں کے درمیان ہوتا ہے جب کہ ایک شریک اپنا حصہ تیسرے شخص کو بیچ دے اور شریک چاہتا ہے کہ اس وقت پر

---

[۱] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۵۸۹ (باب مختصر دعائیں) حدیث ۲۸

[۲] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۷۱۱ مادہ شکر واصول کافی جلد ۲ صفحہ ۹۴ (باب شکر) حدیث ۳

اپنے لیے خرید لے۔ایسی آنکھ جس سے دونظر آتے ہوں اس کو بھی شافعہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک شخص کو دو دیکھ رہا ہے۔ یہ کلمہ مددگار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[1]

کلمہ شفاعت کا اطلاق کسی شخص کا کسی کے لیے بخشش گناہ طلب کرنا پر بھی ہوتا ہے۔یعنی ایک بزرگ شخص گناہگار کے ساتھ کھڑا ہو جائے تا کہ صاحب حق اس کی وجہ سے گناہگار سے بھی لطف ومحبت کا برتاؤ کرے۔

شفاعت کی بحث قرآن مجید میں بڑی وسعت رکھتی ہے جس کا تذکرہ مفصل طور پر مباحث تفسیر موضوعی میں آتا رہے گا۔[2]

اس مقام پر اس کلمہ کا صفت الٰہی کے عنوان سے تذکرہ ہو رہا ہے۔

بہرحال کلمہ شفیع کا اطلاق قیامت کے دن خدا پر اس عنوان سے ہے کہ اس دن سلطنت مطلقہ اس کی ہوگی۔کوئی بھی بدون اجازت کسی کام پر قادر نہیں ہوگا حتی کہ شفعاء جیسے انبیاء، اولیا، ائمہ اور فرشتوں کی شفاعت بھی اس کی اجازت سے ہی ممکن ہوگی۔من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ (بقرہ ۲۲۵)

یہی مطلب حضرت پیغمبر کی طرف خدا کے خطاب میں موجود ہے۔(زمر ۴۴)قل للہ الشفاعۃ جمیعا لہ ملك السموت والارض۔" "کہو کہ تمام شفاعت اس خدا ہی سے ہے کیونکہ حاکمیت و مالکیت آسمان وزمین صرف خدا کے لیے ہے۔

شفاعت کی اجازت خدا کی طرف سے ہوگی۔اس لیے واقعی شفیع وہی ہے گویا خدا خود اپنی جناب میں انسانوں کی شفاعت کرے گا۔ یہ بزرگواری کا اعلیٰ مرحلہ ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ شفیع یا شفع کا اطلاق خدا پر اس لیے ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔جیسے قرآن مجید سورۂ مجادلہ کی آیت سات میں ہے:

مایکون من نجوی ثلثۃ الا ھو رابعھم

"کوئی تین آدمی بات نہیں کر رہے ہوتے، مگر چوتھا خدا ہوتا ہے۔"[3]

لیکن یہ معنی شفیع میں بعید نظر آتا ہے کیونکہ اس کے مفہوم میں ایک قسم کی کمک، حمایت اور تکامل تربیتی پایا جاتا ہے یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ ممکن ہے شفاعت میں جنبہ تکوینی اور تشریعی ہر دو پائے جاتے ہوں۔شفاعت تشریعی کے وہی معنی معروف ہیں کہ ایک شخص بزرگ گناہگار کی نجات کے لیے صاحب حق کے ہاں سفارش کرتا ہے۔شفاعت تکوینی خدا کی طرف سے تمام موجودات کو اپنی ربوبیت اور مرحلہ تکامل کی سمت لے جانا ہے۔

---

[1] مصباح اللغۃ، مقائیس اللغۃ، لسان العرب، نہایۃ ابن اثیر، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم وکتاب العین

[2] تفسیر نمونہ جلد اول ذیل آیۃ ۴۸ سورۂ بقرہ

[3] مصباح کفعمی صفحہ ۳۴۴ قاموس اللغۃ مادہ شفیع

اس صفت سے ایک تو یہ پیغام ملتا ہے کہ لطف وعنایت پروردگار سے کسی وقت مایوس نہیں ہونا چاہیے حتی کہ وہ خود اپنے ہاں گناہگاروں کی شفاعت کراتا ہے۔یعنی پیغمبروں،فرشتوں اور ائمہ کو گناہگاروں کی شفاعت کی اجازت دیتا ہے(البتہ یہ ان کے لیے ہے جن میں شفاعت کی صلاحیت ہو)۔

مسلم ہے کہ اس امر کی طرف توجہ تکرارِ گناہ سے بچنے میں گہرا اثر رکھتی ہے تا کہ امید شفاعت قطع نہ ہوجائے اور شاعت کی صلاحیت محفوظ رہے۔

دوسرے یہ کہ انسان کو تیار کیا جارہا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کریں اور پشیمان اور کمزور افراد کی شفاعت وسفارش کے لیے کوشاں رہیں۔

حدیث میں ہے"**الشفعوا توجروا**"شفاعت کرواس کا تمہیں اجر ملے گا۔[1]

کلمہ''وکیل'' کا مادہ''وکل'' بروزن وصل ہے جس کا معنی کسی پر اعتماد اور تکیہ کرنا ہے۔چونکہ اس کا لازمہ بعض پہلوؤں میں کمزوری وضعف ہے اس لیے''وکل'' بروزن''دکل'' کا بے چارہ وکمزور افراد پر اطلاق ہوتا ہے۔''وکال'' ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو ہمیشہ قافلہ یا گلہ کے پیچھے پیچھے چلیں گویا وہ راہ چلنے میں دوسروں پر تکیہ وبھروسہ رکھتے ہیں۔[2]

لہٰذا''وکیل'' وہ ہے جس پر اعتماد کیا جائے اور مشکلات کے حل میں اس پر بھروسہ ہو۔

یہ کلمہ جب وصف خداوندی کے طور پر استعمال ہوتو(بقول شیخ صدوق در کتاب توحید)اس کا معنی ہے کہ وہ ہمارا محافظ ونگہبان بلکہ ہمارے لیے اور تمام موجودات عالم کے لیے بھی مواردا عتماد اور ملجاء وماوی ہے۔[3]

مصباح میں کفعمی کے خیال میں اس کا معنی یہ ہے:اور وہ ذات کہ تمام امور جس کے سپرد ہوں۔[4]

بعض نے اس سلسلہ میں کفالت رزق کا بھی تذکرہ کیا ہے۔درحقیقت یہ اس کا معنی نہیں بلکہ ایک مصداق ہے وگرنہ یہ رزق وروزی میں محدود نہیں ہے۔

قاموس کی شرح تاج العروس میں زبیدی کہتے ہیں کہ توکل اپنی عاجزی کا اظہار اور غیر پر اعتماد کا نام ہے،البتہ یہ لغوی معنی ہے۔لیکن اہل حقیقت کے نزدیک توکل کا مفہوم جو کچھ خدا کے پاس سے اس پر اعتماد اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیازی ہے۔متوکل بہ خدا وہ ہے جس کا خیال ہو کہ خدا ہی اس کے رزق اور تمام امور کے لیے کافی ہے۔لہٰذا وہ فقط خدا پر تکیہ کرتا ہے،غیر خدا پر بھروسہ نہیں رکھتا۔[5]

---

[1] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۸۴ ذیل آیۃ ۸۵ سورۂ نسائ۔

[2] مقائیس اللغۃ،مفردات،لسان العرب۔

[3] توحید صدوق ص ۲۱۵

[4] مصباح صفحہ ۳۲۶

[5] تاج العروس مادۂ"**وکل**"

آیات قرآنی سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ شئون توحید کا تقاضا ہے کہ انسان فقط خدا پر توکل کرے کیونکہ ہر چیز اور ہر کام اس کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ ہم آیۃ ۱۲۳ سورۂ ہود میں پڑھتے ہیں:

وَاِلَيْهِ يرجع الامر كله فاعبده وتوكل عليه

''اس کی طرف تمام امور کی بازگشت ہے لہٰذا تم اس کی عبادت کرو اور اسی پر اعتماد کرو۔''

نیز آیۃ ۱۲ ابراہیم میں ہے:

وعلى الله فليتوكل المؤمنون

''بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

کیوں نہ ہم اس پر اعتماد کریں اور کیوں نہ ہر معاملہ میں ہے اس کو مورِدِ اعتماد قرار دیں جبکہ وہی قادر ہے اور مہربان بھی ہے۔ چنانچہ آیۃ ۲۱۷ سورۂ شعراء میں ہے

وتوكل على العزيز الرحيم

''یعنی خدائے غالب و مہربان پر توکل کرو۔''

ہمیں اس وصف الٰہی سے یہ پیغام ملتا ہے کہ عام اسباب میں گم نہ ہو جائیں، مادی قوتوں کے فریب میں نہ آئیں، ضعیف کمزور مخلوق پر تکیہ نہ کریں، فقط ذاتِ خدا پر اعتماد کریں اور اسی سے مدد کے طالب ہوں، اس سے دل لگائیں اور اسی کے آستانہ پر جبیں سائی کریں۔

دوسرا پیغام یہ ملتا ہے کہ ہم تخلیق بہ اخلاق اللہ میں سعی و کوشش کریں، جس قدر طاقت ہے دوسرے کے کام آئیں اور رضائے خدا کے لیے پریشان لوگوں کی مشکلات میں ان کی مدد کریں۔ امیر المومنینؑ کے ایک فرمان میں ہے:

التوكل على الله نجاة من كل سوء وحرز من كل عدو

''خدا پر توکل ہر بدی سے نجات اور ہر دشمن سے وسیلہ حفاظت ہے۔''[1]

''کافی'' کا مادہ ''کفایہ'' ہے۔ بقول مقائیس اللغۃ ولسان العرب اس کا معنی کسی کام کی طرف اقدام اور اس سے عہدہ برآ ہونا ہے، لیکن مفردات میں راغب کا کہنا ہے کہ کفایہ کا معنی احتیاج کا رفع کرنا اور مقصود تک پہنچنا ہے۔ کفیہ بروزن کنیہ کا معنی کافی غذا ہے اور کفی بروزن خفی کا معنی ایسی بارش جس سے پانی کی کمی کا مسئلہ حل ہو جائے۔[2]

یہ کلمہ جب خدا کے بارے میں استعمال ہو تو اس کا مطلب وہ ذات ہے جو امورِ بندگان کا اہتمام کرے اور ان کی مشکلات کو حل

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۵ صفحہ ۷۹ حدیث ۵۶ ''باب جوامع الکلم''

[2] تاج العروس فی شرح القاموس مادۂ کفی

کرے۔ نیز جو بھی اس پر اعتماد کرے وہ اسے مقصود تک پہنچائے اور اس کو کسی اور کی طرف واگزار نہ کرے۔

دعاؤں میں کبھی خدا کو یا کافی المہمات (اے وہ ذات جو مشکل کاموں میں انسان کے لیے کفایت کرے جو انسانی فکر کو مشغول کرلیں) میں انسان کے لیے کفایت کرے۔ اس کے مشابہ یہ کلمہ بھی ہے: "یا کافی من کل شیئ"۔

اس وصفت الٰہی کے پیغام کی دو جہات ہیں:

(۱) یہ وصف خدا یاس و ناامیدی کے تاریک بادلوں کو روح انسانی سے پرے دھکیلتا ہے کہ کہیں مشکلات کی کثرت انسان کو بالکل بے حوصلہ نہ کردے کیونکہ جب کوئی شخص اس کو معبود قرار دیتا ہے کہ جو کافی ہے تو اس کی ہر مشکل اس سے دور ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے الیس اللہ بکاف عبدہ "کیا خدا اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟" (زمر ۳۶)

(۲) اس وصف الٰہی سے انسان کو اخلاق خدا کے ساتھ متخلق ہونے (اپنانے) کا داعیہ ملے گا اور وہ کمزور و بے چارہ لوگوں کے کاموں کے لیے قدم اٹھائے اور انوارِ الٰہی کا پرتو اپنے اندر منعکس کرے گا۔

(۴۴) حسیب (۴۵) شریع الحساب (۴۶) اسرع الحاسبین

(۴۷) سریع العقاب (۴۸) شدید العقاب

یہ پانچ صفات، صفات فعل ہیں اور انکا اشارہ حساب وعقاب کی طرف ہے۔ ان کے ذریعے خبردار کیا جارہا ہے کہ گناہوں کے سلسلہ میں اپنے آپ پر قابو رکھو، اپنی ذمہ داریوں سے تخلف نہ کرو اور دوسروں کے حقوق میں تجاوز نہ کرو۔ قوت و کمزوری اور فقر و مالداری (ہر حالت میں) اس طرف متوجہ رہو کہ تم خدا کے حضور میں ہو۔ خدا وہ حساب لینے والا اور عقاب دینے والا ہے جس کا عقاب سریع اور سخت ہے۔ یہ اوصاف قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ چنانچہ ہم آیات زیر میں پڑھتے ہیں:

(۱) وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

"اللہ ہی حساب کے لیے کافی ہے۔"[1] (نساء ۶)

(۲) وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۲۰۲

---

[1] "حسیب" ۴ بار قرآن میں آیا ہے۔ تین جگہ وصف الٰہی کے طور پر ہے۔ نساء ۶، ۸۶۔ احزاب ۳۹۔ ایک جگہ انسانی وصف ہے کہ قیامت کے دن نامہ اعمال دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ حساب کرلو۔ (اسراء ۱۴)

''اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔''[1] (بقرہ ۲۰۲)

(۳) وَهُوَ اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِيۡنَ ﴿۶۲﴾

''وہ حساب کرنے والوں سے سریع تر ہے۔''[2] (انعام ۶۲)

(۴) اِنَّ رَبَّكَ سَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۶۵﴾

''ضرور تمہارا پروردگار بہت جلد حساب کرنے والا ہے اور بے شک بہت بخشنے والا مہربان ہے۔''[3] (انعام ۱۶۵)

(۵) وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

''جان لو کہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے۔''[4] (البقرہ ۱۹۶)

وضاحت و پیام

''حسیب'' کا مادہ ''حساب'' ہے۔ مقائیس اللغۃ نے اس کے کئی معانی ذکر کیے ہیں۔ شمار کرنا، کفایت کرنا۔

''حسبان'' ایک قسم کا چھوٹا تکیہ ہے۔ ''احسب'' کا معنی برص کی بیماری ہے۔ لیکن کتاب التحقیق کے نزدیک ان سب کی بازگشت ایک ہی معنی کی طرف ہے اور وہ ہے کسی چیز کے احوال سے اطلاع کی کوشش اور ان تک رسائی (ان تک پہنچ)۔ چونکہ اس کے لیے شمار کرنا بھی ایک وسیلہ ہے اور اسی طرح کفایت کرنا بھی اسی کے لوازم و نتائج سے ہے۔ لہٰذا یہ ان معانی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

''حسب'' بروزن ''نسب'' یعنی ایسے آباد و اجداد والا ہونا کہ جن کا تذکرہ کیا جا سکے، اسی طرح ''احتساب مصیبت'' کا معنی ہوگا کہ اس کا حساب خدا پر چھوڑیں اور اجر الٰہی طلب کریں۔

''حسبان'' بروزن ''غفران'' کا معنی آسمانی بجلی کی آگ اور عذاب ہے کیونکہ یہ بھی بعض اقوام کے حساب اعمال کے بعد ان کی سزا ہے۔

بہرحال ''حسیب'' جب صفت خداوندی ہو تو بقول شیخ صدوق در کتاب توحید یہ تین معانی میں سے ایک معنی میں ہوگا۔

---

[1] یہ وصف ۸ بار قرآن مجید میں آیا ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ بقرہ ۲۰۲، آل عمران ۱۹، ۱۹۹، مائدہ ۴، رعد ۴۱، ابراہیم ۵۱، نور ۳۹ اور مومن ۱۷

[2] یہ وصف ایک بار قرآن مجید میں آیا ہے۔ (آیۃً مافوق)

[3] یہ وصف دو بار قرآن مجید میں آیا ہے۔ آیۃً مافوق اور آیۃ ۱۶۷ سورۂ اعراف

[4] یہ وصف ۱۴ بار قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے جس سے اس کی عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔ بقرہ ۱۹۶، ۲۱۱، آل عمران ۱۱، مائدہ ۲، ۹۸، انفال ۱۳، ۲۵، ۴۸ اور ۵۲، رعد ۶، مومن ۳، ۲۲ اور حشر ۴، ۷۔

(۱) وہ ذات جو تمام جہان کی چیزوں کی تعداد کو جانے اور ان سے باخبر ہو۔

(۲) جو قیامت کے دن بندوں کا حساب و کتاب کرے اور جزاء اور سزا دے۔

(۳) بندوں کے تمام امور میں ان کے لیے کافی ہو۔[۱]

لیکن قرآن مجید سے مستفاد ہوتا ہے کہ اس کا معنی قیامت کے دن حساب کتاب ہے کیونکہ قرآن میں یہ کلمہ چار جگہ آیا ہے اور تین جگہوں میں اس سے یہی مراد ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ کلمہ ''سریع الحساب'' ''اسراع الحاسبین'' کے ساتھ معنی میں قریب و نزدیک ہے۔ مفسرین نے خدا کو ''اسرع الحاسبین'' کہنے کی مختلف تعبیریں ذکر کی ہیں:

تفسیر قرطبی کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا حساب فکر و تفکر کا محتاج نہیں۔[۲]

روح معانی میں آلوسی کہتے ہیں کہ پوری مخلوق کا حساب تھوڑے سے وقت میں ہو جائے گا جب کہ ایک کا حساب دوسرے کے حساب سے بے توجہ نہیں رکھے گا۔[۳]

مفسرین بزرگ طبرسی نے بھی مجمع البیان میں یہی معنی مراد لیا ہے۔[۴]

احادیث اسلامی میں بھی اس بارے میں عمدہ تعبیریں ذکر ہوئی ہیں، امیر المومنینؑ کے فرمان میں ہے: جیسے خدا ایک ہی وقت میں سب کو روزی دیتا ہے اسی طرح ایک ہی وقت میں سب کا حساب کرے گا۔[۵]

دوسری حدیث میں ہے:

انه تعالیٰ یحاسب الخلائق کلهم فی مقدار لمح البصر۔''

''خدا ساری مخلوق کا حساب چشم زدن میں لے لے گا۔''[۶]

ایک اور حدیث میں ہے:

''انه سبحانه یحاسب جمیع عباده علی مقدار حلب شاة۔''

---

[۱] توحید صدوق صفحہ ۲۰۲ یہ تینوں معانی مصباح کفعمی صفحہ ۳۲۴ میں بھی ذکر ہوئے ہیں۔

[۲] تفسیر قرطبی جلد ۴ صفحہ ۲۴۳

[۳] روالمعانی جلد ۷ صفحہ ۱۵۴

[۴] مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۲۹۸۔ ذیل آیت ۲۰۲ سورۂ بقرہ

[۵] مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۲۹۸۔ ذیل آیت ۲۰۲ سورۂ بقرہ

[۶] مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۲۹۸۔ ذیل آیت ۲۰۲ سورۂ بقرہ

''خداوند قدوس ساری مخلوق کا حساب بکری دوہنے کے برابر وقت میں کرے گا۔''[1]

مفسرین نے بھی اس قسم کی تعبیریں ذکر کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی اس کلمہ کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکا۔ حقیقتاً یہ کہنا چاہیے کہ خدا کو حساب و کتاب لینے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ سب انسان مع اپنے اعمال کے اس کے سامنے (ایک ہی جگہ) حاضر ہوں گے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ آج کمپیوٹر کا زمانہ ہے جو ایک سیکنڈ میں کئی لاکھ یا کئی کروڑ کے حساب کو حل کر لیتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آج کے زمانہ میں سرعت حساب کا سلسلہ کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ جب انسان اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اس طرح سرعت حساب رکھتا ہے تو اس ذات کے حساب کا معاملہ کس قدر تیز ہوگا جس کی توانائیاں لامحدود اور علم بے کنار ہے۔

جیسا کہ ہم نے تفسیر نمونہ میں ذکر کیا ہے کہ اعمال انسانی کے آثار باقی رہتے ہیں اور تدریجاً بڑھتے رہتے ہیں، یہ خود بہترین وسیلہ حساب ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے کارخانہ کی مشین کا میٹر حرکت کرتا رہتا ہے جس سے شمار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ نیز موٹر سائیکل، کار، کوئی اور گاڑی جس قدر چلے اس کے کلومیٹر معلوم ہوتے رہتے ہیں اور صرف نظر ڈالنا پڑتی ہے۔ (کسی حساب و کتاب کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ حساب روشن اور حاضر ہوتا ہے)۔

لہٰذا ایک طرف خدا کا علم لامتناہی ہے اور اس کا تمام عالم ہستی میں حضور دائمی ہے، دوسری طرف آثارِ اعمال کا باقی رہنا اور ان کا مرتب ہونا اس کا موجب ہے کہ چشم زدن میں تمام مخلوق کا حساب ہو جائے۔

ان اوصاف الٰہی (حسیب، سریع الحساب، اسرع الحاسبین) میں موجود پیغام تمام انسانوں کو خبردار کر رہا ہے کہ اپنی چھوٹی سی غلطی کو بھی نظر میں رکھیں اور یقین کریں کہ ہم سے حساب لینے والا وہ ہے جس سے نیک اور بد اعمال میں سے ذرہ بھر بھی مخفی نہیں اور نہ وہاں بھول چوک کا گزر ہو سکتا ہے، قیامت کبریٰ میں ایک لحظہ سے بھی کم مدت میں سب کا حساب ہو جائے گا۔ نیز انسانوں کو درس دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے ہر کام، ہر چیز کا حساب رکھیں اور ان سے زندگی میں کوئی بے طریقہ اور غلط کام نہیں ہونا چاہیے۔

کلمہ ''عقاب'' کا مادہ ''عقب'' بروزن ''خشن'' ہے جس کا معنی پاؤں کی ایڑی ہے، پھر اس کا استعمال ہر شے کے اخیر پر ہوا ہے۔ لیکن مقائیس اللغۃ میں عقب کے دو معانی ذکر کیے گئے ہیں:

اول: کسی چیز کا کسی کے بعد آنا۔

دوم: بلندی، شدت اور صعوبت (لہٰذا عقبہ کا معنی گردنہ لیا گیا ہے)

غلط اعمال کی سزا کو ''عقاب'' کہا گیا ہے کیونکہ یہ عذاب انسان کے غلط اور برے اعمال کے بعد اس پر ہے۔

فرزندوں اور ان کی اولاد کو ''اعقاب'' کہا جاتا ہے کیونکہ وہ باپ دادا کے بعد آتے ہیں۔ ایک پرندے کو اس لیے عقاب کہا جاتا ہے کہ وہ تیزی کے ساتھ اپنے شکار کے پیچھے جاتا ہے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۳۱۳ روح المعانی جلد ۷ صفحہ ۱۵۴

بہرحال شدید العقاب کا اطلاق جب خدا پر ہوتو یہ معنی مراد نہیں ہوگا کہ عاب اصول عدالت کے مقابل زیادہ تر ہے بلکہ اس عنوان سے ہے کہ اس کی طرف سے دنیا وآخرت میں جسم وجان ہر ایک کے ساتھ متعلق ہے، کوئی مجرم اس سے امان میں نہیں اور کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

کسی وقت خدا ایک ہی لحظہ میں ایک قابل سزا شہر کو زیر وزبر کر دیتا ہے، غلط کاروں پر پتھروں کی بارش برسائی جاتی ہے اور کبھی دریائے نیل کی موجوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ لشکر فرعون کو تھوڑے سے وقت میں غرق کر کے انہیں مچھلیوں کی غذا بنا دیں۔ کبھی تند وتیز ہوا کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ قوی ہیکل گناہگاروں کو ان کے مکانات اور محلات سمیت ہوا کے دوش پر لے کر دور پھینک دے، کبھی چھوٹے سے پرندے (ابابیل) کو فرمان دیا جاتا ہے کہ وہ سجیل (کنکریوں) سے فیل سیاہ کو ہلاک کردے، کعبہ سے انہیں دور کردے اور ہاتھی والوں کو عصف ماکول (چبائے ہوئے بھوسے) کی طرح روئے زمین پر بکھیر دے۔

کبھی حکم دیتا ہے کہ آسمان سے پانی کے دھارے گریں، زمین سے چشمے جوش مار کر نکلیں اور دیکھتے ہی دیکھتے زبردست سیلاب اور طغیانی زمین کو گھیر لے اور نیک وپاک لوگوں کی کشتی نجات کے سوا زمین پر کوئی چیز باقی نہ رہے!

ہاں خدا اپنے مقام پر ''شدید العقاب'' ہے، یہ وصف ان سب لوگوں کو خبردار کر رہا ہے جو گناہوں کے معاملہ میں بے پرواہ ہیں، گناہ کو ایک معمولی کام سمجھتے ہیں، ان کے نتائج پر ان کی نظر نہیں ہوتی اور وہ خدا کے لطف وکرم کے سامنے مغرور ہوجاتے ہیں۔ ہاں وہ ارحم الراحمین ہے لیکن عفو ورحمت کے مقام پر۔ جب کہ وہ اشد المعاقبین بھی ہے لیکن سزا وعذاب کے مقام پر! خدایا! ہمیں اپنی رحمت کے سائے میں قرار دے اور عذاب کی سختی سے رہائی عطا فرما کہ ہم گناہوں کے معترف ہیں اور تیری بارگاہ میں اپنی تقصیر وکوتاہی پر عفو وکرم کی خواہش کرتے ہیں۔

(۴۹) نصیر (۵۰) نعم النصیر (۵۱) خیر الناصرین

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی محدود طاقت اپنی بے شمار مشکلات کے حل کے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر عالم تکوین اور عالم تشریع میں خدا کی مدد اس کے شامل حال نہ ہوتو وہ ہرگز مقصد تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ خلقت انسانی کا سب سے بڑا ہدف، جو تکامل انسانی اور تقرب خداوندی ہے، انسان اس جہان کے شور وغوغا میں اس ہدف کو گم کر بیٹھے گا۔

یہ خدائے بزرگ ہے جو نصرت ومدد فرماتا ہے، قوانین تکوینی وتشریعی میں ہمیں ظاہری وباطنی کمک پہنچاتا ہے اور ان پر پیچ وتنگ راستوں سے گزر جانے کی طاقت دیتا ہے تاکہ ہم منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔

اس ضمن میں ہم آیات زیر کی طرف توجہ کرتے ہیں:

(۱) وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ (نساء ۴۵)

(۲) وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ (حج ۷۸)

(۳) بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ (ال عمران ۱۵۰)

ترجمہ

(۱) اللہ تمہارا ولی ہے اور تمہاری مدد کے لیے کافی ہے۔[۱]

(۲) اللہ کے ساتھ تمسک رکھو، وہی تمہارا مولیٰ وسرپرست ہے اور وہی بہترین مولیٰ اور بہترین مددگار ہے۔[۲]

(۳) بلکہ اللہ ہی تمہارا مولیٰ وسرپرست ہے اور بہترین مدد کرنے والا ہے۔[۳]

وضاحت اور پیام

کلمہ ''نصیر'' اور ''ناصر'' کا مادہ ''نصر'' بروزن ''عصر'' ہے۔ مقائیس اللغۃ کے بقول اصل میں اس کا معنی انجام خیر اور خیر کا اعطاء ہے۔ مفردات کے مطابق اس کا معنی مدد کرنا ہے اور لسان العرب کے نزدیک مظلوم کی نصرت ہے۔ لیکن ان سب تفسیروں کی بازگشت ایک ہی معنی کی طرف ہے۔

کبھی بارش کو ''نصر'' کہا جاتا ہے اور جس زمین پر بارش برسے اس کو ''منصور'' کہا جاتا ہے۔ پانی کے جاری ہونے کی جگہوں کو ''نواصر'' کہا جاتا ہے، یہ سارے مفہوم اسی امداد کی وجہ سے ہیں جو بارش سے موجوداتِ زندہ کو ملتی ہے۔

یہ کلمہ جب وصف الٰہی کے عنوان سے ہو تو پھر یہ بے دریغ کمک کی طرف اشارہ ہے جو اس کی طرف سے بندوں کو مل رہی ہے۔

جب نطفہ رحم مادر میں قرار پکڑتا ہے اس وقت سے امدادِ الٰہی ملنا شروع ہوتی ہے اور قوانین تکوینی کی رو سے نصرت پروردگار ہر طرف سے اس کا احاطہ کیے رہتی ہے۔ وہ نطفہ ایک لحظہ بھی مدد خدا سے دور نہیں ہوتا اور اس کی مدد سے مراحل تکامل طے کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جنین بن جاتا ہے، پھر فرمان تو صادر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد بھی مدد خدا اس کا ہاتھ پکڑتی ہے۔ ماں کی محبت، دودھ کا مہیا ہونا، غذاء کامل، قسم قسم کے عطایائے خداوندی سب اس حساس لحظہ میں الٰہی نصرت و مدد کا پرتو ہیں۔

جب وہ حد بلوغ تک پہنچتا ہے اور خدا کے قوانین تشریعی اس پر عائد ہو جاتے ہیں تو خدا اس کا ہاتھ انبیاء کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے اور وحی و کتب آسمانی اس پر سایہ فگن ہوتی ہیں، یوں امداد و نصرت الٰہی اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔

---

[۱] ''نصیر'' ۲۴ بار قرآن مجید میں آیا ہے، چند مقامات پر وصف خداوندی ہے۔ نساء ۴۵، فرقان ۳۱، بقرہ ۱۰۷

[۲] ''نعم النصیر'' قرآن مجید کی دو آیات میں ہے۔ دونوں جگہ وصف خدائی ہے۔ (۱) آیۃً مافوق (۲) انفال ۴۰

[۳] خیر الناصرین فقط ایک ہی دفعہ قرآن مجید میں آیا ہے اور بطور صفت خداوندی ذکر ہوا ہے۔

طولِ زندگی میں ایک طرف آفاتِ حیات اور دوسری طرف شیاطین اور شرِ نفسانی اس کی سعادت وخوش بختی پر حملے کر رہے ہیں۔ اگر خیر الناصرین کی نصرت اس کی کمک نہ کرے تو کوئی انسانی بھی ان خطرات عظیم سے نہیں بچ سکتا۔

اس حقیقت کا احساس انسان کو (ایک طرف سے) امید دلاتا ہے اور طول زندگی میں مشکلات کے مقابل ناامیدی اور یاس کے تاریک بادل کو دور ہٹا دیتا ہے۔ پھر اس کے قدم محکم واستوار، اس کا ارادہ وعزم فولادی اور اس کی تصمیمات قاطع اور محکم ہوں گی، اس طرح تربیت کے راستہ میں نصرت الٰہی اس کے لیے بہترین مددگار اور معاون ہوگی۔

نیز اسے سبق ملے گا کہ اپنے آپ کو اخلاق الٰہی سے آراستہ کرے تاکہ وہ تمام عمر مظلوموں کا مددگار اور محروموں کا ناصر اور ستم رسیدہ اشخاص کی کمک کر سکے۔

(۵۲) قاهر (۵۳) قهار (۵۴) غالب

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ بعض صفات الٰہی کے دو پہلو ہوتے ہیں، یعنی وہ صفت ذات بھی بن سکتی ہے اور صفت فعل بھی بن سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں وہ معانی کے لحاظ سے جدا جدا ہوں گی۔

اوصاف ''قاہر'' اور ''قہار'' بھی اسی طرح ہو سکتے ہیں۔ اگر انہیں قادر اور قدیر کا ہم معنی سمجھا جائے تو صفاتِ ذات میں شمار ہوں گے لیکن اگر قہر وغلبہ فعلی کی طرف اشارہ ہو تو صفاتِ فعل کا حصہ ہوں گے۔ (غور کریں)

بہرحال جس کی قدرت ہر لحاظ سے بے انتہا ہو اس کا غلبہ ہر چیز پر ہوگا، تمام کاموں پر اس کا تسلط ہوگا، کوئی چیز اس کی مشیت میں رکاوٹ نہیں بن سکے گی اور کوئی مطلب اس کے لیے پیچیدہ اور مشکل نہیں ہوگا۔

یہ تینوں صفات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ لہٰذا ہم آیات زیر کی طرف گوش دل سے متوجہ ہوتے ہیں:

(۱) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ

''وہ اپنے تمام بندوں پر مسلط اور غالب ہے۔''[1] (انعام ۱۸)

(۲) ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

''آیا متفرق قسم کے خدا بہترین یا ایک ہی قہار خدا؟''[2] (یوسف ۳۹)

(۳) وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

---

[1] ''قاہر'' قرآن مجید میں دو بار آیا ہے: انعام ۱۸، ۶۱

[2] قہار قرآن مجید میں ۶ بار مذکور ہے اور ہر جگہ وصف خدائی کے طور پر آیا ہے۔ یوسف ۳۹، رعد ۱۶ ابراہیم ۴۸، ص ۶۵، زمر ۴، مومن ۱۶

''اللہ اپنے کام پر غلبہ رکھنے والا ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں۔''[1] (یوسف ۲۱)

وضاحت اور پیام

''قاهر'' اور ''قهار'' کا مادہ ''قهر'' ہے، مقائیس اللغۃ کے نزدیک اس کا معنی غلبہ اور برتری ہے۔ لہٰذا سخت پتھر کو قھقر کہا جاتا ہے۔ مفرداتِ راغب کے مطابق ''قہر'' کا معنی کامیابی ہے لیکن جب اس کے ساتھ مقابل کی تذلیل بھی ہو۔ لہٰذا یہ ان دنوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

خلیل بن احمد ''کتاب العین'' میں کہتا ہے: ''قہر'' کا معنی غلبہ اور کسی چیز یا کسی شخص کو اوپر کی طرف سے پکڑنا ہے، یہی معنی تاج العروس اور لسان العرب میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

''قاہر و قہار'' کا اطلاق جب خدا پر ہو تو اس کا مطلب کائنات عالم کے تمام جباروں پر تسلط کامل اور خدا کے سامنے ان کی کمزوری و ناتوانی ہے، اس طرح کہ کوئی موجود خدا کے ارادہ اور مشیت میں مانع اور رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ البتہ ''قہار'' چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے وہ یہی معنی زیادہ اہمیت اور تاکید کے ساتھ دے گا۔

ان دو اوصاف الٰہی سے انسانوں کو یہ پیغام ملتا ہے کہ وہ اپنی طاقت پر کبھی مغرور نہ ہوں، ظلم کی بنیاد نہ رکھیں اور اپنے آپ کو کبھی مسلط اور قوی نہ سمجھیں کیونکہ غرور و تکبر ہی طول تاریخ میں بدبختی کا سرچشمہ رہا ہے، پس وہ اپنے ارادہ کو خدا کے سامنے مغلوب قرار دیں اور جان لیں کہ ان کی طاقت خدا کے سامنے کچھ نہیں ہے، بے شک خدا کی قہاریت کی طرف انسان کی توجہ اس کو فتح کے وقت تندروی سے مانع ہوگی۔

''غالب'' کا مادہ ''غلبہ'' ہے۔ اس کا معنی وہی ''قہر'' ہے اور یہ قوت و شدت اور کامیابی پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا فرمانروا گردن والے انسان کو ''اغلب'' کہا جاتا ہے اور ''مغلب'' اسے کہا جاتا ہے جسے دشمن پر فتح حاصل ہو۔''[2]

چونکہ قہر اور غالب کا مفہوم ایک جیسا ہے لہٰذا یہ انسانوں اور اہل معرفت لوگوں کو ایک ہی طرح کا پیغام دیتے ہیں۔

خاص بات یہ ہے کہ آیاتِ مافوق میں قاہریت و غلبہ خداوندی کے ذکر کے بعد کہا جارہا ہے ولکن اکثر الناس لایعلمون (لیکن بہت سے لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے)۔

ہاں وہ یہ نہیں جانتے کہ عالم اسباب کی زمام و مہار خدا کے ہاتھ میں ہے، جو خدا چاہے وہی ہوگا اور پانی، ہوا، خاک سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ چونکہ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں ہوتی لہٰذا بہت لوگ عالم اسباب میں گم ہو جاتے ہیں۔ جب اسباب ساتھ دے رہے ہوں تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر ساتھ نہ دیں تو مایوس ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر واقعاً خدا کی قاہریت اور غلبہ پر ایمان ہے تو مایوسی کا گرد و غبار ان

---

[1] ''غالب'' قرآن مجید میں تین بار آیا ہے اور صرف ایک بار وصف خداوندی میں ہے۔ غالبون جمع کے صیغہ کے طور پر بھی چھ بار آیا ہے۔

[2] مقائیس اللغۃ، مفردات راغب اور لسان العرب

کی روح پر نہیں آنا چاہیے اور انہیں اپنی کامیابیوں پر کبھی مغرور بھی نہیں ہونا چاہیے۔

اتفاقاً آیۃ مافوق میں حضرت یوسفؑ کا تذکرہ ہے، وہی یوسفؑ کہ جن کے بھائی انہیں ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ان کو مارا پیٹا اور کنوئیں میں ڈالا تاکہ باپ کی پوری محبت صرف ان کے لیے ہوجائے،لیکن خدا نے انہی کینہ ور بھائیوں کے ذریعے یوسفؑ کو تختِ حکومت پر بٹھایا۔

ہاں خدا کی قاہریت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ بہت سے مواقع پر دشمن ہی کو انسان کی کامیابی و پروزی کا وسیلہ بناتا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو اکثر لوگ جانتے ہیں۔

(۵۵) سلام (۵۶) مومن

خدا کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام جو صفاتِ ذات اور صفاتِ فعل ہر دو میں شمار ہوسکتا ہے وہ وصف ''سلام'' ہے۔اگر اس کا معنی ہر قسم کے نقص وعیب سے پاکیزگی ہو تو اس کا شمار صفاتِ ذات (صفاتِ سلبیہ) میں ہوجائے گا اور یہ قدوس کا ہم معنی ہوگا۔

اگر اس کا معنی یہ ہو کہ لوگ اس کے ہر قسم کے ظلم وستم سے سلام یعنی امن میں ہیں اور وہ صاحب عدل وانصاف ہے،تو اس وقت یہ صفاتِ فعل میں شمار ہوگا۔

ہاں وہ ایسی سلامتی کا مالک ہے کہ ہر شخص اس کی طرف سے بے جا خوف ووحشت اور ظلم وستم سے صحیح وسالم ہے۔پھر وہ مومن بھی ہے اور اپنے دوستوں اور محبین کو امن وامان عطا کرتا ہے، یہ صفت قرآن میں صرف ایک بار ذکر ہوئی ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ

''وہ اللہ وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔وہ بادشاہ، پاکیزہ صفات، بے عیب، سلامتی دینے والا اور امان دینے والا ہے۔''(حشر ۲۳)

وضاحت اور قیام

کلمہ ''سلام'' بمعنی مصدری رکھتا ہے۔کبھی یہی مصدر بمعنی صفت بھی استعمال ہوتا ہے، پہلی صورت میں بقول مقائیس اللغۃ اس کا معنی صحت وعافیت ہے۔''سلام'' کو اس لیے ''اسلام'' کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کو خدا کے فرمان کی مخالفت سے روکتا ہے اور اسے اطاعت و فرمانبرداری کے لیے آمادہ کرتا ہے، نیز تحیہ کو بھی ''سلام'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ سلامتی کی دعا ہے۔

''سلام'' بمعنی ''صلح'' بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس میں خون ریزی وجنگ سے سلامتی حاصل ہوتی ہے۔وقت سے پہلے کسی چیز کی خرید کو ''سلم'' کہا جاتا ہے اس لیے کہ خریدار مال حاصل نہ کرنے کے باوجود قیمت دینے سے نہیں رکتا (اور دے دیتا ہے) سیڑھی کو سلم کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی مدد سے انسان اوپر نیچے آنے جانے کی صورت میں سلامت رہتا ہے۔

بہرحال یہ کلمہ جب وصف کے عنوان سے خدا کے بارے میں استعمال ہو تو اس کے کئی معانی ہیں۔بعض کا خیال ہے کہ ہر قسم کے

عیب، نقص، فساد، نابودی اور ایسی چیز جو مخلوقات میں پائی جاتی ہے وہ ان سب سے مبراء ومنزہ ہے۔[1]

بعض کا خیال ہے کہ اس کا معنی وہ شخص ہے کہ جس سے سلامتی، امن وامان اور کسی قسم کی تکلیف کے بغیر تمہاری ملاقات ہو۔[2]

بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ موجود ہے جو دوسروں کو سلامتی، آرام اور عافیت عطا کرے۔[3]

لیکن اس کلمہ کو انہی معانی میں محدود کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں، یہ کلمہ وسیع معنی رکھتا ہے جو ان سب کو شامل ہیں اور وہ یہ کہ ''وہ ہر قسم کے عیب، نقص، فنا، نابودی، ظلم وستم سے منزہ ومبرا ہے اور بندوں کو سلامتی دینے والا ہے۔

وصف سلام کا پیغام

ایک طرف عدل خدا کی وجہ سے احساس امنیت وآرام اور ایسے اعمال سے بچنے کی فکر ہے جو روح وجسم کی سلامتی کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ دوسری طرف یہ کہ انسان اس صفت کو اپنائے اور اس طرح زندگی بسر کرے کہ تمام انسان اس کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ رہیں اور ہر انسان کے ساتھ صلح وصفائی کا وتیرہ اپنائے۔

کلمہ ''مومن'' کا مادہ ''امن'' ہے، مقائیس اللغۃ کا کہنا ہے کہ اس کے دو معانی ہیں جو باہم قربت رکھتے ہیں۔

اول: خیانت کے مقابلہ میں امانت کہ جس سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

دوم: کسی چیز کی تصدیق کرنا۔

لیکن راغب نے مفردات میں اس کا ایک ہی معنی ذکر کیا ہے کہ نفس کا آرام اور خوف سے دوری، کیونکہ اصول اعتقادی کا قبول کرنا انسان کے لیے موجب امن ہے اس لیے کلمہ ایمان کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جب دعا کے بعد آمین کہیں تو اس کا مفہوم ہوگا: خدایا! اس کی تصدیق فرما اور عطا فرما۔ لہٰذا اس کا معنی تقاضائے قبول بھی لیا گیا ہے۔ چنانچہ عرب اس اونٹ کو ''امون'' کہتے ہیں جو مورد اطمینان ہو، سستی نہ کرے اور لغزش سے بچا رہے۔

فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ خدا کے ''مومن'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پیغمبروں کو معجزہ دے کر ان کی تصدیق فرماتا ہے۔[4]

مصباح میں مرحوم کفعمی کا کہنا ہے کہ جب یہ خدا کی صفت ہو تو اس کا معنی یہ ہے: خدا بندوں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کی تصدیق

---

[1] مقائیس اللغہ، مصباح کفعمی، لسان العرب، مجمع البحرین

[2] المیزان جلد ۱۹ ص ۲۶۵

[3] مصباح کفعمی ص ۳۱۸، فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۵۰

[4] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۹۳

کرتا ہے اور انہیں تحقق عطا فرماتا ہے۔ پھر انہوں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی حدیث نقل کی ہے: سمی سبحانه مومنا لانه یومن عذابه من اطاعه خدا کو اس لیے مومن کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اطاعت کرنے والوں کو عذاب سے محفوظ کرتا ہے، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ''مومن'' وہ ہے جو اپنے بندوں کو اپنے ظلم وستم سے امان رکھتا ہے۔ [1]

تفسیر روح البیان میں اس کا ایک جامع معنی لیا گیا ہے جو سب معانی مافوق کو شامل ہے، وہ ذات جس کے بغیر امن وامان اور آرام حاصل نہ ہو۔

شیخ صدوق نے کتاب التوحید میں اس کے تین معانی ذکر کیے ہیں:

۱۔ وہ ذات جو اپنے وعدوں کو تحقق عطا فرمائے۔

۲۔ وہ ذات جس نے آیات ونشانیوں کے ذریعہ بندوں کو حقیقت ایمان سمجھائی۔

۳۔ وہ ذات جس نے بندوں کو ظلم وستم سے امان دی۔ [2]

لیکن انصاف یہ ہے کہ ''مومن'' کا مفہوم ان معانی میں محدود نہیں بلکہ یہ ایسے جامع معنی رکھتا ہے جو ان سب کو شامل ہیں۔ جب ''مومن'' صفت الٰہی ہے تو اس وسیع معانی میں اس کا استعمال اس ''لفظ'' کے متعدد معانی میں استعمال کا موجب نہیں ہوگا کیونکہ اس میں قدر جامع موجود ہے (پھر لفظ مشترک کئی متعدد معانی میں استعمال میں کوئی مانع بھی نہیں ہے۔)

پس خدا مومن ہے کیونکہ مختلف جہات سے مومنوں کو امنیت عطا فرماتا ہے، آیات آفاقی وانفسی کے اظہار سے بندوں میں روح ایمان کو ایجاد کرتا ہے اور معجزات کے ذریعے انبیاء کی تصدیق کرتا ہے۔ اسی طرح بندوں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرتا ہے خواہ وہ جزا وسزا ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو۔

اس وصفت الٰہی کے پیغام میں ایک طرف عظمت مومن کا اظہار ہے کیونکہ مومن خدا کا نام ہے، دوسری طرف اس وصفت الٰہی کے سایہ میں انسان احساس امنیت وآرام کرے گا کیونکہ اطمینان وآرام کا سرچشمہ خدا ہے۔ تیسرے یہ کہ انسان اخلاق الٰہی کو اپناتے ہوئے کوشش کرے گا کہ اس کی طرف سے سب کو آرام ملے اور لوگ اس کے ہاتھ وزبان حتی کہ فکر وخیال سے بھی امن میں رہیں۔

لہٰذا امام جعفر صادقؑ کے فرمان میں ہے ''المومن من امن جارہ بوائقه'' مومن وہ ہے جس کا پڑوسی اس کی سختیوں سے محفوظ رہے۔

ایک اور حدیث میں حضرتؑ کا فرمان ہے ''المومن الذی یاتمنه المسلمون علی اموالهم و انفسهم'' مومن وہ ہے

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۵۲۵ (اس معنی کو ایک احتمال کے عنوان سے ذکر کیا ہے)

[2] توحید صدوق ص ۲۰۵ (باب اسماء خدا)

جس کو مسلمان اپنے مال وجان پر امین سمجھیں۔[1]

(۵۷) محی

عالم ہستی میں خدا کی واضح ترین نشانی مسئلہ حیات وزندگی ہے۔موجودات زندہ اس کی عظمت کے عجیب ترین، پیچیدہ ترین اور عمدہ ترین آثار ہیں۔اس لیے مباحث توحید میں قرآن مجید نے زیادہ تر حیات وزندگی کا تذکرہ کیا ہے اور خدا کو مردوں کو زندہ کرنے والے کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

اگرچہ یہ کلمہ ''محیی'' (زندہ کرنے والا) قرآن میں دوبار سے زیادہ نہیں آیا۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۵۰

''خدا نے مردزمین کو بارش کے ذریعہ زندگی بخشی، بیشک وہی (قیامت کے دن) مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔''[2] (روم ۵۰)

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا، یہ مردوں کا زندہ کرنا قیامت میں ہے لیکن ''محی'' کے مشتقات قرآن مجید کی مختلف آیات میں زندگی و موت، نباتات، حیوانات اور انسان کے بارے میں اس کی طرف بار بار اشارہ ہا ہے اور اس کو اہم ترین صفت خداوندی شمار کیا گیا ہے۔

وضاحت اور پیام

''محی'' کا مادہ ''حیات'' ہے۔مقائیس اللغہ کے نزدیک اس کے دو معانی ہیں:

(۱) زندگی، موت کے مقابلہ میں (۲) حیا کرنا جس کی ضد اور مقابل بے شرمی و وقاحت ہے۔

لیکن محققین نے معنی دوم کو پہلے کی طرف لوٹایا ہے اور کہا ہے کہ حیا وشرم سے مراد نفس کا بدن کے مقابلہ میں انقباض ہے اور یہ بھی زندہ موجود کا اثر ہے۔دوسرے لفظوں میں حیا بدی ضعف اور نقصان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ بارش کا ایک نام ''حی'' بھی ہے کیونکہ اس سے زمین کو زندگی ملتی ہے، قبیلہ کو بھی حی کہا جاتا ہے۔کیونکہ یہ بھی ایک گروہ کی جمعی طور پر حیات وزندگی ہے، بڑے سانپ کو حیہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں حیات وحرکت اور قوت وقدرت زیادہ ہوتی ہے۔[3]

راغب نے مفردات میں حیات کے چھ معانی ذکر کیے ہیں:

---

[1] دونوں حدیثیں توحید صدوق ص ۲۰۵ پر درج ہیں۔حدیث اول اصول کافی جلد ۲ ۶۶۸ (باب حق الجوار حدیث ۱۲)

[2] دوسرا مقام سورۂ حم السجدہ آیت ۳۹ ہے۔اس میں بھی مردوں کو زندہ کرنے کا تذکرہ ہے۔

[3] مقائیس اللغۃ، مفردات، لسان العرب، نہایۃ ابن الاثیر وتحقیق فی کلمات القرآن الکریم

(۱) حیات نباتات

(۲) حیات حیوانات

(۳) حیات عقل انسان

(۴) حیات عاطفی (یعنی غم کا برطرف ہونا لذت نشاط کا حاصل کرنا)

(۵) حیات اخروی، جاودانی۔

(۶) زندگی جو اوصاف پروردگار میں سے ہے (اور کامل ترین اور جامع ترین زندگی شمار ہوتی ہے یعنی کمال علم وقدرت)۔

البتہ زندگی کی اور اقسام بھی ہوسکتی ہیں جیسے زندگی معنوی، یعنی ایمان اور قرآن مجید نے متعدد آیات میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بہرحال خدا کے محی (زندہ کرنے والا) ہونے کا جلوہ کئی جہات میں واضح ہے، عالم نباتات نے پورے خالی کی کرۂ کو ڈھانپ لیا ہے، قسم قسم کے پھول، چھوٹے بڑے درخت، آبی وخاکی، جنگلی وصحرائی، وحشی واہلی، دوا کے لیے جڑی بوٹیاں اور غذا کے لیے میوہ دار درخت ہیں۔ ان کے تنوع، شگفتگی اور خوبصورتی میں وقت وغور سے انسان کو اس ذات بزرگ کی طرف رہبری ہوتی ہے جو سب کا مبداء ہے۔

عالم حیوانات میں انواع واقسام کے جانور، دریائی، خشکی، پرند، چرند، حشرات الارض، حیوانات اہلی، وحشی، چھوٹے جاندار (جو دوربین سے نظر آتے ہیں) بڑے بڑے جانور اور آخر میں حضرت انسان جو حیات وندگی کا بہترین نمونہ ہے، (ان سب سے) زندگی دینے والے کی عظمت آشکار اور واضح ہوتی ہے۔

مسلم ہے کہ زندگی جس قدر پیچیدہ ہوگی اس میں اسرار اور عجائب زیادہ ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی زندگی کی اصل حقیقت اور ایک بے جان موجود سے ایک موجود زندہ کی پیدائش ایک معمہ ہے جس کا حلھو نا باقی ہے اور ہزاروں مفکرین کی کوشش ابھی تک اس کے حل پر قادر نہیں ہوسکی۔

اس مرحلہ سے آگے چلیں تو حیات معنوی وروحانی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی بنیاد خداوند قدوس نے وحی، کتب آسمانی اور انبیاء کو بھیج کر رکھی ہے جیسا کہ فرمان ہے **اومن کان میت فاحییناہ** ''کیا وہ شخص جو کافر ومردہ تھا ہم نے ایمان کے ذریعے اس کو زندہ کیا۔'' (انعام ۱۲۲)

ایک اور آیت **من عمل صالحا من ذکر اوانثی وھو مؤمن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ** ''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے۔'' (نحل ۹۷)

اس قسم کی زندگی حیات کا ذکر قرآن مجید نے بارہا کیا ہے، اس مرحلہ سے اعلیٰ اور بلند تر حیات قیامت کے دن ''عظام رمیم'' (بوسیدہ ہڈیوں) کو لباس حیات وزندگی پہنانا ہے، ایسی حیات جاودانی کہ جہاں موت کا گزر نہیں ہوگا۔

اس لحاظ سے خدا کا ''محی'' ہونا دنیا وآخرت میں خلقت وآفرینش کا اہم ترین اور وسیع ترین مظہر اور پیدائش کا سرچشمہ ہے۔

اس وصف خدائی کا پیغام اس حقیقت کی طرف توجہ کرنا ہے کہ ہر قسم کی زندگی کا سرچشمہ وہی ہے۔ پس ظاہری وقلبی زندگی کی حفاظت

کے لیے اس کی طرف دیکھنا ہوگا کہ وہی ہر چیز کا زندہ کرنے والا ہے۔ہمیں چاہیے کہ اسی سے زندگی طلب کریں۔دوسری طرف اس صفت الٰہی کو اپنانا انسانوں کی حیات مادی ومعنوی میں ان کی کمک کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔لہٰذا (ہمیں چاہیے) کہ بندگانِ خدا کو معنوی موت سے نجات دلائیں اور انہیں خدا اور اعمال خیر کی طرف (جو راہِ ہدایت ہے) متوجہ کرنے میں کوشاں ہوں۔

(۵۸) شھید

''شھید'' ایک ایسی صفت الٰہی ہے جس کے کئی معانی ہیں، بعض کے لحاظ سے اس کا شمار صفاتِ ذات میں ہے کیونکہ اس کا معنی علم مع حضور وشہود ہے، ظاہر ہے کہ اس وقت اس وصف کی بازگشت صفت علم کی طرف ہوگی۔

اگر اس کا معنی بندوں کے اعمال کی شہادت وگواہی ہو تو یہ صفاتِ فعل میں شمار ہوتا ہے۔اس جگہ اس کا ذکر اسی عنوان سے ہے۔اب ہم ان دو آیات کی طرف توجہ کرتے ہیں:

(۱) وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ۝۹۸ (آل عمران ۹۸)

(۲) قُلِ اللّٰهُ ۧ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ (انعام ۱۹)

ترجمہ

(۱) جو کام تم کرتے ہو اللہ ان پر گواہ ہے۔

(۲) کہو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔

وضاحت اور پیام

''شھید'' کا مادہ ''شھود و شھات'' ہے۔مقائیس اللغہ کے نزدیک اس کا معنی حضور، علم اور اعلام ہے جب کہ گواہی دیتے وقت علم اور حضور واعلام بھی ضروری ہے۔مفردات میں کہا گیا ہے: اس کلمہ میں حضور اور مشاہدہ ہر دو لازم ہیں خواہ ظاہری آنکھ سے ہو یا دل کے ذریعے ہو۔

''مشاہد حج'' ان مقامات مقدسہ کو کہا جاتا ہے جن میں مومن اور فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔یہ جو راہِ خدا میں قتل ہونے والے کو شہید کہا جاتا ہے یا تو اس لیے کہ فرشتگانِ رحمت اس وقت حاضر ہوتے ہیں یا اس لیے کہ یہ ان نعمات کا مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں جو ان کے لیے مہیا کی گئی ہیں یا خدا کے حضور ان کے حاضر ہونے یا راہِ حق میں شہادت کے قیام کرنے یا اس لیے کہ یہ زمین پر گرتے ہیں کیونکہ زمین کا ایک نام مشاہدہ بھی ہے۔نیز روزِ جمعہ کو ''شاہد'' کہتے ہیں کہ اس دن مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے، روزِ عرفہ کو ''مشہود'' کہتے ہیں کیونکہ اس دن بیت الحرام کے زائر وہاں حاضر ہوتے ہیں۔

بہرحال اس وصف کا اطلاق ذاتِ خداوندی پر اس لیے ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر ہے یا اس لیے کہ وہ بندوں کے اعمال کا گواہ ہے۔[1]

اس وصف الٰہی سے یہ پیغام ملتا ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر ہے اور اعمالِ بندگان کا گواہ ہے۔

قیامت کے دن فرشتے، کاتبانِ نامہ اعمال، اعضائ، بدن انسان، زمان ومکان کہ جہاں یہ زندگی بسر کرتا تھا۔ فقط یہی گواہ نہیں ہوں گے بلکہ ذات خداوندی خود بھی گواہ ہوگی۔ مسلم ہے کہ اس حقیقت کی طرف توجہ انسان کے اعمال میں گہرا اثر رکھتی ہے۔

ہاں! خدا پر ایمان اور خدا کے صفات کی معرفت وسائل تربیت میں اہم ترین وسیلہ ہے۔

(۵۹) ھادی

ہدایت خواہ تکوینی ہو اور قانون خلقت کے لحاظ سے ہو، خواہ تشریعی یعنی تعلیم وتربیت اور احکام شریعت کی نظر سے ہو یا خدا ہی کی طرف سے ہے۔

وہی ہے جو بے قیمت نطفہ کو جنین بننے کے مراحل میں ہدایت ورہبری کرتا ہے اور اس بے مقدار موجود کو انسان بزرگ و اعلیٰ بناتا ہے۔

وہی ہے جس نے وحی اور بعثت انبیاء کے ذریعے انسانوں کا ہاتھ تھاما اور وادیِ ضلالت وگمراہی سے شاہراہ ہدایت کی طرف ان کی رہنمائی کی ہے۔ لہٰذا ہم ہمیشہ اپنی نمازوں میں اس سے سیدھے راستہ کی طرف رہبری کرنے کی خواہش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اسی راستہ پر ثابت قدم رکھ کیونکہ ہادی تو وہی ہے۔ اب ہم آیات ذیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:

ہادی بعنوان صفت خداوندی قرآن مجید میں دوبار مذکور ہے:

(۱) وَ كَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾ (فرقان ۳۱)

(۲) وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾ (حج ۵۴)

ترجمہ

(۱) یہ کافی ہے کہ تیرا رب ہدایت کرنے والا اور تیرا مددگار ہے۔

---

[1] لسان العرب میں ابن منظور اور شرح قاموس میں زبیدی کہتے ہیں کہ اسماء خدا میں شہید کا معنی یہ ہے کہ وہ شہادت میں امین ہے، بعض کا خیال ہے کہ شہید کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کا علم اس سے پوشیدہ نہیں ہے، ''شہید'' کا معنی حاضر بھی ہے (البتہ حضورِ مکانی نہیں بلکہ اس کا معنی احاطہ وجودی ہے)۔

(۲) ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں خداوند قدوس سیدھے راستہ کی ہدایت کرتا ہے۔[1]

وضاحت و پیام

کلمہ ''ھادی'' کا مادہ ''ہدایت'' ہے جس کا معنی ہدایت و رہبری کرنا ہے لیکن لطف و کرم بھی ساتھ ہوتا ہے اور ہدیہ کو بھی اسی لحاظ سے ہدیہ کہا جاتا ہے۔ یہ باعث راغب نے مفردات میں کہی ہے لیکن مقائیس اللغہ میں اس کے دو معانی ذکر کیے گئے ہیں: رہنمائی کرنا اور ہدیہ بھیجنا۔ ان دونوں معانی کی بازگشت پہلے قول کی طرف ہے۔ لہٰذا پہلا قول ہی بہتر نظر آتا ہے۔

لغت عرب میں دن کو بھی ہادی کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں اپنی چیزوں اور کاموں کی طرف لوگوں کی رہبری ہوتی ہے۔ عصاء کو ''ہادیہ'' کہا جاتا ہے کہ اس سے نابیناؤں کی رہبری ہوتی ہے۔ وہ حیوانات جو گلہ کے آگے آگے چلتے ہیں انہیں ''ہوادی'' کہا جاتا ہے اور گھوڑوں کی گردنوں کو بھی ''ہوادی'' کہا جاتا ہے۔

وہ اونٹ جن کو قربانی کے لیے خانہ خدا کی طرف لے جایا جاتا ہے ان کو ھدی (بروزن سعی) کہا جاتا ہے کیونکہ یہ خانۂ خدا کی طرف مومنوں کا ہدیہ ہے۔[2]

بہرحال جب یہ کلمہ صف خداوندی ہو تو اس کا معنی تمام شئون حیات۔ ''مادی و معنوی، ظاہری و باطنی اور تکوینی و تشریعی'' میں رہبری کرنا مراد لیا جائے گا۔

مفردات میں ہدایت و رہبری کے چار مراحل (آیات قرآن کے حوالہ سے) ذکر کیے گئے ہیں:

(۱) وہ ہدایت جس میں عمومی پہلو پایا جائے اور تمام مکلفین کو شامل ہو (یہ ہدایت تکوینی ہے) جو عقل و ہوش، معلومات ضروری و فطری کو شامل ہے۔ آیۃ ربنا الذی اعطی کل شیئ حلقه ثم هدی (طہ ۵۰) اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

(۲) ایسی ہدایت جو انبیاء و رسل اور کتب انسانی کی صورت میں حاصل ہو۔ (یہ ہدایت تشریعی ہے) آیت وجعلنا منهم ائمة یهدون بامرنا (سجدہ ۲۴) اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

(۳) ہدایت بمعنی توفیق جو خاصان خدا کو حاصل ہوتی ہے۔ آیۃ والذین اهتدوا زادهم هدی (محمد ۱۷) اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

(۴) آخرت میں بہشت کی طرف ہدایت (جس کا معنی ثواب و انعام الٰہی ہے) جیسا کہ ہم بہشتیوں کا قول پڑھتے ہیں الحمدلله الذی هدانا لهذا (اعراف ۴۳)

---

[1] کلمہ "هادی" کو (بعض حالات میں ''ھاد'' بھی کہا جاتا ہے) یہ قرآن مجید میں ۱۰ بار آیا اور فقط دو جگہ بطور وصف خداوندی آیا ہے۔

[2] کتاب العین، مفرداتِ راغب، مقائیس اللغۃ، تاج العروس، لسان العرب، مجمع البحرین۔ (مادہ ھدی)

یہ چاروں مراحل ایک دوسرے کے بعد ہیں۔ جب تک پہلا مرحلہ حاصل نہ ہو دوسرا نہیں ہو سکے گا۔ دوسرا نہ ہو تو تیسرے کی نوبت نہیں آئے گی۔ بالآخر ہم اس پیغام کی طرف نظر کرتے ہیں جو اس صفت خدا سے حاصل ہوتا ہے۔

(۱) ہمیں کہا جاتا ہے کہ تمام عالم ہستی خدا کے فرمان سے تمہاری ہدایت کے لیے آراستہ ہے، تمہارے لیے لازم ہے کہ اس ندائے ہدایت پر لبیک کہو، کلام الٰہی کو سنو اور خضر تکوین وتشریع کے ساتھ مل کر اس مرحلہ کو طے کرو تا کہ تاریکی اور گمراہی سے نکل سکو۔

(۲) اس خلق الٰہی کو اپنانے کا تقاضا ہے کہ ہم دوسروں کو ہدایت کریں، اپنے جیسے انسانوں کی دست گیری کریں اور انہیں مختلف مراحل سے گزاریں تا کہ وہ سب معرفت خدا اور تجلی اسماء وصفت کی منزل مقصود تک پہنچ سکیں۔

(۶۰) خیر

''خیر'' بعض مواقع پر بمعنی ''خوب'' اور زیادہ تر مقامات پر ''بہترین'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ۱۰ بار اسی دوسرے معنی میں دیگر صفات کے اضافہ سے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آنے والی آیات میں آپ مطالعہ کریں گے۔

''خیر'' وجود کے مساوی وبرابر ہے اور ''وجود وہستی'' خیر کے مساوی ہے کیونکہ خداوند عالم کا وجود مطلق اور لامتناہی ہے وہ تمام وجودوں سے بہترین ہے۔ ہاں وہ بہترین حاکم ہے (خیر الحاکمین) وہ بہترین روزی دہندہ ہے (خیر الرازقین) اور بہترین مددگار ہے (خیر الناصرین) و.....

یہ سب صفات فعل ہیں۔ ہم نے یہاں ان سب کو ایک ہی عنوان کے تحت جمع کیا ہے تا کہ ہماری بحث کا خاتمہ خیر کے ساتھ ہو جائے۔

اب ہم دل کے کانوں سے آیات ذیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:

(۱) وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ (مومنون ۱۰۹)

(۲) وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ (اعراف ۸۷)

(۳) وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ (انعام ۵۷)

(۴) وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ (اعراف ۸۹)

(۵) وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱﴾ (جمعه ۱۱)

(۶) بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ (ال عمران ۱۵۰)

(۷) فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ (اعراف ۱۵۵)

(۸) وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ (مومنون ۲۹)

(۹) وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ (انفال ۳۰)

(۱۰) رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ (انبیاء ۸۹)

ترجمہ

(۱) خداوندتو بہترین رحم کرنے والا ہے (کیونکہ تیری رحمت عام و خاص سب کو پہنچ رہی ہے، خصوصی طور پر تیرے مومن بندوں کے لیے مایہ افتخار ہے۔

(۲) وہ بہترین حاکم ہے۔

(۳) وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۴) تو بہترین عادل اور فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۵) تو بہترین رزق دینے والا ہے

(۶) خدا تمہارا مولا و سرپرست ہے اور وہی بہترین مدد کرنے والا ہے۔

(۷) خدایا ہمیں معاف فرما ہم پر رحم فرما کہ تو بڑا بخشنے والا ہے۔

(۸) اور کہو خدایا ہمیں بابرکت منزل پر اتارنا کہ تو بہترین اتارنے والا ہے۔

(۹) اور ان کی تدبیروں کے ساتھ خدا بھی اس کے خلاف انتظام کر رہا تھا اور وہ بہترین انتظام کرنے والا ہے۔

(۱۰) پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑنا کہ تو تمام وارثوں سے بہترین وارث ہے۔[1]

وضاحت و پیام

لفظ ''خیر'' ارباب لغت اور نحویوں کے نزدیک افعال التفصیل کے عنوان سے مشہور ہے، اصل میں ''اخیر'' بروزن ''افعل'' تھا الف حذف ہو گیا اور ''خ'' کو فتحہ (زبر) دے دی گئی۔

راغب کے بقول ''خیر'' سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے ساتھ سب کی محبت و علاقہ ہو جیسے عقل، عدالت فضیلت اور مفید چیزیں، اس کی ضد اور نکتہ مقابل ''شر'' ہے۔ پھر خیر کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں: خیر مطلق جس کی خواہش ہر دل میں ہو (جیسے بہشت) اور خیر نسبی جو بعض افراد کے لیے مفید ہے جیسے مال ممکن ہے کہ بعض کے لیے موجب سعادت اور کچھ لوگوں کے لیے بدبختی کا سبب ہو۔ لیکن مقائیس اللغۃ کا کہنا ہے کہ اس کا

---

[1] قرآن مجید میں بعض دیگر تعبیرات ہیں جن میں ''خیر'' وصف خدا کے عنوان سے ذکر ہوا ہے جبکہ مضاف الیہ جمع کے صیغہ میں نہیں اور وہ ایک مورد ہے فالله خير حافظا وهو ارحم الراحمين ہے 'خدا بہترین حافظ و نگہبان اور ارحم الراحمین ہے۔'' (یوسف ۶۴)

اصل معنی کسی چیز کی طرف میلان ہے۔ پھر اس کا اطلاق ان امور پر ہوا جو میلان کا محل و مورد بنتے ہیں۔ اس کے مقابل ''شر'' ہے۔ بعض صاحبانِ لغت نے اس کا معنی کرم و بخشش لیا ہے۔ بعض نے فقط اسی پر اکتفاء کیا ہے کہ خیر مقابل شر ہے۔ بعض اوقات اس سے خاص چیزیں مراد لی جاتی ہیں۔ جیسے خیر کا معنی ہے۔ مال، بہشت کی وہ نہر جس کا مرکز کوثر ہے۔ بہشت کے مخصوص محلات، خیار اور اختیار اسی سے نکلے ہیں۔ ان کا معنی بہتر چیز کا انتخاب ہے۔ جب اس کا اطلاق خدا پر ہو تو مطلق اور بلا قید ہوگا۔ **واللہ خیر و ابقی** اللہ سب سے بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ (طہ ۷۳)

یہ پہلا کلمہ ہے جو ساحرانِ فرعون نے حضرت موسیٰ پر ایمان لانے کے بعد کہا تھا۔

اس سے مراد تمام جہات میں بہتر ہونا ہوگا، واقعاً خیر مطلق خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا، وہی جس کا وجود تمام جہات سے بہتر اور برتر ہے۔ کبھی کسی اور صفت کو ساتھ ملاتے ہوئے ''خیر'' کا اطلاق خدا پر ہوتا ہے جیسے مذکورہ بالا دس آیات میں خدا کے دس مقدس نام آئے ہیں۔ یہاں دوسروں پر قیاس کرتے ہوئے خدا کا ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ قیاس بعض جہات سے ہے وگرنہ اس ذات پاک کا قیاس کسی پر نہیں ہوسکتا۔

(۱) پہلی آیت میں "**خیر الراحمین**" (بہترین رحم کرنے والا) کے عنوان سے خدا کا تذکرہ ہے، اس لیے کہ اس کی رحمت لامحدود ہے جو دوست، دشمن، نیک و بد سب کو شامل ہے۔ اس کی رحمت عامہ سب کے لیے ہے اور رحمت خاصہ مومنین کے لیے ہے، رحمت نازل کرتے ہوئے وہ کسی سے کسی عوض و بدلہ کا انتظار نہیں کرتا۔

(۲) دوسری آیت میں **وھو خیر الحاکمین** (وہ بہترین حاکم ہے) کے عنوان سے توصیف ہوئی ہے کیونکہ دوسروں کے حکم میں میلان شخصی و گروہی اور مادی خواہشات کی وجہ سے انحرافات اور غلطیاں ہوتی ہیں لیکن حکم خدا ہر قسم کی خطا و اشتباہ، افراط و تفریط اور باطل کی طرف میلان سے منزہ و مبرا ہے کیونکہ اس کا علم غیر محدود ہے اور وہ (خدا) ہر کسی سے بے نیاز بھی ہے۔

(۳) تیسری آیت میں "**خیر الفاصلین**" (حق و باطل کے درمیان بہترین امتیاز کرنے والا) کا عنوان ہے۔ انسان اگر حق و باطل کے درمیان فرق کرنا چاہیں تو کبھی اشتباہات میں پڑ جاتے ہیں اور صحیح طور پر امتیاز نہیں کر سکتے کبھی جہالت کی وجہ سے حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھ لیتے ہیں یا کبھی خواہشاتِ نفسانی کی وجہ سے حق و باطل میں تفریق نہیں کر سکتے۔

لیکن وہ ذات جو عالم (سر و اخفا) ہے اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، وہاں ہوا و ہوس کا گزر نہیں اور وہ حق کو باطل سے بہترین طریقہ پر جدا کرنے والا ہے۔ علاوہ ازیں انسان حق و باطل کو اچھی طرح نہیں سمجھتا اور اپنے علم و دانش کے اعمال پر قدرت نہیں رکھتا، فقط وہ قادرِ ازلی خدا ہی ہے جو اپنے علم کے مطابق حکم و فیصلے کو تحقق عطا کر سکتا ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں "**خیر الفاتحین**" کی بات ہو رہی ہے۔ ''فاتح'' کا مادہ ''فتح'' ہے۔ اگر اس کا معنی فیصلہ و قضاوت لیا جائے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا بہترین فیصلہ کرنے والا ہے جس کی دلیل خیر الحاکمین کی بحث میں گزر چکی ہے۔ اگر ''فتح'' کا معنی بند چیز کو کھولنا ہو تو اس کا معنی بہترین کھولنے والا ہوگا کیونکہ اس کی قدرت کے سامنے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ اگر فتح کا معنی رحمت کے دروازوں کا کھولنا ہو تو بھی وہی ایسی رحمت کا مالک ہے جس نے پورے جہان و ہستی کو اپنے سایہ میں لے رکھا ہے جب کہ دوسرے لوگوں میں اگر رحمت ہے تو وہ محدود اور جزئی ہے۔ درحقیقت ''فتح'' کے معنی میں بڑی وسعت ہے کہ مادی و معنوی ہر قسم کا کھولنا اور فتح کرنا اس میں آجاتا ہے۔ کبھی علم و رحمت کا دروازہ

کھولنے پر صادق آتا ہے، کبھی دو آدمیوں کے درمیان نزاع و جھگڑا ختم کرنے یا گرہ جنگ کو کھولنے کے معنی میں ہے، ظاہراً خیر الفاتحین میں بہت وسعت ہے اور یہ تمام امور کو شامل ہے۔

(۵) پانچویں آیت میں خدا کا ''خیر الرازقین'' (بہترین روزی دینے والا) ہونا بیان کیا گیا ہے، لوگ ایک دوسرے کو روزی کے عنوان سے جو کچھ دیتے ہیں (اگر اس کو روزی کہا جائے) تو بھی اس میں کئی نقائص ہوتے ہیں۔ یعنی وہ روزی محدود اور جلد ختم ہونے والی ہے۔ کبھی اس کے آئندہ حصول کی امید نہیں ہوتی، کبھی اس کے ساتھ احسان اور جسمانی یا روحانی آزار ہوتا ہے اور کبھی حقارت سے دی جاتی ہے یا اس کے بدلے میں کسی حاصل وصول کا انتظار ہوتا ہے۔

حالانکہ خدا کی طرف سے عطا شدہ روزی و رزق کی کوئی حد و بست نہیں، نہ آئندہ کا خوف، نہ احسان و آزار اور نہ بدلے میں کسی چیز کا انتظار ہے۔ بلکہ جس وقت نطفہ رحم مادر میں قرار حاصل کرتا ہے اسی وقت اس کا رزق و روزی جاری ہو جاتی ہے اور آخر حیات تک اس کا سلسلہ چلتا ہے حتی کہ قیامت کے دن لائق اور باصلاحیت افراد کے لیے اس سے بلند و بالا روزی بطور ''رزق کریم'' موجود ہے۔

بعض مفسرین نے خلفاء بغداد میں سے کسی ایک کے ساتھ بہلول کا واقعہ ذکر کیا ہے جس سے یہ مطلب اچھے انداز میں واضح ہوتا ہے:

کہتے ہیں کہ خلیفہ بغداد نے بہلول سے کہا کہ کسی دن میرے پاس آؤ کہ تمھاری تنخواہ و وظیفہ مقرر کر دیا جائے اور تم روزی کے فکر سے آزاد ہو جاؤ۔ بہلول نے جواب میں کہا کہ اگر اس میں چند عیوب نہ ہوتے تو میں آپ کی اس پیشکش کو ضرور قبول کر لیتا۔ وہ عیوب یہ ہیں:

(۱) آپ کو علم نہیں کہ میری احتیاج کیا ہے۔

(۲) آپ میرے وقت احتیاج کو بھی نہیں جانتے۔

(۳) آپ میری روزی کی مقدار سے بے خبر ہیں۔

(۴) ممکن ہے کہ کسی دن آپ ناراض ہو جائیں اور میری روزی کا سلسلہ منقطع کر دیں۔

لیکن وہ خدا جو مجھے رزق دینے والا ہے اس کے دینے میں یہ عیوب نہیں ہیں حتی کہ جس دن میں (غلط کام) گناہ کروں وہ اس دن بھی میری روزی بند نہیں کرتا۔[1]

خدائی کہ اوساخت از نیست ہمست
بہ عصیان درِ رزق برکس نہ بست
از اوخواہ روزی کہ بخشندہ اوست
برآرندۂ کارِ ہر بندہ اوست[2]

---

[1] روح البیان جلد ص ۵۲۸

[2] روح البیان جلد ۹ ص ۵۲۸

''وہ خدا جو عدم سے وجود دیتا ہے، گناہ سرزد ہونے پر روزی دینا بند نہیں کرتا۔ اس سے روزی طلب کر جو بخشنے والا ہے اور ہر بندے کا ہر کام بنانے والا ہے۔''

کتنا اچھا ہوتا اگر بہلول اس بات کا اضافہ کر دیتا کہ کون ضامن ہے کہ کل بھی آپ مسند حکومت پر ہوں گے اور مجھے یا کسی اور کو روزی دینے پر قادر ہوں گے۔

اپنی اس بحث کو ہم حضرت امیر المومنینؑ کے فرمان سے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں، آپؑ نے اپنے مشہور خطبۂ اشباح کے آغاز میں فرمایا:

الحمدلله الذی لایفره المنع والجمود ولایکدیه الاعطاء و الجود اذکل معط منتقص سواه وکل مانع مذموم ماخلاه وهو المنان بفوائد النعم وعوائد المزید والقسم عالیه الخلائق ضمن ارزاقهم وقدراقواتهم ونهج سبیل الراغبین الیه والطالبین مالدیه ولیس بماسئل باجود منه بمالم یسئل

''تمام حمد اس خدا کے لیے ہے جو فیض و عطا روکنے سے مالدار نہیں ہو جاتا اور جو دو عطا سے کبھی عاجز و قاصر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس کے سوا ہر دینے والے کے ہاں داد و دہش سے کمی واقع ہو جاتی ہے اور ہاتھ روک لینے پر انہیں برا سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ فائدہ بخش نعمتوں اور عطیوں کا دینے والا ہے اور ساری مخلوقات اس کی روزی خوار ہے۔ اس نے سب کے رزق کا ذمہ لیا ہے اور سب کی روزیاں مقرر کر رکھی ہیں۔ اس نے خواہش مندوں اور اپنی نعمت کے طلب گاروں کے لیے راہ کھول دی ہے۔ وہ دست طلب کے نہ بڑھنے پر بھی اتنا ہی کریم ہے جتنا طلب و سوال کا ہاتھ بڑھائے جانے کے وقت سخی و کریم ہے۔''[1]

(۶) چھٹی آیت میں ذات الٰہی کی صفت خیر الناصرین ذکر کی گئی ہے، کیونکہ حقیقی مدد کرنے والا وہی ہے جو ہر دشمن کے ساتھ مدد کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور ہر زمان و مکان اور ہر قسم کے حالات میں (اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہو)۔ وہ ایسا مددگار ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہوتا اور کوئی طاقت اس کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہیں رکھتی۔ علاوہ ازیں دشمنوں کی سازشوں اور جس کی مدد کرنی ہے اس کی کمزوریوں سے آگاہی رکھتا ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس مدد کے صلہ میں کچھ لینا بھی نہیں چاہتا۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ صفات صرف ذاتِ خدا میں ہی جمع ہیں، جب کہ دوسرے مددگاران اوصاف سے بے بہرہ ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۹۱

علاوہ ازیں اگر کوئی تھوڑی سی مدد کر بھی سکتا ہے تو اس دنیا میں، مگر جو دنیا و آخرت دونوں جگہوں پر مدد کر سکتا ہے وہ خدا ہی ہے۔

(۷) ساتویں آیت میں خدا خیر الغافرین کی صفت سے یاد کیا گیا ہے۔

فخر رازی کہتے ہیں کہ اگر کوئی کسی کے گناہ سے صرف نظر کرتا ہے تو اس لیے کہ لوگ اس کی تعریف کریں، خدا کی طرف سے ثواب حاصل ہو اور وہ قساوت قلبی سے محفوظ رہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کے گناہ و غلطی سے صرف نظر کرتا ہے تو مقصد حصول نفع یا دفع ضرر ہے جب کہ خدا کا معافی کرنا اس طرح نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ اس کا فضل و کرم ہی ہے۔[1]

علاوہ ازیں حقوق خدا کے مقابلہ میں حقوق انسان بہت کم تر ہیں اور ان حقوق میں سے ایک انسان کا دوسرے کو معاف کر دینا ایک کم تر فعل ہے۔ لیکن وہ ذات جو اپنے بڑے بڑے حقوق معاف کر دیتی ہے اور بڑے بڑے گناہ بخش دیتی ہے، وہ خدا ہے جس کی بخشش سے بہرہ ور ہونے کے لیے انسان کے اس کا مستحق ہونے کے سوا کوئی شرط نہیں ہے۔ اس لیے ''خیر الغافرین'' کہا جاتا ہے۔

پھر وہ فقط گناہ ہی نہیں بخشتا بلکہ انکی پردہ پوشی بھی کرتا ہے تا کہ دنیا و آخرت میں اس بندے کی عزت محفوظ رہے اور مخلوق میں اس کی رسوائی نہ ہو۔ مزید برآں کبھی وہ ان کی سیئات کو حسنات میں بھی تبدیل کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ سارے حجاب نہ اٹھا چلیں اور خود میں بخشش گناہ کی تھوڑی بہت صلاحیت پیدا کر لیں تا کہ اس کا لطف احسان ان کے شامل حال ہو جائے۔

آیت کے شان نزول پر توجہ کریں کہ جب بنی اسرائیل نے ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا یعنی رویت خداوندی اور وہ بھی ان ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کا تقاضا کیا تا کہ وہ ایمان لائیں (یہ توجہ) خدا اس صفت بخشش کے مفہوم کی گہرائی کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے کہ واقعی وہ خیر الغافرین ہے۔

(۸) آٹھویں آیت میں قصہ طوفان نوح میں خدا کو خیر المنزلین کی صفت کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ جب دعا میں یہ تقاضا کیا گیا اس وقت طوفان ختم ہو رہا تھا۔ حضرت نوح کی حیرانی تھی کہ کشتی کہاں ٹھہرے گی۔ وہ دعا کر رہے تھے کہ اس کی منزل مبارک جگہ پر ہونی چاہیے۔ خدایا ہمیں برکت عطا فرما کہ تو ہی بہترین مہمان نوازی کرنے والا ہے۔

ممکن ہے کہ رب انزلنی منزلا مبارکا میں لفظ ''منزل'' اسم مکان ہو، یعنی منزل گاہ اور جگہ یا مصدر میمی ہو یعنی اترنا اور نزول کرنا۔

بہر حال نہ کہنے کے باوجود واضح ہے کہ ان حالات میں جب مکان، منزل اور کاشانہ نہیں۔ نہ کوئی سائبان ہے اور نہ ہی غذا و خوراک، دشوار ترین حالت میں کشتی کا اترنا لطف خداوندی ہی کے سایہ میں ممکن تھا جو اترتے وقت متوقع خطرات کا ازالہ کر سکتا ہے۔

یہاں بھی خدا کی لامحدود قدرت کا اظہار ہے کہ اس کو مہمانوں کی حاجات کا علم تھا، اس کا یہی علم اس چیز کا سبب بنا ہے کہ وہ خیر المنزلین یعنی بہترین مہمان نواز ٹھہرا۔

---

[1] تفسیر فخر الرازی جلد ۱۵ ص ۲۰

(۹) نویں آیت میں ظالموں اور منحرفوں کی سازش کے مقابلے میں خدا کی چارہ جوئی کا ذکر کرتے ہوئے خدا کو "خیر الماکرین" (بہترین انتظام اور چارہ جوئی کرنے والے) کی صفت سے متصف کیا گیا ہے۔

''ماکر'' کا مادہ ''مکر'' ہے، جس کا معنی ''کسی کو حیلہ و چارہ جوئی کے ساتھ مقصود تک پہنچنے سے روکنا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) پسندیدہ، یہ اس وقت ہوگا جب اس حکمت عملی کا مقصد اچھا ہو۔

(۲) ناپسندیدہ، جب چارہ جوئی کا مقصد غلط اور قبیح ہو۔

اس سے واضح ہوا کہ عام اذھان کا یہ خیال صحیح نہیں کہ کلمہ مکر خرابی اور فساد ہی میں استعمال ہوتا ہے، اسی طرح خود حیلہ کا مفہوم بھی مشترک ہے جبکہ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا استعمال نوع فاسد میں ہی ہوتا ہے۔

قرطبی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ مکر کا معنی کسی کام کو خفیہ طریقے سے انجام دینے کی تدبیر ہے۔ لیکن بعض صاحبانِ لغت کا کہنا ہے کہ مکر کوئی اچھا کام نہیں لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ جب یہ کلمہ خدا کے بارے میں استعمال ہو تو اس کا معنی مجازی لینا ہوگا لیکن مفہوم مکر کی عمومیت صحیح نظر آتی ہے جیسا کہ اکثر اہل لغت کے بیانات سے ظاہر ہے۔

بہرحال خدا کو خیر الماکرین اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ تدبیر اور چارہ جوئی پر سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ یا اس لیے کہ دوسروں کا مکر اچھا یا برا ہو سکتا ہے لیکن خدا کے سلسلہ میں ہمیشہ ممدوح اور اچھا ہی ہوگا۔

''مکر'' جب خدا کی طرف منسوب ہو تو شرح قاموس میں زبیدی نے اس کے کئی معانی ذکر کیے ہیں:

۱۔ دوستوں پر نہیں دشمنوں پر بلا نازل کرنا۔

۲۔ تدریجی سزا یعنی گناہ کے باوجود رزق میں فراوانی تاکہ وہ شخص اپنے آپ کو نیکوکار سمجھتا رہے۔ (پھر اس کو سزا دے)۔

۳۔ بندوں کو ان کے اعمال کے مقابلہ میں جزا دینا۔[1]

بہرحال صحیح حکمت عملی اور چارہ جوئی وہاں ہوگی جہاں وہ شخص معاملات کے نتائج، اشیاء کی حقیقتوں اور گذشتہ و آئندہ حالات کا عالم ہو اور تدبیر و حکمت عملی پر قدرت کاملہ بھی رکھتا ہو۔ یہ دونوں صفات (لامحدود علم و قدرت) خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس لیے ذات پاک کو خیر الماکرین کہا گیا ہے۔

خاص بات یہ ہے کہ ''خیر الماکرین'' قرآن مجید میں دو بار ذکر ہوا ہے:

(۱) واقعہ ہجرت یعنی حیات پیغمبر کے اہم ترین واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کا فرمان ہے:

''کافر تدبیریں کرتے تھے کہ آپؐ کو قید کریں یا شہر بدر کریں، یا قتل کریں، لیکن ان کی تدبیروں کے ساتھ خدا بھی ان کے خلاف تدبیر کر رہا تھا۔ وہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔'' (انفال ۲۹)

---

[1] تاج العروس، در شرح قاموس۔ مادہ ''مکر''

ہم جانتے ہیں کہ قریش کی طرف سے قتل پیغمبرؐ کی سازش نے ہجرت کے ارادہ کو اور قوی کر دیا۔ وہ ہجرت جو مسلم تاریخ اور آغازِ حکومت اسلامی عالمی میں بہت بڑا واقعہ ہے، اس سے خدا کا انتظام اور تدبیر زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

(۲) یہود و نصاریٰ نے مشترکہ طور پر اسلام اور پیغمبرؐ کے خلاف سازش کی۔ (سورۂ آل عمران ۵۴)

یہ بھی انتہائی خطرناک سازش تھی لیکن خدا نے ان کی سازش کو نقش بر آب کر دیا۔

(۱۰) دسویں اور آخری آیت میں خدا کو خیر الوارثین (سب سے بہترین وارث) کی صفت سے متصف کیا گیا ہے۔ یہ صفت قرآن مجید میں صرف ایک بار آئی ہے جو خدا کے بزرگ پیغمبر حضرت زکریاؑ کی زبان سے مذکور ہے۔ تاہم خدا کے وارث ہونے کا ذکر کئی دفعہ آیا ہے، اس وصف کے ساتھ خدا کی توصیف واضح اور آشکار ہے کیونکہ جس نے باقی اور برقرار رہنا ہے اور جو تمام جہان و جہانیاں کا وارث ہے وہ بس خدا ہی ہے جب کہ دوسرے وارث ایک دن خود مورد ث بن جائیں گے۔

علاوہ ازیں دوسرے ورثا کو جو وارثت ملتی ہے وہ محدود ہے، وہ اس کے محتاج بھی ہیں اور اس کے صرف میں بخیل و کنجوس بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نزدیکی رشتہ داروں میں وراثت کے معاملے میں اختلافات کے باعث ہزار ہا مقدمے قائم ہوتے ہیں۔ لیکن خدا جو سب کا وارث ہے نہ اسے احتیاج ہے اور نہ اس کا وراثت کی کوئی حد بندی ہے اور نہ ہی وہاں بخل کا گزر ہے۔ اسی دلیل سے خدا کو خیر الوارثین کہا گیا ہے۔

روح المعانی میں آلوسی کے بقول یہ صفت خدا کی بقا اور دیگر سب کے فنا کی طرف اشارہ ہے۔[1]

البتہ اگر یہ صرف مسئلہ بقا کی طرف اشارہ ہو تو اس کا شمار صفاتِ ذات میں ہوگا جو اس وجود مقدس کی ابدیت ہے، اگر اس کا مطلب لوگوں کے مرنے کے بعد جو کچھ ہے اس کو اپنے اختیار میں لینا ہے تو پھر صفات فعل میں محسوب ہوگا۔ (غور کریں)

ہاں وہ بہترین ہے

جیسا کہ مذکورہ بالا دس آیات میں ذکر کیا گیا ہے خداوند قدوس کو بہترین راحمین، حاکمین، رازقین، ناصرین و..... سے موصوف کیا گیا ہے۔

کیا واقعاً خدا کا قیاس دوسروں پر کیا جا سکتا ہے؟ (یہ خیال کرتے ہوئے کہ ان موارد میں خیر جنبہ تفصیلی رکھتی ہے)۔ اس سوال کے دو جواب ہیں۔

(۱) ان مواقع پر ''خیر'' مفہوم تفصیلی اور مقائسہ و موازنہ سے دور ہے اور اس کا معنی صرف کثرت ہے۔ لہٰذا آیاتِ مندرجہ بالا میں خدا کی بے انتہا رحمت ہر لحاظ سے اعلیٰ حکومت کثرت ارزاق و نصرت و مدد بے پایاں کا تذکرہ ہے اور اس کا کسی پر قیاس نہیں کیا جا رہا کہ مالالتراب و

---

[1] روح المعانی جلد ۱۷ ص ۸۰

رب الارباب؟ خالق پاک کے ساتھ خاک کی کیا نسبت ہے؟''[1]

(۲) ان صفات میں قیاس ومقائسیہ کا مفہوم موجود ہے لیکن مقائسیہ صوری اور ظاہری جیسے ''احسن الخالقین'' (سب سے بہترین خلق کرنے والا) میں کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان جو روزی پہنچانے میں واسطہ ہوتے ہیں ان کو بھی (رازق) کہا جائے گا اور افراد انسان کی طرف سے معمولی رحمت بھی رحمت ہی شمار ہوگی۔ چنانچہ نصرت، حاکمیت اور مغفرت وبخشش میں بھی یہی صورت ہے، ایسی تعبیرات کی قرآن مجید میں کوئی کمی نہیں (علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں دوسری تفسیر کو اختیار کیا ہے)۔[2]

ایک اور تعبیر کے مطابق، وجود حقیقی اور مستقل بالذات صرف ذات خدا ہے۔ باقی سب اس کے مقابلہ میں عدم ونیستی، خیالی وجود اور سراب ہیں۔ لہٰذا موجوداتِ ممکن میں نہ خالقیت ہے نہ رحمت اور نہ رزق ہے نہ نصرت۔ بلکہ یہ سب ''خیر'' اس ذات بے مثال ہی کی طرف سے ہے۔ اس کے سوا جو بھی ہے وہ اس کے احسان کا خوشہ چیں ہے، اس لیے کہا گیا ہے لیس فی الدار غیرہ دیار اس صحن عالم میں اس کے سوا کسی کا گھر نہیں ہے۔

لیکن ظاہری تحلیل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو موجودات ممکن بھی وجود، رحمت، رزق، نصرت اور حاکمیت رکھتے ہیں جیسے قرآن مجید بموجب وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه (ابراہیم ۴) لوگوں کی زبان میں ہی ان سے بات کرتا ہے۔ اس لیے یہ تعبیرات قرآن مجید میں آئی ہیں۔

توضیحات

(۱) یہ جہان اس کی صفات کا مظہر ہے

مشہور جملہ ہے کہ یہ جہان وہستی اس کے صفات کے ظہور وبروز کا محل ہے۔ صفاتِ فعل کی طرف توجہ سے یہ مسئلہ روشن ہو جائے گا کیونکہ اس جہان میں جو آفرینش اور خلقت ہم دیکھ رہے ہیں یہ سب اس کی خالقیت کا مظہر ہے اور ہم جس مادی ومعنوی رحمت کا نظارہ کر رہے ہیں یہ اس کی رحمت کی علامت اور نشانی ہے۔

---

[1] مرحوم کفعمی مصباح میں خیرالناصرین کے بارے میں کہتے ہیں معناه كثرة تكرار النصر منه كما قيل خيرالراحمان لكثرة رحمته اس وصف کا معنی ہے کہ مدد کا تکرار خدا کی طرف سے ہے جیسے خیرالراحمین میں کثرت رحمت مراد ہے۔ (مصباح ص ۳۴۶)
اسی مطلب کو صدوق مرحوم نے کتاب توحید میں مختصر سے فرق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (توحید صدوق ص ۲۱۶)

[2] بحارالانوار جلد ۴ ص ۲۰۷
(وہ کہتے ہیں کہ خیر کا معنی التفضیل ہے۔ اس میں کسی تکلف کی ضرورت نہیں)۔

اس دنیا میں جو تدبیر نظر آتی ہے اس کی ربوبیت کی دلیل ہے اور یہ ظاہری و باطنی رزق و روزی اس کی رازقیت کے مظاہر ہیں۔

البتہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اس کے افعال کو دیکھ کر صفاتِ فعل سامنے آتے ہیں تو جیسے اس کے افعال اعداد و شمار سے ماوراء ہیں۔ اسی طرح صفاتِ فعل کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ تاہم یہ ساٹھ صفات عمدہ ترین صفاتِ فعل میں سے ہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید سے کیا گیا۔ ان میں سے ہر ایک کی کئی شاخیں اور شعبے ہیں جیسے گذشتہ صفحات میں ان کی تحلیل و تفسیر ذکر ہوئی ہے۔ ان اوصاف کی طرف توجہ سے صرف افعال خدا کا علم نہیں ہوتا بلکہ تربیت نفوس اور تہذیب ارواح کے سلسلہ میں بھی یہ ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ (غور کریں)

ہم اس نکتہ کو دوبارہ یاد دلاتے ہیں کہ ان صفات میں سے بعض کا صفت ذات ہونا واضح ہے۔ جیسے عالم۔ بعض واضح طور پر صفات فعل ہیں جیسے راز و خالق۔ لیکن بعض صفات کے دو پہلو ہیں کہ ایک پہلو سے صفت ذات اور دوسرے پہلو سے صفت فعل ہیں جیسے قیوم کہ اگر اس کا معنی قائم بالذات یا بالاستقلال ہو تو صفت ذات ہوگی اور اگر اس کا معنی موجودات کو قائم کرنے والا ہو تو اس کا شمار صفات فعل میں ہوگا۔

(۲) صفات فعل کے زمرہ میں آنے والی دیگر صفات

قرآن مجید میں کچھ افعال خدا کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ لیکن کلمہ وصف وہاں مذکور نہیں ہے۔ علماء علم کلام ان کو بھی خدا کے صفات فعل یا اسماء حسنی میں شمار کرتے ہیں۔ چونکہ ہماری بحث کی بنا یہ تھی کہ صرف ان اوصاف کا ذکر کیا جائے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں لہٰذا ان کا تذکرہ ہم نے مندرجہ بالا اسماء وصفات میں نہیں کیا۔ البتہ ہم چاہتے ہیں کہ ان میں سے اہم ترین صفات یعنی متکلم و صادق کا تذکرہ کر ہی دیں۔ لہٰذا ہم ان دو صفات کا ذکر کرتے ہیں۔

ا۔خدا متکلم ہے

الف: خدا متکلم ہے

وصف متکلم صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں نہیں آیا۔لیکن وہ فعل جو اس پر دلالت کر رہا ہے۔اس کا ذکر ہوا ہے جیسے "**وکلم اللہ موسی تکلیما**" (خدا نے موسیٰ کے ساتھ بات کی) (نساء ۱۶۴، اعراف ۱۴۳) اس لیے حضرت موسیٰ کلیم اللہ (خدا سے بات کرنے والے) کے لقب سے مشہور ہیں۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں تین بار کلام اللہ (کلام خدا)[1] اور ایک بار "کلامی" (میری بات) کا ذکر ہوا ہے۔[2]

کئی مقامات پر "**کلمۃ ربك**" (تیرے پروردگار کا کلمہ) "**کلمۃ اللہ**" (کلمۂ خدا) بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ان تمام جملوں سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ خدا کے اوصاف میں سے ایک وصف "متکلم" ہے بلکہ جیسے قوشجی نے شرح تجرید العقائد میں کہا ہے کہ خدا کے وصف متکلم کے قائل صرف مسلمان ہی نہیں تمام ارباب ملل و مذاہب خدا کو متکلم مانتے ہیں۔اگرچہ کلام کے معنی میں باہم اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔

توضیحات

(ا) کلام اللہ سے مراد کیا ہے؟

کلام اللہ (کلامِ خدا) کی تفسیر اور معنی میں مسلمانوں کا شدید اختلاف ہے اور ہر گروہ نے اس کی الگ الگ تفسیر کی ہے۔

(۱) جنبیلوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ کلام اللہ حروف و اصوات سے مرکب ہے اور یہ خدا کی ذات کے ساتھ قائم اور قدیم ہے۔وہ اپنے اس قول پر اس قدر اصرار رکھتے ہیں کہ کتابت قرآن تو رہی ایک طرف انہوں نے اس کی جلد اور غلاف کو بھی ازلی اور قدیم قرار دے دیا ہے۔

(۲) ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ کلام خدا یہی حروف و اصوات ہیں اور یہ امور حادث ہونے کے باوجود ذات خدا کے ساتھ قائم ہیں۔(اس بات کی کمزوری قابل بیان نہیں) اور اس کی بے پائیگی جنبیلوں کے قول سے کم تر نہیں ہے۔

(۳) تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ کلام خدا یہی حروف و اصوات ہیں۔یہ امور حادث ہیں اور قائم بالذات خداوند نہیں، بلکہ یہ خدا کی

---

[1] بقرہ ۷۵، توبہ ۶، فتح ۱۵

[2] اعراف ۱۴۴

مخلوقات میں شمار ہوتے ہیں۔خدا نے انہیں وجودِ جبرائیل یا پیغمبرؐ یا شجرۂ موسیٰ میں ایجاد کیا ہے۔

(۴) چوتھا اور آخری گروہ اشاعرہ ہیں جن کا اعتقاد ہے کہ کلام خدا اصوات وحروف نہیں بلکہ مفاہیم میں جو ذات خدا کے ساتھ قائم ہیں۔وہ اس کو کلام نفسی کا نام دیتے ہیں اور اس کے قدیم ہونے کے بھی معتقد ہیں۔[۱] حتی کہ ان کا عقیدہ ہے کہ حدوث قرآن کا قائل کافر ہے اور اس کا قتل واجب ہے۔[۲]

ابتدائی تاریخ اسلام کلام اللہ کے حادث وقدیم ہونے کے بارے میں اختلافات خونریزی اور ایک دوسرے کی تکفیر پر شاہد ہے، وہ بحثیں اور جھگڑے کہ جن کا آج کل کوئی صحیح مفہوم بھی نہیں بن پڑتا۔ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیاستدانوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان مسائل کو ہوا دی یعنی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اپنا کر ان اختلافات کو قتل وغارت اور تکفیر تک پہنچا دیا حتیٰ کہ یہ مسائل ایک عرصے تک پوری تاریخ پر چھائے رہے۔

(۲) آخری نتیجہ کا حصول

اس مقام پر چند مطالب ہیں جو بظاہر واضحات میں سے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ان میں بحث کرنے کی کوئی ضرورت ہوگی۔

(۱) خدا اس پر قادر ہے کہ صوتی امواج پیدا کرے، انہیں انبیاء ومرسلین کے کانوں تک پہنچائے اور اس ذریعے سے اپنا پیغام ان تک پہنچا دے، جیسے کہ قرآن مجید وادی ایمن میں موسیٰ بن عمران کے ساتھ خدا کے تکلم کا تذکرہ کر رہا ہے کہ صوتی امواج درخت میں پیدا کیے گئے۔ان کے ذریعے موسیٰ کے ساتھ گفتگو ہوئی۔

(۲) صوتی امواج اور زبان کے ساتھ بات کرنا جسم کے عوارض میں سے ہے اور خدا تو جسم وجسمانیات سے مبرا ومنزہ ہے۔لہٰذا ان چیزوں کا کوئی مطلب نہیں نکلتا، فقط یہی ہوسکتا ہے کہ بعض اجسام میں صوتی امواج پیدا کیے جائیں۔جیسے اوپر اشارہ ہوا ہے۔

(۳) ہمارے ہاتھ میں موجود اقرآن مجید بھی الفاظ وحروف میں کبھی کلام کی صورت میں اور کبھی کتابت کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، یہ دونوں ہی حادث ہیں تو پھر یہ کہنا کہ الفاظ ونقوش قدیم ہیں، بلکہ جلد وغلاف قرآن کو ازلی کہا گیا ہے۔لیکن اس سم کے خرافات قابل اعتناء نہیں ہیں۔

ظاہراً جو لوگ کلام اللہ کے قدیم ہونے کے قائل ہوئے ہیں تو وہ اس لیے کہ انہوں نے دیکھا کہ تکلم خدا کی صفت ہے اور قرآن کلام خدا ہے، دوسری طرف دیکھا کہ خدا کا وجود ازلی ہے۔پس صفات بھی ازلی ہونی چاہئیں۔اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کلام خدا ازلی ہے۔

یہ لوگ اپنی کمزور معلومات کی وجہ سے صفات ذات اور صفاتِ فعل میں فرق نہیں کر سکے ازلی صفات، صفات ذات ہیں جیسے علم و

---

[۱] شرح تجرید قوشجی ص ۴۱۷

[۲] ملل ونحل شہرستانی جلد اول ص ۱۰۶

قدرت لیکن وہ صفات جن کو ہماری عقل صدورِ افعال کی وجہ سے اخذ کرتی ہے، وہ حادث ہیں۔ لہٰذا یہ صفاتِ ذات خدا کے ساتھ قائم نہیں بلکہ عقل کے تعینات ہیں جو افعال خدا سے اخذ کیے گئے ہیں۔

بالفاظ دیگر اس میں شک نہیں کہ خدا کے افعال حادث ہیں جیسے آسمان وزمین کی خلقت، آدم کی پیدائش، رزق وروزی کا دینا، بندوں کے گناہوں کی بخشش اور انبیاء ومرسلین کو مبعوث کرنا۔ جب عقل ان افعال کا ملاحظہ کرتی ہے تو خدا کے لیے خالق، رازق اور غافر وغیرہ کے الفاظ کا انتخاب کرتی ہے۔ مسلم ہے کہ جب تک خدا نے خلق نہیں کیا، روزی نہیں دی، کسی کے گناہ کو نہیں بخشا، اس وقت تک اس کے یہ اوصاف زبان پر نہیں لائے گئے (البتہ اسے ان چیزوں پر قدرت حاصل تھی۔ لیکن یہاں بحث قدرت کی نہیں خود ان افعال کی ہے)۔

لہٰذا صفاتِ فعل کا معاملہ، صفات ذات سے جدا ہے، جو ذات پروردگار کے ساتھ قائم بلکہ عین ذات ہیں۔ اس واقعیت کے عدم ادراک نے کلام خدا کے قدیم کہنے والوں کو ایسے مطالب تک پہنچا دیا جو خندہ آور اور مضحک ہیں جیسے قرآن کی جلد اور غلاف کے قدیم ہونے کا تصور!

(۴) اشاعرہ کے ایک گروہ نے جب ان مطالب کی طرف توجہ کی تو مجبوراً ان کو کلام نفسی کا سہارا لینا پڑا، یعنی ایسا کلام جو قدیم ہو اور ذاتِ خدا کے ساتھ قائم ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے دلیل کے طور پر قرآن مجید کی وہ آیت پیش کی جو منافقوں کی ایک جماعت کے بارے میں ہے۔ ویقولون فی انفسھم لولا یعذبنا اللہ بما نقول ''اپنے دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم غلطی پر ہیں تو خدا ہماری باتوں پر عذاب کیوں نہیں نازل کرتا'' (مجادلہ ۸)

عہد بنی امیہ کے ایک شاعر اخطل کے شعر سے بھی تمسک کرتے ہیں:

ان الکلام لفی الفواد وانما
جعل اللسان علی الفواد دلیلا

بات کا اصل محل تو دل ہے۔ زبان تو ترجمان قلب ودل ہے۔

ان دلائل کے ساتھ انہوں نے کوشش کی کہ کلام کے حادث ہونے اور صفات کے قدیم ہونے میں جو تضاد تھا اس سے رہائی پائیں۔ لیکن اس بات سے ان کی گرفتاری اور مشکل کچھ اور بڑھ گئی، وہ یوں کہ کلام نفسی سے مراد اگر الفاظ وجملوں کی تصویر کشی اور ان کو ذہن وفکر میں گزارنا ہے تو خدا کے بارے میں یہ امور تو قابل تصور نہیں کیونکہ خدا اس قسم کے عوارض انسانی کا محل نہیں ہوسکتا۔

اگر مراد یہ ہو کہ قرآن مجید کے معنوں اور محتواء (مندرجات) کا علم خدا کو ازل سے تھا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ازل سے ہی ان سب کا احاطۂ علمی رکھتا ہے۔ لیکن اس وقت کلام نفسی کی بازگشت علم خدا کی طرف ہوگی اور یہ علیحدہ صفت نہیں بن سکے گی۔

نتیجہ یہ ہے کہ تمام کتب آسمانی کا متن اور مضامین خدا کے علم میں تھے اور یہ بس علم ہی ہے کچھ اور نہیں لیکن الفاظ ونقوش حادث ہیں۔ ان کے درمیان کوئی تیسری چیز ''کلام نفسی'' وغیرہ موجود نہیں کہ جو قدیم اور علم خدا کی غیر ہو۔ یہ سب امور ظاہر وآشکار ہیں لیکن افسوس کہ کلام نفسی کے قدیم وحادث ہونے کی بحث نے تاریخ اسلام کو تاریک کر دیا اور یہ خونین واقعات کا سبب بنی۔ کبھی حکومت معتزلہ کی طرفدار ہوتی (جیسے بعض

خلفاء بنی عباس) تو اس وقت حکومت کا اصرار ہوتا کہ سب لوگ کلام اللہ کے حادث ہونے کا اقرار واعتراف کریں اور عدم اعتراف کی صورت میں تلوار سے کام لیا جاتا۔ اس کے بالمقابل بہت سے حکام بنی عباس اشاعرہ کے حامی تھے اور کلام اللہ کے حدوث کا اعتقاد رکھنے والوں کو تہ تیغ کر دیتے تھے جب کہ آج ہمیں معلوم ہے کہ یہ سب سیاسی بازی گری اور حیلہ سازی تھی جس کا اظہار مذہبی شکل میں ہو رہا تھا۔ وہ مطلق العنان حکمران اپنے مذموم مقاصد کے حصول اور اپنی حکومت کے استحکام کے لیے مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات سے کھیل رہے تھے۔

(۳) صفت تکلم اور اسلامی روایات

ہم اپنی بحث کو امام جعفر صادقؑ کے اس فرمان کے ذکر سے آگے بڑھاتے ہیں۔ امالی میں شیخ طوسی رحمۃ اللہ ابوبصیر سے روایت نقل کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا

"لم یزل الله جل اسمه عالما بذاته، ولا معلوم، ولم یزل قادراً بذاته ولا مقدور، قلت: جعلت فداك، فلم یزل متکلما؟ قال: الکلام محدث کان الله عزوجل لیس بمتکلم ثم احدث الکلام!"

''خدا بالذات اس وقت عالم تھا۔ جب معلوم کا وجود نہ تھا اور وہ بالذات قادر تھا جب کوئی مقدور نہ تھا۔ میں نے عرض کی میری جان آپؑ پر قربان! خدا ہمیشہ سے متکلم بھی تھا؟ فرمایا: کلام حادث ہے، خدا تھا لیکن متکلم نہ تھا۔ پھر کلام کو حادث کیا (یعنی پیدا کیا)۔''[1]

اس حدیث کو کلینی مرحوم نے مختصر سے اضافہ کے ساتھ نقل کیا اور اس کے ذیل میں صراحت کے ساتھ کہا ہے:

"ان الکلام صفة محدثة لیست بازلیة کان الله عزوجل ولا متکلم"

''بات کرنا صفت حادث ہے اور ازلی نہیں۔ خداوند متعال ازل سے تھا اور کلام کا وجود نہیں تھا۔''[2]

اس عبارت سے صفات ذات اور صفات فعل میں فرق واضح ہو جاتا ہے، صفاتِ ذات جیسے علم وقدرت ازل سے تھیں اور انہیں وجود مخلوقات کی احتیاج نہیں۔ لیکن صفات فعل ذات خدا سے خارج ہیں کہ صدورِ افعال کے وقت عقل ان کا تعین کرتی ہے اور اس کی طرف نسبت دیتی ہے جیسے خالق، رازق وغیرہ، صفت تکلم بھی اسی زمرہ میں ہے کیونکہ یہ فعل وحرکت ہی کی ایک قسم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حرکت ذاتِ خدا میں نہیں ہو سکتی (کیونکہ حرکت کے لیے جسم کی ضرورت ہے)۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۴ صفحہ ۶۸ حدیث ۱۱ باب ۱

[2] اصول کافی جلد اول ص ۱۰۷ (باب صفات ذات حدیث ۱)

(ب) خدا صادق ہے

اشارہ

خدا کی صفت تکلم کا ذکر ہو چکا اور ظاہر ہے کہ وہ اپنی گفتگو اور کلام میں صادق ہے۔ لہٰذا اب ہم اس طرف توجہ مبذول کرتے ہیں:

خدا کی صفت تکلم صفات فعل میں اہم ترین صفت ہے جو دعوت انبیاء و رسل پر اعتماد کی بنیاد و اساس ہے۔ کیونکہ اگر وہاں کذب و دروغ کا تصور ہو تو پھر مسئلہ وحی، وعدۂ قیامت، معارف دینی کی خبروں اور بشر کی سعادت و بدبختی کے اسباب۔ ان سب چیزوں پر اعتماد نہیں رہے گا۔

بعبارت دیگر خدا کی صفت تکلم کی نفی سے مسائل دینی کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پروردگار کے صدق پر ایمان رکھنا حقائق دین میں کس قدر موثر ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بکثرت، متنوع اور مختلف پیرایوں میں خدا کی صفت صدق کا تذکرہ کرتے ہوئے مختلف زاویوں سے اس اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

اس اشارہ کے ساتھ ہم قرآن مجید کی طرف لوٹتے ہیں اور آیات زیر کی طرف دلی توجہ کرتے ہیں:

(۱) وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ (نساء ۸۷)

(۲) وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ (نساء ۱۲۲)

(۳) وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ ---------- (ال عمران ۱۵۲)

(۴) هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز ---------- [1] (احزاب ۲۲)

ترجمہ

(۱) کون ہے اللہ سے زیادہ سچی بات کہنے والا؟

---

[1] قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی یہ مفہوم پایا جاتا ہے جیسے ذاریات ۵، انعام ۱۱۵، زمر ۷۴، فتح ۲۷۔ اسی طرح انعام ۱۴۶، حجر ۶۴، میں تعبیر (انا الصادقون آئی ہے)

(۲) کون ہے جو بات اور وعدوں میں خدا سے زیادہ سچا ہو؟

(۳) خدا نے تمہارے ساتھ اپنے وعدے (جنگ احد میں کامیابی) کو پورا کر دیا۔

(۴) یہ وہی بات ہے جس کا خدا اور رسولؐ نے وعدہ کیا تھا اور خدا اور رسولؐ کا وعدہ بالکل سچا ہے۔

مفردات کی تشریح

کلمہ ''صادق'' کا مادہ ''صدق'' ہے اور راغب کے بقول اس کا مقابل کذب و دروغ ہے۔ اصل میں یہ کلام کا وصف ہے، کبھی صدق و سچائی کبھی کذب و جھوٹ، کبھی ظاہری طور پر استفہام اور امر و دعا میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے مثلاً کوئی کہتا ہے کہ آیا فلاں شخص گھر میں ہے؟ اس کا ضمنی مفہوم یہ ہے کہ مجھے علم نہیں کہ گھر میں کوئی ہے یا نہیں (لہٰذا کبھی ہم کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دراصل وہ جانتا ہے کہ فلاں شخص گھر میں موجود ہے)۔

صدق کی حقیقت اعتقاد و واقعیت کے مطابق ہونا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی ایک بات کہتا ہے جو واقعہ کے مطابق ہے لیکن اس کے اعتقاد کے موافق نہیں تو اس کو جھوٹا کہا جائے گا۔ مثلاً منافق پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آ کر کہتے تھے نشهد انك لرسول الله ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

کبھی صدق و کذب کو افعال و اعمال کے لحاظ سے بھی تولا جاتا ہے، وہ شخص جو اپنے اعمال کو وظیفہ لازم کے مطابق انجام دے وہ صادق ہوگا لیکن اگر اس کے برخلاف بجالائے تو کاذب ہوگا۔ مثلاً ایک شخص میدانِ جنگ میں جنگ کا حق ادا کرے تو اسے صادق کہا جاتا ہے۔ صدق فی القتال، اور اگر ایسا نہ کرے تو کہا جاتا ہے کذب فی القتال۔ خدا کا فرمان ہے کہ لقد صدق الله رسوله الرء يا بالحق جو اس وقت کہا گیا جب رسول اعظمؐ نے فتح مکہ اور کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کے مسجد الحرام میں داخلے کا خواب دیکھا، یہ بھی صدق قول کا ایک نمونہ ہے۔ [1]

صدقہ اس مال کو کہا جاتا ہے جو قربت کے خیال سے راہ خدا میں دیا جائے۔ نیز اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے عمل سے صدق و اخلاص کا ثبوت دے رہا ہے۔

مہر کو اس لیے صداق کہا جاتا ہے کہ یہ بیوی کے سامنے شوہر کے صدق و سچائی کی عملی دلیل ہے۔ البتہ مفردات راغب میں صدق کے عناصر اصلی کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ واقعہ اور اعتقاد ہر دو کے مطابق ہو، مفکرین کا اس میں شدید اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک فقط اعتقاد کی موافقت کافی ہے۔ بعض کے نزدیک فقط واقعہ کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ (یہ جگہ محل تشریح نہیں ہے)۔

اس کے باوجود ابن فارس مقائیس اللغۃ میں کہتے ہیں کہ صدق ہر چیز میں موجود خاص قوت کو کہا جاتا ہے اگر واقعہ کے مطابق کلام کو

---

[1] مفردات مادہ ''صدق'' (خلاصہ)

صدق کہا جاتا ہے تو اس لیے کہ اس میں قوت ہے۔ لہٰذا مضبوط نیزہ کو رمح صدق کہا جاتا ہے۔ عورت کے حق مہر کو صداق کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ اس کا ضروری حق بھی ہے اور واجد قوت بھی۔ لیکن مفردات نے اس کی اصل کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ بہتر نظر آتا ہے۔

باقی صاحبانِ لغت بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں۔

شرح قاموس میں خلیل بن احمد کا قول نقل کیا گیا ہے کہ صدق کا معنی کامل ہونا ہے۔ پھر مزید کہتے ہیں اگر ایسے موجودات جن میں قوت واستقامت ہے ان کو صدق کہا جائے جیسے محکم نیزہ کو صدق کہتے ہیں تو یہ بھی اس کی سچائی اور درستگی کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ یعنی اس کی صلابت و خوبی کی تعریف میں کہا گیا ہے وہ حقیقت کے مطابق ہے۔ لیکن اگر صدق کا معنی صلابت ومضبوطی ہوتا تو پھر ہر محکم چیز کو صدق کہا جاتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

صدیق وہ ہے جس میں زیادہ سچائی پائی جائے یا جو کبھی جھوٹ نہ بولے یا جھوٹ بولنا اس کے لیے ممکن ہی نہ ہو کیونکہ سچائی اس کی عادت بن چکی ہے۔ یا اس کو کہا جاتا ہے جو اعتقاد، بات اور عمل (ان تینوں) میں سچا ہو۔ (اس لیے کہ صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے، ہوسکتا ہے کہ مذکورہ جہات میں بطور مبالغہ استعمال ہوا ہو)۔

لسان صدق وہاں کہا جاتا ہے جہاں کوئی شخص ہر نظر سے صالح اور نیک ہو، اگر اس کی مدح وتعریف ہو تو وہ واقعہ کے مطابق ہوگی۔

بہرحال خدا کی صفت صدق کی مختلف جہات ہیں:

خبروں میں صدق وسچائی۔

ان وعدوں کی سچائی جو اس نے نیک وبد لوگوں کی جزا وسزا کے ضمن میں کیے ہیں۔

جو کچھ فرماتا ہے اس کو تحقق وعینیت عطا کرتا ہے جیسے مختلف آیات سے واضح ہوتا ہے اور آیات مورد بحث کی تفسیر میں اس کا تذکرہ ہوگا۔

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

(۱)(۲) پہلی اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے کہ خدا اپنی باتوں میں سب سے زیادہ صادق ہے۔ استفہام انکاری کی صورت میں کہا جارہا ہے:

کون ہے خدا سے زیادہ سچی بات کہنے والا؟ (ومن اصدق من الله حدیثًا)

اور کون ہے جو بات اور وعدوں میں خدا سے زیادہ سچا ہو (ومن اصدق من الله قیلا)[1]

بعض مفسرین کا اعتقاد ہے کہ ''زیادہ سچا کہنا'' مقدار اور کمیت کے لحاظ سے تو ممکن ہے (یعنی بہت سے موارد میں سچ بولے) لیکن کیفیت کے لحاظ سے نہیں کیونکہ اگر کلام واقعہ کے مطابق ہو تو صدق وسچ وگرنہ دروغ وجھوٹ۔ اس کی کیفیت میں کمی وزیادتی کا کوئی تصور

---

[1] قیل وقول مصدر ہے

نہیں ہے۔[1]

لیکن حق یہ ہے کہ کیفیت کے لحاظ سے صدق کے مختلف مراتب ہیں کیونکہ واقعیت کی مختلف جہات اور مراتب وابعاد ہیں۔ اگر متکلم کا کلام تمام ابعاد میں واقعہ کے مطابق ہوتو یقیناً یہ اس شخص سے جو بعض جہات میں صادق ہے، زیادہ سچا ہے۔ مثلاً کوئی شخص صاحب ایمان شخص کو ''سلمان'' سے تشبیہ دیتا ہے، کوئی اسے ''ابوذر'' کہتا ہے تو مسلما وہ شخص جس نے تشبیہ میں کئی جہات کو نظر میں رکھا ہے وہ زیادہ راست گو اور سچا سمجھا جائے گا۔

خدا کو ہم سب سے سچا کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دروغ یا جہل و نادانی اور بے خبری کی وجہ سے ہوتا ہے یا ضعف، کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چونکہ ان میں سے کوئی بھی نقص ذات الٰہی میں نہیں پایا جاتا لہٰذا وہ سب سے زیادہ صادق اور سچا ہے۔

.....☆.....☆.....☆.....

(۳)(۴) تیسری اور چوتھی آیت میں ''وعدوں'' میں خدا کے صدق کا تذکرہ ہے۔ البتہ تیسری آیت میں میدانِ احد میں مسلمانوں کی کامیابی کا وعدہ ہے۔ مسلمان ابتدا میں کامیاب ہوئے پھر سستی اور نافرمانی کی وجہ سے شکست ہوئی۔ فرمان ہے خدا اپنے وعدہ میں سچ کہہ رہا ہے (ولقد صدقکم اللہ وعدہ)

لیکن تمہاری سستی، اختلاف اور نافرمانی بالآخر شکست کا سبب بن گئی۔ یہ کوتاہی تمہاری طرف سے ہے خدا کی طرف سے خلاف وعدہ کچھ نہیں ہوا۔

یہ جواب ان کو دیا گیا جو احد میں شکست کی وجہ سے گلہ کرتے تھے اور اسے وعدۂ خدا کا پورا نہ ہونا تصور کرتے تھے۔

چوتھی آیت میں مومنین کی زبانی جنگ احزاب کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا یہ وہی ہے جس کا وعدہ خدا اور رسول نے ہمارے ساتھ کیا تھا اور خدا اور رسولؐ نے سچ کہا ہے (قالوا ھذا ما وعدنا اللہ و رسولہ و صدق اللہ ورسولہ)

اس جگہ خدا کی سچائی کا تذکرہ ہے اور رسول کے صدق کا بھی کیونکہ ان کا قول خدا کا قول ہے اور ان کا وعدہ خدا کا وعدہ ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ نے کون سا وعدہ کیا تھا جو پورا ہوا۔ اس میں کئی احتمالات ہیں:

(۱) پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ مشرکین ۹-۱۰ دن تک تمہارے سر پر پہنچ جائیں گے اور وہ اس کے مطابق آ گئے، تب مومنین نے یہ بات کہی۔[2]

(۲) خدا نے سورۂ بقرہ آیت ۲۱۴ میں فرمایا تھا کہ مسلمان آسانی کے ساتھ بہشت میں نہیں جائیں گے بلکہ تنگی برداشت کرنا ہوگی اور امتحان لیا جائے گا۔ لہٰذا جب مومنین نے خود کو جنگ کے کنارہ پر دیکھا تو کہا کہ وعدۂ الٰہی سچا ہے اور اب ہمارا امتحان ہونے والا

---

[1] روح المعانی جلد ۵ ص ۹۵ (ذیل آیت ۸۷ سورۂ نسا)

[2] روح المعانی جلد ۲۱ ص ۱۵۱

ہے۔[1]

(۳) بعض کا خیال ہے کہ پیغمبرؐ نے مومنین کو بشارت دی کہ محاصرہ کے بعد (جنگ احزاب میں) کامیابی حاصل ہوگی، پھر پورے عالم میں اسلام پھیلے گا اور ''حیرہ'' مدائن اور محلاتِ کسریٰ تمہارے قبضہ میں ہوں گے، چنانچہ مومنین نے جب اس کا پہلا حصہ دیکھا تو خوش ہوئے اور کہا کہ خوشخبری ہو کہ اب آخری کامیابی بھی قریب ہے۔[2]

توضیحات

صدق خداوندی کے دلائل

علماء علم عقائد کے بقول تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ خداوند قدوس صادق ہے۔ لیکن اشاعرہ چونکہ حسن و قبح عقلی کے قائل نہیں اس لیے وہ اس مطلب کو دلیل کے ذریعہ ثابت نہیں کر سکتے کیونکہ عقلی دلیل انہیں کام نہیں دے سکتی اور نہ وہ دلیل نقلی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یعنی اگر وہ آیات قرآنی سے خدا کی سچائی ثابت کریں تو سوال پیدا ہوگا کہ ان آیات کی سائی کی کیا دلیل ہے، بالفاظ دیگر آیات کے ساتھ استدلال موجب دور رہے۔ (غور کریں)

لہٰذا ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں اور وہ دلیل لانے سے عاجز ہیں۔

لیکن چونکہ حسن و قبیح کا مسئلہ (تعصب اور کج بحثی سے قطع نظر) مسلمات میں سے ہے لہٰذا صدق خداوندی کے اثبات کے لیے یہ بہترین دلیل بن سکتا ہے۔

ایک عام انسان کے لیے جھوٹ بولنا بری بات ہے بلکہ تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے اور اس کے انحطاط اور پستی کی نشانی ہے۔ مسلم ہے کہ اس طرح کا فعل خدا کے لیے قبیح ہوگا کہ نعوذ باللہ وہ جھوٹ بولے یا جھوٹا وعدہ دے، اگر خدا کے بارے میں کوئی اس قسم کا نامعقول احتمال دیتا ہے تو گویا وہ تمام مبانی مذہبی کو باطل کر رہا ہے کیونکہ اکثر بنیادی امور وحی کے ذریعے سے لیے گئے ہیں۔ اگر میں جھوٹ اور خلاف واقعہ ہونے کا احتمال ہو تو وحی، اخبارِ الٰہی اور اس کے وعدہ و وعید پر بھی اعتماد نہیں رہے گا اور مذہبی اعتقاد کی بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی، یہ مطلب اس قدر واضح ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ جھوٹ کی بنیاد جہالت اور ضعف ہے، یہ چیزیں ذاتِ الٰہی میں نہیں ہیں، یہ گویا صدق خدا کی دوسری دلیل بن جائے گی۔

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۶ ص ۳۰۶ نیز فخر رازی کی تفسیر میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۲۳۹

صفات خدا کے بارے میں آخری بات

اس میں شک نہیں کہ صفات خدا کی بحث کا ایک پہلو عقیدتی ہے اور معارف الٰہی کی تکمیل کے لیے ان کی پہچان ضروری ہے، لیکن نفوس انسانی کے تکامل میں اس بحث کا تربیتی اثر بھی ہے جس سے ہرگز غفلت نہیں ہونی چاہیے۔

ان صفات کے تذکرہ میں ظاہراً قرآن کا مقصد بھی یہی تربیت ہے۔

جب ہم ذات الٰہی کو ہر لحاظ سے کامل اور تمام بندگانِ خدا کی امیدوں کے مرکز کے طور پر تسلیم کریں، ہر عنوان سے اس کے قرب کی سعی وکوشش کریں اور تکامل کے تمام امور اس کی طرف منتہی ہوتے ہوں۔ پس واضح ہے کہ اس وقت یہ بات صراحت وقاطعیت سے کہی جائے گی کہ اگر آپ اس کوشش میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو پہلے صفات جلا و جمال کا پرتو بنیں تا کہ اس کی شاعیں آپ کی زندگی میں نظر آئیں اور آپ ان کو اپنا سکیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ ان اسماء اور صفات کا مظہر بنیں اور خود میں رنگ الٰہی پیدا کریں تا کہ آپ کی روح وجان اسماء خدا کا آئینہ اور اوصاف جلال و جمال کا جلوہ لیے ہوئے ہو۔

علم وقدرت، ارادہ ومشیت، مدیریت و ربوبیت، رحمانیت ورحیمیت و..... کے لحاظ سے ایسا رنگ اختیار کریں کہ کچھ نہ کچھ شباہت اس ذات کے ساتھ ہو جائے۔ اسلامی احادیث میں اسی مسئلہ تربیت کے بارے میں لطیف اشارے ملتے ہیں۔ ان میں سے تنبیہ خواطر (مجموعہ وارم بن ابی فراس) میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ فرمایا:

"جعل الله سبحانه مكارم الاخلائق صلة بينه و بين عباده فحسب احدكم ان يمسك بخلق متصل بالله۔"

''خداوند متعال نے فضائل اخلاقی کو اپنے اور بندوں کے درمیان ارتباط اور تعلق کا وسیلہ بنایا ہے۔ تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ اخلاق الٰہی کے ساتھ متمسک ہو جاؤ تا کہ خدا سے رابطہ وارتباط ہو جائے (اس کے اوصاف میں سے کسی وصف سے اپنے آپ کو متصف کرلو)۔''[1]

ایک اور مشہور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

"تخلقوا باخلاق الله"

''اخلاق خدائی اور صفاتِ الٰہی سے متخلق اور متصف ہو جاؤ (ان کو اپناؤ)۔''[2]

---

[1] تنبیہ الخواطر ص ۳۶۲ مطابق نقل میزان الحکمۃ جلد ۳ ص ۱۴۹

[2] زبدۃ المعارف در اصول العقائد محقق لاہیجی ص ۸۷

عدلِ الٰہی

اشارہ

خدائے تعالیٰ کی ''صفاتِ فعل'' میں سے صفت ''عدالت'' کو خصوصیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء وعقائد نے جداگانہ اور تشریح کے ساتھ اس کی بحث کی ہے حتیٰ کہ اصولِ دین میں اس کو مستقل حیثیت دی گئی اور ایک علیحدہ اصل کے طور پر اس کا تذکرہ ہوا ہے، حالانکہ باقی صفات فعل کی طرح یہ بھی ایک صفت ہے اور مباحث معرفت خدا میں اس کو (اسماء وصفت کی بحث کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔

اصل مسئلہ یعنی عدل کی بحث سے پہلے اس کی خصوصیات پر بحث ممکن نہیں، لہٰذا اس کا تذکرہ بعد میں کریں گے۔ یہاں فقط یہی کہنا کافی ہے کہ عدل الٰہی ایک طرف ایمان باللہ کی اصل کے ساتھ اس کا ارتباط ہے، دوسری طرف یہ مسئلہ معاد سے متعلق ہے۔ نیز مسئلہ نبوت اور کئی دوسرے مسائل جیسے جبر، تفویض، جزائ، سزا، توحید، ثنویت (دوگانہ پرستی) اور فلسفہ احکام وغیرہ۔ لہٰذا مسئلہ عدالت کے مثبت یا منفی اعتقاد سے تمام معارف دینی اور اعتقادات کا چہرہ تبدیل ہو متغیر ہو جائے گا۔

علاوہ ازیں معاشرہ میں عدالت اجتماعی، عدالت اخلاقی اور تربیتی مسائل ہیں جن پر عدل الٰہی کا اثر قابل انکار نہیں ہے۔

مندرجہ بالا امور کی بناء پر ہم بھی اس مسئلہ کو مستقل اور تشریح کے ساتھ بیان کریں گے، لیکن جیسا کہ تفسیر موضوعی کا طریقہ وروش ہے، ہم ہر چیز سے پہلے اس سلسلہ کی آیات قرآنی کی تلاش میں جائیں گے تا کہ انکی روشنی میں اس مسئلہ کی مشکلات کو حل کر سکیں۔ اس اشارہ کے ساتھ ہم آیات ذیل کی طرف قلب وجان سے متوجہ ہوتے ہیں:

(۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝۴۴ (یونس ۴۴)

(۲) وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا۝۴۹ (کھف ۴۹)

(۳) فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝۷۰ (توبہ ۷۰)

(روم ۹)

(۴) فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۵۴ (یس ۵۴)

(۵) وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۝۲۷۲ (بقرہ ۲۷۲)

(۶) بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ (نساء ۴۹)

(۷) وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ (ال عمران ۱۰۸)

(۸) شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ (ال عمران ۱۸)

(۹) اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ (یونس ۴)

(۱۰) وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ (انبیاء ۴۷)

(۱۱) وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾ (حم السجدہ ۴۶)

(۱۲) اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ [1] (ص ۲۸)

ترجمہ

(۱) خدا انسانوں پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

(۲) تمہارا پروردگار کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔

(۳) خدا کسی پر ظلم کرنے والا نہیں لوگ خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں۔

(۴) پس آج کے دن بھی کسی نفس پر ظلم نہیں کیا جائے گا اور تم کو صرف ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے اعمال تم کرتے رہے تھے۔

(۵) اور تم کارِ خیر میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہاری طرف واپس آئے گا اور تم پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہوگا۔

---

[1] اس بارے میں قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں، ہم نے ان میں سے ایک مضمون کی دو یا ایک آیت بطور نمونہ لی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات میں بھی یہ مضمون پایا جاتا ہے: نساء ۴۰، ۷۷، عنکبوت ۴۰، انفال ۶۰، بقرہ ۲۸ (ان کے علاوہ ۱۴ آیات ہیں جن میں لایظلمون کی تعبیر ہے اور خدا سے ظلم کی نفی کی جارہی ہے) نیز یونس ۴۷، ۵۴۔

(۶) بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے پاکیزہ بناتا ہے اور بندوں پر تھوڑا سا (دھاگہ برابر) ظلم بھی نہیں ہوتا۔
(۷) اور اللہ اہل جہان پر ہرگز ظلم کرنا نہیں چاہتا۔
(۸) اللہ خود گواہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں (یہ گواہی جہانِ ہستی کے لیے نظام واحد کی بدولت ہے) ملائکہ اور صاحبانِ علم بھی گواہی دیتے ہیں کہ وہ عدل کو قائم کرتا ہے۔
(۹) وہی خلقت کا آغاز کرنیوالا ہے اور واپس لے جانے والا ہے تاکہ ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو عدل کے ساتھ جزا دے۔
(۱۰) اور ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو قائم کریں گے اور کسی نفس پر ادنیٰ سا ظلم نہیں ہوگا۔
(۱۱) اور تمہارا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔
(۱۲) کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں جیسا قرار دے دیں یا صاحبانِ تقویٰ کو فاسق وفاجر (لوگوں) جیسا قرار دے دیں؟ (یہ عدالت نہیں ہوگی)

مفردات کی تشریح

مقائیس کے بقول ظلم کے دو مختلف معانی ہیں:
(۱) تاریکی جس کی تعبیر ظلمت کے ساتھ کی جاتی ہے۔
(۲) کسی چیز کو اس کے محل کے غیر میں رکھنا (اس کے مقابل عدل ہے یعنی کسی چیز کو مناسب محل میں رکھنا)
یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہو کیونکہ ظلم (عدالت کا مقابل) جہاں بھی ہو ظلمت وتاریکی کا سبب ہے، شاید اسی دلیل سے راغب نے مفردات میں اس کی اساس ''ظلمت'' کو قرار دیا ہے۔
لسان العرب کے نزدیک ظلم کا اصل معنی جور اور حد سے تجاوز ہے، ایک اور تعبیر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ ظلم کا معنی میانہ روی سے انحراف ہے۔
البتہ ان تینوں معانی ''ایک چیز کو غیر محل میں قرار دینا، حد سے تجاوز اور میانہ روی سے انحراف'' کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔
بعض مفکرین نے ظلم کی تین قسمیں بتائی ہیں:
(۱) انسان کا ظلم بہ نسبت پروردگار کہ جس کا اہم مصداق کفر، شرک اور نفاق ہے۔
(۲) انسان کا ظلم دوسرے انسانوں پر۔
(۳) اپنے اوپر ظلم کرنا۔ ان سب کے شواہد قرآن مجید میں موجود ہیں۔

لیکن ایک لحاظ سے سب کی بازگشت ''اپنے اوپر ظلم'' کی طرف ہے کیونکہ انسان جب ظلم کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے اوپر ظلم کرتا ہے اور اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے جیسے قرآن مجید میں ہے:

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴿۱۶۰﴾

''ہم انسانوں پر ظلم نہیں کرتے بلکہ انسان ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔'' (اعراف ۱۶۰)

ظلم کے مقابلہ میں عدل ہے۔اس کے لیے دو متضاد معانی ذکر کیے گئے ہیں۔

عدل کا مشہور و معروف معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے محل میں رکھنا، یہ ایک وسیع مفہوم ہے جس کے مصادیق بہت ہیں۔ان میں سے عدالت کا معنی موزوں ہونا، عدالت یعنی برابری اور ہر قسم کی تبعیض وتفریق کی نفی، عدالت یعنی دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا، عدالت یعنی استحقاق ولیاقت کا لحاظ اور آخر میں عدالت یعنی تزکیہ و پاکیزگی اختیار کرنا۔

اگر کبھی شرک کے معنی میں اس کا استعمال ہوا ہے تو اس لیے کہ مشرک لوگ کسی چیز کو خدا کا عدیل ونظیر قرار دیتے ہیں، سورۂ انعام میں ہے: "ثم الذين كفروا بربهم يعدلون" ''پھر وہ لوگ جو کافر ہیں موجودات کو خدا کا عدیل اور اس کی نظیر قرار دیتے ہیں۔'' (انعام ۱)

عدل کا دوسرا معنی بقول مقائیس اللغۃ کجی اور ٹیڑھا پن ہے۔بعض ارباب لغت کا خیال ہے کہ اس کا معنی ظلم ہے۔(یعنی عدل ایسے الفاظ سے ہے کہ جو دو متضاد معانی رکھتا ہے۔لہٰذا ایک مطلب سے انحراف کو بھی عدل کہتے ہیں)۔

کلمہ ''قسط'' کا اصل معنی نصیب اور برابر کا حصہ ہے، اس لحاظ سے یہ کبھی عدالت کے معنی میں بھی آتا ہے۔جب ہر ایک کو عادلانہ حصہ دیا جائے اور کبھی ظلم کے معنی میں آتا ہے جب کسی کا حصہ عادلانہ اس سے روک لیا جائے۔پہلا معنی عام طور پر باب افعال کی صورت میں آتا ہے۔لہٰذا اسماء خدا میں ایک نام ''مقسط'' بھی ہے۔

دوسرا قسط کی صورت میں (ثلاثی مجرد) ہے۔لہٰذا قاسط کا معنی ظالم ہے۔قرآن مجید میں آیا ہے: "واما القاسطون فكانوا لجهنم حطبا" ''بہرحال ظالم جہنم کا ایندھن بنیں گے۔'' (جن ۱۵)

نیز قرآن مجید میں ہے: "ان الله يحب المقسطين" ''خدا عادلوں کو دوست رکھتا ہے۔'' (مائدہ ۴۲)[1]

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قسط وعدل کبھی جداگانہ استعمال ہوتے ہیں۔اس وقت ہم معنی ہوتے ہیں اور کبھی ایک جگہ پر آتے ہیں (پھر بھی معنی میں مشترک ہوتے ہیں) جیسے اہل سنت وشیعہ ایک مشہور حدیث پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں:

"لوله يبق من الدنيا الا يوم واحد لطول الله ذلك اليوم حتى يخرج

---

[1] لسان العرب، مفردات راغب، مقائیس اللغۃ اور مجمع البحرین

رجل من ولدی فیملاها عدلا وقسطا کما ملئت جورا و ظلما۔"

''اگر جہان کی زندگی سے ایک ہی دن رہ جائے تو بھی خدا اس دن کو طولانی کردے گا تا کہ میری اولاد سے ایک مرد آجائے اور زمین کو عدل وانصاف سے پر کردے جس طرح وہ جور وظلم سے بھری ہوگی۔''[1]

اس روایت میں ''عدل'' و ''قسط'' ایک دوسرے کے ساتھ آئے ہیں جیسے ''ظلم'' و ''جور'' بھی یک جا استعمال ہوئے ہیں۔

ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ''قسط'' جیسا کہ اس کے لغوی معنی کے بارے میں کہا ہے ''عادلانہ تقسیم'' ہے۔ اس کے مقابل تبعیض وتفریق ہے۔ لہٰذا قسط سے مراد یہ ہے کہ ہر کسی کا حق اس کو دیا جائے، نہ کہ کسی دوسرے کو دے دیا جائے۔

لیکن عدالت جور اور دوسروں کے حقوق میں تجاوز کے مقابل ہے، یعنی کوئی شخص دوسرے کا حق غصب کر کے خود لے جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ معاشرہ میں کامل عدالت اس وقت ہوگی جب کوئی دوسرے کے حقوق میں تجاوز نہ کرے اور نہ کسی کا حق دوسرے کو دے۔ (بلکہ حق اس کے حق دار کو ہی ملے)۔

بعض حدیثوں میں آمدہ تعبیر سے ایک اور قسم کا فرق سمجھا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ''عدالت'' قضاوت وانصاف کے مرحلہ میں ہے اور قسط تقسیم حقوق میں ہے۔ لسان العرب میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک حدیث میں آیا ہے:

"اذا حکموا عدلوا و اذا قسموا آقسطوا۔"

''یہ لوگ جب حکم وفیصلہ دیتے ہیں تو عدالت کو اپناتے ہیں اور جب تقسیم مال کرتے ہیں تو قسط کی رعایت کرتے ہیں۔''[2]

یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ عدل کا مفہوم قسط کے مفہوم سے وسیع تر ہو، کیونکہ قسط فقط تقسیم کے مقام پر مستعمل ہے جب کہ عدل اس مورد کو اور دوسرے موارد کو بھی شامل ہیں۔ (غور کریں)

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ''کلمۂ عدل'' قرآن مجید میں خدا کے بارے میں نہیں بندوں کے فریضہ کے طور پر ذکر ہوا ہے۔ اس کے

---

[1] منتخب الاثر ص ۲۴۷ اس کتاب میں اس مضمون کی ۱۲۳ احادیث ہیں (مختصر سے فرق کے ساتھ) کتاب نور الابصار محمد شبلنجی میں بھی اس مضمون کی متعدد روایات آئی ہیں۔ ص ۱۷۸ تا ۱۸۹

[2] لسان العرب جلد ۷ مادہ ''قسط''

مقابلے میں خدا سے نفی ظلم کی تعبیر کثرت سے ہے اور پھر رعایت قسط کی تعبیر اس سے بھی کم ہے۔

یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے (یاد رہے کہ یہاں ہم لفظ احتمال لا رہے ہیں) کہ خدا کے بارے میں کلمہ عدل کا عدم استعمال ممکن ہے اس لیے ہو (جیسے پہلے اشارہ ہوا ہے) کہ یہ کلمۂ عدل کبھی شرک (کسی کو خدا کا شریک ٹھہرانے) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، لہٰذا خدا نے پسند نہیں کیا کہ یہ مشترک لفظ اس کی ذات پاک کے لیے بھی استعمال ہو۔

(۱) بہرحال پہلی آیت مورد بحث میں قطعی طور پر فرمایا جا رہا ہے کہ ''خدا انسانوں پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔'' (ان اللہ لا یظلم الناس شیئا ولکن الناس انفسھم یظلمون)

یہ تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو، جس کا ذکر اس آیت سے پہلے ہوا ہے کہ لوگوں کا ایک گروہ مشاہدۂ حق سے اندھا اور حق بات سننے سے بہرا ہے۔ یہ ان کی بداعمالیاں ہیں جن کی وجہ سے ان کی آنکھ اور کان پر پردہ پڑا ہوا ہے نہ یہ کہ خدا نے بے سبب ان کی یہ حالت بنا ڈالی۔

ایک اور تعبیر کے مطابق یہ سنت الٰہی ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان جس مقصد کے لیے پیدا کیے گئے، اگر یہ اس مقصد کے لیے استعمال نہ ہوں تو تدریجاً اپنی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی فرد یا قوم ایسی حالت میں مبتلا ہو جائے تو گویا اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے نہ یہ کہ خدا نے اس پر ظلم کیا ہے۔

اس تفسیر کو بہت سے مفسرین نے قبول کیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ بعض لوگوں جیسے فخر رازی نے اس واضح مطلب کو نہیں اپنایا اور مذہبی تعصب سے کام لیتے ہوئے عدالت کے بارے میں کہا کہ سارا جہان خدا کا ملک ہے۔ پس وہ جو کچھ بھی کرے ظلم تصور نہیں ہوگا۔

جب کہ آیت بڑی باریکی کے ساتھ اس مطلب کو غلط قرار دے رہی ہے۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خدا کی طرف سے ظلم، ظلم نہیں رہے گا بلکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس پر قدرت رکھنے کے باوجود ایسا کام کبھی نہیں کرے گا۔

اس قسم کی تعبیریں بکثرت ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ فلاں ڈاکٹر نے فلاں بیمار کو قبول نہیں کیا تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ علاج کر سکتا تھا لیکن نہیں کیا، ہم ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ فلاں بے لیاقت آدمی نے اس کا علاج نہیں کیا۔

(۲) دوسری آیت میں یہی بات ایک اور تعبیر کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ فرمان ہے کہ تمہارا پروردگار کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا۔ (ولا یظلم ربك احدا)

''رب'' کے نام سے اس کا تذکرہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس کا کام تربیت، پرورش اور تکامل ہے نہ کہ ظلم و جور۔ کیونکہ یہ فعل تو نقصان اور پسماندگی کا سبب ہے جو اصول تربیت کے خلاف ہے۔

یہ جملہ قیامت کے دن مجرموں کی حالت کے بیان کے بعد ذکر کیا گیا ہے، جب وہ اپنے نامہ اعمال کو دیکھیں گے تو ان کی فریاد بلند ہوگی: ہائے افسوس! یہ نامہ اعمال کس نے لکھا ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا عمل نہیں جو اس میں نہ آیا ہو۔ بلکہ وہ اپنے اعمال کو اپنے سامنے حاضر پائیں گے۔ لہٰذا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا نہ کہ خدا نے ان پر ظلم کیا۔ خصوصاً یہ مسئلہ کہ اعمال ان کے سامنے مجسم ہوں گے۔ اس طرح

خدا سے ظلم کی نفی اور واضح ہوجاتی ہے۔

(۳) تیسری آیت میں دنیاوی عذاب کا تذکرہ ہے جو سابقہ چھ قوموں کو ان کی طغیان اور سرکشی کی وجہ سے دیا گیا۔[1] فرمان ہے کہ خدا کسی (یا ان قوموں) پر ظلم کرنے والا نہیں۔لوگ خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں۔(فما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون)

خدا نے ان کو عقل و ہوش اور دانش دی۔پیغمبر اور آسمانی کتب ایک کے بعد دوسری بھیجی اور پھر بار بار خبردار کیا۔جب یہ چیزیں موثر نہ ہوئیں تو ان پر اپنا عذاب نازل کیا۔کسی گروہ کو پانی نے،ایک گروہ کو ہوا نے اور دوسرے گروہ کو زلزلہ اور آسمانی چیخ نے تباہ کر دیا۔

آج کی اقوام جو طغیان اور سرکشی میں ڈوبی ہوئی ہیں یہ بات ان کو بھی خبردار کر رہی ہے کہ اپنے آپ کو سنبھالیں اور اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ ماریں اپنے خرمن زندگی کو اپنی بداعمالیوں کی آگ سے نہ جلائیں (اور خاکستر نہ کریں)۔

جملہ فما کان اللہ لیظلمھم میں فعل ماضی (کان) اور فعل مضارع (لیظلمھم) کو جمع کر دیا گیا ہے۔اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ خدا نے کسی بھی زمانہ میں کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔یہ اس کی ایک سنت جاریہ اور وصف ثابت ہے،کوئی وقتی و اتفاقی معاملہ نہیں ہے۔

(۴) چوتھی آیت قیامت کے دن کی جزا و سزا کا تذکرہ کر رہی ہے۔روزِ قیامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمان ہے کہ ''پس آج کے دن بھی کسی نفس پر ظلم نہیں کیا جائے گا اور تم کو ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے اعمال تم کرتے رہے تھے۔(فالیوم لاتظلم نفس شیئا ولاتجزون الا ما کنتم تعملون)

اگرچہ اس آیت میں (لاتظلم) فعل مجہول ہے لیکن ظاہر ہے کہ میدان قیامت میں حاکم عدالت صرف خدا ہوگا۔لہٰذا ذات خدا سے ظلم کی نفی ہو رہی ہے۔معلوم ہوا کہ وہ نہ دنیا میں کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ آخرت میں کسی پر ظلم کرے گا۔لوگوں کے اپنے ہی اعمال میں جو مجسم صورت میں موجود ہوں گے۔اگر اعمال نیک ہوں گے تو لذت و نشاط حاصل ہوگی اور اگر برے اعمال ہوں گے تو انہی اعمال کی وجہ سے وہ شکنجہ اور عذاب میں مبتلا ہوں گے۔لہٰذا فرمان ہے کہ اس دن تمہاری جزا تمہارے ہی اعمال ہیں۔

(۵) پانچویں آیت ایک مورد خاص یعنی انفاق کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے،چنانچہ صراحت کے ساتھ کہا جا رہا ہے ''اور تم کارِ خیر میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہاری طرف واپس آئے گا اور تم پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہوگا۔'' (وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون)۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں ظلم کو نقصان کے معنی میں لیا ہے یعنی تمھارے حق سے کوئی چیز کم نہیں ہوگی۔لیکن ظاہر ہے کہ ظلم وہی وسیع معنی رکھتا ہے،اگرچہ اس جگہ مقدار و کیفیت کے لحاظ سے نقصان ہی مراد ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ آیت کا پہلا حصہ اشارتاً اور شانِ نزول میں صراحت کے ساتھ انفاق و خرچ کرنے کا ذکر کر رہا ہے

---

[1] قوم نوح،عاد،ثمود،قوم ابراہیم،قوم شعیب،قوم لوط

اگرچہ ضرورت مند کافر ہی کیوں نہ ہو۔قرآن تمام مسلمانوں کوشوق دلا رہا ہے کہ احتیاج کے وقت کافر پر بھی انفاق وخرچ کریں کیونکہ وہ ان کفار کے ایمان لانے کے ذمہ دار نہیں بلکہ ہدایت وتوفیق خدا کے ہاتھ میں ہے۔لیکن مطمئن رہیں کہ جو انفاق خالصانہ ہو اور محتاج کی مدد کے لیے کہا جائے گا تو (دنیا وآخرت) میں اس کا بدلہ خرچ کرنے والے ہی کو ملے گا اور اس تک پہنچے گا۔

دنیا میں انفاق کی وجہ سے تمہارے مال کو ضمانت مل جائے گی کیونکہ جب فقر ووفاقہ معاشرہ کے ایک گروہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو حرج ومرج اور بدامنی معاشرہ کو گھیرے گی،اس میں فقط مال ہی نہیں جانیں بھی برباد ہوں گی۔

لیکن آخرت میں خدا کی رحمت واسعہ سے کئی گنا (مال) اور جزا عظیم ان تک پہنچے گی۔

یہ تعبیر گویا انفاق کرنے والوں کو شوق دلاتی ہے کہ مال کا بہترین مصرف راہ خدا میں انفاق ہی ہے کیونکہ یہ مال بعینہٖ انہی کی طرف لوٹے گا۔کیا کوئی پسند کرتا ہے کہ پرانا لباس اور خراب چیزیں اس کی ملکیت بن جائیں؟ لہٰذا یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بے قیمت مال ہی راہ خدا میں خرچ کیا جائے۔

(۶) چھٹی آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو اپنی تعریف خود کرتے ہیں اور اپنے اور اپنے خاندان کے لیے امتیازات کے قائل ہیں، جیسے یہودی جو خود کو فرزندانِ خدا کہتے ہیں۔ان کا اعتقاد ہے وہ دن میں گناہ کریں تو خدا رات کو یہ گناہ بخش دیتا ہے اور اگر وہ رات کو گناہ کریں تو دن کے وقت بخش دیئے جائیں گے۔اسی طرح نصرانی بھی اپنے لیے امتیازات کے قائل ہیں۔(اس آیت کی شانِ نزول میں بہت سے مفسرین نے ان دونوں گروہوں کی بلند پروازیوں کا ذکر کیا ہے۔)

قرآن کہتا ہے کہ خودستائی دراصل تعصب خود پسندی اور غرور سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی کوئی قیمت نہیں۔(عظمت اس تعریف میں ہے جو خدا کی طرف سے ہو)۔خدا جس کے بارے میں چاہتا ہے (اور صلاحیت دیکھتا ہے) اس کی تعریف خود کرتا ہے اور کسی قسم کا ظلم حتی کہ گٹھلی میں جو باریک دھاگہ ہوتا ہے۔اس کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا(بل اللہ یزکی من یشاء ولا یظلمون فتیلا)۔

ہاں چونکہ وہ تمام وجود انسان،اس کے ظاہر وباطن اور اچھی بری عادات کو جانتا ہے،لہٰذا اس کی طرف سے تعریف نہ حد سے زیادہ ہوگی اور نہ کم ہوگی جب کہ دوسرے لوگوں کی طرف سے تعریف میں جہالت اور مختلف جہات کا عدم علم ملا ہوا ہے، پھر یہ نفرت ومحبت اور غرور وغفلت سے ملی جلی ہوتی ہے۔

اس آیت میں،ظلم وستم،حد سے تجاوز کی بات اسی تعریف کے سلسلہ میں ہو رہی ہے اور خدا نے اسی کا ذکر کیا ہے۔لیکن یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اس جملہ میں ایک بڑے گناہ کا تذکرہ ہو کہ جس کا ارتکاب خودستائی کی وجہ سے کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ لوگ خود کو ایک جدا مخلوق سمجھتے ہیں جو ہر حالت میں اکرم وتعظیم خدائی کی حق دار ہے۔(یہ بجائے خود بہت بڑا گناہ ہے)

قرآن کہتا ہے:اس طرح کی بات موجب سزا ہے لیکن اس میں ظلم نہیں،بہرحال پہلی تعبیر وتفسیر زیادہ مناسب ہے۔

مادۂ ''فتل'' بروزن ''قتل''،اس کا معین بنا ہے۔لہٰذا فتیل بٹی ہوئی رسی کو کہتے ہیں۔اب اس باریک دھاگہ پر استعمال ہو رہا ہے جو خرما کی گٹھلی کے شگاف میں ہوتا ہے یہ بہت معمولی چیز سے کنایہ ہے۔

(۷) ساتویں آیت میں یہی معنی ایک تازہ تعبیر کے ساتھ سامنے آتا ہے، اگر دوسری آیات میں خدا سے ظلم کی نفی صرف انسانوں کے لیے تھی تو اس آیت میں تمام جہان سے خدا کے ظلم کی نفی کی گئی ہے، صرف ظلم ہی کی نفی نہیں بلکہ وہ ظلم کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔ فرمان ہے کہ اور اللہ اہل جہان پر ہرگز ظلم کرنا نہیں چاہتا (وما الله يريد ظلما للعلمين)۔

اگر عالمین کو ذوی العقول کی جمع لیں تو یہ تمام صاحبانِ عقل، انسان، جن، فرشتے سب کو شامل ہوگا۔

اگر صرف (ذوی العقول نہیں) بلکہ تغلیب مراد لیں تو پھر تمام موجوداتِ جاندار اور غیر جاندار سب کو شامل ہے اور عدلِ الٰہی یعنی ہر چیز کو اس کے محل میں قرار دینا مکمل طور پر ثابت ہو جائے گا۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ عالمین کی تعبیر اس حقیقت کی طرف نشاندہی کر رہی ہے کہ ظلم جو بھی ہو جس پر بھی ہو، اس کا اثر سارے جہان میں ظاہر ہوگا (کیونکہ جہان ایک ہے اور سب چیزوں کا باہمی ارتباط ہے۔)[1]

قابل توجہ امر یہ ہے کہ مفکرین کی ایک جماعت نے اس آیت کو جبر اور اس کے سرچشمہ کی نفی پر دلیل کے طور پر لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر بندوں کے اعمال فعل خدا ہوں اور انکا مرکز و منبع ذاتِ خدا ہو تو لوگ ایک دوسرے پر جو ظلم کرتے ہیں یا اپنی ذات پر ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں تو یہ سب فعل خدا ہوگا۔ جب کہ آیت مندرجہ بالا کہہ رہی ہے کہ خدا کبھی بھی عالمین کے کسی فرد پر ظلم نہیں کرتا، یہ اس پر دلیل ہو جائے گی کہ ظلم و جور فعل خدا نہیں بلکہ بندوں کی اپنی کارستانیاں ہیں کیونکہ اگر یہ فعل خدا ہوتا تو حتماً خدا اس کا ارادہ کرتا جب کہ وہ فرما رہا ہے کہ وہ ظلم کا ارادہ ہی نہیں کرتا، اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ذات خدا ان مظالم سے مبرا و منزہ ہے۔

تعجب ہے کہ فخر الدین رازی اس بات کو (جب کہ یہ اس کے عقیدہ جبر و اختیار کے خلاف ہے) نقل کرتا ہے لیکن اس کا جواب نہیں دیتا۔[2]

بہرحال یہ آیت تین لحاظ سے عمومیت رکھتی ہے: (۱) عالمین (۲) ظلم (۳) ارادہ۔ اور یہ خدا سے ظلم کی نفی کی جامع ترین دلیل ہے۔

(۸) آٹھویں آیت میں، برخلاف آیات ماقبل جن میں ظلم کی نفی کی تھی، قسط و عدل اور انصاف کے اثبات پر تاکید کی گئی ہے اور وہ سنت دائمی کے عنوان سے ہے۔ فرمان ہے: خدا خود گواہ ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں، فرشتے اور صاحبانِ عقل بھی (اپنے اپنے طور پر) گواہی دیتے ہیں کہ وہ عدل کو قائم کرتا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ ''شہود'' کی شرائط میں سے ایک اس کا عادل ہونا ہے تاکہ انہیں حق کے راستہ میں ہر قسم کے انحراف سے باز رکھے، اس جگہ بھی خدا کی شہادت و گواہی کی تکمیل کے لیے اس کی عدالت پر تکیہ کیا گیا ہے۔

اگر عمیق نگاہ سے ملاحظہ کریں تو جہان وہستی میں عدالت پوری طرح ثابت ہے کیونکہ ہر چیز کو ہم اس کی مناسب جگہ پر دیکھ رہے

---

[1] المیزان جلد ۳ ص ۴۱۴ (اقتباس)

[2] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۸ ص ۱۷۴

ہیں۔ اگر بعض حوادث اور امور میں ہمیں کوئی نقص نظر آتا ہے تو زیادہ باریک بینی اور علم و دانش کی پیش رفت سے اس کے اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی نادر مقام پر اس کی علت واضح نہ ہو تو ہمیں جن چیزوں کی معرفت حاصل ہے، ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہی سمجھیں گے کہ یہ عدم علم درحقیقت ہماری جہالت اور دانش کی کمی کی وجہ سے ہے۔

علاوہ ازیں عدالت خدا اس کی وحدانیت کی دلیل بھی ہے کیونکہ اگر کوئی اور خالق و حاکم ہوتا تو اس عالم کی تدبیر میں دوئیت آ جاتی جس کا نتیجہ فساد عالم کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ لہٰذا موجودات کا ایک نظام اور تدبیر کی وحدت خدا کی یکتائی کی بہترین دلیل ہے۔

اس ترتیب سے دیکھا جائے تو اس کی توحید اس کی عدالت کی دلیل ہے اور اس کا عدل اس کی توحید و وحدانیت کی دلیل ہے، یہ ایک بہترین اور لطیف نکتہ ہے جو اس آیت سے حاصل ہوا ہے۔[1]

خاص بات یہ ہے کہ زمخشری نے کشاف میں اس آیت کو جبر کی نفی کی دلیل کے طور پر لیا ہے کیونکہ جبر عدالت خدا کے مناسب حال نہیں ہے۔ یہ ایک واضح امر ہے اور آئندہ بحث میں ہم اس پر اعتماد و تکیہ کریں گے، انشاءاللہ اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی شخص کو ایک کام پر مجبور کرے اور پھر اس کا پر اس کو سزا بھی دے۔

لیکن فخر الدین رازی نے مسئلہ جبر میں تعصب کی بدولت صاحب کشاف پر شدید نکتہ چینی کی ہے، بارہا اس کو مسکین یا رموز علم سے ناواقفیت کا طعنہ دیا ہے۔ پھر علم خداوندی کے بارے میں مشہور اشکال کو مسئلہ جبر میں اپنا وسیلہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ اگر غلط کار لوگ نافرمانی نہ کریں اور علم خدا میں ازل سے ان کے جو گناہ ہیں وہ گناہ نہ کریں تو اس سے خدا کا علم جہل بن جائے گا۔[2]

اس اشکال کا جواب اس قدر واضح ہے کہ آج بھی جو لوگ مسئلہ جبر و تفویض کا تھوڑا سا علم رکھتے ہیں وہ اس جواب سے واقف ہیں، اس کی شرح آئندہ بحث میں آئے گی۔ انشاءاللہ!

(۹) نویں آیت میں قیامت کے دن ثواب و جزاء کے سلسلہ میں عدالت خدا کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں کلمہ قسط پر تکیہ کیا گیا ہے۔ فرمان ہے۔ وہی خلقت کا آغاز کرنے والا ہے اور واپس لے جانے والا ہے۔ (جیسے وہ آغازِ خلقت پر قادر ہے معاد اور تجدید حیات پر بھی قادر رہے) تا کہ ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو عدل کے ساتھ جزاء دے۔ (انه يبدئوا الخلق ثم يعيده ليجزى الذين امنوا وعملوا الصلحت بالقسط)

یہ آیت درحقیقت معاد کے امکان عقلی اور وقوع ہر دو کی دلیل کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ جس نے آغاز میں کسی چیز کی بنیاد رکھی اس کو معاد و تجدید پر تو قدرت قطعی ہوگی۔

بہرحال معاد کا وقوع ضروری ہے اس لیے کہ اگر یہ واقع نہ ہو تو قسط و عدالت کا تحقق نہیں ہو سکے گا کیونکہ بہت سے نیک لوگ ہیں جن کو

---

[1] المیزان جلد ۳ ص ۱۱۹ (اقتباس)

[2] تفسیر فخر الرازی جلد ۷ ص ۲۰۶

اس دنیا میں جزا نہیں ملی اور بہت سے ایسے بدکار ہیں جو سزا سے بچے ہوئے ہیں۔ پس اگر معاد و قیامت کا سلسلہ نہ ہو تو عدل و قسط نہیں رہے گا۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ ذیل آیت میں قیامت کے دن کافروں کے لیے سخت عذاب کا اشارہ ہوا ہے۔ (والذین کفروا لھم شراب من حمیم و عذاب الیم بما کانوا یکفرون)

اس آیت میں قسط و عدل کا نام تک نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً کافروں کی سزا کا مطابق عدل ہونا آغاز آیت سے معلوم ہے۔ ثانیاً بما کانوا یکفرون دلیل واضح ہے کہ سزا ان کے عمل کے مقابلہ میں ہے۔ گویا نیک لوگوں کی جزا میں قسط کے تذکرہ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ان کی خلقت کا ہدف اصل یہی تھا اور قیامت انہی کے لیے برپا ہوئی ہے، دوسرے لوگوں کے لیے جنبہ تبعی رکھتی ہے۔

بعض مفسرین نے تفسیر آیت میں یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ قسط کی نظر اعمال مومنین کی طرف ہے کیونکہ عدالت کو جو مقتضائے ایمان ہے انہوں نے ہی قائم کیا ہے۔ لہٰذا خدا ایسے مومنوں کو جزا دے گا۔[1]

لیکن اس بات کے قائل نے اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں کہ (عمل صالح) مسلما موافق اصول عدالت ہے لہٰذا اس قید کی ضرورت نہیں مگر یہ کہ اس کو تاکید سمجھا جائے اور ہمیں علم ہے کہ تاکید خلافِ ظاہر ہے اور اس کے لیے قرینہ کی ضرورت ہے۔

(۱۰) دسویں آیت میں یہی مطلب ذکر کیا جا رہا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ قسط و عدل کو ترازوئے اعمال کے لیے عنوان توصیفی قرار دیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ ترازو خدائے عادل کی طرف سے ہے۔ پس حقیقت میں یہ اس ذات پاک کا وصف ہے۔

اس آیت کا پہلی آیت سے ایک اور فرق یہ ہے کہ اس کا مفہوم عام ہے اور یہ مومن و کافر ہر دو کو شامل ہے کیونکہ ترازوئے عدل سے عادلانہ حساب ہی ہوگا۔ ظلم و بے عدالتی اس میں نہیں ہو سکتی۔ فرمان ہے: ''اور ہم قیامت کے دن عدل کا ترازو قائم کریں گے اور کسی نفس پر ادنی سا ظلم بھی نہیں ہوگا۔'' (ونضع الموازین القسط لیوم القیامة فلا تظلم نفس شیئا)۔

خاص بات یہ ہے کہ ''قسط'' (عدل بمعنی مصدری) کو میزان کی صفت قرار دیا اور کہا جا رہا ہے کہ وہ ترازو جو عین عدالت ہیں، اس سے تاکید موکد سمجھی جاتی ہے۔ یہ اصطلاحاً ''زید عدل'' کی طرح ہو جائے گا۔ یعنی ہم کہتے ہیں فلاں شخص عین عدل ہے۔ لہٰذا آیت میں کسی لفظ کو مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

پیام قرآن کی جلد پنجم میں انشاء اللہ بیان کیا جائے گا کہ میزان سے مراد ترازوئے مادی کی مشابہت نہیں۔ جس سے یہ سوال پیدا ہو کہ کیا اعمال میں وزن اور سنگینی پائی جاتی ہے؟ اور اس میزان سے یہ کیسے معلوم ہوگا۔ پھر ہم فخر رازی کی طرح مجبور ہو جائیں گے کہ وزن سے مراد نامۂ اعمال کا وزن ہے یا یہ کہ نیکیاں سفید نورانی جواہرات کی حالت میں مجسم ہوں گی اور برائیاں سیاہ ظلماتی، جواہر کی طرح ہوں گی۔

بلکہ موازین سے مراد وسیلہ حساب ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہر چیز کے وزن کا پیمانہ اس کی مناسبت ہی سے ہوتا ہے جیسے حرارت کا پیمانہ اور فشار خون کا پیمانہ وغیرہ۔ لہٰذا حساب اعمال کا وسیلہ کوئی ایسی چیز ہوگی جو اس کے مناسب ہو۔ چنانچہ زیارت امیر المومنین علیہ السلام میں ہم

---

[1] المنار جلد ۱۱ ص ۲۹۹

پڑھتے ہیں: "السلام علی میزان الاعمال"۔ اس پر سلام جو حساب اعمال کا میزان و ترازو ہے۔ ہاں۔ انسان کامل مختلف افراد کے اعمال کے حساب کا ترازو اور میزان ہے کیونکہ ہر چیز کا وزن کسی ایسی چیز کے ساتھ ہوگا جو اس کے مشابہ و مناسب ہو۔

خاص بات یہ ہے کہ بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے خدا سے تقاضا کیا کہ ترازوئے اعمال مجھے دکھایا جائے۔ جب مشاہدہ کیا تو بے ہوش ہو گئے اور ہوش آنے کے بعد عرض کیا: خدایا! اس قدر پر عظمت میزان و ترازو! کون اس کے پلڑے کو نیکیوں سے پر کر سکتا ہے؟ خطاب ہوا: اے داؤد! "اذا رضیت عن عبدی ملا تھا بتمرۃ" جب میں کسی بندے سے راضی ہوتا ہوں تو اس پلڑے کو ایک دانہ خرما سے پر کر دیتا ہوں (جو از روئے اخلاص نیت راہِ خدا میں دیا جائے)۔ ہاں مقصود و معیار کیفیت عمل ہے نہ کمیت و مقدار۔ [1]

خدا "ظلام" نہیں ہے

(۱۱) گارہویں آیت میں ظلام (صیغہ مبالغہ جس کا معنی بہت زیادہ ظلم کرنے والا ہے) کا ذکر کرتے ہوئے فرمان ہے: "اور تمہارا پروردگار بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں۔" (وما ربك بظلام للعبید)۔

اس کلام سے پہلے قرآن میں فرمان ہے: ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے۔ اگر عمل صالح انجام دے گا تو اسے نفع ہوگا، اگر برا عمل کرے گا تو اسے نقصان ہوگا۔ اگر لوگ اپنے غلط اعمال کے نتائج میں گرفتار ہیں تو یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے کیونکہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

خداوند عالم سے "ظلام" (زیادہ ظلم کرنے والا ہونے) کی نفی۔ جب کہ وہ معمولی ظلم بھی نہیں کرتا، اس میں بھی ایک نکتہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اصل میں یہ کہنا ہے کہ وہ ذات جو ظلم کی برائی کو جانتی ہے اور اسے اس کی احتیاج بھی نہیں، اس سے معمولی ظلم بھی "ظلم عظیم" شمار ہوگا۔ [2]

بعض کہتے ہیں چونکہ بندے زیادہ ہیں اور ان کے اعمال بھی زیادہ ہیں، اگر ان پر ظلم و ستم ہو تو یہ ظلم کثیر اور فراواں ہو جائے گا۔ [3]

یہ احتمال بھی ہے کہ جہانِ خلقت خصوصا انسانوں کی زندگی میں وحدت و نظم و ضبط ہے۔ اگر ذاتِ پاک کی طرف سے ظلم ہو تو وہ دوسروں کی طرف بھی سرایت کرے گا اور اس میں "ظلام" کا پہلو آجائے گا۔

کس طرح ممکن ہے کہ خدا جو ہر عیب و نقص سے پاک، مبرا و منزہ ہے اور تمام صفات جمال و کمال سے متصف ہے وہ وصف "ظلام" سے موصوف ہو۔

اس مقام پر ایک چوتھی تفسیر بھی ہے جو تمام تفاسیر سے بہتر ہے اور معصومین علیہم السلام کی بعض روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۲ ص ۱۷۶

[2] مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۸۰

[3] المیزان جلد ۱۷ ص ۴۲۷

ہے۔ وہ یہ کہ آیت فوق میں درحقیقت عقیدۂ جبر کا ابطال کیا گیا ہے۔ فرمان ہے: ''جس نے اچھا کام کیا خود اپنے نفع کے لیے کیا اور جو غلط کام کرے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔'' لہٰذا سب لوگ اپنے اعمال میں مختار ہیں۔ اگر خدا بندوں کو مجبور کرتا تو پھر ان کا مواخذہ اور سزا ظلام کے زمرہ میں آجاتے۔ چونکہ خدا ظلام نہیں وہ ہرگز بندوں کو غلط کام کرنے پر مجبور اور پھر ان کا مواخذہ نہیں کرے گا۔

امام ابوالحسن الرضا سے مروی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں: ایک صحابی نے سوال کیا: آیا خدا بندوں کو گناہ پر مجبور کرتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: نہیں! بلکہ انہیں اختیار اور مہلت دی ہے تا کہ توبہ کرلیں۔ اس نے پوچھا کیا خدا بندوں کو ''تکلیف مالایطاق'' دے سکتا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: "كيف يفعل ذلك وهو يقول ماربك بظلام للعبيد"۔ خدا ایسا کام کس طرح انجام دے گا جب کہ وہ کہتا ہے کہ میں بندوں کے لیے ظلام نہیں ہوں۔

توجہ رہے کہ جبر کا اعتقاد تکلیف مالایطاق ہے کیونکہ جو بندہ مجبور ہے وہ ایک فعل کے ترک پر قادر نہیں جب کہ خدا نے ترک معصیت کا حکم انہیں دیا ہے۔[1]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ کلامہ ''ظلام'' قرآن مجید میں پانچ بار آیا ہے، ان میں سے چار کا تعلق بندوں کے اختیار و آزادی کے ساتھ ہے۔

خوب و بد کی برابری کیونکر ممکن ہے؟

(۱۲) بارہویں اور آخری آیت بظاہر عدالت وقسط یا نفی ظلم وغیرہ کی صراحت نہ کرتے ہوئے بھی اسی حقیقت کی بہترین عبارت میں ذکر کرتی ہے، جیسا کہ فرمایا گیا: ''کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں جیسا قرار دے دیں یا صاحبانِ تقویٰ کو فاسق و فاجر لوگوں جیسا قرار دیں؟'' (ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار)

یہ استفہام انکاری ہے یعنی اس طرح کی چیز ممکن نہیں کیونکہ یہ کھلا ظلم ہے کہ مصلح ومفسد اور پرہیزگار و بدکار ایک ہی صف میں قرار دیئے جائیں۔ خدا عادل ہرگز اس طرح نہیں کرتا جو یہ بے خبر لوگ کہتے ہیں۔ اگر مسئلہ یہی ہو کہ جہان کا مالک خدا ہے، بندے اسی کے بندے ہیں، وہ جو کچھ بھی کرے عین عدالت ہوگا (اگر اس طرح ہو) تو پھر آیہ فوق کا کوئی مفہوم نہیں رہے گا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیت اس چیز کو انسان کے وجدان وضمیر کے سامنے پیش کر رہی ہے، چنانچہ استفہام انکاری کی صورت میں کہا جا رہا ہے کہ اے بیدار ضمیر والے! کیا ممکن ہے کہ خدا اس طرح کا کام انجام دے؟ اس میں ضمنی طور پر مسئلہ معاد کی طرف بھی اشارہ ہو جائے گا کیونکہ اگر معاد کا سلسلہ درمیان میں نہ ہو تو مصلح اور مفسد ایک ہی صف میں نظر آئیں۔ چونکہ یہ ممکن ہے کہ دنیا میں کسی کو عمل کی جزاء نہ ملے اور یہ

---

[1] نورالثقلین جلد ۴ ص ۵۵۵ حدیث ۱۷

عدل خدا کے مناسب نہیں، لہٰذا ضرورت ہے کہ روزِ قیامت ہوتا کہ اصولِ عدالت کا اجراء ہو سکے۔

نتیجہ

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ ظلم وستم خواہ کسی بھی قیافہ وچہرہ میں ہو، اس کی ہر شکل، ہر مقدار کم یا زیادہ، دنیا میں یا آخرت میں کسی بھی انسان کے لیے ہو، یہ بات خدا کے مقام مقدس سے دور ہے۔ نہ وہ ایسا کام کرتا ہے جس سے براہ راست کسی پر ظلم ہو اور نہ ایسا کام کہ جس کے واسطہ سے (خواہ سینکڑوں واسطے ہی سہی) کسی پر ظلم وستم ہو۔

یہ مفہوم مختلف تعبیرات اور عناوین متفرقہ کے ساتھ ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس مقام پر فلسفی، اعتقادی اور اسی طرح روایت وحدیث اور تاریخی نکتہ نظر سے بہت سے ابحاث ہیں کہ جنک اتذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

توضیحات

(۱) مسئلہ عدل کی تاریخ

مسئلہ عدل اتنا اہم ہے کہ قدیم زمانہ سے فلاسفہ اور عام افراد میں اس کے حامی اور مخالف چلے آرہے ہیں۔ عدل کے حامی اس خیال پر قائم تھے کہ یہ صفات کمال میں سے ہے، پھر خدا تو تمام کمالات کا منبع ہے، وہ ہرگز اس کمال سے خالی نہیں ہوگا۔

لیکن مخالفین عدل جب دنیا میں ناہمواریاں، آفات اور مصائب دیکھتے اور انہیں مسئلہ عدالت کے منافی پاتے تو مشکل میں پڑ جاتے (لہٰذا مخالف عدل ہو گئے)۔

لیکن یہ مسئلہ مسلمانوں میں ایک اور نکتہ نظر سے قابل بحث رہا ہے۔

ایک گروہ جس کا نام ''اشاعرہ'' ہے اس نے اس کی مخالفت کی لیکن اس لیے نہیں کہ یہ منکر عدالت ہیں۔ بلکہ ان کا نکتہ نظر یہ تھا کہ خدا چونکہ پورے جہان کا مالک ہے۔ اس کے ہاں ظلم کا تصور ہی نہیں۔ وہ جو بھی کام کرے (حتی کہ نیک لوگوں کو سزا اور برے لوگوں کو جزاء) عین عدالت ہوگا، (وہ بادشاہ جو کچھ بھی کرے بیٹھا ہے)۔

اس طرز فکر کی طرف میلان کے تین اسباب ہیں:

(۱) مسئلہ جبر واختیار میں ان کا پھنس جانا۔ چونکہ اشاعرہ جبر کے سخت ترین طرف دار ہیں اور ان کا اعتقاد ہے کہ بندوں کو اپنے افعال میں کوئی اختیار نہیں۔

(۲) قرآن مجید کی صریح آیات اور ضرورت دین اسلام کا تقاضا ہے کہ خدا نیک لوگوں کو بہشت اور کفار وغلط کار لوگوں کو دوزخ کی سزا دے۔ لہٰذا شاعرہ کا سامنا اس سوال سے ہوا کہ اگر انسان اپنے کاموں میں مجبور ہے تو اجباری اور غیر اختیاری کاموں میں جزا وسزا

کیوں؟ یہ امر تو عدالت خدا سے لگاؤ نہیں رکھتا۔ پس وہ مجبور ہو گئے اور عدل ہی کا انکار کر دیا۔

(۳) عدل الٰہی کے انکار ہی کو انہوں نے توحید الٰہی کا اعلیٰ درجہ سمجھ لیا اور یہ خیال کیا کہ اگر خدا کو عدل و ظلم سے ماوراء اور بلند سمجھیں تو گویا توحید کے مرحلہ عالی تک ہماری رسائی ہو جائے گی۔

ان کے مقابلہ میں ''معتزلہ'' ہیں۔ یہ عدل کو نظریاتی مسائل میں ایک اساسی اور بنیادی عقیدہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ خدا کے بارے میں ظلم اور عدل ہر دو کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خدا ہرگز ظلم نہیں کرتا اور عدالت و انصاف کو اس کی پوری حقیقت کے ساتھ اپناتا ہے۔

شیعہ جو پیروکارانِ مذہب اہل بیتؑ ہیں وہ عدل الٰہی کے حامی ہیں۔ لہٰذا ''شیعہ'' اور معتزلہ'' ہر دو کو مجموعاً ''عدلیہ'' کہا جاتا ہے۔

مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں نے عدل الٰہی کو اس قدر اہمیت دی کہ عدل اور امامت کو مذہب کے دو بنیادی رکن شمار کیا اور توحید و نبوت اور معاد کے ساتھ ساتھ انہیں بھی دین اسلام کا پایہ اصلی قرار دیا ہے۔

آئندہ بحثوں میں انشاء اللہ ہم یہ بتائیں گے کہ ممکن ہے عدالت خدا کا انکار اس کے علم و قدرت کے انکار پر منتہی ہو بلکہ خدا کی دیگر صفات پر بھی اس کا اثر پڑے گا اس لیے کہ عدل کو بھی خدا کی ایک صفت قرار دیا گیا ہے۔ جس کا تعلق اور ارتباط دوسری صفات خدا کے ساتھ ہے۔

شاید اسی وجہ سے ہم ایک روایت میں پڑھتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: ان اساس الدین التوحید و العدل۔ دین کی اساس توحید و عدل ہے۔ پھر عرض کیا: آپؑ سے اس سلسلے میں ایسی وضاحت چاہتا ہوں کہ جس کا یاد رکھنا بھی آسان ہو۔

امامؑ نے فرمایا:

''اما التوحید فان لا تجوز علی ربك ما جاز علیك و اما العدل فان لا تنسب الی خالقك ما لا مك علیه''

''توحید یہ ہے کہ جو کام تیرے لیے روا و جائز ہے اسے خدا کے حق میں جائز قرار نہ دے اور عدل یہ ہے کہ اس کام کی نسبت خدا کی طرف نہ دے جس کام پر اس نے تیری ملامت و مذمت کی ہے۔''[1]

یہ جواب بہترین و مضبوط، متفق اور توحید و عدل کی دلیلوں کا خلاصہ ہے کیونکہ ممکنات کی صفات خدا کو نہیں دی جا سکتیں۔ ان صفات میں نقص اور محدودیت ہے جب کہ وہ واجب الوجود ہر لحاظ سے کامل اور لامحدود ہے۔ نیز کس طرح ممکن ہے کہ جس کام سے خدا نے ہمیں منع کیا ہے ہم وہ کام اسی کی طرف منسوب کر دیں۔

بہر حال امامؑ کا جواب دراصل راوی کے کلام ''ان اساس الدین التوحید و العدل'' کی تائید کرتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے ایک مختصر اور پر معنی کلام میں ان دونوں کا اکٹھا ذکر کیا اور بڑے عمدہ پیرایہ میں توحید و عدل کی

---

[1] بحار الانوار جلد ۵ ص ۱۷۔ حدیث ۲۳ باب ۱

حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"التوحید ان لا تتوهمه، والعدل، ان لا تتهمه" توحید یہ ہے کہ اسے اپنے وہم میں جگہ نہ دے (کیونکہ جو وہم میں آئے گا محدود ومخلوق ہوگا جب کہ وہ اس سے بہت بالا ہے) اور عدل یہ ہے کہ تو اس پر تہمت نہ لگائے (یعنی تجھ سے جو غلط اعمال سرزد ہوئے ہیں ان کی نسبت اس کی طرف نہ دے)۔[1]

(۲) مسئلہ عدل پر عقلی دلائل

مفکرین اسلامی نے اس مسئلہ کو عقلیات کی شاخ یعنی حسن وقبح عقلی میں سے قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس مسئلہ کی تنقیح کریں اور اس کا نتیجہ آپ کے سامنے پیش کریں۔

''اشاعرہ'' ابوالحسن الشعری کے پیروکار ہیں جس کا نام علی ابن اسماعیل تھا۔ یہ صاحب تیسری صدی ہجری کے اواخر اور قرن چہارم کے اوائل کے متکلمین میں سے تھے۔

''اشاعرہ'' حسن وقبح عقلی کے منکر ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہماری عقل کسی چیز کی خوبی اور بدی کو سمجھنے پر قادر نہیں ہے۔ اچھائی اور برائی کی پہچان کا معیار صرف شریعت ہے، جس کو شریعت اچھائی کہے وہ نیکی اور جس کو برائی سمجھے وہ بدی کہلائے گی، چنانچہ وہ امور جن کو آج ہم حسن یا قبیح کہتے ہیں اگر شریعت مقدس اس کے خلاف حکم کرتی ہو تو ہم بھی وہی سمجھتے اور کہتے۔ حتی کہ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ کیا عدالت واحسان کی خوبی، ظلم وبخل کی بدی اور بے گناہ افراد کے قتل کی برائی کو آپ کی عقل درک کرتی ہے، وہ کہیں گے نہیں۔ اس میں صرف اور صرف رہبرانِ الٰہی یعنی انبیاء کی رہبری کی ضرورت ہے۔

اس گروہ کے مقابل ''معتزلہ'' اور ''شیعہ'' ہیں جن کا کہنا ہے کہ عقل حسن وقبیح کے ادراک میں مستقل ہے، مثلاً احسان کا حسن اور ظلم کا قبیح بدیہیات عقل میں سے ہے۔

البتہ ان کا اعتقاد یہ نہیں کہ عقل تمام برائیوں اور خوبیوں کے درک پر قادر ہے کیونکہ عقل کا ادراک محدود ہے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ان میں سے جو روشن اور واضح ہیں عقل ان کو درک کرتا ہے۔ انہیں مستقلات عقلیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

''فاضل قوشجی'' نے حسن وقبح کے تین معانی ذکر کیے ہیں:

(۱) کمال ونقص۔ یعنی ہم کہتے ہیں علم حسن ہے، جہالت قبیح ہے کیونکہ علم صاحب علم کو کمال بخشتا ہے اور جہالت سے نقصان ہوتا ہے۔ (علم کی وجہ سے کمال اور جہالت کی وجہ سے نقص پیدا ہوتا ہے)۔

(۲) حسن یعنی مقصد کے ساتھ مناسبت وہم آہنگی اور قبیح بمعنی عدم مناسبت وناہم آہنگی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار کلمہ ۴۷۰

یہی وہ چیز ہے جس کو کبھی مصلحت اور مفسدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں کام میں مصلحت ہے لہٰذا یہ حسن ہے یا فلاں امر میں مفسدہ ہے اس لیے وہ قبیح ہے کیونکہ حسن یا قبح کی وجہ سے ہم اپنے اصلی اہداف سے دور ہو جاتے ہیں خواہ وہ اہداف مادی ہوں یا معنوی ہوں۔

(۳) حسن وہ امور ہیں جن پر خدا کی طرف سے تعریف اور ثواب ہو، قبیح وہ کام ہیں جن پر خدا کی طرف سے سرزنش اور عقاب ہو۔ فاضل قوشجی مزید کہتے ہیں کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان محل نزاع تیسری قسم ہے۔[1]

لیکن حق یہ ہے کہ یہ تین معانی ایک دوسرے سے جدا نہیں کیونکہ ثواب و تعریف ایسے اعمال و افعال پر ہوگی جن میں مصلحت ہے اور طبعاً یہ چیز انسان کو مراحل کمال کے قریب کر دے گی جیسا کہ صفاتِ کمالیہ جیسے علم انسان کو اس کے اہداف کے قریب کر دیتا ہے۔

لہٰذا یہ تینوں معانی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر قوشجی نے ان کو ایک دوسرے سے جدا کیا ہے تو صرف اس لیے کہ حسن و قبح عقلی کے قائلین کو جواب دے سکے۔ مثلاً ان کا یہ استدلال کہ ہم عقل و وجدان کے حکم سے احسان کے حسن اور ظلم کے قبح کو درک کرتے ہیں۔ ان کو جواب دیا جائے کہ یہ پہلے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے صحیح ہے لیکن تیسرے معنی کی رو سے درست نہیں ہوگا۔ (اس میں شریعت کی ضرورت ہے)۔ غور کریں۔

بناء بریں تعریف حسن و قبیح میں کہا جا سکتا ہے کہ افعال حسن و افعال ہیں جو فرد یا جامعہ انسانی کو کمال مطلوب کے نزدیک کریں یا صفات کمالیہ کی اس میں پرورش کریں اور اس کو اہداف تکامل کے نزدیک کر دیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی چیزوں میں مصلحت ہوگی اور دربارِ خداوندی میں قابل مدح و ثواب ہوگا۔ ''افعال قبیح وہ ہیں جو اس طرح کے نہ ہوں۔''

جب ہم حسن و قبح کی تعریف اور اس کے عقلی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں مختلف نظریات سے واقف ہو گئے ہیں تو اب ہم دیکھتے ہیں کہ حق کس گروہ کے ساتھ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تبلیغات اور تعینات ذاتی سے خالی الذہن شخص اجمالی طور پر حسن و قبیح کو عقلی ہی سمجھتا ہے۔ پس یوں لگتا ہے کہ منکرین بعض دیگر مسائل کی وجہ سے مجبوراً انکار کر رہے ہیں۔ (جیسے مسئلہ جبر و اختیار میں گھر جانا کہ جس کی طرف پہلے اشارہ ہوا ہے)۔ اس موضوع کے اثبات کے لیے عمدہ دلیل دو امر ہیں:

(۱) جب ہم اپنے وجدان کی طرف مراجعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی پیغمبر نہ بھی آتا تو بھی ظلم و ستم بے گناہوں کی خون ریزی، مال کا چھین لینا اور غارت کرنا، گھروں اور ڈیروں کو آگ سے بھسم کرنا، بے گناہ لوگوں کی زندگی خراب کرنا، عہد و پیمان کا توڑنا، نیکی کے بدلے برائی، یہ سب چیزیں قبیح اور بری ہیں۔ اس کے برعکس نیکی، ایثار، فداکاری، سخاوت، کمزوروں کی مدد، مظلوم کی حمایت اچھی اور

---

[1] شرح تجرید قوشجی ص ۴۴۱۔ حسن و قبیح کا جو چوتھا معنی کیا گیا ہے وہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ وہ ہے حسن معنی موافق طبیعت۔ قبیح منافی طبیعت۔

قابل قدر بات ہے۔ہم ان کاموں کوصفات کمال اور جامعہ انسانی کے عظیم اہداف کا حاصل اور قابل تعریف تصور کرتے اور جزاء کے لائق سمجھتے ہیں جب کہ اول الذکر اعمال کوفرد وجامعہ کے نقصان اور ویرانی وتباہی کا موجب جانتے اور قابل سزا قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عقلاء جہان، حتی کہ جولوگ شریعت ودین کے قائل نہیں اور تمام ادیان کے منکر ہیں وہ بھی ان امور کے حسن وقبح کے معترف ہیں اور اپنے اجتماعی نظام (اگرچہ صرف ظاہری ہی کیوں نہ ہو) کی بنیاد انہی پر رکھتے ہیں۔اگر کہیں گوشہ وکنار سے اس کے مخالف آواز بلند ہوتو یقینا بعض اشتباہات یا نزاع لفظی کی وجہ سے ہوگی۔

کونسی عقل کہتی ہے کہ ہم اس جہان کے نیک وپارسا لوگوں کو دریا میں پھینک کرنابود کردیں اور جنایت کار اور فسادی لوگوں پر زندان کا دروازہ کھول کران سب کوآزاد کردیں اور انہیں مسند حکومت پر بٹھادیں؟

(۲) اگر ہم حسن وقبح عقلی کا انکار کردیں تو تمام شرائع اور ادیان کی بنیاد ہی متزلزل ہوجائے گی اور پھر کوئی دین ومذہب بھی قابل اثبات نہیں رہے گا کیونکہ ورود شریعت سے پہلے اگر کوئی حسن وقبح عقلی کا منکر ہے تو وہ یہ احتمال دے سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے تمام شرائع میں کیے گئے سب وعدے غلط اور جھوٹے ہیں۔یعنی اگر خدا نے فرمایا ہے کہ نیک لوگ بہشتی ہیں اور برے لوگ دوزخ میں جائیں گے تو اس کے برعکس بھی ہوسکے گا، گویا خدا نے (العیاذ باللہ) سب جھوٹ بولا ہے اور جھوٹ بولنا قبیح بھی تو نہیں ہے۔

نیز کونسا امر مانع ہوسکتا ہے کہ خدا جھوٹوں کے ہاتھ میں معجزات دے دے، پھر وہ لوگوں کو فریب اور دھوکا دیں اور انہیں راہ حق سے منحرف کردیں۔

ایسی صورت میں نہ معجزات پر اور نہ ہی وحی آسمانی کی صحت پر اعتماد رہے گا، مگر یہ کہ قبول کریں کہ یہ امور بحکم عقل قبیح ہیں اور خدا کبھی غلط اور قبیح کام نہیں کرتا۔اب اس وسیلہ سے شریعت کی بنیاد مستحکم، معجزہ نبوت پر دلیل اور وحی بیانِ واقعیت درحقیقت کی دلیل ہوگی۔

(۳) دو اہم یاددہانیاں

(۲) افعال انسانی تین قسم کے ہیں

(۱) ایسے افعال جن کا حسن وقبح ہر کسی کے لیے واضح وآشکار ہے انہیں مستقلات عقلیہ کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔حالات ومقامات کی تبدیلی سے ان میں تغیر پیدا نہیں ہوتا (جیسے احسان کا اچھا ہونا اور ظلم کا برا ہونا)۔

(۲) ایسے افعال جن کا حسن وقبح ہر کسی کے نزدیک واضح ہولیکن مختلف شرائط وحالات کے باعث ان میں تبدیلی ہوجاتی ہے جیسے ہم کہتے ہیں سچ بولنا بہت اچھا اور جھوٹ بولنا بہت برا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ بعض مقامات پر اہم اہداف کے تحفظ کی مصلحت سے دروغ بری بات نہیں۔(جیسے دو گروہوں کے درمیان مصالحت کی خاطر۔لیکن جھوٹ ایسا ہونا چاہیے کہ بظاہر جھوٹ نظر آئے اور واقع میں سچ ہو جس کو اصطلاح شریعت میں توریہ کہا جاتا ہے۔اس کے برعکس ایسی سچائی جو فساد، خونریزی اور اختلافات کا موجب ہو، وہ قبیح

اور بری ہے)۔

(۳) تیسری قسم میں ایسے افعال ہیں جن کا حسن وقبح طے شدہ نہیں بلکہ ان میں نظر اپنی اپنی والا معاملہ ہے۔بعض ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور بعض برا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اس سلسلہ میں بالکل ساکت وخاموش ہوں۔ایسے مقامات پر وحی کے دامن سے متوسل ہونے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔

ان تینوں اقسام کی طرف پوری توجہ سے مسئلہ حسن وقبح کے متعلق بہت سے اشتباہات جو بعض لوگوں کو ہوتے ہیں، پوری طرح روشن ہوجائیں گے۔(غور کریں)

(۲) بعض حضرات نے حسن وقبح کی تعریف اور اس کے موارد ومصادیق کی تشخیص میں عقلاء کے مابین توافق واتفاق کو لازمی قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے: حسن وہ چیز ہے جس کے فاعل کی مدح وثناء پر سب عقلا متفق ہوں اور قبیح وہ ہے جس کی مذمت پر عقلاء میں اتفاق ہو۔

لیکن اس میں ایک اشتباہ ہے اور وہ یہ کہ عقلاء کا اتفاق تب دیکھا جاتا ہے کہ جب ایک امر کا تعلق قوانین جعلی وقراردادی یا اصطلاح کے مطابق تشریعی سے ہو۔جیسے عقلاء عالم اصل مالکیت کو قبول کرتے ہیں (جب کہ اس کی حدوحدود اور مصادیق میں اختلاف ہے) لیکن وہ امور جو عینی وتکوینی پہلو رکھتے ہیں کہ جن میں جنبہ جعلیت وقراردادومعاہدہ نہیں وہاں ہر انسان کا اپنا درک وادراک ہی معیار ہوتا ہے۔

کیا ایک پھول کی خوبصورتی اور ایک شعر کے عمدہ ہونے کے معاملہ میں عقلاء جہان کے اتفاق کا انتظار کیا جاتا ہے؟

اسی طرح حسن وقبح، احسان وظلم میں اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم عقلاء کے توافق اور ان کی عمومی قضاوت وفیصلہ کے منتظر رہیں۔ اس مطلب کو ہم صراحت وجدان کے ساتھ درک کرتے ہیں، جیسے خوبصورتی وبدصورتی میں ہمارے اپنے ادراکات وتصورات ہوتے ہیں۔البتہ ممکن ہے کہ بعض موارد پر حسن وقبح کی تشخیص میں افراد کا عقیدہ ایک جیسا ہو اور بعض میں اختلاف نظر ہو۔لیکن یہ فقط مسئلہ حسن وقبح میں نہیں۔ بلکہ جہاں بھی عقل حاکم ہوتی ہے اسی طرح کی صورتِ حال پیدا ہوجاتی ہے۔

ممکن ہے ایک عقلی دلیل کو سب عقلاء قبول کرلیں اور دوسری دلیل میں اختلاف کرجائیں۔لیکن جس نے استدلال کو قبول کیا اور یقین پیدا کرلیا ہے اس کو دوسروں کی موافقت کا انتظار نہیں رہتا۔اگر کوئی اور اس کو نہیں مانتا تو قبول کرنے والا اسے خطا کار شمار کرتا ہے نہ یہ کہ اپنے عقیدہ کو چھوڑ دے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حسن وقبح عقلی ہے، عقلائی نہیں۔ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔پہلی کا استعمال امور عینی خارجی میں ہوتا ہے جب کہ دوسرے کی قلمرو قانونی قراردادوں میں ہوتی ہے۔

ہم اس بحث کو حسن وقبح کے متعلق ایک مختصر سے جملہ کے ساتھ تمام کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اس کے منکر دیگر عقلی مسائل کے منکرین کی طرح وہ لوگ ہیں جو کسی علمی مسئلہ میں پھنس جاتے ہیں اور جواب کی طاقت نہیں رکھتے، لہٰذا اصل ہی کا انکار کردیتے ہیں وگرنہ اپنے عمل میں تو اس قاعدہ کے حامی ہیں۔

اگر کوئی شخص بلاوجہ انہیں طمانچہ ماردے، معاشرہ میں ان کی توہین کردے، یا انکے سامنے ان کے بچے کو بے جرم وخطا قتل کردے، تو

کیا اس کی ملامت و مذمت میں انہیں کوئی شک وشبہ رہے گا، یا ایسے شخص کے مستحق سزا ہونے سے کوئی اشتباہ ہوگا، خواہ خدا کی طرف سے کوئی شریعت وقانون نازل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو؟

(۴) عدل الٰہی کے دلائل کی طرف رجوع

مسئلہ حسن وقبح کی بحث کے بعد ہم اصل مسئلہ یعنی عدل الٰہی کے دلائل کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہاں ہم آپ کی توجہ دو دلیلوں کی طرف منعطف کراتے ہیں کہ باقی سب دلیلوں کی بازگشت انہی کی طرف ہے۔

دلیل اول

اس کا سرچشمہ وہی حسن وقبح ہی ہے۔ ظلم قبیح ہے اور خداوند حکیم کبھی غلط اور قبیح کام سرانجام نہیں دیتا۔ ظالم کے لیے سرزنش وملامت ہے اور مسلم ہے کہ کوئی کامل ایسا کام نہیں کرتا جس پر اسے ملامت کا خطرہ ہو۔

اس کے برعکس ''عدالت'' کمال وجود وحکمت کی نشانی ہے اور وہ وجود جو ہر لحاظ سے کامل اور بے عیب ونقص ہے، وہ کبھی بھی ایسا چیز کو ترک نہیں کرے گا۔

یہ دلیل اس قدر واضح ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ کیا کوئی شخص یہ احتمال کرسکتا ہے کہ خداوند قدوس تمام انبیاء واولیا اور صالحین کو جہنم میں ڈالے گا اور تمام اشقیا واورناپاک لوگوں کو بہشت بریں عطا کردے گا۔ (اس قسم کا نظریہ) تو وہی رکھ سکتے ہیں جو (ذہنی) مریض اور ہر حقیقت کے منکر ہیں یا وہ جو بعض مسائل کی وجہ سے پریشان ہیں (جیسے مسئلہ جبر واختیار) اور اس مشکل کو حل کرنے پر قادر نہیں۔ لہٰذا وہ اس قسم کے مسائل ہی کا انکار کردیتے ہیں۔

دلیل دوم

اگر تحلیل وتجزیہ کیا جائے تو ظلم کا سرچشمہ چند چیزیں ہوسکتی ہیں:

(۱) ظلم کا سبب احتیاجات انسانی ہوتی ہیں۔ ظالم بجائے اس کے کہ صحیح راستہ سے اپنے مطلوب کو حاصل کرے وہ اپنی احتیاجات کو دوسرے کے حقوق غصب کرکے پورا کرتا ہے۔

(۲) ظلم کا سبب جہالت، نادانی اور بے خبری ہے۔ ظالم واقعاً جانتا ہی نہیں کہ کیا کر رہا ہے اور کون سا کام خلاف واقع انجام دے رہا ہے۔

(۳) ظلم کا سرچشمہ خود پسندی اور خواہشات نفسانی ہیں۔ ظالم چاہتا ہے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر اپنی خواہش وہوس پوری کرے اور اپنے غرور اور خود پسندی کی تسکین کرے۔

(۴) کبھی ظلم کا سبب کمزوری اور ضعف ہوتا ہے، جب ظالم اپنے مقصود کے حصول میں ناکام ہوتا ہے اور ضرورت کی چیز نہ ملنے پر قوت

صبر نہیں رکھتا تو ظلم کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔

(۵) کبھی ظلم کا سبب حس انتقام اور کینہ وری ہوتی ہے۔یعنی ایک شخص پر جو ظلم ہوا ہے وہ انتقام لے کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔

(۶) کبھی یہ ظلم حسد کی وجہ سے ہوتا ہے۔ایک حاسد جو خود کوئی چیز نہیں رکھتا وہ دوسرے کو نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے مقابلہ کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ ظلم وستم کے ساتھ اس سے یہ نعمت چھین لے۔

اس طرح کے عوامل اور اسباب ہیں جو ظالم میں ایک قسم کے نقص، محرومی اور ذہنی الخطاط کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ایسی حالت میں کسی طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ذات جو کمال مطلق ہے اس سے ظلم وستم کا صدور ہو جب کہ وہ نہ محتاج ہے، نہ وہاں جہل ونادانی کا گزر ہے، نہ وہاں کمزوری، خود پسندی اور غرور کا تصور ہے اور نہ وہاں کینہ وری وانتقام جیسی خرابیوں کا محل ہے۔نہ کوئی اس سے بلند ہے تاکہ وہ اس کے درجہ کے لیے حسد کرے اور نہ ہی کوئی اس کے کمال کو اس سے چھین لینے پر قادر ہے تاکہ انتقام کا شائبہ ہو۔کیا اس طرح کی ذات پاک سے عدالت، خیر خواہی اور رحمت ومہربانی کے علاوہ کوئی اور احتمال ہو سکتا ہے؟ اگر وہ برے لوگوں کو سزا دیتا ہے تو یہ ان کی بداعمالیوں ہی کا نتیجہ ہے نہ کہ وہ ان کو سزا دینے کی حاجت رکھتا ہے، نہ گناہ گاروں کے گناہ سے اس کی عظمت پر حرف آتا ہے۔خاص بات یہ ہے کہ قرآن مجید انسانوں کے وجدان عمومی سے کہہ رہا ہے کہ خود ہی اس معاملہ میں فیصلہ کریں، اشاعرہ کے برخلاف کہ جن کا خیال ہے کہ حسن وقبح میں فقط شریعت ہی کا حکم موثر ہے اور وجدان کا کوئی تعلق نہیں۔

فرماتا ہے:

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

''کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی طرح قرار دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، کس طرح کا فیصلہ کرتے ہیں۔''

(قلم ۳۵، ۳۶)

توجہ رہے کہ قرآن یہ بات پرہیزگاروں کی جزاء عظیم کے تذکرہ کے بعد فرما رہا ہے، اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید مسئلہ عدالت وظلم میں عقل کے فیصلہ کو کاملا اہمیت وحیثیت دے رہا ہے، وہ ظلم کو حکم عقل سے ناپسندیدہ اور عدالت کو پسندیدہ ظاہر کر رہا ہے۔

(۵) عدل اور روایات اسلامی

روایات اسلامی میں وہ مسائل جن کی بنیاد عدل پر ہے اور خود عدل الٰہی کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، بایں طور کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل الٰہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا اعتقاد سبھی رکھتے ہیں اور اس کو انسانوں کے وجدان کے فطری اور ضروری ایقانات میں شمار کیا گیا ہے۔

(۱) امیر المومنین علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"ارتفع عن ظلم عباده و قام بالقسط فی خلقه و عدل علیهم فی

حکمه۔"

''وہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے سے بالاتر ہے۔ وہ مخلوق کے بارے میں عدل سے کام لیتا ہے اور اپنے حکم میں انصاف برتتا ہے۔''[1]

(۲) دوسری جگہ فرمایا:

"واشهد انه عدل عدل و حكم فل"

''میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ ایسا عادل ہے کہ جس نے عدل ہی کی راہ اختیار کی ہے اور ایسا حاکم ہے جو (حق و باطل کو) الگ الگ کرتا ہے۔''[2]

(۳) نیز فرمان ہے:

"الذی عظم حلمه فعفی وعدل فی کل ما قضی۔"

''اس کے علم کا درجہ بلند ہے چنانچہ اس نے گناہگاروں سے درگزر کیا اور اس کا ہر فیصلہ عدل پر مبنی ہے۔''[3]

(۴) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک معروف حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"بالعدل قامت السموت والارض۔"

''تمام آسمان وزمین عدالت کے ساتھ قائم ہیں۔''[4]

(۵) علامہ مجلس علیہ الرحمہ بحارالانوار کی کتاب التوحید میں خدائی اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت امام جعفر صادقؑ کی حدیث نقل کرتے ہیں:

"هو نور ليس فيه ظلمه و صدق ليس فيه كذب، وعدل ليس فيه جور، وحق ليس فيه باطل۔"

''خدا ایسا نور ہے جس میں ہرگز ظلمت و تاریکی نہیں۔ وہ ایسا سچا ہے جس میں جھوٹ نہیں۔ وہ ایسا عادل ہے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۳ (اردو)

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۲۱۲ (اردو)

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۹ (اردو)

[4] تفسیر صافی ذیل آیہ ۹ الرحمن

جہاں ظلم نہیں اور ایسا حق کہ جہاں باطل کا گزر نہیں۔''[1]

(۶) صحیح ترمذی ہے:

''هو الله العدل اللطيف۔''

''وہ ایسا خدا ہے جو تمام کا تمام عدالت اور لطف ہی ہے۔''[2]

(۷) صحیح بخاری کی کتاب خمس میں ہے کہ پیغمبرؐ نے اس شخص کے جواب میں جس نے حضرتؐ کی عدالت پر اشکال کیا تھا، فرمایا:

''فمن يعدل اذا لم يعدل الله و رسوله۔''

''اگر خدا اور رسول عادل نہیں تو پھر کون عادل و منصف ہوگا۔''[3]

(۸) صحیفہ سجادیہ کی پینتالیسویں دعا میں حضرت امام علیؑ ابن الحسینؑ خدا کو اس طرح پکارتے تھے:

''وعفوك تفضل و عقوبتك عدل۔''

''تیرا عفو و درگزر تفضّل اور احسان ہے اور تیرا سزا دینا عین عدل ہے۔''

(۹) مدارک اہل تشیع و اہل سنت میں بہت سی روایات ہیں جن میں جبر کا بطلان اور خدا کی عقوبات کا تذکرہ ہے۔ (ان میں) بہت سی ایسی تعبیرات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ عدالت خداوندی ایک مطلب واقعی و قطعی کی صورت میں سب کے لیے مورد قبول ہے اور کئی دلیلوں کا اسی مسئلہ پر ہی تکیہ و اعتماد ہے۔ ان میں سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ اصحابِ امام جعفر صادق علیہ السلام میں سے کسی نے حضرتؑ سے سوال کیا: کیا خدا بندوں کو اعمال کرنے پر مجبور کرتا ہے؟ امامؑ نے جواب میں فرمایا:

''الله اعدل من ان يجبر عبدا على فعل ثم يعذبه عليه''

''خدا اس سے عادل تر ہے کہ بندے کو کسی کام پر مجبور کرے اور پھر اس کام کے انجام پر اسے سزا بھی دے۔''[4]

(۱۰) مسند احمد ابن حنبل میں حضرت پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

''من اذنب فى الدنيا ذنبا فعوقب عليه فا الله اعدل من ان يثنى عقوبته على عبده۔''

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ ص ۳۰۶۔ حدیث ۴۴ باب نمبر ۱۳

[2] المعجم المفہرس برائے الفاظ حدیث نبوی جلد ۴ ص ۱۵۵

[3] المعجم المفہرس برائے الفاظ حدیث نبوی جلد ۲ ۱۵

[4] بحار الانوار جلد ۵ ص ۵۱ حدیث ۸۳

''جس نے گناہ کیا دنیا میں اس کو اس کی سزا مل گئی تو آخرت میں عقاب نہیں ہوگا۔ خدا اس سے عادل تر (و بلند تر) ہے کہ بندہ کو دوبارہ سزا دے۔''[1]

(۱۱) حضرت امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب ایک صحابی نے کہا کہ خدا نے اپنے کام بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں۔ تب آپؑ نے ''امر بین الامرین'' (جبر و تفویض کی نفی) میں فرمایا:

''اللہ اعز من ذلك''

''خدا زیادہ طاقت ور ہے اس سے کہ وہ ایسا کرے (یعنی وہ تمام امور بندوں کے سپرد کر دے اور خود ایک طرف ہو جائے)''

اس نے پوچھا: کیا انہیں کاموں پر مجبور کیا گیا ہے؟ فرمایا:

''اللہ اعدل و احکم من ذلك''

''خدا عادل تر اور محکم تر ہے اس سے کہ وہ ایسا کرے۔'' یعنی یہ کام عدل و حاکمیت خدا کے مناسب نہیں۔''[2]

(۱۲) آخر میں ہم اس بحث کو ائمہ معصومینؑ کی اس دعا سے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ وہ دعا جو آخر نمازِ تہجد میں پڑھی جاتی ہے۔ اس میں ہے:

''وقد علمت یا الهی انه لیس فی تقمتك عجلة۔ ولا فی حکمك ظلم۔ و انما یعجل من یخاف الفوت و انما یحتاج الی الظلم الضعیف وقد تعالیت یا الهی عن ذلك علوا کبیرا۔''

''خدایا میں جانتا ہوں کہ تیری سزا میں جلدی نہیں۔ تیرے حکم و فیصلہ میں ظلم نہیں۔ جلدی وہ کرتا ہے جس کو خوف ہو کہ فرصت کا وقت چلا نہ جائے۔ ظلم و ستم وہ کرتا ہے جو کمزور و ضعیف ہو۔ اسے خدا تو سب سے برتر و اعلیٰ تر ہے۔''[3]

اس ضمن میں بہت زیادہ روایات و احادیث ہیں جن کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ تو ہم نے مختلف روایات میں سے نمونہ کے طور پر گل چینی کی ہے۔

---

[1] مسند احمد جلد اول ص ۹۹ (چاپ دار صادر بیروت)

[2] اصول کافی جلد ۱ ص ۱۵۷۔ باب جبر و قدر۔ حدیث ۳

[3] مصباح المتہجد۔ شیخ طوسی۔ ص ۱۷۳ (نماز شب کے بعد کی دعائیں)

(۶) منکرین عدل کے دلائل

جیسا کہ قبل ازیں بتایا گیا کہ منکرین عدل علمی مسائل میں بحث کے فشاء ودباؤ کی وجہ سے اس نظریہ کی طرف دھکیل دیئے گئے ہیں۔ ان کی عمدہ دلیلیں یہ ہیں:

(۱) مستقلات عقلیہ کا انکار: ان کا نظریہ ہے کہ عقل حکم شرعی کے بغیر خوب وبد کو تشخیص ہی نہیں دے سکتی۔ حسن وقبح، اچھائی برائی، یہ امر ضروری ہے یا نہیں، یہ سب کچھ شریعت ہی سے لیا گیا ہے جو وحی کے ذریعہ ہم تک پہنچتا ہے۔ بنابریں کوئی حکم حتی کہ عدالت کا حسن ہونا اور ظلم کا برا ہونا بھی عقل سے درک نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) پورا جہاں ملک خدا ہے: وہی حاکم، ولی اور تمام چیزوں پر صاحب اختیار ہے۔ وہ اپنے ملک میں ہر قسم کا تصرف کرسکتا ہے۔ ''وہ فعال مایشاء (ہر کام اپنی مشیت سے کرنے والا) ہے اور کوئی اس سے سوال تک نہیں کرسکتا۔ وہ جو کچھ بھی کرے عین عدالت ہوگا حتی کہ نیک لوگوں کو سزا اور برے لوگوں کو جزا بھی دے۔ شہرستانی ملل ونحل میں لکھتے ہیں: ابوالحسن اشعری کا عقیدہ تھا کہ کوئی چیز عقلی طور پر لازم نہیں۔ نہ صالح، نہ اصلح اور نہ ہی لطف وغیرہ۔ پھر وہ لکھتے ہیں: اصل تکلیف ہی خدا پر واجب نہیں کیونکہ اس سے نہ اسے نفع ہے اور نہ ہی ضرر کی دوری و دفعیہ۔ وہ بندوں کو ہر قسم کی جزاء وسزا دے سکتا ہے۔ وہ بلا وجہ کسی پر نعمتوں کی بارش کرسکتا ہے۔ اس کا لطف سراسر فضل ہے اور عقاب وعذاب عین عدل ہے۔ اس سے کسی چیز کا سوال نہیں ہوسکتا، بلکہ وہی دوسروں سے سوال کرسکتا ہے۔ (لایسئل عما یفعل وھم یسئلون)۔''[1]

(۳) یہ لوگ کہتے ہیں ہمیں کیا حق ہے کہ خدا کے افعال کے لیے معیار قرار دیں۔ بعبارت دیگر خدا کے عادل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ خدا قوانین عدل کی پیروی کرے گا بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ وہی سرچشمۂ عدل ہے۔ جو کچھ وہ کرے وہی عدالت ہے اور عدل فعل خدا کا معیار و میزان تشخیص نہیں، بلکہ فعل خدا خود ہی معیار ہے۔

اگر وہ تمام غلط کاروں اور برے لوگوں کو بہشت میں جگہ دے تو عین عدل ہے اگر وہ تمام نیک لوگوں اور پیغمبران ومعصومین کو دوزخ میں بھیج دے تو بھی یہ عین عدل ہے۔

(۴) اشاعرہ کا اعتقاد ہے کہ انسان اپنے اعمال میں کوئی اختیار نہیں رکھتا، وہ جو کام بھی انجام دے گا ارادۂ خدا سے ہوگا۔

جب ان سے یہ سوال ہوتا ہے کہ کس طرح عقل باور کرے گی کہ خدا ہمیں معصیت پر مجبور کرے اور پھر سزا بھی دے۔ یہ عدالت تو نہ ہوئی۔

اس سوال کے جواب میں وہ مسئلہ عدالت وظلم کے منکر ہو گئے اور ان کا کہنا ہے کہ جو وہ کرے گا وہی عین عدالت ہے اور کسی کو سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔

---

[1] ملل ونحل ص ۱۰۲

(۵) عدالت کی نفی کی طرف ان کی توجہ اور رغبت شاید اس لیے ہو کہ معاد اور کفار کے عذاب وسزا جیسے مسائل کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا: ایک انسان مثلاً پچاس سال گناہ کرے کافر ہو، مشرک ہو۔ کیا وجہ ہے کہ وہ جہنم وغضب الٰہی میں ابد تک پڑا رہے، یہ مسئلہ تو عدالت کے مناسب نہیں۔ چونکہ ان کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا لہٰذا وہ اصل عدالت ہی کے منکر ہو گئے۔

(۶) بعض لوگوں کے عدل سے انکار کا سبب یہ امور بنے کہ انہوں نے ظاہری روش وطور طریقے کو دیکھا کہ آفات بلائیں، طوفان، زلزلہ، قسم قسم کے حوادث اسی طرح بیماریاں، شکستگی، ناکامیاں انسانی زندگی میں مشاہدہ کیں لیکن ان امور اور انکے فلسفہ کو سمجھنے سے عاجز ہو گئے۔ لہٰذا عدالت خدا ہی کا انکار کر دیا۔

یہ وہ امور ہیں جو مجموعی طور پر گذشتہ وموجودہ زمانے میں منکرین عدل کے مذہب کی تشکیل کا سبب اور اس کی اساس بنے۔

تنقید وتحقیق

اب ہم ان اشکالات کی تحلیلی وتجزیہ اور ان کی حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہیں:

(۱) منکرین کی پہلی دلیل جس میں مستقلات عقلیہ یہ کا انکار کیا گیا ہے اس پر بہت بحث ہو چکی تو بھی لازم ہے کہ دوبارہ تاکید کر دی جائے کہ منکرین عملی طور پر حسن وقبح کے منکر نہیں اور صرف بحث وگفتگو کے مرحلہ میں ہی اس کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن بعنوان مثال اگر کوئی ان کے چھوٹے سے بے گناہ بچے کو تھپڑ مار دے یا بلاوجہ کسی کے گھر کو آگ لگا دے تو اس عمل کو وہ قبیح ہی سمجھیں گے اور انہیں اس کی برائی میں وجدانی طور پر کوئی تردید نہیں ہوگی۔ اس شخص کو وہ سزا کا مستحق ہی گردانتے ہیں اور ہرگز اس انتظار میں نہیں بیٹھتے کہ کوئی آیت یا روایت اس برائی کو برائی کہے اور پھر یہ اسے قبول کریں۔

اگر جنگ وبیابان میں کوئی بھوکا پیاسا ہو اور کوئی اس کو کھانا اور پانی دے دے یا بیمار کو کوئی چند کلومیٹر اٹھا کر ہسپتال میں لے جائے اور اسے حتمی موت سے نجات دلا دے تو وہ اس عمل کی خوبی اور اس پر تحسین وتشکر میں کوئی پس وپیش نہیں کریں گے اور کبھی یہ نہیں کہیں گے: دیکھیں اس کی مدح وتمجید میں کوئی آیت وروایت بھی ہے یا نہیں۔

عقلی مباحث میں بہت سی ایسی بحثیں ہیں کہ کچھ افراد چند مسائل کے دباؤ اور فشار کے باعث حقائق ہی کا انکار کر دیتے ہیں جب کہ عملی طور پر کاملاً کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کو اپنائے ہوئے ہیں۔ (جیسے سوفطائی ہیں کہ جنہوں نے عام چیزوں کے وجود خارجی ہی کا انکار کر دیا جب کہ عملی طور پر مسلماً آگ سے بچتے ہیں اور جب پیاس محسوس ہو تو پانی کی طرف جاتے ہیں)۔

علاوہ ازیں مستقلات عقلیہ کی قبولیت ہی قبول نبوت انبیاء کی اساس ہے۔ اس کے بغیر کسی پیغمبر کی بات قابل قبول نہیں ہوگی۔ ان کے معجزات ان کی سچائی کی دلیل نہیں بنیں گے کیونکہ مستقلات عقلیہ کے انکار کی صورت میں ان کی باتوں میں جھوٹ کا شبہ اور غلط دعویٰ کرنے والوں کے ہاتھ پر ظہور معجزات کا احتمال بعید نہیں ہوگا۔

(۲) تمام جہان ہستی اور تمام ذرات وجود کا مالک خدا ہے، یہ بات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے لیکن یہ مالکیت غیر حکیمانہ تصرفات کی

دلیل نہیں ہوگی۔ کیونکہ مالک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ حکیم بھی ہے اور یہ نہیں ہوسکتا کہ ان میں سے ایک بات کو ہم قبول کریں اور دوسری کا انکار کردیں۔ ممکن ہے شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے کوئی ہاتھ سے کام کرنے والا کئی سالوں تک اموال جمع کرتا رہے اور ان کا مالک بن جائے لیکن اس کو یہ حق نہیں کہ وہ تمام اموال کو آگ میں جلا دے اس لیے کہ عقل کے نزدیک یہ کام قبیح ہے حتی کہ ان اموال کے مالک کے ہاتھوں ہو تو پھر بھی قبیح ہے۔

خداوند حکیم کبھی اس طرح کا کام نہیں کرسکتا کہ پھر وہ پورے جہان کو بغیر کسی وجہ کے آگ میں بھسم کردے اور تباہ کرکے رکھ دے یا جیسے اشاعرہ کہتے ہیں کہ تمام انبیاء واولیاء اور پاک لوگوں کو جہنم کی گہرائیوں میں ڈال دے اور اشقیاء اور ناپاک لوگوں کو جنت میں جگہ دے دے۔ یہ کام خلاف حکمت اور قبیح ہے، اگرچہ اس جہان کے مالک کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا مالک ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جو بھی کام کرے وہ صحیح ہو خواہ وہ مالک حقیقی وتکوینی ہو جیسے خدا یا صوری اور ظاہری مالک ہو (جیسے بشر وانسان مالک ہے)۔

اشاعرہ کا خیال ہے کہ جب ہم خدا کو مالک اور یہ کہ ''جو وہ چاہے کرسکتا ہے'' مان لیں، جو کام بھی وہ کرے اس کے لیے جائز سمجھیں تو درحقیقت یہ اس کی کمال قدرت وحاکمیت کا اعتراف ہے۔

لیکن یہ لوگ یہ نہیں سمجھ رہے کہ اس غلط بات سے وہ مسئلہ حکمت خدا پر قلم بطلان پھیر دیتے ہیں۔

مسلم ہے کہ اگر خدا حکیم نہ ہو تو پھر اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے وعدوں پر بھروسہ رہے گا کیونکہ ممکن ہے اس کی باتیں خلاف واقع اور مفہوم سے خالی ہوں۔

"تعالی الله عما یقول الظالمون علوا کبیرا"

''خدا ان غلط نسبتوں سے منزہ وبرتر ہے جو وہ ظالم اس کی طرف دے رہے ہیں۔''

(۳) یہ لوگ کہتے ہیں کہ خداوند عالم حسن وقبح سے مافوق ہے۔ اس کے افعال کسی ضابطہ وقانون کے ماتحت نہیں لائے جاسکتے۔ بلکہ تعین ضوابط کا محور وہ خود ہے۔ یہ کلام مغالطہ کے سوا نہیں۔ ایک غلط بات کو خوبصورت لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات خلقت کے قوانین کے متعلق تھی، تشریعی قوانین میں اس سے کام لینا صحیح نہیں۔

اس کی وضاحت

خداوند عالم کی طرف سے خلقت وآفرینش سے پہلے قانون موجود نہیں تھے۔ جب اشیاء کو خلق کیا گیا تو ایک قاعدہ وحساب کے مطابق ان کی خلقت ہوئی اور مسئلہ قانون سامنے آیا۔ مثلاً کرات کی خلقت سے پہلے جاذبہ کا قانون نہیں تھا کہ خدا اس قانون کے مطابق کام کرتا بلکہ قانون جاذبہ خدا کی طرف سے کرات کی خلقت کے ساتھ وجود میں آیا۔

بعبارت دیگر قانون جاذبہ کرات کی خلقت کی تبعیت میں وجود میں آیا۔ یہ بات جہان خلقت وتکوین کے تمام قوانین پر صادق ہے۔

لیکن قوانین تشریعی کے موارد میں مسئلہ کسی اور طرح کا ہے کیونکہ جب خدا نے حضرت انسان کو، جو خلقت اتم واکمل کا نمونہ ہے راہِ

کمال پر چلنے کے لیے پیدا کیا تو حصول کمال کے تمام وسائل اس کے وجود میں رکھ دیئے۔

مسلم ہے کہ اب قوانین شریعت اس سے یہ ہم آہنگ ہونے چاہئیں۔یعنی وہ قانون ہوں جو انسان کو کمال کی طرف لے جائیں۔اگر قانون تشریعی اس کی ضد ومخالف ہوں گے تو یہ خدا کی حکمت کے مناسب نہیں ہوں گے۔کیا ممکن ہے کہ ذات حکیم ایسے کام انجام دے جو اس کی حکمت کے منافی ہوں؟

ظلم، جہان ہستی کے بگاڑ، سقوط اور پستی کی بنیاد ہے اور عدالت اس کے تکامل وترقی کی اساس ہے، خدا ہرگز ظلم کا مرتکب نہیں ہوتا اور تکامل انسانی کی بنیاد کو تباہ نہیں کرتا۔

واضح تر الفاظ میں خلقت وآفرینش میں خدا کے افعال انسانی زندگی کے لیے قانون گزاری کی اصل واساس ہیں اور حسن وقبح درحقیقت انہی سے پیدا ہوتا ہے، نہ یہ کہ خدا کسی اور قانون کے سامنے مغلوب ہوگیا ہے، بلکہ جو کچھ ہے وہ اسی کا قانون ہے۔

البتہ دین وشریعت میں اس کے قوانین جہانِ ہستی کے قوانین سے مربوط ہیں، وگرنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے خود اپنا قانون ہی توڑ دیا ہے اور حکیم ہرگز ایسا نہیں کرتا۔

بعض کا یہ کہنا کہ خدا عقل کے سامنے مغلوب نہیں اور عقل اس کے لیے وظیفہ معین نہیں کرسکتی۔یہ ایک بچگانہ مغالطہ ہے کیونکہ عقل کا کام درک کرنا ہے، تعین وظیفہ نہیں۔یعنی عقل کا کام فکر کرنا اور سمجھنا ہے، قانون گزاری اور تشریع اس کا کام نہیں ہے۔

عقل کہتی ہے میں نے یہ نکتہ سمجھ لیا ہے کہ حکیم ضد ونقیض قسم کے کام سرانجام نہیں دیتا۔میں سمجھتی ہوں کہ خدا نقض غرض نہیں کرتا۔میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ ایک ذات کامل کبھی ظلم کی مرتکب نہیں ہوئی۔یعنی ذات کامل کسی چیز کو غیر محل نہیں رکھتی (کہ یہ منافی حکمت ہے)۔

یہ سب عقل کے ادراکات ہیں نہ کہ یہ تعین وظیفہ برائے خدا ہے۔بنابریں جیسے عقل درک کرتی ہے کہ دو کے ساتھ دو ملا دیا جائے تو چار ہوجائے گا، اسی طرح عقل یہ بھی درک کرتی ہے کہ حکمت اور نقض غرض ہر دو میں منافات ہے۔خداوند حکیم جس نے جہان کو صلاح اور کمال کے لیے پیدا کیا ہے، وہ کبھی اسے فساد وتباہی کی طرف نہیں لے جائے گا۔عقل نے یہ قانون نہیں بنایا کہ دو کو دو کے ساتھ ملانے سے چار بنتا ہے، عقل تو صرف درک کرتی ہے۔حسن وقبح کے مسائل جن کی اساس مسائل تکوینی پر ہے، ان میں بھی مسئلہ اسی طرح ہے اور عقل کا کام حسن وقبح کا ادراک ہے نہ کہ قانون کا وضع کرنا۔(غور کریں)

ذہن میں رہے کہ عقل کا کام ہست ونیست کا ادراک، لازم وغیر لازم کا تصور کرنا ہے۔آج کی اصطلاح میں اس کو ارشادی کہہ سکتے ہیں جیسے حکیم کی ہدایات ہیں کہ جب وہ سمجھتا ہے کہ فلاں غذا مریض کے لیے مناسب نہیں تو کہتا ہے مریض کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔یہ (چاہیے) قانون نہیں کہ اس کا خلاف ورزی جرم ہو بلکہ یہ ایک راہنمائی اور ارشاد ہے۔اگر کوئی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس غذا سے فقط بیمار کا نقصان ہوگا۔(لیکن یہ واضح رہے کہ عقلی کے اوامر ارشادی کا تعلق ذات خدا کے ساتھ نہیں ہے)۔

خلاصہ کلام یہ کہ افعال خدا میں عقل کا کام واقعیت کا فہم وادراک ہے خدا کے لیے تعیین تکلیف ووظیفہ نہیں، لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا اس سے برتر واعلیٰ ہے کہ ہماری عقل اس کے لیے وظیفہ معین کرے۔

(۴) مسئلہ جبر کے ساتھ تعلق بھی انکار عدالت وظلم کا موجب نہیں بننا چاہیے، یہ صحیح ہے کہ بعض غلطیاں دوسری غلطیوں کا سبب بنتی ہیں، اشتباہات دوسرے اشتباہات کے لیے سرچشمہ بنتے ہیں لیکن اشتباہات اور غلطیوں پر اصرار نہیں کرنا چاہیے اور وہ بھی اس حد تک کہ بنیادی مسائل کو پاؤں تلے روندا جائے۔

بلاشک عدل الٰہی یا ''حسن عدالت'' اور ظلم کا قبیح ہونا انسان کے اختیار اور ارادہ کی آزادی سے زیادہ واضح اور آشکار ہے۔ اگر جبر کا مسئلہ حل نہ ہو سکے تو عدل خدا کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔ قائلین جبر کو ہمیشہ اس اشکال کا سامنا رہا ہے کہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ خدا بندوں کو گناہ پر مجبور کرے اور پھر انہیں اس گناہ پر سزا بھی دے۔ یہ چیز عدالت خدا کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

یہ ایک واضح اور منطقی دلیل ہے کہ ''جبریہ'' بجائے اس کے کہ مسئلہ جبر کے بارے میں تجدید نظر کریں، عدل الٰہی ہی کا انکار کر دیتے ہیں، یا کہتے ہیں جو کچھ وہ کرے عدل ہے حتی کہ مجبور افراد کو سزا دینا بھی عدل ہے۔

ان لوگوں نے اپنے ذہن میں خدا کا ایک عجیب وحشت ناک نقشہ بنا رکھا ہے، یعنی ایسا خدا کہ ممکن ہے عام انبیاء مرسلین، ملائکہ مقربین، شہداء اور صدیقین کو جہنم میں ڈال دے اور تمام اشقیاء، ظالمین تاریخ بشر کے گناہ گار اور شیاطین کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے دے۔ ایسا خدا کہ جو بعض لوگوں کو گناہ پر مجبور کرے اور بعض کو اطاعت پر مجبور کرے، پھر گناہ گار کو سزا اور نیک انسان کو جزا دے جب کہ ان دونوں حقیقتوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

مسلم ہے کہ خدا کا یہ غلط و وحشت ناک نقشہ انسانوں کو خدا سے دور کر دے گا۔ اس سے معرفت خدا کا دروازہ بند ہو جائے گا حتی کہ معاشرہ انسانی میں خدا کو بے عدالت قرار دیا جائے گا۔ پھر یہی خیال کیا جائے گا کہ مذہب موجب فساد اور بے سروسامانی کا ایک عامل ہے۔ نیز تمام جہان ہستی کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوگی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جبر پر اصرار عدل الٰہی کے انکار کا سبب نہیں بننا چاہیے بلکہ اس کے برعکس یعنی عدل خداوندی کے وضوح اور روشن ہونے سے جبریہ کے اعتقاد جبر میں تجدید نظر کا داعیہ پیدا ہونا چاہیے۔

کس قدر واضح اور بدیہی مسائل ہیں کہ انسان جن کا انکار کر دیتا ہے اور صرف اس لیے کہ وہ بعض نظری مسائل میں پھنس گیا ہے۔

(۵) معاد و قیامت کے بعض مشکل مسائل بھی عدل الٰہی کے انکار کا موجب بن جاتے ہیں۔ جب یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ غلط کار و گناہ گار ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے تو فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی عمر کس قدر ہوگی، ۵۰ سال، ۷۰ سال یا ۱۰۰ سال عدالت کا تقاضا ہے کہ جرم و سزا برابر ہونی چاہیے۔ لہٰذا کس طرح صحیح ہوگا کہ تھوڑی سی عمر اور عذاب دائمی و جاوید ان۔

لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، ایسے مسائل کو سمجھنے میں مشکل پیدا ہو تو اس کا کوئی منطقی حل ڈھونڈنا ضروری ہے۔ نہ کہ واضح اور بدیہی مسائل کا انکار کر دیا جائے۔ جب سزا کی ہمیشگی کے مسئلہ کا ایک حل موجود ہے (تو اسی کو اپنایا جائے)۔ دراصل اشکال اس لیے پیدا ہوا کہ سزائے الٰہی جو انسان کے اپنے اعمال کا اثر ہے۔ اس کو سزائے قراردادی پر قیاس کیا گیا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے جیسا کہ آیات و ہدایات اور عقلی شواہد سے یہ چیز سامنے آتی ہے کہ قیامت کے دن کی سزا۔ اس دنیا میں اعمال

انسانی کے طبعی آثار کے مشابہ ہے۔مثلاً کوئی زیادہ شراب خواری کرے گا تو معدہ میں زخم،دل کی کمزوری اور اعصاب میں درد کا مریض ہوجائے گا۔بعض حالات میں یہ بیماریاں ساری عمر رہتی ہیں اور اسے عذاب وتکلیف میں مبتلا کیے رکھتی ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ کیا یہ انصاف ہے کہ ایک ماہ کی شراب نوشی ۶۰ سال کی بیماری کا سبب بن جائے اور زخم معدہ،اعصاب وقلب کی ناراحتی لاحق ہوجائے۔

جواب میں کہا جائے گا کہ یہ اس کا اپنا کیا دھرا ہے۔یہ اس کے لیے کوئی معین اور قراردادی سزا نہیں ہے،بالخصوص جب کہ اس کو پہلے خبردار بھی کردیا گیا تھا اور ان خطرناک نتائج سے آگاہ بھی کیا گیا تھا۔

عذاب دوزخ میں ہمیشگی کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے،انسان کے اس دنیا میں بجالائے ہوئے اعمال فنا نہیں ہوتے۔وہ باقی رہتے ہیں اور اس کی روح میں بھی ان کے آثار وملکاۃ جاگزیں ہوتے ہیں۔پھر یہ ملکات اور آثار تمام جہانوں میں انسان کے ہمراہ ہیں اور یہی اعمال قیامت کے دن مجسم ہوں گے،یہ اس کے ساتھ ہوں گے اور یہ ہی اس کے لیے شکنجہ وعذاب بنیں گے۔بحث معاد وقیامت میں اس کی مزید شرح آئے گی۔انشاءاللہ العزیز!

(۷)زندگی بشر میں دردناک حوادث کا مشکل مسئلہ

آفات،بلائیں،طوفان،تکلیف ورنج،ناکامیاں اور شکستیں،یہ تمام چیزیں عدالت خدا کے کس طرح مناسب ہوں گی،اس کے لیے وضاحت کی ضرورت ہے جو آپ سطور ذیل میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ان امور میں سے ہر امر کا ایک فلسفہ یا کئی فلسفے ہیں جو تھوڑے سے غور وفکر کے ساتھ واضح ہوجائیں گے۔اس وقت انسان تصدیق کرے گا کہ یہ سب امور عدل الٰہی کے راستے پر ہیں اور اس کے مخالف نہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ زندگی انسان میں کئی ایسے مسائل ہیں کہ پہلی دفعہ ان کی حقیقت سامنے نہیں آتی کہ بعض لوگ اچھی طرح مطالعہ اور فکر نہیں کرتے،لہٰذا وہ اس قسم کے مسائل سے گھبرا کر مسئلہ عدل خداوندی یا کبھی اس کے وجود ہی کے بارے میں متزلزل ہوجاتے ہیں۔

مختلف قرائن سے نشان دہی ہوتی ہے کہ یہ طرزِ تفکر قدیم زمانہ ہی سے کچھ فلاسفہ کے درمیان موجود تھا بلکہ اوباء بھی اس مسئلہ میں مبتلا تھے۔بعض نے اس مسئلہ کے بارے میں عربی وفارسی میں شعر بھی کہے ہیں اور اپنے شک یا انکار کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔

ناگوار حوادث کو چند گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

(۱) انسانوں میں تفاوت وتبعیض۔بعض انسان زیرک وفطین اور ان میں بڑی استعداد ہوتی ہے۔بعض کی صلاحیت متوسط اور بعض درمیانے سے بھی کم ہوتے ہیں۔جسمانی قوے کے لحاظ سے بھی فرق ہوتا ہے۔ظاہری طور پر بعض افراد خوبصورت ہوتے ہیں اور بعض بدصورت،نیز مال وثروت اور دولت کے لحاظ سے بھی ان میں فرق ہوتا ہے۔

(۲) نقص وکبود۔ بہت سے انسان ماں کے بطن سے صحیح وسالم متولد ہوتے ہیں جب کہ بعض کے اعضاء ناقص ہوتے ہیں اور یہ نقص ساری زندگی ان کے لیے موجب تکلیف ہوتا ہے۔

(۳) ناکامیاں اور شکست: انسان کی ساری زندگی میں سخت مشکلات، بیماریاں، ناکامیاں اور شکست شامل ہوتی ہیں۔ عدل الٰہی کس طرح اجازت دیتا ہے کہ انسان ان تکالیف میں مبتلا رہے اور زندگی کا شہد اس کے منہ میں تلخ ہو جائے۔

(۴) ناگوار حوادث وتکالیف: انسان کے طول زندگی میں تلخ طبیعی حوادث، بلائیں اور آفات پیش آتی ہیں کہ ایک گروہ کی زندگی کو بھسم کر دیتی ہیں ویرانیاں، کشت وخون، زلزلے، طوفان، خشک سالی اور قحط تو ہم سنتے ہی رہتے ہیں۔

جب یہ حوادث پیش آتے ہیں تو عموماً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا نہیں کہ تمام عوامل واسباب طبعی دست قدرت میں ہیں۔ آب، ہوا، خاک، آتش سب اسی کے فرمان کے تابع ہیں۔ دریاؤں کی طغیانی ان کی اپنی تو نہیں۔ جو فرمان ملتا ہے اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ کیا اس طرح امور خدائی عدالت وحکمت کے مناسب حال ہیں؟

ناگوار حوادث کے مسئلہ کا جواب

ہم اعتراف کرتے ہیں کہ خدا پرست اور باایمان شخص ان سوالات کا سامنا کرتا ہے تو تنگ دلی محسوس کرتا ہے، حتی کہ بعض ان مصائب سے سالم نہیں رہتے اور کفر وانکار کی گھاٹی میں جا پڑتے ہیں۔

لیکن یہ ایک عمدہ نکتہ ہے کہ جتنا ہم اس مسئلہ میں زیادہ فکر کریں اور سوچیں، اتنے ہی روشن افق ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اس کو مثل ان مسافروں کے سمجھیں جو ریل گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ ریل گاڑی سرنگ میں داخل ہوتی ہے تو پریشانی ہو جاتی ہے۔ پھر حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب آگے چلتے ہیں تو تھوڑی سی روشنی نظر آتی ہے، پھر روشنی اور زیادہ ہو جاتی ہے حتی کہ گاڑی اس تنگ سرنگ سے نکل کر وسیع فضا میں آ جاتی ہے جہاں ہوا اور فضا آزاد، روشن اور نورانی ہوتی ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ سرنگ میں ٹھہر نہ جائے اور اپنا سفر جاری رکھے۔

بہرحال ان تکلیف دہ سوالات کے دو عمدہ جوابات ہیں کہ ایک گروہ نے ایک جواب پسند کیا، دوسرے نے دوسرے جواب کو پسند کیا اور بعض دونوں کو پسند کرتے ہیں۔

اس مقام پر اہم نکتہ یہ ہے کہ جوابات کو تازہ وضاحتوں کے ساتھ مزین کیا جائے اور تفسیری بحث کی مناسبت کو مدنظر رکھتے ہوئے آیات قرآن مجید سے مدد حاصل کی جائے۔

مختصر اور اجمالی جواب

مندرجہ ذیل نکات پر توجہ دینے سے ان مشکل سوالات کا مختصر اور اجمالی جواب مل جائے گا:

الف: اس میں کوئی شک نہیں کہ مجہولات کے مقابلے میں ہماری معلومات کی مقدار بہت کم ہے۔ جہانِ ہستی کی خلقت کے سلسلہ میں ہماری معلومات سمندر کے مقابلے میں ایک قطرے کے برابر ہیں یا پہاڑ کے مقابل رائی کے دانے کی طرح ہیں۔

تمام مفکرین خواہ مادی ہوں یا الٰہی وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ لہٰذا اس جہان کے حوادث کے معاملے میں جو فیصلے بھی ہم کرتے ہیں وہ ہماری معلومات کے مطابق ہی ہوں گے، کسی طرح بھی مطلق نہیں ہو سکتے۔ پس اگر ہم کسی طوفان یا زلزلہ کے اسرار معلوم نہ کر سکتے ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے وجود ہی کا انکار کر دیں۔ ان طوانوں اور زلزلوں سے جو تباہی ہوتی ہے کیا اس کے مقابلے میں ان کے مثبت آثار کو ہم جانتے ہیں؟ (یعنی اگر ہمیں ان کا علم نہیں تو اور بھی بہت سی مثبت چیزیں ہیں جن کا علم ہم نہیں رکھتے)۔

پہلے زمانے میں ہم بہت سے مسائل کو اسباب آفات کے زمرہ میں شمار کرتے تھے۔ لیکن آج کی علمی پیشرفت اور تازہ ترین اسرار کے معلوم ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوا کہ یہ طوفان وغیرہ تو مفید اور نافع ہیں جیسا کہ پہلے عمومی خیال تھا کہ چھوٹے بچوں کا گریہ سوائے ان کی اپنی زحمت اور ماں باپ کو تکلیف دینے کے اور کچھ نہیں۔ لیکن آج معلوم ہو چکا ہے کہ اگر بچہ گریہ وزاری نہ کرتا تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا کیونکہ رونا اس کی بہترین ورزش ہے۔ بچے کا رونا اس کے تنفس کے سلسلہ میں مفید ہے۔ جریان خون اچھے انداز سے ہوتا ہے۔ اس سے بدن کی بافتوں کو غذا ملتی ہے۔ نیز ہاتھ پاؤں، سینہ اور پیٹ کے عضلات قوی ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچے کے دماغ کی وہ رطوبات جو عفونت کا سبب بن سکتی ہیں وہ رونے سے خارج ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے نمونے بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں جہانِ ہستی میں جس دقیق و عجیب نظام کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں اس کا معرفت خدا کی بحث میں وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوگا کہ ایک عقل کل اور غیر محدود ذات ہے جو اس نظام کو چلا رہی ہے۔

صفاتِ خدا کی بحث کی روشنی میں ہمیں بخوبی معلوم ہو چکا کہ وہ کسی کا بھی محتاج نہیں۔ وہ ہر چیز کا عالم اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ ظلم، جس کا سبب جہالت اور عاجزی ہے اس ذات مقدس کے بارے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کون سی دلیل ہے کہ ایسی ذات اپنے بے چارے بندوں پر ظلم کرے۔ پس اس جہان میں ہمیں یہ جو ستم، بے انصافی یا تفریق نظر آتی ہے وہ ہمارے علم کی محدودیت کا نتیجہ ہے۔

اس سے واضح تر الفاظ میں کہا جائے کہ جس طرح کتاب تدوینی (قرآن مجید) میں ''محکمات'' اور ''متشابہات'' ہیں کہ اکثر آیات کے مفاہیم واضح ہیں لیکن ان میں بعض آیات مجمل نظر آتی ہیں اور فقط انہی کو دیکھا جائے تو یہ ابہام سے خالی نہیں۔ قرآن مجید نے ان کے حل کا ایک منطقی راستہ تجویز کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''محکمات'' کی روشنی میں ''متشابہات'' کے معانی کی جستجو اور تلاش کریں، یعنی ان کو ایک دوسری کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو ابہام دور ہو جائے گا۔

اسی طرح کتاب تکوینی (جہانِ خلقت) میں بھی ''محکمات'' بہت زیادہ ہیں، وہ بہترین اور نفع بخش نظام ہیں جو ان پر حاکم ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض ''متشابہات'' جیسے زلزلہ، طوفان وغیرہ ہیں جو کبھی کبھی نظر آتے ہیں یا عام انسانوں میں بعض ناقص الخلقت بھی دیکھے جاتے ہیں۔ عقل کہتی ہے کہ جب آپ کے سامنے تکوینی طور پر بہت زیادہ اچھی چیزیں ہیں تو اس قسم کے نواقص کا بھی کوئی حساب کتاب ہوگا، اگرچہ ہم اپنے محدود علم کی وجہ سے ابھی ان کی حقیقت کو نہیں پا سکے۔

مثلاً اگر ہزار صفحہ کی ایک کتاب ہمارے سامنے ہو، جس میں عمدہ مطالب، پر مغز ابحاث اور حقائق روشن ہوں لیکن بعض اجمالات کی تفسیر میں ابہام ہو تو کیا ان چند مجملات کی وجہ سے ہم صاحب کتاب کے علم وفہم کا انکار کر دیں گے یا اس کے برعکس، عالمانہ مطالب کو سامنے رکھتے ہوئے یہ خیال کریں گے کہ ہوسکتا ہے ہم ان مطالب کو اپنے محدود علم کی وجہ سے نہ سمجھ سکے ہوں؟

اگر ہم ایک بہترین محل وقصر دیکھیں کہ جس میں فن معماری کا عروج معلوم ہو رہا ہے، لیکن ایک چھوٹی سی چیز کا فلسفہ ہمیں معلوم نہ ہو سکے، تو کیا ہم معمار کو غلط کہیں گے یا اپنے آپ کو؟

جب کہ دوسرے قرائن سے واضح ہو جائے کہ معمار کے فن میں کوئی کوتاہی وکمی نہیں تھی اور اس کے سونیت کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر ہم فقط ان حوادث (طوفان وزلزلہ ونواقص) کو سامنے نہ رکھیں بلکہ پورے نظام عالم کی طرف نظر کریں اور تمام عالم کے متعلق مجموعی فیصلہ کرنا چاہیں تو اس نتیجہ تک پہنچیں گے کہ ان امور میں بھی کچھ اسرار ہیں اگرچہ ہم ان سے بے خبر ہیں۔ ممکن ہے علمی پیش رفت اور زمانہ گزرنے سے کچھ اسرار ظاہر ہو جائیں، جیسے بہت سے امور ظاہر ہوئے ہیں، جب کہ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ اسرار ہمیشہ کے لیے اسرار ہی رہیں۔ لیکن بہرحال یہ علم ضروری ہو جائے گا کہ ان میں کوئی نقص نہیں اور خود ہم ہی ان امور سے ناواقف ہیں۔

قرآن اور آفات کا اجمالی جواب

قرآن مجید جو تمام فکری مسائل میں ہمیں راستہ دکھاتا اور مقصد تک رسائی کا ذریعہ بنتا ہے اس میں ان امور سے متعلق بہت اشارات ملتے ہیں:

(۱) ایک جگہ ارشاد ہے:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

''اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔'' (بنی اسرائیل ۸۵)

ایسا نہ ہو کہ تم اس محدود علم کے باوجود ہر چیز میں فیصلہ کرنا شروع کر دو اور تمہیں ''میں نہیں جانتا'' اور ''نہیں ہے'' میں اشتباہ ہو جائے۔ یعنی تم اسرار حوادث کے عدم علم کو ان کے عدم وجود کے عنوان سے لینے لگو۔

(۲) سورۂ نساء میں عورت، مرد کے باہمی اختلاف کا تذکرہ کرتے ہوئے حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا رویہ رکھو۔ پھر فرمان ہے:

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

''اگر تم انہیں ناپسند بھی کرتے ہو تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اسی میں خیر کثیر قرار دے دے۔''

(نساء ۱۹)

اسی مضمون کی ایک اور تعبیر جہاد کے سلسلہ میں سورۂ بقرہ میں ہے۔فرمان ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶

''تمہارے اوپر جہاد فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہارے لیے ناگوار ہے اور یہ ممکن ہے کہ جسے تم برا سمجھتے ہو وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور جس چیز کو تم دوست رکھتے ہو وہ تمہارے لیے بری ہو۔خدا سب کچھ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''(بقرہ ۲۱۶)

اگرچہ پہلی آیت شوہر، بیوی اور دوسری آیت دشمن کے ساتھ مسلح جہاد کے سلسلہ میں ہے لیکن دونوں آیتوں کے ذیل میں جو مضمون آیا ہے وہ قاعدۂ کلیہ کے طور پر ہے۔(فرمان ہے)

''بہت سے موارد میں تمہارے علم کی محدودیت خیر و شر کی تشخیص سے مانع ہے۔'' چنانچہ ظاہر معاملات کو دیکھتے ہوئے کوئی فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے۔''مسلم ہے زندگی کے تلخ معاملات بھی قرآنی قاعدہ کلیہ کے دائرہ میں آتے ہیں۔

(۳) سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ و خضر کا واقعہ پر معنی قرآنی داستانوں میں سے ہے۔اس کے کئی ایک اہداف ہیں۔اس میں ہماری بحث کی طرف بھی واضح اشارہ ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ان اعلیٰ اہداف میں سے ایک ہمارا موضوع بھی ہے۔وہ یہ کہ جب ذاتِ حکیم سے کوئی کام صادر ہو تو ظاہری صورت پر قناعت کر کے فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے کیونکہ بعض اوقات ظاہر پہلی نگاہ میں اچھا نہیں محسوس ہوتا لیکن غور کرنے سے گہرے اور عمیق اسرار نظر آتے ہیں۔

کشتی کو سوراخ کرنا جو غریب اور کم مایہ لوگوں کے روزی کمانے کا وسیلہ ہے، یا ایسے نوجوان کا قتل کرنا جس سے ظاہراً کوئی جرم و خیانت سرزد نہیں ہوئی۔یا گرتی ہوئی دیوار کو بنا دینا اور وہ بھی ایسے شہر میں جہاں کے باشندے بخیل ہوں کہ مسافروں کی معمولی پذیرائی بھی نہ کریں۔ان میں سے ہر ایک کام دوسرے سے بدتر نظر آتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ امور جو خضر سے ظہور پذیر ہوئے ان میں سے ہر ایک پر حضرت موسیٰ کی داد و فریاد بلند ہوئی کہ یہ کام کیوں کیا گیا؟ پہلے مرحلہ میں فریاد کی کہ کشتی کو سوراخ کیوں کیا؟ کیا تم سب کو غرق کرنا چاہتے تھے؟ یہ تو ایک برا کام ہے۔

اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ۝۷۱ [1] (کہف ۷۱)

دوسرے مرحلہ میں بلند آواز سے کہا کہ ایک بے گناہ انسان کو بدون جرم و خطا کیوں قتل کیا ہے؟ یہ تو بڑی عجیب اور بری بات ہے۔

---

[1] اھر (بروزن شمر) اہم اور حیران کن کام یا بہت برے کام کو کہا جاتا ہے۔

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾ (کهف ۷۴)

تیسرے مرحلہ میں اعتراض کیا کہ یہ کام تم نے مفت میں کیوں انجام دے دیا۔ اگر تم چاہتے تو اس کی اجرت لے سکتے تھے تا کہ اس مسافرت کے زمانے میں کچھ تو بنتا۔

قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾ (کهف ۷۷)

لیکن جب عالم بزرگ (جناب خضر) جو اس وقت حضرت موسیٰ کے استاد اور معلم شمار ہو رہے تھے، انہوں نے اپنے کام کے اسرار سے پردہ اٹھایا تو موسیٰ اپنے عاجلانہ فیصلے پر متاسف ہوئے۔ ان کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کام میں ظاہری چہرہ کے پیچھے انسانی عواطف و رحمت اور کمزور لوگوں کے مصالح کے طور پر کئی اسرار پوشیدہ ہیں۔

کشتی میں سوراخ کرنا جو وقتی طور پر بے کاری کا موجب تھا، لیکن جابر و غاصب سلطان جو اچھی کشتیوں کو ضبط کر لیتا تھا، یہ سوراخ اس کشتی کے بچاؤ کا ذریعہ تھا۔

ایک بے ایمان، کافر اور ظالم نوجوان کا قتل (جو قوانین خدائی میں اس طرح کی سزا کا مستحق تھا) اس لیے تھا کہ اس کے مومن ماں باپ اس کے ہاتھوں آنے والے خطرے سے بچ جائیں۔

دیوار کی مرمت اس لیے تھی کہ دو یتیم بچوں کا خزانہ اس کے نیچے تھا۔ ان کا باپ باایمان تھا۔ حضرت خضر نے اس کو محفوظ کر دیا تا کہ وہ یتیم حد رشد تک پہنچنے کے بعد اس سے فائدہ اٹھائیں۔

''خضر'' ایک انسان تھے البتہ انسان عالم و حکیم۔ لیکن ان کے علم کا قیاس خدا کے علم پر تو نہیں کیا جا سکتا۔ جناب ''خضر'' کے کام ظاہری طور پر قابل اعتراض تھے اور ابتدائی طور پر ان کی وجہ ظاہر نہیں ہو رہی تھی، اس لیے جناب موسیٰ بول اٹھے۔ لیکن جب ''خضر'' کی طرف سے مختصر سی وضاحت کی گئی تو جناب موسیٰ علیہ السلام مطمئن ہو گئے۔

اس قرآنی بیان سے بطور قائدہ کلیہ استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ اس جہان میں ہم جو ظاہری ناہمواریاں دیکھتے ہیں اس میں ان کے بارے میں ایک مفید سبق ہے جو ایک اجمالی جواب بن سکتا ہے تا کہ ہم معلوم کر سکیں کہ ان ظواہر میں کیا اسرار پوشیدہ ہیں۔

(۴) قارون، مال دار، متکبر اور بنی اسرائیل میں ظالم شخص تھا۔ اس کی داستان میں بھی اس مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ ایک دن قارون نے اپنی ثروت کی نمائش کی (جس میں گھوڑے، غلام، کنیزیں، سونا، چاندی اور جواہرات وغیرہ تھے)۔ بنی اسرائیل کا ایک ظاہر بین گروہ اس سے بڑا متاثر ہوا اور کہا:

يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ

''کاش ہمارے پاس بھی ہی ساز و سامان ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔'' (قصص ۷۹)

لیکن جب قارون اور اس کا سارا مال غرق ہو گیا اور معلوم ہوا کہ اس ظاہری چمک دمک کے پیچھے اس کے لیے فساد و تباہ کاری اور درد

ناک سزا بھی چھپی ہوئی تھی اس وقت وحشت زدہ ہو کر کہنے لگے

لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ

''اگر خدا نے ہم پر احسان نہ فرمایا ہوتا تو ہمیں بھی پھنسا دیا جاتا۔'' (قصص ۸۲)

اس واقعہ میں مختلف تربیتی پیغاموں کے علاوہ ایک اور نکتہ بھی ہے کہ ظواہر کو مدنظر رکھتے ہوئے خیر و شر کے سلسلہ میں فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے۔ جس چیز کو انسان کبھی خیر سمجھتا ہے اس میں شر چھپا ہوتا ہے اور اگر اسے باطن کا علم ہوتا تو پہلے ہی اس سے بچنے کی سعی کرتا۔ اس قسم کے حوادثات مورد بحث سوالات کے اجمالی جواب کے سلسلہ میں انسان کے اندر منطقی دلائل کے لیے زینہ و سہارا مہیا کرتے ہیں۔

(۵) قرآن مجید میں وصیت سے مربوط مسائل میں پہلے طبقہ (اولاد، ماں باپ) کی وراثت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمان ہے:

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ

''یہ تمہارے ہی ماں باپ اور اولاد ہیں مگر تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے حق میں زیادہ منفعت رساں کون ہے۔'' (نساء ۱۱)

اگر چہ ماں باپ اور اولاد کا انسانوں میں قریب ترین رشتہ ہے، تمام عمر اکٹھے ہی رہتے ہیں اس کے باوجود قرآن کہتا ہے: تم لوگ دقیقا یہ یقین نہیں کر سکتے کہ باپ ماں اور اولاد میں سے کس کا نقش تمہاری زندگی میں اہم تھا اور ہے۔ اسی لیے ان کی وراثت کا تعین تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا گیا۔

جب انسان کا محدود علم اس قسم کے مسائل میں بھی قطعیت پیدا نہیں کر سکتا تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ کسی خطرناک حادثہ کے ظہور اور عالم خلقت میں اس کی ناموزونی کو سمجھ سکے اور اس کے مطابق اپنا فیصلہ دے سکے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ فقط عقلی دلائل ہی نہیں بلکہ قرآن بھی ان مسائل کے اس مختصر اور اجمالی جواب کی تائید کر رہا ہے۔ یہ انسان کو منطقی فیصلہ سے باز رہنے اور اپنے مسائل میں خاموشی اور زیادہ غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔

روایات اسلامی میں ناگوار حوادث کا تذکرہ

مدارک اسلامی میں رضا و تسلیم کی بحث میں ائمہ معصومینؑ سے بہت سی روایات اگر چہ تربیتی انداز میں وارد ہوئی ہیں لیکن وہ ہمارے محل بحث کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام کی ایک روایت میں ہم پڑھتے ہیں:

"ان الله سبحانه يجرى الامور على ما يقتضيه لا على ما ترتضيه"

''خداوند قدوس مصلحت کے مطابق کاموں کو جاری کرتا ہے نہ تمہاری رضا و رغبت کے موافق۔''[1]

---

[1] غرر الحکم فصل ۹ شمارہ ۵۶

یعنی اگر کوئی چیز تمہاری مرضی اور رغبت کے خلاف ہو تو تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے، اس میں کچھ اسرار و مصالح ہیں جن کا تمہیں علم نہیں۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

ان اعلم الناس بالله ارضاهم بقضاء الله

''خدا کے معاملہ میں زیادہ عالم وہی ہے جو اس کی رضا پر زیادہ راضی رہنے والا ہو۔''[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا فرمان پڑھتے ہیں:

"اجدر الاشیاء بصدق الایمان الرضاء و التسلیم"

''انسان کے ایمان کی سچائی کے لیے لائق ترین چیز پیش خدا رضا و تسلیم ہے۔''[2]

خدا کے علم و حکمت و رحمت پر سچے ایمان کی روشن دلیل اس کش مشیت تکوینی و تشریعی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے، ایسی تسلیم جس میں کراہت و ناپسندیدگی نہ ہو بلکہ رضا ہی رضا ہو کہ اس کی طرف سے جو کچھ بھی ہے اس میں حکمت پوشیدہ ہے۔

خبردار!

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو تکلیف، مصائب، شکست اور ناکامیاں ہمارے اپنے اعمال ہی کی وجہ سے ہو، ہم ان سب کو قضاء الٰہی کے دامن میں ڈال دیں اور اس پر راضی و تسلیم ہو جائیں۔

نیز اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ ہم آفات و مشکلات اور دردناک حوادث کا اپنی طاقت کے مطابق مقابلہ نہ کریں اس لیے کہ یہ حوادث تو ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہیں اور ان کی بازگشت ہماری ہی طرف ہے۔ ان کو ہرگز خدا کے حساب میں ہم نہیں ڈال سکتے۔ بہرحال اس نے درد دیا ہے تو علاج بھی بتایا ہے۔

ان موارد میں اگر ہم کوتاہی کریں تو نہ صرف یہ کہ ہم رضائے خدا پر راضی و تسلیم نہیں ہوئے، بلکہ شرعاً درباِر خدا میں جواب دہ بھی ہوں گے کہ کیوں اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں کو اس کے حساب میں ڈال رہے ہیں۔ اس کی تشریح بحث رضاء و تسلیم میں آئے گی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

---

[1] بحار جلدنمبر ۶۸ ص ۱۴۴ حدیث ۴۲

[2] غرر الحکم

ناگوار مصائب کا تفصیلی جواب

(۱) تفاوت وتفریق کا فلسفہ

تفاوت وتفریق کے مابین بعض اوقات اشتباہ ہوجاتا ہے۔دوسرے میں منفی پہلو پایا جاتا ہے لیکن پہلے میں مثبت پہلو ہوتے ہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ تبعیض کا مطلب ہے جن دو موجودوں میں کاملاً تعاول وبرابری ہے ان میں فرق کریں۔مثلاً دو آدمیوں نے ایک جیسا کام کیا ہے۔شرائط اور اوضاع ایک جیسی ہیں ایک کو کم اجرت دیں اور دوسرے کو دوگنا۔یا اگر دونوں نے ایک جیسا غلط کام کیا ہو،شرائط بھی ایک جیسی ہوں،ایک کو معاف کردیں یا نصف سزا دیں اور دوسرے کو سخت سزا کا مستحق قرار دیں۔

لیکن اگر اعمال مثبت ومنفی میں فرق ہے یا کام کرنے والوں میں فرق ہے،اس وقت فرق کرنا عین عدالت ہوگا۔

یہ جزاء وسزا کے لحاظ سے تبعیض ہے۔

خلقت وتکوین کے لحاظ سے بھی جہان میں ایسے موجودات کا مجموعہ ہے جن میں تفاوت وفرق ہے۔ہر چیز کا اپنا کام اور اپنا وظیفہ خاص ہے۔ان کی خلقت اور ان میں موجود آلات اور استعدادات ان کے کام کے مطابق ہونا چاہیے۔

ایک انسان کے اعضاء بدن کی طرف نگاہ کریں۔بدن کے بعض خلیئے اس قدر لطیف ہیں کہ ذرا سا صدمہ حتی کہ ہوا کا جھونکا بھی برداشت نہیں کرسکتے۔یا تیز روشنی بھی ان کے نظام کو درہم برہم کردیتی ہے،جیسے شبکیہ چشم۔اسی واسطے اس کو ایک محفوظ ترین مقام پر جگہ دی گئی ہے جو حوادث کی دسترس سے کاملا دور ہے۔یہ فوق العادۃ لطافت وظرافت اس کے فواق العادہ اور حساس وظیفہ کی وجہ سے ہے کہ جو اس کے ذمہ ہے۔(یعنی مختلف مقامات،دور ونزدیک اور روشنی میں تفاوت اشیاء کی عکس برداری)۔

لیکن بدن کے بعد خلیے ایسے سخت اور محکم ہیں جو ہر سختی کا مقابلہ کرسکتے ہیں جیسے پاؤں کی ہڈیوں کے خلیے یا پنڈلی کی ہڈی جو پورے بدن کا بوجھ برداشت کرتی ہے،وہ مضبوط ہے تاکہ سخت ترین حملہ اور حوادث سخت کا مقابلہ بہتر انداز میں کرسکے۔

کوئی عاقل اشکال نہیں کرسکتا کہ انسانی ساخت مختلف کیوں ہے سارے بدن کے خلیے (شبکیہ چشم) کی طرف ظریف ولطیف کیوں نہیں بنائے گئے یا سختی وشدت میں پاؤں کی طرح کیوں نہیں خلق کیے گئے؟

اس طرح کا محاسبہ ہم پھول اور بڑے تنے والے درخت کے متعلق بھی کرسکتے ہیں کہ ان کا تنا،شاخیں،پتے اور پھول مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔کس قدر ظرافت کے ساتھ پھول کا کاسہ بنایا گیا ہے۔

اگر اچھی طرح غور وفکر کریں تو انسانی معاشرہ ایک انسان کے بدن یا پھول کے درخت یا بڑے تنے والے درخت کی طرف ہے۔

نظام خلقت کا تقاضا ہے کہ استعدادات،ذوق اور سلیقہ،جسمی وروحانی طور پر افراد معاشرہ میں اختلاف ہونا چاہیے تاکہ ہر شخص اپنی ذمہ داری کے مطابق آمادگی رکھتا ہو۔وگرنہ ہر چیز ناکارہ ہوگی اور اچھا نظام وجود میں نہیں آسکے گا۔

یہ اس درخت والا معاملہ ہوجائے گا جس کی جڑیں، شاخیں سب ہی پھول ہوں۔ ایسا درخت تو تھوڑے وقت کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا اور کچھ وقت کے لیے زندہ رہ بھی جائے تو اس کی زندگی بے ہودہ اور بے فائدہ ہوگی۔

''ماں'' کی ساخت جس نے عواطف ومحبت کا مرکز بننا ہے اور بچے کی حفاظت وتربیت کے لیے مشکلیں اور تکالیف برداشت کرنی ہیں ''باپ'' کی ساخت کی طرح نہیں ہوسکتی کہ جس نے معاشرہ میں کام کرنا ہے کیونکہ اگر یہ ایک جیسے ہوں تو یا ماں اپنا وظیفہ سرانجام نہیں دے سکے گی یا باپ اپنا وظیفہ پورا نہیں کر سکے گا۔

اسی طرح ایک سرجن کے اعصاب ایک شاعر نکتہ سنج کی طرح نہیں ہو سکتے۔ ایک ریاضی دان ایک ماہر زراعت جیسا اور یہ دونوں ایک بھاری صنعتوں کے کاریگر کی طرح اور یہ تینوں ایک سپاہی یا جرنیل کی طرح اور پھر یہ چاروں ایک قاضی کی طرح ہوں، یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ ہر ایک کا معاشرہ میں ایک معین کام ہے۔ اسی کے مطابق ان کی استعداد اور جسم وجان کی خصوصیت ہے۔

یہ بات اس قدر واضح ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت ہی نہیں اور اصولاً اس طرح مختلف استعدادات اور رجحانات عظمت خداوندی کی نشانی ہیں۔ انہی کی بدولت ایک متوازن معاشرہ کی تشکیل ہو پاتی ہے کہ جس میں ہر شے اپنے مناسب مقام پر ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ انسان ایک جیسے برتنوں کی طرح نہیں کہ جو ایک کارخانہ میں بنائے گئے ہوں اور سب ایک ہی کام کے لیے ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ انسانوں کی زندگی اور تمام جہانِ خلقت میں جو چیز ضروری ہے وہ مساوات نہیں عدالت ہے۔ یہاں ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا ہے، ان کا ایک جیسا اور ایک ہی طرح کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق کئی پر معنی اشارے موجود ہیں۔ ایک جگہ فرمان ہے:

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ

''ہم نے بعض کو بعض سے اونچا بنایا ہے تا کہ ایک دوسرے سے کام لے سکے اور رحمت پروردگار ان کے جمع کئے ہوئے مال ومتاع سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔'' (زخرف ۳۲)

''سخریا'' کا مادہ ''تسخیر'' ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے درجات میں تفاوت اور فرق اس کا باعث بنتا ہے کہ بعض دوسروں کے مطیع ہوں یا بعبارت دیگر انسان ایک دسرے سے تعاون کریں۔ چنانچہ ایک بیمار طبیب کے زیر ہدایت ہے اور خود طبیب اپنی ضروریات میں معمار، کسان اور تاجر کے سامنے زیر ہدایت ہے کیونکہ ہر شخص اپنے کام میں دوسرے پر برتری رکھتا ہے تا کہ خدمات متقابل یا قرآن کی اصلاح کے مطابق ''تسخیر'' کے عمل کا حصہ بن جائے۔

اکثر مفسرین اسلامی ''خواہ سنی ہوں یا شیعہ'' انہوں نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے کہ ''سخریا'' کا معنی باہمی خدمات کے لیے مسخر

ہونا ہے۔[1]

یہاں ''سخریا'' کا مزاح ومسخری کے معنی میں ہونے کا احتمال بڑا ضعیف ہے جس کا بعض تفاسیر میں ایک غیر مقبول قول کے طور پر ذکر ہوا ہے۔

ایک اور جگہ ہم پڑھتے ہیں:

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ

''اس (خدا) نے تم میں بعض کے درجات کو بعض سے بلند کیا تا کہ تمہیں اپنے دیئے ہوئے سے آزمائے۔'' (انعام ۱۶۵)

توجہ رہے کہ خدا کی طرف سے یہ آزمائش اور امتحان افراد کے حالات معلوم کرنے کے لیے نہیں کیونکہ وہ تو تمام حالات سے آگاہ ہے۔ بلکہ اس کا مطلب ہے امتحان میں ڈال کر تربیت کرنا تا کہ وہ خالص اور کامیاب ہوں۔ ایک اور تعبیر کے مطابق یہ امتحان ان کے تکامل کا وسیلہ ہے۔ لہٰذا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفاوتیں ان کے تکامل (مادی یا معنوی) کے لیے سبب وذریعہ ہیں۔

دوسرا نمونہ ایسی آیات ہیں جن میں انسانوں میں روزی اور رزق کے فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آخر یہ فرق کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے: قرآن مجید مختلف آیات میں فرما رہا ہے کہ رزق کی تقسیم ایک دقیق، منظم اور اسرار آمیز کام ہے، اگرچہ لوگ اس سے مطلع نہ ہوں جیسا کہ سورۂ اسراء میں ہے:

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ۳۰

''تمہارے پروردگار جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو وسیع یا تنگ کرتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حالات کا خوب جاننے والا اور دیکھنے والا ہے۔'' (اسراء ۳۰)

یعنی وہ بخوبی جانتا ہے کہ فردی واجتماعی لحاظ سے ہر آدمی کی صلاح ومصلحت کس بات میں ہے۔

البتہ وہ تفاوت جو واقعی طبعی اور الٰہی جنبہ رکھتا ہے اس کو ایسی تفریق نہ سمجھ لیں جو ظالموں اور جابروں کی پیدا کردہ ہے۔ کبھی اس فرق کو خدا کی طرف سے تصور نہ کریں وگرنہ مسئلہ کی صورت درست نہیں رہے گی۔ یہ اس کی انحرافی تفسیر ہوگی جو انسانوں کی اجتماعی اور اقتصادی پستی کا موجب بنتی ہے۔ قرآن مجید اس دوسری شکل کو قبول نہیں کرتا بلکہ وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۴۶۔ المیزان جلد ۱۸ ص ۱۰۴۔ قرطبی جلد ۹ ص ۵۹۰۳۔ تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ ص ۲۰۹۔ تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ ص ۲۷۔ مراغی جلد ۳۵ ص ۸۵

روایات اسلامی میں بھی اس مطلب کی طرف اشارہ موجود ہے۔ چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کے ایک فرمان میں ہم پڑھتے ہیں:

"لایزال الناس بخیر ماتفاوتوا فاذا استووا هلکوا۔"

''لوگ خیر وخوبی میں رہیں جب تک ان میں تفاوت ہوگا، اگر مساوات ہوجائے تو تباہ ہوجائیں گے۔''[1]

(۲) خودساختہ مشکلات

انسانی زندگی میں بہت سے ایسے مصائب آجاتے ہیں جن کا سبب وہ خود ہے اگرچہ بہت سے افراد خود کو اپنے اعمال سے بری الذمہ کرنے کے لیے اپنی علمی سستی اور غفلت کا بار دوسرے عوامل پر ڈالتے ہیں۔

وہ ان سب امور کو قضا وقدر کے حساب میں ڈال دیتے ہیں اور اپنی تقصیر وکوتاہی کو مشیت الٰہی کے ذمے لگاتے ہیں، پھر عدالت خدا کے متعلق سوال کرتے ہیں (کہ آخر یہ کیسی عدالت ہے؟) لیکن اگر ہم اچھی طرح غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بہت سے حوادثات، ناکامیاں، مصائب اور مشکلات ہم اپنے ہی ہاتھوں لائے ہوتے ہیں اور فریاد پورا معاشرہ ان کا اصل سبب اور واقعی قصوروار ہوتا ہے، اگرچہ ظاہراً خود کو بری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جو مشکلات ظالم حکومتوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں وہ عموماً اسی قبیل سے ہیں۔ کیونکہ ظالم وجابر تعداد میں کم ہوتے ہیں، ان کے سامنے خاموشی اور بغیر کسی دلیل کے ان کی بات مان لینا بلکہ ان کے ساتھ لوگوں کی ہمکاری ومدد ہی ان کو طاقت ور بنا دیتی ہے۔ اس طرح وہ لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوجاتے ہیں اور ہزار طرح کی بدبختی کا موجب بنتے ہیں۔

بہت سی بیماریاں شکم پرستی اور خواہشات نفسانی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بہت سی ناکامیاں حالات پر نظر نہ ڈالنے اور کارشناس لوگوں سے مشورہ نہ کرنے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اکثر یہ صورت خودغرضی اور اپنی رائے کو بے نقص تصور کرنے سے پیش آیا کرتی ہے۔

یہ بدنظمی ہمیشہ بدبختی کی طرف لے جاتی ہے۔ اختلاف وتفرقہ مصیبت اور تباہی لانے کا سبب بنتا ہے۔

تعجب ہے کہ بہت سے لوگ اس علت ومعلول کے رابطہ کو فراموش کرچکے ہیں اور ہر واقعہ کو خالق کے ذمے لگا دیتے ہیں۔

علاوہ ازیں جامعہ بشری میں بہت سے مصائب ایک فرد کے دوسرے فرد پر ظلم یا ایک گروہ کے دوسرے گروہ پر ظلم کی وجہ سے پیدا ہیں۔ مثلاً آج ہم سنتے ہیں کہ ہر سال تقریباً پانچ کروڑ انسان بھوک سے مرجاتے ہیں یا اس سے زیادہ لوگ ناقص غذا کی وجہ سے مختلف امراض کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ خدا کا لطف ان پر نہیں ہوا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں یا حکومتوں نے خداداد آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا ہے اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ اس گروہ کا استعمار دوسروں کی کمزوری کا سبب بن گیا ہے۔ بھوک اور قحط کی وجہ سے یہ اموات اس لیے ہوئیں کہ مالدار ممالک جو خدا سے بے خبر ہیں، انہوں نے بہت سی غذائی اجناس دریا میں پھینک دیں، کچھ مقدار دوسرے ذرائع

---

[1] منتہی الآمال جلد ۲ ص ۲۲۹

سے ضائع کردی اور اسے کوڑے کے ڈھیروں پر ڈال دیا ہے، جب کہ خود ان کو زیادہ کھانے کی وجہ سے کئی ایک بیماریاں لاحق ہو رہی ہیں۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے ماں باپ کی شراب خواری اور ناقص غذا کے باعث مختلف قسم کے نقائص و عیوب اور بیماریاں لیے ہوئے پیدا ہوتے ہیں تو درحقیقت یہ ان کے ماں باپ کا ظلم ہے جو اس بچے اور معاشرہ پر ہوا۔ (اس کے ذمہ دار ماں باپ اور راہنمایانِ معاشرہ ہیں نہ کہ خدا)۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے باپ خنجر لے کر بیٹے کی آنکھیں نکال دے یا فرعون وقت نومولودوں کے سر کاٹ دے۔

ان مصائب کو ہرگز خدا کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ خودساختہ اور اپنی لائی ہوئی مشکلات و مصائب ہیں کہ جو انسان نے اپنے اور دوسروں کے لیے پیدا کی ہیں۔

قرآن مجید اور خودساختہ مصائب

قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیات ملتی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ انسان کے غلط اعمال اور مصائب و مشکلات کے درمیان رابطہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض آیات کے لہجہ اور طرز میں عمومیت ہے جو سب مسائل کو شامل ہے۔ لیکن بعض آیات میں خاص قسم کی مشکلات کا تذکرہ ہے۔ جیسے:

(۱) اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ

''نیکی اور کامیابی جو تم تک پہنچی ہے خدا کی طرف سے ہے اور برائی (مشکلات، مصائب اور بے سکونی) جو تمہارے دامن گیر ہوئی وہ خود تمہارا کیا دھرا ہے۔'' (نساء ۷۹)

خاص بات یہ ہے کہ مخاطب خود حضرت رسولؐ ہیں لیکن درحقیقت اس موضوع کی اہمیت واضح کی جارہی ہے کہ جب پیغمبرؐ کے متعلق یہ کہا جارہا ہے تو دوسروں کا کیا حال ہوگا۔

وگرنہ معلوم ہے کہ حضور اکرمؐ کبھی اس طرح کا کام نہیں کرتے جس کی وجہ سے خودساختہ مصائب کا شکار ہوں۔

حسنات، نیکیوں کو خدا کی طرف نسبت دی جارہی ہے، اس لیے کہ خدا نے تمام صلاحیتیں انسان کے باطن میں رکھ دی ہیں اور امکانات اس کے اختیار میں دیئے ہیں۔ لیکن ''سیئات'' برائیوں کو انسان کی طرف منسوب کیا جارہا ہے اس لیے کہ جن امکانات و استعدادات کا ہدف خدا کو ہونا چاہیے تھا انسان نے انحراف کرکے کوئی اور مقصد بنایا ہے۔ مگر وہ تو مسبب الاسباب ہے۔ سب طاقتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

شاید اسی لیے بعض آیات میں سبھی کاموں کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے۔ لہٰذا یہ فرق جہات بحث اور زاویہ نگاہ کی وجہ سے ہے۔ (غور کریں)

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کی زندگی میں بہت سے حوادث خود انسان ہی کے ہاتھوں آتے ہیں۔ اصولِ صحت سے انحراف، عدم حفاظت صحت، غذا میں افراط و زیادتی، صفائی کا خیال نہ رکھنا، چلنا پھرنا چھوڑ کر صرف بیٹھا رہنا یا گندی جگہوں پر جانا، گندے

اشخاص سے میل جول رکھنا، یہ امور بیماریوں کے اسباب ہیں۔ اگر انسان ان اصول وقوانین کا لحاظ کرتا جو عالم تکوینی میں مقرر کر دیئے گئے ہیں تو کبھی ان امراض میں مبتلا نہ ہوتا۔

لیکن اس کے باوجود یہ چیز بھی قابل انکار نہیں کہ بعض امراض انسان کے بس سے باہر ہیں۔ مثلاً اچانک ہواؤں میں تبدیل ہونا کہ جو موسم سے ناسازگار ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے بہت سے افراد امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم دیگر حوادث ومصائب میں بھی اسی تقسیم کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر چہ آیہ مافوق عام موارد کو شامل ہے لیکن مراد اکثر موارد ہیں۔

فخر رازی اس مشکل کو حل نہیں کر سکا۔ لہٰذا اس نے ''سیئۃ'' سے معصیت مراد لی ہے [1] جب کہ یہ معنی مناسب نہیں کیونکہ اس وقت آیت کا مطلب ہوگا: جو نافرمانی ہوگی وہ صرف تیری طرف سے ہوگی اور یہ توضیح واضحات میں سے ہے، لہٰذا ''سیئات'' صرف معصیت کو شامل نہیں بلکہ اس کا مفہوم عام ہے۔

(۲) دوسری جگہ خشکی وسمندر میں پیش آنے والی مشکلات کو انسانی اعمال کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ فرمان ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

''خشکی اور سمندر میں فساد انسان کے اپنے اعمال ہی کی وجہ سے ظاہر ہوا ہے۔'' (روم ۴۱)

''الفساد'' پر الف لازم جنس ہے، جس کی دلالت عموم وشمول پر ہے، اس سے پتہ چلے گا کہ روئے زمین پر تمام مفاسد انسان کی اپنی ہی کرتوت سے ہیں اور اس سے اجتماعی مفاسد مراد ہوں گے۔

پھر اس آیت میں مزید اضافہ کیا ہے: خدا چاہتا ہے کہ ان کے بعض اعمال کا کچھ مزہ انہیں چکھا دے تو شاید یہ لوگ پلٹ کر راستہ پر آجائیں۔ (لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو سزا وعقوبات الٰہی کی طرف اشارہ قرار دیا ہے جو لوگوں کے ''اعمال سوء'' کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن ظاہراً آیت میں ''فساد وگناہ'' کے درمیان تکوینی رابطہ کا تذکرہ ہے، آیت کا ذیل بھی اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ اس میں کلمہ ''عقوبت'' نہیں آیا۔ بلکہ ''بعض اعمال کا مزہ'' چکھانے کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی سزا نہیں۔ بعض اعمال کا ذکر ممکن ہے اس لیے ہو کہ لطف خدا کی بدولت زیادہ تر اعمال کے نتیجہ طبعی سے انسان کو بچا لیا جاتا ہے۔

بہر حال اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اجتماعی مفاسد جیسے بدامنی، جنگ، طاعون کی وبا، مظلوموں کی بے چارگی اور اس قسم کی چیزیں انسان کے اپنے غلط اعمال ہی کا نتیجہ ہیں، اس کو کسی صورت میں خدا کے حساب میں نہ ڈالا جائے اور ان کے باعث عدالت الٰہی پر اشکال نہ کیا جائے۔ (غور کریں)

(۳) دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے اندر تبدیلی لانے کے بعد ہی نعمت الٰہی کا مستحق بن سکتا ہے۔ فرمان ہے:

---

[1] فخر رازی جلد ۱۰ ص ۱۹۰

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم

''خدا کسی قوم کو دی ہوئی نعمت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تغیر نہ پیدا کر دیں۔'' (رعد ۱۳)

ایک اور مقام پر اسی بات کو صراحتاً ''نعمت'' کے عنوان سے بیان کیا ہے، فرماتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ

''یہ اس لیے ہے کہ خدا نے کسی قوم کو جو نعمتیں دی ہوں وہ انہیں ہرگز واپس نہیں لیتا مگر یہ کہ وہ لوگ خود بدل جائیں۔'' (انفال ۵۳)

واضح تعبیر کے مطابق خدا کا فیض اور رحمت بڑی وسعت رکھتا ہے، لیکن انسانوں میں اس کی تقسیم ان کی صلاحیت و شائستگی کے لحاظ سے ہوگی۔ اگر انہوں نے صحیح استفادہ کیا تو نعمتیں جاودانی و دائمی ہوں گی اور اگر ان نعمات کو طغیان و سرکشی، ظلم و ستم، تکبر و خود پسندی کا وسیلہ بنا دیا گیا تو نعمات کی جگہ مصائب لے لیں گے۔ گویا تاکید ہو رہی ہے کہ بہت سے مصائب انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔

(۴) انسان کے کم ظرف ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے لوگوں کے اعمال اور مشکلات و مصائب کے درمیان رابطہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرمان ہے:

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ۝۳۶

''اور جب ہم انسانوں کو رحمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ خوش حال اور مغرور ہو جاتے ہیں اور جب ان کے سابقہ کردار کی بناء پر انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔'' (روم ۳۶)

اگرچہ بہت سارے مفسرین نے اس طرح کی آیات کو عذاب الٰہی کی طرف اشارہ قرار دیا ہے لیکن اپنے ذاتی نظریہ اور عقیدہ سے قطع نظر کر کے کوئی دیکھے تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ مصائب و مشکلات کا سبب انسان کے اپنے اعمال ہیں۔ ایک اور تعبیر کے مطابق اعمال سبب اور مصائب و مشکلات مسبب ہیں، اگر اس میں کوئی سزا ہو تو ان کے عمل کا ردعمل اور کردار کا نتیجہ ہوگی۔ لہٰذا ان آیات میں عقوبت و سزا کو مقدر قرار دینا، جیسے بہت سے مفسرین نے کہا ہے، اس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

(۳) وہ مصائب جو خدائی سزا ہیں

بعض مشکلات و مصائب خدا کی طرف سے بطور سزا ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ان افراد کے لیے ہیں جو سزا کے مستحق ہوں۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے کہ یا تو گناہ اس قدر شدید ہیں کہ وہ دنیا و آخرت میں سزا کے مستحق ہیں یا گناہ اس حد تک ہے کہ دنیا کی سزا اس کو ختم کر دے گی،

درحقیقت ایسے افراد کے لیے یہ خدا کا لطف وکرم ہے۔

ممکن ہے کہ گناہ وسزا میں زمانی فاصلہ کافی ہولیکن بہرحال واسطہ محفوظ ہے۔کبھی بغیر فاصلہ کے عذاب آجاتا ہے گویا فوری سزادی جا رہی ہے۔

اس میں اور سابقہ بحث میں فرق یہ ہے کہ سابقہ بحث میں بتایا گیا ہے کہ مشکلات انسان کے اعمال کا اثر ہے اور اب ذکر ہورہا ہے کہ مصائب خدا کی طرف سے سزا کے طور پر ہیں۔

بہرحال موحدین اور عدل الٰہی کے معتقد لوگوں کے لیے واضح ہے کہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ دنیا وآخرت دونوں میں انہیں عذاب ہوتا ہے لیکن جولوگ اس کو نہیں سمجھ سکتے ممکن ہے کہ اسے وہ عجیب اور دردناک مصیبت تصور کریں۔

تاریخ کے صفحات ایسے لوگوں کے تذکرے سے بھرے ہوئے ہیں کہ جن کے پاس طاقت تھی تو انہوں نے ظلم وتشدد کا بازار گرم کیا، پھر اس میں خود بھسم ہوکر رہ گئے، ان کی تشریح کے لیے ایک نہیں کئی کتابیں درکار ہیں۔

روزمرہ زندگی میں ہم ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔لہٰذا ہم اعمال وسزا کے درمیان اجمالی رابطہ کا انکار نہیں کرسکتے۔

قرآن مجید نے اس کا بعنوان کلی تذکرہ کرنے کے علاوہ بعض اقوام کی خاص طور پر نشاندہی بھی کی ہے جن کو سزا کے طور پر دنیا میں عذاب دیا گیا۔ذیل میں بطور نمونہ دونوں گروہوں کا تذکرہ ہے۔

(۱) وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''اور اللہ نے اس قریہ کی مثال بیان کی ہے جس میں آرام وآسودگی تھی اور اس کا رزق ہر طرف سے باقاعدہ آرہا تھا لیکن اس قریہ کے رہنے والوں نے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا تو خدا نے انہیں بھوک اور خوف کے لباس کا مزہ چکھادیا یہ صرف ان کے اعمال کی بناء پر ہوا جو وہ انجام دے رہے تھے۔''(نحل ۱۱۲)

یہ واقعہ خواہ بنواسرائیل میں ہوا ہو یا بنی سبا میں یا مکہ کے لوگوں پر گزرا ہو ایک قاعدہ کلیہ کے عنوان سے بیان ہوا۔(یہ احتمالات کلمات مفسرین میں موجود ہیں)۔یہ ہمارے محل بحث میں بہترین شاہد وگواہ ہے۔اس سے گناہ وسزا کے درمیان رابطہ بخوبی واضح ہورہا ہے

اگر لوگ دوسرے شہروں میں جائیں اور وہاں قحط سالی، بدامنی اور مصیبت کو دیکھیں تو شاید ان کو تعجب وحیرت ہو۔وہ ایک دوسرے سے سوال کرنا شروع کردیں کہ یہ بدبختی اور بے چارگی کیا عدالت الٰہی کے مخالف نہیں؟ لیکن اگر وہ اس شہر والوں کی غلط کاری اور برے کردار سے واقف ہوں تو اس سزا کو عادلانہ بلکہ ان لوگوں کے استحقاق سے کم سمجھیں گے۔

(۲) گذشتہ اقوام جو گناہوں کی وجہ سے سزا کی مستحق بنیں ایک اور مقام پر ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمان ہے:

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۴۰

''پھر ہم نے ایک گروہ کو (قوم عاد، قوم ثمود، قارون، فرعون اور ہامان جن کا تذکرہ پہلی آیات میں ہوا ہے) ان کے گناہ کی پاداش میں پکڑ لیا، کسی پر آسمان کے پتھروں کی طوفانی بارش کر دی، کسی کو ایک آسمانی چیخ (صاعقہ) نے آلیا اور کسی کو زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو پانی میں غرق کر دیا اور اللہ کسی پر ظلم کرنے والا نہیں بلکہ یہ لوگ خود اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہیں۔'' (عنکبوت ۴۰)

اس لحاظ سے اگر قوم عاد پتھروں کے طوفان سے برباد ہوئی اور ان کے گھر تباہ ہو گئے، اگر قوم ثمود کو (صاعقہ) چیخ نے ہلاک کر دیا، زمین کو حرکت ہوئی اور قارون اپنے مال سمیت اس میں دھنس گیا اور فرعون اور اس کا وزیر ہامان دریا میں غرق ہو گئے تو یہ مختلف قسم کے عذاب عدالت الٰہی کے مخالف نہیں بلکہ عین عدالت شمار ہوں گے کیونکہ یہ سب اس کے مستحق تھے۔

بعض تفاسیر میں سورۂ یونس کی آیت نمبر ۹۰ کے ذیل میں فرعون کے بارے میں ایک ایسا واقعہ نقل کیا گیا ہے جو محل بحث میں بہترین شاہد ہے۔ وہ یہ کہ ایک دن جبرائیل انسان کی صورت میں شکایت لے کر فرعون کے دربار میں حاضر ہوئے اور کہا: اے بادشاہ! میرا ایک غلام تھا جس کو میں نے سب پر بادشاہت دی، اپنے خزانہ کی کنجیاں اس کے سپرد کر دیں، وہ میرا دشمن بن گیا، جو مجھ سے محبت کرتا اس کا بھی دشمن بن گیا اور میرے دشمنوں کو اس نے دوست بنا لیا۔ آپ اس کے بارے میں حکم صادر فرمائیں اور اس کی سزا معین کریں۔

فرعون نے کہا: اگر یہ میرا غلام ہوتا تو میں اس کو دریا میں غرق کر دیتا۔

جبرائیل نے کہا: اے بادشاہ آپ جو یہ فرمان دے رہے ہیں، اسے میرے لیے تحریر فرما دیجیے! فرعون نے حکم دیا تو قلم دوات اور کاغذ لایا گیا اور اس نے لکھا:

''وہ غلام جو مولا کے خلاف قیام کرے اور اس کی نعمات کا انکار کرے۔ میرا حکم ہے اسے دریا میں غرق کر دیا جائے۔''

وقت گزرتا رہا۔ پھر جب فرعون اور اس کا لشکر دریا کی موجوں میں غرق ہونے لگے تو جبرائیل ظاہر ہوئے اور فرعون کا خط اس کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یہ وہی حکم ہے جو آپ کی طرف سے صادر ہوا ہے۔ [1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان مصیبتوں (طوفان، صاعقہ، سیلاب اور زلزلے) کی آمد کے وقت ان قوموں کے قرب میں

---

[1] روح البیان جلد ۴ ص ۷۷

موجود ہوتا اور اس کو ان کے سابقہ اعمال اور عذاب کی وجوہات کا علم نہ ہوتا، لیکن وہ دیکھتا کہ لوگ سیلاب میں غرق ہو رہے ہیں، طوفان ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر رہا ہے اور سخت ترین آگ ایک ہی لحظہ میں ہر چیز کو خاکستر کر رہی ہے۔ تب وہ اس پر تعجب کرتا اور شاید جہان وہستی میں عدالت کے بارے میں شک وتردید میں پڑ جاتا۔ لیکن اگر اسے ان حوادث کے وجوہات واسباب کا علم ہوتا یا اس کے سامنے ان کی کارستانیاں بیان کر دی جاتیں تو اس کو ہرگز شک وتردد نہ ہوتا۔ ہاں یہی بعض مشکلات اور مصائب کا فلسفہ ہے۔ لفظ بعض ہم نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ ہر مشکل اور مصیبت کا فلسفہ دوسری مشکل کے فلسفہ سے جدا ہوتا ہے۔

(۳) ''قرآن کی سورۂ سبا میں یمن کی ایک قوم کا بڑا عجیب اور حیران کن واقعہ آیا ہے، ان کا تمدن ترقی یافتہ تھا اور یہ سب کچھ اس عظیم بند کی وجہ سے تھا جو پہاڑوں کے درمیان باندھا گیا تھا۔ چنانچہ پہاڑوں اور دریاؤں کا پانی جمع کر لیا جاتا اور پھر بہترین انتظام کے ساتھ اس سے زمین سیراب کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف باغات اور سرسبز وشاداب کھیت تھے اور وہ سرزمین قسم قسم کی نعمتوں سے مالا مال رہتی تھی۔

علاوہ ازیں ہر طرف امن وامان کا دور دورہ تھا۔ مشکلات، آفات، بلائیں، خشک سالی، قحط اور بدامنی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ بلکہ وہاں موذی جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا وجود بھی نہیں تھا۔

لیکن نعمت پر غرور اور کثرت مال کی وجہ سے ان پر غفلت طاری ہوگئی، سرکشی بڑھ گئی اور وہ مختلف طریقوں سے کفرانِ نعمت کرنے لگے۔

قرآن مجید اس مقام پر کہتا ہے:

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾

''مگر ان لوگوں نے انحراف کیا تو ہم نے ان پر بڑے زوروں کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے دونوں باغات کو ایسے باغات میں تبدیل کر دیا جن کے پھل بے مزہ تھے اور ان میں جھاؤ کے درخت اور کچھ بیریاں بھی تھیں۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کی سزا دی اور کیا ہم ناشکروں کے علاوہ کسی کو سزا دیتے ہیں؟[1] (سبا ۱۶، ۱۷)

عجیب بات یہ ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ اس عظیم بند کی خرابی کا پہلا سبب صحرائی چوہے بنے جنہوں نے اس میں سوراخ کیے (یہ سوراخ پانی کے جریان کی وجہ سے اور بھی کھل گئے) نتیجہ یہ نکلا کہ یہ بند تباہ ہو گیا۔

ہاں! عظیم سیلاب جس کی ابتدا بارش کے لطیف قطرات سے ہوئی اور پھر صحرائی چوہوں کی کارگزاری نے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ ایک

---

[1] ان آیات کی تفسیر اور شرح تفسیر نمونہ فارسی جلد ۱۸ صفحہ ۵۵ پر مفصل طور پر مذکور ہے۔

عظیم تمدن تباہ ہوااوران کی سرکشی نے ان کے لیے عدم ونابودی کاراستہ ہموارکیا۔

اس قسم کے واقعات بہت زیادہ ہیں کہ جہاں مصائب اوراعمال انسانی میں واضح طور پر رابطہ موجود ہے، اگران کوجمع کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب بن جائے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ عقلی ومنطقی دلائل اورقرآن مجید کی آیات، روایات اورتاریخ کودیکھتے ہوئے انکارنہیں کیا جاسکتا کہ بعض مصائب و مشکلات، بعض ظالم وسرکش افرادواقوام کے لیے بطورسزا آئی ہیں اگرچہ بےخبرلوگ ان علل ومعلولات کے باہمی رابطہ کونہیں سمجھ سکے۔

مسلم ہے کہ ان مواقع پرخدانے ظلم نہیں کیا، بلکہ انہوں نے خودہی اپنے اوپرظلم کیا ہے، چنانچہ قرآن کہتا ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ۝۱۰۰ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

''یہ چندآفت زدہ بستیوں کی خبریں ہیں جوہم نے تمہیں بتائی ہیں۔ان میں سے بعض بستیاں رہ گئی ہیں اور بعض کٹ پھٹ کر برابر ہوگئی ہیں اورہم نے ان پرکوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خودہی اپنے اوپرظلم کیا ہے۔''(ہود۱۰۰،۱۰۱)

اسلامی رایات میں گناہ اورمصیبتوں کارابطہ

جوکچھ اوپرذکرکیا گیا ہے اسلامی روایات میں وسعت کے ساتھ اس کا تذکرہ ہوا ہے، بہرحال انسانی معاشرہ میں بعض ایسے مصائب ومشکلات آئے ہیں جوگناہوں کی سزاہیں۔بطورنمونہ ہم چندایک کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) امام جعفرصادقؑ کا فرمان ہے:

"ان اللہ تعالیٰ اذا غضب علی امة ثم لم ینزل بها العذاب اغلی اسعارها و قصر اعمارها و لم ترب تجارها و لم تغزر اهارها، ولم نزك ثمارها وسلط علیها شرارها و حبس علیها امطارها۔"

''جب خداکسی قوم پرغضب ناک ہواوران کوتباہ کن اجتماعی عذاب نہ دے تووہاں مہنگائی ہوجاتی ہے، عمریں کم ہوجاتی ہیں، تاجرخسارہ میں چلے جاتے ہیں، نہروں میں پانی کم، میوے اورپھل اچھے نہیں ہوتے، برے لوگ مسلط ہوجاتے ہیں اوربارشیں ناپید ہوجاتی ہیں۔''[1]

---

[1] بحارالانوارجلد۷۰ص۳۵۳

(۲) دوسری حدیث میں حضرت امام علی رضاؑ کا فرمان ہے:

"کلما احدیث العباد من الذنوب مالم یکونوا یعملون احدث لهم من البلاء مالم یکونوا یعرفون۔"

''جس زمانہ میں لوگ نئے نئے گناہ کریں تو خدا بھی ان پر تازہ مصائب وارد کرتا ہے جن کو پہلے کسی نے نہیں دیکھا ہوتا۔''[۱]

(۳) ایک اور روایت میں حضرت امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے:

"من یموت بالذنوب اکثر ممن یموت بالاجال و من یعیش بالاحسان اکثر ممن یعیش بالاعمار۔"

''طبعی موت سے زیادہ گناہوں کے بدلے میں موتیں واقع ہوتی ہیں اور وہ لوگ جو نیکیوں کی بدولت زیادہ زندگی پائے ہیں وہ طبعی طول زندگی والوں سے زیادہ ہیں۔''[۲]

(۴) ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے:

"ان الرجل لیذنب فیحرم صلوة اللیل وان عمل الشر اسرع فی صاحبه من السکین فی اللحم۔"

''کبھی انسان گناہ کرتا ہے جس کی وجہ سے نمازِ شب سے محروم رہتا ہے، اس برے عمل کا اثر برائی کرنے والے میں گوشت میں چھری کے اثر سے زیادہ ہوتا ہے۔''[۳]

یہ حدیث اس بحث یا گذشتہ بحث میں گناہوں اور ناگوار حوادث میں طبیعی رابطہ کے موجود ہونے پر بہترین شاہد ہوسکتی ہے۔ (غور کریں)

(۵) ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقرؑ کا فرمان ہے: ہم نے کتاب رسولؐ (روایاتِ پیغمبر اکرمؐ) میں پڑھا ہے کہ:

"اذا ظهر الزنا من بعدی کثرموت الفجأة واذا طفف المکیال

---

[۱] بحارالانوار جلد ۷۰ ص ۳۵۴

[۲] بحارالانوار جلد ۷۰ ص ۳۵۴

[۳] بحارالانوار جلد ۷۰ ص ۳۵۸ حدیث ۷۴

والمزيان اخذهم الله بالسنين والنقص واذا معنواالزكات منعت الارض بركتها منالزرع والثمار والمعادن كلها واذا جاروا فى الاحكام تعاونوا على الظلم والعدوان واذا نقضوا العهد سلط الله عليهم عدوهم واذا قطعوا الارحام جعلت الاموال فى ايدى الاشرار واذالم يأمروا بالمعروف ولم ينهوا عن المنكرولم يتبعوا الاخيار من اهل بيتى سلط الله عليهم شرارهم فيدعوا خيارهم فلايستجاب لهم۔"

"جس معاشرہ میں زنا زیادہ ہوگا اس میں ناگہانی موت کا سلسلہ بڑھ جائے گا۔ جہاں ناپ تول میں کمی کی جائے گی وہاں قحط سالی اور اشیاء صرف میں کمی واقع ہوجائے گی۔ جس معاشرہ میں زکوٰۃ نہیں دی جائے گی وہاں سے برکت اٹھ جائے گی (زراعت، میوہ اور معدن سب میں کمی واقع ہوگی) جہاں فیصلوں میں عدالت نہیں ہوگی وہاں ظلم وعدوان پر تعاون میں اضافہ ہوگا۔ جب پیمان شکنی ہوگی تو خدا ان لوگوں پر دشمنوں کو مسلط کردے گا۔ قطع رحمی کی صورت میں اموال برے لوگوں کے ہاتھوں میں چلے جائیں گے۔ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ نہیں ہوگا اور اہل بیت علیہم السلام کے احکام کی پیروی نہیں کی جائے گی تو وہاں برے لوگ مسلط ہوجائیں گے، پھر نیک لوگ دعائیں کریں گے لیکن وہ مستجاب وقبول نہیں ہوں گی۔"[1]

(۶) سورۂ نوحؑ کی تفسیر میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک عجیب فرمان ہے: علماء اہل سنت کے ایک بزرگ عالم قلانسی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت امیر المومنینؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا:

یا امیر المومنینؑ: میں نے بہت زیادہ گناہ کیے ہیں اور اپنے صحیفہ اعمال کو سیاہ کرلیا ہے۔ دعا فرمائیں کہ خدا مجھے بخش دے۔ حضرتؑ نے فرمایا: استغفار کرو!

ایک اور آدمی آیا اور اس نے کہا: یا امیر المومنینؑ! میں کھیتی باڑی کرتا ہوں، پانی کی کمی کی وجہ سے فصل سوکھ گئی ہے۔ دعا فرمائیں کہ خداوند تعالیٰ بارش برسائے۔ آپؑ نے فرمایا: استغفار کرو!

ایک اور شخص نے عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! میں فقیر ومحتاج ہوں۔ اب تو فقر وفاقہ کی وجہ سے طاقت ہی نہیں رہی۔ میرے لیے دعا فرمائیں کہ خدا اپنے لطف عام سے مجھے نعمت رزق دے۔ آپؑ نے فرمایا: استغفار کرو!

چوتھا شخص آیا اور عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! مال ودولت میرے پاس بہت زیادہ ہے لیکن اولاد نہیں۔ دعا فرمائیں کہ خدا مجھے فرزند عطا

---

[1] اصول کافی جلد ۲ ص ۲۷۴ حدیث ۲

فرمائے۔آپؑ نے فرمایا:استغفار کرو!

ایک اور شخص بولا!یا امیر المومنینؑ!میرے باغ کا میوہ کم ہو گیا ہے۔دعاء فرمائیں کہ خدا اس میں برکت دے۔فرمایا:استغفار کرو!

ایک اور شخص بولا:یا امیر المومنینؑ!ہمارے علاقے کے چشمے خشک ہو گئے ہیں،نہروں کا پانی کم ہو گیا ہے اور قحط کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ہم آپ سے التماس دعا کرتے ہیں۔آپؑ نے فرمایا:استغفار کرو!

ابن عباس کہتے ہیں کہ میں بھی اس وقت خدمت امامؑ میں حاضر تھا۔میں نے عرض کیا:یا امیر المومنینؑ!ان لوگوں نے مختلف چیزوں کا تقاضا کیا ہے لیکن آپؑ نے سب کو ایک ہی جواب دیا ہے(آپؑ نے سب بیماریوں کے لیے ایک ہی دوا تجویز کر دی ہے۔)

فرمایا:اے ابن عم!کیا تم نے یہ آیات(زبانِ نوحؑ)سے نہیں سنیں کہ فرماتے ہیں:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ﴿۱۲﴾

''پس(خداوندا)میں نے ان سے کہا کہ اپنے پروردگار سے استغفار کرو،وہ بہت زیادہ بخشنے والا ہے،وہ تم پر موسلا دھار پانی برسائے گا اور اموال و اولاد کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے لیے باغات اور نہریں قرار دے گا۔''[1](نوح ۱۰ تا ۱۲)

مندرجہ بالا روایات کے علاوہ کتب اخبار و تاریخ میں بکثرت روایات ہیں جو بعض مصائب اور گناہوں کے درمیان رابطہ کی بہترین شاہد و گواہ ہیں(البتہ بعض سے پتہ چلتا ہے کہ مصائب و اعمال کا اثر وضعی ہے،بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ سزا کے طور پر ہیں اور بعض میں دونوں معانی کا احتمال ہے)۔

(۴)بیدار کرنے والے مصائب

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض سخت مصائب و مشکلات انسان کے دل و دماغ سے پردۂ غرور و تکبر کو ہٹانے،خواب غفلت سے بیدار کرنے اور ہوس رانی و خود پسندی کے چنگال سے نکالنے کا کام دیتے ہیں۔نیز بہت سے مصائب انسانی زندگی میں ایک اہم موڑ بن کر آتے ہیں اور اس کے اچھی چیزوں کی طرف رجوع کرنے کا مرکزی سبب بن جاتے ہیں۔

نعمتوں کی کثرت،حکومت کی طاقت اور صحت و سلامتی،کبھی انسان کو اس قدر مغرور بنا دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے۔وہ تمام عطیات خداوندی کو اپنی محنت و قوت کا ثمرہ سمجھنے لگ جاتا ہے اور اپنے آپ کو دوسروں سے برتر خیال کرتا ہے،گویا وہ اپنی زندگی کو

---

[1] تفسیر منہج الصادقین جلد ۱۰ ص ۱۹(تلخیص)

دائمی سمجھنے لگ جاتا ہے۔اس کے نتیجے میں وہ ایک خطرناک، بےانصاف، ذخیرہ کار، خودغرض اورنفس پرورشخص کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پس اگراس کی زندگی میں کچھ مشکلات نہ آئیں تو یقیناان غلط کاریوں میں وہ انسان اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کوبھی تباہ و برباد کردیتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جب لطف الٰہی کا ہاتھ اپنی رحمت کی آستین سے باہرآتا ہےاورانسان کی مددفرماتا ہے۔ چنانچہ اس پرایسی سخت و سنگین مصیبت آتی ہے کہ کوئی عزیز و پیارا ہاتھ سے چلا جاتا ہے جس کی تلاش میں اسے ناکامی ہوتی ہے، زلزلہ سے مکانات ومحلات تباہ ہو جاتے ہیں اورکوئی صاعقہ وبجلی اس کے اموال کوخاکستر کرکے رکھ دیتی ہے۔

اس حالت میں اس کے بدن میں کپکپی طاری ہوتی ہے،کبھی وہ اس سے بیدار ہوتا اورفکروخیال میں ڈوب جاتا ہے،حتی کہ اپنی بےراہ روی کوچھوڑکرصحیح راستہ پرچلناشروع کردیتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی شاہراہوں پرکبھی ایسی مصنوعی رکاوٹیں بنادی جاتی ہیں تاکہ ڈرائیورنیند میں نہ چلا جائے اورحادثے سے بچ سکے۔

انسانی زندگی کے جادۂ مستقیم میں بھی کبھی ایسے موڑ اورمصائب آجاتے ہیں جواس کوہلاکررکھ دیتے ہیں تاکہ وہ غفلت کی نیند (جوتباہ کن ہے) سے بیدارہوجائے اور ہلاکت وتباہی سے محفوظ رہے۔

یہ بات ایک فرد، ایک معاشرہ بلکہ تمام جوامع بشری پرصادق آتی ہےاوراس سے زندگی میں بعض دردناک حوادث کا فلسفہ پورے طور پرسامنے آجاتا ہے۔

آج ایجادات میں پیش رفت اورترقی کی وجہ سےانسان اس قدرطاقتورہوگیا ہے کہ آسمان وزمین دونوں اس کی جولان گاہ ہیں۔اس نے مصنوعی سیاروں کے ذریعے منظومہ شمسی کے پراسرارترین سیاروں تک رسائی حاصل کرلی ہے اور روز بروز عجیب وحیرت انگیزمعلومات حاصل ہورہی ہیں۔

الیکٹرونی دماغ اورکمپیوٹرکااستعمال عام ہورہاہےاوراعضاءکی پیوندکاری روزمرہ کامعمول بن چکی ہے۔

ممکن ہے یہ سب چیزیں سائنسدانوں اورانجینئروں کومغرور بنادیں لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہزاروں بلکہ کروڑوں دانش ور برسوں کی کوشش کے باوجودسرطان کا علاج دریافت نہیں کرسکےاور یہ مرض (یعنی ایک سرکش خلیہ) اپنی جگہ پرڈٹا ہوا ہے، پھرایک نئی بیماری ایڈز ہے جومائیکروب یابہت چھوٹے وائرس سے پیدا ہوتی ہے،اس نے سب کوحیرت زدہ کردیا ہے۔

یہ امرقابل توجہ ہے کہ یہ بیماری صنعت میں انتہائی ترقی یافتہ ملکوں سے ہی شروع ہوئی ہے جس سے افکار میں ایک زلزلہ برپا ہے۔ اس وقت انسان ایک لحظہ کے لیے اپنی کمزوری وناتوانی کی طرف متوجہ ہوجاتا ہےاوروہ سمجھتا ہے کہ خالق عظیم اوراس کی پرعظمت خلقت کے سامنے میری کیابساط ومجال ہے۔

اس بات سے انکارنہیں کیاجاسکتا کہ بہت سے لوگ ان حوادث ومصائب سے نصیحت حاصل نہیں کرتے، کوئی سبق نہیں سیکھتے، اپنے

انحرافی راستہ پر چلتے رہتے ہیں اور اپنے خیالات وتصورات میں مسلسل گم ہوئے جاتے ہیں۔لیکن مسلم ہے کہ ایک گروہ سبق حاصل کرتا ہے اور نتیجہ تک پہنچتا ہے، اپنی اصلاح کرتا ہے اور اس کو اہم اور قابل لحاظ فلسفہ تصور کرتا ہے۔

اشتباہ نہ ہونے پائے کہ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ تمام حوادث ومشکلات ومصائب اسی قبیل سے ہیں اور یہ بھی نہیں کہہ رہے ہیں کہ حوادث کے سامنے سر تسلیم خم کر لینا چاہیے اور مشکلات ومصائب کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہم کہہ رہے ہیں کہ بعض سخت ترین مشکلات ایسی درد ناک ہیں کہ انسان ان کی پیش بینی پر قدرت نہیں رکھتا اور نہ ان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ان میں سے بعض ہمارے محل بحث میں داخل ہیں اور ان کو بیدار کنندہ مصائب اور خبردار کرنے والے دردناک حوادث سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

قرآن اور بیدار کرنے والے مصائب

اب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ اس کے بارے میں کیا کہتا ہے یعنی عقل ودلیل کو نقل کی کسوٹی پر جانچیں اور اس کی تائید حاصل کریں۔

چونکہ قرآن ایک عظیم تربیتی کتاب ہے اور ہمارے موضوع بحث کا زیادہ تر تعلق بھی تربیت کے ساتھ ہے، قرآن نے اس بارے میں بہت سی باتیں کہی ہیں اور مختلف تعبیریں استعمال کی ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ [1]

''ہم نے کسی شہر یا آبادی میں پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اہل قریہ کو نافرمانی پر سختی اور پریشانی میں مبتلا کرلیا (تاکہ وہ اپنے آپ میں آئیں اور درگاہِ خدا) میں تضرع وزاری کریں۔'' (اعراف ۹۴) [2]

اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام کے بارے میں تکلیف دہندہ حوادث کا ایک فلسفہ ہے جو گناہوں میں غرق تھیں۔ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انہیں خبردار اور بیدار کیا جائے۔ان حوادث وانبیاء کی آمد میں اس لحاظ سے بھی قریبی تعلق ہے کہ ان کی دعوت کی قبولیت کی راہ ہموار ہوجائے اور تکوین وتشریع کی ہم آہنگی وارتباط ان کے نصائح کے اثرات کو اور قوی کردیں۔

(۲) ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ

---

[1] ''یضرعون'' کا مادہ ''تضرع'' ہے جس کا معنی خضوع اور ایسی حالت ہے جس کے ساتھ تواضع بھی ہو۔(اصل میں اس کا مادہ ''ضرع'' ہے جس کا مطلب پستان سے دودھ کا اترنا ہے۔

[2] اسی طرح کی آیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ انعام آیت ۴۲ ہے۔

بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴿۴۱﴾

''لوگوں کے انجام دیئے ہوئے کاموں کی وجہ سے خشکی اور دریا میں فساد واضح ہوگیا ہے تاکہ خدا انہیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ یہ لوگ پلٹ کر راستہ پر آجائیں۔'' (روم ۴۱)

یہ آیت دو جانب سے اقبال استفادہ ہے۔ ایک خود آوردہ آفات ومصائب اور دوسرے خبردار وہوشیار کرنے والے مصائب ہیں۔ ان مصائب وحوادث کی ہم آہنگی وارتباط تربیتی مسائل وخدائی نظام کو اور واضح کردیتی ہے۔

(۳) وَلَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴿۲۱﴾

''ہم ان کو بڑے عذاب (عذابِ آخرت) سے پہلے قریبی عذاب (عذابِ دنیا) کا مزہ چکھائیں گے۔ شاید وہ راہ راست پر لوٹ آئیں اور خدا کی طرف توجہ کریں۔'' (سجدہ ۲۱)

عذاب ادنیٰ کا مفہوم وسیع ہے، مفسرین نے اس کی تفسیر میں جو احتمالات دیئے ہیں ان میں سے اکثر اس مفہوم میں آجاتے ہیں (مصائب، دردورنج، مالی نقصان، خشک سالی، قحط وبھوک، جنگ میں شکست اور اس قسم کی چیزیں)۔ لیکن یہ خیال جس کو (بعض نے اختیار کیا ہے) کہ عذابِ ادنیٰ سے مراد عذاب قبر ہے۔ بظاہر آیت کے موافق نہیں ہے کیونکہ لعلھم یرجعون کا جملہ اس عذاب کا ہدف لوٹنا اور تجدید نظر قرار دے رہا ہے اور عذاب قبر کی صورت میں اس کا کوئی مفہوم نہیں ہوگا۔[1] (غور کریں)

(۴) آل فرعون کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں:

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ﴿۱۳۰﴾

''ہم نے آل فرعون (اور اس کے قریبی افراد) کو قحط، خشک سالی اور ثمرات کی کمی میں مبتلا کیا کہ شائد وہ نصیحت حاصل کریں۔'' (اعراف ۱۳۰)

اگرچہ یہ آیت آل فرعون کے بارے میں ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ کوئی مورد مخصص نہیں ہوتا اور یہ اس طرح کی دوسری اقوام کو بھی شامل ہے۔ خداوند قدوس بہت سی اقوام کو سخت ترین مشکلات میں مبتلا کرتا ہے تاکہ وہ غرور کی سواری سے اتریں، وہ بیدار ہوں اور حق کی طرف لوٹ آئیں۔

خاص بات یہ ہے کہ آیات مندرجہ بالا میں سے بعض میں ہدف وغرض تذکر ونصیحت حاصل کرنا، بعض میں تضرع اور بعض میں بازگشت ورجوع قرار دیا گیا ہے، درحقیقت یہ مختلف مراتب ہیں کہ جن میں خدا کی طرف لوٹنے کی صورتیں بیان ہوئی ہیں۔

---

[1] اسی طرح کا بیان سورۂ اعراف آیت ۱۶۸ اور سورۂ زخرف آیت ۴۸ میں بھی آیا ہے۔

پہلے انسان تذکر و نصیحت حاصل کرتا ہے، پھر درگاہِ خداوندی میں تضرع وزاری کرتا ہے اور بعد میں عملی طور پر اپنے راستہ کی درستی کرتا اور پھر اپنے خالق کی طرف لوٹ آتا ہے۔

ایک اور تعبیر کے مطابق مرحلہ اول فکر ہے۔ مرحلہ دوم ذکر اور تیسرا مرحلہ عمل ہے۔ اس طرح کے لطیف نکتے اسی وقت حاصل ہوسکتے ہیں جب آیات قرآن کو ایک دوسری کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے اور موضوعی لحاظ سے ان کی تفسیر کی جائے۔ اس وقت اس کتاب آسمانی سے تازہ پیغام حاصل ہوگا۔

البتہ تاریخ نشاندہی کرتی ہے اور قرآن صراحتاً کہتا ہے کہ بہت سی غلط کار و منحرف اقوام نے ان مصائب و مشکلات کے باوجود مثبت رویہ اختیار نہیں کیا، وہ لوگ بیدار نہیں ہوئے اور پرانی راہ پر ہی چلتے رہے حتی کہ سخت عذاب خداوندی نے انہیں تباہ کر دیا۔ چنانچہ سورۂ مومنون آیت ۷۶ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۷۶﴾

''ہم نے انہیں عذاب و مصائب میں مبتلا کیا ہے (تا کہ بیدار ہوں) مگر یہ نہ تو اپنے پروردگار کے سامنے جھکے ہیں اور نہ ہی انہوں نے اس کی درگاہ میں تضرع وزاری کی ہے۔''

لیکن ایسی اقوام بھی ہیں جنہوں نے مصائب و مشکلات کے بعد مثبت رویہ اختیار کیا یا ان اقوام میں ایسے بھی سرکش افراد تھے جنہوں نے سبق حاصل کیا اور ہدایت یافتہ ہوگئے۔ لہٰذا یہ مشکلات و مصائب بعض لوگوں کے لیے بیداری کا سبب بن گئے اور بعض کے لیے فقط اتمام حجت کا موجب بنے۔

اسلامی روایات میں حوادث بیدار کنندہ

اسلامی روایات میں بھی بعض روشن تعبیریں ہیں جن میں حوادث و مشکلات زندگی اور امورِ تربیتی میں باہم رابطہ کا نشان ملتا ہے۔ آپ دیکھیں گے ہم نے قرآن و عقل سے جو استفادہ کیا ہے یہ روایات ان کی تائید کرتی ہیں:

(۱) نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ کے ایک خطبہ میں ہم پڑھتے ہیں:

ان الله يبلى عباده عندالاعمال السيئة بنقص الثمرات و حبس البركات و اغلاق خزائن الخيرات ليتوب تائب ويقلع مقلع ويتذكر متذكر و يزدجر مزدجر!

''اللہ سبحانہ اپنے بندوں کو ان کی بداعمالیوں کے وقت پھلوں کو کم کرنے، برکتوں کے روک لینے اور انعامات کے خزانوں کو بند کرنے سے آزماتا ہے تا کہ توبہ کرنے والا توبہ کرے، انکار و سرکشی سے باز آنے والا باز آجائے اور

نصیحت وعبرت حاصل کرنے والا نصیحت وعبرت حاصل کرے اور گناہوں سے رکنے والا رک جائے۔[1]

(۲) امیرالمومنینؑ کی ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

ان البلاء للظالم ادب للمومن امتحان وللنبیاء درجة وللاولیاء کرامة

''بلا ومصیبت ظالم کے لیے ادب، مومن کے لیے امتحان، انبیاء کے لیے درجہ اور اولیاء خدا کے لیے کرامت و عظمت ہے۔''[2]

(۳) ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

المومن لا یمضی علیه اربعون لیلة الا عرض له امر یحذنه یذکربه

''چالیس روز مومن پر نہیں گزرے مگر یہ کہ غم واندوہ کا کوئی واقعہ پیش آئے تا کہ اس کے لیے تذکر ونصیحت اور بیدار کرنے کا موجب بن جائے۔''[3]

(۴) امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک اور حدیث میں ہے:

اذا اراد الله عزوجل بعبد خیرا فاذنب ذنبا تبعه بنقمة فنذکره الاستغفار، واذا اراد الله عزوجل بعبد شرا فا ذنب ذنبا تبعه بنعمة لینسیة الاستغفار ویتمادی به و هو قول الله عزوجل سنستدرجهم من حیث لا یعلمون۔ بالنعم عند المعاصی!

''جب خداوند قدوس کسی انسان کے لیے سعادت وخوش بختی چاہتا ہے تو اگر وہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے بعد خدا اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے تا کہ توبہ واستغفار کرے اور جب (کسی آدمی کی سرکشی وطغیان) کی وجہ سے خدا اس کو سعادت کی (توفیق) نہیں دینا چاہتا تو گناہ کے بعد نعمت دے دیتا ہے تا کہ وہ توبہ واستغفار کو بھول جائے اور اپنے غلط راستہ پر گامزن رہے۔ یہ وہی بات ہے جس کا ذکر خدا نے فرمایا ہے: ہم درجہ بدرجہ

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۴۱ (اردو)

[2] بحارالانوار جلد ۶۴ ص ۲۳۵ حدیث ۵۴

[3] بحارالانوار جلد ۶۴ ص ۲۱۱ حدیث ۱۴

ان کو عذاب کی طرف لیے جا رہے ہیں جب کہ انہیں علم نہیں اس طرح کہ وہ معصیت کرتے ہیں اور ہم انہیں نعمتیں دیتے ہیں۔''[1]

(۵) اس بحث کو امیر المومنینؑ کے ایک فرمان کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں کہ فرمایا:

اذارایت الله سبحانه یتابع علیك البلاء فقد ایقظك اذارایت الله سبحانه یتابع علیك النعم مع المعاصی فهو استدراج لك

''جب تو مشاہدہ کرے کہ (گناہ کے ارتکاب کے بعد) خدا مصائب بھیج رہا ہے تو گویا اس نے تجھے بیدار کیا اور جب خداوند قدوس نافرمانیوں کے بعد نعمتوں سے نوازے تو یہ ایک طرح کا عذاب تدریجی ہوگا۔''[2]

مشکلات وسیلہ آزمائش

ہمیں معلوم ہے کہ خدائی امتحان اور انسانی آزمائش میں فرق ہے۔ انسان اس لیے کسی شخص کا امتحان لیتے ہیں یا کسی چیز کی طرف اقدام کرتے ہیں تا کہ مجہولات ان کے لیے روشن ہو جائیں۔ یعنی امتحان کے ذریعے اس شخص کی عظمت، ہمت اور استعداد و خصوصیات معلوم ہو جائیں۔ لیکن تمام جہانِ ہستی (زمین، آسمان اور ماوراء آسمان) کوئی اندرونی و بیرونی چیز خدا سے مخفی و پوشیدہ نہیں تا کہ امتحان کے ذریعے وہ اس کا علم حاصل کرے۔

خدائی امتحان میں تربیت کا پہلو پایا جاتا ہے یعنی جیسے سونے کو بھٹی میں ڈالا جاتا ہے تا کہ آگ کے ذریعے ناخالص حصہ جل جائے اور خالص باقی رہ جائے یا فوج کے جوانوں کو سخت اور مشقت کے کاموں میں ڈالا جاتا ہے تا کہ ان کی کارکردگی کی سطح بلند ہو جائے۔ پس خدائی امتحان کی بھی یہی صورت ہے۔

یہ امتحان انسان کو زیادہ ثابت قدم، آگاہ تر اور خالص تر بنا دیتا ہے، خلاصہ کلام یہ کہ خدائی امتحان تکامل روح اور جسم کی پرورش کا وسیلہ ہے۔

لہٰذا کوئی تعجب نہیں کہ زندگی کے بعض مصائب و مشکلات اسی امتحان و آزمائش ہی کے لیے آتے ہوں (ہم پھر تکرار کرتے ہیں کہ سب کے سب نہیں، بعض مصائب امتحان کے طور پر ہوتے ہیں۔ کوئی ملت، صنعتی، عسکری اور عملی پیش رفت نہیں کر سکی جب تک اس نے مشقت نہیں اٹھائی۔ معروف فلسفی و معروف تاریخ دان (ٹوائن بی) کے بقول بہترین تمدن اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک بیرونی دشمن کسی ملت پر ہجوم و حملہ نہ کرے۔ (یہی وہ وقت ہوتا ہے جب یہ ملت اپنی تمام استعداد و قوت کو بروئے کار لاتی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے ظاہر کرتی ہے

---

[1] اصول کافی جلد ۲ ص ۴۵۲ باب استدراج حدیث ۱

[2] غرر الحکم نقل از المیزان الحکمۃ جلد اول البلاء مذکر ص ۴۸۹

تا کہ دشمن کا مقابلہ کر سکے)۔

وہ کمانڈر جو خود جنگ کے آگ کے شعلوں میں داخل ہوتے ہیں وہی طاقت ور اور کامیاب ہوتے ہیں۔ جو تاجر شدید اقتصادی بحران کا شکار ہوتے ہیں وہی بہترین تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ سیاست دان جو بحرانوں سے گزر کر آتے ہیں وہی آزمودہ کار اور طاقت ور سیاست دان ہوتے ہیں۔ انقلابی افراد قید خانوں اور شکنجوں سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ضرور قید خانہ و زندان میں جائیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ زندان ان کو زیادہ ثابت قدم اور باعظمت بنا دیتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان تجزیوں اور مثالوں سے تربیت و تکامل انسان کے ساتھ مشکلات و مصائب زندگی کا رابطہ روشن و واضح ہو گیا ہے۔ البتہ یہاں خود ساختہ مصائب کو علیحدہ رکھیں اور جو کچھ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس کو مشکلات و مصائب کا مقابلہ ترک کرنے کا بہانہ نہ سمجھ لیا جائے۔

(۵) قرآن اور سخت امتحان

اب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے اور دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ مختلف آیات میں دہرایا گیا ہے:

(۱) وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

''ہم تو برائی اور اچھائی کے ذریعہ تم سب کو آزمائیں گے اور تم سب پلٹ کر ہماری بارگاہ میں لائے جاؤ گے۔''

(انبیاء ۳۵)

یہاں شر و خیر کے معنی میں بڑی وسعت ہے، یہ ہر قسم کے مصائب، بیماریاں، مشکلات، گرفتاری، فقر و فاقہ اور اسی طرح کامیابی و کامرانی، صحت و سلامتی اور تونگری جیسے سب عنوانات کو شامل ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ امتحانی موارد میں شر کو خیر سے پہلے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ مصائب و مشکلات کے ذریعہ آزمائش سخت تر، مشکل تر اور زیادہ وسیع ہوتی ہے۔ (البتہ یہ فراموش نہ ہو کہ شر و رجنبہ نسبی رکھتے ہیں)۔

''والینا ترجعون'' کا جملہ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ دنیا ہی دارِ امتحان و آزمائش ہے۔ دار بقاء اور ہمیشگی کی جگہ امتحان کا مقام نہیں ہے۔

بہرحال یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ بعض مصائب امتحان کے بطور آتے ہیں تا کہ انسان کے صبر و حوصلہ کی آزمائش ہو سکے جیسا کہ بعض نعمتیں مقام شکر کا ذریعہ آزمائش ہوتی ہیں۔

(۲) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

''اور ہم یقیناً تمھیں خوف، بھوک اور اموال، نفس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے اور اے پیغمبر آپ صبر

کرنے والوں کو بشارت دے دیں۔'' (بقرہ ۱۵۵)

اس آیت میں پانچ قسم کے مصائب کو امتحانی عنوان قرار دیا گیا ہے۔

(۱) ملک میں خوف اور بدامنی جو سب سے زیادہ اہم ہے۔(خوف)

(۲) بھوک(جوع)

(۳) مال میں کمی(نقص من الاموال)

(۴) موت(والانفس)

(۵) پھر زراعت کی آفات جن سے ثمرات کی کمی اور اناج کی کمیابی ہوتی ہے۔(والثمرات)

اس ضمن میں یہ آیت نشاندہی کر رہی ہے کہ ان امتحانات میں انسان کی مقاومت واستقامت کا درجہ بالا وبلند ہوتا ہے اور وہ امتحان کی بھٹی سے کھرا سونا بن کر نکلتا ہے۔(توجہ رہے ثمرات کی کمی سے اولاد کا مرجانا بھی مراد ہوسکتا ہے کیونکہ اولاد میوۂ دل ہے)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مفہوم وسیع ہو اور ثمرات واولاد دونوں کو شامل ہو، اسی طرح بعض تفاسیر میں نقص النفس سے موت کے علاوہ بیماری بھی مراد لی گئی ہے۔

حقیقتاً بہترین عطایا ونعمات حیات امن وامان، افرادی قوت، اموال اور ذرائع پیداوار ہوتے ہیں۔ خداوند قدوس ان آفات سے جو ان چیزوں پر آتی ہیں۔ انسان کو آزماتا ہے تاکہ اس کا صبر واضح وآشکار ہوجائے۔

بشیء کی تعبیر اس معنی کی زندہ گواہ ہے کہ ہر بدامنی، بھوک اور موت آزمائش وامتحان نہیں ہوتیں، بلکہ بعض مواقع میں یہ صورت ہوتی ہیں۔ چنانچہ خود آور وہ مصائب اور ایسی مشکلات جو جہالت، نادانی، سستی اور غفلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں وہ ہرگز امتحان میں شامل نہیں۔ لہٰذا یہ چیز نادان گروہ کے لیے کوشش ومحنت کے ترک کردینے کا بہانہ نہ بن جائے اور یہ ان کی سستی، کاہلی اور غفلت کا پیشہ خیمہ نہ بننے پائے۔

(۳) وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝

''اور جب آزمائش کے لیے اس کی روزی کو تنگ کردیا گیا تو کہنے لگا کہ میرے پروردگار نے میری توہین کی ہے۔'' (فجر ۱۶)

بے شک یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو میدان آزمائش میں سستی وکمزوری دکھاتے ہیں اور اس قدر کم ظرف ہیں کہ جب نعمت ان کو مل جائے تو مغرور ہوجاتے ہیں اور تھوڑی سی مصیبت آجائے تو مایوس ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ آیت بہرحال اس بات کی واضح دلیل ہے کہ بعض مشکلات زندگی کا مقصود امتحان ہوتا ہے۔

(۴) هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝

''اس وقت مومنین کا باقاعدہ امتحان لیا گیا اور انہیں شدید قسم کے جھٹکے دیئے گئے۔'' (احزاب ۱۱)

یہ آیت جنگ احزاب کا عجیب واقعہ بتا رہی ہے کہ جو صدرِ اسلام میں آزمائش الٰہی کا بہت بڑا میدان تھا۔ اس دن احزاب کا بیشمار لشکر اوپر نیچے سے مدینہ پر حملہ آور ہوا اور مسلمانوں کی قلیل تعداد کو انگشتری کے نگین کی طرح محاصرہ میں لے لیا۔ مدینہ میں موجود منافق عہد شکنی کے مرتکب ہوئے اور ہر جہت سے سختی اور بے چینی کی صورت پیدا ہوگئی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جانیں لبوں پر آنے لگیں اور دل گلے میں آ گئے۔ وبلغت القلوب الناجر (احزاب ۱۰)

قرآن کہتا ہے: یہ بہت بڑی مصیبت اور طوفان عظیم تھا جس نے مومنین کی جماعت میں زلزلہ برپا کر دیا، یہ خدائی امتحان تھا۔ گویا جو کچھ اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ واقعہ اس کی تائید کرتا ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس حقیقت (بعض مصائب امتحان خدائی ہوتے ہیں) کی طرف اشارات ملتے ہیں:

(۱) ایک حدیث جس کو کسی مناسبت کی وجہ سے پہلے بھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ

"ان البلاء للظالم ادب وللمومن امتحان....."

''مصائب ومشکلات ظالم کے لیے تادیب اور مومن کے لیے امتحان ہیں۔''[۱]

(۲) امیر المومنینؑ نے انبیاء کی تعریف کرتے ہوئے ایک خطبہ میں فرمایا:

"قد اختبرهم الله بالمخمصة وابتلاهم بالمجهدة وامتحنهم بالمخاوف ومخضهم بالمكاره۔"

''جنھیں اللہ نے بھوک سے آزمایا، وقت ومشقت میں مبتلا کیا اور خوف وخطر کے موقعوں میں خالص کیا تا کہ امتحان میں سرخرو ہوں۔''[۲]

(۳) اسی خطبے میں عام لوگوں کے بارے میں ایک اور تعبیر میں فرمایا ہے:

"ولكن الله يختبر عباده بأنواع الشدائد و يتعبدهم بأنواع المجاهد ويبتليهم بضروب المكاره۔"

''لیکن اللہ سبحانہ اپنے بندوں کو گوناگوں سختیوں سے آزماتا ہے، ان سے ایسی عبادات کا خواہاں ہے جو طرح طرح کی مشقتوں سے بجالائی گئی ہو اور انہیں قسم قسم کی ناگواریوں سے جانچتا ہے۔''[۳]

---

[۱] بحار الانوار جلد ۶۴ ص ۲۳۵، ص ۵۴

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ (قاصعہ اردو)

[۳] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ (قاصعہ اردو)

(۶) مصائب میں نعمت کی پہچان

کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ جب نعمت موجود ہوتو غالباً دل میں اس کی وقعت نہیں ہوتی، اس سے لذت حاصل نہیں ہوتی اور اس نعمت کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا اور کبھی تو اس کے اصل وجود کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔

ماہیان ندیدہ غیر از آب
پرس پرساں زہم کہ آب کجاست

اگر انسان کبھی بیمار نہ ہوتو صحت وسلامتی کی نعمت اس اہمیت وعظمت کے ساتھ، جو اس کے اندر ہے، ایک عطیہ خداوندی کے عنوان سے متصور نہیں ہوگی۔ اگر کبھی کبھی زمین میں زلزلہ نہ ہوتو اس عجیب قسم کے آرام وراحت کا علم تک نہ ہو جو پورے سال میں اس کے اندر ہے اور اس کے سایہ میں انسان اپنی پسند کی زندگی گزار رہا ہے۔

نور وظلمت جب ایک دوسرے کے بعد آئیں تو ان کی پہچان ہوتی ہے، اگر کبھی کبھی حوادث کا طوفان افکارِ انسان کے سمندر میں تلاظم پیدا نہ کرے تو آرام کی گھڑیوں کا ادراک بھی نہیں ہوگا۔

باریک ترین تعبیر کے مطابق بعض مشکلات زندگی کی روشنیوں کا سایہ ہوتی ہیں کہ ان کے بغیر انسان کسی چیز کو دیکھنے پر قادر ہی نہیں ہوگا۔ آج کے دانشور کہتے ہیں اگر کرہ نما کمرہ کے درمیان ایک کروی چیز رکھ دی جائے جس کے تمام اطراف وجوانب میں روشنی ہی روشنی ہوتو وہ کروی چیز اصلاً نظر ہی نہیں آئے گی۔ یہ سطح جسم کی ناہمواری اور زاویہ ہائے نور کا اختلاف ہوتا ہے جس سے کوئی جسم انسان کے لیے قابل رویت ہوسکتا ہے۔ خدا کی نعمات کی یہی صورت بینہ اور واضح ہے۔ اگر چیزیں ایک ہی حالت کی اور ایک جیسی ہوں تو ہرگز ان کی شناخت و پہچان نہیں ہو سکے گی۔

چونکہ خدا نے یہ عظیم عطایا ونعمات ایک طرف انسان کے فائدہ کے لیے پیدا کی ہیں اور دوسری طرف شکر نعمت سے انسان کے اس ذات پاک کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا منطقی بات ہے کہ کبھی کبھی اس میں تحرک اور قبض و بسط ہونا چاہیے تا کہ مندرجہ بالا دونوں ہدف بہتر انداز میں حاصل ہوسکیں۔

آیات قرآن مجید میں بھی اس حقیقت کی طرف عمدہ اور عجیب اشارات ملتے ہیں (اگرچہ صراحت نہیں) کہ نعمات کی عظمت اس وقت ہی ظاہر ہوتی ہے جب لمحات سلب نعمت کے ساتھ ان کا مقائسہ کیا جائے ان میں سے بعض مقامات یہ ہیں:

(۱) قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾

''کہہ دے کہ خدا ہی تمہیں ان تمام بری و بحری ظلمات سے نجات دینے والا ہے جب کہ اسے ظاہر و پوشیدہ

پکارتے ہو کہ اگر خدا ہمیں اس سے رہائی بخشے تو ہم ضرور شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔'' (انعام ۶۳)

ہاں! یہ لوگ جب تک دریا وصحرا کی ہولناک تاریکی میں گرفتار نہیں ہوئے، روشنی اور امن وامان کی عظمت و واقعیت کو نہیں جانتے تھے۔لیکن جب یہ نعمات سلب ہوئیں تو مبداومنبع نعمت کا تصوران کے ذہن میں آیا اور انہوں نے اس کی شکرگزاری پر آمادگی ظاہر کی۔

(۲) وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰

''اور اگر ہم انسان کو تکلیف کے بعد نعمت وآرام کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ اب تو ہماری ساری برائیاں چلی گئیں اور وہ خوش ہو کر اترانے لگتا ہے۔'' (ہود ۱۰)

قرآن مجید میں بے آرامی کے بعد نعمت کا تذکرہ اس لیے ہے کہ نعمت کی اہمیت کو بخوبی واضح کرے اور بندوں کی شکرگزاری کا سبب بن جائے، اگرچہ مغرور اور خود پسند لوگ اس کی تفسیر کچھ اور کرتے ہیں۔

(۳) وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ

''اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی تو تم اس نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔'' (آل عمران ۱۰۳)

قرآن مجید اس آیت میں نعمت اتحاد اور تالیف قلوب کی اہمیت کا ادراک کراتا ہے، وہ زمانہ یاد دلایا جب کہ یہ نعمت کلی طور پر ناپید تھی اور اختلاف ونفاق کی آگ ہر چیز کو جلائے دے رہی تھی۔(اس نعمت کا تذکرہ مسلمانوں کے سامنے کیا تا کہ وہ ان دونوں کا باہمی مقائسہ کریں اور اس نعمت الٰہی کی واقعی عظمت کو پہچانیں۔

اسلامی روایات میں بھی بعض مصائب وآلام کے بارے میں اشارات ملتے ہیں، ان میں سے بعض مقامات یہ ہیں: مشہور ومعروف حدیث مفضل میں امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے:

"ان هذه الافات و انكانت تنال الصالح و الطالح جميعا فان الله جعل ذلك صلاحا للصنفين كليهما اما الصالحون فان الذى يصيبهم من هذا يردهم (يذكرهم) نعم ربهم عند هم فى سالف ايامهم فيحد وهم ذلك على الشكر والصبر و اما الطالحون فان مثل هذا اذا نالهم

کسر شرتهم وردعهم عن المعاصی والفواحش۔"

"یہ مصائب وآفات نیک وبد ہر کسی کو پہنچتی ہیں، لیکن خدا نے ہر گروہ کے لیے ان کو اصلاح کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ بہر حال نیک لوگ ان مصائب کی وجہ سے گذشتہ نعمتوں کو یاد کرتے اور شکر سے کام لیتے ہیں۔ لیکن غلط کاروں کو جب یہ مصائب لاحق ہوتے ہیں تو ان کی شرارتوں کا زور توڑ دیتے ہیں اور وہ لوگ معاصی اور برائیوں سے باز آ جاتے ہیں۔"[1]

(۷) جہانِ ہستی میں خیر وشر کی موقعیت

ہم نے ذکر کیا ہے کہ جو مسائل مسئلہ عدالت خداوندی میں شک وتردید کا سبب بنتے ہیں ان میں سے ایک دو عالم یعنی (خیر وشر) کا نظریہ ہے۔ اس سے عدالت ہی میں اشکال نہیں بلکہ کبھی اصل وجود خالق بھی زیر سوال آ جاتا ہے۔

یہ مسئلہ مباحث فلسفہ وکلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انسان جب بھی اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ اسے ایک طرح کے ابہام و تاریکی میں پاتا ہے۔ لیکن حوصلہ کرتے ہوئے جتنا آگے جاتا اور مختلف گتھیوں کو سلجھاتا ہے تو اس کے سامنے تازہ اور روشن افق ظاہر ہوتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر وہ خیر وشر کا معمہ حل کر کے سکون واطمینان حاصل کرتا ہے۔ اس راستہ میں اور اس معمہ کو حل کرنے کے لیے نکاتِ ذیل کی طرف ضرور توجہ کرنا چاہیے۔

(۱) خیر وشر کیا ہے؟

"خیر" اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہمارے وجود کے لیے مناسب اور اس کی پیش رفت وتکامل کا سرمایہ ہے۔ "شر" وہ چیز ہے جو ہمارے لیے مناسب نہیں اور ہمارے انحطاط وپسماندگی کی اساس وبنیاد ہے۔ اس سے بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ خیر وشر دونوں نسبی چیزیں ہیں، ممکن ہے ایک چیز ہمارے لیے خیر ہو اور دوسروں کے لیے شر ہو یا تمام انسانوں کے لیے خیر ہو اور بعض حیوانات کے لیے شر ہو۔

مثلاً فضاء آسمان میں بادل ظاہر ہوتا ہے اور بارش برساتا ہے، اس سے کھیت آباد ہوتے ہیں اور درخت میوہ دار ہو جاتے ہیں جب کہ یہی بارش سیلابی علاقہ میں تباہی کا سبب بن جاتی ہے یا پرندوں کے گھونسلے مختصر بوندا باندی سے ہی تباہ ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ ہمارے لیے نظافت ہوا کا موجب بنتی ہے۔ اس مقام پر ہر گروہ اپنے وجود اور اپنے منافع کے عنوان سے اس چیز کو دیکھتا ہے، نسبت قائم کرتا ہے اور اس کا نام خیر یا شر رکھتا ہے۔

اس بیان سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کسی حادثہ کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ وہ خیر ہے یا شر، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۳۹

چاہیے کہ تمام آثار کو تمام علاقوں، تمام زمانوں، خواہ زمانہ حال ہو یا استقبال، نیز گذشتہ ادوار میں اس کے جو اسباب تھے ان سب پر نظر ڈالیں تاکہ ہم کہہ سکیں کہ مجموعی طور پر اس سے ہونے والے نقصانات اس سے حاصل ہونے والے فوائد سے زیادہ ہیں، اس کے پیش نظر ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس طرح کا فیصلہ کرنا سہل نہیں ہے۔

ایک اور لحاظ سے خیر و شر کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) خیر مطلق

(۲) شر مطلق

(۳) خیر و شر نسبی

''خیر مطلق'' وہ ہے جس میں کوئی منفی پہلو نہ ہو، اس کے برعکس ''شر مطلق'' وہ ہے جس میں کوئی مثبت پہلو نہ ہو۔ لیکن ان دونوں کے لیے خارج میں بہت کم مصداق پائے جاتے ہیں۔ غالباً ہم ان اشیاء، حوادث اور واقعات سے دو چار ہوتے ہیں جن میں مثبت و منفی پہلو ملے ہوتے ہیں۔ پس جس میں مثبت اثرات زیادہ ہوں اسے خیر کہہ دیا جاتا ہے اور جس میں منفی اثرات زیادہ ہوں اسے ''شر'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جس چیز میں مثبت و منفی ہر دو پہلو مساوی ہوں وہ نہ ''خیر'' ہے، نہ ''شر'' ہے۔

البتہ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ممکن ہے اشخاص و اقوام کے لحاظ سے مثبت و منفی پہلوؤں میں فرق پڑ جائے۔ اس میں اہم بات یہ ہے کہ آخری فیصلہ تبھی ہو سکتا ہے جب ایک حادثے کے ان آثار پر نظر رکھی جائے جو آج کی دنیا میں اور پھر ہر زمان و مکان میں اس سے ظاہر ہوں۔

ایک خدا پرست انسان کے نکتہ نظر سے ان بہت سی اقسام میں سے صرف دو ہی امکان رکھتی ہیں یعنی ''خیر محض'' اور وہ جس میں ''خیر کا پہلو غالب ہو''۔ لیکن جہاں تک ''شر مطلق'' یا شر کا پہلو غالب ہونے یا خیر و شر کے مساوی پہلوؤں کا سوال ہے، تو ایسا حادثہ اس خدائے حکیم کی طرف سے ظاہر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ذات حکیم علی الاطلاق ہے۔ لہٰذا اس کی طرف سے شر کی ان تینوں اقسام کا صدور قبیح اور غیر ممکن ہے۔

(۲) کیا شرور میں عدم کا پہلو ہے؟

فلسفیوں اور دانش مندوں کے مابین یہ قول معروف ہے کہ اگر ''شر'' کا انتہائی تجزیہ کیا جائے تو یہ ایک ''امر عدمی'' (یا ایک امر وجودی جو عدم کی اصل ہے) تک جا پہنچتا ہے۔ شاید وہ پہلا شخص افلاطون ہے جس نے یہ نظریہ پیش کیا اور ''شر'' کو بعنوان ''عدم'' متعارف کرایا۔ بناء بریں اس کا نقطہ مقابل یعنی ''خیر'' بجز ''وجود'' کے کچھ اور نہیں ہے، وجود جتنا وسیع اور کامل ہوگا اتنا ہی اس میں خیر کا پہلو زیادہ ہوگا یہاں تک کہ بات خدا کے وجودِ مطلق اور لامحدود تک چلی جائے گی جو تمام خیرات و برکات کا سرچشمہ اور ''خیر محض'' ہے۔

شرور کے عدمی ہونے کو واضح کرنے کے لیے عموماً یہ سادہ سی مثال پیش کی جاتی ہے کہ ہم کہتے ہیں: ''ایک بے گناہ انسان کا سر کاٹنا شر ہے۔'' لیکن ہم غور کرتے ہیں کہ کون سی چیز شر ہے؟ آیا قاتل کا زور بازو، یا چھری کی تیزی اور کاٹ، یا مقتول کی گردن کی اثر پذیری و نرمی کہ جس کی بدولت گردن ہر طرف حرکت کرنے کے لائق ہے؟ بے شک ان میں سے کوئی ایک بھی ذاتی طور پر شر و نقص نہیں ہے۔ ان میں سے جو چیز شر

ہے وہ صرف گردن کی ہڈیوں، پٹھوں اور رگوں کی باہمی جدائی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جدائی وعلیحدگی ایک امر عدمی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

اسی طرح ایک امر وجودی جیسے زہر آلود غذا موت کا سبب بن جاتی ہے جو ایک امر عدمی ہے اور اسی دلیل کی بنا پر وہ شر ہے۔ یا جراثیم کہ جو ایک امر وجودی ہیں وہ ''بیماری'' کا باعث بنتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ موت دراصل عدم حیات اور بیماری بجز صحت کے چلے جانے کے کچھ نہیں ہے۔ اس سے ایک مشہور سوال کہ شرور کو کس نے پیدا کیا، کا جواب سب کے لیے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب ''شرور'' امورِ عدمی ہیں تو اصولی طور پر ان کو پیدا کرنے اور وجود میں لانے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ہاں! وہ امور جو بظاہر وجہ عدم بنتے ہیں (جیسے زہر آلود غذا)۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ اگر ان میں خیر وشر مساوی ہے یا شر غالب ہے یا وہ شر مطلق ہیں تو خدائے تعالیٰ کے حکیم ہونے کے پیش نظر اس بات کا امکان ہی نہیں کہ ان کو لباس وجود پہنایا جائے گا۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ''شر مطلق'' اصل میں ''عدم مطلق'' کے مساوی ہے جو ہرگز وجود خارجی نہیں رکھتا، کیونکہ اصطلاح میں عدم مطلق وجود کی ضد ہے۔

لیکن ''شر نسبی'' (وہ چیز جس میں ایک پہلو سے شر اور دوسرے پہلو سے خیر پائی جائے) یقیناً وجود رکھتی ہے، یا بالفاظ دیگر یہ وجود و عدم کا آمیختہ ہے۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے صرف شر نسبی ہی خدا کی حکمت کے ساتھ سازگار ہے اور یہ وہ چیز ہے جس میں خیر کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ (غور کریں)

(۳) شرور سے ظاہر ہونے والے خیرات

خیر وشر کے نسبی ہونے اور چیزوں کی باہمی تاثیر پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے حوادث ایسے ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر شر شمار ہوتے ہیں لیکن وہ بہت سی خیرات و برکات کا سرچشمہ ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی محرومیاں اور ناکامیاں کئی خفیہ صلاحیتوں کی بیداری اور عظیم کارناموں کے انجام پانے کا سبب بن جاتی ہیں کیونکہ انسان کسی نہ کسی صورت محرومی کی تلافی کے لیے قدم اٹھاتا ہے اور اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے، یہی کاوشیں بعض علمی و معاشرتی ترقیوں کی بنیاد بنتی ہیں۔ چنانچہ بہت سی ناکامیاں بڑی بڑی ایجادات کا موجب اور بہت سی خامیاں اور غلطیاں نئے فوائد و منافع کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

وہ جڑی بوٹیاں جو پتھریلی زمین میں اگتی ہیں اور وہ درخت جو وسیع بیابانوں میں پیدا ہوتے ہیں جہاں پانی وغیرہ کی قلت ہوتی ہے۔ ان کی لکڑی مضبوط ہونے کے ساتھ جلنے میں زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ لیکن سرسبز میدانوں اور دریاؤں کے کناروں پر پیدا ہونے والی بوٹیاں اور درخت ایسے نہیں ہوتے، ان کی لکڑی کمزور ہوتی ہے اور وہ جلنے میں بھی اچھی نہیں ہوتی۔ انسانوں میں یہی قانون کارفرما ہے۔ یعنی صحرائی لوگ میدانی علاقے کے لوگوں سے زیادہ تندرست و توانا ہوتے ہیں۔ وہ صحرانشیں جو ہمیشہ مشکلوں سے نبرد آزما رہتے ہیں یا دیگر وحشی جانوروں کے درمیان زندگی گزارتے ہیں وہ بڑے شجاع اور جری ہوتے ہیں مگر وہ لوگ جو بڑے شہروں میں انواع و اقسام کی نعمتوں اور سہولتوں میں بسر کرتے ہیں، ان پر مشکل آ پڑے تو وہ ہمت ہار دیتے ہیں۔

قرآن مجید اس بارے میں ایک دلآویز بیان دے رہا ہے:

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۵ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۶

''بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے، یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔'' (الم نشرح ۵،۶)

اس آیت میں اشارہ ہورہا ہے کہ تنگی و آسانی میں بعض اوقات اتنا قرب ہوتا ہے گویا کہ یہ ایک جگہ پر موجود ہوں، جیسا کہ لفظ ''مع'' سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ''عسر'' الف لام کے ہمراہ ''یسر'' کے ساتھ اسم نکرہ کے طور پر آیا ہے، یہاں اس کے ذریعے اظہارِ عظمت مراد ہے یعنی تنگی و سختی کے ساتھ بہت سی آسانیاں وابستہ ہیں۔

بعض مورخوں نے آغاز اسلام میں مسلمانوں کی تیز رفتار ترقی وعروج کا سبب ان کی اسی پر صعوبت زندگی کو قرار دیا ہے جس میں وہ پلے بڑھے تھے اور شجاع و جری لوگوں اور تلواروں کی جھنکاروں میں زندگی گزارے ہوئے تھے جب کہ بعد کی صدیوں میں مسلمانوں کی پسماندگی کا ایک سبب ان کی پرآسائش زندگی اور قسم قسم کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا بھی ہے۔ ہم اپنی اس گفتگو کو اس بارے میں بعض بزرگ دانشوروں کی گواہیوں کے ساتھ اختتام تک پہنچاتے ہیں۔

ایک عرب مولف کہتا ہے: میرا خیال یہ نہیں کہ ہر شخص لازماً مصیبت اٹھائے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مصیبت غالباً فائدے کا پہلو رکھتی ہے بلکہ یہ انسان کی ایک ضرورت ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ انسان یہ جانتا ہو کہ مشکلات کا مقابلہ کس طرح کیا جائے اور وہ ان امور کو زندگی کے اساسی اور سبق آموز کاموں میں شمار کرے۔ [1]

یہ بات بڑی دقیق ہے کہ انسان مصائب کی طرف نہ بڑھے یا ان کے مقابلے میں خاموش رہے اور ان کا مقابلہ نہ کرے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ بعض ناگہانی مصائب کہ جن کا سامنا کرنے کی قوت ہم میں نہ ہو، وہ ایسے عوامل بن جاتے ہیں جن سے ہماری زندگی میں تعمیر و ترقی کا پہلو نکل آتا ہے۔

مشہور فرانسیسی فلسفی وحکیم الیکسس کارل اپنی کتاب ''انسان موجود ناشناختہ'' میں یوں رقم طراز ہے: ایسے افراد کہ جو دولت مند ہیں اور ہر حیثیت سے قوت و طاقت کے مالک ہیں، وہ اپنی زندگی آرام وچین سے گزارتے ہیں۔ پھر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے بیٹے اپنے باپ کی ثروت مندی کا سہارا لے کر کاروبار سے پہلوتہی کریں اور اس طرح اپنے نفس کی کمزوری اور اپنی صلاحیت کار کی نابودی کا سامان فراہم کریں۔ [2]

اس کے برعکس بہت سے افراد ہیں جن کے فرزندان تنگی و سختی میں پرورش پاتے ہیں لیکن وہ زندگی میں قابل ذکر کامیابیاں اور اونچے مقامات حاصل کرتے ہیں۔ ہم اپنی اس بحث کو امیرالمومنین امام علی مرتضیٰ علیہ السلام کے اس فرمان کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

امیرالمومنینؑ سے پوچھا گیا: یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپؑ نے ایسی سادہ اور بے ذائقہ غذا سے عرب کے نامی بہادروں کے مقابلہ کی

---

[1] زمر موفقیت

[2] انسان موجود ناشناختہ صفحہ ۱۵۲

قوت حاصل کی؟ آپؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

"الا و ان الشجرة البرية اصلب عودا، والرواقع الخضرة ارق جلودا، والنابتات العذية اقوى وقودا و ابطاء خمودا۔"

''آگاہ رہو کہ صحرائی درختوں کی لکڑی سخت ہوتی ہے لیکن وہ سدا بہار درخت جو ہمیشہ کنارِ آب پر رہتے ہیں اور ان کی چھال نازک اور کمزور ہوتی ہے، وہ پودے جو صحرا میں بارش کے سوا پانی نہیں پاتے، جلنے میں ان کا شعلہ بلند اور حرارت دیر پا ہوتی ہے۔''[1]

تانبیند رنج و سختی مرد، کی گرد و تمام
تا نیاید باد و باراں گل کجا بو یا شود؟
مالش صیقل نشد آئینہ رانقص جمال
پشت پاہرکس خورد درکارِ خود بینا شود!

(۴) قرآن میں خیر وشر کا تذکرہ

قرآن مجید میں خشر وشر کے معنی وسیع اور مصادیق مختلف ہیں جن میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ قرآن میں ''خیر'' بمعنی ''مال'' (بقرہ ۱۸۰) ''خیر'' بمعنی ''علم'' ودانش (بقرہ ۲۶۹) ''خیر'' بمعنی ''جہاد'' (نساء ۱۹) ''خیر'' بمعنی ''اعمال صالحہ'' (نساء ۱۴۹) ''خیر'' بمعنی ایمان (انفال ۲۳) اور ''خیر'' بمعنی ''قرآن'' (نحل ۳۰) میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ ''خیر'' بمعنی افرادِ صالح، گمانِ خوب، فرزند صالح اور باغ وزراعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ لفظ ''خیر'' قرآن میں بصورت مفرد ۱۷۶ مرتبہ اور بصورت جمع ۱۲ مرتبہ مستعمل ہے جب کہ لفظ ''شر'' قرآن مجید میں مفرد وجمع مجموعی طور پر صرف ۳۰ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

لفظ ''شر'' جو ''خیر'' کا نقطہ مقابل ہے وہ بلا ومصیبت، عذاب وسختی، رنج وتکلیف اور ہر طرح کے فساد ووسوسہ کے معنی میں آیا ہے۔ ایک اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن آیت ۲ سورۂ فلق میں ''شر'' کو مخلوقات خدا میں شمار کرتا اور کہتا ہے: "من شر ما خلق" (میں خدا کی پناہ لیتا ہوں اس کے شر سے جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے)۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) یہ تعبیر شرور کے عدمی ہونے کے ساتھ کیونکر مطابقت رکھتی ہے؟

(۲) قرآن آیت نمبر ۷ سورۃ ''الم سجدہ'' میں کہتا ہے: الذی احسن کل شیئ خلقه ''وہ خدا جس نے جو کچھ پیدا کیا اچھا پیدا کیا۔''

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب ۴۵

پس یہ دونوں آیتیں کس طرح باہم مطابقت رکھتی ہیں؟

الفاظ دیگر اس دوسری آیت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جس پر ''شیئ'' کا اطلاق ہوتا ہے اور وہ مخلوق ہے تو وہ اچھی ہے، جب کہ پہلی آیت کہتی ہے: مخلوقات کے شر سے خدا کی پناہ مانگو۔

پہلے سوال کے جواب میں یہ کہنا چاہیے: مذکورہ آیت نے کسی مخلوق کو شر قرار نہیں دیا، وہ کہہ رہی ہے کہ ممکن ہے مخلوقات میں سے بعض چیزیں شر کا سبب بن جائیں یعنی اپنے کمال کو ضائع کر دیں، حق کو گم کر دیں اور کسی نظم و ترتیب کو خراب کر دیں۔ بنا بریں شر وہی مفہوم عدمی رکھتا ہے کہ جو کبھی کسی گمراہ انسان یا جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ (غور کریں)

یہاں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں اشارہ شرِ نسبی کی طرف ہو گا نہ شر مطلق یا شر غالب کی طرف۔ جیسے سانپ کے دانت کہ جو اس کا ایک ذریعہ دفاع ہے۔ لیکن انسان کی نسبت سے شاید وہ شر شمار ہو اور انسان ایسے ہی موجود سے خدا کی پناہ مانگتا ہے۔

بعض مفسرین نے مذکورہ آیت میں ''شر'' کے معنی شیطان یا جہنم یا مختلف موذی حیوانات یا جن و انس میں سے نقصان پہنچانے والے افراد، بیماریاں، تکالیف، قحط اور بلا و آفات مراد لیے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے آیت کا مفہوم عمومیت رکھتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کوئی چیز بھی شر مطلق یا شر غالب نہیں ہے، اس کی شرح گذشتہ بحثوں میں آ چکی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ وجہ شر بن جائیں اور انسان ان سے خدا کی پناہ مانگے۔

اس سے دوسرے سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کی تمام مخلوقات خیر (خیر مطلق یا خیر غالب) ہیں۔ جب ہم ان میں سے کسی کو شر سے موسوم کرتے ہیں تو یا وہ عدمی پہلو رکھتا ہے جو خلقت و آفرینش سے تعلق نہیں رکھتا یا نسبی پہلو رکھتا ہے یا وہ امورِ وجودی ہیں جو عدم میں داخل ہو جاتے ہیں جیسے زہر ہائے قاتل کہ وہ دراصل کئی امراض کا معالجہ بھی بن جاتے ہیں۔

اس طرح قرآن میں خیر و شر کے متعلق آمدہ تعبیرات کی تفسیر بخوبی ہوسکتی ہے، نیز اس سے بہت سے اعتراضات کا جواب بھی ہو جاتا ہے جو اس بارے میں کیے جاتے ہیں۔ ان میں وہ اعتراضات بھی ہیں جو فخر رازی نے بعض دہریوں کی زبانی نقل کیے ہیں اور بلا جواب چھوڑ دیئے ہیں۔[1]

(۵) اسلامی روایات میں خیر و شر کا ذکر

''خیر و شر'' یہ دو الفاظ پیغمبر اکرمؐ سے مروی احادیث کے علاوہ ائمہ معصومینؑ سے آمدہ روایات میں بھی بڑی کثرت سے ذکر ہوئے ہیں جس سے ان کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔

ان میں سے جو پہلو ہماری بحث سے نسبت رکھتے ہیں ان میں سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ بہت سی روایتوں میں آیا ہے کہ خیر و شر ہر دو مخلوق

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۳۲ صفحہ ۱۹۵

الٰہی ہیں:

(۱) امام محمد باقرؑ سے مروی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"ان الله يقول انا الله لا اله الا انا، خالق الخير و الشر، و هما خلقان من خلقي..."

''میں ہی خدا ہوں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں خیر و شر کا پیدا کرنے والا ہوں اور وہ دونوں میری مخلوقات میں سے ہیں۔''[۱]

(۲) یہی بات امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک اور حدیث میں بھی آئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"انی انا الله لا اله الا انا خلقت الخلق، و خلقت الخير و اجريته على يدى من احب، فطوبى لمن اجريته على يديه، وانا الله لا اله الا انا، خلقت الخلق و خلقت اشر و اجريته على يدى من اريده، فويل لمن اجريته على يديه۔"

''میں ہی خدا ہوں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں نے انسانوں کو پیدا کیا اور خیر کو بھی پیدا کیا اور اسے ان افراد کے ہاتھوں جاری کرایا جن کو میں دوست رکھتا ہوں، پس ان لوگوں کا کیا ہی اچھا حال ہے کہ جن کے ہاتھوں میں خیر کو جاری کراتا ہوں۔ میں ہی خدا ہوں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں نے انسانوں کو پیدا کیا اور شر کو بھی پیدا کیا اور اسے جن لوگوں کے ہاتھوں چاہتا ہوں جاری کراتا ہوں۔ پس افسوس ہے ان لوگوں پر کہ میں شر کو جن کے ہاتھوں جاری کراتا ہوں۔''[۲]

(۳) ایک اور حدیث میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"الخير و الشر كله من الله۔"

''خیر و شر سب کا سب خدا کی طرف سے ہے۔''[۳]

---

[۱] بحار الانوار جلد ۵ صفحہ ۱۶۰ حدیث ۲۰

[۲] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۵۴ باب خیر و شر حدیث ۱

[۳] بحار الانوار جلد ۵ صفحہ ۱۶۱ حدیث ۲۱

اسلامی مصادر میں ایسی بہت سی حدیثیں پائی جاتی ہیں،لیکن ان سب کا ذکر ہمیں اپنے موضوع سے دور لے جائے گا۔[1]

ان حدیثوں کے بارے میں بہت سے سوالات اٹھتے ہیں،ان میں سے اہم ترین سوالات یہ ہیں۔

(۱) اگر شر وایک امر عدمی ہیں تو یہاں ان کی خلقت کی بات کیوں ہورہی ہے؟

اس سوال کا جواب گذشتہ بحثوں سے معلوم ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شر کا اطلاق امور وجودی پر ہوتا ہے اور ان کی اصل عدم ہی ہوتی ہے۔مثلاً مختلف قسم کے جراثیم،زہریلے مادے اور تباہ کن ہتھیار کہ جو امور وجودی ہیں لیکن ''بیماری'' اور ''موت'' اور ''تخریب'' کا سرچشمہ ہیں جو امورِ عدمی میں سے ہیں۔(غور کریں)

اس بات کو بھی چھوڑیئے تو ممکن ہے مذکورہ بالا عبارات میں شرور نسبی کی طرف اشارہ کیا گیا ہو کہ وہ وجودی پہلو رکھتے ہیں اور ان میں خیر غالب ہے،اگر چہ وہ بعض افراد کی نسبت سے منفی اثر رکھتے ہیں۔

مرحوم علامہ مجلسی رضوان اللہ علیہ ''مرأت العقول'' میں ان روایات کی شرح میں محقق طوسی سے نقل کرتے ہیں:ان روایتوں میں شر سے مراد وہ امور ہیں جو انسانوں کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتے اگر چہ ان میں بہت سے فوائد بھی ہیں۔

بعدہٗ محقق کے اس قول کی مزید توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وہ چیزیں جو طبع انسانی سے ہم آہنگ نہیں ہیں جیسے موذی حیوانات۔

(۲) وہ چیزیں جو موجب خرابی ہیں اور ان میں قائدے کا پہلو نہیں ہے۔

گویا کہ خدا سے جس شر کی نفی کی جاتی ہے وہ دوسرے معنی میں ہے نہ کہ پہلے معنی میں۔پھر فرماتے ہیں کہ فلاسفہ کے نزدیک اشیاء عالم پانچ قسموں پر ہیں:

۱۔ وہ اشیاء جو خیر کا پہلو رکھتی ہیں کہ خدا کی طرف سے ان کا صدور واجب ہے۔

۲۔ وہ چیزیں جو سراسر شر ہیں کہ خدا سے ان کا صدور محال ہے۔

۳۔ وہ اشیاء جن میں خیر غالب ہے اور خدا سے ان کا صدور ضروری ہے۔

۴۔ وہ چیزیں جن میں شر غالب ہے۔

۵۔ وہ چیزیں جن میں خیر و شر مساوی ہے۔

آخری دو میں سے کوئی بھی خدا کی طرف سے صادر نہیں ہوتی،جو موذی حیوانات ہم دنیا میں دیکھتے ہیں ان کے وجود سے حاصل

---

[1] اصول کافی جلد ۱ باب خیر و شر۔جلد دوم کتاب الدعاء باب ما یمجه به الرب حدیث ۱۔۲ صفحہ ۵۱۵۔۵۱۶۔بحارالانوار جلد ۵ باب سعادت و شقاوت سے مزید معلومات حاصل کریں۔

ہونے والے فوائد ان کے شر سے زیادہ ہیں (اور اسی غرض سے ان کو پیدا کیا گیا ہے)۔[1] بنابریں خدا کی طرف سے آفرینش شر میں ممکن ہے ان امور کی طرف اشارہ ہو جو جزوی طور پر شر ہیں لیکن مجموعی طور پر ان میں خیر کا پہلو غالب ہے۔

(۲) اس روایت کے ضمن میں دوسرا سوال اس بات سے پیدا ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ خیر و شر کو لوگوں کے مختلف گروہوں کے ہاتھوں جاری کراتا ہے۔ آیا اس میں جبر کا پہلو نہیں ہے؟ ایسے میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدائے تعالیٰ جو حکیم ہے وہ افراد کو وسیلہ شر و فساد بنائے؟

جو کچھ اس سے پہلے بیان ہوا اس کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کے جواب میں کوئی مشکل نہیں رہتی کیونکہ ان عبارات میں اللہ تعالیٰ کی توحید افعالی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہر چیز کی انتہا خدا کی ذاتِ پاک پر ہوتی ہے، خدا جو انتہاؤں کا آخری مقام ہے اس نے انسانوں کو ارادے میں اختیار و آزادی عطا کی اور انہیں خیر و شر کے اسباب فراہم کر کے معرض آزمائش میں قرار دیا ہے۔ پس یہ خود انسان ہی ہیں جو یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ کس ترتیب سے کام کریں اور کون سا طریقہ اختیار کریں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے جو افراد ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کرتے ہیں خدا قسم قسم کے خیرات و نیکیاں ان کے ہاتھوں صادر کراتا ہے۔

اس بیان سے اس آیت کی تفسیر بھی واضح ہو جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے: انسان جو بھی نیک و بد کام انجام دیتا ہے قیامت میں اسے اپنے سامنے حاضر پائے گا۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ (زلزال ۷، ۸)

مختصر یہ کہ شر اپنے مفہوم عدمی میں مخلوق خدا نہیں ہے، اس ضمن میں صرف دو چیزیں مخلوق ہیں:

(۱) وہ امور جو وجودی ہیں اور کبھی معرض عدم ہوتے ہیں جن کی مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں۔

(۲) وہ امور کہ جن میں شر پر خیر غالب ہے جیسے زہریلے جاندار

یہ زہریلے جاندار بعض حالات میں انسان کی موت کا سبب بنتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ آج کے دور میں ان حیوانات کے زہر سے بہت سی شفا بخش دوائیں بنائی جا رہی ہیں۔ چنانچہ کئی ایک دوا ساز اداروں میں اس غرض سے سانپ بچھو اور ایسے ہی دیگر حیوانات پالے جاتے ہیں تا کہ ان کا زہر نکال کر انسان کی جان بچانے والی دوائیں تیار کی جا سکیں۔ اس قطع نظر یہ ڈنک اور زہر ان حیوانات کے لیے اپنے دفاع اور تلاش خوراک کی غرض سے بڑے کارآمد ہوتے ہیں اور ان کے بغیر وہ اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتے۔

اسی طرح بہت سے جراثیم ہیں جنہیں موجب شر و اذیت شمار کیا جاتا ہے، وہ ایک طرح کا وجود رکھتے ہیں جس میں شر کے ساتھ ساتھ خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ ان خوردبینی موجودات میں کئی ایسے ہیں جو مردہ انسانوں کے اجساد اور مرے ہوئے حیوانوں کے اجسام کو خاکی ذرات میں تبدیل کرتے ہیں۔ اگر یہ جراثیم نہ ہوتیت و تھوڑے ہی عرصے میں یہ کرۂ زمین مردوں انسانوں و حیوانوں کے ناصاف اجساد اور ان سے اٹھنے والے تعفن سے بھر جاتا اور انسان کی زندگی بہت جلد ختم ہو کر رہ جاتی۔ انہی میں سے بعض جراثیم ہیں جو زمین کے اندر ہی اندر کچھ اس طرح کا عمل کرتے ہیں کہ جس سے زمین فصلوں اور درختوں کو اگانے اور پروان چڑھانے کی صلاحیت حاصل کرتی رہتی ہے۔

---

[1] مرأت العقول جلد ۲ صفحہ ۱۷۱ باب خیر و شر حدیث ۱

حتی کہ وہ جراثیم جو بیماری پیدا کرنے والے ہیں، اپنے لگاتار حملوں میں جو ہوا، پانی اور غذا کے ذریعے ہوتے ہیں، وہ جسم انسانی کے خلیات کو ایک لحاظ سے دفاع کے لیے آمادہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس سے ان میں قوت آتی ہے اور وہ بیماری کے حملے سے بدن کا بچاؤ کرنے میں لگ جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض دانش مندوں کا خیال ہے کہ اگر انسانی بدن پر حملہ آور ہونے والے یہ جراثیم نہ ہوتے تو انسان بڑا کمزور اور بے جسامت ہوتا اور شاید اس کا قد اڑھائی تین فٹ سے زیادہ نہ ہوا کرتا۔

(۳) خلقت شر کے سلسلے میں تیسرا اور آخری سوال یہ ہے کہ کیوں تمام مخلوقات خیر محض کی صورت خلق نہیں ہوئے۔

یہاں ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن میں خیر کا پہلو غالب ہے۔ مثال کے طور پر آگ ایک جلانے والی شے ہے جو انسانی تمدن اور زندگی کے لیے بہت سے فوائد کا ذریعہ ہے۔ لیکن کبھی یہ بعض افراد کو جلا ڈالتی ہے یا بے احتیاطی کے نتیجے میں کسی گھر کو مع ساز و سامان کے راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ مگر توجہ کرنی چاہیے کہ اگر خیال یہ ہو کہ ایسے مواقع پر آگ سے اس کا شر سلب ہو جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ خدا آگ کو پیدا ہی نہ کرے کیونکہ جو کبھی جلائے اور کبھی نہ جلائے وہ آگ ہی نہیں ہے۔

یہ بات اس طرح بھی کہی جا سکتی ہے کہ عالم مادہ کی اصلیت میں کمالات کے ساتھ ایسے نقصائص موجود ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نقائص ختم ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم مادہ کو سرے سے پیدا ہی نہ کیا جائے، حالانکہ یہ خیر غالب اور کمال نسبی کا حامل ہے اور اس کی خلقت حکمت کے موافق ہے۔ (غور کریں)

عدل الٰہی کے متعلق دو اہم سوال

ان مباحث کے آخر میں اب دو سوال باقی ہیں جو بڑے اہم اور قابل توجہ ہیں:

(۱) عدل کو اصول دین میں کیوں بطور اصل رکھا گیا؟

ہم جانتے ہیں کہ صفات خدا کی تقسیم میں اس کی ''صفت عدل'' صافت فعل کے زمرے میں آتی ہے اور انہی میں شمار ہوی ہے کیونکہ یہ افعال خدا کی توصیف کے لیے ہے۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس میں وہ کونسی خصوصیت ہے کہ یہ دوسری صفات سے جدا اور اصول دین میں ایک مستقل اصل کے طور پر شامل ہے اور کبھی اسے ''امامت'' کے ساتھ ملا کر شیعیت کے دو اہم اصولوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں چند نکتوں کی طرف توجہ کرنا چاہیے:

(۱) مسئلہ عدل کی وضع خاص جو آغاز کتاب ہذا میں تاریخچہ کے زیر عنوان بیان ہوئی ہے، وہ اس صفت کی دیگر صفات سے الگ حیثیت ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ ہے۔

کیونکہ جس طرح ہم کہ چکے ہیں کہ پہلی صدی ہجری میں علماء عقائد اسلامی کے درمیان سخت ترین نزاع شروع ہوگئی کہ ایک طرف ''اشاعرہ'' تھے جن کا اعتقاد تھا کہ افعالِ خدا کو عدل و ظلم کی میزان میں نہیں تولا جا سکتا، وہ ان باتوں سے بلند و بالا ہے اور وہ جو کچھ بھی کرے، عین عدالت ہے۔ حتی کہ تمام انبیاء کو دوزخ میں اور تمام اشقیاء کو جنت میں بھیج دے!

دوسری طرف شیعہ اور معتزلہ کھڑے ہو گئے (جو عقل کو جزو دین شمار کرتے تھے)۔ان کا کہنا تھا کہ خداوند تعالیٰ حکیم و عادل ہے، وہ ان اصولوں کے خلاف کوئی فعل انجام نہیں دیتا۔ وہ ظالم کو انعام اور منظلوم کو سزا نہیں دیتا ہماری عقل نیک و بد کو وسیع تر طریق سے سمجھتی ہے اور خداوند عادل وحکیم اچھائی اور نیکی کے بغیر کوئی عمل انجام نہیں دیتا۔ پھر ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بہت سی قرآنی آیات بڑی وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کی تائید وتاکید کرتی ہیں کہ خدا کا کوئی کام خلاف عدالت نہیں ہوتا۔

مسئلہ عدل وعدالت میں طرفین کا یہ اختلاف اس کا سبب بنا کہ دوسرا گروہ ''عدلیہ'' کے نام سے معروف ہوا اور پھر آہستہ آہست ''امامت'' کے ساتھ ساتھ ''عدل'' بھی شیعہ مسلک کے بنیادی اصولوں میں شمار ہونے لگا۔

(۲) علاوہ ازیں خدا کی بہت سی صفات فعل درحقیقت اسی اصل عدل کی طرف پلٹ آتی ہیں، مثلاً خدائے تعالیٰ حکیم، حاکم، رازق اور رحمان ورحیم ہے کہ یہ سب مسئلہ عدالت خدا سے متعلق ہیں۔ اصولاً لفظ ''عدالت'' کے وسیع مفہوم میں اس سے مراد ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا ہے، اس لحاظ سے صفت عدل تمام صفاتِ فعل کو اپنے اندر شمولیت ہے۔

اس سے بھی اہم مسئلہ ''معاد'' اور خدا کا "مالك يوم الدين" ہونا ہے جس کا دار و مدار عدل وعدالت پر ہی ہے، پس اس کی یہ خصوصیت تقاضا کرتی ہے کہ صفت عدل کو خاص توجہ کا مرکز بنایا جائے۔

(۳) عدل کا مفہوم اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اس میں عدالت اعتقادی بھی شامل ہے۔ نیز عدالت اخلاقی اور عدالت اجتماعی بھی اس کے تحت آجاتی ہے۔ اس طرح خدا کے عدل وعدالت کا مسئلہ انسان کے اخلاقی اقدار اور پھر تمام اجتماعی ومعاشرتی قوانین پر اپنی رشنی بکھیرتا ہے۔ پس یہ اصل اعتقادی جو اتنی وسعت رکھتی ہے، یہ بجا طور پر اس کی مستحق ہے کہ اسے ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن اور اصولِ اسلام میں سے ایک اصل قرار دیا جائے۔

اگرچہ اسلامی مصادر میں ہم کوئی ایسی آیت یا روایت نہیں پاتے جس میں ''عدل'' کو ایک اصل کے طور پر معصومینؑ کی طرف سے منتخب کیا گیا ہو اور ظاہراً یہ انتخاب علماء علم عقائد کی طرف سے ہے لیکن اس انتخاب کی تائید وحمایت بہت سی آیات وروایات سے ہوتی ہے جن میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[1]

(۲) آیا یہ امور عدلِ الٰہی سے تضاد رکھتے ہیں؟

قرآن مجید اور احادیث اسلامی میں بعض موضوعات پائے جاتے ہیں جو کبھی اسلامی نکتہ نظر سے یا بظاہر بعض علماء کی نگاہ میں ان کا

---

[1] صرف ایک روایت جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے، اس میں ایک شخص نے بطور سوال پوچھا: آیا توحید وعدل اساس دین ہیں؟ اس نے امامؑ سے اس کی وضاحت چاہی۔ امامؑ نے اس کی توضیح کرتے ہوئے ضمنی طور پر عدل کے اساس دین ہونے کی تائید فرمائی۔ (بحارالانوار جلد ۵ ص ۱۷)

مسئلہ عدلِ الٰہی سے ہم آہنگ ہونا واضح نہیں ہوتا، جیسے:

الف) مسئلہ شفاعت

ب) مسئلہ جبر واختیار

ج) قضاوقدر

د) تقسیم رزق میں تفاوت اور انسانی معاشروں میں امیر وغریب لوگوں کا وجود۔

اس میں کلام نہیں کہ ان مسائل میں سے ہر ایک اپنے موضوع و ماہیت کے لحاظ سے الگ اور تفصیلی بحث چاہتا ہے اور انشاء اللہ مناسب مقام پر ہم ان کے بارے میں ضروری گفتگو کریں گے، لیکن یہاں صرف اس رخ سے بحث کی جانی چاہیے کہ یہ امورِ مسئلہ عدلِ الٰہی سے چنداں تضاد نہیں رکھتے۔

لیکن شفاعت کے بارے میں جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ، امام معصومؑ، فرشتہ مقرب کی شفاعت ایک شخص کو جنت میں لے جاتی ہے حالانکہ ایک دوسرا شخص گناہگاری میں اس پہلے جیسا ہی ہے، خدا اسے دوزخ میں بھیج دیتا ہے۔ وہ حق رکھتے ہیں کہ ایسی شفاعت اصل عدالت کے خلاف تصور کریں۔

لیکن اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ شفاعت صرف ایسے لوگوں کے لیے ہے جو خود کو اس کا اہل ثابت کریں اور اعمال خیر بجالا کر شافعین کی شفاعت کے حق دار بنیں کیونکہ وعدۂ شفاعت درحقیقت ایک مدرسہ تربیت کے طور پر ہے کہ جو گنہگاروں کی اصلاح اور انہیں صراطِ مستقیم کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ ہے یا یہ کہ انہیں گناہوں میں آلودہ ہونے سے روکنے کی سبیل ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ مسئلہ شفاعت خدائے تعالیٰ کی حکمت اور عدالت سے کوئی منافات نہیں رکھتا بلکہ یہ ان کو متحقق اور ثابت کرتا ہے۔[1]

جہاں تک مسئلہ ''جبر واختیار'' کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ انسان کے لیے ارادہ واختیار کی آزادی کا اعتقاد نہ صرف یہ کہ عدالت الٰہی سے مخالفت نہیں رکھتا بلکہ یہ اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ جو چیز عدالتِ الٰہی سے منافات رکھتی ہے وہ ''جبر'' ہے۔ بلاشک وشبہ قائلین جبر ایک دوراہے پر کھڑے ہیں کہ چاہیں تو جبر کا اقرار کریں اور عدالت کا انکار کردیں یا عدل کو قبول کریں اور جبر کو ترک کردیں۔ جیسا کہ آپ گذشتہ بحثوں میں پڑھ آئے ہیں جبر کے معتقدین عدالت کے انکار پر مجبور ہوگئے اور یہ ان کے مذہب پر ہونے والے اعتراضات میں سب سے بڑا اعتراض ہے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ یہاں ہمارا مقصد مسئلہ جبر واختیار کا بیان اور اس کے بطلان کے دلائل پیش کرنا نہیں کہ اس کا محل ومقام کہیں اور ہے۔ اس وقت صرف مسئلہ عدالت کے تعلق سے اس پر نظر ڈالنا مقصود ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا اس بات کا امکان ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کو ایک گناہ پر مجبور کرے اور پھر اس گناہ پر اسے سزا بھی دے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔

---

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۴۷-۴۸ کی طرف مراجعہ کریں۔

مسئلہ قضاء وقدراور تقدیر انسان کے بارے میں جیسا کہ قضاء وقدر کی بحث میں بیان ہوگا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر انسان کی تقدیر سعادت وشقاوت، اطاعت ومعصیت اور خوش بختی اور بدبختی کے لحاظ سے جبری طور پر مقرر کی جا چکی ہو کہ جو یقینی اور نا قابل تغیر ہو۔ یہ ایک بے سروپا قول کے سوا کچھ نہیں کہ جسے بعض بے خبر لوگ ''اسلامی قضاوقدر'' کے سر منڈھتے ہیں اور حقیقت امر یت وجہ نہیں دیتے۔

خدائی قضاوقدر ایک طرح سے ''قانون علیت'' کی طرف اشارہ ہے، وہ یوں کہ خدائے تعالیٰ نے یہ چیز مقدر کر دی ہے کہ سعی وکوشش کرنے والے افراد کامیاب ہوں اور سست وناکارہ افراد ناکام ونامراد رہیں۔ (شاذ صورتیں اس مسئلہ کی کلیت پر اثر نہیں ڈالتیں)۔ اسی طرح خدائی قضاوقدر کا تعلق اس بات سے ہے کہ اطاعت گزار سعادت سے ہم کنار ہوں اور نافرمان بدبختی سے دوچار ہوں یا اجتماعی مسائل میں متحد و یکجہت قومیں قوی اور کامران ہوں، وہ گروہ جو نااتفاقی اور انتشار کا شکار ہوں وہ مغلوب اور شکست خوردہ ہو کر رہیں۔

اس کائنات میں قضاوقدر کی یہی صورت ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر اس کے یہی معنی لیے جائیں تو یہ مسئلہ عدلِ الٰہی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ لیکن اگر اس کی وہ تشریح سامنے رکھی جائے جو بعض بے خبر لوگ بیان کرتے ہیں تو وہ عدلِ الٰہی سے تضاد رکھتی ہے اور اس مشکل کو حل کرنے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ [1]

مسئلہ فقر وغنا یعنی لوگوں میں رزق ومال کے لحاظ سے تفاوت کا خدا کی مشروط قضاوقدر سے تعلق ہے۔ بعض سخت کوش ومنظم افراد اور قومیں عام طور پر زیادہ مالدار ہیں اور کام چور وغیر متحد افراد واقوام بے زر وقلاش ہیں۔ ان ہر دو صورتوں کے نمونے ہم اپنے معاشرے میں اور دوسروں میں بھی دیکھتے ہیں، چند ایک خاص واقعات اس عام اور کلی اصول پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

ہاں ایسے حالات بھی پائے جاتے ہیں جن میں ایک فرد یا گروہ پر کسی مادی قوت کی طرف سے فقر وفاقہ مسلط کر دیا جاتا ہے یعنی ایک گروہ کا جبر واستبداد دوسرے گروہ کے فقر وغربت کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال بھی عدل الٰہی کے زیر بحث آنے کا موجب بنتی ہے، اس میں شک نہیں کہ خدا نے انسان کو آزادیٔ عمل دی ہے۔ اگر یہ آزادی نہ ہوتی تو اس اجباری حالت میں انسانی ترقی و تکامل کی راہ پر چل نہیں سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر افراد اس آزادی سے غلط فائدے اٹھاتے ہیں، البتہ خداوند عادل وحکیم بالآخر مظلوم کا حق ظالم سے لے لیتا ہے۔ لیکن اگر آزادیٔ عمل سے غلط استفادہ کیے جانے کو سامنے رکھتے ہوئے خدا انسانوں سے یہ حق سلب کر لیتا تو انسانی ترقی و تکامل کا قافلہ شکستہ پا ہو کر رہ جاتا۔ دوسری طرف انسانوں کی یہ آزادی عدل پروردگار پر کوئی غلط اثر بھی نہیں ڈالتی، پس انسان کو سعی وعمل میں مصروف رہنا چاہیے۔ [2]

---

[1] قضاوقدر اور تقدیر کے مسائل کی مزید توضیح کے لیے کتاب انگیزۂ پیدائش مذاہب صفحہ ۱۷ تا ۴۱ نیز تفسیر نمونہ فارسی جلد ۲۳ صفحہ ۸۳ ملاحظہ فرمائیں۔

[2] یہ بحث پوری شرح کے ساتھ پیام قرآن فارسی جلد دو صفحہ ۵۵ وتا ۳۶۰ میں ملاحظہ ہو۔

عدلِ الٰہی کے بارے میں آخری بات

اخلاق وعمل میں عدلِ الٰہی کا پرتو

قبل ازیں اشارہ ہو چکا ہے کہ اسلام میں مسائل اعتقادی مسائل علمی سے الگ نہیں ہیں، صفاتِ الٰہی کی طرف توجہ اس چیز کا سبب بنتی ہے کہ انسان اپنی نگاہیں کمالِ مطلق کے نقطہ پر جما دے اور کوشش کرے کہ اس کی ظاہری و باطنی سیر وحرکت کا رخ اس کی طرف رکھے اور خود کو اس سے نزدیک تر کرے۔ اس قرب ونزدیکی کے باعث انسان کے اخلاق میں صفاتِ الٰہی کا پرتو آجائے گا اور اس کے عمل میں ان کی جھلک نظر آنے لگے گی۔

بنابریں انسان جس قدر اس ذات مقدس سے نزدیک تر ہوگا، یہ صفات اس میں قوی تر ہوتی چلی جائیں گی۔ خصوصاً عدل الٰہی کا نظریہ (خواہ ہم عدالت کی تفسیر اس کے وسیع تر مفہوم میں کریں جو ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنا ہے یا اس سے مراد ادائے حقوق اور فرق وامتیاز کا مقابلہ ہو) کہ اگر مسلمان افراد اور معاشروں میں یہ اپنا اثر دکھائے تو وہ اپنے کاموں کو منظم طور پر انجام دیں اور عدل وانصاف کا پرچم بلند کریں کہ جو نہ صرف اسلامی ممالک کے لیے ہو بلکہ ساری دنیا میں اس کے اثرات محسوس ہونے لگیں۔

اسلام میں مسئلہ عدالت اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ کوئی چیز اس میں مانع نہیں ہوسکتی یعنی اس میں دوستی ودشمنی، قرابت ورشتہ داری، دوری و نزدیکی کوئی اثر نہیں ڈال سکتی، کسی بھی وجہ سے عدالت کا ترک کرنا نفس کی پیروی شمار ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

''یعنی اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں روئے زمین پر اپنا خلفیہ بنایا ہے، پس لوگوں میں حق کے ساتھ حکم وفیصلہ کرو اور ہوائے نفس کی متابعت نہ کرو کہ یہ تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دے گی۔'' (ص ۲۶)

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ

''کسی گروہ کے ساتھ دشمنی ہرگز تمہیں عدل وانصاف سے دور نہ لے جائے۔'' (مائدہ ۸)

عدالت کی اہمیت کی حد یہ ہے کہ اگر صلح وصفائی کے طریقے سے عدل وانصاف میسر نہ آئے تو مظلوموں کو متحد اور منظم کر کے جابر قوتوں کے خلاف قیام وخروج کی دعوت دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے طور پر بھی مظلوموں کی نصرت کے لیے ظالموں اور ستم گروں سے جنگ کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ ہم قرآن میں پڑھتے ہیں:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ

''تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ خدا کی راہ میں ان مردوں، عورتوں اور بچوں کی حمایت میں جنگ نہیں کرتے جو (ستم گروں کے ہاتھ) مجبور کردیئے گئے ہیں۔'' (نساء ۷۵)

اس بحث کو ہم چند خاص روایتوں کے ذکر پر ختم کرتے ہیں جو اس جلد کے باب آخر کو زینت بخش رہی ہیں:

(۱) امیر المومنین امام علی علیہ السلام اپنے ایک مختصر اور جامع کلام میں فرماتے ہیں:

اعدل حیاۃ۔

''یعنی عدل وانصاف حیات وزندگی کے لیے ایک سرمایہ ہے۔''[1]

(۲) ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

''العدل احلی من الماء یصیبہ الظھان۔''

''عدل پانی سے بھی شریں ہے کہ ایک پیاسا جس کی طرف بڑھتا ہے۔''

(۳) ایک اور حدیث میں امیر المومنین امام علی علیہ السلام سے مروی ہے

''جعل اللہ العدل قواما للانام، وتنزیھا من المظالم و الاثام و تسنیۃ للاسلام''

خداوند تعالیٰ نے عدل کو لوگوں کے لیے قوام، معاشرے کو ظلم وگناہ سے پاک رکھنے کا ذریعہ اور اسلام کی سربلندی کا سبب قرار دیا ہے۔''

(۴) ایک اور حدیث میں امیر المومنینؑ ہی کا فرمان ہے:

العدل راأس الایمان و جماع الاحسان، و اعلی مراتب الایمان

''عدالت پیکر ایمان کے لیے سر کی مانند ہے، تمام نیکیاں اس میں جمع ہیں اور یہ ایمان کے بلندترین مراتب میں شمار ہوتا ہے۔

بالآخر بانی اسلام پیغمبر اکرمؐ کے کلام والا گہرا میں ہم پڑھتے ہیں:

---

[1] غرر الحکم بحوالہ میزان الحکمۃ جلد ۶ صفحہ ۸۱

عدل ساعة خير من عباة سبعين سنة، قيام ليلها و صيام نهارها،
وجور ساعة فی حكم، اشد واعظم عند الله من معاصی ستين سنة

''عدالت کا ایک لمحہ ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے، جس کی راتیں عبادت میں اور دن روزے میں گزرے ہوں، حکم و فیصلے میں ایک لمحہ کا ظلم خدا کے نزدیک ساٹھ سال کی پر معصیت زندگی سے بھی سخت تر ہے۔''

الٰہی! ہمارے قلوب کو اپنی ذات وصفات کے نور معرفت سے اس طرح روشن فرما کہ ہم سوائے تیرے کسی کو نہ چاہیں اور تیری راہ کے علاوہ کسی اور راہ پر نہ چلیں۔

خداوند! ہماری روح وجان کو اپنے جمال کے عشق سے اس طرح پرسوز بنادے جو ہمارے اعمال واخلاق کو اپنے رنگ میں رنگ دے یعنی "صبغة الله و من احسن من الله صبغة" کا مصداق بنادے۔

پروردگار! اپنے اسماء حسنیٰ پر ایمان کے پرتو میں ہمیں وہ تقویٰ عنایت فرما کہ جو سوئی کے ناکے کے برابر بھی عدالت کے راستے سے نہ ہٹے اور ہم کبھی صراط مستقیم سے جدا نہ ہوں۔

آمین یارب العالمین!

اختتام جلد چہارم ''پیام قرآن'' ۱۵ ربیع الثانی، ۱۴۱۰ھ
ترجمہ اردو ''پیام قرآن'' جلد چہارم
بدست حافظ سید ریاض حسین نجفی فرزند سید حسین بخش نقوی
حوزۂ علمیہ جامعۃ المنتظر، لاہور
۵ جمادی الثانی ۱۴۱۳ھ مطابق ۳۰ دسمبر ۱۹۹۲ء
بوقت ساڑھے سات بجے صبح پایہ تکمیل کو پہنچا۔

تفسیر موضوعی

جلد پنجم

زیر نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

مولانا سید نقی علی ثاقب نقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔

فہرست

تفسیر موضوعی: پیامِ قران جلدنمبر5

عنوان	صفحہ نمبر
اہمیت معاد قرآنی نظر سے	13
تفسیر وجمع بندی آیات	16
پے در پے تاکیدیں	16
انکارِ معاد عین گمراہی ہے	19
نتیجہ	22
معاد کے لیے قرآنی تعبیرات	24
تفسیر وجمع بندی آیات	25
۱۔قیامت	25
۲۔مردوں کا زندہ ہونا	27
۳۔"بعث" (اٹھنا)	28
۴۔حشر	29
۵۔نشر	31
۶۔معاد	32
۷۔لقاءاللہ	34
۸۔رجوع الی اللہ	35
نتیجہ	38
قرآن میں قیامت کے ستر نام	39
پہلا حصہ	40
۱۔یوم القیامة	40
۲۔الیوم الاخر	41
۳۔یوم الحساب	43
۴۔یوم الدین	44
۵۔یوم الجمع	44
۶۔یوم الفصل	45
۷۔یوم الخروج	45
۸۔الیوم الموعود	46
۹۔یوم الخلود	47
۱۰۔یوم عظیم	47
۱۱۔یوم الحسرة	48
۱۲۔یوم التغابن	49
۱۳۔یوم التناد	50
۱۴۔یوم التلاق	51
۱۵۔یوم ثقیل	52
۱۶۔یوم الازفة	53
۱۷۔یوم عسیر	54
۱۸۔یوم الیم	55
۱۹۔یوم الوعید	55

عنوان	صفحہ نمبر
۲۰-الیوم الحق	56
۲۱-یوم مشهود	57
۲۲-یوم معلوم	57
۲۳-یوما عبوسا قمطریراً	58
۲۴-یوم البعث	59
۲۵-یوم نطوی السمآء کطی السجل للکتب	61
۲۶-یوم تبدل الارض غیر الارض والسموت	62
۲۷-یوم تمور السمآء مورا	63
۲۸-یوم تشقق السمآء بالغمام ۲۹- یوم تشقق الارض عنهم سراعا	64
۳۰-یوم تکون السمآء کالمهل	65
۳۱-یوم ترجف الارض والجبال	66
۳۲-یوم یسمعون الصیحة بالحق	67
۳۳-یومهم الذی فیه یصعقون	67
۳۴-یوم ینفخ فی الصور	68
۳۵- یوم کان مقدارہ خمسین الف سنة	69
تیسرا حصہ	72
۳۶- یوم یکون الناس کالفراش المبثوث	72
۳۷-یوم تبلی السرآئر ۳۸-یوم هم بارزون	73
۳۹-یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ	75
۴۰-یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من سوء	75
۴۱-یوم تتقلب فیه القلوب والابصار	76
۴۲-لیوم تشخص فیه الابصار	
۴۳-یوم یتذکر الانسان ماسعی	77
۴۴-یوم تاتی کل نفس تجادل عن نفسها	78
۴۵-یوم یقوم الناس لرب العلمین	79
۴۶- یوم یقوم الاشهاد ۴۷- یوم یقوم الروح والملئکة صفا	79
۴۸-یوم لا ینفع مال ولا بنون ۴۹- یوم لا بیع فیه ولا خلال	81
۵۰- یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا ۵۱- یوم لا تملك نفس لنفس شیئا ۵۲-یوما لا یجزی والد عن ولدہ	82
۵۳-یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ	83
۵۴-یوما کان شرہ مستطیرا	85
۵۵-یوم یفر المرء من اخیه	85
۵۶یوما یجعل الولدان شیبا	87
۵۷-یوم لا ینطقون	88

عنوان	صفحہ نمبر
۵۸۔ یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون	88
۵۹۔ یوم لا ینفع الظلمین معذرتھم	89
۶۰۔ یوم یعض الظالم علی یدیہ	90
۶۱۔ یوم یعرض الذین کفروا علی النار	91
۶۲۔ یوم تقلب وجوھھم فی النار	91
۶۳۔ یوم یدعون الی نار جھنم دعا	92
۶۵۔ یوم لا مرد لہ من اللہ	92
۶۴۔ یوم نبطش البطشۃ الکبری	93
۶۶۔ یوم یدع الداع الی شیء نکر	94
۶۷۔ یوم یسحبون فی النار علیٰ وجوھھم	95
۶۸۔ یوم نقول لجھنم ھل امتلات	96
۶۹۔ یوم یقول المنافقون و المنافقات...	97
۷۰۔ لیوم لا ریب فیہ	97
نتیجہ بحث	98
دلائل معاد	102
عناوین	102
پہلا حصہ	102
دوسرا حصہ	102
۱۔ امکان معاد اور منطق مخالفین	103
تفسیر و جمع بندی آیات	105
کیا خاک پھر سے انسان ہو جائے گی؟	105
عاقل انسان ایسا نہیں کہہ سکتا؟	106
یہ سب افسانے ہیں؟	107
فقط ایک بار حیات اور ایک بار مرگ	108
نتیجہ کلام	109
پہلا حصہ	11
دلائل امکانِ معاد ا۔ اولین خلقت	111
تفسیر و جمع بندیٔ آیات	112
تفسیر و جمع بندیٔ آیات	112
نتیجہ بحث	117
توضیحات	117
اس دن کہ جب انسان خلق ہوا	117
۲۔ اللہ کی قدرت مطلقہ	118
تفسیر و جمع بندی آیات	119
اس کے لیے ہر چیز آسان ہے	119
نتیجہ بحث	123
۳۔ احیاء ارض	124
تفسیر و جمع بندی آیات	126
قیامت مردہ زمینوں کی نئی زندگی کی طرح ہے	126
ایک سوال کا جواب	132
۴۔ تغیرات جنین	134
تفسیر و جمع بندی آیات	136
قیامت میں شک ہے تو جنین کو دیکھیں	136

عنوان	صفحہ نمبر
نتیجہ بحث	143
۵۔معاد توانائیوں کی دنیا میں	144
تفسیر	145
توانائیوں کی حیات نو کے مظاہر	145
معاد کے عینی اور تاریخی نمونہ	150
۱۔عزیرؑ کی موت کے بعد زندگی	150
۲۔ابراہیمؑ اور مسئلہ معاد	153
قابل توجہ نکات	155
۳۔داستانِ اصحاب کہف	156
کچھ وضاحتیں	157
(۱) واقعے کا خلاصہ	157
اصحابِ کہف کا واقعہ۔تاریخی کتب میں	158
اصحاب کہف کی غار کا محل وقوع	159
اصحاب کہف کا واقعہ۔موجودہ علم کی روشنی میں	159
بنی اسرائیل کے فرار کا واقعہ	162
مقتول بنی اسرائیل کا واقعہ	163
وقوع معاد پر دلائل	166
۱۔دلیل فطرت	167
تفسیر	167
معاد، دل کی گہرائیوں میں	167
وضاحت	170
چند وضاحتیں	171
۱۔قیامت فطرت کے آئینہ میں	171

عنوان	صفحہ نمبر
(۲) تاریخ میں عقیدے کا تسلسل۔فطری ہونے کی دلیل	172
۲۔دلیل حکمت	173
تفسیر	174
قیامت کے بغیر بے معنی زندگی	174
چند وضاحتیں	177
کون عاقل چند روز دنیاوی زندگی کو ہدف خلقت سمجھتا ہے؟	177
۳۔دلیل عدالت	179
تفسیر	180
اگر قیامت نہ ہو تو عدالت بھی نہ ہوگی	180
چند وضاحتیں	183
خلقت کا بنیادی قانون۔عدل	183
۴۔دلیل ہدف وحرکت	185
تفسیر	186
تمام راستے خدا پر منتہی ہوتے ہیں	186
چند وضاحتیں	189
سفر کی آخری منزل	189
۵۔دلیل رحمت	190
تفسیر	190
۶۔دلیل وحدت	193
تفسیر	194
یہ اختلافات کب ختم ہوں گے؟	194

عنوان	صفحہ نمبر
چند وضاحتیں	198
۷۔ دلیل بقائے روح	200
تفسیر	201
استقلال ارواح	201
شہدائے فی سبیل اللہ	202
آل فرعون پر برزخی عذاب	203
قبض روح	204
چند وضاحتیں	207
۱۔ بقائے روح	207
۲۔ کیا روح مستقل ہے؟	208
۳۔ روح کے عدم استقلال پر مادہ پرستوں کے دلائل	211
دلیل کے کمزور پہلو	212
۴۔ استقلال روح کے طرفداروں کی اَدلہ	213
الف: (وجود سے باہر کی دنیا سے آگاہی)	
''واقعیت نمائی کی خاصیت''	213
ب: شخصیت کی یکتائی	214
ایک اشتباہ سے پرہیز	216
ج: چھوٹے بڑے کا ایک دوسرے پر منطبق نہ ہونا	216
سوال	217
پاسخ	217
د: مظاہر روح مادی کیفیات سے ہم آہنگ نہیں	218
۵۔ کیا روح مجرد ہے؟	219
معادِ جسمانی	220
گروہِ اول	220
تفسیر	222
۱۔ بوسیدہ ہڈیاں کیسے زندہ ہوں گی؟	222
گروہ دوم	223
تفسیر	224
۲۔ کس طرح قبروں سے اٹھیں گے؟	224
گروہ سوم	226
تفسیر	226
۳۔ تم دوبارہ مٹی سے محشور ہو گے	226
گروہ چہارم	228
تفسیر	228
۴۔ معاد زمینوں کے زندہ ہونے کی مانند ہے	228
گروہ پنجم	229
تفسیر	230
۵۔ کیا ہمارا مٹی میں سے دوبارہ اٹھنا ممکن ہے؟	230
گروہ ششم	230
تفسیر	232
۶۔ بہشت کی مادی نعمتوں کا معاد جسمانی پر دلالت کرنا	232
گروہ ہفتم	234
تفسیر	236
۷۔ دوزخ کی مادی سزائیں	236
تفسیر	236

عنوان	صفحہ نمبر
۸۔ایک اور زندہ دلیل۔اعضائے بدن کا گفتگو کرنا	238
گروہ نہم	239
نتیجۂ بحث	239
چند وضاحتیں	240
معاد جسمانی عقل کی رو سے	240
منکرینِ معادِ جسمانی کے شبہات	241
۱۔اعادۂ معدوم کا محال ہونا	241
وضاحت	241
۲۔شبہۂ آکل و ماکول	243
توضیح	243
شبہۂ آکل و ماکول کا آخری جواب	246
۳۔دورانِ زندگی موادِ جسمانی کے تبدیل ہونے کا مسئلہ	248
توضیح	249
۴۔زمین پر درکار مٹی کی قلت	250
۵۔جسم فانی کے لئے حیاتِ باقی کیونکر؟	251
۶۔معادِ جسمانی و روحانی بیک وقت کیونکر؟	252
۷۔کون سا جسم لوٹے گا؟	253
نتیجۂ بحث	253
معاد (گذشتہ اقوام کے کلچر میں)	254
تفسیر	256
مختلف زمانوں میں عقیدۂ معاد	256
نتیجہ بحث	265
توضیحات	266
۱۔قبل از تاریخ کی قوموں میں معاد	266
۲۔بعد از تاریخ کی قوموں میں ایمان معاد	268
الف۔قدیم مصریوں میں معاد	268
ب۔بابلی	270
ج۔سومری	270
د۔زرتشتی	270
ھ۔چینی	271
و۔جاپانی	271
ز۔یونانی	271
ح۔رومی	272
۳۔یہودی کتابوں میں عقیدۂ معاد	272
۴۔اناجیل میں ذکر قیامت	274
نتیجۂ بحث	275
ایمانِ معاد اور تربیت	276
تفسیر	279
اعمال صالح کا باعث، معاد پر ایمان	279
معاد پر ایمان اور استقامت	281
انکار معاد کے منفی نتائج	283
ایمان معاد گناہوں سے بچاتا ہے	285
معاد پر ایمان اور حق بینی	288
نتیجہ بحث	291
توضیحات	291

عنوان	صفحہ نمبر
۱۔قیامت پر ایمان کے غیر معمولی اثرات	291
۲۔معاد کا تربیتی اثر روایات کی نظر میں	293
۳۔ایمان آخرت اور آسودگی حال	296
دروازہ عالم بقاء (۱) موت (۲) برزخ	299
(۱) موت عالم بقاء کا دروازہ	300
تفسیر	203
۱۔موت ایک عمومی قانون ہے	203
۲۔حقیقت موت	304
۳۔روح قبض کرنے والے فرشتے	305
۴ و ۵ موت کے وقت مومنوں اور ظالموں کی حالت	306
۶۔موت سے ڈرنے کی دلیل	308
۷۔فلسفہ موت وحیات	310
۸و۹۔عالم نزع کی سختی اور جان کنی کے مقدمات	312
''واپس لوٹنے اور تلافی کرنے کی تمنا''	315
نتیجہ بحث:	316
چند وضاحتیں	317
۱۔موت، دریچہ عالم بقاء	317
۲۔موت سے ڈر کیسا؟	318
۳۔موت روایات اسلامی میں	320
(۲) برزخ	323
تفسیر	325
برزخ اور اس کی خصوصیات	325
نتیجہ بحث	334
چند وضاحتیں	334
۱۔برزخ، روایات کے آئینے میں	334
۲۔برزخ، عقل واحساس کے میزان میں	339
۳۔عالم برزخ، علماء کی نظر میں	340
۴۔عالم برزخ کی خصوصیات	343
الف: سوال قبر	343
ب۔فشارِ قبر	345
ج: کن امور کے بارے میں سوال ہوگا؟	346
د: دنیا سے روح کا رابطہ	347
ر: دوسروں کے نیک اعمال سے ارواح کا بہرہ مند ہونا	348
۵۔کیا برزخ عمومیت رکھتی ہے؟	349
۶۔فلسفۂ برزخ	350
ایک وضاحت	351

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اہداء

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زُلال سے زیادہ آبِ حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی

۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی

۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی

۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی

۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی

۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی

کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

اہمیت معاد

قرآنی نظر سے

اشارہ

قرآن مجید کی آیات پر اجمالی نظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے اعتقادی مسائل میں بعد از توحید کوئی مسئلہ بھی معاد، حیات بعد از موت کے اعتقاد، بندوں کے اعمال کے حساب و کتاب، سزا و جزا اور اجرائے عدالت جتنی اہمیت نہیں رکھتا۔

معاد کے بارے میں مجموعی طور پر قرآن مجید میں ۱۲۰۰ آیات ہیں۔ قرآن کے تقریباً تمام صفحات پر، بدون استثناء، معاد کا ذکر آیا ہے۔ نیز قرآن مجید کی آخری بہت سی سورتیں مکمل طور پر یا زیادہ تر، معاد، مقدمات قیامت اور اس کی علامتوں اور نتائج کے بارے میں بات کرتی ہیں۔ یہ سب صورت حال اس مدعا پر ایک منہ بولتا گواہ ہے۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ ایمان باللہ کے ذکر کے بعد دوسرے جہان پر ایمان کا ذکر ہے۔ تقریباً تیس آیات میں یہ دونوں ذکر ایک دوسرے کے ساتھ آئے ہیں:

ویومنون باللہ والیوم الاخر

یا اس سے ملتی جلتی عبارات ہیں۔ سو سے زیادہ موارد پر "الیوم الاخرۃ" یا "الاخرۃ" کا ذکر فرمایا گیا ہے:

ایسا کیوں نہ ہو جب کہ:

۱۔ اللہ، اس کی حکمت، عدالت اور قدرت پر ایمان معاد پر ایمان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

۲۔ معاد پر ایمان سے انسانی زندگی بامعنی ہو جاتی ہے اور یہ عقیدہ اس عالم کی زندگی کو بے وقعت ہونے سے بچاتا ہے۔

۳۔ معاد پر ایمان انسانی زندگی کو کمال و ارتقاء کے راستے میں روشنی عطا کرتا ہے۔

۴۔ معاد پر ایمان تمام قوانین الٰہی کے اجراء کا ضامن ہے، تہذیب نفوس کا اصلی جذبہ محرکہ ہے، احقاق حقوق کا باعث ہے، فرائض پر عمل کے لیے تحریک ہے، ایثار شہداء کا ذریعہ ہے، فداکاروں کی فداکاری کا وسیلہ ہے اور یہ ایمان انسان کو اپنے بارے میں تجزیہ کرنا سکھاتا ہے۔

۵۔ معاد پر ایمان روح دنیا پرستی کو کمزور کرتا ہے جب کہ یہ روح تمام گناہوں اور برائیوں کا باعث بنتی ہے۔ یہ ایمان دنیا کو حقیقی ہدف سے نکال کر سعادت ابدی کے حصول کا وسیلہ بناتا ہے اور ان دو نکتہ ہائے نظر میں کس قدر تفاوت ہے!

۶۔ معاد پر ایمان انسان کو مشکلات میں قوت عطا کرتا ہے۔ موت جو ہمیشہ ایک خوفناک صورت بنا کر افکار انسانی کو بوجھل بنائے رکھتی ہے اور اس کا سکون چھینے رہتی ہے، یہ ایمان اس موت کے چہرے کی وحشت انگیزی کو بدل دیتا ہے اور موت کو فنا و نیستی کے مفہوم سے نکال کر اسے جہانِ بقاء کے لیے ایک دریچے میں بدل دیتا ہے۔

۷۔ مختصر یہ کہ معاد پر ایمان، جب اس کے ساتھ مبداء عالم ہستی پر ایمان بھی شامل ہو خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کے مابین ایک حد فاصل شمار ہوتا ہے۔

اس اشارے کے بعد اب ہم مندرجہ ذیل قرآنی آیات کو گوش جان سے سنتے ہیں:

(۱) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ (نساء ۸۷)

(۲) زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷﴾ (تغابن ۷)

(۳) وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ (یونس ۵۳)

(۴) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ (سبا ۳)

(۵) رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۹﴾ (ال عمران ۹)

(۶) اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۸﴾ (شوری ۱۸)

(۷) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ (الاعراف ۱۴۷)

(۸) وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾ (بنی اسرائیل ۱۰)

(۹) وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۝۳۴ (جاثیہ ۳۴)

(۱۰) وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝۵ (الرعد ۵)

ترجمہ

(۱) اللہ، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ یقیناً تم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں اور اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے؟

(۲) کافروں نے گمان کیا کہ انہیں ہرگز نہیں اٹھایا جائے گا۔ کہہ دیجیے! میرے رب کی قسم تم سب (قیامت میں) مبعوث کئے جاؤ گے۔ پھر جو کچھ تم نے عمل کیا ہوگا اس کی تمہیں خبر دی جائے گی اور یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔

(۳) آپؐ سے پوچھتے ہیں: کیا وہ (جزا و سزا الٰہی کا وعدہ) حق ہے؟ کہہ دیجئے ہاں! اللہ کی قسم یقیناً حق ہے اور تم اسے روک نہیں سکتے۔

(۴) کافروں نے کہا کہ قیامت ہرگز ہم تک نہ پہنچے گی۔ کہہ دیجیے: ہاں، میرے اس رب کی قسم، جو غیب سے آگاہ ہے، (قیامت) تم سب تک پہنچے گی۔

(۵) پروردگارا! تو لوگوں کو اس روز جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں۔ اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرتا۔

(۶).....آگاہ رہیں کہ جو قیامت میں شک کرتے ہیں عمیق گمراہی میں ہیں۔

(۷) اور جو لوگ ہماری آیات اور ملاقات قیامت کی تکذیب (اور انکار) کرتے ہیں ان کے اعمال نابود ہو جائیں گے۔ جو کچھ انہوں نے عمل کیا ہے کیا اس کے سوا بھی انہیں کوئی جزا ملے گی؟

(۸) جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

(۹) اور ان سے کہا جاتا ہے: آج ہم تمہیں بھلا دیں گے جیسے تم نے آج کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

(۱۰) اور اگر تو (کسی چیز پر) تعجب کرنا چاہتا ہے تو عجیب تو ان کی بات ہے جو کہتے ہیں کہ کیا جب ہم خاک ہو جائیں گے تو (پھر سے زندہ ہوں گے) اور پھر خلقت تازہ پائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے رب کے کافر ہو گئے ہیں۔ طوق و زنجیر ان کی گردنوں میں ہیں، وہ اہل نار ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر و جمع بندی آیات

پے در پے تاکیدیں

مندرجہ بالا آیات میں معاد اور حیات بعد از موت کے مسئلے پر بہت تاکید کی گئی ہے اور اسے مختلف صورتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس خاص اہمیت کا مظہر ہے کہ جو قرآن اس مسئلے کو دیتا ہے۔

پہلی آیت میں اس روز کہ جس میں کوئی شک نہیں، انسانوں کے یقینی اجتماع کی بات کی گئی ہے فرماتا ہے: اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور وہ تم سب کو یقینی طور پر اس قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک و انکار نہیں (الله لا اله الا هو ليجمعنكم الى يوم القيامة لاريب فيه)

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے اضافہ فرماتا ہے: ''اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے؟ (ومن اصدق من الله حديثاً)۔

آیت کا آغاز و اختتام اور اس کا ہر ہر حصہ اس مسئلے پر تاکید ہے۔ یہ اس اہمیت کا نشان دہندہ ہے جو قرآن کی نظر میں اس مسئلے کو حاصل ہے۔[1] یہ بات قابل توجہ ہے کہ مقائیس اللغہ کے بقول ''ریب'' دراصل ہر طرح کے شک کے معنی میں ہے، یا ایسا شک جو خوف و وحشت سے مملو ہو۔ اس کلمے کا ''حاجت'' پر اطلاق بھی اس وجہ سے ہے کہ صاحب حاجت کو عموماً اس کے حصول میں شک ہوتا ہے، شک ہاتھ سے جانے کے خوف کے ساتھ۔

''فروق اللغہ'' میں ''شک'' اور ''ریب'' میں یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ ''ارتیاب'' ایسا شک ہے جس میں تہمت بھی شامل ہو۔

قرآن مجید میں معاد کے بارے میں اس لفظ کا استعمال شاید اس وجہ سے ہو کہ مخالفین معاد اظہار شک کے علاوہ رسول اللہؐ پر بھی تہمت لگاتے تھے کہ انہوں نے یہ باتیں اپنے پاس سے گھڑ لی ہیں۔

البتہ اس سوال کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ قرآن نے اس جگہ اور اس جیسی دوسری جگہوں پر صرف ادعاء پر قناعت کیوں کی ہے اور کوئی دلیل کیوں ذکر نہیں فرمائی؟

---

[1] قرآن میں اور بھی بہت سی آیات ہیں کہ جو اس امر پر تاکید کرتی ہیں کہ معاد میں کوئی شک نہیں ہے۔ مثلاً حج ۷، ال عمران ۹، ۲۵، انعام ۱۲، کہف ۲۱، مومن ۵۹، شوریٰ ۷، جاثیہ ۲۶ و ۳۳۔

اس کی وجہ اولاً یہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ دلائل معاد کا ذکر ہے اور بار بار اسے پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ ہر آیت میں ان دلائل کا تکرار کیا جاتا۔ ثانیاً گویا قرآن مجید اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ معاد کے دلائل اس قدر روشن اور واضح ہیں کہ اس میں کسی شک وتردید کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ [1]

دوسری آیت میں رسول اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ تاکید کے ساتھ قسم کھائیں کہ قیامت اور حشر نشر یقینی ہے۔ فرماتا ہے: کافروں نے کہا: ہمیں ہرگز اٹھایا نہیں جائے گا۔ کہہ دو! ہاں میرے رب کی قسم کہ تم سب کو اٹھایا جائے گا۔ پھر جو کچھ تم نے کیا اس کی تمہیں خبر دی جائے گی اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے آسان ہے (زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا قل بلی وربی لتبعثن ثم لتنبون بما عملتم وذلك علی الله یسیر)۔

ہم جانتے ہیں کہ قسم کھانا عام طور پر اچھا کام نہیں، وہ بھی پروردگار کی قسم۔ لہٰذا قرآن لوگوں کو اس سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے:

"ولا تجعلوا الله عرضة لایمانکم"

''اپنی قسموں میں اللہ تعالیٰ کو شریک نہ کرو۔'' (بقرہ ۲۲۴)

لیکن کبھی بات اتنی اہم ہوتی ہے کہ اس وقت قسم کھانا نہ صرف منع نہیں بلکہ ضروری ہوتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ لتبعثن اور لتنبون میں موجود تاکیدات کے علاوہ آیت کے آخر میں بھی تصریح کی گئی ہے کہ یہ کام اللہ کے لیے آسان ہے، لہٰذا اس میں شک وتردید نہ کرنا۔ [2]

تیسری آیت میں یہی بات پیغمبر اکرمؐ اور مشرکین کے درمیان ہونے والے سوال وجواب کی صورت میں ذکر کی گئی ہے۔ فرماتا ہے:

''وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا عذاب الٰہی کا وعدہ حق ہے؟ (ویستنبونك احق هو)۔

توجہ رہے کہ "یستنبئونك" "نبا" سے ہے جس کے معنی ہیں ''اہم خبر''۔ مفردات میں راغب کے مطابق یہ ایسی مفید اور

---

[1] توجہ رہے کہ لیجمعنکم میں لام علامت قسم ہے۔ پھر اس کی تاکید ثقیلہ کا نون بھی آیا ہے۔ اس کے بعد "لاریب فیه" کہہ کر تاکید کی گئی ہے۔ پھر آخر میں سب سے زیادہ تاکید کا جملہ ہے: ومن اصدق من الله حدیثا (اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر سچی بات کرنے والا کون ہے) یہ کہ "لیجمعن" یہاں "الی" کے ساتھ متعدی کیوں ہوا ہے جب کہ قاعدتاً "فی" کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ایسا اس لیے ہے کہ "لیجمعن" "لیحشرن" کے معنی میں ہے کہ جو "الی" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے یا پھر "الی" یہاں "فی" کے معنی میں ہے۔

[2] "زعم" (بروزن "طعم") دراصل ایسی بات کے معنی میں ہے جو یقیناً یا احتمالاً جھوٹ ہو۔ بعض اوقات باطل خیال جس میں بات نہ ہو کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ شیخ طوسی نے تبیان میں، قرطبی نے اور روح البیان کے مصنف وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ ''زعم'' (بروزن طعم) دروغ کی کنیت ہے۔

باعظمت خبر کے معنی میں ہے جس کے بارے میں انسان علم یا ظن غالب رکھتا ہو اور اگر (فائدہ، عظمت، علم) یہ تین امور اس میں نہ ہوں تو اسے ''نباء'' نہیں کہا جاتا (لہٰذا مشکوک، کم اہم یا بے فائدہ خبروں کو ''نبا'' نہیں کہتے۔ یہ جو سورۃ میں نبا کی توصیف ''عظیم'' بیان کی گئی ہے تو یہ بیشتر تاکید کے لیے ہے)۔ یہ جو پیغمبر کو ''نبی'' کہا جاتا ہے تو یہ بھی اسی لیے ہے کہ اس کی خبریں ان تین خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔

اس کے بعد رسول اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے: کہہ: ہاں! میرے رب کی قسم یہ حق ہے (قل ای و ربی انه لحق)۔

''رب'' کا عنوان یہاں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت ربوبیت پروردگار کے تسلسل اور اس کے مظاہر میں سے ہے۔ اس بات کی وضاحت انشاء اللہ دلائل معاد کی گفتگو میں آئے گی۔

آیت کے آخر میں پھر مزید تاکید کی گئی ہے۔ کہتا ہے: ''تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی عدالت کی گرفت سے فرار کر سکتے ہو۔'' (وما انتم بمعجزین)۔

کچھ مفسرین نے اس آیت کو حقانیت قرآن یا نبوتِ پیغمبر اسلامؐ کی طرف اشارہ سمجھا ہے جب کہ آیت کا ماقبل و مابعد بخوبی گواہی دیتا ہے کہ نباء سے مراد معاد اور قیامت میں بدکاروں پر ہونے والے عذاب کا مسئلہ ہی ہے جسے مختلف تاکیدوں کے ساتھ ایک حقیقت مسلم کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

کلمہ ''ای'' اور 'ربی' کی قسم اور 'ان' اور 'لحق' میں لام اور خود کلمہ 'حق' اور اس جملے کا اسمیہ ہونا اور 'وما انتم بمعجزین' کا جملہ، یہ سب کچھ اس سلسلے میں تاکید کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

چوتھی آیت میں یہی مطلب ایک نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ پہلے کافروں کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: ''قیامت ہرگز ہم تک نہیں پہنچے گی'' (وقال الذین کفروا لا تاتینا الساعة)۔

اس کے بعد رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا ہے: ''کہہ دو! میرے اس رب کی قسم کہ جو اسرارِ نہاں سے واقف ہے یقیناً اور مسلماً قیامت تمہیں آ لے گی۔'' (قل بلی وربی لتاتینکم عالم الغیب)۔

''عالم الغیب'' کا ذکر ممکن ہے اس لئے ہو کہ منکرین معاد کا انکار اس وجہ سے تھا کہ وہ کہتے تھے: یہ پراگندہ ذرات جو زمین میں ادھر ادھر بکھر گئے ہیں، انہیں کون جمع کر سکتا ہے؟ اور انسانوں کے اعمال کہ جو سب محو و نابود ہو گئے ہیں اور جن کے کوئی آثار باقی نہیں رہے کون ان کا حساب کر کے سزا و جزا دے سکتا ہے؟ قرآن ایک کلمے میں اس کا جواب دیتا ہے: وہی اللہ جو عالم الغیب اور جملہ اسرارِ نہاں سے آگاہ ہے۔ یہ کام اسی کے ذمہ ہے۔

رہا یہ سوال کہ قیامت کا ایک نام ''ساعة'' کیوں ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ارباب لغت کے مطابق ''ساعة'' دراصل اجزاء زمان کے ایک چھوٹے سے جز کے معنی میں ہے، یا دوسرے لفظوں میں زود گزر لحظات۔ قیامت میں بندوں کا حساب یا اصل قیام قیامت چونکہ بسرعت

انجام پائے گا لہٰذا قیامت کے لئے یہ نام منتخب ہوا ہے[1]۔

ضمناً توجہ رہے کہ لسان العرب کے مطابق کلمہ "ساعت" دنیا کے خاتمے کے ناگہاں لحظے کو بھی کہا جاتا ہے اور قیام قیامت کو بھی، کیونکہ یہ بالکل اچانک واقع ہوگی۔

بعض نے ساعت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ساعت کبریٰ

۲۔ساعت وسطیٰ

۳۔ساعت صغریٰ

پہلی ساعت سے مراد ہے روزِ معاد، دوسری سے اسی زمانے کے لوگوں کی اچانک موت (جیسے قومِ نوح کی موت، جو طوفان کی وجہ سے اکٹھی غرق ہوگئی) اور تیسری سے ہر انسان کے مرنے کی گھڑی۔[2]

پانچویں آیت میں یہی مفہوم راسخون فی العلم کی زبانی ذکر ہے۔ وہ جب اللہ سے مناجات کرتے ہیں تو معاد و قیامت کا ذکر ایک قطعی ترین مسئلے کے طور پر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: پروردگارا! تو لوگوں کو اس دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک وشبہ نہیں" (ربنا انك جامع الناس ليوم لا ريب فيه)۔

مزید تاکید کے لئے اضافہ کرتا ہے: "اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرتا" (ان الله لا يخلف الميعاد)۔

اس آیت میں بھی متعدد تاکیدیں نظر آتی ہیں۔ (کلمہ ان، جملہ اسمیہ، "لا ريب فيه" اور جملہ "ان الله لا يخلف الميعاد")۔

انکارِ معاد عین گمراہی ہے

یہاں تک تو تاکیدات تھیں۔ اس کے بعد پانچ آیات میں قیامت اور معاد کے منکرین کے لئے مختلف تہدیدیں آئی ہیں۔ ہر ایک کی اپنی مخصوص عبارت ہے، مثلاً چھٹی آیت میں فرماتا ہے: "آگاہ رہنا کہ جو قیامت میں شک کرتے ہیں عمیق گمراہی میں ہیں (الا ان الذين يمارون فى الساعة لفى ضلال بعيد)۔

"يمارون" دراصل "مراء" یا "مريه" سے لیا گیا ہے۔ "مقائیس اللغۃ" کے مطابق اس کے دو معنی ہیں: ایک جانور کے تھن پر دودھ دوہنے کے لیے ہاتھ پھیرنا اور دوسرا اصلابت واستحکام۔ لیکن راغب نے مفردات میں صرف ایک پہلے معنی ہی کو ذکر کیا ہے۔

---

[1] فعل "ساع" زوال کے معنی میں آیا ہے جس میں زود گزر کا مفہوم پنہاں ہے۔ المنار میں ہے کہ ساعۃ اصل لغت میں چھوٹے سے زمانے کے معنی میں ہے جس کا تعین اس معین عمل کے ذریعے ہوتا ہے جو اس میں واقع ہوتا ہے۔ (ج ۷ ص ۳۵۹)

[2] تاج العروس فی شرح القاموس ومفرداتِ راغب۔

بعدازاں یہ کلمہ تردد وشک کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اگرچہ راغب کے مطابق اس کا مفہوم شک سے محدود تر ہے (شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ "مریہ" ایسے شک کو کہتے ہیں جس میں جستجو اور تحقیق پائی جائے، جیسے دودھ دوھنے والا تھن سے دودھ نکالنے کے لیے کوشش وجستجو کرتا ہے)۔

"مماراۃ" بحث میں مجادلہ اور جدال میں اصرار کے معنی میں ہے۔ گویا طرفین میں کوئی نہیں چاہتا کہ جو کچھ دوسرے کی فکر میں ہے اسے نکال لائے۔ یا صاحب مقائیس کے مطابق ان میں سے ہر ایک بحث میں استحکام وخشونت رکھتا ہے اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے "مریہ" کے ایک معنی استحکام ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "ضلال بعید" کی تعبیر قرآن مجید میں دس جگہ آئی ہے جو عموماً کفار، مشرکین اور منکرین معاد کے بارے میں ہے۔ اس تعبیر سے بخوبی ظاہر ہوجاتا ہے کہ عمیق گمراہی اس گروہ کا خصوصی وصف ہے کیونکہ اگر اللہ اور روزِ جزا پر ایمان ہو تو پھر گمراہی سطحی ہوگی اور ہدایت اور جادۂ حق پر واپسی کا احتمال زیادہ ہوگا۔ لیکن توحید یا معاد کا انکار انسان کو گمراہی کے آخری مرحلے تک لے جاتا ہے اور ہدایت کی حدود یعنی صراط مستقیم سے بالکل دور کر دیتا ہے۔ ایک اور تعبیر کے مطابق خداشناسی اور معاد کے دلائل اتنے روشن ہیں کہ یہ حسی مسائل کی مانند ہیں اور جو ان دو امور میں گمراہ ہوجائے اس کی گمراہی عمیق ہوجائے گی۔

ساتویں آیت میں منکرین معاد کے لئے حبط اعمال (نیک کاموں کا اجر ضائع ہوجانا) کا ذکر ہے۔ فرماتا ہے: ''جنہوں نے ہماری آیات اور ملاقاتِ آخرت کی تکذیب کی ان کے اعمال ضائع ہوجائیں گے۔ جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں کیا انہیں اس کے علاوہ سزا ملے گی (والذین کذبوا بایتنا ولقآء الاخرۃ حبطت اعمالھم ھل یجزون الا ما کانوا یعملون)۔

"حبط" لغت میں دراصل باطل ہونے یا بیمار پڑنے کے معنی میں ہے۔[1] آیات وروایات کی تعبیرات میں یہ لفظ بعض گناہوں کی وجہ سے ثوابِ اعمال ضائع ہوجانے کے معنی میں ہے۔

لسان العرب میں ہے کہ "حبط" کے معنی ہیں کہ انسان کوئی کام انجام دے اور پھر اسے باطل کردے۔

کیا "حبط" کلی طور پر طاعات ومعاصی میں حکم فرما ہے اور یہ دائماً ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ علم کلام کے علماء کے درمیان اس سلسلے میں جو گفتگو ہوئی ہے، انشاء اللہ متعلقہ مقام پر ہم تفصیل سے اسے بیان کریں گے اور اس کے بارے میں بحث کریں گے۔ البتہ قضیۂ جزیہ کی صورت میں اس کے بارے میں شک نہیں کہ کفر کی مانند بعض امور تمام نیک اعمال کا اجر ضائع کر دیتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص بے ایمان دنیا سے چلا جائے تو اس کے تمام اعمالِ خیر اس طرح محو ونابود ہوجاتے ہیں جیسے تیز ہوا خاکستر کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ مندرجہ بالا آیت آیاتِ الٰہی اور معاد کے منکرین کے بارے میں یہی کچھ کہتی ہے اور یہ بات اس اہمیت پر ایک روشن دلیل ہے کہ جو قرآنِ مجید کی نظر میں معاد کو حاصل ہے۔

---

[1] مقائیس اللغہ (مادہ ''حبط'')

آٹھویں آیت میں آخرت پر ایمان نہ رکنے والوں کو عذاب الیم کی صریح تہدید کی گئی ہے۔فرماتا ہے:''جولوگ قیامت پر ایمان نہیں لائے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کررکھا ہے(وان الذین لا یومنون بالاخرۃ اعتدنا لھم عذابا الیما)۔

ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ یہ جزا ابھی سے تیار ہے تا کہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ ایسا وعدہ کیا گیا ہے جس پر عمل درآمد میں تاخیر ہے اور دوسری طرف عذابِ الٰہی کو الیم اور دردناک قرار دیا گیا ہے۔تا کہ معاد پر ایمان کی اہمیت کو زیادہ واضح کیا جا سکے۔

''عذاب الیم'' کا کلمہ قرآن مجید کی آیات میں دسیوں بار آیا ہے اور زیادہ تر کافروں اور منافقوں کے بارے میں ہے۔کہیں کہیں بڑے بڑے گناہوں کے بارے میں اس کا ذکر ہوا ہے،مثلاً جہاد سے کنارہ کشی اختیار کرنا (توبہ ۳۹)،قصاص لیتے ہوئے تجاوز کرنا (بقرہ ۱۷۸)،فحشاء کی شہرت کرنا (نور ۱۹) یا ظلم وستم کرنا (زخرف ۶۹) اور اسی طرح کے دوسرے عظیم اور کبیرہ گناہوں کے بارے میں یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔

نویں آیت میں روزِ قیامت کو بھول جانے والوں کے لئے تین دردناک سزائیں بیان کی گئی ہیں۔فرماتا ہے: قیامت میں (کافروں سے) کہا جائے گا کہ ہم آج تمہیں بھلا دیں گے جیسے تم نے آج کی ملاقات کو بھلا دیا تھا(وقیل الیوم ننساکم کما نسیتم لقاء یومکم ھذا)

اور تمہارا ٹھکانا آگ ہے(وماواکم النار)۔

اور تمہارا کوئی مددگار نہیں(وما لکم من نصرین)۔

درحقیقت قیامت کو بھول جانا ہر طرح کی گمراہی کا سرچشمہ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ۝۲۶

''جولوگ اللہ کے راستے سے بھٹک گئے ہیں ان کے لئے شدید عذاب ہے،اس لئے کہ انہوں نے روزِ حساب کو فراموش کر دیا۔''(ص ۲۶)[1]

البتہ خدا ہر جگہ حاضر ہے اور ہر چیز اس کے سامنے ہے۔اس کے لئے بھول جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔مراد یہ ہے کہ ایسے بھول جانے والوں کو اپنی رحمت سے یوں بے نصیب کر دیتا ہے گویا وہ بھلا دئے گئے ہوں۔(غور کیجئے گا)۔

آخر کار دسویں اور آخری آیت میں منکرین معاد کو آگ میں ہمیشگی اور عذاب کی جاودانی کی تہدید دی گئی ہے۔رسولِ اکرمؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے:''اگر تو تعجب کرنا چاہے تو ان لوگوں کی بات عجیب ہے جو کہتے ہیں:''کیا جب ہم خاک ہو جائیں تو نئی خلقت پائیں گے۔''(وان تعجب فعجب قولھم ءاذا کنا ترابا ءانا لفی خلق جدید)۔

---

[1] المیزان، ج ۱۳ ص ۵۰

پھر اضافہ فرماتا ہے: ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے رب کے لئے کفر کرتے ہیں اور وہ طوق و زنجیر ہیں کہ جو ان کی گردنوں میں ہیں اور وہ اہل نار ہیں۔ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔'' (اولئك الذين كفروا ابربهم و اولئك الاغلال فی اعناقهم واولئك اصحب النارهم فيها خلدون)۔

آیت کے شروع میں کفار کے تعجب کا ذکر ہے۔ پھر اس تعجب کو عجائب میں سے شمار کیا گیا ہے۔ یعنی کیا ایسی واضح بات، جس پر اس قدر روشن دلائل موجود ہیں، پر تعجب کیا جا سکتا ہے؟ آیت کے آخر میں ان کا قیدی کی صورت میں تعارف کروایا جا رہا ہے جن کی گردنوں میں طوق و زنجیر ہیں۔ تعصب، جہالت اور ہوا پرستی سے بڑھ کر طوق و زنجیر اور کیا ہو سکتے ہیں جو ان سے ہر طرح کی آزادیٔ فکر چھین لیتے ہیں، یہاں تک کہ اتنا واضح مسئلہ ان کے لئے باعث تعجب بن گیا ہے، صرف اس لئے کہ یہ ان کی ہوائے نفس اور اندھی تقلید کے خلاف ہے۔

توجہ رکھئے گا کہ یہ نہیں کہتا کہ قیامت میں ان کی گردنوں میں طوق و زنجیر ہوں گے۔ بلکہ ظاہر آیت یہ ہے کہ اس وقت وہ ایسے ہیں جیسا کہ اشعارِ عرب میں ہے۔

لهم عن الرشد اغلال و اقياد

اُن کے طوق و زنجیر انہیں ہدایت سے دور رکھے ہوئے ہیں۔

بعض مفسرین نے آیت کو ان کی قیامت کی حالت کی طرف اشارہ سمجھا ہے، یعنی اس دن ان کی گردنوں میں طوق و زنجیر پڑیں گے [1] بعض نے ہر دو احتمال ذکر کیے ہیں۔ [2] لیکن بعض نے اسے دنیا میں ان کی وضع کی طرف اشارہ شمار کیا ہے، جیسا کہ علامہ طباطبائی مرحوم تفسیر المیزان میں کہتے ہیں:

''یہ جملہ مادی دنیا میں گرفتاری، ہوائے نفس پر بھروسہ، جہالت کی قید اور انکار کی زنجیروں کی طرف اشارہ ہے۔'' [3]

مسلم ہے کہ ایسے طوق و زنجیر جو انسان اس دنیا میں اپنے اختیار سے اپنے ہاتھ، پاؤں اور گردن میں ڈال لیتا ہے، قیامت میں آتشیں طوق و زنجیر کی صورت میں تجسم اختیار کر لیں گے اور ایسے انسان کو پروردگار کے مقام قرب کی طرف بڑھنے سے روک دیں گے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیت سے مجموعی طور پر اور دیگر آیات سے جو آئندہ مباحث میں آئیں گی، سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کس

---

[1] مجمع البیان، سورہ رعد، آیت ۵ کے ذیل میں، و تفسیر قرطبی ج ۵ ص ۳۵۱۳

[2] فخر الدین رازی، ج ۱۹ ص ۹

[3] تفسیر المیزان، ج ۱۱ ص ۳۲۹

حدتک معاد پر ایمان کو اہمیت دیتا ہے اور کس طرح سے اسے ایمان کا ایک پایہ اور رکن قرار دیتا ہے۔قرآن کی نظر میں اس ایمان کے نہ ہونے کا نتیجہ عمیق گمراہی اور ضلالِ بعید ہے۔اس سے انسان حق سے دور ہو جاتا ہے، عذاب الیم کا مستحق ٹھہرتا ہے اور اس کا نتیجہ دوزخ میں دائمی طور پر رہنا ہے۔اس کا انکار آزادیٔ فکر نہ ہونے اور جہل، عناد اور ہٹ دھرمی کی زنجیروں میں قید ہونے کی نشانی ہے۔

بالکل اسی دلیل کی بناء پر قرآن میں توحید اور خداشناسی کی بحث کے بعد یہ گفتگو سب سے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔

معاد کے لیے قرآنی تعبیرات

اشارہ

قرآن مجید میں معاد کے بارے میں سینکڑوں آیات ہیں جن میں بالکل متنوع تعبیرات آئی ہیں۔ ہر تعبیر معاد کے مفہوم کے کسی ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ مجموعی طور پر یہ تعبیرات اس مسئلے کی گہرائی اور موت کے بعد کی زندگی کے اہداف بیان کرتی ہیں۔

معاد کے بارے میں متنوع قرآنی تعبیرات ہماری آنکھوں کے سامنے اس اہم اعتقادی مسئلے کے تازہ افق پیش کرتی ہیں۔ اس حوالے سے ہم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

اس مسئلے کے بارے میں قرآن کی اہم ترین اور نمایاں ترین تعبیرات آٹھ ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

۱۔ "قیام الساعة" (قیامت)

۲۔ "احیاء موتی" (مردوں کو زندہ کرنا)

۳۔ "بعث" (اٹھانا)

۴۔ "حشر" (جمع کرنا)

۵۔ "نشر" (پھیلانا)

۶۔ "معاد" (اللہ کی طرف بازگشت)

۷۔ "لقاء رب" (دیدار پروردگار)

۸۔ "رجوع" (اس کی طرف لوٹ جانا)

اس اشارے کے بعد ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور ان مندرجہ بالا تعبیرات کے کچھ نمونے دیکھتے ہیں۔

آیات

(۱) وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ (روم ۱۲)

(۲) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۶﴾ (حج ۶)

(۳) وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾ (حج ۷)

(۴) وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ (حجر ۲۵)

(۵) وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝ (فاطر ۹)

(۶) كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝ (اعراف ۲۹)

(۷) قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ۝ (یونس ۴۵)

(۸) كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۫ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (عنکبوت ۵۷)

ترجمہ

(۱) جس روز قیامت برپا ہوگی مجرمین ناامیدی اور غم واندوہ میں ڈوب جائیں گے۔

(۲) یہ اس لیے ہے تاکہ جان لو کہ اللہ حق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

(۳) اور یہ ہے قیامت جس میں کوئی شک نہیں اور قبر میں سب آرام کرنے والوں کو وہ زندہ کرے گا۔

(۴) اور تیرا رب (قیامت میں) سب کو جمع اور محشور کرے گا کیونکہ وہ حکیم ودانا ہے۔

(۵) اللہ وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو حرکت دیں، ان بادلوں کو ہم مردہ زمینوں کی طرف لے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتے ہیں۔ قیامت بھی اسی طرح ہے۔

(۶) (اور جان لو کہ) جیسے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا تھا (قیامت میں پھر اسی طرح) لوٹ جاؤ گے۔

(۷) جن لوگوں نے لقاء اللہ (اور قیامت) کا انکار کیا تھا انہوں نے نقصان اٹھایا اور ہدایت نہ پائی۔

(۸) ہر انسان ذائقہ موت چکھے گا، پھر ہماری طرف لوٹ آئے گا۔

تفسیر وجمع بندی آیات

۱۔ قیامت

رستاخیز کے لیے معروف ترین تعبیر ''قیامت'' ہے۔ یہ لفظ ''قیام'' سے لیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ۷۰ مقامات پر اس عظیم دن کو ''یوم القیامۃ'' کہا گیا ہے۔ بعض آیات میں، جیسے زیر بحث پہلی آیت میں کہا گیا ہے ''جس دن ساعت قائم ہوگی''۔ فرماتا ہے: ''جس دن ساعت

برپا ہوگی، مجرمین ناامید ہوجائیں گے۔(ویوم تقوم الساعة یبلس المجرمون)۔[1]

گنہگاروں کے لیے لازم ہے کہ اس دن مایوس، غمگین، ساکت اور خاموش ہوں کیونکہ وہ اپنے اعمال کے نتائج دیکھیں گے اور گزرے ہوئے کی تلافی وتدارک کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

''مایوسی دوطرح کی ہے:

کبھی انسان کے لیے راحت کا موجب ہوتی ہے اور یہ ایسی صورت میں ہوتی ہے جب یہ ایسے امور سے متعلق ہو کہ انسان کو جن کا انتظار ہو، جب کہ وہ اس کی ضروریات زندگی میں سے نہ ہوں۔ایسے مواقع پر مایوسی راحت کا باعث ہوتی ہے۔

لیکن کبھی ایسے امور کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جن کی انسان کو شدید ضرورت ہو۔واضح ہے کہ ایسے امور میں یاس حیرت وسرگردانی اور جانکاہ غم واندوہ کا باعث بنتی ہے۔کلمہ ''ابلاس'' دوسرے موقع کے لیے استعمال ہوتا ہے(جب کہ کلمہ ''یاس'' کی یہ صورت نہیں)۔

کبھی فرماتا ہے:

"یوم یقوم الحساب"

''جس دن حساب برپا ہوگا۔''(ابراہیم ۴۱)

اسی طرح فرماتا ہے:

"یوم یقوم الناس لرب العلمین"

''جس دن لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے۔''(مطففین ۶)

پھر فرماتا ہے:

"یوم یقوم الروح والملئکة"

''جس دن اللہ کا عظیم فرشتہ روح اور دیگر فرشتے قیام کریں گے۔''(نباء ۳۸)

علی ہذا القیاس فرماتا ہے:

"یوم یقوم الاشهاد"

---

[1] "یبلس" "ابلاس" کے مادہ سے ہے جو راغب کے مطابق دراصل ایسے غم واندوہ کے معنی میں ہے جو یاس وناامیدی کی شدت کے سبب ہو۔بعض نے اس کے معنی یاس کیے ہیں جب کہ بعض مفسرین اور ارباب لغت نے اس کے معنی ایسا سکوت قرار دیے ہیں کہ جو دلیل مطلب نہ ہونے کی وجہ سے ہو(مفردات، صحاح، التحقیق، روح المعانی اور تفسیر المیزان)

''جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔'' (مومن ۵۱)

ہاں یہی دن قیام کا اور اٹھ کھڑے ہونے کا ہے۔

روزِ قیام ساعت، قیام حساب، قیام انسان، قیام ملائکہ، قیام گواہان۔ روزِ قیام یعنی ہر چیز کے قیام کا دن۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان تعبیرات میں قیام الساعۃ کا ایک خاص مفہوم ہے کیونکہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں ساعت کے معنی ہیں زمانہ کا ایک جزء۔ کیا زمانہ بھی اٹھ کھڑا ہوگا؟ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ تعبیر اس بات پر دلیل ہے کہ یوم قیامت گویا ایک زندہ موجود ہے جس کے لیے قیام اور اٹھ کھڑے ہونے کا تصور موجود ہے۔ (غور کیجیے گا)

۲۔ مردوں کا زندہ ہونا

''مردوں کو زندہ کرنا'' ایک اور ایسا عنوان ہے جو معاد سے مربوط آیتوں میں وسیع طور پر دکھائی دیتا ہے جیسا کہ دلائل معاد کے حصے میں انشاء اللہ آئے گا کہ بہت سے دلائل کا دارومدار اسی عنوان پر ہے اور طرح طرح سے موت کے بعد مردوں کے زندہ ہونے کا امکان ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی اس سلسلے میں جو آیت ذکر کی گئی ہے اس میں پہلے تین اہم مسئلے ذکر کیے گئے ہیں (خاک سے انسان کی تخلیق، شکم مادر میں بچے پر رونما ہونے والی تبدیلیاں اور حیات بخش بارش کا نزول) اس کے بعد فرماتا ہے: ''یہ اس لیے تاکہ تم جان لو کہ اللہ حق ہے، وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ (ذلك بأن الله هو الحق وانه يحيي الموتى وانه على كل شيء قدير)۔

''حق'' حقیقت اور ثبوت کے معنی میں ہے۔ ''المیزان'' کے مطابق یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ عین حقیقت ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ حامل حقیقت ایک وجود ہو۔ وہ عین ثبوت اور عین حقیقت ہے، بلکہ عالم میں ہر چیز کی حقانیت اور ثبوت اس کے وجود کی برکت ہے۔ [1]

حق کی ضد باطل ہے جس کی کوئی واقعیت اور ثبوت نہیں، بلکہ خیال، زعم اور سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں تین مظاہر (انسان کی مٹی سے پیدائش، رحم مادر میں بچے کے تغیرات اور مردہ زمینوں کا زندہ ہونا) بھی مبدا پر دلیل کے طور پر، یعنی اصل وجود خدا کی دلیل کے طور پر بھی ذکر ہوئے ہیں، معاد پر دلیل کے طور پر بھی اور صفات خدا (مثلاً قدر) پر دلیل کے طور پر بھی۔ درحقیقت یہ وسیع تغیرات کہ جو عالم کی تمام چیزوں پر حکم فرما ہیں اس امر پر دلیل ہیں کہ عالم ہستی میں ایک نقطہ ثابت موجود ہے اور یہ عجیب نظام جو متغیر مظاہر پر حاکم ہے اس کے علم اور قدرت کی نشانی ہے اور یہ سب اس امر پر دلیل ہے کہ حیات بعد از موت پوری طرح ممکن ہے۔ یقیناً واقع ہوگی۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ''احیاء موتی'' (حیات بعد از موت) کی تعبیر وسیع طور پر آیات معاد میں آئی ہے۔ یہ تعبیر معاد

---

[1] المیزان، ج ۱۴ ص ۳۷۸

جسمانی پر ایک واضح دلیل ہے، نہ فقط روح انسانی کی حیات پر۔ یعنی جسم انسانی بھی دوسرے عالم میں پلٹ آئے گا (البتہ ایک بلند تر اور بالاتر حالت میں جس کے بارے میں بعد میں اشارہ کیا جائے گا)۔ اگر معاد صرف روحانی ہوتی تو حیات بعد از موت کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا کیونکہ جسم سے علیحدگی کے بعد روح تو ویسے ہی باقی رہتی ہے۔

فارسی لفظ ''رستاخیز'' حیات بعد از موت کے ہی معنی دیتا ہے، کیونکہ ''رست'' کی بنیادی پہلوی فارسی کا لفظ ''ریستک'' ہے جس کے معنی میں ''مردہ''۔ رستاخیز یا ''رستخیز'' مردوں کے اٹھنے کے معنی میں ہے۔[1] عربی میں اس کا متبادل ''قیامت'' یا ''احیاء موتی'' ہے۔

۳۔ ''بعث'' (اٹھنا)

قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں آنے والے الفاظ میں سے ایک لفظ ''بعث'' ہے۔ زیر بحث آیات میں جو سورۂ حج کی گذشتہ آیت کے بعد ہیں، فرماتا ہے: ''یہ اس لیے ہے کہ جان لو کہ قیامت آئے گی، اس میں کوئی شک نہیں ہے اور اللہ ان سبکو اٹھائے گا جو قبروں میں آرام کر رہے ہیں۔'' (وان الساعة اتية لاريب فيها وان الله يبعث من فى القبور)۔

یہ لفظ قرآن میں اس قدر آیات ہے کہ قیامت کے ناموں میں سے ایک ''یوم البعث'' (اٹھائے جانے کا دن) روم ۵۶) یا ''یوم یبعثون'' ہو گیا ہے۔ یہ تعبیر قرآن کی چھ آیتوں میں آئی ہے۔[2]

حتی کہ مشرکین رسول اکرمؐ سے جو سوالات کرتے تھے ان میں بھی یہ تعبیر بار بار دکھائی دیتی ہے، مثلاً:

ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۙ﴿۱۶﴾

''کیا جب ہم مر جائیں گے، خاک اور ہڈیاں بن جائیں گے، تو اٹھائے جائیں گے۔'' (صافات ۱۶)[3]

''بعث'' کا لغت میں وسیع مفہوم ہے۔ بعض نے اسے ''بھیجنے'' کے معنی میں، بعض نے ''پہنچانے'' کے معنی میں اور بعض نے ''منتشر کرنے'' کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ اس کے استعمال کے مختلف مواقع سے معلوم ہوتا ہے اس کا مفہوم وہی ہے جو فارسی کے لفظ ''برانگیختن'' (اٹھانا) میں پایا جاتا ہے۔ البتہ اپنے استعمال کے ہر موقع پر موقع کی مناسبت سے اس کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ مثلاً ''تبلیغ کے لیے رسول اللہؐ کی بعثت، جہاد کے لیے لشکر کی بعثت، فرائض کی ادائیگی کے لیے انسان کو نیند سے اٹھانا، حساب کے لیے مردوں کو اٹھانا یا جانور کو

---

[1] لغت نامہ دھخدا (مادہ رستاخیز)

[2] اعراف ۱۴، حجر ۱۶، مومنون ۱۰۰، شعراء ۸۶، صافات ۱۴۴ اور ص ۷۹

[3] یہ معنی سورہ بنی اسرائیل ۴۹ و ۹۸، مومنون ۸۲، واقعہ ۴۷، انعام ۲۹ اور مومنون ۳۷ میں آیا ہے۔

حرکت کے لیے اٹھانا۔''[1] و[2]

قیامت کے لیے اس لفظ کا انتخاب اس آغاز حرکت کی وجہ سے ہے جب اللہ مردوں کو قبروں سے اٹھائے گا، پھر انہیں فیصلے اور حساب کے لیے قیامت کی عدالت میں بھیجے گا اور وہاں سے پھر وہ جنت یا دوزخ کی طرف جائیں گے۔ ان میں سے ہر مرحلہ "بعث" کا ایک مصداق ہے۔

قرآن کی آیات میں ایک لفظ اور بھی دکھائی دیتا ہے جو کلمہ "بعث" سے قریب ہے اور وہ ہے مادہ "بعثرة" (بروزن "منقبة") یہ لفظ قرآن کی صرف دو آیتوں میں نظر آتا ہے۔

"واذا القبور بعثرت"

''جب قبریں الٹ پلٹ ہو جائیں گی (اور مردے حساب کے لیے اٹھائے جائیں گے)۔'' (انفطار ۴)

دوسری جگہ فرماتا ہے:

"افلا یعلم اذا بعثر ما فی القبور"

''کیا انسان نہیں جانتا کہ جب جو کچھ قبروں میں ہے الٹ پلٹ ہو جائے گا اور اٹھایا جائے گا۔'' (عادیات ۹)

لفظ "بعثرہ" کو ارباب لغت نے اگرچہ الٹ پلٹ کرنے اور منتشر کرنے کے معنی میں بیان کیا ہے لیکن مفردات میں راغب کے بقول بعید نہیں کہ یہ کلمہ دو الفاظ "بعث" اور "اثیرت" کا مرکب ہو جن میں سے پہلے کے معنی ہیں ''اٹھانا'' اور دوسرے کے ''منتشر کرنا''۔ لہٰذا اس میں ہر دو کا مفہوم جمع ہے۔

بیضاوی نے یہی بات ایک اور انداز سے نقل کی ہے، وہ یہ کہ یہ کلمہ "اثارة" "بعث" اور "رأی" کا مرکب ہے۔[3]

۴۔ حشر

قیامت کے بارے میں ایک اور تعبیر جو قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئی ہے "حشر" ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں فرماتا ہے: تیرا پروردگار ان سب کو محشور کرے گا کہ وہ حکیم و دانا ہے۔ (وان ربك هو يحشرهم انه حكيم عليم)۔

اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انسان کی موت کے ساتھ ہر چیز کا اختتام نہ کیا جائے۔ ورنہ دنیاوی زندگی، نیند، کھانا، پہننا اور پینا کی حیثیت اس سے کہیں کم تر ہے کہ انسان بلند مرتبہ اور اس وسیع جہان کی خلقت کا ہدف ہوں۔ نیز اس کا علم اس امر کا سبب بنتا ہے کہ معاد، حشر و نشر

---

[1] مفردات راغب، مقائیس اللغہ اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم

[2] ہم نے اس جملے میں جہاں ''بعثت'' اور ''اٹھانا'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں فارسی میں ان کی جگہ ''برانگیختن'' استعمال کیا گیا ہے۔ (مترجم)

[3] تفسیر بیضاوی انفطار آیہ ۴ کے ذیل میں

اور بندوں کے حساب و کتاب (یعنی انسانی وجود کے ذرات کی جمع آوری اور اسی طرح انسانوں کے اعمال واقوال کی جمع آوری) میں کوئی مشکل پیش نہ آئے کیونکہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

"حشر" کی تعبیر تقریباً تیس مرتبہ قیامت کے بارے میں قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں استعمال ہوئی ہے۔ یہ وسیع استعمال قرآنی نظر میں اس کی اہمیت کی دلیل ہے۔ ''مقائیس کے مطابق'' حشر کا لفظ اس طرح جمع کرنے کے معنی میں ہے جس کے معنی ساتھ ساتھ چلانا اور حرکت دینا بھی ہیں۔ کبھی یہ ہر طرح سے جمع کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''مفردات'' کے مطابق فوجی مرکز سے کچھ تعداد فوج کو میدان جنگ وغیرہ کی طرف بھیجنے کے معنی میں بھی ہے۔ لہٰذا روایت میں آیا ہے:

"النسآء لایحشرن"

''یعنی عورتوں کو میدانِ جنگ کی طرف نہیں لے جایا جاتا۔''

"التحقیق" میں ہے کہ اس کا اصلی ریشہ تین لفظوں کے معانی پر مشتمل ہے: "بعث" "سوق" (دھکا دینا، چلانا) اور ''جمع''۔

"حشرات الارض" کے معنی ہیں چھوٹے چھوٹے متحرک جاندار (کیڑے مکوڑے)۔ انہیں ان کی کثرت، حرکت اور چلائے جانے کی وجہ ہی سے یہ نام دیا گیا ہے۔

معاد اور روزِ قیامت کے لیے اس تعبیر سے استفادہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اس صفحہ ارض پر پوری انسانی تاریخ میں جتنے بھی انسان ہوئے ہیں اس روز جمع ہوں گے، حساب کتاب کے لیے عدالت الٰہی کی طرف انہیں چلایا جائے گا اور پھر انہیں جنت اور دوزخ کی طرف حرکت دی جائے گی۔

مزید برآں یہ کہ اس روز ہر انسان کے وجود کے ذرات کو جو کرۂ زمین میں ادھر ادھر بکھر چکے ہوں گے حتیٰ کہ اگر سمندروں اور فضاؤں میں بھی منتشر ہو چکے ہوں گے، تو حکم خدا سے باہم جمع ہو جائیں گے اور روح ان میں لوٹ آئے گی۔ وہ خود ہی نہیں بلکہ ان کے اعمال بھی جمع ہو جائیں گے۔ لہٰذا روزِ قیامت مختلف حوالوں سے یوم جمع وحشر ہے۔

بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں اہل زمین ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اہل آسمان بھی جمع ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے یوم التلاق (ملاقات کا روز) قرار دیا گیا ہے جو قیامت کے ناموں میں سے ایک ہے اور سورہ مومن آیت ۱۵ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

"یوم یلتقی اهل السمآء واهل الارض"

''جس دن اہل آسمان اہل زمین سے ملیں گے۔''[1]

---

[1] بحارالانوار، ج ۷ ص ۵۹ حدیث ۵

۵۔نشر

"نشر" یا "نشور" ایک اور تعبیر ہے جو قرآن مجید کی متعدد آیات میں روزِ قیامت کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ یہ درحقیقت موت کے بعد کی انسانی زندگی کے ایک پہلو کی نشاندہی کرتی ہے جیسا کہ زیر بحث پانچویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں۔ ''اللہ وہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ بادلوں کو حرکت دیں۔ پھر ہم ان بادلوں کو مردہ زمینوں کی طرف چلا لے جاتے ہیں۔ پس اس زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتے ہیں۔ (قیامت میں انسانوں کا) نشر اسی طرح ہے۔'' (واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحابا فسقنہ الی بلد میت فاحیینا بہ الارض بعد موتہا کذلک النشور)۔

مفردات میں راغب کے کہنے کے مطابق "نشر" اور "نشور" دراصل پھیلانے اور بچھانے کے معنی میں ہیں جیسے کپڑوں، کاغذ، بادل، نعمتوں اور احادیث کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

''مقائیس اللغۃ'' کے مطابق یہ لفظ دراصل اس طرح سے کھولنے کے معنی میں ہے جس کے ہمراہ بکھیرنا بھی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ فضا میں پھیل جانے والی خوشبو کو ''نشر'' کہتے ہیں۔

معاد کے لیے اس لفظ کا استعمال، یا تو اس لیے ہے کہ محشر کے مختلف حصوں میں انسان پھیلے ہوئے ہوں گے، جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں بھی اشارہ ہوا ہے، یا پھر اعمال ناموں کے پھیلائے جانے کی وجہ سے، جیسا کہ سورۂ تکویر آیت ۱۰ میں ہے:

"واذا الصحف نشرت"

''جب اعمال کے صحیفے پھیلائے جائیں گے۔''

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ زیر عرش سے خاص بارش بھیجے گا۔ جب وہ زمین پر پڑے گی تو مردہ جسموں میں جان پڑ جائے گی اور اسی طرح پودے بھی اگ آئیں گے۔ پھر ان میں روحیں پھونکی جائیں گی۔ پھر زمین پھٹ جائے گی اور وہ مٹی سے باہر آجائیں گے (گویا زمین ان کے لیے رحم مادر ہے)۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے:

ایک شخص نے رسول اللہؐ سے پوچھا: ''اللہ مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟''

فرمایا: کیا کبھی تم ایسی بالکل خشک اور بے آب و گیاہ زمین سے گزرے ہو کہ جب اس پر سے دوسری مرتبہ گزرے ہو تو وہ سبز ہوگئی ہو؟

سائل نے کہا: ''جی ہاں''۔

---

[1] تفسیر روح البیان، ج ۷، ص ۳۲۳ (کچھ تلخیص کے ساتھ)

فرمایا: ''اللہ مردوں کو بھی یونہی زندہ کرتا ہے۔''

یا فرمایا: ''نشور بھی اسی طرح ہے۔''[1]

۶۔معاد

بعض دیگر آیات میں قیامت کے لیے "عود" اور انسانوں کے لوٹنے کی تعبیر بھی استعمال کی گئی ہے۔اس سے مراد حیات نو کی طرف لوٹنا ہے۔زیر بحث چھٹی آیت میں ہے: ''جیسے تمہیں شروع میں پیدا کیا (قیامت میں ویسے ہی دوسری مرتبہ) لوٹائے جاؤ گے۔'' (کما بدا کم تعودون)

دلائل معاد کی بحث میں انشاءاللہ دیکھیں گے کہ یہ جملہ سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود امکان معاد پر روشن ترین دلیل کا حامل ہے۔ اس میں اولین خلقت کے حوالے سے خلقت جدید پر استدلال کیا جارہا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ لفظ "عود" مشرکین اور منکرین معاد کی زبان تک پر موجود تھا۔وہ کہتے: ''کون ہمیں نئی زندگی کی طرف لوٹا سکتا ہے؟'' (فسیقولون من یعیدنا)۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے:

"قل الذی فطرکم اول مرة"

''کہہ دیجئے: وہی جس نے شروع میں تمہیں پیدا کیا۔'' (بنی اسرائیل ۵۱)

لفظ ''معاد'' بھی یہیں سے لیا گیا ہے۔

ضمناً یہ لفظ معادِ جسمانی کے مسئلے پر بھی ایک روشن دلیل ہے کیونکہ درحقیقت روح کے لیے لوٹ آنے کا کوئی مفہوم نہیں، بلکہ موت کے بعد وہ تو باقی رہتی ہے۔یہ تو جسمانی حیات ہے جو قیامت میں لوٹ آئے گی اور روح اس سے منسلک ہوجائے گی۔

ایک اہم نکتہ جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ زیر بحث آیت کی جو تفسیر بیان ہوئی ہے حیات کی اصل بازگشت کے لیے تشبیہ ہے (یہ تفسیر طبرسی مرحوم نے اپنے کلام کے آغاز میں ذکر کی ہے۔روح البیان میں بھی اسے تفسیر آیہ کے طور پر انتخاب کیا گیا ہے)۔

لیکن تفسیر کبیر میں فخر الدین رازی، المیزان میں علامہ طباطبائی، المنار میں صاحب المنار اور بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ تشبیہ اس سلسلے میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شروع میں لوگوں کو دو جماعتوں کی صورت میں پیدا کیا۔ایک جماعت مومنین کی تھی اور دوسری کافروں کی۔ ایک جماعت نے انبیاء کی ہدایت کے زیر سایہ راہ ہدایت کو انتخاب کیا اور دوسری جماعت نے شیطانی وسوسوں کی وجہ سے گمراہی کا راستہ اختیار کیا۔قیامت میں بھی یہ دو جماعتوں کی صورت میں ہی محشور ہوں گے، یعنی مومن و کافر، سعادت مند و بدبخت۔انہوں نے بعد کی آیت کی اس آیت کے لیے شاہد جانا ہے جو یہ ہے:

---

[1] تفسیر روح البیان، ج ۷ ص ۳۲۳

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ (اعراف ۳۰)

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ فخرالدین رازی نے اسے جبر اور ذاتی سعادت وبدبختی کی دلیل ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ اگر ہم قرآن کی دیگر آیات پر جو اسی جیسی ہیں، نظر دوڑائیں تو جانیں گے کہ یہاں تشبیہہ ہدایت بعد از موت کے لیے ہے، نہ کہ دنیا میں ہدایت وگمراہی کے لیے۔ سورہ روم کی آیت ۱۱ میں فرماتا ہے:

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ⑪

''اللہ خلقت کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ بھی فرماتا ہے اور پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔''

اسی سورت کی آیت ۲۷ میں ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ

''وہی ہے جس نے خلقت کا آغاز کیا، پھر اس کا اعادہ بھی کرتا ہے اور یہ اعادہ اس کے لیے آسان تر ہے۔''

دیگر آیات بھی یہی مفہوم دیتی ہیں (یونس ۴ و ۳۴، نمل ۶۴ اور عنکبوت ۱۹)

ممکن ہے یہاں کہا جائے کہ مسئلہ سعادت و بدبختی کے لیے آیت کی تفسیر اس روایت کے مطابق ہے جو تفسیر علی بن ابراہیم میں ابی الجارود سے نقل ہوئی ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

"خلقهم حين خلقهم مومنا وكافر اوسعيد اوشقيا و كذلك يعودون يوم القيامة مهتديا وضالا....."

''جیسے اس نے ابتداء میں ایک جماعت کو مومن اور ایک جماعت کو کافر پیدا کیا، ایک جماعت کو سعادت منداور دوسری کو بدبخت بنایا، اسی طرح قیامت میں لوگ جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک ہدایت یافتہ اور دوسری گمراہ۔''[1]

لیکن بلاشبہ یہ حدیث متشابہ حدیثوں میں سے ہے۔ اس کا راوی ابوالجارود، جس کا نام زیاد بن منذر ہے، ایسے افراد میں سے ہے جس کی کتب رجال میں شدید مذمت کی گئی ہے، یہاں تک کہ بعض نے اس کا نام ''سرحوب'' رکھا ہے جو شیطان کے ناموں میں سے ہے۔ بعض روایات میں اسے کذاب اور کافر قرار دیا گیا ہے اور اسے ایک منحرف مذہب جارودیہ کا بانی کہا گیا ہے۔ (جو زیدیہ کا ایک فرقہ ہے)۔

لہٰذا صحیح تفسیر وہی پہلی ہے۔

---

[1] تفسیر القمی، ج ۱ ص ۲۲۶ اور تفسیر نور الثقلین، ج ۲ ص ۱۸

۷۔لقاءاللہ

قیامت ومعاد کے لیے قرآن مجید کی متعدد آیات میں استعمال ہونیوالی ایک اورتعبیر "لقاء اللہ" یا "لقاء رب" ہے۔ساتویں زیر بحث آیت بھی انہی آیات سے ہے۔ارشاد ہوتا ہے "جولوگ لقاءاللہ کی تکذیب کرتے ہیں یقینا خسارے میں ہیں اورانہوں نے ہرگز ہدایت نہیں پائی۔"(قدخسر الذین کذبوا بلقآء اللہ وما کانوا مھتدین)۔[1]

"لقا اللہ" یا "لقاء رب" کی تعبیر جو بار بار آیات قرآن مجید میں آئی ہے، بہت معنی خیز اورعمیق ہے، اگرچہ بعض مفسرین اس سے بہت سادگی سے گزر گئے ہیں۔

کبھی کہتے ہیں "لقاء اللہ" سے مراد قیامت میں فرشتوں کی خدا سے ملاقات ہے۔

کبھی کہا ہے کہ حساب اور جزاوثواب سے ملاقات مراد ہے۔

اورکبھی یہ کہ حکم وفرمان سے ملاقات مراد ہے۔

اس طرح سے ان میں سے ہرکسی نے ایک کلمہ تقدیر میں فرض کیا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا خلاف اصل ہے اور جب تک اس پرکوئی دلیل نہ ہواس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ رکھتے ہوئے ہم اصلی تفسیر کی جستجو کرتے ہیں۔بلاشبہ مراداللہ سے حسی ملاقات نہیں کیونکہ حسی ملاقات صرف اجسام سے ہوسکتی ہے جومکان وزمان، رنگ اوردیگر کیفیات کے حامل ہوں، اس طرح کہ انہیں ظاہری آنکھ سے دیکھا جاسکے۔

لہٰذا یہاں مراداللہ سے شہود باطنی، دیدارِروحانی اور ملاقات معنوی ہے۔کیونکہ قیامت میں حجاب اٹھ جائیں گے۔آثارالٰہی اس طرح عرصہ محشر، میدانِ معاداورمقامات قیامت میں ظاہروآشکارہوں گے کہ سب یہاں تک کہ کافربھی، اللہ کوچشم دل سے دیکھیں گے اوراس کا دیدارکریں گے (اگرچہ اس دیدار کے بھی مختلف درجے اورصورتیں ہیں)۔

علامہ طباطبائی مرحوم تفسیرالمیزان میں لکھتے ہیں:

"بندگانِ خدا ایسے حالات میں ہوں گے کہ ان کے اوران کے پروردگار کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا کیونکہ یوم قیامت کی طبیعت ہی حقائق کے ظہوروبروز سے عبارت ہے، جیسا کہ سورنور کی آیت ۲۵ میں آیات ہے:

وَيَعْلَمُونَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾

---

[1] یہی تعبیر دیگر آیات میں بھی آتی ہے: انعام ۳۱ و ۱۴۵، یونس ۷ و ۱۱ و ۱۵، رعد ۲، کہف ۵ و ۱۰۵ و ۱۱۰، فرقان ۲۱، عنکبوت ۵ و ۲۳، روم ۸، سجدہ ۲۳، حم سجدہ ۵۴ اور سجدہ ۱۰ و ۲۰

''اس دن جان لیں گے کہ اللہ حق آشکار ہے۔''[1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک تفصیلی حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضرت امیرالمومنین علیؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کی: ''مجھے قرآن مجید کے بارے میں شک ہوگیا ہے۔''

حضرت نے فرمایا: ''کیوں؟''

اس نے عرض کی: ''بہت سی آیات میں دکھائی دیتا ہے کہ قرآن قیامت میں ملاقات پروردگار کے بارے میں بات کرتا ہے جب کہ دوسری طرف فرماتا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ

''آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں جب کہ وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔'' (انعام ۱۰۳)

یہ آیات آپس میں کس طرح سے ہم آہنگ ہیں؟''

حضرت نے فرمایا:

"اللقاء هنا ليس بالروية واللقاء هو البعث فافهم جميع ما فی كتاب الله من لقائه فانه يعنی بذلك البعث۔"

''لقاء سے مراد آنکھوں سے دیکھنا نہیں ہے، بلکہ لقاء سے مراد رستاخیز اور مردوں کا اٹھایا جانا ہی ہے۔ لہٰذا قرآن میں لقاء اللہ کے معنی "بعث" سمجھنا چاہئیں۔''[2]

درحقیقت امیرالمومنین علیؑ نے مسئلہ لقاء اللہ کو ایسی چیز سے تفسیر کیا ہے کہ شہودِ پروردگار جس کے لوازم میں سے ہے۔ ہاں روزِ قیامت حجابوں کے برطرف ہونے اور پردوں کے اٹھنے، آیات حق کے ظہور اور قلوب پر اللہ کی تجلی کا دن ہے۔ امامؑ کے اس کلام سے ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق مطلب اخذ کرسکتا ہے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں قیامت میں اولیاء اللہ کا شہود باطنی عام لوگوں کی نسبت بہت متفاوت اور مختلف ہے۔

۸۔ رجوع الی اللہ

ایک اور تعبیر جو بہت زیادہ (دسیوں بار) قیامت کے بارے میں قرآن مجید کی آیات میں استعمال ہوئی ہے، وہ اللہ کی طرف رجوع اور بازگشت یا "رد الی اللہ" وغیرہ ہے۔ ان میں سے ایک آخری زیر بحث آیت ہے۔ فرماتا ہے: ''ہر انسان موت کو چکھے گا اور پھر تم ہماری طرف لوٹ آؤ گے۔ (کل نفس ذائقة الموت ثم الينا ترجعون)

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۱۵ ص ۱۰۳ و ج ۱۰ ص ۶۹

[2] توحید صدوق ص ۲۶۷ (تلخیص کے ساتھ)

یہ تعبیر جیسا کہ ہم نے کہا مکرر آیات میں دکھائی دیتی ہے۔کبھی فرماتا ہے:

اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا

''تم سب کی بازگشت اللہ کی طرف ہے۔''(مائدہ ۴۸)

کبھی نفس مطمئنہ اور کمال یافتہ روح کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ

''اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔''(فجر ۲۸)

کبھی قدرت الٰہی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

اِنَّہٗ عَلٰی رَجۡعِہٖ لَقَادِرٌ

''وہ قادر ہے کہ انسان کو واپس بلا لے۔''(طارق ۸)

کبھی بعض مومنین کی زبانی نقل کرتا ہے:

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ﴿۱۵۶﴾

''ہم اللہ ہی کی طرف سے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''(بقرہ ۱۵۶)

اور کبھی فرماتا ہے:

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی

''یقیناً سب کی بازگشت تیرے رب ہی کی طرف ہے۔''(علق ۸)

یہ تعبیرات جن کی نظیریں قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں نشاندہی کرتی ہیں کہ رستاخیز اور قیامت قرآن کی نظر میں ایک طرح کی بازگشت اور واپسی ہے یعنی کوئی چیز ایک جگہ سے آئی ہو اور پھر وہیں لوٹ جائے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معنی قیامت پر کس طرح منطبق ہوتے ہیں، کس طرح ہم اللہ کی طرف سے آئے ہیں کہ ہمیں اسی کی طرف واپس جانا ہے؟

بعض مفسرین نے اس سوال کا جواب دینے کے لیے ایک کلمہ آیت میں تقدیر میں فرض کیا ہے اور کہتے ہیں کہ مفہوم یہ ہے:

الی حکمہ ترجعون

''اس کے حکم کی طرف تمہیں لوٹ جانا ہے۔''

جیسے کبھی کہا جاتا ہے:

"رجع امر القوم الی الامیر"

''لوگوں کا کام امیر کی طرف لوٹایا گیا ہے۔''[1]

لیکن کیا یہ درست ہوگا کہ ان تمام آیات میں ہم ایسا کوئی کلمہ محذوف سمجھیں؟ اصولاً تقدیر میں لینے اور حذف کے قائل ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یقیناً قرآن کی اس تعبیر میں کوئی خاص نکتہ ہے جسے جستجو اور کوشش سے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سوال کا جواب پانے کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم آغازِ خلقت انسان کی طرف لوٹ جائیں۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

''جب ہم نے جسم آدم کو بنادیا اور اس میں اپنی روح پھونک دی (تو اے فرشتو!) اسے سجدہ کرو۔'' (حجر ۲۹)

روح خدا سے مراد یقیناً ایسی روح نہیں جو اس کی ذات پاک سے جدا ہوئی ہو، کیونکہ وہ واجب الوجود ہے۔ وہ ہر لحاظ سے بسیط اور اجزاء ترکیبی سے پاک ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایک عظیم روح جو اللہ کی اشرف المخلوقات ہے، اس میں پھونکی گئی (اصطلاح میں اس اضافہ کو ''اضافہ تشریفیہ'' کہتے ہیں)۔

اس لحاظ سے انسان کی بلند روح اس عالم بالا سے جہانِ خاکی کی طرف لائی گئی اور اس کا پیوند اس خاک تیرہ سے جوڑا گیا تاکہ کمال کے درجات طے کر سکے اور پھر اس سے جدا ہو کر عالم بالا کی طرف جوارِ قرب حق میں لوٹ جائے۔

یہ صحیح ہے کہ معاد جسمانی کی رو سے قیامت میں جسم اور روح دونوں لوٹ جائیں گے، لیکن توجہ رہے کہ وہاں روح جسم کی طرف لوٹ کر نہ آئے گی بلکہ جسم روح کی طرف جائے گا اور بلندی و کمال پائے گا۔ لہٰذا دیناوی جسم کے نقائص وہاں اس میں نہ ہوں گے۔ خرابی، بڑھاپا، فنا پذیری، درد، بیماری، تھکاوٹ اور خستگی، وہاں کچھ بھی نہ ہوگا (غور کیجیے گا)۔

روح کے بدن کی طرف نزول اور پھر عالم بالا کی طرف واپسی کے بارے میں بعض علماء نے ایک خوبصورت تشبیہ ذکر کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

وہ روح انسانی کو ایک غوطہ خور سے تشبیہ دیتے ہیں جو سمندر کی گہرائی میں جانے اور گراں بہا جواہرات کو نکال لانے کے لیے اپنے پاؤں سے بھاری بوجھ باندھتا ہے تاکہ اس بوجھ کی مدد سے سمندر میں اتر سکے۔ جب سمندر کی تہہ میں جا پہنچتا ہے، گراں بہا جواہر جمع کر لیتا ہے تو بھاری بوجھ اپنے پاؤں سے کھول دیتا ہے اور سطح سمندر پر واپس آجاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ''رجوع'' کے یہی معنی ہیں۔ (غور کیجیے گا)۔

---

[1] مجمع البیان، ج ۱ ص ۷۱ و تفسیر فخر رازی، ج ۲ ص ۱۵۲

نتیجہ

ہم اب جملہ مطالب کو جمع کرنے کی منزل پر آ پہنچے ہیں، وہ اس طرح کہ واپسی کے دن کے مختلف مراحل اور منازل ہیں۔ قرآن مجید میں ہر ایک کے لیے ایک الگ تعبیر لائی گئی ہے۔

پہلے ''قیامت ساعت'' آغازِ قیامت اور عالم کے تغیر کا مرحلہ ہے۔

پھر ''احیاء موتی'' اور مردوں کے زندہ ہونے کی منزل ہے۔

اس کے بعد اللہ انہیں اٹھائے گا، یعنی ''بعث'' کا مرحلہ شروع ہوگا۔

پھر اللہ جمع کرے گا۔ ''یہ حشر'' کا معاملہ ہے۔ پھر انہیں پھیلائے گا اور اس مرحلے کو ''نشر'' کہتے ہیں۔

پھر وہ اللہ کی طرف لوٹ جائیں گے اور یہ ''معاد'' کا مرحلہ ہے۔

پھر ''لقاء رب'' کا مرحلہ ہے، جسے ''لقاء اللہ'' کا مرحلہ بھی کہا جاتا ہے۔

پھر اس وجودِ لامتناہی اور کمال مطلق کی طرف بڑھنے کی منزل ہے۔ یہ مرحلہ پروردگار کی طرف ''رجوع'' کا ہے۔

قرآن میں قیامت کے ستر نام

اشارہ

قرآن مجید میں ''معاد'' کے بارے میں کلی تعبیرات کے ذکر کے بعد اب ہم دیگر نام جو قرآن میں اس بارے میں آئے ہیں، ذکر کرتے ہیں۔ یہ نام اس عظیم دن کے اوصاف کی جزئیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید قیامت کو ہمیشہ ایک نام سے یاد نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت میں بہت مختلف اور طرح طرح کے واقعات رونما ہوں گے۔ ان میں سے ہر واقعہ اس روز کے ایک رخ کی نشاندہی کرتا ہے۔

قرآن ان خصوصیات کی نشاندہی کے لیے جن کے مسلما غیر معمولی تربیتی آثار ہیں، مختلف ناموں سے استفادہ کرتا ہے تا کہ مجموعی طور پر آیات میں اس عظیم دن کے بارے میں اور اس کے غیر معمولی اور ہلا کر رکھ دینے والے واقعات کو دقیق طور پر ترسیم کر سکے۔

البتہ ''نام'' یہاں پر اسم خاص (یا عربی ادبیات کی تعبیر میں ''علم شخص'') کے معنی میں نہیں بلکہ یہاں اس کے معنی وسیع تر ہیں جس میں توصیفی نام بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ ایسے عناوین ہیں جو اس دن کے اوصاف اور اس دن کی زندگی کی خصوصیات پر منحصر ہیں۔

اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن میں موجود قیامت کے ناموں کا سراغ لگاتے ہیں۔ قارئین کی توجہ ایک بار پھر ہم اس نکتے کی طرف دلاتے ہیں کہ ان ناموں پر غور و خوض گہرے تربیتی آثار کا باعث ہے اور یہ بیداری، آگاہی، تہذیب نفوس، اصلاح قلوب، دعوتِ تقویٰ اور برائیوں سے روکنے کے لیے بہتر موثر ہے۔

فیض کاشانی مرحوم ''محجۃ البیضاء'' میں کہتے ہیں:

''قیامت کے ہر نام میں ایک راز پنہاں ہے اور اس کی ہر توصیف میں ایک اہم معنی بیان کیا گیا ہے۔ ان معانی کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور ان اسرار تک رسائی حاصل کرنا چاہیے۔''

اس کے بعد انہوں نے قیامت کے سو نام ذکر کیے ہیں۔ ☆ البتہ یہ سب نام قرآن مجید میں نہیں ہیں بلکہ ان میں سے کچھ احادیث سے حاصل کیے گئے ہیں۔ ایسے نام ہماری تفسیری بحث سے خارج ہیں۔ ہم فی الحال قیامت کے ان ناموں کی جستجو کرتے ہیں جو قرآن میں آئے ہیں۔

دوسری جانب جناب فیضؒ نے جو نام بیان کیے ہیں ان میں سے بعض بالصراحت قرآن مجید میں موجود ہیں اور روایات میں بلکہ اجمالاً کتاب و سنت سے ایک استنباط ہیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ جن ناموں کا قرآن مجید میں بالصراحت ذکر ہے ہم انہی کی طرف توجہ دیں (چاہے وہ اسم خاص کا پہلو رکھتے ہوں جن کی تعداد محدود ہے یا اس روز کی توصیف اور خصوصیات کے ذکر کا)۔

ان ناموں کو تین حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ

اس میں ایسے نام ہیں جن میں ایک لفظ سے پہلے لفظ ''یوم'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ایسے نام اس دن کے کسی ایک پہلو اور خصوصیت کی خبر دیتے ہیں۔ پہلے ہم ایسے ناموں کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ یوم القیامۃ

یہ روزِ جزا کا مشہور ترین نام ہے۔ قرآن مجید میں ستر مرتبہ اس نام کا ذکر ہے۔ ان آیات میں ایک یہ ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ

''ہم عدل کے ترازو روزِ قیامت نصب کریں گے۔'' (انبیاء ۴۷)

اس روز کو روزِ قیامت اور اٹھ کھڑا ہونے کا دن کیوں کہا گیا ہے؟ قرآن مجید نے اس سوال کے جواب سے خود پردہ اٹھایا ہے:

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦

''اس روز لوگ عالمین کے رب کے حضور کھڑے ہوں گے (اور اس کی عدالت میں حاضر ہوں گے)۔'' (مطففین ۶)

نیز اس لیے کہ اس دن اللہ کا سب سے بڑا فرشتہ جس کا نام ''روح'' ہے اور دیگر سب ملائکہ ایک صف میں قیام کریں گے تاکہ فرمانِ الٰہی کا اجرا کر سکیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۭ (نباء ۳۸)

علاوہ ازیں اس دن انسانی اعمال پر شہادت دینے کے لیے شاہد و گواہ اٹھیں گے:

وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝۵۱ (مومن ۵۱)

اور جس دن حساب و کتاب کا قیام ہوگا:

يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝۴۱ (ابراھیم ۴۱)

عدالتوں کا یہ معمول ہے کہ جس وقت عدالت کے فیصلے کے اعلان کا وقت ہوتا ہے، سب حاضرین، بشمول ملزمان اور جج صاحبان، اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر آخری فیصلے کا اعلان ہوتا ہے۔ یہ کھڑا ہونا عدالت کے فیصلے کے احترام اور اسے تسلیم کرنے کی دلیل ہے۔

اس سے صرف نظر، جس وقت انسان کسی کام کو پکے ارادے سے انجام دینا چاہتا ہے تو اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اسے انجام دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی جہت سے ''قیام''، فیصلے، محکم ارادے، تیار ہونے اور کسی کام کے لیے احترام کی دلیل ہے۔ شاید اسی وجہ سے لفظ ''قیامت'' کی

قرآن مجید میں اس قدر تکرار اور تاکید ہے۔

مزید برآں یہ کہ قبروں سے مردوں کا قیام بھی یہ نام رکھنے کے دلائل میں سے ایک ہے۔

حضرت امام علیؑ بن الحسینؑ سے ایک حدیث اس طرح مروی ہے:

اشد ساعات ابن ادم ثلاث ساعات:

الساعة التی یعاین فیها ملك الموت والساعة التی یقوم فیها من قبره

والساعة التی یقف فیها بین یدی الله تبارك و تعالیٰ

''انسان کے لیے تین گھڑیاں نہایت شدید ہیں:

پہلی وہ گھڑی جب ملک الموت کو اپنے سامنے دیکھتا ہے۔

دوسری وہ گھڑی جب وہ قبر سے اٹھے گا۔

تیسری وہ گھڑی جب وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوگا۔''[1]

۲۔الیوم الاخر

ایک اور نام جو بہت مشہور ومعروف ہے اور قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے: الدار الاخرة اور ''الیوم الاخر'' یا مختصراً ''الاخرة'' ہے۔قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں یہ نام ایک سو چالیس بار آیا ہے۔

بقرہ ۱۷۷ میں نیکوکاری کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ .....

''نیکی (نیک لوگ) وہ ہیں جو اللہ، یوم آخر، فرشتوں، آسمانی کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے ہیں۔''

دوسری جگہ سورہ قصص آیت ۸۳ میں فرماتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ

''اس دارِ آخرت کو ہم نے (صرف) ان لوگوں کے لیے قرار دیا ہے جن کا زمین پر برتری اور فساد کا کوئی ارادہ نہیں۔''

---

[1] بحار، ج ۷ ص ۱۰۵ حدیث ۱۹

پھر ایک اور تعبیر میں سورہ بقرہ ۴ میں فرماتا ہے:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴

''حقیقی مومن وہ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

''الیوم الاخر'' یا ''الدار الاخرۃ'' یا ''الاخرۃ'' کی تعبیر دنیا کے مقابل ہے کہ جسے ''نشئۃ اولی'' کہا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۶۲

''تم نے عالم اول کو جانا ہے تو کیونکر متوجہ نہیں ہوتے ہو (کہ ایک عالم اس کے بعد بھی ہے)۔'' (واقعہ ۶۲)

سورۂ ضحیٰ کی آیت ۴ میں ہے:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴

''تیرے لیے عالم آخرت پہلے عالم سے بہتر ہے۔''

ارباب لغت کے مطابق ''اخر'' ''اول'' کا متضاد ہے اور اخر (جس کا معنی ہے دوسرا) ''واحد'' کا متضاد ہے۔

طبرسی مرحوم مجمع البیان میں فرماتے ہیں:

آخرت کو اس لیے آخرت کہا گیا ہے کہ یہ دنیا کے بعد ہے اور دنیا کو اس لیے دنیا کہا گیا ہے کہ یہ لوگوں کے نزدیک ہے (مادہ ''دنو'' سے)۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں اس کی دنائت یعنی پستی کی وجہ سے اسے دنیا کہا جاتا ہے۔[1]

اسی سے ملتی جلتی بات تفسیر روح البیان اور تفسیر فخر الدین رازی میں بھی آئی ہے۔[2]

ضمنی طور پر یہ تعبیر اس حقیقت کو بھی بیان کرتی ہے کہ انسان کے کمال کا سفر اس جہان سے شروع ہوتا ہے اور جاری رہتا ہے۔ جہانِ آخرت اس سفر کا آخرین مرحلہ ہے۔ دنیا راستہ میں پڑنے والی منزل کی طرح ہے اور آخرت، آخری اور ابدی ٹھکانا ہے۔

یہ بات تمام انسانوں کے لیے ایک صدائے بیدار باش ہے کہ دنیا کو سرائے جاوداں نہ سمجھیں، اس سے دل نہ باندھیں، اسے آخری ہدف قرار نہ دیں اور اپنی ساری صلاحیتیں اسی پر صرف نہ کر دیں بلکہ اسے ایک گزرگاہ سمجھیں، جس سے جہان دیگر تک پہنچنے کے لیے استفادہ کیا جائے۔

---

[1] مجمع البیان، ج ۱ ص ۴۰

[2] روح البیان، ج ۱ ص ۴۱ و تفسیر فخر الدین رازی، ج ۲ ص ۳۲

۳۔یوم الحساب

قیامت کا ایک اور مشہور نام "یوم الحساب" ہے۔ یہ نام قرآن مجید کی پانچ آیتوں میں آیا ہے۔ یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا بدون استثناء اس روز محاسبہ کیا جائے گا، وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، جزئی ہوں یا کلی، روحانی ہوں یا مادی، بدنی ہوں یا روحانی۔ قرآن حضرت موسیٰؑ بن عمران کی زبانی کہتا ہے:

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ۝۲۷

''موسیٰؑ نے آل فرعون سے کہا: میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ چاہتا ہوں ہر متکبر سے جو یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔'' (مومن ۲۷)

کبھی اسے "یوم یقوم الحساب" (جس دن حساب برپا ہوگا) کہا گیا ہے۔ (ابراہیم ۴۱)

مقائیس اللغہ نے مادۂ "حساب" کی چار بنیادوں کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں: گننا، کفایت کرنا، ''حسبان'' (جس کا معنی ہے چھوٹا تکیہ) اور ''احسب'' یعنی جس کے جسم کی کھال بیماری کی وجہ سے سفید ہوگئی ہو اور بال گر گئے ہوں۔

بعض ارباب لغت نے اس کے زیادہ معنی بھی ذکر کیے ہیں حتیٰ کہ سات تک معانی بیان کیے گئے ہیں جن میں سے ایک جزا و عذاب بھی ہے۔[1]

لیکن ظاہر یہ ہے کہ سب مذکورہ بالا معانی، جیسا کہ مفردات راغب سے معلوم ہوتا ہے، ایک ہی معنی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور وہ ہے حساب کرنا۔ اگر یہ لفظ کفایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مرحلہ کفایت تک پہنچنے کے لیے ایک محاسبے اور حساب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جزا و عذاب کے معنی میں بھی یہ لفظ اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ ایسا حساب کے بعد انجام پاتا ہے۔ دیگر معانی بھی اسی طرح اس معنی کی طرف لوٹ آتے ہیں (مثلاً کسی خاص بیماری پر اس کا اطلاق عذابِ الٰہی سے شباہت کی وجہ سے ہے جو حساب کے بعد واقع ہوتا ہے اور شاید چھوٹے تکیہ کو ''حسبان'' اسلیے کہا گیا ہے کہ حساب کرنے والے ایسا کرتے وقت اس سے کام لیتے ہیں)۔

بہرحال ایک واضح ترین کام جو قیامت میں انجام پائے گا اور اصولاً قیام قیامت جس کے لیے ہے وہ حساب الٰہی ہے اس کی کیفیت انشاءاللہ منازل آخرت کی بحث میں آئے گی۔

---

[1] نہایہ ابن اثیر ولسان العرب

۴۔یوم الدین

یہ نام بھی کئی مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔جن آیات میں "یوم الدین" آیا ہے ان کی تعداد تیرہ ہے جن میں مشہور تر اور زبان زد خاص و عام سورہ حمد کی آیت ہے: "ملك یوم الدین" (وہ مالک روزِ جزا ہے)۔

(بعض ارباب لغت کا نظریہ ہے کہ اصل لفظ "دین"، خضوع، تسلیم اور اطاعت کے معنی میں ہے اور اگر یہ لفظ جزا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو ایسا اس وجہ سے ہے کہ اس کے سامنے مطیع رہنا چاہیے یا اس لیے کہ جزا اطاعت کا نتیجہ ہے)۔

بعض روایات میں اس کا معنی یوم حساب بھی کیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت معلول کا ارادہ کر کے علت بیان کرنے کا انداز ہے، کیونکہ حساب جزا کے لیے ایک مقدمہ ہے۔

۵۔یوم الجمع

یہ اصطلاح قرآن مجید میں دو مرتبہ آئی ہے۔ایک مرتبہ سورہ تغابن کی آیت ۹ میں ہے:

یَوۡمَ یَجۡمَعُکُمۡ لِیَوۡمِ الۡجَمۡعِ ذٰلِکَ یَوۡمُ التَّغَابُنِ ؕ

"یاد کریں کہ وہ تم سب کو "روزِ اجتماع" جمع کرے گا۔ یہ وہ دن ہے کہ جب معلوم ہو جائے گا کہ کون لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں؟"

سورہ شوریٰ آیت ۷ میں ہے:

لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَمَنۡ حَوۡلَهَا وَتُنۡذِرَ یَوۡمَ الۡجَمۡعِ

"قرآن اس لیے نازل ہوا ہے کہ تو ام القریٰ اور اس کے گرداگرد لوگوں کو ڈرائے اور اس دن سے ڈرائے جس میں سب مخلوقات جمع ہوں گی۔"

وہ دن یوم الجمع کیوں نہ ہو جب کہ تمام اولین و آخرین، سب جن و انس حتی کہ ملائکہ مقربین بھی اس دن جمع ہوں گے۔ وہ خود ہی جمع نہ ہوں گے بلکہ ان کے تمام اعمال بھی جمع ہو کر عدالت الٰہی میں پیش ہونے کے لیے تیار ہوں گے۔

یہی نام ایک اور صورت میں سورۂ ہود کی آیت ۱۰۳ میں بھی آیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِکَ یَوۡمٌ مَّجۡمُوۡعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ

"وہ ایسا دن ہے کہ جب سب انسانوں کو جمع کیا جائے گا۔"

۶-یوم الفصل

روزِ قیامت کا ایک اور نام "یوم الفصل" (روزِ جدائی) ہے۔ یہ نام قرآن مجید میں چھ مرتبہ آیا ہے۔[1] ان میں سے ایک مرتبہ سورۂ بنا کی آیت ۱۷ میں اس طرح سے ہے:

اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا ﴿۱۷﴾

"جدائی کا دن سب کے لیے مقرر ہے۔"

یہ ایک نہایت معنی خیز تعبیر ہے کہ جو اس عظیم دن کی جدائیوں کی حکایت کرتی ہے: حق کی باطل سے جدائی اور امتیاز، کفاروں اور مجرموں کی صفوں سے مومنین اور صالحین کی جدائی اور علیحدگی، بھائی کی بھائی سے جدائی، ماں باپ کی اولاد سے جدائی، اچھوں کے انجام کی بروں سے جدائی۔

یہ تعبیر کبھی "یوم القضاء" اور فیصلے کے دن کے معنی میں بھی بروئے کار لائی جاتی ہے کیونکہ قاضی اپنے فیصلے کے دن تنازعے کو ختم کرتا ہے لہٰذا فیصلے اور قضاوت کو "الفصل" کہا جاتا ہے کیونکہ یہ تنازعات کے خاتمے کی علت ہوتا ہے۔

۷-یوم الخروج

یہ نام قرآن مجید کی صرف ایک آیت میں آیا ہے۔ سورہ ق کی آیت ۴۲ میں دوسرے صور پھونکنے کے دن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

ذلك یوم الخروج

"یہ وہ دن ہے کہ جب سب مردے زندہ ہو جائیں گے (اور قبروں سے) باہر نکلیں گے۔"

ہاں! وہ دن موت سے حیات کی طرف لوٹنے کا دن ہے، یہ عالم برزخ سے عالم آخرت کی طرف، اندرون سے بیرون کی طرف اور پنہاں سے آشکار کی طرف نکلنے کا دن ہے۔

یہی معنی ایک اور شکل میں سورہ معارج آیت ۴۳ میں بھی آئے ہیں۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا کَاَنَّہُمۡ اِلٰی نُصُبٍ یُّوۡفِضُوۡنَ ﴿۴۳﴾

"جس کا ان سے وعدہ ہے وہ وہی ہے کہ جس دن وہ قبروں میں سے تیزی سے نکلیں گے، گویا وہ اپنے بتوں کی

---

[1] صافات ۲۱، دخان ۴۰، مرسلات ۱۳ و ۱۴ و ۳۸ اور نبا ۱۷

طرف دوڑ رہے ہوں۔"[1]

یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ آغاز کار میں قیامت کے واقعات غیر معمولی تیز رفتاری سے انجام پائیں گے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بت پرستوں اور بت پرستی کے لیے ایک طعن وتمسخر بھی ہے، وہی بت پرستی جو ان بت پرستوں کی زندگی کا اہم ترین حصہ تھی اور ان کم ذہنوں کی سب سے زیادہ توجہ جس کی طرف ہوتی تھی، اس قدر کہ بتوں کی طرف ان کے دوڑنے کو "تیز رفتاری" کے ایک واضح نمونے کے طور پر ذکر کیا ہے۔کسی جشن کے دن غم کے روز یا سفر سے واپسی پر وہ بتوں کی طرف دوڑتے اور تیزی کرتے تھے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔

۸۔الیوم الموعود

یہ نام بھی قرآن کی صرف ایک آیت میں آیا ہے۔سورہ بروج کے آغاز میں دوسری آیت میں ایک اہم قسم کھاتے ہوئے فرماتا ہے:

"والیوم الموعود"

"یوم موعود کی قسم"

یوم موعود یعنی وہ دن کہ جس کا سب سے وعدہ کیا گیا ہے اور سب نبیوں نے جس کا وعدہ کیا ہے۔

بعض مفسرین نے قبروں سے نکلنے کے دن کو یوم موعود قرار دیا ہے، یا وہ دن جو شفاعت پیغمبر کے وعدے کا دن ہے، جب کہ یہ سب معانی پہلے معنی میں جمع ہیں۔[2]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس دن کی قسم کو اس آسمان کی قسم کے بعد لایا گیا ہے جس میں بہت سے برج ہیں:

"والسمآء ذات البروج"

یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن کی عظمت آسمان کی عظمت کی طرح ہے یا اس طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ یوم موعود نہ ہوتو اس عظیم آسمان کی اس پر حکم فرما اس دقیق نظام کے ساتھ خلقت بے کار اور بے مقصد ہوگی، کیونکہ دنیا کی چند روزہ زندگی کی کوئی اہمیت نہیں کہ جس کی

---

[1] "سراع" (بروزن "ظراف") "سریع" (بروزن "ظریف") کی جمع ہے۔اس کے معنی ہیں ایسی چیز جو سرعت سے حرکت کرتی ہے۔ "نصب" "نصیب" کی جمع ہے جب کہ "نصیب" بھی "نصب" (بروزن "کسب") کی جمع ہے۔اس کا معنی دراصل ایسی چیز ہے جو کسی جگہ نصب ہوئی ہو۔لہٰذا بتوں کو بھی کہتے تھے جو کسی جگہ نصب ہوتے تھے۔بعض کا کہنا ہے کہ اس کا صنم سے فرق یہ ہے کہ "صنم" ایک خاص شکل و صورت کا ہوتا تھا لیکن نصب پتھر کا بے شکل ٹکڑا ہوتا تھا جس کا احترام کیا جاتا تھا اور خداؤں کے لیے کی جانے والی قربانی کا خون اس پر ڈالا جاتا تھا۔

[2] روح المعانی، ج ۳۰ ص ۸۶

خاطر ایسا عظیم و وسیع نظام تخلیق کیا جائے۔

اس سے ملتا جلتا ایک نام سورہ زخرف آیت ۸۳ میں بھی آیا ہے:

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۸۳﴾

''انہیں چھوڑ دے کہ وہ اپنے باطل میں غوطہ زن رہیں اور کھیل میں مشغول رہیں، یہاں تک کہ اس دن سے ملاقات کریں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔''[1]

۹۔یوم الخلود

یہ اصطلاح قرآن میں صرف ایک مرتبہ دکھائی دیتی ہے۔فرماتا ہے:

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾

''اس روزِ جاوداں کو اس (بہشت جاودان) میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جانا۔'' (ق ۳۴)

اس آیت سے پہلے کی آیات میں اسی سورت ''ق'' میں بہشت کی توصیف کی گئی ہے۔اس بات کی طرف توجہ رکھی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ نام اس عظیم نعمت الٰہی، نیکوکاروں کی اس عظیم جزا اور بہشت کی تمام نعمتوں کی ابدیت بیان کرنے کے لیے ہے۔درحقیقت یوم الخلود کا آغاز بہشت میں داخل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

جو بات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ تعبیر واضح طور پر اس کی تائید کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ قیامت کا ہر نام اور وصف اس کے کسی ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔یہاں ابدیت کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔البتہ خلود فقط بہشت کی نعمتوں کے لیے نہیں ہے۔دوزخ کے عذاب بھی ایسے ہی ہیں۔تاہم قرآن میں "یوم الخلود" کی اصطلاح صرف اسی ایک موقع کے لیے بروئے کار لائی گئی ہے اور دوزخ کے لیے اس سے ملتی جلتی تعبیر "دار الخلد" استعمال ہوئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

ذالك جزآء اعدآء الله النار لهم فيها دار الخلد

''اللہ کے دشمنوں کی جزاء آگ ہے اور وہ دوزخیوں کا دائمی گھر ہے۔'' (حم سجدہ ۲۸)

۱۰۔یوم عظیم

قیامت کی یوم عظیم سے بھی قرآن مجید کی متعدد آیات میں توصیف کی گئی ہے۔ان میں سے سورہ مریم کی آیت ۳۷ میں ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾

---

[1] اس سے ملتی جلتی تعبیر سورہ معارج ۴۲ اور سورہ ذاریات ۶۰ میں بھی آئی ہے۔

''افسوس ہے کافروں پران کے یوم عظیم کے مشاہدے پر۔''[1]

البتہ "عذاب یوم عظیم" کی تعبیر آیات قرآن میں کبھی اہم دنیاوی عذابوں کے لیے بھی آئی ہے۔ایسے موارد کا عذاب روزِ قیامت سے فرق قبل وبعد کی آیات کو دیکھ کر جاننا چنداں مشکل نہیں ہے۔

بہرحال اس دن کی عظمت سے توصیف ان بہت سے اہم امور کی وجہ سے ہے کہ جو اس عظیم دن میں واقع ہوں گے۔ پاداش و جزائے عظیم، عدالت وحساب عظیم، خلائق کی اس دن عظیم حاضری، اس دن کے طولانی ہونے کی عظمت، خوف وہراس اور وحشت کی عظمت قیامت کے آغاز کی حرکتوں کی عظمت، خلاصہ یہ کہ تمام جہات کی عظمت۔

۱۱۔یوم الحسرۃ

یہ نام جو قرآن مید کی طرف ایک آیت میں آیا ہے، روزِ قیامت کے لیے ایک ہلا کر رکھ دینے والی تعبیر ہے۔یعنی وہ دن روزِ حسرت و تاسف وندامت ہے۔سورہ مریم کی آیت ۳۹ میں فرماتا ہے:

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۹

''انھیں یوم حسرت سے ڈرا، وہ دن کہ جب ہر چیز ختم ہوجائے گی اور آخری حکم صادر ہوجائے گا، یہ ایسی حالت میں ہوگا کہ وہ ابھی غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لائے ہیں۔''

"حسرۃ" مادہ "حسر" سے ہے۔مفردات، مقائیس اور بعض دیگر اہل لغت کے مطابق یہ آشکار کرنے کے معنی میں ہے۔لہٰذا کہا جاتا ہے:

حسرت عن الزراع

''یعنی میں نے آستین کو چڑھالیا ہے اور اپنے بازو کو ظاہر کردیا ہے۔''

بعدازاں لفظ حسرت کا اطلاق ہاتھ سے چلے جانے والے امور، آنے والے غم واندوہ پر ہونے لگا۔گویا انجام شدہ عمل کے ضرر کے بارے میں انسان کی جہالت وناآگاہی ختم ہوجاتی ہے اور حقیقت آشکار ہوجاتی ہے۔

بعض کہتے ہیں دراصل اس کے معنی پیچھے کرنے کے ہیں۔مثلاً جب دریا پیچھے ہٹتا ہے تو فطری طور پر پہلے کے زیرآب ساحل ظاہر ہو جاتے ہیں، یا جب انسان اپنی آستین الٹتا ہے تو بازو ظاہر ہوجاتے ہیں۔البتہ یہ امور پہلے ہی معنی کے لوازم میں سے ہیں۔[2]

بہرحال غم افسوس اور ندامت اس کے مفہوم کے لوازم سے ہیں اور روزِ قیامت واقعاً شدید اندوہ وندامت وحسرت کا دن ہے، نہ

---

[1] اسی سے متشابہ تعبیر یونس ۱۵، انعام ۱۵، اعراف ۵۹، شعراء ۱۳۵، احقاف ۲۱، زمر ۱۳ اور مطففین ۵ میں بھی آئی ہے۔

[2] التحقیق، ج ۲

صرف بدکاروں کے لیے بلکہ نیکوکاروں تک کے لیے کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم جزاؤں کو دیکھیں گے تو افسوس کریں گے کہ انہوں نے زیادہ اور بہتر نیک کام کیوں انجام نہیں دیئے۔ یہ وہ بات ہے جس کی بعض مفسرین [1] نے تصریح کی ہے۔ لیکن فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ صرف بروں کو حسرت ہوگی اور اہل بہشت کے لیے کوئی حسرت نہیں کیونکہ ممکن نہیں کہ وہاں کوئی غم واندوہ موجود ہو۔ [2]

لیکن کہنا چاہیے کہ ایسا غم ایک طرح کا کمال ہے اور روحانی تکلیف وعذاب کا باعث نہیں۔ لہٰذا بہشت میں بھی اس کا ہونا قابل اشکال نہیں۔ (غور کیجیے گا)

البتہ دنیا میں اگر افسوس وحسرت ہو تو قابل تلافی ہے لیکن وہاں تلافی کا کوئی راستہ نہیں۔ لہٰذا اس دن کو حقیقی یوم حسرت اور عظیم یوم حسرت کہنا چاہیے۔ یہی بات سورۂ زمر کی آیت ۵۶ میں ایک اور صورت میں آئی ہے۔ فرماتا ہے:

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ

''یہ خبردار کرنا اور ڈرانا اس لیے ہے کہ مبادا کوئی روزِ قیامت کہے، واحسرتا! ان کوتاہیوں پر جو میں نے حکم الٰہی کی اطاعت میں کی ہیں۔'' [3]

۱۲۔ یوم التغابن

یہ نام قرآن مجید میں صرف ایک بار آیا ہے، وہ بھی سورہ تغابن کی نویں آیت میں:

یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ

''یوم اجتماع جس دن تم سب کو جمع کرے گا وہ یوم تغابن ہے۔''

''تغابن'' ''غبن'' کے مادہ سے ہے اور یہاں پر غبن آشکار ہونے کے معنی میں ہے۔ یعنی اس دن ظاہر ہوگا کہ کون مغبون ہے۔ [4]

طبرسی مرحوم مجمع البیان میں کہتے ہیں:

یہ مادہ جس وقت بات تفاعل (بغابن) میں استعمال ہو تو شر کو لے لینے اور خیر کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔ یا خیر کو اپنا لینے اور شر کو چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔

مومنین اپنے دنیاوی مفاد سے چشم پوشی کر لیتے ہیں اور مفاد آخرت کی طرف توجہ کرتے ہیں، اس طرح یہ کام خیر کو اپنا لینے اور شر کو

---

[1] تفسیر مجمع البیان ج ۶، ص ۵۱۵، روح البیان ج ۵، ص ۳۳۵ اور روح المعانی ج ۱۶ ص ۸۵

[2] تفسیر فخر رازی، ج ۲۱ ص ۲۲۱

[3] سورہ انعام آیہ ۳۱ میں بھی اس سے ملتا جلتا مفہوم آیا ہے۔

[4] مفردات راغب

چھوڑ دینے کا مصداق ہوگا۔لہٰذا انہیں ''غابن'' کہا جاتا ہے، جب کہ کفار مفادِ آخرت کو چھوڑ دیتے ہیں اور مفاد دنیا کو اپنا لیتے ہیں۔ یہ کام خیر کو چھوڑ دینے اور شر کو اپنا لینے کا مصداق ہے۔لہٰذا وہ ''مغبون'' ہیں۔حاصل کلام یہ کہ اس روز ''غابن'' اور مغبون'' ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔

صحاح اللغہ میں ہے کہ ''غبن'' کے معنی ہیں ''مکر وفریب'' ''مغبون'' کے معنی ہیں فریب خوردہ۔جب یہ مادہ تفکر کے سلسلے میں استعمال ہو تو اس کے معنی ضعف و ناتوانی ہوتے ہیں۔لہٰذا ''غبین'' کے معنی ہیں ''ضعیف الفکر''۔

بہرحال قیامت میں پردے اٹھ جائیں گے۔اعمال،عقاید اور نیتوں کے نتائج آشکار ہو جائیں گے۔انسان اپنے آپ کو اپنے اعمال کے نتائج و آثار کے سامنے پائے گا۔وہاں برے اعمال کرنے والے اپنی شکست وزیاں اور شیطان کے مکر وفریب کو جانیں گے۔وہاں انہیں معلوم ہوگا کہ وہ عظیم سرمایہ کھو چکے ہیں،سعادت ابدی سے محروم ہو چکے ہیں اور عذاب الٰہی کے چنگال میں گرفتار ہو چکے ہیں۔

۱۳۔یوم التناد

یہ نام بھی قرآن مجید میں ایک بار آیا ہے۔سورہ مومن کی آیت ۳۲ میں ہے کہ مومن آل فرعون جب فرعونیوں دنیا و آخرت کے عذاب الٰہی سے ڈرا رہا تھا تو اس نے کہا:

وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝۳۲

''اے قوم! میں تمہارے بارے میں اس دن سے ڈرتا ہوں جب لوگ ایک دوسرے کو صدا دیں گے (اور مدد کے لیے پکاریں گے لیکن کوئی ان کی مدد کو نہ آئے گا)۔''

"التناد" دراصل "التنادی" تھا۔اس کی یاء حذف ہوگئی ہے اور دال کا کسرہ جو اس یاء کے لیے دلیل ہے، باقی ہے۔ یہ لفظ "نداء" کے مادہ سے ہے جو آواز دینے کے معنی میں ہے۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ "یوم التناد" قیامت کے ناموں میں سے ہے۔[1] ہر کسی نے قیامت کا یہ نام رکھنے کی کوئی نہ کوئی دلیل ذکر کی ہے۔

کسی کا کہنا ہے کہ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ دوزخی اور بہشتی ایک دوسرے کو آواز دیں گے۔دوزخی کہیں گے: جنت کا تھوڑا سا میٹھا پانی، یا اللہ نے جو تم کو روزی دی ہے،اس میں سے کچھ ہمیں عنایت کر دو۔قرآن کے الفاظ ہیں:

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ

---

[1] فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ اس بات پر مفسرین کا اجماع و اتفاق ہے۔(ج ۲۷ ص ۶۱)

''اہل بہشت جواب میں کہیں گے:

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۵۰﴾

''اللہ نے یہ کافروں پر حرام کردی ہے۔'' (اعراف ۵۰)

''معانی الاخبار'' کی ایک حدیث میں یہ معنی امام جعفر صادقؑ سے روایت ہوئے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ نام رکھنے کا سبب یہ ہے کہ میدانِ محشر میں لوگ ایک دوسرے کو آواز دیں گے اور مدد کے لیے پکاریں گے۔

یا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ فرشتے لوگوں کو حساب کے لیے آواز دیں گے اور لوگ فرشتوں کو مدد کے لیے پکاریں گے۔

یا اس لیے کہ مومن جب اپنا نامہ اعمال دیکھیں گے تو شوق سے پکار اٹھیں گے:

هاؤم اقرءوا کتابیه

''یہ ہے میرا نامہ اعمال، آؤ لوگو اسے پڑھو۔'' (حاقہ ۱۹)

جب کہ کافروں کو جس وقت ان کا نامہ عمل تھمایا جائے گا تو وہ شدت وحشت سے چیخیں گے:

یلیتنی لم اوت کتابیه

''اے کاش! مجھے میرا نامہ اعمال نہ پکڑایا جاتا۔'' (حاقہ ۲۵)

البتہ اس کی اور بھی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ بعض تفاسیر میں آٹھ تک وجوہات شمار کی گئی ہیں لیکن ان میں بعض کمزور لگتی ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ ممکن ہے یہ تمام معانی مفہوم آیت میں جمع ہوں کیونکہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

۱۴۔ یوم التلاق

کہ یہ نام بھی قرآن مجید میں صرف ایک بار سورہ (مومن ۱۵ میں) آیا ہے:

يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۙ﴿۱۵﴾

''اللہ روح کو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنے فرمان سے القاء کرتا ہے تاکہ وہ انسانوں کو ''یوم التلاق'' سے ڈرائیں۔''

دوسری آیات کے قرینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ القائے روح سے مراد وحی اور کتب آسمانی ہی ہیں۔ جیسا کہ سورہ شوریٰ ۵۲ میں رسول اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ

''جیسے ہم نے گذشتہ نبیوں پر وحی بھیجی تجھ پر بھی اپنے امر سے ہم نے روح کو وحی کیا۔''

اس لحاظ سے قرآن مجید اللہ کی جانب سے ایک روح ہے کہ جو انسانی معاشرے کے جسم میں پھونکی گئی ہے۔

مفردات میں راغب کا کہنا ہے کہ قرآن کو اس لیے روح کہا گیا ہے کہ یہ حیات روحانی کا سبب ہے۔اس روح کے القاء کا مقصد اس عظیم روز کی ملاقات سے ڈرانا اور خوف دلانا ہے۔

اس روز مختلف ملاقاتیں ہوں گی جو سب مفہوم آیت میں جمع ہیں اگرچہ مفسرین نے کبھی ان میں سے بعض کا ذکر کیا ہے۔

یہ وہ دن ہے جب بندے اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے:

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ۝ (انشقاق ۶)

یہ وہ دن ہے جب انسان حساب اور جزا وسزا کے لیے فرشتوں سے ملاقات کریں گے:

وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ (انبیاء ۱۰۳)

یہ وہ دن ہے جب انسان اس عدالت عدل میں اپنے اعمال وگفتار کے حساب سے ملاقات کرے گا:

اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ۝ (حاقہ ۲۰)

وہ دن جب گذشتگان اور آئندگان باہم ملاقات کریں گے۔

وہ دن جب حق اور باطل کے پیشوا اپنے پیروکاروں سے ملیں گے۔

وہ دن جب ظالم ومظلوم ایک دوسرے سے ملیں گے۔

وہ دن جب اہل بہشت اہل دوزخ سے ملاقات کریں گے۔

ہاں! انبیاء کے آنے اور کتب آسمانی کے نزول کا مقصد یہی تھا کہ بندوں کو اس عظیم دن کی ملاقات سے خبردار کریں اور اس دن کے لیے یہ نام اور اس کا وسیع اور ہلا دینے والا مفہوم کتنا عجیب ہے۔

۱۵۔یوم ثقیل

یہ ان ناموں میں سے ہے جو فقط ایک بار قرآن میں آئے ہیں۔سورہ دھر کی آیت ۲۷ میں ہے:

اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَاۗءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا۝

''وہ (مجرم) دنیا کی زودگزر زندگی سے محبت کرتے ہیں جب کہ سخت وسنگین دن انہوں نے اپنے پیچھے کر رکھا ہے۔''

اس دن کے لیے "ثقیل" کی صفت ایک وسیع اور پرمعنی توصیف ہے۔وہ دن ثقیل ہے محاسبوں کے لحاظ سے، سنگین ہے جزاؤں سزاؤں کے اعتبار سے، سخت ہے رسوائیوں کے حوالے سے، ثقیل ہے محشر کی شدتوں کے پیش نظر، سنگین ہے سخت ذمہ داریوں کی بناء پر اور سخت

ہے مجرموں کے کندھوں پر گناہوں کے بار کے لحاظ سے۔

قرآن میں "یذرون ورآءھم" (پیچھے ڈال رکھا ہے) فرمایا گیا ہے جب کہ قاعدتا ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ "انہیں یوم ثقیل درپیش ہے۔" ایسا اس لیے ہے کہ مجرموں نے اس دن کو یوں بھلا رکھا ہے گویا انہوں نے اسے پیچھے ڈال رکھا ہو۔

۱۶۔یوم الازفة

قیامت کا ہر نام اپنے ساتھ ایک خاص پیغام رکھتا ہے۔ان میں سے ایک نام "یوم الازفة" بھی ہے جو قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے۔اگرچہ لفظ "الازفة" دو مرتبہ آیا ہے لیکن "یوم الازفة" ایک ہی مرتبہ ہے۔سورہ مومن کی آیہ ۱۸ میں ہے:

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ؕ

"انہیں "روز نزدیک" سے ڈراؤ۔ یہ وہ دن ہے جب وحشت کے مارے دل حلق میں اٹک جائیں گے اور انسان کا سارا وجود غم واندوہ سے بھر جائے گا۔"

"ازفة" "ازف" (بروزن صدف) کے مادہ سے ہے۔مقائیس اللغت، مفردات، مصباح اللغت اور دیگر کتب میں ہے کہ اس کا معنی ہے "نزدیک ہونا"۔البتہ بعض کا کہنا ہے کہ اس کے معنی ایسی نزدیکی ہیں جس کے ساتھ وقت کی تنگی بھی ہو۔

یہ نام رکھنا اس حقیقت کا عکاس ہے کہ قیامت لوگوں کی سوچ سے کہیں قریب تر ہے۔یہ اس لیے ہے کہ بے خبر لوگ یہ نہ کہیں کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے اور قیامت کا وعدہ تو ایک ادھار ہے، بلکہ وہ روزِ نزدیک ہے بھی ایسا کہ جس کی شدت وحشت سے دل گویا حلقوم میں آ اٹکیں گے اور جان لب پر آ جائے گی۔خوف کے ساتھ غم ایسا ہوگا کہ لوگوں کے گلے گھٹ رہے ہوں گے اور سانس لینا دشوار ہو جائے گا۔

پس ایسے دن کے لیے ہر لحظہ تیار رہنا چاہیے۔

یہی بات قرآن نے ایک اور انداز سے سورۂ انبیاء کی آیت ۱ میں بیان فرمائی ہے:

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۚ﴿۱﴾

"لوگوں کا روزِ حساب ان کے بہت نزدیک آن پہنچا ہے۔لیکن وہ غفلت کی وجہ سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

توجہ رہے کہ "اقترب" میں "قرب" کی نسبت زیادہ تاکید ہے۔یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ حساب یوم قیامت بہت نزدیک ہے۔

قیامت اس قدر نزدیک اور یقینی ہے کہ قرآن نے اپنی بہت سی تعبیرات میں اسے فعل ماضی کے صیغوں سے یاد کیا ہے، جیسے سورہ فرقان کی آیت ۶۵ و ۶۶ میں فرماتا ہے:

اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾

''عذاب جہنم بہت سخت اور دائمی تھا اور دوزخ برا ٹھکانا اور قیام گاہ تھی۔''

ایسی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

۱۷۔ یوم عسیر

یہ تعبیر قرآن مجید میں دو مرتبہ آئی ہے۔ سورہ مدثر کی آیت ۹ اور سورہ فرقان کی آیت ۲۶ میں۔ پہلی آیت میں ہے:

فذلك يومئذ يوم عسير

وہ دن ایک سخت دن ہے۔''

دوسری آیت میں ہے:

وكان يوما على الكافرين عسيرا

''یوم قیامت کافروں پر ایک سخت دن ہوگا۔''

البتہ ایک بار ''عسر'' (بروزن ''خشن'') بھی آیا ہے۔ سورہ قمر کی آیت ۸ میں ہے:

يقول الكافرون هذا يوم عسر

''کافر کہیں گے: آج بہت سخت دن ہے۔''[1]

یقیناوہ روز کافروں کے لیے بہت طاقت فرسا، مصیبت بار اور دردناک ہے، اس قدر کہ ان میں طاقت ور ترین بھی گھٹنے ٹیک دے گا اور عاجز، بیچارہ اور ناتوان ہو کر رہ جائے گا۔

فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

کافروں پر اس دن کی سختی اس جہت سے ہے کہ ان سے سخت حساب لیا جائے گا۔ ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں تھمائے جائیں گے۔ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، ان کے بدن نیلے اور ان کی آنکھیں نابینا ہوں گی۔ ان کے جسم کے اعضاء لوگوں کی موجودگی میں ان کے گناہوں پر گواہی دیں گے اور ان کے لیے باعث رسوائی ہوں گے۔[2]

یہ تو محشر کی سختیوں کا ایک مرحلہ ہے جب کہ اس کے بعد کے مراحل تو سخت تر اور زیادہ مصیبت آفرین ہوں گے۔ جب انہیں جہنم کی طرف کھینچ لے جایا جائے گا، پھر وہ مختلف طرح کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور غضب الٰہی کی آتش قہر میں گرفتار ہوں گے۔ وہ دن تو مومنین کے لیے بھی کوئی روزِ آسان نہیں ہے۔ تمام اعمال کا حساب دینا تو بجائے خود، ذرہ بھر سختی کو بھی برداشت کرنا بہت مشکل ہوگا۔

---

[1] ''عسیر'' اور ''عسر'' دونوں صفت مشبہ ہیں۔

[2] تفسیر فخر الدین رازی، ج ۳۰، ص ۱۹۷

۱۸۔یوم الیم

یہ نام بھی آیات قرآن مجید میں دوبار آیا ہے، اگرچہ لفظ "الیم" عذاب قیامت کی توصیف کے طور پر دسیوں مرتبہ قرآن کی مختلف سورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

ایک بار سورہ ہود کی آیت ۲۶ میں اللہ کے نبی حضرت نوحؑ کی زبانی نقل ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی بت پرست قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

انی اخاف علیکم عذاب یوم الیم

''میں تم پر دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔''

دوسری بار سورہ زخرف کی آیت ۶۵ میں وحی الٰہی کی زبان میں یوں آیا ہے:

فویل للذین ظلموا من عذاب یوم الیم

''وائے ہے ظلم کرنے والوں پر، دردناک دن کے عذاب سے۔''

اس دن کو دردناک صرف اس لیے نہیں کہا گیا ہے کہ اس دن کا عذاب الیم و دردناک ہے، بلکہ علاوہ ازیں وہ دن بہت پہلوؤں کے اعتبار سے باعث درد و رنج ہے۔ رسوائیوں کے لحاظ سے، ندامتوں اور پشیمانیوں کے اعتبار سے دیگر بہت سی روحانی تکلیفوں کی وجہ سے۔ مثلاً انسان دیکھے گا کہ دوسرے اس کے وسیلے سے اہل بہشت ہو گئے ہیں اور وہ خود دوزخی بن گیا ہے۔ اس لحاظ سے دردناک ہوگا کہ اس روز بازگشت کی کوئی صورت نہ ہوگی اور اس اعتبار سے کہ اس دن کا عذاب و رنج دائمی ہوگا۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ مذکورہ بالا دو آیتوں میں سے ایک میں مشرکوں کا ذکر ہے اور دوسری میں ظالموں کا اور ہم جانتے ہیں کہ شرک ایک طرح کا ظلم ہے جب کہ ظلم و ستم بھی شرک جلی و خفی کے محرکات میں سے ہے۔

۱۹۔یوم الوعید

یہ نام بھی پورے قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے۔ سورہ ق کی آیت ۲۰ میں ہے:

ونفخ فی الصور ذلك یوم الوعید

''وحشت ناک وعدوں پر عمل کے اس دن صور پھونکا جائے گا۔''

البتہ لفظ "وعید" قرآن میں بہت مرتبہ آیا ہے اگرچہ "یوم الوعید" کی تعبیر ایک ہی دفعہ آئی ہے۔

کلمہ "وعید" "وعد" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ "وعد" خیر و شر ہر دو مواقع کے لیے استعمال ہوتا

ہے جب کہ "وعید" صرف عذاب وسزا کے وعدوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا ابن منظور نے لسان العرب میں اس کا معنی "تہدید" کیا ہے۔کلمہ "ایعاد" بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال یہ نام روزِ قیامت کی تمام سزاؤں کی طرف ایک پرمعنی اشارہ ہے۔اس میں محشر اور عدالت عدل الٰہی کی مشکلات بھی شامل ہیں، دوزخ کی سزائیں بھی اور مادی وروحانی سزائیں بھی مثلاً خلائق کی موجودگی میں رسوائی اور فیض قرب الٰہی سے دوری۔

مفسرین کے درمیان اس مسئلے میں بحث ہے کہ کیا اس آیت میں نفخ صور سے مراد موت کا اور دنیا کے خاتمے کا صور ہے یا زندگی اور آغازِ آخرت کا۔لیکن اس کے بعد کی آیت کہتی ہے:

وجآءت کل نفس معها سائق و شهید

"ہر انسان اس عالم میں وارِدِ محشر ہوگا کہ چلانے والا اور گواہی دینے والا اس کے ہمراہ ہوگا۔"

یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں دوسرا صور مراد ہے اور یوم وعید بھی وہی دن ہے۔[1]

۲۰۔الیوم الحق

یہ نام بھی قرآن مجید میں ایک بار سورہ نباء کی آیت ۳۹ میں آیا ہے۔قیامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ذلك اليوم الحق

"وہ دن یوم حق ہے۔"

ہاں وہ ایک انکار ناپذیر حقیقت ہے۔ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو تمام عالم آفرینش کو بامعنی بناتی ہے۔اگر وہ دن نہ ہوتا تو اس جہان کی حقیقت کا کچھ مفہوم نہ ہوتا۔

اصولاً دنیا ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔دراصل یہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت، فنا ہے نہ کہ بقاء موت ہے نہ کہ حیات۔واقعاً حقیقت، واقعیت اور حیات کا اصلی مفہوم قیامت میں ہی ظاہر ہوگا۔قرآن کے الفاظ ہیں:

وان الدار الاخرة لهی الحیوان

"دارِ آخرت ہی حیات حقیقی ہے۔" (عنکبوت ۶۴)

بعض مفسرین نے اس دن کے حق ہونے کی تفسیر میں تین نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ وہ دن حق ہے اور اس کے سوا سب کچھ باطل۔کیونکہ دنیا کے دنوں کا باطل ہونا ان کے حق ہونے سے زیادہ ہے۔

---

[1] بہت سے مفسرین مثلاً ابوالفتوح رازی، علامہ طباطبائی، فخر الدین رازی، روح المعانی میں آلوسی اور مراغی نے اپنی تفسیر میں مندرجہ بالا آیات کے تحت اس معنی کو قبول کیا ہے۔

۲۔ حق وجودِ ثابت کے معنی میں ہے۔اسی لیے اللہ کو حق کہتے ہیں کیونکہ اس کے لیے فنا کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا۔یوم قیامت بھی ایسا ہی ہے،لہٰذا حق ہے۔

۳۔ وہی وہ دن ہے جسے ''دن'' کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس روزِ روشن میں اسرارِ مخفی آشکار ہوں گے، جب کہ دنیا میں لوگوں کے احوال (رات کی طرح) چھپے ہوئے اور نامعلوم ہیں۔[1]

۲۱۔یوم مشهود

یہ توصیف بھی قرآن مجید میں صرف ایک بار سورہ ہود کی آیت ۱۰۳ میں آئی ہے۔عذابِ آخرت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس روز کا ذکر کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

وذلك يوم مشهود

''اور وہ ایسا دن ہے جس کا نیک اور بد بلا امتیاز مشاہدہ کریں گے۔''

نہ فقط مخلوقات میں سے اولین و آخرین اس روز کا مشاہدہ کریں گے بلکہ وہ اپنے اعمال،حساب،عدالت عدل الٰہی اور اپنے اعمال کی جزا و سزا کا بھی اس روز مشاہدہ کریں گے۔

طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اور علامہ طباطبائی مرحوم نے المیزان میں کہا ہے کہ اس آیت کا مطلق ہونا اس امر پر گواہ ہے کہ فقط انسان نہیں بلکہ جن اور فرشتے بھی اس روز حاضر و ناظر ہوں گے، کیونکہ وہ سب کے عمومی اجتماع کا دن ہے۔[2]

قرطبی بھی کہتے ہیں کہ اہل آسمان بھی اس دن کے شاہد و ناظر ہیں۔

البتہ ہر دن کا مشاہدہ ہوتا ہے،لیکن قیامت کے لیے اس توصیف کا انتخاب ایک طرف تو اس دن کے قطعی ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف اس دن اور اس کے واقعات کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے اور اس کی طرف بھی کہ اس روز سب خلائق حاضر ہوں گے۔

۲۲۔یوم معلوم

یہ تعبیر بھی قرآن مجید میں ایک بار سورہ واقعہ کی آیہ ۵۰ میں کافروں کے سوال کے جواب میں آئی ہے۔ان کا سوال حیات بعد از موت کے بارے میں تھا۔ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝۴۹ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۵۰

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۳۱ ص ۲۵

[2] المیزان، ج ۱۱ ص ۷، مجمع البیان ج ۵ ص ۱۹۱۔مراغی نے بھی اپنی تفسیر میں یہی بات قبول کی ہے۔

''کہہ دے کہ اولین وآخرین سب کومقررہ یوم معلوم کوجمع کیا جائے گا۔''

اس دن کے معلوم ہونے کی دوتفسیریں ہوسکتی ہیں:

۱۔ مراد ''علم تفصیلی'' ہے یعنی اس دن اوراس کی دقیق تاریخ کاعلم۔ہم جانتے ہیں کہ یہ علم اللہ سے مخصوص ہے اوراس کے بارے میں کوئی بھی، یہاں تک کہ انبیاءمرسلین اور ملائکہ مقربین بھی آگاہ نہیں ہیں۔لیکن اللہ کے نزدیک وہ دن ثابت، قطعی اور ہرلحاظ سے معلوم ہے۔

۲۔ مراد ''علم اجمالی'' ہو یعنی اس بات کاعلم کہ ہم سب کوایک ایسادن درپیش ہے اور جیسا کہ آئندہ انشاءاللہ آئے گا، یہ علم ہماری فطرت کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔علاوہ ازیں عقلی ونقلی متعدد دلائل اس پر موجود ہیں جس کی وجہ سے ایک عالم بھی اور عام آدمی بھی اجمالاً اس کاعلم حاصل کرسکتا ہے۔مزید برآں یہ کہ تمام انبیاءاور پیغمبران الٰہی نے اس کی خبر دی ہے۔لہٰذا وہ روزمعلوم، قطعی اور مسلم ہے، اگرچہ اس کی حتمی تاریخ نہ جانتے ہوں۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم سب یقینی طور پر جانتے ہیں کہ آخرکار ہمیں مرجانا اور دنیا سے چلے جانا ہے، اگرچہ کوئی بھی اپنی زندگی کے خاتمہ کی تاریخ نہیں جانتا۔

زیادہ تر مفسرین نے پہلے معنی کو ہی اختیار کیا ہے، لیکن بعض نے دوسرے معنی پر زیادہ زور دیا ہے اور کلمہ ''قل'' کو اس علم کے عمومی ہونے پر دلیل قرار دیا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے یہ بات کہہ دے۔[1]

البتہ ان دونوں تفسیروں کا آیت کے مفہوم میں جمع ہونا بھی کاملاً ممکن ہے۔

ضمنی طور پر ''یوم معلوم'' کی تعبیر یہ پیغام دیتی ہے کہ ہمیں اس دن کے بارے میں سنجیدہ ہونا چاہیے، اپنے آپ کو اس دن کی ملاقات کے لیے تیار کرنا چاہیے اور یقین رکھنا چاہیے کہ قیامت اپنے تمام تر آثار ونتائج کے ساتھ بہرحال آئے گی۔یہ علم ویقین غیر معمولی تربیتی اثر رکھتا ہے۔

۲۳۔یوما عبوسا قمطریراً

یہ نام بھی قرآن مجید میں ایک ہی مرتبہ دکھائی دیتا ہے۔سورہ دھر آیت ۱۰ میں ابرار[2] کی زبانی بیان کیا گیا ہے:

انا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطریرا

''ہم عبوس اور سخت دن کے بارے میں اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔''

واضح ہے کہ ''عبوس'' انسانی صفات میں سے ہے اور ایسے شخص کو کہتے ہیں جو منہ بسورے ہوئے ناراض ہو۔اس دن کی یہ توصیف

---

[1] تفسیر فخرالدین رازی، ج۲۹، ص۱۷۲

[2] ہم جانتے ہیں کہ یہ سورت حضرت علی، فاطمہ، حسن، حسین سلام اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں نازل ہوئی جو ابرار کی صف اول میں ہیں۔

اس کی وحشت ناک وضع کی طرف واضح کنایہ ہے، یعنی اس دن کے واقعات اس قدر سخت اور تکلیف دہ ہیں کہ نہ صرف انسان اس روز عبوس ہوں گے بلکہ وہ دن بذات خود گویا منہ بنائے ہوئے ناراض ہوگا۔

بہت سے مفسرین کے مطابق "قمطریر" کا معنی ہے "سخت وشدید" یا ایسا انسان جو ترشرو اور عبوس ہو۔ لہٰذا اس کا مفہوم "عبوس" کے معنی کے نزدیک ہی ہے۔ یہ مادہ "قطر" (بروزن "قفل") سے لیا گیا ہے اور اس میں میم زائدہ ہے۔ ایک اور قول کے مطابق یہ "قمطر" (بروز خنجر) سے لیا گیا ہے۔

بہرحال یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اس دن کے حوادث اس قدر سخت، شدید، دشوار اور دردناک ہوں گے کہ اس کے آثار انسانوں کے اندر سے ان کے چہروں پر منتقل ہوجائیں گے، ہر کوئی سرتاپا وحشت واضطراب میں گھرا ہوگا، کیونکہ کوئی اپنے انجام سے باخبر نہ ہوگا اور سب حساب اور لطف الٰہی کے انتظار میں ہوں گے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے:

"سبحان اللہ ما اشد اسمہ وھو من اسمہ اشد"

"سبحان اللہ! یوم قیامت کا نام کس قدر شدید وسخت ہے اور وہ دن خود اس سے بھی شدید تر ہے۔"

۲۴۔ یوم البعث

یہ تعبیر قرآن مجید میں دو مرتبہ آئی ہے اور دونوں مرتبہ سورہ روم کی آیت ۵۶ میں ہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۚ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

"جنہیں علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ قیامت میں مجرموں سے کہیں گے تم نے اذن خدا سے (عالم برزخ میں) یوم بعث تک توقف کیا ہے اور اب یوم بعث (مردوں کے اٹھنے کا دن) ہے، لیکن تم نہیں جانتے ہو۔"

البتہ مردوں کے زندہ ہونے کو "بعث" سے تعبیر کرنا (اور اس سے مشتق افعال کا استعمال) آیات قرآن میں بہت زیادہ ہے جس کی طرف قبل ازیں اشارہ کیا جاچکا ہے۔ یہ سب اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ وہ دن موت کے بعد عمومی حیات کا دن ہے۔ اس سلسلے میں چونکہ حسب ضرورت گفتگو ہوچکی ہے لہٰذا یہاں ہم بیشتر وضاحت سے اپنے تئیں بے نیاز سمجھتے ہیں۔

قیامت کے ناموں کا پہلا حصہ یہاں تمام ہوتا ہے۔

اس حصے میں جو نام، صفات اور مختلف تعبیرات آئی ہیں ان سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن نے انسانوں کی بیداری، تعلیم وتربیت اور کمال وبلندی کی طرف لے جانے کے لیے معاد کو مختلف روپ میں پیش کیا ہے۔ اس کے لیے طرح طرح کے ناموں کا انتخاب کیا

ہے جن میں سے ہر نام اس بے مثال دن کے عظیم اور ہلا دینے والے حوادث کے کسی ایک پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔

ان میں سے ہر نام یا بالفاظ دیگر، ان اوصاف میں سے ہر وصف اس روز کے حوالے سے اپنے ساتھ ایک خاص پیغام رکھتا ہے، ایک پیغام، سب نسلوں کے لیے اور سب زمانوں کے لیے۔

ایک ایسا پیغام جس کی طرف توجہ گمراہیوں، برائیوں، گناہوں، جرموں، آلودگیوں اور ظلموں سے بچنے کے لیے ایک طاقت ور سبب ہے۔

ایک ایسا پیغام جس کا مطالعہ مختلف حوالوں سے، خصوصاً تربیتی مسائل میں قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے پہلوؤں کو واضح و آشکار کرتا ہے اور جو راہِ حق کے راہیوں اور قرب خدا کے راستے کے مسافروں کے لیے راہنما ہے۔ (غور کیجیے گا)

دوسرا حصہ

اب ہم قیامت کے ناموں کے دوسرے حصے کی جستجو کرتے ہیں جس میں قیامت کے اوصاف ایک لفظ میں نہیں بلکہ ایک جملے میں بیان کیے گئے ہیں۔

۲۵۔یوم نطوی السمآء کطی السجل للکتب

ان ناموں میں سے بعض ان حوادث کے بارے میں بتلاتے ہیں کہ جو دنیا میں قیامت کے نزدیک رونما ہوں گے، جب کہ بعض اس دن انسانوں کے حال سے متعلق مسائل کے بارے میں ہیں اور بعض انجام کار کی خبر دیتے ہیں۔

وہ تعبیرات جو ''مقدمات قیامت'' سے مربوط ہیں ان میں سے مندرجہ بالا تعبیر بھی ہے۔سورۂ انبیاء میں نیکوں اور بدوں کی کچھ جزا و سزا کی طرف اشارے کے بعد آیت ۱۰۴ میں فرمایا گیا ہے:

یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ ؕ وَعْدًا عَلَیْنَا ؕ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیْنَ ﴿۱۰۴﴾

''جس روز ہم آسمان کو بساط کی طرح لپیٹ دیں گے اور پھر جس طرح سے ہم نے خلقت کا آغاز کیا تھا اسے لوٹائیں گے۔یہ وعدہ ہم نے کیا ہے اور اسے لازماً انجام دیں گے۔''

''سجل'' سجل (بروزن ''سطل'') کے مادہ سے ہے جو بڑی اور بھری ہوئی بالٹی کے معنی میں ہے۔اس کے مادہ کو بکھیرنے اور منتشر کرنے کے لیے جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے کے معنی میں قرار دیا گیا ہے۔اسی لیے بڑی بالٹی کو ''سجل'' کہا گیا ہے اور سجل ان اوراق کو کہتے ہیں جن پر مطالب لکھے جاتے ہیں اور کبھی انہیں طومار اور بساط کی صورت میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔اس موقع پر ''طی السجل'' کہا جاتا ہے۔

بعض سمجھتے ہیں کہ سجل کے معنی ہیں ایسی کتابیں جن میں عدالتی اور فضائی احکام اور دعووں کی صورت وغیرہ مرتب کی گئی ہو۔لہٰذا ''تسجیل'' ثبت کرنے، قرار دینے اور ثابت کرنے کے معنی میں آتا ہے۔[1]

بہرحال ظاہر آیت یہ ہے کہ اس دنیا کے اختتام پر قیامت کے قریب تمام آسمانوں کو باہم سمیٹ لیا جائے گا جیسے شروع میں ایک ڈھیر کی صورت میں تھے۔یہ وہ بات ہے جس کی عصر حاضر کے علم نے صراحت کی ہے۔اس کے مطابق عالم ہستی شروع میں ایک ڈھیر کی صورت میں تھا۔بعدازاں نامعلوم علل کے باعث اپنے گرد گردش کرنے لگا اور مرکز گریز قوت کے زیر اثر اس کے اجزاء ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔

---

[1] قاموس، مفردات، التحقیق اور کتب دیگر۔

اب بھی کائنات پھیل رہی ہے لیکن احتمال یہ ہے کہ پھیلاؤ کی آخری حد تک پہنچ کر بازگشت شروع ہو جائے گی اور پھر سرعت سے مرکز عالم کی طرف حرکت شروع ہو جائے گی۔ آخر کار آسمان باہم سمیٹے جائیں گے اور ایک ہی ڈھیر بن جائیں گے اور یہی اس دنیا کا آخر ہوگا۔

پھر حرکت نو کا بار دیگر آغاز ہوگا۔ نئے زمین و آسمان وجود میں آئیں گے جن سے جہانِ دیگر تشکیل پائے گا۔

اس مفہوم کے مطابق ضرورت نہیں رہتی کہ ہم آیت کی کنائی تفسیر کریں، اگرچہ بہت سے مفسرین نے کنائی معنی کی جستجو کی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں یہ تفسیر پیش نظر نہ تھی۔

البتہ بہرصورت آسمانوں کے جمع ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل ہی نابود ہو جائیں گے اور عالم مادہ ختم ہو جائے گا کیونکہ قرآن متعدد آیات میں صراحت سے کہتا ہے کہ انسان قبروں سے اٹھیں گے اور بوسیدہ ہڈیاں لباس حیات پہنیں گی۔ جسموں کے بوسیدہ ہو جانے کی وجہ سے جو خاک بن چکی ہوگی وہ جمع ہوگی اور نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔

۲۶۔ یوم تبدل الارض غیر الارض والسموت

سابقہ گفتگو میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے قیامت کے بارے میں اس قرآنی تعبیر کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ یہ نام قرآن مجید کی ایک ہی آیت (سورہ ابراہیم ۴۸) میں آیا ہے۔ یہ ظالموں اور مجرموں سے انتقام الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یوم تبدل الارض غیر الارض والسموت

''ایسا اس روز ہوگا جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی دوسرے آسمانوں سے بدل جائیں گے۔''

پہلے تو سب آپس میں تہ ہو جائیں گے۔ پھر عالم ہستی میں معمار ایک نئے منصوبے کے تحت نئے زمین و آسمان ایجاد کرے گا جو بالاتر اور والاتر ہوں گے، ایسے جیسے یوم قیامت کی طبیعت متقاضی ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ کیا زمین کی ظاہری صورت و کیفیت تبدیل ہوگی یا پھر اس کی ذات میں کوئی تبدیلی آئے گی؟ اس سلسلے میں مفسرین کے مابین بحث ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ تمام پہاڑ، جنگل وغیرہ دگرگوں ہو جائیں گے۔ زمین چاندی رنگ کی سی سفید نکل آئے گی، ایسی زمین جس پر کبھی کوئی خون نہ بہا ہوگا اور جس پر کوئی گناہ انجام نہ دیا گیا ہوگا۔ آسمان بھی اسی طرح سے متغیر ہو جائیں گے۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ زمین و آسمان بالکل ناپید ہو جائیں گے اور نئے زمین و آسمان ان کی جگہ لیں گے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، یہ احتمال قرآن کی دیگر آیات سے ہم آہنگ نہیں ہے جن کے مطابق انسانی قبریں اور مٹی اسی طرح باقی رہے گی اور اگر کہا جائے کہ زمین کی یہ تبدیلی انسانوں کی نئی زندگی کے بعد ہوگی، تو یہ بات آیت کے دوسرے حصے کے منافی ہے، جو کہتا ہے:

وبرزوا للہ الواحد القھار

''اور وہ سب اللہ واحد القہار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔''

کیونکہ اس کا ظاہر یہ ہے کہ خلائق کا ظہور و بروز زمین کے تغیر و تبدیل کے بعد ہوگا۔

۲۷۔یوم تمور السمآء مورا

یہ نام بھی قرآن مجید میں فقط ایک بار سورہ طور آیہ ۹ میں آیا ہے۔قبل ازیں وقوع عذاب الٰہی کا ذکر ہے اور یہ کہ کوئی چیز اسے دفع کرنے والی نہیں ہے:

ان عذاب ربك لواقع ماله من دافع

اس کے بعد فرماتا ہے:

یوم تمور المآء مورا وتسیر الجبال سیرا

''جس دن آسمان تیزی سے حرکت میں آجائیں گے اور پہاڑ اکھڑ کر چلنے لگیں گے۔''

''مور'' (بروزن ''موج'') کے ارباب لغت کے مطابق مختلف معانی ہیں:

دورانی حرکت (دائرے کی صورت میں)،

موج،

تیز رفتاری،

آمد و رفت،

ایسا گرد و غبار ہوا جسے ہر طرف اڑائے لیے جاتی ہے۔[1]

اس مقام پر مناسب ترین معنی حرکت سریع ہیں۔ممکن ہے یہ عالم ہستی کے خاتمے کے موقع پر مرکز جہان کی طرف سریع حرکت ہی ہو جس کی طرف گذشتہ صفحات میں اشارہ ہوا ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ عالم کی دورانی حرکت مراد ہو، انبساط اور انقباض پر دو صورتوں میں (دنیا کے پھیلتے اور سمٹتے ہوئے کی دورانی حرکت)۔

فخر الدین رازی اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں:

وتسیر الجبال سیرا (پہاڑ تیزی سے حرکت کریں گے)، یہ جملہ آسمانوں کی حرکت کے لیے ایک وضاحت ہے، ایسے ہی جیسے انسان کشتی میں سوار ہو کر تیزی سے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے تمام زمین اور درخت حرکت میں ہیں۔اسی طرح اس دن

---

[1] لسان العرب، مفردات راغب، مجمع البیان، ج۹ ص ۱۶۳ اور روح البیان، ج۹ ص ۱۸۹

جب پہاڑ اوران کے ہمراہ انسان حرکت میں ہوں گے تو ایسا لگے گا جیسے سب آسمان حرکت میں آ گئے ہیں۔[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آسمان درحقیقت حرکت نہیں کریں گے بلکہ دیکھنے والے کو یوں لگے گا جیسے وہ حرکت کر رہے ہیں، لیکن یہ تفسیر آیت کے ظاہر کے خلاف ہے۔

۲۸۔یوم تشقق السمآء بالغمام

۲۹۔یوم تشقق الارض عنهم سراعا

یوم قیامت کے بارے میں یہ دو تعبیریں جو فرقان ۲۵ اور ق ۴۴ میں آئی ہیں ایک جہت سے باہم شباہت رکھتی ہیں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

یوم تشقق السمآء بالغمام

''اس دن کو یاد کرو جب آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ جائیں گے۔

دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:

یوم تشقق الارض عنهم سراعا

''مردے اس دن زندہ ہوں گے جب زمین ان کے اوپر سے پھٹ جائے گی اور وہ تیزی سے (قبروں سے) نکل آئیں گے۔''

انسانوں کے اوپر سے زمین کے پھٹ جانے کا مفہوم واضح ہے۔ یہ قیامت کے زلزلے کی طرف اشارہ ہے جو قبروں میں شگاف ڈال دے گا، انسان حکم الٰہی سے زندہ ہو جائیں گے اور حساب و جزا کے لیے تیزی سے نکل کھڑے ہوں گے۔

البتہ ابر کے ساتھ آسمانوں کا پھٹ جانا ممکن ہے ان عظیم دھماکوں کی طرف اشارہ ہو جو دنیا کے اختتام پر کرات آسمانی میں رونما ہوں گے۔ ان دھماکوں سے پیدا ہونے والے بادل صفحہ آسمان پر چھا جائیں گے۔ (یہ اس صورت میں ہے جب ''بالغمام''[2] میں با اصطلاحی لحاظ سے باء ملابست ہو، یعنی بادلوں کے ساتھ ساتھ ہمراہ)۔

یا یہ کہ آسمان، یعنی کرات آسمانی، ان بادلوں کے سبب پھٹ جائیں گے جن میں ایٹمی یا کسی اور توانائی کی عظیم اور طاقتور لہریں ہوں

---

[1] تفسیر کبیر ج ۲۸ ص ۲۴۳

[2] ''غمام'' ''غم'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ڈھانپنا۔ بادل چونکہ آسمان کو ڈھانپ دیتے ہیں اس لیے انہیں غمام کہتے ہیں اور رنج و اندوہ چونکہ انسان کے دل پر چھا جاتا ہے اس لیے اسے غم کہتے ہیں۔

گی۔(اس صورت میں باء سببیت کے لیے ہوگی)۔[1]

علامہ طباطبائی مرحوم اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں:

بعید نہیں کہ یہ بات جہل و نادانی کے بادل چھٹ جانے، عالم غیب کے ظاہر ہونے، فرشتوں کے ظہور، زمین یعنی وہ سرزمین جہاں انسان بستے ہیں، پر ان کے نزول کے لیے کنایہ ہو۔[2]

لیکن کنائی معنی پر محمول کرنے کے لیے چونکہ کسی خاص قرینہ کی ضرورت ہے جو آیت میں موجود نہیں ہے، اس لیے پہلی تفسیر ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں زمین کا شگافتہ ہونا بھی ظاہری معنی ہی میں ہے نہ کہ کنائی اور روحانی معنی میں۔

دوسرا شاہد یہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات ایسی ہیں جو نشاندہی کرتی ہیں کہ قیامت کے نزدیک عالم مادہ کے تمام پہلوؤں میں ایک بہت بڑی تبدیلی اور ایک شدید انقلاب رونما ہوگا اور یہ آسمان، زمین، پہاڑ اور سمندر سب پر محیط ہوگا۔

۳۰۔یوم تکون السمآء کالمھل

یہ روزِ قیامت اور عالم میں رونما ہونے والے شدید تغیرات کی ایک اور توصیف ہے۔ یہ توصیف قرآن میں صرف ایک بار سورہ معارج کی آیت ۸ میں آئی ہے۔فرماتا ہے:

یوم تکون السمآء کالمھل

''قیامت کے حوادث اس دن رونما ہوں گے جب آسمان پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوں گے۔''

''مھل'' (بروزن ''قفل'') کبھی پگھلی ہوئی دھات کے معنی میں تفسیر ہوا ہے، کبھی ایسی تلچھٹ کے معنی میں جو گھی یا کسی اور چیز کے برتن کی تہ میں بیٹھ جائے، کبھی پگھلی ہوئی چاندی کے معنی میں اور کبھی بروزہ یا تارکول کے فضلہ کے معنی میں۔[3] البتہ دیگر آیات جو روزِ قیامت کے واقعات کے بارے میں ہیں، کی طرف توجہ کی جائے تو پہلے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

آسمان سے یہاں مراد یا کرات آسمانی ہیں یا صفحہ آسمان جو کرات کے پھٹ جانے کی صورت میں پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہو جائے گا۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ احتمال بھی ہے کہ بہت سے کرات آسمانی اس وقت بھی ایسی گیسوں پر مشتمل ہیں جن کے سالمات دباؤ

---

[1] بعض مفسرین نے ''باء'' کو ''عن'' کے معنی میں لیا ہے۔یعنی بادل آپس میں پھٹ کر آسمان سے ایک طرف ہٹ جائیں گے اور یہ معنی بہت بعید ہے۔

[2] المیزان، ج ۱۵ ص ۲۱۹

[3] مجمع البیان، تفسیر کبیر، المیزان اور دیگر تفاسیر، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

کے تحت قریب ہو گئے ہیں۔اس دن پگھلے ہوئے ڈھیر کی صورت اختیار کرلیں گے اور یہ ان گیسوں کی ایک نئی شکل ہوگی جو عالم قیامت کے لیے ایک مقدمہ ہوگی۔[1]

۳۱۔یوم ترجف الارض والجبال

روزِ قیامت کے بارے میں یہ توصیف قرآن مجید کی دو آیتوں میں کچھ فرق کے ساتھ نظر آتی ہے۔سورہ مزمل کی آیت ۱۴ میں فرمایا گیا ہے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾

''قیامت کی جزاؤں اور دردناک عذاب کا دن وہ ہے جب زمین اور پہاڑوں پر سخت لرزہ طاری ہوگا اور پہاڑ نرم ریت کے ٹیلے بن جائیں گے۔''

سورہ نازعات کی آیت ۶ میں ہے:

یوم ترجف الراجفة

''جس دن وحشت ناک زلزے ہر چیز کو لرزا کر رکھ دیں گے۔''

جب ہول انگیز زلزلے ساری زمین کو لرزا دیں گے اور پہاڑیوں ریزہ ریزہ ہو جائیں گے کہ نرم ریت کے ٹیلوں میں بدل جائیں گے، ظاہر ہے کہ ضعیف و ناتواں انسان کی کیا حالت ہوگی۔

یہ سب باتیں ان حوادث سے مربوط ہیں کہ جن کا نتیجہ اس دنیا کا خاتمہ ہوگا۔اس کے بعد نئی دنیا کا آغاز ہوگا۔قرآن مجید نے دونوں کو ملا کر اور ایک دوسرے کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ایک طرف تو انسانی کی ناتوانی کا ذکر ہے، دوسری طرف اس دنیا کے خاتمے پر رونما ہونیوالے ہول انگیز تغیرات کا تذکرہ ہے اور تیسری طرف قیام قیامت کے روز اس دنیا کی دگرگونی اور شور محشر کی خبر ہے۔یہ سارے تغیرات انسان کی تربیت کے لیے ہیں اور بار بار اس کی بیداری کے لیے صدائے ہوشیار باش ہیں۔

''ترجف'' اور ''راجفة'' ''رجف'' کے مادہ سے ہے جو زور سے ہلنے کے معنی میں ہے۔لہٰذا پر موج دریا کو ''بحر رجاف'' کہتے ہیں ''ارجاف'' بے بنیاد افواہیں پھیلنے کو کہتے ہیں جو معاشرے کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔''اراجیف'' فتنہ و فساد کی جڑوں کو کہا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ''راجفه'' کے معنی میں مختلف احتمالات ذکر کیے گئے ہیں مثلاً واقعہ، بڑی چنگھاڑ وغیرہ لیکن دوسری آیت کے قرینہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے معنی ہیں: زمین جو اس روز سخت لرزہ براندام ہوگی۔

---

[1] فی ظلال القرآن، ج ۸ ص ۲۷۸ و ص ۲۷۹

"کثیب" (اکٹھی ریت) کے معنی میں ہے اور بعض کے نزدیک اس کے معنی ہیں "ریت کا بڑا قطعہ" "مهیل" کا معنی ہے۔ بہت نرم ریت جس پر پاؤں رکھا جائے تو پھیل جائے اور جب ایک طرف سے کچھ اٹھالی جائے تو باقی نیچے آ پڑے۔ لہٰذا بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: سیال ریت۔ [1]

۳۲۔ یوم یسمعون الصیحة بالحق

۳۳۔ یومهم الذی فیه یصعقون

مندرجہ بالا دو تعبیرات جو باہم قریب الافق ہیں، بھی اس عظیم دن کی حکایت کرتی ہیں۔ پہلی سورق کی ۴۲ ویں آیت ہے۔ فرمایا ہے:

جس دن قیامت کی چنگھاڑ حق کے ساتھ سنیں گے وہ یوم خروج ہے: (یوم یسمعون الصیحة بالحق ذلك یوم الخروج)۔

ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا کے اختتام اور قیامت کے آغاز پر دو بڑی چنگھاڑیں ہوں گی جنہیں قرآن مجید نے "صیحة" کہا ہے۔ کبھی اسے صور پھونکنا بھی کہا گیا ہے۔ پہلی چیخ دنیا کی خاموشی اور عمومی موت کے لیے ہوگی اور دوسری حیات نو اور معاد کی آواز ہوگی۔ مندرجہ بالا آیت میں دوسری چنگھاڑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ آیت کے آخر میں ہے: ذلك یوم الخروج۔

اس سلسلے میں کہ یہ عظیم آواز کیسی ہوگی، کس وسیلے سے ہوگی اور مردوں کے احیاء میں اس کی تاثیر ہوگی۔ کیا صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں لیکن قرآن نے اس کی طرف ایک جمالی اشارہ کیا ہے اور کچھ رمزیہ انداز میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس دن کی حقیقت ہم پر واضح نہ ہو کیونکہ قیامت کی ہر چیز اس زندگی سے مختلف ہے۔ ابہام کے ایک ہالے نے اسے چھپا رکھا ہے جیسے ماں کے پیٹ میں موجود بچے کے لیے ممکن نہیں کہ اس دنیا کی زندگی کو سمجھ سکے، اگرچہ فرض کرلیا جائے کہ وہ بڑی عظیم قوت فکر رکھتا ہو۔

دوسری سورہ طور کی آیت ۴۵ ہے۔ فرماتا ہے: انہیں رہنے دے یہاں تک کہ اس روز ملیں جب ان پر چنگھاڑ پڑے گی۔

(فذرهم حتی یلاقوا یومهم الذی فیه یصعقون)

"یصعقون" "اصعاق" کے مادہ سے ہے جو خود دراصل "صاعقه" سے ہے۔ "صاعقه" چونکہ صدائے عظیم کی بھی حامل ہوتی ہے اور ہلاکت کا سبب بھی ہوجاتی ہے، لہٰذا اس جملے کی تفسیر دونوں معانی کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اگر ہلاکت کے معنی میں ہو تو پھر پہلی پھونک کی طرف اور اس جہان کے خاتمہ کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے سورہ زمر کی آیت ۶۸ میں ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ

"صور پھونکا جائے گا اور آسمانوں اور زمین میں موجود سب ہلاک ہوجائیں گے۔"

---

[1] مفردات راغب، مجمع البیان، تفسیر کبیر اور زیر بحث آیت کے ذیل میں دیگر تفاسیر

اگر آواز کے معنی میں ہو تو ممکن ہے پہلی پھونک یا دوسری پھونک کے معنی میں ہو جبکہ دوسری پھونک معاد کی ہے۔ اس صورت میں یہ آیت پہلی آیت کی مانند ہوگی۔

بہت سے مفسرین نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اگرچہ دوسرے احتمال کو بھی انہوں نے نظر انداز نہیں کیا۔[1]

یہ جو بعض نے احتمال ذکر کیا ہے کہ مراد جنگ بدر میں بعض مشرکات کی ہلاکت ہے، بہت بعید معلوم ہوتا ہے (اس ادعا پر شاہد سورہ زمر کی آیت ۶۸ ہے، جو اوپر ذکر کی گئی ہے)۔

۳۴۔ یوم ینفخ فی الصور

یہ تعبیر قرآن مجید میں چار مرتبہ آئی ہے۔ سورۂ انعام ۷۳، طہ ۱۰۲، نمل ۸۷ اور بناء ۱۸ میں۔ پہلی آیت میں فرماتا ہے: جب صور پھونکا جائے گا اس روز حکومت اس کی ہے (وله الملك يوم ينفخ فى الصور)

دوسری آیت میں فرماتا ہے: یہ جزا و سزا اس روز ہوگی جس دن صور پھونکا جائے گا اور اس دن ہم مجرموں کو نیلے جسموں کے ساتھ جمع کریں گے۔ (يوم ينفخ فى الصور ونحشر المجرمين يومئذ زرقا)۔

تیسری آیت میں فرماتا ہے: اس دن کا سوچو جب صور پھونکا جائے گا اور سب آسمان اور زمین والے وحشت میں ڈوب جائیں گے، مگر وہ کہ جنہیں خدا چاہے گا (ويوم ينفخ فى الصور ففزع من فى السموت ومن فى الارض الا من شآء الله)۔

چوتھی آیت میں فرماتا ہے: وہی دن جب صور پھونکا جائے گا، تم گروہ در گروہ محشر میں وارد ہوگے (يوم ينفخ فى الصور فتاتون افواجا)

جیسا کہ انشاء اللہ "نفخ صور" کی بحث میں آئے گا، قرآن مجید دو نفخ صور کی خبر دیتا ہے۔ پہلے نفخہ کے موقع پر زمین و آسمان کی سب زندہ موجودات مر جائیں گی۔ دوسرا نفخہ کی جو نفخہ حیات ہے اس کے موقع پر سب زندہ اور حساب و کتاب کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ البتہ مندرجہ بالا چار آیتیں تمام یا بیشتر نفخہ دوم سے مربوط ہیں جو قیامت میں نفخہ حیات ہے۔

بہر حال قرآن کی طرف سے قیامت کی یہ توصیف اس روز کے آغار پر وقوع پذیر ہونے والے بہت سے حوادث کو نظروں کے سامنے مجسم کرتی ہے۔ یہ نہایت معنی خیز تعبیرات میں سے ایک ہے جو اس دن کے سخت اور وحشت ناک حوادث کو چشم دل کے سامنے سے گزارتی ہے اور اسے آگاہ کرتی ہے۔

"صور" اور "نفخ" کے معنی اور دیگر خصوصیات کے بارے میں انشاء اللہ اپنے مقام پر بحث ہوگی۔ صرف یہ جاننے کے لیے کہ یہ تعبیر کیا مفہوم و موضوع رکھتی ہے۔ ہم رسول اکرمؐ کی صرف ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں جو سورۂ نباء کی اٹھارہویں آیت کے ذیل میں مروی

---

[1] مجمع البیان، ج ۹ ص ۱۶۹، قرطبی، ج ۹ ص ۶۲۴۷، روح المعانی، ج ۲۷ ص ۳۴، المیزان ج ۱۹ ص ۲۳ اور روح البیان ج ۹ ص ۲۰۵

ہے، جس میں ان حوادث کے صرف ایک گوشہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

معاذؓ بن جبل کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے "یوم ینفخ فی الصور فتاتون افواجا" کی تفسیر پوچھی۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: ''تم نے بہت بڑی بات پوچھ لی ہے۔''

یہ کہا اور پھر آپؐ کی مبارک آنکھوں سے سیلاب اشک بہہ نکلا۔

پھر فرمایا: ''یہ گروہ جو نفخ صور کے وقت وارد محشر ہوں گے ان میں میری امت کے وہ دس گروہ ہوں گے جنہیں اللہ مسلمانوں کے گروہوں سے جدا کر دے گا۔ ان میں سے ایک گروہ بندروں کا ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو لوگوں میں سخن چینی اور تجسس کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ سوروں کی شکل میں ہوگا، یہ لوگ حرام مال والے ہوں۔ ایک گروہ کو الٹے پاؤں لٹکا دیا جائے گا، یہ سود خور ہوں گے۔ ایک گروہ نابیناؤں کا ہوگا، یہ لوگ عدالت کے وقت ظلم کرنے والے ہوں گے۔ ایک گروہ بہرہ اور گونگا وارد محشر ہوگا، یہ لوگ اپنے اعمال میں عجب اور نخوت میں مبتلا ہوں گے۔ ایک گروہ کے لوگ اپنی زبانوں کو دانتوں میں چبا رہے ہوں گے، یہ وہ علماء و خطباء ہوں گے کہ جن کی گفتار اور اعمال میں اختلاف ہوگا۔ ایک گروہ آئے گا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے، یہ ہمسایوں کو آزار پہنچانے والے ہوں گے۔ ایک گروہ کو آتش دوزخ کی شاخوں پر سولی پر لٹکایا جائے گا، یہ لوگوں میں چغل خوری کرنے والے اور ظالم بادشاہ ہوں گے۔ ایک گروہ ایسے افراد کا ہوگا جن سے مردار سے بھی بری بدبو آ رہی ہوگی، یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس دنیا میں شہوات نفسانی میں غرق ہیں اور اپنے اموال میں سے اللہ کا حق نہیں دیتے۔ آخر کار ایک گروہ ایسے لباس والوں کا ہوگا جو (آگ بھڑکانے والے مادے) قطران سے آلودہ ہوگا۔ یہ لباس ان کے جسموں سے چسپاں ہوگا اور یہ تکبر و غرور کرنے والے لوگ ہوں گے۔[1]

۳۵۔ یوم کان مقدارہ خمسین الف سنة

دو مقامات پر قرآن مجید قیامت کا ذکر کرتے ہوئے اسے ایک نہایت طولانی دن کے طور پر پیچنوا تا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے: جس دن کا طول پچاس ہزار سال ہے، اس دن فرشتے اور روح اس کی طرف عروج کریں گے۔ (تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ) (معارج ۴)

دوسری جگہ فرماتا ہے: اللہ اس جہان کے امور کو آسمان سے زمین کی طرف تدبیر کرتا ہے۔ پھر جس دن کی مقدار تمہارے سال کے حساب کے مقابلے میں ہزار سال ہے اس روز تم اس کی طرف لوٹ جاؤ گے (اور دنیا ختم ہو جائے گی اور آخرت شروع ہو جائے گی)۔ (يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ) (سجدہ ۵)

بلاشبہ پہلی آیت یوم قیامت کے بارے میں ہے۔ بعد کی تمام آیات اوصاف قیامت کے بارے میں ہیں۔ نیز مجرموں کے لیے

---

[1] یہ حدیث بہت سے مفسرین نے نقل کی ہے مثلاً ابوالفتوح رازی، قرطبی اور روح البیان۔ ہم نے اس کا مخلص ذکر کیا ہے۔

عذاب اور اسی طرح اوصاف دوزخ بھی بیان کرتی ہیں۔

البتہ دوسری آیت کے بارے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے۔[1] بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت اسی دنیا میں تدبیر امر الٰہی کی قوس نزولی وصعودی کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس عالم میں تدبیر الٰہی کے دورانیوں کی طرف اشارہ ہے، جن میں سے ہر دورانیہ ایک ہزار سال ہے اور فرشتے حکم الٰہی سے اس تدبیر تکوینی کا اجراء کرتے ہیں۔ ایک دورانیے کے بعد دوسرا شروع ہوتا ہے۔

لیکن اگر قرآن کی دیگر آیات کی طرف توجہ کی جائے تو وہ آسمان وزمین کے لپیٹ لیے جانے کی بات کرتی ہیں اور اسی طرح اس آیت کی تشریح کے بارے میں مروی روایات پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ روز قیامت کے بارے میں ہے۔ لہٰذا علامہ طباطبائی مرحوم نے المیزان میں دیگر احتمالات کا ذکر کرنے کے بعد اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔[2]

تاہم یہ سوال یہاں سامنے آتا ہے کہ پہلی آیت میں اس دن کی طوالت ہمارے سالوں کے حساب سے پچاس ہزار سال بیان کی گئی ہے جب کہ دوسری آیت میں ایک ہزار سال، ایسا کیونکر ہے؟

اس سوال کا جواب شیخ طوسی مرحوم کی امالی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

"ان فی القیامة خمسین موقفا کل موقف مثل الف سنة، مما تعدون ثم تلا هذه الایة: فی یوم کان مقداره خمسین الف سنة۔"

''قیامت میں پچاس موقف (بندوں کے اعمال کے حساب کی جانچ کے لیے توقف کے مقامات) ہیں۔ ہر موقف آپ کے سالوں کے حساب سے ہزار سال کا ہے۔ پھر امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: جس دن کی طوالت پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔''

یہاں پر ہزار اور پچاس ہزار سال کا ذکر تعداد وشمار بتانے کے لیے ہے، یا تکثیر اور کثرت بتانے کی غرض سے، اس سلسلے میں دو احتمال ہیں لیکن ان آیات سے جو پیغام کانوں تک پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ دن نہایت سخت اور مشکل ہوگا۔ وہ بہت دقیق اور پیچیدہ دن ہوگا جس سے کوئی بھی آسانی سے نہیں گزر سکتا۔ سب کو چاہیے کہ ایسے خطرناک طولانی دن کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ دن تو ایک کرہ کے اپنے ہی محور کے گرد گردش کے دورانیے کا نام ہے، جب کہ تمام آسمانی کرات کی گردش کے یہ دورانیے آپس میں مختلف ہیں۔ کرۂ زمین اپنے محور کے گرد ۲۴ گھنٹے میں ایک بار گردش کرتا ہے۔ کرۂ ماہ اپنی گردش وضعی تقریباً ایک ماہ میں مکمل کرتا ہے۔ (اس کا دن تقریبا دو ہفتے کا ہے اور رات بھی تقریباً دو ہفتے کی ہوتی ہے۔) منظومہ شمسی کے دیگر کرآت بھی اسی طرح اپنی رات اور دن

---

[1] روح المعانی میں آلوسی نے اس آیت کی سات تفسیریں بیان کی ہیں۔ ان میں ایک قیامت ہے۔ (ج ۲۱، ص ۱۰۷)

[2] المیزان، ج ۱۶ ص ۲۶۱۔ یہی معنی تفسیر فی ظلال القرآن میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ (ج ۶ ص ۵۱۱)

ایک خاص مدت میں مکمل کرتے ہیں۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جہان ہستی میں ایسے کرآت بھی ہوں جن کی گردش کا ایک دورانیہ سینکڑوں یا ہزاروں سال کا ہو۔لہٰذا اس میں تعجب نہیں کہ قیامت کا ہر دن پچاس ہزار سال کے برابر ہو۔

ہم یہ بات پھر دہراتے دیتے ہیں کہ قرآن کا اصلی مقصد ایک تربیتی پیغام ہے جو ایسی تعبیرات میں نہاں ہے۔

تیسرا حصہ

۳۶۔یوم یکون الناس کالفراش المبثوث

اس وقت تک جو کچھ اس دن کی توصیف کے بارے میں پڑھا ہے وہ ان ہلا دینے والے حوادث کی خبر تھی جو اس دن کے نزدیک عالم ہستی میں وقوع پذیر ہوں گے۔ان میں سے ہر ایک کسی خصوصی پیغام کا حامل ہے۔آخری صفت یہ بیان کی گئی تھی کہ وہ دن بہت طویل ہوگا۔یہ امر بھی ایک خاص پیام رکھتا ہے۔

اب ہم ایسی توصیفات کی جستجو کرتے ہیں جو اس مشخص دن میں انسانوں کی حالت بیان کرتی ہیں۔ان میں سے ہر تعبیر دوسری سے بڑھ کر سبق آموز ہے۔گویا قرآن انسان کا ہاتھ تھام لیتا ہے،اسے میدانِ محشر میں لے چلتا ہے،اسے اس کے گوشے گوشے کی سیر کرواتا ہے اور انسانی آنکھ کے سامنے اس عظیم دن کے حوادث کو مجسم کر کے پیش کرتا ہے۔

زیر بحث توصیف قرآن مجید میں صرف ایک بار سورۂ قارعہ کی آیت ۴ میں آئی ہے۔اس میں اس روز انسان کی اضطراب انگیز حالت کو پیش کیا گیا ہے۔فرماتا ہے: جس روز انسان بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ادھر ادھر حرکت میں ہوں گے (یوم یکون الناس کالفراش المبثوث)

یہی تعبیر کچھ فرق کے ساتھ سورہ قمر آیت ۷ میں بھی آئی ہے۔فرماتا ہے:

"کانھم جراد منتشر"

"گویا لوگ ٹڈی دل کی طرح بکھرے ہوں گے۔"

یہاں لوگوں کو پروانوں سے تشبیہ کیوں دی گئی ہے۔اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔مجموعی طور پر ان کا کہنا ہے کہ اس تشبیہ کی وجہ لوگوں کی کثرت،اضطراب،وحشت،ادھر ادھر ان کی حرکت،ناتوانی اور سرگردانی ہے۔

اس تعبیر میں ہوسکتا ہے یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہو کہ پروانے عموماً شمع اور چراغ کی لو سے دیوانہ وار ٹکراتے ہیں اور اپنے آپ کو جلاتے ہیں۔آتش دوزخ کے ساتھ مجرموں کا بھی یہی حال ہوگا اور یہ سب کچھ اس دن کی شدید حیرت وسرگردانی،اضطراب اور عظیم توہم کی حکایت کرتا ہے۔

بہرحال یہ ایک بہت ہی منہ بولتی تعبیر ہے۔جو اس روز انسانوں کی عجیب حالت کی ترسیم کرتی ہے جسے قرآن مجید ایک چھوٹی سی تشبیہ کے ذریعہ بیان فرماتا ہے۔بعض کا نظریہ ہے کہ پروانہ شمع کے گرد چکر لگاتا ہے تاکہ اپنے آپ کو آگ میں ڈال لے۔یہ اس لیے ہے کہ وہ حافظے سے محروم ہوتا ہے۔شعلے کے قریب ہوتا ہے تو اس کی حرارت کو محسوس کرتا ہے اور بھاگ جاتا ہے لیکن فوراً بھول جاتا ہے اور پھر شعلے کے نزدیک ہوتا ہے۔یہاں تک کہ اپنے تئیں آگ میں ڈال دیتا ہے اور جلا لیتا ہے۔

بدعمل مجرم بھی اس روز اس قدر پریشان خاطر اور مضطر ہوں گے، گویا وہ اپنا حافظہ گنوا بیٹھیں گے اور پروانوں کی طرح اپنے آپ کو دوزخ کی آگ میں گرائیں گے۔

ارباب لغت اور مفسرین نے ''فراش'' کے متعدد معانی ذکر کیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ٹڈی دل ہیں جو آسمان میں پھیلے ہوتے ہیں اور اکٹھے ہوتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب وہ مچھر ہیں جو گروہ در گروہ اڑتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اہل لغت اور مفسرین نے اس کا معنی پتنگے ہی کیا ہے۔ خصوصاً خلیل بن احمد کتاب ''العین'' میں کہتا ہے:

"الفراش التی تطیر طالبة للضوء"

''فراش وہ ہے جو روشنی کی طلب میں اڑتا ہے۔''

صحاح اللغۃ میں بھی ہے:

"فراش" "فراشة" کی جمع ہے اور یہ وہ پرندہ ہے جو اڑتا ہے اور خود سے آگ میں جا گرتا ہے۔

۳۷۔یوم تبلی السرآئر

۳۸۔یوم ھم بارزون

ان دو جملوں میں اس روز کی ایک حقیقت ذکر کی گئی ہے۔ ایک سورہ طارق کی نویں آیت اور دوسری سورہ مومن کی سولہویں آیت ہے۔ یہ ایک ایسا ہلا دینے والا مطلب ہے کہ جس پر ایمان انسانوں کی تربیت میں بہت موثر ہے۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے: ''اس دن اسرارِ نہاں آشکار ہو جائیں گے۔'' (یوم تبلی السرآئر)

دوسری آیت میں کہتا ہے: ''اس دن تمام پردے اٹھ جائیں گے اور سب انسان اپنے تمام ظاہر و باطن اسرار کے ساتھ نمایاں ہو جائیں گے۔'' (یومھم بارزون)

اس دن کوئی چیز مخفی نہ رہے گی کیونکہ ایک طرف تو مادی رکاوٹیں، مثلاً پہاڑ اور ٹیلے ختم ہو جائیں گے اور زمین "قاعا صفصفا" (ہموار بیابان) کی طرح ہو جائے گی۔ (طہ ۱۰۶)

دوسری طرف انسان قبروں سے نکل پڑیں گے اور زمین کے اندر جو کچھ ہو گا وہ اسے اگل دے گی: (واخرجت الارض اثقالھا) (زلزال ۲)

علاوہ ازیں انسانوں اور امتوں کے اعمال نامے کھل جائیں گے اور ان کا مضمون سب پر آشکار ہو جائے گا: واذا الصحف نشرت (تکویر ۱۰)

ہاتھ پاؤں اور جسم کے دیگر اعضاء، حتی کہ کھال بھی کلام کرے گی۔ سب اعضاء بات کریں گے اور راز افشاں کریں گے۔ زمین و

آسمان بات کریں گے۔اعمال کے گواہ انسانوں کے اعمال کی گواہی دیں گے۔اعمال ہی کی نہیں بلکہ انسانوں کی نیتیں اور عقائد بھی اس روز کھل جائیں گے۔واقعاً وہ دن بروں کے لیے عجیب رسوائی کا دن ہوگا اور نیکوں کے لیے بڑے افتخار کا۔

توجہ رہے کہ "تبلی" "بلاء" کے مادہ سے امتحان کے معنی میں ہے۔البتہ آزمائش کے موقع پر چونکہ چیزوں کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے اس لیے یہاں اس لفظ کی آشکار ہونے کے معنی میں تفسیر ہوئی ہے۔

''معاذؓ بن جبل'' کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے کہا:

میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ ''سرائر'' سے کیا مراد ہے جن کے بارے میں آخرت میں بندگانِ خدا کی آزمائش ہوگی؟

آپؐ نے فرمایا:

تمہارے ''سرائر'' تمہارے اعمال، ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، وضو، غسل جنابت اور دیگر ہر واجب عمل۔کیونکہ سب اعمال پنہاں ہیں۔ممکن ہے انسان کہے میں نے نماز پڑھی ہے اور اس نے نہ پڑھی ہو، کہے میں نے وضو کیا ہے اور اس نے نہ کیا ہو۔یہ ہے اس روز اسرار کے آشکار ہونے کا معنی۔[1]

توجہ رہے کہ جو کچھ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے وہ کلی حقیقت کے لیے مثالوں کی حیثیت سے ہے، ورنہ آیت شریفہ تو تمام عقائد، نیات اور اعمال پر محیط ہے، چاہے وہ نیک ہوں یا بد۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس دنیا میں مخفی، ہتھکنڈوں سے جو جھوٹی شخصیتیں بن جاتی ہیں، وہ طوفان محشر کا سامنا نہ کرسکیں گے۔ان کے ڈھول کا پول وہاں کھل جائے گا اور عظیم رسوائی ان کے حصے میں آئے گی۔ایسے خوش ظاہر بد باطن افراد کا یہ زوال کتنا عجیب ہوگا۔کہاں اوج عزت و آبرو اور کہاں قعر ذلت و رسوائی! کب کہ مخلص و بے ریا مومنین کی شوکت آبرو کتنی حسین ہوگی کہ جن کا اس جہان میں اللہ سے خاص پنہاں رابطہ تھا کہ جو اس دن آشکار ہوگا اور وہ عزت و عظمت کے تخت نشین ہوں گے۔

یہ وہ پیغام ہے جو قیامت کی مندرجہ بالا توصیف، ہم سب کو دیتی ہے اور عالم و جاہل ہر انسان کے لیے ایک صدائے ہوشیار باش ہے

گر پردہ زردی کارِ ما بردارند
معلوم شود کہ درچہ کاریم ہمہ

یعنی:

کوئی جو پردہ ہمارے عمل سے سرکائے
تو اپنی ساری حقیقت کا بھید کھل جائے

---

[1] مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۴۷۱

۳۹۔یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ

۴۰۔یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من سوٴء

یہ دو اوصاف بھی ایک ہی حقیقت کو دو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ایک سورۂ نباء کی چالیسوں آیت ہے اور دوسری آل عمران کی تیسویں آیت ہے۔ان میں اس عظیم دن کی ایک اور ایسی اہم حقیقت بیان کی گئی ہے جو جسموں کو لرزا دیتی ہے، دلوں کو دہلا دیتی ہے اور انسان کو گہری سوچ میں ڈال دیتی ہے۔

پہلی آیت میں قرآن کریم فرماتا ہے: ''عذاب الٰہی کا وہ دن ہوگا جب انسان وہ کچھ دیکھے گا جو اپنے ہاتھوں سے آگے بھیج چکا ہوگا۔ (یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ)

تجسم اعمال اور انسان نے جو کام اس دنیا میں کئے ہیں، ان سب کے اس عظیم دن دیکھے جانے کو قبول کرنا چونکہ بہت سے مفسرین کے لیے گراں تھا، لہٰذا کبھی انہوں نے ینظر کو ینتظر کے معنی میں تفسیر کیا ہے اور کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انسان اس دن اپنے اعمال کی جزاء کے انتظار میں ہوگا اور کبھی اعمال دیکھنے کو اعمال نامہ یا ان کی جزا و پاداش دیکھنے کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔

اس سب کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مفسرین نے حضور و تجسم اعمال کے بارے میں کم سوچا تھا وگرنہ ایسی توجیہوں اور مفروضوں کی ضرورت نہیں، کیونکہ قرآن کہتا ہے: اس دن انسان نے جو کچھ آگے بھیجا ہوگا اسے اپنی آنکھ سے دیکھے گا: یعنی اس کے اعمال جو ظاہراً نظام خلقت میں محو ہو گئے ہیں، ختم نہیں ہوئے اور پھر سے زندہ ہو جائیں گے اور مناسب صورتوں میں مجسم ہو جائیں گے۔صرف انجام دینے والے ہی نہیں بلکہ اہل محشر بھی انہیں دیکھیں گے جیسا کہ یہی مطلب زیادہ وضاحت سے سورۂ کہف آیت ۴۹ میں آیا ہے:

ووجدوا ما عملوا حاضرا

''جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہوگا اسے حاضر پائیں گے۔''

دوسری آیت میں بھی یہی مفہوم وضاحت سے آیا ہے۔فرماتا ہے: جس دن ہر کسی نے جو کچھ بھی نیک کام انجام دیا ہوگا اسے دیکھے گا اور چاہے گا کہ اس کے اور اس کے انجام دیئے ہوئے برے کاموں میں زیادہ فاصلہ ہو۔(یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من سوء تود لو ان بینہا و بینہ امدا بعیدا)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ طبرسی مرحوم مجمع البیان میں دوسری آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

انسان کے اعمال چونکہ اعراضی ہیں اور انجام دہی کے بعد نابود ہو جاتے ہیں اور ان کی بازگشت ممکن نہیں، محال ہے کہ وہاں حاضر ہوں۔

یہ کہنے کے بعد وہ دو دوسری تفسیریں ذکر کرتے ہیں۔ایک اعمال ناموں کا حاضر ہونا ہے اور دوسری اعمال کے ثواب وعقاب کا حاضر ہونا۔لیکن جیسا کہ ہم نے تفسیر نمونہ میں بھی کہا ہے:عمل انسان دنیا کو دیگر توانائیوں کی طرح ایک توانائی ہے،لہٰذا قطعاً باقی رہنے والی ہے۔اس کی فقط شکل تبدیل ہوتی ہے،نابود نہیں ہوتی۔

نیز ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ مادہ کا توانائی میں اور توانائی کا مادہ میں بدل جانا،دونوں سائنسی اعتبار سے ممکن ہیں۔لہٰذا کوئی مانع نہیں کہ انسان کے اعمال باقی رہیں اور اس دن مادہ میں تبدیل ہو جائیں اور ہر عمل اپنی مناسب شکل میں ظاہر ہو۔بنابریں مذکورہ آیات درحقیقت قرآن کے عملی معجزات میں سے ہیں کیونکہ نزول قرآن کے زمانے میں کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی۔آج سائنسی انکشافات کی وجہ سے یہ بات ہم پر آشکار ہوئی ہے۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ اسلامی روایات میں بھی بار بار برزخ اور قیامت میں تجسم اعمال کی طرف اشارہ ہوا ہے۔لیکن معلوم نہیں مفسرین کی توجہ اس امر کی طرف کیوں مبذول نہیں ہوئی۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اعمال کو''اعراض'' کا حصہ سمجھتے تھے،ان کی نابودی کا اعتقاد رکھتے تھے اور اعادۂ معدوم کو محال سمجھتے تھے،جب کہ آج ہم جانتے ہیں کہ یہ استدلال بالکل قابل اعتبار نہیں(اس بات کی مزید وضاحت ہم تجسم اعمال کی بحث میں کریں گے)۔

۴۱۔یوم تتقلب فیه القلوب والابصار

۴۲۔لیوم تشخص فیه الابصار

قیامت کے جو دو اوصاف مندرجہ بالا آیت میں آئے ہیں،باہم بہت شباہت رکھتے ہیں۔یہ اوصاف اس عظیم دن کے اسرار سے ایک اور پردہ اٹھاتے ہیں اور سب انسانوں کو کچھ تازہ قیام دیتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے:''الٰہی انسان اس دن سے ڈرتے ہیں کہ جن دن دل اور آنکھیں زیروزبر و جائیں گے۔''(یخافون یوما تتقلب فیه القلوب و الابصار) (نور ۳۷)

دوسری آیت میں فرماتا ہے:''اللہ نے ظالموں(کی جزا) کو اس دن تک کے لیے موخر کر دیا ہے جس دن آنکھیں(مارے وحشت وخوف کے)ٹھہر جائیں گی(انما یوخرهم لیوم تشخص فیه الابصار) (ابراہیم ۴۲)

عرصہ محشر کئی لحاظ سے نہایت ہولناک ہے،ان ہلا دینے والے حوادث کی وجہ سے جو قیام قیامت کے وقت رونما ہوں گے،گواہوں کی موجودگی میں فرشتگانِ الٰہی کے بندوں کے حساب کے لیے تیار ہونے کے لحاظ سے،ان اعمال ناموں کے کھل جانے کے اعتبار سے کہ جن میں عمر انسانی کے تمام چھوٹے بڑے کام درج ہوں گے،دوزخ اور عذاب الٰہی کی نشانیاں آشکار ہونے کے لحاظ سے،تلافی اور بازگشت کے عدم امکان کی جہت سے اور کسی دوست اور فریادرس کے نہ ہونے کے حوالے سے۔ان میں سے ہر بات تنہا ہی انسانی دل کو زیروزبر کر دینے کے لیے کافی

ہے۔ جب کہ یہ تو سب واقعات وقوع پذیر ہوں گے اور انسان ان میں اس طرح سے گھر جائے گا کہ کبھی اس کی آنکھیں بے ارادہ ہی حرکت کرنے لگیں گی اور وہ مضطرب وملتمس ادھر ادھر دیکھے گا جسے قرآن نے اسے زیروزبر ہونے سے تعبیر کیا ہے اور کبھی بالکل حرکت ہی نہیں کریں گی اور پلکیں تک نہیں جھپکے گا اور وہ یوں ہوجائے گا جیسے روح اس کے جسم سے نکل گئی ہو۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت مردان الٰہی کے بارے میں ہے اور دوسری آیت ظالموں کے بارے میں ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ اس ہولناک دن میں سب وحشت میں ہوں گے، نیک بھی اور بد بھی، کیونکہ کسی کو بھی اپنی عاقبت کار کا علم نہ ہوگا۔ حساب الٰہی کی سخت گیری اور دقیق ہونے کی وجہ سے کوئی بھی درست طور پر اپنے انجام سے آگاہ نہیں ہوگا۔

"تتقلب" کا معنی ہے زیروزبر ہونا اور دگرگوں ہونا۔ اس کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں جو سب اس غیر معمولی وحشت واضطراب کی حکایت کرتی ہیں جو داخلی وخارجی طور پر اور انسان کے دیدہ ودل پر اس دن حکم فرما ہوگا۔

"تشخص" "شخوص" کے مادہ سے آنکھ اور پلکوں کے رک جانے اور ایک نقطے پر ٹھہر جانے کے معنی میں ہے۔

اس لفظ کا اصلی ریشہ یعنی "شخوص" (بروزن "خلوص") بلند ہونے اور نکلنے کے معنی میں ہے۔ "شخص" کو بھی اس لحاظ سے شخص کہتے ہیں کہ وہ دور ہی سے برجستہ انداز سے نمایاں ہوجاتا ہے۔ انسان کے ایک جگہ سے نکل کر دوسری جگہ جانے کو بھی "شخوص" کہتے ہیں۔

"شاخص" بھی اسی مادہ سے ہے جو بلند چیز کے معنی میں ہے جسے تعین وقت وغیرہ کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔[1]

تعجب وتحیر کے وقت یوں لگتا ہے جیسے انسان کی آنکھ نکل کر باہر آرہی ہو۔ لہٰذا یہ تعبیر ایسے مواقع کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ عرصۂ محشر میں انسانوں کی وحشت کا یہ عالم ہوگا کہ ان کی آنکھیں حرکت کرنا بند کردیں گی اور یوں خیرہ ہوجائیں گی گویا باہر نکلا چاہتی ہوں۔ موت کے نزدیک بھی کبھی کبھی ایسی حالت انسان پر طاری ہوجاتی ہے۔

مسلم ہے کہ مجرموں اور گنہگاروں میں یہ حالت نہایت شدید ہوگی۔ لہٰذا قرآن مجید کہتا ہے:

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا ط

"وعدۂ حق نزدیک ہورہا ہے اور اس وقت کافروں کی آنکھیں ٹھہر جائیں گی اور خیرہ ہوجائیں گی۔" (انبیاء ۹۷)

۴۳۔ یوم یتذکر الانسان ماسعی

یہ بھی بہت سبق آمیز تعبیر ہے جو قرآن مجید کی سورۂ نازعات آیہ ۳۵ میں ایک بار آئی ہے۔ فرماتا ہے: اس روز انسان کو اپنی سب تگ ودو یاد آئے گی۔" (یومئذ یتذکر الانسان ماسعی)

یہ یادآوری یا نامۂ اعمال دیکھنے کی وجہ سے ہے یا خود اعمال کے تجسم وحضور کی وجہ سے، یا اعضاء جسم کی گواہی کے سبب، یا اللہ کے

---

[1] مفردات راغب، مقائیس اللغہ، مصباح اور التحقیق فی کلمات القرآن

حضور فرشتوں کی شہادت کے باعث، یا انسانی قلب وروح سے حجابوں کے اٹھ جانے کی خاطر اور غفلت و بے خبری کے عوامل ختم ہوجانے کی وجہ سے۔ لہٰذا تمام پوشیدہ حقائق آشکار ونمایاں ہوجائیں گے اور انسان کو اپنی تمام تر تگ ودو اور سعی وکوشش یاد آجائے گی لیکن افسوس کہ خطاؤں، کوتاہیوں، تقصیروں اور غفلتوں کی تلافی کا اب کوئی راستہ نہ ہوگا۔

یہی تعبیر ایک اور انداز سے سورۂ فجر کی آیہ ۲۳ میں بھی آئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَجِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ یَوْمَىٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾

''اس دن جہنم کو (کافروں کی طرف) لے جایا جائے گا اور اس روز انسان کو اپنے اعمال یاد آئیں گے لیکن اب اس یاد کا اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

مزید فرماتا ہے:

یقول یلیتنی قدمت لحیاتی

''اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ بھیجا ہوتا۔''

ایسا تاسف وحسرت کہ جس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ البتہ اس سے درد ورنج ضرور بڑھ جائے گا۔

''لحیاتی'' کی تعبیر قابل توجہ ہے۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ زندگی تو آخرت کی زندگی ہی ہے۔ حیات دنیا کی تو اتنی بھی اہمیت نہیں کہ اسے حیات کہا جائے۔ قرآن کی تعبیر میں تو یہ لہو ولعب سے زیادہ کچھ نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ ایسی تنگ گھاٹی میں گرفتار ہوجانے سے پہلے انسان کو خبردار کیا جائے تاکہ وہ جو موقع موجود ہے اس سے استفادہ کرلے، کیونکہ اس روز توجہ اور بیداری ہوئی تو پھر بہت دیر ہوچکی ہوگی۔

۴۴۔ یوم تاتی کل نفس تجادل عن نفسها

یہ نام اس عظیم دن کا ایک اور رخ پیش کرتا ہے۔ فرماتا ہے: اس دن کو یاد کرو کہ جب ہر کوئی صرف اپنا ہی دفاع کررہا ہوگا۔ (یوم تاتی کل نفس تجادل عن نفسها) (نحل ۱۱۱)

ہاں! وہ ایسا ہی دن ہوگا کہ عذاب وسزائے الٰہی کا خوف انسان کے سارے وجود پر یوں چھایا ہوگا کہ وہ اپنے عزیز ترین عزیزوں کو بھی بھول جائے گا۔ نہ اولاد کی فکر ہوگی، نہ بیوی اور شوہر کی، نہ ماں باپ کی اور نہ قریب ترین دوستوں کی۔ ہر کوئی بس اپنی ہی فکر میں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ہر کوئی قیامت کے دن کہہ رہا ہوگا: نفسی! نفسی! (ہائے میں! ہائے میں!) ایسا روزِ قیامت کے خوف کی شدت کے باعث ہوگا۔ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے کہ جو اپنی امت کو بچانے کے لیے اٹھیں گے۔ حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

"کل احد یقول یوم القیامة نفسی! نفسی! من شدة هول یوم القیامة سوی محمد فانه یسئل فی امته۔"[1]

۴۵۔یوم یقوم الناس لرب العلمین

یہ نام جو قیامت کے نام کے لیے ایک وضاحت کی حیثیت رکھتا ہے، سورہ مطففین کی آیہ ۶ میں آیا ہے۔ فرماتا ہے: یہ وہ دن ہوگا کہ جب سب لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے۔" (یوم یقوم الناس لرب العلمین)

یہ کھڑا ہونا اس دن کے مسائل کے قطعی ہونے، ایک عظیم عدالت میں پیش ہونے اور سب اعمال کی چھان پھٹک ہونے کی علامت ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے یہ تعبیر سورہ مطففین میں کم فروشوں کو بیدار کرنے کے لیے بیان کی ہے اور کہتا ہے: "کیا انہیں گمان نہیں کہ وہ روزِ عظیم کو اٹھائے جائیں گے؟" پھر اضافہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ دن کہ جب سب لوگ رب العالمین کے حضور قیام کریں گے۔" (یوم یقوم الناس لرب العلمین)۔

یعنی اگر انہیں ایسے دن کے "حضور" اور "قیام" کا یقین ہوتا تو ایسا غلط راستہ ہرگز اختیار نہ کرتے۔ لیکن افسوس کہ حب دنیا، غفلت، غرور اور طول آرزو نے ان کی فکر اور قلب وجان پر ایسا منحوس اور تاریک سایہ ڈال رکھا ہے کہ وہ حقائق کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

روایات میں ہے کہ رسول اللہؐ کے ایک صحابی سورہ مطففین کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے تو اتنا روئے کہ باقی سورۃ کی تلاوت نہ کر سکے۔[2]

۴۶۔یوم یقوم الاشهاد

۴۷۔یوم یقوم الروح والملئکة صفا

مندرجہ بالا اوصاف اس عظیم دن کے ایک اور پہلو کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کے اخلاقی آثار انسان پر بہت گہرے ہوتے ہیں اور اس کا خصوصی پیغام جان ودل میں جاگزیں ہوجاتا ہے۔

پہلی توصیف میں کہا گیا ہے: وہ دن کہ جب گواہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔" (ویوم یقوم الاشهاد) (مومن ۵۱)

---

[1] تفسیر قرطبی، ج۶ ص۳۸۰۹

[2] تفسیر فخر الدین رازی، ج۳۱ ص۹۰ وتفسیر قرطبی، ج۱۰ ص۷۰۴۶

"اشهاد" "شاهد" یا "شهید" کی جمع ہے (جیسے "اصحاب" "صاحب" اور "اشراف" "شریف" کی جمع ہے)۔ یہاں روزِ قیامت کے گواہوں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض مفسرین نے اسے صرف اعمال کی نگرانی کرنے والے فرشتوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعض نے اسے صرف انبیاء کی طرف اشارہ قرار دیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ "اشهاد" کا مفہوم وسیع ہے جس میں فرشتگانِ الٰہی بھی شامل ہیں، انبیاء بھی اور مومنین بھی۔

بعض نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ انسانی جسم کے اعضاء بھی اس میں شامل ہیں جو اس کے اعمال کی گواہی دیں گے لیکن "یقوم" (اٹھ کھڑے ہوں گے) کی تعبیر کی طرف توجہ کی جائے تو یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے۔

ایسے مواقع پر "قیام" کی تعبیر ایک خاص کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو عدالتوں میں ہوتی ہے کہ شہادت دیتے وقت گواہ کھڑے ہو جاتے ہیں تا کہ گواہی دینے میں اپنے سنجیدہ ہونے، عدالت کی قانونی حیثیت کو قبول کرنے اور اس کے احترام کا اظہار کریں۔

بہرحال اس روز ایک گواہ نہیں، بلکہ بہت سے گواہ اس عظیم عدالت میں شہادت دیں گے۔ ایسی گواہی جو مومنین کے لیے افتخار و آبرو کا سبب ہوگی اور مجرموں کے لیے ذلت و رسوائی کا باعث ہوگی۔ ایسی گواہی جو ہر چیز پر محیط ہوگی اور کوئی چیز اس عدالت کی نظر شہود سے مخفی نہیں رہے گی۔ ایسی گواہی جس کا مجرم کسی طور انکار نہ کر سکیں گے۔ اس کے ہمراہ ایسے قرائن ہوں گے کہ قبول و تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہوگا۔

اس سے سمجھا جا سکتا ہے قیامت کے لیے اللہ کی طرف سے اس توصیف کا پیغام کس قدر وسیع اور موثر ہے۔

دوسری آیت میں روزِ قیامت کو ایسا دن قرار دیا گیا ہے: "جس دن روح اور فرشتے ایک صف میں قیام کریں گے۔" (یوم یقوم الروح والملائکة صفا) (نباء ۳۸)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ لفظ "صف" چونکہ مصدری معنی رکھتا ہے اس کا مفرد اور جمع ایک ہی ہے، لہٰذا ممکن ہے یہاں ملائکہ کی مختلف صفوف کی طرف اشارہ ہو یا کم از کم دو صفوں کی طرف اشارہ ہو جن میں سے ایک میں "روح" ہوگا اور دوسرے میں فرشتے۔

ایک سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ "روح" سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں بہت سے اقوال ہیں جو کل آٹھ یا اس سے زیادہ ہیں۔ البتہ ان میں سے چند ایک مشہور تر ہیں:

۱۔ روح ملائکہ مقرب الٰہی میں سے ایک ہے۔ ایسا فرشتہ جو سب فرشتوں سے بالاتر ہے یہاں تک کہ جبریل سے بھی برتر اور وہی انبیاء اور ائمہ معصومین کے ہمراہ تھا۔

۲۔ مراد جبریل امین ہیں جو وحی خدا کے لانے والے ہیں۔

۳۔ مراد انسانوں کی روحیں ہیں، البتہ جسموں سے ملحق ہونے سے پہلے۔

۴۔ مراد ایک باعظمت مخلوق ہے جو نہ انسان ہے اور نہ فرشتہ۔

۵۔ مراد قرآن مجید ہے اور اس کے قیام کا معنی عرصۂ محشر میں اس کے آثار کا ظہور ہے۔

البتہ ان میں سے ہر تفسیر کے لیے قرآن کی بعض آیات سے استدلال کیا گیا ہے۔

اگرچہ قرآن کی مختلف آیات میں لفظ ''روح'' متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے، تاہم یہاں پر جو معنی سب سے مناسب معلوم ہوتا ہے وہ پہلا ہے۔ معصومینؑ کی بعض روایات میں بھی یہ تفسیر صراحت سے بیان ہوئی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

''هو ملك اعظم من جبرآئيل و ميكائيل''

''وہ جبریل اور میکائیل سے بھی بڑا فرشتہ ہے۔''[1]

ابن عباس سے بھی منقول ہے:

''اللہ نے عرش کے بعد روح سے بزرگ تر کوئی مخلوق پیدا نہیں کی۔ قیامت کے دن وہ تنہا ایک صف میں ہوگا اور فرشتے سب ایک صف میں ہوں گے۔''[2]

۴۸۔یوم لا ینفع مال و لا بنون

۴۹۔یوم لا بیع فیه ولا خلال

ان دو آیات سے بھی اس عظیم دن کے حالات کے بارے میں دو قریب الافق پیغام حاصل ہوتے ہیں۔ پہلی آیت میں فرماتا ہے: وہ دن جب مال و اولاد کوئی فائدہ نہ دیں گے۔ (یوم لا ینفع مال ولا بنون) مگر وہ جو بارگاہِ الٰہی میں قلب سلیم لے کر آئے (الا من اتی اللہ بقلب سلیم) (شعرا ۸۸۔۸۹)

دوسری توصیف میں فرماتا ہے: وہ ایسا دن ہے جس میں نہ خرید و فروخت ہے اور نہ ہی دوستی کے رشتے (یوم لا بیع فیه ولا خلال) (ابراہیم ۳۱)

دراصل دنیا کا اہم سرمایہ تین چیزیں ہیں: مال و ثروت، آبرومند اولاد اور باوفا دوست، لیکن محشر کی مشکلات اور ہولناک مصیبتیں ایسی نہیں جنہیں مال و ثروت، اولاد اور دوستوں کی مدد سے برطرف کیا جا سکے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ دنیا کا سب مال، ساری اولاد اور سب دوست بھی انسان کو وہاں میسر آ جائیں، پھر بھی وہ وہاں مشکلات کی کوئی گرہ نہ کھول سکیں گے کیونکہ وہاں کا معیار کوئی اور چیز ہے۔ محشر کا حلال مشکلات ایمان، عمل صالح اور قلب سلیم ہے، ایسا دل جو ہر قسم کے شرک و ریا اور غیر خدا سے پاک ہو۔

اس دنیا میں بیشتر مشکلات مال و دولت کے ذریعے، کچھ دے دلا کر، نقصان پورا کر کے، رشوت دے کر اور ایسے ہی دیگر جائز اور

---

[1] مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۴۷۲

[2] تفسیر قرطبی، ج ۱۰ ص ۶۹۷۷

ناجائز طریقوں سے حل ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح بہت سی مشکلات افرادی قوت خصوصاً محبت کرنے والی اولاد اور مخلص دوستوں کے ذریعے حل ہوسکتی ہیں۔ بہرحال اس دنیا کی بیشتر مشکلات ان وسائل سے حل ہوجاتی ہیں جب کہ وہاں ان چیزوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔

البتہ مال واولاد سے یہاں مراد ایسا مال اور ایسی اولاد نہیں جس سے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کام لیا گیا ہو یا ایسے دوست بھی مراد نہیں جو خدا کے حضور شفاعت کرسکتے ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر یہ سرمایہ وہاں منتقل ہوجائے تو کسی کام کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زخرف ۶۷ میں ہے:

اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۷﴾

''دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقین۔''

۵۰۔یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا

۵۱۔یوم لا تملك نفس لنفس شیئا

۵۲۔یوما لا یجزی والد عن ولده

اس دنیا میں سزا سے بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کوئی کسی دوسرے کی ذمہ داری قبول کرلے اور اپنے آپ کو اس کی جگہ پیش کرے۔ اس کے مالی جرمانے کی ادائیگی قبول کرلے اور اس کے جرم کی سزا اپنے اوپر جھیل لے۔

مندرجہ بالا آیات ہیں جو قیامت کے توصیفی نام بیان کرتی ہیں، قرآن اعلان کرتا ہے کہ اس طرح کے کام اس عظیم الٰہی عدالت میں ہرگز ممکن نہیں۔ ہر کوئی اپنے کام کا خود ذمہ دار ہے۔ خود ہی اپنے اعمال کی سزا بھگتے گا اور اپنے جرائم کا جرمانہ خود ادا کرے گا۔

پہلی آیت جو قرآن مجید میں دو مرتبہ آئی ہے، میں فرمایا گیا ہے: اس دن سے ڈرو جس دن کوئی بھی دوسرے کے حصے کی جزا نہ پائے گا۔ (وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا) (بقرہ ۴۸ و ۱۲۳)

یہی مفہوم دوسری آیت میں کچھ تفاوت کے ساتھ آیا ہے۔ فرماتا ہے: وہ ایسا دن ہے جب کوئی بھی دوسرے کے انجام کار کا مالک نہ ہوگا: (یَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡئًا ؕ) (انفطار ۱۹)

تیسری آیت میں ایک خاص موقعے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فرماتا ہے: اس روز سے ڈرو جب نہ باپ بیٹے کے اعمال کی جزا قبول کرے گا اور نہ ہی بیٹا باپ کی جزا میں سے کچھ قبول کرے گا۔ (وَاخۡشَوۡا یَوۡمًا لَّا یَجۡزِیۡ وَالِدٌ عَنۡ وَّلَدِهٖ ۫ وَلَا مَوۡلُوۡدٌ هُوَ جَازٍ عَنۡ وَّالِدِهٖ شَیۡئًا ؕ) (لقمان ۳۳)

والد کا اولاد سے ربط جذب ومحبت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اولاد کا باپ سے تعلق احترام ومحبت کی اساس پر۔ درحقیقت انسان کے

جذب واحساس کے رشتوں میں یہ دور ابطے نزدیک ترین اور قوی ترین ہیں لیکن قیامت کا خوف وحشت اس قدر زیادہ اور دہلا دینے والا ہے کہ یہ سارے تعلق ٹوٹ کے رہ جائیں گے اور ختم ہو جائیں گے اس طرح سے کہ ہر کوئی بس اپنی فکر میں ہوگا۔

چند مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں تصریح کی ہے کہ "لا تجزی" "لا تغنی" کے معنی میں آیا ہے جس کے معنی ہیں "بے نیاز نہیں کرے گا۔"[1]

مفردات میں راغب کا کہنا ہے کہ جزا در اصل بے نیازی اور کنایت کے معنی میں ہے۔ پاداش اور سزا کو اس لیے جزا کہا جاتا ہے کہ وہ انجام شدہ عمل کی تلافی کے لیے کفایت کرتی ہے۔ یہی معنی مقائیس اللغہ میں بھی آئے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلی دو آیتوں میں مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو قومی اور نسلی تعصب میں دنیا میں ضرب المثل ہیں۔ قرآن انہیں خبردار کرتا ہے کہ اس یوم عظیم میں تم بھی اپنے سوا ہر چیز کو فراموش کر دو گے جب کہ ایک دوسرے کے ساتھ تمہارا ربط اس قدر زیادہ ہے۔

ان آیات کا پیغام بالکل واضح ہے کیونکہ یہ آیات اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے ثابت کرتی ہیں کہ شدائد قیامت اور اس دن کے سخت حوادث کی اس دنیا میں کوئی مثال نہیں۔ اس دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو جذباتی تعلقات کی بناء پر اپنے آپ کو دوسرے پر فدا کر دیتے ہیں، لیکن قیامت میں کسی بھی مورد میں کوئی انسان دوسرے کے لیے ایسا نہیں کرے گا۔

۵۳۔ یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ

یہ نام جو قرآن مجید میں ایک بار آیا ہے اس عظیم دن کے ایک اور پہلو کو بیان کرتا ہے اور اس میں میدانِ محشر کا ایک اہم پیغام مضمر ہے۔ فرماتا ہے: "نفاق پیدا کرنے والوں کے لیے عذاب عظیم اس دن ہوگا جب کچھ چہرے سفید اور کچھ چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔" (یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ) (ال عمران ۱۰۶)

نورانی چہرے ان کے ہوں گے نورِ ایمان جن کے درونِ جان سے قیامت کے یوم ظہور ہونے کی وجہ سے چہروں پر نمایاں ہو جائے گا۔ اسی سبب سے وہ اللہ کی رحمت میں غرق ہوں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے (وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ) (آل عمران ۱۰۷)

لیکن تاریک دل بے نور، بے ایمان کافر اور سیاہ دل مجرم ہوں گے جن کے اندر کی ظلمت باہر آ جائے گی۔ یہ روسیاہ عذاب الٰہی میں غرق ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا:

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۱۰۶

"اپنے کفر کی وجہ سے اب تم عذاب الٰہی کا مزہ چکھو۔" (آل عمران ۱۰۶)

---

[1] مجمع البیان، ج ۱ ص ۱۰۳۔ المیزان ج ۱۶ ص ۱۲۵ اور روح البیان، ج ۱ ص ۱۲۷

مذکورہ بالا تعبیر دوسری صورتوں میں بھی قرآن مجید کی آیات میں آئی ہے۔ایک جگہ فرماتا ہے:

كَأَنَّمَآ أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ ٱلَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ

''ان (پے در پے گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں) کے چہروں کو گویا شب سیاہ کے تاریک ٹکڑوں نے ڈھانپ دیا ہے۔'' (یونس ۲۷)

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾

''اس روز چہرے کشادہ و نورانی اور خنداں و مسرور ہوں گے۔'' (عبس ۳۸و۳۹)

نیز

وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾

''اور (کچھ) چہرے اس روز غبار آلود ہوں گے اور دھوئیں اور تاریکی نے انہیں ڈھانپ دیا ہوگا۔ (عبس ۴۰و۴۱)

کس موقع پر کچھ چہرے نورانی اور کچھ تاریک ہو جائیں گے؟ بعض کہتے ہیں کہ جب صفیں ایک دوسرے سے جدا ہوں گی۔ بعض کہتے ہیں جب نامۂ اعمال کا مشاہدہ ہوگا اور بعض کہتے ہیں جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے یا جب عدلِ الٰہی کی میزان کے سامنے پیش ہوں گے۔

لیکن اس لحاظ سے کہ وہ لوگوں کے حقائق اور اعمال کے ظہور کا دن ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایسا قبور سے نکلتے ہی ہو جائے گا اور پھر باقی رہے گا۔

کن افراد کے چہرے نورانی اور کن کے سیاہ ہوں گے، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں۔کبھی تو اس کو معین افراد کے لیے محدود قرار دیا گیا ہے۔لیکن ظاہر یہ ہے کہ تمام اہل ایمان اور نیک عمل افراد سفید رو ہوں گے اور تمام کافر و مجرم سیاہ رو افراد کی صف میں ہوں گے۔

آخری بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے ان دو تعبیروں کو مجازی مفہوم پر محمول کرنا چاہا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ سفیدی سرور و مسرت کی طرف اور سیاہی غم واندوہ کی طرف اشارہ ہے۔[1]

لیکن اس خلاف ظاہر کے ارتکاب کے لیے کوئی موجب نہیں ہے، بلکہ آیت کو اسی حقیقت معنی پر محمول کیا جانا چاہیے۔قرآن تو یہ بھی کہتا ہے:

---

[1] تفسیر مراغی، ج ۴ ص ۲۵

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ

''ان کا نور عرصہ محشر میں ان کے سامنے اور دائیں طرف چلے گا۔'' (حدید ۱۲)

جب ایسا ہے تو پھر اس میں کون سا تعجب ہے کہ کچھ چہرے سفید اور نورانی ہوں اور کچھ صورتیں سیاہ و تاریک ہوں؟

واقعاً وہ دن کس قدر وحشت ناک ہے کہ جب جو کچھ انسان کے قلب و روح میں ہے، اس کے چہرے پر نمایاں ہو جائے گا، سیاہ دلوں کے لیے بڑا رسوائی کا دن ہوگا اور روشن دلوں کے لیے بڑے افتخار کا دن ہوگا۔ یہی امر سبب بنے گا کہ عرصۂ محشر میں آغاز ہی سے مومنین کا احترام و اکرام ہوگا اور کافرین و مجرمین کے حصے میں لعن و نفرین آئے گی۔

۵۴۔یوما کان شرہ مستطیرا

یہ تعبیر قرآن میں ایک ہی دفعہ آئی ہے۔ اس میں نیکوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا عذاب وسیع اور بہت زیادہ ہوگا۔'' (ویخافون یوما کان شرہ مستطیرا) (دھر ۷)

''مستطیر'' ''طیران'' کے مادہ سے ہے جو ''پرواز'' کے معنی میں ہے۔ یہاں اس کے معنی ہیں منتشر اور وسیع۔ لہٰذا بعض نے اس کے معنی ''غیر معمولی وسعت یافتہ'' کیے ہیں۔ صبح کی سفیدی جب سارے افق پر چھا جاتی ہے اس کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے: فجر مستطیر۔

''شر'' سے یہاں مراد روزِ قیامت کا عذاب یا اس دن کا خوف و وحشت ہے اور اس کی وسعت اس قدر ہوگی کہ تمام زمین و آسمان پر محیط ہوگا، یہاں تک کہ فرشتے بھی وحشت میں ہوں گے۔ نہ فقط وہ بدعمل مجرم بلکہ نیک پاک افراد بھی، جو اپنے انجام کار سے بے خبر ہوں گے، اس وسیع وحشت و اضطراب میں حصہ دار ہوں گے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں ایسے دن سے خوف کو ابرار اور نیک لوگوں کی صفات پسندیدہ اور مثبت اخلاقی نکات میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ ایسا خوف ہر طرح کے گناہ سے پرہیز اور پروردگار کی اطاعت مطلق کا سبب بنتا ہے۔

۵۵۔یوم یفر المرء من اخیہ

یہ تعبیر بھی قرآن مجید میں صرف ایک بار آئی ہے۔ یہ منظر قیامت کی ایک اور واضح تصویر ہے۔ فرماتا ہے: اس دن بھائی اپنے بھائی سے بھاگے گا، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے بھی اور اپنے بیوی بچوں سے بھی (کیونکہ) اس روز ہر ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہوگا کہ بس اسی میں کھو کے رہ جائے گا۔ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾ (عبس ۳۴ تا ۳۷)

ظاہر ہے کہ ہر انسان کے نزدیک ترین اور محبوب ترین افراد اس کے بھائی، ماں باپ اور بیوی بچے ہی ہوتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے

کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ اس دن ان سے غافل ہو جائے گا بلکہ کہتا ہے ان سے گریز کرے گا۔ ماں، جس سے بہت محبت کرتا تھا، باپ جس کا بہت احترام کرتا تھا، بیوی جس سے شدید محبت کرتا تھا اور اولاد جو اس کے دل کا قرار اور آنکھوں کا نور تھی۔ وہاں سب سے گریزاں ہوگا۔

یہ وہ لوگ ہیں اس دنیا کی مشکلات میں ہمیشہ جن کی طرف رجوع کرتا تھا اور مصیبتوں میں یہ لوگ اس کی تسلی خاطر کا سامان تھے۔ لیکن وہاں کیا عالم ہوگا کہ ان سے گریزاں ہوگا۔

ہاں! قیامت کی چنگھاڑ جسے قرآن نے "صاخة" کہا ہے اور جس کا ذکر قبل ازیں آچکا ہے، اس قدر عظیم ہوگی کہ تمام رشتوں کو منقطع کر کے رکھ دے گی۔ اس کی صدائے گوش خراش اور بہرا کر دینے والی آواز، انسان کو اپنے سوا ہر کسی سے بیگانہ کر دے گی۔

انسان گریزاں کیوں ہوگا؟

کیا اپنے نزدیک ترین افراد کے سامنے رسوائی کے خوف سے؟

یا شاید اس لیے کہ ممکن ہے ان کے ایسے گناہ ہوں جن کی سزاؤں سے یہ ڈرتا ہو۔

یا شاید ان کے کچھ حقوق اس سے ضائع ہو گئے ہوں اور اس میدان میں اس تہی دامن سے وہ ان کا مطالبہ کر بیٹھیں؟

یا نہیں، بلکہ محشر کا خوف و وحشت اس قدر زیادہ اور سنگین ہوگا کہ انسان کو اس کے تمام محبوب افراد سے جدا کر دے گا اور اسے اپنے آپ میں مگن کر دے گا۔ وہ ان سے گریزاں ہوگا تا کہ فقط اپنے بارے میں سوچ سکے۔ ان سے بھاگے گا تا کہ اپنی نجات کا راستہ تلاش کر سکے اور ان سے فرار کرے گا تا کہ اپنے انجام کو پا سکے؟

ان چاروں میں سے کوئی مسئلہ بھی ہو ہر ایک تنہا ہی بھاگنے اور گریز کرنے کے لیے کافی ہے جب کہ یہ تو سب امور وہاں پر جمع ہوں گے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ کے خاندان کے ایک فرد نے آپؐ سے پوچھا:

''کیا قیامت میں انسان کو اپنا عزیز دوست یاد آئے گا؟''

آپؐ نے جواب میں فرمایا:

تین مقامات ایسے ہیں جہاں کوئی بھی کسی کو یاد نہیں کرے گا:

اول: میزانِ عمل کے پاس، تا کہ دیکھے اس کا میزان عمل بھاری ہے یا ہلکا؟

دوم: صراط پر، تا کہ دیکھے کہ وہاں سے گزر سکتا ہے یا نہیں؟

سوم: جب انسان کو نامہ اعمال تھما دیا جائے گا تا کہ دیکھے کہ اسے یہ دائیں ہاتھ میں تھمایا جاتا ہے یا بائیں میں۔

ان تین مواقع پر کوئی کسی دوسرے کی فکر میں نہ ہوگا۔ نہ عزیز دوست، نہ یار مہربان، نہ قریبی، نہ مخلص چاہنے والے، نہ اولاد، نہ ماں باپ اور یہی فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے:

لکل امری منهم یومئذ شان یغنیه

''اس روز ان میں سے ہر کوئی اپنے آپ میں کھویا ہوگا۔''[1]

۵۶ یوما یجعل الولدان شیبا

یہ توصیف جو قرآن مجید میں ایک مرتبہ آئی ہے، اس یوم عظیم کے وحشت ناک حوادث کی ایک اور صورت پیش کرتی ہے۔ کافروں اور مشرکوں کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے: جب کافر ہو جاؤ (اور اپنے کفر پر باقی رہو) تو عذاب الٰہی سے اپنے آپ کو اس دن کیسے بچا سکو گے جس روز بچے بوڑھے ہو جائیں گے فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ﴿١٧﴾ (مزمل ۱۷)[2] و[3]

یہ ایک ایسی گویا ترین اور رساترین تعبیر ہے جو اس دن کے ہولناک حوادث سے پردہ اٹھاتی ہے۔ یہ حوادث جیسے ہی عالم طبیعت پر اثر انداز ہوں گے، پہاڑوں اور صحراؤں پر تاکید کریں گے اور انہیں زیروزبر کر کے رکھ دیں گے۔ اسیطرح اس انسان خاکی پر بھی ایسا اضطراب اور وحشت طاری کر دیں گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے۔

بعض مفسرین نے اس تعبیر کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کیا ہے یعنی عرصۂ محشر میں واقعاً بچوں پر بھی پیری کے آثار ظاہر ہوں گے جب کہ بچے کا بڑھاپے سے فاصلہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ان مفسرین نے اس تفسیر کے لیے شواہد بھی نقل کیے ہیں، مثلاً اس دنیا میں بھی ہمیں ایسے افراد مل جاتے ہیں جن کے سیاہ بال کسی سنگین حادثے کی وجہ سے ناگہاں چند دنوں میں بلکہ بعض اوقات چند گھنٹوں میں سفید ہو گئے ہوں۔ اگر اس دنیا کے حوادث انسان پر ایسے اثرات ڈال سکتے ہیں تو حوادثِ محشر تو ان سے کہیں زیادہ شدید اور سخت تر ہوں گے۔ لہٰذا یقینی طور پر ایسا اثر کر سکتے ہیں۔

لیکن بعض نے آیت کو کنائی معنی پر محمول کیا ہے کیونکہ یہ عربی زبان میں اور دوسری زبانوں میں بھی رائج ایک کنایہ ہے کہ کسی حادثے کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے کہتے ہیں: ''اس واقعے نے تو مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔''

آیت کی دونوں تفسیریں ممکن ہیں۔ البتہ یہ جو بعض نے احتمال ذکر کیا ہے کہ بچے اس لیے بوڑھے ہو جائیں گے کہ وہ دن بڑا طولانی

---

[1] تفسیر برہان ج ۴ ص ۴۲۹ حدیث ۱

[2] چند مفسرین کے نزدیک مذکورہ بالا آیت میں ''یوما'' ''تتقون'' کے لیے ''ظرف'' ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اسی فعل کے لیے ''مفعول بہ'' ہو اور اس صورت میں کلمہ ''عذاب'' کو تقدیر میں فرض کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے تقدیر میں آیت یوں ہوگی:

فکیف تتقون ان کفر تم عذاب یوم یجعل الولدان شیبا

[3] ''شیب'' ''أشیب'' کی جمع ہے جس کا معنی ہے بوڑھا۔ اسے مادہ ''شیب'' (بروزن ''عیب'') سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں بال سفید ہونا۔

ہوگا، بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ یہ آیت دیگر بہت سی آیات جو قیامت سے مربوط ہیں، کی طرح اس دن کے حوادث کی سختی کو بیان کر رہی ہے۔ نیز اس سے پہلے آنے والی آیات بھی اس پر شاہد ہیں جن میں پہاڑوں کے بکھر جانے کا ذکر ہے۔

۵۷۔یوم لاینطقون

یہ توصیف بھی صرف ایک بار سورہ مرسلات میں آئی ہے۔فرماتا ہے: یہ وہ دن ہے جس میں بات نہ کریں گے۔'' ..... (مرسلات ۳۴ تا ۳۶)

کیا قیامت کا عظیم خوف اور وحشت ان کی زبانوں سے بات کرنے کی طاقت چھین لے گا جیسے دنیا میں بھی کبھی انسان کی زبان کسی بڑے حادثے کے سبب بند ہو جاتی ہے؟

یا اصولاً انسان کے پاس کہنے کو کوئی بات ہی نہ ہوگی، نہ کوئی دلیل اور نہ کوئی عذر؟

یا پھر مندرجہ ذیل آیت کے پیش نظر زبانیں حکم الٰہی سے بیکار ہو جائیں گی اور اعضاء بدن انسان کے اعمال کے گواہ ہو جائیں گے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾

''آج ان کے مونہوں پر ہم مہر لگا دیں گے، ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے انجام دئے ہوئے اعمال کی گواہی دیں گے۔'' (یس ۶۵)

ممکن ہے تینوں تفاسیر مفہوم آیہ میں جمع ہوں، اگرچہ تیسری تفسیر زیادہ روشن معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال یہ امر اس سے مانع نہیں کہ قیامت کے بعض مقامات پر انسان حکم خدا سے بات کرے کیونکہ قیامت کے مختلف مراحل ہیں۔ مجموعی طور پر قرآن کی آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ بعض مقامات پر مجرم گونگے اور منہ بند ہوں گے اور حکم الٰہی سے بعض مقامات پر بات کریں گے۔

۵۸۔یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون

یہ بھی اپنی نوعیت کی ایک ہی تعبیر ہے جو اس یوم عظیم کے وحشت ناک چہرے کی ایک اور تصویر پیش کرتی ہے۔فرماتا ہے: اس دن کا سوچو جب پنڈلیاں وحشت کے باعث برہنہ ہو جائیں گی اور (مجرموں کو) سجدوں کو کہا جائے گا لیکن ان میں اس کی طاقت ہی نہ ہوگی۔ ''يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿٤٢﴾ (قلم ۴۲)

''یکشف عن ساق'' (پنڈلیاں برہنہ ہو جائیں گی)، یہ تعبیر بہت سے مفسرین کے نظریے کے مطابق سختی کار اور شدت خوف و وحشت کے لیے کنایہ ہے کیونکہ گذشتہ زمانے میں معمول تھا کہ کوئی مشکل کام پیش آتا تو آستینیں الٹ لیتے تھے اور دامن لباس کو کمر سے باندھ لیتے تھے تاکہ مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے بہتر طور پر تیار ہو سکیں۔ طبعی سی بات ہے کہ ایسی صورت میں پنڈلیاں برہنہ ہو جاتیں۔

بعض مفسرین نے آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ "ساق" کے معنی اصل اور اساس ہیں (جیسے "ساقة الشجر") اس بنا پر جملہ "یکشف من ساق" اس دن اشیاء کے حقائق کے آشکار و ظاہر ہونے کی طرف اشارہ ہے۔[1]

بہرحال اس ہولناک دن عظمت پروردگار کے حضور سجود کی دعوت دی جائے گی۔ مومنین سجدہ زیر ہو جائیں گے اور شاید یہ سجدہ ہی ان کے قلب و روح کا قرار ہے، لیکن جو کفر و گناہ سے آلودہ ہوں گے ان میں سجدے کی طاقت ہی نہ ہوگی۔

امام علی بن موسیٰ رضاؑ کی ایک حدیث میں ہے:

"اس دن نورِ الٰہی سے پردہ ہٹ جائے گا اور سب مومنین سجدہ ریز ہو جائیں گے، لیکن منافقوں کی پشت یوں خشک ہو چکی ہوگی کہ ان میں کمر خم کرنے اور سجدہ کرنے کی طاقت نہ ہوگی۔"[2]

بعض کا کہنا ہے کہ "یکشف عن ساق" سے مراد نورِ الٰہی کا ظاہر ہونا ہی ہے۔

۵۹۔ یوم لا ینفع الظلمین معذرتهم

یہ توصیف بھی اس دن کے دردناک حوادث میں سے ایک کو بیان کرتی ہے۔ فرماتا ہے: وہ دن کہ جب ظالموں کی عذرخواہی بے سود ہوگی، ان کے لیے (اللہ کی) لعنت ہے اور ان کے لیے برا ٹھکانا ہے۔ "یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ (مومن ۵۲)

معمولاً اس دنیا میں سزا سے بچنے اور نجات کا ایک طریقہ معذرت خواہی اور معافی ہے لیکن روزِ قیامت کا مزاج ایسا ہے کہ اس دن ظالموں کا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ اصولاً وہ محصولِ بد جزائے عمل کے حصول کا مقام ہے نہ کہ گذشتہ کی تلافی کا جو خود ایک طرح کا عمل ہے۔

گذشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اس روز انہیں عذرخواہی کی اجازت نہیں دی جائے گی اور بعض میں یہ بھی ہے کہ اگر انہوں نے عذرخواہی کی بھی تو وہ بے سود ہوگی۔ لہٰذا ان کے لیے اللہ کی لعنت اور برا ٹھکانا ہی ہے۔

اس نام کا پیغام، جو سب کے لیے ہے، یہ ہے کہ آج ممکن ہے کہ خدا کے حضور توبہ کے ذریعے اپنے گناہوں کے داغ دھوئے جا سکیں اور مظلوموں کو ان کا حق دے کر آثارِ ظلم کو مٹایا جا سکے۔ لہٰذا اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے وگرنہ اس مقام عظیم اور عدالت عالی میں نہ عذرخواہی کا کوئی فائدہ ہوگا، نہ ندامت و پشیمانی کا اور نہ گریہ و زاری کا۔ بقول شاعر:

---

[1] روح المعانی، ج ۲۹ ص ۳۵ و قرطبی، ج ۱۰ ص ۶۷۲۸

[2] نور الثقلین، ج ۵ ص ۳۹۵ حدیث ۴۹

کنونت کہ چشم است اشکی ببار
زبان دردہان است عذری بیار
کنون بایدت عذر تقصیر گفت
نہ چوں نفس ناطق زگفتن بخفت
کنون وقت تخم است تا روی
گر امید داری کہ خرمن بری
کنون باید ای خفتہ بیدار بود
چومرگ، اندر آیدز خوابت، چہ سود

''اس وقت تیرے پاس آنکھ ہے آنسو بہالے، تیرے دہن میں زبان ہے عذرخواہی کرلے۔
ابھی اپنی تقصیر پر عذر کرلے اور نفس ناطق کی طرح چپ نہ رہ
اس وقت بیج بونے کا وقت ہے، بولے، اگر تجھے کل فصل کاٹنے کی امید ہے۔
اے سونے والے! ابھی بیدار ہوجا۔ موت سوئے پڑے آ گئی تو کیا فائدہ۔[1]

۶۰۔یوم یعض الظالم علی یدیه

یہ بھی ان ہلا دینے والی تعبیرات میں سے ہے جو ایک بار قرآن مجید کی آیات میں آئی ہیں۔ فرماتا ہے: اس دن کے بارے میں سوچو جب ظالم اپنے دونوں ہاتھوں کو (شدت حسرت سے) چبائے گا، یہ کہتے ہوئے کہ اے کاش! میں نے اللہ کے رسولؐ کی راہ اپنائی ہوتی وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾

پھر مزید کہے گا: افسوس ہے مجھ پر، اے کاش! میں نے فلاں (گمراہ شخص) کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ (فرقان ۲۷و۲۸)

کبھی انسان اپنے گذشتہ کاموں پر شدید ندامت و پشیمانی اور افسوس کے عالم میں اپنی انگلیوں کو کاٹتا ہے اور کبھی اپنے ہاتھوں کی پشت کو چباتا ہے۔ ندامت وحسرت غیر معمولی ہو تو پھر دونوں ہاتھوں کو یکے بعد دیگرے چباتا ہے۔ یہ افسوس، ندامت اور پشیمانی کے لیے انتہائی رسا تعبیر ہے۔

ظالم اس یوم عظیم میں پیہم اپنے ہاتھوں کی پشت کو کاٹیں گے اور ہم جانتے ہیں کہ اس دن کے ناموں میں سے ایک "یوم الحسرۃ"

---

[1] بوستان سعدی، باب ۹۔ آخری شعر مشہور حدیث "الناس نیام اذا ماتوا انتبہوا" کی طرف اشارہ ہے۔

ہے۔(مریم ۳۹)

لیکن کیا فائدہ؟ کیا ہاتھوں کو دانتوں سے زخمی کرنے سے کوئی مشکل حل ہو جائے گی؟ الٹا یہ تو اپنے آپ سے ایک طرح سے انتقام لینا ہے۔ یا کیا اس سے کوئی چین ملے گا؟ بلکہ اس کے برعکس اس سے تو ظالموں کی تکلیف میں اضافہ ہی ہوگا اور ان کی رسوائی اس سے اور بڑھے گی۔

تفسیر ''المیزان'' میں ہے کہ اس آیت میں لفظ ''ظالم'' ہر ظالم کے لیے ہے جیسے ''رسول'' بھی ہر پیغمبر کے لیے ہے، ہر چند توجہ اس امت کے ظالموں کی طرف ہے اور رسول اللہ بھی محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔

البتہ مختلف تفاسیر میں اس آیت کی شان نزول بھی ذکر ہوئی ہے جس کی شرح طولانی ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ شانہائے نزول مفہوم آیات کو محدود نہیں کرتیں۔[1]

۶۱۔یوم یعرض الذین کفروا علی النار

۶۲۔یوم تقلب وجوھھم فی النار

یہاں بھی اس عظیم دن کی دو مشابہ اور ایک دوسری سے نزدیک توصیفات نظر آتی ہے۔ پہلی توصیف سورہ احقاف میں دو بار آئی ہے، آیہ ۲۰ اور ۳۴ میں فرماتا ہے: اس دن کا سوچو جب کافروں کو آتش دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔(یوم یعرض الذین کفروا علی النار)۔

پہلی آیت میں اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ''تم نے دنیا کے لذائذ وطیبات سے اپنا حصہ پالیا (اور ان کے مزے لوٹ لیے) لیکن آج ذلت ناک عذاب پاؤ گے، اس غرور کی وجہ سے جو تم زمین پر ناحق کرتے تھے، ان گناہوں کی وجہ سے جو تم نے انجام دیے ہیں۔

دوسری آیت میں فرماتا ہے: ''جب انہیں آتش دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا کیا یہ حق نہیں ہے۔'' (تم تو قیامت کو ہمیشہ اگلوں کی کہانیاں سمجھا کرتے تھے۔ کیا آج بھی تمہارا وہی خیال ہے؟) لیکن وہ کہیں گے: ''ہاں! ہمیں ہمارے پروردگار کی قسم یہ حق ہے۔''

درحقیقت دوسری آیت میں ان اعتقادی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا کہ جو دوزخیوں کی بربادی کا سبب ہیں اور پہلی آیت میں عملی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے یعنی ناجائز لذتیں اور نعمات الٰہی سے حرام استفادہ۔

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں آیا ہے کہ قیامت کے دن دوزخ کو مجرموں کی طرف لے جائیں گے:

وَجِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ (فجر ۲۳)

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ ج ۱۵ ص ۶۸ (فارسی) کی طرف رجوع کریں۔

لیکن زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: کافروں کو آتش دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ گویا ان دونوں کے درمیان کوئی قوت جاذبہ کارفرما ہے۔ ایک طرف جہنم ان کی طرف کھنچے گی اور دوسری طرف وہ جہنم کی طرف جذب ہوں گے۔

دوسری تعبیر میں قیامت کے دردناک عذابوں میں سے ایک اور کا ذکر ہے۔ اس دن کو اسی نام سے یاد کرتے ہوئے فرماتا ہے: جس دن ان کی صورتیں (جہنم کی) آگ میں دگرگوں ہو جائیں گی، وہ کہیں گے: اے کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿٦٦﴾ (احزاب ٦٦)

اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں کہ اس دن صورتوں کے دگرگوں ہونے سے کیا مراد ہے۔ کبھی کہا گیا ہے کہ مراد چہرے کے رنگوں کا متغیر ہونا ہے، یعنی کبھی زرد اور پژمردہ ہو جائے گا، کبھی سرخ اور آتشیں ہو جائے گا اور کبھی تاریک و سیاہ ہو جائے گا۔

بعض کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ جیسے آگ پر کسی چیز کو بھوننے کے لیے اسے الٹ پلٹ اور ادھر ادھر کیا جاتا ہے، مجرموں کے چہروں کی حالت بھی اس روز آتش دوزخ میں ایسی ہی ہوگی۔

کبھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انہیں چہروں کے بل آتش دوزخ میں پھینکا جائے گا۔ البتہ ''وجوہ'' کا ذکر اس لیے ہے کہ چہرہ انسان کے اعضاء میں سب سے اشرف ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ تینوں تفسیریں جمع ہوں اگرچہ پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال آیت ایک عظیم حادثے اور ایسے بہت بڑے عذاب کی خبر دیتی ہے جو کافر، مجرم اور دشمن گروہ کے انتظار میں ہے۔

اس آیت کا پیغام یہ ہے کہ اس روز ''اے کاش'' کہنے سے پہلے جس کی نہ کوئی تاثیر ہوگی اور نہ فائدہ، کیوں آج ہی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا راستہ اختیار نہ کر لیا جائے؟ آج شیطان صف بندوں اور زمانے کے طاغوتوں کی اطاعت کو خدا کی اطاعت پر مقدم کیوں کیا جائے؟ خصوصاً ایسے کاموں کو کیوں نہ ترک کر دیا جائے جو قیامت میں ندامت و پشیمانی کا باعث ہوں گے؟

۶۳۔ یوم یدعون الی نار جھنم دعا

یہ تعبیر بھی گذشتہ آیات میں بیان ہونے والی تعبیروں سے کافی شباہت رکھتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿١٣﴾

''روزِ قیامت وہی دن ہے کہ جب وہ سختی کے ساتھ دوزخ کی آگ میں دھکیلے جائیں گے۔'' (طور ١٣)

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٤﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿١٥﴾

''اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ کیا یہ جادو ہے یا تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔''

(طور: ١٤ و ١٥)

مفرادمیں راغب کے بقول "یدعون" "دغ" کے مادے سے ہے جس کا معنیٰ "سختی سے دھکیلنا" ہے۔اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ روزِ قیامت دوزخیوں کا جہنم کی طرف لے جایا جانا بھی انتہائی سختی اور وحشت وخوف کے ساتھ انجام پائے گا۔یہ ایک ایسی تعبیر ہے جس کا تصور بھی انسان کولرزا کر رکھ دیتا ہے،سخت فکر میں ڈال دیتا ہے اور درپیش ذمہ داریوں کی اہمیت کو واضح کر دیتا ہے۔

دوزخیوں اور بہشتیوں میں کس قدر فرق ہے،حتی کہ انہیں ان کی اصل جگہ پر منتقل کرنے میں بھی۔قرآن بہشتیوں کے بارے میں فرماتا ہے:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

فرشتے ان پر درود بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں:

"درود وسلام ہو آپ پر۔جنت میں داخل ہو جائیں،ان اعمال کی بناء پر جو آپ نے انجام دیئے۔" (نحل ۳۲)

ایک اور جگہ پر ہے کہ ملائکہ ان سے کہتے ہیں:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

"درود وسلام ہو آپ پر اس صبر واستقامت کے بدلے جو آپ نے انجام دیا اور کیا ہی اچھی عاقبت اس دنیا میں آپ کو نصیب ہوئی ہے۔" (رعد ۲۴)

۶۴۔یوم نبطش البطشة الکبری

۶۵۔یوم لا مرد له من الله

اس روزِ عظیم کے بارے میں پہلی تعبیر تولرزا دینے والی ہے،کیونکہ خداوند بزرگ اپنی بے انتہا قدرت کے ساتھ سخت ترین لہجے میں مجرم کافروں کو دھمکی دیتا ہے اور فرماتا ہے:

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾

"اس دن انہیں ہم اپنی عظیم قدرت کے ساتھ پکڑیں گے اور ان سے ضرور انتقام لیں گے۔" (دخان ۱۶)

"بطش" کی تعبیر سختی سے پکڑنے اور حملہ کے معنی میں ہے۔"کبریٰ" کے ساتھ اس کی صفت لانا اس کے عظیم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔"انا منتقمون" کی تعبیر جملہ اسمیہ بھی ہے اور انا کے ساتھ تاکید بھی کی گئی ہے۔آیت کی ان تعبیرات کے جزء جزء پر جب انسان غور کرتا ہے تو لرزہ براندام ہو جاتا ہے کہ وہ رحیم وغفور خدا اور وہ قادر وقاہر پروردگار ایسی دھمکی دے رہا ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے یا اس بات کا احتمال ذکر کیا ہے کہ ممکن ہے آیت اشارہ ہو اس سخت ترین سزا کی طرف کہ جو

جنگ بدر میں مشرکین کے نصیب میں آئی۔لیکن آیت کی تعبیرات ایک بڑے شدید تر اور وسیع تر عذاب کے ساتھ مناسب رکھتی ہیں اور یہ ماسوائے آخرت کے کسی اور پر صادق نہیں آتیں۔

علاوہ ازیں اس سے پہلے والی آیات میں بھی ایسی تعبیرات موجود ہیں جو جنگ بدر کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔

دوسری تعبیر میں اس دن کی طرف ایک نئے انداز سے اشارہ کیا گیا ہے:

یوم لا مرد له من الله

''وہ دن کہ جس میں اللہ کی طرف سے واپسی نہیں ہے۔''(شوری ۴۷)

نہ تو تلافی کا کوئی راستہ موجود ہے، نہ ہی اس دنیا میں پلٹنے کی کوئی راہ ہے اور نہ ہاتھ سے گئی چیزوں کے تدارک کا کوئی طریقہ ہے۔

بعض مفسرین سمجھتے ہیں کہ جملہ اس دن کے قطعی اور یقینی ہونے کی طرف اشارہ ہے چونکہ ارشاد ہے: ''خدا کی طرف سے اس دن واپسی نہیں ہے۔'' یعنی ایسا دن جو ضرور اور حتماً واقع ہونے والا ہے۔اس تفسیر کے مطابق اس کا مفہوم قیامت کے بارے میں آنیوالے جملے (لاریب فیه) کے نزدیک تر ہے۔لیکن آیت کے بعد والے جملوں کے مطابق پہلی تفسیر مناسب دکھائی دیتی ہے اور وہ جملے یہ ہیں ''اس دن نہ تمہارے لیے کوئی پناہ گاہ ہے اور نہ کوئی دفاع کرنے والا۔''

اس احتمال کا بھی امکان ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس دن کوئی اس امر کی طاقت نہیں رکھتا کہ عذابِ الٰہی کو ٹال سکے اور یہ معنی آیت کے بعد والے حصے کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ہم ان تفاسیر میں سے جس ایک کا بھی انتخاب کرلیں سختی اور سنگینی کا پیام ہمراہ لیے ہوئے ہے۔

۶۶۔یوم یدع الداع الی شیء نکر

یہ نام جو قرآن میں ایک بار آیا ہے، سربستہ اور خوفناک تعبیر ہے جو انسانی فکر کو اس دن کے حوادث کے بارے میں مختلف مسائل کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

یوم یدع الداع الی شیئ نکر

''اس دن کو یاد کرو جب خدائی دعوت دہندہ لوگوں کو ایسے وحشت ناک امر کی طرف دعوت دے گا جس سے لوگ بے خبر ہیں۔''(قمر ۶)

اس بارے میں کہ یہ ''خدائی دعوت دہندہ'' کون ہے، مفسرین نے کئی ایک احتمالات کا ذکر کیا ہے۔کیا وہ خود خدا ہے یا اس کے مقرب فرشتے مثلاً جبرائیل یا اسرافیل کہ جو صور پھونک کر لوگوں کو قیامت کی دعوت دیں گے۔درج ذیل آیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلا معنی مناسب تر محسوس ہوتا ہے اگرچہ بعد والی آیات فرشتگان اور حساب و کتاب کے مامورین سے زیادہ مناسبت رکھتی ہی:

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ

''یاد کرو اس دن کو جب خدا تمہیں (قبروں میں سے) بلائے گا اور تم اس کی حمد وثناء کے ساتھ اس کی دعوت قبول کرو گے۔'' (بنی اسرائیل ۵۲)

''شیء نکر'' (ناشناختہ مطلب) سے کیا مراد ہے؟

کیا اس سے مراد وہ وحشت ناک عذاب ہیں جو انسان کے لیے ناشناختہ ہیں، یا پھر اعمال کا وہ دقیق ترین حساب کتاب جس کے اس حد تک دقیق ہونے میں کسی کو بھی یقین نہیں تھا، یا یہ سب کچھ مقصود ہے؟ البتہ جو بھی ہو یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو انتہائی وحشت ناک، خوف ناک اور بہت دردناک ہے۔

۶۷۔ یوم یسحبون فی النار علیٰ وجوھھم

قیامت کے اس نام کا یہ خوف ناک پیغام واقعاً عجیب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وہ دن جب مجرمین اوندھے منہ دوزخ کی آگ میں گھسیٹے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا جہنم کی آگ کا مزہ چکھو!

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾ (قمر ۴۸)

ہم جانتے ہیں کہ چہرہ بدن کے لطیف ترین اور اہم ترین حصے میں سے ہے جس میں آنکھ، منہ اور ناک جیسے انتہائی اہم اعضاء موجود ہیں۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دوزخ کی آگ اس دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ ہے بلکہ یہ دنیاوی آگ تو اس کے سامنے ایک مذاق ہے۔

اب سوچیں (اگر کسی کو منہ کے بل اس آگ میں گھسیٹا جائے تو) کیا ہوگا؟ علاوہ ازیں یہ عمل خود غرض مستکبرین کی سخت تحقیر کی علامت ہے۔ اس طرح روحانی اور جسمانی ہر دو عذاب اس میں یکجا ہو جاتے ہیں۔

''سقر'' (بروزن سفر) خود دوزخ کے معنی میں ہے یا پھر اس کا وہ خاص حصہ مراد ہے جس کی تپش اور حرارت غیر معمولی ہے اور جو متکبروں کا ٹھکانا ہے؟ اس بارے میں دو احتمال موجود ہیں۔ دوسرے مطلب کی امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہونے والی حدیث تائید کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''ایسا درہ ہے جو متکبرین کا ٹھکانا ہے اور یہ جب بھی سانس لیتا ہے تو دوزخ کو جلا دیتا ہے۔''[1]

---

[1] تفسیر صافی (زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

۶۸۔یوم نقول لجھنم ھل امتلات

یہ تعبیر قرآن مجید میں ایک بار آئی ہے اور قیامت کے ناموں میں سے شمار ہوتی ہے۔ یہ بھی لرزا دینے والی تعبیرات میں سے ایک ہے جو دوزخ کی وسعت اور جہنمیوں کی کثرت کی حکایت کرتی ہے، ایسی کثرت کہ جو ہر انسان کو خوف زدہ کر دیتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ان کے زمرے میں آجائے۔ فرماتا ہے:

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾ (ق ۳۰)

''یاد کرو اس دن کو جب ہم جہنم سے کہیں گے کیا بھر چکی ہو؟ تو وہ کہے گی: کیا کچھ اور بھی ہے؟''

اس آیت کی تفسیر میں دو زاویۂ نگاہ موجود ہیں۔ اول یہ کہ ممکن ہے یہ ''استفہام انکاری'' ہو۔ یعنی جہنم اس سوال کے جواب میں کہ آیا بھر چکی ہو؟ کہے گی: آیا کچھ اور بھی ہے؟ اشارہ ہو اس بات کی طرف کہ اب کوئی جگہ باقی نہیں بچی۔

دوم یہ کہ ممکن ہے استفہام (استفہام تقریری) ہو۔ یعنی کیا مزید افراد بھی ہیں کہ دوزخ میں آئیں اور اس طرح دوزخ بھوکے انسان کی طرح ہمیشہ زیادہ خوراک کا تقاضا کرتی ہے اور کبھی بھی سیر نہیں ہوتی اور دائماً تباہ کاروں اور ستم گروں کی تلاش میں ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نہ جہنم بدکاروں سے سیر ہو اور نہ بہشت نیک لوگوں سے سیر ہو۔ لیکن بعض مفسرین نے اس تفسیر پر تنقید کی ہے کہ یہ مندرجہ ذیل آیت کے ساتھ موافق نہیں:

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾

''میں قسم کھاتا ہوں کہ دوزخ کو جن وانس سے بھر دوں گا۔'' (سجدہ ۱۳)

بنا بر ایں پہلی تفسیر ہی مناسب نظر آتی ہے۔[1] اگرچہ اس اعتراض کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ پر ہو جانے اور بھر جانے کے بھی مختلف درجے ہیں، بالکل اس برتن کی مانند کہ جو خوراک سے پر ہو اور کسی دیا جائے تو وہ تقاضا کرے کہ اس کے اوپر کچھ اور ڈالا جائے۔

دوزخ کے ساتھ یہ سوال و جواب کیسے ہوں گے، بعض نے کہا ہے کہ سوال و جواب دوزخ کے داروغوں اور نگہبانوں سے ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سوال و جواب زبان حال کے ذریعے انجام پائیں گے۔ نیز جیسا کہ قرآن اور روایات کی بعض تعبیرات سے پتہ چلتا ہے دوزخ خود سے ایک زندہ وجود ہے اور گفتگو کرنے پر قادر ہے۔ بنا بریں آیت کی اس کے ظاہری مفہوم کے مطابق بھی تفسیر کی جا سکتی ہے۔[2]

بہر حال آیت کا پیغام یہ ہے کہ جہنمی بہت زیادہ ہیں اور خداوند تعالیٰ کی دھمکی بھی قطعی و یقینی ہے اور ہر ایک کو خبردار کرتی ہے کہ

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۲۸ ص ۱۷۴، روح المعانی ج ۲۶ ص ۱۷۰، المیزان ج ۱۸ ص ۳۸۴۔ ان تفاسیر میں یہ اعتراض بعض مفسرین کی طرف سے نقل ہوا ہے۔

[2] تفسیر روح البیان ج ۹ ص ۱۲۷ میں اس معنی سے متعلق مختلف آیات و روایات سے شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ ان افراد میں سے ایک تم بھی ہو۔ یہی اندیشہ انسان کو بیدار کرسکتا ہے، اسے ہوش میں لاکر بدیوں اور انحرافات جاری رکھنے سے روک سکتا ہے۔

۶۹۔یوم یقول المنافقون و المنافقات...

روزِ قیامت کے بارے میں یہ تعبیر قرآن مجید میں صرف ایک بار استعمال ہوئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:''اس دن منافق مرد اور عورتیں بہت زیادہ دکھ اور حسرت کے ساتھ مومنین سے کہیں گے: ہم پر بھی ایک نگاہ ڈالو تا کہ ہم بھی تمہارے نور میں سے کوئی شعاع لے لیں (یا موقع دیں تا کہ ہم بھی تمہارے نور کی شعاعوں میں حرکت کرسکیں) یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ ۚ (حدید ۱۳)

یہ ایسی حالت میں ہے کہ جب باایمان مرد اور عورتیں راہِ محشر کو بہشت کی طرف جلدی کے ساتھ طے کر رہے ہوں گے، ایسی حالت میں جب ان کے ایمان کا نور ان کے آگے سے اور دائیں طرف سے ان کے ساتھ حرکت کرے گا اور فرشتے انہیں جنت کی خوشخبری دیں گے۔

یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىکُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ..... (حدید ۱۲)

لیکن منافقین مودبانہ انداز میں مایوسی کے ساتھ ان کی طرف دیکھیں گے اور اپنے اس تقاضا کے جواب میں سنیں گے کہ پلٹ جاؤ اور کسب نور کرو۔

قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَکُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ (حدید ۱۳)

قیامت اور میدانِ محشر کسب نور کی جگہ نہیں۔اس کی جگہ تو دنیا تھی۔اگر تم جا سکتے ہو تو وہاں پلٹ جاؤ اور ایمان اور عمل صالح کے پر فروغ چراغ سے اپنے لیے نور اور روشنی حاصل کرلو۔

کس قدر دردناک ہے ظلمتوں میں پڑے اندھے دل اور تاریک فکر۔ان منافقوں کی حالت جب کہ نورِ ایمان اور عمل صالح کس قدر خوبصورت ہے اور کتنا اہم پیغام ان دو گروہوں کی حالت کے فرق میں ہمارے آج کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

۷۰۔لیوم لاریب فیه

روزِ قیامت کے لیے آخری اور ستر واں توصیفی نام یہی متذکرہ بالا تعبیر ہے جو سورۂ آل عمران میں دو بار ذکر ہوئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ

''راسخ العلم مومنین خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں: خدایا تو ہی لوگوں کو اکٹھا کرنے والا ہے اس دن کہ جس

میں کوئی شک وشبہ نہیں۔'' (آل عمران ۹)

اس سورت کی آیت ۲۵ میں بھی یہ تعبیر کلام پروردگار میں ذکر ہوئی ہے۔فرماتا ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ

''پھر کیسا ہوگا؟ جب ہم انہیں جمع کریں گے اس دن کہ جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔''

چونکہ قرآن مجید کی نگاہ میں قیامت کے قطعی ہونے سے متعلق بحث کے بارے میں بقدر کافی آیات (اسی جلد میں) بیان کی جا چکی ہیں۔لہٰذا اب ہم اس کے تکرار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔فقط اس ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس دن کے قطعی ویقینی ہونے اور اس دن سے متعلق مختلف خدائی وعدے نہ فقط کلام خداوندی میں مسلم اور ہر قسم کے شک وشبہ سے خالی ہیں بلکہ وہ تمام افراد جو راسخ الایمان ہیں، وہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر سب متفق ہیں۔قیامت کے باقی نام اس دن پیش آنے والے مختلف حوادث اور واقعات کی خبر دیتے ہیں جب کہ یہ نام قیامت کے قطعی اور یقینی ہونے کی خبر دیتا ہے۔درحقیقت یہ ان سب کے لیے تاکید ہے۔اسی دلیل کی بنا پر ہم نے ناموں کے اس سلسلے میں اس کو آخری عنوان کے طور پر منتخب کیا ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ جب مومنین اس عنوان کے ساتھ اس دن کے بارے میں خبر دیتے ہیں تو اس کی دلیل بھی بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہیں، جیسا کہ پہلی آیت کے ذیل میں بیان ہوا ہے:

ان الله لا يخلف الميعاد

''کیونکہ خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔''

یہی دلیل ہے اس دن کے قطعی ہونے کی اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہونے کی۔

نتیجہ بحث

''قرآن میں قیامت کے نام'' کے موضوع پر وسیع گفتگو سے یہ بات واضح ہوئی کہ یوم قیامت کے قرآن میں کم از کم ستر نام ہیں۔ البتہ نام سے یہاں مراد اسم خاص (جسے ادبیات عرب میں ''علم'' کہتے ہیں) نہیں بلکہ وہ توضیحات جو قیامت کے بارے میں قرآن میں آئی ہیں اور کلمہ ''یوم'' سے ان کا آغاز ہوتا ہے، اس میں شامل ہیں۔

تاہم ان ناموں کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ وہ نام جو صرف ایک لفظ کے ذریعے خبر دیتے ہیں۔مثلاً: یوم البعث یوم القیامة، یوم الدین اور یوم الحساب۔ ایسے کل ۲۴ نام ذکر کیے گئے ہیں۔

۲۔ وہ نام جن میں جملے کی صورت میں قیامت کی توصیف کی گئی ہے۔چوبیس کے علاوہ باقی نام اسی نوعیت کے ذکر کیے

گئے ہیں۔

یہ ستر نام بہت ہی مفید اور معنی خیز ہیں۔ یہ حقیقت روزِ قیامت کو دیکھنے کے لیے ستر دریچے ہیں۔ ان میں اس دن کے تمام حوادث کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مردوں کے زندہ ہونے سے لے کر اہل بہشت کے بہشت میں اور اہل دوزخ کے دوزخ میں جانے تک کے احوال کی طرف ان میں اشارے موجود ہیں۔

یہ ستر نام اس یوم عظیم کا عجیب، ہلا دینے والا، واضح اور منہ بولتا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں کہنے کی سب باتیں ہیں اور یہ اس روز مقامات محشر میں سب انسانوں کے انجام کی وضاحت کرتے ہیں۔

ممکن نہیں کہ انسان ان سب ناموں پر غور کرے، انہیں قبولیت کی نظر سے دیکھے اور اس پر غیر معمولی تربیتی اثر نہ ہو۔

درحقیقت مقصد بھی یہی تھا کہ ان تعبیرات کے ذریعے انسان کو بیدار کیا جائے جن میں سے ہر ایک ایک خاص زاویے سے معاد کی تفسیر پیش کرتی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ گمراہی سے راہ کی طرف دعوت دی جائے۔ آلودگی سے پاکیزگی، دنیا پرستی سے زہد، فسق سے تقویٰ، ظلمت سے نور، کفر سے ایمان اور شرک سے توحید کی طرف بلایا جائے۔ واقعاً قرآن مجید عجیب سبق آموز کتاب ہے اور اس کا عجیب تربیتی اور حساب شدہ لائحہ عمل ہے۔

ان ناموں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک بار پھر چشم دل سے دیکھیں۔ اس کے ایک ایک حصے پر رکیں اور دیکھیں کہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا چاہ رہا ہے اور انسان کے انجام کی کیا تصویر پیش کر رہا ہے؟ پھر اس سے اپنے لیے تربیتی درس حاصل کریں۔

خداوند! ہمیں ایسا ادراک اور ایسی نگاہ عطا فرما کہ ہم آج ہی اس یوم عظیم کو ان مختلف زاویوں سے دیکھ سکیں جو تو نے قرآن میں بیان فرمائے ہیں۔

ان آیات کے پیغام کو سن سکیں۔

ان ناموں کا مفہوم یاد رکھ سکیں۔

اور اس یوم عظیم کے لیے تیار ہو سکیں۔ امین یارب العالمین

یہ بحث ہم اس سلسلے میں ایک نکتہ پرداز اشعار کے شاعر پر ختم کرتے ہیں:

بشنواز قرآن چہ نیکودم زند — زخمہ برساز دل آدم زند

تا کند بیدارش از خواب گران — از قیامت گوید و احوالِ آن

باسکو تت نغمہ ی قرآن شنو — آنچہ می گوید بہ گوش جان شنو

از ''مزمل'' از ''نبا'' از ''انفطار'' — گوش کن غوغای محشر آشکار

سورۂ ''زلزال'' و ''طور'' و ''قارعہ'' — یا کہ ''تکویر'' و ''قیامت'' ''واقعہ''

چونکہ ہر یک وصف ''محشر'' راکند — خود ''قیامت'' زآن سخن برپا کند

این زمین، درآن زمان پر بلا — ناگهاں چوں ''زلزلت زلزالها''
از درونش ''اخرجت اثقالها'' — با تعجب ''قال الانسان مالها''
مردگان خیزند برپا ''کلهم'' — تاهمه مردم ''یروا اعمالهم''
هر که دارد ''ذرة خیر ایره'' — یا که آرد ''ذرة شرایره''
آن زمان، خورشید تاباں ''کورت'' — کوههای سخت و سنگین ''سیرت''
آباردر کام دریا ''سجرت'' — آتش دوزخ بشدت ''سعرت''
پس درآن هنگام ''جنت از لفت'' — خود بداند هر کسی ''ما احضرت''
نامهٔ کردار و گفتارِ بشر — خود بود روشنگر هر خیر و شر
نامه ای باجانِ او آمیخته — می شود برگردنش آو یخته
نامه یا نقش دقیق نفس او — یاکه از هر لحظه عمرش عکس او
نامه رد یا قبول بندگی — باسر افرازی، و یاشرمندگی
حکم عزت یا عذاب هرکس است — خودنمودارِ حسابِ هرکس است [2][1][3]

منظومہ ترجمہ

ساز قلب آدمی کو چھیڑ کر — کچھ کہے قرآن، ذرا تو کان دھر
خواب غفلت سے جگانے کے لیے — وحشت محشر بتانے کے لیے
خامشی سے نغمہ قرآن سنو — کہہ رہا ہے جو، بہ گوش جاں سنو
از ''مزمل'' از ''نباء'' از ''انفطار'' — شور محشر کس قدر ہے آشکار
سورۂ ''زلزال'' و ''طور'' و ''قارعہ'' — یا کہ ''تکویر'' و ''قیامت''، ''واقعہ''
اس طرح ہے حال محشر کہہ رہا — کہ سخن سے خود قیامت ہو بپا
یوں زمیں پر آئے گا دورِ بلا — ہوگی یک دم ''زلزلت زلزالها''
یوں یہ دھرتی "اخرجت اثقالها" — ہو کے حیراں "قال الانسان مالها"
اٹھ پڑیں گے مرنے والے "کلهم" — لوگ سب تاکہ "یروا اعمالهم"

---

[1] ''خلوت گاہِ راز'' دیوان ''حسان'' جلد ۲ صفحہ ۱۹ (جلد دوم ای اشکہا بریزید)

ہوگا جس کا "ذرۃ خیر ایرہ"
یا کہ ہوگا "ذرۃ شرایرہ"

اس گھڑی خورشید تاباں ''کورت''
کوہسار اتنے گراں بھی ''سیرت''

سارے دریاؤں کا پانی ''سجرت''
آگ دوزخ کی بشدت ''سعرت''

ایسے عالم میں کہ ''جنت از لفت''
جان لے ہر کوئی خود ''مااحضرت''

نامۂ کردار و گفتارِ بشر
ہوگا کامل ترجمان خیر و شر

نارجس میں جان انسان گندھ گئی
اس کے حلقے میں ہے گردن آدمی

زندگی کا ہر نفس تحریر ہے
عمر کے ہر لحظے کی تصویر ہے

نامۂ رد یا قبول بندگی
باسرافرازی، ویاشرمندگی

اس کے حصے میں ہے عزت یا عذاب
اس میں بالکل ہے نمایاں ہر حساب

[1] [2] [3]

---

[1] اس منظوم ترجمے میں جن مصرعوں کے اردو ترجمے کی ضرورت نہ تھی انہیں من وعن نقل کر دیا گیا ہے۔ نیز شعری تقاضوں کی وجہ سے بعض مصرعوں کے صرف مفہوم کو منتقل کیا گیا ہے۔ (مترجم)

دلائل معاد

عناوین

معارفِ دینی کے اعتبار سے اور تربیتی اثر کے حوالے سے قرآن مجید نے معاد کو جو غیر معمولی اہمیت دی ہے اس کے پیش نظر معاد کے دلائل بیان کرنے کے لیے اس نے بہت سی آیات مختص کی ہیں۔

یہ دلائل درحقیقت دو اہم حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

پہلا حصہ

یہ حصہ ایسے دلائل پر مشتمل ہے جو وقوع معاد اور حیات بعد از ممات کو مختلف طریقوں سے ثابت کرتے ہیں۔

دوسرا حصہ

اس میں ایسے دلائل ہیں جو دراصل مخالفین کے اعتراضات کا جواب ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ تجدید حیات محال ہے اور وہ مختلف تعبیرات کے ذریعے اسے غیر ممکن ظاہر کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے ان کے سامنے عقلی اور حسی و تجربی دلائل پیش کیے ہیں اور ان کے محال ہونے کے دعویٰ کے جواب میں امکان معاد کو بڑی وضاحت سے ثابت کیا ہے۔

بحث کی طبیعی ترتیب کا تقاضا ہے کہ پہلے ہم امکانِ معاد کے دلائل کو زیر بحث لائیں اور انکارِ مطلق کے مرحلے سے امکان مطلق کے مرحلے کی طرف قدم اٹھائیں۔ بعد ازاں ان دلائل کا ذکر کریں جو لزوم معاد اور وقوع معاد کو ثابت کرتے ہیں تا کہ اس طریقے سے ہم صحیح اور منطقی طور پر معاد کی حقیقت اور اس کے مختلف مراحل سے آشنا ہو سکیں۔

جس نکتے کا یہاں پر تاکید کے ساتھ ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ امکان معاد کے بارے میں قرآن کی تمام تر گفتگو ان لوگوں کے بالمقابل ہے جو معادِ جسمانی کے منکر تھے اور قرآن اس امر پر تاکید کرتا ہے کہ جہانِ دیگر میں روح اور جسم دونوں کی باہم بازگشت کا ملا ممکن ہے کیونکہ اس کے مختلف نمونے ہمیں اس دنیا میں اپنی آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں۔

بہر حال قرآن اس حوالے سے جو راہیں اختیار کرتا ہے وہ بہت متنوع اور دلکش ہیں۔ ان کا خلاصہ چھ عناوین کے تحت یوں کیا جا سکتا ہے:

۱۔ جہان اور انسان کی اولین خلقت سے متعلق آیات۔

۲۔ قدرتِ الٰہی کے ہمہ گیر ہونے سے متعلق آیات۔

۳۔ زمینوں کے زندہ ہونے سے متعلق آیات۔

۴۔ جنین کے تغیرات کے بارے میں آیات۔

۵۔ توانائیوں کی بازگشت کے بارے میں آیات۔

۶۔ ایسی آیات جو اس دنیا میں معاد کے عینی و تاریخی نمونے پیش کرتی ہے۔

اس سے پہلے کہ یہ واضح ہو کہ قرآن کن لوگوں سے مخاطب ہے اور آیات میں کیا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے، ضروری ہے کہ معاد کے مخالفین کی منطق کو آیات قرآن کے حوالے سے پیش کریں۔ یہی منطق آج بھی دہرائی جاتی ہے اور مخالفین آج بھی اس کا سہارا لیتے ہیں۔

اس وضاحت کے ساتھ ہم امکان معاد کے بارے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہیں اور پہلے منکرین کی منطق اور طرز تفکر کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ امکان معاد اور منطق مخالفین

اشارہ

ہم کہہ چکے ہیں کہ قرآن مجید اس مسئلے میں فکری فضا ہموار کرنے کے لیے پہلے امکان معاد کے موضوع پر بات کرتا ہے اور پھر مذکورہ چھ مختلف طریقوں سے اس کا اثبات کرتا ہے۔ بعد ازاں وقوع معاد کے دلائل شمار کرتا ہے۔

شاید اس امر کے ذکر کی ضرورت ہو کہ مخالفین معاد کے پاس اپنے مقصد کے اثبات کے لیے کوئی خاص عقلی و منطقی دلیل نہیں ہے۔ وہ عام طور پر اپنی بالکل عامیانہ ذہنیت کی وجہ سے صرف اس بات کا سہارا لیتے ہیں کہ تجدید حیات بعید از امکان ہے، یہاں تک کہ حیات بعد از ممات کے نظریہ کو پاگل پن کی علامت، یا خدا پر الزام قرار دیتے ہوئے اس نظریے کے حامل افراد کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

اس کے بعد ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سنتے ہیں:

(۱) وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ (بنی اسرائیل ۴۹)

(۲) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۷﴾ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ (سبا ۷)

(۳) وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ (السجدۃ:۱۰)

(۴) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (النمل: ۶۷،۶۸)

(۵) فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝

(ق: ۲،۳)

(۶) اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝

(مومنون: ۳۵ تا ۳۷)

(۷) اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝ [1] (الدخان

۳۴،۳۵)

ترجمہ

(۱) اور کہنے لگے کہ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہوجائیں گے اور بکھر جائیں گے تو کیا پھر ہماری خلقت جدید ہوگی؟

(۲) کافروں نے کہا: کیا ہم تمہیں ایک ایسے شخص کا پتہ بتائیں جو خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل پراگندہ ہوجاؤ گے تو پھر تمہاری خلقت جدید ہوگی؟ کیا وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے یا پھر کسی دیوانگی کا شکار ہے؟ (ایسا نہیں ہے) بلکہ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ عذاب اور پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں (اور ان کی گمراہی کا ثبوت یہی ان کا شدید انکار ہے)۔

---

[1] اس ضمن میں متعدد آیات اور بھی موجود ہیں جن کا مضمون مندرجہ بالا آیات کے قریب قریب ہے۔ مثلاً: واقعہ ۴۷ و ۴۸، صافات ۵۳ اور یس ۷۸ وغیرہ

(۳)انہوں نے کہا: کیا جب ہم مرجائیں گے اور زمین میں کھوجائیں گے تو حیات نو پائیں گے؟

(۴) کافر کہنے لگے: کیا جب ہم اور ہمارے آباء خاک ہوجائیں گے تو پھر ہمیں نکالا جائے گا؟ یہی وعدہ ہم سے اور ہمارے آباء سے قبل ازیں بھی کیا جاتا رہا ہے۔ یہ تو سب پہلوں کے افسانے ہیں۔

(۵) اور کافروں نے کہا: یہ عجیب چیز ہے۔ کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہوجائیں گے تو پھر سے زندگی پائیں گے؟ یہ بازگشت تو بہت بعید ہے۔

(۶) کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب مرجاؤ گے، خاک اور ہڈیوں میں بدل جاؤ گے، تو پھر تمہیں نکالا جائے گا؟ پناہ ہے۔ پناہ ہے ایسے وعدوں سے جو تم سے کیے جاتے ہیں۔ ہماری حیات اس حیات دنیوی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ہمیشہ ہم میں سے کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ دوسری نسل لے لیتی ہے۔ ہمیں پھر سے نہیں اٹھایا جائے گا۔

(۷) یہ (مشرکین) کہتے ہیں کہ ہماری موت اسی پہلی موت کے علاوہ کچھ نہیں اور ہم ہرگز پھر سے زندہ نہ ہوں گے۔

تفسیر وجمع بندی آیات

کیا خاک پھر سے انسان ہوجائے گی؟

ہر چند ان آیات کے مضامین ایک دوسرے سے مشابہ ہیں لیکن ان کی تعبیرات اور مفاہیم میں فرق قابل غور ہے۔

پہلی آیہ میں مشرکین عرب کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتا ہے: انہوں نے کہا کہ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہوجائیں گے اور بکھر جائیں گے تو کیا ہماری خلقت جدید ہوگی۔ (وقالواء اذا کنا عظاما ورفاتاء انا لمبعوثون خلقا جدیدا)

کیونکر ممکن ہے کہ انسان کا گوشت خاک ہوجائے، ہڈیاں بکھر جائیں اور اس کا ہر ذرہ ادھر ادھر بکھر جائے، پھر اسے جمع کیا جائے اور لباس حیات پہنایا جائے؟ مشت بھر بوسیدہ اور بکھری ہوئی ہڈیاں کجا اور ایک زندہ ومحترک اور قوی انسان کجا؟

"رفات" "رفت" (بروزن "نفت") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے چور چور کرنا۔ بعض نے لپیٹنا کو بھی اس کے معانی کا جزو شمار کیا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ "رفات" انتہائی چھوٹے بوسیدہ اور کہنہ ذرات کے معنی میں ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جو ہڈیاں سالہا سال گزرنے کے بعد اختیار کرتی ہیں۔ بعض سمجھتے ہیں کہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایک ایسی حالت جو کہنہ وشکستہ ہونے کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ

تفسیریں آپس میں بہت زیادہ شباہت کی حامل ہیں۔[1]

''روح المعانی'' کی روایت کے مطابق یہ جو بعض مفسرین نے اسے خاک، غبار یا ایسی چیز جسے غیر معمولی طور پر کوٹا اور نرم کیا گیا ہو، کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ یہ درحقیقت اسی کا ایک مصداق ہے۔

عاقل انسان ایسا نہیں کہہ سکتا؟

دوسری آیت میں مشرکوں کا سخت تر اور مغرورتر لہجہ ترسیم کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے: کافروں نے کہا: کیا ہم تمہیں ایسے شخص کا پتہ بتائیں جو ہمیشہ تمہیں خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل بکھر جاؤ گے تو حیات تازہ پاؤ گے؟''(وقال الذین کفروا ھل ندلکم علی رجل ینبئکم اذا مزقتم کل ممزق انکم لفی خلق جدید)

''کیا وہ خدا پر جھوٹ باندھتا ہے (کیونکہ کہتا ہے کہ یہ خبر اللہ کی طرف سے ہے) یا پھر کسی جنون میں مبتلا ہے؟'' (لہٰذا دیوانگی کی باتیں کرتا ہے)(افتری علی اللہ کذبا ام بہ جنۃ)

اسی طرح سے وہ رسول خداؐ کی طرف سے معاد جسمانی کی خبر دینے کو دو امور میں سے کسی ایک کا نتیجہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے: یا وہ عاقل اور سمجھدار ہے لیکن سوء استفادہ کے لیے ان باتوں کو جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کرتا ہے تاکہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر سکے، یا پھر اس کا کوئی مقصد اور غرض نہیں اور نعوذ باللہ جنون میں مبتلا ہے۔ کیا کوئی عاقل ایسا کہہ سکتا ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں اور وہ بھی پراگندہ خاک، جس کے ذرات موج ہوا کے دوش پر سوار ہو کر ادھر ادھر بکھر چکے ہیں، ایک روز جمع ہو جائیں گے اور از سر نو زندہ ہو جائیں گے؟

دل کے اندھے یہ مغرور جو اس پر بھی تیار نہ تھے کہ پیغمبر اکرمؐ کو ''رجل'' (ایک اجنبی آدمی) کے بجائے کسی نام سے یاد کرتے، اپنی آغازِ خلقت کو بالکل بھول چکے تھے۔ جہل و غرور کے پردوں نے ان سے حقیقت بینی کو اس طرح چھین لیا تھا کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں رونما ہونے والے معاد کے واقعات کو بھی نہ دیکھ پاتے تھے۔ ان کی وضاحت انشاء اللہ ان آیات کے ذکر کے بعد آئے گی۔

''مزقتم'' ''تمزیق'' کے مادہ سے پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے معنی میں ہے، یہاں یہ لفظ انسانی وجود کے ذرہ ذرہ ہو کر خاک، آب اور ہوا میں بکھر جانے کے معنی میں ہے۔

اس ضمن میں تیسری آیت میں ایک نئی تعبیر دیکھنے کو ملتی ہے۔ فرماتا ہے: مشرکین نے کہا: ''جب ہم زمین میں گم ہو چکے ہوں گے تو کیا پھر سے حیات نو پائیں گے''(وقالوا اذا ضللنا فی الارض انا لفی خلق جدید)۔ زمین میں گم ہو جانے کی تعبیر ایک تو انسانی بدن کے اجزا کے خاک ہو جانے اور زمین کے ہمشکل ہو جانے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا اس کا دنیا کے مختلف حصوں میں اس طرح بکھر جانے کی طرف اشارہ ہے کہ اصلاً پہچانا نہ جا سکے۔ اس طرح وہ چاہتے تھے کہ یہ ثابت کریں کہ ایسی بازگشت محال ہے۔

---

[1] مفرداتِ راغب، مقائیس اللغۃ، التحقیق و تفسیر روح المعانی

حالانکہ بالکل یہی مسئلہ انسانی خلقت کے آغاز میں پیش آچکا ہے جہاں طبیعت میں بکھرے ہوئے ذرات خدائی قدرت سے اکٹھے ہوئے اور انسانی معرض وجود میں آیا (اور کسی چیز کے امکان پر بہترین دلیل اس کا واقع ہونا ہے)۔

یہ سب افسانے ہیں؟

چوتھی آیت میں یہی بات کچھ اضافوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ فرماتا ہے: کافروں نے کہا: ''کیا جب ہم اور ہمارے آباء خاک ہو جائیں گے تو پھر زندہ انسانوں کی صورت میں خاک سے نکلیں گے؟ یہ تو ایک (جھوٹا) وعدہ ہے جو ہم سے اور ہمارے آباء سے کیا جاتا رہا ہے۔ یہ سب پہلوں کے افسانے ہیں (وقال الذين كفروا اذا كنا ترابا وابآونا ائنا لمخرجون۔ لقد وعدنا هذا نحن و ابآو نا من قبل ان هذا الا اساطير الاولين)[1]

اس تعبیر سے بخوبی یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ مسئلہ معاد اور وہ بھی جسمانی صورت میں، قرآن اور شریعت اسلام سے مختص نہیں بلکہ گذشتہ انبیاء نے بھی اس کی خبر دی ہے لیکن امتوں کے سرپھروں نے بعض وجوہ کی بنیاد پر کہ جن کا ذکر انشاء اللہ بعد میں آئے گا، اس حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا اور وہ اسے عقل و منطق سے دور خرافات اور افسانہ قرار دیتے رہے۔

اس تعبیر میں درحقیقت انکارِ معاد کے لیے انہوں نے دو چیزوں کا سہارا لیا ہے۔ ایک تو یہ کہ بعید نظر آتا ہے کہ خاک پھر سے لباس حیات پہن لے۔ دوسرا یہ کہ چونکہ سب انبیاء نے اپنی امتوں سے ایسا وعدہ کیا، لیکن اس نے کبھی عملی شکل اختیار نہیں کی، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ بات ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ (گویا ان کا خیال یہ تھا کہ قیامت فوراً برپا ہوجائے گی اور اگر نہ ہو تو پھر یقیناً جھوٹ ہے)۔

پانچویں آیت میں اسی انکار اور اس عقیدے کو بعید قرار دینے کے لیے کافروں کی ایک اور تعبیر مذکور ہے۔ فرماتا ہے: کافروں نے کہا: یہ ایک عجیب چیز ہے! کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں تو پھر زندہ ہوں گے؟ یوں لوٹ آنا تو عجیب ہے۔ (فقال الكافرون هذا شيء عجيب أاذا متنا و كنا ترابا ذلك رجع بعيد)۔[2]

---

[1] ''اساطير'' ''اسطورة'' کی جمع ہے۔ بعض اہل لغت کا کہنا ہے کہ یہ ''اسطار'' کی جمع ہے جو خود ''سطر'' کی جمع ہے اور اس کا معنی ایسی چیز ہے جو جھوٹ لکھی گئی ہو۔ بعض کا کہنا ہے کہ چونکہ ''اسطورہ'' مزید فیہ کے صیغوں میں سے ہے اس لیے سطر طبیعی کے زیادہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے یہ ''سطر مجہول'' کے معنی میں ہے۔ بہرحال ''اسطورہ'' باطل، بے بنیاد اور خرافات پر مبنی مطالب کے معنی میں ہے۔ (مقائیس، مفرادت، مصباح اللغہ والتحقیق)

[2] بعض مفسرین نے کلمہ ''رجع'' اور ''رجوع'' کو ایک ہی معنی میں لیا ہے، جیسے تفسیر المیزان میں ہے)، جب کہ بعض کا خیال ہے کہ ''رجع'' متعدی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ''رجوع'' لازم کے معنی میں۔ (روح البیان ج ۹ ص ۱۰۳) تفسیر فخر الدین رازی میں بھی آیا ہے کہ ان دونوں میں تفاوت موجود ہے، البتہ زیر بحث آیت میں دونوں معانی کی صلاحیت موجود ہے۔ (ج ۲۸ ص ۱۵۲)

اس طرح انہوں نے شروع کلام ہی میں اسے ''عجیب'' قرار دے دیا اور آخر کلام میں ''بعید'' کہہ دیا، بغیر اس کے کہ اپنی خلقت کے بارے میں غور کریں اور دیکھیں کہ یہ ''عجیب و بعید'' بات تو ان کی ابتدائے خلقت میں بخوبی رونما ہو چکی ہے بلکہ جیسا کہ ہم واضح کریں گے کہ معاد اور تجدد حیات کو ہم ہمیشہ اپنی ان آنکھوں سے اسی زندگی میں دیکھتے رہے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں، کس قدر عجیب و بعید ہے؟

چھٹی آیت میں ہمارا سامنا مخالفین کے اسی انکار سے کسی اور پیرائے میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے بحث کرتے ہوئے پوری قاطعیت اور جسارت سے کہتے ہیں: کیا یہ جو تم جیسا انسان ہے تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب مر جاؤ گے، بالکل مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ پناہ ہے، پناہ ہے ان وعدوں سے جو تم سے کئے جاتے ہیں۔ (ایعدکم انکم اذا متم و کنتم ترابا و عظاما انکم مخرجون هیهات هیهات لما توعدون)

پھر یہ کور دل کسی استدلال کی ضرورت محسوس کئے بغیر بڑی قاطعیت سے مزید کہتے ہیں: اس حیاتِ دنیا کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمیشہ ہم میں سے کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں ان کی جگہ ایک اور نسل آ جاتی ہے اور ہمارے لیے کوئی معاد ہے ہی نہیں، (ان هی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا و ما نحن بمبعوثین)۔

''وہ تو صرف ایک جھوٹا آدمی ہے کہ جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے اور ہم اس پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔'' (ان هو الا رجل افتری علی الله کذبا و ما نحن له بمومنین)۔

ہٹ دھرم منکروں کا معاد کے خلاف یہ شدید ترین لہجہ ہے بغیر اس کے کہ وہ حیاتِ انسانی کے فلسفے کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ کیا ممکن ہے کہ مصائب و مشکلات سے بھری یہ چند روزہ زندگی تخلیق انسانی کا اصلی ہدف ہو؟

انہوں نے احکام الٰہی کے فلسفے پر بھی غور نہیں کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدائے عادل اچھوں اور بروں کے ساتھ ایک سا سلوک کرے؛ نہ اس دنیا میں ان کے لیے کوئی خاص فرق ہو اور نہ دوسرے جہان میں۔ اسی طرح انہوں نے اپنی ابتدائے آفرینش پر بھی غور نہ کیا کہ پہلے بھی وہ خاک اور منتشر ذرات ہی تھے۔

آیت مبارکہ میں ''تراب'' کو ''عظام'' پر (یعنی مٹی کو ہڈیوں پر) مقدم رکھا گیا ہے جب کہ انسانی جسم پہلے بوسیدہ ہڈیوں میں اور پھر خاک میں تبدیل ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ ''تراب'' گوشت کی طرف اشارہ ہو جو پہلے مٹی بنتا ہے اور ''عظام'' بوسیدہ ہڈیوں کی طرف۔ یا پھر ممکن ہے کہ ''تراب'' گذشتگان اور آباؤ اجداد کی طرف اشارہ ہو جو بالکل مٹی ہو چکے ہیں اور ''عظام'' چل بسنے والے ماں باپ کی طرف۔ یا پھر چونکہ خاک کا زندگی میں بدلنا ہڈیوں کی نسبت بعید تر ہے، اس لیے اسے انہوں نے اپنی گفتگو میں مقدم رکھا ہے۔ بہرحال یہ بات اس مسئلے میں ان کی شدید مخالفت کی عکاسی کرتی ہے۔

فقط ایک بار حیات اور ایک بار مرگ

ساتویں اور آخری آیت میں اس سلسلے میں ہم پھر ایک نئی تعبیر کا سامنا کرتے ہیں، وہ یہ کہ مشرکین عرب اور منکرین معاد بوسیدہ ہڈیوں

اور مٹی وغیرہ کا ذکر کئے بغیر ایک بے دلیل ادعا کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہماری موت اسی پہلی موت کے علاوہ اور کچھ نہیں، ہم ہرگز زندہ ومحشور نہ ہوں گے اور اگر تمہارا یہ کہنا سچ ہے کہ موت کے بعد زندگی ہے تو پھر ہمارے آباء کو زندہ کر کے ہمارے پاس لے آؤ تا کہ وہ تمہاری بات کی سچائی پر گواہی دیں۔(ان هو لاء ليقولون ان هی الا موتتنا الاولی وما نحن بمنشرين فاتوا بابآئنا ان كنتم صدقين)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ ''پہلی موت'' کے سوا کچھ نہیں جب کہ ابتداء میں معلوم ہوتا ہے کہ کہا جاتا ہے ''پہلی حیات'' کے سوا کچھ نہیں۔ایسا کیوں ہے؟

اس مقام پر ہر مفسر نے ایک طرح سے مندرجہ بالا سوال کا جواب دیا ہے، لیکن سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ مراد یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد یہی موت جو اس کے بعد آئے گی، اس کے سوا کوئی حادثہ رونما ہونے والا نہیں۔یعنی کوئی حیاتِ مجدد نہیں ہے۔

تفسیر کشاف میں اس اشکال کو بیان کرنے کے بعد زمخشری کہتا ہے: اس آیت کی نظر اس آیت پر ہے جو کہتی ہے:

اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ

''تم مردہ تھے۔اللہ نے تمہیں زندگی دی، وہ تمہیں پھر مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔'' (بقرہ ۲۸)

یعنی جیسے پہلی موت کے بعد (جب انسان خاک تھا) اس جہان میں تم زندہ ہوئے، دوسری موت کے بعد بھی زندہ ہو گے۔لیکن کافر کہتے کہ جس موت کے بعد زندگی تھی وہی پہلی موت تھی، یعنی زندگی کے بعد کوئی موت نہیں۔[1]

واضح ہے کہ یہ تفسیر بہت پر تکلف ہے۔اصولاً اس کی ضرورت ہی نہیں اور بہتر وہی پہلی تفسیر ہے۔(غور کیجیے گا)

دوسرا سوال جو اس آیت کے بارے میں درپیش ہے یہ ہے کہ ہر ''پہلے'' کا ''دوسرا'' ہونا چاہیے۔لہٰذا ''پہلی موت'' کیسے ''دوسری موت'' کے بغیر ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ ہر اول کا ثانی بھی ہو۔مثلاً ایک شخص نذر مانتا ہے کہ اللہ جو اسے پہلا بیٹا دے گا اس کا نام ''محمد'' رکھے گا اور بہت ممکن ہے کہ اس کے ہاں صرف ایک ہی بیٹا ہو۔یا کوئی شخص جو پہلی کتاب لکھے اسے باپ کے نام اہداء کرے اور کیا خبر کہ دوسری کتاب نہ لکھے۔ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے ناموں میں ایک ''اول'' ہے جب کہ اس کا دوسرا کوئی نہیں۔

نتیجہ کلام

مندرجہ بالا سات آیات سے اور جو ان کے قریب الافق ہیں ان سے مخالفین معاد کی منطق سے ہمیں آشنائی ہوئی۔خصوصاً عصر نزول قرآن کے مخالفین کی منطق معلوم ہوئی۔ان کی تمام باتیں جو عموماً معادِ جسمانی کے انکار پر مبنی نہیں، انہیں ان کے ادعا کی صورت میں خلاصۃ یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

---

[1] تفسیر کشاف، ج ۴، ص ۲۷۹، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

(۱) کیسے ممکن ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں پھر لباس حیات پہن لیں؟

(۲) ہمارا گوشت اور ہڈیاں جب خاک ہو جائیں گی، اس خاک کے ذرات ہر سو بکھر جائیں گے اور زمین کے طول وعرض میں نظروں سے محو ہو جائیں گے۔ پھر کس طرح جمع ہو کر حیات نو پالیں گے؟ یہ باتیں یا اللہ پر افتراء ہیں یا پھر جنون کی علامت۔

(۳) اس دنیا کی حیات اور اس کے بعد موت کے سوا ہماری اور کوئی سرنوشت نہیں ہے۔ کوئی شخص ابھی تک مر کر زندہ نہیں ہوا کہ ہم اس دعویٰ کا اعتبار کریں اور اصولاً یہ ادعا ہے ہی عجیب، محال اور نا قابل قبول۔

اپنے آپ میں مگن یہ مغرور منکرین ایسے ہیں جو اپنی پہلی خلقت کے بارے میں بھی نہیں سوچتے۔ حیات بعد از موت کے نمونے جو ہمیشہ اس زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ان پر بھی غور نہیں کرتے اور اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہمیشہ بے دلیل دعووں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ دعوے اس زمانے میں منحصر نہ تھے اور نہ ہیں۔ ایسی باتیں آج بھی ہم دیگر افراد کی زبانی سنتے رہتے ہیں جن میں بعض فلاسفہ یا دانشور حضرات بھی شامل ہیں۔

بہر حال قرآن نے ان دعووں کے قاطع جواب دیئے ہیں، جو آئندہ کی بحثوں میں آئیں گے۔ یہ ایسے جوابات ہیں کہ منکرین معاد علم و دانش کی جس سطح پر بھی ہوں حتی کہ جو بالکل بے علم ہیں سب کے لیے قاطع کنندہ ہو سکتے ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ وہ واقعاً حق کی تلاش میں ہوں۔

اب ہم دلائل امکانِ معاد کو قرآن مجید کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

پہلا حصہ

دلائل امکانِ معاد

۱۔ اولین خلقت

اشارہ

قرآن مجید میں امکانِ معاد کے اثبات کے لیے بہت سے طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ ان سب کو منطقی استدلال کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور ان طریقوں کو قرآن نے نہایت لطیف تعبیرات کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

ان طریقوں کا خلاصہ، جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، چھ موضوعات میں کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اولین خلقت

۲۔ اللہ کی قدرتِ مطلقہ

۳۔ جہانِ نباتات میں مکرر موت وحیات

۴۔ جنین کے تحولات

۵۔ توانائیوں کی بازگشت

۶۔ معاد کے عینی نمونے

مندرجہ بالا تمام عناوین میں سے ہر ایک کے بارے میں ایک یا متعدد آیات قرآن مجید میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان آیات کا گہرا مطالعہ نہ صرف امکانِ معاد کو ثابت کرتا ہے بلکہ بہت سے دیگر مطالب بھی واضح کر دیتا ہے۔

اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن مجید کی طرف لوٹتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم اولین اور پہلی خلقت سے مربوط آیات کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ﴿۷۹﴾ (یس ۷۸، ۷۹)

(۲) اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾ (ق ۱۵)

(۳) وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ (روم ۲۷)

(۴) اَوَلَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ﴿۱۹﴾ (عنکبوت ۱۹)

(۵) کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ (اعراف ۲۹)

ترجمہ

(۱) اور ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی تخلیق کو بھول گیا۔ کہنے لگا: ان ہڈیوں کو کون زندہ کرتا ہے جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں؟ کہہ دو: وہی انہیں زندہ کرتا ہے جس نے اولین مرتبہ انہیں پیدا کیا اور وہ ہر مخلوق سے آگاہ ہے۔

(۲) (کیا ہم اولین تخلیق سے عاجز ہوئے (کہ آفرینش قیامت پر قادر نہ ہوں؟) لیکن ان سب دلائل کے باوجود) وہ پھر بھی خلقت جدید کے بارے میں شک کرتے ہیں۔

(۳) وہ وہ ہے جس نے آغاز تخلیق کیا، پھر اسے پلٹائے گا اور یہ کام اس کے لیے آسان تر ہے۔

(۴) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح تخلیق کا آغاز کرتا ہے، پھر پلٹاتا ہے؟ یہ کام اس کے لیے آسان تر ہے۔

(۵) جیسے اس نے پہلے تمہیں پیدا کیا (قیامت کے روز پھر) پلٹائے گا بھی۔

تفسیر وجمع بندیٔ آیات

تفسیر وجمع بندیٔ آیات

پہلی آیت میں ایک مشہور واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ عرب کا ایک مشرک ایک بوسیدہ ہڈی لیے رسول اکرمؐ کے پاس آیا۔ اس کا نام ابی بن خلف، یا عاص بن وائل یا امیہ بن خلف تھا۔ ہڈی کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہتا تھا کہ میں اس محکم دلیل کے ساتھ محمدؐ سے جھگڑنے جا رہا ہوں اور معاد کے بارے میں اس کے نظریے کو باطل کروں گا۔

وہ رسولؐ اللہ کے پاس آیا اور آواز دی: اس بوسیدہ ہڈی کو کون پھر سے زندہ کر سکتا ہے؟ کون سی عقل اس دعویٰ کو باور کرتی ہے؟ شاید اسی حالت میں اس نے اپنی بات کی تائید کے لیے ہڈی کا کچھ حصہ نرم کر کے زمین پر پھینک دیا (قال من یحی العظام وھی رمیم)

اس پر قرآن رسول اللہؐ کو حکم دیتا ہے کہ مختلف طریقوں اور مختلف مثالوں کے ذریعے اسے قاطع جواب دو جن میں سے ایک یہی پہلی خلقت کا ذکر ہے جسے قرآن نے نہایت مختصر اور جاذب توجہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ فرماتا ہے: (ونسی خلقه) یہ فراموش کار شخص اپنی پہلی خلقت کو بھول گیا ہے۔

اس کے بعد وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے: کہو: ''اسے وہی زندہ کرے گا جس نے اولین بار اسے پیدا کیا (قل یحییها الذی انشاها اول مرة)۔ اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں آخرکار پراگندہ ہو جائیں گی اور ان کا ہر ذرہ کسی گوشے میں جا پڑے گا، یا اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ ذرات میں پہلی تمام صفات کا لوٹا دینا ممکن نہیں کیونکہ کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، تو یہ ایک بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر مخلوق سے آگاہ ہے (وهو بکل خلق علیم)

''انشاها'' انشاء کے مادہ سے ایجاد اور تربیت کے معنی میں ہے اور یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا جس نے ابتداء میں اسے جب یہ کچھ بھی نہ تھا، وجود بخشا، یقیناً اسے خاک ہو جانے کے بعد بھی زندہ کر سکتا ہے۔

اس آیت میں نسیانِ خلقت سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں دو احتمال موجود ہیں۔ اول یہ کہ انسان نے اپنی خلقت کی ابتداء کو، جو ایک ناچیز نطفے اور بے وقعت قطرۂ آب سے ہے، فراموش کر دیا ہے جس کی وجہ سے تجدید حیات کے مسئلہ میں خدائی قدرت کا منکر ہے۔

دوسرا یہ کہ بنی نوع آدم کی خاک سے خلقت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ابتداء میں اسے خاک سے پیدا کرے اور پھر ایسا ہی امر محال ہو جائے، کیونکہ:

حکم الامثال فیما یجوز وفیما لا یجوز واحد

''یعنی جو چیزیں ایک جیسی ہوں ان کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں حکم یکساں ہے۔''

البتہ یہاں پر ''نسیان'' یا تو حقیقی اور واقعی فراموش کاری ہے یا پھر اس فراموش کار شخص کی طرح ہے جو اگرچہ بھولا نہیں ہے لیکن چونکہ اس نے اپنی تشخیص اور آگاہی کے مطابق عمل نہیں کیا اس لیے منکر ہوئے جا رہا ہے۔

دوسری آیت میں یہی حقیقت ایک منفرد پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ معاد کے منکرین کے جواب میں فرماتا ہے: کیا ہم اولین خلقت سے عاجز آ گئے ہیں؟ (جو روزِ قیامت خلقت جدید پر قادر نہ ہو سکیں) (افعیینا بالخلق الاول)۔

بعد میں اضافہ کرتا ہے: انہیں پہلی خلقت میں کوئی شک نہیں بلکہ غفلت و فراموش کاری کی بناء پر یا تعصب و ضد کی خاطر یا پھر موجودہ شرائط کی وجہ سے (ایسا ہے) کہ کوئی بھی مردہ زندہ نہیں ہوتا'' کیا انہیں خلقت جدید میں کوئی شک و تردد ہے۔'' (بل هم فی لبسٍ من خلق جدید)۔

اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے واضح و آشکار تناقض میں پھنسا لیا ہے جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔

عییینا ''عی'' کے مادہ سے ہے۔ بعض اوقات عجز و ناتوانی کے معنی میں اور کبھی رنج و سختی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پر

مقصود وہی پہلے معنی ہیں۔یعنی ہم پہلی خلقت سے عاجز نہ تھے۔

''خلق اول'' کی تعبیر ہر انسان کی اولین خلقت یا بالخصوص حضرت آدمؑ کی طرف اشارہ ہے یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ذکر کیا ہے کہ خلقت اول سے مقصود جہانِ ہستی ہے، بحث کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتا۔

لبس (''جسن کے وزن پر'') کسی چیز کو ڈھانپنے کے معنی میں ہے۔لباس کو بھی اسی وجہ سے لباس کہتے ہیں کہ یہ بدن کو ڈھانپتا ہے۔لیکن بقول راغب کبھی یہ لفظ امورِ معنوی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ایسی صورت میں حقیقت کو چھپانے کے معنی میں ہے۔زیر بحث آیت میں بھی انہی معنوں میں ہے، یعنی وہ قیامت سے متعلق جہالت اور اشتباہ میں ہیں اور تعصب وضد کی وجہ سے حقیقت ان پر پنہاں ہے۔

تیسری آیت میں اسی ضمن میں ایک دوسری تعبیر دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ ''مبدأ'' حیات اور معاد کا موازنہ ہے۔۔فرماتا ہے: وہ وہ ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسے پلٹا دیتا ہے اور یہ کام اس کے لیے انتہائی آسان ہے۔(**وھو الذی یبدوا الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ**)

کچھ مفسرین نے جملہ ''یبدأ'' کو ماضی کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔یعنی خداوند تعالیٰ نے ابتداء میں خلقت کو ایجاد کیا۔لیکن کیا مانع ہے کہ ''یبدأ'' اسی اصل معنی فعل مضارع میں تفسیر ہو؟ اس امر کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ فعل مضارع یہاں استمرار پر دلالت کرتا ہے آیت کے معنی کچھ یوں ہوں گے۔

''خدا دائماً خلقت کو ایجاد کرتا ہے اور پھر پلٹاتا ہے۔''

یعنی جہانِ ہستی ایک رواں دواں حیات ومرگ اور مستمر مبدأ ومعاد کا مجموعہ ہے۔بنابریں قیامت کے دن امکانِ معاد کے بارے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔

ہماری دنیا مسلسل مرتی ہے، پھر نئی ہو جاتی ہے اور جدید خلقت پالیتی ہے۔اس حساب سے تو معاد یا حیات نو کی طرف بازگشت ایک معمولی وعادی امر ہے اور یہ منکروں کے لیے خوبصورت نپا تلا جواب ہے۔

تعبیر (وھو اھون علیہ) ''(اس کے لیے اعادہ آغاز کی نسبت آسان تر ہے)'' سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ خدا کی قدرتِ مطلقہ وبے پایاں کے مقابل تو آسان ومشکل کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔اس کے لیے تو ہر چیز برابر ہے۔اس کے لیے دنیا کے بڑے بڑے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے اکھاڑ پھینکنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک تنکا اٹھانا۔اس کی قدرت کے مقابل منظومہ شمسی کی خلقت تو خاک کے ایک ذرے کی خلقت کی مانند ہے کیونکہ اس کی بے انتہا قدرت کے مقابلے میں سخت وآسان کوئی معنی نہیں رکھتا۔لیکن ہمارے لیے، جو محدود قدرت کے مالک ہیں، کہتے ہیں کہ چھوٹے پتھر کا اٹھانا آسان ہے لیکن بڑے پتھر کا اٹھانا مشکل!

مفسرین نے اس سوال کے کئی ایک جواب دیئے ہیں لیکن مناسب ترین جواب یہ ہے کہ یہ بات لوگوں کی منطق اور ان کی وسعت نظر کے مطابق ہے۔اگر کوئی کسی کام کو انجام دے تو دوسری بار اس کا انجام دینا آسان تر اور سہل تر ہے، اگرچہ اس قادرِ لایزال کے لیے تمام

چیزیں یکساں ہیں۔[1]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں "اھون" تفضیلی معنی میں نہیں ہے بل کہ "ھین" یعنی آسان کے معنی میں ہے۔

دیگر توجیہات بھی کی گئی ہیں جو چونکہ مناسب نہ تھیں اس لیے ان کے ذکر سے صرف نظر کیا گیا ہے۔

بہرحال آسان و آسان تر کے مفہوم میں لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو اور سطح فکر کو مدنظر رکھا گیا ہے وگرنہ اس کے لیے تو ہر چیز آسان ہے اور آسان تر کا کوئی وجود نہیں۔ بقول شاعر

چوں قدرت او منزہ از نقصان است
آوردنِ خلق و بردنش یکساں است
نسبت بہ من و تو ہرچہ دشوار بود
در قدرتِ پر کمال او آسان است

(چونکہ اس کی قدرت عیب و نقص سے پاک ہے لہٰذا اس کے لیے مخلوق کا لانا اور اسے لے جانا یکساں ہے اور ہر وہ چیز جو میرے اور تمہارے لیے مشکل ہے اس کی باکمال قدرت کے سامنے آسان ہے)۔

جو کچھ گذشتہ آیت میں آچکا تھا چوتھی آیت میں ایک نئے انداز سے بیان ہوا ہے۔ معاد کے منکرین کے جواب میں فرماتا ہے: ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسے پلٹاتا ہے؟ یہ کام خدا کے لیے آسان و سہل ہے۔'' (اولم یروا کیف یبدی اللہ الخلق ثم یعیدہ ان ذلک علی اللہ یسیر)۔[2]

فعل مضارع کی صورت میں "یبدء" (ابتداء کرتا ہے) اور "یعید" (پلٹاتا ہے) کی تعبیر ہوسکتا ہے تاکید ہو اس کے لیے کہ جو ماقبل آیت میں کہا گیا ہے کہ خدا ہمیشہ ایجاد و اعادہ کرتا رہتا ہے اور یہ جہان دائماً نو بہ نو ہوتا اور بدلتا رہتا ہے اور ہر دن مبدء و معاد اور آغاز و تکرار ہے۔

خصوصاً اس انداز سے جو فرمایا گیا ہے کہ:

اولم یروا... (کیا انہوں نے نہیں دیکھا) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دائمی و مستمر ایجاد و اعادہ کا مشاہدہ سب کے لیے ممکن پذیر ہے۔

---

[1] اس وجہ کو بہت سے مفسرین نے بہترین تفسیر یا ان میں سے ایک قرار دیا ہے۔ (مجمع البیان ج ۸ ص ۳۰۲، روح البیان ج ۷ ص ۲۶، قرطبی، ج ۷ ص ۵۱۰۴ اور دیگر تفاسیر)

[2] یاد رکھنا چاہیے کہ یبداء (باب افعال سے) اور یبداء (مجرد ثلاثی) دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی کسی چیز کی ابتداء کرنا یا اسے واضح کرنا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ "یعید" فقط روزِ قیامت ہی سے متعلق ہو۔ایسی صورت میں آیت کی تفسیر پھر کچھ یوں ہوگی: ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا نے مخلوق کو کس طرح پیدا کیا۔وہ اسی طرح اسے پلٹا بھی سکتا ہے۔''

"ان ذلك على الله يسير" کی اصطلاح سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے لیے ہر چیز آسان ہے اور ممکن ہے یہ دلیل ہو ان لوگوں کے لیے جنہوں نے گذشتہ آیت میں "اهون" کو "هين" (آسان) کے معنی میں بیان کیا ہے۔

بہرحال معاد کے تمام منکرین اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کس طرح مردہ زمین سے سبزہ پیدا ہوتا ہے؟ کس طرح انسان عرصۂ حیات میں قدم رکھتے ہیں؟ کس طرح بے جان درخت سبز پتوں اور پھلوں سے لد جاتے ہیں؟ اور کس طرح اس عالم میں ہر وقت ایک نئی خلقت معرضِ وجود میں آتی ہے؟

کیا ان تمام موجودات کے خالق کے لیے ان سب کا پلٹانا مشکل ہے جب کہ یہ ہر دو کام اس کی قدرت کے سامنے مساوی ہیں؟ کسی چیز کے امکان کے لیے بہترین دلیل اس کا وجود ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں گفتگو کا لب لباب انتہائی مختصر جامع اور پر معنی جملہ میں بیان کیا گیا ہے۔فرماتا ہے: جیسے تمہاری ابتداء کی (ویسے) واپس پلٹو گے۔'' (كما بداء كم تعودون)

یہ جملہ سورہ اعراف کی آیت ۲۹ کا کچھ حصہ ہے اور یہ درحقیقت امکان معاد پر قرآن کا مختصر ترین اور روشن ترین استدلال گردانا جاتا ہے۔فرماتا ہے: ''حیاتِ نو کو پہلی اور اولین حیات پر قیاس کرو۔'' اور یہ ایک عقلی امر میں ایک منطقی قیاس ہے وہ لوگ سخت اشتباہ میں ہیں جو ایسی آیات کو تعبدی احکام میں قیاس کے جواز پر دلیل سمجھتے ہیں کیونکہ قیاس اس میں جائز ہے جب حکم اول کی دلیل اور علت و فلسفہ واضح ہو جائے تا کہ اس کا وجود حکم ثانی میں بھی ثابت ہو سکے، بالکل اسی طرح جیسے متذکرہ بالا آیت میں معاد کی بحث کے ضمن میں اور اسی طرح کی دوسری آیات میں نظر آتا ہے۔

چونکہ ہم جانتے ہیں کہ اولین خلقت کی دلیل قدرت خدا ہی ہے اور یہ مفہوم عینا خلقت مجدد میں بھی موجود ہے، لیکن فرعی احکام میں قیاس کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ نہ تو ان کا فلسفہ واضح ہے اور نہ ہی ان کی علت پر صراحت سے کوئی دلیل بیان ہوئی ہے اور ایسا قیاس ظنی و غمینی ہوتا ہے نہ کہ یقینی و عقلی۔

بہرحال وہ تفسیر جو اوپر بیان ہوئی ہے اسی ضمن میں آنے والی دیگر قرآنی آیات کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مکمل طور پر واضح ہے۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جیسے ابتداء میں آپ کو خوش بخت، بد بخت، مومن اور کافر پیدا کیا گیا ہے، آپ کا اختتام اور عاقبت کار بھی یہی ہوگا۔[1]

شاید بعض لوگ چاہتے تھے کہ اس طرح مسئلہ جبر میں اپنے فاسد عقیدے کے لیے کوئی دلیل کی راہ تلاش کریں درآں حالیکہ یہاں تو

---

[1] فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اسے دو احتمالات میں سے ایک احتمال کے طور پر بیان کیا ہے۔(جلد ۱۴ صفحہ ۵۸)

بات ہی انسان کی اصل آفرینش، اس کی ابتدائی خلقت اور پھر اس کے جدید زندگی کی طرف پلٹ جانے سے متعلق ہے، بالخصوص جب کہ آیت میں اجباری سعادت وشقاوت اور مومن وکافر کی طینت کے مسئلے میں کوئی ہلکا سا اشارہ بھی موجود نہیں۔

نتیجہ بحث

ان آیات سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ معاد کے مخالفین کے انکار کی اصل وجہ ان کا اس جہان کی اولین آفرینش اور انسانوں کی پہلی خلقت سے متعلق بے توجہی اور غفلت برتنا ہے۔ چونکہ اگر وہ کچھ تھوڑا سا بھی اس کے بارے میں سوچتے تو خود اپنے سوال کا جواب پا لیتے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ انسان کی خلقت ابتداء میں تو خاک سے واقع پذیر ہو لیکن بعد میں ایسا غیر ممکن ہو؟

توضیحات

اس دن کہ جب انسان خلق ہوا

سائنس دان کہتے ہیں کہ جب زمین سورج سے جدا ہوئی تو جھلسا دینے والی آگ کی مانند تھی۔ اربوں سال گزرنے کے بعد زمین تدریجاً سرد ہونا شروع ہوئی اور بادلوں کے وہ ٹکڑے جنہوں نے اس کرۂ خاکی کو ہر طرف سے گھیرا ہوا تھا، بارش میں تبدیل ہو گئے۔

ان سیلابی بارشوں کا پانی جب اس گرم زمین پر پڑتا تو ابلنا شروع ہو جاتا اور پھر سے بادلوں کی صورت میں تبدیل ہو جاتا اور اس طرح یہ کرۂ خاکی سرد سے سرد تر ہوتا گیا۔

بالآخر زمین کے پست حصوں میں پانی جمع ہوتا گیا اور سمندر بنتے گئے۔ لیکن کہیں بھی زندگی کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔

نہ کوئی سبزہ اگتا تھا۔

نہ کوئی پرندہ اڑتا تھا اور نہ کسی طائر کے چہچہے تھے اور نہ ہی ان عظیم سمندروں میں کسی زندہ موجود کی حرکت تھی۔

کیونکہ ابھی تک زمین بہت زیادہ گرم تھی اور اس پر زندگی ممکن نہ تھی۔

جب زمین ٹھنڈی ہوئی تو خداوند عالم کی قدرت سے دریاؤں اور صحراؤں میں زندگی کے اولین آثار نمایاں ہونے لگے۔ مختلف نوع کے جاندار ظاہر ہوئے اور آخر کار خدا نے انسان کو خلق کیا۔

بنابریں اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان ابتداء میں خاک سے پیدا ہوا اور پھر دوبارہ خاک میں پلٹ جائے گا، پھر اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ وہ دوبارہ خاک سے آفرینش مجدد کا لباس زیب تن کر لے۔

البتہ معمول کی زندگی سے انس، کوتاہ فکری اور انسانی فکر وسوچ پر پڑنے والے ضد وتعصب کے پردے اسے اجازت نہیں دیتے کہ روشن حقیقتوں کو دیکھے، سمجھے یا ان کا اعتراف کرے۔

۲۔اللہ کی قدرت مطلقہ

اشارہ

نئی زندگی کی طرف بازگشت کے امکان کے اثبات کا دوسرا راستہ اللہ کی بے پایاں قدرت کی طرف توجہ ہے کیونکہ معاد کی بحث توحید اور اللہ کی صفات ثبوتیہ وسلبیہ کو قبول کرنے کے بعد پیش آتی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ اللہ کی صفات ثبوتیہ میں سے ایک اس کی قدرت مطلقہ اور ہر چیز پر اس کا اختیار ہے۔ہر چیز پر اس کی قدرت کے اثبات کے لیے ایک بات تو یہ ہے کہ وہ واجب الوجود ایک لامحدود ہستی کا حامل ہے اور نتیجتاً اس کی قدرت بھی لامحدود ہے۔لیکن اس کے علاوہ اس کی قدرت کے اثبات کے لیے جہانِ خلقت کی عظمت کو بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

آسمانوں کی وسعتیں،منظومہ،کہکشائیں،ثابت وسیار کواکب کی کثرت وعظمت،طرح طرح کے زندہ موجودات جن میں پودے اور حیوانات بھی شامل ہیں،زندہ خلیوں کی بناوٹ میں عجیب ریزہ کاریاں اور ایٹمی ذرات کی حیران کن تشکیل سب اس کی قدرتِ بے پایاں پر شاہد ہیں۔اس بنیاد کو مان لینے کے بعد اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے اور یہ کہ کیسے ممکن ہے کہ منتشر خاک پھر سے جمع ہو اور ایک جسم میں ڈھل کر نئے سرے سے لباس حیات پہن لے۔

یہ وہ مطالب ہیں جن کے بارے میں ہم اس حصے میں گفتگو کریں گے۔قرآن مجید کی متعدد آیات میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔مزید وضاحت سے پہلے ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

(۱) لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝۵۷ (مومن ۵۷)

(۲) اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا۝۹۹ (بنی اسرائیل ۹۹)

(۳) اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝۳۳ (احقاف: ۳۳)

(۴) اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ

بَلٰی ۚ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۱﴾ (یس ۸۱)

(۵) قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾ [1] (عنکبوت ۲۰)

ترجمہ

(۱) آسمانوں اور زمین کی خلقت انسانوں کی خلقت سے بڑھ کر ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۲) کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ان جیسا اور بھی پیدا کرنے پے قادر ہے (اور انہیں حیات نو کی طرف پلٹا سکتا ہے) اس نے ان کے لیے ایک قطعی انجام قرار دیا ہے، لیکن ظالم لوگ کفر و انکار کے علاوہ کچھ نہیں مانتے۔

(۳) کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور ان کی خلقت سے ناتواں نہیں ہو گیا، مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ ہاں! وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۴) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، کیا وہ اس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ ان جیسے (خاک شدہ انسانوں کو) پیدا کر لے؟ ہاں! (وہ ایسا کر سکتا ہے) اور وہ پیدا کرنے والا دانا ہے۔

(۵) کہو: زمین میں چلو پھرو اور دیکھو، اللہ نے کس طرح تخلیق کا آغاز کیا۔ پھر (اسی طرح) اللہ جہان آخرت کو پیدا کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر و جمع بندی آیات

اس کے لیے ہر چیز آسان ہے

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے کا موازنہ تمام آسمانوں اور زمین کی خلقت سے کرتا ہے۔ فرماتا ہے: آسمانوں اور زمین کی خلقت انسانوں کی خلقت سے زیادہ مشکل ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (لخلق السموت والارض اکبر من خلق الناس و لکن اکثر الناس لا یعلمون)

اس آیت کی تفسیر میں فخر الدین رازی کہتے ہیں:

---

[1] دیگر آیات میں بھی یہی مفہوم موجود ہے۔ مثلاً شوریٰ ۹ اور حدید ۲

یہ اس حقیقت کے بیان کے لیے ایک واضح استدلال ہے کہ اللہ حیاتِ انسانی کے اعادہ پر قادر ہے اور واضح کرتی ہے کہ منکرین معاد کسی دلیل و برہان کے بغیر صرف، حسد جہل، کفر اور تعصب کی بنا پر اختلاف اور انکار کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ [1]

دیگر مفسرین مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں اور قرطبی نے روح البیان میں بھی تصریح کی ہے کہ اس آیت کا روئے سخن منکرین قیامت کی طرف ہے اور کہتی ہے: جو اہم تر اور بڑے کام پر قادر ہو، مثلاً جیسے باعظمت آسمانوں اور زمین کی خلقت ہے (ان میں موجود اس قدر حیرت انگیز اور حیران کن مخلوقات کے ساتھ) کس طرح سے مردوں کو حیاتِ نو عطا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ [2]

جملہ "ولکن اکثر الناس لایعلمون" جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، اس معنی میں نہیں ہے کہ واقعاً اکثر لوگ آسمانوں کی خلقت، جس میں اس قدر نظم وحساب موجود ہے، کی انسان کی حیات نو کے مقابلے میں عظمت کو نہیں جانتے، بلکہ یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اس اہم امر سے غفلت کرتے ہیں اور اس پر غور وفکر نہیں کرتے۔ تعصب اور ہوائے نفس کی پیروی کی وجہ سے وہ اس سے معاد کے مسئلے کے لیے ضروری نتیجہ اخذ نہیں کرتے۔ لہٰذا قرآن انہیں بے خبر جاہلوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ [3]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس زمانے میں ابھی آسمانوں کی عظمت اچھے طریقے سے سمجھی نہ گئی تھی۔ کم ہی کوئی ایسا شخص تھا جو ان عظیم اسرار سے آگاہی رکھتا ہو جو آج علم و دانش کے زیر سایہ پہچانے گئے ہیں۔ لیکن قرآن جس کا سرچشمہ اللہ کا علم بے پایاں ہے، نے ان اسرار سے پردہ ہٹایا۔

ضمناً یہ توجہ بھی رہے کہ "لخلق" کا لام ظاہراً "لام ابتدا" ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے۔

منکرین معاد کہ جو ہڈیوں کے بوسیدہ اور خاک ہوجانے کے بعد انسان کی تخلیق نو کے منکر تھے، ان کا ذکر کرنے کے بعد دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے وہ اس پر قادر ہے کہ انہی جیسے اور پیدا کرلے (اولم یروا ان اللہ الذی خلق السموت والارض قادر علی ان یخلق مثلھم)

"مثل" کا کلمہ ممکن ہے کہ انسانوں کی تخلیق نو کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ایسا کرنا مثل سابق ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ اللہ قادر ہے کہ ان انسانوں کی طرح اور انسان نئے سرے سے پیدا کرلے۔ جب وہ اس پر قادر ہے تو پھر موجود انسانوں کی تجدید حیات آسان تر ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بدن جو کچھ بھی ہوں بالکل وہی پہلے والے نہیں ہیں، کیونکہ اولین موادِ نئی کیفیتوں کے ساتھ لوٹ کر آتا ہے۔ اسی لیے اسے "مثل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن انسانی روح وہی ہے اور اس کے جسم کے ساتھ تعلق کے بعد ہر لحاظ سے وحدت حاصل ہو

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۲۷ ص ۷۹

[2] تفسیر طبرسی ج ۸ ص ۵۱۰۹، قرطبی ج ۸ ص ۵۷۶۹، روح البیان ج ۸ ص ۱۹۹

[3] مجمع البیان، کشاف، روح المعانی زیر بحث آیت کے ذیل میں

جاتی ہے،لہٰذاانسان تجدید حیات کے وقت گذشتہ کی مثل بھی ہیں اور ایک لحاظ سے وہی بھی۔(غور کیجیے گا)

اس کے بعد آیت میں منکرین کے دوسرے سوال کا جواب دیتا ہے وہ کہتے تھے: اگر قیامت حق ہے تو پھر آتی کیوں نہیں؟ قرآن کہتا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان کے پلٹنے کے لیے ایک قطعی مدت قرار دی ہے، چاہیے کہ انتظار کریں(وجعل لهم اجلا لا ریب فیه)۔

دوسرے الفاظ میں: اس نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کا صحیح وقت متعین کر رکھا ہے اور کسی معمولی سے فرق کے بغیر وہ بالکل اسی وقت رونما ہوگی۔

لیکن ظالم کفر وانکار کے سوا کچھ نہیں مانتے (کیونکہ ہوائے نفس، تعصب اور حق دشمنی نے ان کی فکر پر پردہ ڈال رکھا ہے (فابی الظلمون الا کفوراً)

یہی مطلب تیسری آیت میں ایک اور انداز سے بیان کیا گیا ہے۔فرماتا ہے: کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے (ایسے عظیم) آسمانوں اور (ایسی شگفت انگیزیوں) کے ساتھ زمین کو پیدا کیا ہے اور ان سے ہرگز عاجز نہیں ہوا مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔(اولم یروا ان اللہ الذی خلق السموات والارض ولم یعی بخلقھن بقادر علی ان یحیی ے الموتی بلی انه علی کل شیء قدیر)

"اولم یروا" (کیا انہوں نے نہیں دیکھا) چشم عقل سے مشاہدے کے معنی میں ہے۔لہٰذا مفسرین نے اسے اولم یعلموا (کیا وہ نہیں جانتے) کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔بعض نے علم وآگاہی کہ جو بصیرت اور دقت نظر کے ہمراہ ہو، مراد لی ہے۔

"لم یعی" "عی" کے مادہ سے عجز وناتوانی کے معنی میں ہے جو زیادہ چلنے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔نیز یہ ہر طرح کی ایسی عجز وناتوانی کے معنی میں ہے جو کسی کام کی ذمہ داری یا کسی سے بات کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔"داء عیاء" کہ جو درد بے درماں کے معنی میں ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ایسا درد واقعاً تھکا دینے والا ہوتا ہے۔

بعض نے اس کے معنی "جہل" بھی کئے ہیں، لیکن یہ معنی اس آیت سے مناسبت نہیں رکھتے۔

ظاہر ہے کہ خستگی وناتوانی کا تصور ایسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ جب کسی شخص کی قدرت محدود ہو۔لیکن اللہ کہ جس کی قدرت لامحدود ہے، اس کے بارے میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بہرحال ممکن ہے یہ تعبیر یہودیوں کی اس خرافات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ کہتے تھے: اللہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کر کے تھک گیا ہے اور اس نے ہفتہ کو یوم آرام قرار دیا۔بعد ازاں یہ معنی ایک روایت کے طور پر باقی رہا۔

اس بات کا باطل ہونا اتنا واضح ہے کہ بحث کی ضرورت نہیں۔

چوتھی آیت میں منکرین معاد کے متعدد سوالوں کا جواب ہے۔نیز اس شخص کا جواب بھی جو رسول اللہؐ کی خدمت میں ہاتھ میں بوسیدہ ہڈی لیے آیا تھا اور کہتا تھا: "من یحیی العظام وھی رمیم" (بوسیدہ ہڈی کو کون زندہ کرے گا)۔اللہ فرماتا ہے: کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو (اس وسعت، عظمت اور تعجب انگیزیوں کے ساتھ) پیدا کیا ہے قادر نہیں ہے کہ ان جیسے انسانوں کو پیدا کرے؟ (اولیس الذی

خلق السموت والارض بقادر علی ان یخلق مثلھم)

ہاں قادر ہے اور وہ خلاق علیم ہے۔(بلی وھو الخلاق العلیم)

ظاہر ہے جب آسمانوں کا ذکر آتا ہے تو تمام کرات، ستارے اور کہکشاں اس میں آجاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سائنسدانوں کے تازہ ترین انکشافات کے مطابق ہمارا منظومہ شمسی MILKY WAY کی معروف کہکشاں کا حصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کہکشاں میں ایک سو ارب سے زیادہ ستارے ہیں جن میں سے ہمارا سورج متوسط ستاروں میں سے ایک ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بڑی ٹیلی سکوپس تقریباً ایک ارب کہکشاؤں کا پتہ دے چکی ہیں۔ اگر ہم اس عدد کو آپس میں ضرب دیں تو کرات آسمانی کی حیرت کن تعداد کا اجمالاً اندازہ لگا سکتے ہیں، جب کہ یہ بھی آج کے انسان کی معلومات کی حد ہے۔ شاید کل اور ایسے جہان منکشف ہوں کہ جو کچھ ہم آج جانتے ہیں، یہ دنیا اس کے مقابلے میں حقیر و ناچیز ہو۔

اسی طرح سے جب زمین کہا جاتا ہے تو اس کے تمام اسرار اور تعجب انگیزیاں اس میں آجاتی ہیں۔

جس کسی نے اس عظیم، عجیب اور منظم جہان کو پیدا کیا ہے، کیا وہ انسان کو حیاتِ نو عطا کرنے سے ناتواں ہے؟

"خلاق" (بہت خلق کرنے والا) ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ اللہ ہمیشہ مصروف خلقت ہے اور ہر روز نئی موجودات کو پیدا کرتا ہے اور کچھ موجودات کو ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح ہر روز ایک احیاء جدید اور معادِ تازہ ہے۔ اسی لیے "خلاق" کہ جو مبالغے کا صیغہ ہے کا اس پر اطلاق ہوا ہے۔

"علیم" بھی اس نکتے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اگر انسان مر جائیں، خاک ہو جائیں اور ان کے ذرے ہر طرف بکھر جائیں تو ان کی جمع آوری اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل نہیں جو عالم و آگاہ ہے، جیسا کہ ان کی عمر بھر کے اعمال کا حساب رکھنا بھی کوئی پیچیدہ معاملہ نہ ہوگا (توجہ رہے کہ "علیم" اس مقام پر صفت مشبہ ہے اور چونکہ "خلاق" کے ساتھ آیا ہے جو صیغہ مبالغہ ہے، لہٰذا تاکید کے لیے ہے)۔

زیر بحث پانچویں اور آخری آیت میں منکرین معاد کو ایک حسی اور تجربی طریقے سے دعوت دی گئی ہے۔ قرآن رسول اللہؐ سے فرماتا ہے: ان سے کہو: جاؤ اور زمین میں چلو پھرو اور پھر دیکھو کہ اللہ نے آغازِ خلقت کس طرح سے کیا ہے؟ پھر (جان لینا کہ جو اس طرح طرح کی مخلوق پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے) وہی جہان آخرت کو پیدا کرے گا کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے (قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدا الخلق ثم اللہ ینشی النشاۃ الاخرۃ ان اللہ علی کل شیء قدیر)

"سیروا فی الارض" اور زمین میں چلنا پھرنا انسان کو اس لحاظ سے آغازِ خلقت سے آگاہ کرتا ہے کہ جب زندگی اس کرہ زمین پر پیدا ہوئی ان اولین ایام سے زندہ موجودات کے آثار اس کے مختلف طبقوں میں موجود ہیں اور ان کے مطالعے سے آج دانشور موجودات زندہ کے بہت کے اسرار کا کھوج پا لیتے ہیں۔ نیز ممکن ہے کہ کرہ زمین اور اس کے بے جان موجودات کے آغازِ خلقت کے اسرار کا کھوج لگانا مراد ہو کیونکہ زمین کے مختلف طبقات کے مطالعے سے طرح طرح کے عناصر اور مرکبات آشکار ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان مکرر تخلیقات کی طرف اشارہ ہو جو ہر روز اس کرہ خاکی پر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ بہت سے موجوداتِ زندہ ہر روز عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اور بہت

سے چل بستے ہیں۔

وہ خدا جوان سب تخلیقات اور تحولات حیات پر قادر ہے، مردوں کو زندہ کرنے سے کیونکر عاجز ہوگا؟ اس طرح حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ سے انسان کی حیاتِ مجدد کے امکان کو ثابت کرنے کے لیے استفادہ کیا گیا ہے۔

البتہ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ انسان کی اولین خلقت کی طرف اشارہ ہو اور تجدید خلقت پر خلقت اول کے ذریعے قیاس عقلی قائم کیا گیا ہو، اس صورت میں یہ آیت گذشتہ آیات کے گروپ میں قرار پائے گی، لیکن ہر صورت میں اصل مدعا پر ایک شاہد ہے۔

جو کچھ ہم تفسیر میں بیان کر چکے ہیں اس سے اس سوال کا جواب بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن انسانوں کو زمین میں سیر کی کیوں دعوت دیتا ہے اور انسان کس طرح سے آغاز خلقت کو دیکھیں جب کہ آغاز آفرینش کا زمانہ تو لاکھوں یا کروڑوں سال پہلے کا ہے اور آج قابل مشاہدہ نہیں۔

اس سوال کے جواب میں تین باتیں سطور بالا میں ذکر کی گئی ہیں۔ (غور کیجیے گا)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہاں معاد کے لیے "نشاۃ آخرت" کی تعبیر استعمال کی گئی ہے اور جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "نشاۃ" کسی چیز کی ایجاد اور نشوونما کے معنی میں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت میں آفرینش تازہ بھی ہے اور نموئے جدید بھی۔

نتیجہ بحث

یہ آیات امکان معاد کے منکرین کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلاتی ہے کہ کیا تم اللہ کی قدرت مطلقہ کو مانتے ہو یا نہیں؟ اگر نہیں مانتے تو ایک نظر جہانِ آفرینش پر ڈالو، آسمان، ثابت و سیار ستارے، کہکشائیں اور منظومے اور ایک نظر زمین پر ڈالو اور اس کے محیرات و عجائبات کو دیکھو اور دیکھو کہ کس طرح ایک نظم و قانون ان سب پر حکم فرما ہے۔

کیا ممکن ہے کہ قدرت کی ان سب نشانیوں کو دیکھو اور پھر بھی حق تعالیٰ کی قدرت مطلقہ میں شک کرو؟

نیز اگر تمہارا اس کی قدرت مطلقہ پر ایمان ہے تو پھر معاد اور مردوں کے زندہ کرنے کے لیے مسئلے میں کیونکر شک کرتے ہو اور اسے عجیب و غریب و نا قابل قبول قرار دیتے ہو؟

۳۔احیاءارض

اشارہ

معاد کا ایک اور رخ جسے قرآن مجید نے پیش کیا ہے اور اس مطلب کے اثبات کے لیے اسے ایک خوبصورت علامت قرار دیا ہے اور پھر اسے سب کی آنکھوں کے سامنے رکھا ہے، وہ عالم نباتات میں موت کے بعد پیدا ہونے والی زندگی ہے۔

وہی رخ جو ہر سال ہمارے سامنے لوٹ کے آتا ہے اور یہ منظر ہم جتنے سال جیتے ہیں اتنی دفعہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہی رخ قیامت عظمی، محشر کبریٰ، احیاء اموات اور زندگی کی طرف پھر سے پلٹ آنے کا ایک نمونہ ہے۔

زندگی اور موت کا قانون ہر جگہ یکساں ہے۔ اگر انسان کا موت اور خاک ہوجانے کے بعد پھر زندگی کی طرف لوٹ آنا محال ہے تو پھر یہ اتنے نباتات جو مر جاتے ہیں، بوسیدہ ہوجاتے ہیں، خاک ہوجاتے ہیں حیاتِ تازہ پا کر پھر عرصہ وجود میں قدم کیوں رکھتے ہیں، مردہ زمینیں حیات بخش بارش کے بعد کیوں کروٹ بدلتی ہیں اور حرکت میں آجاتی ہیں اور لباس حیات پہن لیتی ہیں۔ پودوں کا اگنا، شگوفوں کا پھوٹنا اور پھولوں کا خندہ کناں ہونا، سب زندگی کی علامتیں ہیں اور یہ سب مل کر شور برپا کر دیتے ہیں۔

قرآن نے سب انسانوں کی توجہ اس مسئلے کی طرف مبذول کروائی ہے۔ اس سلسلے کی اہم آیات کا نمونہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں اور ان آیات کو گوش جان سے سنتے ہیں:

(۱) وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ﴿۹﴾ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾ (ق ۹ تا ۱۱)

(۲) يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ (روم ۱۹)

(۳) فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ (روم ۵۰)

(۴) وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ

مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۭ بَهِيۡجٍ ۝٥ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَـقُّ وَاَنَّهٗ يُحۡىِ الۡمَوۡتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝٦ (حج ۵،۶)

(۵) وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الۡاَرۡضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ ؕ اِنَّ الَّذِىۡۤ اَحۡيَاهَا لَمُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝٣٩ (حم السجدۃ ۳۹)

(۶) وَاللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيۡرُ سَحَابًا فَسُقۡنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحۡيَيۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوۡرُ ۝٩ (فاطر ۹)

(۷) وَهُوَ الَّذِىۡ يُرۡسِلُ الرِّيٰحَ بُشۡرًا ۢ بَيۡنَ يَدَىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتۡ سَحَابًا ثِقَالًا سُقۡنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنۡزَلۡنَا بِهِ الۡمَآءَ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰى لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ۝٥٧ (اعراف ۵۷)

ترجمہ

(۱) اور آسمان سے ہم نے بابرکت پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے باغات اور اجناس کو کہ جو بوئے جاتے ہیں، نشوونما دی، اور بلند قامت کھجور کے درختوں کو جن کا پھل باہم ملا ہوا ہوتا ہے۔ یہ سب بندوں کو روزی دینے کے لیے ہے اور ہم نے بارش کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ قیامت میں مردوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہے۔

(۲) وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے اور زمین کو موت کے بعد زندگی عطا کرتا ہے۔ اسی طرح روزِ قیامت تم بھی نکالے جاؤ گے۔

(۳) اللہ کی رحمت کے آثار دیکھو کہ وہ کیسے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ وہی (جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا ہے) قیامت میں مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۴) تو زمین کو خشک اور مردہ دیکھتا ہے۔ جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو اس میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے، نمو کرتی ہے اور طرح طرح کے خوبصورت پودے اگاتی ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ جان لو کہ اللہ حق ہے، مردوں

کوزندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۵) اس کی آیات میں سے یہ ہے کہ تو زمین کو خشک اور خاضع دیکھتا ہے، لیکن جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ حرکت میں آجاتی ہے اور نمو پاتی ہے۔ وہی جس نے اسے زندگی بخشی، مردوں کو بھی زندہ کرتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۶) اللہ وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا کہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں۔ ان بادلوں کو ہم مردہ زمین کی طرف چلاتے ہیں اور اس کے وسیلہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتے ہیں۔ قیامت بھی اس طرح سے ہے۔

(۷) وہ، وہ ہے جو ہواؤں کو اس کی (بارانِ) رحمت کی خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے تاکہ جب وہ بوجھل بادلوں کو (اپنے دوش پر) اٹھائیں اس وقت ہم انہیں مردہ زمینوں کی طرف بھیجیں، اس کے ذریعے سے ہم (حیات بخش) پانی نازل کرتے ہیں اور اس کے ذریعے ہم ہر طرح کا پھل (اندھیری مٹی سے) نکال لاتے ہیں اور ایسے ہی (جیسے ہم نے مردہ زمینوں کو زندہ کیا ہے) مردوں کو (قیامت میں) زندہ کریں گے، تاکہ تم متوجہ ہو۔

تفسیر وجمع بندی آیات

قیامت مردہ زمینوں کی نئی زندگی کی طرح ہے

پہلی آیت میں حیات کے اصلی سرچشمہ یعنی بارش کے حیات بخش قطروں کا ذکر ہے۔ فرمایا گیا ہے: ''ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے باغوں اور بوئے جانے والے اناجوں کو اگایا (ونزلنا من السمآء مآء مبارکا فانبتنا به جنات وحب الحمید)

اس طرح پھلوں کے تمام باغات، اناج کے کھیتوں اور غذائی اجناس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[1]

اس کے بعد قرآن ان میں سے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے کھجور کے پھلدار درختوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس کا اکمل واتم نمونہ ہے۔ ارشاد فرماتا ہے: اور اس طرح ہم نے کھجور کے بلند قامت درخت اگائے جس پر پھل باہم ملا ہوا ہے۔ (والنخل باسقات لها

---

[1] توجہ رہے کہ ''حب الحصید'' کے معنی ہیں ایسے دانے کہ جو بوئے جانے کے قابل ہوں ''حصید'' ''محصود'' کے معنی ہے یعنی ''بوئے ہوئے''۔

طلع نضید)۔[1]

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ ایک طرف تو کھجور کے بلند قامت درختوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اسی مردہ زمین سے اگے اور ایک ناچیز دانے سے حیران کن اور ناقابل یقین انداز سے پروان چڑھے ہیں اور دوسری طرف باہم ملے ہوئے ان کے پھل کی طرف جسے وہ آسمان کی بلندیوں کی طرف اپنے ساتھ اٹھالے جاتے ہیں۔ اس کا شیریں، حیات بخش پھل جو ایک اعلیٰ غذا ہے جس میں طرح طرح کا ایسا حیاتیاتی مواد ہے جو انسانی جسم کی ضرورت ہے۔[2]

آخر کار قرآن مجید نتیجہ یوں اخذ کرتا ہے: ہدف یہ ہے کہ ہم بندوں کو روزی عطا کریں (رزقا للعباد)۔

اس (بارش) کے ذریعے ہم نے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ (واحیینا به بلدة میتا)۔[3] مردوں کا زندہ ہونا بھی اسی طرح ہے (کذلك الخروج)

یہ آیۃ اس حقیقت کو بڑی صراحت سے دہراتی ہے کہ قیامت میں انسانوں کا خروج اسی بنیاد پر ہے جس بنیاد پر پودے پھول، اناج کے دانے اور درختوں کے رنگا رنگ پھل نکلتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جسے ہم ہر سال دیکھتے ہیں لیکن چونکہ ہم عادی ہو چکے ہیں اس لیے اسے ایک سادہ سا مسئلہ سمجھتے ہیں اور انسانوں کا پھر سے جی اٹھنا چونکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، اس لیے کچھ لوگ اسے پیچیدہ اور بعض محال خیال کرتے ہیں، حالانکہ دونوں پر ایک ہی طرح کے قوانین حکم فرما ہیں۔

دوسری آیت میں اس مسئلے کو ایک اور انداز سے پیش کیا گیا ہے، فرماتا ہے: ''اللہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے (یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی)

یہ فاصلہ جو آپ کو موت و حیات کے درمیان نظر آتا ہے، اس کی ذات پاک کے لیے کچھ بھی نہیں۔ وہ مسلسل زندوں کو مردوں میں سے اور مردوں کو زندوں میں سے نکالتا ہے (توجہ رہے کہ ''یخرج'' فعل مضارع کا صیغہ ہے جو تسلسل پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی یہ اس کا ہمیشہ کا کام ہے)۔

لہٰذا اس دنیا کے خاتمے کا نمونہ جو حیات سے موت کے نکلنے سے عبارت ہے اور اسی طرح معاد کا نمونہ کہ جو موت سے حیات کے نکلنے سے عبارت ہے، تمہاری آنکھوں کے سامنے دہرایا جاتا رہتا ہے اگرچہ بہت محدود پیمانے پر ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اس میں کون سی تعجب کی بات ہے

---

[1] ''باسقات'' ''باسق'' کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں مرتفع اور بلند۔

[2] ''طلع'' کھجور کے درخت کے پھل کو کہتے ہیں، جب کہ وہ شروع میں ظاہر ہوتے ہیں اور ''نضید'' باہم ملے ہوئے اور پے در پے کے معنی میں ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ بلند قامت درختوں کا پھل بہت کم ہی خوشہ دار ہوتا ہے، جب کہ کھجور کے درخت کے بڑے بڑے اور بھاری خوشے بہت ہی تحیر انگیز ہوتے ہیں۔

[3] اگرچہ ''بلدۃ'' مونث ہے لیکن اس کی صفت ''میتا'' مذکر لائی گئی ہے، کیونکہ ''بلدۃ'' یہاں پر ''مکان'' کے معنی میں ہے۔

کہ اس دنیا کے خاتمہ پر تمام زندہ موجودات مرجائیں اور قیامت کے موقع پر تمام انسان حیات نو پالیں، یعنی وہی موت کے حیات میں بدلنے اور حیات کے موت میں بدلنے کا قانون ایک وسیع پیمانے پر عملی شکل اختیار کرلے۔ البتہ موت کا حیات سے نکلنا تو سب پر واضح ہے لیکن چونکہ ہوسکتا ہے کہ حیات کا موت سے نکلنا بعض کے نزدیک قابل تامل ہو، لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: اور وہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسی طرح تم بھی (قیامت کے روز) نکالے جاؤ گے۔ (ویحی الارض بعد موتہا و کذلك تخرجون)

"کذلك تخرجون" (اسی طرح تم مبعوث کیے جاؤ گے)۔ یہ جملہ بڑی وضاحت سے اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ پودوں اور مردہ زمینوں کا چھوٹی سطح پر پھر سے جی اٹھنا اور اس عظیم اور وسیع معاد اور پھر سے جی اٹھنے میں کوئی فرق نہیں۔ اس مسئلے پر تھوڑا سا بھی غور وخوض کیا جائے تو ہر طرح کی غلط فکر اور شیطانی وسوسے، جو معاد کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں، برطرف ہوجائیں۔

ہاں اس عظیم ووسیع جہان میں ہر لحظہ ہزار ہا ئی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور نئی زندگیاں ظہور پاتی ہیں اور ہر لحظہ اس دنیا کے گوشہ وکنار میں مردہ زمینیں حیات تازہ سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔ یہ اللہ کی ہمیشہ کی اور ایک دائمی سنت ہے جو زمینوں کو معاد کی یاد بھی دلاتی ہے۔

تیسری زیر بحث آیت میں ہواؤں اور بادلوں کے آگے پیچھے آنے اور ان کے ساتھ پھر بارش کے وجود میں آنے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے: اب آثار رحمت الٰہی کو دیکھو کہ کس طرح زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے (فانظر الی آثار رحمت اللہ کیف یحی الارض بعد موتہا)

''جو یہ کچھ کرتا ہے وہی قیامت میں مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔'' (ان ذلك لمحی الموتی)

ہاں ''وہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (وھو علی کل شیء قدیر)

''مقائیس اللغۃ'' کے مطابق ''آثار'' جو ''اثر'' کی جمع ہے، تین معنی میں آیا ہے:

۱۔ مقدم کرنا

۲۔ یاد کرنا اور

۳۔ وہ آثار جو کسی چیز کے باقی رہ جاتے ہیں۔

لیکن بعض اہل لغت نے ان تمام معانی کو تیسرے معنی میں سمو دیا ہے کیونکہ کسی چیز کو مقدم کرنا اور اسے یاد کرنا ان آثار فضیلت اور برتری کے عوامل کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس میں باقی رہے۔

"رحمۃ اللہ" کی تعبیر اس مقام پر حیات بخش بارشوں کی طرف اشارہ ہے جو رحمت الٰہی کا ایک زندہ اور آشکار نمونہ ہے۔ اس کے آثار ہر جگہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ مردہ زمین کو زندہ کرتی ہے، مردہ دلوں کو زندگی بخشتی ہے، آلودہ اور مردہ ہوا کو نشاط حیات عطا کرتی ہے اور انسانی جسم وروح پر نورِ حیات چھڑکتی ہے۔

"ذلك" دور کے لیے اسم اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا آنا درحقیقت اس کے مقام کی اس عظمت کی طرف اشارہ ہے جو فکروں اور عقلوں کی دسترس سے ماورا ہے۔

"ان" تاکید کے لیے "لمحی" کا "ل" بھی تاکید کے لیے ہے اور پھر جملہ اسمیہ بھی تاکید کے لیے آتا ہے۔ یہ سب اس حقیقت کے اثبات کے لیے ہیں جو اپنی بارانِ رحمت کے ذریعے مردہ زمینوں کو زندہ کرتا رہتا ہے۔ وہ یہ طاقت بھی رکھتا ہے کہ مردہ انسانوں کو حیاتِ نو عطا کرے۔

"انظر" (دیکھ) یہ تعبیر اس لحاظ سے جاذب نظر ہے کہ کہتا ہے: معاد ایک حسی اور قابل دید مسئلہ ہے اور اسے تم ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہو۔ تو پھر کیوں اس کا تمسخر اڑاتے ہو یا انکار کرتے ہو؟

چوتھی آیت میں رحم مادر میں نطفے کے ارتقائی اور تکمیلی سفر اور جنین کے تغیرات جو امکانِ معاد کے لیے ایک روشن دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں، کا ذکر کرنے کے بعد پودوں کے نطفوں کا ذکر کرتا ہے جو رحم زمین میں پرورش پاتے ہیں۔ فرماتا ہے: ''تو زمین کو (فصل سرما میں) خشک اور مردہ دیکھتا ہے۔'' (وتری الارض هامدة) [1]

جب ہم اس پر بارش کا پانی برساتے ہیں تو وہ انگڑائی لیتی ہے، حرکت میں آتی ہے، نشوونما پاتی ہے اور طرح طرح کے دل انگیز پودے اگاتی ہے (فاذا انزلنا علیها الماء اهتزت وربت وانبتت من کل زوج بهیج)۔

واقعاً قرآن مجید ایک عجیب کتاب ہے۔ جب وہ کسی حقیقت پر تاکید اور اسے افکار و اذہان میں ثبت کرنے کے لیے تکرار کرنا چاہتا ہے تو ایسے طرح طرح کے اور مختلف پیرائے کے لباس میں اسے پیش کرتا ہے کہ انسان ہر بار ایک بالکل نئی بات محسوس کرتا ہے اور وہ اس حقیقت کو ایک نئے روپ میں دیکھتا ہے۔ قرآن کا تکرار نہ ملال انگیز ہے نہ کسی نئی بات سے خالی۔ ہمیشہ کسی نئے درس کا حامل ہوتا ہے۔ اس کا نمونہ ہم مردہ زمینوں کے احیاء کے بارے میں موجود قرآنی آیات میں دیکھ رہے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن خاص طور پر زیر بحث آیت میں، جسے اس نے تغیرات جنین کے مسئلے پر عطف کیا ہے، یہ امر یاد دلاتا ہے کہ انسانی، حیوانی اور نباتاتی حیات سب ایک ہی مقولے سے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی معاد کے نمونے جنہیں ہم اس جہان میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور لمس کرتے ہیں، معاد دیگر کے امکان پر دلیل ہیں۔

"تری" (تو دیکھتا ہے) کی تعبیر "انظر" (دیکھ) کی طرح جو آیہ ماقبل میں آیا ہے، جہانِ نباتات کی معادِ عظیم کے محسوس ہونے پر تاکید ہے۔

---

[1] "هامدة" "همود" کے مادہ سے ہے۔ ''مفردات'' میں راغب کے بقول یہ دراصل آگ کے بجھ جانے (اور اس کی روشنی اور حرارت ختم ہوجانے) کے معنی میں ہے۔ لیکن بعض ارباب لغت اور مفسرین نے اس کے اور بھی معنی ذکر کیے ہیں۔ مثلاً خشک ہونا، ساکت ہوجانا، مرجانا اور کہنہ ہوجانا۔ زیر بحث آیت میں یہ سب تعبیرات درست ہیں۔ فصل سرما میں زمین خشک، خاموش اور ساکت ہوجاتی ہے جب کہ فصل بہار میں اس میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ حرکت میں آجاتی ہے گویا بولنے لگتی ہے۔ (مولف محترم نے زمین کے مردہ ہونے کو فصل سرما سے جو مختص کیا ہے یہ زمین کے ہر خطے کے لیے ضروری نہیں۔ مترجم)

"اهتزت" "اتهزاز" کے مادہ سے ہے اور یہ "هز" سے شدید تحریک کے معنی میں لیا گیا ہے۔ بعض نے اسے پیاری اور اچھی حرکات کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ اس مقام پر یہ ایسے اچھے تغیرات اور ایسی مختلف حرکات کے معنی میں ہے جو انواع واقسام کے پودوں کے اگنے سے صفحۂ زمین پر نمودار ہوتی ہیں۔

"ربت" "ربو" (بروزن غلو) کے مادہ سے "نمو" کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد زمین کی نمو ہے نہ کہ پودوں کی اور اس کی نمو سے مراد زمین اور مٹی کے مختلف اجزاء سے جڑوں، تنوں اور شاخوں کا نمودار ہونا ہے۔ جن لوگوں نے اسے پودوں کی نمو کی طرف اشارہ سمجھا ہے انہوں نے بعد کے جملے سے غفلت کی ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے: "وانبتت من کل زوج بهیج" (زمین ہر طرح کے خوبصورت اور خوش منظر پودے کو اگاتی ہے)۔

پانچویں آیت میں وہی ماقبل کی آیت کا مضمون ہے، البتہ دو فرق ہیں، ایک تو یہ کہ آیت مردہ زمینوں کے احیاء کو توحید پر دلیل بھی شمار کرتی ہے اور معاد کے لیے ایک علامت بھی۔ فرماتا ہے: یہ اس کی آیات میں سے ہے کہ تو زمین کو خشوع میں دیکھتا ہے۔ البتہ جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ حرکت میں آتی ہے اور نمو کرتی ہے (ومن ایته انك تری الارض خاشعة فاذا انزلنا علیها الماء اهتزت وربت)۔

جس نے اسے زندہ کیا ہے وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ (ان الذی احیا ها لمحی الموتی انه علی کل شیء قدیر)۔

یہاں مردہ زمینوں کو "خاشعة" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ المیزان کے مطابق خشک اور بنجر زمین کو یہاں فقیر اور بے بضاعت شخص سے تشبیہ دی گئی ہے، جو ذلت وحقارت میں گرفتار ہوتا ہے، جب کہ بارش کے نازل ہونے کے بعد وہ ایسی ہو جاتی ہے جیسے کسی کو فراواں دولت ہاتھ آئی ہو، وہ بہترین لباس زیب تن کرتی ہے، اس کی قامت صاف، سیدھی اور پرنشاط ہو جاتی ہے اور یوں وہ حرکت میں آتی ہے، اس طرح سے کہ اس کی صورت سے آثار نعمت نمایاں ہوتے ہیں۔ [1]

ایک اور نکتہ جس کا اس تعبیر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، وہ ایک اخلاقی درس ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح سے خاشع وخاضع زمین پر رحمت الٰہی ہوتی ہے، اس میں یہ سب آثار وبرکات اور نمو ونشاط پیدا ہوتے ہیں، خاشع وخاضع بندے بھی اس کی وسیع رحمت سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، علم وایمان اور تقویٰ کے شگوفے ان کے صفحہ وجود پر پھوٹتے ہیں۔

چھٹی آیت میں پھر یہی مسئلہ (ایک تازہ تعبیر کے ساتھ) درپیش ہے۔ نزول باراں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اللہ وہی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا کہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں، پھر ہم انہیں مردہ زمینوں کی طرف چلاتے ہیں اور اس کے ذریعے ہم زمین کو ان کی موت کے بعد زندگی دیتے ہیں۔" (والله الذی ارسل الریاح فتثیر سحابا فسقناه الی بلد میت فاحیینا به الارض بعد

---

[1] المیزان، ج۱۷ ص۴۱۹

موتها)۔

مردوں کا محشور ہونا بھی اسی طرح ہے (كذلك النشور)۔

درحقیقت یہ آیت مبداء کے اثبات کے لیے بھی ایک دلیل ہے، یعنی اللہ کی پاک ذات کے لیے اور معاد کے لیے بھی دلیل ہے۔ آیت کے آغاز میں اللہ کی معرفت اس گہرے اور دقیق نظام کے ذریعے کروائی گئی ہے جو ہواؤں کے چلنے، بادلوں کے حرکت کرنے، مردہ زمینوں کی آبیاری اور ان کے احیاء پر حکم فرما ہے۔ آخر میں مسئلہ معاد کی طرف ایک زندہ اور پرمعنی اشارہ کیا گیا ہے۔ گویا ایک بات کے ذریعے دو مقصد حاصل کیے گئے ہیں۔

"كذلك النشور" میں انسانوں کے احیاء کو مردہ زمینوں کے احیاء سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ جملہ اس معنی کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے جیسے ہوائیں بادلوں کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں ملا دیتی ہیں اور انہیں بارآور بناتی ہیں، روزِ قیامت انسانی ارواح بھی جسموں کی طرف حرکت کریں گی۔ مٹی کے پراگندہ ذرے فرمانِ الٰہی سے جمع ہوجائیں گے اور زندگی پالیں گے۔

رسول اللہؐ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا:

يا رسول الله! كيف يحي الله الموتى وما اية ذلك في خلقه

"اللہ کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے اور خلق میں اس کا نمونہ کیا ہے؟"

رسول اللہؐ نے فرمایا:

اما مررت بوادي اهلك ممحلا ثم مررت به يهتز خضرا [1]

"کیا تم کبھی کسی ایسی زمین سے نہیں گزرے جو مرگئی ہو اور پھر جب تم وہاں سے گزرے ہو تو وہ سرسبز ہو؟"

اس نے کہا: "ہاں یارسول اللہؐ!"

فرمایا:

فكذلك يحي الله الموتى وتلك ايته في خلقه

"بس یونہی اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور کائنات میں اس کا نمونہ یہی ہے۔" [2]

ساتویں اور آخری آیت میں بھی ان ہواؤں کے بھیجے جانے کا ذکر ہے جو بارانِ رحمت سے پہلے بشارت بن کر آتی ہیں۔ پھر ان بھاری

---

[1] "ممحل" "محل" (بروزن "نخل") کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں، خشک سالی، بارش نہ ہونا اور پودوں کا خشک ہونا (مجمع البحرین، مادہ "محل")

[2] تفسیر قرطبی اور روح البیان، زیر بحث آیہ کے ذیل میں

بادلوں کا تذکرہ ہے کہ جو دوش ہوا پر سوار ہو کر مردہ زمینوں کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں اور پھر بارش کے حیات بخش قطرے ان سے گرتے ہیں (وھو الذی یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمته حتی اذا اقلت سحابا ثقالا سقنه لبلد میت فانزلنا به الماء)[1]

اسی مقام پر فرماتا ہے: اس کے ذریعے سے ہم (سیاہ اور مردہ مٹی سے) طرح طرح کے پھل نکالتے ہیں اور اسی طرح ہم (قیامت میں) مردوں کو (قبروں سے) نکالیں گے (فاخرجنا به من کل الثمرات کذلك نخرج الموتی لعلکم تذکرون)۔

لعلکم تذکرون اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ حیران کن منظر اس جہان میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہے تا کہ ایک طرف تم اس کی ذات پاک کو سمجھ سکو اور دوسری طرف دوسرے جہان میں معاد اور قیامت کو سمجھ سکو۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک روایت میں رسول اکرمؐ سے مروی ہے:

ثم یرسل الله مطرا کانه الطل فتنبت منه اجساد الناس

ثم یقال: یا ایها الناس هلموا الی ربکم وقفوهم انهم مسئولون

پھر اللہ بارش بھیجتا ہے قطروں کی صورت میں اور اس کے ذریعے لوگوں کے اجسام میں نمو پیدا ہوتی ہے۔

پھر کہا جاتا ہے: اے لوگو! اپنے پروردگار کی طرف آؤ اور انہیں کھڑا کرو کہ وہ اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں۔[2]

بعض مفسرین کے کلمات سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ بارش ایک عام بارش نہیں ہے، بلکہ نطفہ کے پانی سے شباہت رکھتی ہے جس سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ یہ بارش چالیس روز تک جاری رہتی ہے، انسانوں کے بے جان اجزاء پر عجیب تاثیر مرتب کرتی ہے اور ان میں زندگی کی روح پھونکتی ہے۔[3]

ایک سوال کا جواب

قرآن مجید میں مندرجہ بالا آیات میں ایک واضح حسی مثال سے استفادہ کرتے ہوئے منکرین معاد کو ایک محکم جواب دیا گیا ہے۔ گویا شاہد کو غیب کی دلیل بنایا ہے اور آج کو کل کا گواہ ٹھہرایا ہے کیونکہ ہر سال کم از کم ایک بار اور کبھی دو یا چند بار مردہ زمینیں بارانِ رحمت الٰہی کے برسنے سے زندہ ہو جاتی ہیں اور نئی زندگی پاتی ہیں، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات تو دنیا میں ہر روز رونما ہوتی ہے، ہر روز کوئی نیا پودا مردہ زمین سے اگتا ہے اور ہر روز معاد کا منظر انسان کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] توجہ رہے کہ معنی کے لحاظ سے ''سحاب'' جمع ہے، لہٰذا اس کی صفت ''ثقال'' آتی ہے۔ البتہ یہ لفظ کے اعتبار سے مفرد ہے، لہٰذا ''سقناہ'' کی ضمیر مفرد ہے۔

[2] تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۲۶۶۷

[3] تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۲۶۶۷

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ عصر حاضر کے علماء اور سائنسدان اس بات پر متفق ہیں اور سب تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ موجودات زندہ فقط موجودات زندہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں؟ اگر کسی پودے کا بیج یا دانہ زمین میں نہ ہو تو بارش کے برسنے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

پھر پودوں کے بیج دو حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کا بڑا حصہ غذائی مواد کا ہوتا ہے اور چھوٹا حصہ ایک زندہ سیل جس کو جب پرورش کے لیے درکار حالات (خصوصاً پانی) فراہم ہوتے ہیں، تو وہ دانہ میں موجود غذائی مواد سے اور اسی طرح زمین میں موجود غذائی مواد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نمو کرتا ہے اور اگر یہ زندہ سیل (LIFE CELL) نہ ہوتا تو مردہ زمینوں کا زندہ ہونا ممکن نہ تھا۔

اس سوال کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ بلا شک زندہ سیل ایک چھوٹا سا ذرہ ہوتا ہے جو مردہ اجزا کو زمین سے اپنے میں جذب کرتا ہے اور انہیں موجود زندہ کے پیکر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ (غور کیجیے گا)

دوسرے الفاظ میں کھجور کا ایک درخت کہ جس کا وزن کبھی کبھی ایک ٹن تک ہوتا ہے آغاز میں کھجور کی گٹھلی کے ساتھ وہ ایک چھوٹا سا سیل ہوتا ہے، جس کا وزن تقریباً ایک ملی گرام ہوتا ہے، پھر وہ زمین، پانی اور ہوا سے تقریباً ایک ٹن مواد جذب کرتا ہے جب کہ یہ سب چیزیں موجودات مردہ ہیں۔ یہ ان سب کو زندگی عطا کرتا ہے۔ یہی درحقیقت مردہ زمینوں کا موجود زندہ میں تبدیل ہونا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے مردہ زمینیں زندہ ہو جاتی ہیں (یہ نہیں کہتا کہ مردہ درخت اور بیج زندہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ پوری طرح مرے ہوئے نہیں ہوتے) یعنی یہ مردہ زمینیں پودوں اور درختوں کا حصہ بن جاتی ہیں اور زندہ خلیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

البتہ اگر ہم اس کرۂ زمین پر زندگی کی تخلیق کے آغاز پر نظر ڈالیں تو مسئلہ اس سے بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب زمین سورج سے جدا ہوئی تو یہ ایک آتشیں اور جلتا ہوا کرہ تھا اور ظاہر ہے کہ کوئی زندہ موجود اس پر نہیں تھا۔

لیکن بعد ازاں جب یہ کافی سرد ہو گئی اور زندہ موجودات کی پرورش کے لیے تیار ہو گئی تو اس پر بہت زیادہ بارشیں ہوئیں جنہوں نے اسے اور بھی نرم اور تیار کر دیا۔

کسی پودے کی زندگی کی پہلی شاخیں اس طرح سے زمین کے مردہ مواد سے پھوٹیں کہ ابھی تک اس کے اسرار سب سائنس دانوں پر مخفی ہیں اور یوں ایک مردہ موجود زندہ ہو گیا۔ (پھر غور کیجیے گا)

۴۔تغیراتِ جنین

اشارہ

قرآن کی متعدد آیات میں امکان معاد کے اثبات کے لیے ایک اور راستہ بھی اختیار کیا گیا ہے اور وہ ہے نطفے میں واقع ہونے والے تغیرات، اس وقت سے لے کر جب وہ رحم کی پراسرار اور پیچیدہ دنیا میں ٹھہرتا ہے، اس وقت تک جب وہ متولد ہوتا ہے۔ درحقیقت ان میں سے ہر مرحلہ حیاتِ تازہ اور معاد کا ایک نمونہ ہے۔

ان تغیرات کی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ انسان جب ان کا مطالعہ ومشاہدہ کرتا ہے تو حیرت واستعجاب میں کھو جاتا ہے کہ کس طرح ایک ناچیز نطفہ اس چھوٹی سی مدت میں اس طرح کے تحولات سے گزرتا ہے۔

ایک طرف یہ صریح، بے وقفہ اور حیرت انگیز تبدلات مبداء عالم اور اس قادر ذات کے وجود پر دلیل ہیں (جو رحم مادر کی تہری ظلمتوں) میں یوں پانی پر تحیر انگیز نقش بناتا ہے۔ دوسری طرف یہ تحولات حیات بعد از ممات کے مسئلے سے بہت شباہت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید نے دونوں طرح (توحید ومعاد) کی گفتگو میں اس کا ذکر کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ ایسا واقعہ ایسے استفادے کے لیے شائستگی ولیاقت رکھتا ہے۔

اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی ان آیات کو گوش جان سے سنتے ہیں کہ جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں:

(۱) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ..... ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ﴿۶﴾ (حج ۵،۶)

(۲) اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۙ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۙ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ؕ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ﴿۴۰﴾ (القیمۃ: ۳۷ تا ۴۰)

(۳) وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۙ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۙ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ

النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی ﴿۴۷﴾ (نجم: ۴۵ تا ۴۷)

(۴) قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾

(عبس: ۱۷ تا ۲۲)

(۵) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَیِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾ (مومنون: ۱۲ تا ۱۶)

ترجمہ

(۱) اے لوگو! اگر تمہیں پھر جی اٹھنے میں شک ہے (تو اس نکتے کی طرف توجہ کرو کہ) ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون سے اور پھر لوتھڑے سے جن میں سے بعض کی شکل ہے اور بعض بغیر شکل کے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہم تم پر واضح کر دیں (کہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں) اور جن جنینوں کو ہم چاہتے ہیں ایک مدت معین تک ماؤں کے رحم میں رکھتے ہیں (اور جنہیں چاہتے ہیں ساقط کر دیتے ہیں) پھر تمہیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں..... یہ اس لیے ہے کہ تم جان لو کہ اللہ حق ہے، وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲) کیا انسان رحم میں ڈالا گیا ایک نطفہ نہ تھا، پھر وہ جما ہوا خون بن گیا، پھر (اللہ نے) اسے پیدا کیا اور موزوں بنایا، پھر اس سے مذکر اور مونث کا جوڑا بنایا۔ کیا وہ ذات اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر سکے؟

(۳) وہ وہی ہے جس نے مذکر اور مونث کا جوڑا پیدا کیا، نکلنے والے نطفے سے (جو رحم مادر میں گرتا ہے، اسی طرح) ایجادِ عالم اللہ کے ذمہ ہے (تاکہ عدالت روبہ عمل آئے)۔

(۴) مرجائے یہ انسان! کتنا ناکارہ اور ناشکرا ہے۔ (اللہ نے) اسے کس چیز سے پیدا کیا، ایک ناچیز نطفے سے اسے پیدا کیا، پھر اس نے اسے ایک پیمانہ کے مطابق اور موزوں بنایا پھر اسے مار ڈالا اور قبر میں چھپا دیا، جب

چاہے گا اسے زندہ کرے گا۔

(۵) ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر اسے نطفے کی صورت میں مقام مطمئن (رحم) میں رکھا۔ پھر نطفے کو ہم نے علقہ (جما ہوا خون) علقہ کو مضغہ میں بدلا (جو گوشت کے لوتھڑے کی مانند ہوتا ہے)۔ مضغہ کو ہم نے ہڈیوں کی صورت دی، پھر ہم نے اسے ایک نئی خلقت بخشی۔ وہ اللہ بزرگ و پر برکت ہے جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے بعد تم مرجاؤ گے اور روزِ قیامت اٹھائے جاؤ گے۔

تفسیر و جمع بندی آیات

قیامت میں شک ہے تو جنین کو دیکھیں

پہلی آیت میں روئے سخن سب انسانوں کی طرف ہے، وہ انسان جو زمان و مکان کی پنہائیوں میں بلا استثناء زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فرماتا ہے: اے انسانو! اگر پھر جی اٹھنے اور قیامت میں تمہیں شک ہے تو (اس نکتے کی طرف توجہ کرو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر اس کے بعد نطفہ سے، اس کے بعد علقہ (جمے ہوئے خون) سے اور اس کے بعد مضغہ سے (کہ جو گوشت کے لوتھڑے سے ملتا جلتا ہے)، ان میں سے بعض کی شکل ہوتی ہے اور بعض کی نہیں مقصد یہ تھا کہ ہم تم پر واضح کر دیں (کہ ہم تو ہر چیز پر قادر ہیں)۔ (یا ایها الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم من مضغة مخلقة وغیر مخلقة لنبین لکم)۔ اس طرح سے مراحل خلقت میں انسان کے چار مرحلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے (مٹی کا مرحلہ، نطفہ، علقہ اور پھر مضغہ جن میں سے ہر کوئی اپنی جگہ پر ایک پیچیدہ اور عجیب دنیا ہے)۔

اس کے بعد بات یوں جاری رکھتا ہے: پھر جن جنینوں کو ہم چاہیں (کہ وہ زندہ متولد ہوں) ایک مدت معین تک ماؤں کے رحم میں رکھتے ہیں (تا کہ اپنی تکمیل کا دور پورا کریں اور جنہیں ہم مناسب سمجھتے ہیں، ساقط کر دیتے ہیں (ونقر فی الارحام مانشآء الی اجل مسمی)۔

آخر کار یہ نشیب و فراز طے کرنے کے بعد ہم تمہیں ایک مکمل بچے کی صورت میں ماں کے شکم سے نکالتے ہیں۔ (ثم نخرجکم طفلا)۔

اس کے بعد دنیا میں حیات انسانی کے مختلف مراحل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر جہانِ نباتات کا رخ کرتا ہے۔ یہاں نباتات کے بیجوں کے رحم زمین میں قرار پائے اور مردہ زمینوں کے بارش کے ذریعے زندہ ہونے کی ایک اور مثال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ فرماتا ہے: یہ سب اس لیے ہے کہ تم جانتے ہو کہ اللہ حق ہے (اور اس لیے کہ پایہ توحید تمہاری روح میں محکم ہو) نیز تم جان لو کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے (ذلك بأن الله هو الحق و انه یحی الموتی و انه علی کل شیء قدیر)۔

یوں اس جہان ہستی کے امور و مظاہر کی طرف کبھی زاویۂ توحید سے نگاہ کرتا ہے اور کبھی زاویۂ معاد سے۔ اس آیت میں ایسے دقیق و لطیف نکتے ہیں کہ اگر ہم ان کی طرف توجہ کریں تو ان دو اہداف تک پہنچنے میں معاون ہیں، مثلاً:

(۱) منکرین معاد اگرچہ یقینی طور پر معاد کی نفی کرتے ہیں، تاہم قرآن انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: اگر تمہیں شک و تردد ہو تو..... یہ بات اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس حقیقت کی نفی کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ تم معاد میں شک کرو اور واضح ہے کہ جو شخص شک میں ہو اسے چاہیے کہ تحقیق کرنے نہ کہ انکار۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہاں "ریب" نکرہ کی صورت میں آیا ہے جو ایسے مواقع پر بیانِ حقارت کے لیے ہوتا ہے یعنی اس سلسلے میں تمہارا شک کمزور اور بے حیثیت ہے، کیونکہ دلائل معاد تو شاہد ہیں۔

(۲) اس آیت میں تخلیق انسانی کے پہلے مرحلے کو مٹی کہا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر تخلیق آدم کی طرف اشارہ ہو جو مٹی سے تھی، یا پھر سب انسانوں کی خلقت کی طرف اشارہ ہو کیونکہ جسم انسانی کا اہم حصہ جس مواد سے بنتا ہے وہ مٹی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ بہرحال انسانی پیدائش مردوں کی حیات نو پر ایک روشن دلیل ہے۔

(۳) اس آیت میں خاک سے انسانی خلقت کے ذکر کے علاوہ انسانی تکمیل کے پانچ مراحل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (نطفہ، علقہ، مضغہ، بعد کا ارتقاء اور ماں کے پیٹ سے تولسد)۔ اس کے بعد جسمانی و روحانی بلوغ اور اس کے بعد بڑھاپے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس طرح سے کل سات مرحلے ہوجاتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں فی الحال پہلے پانچ مراحل سے سروکار ہے جن میں سے ہر ایک حیات نو ہے، تولد جدید ہے اور معاد کے مناظر میں سے ایک منظر ہے۔

(۴) "لنبین لکم" (تاکہ تمہارے لیے واضح کریں)، یہ ایک سربستہ تعبیر ہے جو خالق کے علم و قدرت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتی ہے، یعنی مسئلہ توحید کی طرف اور حیات بعد از موت یعنی مسئلہ معاد کی طرف بھی۔

(۵) یہ امر جاذب نظر ہے کہ یہ عظیم و عجیب تغیرات جو جنین پر گزرتے ہیں، ان میں تغیرات کے اعتبار سے تو بہت فاصلہ ہے۔ ایک نطفے سے آغاز ہوتا ہے کہ جو ایک ذرہ ناچیز ہے۔ یہ نطفہ تبدیلیوں سے گزرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک مکمل انسان بن جاتا ہے۔ لیکن ان سب تبدیلیوں کی عدت زمانی بہت کم ہے، تقریباً ۹ مہینے۔ عالم یہ ہے کہ اگر ان عجائبات و تحیرات کو قلم بند کیا جائے تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مطالعے کے لیے اس سے زیادہ وقت درکار ہوگا۔

ان روشن نشانیوں کے ہوتے ہوئے کیا کوئی گنجائش ہے کہ کوئی ہمارے حضور امکانِ معاد کے بارے میں شک کرسکے؟

دوسری آیت میں یہی بات ایک اور پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ سورہ قیامت کے آغاز مطلب کی طرف اشارہ ہے جس میں فرماتا ہے:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗؕ (قیامة ۳)

''کیا انسان کا یہ خیال ہے کہ ہم اس کی (بوسیدہ) ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟''

ان آیات میں فرماتا ہے: یہ کیا خیال اور گمان ہے؟ کیا انسان آغاز میں رحم مادر میں ڈالا جانے والا منی کا ایک نطفہ نہ تھا؟ بعدازاں وہ جما ہوا خون بنا، پھر اللہ نے اسے موزو ومتناسب بنایا اور اس سے مذکر ومونث کا جوڑا پیدا کیا۔ (الم یك نطفة من منی یمنی، ثم کان علقة فخلق فسوی، فجعل منه الزوجین الذکر والانثی)۔

کیا وہ (کہ جوان تیز رفتار تبدیلیوں اور پے در پے اور عجیب تغیرات کو ظلمت گاہِ رحم میں وجود میں لایا ہے اور اس قدر مختصر مدت میں جس نے ایسی عظیم مخلوق کو پیدا کیا ہے) اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے؟ (الیس ذلك بقدر علی ان یحی الموتی)

اس آیت میں جنین کے صرف چار مراحل کی طرف اشارہ ہوا ہے، نطفہ، علقہ، اعضاء کا ہموار ومتناسب ہونا اور اس بات کا ظاہر ہونا کہ جنین بیٹا ہے یا بیٹی؟

بعض ارباب لغت کے بقول ''نطفہ'' کے معنی ہیں آب صاف۔ یہی وجہ ہے کہ "نطف" لولر (موتیوں) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔[1] لیکن بعض نے اسے تھوڑے سے پانی کے معنی میں لیا ہے۔ یا جو پانی برتن میں بچ جاتا ہے، اسے اس معنی میں تفسیر کیا ہے۔[2] بعض نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ نطفہ کے معنی ہیں صاف پانی، یہ کم ہو یا زیادہ۔[3] بعض نے کہا ہے کہ یہ سب نطفہ کے معانی کا جز ہیں البتہ ''نطفہ'' کا معنی صاف پانی یا تھوڑا سا پانی ہے اور ''نطفہ'' کا معنی ہے موتی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض سائنس دانوں نے، جو حال ہی میں تحقیق کی ہے، اس کے مطابق یہ تھوڑا سا پانی جس کا نام ''نطفہ'' ہے، بدن انسانی کے مختلف غدودوں سے حاصل ہونے والے متعدد قسم کے پانیوں سے تشکیل پاتا ہے، اس کا کچھ حصہ ان بیضوں سے حاصل ہوتا ہے کہ جو سپر میٹازائڈ (SPERMATOZOIDE) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ ان تخمی پیکٹس سے حاصل ہوتا ہے جو پراسٹیٹ (PROSTATE) غدود کے پاس ہوتے ہیں۔ تیسرا حصہ خود پراسٹیٹ (PROSTATE) سے حاصل ہوتا ہے۔ منی کی ظاہری وضع اور اس کی مخصوص بواسی سے ہوتی ہے۔ اس کا چوتھا حصہ کوپر اور تیرہ کی غدود سے حاصل ہوتا ہے۔ تیرہ پیشاب کی نالی کے قریب ہوتی ہے۔

یہ پانچ پانی ایک دقیق اور حساب شدہ تناسب کے ساتھ آپس میں ملتے ہیں اور اس ملاپ کے نتیجے میں وہ حیات آفرین مادہ تشکیل پاتا ہے۔ یہ بات ایک فرانسیسی سائنسدان نے کہی ہے کہ حال ہی میں اسے قرآن اور اسلام کی طرف بہت رغبت پیدا ہوگئی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ قرآن مجید میں "امشاج" (مخلوط شدہ) کی جو تعبیر استعمال ہوئی ہے وہ اسی دقیق معنی کی طرف اشارہ ہے جب کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں یہ بات دنیا کے لوگوں سے اور ان صدیوں کے علماء کی نظروں سے پوشیدہ و پنہاں تھی۔

---

[1] مقائیس اللغہ ومفردات راغب

[2] لسان العرب

[3] قاموس اللغۃ ومجمع البحرین، لسان العرب

(اقتباس از کتاب: ''تورات، انجیل اور قرآن کا موازنہ'' از ڈاکٹر بوکامی۔ ترجمہ انجینئر ذبیح اللہ دبیر ص ۲۷۱)

بہرحال اس کلمہ کا اس پانی کے لیے استعمال جو جنسی ملاپ کے وقت مرد سے خارج ہوتا ہے اس کی اس کے اصلی معنی سے واضح نسبت کی وجہ سے ہے۔

''منی'' ''منی'' (بروزن ''منع'') کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اندازہ لگانا اور تقدیر و سرنوشت کا معین کرنا۔ لہٰذا موت کو ''منیة'' اور آرزوؤں کو ''امنیة'' کہا جاتا ہے۔ اس کلمہ کا مرد سے نکلنے والے پانی پر اطلاق اس وجہ سے ہے کہ مقدر ہوا ہے کہ اس سے انسان وجود میں آئے۔[1]

لہٰذا ''الم یك نطفت من منی یمنی'' کا مفہوم یہ ہے کہ کیا وہ آغاز میں ایسا ناچیز پانی نہ تھا جس کے بارے میں مقدر ہو گیا تھا کہ انسان اس سے وجود میں آئے؟[2]

جن چار مراحل کا اس آیت میں ذکر ہے ان میں سے ہر ایک حیات بعد از مرگ کے لیے ایک نیا اور تازہ نمونہ ہے۔ اس سے ایک طرف تو واضح طور پر قدرت خالق ظاہر ہوتی ہے اور دوسری طرف حیات بعد از مرگ اور معاد کا امکان بخوبی واضح ہوتا ہے، خاص طور پر نطفے کی جنس کہ مذکر ہے یا مونث، جنین شناسی کے عجیب ترین اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے۔ ابھی تک اس پر حکم فرما قوانین سائنسدانوں کی چشم تیز میں سے پوشیدہ ہیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ایک بڑی مدت تک رحم مادر میں جنین کی جنس بالکل نامعلوم اور غیر مشخص رہتی ہے اور آخری مراحل میں ظاہر ہوتی ہے۔ نیز ہم جانتے ہیں کہ ایسے دقیق قوانین اس پر حکم فرما ہیں کہ جو ان دو جنسوں کی تعداد کو ایک حد تک برابر اور ایک دوسرے کے نزدیک رکھتے ہیں۔ البتہ ان مسائل کی جزئیات ابھی تک پردۂ الہام میں ہیں۔

آپ سوچیں کہ اگر ہر دس بچوں میں سے نو بیٹیاں ہوتیں اور ایک بیٹا یا اس کے برعکس تو انسانی معاشرے میں کیا عجیب بے نظمی، وحشت ناک غوغا اور شدید جھگڑا پیدا ہو جاتا۔

تیسری آیت میں اللہ کی قدرت نمائی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرماتا ہے: کیا انسان نہیں جانتا کہ اس نے مذکر اور مونث کا جو جوڑا پیدا کیا ہے اس نطفے سے جو رحم میں گرتا ہے (یا مقدر ہوتا ہے کہ ایک انسان اس سے متولد ہو) اور کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ عالم دیگر کو پیدا کرے، (تا کہ عدالت کا اجراء ہو سکے)؟ (وانه خلق الزوجين الذكر والانثى من نطفة اذا تمنى وان عليه النشاة الاخرى)

ان آیات میں اگرچہ اس حقیقت کی تشریح نہیں کی گئی کہ عالم آخرت کی پیدائش کو تغیرات جنین کے ساتھ موازنہ کر کے معلوم کیا جا سکتا

---

[1] تاج العروس فی شرح القاموس

[2] لیکن بعض مفسرین نے ''یمنی'' کو تقدیر کے معنی میں نہیں لیا بلکہ اس پانی کے رحم میں ڈالے جانے کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ بہرصورت ''من'' بیانیہ ہے نہ کہ تبعیضیہ۔

ہے،لیکن آیات کا باہمی ارتباط اور تعلق تقاضا کرتا ہے کہ پہلی دوسری کے لیے دلیل اور شاہد کے طور پر ہو جیسا کہ بعض مفسرین نے بھی اس امر کی طرف توجہ کی ہے۔[1]

"النشاۃ الاخری" "ایجاد دیگر" (دوسری ایجاد) کے معنی میں ہے اور مفسرین کی اکثریت قاطع کا نظریہ یہ ہے کہ یہ حیاتِ آخرت کے معنی میں ہے۔لیکن بعض کا اصرار ہے کہ یہ جنین میں روح انسانی کے پھونکے جانے کے معنی میں ہے۔انہوں نے مندرجہ ذیل آیت کو اس بات کے لیے دلیل بنایا ہے:

فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ

"ہڈیوں پر ہم نے گوشت چڑھایا۔اس کے بعد ہم نے جنین کو خلقت نو عطا فرمائی۔" (مومنون ۱۴)

لیکن اس تعبیر (یا اس سے مشابہ دیگر تعبیرات) کو قرآن کی دوسری آیات میں دیکھا جائے تو بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ روزِ قیامت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ سورۂ عنکبوت کی آیہ ۲۰ میں ہے:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ

"کہو: زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح خلقت کا آغاز کیا۔ پھر اللہ خلقت دیگر کو ایجاد فرماتا ہے۔"

سورۂ واقعہ کی آیت ۶۲ میں ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

"تم نے خلقت اول کو جانا ہے۔پس متوجہ کیوں نہیں ہوتے ہو (کہ عالم دیگر بھی درپیش ہے)۔"

چوتھی آیت میں چھوٹے چھوٹے اور نہایت عمدہ جملوں میں کسی اور پیرائے میں بیان کیا گیا ہے،فرماتا ہے: مرجائے یہ انسان! کس قدر کافر اور ناشکرا ہے۔اللہ نے اسے کس چیز سے پیدا کیا ہے،ایک ناچیز نطفے سے اسے پیدا کیا اور پھر اسے موزوں اور متناسب بنایا اور پھر اس کے لیے راستے کو آسان کر دیا۔پھر اسے مارتا ہے اور پھر اسے قبر میں پنہاں کر دیتا ہے۔پھر جب چاہتا ہے اسے زندہ کر دیتا ہے۔(قل الانسان ما اکفرہ۔ من ای شیء خلقت من نطفة خلقه فقدره ثم السبيل يسره ثم اماته فاقبره ثم اذا شآء انشره)

ان آیات میں بھی پہلے اس بات کی طرف ایک مجموعی اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کی خلقت کی بنیاد نطفے سے پڑی اور پھر اس نے جنین کے ارتقائی مراحل طے کیے۔اس کے بعد موت کا ذکر ہے اور پھر حیات بعد از ممات کا ان باتوں کے درمیان منطقی روابط میں سے ایک یہی ہے

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن، ج ۷ ص ۶۳۱

کہ ایک سے دوسری پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

یہاں چند نقطے جاذب توجہ ہیں:

ا۔ "خلقه قدره" (اسے پیدا کیا اور اس کی تقدیر معین کی) یہ بہت ہی پر معنی تعبیر ہے جس میں دورانِ جنین کے تمام تر انسانی تغیرات آجاتے ہیں۔ تقدیر معین کرنے سے مراد یہاں اس کے اصل وجود کا تعین، اس کے پیکر کے اعضاء کا تعین، ترکیب اجزاء کا تعین، اس کی مختلف ضروریات اور مختلف زمانی فاصلوں جن میں اسے اپنی تکمیل کے دور سے گزرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے معین کر دیا ہے، اسے منظم کر دیا ہے اور موزوں بنا دیا ہے۔

بنابریں "خلقه" نطفے سے انسانی پیدائش کے پہلے مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔ "فقدره" بعد میں موجود پذیر ہونے والے تمام مراحل کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ "ثم السبيل يسره" (پھر اس نے راستہ آسان اور ہموار بنایا)۔ یہ بھی ایک پر معنی اور قابل توجہ جملہ ہے۔ ہوسکتا ہے یہ ان امور کی طرف اشارہ ہو:

تکمیل کے مراحل طے کرنے کے بعد پیدائش کو اس کے لیے آسان بناتا ہے۔ عام حالات میں جنین کا سر اوپر کی طرف اور پاؤں نیچے کی طرف ہوتے ہیں۔ اچانک تبدیلی آتی ہے اور وہ بالکل الٹ ہوجاتا ہے تاکہ آسان ولادت کے لیے راہ ہموار ہوسکے۔ ماں کے بھی تمام ااعضاء اور اندام نرم پڑ جاتے ہیں اور اس پیدائش کے لیے وہ تیار ہوجاتی ہے۔ رحم کے اندر بچے پر ہر طرف سے سخت دباؤ پڑتا ہے تاکہ وہ باہر کا راستہ اپنائے۔ وہ پر آب تھیلی، بچہ عام حالات میں جس میں تیر رہا ہوتا ہے، ناگہاں پھٹ جاتی ہے اور یوں خروج کا تمام راستہ مرطوب ہوجاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بچے کے نئی دنیا میں آنے کے لیے ہر چیز آمادہ ہوجاتی ہے اور راستہ ہر لحاظ سے ہموار ہوجاتا ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ انسان کو عقل وخرد اور طرح طرح کی جبلی خصوصیات ودیت فرماتا ہے جن میں سے ہر کوئی راہ حیات کی راہنمائی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ اپنے انبیاء اور آسمانی کتب بھی بھیجتا ہے تاکہ اللہ کی اطاعت وبندگی اور اس کی سعادت کے راستے کو ہموار کرے۔

ضمناً یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ انسان فاعل مختار وآزاد پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہیں فرماتا کہ اسے راہ طے کرنے پر ابھارتا ہے بلکہ کہتا ہے کہ راستہ اس کے لیے آسان بنایا ہے لیکن راہ طے کرنا خود اسی کے ذمہ ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں جنین کے تکمیل کے مراحل کا تفصیل سے ذکر ہے، یہاں تک کہ اس سلسلہ کی تمام آیات سے زیادہ بات کی گئی ہے۔ اس میں جزئیات وریزہ کاریوں کا ذکر فرماتا ہے: ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، پھر اسے مقام اطمینان (رحم) میں ایک نطفے کی صورت میں قرار دیا، پھر نطفے کو جمے ہوئے خون کی صورت دی اور جمے ہوئے خون کو لوتھڑے کی صورت، پھر گوشت کے لوتھڑے کو ہم ہڈیوں کی صورت میں لے آئے اور پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا (ولقد خلقنا الانسان من سللة من طين۔ ثم جعلنه نطفة فى قرار مكين۔ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظا ما فكسونا

العظام لحما)۔

ان پانچ مرحلوں (نطفہ،علقہ،مضغہ،عظام اورلحم) کو بیان کرنے کے بعد آخری اوراہم ترین مرحلے کا ذکر کرتاے جوروح انسانی پھونکے جانے کا مرحلہ ہے۔فرماتا ہے: پھرہم نے اسے خلقت تازہ عطا کی۔(ثم انشاناہ خلقا اخر)

پس جاویدوبابرکت ہے وہ خدا کہ جوسب خالقین سے بہتر ہے۔(فتبارك الله احسن الخالقين)

فکسونا العظام لحما (ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا) یہ بات جنین کی تکمیل کے مراحل کا ذکر کرتے ہوئے صرف اسی آیت میں آئی ہے۔اس سے ہڈیوں کی پیدائش کی اہمیت پر سے پردہ اٹھتا ہے۔

آج یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ ہڈیاں انسانی ڈھانچے کی حدود معین کرنے والی کوئی ایسی چیز نہیں ہیں جوفقط بدن اوراعضاء کی حفاظت کے لیے ہو، بلکہ بہت سی زندگی کی اورعلم کی اہم حیاتیاتی (BIOLOGICAL) ذمہ داریوں کی ادائیگی ان ہڈیوں ہی کے ذمے ہوتی ہے۔

ہڈیاں فاسفورس،کیلیشیم اورنمکیات وغیرہ جیسی بہت سی احتیاجات کو پورا کرتی ہیں۔یہ ہڈیاں بدن کی زندگی کے اعمال کومنظم کرتی ہیں۔دل کی دھڑکن اورعضلات کی حرکت کومرتب کرتی ہیں۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی میں خون کے سرخ اورسفید گلبول مہیا کرتی ہیں۔اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہرمنٹ میں ۱۸۰ ملین سرخ جرثومے مرجاتے ہیں اور یہ ہڈیاں ہیں جوان کی جگہ نئے جرثومے بناتی ہیں اورتازہ بہ تازہ اس کمی کو پورا کرتی رہتی ہیں۔[1]

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ بعض مفسرین کے مطابق آج یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ جنین میں پہلے ہڈیوں کے خلئے ظاہر ہوتے ہیں اور پھر گوشت کے۔یہ وہ حقیقت ہے قرآن نے جس پر سے چودہ سوسال پہلے پردہ اٹھایا تھا جب کہ اس زمانے میں یہ بات کسی کومعلوم نہ تھی۔[2]

گوشت کے لیے "کسوۃ" (لباس) کی تعبیر بہت عمدہ اور پیاری ہے۔لباس جسم انسانی کوخوبصورتی بھی عطا کرتا ہے اور بدن انسانی کومختلف نقصانات سے بھی بچاتا ہے۔اسی طرح اگرعضلات اورگوشت نہ ہوتا تو واقعاً صرف ہڈیاں کتنا برا منظر پیش کرتیں۔اسی طرح ہڈیوں پر ہرطرف سے جو دباؤ پڑتا اس سے انہیں بہت نقصان پہنچتا۔یہ تو گوشت اورعضلات کا لباس ہے کہ جوان کی حفاظت کرتا ہے۔

تکمیل جنین کے آخری مرحلے کے بارے میں فرماتا ہے: پھرہم نے اسے خلقت تازہ عطا کی (ثم انشاناہ خلقا اخر)۔ یہ بات بھی صرف اس آیت میں آئی ہے۔اس عجیب تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ "خلق اخر" پہلے کے مختلف مراحل سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اسے "آفرینش دیگر" قرار دیا گیا ہے۔بیشترمفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ جملہ خلقت روح کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں بچہ ماں کے پیٹ میں چار مہینے تک زیادہ تر ایک ایسے پودے سے شباہت رکھتا ہے جو تیزی سے نمو کرتا ہے اوراس میں کوئی حس وحرکت نہیں ہوتی۔جونہی اس

---

[1] قرآن بہ فراز اعصاء ص ۱۸۷

[2] فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۱۶

مرحلہ میں پہنچتا ہے نا گہاں متغیر ہوجاتا ہے اوراس میں حس وحرکت پیدا ہوجاتی ہے۔مختلف حقائق کا ادراک جن اعضاء کے ذریعہ ہوتا ہے تدریجاً اس میں تیار ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ایک دم کی یہ تبدیلی ایسی محرمانہ اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ کوئی بھی سائنس دان اس سے آگاہ نہیں ہے۔یہ تو صرف خداوندعالم قادر جانتا ہے کہ جنین پر کیا گزرتی ہے جو اس مرحلے سے اس مرحلے میں منتقل ہوتا ہے۔

بہرحال اس تھوڑی سی مدت میں ان مراحل کا طے ہونا اس اللہ خالق اکبر کی عظمت پر بھی دلیل ہے جو مبداء عالم ہستی بھی ہے،احسن الخالقین بھی اور حیات بعدازممات کی بھی نشانی ہے جس کی طرف ان آیات کے آخر میں اشارہ کیا ہے۔

نتیجہ بحث

مندرجہ بالا تمام آیات میں تکمیل جنین کے مختلف مراحل کو حقیقت کے متلاشی انسان کے سامنے مجسم کرکے رکھ دیا گیا ہے۔ان مراحل میں سے ہر ایک درحقیقت حیات جدید ہے اور معاد کا ایک منظر ہے۔اس طرح سے منکرین معاد کو واضح جواب دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ان مراحل میں سے کسی ایک کی طرف بھی توجہ کی جائے تو اس حقیقت کے اثبات کے لیے کافی ہے۔

۵۔معادتوانائیوں کی دنیامیں

اشارہ

اس وسیع عالم میں ہمیشہ چیزیں مرتی رہتی ہیں لیکن ان کے بقایا جات باقی رہتے ہیں۔البتہ ان سب میں توانائیوں کی موت عجیب ترین چیز ہے کیونکہ ظاہراً موت کے وقت وہ فنائے مطلق کوسدھارتی ہیں اوران کا کچھ باقی نہیں رہتا۔مثال کے طور پرسورج کی روشنی وحرارت ایک توانائی ہے جو ہمیشہ ہمارے کرہ اورمنظومہ شمسی کے دیگر کرات تک پہنچتی رہتی ہے اورپہنچنے کے بعد نابود ہوجاتی ہے۔اگراس کی پیدائش کا مرکزیعنی سورج اس عمل کومسلسل جاری نہ رکھے توہرطرح کی روشنی اورحرارت ختم ہوجائے۔

لیکن آج کی سائنس نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ توانائیاں بھی پوری طرح نابودنہیں ہوتیں بلکہ ختم ہوکرنئی صورت اختیارکرلیتی ہیں اورجونہی انہیں نئے مناسب حالات میسرآتے ہیں وہ حیات نوکا آغازکرتی ہیں اورایک عظیم معادرونما ہوتی ہے۔

اس مختصرسے اشارے کے بعدہم قرآن کی ان آیات کودیکھتے ہیں جواس سلسلے میں آئی ہیں تاکہ حقیقت واضح وروشن ہوجائے:

(۱) قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَبِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ (یس: ۷۹، ۸۰)

(۲) اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۝ (واقعة: ۷۱ تا ۷۳)

ترجمہ

(۱) کہہ دو! وہی اسے زندہ بھی کرتا ہے جس نے پہلی بار اسے پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق سے آگاہ ہے۔وہی جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی اورتم اس سے آگ روشن کرتے ہو۔

(۲) کیا یہ جو آگ تم جلاتے ہو اس کے بارے میں تم نے سوچا ہے؟ کیا اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم نے پیدا کیا ہے؟ ہم نے اسے (سب کے لیے) توجہ کا ذریعہ اور مسافروں کے لیے وسیلہ حیات قرار دیا ہے۔

تفسیر

توانائیوں کی حیات نو کے مظاہر

سورۂ یٰس کے آخر میں معاد کے بارے میں جامع، متنوع اور عمیق گفتگو نظر آتی ہے۔ اس میں توانائیوں کی معاد کے بارے میں ذکر بھی شامل ہے جو لوگ اس امر پر تعجب کرتے تھے کہ بوسیدہ ہڈیاں کس طرح پھر سے زندہ ہو جائیں گی، ان کے جواب میں فرماتا ہے: کہو جس نے آغاز میں اسے پیدا کیا اور جو ہر مخلوق سے آگاہ ہے، وہی اسے زندہ بھی کرتا ہے (قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ و ھو بکل خلق علیم)

یہ حصہ معاد کے پہلی خلقت سے موازنہ سے مربوط ہے جس کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔ اس کے بعد اضافہ فرماتا ہے: وہی جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی اور تم اس کے ذریعہ آگ روشن کرتے ہو (الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا فاذا انتم منہ توقدون)

یقیناً یہ توصیف مسلہ معاد کی طرف اشارہ ہے اور منکرین کے لیے ایک اور جواب ہے۔ لیکن کس طرح اور کس انداز سے؟ مفسرین کی اس سلسلے میں مختلف تفسیریں ہیں:

۱۔ بہت سے مفسرین نے آیت کو دو مخصوص درختوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو عربوں میں ''مرخ'' اور ''عفار'' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ آگ جلانے کے لیے دیا سلائی کے بجائے ان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ ایک کو دوسرے پر زور سے مارا جاتا تا کہ اس سے آگ کا شعلہ نکلے۔ درحقیقت قدیم زمانہ میں معمول تھا کہ آگ روشن کرنے کے لیے ایسے پتھروں کو استعمال کیا جاتا تھا جن سے شعلہ نکلتا تھا۔ عرب درحقیقت اس کے بجائے ان درختوں سے استفادہ کرتے تھے۔

قرآن فرماتا ہے کہ جو خدا ان دو سبز لکڑیوں سے آگ نکلتا ہے، مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ جس نے پانی اور آگ کو آپس میں جمع کر دیا ہے وہ کیونکر موت کے بعد حیات کو پیدا نہیں کر سکتا؟ کیا حیات و موت کا تضاد آب و آتش کے تضاد جیسا نہیں ہے؟

۲۔ بعض نے اس سے آگے قدم رکھا ہے اور کہا ہے کہ درختوں کی لکڑیوں سے آگ جلانے کی خاصیت (مرخ و عفار کی) دو مخصوص لکڑیوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ یہ خاصیت تمام درختوں میں پائی جاتی ہے۔ البتہ ان دو مخصوص لکڑیوں میں بہتر اور سریع تر ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا عربوں میں ایک قدیم ضرب المثل ہے:

فی کل شجر نار

''ہر درخت میں آگ ہے۔''

مختصر یہ کہ جب درختوں کی لکڑیاں ایک دوسرے پر پڑتی ہیں تو دباؤ پیدا کرتی ہیں یہاں تک کہ سبز درختوں کی لکڑیوں کا بھی یہی حال ہے۔لہٰذا بہت دفعہ یہ اتفاق پیش آتا ہے کہ جنگلوں میں وسیع اور وحشت ناک آگ بھڑک اٹھتی ہے، بغیر اس کے کہ کسی تخریب کار انسان کا ہاتھ اس میں کارفرما ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تیز ہوائیں شاخوں کو زور سے ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور کبھی کبھی ان سے نکلنے والا شعلہ خشک پتوں پر جا پڑتا ہے اور ان میں شعلہ پیدا کر دیتا ہے۔ پھر تیز ہوائیں ان پر چلتی ہیں اور ہم دیکھتے کہ اچانک وسیع جنگل اور خشک لکڑیاں آگ میں بھڑک اٹھتے ہیں۔

آج کے علم کی روشنی میں اس مسئلے کی توجیہ واضح ہے۔ہم جانتے ہیں کہ یہ نہ فقط دو درخت بلکہ کوئی سے دو جسم جب آپس میں زور سے ٹکراتے ہیں تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہی آگ ہے جو جہانِ مادہ کے تمام ذرات میں، یہاں تک کہ سبز درختوں میں بھی چھپی ہوئی ہے۔

واقعاً عجیب بات ہے؟ کیسی قدرت ہے جس نے پانی میں آگ چھپا رکھی ہے اور ان دو دشمنوں کو جس نے آپس میں آشتی سے رکھا ہے، جن میں قدما کے الفاظ میں ایک کی طبیعت سرد اور تر ہے جب کہ دوسرے کی گرم اور خشک۔کیا ایسی قدرت سے بعید ہے کہ وہ موت وحیات کے درمیان ایسا تعلق قائم کر دے یا ایک کو دوسرے کا جانشین بنا دے؟

دوسرے الفاظ میں جو پانی اور آگ کو اس طرح سے جمع کر سکتا ہے کہ نہ پانی آگ کو بجھا سکے اور نہ آگ درخت کو جلا سکے۔کیا وہ خشک شدہ درخت کو حیاتِ نو عطا نہیں کر سکتا؟

۳۔ ایک اور تفسیر جو اس آیت کی موجود ہے اور گذشتہ دور میں مفسرین پر مخفی رہی ہے، لیکن علوم کی ترقی کے پیش نظر آج ہم پر واضح ہے اور شاید سب تفسیروں سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ درخت اپنی پوری عمر میں مسلسل سورج کی روشنی اور حرارت جذب کرتے رہتے ہیں اور اسے اپنے اندر ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ جب ہم خشک لکڑیوں کو جلاتے ہیں تو جو روشنی اور حرارت انہوں نے سالہا سال ذخیرہ کر رکھی ہوتی ہے، تھوڑی ہی مدت میں خارج کر دیتے ہیں اور ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔یعنی مردہ توانائیاں اس معادِ عظیم میں جان پا لیتی ہیں اور اظہار وجود کرتی ہیں۔ بنا بریں جب بھی ہم آگ جلاتے ہیں اپنی آنکھوں کے سامنے معاد کا منظر دیکھ سکتے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جن خلیوں (CELLS) سے درختوں کے اجزا بنتے ہیں، وہ کاربن آکسیجن، اور ہائیڈروجن سے مرکب ہوتے ہیں۔

پودے آکسیجن اور ہائیڈروجن پانی سے حاصل کرتے ہیں اور کاربن ہوا سے۔یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ جو آکسیجن اور کاربن کا مرکب ہے، اسے حاصل کر کے اس کا تجزیہ کرتے ہیں، حیات بخش آکسیجن کو چھوڑ دیتے ہیں اور کاربن کو اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ پھر وہ پانی کے ساتھ ترکیب پاتی ہے اور یوں درختوں کی لکڑی بنتی ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ علم کیمیا کے معلوم اصول کے مطابق بہت سے کیمیاوی مرکبات کسی خاص توانائی کو جذب کیے بغیر ترکیب و تشکیل نہیں پاتے۔اس اصول کے مطابق درخت جب کاربن حاصل کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ سورج کی حرارت اور روشنی سے ایک فعال قوت کی حیثیت سے استفادہ کریں۔(غور کیجیے گا)

اس لحاظ سے جب درخت نمو کرتے ہیں، ان کے تنے اور شاخیں روز بروز قوی تر اور بڑے ہوتے جاتے ہیں تو ساتھ ساتھ وہ سورج کی بہت سی توانائی کا اپنے اندر ذخیرہ کرتے رہتے ہیں۔ جب لکڑیاں جلتی ہیں تو یہی روشنی اور حرارت ظاہر ہوتی ہے، یعنی وہی ذخیرہ شدہ توانائیاں اور ظاہراً مردہ دھوپ ایک جاذب نظر نپی تلی معاد کی صورت میں پھر زندہ ہوجاتی ہیں۔

ایک اہم نکتہ جو اس تفسیر کی تائید کرتا ہے وہ یہ تعبیر ہے جس سے قرآن نے اس مقام پر بیان مطلب کے لیے استفادہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جملہ "فاذا انتم منه توقدون" (تم اس سے "وقود" حاصل کرتے ہو)۔

دیکھنا چاہیے کہ "وقود" کے لغت میں کیا معنی ہیں؟ لغت کی بہت سی کتابوں کی صراحت کے مطابق "وقود" کے معنی ہیں "ایندھن"، یعنی دوسرے لفظوں میں وہ جسم جو آگ پکڑتا ہے اور جلتا ہے جب کہ جس چیز سے آگ لگاتے ہیں اس کے مادے کو "زند" یا "زناد" کہتے ہیں۔ مقائیس کے مطابق "زند" کے معنی دراصل کلائی ہیں۔ اس لفظ کا اس چیز پر اطلاق جس سے لگاتے ہیں اس شباہت کی وجہ سے تھا جو کلائی اور ان چیزوں کے مابین تھی، قدیم زمانے میں جن سے آگ روشن کرتے تھے۔

"قدح" کی تعبیر عربی زبان میں یہی بات بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ قرآن نے "وقود" (ایندھن) کا لفظ استعمال کیا ہے اور "زند" یا "قدح" کا نہیں، جب کہ گذشتہ تفسیروں میں اس نکتے کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ ان میں آیہ کی تفسیر "آگ روشن کرنے والی چیز" سے کی گئی ہے۔ لیکن جو کچھ ہم نے تیسری تفسیر میں بیان کیا ہے وہ "وقود" یعنی "ایندھن" کے لفظ پر بالکل منطبق ہے۔ (غور کیجیے گا)

صرف ایک سوال یہاں باقیرہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ لکڑی کو جب جلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو خشک ہوتی ہے، جب کہ قرآن نے "الشجر الاخضر" (سبز درخت) کی تعبیر استعمال کی ہے۔

اس سوال کا دو طریقوں سے جواب دیا جاسکتا ہے:

پہلا: گیلی لکڑیاں بھی جل سکتی ہیں، اگرچہ انہیں جلانا خشک لکڑیوں کی نسبت مشکل ہے۔ مشہور ضرب المثل ہے: آتش کہ گرفت خشک وتر می سوزد

یعنی: آگ لگے تو پھر خشک وتر سب جل جاتے ہیں۔

یہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

دوسرا: اس سے قطع نظر، قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ صرف سبز درخت ہی سورج کا نورِ حرارت جذب کرکے ذخیرہ کرسکتے ہیں اور ہوسکتا ہے قرآن اس تعبیر کے ذریعے اس ظریف نکتے کو بیان کرنا چاہتا ہو کیونکہ درخت جب خشک ہوجاتا ہے تو اس کا کاربن حاصل کرنے کا عمل بالکل رک جاتا ہے اور پھر وہ ہرگز سورج کی توانائی کو اپنے میں ذخیرہ نہیں کرتا۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت امکانِ معاد کے اثبات کے سلسلے میں انتہائی اہم آیت ہے۔ نیز یہ تینوں تفسیریں معاد کا منظر اہل نظر کے سامنے مجسم کرتی ہیں اور اس میں کوئی مانع نہیں کہ یہ تینوں تفاسیر مفہوم آیت میں جمع ہوں، کوئی عوام کے لیے، کوئی خواص کے لیے، کوئی اخص

الخواص کے لیے، کوئی اس دور کے لوگوں کے لیے اور کوئی اس دور کے لیے مفید ہو اور شاید عمیق تر تفسیریں آئندہ کے علماء کے لیے ہوں۔

دوسری آیت سورۂ واقعہ کی ہے۔ اس سورہ کا ایک اہم حصہ معاد و قیامت کے دلائل پر مشتمل ہے، خاص طور پر یہ آیت اور اس کے بعد۔ یہاں پر منکرین معاد کی بات کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کی بات آیت ۴۷ میں ذکر ہوئی ہے۔ جواب میں سات نکات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن میں ہر ایک مسئلہ معاد پر ایک دلیل ہے۔ [1]

زیر بحث آیت دراصل آخری اور ساتویں دلیل ہے۔ فرماتا ہے: کیا جو آگ تم جلاتے ہو اس کے بارے میں کچھ غور بھی کرتے ہو؟ (افرء یتم النار التی تورون)۔ [2]

کیا اس درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم نے پیدا کیا ہے؟ (ء انتم انشا تم شجرتها ام نحن المنشئون) [3]

شجرہ اور درخت آتش سے اس آیہ میں کیا مراد ہے، اس سلسلے میں دو اہم تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

پہلی یہ کہ مراد وہی معروف درخت ''مرخ'' اور ''عفار'' ہیں عرب جن کی لکڑیوں کو ایک دوسرے پر مار کر آگ کا شعلہ حاصل کرتے تھے۔ ان کی حیثیت ماچس کی سی تھی جس سے آگ جلانے کا کام لیا جاتا ہے۔

دوسری یہ کہ مراد سب وہ درخت ہیں جن میں ایندھن بننے اور آگ پکڑنے کی صلاحیت ہے۔ [4]

''تذکرۃ'' سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں بھی مفسرین میں بحثیں ہوئی ہیں۔ بعض نے اسے آتش دوزخ کا یاد دلانا قرار دیا ہے جو آتش دنیا کو دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت میں مسئلہ معاد کے بارے میں آیت میں کوئی استدلال پنہاں نہ ہوگا۔

بعض کا کہنا ہے کہ مراد معاد کی طرف توجہ اور اس کی یاد آوری ہے کیونکہ جس میں یہ طاقت ہے کہ وہ سبز درختوں میں آتش سوزاں کو ذخیرہ کردے، وہ مردوں کے بدن میں پھر سے جبلی حرارت لوٹانے سے عاجز نہیں ہے۔ وہ کہ جو آب و آتش جیسی دو متضاد چیزوں کو ایک دوسرے کے پہلو میں باقی رکھ سکتا ہے، وہ درجہ اولیٰ موت و حیات جیسے دو متضاد امور کو یکے بعد دیگرے ایجاد کر سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر جو نور و حرارت کی مردہ توانائیوں کو اتنا واضح طور پر لوٹا سکتا ہے وہ مردہ انسانوں کو حیات نو کیوں نہیں دے سکتا!

البتہ دوسری تفسیر اس سورہ کی مجموعی آیات سے زیادہ ہم آہنگ ہے کیونکہ اس میں منکرین معاد کے شبہات کا جواب دیا جا رہا ہے اور

---

[1] ان سات دلائل کی تشریح تفسیر نمونہ ج ۲۳ میں متعلقہ آیات کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے۔

[2] ''تورون'' ''ایرائ'' کے مادہ سے آگ روشن کرنے کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب لکھتے ہیں: اس کا اصل ستر اور ڈھانپنے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا ''ورائ'' ''پیچھے'' کو کہتے ہیں۔ آگ چونکہ آگ روشن کرنیوالی چیز یا ایندھن میں چھپی ہوتی ہے اس لیے اسے باہر نکلنے کو عرب ''وری'' اور ''ایرائ'' کہتے ہیں۔

[3] ''مقوین'' ''قوا'' (بروزن کتاب) کے مادہ سے خشک اور خالی خیابان کے معنی میں ہے اور مقوین خشک خالی خیابان میں چلنے والے مسافروں کو کہتے ہیں۔

[4] یہ دو تفسیریں تفسیر روح المعانی، ج ۲۷ ص ۱۲۹ اور تفسیر فخر الدین رازی، ج ۲۹ ص ۱۸۴ میں زیر بحث آیات کے ذیل میں آئی ہیں۔

الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾ (بقرة: ۲۵۹)

ترجمہ

کیا تو نے نہیں دیکھا (تو آگاہ نہیں ہے) اس کو جو ایک آبادی کے پاس سے گزر رہا تھا جب کہ اس کی دیواریں اس کی چھتوں پر گری پڑی تھیں (اور اس کے باسیوں کے اجساد اور ہڈیاں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ وہ اپنے آپ سے) کہنے لگا: اللہ انہیں موت کے بعد کیسے زندہ کرتا ہے؟

اللہ نے ایک سو سال اسے مارے رکھا اور پھر زندہ کیا۔ پھر اس سے پوچھا: تو کتنی دیر پڑا رہا؟ اس نے عرض کی: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔

فرمایا: (نہیں) بلکہ تو ایک سو سال پڑا رہا۔ اپنے کھانے پینے کی طرف دیکھ۔ دیکھ کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور جان لے کہ اتنی جلدی خراب ہو جانے والی چیزوں کو جس خدا نے اس قدر طویل مدت تک بچائے رکھا، وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔ لیکن گدھے کو دیکھ (کہ کیسے بکھر گیا ہے)۔ یہ اس لیے ہے کہ تجھے (معاد کے مسئلے میں) لوگوں کے لیے ہم ایک نشانی قرار دیں۔

اب ذرا (اپنی سواری کی) ہڈیوں پر نظر ڈال کہ ہم انہیں کس طرح اٹھا کر آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جس وقت (یہ حقائق) اس پر آشکار ہو گئے تو کہنے لگا: ''میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''[1]

یہاں چند نکتے قابل غور ہیں:

۱۔ یہ شخص کون تھا اور وہ قریہ کہاں ہے (توجہ رکھئے کہ ''قریہ'' یہاں گاؤں کے معنی میں نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں لوگوں کے اجتماع کا مرکز، چاہے وہ شہر ہو یا گاؤں ہو)۔ قرآن نے اس کے بارے میں وضاحت نہیں کی۔ آیہ مبارکہ سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسے شخص تھے جن کا وحی الٰہی سے رابطہ تھا، یعنی انبیاء الٰہی میں سے ایک نبی تھے۔ لیکن مفسرین نے روایات اور تواریخ کا سہارا لیتے ہوئے ان کا نام معین کیا ہے۔ بہت سی روایات میں اور مفسرین کے کلمات میں آیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے معروف پیغمبر ''عزیر'' تھے۔ بعض کے مطابق وہ بنی اسرائیل

---

[1] جملہ او کالذی مر... بہت سے مفسرین کی تصریح کے مطابق اپنے سے پہلی آیت: الم تر الی الذی حاج ابراھیم... پر عطف ہے، لہٰذا جملے کے معنی یوں ہوں گے۔

''الم تر الی الذی مر علی قریۃ''

کے ایک اور نبی ''ارمیا'' تھے۔بعض نے ان کا نام ''خضر'' بتایا ہے اور بعض نے ''اشعیا''۔[1]

البتہ یہ بات مسلم ہے کہ وہ کوئی بھی ہو اس سے آیت کے معنی اور مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔لیکن یہ جو بعض نے احتمال ذکر کیا ہے کہ وہ ایک غیر مومن شخص تھا جسے قیامت میں شک تھا، ایک غلط بات ہے، کیونکہ آیت واضح طور پر اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس پر وحی نازل ہوتی تھی۔

وہ ''قریہ'' بہت سی روایات کے مطابق بیت المقدس تھا اور یہ واقعہ بخت النصر کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی کے بعد پیش آیا۔

۲۔ یہ مردِ خدا (جو کوئی بھی تھا) کیا واقعی مر گیا تھا یا کیا گہری نیند سو گیا تھا؟ مندرجہ بالا آیت کا ظاہر تو یہی ہے کہ وہ واقعاً دنیا سے چل بسا تھا اور پھر ایک سو سال گزرنے کے بعد اللہ کے حکم سے زندہ ہوا۔بہت سے مفسرین کا یہی نظریہ ہے جب کہ بعض کا میلان اس طرف ہے کہ ''موت'' کو یہاں ایسی ہی گہری نیند کے معنی میں تفسیر کریں جو شبیہ موت تھی جیسے آج بعض جانداروں میں ایسی ہی گہری نیند دکھائی دیتی ہے۔مثلاً بعض حیوان تمام موسم سرما میں سوئے رہتے ہیں، بہار آتی ہے تو بیدار ہوتے ہیں اور پھر حرکت کرنے لگتے ہیں۔ایسی نیند میں زندگی کی حرکات بہت کند ہو جاتی ہیں اور درکار توانائی غیر معمولی طور پر کم ہو جاتی ہے لیکن بہر حال شعلۂ حیات خاموش نہیں ہوتا۔

''المنار'' کے مصنف، اسی طرح مراغی نیز ''اعلام قرآن'' کے مصنف نے اسی احتمال کا انتخاب کیا ہے۔اعلام قرآن میں یہ ہے کہ ''مائۃ عام'' کے معنی ضروری نہیں کہ ایک سو سال ہی ہو بلکہ ممکن ہے مراد سو دن یا گھنٹے ہوں۔

یہ روشن فکر افراد کا گروہ ہے جن پر غیر معمولی امور کا قبول کرنا گراں ہوتا ہے۔لہٰذا جب بھی ایسے امور کا سامنا کرتے ہیں تو ان کی توجیہ کی کوشش کرنے لگتے ہیں، جب کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن مجید اور مسلم اسلامی روایات، ایک کلمہ میں کہا جا سکتا ہے کہ مذاہب آسمانی کا مضمون و مفہوم طرح طرح کے غیر معمولی امور سے مملو ہے جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کی توجیہہ کی ضرورت ہے۔اگر ہم غیر معمولی امور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو قبول کر لیں تو ان امور کو قبول کرنا بہت آسان ہے۔تاہم اس سلسلے میں ہم ہرگز مبالغہ کا راستہ اختیار نہیں کرتے نہ ہی حد سے تجاوز کرتے ہیں اور ہر کام کو ہم اعجاز یا خوارق عادات سے نسبت نہیں دیتے ہیں۔

مادی علماء کی نظر میں بھی بہت سے خوارق عادات ایسے ہیں جو معلوم علمی ذرائع سے قابل تفسیر نہیں ہیں۔لہٰذا کیا ضرورت ہے کہ جب بھی ہم کسی خوارق عادت یا غیر معمولی امر کا سامنا کریں تو اسے اس کی اصل صورت سے نکال کر مسخ کر دیں۔

مندرجہ بالا واقعے میں ایک تو اس مردِ خدا کے مرنے اور پھر زندہ ہونے کا ذکر ہے اور مقصد قیامت میں مردوں کے زندہ ہونے کا نمونہ پیش کرنا ہے، اس سے قطع نظر سواری کے جانور کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔قرآن کہتا ہے: وہ مر گیا تھا اور اس کی ہڈیاں بکھر چکی تھیں۔آیت تقریباً صراحت سے کہتی ہے کہ اللہ کے حکم سے ہڈیاں جمع ہوئیں، گوشت ان پر پھر چڑھ آیا اور وہ زندہ ہو گیا۔کیا پھر ان سب باتوں کی بھی توجیہ کرنا پڑے گی؟

---

[1] تفسیر برہان، نور الثقلین، مجمع البیان، روح المعانی، روح البیان، فخر رازی و قطربی۔زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ یہ بات کہ یہ واقعہ کون سی سرزمین پر پیش آیا، بہت سوں کا نظریہ ہے کہ یہ بیت المقدس میں رونما ہوا اور ایسا بخت النصر کے حملے اور تباہی کے بعد ہوا۔ ایسی تباہی ہوئی کہ قرآن جسے "خاوية على عروشها" (یعنی چھتیں گری پڑی تھیں اور دیواریں ان کے اوپر آ گری تھیں) کہتا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بیت المقدس کے نزدیک ایک اور جگہ تھی اور اس مردِ خدا نے اپنے آپ سے یہ جو سوال کیا کہ اللہ انہیں کیسے زندہ کرتا ہے، انکار کی بناء پر نہ تھا بلکہ تعجب اور شک کی بناء پر بھی نہ تھا بلکہ اس کی خواہش تھی کہ شہود عینی کے طور پر مردوں کو زندہ ہوتے دیکھوں جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے چاہا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ ابھی ذکر کیا جائے گا۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تقاضا اس لیے ہو کہ منکرین یا شک کرنے والوں کے سامنے ایک عینی نمونہ پیش کیا جائے کیونکہ بعض اوقات عقلی دلائل کچھ لوگوں کو قانع نہیں کرتے یہاں تک کہ وجدان کی آواز بھی ان کے لیے اطمینان بخش نہیں ہوتی۔ ان کا اصرار ہوتا ہے کہ وہ عینی نمونوں کو دیکھیں تا کہ مسئلہ حسی صورت اختیار کر لے اور قلب و روح سے تمام وسوسے ختم ہو جائیں۔

۴۔ ایک سوال یہی ہے کہ ان کے پاس کھانے پینے کی کیا چیز تھی؟ قرآن نے اس بارے میں صراحت سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن قرآن میں ہے "لم يتسنه" اور یہ "سنه" کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں "سال"۔ مطلب یہ ہوا کہ سالہا سال گزرنے کے باوجود وہ خراب نہ ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی دونوں چیزیں خراب ہو جانے والی تھیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان کے پاس کھانے کی چیز انجیر اور انگور تھے اور پینے کے لیے کسی پھل کا عرق یا دودھ تھا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے اظہار کے لیے اس جلد خراب ہو جانے والے مواد کو اس کی اسی حالت پر باقی رکھا، جب کہ سواری کا جانور اپنی تمام تر مضبوطی کے باوجود بکھر گیا تا کہ وہ اس بات کی علامت بنے کہ ایک سو سال کی مدت گزر گئی ہے۔ نیز اس طرح اس کا وجود امکانِ حیات بعد از موت پر ایک اور دلیل بھی بنے تا کہ وہ مردِ خدا ہر دو حصوں میں اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے (اپنے وجود میں بھی اور اپنی سواری کے وجود میں بھی)۔

۵۔ "ولنجعلك اية للناس" (ہدف یہ ہے کہ تجھے لوگوں کے لیے آیت اور نشانی قرار دیں)۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس واقعے کا فائدہ صرف اس مردِ خدا کے لیے نہ تھا بلکہ اس کا فائدہ عام تھا کیونکہ لوگوں نے مختلف قرائن کے ذریعے "عزیر" کو پہچان لیا اور یقین کر لیا کہ انہوں نے سو برس کے بعد حیات نو پائی ہے۔ ان کی معاصر نسل اگر دنیا سے چل بسی تھی تو بعد کی نسلوں نے حقیقت پالی اور اپنے بزرگوں سے جو معلومات انہیں نے حاصل کی تھیں ان کی مدد سے حقیقت امر سے واقف ہو گئے۔

۲۔ ابراہیمؑ اور مسئلہ معاد

جن تاریخی و عینی نمونوں کا قرآن مجید نے ذکر فرمایا ہے ان میں سے ایک حضرت ابراہیمؑ اور "طیور اربعہ" (چار پرندوں) کا واقعہ ہے۔ یہ واقعہ داستانِ عزیرؑ کے فوراً بعد قرآن پاک میں آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ (بقرۃ: ۲۶۰)

ترجمہ

یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا: پروردگار! مجھے دکھا کہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے؟
فرمایا: کیا تیرا (معاد) پر ایمان (کامل) نہیں؟
عرض کیا: ہاں، ایمان تو ہے لیکن میں دل کا اطمینان چاہتا ہوں، (ایسا اطمینان جو حس اور مشاہدے کے ذریعے پیدا ہوتا ہے)۔
فرمایا: پس چار قسم کے پرندے انتخاب کر، پھر انہیں (ذبح کرنے کے بعد) ٹکڑے ٹکڑے کر (اور آپس میں ملا دے) پھر (اپنے اطراف میں موجود) ہر پہاڑ پر اس کا کچھ حصہ رکھ دے۔ پھر انہیں آواز دے (وہ اللہ کے حکم سے زندہ ہو جائیں گے اور) تیزی سے تیری طرف آئیں گے اور جان لے کہ اللہ توانا و حکیم ہے۔

اگر ہم پہلے سے کیے گئے فیصلوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ظاہر آیت کو دیکھیں اور تمام مختلف القائات کا اثر قبول نہ کریں تو آیت پوری وضاحت سے نشاندہی کرتی ہے کہ ابراہیمؑ چاہتے تھے کہ مردوں کے پھر سے زندہ ہونے کا منظر اطمینانِ قلب کی خاطر اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اس پر انہیں حکم دیا گیا کہ فرمانِ خدا کے تحت اس کا ایک نمونہ اپنے ہاتھوں سے انجام دیں۔ اس نمونہ میں چار پرندں کے اجزاء بدن آپس میں یوں ملا دیئے گئے جیسے انسانی خاک کے ذرات ملے ہوئے ہر طرف بکھر جاتے ہیں۔ اسی طرح پرندوں کے اجزاء بھی پھیلا دے گئے۔ پھر فرمانِ الٰہی سے وہ گوشہ و کنار سے جمع ہو گئے اور جامۂ حیات پہن لیا۔

بہت سے مفسرین نے جو شانِ نزول اس آیت کی ذکر کی ہے وہ بھی اس دعویٰ پر شاہد ہے۔ وہ ایک دریا کے پاس سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ایک مردار کو دیکھا جس کا ایک حصہ پانی میں تھا اور ایک خشکی پر۔ ایک طرف سے پرندے اسے کھا رہے تھے اور دوسری طرف سے دریائی جانور۔ ابراہیمؑ سوچ میں پڑ گئے کہ اس کے منتشر اجزاء پھر سے کیونکر جمع ہو کر زندہ ہوں گے جب کہ ممکن ہے کہ یہ بہت سے دوسرے جانداروں کے بدنوں کا حصہ بن گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مقام نبوت پر فائز تھے اور ان کا وحی سے رابطہ تھا، اس لیے ہر چیز پر ان کا ایمان تھا، ایسا ایمان جو عقلی استدلالات سے حاصل کردہ ایمان سے بالاتر ہوتا ہے۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں انہیں شہود حسی حاصل ہو جائے۔ لہٰذا اللہ نے

ان کے لیے اسے مجسم کرنے کا سامان کر دیا تا کہ وہ معاد جسمانی کو اس کے دقیق معنی کے لحاظ سے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ان کا دل مطمئن ہو جائے۔

قابل توجہ نکات

۱۔ "فصرھن" بعض ارباب لغت اور بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق مادہ "صور" (بروزن ''قول'') سے ہے۔ اس کے معنی ہیں تقطیع اور ٹکڑے کرنا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ابراہیمؑ مامور تھے کہ چاروں پرندوں کو ذبح کریں اور پھر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں ملا دیں۔

لیکن بعض ارباب لغت نے اسے مائل کرنے کے معنی میں لیا ہے (خصوصاً جب ''الی'' کے ساتھ متعدی ہو)۔ اسی وجہ سے بعض نام نہاد روشن فکر مفسرین کا اصرار ہے کہ ابراہیمؑ نے پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہرگز نہیں کیا، بلکہ وہ مامور تھے کہ انہیں اپنے آپ سے مانوس کریں اور پھر ان میں سے ہر ایک کو کسی پہاڑ پر رکھ دیں، پھر آواز دے کر اپنی طرف بلائیں، پھر اسے مردوں کے زندہ ہونے پر ایک مثال قرار دیں اور جان لیں کہ جیسے یہ کام آسان ہے کہ وہ پرندوں کو آواز دیں اور پرندے ان کی طرف آ جائیں، مردوں کے احیاء کا مسئلہ بھی قدرت الٰہی کے لیے اسی طرح آسان ہے۔[1]

انہوں نے گویا یہ فراموش کر دیا ہے کہ اولاً حضرت ابراہیمؑ نے مردوں کے احیاء کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا کیا اور اللہ نے ان کے تقاضے کو قبول کرنے کا حکم اس طریقے سے دیا اور فرمایا: ''تا کہ ابراہیمؑ کا دل مطمئن ہو جائے''۔ اگر مسئلہ یہیں ختم ہو جائے کہ لوگ پرندوں کو پکڑیں، تربیت کریں، آواز دیں اور وہ آ جائیں تو نہ صرف یہ کہ ابراہیمؑ کی احیائے اموات کے مشاہدے کی خواہش پوری نہ ہو اور ان کے دل کو اطمینان حاصل نہ ہو، بلکہ اس فرمان کا اس درخواست سے کوئی ربط ہی نہیں۔ اگر ایسی درخواست کا ایسا جواب کسی عام فرد کی طرف سے ہو تو یہ ناموزوں اور غلط دکھائی دیتا ہے، چہ جائے کہ ایسا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو، وہ بھی قرآن جیسے کلام فصیح میں۔

ثانیاً ''جزئ'' سے چار پرندوں میں سے ایک ایک مراد لینا بہت ہی نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

ثالثاً اس آیت کی جو شانِ نزول ذکر ہوئی ہے اور کتب حدیث میں جو متعدد روایات آئی ہیں کوئی بھی اس معنی سے مناسبت نہیں رکھتی۔ بلکہ ان سے یہ حقیقت پوری صراحت سے سامنے آتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے چار پرندوں کو پکڑا، ان کے سر کاٹے، ان کے اجزاء کو

---

[1] یہ بات دراصل مفسرین میں سے ''ابومسلم'' سے مربوط ہے۔ صاحب المنار نے اسی سے لی ہے اور اس کے دفاع پر کمر بستہ ہو گیا ہے۔ (ج ۳ ص ۵۶)

آپس میں ملایا، پھران کے کچھ حصے کیے۔ پھر ہر حصے کوایک پہاڑ پر رکھا۔ [1]

البتہ "فصرھن" چاہے ٹکڑے کرنے کے معنی میں ہواور چاہے مائل کرنے کے معنی میں ہو، آیت کے مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ آیت بہرحال فرمان خدا سے احیائے اموات کی کیفیت بیان کرنے کے بارے میں ہے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جولوگ آیات قرآن کی ایسی تفاسیر کے درپے ہیں ان کی بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ خوارق عادات کوقبول نہیں کرتے کیونکہ یہ امر مادی مکاتب فکر کے حامی کے ذوق سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے وہ ایسی سنگلاخ وادیوں میں جا پڑتے ہیں، حالانکہ معجزہ اور خوارق عادات کا وجود تمام مذاہب کی واضحات میں سے ہے یہاں تک کہ عالم طبیعی میں بھی بہت سے خوارق عادات نظر آئے ہیں جن کی تفسیر کرنے سے آج کا علم عاجز ہے (غور کیجیے گا)۔

۲۔ چار پرندے کون کون سے تھے، اس سلسلے میں مشہور ہے کہ وہ کبوتر، مرغ، مور اور کوا تھے۔ ان میں سے ہر ایک خصوصی جذبات اور صفات کا مظہر ہے۔ کبھی کبھی انسانی حرکات کو ان سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مور، بڑائی اور خودنمائی کا مظہر ہے۔ کبوتر، لہوولعب اور بازی گری کے لیے مشہور ہے۔ مرغ، شدید جنسی خواہشات کو ظاہر کرتا ہے۔ کوا طولانی آرزوؤں کا اظہار کرتا ہے۔

البتہ تفاسیر میں متعدد دیگر احتمالات بھی ذکر ہوئے ہیں۔ مختلف مفسرین نے ہدہد، الو، شاہین اور کرگس کا نام بھی لیا ہے۔ [2]

ظاہر ہے کہ مذکورہ پرندوں کی خصوصیات کا اصل مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی قدر کافی ہے کہ مختلف قسم کے پرندے تھے تاکہ یہ مختلف انسانوں کی مٹی کے ایک دوسرے سے مل جانے کی ایک نشانی بن جائے۔

جن پہاڑوں پر ان پرندوں کا گوشت رکھا گیا تھا روایات میں ان کی تعداد دو بیان کی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیمؑ کے شام میں آنے کے بعد پیش آیا کیونکہ سرزمین بابل پر کوئی پہاڑ نہیں ہے۔

۳۔ داستانِ اصحاب کہف

سورہ کہف میں چودہ آیات میں ایک داستان بیان کی گئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ

---

[1] ان روایات کے بارے میں مزید اطلاع کے لیے تفسیر نورالثقلین، ج ۱ ص ۲۷۵ تا ص ۲۸۲ اور تفسیر درالمنثور، ج ۱ ص ۳۳۵ کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] مجمع البیان، قرطبی، فخرالدین رازی اور تفسیر نورالثقلین زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ترجمہ

''اور اس طرح ہم نے لوگوں کو ان (اصحاب کہف) کے حال سے آگاہ کیا تا کہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت اور معاد میں کوئی شک نہیں۔'' (کہف ۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حبیب اور طولانی نیند، جو موت سے بہت مشابہت رکھتی ہے، کا کم از کم ایک مقصد یہ تھا کہ یہ منکرین معاد کے لیے اور ان افراد کے لیے درس ہو جو اس سلسلے میں شک وشبہ میں مبتلا تھے۔

خاص طور پر یہ کہ "اذیتنازعون بینھم امرھم" سے استفادہ کیا گیا ہے کہ اس زمانے کی اقوام کا مسئلہ معاد (معادِ جسمانی) کے بارے میں باہم نزاع واختلاف تھا۔ مخالفین چاہتے تھے کہ اصحاب کہف کی نیند اور بیداری کا واقعہ جلد فراموش ہو جائے اور اس مسئلہ کے حامیوں کے ہاتھوں سے وہ یہ روشن برہان لے لیں (اس کی تفسیر میں جو متعدد احتمالات ذکر کیے گئے یہ ان میں سے ایک ہے)۔

فخر الدین رازی نے اس کی تفسیر میں پانچ دیگر احتمالات بھی ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اختلاف اور تنازعہ اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں تھا اور ان کے ناموں کے بارے میں یا ان کی نیند کی مدت کے بارے میں یا اس بارے میں اختلاف تھا کہ غار کے پاس ایک عبادت گاہ معبد کفار کے قریب تعمیر کریں یا معبد موحدین کے قریب۔ [1]

اس سورہ کی آیت میں قرآن مجید صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ وہ تین سو نو سال سوئے رہے۔ قرآن پاک کے الفاظ ہیں:

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ (کہف ۲۵)

کوئی شک نہیں کہ ایسی طولانی نیند موت کی شبیہ ہے اور اس کے بعد بیداری حیات بعد از موت کی مانند ہے۔ لہٰذا یہ واقعہ معاد کے لیے تاریخی اعتبار سے بخوبی ایک عینی نمونہ ہو سکتا ہے۔

کچھ وضاحتیں

اس داستان کے حوالے سے بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہماری بحث سے صرف چند نکتے متعلق ہیں:

(۱) واقعے کا خلاصہ

قرآن مجید اور مشہور روایات میں جو کچھ آیا ہے اس کے مطابق واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک ظالم بادشاہ تھا جس کا نام دقیانوس تھا جو ایک بت پرست قوم پر حکمرانی کرتا تھا۔ بعض نے اس کا نام ''دسیوس'' لکھا ہے۔ اس کا زمانہ پہلی سے تیسری صدی عیسوی کے درمیان تھا۔ اس کے پایہ تخت کا نام ''افسوس'' تھا۔ اس کے کچھ وزراء تھے۔ ایک واقعہ کی بناء پر وہ بت پرستی کے بے اساس ہونے کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۲۱ ص ۱۰۵

اپنے مقام ومنصب پر اس خرافاتی مذہب کے چنگل سے آزادی کو ترجیح دی۔ وہ لوگ خفیہ طور پر اپنے شہر سے نکلے اور ایک نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔ ایک عرصے کے بعد وہ ایک غار تک پہنچے جسے انہوں نے اپنی پناہ گاہ قرار دیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب طولانی نیند ان پر مسلط فرما دی۔ وہ سینکڑوں برس سوتے رہے۔ جب وہ اس خواب گراں سے بیدار ہوئے تو ایک دوسرے سے اپنی نیند کے بارے میں سوال کرنے لگے۔ انہوں نے خیال کیا کہ ان کی نیند ایک دن یا دن کے کچھ حصے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن غار کے اطراف کے قرائن وشواہد اور ان کے اپنے چہرے مہرے نشاندہی کر رہے تھے کہ بات اس سے مختلف ہے۔ لہٰذا وہ شک میں پڑ گئے۔

انہیں چونکہ بھوک لگ رہی تھی لہٰذا انہوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو شہر کی طرف بھیجا کہ ان کے لیے چپکے سے کھانا لے کر آئے۔ لیکن انہوں نے کھانا خریدنے کے لیے جو سکے دیے ان سے ان کا راز فاش ہو گیا۔ ان کا طرزِ عمل بھی لوگوں کی عادات ورسوم سے مختلف تھا۔ اس پر مستزاد کہ لوگوں نے سن رکھا تھا کہ ایک مدت پہلے چند جوان جو صاحب منصب اور عالی مقام تھے، غائب ہو گئے تھے۔ یہ سب امور نشاندہی کر رہے تھے کہ یہ لوگ وہی ہیں۔

لوگوں کو پتہ چل گیا اور وہ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن وہ شخص اپنی غار میں واپس آ گیا اور ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے آنکھیں موند لیں۔ لوگوں نے اس جگہ ان کے احترام میں ایک معبد تعمیر کر دیا۔

اصحابِ کہف کا واقعہ۔ تاریخی کتب میں

سوال یہ ہے کہ کیا یہ واقعہ قرآن مجید کے علاوہ بھی کہیں نقل ہوا ہے اور موجودہ تورات اور انجیل میں اس کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے؟

پہلے سوال کا جواب مثبت ہے اور دوسرے کا منفی کیونکہ مورخین کے مطابق یہ واقعہ ولادتِ مسیح کے طویل عرصہ کے بعد رونما ہوا۔ بعض نے اس کی تاریخ ۲۴۹ تا ۲۵۱ عیسوی کے مابین ذکر کی ہے۔ لہٰذا ممکن نہیں کہ تورات یا انجیل میں اس کے بارے میں کوئی اشارہ ہو۔ ''اعلام قرآن'' میں ہے:

یورپیوں نے اصحاب کہف کا واقعہ بطورِ خلاصہ یوں نقل کیا ہے:

''دقیانوس جو عیسائیوں پر سخت ظلم کرتا تھا، اس کے زمانے (۲۴۹ تا ۲۵۱) میں اشراف کے سات جوانوں نے غار میں پناہ لے لی۔ دقیانوس نے حکم دیا کہ غار کے دہانے پر ایک دیوار تعمیر کر دی جائے تا کہ وہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے مر جائیں۔ لیکن وہ ساتوں غار میں گہری نیند میں چلے گئے۔ ۱۵۷ سال بعد تھوڈوزدوم کے زمانے میں وہ بیدار ہوئے۔ یورپیوں نے اصحاب کہف کو ''افسوس کے ساتھ سونے والے'' کا نام دیا ہے۔''

اس کتاب کے ایک اور حصے میں آیا ہے:

اصحاب کہف کا واقعہ پہلی بار پانچویں صدی عیسوی میں ساروک کے رہنے والے ''زاک'' نے اپنے ایک سریانی رسالے میں بیان کیا

ے۔ژاک کلیسائے شام کا خلیفہ تھا گو گویوس نامی شخص نے جلال شہداء کے زیر عنوان اس رسالے کا سریانی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔[1]

تواریخ اسلامی اور مشرق ومغرب کی ادبیات میں اس واقعے کی وسیع بازگشت سنائی دیتی ہے، یہاں تک کہ روس اور حبشہ کے ادبی آثار میں بھی اس واقعے کی بازگشت اور اس کی طرف اشارے موجود ہیں۔[2]

بنابریں مذکورہ واقعہ صرف قرآن مجید میں ہی بیان نہیں ہوا بلکہ دوسروں کے تاریخی آثار میں بھی اس کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔

اصحاب کہف کی غار کا محل وقوع

مشہور یہ ہے کہ یہ غار ''افسوس'' نامی ایک شہر کے پاس واقع تھا۔ جو ایشیائے کوچک کے شہروں میں سے ایک مشہور شہر ہے۔ (ایشیائے کوچک یعنی موجودہ ترکی جو قدیم مشرقی روم کا ایک حصہ ہے) یہ دریائے کایسر کے نزدیک ازمیر سے جنوب مشرق میں تقریبا چالیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔[3]

''افسوس'' اپنے معروف عبادت خانہ اور بت خانہ اوطامیس کی وجہ سے عالمی شہرت رکھتا ہے کیونکہ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے ہے۔[4]

لیکن بعض کے خیال میں اصحاب کہف کا غار شام کے نزدیک ''طرطوس'' کے علاقے میں ہے۔[5]

اس وقت بھی دمشق میں ایک محلہ موجود ہے جو غارِ اصحاب کہف کے نام سے مشہور ہے اور لوگ اسے دیکھنے جاتے ہیں۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مشہور ہے۔

اصحاب کہف کا واقعہ۔موجودہ علم کی روشنی میں

سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی شخص کی عمر چند سو سال ہو جائے، خواہ یہ عمر بیداری میں گزرے یا گہری نیند میں؟ اگر یہ مان لیں کہ بیداری میں ممکن ہے تو بھی نیند میں ایسا امکان بیشتر مشکلات کا حامل ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان بغیر کچھ کھائے پیئے تین سو سال زندہ رہے جب کہ عام حالات میں اتنی مدت میں شاید ایک انسان کو ایک سو ٹن غذا اور ایک لاکھ لیٹر پانی سے زیادہ کی ضرورت ہوگی۔

---

[1] اعلام قرآن، ص ۱۷۱ و ص ۱۷۲

[2] اعلام قرآن، ص ۱۸۱

[3] فرہنگ قصص قرآن ص ۳۱۵

[4] قاموس مقدس ص ۸۷

[5] دائرۃ المعارف وجحند امادۂ اصحاب کہف

یہ وہ سوالات ہیں جو سائنسی اعتبار سے اس واقعہ کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ جو ان سوالات کے جواب کے لیے کوئی دلیل نہیں پا سکے انہوں نے فوراًانکار کا راستہ اختیار کیا ہے اور اس واقعہ کو ایک دیومالائی داستان قرار دیا ہے۔

یہ اس حال میں ہے جب کہ سائنسدانوں کے تازہ ترین مطالعات ایک طرف اور زندہ موجودات کی زندگی کے بارے میں انکشافات دوسری طرف کہہ رہے ہیں کہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔

عصر حاضر کے سائنسدانوں کے اس بارے میں طرزِ تفکر کو اجمالی طور پر جاننے کے لیے ہم حال ہی میں سائنسی مطبوعات میں شائع ہونے والی تحقیقات کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔

ان مطبوعات میں سے ایک میں اس عنوان کے تحت کہ کیا انسان موت پر قابو پالے گا، بیان کیا گیا ہے:

مٹالینکف، جو معروف بیالوجسٹ تھا، نے ۱۹۳۰ء میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ خود عالم طبیعی میں صلاحیت کے اعتبار سے حیات ابدی موجود ہے۔سائنس کی ذمہ داری یہ ہے کہ حیات جاوید کے اسرار تک رسائی حاصل کرے۔

وہ مزید کہتا ہے کہ سادہ جانور جو مثلاً ایک خلیئے[1] پر مشتمل ہوتے ہیں، درحقیقت مرگ ناپذیر ہیں، کیونکہ وہ لامتناہی طور پر خلیوں کی تقسیم کے طریق پر زندہ رہتے ہیں۔لہٰذا کیا تعجب ہے کہ عالی تر موجودات میں کہ جو لاکھوں خلیوں سے تشکیل پاتے ہیں، صلاحیت کے اعتبار سے حیاتِ جاوید کا مصداق موجود ہو۔ہم سائنسدانوں کو چاہیے کہ ان کے اسرار تک رسائی حاصل کریں۔

اس مقولہ کے بارے میں ایک اور جگہ ''چھ سو ملین سالہ نیند'' کے زیر عنوان بیان کیا گیا ہے کہ ایسے افکار پختہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ پروفیسر ایٹنجر نے اس کے عملی مفہوم کے بارے میں بیان کیا۔وہ کہتا ہے کہ اب ہم حیات ابدی کے بارے میں بات کر سکتے ہیں کیونکہ نظریات کی دنیا میں حیات جاوید کا امکان ثابت ہو چکا ہے اور تکنیک کے حوالے سے ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں اس نظریے کو عملی شکل دے سکیں۔

اس کے بعد تسلسل حیات کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اضافہ کرتا ہے:

جب بدن کا درجہ حرارت بہت نیچے آجاتا ہے تو زندگی کی رفتار اتنی سست پڑ جاتی ہے کہ تقریباً زمانہ کی دسترس سے نکل جاتی ہے۔جب ہمارے بدن کا درجۂ حرارت صفر مطلق[2] کے نزدیک پہنچ جاتا ہے تو عام حالات میں ایک سیکنڈ زندگی کے لیے توانائی کی جس مقدار کی ضرورت ہوتی ہے وہ صدیوں کی زندگی کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد نمک کی قلموں کے بارے میں بات کرتا ہے، جو سو ملین سال قبل سے مربوط ہیں۔ان میں اس زمانے کے جراثیم (BACTERIAS) کے آثار اور بقایا جات موجود تھے۔وہ مناسب فضا میں آئے اور زندہ ہو گئے اور ان کی نسل بڑھی (یعنی درحقیقت یہ

---

[1] (PROTOZO'AS)

[2] صفر مطلق عام صفر سے ۲۷۰ درجہ سنٹی گریڈ کم ہوتا ہے۔(ABSOLUTE ZERO)

جرثومے سوملین سال کے بعد نیند سے بیدار ہوئے ہیں)۔ پروفیسر ایٹنجر نے اس واقعے کے بعد ان قلموں (CRYSTALS) کو جو علاقے میں چھ سوملین سال قبل سے موجود ہیں ان کے سمیت دنیا کے مختلف علاقوں سے جمع کیا اور ان جرثوموں کے بقایا جات کو بویا اور نہایت تعجب سے دیکھا کہ وہ بھی خواب گراں سے اٹھ بیٹھے ہیں۔ اس طرح سے اس نے ان چھوٹے چھوٹے موجودات کے لیے چھ سوملین سال کی ریکارڈ عمر ثابت کی۔

اس کا نظریہ ہے کہ سائنسی اعتبار سے ایسا انسان کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔ یہ انجماد بالکل موت سے قبل کے لحظے میں ہوتا ہے اور خاص حالات میں ایسا ہوتا ہے۔ اس طرح سے بدن کے اعضاء (ORGANS) کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ [1]

ہمارا ہرگز یہ ادعا نہیں کہ اصحاب کہف انجماد کی حالت میں زندہ تھے۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اگر نیند بہت گہری ہو اور جسم کے نظام غیر معمولی طور پر آہستہ روی سے کام کریں تو بدن کی ضروریات اتنی کم ہوجاتی ہیں کہ ممکن ہے بدن میں موجود ذخیرہ صدیوں کی زندگی کی ضروریات بھی پوری کردے، چونکہ یہ کوئی معمول کی طبیعی نیند نہ تھی۔ یہ حکم خدا سے استثنائی حالت میں آئی تھی اور فضا ایسی مخصوص تھی کہ قرآن کے مطابق وہاں دھوپ ہرگز نہ پڑتی ہے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ (کهف ۱۷)

طولانی نیند کا مسئلہ ہمارے زمانے میں حل ہوچکا ہے (بہت سے جانداروں کے بارے میں یہ بات تسلیم ہوچکی ہے کہ وہ پورے موسم سرما میں سوئے رہتے ہیں)۔ ایسی نیند میں زندگی کی فعالیت تقریباً رک جاتی ہے اور انتہائی معمولی سی حرارت باقی رہ جاتی ہے۔ دل کی دھڑکن اس قدر خفیف ہوجاتی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ایسے مواقع پر انسانی جسم کو ایسے بڑے آتش دان سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس میں آگ خاموش ہو جائے تو ایک چھوٹا سا شعلہ بھڑکتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک دن میں ایک بڑے آتش دان کو پوری طرح سے جلنے کے لیے جس قدر توانائی کی ضرورت ہوتی ہے ممکن ہے کہ چھوٹے چھوٹے شعلوں کی صدیوں کی ضرورت اس سے پوری ہوجائے۔

سائنسدان کہتے ہیں کہ نہ صرف بعض خون سرد جاندار موسم سرما میں سوجاتے ہیں بلکہ بعض خون گرم جاندار بھی ایسا کرتے ہیں۔ اس دوران ان کی زندگی کی رفتار بہت سست پڑجاتی ہے اور انکے بدن کی چربی کا ذخیرہ بتدریج صرف ہوتا رہتا ہے۔ [2]

ہمارا مقصد اصحاب کہف کی نیند کی کیفیت بیان کرنا نہیں بلکہ دو امور کا بیان کرنا مقصود ہے:

ایک یہ کہ ان کی نیند اجمالاً ایک عام اور معمولی نیند نہ تھی۔ خصوصاً اس لیے کہ قرآن فرماتا ہے:

---

[1] مجلہ دانستنیہا۔ آذرہ ماہ ۱۳۶۱ (ہجری شمسی) شمارہ ۸۰

[2] دائرۃ المعارف ''فرہنگ نامہ'' مادہ ''زمستان خوابی''

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

''اگر تو انہیں اس حال میں دیکھتا تو بھاگ جاتا اور بہت ڈرتا۔'' (کہف ۱۸)

دوسرا یہ کہ ایسی نیند میں معمول کی نیند کا حساب حکم فرما نہیں ہوتا اور ممکن ہے کہ جسم کی ضروریات اس قدر کم ہو جائیں کہ تغذیہ کی مشکل بالکل باقی ہی نہ رہے۔

بنی اسرائیل کے فرار کا واقعہ

اس سلسلے کا ایک اور نمونہ قرآن کی سورۂ بقرہ میں آنے والا ایک واقعہ ہے یہ واقعہ ایک جماعت کے بارے میں ہے جو ہزاروں افراد پر مشتمل تھی۔ موت کے خوف سے ان لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑ دیا اور فرار ہو گئے۔ لیکن اس فرار کے باوجود وہ نجات نہ پا سکے۔ اللہ کے حکم سے وہ سب موت کے پنجہ میں گرفتار ہوئے۔ بعد ازاں اللہ نے انہیں پھر سے زندہ فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (بقرہ ۲۴۳)

مفسرین کے مطابق یہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت تھی۔ یہ لوگ کسی وبا یا طاعون کے خوف سے اپنے علاقے سے بھاگ گئے لیکن زیادہ دیر نہ گزری کہ اسی بیماری کے باعث دنیا سے چل بسے۔ بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت حزقیل کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ انہیں زندہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے (منکرین معاد کے مقابلے میں) مردوں کے احیاء کے لیے ایک نمونہ کے طور پر انہیں زندہ کر دیا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ شام کے کسی شہر میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے درمیان طاعون پھیل جاتا تھا۔ جب بھی اس کے آثار دیکھتے تو امیر لوگ جن کے پاس کافی وسائل ہوتے وہ شہر چھوڑ جاتے۔ غریب لوگ باقی رہ جاتے اور ان میں بہت اموات واقع ہوتیں۔ جو لوگ باہر چلے جاتے وہ زیادہ تر صحیح وسالم رہتے۔ بعد ازاں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب جب کبھی ایسا ہوگا تو سب نکل جائیں گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا لیکن کوئی نہ بچ سکا اور سب اللہ کے حکم سے اس دنیا سے چل بسے۔ [1]

مندرجہ بالا آیت میں اس نکتے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے کہ مرنے کے بعد اس زندہ کرنے کا مقصد اس دنیا میں معاد کے منظر کی نشاندہی کرنا ہے لیکن جو روایات اس واقعے کی تشریح کے ضمن میں آئی ہیں ان میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ یہی ہدف پیش نظر تھا۔ [2]

یہاں پھر ہمیں بعض نام نہاد روشن فکر مفسرین کی انحرافی تفسیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ واقعہ بھی معجزانہ پہلو رکھتا ہے اور ہم جانتے

---

[1] مجمع البیان، تفسیر فخر رازی اور تفسیر نور الثقلین (زیر بحث آیت کے ذیل میں)

[2] مجمع البیان، ج ۱ و ۲ ص ۳۴۷

ہیں کہ ایسے امور کا بعض افراد کے لیے ہضم کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا ظاہر قرآن جس امر کی حکایت کرتا ہے یہ لوگ اس کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اسے امتوں کی حیات وموت کے لیے صرف ایک مثال قرار دیا ہے جو ان کی نظر میں درحقیقت ان کی کامیابی اور ناکامی کے لیے ایک کنایہ ہے۔

یہ افراد کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں ایک ایسے گروہ کی خبر دی گئی ہے جنہوں نے اپنی قوت وطاقت اور استقلال کو بالکل گنوا دیا۔ اس طرح سے وہ ایک مردہ امت کی طرح سے ہو گئے۔ پھر وہ خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور لطف الٰہی سے دوبارہ قوت واستقلال پایا۔[1]

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسی تفسیروں اور توجیہوں کو اگر قرآن کی حدود میں لے آیا جائے تو پھر بہت سے حقائق قرآنی قابل انکار قرار پائیں گے۔ پھر ہر کوئی واضح آیات کی اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق تفسیریں کر سکتا ہے۔ یوں قرن جو انسانوں کا رہبر ورہنما ہے توجیہ افکار اور ذاتی ذوق کا آلہ بن جائے گا جب کہ اسے تو راہبر ہونا چاہیے اور اس کے پیچھے چلنا چاہیے۔

روایات اسلامی میں جس تفسیر بالرائے سے سختی سے روکا گیا وہ ایسی ہی تفسریں ہیں۔ ایسی ہی تفسیر بالرائے کرنے والے کو ایسا شخص قرار دیا گیا ہے کہ جو آسمان سے زمین پر آ گرے۔ ایسی تفسیریں فہم الفاظ کے معیارات اور قواعد سے خارج ہیں۔

اگر یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ایسی تفسیروں سے مادی فکر والوں کو مطمئن کریں تو وہ ہرگز ایسی چیزوں سے مطمئن نہیں ہوتے اور اگر یہ معجزات کا انکار کرنا چاہتے ہیں تو پھر ایسی بات نہ تو مذہب کے حامی قبول کرتے ہیں اور نہ مخالفین مذہب۔

مقتول بنی اسرائیل کا واقعہ

احیاء اموات کا اس جہان میں عینی نمونہ قرآن مجید کے جن واقعات میں پیش کیا گیا ہے ان میں سے آخری مورد بنی اسرائیل کے کچھ افراد سے متعلق ایک واقعہ ہے۔ ہوا یہ کہ ان میں سے ایک اہم آدمی خفیہ طور پر قتل ہو گیا۔ قاتل کی تلاش کے سلسلے میں بنی اسرائیل کے درمیان بہت اختلاف پیدا ہوا۔ ہر قبیلہ اس قتل کا الزام دوسرے قبیلے پر دھرتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کشمکش کے جاری رہنے کی صورت میں کوئی بہت بڑا فتنہ پیدا ہو جاتا۔ لہٰذا وہ حضرت موسیٰ کے پاس آئے۔ حضرت موسیٰ نے الطافِ الٰہی سے مدد لی اور ایک ایسے اعجاز آمیز طریقے سے مسئلہ کو حل کر دیا جسے سب نے قبول کر لیا۔

آپ نے حکم دیا کہ ایک گائے کو ذبح کریں۔ لیکن گائے کا سر آسانی سے نہ کاٹا جا سکا۔ بنی اسرائیل کے بہانہ جو افراد اس گائے کے اوصاف پوچھنے کے لیے بار بار حضرت موسیٰ کے پاس آئے اور بے جا اور بے معنی سوالات کر کے انہوں نے مسئلے میں تاخیر پیدا کی۔ آخر کار کچھ خاص اوصاف والی ایک گائے کو انہوں نے ذبح کیا۔ اس کے گوشت کا ایک حصہ مقتول پر رکھا گیا۔ وہ اللہ کے حکم سے چند لحظوں کے لیے زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کی شناخت کر دی۔

اس واقعے کے آخری حصے میں قرآن فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر اس کے بارے میں تم

---

[1] المنار، ج ۲ ص ۴۵۸

جھگڑنے لگے اور جو کچھ تم چھپاتے تھے اللہ نے اسے ظاہر کر دیا۔ پس ہم نے حکم دیا کہ اس کا ایک حصہ مقتول کے جسم پر مارو۔ اس طرح سے اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی آیات دکھاتا ہے کہ شاید سمجھ جاؤ (وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝) (بقرہ ۷۲-۷۳)

یہ بات عجیب ہے کہ اس میں انہوں نے ایک مردے کا کچھ حصہ دوسرے مردے کو مارا تا کہ وہ زندہ ہو جائے اور حقیقت حال کو بیان کرے۔ ان دونوں کے درمیان کیا ربط ہے اور یہ اثر کہاں سے پیدا ہوا، یقیناً یہ ایک رازِ الٰہی ہے جس سے اس کی پاک ذات کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں۔ بس اتنی بات واضح ہوتی ہے کہ دوسری دنیا میں مردوں کو زندہ کرنا قدرت الٰہی کے لیے کس قدر آسان اور سادہ ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایک موجود زندہ ہی سے دوسرا موجود زندہ پیدا ہو، بلکہ ممکن ہے کہ حکم الٰہی سے دو اعضاء کے باہم ملنے سے شعلۂ حیات بھڑک اٹھے۔

كذلك يحيي الله الموتى (اس طرح سے اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے)۔ یہ جملہ وضاحت سے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ مقتول کے زندہ ہونے نے موت کے بعد حیات کا ایک عینی نمونہ انسانوں کے لیے پیش کیا ہے۔

اس مقام پر پھر ہمیں صاحب المنار جیسے مصنفین کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس قدر وضاحت کے باوجود جملہ کے معنی خلاف ظاہر کرنے پر مصر ہیں، جب کہ ان کے پاس نہ کوئی عقلی قرینہ ہے اور نہ ہی نقلی اور نہ ضرورت ہے۔

وہ کہتے ہیں:

ظاہراً یوں تھا کہ اگر کسی شہر کے پاس کوئی مقتول پڑا ملتا اور اس کے قاتل کی شناخت نہ ہوتی تو ہر کوئی وہاں اپنے خاص مذہبی مراسم کے ساتھ اپنے ہاتھ دھوتا اور خون مقتول سے بری ہو جاتا اور جو کوئی نہ دھوتا اسے قاتل سمجھا جاتا۔ احیائے موتے سے یہاں مراد اس خون کی حفاظت ہے جس کے ایسی کشمکش اور نزاع میں بہہ جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ یعنی اللہ ایسے احکام کے ذریعے مزید خون بہنے سے روکتا ہے۔[1]

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے ایسی تفسیریں ایک طرح سے الفاظ کی بازی گری ہیں۔ ان تفاسیر سے کلام اللہ کی اصالت ہی مخدوش ہو جاتی ہے۔ اس سے کسی بھی آیت سے کسی بھی مقصد پر استدلال کرنے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ پھر تو ہم الفاظ سے کنائی اور مجازی معانی نکالتے رہیں، بغیر اس کے کہ اس کے لیے کوئی اطمینان بخش قرینہ موجود ہو۔ علاوہ ازیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت و احتیاج بھی نہیں، کیونکہ مذاہب کے پیروکاروں کو بہر حال معجزات اور خوارق عادات کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ جب ایسا ہے تو ان توجیہات کی کیا ضرورت ہے۔

شاید ذبح کرنے کے لیے گائے کو اس لیے منتخب کیا گیا کہ بنی اسرائیل قربانی گائے کی ہی دیا کرتے تھے۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ اس قتل کا محرک کیا تھا؟ روایات میں آیا ہے کہ ایک جوان نے اموال پر قبضہ کے لیے اپنے چچا کو قتل کیا تھا (یا اس لیے کہ اس کی بیٹی سے شادی کر سکے)۔ اس کے پیش نظر قتل کا محرک مال یا عورت کی محبت ہے (اور دنیا میں اکثر قتل کا محرک یہی ہوتا ہے)۔

اس عجیب واقعہ میں، بالخصوص اس کی تفصیلات میں بہت سے سبق آموز نکات ہیں۔ چونکہ یہ معاد کی بحث سے خارج ہیں لہٰذا ہم ان

---

[1] المنار، ج ۱ ص ۳۵۱

سے صرف نظر کرتے ہیں۔ بیشتر آگاہی کے لیے آپ تفسیر نمونہ ج ا میں زیر بحث آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔ [1]

یہ تھے مردہ کے احیاء کے چند عینی نمونے جن کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی امکان معاد کے بارے میں گفتگو اختتام کو پہنچتی ہے۔ اب ہم اس کے عقلی دلائل کی جستجو کی طرف بڑھتے ہیں۔

[1] سورہ بقرہ کی آیہ ۵۵ و ۵۶ میں بھی حیات بعد از ممات کے ایک نمونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جب بنی اسرائیل کے نمائندے حضرت موسیٰؑ کے ہمراہ کوہ طور پر گئے تو وہاں انہوں نے چشم ظاہر سے اللہ کو دیکھنے کا تقاضا کیا۔ ایک ہلاکت خیز بجلی پہاڑ پر پڑی اور وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ موسیٰ بیہوش ہو گئے اور بنی اسرائیل کے نمائندے مر گئے۔ بعد ازاں اللہ نے انہیں زندہ کیا کہ شاید اس کی نعمت کا شکر بجالائیں (ثم بعثنکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون)۔ لیکن اس لیے کہ آیت میں یہ بات بیان نہیں کی گئی کہ اس کا مقصد معاد کا کوئی نمونہ پیش کرنا تھا، ہم نے اسے زیر بحث موضوع کی آیات میں نہیں شمار کیا، خاص طور پر اس بات کے پیش نظر کہ بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل اس عظیم چمک کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے، مرے نہیں تھے۔ نیز بعض نے موت سے جہل اور بعثت سے علم مراد لیا ہے، (روح المعانی میں آلوسی نے یہ دو تفسیریں بعض مفسرین سے نقل کی ہیں۔ ج ا ص ۲۲۹) اگرچہ ایسی تفسیریں ظاہر آیہ کے مخالف ہیں اور قابل قبول نہیں ہیں۔

وقوع معاد پر دلائل

معاد کے ثبوت کے لیے متعدد عقلی و منطقی دلائل موجود ہیں کہ جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے بلکہ بعض جگہ تو بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے اپنے ان اشاروں میں مسلمانوں کو ان اصول و براہین کی پیروی کے لیے ہدایت کی ہے۔

اصولاً قرآن مجید نے اپنی اعتقادی بحثوں میں کسی ایک میں بھی تعبد اور بے دلیل گفتگو کا انداز نہیں اپنایا بلکہ ان تمام مباحث میں دلائل عقلی پر زور دیا ہے۔ لہٰذا بعض اوقات ایک چھوٹی سی آیت اہم ترین عقلی دلائل کے دریچوں کو کھول دیتی ہے جس کی مثال توحیدی مباحث میں بہت زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے اور معاد کی بحث میں بھی آپ انشاءاللہ اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔

قرآن مجید سے وقوع معاد کے بارے میں معمولاً سات دلیلیں پیش کی جاتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ دلیل فطرت

۲۔ دلیل حکمت

۳۔ دلیل عدالت

۴۔ دلیل حرکت و ہدف

۵۔ دلیل رحمت

۶۔ دلیل نفی اختلاف

۷۔ دلیل بقائے روح

۱۔دلیل فطرت

یہاں پر دلیل فطرت سے مراد ہے کہ انسان اپنے اندر دل کی گہرائیوں سے ایک حقیقت پر ایمان واعتقاد کو پاتا ہے اور ہماری بحث کے مطابق انسان دوسرے جہان کے وجود، قیامت اور خدائی عدالت پر ایمان کو محسوس کرتا ہے۔

البتہ اس بات کی مختلف طریقوں سے وضاحت ضروری ہے جس کی تشریح ہم درج ذیل آیات کی بحث کے بعد بیان کریں گے۔

(۱) فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۙ (روم: ۳۰)

(۲) لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴿١﴾ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿٢﴾ أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ﴿٣﴾ (القیمۃ: ۱ تا ۳)

ترجمہ

(۱) اپنا رخ خدا کے دین حنیف (خالص آئین کی طرف کرلو۔ یہ ایسی فطرت ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا۔ خدا کی خلقت میں تغیر وتبدل نہیں ہے۔ یہی دین اور محکم واستوار آئین ہے۔

(۲) روزِ قیامت کی قسم.....اور باضمیر اور ملامت کنندہ نفس لوامہ کی قسم! (کہ قیامت حق ہے) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے؟

تفسیر

معاد دل کی گہرائیوں میں

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ متذکرہ آیات میں سے پہلی آیت میں شاید انسان کی صرف فطرت خداشناسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ آیت میں دقت نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا موضوع سخن عمومیت کا حامل ہے اور تمام دین کو فطری جانتا ہے۔ یعنی اصول عقائد کا مجموعہ حتی کہ فروع دین کی کلیات اور احکام بصورتِ خلاصہ فطرت کی اتھاہ گہرائیوں میں موجود ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اپنا رخ خدا کے خالص دین کی طرف کرلو، یہ وہی فطرت ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا، خلقت خدا میں تغیر و تبدل نہیں ہے۔ یہی مستحکم واستوار آئین اور دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۙ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں متذکرہ بالا آیت میں لفظ ''دین'' دوبار استعمال ہوتا ہے کہ جو دینی حقائق کے مجموعے کی جانب اشارہ ہے اور یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ ایک جملے میں فرماتا ہے: ''یہ خلقت خدا ہے'' بعدازاں ارشاد ہوتا ہے: ''خلقت خدا میں تغیر وتبدل نہیں ہے'' اور تیسری مرتبہ اس مسئلہ پر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''یہ آئین مستحکم اور استوار ہے۔''

لہٰذا اس طرح اس آیت میں انسانوں کے لیے دین کے فطری ہونے پر تین بار تاکید کی گئی ہے۔[1]

اس آیت کے مجموعی مطالب سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف مسئلہ خداشناسی بلکہ قیامت اور خدا کی اس عظیم عدالت پر اعتقاد بھی انسانی فطرت میں شامل ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت کے ضمن میں ملنے والی روایات میں بھی یہ مطلب روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے کسی نے اس آیت کے ضمن میں فطرت کا معنی پوچھا:

امام علیہ السلام نے فرمایا: هی الاسلام

اس فطرت سے مراد اسلام ہے۔[2]

تفسیر درالمنثور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یوں نقل کیا گیا ہے:

فطرت الله التی فطر الناس علیها، دین الله

''وہ فطرت کہ جس پر خدا نے لوگوں کو خلق کیا ہے، دین خدا ہے۔''[3]

یہ معروف ترین حدیث شیعہ سنی دونوں نے نقل کی ہے کہ تمام انسان فطرت (اسلام) پر پیدا ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے والدین ہیں

---

[1] ''حنیف'' کا معنی خالص یا ہر قسم کے انحراف سے خالی ہونا ہے اور اس کا ریشہ اصلی بمعنی ''تمایل'' ہے۔ البتہ یہاں حق کی جانب تمایل کے معنی میں ہے۔ ''فطرت'' دراصل ''فطر'' (بروزن سطر) کے مادے سے ہے اور اس کا معنی پھاڑنا ہے، چونکہ تخلیق کے وقت پردۂ عدم پھٹ جاتا ہے۔ اسی لیے یہ لفظ خلقت وآفرینش کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ''قیم'' کا مادہ قیام ہے جس کا معنی استوار، مستحکم، مضبوط و پائیدار اور ثابت و مستقیم ہے۔

[2] نورالثقلین جلد ۴ ص ۱۸۴ حدیث ۵۴

[3] درالمنثور ج ۵ ص ۱۵۵

جوانہیں مجوسیت، یہودیت یا نصرانیت کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔[1]

دوسری آیت میں خداوند متعال کی قسم کے دو موضوع ذکر ہوئے ہیں: ایک روزِ قیامت اور دوسرا بیدار انسانی وجدان (لا اقسم بیوم القیمة و لا اقسم بالنفس اللوامة)۔

بعض معتقد ہیں کہ متذکرہ آیت میں لا نفی ہی کے معنی میں ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں ان دو موضوعات کی قسم نہیں کھاتا اور ہدف یہ ہے کہ اپنے مقصد کو بطورِ تاکید بیان کرے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے ہم کسی کو کہتے ہیں کہ میں تیری جان کی قسم نہیں کھاتا جب کہ اشارہ یہ ہے کہ قسم سے بڑھ کر ہے۔ لیکن بیشتر مفسرین کا کہنا ہے کہ لا زائدہ ہے اور تاکید کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ بنابرایں خدا نے روزِ قیامت کی قسم بھی کھائی ہے اور اسی طرح ''نفس لوامہ'' کی بھی۔

انسان کا اخلاقی ضمیر ہی ''نفس لوامہ'' ہے کہ جب اس سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو اپنے ہی کو ملامت کرتا ہے۔ جتنی بڑی غلطی ہو ضمیر کی سرزنش اور عذاب بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے حتی کہ بعض افراد جب گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں یا کسی بڑی جنایت کا ارتکاب کرتے ہیں تو خودکشی کر لیتے ہیں تاکہ اس طرح ضمیر کے شکنجے سے نجات پالیں اور ہم میں سے اکثر نے قاتلوں یا جنایت کاروں کے بارے میں ایسی مثالیں سنی یا دیکھی ہیں۔

(روزِ قیامت اور نفس لوامہ) دو ایسے اہم ترین موضوعات کہ جن کی قسم کھائی جاسکتی ہے، ان کا اکٹھے ذکر ہونا درحقیقت ان کے آپس میں رابطے کی طرف اشارہ ہے۔

روزِ قیامت خدا کی سب سے بڑی عدالت ہے اور نفس لوامہ بھی انسان کے دل میں ایک چھوٹی عدالت اور قیامت ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ آپ کیسے قیامت کا انکار کرتے ہیں درحالیکہ اس کا چھوٹا سا نمونہ اسی دنیا میں خود آپ کے اپنے اندر موجود ہے اور آپ نے کئی بار آزمایا ہے کہ کوئی نیک کام انجام دینے سے آپ کی روح خوشی و مسرت سے پھولے نہیں سماتی۔ یہ اطمینان و سکون اور ضمیر کی رضامندی کا وہ صلہ ہے جو آپ کی روح آپ کو دیتی ہے۔ برا کام انجام دینے سے آپ بے چین ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہی اندر سے اپنے آپ پر کوڑے برساتے ہیں۔ اندر ہی اندر سے جلتے رہتے ہیں۔ گریہ و بکا کرتے ہیں اور یہ وہ سزا ہے جو عدالت ضمیر سے آپ کو ملتی ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ آپ میں سے ہر ایک کے اندر تو یہ خدائی عدالت ہو لیکن اتنی بڑی کائنات میں اس عظیم عدالت کا کوئی وجود نہ پایا جائے؟

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ روزِ قیامت کے اثبات کے لیے روزِ قیامت کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا ارشاد ہوتا ہے: روزِ قیامت کی قسم

---

[1] در المنثور، ج ۵ ص ۱۵۵ اور تفسیر جامع الجوامع متعلقہ آیت کے ذیل میں

کہ قیامت حق ہے۔''[1]

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مذکورہ قسم مومنین کے لیے ہے تو اس بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر منکرین کے لیے ہے تو کیونکر اس چیز کی قسم کھائی گئی ہے جسے وہ قبول نہیں کرتے۔

بعض مفسرین اس مشکل کو حل کرنے کے لیے فرماتے ہیں کہ کلمہ رب تقدیر میں ہے اور آیت کا معنی یوں ہے کہ قیامت کے پروردگار کی قسم! قیامت واقع ہوگی۔[2]

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ قسم ان لوگوں کے لیے ہے جو کلا روزِ قیامت کے قائل ہیں، لیکن اس کی جزئیات میں شک کرتے ہیں، وہ جزئیات کہ جو بعد والی آیات میں بیان ہوئی ہیں، قرآن نے ان کے اثبات کے لیے روزِ قیامت کی قسم کھائی ہے۔

ایک اور تفسیر جو یہاں بیان کی جا رہی ہے اور شاید گذشتہ دونوں تفسیروں سے بہتر ہے وہ یہ کہ قرآن نے منکروں کے سامنے مسئلہ روزِ قیامت کو اس کے فطری ہونے کی وجہ سے اتنے مسلم طور پر بیان کیا ہے کہ اس کے اثبات کے لیے خود اسی کی قسم کھائی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ خود انہی کی فطرت سے ان کے لیے استدلال پیش کیا ہے۔ نفس لوامہ کی وضاحت میں مفسرین کے گوناگوں بیانات ملتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس بارے میں چھ تفاسیر نقل کی ہیں۔ کبھی اسے نفس مومن کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو لغزشوں پر اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہے اور کبھی اسے نفس کافر سے موسوم کیا گیا ہے جو قیامت میں اپنے اعمال کے نتائج کو دیکھ کر اپنے آپکو سرزنش کرتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ مومن و کافر سے اعم تر ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے خارج ہونے کے بعد کی داستان کی طرف اشارہ ہے۔

قسم جو کہ دلیل شرافت ہے اور روزِ قیامت کے ساتھ واقع ہوئی ہے اس کے لیے سب سے مناسب یہی ہے کہ یہ ایسے مومنین کے نفوس کی جانب اشارہ ہے جو ابھی حد کمال تک نہیں پہنچے۔

وضاحت

نفوس انسانی کو تین گروہ میں تقسیم کیا جاتا ہے: پہلا گروہ مکمل ظلمانی ہے جو نہ تو لائق قسم ہے اور نہ ہی اس میں کمال کی طرف بڑھنے کا جذبہ اور تحرک ہے اور اسی طرح یہ روزِ قیامت کی نشانیوں میں سے بھی نہیں ہے۔ یہ نفس امارہ ہے جو ہمیشہ برائی اور بدی کا حکم کرتا ہے۔

دوسرا گروہ نیم نورانی ہے جو حق کے راستے میں کمال کی طرف پرواز کرتا ہوا ہے۔ جب کبھی اپنے ظلمانی پہلو کی وجہ سے خطا کا مرتکب

---

[1] توجہ رہے کہ آیت میں مقسم له (وہ چیز کہ جس کے لیے قسم کھائی جائے) محذوف ہے اور بعد والے جملے سے پتہ چلتا ہے کہ ''تقدیر'' میں یوں تھا۔ ''لتبعثن یوم القیمة''

[2] تفسیر فخر زاری ج ۳۰ ص ۲۱۶

ہوتا ہے تو نورِ ایمان کے پرتو سے بیدار ہوجاتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، ایسی ملامت جو کمال تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اسی نفس کی قدر و قیمت ہے اور یہی صحنہ قیامت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ اسے نفس لوامہ کہتے ہیں۔

تیسرا گروہ مکمل نورانی ہے جو نفس لوامہ کے مرحلے سے گزر کر اطمینان وسکون کے مرحلے تک جا پہنچتا ہے "یا ایتھا النفس المطمئنة" کے خطاب کا مخاطب قرار پاتا ہے، "ارجعی" کے خطاب سے کمال مطلق کے مبدا کی طرف بازگشت پر مامور ہوجاتا ہے، خدا کے خالص بندوں میں شمار ہونے لگتا ہے اور بالآخر راضية مرضية (خدا سے خوش اور خدا اس سے) کی منزل پر فائز ہوجاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس آیت کی تفسیر اور دلالت سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے مدنظر ان دو قسموں کا اکٹھے واقع ہونا بے ربط اور حادثاتی طور پر نہیں ہوسکتا بلکہ روزِ قیامت اور نفس لوامہ کے درمیان ضرور کوئی رابطہ ہے اور وہ رابطہ یہ ہے کہ ہر انسان (اگر غلط تعلیمات کی وجہ سے فطرت حقیقی سے تہی دامن نہ ہوا ہو تو) ایک ایسے وجدان وضمیر کا حامل ہے جو برائیوں کے وقت اسے سرزنش کرتا ہے اور نیکیوں کے وقت ترغیب دلاتا ہے۔

یہ وجدان کہ جو ایک وجدان شخصی ہے اور انسان کے اندر موجود ایک چھوٹی سی عدالت کا کام دیتا ہے، اس بات کو روشن کرتا ہے کہ اتنے بڑے عالم میں بھی کوئی ایک بڑا وجدان ہونا چاہیے جو مجرموں کی ملامت اور سزا کے لیے قیام کرے۔ لہٰذا اس بڑے وجدان کا مصداق روزِ قیامت کی عدالت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

چند وضاحتیں

۱۔ قیامت فطرت کے آئینہ میں

اگرچہ فطری مسائل استدلالی ہیں نہ قابل درک، دیکھے جاسکتے ہیں نہ سنے جاسکتے ہیں بلکہ ہر کسی کو اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اسے پانے کی جدوجہد کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود ہم چند ایک وضاحتیں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس جدوجہد میں لوگوں کی مدد ہوجائے اور وہ اپنے اندرونی پیغام کو بہتر اور آسان طریقے سے سمجھ سکیں، تحریر فطرت کو آگاہی کے ساتھ پڑھ سکیں اور اس فطری پیغام کے منکرین کے مقابلے میں مدلل جواب کی صلاحیت کے حامل ہوسکیں۔

(۱) اگر ہم فنا کے لیے پیدا ہوئے ہیں تو پھر عشق بقاء سے کیا مطلب؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موت اگر نیستی کے معنی میں ہو تو پھر ہر کوئی اس سے گریزاں ہے اور نہ فقط طولِ عمر کا خواہشمند ہے بلکہ حیاتِ ابدی کا خواہاں ہے۔

طول عمر کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا، اکسیر جوانی کے حصول کی تگ و دو اور سرچشمۂ آب حیات کو پانے کا شوق ان سب کے نشانات تاریخ بشر، دانشوروں اور سائنسدانوں کی کاوشوں اور شعراء کے کلام میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب بات پر دلالت کرتے ہیں کہ انسان ذاتاً بقاء کا

طلبگار رہے۔حتیٰ کہ انسان کو اپنی اولاد کی زندگی کا اشتیاق کہ جو خود اسی کی زندگی کا استمرار محسوب ہوتا ہے، اس فطری عشق کی علامت ہے۔

اگر ہم فنا کے لیے خلق ہوئے ہیں تو پھر ہمارے اندر اس فطری خواہش کا وجود بے معنی ہے۔درحقیقت ایک بلاوجہ کا عشق ہے اور کیسے ممکن ہے کہ خدائے حکیم ودانا ہمارے اندر ایک بلاوجہ اور فالتو چیز خلق کرے۔(توجہ رہے کہ توحید کی بحثوں کو قبول کرنے اور خدا کی پاک ذات پر ایمان لانے کے بعد معاد کی مباحث شروع ہوتی ہیں)

انسان کے اندر موجود یہ فطری خواہش اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسانی وجود سے باہر اس کی تسکین واشباع کا راستہ موجود ہے، پیاس پانی کے وجود پر دلالت کرتی ہے، بھوک غذا کے وجود پر اور جنس مخالف کی طرف رغبت اس کے موجود ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اگر ایسا نہ ہوتو یہ حکیم کی حکمت کے خلاف ہے۔بنابریں عشق بقاء انسان میں فطری طور پر موجود ہے اور یہ زندگی جاوید کی روشن دلیل ہے۔

اس بارے میں معروف دانشور فیض کاشانی مرحوم نے ایک بڑی ظریف بات کہی ہے۔فرماتے ہیں:

کس طرح ممکن ہے کہ نفوس انسانی نابود ہوجائیں جب کہ خدا نے اپنی حکمت کے تحت ان کی فطرت میں بقاء سے عشق اور فنا وعدم سے کراہت کا جذبہ پیدا کیا ہے؟ دوسری طرف یہ مسئلہ حتمی ویقینی ہے کہ اس دنیا میں تو بقاء ودوام امر محال ہے اور اگر کسی اور دنیا کا وجود بھی نہ ہو کہ جہاں انسان منتقل ہوسکے تو پھر خدا کا ودیعت شدہ یہ جبلی وفطری جذبہ بے ہودہ اور بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے اور خدائے حکیم کی ذات اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ ایسا لغو کام انجام دے۔[1]

یا بعض معاصر دانشوروں کے بقول انسان کے ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش اتنی ہمہ گیر ہے کہ اس آرزو کے پورے نہ ہونے کو کسی طور بھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) تاریخ میں عقیدے کا تسلسل۔فطری ہونے کی دلیل

قوموں کے رسم ورواج ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔فرہنگ وتمدن عموماً تغیر وتبدل کا شکار رہتا ہے۔انسانی تاریخ میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فقط وہی امور پائیدار رہتے ہیں جن کی جڑیں فطرت کی اتھاہ گہرائیوں میں ہوں۔

لہٰذا امورِ عادی سے مسائل فطری کو جدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ اگر کوئی چیز مختلف قوموں کے اندر طولِ تاریخ میں (اگرچہ مختلف صورتوں ہی میں کیوں نہ ہو) اپنے وجود کو محفوظ رکھ سکے تو یہ اس کے فطری ہونے کی بہترین علامت ہے اور یہ امر زندگی بعد از مرگ کے بارے میں انسانی توجہ کے مسئلے پر مکمل طور پر صادق آتا ہے۔(دقت نظر فرمائیں)۔

آج سوشیالوجسٹ حضرات بتاتے ہیں کہ مذہبی اعتقادات من جملہ حیات بعد از مرگ کا عقیدہ ہمیشہ لوگوں میں موجود رہا ہے۔

بطور نمونہ سموئیل کنیگ کی سوشیالوجی کی کتاب سے ایک پیراگراف آپ کے حاضر خدمت ہے:

''آج پوری دنیا میں نہ فقط مذہب موجود ہے بلکہ دقیق ترین تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اولین انسانی طبقات بھی مذہب کے حامل

---

[1] ''علم الیقین''، فیض مرحوم ج ۲ ص ۷ ۸۳

تھے۔ جیسا کہ آج کے انسان کے اسلاف (FOREFATHERS) بھی ایک قسم کا مذہب رکھتے تھے کیونکہ وہ اپنے مردوں کو ایک مخصوص طریقے سے دفن کرتے تھے اور ان کے کام کاج کے اوزار ان کے پاس رکھ دیتے تھے۔ اس طرح دوسری دنیا کے وجود پر اپنے عقیدے کو ثابت کرتے تھے۔ [1]

مذہبی عقائد کا اس قدر گہرا نفوذ قیامت کے فطری ہونے کی بہترین علامت ہے۔

۳۔ آیات اس بات کو باور کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے باطن میں تو ایک چھوٹی سی عدالت ہو لیکن اس عظیم کائنات میں محکمۂ عدل نہ ہو؟

انسان باطن میں اخلاقی وجدان کی موجودگی یا دوسرے لفظوں میں انسان کے اندر موجود عدالت ہر ایک کے لیے قابل احساس ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص بھی ہے جو ایک بہت بڑی انسانی خدمت انجام دے کر اور محروموں اور مظلوموں کو نجات دلانے کے بعد اپنے اندر خوشی محسوس نہ کرے؟ اور کون ہے جو کسی ظلم کا مرتکب ہو اور اپنے اندر بے چینی محسوس نہ کرے اور اس وجہ سے وہ مضطرب و پریشان نہ ہو جائے۔

(البتہ ہم پیشہ ور جنایت کاروں کی بات نہیں کرتے جن کی ابتدائی فطرت تکرار گناہ سے مسخ ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ بات عام افراد پر صادق آتی ہے)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ معاد پر ایمان انسانی سرشت میں موجود ہے اور اس کے لیے کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ اس بارے میں عقلی دلائل بھی فراوانی سے موجود ہیں۔

۲۔ دلیل حکمت

جہان ہستی کی بناوٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر چیز ہدف، حکمت، نظم وضبط اور پروگرام کے تحت خلق ہوئی ہے۔

اب اگر ہم انسانی زندگی پر نظر ڈالیں اور یہ فرض کریں کہ موت اس کے لیے ہر چیز کا خاتمہ ہے، ہزاروں مشکلات اور زحمات سے پر یہ چند روزہ دنیاوی زندگی، چند لقموں کی خاطر سر توڑ کوششوں کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیات سے آنکھیں چرا لینا، یقیناً ایسی کوئی چیز انسانی خلقت کا ہدف نہیں ہو سکتی وگرنہ اس طرح تو اس کی خلقت ہی فضول، عبث اور بے مقصد ہو جائے گی اور یہ بات خدائے حکیم کی حکمت کے سراسر منافی ہے۔

قرآن مجید نے یہی بات جیتے جاگتے مطالب میں یوں پیش فرمائی ہے۔

(۱) اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

(مومنون:۱۱۵)

---

[1] جامعہ شناسی ص ۱۹۲

(۲) وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ [1] (الحجر: ۸۵)

(۳) اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ ..... اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝ (قیامة: ۳۶-۴۰)

ترجمہ

(۱) کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے!

(۲) اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ماسوائے حق پیدا نہیں کیا اور وقت مقررہ (قیامت) یقیناً پہنچ کر رہے گا۔

(۳) کیا انسان گمان کرتا ہے کہ یوں ہی بے ہدف چھوڑ دیا جائے گا؟ ..... کیا وہ قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے؟

تفسیر

قیامت کے بغیر بے معنی زندگی

پہلی آیت میں قرآن مجید نے چھوٹے سے جملے میں مطالب کے سمندر کو سمو دیا ہے اور قیامت کی انتہائی واضح دلیل بیان فرمائی ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ (مومنون)

''کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں فضول اور بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے؟''

یعنی اگر قیامت کا وجود نہ ہوتا اور آپ کی زندگی اسی چند روزہ دنیاوی حیات تک محدود ہوتی تو پھر واقعاً یہ زندگی فضول، بے مقصد اور بے معنی ہوتی۔ یہ حیات ابدی ہے جو اس دنیا میں ہماری زندگی کا مفہوم عطا کرتی ہے اور اسے عبث ہونے سے بچا کر حکمت خدا کے ساتھ ہم آہنگ کرتی ہے۔

---

[1] سورہ ص آیت ۲۷، دخان ۳۸، آل عمران ۱۹۱ اور اسی طرح دیگر متعدد آیات میں خلقت کے بامقصد ہونے کا ذکر ہے۔ لیکن چونکہ ان میں معاد اور روزِ محشر کی عدالت پر صریحاً اشارہ نہ تھا اس لیے انہیں زیر بحث لانے سے گریز کیا گیا ہے۔

لہٰذا اس آیت کے بعد ارشاد ہوتا ہے: فتعالی اللہ الملك الحق، اس کا وجود سراسر حق ہے، باطل کا اس میں کوئی ٹھکانہ نہیں۔ بے مقصد اور عبث کام باطل ہے اور باطل کا حق کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔

''مقائیس اللغۃ'' اور ''مفردات'' کے مطابق ''عبث'' کا معنی دراصل مخلوط کرنا ہے لیکن بعد ازاں بے مقصد امور پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا ہے۔

''لسان العرب'' کے مطابق یہ کھیلنے کودنے کے معنی میں ہے۔ اگرچہ اس کے معانی میں مخلوط کرنا بھی بیان کیا گیا ہے اور مجموعی طور پر فضول، بے ہدف، نامعقول، بے معنی اور عقل سے عاری کاموں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن انسانی خلقت میں ایسا ممکن نہیں ہے۔

اسی مطلب کو دوسری آیت میں ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وما خلقنا السموت والارض وما بینهما الا بالحق

''اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ماسوائے حق پیدا نہیں کیا۔''

بلا فاصلہ ارشاد ہوتا ہے:

وان الساعة لاتية

''اور یقیناً وقت مقررہ (قیامت) پہنچ کر رہے گا۔''

ان دو آیتوں کا اکٹھے ذکر ہونا ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ عجائبات، نعمات، برکات، اسرار اور عقل کو خیرہ کر دینے والے رموز سے مالا مال اس وسیع کائنات کی خلقت کا ہدف اگر فقط دنیا کی چند روزہ مادی اور پست زندگی ہی ہوتا تو پھر یہ خلقت بیہودہ ولغو اور فاقد حق ہوتی۔ لہٰذا وہ چیز جو اسے حقانیت اور ہدف عطا کرتی ہے وہ دوسری دنیا کی زندگی جاوید ہی ہے۔

گذشتہ آیت میں خلقت انسان کے عبث نہ ہونے کی بات کی گئی تھی اور اس آیت میں کل کائنات کی خلقت کے حق ہونے کی گفتگو ہے۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہے، وہ یہ کہ آخرت کی زندگی کے بغیر دنیاوی زندگی بے معنی، بے کیف، بے مقصد اور لغو و بیہودہ ہے اور یہ کام حکیم کے ہاتھوں ہرگز انجام نہیں پا سکتا۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ اس آیت میں حق و لعب و باطل کے مقابل میں ہے اور جملہ و ان الساعة لاتية اس پر دلیل ہے۔ لہٰذا جنہوں نے حق کو عدل و انصاف کے معنی میں بیان کیا ہے یہ درست دکھائی نہیں دیتا۔[1]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں پیغمبرؐ کو عفو و بخشش کا امر ہوا ہے اور ایسی خوبصورت بخشش جو سرزنش و ملامت سے پاک ہو (فاصفح الصفح الجميل)

ممکن ہے یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اے پیغمبرؐ چونکہ ہدف خلقت انسانوں کی تربیت اور اگلے جہان کے لیے انہیں

---

[1] المیزان ج ۱۲ ص ۱۹۹

آمادہ کرنا ہے لہٰذا آپ تربیت کے تمام اصولوں کو اپنائیں جن میں عفو و درگذشت اور محبت و مدارا بھی شامل ہے، خصوصاً نادان اور متعصب لوگوں کے لیے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ پہلی آیت کے مفہوم کے مطابق اگر آخرت کی زندگی نہ ہوتی تو خلقت انسان عبث ہوتی اور دوسری آیت کے مطابق (متذکرہ بالا تفسیر کی روشنی میں) اگر آخرت نہ ہوتی تو کل کائنات کی خلقت لغو ولایعنی ہوتی، شاید اس حوالے سے کہ خلقت کائنات کے درخت کا پھل اور محصول اعلاء انسان ہے لہٰذا اگر آخرت کی حیات جاوید نہ ہو تو پھر اس درخت اور پھل دونوں کی خلقت بے معنی ہے۔

"مابینھما" (جو کچھ زمین و آسمان میں موجود ہے) کی عبارت میں فرشتے، نور حرارت، ابر، ہوا، مختلف گیسیں اور خطۂ زمین پر بسنے والے تمام جاندار، خواہ انسان ہوں یا نباتات شامل ہیں۔

تیسری آیت میں انسانی خلقت کے ہدف پر اشارہ کرتے ہوئے اسے مسئلہ معاد سے مربوط کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے: ایحسب الانسان ان یترك سدی (کیا انسان گمان کرتا ہے کہ یوں ہی بے ہدف اور مہمل چھوڑ دیا جائے گا)۔

انسان کی معمولی و ناچیز پانی (نطفے) سے پیدائش اور رحم میں اس کے تکامل کے بعض مراحل کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ: الیس ذلك بقدر علی ان یحیی الموتی کیا اس جیسا مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا؟

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حیات بعد از مرگ کے بغیر انسانی وجود کا بامقصد ہونا غیر ممکن ہے۔

یقیناً خداوند حکیم کا کوئی کام بغیر ہدف کے نہیں ہوسکتا اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ اس کے افعال کا ہدف خود اسی کی طرف نہیں پلٹتا کیونکہ وہ تو ہر لحاظ سے لامحدود اور غنی بالذات ہے، لہٰذا بندوں ہی کی طرف پلٹتا ہے۔ کیا مشکلات و مصائب سے پر دنیا کی مختصر زندگی اس عظیم خلقت کا ہدف بن سکتی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ بنابرایں ایک ایسا عالم جو انسان کے سیر تکاملی کا ہدف ہے اسے قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

"التحقیق" کے بقول سدی (بروزن ہدی) دراصل ایسی حرکت کو کہتے ہیں جو فکر و تدبر اور نظم و ضبط کے بغیر ہو۔ اسی مناسبت سے اس اونٹ کو "ابل سدی" کہا جاتا ہے جسے ساربان کے بغیر بیابان میں چھوڑ دیا جائے۔ رات کو ٹپکنے والی رطوبتوں کو بھی سدی (بروزن وفا) کہا جاتا ہے کیونکہ یہ نظم اور کسی خاص پروگرام سے تہی دامن ہوتی ہے۔ کپڑے کے بنے جانے سے پہلے اس کی تاروں اور ریشوں کو بھی سدی کہا جاتا ہے اس لیے کہ یہ اس حالت میں بے نتیجہ اور مہمل ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آیت استفہام انکاری کی صورت میں گویا ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ اس قدر زیادہ استعداد، فکری و جسمی صلاحیتوں اور گوناگوں امکانات کے ہوتے ہوئے انسان کو بغیر کسی پروگرام کے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ اس کے بعد مسئلہ معاد اور مسولیت کو نتیجہ کے طور پر آیت مجیدہ میں بیان کیا گیا ہے۔

چند وضاحتیں

کون عاقل چند روز دنیاوی زندگی کو ہدف خلقت سمجھتا ہے؟

جس عالم میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں بلا شک وشبہ بہت بڑا، انتہائی دقیق اور منظم ہے۔ کرۂ زمین منظومہ شمسی کے مجموعے کا ایک یونٹ ہے۔ وہ بھی اپنی سطح پر مجموعۂ کہکشاں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ ہماری کہکشاں اس عالم میں پائی جانے والی متعدد کہکشاؤں میں سے ایک ہے۔

پروفیسر کارل گیلزین اپنی کتاب ''سفری بہ جہانہای دوردست'' میں رقمطراز ہے: غول پیکر ستاروں کا مجموعہ جسے کہکشاں بھی کہتے ہیں، یہ آسمانی جزائر اپنے ہی محور کے گرد گھومتے ہیں اور ایک دوسرے سے اتنے زیادہ فاصلے پر واقع ہیں جس کا سوچنا بھی مشکل ہے۔ ہر کہکشاں کئی ارب ستاروں پر مشتمل ہے اور ان ستاروں کے درمیان فاصلہ اسقدر زیادہ ہے کہ کسی ایک کہکشاں میں واقع دو ستاروں کے درمیانی فاصلے کی مسافت طے کرنے کے لیے کئی لاکھ نوری سال درکار ہیں۔ [1]

اگر اس مطلب پر یہ جملہ اضافہ کر دیا جائے تو اس جہان کی عظمت کے لیے کافی ہوگا، وہ یہ کہ ماہرین فلکیات کی تازہ ترین تحقیقات کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں تقریبا ایک کھرب ستارے موجود ہیں جب کہ ایک اندازے کے مطابق اس عالم میں ایک ہزار ملین سے زیادہ کہکشائیں موجود ہیں۔

دقت نظر اور نظم وضبط کے حوالے سے اس کائنات کے جزء جزء کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ ایک چھوٹے سے خلیے کی ساخت کا ایک بڑے صنعتی شہر کے ساتھ موازنہ کر سکتے ہیں۔

اس دوران وہ کم سے کم کامل ترین موجود انسان ہی ہے جسے ہم اس کی روح وجسم کے ساتھ مخصوص بناوٹ، اس کی ریزہ کاری، ظرافت اور عجائب کے ہمراہ اسے پہچانتے ہیں۔

اب اگر یہ طے پائے کہ گلشن خلقت کے اس سرسبز وشاداب پھول کی زندگی دنیا کے انہی چند روز تک محدود رہے، کبھی بچپن اور ناتوانی ہے تو کبھی جوانی کے شدید طوفانوں میں مبتلا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ بڑھاپے اور بیکاری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گاہے تندرست گاہے بیمار اور شاید زیادہ وقت ضروریات زندگی کے پورا کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں صرف ہو جاتا ہے، بعد ازاں موت اور فنا اس کا مقدر ہے یہ کس قدر نازیبا اور حکمت سے دور ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خدا حکیم ہے یعنی اس کے تمام کام حکمت سے مالا مال ہیں۔ کیا حکمت اس کے علاوہ کچھ ہے کہ اس کے تمام کام سوچے سمجھے اور واضح ہدف کے تحت ہوں، اس کے باوجود کہ وہ تمام کمالات کا مالک ہے اور ہر چیز سے بے نیاز ہے کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا ہدف اپنے ہی وجود کے فائدے کے لیے ہو، اور اگر اس مطلب کا نتیجہ بندوں کے حق میں نکلتا ہے تو پھر دنیا کی محدود اور مادی زندگی اس

---

[1] سفری بہ جہانہای دوردست ص ۸

عظیم خلقت کا ہدف نہیں بن سکتی، وہ زندگی جو پلک جھپکنے میں فانی ہوجاتی ہے۔

کیا یہ ایسے ہی نہیں ہے جیسے ایک کاریگر سالہا سال کی محنت کے بعد ایک بہترین اور دقیق ترین گاڑی یا کوئی اور مشین بنائے اور جونہی وہ کام کرنا شروع کرے اسے توڑ پھوڑ دے اور تباہ و برباد کردے۔ کیا آپ کی نظر میں یہ کام حکیمانہ ہے؟

کیا یہ اس سے مشابہ نہیں ہے کہ ایک بچے کو کسی مصنوعی رحم میں ہزاروں مشکلات اور دردِ سر کے بعد پروان چڑھایا جائے اور جونہی وہ زندگی کے لیے آمادہ ہوا سے مار دیا جائے؟

یہی وجہ ہے کہ خدا اور قیامت پر ایمان نہ رکھنے والے مادی لوگ زندگی کو بے معنی اور بے ہدف سمجھتے ہیں اور سچ پوچھیں تو قیامت کی زندگی کے بغیر دنیاوی زندگی واقعاً بے معنی اور بے ہدف ہے اور اس لحاظ سے وہ لوگ اپنی بات میں سچے ہیں۔

پس خدا اور اس کی حکمت پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص بھی اس بات کا انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کی موت واقع ہونے اس اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوجاتا۔ بلکہ یہ دنیا رحم مادر کی طرح ہے، انسان یہاں ایک جنین کی مانند پرورش پاتا ہے اور یہ رحم اسے دوسرے جہان کے جنم کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ بلاشک وشبہ رحم میں جنین کی یہ زندگی ہدف نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک اور طویل زندگی کے لیے مقدمہ ہے۔

۳۔ دلیل عدالت

عدالت خدا کی صفات میں سے ایک ہے وہ عدالت جو عالم ہستی میں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ زمین و آسمان میں، انسان کے وجود میں، دل کی دھڑکنوں میں، خون کی گردش میں حتی کہ پوری کائنات میں اس کے آثار واضح ہیں۔

بالعدل قامت السموت والارض

''زمین و آسمان عدالت کی بنیاد پر قائم ہیں۔''[1]

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اس جہان کی ہمہ گیر عدالت سے دور رہے اور اس وسیع کائنات میں ایک بے تکے جوڑ کی طرح رہے؟

انسان کی تاریخ اور موجودہ حوادث سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں نہ تو کبھی مظلوموں کو ان کا مکمل حق ملا ہے اور نہ ہی کبھی کسی ظالم کو اس کے صحیح کیفر کردار تک پہنچایا گیا ہے۔ ممکن ہے جزئی طور پر کہیں یہ کام انجام پایا ہو لیکن وسیع اور بڑی سطح پر اس کام کو انجام نہیں دیا گیا۔

اس جہان پر حاکم عدالت کہ جو خدا ہی کی عدالت کا پرتو ہے، اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک دن ایسا بھی ہو کہ جب تمام انسانوں کے اعمال کی دقیق ترین طریقے سے جانچ پڑتال کی جائے اور یہ وہی دن ہے کہ جسے ہم قیامت کہتے ہیں۔

اسی اشارے کے ساتھ ہم قارئین محترم کی توجہ درج ذیل آیات مجیدہ کی طرف مبذول کرتے ہیں:

(۱) اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

(قلم: ۳۵، ۳۶)

(۲) اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ (ص: ۲۸)

(۳) اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَ مَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَ لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ وَ هُمۡ لَا

---

[1] تفسیر صافی سورہ رحمان کی آیت ۷ کے ذیل میں

يُظْلَمُوْنَ﴿۲۲﴾ [1] (الجاثیہ: ۲۱،۲۲)

ترجمہ

(۱) کیا ہم مومنوں کو مجرموں کے برابر قرار دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسا حکم لگاتے ہو؟
(۲) جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے رہے کیا ہم انہیں زمین پر فساد کرنے والوں کے برابر قرار دیں گے؟ یا متقین کو فاجروں کی مانند کر دیں گے؟
(۳) وہ لوگ جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں باایمان اور عمل صالح انجام دینے والوں کے برابر ٹھہرائیں گے تاکہ ان کی زندگی و موت ایک ہی جیسی رہے؟ یہ کتنا غلط حکم لگاتے ہیں اور خدا نے زمین و آسمان کو باحق خلق کیا ہے تاکہ ہر کسی کو اس کے انجام شدہ اعمال کے مطابق جزا دی جائے اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

تفسیر

اگر قیامت نہ ہو تو عدالت بھی نہ ہوگی

سورہ قلم میں متقین کے لیے عظیم اجر کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ افنجعل المسلمین کالمجرمین (کیا ہم مومنین کو مجرمین کے برابر قرار دیں گے؟)۔

کیا بجا ہے کہ یہ دونوں باہم برابر ہوں؟ کیا عدالت اسی چیز کا تقاضا کرتی ہے؟

پس مزید ارشاد ہوتا ہے: مالکم کیف تحکمون (تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسا حکم لگاتے ہو؟)

کوئی بھی عاقل انسان یقین نہیں کرتا کہ مسلم و مجرم، مطیع و عاصی اور عادل و ظالم کا انجام ایک جیسا ہو اور وہ بھی خدا کی بارگاہ میں کہ جہاں ہر کام بڑے حساب کتاب کے ساتھ اور عدالت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے دو احتمال ذکر کیے ہیں: اول یہ کہ ممکن ہے یہ آیت مسئلہ معاد سے متعلق ہو کہ کیونکہ یہاں اس دنیا میں مسلمین و مجرمین تقریباً برابر ہی ہیں بلکہ بعض اوقات مجرمین غیر مشروع طریقوں سے زیادہ انعامات و اکرامات ہتھیا لیتے ہیں۔ لہٰذا مسلمین

---

[1] اس بارے میں ان آیات سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔ یس ۵۹، زلزال ۸،۷، انبیاء ۴۷ چونکہ ان کی دلالت واضح نہ تھی اس لیے ہم نے اس سے صرف نظر کیا ہے۔

کی مجرمین پر برتری کہ جو عدل وانصاف کا تقاضا ہے، دوسری دنیا میں لازماً رونما ہونی چاہیے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ان مشرکین کا جواب ہے جو کہتے تھے کہ اگر قیامت ہو بھی تو ہماری حالت اس دنیا کی طرح وہاں بھی اچھی ہوگی۔ (اچھے سال کا بہار ہی سے پتہ چل جاتا ہے)۔ قرآن انہیں جواب دیتا ہے: کیا یہ ممکن ہے کہ خداوند عادل مسلمین اور مجرمین کو ایک جیسا قرار دے؟

لیکن ظاہراً ان دونوں تفسیروں میں کوئی تفاوت نہیں ہے اور ممکن ہے دونوں معانی اس آیت کے مفہوم میں سموئے ہوں۔

ضمناً شریعت سے قطع نظر اس آیت کے حسن وقبح اور عقلی ادراکات پر عقل کی حاکمیت بھی ثابت ہوجاتی ہے۔ (دقت نظر فرمائیں)

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ فخر رازی اپنی گفتگو کے شروع ہی میں اس آیت کو ''حسن وقبح عقلی'' کے دلائل میں سے شمار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: برادران اہل تسنن سے جو نقل ہوا ہے کہ اگر خدا کافروں کو بہشت میں اور فرمانبردار لوگوں کو دوزخ میں بھیج دے تو یہ جائز ہے۔ یہ اس آیت کے مطابق حکم عقل کے خلاف اور قبیح ہے۔ لیکن فخر رازی چونکہ خود اشاعرہ سے تھا اور حسن وقبح عقلی کا منکر تھا لہٰذا اس کا جواب اس طرح دیتا ہے: اس مساوات اور برابری کا انکار خدا کے فضل واحسان کی وجہ سے ہے، نہ یہ کہ کسی کا اس پر کوئی حق ہے۔ [1]

قرآن صریحاً انہیں عقلی ومنطقی فیصلہ کرنے کو کہتا ہے اور پھر سرزنش وملامت کے لہجے میں کہتا ہے: تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیسا حکم لگاتے ہو؟ یعنی یہ فیصلہ ایک عاقل انسان کے شایانِ شان نہیں ہے اور ایسے امور میں عقل ومنطق کی حاکمیت پر یہ واضح وروشن دلیل ہے۔

دوسری آیت میں اسی مطلب کو مزید کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے: **ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض** (جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے رہے، کیا یہ ممکن ہے کہ ہم انہیں زمین پر فساد کرنے والوں کے برابر کردیں؟)

یا ام نجعل المتقین کالفجار (کیا ہوسکتا ہے کہ ہم متقین کو فاجروں کی مانند کردیں؟)

جاذب توجہ یہ ہے کہ سورۂ ص کی اس آیت سے پہلے والی آیت میں زمین وآسمان اور وہ جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان سب کے بامقصد ہونے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وما خلقنا السمآء والارض وما بینهما باطلا

ایک طرف زمین وآسمان کی آفرینش کا بے مقصد نہ ہونا اور دوسری جانب صالح مومنین اور فاسق وفاجر مفسدین کا آپس میں برابر نہ ہونا اس بات کا تقاضا ہے کہ قیامت اور عدل وانصاف کی کوئی عدالت ضرور ہوتی چاہیے۔ بنابرایں ان دو آیتوں میں دلیل حکمت اور دلیل عدالت آپس میں مخلوط ہیں۔

قیامت کا انکار صرف وہی کرسکتا ہے جو خدا کے حکیم ہونے پر شک کرتا ہو اور اس کی عدالت پر بھی شاکی ہو کیونکہ اس صورت میں نہ تو اس دنیا کی خلقت کا کوئی ہدف نظر آتا ہے اور نہ ہی مطیع اور فاسق کے درمیان کوئی امتیاز باقی رہتا ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی ج ۳۰ ص ۹۲

یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ مفسدین کو مومنین صالح اور فاجرین کو متقین کے مقابلے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس حقیقت کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے کہ اگر انسان ایمان اور عمل صالح کے اسلحہ سے لیس نہ ہو تو خواہ ناخواہ مفسدین کی صف میں جا پہنچے گا۔

اور اسی طرح اگر تقویٰ یعنی گناہوں سے بچانے والی قوت سے تہی دامن ہو تو فاجروں کی صفتوں میں جا ملے گا (فجار کا مادہ ''فجر'' ہے جس کا معنی وسیع ترین شگاف ڈالنا ہے۔ گویا فاجر انسان دین واطاعت کے پردے کو پھاڑ ڈالتا ہے)۔

یہ آیت مجیدہ بھی عقل کی حاکمیت پر روشن دلیل ہے اور حسن وقبیح کے معاملے میں انسان کے عقلی ادراکات کے حجت ہونے کی بات کرتی ہے اور اس حقیقت پر بھی واضح دلیل ہے کہ عقل شریعت کے وارد ہونے سے پہلے اچھائی برائی کو کسی حد تک درک کر لیتی ہے۔ یہاں پر یہ بات عجیب دکھائی دیتی ہے کہ فخر رازی نے یہاں پر تو اس مسئلے کو ضمنی طور پر مکمل قبول کیا ہے جب کہ گذشتہ بحث میں اس کا انکار کر چکا ہے۔[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر انسان اپنے ضمیر کی طرف رجوع کرے تو تعصب کے پردے ہٹ جائیں گے اور اسے احساس ہوگا کہ وہ تہہ دل سے اس واقعیت کا معترف ہے۔

تیسری آیت میں اسی معنی کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: **ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلھم کالذین امنوا و عملوا الصلحت سوآء محیا ھم و مماتھم**۔ وہ لوگ جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں باایمان اور عمل صالح انجام دینے والوں کے برابر ٹھہرائیں گے تا کہ ان کی زندگی وموت ایک ہی جیسی ہو؟

خدائے عادل کی عدالت سے ایسا امر بعید ہے اور خدا کی ذاتِ اقدس سے ایسا قبیح امر صادر ہونا محال ہے محال۔

سآء مایحکمون کتنا غلط حکم لگاتے ہیں!

کیا یہ ممکن ہے کہ خوب وبد، پاک وناپاک، صالح وطالح، مومن وفاسق اور نور وظلمت ایک جیسے ہو جائیں؟ یہ امر اصلاً وابداً ممکن ہی نہیں ہے۔

سوآء محیا ھم و مماتھم سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے متعدد احتمالات ذکر کیے ہیں: کبھی کہتے ہیں اس سے مراد دنیاوی موت وحیات ہے کیونکہ ایمان اور عمل صالح انسان کے وجود پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں، دل کو منور اور فکر کو روشن کر دیتے ہیں اور صالح مومنین کو خدا کی ہدایت، حمایت اور نصرت شامل حال رہتی ہے جب کہ کفر اور گناہ دل کو اندھیر اور روح کو تاریک کر دیتا ہے اور انسان کو الطافات الٰہی سے محروم کرنے کا باعث بنتا ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت سے مراد دنیا کی موت کے بعد آخرت کی زندگی ہے یعنی جب پہلا گروہ فوت ہوتا ہے تو رحمت کے فرشتے ان پر نازل ہوتے ہیں۔ ان پر درود وسلام بھیجتے ہیں اور انہیں جنت میں داخل ہونے کی بشارت دیتے ہیں۔ (**الذین تتو فھم الملئکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ**)۔[2] جب کہ گنہگاروں کے مرنے کے وقت عذاب کے فرشتے ان پر نازل

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۲۶ ص ۲۰۱

[2] نحل ۳۲

ہوتے ہیں، ان کے چہروں اور پشت پر مارتے ہیں اور انہیں خدا کے دردناک عذاب کی خبر دیتے ہیں۔(فکیف اذا توفتهم الملئکة یضربون وجوههم وادبارهم)۔[1]

اس آیت کی تفسیر میں اور بھی احتمالات بیان کیے گئے ہیں جو چندان قابل ملاحظہ نہیں ہیں۔لیکن متذکرہ بالا دونوں تفسیروں کو جمع کیا جا سکتا ہے اگرچہ بعد والی آیت دوسری تفسیر کے ساتھ زیادہ موزوں ہے چونکہ ارشاد ہوتا ہے:وخلق السموت والارض بالحق (خدا نے زمین وآسمان کو باحق خلق کیا ہے)۔

ولتجزی کل نفس بما کسبت وهم لایظلمون

(اور ہدف یہ تھا کہ ہر کسی کو اس کے انجام دیئے ہوئے اعمال کے مطابق جزا دی جائے اور ان پر کسی قسم کا کوئی ظلم وستم نہ ہوگا)۔[2]

یہ بات مدنظر رہے کہ ایک طرف ہم کہتے ہیں کہ خدا عادل ہے، زمین وآسمان کی خلقت حق ہے اور ہر کسی کو اس کے اعمال کا عادلانہ جزا وسزا بھی ہے اور دوسری طرف جیسا کہ ہم نے کہا یہ امر اس دنیا میں مکمل طور پر انجام نہیں پاتا۔پس ضروری ہے کہ اس موت کے بعد ایک اور زندگی ہوتا کہ حق وعدالت کا بول بالا ہو اور عدل وانصاف کی حکمرانی ہو سکے۔

چند وضاحتیں

خلقت کا بنیادی قانون۔عدل

جو علم طبیعات سے تھوڑی بہت آشنائی بھی رکھتا ہو وہ جانتا ہے کہ اس دنیا میں تمام موجودات ایک خاص قانون سے بہرہ مند ہیں۔ان قوانین کی حاکمیت اتنی جچی تلی ہے کہ دانشور اور سائنسدان اپنی علمی کتابوں کو با آسانی ان قطعی ودقیق قوانین اور فارمولوں کی بنیاد پر مرتب کر سکتے ہیں۔مثلاً فضائی اور خلائی سفر کے پروگرام حتی کہ مختلف سیاروں تک پہنچنے کے پروگرام بھی انہی فارمولوں کی بنیاد پر مرتب ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جدھر بھی نگاہ کریں ہر طرف قانون نظم وعدالت دکھائی دے گا جو ہر چیز پر سایہ فگن ہے۔بڑے بڑے منظومات شمسی سے لے کر ایٹم کے چھوٹے ترین ذرے تک اس قانون کا احاطہ ہے۔

---

[1] محمد ۲۷

[2] زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں رقمطراز ہے کہ:"ولتجزی" کا جملہ "بالحق" پر عطف ہے کیونکہ اس میں تعلیل کے معنی پائے جاتے ہیں (لہٰذا معنی یوں ہوگا خلق الله السموت والارض لیحق الحق ولتجزی...) بعدازاں احتمال دیتا ہے کہ جملۂ محذوف پر بھی عطف ہوسکتا ہے اور تقدیر میں یوں ہو خلق الله السموت والارض بالحق لیدل به علی قدرته ولتجزی کل نفس۔ (تفسیر کشاف، ج ۴ ص ۲۹۰)

دوسری طرف یہ کہ انسان اس قانون عدالت سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا ہے، اس قانون سے کہ جو خالق کے حکم سے پوری کائنات پر حاکم ہے کیونکہ اس صورت میں تو انسان اس کائنات میں ایک بے ڈھنگے اور ایک بے رنگ جوڑ کی مانند ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا یہ استثناء انتہائی غیر منطقی اور بے دلیل ہے۔ بناء برایں ہمیں یقین ہے کہ انسان کے لیے بھی ایک ایسی عدالت کو مدنظر رکھا گیا ہے جہاں سب حاضرین ہوں گے اور کائنات کی ہمہ گیر عدالت سے بہرہ ور ہوں گے۔

علمائے عقائد پرانے وقتوں ہی سے مسئلہ معاد کے اثبات کے لیے اس دلیل سے استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ وہ انسانی مظالم کے ان مناظر کو پیش کرتے تھے جن سے متعلق اس دنیا میں عدل وانصاف کا اجراء نہ ہوسکا اور ساری عمر بہترین زندگی گزارنے والے ظالموں کا ذکر کرتے رہے۔ اسی طرح ان مظلوموں کے بارے میں بھی بتاتے رہے جو زندگی کے آخری لمحوں تک مختلف شکنجوں اور عذاب میں مبتلا رہے۔

کیا وہ عادل خدا اس پر راضی ہے؟ کیا یہ مناظر اس کے عدل وانصاف کے منافی نہیں؟

لہٰذا علمائے کرام اس سے بآسانی نتیجہ اخذ کرتے تھے کہ ایک اور دنیا ہونی چاہیے کہ جہاں انسانوں سے متعلق خدا کا عدل وانصاف رونما ہو۔ جس کسی نے اگر ذرہ بھر بھی نیکی کی ہو تو اسے جزا ملے اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی ہے اسے اپنے کیفر کردار تک پہنچنا چاہیے۔

لہٰذا قیامت خدا کے عدل وانصاف کی مظہر ہے اور تمام سوالات کا مکمل ترین جواب۔

۴۔دلیل ہدف وحرکت

بلاشک وشبہ انسانی خلقت کا ایک ہدف ہے، ان مادہ پرستوں کے خیالات کے بالکل برعکس جو اس دنیا کو بے ہدف سمجھتے ہیں۔الٰہی جہان بینی میں انسانی خلقت کا یقیناایک ہدف ہے جو اپنی تکاملی حرکت کے تحت آگے بڑھ رہا ہے۔

اب اگر موت کے ساتھ ہی ہر چیز کا خاتمہ ہو جائے تو پھر یقیناً یہ ہدف حاصل نہیں ہوتا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہ انسانی زندگی اس دنیا کے بعد بھی جاری رہنی چاہیے تا کہ اپنے ضروری تکامل تک پہنچ سکے اور یہاں بوئے گئے بیج کا ثمر وہاں حاصل کر سکے۔

مختصر یہ کہ معاد کو قبول کئے بغیر خلقت کے ہدف کا قائل ہونا ممکن نہیں اور اگر موت کے بعد والی دنیا کے ساتھ انسانی زندگی کا راستہ منقطع کر دیا جائے تو پھر ہر چیز معمہ بن جائے گی۔

اس پس منظر کے ساتھ درج ذیل آیات پر توجہ فرمائیں:

(۱) يَاأَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ۝٦ (انشقاق: ٦)

(۲) وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝١٨ (فاطر: ١٨)

(۳) إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝١٥٦ (بقرة: ١٥٦)

(۴) إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۝١٢ (قیامت: ١٢)

(۵) إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ۝٣٠ [1] (قیامت: ٣٠)

ترجمہ

(۱) اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف مشقت اٹھاتے ہوئے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور آخر کار اس سے ملاقات کرے گا۔

(۲) جس نے تزکیہ کیا اس نے اپنے ہی لیے تزکیہ کیا ہے اور خدا ہی کی طرف بازگشت ہے۔

(۳) ہم خدا ہی کے لیے ہیں اور اسی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔

(۴) آخری ٹھکانہ فقط تیرے پروردگار ہی کے ہاں ہے۔

---

[1] قرآن مجید میں ان آیات کے مطالب سے ہم آہنگ اور بھی متعدد آیات ہیں جو خدا کی طرف سب کے لوٹنے پر بحث کرتی ہیں۔مثلاً علق ۸، مومنون ۲۲، انعام ۱۰۸، انبیاء ۹۳ اور جاثیہ ۱۵۔

(۵) تمام راستے تمہارے پروردگار پر منتہی ہوتے ہیں۔

تفسیر

تمام راستے خدا پر منتہی ہوتے ہیں

پہلی آیت میں بطور کلی بنی نوع انسان کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے: یا ایها الانسان انك كادح الى ربك كدحا فملاقيه (اے انسان تو بڑی محنت اور مشقت کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے اور آخر کار اس سے ملاقات کرے گا)۔

بعض مفسرین کے بقول ''کدح'' بروزن ''مدح'' جلد پر پڑنے والی خراش کے معنی میں ہے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ محنت و مشقت کی وجہ سے انسانی جان اور روح پر پڑنے والے اثرات کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔[1]

مفردات راغب کے بقول اس لفظ کا اطلاق ایسی محنت پر ہوتا ہے جو سختیوں اور تکالیف سے پر ہو۔

لیکن المیزان کا کہنا ہے کہ کدح جب الیٰ کے ساتھ آئے تو یہ حرکت کے معنی میں ہے۔ (البتہ ان معانی میں کوئی تضاد نہیں ہے)۔[2]

مجموعی طور پر اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید انسانوں کو ایک ایسے کارواں سے تشبیہ دیتا ہے جو عدم کی سرحدوں کو پار کر کے اقلیم وجود میں داخل ہوا اور اب یہاں سے آگے اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے تا کہ لقاء اللہ تک جا پہنچے۔ درج ذیل آیت اسی معنی پر دلالت کرتی ہے:

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ (نجم ۴۲)

ممکن ہے بعض لوگ اس راستے سے منحرف ہو جائیں اور کبھی بھی لقاء اللہ تک نہ پہنچ پائیں لیکن انسانی خلقت کی بنیاد ہی اس ہدف کے حصول میں رکھی گئی ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے لقاء اللہ سے مراد دل کی آنکھوں سے خدا کا مشاہدہ کرنا اور شہودِ قلب کے اس مقام تک پہنچنا جو انسان اپنے کمال کے ارتقائی مراحل کو طے کرتے ہوئے حاصل کرتا ہے اور یہ قرب خدا کے اہم ترین مراتب میں سے ہے۔

دوسری آیت میں پہلے انسان کی پاکیزگی، تقویٰ اور تزکیہ کی بات کی گئی ہے جس کا فائدہ خود اسی کی ذات کو ہوتا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے: ومن تزكى فانما يتزكى لنفسه (جس نے تقویٰ اختیار کیا پس اس کا نتیجہ بھی خود اسی کی طرف لوٹے گا)۔

بعد ازیں ارشاد ہوتا ہے: والى الله المصير (سب کی بازگشت خدا ہی کی جانب ہے)۔

---

[1] تفسیر کشاف۔ روح المعانی اور فخر رازی (زیر بحث آیت کے ذیل میں)

[2] المیزان، ج ۲۰ ص ۳۶۰

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر نیک اور متقی لوگ اس دنیا میں پاکی وتقویٰ کے تمام نتائج سے بہرہ مند نہ ہوں تو ان کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔ وہاں دارالبقاء میں اپنے اعمال کے نتائج سے بہرہ ور ہو جائیں گے۔

بہرحال "والی اللہ المصیر" کا جملہ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ کمالِ انسان کے ارتقائی مراحل موت کے ساتھ ختم نہ ہوں گے بلکہ اسی طرح جاری وساری رہیں گے یہاں تک کہ لقاءاللہ تک جا پہنچے۔

زیر بحث تیسری آیت کی تفسیر میں مفسر بزرگ علامہ طبرسی مرحوم فرماتے ہیں: انا للہ (ہم خدا ہی کے لیے ہیں) عبودیت کا اقرار ہے کہ ہم سب اس کے بندے اور مملوک ہیں۔ (وانا الیہ راجعون) (اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ جانا ہے) روز قیامت کا اقرار ہے۔ اس کے بعد وہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

ان قولنا "انا للہ" اقرار علی انفسنا بالملك و قولنا "وانا الیہ راجعون" اقرار علی انفسنا بالھلك

"یہ جو ہم کہتے ہیں انا للہ یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہم اس کے بندے اور مملوک ہیں اور جو کہتے ہیں وانا الیہ راجعون یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمیں اس دنیا سے جانا ہے (اور ہمارا قیام کہیں اور ہوگا)۔ [1]

توجہ رہے کہ قرآن مجید نے اس جملے کو صابرین کے شائستہ ترین جملے کے طور پر بیان کیا ہے جو وہ مصائب سے دوچار ہونے کے وقت کہتے ہیں۔ یہ ایسا جملہ ہے جو مصائب کے وقت انسان کے لیے تسلی کا باعث بنتا ہے۔ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے پر یہ جملہ دل وجان کو بیدار کر دیتا ہے اور ان حساس لمحات میں انسانی روح کو پلید اور شیطانی سوچوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

کیونکہ ایک طرف تو انسان اقرار کرتا ہے کہ خود اور وہ جو کچھ اس کے پاس ہے سب کا سب خدا کی ملکیت ہے۔ وہی نعمت عطا کرتا ہے اور وہی واپس لے لیتا ہے۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اگرچہ عطا کرنے والا جو بخش دے ہرگز واپس نہیں لیتا۔ لہٰذا یہاں واپس لینے سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے کسی بہتر جگہ پر ذخیرہ کرنا چاہتا ہے اور یہ بات خود مصیبت زدہ کے لیے تسلی کا باعث ہے۔

دوسری طرف انسان اعتراف کرتا ہے کہ ہمیں اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔ یہ جملہ بھی اسے ایک اور تسلی دیتا ہے چونکہ جہاں وہ جا رہا ہے وہ اس کی رحمت، لطف اور فضل وکرم کی جگہ ہے، سرائے ابدی اور اس کے لقاء کا مرکز ہے۔

اسی لیے بعض کا کہنا ہے کہ یہ آیت خدا کی ان عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے جو خدا نے اس امت کو عطا کی ہیں تاکہ مصیبت کے وقت اس آیت سے الہام حاصل کر سکے۔ کتنا فرق ہے اس آیت میں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس بات میں جو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھو دینے پر کہی: وقال یا اسفی علی یوسف (اور کہا ہائے میرا یوسف)۔ [2] جی ہاں! اس وقت تک ابھی یہ

---

[1] مجمع البیان ج ۱ ص ۲۳۸۔ یہ جملہ نہج البلاغہ میں بیان ہونے والے جملات قصار میں بھی ہے۔

[2] سورۂ یوسف ۸۴

آیت نازل نہ ہوئی تھی۔

البتہ یہ جملہ توحید کامل اور قیامت پر ایمان کا نچوڑ ہے۔اسی طرح ہر وقت اور ہر حال میں خدا کی پاک ذات پر توکل اور بھروسہ کرنے کا حاصل ہے۔[1]

چوتھی آیت میں اسی حقیقت کو ایک نئے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔روزِ قیامت دنیا میں پیش آنے والے ان عجیب وغریب حوادث کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:الی ربك یومئذ المستقر (اس دن آخری آرام گاہ فقط تیرے پروردگار ہی کے ہاں ہے)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آرام گاہ نہیں ہے۔اس میں موجود تمام علامتیں گواہی دیتی ہیں کہ یہ فنا اور نیست ونابود ہوجانے کی جگہ ہے،دگرگونی،فرسودگی اور زوال کا مقام ہے۔لہٰذا دنیا انسان کی تکاملی حرکت میں اس کا آخری ہدف نہیں بن سکتی۔بنا برایں آرام گاہ کوئی اور جگہ ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت میں ایک تقدیر ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد الی حکم ربك ہے۔یعنی وہاں آرام گاہ دراصل وہی خدا کا حکم ہے جس کے ذریعے عدل وانصاف کا قیام ہوگا یا وہ حکم خدا ہے جس کے ذریعے ایک گروہ کو جنت کی آرام گاہوں میں بھیجا جائے گا اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں ٹھکانے لگایا جائے گا۔

لیکن اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہاں تقدیر فرض کرنا خلاف قاعدہ ہے اور تقدیر کی کوئی ضرورت بھی دکھائی نہیں دیتی،لہٰذا ایسی تفاسیر پر کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

گذشتہ آیت میں بیان ہونے والے مطلب کو پانچویں اور آخری آیت میں ایک نئے اور اچھوتے انداز میں تازہ اصطلاح استعمال کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔جان کنی کے لمحات،مختصر سے حالات اور انسانی زندگی کا بستر گول ہوجانے کی جانب اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:الی ربك یومئذ المساق (اس دن تمہارے رب کی طرف کھینچ لے جایا جائے گا)۔

مساق مصدر میمی ہے جس کا معنی سوق (ڈھکیلنا) ہے۔اس اصطلاح سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی تکاملی حرکت کی سمت خدا ہی کی طرف ہے۔یعنی کمالِ مطلق اور کمال لامتناہی کی جانب۔

یہاں پر پھر بعض مفسرین نے حکم یا جزا کا لفظ تقدیر میں فرض کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ یہاں دھکیلے جانے سے مراد ہے کہ خدا کے حکم اور اس کی جزاء کی طرف سب کو دھکیلا جائے گا۔لیکن جیسا کہ ہم گذشتہ آیت میں بھی عرض کر چکے ہیں ایسی تقدیروں کے فرض کرنے کی اصلا کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔بلکہ تمام حرکات خدا ہی کی جانب ہیں۔

---

[1] گذشتہ آیت کی اس بیان شدہ تفسیر کے ذریعے اس آیت سے ملتی جلتی دوسری آیات کی تفسیر بھی واضح ہو جاتی ہے۔مثلاً الی اللہ مرجعکم جمیعا (مائدہ ۱۰۵) ان الی ربك الرجعی (علق ۸) والموتی یبعثهم الله ثم الیه یرجعون (انعام ۳۶) ان الینا ایابهم (غاشیہ ۲۵)

قرآن مجید کی بعض آیات میں بھی خدا کی پاک ذات کو تکاملی حرکت کی انتہا کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ﴿۴۲﴾ (نجم ۴۲)

اور یہ آیت خود بھی متذکرہ بالا مطلب پر ایک اور دلیل ہے۔

چند وضاحتیں

سفر کی آخری منزل

آیات مجیدہ کی روشنی میں بیان ہونے والے اس مطلب (تمام انسانوں کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے) کو عقلی دلائل سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کیونکہ انسانی معاشرہ اس کارواں کی مانند ہے جس نے عدم کے تاریک نقطے سے حرکت شروع کی ہو اور نورِ مطلق کی طرف پیش قدمی کر رہا ہو۔اس حرکت پر فرمانِ خدا اور اس کی ربوبیت سایہ فگن ہے (توجہ رہنا چاہیے کہ یہ تمام بحثیں اصل توحید اور صفات کو قبول کرنے کے بعد کی ہیں)۔

ان متعدد آیات میں لفظ رب کی اصطلاح کا استعمال بتاتا ہے کہ یہ ایک ایسی حرکت ہے جو خدا کی ربوبیت کے سائے تلے اور ایک باقاعدہ حساب کتاب کے تحت انجام پاتی ہے۔

اگر اس حرکت کا آخری نقطہ موت ہو تو ایسی حرکت بے ہدف، بے مقصد اور فاقد قرارگاہ ہوگی جب کہ یقین ہے کہ یہ الٰہی حرکت ایک بہتر مقصد کی طرف جاری ہے۔

انتہائی غور فکر کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہر حرکت تکاملی ایک اعلیٰ تر اور بالاتر مرحلے میں پہنچنے کے لیے انجام پاتی ہے اور اعلیٰ ترین نقطۂ وجود ذاتِ مقدس واجب الوجود ہے۔بنابرایں تمام حرکات اسی کی جانب جاری وساری ہیں۔لہٰذا انسان جب تک اس کے قرب کو حاصل نہ کر لے، اس کی پاک ذات کے مقام شہود تک نہ پہنچ جائے اور مقربین کی صف میں داخل نہ ہو جائے، آرام نہ پائے گا کیونکہ حرکت کے آخری نقطہ تک نہیں پہنچ سکا۔(وقت نظر فرمائیں)۔

اس تمام بحث سے واضح ہوتا ہے کہ موت واقع ہونے سے انسان کا ارتقاء اور سیر صعودی نہیں رکنی چاہیے بلکہ دوسری دنیا میں بھی اس کو اسی طرح جاری رہنا چاہیے۔بنابرایں حرکت اور ہدف کا وجود حیات بعد از مرگ کے مسئلہ پر خود ایک روشن دلیل ہے۔

۵۔دلیل رحمت

خدا کی مشہور و معروف صفات میں سے ایک صفت رحمت ہے۔رحمت کا معنی ہے اس وجود کو فیض اور نعمت سے نوازنا جو اس کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہو۔

چونکہ انسان اپنی مخصوص بناوٹ اور اس روح کے ساتھ جو نفخہ الٰہی کی برکت سے اس میں پھونکی گئی ہے حیات جاوید اور کئی ایک کمالات تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔لہٰذا خداوند رحمان و رحیم ایسے فیض اور سعادت کو اس سے منقطع نہیں کرتا اور نہ ہی موت واقع ہونے سے اس کے فیض و رحمت کا خاتمہ ہوتا ہے۔اسی کو دلیل رحمت کہا جاتا ہے۔اب قرآن مجید سے اس مطلب پر درج ذیل آیت آپ کے پیش خدمت ہے:

(۱) قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ (انعام ۱۲)

ترجمہ

(۱) آپ کہئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود ہے، یہ سب کس کی ملک ہے؟ آپ کہہ دیجئے سب اللہ ہی کی ملک ہے، اس نے (اللہ تعالیٰ نے) رحمت اور مہربانی فرمانا اپنے اوپر لازم فرمالیا ہے۔روزِ قیامت کہ جس میں کوئی شک ہی نہیں تم سب کو خدا ضرور جمع کرے گا۔

تفسیر

یہ آیت درحقیقت چار حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ سوالیہ انداز میں شروع ہوتا ہے۔پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ کہیئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود ہے یہ سب کس کی ملک ہے؟(قل لمن ما فی السموت والارض)۔

بعد ازاں کسی جواب کا انتظار کئے بغیر ارشاد ہوتا ہے کہ آپ خود ہی کہہ دیجئے سب اللہ ہی کی ملک ہے۔(قل اللہ)

یعنی یہ بات اتنی واضح اور قطعی و مسلم ہے کہ اصلاً کسی بحث مباحثہ کی ضرورت ہی نہیں۔

دوسرے حصے میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ خدا نے رحمت اور مہربانی فرمانا اپنے اوپر لازم فرمالیا ہے (تاکہ تمام لوگوں کو بلا استثناء اپنی رحمت واسعہ اور بے پایاں لطف و عنایات سے فیض یاب کرے)(کتب علی نفسہ الرحمۃ)۔

تیسرے حصے میں قیامت سے متعلق ارشاد ہوتا ہے: روزِ قیامت کہ جس میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں تم سب کو خدا ضرور بالضرور جمع کرے گا۔(لیجمعنکم الی یوم القیمة لاریب فیه)۔

چوتھے حصے میں یوں نتیجہ گیری کی گئی ہے: فقط وہی لوگ ایمان نہ لائیں گے جنہوں نے اپنے کو ضائع کیا، اپنا سرمایہ وجود کھو دیا اور گھاٹے میں رہے۔(الذین خسروا انفسهم فهم لا یؤمنون)۔

ان چار جملوں کا آپس میں کیا رابطہ ہے، اس بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ پہلا حصہ توحید کے بارے میں ہے اور باقی حصہ معاد یا نبوت اور معاد کو بیان کرتا ہے اور دین کے بنیادی ترین اصول اس میں سموئے گئے ہیں۔

لیکن علامہ طباطبائی مرحوم کا فرمانا ہے کہ پوری آیت مسئلہ معاد کو بیان کرتی ہے اور یہی تفسیر زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے۔ہم اس کی وضاحت یوں پیش کرتے ہیں:

پہلے حصے میں خدا نے تمام عالم ہستی پر اپنی مالکیت اور حاکمیت کو بیان کیا ہے اور ایک سوال و جواب کی صورت میں مطلب بالکل واضح کر دیا ہے، ایک ایسے سوال کے ساتھ کہ جس کا جواب دل، فطرت اور ضمیر کی اتھاہ گہرائیوں سے ملتا ہے۔ یہاں تک کہ مشرکین بھی اسی پر اعتقاد رکھتے تھے (یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہتا ہے کیا میں نے تمہاری تعلیم وترقی کے لیے تمام وسائل فراہم نہیں کیے۔اس کے بعد بیٹے کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہتا ہے: یقینا میں نے ایسا ہی کیا ہے)۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم ہستی میں کوئی چیز بھی حق تعالیٰ کے ارادے اور فرمان کے مقابلے میں رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکتی۔

بعد ازاں مزید ارشاد ہوتا ہے: قادر وتوانا خدا نے رحمت فرمانا اپنے اوپر لازم قرار دے دیا ہے اور کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اسے لازم قرار نہ دے جب کہ وہ منبع فیض ہے اور اس سرچشمے پر بخل پھٹک ہی نہیں سکتا۔لہٰذا اگر تا ابد بھی فیض رسانی کرے تو اس سے کوئی چیز کم نہ ہوگی۔

کیا رحمت اس کے علاوہ بھی کچھ ہے کہ نعمت اسے دی جائے جو اس کا مستحق ہو اور ہر موجود کو اس کمال مطلوب تک پہنچایا جائے جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہے؟

جب یہ دو مقدمے ثابت ہو گئے (کہ ایک طرف خدا منبع فیض ہے اور دوسری طرف اس کی فیض رسانی میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی) تو تیسرے جملے میں یوں نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے: پس روزِ قیامت کہ جس میں کوئی شک وشبہ نہیں، تم سب کو ضرور اکٹھا کیا جائے گا۔اگر انسانی موت کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو جائے تو پھر انسان تو اپنے کمال مطلوب تک نہ پہنچا اور حیات جاوید کی استعداد کھو بیٹھا، رحمت وفیض الٰہی اس سے اٹھالی گئی یا اس فیض رسانی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوگئی۔لیکن چونکہ رکاوٹ کا تو اصلا کوئی مسئلہ ہی نہیں اور اس کی رحمت بھی یقینی ہے لہٰذا انسان کے لیے دوسری دنیا میں حیات جاوید پانا اور قرب الٰہی کا حصول بھی حتمی ہے۔

البتہ بعض لوگ حیات ابدی کی صلاحیت گنوا بیٹھتے ہیں اور گھاٹے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔

بنا برایں یہ دلیل رحمت جو اس آیت کا نچوڑ ہے مکمل طور پر منطقی ہے اور دلیل حکمت اور دلیل عدالت سے بالکل جدا ہے۔

(دقت نظر فرمائیں)۔

ضمناً اس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قیامت ایک گروہ کے لیے تو مایہ رحمت ہے جب کہ دوسرے گروہ کے لیے باعث عذاب ہے اور یہ بات کیونکر رحمت خداوندی کے مطابق ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب وہی ہے جو آیت کی وضاحت میں بیان ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ خدا نے اپنی رحمت تک پہنچنے کی صلاحیت ہر کسی کو عطا کی ہے اور اس کے لوازمات بھی ہر ایک کے اختیار میں دے دیئے ہیں۔ اب اگر بعض لوگ اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیں اور انہیں تباہ و برباد کر دیں جب کہ عقل بھی رکھتے ہیں اور تعلیمات وحی سے بھی بہرہ ور ہیں، بنابرایں وہ خود قصوروار ٹھہریں گے۔ چونکہ یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے لہٰذا لعنت کا طوق بھی خود سے پہنیں۔

زندگی کی تمام نعمتیں اسی طرح ہیں۔ بعض ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض ان نعمتوں سے سوءاستفادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ چیز خدا کی رحمت اور فیض رسانی میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ لیجمعنکم کے جملے میں ایک طرف ''لام قسم'' دوسری طرف ''نون تاکید ثقیلہ'' اور تیسری طرف "لاریب فیہ" کا جملہ استعمال کر کے تاکید در تاکید پیش کی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رحمت پروردگار کے پیش نظر قیامت ہر لحاظ سے حتمی ہے۔

امید ہے دلیل رحمت کے ضمن میں پیش ہونے والی متذکرہ بالا توضیحات کافی ہوں گی۔ بنابرایں ہم مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

۶۔دلیل وحدت

افکار وآراء کا مختلف ہونا دنیاوی زندگی کی خصوصیات میں سے ہے۔حتی کہ ایک ہی مذہب کے پیروکار مختلف عقائد کی وجہ سے کئی ایک گروہوں میں تقسیم ہیں۔

بعض اوقات آراء وعقائد کا یہ اختلاف معاشرے سے گھر اور خاندان تک اس طرح سرایت کر جاتا ہے کہ خاندان کا ہر فرد مختلف عقیدے اور مکتب کا پیروکار رہوتا ہے۔

بلا شک ہر انسان دنیا میں موجود ان اختلافات کے ہاتھوں نالاں ہے اور ہر کسی کی یہ آرزو ہے کہ ان اختلافات کا جلد از جلد خاتمہ ہو جائے۔

خدا جس نے انسان کو تکامل اور ہدایت کے لیے خلق کیا ہے یقینا وہ انسان کو اپنی یہ آرزو پانے سے محروم نہ رکھے گا اور اس کی ربوبیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔چونکہ بعض وجوہات کی بنا پر یہ ہدف دنیا میں تو پورا نہ ہوگا اور متعدد شواہد بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں،لہٰذا اختلافات رفع ہونے اور وحدت کے حصول کی جگہ یقینا کوئی دوسری دنیا ہے۔

قرآن مجید نے اس مطلب پر بہت تاکید کی ہے۔دسیوں آیات مجیدہ اس موضوع کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ہر قسم کے اختلافات رفع ہونے کی جگہ ایک دوسری دنیا ہے اور خدا یقینا اس کام کو انجام دے گا۔

اس مقدمے کے ساتھ اب ہم درج ذیل آیات مجیدہ کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں:

(توجہ رہے کہ ملتے جلتے مضامین کی حامل آیات میں سے ایک آیت کو متن کے لیے انتخاب کیا گیا اور باقی آیات کی طرف حاشیے میں اشارہ کیا گیا ہے)۔

(۱) وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِىْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ

(نحل:۳۸،۳۹)

(۲) ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

(انعام:۱۶۴)

(۳) اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

(یونس:۹۳)

(۴) اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۝۶۹ (حج: ۶۹)

(۵) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۝۱۷ [1] (حج: ۱۷)

ترجمہ

(۱) وہ بڑی محکم قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ خدا انہیں مارے گا تو پھر کبھی دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ جی ہاں یہ خدا کا حتمی وعدہ ہے (کہ وہ تمام مردوں کو دوبارہ زندگی عطا کرے گا) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ مقصد یہ ہے کہ جن باتوں پر یہ لوگ جھگڑا کرتے ہیں اسے ان کے سامنے صاف واضح کر دے۔

(۲) پھر تم سب کو اپنے پروردگار کے حضور لوٹ کر جانا ہے۔ تب تم لوگ جن باتوں میں باہم جھگڑتے تھے وہ سب تمہیں بتا دے گا۔

(۳) جن باتوں میں یہ باہم جھگڑ رہے ہیں قیامت کے دن تمہارا پروردگار اس میں فیصلہ کر دے گا۔

(۴) جن باتوں میں تم باہم جھگڑا کرتے ہو قیامت کے دن خدا تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔

(۵) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور یہودی، صابئان (لامذہب) نصاریٰ، مجوسی اور مشرکین خدا قیامت کے دن ان لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔ حق و باطل کو جدا جدا کر دے گا اور خدا ہر چیز پر گواہ ہے (اور ہر چیز سے آگاہ ہے)۔

تفسیر

یہ اختلافات کب ختم ہوں گے؟

ابتداً پہلی آیت میں دوسری دنیا کے وجود کی نفی پر منکرین معاد کی قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ تاکیداً اور مکرراً قسمیں کھا

---

[1] انہی مضامین کی حامل قرآن مجید کی دیگر آیات آل عمران ۵۵، مائدہ ۴۸، نحل ۹۲، ۱۲۴، بقرہ ۱۱۳، زمر ۳، جاثیہ ۱۷، حج ۶۹، دخان ۴۰، نباء ۱۷، مرسلات ۱۳-۱۴، سجدہ ۲۵۔

کر کہتے ہیں کہ خدا مرنے والے کو ہرگز دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔(واقسموا باللہ جھد ایمانھم لا یبعث اللہ من یموت)

بعدازاں انہیں جواب دیا جاتا ہے: ''جی ہاں! (یقیناً سب کو نئی زندگی عطا کی جائے گی) یہ خدا کا حتمی وعدہ ہے۔لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''(بلی وعدا علیہ حقا ولکن اکثر الناس لا یعلمون)

اس کے بعد قیامت اور مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے: ''مقصد یہ ہے کہ جن باتوں پر یہ لوگ جھگڑا کرتے ہیں اسے ان کے سامنے واضح کر دے۔''(لیبین لھم الذی یختلفون فیہ)

بنابرایں کہا جا سکتا ہے کہ قیامت کے مقاصد میں سے ایک اختلافات کی نفی کرنا اور وحدت کی جانب لوٹنا ہے کیونکہ دنیا کی یہ ماہیت اتنے انواع واقسام کے پردوں کے ساتھ اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ یہ اختلافات کلی طور پر ختم ہو جائیں۔لیکن وہ دن کہ جو کشف غطاء ہے، پردوں کے ہٹ جانے کا دن ہے، تمام اسرار پنہانی کے آشکار ہونے کا دن ہے، اس دن ہر چیز واضح و روشن ہو جائے گی اور ہر قسم کے اختلافات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مومنوں کا ایمان پکا ہو جائے گا اور وہ عین الیقین کے مقام تک جا پہنچیں گے جب کہ کافر اور باطل مذاہب کے پیروکار اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے اور حق پر لوٹ آئیں گے۔

دوسری آیت میں اسی مطلب کو ایک اور انداز سے پیش کیا گیا ہے۔مشرکین کے معبودوں کی نفی کرنے کے بعد اور اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ہر کسی نے اپنے اعمال کے بدلے خود کو گروی رکھ دیا ہے، لہٰذا کسی کا گناہ دوسرے کے کھاتے میں نہ ڈالا جائے گا۔ارشاد ہوتا ہے: پھر تم سب کو اپنے پروردگار کے حضور میں لوٹ کر جانا ہے۔تب تم لوگ جن باتوں میں باہم جھگڑتے تھے وہ سب تمہیں بتا دے گا (اور اختلافات ختم ہو جائیں گے)۔

(ثم الی ربکم مرجعکم فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون)

پہلی آیت میں تبیین اختلافات کی بات تھی اور اس آیت میں انباء (خبر دینا، آگاہ کرنا) کی بات کی گئی ہے اور درحقیقت دوسری پہلی کی علت ہے چونکہ روزِ قیامت خدا کا خبر دینا دراصل تبیین حقائق کا جوشاں چشمہ ہے یا ''تبیین'' دیکھنے سے اور ''انبای'' سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

تیسری آیت میں لوگوں کے اختلافات سے متعلق خدا کی قضاوت کا ذکر کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے: ''جن باتوں میں یہ اکثر باہم جھگڑتے رہتے ہیں روزِ قیامت تمہارس پروردگار اس میں فیصلہ کر دے گا۔''

(ان ربک یقضی بینھم یوم القیمۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)

واضح ہے کہ جب خدا اس دن ان کے درمیان رسماً قضاوت کرے گا تو یقیناً تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے اور حقائق اظہر من الشّمس ہو جائیں گے۔

یہ آیت بنی اسرائیل کے اختلافات کی طرف اشارہ کرتی ہے یا ان اختلافات کی جانب جو نزول قرآن اور ظہور اسلام کے بعد ان

کے درمیان پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں نے اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے والی روشن نشانیوں کے بعد ان سے ہاتھ اٹھالیا جب کہ بعض نے اپنے شخصی منافع ومفادات کی خاطر ان روشن علامات سے منہ موڑ لیا۔

یا پھر ان اختلافات کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے دور میں فرعونیوں کے چنگل سے آزادی اور اس عظیم معجزے کے مشاہدے کے بعد ان کے درمیان پیدا ہوئے۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے اور سامری کا بچھڑا نکالنے کے بعد پیدا ہونیوالے اختلافات کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔

اگرچہ متعدد مفسرین پہلے احتمال کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اس آیت سے پہلے والی آیات دوسرے احتمال کو ترجیح دیتی ہیں۔[1] البتہ تینوں تفسیروں میں جمع بندی کی جاسکتی ہے۔

بہرحال بعض معروف مفسرین کے بقول یہ اختلافات اس دنیا میں تو ختم ہونے سے رہے، فقط قیامت ہی ہے کہ خدا انکے درمیان قضاوت کرے گا اور ہر کھرے کھوٹے اور حق و باطل کو جدا جدا کردے گا۔[2]

چوتھی آیت میں لفظ حکم استعمال ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے اختلافات کے ایک پہلو پر اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ''جن باتوں میں تم باہم جھگڑا کرتے ہو قیامت کے دن خدا تم لوگوں کے درمیان حکم کردے گا۔''

(الله يحكم بينكم يوم القيمة فيما كنتم فيه تختلفون)

یہودیوں کا اختلاف کس بات پر تھا؟ آیت کے شروع سے پتہ چلتا ہے کہ ہفتے کے دن پر ان کے درمیان اختلاف تھا جو ان کی چھٹی کا دن تھا (اختلاف یہ تھا کہ آیا اس دن شکار کرنا حرام ہے یا حلال؟ اگرچہ ان کے پیغمبر اسے حرام قرار دے چکے تھے یا ہفتے کی جمعہ پر فضیلت کے بارے میں اختلاف تھا)۔

تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اصولاً بنی اسرائیل نے ہمیشہ اختلاف وانتشار کے ایک مرکز کا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن آج ایسی مرکزیت نہیں ہے بلکہ بعض حوادث زمانہ کی وجہ سے ان کا اصل وجود بھی خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ اسی لیے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر خصوصاً دنیا بھر کے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔

گذشتہ آیات میں بیان ہونے والے مطلب کو پانچویں آیت میں ایک اور عنوان کے تحت بطور کلی زیر بحث لایا گیا ہے۔ کافروں کے مختلف گروہوں اور مومنین کے درمیان پائے جانے والے وسیع ترین اختلافات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ''جنہوں نے ایمان قبول کیا (مسلمان) اور وہ لوگ جو یہودی، صابئان (ستارہ پرست)، نصاریٰ، مجوسی اور مشرک ہیں خدا روزِ قیامت ان کے درمیان جدائی ڈال دے گا (حق کو باطل سے جدا کردے گا) اور خدا ہر چیز پر گواہ ہے (اور ہر چیز سے آگاہ ہے)۔''

---

[1] فخر رازی، قرطبی اور طبرسی مرحوم نے پہلی تفسیر کو قبول کیا ہے جب کہ المیزان کی تعبیرات دوسری تفسیر سے موافقت رکھتی ہیں۔

[2] تفسیر کبیر، ج ۱۷ ص ۱۵۹

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالصّٰبِـُٔوۡنَ وَالنَّصٰرٰی وَالۡمَجُوۡسَ وَالَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا ۟ اِنَّ اللّٰهَ یَفۡصِلُ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ﴿۱۷﴾

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قیامت کے معروف ترین ناموں میں سے ایک یوم الفصل ہے۔قرآن گویا ہے:اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا ﴿۱۷﴾ (نبا:۱۷)

یعنی یوم الفصل (سب کی) وعدہ گاہ معین وقت ہے۔قرآن حکیم میں اس کے علاوہ بھی کئی ایک اور آیات میں قیامت کے بارے میں اسی اصطلاح کو بیان کیا گیا ہے۔

''فصل'' دراصل دو چیزوں کی ایک دوسرے سے جدائی کے معنی میں ہے۔قیامت کو یوم الفصل اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دن حق باطل سے جدا ہو جائے گا اور خدا کی قضاوت کے ذریعے ہر طرح کا اختلاف ختم ہو جائے گا۔نیک و پاک لوگوں کی صفوف بدکار و آلودگان سے جدا ہو جائیں گی۔مجمع البیان میں طبرسی مرحوم کے بقول اہل حق کے چہرے سفید اور نورانی ہوں گے اور اہل باطل کے چہرے سیاہ اور ظلمانی ہوں گے۔[1]

کیا اتنی واضح و آشکار علامات کے باوجود بھی حق و باطل کے مسئلے میں کوئی اختلاف و نزاع باقی بچتا ہے؟

اس آیت میں ان چھ مشہور ادیان کا ذکر کیا گیا ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے اور درحقیقت زیادہ تر پیروکار انہی مذاہب کے تھے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ: مومنین (مسلمان)، یہود، صائبین (حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیروکار جن میں سے بعض کو ان کے انحرافات کی وجہ سے ستارہ پرست کہا جانے لگا)، نصاریٰ (عیسائی)، مجوس (زرتشتیان، آگ پرست)، مشرکین اور بت پرست۔خدا روزِ قیامت ان کے درمیان جدائی ڈال دے گا اور اہل حق کو واضح طور پر اہل باطل سے جدا کر دے گا۔

اگر آج اہل حق کو اہل باطل سے جدا کرنے کے لیے دلیل، منطق اور استدلال کی ضرورت ہے تو اس دن اصلاً ایسے کسی مسئلے کی ضرورت پیش نہ آئے گی بلکہ فارسی محاورہ کے مطابق ''آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بہ بیان است'' یعنی جو چیز خود سے اظہر من الشمس ہے اس کی وضاحت کرنا معنی نہیں رکھتا۔

رنگ رخسارہ باخبر از سر در و نہامی دہد!
رنگ رخسار رازِ درون کو ظاہر کرتا ہے۔

---

[1] مجمع البیان، ج ۷ ص ۶۷

چند وضاحتیں

متذکرہ بالا پانچ آیات میں پانچ مختلف عنوانات "انباء"، "تبیین"، "حکم"، "قضاء" اور "فصل" کا ذکر کر کے اس حقیقت کو انتہائی واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ روزِ قیامت اختلافات کے خاتمے، حقائق کے آشکار ہونے، حق و باطل کے جدا ہونے اور آخری حکم اور قضاوت کا دن ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو جب کہ قیامت یوم البروز اور یوم الظہور ہے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ (ابراھیم ۴۸)

قیامت پردوں کے ہٹ جانے اور کشف غطاء کا دن ہے۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ (ق ۲۲)

درحقیقت عالم دنیا کہ جو ایک تاریک یا نیم ظلمانی عالم ہے، اس کی طبیعت میں یہ ہے کہ یہ حقائق کو مکمل طور پر طشت از بام نہیں ہونے دیتی۔ یہ بالکل رات کی مانند ہے جس میں انسان چراغ لیے حقائق تک دسترس حاصل کرنے کی جتنی بھی کوشش کرے پھر بھی حقائق کا کچھ حصہ نمایاں ہونے سے رہ جائے گا۔ لیکن قیامت طلوع آفتاب کی مانند ہے کہ جس کی درخش سے ہر چیز واضح، آشکار اور روشن ہو جائے گی۔

رات کی تاریکی میں ممکن ہے بعض لوگ راستے کو پالیں اور بعض بھٹک جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حق تک پہنچنے والا ہر کوئی اپنے تئیں اس کی تعریف کرے۔ جیسا کہ یہ مثال مشہور ہے کہتے ہیں: کچھ افراد رات کی تاریکی میں ہاتھی کی جان پہچان کرنے کے لیے اس کے پیچھے جا نکلے۔ ہر کسی نے اس کے جسم کے کسی ایک حصے کو چھوا۔ اب جب واپس لوٹے تو متضاد تعریفیں کرنے لگے۔ جس نے ہاتھی کے پاؤں کو مس کیا تھا اس نے کہا: ہاتھی ایک ستون کی مانند ہے۔ دوسرا جو ہاتھی کی سونڈ کو چھو کر آیا تھا کہنے لگا کہ ہاتھی تو ایک بڑے پائپ کی طرح ہے۔ تیسرا جس نے ہاتھی کے سینے کو مس کیا تھا ہاتھی کو ایک چھت جیسا سمجھ رہا تھا۔ لیکن جب ہاتھی روشنی میں نمودار ہوا تو سارے اختلافات برطرف ہو گئے اور سب جان گئے کہ ان کی تعریفیں محدود تھیں۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ امواجِ اختلاف سے چھٹکارا پالے اور یقین وحدت کی دنیا میں قدم بڑھاتا چلا جائے۔ خدا جس نے اسے تکامل کے لیے خلق کیا ہے یقیناً اسے اس فیض سے محروم نہ رکھے گا۔

تکامل کی راہ میں درپیش موانع میں سے ایک اختلاف ہے۔ اختلاف سکون و آرام میں مزاحمت ایجاد کرتا ہے اور یہ اختلاف ہی ہے جو بعض اوقات انسان کے اعتقادات کی جڑوں کو شک کے زہر ہلاہل سے سیراب کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس دن کا انتظار کیا جائے جب ان تمام مزاحمتوں کا خاتمہ ہو جائے۔

البتہ جہاں تک دنیاوی زندگی کی طبیعت نے اجازت دی ہے انبیاء اور اوصیاء نے آسمانی کتابوں کی مدد سے حقائق کو روشن کیا ہے۔

لیکن وہ بھی ان چراغوں کی مانند تھے جسے انسان رات کی تاریکی میں اس دنیا میں لیے پھر رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وحدت کی جگہ فوراً اختلاف سر اٹھا لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن گویا ہے:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ (نحل: ٦٤)

''ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں انہیں آپ ان پر تبین (ظاہر) فرما دیں۔''

ایک اور جگہ یوں ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ (جاثیہ: ١٧)

''انہوں نے علم و آگاہی کے حصول ہی کے بعد باہم اختلاف کیا۔''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کی پوری جدوجہد اور نسبی اختلافات کے برطرف ہونے کے باوجود بھی اختلاف مکمل طور پر ختم نہ ہوئے۔ دراصل اس دنیا میں بہت سارے لوگوں پر ہوا و ہوس اور حب و بغض حکم فرما ہے۔ جب تک یہ پردے نہیں ہٹتے وحدت کی طرف گامزن نہیں ہوا جا سکتا۔

لیکن روزِ قیامت یہ تمام پردے جل کر راکھ ہو جائیں گے اور حقائق بغیر ان پردوں کے آشکار ہو جائیں گے۔

۷۔دلیل بقائے روح

الٰہیات کے متعدد فلاسفہ معاد کی بحث میں بقائے روح کے مسئلہ پر زور دیتے ہیں اور اسے قیامت کی روشن ترین دلیلوں میں سے ایک جانتے ہیں۔

بلاشک بقائے روح پر اعتقاد ہمارے لیے حیات بعد از موت اور قیامت کے آدھے راستے کو ہموار کر دیتا ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے کہ اگر کوئی بقائے روح پر اعتقاد نہ رکھتا ہو تو مسئلہ قیامت اس کے لیے ثابت کرنا مشکل ہو جائے۔ بلکہ بحث معاد بقائے روح کے مسئلہ کو منہا کر کے بھی مکمل طور پر قابل اثبات ہے۔

شاید اسی بناء پر قرآن کریم نے بحث قیامت کے تحت بیان ہونے والی آیات میں بقائے روح کے مسئلہ پر کم تر سہارا لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہ قرآن مجید نے بقائے روح اور مسئلہ معاد کے درمیان کوئی خاص رابطہ برقرار نہیں کیا جیسا کہ آپ ملاحظہ بھی فرمائیں گے۔لیکن اس کے باوجود انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بقائے روح کے مسئلے کی روشنی میں قیامت کے مسئلے کو زیادہ واضح طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت سے بھی فرار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن پاک میں بقائے روح کے مسئلے پر انتہائی ظریف اور خوبصورت اشارے ملتے ہیں بنابرایں بقائے روح کا مسئلہ ایک طائرانہ نگاہ کا سزاوار ہے۔ چونکہ روح سے مربوط مباحث اس قدر وسیع ہیں کہ ان کے لیے علیحدہ سے کئی ایک کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے اس لیے ابھی ہم اس مسئلے کی گہرائیوں میں نہیں جا سکتے۔

اب اس مقدمے کے ساتھ ہی ہم قارئین محترم کو آیات ذیل کی طرف گوش شنوا اور چشم بینا کے ہمراہ دعوت دیتے ہیں:

(۱) وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ﴿۱۶۹﴾

(ال عمران:۱۶۹)

(۲) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴿۱۵۴﴾ (البقرۃ: ۱۵۴)

(۳) اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴿۴۶﴾ (مومن: ۴۶)

(۴) قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۧ﴿۱۱﴾

(سجدہ: ۱۱)

(۵) اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۴۲ [1] (زمر: ۴۲)

ترجمہ

(۱) (اے پیغمبرؐ) ہرگز گمان نہ کرو کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والے مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور انہیں اپنے پروردگار کے ہاں سے روزی دی جاتی ہے۔

(۲) خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔

(۳) ان کا عذاب وہ آگ ہے جس کے سامنے یہ صبح وشام لائے جاتے ہیں اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں پھینک دو۔

(۴) کہہ دیجئے کہ تم پر مامور ہونے والا ملک الموت تمہاری روح لے لے گا اور پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

(۵) خدا موت کے وقت ارواح قبض کرتا ہے اور ان روحوں کو بھی نیند کی حالت میں لے جاتا ہے جو ابھی نہیں مری۔ پھر جن ارواح کی موت کا حکم صادر ہو چکا انہیں اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہے اور باقی روحوں کو (کہ جنہیں ابھی زندہ رہنا ہے) واپس لوٹا دیتا ہے ایک مقررہ وقت تک کے لیے اس امر میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے واضح نشانیاں ہیں۔

تفسیر

استقلال ارواح

پہلی آیت میں راہ خدا میں شہادت پانے والوں کی بات ہوئی ہے۔ بعض کمزور ایمان لوگ ان (شہداء) کی حالت پر افسوس کرتے

---

[1] متعدد آیات مجیدہ میں موت کے لیے توفی (دریافت کرنا) کی اصلاح استعمال ہوئی ہے جو بقائے روح کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے۔ مانند: النساء ۹۷، انعام ۶۱، نحل ۲۷، ۳۲، ۷۰، یونس ۴۶، رعد ۴۰، مومن ۶۷، ۷۷، انفال ۵۰، اعراف ۳۷، حج ۵۔

تھے کہ کیسے مرکھپ گئے، ختم ہوگئے، مٹی میں مٹی ہوگئے اور کہیں کے بھی نہ رہے؟ اس موقع پر قرآن حکیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتا ہے (تاکہ اعتراض کرنے والے ہوش کے ناخن لیں) ارشاد ہوتا ہے: ہرگز گمان نہ کرو کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والے مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور انہیں اپنے پروردگار کے ہاں سے روزی دی جاتی ہے۔ (ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون)۔

اس طرح قرآن نے موت کے بارے میں، خصوصاً خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کی موت سے متعلق لوگوں کی فکر ونظر کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا اور بتایا کہ وہ خدا کے جوارِ رحمت میں مسرت وخوشی میں غرق ہیں اور دوسروں کے لیے پیغام بھیجتے ہیں کہ کسی غم واندوہ یا فکر وفاقے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو راحت وسکون میں ہیں۔

ایک تو یہ روشن عبارات بقائے روح پر دلالت کرتی ہیں، دوسرا شہداء کی اس دنیا سے کہیں بالاتر اور اعلیٰ تر زندگی کی حکایت کنندہ ہیں۔

اگر موت کے ساتھ ہی انسانی زندگی کا مکمل خاتمہ ہوجائے تو پھر یہ عبارات حتی کہ شہداء کے بارے میں بھی بے معنی ہوجاتی ہیں اور مجاز واستعارے سے بڑھ کر ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

لیکن جو لوگ ان آیات کے پیغام کو درک نہیں کر پائے، آغازِ اسلام کے کمزور ایمان لوگوں کی طرح انہی کی پیروی کرتے ہوئے ایسی عبارات کی تفسیریوں کرتے ہیں کہ ان سے مراد شہداء کا نام اور ان کے مکتب کا باقی رہنا ہے۔ جب کہ آیت صریحاً ایسے افکار کو رد کرتی ہے اور شہداء کے لیے حیاتِ ابدی کی قائل ہے، ایسی حیات جو یقیناً جسمانی نہیں ہے۔ چونکہ شہید کا خون سے رنگین جسم تو سپرد خاک کر دیا جاتا ہے پس برزخ میں بقائے روح کے ذریعے ملنے والی روحانی زندگی ہی ہے۔

تفسیر المیزان کے بقول اگرچہ بعض مصر ہیں کہ یہ آیت شہدائے بدر کے لیے مخصوص ہے (یا بعض کے نزدیک شہدائے احد سے مربوط ہے) لیکن یقیناً آیت کا مفہوم انتہائی وسیع ہے اور بلا استثناء تمام شہداء اس میں شامل ہیں۔ البتہ شہداء کے علاوہ دوسروں کے بارے میں بھی انکار نہیں کیا گیا۔

بہرحال اس آیت کا اور اس کے بعد والی تمام آیات کا لہجہ یہ بیان کرتا ہے کہ شہداء کی ارواح باقی ہیں، وہ خدا کے جوارِ رحمت میں معنوی رزق سے بہرہ ور ہیں اور اس کے فضل ونعمت پر خوشحال وشاداں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ آیت غلط توجیہات اور انحرافی تفسیروں پر مہر بطلان ثبت کر رہی ہے۔

شہدائے فی سبیل اللہ

متذکرہ بالا مطلب ہی کو دوسری آیت میں ایک اور انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں فرق یہ ہے کہ پہلی آیت کا شانِ نزول شہدائے احد اور دوسری کا شانِ نزول شہدائے بدر سے مربوط ہے۔ لیکن مضمونِ آیت یہ دو جگہ پر عمومیت کا حامل ہے۔

ایک فرق یہ بھی ہے کہ پہلی آیت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دیا گیا تھا جب کہ دوسری میں تمام مسلمانوں کو

خطاب کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مردہ مت کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔

(ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیآء ولکن لاتشعرون)

درست ہے کہ پہلی آیت اپنے بعد بیان ہونے والی آیات کے ساتھ مل کر شہداء کی روحانی زندگی پر زیادہ تاکید کرتی ہے۔لیکن دوسری آیت بھی مکمل گویا ہے،خصوصاً جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ''وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے''۔

یہاں دوبارہ بعض ایسے تنگ نظر افراد سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے جنہوں نے شہداء کی زندگی کے بارے میں مجازی اور انحرافی توجیہات کی ہیں۔ان کے نزدیک شہید کی زندگی سے مراد اس کا ہدایت پا جانا،اس کے دین کا نام باقی رہنا یا پھر اس کے اپنے نام کی بقاء ہے۔جب کہ ان کے پاس اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

گویا اس گروہ نے ان دونوں آیات کی ان تعبیرات پر دقت نظر نہیں کی جن میں شہید کی زندگی کے علاوہ اس کی روزی،رزق،خوشی، مسرت،مختلف خدائی نعمتوں سے بہرہ مند ہونا،بے غم،نڈر اور بیخوف ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔خصوصاً جہاں یہ دوٹوک بات کی گئی ہے:''تم ان کی زندگی کو نہیں سمجھ سکتے۔''

اگر مقصد بیان نام و دین کا باقی رہنا اور قیامت کی زندگی ہے تو پھر مذکورہ تعبیرات میں سے کوئی ایک بھی صحیح نہیں ہے۔

اسی لیے قرآن نے بقائے روح کی بحث کی بنیاد ہی کو اس پر استوار کیا ہے اور شہداء سے بات کا آغاز ہوا ہے۔

آل فرعون پر برزخی عذاب

تیسری آیت میں ایک ظالم و ستمگر گروہ یعنی آل فرعوان کی بات ہوئی ہے جو شہداء کے بالکل برعکس ہے۔ان کے مرنے کے بعد کی حالت یوں بیان کی گئی ہے:انہیں صبح و شام آگ کے سامنے لایا جاتا ہے اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں پھینک دو۔

(النار یعرضون علیھا غدوا و عشیا ویوم تقوم الساعۃ ادخلوا ال فرعون اشد العذاب)

واضح ہے کہ جس آگ کے سامنے آل فرعون کو صبح و شام لایا جاتا ہے اس سے مراد برزخی آگ ہے کیونکہ دنیا سے تو وہ جا چکے ہیں اور قیامت ابھی برپا نہیں ہوئی۔علاوہ ازیں روزِ قیامت انہیں صبح و شام سزا نہیں ہوگی بلکہ وہاں تو دائمی طور پر سخت ترین عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ (جیسا کہ آیت ذیل اس پر دلالت کرتی ہے)۔

قرآن کی یہ عبارت بقائے روح پر ایک اور زندہ دلیل ہے۔لیکن اگر روح ہی باقی نہ رہے تو پھر کس چیز کو صبح و شام آگ کے سامنے لایا

جاتا ہے؟ کیا فقط بے جان اور خاک شدہ جسم کو؟ اس کا کیا فائدہ، اس پر کیا اثر ہوگا؟ پس ضروری ہے کہ ان کی روح باقی رہے، شعور اور درک کرنے کی قوت رکھتی ہو تو عالم برزخ میں ہر صبح وشام عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو۔

غدو اور عشی (صبح وشام) کی اصطلاح ممکن ہے اس وجہ سے بیان کی گئی ہو کہ صبح اور شام کا وقت طاغوت صفت لوگوں کی قدرت نمائی، عیش وعشرت اور خورد ونوش کے اوقات سے ہے۔ اسی لیے ٹھیک اسی وقت ان پر خدا کی پھٹکار پڑتی ہے۔

آیت ذیل آگ میں داخل ہونے کو بیان کرتی ہے جب کہ یعرضون (پیش کیا جانا) کی تعبیر اس سے بہت مختلف ہے۔ ممکن ہے یہ آگ کے قریب ہونے پر اشارہ ہو۔ برزخ میں آتش دوزخ نزدیک ہوں گے اور روزِ قیامت اس کے اندر جھونک دیئے جائیں گے۔

متعدد مفسرین اس آیت کو عذاب قبر اور برزخ سے متعلق سمجھتے ہیں [1] اور یہ بات قطعی ومسلم ہے کہ عذاب قبر (اور برزخ) بقائے روح کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: آپ میں سے جو بھی دنیا سے چلا جائے اسے صبح وشام اس کا قیام کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے۔ اگر جنتی ہو تو اس کی جنت والی جگہ اور اگر دوزخی ہو تو اس کا جہنمی ٹھکانا اسے دکھایا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے: قیامت میں یہ تمہاری جگہ ہے (اور یہی بات اس کی خوشی یا غمی کا باعث بنتی ہے) [2]

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ برزخ میں جزاء وسزا فقط شہیدوں اور آل فرعون تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ باقی سب لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔

قبض روح

چوتھی آیت میں (اور اس سے ملتی جلتی دوسری آیتوں میں بھی) ایک اور اصلاح اسی بارے میں ہمیں ملتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دیجئے کہ تم پر مامور ہونے والا ملک الموت تمہاری روح لے لے گا اور پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

(قل یتوفکم ملك الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون)

یہاں ایک انتہائی لطیف اور جالب تعبیر کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر یتوفکم ہے جو توفی (بروزن ترقی) کے مادے سے ہے۔ مفردات میں راغب نے بیان کیا ہے کہ ''وافی'' دراصل کسی ایسی چیز کو کہتے ہیں جو حد کمال تک پہنچی ہو۔ لہٰذا ''توفی'' کسی چیز کو مکمل طور پر پکڑنے کے معنی میں ہے۔ یہ تعبیر واضح طور پر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ موت فنا اور نابودی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر قبض کرنے اور لے لینے کی ایک قسم ہے اور انسانی روح کی مکمل گرفت کے معنی میں ہے۔ یہ خود ایک روشن دلیل ہے کہ انسانی روح مرنے کے بعد

---

[1] مجمع البیان ج ۷، ۸ ص ۵۲۵، تفسیر فخر رازی ج ۲۷ ص ۳۷، قرطبی ج ۸ ص ۵۷۶۳، المیزان ج ۱۷ ص ۳۵۴

[2] یہ حدیث مجمع البیان میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے نقل کی گئی ہے (جلد ۷ اور ۸ صفحہ ۵۲۶)

باقی رہتی ہے۔ بڑے بڑے متعدد مفسرین اس مسئلے کی طرف متوجہ رہے ہیں اور اس پر تاکید بھی کرتے رہے ہیں کیونکہ توفی (مکمل طور پر لے لینا) کے ساتھ فنا اور نابودی کا کوئی ربط دکھائی نہیں دیتا۔

یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ یہ آیت قیامت کا انکار کرنے والوں کے جواب میں ہے۔ گذشتہ آیت میں انہی کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا جب ہم مرجائیں گے اور زمین میں گم ہوجائیں گے تو کیا پھر ہم دوبارہ خلق کئے جائیں گے؟

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ (سجدہ ۱۰)

آیت مجیدہ ان کے جواب میں گویا ہے: آپ کا وجود فقط آپ کا جسم نہیں ہے جو موت کے ساتھ ہی مکمل طور پر آپ گم ہوجائیں گے بلکہ گوہر حقیقی تو روح ہے جو خدا کے فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور روزِ قیامت آپ خدا ہی کی طرف لوٹ کر جائیں گے (اور روح کے ساتھ ساتھ آپ کا جسم بھی محشور ہوگا)، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ یہ عبارت قرآن کی متعدد آیات میں دہرائی گئی ہے اور اس پر تاکید بھی کی گئی ہے۔

آیات مجیدہ یہ پیغام دے رہی ہیں کہ موت کو مادہ پرست دنیاداروں کی نظر سے نہ دیکھو کیونکہ وہ تو اسے انسان کی نابودی اور زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں۔ ان کی تو پکار ہے "ان ھی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا"، جب کہ موت تو حیاتِ ادنی اور پست ترین زندگی سے حیاتِ اعلیٰ اور بہترین زندگی کی طرف منتقل ہونے کے معنی میں ہے اور وہ بھی ان خدائی فرشتوں کے ذریعے کہ جو اس منتقلی کا وسیلہ بنتے ہیں۔

بعض مقامات پر اس توفی (لینا) کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے: "اللہ یتوفی الا نفس حین موتھا" "خدا موت کے وقت جانوں (ارواح) کو لے لیتا ہے۔" (زمر ۴۲)

ایک دوسری جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے: ولکن اعبد اللہ الذی یتوفکم (لیکن میں اس خدا کی پرستش کرتا ہوں جو موت کے وقت آپ کی روح قبض کرتا ہے)۔ (یونس ۱۰۴)

البتہ قرآن مجید میں ذکر ہونے والی ان تینوں عبارتوں (خدا آپ کی جانیں قبض کرتا ہے، ملک الموت روح لیتا ہے اور فرشتے روحیں قبض کرتے ہیں) میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ سب اس کے فرمانبردار ہیں۔ لہٰذا حقیقی فاعل اسی کی ذاتِ اقدس ہے۔ اسی طرح روحیں قبض کرنے والے فرشتوں کا ایک سردار ہے جسے ملک الموت کہا جاتا ہے۔ ارواح قبض کرنے والے باقی فرشتوں کو وہی مامور کرتا ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں یہی مطلب کچھ اضافے کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں انسانی نیند کا موت کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے اور توفی کا کلمہ ہر دو جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا موت کے وقت جانیں (ارواح) قبض کر لیتا ہے اور وہ جانیں جو ابھی نہیں مریں انہیں بھی حالت نیند میں لے لیتا ہے۔

اللہ یتوفی الا نفس حین موتھا و التی لم تمت فی منامھا"

پھر جن کی موت کا حکم صادر ہو چکا ہو نہیں روک لیا جاتا ہے اور باقیوں کو (جن کی موت کا حکم ابھی صادر نہیں ہوا) ایک معین مدت تک

کے لیے واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

(فیمسك التی قضی علیها الموت و یرسلك الا خری الی اجل مسمی)

جولوگ غور وفکر کرتے ہیں ان کے لیے اس مسئلہ میں واضح آیات اور روشن نشانیاں ہیں۔

(ان فی ذلك لایت لقوم یتفکرون)

"انفس" نفس کی جمع اور جان کے معنی میں ہے اور یہاں جان سے مراد وہی انسانی روح ہے متذکرہ بالا آیت سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں حالتوں میں انسان کی روح لے لی جاتی ہے یعنی موت کے وقت اور حالت نیند میں۔ البتہ اس میں فرق یہ ہے کہ نیند کی حالت میں مکمل توفی نہیں ہے، روح دوبارہ بدن میں لوٹا دی جاتی ہے لیکن موت کی صورت میں واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ (بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سوئے سوئے مرجاتے ہیں اور پھر کبھی بیدار نہیں ہوتے۔ ان کے بارے میں ہم پہلے والی آیت میں اشارہ کر چکے ہیں)۔

بعض مفسرین کا قول ہے کہ "روح کی تین حالتیں ہیں۔ کبھی یہ ظاہر و باطن دونوں پر محیط ہے، کبھی فقط ظاہر پر حکم فرما ہے اور گاہ بگاہ ظاہر و باطن دونوں سے اپنا بور یا بستر گول کر جاتی ہے۔

پہلی حالت بیداری کی ہے۔ دوسری نیند کی حالتے اور تیسری حالت موت ہے۔[1] مزید وضاحت کے لیے اس حقیقت پر توجہ رہے کہ انسانی زندگی تین طرح کی ہے۔ "نباتاتی زندگی" جس کی بنیاد پر بدن کے خلیے تغدیے، رشد، نمو اور تولید مثل کرتے ہیں (جیسے تمام نباتات)۔

"حیوانی زندگی" جس میں حس اور حرکت بھی شامل ہے خواہ حرکات غیر اختیاری ہوں، جیسے نبض چلنا یا دل دھڑکنا، یا اختیاری، جیسے کسی جاندار کا چلنا اور ہاتھ پاؤں ہلانا۔

"انسانی زندگی" انسان کے اعلیٰ ترین ادراکات، فیصلے، ارادے، مختلف مسائل کے تجزیہ و تحلیل، ایجاد، دریافت، احساس ذمہ داری اور مسئولیت سے مربوط ہے۔

یہ بات قطعی ہے کہ حالت نیند میں پہلی اور دوسری قسم انسان سے نہیں لی جاتی۔ فقط تیسری قسم ہے جو انسان کھو بیٹھتا ہے۔

ضمناً اس آیت سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نیند موت ہی کی ایک ناقص شکل ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہ موت نیند کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ مزید آیت مجیدہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جسم و روح سے مرکب ہے۔ جسم عالم مادہ سے ہے اور روح ایک ایسا گوہر ہے جو اس عنصری مادی جہان سے ماوراء ہے۔

اسی طرح خوابوں کے وہ معمے اور تازہ بہ تازہ حقائق جو انسان اس حالت میں درک کرتا ہے کسی حد تک حل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ نیند کے وقت انسانی روح جدا ہو جاتی ہے اور آزادانہ فعالیت کر سکتی ہے اسی لیے نئے نئے عوالم سے آگاہ ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر ج ۲۶ ص ۲۸۴

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے:

ان الروح یخرج عند النوم، و یبقی شعاعة فی الجسد فلذلك یری الرؤیا، فاذا انتبه عاد روحه الی جسده باسرع من لحظة

''روح نیند کے وقت بدن سے خارج ہو جاتی ہے اور اس کی شعاع بدن میں باقی رہتی ہے۔ اسی لیے انسان خواب دیکھتا ہے اور جب بیدار ہوتا ہے تو روح پلک جھپکنے میں واپس لوٹ آتی ہے۔''[1]

بہرحال ان آیات کی بقائے روح کے علاوہ کوئی اور تفسیر نہیں بنتی کیونکہ موت کے وقت کسی چیز کا اخذ کرنا اور وہ بھی مکمل طور پر اس کا کوئی جسمانی مصداق نہیں بنتا۔ نباتاتی اور حیوانی زندگی تو موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے لہٰذا یہ توفی کا مصداق نہیں بن سکتی۔ بنابرایں ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ توفی (مکمل طور پر لے لینا) سے مراد روح انسانی ہی ہے جو انسانی زندگی کا حقیقی عامل ہے۔

چند وضاحتیں

۱۔ بقائے روح

بقائے روح کے مسئلے کا روح کی اصالت اور ثبات کے مسئلے کے ساتھ نزدیکی رابطہ ہے کیونکہ اگر روح مستقل ہو تو ہی موت کے بعد باقی رہ سکتی ہے لیکن اگر مادے اور اس کے خواص کے تابع ہو تو اس صورت میں مادی جسم کے نابود ہونے کے ساتھ ساتھ روح بھی نابود ہو جائے گی۔

لہٰذا ہر چیز سے پہلے ہمیں اس اصل کو دیکھنا ہے کہ آیا انسانی روح ایک مستقل گوہر ہے یا پھر جسم کے فزیکل اور کیمیکل خواص اور دماغی خلیوں سے متعلق کوئی چیز ہے جو دماغ کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی نابود ہو جاتی ہے، ہو بہو نباتاتی اور حیوانی روح کی طرح کہ جو نمو، تغذیہ، تولید مثل، حس اور حرکت کا مجموعہ ہے اور یہ بات واضح ہے کہ جسم کے خاتمے کے ساتھ ہی تغذیہ باقی رہتا ہے نہ نمو تولید مثل اور نہ ہی حس و حرکت (دقت نظر فرمائیں)

لیکن ہمارے پاس ایسے متعدد دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی روح نباتاتی اور حیوانی روح کے ساتھ کسی قسم کی شباہت نہیں رکھتی بلکہ یہ ایک مستقل حقیقت ہے جو کبھی اس مادی بدن کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتی ہے اور کبھی اس سے جدا ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے ہم روح کی اصالت اور استقلال کو ثابت کرنے کے لیے الٰہیات کے فلاسفہ کے عقلی دلائل بیان کریں گے۔ اس کے بعد منکرین یعنی مادیوں کے دلائل بیان کر کے ان پر ایک تنقیدی اور تحقیقی نگاہ ڈالیں گے۔

---

[1] روح البیان ج ۸ ص ۱۱۵

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ فقط بقائے روح کو ثابت کرنے سے معاد کی بحث میں ہمارا پورا مقصد بیان نہیں ہوتا (کیونکہ قیامت کا ایک بڑا حصہ جسمانی پہلو کا حامل ہے) لیکن پھر بھی ہمارا کم از کم آدھا راستہ ہموار ہو جاتا ہے اور منکرین کی وجاہت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

۲۔ کیا روح مستقل ہے؟

جہاں تک انسانی علم و دانش کی تاریخ کی رسائی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ روح، اس کا ڈھانچہ اور اس کی خصوصیات ہمیشہ دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں اور ہر دانشور نے اپنی استعداد کے مطابق روح کے اسرار آمیز محیط میں گامزن رہنے کی کوشش کی ہے۔

بالکل اسی وجہ سے علماء اور دانشمندوں کی طرف سے روح کے بارے میں پیش ہونے والے نظریات بھی متعدد اور کئی انواع پر مشتمل ہیں۔

ممکن ہے ہمارا آج کا علم و دانش حتی کہ آئندہ آنے والی نسلوں کا علم و دانش اور سائنس بھی روح کے تمام رازوں کو کشف کرنے کے لیے کافی نہ ہو اگرچہ دنیا کی ہر چیز کی نسبت ہماری روح ہمارے زیادہ نزدیک ہے۔ لیکن چونکہ ہم مادی عالم سے زیادہ مانوس ہیں اور روح کا گوہر اس سے بالکل مختلف ہے اس لیے ہمیں اس بات سے کوئی زیادہ تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر ہم ماورائے مادہ مخلوق اور اس عجیب ترین خلقت کے اسرار و رموز اور اس کی گہرائیوں کو نہ سمجھ پائیں۔

بہرحال یہ مطلب عقلی طور پر روح پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا اور نہ ہی روح پر حاکم کلی اصول اور نظاموں کو سمجھنے میں مانع ہے۔

وہ اہم ترین اصل جس کا یہاں جاننا ضروری ہے روح کے استقلال اور اصالت کا مسئلہ ہے ان مادی مکاتب کے مقابلے میں جو روح کو مادی جانتے ہیں اور اسے مادے کی خصوصیات اور عصبی خلیوں کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے۔

یہاں ہم زیادہ تر اسی بحث کو بیان کریں گے کیونکہ بقائے روح کی بحث اور تجرد کامل یا تجرد برزخی کا مسئلہ بھی اسی پر منحصر ہے۔

لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس نکتے کا ذکر کر دیا جائے جیسا کہ بعض کا خیال ہے روح اور انسانی بدن کا تعلق ایک قسم کا حلول ہے (البتہ ایسا نہیں جیسے ہوا مشک میں داخل ہو جاتی ہے) بلکہ ایک طرح کا ایسا رابطہ اور پیوند ہے جس کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ روح بدن پر حاکم ہے اور اس پر مکمل تصرف اور اختیار رکھتی ہے۔ اسی مطلب کو بعض نے لفظ اور معنی کے تعلق سے تشبیہ دی ہے۔

البتہ یہ مسئلہ استقلال روح کی بحث میں مزید روشن ہو جائے گا۔

اب ہم اصل مطلب کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ انسان اور بے روح پتھر و لکڑی میں بہت فرق ہے۔ ہم اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ بے جان موجودات حتی کہ نباتات کے ساتھ بھی ہمارا بہت فرق ہے۔ ہم سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، سوچ بچار کرتے ہیں، فیصلے کرتے ہیں، قوت ارادہ

سے مالا مال ہیں۔عشق ومحبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں،اظہارنفرت بھی کرتے ہیں اور.....

لیکن نباتات اور جمادات میں ان احساسات میں سے کوئی چیز بھی نہیں پائی جاتی۔لہٰذا ہمارے اور ان کے درمیان ایک اصولی تفاوت موجود ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے روح انسانی کہا جاتا ہے۔

روح اور نفس کے اصل وجود کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا حتی کہ مادیت والے بھی اس کے منکر نہیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ سب روح شناسی (علم نفسیات)[1] اور نفسیاتی تجزیات[2] کو ایک مفید علم سمجھتے ہیں۔اگرچہ یہ دونوں علم مختلف حوالوں سے تقریبا اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا ایسے علوم میں شمار ہوتا ہے جن پر دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور محققین کام کر رہے ہیں۔آئندہ بحث میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ روح اور نفس ایک دوسرے سے جدا حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی واقعیت کے مختلف مراحل ہیں۔

جب جسم کے ساتھ روح کے رابطے کی بات ہوئی ہے اور ان کے ایک دوسرے پر اثرات مرتب کرنے کا ذکر آتا ہے تو اس کا نام نفس رکھا جاتا ہے اور جب جسم سے قطع نظر فقط روحانی مظاہر کی بات ہو تو یہاں روح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے اندر موجود روح اور نفس نام کی حقیقت سے کوئی بھی انکاری نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ میٹریلسٹ[3] اور میٹافزیک[4] فلاسفہ کے درمیان پائی جانے والی یہ لمبی چوڑی جنگ کس مسئلہ پر ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ الٰہی اور روحانی دانشمندوں اور میٹافزیک فلاسفہ معتقد ہیں کہ انسانی جسم کو تشکیل دینے والے مواد کے علاوہ بھی ایک اور حقیقت انسان کے اندر پوشیدہ ہے جس کی جنس تو مادہ نہیں ہے لیکن انسانی بدن براہ راست اس کے زیر اثر رہتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ روح ماورائے طبیعت ایک ایسی حقیقت ہے جس کی فعالیت اور ساخت عالم مادہ کی بناوٹ اور سرگرمیوں سے مختلف ہے۔یہ درست ہے کہ ہمیشہ عالم مادہ کے ساتھ اس کا تعلق رہتا ہے لیکن روح نہ تو مادہ ہے اور نہ ہی مادی خواص میں سے ہے!

الٰہی فلاسفہ کے مدمقابل مادی فلاسفہ صف آراء ہیں جو کہتے ہیں: مادے کے علاوہ روح نام کی کسی ایسی مستقل چیز کا وجود نہیں جو مادے سے بے نیاز ہو۔جو کچھ بھی ہے فقط یہی جسمانی مادہ ہے یا پھر اس کے کیمیائی اور طبیعی[5] آثار ہیں۔

ہم مغز اور اعصاب نامی ایک ایسے نظام کے حامل ہیں جو ہمارے بہت سارے حیاتی امور انجام دیتا ہے، بدن کے دیگر نظاموں کی طرح مادہ سے بہرہ ور ہے اور مادی قوانین ہی کے تحت اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔

---

[1] PSYCHOLOGY

[2] PSYCHO-ANALYSIS

[3] ACIDITY, MATERIALIST (مادہ پرست)

[4] METAPHYSICS مابعدالطبیعات۔(علم روح انسانی)

[5] CHEMICAL & PHYSICAL

مثال کے طور پر ہماری زبان کے نیچے خاص قسم کے غدود پائے جاتے ہیں جنہیں لعاب دہن کے غدود کہا جاتا ہے۔ یہ غدود طبیعات کے امور بھی انجام دیتے ہیں اور کیمیائی فعالیت بھی کرتے ہیں۔ جب منہ میں غذا ڈالی جاتی ہے تو یہ خود بخود کام کرنا شروع کر دیتے ہیں یعنی مکمل طور پر خودکار[1] ہوتے ہیں۔

اس قدر زیادہ اندازہ گیر ہیں کہ غذا چبانے اور نرم کرنے کے لیے جتنے پانی کی ضرورت ہو فقط اتنی ہی مقدار میں لعاب دہن کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ آبدار، خشک اور نمدار غذائیں اپنی ضرورت کے مطابق لعاب دہن سے اپنا حصہ وصول کرتی ہیں۔ تیزابی[2] مواد خصوصاً جب بہت گاڑھا ہو تو ان غدود کی فعالیت میں اضافہ ہو جاتا ہے تاکہ پانی کی زیادہ مقدار حاصل کر کے اس مواد کو بطور کافی پتلا کر دیا جائے اس لیے کہ معدہ کے کناروں کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔

جب غذا نگل لی جائے تو ان غدود کی فعالیت ختم ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان جوشاں چشموں پر ایک عجیب نظام حکم فرما ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی اس نظام کا تعادل اور حساب درہم برہم ہو جائے تو پھر یا مسلسل منہ سے رال ٹپکتی رہے گی یا زبان اور گلہ اتنا خشک ہو جائے گا کہ لقمہ بھی حلق میں پھنس کر رہ جائے۔

یہ لعاب دہن کا طبیعاتی کام ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ لعاب دہن کا اہم ترین کام کیمیائی ہے۔ مختلف قسم کے مواد غذا کے ساتھ مل جاتے ہیں اور اس طرح معدے کی زحمت کم ہو جاتی ہے۔

مادہ پرست کہتے ہیں: ہمارے اعصاب و مغز کا سلسلہ لعاب دہن کے غدود کی مانند ہے اور اسی کی طرح طبیعی اور کیمیائی فعالیت انجام دیتا ہے (اسے مجموعی طور پر (PHYSICO-CHEMICAL) کہا جاتا ہے)۔ یہی (PHYSICO-CHEMICAL) طبعی و کیمیائی فعالیت ہے جسے مظاہر روح یا روح کہا جاتا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ جب ہم سوچ رہے ہوتے ہیں تو ہمارے دماغ سے ایک خاص قسم کی برقی امواج پیدا ہوتی ہیں جنہیں مخصوص آلات کے ذریعہ کاغذ پر ثبت کر لیا جاتا ہے۔ نفسیاتی امراض کے ہسپتالوں میں خصوصی طور پر ان امواج کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور انہی امواج کے ذریعے نفسیاتی مریضوں کی بیماری کو پہچانا جاتا ہے جس کے بعد مناسب علاج معالجہ کی راہ تلاش کی جاتی ہے۔ یہ ہمارے مغز کی طبیعی (PHYSICAL) فعالیت ہے۔

علاوہ ازیں دماغی خلیے سوچ بچار کے وقت یا دیگر نفسیاتی سرگرمیوں کے دوران کیمیائی عمل و ردعمل بھی انجام دیتے ہیں۔

لہٰذا روح اور مظاہر روح ہمارے دماغی و اعصابی خلیوں کے طبعی خواص اور کیمیائی عمل و ردعمل کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

وہ اس تمام بحث سے یوں نتیجہ نکالتے ہیں:

---

[1] AUTOMATICALLY

[2] ACDITY

۱۔جیسے بدن سے پہلے لعاب دہن کے غدود کی فعالیت اور اس کے اثرات نہ تھے اور بدن کے خاتمے کے ساتھ یہ بھی ختم ہوجاتے ہیں بالکل اسی طرح ہماری روح کی فعالیت اعصابی نظام اور مغز کے وجود میں آنے سے شروع ہوتی ہے اور ان کی تباہی کے ساتھ یہ بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

۲۔چونکہ روح جسم کے خواص میں سے ہے اس لیے مادی ہے اور ماورائے طبیعت کے پہلو کی حامل نہیں۔

۳۔روح ان تمام قوانین پر مشتمل ہے جو جسم پر حکمرانی کرتے ہیں۔

۴۔روح جسم کے بغیر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی اور نہ ہی رکھ سکتی ہے۔

۳۔روح کے عدم استقلال پر مادہ پرستوں کے دلائل

مادہ پرستوں کا دعویٰ ہے کہ روح، فکر اور باقی تمام مظاہر روح یہ سب کے سب مادی ہیں، یعنی دماغی اور اعصابی خلیوں کے طبیعی اور کیمیائی خواص ہیں۔اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے چند دلائل بیان کیے ہیں جن کی طرف ہم یہاں اشارہ کررہے ہیں۔

۱۔اس بات کو بآسانی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ دماغ یا اعصابی سلسلے میں خلل واقع ہونے سے آثار روح کی بھی چھٹی ہوجاتی ہے۔[۱]

مثلاً اس بات کا تجربہ کیا گیا ہے کہ اگر کبوتر کے دماغ میں نقص ڈال دیا جائے تو وہ مرتا نہیں ہے لیکن اپنے حافظے کی بہت سی معلومات کھو بیٹھتا ہے۔اگر اس کے منہ میں دانہ ڈالا جائے تو کھالیتا ہے اور ہضم بھی کرلیتا ہے اور اگر فقط اس کے سامنے دانے ڈال دیئے جائیں تو بھوک سے مرجائے گا لیکن کھائے گا نہیں۔

اسی طرح انسانی دماغ پر لگنیوالی چوٹوں یا بعض بیماریوں کی وجہ سے مغز کے بعض حصے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور انسان اپنا حافظہ کھو دیتا ہے۔

اخبار میں تھا کہ ایک پڑھا لکھا نوجوان ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اپنا حافظہ کھو بیٹھا اور زندگی کے تمام سابقہ واقعات بھول گیا یہاں تک کہ اپنی ماں بہن کو بھی نہ پہچانتا تھا۔جب اسے اس کے گھر لے جایا گیا جہاں وہ پلا بڑھا تھا تو اس کے لیے یہ گھر بالکل ناآشنا سا تھا!

اس واقعہ سے اور اسی طرح کے دیگر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دماغی خلیوں کی فعالیت اور مظاہر روح کے درمیان ایک نزدیکی رابطہ موجود ہے۔

۲۔سوچ بچار کے وقت مغز میں مادی تبدیلیاں زیادہ رونما ہوتی ہیں۔مغز غذا بھی زیادہ حاصل کرتا ہے اور فاضل مواد بھی زیادہ چھوڑتا ہے۔حالت نیند میں جب مغز فکری کام نہیں کرتا تو غذا بھی کمتر استعمال کرتا ہے اور یہی فکری آثار کے مادی ہونے پر دلیل ہے۔[۲]

---

[۱] سائیکالوجی، ڈاکٹر ارانی ص ۲۳

[۲] بشر از نظر مادی۔وکتر ارانی ص ۲

۳۔تجربات ثابت کرتے ہیں کہ مفکرین کے دماغ کا وزن عام طور پر ایک متوسط حد سے زیادہ ہی ہوتا ہے (مردوں کے دماغ کا متوسط وزن تقریباً ۱۴۰۰ گرام اور خواتین کے دماغ کا وزن اس سے کچھ کم ہوتا ہے) یہ روح کے مادی ہونے پر ایک اور دلیل ہے۔

۴۔اگر فکری قوت اور مظاہر روح اس بات پر دلیل بنیں کہ روح ایک مستقل وجود کی حامل ہے تو پھر حیوانات میں بھی یہی بات قبول کرنا ہوگی، کیونکہ وہ بھی کسی حد تک ان ادراکات کے مالک ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان کا کہنا ہے ہم احساس کرتے ہیں کہ ہماری روح کسی مستقل وجود کی حامل نہیں ہے اور انسان شناسی سے مربوط علوم کی پیش رفت سے بھی اس واقعیت کی تائید ہوتی ہے۔

ان تمام دلائل سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسانی اور حیوانی فزیالوجی کی وسعت اور پیش رفت سے یہ حقیقت روز بروز واضح ہوتی جارہی ہے کہ دماغی خلیوں اور مظاہر روح کے درمیان بہت نزدیکی رابطہ ہے۔

دلیل کے کمزور پہلو

مادہ پرستوں نے جو ایک بڑی غلطی کی ہے وہ یہ کہ ''آلہ'' اور ''فاعل'' میں تمیز نہیں کر پاتے۔

یہ جاننے کے لیے کہ وہ آلہ اور فاعل میں کیونکر تمیز نہیں کر پائے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔(دقت نظر فرمائیے گا)

گلیلیو کے بعد آسمانوں کے مطالعات میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا ہے۔اٹلی کے گلیلیو نے ایک عینک ساز کی مدد سے چھوٹی سی دور بین بنائی اور اس کام پر بڑا خوش تھا۔راتوں کو آسمان پر موجود ستاروں کے مطالعے میں مصروف رہتا۔ایسے ایسے حیرت انگیز مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آئے کہ پہلے کبھی کسی انسان نہ دیکھے تھے۔گلیلیو سمجھ گیا کہ اس نے اہم ترین چیزیں دریافت کی ہیں۔اس دن کے بعد سے عالم بالا کے اسرار کشف کرنے کی چابی انسان کے ہاتھوں لگی۔

اس دن تک انسان ایک ایسے پرندے کی مانند تھا جسے اپنے اردگرد چند شاخوں کے علاوہ کچھ سمجھائی نہ دیتا تھا۔لیکن جونہی دوربین کو آنکھوں پر سجایا تو کائنات کے اس بزرگ ترین جنگل میں اپنے اردگرد بے شمار درختوں کا بھی مشاہدہ کرنے لگا۔

یہ مسئلہ ترقی کے زینے طے کرتا گیا یہاں تک کہ ایسی بڑی بڑی فلکیاتی دوربینیں وجود میں آئیں جن کے عدسہ کا قطر کئی میٹر پر مشتمل تھا۔ان دوربینوں کو صاف ستھری فضا میں بلند پہاڑوں پر نصب کیا گیا۔یہ آلات دوربین بعض اوقات چند منزلہ عمارت کے برابر ہوتے تھے۔ان کی مدد سے انسان نے عالم بالا کے وہ جہان دیکھے جس کے ہزارویں حصے کو بھی ان معمولی آنکھوں نے نہ دیکھا تھا۔

اب آپ اندازہ کریں۔اگر کسی دن ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایسی دوربین بننا شروع ہوجائے جس کے عدسے کا قطر سو میٹر ہو اور اس کی مشینری ایک شہر جتنی بڑی ہو تو پھر ہمارے لیے کتنی دنیائیں دریافت ہوجائیں گی!!!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دوربینیں ہم سے چھن جائیں تو یقیناً آسمانوں سے متعلق ہماری بعض معلومات اور ہمارے بعض مشاہدات میں فرق تو پڑے گا لیکن کیا دیکھنے والے حقیقتاً ہم ہیں یا دوربین ہے؟

کیا دوربین اور ٹیلیسکوپ ہمارا آلۂ کار ہے اور ہم اس کے وسیلے سے دیکھتے ہیں یا خود فاعل ہے اور حقیقت میں دیکھنے والی بھی دوربین ہی ہے؟

دماغ کے لیے مغزی خلیوں کے بغیر سوچ بچار کرنا ممکن نہیں۔اس بات سے تو کسی کو انکار نہیں ہے۔لیکن کیا دماغ روح کا آلۂ کار ہے یا خود روح ہے؟!

مختصر یہ کہ مادہ پرستوں نے جتنی بھی دلیلیں پیش کی ہیں ان سے فقط یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ادراکات اور دماغی خلیوں کے درمیان ایک رابطہ موجود ہے۔لیکن ان ادلہ میں سے کوئی ایک بھی یہ ثابت نہیں کرتی کہ دماغ ادراکات کو انجام دیتا ہے اور آلۂ کار نہیں ہے۔ (دقت نظر فرمائیں)۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر مردہ جسم کوئی بات نہیں سمجھتا تو روح کا بدن سے رابطہ منقطع ہوجانے کی وجہ سے ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ روح فنا ہوگئی ہے۔یہ اسی طرح ہے جیسے کسی بحری جہاز کا وائرلیس سسٹم خراب ہوجائے۔اب بحری، جہاز اس کا عملہ اور کپتان تو موجود ہیں لیکن ساحل پر موجود لوگ ان سے رابطہ برقرار نہیں کرسکتے کیونکہ رابطہ کرنے والا وسیلہ ختم ہوچکا ہے۔

۴۔استقلال روح کے طرفداروں کی اَدلہ

الف:(وجود سے باہر کی دنیا سے آگاہی) ''واقعیت نمائی کی خاصیت''

مادہ پرستوں سے جو سب سے پہلا سوال کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر افکار اور مظاہر روح وہی دماغ کے طبیعی اور کیمیائی خواص ہیں تو پھر دماغ، معدے، جگر اور پھیپھڑوں کے کاموں میں کوئی اصولی تفاوت تو نہ رہا کیونکہ معدے کا کام مثلاً ایک قسم کے طبیعی و کیمیائی اعمال انجام دینا ہے۔معدہ اپنی مخصوص حرکات کے ساتھ غذا کی تیزابیت خارج کرتا ہے، اسے قابل ہضم بناتا ہے اور بدن میں جذب ہونے کے قابل بناتا ہے۔اسی طرح تھوک بنانے والے غدود(SALIVARY GLANDS) کے بارے میں بھی جیسا کہ کہا جاتا ہے یہ بھی طبیعی اور کیمیائی کام کرتے ہیں۔جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ روح کا کام ان سب سے مختلف ہے۔

چونکہ دماغ ایک استثنائی حالت رکھتا ہے اس لیے ماسوائے دماغ کے بدن کے باقی تمام نظاموں کا کام تقریباً ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ان سب کا کام داخلی پہلوؤں پر مشتمل ہے جب کہ مظاہر روح کا تعلق خارجی پہلو سے ہے۔یعنی یہ مظاہر ہمیں اپنے وجود سے باہر کی دنیا سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس مطلب کی وضاحت کے لیے ہم چند نکات پیش کرتے ہیں اور قارئین کی توجہ کے طالب ہیں:

سب سے پہلے یہ کہ کیا ہمارے وجود سے باہر بھی کوئی جہان موجود ہے یا نہیں؟ یقیناً ایسا جہان موجود ہے۔''خیال پرست فلاسفہ''[1]

---

[1] IDEALIST

کہتے ہیں: خارج میں کوئی جہان موجود نہیں ہے۔ان کا کہنا ہے: ''جو کچھ بھی ہے وہ ہم ہیں اور ہمارے تصورات۔ باہر کی دنیا ایسے ہی ہے جیسے خواب میں دیکھے جانے والے مناظر ہوں۔لہٰذا یہ تصورات سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔'' یہ لوگ بھی سخت اشتباہات کے مرتکب ہوئے ہیں۔اس بات کی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ خود عمل کے وقت ''واقع پرست''[1] بن جاتے ہیں۔جو کچھ کتابوں کی دنیا میں پڑھا ہوتا ہے یا اس پر غور وفکر کیا ہوتا ہے عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں اور پھر ہر چیز کو واقعی اور حقیقی سمجھتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ کیا ہم باہر کی دنیا سے آگاہ بھی ہیں یا نہیں؟

یقیناً اس سوال کا جواب بھی ہاں میں ہے کیونکہ ہم اپنے باہر کی دنیا سے بہت زیادہ آگاہی رکھتے ہیں اور وہ تمام موجودات جو ہمارے اردگرد ہیں یا دور دراز علاقوں میں پائے جاتے ہیں، ان سب کے بارے میں ہم کافی معلومات رکھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا باہر کی دنیا ہمارے وجود کے اندر سما سکتی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا۔البتہ اس کا نقشہ اور خاکہ ہمارے پاس موجود ہے۔بنابرایں واقعیت نمائی کی خاصیت سے استفادہ کرتے ہوئے ہم اپنے وجود سے باہر کی دنیا تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

اس واقعیت نمائی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دماغ کے فقط طبیعی اور کیمیائی خواص ہیں۔یہ بات اپنی جگہ پر بجا ہے کہ یہ خواص ہمارے باہر کی دنیا کے تاثرات کی پیداوار ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں کہ یہ خواص ان تاثرات کا معلول ہیں۔لیکن یہ بالکل اس تاثیر کی مانند ہے جو غذا کی معدے پر ہوتی ہے۔کیا غذا کی معدے پر یہ تاثیر اور اس کا طبیعی و کیمیائی عمل وردعمل اس بات کا باعث بن سکتا ہے کہ معدہ مختلف غذاؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرلے؟!

خارج میں موجود چیزوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لیے ان پر ایک قسم کا احاطہ ہونا ضروری ہے اور یہ احاطہ دماغی خلیوں کا کام نہیں ہے۔دماغی خلیے خارجی چیزوں کا فقط اثر قبول کرسکتے ہیں اور یہ اثر پذیری بدن کے دیگر نظاموں کی اثر پذیری سے مختلف ہے جسے ہم سب بخوبی سمجھتے ہیں۔

اگر خارجی چیزوں کا اثر انداز ہونا اس بات کی دلیل ہو کہ ہم اپنے باہر کی دنیا سے آگاہی حاصل کرلیں تو پھر ضروری ہے کہ ہم اپنی زبان اور معدے سے بھی سمجھنا شروع کردیں جب کہ ایسا نہیں ہوتا۔خلاصہ یہ کہ ہمارے ادراکات کی استثنائی حالت اس بات پر دلیل ہے کہ اس میں کوئی اور حقیقت پوشیدہ ہے جس کا نظام طبیعی اور کیمیائی نظاموں کے قوانین سے بالکل مختلف ہے۔یعنی ہمیں قبول کرنا ہوگا کہ ہمارے اندر ایک اور گوہر موجود ہے جسے روح کہا جاتا ہے اور یہی حقائق کے ادراک کا باعث بنتا ہے۔(دقت نظر فرمائیں)

ب: شخصیت کی یکتائی

ایک اور دلیل جو استقلال روح کے لیے پیش کی جاسکتی ہے وہ دوران زندگی انسانی شخصیت کی یکتائی کا مسئلہ ہے۔

---

[1] REALIST

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ ہم اگرچہ ہر چیز کے بارے میں شک اور تذبذب کا شکار ہوں لیکن اس بارے میں ہمیں کسی قسم کا کوئی شک نہیں کہ ''ہم وجود رکھتے ہیں۔''

''میں ہوں'' اور اپنے ہونے میں مجھے کوئی شک وشبہ نہیں۔ میرا اپنے وجود کے بارے میں علم اصطلاحی طور پر علم حضوری کہلاتا ہے نہ کہ علم حصولی۔ یعنی میں اپنے سامنے حاضر ہوں اور اپنے آپ سے جدا نہیں ہوں۔

بہرحال ہماری اپنے بارے میں پہچان اور آگاہی ہماری روشن ترین معلومات میں سے ہے۔ اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ فرانس کے مشہور فلاسفر ڈیکارٹ کی وجود پر یہ معروف دلیل کہ ''میں سوچ بچار کرتا ہوں لہٰذا وجود رکھتا ہوں۔'' کچھ نادرست سی دکھائی دیتی ہے چونکہ قبل اس کے کہ وہ اپنے وجود کو ثابت کرے دو دفعہ اپنے وجود کا اعتراف کر چکا ہے۔ ایک دفعہ جب کہتا ہے ''میں'' اور دوسری دفعہ جب کہتا ہے ''کرتا ہوں''۔

یہ ''میں'' زندگی کے آغاز سے لے کر اختتام تک یعنی پوری عمر ایک ہی رہتا ہے۔ آج کا ''میں'' وہی کل والا ''میں'' یا پھر بیس سال پہلے والا ''میں'' ہوتا ہے۔ ''میں بچپن سے لے کر آج تک ایک ہی شخص ہوں''۔ میں وہی شخص ہوں جو پہلے تھا اور آخری عمر تک بھی یہی رہوں گا۔ ایسا نہیں کہ کسی اور شخص کا روپ دھار لوں۔ البتہ یہ ہے کہ میں نے درس پڑھا اور تعلیم یافتہ ہو گیا۔ ترقی وکمال کا ایک زینہ طے کر لیا اور مزید بھی کرتا رہوں گا۔ لیکن اس سے میں کوئی اور نیا آدمی نہیں بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام لوگ مجھے پوری زندگی ایک ہی شخص کے عنوان سے جانتے ہیں۔ میرا ایک نام ہے، ایک شناختی کارڈ ہے اور.....۔

آیئے اب اندازہ کریں اور دیکھیں کہ یہ ایک وجود جو ہماری پوری زندگی پر محیط ہے: یہ کیا ہے؟ کیا یہ ہمارے بدن کے ذرات اور خلیے ہیں یا دماغ کے خلیوں کا مجموعہ اور اس کا عمل وردعمل ہے؟ یہ تو ہماری زندگی میں کئی مرتبہ تبدیل ہوتے ہیں۔ تقریباً سات سال میں ایک دفعہ تمام خلیے تبدیل ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر صبح وشام ہمارے جسم میں لاکھوں خلیے مرتے ہیں اور لاکھوں نئے ان کی جگہ لے لیتے ہیں بالکل اس عمارت کی طرح کہ جس میں سے ایک ایک کر کے اینٹیں نکالی جائیں اور نئی اینٹیں اس کی جگہ لگاتے ہیں۔ اس طرح یہ عمارت کچھ ہی عرصہ بعد مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گی اگرچہ عام لوگوں کو پتہ بھی نہ چلے۔ یا ایک بڑے تالاب کی مثال لیں جس کے ایک طرف سے آہستہ آہستہ پانی نکالتے جائیں اور دوسری طرف سے ڈالتے جائیں۔ واضح ہے کہ کچھ ہی دیر بعد تالاب کا پورا پانی بدل جائے گا اگرچہ ظاہراً دیکھنے والے لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چلے گا اور وہ اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہوں گے، بلکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ پانی پہلے والا ہی ہے۔

بطور کلی کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ وجود جو غذا حاصل کرتا ہے اور اسے استعمال کرتا ہے تدریجاً اس میں نوسازی کے مراحل طے ہوتے ہیں اور وہ تبدیل ہو جاتا ہے۔

بنابرایں ایک ستر سالہ آدمی کے اجزائے بدن تقریباً دس مرتبہ تبدیل ہوتے ہیں۔ اس حساب وکتاب کی بناء پر اگر انسان کو مادہ پرستوں کی طرح فقط یہی جسم اور دماغی واعصابی نظاموں کا مجموعہ یا طبیعی وکیمیائی خواص کا پیکر سمجھا جائے تو پھر اس ''میں'' کو ستر سال میں دس دفعہ تبدیل ہونا چاہیے اور ہو بہو وہ پہلے والا شخص باقی نہیں رہنا چاہیے جب کہ کوئی بھی عقل منداس بات کو قبول نہ کرے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مادی اجزاء کے علاوہ ایک مستقل حقیقت پوری زندگی میں موجود رہتی ہے جو مادی اجزاء کی طرح تبدیل نہیں ہوتی۔ ہماری وجود کی اساس بھی اسی سے ہے اور ہماری شخصیت کی یکتائی کا عامل بھی یہی ہے۔

ایک اشتباہ سے پرہیز

بعض خیال کرتے ہیں کہ دماغی خلیے تبدیل نہیں ہوتے۔ ان کا کہنا ہے فزیالوجی کی کتب میں لکھا ہے کہ دماغی خلیوں کی تعداد ابتدائے عمر سے لے کر آخر تک ایک جیسی ہی رہتی ہے یعنی کمتی بڑھتی نہیں۔ فقط یہ بڑے ہوجاتے ہیں لیکن تولید مثل نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان میں نقصان ہوجائے تو اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ہمارے بدن میں ایک مستقل اکائی موجود ہے اور یہ وہی دماغی خلیے ہیں جو ہماری شخصیت کی یکتائی کے محافظ ہیں۔

لیکن یہ بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ جو لوگ یہ بات کرتے ہیں انہوں نے دو مختلف مسئلوں کو غلطی سے ایک دوسرے میں گڈ مڈ کر دیا ہے۔ آج کے علوم نے جو بات ثابت کی ہے وہ یہ ہے کہ دماغی خلیوں کی تعداد ساری زندگی ایک ہی رہتی ہے اور کمتی بڑھتی نہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ ان خلیوں کو تشکیل دینے والے ذرات تبدیل نہیں ہوتے کیونکہ جیسے ہم نے کہا کہ بدن کے خلیے دائماً غذا حاصل کرتے ہیں اور اپنے کہنہ ذرات کو بھی آہستہ آہستہ کھو بیٹھتے ہیں، ہو بہو پانی کے اس تالاب کی طرح کہ جس کے ایک طرف سے پانی ڈالا جا رہا ہو اور دوسری طرف سے خارج ہو رہا ہو۔ کچھ دیر بعد اس کا سب کچھ مکمل طور پر تبدیل ہوجاتا ہے اگرچہ پانی کی مقدار اپنی جگہ قائم ہے۔ اسی طرح دماغی خلیے بھی تبدیل ہوجاتے ہیں۔ [1]

ج: چھوٹے بڑے کا ایک دوسرے پر منطبق نہ ہونا

فرض کریں ہم ایک انتہائی خوبصورت اور دلکش سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ چند چھوٹی کشتیاں اور ایک بحری جہاز سمندر کی لہروں پر محو رقص ہیں۔ ایک طرف سورج غروب ہوتے ہوئے اپنی رعنائیاں بکھیر رہا ہے تو دوسری طرف ابھرتا ہوا چاند دل موہ رہا ہے۔

حسین سمندری پرندے موجوں پر اٹھتے بیٹھتے اٹھکیلیاں کر رہے ہیں اور اسی طرح سمندر کے اس پار ایک بلند قامت پہاڑ آسمان کے ساتھ بوس و کنار میں مگن ہے۔

اب کچھ لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں بند کریں اور جو کچھ دیکھا ہے اسے اپنے ذہن میں مجسم کرنے کی کوشش کریں: پہاڑ اپنی اسی عظمت کے ساتھ، دریا اپنی اسی پہناوری کے ساتھ، بحری جہاز اپنے اسی غول پیکر کے ساتھ ہمارے ذہن میں مجسم ہوجائیں گے یعنی یوں لگتا ہے جیسے ہماری روح میں یا ہماری فکر کے سامنے ایک غیر معمولی سکرین موجود ہو۔

---

[1] فزیالوجی کی کتابوں میں اس مسئلے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر کتاب کا نام ہے ہارمونز ص ۱۱ اور حیوانی فزیالوجی مصنف ڈاکٹر محمود بہزاد ص ۳۲

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اتنے بڑے منظر کی عکاسی کی جگہ کون سی ہے؟ کیا دماغ کے غیر معمولی چھوٹے خلیوں میں یہ استعداد ہے کہ وہ اتنے بڑے منظر کو اپنے اندر سمو سکیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے جسم کا کوئی ایک حصہ ایسا ہونا چاہیے جو اس جسمانی مادے سے ماوراء ہو اور اتنا وسیع ہو کہ ان تمام مناظر کو اپنے اندر سمو لے۔

پانچ سو (۵۰۰) میٹر پر محیط عمارت کا ایک نقشہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اب ہم اس نقشے کو چند میٹر پر مکمل کرنا چاہیں تو کیا یہ ممکن ہے؟

یقیناً اس سوال کا جواب منفی ہے کیونکہ ایک بڑا وجود اپنے بڑے پن کے ساتھ چھوٹے وجود پر منطبق نہیں ہوسکتا۔ منطبق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں مساوی ہوں یا پھر نقشہ چھوٹا بنوالیا جائے۔

اس صورت کے پیش نظر ہم اپنے بڑے بڑے ذہنی نقشوں کو دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیوں پر کیونکر اتار سکتے ہیں؟

ہم زمین کے چار کروڑ میٹر محیط کو اپنے ذہن میں ترسیم کر سکتے ہیں۔ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑے سورج اور اسی طرح سورج سے لاکھوں گنا بڑی کہکشاؤں کو بھی اپنی سوچوں میں مجسم کر سکتے ہیں ان نقشوں کو اگر دماغ کے ننھے منے خلیوں پر اتارنا چاہیں تو ممکن نہیں کیونکہ قانون یہ ہے کہ بڑی چیز چھوٹی چیز پر منطبق نہیں ہوسکتی۔ پس ضروری ہے کہ ہم اس جسم سے ماوراء ایک ایسے وجود کا اعتراف کریں کہ جو ان تمام بڑے بڑے نقشوں اور مناظر کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

سوال

ممکن ہے کہا جائے کہ ہمارے ذہنی نقشے مائیکرو فلم یا جغرافیائی نقشوں کی طرح ہیں جن کے کونے میں ایک کسری ہندسہ لکھا ہوتا ہے جیسے ۱/۱۰۰۰۰۰۰ یا ۱/۱۰۰۰۰۰۰۰۰ یہ ان کے چھوٹے ہونے کا سکیل ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ نقشے کو اسی نسبت کے ساتھ بڑا کریں تاکہ حقیقی نقشے تک پہنچ سکیں۔ اسی طرح اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کسی غول پیکر بحری جہاز کی تصویر اتاری جاتی ہے تو فقط بحری جہاز کی تصویر سے اس کے بڑے ہیکل کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے تصویر اتارنے سے پہلے کسی آدمی کو اس کے عرشہ پر کھڑا کر دیا جاتا ہے اور پھر ان دونوں کی اکٹھی تصویر بنائی جاتی ہے تاکہ ان دونوں کے موازنہ سے بحری جہاز کی وسعتوں اور عظمتوں کا اندازہ ہو سکے۔

ہمارے ذہنی نقشے بھی انتہائی چھوٹی تصویریں ہیں جو معین سکیل (پیمانے) کے مطابق چھوٹی کی گئی ہیں اور جب انہیں اسی نسبت کے تحت بڑا کیا جائے تو حقیقی نقشہ مل جائے گا، لہٰذا یقیناً یہ چھوٹے نقشے اور مائیکرو فلمیں ہمارے دماغی خلیوں میں سما سکتی ہیں۔ (دقت نظر فرمائیں)

پاسخ

یہاں ایک اہم ترین مسئلہ درپیش ہے، وہ یہ کہ مائیکرو فلم معمولاً پروجیکٹر کے ذریعے بڑی کی جاتی ہے اور پھر پردہ سکرین پر اسے منعکس کر دیا جاتا ہے یا جغرافیائی نقشوں کے کونے پر لکھا گیا عدد ہماری مدد کرتا ہے کہ نقشے کو اس عدد سے ضرب دے کر ایک بڑا حقیقی نقشہ اپنے ذہن

میں منعکس کرلیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پردۂ سکرین جس پر ہماری ذہنی مائیکروفلم منعکس ہووہ کہاں ہے؟

کیا یہ پردۂ سکرین وہی دماغی خلیے ہیں؟ قطعاً ایسا نہیں ہے اور وہ چھوٹا سا جغرافیائی نقشہ جسے ہم ایک بڑے عدد کے ساتھ ضرب دے کر ایک بڑے نقشے میں تبدیل کریں گے یقیناً اس کے لیے بھی کوئی جگہ درکار ہوگی۔تو کیا دماغ کے یہ چھوٹے چھوٹے خلیے اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں؟

مزید واضح الفاظ میں یوں بیان کریں کہ مائیکروفلم اور جغرافیائی نقشوں میں جو کچھ خارج میں موجود ہے وہی کچھ چھوٹے سائز میں فلم اور نقشوں میں سمو دیا گیا ہے۔لیکن ہمارے ذہنی نقشے اپنے خارجی وجود کے پورے سائز کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور یقیناً ان کے لیے ان کے سائز کے مطابق جگہ درکار ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ دماغی خلیے اس سے کہیں چھوٹے ہیں کہ ان نقشوں کو اس طرح پوری وسعت کے ساتھ منعکس کر سکیں۔

مختصر یہ کہ ہم ان ذہنی نقشوں کو اسی بڑائی کے ساتھ تصور کرتے ہیں جو خارج میں موجود ہے اور یہ اتنی بڑی تصویر چھوٹے سے خلیے میں منعکس نہیں ہوسکتی اسی لیے اسے ایک بڑی جگہ کی ضرورت ہے اور اسی سے ہم ان خلیوں سے ماوراء ایک حقیقت کے وجود کا سراغ پاتے ہیں جسے روح کہا جاتا ہے۔

د: مظاہر روح مادی کیفیات سے ہم آہنگ نہیں

استقلال روح پر اور اس کے مادی نہ ہونے پر ایک اور دلیل یہ ہے کہ مظاہر روح کے خواص اور اس کی کیفیات مادی موجودات کے خواص اور کیفیتوں سے بالکل کوئی شباہت نہیں رکھتے کیونکہ:

اولاً: موجودات کے لیے زمان لازمی ہے اور یہ تدریجی پہلو کے حامل ہیں۔

ثانیاً: وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرسودہ ہوجاتی ہیں۔

ثالثاً: انہیں متعدد اجزاء میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن ذہنی مظاہر ان خواص اور آثار کے حامل نہیں ہوتے۔مثلاً بچپن میں جو مناظر ہمارے ذہن پر نقش ہوتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرانے ہوتے ہیں نہ فرسودہ، اپنی اصل شکل میں قائم رہتے ہیں۔ممکن ہے انسانی مغز سودہ ہوجائے لیکن اس کے کہنہ و فرسودہ ہونے سے وہ خانہ فرسودہ نہیں ہوتا جس میں بیس سال پہلے ہمارے ذہن پر ایک منظر یا نقشہ ثبت ہوا تھا اور یہ ایک قسم کے ثبات کا حامل ہے جو مادے سے ماوراء جہان کی خاصیت ہے۔

ہماری روح کو نقش و نگار اور تصویر کشی کے میدان میں عجیب تخلیقی ملکہ حاصل ہے۔بغیر کسی مقدمہ کے ایک لحظے میں ہر قسم کے نقوش ذہن میں بن جاتے ہیں جیسے آسمانی کرات، کہکشائیں، زمینی و دریائی موجودات اور پہاڑ وغیرہ یہ کسی مادی موجود کی خاصیت نہیں بلکہ یہ تو ماورائے مادہ کسی موجود کی خبر دیتی ہے۔

علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ ۲ + ۲ = ۴، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہم اس معادل کے طرفین کا تجزیہ تو کر سکتے ہیں یعنی دو کے عدد کا تجزیہ کرلیں یا چار کا لیکن اس برابری کا تجزیہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ برابری کے دونصف ہیں اور ہر نصف دوسرے سے مختلف ہے، بلکہ برابری ایک ایسا مفہوم ہے جو نا قابل تجزیہ ہے، یا وجود رکھتی ہے یا وجود نہیں رکھتی۔ لیکن اسے نصف بالکل نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے ذہنی مفاہیم قابل تجزیہ نہیں ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مادی نہیں ہوتے کیونکہ اگر مادی ہوتے تو قابل تجزیہ ہوتے۔ اسی لیے ہماری روح بھی مادی نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ بھی ایسے ہی غیر مادی مفاہیم کا مرکز ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مادے سے ماوراء ہے (دقت نظر فرمائیں) [1]

۵۔ کیا روح مجرد ہے؟

کیا فقط انسانی روح مستقل ہے یعنی جسم کے نیست و نابود ہونے کے بعد روح اپنی بقاء کو جاری رکھ سکتی ہے؟ یا استقلال کے علاوہ مجردات میں سے بھی ہے یعنی زمان و مکان جیسے مادے کے عمومی خواص سے مبرا ہے؟

بعض فلاسفہ کا اصرار ہے کہ روح مجردات میں سے ہے اور کسی قسم کی مادی کیفیات اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے استقلال روح کے ضمن میں بیان ہونے والی گذشتہ ادلہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ جب کہ بعض دوسرے فلاسفہ روح کو ایک قسم کا لطیف مادہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اسے ''آدھا مجرد'' جانتے ہیں یعنی عنصری کثیف مادے سے مجرد۔

مثال کے طور پر ہمیں یقین ہے کہ نور ایک قسم کا جسم ہے، اب یہ خواہ شعاعوں کی صورت میں ایتھر (ETHER) میں موجود ہو یا پھر ذرات اور فوٹان (PHOTON)، غیر مرئی شعاعوں، کی شکل میں۔ لیکن یقیناً عام اجسام سے اس کا حساب کتاب جدا ہے وہ قوانین جو عام اجسام پر حاکم ہوتے ہیں اس پر حکم فرما نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شفاف اجسام سے عبور کر جاتا ہے۔ اس کے لیے خلاء و ملاء دونوں یکساں ہیں۔

کیا واقعی روح انسان بھی اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے یا مکمل مجرد ہے۔ لطیف و کثیف ہر دو مادوں سے ماوراء ہے، چونکہ معاد سے مربوط مباحث میں روح کے تجرد یا مادۂ لطیف ہونے کا زیادہ عمل دخل نہیں ہے۔ جو چیز اہم ہے وہ استقلال روح اور جسم کے نیست و نابود ہونے کے بعد اس کی بقاء ہی کا مسئلہ ہے۔ اب ہم اس بارے میں مزید بحث سے پرہیز کرتے ہوئے اسے فلسفیانہ بحث پر چھوڑتے ہیں۔ البتہ فقط اتنا کہتے ہیں کہ ایک مستقل روح اس عنصری جسم کے فنا ہونے کے بعد باقی رہ سکتی ہے اور فعال بھی۔ اب خواہ یہ مکمل طور پر مجرد ہو یا جسم لطیف کی حامل اور یہ بعد از مرگ کے جہان کی طرف ایک قدم ہے۔ (دقت نظر فرمائیں)

---

[1] یہ بحث تفسیر نمونہ فارسی جلد ۱۲ صفحہ ۲۵۴ تا ۲۶۹ سے لی گئی ہے۔

معادِ جسمانی

اشارہ

کیا حیات بعد از مرگ فقط روحانی پہلو کو حامل ہے، یعنی انسان مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے اس بدن سے جدا ہو جائے گا، بدن بوسیدہ ہو کر بالکل ختم ہو جائے گا اور اس دنیا کی ابدی زندگی فقط روح سے مربوط ہوگی؟

یا حیات بعد از مرگ دونوں پہلوؤں کی حامل ہے (یعنی) مادی جسم بھی واپس لوٹے گا اور روح بھی پلٹ آئے گی اور دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گے؟ یا فقط جسمانی پہلو کی حامل ہے یعنی صرف جسم واپس آئے گا اور روح تو اس جسم کے خواص و آثار سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے؟

یا پھر قیامت روحانی اور نیم جسمانی پہلو کی حامل ہے یعنی روح اور جسم دونوں پلٹ آئیں گے اور اکٹھے ہو جائیں گے لیکن یہ مادی و عنصری جسم واپس نہیں آئے گا بلکہ ایک ایسا لطیف جسم ہوگا جو اس جسم سے برتر اور اس کا ماحصل ہوگا؟

ان چار نظریات میں سے ہر ایک کے معتقدین موجود ہیں۔ لیکن قرآن مجید سے واضح طور پر جو معلوم ہوتا ہے اور سینکڑوں آیات اس پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ کہ معاد روحانی اور جسمانی ہے (اسی مادی جسم کے ساتھ)۔ چونکہ روح کی بازگشت تو دانشمندوں اور فلاسفہ کے درمیان قطعی ہے اسی لیے معادِ جسمانی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے وگرنہ مراد وہی معادِ جسمانی و روحانی ہی ہے۔

آیئے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور معادِ جسمانی پر صراحت سے دلالت کرنے والی آیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ چونکہ اس بارے میں آیات بہت زیادہ ہیں لہٰذا ہم نے نو گروہ میں ان کی دستہ بندی کی ہے اور ہر گروہ میں سے چند نمونے قارئین محترم کے پیش خدمت ہیں:

گروہِ اول

اس گروہ میں وہ آیات بیان کی گئی ہیں جن میں منکرین معاد کے ان سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ ہمیشہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا کرتے تھے کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے یا عظام رمیم (یعنی بوسیدہ ہڈیوں) کی صورت میں تبدیل ہو جائیں گے تو پھر کیسے نئی زندگی پائیں گے؟ یہ مطلب بڑی صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ خدا اس کام پر قادر ہے کہ انہی بوسیدہ ہڈیوں کو حیات نو بخش دے (جی ہاں اسی مادی و عنصری جسم کو زندہ کرے گا)۔

(۱) وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ۙ﴿۷۹﴾ (یس: ۷۸، ۷۹)

(۲) اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰي قٰدِرِيْنَ عَلٰٓي اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ (قیامة: ۳،۴)

(۳) اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ (مومنون: ۳۵، ۳۶)

(۴) وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَاٰبَاۗؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰي مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (واقعه: ۴۷ تا ۵۰)

(۵) ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ [1] (بنی اسرائیل: ۹۸)

ترجمہ

(۱) اور ہمارے بارے میں باتیں بنانے لگا اور اپنی خلقت کو بھول گیا اور کہنے لگا: جب یہ ہڈیاں سڑ گل جائیں گی تو کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا؟ کہہ دو: انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے اسے پہلی مرتبہ خلق کیا اور وہ ہر طرح کی پیدائش سے آگاہ ہے۔

(۲) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟! ہاں (ضرور کریں گے) ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پور پور درست کریں۔

(۳) کیا وہ آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ جب آپ مر کر خاک اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو دوبارہ (قبروں سے) نکلیں گے؟ ہیہات ہیہات ان وعدوں سے جو آپ سے کئے جاتے ہیں۔

(۴) اور کہتے ہیں کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟

---

[1] اگرچہ اس بارے میں قرآن مجید میں اور بھی بہت ساری آیات پائی جاتی ہیں لیکن مضامین کی ہم آہنگی کے پیش نظر فقط انہی آیات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

یا ہمارے پہلے اجداد؟ کہوا گلے اور پچھلے سب کے سب روزِ معین جمع ہوں گے۔

(۵) یہ ان کی جزاء ہے کیونکہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: جب ہم بوسیدہ ہڈیوں اور پراگندہ خاک میں تبدیل ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ ازسرنو خلق کئے جائیں گے؟

تفسیر

۱۔ بوسیدہ ہڈیاں کیسے زندہ ہوں گی؟

چونکہ متذکرہ بالا آیات دیگر بحثوں میں بھی موردِ توجہ قرار پائی ہیں اور ان کی تفسیر بیان ہو چکی ہے لہٰذا یہاں پر فقط اس بحث سے متعلق اہم نکات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

پہلی آیت میں صراحت سے ارشاد ہوتا ہے کہ وہی خدا جس نے اسے پہلی مرتبہ خلق کیا بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہونے کے بعد دوبارہ اسے زندہ کرے گا۔

یحییھا (ان بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا) معادِ جسمانی پر اس قدر صراحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے کہ اگر قرآن مجید میں فقط اس عبارت کے علاوہ اور کچھ بھی نہ ہوتا تو یہ اس مسئلے کے اثبات کے لیے کافی تھا جب کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ سینکڑوں آیات معادِ جسمانی کی خبر دیتی ہیں۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ مذکورہ آیت میں خصوصاً اسی مادی وعنصری جسم پر تاکید کی گئی ہے نہ کہ اس سے مشابہ کسی اور جسم پر اور نہ ہی کسی برزخی یا نیم مادی جسم کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں ان لوگوں کے خیال کو رد کیا گیا ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ خدا انسانی ہڈیوں کو جمع نہ کرے گا اور واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ہم نہ فقط اس امر کو انجام دیں گے بلکہ اس پر بھی قادر ہیں کہ اس کی ظریف ترین خصوصیات (جیسا کہ انگلیوں کے پوروں کی لائنیں) کو واپس پلٹا دیں اور منظم ومرتب کر دیں۔

ہر لحاظ سے معاد کے جسمانی ہونے کے بارے میں اس آیت کی صراحت قابل توجہ ہے۔

تیسری آیت میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود [1] کے بیان کو نقل کیا گیا ہے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو خطاب کر کے اس عظیم پیغمبر کی مذمت میں یوں کہا کرتے تھے: کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم دنیا سے چلے جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیوں میں تبدیل ہو جاؤ گے تو پھر

---

[1] مذکورہ آیت مجید میں اس پیغمبر اور قوم کے نام کی وضاحت نہیں کی گئی۔ بعض نے اسے قوم ثمود (قوم صالح) کہا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ قوم عاد (قوم ہود) تھی لیکن آیت مجیدہ میں بیان کی جانے والی ان کی سزا (آسمانی چنگھاڑ) قوم ثمود سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

(قبروں سے) نکالے جاؤ گے (اور لباس حیات پہنو گے)۔

هیهات کس قدر بعید ہیں یہ (جھوٹے) وعدے جو تم سے کئے جاتے ہیں: (ایعدکم انکم اذا متم و کنتم ترابا و عظاما انکم مخرجون هیهات هیهات لما توعدون)۔

ان عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے پیغمبر صالحؑ (یا ہودؑ) نے ان سے معادِ جسمانی کا وعدہ کیا تھا اور انہوں نے شدت سے اس کی مخالفت کی تھی۔ بالآخر اس تکذیب کی وجہ سے دردناک عذاب میں مبتلا ہوئے اور نابود ہو گئے (جیسا کہ انہی آیات کے ضمن میں سورۂ حج میں بھی بیان ہوا ہے۔

چوتھی آیت میں اصحاب شمال کی بات کی گئی (جن کا نامۂ اعمال ان کے جرائم کی وجہ سے ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔ قرآن ان کی مذمت کرتے ہوئے اسی معنی کو دہراتے ہوئے گویا ہے: وہ گناہانِ کبیرہ پر اصرار کرتے تھے اور معاد کا انکار کرتے ہوئے کہتے: جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہمارا دوبارہ لوٹنا ممکن ہے؟ (وکانوا یقولون أاذا متنا و کنا ترابا و عظاما ءانا لمبعوثون)۔

یہ شدید مذمت درحقیقت اس واقعیت کا دفاع ہے کہ خاک شدہ ہڈیاں دوبارہ لباس حیات پہنیں گی اور زندہ ہو جائیں گے۔

آخری پانچویں آیت میں بھی کفار کے ایک گروہ کے بارے میں صراحت سے ارشاد ہوتا ہے: یہ آتش دوزخ ان کی پاداش ہے اس لیے کہ وہ کافر ہو گئے اور کہتے ہیں: جب ہم ہڈیاں اور پراگندہ خاک ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ خلقت جدید پائیں گے؟ (ذلك جزآو هم بانهم کفروا بایتنا وقالواء اذا کنا عظاما ورفاتاءانا لمبعوثون خلقا جدیدا)

ضمناً اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ معادِ جسمانی کے منکر اہل دوزخ ہیں اور یہ عبارت بھی مدعا پر دلیل ہے۔

مجموعی طور پر متذکرہ بالا آیات سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہی مادی جسم ختم ہونے کے بعد دوبارہ حیاتِ نو پائے گا۔

گروہ دوم

یہاں ان آیات کا ذکر ہے جو بیان کرتی ہیں کہ روزِ قیامت انسان قبروں سے اٹھیں گے۔ واضح بات ہے کہ قبور انسانی اجسام کی جگہ ہے اور یہ تعبیر بھی معادِ جسمانی پر ایک روشن دلیل ہے۔

یہ آیات بھی قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں جس میں سے چند نمونے آپ کے پیش خدمت ہیں:

(۱) وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ [1]

(حج: ۷)

---

[1] یہی مطلب سورہ انفطار آیت ۴ اور سورہ عادیات آیت ۹ میں نظر آتا ہے۔

(۲) وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ۝۵۱ [1] (یس: ۵۱)

(۳) قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ۝۵۲ (یس: ۵۲)

ترجمہ

(۱) اور قیامت کے آنے میں تو شک ہی نہیں اور خدا ان سب کو جو قبروں میں آرام کر رہے ہیں، زندہ کرے گا۔

(۲) دوبارہ صور پھونکا جائے گا اچانک وہ قبروں سے اپنے پروردگار (کی عدالت) کی طرف تیزی سے بڑھیں گے۔

(۳) وہ کہیں گے وائے ہو ہم پر! کس نے ہمیں ہمارے مرقد سے اٹھایا (جی ہاں) یہ وہی ہے جس کا خدا نے وعدہ کیا تھا اور اس کے رسولوں نے سچ کہا۔

تفسیر

۲۔ کس طرح قبروں سے اٹھیں گے؟

متذکرہ بالا آیات تین عناوین (قبروں سے خارج ہونا، اجداث اور مرقد) کے تحت بیان ہوئی ہیں اور اس سے ملتی جلتی آیات کو ملا کر مجموعاً سات آیات بنتی ہیں جو صراحت کے ساتھ معادِ جسمانی پر دلالت کرتی ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے وان الساعة اتية لاريب فيها وان الله يبعث من فى القبور (یہ اس وجہ سے ہے کہ قیامت آئے گی اور اس میں تو شک ہی نہیں اور خدا ان سب کو زندہ کرے گا جو قبروں میں آرام کر رہے ہیں)۔

یہ بات تو ان کہے معلوم ہے کہ قبروں میں جو آرام کر رہے ہیں وہ انسانی اجسام ہی ہیں اور اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ جسم مادی ہی

---

[1] معارج ۴۳ اور قمر ۷ میں بھی یہی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔

سے نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔

دوسری آیت میں قبور کی بجائے اجداث کی تعبیر دکھائی دیتی ہے۔ اجداث جدث (بروزن قفس) کی جمع ہے جس کے معنی قبر ہیں۔ بعض ارباب لغت کا کہنا ہے کہ حدث اہل تہامہ کی لغت ہے لیکن اہل نجد اس کی بجائے جدف کہتے ہیں۔

بہرحال اس تعبیر کا بھی معاد جسمانی کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں ہے کیونکہ قبر میں اجسام یا بوسیدہ ہڈیاں اور ان کی خاک موجود ہے اور روزِ قیامت ان قبور سے انسانوں کا خارج ہونا ان ابدان کے زندہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

تیسری آیت میں تعبیر سوم سے ہمارا سامنا ہوتا ہے اور وہ مردوں کے اپنے اپنے مرقد سے قیام کا مسئلہ ہے۔ کفار جب حیات نو کے بعد اپنے آپ کو ایک دوسری دنیا میں پائیں گے تو ان میں سے ایک گروہ کی فریاد بلند ہوگی: قالوا یویلنا من بعثنا من مرقدنا (کہیں گے وائے ہم پر! کس نے ہمیں ہمارے مرقد سے اٹھایا)۔

مرقد "رقود" اور "رقاد" کے مادے سے ہے جو دن یا رات میں نیند کے معنی میں ہے۔ بعض اہل لغت اسے رات کی نیند سے مخصوص جانتے ہیں اور بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اس کا اصلی معنی وہ نیند اور آرام ہے جو مشکلات میں گھیراؤ کے وقت طاری ہو (آرام بخش نیند)۔ لہٰذا یہ کلمہ شدائد اور مشکلات کے دور کرنے کی خاطر ہونے والا وقفے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بنابرایں مرقد کے معانی آرامگاہ، استراحت گاہ اور خواب گاہ ہیں اور یہ جو قبر کے بارے میں اسے استعمال کیا گیا ہے اس لئے ہے کہ میت دنیاوی گرفتاریوں اور مشکلات سے رہائی پاکر وہاں آرام بخش نیند پاتی ہے۔[1]

قبر کے بارے میں اس تعبیر کا استعمال اس وجہ سے ہے کہ موت اور نیند کی آپس میں بہت زیادہ شباہت ہے حتی کہ کہا جاتا ہے: النوم اخ الموت (نیند اور موت بھائی بھائی ہیں)۔

بعض نے کہا ہے کہ اس تعبیر کے انتخاب میں منکرین معاد کا ہدف یہ تھا کہ موت کے بعد زندہ ہونے کے مسئلے پر اپنے شک کا دوبارہ اظہار کریں کہ آیا واقعاً ہم سو رہے تھے اور بیدار ہو گئے ہیں یا مرے ہوئے تھے جو زندہ ہوئے ہیں؟

لیکن ابھی وقت نہیں گزرتا کہ خود ہی اپنے اس سوال کا جواب دیتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ هذا ماوعد الرحمن و صدق المرسلون (یہ وہی چیز ہے جس کا خداوند رحمن نے وعدہ کیا اور اس کے رسول سچ کہتے تھے)۔

قیامت کا منظر اس قدر گویا اور دہشت ناک ہے کہ ہر ضدی انسان کو حقائق کا واضح اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

وہ خدا کی (لفظ) رحمن کے ساتھ تعریف کر کے گویا یہ چاہتے ہیں کہ اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتے ہوئے رحمت الٰہی کے دامن کو تھام لیں۔ شاید اس طرح اپنے گذشتہ تاریک ادوار کی تلافی کر سکیں۔

بہرحال یہ تعبیر بھی معاد جسمانی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اگر معاد روحانی ہوتی تو آرام گاہ کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔

---

[1] مقائیس اللغۃ، صحاح اللغۃ اور التحقیق فی کلمات القرآن (مادۂ رقد)

گروہ سوم

یہاں وہ آیات پیش کی جارہی ہیں جو کہتی ہیں: انسان مٹی سے پیدا ہوا، دوبارہ مٹی میں لوٹ جائے گا اور پھر مٹی ہی سے محشور ہوگا۔

(۱) مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى ﴿۵۵﴾ (طٰہٰ: ۵۵)

(۲) وَاللّٰهُ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيۡدُكُمۡ فِيۡهَا وَيُخۡرِجُكُمۡ اِخۡرَاجًا ﴿۱۸﴾ (نوح: ۱۷، ۱۸)

(۳) قَالَ فِيۡهَا تَحۡيَوۡنَ وَفِيۡهَا تَمُوۡتُوۡنَ وَمِنۡهَا تُخۡرَجُوۡنَ ﴿۲۵﴾ (اعراف: ۲۵)

ترجمہ

(۱) ہم نے تمہیں اس (مٹی) سے خلق کیا اور اسی میں واپس لوٹائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ تمہیں باہر نکالیں گے۔

(۲) اور خدا نے تمہیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا! پھر اسی زمین میں تمہیں واپس لوٹائے گا اور دوبارہ تمہیں خارج کرے گا۔

(۳) فرمایا: تم اس (زمین) میں زندہ ہوگے اور اسی میں مروگے اور اسی سے (روزِ قیامت) باہر نکلوگے۔

تفسیر

۳۔ تم دوبارہ مٹی سے محشور ہوگے

پہلی آیت موسیٰ و فرعون کی داستان کے دوران بیان ہوئی ہے۔ لیکن بات خداوند متعال کی طرف سے کی جارہی ہے۔ زمین (ارض) جس کا گذشتہ آیات میں ذکر ہوا ہے، اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہم نے تمہیں اس سے خلق کیا اور اسی میں واپس لوٹائیں گے اور پھر دوبارہ تمہیں اسی سے باہر نکالیں گے (منها خلقنكم و فيها نعيد كم و منها نخرجكم تارة اخرى)۔

ہم سب کے وجود کی ابتداء مٹی تھی، یا ہم سب آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہیں، یا پھر وہ تمام غذائی مواد کہ جس سے ہمارا گوشت، پوست اور ہڈیاں تشکیل پاتی ہیں، مٹی سے حاصل ہوتا ہے (نباتات سے یا ان حیوانات سے جو نباتات سے غذا حاصل کرتے ہیں)۔

ہم سب کی بازگشت یقیناً مٹی میں ہوگی اور ہماری قیامت بھی مٹی ہی سے ہوگی اور یہ معادِ جسمانی کے مسئلے پر ایک روشن دلیل ہے۔

یہ عبارت ایک تو ان لوگوں کے لیے جواب ہے جو معاد کو ناممکن جانتے تھے کہ کس طرح خاک شدہ اجساد زندہ ہوں گے اور اس بات سے غافل تھے کہ ہم سب ابتداء میں مٹی ہی تھے اور دوسرا اس میں فرعون اور اس کے حواریوں جیسے تمام باغی، گردنکش اور متکبر افراد کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ جان لیں کہ ابتدا میں وہ سب خاک تھے اور پھر خاک میں واپس لوٹیں گے اور دوبارہ خاک ہی سے اٹھیں گے اور خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے۔ انسان کے لیے زندگی کے ان مراحل پر تھوڑی سی فکر ہی کافی ہے جو اس کے غرور کا خاتمہ کردے اور حق کے مقابل میں تواضع اور تسلیم کی روح اس میں زندہ کردے۔

دوسری آیت خدا کے بزرگ پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کی زبانی ہے جس میں انہوں نے انسانوں کی ان نباتات سے تشبیہ دی ہے جو زمین سے اگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: واللہ انبتکم من الارض نباتا (خدا نے نباتات کی طرح تمہیں زمین سے اگایا)۔ ثم یعیدکم فیھا (پھر تم سب کو دوبارہ زمین میں پلٹادے گا)۔ ویخرجکم اخراجا (اور بار دیگر تمہیں اسی زمین سے نکالے گا)۔[1]

انسانوں کے بارے میں انبات (اگانا) کی اصطلاح بڑی ظریف اصطلاح ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی اور گیاہی زندگی پر حاکم قوانین کی آپس میں بہت زیادہ مشابہت ہے۔ علاوہ ازیں انسانوں کے بارے میں خدا کا کام فقط ایک استاد اور معلم جیسا نہیں ہے بلکہ یہ باغبان کے کام سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو مناسب حالات میں بیج بوتا ہے اور پھر ان کی آبیاری کرتا ہے تاکہ ان میں پوشیدہ صلاحیتیں ثمر آور ہوسکیں۔

ہم جانتے ہیں کہ فقط انہی پودوں کو زندگی کا حق حاصل ہوتا ہے جو رشد اور نمو پاسکیں، جو سرسبز و شاداب ہوں، جو پھولوں اور پھلوں کو اپنے دامن میں لیے ہوں اور سایہ کی نعمت سے بہرور ہوں، وگرنہ وہ تو اس خشک لکڑی کی مانند ہوں گے جو فقط جلانے کے کام آتی ہے اور یہی حال انسان کا ہے۔

بسوزند چوب درختان بی بر
سزا خود ہمیں است مربی بری را!

(بے ثمر درختوں کی لکڑی جلتی ہے اور بے ثمری کی سزا بھی یہی ہے)۔

بہرحال یہ آیت بھی معادِ جسمانی پر روشن دلیل ہے کیونکہ ارشاد ہوتا ہے: زمین میں واپس جاؤ گے دوبارہ زمین سے خارج ہوگے، ابتداء میں مٹی تھے اور دوبارہ مٹی ہی سے اٹھو گے۔

تیسری آیت میں حضرت آدم علیہ السلام، ان کی بیوی حوا اور ان کی نسل کی زبانی بات کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خداوند تعالیٰ

---

[1] ان آیات میں قاعدتاً "انباتا" کہا جانا چاہئے تھا کہ جو فعل انبتکم کا مصدر ہے لیکن بعض مفسرین کے مطابق آیت میں ایک تقدیر ہے جو یوں ہے "انبتکم من الارض فنبتم نباتا..... یا..... انبتکم من الارض انبات النبات (تفسیر فخر رازی، ابوالفتوح رازی اور المیزان)

نے ان سے کہا آپ زمین میں زندہ ہوں گے، اسی میں مریں گے اور اسی سے (روزِ قیامت) خارج ہوگے (قال فیھا تحیون و فیھا تموتون ومنھا تخرجون)۔

"ومنھا تخرجون" (اس یعنی زمین سے خارج ہوگے) کا جملہ قرآن مجید کے مطابق معادِ جسمانی پر روشن دلیل ہے اور کسی بھی تاویل کے ذریعے اسے معاد روحانی یا نیم جسمانی پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ معادِ جسمانی کا مسئلہ خلقت آدمؑ کی ابتداء ہی سے زیر بحث تھا اور یہ صرف ظہورِ اسلام اور نزولِ قرآن کے زمانے کے ساتھ مختص نہیں ہے۔

گروہ چہارم

یہاں ان آیات کا بیان ہے جن میں انسان کی حیات مجدد کی طرف بازگشت کو زمین کی حیات بعد از مرگ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے:

(۱) وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝۹ (فاطر: ۹)

(۲) وَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝۱۱ [1] (ق: ۱۱)

ترجمہ

(۱) خدا وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا تا کہ بادلوں کو اڑائے پھریں، ہم ان بادلوں کو مردہ زمین کی طرف چلاتے اور اس کے ذریعے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتے ہیں۔ قیامت بھی اسی طرح ہے۔

(۲) اور ہم نے بارش کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کیا۔ جی ہاں! مردوں کا زندہ ہونا بھی ایسے ہی ہے۔

تفسیر

۴۔ معاد زمینوں کے زندہ ہونے کی مانند ہے

ان آیات کی تفسیر گذشتہ مباحث میں مختلف مناسبتوں کے تحت بیان ہوچکی ہے۔ اب ہم انہیں اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے بارش کے ذریعے زمین کو ملنے والی زندگی کے ساتھ قیامت کو تشبیہ دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کذلك النشور (انسانوں کا جی اٹھنا بھی

---

[1] اس بارے میں اور بھی کئی ایک آیات ہیں جن کی طرف گذشتہ بحثوں میں اشارہ ہو چکا ہے۔ مثلاً روم ۱۹، زخرف ۱۱ اور حج ۵۔

ایسے ہی ہے)۔

ایک دوسرے مورد پر فرماتا ہے: کذلك الخروج انسانوں کا (قبروں سے) باہر نکلنا بھی اسی طرح ہے۔

یہ تعبیرات اوراس سے مشابہ دوسری عبارات بھی معادِ جسمانی کی آشکار اخبر دیتی ہیں کیونکہ اگر یہ عنصری جسم لباس حیات زیب تن نہ کرتا تو زمین کی حیات بعد از مرگ کے ساتھ اس کی تشبیہ بالکل بغیر کسی مناسبت کے تھی چونکہ معادِ روحانی تو بدن کی موت کے بعد بقائے روح کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور بقائے روح کو زمین کی حیات بعد از مرگ کے ساتھ کیا شباہت؟

جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ قرآن مجید میں اور بھی آیات انہی مضامین اور عبارات کے ساتھ مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہیں جو سب کی سب معادِ جسمانی پر دلالت کرتی ہیں۔

گروہ پنجم

یہاں ان آیات کا بیان ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یا تمام پیغمبروں کے مخالفین مسئلہ معاد کے بارے میں کس قدر سخت موقف رکھتے تھے اور بعد از مرگ زندہ ہونے کے دعوے کو (نعوذ باللہ) جنون آمیز اور عجیب وغریب شمار کرتے تھے۔

اگر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معادِ روحانی کی دعوت دیتے تو یقیناً یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کیونکہ یہ جاہل اقوام خود بھی بقائے روح کا عقیدہ رکھتی تھیں اور اصولاً بقائے روح کوئی عجیب چیز نہ تھی۔

علاوہ ازیں ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاک کے اندر پراگندہ انسانی اجزاء کے اکٹھا ہونے پر متعجب تھے۔ ذیل کی آیات پر توجہ فرمائیں:

(۱) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۞ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ (سبا: ۷،۸)

(۲) اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ۞ (المومنون: ۳۸)

ترجمہ

(۱) کافروں نے کہا: کیا ہم آپ کو ایک ایسے آدمی کے بارے میں بتائیں جو خبر دیتا ہے کہ جب (مرجاؤ گے،

مٹی ہوجاؤ گے اور) ریزہ ریزہ ہوجاؤ گے تو (دوبارہ) نئی خلقت پاؤ گے! کیا وہ خدا پر جھوٹ باندھتا ہے یا کسی جنون کا شکار ہوگیا ہے؟

(۲) وہ صرف ایک جھوٹا شخص ہے جس نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور ہم اس پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔

تفسیر

۵۔ کیا ہمارا مٹی میں سے دوبارہ اٹھنا ممکن ہے؟

ان آیات کی تفسیر پہلے بھی بیان ہوچکی ہے لیکن اب ہم ان پر ایک نئے زاویے سے نگاہ ڈالیں گے۔ پہلی آیت کے مطابق رسول اکرمؐ کے ہم عصر مشرکین آپؐ کے خلاف قیام کئے ہوئے تھے اور تعجب سے کہا کرتے تھے: ایک ایسا شخص پیدا ہوا ہے جو کہتا ہے: جب تم خاک ہوجاؤ گے، ریزہ ریزہ ہوجاؤ گے تو دوبارہ نئی خلقت سے ہمکنار ہوگے۔ پھر اس بات کو علامت جنون اور خدا پر جھوٹ باندھنے کے عنوان سے مشہور کرتے تھے۔ یعنی اگر وہ عاقل ہے تو لوگوں کو غفلت میں مبتلا کرنے کے لیے خدا پر جھوٹ باندھتا ہے اور اگر عاقل نہیں ہے تو پھر ان باتوں کا سرچشمہ اس کی دیوانگی اور جنون ہے!

دوسری آیت میں قوم ثمود کے کفار اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں گویا ہیں۔ اس آیت میں بھی یہی مطلب دکھائی دیتا ہے کہ وہ حضرت صالحؑ کی طرف سے پیش ہونے والے مسئلہ معاد کے بارے میں انتہائی تعجب اور حیرت کا شکار تھے اور اسے ایک قسم کی دروغ پردازی اور خدا کے بارے میں افتراء بندی شمار کرتے تھے۔

ان سب سے پتہ چلتا ہے کہ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا حضرت صالح علیہ السلام اور دیگر تمام انبیاء معاد جسمانی ہی کی دعوت دیتے تھے وگرنہ ان کے ساتھ ہونیوالا یہ سلوک بے معنی تھا۔ معاد جسمانی کے مسئلہ پر قرآن مجید سے یہ چند مزید دلائل ہیں۔

گروہ ششم

اب ان آیات کا بیان ہے جن میں بہشت کی مختلف قسم کی مادی نعمتوں کا ذکر ہے۔ مثلاً پھل، نہریں، تخت، مختلف النوع شراب طہور، لباس، سایہ، مختلف درخت اور جسمانی لذائذ کی دیگر مختلف اقسام اور ایسی آیات بے شمار ہیں۔

یقیناً ہم ان تمام آیات کو مجازی معانی میں نہیں لے سکتے اور نہ ہی الفاظ کو بغیر کسی واضح قرینے کے حقیقی معانی سے منصرف کرسکتے ہیں۔ درست ہے کہ بہشتی پھل، شراب، لباس، برتن اور غذاء کا دنیاوی چیزوں کے ساتھ بہت زیادہ فرق ہے اور ہم اس محدود دنیا کے زندانی ہوتے ہوئے عالم آخرت کے وسیع افق کا اچھی طرح ادراک نہیں کرسکتے، لیکن جو کچھ بھی ہے بہرحال یہ نعمتیں ایسی مادی نعمتیں ہیں جو فقط معادِ جسمانی ہی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔

البتہ بہشتی نعمتیں مادی نعمتوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ مادی نعمتوں کے ساتھ ساتھ بے نظیر اور نا قابل توصیف معنوی و روحانی مواہب بھی فراوان ہیں۔لیکن یہ مادی نعمتوں کے وجود میں کوئی رکاوٹ نہیں ہیں۔

دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ معاد جسمانی پہلو بھی رکھتی اور روحانی پہلو کی بھی حامل ہے اور بہشتی نعمتیں بھی جسمانی و روحانی دونوں پہلوؤں پر محیط ہیں لہٰذا معاد کو فقط روحانی پہلو تک محدود نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان تمام روشن آیات سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔

ایسی آیات کی تعداد شائد سینکڑوں سے بھی تجاوز کرتی ہو،نمونے کے طور پر درج ذیل جو چند آیات آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں قرآن مجید کی صرف ایک سورۃ،سورۃ الرحمان، سے منتخب کی گئی ہیں۔اس مجمل سے حدیث مفصل کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں:

١۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ﴿٤٦﴾

٢۔ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۚ﴿٤٨﴾

٣۔ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ۚ﴿٥٠﴾

٤۔ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۚ﴿٥٢﴾

٥۔ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ

٦۔ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ۚ﴿٥٤﴾

٧۔ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۚ﴿٦٢﴾

٨۔ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۚ﴿٦٦﴾

٩۔ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ۚ﴿٦٨﴾

١٠۔ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ۚ﴿٧٠﴾

١١۔ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِى الْخِيَامِ ۚ﴿٧٢﴾

١٢۔ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۚ﴿٧٤﴾

١٣۔ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۚ﴿٧٦﴾

(سورۃ الرحمن، یات ٤٦ تا ٧٦)

ترجمہ

(۱)اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کے لئے بہشت کے دو باغ ہیں۔
(۲) بہشت کے وہ دو باغ مختلف النوع نعمتوں اور سرسبز درختوں سے مالا مال ہیں۔
(۳)ان میں دو چشمے ہیں جو ہمیشہ بہتے ہیں۔
(۴)ان میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں۔
(۵) یہ لوگ ان فرشتوں پر جن کے استر اطلس کے ہوں گے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔
(۶)اور دونوں باغوں کے میوے قریب (جھک رہے) ہیں۔
(۷)اور ان کے نیچے دو جنتیں اور ہیں۔
(۸)ان میں دو چشمے پھوٹ رہے ہیں۔
(۹)ان میں درخت، کھجور، انار اور بکثرت پھل پائے جاتے ہیں۔
(۱۰)اور ان بہشتی باغوں میں نیک سیرت، با اخلاق اور خوب صورت عورتیں ہیں۔
(۱۱)ایسی حوریں جو بہشتی خیموں میں مستور ہیں۔
(۱۲)ایسی عورتیں جنہیں جن وانس میں کسی نے بھی اس سے پہلے مس نہیں کیا اور
(۱۳) یہ بہشتی سبز رنگ کے بہترین اور زیباترین کپڑے سے ڈھکے ہوئے تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے۔

تفسیر

۶۔ بہشت کی مادی نعمتوں کا معاد جسمانی پر دلالت کرنا

جیسا کہ آپ نے مشاہدہ فرمایا صرف سورہ رحمن میں کہ جو قرآن مجید کی نسبتاً ایک چھوٹی سورۃ ہے بہشت کی مادی نعمتوں میں سے کم از کم بارہ قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً: بہشتی باغ، مختلف النوع اور سرسبز درخت، رنگا رنگ اور مختلف قسم کے پھل، یہاں تک کہ پھلوں کے پائے جانے کا طریقۂ کار اور ان کا تمام بہشتیوں کے لئے دستیاب ہونا، بہشتی قالین، بہشتیوں کے خوبصورت اور جاذب نظر کپڑے، بہشتی عورتیں، ہر لحاظ سے باکرہ عورتیں کہ جو یاقوت و مرجان کی طرح ہوں گی، آب جاری کے رواں چشمے، بہشتی خیموں میں مستور حوریں، زیباترین کپڑوں سے مزین تخت جن پر بہشتی ٹیک لگائے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

قرآن مجید کی باقی سورتوں میں بھی کئی ایک ایسے نمونے دکھائی دیتے ہیں (مثلاً) مختلف مضامین اور ناموں کے ساتھ بہشتی نہروں کا

ذکر، شراب طہور، رنگ برنگے برتن کہ جن میں بہشتیوں کے کھانے اور مشروب ہوں گے، بہشتی حجرے، ایک دوسرے کے سامنے لگے ہوئے تختوں پر بہشتیوں کا براجمان ہونا اور محفل انس کا تشکیل دینا (وغیرہ)

گاہ بہ گاہ بہشت کی یہ مادی نعمتیں آیات میں اس طرح سلسلہ وار بیان ہوتی ہیں کہ کسی قسم کے ابہام وشک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

سورۂ غاشیہ کی ان چھوٹی، خوبصورت اور پرمحتوی آیات کی جانب توجہ فرمائیں:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۙ﴿۸﴾

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ﴿۱۰﴾

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۚ﴿۱۲﴾

فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۙ﴿۱۳﴾

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۙ﴿۱۴﴾

وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۙ﴿۱۵﴾

وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ؕ﴿۱۶﴾ (غاشیۃ: آیات ۸ تا ۱۶)

اس دن چہرے شاداب اور تروتازہ ہوں گے۔

جنت کے عالی شان باغ میں۔

اس میں چشمے جاری ہوں گے۔

اس میں اونچے اونچے خوبصورت تخت بچھے ہوں گے۔

اوران چشموں کے کنارے جام رکھے ہوں گے۔

اور گاؤ تکیئے قطار در قطار لگے ہوں گے۔

اور نفیس مسندیں بچھی ہوں گی۔

اس سورہ کی چھبیس آیات میں سے سات آیتیں اسی معاد جسمانی اور جنت کی مختلف جسمانی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اسی ترتیب سے اگر ہم اس بارے میں قرآن کی تمام آیات کو جمع کریں تو ایک بڑی تعداد اکٹھی ہوجائے گی۔

یہاں دونکتوں کا ذکر ضروری ہے:

۱۔ یقیناً بہشتی نعمتیں مادی نعمتوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ بہشت میں روحانی ومعنوی نعمتیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں جو انشاء اللہ اپنے مقام بحث پر بیان ہوں گی۔ اصولاً یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا انسانی جسم کی تسکین کے لیے تو یہ سب طرح طرح کی نعمتیں فراہم کرے لیکن

اس کی روح کے لئے کہ جو اس کے وجود کے ایک اہم حصے کو تشکیل دیتی ہے اور ہر لحاظ سے افضل و برتر ہے، کوئی مناسب اور شائستہ مواہب اور نعمتیں فراہم نہ کرے؟

روحانی نعمتیں چونکہ وضاحت اور بیان کی حامل نہیں ہیں جب تک ان نعمتوں تک رسائی نہ ہو اور ان کا ادراک نہ کیا جائے، ان کا احساس نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے آیاتِ قرآن میں ان کے بارے میں کوئی زیادہ تشریح اور وضاحت دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ اس کے باوجود اس بارے میں ایسی مختصر، جالب اور سربستہ تعبیرات مل جاتی ہیں جو ان نعمتوں کی عظمت اور عمق کو بیان کرتی ہیں۔ اس کی تشریح ایک مستقل بحث میں پیش کی جائے گی۔

۲۔ بعض احباب بڑی جرأت اور جسارت کے ساتھ ان تمام آیات کی تاویلات اور توجیہات کرتے ہیں اور انہیں خلاف ظاہر مفاہیم پر محمول کرتے ہیں اور ان سب کو معنوی نعمتوں پر کنایہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ باب الفاظ کے جانے پہچانے قوانین ہمیں ہرگز ایسی اجازت نہیں دیتے اور اگر یہ طے کرلیا جائے کہ ہم اپنے آپ کو ایسی تاویلات اور توجیہات کی چھٹی دے دیں تو پھر ظواہر الفاظ کی حجیت کا کوئی مفہوم باقی نہ رہے گا، الفاظ مفاہیم کے انتقال کا ذریعہ نہ رہیں گے، اپنی ارزش و اصالت کو کھو بیٹھیں گے اور یہ خدا اور قرآن مجید کے خلاف جسارت ہے۔

گروہ ہفتم

اس گروہ میں ایسی آیات کا ذکر ہے جن میں روز قیامت مجرموں کو ملنیوالی سزاؤں اور ان کے کیفر کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان سزاؤں میں متعدد جسمانی پہلو کی حامل ہیں۔ اگر معاد فقط روحانی ہو تو پھر ان تمام تعبیرات کے مجازی معانی تصور کرنا پڑیں گے جب کہ اس کام کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

یہاں بھی ہم (اس بات پر) تاکید کریں گے کہ قیامت کی سزائیں دو طرح کی ہیں: روحانی عذاب اور جسمانی عذاب اور قرآن مجید میں ان دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگرچہ آیات قرآن میں زیادہ تر جسمانی عذاب ہی کو موردِ توجہ قرار دیا گیا ہے اور اس کی علت ہم گذشتہ بحث میں ذکر کرچکے ہیں۔

یہ آیات بہت زیادہ ہیں بطورِ نمونہ درج ذیل چند آیات کی طرف توجہ فرمائیں:

(۱) وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ ﴿۴۲﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ ﴿۴۴﴾ (واقعة: ۴۱ تا ۴۴)

(۲) یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ (توبة: ۳۵)

(۳) وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ۝۸۱(توبة: ۸۱)

(۴) كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ۝۱۵ (محمد: ۱۵)

(۵) يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ ۭ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ۝۴۸ (قمر: ۴۸)

(۶) تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً۝۴ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ۝۵ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ۝۶ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ۝۷ (الغاشية: ۴ تا ۷)

(۷) اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ۝۴۳ طَعَامُ الْاَثِيْمِ۝۴۴ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ۝۴۵ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ۝۴۶ (دخان: ۴۳ تا ۴۶)

ترجمہ

(۱) بائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والے کیا (مصیبت میں) ہیں۔ (دوزخ کی) آگ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہے اور نہ خوش آیند۔

(۲) جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔

(۳).....اور کہنے لگے (اس) گرمی میں (گھر سے) نہ نکلو (اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ جہنم کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔

(۴) (بھلا یہ لوگ) ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو وہ آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

(۵) اس روز یہ لوگ اپنے اپنے منہ کے بل جہنم کی آگ میں گھسیٹے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) اب جہنم کی آگ کا مزہ چکھو۔

(۶) دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ انہیں ایک کھولتے ہوئے چشمہ کا پانی پلایا جائے گا۔ خاردار جھاڑی کے سوا ان کے لیے کوئی کھانا نہیں جو نہ موٹائی پیدا کرے نہ بھوک میں کچھ کام آئے۔

(۷) تھوہڑ کا درخت ضرور ان کا کھانا ہوگا، جیسے پگھلا ہوا تانبا، وہ پیٹوں میں اس طرح ابال کھائے گا جیسے کھولتا

ہوا پانی ابال کھاتا ہے۔

تفسیر

۷۔دوزخ کی مادی سزائیں

زیر بحث ان آیات کی تفسیر کا ملا روشن ہے اور زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے چونکہ ان آیات میں آتش دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے، ایسی آگ کہ جس میں مجرموں کو اوندھے منہ کھینچا جائے گا، ایسی آگ کہ جس میں ان درہم و دینار کو پگھلایا جائے گا جو خزانوں کی صورت میں جمع کئے گئے اور ان میں سے حقوق الٰہی ادا نہ کئے گئے اور پھر ان (پگھلے ہوئے درہم و دینار) سے ان کے مالکوں کے چہرے، پہلو اور پشت کو داغا جائے گا۔

مسموم و مہلک ہواؤں، کھولتے پانی اور جھلسا دینے والے سائے کا بیان ہے جو مجرموں کی تاک میں ہیں۔

ان چہروں کی بات کی گئی ہے جنہیں اس دن آتش جہنم میں پھینکا جائے گا اور کھولتے چشموں میں سے انہیں پلایا جائے گا اور ان کے کھانے کو ضریع (ناگوار غذا) کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

اس درخت زقوم کا ذکر ہے جو گناہگاروں کی غذا ہے۔ جام سوزان ہوں گے جو گناہگاروں کو دیئے جائیں گے۔

یہ سب اور ان سے مشابہ دوسرے موارد بھی روزِ روشن کی طرح معادِ جسمانی پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ اگر معاد فقط روحانی پہلو کی حامل ہوتی تو اس طرح کے جسمانی عذاب بے معنی دکھائی دیتے۔

گروہ ہشتم

ایسی آیات ہیں کہ جو قیامت میں انسانی بدن کے اعضاء کے بارے میں بات کرتی ہیں مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، زبان، منہ، صورت، گوشت وغیرہ اور یہ سب معادِ جسمانی پر دلالت کرتے ہیں۔

ایسی آیات قرآن مجید میں فراواں ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر ذیل میں چند آیات پیش کرتے ہیں:

(۱) اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۶۵﴾ (یس: ۶۵)

(۲) حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۲۰﴾ (حم سجدہ: ۲۰)

(۳) وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حم سجدہ: ۲۱)

(۴) فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ ۱۹ ..... وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۚ ۲۵ (حاقة: ۱۹-۲۵)

(۵) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۙ ۳۸ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ ۳۹ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ ۴۰ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ؕ ۴۱ (عبس: ۳۸ تا ۴۱)

ترجمہ

(۱) آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ گفتگو کریں گے اور ان کے پاؤں ان کاموں کی گواہی دیں گے جو وہ انجام دیتے رہے۔

(۲) یہاں تک کہ جب سب کے سب جہنم کے پاس جائیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور بدن کا گوشت ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

(۳) وہ اپنے گوشت پوست سے کہیں گے: تم نے کیوں ہمارے خلاف گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے جس خدا نے ہر موجود کو گویائی بخشی اسی نے ہمیں گویا کیا۔

(۴) جس کا نامۂ اعمال اپنے دائیں ہاتھ میں ہوگا (فخر و مباہات اور فرطِ خوشی سے) چلائے گا کہ (اے اہل محشر!) میرا نامۂ اعمال لو اور پڑھو..... لیکن جس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ہوگا، کہے گا: اے کاش مجھے میرا نامۂ اعمال ہرگز نہ دیا گیا ہوتا۔

(۵) اس دن بہت سے چہرے کشادہ و نورانی ہوں گے۔ خنداں و مسرور اور ایسے چہرے بھی ہوں گے جن پر گرد اڑی ہوگی اور سیاہی چھائی ہوگی۔

تفسیر

۸۔ایک اورزندہ دلیل۔اعضائے بدن کا گفتگو کرنا

چونکہ ان آیات کی تفسیر شاہدانِ روز قیامت اور نامۂ اعمال جیسی بحثوں میں بھی کی جائے گی لہٰذا یہاں پر ہم فقط اجمالی طور پر اشارہ کرتے ہوئے اپنے مورِدِتوجہ مطلب (کہ وہ معادِ جسمانی پر کیسے دلالت کرتے ہیں) پر بحث کریں گے مونہوں پر مہر لگنے، زبان کے وقتی طور پر بیکار ہوجانے، ہاتھ پاؤں کے گفتگو کرنے اور انسان کے انجام دیئے ہوئے اعمال پر ان کی گواہی کو پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

یقیناً یہ مسئلہ فقط معادِ جسمانی ہی کے ساتھ سازگار ہے وگرنہ معاد روحانی میں تو نہ دست و پا کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی زبان و دہان اور گفتگو کا کوئی محل ہے۔

دوسری و تیسری آیت کا بیان ہے کہ گوش وچشم یہاں تک کہ گوشت و پوست اس عظیم عدالت میں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ انجام دیتے رہے۔

البتہ ممکن ہے یہ گواہی اس طریقے سے ہو کہ خدا انہیں قدرتِ تکلم عطا کرے یا پھر زبان حال سے، کیونکہ گوش وچشم، دست و پا اور گوشت و پوست اعمال کے آثار کو اپنے اندر محفوظ کر لیتے ہیں اور اس دن کہ جو "یوم البروز" ہے یہ آثار آشکار ہوجائیں گے (اس کی تشریح انشاءاللہ گواہانِ روزِ قیامت کی بحث میں بیان ہوگی)۔

چوتھی آیت میں ایسے لوگوں کی بات کی گئی ہے کہ جن کا نامۂ اعمال (موفقیت، کامیابی اور پاکیزگی کی علامت کے طور پر) ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ فخر ومباہات اور سربلندی کے ساتھ اہل محشر کو اس کے مطالعہ کی دعوت دیں گے اور وہ لوگ کہ جنہیں ان کے برے اعمال کی علامت کے طور پر نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا ان کی چیخ وپکار بلند ہوگی کہ اے کاش ہمارا نامۂ اعمال ہمیں نہ دیا جاتا۔

یہاں پر نہ صرف مختلف اعضائے بدن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ دائیں اور بائیں ہاتھ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

پانچویں آیت میں صالحین کے درخشاں اور بدکاروں کے سیاہ وغبار آلود چہروں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی معاد کے جسمانی ہونے پر تاکید ہے۔

نمونے کے طور پر بیان کی جانے والی ان آیات کے علاوہ بھی قرآن مجید میں متعدد آیات ایسی ملتی ہیں جن میں ان طوق وزنجیر کا ذکر ہے جو انکے ہاتھ، پاؤں اور گردن میں پڑی ہوں گی۔ (سورہ ابراہیم ۴۳ اور دھر ۴)

اور ایسی آیات بھی ہیں کہ جنمیں بعض جسمانی حالتوں اور کیفیات تک کا ذکر کیا گیا ہے۔مثلاً روزِ قیامت کافروں کے حال پر مومنین کا ہنسنا۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۙ﴿۳۴﴾ (مطففین ۳۴)

وہ آیات بھی ہیں جو روزِ قیامت کو ایک ایسے دن سے یاد کرتی ہیں کہ جس دن وحشت وترس کی شدت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، گردنیں اکڑ جائیں گی، سر آسمان کی طرف کھنچ جائیں گے، یہاں تک کہ شدت رعب اور ترس سے آنکھیں پلک تک نہ جھپک پائیں گی۔

اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ (ابراھیم ۴۲ و ۴۳)

ایسے دن کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس دن ظلم شدت حسرت سے اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ لیں گے۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (فرقان ۲۷)

کیا ہم ان تمام آیات کو بغیر کسی واضح دلیل کے کنایہ ومجاز پر محمول کر کے باب الفاظ کے مسلم قواعد سے چشم پوشی کر سکتے ہیں؟

گروہ نہم

اس گروہ میں ایسی آیات کا بیان ہے کہ جس میں تمام تاریخ انبیاء کے دوران اس دنیا میں پیش آنے والے قیامت کے مختلف نمونوں کو مشخص کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کی داستان، حضرت عزیرؑ یا ارمیا پیامبر کا واقعہ، داستانِ اصحاب کہف اور بنی اسرائیل کے مقتول کا ماجرا، ان سب کی تشریح قبلاً ''معاد کے تاریخی وعینی نمونے'' کے زیر عنوان بیان ہو چکی ہے۔

یہ تمام واقعات واضح کرتے ہیں کہ معاد فقط روحانی پہلو نہیں رکھتی بلکہ اس میں جسمانی پہلو بھی کارفرما ہے۔ لوگوں کے ساتھ انبیاء کے سوال وجواب کا محور بھی یہی رہا ہے اور ان نمونوں کے پیش کرنے کا مقصد بھی معادِ جسمانی کو ثابت کرنا تھا۔

چونکہ ان آیات کو ہم پہلے بہت کھول کر بیان کر چکے ہیں لہٰذا اب ان پر مزید بحث اور تکرار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نتیجۂ بحث

معادِ جسمانی کو مختلف بیانات اور طریقوں سے بیان کرنے والے آیات کے ان نو گروہوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ قرآن مجید کی نظر میں (معادِ روحانی کے ساتھ ساتھ) معادِ جسمانی کا مسئلہ قطعی اور مسلم ہے۔ بلکہ آیات کی وضاحت وصراحت کے پیش نظر یہ کہنا چاہیے کہ معادِ جسمانی قرآن مجید کی ضروریات میں سے ہے اور جنہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے نابلد ہیں۔ اب ہم چند وضاحتوں کی طرف بڑھتے ہیں اور معادِ جسمانی کے دلائل اور اس کے مخالفین کے اعتراضات کو منطقی صورت میں بیان کر کے اس کی جانچ پرکھ کریں گے۔

چند وضاحتیں

معاد جسمانی عقل کی رو سے

کیا معاد اسی عنصری و مادی جسم کے ساتھ عقلی دلائل کے ذریعے قابل اثبات ہے یا نہیں؟ بعض معتقد ہیں کہ ہمارے پاس اس مسئلے پر کوئی خاص عقلی دلیل نہیں ہے ایسے ہی جیسے کہ اس کے انکار پر کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ بنابرایں چونکہ اس کے محال ہونے پر بھی کوئی دلیل نہیں، اس بارے میں قرآن وسنت کی گواہی کافی ہے اور کسی تاویل وتوجیہہ کی بھی ضرورت نہیں ہے [1] دوسرے الفاظ میں یہ کہ عقلی دلائل اس مسئلے کی تہہ تک پہنچنے میں ناتواں ہیں اور جب ہم اس مسئلے پر نقلی دلائل کی تاکید دیکھتے ہیں تو اسے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں۔

درحالیکہ بعض احباب معاد جسمانی کو عقلی دلائل کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسانی روح بدن کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی ہے، کمال کی منازل طے کرتی ہے اور اسی کے ساتھ متشکل ہوتی ہے۔

بنابرایں روح اور بدن کا آپس میں بہت قریبی تعلق ہے اور ان کے حالات ایک دوسرے میں منعکس ہوتے ہیں۔ جسمی تکالیف روح پر اثر انداز ہوتی ہیں اور روحی تکالیف جسم پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔ بعینہ ان کا سکون واطمینان بھی ایک دوسرے پر مکمل طور پر موثر ہوتا ہے۔

اس طرح روح اور جسم دودیرینہ دوست ہیں اور باہم نشوونما پاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ موت روح اور بدن کے رابطے کو عارضی طور پر قطع کر دیتی ہے۔ لیکن مکمل جزا وسزا پانے اور عدالت الٰہی کے اجراء کے لئے ضروری ہے کہ یہ رابطہ ایک اعلیٰ سطح پر دوبارہ برقرار ہوتا کہ روح اپنے اصلی مرکب کو دوبارہ پالے، اس کے ساتھ پرواز کرے اور اس دنیا کی مادی ومعنوی نعمتوں سے بہرہ مند ہو یا پھر اسی کی سختیوں اور عذاب کا مزہ چکھے۔

مختصر یہ کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہیں اور معادِ کامل ان دونوں کی بازگشت کے بغیر امکان پذیر نہیں ہے۔

درست ہے کہ پاداش وکیفر اور لذات والم کا مرکز روح ہی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ روح متعدد لذات وآلام کو جسم کے ذریعے حاصل کرتی ہے۔ اگر درمیان میں جسم کا واسطہ نہ ہو تو لذات وآلام کا یہ بڑا حصہ مکمل طور پر ختم ہوجائے۔

بنابرایں عقل گویا ہے کہ جس طرح یہ دونوں اس دنیا میں اکٹھے تھے اسی طرح اس عالم میں بھی انہیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیے کیونکہ یہ ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہیں۔ (دقت نظر فرمائیں)۔

---

[1] بحارالانوار میں علامہ مجلسی مرحوم فرماتے ہیں: معادِ جسمانی ایسے امور میں سے ہے کہ جس پر تمام ادیان متفق ہیں۔ اسے ضروریات دین میں سے شمار کیا جاتا ہے اور اس کا انکار کرنیوالا مسلمانوں کے زمرے میں نہیں آتا۔ اس سے متعلق آیات قرآن بہت واضح ہیں اور قابل تاویل نہیں ہیں۔ اسی طرح روایات بھی متواتر ہیں جو قابل انکار نہیں ہیں۔ (بحارالانوار ج ۷ ص ۴۷)

منکرینِ معادِ جسمانی کے شبہات

اب دیکھنا یہ ہے کہ بعض فلاسفہ وغیرہ نے کیوں اس مسئلے کا انکار کیا ہے اور کون سے عوامل اس اعتقاد کی قبولیت کا باعث بنے ہیں؟ ان کی عبارات پر ایک تحقیقی نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ درج ذیل آٹھ عوامل اس بارے میں موثر رہے ہیں:

۱۔ اعادۂ معدوم کا محال ہونا

۲۔ شبہۂ آکل و ماکول

۳۔ دورانِ زندگی موادِ جسمانی کے تبدیل ہونے کا مسئلہ

۴۔ زمین پر قلت موادِ خاکی

۵۔ کرۂ ارض پر معادِ جسمانی کی صورت میں قلت مکاں

۶۔ جسم فانی کے لیے حیات باقی کیونکر؟

۷۔ معادِ جسمانی و روحانی بیک وقت کیونکر؟

۸۔ چونکہ دورانِ زندگی جسم کئی بار تبدیل ہوتا ہے تو کیا روزِ قیامت وہ تمام جسم واپس لوٹیں گے یا ان میں سے بعض؟

اب ہم ان تمام متذکرہ بالا اعتراضات کی اصل و حقیقت کو پرکھتے ہیں۔

۱۔ اعادۂ معدوم کا محال ہونا

بعض علماء عقائد معادِ جسمانی کے مسئلے میں اعادۂ معدوم کی بحث کو گھسیٹ لائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی جسم چونکہ کلی طور پر نابود ہو جائے گا اور پھر روزِ قیامت اس کا دوبارہ پلٹنا یہ اعادۂ معدوم کے ضمن میں آتا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ اعادۂ معدوم محال ہے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ معادِ جسمانی کا مسئلہ قابل اعتراض ہے۔

لیکن تھوڑی سی دقت نظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اعادۂ معدوم اس صورت میں کہ جو قیامت میں ہے، محال نہیں ہے اور نہ ہی معاد اعادۂ معدوم کے ضمن میں آتی ہے۔

وضاحت

اعادۂ معدوم کے محال ہونے پر فلاسفہ نے متعدد دلائل پیش کیے ہیں، یہاں تک کہ وہ معتقد ہیں کہ معدوم شدہ چیز کا عالم وجود میں آنا ایسے امور میں شمار ہوتا ہے کہ جن کا محال ہونا جزء بدیہیات ہے کیونکہ کسی شے کی بازگشت اس کی تمام تر خصوصیات اور مشخصات کے ساتھ ہونا

چاہیے اور مسلما جو چیز کل تک وجود رکھتی تھی آج اس کا اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ واپس لوٹنا محال ہے کیونکہ اس کی خصوصیات میں سے ایک ''کل کے دن میں اس کے وجود کا ہونا'' ہے۔لہٰذا کس طرح ممکن ہے کہ ''کل اور آج'' یکجا ہوجائے؟ جب کہ یہ تناقض ہے۔

لیکن اگر اس خصوصیت سے صرف نظر کیا جائے تو کوئی مانع نہیں کہ ایک ایسا وجود پیدا ہوجائے کہ جو تمام پہلوؤں سے بعینہٖ پہلے وجود کی مانند ہو اور فقط زمانے کے اعتبار سے مختلف ہو۔واضح ہے کہ یہ وجود عینا وہی نہیں ہے بلکہ اس کی مثل ہے اور اس طرح اعادۂ معدوم کے محال ہونے یا نہ ہونے کا معروف نزاع ایک نزاع لفظی میں بدل جاتا ہے۔جو نہیں مانتے ان کا کہنا ہے کہ (وجود) اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ واپس نہیں لوٹتا جب کہ طرف دار کہتے ہیں کہ ماسوائے زمان کے اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ واپس لوٹ آتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معادِ جسمانی کے معتقدین میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ جسم جو دنیا میں تھا روزِ قیامت اسی زمان گذشتہ کی قید کے ساتھ واپس پلٹے گا بلکہ اس کی بازگشت سے مراد دوسرے زمانے میں ہے کہ جو ایک لحاظ سے تو بالکل وہی گذشتہ وجود ہے اور ایک لحاظ سے اس کی مانند ہے (دقت نظر فرمائیں)

علاوہ ازیں معاد کسی طور پر بھی اعادۂ معدوم نہیں ہے کیونکہ روح تو معدوم نہیں ہوتی اور من وعن باقی رہتی ہے۔جسم اگرچہ پراگندہ ومنتشر ہوکر خاک میں تبدیل ہوجاتا ہے لیکن نابود ہرگز نہیں ہوتا۔فقط اس کی ظاہری صورت جاتی رہتی ہے اور روزِ قیامت خاک کے یہی ذرات اپنی پہلے والی صورت اختیار کرلیں گے۔اگر اعادۂ معدوم کے بارے میں بات کی بھی جائے تو فقط ظاہری صورت کے بارے میں ہے کہ اسی جیسی روزِ قیامت پلٹ آئے گی۔لیکن ایک طرف روح اور دوسری طرف مادۂ جسمانی کی وحدت اس انسان کی شخصیت کی حفاظت کا سبب ہے۔اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ انسان وہی فرد ہے کیونکہ اس کی روح وہی روح ہے، مادۂ جسمانی بھی وہی ہے اور جسمانی صورت بھی اسی کے مشابہ ہے۔

سورۂ یٰس آیت ۸۱ میں ''مثل'' کی تعبیر بھی شاید اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ

''جس نے زمین وآسمان کو خلق کیا ہے آیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ اس کی مثل انسانوں کو خلق کرے؟

سورۂ نساء آیت ۵۶ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ

''جب بھی ان (دوزخیوں) کے جسم کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کی کھالوں کو بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔''

ابن ابی العوجاء نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا:

ماذنب الغير

ان دوسری جلدوں کا کیا گناہ کہ.....وہ بھی جلیں؟!

امامؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

هی هی و هی غیرها

نئی جلد وہی پہلے والی جلد ہے اور اس کے باوجود دوسری ہے۔

ابن ابی العوجا نے مزید توضیح کا تقاضا کرتے ہوئے عرض کیا: دنیاوی امور میں سے کوئی مثال بیان کیجیے۔ امامؑ نے فرمایا:

ارایت لو ان رجلا اخذ لبنة فکسر ها ثم ردها فی ملبنها، فهی هی و هی غیرها

''یہ اسی طرح ہے جیسے کسی نے کوئی اینٹ لی ہے اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا اور پھر قالب میں ڈال کر نئی اینٹ بنا لی۔ اب یہ اینٹ وہی پہلے والی اینٹ ہے اور اس کے باوجود دوسری ہے۔

اس کا مادۂ اصل تو وہی ہے لیکن ان کی صورت پہلی صورت کے مشابہ ہے۔[1]

۲۔ شبہۂ آکل و ماکول

دوسرا سوال جو اس بحث میں بیا نکیا گیا ہے، یہی شبہہ آکل و ماکول ہے جو درحقیت معاد جسمانی کی پیچیدہ ترین بحثوں میں سے ایک ہے۔

توضیح

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے جسم کے اجزاء کسی دوسرے کے بدن کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایسا خواہ براہِ راست ہو جیسا کہ قحط کے زمانے میں کوئی کسی دوسرے انسان کا گوشت کھالے یا بالواسطہ ہو کہ جب انسانی جسم خاک ہو جائے اور اس خاک کا غذائی مواد نباتات کا حصہ بن جائے اور پھر انسان ان نباتات (سبزیوں، دالوں، پھلوں وغیرہ) کو کھانے میں استعمال کرے، یا پھر حیوانات ان سے اپنی غذا حاصل کریں اور وہ حیوان انسانی غذا کے کام آئے۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ انسانی بدن کے بعض حصے ریزہ ریزہ ہو کر بخارات اور گیس میں تبدیل ہو جائیں اور سانس کے ذریعے کسی دوسرے انسان کے بدن میں داخل ہو جائیں۔

---

[1] بحارالانوار ج ۷ ص ۳۸ حدیث ۶۔ یہی مطلب ایک اور حدیث میں مختصر تفاوت کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ (بحارالانوار ج ۷ ص ۳۹ حدیث ۷)

نورالثقلین میں بھی متذکرہ بالا حدیث سورۂ نساء آیت ۵۶ کے ضمن میں ذکر ہوئی ہے۔ ج ۱ ص ۴۹۴

یہ بھی ممکن ہے کہ ایک انسان کا پورا بدن تریجاً کسی دوسرے انسان کے بدن کا حصہ بن جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح کے بدن میں پلٹنے کے وقت یہ اجزاء کس بدن کا حصہ ہوں گے؟ اگر پہلے بدن کا حصہ بنیں تو باقی ابدان ناقص رہ جائیں گے اور اگر بعد والے ابدان کا حصہ بن جائیں تو پہلے بدن کے لیے کچھ باقی نہ بچے گا۔ علاوہ ازیں ممکن ہے ان میں سے بعض اچھے لوگ ہوں اور بعض بدکار۔ بالآخران اجزاء کا کیا بنے گا؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کے واقعے (بقرہ ۲۶۰) کی شان نزول سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال معادِ جسمانی اور شبہۂ آکل و مآکول کے بارے میں تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دریا کے کنارے ایک مردار کو دیکھا کہ جس کا کچھ حصہ دریا میں تھا اور دریائی جانور اسے کھا رہے تھے اور باقی بدن خشکی پر تھا جس سے خشکی کے حیوانات کھا رہے تھے۔ اس مسئلے نے حضرت ابراہیمؑ کو سوچ میں ڈال دیا اور اسی بناء پر انہوں نے بارگاہِ خداوند میں معاد کے کسی نمونے کا تقاضا کیا۔

جواب

ان قدیمی اعتراضات کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں جن میں سے معروف ترین ''اصلی اجزا'' پر اعتقاد ہے۔ اس عقیدے کے طرف داروں کا کہنا ہے کہ انسانی بدن دو طرح کے اجزاء سے مرکب ہے: ''اصلی اور غیر اصلی اجزا''۔ اصلی اجزاء تو وہی ہیں کہ جن میں ہرگز کمی بیشی نہیں ہوتی اور غیر اصلی اجزاء وہ ہیں کہ جو ہمیشہ کم و زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔

اصلی اجزاء موت کے بعد ہمیشہ باقی رہتے ہیں اور اگر خاک بھی ہو جائیں تو وہ خاک کسی دوسرے جاندار کے بدن کا حصہ نہیں بنتی۔ روزِ قیامت یہی اجزاء اکٹھے ہو کر انسانی جسم کو تشکیل دیں گے اور پھر روح اس سے ملحق ہو جائے گی۔

بعض روایات بھی اس نظریئے کی تائید کرتی ہیں۔ روایت ہے کہ مصدق بن صدقہ عمار بن موسیٰ سے نقل کرتا ہے کہ اس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا میت کا پورا جسم بوسیدہ ہو جائے گا؟ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: جی ہاں، یہاں تک کہ اس کا گوشت اور ہڈیاں بھی باقی نہ بچیں گی ماسوائے اس خاک کے کہ جس سے وہ ابتداء میں خلق ہوا تھا:

فانها لاتبلی وتبقی فی القبر مستديرة، حتی يخلق منها كما خلق منها اول مرة۔

''وہ حصہ بوسیدہ نہ ہوگا اور قبر میں ہمیشہ باقی رہے گا یہاں تک کہ اس سے اس کی پھر ویسے ہی خلقت ہوگی جیسے پہلے ہوئی تھی۔''[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک اور مرسل روایت نقل کی گئی ہے کہ آپؑ نے بنی اسرائیل کی گائے کے ذبح سے متعلق فرمایا:

---

[1] بحارالانوار ج ۷ ص ۴۳ حدیث ۲۱

فاخذو اقطعة وهی عجب الذنب الذی منه خلق ابن ادم، وعلیه یر کب اذا ارید خلقا جدیدا فضربوه بها۔

''پس انہوں نے اس (ذبح شدہ گائے) کے ایک ٹکڑے کو لیا اور اسے مقتول پر مارا اور وہ ٹکڑا ریڑھ کی ہڈی کا آخری مہرہ تھا وہی چیز کہ جس سے فرزندان آدم بھی خلق ہوں گے اور جدید خلقت کے وقت اسی سے ترکیب پائیں گے۔''[1]

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ دوسری حدیث مرسل ہونے کی وجہ سے ضعف اور پہلی حدیث ''عمرو بن سعید'' کے اختلافی ہونے کی وجہ سے قابل بحث ہے۔

علاوہ ازیں آپ دیکھیں گے کہ یہ روایات ظاہر قرآن کے مطابق بھی درست نہیں ہیں۔ لہٰذا ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال سائنسدانوں کی موجودہ تحقیقات اس مسئلے کی نفی کرتی ہیں اور اجزائے بدن کے درمیان کوئی تفاوت روا نہیں رکھتیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ تمام اجزائے بدن خاک ہو سکتے ہیں اور طبیعی طور پر دوسرے انسانوں کے بدن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ اجزائے اصلیہ کے معتقد حضرات ریڑھ کی ہڈی کہ جسے عربی میں عجب الذنب کہتے ہیں، کو جزء اصلی جانتے ہیں اور انکے بقول وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ختم نہیں ہوتی جب کہ مشاہدات اس مطلب کی تائید نہیں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ آگ لگنے کے واقعات میں تمام بدن جل کر راکھ ہو گیا اور اس راکھ اور دوسری خاک کے درمیان کوئی فرق بھی دکھائی نہیں دیتا۔

علاوہ ازیں نظریہ فوق قرآنی آیات کے مطابق بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ عربی شخص کہ جو بوسیدہ ہڈی لے کر آیا تھا اور کہتا تھا کہ کون اسے زندہ کرے گا، قرآن اس شخص کے جواب میں کہتا ہے: ''وہی کہ جس نے ابتداء میں اسے پیدا کیا دوبارہ اس کے بدن کو لباس حیات سے ڈھانپے گا۔'' بہت بعید دکھائی دیتا ہے کہ وہ مرد عرب فقط ریڑھ کی ہڈی کو ہاتھ میں لئے ہوئے اس کے بارے میں سوال کر رہا ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں والی داستان سے بھی ظاہراً یہی پتہ چلتا ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تمام اجزاء لوٹ آئیں گے۔

بہرحال موجودہ شرائط اور قرآنی متن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس جواب پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کے اثبات کے لئے خبر واحد پر قناعت نہیں ہو سکتی۔

''شبہ آکل و ماکول'' کے جواب میں بعض دوسرے لوگوں نے ایک اور راہ اپناتے ہوئے کہا ہے کہ لازم نہیں ہے کہ جسم کے وہی سابقہ اجزاء پلٹ آئیں کیونکہ انسان کی شخصیت تو اس کی روح سے مربوط ہے اور روح کسی بھی جسم سے تعلق رکھے وہی پہلے والا انسان ہوگا۔ لہٰذا دورانِ زندگی انسانی جسم میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، اجزاء کا تبدیل ہونا اور دوسرے اجزا کا ان کی جگہ لے لینا انسانی شخصیت کو ہرگز نقصان

---

[1] بحارالانوار ج ۷ ص ۴۳ حدیث ۱۹

نہیں پہنچاتا۔

بنابرایں کوئی مانع نہیں کہ خدا ایک اور جسم خلق کرے اور روح اس سے متعلق ہو جائے اور پھر یہ روح اس جسم کے ساتھ بہشتی نعمتوں سے بہرہ ور ہو یا پھر دوزخ کے عذابمیں مبتلا ہو ہم جانتے ہیں کہ لذت وعذاب کا تعلق روح سے ہے اور جسم کا کردار ایک واسطے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

یہ جواب بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ بہت ساری آیات قرآن کے ساتھ ٹکراتا ہے جیسا کہ گذشتہ مباحث میں ہم نے بیان کیا ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ روزِ قیامت وہی بوسیدہ ہڈیاں ان قبروں سے اٹھیں گی نہ یہ کہ اللہ ایک اور جسم کو خلق کرے گا تا کہ روح اس سے وابستہ ہو سکے۔ لہٰذا مذکورہ بالا جواب بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔

شبہۂ آکل وماکول کا آخری جواب

اس سوال کے بہترین جواب کے لئے ضروری ہے کہ چند مقامات کا ذکر کیا جائے۔

۱۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے اجزائے بدن بچپن سے لے کر موت تک کئی بار تبدیل ہوتے ہیں۔ دماغی خلیات اگرچہ تعداد کے اعتبار سے کم وزیادہ نہیں ہوتے لیکن اجزاء کے اعتبار سے تبدیل ہو جاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی ان کی مکمل تبدیلی کا باعث ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سات سال کے عرصہ تک پہلے والے انسانی بدن کے ذرات میں سے کوئی ایک بھی باقی نہیں رہتا۔

لیکن اس امر کی طرف توجہ رہنا چاہیے کہ پہلے والے ذرات ختم ہوتے وقت اپنے تمام آثار وخواص نئے خلیوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی جسمانی خصوصیات رنگ، شکل، صورت اور دیگر کیفیات باقی رہتی ہیں اور ایسا فقط نئے خلیات تک انتقال صفات ہی کی وجہ سے ممکن ہے۔ (دقت نظر فرمائیں)

بنابرایں ہر انسان کے وہ آخری اجزائے بدن کہ جو مرنے کے بعد خاک میں تبدیل ہو جاتے ہیں ان تمام صفات کا مجموعہ ہوتے ہیں کہ جو وہ پوری زندگی کے دوران کسب کرتے ہیں اور یہ انسانی جسم کی ساری زندگی کی کہانی بیان کرنے والی تاریخ کا کردار ادا کرتے ہیں۔

۲۔ درست ہے کہ روح ہی انسانی شخصیت کی بنیاد فراہم کرتی ہے لیکن اس امر کی طرف بھی توجہ رہنا چاہیے کہ روح جسم کے ہمراہ پرورش اور تکامل کی منازل طے کرتی ہے اور دونوں ایک دوسرے پر موثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح دو جسم تمام جہات سے باہم ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں اسی طرح دو روحیں بھی تمام پہلوؤں کے اعتبار سے آپس میں شباہت نہ رکھتیہوں گی۔ بنابرایں کوئی بھی روح بغیر اس جسم کے کہ جس کے ساتھ اس نے پرورش پائی اور تکامل پیدا کیا مکمل اور وسیع فعالیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا روزِ قیامت اسی سابقہ جسم کو واپس پلٹنا چاہیے تا کہ روح اس سے ملحق ہو کر اپنی فعالیت کا نسبتاً ایک بڑے مرحلے میں آغاز کرے اور انجام شدہ اعمال کے نتائج سے بہرہ مند ہو سکے۔

۳۔ انسانی بدن کے ذرات میں سے ہر ایک اس کی تمام جسمی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی اگر ہم جسم کے ہر ایک سیل کی

پرورش کریں، یہاں تک کہ وہ ایک مکمل انسان کی صورت میں تبدیل ہوجائے تو یہ انسان ان تمام شخصی صفات کا حامل ہوگا کہ جس سے یہ سیل حاصل کیا گیا تھا۔ (توجہ فرمائیں)۔

کیا وہ پہلے دن ایک سیل سے زیادہ کچھ تھا؟ نطفے کا ایک سیل ہی اس کی تمام صفات کا حامل تھا اور تدریجاً تقسیم کے ذریعے دو سیلوں میں تبدیل ہوگیا اور پھر دو سے چار خلیوں میں اور اسی طرح انسانی بدن کے تمام خلیے وجود میں آگئے۔ بنابرایں انسانی بدن کے خلیوں میں سے ہر ایک پہلے والے سیل ہی کی ایک شاخ ہے کہ اگر اسی کی طرح پرورش پائے تو ہر لحاظ سے اسی سے مشابہ ایک ایسا انسان بن جائے گا جو اس کی صفات کا حامل ہو۔

۴۔ معادِ جسمانی کے بارے میں قرآنی آیات سے جو پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ آخری انسانی بدن کہ جو خاک میں تبدیل ہوگیا ہے اور قبر میں موجود ہے حکم خدا سے زندہ ہوگا اور حساب و کتاب کے لئے آمادہ ہوجائے گا۔ قرآن کی نظر میں معادِ جسمانی کے موضوع پر بیان کی جانے والی بے شمار آیات اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

۵۔ کسی ایک بدن کا دوسرے بدن میں مکمل طور پر ضم ہوجانا ممکن نہیں ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ جسم اول سارے کا سارا جسم دوم نہیں بن سکتا۔ بلکہ جسم اول جسم دوم کا فقط ایک حصہ ہی بن سکتا ہے کیونکہ جسم دوم کو قبلاً موجود ہونا چاہیے تاکہ وہ پورے بدن اول کو یا اس کے کچھ حصے کو تجزیے کے ذریعے اپنا جزء بنا سکے۔

پس کوئی ایک پورا بدن کسی دوسرے بدن کا جزء تو بن سکتا ہے لیکن اس کا ''کل'' بننا ممکن نہیں ہے۔ جیسے متعدد ابدان کا کسی دوسرے بدن کا جزء بننا تو ممکن ہے لیکن اس کے ''کل'' کو تشکیل نہیں دیتے۔ (دقت نظر فرمائیں)

متذکرہ بالا چار مقدمات کی روشنی میں اب ہم شبہہ آکل و ماکول کے اصل جواب کی طرف بڑھتے ہیں:

قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ موت کے وقت انسانی بدن کے موجود آخری ذرات ہی روزِ قیامت واپس لوٹیں گے۔ لہٰذا اگر یہ ذرات خاک ہوکر کسی دوسرے انسان کے بدن کا حصہ بن بھی جائیں تو روزِ قیامت اپنے اصلی بدن یعنی اسی پہلے والے شخص کے بدن میں واپس لوٹ آئیں گے۔ البتہ آپ یہ کہیں گے کہ اس طرح تو بدن دوم ناقص ہوجائے گا چونکہ بعض اجزاء کو جو کھو بیٹھا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ بدن دوم چھوٹا اور لاغر ہوجائے گا (ناقص ہوگا) کیونکہ بدن اول کے اجزاء بدن دوم کے کسی ایک حصے میں نہیں بلکہ پورے بدن میں منتشر اور پراگندہ ہیں (چونکہ انسان غذا بھی کھاتا ہے وہ پورے بدن میں تقسیم ہوجاتی ہے)۔ اس لئے ممکن ہے کوئی ستر کلوگرام وزن کا حامل انسان اپنا آدھا یا ماسوائے ایک کلوگرام کے باقی سارا وزن کھو بیٹھے اور اس کا بچپن جتنا یا حالت جنین جتنا چھوٹا سا بدن باقی بچے!

اس مسئلے سے کوئی نئی مشکل کھڑی نہیں ہوتی کیونکہ یہ چھوٹا بدن ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو اس بڑے بدن میں موجود تھیں اور یہ نمو کرے تو اسی بڑے بدن کی صورت میں تبدیل ہوجائے گا۔

کیا پہلے دن نوزاد بچے کا جسم چھوٹا نہ تھا اور کیا اس سے بھی پہلے دورانِ جنین میں ایک ننھا منا سا وجود نہ تھا؟ بعدازاں بڑھا پھولا اور ایک مکمل انسان کی صورت سے تبدیل ہوگیا۔ نہ اس کی شخصیت تبدیل ہوئی اور نہ ہی کوئی نیا شخص وجود میں آیا۔

فقط ایک سوال جو یہاں باقی بچتا ہے وہ یہ ہے کہ ان اجزائے خاص کا کیا بنے گا جو دو یا سے زیادہ ابدان کا حصہ بن گئے ہیں اور ان ابدان میں سے ایک تو مطیع وفرمانبردار انسان ہے جب کہ دوسرا گناہ گار؟

اس سوال کا جواب بھی مشکل نہیں ہے چونکہ جیسے پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جزاء وسزا درحقیقت روح کے لئے۔ اسی لئے جب بیہوشی کے ذریعے وقتی طور پر اس رابطے کو منقطع کر دیا جاتا ہے تو سرجن بدن کو اوزار سے چیر پھاڑ کر دیتا ہے جب کہ روح کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہ بدن اکیلا جزاوسزا، دکھ درد اور لذت حاصل نہیں کرتا بلکہ یہ تو انسانی روح کے کیفر و پاداش اور لذت والم کے لیے ایک آلہ ہے۔

متذکرہ بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ظاہر آیات کے مطابق معادِ جسمانی اسی مادی وعنصری جسم کے ساتھ ہوگی اور آکل وماکول کے مفروضے سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

اس نکتے کا ذکر بھی تاکیداً ضروری ہے کہ معاد جسمانی کا انکار کرنے والے بعض لوگ اسلامی معاشرے میں اور قرآن کی واضح آیات کے مقابلے میں اپنی بات کا بھرم قائم رکھنے کے لیے معادِ جسمانی کے بارے میں ایسی تعبیرات بیان کرتے ہیں کہ جن کی بازگشت معادِ روحانی کی طرف ہوتی ہے یا اس معادِ جسمانی کی طرف کہ جو اس مادی جسم کے بغیر ہو۔

یہ لوگ جسم کو کبھی ایک نوع سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کی شخصیت چونکہ روح سے وابستہ ہے لہٰذا یہ روح کسی بھی جسم کے ساتھ تعلق پیدا کرلے اسی شخص کی تشکیل کا باعث بنے گی اور کبھی جسم برزخی کا سہارا لیتے ہیں اور ان لطیف نورانی اجسام کے ساتھ معاد کے برپا ہونے کے قائل ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ کسی چیز کی شیئیت اور ہستی اس کے مادے کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ اس کی صورت کے ساتھ ہوتی ہے اور جب تک صورت موجود ہے اس چیز کی ہستی بھی موجود ہے اور صورت کی بقاء کا دارومدار روح انسانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ بنابرایں جہاں روح ہوگی وہاں انسان کی تمام شیئیت اور ہستی بھی ہوگی۔

ان تعبیرات میں سے کوئی ایک بھی اس قرآنی معادِ جسمانی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کہ جو گذشتہ متعدد آیات میں بیان ہوئی ہے۔ درحقیقت بعض فلاسفہ کی آراء کے ساتھ دل بستگی اور آکل وماکول کے مسئلہ کو حل نہ کرسکنا ان باتوں کی طرف میلان کا باعث بنا ہے کہ جو ایک پابند قرآن اور مسلمان عالم کے شایانِ شان نہیں ہے۔

۳۔ دورانِ زندگی موادِ جسمانی کے تبدیل ہونے کا مسئلہ

ایک اور مطلب کہ جس نے بعض اذہان کو معادِ جسمانی کے حوالے سے مشوش کر رکھا ہے وہ زمین پر مٹی کی قلت کا مسئلہ ہے۔

توضیح

پوری تاریخ میں اس کرۂ خاکی پر قدم رکھنے والے انسان اور دنیا کے خاتمے تک آنے والے تمام انسانوں کو اگر ہم ذہن میں رکھیں اور پھر سوچیں کہ وہ سب کے سب خاک ہو جائیں گے تو اس طرح خاک کی ایک عظیم مقدار وجود میں آ جائے گی جب کہ زمین پر موجود خاک کی مجموعی مقدار کے لئے مشکل ہے کہ وہ اتنی بڑی مقدار کی ضرورت کو پورا کر سکے مگر یہ کہ ہم کہیں کہ اس دن انسان انتہائی چھوٹے بونوں کی شکل میں محشور ہوں گے اور یہ بھی عجیب دکھائی دیتا ہے۔ بہر حال اس موجود مٹی سے ان سب انسانوں کے دوبارہ پیدائش ایسے ہی ہے جیسے ہم ایک ہزار ٹن لوہے سے کئی ملیون گاڑیاں بنانا چاہیں۔

جواب

کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس قسم کے اعتراضات کرنے والے احباب اپنے آپ کو کچھ زحمت دیتے اور کاغذ قلم لے کر ایک سرسری حساب کتاب کر لیتے تا کہ معلوم ہو جاتا کہ ایسے اعتراضات حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔

اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہر انسانی بدن تقریباً ۶۵ تا ۷۰ فیصد پانی پر مشتمل ہے اور خاکی مواد کی مقدار فقط ۳۰ فیصد ہے، لیکن ہم فرض کرتے ہیں کہ بدن کا تمام وزن اسی خاکی مواد ہی پر مشتمل ہے۔

آپ کے خیال میں ایک مکعب میٹر خاک کا کتنا وزن ہوگا؟

تقریباً دو سے تین ٹن تک! اور اگر ہر انسان اوسطاً ساٹھ کلوگرام کا ہو تو ایک مکعب میٹر خاک چالیس متوسط انسانوں کے لئے کافی ہے۔

اس حساب کے تحت ایک مکعب کلومیٹر کہ جو درحقیقت ایک ارب مکعب میٹر خاک بنتی ہے کرۂ زمین پر موجودہ آبادی سے آٹھ گنا زیادہ لوگوں کے لئے کافی ہوگی۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ گذشتہ ادوار میں کرۂ زمین کی آبادی آج کی نسبت بہت کم تھی اور شاید بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں اس کرۂ خاکی پر چالیس ارب لوگ بھی نہ آئے ہوں۔

اب جب کہ ایک مکعب کلومیٹر سے متعلق یہ حساب کرۂ زمین کے حجم کے مقابلے میں ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہے اور اصلا کسی کھاتے میں نہیں آتا، اب آپ سوچیں کہ اگر ایک مکعب کلومیٹر کی بجائے سو ہزار یا ایک ملین مکعب کلومیٹر کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بھی کرۂ زمین کے حجم کے مقابلے میں کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ اب اس صورت میں ایسے اعداد و شمار کے ساتھ ہمارا واسطہ پڑے گا جو ہمارے مطلب کو انتہائی آشکار کر دیتے ہیں۔

اب جب کہ آپ نے اس حساب کتاب کی زحمت فرمائی ہے تو آیئے ذرا افق زمان کی سیر و سیاحت پر نکلتے ہیں۔

آپ کے خیال میں ایک انسان کی اوسط عمر کیا ہوگی؟

یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ کتنا عرصہ لگتا ہے کہ ایک نسل مکمل طور پر ختم ہو جائے اور دوسری نسل اس کی جگہ لے لے۔

شاید اوسطاً پچاس سال یا اس سے کچھ کم وبیش۔

لہٰذا ایک مکعب کلومیٹر خاک کم از کم آٹھ نسلوں یا چار سو سال تک کا احاطہ کرسکتی ہے۔(اس صورت میں کہ اگر گذشتہ نسلوں کی آبادی کو بھی موجودہ تعداد کے برابر تصور کیا جائے کہ جو قطعاً یوں نہ تھی)۔

لہٰذا انسانی زندگی کے ایک ملین سال کے لئے فقط دو ہزار پانچ سو مکعب کلومیٹر خاک کافی ہے اور چار ملین سال کے لئے صرف دس ہزار مکعب کلومیٹر خاک کی ضرورت پڑے گی۔ جب کہ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی نظریئے کے مطابق کرۂ زمین پر حیات بشر کو چار ملین سال نہیں گزرے اور ہمیں نہیں پتہ کہ دنیا کے اختتام میں کتنی مدت باقی ہے؟

البتہ اس طرح جو بھی حساب ہو تمام تاریخ کے دوران انسانی ابدان کی خاک زمین کے فقط ایک چھوٹے سے گوشے پر مشتمل ہوگی، دس ہزار مربع کلومیٹر اور ایک کلومیٹر گہرائی پر مشتمل ایک چھوٹی سی ریاست۔

چونکہ ہمارے لئے کوئی مشکل نہ تھی لہٰذا ہم نے اس سارے حساب کتاب کو بڑے فیاضانہ انداز سے انجام دیا ہے۔ نہ تو ہم نے انسانی بدن کے پانی کا حساب کیا ہے اور نہ ہی گذشتہ نسلوں کی تعداد کو کم شمار کیا ہے کہ جو آج کی نسبت بہت قلیل تھی اور اسی طرح دنیا کے آئندہ زمانہ کے لیے بھی ایک طولانی وقت کو مدنظر رکھا ہے۔

مختصر یہ کہ کرۂ زمین کی خاک کا معاد جسمانی کے لئے کافی نہ ہونے کا دعویٰ کسی ایسے ہی شخص سے ممکن ہے کہ جو اس سادہ سے حساب کو بھی نہ جانتا ہو۔ یا پھر وہ لٹھ مار اور بغیر ناپ تول کے بات کرنے والا ہوگا۔

۴۔ زمین پر درکار مٹی کی قلت

یہ مسئلہ بھی بعض لوگوں کے ذہن کو مشوش کئے ہوئے ہے کہ اگر معاد بصورت جسمانی ہو اور تمام تاریخ کے لوگوں کے لئے قیامت ایک ہی وقت میں برپا ہو تو اس کرۂ زمین پر ان سب کے لئے گنجائش نہ ہوگی۔ مختصر یہ کہ اگر معادِ جسمانی سے متعلق یہ تمام مشکلات حل ہو بھی جائیں تو ان سب انسانوں کا لوٹنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ کرۂ زمین تو موجودہ نسل کے لئے بھی کم ہے جب کہ ماہرین آبادی بھی خبردار کرتے رہتے ہیں کہ اگر آبادی کے بڑھنے کی شرح اسی برق رفتاری سے جاری رہی تو محیط زمین آئندہ نسل کے لئے تنگ ہوجائے گا۔ اب آپ سوچیں اگر گذشتہ اور آئندہ کی تمام نسلیں ایک جگہ جمع ہوجائیں تو کیا بنے گا؟

لیکن اگر معاد بصورت روحانی ہو تو اس حوالے سے ہمیں کوئی مشکل نہ ہوگی کیونکہ عالم ارواح میں تو ایسی کوئی مشکل نہیں ہے۔

جواب

یہ اعتراض پیش کرنے والے اس نکتے سے غافل رہے ہیں کہ قرآن کی واضح آیات کے مطابق معاد کرۂ زمین پر اس کی موجودہ صورت میں انجام نہ پائے گی بلکہ یہ زمین تبدیل ہوجائے گی:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ

''اس روز یہ زمین ایک اور زمین میں اور آسمان دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہوجائیں گے۔(ابراہیم:۴۸)

قرآن مزید کہتا ہے کہ بہشت کی وسعت زمین وآسمان کی پہنائیوں کے برابر ہے:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

''اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنت کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ کہ جس کی پہنائی زمین وآسمان کے برابر ہے۔'' (حدید:۲۱)

ان آیات مجیدہ اور قرآن پاک کی بعض دیگر آیات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو زمین میں اس قدر گسترش اور وسعت پیدا ہو جائے گی کہ یہ زمین وآسمان کی وسعت کے برابر ہوجائے اور جنت ودوزخ اور تمام انسانوں کو اپنے اندر سمو لے یا پھر روزِ قیامت انسانوں کو اس کرۂ زمین سے کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ البتہ ان دوصورتوں میں تمام انسانوں کے لئے معاد جسمانی کے حوالے سے جگہ کی قلت کا مسئلہ باقی نہیں رہتا اور اس طرح تمام دوزخیوں اور بہشتیوں کے لئے سکونت کا وہ مسئلہ حل ہوجاتا ہے کہ جو اس سے متعلق اعتراض کرنے والوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

۵۔ جسم فانی کے لئے حیاتِ باقی کیونکر؟

ایک اور سوال کہ جو معادِ جسمانی کے متعلق اٹھایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آخرت سرائے جاوید ہے اور آیاتِ خلود اس کی جاودانی پر روشن دلیل ہیں جب کہ جسم مادی کچھ بھی ہو کہنہ اور فرسودہ ہوجاتا ہے اور آخر کار گل سڑ کر ختم ہوجاتا ہے۔

اب اگر معاد جسمانی ہو تو یہ تضاد پیش آئے گا کہ ''فنا'' ''عالم بقا'' میں جا نکلے اور وہ جسم کہ جس کی طبیعت ہی میں فنا ہونا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہے۔

علامہ علی مرحوم نے تجرید العقائد کی شرح میں اس اعتراض کو یوں بیان کیا ہے کہ جسمانی قوی محدود اور متناہی ہیں جب کہ اہل بہشت کی نعمتوں کے جاوداں ہونے پر اعتقاد کا لازمہ لامحدود اور لامتناہی ہونا ہے۔[1]

جواب:

اس سوال کا جواب بھی کوئی پیچیدہ نہیں ہے چونکہ اس میں تو کوئی اعتراض نہیں ہے کہ جسم اپنی طبیعت کے اعتبار سے فانی، فرسودہ اور بوسیدہ ہونے والا ہے۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ اسے مسلسل کوئی بیرونی امداد نہ ملے اور اگر باہر سے الٰہی امداد اس کے شامل حال رہے تو یہ

---

[1] شرح تجرید ص ۳۲۲

امداد جسم کو ہمیشہ کے لئے تازہ دم اور نیا رکھ سکتی ہے۔

یہ بالکل اس درخت کی مانند ہے کہ جو ہر روز ملنے والی مخصوص غذا کے استعمال سے اپنے فرسودہ خلیوں کو از سر نو تعمیر کر سکتا ہے اور ہمیشہ تر و تازہ، شاداب اور جوان رہ سکتا ہے اور ایسی بات ہرگز محال نہیں ہے۔

یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ اقتضائے ذات اور چیز ہے اور ذات کے بیرونی عوامل کی اقتضاء ایک اور چیز، جب کہ بحث یہ ہے کہ انسانی بدن کے خلیے جو اپنی طبیعت کے اعتبار سے معین عمر کے حامل ہیں، خدا کے خلق کردہ طریقوں اور بیرونی عوامل کے ذریعے اپنی تعمیر نو کر کے غیر محدود عمر پیدا کر سکتے ہیں اور اس طرح دوام حاصل کر لیتے ہیں۔

اس اعتراض کو متذکرہ بالا انداز میں بیان کرنے کے بعد علامہ حلی مرحوم ایک خاص بے اعتنائی کے ساتھ فرماتے ہیں: یہ دلیل نہیں ہے بلکہ یہ تو دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے یعنی اس کی کوئی منطقی بنیاد نہیں ہے اور ایک خام خیالی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ [1]

۶۔ معادِ جسمانی و روحانی بیک وقت کیونکر؟

کبھی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ معادِ جسمانی کے معتقدین کا حقیقی مدعا یعنی معادِ روحانی و جسمانی کا جمع ہونا مشکل دکھائی دیتا ہے چونکہ اس جہان میں ان دونوں کے موافق مادی و معنوی پاداش اور ہر دو طرح کی لذات ہونا چاہئیں۔ جب کہ (ہم دیکھتے ہیں کہ) اگر انسان عالم قدس کے انوار کی تجلیوں میں کھو جانا چاہے تو اس کے لئے لذات جسمانی کی طرف توجہ کرنا ممکن ہی نہیں اور اسی طرح اگر لذات جسمانی میں غرق ہو تو لذات روحانی کی طرف متوجہ نہ ہو پائے گا۔ مختصر یہ کہ اس دو طرح کی معاد کا باہم واقع ہونا متضاد دکھائی دیتا ہے اور ان دونوں کا جمع ہونا ممکن نہیں ہے۔

جواب

یہ اعتراض انتہائی کمزور معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر روح باندازۂ کافی قدرت رکھتی ہو تو جسم کے لذات مادی کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود انوارِ الٰہی میں غوطہ زن ہو سکتی ہے۔ بزرگ اولیاء اللہ اور انبیائے کرام اس کا واضح نمونہ ہیں۔

بحار الانوار میں علامہ مجلسی مرحوم اس بارے میں نقل کرتے ہیں کہ اگر اس دنیا میں مقامات معنوی و روحانی کی طرف توجہ انسان کی لذاتِ جسمانی سے روک سکتی ہے تو اس کا برعکس ہونا بھی صادق ہے۔ انسانی روح اس دنیا میں تو ضعیف ہے لیکن موت کے بعد جب عالم قدس و طہارت سے مدد حاصل کرتی ہے تو اس میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کو جمع کر سکے۔ [2]

بہر حال یہ بھی دلیل کے مشابہ ہے نہ کہ خود دلیل۔

---

[1] شرح تجرید ص ۳۲۲

[2] بحار الانوار ج ۷ ص ۵۰

۷۔کون سا جسم لوٹے گا؟

یہاں پر آخری اعتراض جو بیان کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کے جسم میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔بعض خلیے تدریجاً ختم ہو جاتے ہیں اور دوسرے خلیے ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور تقریباً سات سال میں پہلے جسم کے تمام اجزاء تبدیل ہو کر اپنی جگہ نئے اجزاء کو دے دیتے ہیں، بالکل اس تالاب کی مانند کہ جس میں ایک طرف سے پانی آہستہ آہستہ داخل ہو اور دوسری طرف سے باہر نکل جائے اور یقینا کچھ ہی دیر بعد اس تالاب کا سارا پانی تبدیل ہو جائے گا۔

بنابرایں ستر سال کی عمر تک یہ جسم دس دفعہ تبدیل ہوتا ہے۔تو کیا وقت بازگشت یہ تمام دس بدن واپس آئیں گے اور انسان ایک غول پیکر کی صورت میں محشور ہو گا یا ان میں سے کوئی ایک لوٹے گا؟

اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے کوئی ایک پلٹے گا تو ان میں سے کون سا ہو گا اور ان کے درمیان ترجیحی معیار کیا ہے؟

جواب

درحقیقت یہ اعتراض بھی دور کی کوڑی لانے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ تمام ابدان واپس لوٹ آئیں۔لیکن حق یہ ہے کہ آخری بدن اس دن زندہ ہو گا کیونکہ قرآن کہتا ہے: ''مردے قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔'' بوسیدہ ہڈیوں اور خاک میں دوبارہ جان پڑ جائے گی اور یہ آخری بدن کی واپسی کے معنی میں ہے اس بدن کو جو تمام ابدان پر ترجیح حاصل ہے وہ اس وجہ سے کہ یہ ان ابدان کی تمام خصوصی صفات کا حامل ہے کیونکہ وہ اجزاء جو اپنی جگہ آنے والے اجزاء کے سپرد کرتے ہیں اپنی صفات بھی انہیں منتقل کر دیتے ہیں۔اس طرح آخری بدن گذشتہ اوصاف اور تمام اعمال کے نچوڑ کا حامل ہوتا ہے۔اگر کوئی واقع بین آنکھ ہو تو آخری بدن کی پیشانی پر تمام گذشتہ واقعات کو پڑھ سکتی ہے۔

البتہ اس امر کا اس بات کے ساتھ کوئی تضاد نہیں ہے کہ بہشتی اور صالح مومنین خوبصورت جوان کی صورت میں محشور ہوں۔یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے ایک پرانی اور فرسودہ اینٹ کو خاک بنا کر قالب میں ڈال دیا جائے اور وہ نئی اینٹ میں تبدیل ہو جائے۔

نتیجۂ بحث

گذشتہ مباحث کے مجموعے سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ معادِ جسمانی سے متعلق بحث میں کوئی اہم مشکل درپیش نہیں ہے اور جن مشکلات کا تصور کیا گیا ہے وہ اس مسئلے کی خصوصیات کے بارے میں عدم دقت اور کم توجہی کی بنا پر ہے۔متذکرہ بالا آٹھ اعتراضات میں سے بہترین قابل بحث اعتراض ''آکل و ماکول'' کا ہے اور باقی جزئی مسائل ہیں کہ جن کا جواب تھوڑی سی فکر اور توجہ کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔

معاد

(گذشتہ اقوام کے کلچر میں)

گذشتہ اقوام میں مسئلہ معاد کی بازگشت بہت زیادہ سنائی دیتی ہے۔ دورترین زمانوں یعنی قرون قبل از تاریخ سے مختلف قوموں کے درمیان حیات بعد از مرگ پر اعتقاد کے آثار اس طرح بخوبی دکھائی دیتے ہیں کہ اس بات میں کوئی شک وتردد باقی نہیں رہتا کہ وہ دوسری دنیا کے بارے میں راسخ العقیدہ تھے۔

جب ہم مرحلۂ تاریخ میں وارد ہوتے ہیں تو پھر بھی دیکھتے ہیں کہ تمام قومیں اپنے تمام تر ثقافتی اختلافات کے باوجود مسئلہ معاد پر ایمان رکھتی ہیں۔ لیکن قبل از اینکہ اس ماجرا کو اسناد کے ساتھ مورخین کی زبان شرح حال سے سنیں قرآن کی طرف پلٹتے ہیں تا کہ دیکھیں کہ قرآن اس بارے میں کیا فرماتا ہے۔

قرآن مجید نے بھی اس حقیقت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ خلقت آدم کے وقت ہی سے معاد اور حیات بعد از مرگ کا مسئلہ موجود رہا ہے۔ حتی کہ ابلیس نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے اور آدمؑ کے بعد کے پیامبرانِ الٰہی کہ جو مختلف قوموں کی ہدایت پر مامور تھے، انہوں نے بھی حیات بعد از مرگ اور زندگی آخرت کی طرف اس طرح توجہ دلائی ہے کہ یہ زندگی ان تمام قوموں کے لئے کہ جن کی طرف انبیاء مبعوث ہوئے ایک آشنا بات سمجھی جاتی تھی۔

البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مسئلہ پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان میں اور وہ معارف کہ جو بذریعہ وحی ان پر نازل ہوئے ان میں انتہائی وسعت کا حامل ہے۔ قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ مسئلہ معاد کی توضیح وتشریح پر مشتمل ہے۔

آیئے قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور دل وجان سے چند ایک آیات کے نمونے رہسپار گوش کرتے ہیں:

(۱) قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ﴿۱۴﴾ (الاعراف: ۱۴)

(۲) قَالَ فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَفِیْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ﴿۲۵﴾ (الاعراف: ۲۵)

(۳) اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ (مائدۃ: ۲۹)

(۴) اَیَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ﴿۳۵﴾ (مؤمنون: ۳۵)

(۵) وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ﴿۸۷﴾ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ﴿۸۸﴾ (الشعراء: ۸۷

تا ۸۸)

(۶) وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ (بقرة: ۱۱۱)

(۷) وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾ (مریم: ۳۳)

(۸) وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ (العنکبوت: ۳۶)

(۹) اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ (یوسف: ۳۷، ۳۸)

(۱۰) لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ (النمل: ۶۸)

ترجمہ

(۱) (شیطان) بولا: مجھے فرصت دے جس دن تک لوگ جی اٹھیں (اور مجھے زندہ رکھ)۔

(۲) فرمایا اسی (زمین) میں تم جیو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے (روزِ قیامت) نکالے جاؤ گے۔

(۳) میں چاہتا ہوں کہ تو حاصل کرے میرا گناہ اور اپنا گناہ، پھر ہو دوزخ والوں میں سے۔

(۴) کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر گئے، ہڈیاں اور مٹی ہو گئے تو پھر (قبروں میں) سے نکالے جاؤ گے۔

(۵) اور مجھے اس دن کہ جب لوگ مبعوث کئے جائیں گے شرمندہ اور رسوا نہ کر۔ اس دن کہ جب مال و دولت اور اولاد کوئی فائدہ نہ پہنچا ئیں گے۔

(۶) انہوں نے کہا کہ یہود یا نصاریٰ کے علاوہ ہرگز کوئی بھی جنت میں داخل نہ ہوگا۔

(۷) اور (اللہ کا) سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن جی اٹھوں۔

(۸) ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ پھر بولا: اے میری قوم! بندگی کرو اللہ کی اور واپس پلٹنے کے دن کی توقع رکھو۔

(۹) میں نے اس قوم کے دین کو چھوڑ دیا کہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتی اور آخرت کی منکر ہے اور میں نے اپنے

آباؤاجداد ابراہیم، اسحاق اور یعقوب (کے دین) کی پیروی کی۔

(۱۰) یہ ایک ایسا وعدہ ہے کہ جو ہمیں اور ہمارے باپ دادا کو پہلے سے دیا گیا ہے یہ وہی پہلوں کے خرافاتی افسانے ہیں۔

تفسیر

مختلف زمانوں میں عقیدۂ معاد

اوپر بیان کی جانے والی آیات میں سے ہر آیت ایک مخصوص زمانے سے متعلق ہے۔

پہلی آیت ابلیس کے بارگاہِ خداوندی سے راندہ جانے کے واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ ابلیس کہ جو بادۂ غرور اور خودخواہی سے سرمست تھا اور بجائے اس کے کہ خدا کی طرف پلٹتا اور درِ توبہ سے استفادہ کرتا ہٹ دھرمی اور ضد پر اتر آیا اور خدا سے یوں تقاضا کرنے لگا۔ مجھے فرصت دے جس دن تک لوگ جی اٹھیں۔

قال انظرنی الی یوم یبعثون

یہ مہلت اس لئے نہ تھی کہ درگاہِ خدا میں توبہ کے ذریعہ لوحِ معاصی پر قلم عفو و درگزر کے ساتھ خط کھینچ دے یا سیئات کے مقابلہ میں حسنات لکھ لے۔ بلکہ یہ مہلت تو اس لئے تھی کہ آدم اور اس کی اولاد کے راستے میں کمین لگائے اور انہیں گمراہ کرے اور اس طرح اپنے غصے اور حسد کی جہنمی پیاس بجھا سکے۔

اس آیت سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ مسئلہ معاد ابتداء ہی سے موجود تھا حتی کہ شیطان بھی اس پر یقین رکھتا تھا کہ ایک ایسا دن درپیش ہے۔

لیکن شیطان کا یہ تقاضا اس صورت میں قبول نہ ہوا جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت ۳۸ گویا ہے۔ اس (شیطان) سے کہا گیا کہ:

فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

''روزِ معین و معلوم تک تجھے مہلت دی جائے گی۔''

بعض نے ''یوم الوقت المعلوم'' کو اختتام جہان یا انسان کی ذمہ داری کا زمانہ ختم ہوجانے کے معنی میں لیا ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے اسے مہدی موعودؑ کے روزِ قیام کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔

البتہ بعض مفسرین کے کلمات میں ایک احتمال بعید بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ''یوم الوقت المعلوم'' روزِ قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ احتمال بہت بعید دکھائی دیتا ہے کیونکہ نہ تو ظاہر آیات سے موافقت رکھتا ہے اور نہ ہی ان روایات سے کہ جو اس آیت کی تفسیر

میں نقل ہوئی ہیں۔

یہاں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جو کچھ اس طرح سے ہیں:

۱۔ کیونکر خدا نے اسے مہلت دی کہ وہ اپنی نیت بد کو عملی جامہ پہنا سکے اور انسانوں کو گمراہ کرے؟

جواب: ابلیس کی بقاء، اس کے وجود کی اصل کی مانند، انسانوں کی نسبت الٰہی امتحان کا ایک گوشہ ہے کہ جس کے سائے میں اولیاء اللہ اور باایمان افراد راہِ کمال طے کرتے ہیں اور ناخالص افراد ان کی صف سے خارج ہو جاتے ہیں۔

۲ ابلیس کو اختتام جہان تک زندگی کی مہلت کا اطمینان دلانا۔ کیا اس بات کا باعث نہیں ہوسکتا کہ ابلیس اپنے کام کو جاری رکھے اور جونہی زندگی کا خاتمہ قریب ہونے کا احساس کرے توبہ کرلے اور خدا کی طرف پلٹ جائے؟

جواب: جو راستہ ابلیس طے کر چکا تھا ایسا راستہ تھا کہ جس میں واپسی کا کوئی وجود نہ تھا۔ باغیانہ حالت کی شدت کے باعث، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ صفت اس کی طبیعت ثانوی بن چکی تھی۔ اس قسم کی طبیعت کے مقابلے میں توبہ کا کوئی راستہ موجود نہیں۔

۳۔ شیطان نے روزِ قیامت تک زندگی کا تقاضا کیوں کیا جب کہ اسے اپنے ہدف کے لیے اختتام دنیا تک زندگی کافی تھی؟

جواب: تفسیر المیزان میں کہا گیا ہے کہ اس کی تمنا تھی کہ عالم برزخ اور اس دنیا اور اگلی دنیا کے درمیان فاصلے میں بھی انسانوں کو ورغلائے۔

۴۔ ابلیس یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بارگاہ خداوندی کا دھتکارا ہوا ہے کیونکر امیدوار تھا کہ اس کا تقاضا پورا ہو جائے گا؟

جواب: تفسیر مجمع البیان میں مرحوم طبرسی فرماتے ہیں کہ اسے یقین تھا کہ فضل و کرم الٰہی اسقدر زیادہ ہے کہ اس کی بارگاہ سے دھتکارا جانے کے بعد بھی اس کے فضل و کرم کا امیدوار ہوا جاسکتا ہے۔ روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ اس کی دعا کی قبولیت ان عبادات کی وجہ سے تھی جو وہ اس سے پہلے انجام دے چکا تھا۔

دوسری آیت حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی شریک حیات حضرت حوّا کے بہشت سے زمین پر منتقل ہونے اور ابلیس کے اس قربِ الٰہی کے مقام سے دھتکارے جانے سے متعلق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: خدا نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''اسی (زمین) میں تم جیو گے، اسی میں مرو گے اور اسی سے (روزِ قیامت) نکالے جاؤ گے (قال فیها تحیون و فیها تموتون و منها تخرجون)۔

اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف انسانوں کا اٹھایا جانا بلکہ جنوں اور شیطان کہ جو ان میں سے ہے، کا اٹھایا جانا بھی اسی ایک دن میں مسلم و قطعی ہے۔ بعض تفاسیر میں احتمال ذکر کیا گیا ہے کہ اس آیت میں فقط حضرت آدمؑ و حوّا اور ان کی آئندہ آنے والی اولاد مخاطب ہے، لیکن اس کی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔

اس تعبیر سے یہ بھی بخوبی پتہ چلتا ہے کہ زمین انسان کا مبداء حیات بھی ہے اور اس کے مرنے اور دوبارہ اٹھائے جانے کی جگہ بھی۔ [1]

---

[1] حضرت آدم علیہ السلام کے خروج اور روزِ قیامت کے ضمن میں خداوند قدوس کی طرف سے سورہ طٰہٰ آیت ۱۲۳ - ۱۲۴ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

تیسری آیت حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں ہابیل وقابیل سے متعلق ہے۔ جب ہابیل کی قربانی اس کے اخلاص کی بنا پر بارگاہِ ایزدی میں قبول ہوئی اور قابیل کی قربانی عدم خلوص کی وجہ سے رد ہوگئی، تو قابیل کے اندر حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کی دھمکی دی۔ ہابیل نے کہا: اگر تو میرے قتل کا ارادہ کرے بھی تو میں تیرے قتل کا ارادہ نہ کروں گا، میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ پھر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ تو اپنے اور میرے گناہوں کا بوجھ اٹھائے اور جہنمیوں میں سے ہو جائے اور ظالموں کی سزا یہی ہے۔ انی اریدان تبوء باثمی واثمك فتكون من اصحاب النار و ذلك جزآوا الظالمين۔

اس آیہ مجیدہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ معاد اسی زمانے سے اولاد آدم میں ایک امر مسلم تھا۔ اسی لئے ہابیل اپنے بھائی قابیل کو دوسری دنیا میں عذاب الٰہی کی تہدید کرتا ہے۔

مفردات میں راغب کے بقول "تبوأ" "بواء" کے مادہ سے ہے کہ جس کا معنی کسی جگہ کا ہموار ہونا ہے، "نبوہ" کے مقابلے میں کہ جو سطحوں کے متفاوت ہونے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا جب کہا جائے کہ "بوأت له مكانا" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اس کے لئے جگہ صاف اور ہموار کی۔

یہ لفظ بعض اوقات اقامت اور لازمی ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چونکہ جب کوئی انسان چاہے کہ کسی جگہ رہائش پذیر ہو تو اس جگہ کو صاف اور مرتب کرتا ہے۔ متذکرہ بالا آیت کے یہی معنی کئے گئے ہیں۔

لیکن "مصباح المنیر" نے اس لفظ کے معانی اعتراف کرنا اور بھاری بوجھ کاندھوں پر اٹھانا بیان کئے ہیں جب کہ مقائیس اللغہ میں اس کے دو معنی ذکر ہوئے ہیں۔ دو چیزوں کی بازگشت یا دو چیزوں کا مساوی ہونا۔

"کتاب التحقیق" نے اس کے اصلی معنی انحطاط اور نیچے کی طرف بازگشت بیان کئے ہیں اور باقی تمام معانی کو مجازی معنوں میں لیا ہے کہ جو اصلی معنی کے لوازمات میں سے ہے۔ لہٰذا اس معنی کے مطابق مورد بحث آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تو بارگاہِ خداوندی میں اپنے اور میرے گناہوں کے ساتھ سقوط کرے۔"

اس لفظ کے قرآن مجید میں اور دیگر عبارتوں میں استعمال کے موارد کو ملاحظہ کرنے سے مقائیس میں بیان کئے گئے دو مفہوموں کو تقویت ملتی ہے اور مورد بحث آیت میں دونوں معانی مناسب ہیں۔

پہلے معنی کے مطابق ہابیل کہتا ہے: "میں چاہتا ہوں کہ تو واپس پلٹے (خدا کی طرف) اپنے اور میرے گناہوں کے ساتھ۔"

اور دوسرے معنی کے مطابق کہتا ہے: "تم ایسی جگہ اپنے لئے فراہم کر رہے ہو کہ جو میرے گناہوں اور تیرے گناہوں کے ساتھ تیار ہوئی ہے۔"

یہاں ایک بہت اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہابیل جو اپنے بھائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کا وہ کون سا گناہ تھا کہ جس کا بوجھ اس کے بھائی کے کندھوں پر جا پڑا؟ اصولاً یہ بات کس طرح قابل قبول ہے جب کہ خدا فرماتا ہے:

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ﴿۳۸﴾ (نجم ۳۸)

''کوئی بھی کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

یہاں پر معروف مفسرین میں سے ہر ایک نے تقریباً ایک ایسا راستہ انتخاب کیا ہے کہ جس میں بیشتر کسی چیز کو محذوف تصور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے مطابق ''اثمی'' (میرے گناہ) کا مطلب ''اثم قتلی'' (میرے قتل کا گناہ) مقصود ہے۔

لیکن مناسب ترین معنی یہ ہے کہ آیت میں کسی بھی چیز کے محذوف تصور کرنے کی ضرورت نہیں اور آیت کا مقصود یہ ہے کہ اگر تم اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے مجھے قتل کر دو تو میرے گذشتہ گناہوں کا بوجھ تمہارے کندھوں پر آن پڑے گا کیونکہ تمہیں روزِ قیامت میرے قتل کا بدلہ دینا پڑے گا اور چونکہ تمہارے پاس کوئی عمل صالح نہیں ہے لہٰذا میرے گناہوں کا بوجھ قبول کرو گے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے آیت کی تفسیر کے ضمن میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ جو اس معنی کی تائید کرتی ہے۔

امامؑ فرماتے ہیں:

من قتل مومنا متعمدا اثبت الله على قاتله جميع الذنوب و برى المقتول منها و ذلك قول الله عزوجل: انى اريد ان تبوا باثمى واثمك فتكون من اصحب النار

''اگر کوئی کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو خدا مقتول کے تمام گناہ قاتل کے حساب میں لکھ دیتا ہے اور مقتول تمام گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے اور یہ ہیں کلام خدا کے معنی کہ جو فرماتا ہے کہ انی اریدان.....''[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہونے والی ایک روایت میں بھی بالکل یہی معنی دیکھنے کو ملتے ہیں (اگرچہ یہ روایت خصوصاً اس آیت کی تفسیر میں نہیں ہے)۔روایت کچھ یوں ہے:

يوتى يوم القيمة با الظالم والمظلوم فيوخذ من حسنات الظالم فتزاد فى حسنات المظلوم، حتى ينتصف، فان لم تكن له حسنات اخذ من سيئات المظلوم فتطرح عليه

''روزِ قیامت ظالم اور مظلوم کو حاضر کیا جائے گا اور ظالم کی نیکیوں کو لے کر مظلوم کی نیکیوں میں اضافہ کر دیا جائے گا تا کہ انصاف ہو جائے اور اگر ظالم کی کوئی نیکیاں نہ ہوں تو مظلوم کے گناہوں کو لے کر ظالم کے کھاتے میں

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ا صفحہ ۶۱۳ حدیث ۱۳۳

ڈال دیا جائے گا۔''[1]

چوتھی آیت حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کو ظاہر کرتی ہے۔ کافروں اور منکرین کی زبانی حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو یوں نقل کیا گیا ہے: کیا وہ (نوح) تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور خاک اور ہڈیاں ہوجاؤ گے تو دوبارہ (قبروں سے) نکالے جاؤ گے؟ (ایعدکم انکم اذامتم و کنتم ترابا وعظاما انکم مخرجون)۔

اس تعبیر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ مسئلہ معاد اور وہ بھی معادِ جسمانی کو بارہا بیان کرتے رہے ہیں اور وہ بھی اس انداز سے کہ دشمنوں کے کانوں تک بھی یہ بات جا پہنچی تھی۔ لہٰذا وہ اپنی اس عجیب بے یقینی کے ساتھ کہ جس کا سرچشمہ ان کے گھٹیا اور پست افکار تھے ایک دوسرے سے کہتے تھے: دور! دور! وہ وعدے کہ جو تم سے کئے جاتے ہیں (ھیھات ھیھات لما توعدون)

سورۂ نوحؑ کی آیات سے بطورِ احسن پتہ چلتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام منکرین اور کافرین کے شبہات اور مسئلہ معاد سے ان کی وحشت و دوری کو ختم کرنے کے لیے تشبیہ سے استفادہ کرتے ہیں اور انسانی زندگی کو نباتات کی زندگی سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں: خدا نے تمہیں نباتات کی طرح زمین سے پیدا کیا، پھر تمہیں اسی زمین میں پلٹائے گا اور دوبارہ اس سے نکالے گا.....(نوح ۱۷ و ۱۸)

لہٰذا اس ترتیب سے سب سے پہلے اوالعزم اور صاحب شریعت پیامبر حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں معاد کی معرفت کا سابقہ واضح و روشن ہوجاتا ہے حتی کہ بالکل انہی دلائل اور تشبیہات کے ساتھ کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین مکہ کے لئے پیش کیا کرتے تھے۔

پانچویں آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مسئلہ قیامت پر ان کے ایمان سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا کچھ حصہ پیش کیا گیا ہے۔ جب انہیں اپنے زمانے کے کفار کی شدید مخالفت کا سامنا تھا تو خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

ولا تخزنی یوم یبعثون

''مجھے شرمندہ و رسوا نہ کرنا اس دن کہ جب لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔''

یوم لا ینفع مال ولا بنون

''اسی دن کہ جب مال اور اولاد کوئی فائدہ نہ پہنچائیں گے۔''

ان سے پہلی دو آیتوں میں عرض کرتے ہیں کہ مجھے پرنعمت بہشت کے وارثوں میں سے قرار دے:

واجعلنی من ورثه جنة النعیم

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۳ ص ۲۱۳۴

متذکرہ بالا دعاؤں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اس بزرگ ترین الوالعزم انبیاء والے مقام عظمت کے باوجود روزِ قیامت کی رسوائی سے خوف زدہ تھے۔

ممکن ہے بعض لوگ اس تعبیر کو دوسروں کے لیے نمونہ عمل جانتے ہوں اور غیر معصومین کے لئے ایک درس سمجھیں۔ کیونکہ معصومین کے لئے رسوائی قیامت ناممکن ہے۔ لیکن بعض نے یہاں پر ایک بڑی لطیف تعبیر بیان کی ہے اور وہ یہ کہ:

حسنات الابرار سیئات المقربین

معمولی نیک کام معصوم پیامبروں کی شان وعظمت سے کمتر ہیں۔ اسی طرح اگر وہ لوگ کہ جو مقربین میں سے ہیں اگر بہشت کے ان نیچے والے حصوں میں جگہ لیں کہ جو ''ابرار'' کے لیے مخصوص ہیں تو یہ ان کے لئے مایہ رسوائی شمار کیا جائے گا کیونکہ ہر کسی سے ایک خاص عمل کی توقع ہوتی ہے اور ایک خاص مقام ومنزلت کی۔

چھٹی آیت ''یہود ونصاریٰ'' کے عقیدۂ معاد کے بارے میں ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وقالوا لن یدخل الجنة الا من کان ھوداً وٗ نصاری

''انہوں نے کہا کہ کوئی بھی ماسوائے یہود یا نصاریٰ کے ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا۔''

جی ہاں! وہ اس قدر اپنی بڑائی کے قائل تھے اور احساس برتری کا شکار تھے کہ جنت کو فقط اپنے لئے مختص سمجھتے تھے حتی کہ دوسرے مومنوں کی طرف ان کی معمولی سی توجہ بھی نہ تھی۔

قرآن اولا ان کے جواب میں کہتا ہے کہ ''یہ ان کی آرزو ہے۔''

تلك امانیھم

ایسی آرزو کہ جو بے دلیل، بے بنیاد اور واقعیت سے کوسوں دور ہے اور وہ ہرگز اس آرزو کو نہ پاسکیں گے۔

پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے:

قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین

''ان سے کہو کہ اگر وہ سچے ہیں تو اپنی دلیل لائیں۔''

یہ اپنے لئے منحصر جاننا کس عقلی معیار پر استوار ہے اور کس دلیل کی بناء پر لطف خدا فقط تمہارے ساتھ مخصوص ہے اور دوسروں کے شامل حال نہ ہوگا؟ اصولاً کس طرح ممکن ہے کہ یہ تبعیض عدالت خداوندی کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور فقط تمہارے اس گمان کے بدلے خدا نیک کردار مومنین کو جنت سے محروم کردے؟

فرض کیا اگر وہ اپنے دین کی ابدیت کے دعویدار تھے تو پھر کیونکر پہلی امتوں کے بارے میں ایسی قضاوت کرتے تھے جب کہ وہ

امتیں انبیاء سلف کی پیروکار تھیں اور اپنے فرائض پر عمل کرتی رہی تھیں۔ ان سب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جنت کی اجارہ داری میں فقط اپنے ان اوہام کے تابع تھے کہ جن کا سرچشمہ ان کی خودخواہی تھی۔

"امانی" بمعنی آرزو "امنیہ" کی جمع ہے (بعض مفسرین نے بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ ان آرزوؤں کے معنی میں ہے کہ جن تک انسان کی رسائی نہیں ہے)۔

بنابرایں "امانی" آرزوؤں کے معنی میں ہے یعنی جمع کے معنی ادا کرتا ہے۔ درحالیکہ جنت کی اجارہ داری تو فقط "ایک آرزو" تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک آرزو اور بہت سی آرزوؤں کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے ہے اور وہ عذاب الٰہی سے نجات، محشر کی وحشت وخوف سے بچت، حساب کتاب کا آسان ہونا اور اسی طرح کے دوسرے مسائل ہیں۔

بعض دوسرے احباب کا کہنا ہے کہ جب آرزو اور امید بہت بڑی ہوجائے تو آرزوؤں کے مفہوم میں داخل ہوجاتی ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ چونکہ ان میں سے ہر ایک ایسی آرزو رکھتا تھا یا ان میں سے ہر ایک بار ہا مرتبہ ایسی آرزو کو جنم دیتا تھا، لہٰذا اسی لیے جمع کی صورت میں بیان کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ خیال کسی ایک فرد تک محدود نہ تھا بلکہ ایک دائمی اور عمومی پہلو کا حامل تھا۔

بہرحال یہ آیت قوم یہود ونصاریٰ میں عقیدۂ معاد کے وجود پر روشن دلیل ہے۔

ساتویں آیت میں ہم حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں کہ جب وہ گہوارے میں تھے اور آپ نے فرمانِ خدا سے بولنا شروع کیا تو بڑی صراحت سے معاد کی خبر دی۔ اپنی گفتگو میں فرماتے ہیں:

والسلام علی یوم ولدت و یوم اموت و یوم ابعث حیا

"اللہ کا سلام ہو مجھ پر اس دن جب میں پیدا ہوا اور اس دن کہ جب میں مرجاؤں گا اور اس دن کہ جب میں زندہ دوبارہ اٹھایا جاؤں گا۔"

ان تین دنوں کا انتخاب (پیدائش، موت اور روزِ قیامت یعنی حیاتِ مجدد کا دن) اس وجہ سے ہے کہ یہ تین دن انسانوں کی زندگی میں خطرناک اور تقدیر ساز ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ان تین میں سے ہر ایک انسان کے لئے ایک نئے موسم کی ابتداء ہے کہ جس میں سلامتی بہت اہم ہے اور یہ لطف خدا کے بغیر میسر نہیں ہوسکتی۔ درحقیقت حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے اس کلام کے ذریعے ان تین دنوں میں لطف الٰہی کا تقاضا کیا ہے۔

ضمناً اسی گہوارے سے آپ تمام انسانوں کو اپنی الوہیت کی نفی اور تمام بندگانِ خدا کی طرح ہونے کا پیغام بھی دے رہے ہیں۔

اسی سورۃ کی پندرھویں آیت میں یہی بات حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی موجود ہے، فرق صرف یہ ہے کہ یہاں سخن خدا کی طرف سے ہے جب کہ وہاں خود حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام ہے۔

حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان اوحش مایکون هذا الخلق فی ثلاثة مواطن: یوم ولد من بطن امه فیری الدنیا، ویوم یموت، فیعاین الاخرة واهلها، ویوم یبعث حیا، فیری احکاما لم یرها فی دار الدنیا

''انسان کے لیے وحشت ناک ترین چیز تین موقع پر ہے: اس دن کہ جب وہ پیدا ہوتا ہے اور ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے اور اس دنیا پر اس کی نظر پڑتی ہے اور جس دن وہ مرتا ہے۔ مرنے کے بعد اس عالم اور اس جہان کے لوگوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اس دن کہ جب دوبارہ زندہ ہوگا اور ان احکام کو دیکھے گا کہ جو اس نے دارِ دنیا میں نہ دیکھے ہوں گے۔''

پھر حضرت امام رضا علیہ السلام نے اس بارے میں حضرت مسیحؑ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام سے متعلق آیات کی طرف اشارہ فرمایا:[1]

بہرحال متذکرہ بالا آیت سے یہ بخوبی پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ قیامت پہلی امتوں میں اس قدر مسلم تھا کہ حتی کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے گہوارے میں اس سے متعلق گفتگو فرمائی۔

اب تک ہم نے ''اولوالعزم'' پیامبروں میں سے چار کے دین میں معاد کی اجمالاً تحقیق کی ہے اور بہت ساری آیات کہ جو حضرت پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے معاد کے بارے میں نقل ہوئی ہیں، کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ موضوع پانچ ''اولوالعزم'' پیامبروں سے متعلق مکمل ہوجاتا ہے۔

''غیر اولوالعزم'' انبیاء میں سے ہم نے حضرت آدمؑ کا قصہ اور اس سے متعلق مسائل جیسا کہ ان کے بیٹوں اور شیطان کی داستان کو ملاحظہ کیا ہے۔ اب بے جا نہ ہوگا اگر ہم اسی مطلب کو دیگر انبیاء کی زبانی بھی سنیں۔

حضرت شعیبؑ کہ جو حضرت موسیٰ کے ہم عصر تھے جب رسالت کے لئے مبعوث ہوئے اور مدین[2] کی طرف آئے تو اپنی قوم سے مخاطب ہوکر فرمایا:

فقال یقوم اعبدوا الله وارجوا الیوم الاخر ولا تعثوا فی الارض مفسدین

''اے میری قوم! خدا کی عبادت کرو اور یوم آخرت کی امید رکھو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔''

یہاں حضرت شعیبؑ اپنی دعوت کے آغاز میں تمام ادیان کے دو بنیادی اصولوں یعنی ''مبدأ'' اور ''معاد'' کا ذکر کرتے ہیں اور لوگوں

---

[1] نورالثقلین، جلد ۳ صفحہ ۳۳۵ حدیث ۷۵

[2] اردن کے جنوب مغرب کا ایک شہر کہ جو آج کل معان کے نام سے جانا جاتا ہے اور خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع ہے۔

کو انہی دو اصولوں کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

روزِ قیامت پر امید رکھنے سے مراد اس دن ثواب الٰہی کے لیے امیدوار ہونا ہے یا پھر اس جگہ امید کا معنی ہے: اس دن پر ایمان و اعتقاد رکھنا۔

نویں آیت حضرت یوسفؑ کی زبانی ہے کہ جب وہ قید خانے میں اپنے دوسرے قیدی ساتھیوں کے ساتھ خواب کی تعبیر کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ یوسفؑ نے ان سے اس طرح کہا:

انی ترکت ملة قوم لا یومنون باللہ وھم بالاخرة ھم کافرون

''میں نے ایسی قوم کے دین و مذہب کو نہیں اپنایا کہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتی اور روزِ قیامت کی منکر ہے۔''

یہ تعبیر اس لئے ہے کہ بت پرست مشرکین خدا پر تو اعتقاد رکھتے تھے لیکن معاد اور یوم الجزاء کو تناسخ کی صورت میں قبول کرتے تھے اور معتقد تھے کہ ہر انسان کی روح مرنے کے بعد ایک دوسرے جسم کی صورت میں اسی دنیا میں واپس پلٹ آتی ہے اور اپنی جزا و سزا کو اس نئی زندگی میں پا لیتی ہے۔ حالانکہ توحیدی دین نہ تو شرک کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی تناسخ اور روحوں کے اس دنیا میں لوٹ آنے کو، اسی لیے حضرت یوسفؑ نے انہیں منکر خدا اور منکر معاد کہا ہے۔ [1]

''ملت'' دراصل ''دین'' کے معنی میں ہے۔ لفظ ''ملت'' اور ''دین'' میں فرق یہ ہے کہ دین کی نسبت خدا اور افراد کی طرف دی جا سکتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے دین خدا یا دین محمد لیکن ملت کی اضافت معمولا انبیاء کی طرف ہوتی ہے (یا وہ قومیں کہ جن کے درمیان انبیاء یا مدعیان نبوت رہے ہوں) مثلاً ملت ابراہیم [2] لیکن ملت اللہ نہیں کہا جاتا۔

یہاں حضرت یوسفؑ کے پیش نظر عزیز مصر، اس کی بیوی، اس کے حواری اور بطور کلی اس زمانے کے وہ تمام مصری لوگ ہیں کہ جو نہ تو مبداء کے بارے میں صحیح عقیدہ رکھتے تھے اور نہ ہی معاد کے بارے میں درست عقیدہ کے حامل تھے۔

بہر حال اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ معاد پر اعتقاد مذہب کے دو بنیادی ارکان میں سے ایک رکن کے طور پر دین یوسفؑ میں بھی موجود رہا ہے یہاں تک کہ حضرت یوسفؑ نے قید خانے میں بھی اپنے ساتھ کے قیدیوں کے سامنے ان دونوں ارکان کو باہم بیان کیا ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ اس بات کے فوراً بعد حضرت یوسفؑ فرماتے ہیں،

واتبعت ملة ابآئی ابراھیم واسحاق و یعقوب

''میں نے اپنے آباؤ اجداد ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے دین کی پیروی کی ہے۔''

یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ دو مسلم اصول مبداء و معاد پر ایمان تمام ادیانِ الٰہی اور پہلے مذاہب میں موجود رہا ہے۔

---

[1] المیزان ج ۱۱ ص ۱۸۹

[2] مفردات راغب مادۂ ''ملت''

زیر بحث دسویں اور آخری آیت کہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابل مشرکین مکہ کی زبانی ہے، گویا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روزِ قیامت پر ایمان لانے کی دعوت پر اظہارِ تعجب کیا کہ کس طرح انسان خاک ہوجانے کے بعد دوبارہ لباس حیات زیب تن کرے گا اور کہا: یہ ایک ایسا وعدہ ہے کہ جو ہم سے اور ہمارے باپ داداؤں سے پہلے سے کیا جاتا رہا ہے، یہ تو پہلوں کے خرافات قصے وافسانے ہیں۔(لقد وعدنا هذا نحن و اٰبآؤ نا من قبل ان هذا الا اساطير الاولين)۔

اس تعبیر سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ معاد پر ایمان کی دعوت قدیم ترین ایام میں بھی پیامبران الٰہی کی طرف سے اسی طرح دی جاتی رہی کہ مشرکین اس کو اساطير الاولين (پہلوں کے افسانے) کے زمرے میں شمار کرتے تھے۔

"اساطير" جمع ہے "اسطار" کی اور "اسطار" خود "سطر" کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں درختوں کی قطار یا کلمات یا اس کی مثل۔لہٰذا "اساطير" جمع کی بھی جمع ہے اور یہ اشارہ ہے کہ گذشتگان کی حکایات کی طرف اور چونکہ گذشتہ لوگوں کی داستانیں معمولاً خرافات اور افسانوں سے مخلوط ہوتی تھیں اسی لیے "اساطیر" کی اصطلاح معمولاً خرافات کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ "اساطير" اسطورہ، اسطارہ اور اسطير کی جمع ہے اور چونکہ ثلاثی مزید فیہ ہے لہٰذا یہ لفظ اضافی معنی بھی رکھتا ہے۔اس کے اصلی معنی طبیعی سطر کے ہیں اور اضافی معنی جعل شدہ اور جھوٹی سطور کے ہیں۔[1]

نتیجۂ بحث

جو کچھ متذکرہ بالا آیات میں کہا گیا ہے اور اسی طرح کی دوسری بہت سی آیات کہ جو قرآن مجید میں وافر طور پر موجود ہیں، سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ روزِ قیامت پر ایمان کا مسئلہ اوائل ایام ہی سے موجود تھا کہ جب انسان نے اس زمین پر قدم رکھا۔تمام پیامبرانِ الٰہی نے اس کی طرف دعوت کی۔ یہ سب کچھ ان ناآگاہ اور نادان لوگوں کی فکر کے برخلاف ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ روزِ قیامت پر ایمان رکھنے والی قوموں کے درمیان حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔

قرآن میں بہت ساری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ خدا اس مسئلے کے بارے میں روزِ قیامت مجرموں کے سامنے دلیل و حجت قائم کرے گا اور فرمائے گا:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ

"اے گروہ جن و انس! کیا خود تمہارے درمیان میں سے رسول تمہارے پاس نہیں آئے تاکہ تم سے ہماری آیتیں بیان کریں اور تمہیں ایسے (قیامت کے) دن کی ملاقات سے ڈرائیں؟" (انعام ۱۳۰)

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم

یہ آیت بطور احسن اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پوری تاریخ میں رسولانِ الٰہی تمام جن وانس کو ایمان معاد کی دعوت دیتے رہے ہیں۔

یہی مطلب ایک اور آیت میں بھی ملتا ہے۔ جب دوزخ کے داروغوں نے دوزخیوں سے کہا:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ (زمر ۷۱)

یہ بات توجہ طلب ہے کہ خود دوزخی بھی عموماً اس بات کا اعتراف کرتے ہیں جیسا کہ اسی آیت میں ہے۔ ''انہوں نے کہا: کیوں نہیں۔''

قالوا بلی

بنابریں قرآن کی نظر میں مسئلہ معاد ایسے مسائل میں سے ہے کہ جو ہمیشہ دعوتِ انبیاء میں سرفہرست رہا ہے اور خلقت آدم ہی سے زیر بحث چلا آرہا ہے اور ہر عصر و زمان میں رسولانِ الٰہی کی طرف سے اس پر تاکید کی جاتی رہی ہے۔ مزید یہ کہ تمام قومیں اس سے آشنا تھیں۔

آیئے اب اسی سلسلے میں تواریخ اور علماء کے شواہد کی طرف بڑھتے ہیں۔

توضیحات

ا۔ قبل از تاریخ کی قوموں میں معاد

جیسا کہ ہم جانتے ہیں زندگی بشر کو دو دور میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک دور وہ ہے کہ جب رسم الخط ایجاد ہو چکا تھا اور انسان اپنی تحریروں کو یادگار کے طور پر چھوڑ سکتا تھا۔ اسے تاریخ کا دور کہتے ہیں۔ دوسرا وہ دور ہے کہ جب رسم الخط ایجاد نہ ہوا تھا اور اس دور کا انسان اپنے حالاتِ زندگی کو مدون تاریخ کی صورت میں پیش نہیں کر سکا۔ یہ قبل از تاریخ کا دور کہلاتا ہے۔

لیکن اس زمانے میں رسم الخط ایجاد نہ ہونا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم ان کے حالات پر دسترس نہ رکھتے ہوں کیونکہ زیر زمین غاروں میں اور اسی طرح دوسری کئی جگہوں پر ان قوموں کے چھوڑے ہوئے آثار اتنی وافر مقدار میں ملے ہیں کہ بہت حد تک ان کے اسرارِ زندگی سے پردہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ابھی تک ماہرین آثار قدیمہ دنیا کے مختلف کونوں میں، گھروں میں اور شہروں میں مختلف وسائل کے ساتھ قبل از تاریخ کی قوموں کی زندگی کے بارے میں جستجو کر رہے ہیں اور کسی چیز کے ملنے کے بعد بہت باریک بینی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں ان کی زندگی کی تاریخ، ثقافت اور تمدن کو ضبط تحریر کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے ذہبی عقائد کا بھی پتہ لگایا جاتا ہے۔

معروف ماہر عمرانیات سمیوئیل کنگ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''آج کے انسان کے اسلاف (کہ جن کے آثار زمین کی کھدائی کے دوران میں ملے ہیں) یعنی (نئاندرتالہا)

دیندار اور مذہبی تھے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے مردوں کو ایک خاص کیفیت سے دفن کرتے تھے اور ان کے کام کاج کے اوزار ان کے پہلو میں رکھ دیتے تھے اور اس طریقے سے دوسری دنیا کے بارے میں اپنے عقیدے کو ثابت کرتے تھے۔[1]

ہم جانتے ہیں کہ شانڈرتال کے لوگ لاکھوں سال پہلے کے ہیں جب نہ تو ابھی رسم الخط ایجاد ہوا تھا اور نہ ہی تاریخ بشر کا آغاز ہوا تھا۔ یقیناان کے عمل کی کیفیت ایک مہمل کام کی مانند تھی۔ چونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیاوی کاموں کے اوزار اس دنیا میں کام آنے والی چیز نہیں ہیں لیکن اس کا جذبہ محرکہ اور بنیاد بعد از مرگ کی زندگی پر ایمان ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو ان کے درمیان موجود تھی۔

بیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا میں ''ہربرٹ اسپنسر'' کی کتاب ''اصول علم الاجتماع'' سے نقل کیا گیا ہے کہ پہلے وقتوں کے لوگ چونکہ سوچ بچار اور فکر کی طاقت نہ رکھتے تھے لہٰذا بعد از مرگ کی دنیا کو اپنی عقل کے مطابق سمجھتے تھے۔اسی لئے اس زندگی کی جزئیات کے بارے میں عجیب وغریب بلکہ خرافات پر مبنی باتیں کرتے تھے۔

ان میں سے بہت سارے لوگ باوجود اس کے کہ موت کے بعد کی دنیا کا اعتراف کرتے تھے لیکن پھر بھی اس زندگی کو فقط ان لوگوں کے لئے مخصوص سمجھتے تھے کہ جو طبیعی موت مریں اور بعض لوگ اس کو فقط بڑی شخصیات اور طاقت ور افراد کے لئے مخصوص سمجھتے تھے۔

پہلی قوموں میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ جو مرنے والے کے اسلحے کو اس کے ساتھ دفن کر دیتے تھے، گھر کی اشیاء خواتین کے ساتھ اور کھلونے بچوں کے ساتھ دفن کر دیتے تھے (تا کہ بعد از مرگ کی زندگی میں وہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں)۔

بعض لوگ تو تمام حیوانات کو بھی میت کے ساتھ دفن کر دیتے تھے اور کچھ تھوڑے سے غذائی بیج اور ذرت بھی قبر میں رکھ دیتے تا کہ آخرت میں زراعت کر سکے۔

کبھی کبھار بعض لوگ تو اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر مرنے والے کے ساتھ اس کی بیویوں، غلاموں اور بعض دوست احباب کو بھی سپرد خاک کر دیتے تا کہ مرنے والا آخرت میں ان کے ساتھ مانوس رہے۔حتی کہ امریکہ اور مکزیک کے بعض علاقوں میں ان بزرگوں کے ساتھ کہ جو اس دنیا سے چلے جاتے پادری اور مذہبی پیشوا کا سر بھی کاٹ دیا جاتا (اور ان بزرگوں کے ساتھ دفن کر دیا جاتا) تا کہ اس دوسری دنیا میں مذہبی وروحانی مشیر کا کام دے سکے۔

گاہ بہ گاہ ان کے مراثیوں کو بھی قتل کر دیتے کہ وہ اپنی حرکات اور باتوں سے اس دوسری دنیا میں اس بزرگوار کو مشغول رکھ سکے۔

ان افراد کے ساتھ قتل ہو کر دفن ہو جانے والے لوگوں کی تعداد اس فرد کی شخصیت پر منحصر تھی، یہاں تک کہ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ان مردوں میں سے بعض کی قربانیوں کی تعداد دو سو افراد تک جا پہنچتی ہے۔

جب کبھی اولاد میں سے کوئی بہت ہی عزیز بچہ فوت ہو جاتا تو اس کے ساتھ اس کی ماں، پھوپھی اور دادی کا سر کاٹ کر دفن کر دیا جاتا

---

[1] جامعہ شناسی۔سیموئیل کنگ جلد اول صفحہ ۲۹۱

تا کہ دوسری دنیا میں اس کے پاس رہیں۔[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب خرافات ان قوموں کے منحرف افکار کی پیداوار تھیؒ۔لیکن یہ سب ایک نکتہ کو بیان کرتی ہیں اور وہ یہ کہ مرنے کے بعد کی دنیا پر اعتقاد پہلی قوموں کے درمیان ایک گہرے عقیدے کے طور پر موجود رہا ہے۔

کتاب ''تاریخ عمومی تمدن ہا'' میں بھی ذکر ہوا ہے کہ قبل از تاریخ کے ادوار سے لے کر قدیم تاریخ کے اواخر تک مردوں کے اجسام ایک خاص طریقے اور مخصوص رسوم کے ساتھ سپرد خاک کئے جاتے تھے اور بہت ساری گھریلو اشیاء اور پراسرار شکلیں ان کے ساتھ دفن کر دی جاتی تھیں۔لواحقین ان کے لئے تحائف بھیجا کرتے تھے۔یہ تمام عادات ورسوم اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ دوسری زندگی پر ایمان رکھتے تھے۔[2]

۲۔بعد از تاریخ کی قوموں میں ایمان معاد

تاریخی اسناد سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں زندگی بسر کرنے والی اقوام اس عقیدے میں مشترک تھیں اور زندگی بعد از مرگ کے بارے میں بیشتر مضبوط عقیدے کی مالک تھیں اور اس کے لئے تکلفات کی قائل تھیں اگر چہ معمولاً اسے خرافات سے مخلوط کر دیتی تھیں۔

الف۔قدیم مصریوں میں معاد

آلبر مالہ اس بارے میں اپنی تاریخ میں یوں رقمطراز ہے:

''مصر کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ مردہ کی روح قبر سے جدا ہو کر بڑے خدا ''آزیریس'' کے حضور حاضر ہوتی ہے۔''

جب اسے احکم الحاکمین ''آزیریس'' کے حضور لے جایا جاتا ہے تو اس کے قلب کو میزان حقیقت میں تولتے ہیں اور جس روح کا حساب کتاب پاک صاف ہو جائے وہ ایک ایسے باغ کی طرف روانہ ہو جاتی ہے کہ جس کی برکتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔اموات کے کنارے ایک خط رکھا جاتا تھا تا کہ اس دنیا کے سفر میں ان کے لئے راہنمائی کا کام دے۔یہ خط عجیب اور جاذب توجہ جملوں کا حامل تھا کہ جو مردے کو بڑے خدا ''آزیریس'' کی بارگاہ میں کہنا ہوتے۔وہ جملے یہ تھے:

''بزرگی تیرے ہی لئے سزاوار ہے۔اے خداوند عالی مقام!اے خداوند صدق وعدالت''

میں نے لوگوں کے بارے میں کبھی دھوکا دہی سے کام نہیں لیا،کبھی کسی بڑھیا کو نہیں ستایا،عدالت میں جھوٹ نہیں بولا،مکر وفریب سے آلودہ نہیں ہوا۔

کوئی مزدور جتنی ایک دن میں کام کرنے کی طاقت رکھتا ہے،اس سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں ڈالا،ذمہ داری ادا کرنے میں کاہلی نہیں

---

[1] انسائیکلو پیڈیا قرن بیستم۔جلد اول صفحہ ۹۰ تا ۹۴ (خلاصۃً)

[2] تاریخ الحضارات العام۔جلد ا صفحہ ۹۹

برتی، سستی کے قریب نہیں پھٹکا، مقدسات کی بے حرمتی اور ہتک کو جائز نہیں سمجھا، کسی غلام کی اس کے آقا کے پاس چغلی نہیں کھائی، کسی کی روزی پر لات نہیں ماری، کسی بندے کو قتل نہیں کیا اور تابوت اور میت کے ساتھ رکھے گئے کھانے کو چوری نہیں کیا۔

کسی کی زمین غصب نہیں کی، شیر خوار بچوں کے منہ سے دودھ نہیں چھینا، کوئی نہر نہیں کاٹی، میں پاک ہی پاک ہوں!.....

اے منصفو! آج کے دن کہ جو یوم حساب ہے اس مرحوم کو بھی راہ دو کہ جو گناہ کے قریب نہیں پھٹکا۔ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ نہیں جانتا برائی کیا ہے۔ اس نے زندگی اور حصول معاش میں حق و انصاف کی راہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس کے اعمال لوگوں کے مورد توجہ اور خداؤں کی خوشنودی کا موجب تھے۔ اس نے بھوکوں کی دادرسی کی۔ راہ خدا میں قربانی کی۔ مردوں کو غذا پہنچائی، اس کا منہ پاک ہے اور اس کے دونوں ہاتھ بھی پاک ہیں۔

مذکورہ مورخ ''آلبر مالہ''[1] ان باتوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ ان عبارات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مصر کے لوگ گناہانِ کبیرہ، حسنات اور مستحبات کو بھی پہچانتے تھے۔ مورخ کے اس قول کے ساتھ اس بات کا بھی اضافہ کرنا چاہیے کہ ان عبارات سے ضمناً یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی خدائی حساب کتاب، میزانِ عمل اور بہشت کے باغوں پر بھی اعتقاد رکھتے تھے۔ دراصل یہ عبارات ایک طرح کی تلقین تھیں کہ جو آج کل اموات کے لئے معمول ہے اور زندوں کے لئے گناہوں کی ہر قسم کی آلودگی سے پاکیزگی کے لئے پر معنی اشارات ہیں۔ گناہوں کی ایک دوسرے کے ساتھ نسبت کی اہمیت کو بھی واضح کرتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ تاریخی شواہد کے مطابق مصری حیات بعد از مرگ پر گہرا اعتقاد رکھتے تھے۔ اگرچہ اس اعتقاد کو بہت سی خرافات سے مخلوط کئے ہوئے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ وسائل ولوازم زندگی اور اشیائے خورد ونوش قبر میں رکھنے کے بجائے ان کی تصاویر، مجسمے یا ڈرائنگز قبروں میں رکھ دیتے تھے اور معتقد تھے کہ یہ تصاویر اور ڈرائنگز ان کی اصلی جگہ لے سکتی ہیں۔

بعض قبروں میں سے کھانا پکانے کے منظر، گائے ذبح کرنے کے مناظر، کھیتوں کی تصاویر اور برتن میں پڑا پکا ہوا گوشت جیسا کہ مہمانوں کے سامنے رکھ جاتا ہے، دکھائی دیا ہے۔[2] مردوں کے اجساد کو مومیانے اور اہرام مصر کی طرح قبروں کو بہت زیادہ مضبوط بنانے کا مسئلہ بھی اسی ضمن میں تھا۔

مقصد یہ تھا کہ اپنے اجساد کو مرنے کے بعد سے لے کر حشر تک صحیح وسالم رکھ سکیں اور جب روح بدن میں واپس لوٹے تو سامانِ عیش وعشرت ان کے پاس ہو۔ (لہٰذا اسی مقصد کے لیے) مختلف قسم کی غذائیں، نانبائی اور باورچیوں کے مجسمے، جواہرات اور دفاع کے مختلف ہتھیار قبر میں اور مردے کے پہلو میں رکھتے تھے۔ چونکہ معمولاً یہ قبریں وحشی حیوانات یا جواہرات کی چوری کے لئے لوگوں کے حملے کا نشانہ بنتی رہتی تھیں لہٰذا صاحب ثروت افراد اہرام بنانے یا قبروں کے اوپر بلند و بالا عمارتیں بنانے کی کوشش کرتے تھے کہ جسے

---

[1] تاریخ ملل وشرق ویونان جلد ا ص ۴۷

[2] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔ جلد ا ص ۱۸۰

''پیرموس'' یعنی ''بلند'' کہا جاتا تھا۔[1]

ب۔بابلی

گذشتہ متمدن قوموں میں سے ایک بابل کی قوم بھی تھی۔ان کے باقی ماندہ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بعدازمرگ کی زندگی اور معاد کے بارے میں راسخ العقیدہ تھے۔بعض مورخین کے بقول اسی دلیل کی بناء پر وہ لوگ اپنے مردوں کے اجساد کو چھت دار زمینوں کے نیچے سپرد خاک کرتے تھے۔اگرچہ مردوں کو مومیاتے نہ تھے۔لیکن غسل دینے کے بعد انہیں بہترین لباس پہناتے تھے۔رخساروں کو رنگین اور پلکوں کو سیاہ کرتے تھے۔ان کی انگلیوں میں انگوٹھیاں پہناتے اور اگر مردہ عورت ہوتی تو عطر کی شیشیاں، کنگھی، پاؤڈر اور بناؤ سنگھار کے مختلف تیل اس کی قبر میں رکھ دیتے تھے تاکہ اپنے چہرہ کی خوبصورتی اور خوشبو کو دوسرے جہان میں باقی رکھ سکے۔[2]

ج۔سومری

جنوبی عراق میں رہنے والی قدیم ترین متمدن قوموں میں سے سومریوں کا شمار ہوتا ہے۔''ویل ڈیورنٹ'' کے بقول یہ لوگ اپنے مردوں کے ساتھ اشیائے خوردونوش، آلات اور ہتھیار بھی دفن کرتے تھے۔

''ویل ڈیورنٹ'' اسی ضمن میں دوبارہ رقمطراز ہے کہ چونکہ سومری اپنے مردوں کے ساتھ غذائی مواد اور وسائل زندگی بھی قبر میں رکھتے تھے لہٰذا یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ دوسری دنیا کی زندگی پر اعتقاد رکھتے تھے۔[3]

د۔زرتشتی

فارس کے رہنے والے زرتشتی بھی دوسری قوموں کی طرح بعدازمرگ کی زندگی پر اعتقاد رکھتے تھے بلکہ اس زندگی کے بارے میں بڑی دقیق ترین جزئیات بیان کرتے تھے۔بہشت، دوزخ، پل صراط حتی کہ دوزخیوں کی درجہ بندی کے فرق سے متعلق ایسی تعبیرات کے حامل تھے کہ جو آج کے اعتقادات سے بہت زیادہ شباہت رکھتی ہیں۔

ویل ڈیورنٹ کے بقول وہ معتقد تھے کہ موت کے بعد دوزخ، ''تطہیرگاہ'' (اعراف) اور بہشت کا وجود پایا جاتا ہے۔تمام روحیں مجبور ہیں کہ موت کے بعد ایک ایسے پل سے گزریں کہ جو پلید اور پاکیزہ کو ایک دوسرے سے جدا کردیتا ہے۔

پاکیزہ روحیں پل کے ایک طرف سرزمین ''سرور'' میں جا اترتی ہیں.....اور اس ابدی جگہ پر ''اھورامزدا'' کے ہمراہ نعمتوں میں غرق

---

[1] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔جلد ا ص ۴۹

[2] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔جلد اول ص ۲۸۳ (خلاصۃً)

[3] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔جلد اول ص ۱۵۵

اورخوش بختی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔لیکن پلید ورحیں اس پل سے نہیں گزر سکتیں اور دوزخ کے گڑھوں میں جا گرتی ہیں۔جس قدر زیادہ انہوں نے گناہ کئے ہوں گے ان کی دوزخ کا گڑھا بھی اتنا ہی گہرا ہوگا۔[1]

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے بالکل ایسا ہی ہے کہ وہ لوگ بعد از مرگ کی زندگی کے بارے میں بیشتر اور دقیق تر جزئیات بیان کرتے تھے۔

ھ۔چینی

چینی بھی اپنے عقائد میں بعد از مرگ کی زندگی پر ایمان کا اظہار کرتے رہتے تھے۔''ویل ڈیورنٹ'' کہتا ہے کہ ان کے مذہب میں خداؤں کی مدد اور بہشت کے وصال کی امید دلائی گئی تھی۔''آمیتابا'' خدا بہشت کا حکمران جانا جاتا تھا۔(ممکن ہے یہاں پر خدا سے مراد فرشتہ ہو)۔[2] ایک اور جگہ پر ہم پڑھتے ہیں کہ وہ لوگ معتقد تھے کہ طبیعی موت مرنے والوں کی ارواح خواص میں شمار ہوتی ہیں اور اگر وہ صالح بھی ہوں تو تحائف،قربانیوں اور دیگر احترامات وتکلفات کے ساتھ آہستہ آہستہ بلند پایہ روحوں اور آلھه(فرشتوں) میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔[3]

و۔جاپانی

یہ لوگ بھی اس عقیدہ میں دوسروں کے ساتھ ہم صدا تھے۔جب مذہب بودھا جاپان پہنچا تو اس پر بدگمانی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔لیکن جلد ہی جاپان کے آسمان تلے یہ بادل چھٹ گئے اور نگہبان خداؤں (نگہبان فرشتوں)،خوش آئند رسوم.....اور آرام بخش بہشت نے بھی اس میں اپنی جگہ بنالی۔البتہ یہ آئین دیو اور دوزخ سے بھی محروم نہیں رہا۔[4]

اس ضمن میں دوبارہ ہم دیکھتے ہیں کہ''ماہایانا'' کا مذہب ایسی حالت میں جاپان پہنچا کہ جب اس کا مذہب بودھا سے کافی فاصلہ پیدا کر چکا تھا۔(لیکن پھر بھی یہ) تسلی بخش عقائد بہشت،دوزخ اور.....اپنے ہمراہ لایا۔[5]

ز۔یونانی

یہ لوگ بھی مختلف طریقوں سے بعد از مرگ کی دنیا کے بارے میں اپنے عقیدے کا اظہار کرتے تھے۔مثلاً ان میں سے ایک

---

[1] تاریخ ویل ڈیورنٹ۔جلد اول ص ۴۲۹

[2] تاریخ ویل ڈیورنٹ۔جلد اول ص ۸۵۱

[3] اسلام وعقائد وآراء بشری۔ص ۱۵۸

[4] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔جلد ا ص ۹۲۵

[5] اسلام وعقائد وآراء بشری۔ص ۱۸۴

گروہ ایسا بھی تھا کہ جو فقط اس لئے کہ ان کے مردے زیرِ زمین خوش باش رہیں کچھ مقدار میں اشیائے خورد ونوش، صفائی ستھرائی کی کچھ چیزیں اور اسی طرح عورتوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے ان کے ساتھ دفن کر دیتے تھے تا کہ سرائے ابدیت میں مردے ان کی تسلی خاطر اور نگہداری سے محروم نہ رہیں۔ [1]

ح۔ رومی

رومی بھی اس سلسلے میں کئی ایک طرح کی باتیں کرتے تھے۔ ''اتروسک'' کہ جو قدیم روم کے فرمانرواؤں میں سے ایک گروہ تھا، ان کے بنیادی ترین اعتقادات میں سے ایک یہ تھا کہ مردے کی روح زیرِ زمین ایک دنیاوی عدالت میں حاضر ہوتی ہے، جیسا کہ قبروں میں بنائی گئی تصاویر سے پتہ چلتا ہے، قضاوت کے آخری لمحات میں اپنی زندگی کے طرزِ عمل کے دفاع کے لئے اسے موقع ملتا ہے اور اگر اس دفاع اور جواب دہی میں پورا نہ اتر سکے تو مختلف قسم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے..... وہ کبھی کبھار مردوں کی قبر سخت پتھروں کے اندر ایک گھر کی صورت میں بھی بناتے اور زندگی کے تمام وسائل حتی کہ لباس، گلدان، اسلحہ، جواہرات، آئینہ اور لوازمات آرائش اس میں مہیا کرتے تھے۔ [2]

یونانی مورخ ''پلوتارک'' جو ۵۰ تا ۱۲۰ عیسوی تک زندہ رہا اور یونانی و رومی شخصیات اور ان کے عقائد سے متعلق کئی ایک کتابوں کا مصنف ہے، عقیدہ رکھتا تھا کہ ہمیں انسان کے ابدی اور جاوید ہونے، پاداش و جزا بخشنے والی بہشت، پاک کرنے والی برزخ اور سزا دینے والی دوزخ پر اعتقاد رکھنا چاہیے۔ [3]

۳۔ یہودی کتابوں میں عقیدۂ معاد [4]

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود و نصاریٰ موت کے بعد کی دنیا پر اعتقاد رکھتے تھے اور یہ مسئلہ ''عہد جدید'' کی کتابوں اور اناجیل میں

---

[1] ''یونان باستان'' ویل ڈیورنٹ۔ ج ۲ ص ۱۸

[2] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ۔ ج ۳ (قیصر و مسیح) ص ۹

[3] تاریخ ویل ڈیورنٹ۔ ج ۳ ص ۵۷۱

[4] یہودیوں کی مقدس کتابیں کہ جنہیں عہد عتیق کہا جاتا ہے، ۳۹ کتابوں پر مشتمل ہیں۔ جن میں سے ۵ کتابیں تورات کے پنجگانہ اسفار ہیں اور ۱۷ کتابیں مورخین کے مکتوبات کے نام پر ہیں۔ جیسا کہ ان کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بادشاہوں اور ملوک وغیرہ کے بارے میں مورخین کی لکھی گئی تحریریں ہیں۔ باقی ۱۷ کتابوں کو مکتوبات انبیاء کہا جاتا ہے کہ جس میں انبیاء کے حالات زندگی، احادیث، نصائح اور مناجات موجود ہیں۔ لیکن عیسائیوں کی مقدس کتابیں (عہد جدید) مجموعاً ۲۷ کتابوں سے زیادہ نہیں ہیں جن میں سے ۴ انجیلیں ہیں کہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں یا شاگردوں کے بھی شاگردوں کے وسیلے سے لکھی گئی ہیں۔ ۲۲ کتابیں پولس اور مسیحیت کی ان تمام بڑی شخصیات کے وہ خطوط ہیں کہ جو مختلف علاقوں میں بھیجے گئے۔ آخری کتاب یوحنا کے مکاشفات ہیں۔ اس میں اس کے مکاشفات کی تفصیل دی گئی ہے۔

بکثرت دیکھنے کوملتا ہے اگرچہ ''کتب عتیق''یعنی کتب یہود میں یہ مسئلہ کم دکھائی دیتا ہے۔

یہ تفاوت ''شاید'' اس وجہ سے ہے کہ یہودیٰ جیسا کہ ان کی پوری تاریخ سے آشکار ہے، یہ دنیا پرستی کی شدت اور حیاتِ مادی سے بہت زیادہ رغبت کی وجہ سے عقیدۂ معاد کو اپنے کاموں میں رکاوٹ کا باعث سمجھتے تھے۔ لہٰذا جب انہوں نے اپنے انبیاء کے آثار میں تحریف کا سلسلہ شروع کیا تو جہاں کہیں مادی زندگی کے بارے میں بات ہوئی اسے بطور احسن محفوظ کرلیا لیکن جہاں دیکھا کہ قیامت اور دنیا پرستوں اور ستم گاروں کی سزا کا ذکر ہے، اسے حذف کر دیا۔

قرآن مجید نے بھی ان کا تعارف کچھ اس طرح سے کروایا ہے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ (بقرہ ۹۶)

''اور تم انہیں (دیناوی) زندگی کے حریص ترین لوگوں میں سے پاؤ گے حتی کہ مشرکین سے بھی زیادہ حریص، اس طرح کہ ان میں سے ہر کوئی چاہتا ہے کہ ہزار سال زندہ رہے۔''

موت کے بعد کی دنیا کے مسئلے سے متعلق ''عہد قدیم'' کی کتب میں دکھائی دینے والی اس ساری بے توجہی کے باوجود ایسی واضح تعبیرات مل جاتی ہیں کہ جو ایک ایسی دنیا پر اعتقاد کے مسئلے کو بیان کرتی ہیں۔

مثلاً:

۱۔ کتاب ''اشعیای نبی'':

تمہارے مردے زندہ ہو جائیں گے اور مرے جسم کھڑے ہو جائیں گے۔[۱]

۲۔ کتاب اول ''سموئیل'':

خداوند مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے اور قبروں کے نیچے لے جاتا ہے اور پھر اٹھا لیتا ہے۔[۲]

۳۔ مزامیر ''داؤد'':

اگرچہ سایہ موت کی وادی میں بھی چلوں، برائی سے نہ ڈروں گا کیونکہ تو میرے ساتھ ہے، تیرا فضل و کرم میری ساری زندگی میں ہر طرح میرے ساتھ رہے گا اور خدا کے گھر میں تا ابدالآباد رہوں گا۔[۳]

---

[۱] کتاب اشعیا باب ۲۶ جملہ ۱۹

[۲] کتاب اول سموئیل باب ۲ جلد ۶

[۳] مزامیر داود مزبور ۲۳ جملہ ۴-۶

اسی طرح حضرت ''سموئیل''، ''اشعیا'' اور داؤد جیسے پیغمبروں نے بڑے واضح اشارات کے ساتھ قیامت کے بارے میں خبر دی ہے اگرچہ ایسی باتیں اور اس طرح کے دوسرے بیانات قوم یہود کے لئے خوشی کا باعث نہ تھے۔ شاید اسی بناء پر انہوں نے اس ضمن میں پائی جانے والی کئی ایک عبارات کو ختم کر دیا۔

بعض مورخین نے یہودی عقائد کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

وہ لوگ معتقد تھے کہ آخر کار یوم اللہ (روزِ جزا) میں مردے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ (نئے سرے سے زندگی شروع کریں گے)..... جلد ہی کوئی ایک نجات دینے والا آئے گا اور اس کی کامیابی کے ساتھ تمام اچھے کام کرنے والے قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور ابدی جگہ بہشت کی طرف چل پڑیں گے۔ [1]

یہی مصنف ایک دوسری جگہ پر زرتشتوں کے عقیدے سے متعلق اشارہ کرتے ہوئے یوں نقل کرتا ہے:

''مردے اٹھ کھڑے ہوں گے، مردہ جسموں میں جان پڑ جائے گی، سانس سینوں میں واپس لوٹ آئے گا، تمام عالم مادی بڑھاپے، موت اور تباہی و بربادی سے نجات پالے گا اور پھر ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

۴۔ اناجیل میں ذکر قیامت

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے موت کے بعد کی زندگی کے مسئلے پر مسیحیوں کی اناجیل میں نسبتاً زیادہ صراحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

مثلاً:

''انجیل متی'' کہ جو سب سے پہلی اناجیل میں سے ہے یوں گویا ہے:

''بنابرایں انسان کا بیٹا اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ نمودار ہوگا اور پھر اس وقت ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا دیں گے۔'' [2]

''انجیل یوحنا'' میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''..... وہ گھڑی بھی آئے گی کہ جب وہ سب کے سب جو قبروں میں ہیں اس کی آواز سنیں گے اور باہر نکل آئیں گے۔ وہ جنہوں نے نیکی کی ہوگی قیام حیات کے لئے اور جنہوں نے بدی کی ہوگی قیام جزاء کے لئے۔'' (قیام حیات سے مراد ظاہراً نعمت خدا کے سایہ میں حیات ابدی ہی ہے کہ جو صالح افراد کا صلہ ہے اور قیام جزا سے مراد بدکاروں کا خداوند قدوس کی عادلانہ قضاوت کے مطابق اپنے

---

[1] تاریخ تمدن ویل ڈیورنٹ، جلد ۳ ص ۷۶۳ (خلاصۃً)

[2] انجیل متی۔ باب ۱۶ جملہ ۲۷

کیفر کردار تک پہنچنا ہے۔)[1]

نتیجۂ بحث

متذکرہ بالا تمام بحث سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مذہبی وغیر مذہبی مورخین کے مطابق موت کے بعد کی زندگی پر اعتقاد قدیم ترین زمانے ہی سے موجود رہا ہے حتی کہ رسم الخط کے ایجاد ہونے اور قبل تاریخ ہی سے مختلف انسانی قوموں میں یہ عقیدہ موجود رہا ہے۔ ہر قوم و ملت نے اس مسئلے سے متعلق اپنے یقین کا اظہار اس طرح سے کیا ہے کہ یہ بات کا ملاعیاں ہوجاتی ہے کہ یہ اعتقاد قومیت، نسل پرستی، زبان اور کسی خاص علاقے کے رنگ میں نہیں رنگا ہوا تھا بلکہ تاریخ میں اور قبل از تاریخ بھی ایک عمومی اعتقاد کی حیثیت سے موجود رہا ہے۔

جیسا کہ معاد کے فطری ہونے کی بحث میں بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اس عمومی اعتقاد کا سرچشمہ یہی ہے کہ اس پر اعتقاد انسان کی سرشت وفطرت میں رچا بسا ہوا ہے اور یہ کہیں باہر سے القاء ہونے والا امر نہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یا قوموں کے بدل جانے سے بدل جائے۔

---

[1] انجیل یوحنا باب ۵ جملہ ۲۸ و ۲۹

ایمانِ معاد اور تربیت

اس میں شک نہیں کہ معاد پر ایمان انسانی اعمال میں گہری اور وسیع تاثیر کا باعث ہے۔ اصولاً انسان کے اعمال اس کے اعتقادات ہی کا انعکاس ہیں یا بالفاظ دیگر ہر انسان کا برتاؤ اس کے تصورِ کائنات سے مستقیما و براہِ راست مربوط ہے۔

اگر کسی کو پتہ ہو کہ اس کے تمام اعمال جلد ہی ایک ایسی عدالت میں پیش ہوں گے جس کے جج ہر چیز سے آگاہ ہیں، جہاں سفارش کام آئے گی نہ رشوت اور نہ ہی اس عدالت کے حکم پر تجدید نظر ہوگی، پھر اس کے مطابق صلہ پائے گا یا سزا یا دوسرے زاویہ نگاہ سے یہ کہ اس کے تمام اعمال محفوظ ہیں اور رنگ ابدیت میں رنگے ہوئے ہیں اور دوسری دنیا میں اس کے ہمراہ ہیں، اس کی عزت و آبرو یا شرمساری یا پھر آسودگی و سکون یا سزا کا باعث ہیں اور انہی کی بناء پر ابدی سعادت ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب، یقیناً ایسا فرد نہ صرف اپنی اصلاح و کوشش کرے گا بلکہ اپنے مختلف اعمال کی انجام دہی میں بہت زیادہ باریک بین اور سخت گیر ہوگا بالکل اسی طرح جیسا کہ ایک واقف حال شخص شفا بخش اور مسموم دوائیوں کے خواص سے آگاہ ہو تو ان کے بارے میں بہت حساس ہوتا ہے اور اپنی تمام تر کوشش کے ساتھ شفا بخش دوائیوں ہی کا انتخاب کرتا ہے اور اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ مسموم اور مہلک دوائیوں سے دوری اختیار کرے۔ یہی مسئلہ موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کی عدالت پر صادق آتا ہے۔

آیئے! قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور اس حقیقت کو بیان کرنے والی درج ذیل آیات کو گوش شنوا اور چشم بینا سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

(۱) فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ (کهف ۱۱۰)

(۲) وَيُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا وَّاَسِيۡرًا ﴿۸﴾ اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا ﴿۹﴾ اِنَّا نَخَافُ مِنۡ رَّبِّنَا يَوۡمًا عَبُوۡسًا قَمۡطَرِيۡرًا ﴿۱۰﴾ (دهر: ۸ تا ۱۰)

(۳) وَمَا لِىَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾ (یس: ۲۲)

(۴) قَالَ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً

كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ (البقرۃ: ۲۴۹)

(۵) قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِىْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا (طٰہٰ: ۷۲: ۷۳)

(۶) ..... يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِىْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ ..... وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾ (المدثر: ۴۰ تا ۴۶)

(۷) وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾ ..... اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ﴿۴﴾

(مطففین: ۱، ۴)

(۸) اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (توبہ: ۴۵)

(۹) اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ﴿۱﴾ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ﴿۲﴾

(ماعون: ۱، ۲)

(۱۰) بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿۵﴾ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿۶﴾

(قیامۃ: ۵، ۶)

(۱۱) اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۴﴾

(النمل: ۴)

(۱۲) وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِىْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ

(بنی اسرائیل: ۴۵، ۴۶)

ترجمہ

(۱) جو اپنے پروردگار سے ملاقات کی امید رکھتا ہے پس وہ عمل صالح انجام دے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

(۲) (اور (اپنا) کھانا (باوجود اس کے کہ خود اس کے نیازمند ہیں) اس کی (اللہ تعالیٰ) محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم تمہیں خدا کی خوشنودی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں اور تم سے کوئی صلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔ ہم اپنے پروردگار سے خوف زدہ ہیں اس دن کے بارے میں جو سخت اور شدید ہے۔

(۳) میں کیوں نہ اس کی عبادت کروں کہ جس نے مجھے خلق کیا ہے اور سب کے سب اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔

(۴) لیکن وہ تو جانتے تھے کہ خدا سے ملاقات کریں گے (اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے تھے)۔ انہوں نے کہا کتنے ہی ایسے چھوٹے گروہ (لشکر) ہیں کہ جو خدا کے حکم سے بڑے گروہوں (لشکروں) پر غلبہ پا گئے اور خدا صابرین (استقامت کرنے والوں) کے ساتھ ہے۔

(۵) انہوں نے کہا کہ ہم ہرگز تمہیں اس خدا پر کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے وہ روشن دلائل کہ جو ہم تک پہنچے ہیں مقدم نہ جانیں گے۔ جو حکم دینا چاہتے ہو دے لو چونکہ تم فقط اس دنیاوی زندگی ہی میں قضاوت کر سکتے ہو۔ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہیں تا کہ ہمارے گناہوں کو بخش دے۔

(۶) وہ بہشت کے باغوں میں ہیں اور سوال کرتے ہیں مجرمین سے: کس چیز نے آپ کو دوزخ میں بھیجا؟ کہتے ہیں ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور حاجتمندوں کو کھانا نہ کھلاتے تھے اور ہمیشہ اہل باطل کے ساتھ ہم نشین و ہم صدا تھے اور ہر وقت روزِ جزا کا انکار کرتے تھے۔

(۷) ہلاکت ہے کم تولنے والوں کے لئے، کیا وہ گمان نہیں کرتے کہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے یوم عظیم کو۔

(۸) فقط وہ لوگ تم سے اجازت لیتے ہیں کہ جو خدا اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

(۹) کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

(۱۰) (انسان کو قیامت میں شک نہیں ہے) بلکہ وہ تو چاہتا ہے (آزاد رہے اور) ساری عمر گناہ کرے۔ (لہٰذا) پوچھتا ہے قیامت کب ہوگی!

(۱۱) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے (برے) اعمال کو ان کے لئے زینت دیتے ہیں اس طرح کہ وہ سرگرداں ہو جاتے ہیں۔

(۱۲) اور جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے غیر مرئی حجاب قرار دے دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں تا کہ وہ سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں کو بہرہ کر دیتے ہیں۔ اور جب تم قرآن میں اپنے پروردگار کو وحدانیت سے یاد کرتے ہو تو تیری طرف پشت کر لیتے ہیں اور تم سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

تفسیر

اعمال صالح کا باعث، معاد پر ایمان

پہلی آیت میں آخرت پر ایمان اور عمل صالح کے درمیان نزدیک ترین رابطے کو منعکس کیا گیا ہے۔ فرمان خداوندی ہے: ''جو کوئی اپنے پروردگار سے ملاقات کی امید رکھتا ہے پس اسے چاہیے کہ عمل صالح انجام دے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔''

فمن كان يرجوا لقآء ربه فليعمل عملا صالحا ولا يشرك بعبادة ربه احدا

درحقیقت آخرت پر ایمان اس آیت کے مطابق انسان میں دو چیزوں کا باعث بنتا ہے، ایک عمل صالح اور دوسرا اخلاص عبودیت۔

جاذب توجہ یہ ہے کہ روزِ قیامت کو لقاء اللہ کا دن قرار دیا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دیدارِ معنوی اور شہودِ باطنی انسان کے تکامل کا بلند ترین مقام ہے اور اس کا ذکر اخلاص کامل اور عمل صالح کا باعث ہوسکتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ معاد پر یقین کے بجائے امید ورجاء کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ معاد کے بارے میں امید ورجاء بھی ایسے آثار کا منبع ہوسکتی ہے۔[1]

''یرجوا'' کہ جو فعل مضارع ہے استمرار اور کسی کام کے تسلسل پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد امر مطلق کی صورت میں اخلاص اور عمل صالح کا حکم، یہ سب اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ وہ امید اور یہ عمل، ہمیشہ اور دائماً ایک دوسرے کے دوش بدوش آگے بڑھتے ہیں۔

اس آیت مجیدہ کا یہ ظریف نکتہ بھی قابل استفادہ ہے کہ قرآن درحقیقت بندوں کو ایسے مسافروں سے تشبیہ دیتا ہے کہ جو کچھ عرصے کی جدائی اور دوری کے بعد اپنے محبوب سے جاملیں گے اور انہیں چاہیے کہ اس سفر سے لازماً کوئی نہ کوئی سوغات یا تحفہ لے کر جائیں اور کوئی ایسا کام انجام دیں کہ جو اس دیدار کے سزاوار ہوتا کہ دیدارِ یار سے شرمندہ نہ ہونے پائیں۔

بعض تفاسیر نے اس کے شانِ نزول میں بیان کیا ہے کہ ایک آدمی رسولؐ پاک کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں خدا کی راہ میں جہاد کرنے کو پسند کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میدانِ جہاد میں میرے مقام کا مجھے علم ہو۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (اور اخلاص کی تاکید کی گئی)۔

اسی آیت کی ایک اور شان نزول میں بیان کیا گیا ہے کہ کوئی شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ''اے رسولؐ خدا! میں صدقہ دیتا ہوں اور صلۂ رحم بجالاتا ہوں اور یہ کام فقط خدا کی رضا وخوشنودی کے لئے انجام دیتا ہوں۔ لیکن جب لوگ

---

[1] المیزان، ج ۱۳ ص ۴۰۶

میرے عمل کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اور ستائش کرتے ہیں تو خوش ہوتا ہوں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے اور کوئی بات نہ کہی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ [1]

ان شان نزول سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ عبادت اور عمل صالح کی بنیاد اخلاص کامل پر ہے، ایسا اخلاص کہ جس میں ریاکاری، خودنمائی اور شرک کا شائبہ تک نہ ہو۔

دوسری آیت اس معروف داستان کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو خاندانِ رسالت نے تین دن نذر کے روزے رکھے اور پھر اپنا افطار کا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو بخش دیا۔ اس واقعہ سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ اس بے مثال ایثار و درگزر کا سرچشمہ معاد پر ایمان ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''ہم تمہیں فقط خدا کے لئے کھانا کھلاتے ہیں اور تم سے کسی قسم کا صلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔ ہم اپنے پروردگار سے خوف زدہ ہیں اس دن کہ جو عبوس اور شدید ہے۔'' (اور بناء براسی دلیل کے ہم اس کی رضا کے حصول کے لئے جہاں تک ہماری قوت وطاقت ہے ایثار کرتے ہیں)۔

انما نطعمکم لوجه الله لا نرید منکم جزآء ولا شکورا۔ انا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطریرا۔ [2]

جی ہاں! جو خدا اور روزِ جزا سے ڈرتا ہے نہ صرف اپنی ضرورت سے زائد چیزیں اس کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے بلکہ وہ چیز بھی کہ جس کی اسے خود اشد ضرورت ہو اسے بھی اس بے مثل محبوب کی راہ میں دے دیتا ہے اور وہ بھی اخلاص کامل کے ساتھ، صلہ کا منتظر ہے اور نہ کسی کے زبانی اظہار تشکر کا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس عظیم دن پر ایمان خلوص نیت اور نیکیوں کی طرف متوجہ کرنے کا کس قدر طاقت ور محرک ہے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ گذشتہ آیت میں بات کی گئی ہے کہ قیامت کے بارے میں امید ورجاء عمل صالح اور اخلاص کے لئے موثر ہے اور یہاں اس دن سے خوف کو موثر قرار دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر امید وخوف دونوں اعمال کے بنیادی محرک ہیں۔

تیسری آیت میں اس مردِ مومن کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین رسولوں [3] کی حمایت میں انطاکیہ میں

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۶، ص ۴۱۰۹

[2] ''عبوس'' منہ بسورنا، تیوری چڑھانا کے معنی میں ہے اور ''قمطریر'' سخت اور شدید کے معنی میں ہے اور یہ جو روزِ قیامت کو اس سے تشبیہ دی گئی ہے کہ انسانوں کے چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے یا منہ بنے ہوئے ہوں گے، یہ انتہائی لطیف تعبیر ہے جو اس دن کی وحشت اور خوف کی خبر دیتی ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ ''قمطریر'' کا مادہ ''قمطر'' ہے اور بعض کے نزدیک اس کا مادہ ''قطر'' بروزن ''قفل'' ہے۔ لیکن مشہور پہلے والا ہی ہے۔

[3] مفسرین نے اس مردِ مومن کا نام حبیب نجار بتایا ہے اور بعض روایات میں ''مومن آل یاسین'' بھی نقل ہوا ہے۔ ان تین مسیحی پیامبروں کے نام ''شمعون''، ''یوحنا'' اور ''پولس'' بتائے جاتے ہیں۔

کھڑا ہوا اور وہاں کے لوگوں کو ان کی پیروی کی دعوت دی۔ وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہوئے یوں کہتا ہے:

وما لی لا اعبد الذی فطرنی والیه ترجعون

''کیونکر میں اس کی پرستش نہ کروں کہ جس نے مجھے خلق کیا اور سب نے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

درحقیقت اس نے اپنی اس بات میں پروردگار کی عبودیت کے لازم ہونے کی دو دلیلیں بیان کی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ ہمارا خالق ہے اور ہمارا تمام وجود ''علم''، ''دانش اور طاقت سب کچھ اسی سے ہے۔ دوسری دلیل یہ کہ آگے ایک اور دنیا ہے کہ سب وہاں پہنچیں گے، خدا اور اس کی عدالت میں لوٹ کر جائیں گے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ خلق کرنے اور نعمتوں کی بخشش کے مطلب کو خدا تعالیٰ اپنی طرف نسبت دیتا ہے اور قیامت میں واپس پلٹنے کو ان کی طرف کہ جو پہلے مرحلے میں شکر نعمت کی شکل میں اور دوسرے مرحلے میں مخالفین کو قیامت میں عذاب الٰہی کی دھمکی کی صورت میں ہے۔

معاد پر ایمان اور استقامت

چوتھی آیت میں بتایا گیا ہے کہ معاد پر ایمان میدانِ جہاد میں دشمن کے مقابلے میں مقاومت کرنے اور استقامت و پامردی میں کس قدر موثر ہے۔ بنی اسرائیل کے مومنین کے ایک گروہ کی زبانی بات کی گئی ہے کہ انہوں نے ''طالوت'' (ان کے لشکر کا خدائی کمانڈر) کی ہمراہی میں ستمگر بادشاہ ''جالوت'' کے خلاف قیام کیا۔ ایک سخت امتحان کے بعد ایک گروہ پیچھے رہ گیا اور صرف ایک چھوٹی سی اقلیت نے میدانِ جہاد میں قدم رکھا۔ پھر یہ اقلیت بھی دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ان میں سے بعض وحشت وخوف میں مبتلا ہو گئے اور کہنے لگے:

قالوا لا طاقة لنا الیوم بجالوت وجنوده

''آج ہم جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔''

اس گروہ کے مقابلے میں ان لوگوں نے کہ جو یہ جانتے تھے کہ خدا سے ملاقات کریں گے (اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے تھے) کہا: چہ بسا چھوٹے گروہ خدا کے حکم سے عظیم لشکروں پر غلبہ حاصل کر گئے اور خدا صابرین کے ساتھ ہے۔ (قال الذین یظنون انهم ملقوا الله کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن الله والله مع الصبرین)۔

کئی ایک مفسرین کے بقول ''یظنون'' کی تعبیر یہاں روزِ قیامت پر یقین'' کے معنی میں ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے چونکہ یہ اظہارِ خیال ایسے افراد کی طرف سے تھا جو مختلف امتحانات کی کسوٹی پر پرکھے جا چکے تھے اور راسخ ایمان کے ساتھ انہوں نے میدانِ جہاد میں قدم رکھا تھا۔

البتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ''ظن'' وسیع معنی کا حامل ہے جس میں یقین بھی شامل ہے۔ ''مفردات'' میں راغب کے بقول ''ظن'' اس اعتقاد کے معنی میں ہے کہ جو دلائل اور علامات سے حاصل ہو۔ جب کبھی قوی ہو تو علم پر منتہی ہوتا ہے اور اگر ضعیف ہو تو وہم کی

حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ''ظن'' یہاں اسی ''گمان'' کے معنی میں ہے۔لیکن (لقاء اللہ) یہاں قیامت کے معنی میں نہیں بلکہ راہ خدا میں شہادت کے معنیٰ میں ہے۔یعنی یہ بات ان لوگوں کی تھی کہ جنہیں پُر افتخار شہادت کا گمان تھا۔

لیکن یہ معانی بہت بعید دکھائی دیتا ہے کیونکہ چھوٹے گروہ کے بڑے پر غلبے سے اس کی کوئی مناسبت نہیں ہے علاوہ ازیں لقاء اللہ معمولاً آیات قرآن میں قیامت کے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ موت یا شہادت کے معنی میں۔

بہرحال یہ بات قطعی ہے کہ جو لوگ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ہرگز موت کو زندگی کا اختتام نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک برتر زندگی کا آغاز شمار کرتے ہیں ایسے اشخاص نہ فقط موت سے ڈرتے نہیں بلکہ شجاعت و جرات اور دلیری کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہیں۔

پانچویں آیت فرعون کے جادوگروں کی زبانی بیان کی گئی ہے جب وہ موسیٰؑ پر ایمان لائے اور فرعون نے ان کو بے رحمانہ قتل کی دھمکی دی تو انہوں نے بڑی صراحت کے ساتھ فرعون سے کہا:

فاقض ما انت قاض انما تقضی هذه الحیوة الدنیا انا امنا بربنا لیغفر لنا خطایانا وما اکرهتنا علیه من السحر واللہ خیر وابقی۔

''جو حکم دینا چاہتے ہو دے لو تم فقط اس دنیاوی زندگی ہی میں حکم دے سکتے ہو لیکن ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہیں تا کہ وہ ہمارے گناہوں کو اور وہ جو کچھ تم نے جادو کے ذریعہ ہم پر ٹھونسا ہے بخش دے اور خدا بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔''

اس جگہ قیامت پر ایمان اور دنیاوی زندگی کو حقیر جاننا اس بات کا باعث بنا کر فرعونی جادوگر انتی بڑی قربانی۔ایثار، اور درگذر کا مظاہرہ کریں اور فرعون کے تمام تر انعامات اور مادی فوائد و منافع کو پاؤں کی ٹھوکر ماریں اور غیر معمولی دردناک اور مختلف قسم کے شکنجوں سے بھرپور موت کا استقبال کریں۔جرات و ہمت اور شجاعت و بہادری کے ساتھ اس ظالم و سفاک طاغوت کی دھمکیوں کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں اور شجاعت کے ساتھ شربت شہادت نوش کریں۔

جی ہاں جب معاد پر ایمان کے شیریں شربت کے گھونٹ دل و جان کی گہرائیوں میں اتر جائیں تو پھر اس اس قدر شعلہ ور کر دیتے ہیں کہ کوئی بھی دھمکی اس کے مقابلے میں کارگر ثابت نہیں ہوتی اور پھر انسان کی نظر میں خدا اس کی دائمی نعمت اور آخرت کے علاوہ ہر چیز بے وقعت و ناچیز ہے۔

یہی طاقت ور شعلہ ور ایمان اس امر کا سبب بنا کہ کل کے گھٹیا مادی اور چاپلوس جادوگر آج کے قوی شجاع اور نہایت با استقامت

انسانوں میں تبدیل ہوجائیں۔[1]

الحیوۃ الدنیا (اس دنیا کی پست زندگی) کی اصطلاح ان لوگوں کے حیات جاویداوراس بہترین جہان پرایمان کی طرف ایک عمدہ اشارہ ہے۔

اس آیت کے بعدوالی آیات مزیدصراحت کے ساتھ ان لوگوں کے جہان آخرت، الٰہی عدالت بہشت، دوزخ بہشتیوں کے مختلف درجات۔مختلف قسم کی بہشتی نعمتوں اوران کے دوام پرایمان کوواضح کرتی ہیں۔

انکارمعادکے منفی نتائج

گذشتہ پانچ آیتوں میں معاداورموت کے بعدکی زندگی پرایمان کے مثبت آثارکومختلف جہات سے بیان کیا گیاہے چھٹی آیت سے معادپرایمان نہ رکھنے کے منفی آثارکومشخص کیاجارہاہے۔

یتسآء لون۔ عن المجرمین ماسلککم فی سقر۔[2]

جب بہشتی دوزخ کی طرف نگاہ کریں اورمجرموں کومختلف قسم کی سزاؤں میں دیکھیں گےتوان سے بڑے معنیٰ خیزانداز مین پوچھیں گےکہیں گے:''کس چیز نےتمہیں دوزخ میں پہنچایا''؟

دوزخی جواب دیں گےاوراپنے دوزخی ہونے کےعوامل کوخلاصتہً چارچیزوں میں بیان کریں گے:

ترک نماز،ضرورت مندوں کوکھانانہ کھلانااہل باطل کے ساتھ ہم نشینی اورروز جزاکودائماً جھٹلاتا۔(قالوا لم نك من المصلين ولم نك نطعم المسكين و كنا نخوض مع الخآئضين و كنا نكذب بيوم الدين)۔

ان آیات سے بخوبی پتہ چلتاہے کہ دوزخی اعمال میں مبتلا ہونے کےعوامل میں سے ایک اہم ترین عامل بلکہ ام الفسادواورعامل اصلی

---

[1] جملہ والذی فطرنا کی تفسیر میں دواحتمال ذکر کئے گئے ہیں پہلا یہ کہ جملہ قسم کے معنیٰ میں ہے جیسا کہ مندرجہ بالاتفسیر میں ہم نے ذکر کیا ہے دوسرا یہ کہ جملہ پہلے والے جملے پرعطف ہے۔ایسی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا ہم تمہیں ہرگز مقدم نہ جانیں گےاس روشن دلائل پر کہ جوہم تک پہنچے ہیں اوراس خداپر کہ جس نےہمیں خلق کیاہےلیکن پہلے والامعنیٰ لطیف دکھائی دیتاہے چونکہ پہلے والی چندآیات مین وہ فرعون کی عزت کی قسم کھاتے ہیں اوریہاں تمام انسانوں کے خالق کی!

[2] دراصل''سقر''(بروزن سفر)سقر (بروزن فقر) کے مادے سے لیا گیاہےجس کامعنیٰ ہےدگرگوں ہوجانا یادھوپ کی تپش کے زیراثر پگھل جانا مقائیس اللغہ کی طرح بعض نے اس کے معنی جلنےاورجلانے کے بھی کئے ہیں صحاح اللغہ نے کہاہے کہ آگ کے ناموں میں سے ایک نام ہے،بہرحال دوزخ کے لیےاس نام کاانتخاب اس لیے کیا گیاہے کہ تمام معانی اس میں جمع ہیں کتاب التحقیق مین کہا گیاہے کہ سقرخود آگ کانام ہےنہ کہ آگ والی جگہ جیسا کہ جہنم۔

یہی روز جزا کا جھٹلانا ہے کہ جو انسان کو غیر ذمہ دار مسئولیت سے عاری اور تقویٰ سے تہی دامن کر دیتا ہے

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ بہشتیوں نے یہ نہیں پوچھا کہ کیونکر خدا نے تمہیں دوزخ میں بھیجا بلکہ سوال یہ کیا کہ تمہیں جہنم بھیجنے میں کون سا عمل کارفرما تھا تا کہ اس طرح سے برے عقائد و اعمال اور ان کے ساتھ ہونے والے سلوک اور ورود جہنم کے درمیان موجود طبعی ارتباط کو واضح کریں۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ان چار عوامل میں سے سب سے پہلے ارتباط با خدا (نماز) کو ترک کرنے کا ذکر ہے اور اور پھر ستم رسیدہ مخلوق کے ساتھ رابطے کو ترک کرنے اور اس کے بعد اہل باطل کے ساتھ ہم نشینی (خوض مع الخائضین) اور آخر میں قیامت پر ایمان نہ رکھنے کا ذکر ہے۔

قیامت کے ناموں میں سے "یوم الدین" (روز جزا) کا ذکر اس حقیقت کی طرح اشارہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی طرف حرکت کا اصلی عامل قیامت کو روز جزا جاننا ہی ہے

ساتویں آیت مطففین (کم تولنے والوں) کے بارے میں بات کرتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ویل للمطففین..... الا یظن اولئك انهم مبعوثون لیوم عظیم یوم یقوم الناس لرب العلمین

ہلاکت ہے کم تولنے والوں کے لیے کیا انہیں یقین نہیں کہ یوم عظیم کو دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اس دن کہ جب سب لوگ رب العالمین کی بارگاہ میں کھڑے ہونگے۔

یہاں بھی ممکن ہے "ظن" یقین کے معنیٰ میں ہو یا پھر گمان ہی کے دوسرے مطابق اس واقعیت پر تاکید مقصود ہے کہ روز جزا اس قدر عظیم اور پر اہمیت ہے کہ اگر کسی کو اس دن کے وقوع کا گمان بھی ہو تو وہ غلط کام سرانجام دینے سے بچے گا چہ جائے کہ یقین رکھتا ہو۔

لیکن بہت سارے مفسرین نے پہلے معنیٰ کا انتخاب کیا ہے جیسا کہ قبل ازیں بقرہ آیت ۲۴۹ میں بھی بیان اور کیا گیا ہے اور روایات مین بھی اسی معنیٰ پر تاکید کی گئی ہے۔[1]

بہرحال ظن کو یقین کے معنی میں تفسیر کریں یا گمان کے ہر دو صورت میں یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ قیامت پر ایمان انسان کو ظلم اور لوگوں کے غصب حقوق کو ترک کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

---

[1] امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں "الظن ظنان! ظن شك وظن یقین، فما كان من امر المعاد من الظن، فهو ظن یقین وما كان من امر الدنیا فهو علی الشك ظن دو قسم کا ہوتا ہے شک والا ظن اور یقین والا ظن۔ جو کچھ قرآن میں معاد کے بارے میں بیان ہوا ہے یقین والا ظن ہے اور جو کچھ دنیا کے بارے میں ذکر ہوا ہے شک والا ظن ہے۔ (نور الثقلین، ج ۵ ص ۵۲۸ حدیث ۶) عبارت راغب میں بھی ذکر ہوا ہے کہ لفظ ظن دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

جب کوئی قطعی طور پر یہ جانتا ہو یا اس بات کا گمان بھی کرے کہ اسے ایک عظیم عدالت کا سامنا کرنا ہے کہ جہاں (مثقال ذرہ) نیک و بد کاموں کا محاسبہ ہوگا اور اس کی مناسب پاداش دی جائے گی اور ان کی تلافی یا واپسی کا کوئی راستہ نہ ہوگا تو یقیناً اس دنیا میں اپنے اعمال میں محتاط ہوگا اور یہی ایمان و یقین اس کی تربیت کرے گا۔

البتہ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ لوگ جو کم تولتے ہیں یا کسی اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں لازماً معاد پر ایمان نہیں رکھتے اور کافر ہیں۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ یا تو ان کا ایمان بہت کمزور ہے یا پھر وہ غفلت میں ہیں وگرنہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی انسان ایسے دن پر ایمان بھی رکھتا ہو اور پھر بھی خوابِ غفلت میں پڑا رہے اور اس طرح گناہوں میں غرق ہو جائے گا۔

ایمان معاد گناہوں سے بچاتا ہے

آٹھویں آیت میں ان لوگوں کی زبانی بات کی گئی ہے کہ جو جہاد کا حکم صادر ہونے کے وقت اس عظیم فریضہ الٰہی میں شرکت نہ کرنے کی غرض سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مختلف حیلے و بہانے تراشتے تاکہ پیامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں جائز طور پر معذور قرار دے کر میدانِ جہاد میں شرکت نہ کرنے کی اجازت دے دیں اور اس طرح یہ لوگ اس اہم فریضے سے سبکدوش ہو جائیں اور ظاہراً کسی گناہ کے مرتکب بھی نہ ہوں۔

قرآن کہتا ہے کہ روز قیامت اور خدا پر ایمان رکھنے والے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے کے لیے تم سے کبھی بھی رخصت نہیں مانگیں گے بلکہ جب جہاد کا حکم صادر ہو تو شوق سے میدان کی طرف چل نکلتے ہیں کیا انجام وظیفہ سے بھی رخصت چاہی جاتی ہے؟

اس کے بعد قرآن اضافہ کرتا ہے: صرف وہ لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں جو خدا اور روز جزاء پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے دل شک و شبہات سے بھرپور ہیں اور خود اپنے شک و تردد میں حیران و سرگرداں ہیں۔

انما یستاذنك الذین لایومنون باللہ والیوم الاخروار تابت قلوبھم فھم فی ریبھم یترددون۔

البتہ یہ فریضہ جہاد ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ با ایمان اور معاد کے معتقد افراد ہر جگہ عزم راسخ اور مضبوط و خلل ناپذیر ارادے کے ساتھ اپنی الٰہی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے کمر ہمت باندھتے ہیں۔ لیکن بے ایمان اور کمزور و متزلزل ایمان والے افراد خصوصاً منافقین ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ مختلف حیلہ و بہانہ کے ساتھ اس ذمہ داری کی انجام دہی سے بھی بچ جائیں اور یہ بھی ظاہر کریں کہ شریعت مقدسہ کے ظاہری قوانین کے مطابق وہ مستثنیٰ ہیں۔ مخلص مومنین اور چھپے ہوئے منافقین کے درمیان امتیاز کی یہ ایک اچھی علامت ہے۔

نویں آیت بڑی صراحت کے ساتھ ان لوگوں کے بارے میں بات کرتی ہے جو یتیموں کے ساتھ سختی کر کے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دے کر روز جزا کو جھٹلاتے ہیں ارشاد ہوتا ہے:

ارأيت الذى يكذب بالدين۔ فذالك الذى يدع اليتيم۔ ولا يحض على طعام المسكين۔

کیاتم نے اس شخص کونہیں دیکھا جو ہمشہ روز جزا کا انکار کرتا ہے؟ یہ وہی ہے جو تیتیم کو دھکے دیتا ہے اور مساکین کو کھانا کھلانے کی ہرگز دوسروں کو ترغیب نہیں دیتا۔

"یدع" "دع" (بروزن حد) کے مادہ سے ہے۔ دراصل یہ لفظ سختی اور غصے کے ساتھ دھکے دینا یا دھتکارنا کے معنیٰ میں ہے یحض "حض" کے مادہ سے دوسروں کو ترغیب دینا کے معنیٰ میں ہے۔ چونکہ یہ دونوں لفظ فعل مضارع کی صورتمیں مندرجہ بالا آیت میں ذکر ہوئے ہیں لہذا دوام واستمرار پر دلالت کرتے ہیں اور "طعام"، "اطعام" کھانا کھلانے کے معنی ہیں۔

"فذالك" کی فاء سببیت کے معنی میں ہے جو اس معنی پر روشن دلیل ہے کہ ان بُرے اور بداعمال کا اصلی سرچشمہ یہی روز جزا کا انکار کرنا ہے اور نہ فقط یتیموں کو محروم کرتے ہیں بلکہ سختی وشدت اور غصے کے ساتھ دھتکار دیتے ہیں۔ نہ فقط خود مساکین کی مدد نہیں کرتے بلکہ دوسرں کو بھی اس کام کی ترغیب نہیں دیتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دوسرونکے کار خیر میں رکاوٹ بنتے ہیں کیونکہ اپنے بُرے اعمال کی عاقبت سے نہیں ڈرتے۔

وہ خدا کی عدالت، حساب کتاب اور جزاوسزا پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہیں اس چندروزہ زندگی اور اس کے مادی لذائذ کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لہذا اسی سے دل لگا کر دوسری ہر چیز سے بیگانے ہوجاتے ہیں۔

"رویت" کے مادے سے "ارایت" کا جملہ ممکن ہے آنکھ سے مشاہدہ کرنے کی طرف اشارہ ہو یا پھر چشم دل (یعنی علم ومعرفت) سے مشاہدہ کرنا۔ بہرحال ہردومعنیٰ میں ارشاد ہوتا ہے: اگر روز جزا کے منکرین کو نہیں پہچانتے تو ان کی بڑی واضح نشانیاں ہیں جن میں سے ایک یتیموں کے بارے میں انکی بے رحمی اور سردمہری ہے اور دوسرا ان کا محرومین کے بارے مین بے اعتنائی برتنا۔ ان برے اعمال سے بآسانی انہین پہچان سکتے ہو اور معاد پر ایمان کی بنیاد نہ ہونے سے انکے وجود کا پتہ لگا سکتے ہو۔

مفسرین نے ان آیات کی مختلف شان نزول بیانکی ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ آیات ابوسفیان کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ وہ ہر ہفتہ دواونٹ ذبح کرتا تھا (لیکن صرف اپنے اور اپنے عزیز واقارب کیلیے) ایک دن ایک بھوکا یتیم اس کے پاس آیا اور اس سے کسی چیز کا تقاضا کیا تو ابوسفیان نے اپنے عصاء سے اس یتیم کو پیچھے دھکیل دیا۔ (اس موقع پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں)

فخر رازی نے "ماوردی" سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ ایک دن وہ یتیم عریاں وبرہنہ ابوجہل کے پاس آیا اور اپنے مال میں سے کچھ مطالبہ کیا تو اس نے یتیم کو سختی سے دھتکار دیا۔ قریش کے سرداروں نے اس مایوس یتیم بچے سے کہا: محمدؐ سے کہو کہ ابوجہل کے پاس تمہاری سفارش کرے۔ ان کا مقصد توہنسی مذاق اڑانا تھا۔ لیکن بچہ کہ جو اس نکتے کی طرف متوجہ نہ تھا رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ کبھی کسی نیازمند کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹاتے۔ اس بچے کے ہمراہ ابوجہل کے

ہاں پہنچے۔ابوجہل کو بہت تعجب ہوا۔بہرحال اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوخوش آمدید کہااور بہت زیادہ مال اس یتیم گئی دے دیا۔ قریش کے سرداروں نے اس کام پراس کی سرزنش کی اور کہا: کہیں ایسا تونہیں کہ محمدؐ سے محبت پیدا ہوگی ہو۔ابوجہل کہنے لگا خدا کی قسم ایسا ہرگز نہیں مجھے اس سے محبت نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے اس کے دائیں اور بائیں ایسا جنگی اسلحہ دیکھا کہ اس سے ڈر گیا اور خوفزدہ ہوگیا کہ اگر اس کی بات نہ مانی تو کہیں یہ میرے جسم کے اندر نہ اتار دے۔[1]

بہرحال آیت نمایاں طور پر ایمان معاد کی انسان کے اعمال پر تاثیر سے متعلق دلالت کرتی ہے۔

''موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کے حساب کتاب پر ایمان کے''اس دنیا میں انسان کے اعمال اور تربیتی مسائل'' کے مابین رابطے کو اسی رابطے کو اسی آیت میں ایک اور انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

بل تريد الانسان ليفجر امامه يسئل ايان يوم القيامة

(منکر معاد درحقیقت معاد میں شک نہیں رکھتا) بلکہ وہ چاہتا ہے (آزاد رہے اور) ساری عمر گناہ کرے۔(لہذا از روئے انکار) سوال کرتا ہے قیامت کب آئے گی۔

کس طرح ممکن ہے کہ انسان خدا کی قدرت اور اس کی ان تمام کرات۔کہکشاؤں اور عوالم عجیب کی خلقت کی توانائی پر تو ایمان رکھتا ہو اور اس کی مردوں کی زندہ کرنے کی قدرت سے منکر ہو؟

بنابرایں اس کا اس انکار سے مقصد کچھ اور ہے۔وہ چاہتا ہے کہ ہر قسم کی ہوس رانی۔ظلم وستم اور گناہ کے ذریعہ اپنے لیے آزادی حاصل کرے۔وہ اس طرح اپنے ضمیر کو دھوکا دینا چاہتا اور یہاں تک کہ مخلوق خدا کے سامنے مختلف حیلے بہانے تراشتا ہے وہ چاہتا ہے کہ معاد پر ایمان کی وجہ سے عصیان کی طغیانی کے سامنے وہ جو ایک بڑا بند بندھ جاتا ہے اسے توڑ ڈالے۔یہ فقط گذشتہ زمانوں پر ہی منحصر نہیں بلکہ آج بھی ایسا ہی ہے۔لہذا مادہ پرستی کی طرف میلان مبدا ومعاد کے انکار کی وجوہات سے مربوط بحثوں میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان وجوہات میں سے ایک علت یہ بھی بیان کی گئی ہے یعنی مسئولیت سے گریز کرنا الہیٰ قوانین کو توڑنا اور انسانی ضمیر کو دھوکا وفریب دینا۔

لفظ''انسان''اس آیت میں اسی انسان کی طرف اشارہ ہے کہ جس کے بارے میں سودہ دھر کے شروع میں گفتگو کی گئی ہے۔یعنی وہ انسان کہ جو قیامت کا منکر ہے اور خیال کرتا ہے کہ خدا بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اور ان ہڈیوں کو حیات مجدد بخشنے پر قادر نہیں۔المیزان کے بقول یہاں ضمیر کا استعمال نہ کرنا اور''کلمہ انسان''کو اسم ظاہر کی صورت میں تبدیل کرنا درحقیقت ایک قسم کی سرزنش وملامت ہے کہ کس طرح اس مقام انسانیت کے باوجود اس غلط راستے کو اپناتا ہے۔[2]

---

[1] تفسیر فخر ازی ج ۳۲ ص ۱۱۱ وروح البیان ج ۱۰ ص ۵۲۲

[2] تفسیر المیزان ج ۲۰ ص ۱۹۰

(یریدُ۔ یفجر) کا یہاں فعل مضارع (کہ جو معمولاً دوام واستمراری ہونے پر دلالت کرتا ہے) کی صورت میں استعمال اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خودخواہ غرض انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے دائمی فسق وفجور کو جاری وساری رکھے۔

"فجور" "فجر" کے مادے سے ہے اور کسی چیز کو وسیع پیمانہ پر چاک و پارہ کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے بنابرایں چونکہ گناہ پردہ دینداری کو چاک کرنے کا سبب بنتا ہے اسی لفظ فجور کا اس پر اطلاق کیا گیا ہے۔[1]

"امام" بروزن مقام دراصل اس سمت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے کہ جو آگے کی طرف واقع ہو اور جس کا متضاد خلف (پیچھے) ہے یا "امام" کے معنیٰ پیرو کے بھی ہیں۔ چونکہ ہمیشہ پیشرو کی طرف انسان کی توجہ رہتی ہے اس لیے اس کلمے کا اس پر اطلاق ہوا ہے چونکہ مادہ ام قصد کے معنیٰ میں ہے۔)

لیکن یہ واضح ہے کہ یہ لفظ یہاں پر زندگی کے مستقبل کی طرف اشارہ ہے اور بعض مفسرین کے بقول ظرف مکان ہے اور کنایۃً ظرف زمان کے لیے استعمال ہوا ہے۔[2]

درحقیقت مقصد یہ ہے کہ ہوس باز وہوس پرست انسان تمام عمر گناہ کرنے کی آزادی حاصل کرنے کی خاطر معاد کا انکار کراتا ہے۔

یہ جو بعض احباب نے احتمال ذکر کیا ہے کہ "امام" قیامت کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے انتہائی بعید دکھائی دیتا ہے کیونکہ نہ تو فجور کے کلمے سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی آیات کے درمیان پیوند کو مشخص کرتا ہے۔

معاد پر ایمان اور حق بینی

گیارہویں آیت میں یہی مسئلہ ایک نئی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

ان الذین لا یومنون بالاخرۃ زینا لھم اعمالھم فھم یعمھون

وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے برے اعمال کو ان کے لیے زینت بنا دیتے ہیں اس طرح کہ وہ بہکے اور بھٹکتے پھریں۔

جیسا کہ علمائے ادب اور علم اصول میں مشہور ہے کہ وصف حکم کی علت بنتا ہے یعنی کسی حکم کے لاگو یا صادر ہونے کی علت اصلی خود اوصاف ہی ہیں۔ بنابرایں اگر آیت میں انسان کے برے اعمال کی اس کی نگاہوں میں تزئین کو آخرت پر ایمان نہ رکھنے سے وابستہ کیا گیا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس لیے ایسے انجام میں مبتلا ہوگیا ہے۔ (غور کیجئے گا)

---

[1] مفردات راغب

[2] روح البیان، ج ۱۰ ص ۲۴۵۔ المیزان، ج ۲۰ ص ۱۹۰

ایک مختصر سی کوشش سے اس حقیقت کو جانا جا سکتا ہے کہ آخرت پر ایمان یعنی ایسی عدالت پر ایمان کہ جس کا قاضی خدا ہے اور جس کے گواہ فرشتے ہیں اور جہاں، دھوکہ دہی، سفارش اور رشوت پھٹک نہیں سکتی، ایسی عدالت پر ایمان انسان کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے اعمال (جیسا کہ وہ ہیں) کی واقعیت اور حقیقت کا مطالعہ کرے۔

لیکن اس عقیدے سے جدائی و بیگانگی اور نیکی و بدی کے مفاہیم کو تبدیل کرنے میں آزادی کا احساس اس بات کا باعث بنتا ہے کہ خود خواہ اور خود غرض انسان اپنے آپ کو دوسروں کو فریب دینے کے لیے مختلف حیلے اور بہانے تراشے، اپنی سرکش ہوس کو اصلاح و تقویٰ کا رنگ دے اور برائیوں کو بصورت پیرائے میں جلوہ نمائی کرے کہ جس کا حاصل حیرت و سرگردانی ہے (جیسا کہ تفریح سے پتہ چلتا ہے جو کہ سببیت پر دلالت کرتی ہے اور یہ اس عظیم عدالت الٰہی کے انکار کے خطرناک نتائج میں سے ایک ہے

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں تزیین اعمال کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے درحالیکہ قرآن مجید کی دیگر آیات میں (تقریباً آٹھ مواقع پر) یہی نسبت شیطان اور ہوئے نفس کی طرف دی گئی ہے اور کئی ایک دوسری آیات (تقریباً دس مواد پر) اعمال کو زینت دینے کی نسبت فعل مجہول یعنی زین (مزین کر دیا گیا ہے) کی صورت میں بیان ہوئی ہے۔ اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب تعبیرات ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں اگر نسبت خدا کی طرف ہو تو یہ اس لیے ہے کہ وہ مسبب الاسباب ہے۔ کسی موجود کے جو بھی آثار ہوں بالآخر خدا پر منتہی ہوتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ خدا نے روز قیامت کے انکار اور برے اعمال کے تکرار میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ اس طرح کے اعمال انسان کو خوبصورت دکھائی دیتے ہیں اور اس سے نیک و بد کی تمیز چھن جاتی ہے۔

اگر نسبت خدا کی طرف ہو تو یہ اس لئے ہے کہ وہ مسبب الاسباب ہے۔ کسی موجود کے جو بھی آثار ہوں بالآخر خدا پر منتہی ہوتیہیں، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ خدا نے روزِ قیامت کے انکار اور برے اعمال کے تکرار میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ اس طرح کے اعمال انسان کو خوبصورت دکھائی دیتے ہیں اور اس سے نیک و بد کی تمیز چھن جاتی ہے۔

اگر یہ نسبت ہوئے نفس اور شیطان کی طرف دی گئی ہو تو اس لیے کہ برے اعمال کو زینت دینے کی نزدیک ترین اور براہ راست علت یہی ہیں۔

جب کہ بعض مواد پر فعل مجہول کی صورت میں یہ نسبت ذکر ہوئی ہے تو یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ انکار قیامت اور برے اعمال کے تکرار کی طبیعت ایسا تقاضا کرتی ہے۔ سب سے پہلے انسان ان سے رغبت پیدا کرتا ہے اور پھر ان سے عشق کرنا شروع کر دیتا ہے اور بعد ازاں نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ یہ انسان کی آنکھوں کو بھانے لگتے ہیں۔

یہ بات بدیہی ہے کہ اس تزیین اعمال کا نتیجہ گمراہی و ضلالت کی وادی میں ہمیشہ کی سرگردانی اور دائمی حیرت ہے کیونکہ انسان جب تک کسی کام کی برائی اور بدی کو تشخیص نہ دے اس کام سے جدا نہ ہوگا۔

جو کچھ گزشتہ سطور میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا ان کے اچھے اعمال کو ان کی نظروں میں اس طرح زینت دیتا ہے کہ وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور آخر کار اس غرور کے پیچھے سرگرداں۔

یہ کوئی مناسب تفسیر دکھائی نہیں دیتی چونکہ وہ برے اعمال کو زینت دینے کی خدا کی طرف نسبت کو حل نہ کر سکے اس لیے ایسی خلاف ظاہر تفسیریں کرنے لگے۔

مورد بحث بارہویں اور آخری آیت میں پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمایا جارہا ہے:

واذا قرأت القران جعلنا بينك و بين الذين لايومنون بالاخرة حجابا مستورا۔

جب تم قرآن کی تلاوت کرتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے غیر مرئی پردے ڈال دیتے ہیں۔

مزید ارشاد ہوتا ہے:

وجعلنا على قلوبهم اكنة ان يفقهوه وفى اذانهم وقرا۔

اور ہم ان کے کان بہرے کر دیتے ہیں اور دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں تا کہ وہ سمجھ نہ سکیں۔

دوبارہ یہاں پر وصف کی بناء پر حکم کے صادر ہونے کا مسلہ درپیش ہے یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مشرکین کے درمیان حجاب معنوی کا وجود مشرکین کے دلوں پر پردے پڑنے اور ان کے کانوں کا طاقت شنوائی سے محروم ہو جانا یہ سب کچھ ان مشرکوں کے آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی بنا پر ہے اس سے یہ بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ان پردون کے پڑنے اور حقائق کے ادراک سے محروم ہونے کا سبب اس عظیم عدالت پر ایمان نہ رکھنا ہی ہے۔ اس کی دلیل بھی اظہر من الشّمس ہے کہ حساب و کتاب اور جزائے اعمال کی طرف عدم توجہ انسان کو خود غرضی، غرور، تعصب، نفس پرستی اور ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر سوار کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ انسان حقائق کو جیسے کہ وہ ہیں سمجھ سکے اور ان پر ایمان لے آئے۔

ہوائے نفس کے بدترین پردوں سے بڑھ کر اور کیا پردے ہوں گے؟ اور خود پرستی و غرور کی بدترین سواری سے بڑھ کر اور کیا سواری ہوگی؟

بعض مفسرین نے کہا کہ ''حجاب مستور'' سے مراد دکھائی نہ دینے والے پردے اور دیوار ہے کہ جو خداوند کریم قرآن مجید کی تلاوت کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مشرکین کے درمیان حائل کر دیتا تھا تا کہ وہ پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ دیکھ سکیں اور نہ کوئی اذیت پہچائیں اسی ضمن میں بعض شان نزول بھی نقل کی گئی ہیں۔

لیکن آیت کا ظاہراً تفسیر کی نفی کرتا ہے چونکہ آیت گویا ہے کہ یہ حجاب و پردے قرآن کے لطیف نکات اور حقائق کے فہم و ادارک میں رکاوٹ ہیں لہذا ہمیں قبول کرنا پڑے گا کہ اس ''حجاب مستور'' سے مراد وہی حجاب معنوی ہے کہ جو خود غرضی، متعصب اور ہوس پرست مشرکین کے دلوں، کانوں، اور آنکھوں پر پڑے ہیں اور انہیں قرآن کے اعلیٰ مفاہیم کے ادارک سے روکتے ہیں۔

یہ وہی بات ہے کہ جس کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارہ ہوا ہے اور ہم نے اس بحث کو جلد اول میں معرفت شناخت کے موانع کے زیر عنوان بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔[1]

سورہ نحل کی آیت ۲۲ میں بھی اسی معنیٰ کے مشابہ ارشاد ہوتا ہے کہ

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ﴿۲۲﴾

''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل حق کا انکار کرتے ہیں اور تکبر کرتے ہیں''

یہاں پر بھی حق کا انکار کرنے اور اس کے مقابلے میں تکبر کرنے کی اصلی وجہ ''آخرت پر ایمان نہ رکھنا'' ہی بیان کی گئی ہے۔

نتیجہ بحث

متذکرہ بالا بارہ آیات (اور اس سے مشابہ دوسری آیات) سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک طرف تو آخرت (دوسری دنیا میں عدالت الٰہی) پر ایمان، بیداری، آگاہی، تقویٰ اور اصلاح نفس کا سبب بنتا ہے اور اسی طرح گناہ اور ظلم وستم کے ارتکاب سے خوف کا باعث بنتا ہے اور دوسری طرف اس امر پر ایمان نہ لانا حقائق سے دوری، حق کے مقابلے میں غرور وتکبر برتنے اور گناہوں اور فسق وفجور کے دریا میں غرق ہو جانے کا باعث بنتا ہے۔

بنابریں قرآن کی نگاہ میں انسانوں کی تربیت میں معاد پر ایمان کی انتہائی غیر معمولی اور عمیق تاثیر کا ملا مشخص ہو جاتی ہے۔

توضیحات

۱۔ قیامت پر ایمان کے غیر معمولی اثرات

''مراقبہ اور محاسبہ'' تربیت کے دو اہم عوامل ہیں۔ مراقبہ کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ انسان جان کہ کے کوئی اس کی نگرانی کرنے والا ہے اور ہر وقت اس کے افعال کو زیر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اندرونی بھید بھی اس پر آشکار ہیں۔

اس امر کی طرف توجہ انسان کو ہمیشہ ایک بیدار باش حالت میں رکھنے کا باعث بنتی ہے ''محاسبہ کی طرف توجہ اور یہ کہ تمام اعمال چھوٹے سے بڑے تک اور نیک وبد کا حساب کتاب ہوگا اور ہر ایک کے ساتھ عادلانہ برتاؤ ہوگا یہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان مختلف کام انجام دینے میں اپنے آپ کو مطلقاً آزادانہ سمجھے اور کسی بھی کام کو معمولی اور حقیر نہ جانے، جیسا کہ حساب کتاب اور نگرانی سخت اور باریک بینی کے

---

[1] ''حجاب'' کے ساتھ ''مستور'' کی صفت کو بعض اوقات اس کے ظاہری معنی میں لیا گیا ہے یعنی ''غیر مرئی حجاب'' اور بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ ''اسم مفعول یہاں پر اسم فاعل کے معنی میں ہے۔'' لہٰذا ''مستور'' کے معنی ہوئے ''ساتر'' یعنی چھپانے والا، پردہ پوشی کرنے والا۔

ساتھ ہے ایسے ہی اسے بھی اپنے کاموں کے انجام دینے میں دقیق اور سخت ہونا چاہیے۔

آج کل بعض ممالک میں بڑی سڑکوں اور ان پر گاڑیوں کی نقل وحرکت کو مخفی کیمروں کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ٹریفک پولیس والے اپنے مرکز میں بیٹھ کر بڑے دقیق انداز سے ان کی نگرانی کرتے ہیں اور خلاف ورزی کرنے والی گاڑیوں کو موبائل پولیس والوں کے ساتھ (وائرلیس کے ذریعے) رابطہ کرکے یا پھر مختلف چوکیوں پر روک لیا جاتا ہے اور جرمانہ کردیا جاتا ہے۔

اس نگرانی اور اس جرمانی کی طرف توجہ اس امر کا سبب بنتی ہے کہ سڑکوں پر حتیٰ کہ بیابانوں میں بھی نظم وضبط کی حکمرانی ہو۔

جہاں یہ انسانی نگرانی اور حساب کتاب کہ جو غلطی سے مبرا نہیں اس قدر گہرا اثر رکھتا ہے تو پھر خداوند کہ جو اندرونی اور بیرونی تمام اسرار سے آگاہ ہے اس کی دائمی نگرانی پر ایمان اور اس عدالت پر ایمان کہ جہاں ''مثقال ذرہ'' کا بھی حساب ہوگا اور جہاں کسی بھی قسم کی نافرمانی اور سفارش نہ چلے گی، اس ایمان) کی انسان کے اندر گہری تاثیر بدرجہ تم آشکار ہے۔

واضح ہے کہ یہ بات تدریجاً فعل کی صورت سے عادت میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر عادت سے ملکہ حاصل ہوجانے تک جا پہنچتی ہے اور یہ حقیقت کہ جس کا نام ''وجدان اخلاقی'' اور تقویٰ الٰہی'' ہے باایمان انسان میں راسخ ہوجاتی ہے۔

درحقیقت عدالتوں کے وجود، معمولی سزاؤں اور اسی طرح عام ترغیب دلانے اور صلہ ادا کرنے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ نظم وضبط برقرار ہو قانون کی حکمرانی ہو اور تربیت انسان کا سبب بنے اس فرق کے ساتھ کہ اس دنیا کی معمولی عدالتوں میں تجدید نظر ہوسکتی ہے اور بیشتر عدالتوں میں رشوت اور سفارش کی خرابی چل جاتی ہے علاوہ ازیں قوانین کی پیچیدگیاں، تاویلات، استثنات اور جھوٹی اسناد بہت موارد میں اس بات کا سبب بنتی ہیں کہ مجرم عدالت کے چنگل سے فرار حاصل کرلے اور بعض اوقات مجرم عدالتوں کے تکلفاتی مسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی سزا کو سالوں موخر کروالیتے ہیں۔لیکن قیامت کی عدالت ان خامیوں میں سے کسی ایک کی بھی حامل نہیں۔ بلکہ جیسا کہ بعد میں اشارہ کیا جائے گا وہاں پر سزا و جزاء چیزوں کے طبیعی آثار اور خواص کے ساتھ زیادہ شباہت رکھتی ہے۔آیا کسی شفا بخش دوائی یا ہلاک کنندہ زہر کے اثر کو جھوٹی اسناد، سفارش اور رشوت کے ذریعے تبدیل کیا جاسکتا ہے؟

یقیناً ایک ایسی عدالت پر ایمان انسان کی پاکیزگی اور تربیت میں دنیا کی معمولی عدالتوں کی نسبت زیادہ موثر ہے۔

دوسری طرف یہ کہ ایسی عدالت پر ایمان انسان میں فداکاری اور ایثار کی روح زندہ کردیتا ہے کیونکہ:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ

وہ جو کچھ تمہارے پاس ہے فنا ہوجائے گا اور وہ جو کچھ خدا کے ہاں ہے باقی رہنے والا ہے۔(نحل ۹۶)

اس آیت کے مطابق اس دنیا کی زندگی ناپائیدار، فانی، اور جلد ختم ہوجانے والی ہے جب کہ وہ جو کچھ اس جہان کے لیے ذخیرہ کیا جائے گا وہ پائیدار اور جاوداں ہوگا۔کون عاقل ہے کہ جو ''متاع قلیل'' کے مقابلے میں ''مواہب کثیر'' بلکہ لامحدود کا انکار کرے؟ یہی وجہ ہے کہ معاد پر ایمان مختلف قسم کے انفاق (راہ خدا میں مال خرچ کرنا) ایثار اور درگذشت کا سرچشمہ ہوسکتا ہے۔

تیسرا یہ کہ یہ ایمان انسان میں شجاعت و دلیری اور صبر و استقامت کی روح پھونک دیتا ہے۔ موت سے وہی ڈرتا ہے جو یہ کہے ان هی الاحیاتنا الدنیا (اس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں) لیکن وہ جو معتقد ہے کہ وان الدار الاخرة لهی الحیوان (حقیقی زندگی تو فقط دار آخرت ہی میں ہے)[1] اسے موت سے کیا ڈر؟!

وہ جو راہ خدا میں شہادت کو اس کے جوار رحمت میں پہنچنے کا دروازہ سمجھتا ہو اور بہشت کی با قابل تعریف نعمتوں اور اس کی قربت کے مقام تک پہنچنے کا ایک راستہ جانتا ہو کس طرح ممکن ہے کہ وہ راہ خدا میں اپنی جان و مال فدا کرنے سے دریغ کرے، یا دشمن کے لشکر سے ہراساں ہو؟

یہ جو صدر اسلام کی جنگوں میں اور خود ایران عراق کی ٹھونسی گئی حالیہ جنگ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی فوج کے دلیر سپاہی بے مثال استقامت اور تعجب انگیز شجاعت کا مظاہرہ کرتے تھے اور دشمن کے وسائل اور لاؤلشکر کی برتری کے باوجود ان پر غلبہ حاصل کر لیتے تھے اس کا راز یہی ہے کہ معاد پر ایمان انہیں ایک اور ہی قسم کا انسان بنا دیتا ہے، ایک ایسا انسان جو موت سے ہرگز نہیں ڈرتا اور راہ خدا میں شہادت کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا ہے۔

مختصر یہ کہ جتنا زیادہ ہم اس رابطے (معاد پر ایمان اور انسانی تربیت کا رابطہ) کے متعلق سوچیں اتنا ہی زیادہ اس کی اہمیت سے واقف ہوتے چلے جائیں گے اور اصولاً جیسا کہ بارہا یہ کہا گیا ہے متعدد آیات قرآن میں اس کا ذکر اسی مطلب کی خاطر ہے۔

ممکن ہے کہا جائے کہ وہ جو کچھ بھی آپ نے کہا ہے ''عمل'' اور ''ایمان'' کے درمیان رابطے کو مشخص کرتا ہے نہ کہ ''اخلاق'' اور ''ایمان'' کے رابطے کو۔

لیکن جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے ''عمل'' تکرار کی وجہ سے پہلے تو ''حالت'' اور پھر ''عادت'' اور بعد ازاں ''اخلاقی ملکے'' کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۲۔ معاد کا تربیتی اثر روایات کی نظر میں

نہ فقط آیات قرآن بلکہ روایات اسلامی میں بھی اس موضوع کی وسیع پیمانہ پر بازگشت سنائی دیتی ہے جس سے ان دونوں کے درمیان دائمی عمیق اور گہرا رابطہ آشکار ہوتا ہے نمونے کے طور پر درج ذیل روایات کی طرف توجہ فرمائیں۔

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

والله لان ابیت علی حسك السعدان مسهدا، اذا جر فی الاغلال مصفدا،
احب الی من ان القی الله ورسوله، یوم القیمة ظالما لبعض العباد

---

[1] عنکبوت ۶۴

وغاصبا لشیء من الحطام

خدا کی قسم! اگر راتیں جان گھلا دینے والے ''سعدان''[1] کے کانٹوں پر بسر کروں اور دن کو مجھے طوق و زنجیر میں باندھ کر گھسیٹا جائے یہ میرے لیے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ روز قیامت خدا اور رسول اللہؐ سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو اور دنیا کے مال میں سے کچھ غصب کیا ہو۔[2]

ان جملوں کے بعد حضرت علی علیہ السلام اپنے بھائی عقیل کے مشہور واقعے کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو فقر و پریشانی کی شدت کی وجہ سے آپؑ کے پاس آئے اور تقاضا کیا کہ اسلامی عدالت کے قانون کے برخلاف بیت المال سے ان کے حصے میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔

لیکن امام علیہ السلام نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو آگ میں تپایا اور انکے جسم کے نزدیک لے گئے۔ جب حضرت عقیل کی چیخیں بلند ہوئیں تو ان سے فرمانے لگے! تم اس لوہے کے ٹکڑے سے چیخ اٹھے ہو جسے ایک انسان نے ہنسی مذاق میں (بغیر جلانے کی نیت کے) تپایا ہے اور تم مجھے اس آگ کی طرف کھینچ رہے ہو جسے خدائے جبار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے۔[3]

معاد پر ایمان کی لرزا دینے والی طاقت و رموجین اور عدل قائم کرنے میں ان کی تاثیر اور ہر قسم کے گناہ اور انحراف کے مقابلے میں استقامت ان چند مختصر جملوں میں اظہر من الشمس ہے اور انسانی اعمال میں الہیٰ عدالت اور قیامت پر ایمان کی تجلی کا ایک زندہ نمونہ ہے۔

۲۔ مولائے متقیان حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من ایقن بالخلف جاد بالعطیة

''جسے عوض کے ملنے کا یقین ہو وہ عطیہ دینے میں دریا دلی دکھاتا ہے''۔[4]

اس حدیث سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ معاد پر ایمان انسان کو دریا دل فیاض، اور سخاوت مند بنا دیتا ہے۔

۳۔ غرر الحکم میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے اس سے زیادہ صراحت اور واضح عبارت کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

اجعل همك لمعادك تصلح

---

[1] ایک قسم کی خاردار جھاڑی جسے اونٹ چرتا ہے۔ (مترجم)

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴ (مولانا مفتی جعفر حسین مرحوم کے ترجمہ میں یہ عبارت خطبہ ۲۲۱ میں موجود ہے۔ (مترجم)

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴ (مولانا مفتی جعفر حسین مرحوم کے ترجمہ میں یہ عبارت خطبہ ۲۲۱ میں موجود ہے۔ (مترجم)

[4] نہج البلاغہ ۱۳۸ (چھوٹے چھوٹے حکیمانہ جملوں میں سے) بحار الانوار ج ۷۴، روضۂ بحار ص ۳۸۵

''اپنے غم کو اپنی قیامت پر چھوڑ دو تا کہ صالح ہو جاؤ''۔[1]

۴۔معرکہ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے روز عاشورا خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

صبرا بنی الکرام فما الموت الا قنطرہ تعبر بکم عن البوس والضرآء الی الجنان الواسعة والنعیم الدآئمة فایکم یکرہ ان ینتقل من سجن الی قصر

''استقامت کرو اے کرامت مند فرزندو! کیونکہ موت (شہادت) تو فقط ایک ایسا پل ہے جو سختیوں اور تکالیف سے جنت کی ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی نعمتوں اور وسیع باغوں کی طرف منتقل کرتا ہے آپ میں سے کون ہے جو اس زندان سے اس محل میں منتقل ہونے سے ناراحت ہو؟''

یہ گفتگو امام حسین علیہ السلام نے اس وقت فرمائی جب امام اور ان کے سپاہیوں کے محاصرے کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہو رہا تھا۔ میدان جنگ کی مشکلات بہت بڑھ گئی تھیں لیکن دوسری طرف چہرے دمک رہے تھے اور حالات پر سکون تھے۔

اسی مقام پر امام علیہ السلام کے جانثار ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے اور کہتے:

انظر والا یبالی بالموت

''دیکھو! وہ تو موت کی پرواہ ہی نہیں کرتا اور اسے اس کا کوئی خوف ہی نہیں۔''

امام علیہ السلام نے جب یہ بات سنی تو متذکرہ بالا گفتگو کے بعد فرمایا: میرے والد نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل کیا:

ان الدنیا سجن المومن وجنة الکافر، الموت جسر هولآء الی جنانهم وجسر هولآء الی جحیمهم ما کذبت ولا کذبت

''دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے اور موت پل ہے پہلے گروہ کے لیے بہشت کی طرف اور دوسرے گروہ کے لیے پل ہے دوزخ کی طرف۔ (یہ ایک حقیقت ہے) نہ میں جھوٹ بولتا ہوں اور نہ مجھ سے جھوٹ کہا گیا ہے۔''[2]

---

[1] غرر الحکم۔ میزان الحکمۃ جلد اول ص ۳۷ حدیث ۱۳۳

[2] بحار الانوار ج ۴۴ ص ۲۹۷ (باب فضل الشهداء معه وعلة عدم مبالاتهم بالقتل) مرحوم صدوق نے کتاب ''معانی الاخبار'' میں باب ''معنی الموت'' میں اس حدیث کو حضرت امام علیؑ بن الحسینؑ سے نقل کیا ہے۔ ص ۲۸۸

تاریخ میں سنہری حروف سے ثبت ہونے والے معرکہ کربلا اور امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی بے نظیر شجاعت کے راز کو اگر تلاش کرنا چاہیں تو آخرت کی زندگی جاوید اور معاد پر ان کے قوی اور مستحکم ایمان میں ڈھونڈیں۔

۵۔اعمال کے اچھے ہونے میں معاد پر ایمان کی تاثیر اس قدر آشکار اور روشن ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام تعجب کرتے ہیں اس شخص پر کہ جو آخرت پر تو ایمان رکھتا ہے لیکن اپنے اعمال کو اچھا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

عجبت لمن یعلم ان للاعمال جزآء کیف لایحسن عمله [1]

۶۔اس گفتگو کو بانی اسلام پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پر تمام کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل یقین کی علامات اور نشانیاں بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کی علامات میں سے یہ ہے کہ:

ایقن بان الجنة حق فاشتاق الیها، وایقن بان النار حق فظهر سعیه للنجاة منها، وایقن بان الحساب حق فحاسب نفسه۔

وہ جنت پر ایمان رکھتے ہیں۔اسی لیے اس کے مشتاق ہیں (اور اسے پانے کے لیے نیکیاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اور جہنم کی آگ پر یقین رکھتے ہیں لہٰذا اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں (گناہوں کے پیچھے نہیں بھاگتے) اور یقین رکھتے ہیں کہ روز قیامت کا حساب حق ہے اسی لیے اپنا محاسبہ کرتے ہیں (قبل ازیں کہ انکا محاسبہ کیا جائے)۔[2]

اس ضمن میں احادیث بہت زیادہ ہیں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے ان احادیث کا عشر عشیر بھی نہیں۔البتہ یہ تمام احادیث سرائے آخرت پر ایمان کے انسانی تربیت میں گہرے نقوش ثبت کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔

۳۔ایمان آخرت اور آسودگی حال

موت کے بعد کی زندگی پر اعتقاد نہ صرف تہذیب نفوس۔اخلاص قلوب پرورش، اخلاق اور پاکیزگی اعمال میں موثر ہے بلکہ اسی دنیاوی زندگی میں انسانی صحت وسلامتی اور فلاح وبہبود میں بھی انتہائی موثر ہے۔

ہم جانتے ہیں وہ اہم ترین چیز کہ جس کی وجہ سے انسان مختلف درد ورنج میں مبتلا ہوتا ہے۔جو انسانی زندگی کے جام شیریں کو انسانی حلق میں تلخ بنانے کا باعث ہے اور انسانی اعصاب کو درہم برہم کر دیتی ہے مختلف قسم کی پریشانی ہے کہ جو آدمی کی زندگی کو چہار سو سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔

---

[1] غرر الحکم۔ج ۲ ص ۴۹۵

[2] تحف العقول ص ۲۳

ماضی پر حسرت وملال ہاتھ سے نکل جانے والے مواقع پر پشیمانی اور دامن گیر ہونے والے نقصانات پر افسوس۔ مستقبل زندگی کے خاتمے نیز دوست، عزیز واقارب، اولاد، مال وثروت اور قوائے جسمانی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بارے میں پریشانی اور مختلف غیر متوقع حادثات کی پریشانی ایک زبردست طوفان کی مانند زندگی سکون واطمینان کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

اسی دلیل کی بنا پر دانشوروں کا کہنا ہے کہ اگر چہ آج طبی علوم اور جراحی فنون کی ترقی کی بدولت انسان نے بہت سی بیماریوں پر قابو پالیا ہے حتی کہ کئی ایک بیماریوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے لیکن اس کے باوجود روحانی اور نفسیاتی بیماریوں کے ہاتھوں پہلے کی نسبت زیادہ پریشان ہے اور ایسے بیماروں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہورہا ہے۔

پرینسٹن یونیورسٹی کے سوشیالوجی کے ایک معروف استاد ڈونالڈ لائیٹ کا کہنا ہے کہ ''حال حاضر میں فقط امریکہ کے اندر پانچ ملیون افراد ایسے ہیں کہ جنہوں نے اپنی زندگی میں کم از کم ایک دفعہ ضرور اقدام خودکشی کیا ہے اور اس ضمن مین خودکشی کے خلاف جہاد کرنے والی انجمنوں کی طرف سے کی جانے والی تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی قابل توجہ نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ناامیدی کی وجہ سے زندگی کے بے معنیٰ ہونے کے احساس کی بنا پر غیر یقینی کی صورت حال کا شکار ہونے کی وجہ سے اضطراب، وبے چینی اور اجتماعی بحرانوں سے پیدا ہونے والی تشویش کی بنا پر خودکشی کی کوشش کرتے ہیں اور یہ امر متذکرہ بالا وسائل کے ساتھ قابل علاج نہیں ہے۔''[1]

اگر چہ ہمارا دور انسانی راحت کا دور ہے اوقات کار پہلے کی نسبت کم ہوگئے ہیں انسان کے کندھوں سے بوجھ کم ہوکر کارخانوں کے بڑے بڑے پہیوں پر جا پڑا ہے اندرون خانہ کے سخت اور مشکل کاموں کو بھی برقی وسائل نے اپنے ذمے لے لیا ہے گھر ماڈرن اور تمام تر سہولیات سے مزین ہیں نقل وحمل اور آمدورفت کے ذرائع زیادہ منظم اور آسان تر ہوگئے ہیں وہ سفر جو گذشتہ زمانے میں نہایت مشکل شمار ہوتے تھے آج کل تفریح کا ایک موثر ذریعہ بن گئے ہیں مختلف قسم کی ماڈرن اور صحت افزاء سرگرمیوں کے جدید طریقوں نے انسانی زندگی کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا ہے۔

ان حالات میں توقع کی جاتی ہے کہ ہمارے اس دور کا انسان مکمل آرام کی آغوش میں چلا جائے اور جسم وروح کی مکمل سلامتی سے مستفیض ہو لیکن ہم آشکار دیکھتے ہیں کہ اضطراب اور پریشانی اسے پہلے سے زیادہ دکھ پہنچا رہی ہے۔

نفسیاتی مریضوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے خودکشی کا دائرہ وسیع ہورہا ہے شراب اور منشیات کی پناہ ڈھونڈنے والوں کی تعداد دن دگنی رات چوگنی ہورہی ہے۔

اس امر کا اصل محرک زندگی کے بے معنیٰ اور بے ہدف ہونے کا احساس ہے جان لیوا مشکلات مین کسی پناہ گاہ کے نہ ہونے کا احساس ہے موت کے بھیانک چہرے کی تصویر تکلیف دہ بدبینی دنیا کے مستقبل کا خوف یا پھر انفرادی زندگی کے مستقبل کا خوف اس کا اصلی عامل ہے بے شک دوسری دنیا پر ایمان اور اس دنیا میں آرام وسکون اور عدالت کے ساتھ گذرنے والی زندگی جاوید پر ایمان ہی ان

---

[1] کتاب ''غربت غرب'' ص ۱۸ (اختصار کے ساتھ)

پریشانیوں کا خاتمہ کرسکتا ہے۔

نفسیات کے معروف استاد اور فرائیڈ کے مشہور معاونین میں سے ایک پروفیسر ''یونگ'' کا کہنا ہے کہ پوری دنیا سے میری طرف رجوع کرنے والے بیماروں میں سے دو تہائی افراد ایسے ہیں کہ جو پڑھے لکھے خوشحال اور کامیاب ہیں لیکن زندگی کے بے معنیٰ اور ہیچ پوچ ہونے کا احساس انہیں دکھی کیئے ہوئے ہے وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کا انسان ٹیکنالوجی کی پیش رفت تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے مذہب کو ہاتھ سے گنوا بیٹھا ہے اور حیران وسرگرداں اپنی روح کی جستجو مین ہے یہ انسان جب تک مذہب کو پا نہ لے اسے چین نہیں آتا کیونکہ لامذہبیت زندگی کے ہیچ اور بے معنیٰ ہونے کا سبب بنتی ہے۔[1]

آیئے قرآن کی روشنی کی طرف پلٹتے ہیں اور اس سے مدد حاصل کرتے ہیں سورہ یونس میں اس معنیٰ کی طرف ایک لطیف اشارہ دکھائی دیتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

الاان اولیآء الله الاخوف علیهم والاهم یحزنون لهم البشری فی الحیوة الدنیا وفی الاخرة

آگاہ رہو کہ اولیا اللہ اور دوسان خدا کو نہ کوئی ڈر ہے (مستقبل کا) اور نہ کوئی غم (ماضی کا) وہ دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں شاد ومسرور ہیں۔'' (یونس ۶۱۔۶۴)

جی ہاں یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے خدا کے ساتھ دل باندھ لیا ہے اور اس بحر عظیم کے ساتھ پیوست ہو گئے ہیں اور جو دنیاوی زندگی کو جہان آخرت کی زندگی جاوید کے لیے ایک گذرگاہ اور پل سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر نہ وہ احساس تنہائی کرتے ہیں اور نہ ہی زندگی کے لایعنی ہونے کا خیال اگرچہ اس ضمن میں بہت ساری بحثیں تشنہ رہ گئی ہیں لیکن ان عرائض کے ساتھ ہی ہم روز قیامت پر ایمان کے انسان کی انفرادی واجتماعی اور مادی ومعنوی زندگی پر نقش ہونے والے گوناگوں آثار کو گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔

---

[1] معاد از نظر روح وجسم۔ ج ا ص ۴۴

دروازہ عالم بقاء

(۱) موت

(۲) برزخ

(۱) موت عالم بقاء کا دروازہ

اگرچہ موت کا مام بہت ساروں کے لیے وحشت ناک اور ہول انگیز ہے لیکن اسلامی تصور کائنات میں یہ موضوع ایک اور ہی رخ کا حامل ہے کیونکہ اس کے نزدیک موت تو دوسری دنیا کے لیے ایک گذرگاہ اور پل ہے اور درحقیقت یہ ایک دوسری پیدائش ہے۔

نوزائیدہ بچہ پیدائش کے وقت زاروقطار روتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ شاید تباہ و برباد ہو جائے گا بالکل نابود ہو جائے گا حالانکہ وہ ایک ایسے جہان میں وارد ہو رہا ہوتا ہے کہ جو شکم مادر سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

بہرحال اس دروازے سے گذرنا سب کے لیے خوش آئند نہیں ہے بلکہ فقط انہی کے لیے خوشی و مسرت کا باعث ہے جنہوں نے اس عظیم سفر کے لیے کافی وافی زادراہ فراہم کرلیا ہے۔ بنابراس دلیل کے اگر بدکار و مجرم افراد اگرچہ موت کے بعد کی زندگی پر اعتقاد بھی رکھتے ہوں موت سے ڈریں اور اس سے وحشت زدہ ہوں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔

موت کے بارے میں ایسا عقیدہ ایک تو انسان کو ایثار و فداکاری اور جہاد کی قوت عطا کرتا ہے اور موت کا خوف اسے ذلت و خواری اور پستی کی طرف نہیں دھکیلتا، دوسرا یہ انسانوں کو گناہوں کے بارے میں خبردار کرتا ہے اور ان کی تربیت کا ایک موثر وسیلہ ہے۔

قرآن مجید نے اس مسئلے کا بہت زیادہ ذکر کیا ہے اور اس اہم واقعے کی حقیقت کو کہ جو سب کے لیے بلا استثناء پیش آتا ہے بڑی صراحت سے بیان کیا ہے اور اس بارے میں بڑے پتے کی باتیں کی ہیں۔

اس مقدمے کے ساتھ پہلے مرحلے یعنی مرحلہ مرگ کی طرف توجہ کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل پرمعنی آیات کے لیے دل و جان سے گوش برآواز ہوتے ہیں (اس امر کی طرف توجہ رہنا چاہئے کہ ہر آیت اس موضوع کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پر دلالت کرتی ہے)۔

(۱) كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

(ال عمران:۱۸۵)

(۲) اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (الزمر: ۴۲)

(۳) قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

(سجدۃ:۱۱)

(۴) الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ (نحل:۲۸)

(۵) الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۳۲ (نحل: ۳۲)

(۶) قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۶ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۝۷ (جمعة: ۶،۷)

(۷) تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ۝۱ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ۝۲ (ملک: ۱،۲)

(۸) وَجَاۗءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ۝۱۹ (ق: ۱۹)

(۹) كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ۝۲۶ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ۝۲۷ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ۝۲۸ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ۝۲۹ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِۨ الْمَسَاقُ۝۳۰ (قیامت: ۲۶ تا ۳۰)

(۱۰) حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ۝۹۹ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ (مومنون: ۹۹، ۱۰۰)

ترجمہ

(۱) ہر جان (ایک نہ ایک دن) موت کا مزہ چکھے گی اور تم لوگ قیامت کے دن (اپنے کئے کا) پورا پورا بدلہ بھر پاؤ گے۔

(۲) خدا ہی مرنے کے وقت روحوں کو قبض کرتا ہے اور ان کی روحوں کو بھی کہ جو ابھی نہیں مرے، حالت خواب میں کھینچ لیتا ہے۔ پھر جن کے بارے میں خدا موت کا حکم صادر کر چکا ہے ان کی روحوں کو روک رکھتا اور باقی دوسری روحوں کو (کہ جنہیں زندہ رہنا چاہیے) پھر ایک وقت مقررہ تک کے لیے بھیج دیتا ہے

(۳) کہہ دو: ملک الموت جو تمہارے اوپر متعین ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا اس کے بعد تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

(۴) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب فرشتے ان کی روح قبض کرنے لگتے ہیں جب کہ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم بھی کیا ہوتا ہے تو اس دوران میں یہ تسلیم ہو جاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم کوئی برائی نہیں کرتے تھے۔ جی ہاں! جو کچھ تمہاری کرتوتیں تھیں خدا ان سے خوب اچھی طرح واقف ہے

(۵) یہ وہ لوگ ہیں جن کی روحیں فرشتے اس حالت مین قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں۔ ان سے کہتے ہیں: تم پر سلام ہو۔ جو اعمال دنیا میں انجام دیتے تھے ان کے صلہ میں جنت میں چلے جاؤ۔

(۶) (اے رسول اللہ تم) کہہ دو: اے یہودیو! اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں، تو اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو موت کی تمنا کرو (تا کہ اپنے محبوب سے ملاقات کر سکو) اور یہ لوگ ان اعمال کے سبب جو یہ پہلے کر چکے ہیں، میں کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے اور خدا تو ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

(۷) پر برکت اور زوال ناپذیر ہے وہ کہ جس کے ہاتھ میں جہان ہستی کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی کہ جس نے موت و حیات کو خلق کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل انجام دیتا ہے اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے۔

(۸) موت کی بے ہوشی یقیناً طاری ہوگی (اور انسان سے کہا جائے گا) یہ وہی چیز ہے کہ جس سے تو بھاگا کرتا تھا۔

(۹) ایسا نہیں، وہ ہرگز ایمان نہیں لائے گا یہاں تک کہ جان اس کی ہنسلی تک پہنچ جائے اور کہا جائے گا: آیا کوئی ہے جو اس بیمار کو موت سے نجات دے؟ اور دنیا سے جدائی کا یقین پیدا کر لیگا (اور موت کی شدت سے) پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گ ء۔ (جی ہاں) اس دن سب کا رخ تیرے پروردگار کی (عدالت کی) طرف ہوگا۔

(۱۰) (وہ اسی طرح اپنے غلط راستے کو جاری و ساری رکھتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آئی تو کہنے لگے: اے میرے پروردگار! مجھے واپس لوٹا دے (دنیا میں) شائد وہ جو کچھ میں نے ترک کیا ہے (اور کوتاہی کی ہے) عمل صالح انجام دوں۔ (جواب دیا جائے گا) ہرگز نہیں یہ تو وہ ایک بے ہودہ بات کہہ رہا ہے (اور اگر واپس پلٹ بھی جائے تو بھی اس کی کرتوتیں پہلے ہی کی طرح رہیں گی)۔

تفسیر

۱۔ موت ایک عمومی قانون ہے

پہلی آیت میں قانون موت کی عمومیت کے بارے میں بات کی گئی ہے یہ ایک ایسا مقدر ہے کہ جو تمام انسانوں اور تمام زندہ موجودات حتیٰ کہ غیر زندہ موجودات کے لیے بھی حتمی ہے ارشاد ہوتا ہے:

كل نفس ذآئقة الموت

''ہرانسان (آخرکار) موت کا ذائقہ چکھے گا۔''

یہ تعبیر قرآن مجید میں تین بار آئی ہے[1] اور یہ تکرار موت کے قطعی ہونے کی جانب اشارہ ہے ضمناً تمام انسانوں کے لیے تنبیہ بھی ہے کہ اس قطعی مقدر سے غافل نہ ہوں۔

جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ موت عالم بقاء کی طرف ایک دریچہ ہے اس کے فوراً بعد اضافہ فرمایا گیا ہے:

وانما تقوفون اجور کم یوم القیامة

اپنے اعمال کا بطور کامل صلہ فقط روز قیامت میں پاؤ گے۔

یہ اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ دنیا عمل کی جگہ ہے نہ حساب و جزا کی اور آخرت حساب و جزا کی جگہ ہے نہ کہ عمل کی۔ اگرچہ دنیا اور عالم برزخ میں ایک محدود حد تک صلہ اور جزا ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ کامل صلہ اور جزا فقط سرائے آخرت میں ہے۔

اس احتمال کا بھی امکان ہے کہ متذکرہ بالا تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ روز قیامت نجات انسان کا واحد وسیلہ اس کے پاکیزہ اعمال ہیں وگرنہ مال وجاہ، مقام ومنزلت، اولاد، قبیلے اور طائفے کسی کے لیے عقدہ کشا نہیں ہیں، جیسے اس آیت قرآن حکیم میں ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

''جس دن نہ تو مال ہی کچھ کام آئے گا اور نہ ہی اولاد قبیلہ مگر یہ کہ جو شخص خدا کے سامنے قلب سلیم (شرک اور فاسد اعتقادات سے پاک دل، لیئے ہوئے حاضر ہوگا۔'' (شعراء ۸۸-۸۹)

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب دکھائی دیتی ہے اور کئی ایک مفسرین نے اسے اختیار کیا ہے اصولاً یہ امر واضح ہے کہ انسان خواہ ہر چیز میں شک وتردد کا شکار ہو لیکن موت کے بارے وہ شک وتردد میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ تمام اہل زمین وآسمان مرجائیں گے۔ تمام زندہ موجودات موت کے حلق میں اتریں گی۔ ہر کسی کے لیے بلا استثناء موت اور ایک اختتام ہے جس میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہے اور یہ جو لوگ ایک دوسرے کے بارے میں یا پھر اپنے رہبروں اور بزرگوں کے بارے میں ہمیشگی اور جاودانی کی دعائیں کرتے ہیں محض تکلفات ہیں وگرنہ کون سی ہمیشگی اور کون سی جاودانی جب کہ تمام انبیاء اور اولیاء نے اس راستے کو طے کیا ہے سب کے سب بلا استثناء اس گذرگاہ سے گذرے ہیں۔

ضمناً اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اولاً یہ کہ آدمی کی روح اس کی موت کے ساتھ نہیں مرتی کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ہر نفس موت چکھے گا اور چکھنے کا معنیٰ یہ ہے کہ روح باقی ہے اور موت کو درک کرتی ہے اور ثانیاً کہ روح بدن کے علاوہ کوئی چیز ہے کیونکہ اس کی موت کے ساتھ یہ باقی رہتی ہے۔

---

[1] آل عمران ۱۸۵، انبیاء ۳۵ اور عنکبوت ۵۷

حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

کل من علیها فان

وہ سب جو زمین پر ہیں فنا ہو جائیں گے۔(رحمن ۲۶)

تو فرشتوں نے کہا:

مات اهل الارض

یعنی! اہل زمین کی موت کا فرمان صادر ہو گیا!

اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ کل نفس ذآئقة الموت تو فرشتوں نے کہا کہ ہماری موت کا بھی فرمان صادر ہو گیا۔[1]

اگرچہ یہ درست ہے کہ کلمہ ''نفس'' کا بعض اوقات خدا کی ذات پر بھی اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا سے مخاطب ہو کر کہا:

ولا اعلم ما فی نفسك (مائدہ ۱۱۶)

لیکن یہ بھی واضح اور روشن ہے کہ مورد بحث آیت میں ''کل نفس'' کی تعبیر مخلوقات کی طرف اشارہ ہے نہ کہ خالق کی جانب۔

۲۔ حقیقت موت

اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ موت فناء نابودی اور ہر چیز کے خاتمے کا نام ہے اسی دلیل کی بنا پر وہ خوفزدہ اور وحشت زدہ ہیں جب کہ قرآن مجید نے اس کی حقیقت کو توفی (پاک پروردگار کی ذات کے ذریعے روح انسان کا قبض ہونا یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ اس حقیر و ناچیز عالم سے اس جہان بزرگ کی طرف انتقال) کے عنوان سے تفسیر فرمایا ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

الله یتوفی الانفس حین موتها[2]

''خدا موت کے وقت ارواح کو قبض کر لیتا ہے''

اس کے بعد اس دنیاوی زندگی ہی میں موت کا ایک نمونہ پیش کرنے کے لیے مزید فرماتا ہے:

---

[1] تفسیر کبیر۔ ج ۹ ص ۱۲۵

[2] ''موتها'' کی ضمیر اگرچہ ظاہراً انفس کی طرف پلٹ رہی ہے لیکن درحقیقت یہ انسانوں کے ابدان اور اجساد کی طرف اشارہ ہے کیونکہ بدن مرتا ہے نہ کہ روح۔ اسی طرح منامها کی ضمیر بھی۔

والتی لم تمت فی منامها

''اوران کی روحوں کوبھی کہ جوابھی نہیں مرے حالت خواب میں کھینچ لیتا ہے۔''

پھر جن لوگوں کی موت کا حکم صادر ہو چکا ہوان کی ارواح کو روکے رکھتا ہے • اور وہ ہرگز موت سے بیدار نہیں ہوتے) اور باقی دوسرے لوگوں کی ارواح کو (کہ جنہیں اس دنیا میں مزید زندہ رہنا چاہئے) پھر ایک مقررہ وقت تک کے لیے پلٹا دیتا ہے۔(فیمسك التی قضی علیها الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی)۔

اوراس میں روشن نشانیاں ہیں (موت وحیات کے قانون اوران دومظاہر کی حقیقت سے متعلق) ان لوگوں کے لیے کہ جوتفکر کرتے ہیں۔(ان فی ذلك لایت لقوم یتفکرون)۔

قرآن کا مقصداس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ جیسے عالم خواب یا نیند میں روح انسان ختم نہیں ہوتی بلکہ وقتی طور پراس کا بدن کے ساتھ رابطہ کمزور ہوجاتا ہےاوروہ روح دوسرے عوالم کی سیر کرسکتی ہے بالکل اسی طرح مرنے کے ساتھ فنا کا اصلاً وابداً کوئی ربط نہیں بلکہ مرنا تو روح کا آزاد ہونااور دوسرے بڑے بڑے عوالم کی سیر ہے۔

''یتوفی'' ''وفی'' کے مادے سے ہے۔یہ دراصل کمال کے معنیٰ میں ہے لہذا ''درہم وافی'' کامل درہم کے معنیٰ میں ہے (یعنی چاندی کی مقداراوروزنکے اعتبار سے کامل،اوراسی طرح ''توفی'' کامل دریافت کے معنیٰ میں ہے۔اس امر کی طرف متوجہ رہتے ہوئے کہ وصول کرنے والا اور دریافت کرنے والا خدا ہےاس جملے کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ موت کے بعد ایک بزرگ تر اور بالاتر جہان میں انسان قدم رکھتا ہے موت کے بارے میں ایسا نظریہ بہت سارے مفاہیم اورمحاسبات کو دگرگوں کردیتا ہے۔یہی وجہ یہ کہ اس کا عالم بقا کی طرف کھلنے والے ایک دریچے کےعنوان سےتعارف کرایا گیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ یہ کہ متذکرہ بالا آیت موت اور نیندکوایک دوسرے سے ہم آہنگ شمار کرتے ہوئے تمام انسانوں کوخبردار کرتی ہے کہ تم کس طرح موت سے غافل ہوجبکہ موت ہرشب وروزتمہاری تلاش میں آتی ہےاورتم بخوبی اسے لمس بھی کرتے ہو۔

آپ حالت نیند میں اس دنیا سے بیگانہ ہوجاتے ہیں اوراپنی تمام تر زندگی اور مقام ومنزلت سے وقتی طور پر جدا ہوجاتے ہیں۔موت بھی ایک جاودانی نیند ہےاور نیندایک عارضی موت ہے۔شاید آیت کا یہ آخری جملہ ان تمام جہات کی طرف ارشار ہو:

ان فی ذلك لایت لقوم یتفکرون

۳۔روح قبض کرنے والے فرشتے

اگرچہ گذشتہ آیت میں روح قبض کرنے کی خدا کی طرف نسبت دی گئی ہےلیکن قرآن کی دیگر آیات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کام فرشتوں کے ذریعے انجام پاتا ہے۔

زیر بحث تیسری آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے۔ جب مشرکین نے انکار معاد کیا تو ارشاد باری تعالیٰ ہوا:

قل یتوفٰکم ملك الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون

کہہ دو کہ ملک الموت جو تمہارے اوپر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا اس کے بعد تم پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں فرشتہ مرگ (ملک الموت) کی بات کی گئی ہے یعنی وہ فرشتہ کہ جو اس کام کے لیے مامور ہے جب کہ گذشتہ آیات میں ارواح قبض کرنے والے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے اور سورۂ نحل آیت ۲۸ میں فرشتوں کے گروہ کی طرف:

الذین تتوفٰھم الملئکة

اور اسی طرح سورہ انعام آیت ۶۱ میں رسولانِ الٰہی کی جانب:

توفته رسلنا

اگر متذکرہ بالا ان آیات میں تھوڑی باریک بینی سے کام لیا جائے تو ان میں کسی قسم کا کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا کیونکہ اصل میں روح قبض کرنے والی خدا ہی کی پاک ذات ہے۔ پھر عالم اسباب میں موت کا بڑا فرشتہ ''عزرائیل'' اس فرمان کو اجراء کرنے والا ہے اور وہ بھی ''فرشتوں کے ایک گروہ'' کے ذریعے اس امور یت کو انجام دیتا ہے ان فرشتوں کی طرف ہی ''رسلنا'' کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے اصولاً اس دنیا کے اہم حوادث فرشتوں ہی کے ذریعے انجام پاتے ہیں جو سب کے سب خدا کے تابع فرمان ہیں اور اس کے حکم کا اجراء کرنے والے ہیں۔ موت بھی کہ جو اس دنیا کے اہم حوادث میں سے ایک ہے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

ثم الی ربکم ترجعون

اس کے بعد تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔

یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی جانب بازگشت کیلیے اس سیر صعودی میں موت بالکل اسی طرح ایک مقدمہ ہے کہ جیسے پیدائش علم فنا اور انسانی روح کی سیر نزولی کی جانب کھلنے والا ایک دریچہ ہے اور ''ثم'' کی تعبیر ممکن ہے وجود برزخ پر دلالت کرتی ہو۔

۴و۵ موت کے وقت مومنوں اور ظالموں کی حالت

مومن و ظالم اور نیک و بد لوگ اسی موت کے لمحے ہی سے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور مختلف حالات کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ان کے عقائد اور اعمال کے نتائج اسی لمحے آہستہ آہستہ ظاہر و آشکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں ''چوتھی اور پانچویں'' آیت اسی حقیقت کی جانب ایک پر معنی اشارہ ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے:

الذین تتوفھم الملئکۃ ظالمی اانفسھم فالقوا لسلم ما کنا نعمل من سوء .....

''یہ کافر وہ لوگ ہیں کہ جب روح قبض کرنے والے فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں اس حالت میں جب کہ ان کافروں نے اپنے نفس پر ظلم بھی کیا ہوتا ہے تو اس دوران میں یہ تسلیم ہو جاتے ہیں اور اظہار ایمان کرتے ہیں (جیسے فرعون نے غرق ہوتے وقت خدا کی وحدانیت پر ایمان کا اظہار کیا تھا، اور پھر یہ کافر کہتے تھے کہ ہم کوئی برائی نہیں کرتے تھے۔''

اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کاملاً سر تسلیم خم نہیں کیا۔ وہ نہیں جانتے کہ خداوند عالم الغیب اور اس کے گواہ فرشتوں کے سامنے یہ انکار بیہودہ ہے اسی لیے آخر میں فرمایا گیا ہے:

بلی ان اللہ علیم بما کنتم تعملون

''جی ہاں! جو کچھ تمہاری کرتوتیں تھیں خدا اس سے خوب اچھی طرح واقف ہے۔''

پھر انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ (نحل ۲۹)

اب جب ایسا ہے تو جاؤ پھر جہنم میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں پڑے رہو۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اظہار تسلیم یہاں توحید کے معنیٰ میں ہے اور حق تعالیٰ شانہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا (جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے) لیکن چونکہ ابھی تک دنیا کی ہوا و ہوس کا بھوت ان کے سروں پر سوار ہے اور یہ موت کے بعد کے مراحل پر حاکم قوانین سے نا آشنا ہیں اسی لیے اپنی سابقہ برائیوں کا اانکار کرتے پھرتے ہیں اور جھوٹ اور فریب کاری سے کام لے رہے ہیں لیکن انہیں جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ یہ جگہ غلط بیانی اور دروغ گوئی کی نہیں ہے۔

یہ کہ یہاں پر جہنم سے مراد عالم برزخ کی جہنم ہے یا جہنم قیامت اس سلسلے میں دو احتمال ذکر کئے گیے ہیں۔ موت کے لمحات سے مناسب تر تو جہنم برزخ ہی میں داخل ہونا ہے اگرچہ خلود اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی تعبیر جہنم قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ کہ کہا جائے کلام برزخ میں ابواب جہنم میں وارد ہوں گے نہ کہ خود جہنم میں اور خلود و ہمیشگی کافروں کے لیے خود دوزخ میں وارد ہونے کے وقت کی صفت ہے نہ کہ ابواب دوزخ میں۔

بلی ان اللہ علیم بما کنتم تعملون

یہ آیت ممکن ہے کہ موت کے فرشتوں کی زبانی ہو کہ جو انہیں خبردار کر رہے ہیں کہ (اپنی سابقہ کرتوتوں کا) خواہ مخواہ انکار نہ کرو کیونکہ

خدا کا لامتناہی علم تمہارے اعمال سے پردہ ہٹا دے گا۔

بہرحال یہ آیت سورہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آیت ۲۷ سے مشابہ ہے کہ جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

فکیف اذا توفتهم الملئکة یضربون وجوههم وادبارهم

''ان کی کیا حالت ہوگی جب روح قبض کرنے والے فرشتے ان کے چہروں اور پیٹھ پر مار رہے ہوں گے؟''

جی ہاں! ملائکہ ان کے چہروں اور پیٹھ پر تھپڑوں اور مکوں کی بارش کے ساتھ انکا استقبال کریں گے اور شاید انکا حق باتوں اور توحید کا اعتراف کرنا بھی اس منظر کو دیکھنے کی وجہ سے ہے نہ کہ اخلاص کی بناء پر۔

ان کے مقابل رحمت کے فرشتے ہیں کہ جو مومنوں کی ارواح قبض کرنے آتے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ذکر ہوا ہے:

الذین تتوفهم الملئکة طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنة بما کنتم تعملون

پرہیز گار وہ لوگ ہیں کہ ملائکہ جب ان کی روح قبض کرتے ہیں تو وہ اپنے عقیدے، گفتار اور کردار میں پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں اور فرشتے ان سے کہتے ہیں کہ تم پر سلام ہو (ایسا سلام کہ جو امن و امان اور سلامتی کی علامت ہے) جو اعمال تم دنیا میں انجام دیتے تھے ان کی بدولت جنت میں چلے جاؤ۔

واقعاً تقویٰ و پاکیزگی کی جزا اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتی کہ فرشتگان الٰہی درود و سلام کے ساتھ ان کا استقبال کریں اور انہیں بہشت کی دعوت دیں، ایسی دعوت کہ جو احترام اور لطف و محبت میں گندھی ہو۔

یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جنت برزخ کی جنت کی طرف اشارہ ہو یا پھر قیامت کی جنت ہی کی طرف چونکہ بہشت برزخ بھی تو اسی جنت کا دروازہ شمار ہوتی ہے۔

بہرحال یہ موت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک ہے کہ جس کی کیفیت صالح اور بدکار لوگوں کی نسبت بالکل متفاوت ہے۔

۶۔ موت سے ڈرنے کی دلیل

معمولاً لوگوں کے لیے چہرہ موت وحشت ناک ہوتا ہے اور اس کی دلیل ان دو چیزوں میں سے کوئی ایک ہے: یہ لوگ یا تو موت کو ہر چیز کا خاتمہ اور فنا کے مترادف سمجھتے ہیں یا پھر ایسا گناہوں کی آلودگی اور دنیا سے ان کی دلبستگی کی بناء پر ہوتا ہے۔

لیکن وہ جو موت کو ایک نیا جنم ایک وسیع تر جہان میں منتقلی کا نقطہ آغاز اور ایک اعلیٰ و برتر زندگی جانتا ہو اور اس نے اس سفر کے لیے بھاری بھرکم اعمال صالح کا زادراہ بھی ذخیرہ کیا ہو اور پھر دنیا سے بھی کوئی خاص دلبستگی نہ رکھتا ہو وہ آخر موت سے کیونکر ڈرے؟

چھٹی آیت میں اس مطلب کی جانب ایک ظریف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

قل یا ایها الذین هادوا ان زعمتم انکم اولیآء لله من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین

(اے رسول اللہؐ) کہہ دو: اے یہودیو! اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں، اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو موت کی تمنا کرو (تا کہ اپنے محبوب سے ملاقات کر سکو)۔

بعد میں مزید فرماتا ہے:

ولا یتمنونه ابدا بما قدمت ایدیهم والله علیم بالظلمین۔

اور یہ لوگ ان اعمال کے سبب کہ جو پہلے کر چکے ہیں کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے اور خدا تو ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہاں پر یہودیوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور یہ ظاہراً دو نکتوں کی بناء پر ہے:

اول یہ کہ یہودی ہمیشہ حتی کہ آج بھی اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ نسل جانتے ہیں اور خود ہی سے اپنے لیے دوسروں کی نسبت اپنی امتیازی حیثیت کے خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ کبھی اپنے آپ کو خدا کی اولاد سمجھتے ہیں تو کبھی اس کے اولیاء اور بندگانِ خاص میں سے اپنے آپ کو شمار کرتے ہیں۔[1] اور کبھی کہتے ہیں کہ:

''ہم خواہ جتنے بھی گناہ گار ہوں ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔''[2]

قرآن ان سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنے اس اعتقاد میں سچے ہو تو پھر یہ موت کا خوف کیسا؟ کیا کوئی عاشق اپنے محبوب کے لقا سے ڈرتا ہے؟ کیا ایک زندان سے کسی سرسبز و شاداب باغ میں منتقل ہونا وحشت ناک ہے؟

سورہ بقرہ کی آیت ۹۴ میں بھی اس سے مشابہ بات کی گئی ہے:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

ان سے کہہ دو: اگر خدا کے نزدیک آخرت کا گھر خاص تمہارے واسطے ہے اور لوگوں کے لیے نہیں ہے تو اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو۔

دوسرا یہ کہ وہ لوگ دنیا پرست اور عالم مادہ سے دل بستہ تھے۔ علاوہ ازیں ناحق خونریزی اور کثرت گناہ سے ان کا دامن آلودہ تھا

---

[1] وقالت الیهود والنصاری نحن ابنؤا الله واحباؤه (مائدہ ۱۸)

[2] وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودة (بقرہ ۸۰)

۔یہی وجہ تھی کہ وہ موت سے سخت خوفزدہ تھے۔

سورہ بقرہ آیت ۹۶ میں قرآن گویا ہے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ

اور آپ لوگوں میں سے اس پست مادی زندگی کا سب سے زیادہ حریص انہیں پائیں گے۔

اسی سورۃ بقرہ کی آیت ۹۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ

لیکن وہ ان اعمال بد کی وجہ سے جنہیں ان کے ہاتھوں نے پہلے سے آگے بھیجا ہے، ہرگز موت کی آرزو نہ کریں گے۔

لہٰذا اس انداز سے قرآن مجید نے موت سے ڈرنے کی وجوہات کو بھی واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور اس وحشت وخوف سے نجات کے مختلف طریقوں کو بھی ذکر فرما دیا ہے۔بعض مفسرین متذکرہ بالا آیت کو یہودیوں کے ساتھ ایک قسم کا مباہلہ سمجھتے ہیں کہ جو جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کے ساتھ مقابلے کا ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے بارگاہ خداوندی میں دعا کریں کہ اگر وہ جھوٹے ہیں تو رسوا ہوں۔(اور اگر مباہلے کی شرائط اس میں موجود ہوں تو اس کا اثر ہوگا)۔

اور اس بات کی شہادت یہ ہے کہ روایات میں ذکر ہوا ہے کہ اگر یہ جھوٹے دعویدار یعنی یہودی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے موت کی آرزو کرتے تو بلا فاصلہ وہی آب دہن ان کے حلق میں پھنس جاتا اور وہ سب ڈھیر ہو جاتے۔

والذی نفسی بیدہ لا یقولها احد منکم الا غص بریقه[1]

۷۔فلسفہ موت وحیات

بہرصورت انسانی زندگی محدود ہے اور ہر جاندار کو موت سے دوچار ہونا ہے۔یہاں جو پہلا سوال ابھرتا ہے وہ یہ کہ کہ آخر اس موت وحیات کا ہدف کیا ہے؟

زیر بحث اس ساتویں آیت میں قرآن مجید اسی مطلب کی طرف اشارہ کر رہا ہے:

تبارك الذين بيده الملك وهو على كل شيء قدير الذی خلق الموت و الحياة ليبلو كم ايكم احسن عملا وهو العزيز الغفور

---

[1] روح المعانی ج ۲۸ ص ۵۸ وتفسیر مراغی ج ۲۸ ص ۱۰۰

''زوال ناپذیر اور پر برکت ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی کہ جس نے موت وحیات کو خلق کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل انجام دیتا ہے اور وہ عزیز و غفور ہے۔''

یہاں پر خداوند تبارک وتعالیٰ نے پہلے تو خلقت موت وحیات کا تعارف اپنی لامتناہی قدرت کی علامت کے طور پر کروایا ہے، بعد میں فرماتا ہے:

اس خلقت کا ہدف حسن عمل کی آزمائش ہے، ایسی آزمائش کہ جو قرب الہیٰ کے راستے میں انسانوں کی ہدایت، تربیت اور نمو کا باعث بنتی ہے۔

اس آیت سے چند نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱: موت وحیات دونوں مخلوق ہیں۔ اگر موت فنا اور نیستی مطلق کے معنی میں ہوتی تو اس کا مخلوق ہونا بے معنی تھا۔ چونکہ موت ایک دنیا سے دوسری دنیا کی طرف انتقال ہے لہذا ایک امر وجودی ہے اور قابل خلقت۔

۲: موت حیات سے پہلے ہے۔ یا تو یہ دنیا کی موت اور جہان آخرت کی حیات کی طرف اشارہ ہے یا انسانکے خاک ہوجانے اور پھر اسی خاک سے زندہ ہونے کے مرحلے کی طرف اشارہ ہے اور یا پھر ان دونوں امور کی جانب۔

۳: اس دنیا کا ایک میدان آزمائش کے عنوان سے تعارف کروایا گیا ہے، ایک ایسا میدان کہ جو عمل کے اعتبار سے بہترین افراد کے امتحان کی جگہ ہے اور لازمی بات ہے کہ اس امتحان کا نتیجہ اور کامیابی کی سند دوسری دنیا میں واضح ہوگی۔

۴: خدا کی بارگاہ میں انسان کی قدر و قیمت کا معیار اس کا حسن عمل ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نیک اعمال کا سرچشمہ خالص نیت، پاکیزہ عقائد اور قلب مومن ہی ہے کیونکہ عمل انہی امور کا انعکاس ہے۔

شاید اسی دلیل کی بنا پر جملہ "احسن عملاً" کی تفسیر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اتمکم عقلا واشدکم للہ خوفا واحسنکم فیما امر اللہ بہ ونہی عنہ نظرا، وان کان اقلکم تطوعا

مراد یہ ہے کہ تم میں سے کون ہے جو عقل وخرد کے اعتبار سے کامل ہو، خدا خوفی کے حوالے سے زیادہ قوی اور خدا کے اوامر ونواہی سے زیادہ آگاہی کا حامل ہو اگرچہ تمہارے مستحب اعمال کم ہی کیوں نہ ہوں۔ [1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ "احسن عملاً" کے بارے میں جو مختلف تفاسیر کی گئی ہیں جیسا کہ اخلاص عمل، افزونی عقل، زہد فراوان، موت کو یاد رکھنا اس سفر کے لیے بیشتر آمادہ رہنا وغیرہ یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں یہ مختلف تفاسیر شمار نہیں ہوتیں۔ چونکہ یہ سب

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ ج ۱۰ ص ۳۲۲

ایک ہی درخت کی شاخیں پتے، جڑیں، ٹہنیاں، تنے اور پھل ہیں۔

۵: حقیقی قدر و قیمت عمل کی ''کیفیت'' سے ہے نہ کہ ''کمیت'' اور اس کے حجم سے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی و حقیر عمل خلوص، ایمان اور معرفت کے حوالے سے اپنی اعلیٰ کیفیت کے اعتبار سے کثرت اعمال پر فوقیت رکھتا ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لیس یعنی اکثر عملا ولکن اصوبکم عملا

ہدف یہ نہیں ہے کہ کون زیادہ عمل انجام دیتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ کون زیادہ صحیح اور خالص عمل انجام دیتا ہے۔ [1]

۶: الٰہی افعال ہدف یا دوسرے الفاظ میں "معلل بالاغراض" ہیں، ان ناآگاہ اور بے خبر لوگوں کی بات کے برخلاف کہ جو خدا کے افعال کو بے ہدف گردانتے ہیں۔

۷: ممکن ہے اس عظیم امتحان کے میدان میں انسان تنہائی اور ناتوانی کا احساس کرے اور لغزشوں کی وجہ سے مایوس ہو جائے، لہذا آیت کے آخر میں خدا کے لیے عزیز و غفور کی صفت لانے سے ان پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور انسان سے کہا گیا ہے کہ تم تنہا نہیں ہو امتحان کے عظیم ہونے سے نہ ڈرو۔ خدا سے دل باندھو اور اگر تم سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اس کے عفو و درگذشت کے دامن کو تھامو۔

۸ و ۹۔ عالم نزع کی سختی اور جان کنی کے مقدمات

قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ موت کے لمحات وحشت ناک اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

زیر بحث آٹھویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وجآءت سکرۃ الموت بالحق

بالآخر موت کی سختی یقینا آ پہنچی۔

اور پھر ایسے عالم میں انسان سے خطاب ہوتا ہے کہ:

ذلك ما كنت منه تحيد

''یہ وہی چیز ہے کہ جس سے تم فراری تھے'' (آخر کار تمہارے دامن گیر ہو ہی گئی)۔

"سکرۃ" سکر کے مادے سے ہے۔ ارباب لغت کے بقول یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان پیدا ہوتی ہے اور یہ فقط زیادہ شراب کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات ایسی حالت کو بھی کہا جاتا ہے کہ جو شدت غضب اور آتشین و

---

[1] اصولِ کافی۔ ج ۲ ص ۱۶ ''باب الاخلاص'' حدیث ۴

سوزاں عشق کی وجہ سے رونما ہو۔

لیکن ''مقائیس اللغۃ'' کے بقول دراصل یہ مادہ ''حیرت'' کے معنیٰ میں ہے۔اور بعض نے اسے ''شدت'' کے معنیٰ میں تفسیر کیا ہے ظاہراً یہ سب مختلف تعبیرات کے ساتھ ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔موت کے وقت مستی کی سی حالت کا پیدا ہونا یا تو یہ طبیعتاً ایسا ہوتا ہے چونکہ اس دنیا سے ایک ایسی دنیا کی طرف منتقلی ہو رہی ہے کہ جو مختلف جہات سے ناشناختہ ہے۔یہ بالکل ان نوزائیدہ بچوں کی سی ہیجانی حالت ہے کہ جو عالم جنین سے عالم دنیا میں منتقل ہوتے وقت پیدا ہوتی ہے۔

یا موت کے بعد کے حالات وشرائط کا مشاہدہ کرنے نتیجہ اعمال کا سامنا کرنے اور انجام کے خوف کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔

اور یا پھر دنیا،عزیز واقارب اور محبوب اشخاص واشیاء سے جدائی کی بنا پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انبیا واولیا اللہ علیہم السلام کہ جن کی نہ اس دنیا سے دلبستگی تھی اور نہ ہی انہیں آئندہ کا کوئی خوف وخطر لاحق تھا اور اسی بنا پر وہ اس لمحے ایک خاص سکون وآرام سے بہرہ ور ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود اس لمحہ منتقلی کے وقت مشکلات وشدائد سے وہ بھی مبرا نہ تھے۔

جیسا کہ پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے ہاتھوں کو پانی کے ایک برتن میں گیلا کر کے چہرہ مبارک پر پھیرتے اور کہتے لا الہ الا اللہ اور پھر فرماتے

ان للموت سکرات

''موت سختیوں اور تکالیف سے پر ہے۔''[1]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا بھی ارشاد گرامی ہے کہ:

ان للموت غمرات ھی افطع ان تستغرق بصفة او تعتدل علی عقول اھل الدنیا

''موت اس قدر تکالیف اور سختیوں سے پر ہے کہ جو بیان سے باہر ہے یا جسے دنیا والوں کے عقلی معیار سے نہیں پرکھا جا سکتا۔''[2]

''غمرۃ'' ایسی سختیوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسانی وجود پر چھا جاتی ہیں۔بعض اوقات سکرات موت کچھ دیگر امور کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں جو اس کی شدت کو دو چند کر دیتے ہیں جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر روح البیان۔ج ۹ ص ۱۱۸

[2] غرر الحکم

اجتمعت علیهم سکرة الموت وحسرت الفوت

''سکرات موت اور دنیا کو ہاتھ سے کھو دینے کی حسرت ان کو گھیر لیتی ہے۔''[1]

ایک طرف تو یہ پہلو ہے اور دوسری جانب آیات مجیدہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بدن سے روح کی خدائی تدریجاً عمل میں آتی ہے اور خود یہ عمل وحشت کو دوگنا کر دیتا ہے۔ اگر یہی عمل اچانک اور ایک لمحے میں انجام پاتا تو اس کا برداشت کرنا نسبتاً آسان تھا۔

چنانچہ مورد بحث آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

کلا اذا بلغت التراقی وقیل من راق

ایسا نہیں (کہ یہ ہٹ دھرم جو کہتے ہیں کہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے) یہاں تک کہ جان ان کے گلوں تک جا پہنچے اور کہا جائے: آیا کوئی ہے جو اس بیمار کو موت سے نجات دلائے۔

وظن انه الفراق۔ والتفت الساق بالساق۔

اس دوران (دنیا سے) جدائی کا یقین پیدا کر لیتا ہے (اور جان کنی کی شدت کی وجہ سے) ٹانگوں کو آپس میں بھینچ لیتا ہے۔

سورہ واقعہ آیت ۸۳ میں اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فلو لا اذا بلغت الحلقوم

''پس کیونکر جب جان گلے تک آ پہنچی ہے۔'' (تو پھر اس کے واپس پلٹانے پر قادر نہیں ہو)۔

وانتم حینئذ تنظرون۔

اور تم اس دوران میں دیکھتے ہی رہتے ہو (اور تم سے کچھ نہیں بن پاتا)۔

''تراقی'' ''ترقوہ'' کی جمع ہے جس کے معنی ایسی ہڈیوں کے ہیں کہ جو گلوگیر ہوئی ہوں اور جان کا گلے تک پہنچ جانا زندگی کے آخری لمحات کے لیے کنایہ ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جب انسان کے بدن سے جان جدا ہوتی ہے تو جو اعضاء مغز اور دل سے جتنے دور ہیں اتنا ہی جلدی ناکارہ ہو جاتے ہیں اور کام کرنا چھوڑ جاتے ہیں۔

''التفت الساق بالساق'' کا جملہ ممکن ہے اسی مطلب کی طرف اشارہ ہو۔ (تفسیر مجمع البیان میں اس آیت کی مختلف تفاسیر میں سے ایک تفسیر یہ بھی ذکر کرگئی ہے کہ اس سے مراد ٹانگوں کا ناکارہ ہو جانا ہے)'' ضمناً جان کے حلقوم تک پہنچ جانے کی تعبیر بھی اسی معنیٰ میں ہے۔ البتہ جب جان گلے تک پہنچتی ہے تو پھر نظام تنفس درہم برہم ہو جاتا ہے اور نظام تنفس کی خرابی آکسیجن کی کمی، گھٹن اور دماغ کے ناکارہ ہونے کا

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۰۹

سبب بنتی ہے۔اس دوران حاضرین رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں بے چینی کا اظہار کرتے ہیں اور اسے واپس پلٹانے کی بے ثمر کوششیں کرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن کسی سے کچھ بن نہیں پاتا اور کچھ ہی لمحوں بعد انسان ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے جدا ہو جاتا ہے اور اس کا بے جان جسم اس طرح ایک کونے میں پڑا ہوتا ہے جیسے وہ ہرگز اہل دنیا میں سے نہ تھا۔

اور یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ ان مراحل سے سبھی کو گزرنا ہے کہ جو کبھی دیر سے اور کبھی جلدی طے ہو جاتے ہیں ستمگر، جابر، بادشاہ بھی اسی طرح مر جائیں گیا جیسے مظلوم اور مستضعف وستم رسیدہ لوگ مر جائیں گے بلکہ ان کے جان کنی کے لمحات زیادہ دردناک ہیں۔۔چونکہ مادی دنیا کے ان دلبستگان کے لیے اس مال و دولت اور مقام و منزلت سے جدا ہونا کہ جس کے لیے انہوں نے زندگی بھر محنت کی اور ان سے منہ موڑنا آسان نہیں۔

''واپس لوٹنے اور تلافی کرنے کی تمنا''

دنیا سے جدائی اور موت کے لمحے کہ جب چشم برزخ کھل جاتی ہے، پس پردہ بعض غیبی اسرار انسان پر آشکار ہو جاتے ہیں، نتیجہ، اعمال اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، ہاتھوں کو حسنات سے خالی اور پشت کو گناہوں کیبوجھ تلے دبتا محسوس کرتا ہے تو اپنے ماضی پر شدید نادم اور پشیمان ہوتا ہے اور اس کی تلافی کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ان حالات میں، جیسا کہ زیر بحث دسویں آیت میں ذکر ہوا ہے، قبض روح کرنے والے فرشتوں کی طرف رخ کر کے بارگاہ خداوندی میں التجا کرتا ہے اور پکارتا ہے: اے میرے پروردگار! مجھے واپس بھیج دے۔

حتی اذا جآء احدھم الموت قال رب ارجعون

شاید اپنے گذشتہ کی تلافی کر سکوں اور وہ جو کچھ مجھ سے ترک ہوا ہے اس کے بدلے عمل صالح انجام دے سکوں۔

لعلی اعمل صالحا فیما ترکت

لیکن الٰہی سنت کسی کو ایسی اجازت نہیں دیتی نہ نیک لوگوں کے لیے واپسی کا کوئی راستہ ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال میں اضافہ کر سکیں اور نہ ہی بدکاروں کے لیے توبہ اور تلافی کی کوئی سبیل، لہذا قاطعانہ طور پر اسے جواب دیا جاتا ہے کہ

کلا

نہیں! ہرگز واپسی کی کوئی راہ نہیں۔

مزید برآں فرماتا ہے:

انھا کلمۃ ھو قائلھا

یہ ایسی بات ہے جو وہ فقط زبان سے کہتے ہیں دل سے نہیں۔

تمام مجرم جب سزاؤں کے پھندے میں گرفتار ہوتے ہیں تو اس وقت ایسی باتیں کرتے ہیں لیکن جونہی امواج مصائب اور سختیوں کا

زور ٹوٹتا ہے تو بیشتر وہی پہلے والے کاموں کی تکرار ہوتی ہے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ "رب ارجعون" میں مخاطب پاک پروردگار کی ذات ہے لیکن "ارجعون" کی ضمیر جمع استعمال ہوئی ہے۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ مقام حق تعالیٰ کے احترام و تعظیم کی خاطر ہے یا درحقیقت مخاطب فرشتگان خدا ہیں کہ جو ایک گروہ کی صورت میں قبض روح کے لیے آتے ہیں۔

یہ معنی بھی ممکن ہے کہ اولاً انسان لطف خدا کا دامن تھامتا ہے اور پھر فرشتوں کی طرف رخ کر کے ان سے بازگشت کا تقاضا کرتا ہے۔[1]

سورۃ منافقوں کی دسویں آیت میں بھی اسی سے مشابہ مطلب بیان ہوا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰

وہ جو روزی ہم نے آپ کے نصیب کی ہے اس میں سے خدا کی راہ میں انفاق کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی ایک کی موت آپہنچے اور پھر وہ کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے کچھ تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تا کہ خیرات کرتا اور صالحین میں سے ہو جاتا۔

اس آیت کے ذیل میں بھی ایک اور انداز سے انہیں نفی میں جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ولن يؤخر الله اذا جاء اجلها والله خبير بما تعملون۔

اور جب کسی کو موت آجاتی ہے تو خدا اس کو ہرگز مہلت نہیں دیتا اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

سورہ انعام کی آیت ۲۸ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مجرمین دوزخ کے کنارے یہی باتیں کریں گے چونکہ یہ بات موضوع بحث سے خارج ہے اس لیے ابھی اس کی تشریح سے صرف نظر کرتے ہیں۔

نتیجہ بحث:

متذکرہ بالا دس عناوین اور آیات کی تفسیر سے مسئلہ موت کے بارے میں مختلف زاویوں سے قرآن کی نظر واضح ہو جاتی ہے۔

قابل توجہ ہے کہ قرآن نے ان تمام موارد میں ان کے تربیتی آثار پر انحصار کیا ہے کیونکہ قرآن ایک مکمل تربیتی کتاب ہے۔ اصول

---

[1] تفسیر "المیزان" میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ جمع کی ضمیر جمع فاعل کی بجائے جمع فعل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی عالم نزع کی حالت میں گویا وہ شخص چند بار "ارجع ارجع" کہنے کی بجائے "ارجعوا" کہتا ہے۔

المیزان ج ۱۵ ص ۱۷ (لیکن مسلما ایسا عربی ادبیات میں بہت کم ہے)۔

دین، فروع دین اور تاریخی واجتماعی مسائل وغیرہ کو بیان کرتے وقت ان کے تربیتی پہلوؤں پر قرآن خاص نگاہ رکھتا ہے۔یعنی واقعات اور حقائق کو واضح طور پر بیان کرتا ہے اور ان سے سرکش نفس کو کنٹرول کرنے تقویٰ و پرہیز گاری کی دعوت اور قرب خدا کی راہ طے کرنے کے لیے انتہائی ظریف اور دقیق انداز سے استفادہ کرتا ہے اور واقعاً ان تمام پہلوؤں میں قرآن کی باریکی اور ظرافت کس قدر جاذب اور دلکش ہے!

چند وضاحتیں

۱۔موت، دریچہ عالم بقاء

آیات قرآنی سے استناد کے ساتھ وہ جو کچھ سطور بالا میں ذکر ہوا ہے منطقی طریقوں سے قابل استدلال ہے۔(لیکن غیبی عوالم اس سے مستثنیٰ ہیں چونکہ ان تک ہماری رسائی نہیں اور قرآن نے ان سے پردہ اٹھایا ہے)۔

اس میں شک نہیں کہ موت کے بارے میں معتقدین معاد اور الٰہی افراد کی نظر مادی افراد اور منکرین معاد کی نظر کی نسبت زمین و آسمان کے تفاوت کی حامل ہے یہ نظریے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے پیروکاروں کی روش کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔

مادی افراد موت کو انتہائی تاریک اور ظلمانی عالم تصور کرتے ہیں ایک ایسا عالم کہ جس کے ساتھ ہر چیز کا خاتمہ ہو جاتا ہے ان کے نزدیک موت انسان کی تمام تر کوششوں، جدوجہد، آرزوں اور تمناؤں کا اختتام ہے بنابرایں باعث تعجب نہیں کہ مادی انسان موت کے خوف سے اپنے اوپر لرزہ طاری رکھے اور اسی فکر سے زندگی کے جام شیریں کو ساغر زہر بنا ڈالے۔

باعث تعجب نہیں کہ وہ انفرادی اور اجتماعی دباؤ کے بغیر ایثار و فداکاری کے قریب بھی نہ پھٹکیں چونکہ ایثار کے بعد کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی نعم البدل ہو سکے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ ایثار کا ہدف نہائی بنے۔

تعجب آور نہیں کہ وہ زندگی کو لغو بیہودہ اور بے معنیٰ جانیں کیونکہ اگر موت ہر چیز کا خاتمہ ہو تو یہ دنیاوی زندگی کہ جو چھوٹی سطح کے تکراری کاموں مثلاً کھانے پینے پہننے اور مصرف کرنے کا مجموعہ ہے ایک عالی ہدف کے عنوان سے روح انسانی کو ہرگز سیراب نہیں کر سکتی لہذا بعض لوگ خودکشی کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے اس اقدام کو روزمرہ زندگی کے بے معنی تکراری افعال کے خاتمہ کے لیے ایک صحیح انتخاب تصور کرتے ہیں اور اسے عقل و منطق کے عین مطابق سمجھتے ہیں جب کہ زندہ رہنے کو ایک طرح کی حماقت، نادانی اور مایہء ذلت خیال کرتے ہیں۔

لیکن معتقدین معاد اور الٰہی افراد موت کو اسی طرح دیکھتے ہیں کہ جیسے شکم مادر سے جنین کی پیدائش۔

درحقیقت جنین مرجاتا ہے یعنی شکم مادر والی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے لیکن ٹھیک اسی لمحے ایک ایسے جہان میں قدم رکھتا ہے کہ جو شکم مادر کے محدود تاریک محیط کی نسبت وسیع تر، کشادہ تر اور مختلف نعمتوں اور عنائیوں سے معمور ہے۔

موت بھی ایک تولد ثانوی ہے انسان موت کے راستے میں دنیاوی زندگی کے محدود محیط سے ایک انتہائی وسیع تر جہان میں قدم

رکھتا ہے۔

واقعاً اگر جنین جان لے کہ تولد کے بعد کہاں قدم رکھے گا تو شروع ہی سے اپنی پیدائش کے لیے ایک ایک گھڑی گنے وحشت و ہراس کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے عالم جنین کو ہرگز لغو اور بے ہودہ شمار نہ کرے اور اس راہ میں فداکاری وایثار سے ہرگز دریغ نہ کرے۔

مختصر یہ کہ دریچہ عالم بقاء کے عنوان سے موت کے بارے میں انسان کی نگاہ اس کی زندگی کو ایک نیا رنگ بخشتی ہے۔اسے ایک دل پذیر مفہوم عطا کرتی ہے اور اسے سرگردانی بدبینی حیرت احساس پوچ اور بے ہدفی سے نجات دلاتی ہے کہ جس سے پیدا ہونے والا رنج انتہائی جانکاہ ثابت ہوتا ہے

۲۔موت سے ڈر کیسا؟

گذشتہ بحث سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ معاد پر اعتقاد رکھنے والے انسانوں کے لیے موت سے ڈر یا خوف کوئی معنیٰ نہیں رکھتا لیکن وہ لوگ کہ جن کا اعمالنامہ ہی سیاہ ہو چکا ہو اور وہ لوگ کہ جو سرائے آخرت میں عذاب الہیٰ سے وحشت زدہ ہیں۔بہر حال تین طرح کے لوگ موت سے خوف زدہ ہیں۔

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جو موت کو فنا اور نابودی کے مساوی سمجھتے ہیں نابودی وحشت ناک ہے۔فقر بیماری ضعف اور ناتوانی سب مایہ وحشت ہیں چونکہ نیستی و نابودی ثروت سلامتی قدرت اور طاقت کی نابودی کے معنیٰ میں ہے اور انسان ایک ایسا موجود ہے کہ جو ہستی کا حامل ہے اور ہستی ہستی ہی کے ساتھ مانوس وآشنا ہے۔جب کہ نیستی کے ساتھ اس کی کوئی مناسبت نہیں پس انسان کو موت سے گریزاں ہی ہونا چاہیے اور اسے موت سے فرار ہی کرنا چاہیے۔

لیکن اگر ہم موت کو ایک برتر ہستی تک پہنچنے کے لیے زینے کے عنوان سے تعبیر کریں اور جہان بعد از مرگ کو نعمت اور وسعت کے اعتبار سے اس جہان کے ساتھ قابل تقابل نہ جانیں دنیا کو زندان اور موت کو اس زندان سے رہائی شمار کریں،موجودہ زندگی کو طائر روح کے لیے قفس سمجھیں اور موت کے درِ قفس کے کھل جانے اور پرواز روح سے تعبیر کریں تو نہ صرخوف و ہراس والا مسئلہ ہی نہ رہے گا بلکہ موت خود اپنی جگہ دلپسند اور مرغوب بن جائے گی۔

بقول کسی دانشمند حکیم کے:

بمیر ای حکیم ازچنین زندگانی
کزایں زندگانی بمیری بمانی
سفر ہای علوی کند مرغ جانت
چوازچیز آز ،بازش رہانی

اے حکیم!اس زندگی سے تو مرہی جاؤ چونکہ مرکر ہی باقی رہ سکتے ہو اور پھر تیرا طائر جاں ایسے بلند و بالا سفر کرے گا

کہ جیسے تو نے اس کے شاہیں کو آرزوؤں طمع اور حرص کے چنگل سے رہائی دلوائی ہو۔

ایک شاعر کے بقول

مرغ باغ ملکوتم نیم از عالم خاک
دوسہ روزی قفسی ساختہ انداز بدنم
خرم آن روز کہ پرواز کنم تا بردوست
بہ ہوای سر کویش پر و بالی بزنم

میں باغ ملکوت کا طائر ہوں۔ میرا کچھ حصہ عالم خاک سے ہے میرے بدن کو دو تین دن کے لیے میرا قفس بنایا گیا ہے خوشی تو اس دن ہوگی جب میں کوچہ یار کی ہوا میں پر مارتا ہوا محبوب کی طرف پرواز کروں گا۔

ایک اور شاعر آغوش پھیلا کر موت کا استقبال کرتا ہے اور اسے اپنی طرف پکارتا ہے

موت اگر مرد است کو نزد من آی
تادر آغوشش بگیرم تنگ تنگ
من زاو جانی ستانم جاودان
او زمن دلقی ستاند رنگ رنگ!

موت اگر مرد ہے تو اسے کہہ دو کہ میرے پاس آئے تا کہ میں بازو پھیلا کر اس سے خوب بغل گیر ہو جاؤں میں اس سے حیات جب جاوداں لے لوں اور وہ مجھ سے خرقہ رنگ رنگ لے لے۔

واضح ہے کہ جب موت کی ایسی تفسیر ہو تو کوئی بھی اس سے نہیں ڈرتا اور خوف کو اپنے اوپر طاری نہیں کرتا ہم یہ نہیں کہتے کہ خودکشی کر لے کیونکہ یہ زندگی تو زیادہ سے زیادہ پس انداز کرنے کسب زاد راہ اور اس جہان کے سفر کی تیاری کے لیے ہے۔

بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اس عقیدے کا مالک دنیا سے جدا ہوتے وقت کھلے بازوؤں سے آگے بڑھتا ہے جرات و شجاعت کے ساتھ ایک ایسی چیز کے استقبال کو اٹھتا ہے جو اسے حیات تو بخشتی ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو حیات بعد از ممات پر ایمان رکھتے ہیں موت کو ہرگز فنا اور نیستی نہیں سمجھتے لیکن فقط اس وجہ سے کہ ان کا اعمال نامہ سیاہ اور تاریک ہے اور انہیں بعد از مرگ روز محشر طرح طرح سزاؤں کا خوف ہے اسی لیے موت سے گریزاں اور فراری ہیں بالکل ان مجرموں کی طرح کہ جو اپنے سیاہ اعمال نامہ کی وجہ سے ہمیشہ یہی آرزو کرتے ہیں کہ روز عدالت میں تاخیر ہوتی رہے اور وہ اسی طرح زندان میں پڑے رہیں۔

اس گروہ کے افراد بھی حق بجانب ہیں کہ موت سے ڈریں۔ زندان سے رہائی خوب ہے لیکن اس مجرم کے لیے نہیں کہ جسے آزادی

زندان سے تختہ دار تک پہنچادے۔

تیسرا گروہ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ دنیاوی زندگی سے وابستگی اور دلبستگی انسان کو اذیت پہچاتی ہے مال ومقام اور دنیا کی چکا چوند سے انسان کی شدید محبت اسے اس موت سے کہ جو یہ سب کچھ چھین لے بیزار کردیتی ہے۔

لیکن وہ لوگ جو موت کو فنا نہیں سمجھتے اور ان کا اعمال نامہ بھی سیاہ نہیں اور نہ ہی دنیا کی مادی زندگی سے ان کی کوئی وابستگی ہے کوئی دلیل نہیں بنتی کہ وہ موت سے خوفزدہ ہوں۔

۳۔موت روایات اسلامی میں

روایات اسلامی میں بھی موت سے وحشت اور خوف کی وجوہات سے متعلق انتہائی اہم نکات دکھائی دیتے ہیں جو بہت سبق آموز ہیں۔

ا۔کسی نے حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے پوچھا!

یابن رسول الله! ما بالنا نکرة الموت ولا نحبه؟

ہم کیوں موت کو ناخوش آیندہ سمجھتے ہیں اور اسے پسند نہیں کرتے؟

امامؑ نے جواب دیا:

انکم اخربتم اکرتکم وعمرتم دنیا کم و انتم تکرهون النقلة من العمران الی الخراب!

یہ اس وجہ سے ہے کہ تم نے اپنی آخرت کو ویران کرلیا ہے اور اپنی دنیا کو آباد اسی لیے آبادی سے ویرانی کی طرف منتقل ہونا تم پر ناگوار گزرتا ہے۔[1]

۲۔امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ایک شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

مالی لا احب الموت؟

مجھے کیا ہے کہ میں موت کو پسند نہیں کرتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] بحارالانوار۔ج ۶ ص ۱۲۹ حدیث ۱۸

الك مال؟

کیاتمہارے پاس کوئی ثروت ہے؟

عرض کرنے لگا۔ جی ہاں!

آنحضرت نے فرمایا:

فقدمته

آیا کچھ آگے بھی بھیجا ہے؟

عرض کیا: نہ

فرمایا: فمن ثم لا تحب الموت

یہی وجہ ہے کہ تم موت کو پسند نہیں کرتے۔[1]

۳۔ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام اپنے ایک دوست کی عیادت کے لیے گئے دیکھا کہ وہ مسلسل رو رہا ہے اور موت کے خوف سے بے چین ہوئے جا رہا ہے امامؑ نے اس سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

یا عبد الله! تخاف من الموت لا نك لا تعرفه

اے بندہ خدا! تم موت سے ڈرتے ہو کیونکہ حقیقت موت کو نہیں جانتے۔

پھر امام علیہ السلام نے موت کو ایک صاف ستھرے حمام سے تشبیہ دی جہاں ایک آلودہ انسان وارد ہوتا ہے اور اس کے تمام تر غم و اندوہ اور دکھ دھل جاتے ہیں اور وہ سرور و شادمانی پالیتا ہے۔[2]

۴۔امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

لما اشتد الامر بالحسين بن علي بن ابي طالب... كان الحسين و ابعض من معه تشرق لوالهم وتهدا جوا ر حهم وتسكن لفوسهم فقال بعضهم لبعض انظر و الا يبالى بالموت۔

جب ورز عاشورا امام حسین علیہ السلام پر بہت زیادہ مشکل آن پڑی تو آپ اور آپ کے کچھ ساتھیوں کے چہرے

---

[1] بحار الانوار۔ ج ۶ ص ۱۲۷ حدیث ۹

[2] معانی الاخبار۔ ص ۲۹۰ حدیث ۹ (باب فی معنی الموت)

لحظہ بہ لحظہ زیادہ دمکنے لگے اور آپ کے جسم کے اعضاء زیادہ پرسکون ہونے لگے اور نفوس زیادہ مطمئن ہونے لگے۔ بعض لوگ ایک دوسرے کو کہتے کہ انہیں دیکھو کہ انہیں موت کی کچھ بھی پرواہ نہیں۔ [1]

یہ احادیث موت سے خوف کی علت بیان کرنے کے لیے کافی واضح ہیں اور ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔

---

[1] معانی الاخبار۔ص ۲۸۸ حدیث ۳

(۲)برزخ

''برزخ''اس چیز کے معنی میں ہے جو دو اشیاء کے درمیان حائل ہو۔آہستہ آہستہ اس معنیٰ نے وسعت حاصل کر لی اور پھر اس ہر امر پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔جو دو مرحلوں یا دو چیزوں کے درمیان حائل ہو[1]۔

یہاں پر برزخ سے مراد وہ جہان ہے جو دنیا اور عالم آخرت کے درمیان موجود ہے یعنی جب روح بدن سے جدا ہوتی ہے تو قبل ازیں کہ قیامت میں دوبارہ بدن اصلی کے ساتھ حاضر ہو اس عالم میں ٹھہرے گی جو ان دونوں جہانوں کے درمیان واقع ہے اور برزخ سے موسوم ہے۔

عالم برزخ کے اثبات کے لیے ہمارے پاس اہم دلائل،آیات،روایات اور نقلی دلائل ہیں اگرچہ یہ مسئلہ طرق عقلی یا حسی (ارواح کے ساتھ رابطے کے ذریعے) سے بھی ممکن ہے۔

اگرچہ قرآن مجید میں برزخ کے بارے میں زیادہ بحث نہیں اور نسبتاً ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے قرآنجید اس مسئلے سے گذر گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس ضمن میں متعدد آیات بڑی صریح اور روشن تعبیرات کی حامل ہیں جو ہمارے لیے جہان برزخ سے مربوط کلی اصول واضح کرتی ہیں۔

اس وضاحت کے ساتھ ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نگاہِ دل وجان سے درج ذیل آیات کو دیکھتے ہیں:

(۱) حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝۹۹ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۰۰ (مؤمنون: ۹۹، ۱۰۰)

(۲) وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝۱۶۹ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۱۷۰

(ال عمران ۱۶۹، ۱۷۰)

---

[1] سورۂ رحمن آیت ۲۰ میں شیریں اور تلخ سمندروں کے بارے میں ذکر ہوا ہے کہ جو ایک دوسرے کے ہم جوار ہیں "بینھما برزخ لا یبغیان" ان دونوں کے درمیان برزخ ہے کہ جو ایک کو دوسرے پر غلبہ کرنے سے باز رکھتی ہے۔

(۳) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴿۱۵۴﴾ (بقرة: ۱۵۴)

(۴) اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴿۴۶﴾ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ﴿۴۷﴾ (مؤمن: ۴۶، ۴۷)

(۵) مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا﴿۲۵﴾ (نوح: ۲۵)

(۶) قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ﴿۲۶﴾ۙ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ﴿۲۷﴾ (يس: ۲۶، ۲۷)

(۷) وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ﴿۵۵﴾ (روم: ۵۵)

(۸) قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ﴿۱۱﴾ (مؤمن: ۱۱)

ترجمہ

(۱) یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک کی موت آ پہنچتی ہے تو کہنے لگتا ہے؛ اے میرے پروردگار! مجھے واپس بھیج دے شاید وہ کچھ جو میں نے ترک کیا ہے (اور کوتاہی کی ہے۔ ازالہ کروں) عمل صالح انجام دوں اسے جواب دیا جائے گا) ایسا نہیں ہے یہ تو فقط اس کے کہنے کی باتیں ہیں (اگر اسے واپس بھیج بھی دیا جائے تو یہ اپنی پہلی سی ڈگر پر قائم رہے گا) اور انکے پیچھے برزخ ہے اس دن تک کہ جب یہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے

(۲) (اے رسولؐ خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو ہرگز مردہ نہ جانو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے

حضور سے روزی حاصل کرتے ہیں وہ ان فروان نعمتوں کے باعث خوش ہیں کہ جو خدا نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں اور ان لوگون (مجاہدیں) کے لیے بھی خوشی سے پھولے نہیں سماتے جو انکے بعد (ابھی) ان سے ملحق نہیں ہوئے (کیونکہ یہ اس دنیا میں ان مقامات عالیہ کو دیکھتے اور اجانتے ہیں) کہ ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی انہیں کوئی غم ہوگا۔

(۳) جو خدا کی راہ میں قتل ہوتے ہیں انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہین لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔

(۴) ان کا عذاب آگ ہے کہ جس کے سامنے وہ ہر صبح وشام لا کھڑے کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت بر پا ہوگی حکم ہوگا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں جھونک دو یا دکرو اس وقت کو جب آتش جہنم میں یہ باہم جھگڑیں گے ضعفاء مستکبر ین سے کہیں گے ہم تمہارے پیروکار رہے ہیں کیا (آج) ہماری بجائے تم کچھ آگ قبول کرتے ہو؟

۵۔ (جی ہاں بالآخر) سب کے سب اپنے گناہوں کی بدولت غرق ہو گئے اور آتش دوزخ میں جا پڑے اور خدا کے سوا کسی کو اپنا یاور مددگار نہ پایا۔

(۶) (آخرکار اسے شہید کر دیا گیا اور) اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ تو اس نے کہا: اے کاش میری قوم جانتی۔ کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے ان میں سے قرار دیا کہ جن کی تکریم کی گئی۔

(۷) جب قیامت بر پا ہوگی تو گناہگار قسم کھائیں گے کہ گھڑی بھر سے زیادہ (عالم برزخ میں) نہ ٹھہرے۔ اس طرح وہ ادراک حقیقت سے محروم رہے۔

(۸) وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دوبارہ مارا اور دوبارہ زندہ کیا۔ اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا (دوزخ سے) خارج ہونے کی کوئی سبیل ہے؟!

تفسیر

برزخ اور اس کی خصوصیات

پہلی آیت میں آغاز بحث کافروں، ظالموں اور مجرموں کی کیفیت سے ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے:

حتی اذا جاء احدهم الموت قال رب ارجعون لعله اعمل صالحا فيما ترکت

وہ یونہی اپنی غلط ڈگر پر چلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک کی موت آ پہنچتی ہے تو کہنے لگتا ہے : پروردگار! مجھے واپس بھیج دے جو کچھ میں کوتاہی کر چکا ہوں اس کے بجائے شائد عمل صالح انجام دوں (اور اپنی گذشتہ سیاہ کاریوں کی تلافی کروں)

لیکن جلد ہی اسے مدلل منفی جواب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے خطاب ہوتا ہے:

کلا انہا کلمۃ ھو قائلھا

ایسا نہیں ہے یہ وہ بات ہے جو وہ زبان سے کہتا ہے (اگر وہ واپس لوٹ جائے تو پھر وہی پہلے سے کاموں کی تکرار کرے گا)۔

مزید ارشاد ہوتا ہے:

ومن ورآئھم برزخ الی یوم یبعثون

انہیں اس دن تک برزخ درپیش ہے کہ جب یہ پھر اٹھائے جائیں گے۔

آیت کے شروع میں پہلے مرحلے یعنی مرگ کی طرف اور آخر آیت میں دوسرے مرحلے یعنی برزخ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

اگرچہ بعض کا اصرار ہے کہ برزخ کو یہاں پر انسان اور بہشت کے درجات عالی کے درمیان حائل کے طور پر تفسیر کیا جائے۔ لیکن "الی یوم یبعثون" (تا روز قیامت) کے جملے سے بخوبی آشکار ہوجاتا ہے کہ برزخ قبل از قیامت اور بعد از موت کا مرحلہ ہے۔

بعض نے اس دنیا میں واپس لوٹنے میں رکاوٹ کے معنی میں بھی برزخ کا بیان کیا ہے اور یہ معنی بھی آیت کے آخری جملے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کہ جس میں کہا گیا ہے برزخ روز قیامت تک جاری رہے گا۔

بنابرایں متذکرہ بالا آیت بڑی وضاحت کے ساتھ دنیا و آخرت کے درمیان ایک ایسے عالم کی نشاندہی کرتی ہے۔

''وارء'' کی تعبیر ''آگے'' کے لیے اور کبھی پیچھے کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ چونکہ یہ کلمہ ''وری'' کے مادے سے بروزن ''سعی'' ہے جس کا معنی ہے ''چھپانا'' مثلاً اگر کوئی دیوار کے ایک طرف کھڑا ہو تو دیوار کی دوسری طرف اس کے لیے پوشیدہ ہوگی جسے وارء کہا جائے گا بناء بریں انسان دیوار کے کسی بھی طرف کھڑا ہو اس کے دوسری جانب ''وراء'' ہے۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اتخوف علیکم فی البرزخ

''میں تمہارے لیے برزخ سے ڈرتا ہوں''

---

[1] مفردات راغب مادہ ''وری''

راوی نے سوال کیا:

ما البرزخ

(برزخ کیا ہے؟)

فرمایا:

القبر منذ حين موته الى يوم القيمة

برزخ قبر ہی ہے، انسان کے مرنے سے لے کر روز قیامت تک۔ [1]

حضرت امام علی بن الحسین علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان القبر روضة من رياض الجنة

او حفرة من حفر النيران

قبر بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے

یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ [2]

دوسری آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہوتے ہوئے صریحاً ارشاد ہوتا ہے:

ولا تحسبن الذين قتلوا فى سبيل الله امواتا بل احيآء عند ربهم يرزقون

خدا کی راہ میں قتل ہونے والوں کو ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے حضور سے روزی حاصل کرتے ہیں۔

تیسری آیت میں تمام مومنین سے بالصراحت خطاب کیا گیا ہے:

ولا تقولوا لمن يقتل فى سبيل الله اموات بل احيآء ولكن لا تشعرون

راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔

یہ دونوں آیتیں عالم برزخ کے وجود پر روشن دلائل میں سے ہیں (اگرچہ بات فقط شہداء کے بارے میں کی گئی ہے) کیونکہ دونوں

---

[1] تفسیر برہان۔ ج ۳ ص ۱۲۰ حدیث ۲ و ۱

[2] تفسیر برہان۔ ج ۳ ص ۱۲۰ حدیث ۲ و ۱

آیتوں میں شہیدوں کے زندہ ہونے بلکہ اس سے بڑھ کر اس کے حضور سے روزی حاصل کرنے اور قرب خدا سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

وہ کلمات کہ جو ان آیات میں اور اس کے بعد والی آیات میں بھی ذکر ہوئے ہیں اور سب کے سب شہدا کی زندگی (زندگی اپنے تمام حقیقی معنیٰ میں) سے متعلق حکایت کرتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ ان کلمات کو بعض مفسرین نے بغیر کسی توجہ کے توجیہات کر کے مجازی معنی میں بیان کیا ہے مثلاً شہدا کے نام اور ان کے آثار کا زندہ رہنا، ہدایت، اطاعت اور ان کے دین کا زندہ ہونا یا روز قیامت قبروں سے زندہ ہونا۔

کیا وہ غور نہیں کرتے کہ قرآن کہتا ہے کہ شہدا اپنے پروردگار کے پاس ہیں انہیں روزی دی جاتی ہے؟

خدا کے فضل و کرم سے حاصل ہونے والی نعمتوں پر خوش ہیں۔

انہیں آئندہ کا خوف اور گذشتہ کا غم نہیں۔

یہ تعبیرات مفاہیم مجازی کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی ہیں؟

علاوہ ازیں خدا فرماتا ہے کہ: تم ان کی زندگی کا ادراک نہیں رکھتے اگر نام و نشان ہدایت اور دین کا زندہ ہونا مقصود ہوتا تو سب کے لیے قابل فہم تھا۔

ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مفسرین حیات برزخ کو صحیح طرح ہضم نہیں کر پائے۔

چوں ندید ند حقیقت

رہ افسانہ زدند

چونکہ حقیقت سمجھ نہیں آسکی اس لیے آئیں بائیں شائیں کرنے لگے ہیں۔

فخر رازی بھی اپنی تفسیر میں یوں رقمطراز ہے کہ اکثر معتقد ہیں کہ یہاں پر زندگی سے مراد حیا تحقیقی ہے۔[1]

مجمع البیان میں طبرسی مرحوم نے اگرچہ اس آیت کی چار تفسیریں بیان کی ہیں لیکن پہلی تفسیر کو جو حیات حقیقی کے معنیٰ میں ہے آیت کی صحیح تفسیر کے طور پر انتخاب کیا ہے۔[2]

البتہ اس بارے میں روایات بھی فراوان ہیں کہ جنکی طرف انشاءاللہ بعد میں اشارہ کیا جائے گا۔

ایک اور عجیب بات ہے کہ بعض مفسرین اس آیت کو شہدائے بدر کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سارے شہدا اس آیت کے ضمن میں نہیں آتے اس بات کو تفسیر المیز ان نے نقل کیا ہے اس بات کی طرف توجہ رہنا چاہیے کہ پہلی آیت کی شان نزول کے بارے میں

---

[1] تفسیر فخر رازی۔ جلد ۴ ص ۱۴۵

[2] مجمع البیان۔ جلد ۱ و ۲ ص ۲۳۶

مفسرین نے بڑی صراحت سے شہدائے احد کا ذکر کیا ہے اور دوسری آیت سے متعلق شہدائے بدر کا)۔[1]

بہرحال شان نزول سے آیت کا مفہوم محدود نہیں ہوجاتا اور آیت تمام شہدا کو اپنے اس وسیع مفہوم کے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

بہرحال اگرچہ آیت راہ خدا میں شہید ہونے والوں کے بارے میں گویا ہے لیکن غیر از شہدا کی نفی نہیں کی گئی یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حیات برزخ سب انسانوں کے لیے ہے تو پھر شہداء کو دوسروں پر کیا فضیلت ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے کہ ان کی فضیلت ایک خاص قسم کی زندگی کی بنا پر ہے یعنی ان کی زندگی بارگاہ خداوندی میں اس کے جوار رحمت میں، اس کے قرب میں اور الٰہی دسترخوان پر غریق نعمت ہونے کی وجہ سے فضیلت کی حامل ہے اور یقیناً دوسروں کی زندگی ان نعمتوں اور برکتوں سے معمور نہیں۔

چوتھی آیت عالم برزخ میں آل فرعون کے عذاب میں مبتلا ہونے سے متعلق حکایت کرتی ہے اور یہ درحقیقت آیات شہدا کے مقابل مفہوم رکھتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾

''آخرکار آل فرعون پر سخت عذاب نازل ہوا'' (مومن ۴۵)

پھر اس عذاب الٰہی کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے:

"النار یعرضون علیها غدوا وعشیا ویوم تقوم الساعة ادخلوا ال فرعون اشد العذاب

''ان کا عذاب وہ آگ ہے جس کے سامنے وہ ہر صبح اور شام لا کھڑے کئے جاتے ہیں اور جب قیامت برپا ہوگی تو خدا حکم دے گا: آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں جھونک دو۔''

واضح ہے کہ یہ آگ کہ جس کے بارے میں آیت کے (شروع میں) اشارہ ہوا ہے کہ آلِ فرعون کو صبح وشام اس کے سامنے لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ دوزخ برزخ ہے کیونکہ آخر آیت میں ان کی نظر قیامت کی سزا کا علیحدہ سے ذکر ہوا ہے لہذا اکثر مفسرین نے اس آیت کو عذاب قبر اور عالم برزخ کے بارے میں بیان کیا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آل فوعون کے عذاب کے بارے میں تو فرمایا گیا ہے کہ'' آل فرعون ہر صبح اور شام آگ کے سامنے لا

---

[1] بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ سورہ آل عمران کی آیت شہدائے بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ درحالیکہ سورۂ بقرہ کی آیت کی شانِ نزول شہدائے بدر اور احد دونوں کے بارے میں ہے۔

کھڑے کئے جاتے ہیں۔'' لیکن ان کے عذاب آخرت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ''حکم دیا جائے گا کہ انہیں سخت ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔''

ان دوعبارتوں (لاکھڑا کیا جانا اور جھونک دیا جانا) کے فرق سے پتہ چلتا ہے کہ آگ سے مراد آتش دوزخ ہی ہے البتہ عالم برزخ میں دور سے اس کا مشاہدہ کریں گے اور اذیت پائیں گے جب کہ روز قیامت نزدیک سے اور اس میں داخل ہو کر اس کا مزہ چکھیں گے یہ سزا عالم برزخ میں فقط صبح اور شام کے وقت ہے اور روز قیامت مسلسل اور دائمی ہے۔

اسی بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے جو اس مطلب کی تائید کرتی ہے آپؐ فرماتے ہیں:

ان احدکم اذامات عرض علیه مقعده بالغداة والعشی، ان کان من اهل الجنة، فمن الجنة وان کان من اهل النار فمن النار، یقال هذا مقعدك حین یبعثك الله یوم القیمة۔

جب تم میں سے کوئی ایک مرجاتا ہے تو اس کو ہر صبح اور شام اس کا مقام دکھایا جاتا ہے اگر اہل جنت میں سے ہو تو جنت میں اور اگر اہل نار میں ہو تو نار میں۔ اور اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ تمہاری جگہ ہے جب روز قیامت خدا تمہیں دوبارہ زندہ اٹھائے گا۔[1]

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسئلہ آل فرعون کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عمومیت رکھتا ہے۔

کیا اہل برزخ جنت یا دوزخ کو فقط دیکھنے ہی سے خوش ہوں گے یا سزا میں مبتلا ہوں گے؟ یا جنت و دوزخ ان کے ظاہری وجود پر بھی کوئی اثر مرتب کرے گی جیسا کہ جب کوئی دہکتی ہوئی آگ کے قریب سے گذرے تو آگ کی تپش اس کے چہرے کو جھلسا دیتی ہے یا پھر سرسبز وشاداب باغ کے نزدیک سے گذرے تو جان افزاء بادنسیم اور اس کی خوشبو اسے مسحور کر دیتی ہے یا پھر دونوں طریقوں سے سزاء وجزاء پائے گا۔

تیسرا احتمال سب سے زیادہ مناسب دکھائی دیتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آیت ظاہراً تو یوں ہے کہ آل فرعوں کو آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ عبارت اس کے برعکس معنی کے لیے کنایہ ہے یعنی آگ ان کے سامنے پیش کی جائے گی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے عرضت الناقة علی الحوض (میں نے اونٹ کو تالاب کے سامنے پیش کیا)۔ یعنی اسے پانی پیش کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبارت بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے چونکہ ارشاد ہوتا ہے: بہشت و دوزخ میں ان کی جگہ انہیں دکھائی جاتی ہے۔

چھٹی آیت ''مومن آل یس'' کے بارے میں (وہ مرد باایمان کہ جس کی داستان سورہ یس میں بیان ہوئی ہے جو شہر انطاکیہ میں آنے

---

[1] ''مجمع البیان'' میں اس حدیث کو گذشتہ آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری اور مسلم سے نقل کیا گیا ہے۔ (جلد ۷ اور ۸ ص ۵۲۶)

والے حضرت مسیح علیہ السلام کے رسولوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور لوگوں کو نصیحت کی کہ ان رسولوں کی پیروی کریں لیکن اس ہٹ دھرم اور گناہگار قوم نے نہ صرف اس پاک باز مومن کی باتوں پر کان دھرے بلکہ اس پر ٹوٹ پڑی اور شہید کر دیا)۔

ارشاد ہوتا ہے:

قیل ادخل الجنة قال یلیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین

اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جائے تو اس نے کہا: اے کاش میری قوم جانتی کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے ان میں سے قرار دیا ہے کہ جن کی تکریم کی گئی۔

واضح ہے کہ جنت قیامت والی جنت نہیں ہے بلکہ بہشت برزخ ہے چونکہ مومن آل یس یہاں آرزو کرتا ہے کہ دنیا میں اس کی قوم اس کے انجام سے آگاہی حاصل کرے اور جان لے کہ کس طرح خدا نے اسے مشمول غفران قرار دیا ہے اور اسے مکرمین میں سے شمار کیا ہے۔

مجمع البیان میں جناب طبرسی مرحوم فرماتے ہیں یہ آیت قبر (برزخ) کی نعمتوں پر دلالت کرتی ہے چونکہ مومن آل یس نے یہ بات اس وقت کی جب اس کی قوم زندہ تھی۔ لہٰذا جب قبر میں نعمت کا تصور ہو سکتا ہے تو عذاب قبر بھی ممکن ہے۔[1]

کئی ایک تفاسیر میں ذکر ہوا ہے کہ یا باایمان شخص ''حبیب نجار'' تھا۔ بعض روایات میں اسے مومن آل یس کے نام[2] سے شاید اس وجہ سے پکارا گیا ہے کہ وہ ایک انتہائی باایمان شخص تھا کہ جس بنا پر سورہ یس میں اس کا ذکر ہوا ہے بعض نے کہا کہ لفظ آل یہاں پر اضافی ہے اور یہ ''مومن یس'' کے معنی میں ہے۔[3]

ساتویں آیت قیامت میں مجرموں کی حالت کے بارے میں اشارہ کرتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

ویوم تقوم الساعة یقسم المجرمون مالبثوا غیر ساعة

جب قیامت برپا ہوگی تو گناہگار قسم کھائیں گے کہ وہ گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے:

کذلك کانوا یوفکون

---

[1] مجمع البیان۔ جلد ۷ اور ۸ ص ۴۲۱

[2] تفسیر درمنثور۔ بنابر نقل المیزان ج ۱۷ ص ۷۶

[3] تفسیر ''ابوالفتوح رازی'' ج ۹ ص ۲۷۰ (فٹ نوٹ علامہ شعرانی مرحوم)۔

اس طرح وہ ادراک حقیقت سے محروم رہ جاتے تھے۔

اگرچہ آیت میں ان کے ٹھہرنے کی جگہ مشخص نہیں ہوئی لیکن بعد والی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ انکے ٹھہرنے سے مراد عالم برزخ ہی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وقال الذین اوتوا العلم والایمان لقد لبثتم فی کتاب اللہ الی یوم البعث فھذا یوم البعث ولکنکم کنتم لاتعلمون

وہ لوگ کہ جنہیں علم وایمان عطا کیا گیا ہے مجرموں سے کہیں گے تم نے روز قیامت تک حکم الٰہی پر عمل سے توقف کیا اور اب روز قیامت ہے لیکن تم نہ جانتے تھے۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ٹھہرنا قیامت تک ہوگا اور یہ فقط برزخ ہی کے بارے میں صحیح ہوسکتا ہے۔

بزرگ مفسرین میں سے بھی بعض نے اسی تفسیر کا انتخاب کیا ہے کہ آیت حیات برزخ کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دنیا میں توقف پذیر ہونا ہے جسے مجرمین انتہائی کم شمار کرتے ہیں جلد ختم ہوجانے والی گھڑی کی مانند اور سورہ نازعات کی آیت ۴۶ کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

کانھم یوم یرونھا لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحھا

اس دن جب قیامت کا مشاہدہ کریں گے تو سمجھیں گے کہ دنیا میں ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہ ٹھہرے۔

لیکن اس آیت میں دنیا میں ٹھہرنے سے متعلق کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا جبکہ اس کے برعکس عالم برزخ میں توقف پذیر ہونے سے متعلق پھر بھی احتمال موجود ہے۔

علاوہ ازیں زیر بحث آیت میں ذکر ہوا ہے کہ اس توقف کا اختتام روز قیامت ہے اس نکتے کو مدنظر رکھتے ہوئے برزخ'' کے علاوہ آیت کی کوئی اور تفسیر نہیں ہوسکتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح وہ عالم برزخ کے اتنے لمبے عرصے کو اس قدر سمجھیں گے اور اسے شمار میں ہی نہ لائیں گے؟

اس ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ جب انسان کو کوئی اچھی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کو پانے کے لیے اس کی آتش شوق بھڑک اٹھتی ہے اور پھر ایک ایک لمحہ بڑی دیر سے گذرتا ہے بلکہ لمحے صدیوں میں بدلتے دکھائی دیتے ہیں اس کے برعکس اگر کسی کو دردناک عذاب کی خبر دی جائے تو وہ چاہتا ہے کہ چرخ زمان ٹھہر جائے گھڑیاں رک جائیں اور پھر دن اور مہینے اسے پل بھر میں گذرتے دکھائی دیتے ہیں اور روز قیامت مجرموں کی حالت بھی ایسی ہی ہوگی یہ درست ہے کہ عالم برزخ میں بھی وہ عذاب الٰہی سے چھٹکارا نہ پائیں گے لیکن کہاں عذاب برزخ اور کہاں عذاب قیامت؟

اس بات کا بھی احتمال ہے کہ عالم برزخ عذاب قبر شروع ہونے کے بعد بعض کے لیے خواب کا حکم رکھتا ہو لہٰذا قدرتی بات ہے کہ وہ روز قیامت یعنی بیداری کے دن نہ جان سکیں گے کہ انہوں نے کس قدر توقف کیا؟

چونکہ عالم برزخ میں تمام حقائق انسان پر منکشف اور آشکار نہیں ہوتے لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس قوم کے امور انسان پر مخفی رہیں البتہ روز قیامت کہ جو یوم البروز ہے اس میں حقائق بخوبی آشکار ہو جائیں گے۔

زیر بحث آٹھویں آیت میں کفار کی زبانی نقل ہوا ہے:

قالوا ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین فاعترفنا بذنوبنا فھل الی خروج من سبیل

کفار بارگاہ خداوندی میں عرض کریں گے: پروردگار! تو نے ہمیں دوبارہ مارا اور دوبارہ زندہ کیا اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کیا (دوزخ) سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے؟

جہاں برزخ پر اس آیت کی دلالت اس بنا پر ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے اور دوبارہ مرنے کا تصور عالم برزخ کے قبول کیے بغیر ممکن نہیں یعنی اس دنیاوی زندگی کی موت اور پھر حیات برزخ بعد ازاں حیات برزخ کی موت اور پھر عالم آخرت کی زندگی۔

چونکہ اس دنیا کے اختتام پر اور صور پھونکے جانے کے وقت نہ فقط انسان بلکہ تمام فرشتے اور مردوں کی ارواح کہ جو عالمبرزخ میں ایک خاص قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں سب کی سب مر جائیں گی اس آیت کے مصداق کے طور پر فصعق من فی السموت ومن فی الارض (زمر ۶۸) اور پھر اس دن ماسوائے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے کوئی بھی باقی نہ بچے گا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیات برزخ کے بعد بھی موت کا وجود ہے۔

لیکن دنیاوی زندگی کا مسئلہ اس سے جدا ہے چونکہ آیت مبارکہ میں موت کے بعد کی دو زندگیوں کے بارے میں بات کی گئی ہے جبکہ دنیاوی زندگی موت کے بعد نہیں ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ پہلی موت سے مراد انسان کا وہ وجود ہے کہ جب وہ خاک تھا اور ابھی اس دنیا میں نہ آیا تھا لہذا پہلی زندگی بھی یہی دنیاوی زندگی ہوگی جبکہ دوسری موت اس عالم کے اختتام پر اور دوسری زندگی روز قیامت واقع ہوگی جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸ میں بھی بیان ہوا ہے: کیف تکفرون باللہ و کنتم امواتا فاحیا کم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون (کیسے خدا کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا وہی مار ڈالے گا اور پھر دوبارہ زندہ کرے گا اور پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)۔

''واضح ہے کہ ''پہلی موت'' کا لفظ تو ٹھیک ہے لیکن ''مار ڈالنا'' صحیح نہیں ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ جب انسان خاک تھا مردہ تھا نہ یہ کہ خدا نے اسے مار ڈالا تھا کیونکہ مار ڈالنے کا مفہوم زندگی کے بعد ہی صادق آتا ہے بنابرایں زیر بحث آیت کو عالم برزخ کے معنیٰ میں تفسیر کئے بغیر چارہ ہی نہیں مگر یہ کہ مار ڈالنے کا کوئی مجازی معنیٰ تصور کیا جائے اور وہ بھی قرینے کے بغیر جائز نہیں۔

بعض نے اس آیت سے قبر کی زندگی کے بارے میں استدلال کیا ہے یعنی وہ زندگی کہ جو کچھ ہی دیر بعد پھر موت میں بدل جاتی ہے (اور درحقیقت یہ بھی حیات برزخ کی ایک عارضی قسم ہے)۔

قبر میں زندگی کیسی ہوگی؟ کیا یہ زندگی جسمانی ہے یا برزخی اور ایک خاص قالب میں ڈھلی ہوئی؟ یا پھر نیم جسمانی؟ اس بارے میں علمائے کی آراء مختلف ہیں۔ ہم انشاءاللہ بعد میں اس کے بارے میں اشارہ کریں گے۔

نتیجہ بحث

گذشتہ سات آیات کی بحث سے عالم برزخ (کہ جو اس دنیا اور عالم آخرت کے درمیان ایک فاصلہ ہے) کے بارے میں قرآن مجید کی نظر بخوبی واضح ہوجاتی ہے فرض کریں اگر بعض آیات قابل بحث بھی ہوں تو دوسری آیات (ابتدائی آیات کی مانند) کی صراحت سے شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

علاوہ ازیں قرآن مجید کی متعدد آیات میں موت کو توفی'' (قبض ارواح) سے تعبیر کیا گیا ہے یہ خود عالم برزخ کے وجود پر ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔

اگرچہ آیات قرآن میں عالم برزخ کی جزئیات سے متعلق کوئی زیادہ وضاحت نہیں ملتی فقط اس عالم کے وجود نیک لوگوں کے لیے کچھ جزا اور بدکاروں کی سزا کا ذکر ملتا ہے البتہ روایات اور احادیث میں اس سے متعلق بہت زیادہ تفصیل موجود ہے جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

چند وضاحتیں

ا۔ برزخ، روایات کے آئینے میں

عالم برزخ اور اس کی خصوصیات کے بارے میں احادیث میں بہت وسیع پیمانے پر گفتگو کی گئی ہے یہ احادیث و روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ خواجہ طوسی مرحوم نے تجرید العقائد میں انکے تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

وعذاب القبر واقع بالامکان وتواتر السمع بوقوعه

عذاب قبر حقیقت رکھتا ہے کیونکہ عقلاً ممکن ہے اور روایات متواتر سے بھی اس کے وقوع کی خبر ملتی ہے۔

اب ہم اسلامی روایات کے چند واضح نمونے قارئین کے لیے پیش کرتے ہیں۔

ا۔ حدیث مبارکہ ہے:

القبر اما روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النيران

قبر بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا

دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

اس حدیث کو ترمذی نے اپنی صحیح میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے جب کہ علامہ مجلسی مرحوم نے بحارالانوار میں ایک جگہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے اور دوسری جگہ حضرت امام علی بن الحسین علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔[1]

۲۔ جنگ بدر میں قتل ہونے والے مشرکین مکہ کے اجساد کو جب کنوئیں میں پھینکا گیا تو پیغمبر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنوئیں کے کنارے کھڑے ہوکر یہ معروف کلمات ارشاد فرمائے:

يا اهل القليب هل وجدتم ماوعدربكم حقا؟ فانى وجدت ماوعدنى ربى حقا۔ قالوا: يارسول الله! هل يسمعون؟ قال مآانتم باسمع لما اقول منهم ولكن اليوم لايجيبون۔

اے اہل چاہ! تمہارے پروردگار نے جوتم سے وعدہ کیا تھا کیا تم نے اسے حق پایا؟ میں نے تو اپنے پروردگار کے وعدہ کو (فتح سے متعلق) حق پایا ہے۔

بعض نے عرض کیا: اے رسول اللہ! کیا وہ سنتے ہیں فرمایا جو کچھ میں کہتا ہوں تم انکی نسبت زیادہ سننے والے نہیں ہو لیکن وہ آج جواب نہیں دیتے۔[2]

یہی مطلب متعدد روایات میں مختلف عبادات کے ساتھ ذکر ہوا ہے جن میں سے ایک حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض مشرکین کو ان کے ناموں سے مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يآ اباجهل! ياعتبة! ياشيبة! يا امية! هل وجدتم ماوعدربكم حقا؟ فانى قدوجدت ماوعدنى ربى حقا، فقال عمر: يارسول الله اما تكلم من اجساد لااروا ح فيها؟ فقال والذى نفسى بيده مآ انتم باسمع لما اقول منهم غير انهم لايستطعون جواباً۔

---

[1] صحیح ترمذی۔ ج ۴ کتاب صفۃ القیامۃ باب ۲۶ حدیث ۲۴۶۰، بحارالانوار۔ ج ۶ ص ۲۱۸ وص ۲۱۴

[2] کنزالعمال۔ ج ۱۰ ص ۳۷۷ حدیث ۲۹۸۷۶

اے ابوجہل! اے عتبہ! اے شیبہ! اے امیہ! خدا نے جو تم سے وعدہ کیا تھا تم نے اسے حق پایا؟ مجھ سے تو خدا نے جو وعدہ کیا تھا میں نے اسے حق پایا۔ حضرت عمرؓ: اے رسول اللہؐ! کیا آپ ایسے اجساد سے باتیں کر رہے ہیں کہ جن میں روح ہی نہیں؟ فرمایا! قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میری باتوں کو ان کی نسبت زیادہ سننے والے نہیں ہو۔ فقط وہ جواب نہیں دے سکتے۔ [1]

یہ احادیث نہ صرف عالم برزخ کے وجود اور جسمانی موت کے بعد انسان کے لیے ایک خاص قسم کی زندگی پر دلالت کرتی ہیں بلکہ اس بات پر بھی دلیل ہیں کہ ان کا اس دنیا کے ساتھ ایک خاص ارتباط بھی ہے اور کم از کم بعض باتوں کو سنتے ہیں۔

۳: جنگ صفین سے پلٹتے ہوئے کوفے کے دروازے کے عقب میں واقع ایک قبرستان کے کنارے کھڑے ہو کر حضرت علی علیہ السلام نے مردوں کی ارواح کو ان الفاظ سے مخاطب کیا:

انتم لنا فرط سابق، ونحن لکم تبع لاحق، اما الدور فقد سکنت، و اما الازواج فقد نکحت واما الاموال فقد قسمت هذا خبر ما عندنا فما خبر ما عندکم؟

تم نے پیش قدمی کی اور ہم بھی تمہارے ساتھ ملحق ہو جائیں گے۔ تمہارے گھروں میں دوسرے بس گئے ہیں۔ تمہاری بیویاں دوسروں کی زوجیت میں چلی گئی ہیں اور تمہارا مال و اسباب تقسیم ہو چکا ہے۔ یہ تو ہمارے یہاں کی خبریں ہیں تمہارے ہاں کیا خبر ہے؟

پھر اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

اما لو اذن لهم فی الکلام لاخبروکم ان خیر الزاد التقوی۔

اگر انہیں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو تمہیں خبر دیں کہ بہترین زادِ راہ اور توشہ سفر آخرت تقویٰ ہے۔ [2]

یہ حدیث بھی اس بات پر شاہد ہے کہ نہ صرف عالم برزخ مردوں کی ارواح کے لئے حقیقت کا حامل ہے بلکہ ان کا اس دنیا کے ساتھ ایک خاص قسم کا ارتباط بھی ہے۔

۴: نہج البلاغہ کے متعدد خطبوں میں عالم برزخ کے بارے میں صراحت سے گفتگو کی گئی ہے۔

امام علی علیہ السلام نے بعض گذشتگان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] کنز العمال۔ ج ۱۰ ص ۳۷۶ حدیث ۲۹۸۷۴

[2] نہج البلاغہ۔ کلمات قصار (چھوٹے حکیمانہ جملے) کلمہ ۱۳۰

اولئکم سلف غایتکم.....سلکوا فی بطون البرزخ سبیلا

وہ آپ سے پہلے موت کے منہ میں جا پڑے.....اور عالم برزخ میں وارد ہو گئے۔[1]

''اہل ذکر'' کی تعریف کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فکانما قطعوا الدنیا الی الاخرۃ وھم فیھا، فشاھدوا ما وراء ذلك، فکانما اطلعوا عیوب اھل البرزخ فی طول الاقامۃ فیہ۔

اگرچہ وہ اس دنیا میں ہیں لیکن گویا انہوں نے دنیا و آخرت کے درمیانی فاصلے کو طے کر لیا ہے اور آخرت کے ساتھ پیوستہ ہو گئے ہیں۔ وہ ماورائے دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں گویا جہانِ برزخ کو دیکھتے ہیں اور اس میں دورانِ اقامت اس کے اسرار سے باخبر ہو گئے ہیں۔[2]

۵: امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

واللہ مآ اخاف علیکم الا البرزخ

خدا کی قسم میں تمہارے لئے فقط برزخ سے ڈرتا ہوں۔

(یہ اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ روزِ قیامت تو مومنین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی شفاعت سے بہرہ ور ہوں گے لیکن برزخ کا حساب جدا ہے)۔[3]

۶: ایک اور جگہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

البرزخ القبر و ھو الثواب والعقاب بین الدنیا والاخرۃ

برزخ عالم قبر ہی ہے اور دنیا و آخرت کے درمیان موجود سزا و جزا ہے۔[4]

۷: تفسیر درالمنثور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث منقول ہے کہ فرمایا: جب مومن کی روح قبض ہوتی ہے تو بندگانِ خدا جو اہل رحمت ہیں اس کے استقبال کے لئے آتے ہیں اور کہتے ہیں: نووارد کا خیال رکھیں، استراحت کرے، چونکہ سخت درد و تکلیف میں مبتلا رہا ہے۔ بعد ازاں بعض دوستوں اور رفقاء کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ بعض اس نووارد سے پہلے دنیا سے جا چکے

---

[1] نہج البلاغۃ۔ خطبہ ۲۲۱

[2] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۲۲

[3] تفسیر نور الثقلین۔ ج ۳ ص ۵۵۳ حدیث ۱۲۰

[4] تفسیر نور الثقلین۔ ج ۳ ص ۵۵۳ حدیث ۱۲۲

ہیں تو کہتے ہیں: انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اسے دوزخ میں لے گئے ہیں۔(اسی لئے اس کا یہاں کوئی نام ونشان نہیں ہے۔[1]

۸: متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے کہ لواحقین کے نیک اعمال مومنین کی ارواح کے لئے مسرت وانبساط کا باعث بنتے ہیں۔امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان المیت لیفرح بالترحم علیہ والاستغفار لہ کما یفرح الحی بالھدیۃ

میت کے لئے طلب رحمت اور استغفار کرنے سے وہ خوش ہوتی ہے جیسے زندہ لوگ تحفے سے خوش ہوتے ہیں۔[2]

یہی مطلب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول حدیث میں بھی ذکر ہوا ہے۔

آپؐ فرماتے ہیں:

ان ھدایا الاحیاء للاموات الدعاء والاستغفار

زندوں کے مردوں کے لئے تحفے، دعا اور استغفار ہے۔[3]

۹: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

من أنکر ثلاثۃ اشیاء فلیس من شیعتنا: المعراج والمسألۃ فی القبر والشفاعۃ

جو ان تین چیزوں کا انکار کرے ہمارے شیعوں میں سے نہیں: معراج، قبر میں سوال، شفاعت۔[4]

واضح ہے کہ قبر میں سوالات عالم برزخ ہی کا ایک حصہ ہے۔

۱۰: کنز العمال میں رسول خداؐ سے نقل ہونے والی اس حدیث پر ہم احادیث کے سلسلے کو ختم کرتے ہیں۔(اگرچہ اس ضمن میں احادیث بہت زیادہ اور متواتر ہیں)۔

آنحضرتؐ نے شہدائے احد کی جانب اشارہ کیا اور فرمایا:

ایھا الناس زوروھم واتوھم وسلموا علیھم فوالذی نفسی بیدہ لا

---

[1] تفسیر در المنثور طبق نقل تفسیر المیزان۔ج ۲۰ ص ۴۹۴ (خلاصۃً)

[2] محجۃ البیضاء۔ج ۸ ص ۲۹۲

[3] محجۃ البیضاء۔ج ۸ ص ۲۹۱

[4] بحار۔ج ۶ ص ۲۲۳

یسلم علیهم مسلم الی یوم القیمة الا ردوا علیه السلام

اے لوگو! ان کی زیارت کرو اور ان کے پاس جاؤ اور ان پر سلام بھیجو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے روزِ قیامت بھی کوئی مسلمان اگر ان پر سلام بھیجے گا تو وہ اس کا جواب دیں گے۔[1]

اسی سلسلے میں اور بھی کئی ایک احادیث اسی کتاب میں نقل ہوئی ہیں۔

ضمناً اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل قبور کی زیارت کا انکار کرتے ہیں اور انہیں لکڑی اور پتھر کی طرح بے جان سمجھتے ہیں کس قدر احادیث سے بے خبر اور تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور ہیں۔

اصولاً وہ تمام روایات جو عذابِ قبر، اس کی سختی اور سوالات کی نشاندہی کرتی ہیں اور وہ روایات جو موت کے بعد انسان کے نیک و بد اعمال کے نتیجے کی خبر دیتی ہیں نیز وہ روایات جو ارواح کے اپنے خاندانوں کے ساتھ رابطے اور ان کے حالات کے مشاہدے سے متعلق بحث کرتی ہیں اور وہ روایات بھی کہ جو شب معراج کے واقعات اور رسول اکرمؐ کی دوسرے انبیاء اور پیغمبروں سے ملاقات کا ذکر کرتی ہیں، سب عالم برزخ کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اور ایک ایسے عالم کا تصور کئے بغیر یہ تمام متذکرہ روایات بے معنی ہو جائیں گی۔

۲۔ برزخ، عقل و احساس کے میزان میں

دنیا و آخرت کے درمیان موجود ایک عالم پر دلالت کرنے والی گذشتہ آیات و روایات کے علاوہ یہ مسئلہ عقلی و حسی طریقوں سے بھی قابل اثبات ہے۔ چونکہ وجودِ روح اور بدن کی قید و بند کے بغیر روح کے باقی رہنے سے متعلق تمام دلائل عالم برزخ کے وجود کی گواہی دیتے ہیں کیونکہ ان دلائل کے مطابق جسمانی بدن کی موت سے انسانی روح فنا نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ جسم کے عوارض میں سے نہیں ہے کہ جو جسم کے فنا ہونے سے ختم ہو جائے بلکہ ایک جوہر مستقل ہے جو جسم کے بغیر بھی باقی رہتا ہے۔ اس بات کو قبول کرنا عالم برزخ کو قبول کرنے کے مساوی ہے چونکہ بحث دراصل عالم برزخ کے وجود کے بارے میں ہے نہ کہ اس کے روحانی ہونے کے بارے میں۔

علاوہ ازیں عالم ارواح سے ارتباط ایک ایسا فن ہے جو آج کل علماء کے درمیان مسلمات میں سے ہے، اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ارواح بدن سے جدائی کے بعد ایک مخصوص عالم میں خود سے باقی اور موجود ہیں اور ان کے ادراکات کا دائرہ انتہائی وسیع ہے اور بعض اوقات اپنی معلومات اس دنیا کے لوگوں سے رابطے کے ذریعے ان تک منتقل کرتی ہے۔

بہت سے افراد ایسے ہیں جنہوں نے ارواح سے پیغامات حاصل کئے ہیں اور ایسے افراد بھی بہت ہیں جو کہتے ہیں کہ انہوں نے روح کو ایک ''مثالی قالب'' میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس بات کا دعویٰ کرنے والے سب کے سب سچے ہیں، کیونکہ جھوٹے، مکار، دغاباز اور منافع خور لوگوں نے اس مسئلے سے بہت سوئے استفادہ کیا ہے۔ لیکن یہ باعث نہیں بنتا کہ اصل موضوع ہی کو نظر انداز کر دیا جائے

---

[1] کنز العمال، ج ۱۰، ص ۳۸۲، حدیث ۲۹۸۹۶

کہ جو علمی اور سائنسی پہلوؤں کا حامل ہے یا اس موضوع کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔ چونکہ کئی ایک با اعتماد افراد نے اس بارے میں اپنے تجربات بیان کئے ہیں اور بہت سارے علمی اداروں اور بڑے بڑے صاحبانِ علم نے اس بارے میں اس قدر کتابیں لکھیں ہیں کہ اب اس مسئلے کی حقیقت کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اگر ہم اس کے کسی ایک پہلو کی بھی تشریح کریں تو بات بہت طول پکڑ جائے گی۔[1]

لہٰذا عالم برزخ کو ان طریقوں سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ عالم برزخ، علماء کی نظر میں

علمائے اسلام کے درمیان عالم برزخ کی جزئیات سے متعلق پائی جانے والی بحث سے صرف نظر ایک ایسے عالم کے وجود کی حقیقت پر سب اتفاق نظر رکھتے ہیں ماسوائے ان چند افراد کے کہ جو قابل اعتناء نہیں ہیں۔

اس اتفاق نظر کی وجہ قرآنی آیات اور روایات کی فراوانی ہے، ایسی آیات جو موت کے بعد انسان کے حالات اور جزاء و سزا کے بارے میں مفصل گفتگو کرتی ہیں اور ان کے اس جہان کے ساتھ ارتباط اور اسی طرح کے دیگر امور کے بارے میں بھی بیان کرتی ہیں۔ (اس مطلب کی تشریح پہلے ہو چکی ہے)۔

لہٰذا عالم برزخ کے وجود کی حقیقت زیر بحث نہیں ہے بلکہ یہ جاننا اہم ہے کہ برزخی زندگی کیسی ہے؟ اس سے متعلق علماء نے مختلف تصور پیش کئے ہیں جن میں سے وہ اہم ترین تصور جو احادیث سے مطابقت رکھتے ہیں درج ذیل ہیں:

انسانی روح دنیاوی زندگی کے اختتام پر ایک ایسے لطیف جسم کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو مادی جسم کے بہت سے عوارض سے مبرا ہے۔ لیکن چونکہ اس مادی جسم کے مشابہ ہے اس لئے اسے ''مثالی بدن'' یا ''مثالی قالب'' کہتے ہیں کہ جو نہ تو کاملا مجرد ہے اور نہ ہی خالص مادی بلکہ یہ بدن ایک قسم کا ''تجرد برزخی'' ہے۔ (توجہ فرمائیے گا)۔

البتہ جس طرح اس عالم مادہ کے زندان میں ہم اسیروں کے لئے عالم آخرت کی زندگی کی حقیقت کا ادراک غیر ممکن ہے بالکل اسی طرح عالم برزخ کی بطور کامل آگاہی بھی ناممکن ہے کیونکہ اس کا مرتبہ اس دنیا سے بالاتر ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہ یہ عالم عالم دنیا پر محیط ہے۔

بعض علماء کے بقول اسے حالت خواب سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ حالت خواب میں انسانی روح اس مخصوص قالب سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف نقاط کی طرف پرواز کرتی ہے، مختلف مناظر کا مشاہدہ کرتی ہے، تازہ بہ تازہ نعمتوں سے بہرہ ور ہوتی ہے، ان سے محظوظ اور لطف اندوز ہوتی ہے اور کبھی ہولناک مناظر دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے اور چیختی ہوئی نیند سے بیدار ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ [2] (زمر ۴۲)

---

[1] مزید توضیح کے لئے ہماری کتاب بنام ''عود ارواح و ارتباط با ارواح'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] ترجمہ: اللہ ہی جانوں کو موت کے وقت قبض کرتا ہے اور جن کی موت نہیں آئی وہی انہیں نیند میں قبض کرتا ہے۔

یہ آیت بھی اس حقیقت کی تاکید کرتی ہے۔

علامہ مجلسی مرحوم نے بحارالانوار میں واضح کیا ہے کہ عالم برزخ کی حالت نیند یا خواب سے تشبیہ بہت سی روایات میں بیان ہوئی ہے۔

اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں: ممکن ہے قوی وعالی نفوس متعدد مثالی اجساد میں ہوں۔ بنابریں وہ روایات جو کہتی ہیں کہ وقت احتضار اور جان کنی کے وقت آئمہ ہر کسی کے سرہانے آتے ہیں ان کی کسی توجیہ اور تفسیر کی ضرورت نہ ہوگی۔[1] (وقت نظر فرمائیں)

بعض وضاحت کرتے ہیں کہ مثالی قالب ہر انسان کے باطنی بدن میں موجود ہے۔ البتہ موت کے وقت اس بدن سے جدا ہو جاتا ہے اور اپنی برزخی زندگی شروع کر دیتا ہے۔

مقناطیسی خوابوں میں روح مختلف نقاط کی طرف پرواز کرتی ہے۔ اپنی فعالیت انجام دیتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بعض قوی روحیں حالت بیداری میں بھی دورترین مناطق کی طرف جا نکلتی ہیں اور اپنے اس روحانی سفروں کے ذریعے وہاں کے اسرار سے مطلع کرتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں بھی قالب مثالی کے ذریعے انجام پاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ بدن مثالی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اسی جسم کے مشابہ ہے لیکن اس عنصری کثیف مادے کا حامل نہیں ہے بلکہ ایک ایسا جسم ہے جو لطیف، نورانی اور اس ساری دنیا کے متعارف عناصر اور مواد سے خالی۔

یہاں بعض افراد کو اشتباہ ہوا ہے اور شاید اسی اشتباہ کی وجہ سے انہوں نے بدن مثالی کا انکار کیا ہے اور وہ یہ کہ ایک ایسے جسم کے وجود کا اعتقاد مسئلہ ''تناسخ'' کے اعتقاد کا باعث بنتا ہے چونکہ تناسخ بھی ایک روح کا متعدد اجسام میں منتقل ہونا ہی ہے۔

لیکن اگر قالب مثالی کو اس عنصری بدن کے باطن میں تصور کیا جائے تو کسی دوسرے بدن میں اس کے منتقل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بنابریں مسئلہ تناسخ بھی باقی نہیں رہتا۔

علاوہ ازیں شیخ بہائی کے بقول: تناسخ کہ جس کے بطلان پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے یہ ہے کہ روحیں بدن کے خراب اور خاک ہونے کے بعد اسی دنیا میں کسی دوسرے بدن اور جسم میں منتقل ہو جائیں لیکن عالم برزخ میں اجساد مثالی کے ساتھ ارواح کے تعلق اور روزِ قیامت اپنے پہلے جسموں میں ان کے انتقال کا مسئلہ تناسخ کے ساتھ کوئی ربط نہیں۔[2] کلینی مرحوم نے فروف کافی ایسی روایات نقل کی ہیں جو صداق سے جسم مثالی کی خبر دیتی ہیں

امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہونے والی معتبر روایات میں ہے کہ آپؑ کے اصحاب میں سے کسی ایک نے آپؑ سے کہا کہ بعض لوگ معتقد ہیں کہ مومنین کی ارواح اطراف عرش میں سبز رنگ کے پرندوں کے قفس میں ہوں گی۔

---

[1] بحارالانوار ج ۶ ص ۲۷۱

[2] اس بات کو علامہ مجلسی نے بحارالانوار ج ۶ ص ۲۷۷ پر شیخ بہائی مرحوم سے نقل کیا ہے۔

امامؑ نے فرمایا:

لا، المومن اکرم علی اللہ من ان یجعل روحه فی حوصلة طیر، ولکن فی ابدان کابدانهم

نہیں، ایسا نہیں، مومن خدا کے نزدیک گرامی تر ہے اس سے کہ اس کی روح پرندے کے قفس میں رکھی جائے بلکہ ارواح پہلے بدن سے مشابہ بدنوں میں ہوں گی۔[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام ہی سے نقل ہونے والی ایک اور حدیث کچھ یوں گویا ہے:

فاذا قبضه اللہ عزوجل صیر تلك الروح فی قالب کقالبه فی الدنیا۔

خدا جب مومن کی روح قبض کرتا ہے تو اسے ایک ایسے قالب میں منتقل کرتا ہے جو دنیاوی قالب کے مشابہ ہے۔[2]

اس ضمن میں ایک اور جگہ امام ششم علیہ السلام فرماتے ہیں:

فی حجرات فی الجنة یأکلون من طعامها ویشربون من شرابها، ویقولون ربنا اقم الساعة لنا وانجز لنا ما وعدتنا۔

ارواح مومنین کے بارے میں ہونے والے سوال کے جواب میں فرمایا: وہ جنت کے کمروں میں مقیم اور وہاں کی شراب اور کھانوں سے بہرہ ور ہیں اور کہتے ہیں: پروردگار! ہمارے لئے قیامت برپا کردے اور ہمارے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کو وفا فرما۔[3]

واضح ہے کہ یہاں پر بہشت سے مراد برزخی بہشت ہے کہ جو قیامت والی بہشت سے کہیں کم تر ہے۔ اسی لئے ارواح مومنین قیامت کی آرزومند ہیں۔

ضمناً برزخ میں ان کے مکانی ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قالب مثالی کی حامل ہیں چونکہ دنیاوی جسم کو تو ترک کرچکی ہیں۔

---

[1] فروع کافی۔ ج ۳ ص ۲۴۴ (ارواح مومنین کے بارے میں آخری باب) حدیث ۱

[2] فروع کافی۔ ج ۳ ص ۲۴۴ حدیث ۶

[3] فروع کافی۔ ج ۳ ص ۲۴۴ حدیث ۴

۴۔عالم برزخ کی خصوصیات

قرآن مجید نے ان خصوصیات کے بارے میں زیادہ وضاحت نہیں کی۔فقط یہ کہتا ہے: ایک برزخ ہے۔کچھ لوگ وہاں رحمت الٰہی میں غوطہ ور ہیں اور کچھ عذاب میں مبتلا ہیں۔لیکن اس کی جزئیات کیا ہیں یہ مشخص نہیں ہوا۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قرآن کی روش کلی اصول بیان کرنا ہے۔جزئیات کو وہ سنت پر چھوڑ دیتا ہے۔

لہٰذا اس ضمن میں سنت سے درج ذیل استفادہ ہوتا ہے:

الف: سوال قبر

روایات کثرت سے اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جب انسان کو قبر میں ڈال دیا جائے گا تو خدا کے بھیجے ہوئے دو فرشتے اس کے پاس آئیں گے اور اس کے اصول وعقائد، توحید، نبوت، ولایت اور بعض روایات کے مطابق مختلف طریقوں سے زندگی گزارنے کی کیفیت، مال و دولت کمانے اور اس کے خرچ کرنے کے طریقوں کے بارے میں سوالات کریں گے۔چنانچہ اگر پکے سچے مومنین میں سے ہوا تو بخوبی ان کے جوابات سے عہد برآ ہوگا اور حق تعالیٰ کی رحمتیں اور عنایتیں اس کے شامل حال ہوں گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو ان سوالات کے جواب سے قاصر رہے گا اور برزخ کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔

بعض روایات میں ان دو فرشتوں کو ناکر ونکیر [1] اور بعض میں منکر ونکیر [2] سے موسوم کیا گیا ہے۔

امام علی بن الحسین علیہ السلام فرماتے ہیں: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روزِ جمعہ مسجد میں لوگوں کو وعظ فرماتے اور اس انداز سے نصیحت کرتے کہ لوگوں نے اس کے خلاصۂ مطلب کو حفظ کر کے لکھ لیا۔آپؐ فرمایا کرتے:

ایها الناس اتقوا الله واعلموا انکم الیه ترجعون.....

لوگو! تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اور پھر دو فرشتوں منکر ونکیر کے قبر میں آنے اور سوالات سے متعلق آپؐ کے لرزا دینے والے مبارک کلمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

الا وان اول مایسئلانك، عن ربك الذی کنت تعبده، وعن نبیك الذی ارسل الیك، وعن دینك الذی کنت تدین به، وعن کتابك الذی

---

[1] اصول کافی۔ج ۲ ص ۶۳۳ حدیث ۲۶ (باب النوادر)

[2] بحارالانوار۔ج ۶ ص ۲۲۲، ص ۲۲۳ حدیث ۲۲، ۲۴

كنت تتلوه، وعن امامك الذى كنت تتولاه، ثم عن عمرك فيما افنيته ومالك من اين اكتسبته وفيما اتلفته فخذ حذرك، وانذر لنفسك واعد للجواب قبل الامتحان والمسئلت والاحتبار فان تك مومنا تقياً عار فابدينك متبعا للصادقين مواليا لاولياآء الله لقاك الله حجتك، وانطق لسانك بالصواب، فأحسنت الجواب فبشرت بالجنة والرضوان من الله والخيرات الحسان، واستقبلتك الملئكة بالروح والريحان، وان لم تكن كذلك تلجلج لسانك ودحضت حجتك وعميت عن الجواب، وبشرت بالنار و استقبلتك ملائكة العذاب.....

جان لو! وہ پہلی چیز جس کے بارے میں وہ دوفرشتے سوال کریں گے تمہارا پروردگار جس کی تم عبادت کرتے رہے، تمہارا نبی جو تمہاری طرف بھیجا گیا، تمہارا دین جس پر تم کاربند تھے، وہ کتاب جس کی تم تلاوت کرتے تھے، وہ امام جس کی ولایت کو تم نے قبول کیا۔ بعدازاں تمہاری عمر کے بارے میں سوال کریں گے کہ کہاں فنا کی؟ تمہارے مال کے بارے میں کہ کہاں سے لائے اور کہاں خرچ کیا؟ دامن احتیاط تھاموا اور اپنے بارے میں سوچو! امتحان، آزمائش اور سوال سے پہلے جواب تیار رکھو۔ اگر باایمان، متقی، دین سے آگاہ، سچوں کے پیروکار، اولیاء اللہ کے موالی رہے تو اللہ ضروری جوابات تمہیں الہام کردے گا اور تمہاری زبان کو حق گو بنادے گا اور تم جواب دے لوگے۔ اس وقت خدا کی جانب سے تمہیں جنت و رضوان اور خیر کثیر کی بشارت دی جائے گی اور ملائکہ روح و ریحان کے ساتھ تمہارا استقبال کریں گے۔ اگر تم ایسے نہ ہوئے تو تمہاری زبانی لکنت کا شکار ہو جائے گی، تمہاری دلیل باطل ہوجائے گی، جواب دینے سے قاصر رہوگے، اندھے ہوجاؤ گے، تمہیں آگ کی نوید سنائی جائے گی اور عذاب کے فرشتے تمہارا استقبال کریں گے.....[1]

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سوالات قالب مثالی اور برزخی روح سے ہوں گے یا اسی عنصری و مادی جسم سے؟ روح وقتی طور پر واپس آجاتی ہے۔ (البتہ بطور کامل نہیں فقط اتنی حد تک کہ سوالات کے جوابات دینے پر قادر ہو) اور پھر روح سے سوال ہوتا ہے۔ بعض روایات

---

[1] بحارالانوار۔ ج ۶ ص ۲۲۳ حدیث ۲۴۔ اس بارے میں بڑی تعداد میں روایات موجود ہیں۔ مزید اطلاع کے لئے بحارالانوار ج ۶۔ تفسیر ربرہان ج ۲ ص ۳۱۲۔ (آیۃ ۲۷ سورۂ ابراہیم کے ذیل میں) محجۃ البیضاء ج ۸ ص ۳۰۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

سے پتہ چلتا ہے کہ روح اسی مادی وعنصری جسم کے ساتھ اتنا تعلق اور ارتباط پیدا کر لیتی ہے کہ سوالات سمجھ سکے اور ان کے جوابات دے سکے۔[1]

درحالیکہ علامہ مجلسی مرحوم نے اس بارے میں وارد ہونے والی احادیث سے متعلق اپنی تحقیق میں فرمایا ہے:

فالمراد بالبر فی اکثر الاخبار مایکون الروح فیه فی عالم البرزخ

اکثر روایات میں قبر سے مراد وہ چیز ہے جس میں روح دورانِ عالم برزخ میں پائی جاتی ہے۔[2]

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ روایات میں موجود قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ قبر کے سوال وجواب کوئی معمولی نہیں ہیں کہ انسان جس قدر مائل ہو اتنا جواب دے بلکہ یہ ایسے سوال ہیں کہ جن کے جواب کا سرچشمہ انسان کے اندر اور ہر کسی کے عقیدے کے باطن سے پھوٹتا ہے اور اموات کے لئے تلقین پڑھنا ان کے لئے اس چشمے کے پھوٹنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ یہ کوئی اپنا آزادانہ اثر رکھتی ہو۔ گویا ایسا جواب ہے جو حقیقت باطن اور عمق تکوین سے ملتا ہے۔

ب۔ فشارِ قبر

یہ مسئلہ بھی احادیث میں بکثرت موجود ہے حتی کہ روایات میں فشارِ قبر سب کے لئے بلا استثناء بیان ہوا ہے۔ البتہ بعض کے لئے شدید ہے اور ان کے کیفر اعمال کے حساب میں آتا ہے جب کہ بعض کے لئے کم تر ہے اور ان کے کفارۂ گناہ اور کوتاہیوں کی تلافی کے زمرے میں ہے۔

مشہور صحابی سعدؓ بن معاذ کو دفن کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انه لیس من مومن الا وله ضمة

کوئی مومن ایسا نہیں جسے فشار قبر نہ ہو۔[3]

امام جعفر صادق علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل فرماتے ہیں:

ضغطة القبر للمومن کفارة لما کان منه من تضییع النعم

مومن کے لئے فشارِ قبر اس کا نعمتوں کو ضائع کرنے کا کفارہ ہے۔[4]

لیکن دیگر احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مومنین کو اصلاً فشار قبر نہ ہوگا۔ سعدؓ بن معاذ کا فشار قبر ان کی اپنے گھرانے کے ساتھ کج

---

[1] تفسیر برہان ج ۲ ص ۳۱۴ حدیث ۹ (سورہ ابراہیم کی آیت ۲۷ کے ذیل میں)

[2] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۵۱

[3] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۲۱ حدیث ۱۹

[4] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۲۱ حدیث ۱۶

خلقی کی بناء پر تھا(انه کان فی خلقه مع اهله سوء)۔[1]

لہٰذا روایات میں ہے کہ جن لوگوں نے اچھے اعمال انجام دیئے ہوں گے (جیسے چند بار حج کرنا یا بعض قرآنی سورتوں اوراذکار کا ورد کرنا) فشارِ قبر سے امان میں رہیں گے۔[2]

بہرحال عالم برزخ میں جزاء وسزا کا پہلا مرحلہ فشارِ قبر معلوم ہوتا ہے۔آیا فشار اس مادی وعنصری جسم پر وارد ہوگا اور پھر وہاں سے روح کی طرف منتقل ہوجائے گا (اس جسم اور روح کے درمیان پائے جانے والے رابطے کی وجہ سے) یا فقط اسی بدن مثالی پر وارد ہوگا؟ یہاں پھر وہی پہلے والے دو نظریے موجود ہیں۔ چونکہ ان جزئیات میں وارد ہونے سے کوئی اہم مشکل حل نہیں ہوتی۔لہٰذا ہم اس بحث کو مختصر کرتے ہوتے صرف یہ کہیں گے کہ بہت ساری روایات کے مطابق فشارِ قبر کا ہونا مسلم ہے[3] حتی کہ ایک روایت میں ہے کہ امامؑ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی چند دن تک پھانسی کے پھندے پر لٹکا رہے تو اسے فشارِ قبر کیسے ہوگا؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ''وہ ہوا جو اسے احاطہ کئے ہوئے ہے اس ہوا کو حکم دیا جائے گا کہ ہر طرف سے اس پر فشار ڈالے۔''[4]

ج: کن امور کے بارے میں سوال ہوگا؟

سوالات قبر کے بارے میں وارد ہونے والی متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قبر میں دو گروہوں سے سوال ہوگا: ایک گروہ خالص باایمان لوگوں کا ہے اور دوسرا خالص اہل کفار کا ہے لیکن کمزور افراد کہ جو ان دو گروہوں کے درمیان واقع ہوئے ہیں ان کے سوالات کو روزِ قیامت پر موقوف کر دیا جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لایسال فی القبر الا من محض الایمان محضا اومحض الکفر محضا و الاخرون یلهون عنهم

قبر میں سوال نہیں ہوگا لیکن فقط ان سے کہ جو ایمان خالص یا کفر خالص کے حامل ہیں اور باقی تمام افراد اس سے

---

[1] بحارالانوار ج۶ ص ۲۲۰ حدیث ۱۴

[2] مزید توضیح کے لئے سفینۃ البحار، ج ۲ ص ۳۹۷۔ مادۂ قبر

[3] وہ روایات کہ جو کہتی ہیں کہ ''القبر اما روضة من ریاض الجنة اوحفرة من حفر النیران'' پہلے بھی اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے یہ روایت اس بات پر دلیل بن سکتی ہے کہ فشارِ قبر قالب مثالی اور روح پر ہے کیونکہ مسلما یہ مادی وجسمانی قبر تو جنت کے باغوں اور آگ کے گڑھوں میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔

[4] امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں کہ جو پھانسی پر لٹکایا گیا ہے اسے عذاب قبر کیسے ہوگا، فرمایا: ان رب الارض هو رب الهواء فیوحی الله عزوجل الی الهواء فیضغطه ضغطة اشد من ضغطة القبر بحارالانوار ج۶ ص۲۶۶ حدیث ۱۱۲

مبرا ہوں گے۔[1]

یہی مطلب حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہونے والی ایک حدیث میں بھی بیان ہوا ہے۔آپؑ کے اصحاب میں سے کسی ایک نے پوچھا:من المسئولون فی قبورھم ؟ قبر میں کن لوگوں سے سوال ہوگا؟امامؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

من محض الایمان و من محض الکفر

وہ لوگ کہ جو خالص ایمان اور خالص کفر کے حامل ہیں۔

راوی نے پوچھا:باقی لوگوں کا کیا بنے گا؟ آپ نے فرمایا:وہ مبرا ہیں۔

راوی نے پھر سوال کیا:کس بارے میں سوال ہوگا؟امامؑ نے فرمایا:

عن الحجة القآئمة بین اظھر کم

اس حجت کے بارے میں جو آپ کے درمیان قائم ہے۔[2]

بعض خیال کرتے ہیں کہ اعمال کے بارے میں سوال نہ ہوگا اور فقط عقائد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔لہٰذا من محض الکفر ومن محض الایمان کے جملے کو''صلہ وموصول'' کے بجائے''جار ومجرور'' کی صورت میں پڑھتے ہیں جس سے اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ فقط ایمان خالص اور کفر خالص کے بارے میں پرسش ہوگی۔

لیکن متذکرہ بالا روایت کو مدنظر رکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اعمال کے بجائے اشخاص کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری تفسیر صحیح نہیں ہے۔علاوہ ازیں امام علی بن الحسین علیہما السلام سے نقل ہونے والی گذشتہ روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے لمحات اور اس کے کمائے ہوئے مال کے بارے میں بھی وہاں پوچھا جائے گا۔

د:دنیا سے روح کا رابطہ

متعدد روایات نشاندہی کرتی ہیں کہ عالم برزخ میں منتقل ہونے کے بعد اس دنیا سے روح کا رابطہ کلی طور پر منقطع نہیں ہوتا بلکہ روح کبھی کبھار اس جہان سے بھی رابطہ برقرار رکھتی ہے۔

کافی کی جلد سوم میں ایک باب ان المیت یزور اھلہ (مردے اہل خانہ سے ملاقات کے لئے آتے ہیں) کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔اس میں پانچ روایات بیان کی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ باایمان افراد بلکہ بے ایمان افراد بھی گاہ گاہ اپنے اہل خانہ سے ملاقات کے لئے آتے ہیں۔مومنین اپنے خاندان کی فقط خوبیاں اور خوشیاں دیکھتے ہیں اور فرط مسرت سے واپس لوٹتے ہیں جب کہ کفار اپنے خاندان کی

---

[1] بحارالانوار ج ۶ ص ۲۶۰،کافی ج ۳ ص ۲۳۵(باب المسالة فی القبر۔ حدیث ۱)

[2] کافی۔ج ۳ ص ۲۳۷ حدیث ۸

برائیوں اور ناراحتیوں کا مشاہدہ کر کے غمگین ہوجاتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان المومن لیزور اهله فیری مایحب ویستر عنه مایکره،وان الکافر لیزور اهله فیری مایکره ویستر عنه مایحب[1]

سائنسی اور تجربی طریقوں سے ارواح کے ساتھ ارتباط پیدا کرنے والے اہل علم بھی بڑی صراحت سے بیان کرتے ہیں کہ انسانوں کی روحیں مرنے کے بعد کلی طور پر اس عالم سے لاتعلق نہیں ہوجاتیں بلکہ دنیا کے حالات سے کم وبیش آگاہ رہتی ہیں اور ان کے ساتھ رابطہ بھی ممکن ہے۔(اگرچہ اس بارے میں بیانات اور مشاہدات فراواں ہیں لیکن ان کا ذکر ہمیں اپنے مقصد سے دور کردے گا)۔

ر: دوسروں کے نیک اعمال سے ارواح کا بہرہ مند ہونا

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جو مختلف منابع اسلامی سے نقل ہونے والی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مرحومین کے لئے انجام دیئے جانے والے اچھے اعمال تحائف کی صورت میں ان تک پہنچتے ہیں۔ یہ بات ایک طرف تو عالم برزخ کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور دوسری طرف روحوں کے دنیا کے ساتھ رابطے کی واضح دلیل ہے۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہما السلام فرماتے ہیں:

مامن عبدزار قبر مومن فقرء علیه انا انزلنه فی لیلة القدر سبع مرات الا غفر الله له ولصاحب القبر

جو شخص کسی قبر مومن کی زیارت کرے اور اس پر سات بار انا انزلنه پڑھے تو خدا اسے اور صاحب قبر کو بخش دیتا ہے۔[2]

بلکہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک قبر کے پاس سے گزرے تو اس صاحب قبر کو عذابِ الٰہی میں گرفتار پایا۔ ایک سال بعد دوبارہ وہیں سے گزر ہوا تو دیکھا کہ پہلے سے بہتر اور سکون میں ہے۔ جب بارگاہِ الٰہی میں سوال کیا تو خطاب ہوا کہ یہ اس عمل خیر کی وجہ سے ہے کہ جو اس کے نیک وصالح فرزند نے انجام دیا ہے۔ اس نے ایک راستے کی مرمت کی ہے اور ایک یتیم کو پناہ دی ہے۔[3]

---

[1] کافی۔ ج ۳ ص ۳۳۰ حدیث ۱

[2] محجۃ البیضاء۔ ج ۸ ص ۲۹۰

[3] بحارالانوار۔ ج ۶ ص ۲۲۰ حدیث ۱۵

متعدد روایات یہاں تک بتاتی ہیں کہ اگر انسان لوگوں کے درمیان کوئی اچھی سنت قائم کر جائے یا کسی بری سنت کی ابتداء کر جائے تو اس کے اثرات اس تک پہنچتے ہیں۔ اسی طرح صدقات جاریہ (وہ نیک کام کہ جو دائمی اثر رکھتے ہیں) کی برکات اس کو ایصال ہوتی ہیں۔[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ست خصال ينتفع بها المومن من بعد موته: ولد صالح يستغفر له و مصحف يقرء فيه، وقليب يحفره وغرس يغرسه، وصدقة مآء يجريه وسنة حسنة يوخذ بها بعده

چھ چیزیں ایسی ہیں کہ مومن اپنی موت کے بعد ان سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ وہ نیک وصالح فرزند جو اس کے لئے استغفار کرے، وہ قرآن کہ جو لوگ پڑھیں، پانی کا کنواں جو کھودا گیا ہو، وہ درخت جسے کاشت کیا گیا ہو، وہ جاری پانی جو لوگوں کے اختیار میں دیا گیا ہو اور وہ نیک سنت کہ جس پر اس کے بعد عمل ہو۔[2]

۵۔ کیا برزخ عمومیت رکھتی ہے؟

کیا وہ لوگ جو دنیا سے چل بسے اور عالم برزخ میں منتقل ہو گئے۔ سب کے سب آگاہانہ زندگی سے مستفید ہو رہے ہیں یا بعض کی برزخی زندگی گہری نیند سونے والے افراد کی مانند غیر آگاہانہ اور بے شعور ہے گویا روزِ قیامت بیدار ہوں گے اور ہزاروں سال کو چند لمحوں کے برابر تصور کریں گے؟

سورہ روم آیت ۵۵ دوسرے معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ

اور جب قیامت برپا ہوگی تو گناہگار قسم کھائیں گے کہ انہوں نے (عالم برزخ میں) چند لمحوں سے زیادہ توقف نہیں کیا۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ آیت کو ''قیامت کے مقابلے میں دنیا یا عالم برزخ کو حقیر و ناچیز جاننا'' کے معنی میں نہ لیا جائے۔ (توجہ فرمائیے گا)۔

لیکن برزخ کی طرف اشارہ کرنے والی بعض آیات ظاہراً مطلق اور عام ہیں جیسا کہ سورۂ مومنون کی آیت ۱۰۰ کہ جو ظاہراً تمام کفار

---

[1] سنت حسنہ اور سیئہ سے مربوط روایات بحارالانوار۔ ج ۶۸ (بیروت الوفاء کی چھپی ہوئی) ص ۲۵۷ باب نمبر ۷۳

[2] بحارالانوار۔ ج ۶ ص ۲۹۳ (باب ۱۰ حدیث ۱)

کے بارے میں ہے۔

ارشادِ رب العزت ہے:

ومن ورآئھم برزخ الی یوم یبعثون

اورانہیں آگے برزخ درپیش ہے تاروزِ قیامت۔

(لیکن یہ کہ پہلی آیت کو''خاص'' کہا جائے اوراسے''عام''اوراس کے ذریعے اس کی''تقییدوتفسیر کی جائے)۔روایات میں بھی اس بات کا بارہا ذکر ہوا ہے کہ صرف دوگروہوں سے سوال قبر ہوگا۔وہ لوگ جوخالص اہل ایمان ہیں یا خالص کفر پر قائم رہے،لیکن باقیوں کوان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا۔

ان روایات کوگذشتہ بحث میں بیان کر چکے ہیں اورمزید آگاہی کے لئے بحارالانوار۔ج ۶ ص ۱۲۶۰احادیث ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰ ملاحظہ فرمائیں۔

البتہ"یلھی عنھم"(انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا یاان سے صرف نظر کیا جائے گا) کی عبارت سے مراد یہ نہیں کہ ان کے لیے برزخ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے قبر میں سوال نہ ہوگا۔اس کے برعکس فشارِ قبر کی روایات سے پتہ چلتاہے کہ یہ مسئلہ عمومیت کا حامل ہے اوربعض اولیااللہ کے علاوہ سب اس سے دوچار ہوں گے۔

(اس بارے میں روایات قبلاً بیان ہوچکی ہیں)۔

۶۔فلسفۂ برزخ

دنیاوی زندگی کا فلسفہ تو واضح ہے کہ یہ محل امتحان ہے۔سیکھنے،سکھانے اور پرورش پانے کی جگہ ہے۔علمی کمالات کے حصول اور دوسرے عالم کی تیاری کے لئے میدانِ عمل ہے۔روایات اوربعض قرآنی آیات میں زمین کوکھیتی،درسگاہ،میدانِ عمل،تجارت گاہ وغیرہ کے نام سے موسوم کیا گیاہے،یا پھراسے دوسری دنیا کے لئے عالم جنین قرار دیا گیاہے۔جب کہ آخرت انوارِالٰہی کا مرکز،حق تعالیٰ کی عظیم عدالت،اعمال کے حساب کتاب کی جگہ،جوارِرحمت باری تعالیٰ اورقرب خداوندی ہے۔

لیکن یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ فلسفہ برزخ کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ دنیاوآخرت کے درمیان واقع ہونے والے عالم برخ کا فلسفہ ہراس فلسفہ کی مانند ہے جومتوسط مرحلے سے متعلق ہے چونکہ ایک محیط سے دوسرے محیط کی طرف منتقل ہونا کہ جو پہلے سے کلی طور پرمختلف ہواسی صورت میں قابل تحمل ہوسکتا ہے کہ جب ایک درمیانی مرحلہ بھی موجود ہو،ایک ایسا مرحلہ کہ جس میں کچھ خواص پہلے مرحلے والے اور کچھ خصوصیات دوسرے مرحلے کی بھی پائی جاتی ہوں۔

علاوہ ازیں قیامت تمام انسانوں کے لئے ایک ہی دن برپا ہوگی کیونکہ زمین وآسمان ایک ہی دن میں زیروزبر ہوں گے اورایک نئی

دنیاوجود میں آئے گی۔ پھراسی نئی دنیامیں انسانوں کی حیاتِ نوکا آغاز ہوگا۔لہٰذااس صورتِ حال کے پیش نظراس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ دنیاو آخرت کے درمیان ایک برزخ ہوتاکہ ارواح ابدانِ مادی سے جداہوکراس برزخ میں منتقل ہوجائیں اوردنیا کے خاتمے تک وہیں رہیں اور پھر دنیاکے خاتمے پراورآغازِ قیامت پراکٹھی محشورہوں کیونکہ ممکن نہیں ہے کہ ہرانسان اپنے لئے جداگانہ قیامت رکھتاہو،اس لئے کہ قیامت اس دنیا کے فناہونے اورزمین وآسمان کے ایک اورزمین وآسمان میں متبدیلی کے بعدرونماہوگی۔

مزیدبرآں روایات سے پتہ چلتاہے کہ مومنین کی تعلیم وتربیت میں رہ جانے والی کمی کی تلافی عالم برزخ میں ہوں گی۔یہ درست ہے کہ وہ عمل صالح انجام دینے کامقام نہیں ہے۔لیکن اس کے پہلے سے زیادہ معرفت کے حصول اورآگاہی کے مقام ہونے میں کیامانع ہے؟

حضرت امام موسیٰ ابن جعفرعلیہ السلام سے منقول ہے:

من مات من اولیائنا وشیعتناولم یحسن القران علم فی قبرہ لیزفع اللہ بہ من درجتہ فان درجات الجنۃ علی قدر آیات القران یقل لہ اقرا وارق، فیقرأ ثم یرقی

جوکوئی ہمارے دوستوں اورپیروکاروں میں سے مرجائے اوروہ اس وقت تک تعلیم قرآن سے مکمل طور پر بہرہ ور نہ ہواہوتوقبرمیں اسے (قرآن کی) تعلیم دی جائے گی تاکہ خداوندتبارک وتعالیٰ اس وسیلے سے اس کے درجات بلندکرے چونکہ درجات بہشت قرآنی آیات ہی کی تعداد کے مطابق ہوں گے۔اس سے کہاجائے گاکہ پڑھو اوراوپرچلتے جاؤ۔وہ پڑھے گا(اوردرجات بہشت) طےکرتاجائے گا۔[1]

ایک وضاحت

پہلے خیال یہ تھاکہ ''معاددرقرآن'' سے متعلق تمام بحث کوایک ہی جلدمیں جمع کردیاجائے تاکہ رجوع کرنے میں آسانی رہے،لیکن عملاً ایسامشکل دکھائی دیا کیونکہ معاد سے متعلق بحث اس قدروسیع ہے کہ ممکن ہےنوسوسے ایک ہزارصفحے تک طول پکڑجائے۔(وہ بھی اختصارکا دامن تھامتے ہوئے)۔بنابرایں ایک جلد بنانامشکل تھی۔لہٰذامجبوراً کلیات معاد سے مربوط بحث کوایک جلدمیں اوراس سے متعلق خصوصیات کو دوسری جلدمیں سمودیاگیاہے۔امیدہے کہ تاحدالامکان اس کاحق اداہوگیاہوگا۔

خداوندا! ہم جانتے ہیں کہ ہمیں ایک عظیم اور پرخطرسفرکاسامناہےاورابھی تک ہم نے اپنے آپ کواس کے لئے آمادہ نہیں کیا۔لہٰذاہمیں اس کے لئے جلداز جلداورزیادہ سے زیادہ آمادگی کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! جب تیراخاص بندہ علیؑ سیل اشک جاری کرتے ہوئے یہ فرماتاہے کہ:''سفرطویل ہےاورعلیؑ کے پاس اس سفرکے لئے زادِراہ کم ہے''

---

[1] اصول کافی۔ج ۲ ص ۶۰۶ باب فضل حامل القرآن حدیث ۱۰

تو ہم ان خالی ہاتھوں کے ساتھ کیا کہیں؟ ہماری امید تو فقط تیرے بے انتہا لطف وکرم سے وابستہ ہے۔

بارالہا! لیکن ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہے ایک ایسا عامل ہے جو اس دنیا سے کہیں والاتر و بالاتر ہے۔ اس تنگ، محدود اور تاریک عالم کی حدود سے کہیں زیادہ ہے اور ایک ایسا عالم ہے کہ جس پر تیرے انوار کا پے در پے بطور واضح وآشکار پرتو ہوگا اور وہاں قدرت وعظمت کے آثار روشن تر وتابندہ تر ہوں گے۔ تیرے اس روحانی دیدار کی نوید مسرت دی جائے گی جس سے ہم اس دنیا میں محروم رہے اور اس عظیم دعوت کی بشارت دی جائے گی کہ جس کے دستر خوان پر ''ایسی چیزیں ہیں کہ جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی کے دل میں اس کا گزر ہوا۔''

ما لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر

اے پروردگارِ بزرگ! ہمیں محروم نہ فرما۔

اختتام جلد پنجم
تفسیر موضوعی (قیام قرآن)
۱۶/ جمادی الثانی ۱۴۱۱ھ